10

مرقاۃ المفاتیح

شرح اردو

مشکوٰۃ المصابیح

للعلامہ الشیخ القاری علی بن سلطان محمد القاری

مترجم: مولانا راؤ محمد ندیم

مکتبۃ رحمانیۃ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

معزز قارئین توجہ فرمائیں!

کتاب وسنت ڈاٹ کام پر دستیاب تمام الیکٹرانک کتب ....

- عام قاری کے مطالعے کے لیے ہیں۔
- مجلس التحقیق الاسلامی کے علمائے کرام کی باقاعدہ تصدیق واجازت کے بعد آپ لوڈ (Upload) کی جاتی ہیں۔
- دعوتی مقاصد کی خاطر ڈاؤن لوڈ، پرنٹ، فوٹو کاپی اور الیکٹرانک ذرائع سے محض مندرجات نشرواشاعت کی مکمل اجازت ہے۔

☆ تنبیہ ☆

- کسی بھی کتاب کو تجارتی یا مادی نفع کے حصول کی خاطر استعمال کرنے کی ممانعت ہے۔
- ان کتب کو تجارتی یا دیگر مادی مقاصد کے لیے استعمال کرنا اخلاقی، قانونی و شرعی جرم ہے۔

﴿اسلامی تعلیمات پر مشتمل کتب متعلقہ ناشرین سے خرید کر تبلیغ دین کی کاوشوں میں بھرپور شرکت اختیار کریں﴾

- نشرواشاعت، کتب کی خرید وفروخت اور کتب کے استعمال سے متعلقہ کسی بھی قسم کی معلومات کے لیے رابطہ فرمائیں۔

kitabosunnat@gmail.com
www.KitaboSunnat.com

مرقاۃ المفاتیح اردو

للعلامہ الشیخ القاری علی بن سلطان محمد القاری هجری ١٠١٤

شرح

مشکوٰۃ المصابیح

للامام العلامۃ محمد بن عبداللہ الخطیب التبریزی المتوفی ٧٤١

مترجم: مولانا راؤ محمد ندیم

جلد دہم

مکتبہ رحمانیہ
اقرأ سنٹر غزنی سٹریٹ، اردو بازار، لاہور
فون: 37355743-37224228-042
MAKTABA-E-REHMANIA

بسم اللہ الرحمن الرحیم

MAKTABA-E-REHMANIA

مکتبہ رحمانیہ

نام کتاب: .... مرقاۃ المفاتیح اردو (جلد دہم)

مترجم: .... مولانا راؤ محمد ندیم

ناشر: .... مکتبہ رحمانیہ

مطبع: .... لٹل سٹار پرنٹرز لاہور

استدعا

اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے انسانی طاقت اور بساط کے مطابق کتابت، طباعت، تصحیح اور جلد سازی میں پوری پوری احتیاط کی گئی ہے۔

بشری تقاضے سے اگر کوئی غلطی نظر آئے یا صفحات درست نہ ہوں تو ازراہ کرم مطلع فرما دیں۔ ان شاء اللہ ازالہ کیا جائے گا۔ نشاندہی کے لیے ہم بے حد شکر گزار ہوں گے۔ (ادارہ)

فہرست

الموضوع

كِتَابُ الْفِتَنِ

فتنوں کا بیان

"فتن" یہ "فتنة" کی جمع ہے۔اس کا معنی ہے امتحان' مصیبت میں آزمانا۔

فتنہ کے مختلف معنی ہیں' مثلاً: آزمائش وامتحان' ابتلاء' گناہ' فضیحت' عذاب' مال ودولت' اولاد' بیماری' جنون' محبت' عبرت' گمراہ کرنا وگمراہ ہونا اور کسی چیز کو پسند کرنا اور اس پر فریفتہ ہونا نیز لوگوں کی رائے میں اختلاف پر بھی فتنہ کا اطلاق ہوتا ہے۔

واضح رہے کہ مشکوۃ کا وہ حصہ جو یہاں سے شروع ہو کر آخر تک ہے اس کو مؤلف نے کتاب الفتن کا نام دیا ہے اور اس کے ضمن میں مختلف ابواب قائم کیے ہیں۔ بظاہر اس کی وجہ سمجھ میں نہیں آتی' خصوصاً فضائل ومناقب کے ابواب کو کتاب الفتن میں شامل کرنے کی کوئی معقول وجہ نظر نہیں آتی۔اگر یہ کہا جائے کہ ان ابواب میں جن مقدس ہستیوں یعنی ذات رسالت پناہ صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفاء راشدین واکابر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے فضائل ومناقب بیان کیے گئے ہیں۔ہم ان کی عظمت وبرتری اور بزرگی کا اعتقاد رکھنے کے مکلف اور اس اعتقاد کو اپنے عمل سے ثابت کرنے کے امتحان وآزمائش میں مبتلا ہیں۔نیز ان کی ذات کے گرویدہ اور ان پر فریفتہ ہیں اور اس اعتبار کو ملحوظ رکھا جائے تو پوری کتاب میں جو کچھ منقول ومذکور ہے وہ سب اسی قبیل سے ہے اور اس صورت میں محض کتاب الفتن کی تخصیص لاحاصل ہوگی! بہر حال اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ اس موقع پر مؤلف مشکوۃ کے ذہن میں کیا بات تھی اور انہوں نے کن وجوہ کی بنا پر یہاں سے کتاب کے آخر تک کے حصہ کو کتاب الفتن کا نام دیا۔

اَلْفَصْلُ الْاَوَّلُ:

قیامت سے پہلے وقوع پذیر فتنوں کا تذکرہ

۵۳۷۹: عَنْ حُذَيْفَةَ قَالَ قَامَ فِينَا رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَقَامًا مَا تَرَكَ شَيْئًا يَكُونُ فِي مَقَامِهِ ذٰلِكَ إِلٰى قِيَامِ السَّاعَةِ إِلَّا حَدَّثَ بِهِ حَفِظَهُ مَنْ حَفِظَهُ وَنَسِيَهُ مَنْ نَسِيَهُ قَدْ عَلِمَهُ أَصْحَابِي

هٰؤُلَآءِ وَإِنَّهُ لَيَكُوْنُ مِنْهُ الشَّيْءُ قَدْ نَسِيْتُهُ فَأَرَاهُ فَأَذْكُرُهُ كَمَا يَذْكُرُ الرَّجُلُ وَجْهَ الرَّجُلِ إِذَا غَابَ عَنْهُ ثُمَّ إِذَا رَاٰهُ عَرَفَهُ۔ (متفق علیہ)

اخرجه البخاری فی صحیحه ۴۹۴/۱۱ حدیث رقم ۶۶۰۴ ومسلم فی صحیحه ۲۲۱۷/۴ حدیث رقم (۲۳-۲۸۹۱) واخرجه ابو داؤد ۴۴۱/۴ حدیث رقم ۴۲۴۰ والترمذی فی السنن ۴۱۰/۴ حدیث رقم ۲۱۹۱ وابن ماجه فی السنن ۱۳۴۶/۲ حدیث رقم ۴۰۵۳ واحمد فی المسند ۳۸۵/۵۔

ترجمہ: ''حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا کہ (ایک روز) رسول اللہ ﷺ ہمارے درمیان کھڑے ہوئے جیسا کہ (خطبہ کے لئے) قیام کیا جاتا ہے۔ پس ان فتنوں سے متعلق جو کچھ بھی آپ کے قیام فرمانے کے وقت) سے لے کر قیامت تک رونما ہونے والی تھیں ان سب کو ذکر فرمایا اور ان میں سے کوئی چیز (بیان کرنے سے) ترک نہیں فرمائی ان باتوں کو یاد رکھنے والوں نے یاد رکھا اور جو فراموش کرنے والے تھے وہ بھول گئے (یعنی آپ ﷺ نے جن فتنوں کا ذکر فرمایا ان کو بعض نے یاد رکھا اور بعض نے فراموش کر دیا)۔

تشریح: قوله: قام فینا رسول اللہ ﷺ مقاما...... الاحدث به:

مقاما: مصدر میمی ہے یا اسم مکان ہے اور بعض نے کہا ہے کہ یہ اسم زمان ہے اور منفی جملہ ''ما ترك شيئا'' صفت ہے اور ''یکون'' بمعنی یوجد ''شيئاً'' کی صفت ہے اور ''فی مقامه ''ترك کا متعلق ہے اور موصوف کی طرف لوٹنے والی ضمیر کی جگہ ''مقامه'' کو ذکر کیا اور ''ذالك'' مقامه کی صفت ہے اور اس میں حضور علیہ السلام کے زمانے کی طرف اشارہ ہے اور ''الی قیام الساعة'' یکون کے لئے غایت ہے۔

اور مطلب یہ ہے کہ آپ کھڑے ہوئے اور قیامت تک آنے والے ایسا کوئی فتنہ (بیان کئے بغیر) نہیں چھوڑا جو پیدا ہوگا اور اس کو ذکر کرنا اور اس کے بارے میں خبر دینا مناسب ہو۔

قوله: قد علمه اصحابی هؤلآء ....:

یعنی میرے موجود ساتھیوں میں سے' لیکن بعض ساتھیوں کو وہ فرمودات تفصیل کے ساتھ یاد نہیں رہے کیونکہ وقت گزرنے کے ساتھ نسیان کا آنا انسان کے خواص میں سے ہے' اور میں وہ آخری شخص ہوں جس کو بعض باتیں یاد نہیں ہیں، اور اگلے جملہ کا یہی معنی ہے۔

وانه: ضمیر، ضمیر شان ہے اور جنہوں نے کہا ہے کہ یہ ضمیر ''شيئا'' کی طرف راجع ہے ہو یہ بات حقیقت سے دور ہے۔

انه لیکون منه بشئ قد نسیه فأراه فاذكره: ''الشیء'' کی صفت ہے، اور لام زائد ہے اور ''لیکون'' میں لام مفتوحہ ہے قسم مقدر کا جواب ہونے کی بناء پر۔ اور مطلب یہ ہے کہ نبی علیہ السلام نے جو کچھ ذکر کیا تھا اس میں سے کچھ واقع ہو جاتا ہے جس کو میں بھول چکا ہوتا ہوں تو جب میں اُسے دیکھ لیتا ہوں، تو وہ بھولی ہوئی بات یاد آ جاتی ہے'

اور حال حکایت کے استحضار کیلئے ماضی سے مضارع کی طرف عدول فرمایا۔ پھر موصوف کو دیکھی ہوئی چیز کے ساتھ تشبیہ

دیتے ہوئے اگلی بات ارشاد فرمائی۔

۵۳۸۰ : وَعَنْهُ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ تُعْرَضُ الْفِتَنُ عَلَى الْقُلُوْبِ كَالْحَصِيْرِ عُوْدًا عُوْدًا فَاَيُّ قَلْبٍ اُشْرِبَهَا نُكِتَتْ فِيْهِ نُكْتَةٌ سَوْدَاءُ وَاَيُّ قَلْبٍ اَنْكَرَهَا نُكِتَتْ فِيْهِ نُكْتَةٌ بَيْضَاءُ حَتّٰى يَصِيْرَ عَلٰى قَلْبَيْنِ اَبْيَضَ مِثْلُ الصَّفَاءِ فَلَا تَضُرُّهُ فِتْنَةٌ مَادَامَتِ السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ وَالْاٰخَرُ اَسْوَدُ مُرْبَادًا كَالْكُوْزِ مُجَخِّيًا لَا يَعْرِفُ مَعْرُوْفًا وَلَا يُنْكِرُ مُنْكَرًا اِلَّا مَا اُشْرِبَ مِنْ هَوَاهُ . (رواہ مسلم)

اخرجه مسلم فی صحیحه ۱۲۸/۱ حدیث رقم (۲۳۱-۱۴۴) واحمد فی المسند ۴۰۵/۵

ترجمہ: ''حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ ارشاد فرماتے ہوئے سنا کہ: ''لوگوں کے دلوں پر فتنے ایسے لگا تار وارد ہوں گے جس طرح چٹائی کے تنکے ہوتے ہیں (یعنی جس طرح چٹائی میں ایک دوسرے کے پیچھے مسلسل پیوست کیے جاتے ہیں ایسے ہی دلوں پر ایک کے بعد ایک فتنے پیش کیے جائیں گے) پس جو دل ان فتنوں کو قبول کرے گا اس میں سیاہ نکتہ لگا دیا جائے اور جو دل ان فتنوں کو قبول کرنے سے انکار کرے گا اس میں سفید نکتہ لگا دیا جائے گا پس انسانوں کے دل فتنوں کے لگا تار پیش آنے اور ان کی دلوں پر تاثیر اور عدم تاثیر کے لحاظ سے دو قسم کے ہو جائیں گے) ایک تو سفید سنگ مرمر کی مانند ہے۔ چنانچہ اس طرح کے دل پر کوئی بھی فتنہ اثر انداز نہیں ہوگا جب تک کہ زمین و آسمان کا قیام ہے (یعنی اس دل کی یہ کیفیت ہمیشہ باقی رہے گی) اور دوسرا راکھ کے رنگ جیسے سیاہ بادل' اوندھے برتن کی طرح ہوگا (کہ اس میں جو کچھ بھی ہو گر پڑے' مطلب یہ کہ ایسا دل راکھ کی طرح کالا اور اوندھے برتن کی مانند ایمان و معرفت کے باطنی انوارات سے محروم ہوگا) چنانچہ ایسا دل کا نہ تو نیک و اچھے اور مشروع کاموں کی پہچان رکھے گا اور نہ غیر مشروع کاموں کی برائی کو پہچانے گا' وہ تو بس اس چیز سے مطلب رکھے گا جو از قسم خواہشات اس میں رچ گئی ہے اور جس کی محبت کا وہ غلام بن چکا ہے۔''۔ (مسلم)

تشریح: قوله: تعرض الفتن علی القلوب:

تعرض: مجہول کے صیغہ کے ساتھ۔

''فتن'' سے مراد مصائب اور آزمائشیں ہیں۔ بعض حضرات نے کہا ہے کہ غلط عقائد اور خواہشات کا سرہ مراد ہیں۔

الفتن علی القلوب: بعض فرماتے ہیں اس کا مطلب یہ ہے کہ دلوں کے سامنے ظاہر ہوں گی اور وہ پہچان لے گا کہ کونسی بات قابل قبول ہے اور کونسی بات قابل تردید ہے، اور قابل تردید سے نفرت کریں گے۔

یہ ''عرض العود علی الاناء'' سے ماخوذ ہے۔ یہ اس وقت بولا جاتا ہے جب برتن پر عرضاً لکڑی رکھی جائے۔

بعض کا کہنا ہے، کہ یہ ''عرض الجند بین یدی السلطان'' (بادشاہ کے سامنے لشکر کو پیش کرنا) سے ماخوذ ہے، اور لشکر کو اس لئے پیش کیا جاتا ہے تا کہ بادشاہ اور ان کو جانچ لے۔

عودًا عودًا: عین کے ضمہ اور دال کے ساتھ ہے۔اور دونوں کا نصب حال ہونے کی بناء پر ہے، ای ینسج الحصیر حال کونه علی هذا المنوال۔

شیخ تورپشتی رحمہ اللہ فرماتے ہیں، کہ یہ رفع کے ساتھ بھی منقول ہے، اور ہم اس کو امام مسلم سے اسی طرح نقل کرتے ہیں، اور صاحب مصابیح نے اسی طرح اس کو ذکر کیا ہے۔تقدیر "ھو عودٌ عودٌ" ہے، اور دوسروں نے اس کو نصب کے ساتھ نقل کیا ہے۔(انتہی)

یہ مبتدا مقدر کی خبر ہے اور تقدیر یہ ہے: "ینسج عود عود" اس صورت میں یہ مفعول مالم لیسم فاعله ہے۔اور ایک نسخہ میں "عوذًا عوذًا" عین کے فتحہ اور نقطہ والی ذال کے ساتھ ہے۔تقدیر عبارت یہ ہوگی: "نعوذ باللہ من ذالك عوذاً عوذًا"۔

امام نووی فرماتے ہیں کہ ان دونوں حرفوں کے بارے میں اختلاف ہے۔ان کو تین طرح نقل کیا گیا ہے۔سب سے مشہور اور زیادہ واضح ضبط عین کے پیش اور دال مہملہ کے ساتھ ہے، اور دوسرے ضبط کے مطابق عین کے زبر اور دال مہملہ کے ساتھ ہے اور تیسرے ضبط کے مطابق عین کے زبر اور نقطے والی ذال کے سات ہے۔اور "تعرض" کا مطلب یہ ہے کہ دل کے ایک کنارے کے ساتھ چمٹ جائیں گے، جیسا کہ چٹائی پر لیٹنے والے کے جسم کے ساتھ چٹائی چمٹ جاتی ہے، اور زیادہ چمٹا رہنے کی وجہ سے بدن پر چٹائی کے نشانات پڑ جاتے ہیں، اور "عودا عودا" کا معنی یہ ہے کہ بار بار پیش آتے رہیں گے۔

ابن سراج کے کلام کا حاصل یہ ہے کہ ذال نقطے والی کے ساتھ اس کا معنی ہے اُن فتنوں سے پناہ مانگنا، جیسا کہ کہا جاتا ہے: غفرًا غفرًا کا معنی ہے، اے اللہ ہم تجھ سے پناہ اور گناہوں کی بخشش مانگتے ہیں۔

خطابی فرماتے ہیں: اس کا معنی یہ ہے کہ دلوں پر فتنے ظاہر ہونگے، یعنی دلوں کو یکے بعد دیگرے فتنے پیش آتے رہیں گے۔جیسا کہ چٹائی کو بُنا جاتا ہے

قاضی عیاض فرماتے ہیں کہ عین کی روایت کی توجیہ اسی طرح ہے کہ عرب میں چٹائی بُننے والا جب ایک تنکا لگا لیتا، تو دوسرا تنکا اٹھا کر چٹائی میں لگا لیتا، چنانچہ دلوں پر یکے بعد دیگرے فتنوں کے پیش آنے کو تشبیہ دی گئی چٹائی بُننے والے کے سامنے چٹائی کے تنکوں کے یکے بعد دیگرے پیش آنے کے ساتھ۔(انتہی)۔

اور جب معاملہ اس طرح ہوگا۔

قوله: فای قلب اشربها نکتة فیه نکة بیضاء:

اشربھا: مجہول کا صیغہ ہے کہا جاتا ہے: "أشرب فی قلبه حبه" ای خالطه یعنی فلاں کی محبت اس کے دل میں رچ بس گئی، لہٰذا معنی یہ ہوا کہ فتنے ان لوگوں کے دلوں کے ساتھ مخلوط ہو جائیں گے اور دل میں مکمل طور پر داخل ہو جائیں گے، اور خوب چمٹ جائیں گے۔اور دلوں میں اس طرح سرایت کر جائیں گے، جیسا کہ پینے کی کوئی چیز جسم کے مسامات میں سرایت کر جاتی ہے، اور اسی معنی میں اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: ﴿وَأُشْرِبُوا فِي قُلُوبِهِمُ الْعِجْلَ بِكُفْرِهِمْ﴾ [البقرة:۹۳] "ان کے

قلوب میں وہی گوسالہ پیوست ہوگیا تھا ان کے کفر (سابق) کی وجہ سے۔"یعنی بچھڑے کی محبت دلوں میں رچ گئی۔

"اشراب" کا معنی ہے ایک رنگ کا دوسرے رنگ کے ساتھ (اس طرح) مخلوط ہو جانا، گویا کہ ایک رنگ نے دوسرے رنگ کو پی لیا ہے اور ایک رنگ کو دوسرا رنگ پہنا دیا گیا ہے۔ چنانچہ معنی یہ ہوا کہ دل فتنوں سے اس طرح متاثر ہو جائیں گے کہ فتنوں کی محبت دلوں میں اس طرح داخل ہو جائے گی جیسا کہ رنگ کپڑے میں داخل ہو جاتا ہے۔

نکتت: مجہول کے صیغہ کے ساتھ۔

"نکت" کا اصل معنی ہے زمین کو لکڑی سے اس طرح کریدنا کہ زمین پر نشان پڑ جائے۔

اگر پہلے سے سفید نکتہ نہ ہو ورنہ معنی یہ ہوگا کہ وہ نکتہ پختہ دائمی و مستمر ہو جائے گا۔

قوله: حتى تصير على قلبين ابيض السماوات والارض:

"حتی": دونوں کیلئے غایت ہے۔

تصير: تاء کے ساتھ۔ای "**تصير قلوب اهل ذالك الزمان**". اور ایک نسخہ میں یاء کے ساتھ ہے۔ای "**يصير الانسان باعتبار قلبه**" او "**يصير قلبه**".

على قلبين: دو قسموں پر یا دو صفتوں پر۔

أبيض: رفع کے ساتھ ہے (مبتدا محذوف کی خبر ہے۔) ای: "**احدهما أبيض**".

الصفا: الف مقصورہ کے ساتھ ہے، یعنی اس سنگِ مرمر کی طرح جو انتہائی سفیدی و صفائی کی وجہ سے چمک رہا ہو، اور ایک نسخہ میں دونوں (یعنی) بیض اور مثل) فتحہ کے ساتھ منقول ہیں، اس بناء پر کہ پہلا ("أبيض") "قلبین" سے بدل البعض ہے، اور دوسرا (یعنی "مثل) أبيض سے حال ہے، ای "**مماثلاً ومشابهاً للصفا في النور**"

یہ وہ پاکیزہ دل ہونگے جنہوں نے فتنوں کے زمانے میں فتنوں کا انکار کیا۔ پس اللہ تعالیٰ اس وقت سے لے کر قیامت تک ان کی حفاظت کرے گا۔

قوله: والآخر اسود مربادا كالكوز......: والآخر: مرفوع ہے اور اسی طرح "**أسود**" بھی مرفوع ہے۔

"**مرباد**": میم کے کسرہ اور دال کی تشدید کے ساتھ ہے، **ارباد** سے ماخوذ ہے جو "**احمار**" کے وزن پر ہے، معنی یہ ہے کہ راکھ کے رنگ جیسے ہو جائیں گے۔ "**مرماد**" (**رمد** سے ماخوذ ہے) خاکستری اور سیاہ رنگ کے درمیان کا رنگ۔ یہ حال ہے یا منصوب ہے ذم کی بناء پر۔

مجخيا: میم کے پیش، جیم کے سکون، خاء کے زیر اور آخر میں یاء مشددہ ہے اور کبھی یاء کو مخفف بھی پڑھا جاتا ہے۔ نہایہ میں لکھا ہے کہ اس لفظ کو خاء کی جیم پر تقدیم کے ساتھ بھی نقل کیا گیا ہے، ای **مائلا منكوسا**۔

اگلے جملہ کا مطلب یہی ہے علوم معرفت سے خالی شخص کو تشبیہ دی گئی ہے اُس مائل کوزہ کے ساتھ کہ جس میں کوئی چیز نہ

ٹھہرتی ہے، اور نہ باقی رہتی ہے،

لا یعرف معروفًا و لا ینکر منکرا: یعنی کہ معروف کا معروف ہونا اور منکر کا منکر ہونا اس دل میں باقی نہیں رہتا۔

من هواه: چنانچہ دل طبعی طور پر اس کی اتباع کرتا ہے، اُس کا شریعت میں معروف اور منکر کا لحاظ کیے بغیر۔

قاضیؒ فرماتے ہیں کہ "حتی یصیر علی قلبین الخ" کا مطلب یہ ہے کہ یہاں تک کہ انسان کی دو قسمیں بن جائینگی ایک قسم وہ انسان جو سنگ مرمر کی طرح سفید دل والے ہوں گے اور دوسری قسم وہ انسان جو راکھ کی مانند سیاہ دل والے ہونگے۔

مظہرؒ فرماتے ہیں کہ "تصیر" کی ضمیر "القلوب" کی طرف راجع ہے ای تصیر القلوب علی نوعین۔ یعنی کہ دل دو قسموں میں تقسیم ہو جائیں گے۔ ایک قسم سفید اور دوسری قسم سیاہ۔

تورپشتی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں، کہ "الصفا" صاف ستھرے، نرم چکنے پتھر کو کہا جاتا ہے وہ پتھر جو بالکل سفید رنگ کا ہو اور "ابیض" کہہ کر اسی مراد کی طرف اشارہ کیا ہے۔ اور اس کو بطور ضرب المثل بیان فرمایا اس لئے کہ غیر معدنی پتھر میں پتھر لمبا عرصہ گزرنے کے باوجود اس میں کوئی تغیر نہیں آتا، اور کوئی نہ اس کا رنگ تبدیل ہوتا ہے خصوصاً جب کہ پتھر بھی وہ پتھر ہو جس کو ضرب المثل کے طور پر ذکر کیا جاتا ہے۔ کیونکہ یہ پتھر ہمیشہ خالص سفید رنگ کا ہی رہتا ہے۔ اس میں کدرت نہیں ہوتی۔

مسلم کی شرح میں لکھا ہے کہ قاضی عیاضؒ فرماتے ہیں، کہ دل کو سنگِ مرمر کے ساتھ تشبیہ دینے سے دل کی سفیدی بیان کرنا مقصود نہیں ہے بلکہ ایک دوسری صفت یعنی شدت کو بیان کرنا مقصود ہے کہ وہ دل ایمان پر مضبوطی سے قائم ہونگے، ایمان میں خلل آنے سے محفوظ ہونگے اور فتنے نہ اُن کے ساتھ چمٹیں گے اور نہ اُن میں اثر کریں گے جیسا کہ "صفا" ملائم چکنا پتھر ہوتا ہے، کہ کوئی چیز اس کے ساتھ معلق نہیں رہتی۔

"مربادًا" ہماری روایت اور ہمارے بلاد کی نسخ اصول میں اسی طرح ہے۔ یہ حال ہونے کی بناء پر منصوب ہے اور قاضی عیاضؒ نے اس لفظ میں اختلاف ذکر کیا ہے، کیونکہ بعض لوگ تو اسی طرح نقل کرتے ہیں، جس طرح ہم نے ذکر کیا ہے اور بعض لوگ اس لفظ کو "مربئد" یعنی باء کے بعد ہمزہ مکسورہ کے ساتھ نقل کرتے ہیں کہ اصل تو یہ ہے کہ یہ لفظ ہمزہ کے ساتھ نہ پڑھا جائے بلکہ "مسود" اور "محمر" کے وزن پر "مربد" پڑھا جائے اس لئے کہ یہ "اربد" سے مشتق ہے۔ اور اُن لوگوں کی لغت کے مطابق ہمزہ کے ساتھ پڑھا جا سکتا ہے، جو کہتے کہ "احمار" میں میم کے بعد ہمزہ ہے کیونکہ ہمزہ نہ ہونے کی صورت میں التقاء ساکنین ہوگا چنانچہ اُن لوگوں کی لغت میں "ارباد فهو مربئد" پڑھا جاتا ہے، اور دونوں قولوں کے مطابق دال مشدد ہے۔

مظہرؒ فرماتے ہیں کہ "الا ما أشرب" کا مطلب یہ ہے کہ دل سوائے فاسد عقائد اور نفسانی خواہشات کے نہیں پہچانیں گے اور علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں کہ ممکن ہے اس سے مراد مدح کے مشابہ مذمت کی تاکید ہو یعنی اس میں ہرگز خیر پر نہیں ہیں، سوائے اس کے اور یہ بھی بھلائی پر نہیں چنانچہ اس سے یہ لازم آتا ہے، کہ ان لوگوں میں بالکل بھلائی نہیں ہے۔

۵۳۸۱ : وَعَنْهُ قَالَ حَدَّثَنَا رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ حَدِيْثَيْنِ رَأَيْتُ اَحَدَهُمَا وَاَنَا اَنْتَظِرُ

الْاٰخَرَ حَدَّثَنَا اَنَّ الْاَمَانَةَ نَزَلَتْ فِيْ جَذْرِ قُلُوْبِ الرِّجَالِ ثُمَّ عَلِمُوْا مِنَ الْقُرْاٰنِ ثُمَّ عَلِمُوْا مِنَ السُّنَّةِ وَحَدَّثَنَا عَنْ رَفْعِهَا قَالَ يَنَامُ الرَّجُلُ النَّوْمَةَ فَتُقْبَضُ الْاَمَانَةُ مِنْ قَلْبِهٖ فَيَظَلُّ اَثَرُهَا مِثْلَ اَثَرِ الْوَكْتِ ثُمَّ يَنَامُ النَّوْمَةَ فَتُقْبَضُ فَيَبْقٰى اَثَرُهَا مِثْلَ اَثَرِ الْمَجْلِ كَجَمْرَةٍ دَحْرَجْتَهٗ عَلٰى رِجْلِكَ فَنَفِطَ فَتَرَاهُ مُنْتَبِرًا وَلَيْسَ فِيْهِ شَيْءٌ وَيُصْبِحُ النَّاسُ يَتَبَايَعُوْنَ وَلَا يَكَادُ اَحَدٌ يُؤَدِّي الْاَمَانَةَ فَيُقَالُ اِنَّ فِيْ بَنِيْ فُلَانٍ رَجُلًا اَمِيْنًا وَيُقَالُ لِلرَّجُلِ مَا اَعْقَلَهٗ وَمَا اَظْرَفَهٗ وَمَا اَجْلَدَهٗ وَمَا فِيْ قَلْبِهٖ مِثْقَالُ حَبَّةٍ مِنْ خَرْدَلٍ مِنْ اِيْمَانٍ. (متفق عليه)

اخرجه البخاری فی صحیحه ۳۳۳/۱۱حديث رقم ٦٤٩٧ومسلم فی صحيحه ۱۲٦/۱حديث رقم (۲۳۰-۱٤۳) والترمذی فی السنن ٤۱۱/٤حديث رقم ۲۱۷۹ وابن ماجه فی السنن ۱۳٤٦/۲حديث رقم ٤۰۵۳ واحمد فی المسند ۳۸۳/۵

ترجمہ: ''حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا (ایک روز) رسول اللہ ﷺ نے ہم سے (امانت اور فتن و حوادث زمانہ) دو حدیثیں (یعنی دو باتیں) بیان فرمائیں جن میں سے ایک کا تو میں مشاہدہ کر چکا ہوں جب کہ دوسری کا انتظار کر رہا ہوں چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے ہم سے بیان فرمایا کہ امانت لوگوں کے دلوں کی گہرائی میں نازل ہوئی پھر لوگوں نے قرآن کو جانا اور پھر انہوں نے سنت کو جانا۔'' اس بعد کے آپ ﷺ نے ہم سے امانت کے اٹھ جانے (یعنی ایمان کے ثمرات وانوارات کے ختم ہو جانے اور مانند پڑ جانے) کی حدیث بیان کی' چنانچہ ارشاد فرمایا۔ آدمی (حسب معمول) سوئے گا یا غافل ہوگا اور امانت اس کے دل سے نکال لی جائے گی (یعنی اس کے ایمان کی بعض برکات وانوار ناقص وکم ہو جائیں گی) پس امانت کا اثر یعنی نشان (جو ثمرہ ایمان ہے) وکت کے نشان کی مانند غفلت کا شکار ہوگا (حاصل یہ کہ ایمان کا نور دھندلا اور اس کا اثر وثمرہ میں کمی پیدا ہو جائے گی پھر جب وہ دوبارہ سوئے گا (اور زیادہ غفلت کی شکار رہ جائے) تو اس کی امانت کا وہ حصہ بھی ناقص کر دیا جائے گا اور اٹھا لیا جائے گا جو باقی رہ گیا تھا پس (اس کے دل میں) ایک مجل یعنی آبلہ کی مانند نشان رہ جائے گا جیسا کہ تم آگ کے انگارے کو اپنے پاؤں پر لڑھکا دو اور اس سے آبلہ پڑ جائے۔ جو بظاہر پھولا اور اٹھا ہوا دکھائی دے حالانکہ اندرونی طور پر اس میں (خراب اور گندے پانی کے علاوہ) کچھ نہیں ہوگا۔ پھر (ایسے حالات میں) جب لوگ صبح کو اٹھیں گے تو حسب معمول آپس میں لین دین کریں گے اور ان میں سے ایک شخص بھی امانت کو ملحوظ رکھنے والا نہیں ہوگا۔ یہاں تک کہ (امانت و دیانت میں کمی آ جانے کے سبب یہ کہا جائے گا کہ فلاں قبیلہ (یا فلاں شہر و آبادی) میں (لوگوں کی کثرت کے باوجود) بس ایک امانتدار آدمی یعنی کامل الایمان ہے اور (اس زمانے میں) ایک شخص کے متعلق کہا جائے گا کہ (اپنے دنیاوی کاروبار اور معاملات میں) کس قدر ہوشیار کتنا دانا وخوبصورت' حوصلے والا اور کس قدر چست وچالاک ہے' حالانکہ اس کے دل میں رائی کے دانے کے بقدر بھی ایمان نہ ہوگا''۔ (بخاری ومسلم)

تشریح: قوله:قال حدثنا رسول الله ﷺ حديثين......انتظر الآخر:

یعنی امانت اور فتنے کے زمانے کے حوادث کے بارے میں دو حدیثیں بیان فرمائیں۔ چنانچہ ان دونوں حدیثوں کو اس باب میں ذکر کرنے کی وجہ مناسبت ظاہر ہے۔

امام نوویؒ فرماتے ہیں کہ پہلی حدیث یہ ہے: "حدثنا ان الامانة نزلت......

اور دوسری حدیث یہ ہے: "حدثنا عن رفعها.....

قوله: حدثنا ان الا مانة من السنة:

یہ وہ پہلی حدیث ہے۔ اور اس سے مراد ایمان ہے اور اسی سے یہ ارشاد باری ہے: ﴿انا عرضنا الامانة﴾ [الاحزاب:٧٢] "ہم نے یہ امانت (یعنی احکام جو بمنزلہ امانت کے ہیں) آسمان و زمین اور پہاڑوں کے سامنے پیش کی تھیں اور ایمان کو 'امانت سے' اس لئے تعبیر کیا کہ دیانت کا مدار یہی ہے۔

"جذر" : جیم کے زبر کے ساتھ ہے، اور جیم کی زیر کے ساتھ بھی پڑھا جا سکتا ہے۔ شارحؒ فرماتے ہیں: "جذر شئ" کا معنی ہے اس کی جڑ اس کی اصل اور، مطلب یہ ہے کہ امانت وہ پہلی چیز ہے جو لوگوں کے دلوں میں اتری اور دلوں پر قبضہ جمایا، یہی امانت انسان کو قرآن و سنت پر عمل کرنے کیلئے ابھارتی ہے، اور اگلے جملے کا بھی یہی معنی ہے۔

قوله :ثم علموا من القرآن: یعنی ایمان کے نور کی برکت سے جو احکامات از قبیل واجب یا نفل یا حرام یا مباح حضور علیہ السلام سے جو یعنی حاصل کرتے تھے قرآن یا حدیث سے ماخوذ ہوتا تھا۔

ثم من السنة: اور ایک صحیح نسخہ میں "ثم علموا من السنة" کے الفاظ ہیں۔ اس جملہ میں اشارہ ہے اس بات کی طرف کہ حدیث سے جو حکم حاصل ہوتا ہے اس کا رتبہ اُس حکم سے مؤخر ہوتا ہے، جو قرآن کی نص سے حاصل ہو۔

نوویؒ فرماتے ہیں، کہ ظاہر یہ ہے کہ امانت سے مراد وہ "تکلیف" شرعی ہے، جس کا اللہ تعالیٰ نے بندوں کو مکلف کیا ہے، اور وہ عہد مراد ہے جو اللہ تعالیٰ نے انسانوں سے لیا ہے۔

صاحب تقریر فرماتے ہیں، کہ حدیث میں مذکور امانت وہی امانت ہے، جو قرآن کریم کی اس آیت ﴿انا عرضنا الأمانة﴾ [الاحزاب:٧٢] "ہم نے یہ امانت (یعنی یہ احکام جو بمنزلہ امانت کے ہیں آسمان و زمین اور پہاڑوں کے سامنے پیش کی تھی۔" میں مذکور ہے اور وہ عین ایمان ہے۔ (انتہی)

بظاہر امام نوویؒ کے کلام میں عہد سے مراد عہدِ میثاق ہے، اور وہ فطری ایمان ہے، چنانچہ صاحب تقریر کی بات کو ذکر کرنا مزید وضاحت اور تاکید کیلئے ہے اُس ذکر سے یہ غرض نہیں ہے کہ صاحب تقریر کی یہ بات امام نوویؒ کی بات کے مخالف ہے، جیسا کہ ظاہراً معلوم ہو رہا ہے۔ اس لئے کہ یہ گذشتہ حدیث کے شروع والے حصہ کے موافق نہیں۔

اسی طرح اس حدیث کا آخری حصہ "وما فی قلبه مثقال حبة من ایمان" اُس کے موافق نہیں ہے۔ علاوہ ازیں ایمان امانت کو رو کے رکھنے کا نام ہے۔ اور جہاں تک حضور علیہ السلام کے ارشاد "لا ایمان لمن لا امانة له" کا تعلق ہے تو اس میں کمال ایمان کی نفی مراد ہے۔ واللہ اعلم بالصواب

قوله: وحدثنا عن رفعها قال ينام الرجل النومة فتقبض الامانة من قلبه:

ينام الرجل النومة: (اس کے دو مطلب ہو سکتے ہیں)

۱ اس سے حقیقتاً سونا مراد ہے، چنانچہ اس کے بعد والی حالت ایک اضطراری چیز ہے۔

۲ سونا کنایہ ہے غفلت سے جو گناہ کے ارتکاب کا ذریعہ ہے اور گناہوں کا ارتکاب امانت اور ایمان میں نقصان کا باعث بنتا ہے۔

فتقبض الامانة من قلبه: یعنی امانت کا کچھ حصہ، جیسا کہ بعد والا کلام اس پر دلالت کرتا ہے، اور مطلب یہ ہے کہ ایمان کے بعض ثمرات اٹھالئے جائیں گے۔

فيظل اثرها مثل اثر الوكت...... وليس فيه شئ:

فيظل: یاء اور ظاء دونوں کے فتحہ اور لام کی تشدید کے ساتھ' بمعنی يصير

الوكت: واؤ کے زیر' کاف کے سکون اور آخر میں تاء کے ساتھ۔ اس کا معنی ہے معمولی سا نشان جیسا کہ کسی چیز پر نقطہ ہو۔

فيبقى: معروف کا صیغہ ہے اور بعض کا کہنا ہے کہ مجہول کا صیغہ ہے۔

المجل: میم کے زبر اور جیم کے سکون کے ساتھ ہے جیم کا فتحہ بھی جائز ہے۔ "آبلہ"۔

كجمر: تاثیر کے اعتبار سے۔ (یہاں مضاف محذوف ہے) ای "كتاثير جمر" ایک شارح فرماتے ہیں، کہ "كجمر" یہ "مثل اثر المجل" سے بدل ہے ای: "يكون اثرها فى القلب كاثر جمر". یا یہ مبتدا محذوف کی خبر ہے ای: "هو كجمر اى اثر المجل كجمر".

نفط: فاء کے زیر کے ساتھ۔

منتبراً: بائے موحدہ مکسورہ کے ساتھ ہے اس کا معنی ہے ابھرا ہوا۔ "نفط" اور "منتبر ا" دونوں کو بصیغہ مذکر ذکر کیا حالانکہ "رجل" مونث سماعی ہے کیونکہ "رجل" سے وہ "موضع" مراد ہے جس پر چنگاری لڑھکائی جائے۔ اور اسی سے حضرت عمرؓ کا یہ ارشاد بھی ہے: "اياكم و التخلل بالقصب فان الفم ينتبر منه"

"نرکل سے دانتوں کا خلال نہ کیا کرو، کیونکہ اس سے منہ سوج جاتا ہے)۔

بعض نے اس کا معنی یہ بیان کیا ہے کہ تجھے یہ خیال گزرے گا کہ یہ بڑا امانت دار شخص ہے لیکن یہ شخص اُس آبلے کی مانند ہو گا جو بھرا ہوا نظر آتا ہے، لیکن اندر سے خالی ہوتا ہے (اسی طرح وہ شخص اندر سے امانت کے اعتبار سے خالی ہوگا)۔

اور فائق میں لکھا ہے کہ "الوكت" اور "المجل" میں فرق وہ یہ ہے کہ "الوكت" کسی شئ پر لگ جانے والا وہ نقطہ جو کسی اور رنگ کا ہو اور "المجل" کام کی وجہ سے ہاتھ کی کھال کا سخت ہو جانا "فتراه منتبراً" اسی پر دلالت کر رہا ہے۔

وليس فيه شئ: کوئی فائدہ مند چیز نہیں ہے، بلکہ خراب پانی ہے۔

شرح مسلم میں صاحب تحریر نے لکھا ہے، کہ حدیث کا مطلب یہ ہے کہ امانت دلوں سے آہستہ آہستہ زائل ہوتی جائے گی،

چنانچہ جب اس کا ایک حصہ زائل ہو جائے گا تو دل سے امانت کے اس حصہ کے بقدر نور زائل ہو جائے گا، اور "وکت" جیسا اندھیرا دل میں داخل ہو جائے گا، جب دوسرا حصہ زائل ہوگا تو دل میں ایسا نشان ہوگا جیسا کہ آبلے کا ہوتا ہے، اور یہ نشان پختہ ہوتا ہے ایک عرصہ بعد ہی زائل ہوتا ہے اور اس کی ظلمت پہلے والے کی ظلمت سے بڑھ کر ہوتی ہے، پھر اس کے بعد دل میں نور ایمان کے داخل ہونے اور اس کے قرار پکڑنے کے بعد اس نورِ ایمان کے زائل و ماج ہونے اور اس کے بعد اندھیرا داخل ہونے کو تشبیہ دی ایسے انگارے کے ساتھ جس کو پاؤں پر لڑھکایا جائے، یہاں تک کہ وہ جلد کو متاثر کر دے اور پھر وہ جمرہ زائل ہو جائے تو جلی ہوئی جگہ پر آبلہ پڑ جائے۔ اور لفظ "نفط" کو بصیغہ مذکر فرمایا نفطت یعنی مونث کے صیغہ کے ساتھ نہیں فرمایا، اس لئے کہ "رجل" کو "عضو" کی تاویل میں لیا گیا ہے، (انتہیٰ)۔

ہمارے علماء میں سے ایک اور شارح فرماتے ہیں، مراد یہ ہے کہ جب لوگ گناہوں کا ارتکاب کریں گے تو بطور سزا ان کے دلوں سے اس امانت کو اٹھا لیا جائے گا، یہاں تک کہ جب وہ نیند سے بیدار ہوں گے تو اپنے دلوں کی وہ حالت نہیں پائیں گے جو پہلے تھی۔ اور ان کے دلوں میں ایک نشان ہوگا جو کبھی تو "وکت" کی طرح ہوگا اور کبھی "مجل" کی طرح ہوگا۔

مجل کا معنی ہے "کام کرنے کی وجہ سے ہاتھ میں چھالے پڑنا"۔ اور "مجل" اگرچہ مصدر ہے لیکن یہاں اس سے مراد آبلہ ہے، اور یہ درجہ پہلے درجے (یعنی "وکت") سے کمتر ہے، کیونکہ آبلہ کی تعبیر میں دل کے بالکل خالی ہونے کی طرف اشارہ ہے، جبکہ پہلے درجہ سے مراد یہ ہے کہ اگرچہ دل امانت سے خالی ہوگا۔ مگر کچھ نہ کچھ نشان باقی رہے گا۔

قوله: ويصبح الناس يتبايعون...... يؤدی الامانة:

ويصبح الناس: یہ "يدخلون في الصباح" کے معنی میں ہے (یعنی صبح کے وقت میں داخل ہونگے۔) یا "يصيرون" کے معنی میں ہے۔ (لوگ سو جائیں گے)

یعنی لوگوں میں خرید و فروخت کا معاملہ ہوگا اور آپس میں وعدہ کریں گے۔ خرید و فروخت، وعدہ اور عہد و پیمان میں خیانت کریگا۔ اور یہ بات تو معلوم ہے کہ امانت کی حفاظت کامل ایمان کا اثر ہے۔ چنانچہ جب امانت داری ناقص ہوگی تو ایمان ناقص ہو جائے گا اور یقین باطل ہوگا اور احسان کی کیفیت زائل ہو جائے گی۔

قوله: فيقال ان في بني فلان ...... وما أجلده:

اس شخص کے کمال درپے تعجب اور اس کے کلام جمال کو عجیب و غریب سمجھنے کی وجہ سے حاصل یہ کہ اس شخص کی عقل کی زیادتی، چالاکی اور مہارت کی تعریف کریں گے اور اس پر تعجب کریں گے لیکن کسی عالم باعمل کی تعریف اس کے علم نافع اور عمل صالح کی وجہ سے نہیں کریں گے۔

قوله: وما في قلبه مثقال حبة......:

وما في قلبه: یہ جملہ "الرجل" سے حال ہے۔ ای والحال انه ليس في قلبه......

من خردل: "من" بیانیہ "حبة" کا بیان ہے، ای هي خردل۔

من ایمان: یہ ''کائنا'' کے متعلق ہے اور اس سے اصل ایمان کی نفی بھی مراد لی جاسکتی ہے، اور کمال ایمان کی نفی بھی مراد لی جاسکتی ہے۔ واللہ اعلم

علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں کہ شراح حدیث نے ارشاد گرامی: ''ان الأمانة نزلت'' میں مذکور لفظ ''امانت'' کی تفسیر ایمان سے کی ہے اور شاید ان کو اس تفسیر پر اس حدیث کے آخری جملہ ''وما فی قلبه مثقال حبة من خردل من الایمان''. نے ابھارا ہے انہوں نے ایسا کیوں نہیں کیا کہ ''ویصبح الناس یتبایعون ولا یکاد احد یؤدی الأمانة'' کی طرف نظر کرتے ہوئے امانت کو اس کے حقیقی معنی پر محمول کرتے' اور آخر میں امانت کی جگہ ایمان کا ذکر اس لئے کیا تا کہ امانت کی عظمت شان ظاہر ہو اور اس کی ادائیگی کی ترغیب ہو۔ حضور علیہ السلام کا ارشاد ہے: لادین لمن لاامانة له۔

''اس شخص کا کوئی دین نہیں جو امانت دار نہیں''

میں (علی قاریؒ) کہتا ہوں، کہ شراح حدیث کو مذکورہ تفسیر پر جس بات نے ابھارا ہے، وہ حدیث کا آخری جملہ مذکورہ جملہ ''نزلت فی جذر قلوب الرجال'' دونوں ہیں، کیونکہ امانت بمعنی ایمان ہی مؤمنین کے دلوں کی گہرائی میں اترنے سے مناسبت رکھتا ہے۔ واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

۵۳۸۲: وَعَنْهُ قَالَ كَانَ النَّاسُ يَسْأَلُوْنَ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنِ الْخَيْرِ وَكُنْتُ اَسْأَلُهُ عَنِ الشَّرِّ مَخَافَةَ اَنْ يُدْرِكَنِىْ قَالَ قُلْتُ يَارَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّا كُنَّا فِىْ جَاهِلِيَّةٍ وَشَرٍ فَجَاءَ نَا اللّٰهُ بِهٰذَا الْخَيْرِ فَهَلْ بَعْدَ هٰذَا الْخَيْرِ مِنْ شَرٍّ قَالَ نَعَمْ قُلْتُ وَهَلْ بَعْدَ ذٰلِكَ الشَّرِّ مِنْ خَيْرٍ قَالَ نَعَمْ فِيْهِ دَخَنٌ قُلْتُ وَمَادَخَنُهٗ قَالَ قَوْمٌ يَسْتَنُّوْنَ بِغَيْرِ سُنَّتِىْ وَيَهْدُوْنَ بِغَيْرِهَدْيِىْ تَعْرِفُ مِنْهُمْ وَتُنْكِرُ قُلْتُ فَهَلْ بَعْدَ ذٰلِكَ الْخَيْرِمِنْ شَرٍّ قَالَ نَعَمْ دُعَاةٌ عَلٰى اَبْوَابِ جَهَنَّمَ مَنْ اَجَابَهُمْ اِلَيْهَا قَذَفُوْهُ فِيْهَا قُلْتُ يَارَسُوْلَ اللّٰهِ صِفْهُمْ لَنَا قَالَ هُمْ مِنْ جِلْدَتِنَا يَتَكَلَّمُوْنَ بِاَلْسِنَتِنَا قُلْتُ فَمَا تَاْمُرُنِىْ اِنْ اَدْرَكَنِىْ ذٰلِكَ قَالَ تَلْزِمُ جَمَاعَةَ الْمُسْلِمِيْنَ وَاِمَامَهُمْ قُلْتُ فَاِنْ لَّمْ يَكُنْ لَهُمْ جَمَاعَةٌ وَّلَا اِمَامٌ قَالَ فَاعْتَزِلْ تِلْكَ الْفِرَقَ كُلَّهَا وَلَوْ اَنْ تَعَضَّ بِاَصْلِ شَجَرَةٍ حَتّٰى يُدْرِكَكَ الْمَوْتُ وَاَنْتَ عَلٰى ذٰلِكَ (متفق عليه وفى رواية لِمُسْلِم) قَالَ يَكُوْنُ بَعْدِىْ اَئِمَّةٌ لَا يَهْتَدُوْنَ بِهُدَاىَ وَلَايَسْتَنُّوْنَ بِسُنَّتِىْ وَسَيَقُوْمُ فِيْهِمْ رِجَالٌ قُلُوْبُهُمْ قُلُوْبُ الشَّيَاطِيْنِ فِىْ جُثْمَانِ اِنْسٍ قَالَ حُذَيْفَةُ قُلْتُ كَيْفَ اَصْنَعُ يَارَسُوْلَ اللّٰهِ اِنْ اَدْرَكْتُ ذٰلِكَ قَالَ تَسْمَعُ وَتُطِيْعُ الْاَمِيْرَوَاِنْ ضَرَبَ ظَهْرَكَ وَاَخَذَ مَالَكَ فَاسْمَعْ فَاَطِعْ.

أخرجه البخارى فى صحيحه ٦١٥/٦ حديث رقم ٣٦٠٦ ومسلم فى صحيحه ١٤٧٥/٣ حديث رقم (٥١-١٨٤٧) وابن ماجه ١٣١٧/٢ حديث رقم ٣٩٧٩

ترجمہ: ''حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا کہ لوگ تو (اکثر) رسول اللہ ﷺ سے خیر و نیکی اور بھلائی کے

متعلق دریافت کیا کرتے تھے جب کہ میں آپ ﷺ سے شر و برائی کے متعلق پوچھا کرتا تھا اس اندیشہ کے باعث کہ کہیں کوئی شر وفتنہ مجھے اپنی لپیٹ میں نہ لے لے۔ حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ نے بیان کیا کہ (اپنے اسی معمول کے مطابق ایک روز کی تاریکیوں سے نکل گئے) میں نے عرض کیا کہ یارسول اللہ! ہم لوگ (اسلام سے قبل) جاہلیت اور برائی میں مبتلا تھے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے (آپ ﷺ کی بعثت کے صدقہ میں) ہمیں یہ ہدایت و بھلائی یعنی (نور اسلام سے نوازا) جس کی وجہ سے کفر وضلالت کے بادل چھٹ گئے اور ہم گمراہیوں اور برائیوں کی تاریکیوں سے نکل گئے) تو کیا اس ہدایت و بھلائی کے بعد کوئی اور برائی و بدی پیش آنے والی ہے؟ حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا: ہاں! (اس بھلائی کے بعد بھی برائی پیش آئے گی)'' میں نے عرض کیا تو کیا اس برائی کے بعد پھر ہدایت و بھلائی کا ظہور ہوگا (کہ جس کی وجہ سے دین اسلام وشریعت کا پھر بول بالا ہو جائے)؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ہاں! اس برائی کے بعد پھر بھلائی کا ظہور ہوگا لیکن اس برائی کے بعد وہ بھلائی آئے گی جس میں کمزوری ہوگی میں نے عرض کیا کہ اس بھلائی کی کمزوری کیا ہوگی؟ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا میں نے کمزوری کی جو بات کہی ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ) ایسے لوگ پیدا ہوں گے جو میرے طریقہ اور میری روش کے خلاف طریقہ وروش اپنائیں گے۔ لوگوں کو میرے بتائے ہوئے راستے سے گمراہ کریں گے۔ (اور میری سیرت اور میرے کردار کے مخالف اغیار کی سیرت و کردار کو اپنانا میری سنت کی مخالفت کرنا اب کا شیوہ ہوگا) جن میں تم دین دار بھی دیکھو گے اور بے دین بھی۔ میں نے عرض کیا کیا اس بھلائی کے بعد پھر کوئی برائی پیش آئے گی؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ''ہاں! ایسے لوگ (جنم) لیں گے جو دوزخ کے دروازوں پر کھڑے ہو کر مخلوق کو (اپنی طرف) دعوت دینے والا ہونگے) جو شخص ان کی دعوت کو قبول کر کے جہنم میں داخل ہونا چاہے گا اس کو وہ دوزخ میں پھینک دیں گے (یعنی جو شخص ان کے بہکاوے میں آ کر ان گمراہیوں کا شکار ہو جائے گا جو دوزخ کے عذاب کا مستحق بناتی ہیں تو وہ جہنم میں ڈال دیا جائے گا)''۔ میں نے درخواست کی کہ آپ ان کے متعلق واضح فرما دیجئے (کہ وہ کون لوگ ہوں گے' آیا وہ مسلمانوں ہی میں سے ہوں گے یا غیر مسلم ہوں گے؟) حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''وہ ہماری قوم (یا ہماری جنس اور ہماری ملت کو افراد میں سے شمار ہوں گے اور ہماری زبان میں گفتگو کریں گے (یعنی وہ لوگ عربی اللسان ہوں گے یا یہ معنی ہے کہ ان کی بات چیت قرآن وحدیث کے حوالوں اور وعظ ونصیحت سے آراستہ و پیراستہ ہوگی اور بظاہر ان کی زبان پر دین و مذہب کی باتیں ہوں گی مگر ان کے دل نیکی و بھلائی سے خالی ہوں گے) میں نے عرض کیا کہ تو پھر میرے بارے میں آپ کیا حکم فرماتے ہیں؟ (یعنی اگر میں ان لوگوں کا زمانہ پاؤں تو اس وقت میرا لائحہ عمل کیا ہونا چاہئے؟) حضور ﷺ نے فرمایا: ''کتاب وسنت پر عمل کرنے والے مسلمانوں کی جماعت کو لازم جاننا اور ان کے امیر کی اطاعت کرنا (یعنی اہل سنت کے راستے کو اپنانا اور اہل سنت کا جو امام ومقتدا ہو اس کی موافقت ومتابعت کرنا) میں نے عرض کیا کہ اور اگر مسلمانوں کی کوئی (مسلمہ) جماعت ہی نہ ہو اور نہ ان کا کوئی (متفقہ) امیر ومقتدا ہو (بلکہ مسلمان الگ الگ پارٹیوں میں تقسیم ہو چکے ہوں اور مختلف امراء کے پیچھے چلتے ہوں تو اس صورت میں میرا کردار کیا ہونا چاہیے؟) آپ ﷺ نے فرمایا: ایسی صورت میں تمہیں ان سب فرقوں اور جماعتوں سے صرف نظر کر کے علیحدگی اختیار کر لینی چاہئے۔ اگر چہ اس یکسوئی کے لئے

تمہیں کسی درخت کی جڑ میں پناہ کیوں نہ لینی پڑے (جنگلوں میں چھپنا کیوں نہ پڑے اور اس کی وجہ سے سخت سے سخت مصائب وسختیوں کو جھیلنا کیوں نہ کرنا پڑے اور ان جنگلوں میں گھاس پھوس کھا کر گزارا کرنے تک کی نوبت کیوں نہ آ جائے) یہاں تک کہ اسی یکسوئی کی حالت میں موت تمہیں اپنی آغوش میں لے لے"۔ (بخاری ومسلم)

تشریح: قوله: كان الناس يسالون...... مخافة أن يدركني:

یعنی دوسرے صحابہ کے زیادہ تر سوالات کا تعلق اطاعت وعبارت سے متعلق ہوتا تھا تا کہ وہ اپنے اعمال صالحہ میں مزید اضافہ کر سکیں یا یہ کہ وہ لوگ آپ ﷺ سے اپنے رزق میں برکت اور معاشی خوشحالی کی استدعا کرتے تھے تا کہ معاشی الجھنوں سے فارغ ہو کر اطمینان حاصل کر سکیں اور اپنی دنیا کو اخروی فلاح و بہبود کا وسیلہ بنا سکیں لیکن میرا معمول ان سے مختلف تھا۔ میں حضور ﷺ سے گناہ اور برائیوں کے متعلق پوچھتا رہتا تھا یا یہ کہ ان فتنوں کے بارے میں پوچھتا تھا جو اس دنیا میں ظہور پذیر ہو سکتے ہیں اور جو نہ صرف اخروی زندگی کو ناکام بناتے ہیں بلکہ ان کے برے اثرات دنیاوی خوشحالی اور رزق کی وسعت پر بھی پڑتے ہیں اور پوچھنا اس اندیشہ کے پیش نظر ہوتا تھا کہ کہیں میں ان فتنوں کی زد میں نہ آؤں یا ان کے برے اثرات واسباب مجھ تک نہ پہنچ جائیں چنانچہ اہل علم سے برائیوں کی واقفیت حاصل کر کے ان سے بچنے کی تدابیر اختیار کرنا اصلاح کے حوالہ سے زیادہ بہتر طریقہ ہے۔ اسی لئے حکماء اور اطباء بلکہ بعض فضلاء نے اسے اصول وضابطہ کہ ازالۂ مرض کے سلسلہ میں پرہیز کو ملحوظ رکھنا' دوا استعمال کرنے سے زیادہ بہتر ہے۔ نیز کلمہ توحید میں بھی اسی اصول کی طرف اشارہ ہے کہ پہلے غیر اللہ کی نفی کی گئی ہے اس کے بعد الوہیت کو ثابت کیا گیا۔

اللہ تعالیٰ کی معرفت کا مدار صفات تنزیہیہ ہے' جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿ليس كمثله شيء﴾ [الشوریٰ:۱۱]

صفات ثبوتیہ پر نہیں ہے اس لئے کہ ان صفات کا اللہ تعالیٰ میں موجود ہونا عقل بھی مانتی ہے۔

علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں کہ شر سے مراد فتنہ، ارکان اسلام میں سستی واقع ہو جانا، گمراہی کا غلبہ اور بدعت کا پھیلنا ہے اور "خیر" سے مراد اس کا برعکس معنیٰ ہے۔ اور اس پر راوی کا اگلا کلام دلالت کر رہا ہے۔

قوله: قال قلت: يا رسول الله!...... فهل بعد هذا الخير من شر؟

یعنی اس زمانے میں جس میں توحید، نبوت اور ان دونوں کے توابع، یعنی احکام شرعیہ پر جہالت غالب تھی۔

جاهلية وشر: عطف تفسیری ہے اور اس کا معنیٰ "کفر" ہے چنانچہ یہ تعمیم کے بعد تخصیص ہے۔

خیر سے مراد اسلام ہے، یعنی آپؐ کی نبوت کی برکت سے۔ اور اس کا مفہوم (یعنی مفہوم مخالف) یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کفر و گمراہی کی بنیادوں کو اُکھیڑ کر برائی کو ختم کر دیا۔

اور شاید اس (مفہوم مخالف) کو اکتفاء کی بناء پر حذف کیا ہے، خصوصاً جبکہ دونوں (کفر واسلام ایک دوسرے کی ضد ہیں اور کبھی جمع نہیں ہو سکتے

قولہ:قال :نعم وفیہ دخن...... تعرف منھم وتنکر :

دخن: دال اور خاء کے فتحہ کے ساتھ' سیاہی مائل کدورت' اور مطلب یہ ہے کہ خالص خیر نہیں ہوگی، بلکہ اس میں کدورت تاریکی کی آمیزش ہوگی۔

یستنون: نون کی تشدید کے ساتھ۔ای **یقتدون**۔

تعرف منھم وتنکر : مظہرؒ فرماتے ہیں کہ اس کا معنی یہ ہے کہ تم ان میں ایسے اعمال بھی دیکھو گے جن کو تم میرے دین میں سے سمجھو گے اور ایسے اعمال بھی دیکھو گے جن کو تم میرے دین میں اوپرا جانو گے۔

اشرفؒ فرماتے ہیں کہ ان سے منکرات کا صدور ہوگا۔اور ''تنکر'' خبر ہے لیکن امر کے معنی میں ہے **ای انکر علیھم المنکر عنھم** یعنی اُن سے منکرات کے صدور پر تم انکار کرو۔

علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں کہ پہلی توجیہ ارشاد گرامی ''**نعم وفیہ دخن**'' کے معنی کی طرف راجع ہے۔تم ان میں بھلائی دیکھو گے تو تم اس کو قبول کرو گے اور ان میں برائی دیکھو گے تو تم اس پر انکار کرو گے، لہٰذا یہ معنوی مقابلہ ہوگا اور دوسری توجیہ اس ارشاد گرامی: ''**یستنون بغیر سنتی**'' کی طرف راجع ہے۔پس معطوف معطوف علیہ دونوں امر کے معنی میں ہیں ای **اعرف منھم ذلك وانکر** اور ''**تعرف وتنکر**'' میں خطاب عام ہے۔

میں (ملا علی قاریؒ) کہتا ہوں کہ اس کا محل اشکال ہونا مخفی نہیں ہے' اس لئے کہ ہر شخص اس بات کا اہل نہیں ہے کہ معروف کو پہچان سکے اور منکر پر انکار کر سکے۔چنانچہ یہ خطاب خاص حضرت حذیفہؓ اور دوسرے اہل علم دیانت سے ہے۔

کہا گیا ہے کہ حدیث میں موجود ہے لفظ شر سے مراد وہ فتنے ہیں، جو حضرت عثمانؓ کی شہادت کے وقت اور اس کے بعد پیدا ہوئے تھے اور خیر ثانی سے مراد حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کا زمانہ خلافت ہے۔

اور'' **قوم تعرف منھم وتنکر**'' سے مراد وہ امراء ہیں جو حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کے بعد حکمران بنے تھے۔چنانچہ ان میں سے بعض تو ایسے تھے جنہوں نے سنت اور عدل کو تھامے رکھا اور بعض ایسے تھے جو بدعات کے داعی تھے اور ظلم کرتے تھے' اور بعض ایسے تھے جو کبھی نیک اعمال کرتے تھے اور کبھی نفسانی خواہشات کی اتباع اور دنیاوی امور میں اپنے اغراض کی تحصیل کی خاطر برے اعمال کرتے تھے اور دار آخرت کی رعایت نہیں کرتے تھے۔جیسا کہ اس زمانے کے بعد امراء کا حال ہے۔

بعض کا کہنا ہے کہ حدیث میں پہلے سے مراد وہ فتنہ ہے جو حضرت عثمانؓ کی شہادت کے وقت اور اس کے بعد رونما ہوا اور خیر ثانی سے مراد حضرت امیر معاویہؓ اور حضرت حسنؓ کے درمیان ہونے والی صلح اور اس صلح پر اجماع ہے۔اور'' **دخن**'' سے مراد وہ واقعات ہیں جو حضرت معاویہؓ کے زمانے میں بعض امراء سے رونما ہوئے جیسا کہ عراق میں زیاد کا فتنہ اور خوارج کا اس کی مخالفت کرنا۔

دعاۃ: داعی، کی جمع ہے۔

قولہ:فھل بعد ذلك الخیر من شر؟قال نعم 'دعاۃ.....قد فوہ فیھا:

اشرفؒ فرماتے ہیں، کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ ایک گروہ ہوگا جو طرح طرح کے مکروفریب کے ذریعہ لوگوں گمراہی کی طرف بلائے گا' ان کو ہدایت سے روکے گا خیر سے شر کی طرف اور سنت سے بدعت کی طرف اور دنیا کی بے رغبتی سے دنیا کی رغبت کی طرف۔ حضور علیہ السلام نے گمراہی کی طرف مدعودین کو جہنم میں داخل کرنے کا سبب قرار دیا اور گمراہی کی دعوت کو قبول کرنے کو جہنم میں داخل ہونے کا سبب قرار دیا اور مکروفریب کی ہر قسم کو بمنزلہ جہنم کے دروازوں میں سے ایک دروازہ قرار دیا۔

قذفوه فيها: ان کو پھینکیں گے اور اُن لوگوں کے جہنم میں داخل ہونے کا سبب بنیں گے۔

بعض کا کہنا ہے کہ گمراہی کی طرف دعوت دینے والوں سے مراد حکومت پر قبضہ کرنے کیلئے اُٹھنے والے خوارج، روافض اور وہ لوگ مراد ہیں جن میں امارت، امانت اور ولایت کی شرائط نہیں پائی جاتیں۔ اور (گمراہی کی طرف) دعوت دینے والے لوگوں کو جہنم کے دروازوں پر کھڑے ہو کر دعوت دینے والے قرار دیا، یہ ان کے مآل اور انجام کے اعتبار سے ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿ اِنَّ الَّذِيْنَ يَاْكُلُوْنَ اَمْوَالَ الْيَتٰمٰى ظُلْمًا اِنَّمَا يَاْكُلُوْنَ فِيْ بُطُوْنِهِمْ نَارًا﴾ [النساء: ١٠]

"بلاشبہ جو لوگ یتیموں کا مال بلا استحقاق کھاتے (برتتے) ہیں اور کچھ نہیں اپنے شکم میں آگ بھر رہے ہیں"۔

بعض حضرات فرماتے ہیں کہ یہ کلام اس ارشاد باری کی مانند ہے: ﴿ اِنَّ الْاَبْرَارَ لَفِيْ نَعِيْمٍ وَّاِنَّ الْفُجَّارَ لَفِيْ جَحِيْمٍ ﴾ [الانفطار: ١٤] "نیک لوگ بے شک آسائش میں ہوں گے اور بدکار (یعنی کافر لوگ) بے شک دوزخ میں ہوں گے"۔

گویا کہ وہ لوگ جہنم کے دروازوں پر ہونگے اور لوگوں کو اپنی مہمانی میں داخل ہونے کی دعوت دے رہے ہونگے۔

یا اس وجہ سے کہ کسی کام کے سبب کا مرتکب گویا کہ اُس کام میں واقع اور داخل ہے۔

قوله: قلت يا رسول الله صفهم لنا..... يتكلمون بالسنتنا:

"هم من جلدتنا": نہایہ میں اس کا معنی یہ لکھا ہے کہ "وہ ہمارے خاندان اور ہم میں سے ہونگے"۔

بعض نے کہا ہے کہ اس کا معنی ہے یہ کہ وہ ہماری ملت کے لوگوں میں سے ہونگے۔ (ذکرہ اشرف)

یہ مفہوم زیادہ لطیف ہے۔

بعض نے معنی یہ بیان کیا ہے کہ وہ ہماری جنس کے لوگوں کی اولاد میں سے ہونگے۔ اس پر اشکال یہ ہوتا ہے لفظ "جلد" کی بنسبت لفظ "جلده" خاص ہے اور "جلد" کسی چیز کے ظاہر کو کہا جاتا ہے۔ یہ اصل میں جسم کے پردہ کو کہا جاتا ہے۔

یعنی وہ لوگ عربی زبان بولتے ہوں گے۔

یا معنی یہ ہے کہ مواعظ وحکمت بیان کریں گے۔

یا معنی یہ ہے کہ اللہ اور اللہ کے رسول کی باتیں بیان کریں گے حالانکہ ان کے دلوں میں کوئی بھلائی نہیں ہوگی زبان سے وہ بات کریں گے جو ان کے دلوں میں نہیں ہوگی۔

قوله:قلت فماتأمرني:

فان لم يكن لهم جماعة ولا امام: یعنی نہ جماعت ہو اور یہ ایسا کوئی امیر جس پر سب کا اتفاق ہو۔ یعنی دونوں امور مفقود ہوں یا ان میں سے کوئی ایک امر مفقود ہو، ہر دو کا احتمال ہے۔

قوله:قال:فاعتزل تلك الفرق كلها...... وانت على ذلك:

یعنی ان تمام گمراہ فرقوں سے جو اہل سنت والجماعت کے راستہ سے ہٹ کر کسی اور راستے پر گامزن ہیں۔

ولو ان تعض باصل شجرة یعنی اگرچہ یکسوئی حاصل کرنے کیلئے درخت ہی کی پناہ کیوں نہ لینا پڑے۔

"ان تعض": "ان" مصدر یہ ہے اور تصحیح شدہ اور معتمد نسخوں میں "تعض" منصوب ہے۔ اور بعض کا کہنا ہے کہ یہ "ان" **مخففه از مثقله** ہے۔

تورپشتی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس کا معنی یہ ہے کہ ایسی چیز کے ساتھ چمٹ جانا اور اس کو مضبوطی سے پکڑ لینا جو تم میں صبر پیدا کرے اگرچہ ایسی چیز کو پکڑنا پڑے کہ جس کو پکڑنا درست نہ ہو۔

علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں، اس شرط کو کلام کے بعد تتمہ اور مبالغہ کیلئے ذکر کیا جاتا ہے، پس مطلب یہ ہوگا کہ لوگوں سے اس طرح تنہائی اختیار کرنا جس سے آگے مزید تنہائی حاصل نہ کی جا سکتی ہو اور اگر لوگوں سے تنہائی کیلئے ایک درخت کی جڑ میں پناہ لینی پڑے تو اس سے پناہ لو کیونکہ اس میں تیرے لئے خیر ہے۔

قوله:وفي رواية لمسلم:

امام میرکؒ فرماتے ہیں، کہ اس حدیث کو امام مسلمؒ نے ابوسلام عن حذیفہؓ سے مروی سابقہ حدیث کے بعد نقل کیا ہے، اور دار قطنیؒ نے ذکر کیا ہے، کہ ابوسلام نے حضرت حذیفہؓ سے سماع نہیں کیا۔ اسی وجہ سے اس حدیث کو بیان کرتے ہوئے ابوسلام نے "**قال حذيفة**" کی صراحت کی ہے۔ چنانچہ یہ حدیث منقطع ہے، بعض حفاظ فرماتے ہیں کہ امام بخاریؒ نے صحیح بخاری میں ابو سلامؒ کی کوئی روایت نقل نہیں کی، کیونکہ ان کی روایات مرسل ہوتی ہیں۔ اھ۔ ابوسلامؒ کا نام **ممطر الأسود الحبشي** ہے۔

امام نوویؒ فرماتے ہیں کہ دار قطنی نے جو کہا ہے وہ صحیح ہے، لیکن حدیث کا متن پہلی سند سے صحیح ہے، اور امام مسلم نے اس روایت کو متابعت میں ذکر کیا ہے، کیونکہ مرسل حدیث جب کسی اور سند سے بھی ثابت ہو تو اس کی صحت واضح ہو جاتی ہے اور اس سے استدلال کرنا درست ہوتا ہے۔ اور اس طرح مسئلہ میں دو صحیح حدیثیں حاصل ہو جاتی ہیں۔ واللہ اعلم۔

میں (ملا علی قاریؒ) کہتا ہوں کہ یہ اشکال تو امام شافعیؒ اور اُن کے متبعین کے قول پر ہوتا ہے جو کہتے ہیں کہ حدیث مرسل حجت نہیں ہے اور جمہور بشمول امام ابوحنیفہؒ یہ فرماتے ہیں کہ حدیث مرسل حجت ہے

قوله:يكون بعدى ائمة...... في جنمان انس:

"**أئمة**": دوسرے ہمزہ کو تسہیل، تحقیق اور ابدال کے ساتھ پڑھنا درست ہے۔ یہ "امام" کی جمع ہے۔ "ائمۃ" کا وزن "**افعلة**" ہے۔ "ائمۃ" سے مراد ایسی جماعت ہے جس پر "ائمۃ" کا اطلاق ہو سکے۔

لا یھتدون بھدای: علم کے اعتبار سے۔

لا یستنون بسنتی: عمل کے اعتبار سے مطلب یہ ہے کہ قرآن وسنت کو لازم نہیں پکڑیں گے۔

وسیقوم فیھم رجال قلوبھم قلوب: الشیاطین: ان لوگوں کے دل ظلمت وسخت دلی، وسوسہ، تلبیس' غلط خیالات اورفاسد خواہشات کے اعتبار سے شیاطین کے دلوں کی طرح ہونگے۔

جثمان: جیم کے پیش کے ساتھ انسانی جسم' اوراس سے مراد جنس انسانی ہے' چنانچہ یہ گذشتہ جمع کے موافق ہے۔

قوله: قلت كيف أصنع ......:

ذالك؟: یعنی وہ وقت، یامراد یہ ہے کہ اگر اس زمانے کے مذکورہ صفات والے لوگوں کو پاؤں۔

تسمع: امیر جو حکم دے گا۔ یہ ''خبر'' ہے لیکن ''امر'' کے معنی میں ہے

تطیع: یعنی جن امور میں معصیت نہیں ہے۔ یہ ''خبر'' بھی ''امر'' کے معنی میں ہے۔

الأمیر: یہ مفعول بہ ہے جس میں دوفعلوں کا تنازع ہے۔

ضرب: مجہول کے صیغہ کے ساتھ ہے۔ معنی یہ ہے اگر چہ تجھے ماراجائے۔

اخذ: اورایک نسخہ میں دونوں الفاظ (''ضرب'' اور ''اخذ'') معروف کے صیغہ کے ساتھ ہیں، چنانچہ دونوں فعلوں میں فاعل کی ضمیر ''امیر'' کی طرف راجع ہوگی اوراسناد حقیقی ہوگا یا مجازی ہوگا اور پشت کو بطور خاص اس لئے ذکر کیا گیا کہ عموماً اسی طرح ہوتا ہے۔

فاسمع واطع: یہ شرط کی جزاء ہے جس کو مزید تاکید وتحقیق کیلئے ذکر کیا گیا ہے ورنہ تو شرط کا ماقبل اس سے مستغنی ہے۔ ابن الملکؒ فرماتے ہیں، یعنی امیر کی اطاعت کر، لیکن اگر وہ تجھے گناہ کا حکم دے تو اس کی اطاعت نہ کر، لیکن اس کے ساتھ قتال نہ کر، بلکہ اس سے بھاگ جا۔

۵۳۸۳: وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ بَادِرُوْا بِالْاَعْمَالِ فِتَنًا كَقِطَعِ اللَّیْلِ الْمُظْلِمِ یُصْبِحُ الرَّجُلُ مُؤْمِنًا وَیُمْسِیْ كَافِرًا وَیُمْسِیْ مُؤْمِنًا وَیُصْبِحُ كَافِرًا وَیَبِیْعُ دِیْنَهٗ بِعَرْضٍ مِنَ الدُّنْیَا. (رواہ مسلم)

اخرجه مسلم فی صحیحه ۱۱۰/۱ حدیث رقم (۱۸٦-۱۱۸) وابو داؤد فی السنن ٤٥٧/٤٠ حدیث رقم ٤٢٥٩ والترمذی فی السنن ٤٢٢/٤ حدیث رقم ٢١٩٥ وابن ماجه ١٣٠٥/٢ حدیث رقم ٣٩٥٤ واحمد فی المسند ٣٠٤/٢

ترجمه: ''حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: اعمال صالحہ میں جلدی کرو ایسے فتنوں کے رونما ہونے سے پہلے ہو جو تاریک رات کے ٹکڑوں کی مانند ہوں گے (اوران فتنوں کا اثر یہ ہوگا کہ) انسان صبح کو ایمان کی حالت میں اٹھے گا اور شام کو کافر بن جائے گا اور شام کو صاحب ایمان ہوگا تو صبح کو حالت

کفر میں کرے گا' نیز اپنے دین و مذہب کو دنیا کے بہت قلیل مال و متاع کے عوض فروخت کر ڈالے گا''۔ (مسلم)

تشریح: **قوله: بادروا بالاعمال فتنا كقطع الليل المظلم:**

''قطع'': قاف کے فتحہ اور طاء کے کسر کے ساتھ ہے''قطعة'' کی جمع ہے۔ معنی یہ ہے کہ وہ فتنے فرط سواد و ظلمت اور صلاح و فساد کے درمیان عدم تبیین اعتبار سے تاریک رات کے ٹکڑوں کی مانند ہوں گے۔

اس میں اشارہ ہے کہ یہی وہ فتنے ہیں، جن کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿كَأَنَّمَا أُغْشِيَتْ وُجُوهُهُمْ قِطَعًا مِّنَ اللَّيْلِ مُظْلِمًا﴾ [یونس:۲۷]

''گویا ان کے چہروں پر اندھیری رات کے پرت کے پرت لپیٹ دیے گئے ہیں۔''

ابن کثیر اور کسائی نے آیت میں (اس لفظ کو) طاء کے سکون کے ساتھ پڑھا ہے، اس بناء پر کہ اس سے رات کا یا رات کی تاریکی کا ایک حصہ مراد ہے۔ اور اس کا مترادف لفظ'' قطعة'' ہے۔

حاصل معنی یہ ہے کہ تاریک فتنوں یعنی قتل' ڈاکہ زنی، دین و دنیا کے امور میں مسلمانوں کا باہمی اختلاف ہونے سے پہلے اعمال صالحہ کرنے میں جلدی کرو، کیونکہ ان فتنوں کے زمانے میں تم اعمال کو بدرجہ کمال ادا کرنے کی طاقت نہیں رکھ سکو گے۔

اس تشبیہ سے مقصود فتنوں کا حال بیان کرنا ہے کہ یہ فتنے بہت ہی بشیع و فظیع ہونگے' ان کا نہ کوئی سبب معلوم ہوگا' اور نہ ان سے خلاصی کا کوئی راستہ۔

قوله: يصبح الرجل مؤمنا...... ويصبح كافرا:

(اس کے دو مطلب ہو سکتے ہیں)

۱ مؤمن نفس ایمان کے ساتھ موصوف ہوگا۔ ۲ یا یہ کہ مؤمن کامل ایمان کے ساتھ موصوف ہوگا۔

''**ويمسى كافرا**'': اس کے متعدد مطالب ہو سکتے ہیں:

۱ حقیقتاً کافر بن جائے گا۔ ۲ نعمتوں کی ناشکری کرنے والا ہوگا۔

۳ کافر کے مشابہ ہوگا۔ ۴ کافر والا عمل کرے گا۔

بعض نے اسکا مطلب یہ بیان کیا ہے، کہ اللہ کی حرام کردہ اشیاء کو صبح کے وقت تو حرام سمجھے گا لیکن شام کے وقت ان اشیاء کو حلال سمجھے گا۔ اور اسی طرح اس کے برعکس۔ اور اس کا حاصل یہ ہے کہ وہ امور دینیہ میں متذبذب ہوگا اور امور دنیویہ میں متبع ہوگا۔

قوله: ويبيع دينه بعرض من الدنيا:

يبيع: اس میں موجود ضمیر'' الرجل'' کی طرف لوٹ رہی ہے یا فاعل'' احدکم'' ہے جیسا کہ جامع میں مذکور ہے۔

عرض: عین اور راء دونوں پر فتحہ ہے۔ یعنی گھٹیا سامان اور کم قیمت مال لے کر۔

من الدینا جامع میں لفظ "قلیل" کی زیادتی ہے جو "عوض" کی صفت ہونے کی وجہ سے مجرور ہے۔

ابن ماجہ اور طبرانی نے ابو امامہؓ سے مرفوع حدیث نقل کی ہے:

ستكون فتن يصبح الرجل فيها مؤمنا ويمسى كافرا الامن احياه الله بالعلم۔

"عنقریب فتنوں کا ظہور ہوگا، ان فتنوں میں آدمی صبح کے وقت ایمان کی حالت میں اٹھے گا اور شام کو کافر بن جائے گا، سوائے اس شخص کے جس کو اللہ تعالیٰ علم کے ساتھ زندہ رکھے"۔ (یعنی جن کو اللہ تعالیٰ نے علم کی دولت سے نوازا ہو)

"یصبح": جملہ مستانفہ ہے اس زمانے کے بعض فتنوں کا بیان ہے۔

علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں کہ یہ جملہ مستانفہ ہے مشبہ یعنی "فتنوں" کے حال کا بیان ہے اور "یبیع الخ" بیان کا بیان ہے۔

مظہرؒ فرماتے ہیں کہ اس کی متعدد صورتیں ہوسکتی ہیں:

ایک یہ کہ مسلمانوں کے دو فریقوں کے درمیان محض عصبیت اور بغض وعناد کی وجہ سے لڑائی ہوگی، ہر فریق دوسرے فریق کا مال لوٹنے اور خون بہانے کو حلال سمجھے گا۔

دوسری یہ کہ مسلمانوں کے حکمران ظالم ہوں گے چنانچہ وہ مسلمانوں کا خون بہائیں گے، ان کے اموال ناحق چھینیں گے زنا کریں گے، اور شراب نوشی کریں گے، چنانچہ ان کے بارے میں لوگوں کا اعتقاد یہ ہوگا کہ یہ حکمران حق پر ہیں، اور بعض علماء سوء فتویٰ دیں گے کہ یہ حکمران جو کام کررہے ہیں، یہ جائز ہیں۔

تیسری یہ کہ لوگوں کے درمیان جو معاملات اور خرید وفروخت شریعت کے خلاف ہورہے ہیں ان کو حلال سمجھیں گے۔ واللہ اعلم

(رواہ مسلم): اسی طرح اس حدیث کو امام احمد اور ترمذی نے بھی نقل کیا ہے، اور بیہقی نے ابو امامہؓ سے مرفوعاً روایت نقل کی ہے:

بادروا بالاعمال هرما فاغضا وموتا خالسا ومرضا حالبسا وتسويفا مسيًا۔

"بڑھاپے، اچانک اچکنے والی موت، بے کار بنا دینے والی بیماری اور بے جا ٹال مٹول سے پہلے ہی اعمال صالحہ میں جلدی کرو"

امام ترمذی اور حاکم نے ابو ہریرہؓ سے حدیث مرفوع نقل کی ہے:

بادروا بالأعمال سبعا ماتنتظرون الا فقرا منسيا اوغنى مطغيا اومرضا مفسدا أو هرما مفندا أو موتا مجهزا او الاجال فانه شر منتظر اوالساعة والساعة ادهى وأمر۔

"سات مصیبتوں کے آنے سے پہلے اعمالِ صالحہ میں جلدی کرو تم لوگ انتظار نہیں کررہے ہو مگر بھلا دینے والے فقر کا یا سرکش کردینے والی مالداری کا یا بے کار بنادینے والی بیماری کا یا عقل کو کمزور کردینے والے بڑھاپے کا یا ختم کردینے والی موت کا یا

دجال کا جبکہ دجال ایک بہت بڑا شر ہے جس کا انتظار ہے، یا قیامت کا جبکہ قیامت ایک بہت بڑی مصیبت ناک اور کڑوی چیز ہے۔"

طبرانی نے عابس غفاریؓ سے حدیث مرفوع نقل کی ہے:

"بادروا بالاعمالستا: امارةالسفهاو كثرة الشرط وبيع الحكم واستخفافا بالدم قطيعة الرحم ونشوا يتخذون القرآن مزامير يقدمون احدهم ليغنيهم وان كان أقلهم فقها"۔

"چھ چیزوں کے آنے سے پہلے اعمالِ صالحہ میں جلدی کرو، بیوقوف لوگوں کی امارت، کثرت شرط، بیع الحکم، خون کو بے قیمت سمجھنا، قطع رحمی اور نوجوان جو قرآن کو بانسری بنا دیں گے' اپنے میں سے کسی کو آگے کر دیں گے تا کہ وہ گائے (یعنی قرآن کو گانے کی طرز پر پڑھے گا) اگر چہ وہ ان میں سب سے کم علم والا ہوگا"۔

۵۳۸۴: وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ سَتَكُوْنُ فِتَنٌ الْقَاعِدُ فِيْهَا خَيْرٌ مِّنَ الْقَائِمِ وَالْقَائِمُ فِيْهَا خَيْرٌ مِّنَ الْمَاشِيْ وَالْمَاشِيْ فِيْهَا خَيْرٌ مِنَ السَّاعِيْ مِنْ تَشَرَّفَ لَهَا تَسْتَشْرِفْهُ فَمَنْ وَجَدَ مَلْجَأً اَوْ مَعَاذًا فَلْيَعُذْ بِهٖ (متفق عليه وفي رواية لمسلم) قَالَ تَكُوْنُ فِتْنَةٌ النَّائِمُ فِيْهَا خَيْرٌ مِّنَ الْيُقْظَانِ وَالْيُقْظَانُ فِيْهَا خَيْرٌ مِنَ الْقَائِمِ وَالْقَائِمُ فِيْهَا خَيْرٌ مِنَ السَّاعِيْ مَنْ وَجَدَ مَلْجَاءً اَوْ مَعَاذًا فَلْيَسْتَعِذْ بِهٖ۔

اخرجه البخاري في صحيحه ٦١٢/٦-٧٠حديث رقم ٣٦٠١ومسلم في صحيحه ٢٢١٢/٤حديث رقم (١٠-٢٨٨٦) واخرجه الترمذي في السنن ٤٢١/٤حديث رقم ٢١٩٤ واحمد في المسند ٢٨٢/٢

ترجمہ: "حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: "عنقریب ایسے فتنے رونما ہونے والے ہیں (یعنی جلد ہی ایک بڑا فتنہ پیش آنے والا ہے یا یہ کہ مسلسل یا کچھ کچھ وقفہ سے بہت زیادہ فتنوں کا ظہور ہونے والا ہے) ان فتنوں میں بیٹھنے والا' کھڑے ہونے والے سے بہتر ہوگا اور کھڑا ہونے والا (معتدل رفتار سے چلنے والے سے بہتر ہوگا اور چلنے والا سعی کرنے (یعنی جلد چلنے والے یا دوڑنے والے یا سواری پر سوار ہونے والے) سے بہتر ہوگا اور جو شخص ان فتنوں کی طرف جھانک کر دیکھے گا تو وہ فتنے اسے اپنی گرفت و لپیٹ میں لے لیں گے پس جو شخص ان فتنوں سے جائے نجات جائے پناہ پائے (اور یا کوئی ایسا آدمی اس کو مل جائے جس کے دامن میں وہ ان فتنوں سے پناہ لے سکتا ہو) تو اس شخص کو چاہئے کہ اس کے ذریعہ پناہ لے"۔ (بخاری ومسلم) اور مسلمؒ کی ایک اور روایت میں یہ الفاظ ہیں کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: (جب) کوئی فتنہ رونما ہوگا تو اس فتنہ میں سونے والا آدمی (جو اس فتنہ سے غافل اور بے خبر ہو اور اس کے متعلق اطلاعات نہ رکھتا ہو) بیدار شخص (یعنی اس فتنہ سے باخبر اور اس کی اطلاعات رکھنے والا ہو سے بہتر ہوگا' جاگنے والا شخص (کہ خواہ وہ لیٹا ہوا ہو یا بیٹھا ہوا) کھڑا رہنے والے سے بہتر ہوگا اور اس فتنہ میں کھڑا ہونے والا شخص اس فتنہ میں سعی وکوشش کرنے والے سے بہتر ہوگا کسی چیز کی

طرف چلنا گویا اس چیز کے حق میں سعی وکوشش کرنے کے مترادف ہوتا ہے۔ پس اس فتنہ میں سعی کرنے والے سے مراد اس فتنہ میں مدد وتعاون دینا اور اس کے حق میں سعی وکوشش کرنا ہے) لہٰذا جو شخص اس فتنہ سے راہ فرار پا جائے پناہ پائے تو اس کو چاہئے کہ وہاں جا کر پناہ گزین ہو جائیں''۔

تشریح: قوله:ستكون فتن القاعد فيها خير من القائم:

کھڑا ہوا شخص وہ کچھ سنتا اور دیکھتا ہے جس کو بیٹھا ہوا شخص نہیں سنتا اور نہیں دیکھتا۔ چنانچہ کھڑا ہوا شخص ان فتنوں کو دیکھنے اور سننے کی وجہ سے اس شخص کی بنسبت اللہ کے عذاب کے زیادہ قریب ہوگا جو شخص ان فتنوں کا مشاہدہ نہیں کر رہا۔

اور یہ بھی ممکن ہے کہ ''القاعد فيها'' سے مراد وہ شخص ہو جو اپنی جگہ ثابت قدم رہے اور اس زمانے میں فتنے ظاہر ہونے کی وجہ سے حرکت نہ کرے۔ اور ''القائم'' سے مراد وہ شخص ہو جس میں ایک گونہ باعث اور داعیہ تو ہو لیکن فتنہ انگیزی کے بارے میں تردد میں ہو۔

قوله:والقائم فيها خير من الماشي.....من يشرف لها تستشرفه:

القائم فيها خير من الماشي: یعنی دور سے ان فتنوں کی طرف جھانکنے والا یا اس حالت میں اپنی جگہ کھڑا ہوا شخص۔

یعنی اس شخص سے بہتر ہے جو اپنے قدموں سے ان فتنوں کی طرف چل کر آنے والا ہو۔

''**فيها**'': **اليها** کے معنی میں ہے یا ''**فيما بينها**'' کے معنی میں ہے۔

تشرف: راء کی تشدید کے ساتھ۔

تستشرفه: مجزوم ہے اور مرفوع بھی پڑھا جا سکتا ہے، یعنی وہ فتنے اس شخص کو اپنی طرف بلائیں گے اور کھینچیں گے۔

تورپشتی رحمہ اللہ فرماتے ہیں یعنی جو شخص ان فتنوں کی طرف جھانکے گا وہ فتنے اس شخص کو ان فتنوں میں مبتلا ہونے کی طرف دعوت دیں گے۔ تشرف کا معنی ہے جھانکنا' یہاں یہ استعارہ ہے فتنوں تک رسائی سے۔

یا مطلب یہ ہے کہ وہ فتنے اس جھانکنے والے کو اپنی طرف مزید دیکھنے کی دعوت دیں گے۔

بعض کا کہنا ہے کہ یہ ''**استشرف الشيء**'' بمعنی علوتہ سے ماخوذ ہے۔

اور بعض نے اس کا معنی ''**المخاطرة والاشفاء على الهلاك**'' بیان کیا ہے۔

علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں کہ شاید یہ تیسری توجیہ بہتر ہو کیونکہ اس توجیہ کے مطابق ''**لها**'' میں مذکور لام کا معنی ظاہر ہے اور صاحب فائق کا کلام اسی کے موافق ہے۔ ای ''**من غالبها غالبته**''۔

میں (ملا علی قاریؒ) کہتا ہوں شاید کہ پہلی توجیہ زیادہ بہتر ہو کیونکہ اس میں اس معنی مفہوم کی رعایت زیادہ ہے اور اس بات کا فائدہ دیتا ہے کہ دنیا اور آخرت میں فائدے والے امور کو اختیار کرنا چاہئے۔

شارحؒ فرماتے ہیں کہ ''**تشرف**'' اور ''**استشرف**'' کا معنی ہے ''صعد شرفا'' یعنی کسی چیز کو دیکھنے کیلئے بلند جگہ پر چڑھنا یہی اس کا اصل معنی ہے پھر ان کو کسی چیز کی طرف ~~دیکھنے~~ دیکھنے کے معنی میں استعمال کیا جانے لگا' چاہے جہاں سے بھی دیکھے اور

جس چیز کو بھی دیکھے۔اور حدیث مبارکہ کے اس جملہ کا مطلب یہ ہے کہ جو شخص ان فتنوں کے قریب ہوگا اور ان کو دیکھے گا تو وہ فتنے اس شخص کی طرف متوجہ ہو جائیں گے اور اس شخص کو اپنی طرف کھینچیں گے، چنانچہ ان فتنوں سے دور رہنے میں نجات ہے اور ان کے قریب جانے میں ہلاکت ہے۔

قوله:فمن وجد ملجأ او معاذا فليعذبه:

''معاذ'':میم کے فتحہ کے ساتھ یعنی کوئی جائے پناہ۔

فليعذ: یہ عین کے پیش کے ساتھ ہے۔اور ضمیر مجرور کا مرجع ''معاذ'' ہے۔یا مرجع ''معاذ'' اور ''ملجا'' دونوں ہیں مگر بعاویل ''مذکور''۔

تخریج: اس حدیث کو امام احمد نے روایت کیا ہے۔

قوله:وفي رواية لمسلم:قال :تكون فتنة......:

''يقظان'' قاف ساکن ہے۔

جامع میں ہے کہ حاکم نے خالد بن عرفطہ سے نقل کیا ہے:

ستكون احداث وفتنة وفرق واختلاف 'فان استطعت أن تكون المقتول لا القاتل فافعل

''عنقریب مصائب،فتنہ،فرقہ واریت اور اختلاف وجود میں آئیں گے اگر تمہاری طاقت ہو اس بات کی کہ مقتول بنو اور قاتل نہ بنو،تو کر لینا (مقتول بن جانا)۔

۵۳۸۵ : وَعَنْ اَبِيْ بَكْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّهَا سَتَكُوْنُ فِتَنٌ اَلَاثُمَّ تَكُوْنُ فِتَنٌ اَلَاثُمَّ تَكُوْنُ فِتَنٌ اَلَا ثُمَّ تَكُوْنُ فِتْنَةُ الْقَاعِدِ فِيْهَا خَيْرٌمِنَ الْمَاشِيْ وَالْمَاشِيْ فِيْهَا خَيْرٌمِّنَ السَّاعِيْ اِلَيْهَا اَلَا فَاِذَا وَقَعَتْ فَمَنْ كَانَ لَهٗ اِبِلٌ فَلْيَلْحَقْ بِاَهْلِهٖ وَمَنْ كَانَ لَهٗ غَنَمٌ فَلْيَلْحَقْ بِغَنَمِهٖ وَمَنْ كَانَتْ لَهٗ اَرْضٌ فَلْيَلْحَقْ بِاَرْضِهٖ فَقَالَ رَجُلٌ يَارَسُوْلَ اللّٰهِ اَرَاَيْتَ مَنْ لَّمْ تَكُنْ لَّهٗ اِبِلٌ وَلَا غَنَمٌ وَلَا اَرْضٌ قَالَ يَعْمِدُ اِلٰى سَيْفِهٖ فَلْيَدُقَّ عَلٰى حَدِّهٖ بِحَجَرٍ ثُمَّ لِيَنْجُ اِنِ اسْتَطَاعَ النَّجَاءَ اَللّٰهُمَّ هَلْ بَلَّغْتُ ثَلٰثًا فَقَالَ رَجُلٌ يَارَسُوْلَ اللّٰهِ اَرَاَيْتَ اِنْ اُكْرِهْتُ حَتّٰى يُنْطَلَقَ بِيْ اِلٰى اَحَدِالصَّفَّيْنِ فَضَرَبَنِيْ رَجُلٌ بِسَيْفِهٖ اَوْ يَجِيْءُ سَهْمٌ فَيَقْتُلُنِيْ قَالَ يَبُوْءُ بِاِثْمِهٖ وَاِثْمِكَ وَيَكُوْنُ مِنْ اَصْحَابِ النَّارِ .

اخرجه مسلم في صحيحه ٢٢١٢/٤ حديث رقم (١٢-٢٨٨٦) وابن ماجه في السنن ١٣٠٨/٢ حديث رقم ٣٩٥٨ واحمد في المسند ٤٨/٥۔

ترجمہ: ''حضرت ابو بکرہ رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:''بلاشبہ عنقریب فتنے ظاہر ہوں گے'یاد رکھنا پھر فتنوں کا ظہور ہوگا اور خبردار پھر اور فتنے رونما ہوں گے اور یاد رکھو ان فتنوں میں سے ایک بہت

بڑا فتنہ (یعنی مسلمانوں کی باہمی خانہ جنگی اور خونریزی کا حادثہ پیش آئے گا' اس فتنہ میں بیٹھا ہوا شخص چلنے والے شخص سے بہتری میں ہوگا اور چلنے والا شخص اس فتنہ کی طرف دوڑنے والے شخص سے بہتری میں رہے گا۔ پس آگاہ رہو! جب وہ فتنہ پیش رونما ہوگا وہ اپنے اونٹوں کے پاس (جنگل میں) جا کر رہنے لگ جائے جس شخص کے پاس بکریاں ہوں' وہ بکریوں میں مشغول ہو جائے اور جس شخص کے پاس (اس فتنہ کی جگہ سے کہیں دور) کوئی زمین و مکان وغیرہ ہو وہ اپنی اس زمین پر یا اس مکان میں رہائش اختیار کرے''۔ (حاصل یہ کہ جس جگہ وہ فتنہ ظاہر ہو یا تو وہیں پر دیتے ہوئے یکسوئی کے ساتھ اپنے کاروبار وغیرہ میں مصروفیت پیدا کر لے یا اس جگہ سے راہ فرار اختیار کر کے گوشہ عافیت میں پناہ گزین ہو جائیں اور اس ارض فتنہ کو خیرآباد کہہ دے) ایک شخص نے (یہ سن کر) عرض کیا کہ یا رسول اللہ! مجھے یہ بتائیے کہ اگر کسی شخص کے پاس اونٹ اور بکریاں نہ ہوں اور نہ (کسی دوسری جگہ) کوئی مکان و جائیداد وغیرہ ہو (کہ جہاں وہ جا کر گوشۂ عافیت اختیار کرے اور اس فتنہ کی جگہ سے یکسوئی اور علیحدگی اختیار کر سکے تو اس کے لئے آپ کیا حکم فرماتے ہیں؟) حضور ﷺ نے فرمایا: ''اس کو چاہئے کہ وہ اپنی تلوار کی طرف متوجہ ہو اور اس کو پتھر پر مار کر بیکار بنا دے''۔ (یعنی اس کے پاس جو بھی جنگی اسلحہ و ہتھیار ہوں وہ انہیں ضائع کر دے اور ناقابل استعمال بنا دے تاکہ جنگ و جدال کی امنگ ہی ختم ہو جائے اور وہ مسلمانوں کی باہمی خانہ جنگی اور خونریزی کے حادثہ میں شامل ہی نہ ہو سکے! یہ حکم اس لئے ہے کہ جس لڑائی میں دونوں طرف سے مسلمان برسرپیکار ہوں اور ایک دوسرے کی خونریزی کر رہے ہوں' اس میں شریک نہیں ہونا چاہئے) اور پھر اس شخص کو چاہئے کہ اگر وہ فتنہ کی جگہ سے بھاگ کر بچ سکتا ہو تو جلد نکل بھاگے (تاکہ) وہ اس فتنہ کے اثرات نجات پا سکے (اس کے بعد آپ ﷺ نے یہ فرمایا) اے اللہ! میں نے تیرا پیغام و حکم تیرے بندوں کو پہنچا دیا۔ یہ الفاظ آپ ﷺ نے تین بار فرمائے! ایک شخص نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ ﷺ! مجھے یہ بتائیے کہ اگر مجھے جبراً (یعنی زور و زبردستی سے) جنگ کرنے والی دونوں جماعتوں میں سے کسی ایک فریق کی صف میں لے جایا جائے اور وہاں کوئی شخص اپنی تلوار سے مجھے مار ڈالے یا کسی کا تیر آ کر مجھ کو لگے جو مجھے موت کی آغوش میں پہنچا دے (تو اس صورت میں قاتل اور مقتول کا کیا حکم ہوگا؟) آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا ''تمہارا وہ قاتل اپنے اور تمہارے گناہ کو لے کر لوٹے گا اور اہل دوزخ میں شمار ہوگا''۔ (مسلم)

تشریح: قولہ: انها ستكون فتن ...... القاعد فيها خير من الساعي اليها:

انها: یہ ضمیر قصہ ہے۔

الا: تنبیہ کیلئے ہے۔

ثم تكون فتنة: اور بعض تصحیح شدہ نسخوں میں یہ الفاظ ہیں: ''الا ثم تكون فتن''. یعنی جمع کے صیغہ کے ساتھ ہے' اور پھر اس کے بعد یہ الفاظ ہیں: ''الا ثم تكون فتنة'' (یعنی واحد کے صیغہ کے ساتھ ہے)

امام طیبیؒ فرماتے ہیں کہ اس کلام میں تین مبالغے ہیں:

اول: معطوف اور معطوف علیہ کے درمیان حرف تنبیہ لایا ذکر کیا گیا، تاکہ مزید تنبیہ ہو جائے۔

دوم: اس (حرف تنبیہ کے بعد "ثم" کے ذریعے عطف کیا گیا جو اس خاص فتنے کی مرتبہ کے تراخی پر دلالت کرتا ہے تا کہ اس فتنہ کی عظمت اور ہولناکی پر تنبیہ ہو جائے۔

سوم: اس میں خاص کا عام پر عطف ہے اس فتنہ کی یہ خصوصیت بتانے کیلئے کہ اس کے ہم شکل دیگر فتنوں سے یہ ایک ممتاز فتنہ ہوگا اور یہ ایک غیر معمولی مصیبت ہوگی۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ اپنے وسیع فضل کے طفیل اس فتنہ سے عافیت نصیب فرمائے۔

"الساعي اليها": جو ان فتنوں کو اپنی کوشش کی غایت اور غرض کا منتہیٰ بنائے اور وہ ان فتنوں کے علاوہ کسی اور چیز کو اپنی کوشش کا مقصود نہ بنائے۔ غرض پر دلالت کرنے والا حرف لام اور غایت پر دلالت کرنے والا حرف "الی" دونوں قریب المعنی ہیں، چنانچہ اس وقت "ماشی" سے "الساعی" کی طرف ترقی اور تدریج درست ہوگی۔

قوله: ألا فاذ وقعت...... فليلحق بارضه:

الا: یہ مزید تاکید کیلئے تنبیہ کے واسطے ہے۔

کوئی رہائشی زمین یا کاشتکاری کی زمین جو لوگوں سے دور ہو وہاں چلا جائے کیونکہ لوگوں سے دور رہنا اس وقت واجب ہو گا کیونکہ لوگوں میں گمراہ کن فتنے عام ہونگے جیسا کہ شاعر کہتا ہے:

ان السلامة من ليلى وجارتها
ان لا تمر على حال بواديها

قوله: يعمد الى سيفه......ان استطاع النجاء:

ینج: لام کو زیر کے ساتھ پڑھا جاتا ہے اور ساکن بھی پڑھنا درست ہے۔ اس کی یاء پر فتحہ، نون ساکن اور جیم پر ضمہ ہے، معنی یہ ہے کہ اس صورت میں بھاگ جائے اور جلدی کرے کہ کہیں اس فتنہ میں مبتلا نہ ہو جائے۔

النجاء: نون کے فتحہ اور مد کے ساتھ، اس کا معنی ہے تیز چلنا۔ علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں کہ "ليعمد" الخ سے مراد یہ ہے کہ وہ مکمل طور پر ان فتنوں سے یکسو ہو جائے گویا کہ یہ کہا گیا ہے: من لم يكن له مايشتغل به من مهامه فلينج برأسه.

بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ علامہ طیبیؒ نے "فلينج" کو "النجاة" مصدر سے امر کے صیغے پر محمول کیا ہے جبکہ ایسا نہیں ہے "ان استطاع النجاء" اس پر دلالت کرتا ہے کہ "ان استطاع النجاة" نہیں کہا۔ بس یہی کہا جا سکتا ہے کہ مادہ اور صیغہ سے قطع نظر اس کا حاصل معنی مراد ہے۔ واللہ تعالیٰ علم

قوله: اللهم هل بلغت ؟ثلاثا: حضور علیہ السلام جب ان فتنوں اور ان کے زمانے کی مشقتوں میں مبتلا ہونے سے ڈرا کر فارغ ہوئے تو یہ ارشاد فرمایا۔ تیرے بندوں تک وہ احکام اور دوسری باتیں پہنچادی ہیں جن کے پہچانے کا تُو نے مجھے حکم دیا تھا۔

ثلاثا: فعل مقدر کیلئے مفعول مطلق ہے۔ ای "قاله ثلاث مراتٍ" (یہ بات حضور علیہ السلام نے تین مرتبہ ارشاد

فرمائی)۔

ارايت ان اكرهت ....:

ينطلق: مجہول کے صیغہ کے ساتھ ہے۔

فضربنی رجل بسيفه اويجئ سهم: ''او'' ،نوع پر دلالت کر رہا ہے۔

يجئ: مضارع کے صیغہ کے ساتھ اس کا عطف ماضی پر ہے۔

فيقتلني؟: بظاہر یہ آخری جملہ پر تفریع ہے اور اسناد مجازی ہے اور اس بات کا بھی احتمال ہے کہ پہلے جملے پر بھی مشتمل ہو (قاتل) اور معنی یہ ہوگا کہ قاتل اور مقتول کا کیا حکم ہوگا؟

يبوء: یعنی وہ قاتل لوٹے گا۔ بعض کا کہنا ہے کہ ضمیر ''مکرہ'' کی طرف راجع ہے۔

یعنی عمومی طور پر اس شخص نے جو کچھ کیا تھا اس کی سزا کے ساتھ ساتھ بطور خاص تجھے قتل کرنے کے گناہ کے ساتھ لوٹے گا۔

یا ''اثمه'' سے مراد اس کا تیرے قتل کرنے کا ارادہ ہے اور ''اثمك'' سے مراد تیرا اس کی طرف ہاتھ بڑھانا ہے۔

یا ''اثمك'' سے مراد تیرے کردہ گناہ ہیں اس طرح کہ جب قاتل کی نیکیاں ختم ہو جائیں گی تو تمہارے گناہ اس قاتل کے گلے پر ڈالے جائیں گے، جیسا کہ (روایات میں) وارد ہوا ہے۔ اور وہ شخص اصحاب نار میں سے ہوگا۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿وذالك جزاء الظالمين﴾ [المائدة:۲۹، الحشر:۱۷] ''اور ظالموں کی یہی سزا ہے۔''

اور حدیث میں یہ نہیں فرمایا: وانت من اصحاب الجنة کہ ''تم جنتی ہوگے''، اگرچہ یہ بات اس کلام سے مفہوم ہو رہی ہے اس بات کو ازراہِ احتیاط ایک جانب پر اکتفاء کرتے ہوئے چھوڑ دیا کیونکہ یہ متعین خطاب ہی مفہوم ہو رہا ہے ایسا کوئی کلام مقدر نہیں مانا جا سکتا جو عام خطاب ہو اور مبہم ہو۔ یہ حکم اس ارشاد باری: ﴿ وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَاَ ابْنَيْ اٰدَمَ بِالْحَقِّ ﴾[المائدة۔۲۷] ''اور آپ ان اہل کتاب کو آدم کے دو بیٹوں کا قصہ صحیح طور پر پڑھ کر سنائیے'' سے ماخوذ ہے۔ نیز حضور علیہ السلام کا ارشاد ہے: كن خير ابني آدم ''آدم کے دو بیٹوں میں سے بہتر انسان بنو۔''

اور دوسری روایت میں ہے: كن عبد الله المقتول ولاتكن عبد الله القاتل۔

''اللہ کا مقتول بندہ بن جاؤ، اللہ تعالیٰ کا قاتل بندہ نہ بنو۔''

علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں، کہ ارشاد نبوی يبوء ..... کے دو معنی ہیں:

١ يرجع بمثل انمك اى يرجع باثمه ومثل اثمك المقدر لو قتله (یعنی وہ شخص اپنے گناہ کے ساتھ لوٹے گا اور اگر تم اس کو قتل کرتے تو ان کے بقدر گناہ کے ساتھ لوٹے گا۔)

٢ مضاف محذوف ہے۔ اى بمثل قتلك۔ یعنی تجھے قتل کرنے کے گناہ جیسے گناہ کے ساتھ اور قتل کرنے سے پہلے والے اپنے گناہ کے ساتھ۔

۵۳۸۶ : وَعَنْ اَبِیْ سَعِیْدٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یُوْشِكُ اَنْ یَّكُوْنَ خَیْرَ مَالِ الْمُسْلِمِ غَنَمٌ یَتَّبِعُ بِهَا شَعَفَ الْجِبَالِ وَمَوَاقِعَ الْقَطْرِ یَفِرُّ بِدِیْنِهٖ مِنَ الْفِتَنِ۔ (رواہ البخاری)

اخرجه البخاری فی صحیحه ۶۹/۱ حدیث رقم ۱۹، واخرجه ابو داوٗد فی السنن ٤٦١/٤ حدیث رقم ٤٢٦٧ والنسائی ۱۲۳/۸ حدیث رقم ٥٠٣٦ وابن ماجه فی السنن ۱۳۱۷/۲ حدیث رقم ۳۹۸۰ واحمد فی المسند ۶/۲۔

ترجمہ: ''حضرت ابوسعید رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''عنقریب (ایسا وقت آنے والا ہے جب کہ) ایک مسلمان کے لئے اس کا بہترین مال بکریاں ہوں گی جن کو لے کروہ پہاڑوں کی چوٹیوں اور بارش برسنے کی جگہوں پر چلا جائے اور فتنوں سے بھاگ کر اپنے دین کی حفاظت کر لے''۔ (بخاری)

تشریح: قوله:یوشك ان یکون خیر مال المسلم غنم:

''خیر'':منصوب ہے۔

غنم: بکریوں کا ریوڑ۔ علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں کہ غنم نکرہ موصوفہ ہے اور'' یکون'' کا اسم ہے، اور'' یکون '' کی خبر ''خیر مال المسلم'' ہے جو کہ معرفہ ہے اور یہ درست نہیں ہے' الا یہ کہ ''المسلم'' سے مراد جنس ہو جو اس صورت میں معرفہ نہیں ہوگا۔ خبر کو مقدم کرنے کا فائدہ یہ ہے کہ مطلوب اس وقت یکسوئی ہے خواہ اس کی صورت جو بھی ہو۔

بعض کا کہنا ہے کہ ''خیر'' اور ''غنم'' کو مبتدا خبر ہونے کی بناء پر مرفوع پڑھنا بھی درست ہے، اور''یکون'' کی ضمیر شان ہوگی۔ (کذا فی مفاتیح)

قوله:یتبع بها شعف الجبال......:

یتبع: تاء کی تشدید کے ساتھ ہے اور بعض نسخوں میں تائے موحدہ کے سکون اور باء کے فتحہ کے ساتھ مذکور ہے'' یتتبع'' کے معنی میں ہے۔

بها: (باء مصاحبت کیلئے ہے یا سببیہ ہے۔) ای مع الغنم أو بسببها۔

شعف: شین اور عین دونوں کے فتحہ کے ساتھ۔'' شعف'' کا واحد شعفة ہے جس کا معنی ہے پہاڑ کی چوٹی یا پہاڑ کی بلندی۔

القطر: قاف کے فتحہ اور طاء کے سکون کے ساتھ۔''مواقع القطر'' سے مراد ہے مواضع مطر اور اس آثار مثلاً نباتات اور درختوں کے پتے صحرائی یا پہاڑی علاقہ کی چراگاہ ہے۔

اس کلام میں تعمیم بعد از تخصیص ہے۔

'' شعف الجبال'' کو مقدم ذکر کیا' ان حالات میں لوگوں سے الگ تھلگ رہنے کی فضیلت کو مبالغہ کے ساتھ بیان کرنا مقصود ہے۔

یفر بدینه: اس باء کے بارے میں دو احتمال ہیں:

۱ (باءسببیہ ہے) ای بسبب حفظه من الفتن ای المحن الدينية۔

۲ (یا باء برائے مصاحبت ہے۔) ای يهرب من الفتن الدنيوية مصحوبا بدينه

یعنی دنیوی فتنوں سے بھاگ جائے تاکہ دور جا کر ان فتنوں سے علیحدہ ہو کر دین کے احکام کو قائم کر کے نجات حاصل کر سکے۔

۵۳۸۷ : وَعَنْ اُسَامَةَ بْنِ زَيْدٍ قَالَ اَشْرَفَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَلٰى اُطُمٍ مِنْ اٰطَامِ الْمَدِيْنَةِ فَقَالَ هَلْ تَرَوْنَ مَا اَرٰى قَالُوْا لَا قَالَ فَاِنِّي لَاَرٰى الْفِتَنَ تَقَعُ خِلَالَ بُيُوْتِكُمْ كَوُقْعِ الْمَطَرِ. (متفق علیه)

اخرجه البخاری فی صحيحه ٩٤/٤ حديث رقم ١٨٧٨ ومسلم فی صحيحه ٢٢١١/٤ حديث رقم (٩-٢٨٨٥) واحمد فی المسند ٢٠٠/٥

ترجمہ: ''حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ عنہما نے بیان فرمایا کہ (ایک روز) نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ کے کسی ٹیلے پر تشریف لے گئے اور پھر صحابہ کو مخاطب کر کے) پوچھا کہ ''کیا تم اس چیز کو دیکھتے ہو جسے میں دیکھ رہا ہوں''؟ صحابہؓ نے جواب دیا کہ نہیں! آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ بلاشبہ میں وہ فتنے دیکھ رہا ہوں جو تمہارے گھروں میں یوں داخل ہو جائیں گے جیسے بارش کے قطرے داخل ہو جاتے ہیں''۔

تشریح: قوله: اشرف النبی ﷺ علی اطم من آطام المدينة ......:

أطم: ہمزہ اور طاء کے ضمہ کے ساتھ ہے۔ پہاڑ کی چوٹی، قلعہ اور بلند مکان۔

آطام: ہمزہ کے مد کے ساتھ' یہ أطم'' کی جمع ہے۔

خلال: '' وسط'' کے معنی میں ہے۔

مطلب یہ ہے کہ جب حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے پہاڑ کی چوٹی کو دیکھا یا جس وقت اس پہاڑ کی چوٹی پر چڑھے تو اس وقت اللہ تعالیٰ نے آپ کو ان فتنوں کا قریب ہونا دکھا دیا تاکہ آپؐ ان فتنوں کے بارے میں اپنی امت کو آگاہ فرما دیں اور لوگ ہوشیار ہو جائیں اور یہ جان لیں کہ ان فتنوں کا واقع ہونا مقدر ہو چکا ہے اور ان فتنوں کو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے معجزات میں سے شمار کریں۔

علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں'' تقع'' میں اس بات کا بھی احتمال ہے کہ (''اریٰ'' کے لئے) دوسرا مفعول بہ ہو۔ لیکن ذوق کے زیادہ قریب بات یہ ہے کہ'' تقع '' کو حال بنایا جائے، اور'' رؤیت'' نظر (آنکھ سے دیکھنے) کے معنی میں ہو۔ چنانچہ کلام کا معنی یہ ہوگا کشف لی فابئصر ها عيانا (مجھ پر کشف ہو گیا اور میں ان فتنوں کو دیکھ رہا ہوں۔)

اور جامع میں امام احمدؒ و شیخین کی روایت حضرت اسامہؓ سے یوں منقول ہے:

''هل ترى ما ارٰی' انی لأرئ مواقع الفتن خلال بيوتكم كمواقع المطر''۔ ''کیا تو اس چیز کو دیکھ رہا ہے جس کو میں دیکھ رہا ہوں؟ بلاشبہ میں کو دیکھ رہا ہوں تو تمہارے گھروں میں یوں اتریں گے جیسے بارش پڑتی ہے۔''

۵۳۸۸ : وَعَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ هَلَكَةُ اُمَّتِي عَلٰى يَدَيْ

غِلْمَةٍ مِنْ قُرَيْشٍ۔

اخرجه البخاری فی صحیحه ٦١٢/٦ حدیث رقم ٣٦٠٥ واحمد فی فی المسند ٢٨٨/٢

ترجمہ: ''حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا کہ (ایک دن) رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''میری اُمت کی تباہی و بربادی قریش کے چند نوجوانوں کے ہاتھوں ہوگی''۔ (بخاری)

تشریح: قوله: هلكة امتي على...... :

هلكة: ھاء اور لام کے فتحہ کے ساتھ ہے، اس کا معنی ہے ہلاک ہونا۔

یہاں ''امت'' سے مراد صحابہ کرامؓ ہیں کیونکہ وہ اس امت کا بہترین طبقہ ہیں اور اس امت کے ائمہ کے اکابر ہیں۔

يدى: تثنیہ ہے ''غلمة'' کی طرف مضاف ہے۔

''غلمة'': غین کے کسرہ کے ساتھ ''غلام'' کی جمع ہے۔

مطلب یہ ہے کہ ایسے نوجوانوں کے ہاتھوں جو عقل کمال کے مرتبہ تک نہ پہنچے ہوں گے اور ایسے نوعمر لڑکوں کے ہاتھوں کو جن لڑکوں کو اصحاب وقار اور ارباب دانش کی کوئی پرواہ نہیں ہوگی۔

بظاہر اس ہلاکت سے مراد وہ واقعات ہیں جو حضرت عثمانؓ اور ان کے قاتلوں کے مابین پیش آئے اور حضرت علیؓ اور حضرت حسنؓ اور ان سے قتال کرنے والوں کے مابین رونما ہوئے۔

مظہرؒ فرماتے ہیں کہ ممکن ہے ان نوجوانوں سے مراد وہ لوگ ہوں جو خلفاء راشدین رضی اللہ عنہم اجمعین کے بعد آئے۔ مثلاً یزید، عبدالملک بن مروان وغیرہما۔ توضیح اور جامع کی روایت کے الفاظ یوں ہیں: ''هلاك امتي على يدى غلمة من قريش''۔

اس حدیث کو امام احمدؒ اور امام بخاریؒ نے حضرت ابوہریرہؓ سے نقل کیا ہے۔

۵۳۸۹ : وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَتَقَارَبُ الزَّمَانُ وَيُقْبَضُ الْعِلْمُ وَتَظْهَرُ الْفِتَنُ وَسَيُلْقَى الشُّحُّ وَيَكْثُرُ الْهَرَجُ قَالُوْا وَمَا الْهَرَجُ قَالَ الْقَتْلُ . (متفق علیه)

اخرجه البخاری فی صحیحه ١٨٢/١ حدیث رقم ٨٥ ومسلم فی صحیحه ٢٠٥٧/٤ حدیث رقم (١١-١٥٧) وابو داوٗد فی السنن ٤٥٤/٤ حدیث رقم ٤٢٥٥ وابن ماجه ١٣٤٥/٢ حدیث رقم ٤٠٥٢ واحمد فی المسند ٤٠٢/١

ترجمہ: ''حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: (ایک وقت ایسا بھی آنے والا ہے جب) زمانے ایک دوسرے کے قریب ہو جائیں گے، علم کو قبض کر لیا جائے گا، فتنے رونما ہوں گے، بخل پیدا ہو جائے گا اور ہرج بڑھ جائیگا''۔ صحابہؓ نے (یہ سن کر) عرض کیا کہ ''ہرج'' سے مراد کیا لیتے ہیں؟ آپ ﷺ نے فرمایا: قتل''۔ (بخاری ومسلم)

تشریح: قوله: قال رسول الله يتقارب الزمان:

یعنی دنیا اور آخرت کا زمانہ قریب ہوگا، چنانچہ اس سے مراد قیامت کا قریب ہونا ہے۔

تورپشتی رحمہ اللہ فرماتے ہیں جو حسب ذیل ہیں:

1. اس سے مراد قیامت کا قریب ہونا ہے۔ اور یہ بھی احتمال ہے
2. تقارب اہل زمان مراد ہو یعنی اہل زمانہ کا برائی میں ایک دوسرے کے قریب ہونا مراد ہو۔
3. بذات خود زمانے کا برائی میں قریب ہونا مراد ہو کہ زمانے کے پہلے حصے کو آخری حصے کے مشابہ قرار دیا۔
4. بعض کا کہنا ہے کہ زمانے کا قریب ہونا اس طرح ہوگا کہ زمانے والوں کی عمریں چھوٹی ہو جائیں گی۔ اھ۔

اس کا بھی احتمال ہے کہ یہ کنایہ ہو اس بات سے کہ گناہوں کی کثرت کی وجہ سے زمانے کی برکت کم ہو جائے گی۔

قاضیؒ فرماتے ہیں کہ یہ مراد ہے کہ مملکتیں اور زمانے تیزی سے ختم ہونے کی طرف بڑھ رہے ہونگے چنانچہ اس طرح ان لوگوں کا زمانہ اور ان کی جدائی قریب ہو جائے گی۔

جن پر مصائب مرتب ہوں گے۔

قولہ: ویلقی الشح:

یعنی اُس زمانے کے لوگوں کے دلوں میں ان کے احوال کے مطابق بخل ڈالا جائے گا، یہاں تک کہ عالم اپنے علم میں، صنعت وحرفت والا اپنی صنعت وحرفت میں اور مالدار اپنے مال میں بخل کرے گا۔

اور القائے شح سے اصل بخل کا پایا جانا مراد نہیں ہے کیونکہ اصل بخل تو انسان کی جبلت میں پڑا ہوا ہے سوائے ان لوگوں کے جن کو اللہ تعالیٰ اس سے محفوظ کرے، اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿وَمَنْ يُّوقَ شُحَّ نَفْسِهٖ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ﴾ [الحشر: ۹، التغابن: ۱۶] ''اور جو شخص نفسانی حرص سے محفوظ رہا ایسے ہی لوگ (آخرت میں) فلاح پانے والے ہیں''۔ ''اور جو شخص اپنی طبیعت کے بخل سے محفوظ رکھا جاوے ایسے ہی لوگ فلاح پانیوالے ہیں۔''

قولہ: ویکثر الھرج ......:

''الھرج'' ہاء کے فتحہ، راء کے سکون اور جیم کے ساتھ۔ قاموس میں لکھا ہے: ''ھرج الناس'' کا معنی یہ ہے کہ لوگ فتنہ، اختلاط اور قتل میں پڑ گئے۔ (انتہی)

چنانچہ اس سے معلوم ہوا کہ ''ھرج'' سے خاص قتل مراد ہے، یعنی ایسا قتل جس کے ساتھ فتنہ واختلاط بھی ہوگا۔ لہٰذا (''القتل'' میں) لام عہد کا ہے۔

۵۳۹۰ : وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَالَّذِیْ نَفْسِیْ بِيَدِهٖ لَا تَذْهَبُ الدُّنْيَا حَتّٰى يَاْتِیَ عَلَى النَّاسِ يَوْمٌ لَا يَدْرِی الْقَاتِلُ فِيْمَ قَتَلَ وَلَا الْمَقْتُوْلُ فِيْمَ قُتِلَ فَقِيْلَ كَيْفَ يَكُوْنُ ذٰلِكَ

قَالَ الْهَرَجُ الْقَاتِلُ وَالْمَقْتُوْلُ فِي النَّارِ . (رواہ مسلم)

اخرجه مسلم فی صحیحه ٢٢٣١/٤ حدیث رقم ٥٦-٢٩٠٨)

ترجمہ: ''حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''قسم ہے اس ذات پاک کی جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے (تمام کائنات اس وقت تک ختم نہیں ہوگی جب تک لوگوں پر ایسا وقت (یعنی باہمی جھگڑوں اور فسادات بدامنی اور بے الحاری کے باعث ایسا پرفتن دور) نہ آ جائے جس میں نہ قاتل کو یہ معلوم ہوگا یہ کس وجہ سے قاتل بن گیا اور نہ مقتول (یا اس کے ورثاء و متعلقین) کو یہ معلوم ہوگا کہ اسے کیونکر مقتول بنایا گیا''۔ عرض کیا گیا یہ کس سبب سے ہوگا آخر کیا وجہ ہوگی (یعنی اس کی وجہ کیا ہوگی کہ قتل کا سبب نہ قاتل کو معلوم ہوگا نہ مقتول کو)'' آپ ﷺ نے فرمایا: ''فتنہ کے سبب' نیز قاتل و مقتول دونوں دوزخ میں جائیں گے''۔ (مسلم)

تشریح: قوله: لا یدری القاتل و لا مقتول فیم قتل؟:

(قتل، کا مفعول بہ ''مقتول'' محذوف ہے۔) یعنی یہ معلوم نہیں ہوگا کہ اس کا قتل کرنا جائز بھی ہے یا نہیں؟ اور نہ بذاتِ خود مقتول کو یا مقتول کے اہل خانہ کو معلوم ہوگا کہ کیا کسی شرعی سبب سے یا کسی اور وجہ سے قتل کیا گیا ہے یہ دونوں باتیں ہمارے زمانہ میں کثرت سے ہیں۔

قوله: فقیل کیف یکون ذالك؟ قال: الهرج:

یعنی اس مجہول قتل کا باعث فتنہ اور اختلاط ہوگا۔ اور معنی یہ ہے کہ اس کا سبب کثرت و شدت کے ساتھ هرج کا بھڑک اٹھنا ہوگا۔

قوله: القاتل و المقتول فی النار:

قاتل تو اس لئے کہ دوزخ میں جائے گا کہ اُس نے مسلمان کو قتل کیا، اور مقتول اس لئے دوزخ میں جائے گا کہ اسے بھی اُس قاتل کو قتل کرنے کی خواہش تھی لیکن اس کو موقع نہیں ملا۔

امام نوویؒ فرماتے ہیں کہ قاتل کے دوزخ میں جانے کی وجہ تو ظاہر ہے اور مقتول دوزخ میں اس لئے جائے گا کہ اس کا ارادہ قاتل کو قتل کرنے کا تھا۔ اور یہ اُس مشہور صحیح مذہب کیلئے دلیل ہے، کہ جو شخص معصیت کی نیت کرے اور اپنی اس نیت پر اصرار کرے وہ گنہگار رہوگا، اگرچہ اس نے یہ گناہ نہ کیا ہو اور نہ اس کا ذکر زبان پر لایا ہو۔

۵۳۹۱: وَعَنْ مَعْقَلِ بْنِ يَسَارٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَلْعِبَادَةُ فِي الْهَرْجِ كَهِجْرَةٍ اِلَيَّ.

اخرجه مسلم فی صحیحه ٢٢٦٨/٤ حدیث رقم (١٣٠-٢٩٤٨) واخرجه الترمذی فی السنن ٤٢٤/٤ حدیث رقم ٢٢٠١ وابن ماجه فی السنن ١٣١٩/٢ حدیث رقم ٣٩٨٥ واحمد فی المسند ٢٥/٥۔

ترجمہ: ''حضرت معقل بن یسار رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: فتنے کے دور میں

(اور مسلمانوں کی باہمی خانہ جنگی اور قتل وقتال کے وقت مکمل استقلال اور دوام کے ساتھ دین پر قائم رہنے اور) عبادت اور بھلائی کے کام کرنے کا ثواب' میری طرف ہجرت کرنے کے ثواب کی مانند ہے''۔ (مسلم)

تشریح: (یعنی) یہ ہجرت ''ومن کانت هجرته الی الله ورسوله فهجرته الی الله ورسوله'' کا مصداق ہوگی اور اس کی نظیر یہ حدیث ہے: ''ذاکر الله فی الغافلین بمنزلة الصابر فی الفارین''

تخریج: اسی طرح اس حدیث کو امام احمد، امام ترمذی اور امام ابن ماجہ رحمہم اللہ نے بھی نقل کیا ہے۔

۵۳۹۲ : وَعَنِ الزُّبَيْرِ بْنِ عَدِيٍّ اَتَيْنَا اَنَسَ بْنَ مَالِكٍ فَشَكَوْنَا اِلَيْهِ مَا نَلْقٰى مِنَ الْحَجَّاجِ فَقَالَ اِصْبِرُوْا فَاِنَّهٗ لَا يَاْتِيْ عَلَيْكُمْ زَمَانٌ اِلَّا الَّذِيْ بَعْدَهٗ اَشَرُّمِنْهُ حَتّٰى تَلْقَوْا رَبَّكُمْ سَمِعْتُهٗ مِنْ نَبِيِّكُمْ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ.

اخرجه البخاری فی صحیحه ۱۹/۱۳ حدیث رقم ۷۰٦۸ واحمد فی المسند ۱۷۹/۳

ترجمہ: ''حضرت زبیر بن عدیؒ (تابعی) کا بیان ہے کہ (ایک روز) ہم لوگ حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ان سے حجاج بن یوسف کی جانب سے ہمیں پہنچنے والی تکالیف اور مصائب ومظالم کی شکایت کی۔ انہوں نے فرمایا کہ تم صبر اور تحمل کا دامن تھا کیونکہ یقیناً آئندہ جو بھی دور آئے گا وہ گزشتہ دور سے بدترین ہوگا (پس نامعلوم آنے والا دور کیسے کیسے سلاطین واُمراء کو لیے ہوئے آتا ہے جو ممکن ہے حجاج سے بھی بڑھ کر ظلم و بربریت سے کام لینے والے ثابت ہوں' اس لئے تم حجاج کے مظالم اور ایذا رسانیوں کو صبر سے برداشت کرلو یہاں تک تم (قیامت کے دن) اپنے پروردگار سے ملاقات کرو (اور پھر تم دیکھنا کہ تمہارا پروردگار تمہارے ظالموں کو کس طرح شدید پکڑ میں لیتا ہے اور سخت ترین عذاب سے دوچار کرتا ہے۔ یہ بات میں نے تمہارے پیغمبر ﷺ سے سن رکھی ہے''۔ (بخاری)

راویٔ حدیث:

زبیر بن عدی۔ یہ ''عدی'' کے بیٹے ہیں۔ ہمدانی کوفی ہیں مقام ''رے'' کے قاضی تھے۔ تابعی ہیں۔ انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں۔ ان سے سفیان ثوری وغیرہ نے روایت حدیث کی ہے ۱۳۱ھ میں ان کی وفات ہوئی ہے۔ ''ہمدانی'' کا میم ساکن ہے۔

تشریح: قوله: اتینا انس بن مالك...... حتی تلقوا ربکم ......:

من الحجاج حاء کے فتحہ کے ساتھ ہے۔ (یہاں مضاف محذوف ہے۔) ای من ظلم الحجاج

لفظ ''خیر'' اور شر کی تحقیق: یہ بات اکثر زمانوں کے اعتبار سے ہے یا بعض وجوہ کے اعتبار سے ہے۔

قاضیؒ فرماتے ہیں کہ ''خیر'' اور ''شر'' کی اصل ''أخیر'' اور ''أشر'' ہے دونوں کی اصل کا استعمال متروک ہے اور نادر طور پر ہی استعمال کیا جاتا ہے۔ اسم تفضیل کے معنی کی ادائیگی کیلئے ''خیر'' اور ''شر'' کا استعمال متعارف ہے۔ اور قاموس میں

لکھا ہے:هو شر منه واشر منه قليلة اور دئية (کہ مستعمل تو دونوں ہیں' البتہ ثانی کا استعمال قلیل وردی ہے۔)

قاموس میں یہ بھی لکھا ہے:هو شر منه و أشر منه۔ یہ لغت قلیل ہے یا ردی ہے اور اسی طرح:هو اخير منك اور هو خير ہے۔اھ۔اس عبارت میں تنبیہ ہے کہ'' اخیر'' کا استعمال'' أشر'' کے استعمال سے بہتر ہے۔اور شاید اس (فرق) کی وجہ یہ ہے کہ لفظ'' خیر'' کو تفصیل وغیر تفضیل کے لئے استعمال کیا جاتا ہے۔اس لئے لفظ ''اخیر'' مقصود میں صریح ہے، بخلاف لفظ شرؐ کے۔البتہ مبالغہ کیلئے اس کو ہمزہ کے ساتھ استعمال کیا جاتا ہے۔واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

"سمعته" کی ضمیر منصوب کا مرجع حضرت انسؓ کا قول'' اصبروا...... الخ'' ہے۔زیادہ ظاہر یہ ہے کہ ضمیر کا مرجع''انه لا يأتي عليكم...... '' ہے۔

بعض نے لکھا ہے کہ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کے زمانہ سے اس حدیث کے اطلاق پر اشکال ہوتا ہے' کیونکہ حضرت عمر بن العزیزؒ کا زمانہ حجاج بن یوسف کے بعد قریب ہی تھا۔اور اسی طرح امام مہدی اور حضرت عیسیٰ علیہما السلام کے زمانہ سے بھی اشکال ہوتا ہے۔

اس کا جواب یہ دیا گیا ہے کہ یہ بات اکثر واغلب کے اعتبار سے ہے' اور ان زمانوں سے مراد حجاج بن یوسف کے زمانے سے لے کر دجال کے زمانے تک کے وہ زمانے مراد ہیں جن میں برائی زور پر ہوگی اور جہاں تک عیسیٰ علیہ السلام کے زمانے کی بات ہے تو اس کے لئے ایک علیحدہ حکم ہے۔

میں (ملاعلی قاریؒ) کہتا ہوں کہ زیادہ ظاہر (جواب یہ) ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام کا زمانہ تو شرعاً اس کلام سے مستثنیٰ ہے' اور جہاں تک بات ہے باقی زمانوں کی تو ممکن ہے کہ ان میں شریت ایک حیثیت سے موجود ہو' ایک اعتبار سے نہ' کسی جگہ موجود ہو اور کسی جگہ نہ ہو' کسی کام میں ہو اور کسی کام میں نہ ہو۔کاموں سے مراد علم، کیفیات، استقامت وغیرہ دوسرے امور ہیں جن کی تفصیل طویل ہے۔اور یہ حضور اکرم ﷺ کے مبارک زمانہ سے دوری کا تقاضا ہے کیونکہ حضور علیہ السلام کا مبارک زمانہ' جہاں کے لئے بمنزلہ منور مشعل کے ہے اور جوں جوں زمانہ حضور اکرم ﷺ کے عہد مبارک سے دور ہوتا جاتا ہے، ظلمت وتاریکی بڑھتی جاتی ہے۔چنانچہ صحابہ کرامؓ حضور علیہ السلام کی تدفین کے فوراً بعد اپنے قلوب کی کیفیت میں تبدیلی محسوس کی۔باوجودیکہ ان کے نفوس قدسیہ مصفی ومزکی تھے۔

حکایت: مشائخ کبار میں سے ایک بزرگ کے بارے میں منقول ہے، (وہ فرماتے ہیں) کہ میں ایک رات شیراز کی جامع مسجد میں بیٹھا ہوا اپنے اوراد میں مشغول تھا کہ اچانک دل میں مسجد سے باہر جانے کا ارادہ پیدا ہوا اس ارادے کا نہ کوئی داعیہ تھا اور نہ کوئی باعث۔چنانچہ میں مسجد سے باہر آیا تو میں نے ایک عورت کو دیکھا کہ جو دیوار کے ساتھ چمٹی ہوئی تھی۔مجھے خیال ہوا کہ یہ عورت گھر جانا چاہتی ہے، مگر اس کو راستہ میں اہل فساد کا خوف ہے۔میں نے اس سے یہ بات کہی تو اس نے اشارہ سے کہا کہ ہاں پس میں اس کے آگے ہولیا اور اس سے کہا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے شعیب علیہ السلام سے کہا تھا کہ اگر میں درست راستے سے ہٹ جاؤں تو تو پتھر پھینکنا جو راہ مستقیم پر دلالت کرے۔چنانچہ میں نے اُس عورت کو اس کے گھر تک پہنچایا اور

آ کر دوبارہ اپنے وظائف میں مشغول ہو گیا اس وقت میرے دل میں حضرات نفسانی سے متعلق کوئی خیال پیدا نہیں ہوا، پھر اس روحانی کیفیت والے زمانے کے بعد ایک وقت ایسا آیا کہ دل میں شیطانی وسوسے اور نفسانی خیالات آنے لگے اس پر میں غور کرتا رہا کہ کیا اس تغیر کی وجہ میرے کھانے پینے اور لباس میں تبدیلی ہے، یا عبادت میں نیت کی تبدیلی ہے یا اپنے ساتھیوں کی صحبت میں تبدیلی آ گئی ہے یا ظالموں کے ساتھ اختلاط ہوا ہے۔غرض یہ کہ اس جیسے طرح طرح اسباب ذہن میں آتے رہے۔ چنانچہ غور وفکر کر کے نتیجہ میں اس ظلمت کی کوئی وجہ مجھے سمجھ میں نہیں آئی سوائے اس کے کہ حضور علیہ السلام کے عہد مبارک سے بُعد پیدا ہوا ہے جس کی وجہ سے یہ خطرات پیدا ہو گئے۔

جامع میں حضرت انسؓ سے مرفوعاً منقول ہے:

"لا یاتی علیکم عام ولا یوم الا والذی بعدہ شر منہ حتی تلقوا ربکم".

اس حدیث کو امام احمد، امام بخاری اور امام نسائی رحمہم اللہ نے نقل کیا ہے۔

اور طبرانی نے یہ حدیث حضرت انسؓ سے ان الفاظ کے ساتھ مرفوعاً نقل کی ہے

"ما من عام الا الذی بعدہ شر منہ حتی تلقوا ربکم"

طبرانی کی کبیر میں ابوالدرداءؓ سے یہ مرفوع حدیث منقول ہے:

"ما من عام الا ینقص الخیر فیہ ویزید الشر".

علامہ زرکشیؒ فرماتے ہیں کہ طبرانی نے حضرت ابن عباسؓ سے نقل کیا ہے:

"ما من عام الا ویحدث الناس بدعۃ ویمیتون سنۃ حتی تمات السنن وتحیا البدع"

"ہر سال لوگ بدعات پیدا کریں گے اور سنتوں کو مٹائیں گے۔ یہاں تک کہ سنتیں مردہ ہو جائیں گی اور بدعات زندہ ہو جائیں گی۔"

پس یہ حدیث اس بات پر صراحت کے ساتھ دلالت کر رہی ہے کہ "شر" سے مراد موت سنن اور احیاء بدعات کا ہے۔(یعنی سنتوں کی موت اور بدعات کا احیاء مراد ہے) اور بلاشبہ ہر زمانہ میں ان امور کا وجود ثابت رہا ہے اور اس کی تائید حضرت انسؓ کی اُس مرفوع حدیث سے ہوتی ہے جس کو امام بخاریؒ نے نقل کیا ہے:

"لا یاتی علی الناس زمان الا الذی بعدہ شر منہ"

اور یہ عوام کی زبان پر مشہور ہے: "کل عام ترذلون" تو یہ حسن بصریؒ کا کلام ہے جو ان کے رسالہ میں مذکور ہے۔ جیسا کہ علامہ زرکشیؒ وغیرہ نے ذکر کیا ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

الفصل الثانی:

۵۳۹۳ : عَنْ حُذَیْفَةَ قَالَ وَاللّٰهِ مَاأَدْرِیْ أَنَسِیَ أَصْحَابِیْ أَمْ تَنَاسَوْا وَاللّٰهِ مَاتَرَكَ رَسُوْلُ اللّٰهِ

صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مِنْ قَائِدِ فِتْنَةٍ إِلٰى أَنْ تَنْقَضِيَ الدُّنْيَا يَبْلُغُ مَنْ مَعَهُ ثَلٰثَمِائَةٍ فَصَاعِدًا لَا قَدْسَمَّاهُ لَنَا بِاسْمِهِ وَاسْمِ أَبِيْهِ وَاسْمِ قَبِيْلَتِهِ ۔ (رواه ابوداود)

اخرجه ابو داوٗد فی السنن ٤٤٣/٤ حدیث رقم ٤٢٤٣

ترجمہ: ''حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا خدا کی قسم مجھے نہیں معلوم کہ میرے یہ رفقاء (یعنی صحابہ کرامؓ) بھول گئے ہیں یا انہوں نے ان باتوں کو فراموش تو نہیں کیا لیکن (ایسا ظاہر کرتے ہیں) جیسے وہ بھول گئے ہیں' میں خدا کی قسم کھا کر کہتا ہوں' رسول اللہ ﷺ نے کسی بھی فتنہ کی باگ ڈور سنبھالنے والے کے تذکرہ کو نہیں چھوڑا تھا جو کائنات کے اختتام پزیر ہونے تک پیدا ہونے والا ہے اور جس کے تابعداروں کی تعداد تین سو تک یا تین سو سے زیادہ ہوگی۔ آپ ﷺ نے ہر فتنہ پرداز کا ذکر کرتے وقت ہمیں اس کا اور اس کے باپ کا اور اس کے قبیلے تک کا نام بتایا تھا''۔

(ابوداؤد)

تشریح: قوله: والله ما ادری انسی اصحابی ......:

''من'' زائدہ ہے نفی میں استغراق کی تاکید کیلئے ہے۔

''قائد فتنة'' سے مراد گمراہی کا داعی اور بدعت کا باعث بننے والا شخص ہے۔

ان تنقضی :'' ان'' مصدریہ ہے۔)ای الی انقضا ئها وانتها ئها۔

یبلغ :''قائد'' کی صفت ہے۔

الا قدسماه :یہ استثناء متصل ہے اور معنوی اعتبار سے تقدیری عبارت یوں ہے علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں کہ'' الی ان تنقضی'' محذوف کے متعلق ہے ۔ای ما ترك رسول الله ذكر قائد فتنة الی ان تنقضی الدنیا مهملا لكن قد سماه. چنانچہ استثناء منقطع ہے۔

مظہرؒ فرماتے ہیں کہ'' قائد فتنہ'' سے مراد وہ شخص ہے جس کی وجہ سے لوگوں میں بدعات، گمراہی اور قتل وقتال ہوگا، جیسا کہ وہ بدعتی عالم جو لوگوں کو بدعت کا حکم دے، یا وہ امیر جو مسلمانوں سے لڑے۔

۵۳۹۴ : وَعَنْ ثَوْبَانَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِنَّمَا أَخَافُ عَلٰى أُمَّتِي الْأَئِمَّةَ الْمُضِلِّيْنَ وَإِذَا وُضِعَ السَّيْفُ فِيْ أُمَّتِيْ لَمْ يُرْفَعْ عَنْهُمْ إِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ ۔

اخرجه ابو داوٗد فی السنن ٤٥١/٤ حدیث رقم ٤٢٥٢ والترمذی فی السنن ٤٣٧/٤ حدیث رقم ٢٢٢٩ وابن ماجه فی ١٣٠٤/٢ حدیث رقم ٣٩٥٢ واحمد فی المسند ٢٧٨/٥۔

ترجمہ: ''حضرت ثوبان رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''حقیقت یہ ہے کہ میں اپنی امت کے حق میں جن لوگوں سے سب سے زیادہ خطرات رکھتا ہوں وہ صرف اور صرف گمراہ کرنے والے پیشوا وامراء ہیں' (آگاہ رہو!) جب میری امت میں تلوار چل پڑے گی تو پھر وہ روز قیامت تک ان سے اٹھائی نہیں جائے

گی''۔

تشریح: ''الائمة'': امام کی جمع ہے۔اس کا معنی ہے: لوگوں کا پیشوا، قوم کا سردار وہ شخص جو لوگوں کو کسی قول، فعل اور عقیدے کی طرف بلائے۔

یعنی اگر ایک شہر میں نہیں ہوگا تو دوسرے شہر میں ہوگا۔

۵۳۹۵:وَعَنْ سَفِيْنَةَ قَالَ سَمِعْتُ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ الْخِلَافَةُ ثَلٰثُوْنَ سَنَةً ثُمَّ تَكُوْنُ مُلْكًا ثُمَّ يَقُوْلُ سَفِيْنَةُ :اَمْسِكْ :خِلَافَةَ اَبِيْ بَكْرٍ سَنَتَيْنِ وَخِلَافَةُ عُمَرَ عَشَرَةً وَعُثْمَانَ اِثْنَتَيْ عَشَرَةَ وَعَلِيٍّ سِتَّةً.

اخرجه ابو داوٗد فی السنن ۳۶/۵حدیث رقم ٤٦٤٦ والترمذی فی السنن ٤/ ٤٣٦حدیث رقم ٢٢٢٦ واحمد فی المسند ٥/ ٢٢٠

ترجمہ: ''حضرت سفینہ رضی اللہ عنہ (جو آنحضرت ﷺ کے آزاد کردہ غلام تھے) بیان فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ ارشاد فرماتے ہوئے سنا: دورِ خلافت تیس سال تک رہے گا' اس کے بعد وہ خلافت بادشاہت کی صورت میں تبدیل ہو جائے گی۔حضرت سفینہ نے (یہ حدیث بیان کرنے کے بعد ان سے روایت لینے والے ایک شخص کو یا عام لوگوں کو مخاطب فرمایا اور) کہا کہ شمار کرو (حضور ﷺ نے جو تیس سال کا عرصہ بتلایا ہے وہ اس طرح پورا ہوتا ہے کہ) سیدنا صدیق اکبرؓ کا دورِ خلافت دو سال' سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا دورِ خلافت دس سال' سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کا دورِ خلافت بارہ سال اور سیدنا علی رضی اللہ عنہ کا دورِ خلافت چھ سال''۔(احمد' ترمذی' ابوداؤد)

راویٔ حدیث:

سفینہ :حضرت سفینہ رضی اللہ عنہ بھی حضور اکرم ﷺ کے آزاد کردہ غلام ہیں۔کہا جاتا ہے کہ ''سفینہ'' ان کا لقب تھا اور ان کے نام کے بارے میں اختلاف ہے (ان کو یہ لقب اس طرح ملا کہ) ایک مرتبہ حضور اکرم ﷺ کہیں سفر پر تشریف لے جا رہے تھے اور حضرت سفینہ رضی اللہ عنہ بھی ساتھ تھے۔سفر کے دوران ایک شخص تھک گیا تو اس نے اپنی تلوار، ڈھال اور نیزہ حضرت سفینہ رضی اللہ عنہ کو پکڑا دیا۔بہت ساری چیزوں کو اٹھائے ہوئے تھے۔اس لئے حضور علیہ السلام نے اُن سے فرمایا: انت سفينة (تم کشتی ہو) ان سے ان کے بیٹوں عبدالرحمٰن، محمد اور زیاد اور دوسرے حضرات نے روایات نقل کی ہیں۔

تشریح: قوله:الخلافة ثلاثون سنة ثم تكون ملكا:

الخلافة: (اس کی صفت محذوف ہے) ای الخلافة الحقة أو المرضية الله ورسوله او الكاملة والمتصلة (یعنی حقیقی خلافت یا ایسی خلافت جو اللہ اور اس کے رسول کی پسندیدہ خلافت یا کامل خلافت یا ایسی خلافت جو عہد نبوی سے متصل ہو۔)

تکون :ای تنقلب بترجع ملكًا میم کے ضمہ کے ساتھ۔یعنی ایسی حکومت و بادشاہت ہوگی جن میں اہل حق پر غلبہ ہوگا۔

شرح عقائد میں لکھا ہے کہ یہ حدیث مشکل ہے چونکہ حدیث میں خلافت کا زمانہ تیس سال بتایا گیا جبکہ خلفاء راشدین کے بعد خلفاء عباسیہ کی اور بعض مروانی خلفاء مثلاً عمر بن عبدالعزیزؒ کی خلافت پر تمام اہل حل وعقد کا اتفاق ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ ممکن ہے خلافت سے مراد ایسی کامل خلافت ہو جس میں مخالفت کی ذرا سی بھی آمیزش نہ ہو اور اتباع سے بالکل اعراض نہ ہو کہ ایسی خلافت تیس برس رہے گی اور اس کے بعد کبھی اس طرح ہو گی اور کبھی اس طرح نہیں ہو گی۔(انتہی)

واضح رہے کہ مروانیوں کا سب سے پہلا خلیفہ یزید بن معاویہ تھا' اس کے بعد اس کا بیٹا معاویہ بن یزید خلیفہ بنا، پھر عبد الملک پھر ہشام بن عبدالملک' پھر ولید' پھر سلیمان پھر عمر بن عبدالعزیزؒ پھر ولید بن یزید پھر یزید بن ولید' اور پھر مروان بن محمد خلیفہ بنا۔ اس کے بعد خلافت اس خاندان سے نکل کر بنوعباس کی طرف منتقل ہو گئی۔

شرح السنہ میں لکھا ہے کہ حقیقی خلافت تو ان لوگوں کی تھی جنہوں نے اپنے اعمال سے خلیفہ ہونے کو سچا کر کے دکھایا اور حضور علیہ السلام کے بعد آپ ﷺ کو مضبوطی سے تھامے رکھا، اور جب حکمرانوں نے سنت کی مخالفت کی اور شہرت کو بدل ڈالا تو وہ محض حکمران ٹھہرے۔ اگرچہ ان کا نام 'خلیفۂ وقت' ہوتا تھا، اور اس میں کوئی حرج کی بات نہیں کہ مسلمانوں کے امور کی نگرانی کرنے والے شخص کو ''امیر المؤمنین'' کہا جائے، اگرچہ وہ عادل خلفاء کی سیرت کے خلاف زندگی گزار رہا ہو۔ اور اس کو خلیفہ اس لئے کہا جاتا ہے کہ وہ اپنے پیش رو کا ''خلف'' اور اس کا قائم مقام ہے، حضرت آدم اور حضرت داؤد علیہما السلام کے بعد کسی کو ''خلیفۃ اللہ'' کہنا درست نہیں ہے۔

میں (ملا علی قاریؒ) کہتا ہوں کہ اس بات میں کوئی شک نہیں ہے کہ حضور علیہ السلام خدا کی مخلوق میں خدا کے خلیفہ تھے، بلکہ اس کا اطلاق تو آپؐ کے علاوہ کسی اور پر بھی کیا جا سکتا ہے، جیسا کہ عنقریب ایک حدیث آ رہی ہے:

''فإن كان لله في الأرض خليفة''. [الحديث]

فرمایا: کسی شخص نے عمر بن عبدالعزیزؒ کو: ''یا خلیفة الله'' کہا تو عمر بن عبدالعزیزؒ نے فرمایا، تیرا ناس ہو جائے۔ میری والدہ نے میرا نام عمر رکھا ہے' اگر تم مجھے اُس نام سے پکارتے تو میں تمہاری پکار کا جواب دیتا' پھر یہ کہ تم لوگوں نے تو مجھے اپنے امور کا نگران بنا دیا اور میرا نام ''امیر المؤمنین'' رکھ دیا۔ چنانچہ اگر تم مجھے ''امیر المؤمنین'' کہہ کر پکارتے تو بھی کافی تھا۔ یعنی از روئے ادب وتعظیم صرف ''امیر المؤمنین'' کہنا کافی تھا۔ یہ عمر بن عبدالعزیزؒ کی تواضع مع الخلق تھی اور خدا کے سامنے عاجزی کا اظہار تھا، اس لئے یہ واقعہ اس بات کی دلیل نہیں ہے کہ عمر عبدالعزیزؒ کو خلیفۃ اللہ کہنا درست نہیں ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم

قوله: ثم يقول سفينه امسك ....:

أمسك: (یہ از باب افعال صیغہ امر ہے) ای عدّ مدة الخلافة۔ امام طیبیؒ فرماتے ہیں ممکن ہے کہ ''امسك'' کا مطلب یہ ہو: ای اضبط الحساب عاقدا أصابعك، تاکہ ''امسك'' کو اس کے اصل معنی پر محمول کیا جا سکے۔ اھ۔ حاصل معنی یہ ہے کہ حساب کرو اور یاد رکھو۔

عشرة: (اس کی تمیز محذوف ہے۔) ای "اعوام"

وعثمان: (یہاں مضاف محذوف ہے۔) ای خلافة عثمان

اثنتی عشرة سنة: اور ایک نسخہ میں "اثنی عشر ہے۔ (اس صورت میں تمیز محذوف ہوگئی۔) ای "عامًا"

"ستة": (اس کی تمیز محذوف ہے۔) ای اعوام۔ چنانچہ حضرت علی "خاتم الخلفاء" ہیں، جیسا کہ حضور اکرم ﷺ "خاتم الانبیاء" ہیں اور امام مہدیؒ "خاتم الاولیاء" ہیں۔

تخریج: اس طرح اس حدیث کو امام نسائی نے بھی روایت کیا ہے۔ (ذکرہ السید جمال الدینؒ۔)

جامع صغیر میں ہے:

الخلافة بعدی فی امتی ثلاثون سنة ثم ملك بعد ذالك۔

اس حدیث کو امام احمد، امام ترمذی، ابویعلی اور ابن حبان رحمہم اللہ نے حضرت سفینہ سے نقل کیا ہے۔

امام بخاریؒ نے اپنی تاریخ میں، اور حاکم نے حضرت ابوہریرہؓ سے نقل کیا ہے:

"الخلافة بالمدينة و الملك بالشام"۔

اس حدیث میں اشارہ ہے: کہ حقیقی خلافت وہ ہے جو حضور علیہ السلام کے مبارک شہر مدینہ منورہ میں اہل حل وعقد جمہور صحابہ کے اتفاق سے قائم ہوئی ہو۔ اور اس خلافت کا حقیقی خلافت سے کوئی تعلق نہیں جو مدینہ منورہ کے علاوہ کسی اور جگہ کے اہل حل وعقد کے اتفاق سے قائم ہو، اور اُس زمانہ کے خلفاء جیسے اشخاص کے علاوہ کسی اور طرح کے شخص کے سپرد کی گئی ہو تو اس صورت کی خلافت بطور تسلط منعقد ہوگی جس کو "حکمرانی" کہا جائے گا (اور اس حکمرانی کا انعقاد صحیح ہے) اس لئے کہ عوام کے نظم وضبط کیلئے ضرورت تو بہرحال دائمی ہے۔ اور اس لئے بھی تا کہ یہ (حکمرانی) کھلم کھلا فتنوں کا ذریعہ نہ بنے۔ واللہ تعالیٰ اعلم

۵۳۹۶ : وَعَنْ حُذَيْفَةَ قَالَ قُلْتُ يَارَسُوْلَ اللّٰهِ اَيَكُوْنُ بَعْدَ هٰذَا الْخَيْرِ شَرٌّ كَمَا كَانَ قَبْلَهٗ شَرٌّ قَالَ نَعَمْ قُلْتُ فَمَا الْعِصْمَةُ قَالَ السَّيْفُ قُلْتُ وَهَلْ بَعْدَ السَّيْفِ بَقِيَّةٌ قَالَ نَعَمْ تَكُوْنُ اَمَارَةٌ عَلٰى اَقْذَاءٍ وَهُدْنَةٌ عَلٰى دَخَنٍ قُلْتُ ثُمَّ مَاذَا قَالَ ثُمَّ يَنْشَاءُ دُعَاةُ الضَّلَالِ فَاِنْ كَانَ لِلّٰهِ فِي الْاَرْضِ خَلِيْفَةٌ جَلَدَ ظَهْرَكَ وَاَخَذَ مَالَكَ فَاَطِعْهُ وَاِلاَّ فَمُتْ وَاَنْتَ عَاضٌّ عَلٰى جِذْلِ شَجَرَةٍ قُلْتُ ثُمَّ مَاذَا قَالَ ثُمَّ يَخْرُجُ الدَّجَّالُ بَعْدَ ذٰلِكَ مَعَهٗ نَهْرٌ وَنَارٌ فَمَنْ وَقَعَ فِيْ نَارِهٖ وَجَبَ اَجْرُهٗ وَحُطَّ وِزْرُهٗ وَمَنْ وَقَعَ فِيْ نَهْرِهٖ وَجَبَ وِزْرُهٗ وَحُطَّ اَجْرُهٗ قَالَ قُلْتُ ثُمَّ مَاذَا قَالَ ثُمَّ يُنْتَجُ الْمُهْرُ فَلَا يُرْكَبُ حَتّٰى تَقُوْمَ السَّاعَةُ وَفِيْ رِوَايَةٍ قَالَ هُدْنَةٌ عَلٰى دَخَنٍ وَجَمَاعَةٌ عَلٰى اَقْذَاءٍ قُلْتُ يَارَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَلْهُدْنَةُ عَلَى الدَّخَنِ مَا هِيَ قَالَ لَا تَرْجِعُ قُلُوْبُ اَقْوَامٍ عَلَى الَّذِيْ كَانَتْ عَلَيْهِ قُلْتُ هَلْ بَعْدَ هٰذَا الْخَيْرِ شَرٌّ قَالَ فِتْنَةٌ عَمْيَاءُ صَمَّاءُ عَلَيْهَا دُعَاةٌ عَلٰى اَبْوَابِ النَّارِ فَاِنْ مُتَّ يَا حُذَيْفَةُ وَاَنْتَ عَاضٌّ عَلٰى

جِذْلِ خَیْرٌ لَّکَ مِنْ اَنْ تَتَّبِعَ اَحَدًا مِنْهُمْ۔

اخرجه ابو داوٗد فی السنن ٤٤٤/٤ حدیث رقم ٤٢٤٤ واخرجه ابن ماجه ١٣١٧/٢ حدیث رقم ٣٩٨١ واحمد فی المسند ٤٠٣/٥

ترجمہ: ''حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا کہ (ایک روز) میں نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ ﷺ کیا اس خیر کے بعد شر پیدا ہوگا جیسا کہ اس خیر (اسلام) سے پہلے شر کا دور دورہ تھا۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ''ہاں! (اس کے بعد پھر بدی و برائی کا دور دورہ ہو جائے گا)'' میں نے عرض کیا کہ پھر اس وقت بچاؤ کی کیا سبیل ہوگی؟ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''تلوار!۔ میں نے عرض کیا کہ پھر اس تلوار کے بعد اہل اسلام کی بقاء ہوگی (یعنی جب مسلمان باطل طاقتوں کو مٹانے کی خاطر تلوار اٹھائیں گے اور قتل و قتال کریں گے تو کیا پھر بھی مسلمان اس دور میں اتنے طاقتور اور متحد و مجتمع ہوں گے کہ وہ امانت و دیانت کے ساتھ اپنی سرداری و حاکمیت کو قائم کر لیں اور لوگ متفقہ طور پر ان کی قیادت و امارت کو تسلیم کر لیں؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ''ہاں! امارت یعنی حکومت و سلطنت تو قائم ہو جائے گی لیکن اس کے نتیجہ میں فساد ہوگا اور صلح و اتحاد کی بنیاد نفاق اور مفاد پرستی پر ہوگی'' میں نے عرض کیا کہ پھر اس کے بعد کیا ہوگا؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ''اس کے بعد گمراہی کی طرف بلانے والے لوگ جنم لیں گے۔ اگر اس وقت زمین پر اللہ کا کوئی خلیفہ ہو تو اگرچہ وہ تمہاری پیٹھ پر کوڑے لگائے اور تیرا مال غصب کیوں نہ کر لے (یعنی وہ امیر بادشاہ اگرچہ تمہیں ناحق ستائے تم پر ظلم و ستم ڈھائے اور تمہارا مال و اسباب چھین لے) لیکن تم اس کی اطاعت سے منہ نہ پھیرنا (تاوقتیکہ وہ تمہیں خدا اور اس کے رسول ﷺ کے احکام کی خلاف ورزی کے لئے نہ کہے اور یہ حکم اس لئے دیا گیا ہے تاکہ مذہبی اور دینی فرقہ واریت اور عدم اتحاد و اتفاق اور مملکت میں بدامنی و فساد کا سدباب ہو سکے) اور اگر کوئی خلیفہ یعنی امیر و بادشاہ نہ ہو تو تمہاری وفات اس حالت میں ہونی چاہیئے کہ تم کسی درخت کی جڑ میں پناہ گزین ہو۔ میں نے عرض کیا کہ پھر اس کے بعد کیا ہوگا؟ آپ ﷺ نے فرمایا اس کے بعد دنیا اور زیادہ فتنہ و انتشار اور برائیوں کا شکار ہوگی اور مسلمان دھیرے دھیرے دینی اور دنیوی لحاظ سے تنزل کا شکار ہوں گے یہاں تک کہ حضرت مہدیؓ کے عہد میں) دجال کا ظہور ہوگا جس کے ساتھ پانی کی نہر ہوگی اور آگ (کی خندق) پس جو شخص اس کی آگ میں داخل ہو جائے گا اس کا اجر ثابت لازم ہو جائے گا اور اس کے گناہ (جو اس نے پہلے کئے ہوں گے) مٹا دیئے جائیں اور جو شخص اس کی نہر میں پڑے گا اس کا گناہ اس کے لئے ثابت و قائم ہو جائے گا اور اس کا اجر (جو اس نے اچھے عمل کر کے حاصل کیئے ہوں گے) ختم کر دیا جائے گا۔ حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا کہ میں نے عرض کیا کہ پھر اس کے بعد کیا ہوگا؟ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''گھوڑے کے بچہ کو جنم دلوایا جائے گا اور وہ سواری کے لائق نہیں بنے گا کہ قیامت کا وقوع ہو جائے گا''۔ ''اور ایک روایت میں یوں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: نفاق کی بنیاد پر صلح ہوگی اور وہ (کسی معاہدہ و فیصلہ پر) دلوں کی ناخوشی اور رنجش کے ساتھ متفق و مجتمع ہوں گے''۔ میں نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! ''نفاق کی بنیاد پر صلح کا کیا معنی ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ''اس کا مطلب یہ ہے کہ لوگوں کے دل اس حالت پر نہیں ہوں گے جس پر پہلے تھے کوئی اور برائی ہوگی؟ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا ''ہاں'' اس کے بعد پھر برائی رونما ہوگی اور

وہ ایسے خطرناک فتنہ کی شکل میں ہوگی جو اندھا اور بہرا ہوگا اس فتنہ کی طرف بلانے والے لوگ پیدا ہو جائیں گے اور اس جماعت کے لوگوں کا یہ عمل بظاہر یوں محسوس ہوگا جیسے کہ وہ دوزخ کے دروازے پر کھڑے ہو کر مخلوق کو اس (دوزخ) کی طرف بلا رہے ہیں (چنانچہ داعیان اور مدعون سب اہل نار میں ہوں گے) پس اے حذیفہ! اس وقت تمہاری موت اگر اس حالت میں آئے کہ تم کسی درخت کی جڑ میں پناہ گزین ہو تو یہ اس سے بہتر ہوگا کہ تم اہل فتنہ میں سے کسی کی اتباع و پیروی کرو''۔ (ابوداؤد)

تشریح: قوله: أيكون بعد هذا الخير...... قال: نعم:

(یہاں) ''خیر'' سے مراد اسلام اور وہ کامل نظام مراد ہے جس کی طرف اس ارشاد باری تعالیٰ میں اشارہ ہے:

﴿اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ﴾ [المائدة۔۳] ''آج کے دن تمہارے لئے تمہارے دین کو میں نے کامل کر دیا ہے۔

اور ''يكون'' تامہ ہے ''يوجد'' کے معنی میں ہے۔

قبله: میں موجود ضمیر کا مرجع ''الخیر'' ہے اور ''قبل از خیر'' زمانہ سے مراد زمانہ جاہلیت ہے۔

اس لئے کہ سوائے اللہ تعالیٰ کے کمال کے ہر کمال کے بعد زوال آتا ہے۔

قوله: قلت فما العصمة؟ قال: السيف:

یعنی اسلام پر برقرار رہنے کیلئے اور فتنوں میں مبتلا ہونے سے بچنے کیلئے نجات کا راستہ کیا ہوگا؟

یا معنی یہ ہے کہ نجات کا راستہ یہ ہے کہ فتنہ پیدا کرنے والوں کا سر تلوار سے اڑا دو۔

حضرت قتادہؒ فرماتے ہیں کہ جس جماعت کے فتنے سے بچاؤ کا ذریعہ تلوار ہے اس جماعت سے مراد وہ لوگ ہیں جو حضور اکرم ﷺ کی وفات کے بعد حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے زمانہ خلافت میں مرتد ہو گئے تھے۔ شراح نے اسی طرح ذکر کیا ہے۔

یہ بھی ممکن ہے کہ یہ اس واقعہ کو شامل ہو جو حضرت حضرت علیؓ اور حضرت معاویہؓ کے درمیان ہوا تھا، کیونکہ حق حضرت علیؓ کے ساتھ تھا اور اپنی حفاظت کا راستہ یہ تھا کہ معاویہؓ کے ساتھ قتال کیا جائے، جیسا کہ حضرت عمارؓ کی حدیث اس پر دلالت کرتی ہے: ''تقتلك الفئة الباغية'' (ایک باغی گروہ تجھے قتل کرے گا)

اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿فَقَاتِلُوا الَّتِيْ تَبْغِيْ حَتّٰى تَفِيْٓءَ اِلٰٓى اَمْرِ اللّٰهِ﴾ [الحجرات۔۹]

''تو اُس گروہ سے لڑو جو زیادتی کرتا ہے یہاں تک کہ وہ خدا کے حکم کی طرف رجوع ہو جاوے۔''

قوله: قلت: وهل بعد السيف بقية هذنة؟...... على دخن:

یعنی کہا، اس تلوار کے بعد برائی رہے گی یا مطلب یہ ہے کہ کیا اس تلوار کے بعد کوئی خیر باقی رہے گا۔

شارحؒ فرماتے ہیں: کہ اس کلام کا معنی ہے کیا جب ہم اُن سے قتال کر لیں گے تو اُس کے بعد اسلام باقی رہے گا؟

امارة: ہمزہ کے کسرہ کے ساتھ۔ امارۃ کا معنی ہے ولایت اور سلطنت۔

اقذاء: نہایہ میں لکھا ہے کہ أقذاء، قذی کی جمع ہے اور قذی، قذاۃ کی جمع ہے اور ''قذاۃ'' کے معنی اس کیچڑ، کوڑے اور تنکے کے ہیں جو آنکھ میں یا پانی اور شرب وغیرہ میں پڑ جائے۔

اس جملہ سے مراد یہ ہے کہ مسلمانوں کی حکومت و امارت پر اتفاق اور اجتماعیت تو ہوگی مگر اس کی بنیاد تمہارے دلوں کے فساد پر ہوگی چنانچہ حکومت پر اتفاق اور اجتماعیت کو آنکھ کے کیچڑ وغیرہ سے تشبیہ دی ہے۔ قاضیؒ نے یہ معنی بیان کیا ہے کہ ایسی امارت جس میں بدعات کی آمیزش ہوگی اور نافرمانی کا ارتکاب ہوگا۔

هدنة: ھاء کے ضمہ کے ساتھ، اس کا معنی ہے صلح۔

دخن: دال اور خاء کے فتحہ کے ساتھ اس کا معنی ہے دھوکہ، نفاق اور خیانت کے ساتھ صلح ہوگی۔

فائق میں لکھا ہے کہ هدن کا معنی ہے سکون۔

اس کا معنی یہ بھی ممکن ہے کہ لوگ بغیر دلی رضامندی کے نفس کی ناگواری کے ساتھ کسی کی امارت پر اتفاق کریں گے، جب کوئی کام طبیعت کی ناگواری کے ساتھ آنکھوں کو بند کر کے کیا جائے، اُس وقت عربی کلام میں یوں کہا جاتا ہے: ''فعلته کذا وفي العين قذى'' یعنی جیسا کہ وہ آنکھ جس میں کوئی تنکا وغیرہ پڑ جائے، بظاہر صحیح معلوم ہوتی ہے مگر اس کے اندر سخت سوزش ہوتی ہے اسی طرح حکومت قائم تو ہوگی مگر عوام اس پر دل سے متفق نہیں ہونگے اور وفاداری نہیں کریں گے۔

''دخن'': اصل میں کدورت اور سیاہ مائل رنگ کو کہا جاتا ہے، چنانچہ اس میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ صلح تو ہوگی مگر اس میں فساد کی آمیزش ہوگی، اور اس میں اس مصالحت کی طرف اشارہ ہے جو حضرت حسنؓ اور حضرت امیر معاویہؓ کے درمیان ہوئی تھی جس کے تحت حضرت حسنؓ نے خلافت سے دستبردار ہو کر ملک کا نظام حضرت امیر معاویہؓ کے سپرد کر دیا تھا، اور حضرت امیر معاویہؓ نے امارت کو مستحکم کر لیا تھا۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت حسنؓ کے مصالحت کی وجہ سے حضرت امیر معاویہؓ اس وقت کے مستحق خلیفہ نہیں بنے، جیسا کہ بعض حضرات کو اس کا وہم ہوا ہے۔ واللہ اعلم

قوله: قلت ثم ما ذا؟ قال: ثم ينشا...... فاطعه:

''ما ذا'' کی خبر ''يكون'' محذوف ہے۔

مالك: مرکب اضافی ہے اور بالغصب متعلق مقدر ہے اس وقت معنی یہ ہوگا کہ تیرا مال غصب کر کے لے لے۔ یا مَا موصولہ ہے اور لك صلہ کے موضع میں ہے اس وقت معنی یہ ہوگا کہ تجھے جو منصب دیا گیا تھا وہ منصب تم سے ظلماً لے لے۔

وقوله: الا فمت وانت عاض على جذل شجرة:

اس کی تقدِ عبارت یوں ہے: ''وان لم يكن لله في الارض خليفة'' (یعنی اگر زمین میں خدا کا کوئی خلیفہ نہ ہوتو)

فمت: مات يموت سے امر کا صیغہ ہے اس میں اشارہ ہے اس حدیث کی طرف کہ ''موتوا قبل ان تموتوا'' (مرنے سے پہلے مُردوں کی طرح ہو جاؤ) اس عبارت میں گویا کہ لوگوں سے الگ تھلگ رہنے اور اختلاط چھوڑنے کو موت سے تعبیر کیا گیا۔ کیونکہ عموماً زندگی کی لذت، شہرت، اختلاط اور مجالس میں شرکت سے حاصل ہوتی ہے۔

وأنت عاض:"عاض" ضاد کی تشدید کے ساتھ، یہ جملہ حالیہ ہے اور کلام کا معنی یہ ہے کہ "اس حال میں کہ تم قوت وشدت کے ساتھ پکڑلو"۔

جذل:جیم کے کسرہ کے ساتھ ہے اور جیم پر فتحہ بھی پڑھا جاتا ہے اس کا معنی ہے درخت کی جڑ۔

قاضیؒ فرماتے ہیں کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ لوگوں سے تنہائی اختیار کرو، اور زمانے کی پریشانیوں پر صبر کرو، اور زمانے کی تکالیف اور مشقتوں پر تحمل کرو۔ اور **عض جذل الشجرة** کنایہ ہے مشقتوں کو برداشت کرنے سے، یہ عربی محاورہ: "**فلان یعض بالحجارة لشدة الألم**" سے مأخوذ ہے

اور اس معنی کا بھی احتمال ہے کہ لوگوں سے یکسو ہو جائے اور ایک گنجان درخت کو اپنا ٹھکانہ بنالے، یہاں تک کہ موت آئے، یا حالات سنور جائیں جیسا کہ "**عض الرجل بصاحبه**" کا معنی ہے "اپنے دوست کے ساتھ چمٹ گیا اور اُس کے ساتھ ہی رہا"۔ اور "**عضوا علیها بالنواجذ**" اسی معنی میں ہے۔

بعض حضرات فرماتے ہیں کہ یہ جملہ ارشاد نبوی **فاطعه** کا تتمہ ہے اور معنی یہ ہے کہ اگر تم اُس خلیفہ کی اطاعت نہیں کرو گے تو اس کی وجہ سے ایسے حالات کا سامنا کرنا پڑے گا جن پر تم صبر نہیں کرسکو گے۔

پہلے معنی پر آئندہ دوسری روایت کا دوسرا حصہ: "**فتنة عمیاء صماء علیها دعاة علی ابواب النار فان مت یا حذیفة وأنت عاض علی جذل خیر لك من ان تتبع أحدا منهم**" دلالت کرتا ہے۔

علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں کہ پہلی صورت میں لفظ کے اعتبار سے کلام خبریہ ہے، اور معنی کے اعتبار سے امر ہے اور "**فان کان لله فی الأرض خلیفة**" کی تتمیم ہے، اور دوسری صورت میں ارشاد نبوی **فأطعه** کا مسبب ہے۔

ایک اور نسخہ میں "**فمت**" کی بجائے "**قمت**" ہے، جو کہ "**قیام**" سے حاضر کا صیغہ ہے۔ سید جمال الدینؒ فرماتے ہیں کہ **قم** خبر ہے جو کہ امر کے معنی میں ہے۔

قوله :قلت ثم ما ذا؟ قال:ثم یخرج الدجال بعد ذلك معه نهر ونار :

من الفتن اس کی خبر ہے۔

نهر: ھاء کے سکون اور فتحہ کے ساتھ۔

بعض حضرات فرماتے ہیں کہ یہ دونوں چیزیں حقیقی نہیں ہوگی، بلکہ محض خیالی ہوں گی جن کا تعلق سحر اور طلسم سے ہوگا۔

بعض حضرات فرماتے ہیں کہ پانی درحقیقت آگ ہوگی اور آگ درحقیقت پانی ہوگا۔

قوله:فمن وقع فی ناره وجب اجره و حط وزره:

یعنی جس شخص نے دجال کی مخالفت کی، یہاں تک کہ وہ اس کو اپنی آگ میں گرادے۔ حدیث کی عبارت "**فی ناره**" میں نار کی اضافت دجال کی ضمیر کی طرف کرنے میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ وہ حقیقی آگ نہیں ہوگی بلکہ جادو کا اثر ہوگا۔

قولہ:ومن وقع فی نهره وجب وزره وحط اجره:
یعنی اس کے حکم کی موافقت کرکے۔آئندہ کیلئے گناہ اس کے لئے لازم ہو گئے۔

وزره: اسکی صفت ''اللاحق''محذوف) ہے،

ینتج :فعل مجہول ہے، ''یولد'' کے معنی میں ہے۔

المهر :میم کے ضمہ اور ھاء کے سکون کے ساتھ،گھوڑے کا بچہ۔

علامہ تورپشتی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ''ینتج'' کا مصدر'' نتج'' ہے نہ کہ یہ'' نتاج'' مصدر سے ماخوذ ہے جس کا معنی ہے جننا،اور نہ'' انتاج'' مصدر سے ماخوذ ہے۔ نتجت الفرس یا نتجت الناقة (مجہول کے صیغہ کے ساتھ) کا مصدر'' نتاج'' ہے،اور'' نتجها اهلها'' کا مصدر'' نتج'' ہے اور'' انتاج '' کا معنی ہے،''بچہ جننے کا وقت قریب ہونا''۔بعض حضرات نے اس کا معنی''حمل کا ظاہر ہونے'''' سے کیا ہے۔

فلا یرکب: کاف کے کسرہ کے ساتھ ہے یہ'' ارکب المهر'' سے ماخوذ ہے۔ ''أرکب المهر'' کا معنی ہے گھوڑے کا بچہ سواری دینے کی عمر کو پہنچ گیا۔ایک نسخہ(فلا یرکب) میں کاف کے فتحہ کے ساتھ معنی یہ ہے کہ فتن اور قیامت کے قریب آنے کی وجہ سے گھوڑے پر سوار نہ ہو جائے۔

بعض حضرات فرماتے ہیں کہ اس سے مراد عیسیٰ علیہ السلام کا زمانہ ہے کیونکہ اُس زمانہ میں کفار کے نہ ہونے کی وجہ سے اُن کے خلاف لڑنے کی نوبت نہیں آئیگی اور گھوڑے کی سواری کی ضرورت پیش نہیں آئے گی۔

یا اس سے مراد دجال کے نکلنے کے بعد کا زمانہ ہے کیونکہ دجال کے نکلنے کے بعد قیامت تک زمانہ بہت قلیل ہوگا اور مطلب یہ ہے کہ اس وقت قیامت آنے میں اتنا عرصہ رہ جائے گا جتنا عرصہ ایک بچھڑے کے پیدا ہونے کے وقت سے لے کر اس کے سواری کے قابل ہونے تک کے درمیان لگتا ہے، یہ وضاحت زیادہ ظاہر ہے واللہ اعلم بالسرائر۔

قولہ:وفی روایة قال وجماعة علی اقذاء.....الذی کانت علیه؟:
یعنی مختلف قسم کے نفسانی خواہشات اور عیوب پر اجتماع واتفاق ہوگا۔

قلوب : مرفوع بھی پڑھا گیا ہے اور منصوب بھی۔مرفوع پڑھنا اس پر مبنی ہے کہ'' رجع'' لازم ہو اور یہی زیادہ صحیح ہے، اور منصوب پڑھنے کی بناء'' رجع'' کے متعدی ہونے پر ہے۔'' قلوب'' کے رفع کی صورت میں عبارت کی تقدیر ''لا تصیر قلوب اقوام'' ہوگی۔''قلوب '' کے نصب کی صورت میں'' لا ترجع'' لا ترد کے معنی میں ہے اس کے فاعل کی ضمیر کا مرجع ''هدنة'' ہوگا اور'' قلوب اقوام'' مفعول سے ہوگا۔

الذی:یہ اسم موصول'' حالت عبارت'' ہے تقدیری عبارت یہ ہے'' علی الوجه الذی'' یا مراد صفائی قلوب ہے، تقدیری عبارت یہ ہے علی الصفاء الذی.

یعنی اُن کے دل کینہ اور بغض سے اس طرح صاف نہیں ہونگے جس طرح اس سے پہلے تھے۔

قوله:قلت :بعد هذا...... على ابواب النار:

"يقع": فعل محذوف ہے،اور تقدیر یہ ہے "أيقع بعد هذا".

قال: فتنة: یعنی ہاں شر واقع ہوگا جو کہ بہت بڑا فتنہ بڑی مصیبت ہوگی۔

عمياء: یعنی اس فتنہ میں انسان حق دیکھنے سے اندھا ہوگا۔

صماء: یعنی اُس زمانے والے اُس فتنہ میں حق کی بات یا نصیحت سننے سے بہرے ہونگے۔

قاضیؒ فرماتے ہیں کہ فتنہ کے عمیاء صماء ہونے سے مراد یہ ہے کہ فتنے کی کیفیت یہ ہوگی کہ لوگوں کو اُس سے نکلنے کا راستہ نہیں ملے گا اور نہ اس فتنے سے بچنے کیلئے کوئی جائے پناہ اور مددگار ملے گا۔ یا اس سے مراد یہ ہے کہ لوگ اس فتنہ میں بغیر بصیرت کے دھوکہ میں پڑ جائیں گے، چنانچہ وہ اس فتنہ میں اندھے ہو جائیں گے، اور حق کو سُن کر حق میں غور تاَمل کرنے سے بہرے ہو جائیں گے۔

میں (ملا علی قاریؒ) کہتا ہوں کہ ممکن ہے کہ فتنہ کی دو صفتیں ذکر کرنا کنایہ اس بات سے ہو کہ اُس فتنہ کی وجہ سے اُس زمانہ میں ظلمت ہوگی اور حق ظاہر نہیں ہوگا۔ اور اُس فتنہ میں بڑی آزمائش ہوگی اور اُس وقت کے لوگ اتنے پریشان ہونگے کہ ایک دوسرے کی طرف التفات ہی نہیں کریں گے۔

یعنی ایسی جماعت ہوگی جو فتنے کے انتظام کرے گی اور لوگوں کو اُس فتنے کے قبول کرنے کی طرف دعوت دیں گے۔

على أبواب النار: یہ حال ہے یعنی گویا کہ وہ فتنہ پرداز جہنم کے کنارے پر کھڑے ہونگے جو لوگوں کو اس جہنم کی طرف بلائیں گے تا کہ تمام اکٹھے ہو کر اس جہنم کی آگ میں داخل ہو جائیں۔

قوله:فان مت يا جذيفة ......ان تتبع احدمنهم:

مت: میم کے ضمہ اور کسرہ دونوں کے ساتھ درست ہے۔

"انت عاض على جذل": جملہ حالیہ ہے۔ معنی یہ ہے کہ اگر تم اس حال میں مرجاؤ کہ لوگوں سے یکسوئی اور تنہائی ہو اور درختوں کے پتے کھا کر اور پتھروں کے اوپر لیٹنے پر گزارہ کر کے وقت گزار رہے ہو......

تتبع بروسری تاء کی تشدید اور باء کے کسرہ کے ساتھ اور دوسری تاء کی تخفیف اور باء کا فتحہ بھی جائز ہے۔

تخريج: امام میرکؒ نے لکھا ہے کہ امام نسائی نے بھی اس حدیث کو نقل کیا ہے۔

۵۳۹۷ : وَعَنْ اَبِیْ ذَرٍّ قَالَ كُنْتُ رَدِيْفًا خَلْفَ رَسُوْلِ اللهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَوْمًا عَلٰى حِمَارٍ فَلَمَّا جَاوَزْنَا بُيُوْتَ الْمَدِيْنَةِ قَالَ كَيْفَ بِكَ يَا اَبَاذَرٍّ اِذَا كَانَ بِالْمَدِيْنَةِ جُوْعٌ تَقُوْمُ عَنْ فِرَاشِكَ وَلَا تَبْلُغُ مَسْجِدًا حَتّٰى يُجْهِدَكَ الْجُوْعُ قَالَ قُلْتُ اَللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ اَعْلَمُ قَالَ تَعَفَّفْ يَا اَبَاذَرٍّ قَالَ كَيْفَ بِكَ يَا اَبَاذَرٍّ اِذَا كَانَ بِالْمَدِيْنَةِ مَوْتٌ يَبْلُغُ الْبَيْتُ الْعَبْدَ حَتّٰى اِنَّهٗ يُبَاعُ الْقَبْرُ بِالْعَبْدِ قَالَ قُلْتُ اَللّٰهُ

وَرَسُوْلُهٗ اَعْلَمُ قَالَ تَصْبِرُ يَا اَبَاذَرٍّ قَالَ كَيْفَ بِكَ يَا اَبَاذَرٍّ اِذَا كَانَ بِالْمَدِيْنَةِ قَتْلٌ تَغْمُرُ الدِّمَاءُ اَحْجَارَ الزَّيْتِ قَالَ قُلْتُ اَللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ اَعْلَمُ قَالَ تَاْتِيْ مَنْ اَنْتَ مِنْهُ قَالَ قُلْتُ وَاَلْبَسُ السِّلَاحَ قَالَ شَارَكْتَ الْقَوْمَ اِذًا قُلْتُ فَكَيْفَ اَصْنَعُ يَارَسُوْلَ اللّٰهِ قَالَ اِنْ خَشِيْتَ اَنْ يَّبْهَرَكَ شُعَاعُ السَّيْفِ فَاَلْقِ نَاحِيَةَ ثَوْبِكَ عَلٰى وَجْهِكَ لِيَبُوْءَ بِاِثْمِكَ وَاِثْمِهٖ. (رواہ ابوداود)

اخرجه ابو داؤد فی السنن ٤٥٨/٤حدیث رقم ٤٢٦١ وابن ماجه ١٣٠٨/٢حدیث رقم ٣٩٥٨ واحمد فی المسند ١٤٩/٥

ترجمہ: ''حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ایک روز میں گدھے پر رسول اللہ ﷺ کے پیچھے سوار تھا۔ بہرحال حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ جب ہم مدینہ کے گھروں سے (یعنی آبادی سے) باہر نکل آئے تو آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ابوذر رضی اللہ عنہ اس وقت تمہاری کیا حالت ہوگی جب مدینہ میں بھوک کا دور دورہ ہوگا' تمہیں اپنے بستر سے اٹھ کر اپنی مسجد تک جانے میں بھی مشقت محسوس ہوگی اور بھوک کی شدت تمہیں سخت پریشانی اور اذیت میں گرفتار کر دے گی۔ حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ میں نے عرض کیا کہ اللہ تعالیٰ اور اس کا پیغمبر بخوبی واقف ہے (یعنی میں نہیں بتا سکتا کہ اس وقت کیا کروں گا' ہاں آپ ﷺ ہی) آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''ابوذر' پارسائی اختیار کرنا'' (یعنی ایسے حالات میں بھی اولاً غیر اللہ کے سامنے دست سوال دراز کرنے اور مخلوق کے سامنے ذلت و رسوائی کو گوارا نہ کرنا اور ثانیاً حرام و ناجائز اور مشتبہ رزق سے اپنے آپ کو بچانا اور ثالثاً صبر واستقامت کے ساتھ بھوک کو برداشت کر کے اس سنگین حالت کا مقابلہ کرنا پھر آپ ﷺ نے فرمایا: ''ابوذر رضی اللہ عنہ! اس وقت تمہارا کیا حال ہوگا جب قحط یا کسی وبا کے پھیل جانے کے باعث مدینہ میں موت کی گرم بازاری ہوگی اور مکان (یعنی قبر کی) قیمت غلام تک پہنچ جائے گی یہاں تک کہ قبر کی جگہ غلام کی قیمت کے برابر فروخت ہوگی۔ حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ میں نے عرض کیا کہ اللہ اور اس کا رسول ﷺ بخوبی واقف ہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ''ابوذر رضی اللہ عنہ! صبر کا دامن تھامے رکھنا'' اور پھر فرمایا ابوذر رضی اللہ عنہ اس وقت تمہاری کیا کیفیت ہوگی؟ جب مدینہ میں قتل وقتال کی گرم بازاری ہوگی اور اس کا خون احجار الزیت (مدینہ کا محلہ ہے) کو ڈھانک لے گا؟ حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ میں نے عرض کیا کہ اللہ اور اس کا رسول بخوبی واقف ہیں (آپ ﷺ ہی راہنمائی فرما دیجئے کہ اس وقت میرا کردار کیا ہونا چاہیئے؟) آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''تم ان کے پاس چلے جانا' جن سے تمہارا تعلق ہو (دینی یا خونی) ہو'' میں نے عرض کیا کہ تو کیا میں اس وقت مسلح ہو جاؤں اور فتنہ پھیلانے والی جماعت کے خلاف برسرپیکار ہو جاؤں؟ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''تب تو تم بھی اس جماعت کے شریک کار ہو جاؤ گے'' میں نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ ﷺ پھر مجھے اس وقت کیا کرنا چاہیے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ''اگر تمہیں اس وقت کا خطرہ ہو کہ تلوار کی چمک تم پر غالب آ جائے گی (یعنی تم یہ دیکھو کہ کوئی شخص اپنی تلوار کا وار کر کے تمہیں مار ڈالنا چاہتا ہے) تو اس وقت تم اپنے کپڑے کا کنارہ اپنے منہ پر ڈال لینا تا کہ وہ تمہارا گناہ (یعنی قتل کا

گناہ) اور اپنا گناہ لے کر واپس ہو"۔ (ابوداؤد)

تشریح: قوله: كنت رديفا خلف ...... قلت الله ورسول اعلم:

خلف رسول الله: علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں "خلف رسول الله" ظرف ہے رديفاً کے لئے صفت مؤکدہ واقع ہے۔

على حمار: اس سے معلوم ہو رہا ہے کہ حضور علیہ السلام اپنے صحابہؓ کے ساتھ بہت زیادہ تواضع اور حسن سلوک کا رویہ اختیار فرماتے تھے اور یہ بھی معلوم ہو رہا ہے کہ حضرت ابوذرؓ کو حضور علیہ السلام سے قریب کا مقام حاصل تھا، اسی لئے اس حدیث کے مکمل طور پر یاد رہنے اور مکمل استحضار کی طرف اشارہ کرنے کیلئے حضرت ابوذرؓ نے اس وقت حالت کو بھی ذکر کیا۔

كيف بك: علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں کہ "كيف بك" مبتدا خبر ہیں اور بك میں باء زائدہ ہے، اور" كف أنت" کے معنی میں ہے جس کا معنی ہے كيف حالك!

يا أبا ذر! اذا كان بالمدينة جوع: "كان" وقع کے معنی میں ہے۔

صرف حضرت ابوذرؓ پر بھوک کی حالت کا آنا مراد ہے یا عام قحط کا پھیل جانا مراد ہے۔

حتى يجهدك الجوع: یاء کے ضمہ اور ھاء کے کسرہ کے ساتھ ہے اور ایک نسخہ میں یاء اور ھاء دونوں کے فتحہ کے ساتھ پڑھا گیا ہے۔

الله رسول "اعلم": اس کا معمول محذوف ہے۔ تقدیری عبارت یہ ہے: "الله ورسوله اعلم بحالي وحال غيرى في تلك الحالة وسائر الأحوال" (اللہ اور اللہ کا رسول ہی اُس حالت اور اس کے علاوہ دوسرے احوال میں میری اور دوسری کی حالت کو بہتر جانتے ہیں)۔

تعفف: امر کا صیغہ ہے۔ **العفة** کا معنی ہے "عمل کی درستگی، تقویٰ، بھوک کی اذیت پر صبر کرنا، حرام اور مشتبہ مال سے اور مخلوق کے سامنے ذلیل ہو کر مخلوق سے سوال یا طمع کرنے سے پرہیز کرنا۔

قوله: كيف بك يا ابا ذر...... تصبر يا اباذر:

أبا ذر: حضور علیہ السلام نے نداء میں تکرار فرمایا تاکہ اس حدیث کو تاکید کے ساتھ محفوظ کرنے پر تنبیہ ہو جائے۔

اذا كان بالمدينة موت: یعنی قحط کی وجہ سے یا ہوا کے تعفن یا کسی اور چیز کی وجہ سے۔

حتى انه: ہمزہ کسرہ اور فتحہ دونوں کے ساتھ پڑھنا درست ہے اور ضمیر ضمیر شان ہے۔

يباع القبر بالعبد: اس عبارت میں گذشتہ عبارت میں مذکور لفظ" البيت" کے ابہام کی توضیح ہے۔

نہایہ میں لکھا ہے کہ اس مقام پر البيت سے مراد قبر ہے اور مطلب یہ ہے کہ (اموات کی کثرت کی وجہ سے) زمین قبروں کیلئے کم پڑ جائی گی اس لئے لوگ غلام کے بدلے میں ایک قبر کی جگہ خریدیں گے اور فروخت کریں گے۔

علامہ تورپشتی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ بات محل نظر ہے اس لئے کہ موت اگرچہ مسلسل جاری رہے یہ سلسلہ بدراز سے دراز

ہوتا چلا جائے تو بھی زمین کے کم پڑ جانے کی نوبت نہیں آتی کیونکہ اللہ تعالیٰ نے لوگوں کیلئے اس میں بہت وسعت رکھی ہے، انتہیٰ۔

اس اشکال کا جواب بعض حضرات نے اس طرح دیا ہے کہ قبروں کی جگہ سے مراد معروف قبرستان ہیں اور لوگوں کی یہ عادت بھی معروف ہے کہ وہ قبرستان کی جگہ سے آگے تجاوز نہیں کرتے۔

شرح السنہ میں لکھا ہے کہ بعض حضرات نے اس کا یہ معنی بیان کیا ہے کہ لوگ ان حالات میں اتنے زیادہ پریشان ہونگے کہ مردوں کو دفنانے سے بے پرواہ ہونگے اور اس کی طرف دھیان ہی نہیں ہوگا، یہاں تک کہ کوئی ایسا شخص نہیں ملے گا جو قبر کھود دے اور میت کو اس میں دفنا دے سوائے اس کے کہ غلام یا غلام کی قیمت کسی کو دے اور اس کے بڑے قبر کھود کر میت کو اس میں دفنا دے۔

دوسرے بعض حضرات نے یہ معنی بیان کیا ہے، کہ جن گھروں میں بہت سارے افراد رہا کرتے تھے اُن گھروں میں سے کوئی گھر ایسا نہیں ہوگا جس میں کوئی بندہ ہو، سوائے اُس غلام کے جو اُس گھر کے ضعیف لوگوں کی خدمت کرینگے۔

مظہرؒ فرماتے ہیں یعنی مکانات اتنے سستے ہو جائیں گے کہ ایک غلام کے بدلے میں گھر فروخت کیا جائے گا۔

علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں کہ (حدیث کے آخر الذکر جملہ کے بارے میں جو چار اقوال بیان ہو گئے ان میں سے) آخری دو اقوال کے مطابق حدیث میں لفظ "حتی" کا ذکر کرنا اتنا اچھا نہیں ہے جتنا کہ پہلے دو اقوال کے مطابق لفظ "حتی" کا ذکر اچھا ہے۔ میں (ملا علی قاریؒ) کہتا ہوں کہ آخری دو اقوال کے مطابق لفظ "حتی" کا ذکر کرنا درست ہی نہیں اور شاید مصابیح میں یہ لفظ موجود نہ ہو۔

علامہ خطابیؒ فرماتے ہیں کہ جن لوگوں کا مذہب یہ ہے کہ کفن چور کا ہاتھ کاٹا جائے گا، انہوں نے اس حدیث سے استدلال کیا ہے اور استدلال اس طرح کیا ہے کہ حضور علیہ السلام نے قبر کو بیت فرمایا ہے چنانچہ اس میں دلالت ہے اس بات پر کہ قبر بھی گھر کی طرح ایک محفوظ جگہ ہے۔ میں (ملا علی قاریؒ) کہتا ہوں کہ خصوصاً جبکہ حضور علیہ السلام نے کفن چور کو قطع ید کی سزا دی لیکن احناف نے اس روایت کو سیاست پر محمول کیا ہے۔ واللہ سبحانہ اعلم

تصبر: باء مفتوحہ کی تشدید کے ساتھ باب تفعل سے امر ہے۔

ایک اور نسخہ میں "صبر" سے بصیغۂ مضارع ہے۔ یہ خبر ہے جو کہ امر کے معنی میں ہے۔ مطلب یہ ہے کہ آزمائش پر صبر کرو اور تنگ ہو کر جزع فزع نہ کرو اور دوسری نعمتیں اور خوشیاں نہ بھولو اور جو فیصلے خدا کی طرف سے ہوتے ہیں ان پر راضی رہو زمین و آسمان کے خالق کی طرف سے اجر ملے گا۔

قولہ: کیف بک یا اباذر...... نسائی من انت منه:

تغمر: غین معجمہ کے سکون اور میم کے ضمہ کے ساتھ۔ تستر اور تعلو کے معنی میں ہے (یعنی ڈھانپے گا اور چڑھ جائیگا۔)

احجار الزیت: بعض حضرات فرماتے ہیں کہ یہ مدینہ منورہ کے ایک محلے کا نام ہے اور بعض حضرات فرماتے ہیں کہ مدینہ

منورہ میں ایک جگہ ہے۔

علامہ تورپشتی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ احجاز الزیت حرہ کا وہ علاقہ ہے جس میں یزید کے زمانے میں واقعہ حرہ پیش آیا تھا۔ یزید نے مسلم بن عقبہ کو ایک سرکش لشکر کا اسیر بنا کر اہل مدینہ کی طرف روانہ کیا جو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اہل بیت کے خون بہانے کو جائز سمجھ رہا تھا چنانچہ مسلم بن عقبہ نے اپنے لشکر کے ساتھ مدینہ کے مغربی حرہ پر حملہ کیا اور مدینہ کے تقدس اور حرمت کی کوئی پرواہ نہیں کی اور مدینہ میں تین دن رہ کر اور بعض کے نزدیک پانچ دن رہ کر اہل مدینہ کا خون بہایا۔

تاتی انت منه: تأتی خبر ہے امر کے معنی میں ہے، مطلب یہ ہے کہ جو شخص تمہارے ساتھ دین ومسلک اور اخلاق واعمال میں موافق ہو اس کے پاس چلے جانا۔

قاضیؒ فرماتے ہیں کہ اس کا معنی یہ ہے کہ ''تم جن لوگوں کے پاس سے آئے ہو انہی کے پاس واپس چلے جاؤ'' یعنی اپنے اہل واقارب کے پاس واپس چلے جاؤ۔ علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں کہ اس معنی کے مطابق یہ کلام سوال کا جواب نہیں بنے گا۔

قوله:قال :قلت والبس السلاح قال:شاركت القوم اذا:

پچھلے جملے کا یہ مطلب زیادہ ظاہر ہے۔ کہ تم اپنے امام اور جس کے ہاتھوں تم نے بیعت کی ہے ان کی طرف رجوع کرو اس مطلب کے مطابق اس کے جواب میں حضرت ابوذرؓ کا یہ کہنا "والبس السلاح؟" کیا میں ہتھیار باندھ کر امام کے ساتھ ہو کر قتال کرو) زیادہ مناسب ہوگا۔

جب تم نے ہتھیار باندھ لیے، مطلب یہ ہے کہ تم ہتھیار نہ پہنو اور امام اور دوسرے صلح پسند لوگوں کے ساتھ رہو اور جنگ میں شریک نہ ہو یہاں تک تمہیں کوئی کامیابی حاصل ہو۔ یہ علامہ طیبیؒ کے کلام کا حاصل ہے۔

لیکن اس میں یہ اشکال ہے کہ جب امام قتال کرے گا تو ان کیلئے اُس کے ساتھ ہو کر لڑائی میں شریک نہ ہونا کیسے ممکن ہوگا؟ علامہ ابن الملک رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ارشاد نبوی "شاركت" خونریزی کی برائی سے روکنے کی تاکید کیلئے ذکر کیا گیا ورنہ تو اپنا دفاع کرنا واجب ہے۔ علامہ طیبی رحمۃ اللہ علیہ نے اس بات کو ذکر کر کے اس کو درست قرار دیا ہے، لیکن زیادہ صحیح یہ ہے کہ اس میں تفصیل ہے اور وہ یہ ہے کہ غارتگری کیلئے آنے والا دشمن اگر مسلمان ہو تو اس سے لڑنا اور اپنا دفاع کرنا جائز ہے بشرطیکہ کہ اس سے فتنہ وفساد بڑھ جانے کا اندیشہ نہ ہو اور اگر وہ دشمن غیر مسلم ہو تو پھر اسکا ہر ممکن ذریعے سے مقابلہ کر کے دفاع کرنا واجب ہے۔

قوله:ان خشيت ان يبهرك فالق ناحية ....:

یبھر: ھاء کے فتحہ کے ساتھ یغلب کے معنی میں ہے۔

شعاع: شین کے فتحہ کے ساتھ تلوار کی چمک۔

ألق: الالقاء سے امر کا صیغہ ہے۔

چہرہ پر کپڑا ڈال لینا۔

تاکہ تمہیں تلوار نظر نہ آئے اور جزع فزع نہ کرو۔ مطلب یہ ہے کہ تم ان سے نہ لڑو اگرچہ وہ تم سے لڑے، بلکہ اپنے آپ کو

قتل کے لیے پیش کرو، کیونکہ وہ لوگ مسلمان ہونگے اور مسلمانوں کے ساتھ لڑائی ترک کرنا اور اپنے آپ کو حوالے کر دینا جائز ہے، اسی کی طرف آئندہ جملے میں اشارہ کیا گیا۔

تخریج: امام ابن ماجہؒ نے بھی اس کو نقل کیا ہے اور امام حاکمؒ نے مستدرکِ حاکم میں نقل کیا ہے اور لکھا ہے کہ یہ روایت شیخین کی شرط پر صحیح ہے، اس بات کو امام میرک نے تصحیح سے نقل کیا ہے۔

۵۳۹۸ : وَعَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عَمْرِو ابْنِ العَاصِ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ كَيْفَ بِكَ اِذَا اُبْقِيْتَ فِيْ حُثَالَةٍ مِّنَ النَّاسِ مَرِجَتْ عُهُوْدُهُمْ وَاَمَانَاتُهُمْ وَاخْتَلَفُوْا وَكَانُوْا هٰكَذَا وَشَبَّكَ بَيْنَ اَصَابِعِهِ قَالَ فَبِمَ تَامُرُنِيْ قَالَ عَلَيْكَ بِمَا تَعْرِفُ وَدَعْ مَا تُنْكِرُ وَعَلَيْكَ بِخَاصَّةِ نَفْسِكَ وَاِيَّاكَ وَعَوَامَّهُمْ وَفِيْ رِوَايَةٍ اِلْزَمْ بَيْتَكَ وَاَمْلِكْ عَلَيْكَ لِسَانَكَ وَخُذْ مَا تَعْرِفُ وَدَعْ مَاتُنْكِرُ وَعَلَيْكَ بِاَمْرِ خَاصَّةِ نَفْسِكَ وَدَعْ اَمْرَ الْعَامَّةِ. (رواه الترمذي وصححه)

اخرجه البخاري في صحيحه ٢٥١/١١ حديث رقم ٦٤٣٤ وابو داوٗد في السنن ٥١٣/٤ حديث رقم ٤٣٤٢ وابن ماجه في السنن ١٣٠٧/٢ حديث رقم ٣٩٥٧ والدارمي في السنن ٣٩٠/٢ حديث رقم ٢٧١٩ واحمد في المسند ١٦٢/٢

ترجمہ: ''حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ (ایک روز) نبی کریم ﷺ نے ان سے ارشاد فرمایا: ''اس وقت تمہاری کیا کیفیت ہوگی؟ جب ناکارہ لوگوں کے دور میں باقی رہ جاؤ گے' جن کے معاہدے اور جن کی امانات خراب ہو جائے گی اور جو باہمی اختلاف کا شکار ہو جائیں گے' گویا وہ لوگ اس طرح کے ہو جائیں گے یہ فرما کر آپ ﷺ نے اپنی انگلیوں کو ایک دوسرے کے اندر داخل کیا''۔ حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہما نے (یہ سن کر) درخواست کی کہ آپ ﷺ میری راہنمائی فرما دیجئے کہ اس وقت میرا کردار کیا ہونا چاہیے؟ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''اس وقت تم پر لازم ہوگا کہ اس چیز کو اختیار کرو اور اس پر عمل کرو جس کو تم (شرعی نکتہ نظر سے) حق اور سچ خیال کرو اور اس چیز سے کنارہ کش رہو جس کو تم (شرعی نکتہ نظر سے ناحق اور باطل و مکروہ خیال کرو' نیز صرف اپنے کام اور اپنی بھلائی سے مطلب رکھو اور خود کو عوام الناس سے علیحدہ رکھو' اور ایک روایت میں یہ الفاظ مروی ہیں کہ ''اپنے گھر میں رہا کرو (اشد ضرورت کے علاوہ باہر نکل کر اِدھر اُدھر نہ جاؤ) اپنی زبان کو اپنی گرفت میں رکھو' جس بات کو حق اور سچ سمجھو اسے عمل میں لاؤ اور جسے ناحق اور باطل سمجھو اسے سے کنارہ کش رہو' صرف اپنے کام اور اپنی بھلائی کی فکر لازمی جانو اور عوام الناس کے معاملات سے کوئی تعلق نہ رکھو''۔ اس روایت کو ترمذی نے نقل کیا ہے اور اس کو صحیح کہا ہے۔

تشریح: قوله: عبد الله بن عمرو بن العاص ...... واختلفوا فكانوا هكذا:

عبداللہ بن عمرو بن العاص: دونوں جلیل القدر صحابی ہیں اور صحیح بات یہ ہے کہ ''العا'' یاء کے بغیر ہے۔''

کیف بك: اس کی نحوی ترکیب پہلے گزر چکی ہے۔ اور ایک روایت میں ''کیف انت'' ہے بمعنی کیف حالك.

ابقیت: الابقاء سے مجہول کا صیغہ ہے۔ یہ" ابقاك الله" سے ماخوذ ہے جس کا معنی ہے" ابقی الله عمرك"۔ اور ایک نسخہ میں البقاء مصدر سے بصیغہ معروف "بقیت" ہے۔

حثالة: حاء کے ضمہ اور ثاء مثلثہ کے ساتھ۔ اس کا معنی ہے جو چاول اور کھجور کا چھلکا، کسی بھی چیز کا ناکارہ حصہ۔ یہاں مراد ردی اور بے کار لوگ ہیں۔

مرجت عهودهم ومانتهم: جملہ مستأنفہ بیانیہ ہے۔ اور" مرجت" میم کے فتحہ اور راء کے کسرہ کے ساتھ ہے۔ اس کا معنی ہے فاسد ہو جانا۔

واماناتهم: ایک اور نسخہ میں بصیغہ مفرد" امانتهم" ہے، اس صورت میں اس سے جنس مراد ہوگی، یا ہر فرد کے اعتبار سے مفرد کا صیغہ ذکر کیا گیا۔ اور جمع کا صیغہ مقابلہ اور توزیع کیلئے ذکر کیا گیا ہے جبکہ ان دونوں میں جمع حقیقت بھی ممکن ہے۔ تامل فرمائے اور مطلب یہ ہے کہ اُن کا معاملہ درست نہیں ہوگا، بلکہ اُن میں سے ہر ایک کی طبیعت اور عہد و پیان لحہ بہ لحہ بدلتا جائے گا وہ وعدہ خلافی کے مرتکب ہوں گے اور امانتوں میں خیانت کریں گے۔

علامہ تورپشتی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں مطلب یہ ہے کہ آپس میں مخلوط ہو جائیں گے، اور ان میں فساد برپا ہو جائے گا اور اسباب دیانت خلط ملط ہو جائیں گے۔

قوله: واختلفوا فكانوا هكذا وشبك بين اصابعه:

یعنی ایک دوسرے کے ساتھ خلط ملط ہو جائیں گے اور ان کے دینی معاملات بھی اس طرح خلط ملط ہو جائیں گے کہ امین وخائن اور نیک وبد کے درمیان تمیز کرنا ممکن نہیں رہے گا۔

اور ایک نسخہ میں "مرجت" راء کے فتحہ کے ساتھ ہے جو کہ متعدی ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد: ﴿مرج البحرين﴾ [الرحمن: ۱۹] اسی سے ہے۔ چنانچہ اس کی ضمیر" حثالة" کی طرف راجع ہوگی اور معنی یہ ہوگا کہ ان بے کار لوگوں کا گروہ وعدوں اور امانتوں کو بگاڑے گا' اور دینی معاملات میں اختلاف کریں گے اور ان کی حالت یوں ہوگی جیسا کہ حضور علیہ السلام نے ایک ہاتھ کی انگلیوں کو دوسرے ہاتھ کی انگلیوں میں داخل کر کے دکھائی۔

چنانچہ قاموس میں لکھتے ہیں: المرج الخلط' والمرج محركة الفساد والقلق والاختلاط والاضطراب، وانما يسكن مع الهرج يعني للازدواج مرح كفرح، وامر مريج مختلط، وامرج العهد لم يف به۔ اھ۔

"مختصر النهاية" میں لکھا ہے مرج الدين فسد وقلقت أسبابه و مرجت عهودهم اى اختلطت: امام میرک رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی کتاب کے حاشیہ میں" مرجت " کو صیغہ مجہول کے ساتھ ذکر کیا ہے، اور علت یہ بیان کی ہے" مرج" متعدی ہے۔ اور فعل لازم ماننے کی صورت میں معنی واضح نہیں ہیں، جیسا کہ قاموس وغیرہ سے ظاہر ہوتا ہے۔

قوله: قال عليك بما تعرف...... واياك وعوامهم:

مطلب یہ ہے کہ تم صرف اپنے کام سے کام رکھنا' اپنے دین کی حفاظت کرنا دوسرے لوگوں کو چھوڑ دینا ان کے پیچھے۔

پڑنا۔ اس حدیث میں ایسے ماحول میں امر بالمعروف ونہی عن المنکر کے فریضہ کو چھوڑ دینے کی اجازت دی گی ہے جس میں شریر وبدکار لوگوں کی کثرت ہو اور نیک لوگ ضعیف ہوں۔

قوله: الزم بيتك واملك عليك ......:

أملك: "املاك" مصدر سے امر کا صیغہ ہے، اس کا معنی ہے باندھنا۔ قابو میں رکھنا۔

یعنی تم اس وقت لوگوں کے احوال ومعاملات کے بارے میں کوئی بات نہ کرنا تاکہ وہ لوگ تجھے اذیت نہ پہنچائیں۔

تخریج: امام میرک فرماتے ہیں کہ دوسری روایت کو امام ابوداؤد اور امام نسائی نے بھی روایت کیا ہے۔

۵۳۹۹: وَعَنْ اَبِیْ مُوْسٰی عَنِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَنَّهٗ قَالَ اِنَّ بَيْنَ يَدَیِ السَّاعَةِ فِتَنًا كَقِطَعِ اللَّيْلِ الْمُظْلِمِ يُصْبِحُ الرَّجُلُ فِيْهَا مُؤْمِنًا وَيُمْسِیْ كَافِرًا وَيُمْسِیْ مُؤْمِنًا وَيُصْبِحُ كَافِرًا اَلْقَاعِدُ فِيْهَا خَيْرٌ مِنَ الْقَائِمِ وَالْمَاشِیْ فِيْهَا خَيْرٌ مِنَ السَّاعِیْ فَكَسِّرُوْا فِيْهَا قِسِيَّكُمْ وَقَطِّعُوْا فِيْهَا اَوْتَارَكُمْ وَاضْرِبُوْا سُيُوْفَكُمْ بِالْحِجَارَةِ فَاِنْ دُخِلَ عَلٰی اَحَدٍ مِّنْكُمْ فَلْيَكُنْ كَخَيْرِ بَنِیْ اٰدَمَ (رواه ابوداود وفی رواية له) ذُكِرَ اِلٰی قَوْلِهٖ خَيْرٌ مِنَ السَّاعِیْ ثُمَّ قَالُوْا فَمَا تَاْمُرُنَا قَالَ كُوْنُوْا اَحْلَاسَ بُيُوْتِكُمْ وَفِیْ رِوَايَةِ التِّرْمِذِیِّ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ فِی الْفِتْنَةِ كَسِّرُوْا فِيْهَا قِسِيَّكُمْ وَقَطِّعُوْا فِيْهَا اَوْتَارَكُمْ وَالْزَمُوْا فِيْهَا اَجْوَافَ بُيُوْتِكُمْ وَكُوْنُوْا كَابْنِ اٰدَمَ وَقَالَ هٰذَا حَدِيْثٌ صَحِيْحٌ غَرِيْبٌ.

اخرجه ابو داؤد فی السنن ٤٥٧/٤ حديث رقم ٤٢٥٩ والترمذی فی السنن ٤٢٤/٤ حديث رقم ٢٢٠٢ وابن ماجه فی السنن ١٣١٠/٢ حديث رقم ٣٩٦١ واحمد فی المسند ٤١٦/٤۔

ترجمہ: "حضرت ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ نبی اکرم ﷺ سے نقل فرماتے ہیں کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: "وقوع قیامت سے پہلے تاریک رات کے ٹکڑوں کی مثل فتنے رونما ہوں گے' ان فتنوں کے زمانے میں آدمی بحالت ایمان صبح کو اٹھے گا اور شام کو کافر ہو جائے گا' شام کو مؤمن ہوگا تو بحالت کو صبح کو اٹھے گا۔ (ان فتنوں دور میں) بیٹھنے والا شخص کھڑے ہونے والے سے بہتر ہوگا اور چلنے والا شخص دوڑنے والے سے بہتر ہوگا! (پس جب تم ان فتنوں کا زمانہ پاؤ تو) اپنی کمانوں کو توڑ دینا' کمانوں کے تانت کاٹ دینا اور اپنی تلواروں کو پتھر پر دے مارنا (یعنی ان کے دھار کو کند و بیکار بنا دینا) اور جب تم میں سے کوئی شخص کسی کو مارنے کے لئے آگے بڑھے تو اس کو چاہئے کہ وہ (حملہ آور کا مقابلہ کرنے یا اپنا دفاع کرنے کی بجائے) آدم کے دو بیٹوں میں سے بہترین بیٹے کی مانند ہو جائے۔ (ابوداؤد) اور سنن ابی داؤد کی ایک دوسری روایت میں میں خَیْرٌ مِنَ السَّاعِیْ (یعنی چلنے والا شخص دوڑنے والے سے بہتر ہوگا) کے الفاظ نقل کرنے کے بعد پھر یہ ذکر کیا گیا کہ صحابہؓ نے (یہ ارشاد گرامی سن کر) درخواست کی کہ پھر آپ ہمیں حکم فرماتے ہیں؟ (یعنی ہمیں ہدایت دیجئے کہ ان فتنوں میں ہم کس روش کو اپنا کر زندگی گزاریں؟) آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: "تم اپنے گھروں کے ٹاٹ بن جانا" نیز ترمذی کی روایت میں یوں ہے کہ حضور ﷺ نے

فتنہ کے دور کے متعلق یہ راہنمائی فرمائی کہ ''تم فتنوں کے زمانے میں اپنی کمانوں کو توڑ دینا اور ان کے تانت کاٹ دینا' نیز گھروں کی چار دیواری کو لازم پکڑ لینا (یعنی بلا ضرورت شدیدہ باہر نہ نکلنا اور اپنا سارا وقت گھروں میں گزار کر لوگوں کے معاملات سے لاتعلق ہو جانا تا کہ ان فتنوں کے برے اثرات سے محفوظ رہ سکو) اور تم ابن ادم (ہابیل) کی مانند (مظلوم) بننا گوارہ کر لینا (لیکن اپنے بچاؤ کی غرض سے بھی کسی پر ہتھیار نہ اٹھانا)۔ اس روایت کو ترمذیؒ نے نقل کر کے فرمایا ہے کہ یہ حدیث صحیح غریب ہے''۔

تشریح:قوله:ان بين يدى الساعة......ويصبح كافرا:

قطع: قاف کے کسرہ اور طاء کے فتحہ کے ساتھ ہے۔ طاء کو ساکن پڑھنا بھی درست ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ہر فتنہ اپنی شدت، تاریکی اور اس اعتبار سے کہ اس میں تمیز کرنا مشکل ہوگا، رات کے ایک حصے کے مانند ہوگا۔

علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں: اس سے مراد یہ ہے کہ وہ فتنہ بہت بڑا ہوگا اس میں نیک و بد کے درمیان امتیاز کرنا مشکل ہوگا وہ فتنہ عام اور مستمر ہوگا۔

يصبح الرجل فيها:

بظاہر صبح شام سے مراد یہ ہے کہ وقتاً فوقتاً لوگوں کے احول میں تبدیلی آئے گی' خاص صبح وشام کے اوقات مراد نہیں ہیں، گویا کہ یہ کلام کنایہ ہے اس بات سے کہ اس وقت لوگوں کے احوال میں تردد ہوگا اقوال میں تذبذب کا شکار ہونگے اور افعال میں تنوع ہوگا (یعنی ٹھہراؤ نہیں ہوگا۔) مثلاً وعدہ کرینگے وعدہ خلافی کریں گے۔ امانت لیں گے تو اس میں خیانت کریں گے، نیکی کریں گے تو بدی بھی کریں گے، کبھی سنت پر عمل پیرا ہونگے تو کبھی بدعت کی راہ پر چلیں گے، اور کسی وقت ایمان کے حامل ہونگے تو کبھی کفر کے اندھیروں میں بھٹکنے لگیں گے۔

قوله:القاعد فيها خير...... من الساعى:

یعنی جو شخص ان فتنوں سے اور فتنہ پرور لوگوں سے جتنا زیادہ دور ہوگا وہ اس شخص سے اتنا ہی زیادہ بہتر ہوگا جو ان فتنوں کے قریب ہوگا اور فتنے والوں سے اختلاط کرے گا۔ کیونکہ اس کا انجام اہل فتنہ سے قتل وقتال ہوتا ہے

قوله:فكسروا فيها قسيكم...... واضربوا سيوفكم بالحجارة:

مکسروا: ''کسر'' کی بجائے ''تکسیر'' ذکر کرنا مبالغہ کے لئے ہے کیونکہ باب تفعیل تکثیر پر دلالت کرتا ہے۔

قسیکم: قاف وسین کے کسرہ اور یائے تحتیہ کی تشدید کے ساتھ'' قوس'' کی جمع ہے۔

قطعوا: تقطیع سے امر کا صیغہ ہے۔ یہ جملہ مزید مبالغہ کے لئے ہے کیونکہ کمان کو توڑ دیا جائے تو پھر وتر میں کوئی فائدہ ہی نہیں رہتا، یا مراد یہ ہے کہ کوئی اور اس وتر سے کچھ فائدہ نہ اٹھائے' اور بھلائی کو چھوڑ کر برائی میں استعمال نہ کرے۔

قوله:فان دخل على احد منكم فليكن كخير ابنى آدم:

دخل: فعل مجہول ہے اور اس کا نائب فاعل ''علی احد'' ہے۔

منکم: '' من '' بیانیہ ہے۔

(یعنی اپنے آپ کو حوالے کر دے تا کہ ہابیل کی طرح مظلوم مقتول بنے' قابیل کی طرح قاتل نہ بنے۔)

قولہ: فما تأمرنا؟ قال کونوا احلاس بیوتکم:

"**احلاس البیوت**'': اس سے مراد وہ ٹاٹ ہے جو عمدہ کپڑے کے نیچے بچھایا جاتا ہے اور مسلسل بچھا رہتا ہے۔

٥٤٠٠ : وَعَنْ اُمِّ مَالِكٍ الْبَهْزِيَّةِ قَالَتْ ذَكَرَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِتْنَةً فَقَرَّبَهَا قُلْتُ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ مَنْ خَيْرُ النَّاسِ فِيْهَا قَالَ رَجُلٌ فِيْ مَاشِيَتِهِ يُؤَدِّيْ حَقَّهَا وَيَعْبُدُ رَبَّهٗ وَرَجُلٌ اٰخِذٌ بِرَاْسِ فَرَسِهٖ يُخِيْفُ الْعَدُوَّ وَيُخَوِّفُوْنَهٗ ۔ (رواہ الترمذی)

جامع الترمذی' کتاب الفتن' باب ما جاء کیف یکون الرجل فی الفتنۃ' ح ٢١٧٧

ترجمہ: '' حضرت اُم مالک بہزیہ رضی اللہ عنہا نے بیان فرمایا کہ (ایک روز) جب رسول اللہ ﷺ نے فتنہ کا تذکرہ فرمایا اور آپ کو قریب تر قرار دیا تو میں نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ ﷺ اس فتنے کے وقت سب سے زیادہ بہترین انسان کونسی روش والا ہوگا؟ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اس دور میں سب سے بہترین انسان وہ ہوگا جو اپنے مویشیوں (کی دیکھ بھال اور ان کے گھاس چارے کے انتظام) میں (مشغول) رہے' ان کا حق ادا کرے (یعنی ان تمام شرعی واجبات کو ادا کرے جو ان جانوروں سے متعلقہ ہوں) اور اپنے رب کی بندگی کرتا رہے' اور وہ شخص بھی سب سے بہتر ہوگا جو اپنے گھوڑے کا سر (یعنی اپنے گھوڑے کی پشت پر سوار اس کی لگام) تھامے (کھڑا) ہو اور دشمنانِ دین کو خوف زدہ کرتا ہو اور دشمن اس کو ڈراتے ہوں'' یعنی ایک وہ شخص بہترین ہے جو فتنہ کا حصہ ہی نہ بنے بلکہ اس سے کنارہ کش رہے دوسرا شخص جو فتنہ کا مقابلہ کرنے کے لئے نکل پڑے''۔ (ترمذیؒ)

راویٔ حدیث:

اُمّ مالک بہزیۃ ۔ یہ ام مالک بہزیہ ہیں۔ صحابی عورت ہیں۔ بنو سلیم سے تعلق رکھتی ہیں۔ ان سے روایت بھی نقل کی گئی ہے۔ یہ حجازی ہیں۔ ان سے طاؤس اور مکحول نے روایت کی۔ ''بہزیہ'' میں بائے موحدہ مفتوح' حا ساکن' زاء معجمہ اور یائے نسبت ہے۔

٥٤٠١ : وَعَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عَمْرٍو قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ سَتَكُوْنُ فِتْنَةٌ تَسْتَنْظِفُ الْعَرَبَ قَتْلَاهَا فِي النَّارِ اللِّسَانُ فِيْهَا اَشَدُّ مِنْ وَقْعِ السَّيْفِ. (رواہ الترمذی وابن ماجۃ)

اخرجہ ابو داؤد فی السنن ٤٦١/٤ حدیث رقم ٤٢٦٥ والترمذی فی السنن ٤١١/٤ حدیث رقم ٢١٧٨ وابن ماجہ فی السنن ١٣١٢/٢ حدیث رقم ٣٩٦٧ واحمد فی المسند ٢١٢/٢

ترجمہ: '' حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کا بیان ہے کہ (ایک روز) رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: '' عنقریب ایک بڑا فتنہ رونما ہونے والا ہے جو تمام اہل عرب کو اپنی لپیٹ میں لے لے گا (اور اس کے نتائج کا نشانہ

ہر شخص بنے گا) اس فتنہ میں قتل ہو جانے والے لوگ (بھی جہنمی ہوں گے' نیز اس فتنہ کے وقت زبان کھولنا (یعنی کسی کو برا بھلا کہنا اور عیب و عار دلانا) تلوار مارنے سے بھی زیادہ سخت مضر ہوگا''۔ (ترمذی' ابن ماجہ)

۵۴۰۲ : وَعَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ سَتَكُوْنُ فِتْنَةٌ صَمَّاءُ بُكْمَاءُ عَمْيَاءُ مَنْ اَشْرَفَ لَهَا اِسْتَشْرَفَتْ لَهُ وَاِشْرَافُ اللِّسَانِ فِيْهَا كَوُقُوْعِ السَّيْفِ. (رواه ابوداود)

ابوداود' کتاب الفتن' باب فی کف اللسان' ح ۴۲۶۴۔

ترجمہ: ''حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''عنقریب ایسا فتنہ رونما ہوگا جو گونگا بہرہ اور اندھا ہوگا جو شخص اس فتنہ کو جھانکے گا وہ فتنہ اس کو اپنی لپیٹ میں لے لے گا' نیز اس فتنہ کے وقت زبان درازی' تلوار مارنے کی مانند ہوگی''۔ (ابوداؤد)

۵۴۰۳ : وَعَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عُمَرَ قَالَ كُنَّا قُعُوْدًا عِنْدَ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَذَكَرَ الْفِتَنَ فَاَكْثَرَ فِيْ ذِكْرِهَا حَتّٰى ذَكَرَ فِتْنَةَ الْاَحْلَاسِ فَقَالَ قَائِلٌ وَمَا فِتْنَةُ الْاَحْلَاسِ قَالَ هِيَ هَرَبٌ وَحَرَبٌ ثُمَّ فِتْنَةُ السَّرَّاءِ دَخَنُهَا مِنْ تَحْتِ قَدَمَيْ رَجُلٍ مِنْ اَهْلِ بَيْتِيْ يَزْعَمُ اَنَّهُ مِنِّيْ وَلَيْسَ مِنِّيْ اِنَّمَا اَوْلِيَائِيْ الْمُتَّقُوْنَ ثُمَّ يَصْطَلِحُ النَّاسُ عَلٰى رَجُلٍ كَوَرِكٍ عَلٰى ضِلَعٍ ثُمَّ فِتْنَةُ الدُّهَيْمَاءِ لَا تَدَعُ اَحَدًا مِنْ هٰذِهِ الْاُمَّةِ اِلَّا لَطَمَتْهُ لَطْمَةً فَاِذَا قِيْلَ انْقَضَتْ تَمَادَتْ يُصْبِحُ الرَّجُلُ فِيْهَا مُؤْمِنًا وَيُمْسِيْ كَافِرًا حَتّٰى يَصِيْرُ النَّاسُ اِلٰى فُسْطَاطَيْنِ فُسْطَاطَ اِيْمَانٍ لَانِفَاقَ فِيْهِ وَفُسْطَاطُ نِفَاقٍ لَااِيْمَانَ فِيْهِ فَاِذَا كَانَ ذٰلِكَ فَانْتَظِرُوا الدَّجَّالَ مِنْ يَوْمِهِ اَوْمِنْ غَدِهِ. (رواه ابوداود)

اخرجه ابو داؤد فی السنن ۴۴۲/۴ حدیث رقم ۴۲۴۲ واحمد فی المسند ۱۳۳/۲

ترجمہ: ''حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے بیان فرمایا کہ (ایک روز) ہم نبی اکرم ﷺ کی خدمت میں بیٹھے ہوئے تھے کہ آپ ﷺ (قرب قیامت رونما ہونے والے) فتنوں کا ذکر فرمانے لگے اور بہت سے فتنوں کے متعلق گفتگو فرمائی' یہاں تک کہ فتنہ احلاس کا ذکر فرمایا۔ ایک پوچھنے والے نے دریافت کیا کہ فتنہ حلاس کی نوعیت کیا ہوگی؟ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''وہ بھاگنا' اور مال کا ناحق لوٹنا (یعنی اس فتنہ کی نوعیت یہ ہوگی کہ لوگ باہمی نفرت و دشمنی کی وجہ سے ایک دوسرے سے بھاگیں گے' کوئی کسی کی صورت دیکھنے اور کسی کے ساتھ نباہ کرنے کا روادار نہیں ہوگا' ایک دوسرے کے مال کو جبراً لوٹ لینے اور ایک دوسرے کا مال ہڑپ کر لینے کا دور دورہ ہوگا) اور پھر سراء کا فتنہ ہے' اس فتنہ کی تاریکی اور تباہی اس آدمی کے پاؤں کے نیچے سے نکلے گی (یعنی اس فتنہ کا علمبردار و بانی وہ شخص ہوگا) جو میرے اہل بیت میں سے ہوگا' اس شخص کا خیال و دعویٰ تو یہ ہوگا کہ وہ (فعل و کردار کے اعتبار سے بھی) میرے اہل بیت میں سے ہے مگر درحقیقت وہ) خواہ نسب کے اعتبار سے میرے اہل بیت میں سے ہو مگر اپنے کردار عمل کے لحاظ سے) میرے اپنوں میں سے (ہرگز) نہیں ہوگا' اس میں کوئی شبہ نہیں کہ میرے دوست اور میرے اپنے تو وہی لوگ

ہو سکتے ہیں جو پرہیزگار ہوں۔ پھر اس فتنہ کے بعد لوگ ایسے شخص کی امامت و حکمرانی پر جمع ہونگے جو پسلی کے اوپر سرین کی طرح ہوگا' پھر دہیماء کا فتنہ رونما ہوگا اور وہ فتنہ اس امت میں سے کسی فرد کو نہیں چھوڑے گا مگر اسے طمانچہ بن کر لگے گا (یعنی وہ فتنہ اتنا وسیع اور ہمہ گیر ہوگا کہ امت کا ہر فرد اس کی تاثیر بد کی لپیٹ میں آئے گا اور ہر مسلمان اس کے ضرر و نقصان سے دوچار ہوگا) اور جب کہا جائے گا کہ وہ فتنہ ختم ہو گیا ہے تو اس کی مدت اور دراز ہو جائے گی (یعنی لوگ یہ گمان کریں گے کہ فتنہ ختم ہو گیا ہے مگر حقیقت میں وہ کچھ اور طویل ہو گیا ہوگا' مگر چونکہ کسی وقت اس کا اثر کچھ کم ہو جائیگا' جس سے لوگ اس کے ختم ہو جانے کا خیال کریں گے لیکن بعد میں اور زیادہ ہو جائے گا) اس وقت آدمی صبح کو ایمان کی حالت میں اٹھے گا اور شام کو کافر ہو جائے گا (یعنی یہ فتنہ لوگوں کی حالت و کیفیت پر اتنا جلدی اثر انداز ہوگا کہ لوگوں کے قول و عمل اور عادت میں بہت جلد تبدیلی واقع ہوگی اگر ایک وقت کوئی شخص دوسرے مسلمان کے جان و مال و عزت کو اپنے لئے حلال خیال کرتا ہے تو دوسرے وقت امر کا قائل ہو جائے گا جب کہ اگر ایک وقت حرام و ناجائز جانتا ہے تو دوسرے وقت حلال سمجھ بیٹھے گا) حتی کہ لوگ دو خیموں میں تقسیم ہو جائیں گے۔ ایک خیمہ ایمان کا ہوگا کہ اس میں نفاق مقصود نہ ہوگا اور ایک خیمہ نفاق کا ہوگا کہ اس میں ایمان نہ مقصود ہوگا! جب یہ بات عیاں ہو جائے تو پھر اس دن یا اس کے اگلے دن دجال کے ظاہر ہونے کا منتظر رہنا''۔ (ابوداؤد)

۵۴۰۴: وَعَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ وَيْلٌ لِلْعَرَبِ مِنْ شَرٍّ قَدِ اقْتَرَبَ اَفْلَحَ مَنْ كَفَّ يَدَهٗ ۔ (رواه ابوداود)

اخرجه البخاري في صحيحه ١١/١٣ حديث رقم ٧٠٥٩ ومسلم في صحيحه ٢٢٠٧/٤ حديث رقم (١ - ٢٨٨٠) وابو داوٗد في السنن ٤٤٩/٤ حديث رقم ٤٢٤٩ والترمذي في السنن ٤١٦/٤ حديث رقم ٢١٨٧ وابن ماجه ١٣٠٥/٢ حديث رقم ٣٩٥٣ واحمد في المسند ٤٤١/٢

ترجمہ: ''حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''ہلاکت اور بدنصیبی ہے اہل عرب کے لئے اس شر کے باعث جو) قریب آ گیا۔ اس فتنہ میں وہی شخص کامیاب و کامران ہوگا جس نے اپنا ہاتھ روک و گرفت میں رکھا''۔ (ابوداؤد)

۵۴۰۵: وَعَنِ الْمِقْدَادِ بْنِ الْاَسْوَدِ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ اِنَّ السَّعِيْدَ لِمَنْ جُنِّبَ الْفِتَنَ اِنَّ السَّعِيْدَ لِمَنْ جُنِّبَ الْفِتَنَ اِنَّ السَّعِيْدَ لِمَنْ جُنِّبَ الْفِتَنَ وَلَمَنِ ابْتُلِیَ فَصَبَرَ فَوَاهًا. (رواه ابو داود)

اخرجه ابو داوٗد في السنن ٤٦٠/٤ حديث رقم ٤٢٦٣

ترجمہ: ''حضرت مقداد بن اسود رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ ارشاد فرماتے ہوئے سنا کہ بلاشبہ بانصیب ہے وہ شخص جو فتنوں سے دور رکھا گیا ہو۔ بلاشبہ بانصیب ہے وہ شخص جو فتنوں سے دور رکھا گیا۔ اور بلاشبہ بانصیب ہے وہ شخص جو فتنوں سے دور رکھا گیا (یہ بات آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کے اذہان میں پختہ فرمانے

اور مؤثر بنانے اور اس کی اہمیت سے آگاہ فرمانے کے لئے تین بار ارشاد فرمائی) اور یقیناً نیک بخت وہ شخص بھی ہے جو فتنہ میں مبتلا کیا گیا لیکن اس نے صبر وضبط کا دامن نہیں چھوڑا اور قابل افسوس وہ شخص ہے جو نہ فتنوں سے محفوظ رکھا گیا اور نہ اس نے صبر وتحمل سے کام لیا''۔ (ابوداؤد)

۵۴۰۶ : وَعَنْ ثَوْبَانَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذَا وُضِعَ السَّيْفُ فِيْ اُمَّتِيْ لَمْ يُرْفَعْ عَنْهَا اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ وَلَا تَقُوْمُ السَّاعَةُ حَتّٰى تَلْحَقَ قَبَائِلُ مِنْ اُمَّتِيْ بِالْمُشْرِكِيْنَ وَحَتّٰى تَعْبُدَ قَبَائِلُ مِنْ اُمَّتِي الْاَوْثَانَ وَاِنَّهٗ سَيَكُوْنُ فِيْ اُمَّتِيْ كَذَّابُوْنَ ثَلٰثُوْنَ كُلُّهُمْ يَزْعُمُ اَنَّهٗ نَبِيُّ اللّٰهِ وَاَنَا خَاتَمُ النَّبِيِّيْنَ لَا نَبِيَّ بَعْدِيْ وَلَا تَزَالُ طَائِفَةٌ مِنْ اُمَّتِيْ عَلَى الْحَقِّ ظَاهِرِيْنَ لَايَضُرُّهُمْ مَنْ خَالَفَهُمْ حَتّٰى يَاْتِيَ اَمْرُ اللّٰهِ ۔ (رواه ابوداود والترمذی)

اخرجه ابوداود ٤٥١/٤ حديث رقم ٤٢٥٢ واخرجه الترمذي في السنن ٤٢٤/٤ حديث رقم ٢٢٠٢ وابن ماجه ١٣٠٤/٢ حديث رقم ٣٩٥٢ واحمد في المسند ٢٧٨/٥

ترجمہ: ''حضرت ثوبان رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''جب میری اُمت میں (باہمی خونریزی کے لئے) تلوار چل جائے گی تو پھر روز قیامت تک اس امت کے افراد کی خانہ جنگی سے رکے گی بھی نہیں! اور اس وقت تک قیامت کا قیام نہیں ہوگا جب تک میری امت کے بعض قبائل مشرکوں کے ساتھ نہیں مل جائیں گے اور قیامت قائم نہیں ہوگی حتی کہ میری امت کے بعض قبائل بتوں کے بجاری بن جائیں گے اور بلاشبہ عنقریب میری امت میں سے تیس جھوٹے (یعنی مدعیان نبوت) اٹھیں گے۔ ان میں سے ہر ایک یہ دعویٰ کرے گا کہ وہ خدا کا نبی ہے حالانکہ درحقیقت میں خاتم النّبیین ہوں' میرے بعد کوئی نبی نہیں ہوگا اور میری امت میں سے ہمیشہ ایک طبقہ حق پر قائم ودائم رہے گا (یعنی علمی اور عملی طور پر دین کے بالکل درست راستے پر گامزن ہوگا اور اہل باطل پر غالب رہے گا) اس جماعت کا کوئی بھی مخالف ومقابل اس کو ضرر ونقصان نہیں پہنچا سکے گا (کیونکہ اس طبقہ کے افراد حق والے ہونے اور حق پر استقامت اختیار کرنے کے سبب سے خدا کی مدد ونصرت کے سائے تلے ہوں گے) تا آنکہ اللہ کا حکم آجائے''۔ (ابوداؤد' ترمذی)

۵۴۰۷ : وَعَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ مَسْعُوْدٍ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ تَدُوْرُ رُحَى الْاِسْلَامِ لِخَمْسٍ وَّثَلٰثِيْنَ اَوْسِتٍّ وَّثَلٰثِيْنَ اَوْسَبْعٍ وَّثَلٰثِيْنَ فَاِنْ يَّهْلِكُوْا فَسَبِيْلُ مَنْ هَلَكَ وَاِنْ يَّقُمْ لَهُمْ دِيْنُهُمْ يَقُمْ لَهُمْ سَبْعِيْنَ عَامًا قُلْتُ اَمِمَّا بَقِيَ اَوْمَضٰى قَالَ مِمَّا مَضٰى۔ (رواه ابوداود)

اخرجه ابو داؤد في السنن ٤٥٣/٤ حديث رقم ٤٢٥٤ واحمد في المسند ٣٩٠/١۔

ترجمہ: ''حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نبی اکرم ﷺ سے روایت بیان فرماتے ہیں کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''اسلام کی چکی پینتیس یا چھتیس یا سینتیس سال کے عرصہ تک گھومتی رہے گی پھر اگر لوگ ہلاک ہوں گے تو اس راستے کو اختیار کرنے کے باعث ہلاک ہوں گے جس پر چل کر پہلے لوگ ہلاک ہو چکے ہیں اور اگر ان کے دین کا

نظام کامل و برقرار رہا تو ان کے دینی نظام کا یہ سلسلہ ستر سال کے عرصہ تک"۔(حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ) میں نے یہ (ارشاد گرامی سن کر) پوچھا کہ یہ ستر بقیہ میں سے ہوں گے یا اس عرصہ سمیت ہوں گے جو گزرا (یعنی آپ ﷺ نے دین کے نظام کی تکمیل و برقراری کے لئے جس ستر برس کا تذکرہ فرمایا ہے اس ستر برس کے عرصہ کا آغاز ۳۵ یا ۳۶ یا ۳۷ سال کا مذکورہ زمانہ گزرنے کے بعد ہوگا یا وہ مذکورہ سال بھی اس ستر سال کی مدت میں شامل ہیں اور اس کا آغاز اسلام کے ابتدائی زمانے یا ہجرت کے وقت سے مراد لیا گیا ہے؟ حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا (یہ مذکورہ سال بھی ان ستر سالوں میں شامل ہیں اور) ستر سال کی مدت اس دور سمیت ہے (اسلام کے ابتدائی زمانے یا ہجرت کے وقت سے اب تک جو زمانہ بیت چکا ہے"۔(ابوداؤد)

الفصل الثالث:

۵۴۰۸ : عَنْ اَبِیْ وَاقِدِ اللَّیْثِیِّ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ لَمَّا خَرَجَ اِلٰی غَزْوَةِ حُنَیْنٍ مَرَّ بِشَجَرَةٍ لِلْمُشْرِکِیْنَ کَانُوْا یُعَلِّقُوْنَ عَلَیْهَا اَسْلِحَتَهُمْ یُقَالُ لَهَا ذَاتُ اَنْوَاطٍ فَقَالُوْا یَارَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اِجْعَلْ لَنَا ذَاتَ اَنْوَاطٍ کَمَا لَهُمْ ذَاتُ اَنْوَاطٍ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ سُبْحَانَ اللّٰهِ هٰذَا کَمَا قَالَ قَوْمُ مُوْسٰی اِجْعَلْ لَّنَا اِلٰهًا کَمَا لَهُمْ اٰلِهَةٌ وَالَّذِیْ نَفْسِیْ بِیَدِهٖ لَتَرْکَبُنَّ سُنَنَ مَنْ کَانَ قَبْلَکُمْ ۔ (رواہ الترمذی)

اخرجه البخاری فی صحیحه حدیث رقم ۷۳۱۹ واخرجه الترمذی فی السنن ٤١٢/٤ حدیث رقم ٢١٨٠ وابن ماجه ١٣٢٢/٢ حدیث رقم ٣٩٩٤ واحمد فی المسند ٣٤٠/٥

تخریج ...... جامع الترمذی' کتاب الفتن' باب ما جاء لترکبن' ح ۲۱۹۰۔(ص : ۵۰۰: دارالسلام' ریاض)

ترجمہ:"حضرت ابو واقد لیثی رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ رسول اللہ (فتح مکہ کے بعد) جب غزوۂ حنین کے لئے روانہ ہوئے تو (راستے میں) آپ ﷺ کا گزر مشرکوں کے ایک پیڑ کے پاس سے ہوا جس پر وہ (مشرک) اپنا اسلحہ لٹکایا کرتے تھے اس درخت کا نام ذات انواط تھا۔(آنحضرت ﷺ کے ہمراہیوں میں کچھ ایسے نومسلم نفوس بھی تھے جو اسلامی احکام و شرائع اور دینی تعلیمات سے زیادہ واقفیت نہ رکھنے کی وجہ سے کفر و شرک اس کی رسوم باطلہ اور ان سے مشابہت رکھنے والے افعال و اعمال سے بیزاری کے بارے میں شرعی مزاج و مذاق سے آگاہی نہ رکھتے تھے' انہی مسلمانوں میں سے بعض لوگوں نے اس درخت کو دیکھ کر) حضور ﷺ سے عرض کیا کہ یارسول اللہ ﷺ! ہمارے لئے بھی کوئی ایسا درخت متعین فرمادیجئے جس پر ہم اپنا اسلحہ لٹکایا کریں اور اس کو ذات انواط کہا کریں جیسا کہ مشرکوں نے اس درخت کو اپنے لئے ذاتِ انواط بنا رکھا ہے اور اس پر ہتھیار لٹکاتے ہیں۔حضور ﷺ نے (ان لوگوں کی اس عجیب و غریب خواہش کا اظہار سن کر از راہ حیرت و تعجب) فرمایا کہ"سبحان اللہ (یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟) یہ بات تم ایسی کہہ رہے ہو جیسا کہ موسیٰ علیہ السلام کی قوم (یہود) نے (اپنے پیغمبر موسیٰ سے کہا) تھا کہ ہمارے لئے بھی ایک ایسا معبود (یعنی بت) بنا دیجئے جیسا کہ کافروں کے معبود ہیں) تاکہ جس طرح وہ کافر اپنے بتوں کی پرستش کرتے ہیں

ایسے ہی ہم اپنے اس بت کی پرستش کیا کریں۔ پھر حضور ﷺ نے بطور تنبیہ یہ ارشاد فرمایا کہ قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے تم ان لوگوں کے راستے پر چلنا شروع کرو گے جو تم سے پہلے گزرے ہیں''۔(ترمذی)

راویٔ حدیث:

ابوواقد لیثی: ابوواقد نے غزوۂ حنین میں شرکت کی اور وہیں وفات پا گئے اور مقام ''فج'' میں دفن ہوئے۔

تشریح: قوله:أن رسول الله ﷺ لما خرج الى حنين:

غزوۂ حنین کی طرف حضور علیہ السلام کی یہ روانگی فتح مکہ کے بعد ہوئی تھی، اس وقت آپ کے ساتھ سفر میں کچھ ایسے صحابہ تھے جو نئے نئے اسلام میں داخل ہوئے تھے، اور ابھی تک احکام شرعیہ سے متعلق کسی آیت اور حدیث کو نہیں سیکھا تھا۔

قوله:مر بشجرة للمشركين ......ذات انواط:

مشرکین اس درخت کے گرد بطور عبادت کے طواف کرتے تھے۔ اس درخت کا نام ''ذات انواط'' تھا۔ ''أنواط''، نَوطٌ کی جمع ہے، جو'' ناط'' کا مصدر ہے جس کا معنی ہے ''لٹکانا''۔

اجعل لنا ذات انواط: یعنی ''ذات انواط'' کی طرح ایک درخت مقرر کریں۔ ان صحابہؓ نے کفار کے ساتھ ایک گونہ مخالفت کرنا چاہی لیکن قاعدیہ شرعیہ کی طرف دھیان نہ رہا۔

قوله:سبحان الله!هذا كما قال ....:

''هذا'': اس کا مشار الیہ ان نومسلم صحابہ کا مذکور بالا کلام ہے، اور عبارت کی تقدیر یوں ہے: **هٰذا القول منكم.**

لیکن یہ بات واضح ہے کہ حضور علیہ السلام کے صحابہ اور موسیٰ علیہ السلام کے صحابہ کے اقوال میں فرق ہے، کیونکہ تشبیہ میں مشبہ بہ مشبہ سے اقویٰ ہوتا ہے۔

''لتركبن'': اس میں باء پر ''پیش'' ہے۔

سنن: سین پر ضمہ (پیش) ہے۔ سُنن کا معنی ہے راستے اور گزرگاہیں۔ ایک نسخہ میں سین پر زبر ہے۔

توضیح وتخریج: امام ترمذیؒ نے حضرت ابن عمر ؓ سے اس کے ہم معنی ایک مرفوع حدیث نقل کی ہے:

ليأتين على أمتي ما أتى على بنى اسرائيل حذو النعل بالنعل ،حتى ان كان منهم من أتى امه علانية لكان فى امتى من يضع ذلك

''میری اُمت پر اس طرح زمانہ آئے گا، کہ یہ اپنے احوال اور اقوال میں بنی اسرائیل کے ساتھ اس طرح موافق ہو جائیں گے، جیسا کہ ایک پیر کا جوتا، دوسرے پیر کے جوتے کے ساتھ ناپ میں موافق ہوتا ہے، یہاں تک کہ اگر بنی اسرائیل میں کسی شخص نے اپنی ماں کے ساتھ اعلانیہ زنا کیا ہو تو اس اُمت میں بھی ایسا شخص ہوگا جو اس طرح کرے گا''

نیز اس حدیث کو حاکم نے ابن عباس ؓ سے نقل کیا ہے:

لتركبن سنن من قبلكم شبرا بشبر وذرا عابذراع حتى لوأن احدهم دخل حج صب لدخلتم وحتى لو ان احدهم جامع امراته بالطريق لفعلتموه۔

''تم لوگ گذشتہ اقوام کے راستوں پر چل کر اُن کے ساتھ اس طرح موافقت کرو گے جس طرح ایک ہاتھ کا بالشت دوسرے ہاتھ کے بالشت کے ساتھ اور ایک ذراع دوسرے ذراع کے ساتھ برابر ہوتا ہے، یہاں تک کہ اگر اُن میں سے کوئی شخص گوہ کے بل میں داخل ہو گیا ہو، تو تم میں بھی کوئی اس طرح کرے گا، اور اگر اُن میں سے کسی شخص نے اپنی بیوی کے ساتھ سر راہ جماع کیا ہو گا تو تم بھی یہ کرو گے''۔

۵۴۰۹ : وَعَنِ ابْنِ الْمُسَيَّبِ قَالَ وَقَعَتِ الْفِتْنَةُ الْاُوْلٰى يَعْنِى مَقْتَلَ عُثْمَانَ فَلَمْ يَبْقَ مِنْ اَصْحَابِ بَدْرٍ اَحَدٌ ثُمَّ وَقَعَتُ الْفِتْنَةُ الثَّانِيَةُ يَعْنِى الْحَرَّةَ فَلَمْ يَبْقَ مِنْ اَصْحَابِ الْحُدَيْبِيَّةِ اَحَدٌ ثُمَّ وَقَعَتِ الْفِتْنَةُ الثَّالِثَةُ فَلَمْ تَرْتَفِعْ وَبِالنَّاسِ طَبَاخٌ. (رواه البخارى)

اخرجه البخارى فى صحيحه ۳۲۳/۷ حديث رقم ۴۰۲۴

ترجمہ: ''حضرت سعید بن میسبؒ سے (جو جلیل القدر تابعین میں سے تھے) منقول ہے کہ انہوں نے فرمایا: ''جب پہلا فتنہ (کہ جس سے پہلے عہد اسلام میں کسی قسم کا فتنہ رونما نہیں ہوا۔) واقع ہوا یعنی حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت کا سانحہ پیش آیا تو غزوہ بدر میں شامل ہونے والے صحابہؓ میں سے کوئی بھی زندہ نہیں رہا' پھر جب دوسرا فتنہ رونما ہوا یعنی حرہ کا واقعہ پیش آیا تو ان صحابہؓ میں سے کوئی زندہ نہیں رہا جو صلح حدیبیہ (یعنی بیعت الرضوان) میں شریک ہوئے تھے پھر جب تیسرا فتنہ ظاہر ہوا تو اس کا خاتمہ اس وقت تک نہیں ہوا جب تک لوگوں میں عقل وحواس باقی رہے''۔ (بخاری)

تشریح: قوله: وقعت الفتنة الاولى......من اصحاب بدر احد:

حضرت ابن میسب رحمہ اللہ کا کلام ہے، یعنی اصحاب بدر اس وقت سے اللہ کو پیارے ہونے لگے تھے جبکہ حضرت عثمانؓ کی شہادت کا خطرناک حادثہ پیش آیا تھا، اور پھر دوسرا فتنہ یعنی حرہ کی جنگ کا واقعہ پیش آیا تھا، اس کا حاصل یہ ہے کہ غزوہ بدر میں شرکت کی برکت سے اللہ تعالیٰ نے اصحاب بدر کو ان دو فتنوں میں مبتلا ہونے سے محفوظ رکھا۔

قوله: ثم وقعت الفتنة الثانية......من الحديبية احد:

''حرۃ'' مدینہ کے قریب ایک جگہ کا نام ہے جس کی زمین پتھریلی اور سیاہ رنگ کی تھی۔ یزید بن معاویہؓ کے زمانے میں جو مشہور واقعہ پیش آیا تھا کہ جب انہوں نے ۶۳ ہجری کو ماہِ ذی الحجہ میں مسلم بن عقبہ کو لشکر کا امیر بنایا اور انہوں نے مدینہ کے صحابہ اور تابعین کے ساتھ قتال کیلئے مدینہ پر لشکر کشی کی، اس واقعہ میں جنگی کارروائیوں کی ابتداء اسی جگہ (حرہ) سے ہوئی تھی۔

''الحديبية'': دوسری یاء کو تشدید اور تخفیف دونوں کے ساتھ پڑھنا درست ہے، اور ''اصحاب الحديبية'' سے بیعت رضوان والے صحابہ کرامؓ مراد ہیں۔

قوله: وقعت الفتنة الثالثه...... وبا الناس طباخ:

شاید اس تیسرے فتنہ سے حضرت عبداللہ بن زبیرؓ اور اہل مکہ کے خلاف حجاج بن یوسف کی جنگ مراد ہے۔

فلم ترتفع: ایک دوسرے نسخہ میں (فاء کے بغیر صرف) "لم ترتفع" مذکور ہے۔

طباخ: طاء کے فتحہ، با کی تخفیف کے ساتھ ہے اور آخر میں نقطہ والی "خا" ہے۔ اس بات کی صاحب مشارق نے تصریح کی ہے اور نہایہ سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے، چنانچہ جن نسخوں میں اس لفظ کو "طا" کے کسرہ کے ساتھ نقل کیا گیا ہے وہ درست نہیں ہے۔ قاموس میں لکھا ہے، کہ یہ لفظ سحاب کے وزن پر ہے، اور "طا" کے ضمہ کے ساتھ ہی پڑھنا درست ہے، جس معنی ہے قوت، مضبوطی اور موٹاپا۔

علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں کہ "طباخ" کا اصل معنی تو ہے قوت اور موٹاپا لیکن اس لفظ کو دوسے زیادہ معانی میں بھی استعمال کیا گیا ہے، چنانچہ کہا جاتا ہے: فلان لا طباخ له، یعنی فلان کے اندر عقل اور خیر نہیں ہے۔ اس آخری جملہ کا مطلب یہ ہے کہ لوگوں میں کوئی صحابی باقی نہ رہا، لہٰذا "الناس" میں "اَل" عہدی ہے، اور "الناس" سے مراد صحابہ ہیں، یا وہ لوگ مراد ہیں جو انسانوں میں کامل رتبہ تک پہنچے ہوں۔

بَابُ الْمَلَاحِمِ

جنگ اور قتال کا بیان

"ملاحم"۔ میم کے فتحہ اور حاء کے کسرہ کے ساتھ۔ یہ" ملحمة" کی جمع ہے۔اس کا معنی ہے میدان جنگ یا گھمسان کی جنگ کا موقع اور نہایہ میں لکھا ہے کہ اس کا معنی ہے حرب اور موضع قتال۔ یہ" لحمة" سے ماخوذ ہے جس کا معنی ہے کپڑے کا بانا۔اور وجہ مناسبت یہ ہے کہ لڑائی میں لوگ ایک دوسرے اس طرح مخلوط ہو جاتے ہیں، اور اس طرح گتھم گتھا ہوتے ہیں، جیسا کہ کپڑے کا تانا اور بانا مخلوط ہوتا ہے۔

بعض کا کہنا ہے کہ یہ" اللحم" سے ماخوذ ہے، جس کا معنی ہے گوشت اور وجہ مناسبت یہ ہے کہ لڑائی میں مقتولین کے گوشت کی کثرت ہوتی ہے۔

حضور علیہ الصلوۃ والسلام کا ایک نام" نبی الملحمة" ہے، اس میں اشارہ ہے کہ آپ ﷺ جلال کا معدن اور جمال کا خزانہ ہیں، کیونکہ آپ ﷺ "نبی الرحمۃ" ہے، اور جمال وجلال کا یکجا ہونا کمال ہے، اور چونکہ آپ ﷺ اللہ تعالیٰ کے اخلاق کے ساتھ متصف تھے، اور آپ پر رحمت غالب تھی، اسی لئے آپ ﷺ کی شان میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿وما ارسلناك الا رحمة للعالمين﴾ [الانبیاء: ۱۰۷] "اور ہم نے (ایسے مضامین نافعہ دے کر) آپ کو اور کسی بات کے واسطے نہیں بھیجا مگر دنیا جہاں کے لوگوں (یعنی مکلفین) پر مہربانی کرنے کے لئے۔"

اللہ تعالیٰ کی ذات کے بارے میں حدیث قدسی میں وارد ہوا ہے: "سبقت رحمتي غضبي" (میری رحمت میرے غضب پر غالب ہے)۔اور اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ کو "یا أرحم الراحمین" کہہ کر پکارا جاتا ہے۔

بلکہ" ملحمة" ، درحقیقت سراپا رحمت ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے مشقتوں کا آجانا، اللہ تعالیٰ کی طرف سے عطیہ ہے اور آزمائش نعمتوں تک وصولی کا ذریعہ ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿وَفِي ذَٰلِكُم بَلَاءٌ مِّن رَّبِّكُمْ عَظِيمٌ﴾ [الاعراف: ۱۴۱] اور اس (واقعہ) میں تمہارے پروردگار کی طرف سے بڑی بھاری آزمائش تھی"۔

الفصل الاول:

٥٤١٠ : عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قَالَ لَاتَقُوْمُ السَّاعَةُ حَتّٰی تَقْتَتِلَ فِئَتَانِ عَظِیْمَتَانِ تَکُوْنُ بَیْنَهُمَا مَقْتَلَةٌ عَظِیْمَةٌ دَعْوَاهُمَا وَاحِدَةٌ وَحَتّٰی یُبْعَثَ دَجَّالُوْنَ کَذَّابُوْنَ قَرِیْبٌ مِنْ ثَلٰثِیْنَ کُلُّهُمْ یَزْعَمُ اَنَّهٗ رَسُوْلُ اللّٰهِ وَحَتّٰی یُقْبَضَ الْعِلْمُ وَتَکْثُرَ الزَّلَازِلُ وَیَتَقَارَبَ الزَّمَانُ وَیَظْهَرَ الْفِتَنُ وَیَکْثُرَ الْهَرْجُ هُوَالْقَتْلُ وَحَتّٰی یَکْثُرَ فِیْکُمُ الْمَالُ فَیَفِیْضَ حَتّٰی یُهِمَّ رَبَّ الْمَالِ مَنْ یَقْبَلُ صَدَقَتَهٗ وَحَتّٰی یَعْرِضَهٗ فَیَقُوْلُ الَّذِیْ یَعْرِضُهٗ عَلَیْهِ لَا اَرَبَ لِیْ بِهٖ وَحَتّٰی یَتَطَاوَلَ النَّاسُ فِی الْبُنْیَانِ وَحَتّٰی یَمُرَّ الرَّجُلُ بِقَبْرِ الرَّجُلِ فَیَقُوْلُ یَالَیْتَنِیْ مَکَانَهٗ وَحَتّٰی تَطْلُعَ الشَّمْسُ مِنْ مَغْرِبِهَا فَاِذَا طَلَعَتْ وَرَاٰهَا النَّاسُ اٰمَنُوْا اَجْمَعُوْنَ فَذٰلِكَ حِیْنَ لَا یَنْفَعُ نَفْسًا اِیْمَانُهَا لَمْ تَکُنْ اٰمَنَتْ مِنْ قَبْلُ اَوْ کَسَبَتْ فِیْ اِیْمَانِهَا وَلَتَقُوْمَنَّ السَّاعَةُ وَقَدْ نَشَرَ الرَّجُلَانِ ثَوْبَهُمَا بَیْنَهُمَا فَلَا یَتَبَایَعَانِهٖ وَلَا یَطْوِیَانِهٖ وَلَتَقُوْمَنَّ السَّاعَةُ وَقَدْ اِنْصَرَفَ الرَّجُلُ بِلَبَنِ لِقْحَتِهٖ فَلَا یَطْعَمُهٗ وَلَتَقُوْمَنَّ السَّاعَةُ وَهُوَ یَلِیْطُ حَوْضَهٗ فَلَا یَسْقِیْ فِیْهِ وَلَتَقُوْمَنَّ السَّاعَةُ وَقَدْ رَفَعَ اُکْلَتَهٗ اِلٰی فِیْهِ فَلَا یَطْعَمُهَا. (متفق علیه)

اخرجه البخاری فی صحیحه ۸۱/۱۳حدیث رقم ۷۱۲۱ واخرجه مسلم ۱۳۷/۱حدیث رقم (۲۴۸-۱۵۷)
واخرجه احمدفی المسند ۳۱۳/۲

ترجمه: ''حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''قیامت کا قیام اس وقت تک نہیں ہوگا جب تک کہ دو عظیم گروہ آپس میں نہ قتال نہ کریں گے' ان دونوں جماعتوں کے مابین شدید ترین جنگ وجدال ہوگا اور دونوں کا دعویٰ ایک ہی ہوگا (اور قیامت کا قیام نہیں ہوگا) حتی کہ حد درجہ دغا باز تمیں کے قریب جھوٹے لوگ اٹھیں گے زلزے بڑھ جائیں گے اور ان میں سے ہر ایک کا یہ دعویدار ہوگا کہ وہ اللہ کا پیغمبر ہے (اور قیامت قائم نہیں ہوگی) حتی کہ علم اٹھالیا جائے گا' زمانہ قریب ہو جائے گا' فتنے رونما ہونے لگیں گے اور ہرج یعنی قتل و قتال میں اضافہ ہو جائے گا (اور قیامت قائم نہیں ہوگی) حتی کہ تمہارے پاس مال و دولت کی اتنی فراوانی ہو جائے گی کہ مالدار شخص اس قلق اور پریشانی میں مبتلا ہوگا اس کے صدقہ کو کون قبول کرے گا' یہاں تک کہ وہ مالدار جس شخص (کو صدقہ خیرات لینے والا سمجھ کر اس) کے سامنے صدقہ خیرات کے قبول کرنے کی پیشکش کرے گا' وہ (غنائے قلبی کے سبب یا خود مالدار ہونے کی وجہ سے) یہ کہے گا کہ مجھے تمہارے اس صدقہ خیرات کے مال) کی ضرورت وحاجت نہیں ہے! (اور قیامت قائم نہیں ہوگی) حتی کہ لوگ وسیع وعریض عمارتوں کے بنانے پر باہم فخر کریں گے اور جب حتی کہ آدمی کسی قبر کے پاس سے گزرتا ہوا یہ کہے گا کہ کاش! میں اس کی جگہ ہوتا (اور قیامت قائم نہیں ہوگی) حتی کہ آفتاب مغرب کی طرف سے طلوع نہ ہوگا۔ چنانچہ جب آفتاب مغرب کی جانب سے طلوع ہوگا اور لوگ اس کو دیکھیں گے تو سب ایمان قبول کرلیں گے پس یہ وقت وہ ہوگا جب کسی اس شخص کو اس وقت اس کا ایمان قبول کرنا نفع

نہ دے گا جو اس وقت سے پہلے ایماندار نہ ہوگا اور نہ کسی شخص کے لئے اس وقت اپنے ایمان کی حالت میں نیک کام کرنا فائدہ مند ہوگا اگر اس نے اس دن سے پہلے اچھے اعمال نہیں کیئے ہوں گے اور اس میں شک نہیں کہ قیامت اچانک قائم ہوگی (یعنی پہلا صور کہ جو آغاز قیامت ہوگا' اس طرح اچانک پھونکا جائے گا) کہ دو شخصوں نے کپڑے کو کھولا ہوا ہوگا اور وہ نہ اس کا لین دین کر چکے ہوں گے اور نہ اس کو لپیٹ سکیں گے کہ اسی حالت میں قیامت آ جائے گی اور بلاشبہ قیامت اس طرح قائم ہوگی کہ ایک شخص اپنی اونٹنی کا دودھ لے کر واپس آیا ہوگا اور ابھی اس کو استعمال میں لانے کی نوبت بھی نہ آئی ہوگی کہ قیامت اس طرح واقع ہو جائے گی اور بلاشبہ قیامت اس طرح قائم ہوگی کہ ایک شخص اپنے حوض کو کی لیپ پوت کر رہا ہوگا (یعنی اپنے جانوروں کو پانی پلانے کے لئے کوئی کنڈ وغیرہ بنا تا یا اس کو درست کرتا ہوگا) اور وہ اپنے جانوروں کو اس حوض سے پانی نہ پلانے پایا ہوگا کہ قیامت آ جائے گی اور بلاشبہ قیامت اس طرح قائم ہوگی کہ ایک شخص نے منہ میں رکھنے کے لئے لقمہ اٹھایا ہوگا اور وہ اس لقمہ کو کھانے نہ پایا ہوگا کہ قیامت قائم ہو جائے گی"۔ (بخاری ومسلم)

تشریح: قوله: لاتقوم الساعة...... دعواهما واحدة:

لاتقوم: مؤنث کے صیغہ کے ساتھ بھی منقول ہے، اور مذکر کے صیغہ کے ساتھ بھی منقول ہے۔

تقتتل: مذکر ومؤنث دونوں طرح نقل کیا گیا ہے۔

فئتان عظیمتان: مذکور میں دو عظیم جماعتوں کو عظیم قرار دینا تعداد کے اعتبار سے ہے۔ (یعنی دونوں جماعتوں میں شریک ہونے والے افراد بہت زیادہ تعداد میں ہوں گے۔)

یا کیفیت کے اعتبار سے "عظیم جماعتیں" مراد ہے۔ (یعنی دونوں جماعتوں کے افراد عظمت والے ہوں گے،) کیونکہ دونوں جماعتوں میں صحابہ کرامؓ جیسی جلیل القدر شخصیات موجود تھیں۔

یا آپ علیہ الصلوٰۃ والسلام نے دونوں جماعتوں کو تغلیباً عظیم جماعتیں ارشاد فرمایا، کیونکہ حقیقت میں تو عظیم المرتبہ جماعت حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی جماعت تھی۔

اکملؒ فرماتے ہیں کہ یہ پیشینگوئی آپ علیہ الصلوٰۃ والسلام کے معجزات میں سے ہے، اس لئے کہ قرن اول ہی میں اس طرح کا واقعہ پیش آ گیا تھا۔

دعواهما واحد یعنی دونوں جماعتوں میں سے ہر ایک جماعت اسلام کا دعویٰ کرے گی۔

ابن الملکؒ فرماتے ہیں کہ " **فئتان عظیمتان** " سے حضرت علیؓ ' حضرت امیر معاویہؓ اور ان دونوں کے رفقاء مراد ہیں۔ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد "**دعواهما واحد**" سے خوارج کے اس قول کی تردید ہوتی ہے کہ دونوں جماعتیں کفر پر ہیں۔ (انتہی)

"**دعواهما واحد**" کو خوارج پر ردّ قرار دینا محض ایک دعویٰ ہے جس میں کوئی خفاء نہیں، کیونکہ اول تو دعویٰ کے تحقق سے مدعی کا اپنے دعویٰ کو حاصل کرنا لازم نہیں آتا، ثانی یہ کہ دعویٰ سے خلافت یا کسی اور چیز کا دعویٰ بھی مراد لیا جا سکتا ہے۔

قوله: وحتى يبعث دجالون كذابون......انه رسول الله:

يبعث دجالون: یعنی عالم غیب سے اس عالم موجود میں بھیج دیئے جائیں گے اور ظاہر ہو جائیں گے۔

دجالون: شدید فساد پھیلانے والے۔

كذابون: یعنی اللہ اور اللہ کے رسول کے خلاف جھوٹ بولنے والے۔

شرح السنہ میں لکھا ہے، کہ ہر جھوٹا شخص دجال ہے۔ کہا جاتا ہے: "دجل فلان الحق بباطله" "فلاں نے باطل بات کر کے حق کو چھپا دیا"۔ اور اسی لفظ دجل سے "دجال" ماخوذ ہے۔ کہا جاتا ہے۔ "دجله" کہ فلاں نے جادو کیا یا فلاں نے جھوٹ بولا۔

بقول بعض " دجال" کو دجال اس لئے کہا جاتا ہے کہ یہ لوگوں کو جھوٹ سنا کر شک میں ڈالے گا، کیونکہ " دَجَل " کا معنی "لوگوں کو جھوٹی بات سنا کر شک میں ڈالنا" بھی آتا ہے۔

"قريب من ثلاثين": حدیث کے یہ الفاظ ان روایات کے منافی نہیں ہیں کہ جن میں یقین کے ساتھ تعداد تیس ۳۰ بتائی گئی ہے۔ کیونکہ گذشتہ حدیث کے وہ الفاظ یا تو بعد میں ارشاد فرمائے گئے، یا اُن گذشتہ الفاظ سے بھی تقریباً تیس ۳۰ مراد ہیں۔

علاوہ ازیں یہ حدیث اس کے بھی منافی نہیں جس کو طبرانی نے حضرت ابن عمرؓ سے نقل کیا ہے:

"لا تقوم الساعة حتى يخرج سبعون كذاباً".

اس حدیث میں ستر ۷۰ کے عدد سے کثرت تعداد مراد ہے۔

یا اس حدیث میں مذکورہ ستر ۷۰ اور حدیث بالا میں مذکورہ عدد تیس ۳۰ سے الگ الگ قسم کے کذاب مراد ہیں، اور وہ اس طرح کہ طبرانی کی حدیث میں مذکورہ ستر میں سے تیس کذاب وہ لوگ ہیں جو نبوت کا دعویٰ کرینگے۔ اور چالیس اس کے علاوہ ہونگے اس طرح سو (۱۰۰) پورے ہو جائیں گے۔

كلهم يزعم أنه رسول الله: ایک اور نسخہ میں "رسول الله" کی بجائے "نبی الله" کے الفاظ ہیں۔

قوله: وحتى يقبض العلم ......وهو القتل

يقبض العلم: "علم" سے مراد کتاب وسنت کا وہ علم ہے جو نافع ہو اور علم کے اٹھائے جانے کی صورت یہ ہوگی کہ اللہ تعالیٰ علماء اہل سنت والجماعت کو اٹھا لے گا، اور پیچھے جاہل اور بدعتی لوگ رہ جائیں گے۔

وتكثر الزلازل: زلزلوں سے حسی زلزلے (یعنی زمین کا حرکت کرنا) مراد ہے، یا معنوی زلزلے یعنی مختلف قسم کی آزمائشیں مراد ہیں، کیونکہ علماء کی موت عالَم کی موت ہے۔

يتقارب الزمان: علامہ خطابیؒ فرماتے ہیں کہ اس مذکورہ زمانے سے امام مہدی علیہ السلام کا زمانہ مراد ہے، کیونکہ امام مہدی علیہ السلام کے زمانے میں زمین پر امن وامان کی فضاء قائم ہو جائے گی، جس وجہ سے لوگوں کو زندگی کی لذت نہایت

فرحت واطمینان ہونے کے باعث امام مہدی علیہ السلام کا زمانہ مختصر معلوم ہوگا، کیونکہ خوشی کا وقت اگر طویل بھی ہوتو مختصر معلوم ہوتا ہے، اور غم ورنج کا وقت مختصر بھی ہوتو طویل معلوم ہوتا ہے۔

يظهر الفتن: فتنوں کے ظہور کی وجہ سے زندگی گزارنے میں دشواریاں پیدا ہوجائیں گی۔

ويكثر الهرج: کثرت سے مراد عام ہوجانا اور برقرار رہنا ہے۔ "وهو القتل:" کے احتمال ہے کہ یہ حضور ﷺ کے الفاظ ہوں، لیکن راجح یہ ہے کہ یہ الفاظ راوی کے ہیں، جن سے لفظ "الهرج" کی تفسیر کرنا مقصود ہے، اور یہ جملہ معترضہ ہے۔

قوله: وحتى حتى يكثر فيكم المال...... لاأرب لي فيه:

"يفيض": منصوب اور مرفوع دونوں طرح پڑھا گیا ہے۔ یہ "فاض الماء" سے مأخوذ ہے، جس کا معنی ہے برتن کا پانی سے بھر جانے کی وجہ سے چھلک جانا۔ "يفيض" کی ضمیر کا مرجع لفظ "المال" ہے، اور اس جملہ سے حصول مال میں مبالغہ بتانا مقصود ہے۔

يهم: یاء کے ضمہ هاء کے کسرہ اور میم کی تشدید کے ساتھ "أهم" کا مضارع ہے، جس کا معنی ہے غمزدہ کرنا، پریشان کرنا۔ اور "رب المال" مفعول بہ ہونے کی بناء پر منصوب ہوگا۔ اور "من يقبل صدقته" فاعل بنے گا اور مضاف مقدر مانا جائے گا، ای: "حتى يوقع في الحزن فقدان من يقبل الصدقة رب المال" مطلب یہ ہے کہ ایسا شخص نہیں ملے گا جو صدقہ قبول کرے جبکہ زکاۃ کی ادائیگی کے صحیح ہونے کیلئے کسی کو مالک بنانا ضروری ہے، اور زکاۃ کی وصولی کے صحیح ہونے کیلئے قبضہ ضروری ہے۔

اور ایک نسخہ میں "يهم"۔ یاء کے فتحہ اور هاء کے ضمہ کے ساتھ۔ همّ کا مضارع ہے جس کا معنی ہے، غمزدہ اور پریشان کرنا، اس صورت میں بھی لفظ "رب المال" مفعول بہ ہے۔

بعض نسخوں میں "يهم" کو یاء ضمہ اور هاء کے فتحہ کے ساتھ "همّ به" ارادہ کرنا کا مضارع قرار دیا گیا ہے، (اور "رب المال" کو فاعل ہونے کی بناء پر مرفوع) اور "من يقبل صدقته" کو مفعول بہ ہونے کی بناء پر منصوب قرار دیا گیا ہے۔

ہمارے زمانے کے معروف عادت کے برعکس مالدار لوگ مال کو لیکر فقیروں کو تلاش کریں گے، اس ترکیب میں اصل استعمال کے اعتبار سے "من يقبل صدقته" پر باء داخل ہونا چاہئے تھا (کیونکہ "همّ يهم قصد" کے معنی میں اس وقت استعمال ہوتا ہے جب باء جارہ کے ذریعے متعدی ہو) لیکن باء داخل نہیں ہے اس لئے "من يقبل صدقته" ترکیب میں منصوب بنزع الخافض ہوگا۔ لفظ "يهم" کی پہلی ضبط اور پہلی ترکیب زیادہ ظاہر اور قابل اعتماد ہے۔

امام نوویؒ صحیح مسلم کی شرح میں فرماتے ہیں کہ علماء نے "يهم" کو دو طریقوں سے پڑھا ہے، لیکن زیادہ مشہور یہ ہے کہ یا ضمہ کے ساتھ اور هاء کسرہ کے ساتھ پڑھا جائے۔

علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں کہ جامع الاصول میں "يهم" یاء کے ضمہ کے ساتھ ضبط کیا گیا ہے، اور "رب المال" کو اس کا مفعول اور اسم موصول کو صلہ کے ساتھ لاکر فاعل قرار دیا گیا ہے۔

"يعرضه": راء کے کسرہ کے ساتھ مقدر عبارت پر عطف ہے، ای: "حتى يهم طلب من يقبل الصدقة صاحب المال فيطلبه حتى يجده وحتى يقرضه".اھ۔ مالدار شخص مال لے کر فقیر کو ڈھونڈتا پھرے گا تاکہ کوئی فقیر شخص اس کو ملے اور زکوۃ کا مال اس کو دے۔

"أرب"، ہمزہ مفتوح ہے، بمعنی "حاجة ۔ (یہ کہنے کی دو وجوہات ہوسکتی ہیں)

1 شخص قلبی غنا کی وجہ سے یہ جواب دے کر مال رد کرے گا۔

2 مالدار ہونے کی وجہ سے یہ جواب دے کر مال کو رد کرے گا۔

لیکن بظاہر اس وقت دونوں قسم کا غنا (قلبی و دستی غنا) حاصل ہوگا، گویا کہ سارے لوگوں کو مال مل جائے گا، اور ساتھ ہی ہر ایک شخص اپنے مال پر قناعت کرے گا، اور مزید مال جو سرکشی کا سبب بنے، یا ضرورت سے زائدہ ہو، اس کی چاہت نہ ہوگی، ورنہ تو یہ بات واضح ہے کہ اگر انسان کو سونے چاندی کی دو،۲ وادیاں مل جائیں، تو یہ انسان تیسری کی تلاش کرے گا، اور اس انسان کا پیٹ تو قبر کی مٹی ہی سے بھر سکتا ہے، اور جو شخص توبہ کرے گا اللہ اُس کی توبہ قبول کرے گا، جیسا کہ ایک حدیث میں وارد ہوا ہے بلکہ یہ قرآن کریم کا منسوخ حصہ ہے کہ "فكان أهل ذالك الزمان كلهم ممن تاب الله عليهم...... "جس کا ترجمہ یہ ہے کہ اُس زمانہ کے تمام لوگوں کی توبہ کو اللہ قبول کرے گا، یہاں تک کہ یہ لوگ رضاء بالقضاء کے مقام تک پہنچ جائیں گے، اور بقدر ضرورت مال پر کفایت کریں گے اور اللہ کی دین پر راضی ہو کر لوگوں سے مستغنی ہوں گے۔ کیونکہ لوگوں کی طرف توجہ کرنا اور لوگوں کو اپنا سہارا بنانا افلاس کی علامت ہے۔

قوله: حتى يتطاول الناس في البنيان:

مطلب یہ ہے کہ یا تو لمبی چوڑی عمارتیں بنا کر فخر کریں گے یا عمارتوں کی تزیین و تحسین پر فخر کریں گے۔ اور یہ امام مہدی علیہ السلام کا زمانہ نہ ہوگا، بلکہ ان کے بعد والا زمانہ ہوگا یا پہلے والا زمانہ ہوگا، کیونکہ آج کل کے زمانے میں بھی لمبی چوڑی عمارتیں بنانا، اور اس پر فخر کرنا موجود ہے، اور ہر جگہ مکانات اور تعمیرات پر فخریہ گفتگو زبان زد ہے۔ اور بڑی بڑی عمارتوں کے ذریعے شان شوکت ظاہر کرنے کی غرض سے آج کل لوگوں نے عبادت گاہوں کو مسمار کر کے ان جگہوں میں سیر و تفریح کے لئے باغیچے اور باغات لگا دیئے۔

قوله: وحتى يمر الرجل......ياليتني مكانه:

یعنی یا تو دنیاوی معاملات میں غم و فکر کی کثرت کی وجہ سے یا دینی معاملات میں مشکلات اور غموں کی کثرت کی وجہ سے یا آزمائشوں کی کثرت کی وجہ سے یہ بات کہے گا جبکہ ان آزمائشوں سے نکلنے کا کوئی اور راستہ نظر نہ آئے گا۔ وہ شخص یہ بات اپنے رشتہ داروں میں سے کسی کی قبر پر یا کسی اجنبی شخص کی قبر پر آ کر کہے گا۔

فیقول: اس کو منصوب اور مرفوع دونوں طرح پڑھا گیا ہے۔

يا ليتني مكانه: یہ نقل بالمعنی ہے، ورنہ (درحقیقت لفظ "مكانه" کی بجائے) "مكانك" ہونا چاہئے، مطلب یہ ہوا کہ

کاش! میں مرجاتا، تاکہ مجھے یہ فتنے اور مصائب نہ دیکھنے پڑتے۔

قولہ: وحتی تطلع الشمس ...... فی ایما نها خیرا:

"اجمعون": "الناس" کے لئے تاکید ہے، یا" الناس" کی طرف لوٹنے والی ضمیر کیلئے تاکید ہے۔ یعنی لوگ جب قیامت کی اس واضح نشانی کو دیکھ لیں گے، تو ایمان لے آئیں گے، حالانکہ ان لوگوں سے تو ایمان بالغیب مطلوب ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿الذین یؤمنون بالغیب﴾[البقرۃ:۲] "وہ اللہ سے ڈرنے والے لوگ ایسے ہیں کہ یقین لاتے ہیں چھپی ہوئی چیزوں پر"۔ اور اسی وجہ سے حضور ﷺ نے اگلی بات ارشاد فرمائی۔

ذالك: اس کا مشار الیہ وقت مذکور ہے۔

حین لا ینفع نفسًا ایمانها": یعنی اس واضح نشانی کے ظاہر ہونے کے بعد لایا ہوا ایمان اور ایمان پر مرتب ہونے والے نیک اعمال نفع نہیں دیں گے۔ اور ارشاد باری: لم تکن آمنت من قبل او کسبت فی ایمانها خیرًا میں اسی بات کی تصریح ہے (کہ یہ ایمان پہلے کا نہیں بلکہ اب قیامت کی اس واضح نشانی کے ظہور کے بعد والا ایمان ہے۔) "أو" نوع بیان کیلئے ہے، کیونکہ کبھی ایمان تو ہوتا ہے، مگر عمل صالح ساتھ نہیں ہوتا، اور کبھی ایمان کے ساتھ عمل صالح بھی ہوتا ہے، لیکن چونکہ یہ ایمان اور نیک اعمال حالت یاس اور حالت باس میں حاصل ہوئے ہیں، اس لئے ان کا فائدہ نہیں ہوگا۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿فَلَمْ يَكُ يَنفَعُهُمْ إِيمَانُهُمْ لَمَّا رَأَوْا بَأْسَنَا﴾ [غافر:۸۵] "سو ان کو ان کا یہ ایمان لانا نافع نہ ہوا جب انہوں نے ہمارے عذاب کو دیکھ لیا۔"

بعض نے تقدیر عبارت اس طرح بیان کی ہے:"لا ینفع ایمانها ولا کسبها ان لم تکن آمنت من قبل أو لم تکن کسبت"

گویا کہ کلام میں ایک تقدیری اجمال اور ظاہری تفصیل ہے۔

بعض حضرات نے "لم تکن آمنت" کو "نفسًا" کی صفت کہا ہے۔ لیکن بہتر یہ ہے کہ اس کو جملہ مستأنفہ قرار دیا جائے، تاکہ موصوف اور صفت کے درمیان فصل نہ ہو۔ اور "من قبل" مضاف الیہ محذوف ہے، اور وہ مضاف الیہ "اتیان بعض آیات الرب" ہے جیسا کہ قرآن شریف میں ابہام و احتمال کے ساتھ مذکور ہے یا "طلوع الشمس من مغربها" ہے جیسا کہ حدیث میں اس کی تفسیر منقول ہے۔

"أو کسبت" کا عطف "آمنت" پر ہے۔ اور "خیرًا" سے توبہ یا اخلاص مراد ہے، چنانچہ اس کی تنوین تعظیم کیلئے ہے، ای: "لا ینفع تلك النفس ایمانها وقبول توبتها". اور یہاں أو نوع بیان کا فائدہ دے رہا ہے۔ گویا کہ عبارت یوں ہے "لا ینفعها توبة عن الشرك ولا توبة عن المعاصی" (نہ تو شرک سے توبہ کرنا کارآمد ہوگا، اور نہ گناہوں سے توبہ کرنا کچھ مفید ثابت ہوگا)۔

اس ترکیب و تقریر سے معتزلہ کا وہ استدلال دفع ہوگیا، جو انہوں نے اس آیت سے کیا ہے کہ عمل جس کو "خیر" سے تعبیر

کیا گیا ہے ایمان کی جزاء ہے جبکہ ارشاد ربانی کے یہ الفاظ "فی ایمانها خیراً" اس کے خلاف ہیں۔

بعض نے لکھا ہے کہ ایمان اور توبہ کا قبول نہ ہونا، ان لوگوں کے ساتھ خاص ہے جو مغرب سے سورج کے طلوع ہونے کو دیکھ لیں گے' لہٰذا جو شخص اس علامت (مغرب سے سورج کے طلوع ہونے) کے بعد پیدا ہوگا یا جس نے یہ علامت دیکھی نہیں ہو گی اس کا ایمان لانا اور توبہ کرنا دونوں قبول کئے جائیں گے۔ لیکن صحیح قول یہ ہے کہ ایمان لانے اور توبہ کرنے کا قبول نہ ہونا کسی کے ساتھ بھی خاص نہیں ہے۔ کیونکہ صحیح حدیث میں وارد ہوا ہے: ان التوبة لا تزال مقبولة حتی یغلق بابها 'فاذا طلعت الشمس من مغربها أغلق۔

"بندے کی توبہ قبول کی جاتی ہے جب تک توبہ کی قبولیت کا دروازہ بند نہ ہو چنانچہ جب سورج مغرب سے طلوع ہوگا، تو توبہ کی قبولیت کا دروازہ بند ہو جائے گا۔"

قوله: ولتقومن الساعة.....ولا یطویانه: "الساعة" سے مراد نفخۂ اولیٰ (پہلی بار صور کا پھونکا جانا) ہے، اور اس نفخۂ اولیٰ کو "الساعة" سے اس لئے تعبیر کیا کہ یہ قیامت کے مقدمات میں سے ہے۔

وقد نشر الرجلان: یہ جملہ ترکیب میں حال واقع ہو رہا ہے۔ ای والحال انهافتحا (یعنی قیامت اس طرح اچانک قائم ہوگی کہ دو شخصوں نے کپڑا (خرید و فروخت کیلئے) پھیلایا ہوا ہوگا، اور اچانک قیامت آ جائے گی۔)

ثوبهما بینهما: "ثوب" کی اضافت دونوں کی طرف کی گئی (حالانکہ کپڑا ایک کا ہوگا) چونکہ ایک تو کپڑے کا مالک ہوگا، اور دوسرا کپڑے کا طالب ہوگا۔ اور ابھی تک خرید و فروخت مکمل نہیں ہوئی ہوگی' اور نہ کپڑے کو لپیٹ کر ایک دوسرے سے ابھی تک جدا ہوئے ہوں گے، بلکہ ابھی تک اس خرید و فروخت ہی میں مشغول ہوں گے کہ قیامت اچانک آ جائے گی، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿مَا يَنظُرُونَ إِلَّا صَيْحَةً وَاحِدَةً تَأْخُذُهُمْ وَهُمْ يَخِصِّمُونَ فَلَا يَسْتَطِيعُونَ تَوْصِيَةً وَلَا إِلَىٰ أَهْلِهِمْ يَرْجِعُونَ﴾ [یٰس: ۴۹، ۵۰]

"یہ تو ایک چنگھاڑ کے منتظر ہیں جو ان کو اس حال میں کہ باہم جھگڑ تے ہوں گے آ پکڑے گی' پھر نہ تو وصیت کر سکیں گے اور نہ اپنے گھر والوں کے پاس واپس جا سکیں گے۔"

حاصل یہ ہے کہ لوگ اپنے اپنے کاموں میں مصروف ہونگے کہ اچانک قیامت آ جائے گی۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿لَا تَأْتِيكُمْ إِلَّا بَغْتَةً﴾ [الاعراف: ۱۸۷] "نہیں آئے گی مگر اچانک"۔

قوله: وتقتومن الساعة وقد انصرف......فلا یطعمه:

"لقحة": لام کے کسرہ اور قاف کے سکون کے ساتھ' دودھ والی اُونٹنی۔

فلا یطعمه: یعنی کسی شخص نے اگر اونٹنی کا دودھ دوہ کر ہاتھ میں پینے کیلئے اٹھایا ہوا ہوگا تو اس کو پینے نہ پایا ہوگا کہ قیامت قائم ہو جائیگی۔

یلیط: یاء کے فتحہ کے ساتھ۔"لیپنا"۔

فلا یسقی: یاء پر فتحہ اور ضمہ دونوں پڑھنا جائز ہے۔

فیہ: ضمیر کا مرجع "حوض" ہے۔

مطلب یہ ہے کہ لوگ اپنے کاموں میں مشغول ہونگے اور قیامت اس طرح اچانک آجائے گی کہ اس کام کو پورا کرنے کی مہلت نہیں ملے گی۔

قولہ: ولتقومن الساعۃ وقد رفع اکلتہ الی فیہ فلا یطعمھا:

"اکلۃ": ہمزہ کے ضمہ کے ساتھ "لقمہ"۔ یہ صورت بنسبت دوسری صورتوں کے بلا زیادہ بلیغ ہے۔

۵۴۱۱ وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا تَقُوْمُ السَّاعَةُ حَتّٰى تُقَاتِلُوْا قَوْمًا نِعَالُهُمُ الشَّعْرُ وَحَتّٰى تُقَاتِلُوا التُّرْكَ صِغَارَ الْاَعْيُنِ حُمْرَ الْوُجُوْهِ ذُلْفَ الْاُنُوْفِ كَاَنَّ وُجُوْهَهُمُ الْمَجَانُّ الْمُطْرَقَةُ۔ (متفق علیہ)

اخرجہ البخاری فی صحیحہ ۱۰٤/٦ حدیث رقم ۲۹۲۸ ومسلم فی صحیحہ ۲۲۳۳/٤ حدیث رقم (۱۱-۲۹۱۲) اخرجہ ابو داؤد فی السنن ٤۸٦/٤ حدیث رقم ٤۳۰٤ والترمذی فی السنن ٤۳۰/٤ حدیث رقم ۲۲۱۵ والنسائی فی ۲٤/٦ حدیث رقم ۳۱۷۷ وابن ماجہ ۱۳۷۱/۲ حدیث رقم ٤۰۹٦ واحمد فی المسند ۳۳۹/۲

ترجمہ: "حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: "قیامت اس وقت تک قائم نہ ہوگی جب تک اس قوم سے قتال کر نہ کرو گے جن کے جوتے بالدار چمڑے کے ہوں گے اور جب تک تم ترکوں سے قتال نہیں کرو گے جو چھوٹی آنکھوں والے سرخ چہروں والے اور چپٹی ناک والے ہوں گے' گویا ان کے منہ چمڑے کی تہہ بہ تہہ ڈھال کی مانند ہوں گے"۔ (بخاری ومسلم)

تشریح: **قولہ: لاتقوم الساعۃ حتی تقاتلوا قوما نعالھم الشعر:**

الشعر: شین اور عین دونوں کے فتحہ کے ساتھ پڑھنا بھی جائز ہے اور شین کے فتحہ اور عین کے سکون کے ساتھ پڑھنا بھی جائز ہے۔"الشعر" سے وہ چمڑا مراد ہے، جس کو دباغت نہ دی گئی ہو اور بالدار ہو۔

قولہ: حتی تقاتلوا الترک ......:

الترک: امام سدیؒ فرماتے ہیں کہ "ترک" سے یا جوج ماجوج کی جماعت مراد ہے۔ حضرت قتادہؒ فرماتے ہیں: کہ "ترک کے بائیس ۲۲ گروہ تھے، اکیس ۲۱ گروہوں کو حضرت ذوالقرنین نے دیوار کے پیچھے قید کر دیا تھا اور ایک گروہ باقی رہ گیا تھا۔ اسی باقی ماندہ گروہ کو "ترک" کہا جاتا ہے۔

"ترک" اس لئے کہا جاتا ہے کہ ان کو ذوالقرنین نے قید نہیں کیا تھا بلکہ یونہی آزاد چھوڑ دیا تھا۔

صغار: منصوب ہے۔ آنکھوں کا چھوٹا پن دنیا کی حقیر وصغیر اشیاء کی حرص اور بخل سے کنایہ ہے۔

حمر الوجوہ: اپنے باطن کی شدت حرارت اور شدت غضب کی وجہ سے ان کے چہرے سرخ ہونگے۔

"ذُلف": ذال کے ضمہ کے ساتھ ''چھوٹی ناک''

''ناک کا چھوٹا ہونا'' یہ کنایہ ہے کہ ان کو حق کی بُو تک نہیں لگی ہوگی۔

یا مطلب یہ ہے کہ ان کی ناک چوڑی اور چپٹی ہوگی' اور ناک کا چوڑا ہونا اشارہ ہے کہ ان میں حق و باطل دونوں اس طرح داخل ہوں گے، کہ ان کو حق و باطل کے درمیان تمیز نہ ہوگی۔

اور زیادہ واضح یہ ہے، کہ **"ذلف الانوف"** کا معنی ہے **"فطس الأنوف"** جیسا کہ اگلی روایت میں آ رہا ہے۔ اور **"فطس" أفطس** کی جمع ہے،'' **فطس** ''فاء اور طاء دونوں کے فتحہ کے ساتھ۔ سے مأخوذ ہے۔ اس کا معنی ہے ناک کا جھکا ہوا اور چپٹا ہونا ہے، جس کا حاصل ناک کا چوڑا ہونا ہے۔

قاضیؒ فرماتے ہیں کہ **"ذلف" أذلف** کی جمع ہے ''اذلف'' وہ شخص جس کی ناک چھوٹی ہو، اور اس کا کنارا سخت ہو۔

كأن: نون کی تشدید کے ساتھ۔

المجان: میم کے فتحہ اور نون کی تشدید کے ساتھ یہ ''مجن''۔ میم کے کسرہ کے ساتھ کی جمع ہے' جس کا معنی ہے، ڈھال۔

المطرقة: میم کے ضمہ اور راء کی تخفیف اور فتحہ کے ساتھ۔ اس کا معنی ہے ایسی ڈھال جس پر تہہ بہ تہہ چمڑا لگا ہوا ہو۔

بعض نے'' **المطرقة**'' کا معنی یہ بیان کیا ہے کہ وہ چمڑا جس کو مکمل ڈھال پر چڑھایا جائے۔

بعض نے لکھا ہے کہ **"المطرقة"** اطراق، مصدر سے اسم مفعول ہے، اور'' **اطراق**'' کا معنی ہے ''طِرق چڑھانا''۔ **طِرق** (طاء کے کسرہ کے ساتھ) کا معنی ہے ''چمڑا''۔ چنانچہ'' **المطرقة** '' کا معنی یہ ہوا کہ وہ ڈھال کے ایک طرق چمڑا لگایا گیا ہو۔ اھ۔

ان لوگوں کے چہروں کو گولائی اور چوڑا ہونے کو ڈھال کے ساتھ تشبیہ دی ہے اور ان کے چہروں کی سختی اور چہروں کے پُر گوشت ہونے کو'' **المطرقة** '' کے ساتھ تشبیہ دی۔

اس میں اشارہ ہے کہ ان کے چہروں میں چونکہ خشکی ہے اور وہ چہرے پُر گوشت اور سخت ہیں، اس لئے وہ مال کے حریص ہونگے اور ان میں نہ تو انسانیت کی نرمی ہوگی اور نہ کوئی انسانی مناسبت اور نہ احسان سے کوئی لگاؤ بلکہ یہ مخلوق گویا کہ انسانوں کی ایک اور نوع ہے، اور ان کو انسان کی بجائے ''**نسناس**'' کہنا زیادہ مناسب ہوگا۔ اور ان کی مذمت کیلئے اتنا ہی کافی ہے کہ یہ قوم یاجوج ماجوج اور ان کا ایک نمونہ ہے۔ اس لئے اس بات میں تو کوئی شک ہی نہیں کہ یہ لوگ انتہائی فسادی اور دوسرے لوگوں کیلئے انتہائی مضر ہونگے۔ اللہ تعالیٰ قیامت تک ہمیں ان کے چہرے نہ دکھائے۔

قاضی عیاض رحمۃ اللہ فرماتے ہیں کہ آئندہ حدیث میں یہ صفات خوز اور کرمان (کے لوگوں) کی بتائی گئی ہیں، اور اگر یہ کسی راوی کا تصرف نہ ہو، تو شاید ان دونوں سے تُرک کی دو صفات مراد ہوں۔ کہ ان دونوں میں سے ایک کے آباؤ اجداد میں

سے کوئی ایک خوز سے ہو، اور دوسرے کے آباؤ اجداد میں سے کوئی ایک کرمان سے ہو، چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے ان کو ان کے ناموں سے موسوم فرما دیا ہو، اگرچہ ہمارے نزدیک یہ بات مشہور نہیں، جیسا کہ بعض لوگوں نے قنطوراء کے بارے میں کہا ہے کہ یہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی باندی تھی۔ اور شاید کہ اس قتال سے مراد وہ قتال ہو جو اس زمانے میں ترک اور مسلمانوں کے درمیان ہوا تھا۔ اھ۔

زیادہ راجح یہ معلوم ہوتا ہے، کہ اس میں چنگیز خان کے وحشیانہ فسادات خصوصاً بغداد میں اس نے جو کچھ کیا اس کی طرف اشارہ ہے۔ واللہ رؤوف بالعباد۔

۵۴۱۲: وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا تَقُوْمُ السَّاعَةُ حَتّٰى تُقَاتِلُوْا خُوْزًا وَكِرْمَانَ مِنَ الْاَعَاجِمِ حُمْرَ الْوُجُوْهِ فُطْسَ الْاُنُوْفِ صِغَارَ الْاَعْيُنِ وُجُوْهُهُمُ الْمَجَانُّ الْمُطْرَقَةُ نِعَالُهُمُ الشَّعْرُ۔ (رواه البخاری)

اخرجه البخاری فی صحيحه ٦٠٤/٦ حديث رقم ٣٥٩٠ وابن ماجه فی السنن ١٣٧٢/٢ حديث رقم واحمد فی المسند ٣١٩/٢۔

ترجمہ: "حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے منقول کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: "قیامت کا قیام نہیں ہوگا یہاں تک کہ تم اہل عجم میں سے خوز و کرمان کے لوگوں سے جنگ نہ کرلو گے جو لوگ سرخ چہروں بیٹھی ہوئی ناک اور چھوٹی چھوٹی آنکھوں والے ہوں گے اور چہرے تہہ بہ تہہ چمڑے کی ڈھال کی مانند ہوں گے اور ان کے جوتے بالدار چمڑے کے ہوں گے۔ (بخاری)

تشریح: قوله: لاتقوم الساعة حتی تقاتلوا خوزا و کرمان ....:

"خوز": خاء پر ضمہ، واؤ ساکن اور آخر میں زاء ہے۔ قاموس میں لکھا ہے کہ "الخوز" خاء کے ضمہ کے ساتھ ہے، اس کا معنی ہے لوگوں کی ایک جماعت، اور خوزستان کے تمام علاقوں کو "خوز" کہا جاتا ہے۔

"کرمان": کاف مکسور ہے اور مفتوح بھی پڑھا جاتا ہے، اور صحیح نسخوں میں اسی طرح ہے، لیکن قاموس میں ہے کہ "کرمان" فارس اور بجستان کے درمیان ایک علاقے کا نام ہے۔

تورپشتی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "الخوز" کا معنی ہے لوگوں کا ایک گروہ ایک زمانہ کے لوگ، اور حدیث میں یہ لفظ تنوین کے ساتھ اس طرح منقول ہے کہ بیچ والا حرف ساکن ہے۔ ابن الاثیر نے اس لفظ کو خائے معجمہ کے ضمہ اور زاء کے ساتھ اضافت کے ساتھ کیا ہے۔ چنانچہ بغیر واؤ کے "خوز کرمان" کہا جاتا ہے۔ نیز فرمایا کہ "خوز و کرمان" بھی مروی ہے۔ فرمایا کہ "خوز" کا معنی ہے لوگوں کا ایک گروہ ہے، اور "کرمان" عجم میں ایک معروف یا لازدہ جگہ ہے۔ (یعنی انتہائی سرد علاقہ ہے۔) اور مہلہ کے ساتھ بھی مروی ہے، یہ فارس کا ایک علاقہ ہے۔ امام دار قطنی رحمہ اللہ نے اس قول کو صحیح قرار دیا ہے۔ بعض کا کہنا یہ ہے کہ اگر اضافت کے ساتھ پڑھا جائے تو پھر راء کے ساتھ ہے۔ اور اگر عطف کے ساتھ پڑھا جائے تو پھر زاء کے ساتھ

"من الأعاجم": یہ "خوز" اور "کرمان" کے لئے بیان ہے۔ شارح فرماتے ہیں، کہ ان سے تُرک کی دو قسمیں مراد ہیں، ان کو ان کے آباء کے نام سے موسوم کیا گیا ہے اسے خرستان اور کرمان کے لوگوں پر محمول نہیں کرتے کیونکہ مذکورہ بالا صفات سے متصف خورستان اور کرمان کے لوگ نہیں ہیں، بلکہ یہ اوصاف تُرکوں میں پائے جاتے ہیں۔

۵۴۱۳ : وَفِیْ رِوَایَةٍ لَهٗ عَنْ عَمْرٍو بْنِ تَغْلِبَ عِرَاضِ الْوُجُوْهِ۔

اخرجه البخاری فی صحیحه ۱۰۳/۶ حدیث رقم ۲۹۲۷۔

ترجمہ: اور صحیح بخاری ہی میں عمرو بن تغلب سے بھی انہی الفاظ میں روایت مروی ہے کہ وہ چوڑے چہرے والے ہوں گے۔

راویٔ حدیث:

عمرو بن تغلب۔ یہ عمرو بن تغلب "عبدی" ہیں۔ قبیلہ "عبدالقیس" میں سے تھے۔ ان سے حسن بصری رحمہ اللہ وغیرہ روایت کرتے ہیں۔ "تغلب" اوپر دو نقطوں والی تاء اور غین معجمہ کے ساتھ ہے۔ "تغلب" (بروزن فعل اور علمیت کی وجہ سے غیر منصرف ہے۔

عراض: اعراب حکائی کی بناء پر اس کو منصوب پڑھنا اور خبر مقدم کیلئے مبتدا مؤخر ہونے کی بناء پر مرفوع پڑھنا بھی جائز ہے۔

۵۴۱۴ : وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ لَا تَقُوْمُ السَّاعَةُ حَتّٰی یُقَاتِلَ الْمُسْلِمُوْنَ الْیَهُوْدَ فَیَقْتُلُهُمُ الْمُسْلِمُوْنَ حَتّٰی یَخْتَبِیَ الْیَهُوْدِیُّ مِنْ وَّرَاءِ الْحَجَرِ وَالشَّجَرِ فَیَقُوْلُ الْحَجَرُ وَالشَّجَرُ یَا مُسْلِمُ یَا عَبْدَ اللّٰهِ هٰذَا یَهُوْدِیٌّ خَلْفِیْ فَتَعَالَ فَاقْتُلْهُ اِلَّا الْغَرْقَدُ فَاِنَّهٗ مِنْ شَجَرِ الْیَهُوْدِ ۔ (رواه مسلم)

اخرجه البخاری فی صحیحه ۱۰۳/۶ حدیث رقم ۲۹۲۶ ومسلم فی صحیحه ۲۲۳۹/۴ حدیث رقم (۸۲-۲۹۲۲) واحمد فی المسند ۴۱۷/۲

ترجمہ: "حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: "قیامت کا قیام اس وقت تک نہ ہوگا جب تک کہ مسلمان یہودیوں کے ساتھ قتال نہ کریں گے چنانچہ (اس لڑائی میں) مسلمان یہودیوں کی انتہائی قتل وغارت کریں گے (یعنی ان پر غلبہ حاصل کریں گے) یہاں تک کہ یہودی پتھر اور درخت کے پیچھے پناہ کی خاطر چھپتا پھرے گا اور وہ پتھر و درخت پکار کر کہے گا کہ اے مسلمان! اے بندہ خدا! ادھر آ میرے پیچھے یہودی چھپا بیٹھا ہے اس کو قتل کر دے۔ مگر غرقد کا درخت (ایسا نہ کہے گا) اس لئے کہ وہ یہودیوں کا درخت ہے"۔ (مسلم)

تشریح: قوله: وعنه:

مضمون سابق کی طرف دیکھتے ہوئے اس ضمیر کا مرجع ابوہریرہؓ ہے، جبکہ ایک صحیح نسخہ میں ضمیر کی بجائے "عن ابی هریرةؓ

یا لاطیار دہوا ہے، تاکہ اس بات کا وہم نہ رہے کہ ضمیر کا مرجع بعد والا صحابی (حضرت عمرو بن تغلبؓ) ہے۔قریب میں حضرت عمرو بن تغلبؓ کا ذکر ہوا ہے اس لیے قرب کی وجہ سے اس بات کا گمان ہوتا ہے، کہ ضمیر کا مرجع یہی قریب الذکر شخص (یعنی حضرت عمرو بن تغلبؓ) ہے۔

قوله: لا تقوم الساعة......الاحجر و الشجر:

یقتل: بمعنی "قتال" ہے یا بمعنی غالب آنے کے ہے۔

قوله: فقيول الحجر و الشجر......الا الغرقده:

يا مسلم! يا عبد الله! مسلمان کی عظمت شان کے پیش نظر دونوں قسم کے الفاظ سے خطاب کرے گا۔

الا الغرقد: "الشجر" سے مستثنیٰ ہے۔غرقد ایک خاردار درخت ہے، جس کو "عوسج" کہا جاتا ہے۔(كذا ذكره الشارح) اور نہایہ میں لکھا ہے کہ غرقد ایک قسم کی کانٹے دار جھاڑی ہے۔کہا گیا ہے کہ مدینہ منورہ کے قبرستان "جنت البقیع" میں پہلے غرقد نامی جھاڑیاں تھیں جو بعد میں کاٹ دی گئیں اس لئے اس قبرستان کو "بقیع الغرقد" بھی کہا جاتا ہے۔

قوله: فانه من شجر اليهود:

"شجر" کی اضافت "الیھود" کی طرف ادنیٰ درجہ کی مناسبت سے کی گئی ہے۔بعض کا کہنا ہے کہ یہ معاملہ ظہور دجال کے بعد اُس وقت ہوگا جب مسلمان دجال کے پیروکار یہودیوں کے ساتھ قتال کریں گے۔

۵۴۱۵ : وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا تَقُوْمُ السَّاعَةُ حَتّٰى يَخْرُجَ رَجُلٌ مِنْ قَحْطَانِ يَسُوْقُ النَّاسَ بِعَصَاهُ. (متفق علیه)

اخرجه البخاري في صحيحه ٥٤٥/٦٥حديث رقم ٣٥١٧ومسلم في صحيحه ٢٢٣٢/٤حديث رقم (٦-٢٩١٠) واحمد في المسند ٤١٧/٢۔

ترجمہ: "حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: "قیامت کا قیام نہیں ہو گا حتی کہ قبیلہ قحطان کا ایک آدمی ظہور پزیر ہوگا جو لوگوں کو اپنی لٹھ کے ساتھ ہانکے گا۔(بخاری و مسلم)

تشریح: "قحطان" قاف کے فتحہ اور حاء کے سکون کے ساتھ ہے۔یمن میں رہنے والی قوم کا مورث اعلیٰ ہے۔ بعض کا کہنا ہے کہ یہ ان کے ایک قبیلے کا نام ہے۔

"یسوق الناس": یعنی اقتدار وحکومت کے بل بوتے پر لوگوں کو آگے لگا لے گا۔مطلب یہ ہے کہ لوگوں کو مسخر کرے گا، اور اس طرح قابو میں رکھے گا، جس طرح کہ چرواہا بکریوں کو قابو کر کے ڈنڈے سے ہانکتا ہے۔کہا گیا ہے کہ شاید یہ قحطانی شخص وہی ہو جس کو "جھجاہ" کہا جائے گا۔جیسا کہ عنقریب آئے گا۔

۵۴۱۶ : وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا تَذْهَبُ الْاَيَّامُ وَاللَّيَالِيْ حَتّٰى يَمْلِكَ رَجُلٌ يُّقَالُ لَهُ الْجَهْجَاهُ وَفِيْ رِوَايَةٍ حَتّٰى يَمْلِكَ رَجُلٌ مِنَ الْمَوَالِيْ يُقَالُ لَهُ الْجَهْجَاهُ . (رواه مسلم)

اخرجه مسلم فی صحیحه ۲۲۳۲/٤ حدیث رقم (٦١-٢٩١١) والترمذی فی السنن ٤٣٧/٤ حدیث رقم ۲۲۲۸ واحمد فی المسند ۳۲۹/۲۔

ترجمہ:''حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''دن ورات (کا دور ختم) قیامت نہ ہوگا جب تک کہ وہ شخص حکومت واقتدار پر قابض ہو جائے گا جس کا نام جہجاہ ہوگا اور ایک روایت میں یوں ہے کہ جب تک آزاد کردہ غلاموں میں سے ایک شخص مالک نہ ہو جائے گا یعنی لوگوں پر اقتدار و تسلط نہ حاصل کرے گا جس کو جہجاہ کہا جائے گا''۔ (مسلم)

تشریح: ''الجهجاه'': امام نوویؒ فرماتے ہیں کہ یہ لفظ جیم کے فتحہ اور ھاء کے سکون کے ساتھ منقول ہے، اور بعض نسخوں میں ''الجهجها'' (دو ھاء کے ساتھ) مروی ہے، اور دوسرے بعض نسخوں میں ''الجهجا'' الف کے بعد والی ھاء کے حذف کے ساتھ منقول ہے، پہلی لغت زیادہ مشہور ہے۔

الموالي: میم کے فتحہ کے ساتھ یہ'' المولی '' کی جمع ہے، جس کا معنی ہے'' غلام''۔

علامہ جزریؒ فرماتے ہیں کہ میں نے اس روایت کو صحیحین میں سے کسی میں نہیں پایا۔ (نقلہ میرک) چونکہ صحیحین کے علاوہ کسی اور روایت کو نقل کرنا محض استشہاد اور تائید کیلئے ہے اس لئے اس حدیث کو فصل اول میں ذکر کرنے کی وجہ سے مؤلفؒ پر اشکال نہیں کیا جا سکتا کیونکہ فصل اول کا صحیحین کی روایات کے ساتھ مختص ہونا صرف اصل روایات کے اعتبار سے ہے (بطور تائید کے ذکر کئے جانے والی روایات کے اعتبار سے نہیں ہے۔)

۵۴۱۷ : وَعَنْ جَابِرِ بْنِ سَمُرَةَ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ لَتَفْتَحَنَّ عِصَابَةٌ مِّنَ الْمُسْلِمِيْنَ كَنْزَ آلِ كِسْرٰى الَّذِيْ فِي الْاَبْيَضِ. (رواه مسلم)

اخرجه مسلم فی صحیحه ۲۲۳۷/٤ حدیث رقم (۷۸-۲۹۱۹) واحمد فی المسند ۱۰۰/۵۔

ترجمہ:''حضرت جابر بن سمرہ رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ ارشاد فرماتے ہوئے سنا کہ ''بلاشبہ اہل اسلام کی ایک جماعت آل کسریٰ کے اس خزانہ پر فاتح بن کر قبضہ کرلے گی جو سفید محل میں ہے''۔ (مسلم)

تشریح: ''لتفتحن'': حاء کے فتحہ کے ساتھ ہے بمعنی'' لتاخذن'' اور ایک صحیح نسخہ میں ''لتفتتحن'' (یعنی فاء کے بعد دو تاؤں کے ساتھ) منقول ہے۔

علامہ تورپشتی ؒ فرماتے ہیں: ہمیں مصابیح کے اکثر نسخوں میں یہ لفظ فاء کے بعد دو۲ تاء کے ساتھ منقول ملا ہے، اور ہم اس لفظ کو صحیح مسلم سے ایک ہی تاء کے ساتھ نقل کرتے ہیں، اور یہی زیادہ مناسب معنی رکھتا ہے۔ کیونکہ لفظ'' افتتاح'' اکثر ''استفتاح'' کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ لہٰذا تحقیق و وقوع امر کے لئے ''فتح'' کی جگہ میں واقع نہیں ہوتا۔ اور حدیث تو تکوینی امور کے بارے میں خبر دینے کے معنی کیلئے وارد ہوئی ہے۔

کسریٰ: کاف کے کسرہ کے ساتھ ہے۔ اور کاف کے فتحہ کے ساتھ بھی پڑھا جاتا ہے

آل: یہ زائد ہے یا اس کے متبعین مراد ہیں۔

الأبیض: قاضی عیاضؒ فرماتے ہیں، کہ "أبیض" ایک مضبوط محل کا نام ہے جو مدائن میں واقع تھا، اور اہل فارس اس کو "سفید کرشک" کہا کرتے تھے، اور اب اس کی جگہ "مسجد مدائن" بنائی گئی۔ اور کسریٰ کا یہ خزانہ حضرت عمرؓ کے زمانہ خلافت میں نکالا گیا تھا اور کہا گیا ہے کہ اس سے مراد "ھمدان" میں واقع وہ قلعہ ہے جس کو "دارین دارا" نے تعمیر کیا تھا، اس کو "شہرستان" کہا جاتا ہے۔

۵۴۱۸ : وَعَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ هَلَكَ كِسْرٰى فَلَا يَكُوْنُ كِسْرٰى بَعْدَهٗ وَقَيْصَرُ لَيَهْلِكَنَّ ثُمَّ لَا يَكُوْنُ قَيْصَرُ بَعْدَهٗ وَلَتُقْسَمَنَّ كُنُوْزُ هُمَا فِیْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَسَمَّى الْحَرْبُ خُدْعَةً ۔ (متفق علیہ)

اخرجہ البخاری فی صحیحہ ۱۵۸/۶ حدیث رقم ۳۰۲۷ ومسلم فی صحیحہ ۲۲۳۷/۴ حدیث رقم (۷۶-۲۹۱۸) واخرجہ الترمذی فی السنن ۴۳۱/۴ حدیث رقم ۲۲۱۶ واحمد فی المسند ۳۱۳/۲۔

ترجمہ: "حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: "کسریٰ (شاہ فارس کی تباہی آچکی ہے' اس کسریٰ کے بعد اور کوئی کسریٰ نہیں ہوگا اور یقیناً قیصر (یعنی شاہ روم) بھی ہلاک ہوگا جس کے بعد کوئی اور قیصر نہیں ہوگا' نیز ان دونوں بادشاہوں کے خزانے اللہ کے راستے میں بانٹ دیئے جائیں گے اور آنحضرت ﷺ نے جنگ کا نام دھوکہ اور فریب رکھا"۔ (بخاری و مسلم)

تشریح: **قولہ: کسریٰ فلایکون کسری بعدہ:**

"**ھلك کسری**": یہ جملہ خبریہ ہے، اور ہلاکت کسریٰ سے مراد اس کی حکومت کا تباہ ہو جانا ہے۔ اور اس کو ماضی کے صیغہ کے ساتھ تعبیر کرنے میں اس کے وقوع کے یقینی ہونے اور قریب ہونے کی طرف اشارہ ہے، یا یہ جملہ دعائیہ ہے، اور ماضی کے صیغہ کے ساتھ تعبیر کرنا دعاء اور نیک فالی کی غرض سے ہے۔

فلا یکون کسریٰ: ایک اور نسخے میں تنوین کے ساتھ وارد ہوا ہے، اس لئے کہ تنکیر مقصود ہے۔

بعدہ: ضمیر کا مرجع "وہ جو کسریٰ ہے جو حضورؐ کے زمانہ میں تھا۔ اور مطلب یہ ہے کہ کسی اور کافر کو حکومت نہیں ملے گی بلکہ اس کے بعد قیامت تک حکومت مسلمانوں کے پاس رہے گی۔

قولہ: وقیصر لیھلکن ثم لایکون قیصر بعدہ:

قیصر: روم کے بادشاہ کو کہا جاتا تھا۔ "قیصر" مبتدا ہے، اور "لیھلکن" اس کی خبر ہے۔ اور متغایر الفاظ کا ذکر کرنا تفنن کی غرض سے ہے، یا لفظ "قیصر" کا عطف "کسریٰ" پر ہے۔ اور "لیھلکن" تاکید کے ساتھ مبالغہ کی اُس زیادتی کا فائدہ دے رہا ہے جو لام قسم اور نون تاکید سے مستفاد ہے،

لا یکون قیصر: "قیصر" تنوین کے ساتھ اور بغیر تنوین کے دونوں طرح منقول ہے، اور اس کی صفت "آخر"

محذوف ہے اور "بعدہ" کی ضمیر کا مرجع "قیصر مذکور" ہے۔ یعنی "بعد قیصر الاول".

علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں کہ کسریٰ اور قیصر دونوں کی ہلاکت متوقع تھی، اور کسریٰ کی ہلاکت کو ماضی کے ساتھ تعبیر کیا تاکہ اس بات پر دلالت ہو کہ کسریٰ کی ہلاکت گویا کہ واقع ہو چکی ہے، چونکہ یہ صادق و مصدوق ذات کی طرف سے پیشینگوئی ہے۔ اور قیصر کی ہلاکت کی پیشینگوئی مضارع پر لام قسم داخل کر کے کی گئی، اور مبتدا خبر لا کر جملہ اسمیہ سے پیشینگوئی کی، تاکہ قیصر کی ہلاکت کی اہمیت ظاہر ہو اور اس بات پر دلالت ہو کہ یہ حضور علیہ السلام کو زیادہ مطلوب ہے۔ چونکہ اہل روم شام کے رہنے والے تھے اور حضور علیہ السلام کو شاک کے فتح ہونے کی رغبت زیادہ تھی، اسی وجہ سے حضور علیہ السلام نے تبوک کا معرکہ لڑا۔ اور تبوک شام کا علاقہ ہے۔

میں (ملا علی قاریؒ) کہتا ہوں چونکہ فی الواقع کسریٰ کی ہلاکت قیصر کی ہلاکت سے پہلے ہوئی تھی، ان لئے مناسب یہی تھا کہ ہلاکت کسریٰ کو بصیغہ ماضی تعبیر کیا جائے، اور ہلاکت قیصر کو استقبال کے صیغہ کے ساتھ ذکر کیا جائے۔

ولتقسمن: تخفیف کے ساتھ مجہول کا صیغہ ہے۔

قوله: وسمى الحرب خدعة:

"سمّٰی" کا عطف "قال رسول الله ﷺ" پر ہے۔ اور تقدیر یوں ہے: "قال الراوی: وسمٰی النبی ﷺ".

"خدعة": اس کو خاء کے فتحہ اور دال کے سکون کے ساتھ، اور خاء کے ضمہ اور دال کے سکون کے ساتھ پڑھنا بھی جائز ہے، اور خاء کے ضمہ اور دال کے فتحہ کے ساتھ بھی پڑھنا جائز ہے۔ اس لفظ کے مبنی و معنی کی تحقیق ماقبل میں گذر چکی ہے۔ صاحب قاموس لکھتے ہیں: الحرب خدعة مثلثة و كهمزة، وروى بهن جميعا. أي ينقضى بخدعة.

بظاہر (یہ آخری بات اور پہلی والی بات دونوں الگ الگ مواقع پر ارشاد فرمائی گئی ہیں، راوی نے دو حدیثوں کو یکجا کر کے (ایک ہی حدیث کے طور پر) نقل کیا ہے۔ لہٰذا ان دونوں کے درمیان مناسبت تلاش کرنے کی ضرورت ہے ہی نہیں، علاوہ ازیں اس آخری بات کے ذکر سے اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ قیصر و کسریٰ کی ہلاکت اور ان کے خزانوں پر قبضہ لڑائی سے حاصل ہو گا، اور لڑائی جیتنے کیلئے بسا اوقات حیلہ کرنا پڑتا ہے، چنانچہ حضور علیہ السلام نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو ایسے حیلہ کرنے کا جواز بتایا تاکہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو یہ وہم نہ ہو کہ لڑائی کیلئے حیلہ کرنا غدر خیانت ہے۔

علامہ طیبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں، کہ اگر آپ پر سوال کریں کہ حدیث مبارک کے جملہ "وسمٰی الحرب خدعةً" اور کلام سابق کے درمیان وجہ مناسبت کیا ہے، تو اس کا جواب یہ ہے کہ یہ آخری جملہ بطور استطراد وارد ہوا ہے، کیونکہ اصل کلام تو فتوحات کے بارے میں تھا، اور حدیث لڑائیوں کے ذکر پر مشتمل تھی، اس لئے آخر میں اس کا ذکر فرمایا۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے: [وما يستوى البحران هذا عذبٌ فراتٌ] کے بعد [ومن كل تأكلون لحمًا طريًا] کو ذکر فرمایا ہے، کیونکہ "البحران" سے مراد مؤمن اور کافر ہیں،

میں کہتا ہوں "من كل تأكلون" تشبیہ تکمیل کی طرف اشارہ ہے، اور تشبیل کی یہ تکمیل اس طرح ہے، کہ مؤمن اور کافر

دونوں سے نفع حاصل ہوتا ہے، اور اس عالم کا نظام ان دونوں کے وجود سے ہے، بلکہ فریقین جمال اور جلال کا مظہر ہیں، جو کہ صفات کمال ہیں، اوران پر دنیا و آخرت اور فریقین کے انجام کا مدار ہے۔ اور دونوں پر ''بحرین'' کی وہ مثال دلیل ہے، جو اس ارشاد میں مذکور ہے:

﴿هٰذا عذبٌ فراتٌ وهٰذا ملح اجاجٌ﴾ [الفرقان:۵۳] ''ایک (کا پانی) شیریں تسکین بخش ہے اور ایک (کا پانی) شور تلخ ہے۔'' چنانچہ ہر ایک اپنے باب میں انتہائی کمال پر ہے۔ وہ جس کو چاہتا ہے گمراہ کرتا ہے اور ہدایت دیتا ہے جس کو چاہتا ہے اور جس کو چاہتا ہے عذاب دیتا ہے اور جس کی چاہتا ہے مغفرت کرتا ہے، وہ ہر وہ چیز پر قادر ہے۔

۵۴۱۹: وَعَنْ نَافِعِ ابْنِ عُتْبَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ تَغْزُوْنَ جَزِيْرَةَ الْعَرَبِ فَيَفْتَحُهَا اللّٰهُ ثُمَّ فَارِسَ فَيَفْتَحُهَا اللّٰهُ ثُمَّ تَغْزُوْنَ الرُّوْمَ فَيَفْتَحُهَا اللّٰهُ ثُمَّ تَغْزُوْنَ الدَّجَّالَ فَيَفْتَحُهُ اللّٰهُ. (رواه مسلم)

اخرجه مسلم في صحيحه ٢٢٢٥/٤ حديث رقم (٣٨-٢٩٠٠) وابن ماجه ١٣٧٠/٢ حديث رقم ٤٠٩١ واحمد في المسند ٢٣٨/٤۔

ترجمہ: ''حضرت نافع بن عتبہ رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''تم لوگ (میرے بعد) جزیرۃ العرب سے میں جنگ لڑو گے اور اللہ تعالیٰ تمہارے ہاتھوں اس کی فتح عطا کرے گا' پھر تم مملکۃ فارس سے جہاد کرو گے' اور حق تعالیٰ شانہ تمہارے ذریعہ اس کی فتح عنایت پھر تم سلطنت روم سے جہاد کرو گے اور اللہ تعالیٰ اس کی فتح بھی تمہارے ذریعہ عطا کرے گا اور پھر (آخری زمانہ میں) تم دجال سے جنگ کرو گے اور اللہ تمہیں اس کا بھی فاتح بنائے گا''۔ (مسلم)

راوی حدیث:

نافع بن عتبہ: یہ حضرت نافع بن عتبہؓ ابن ابی وقاصؓ ہیں۔ زہری وقرشی ہیں، اور ''مرقال'' کے نام سے معروف ہیں، میم کے کسرہ' راء کے سکون اور آخر میں قاف کے ساتھ ہے۔ یہ حضرت سعد بن ابی وقاص کے بھتیجے ہیں، طبقہ صحابہ سے تعلق رکھتے ہیں فتح مکہ کے موقع پر اسلام قبول کیا' یہ مؤلفہ میں سے تھے۔ حضرت ابن عمرؓ اور حضرت جابر بن سمرہؓ نے ان سے روایات نقل کی ہیں۔ (نقله ميرك عن التصحيح) ان کا شمار اہل کوفہ میں ہے۔

تشریح: قوله: تغزون...... جزيرة العرب۔

جزیرۃ العرب: جزیرۃ العرب پر کلام ماقبل میں گذر چکا ہے۔ اس کا خلاصہ امام مالک سے یہ منقول ہے کہ جزیرۃ العرب مکہ، مدینہ، یمامہ اور یمن پر مشتمل خطے کو کہا جاتا ہے۔ چنانچہ مطلب یہ ہوا کہ تم بقیہ علاقوں میں بھی جنگ کرو گے، اور وہاں (بھی اسلام اس طرح پھیل جائے گا کہ) کوئی کافر ان علاقوں میں نہیں رہے گا۔

قوله: ثم تغزون الدجال ......:

اس کلام میں خطاب تو صحابہ کرامؓ سے ہے، لیکن مراد پوری امت ہے۔

یعنی اللہ تعالیٰ دجال کو مقہور و مغلوب کردیگا، اور اس کی ہلاکت بنی اسرائیل کے ہاتھوں ہوگی، حضرت عیسیٰ علیہ السلام اس امت کی مدد کیلئے آسمان سے نیچے تشریف لائیں گے۔

تخریج: امام مسلم نے اس حدیث کو "کتاب الفتن" میں جابر بن سمرۃ عن نافع بن عتبہ رضی اللہ عنہما کی سند سے نقل کیا ہے، جس کے الفاظ یہ ہیں: میں نے رسول اللہ (سن کر) چار کلمات یاد کئے جو انہوں نے میرے ہاتھ پر شمار کئے' فرمایا: تم جزیرۃ عرب میں جہاد کروگے' پس اللہ تعالیٰ تمہیں یہاں فتح عطا فرمائے گا

تعجب کی بات ہے کہ امام حاکم رحمۃ اللہ علیہ نے اس حدیث کو مستدرک حاکم میں نقل کر کے فرمایا کہ یہ حدیث امام مسلم کی شرط پر پوری اترتی ہے، اور علامہ ذہبیؒ نے بھی اس کا اقرار کیا ہے۔ (نقلہ میرک) بظاہر امام حاکمؒ نے اس حدیث کو کسی اور سند سے نقل کیا ہے جس کے راوی صحیح مسلم کے راوی ہیں، چنانچہ وہ مستدرک ہیں، نا کہ مستدرَک۔

۵۴۲۰ : وَعَنْ عَوْفِ ابْنِ مَالِكٍ قَالَ اَتَيْتُ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِيْ غَزْوَةِ تَبُوْكَ وَهُوَ فِيْ قُبَّةٍ مِّنْ اَدَمٍ فَقَالَ اُعْدُدْ سِتًّا بَيْنَ يَدَيِ السَّاعَةِ مَوْتِيْ ثُمَّ فَتْحُ بَيْتِ الْمَقْدِسِ ثُمَّ مُوْتَانٌ يَاْخُذُفِيْكُمْ كَقُعَاصِ الْغَنَمِ ثُمَّ اسْتِفَاضَةُ الْمَالِ حَتّٰى يُعْطَى الرَّجُلُ مِائَةَ دِيْنَارٍ فَيَظَلُّ سَاخِطًا ثُمَّ فِتْنَةٌ لَا يَبْقٰى بَيْتٌ مِّنَ الْعَرَبِ اِلَّا دَخَلَتْهُ ثُمَّ هُدْنَةٌ تَكُوْنُ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَ بَنِي الْاَصْفَرِ فَيَغْدِرُوْنَ فَيَاْتُوْنَكُمْ تَحْتَ ثَمَانِيْنَ غَايَةً تَحْتَ كُلِّ غَايَةٍ اِثْنَا عَشَرَ اَلْفًا . (رواه البخاري)

اخرجه البخاري في صحيحه ٦/ ٢٧٧ حديث رقم ٣١٧٦ ومسلم في صحيحه ١/ ٣٦٠ حديث رقم (٢٤٩-٣-٥٠) وابن ماجه ٢/ ١٣٤١ حديث رقم ٤٠٤٢ واحمد في المسند ٦/ ٢٤۔

ترجمہ: "حضرت عوف بن مالک رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا کہ غزوۂ تبوک کے دوران (ایک روز) میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا' اس وقت آپ صلی اللہ علیہ وسلم چمڑے کے خیمے میں تشریف فرما تھے' آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: (تم قیامت آنے سے پہلے چھ چیزوں کو شمار کرو) یعنی ان چھ چیزوں کو علامات قیامت میں سے سمجھو کہ وقوع قیامت سے قبل ضرور یہ علامات رونما ہوں گی ایک تو میری وفات (کہ جب تک میں زندہ ہوں قیامت نہیں آئے گی) دوسرے بیت المقدس کا فتح ہونا (یعنی جب تک اہل اسلام کے ہاتھوں بیت المقدس کی فتح نہ ہو جائے وقوع قیامت نہ ہوگا) تیسرے عام وبا' جو تم میں بکریوں کی بکریوں میں پھیلنے والی طاعون کی بیماری کی طرح پھیلے گی' چوتھے لوگوں کے پاس مال و دولت کی اس قدر فراوانی ہو جائے گی کہ اگر ایک آدمی کو سو دینار بھی دیئے جائیں گے تو ان کو حقیر و کمتر جانے گا پھر بھی ناخوش ہوگا (یعنی مال و دولت کی اس قدر ریل پیل ہوگی کہ بہت زیادہ رقم کو بھی کوز یادہ اہمیت نہیں دی جائے گی) چنانچہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ پیش گوئی خلیفہ ثالث سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کے دور خلافت میں پوری ہوئی کہ جب فتوحات کثیر ہوگئیں تو ان کے بعد اہل اسلام کو مالی لحاظ سے خوشحالی حاصل ہوگئی' پانچویں فتنہ

اور آپس کی مخاصمت ومخالفت کا اس طرح پھوٹ پڑنا کہ عرب کا کوئی گھر باقی نہیں بچے گا جس میں اس فتنے کے برے اثرات نہ پہنچیں (ارباب علم لکھتے ہیں کہ اس پیش گوئی کا مصداق حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا سانحہ شہادت ہے یا فتنہ سے مراد ہر وہ فتنہ اور پرشر ہے جو آنحضرت ﷺ کے وصال کے بعد رونما ہوا) اور چھٹے صلح جو تمہارے اور رومیوں کے درمیان ہوگی' پھر رومی عہد شکنی کریں گے اور تمہارے مقابلے اسی پرچموں تلے آئیں گے جن میں سے ہر نشان کے ماتحت بارہ ہزار آدمی فوج ہوگی'۔ (بخاری)

تشریح: قوله: اتيت النبى فى...... موتى:

"أدم" ہمزہ اور دال کے فتحہ کے ساتھ بمعنی چمڑا۔

موتی: یعنی پہلی علامت دنیا سے آخرت کی طرف میرا انتقال ہے۔ کیونکہ آپ علیہ السلام کے چہرہ انور کے جمال کے غائب ہونے سے کمال کا یہ پہلا زوال ہوگا۔

قوله: ثم فتح بيت المقدس...... كقعاص الغنم: "المقدس":

میم کے فتحہ، قاف کے سکون اور دال کے کسرہ کے ساتھ ہے' اور ایک نسخہ میں میم کے ضمہ، قاف کے فتحہ اور دال کی تشدید کے ساتھ ہے۔

"موتان": میم کے ضمہ کے ساتھ' بمعنی وباء۔

"قعاص": قاف کے ضمہ کے ساتھ' بکریوں کی ایک بیماری کا نام ہے، جو بکری کو مار کر ہی چھوڑتی ہے۔

علامہ تورپشتی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ "موتان" سے مراد وباء ہے، جو مویشیوں میں پھیلتی ہے، اس لفظ کا میم مضموم ہے، اور اس حدیث میں انسانوں کیلئے اس بیماری کا ذکر کرنے میں اس بات پر تنبیہ ہے کہ یہ وباء ایسی تیزی سے پھیل کر انسانوں کو ہلاک کرے گی کہ جس طرح موتان نامی بیماری مویشیوں میں تیزی سے پھیل کر جلد ہی ان تمام مویشیوں کو ہلاک کر دیتی ہے۔ اور یہ وباء "طاعون عمواس" کی صورت میں حضرت عمرؓ بن الخطاب کے زمانہ خلافت میں پیدا ہوئی' اسلام کے زمانے میں پیدا ہونے والا یہ پہلا طاعون تھا، اس طاعون سے تین دن کے اندر ستر ہزار آدمی ہلاک ہوئے۔ "عمواس" بیت المقدس کے مضافات میں ایک بستی تھی، جہاں مسلمانوں کی فوجی چھاؤنی تھی۔

قوله: ثم استفاضه المال...... فيظل ساخطا:

شرح السنہ میں "استفاضة المال" کا معنی "كثرة المال" لکھا ہے۔ "استفاضة" کا اصل معنی پھیلنا اور متفرق ہونا ہے، چنانچہ جب کوئی بات لوگوں میں پھیل جائے اور مشہور ہو جائے، تو کہا جاتا ہے: "استفاض الحديث"' نہایہ میں لکھا ہے کہ یہ لفظ "فاض المال والدمع" بمعنی "كثر المال والدمع" سے ماخوذ ہے۔ "يظل": اس کو رفع اور نصب دونوں کے ساتھ پڑھنا درست ہے، اور یہ "يصير" کے معنی میں ہے۔

یعنی سو دینار کو کم سمجھے گا، اور اس پر ناراض ہوگا، مال کی یہ کثرت اور وسعت حضرت عثمانؓ کے زمانہ خلافت میں فتوحات

کے وقت دیکھنے میں آئی تھی، اور جہاں تک بات ہے ہمارے زمانہ کی تو آج ہزار دینار کو بھی قلیل وحقیر سمجھا جاتا ہے۔

ثم فتنة: (تنوین تعظیم کیلئے ہے ای "بلیة عظیمةٌ" کہا گیا ہے کہ اس فتنہ سے مراد حضرت عثمان غنیؓ کی شہادت اور اس کے بعد کے حوادثات ہیں۔

قوله: ثم فتنة لا يبقٰى بيت من العرب الا دخلته:

کہا گیا ہے کہ "بیت" سے امت کے گھر مراد ہیں، لیکن عربوں کا ذکر بوجہ کثرت شرافت کے کیا ہے، گویا کہ اس میں ایک طرح کی تغلیب ہے، یا اس مقولہ کی طرف اشارہ ہے: "ان من اسلم فهو عربیٌ" (جو بھی مسلمان ہوا وہ عربی ہے)۔

قوله: ثم تكون هدنة تكون بينكم وبين بني الأصفر:

"بنو الأصفر" سے رومی مراد ہیں۔ رومیوں کے آباء واجداد میں پہلا شخص روم بن عیصو بن یعقوب بن اسحاق تھا، اس کا رنگ زرد مائل سفید تھا۔ اس کے اس زرد رنگ کی نسبت سے اس کی اولاد کو "بني الأصفر" کہا جائے گا، بعض کا کہنا ہے کہ روم کا ایک سیاہ فام بادشاہ تھا اُس نے اس علاقے کی عورت سے شادی کی تھی اس عورت سے اس شخص کی جو اولاد پیدا ہوئی وہ بہت زیادہ حسین تھی تو روم کی نسبت اس شخص کی طرف کر دی گئی (اور اس کے نام کی طرف منسوب کر کے رومیوں کو بنو الأصفر کہا جانے لگا۔)

قوله: فيغدرون فيأتونكم تحت ثمانين غايةً.......:

غاية: بمعنی "جھنڈا" ہے۔ علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں کہ بعض راویوں نے لفظ "غاية" کو "باء" کے ساتھ ("غابة") نقل کیا ہے،

"ألف فارس": اس سے بارہ ہزار گھوڑ سوار مراد ہیں، اکملؒ نے لکھا ہے کہ کل تعداد سات لاکھ ساٹھ ہزار (۷۶۰۰۰۰) ہو گی۔

تخریج: اس حدیث کو ابن ماجہ نے اور امام حاکم نے مستدرک میں نقل کیا ہے، امام حاکمؒ فرماتے ہیں کہ یہ روایت صحیح ہے، اور شیخین کی شرط کے مطابق ہے، جبکہ شیخین نے اس کی تخریج نہیں کی، اور علامہ ذہبیؒ نے کی ہے، لیکن یہ بھی ایک وہم ہے کیونکہ یہ حدیث صحیح بخاری کی کتاب الجہاد میں "باب ما يجوز من الغدر" کے تحت موجود ہے۔ (نقلہ میرک عن التصحیح) اس اعتراض کا جواب میں (ملا علی قاری) پہلے ذکر کر چکا ہوں۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصحیح

۵۴۲۱ : وَعَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا تَقُوْمُ السَّاعَةُ حَتّٰی يَنْزِلَ الرُّوْمُ بِالْاَعْمَاقِ اَوْبِدَابِقَ فَيَخْرُجُ اِلَيْهِمْ جَيْشٌ مِّنَ الْمَدِيْنَةِ مِنْ خِيَارِ اَهْلِ الْاَرْضِ يَوْمَئِذٍ فَاِذَا تَصَافُّوْا قَالَتِ الرُّوْمُ خَلُّوْا بَيْنَنَا وَبَيْنَ الَّذِيْنَ سَبَوْامِنَّا نُقَاتِلْهُمْ فَيَقُوْلُ الْمُسْلِمُوْنَ لَا وَاللّٰهِ لَانُخَلِّيْ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَ اِخْوَانِنَا فَيُقَاتِلُوْنَهُمْ فَيَنْهَزِمُ ثُلُثٌ لَا يَتُوْبُ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ اَبَدًا وَيُقْتَلُ ثُلُثُهُمْ اَفْضَلَ

الشُّهَدَآءِ عِنْدَ اللّٰهِ وَيَفْتَتِحُ الثُّلُثُ لَا يُفْتَنُوْنَ اَبَدًا فَيَفْتَتِحُوْنَ قُسْطُنْطِيْنِيَّةَ فَبَيْنَمَا هُمْ يَقْتَسِمُوْنَ الْغَنَائِمَ قَدْ عَلَّقُوْا سُيُوْفَهُمْ بِالزَّيْتُوْنِ اِذْصَاحَ فِيْهِمُ الشَّيْطَانُ اِنَّ الْمَسِيْحَ قَدْخَلَفَكُمْ فِيْ اَهْلِيْكُمْ فَيَخْرُجُوْنَ وَذٰلِكَ بَاطِلٌ فَاِذَا جَاؤُا الشَّامَ خَرَجَ فَبَيْنَمَاهُمْ يُعِدُّوْنَ لِلْقِتَالِ يُسَوُّوْنَ الصُّفُوْفَ اِذَا اُقِيْمَتِ الصَّلٰوةُ فَيَنْزِلُ عِيْسٰى بْنُ مَرْيَمَ فَاَمَّهُمْ فَاِذَا رَاٰهُ عَدُوُّاللّٰهِ ذَابَ كَمَا يَذُوْبُ الْمِلْحُ فِي الْمَاءِ فَلَوْ تَرَكَهُ لَانْذَابَ حَتّٰى يَهْلِكَ وَلٰكِنْ يَقْتُلُهُ اللّٰهُ بِيَدِهٖ فَيُرِيْهِمْ دَمَهٗ فِيْ حَرْبَتِهٖ. (رواه مسلم)

اخرجه مسلم فی صحیحه ۲۲۲۱/۴ حدیث رقم (۳۴-۲۹۹۷)

ترجمہ: ''حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''قیامت کا قیام نہیں ہو گا حتی کہ افواج روم اعماق یا دابق میں آ کر نہ ٹھہریں گے اور پھر اہل مدینہ کا ایک لشکر ان کے مقابلے کے لئے روانہ ہوگا جو اس دن یعنی اس وقت کے روئے زمین کے سب سے بہترین لوگوں پر مشتمل ہوگا' جب (لڑائی کے لئے) صف بندی ہوگی تو رومی یہ اعلان کریں گے کہ ہمارے اور ان لوگوں کے درمیان کہ جو ہمارے لوگوں کو گرفتار کر کے لائے ہیں راستہ چھوڑ دو تاکہ ہم ان سے لڑیں (یعنی اہل روم یہ اعلان کریں گے کہ ہم سب مسلمانوں سے مقابلہ ہرگز نہیں کرنا چاہئے بلکہ صرف ان مسلمانوں سے بدلہ لینا چاہتے ہیں جنہوں نے اس سے پہلے ہمارے خلاف جہاد کیا ہے اور ہمارے افراد کو قید کیا ہے۔ گویا رومی یہ بات اس لئے کہیں گے تاکہ مسلمان ان کی باتوں میں آ کر باہمی یکجہتی اور اتحاد کو خیر باد کہہ کر ٹوٹ پھوٹ کو دعوت دیں) لیکن مسلمان ان کو جواب دیں گے کہ بخدا ایسا ہرگز نہیں ہوسکتا' ہم تمہارے اور اپنے ان مسلمان بھائیوں کے درمیان (جنگ کے لئے) راہیں ہموار نہیں کر سکتے (یعنی یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ ہم اپنے مسلمان بھائیوں کو تو تمہارے مقابلے پر لڑنے کیلئے آگے کر دیں اور خود ایک طرف ہو کہ تماشائی بن جائیں ہم ایسا نہیں ہونے دیں گے بلکہ تمہیں ہم سب سے جنگ کرنا پڑے گی) چنانچہ سارے مسلمان رومیوں سے جہاد کرنے لگیں گے اور (جب گھمسان کا رن پڑے گا) تو ان اہل اسلام میں سے ایک تہائی مسلمان میدان جنگ چھوڑ کر بھاگ جائیں گے' جن کو حق تعالیٰ شانہ کبھی معاف نہیں کرے گا اور ایک تہائی مسلمان جام شہادت نوش کریں گے جو خدا تعالیٰ کے ہاں انتہائی عظیم المرتبہ شہداء ہوں گے اور باقی ایک تہائی اہل اسلام فاتح بن جائیں گے (یعنی اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم اور امداد سے مسلمان رومیوں کے مقابلہ میں کامیاب ہو کر ان کے بہت سے شہروں اور بستیوں پر پرچم اسلام لہرائیں گے) ان مسلمانوں کو فتنہ میں مبتلا کیا جائے گا۔ پھر مسلمان قسطنطنیہ فاتح بن جائیں گے (یعنی اس شہر کو کافروں کے قبضہ سے لے لیں گے) اور اس کے بعد جن دنوں میں مسلمان مال غنیمت تقسیم کرنے میں مصروف ہوں گے اور اپنی تلواروں کو زیتون کے درختوں پر لٹکائے ہوئے ہوں گے اچانک شیطان ان کے درمیان چلا کر یہ آواز لگائے گا (مسلمانو! تم یہاں مصروف ہو جب کہ) تمہاری عدم موجودگی میں مسیح دجال تمہارے گھر والوں کے پاس ظہور پزیر ہو چکا ہے۔ (اسلامی لشکر کے لوگ یہ سنتے ہی قسطنطنیہ سے) نکل پڑیں گے لیکن شیطان کی یہ خبر سراسر جھوٹی ثابت ہوگی' البتہ جب مسلمان شام کو پہنچیں گے تو پھر دجال نکل چکا ہوگا) مسلمان اس سے قتال کی تیاری

کرنے اور صفوں کو درست کرنے میں مصروف ہوں گے کہ نماز کا وقت آ جائے گا (اور مؤذن تکبیر کہنے کے لئے کھڑا ہو چکا ہوگا) اسی دوران حضرت عیسٰی بن مریم علیہ السلام (آسمان سے دمشق کی جامع مسجد کے منارے پر) نزول فرمائیں گے (پھر قدس آئیں گے) اور مسلمانوں کی امامت فرمائیں گے۔ پھر دشمن خدا یعنی دجال (جو اس وقت مسلمانوں کو مسلمانوں کو خطرناک فتنہ میں مبتلا کرنے کے درپے ہوگا) جب حضرت عیسٰی علیہ السلام کو دیکھے گا تو اس طرح گھلنا شروع ہو جائے گا جس طرح نمک پانی میں گھلنے لگتا ہے کہ اگر حضرت عیسٰی علیہ السلام اس کو اسی حالت میں رہنے دیں اور اس کے قتل کا اقدام نہ کریں تو وہ سارا گھل کر (حضرت عیسٰی علیہ السلام کے قتل کئے بغیر) خود ہی مر جائے' لیکن اللہ تعالیٰ (کی مشیت و مرضی چونکہ یہ ہوگی کہ یہ عیسی بن مریم کے ہاتھوں قتل ہو اس لئے) اس کو حضرت عیسٰی علیہ السلام کے ہاتھ سے قتل کرائے گا۔ پھر حضرت عیسٰی علیہ السلام (مسلمانوں کو یا کافروں کو اور یا سب کو) دجال کا خون اپنے نیزے پر لگا ہوا دکھائیں گے (یعنی حضرت عیسٰی علیہ السلام جس نیزے سے دجال کو قتل کریں گے اور جو اس کے خون سے آلودہ ہوگا اس کو لوگوں کو دکھائیں گے کہ دیکھو میں نے اللہ کا دشمن موت کے گھاٹ اتر گیا ہے ہے)''۔ (مسلم)

تشریح: **قوله: لاتقوم الساعة حتى تنزل الروم باعماق او بدابق:**

''**الأعماق**'': ہمزہ مفتوحہ کے ساتھ ہے۔ علامہ تورپشتی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: یہاں ''**أعماق**'' **عمق** کی جمع نہیں ہے، بلکہ مدینہ منورہ کے اطراف میں واقع ایک خاص جگہ کا نام ہے۔

دابق: باء کو کسرہ اور فتحہ دونوں کے ساتھ پڑھنا جائز ہے۔ اور منصرف و غیر منصرف دونوں طرح پڑھا گیا ہے۔ علامہ تورپشتی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ''**دابق**'' باء کے فتحہ کے ساتھ' مدینہ منورہ میں کھجور کی منڈی تھی، اور مفاتیح میں مذکور ہے، کہ ''**أعماق**'' اور ''**دابق**'' دونوں جگہوں کے نام ہیں۔ یا ''**أو**'' کو راوی نے شک کی وجہ سے ذکر کیا ہے۔

علامہ جزریؒ فرماتے ہیں کہ ''**دابق**'' کو بائے موحدہ کے کسرہ کے ساتھ پڑھا جائے یہی صحیح ہے، اگرچہ عیاضؒ نے ''مشارق'' میں باء کو مفتوح ذکر کیا ہے۔

صاحب صحاح فرماتے ہیں کہ غالب استعمال میں یہ لفظ مذکر ہے، اور منصرف ہے، اس لئے کہ اصل میں یہ اسم ہے، کہ بعض اوقات اس کو تانیث کے ساتھ غیر منصرف پڑھا جاتا ہے۔ اھ۔ جس نے اس لفظ کو مؤنث قرار دے کر بھی منصرف پڑھا ہے، انہوں نے اس لفظ کو ''**بقعة**'' (زمین کا ایک ٹکڑا) کی تاویل میں لیا ہے۔ قاموس میں لکھا ہے کہ ''**دابق**'' بروزن ''صاحب'' حلب میں ایک جگہ ہے۔ لیکن دوسرے نسخوں میں اس لفظ کو غیر منصرف ضبط کیا گیا ہے۔

قوله: فيخرج اليهم جيش من المدينة...... نقاتلهم:

فيخرج: اس کو منصوب اور مرفوع دونوں طرح پڑھنا درست ہے۔

المدينة: ابن الملکؒ فرماتے ہیں کہ بعض کا کہنا ہے کہ ''مدینہ'' سے مراد مقام حلب ہے، اور ''**اعماق**'' اور ''**دابق**'' اس

کے قریب دو جگہوں کے نام ہیں اور بعض کا قول ہے کہ مدینہ سے مراد دمشق ہے۔

ازھار میں لکھا ہے، کہ جس قول میں ''مدینہ'' سے ''مدینہ منورہ'' مراد لیا گیا ہے، یہ قول ضعیف ہے، کیونکہ روم کے مقابلے میں نکلنے والے لشکر سے امام مہدی علیہ السلام کا لشکر مراد ہے، اوراس کی دلیل حدیث کا آخری حصہ ہے، نیز مدینہ منورہ اس وقت ویران ہو چکا ہوگا، (اس لئے بھی اس مدینہ سے مراد مدینہ منورہ نہیں ہے۔)

من خیار اهل الأرض: ''جیش'' کا بیان ہے۔

یومئذٍ: اس لفظ کے ذریعے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے مبارک زمانہ سے احتراز کرنا مقصود ہے۔

''تصافوا'' بفاء مشدد اور مضموم ہے۔

سبوا: بصیغۂ معروف ہے۔

نقاتلهم: اس سے مقصود مسلمانوں کو دھوکہ دینا ایک دوسرے کے بارے میں بدگمانی پیدا کرنا اور افتراق پیدا کرنا ہوگا، اور ''الذین سبوا'' سے وہ لوگ مراد ہیں جنہوں نے ان کے بلاد میں لڑائی کی اور ان کی اولاد کو قیدی بنایا۔ (كذا ذكره تور بشتیؒ) اور مختلف نسخوں اور اُصول کے موافق یہی ہے۔

ابن الملکؒ فرماتے ہیں کہ ''سبوا'' کو مجہول کے صیغہ کے ساتھ بھی نقل کیا گیا ہے۔

قاضیؒ فرماتے ہیں کہ معروف کے صیغہ کے ساتھ ہی درست ہے۔

امام نوویؒ فرماتے ہیں کہ لفظ ''سبوا'' کو معروف مجہول دونوں طرح پڑھنا درست ہے، کیونکہ شام اور مصر میں مسلمانوں کے لشکروں کو قیدی بنایا گیا تھا اور آج الحمدللہ مسلمان کفار کو قیدی بنا رہے ہیں۔

علامہ تورپشتی رحمہ اللہ فرماتے ہیں زیادہ ظاہر یہ ہے کہ یہ قول اس ملحمہ کبریٰ کے بعد سامنے آئے گا، کہ جس کی چکی دو بڑی جماعتوں کے درمیان چل چکی ہوگی، اور یہ فتح قسطنطنیہ سے پہلے پیش آئے گا۔

رومی، عرب کی زمین پر لشکر کشی کریں گے، یہاں تک کہ ''أعماق'' اور ''دابق'' تک پہنچ جائیں گے، اور مسلمانوں سے کہیں گے، کہ ہمارے اور ہماری اولاد کو قیدی بنانے والوں کے درمیان راستہ خالی کر دیں، چنانچہ مسلمان آگے سے یہ جواب پیش کریں گے، جو حدیث میں آگے مذکور ہے۔

قوله: فیقول المسلمون...... فیفتتحون قسطنطینیة:

لا یتوب الله علیهم ابدًا: اس میں اشارہ ہے، اس بات کی طرف کہ یہ لوگ کفر پر مریں گے، اور اللہ کے ابدی عذاب میں مبتلا ہونگے۔

ویقتل ثلثهم افضل الشهداء عند الله:

''أفضل'': مبتدا محذوف ''هم'' کی خبر ہونے کی بناء پر مرفوع ہے، اور ایک نسخہ میں حال ہونے کی بناء پر منصوب ہے۔

لا يفتنون: (اس کے تین مطلب ہو سکتے ہیں):

1. ان کو کسی آزمائش میں مبتلا نہیں کیا جائے گا۔
2. قتال میں مبتلا کر کے ان کو نہیں آزمایا جائے گا۔
3. ان کو عذاب نہیں دیا جائے گا۔

أبدًا: اس لفظ سے ان کے حُسنِ خاتمہ کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

فيفتتحون: یہ ''فاء'' یا تعقیبیہ ہے، یا تفریعیہ ہے۔

ابن الملکؒ فرماتے ہیں: کہ ایک نسخہ میں يفتتحون کی بجائے يفتحون (ایک تاء کے ساتھ) وارد ہوا ہے، اور یہی زیادہ صحیح ہے، کیونکہ '' افتتاح'' اکثر '' استفتاح'' کے معنی میں مستعمل ہوتا ہے، ''فتح'' کے معنی میں استعمال نہیں ہوتا۔

ملا علی قاریؒ فرماتے ہیں، کہ اس قسم کی بات علامہ تورپشتی رحمہ اللہ کے کلام میں پہلے گزر گئی ہے۔ لیکن بظاہر اس میں اشارہ ہے اس بات کی طرف کہ یہ فتح سخت مزاحمت کے بعد حاصل ہوگی۔ قاموس میں لکھا ہے، کہ فَتَحَ بروزن منع أغلق کی ضد ہے، جیسا کہ فتح : افتح اور الفتح بمعنی النصر اور '' افتتاح دار العرب'' اور '' استفتاح'' کا مطلب ہوتا ہے: ''استنصار''، مطلب یہ ہے کہ مسلمان کفار سے قسطنطنیہ لے کر اس پر قبضہ کریں گے۔

قسطنطنية: اس لفظ کو متعدد طرح پڑھا گیا ہے:

اول: قاف مضموم، سین ساکن، پہلی طاء مضموم، دوسری طاء مکسور، دوسری طاء کے بعد یاء ساکنہ، اور اس کے بعد نون ہے۔ امام نوویؒ فرماتے ہیں کہ اس لفظ کو ہم نے اسی طرح اس مقام پر نقل کیا ہے، اور اس لفظ کا یہی ضبط مشہور ہے۔

ثانی: قاضی عیاضؒ نے ''المشارق'' میں متقنین سے اس لفظ میں نون کے بعد ''یاء مشددہ'' بھی نقل کیا ہے۔

قاضی عیاضؒ نے جس طرح نقل کیا ہے، مشکوٰۃ کے نسخے اسی پر متفق ہیں، اور بعض نسخوں میں یاء مشددہ کی بجائے یاء مخففہ ہے، چنانچہ علامہ جزریؒ فرماتے ہیں کہ نون کے بعد یاء مخففہ ہے۔ اور بعض حضرات نے اس ''یاء'' کو تشدید کے ساتھ حکایت کیا ہے۔

ثالث: بعض دوسرے حضرات نے اس ''یاء'' کے حذف کے ساتھ اس لفظ کو نقل کیا ہے، اور قاضی عیاضؒ نے اس کو اکثر حضرات کی طرف سے نقل کیا ہے۔

حجازیؒ نے ''حاشية الشفاء'' میں لکھا ہے، کہ قسطنطية اور قسطنطينية ہے اور اس کو لام تعریف کے ساتھ بھی نقل کیا جاتا ہے، یہ روم کے بادشاہ کا ٹھکانہ تھا، اور اس میں چھ لغات منقول ہیں:

1. پہلی ''طاء'' مفتوح ہو اور دوسری ''یاء'' مخففہ ہو۔
2. پہلی ''طاء'' مفتوح ہو اور دوسری ''یاء'' مشددہ ہو۔
3. پہلی ''طاء'' مضموم ہو اور دوسری ''یا'' مخففہ ہو۔
4. پہلی ''طاء'' مضموم ہو اور دوسری ''یاء'' مشددہ ہو۔

❺ پہلی ''طاء'' مفتوح ہو اور دوسری ''یاء'' محذوف ہو اور نون مفتوح ہو۔

❻ پہلی ''طاء'' مضموم ہو اور دوسری ''یاء'' محذوف ہو اور نون مفتوح ہو۔

لیکن پہلی طاء کے ضمہ کے ساتھ اس لفظ کو زیادہ تر استعمال کیا جاتا ہے، اور ''قاف'' تو بہر حال میں مضموم ہے۔

قسطنطنیہ، روم کے بڑے شہروں میں سے ایک مشہور شہر ہے۔ امام ترمذیؒ فرماتے ہیں کہ قسطنطنیہ بعض صحابہ کے زمانے میں فتح ہو گیا تھا، اور دجال کے خروج کے وقت فتح ہوگا۔

قوله: فبيناهم يقتسمون ...... وذاليك ماطل:

فبينا هم: اس ضمیر کا مرجع **المسلمون** ہے۔

قدعلقوا سيوفهم بالزيتون: زیتون سے معروف درخت مراد ہے، اور یہ جملہ ترکیب میں حال واقع ہو رہا ہے۔

ان المسيح: "ان" کا ہمزہ مکسور ہے، کیونکہ "صاح" قول کے معنی کو متضمن ہے، اور "ان" کے ہمزہ کو مفتوح پڑھنا بھی جائز ہے، اس لئے کہ صاح کو اعلم کے معنی کو متضمن تسلیم کیا جاسکتا ہے۔ اور یہاں **مسیح** سے **دجّال** مراد ہے۔

قد خلفكم: لام کی تخفیف کے ساتھ بمعنی **قام مقامكم**.

في أهليكم: "أهل" سے "ذرية" مراد ہے، کیونکہ ایک روایت میں "أهليكم" کی بجائے "ذراريكم" مذکور ہے۔

وذالك: اس کا مشارالیہ "القول من الشيطان" ہے۔

باطل: بمعنی "كذب" ہے۔

قوله: فاذا جاؤا لشام...... فأمهم:

الشام: بظاہر شام سے مراد "القدس" ہے کیونکہ بعض روایات میں "القدس" کی تصریح ہے۔

يعدون: یاء کے ضمہ اور عین کے کسرہ کے ساتھ ہے۔

يسوون الصفوف: **يعدون للقتال** سے بدل ہے۔

اذا أقيمت الصلاة: اور ایک صحیح نسخے میں "اذ" کی بجائے "اذا" (الف کے ساتھ) وارد ہوا ہے۔ اس عبارت کی تقدیر "وقت اقامة المؤذن للصلاة" ہے۔

فأمهم: اس جملے میں مضارع سے ماضی کی طرف اس لئے عدول کیا، تاکہ اس واقعہ کے تحقیق و تاکید پر دلالت ہو اور اس بات پر دلالت کرنے کیلئے کہ مضارع پر ماضی کا عطف اور اس کے بالعکس جائز ہے۔ اس فعل کے فاعل کی ضمیر کا مرجع عیسیٰ علیہ السلام ہے اور مفعول بہ کی ضمیر کا مرجع "المسلمين" ہے۔

اور "امامة" سے مراد نماز کی امامت ہے، اور اس وقت مقتدیوں میں امام مہدی علیہ السلام بھی ہونگے۔ اور ایک روایت

میں ہے کہ: حضرت عیسیٰ علیہ السلام امام مہدی کو یہ کہہ کر امامت کیلئے آگے کر دیں گے، کہ نماز آپ کیلئے قائم کی گئی ہے۔ اور اس میں اشارہ ہے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے تابع ہونے کی طرف، اگرچہ مستقل طور پر امام مہدی علیہ السلام کی اتباع ہوگی، بلکہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام صرف شریعت محمدی صلی اللہ علیہ وسلم کی تائید و تاکید کریں گے پھر اس کے بعد ہمیشہ کیلئے امام مہدی علیہ السلام ہی مسلمانوں کی امامت کریں گے۔ چنانچہ ارشاد نبوی "فامهم" میں یا تو تغلیب ہے یا مجاز ہے۔ اور عبارت کی تقدیر اس طرح ہے: "أمر امامهم بالامامة" اور دجال اس وقت مسلمانوں کا محاصرہ کیے ہوئے ہوگا۔

قوله: فاذا رآه عدو الله ......:

عدو: مرفوع ہے۔ اور اس سے دجال مراد ہے۔

"حربة": اس کا معنی ہے چھوٹا نیزہ۔

امام ترمذیؒ نے مجمع بن جاریہ سے یہ مرفوع روایت نقل کی ہے:

"يقتل ابن مريم الدجال بباب لد" (عیسیٰ بن مریمؑ دجال کو باب لُد کے پاس قتل کریں گے)۔

مشہور یہ ہے کہ باب لُد مسجد القدس کے دروازوں میں سے ایک دروازے کا نام ہے۔ نہایہ میں لکھا ہے کہ باب لُد شام میں ایک مقام کا نام ہے۔ امام سیوطیؒ نے ترمذی کی اپنی شرح میں ذکر کیا ہے، کہ بعض کا یہ کہنا کہ باب لُد فلسطین میں ایک جگہ کا نام ہے۔ ممکن ہو کہ اس طرح ہے کہ دجال کا جب محاصرہ کیا جائے گا، وہ بیت المقدس سے بھاگ کھڑا ہو، اور عیسیٰ علیہ السلام اس کو ملکِ شام میں کسی جگہ قتل کر ڈالیں۔ واللہ اعلم۔

امام مسلمؒ نے اس حدیث کو اسی سیاق کے ساتھ نقل کیا ہے اور امام بخاری نے اس حدیث کو خروج دجال ونزول عیسیٰ علیہ السلام کے ضمن میں بیان کیا ہے۔ (كذا ذكره ميركؒ عن تصحيح)

۵۴۲۲ : وَعَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ مَسْعُوْدٍ قَالَ اِنَّ السَّاعَةَ لَا تَقُوْمُ حَتّٰى لَا يُقْسَمُ مِيْرَاثٌ وَلَا يُفْرَحُ بِغَنِيْمَةٍ ثُمَّ قَالَ عَدُوٌّ يَجْمَعُوْنَ لِاَهْلِ الشَّامِ وَيَجْمَعُ لَهُمْ لِاَهْلِ الْاِسْلَامِ يَعْنِي الرُّوْمَ وَفَيَتَشَرَّطُ الْمُسْلِمُوْنَ شُرْطَةً لِلْمَوْتِ لَا تَرْجِعُ اِلَّا غَالِبَةً فَيَقْتَتِلُوْنَ حَتّٰى يَحْجُزَ بَيْنَهُمُ اللَّيْلُ فَيَفِيْءُ هٰؤُلَاءِ كُلٌّ غَيْرُ غَالِبٍ وَتَفْنَى الشُّرْطَةُ ثُمَّ يَتَشَرَّطُ الْمُسْلِمُوْنَ شُرْطَةً لِلْمَوْتِ لَاتَرْجِعُ اِلَّا غَالِبَةً فَيَقْتَتِلُوْنَ حَتّٰى يُمْسُوْا فَيَفِيْءُ هٰؤُلَاءِ وَهٰؤُلَاءِ كُلٌّ غَيْرَ غَالِبٍ وَتَفْنَى الشُّرْطَةُ فَاِذَا كَانَ يَوْمُ الرَّابِعِ نَهَدَ اِلَيْهِمْ بَقِيَّةُ اَهْلِ الْاِسْلَامِ فَيَجْعَلُ اللّٰهُ الدَّبَرَةَ عَلَيْهِمْ فَيَقْتَتِلُوْنَهُ مَقْتَلَةً لَمْ يُرَمِثْلُهَا حَتّٰى اِنَّ الطَّائِرَ لَيَمُرُّ بِجَنَبَاتِهِمْ فَلَا يُخَلِّفُهُمْ حَتّٰى يَخِرَّ مَيْتًا فَيَتَعَادُّ بَنُو الْاَبِ كَانُوْا مِائَةً فَلَا يَجِدُوْنَهُ بَقِيَ مِنْهُمْ اِلَّا الرَّجُلُ الْوَاحِدُ فَبِاَيِّ غَنِيْمَةٍ يُفْرَحُ اَوْ اَيُّ مِيْرَاثٍ يُقْسَمُ فَبَيْنَا هُمْ كَذٰلِكَ اِذْ سَمِعُوْا بِبَاْسٍ هُوَ اَكْبَرُ مِنْ ذٰلِكَ فَجَاءَ الصَّرِيْخُ اِنَّ الدَّجَّالَ قَدْ خَلَفَهُمْ فِيْ ذَرَارِيْهِمْ فَيَرْفُضُوْنَ مَافِيْ اَيْدِيْهِمْ وَيُقْبِلُوْنَ

فَيَبْعَثُوْنَ عَشَرَ فَوَارِسَ طَلِيْعَةً قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنِّيْ لَاَعْرِفُ اَسْمَاءَ هُمْ وَاَسْمَاءَ اٰبَائِهِمْ وَاَلْوَانَ خُيُوْلِهِمْ هُمْ خَيْرُ فَوَارِسَ اَوْمِنْ خَيْرِ فَوَارِسَ عَلٰى ظَهْرِ الْاَرْضِ يَوْمَئِذٍ.

(رواه مسلم)

اخرجه مسلم في صحيحه ٢٢٢٣/٤ حديث رقم (٣٧-٢٨٩٩)

ترجمہ: ''حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ ''یقیناً قیامت کا قیام نہیں ہوگا حتی کہ میراث کا تقسیم ہونا بند ہو جائے گا'' یعنی یا تو کفار سے جنگ و جدال میں اہل اسلام کی اکثریت کے قتل ہو جانے کی وجہ سے تقسیم میراث موقوف ہو جائے گی کیونکہ اس وقت جو تھوڑے بہت مسلمان بچیں گے انہیں بھی اپنے مرنے والوں کے ترکہ کو بانٹنے کی فرصت نہیں ہوگی یا دینی احکام پر عمل کرنے میں لوگ اس قدر سستی برتنے لگیں گے کہ لوگوں میں یہ سلسلہ خود ہی ختم ہو جائے گا اور یا یہ کہ مرنے والے لوگ اپنے ذمہ اتنے قرض اور مطالبات چھوڑ جائیں گے کہ ان کی ادائیگی کرنے کے بعد ترکہ میں سے اتنا بچے گا ہی نہیں کہ اس میں وراثت جاری ہو) اور (حتی کہ) مال غنیمت سے خوش نہیں ہوا کریں گے (یعنی قیامت قائم ہونے سے پہلے مسلمان غنیمت کے مال سے کی تقسیم سے خوشی محسوس نہیں کیا کریں گے اور یہ خوش نہ ہونا یا تو اس لئے ہوگا کہ مال غنیمت ملنا ہی بند ہو جائے گا اور جب مال ملے گا نہیں تو کوئی خوش کہاں سے ہوگا اور یا خوش نہ ہونے سے یہ مراد ہے کہ جو خائن و بددیانت لوگ ہوں گے وہ عہدیدار ہوں گے اور اس مال کو حقداروں تک پہنچانے کے ذمہ داران ہوں گے اس لئے دیانتدار و ایماندار لوگوں کو اس مال سے خوشی نہ ہوگی جس کی وجہ سے مال) پھر حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے (ان دونوں) باتوں کی حقیقت وصورۃ واقعہ کو اپنی تحقیق کے مطابق یوں) بیان کیا کہ ''دشمن یعنی کافر اہل شام سے لڑائی کے لئے فوج اور طاقت جمع کریں گے' اِدھر مسلمان بھی ان کافروں سے جنگ کے لئے لشکر اور طاقت جمع کریں گے۔ دشمن سے مراد رومی ہیں' چنانچہ مسلمان اپنے لشکر میں ایک دستہ (جو کچھ فوج پر مشتمل ہوگا علیحدہ کر کے آگے روانہ کریں گے تاکہ وہ جنگ کرے اور مر جائے اور نہ واپس لوٹے مگر فتح یاب اور غالب ہو کر۔ پس دونوں طرف کے لشکر باہم ایک دوسرے کے خلاد جنگ شروع کر دیں گے) حتی کہ دونوں لشکروں کے درمیان رات مانع جنگ بن جائے گی) نیز دونوں فریق لوٹ آئیں گے اور ان میں سے کوئی بھی فتح وغلبہ حاصل کرنے والا نہ ہوگا البتہ دونوں فریقوں وہ چیدہ اور منتخب دستے جو لڑنے کے لئے آگے گئے ہوں گے ختم ہو جائیں گے (یعنی دونوں طرف کے لشکروں نے اپنے جن چیدہ فوجیوں کو لڑنے کے لئے آگے بھیجا ہوگا وہ اس دن کی جنگ میں کام آ جائیں گے۔ اور باقی تمام فوجی اپنے اپنے ٹھکانوں پر واپس آ جائیں گے' لہٰذا اس جنگ کا حساب برابر رہے گا کوئی بھی غالب یا مغلوب نہ ہوگا) پھر (دوسرے دن) مسلمان ایک دوسرے دستے کو چن کر علیحدہ کر کے آگے روانہ کریں گے تاکہ وہ جنگ کرے اور مر جائے اور واپس نہ لوٹے مگر فاتح ہونے کی حالت میں لوٹے' پس دونوں طرف کے لشکر ایک دوسرے کے خلاف جنگ شروع کر دیں گے یہاں تک کہ دونوں لشکروں کے درمیان رات مانع جنگ بن جائے گی' اور دونوں فریق لوٹ آئیں گے ان میں سے نہ کوئی

غالب ہوگا (نہ کوئی مغلوب) البتہ دونوں طرف کی فوج کے وہ چیدہ دستے جولڑنے کے لئے آگے گئے ہوں گے ختم ہو جائیں' پھر (تیسرے دن) مسلمان ایک اور لشکر کو منتخب کر کے آگے بھیجیں گے تا کہ وہ جنگ کرے اور مر جائے اور اگر واپس آئے تو فتح یاب ہو کر آئے' پس دونوں فریق ایک دوسرے کے خلاف جنگ شروع کر دیں گے' حتیٰ کہ شام تک لڑتے رہیں گے اور دونوں طرف کے فوجی اپنے اپنے ٹھکانوں پر واپس آ جائیں گے' ان میں سے نہ کوئی غالب ہوگا نہ کوئی مغلوب البتہ دونوں طرف کے وہ منتخب دستے جو جنگ کے لئے آگے گئے ہوں گے فنا کے گھاٹ اتر جائیں گے اور پھر جب چوتھا دن ہوگا تو اہل اسلام کی بقیہ تمام فوج کفار سے جنگ کے لئے نکل کھڑی ہوگی اور اللہ تعالیٰ ان کے ہاتھوں کفار کو شکست دلوائے گا۔ بہر حال (اس دن نہایت سخت اور خوفناک جنگ ہوگی اور) مسلمان جان توڑ کر مقابلہ کریں گے اور یہ ایسی جنگ ہوگی اس طرح کی لڑائی کبھی نہیں دیکھی گئی ہوگی' یہاں تک کہ اگر کوئی پرندہ لشکر والوں کے اوپر سے گزر جانا چاہے گا تو ان کو پیچھے نہیں چھوڑ پائے گا یعنی ان سے آگے نہیں گزر سکے گا کہ ہلاک ہو کر زمین پر گر جائے گا (مطلب یہ کہ اس لڑائی میں اس کثرت سے لوگ مارے جائیں گے کہ پورا میدان قتال انسانی لاشوں سے پر ہوگا اور اگر کوئی پرندہ وہاں سے پرواز کرنا چاہے گا تو وہیں پر لاشوں کی ناقابل برداشت بدبو کی وجہ سے مر کر گر پڑے گا یا یہ کہ وہ معرکہ کی جگہ اتنی طویل وعریض ہوگی کہ اگر کوئی پرندہ اس کی ایک جانب سے اڑ کر دوسری جانب جانا چاہے گا تو نہیں جا پائے گا بلکہ اڑتے اڑتے اتنا تھک جائے گا کہ پہلے ہی مر جائے گا گر پڑے گا) پھر جب ایک باپ کے بیٹے (یعنی کسی ایک خاندان یا کسی ایک سلسلے کے لوگ) کہ جن کی تعداد سو ہوگی اپنے افراد کو گننا شروع کریں گے تو ان میں سے صرف ایک ہی مل پائے گا (یعنی جنگ ختم ہونے کے بعد باقی ماندہ لشکر کے لوگ جانی نقصان کا جائزہ لینا شروع کریں گے' چنانچہ ہر شخص اپنے اقارب اور متعلقین کو شمار کرے گا تو اسے معلوم ہوگا کہ اگر اس کے رفقاء واقرباء میں سے صرف ایک فیصد لوگ زندہ بچے ہیں ننانوے فیصد شہید ہو گئے یا قتل ہو گئے ہیں) پس ایسی صورت میں (جب کہ مرنے والوں کی تعداد اس قدر بڑی ہوگی) کون سا مال غنیمت خوش کن ثابت ہوگا اور کون سی میراث تقسیم ہوگی؟ بہر حال مسلمان اسی حالت میں ہوں گے کہ اچانک ان کو ایک سخت لڑائی اطلاع ملے گی' جو پہلی جنگ سے بھی زیادہ عظیم اور خطرناک ہوگی' پھر مسلمان یہ آواز سنیں گے (کہ جیسے کوئی منادی پکار رہا ہے کہ) ان کی عدم موجودگی میں ان کے اہل وعیال کے درمیان دجال ظاہر ہو چکا ہے (یہ خبر سنتے ہی) وہ مسلمان اپنے ہاتھوں کی چیزوں (یعنی مال جو مال غنیمت حاصل ہوا ہوگا) پھینک پھانک کر دجال کی طرف متوجہ ہو جائیں گے اور (پہلے) وہ اپنے دس سواروں کو آگے روانہ کریں گے تا کہ دشمن کے متعلق پہلے سے اطلاعات وآگاہی حاصل ہو جائے۔ رسول کریم ﷺ نے فرمایا تھا کہ مسلمان جن سواروں کو پہلے روانہ کریں گے یقیناً میں ان کے اور ان کے باپ کے نام سے بھی باخبر ہوں اور یہ بھی جانتا ہوں کہ ان کے گھوڑے کس رنگ کے ہوں گے نیز وہ بہترین سوار ہوں گے' یا یہ فرمایا کہ وہ اس زمانے کے روئے زمین کے بہتر سواروں میں سے ہوں گے''۔ (مسلم)

تشریح: قوله:ان الساعة لاتقوم حتى لا يقسم ميراث:

(میراث کی عدم تقسیم) کی وجہ کے بارے میں کئی اقوال ہیں:

1. مقتولین کی کثرت کی وجہ سے میراث تقسیم نہیں کی جائے گی۔
2. بعض کا کہنا ہے کہ مال کی کثرت کی وجہ سے میراث تقسیم نہیں کی جائے گی۔ پہلا قول زیادہ صحیح ہے۔ (کذافی الازھا)
3. کہا گیا ہے کہ ایسا وقت آئے گا، جس میں میراث کا علم جاننے والا کوئی نہیں رہے گا، اس لئے میراث کا مال تقسیم نہیں کیا جائے گا۔
4. میں (ملاعلی قاریؒ) کہتا ہوں مطلب یہ ہے کہ شریعت اُٹھ جائے گی، چنانچہ لوگ میراث کو ورثاء میں بالکل تقسیم نہیں کریں گے۔
5. مطلب یہ ہے کہ لوگ شریعت کے مطابق مالِ میراث کو تقسیم نہیں کریں گے، جیسا کہ آج کل ہو رہا ہے۔
6. اس بات کا بھی احتمال ہے کہ مال کی قلت اور فقراء کی کثرت کی وجہ سے ورثاء میں مالِ میراث تقسیم نہیں کیا جائے گا۔
7. تو اس وجہ سے کہ کوئی مال ہوگا ہی نہیں جس کو تقسیم کیا جائے
8. لوگوں پر دوسروں کا قرضہ اتنا ہوگا کہ متروکہ مال کو میراث میں تقسیم نہیں کیا جاسکتا ہوگا،
9. مالدار لوگ ظالم بن گئے ہونگے، اس لئے ان کا مال بیت المال میں پہنچا دیا گیا ہوگا، اور ان کی اولاد کے پاس کچھ مال نہیں بچے گا، جس کو بطور میراث کے آپس میں تقسیم کریں۔ واللہ اعلم۔ اس توجیہ کی تائید اسی روایت کے اگلے لفظ "ولا یفرح" سے ہوتی ہے۔

قولہ: ولا یفرح فبنیمة:

لایفرج: مجہول کے صیغہ کے ساتھ منقول ہے، ای **ولا یفرح أحدٌ بغنیمةٍ**: غنیمت سے کسی کو خوشی اس لئے نہیں ہو گی کہ مالِ غنیمت میں سے لوگوں کو کچھ بھی دیا نہیں جائے گا۔

یا ظالموں کے ظلم کی وجہ سے یا ملاوٹ وخیانت کی وجہ سے دیانت دار لوگوں کو مالِ غنیمت کے آنے سے کچھ بھی خوشی نہ ہو گی۔ اور یہ بات طے شدہ قاعدہ ہے: "**العبرة بعموم اللفظ لا بخصوص السبب**" (الفاظ کے عموم کا اعتبار کیا جاتا ہے، شانِ ورود کی خصوصیت کا اعتبار نہیں کیا جاتا) اس لئے راوی نے جو وجہ ذکر کی ہے وہ ان توجیہات کیلئے کوئی مضر نہیں ہے۔

قولہ: عدو یجمعون لاھل الشام...... وتفضی الشرطة:

عدو: (اس کی صفت مقدر ہے) ای: "**عدو من الروم**" (رومی دشمن)، "**عدو کثیر**" (بہت زیادہ تعداد میں دشمن)۔ "**عدو**" مبتدا ہے اور اس کی خبر "**یجمعون**" ہے۔ (اس فعل کا مفعول بہ مقدر ہے) ای: "**یجمعون الجیش والسلاح**"۔

یعنی الروم: راوی کا مقولہ ہے اور فاعل ضمیر ابن مسعودؓ کی طرف راجع ہے۔ اور مطلب یہ ہے کہ "**عدو**" سے ابن مسعودؓ کی مراد روم ہے۔

فیتشرط المسلمون:

باب افتعال کی بجائے باب تفعل استعمال کیا گیا ہے۔کہا جاتا ہے: "اشترط فلانٌ بنفسہٖ لأمر کذا" قدمھا و أعلمھا، أعدھا۔(یعنی فلان نے اپنے آپ کو اس کام کیلئے آمادہ کیا، اور تیار کیا اور کہا جاتا ہے أشرط نفسہ ای اعلمہ۔ یہ لفظ دوسری جگہ باب افتعال سے "فیشترط المسلمون" وارد ہوا ہے،

شرطۃ: شین کے ضمہ اور راء کے سکون کے ساتھ کا معنی ہے لشکر میں سے ایک جماعت جو قتال کے لئے پہلے آگے بڑھتی ہے اور معرکہ جنگ میں پہلے پہنچتی ہے۔اس جماعت کو" شرطۃ "اس لئے کہا جاتا ہے کہ (شرطۃ کا معنی علامت ہے اور) یہ جماعت لشکر کیلئے بمنزلہ علامت کے ہے۔

للموت: موت سے مراد" حرب" ہے، اور اس میں ایک قسم کی تجرید ہے۔

قاموس میں لکھا ہے:"الشرطۃ" شرط بروزن"صرد" کا واحد ہے" الشرطۃ "اس جماعت کو کہا جاتا ہے جو موت کیلئے تیار ہو کر سر بکف میدانِ جنگ میں گھس جاتی ہے اور اس جماعت کو بھی کہا جاتا ہے جو گورنروں اور کمانڈروں کی معاون ہوتی ہے۔اھ۔

یہاں پہلا معنی مراد ہے۔کہا گیا ہے اس جماعت کو شرطۃ اس لئے کہا جاتا ہے، کہ (یہ لفظ اشتراط سے مأخوذ ہے، اور اشتراط کا معنی ہے آگے بڑھنا تیار و آمادہ کرنا۔مترجم) یہ جماعت آگے بڑھتی ہے اور اپنے آپ کو موت کیلئے آمادہ کرتی ہے۔ اور اس کی تائید اگلے جملہ" لا ترجع" سے ہوتی ہے۔اس کی ضمیر "الشرطۃ" کی طرف راجع ہے۔

یہ جملہ" شرطۃ " کیلئے صفت کاشفہ مبینہ ہے اور مطلب یہ ہے کہ مسلمان اپنے لشکر کی اگلی جماعت کو اس بات پر تیار کر کے آگے بھیجتے ہیں کہ وہ جماعت دشمن سے شکست نہ کھائے، بلکہ جمے رہیں اور ڈٹے رہیں یہاں تک کہ شہید ہو جائیں، یا غالب ہو جائیں۔

فیقتتلون: ضمیر "المسلمون والکافرون" کی طرف راجع، یعنی مسلمان اور کفار آپس میں لڑتے ہیں۔

یحجز: جیم کے ضمہ اور کسرہ کے ساتھ بمعنی "یمنع"

اللیل: (مضاف محذوف ہے) ای "دخول اللیل" اور "ظلام اللیل" ہے، مطلب یہ ہے کہ رات کی تاریکی کی وجہ سے لڑائی موقوف ہو جائے گی۔

یفئی: یہ فعل مضارع ہے "الفيء" بمعنی" زوال" سے مأخوذ ہے،

ھؤلاءِ: اس کا مشار الیہ" المسلمون" ہے، ای:"ھؤلاء المسلمون"

وھؤلاء: اس کا مشار الیہ" الکافرون" ہے۔

کل: ای "کلٌ من الفریقین"

غیر غالب: یعنی بغیر ہار جیت کے لڑائی ختم ہو جائے گی۔

"الشرطة" سے "جنس مراد ہے" چنانچہ دونوں لشکروں کی جماعت کو یہ لفظ شامل ہے۔ حاصل یہ ہے کہ دونوں طرف سے لشکر کا بڑا حصہ اور علمبردار، ہار جیت کے بغیر واپس لوٹ جائیں گے، اور دونوں لشکروں کا اگلا حصہ ہلاک ہو جائے گا، اس لئے کہ اگر کسی ایک لشکر کا اگلا حصہ باقی رہے گا، تو دوسرا لشکر جس کا اگلا حصہ ہلاک ہو گیا مغلوب بن جائے گا، جبکہ پہلے صراحۃً "کل غیر غالب" ارشاد فرمایا گیا ہے۔

بعض تصحیح شدہ نسخوں میں "شرطة" شین کے فتحہ کے ساتھ ہے۔ چنانچہ سید جمال الدینؒ فرماتے ہیں: جان لیجئے کہ یہ لفظ دو احتمال رکھتا ہے۔ اگر اس کی "شین" مفتوح ہو تو اس کا مطلب ہوگا: **يشرطون معهم شرطة واحدة**، اور "**يفئ هؤلاء وهؤلاء**" کا مطلب یہ ہوگا کہ وہ دونوں لشکر رات ڈھل جانے کی وجہ سے واپس ہو جائیں گے۔ اور اگر اس کی "شین" مضموم ہو تو اس سے مراد لشکر کا اہم ترین حصہ ہوگا۔

لیکن اس پر ایک اشکال ہوتا ہے اور وہ یہ کہ "جب لشکر کا اگلا حصہ غلبہ حاصل کئے بغیر لوٹ آیا تو وہ ہلاک نہیں ہے۔ اس لئے کہ اگر وہ اگلا حصہ ہلاک ہو گیا تو پھر یہ کہنا کیسے درست ہوگا کہ "**فيفئ هؤلاء وهؤلاء كل غير غالب وتفئ الشرطة**"

اس اشکال کا جواب اس طرح دیا جا سکتا ہے کہ " الشرطة " کے ساتھ لشکر کا بھی کچھ حصہ ہوگا۔ یہی وہ لوگ ہوں گے جو غلبہ حاصل کئے بغیر لوٹیں گے، اگلا حصہ مراد نہیں ہے۔

یا یہ کہ تمام مسلمان "شرطه" کے ساتھ ہر روز ہوں گے، لہٰذا شرطہ کے علاوہ باقی تمام لوگ لوٹ آئیں گے۔ اھ۔

راجح اور معتمد جواب وہی ہے جو ہم نے پہلے ذکر کیا' اور ہماری اس تقریر کی تائید علامہ طیبیؒ کی اس بات سے بھی ہوتی ہے جو انہوں نے "الفائق" میں ذکر کی ہے۔ چنانچہ وہ فرماتے ہیں: کہا جاتا ہے "**شرط نفسه لكذا**" ای "**اعلم نفسه لكذا وأعد نفسه لكذا**" فعل کا مفعول محذوف ہے۔

اور حدیث میں لفظ "**فيتشرط**" ہے "**يشترط**" "**اشترط**" کی جگہ استعمال ہوا ہے۔ کہا جاتا ہے "**اشترط فلان بنفسه لأمر كذا**" **قدم نفسه لأمر كذا وأعدها وأعلمها**۔ اور اگر یہ لفظ روایت میں "شین" کے فتحہ کے ساتھ ہو جو "الشرط" سے مأخوذ ہے تو اس کا معنی زیادہ واضح اور درست ہوتا۔ اور " **تفئ الشرطة** " کا مطلب یہ ہے کہ وہ " آپس میں شرط لگائیں گے کہ غلبہ حاصل کئے بغیر واپس نہیں لوٹیں گے یعنی اس دن۔ چنانچہ جب رات کی تاریکی چھا جائے گی، تو وہ شرط مرتفع ہو جائے گی جو انہوں نے لگائی تھی۔

اس لفظ میں تاء اس لئے داخل کی گئی تاکہ توحید پر دلالت کرے ای یشترطون شرطۃ واحدۃ الخ یعنی یہ شرط ایک جانب سے لگے گی دونوں جانبوں سے نہیں لگے گی، لیکن روایت میں یہ لفظ اس طرح مروی نہیں ہے۔

چنانچہ علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں، جب صحیح وصریح روایت مل جائے تو اس کو لینا واجب ہوگا، اور اگر اس طرح کی کوئی صحیح وصریح حدیث نہ ملے تو ہم "شین" کے ضمہ میں تحریف کر کے "شین" کو فتحہ نہیں دیں گے، اور نہ ہی افتعال کی " تاء" کی تاویل میں تکلف کر کے **شرطة** کی نفی میں حقیقت سے مجاز بعید کی طرف رجوع کریں گے۔ نیز اس بات کو فرض کرنے میں کیا مانع ہے کہ مسلمان

اپنے لشکر میں سے ایک جماعت کو جنگ لڑنے کیلئے آگے بھیج دیں، اور ان سے اس بات کا عہد کر لیں کہ جب تک غلبہ حاصل نہ کر لے واپس نہ لوٹے، چنانچہ اس عہد کی وجہ سے لشکر کا یہ حصہ اپنی پوری کوشش کرے گا اور اپنے عہد میں اپنے آپ کو سچا دکھا کر اس طرح قتال کرے گا کہ سارے کے سارے قتل ہو جائیں گے، لیکن واپس پیچھے کی طرف نہ لوٹیں گے۔ اور "وتفنى الشرطة" کا یہی مطلب ہے۔

علامہ جوہریؒ فرماتے ہیں: قد شرط عليه كذا، واشترط عليه وشرط. "فيفئ هولا ء وهولاء " سے مراد شرطہ نہیں بلکہ دو عظیم الشان لشکر مراد ہیں۔

قوله:ثم يشترط المسلمون شرطة للموت ......وتفى الشرطة:

شرطةً: (کی صفت محذوف ہے۔) اى ثالثة

"يمسوا": اى يدخلوا في المساء۔ اس تعبیر میں صنعت "تفنن" ہے۔

قوله:فاذا كان يوم الرابع ......حتى يخرميتا: نهد: بمعنی نهض وقام، یعنی اہل روم سے لڑنے کیلئے تیار ہو کر کھڑے ہو جائیں گے۔

"الدبرة": دال مہملہ اور بائے موحدہ کے فتحہ کے ساتھ 'اسم ہے' "ادبار" سے مأخوذ ہے۔ ایک روایت میں اس لفظ کی بجائے "الدابر" وارد ہوا ہے، جس کا معنی ہے: الهزيمة

عليهم: ضمیر کا مرجع "الكفار" ہے۔ اور ایک شارحؒ فرماتے ہیں، کہ یہ ضمیر "الروم" کی طرف راجع ہے۔

فيقتلون: باب افتعال سے ہے اور یہی صحیح ہے، جو اکثر معتمد نسخوں میں موجود ہے، ایک نسخے میں ثلاثی مجرد سے بصیغۂ مجہول" فيقتلون" وارد ہوا ہے، اور اس کی بنیاد یہ وہم ہے کہ یہ "فيجعل الله" کے متعلق ہے، حالانکہ معاملہ اس طرح نہیں ہے، بلکہ یہ مجموعہ کلام سے متعلق ہے۔ واللہ اعلم۔

مقتلة: یہ مفعول مطلق ہے من غیر باب یا حذف زوائد کے ساتھ ہے، اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد: ﴿والله أنبتكم من الارض نباتا﴾ [نوح:۱۷] :"اور اللہ نے تم کو زمین سے ایک خاص طور پر پیدا کیا ہے۔" اس کی نظیر ہے۔ (اور "مقتلة" کی تنوین تعظیم کیلئے ہے) اى "مقاتله عظيمة"۔

لم ير: رؤیت بصری مراد ہے، یا رؤیت قلبی مراد ہے۔

"الطائر" ہمزہ کو مفتوح اور مکسور دونوں طرح پڑھا گیا ہے۔

جنباتهم: یہ جیم، نون اور باء ہے۔ پہلے دونوں حروف مفتوح ہیں، ۔بمعنی "نو احيهم"

لا: ایک اور نسخے میں "فما" ہے۔

(يخلفهم) لام مشدد کے کسرہ کے ساتھ "خلفت فلانا ورائى" سے مأخوذ ہے۔ اور یہ اس وقت بولا جاتا ہے جب تم کسی کو اپنے سے پیچھے چھوڑ دو۔

"یخر": خاء کے کسرہ اور راء کی تشدید کے ساتھ) فاعل ضمیر "الطائر" کی طرف راجع ہے۔

میتا: یاء کو تشدید اور تخفیف دونوں کے ساتھ پڑھنا درست ہے۔

مظہرؒ مطلب بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں یعنی' جب کوئی پرندہ ان کی لاشوں کے اوپر اُڑے گا، تو وہ پرندہ ان لاشوں کے آخر تک پہنچنے سے پہلے ہی ان کی بدبو کی شدت کی وجہ سے مر کر گر جائیگا۔

یا اس میدان کی مسافت جس میں ان لوگوں کی لاشیں پڑیں ہونگیں، اتنی طویل ہوگی کہ جب وہ پرندہ اڑے گا اس میدان کی مسافت کو اپنی زندگی میں طے نہیں کر سکے گا، اور میدان کے آخر تک پہنچنے سے پہلے ہی مر جائے گا۔

علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں کہ یہ دوسرا معنی بختری کے اُس قول کے ہم مفہوم ہے جس میں بختری نے برکت کو بیان کرتے ہوئے کہا:

لا يبلغ السمك المحصور غايتها

لبعد ما بين قاصيها ودانيها

فیعاد بنو الأب قوله: ......ای میراث یقسیم: فیتعاد: معروف کے صیغہ کے ساتھ ہے، اور بعض حضرات کے نزدیک یہ لفظ مجہول کے صیغہ کے ساتھ ہے۔ یہ فعل باب تفاعل سے ہے، اور "یعد" کے معنی میں ہے۔

"بنو الأب": سے وہ جماعت مراد ہے، جو اس لڑائی میں شریک ہوگی، اور آپس میں رشتہ دار ہونگے۔

"یجدونہ": میں مفعول بہ کی ضمیر منصوب مائة کی طرف راجع ہے۔ اور مائة، المعدود یا العدد کی تاویل میں لیا جائے گا، اور عبارت کی تقدیر "فلا یجدون عددھم" ہے۔

بعض حضرات فرماتے ہیں: کہ مفعول بہ کی ضمیر منصوب بنو الأب کی طرف لوٹتی ہے اور بنو الأب لفظ کے اعتبار سے حقیقی جمع نہیں ہے، بلکہ معنی کے اعتبار سے جمع ہے۔ حاصل یہ ہے کہ "بنو الأب" قوم کے معنی میں ہے اور لفظ "قوم" معنی کے اعتبار سے جمع ہے، اور لفظ کے اعتبار سے مفرد ہے۔ چنانچہ لفظ اور معنی دونوں کی رعایت رکھتے ہوئے "لا یجدونہ" میں مفرد کی ضمیر ذکر کی گئی جبکہ "بقی منھم" میں جمع کی ضمیر ذکر کی گئی۔

قوله: فلا یجدونه بقی منهم الا الرجل الواحد:

خلاصہ یہ کہ لڑائی کے بعد اپنے آپ کی گنتی کرنا شروع کریں گے اور ہر جماعت والے اپنے رشتہ داروں کی گنتی کریں گے تو سو میں سے ایک فرد ہی ملے گا، یعنی سو افراد میں سے ایک ہی فرد زندہ بچ گیا ہوگا۔

قوله: فبأی غنیمة یفرح؟:

فاء یا تو تفریعیہ ہے یا فصیحیہ ہے۔ علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں، کہ یہ جملہ شرط محذوف کی جزاء ہے، جس کو اولاً مبہم طور پر ذکر کیا، ان الساعة لا تقوم حتی لا یقسم میراث، ولا یفرح بغنیمة، پھر اس کو قدرے تفصیل کے ساتھ بیان کرتے ہوئے یوں فرمایا: عدو یجمعون الخ، کہ وہ اس صفت کے ساتھ مقید ہے، لہٰذا یہ کہنا صحیح ہوگا: فاذ کان کذلك فبأی غنیمة یفرح۔

قوله: او ای میراث یقسم؟: ظاہر یہ ہے کہ ای مرفوع ہے۔او، بیان نوع کیلئے ہے۔اور ایک نسخے میں یہ لفظ ''جر'' کے ساتھ منقول ہے،اور فبای میراث تقع القسمة؟ کی تقدیر میں ہے۔

اور اس مقام پر تقسیم میراث کو مؤخر ذکر کیا جبکہ حدیث کے شروع میں اس کو مقدم ذکر کیا گیا چنانچہ یہ ارشاد باری تعالیٰ ﴿يَوْمَ تَبْيَضُّ وُجُوهٌ وَتَسْوَدُّ وُجُوهٌ فَأَمَّا الَّذِينَ اسْوَدَّتْ وُجُوهُهُمْ﴾[آل عمران:۱۰۶] ''اس روز کہ بعض چہرے سفید ہو جائیں گے اور بعض چہرے سیاہ ہوں گے۔سو جن کے چہرے سیاہ ہو گئے ہوں گے'' کی نظیر ہے(کیونکہ اس آیت میں بھی شروع حصہ میں چہرے سیاہ ہونے کو چہرے سفید ہونے کے بعد بیان کیا گیا،لیکن دوسرے حصہ میں چہرے سیاہ ہونے کو مقدم کیا گیا۔

قوله: فبیناهم کذلك اذا سمعوا فوارس طلیعه:

فبیناهم...... سمعوا: فعل کے فاعل کی ضمیر المسلمون کی طرف لوٹتی ہے۔

بأس: باء کے فتحہ اور ہمزہ کے سکون کے ساتھ منقول ہے اور ہمزہ کو الف سے بدلنا بھی جائز ہے،بأس،کی تنوین تعظیم کیلئے ہے اور ''حرب عظیمٌ'' کے معنی میں ہے،چنانچہ اس کی تقدیر بحرب شدید ہے۔

هو اکبر: اکبر بمعنی ''اعظم'' ہے۔

من ذالك: اس کا مشار الیہ '' ما سبق'' ہے اور '' بأس'' سے مراد ''اہل بأس'' ہے۔گویا کہ اس لفظ میں مجاز کے مشہور دو طریقوں میں سے کوئی ایک مجاز کا ارتکاب ہوا ہے۔

فجاء هم: ضمیر منصوب کا مرجع المسلمین ہے۔

صریخٌ: بروزن فعیل ہے جو کہ ''صراخ'' بمعنی صوت سے ماخوذ ہے یعنی فجاء هم صوت المستغیث۔

ان الدجال: ہمزہ کو مکسور اور مفتوح دونوں طرح پڑھنا درست ہے۔

خلفهم: (لام کی تخفیف کے ساتھ) قعد مکانهم کے معنی میں ہے۔

فی ذراریهم: (یاء کی تشدید کے ساتھ) اولادهم کے معنی میں ہے۔ایک اور روایت میں ''فی ذراریهم'' کی بجائے ''فی اهلیهم'' وارد ہوا ہے۔

یرفضون: فاء کے ضمہ کے ساتھ۔

''ما'' سے غنیمت اور دوسرے اموال مراد ہیں،اور غنیمت و اموال کو چھوڑ دینا اہل وعیال کے خوف کی وجہ سے ہوگا۔

یقبلون: باب افعال سے مضارع کا صیغہ ہے۔

فوارس: فارس،کی جمع ہے اور فارس کا معنی ہے ''راکب فرس (گھوڑ سوار)

طلیعة: سے وہ جماعت مراد ہے جس کو دشمن کے احوال پر مطلع ہونے کیلئے بھیجا جاتا ہے،بمنزلہ جاسوس کے یہ فعیلة بمعنی فاعلة ہے۔اس میں واحد اور جمع برابر ہے۔

''عشر'': اس کو اس لئے ذکر کیا گیا کہ ''فوارس'' سے مراد ''طلائع'' ہیں۔

قوله: انی لاعرف سما ئهم واسمهآء ابآئهم والوان خيولهم:

یہ حضور علیہ السلام کے معجزات میں سے ہونے کے ساتھ ساتھ اس بات پر بھی دلالت ہے کہ اللہ تعالیٰ کا علم کائنات کے تمام جزئیات وکلیات پر محیط ہے۔

هم خير فوارس أومن خير فوارس بظاہر شک کی وجہ سے راوی نے ''او'' ذکر کیا ہے۔

علی ظهر الارض: ملائکہ سے احتراز کیلئے ''ظهر الأرض'' کی قید کو ذکر کیا ہے۔

یومئذ: یہ قید عشرہ مبشرہ اور ان جیسے اصحاب فضیلت سے احتراز کیلئے ہے۔

۵۴۲۳ : وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ هَلْ سَمِعْتُمْ بِمَدِيْنَةٍ جَانِبٌ مِنْهَا فِي الْبَرِّ وَجَانِبٌ مِنْهَا فِي الْبَحْرِ قَالُوْا نَعَمْ يَارَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ لَاتَقُوْمُ السَّاعَةُ حَتّٰى يَغْزُوَ هَا سَبْعُوْنَ اَلْفًا مِّنْ بَنِیْ اِسْحٰقَ فَاِذَا جَآءُ وْهَا نَزَلُوْا فَلَمْ يُقَاتِلُوْا بِسَلَاحٍ وَلَمْ يَرْمُوْا بِسَهْمٍ قَالُوْا لَآ اِلٰهَ اِلَّااللّٰهُ وَاللّٰهُ اَكْبَرُ فَيَسْقُطُ اَحَدُ جَانِبَيْهَا قَالَ ثَوْرُبْنُ يَزِيْدَ الرَّاوِیّ لَا اَعْلَمُهُ اِلَّا قَالَ الَّذِیْ فِی الْبَحْرِ ثُمَّ يَقُوْلُوْنَ الثَّانِيَةَ لَآاِلٰهَ اِلَّااللّٰهُ وَاللّٰهُ اَكْبَرُ فَيَسْقُطُ جَانِبُهَا الْاٰخَرُ ثُمَّ يَقُوْلُوْنَ الثَّالِثَةَ لَآاِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاللّٰهُ اَكْبَرُ فَيُفَرَّجُ لَهُمْ فَيَدْ خُلُوْنَهَا فَيَغْنِمُوْنَ فَبَيْنَا هُمْ يَقْتَسِمُوْنَ الْمَغَانِمَ اِذَا جَآءَ هُمُ الصَّرِيْخُ فَقَالَ اِنَّ الدَّجَّالَ قَدْ خَرَجَ فَيَتْرُكُوْنَ كُلَّ شَیْءٍ وَيَرْجِعُوْنَ ۔ (رواه مسلم)

اخرجه مسلم فی صحیحه ٢٢٣٨/٤ حديث رقم ٧٨-٢٩٢٠۔

ترجمہ: ''حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ (ایک روز) نبی کریم ﷺ نے (صحابہؓ سے) دریافت فرمایا کہ کیا تم نے کسی ایسے شہر کے متعلق سن رکھا ہے جس کی ایک جانب تو سمندر ہے اور دوسری جانب جنگل ہے؟ صحابہؓ نے عرض کیا کہ یارسول اللہ ﷺ (ہم نے اس شہر کا تذکرہ سن رکھا ہے) آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''قیامت کا قیام نہیں ہوگا حتی کہ حضرت اسحٰق علیہ السلام کی اولاد میں سے ستر ہزار افراد اس شہر کے اہل سے جہاد کریں گے! چنانچہ حضرت اسحٰق کی اولاد میں سے وہ لوگ (جب جنگ کے ارادے سے) اس شہر میں داخل ہوں گے تو (اس شہر کے نواحی علاقے میں) قیام کریں گے لیکن وہ لوگ شہر والوں سے اسلحہ کے ساتھ لڑائی نہیں کریں گے اور نہ ان کی طرف تیر پھینکیں گے بلکہ لا الٰہ الا اللہ واللہ اکبر کا نعرہ لگائیں گے اور شہر کے دو طرف کی دیواروں میں سے ایک طرف کی دیوار گر جائے گی'' (اس موقع پر) حدیث کے راوی ثور بن یزید رضی اللہ عنہ نے کہا کہ میرا خیال ہے کہ مرکزی راوی سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے یہاں سمندر کی جانب والی دیوار فرمایا تھا (یعنی میں یقین کے ساتھ تو نہیں کہہ سکتا' البتہ مجھے یاد پڑتا ہے کہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے اس موقع پر یہ بیان فرمایا تھا کہ اس نعرہ سے سمندر کی طرف والی دیوار گر جائے گی)۔ (بہر حال اس کے بعد حضور ﷺ نے یہ ارشاد فرمایا کہ) پھر وہ لوگ دوسری مرتبہ لا

الٰہ اللہ واللہ اکبر کا نعرہ لگائیں گے تو شہر کی دوسری جانب (یعنی جنگل کی طرف والی) دیوار بھی گر پڑے گی اس کے بعد لوگ تیسری مرتبہ لا الٰہ الا اللہ واللہ اکبر کا نعرہ لگائیں گے تو ان کے لئے شہر میں جانے کی راہ وسیع وکشادہ کردی جائے گی اور وہ شہر میں داخل ہو جائیں گے پھر وہ مالِ غنیمت جمع کریں گے (یعنی شہر میں جو کچھ ہوگا اس کو اپنے قبضہ میں لے لیں گے) اور اس مالِ غنیمت کو آپس میں تقسیم کرنے میں مصروف ہوں گے کہ دفعتاً (ان کے کانوں میں) یہ آواز آئے گی کہ کوئی اعلان کر رہا ہے دجال نکل آیا ہے! یہ آواز سنتے ہی وہ لوگ سب کچھ (یعنی مالِ غنیمت وغیرہ کو) پھینک کر (دجال سے جہاد کرنے کی غرض سے) واپس آ جائیں گے"۔ (مسلم)

تشریح: ایک شارحؒ فرماتے ہیں، کہ یہ شہر روم میں ہے اور بعض کا کہنا ہے کہ بظاہر اس شہر سے قسطنطنیہ مراد ہے۔ چنانچہ قاموس میں لکھا ہے کہ یہ شاہِ روم کا ٹھکانہ ہے۔ اس کو فتح کرنا قیامت کی نشانیوں میں سے ایک نشانی ہے۔ اس کو رومی زبان میں "بورنطیا" کہا جاتا ہے۔ اس شہر پناہ کی اونچائی اکیس ۱/۲۱ ذراع ہے۔ اس کا کنیسہ (گرجا گھر) مستطیل نما ہے، اور اس کنیسہ کے ایک جانب ایک اونچا ستون ہے، جس کے اوپر والے سرے پر تانبے کا بنا ہوا گھوڑا ہے جس پر ایک شخص سوار ہے اور اس کے ایک ہاتھ میں سونے کا ایک کرّہ (گیند نما گول چیز) ہے، اور دوسرے ہاتھ کی اُنگلیاں کھلی ہیں جن سے اشارہ کر رہا ہے۔ یہ قسطنطنیہ کے بانی کا مجسمہ ہے۔ اھ۔

اس بات کا بھی احتمال ہے کہ اس شہر کے علاوہ کوئی دوسرا شہر مراد ہو اور بظاہر ایسا ہی ہے۔ اس لئے کہ قسطنطنیہ تو ایک زبردست جنگ کے بعد فتح ہوگا، جبکہ یہ شہر محض مسلمانوں کے اللہ اکبر اور لا الٰہ الا اللہ کا نعرہ لگانے سے فتح ہو جائے گا۔

قوله: لاتقوم الساعة حتى يغزوها سبعون الفاء من بني اسحاق:

مظہر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ شام کے کُرد قبیلہ میں سے بعض حضرت اسحاق علیہ السلام کی اولاد میں سے ہیں، جو مسلمان ہیں اھ۔
اس بات کا بھی احتمال ہے کہ ان کے ساتھ ساتھ حضرت اسماعیل علیہ السلام کی اولاد بھی مراد ہو جن میں عرب اور غیر عرب مسلمان بھی شامل ہیں، مگر تغلیباً صرف بنو اسحاق کو ذکر کیا، نیز یہ بھی احتمال ہے کہ یہ واقعہ صرف حضرت اسحاق علیہ السلام کی اولاد کے ساتھ خاص ہو۔

قوله: فلم يقاتلوا بسالح ولم يرموا بسهم......:

عمومِ نفی کی تاکید کیلئے تعمیم کے بعد تخصیص لائی گئی ہے۔

قالوا: یہ جملہ مستأنفہ ہے یا حال ہے۔

يسقط: یہ صیغہ مضارع کا ہے۔

لا أعلمه: لا أظن کے معنی میں ہے اور ضمیر منصوب کا مرجع ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ ہے۔ ای "لا اظن أبا هريرةؓ"۔

الذى فى البحر: اى: أحد جانبيها الذى فى البحر لا اعلمه الا قال: مطلب یہ ہے کہ مجھے اس بات کا یقین نہیں ہے۔

یہ بھی ممکن ہے کہ اس کلام سے نزاع کرنے والے ان لوگوں پر رڈ کرنا مقصود ہو جنہوں نے حضرت ابو ہریرہؓ سے اس حدیث کو اس قید کے بغیر سُنا ہوا۔ اور اس سے وہ اشکال بھی ختم ہو گیا جس کو علامہ طیبیؒ نے ذکر کیا ہے کہ مصابیح کے نسخوں کی یہ عبارت "الذی فی البحر" راوی کی طرف سے "مدرج" ہے۔

یفرج: راء کے فتحہ وتشدید کے ساتھ ہے اور لهم ظرف نائب فاعل ہے۔

یغنمون: کا مفعول بہ "ما فیها" محذوف ہے۔

الفصل الثانی:

۵۴۲۴ : عَنْ مُعَاذِ بْنِ جَبَلٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عُمْرَانُ بَيْتِ الْمَقْدِسِ خَرَابُ يَثْرِبَ وَخَرَابُ يَثْرِبَ خُرُوْجُ الْمَلْحَمَةِ وَخُرُوْجُ الْمَلْحَمَةِ فَتْحُ قُسْطُنْطِيْنِيَّةَ وَفَتْحُ قُسْطُنْطِيْنِيَّةَ خُرُوْجُ الدَّجَّالِ ۔ (رواہ ابوداود)

اخرجه ابو داوٗد فی السنن ۴۸۲/۴ حدیث رقم ۴۲۹۴ وابن ماجه فی السنن ۱۳۷۰/۲ حدیث رقم ۴۰۹۲ واحمد فی المسند ۲۳۲/۵۔

ترجمہ: "حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: "بیت المقدس کا مکمل طور آباد ہونا مدینہ منورہ کی کی ویرانی اور بربادی کی وجہ سے ہوگا' اور مدینہ منورہ کی ویرانی' بہت سنگین خونریزی کے وقوع پزیر ہونے کا باعث ہوگی اور اس بہت سنگین جنگ کا وقوع پذیر ہونا قسطنطنیہ کی فتح کے حاصل ہونے کا سبب ہوگا اور قسطنطنیہ کی فتح کا حاصل ہونا دجال کے آ پہنچنے کا باعث اور اس کی نشانی ہوگا"۔ (ابوداود)

تشریح: قوله: عمران بیت المقدس خراب یثرب:

"المقدس": دال کی تشدید اور تخفیف کے ساتھ دونوں طرح پڑھنا درست ہے۔

عمران: عین کے ضمہ اور میم کے سکون کے ساتھ بمعنی "تعمیر" ہے۔ مال وجائیداد اور بندوں کی کثرت مراد ہے۔

بعض نے اس کی یہ وجہ بتائی ہے کہ بیت المقدس کی تعمیر کفار کے غلبہ کی وجہ سے ہوگی۔

ازہار میں لکھا ہے کہ بعض شارحین فرماتے ہیں، کہ بیت المقدس کی تعمیر سے مراد بیت المقدس کی عمارت کے خراب ہو جانے کے بعد دوبارہ تعمیر ہے کیونکہ آخری زمانہ میں بیت المقدس کی عمارت خراب ہو جائے گی پھر کفار اس کی تعمیر نو کریں گے۔

اور اصح قول یہ ہے کہ عمران سے تعمیر میں کمال ہے۔ ای: "عمران بیت القدس کاملاً مجاوزاً عن الحد وقت خراب یثرب": (یعنی بیت المقدس کی اس طرح تعمیر کہ مکمل ہو کر حد سے تجاوز کر جائے یثرب کے خراب ہونے کے وقت ہو گی) کیونکہ بیت المقدس خراب نہیں ہوگا۔

ابن الملکؒ فرماتے ہیں کہ موجودہ عمارت کو سلطان ملک ناصر نے تعمیر کروایا ہے، اور اللہ تعالیٰ ان کو جزاء خیر دے کہ انہوں چشموں کے پانی کا بندوبست کروادیا ہے۔

میں (ملا علی قاریؒ) کہتا ہوں: کہ بنو عثمان حفظہم اللہ نے وہاں تعمیرات میں کافی اضافے کئے ہیں، لیکن اس تمام کے باوجود مدینہ معطرہ سے اس کا کیا مقابلہ۔

قوله: وخراب يثرب خروج الملحمة:

ابن الملکؒ فرماتے ہیں کہا گیا ہے کہ اس جنگ سے مراد شامیوں اور رومیوں کے درمیان جنگ ہے۔ اور ظاہر یہ ہے کہ اس سے تاتاریوں اور شامیوں کے درمیان جنگ مراد ہے۔

میں (ملا علی قاریؒ) کہتا ہوں کہ گذشتہ حدیث' آئندہ حدیث اور اگلے الفاظ کی بناء پر پہلا قول زیادہ واضح ہے

قوله: خروج الملحمة فتح قسطنطينية ......:

ایک دوسرے نسخے میں قسطنطنیہ معرف باللام ہے۔

اشرفؒ فرماتے ہیں کہ بیت المقدس پر کفار کا قبضہ کرنا اور اس میں کفار کی کثرت تعمیر اس بات کی علامت ہے کہ اس کے بعد یثرب خراب ہو جائے گا، اور یثرب کی خرابی اس بات کی علامت ہے کہ اس کے بعد ایک عظیم الشان لڑائی ہوگی اور یہ عظیم الشان لڑائی اس بات کی علامت ہے کہ اس کے بعد قسطنطنیہ فتح ہوگا، اور قسطنطنیہ کی فتح اس بات کی علامت ہے کہ اس کے بعد دجال کا خروج ہوگا، اس لئے حضور علیہ السلام نے ہر ایک واقعہ کو بعینہٖ اگلا واقعہ قرار دے کر ہر ایک واقعہ کو بعد والے واقعہ سے تعبیر کیا اھ۔ حاصل یہ ہے کہ ان امور میں سے ہر ایک واقعہ بعد والے واقعہ کی علامت ہے اگرچہ درمیان میں کچھ وقفہ ہو۔

علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں اگر کوئی یہ اعتراض کرے کہ اس حدیث میں "**فتح القسطنطنية خروج الدجال**" ارشاد فرمایا گیا جبکہ گذشتہ حدیث میں "**اذا صاح فيهم الشيطان ان المسيح قد خلفكم فى اهليكم فيخرجون وذالك باطلٌ**" ارشاد فرمایا گیا تو ان دونوں ارشادات میں مطابقت کیسے ہوگی؟

اس کا جواب یہ ہے کہ حضور علیہ السلام نے فتح قسطنطنیہ کو خروج دجال کی علامت قرار دیا ہے، یہ نہیں فرمایا کہ فتح قسطنطنیہ کے فوراً بعد بغیر کسی تاخیر کے خروج دجال ہوگا، اور شیطان کی آواز اس بات کی اطلاع کیلئے ہوگی تاکہ لوگ اموال غنیمت کو تقسیم کرنا چھوڑ دیں حالانکہ یہ بات جھوٹی ہوگی۔ اور اس پر یہ اگلی حدیث دلالت کر رہی ہے۔

"**الملحمة العظمٰى فتح القسطنطنيه وخروج الدجال فى سبعة اشهر**" اور حدیث میں جو لفظ "**الصريخ**" آیا ہے، اس کا الف لام عہدی ہے، اور معہود یعنی شیطان کی آواز ہے۔

میں (ملا علی قاریؒ) کہتا ہوں بظاہر اس قسم کا واقعہ متعدد بار پیش آئے گا اور مسلمان متفرق ہونگے' اور حدیث میں "**المدينة**" سے قسطنطنیہ کے علاوہ دوسرا شہر مراد ہے۔ کیونکہ قسطنطنیہ ایک شدید جنگ کے بعد فتح ہوگا، اور حدیث میں جس "**المدينة**" (بغیر کسی لڑائی کے) لا الہ الا اللہ اور اللہ اکبر کا نعرہ لگانے سے فتح ہوگا۔ چنانچہ اس وقت شیطان کی آواز' قسطنطنیہ میں لڑنے والوں کو دی جانے والی آواز پر محمول ہوگی' اور مسلمانوں کی آواز فتح مدینہ کے اصحاب کو دی جانے والی آواز پر محمول ہوگی' اور دونوں فریق (قسطنطنیہ میں لڑنے والے اور فتح مدینہ کیلئے لڑنے والے) اموال غنیمت کو چھوڑ کر دجال سے قتال کی طرف متوجہ ہو

جائیں گے۔ واللہ اعلم بالحال۔

اسنادی حیثیت: امام ابوداوُدؒ نے اس حدیث پر سکوت اختیار کیا ہے۔ (ذکرہ میرک)

تخریج: اس حدیث کو امام احمدؒ نے بھی حضرت معاذؓ سے نقل کیا ہے۔

۵۴۲۵ : وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَلْمَلْحَمَةُ الْعُظْمٰى وَفَتْحُ قُسْطُنْطِيْنِيَّةَ وَخُرُوْجُ الدَّجَّالِ فِيْ سَبْعَةِ اَشْهُرٍ۔

اخرجه البو داوٗد فی السنن ٤٨٣/٤ حديث رقم ٤٢٩٥ والترمذی فی السنن ٤٤٢/٤ حديث رقم ٢٢٣٨ وابن ماجه فی السنن ١٣٧٠/٢ حديث رقم ٤٠٩٢ واحمد فی المسند ٢٣٤/٥

ترجمہ: ''حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا کہ پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''جنگ عظیم کا پیش آنا قسطنطیہ کی فتح کا حاصل ہونا اور دجال کا ظاہر ہو جانا' یہ سب کچھ سات مہینوں کے دوران پیش آ جائے گا''۔

(ترمذی' ابوداوٗد)

تشریح: قوله الملحمة العظمی ......:

الملحمة العظمی: اور جامع میں (کی بجائے) ''الملحمة الکبرٰی'' کے الفاظ منقول ہیں۔

بعض کا کہنا ہے کہ اس سے وہی لڑائی مراد ہے، جس کا ذکر ''فیتعاد بنو الأب کانوا مائة فلا یجدونه بقی منهم الا الرجل الواحد'' کے تحت بیان کیا گیا ہے۔

لیکن زیادہ واضح بات یہ ہے، کہ اس سے فتح مدینہ مراد ہے، کہ وہ اللہ تعالیٰ کے اسماء حسنیٰ کی عظمت کی برکت سے فتح ہوگا۔

اور اسی وجہ سے اس پر ''وفتح القسطنطنیه'' کا عطف درست ہے، کیونکہ عطف میں اصل یہ ہے کہ معطوف ومعطوف علیہ متغائر ہوں، نیز ذہن بھی اس کی طرف سبقت کرتا ہے۔ یہاں ''القسطنطنیة'' الف لام کے ساتھ وارد ہوا ہے۔

مدینہ اور قسطنطنیہ کی طرف مسلمانوں کے متوجہ ہونے اور ظہور دجال کے اعتبار سے سات ماہ کا عرصہ ہے۔ البتہ یہ دونوں یکے بعد دیگرے فتح ہو جائیں گے، دونوں کی فتح بلاتراخی ہوگی۔

تخریج: سید جمال الدینؒ نے ذکر کیا ہے کہ ابن ماجہ نے بھی اس روایت کو اسی طرح نقل کیا ہے۔ جامع میں ہے کہ امام احمد، ابوداوٗد، ترمذی، ابن ماجہ اور حاکم نے اس حدیث کو نقل کیا ہے۔

۵۴۲۶: وَعَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ بُسْرٍ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ بَيْنَ الْمَلْحَمَةِ وَفَتْحِ الْمَدِيْنَةِ سِتُّ سِنِيْنَ وَيَخْرُجُ الدَّجَّالُ فِي السَّابِعَةِ . (رواه ابوداود وقال هذا اصح)

اخرجه ابو داوٗد فی السنن ٤٨٣/٤ حديث رقم٤٢٩٦ وابن ماجه فی السنن ١٣٧٠/٢ حديث رقم ٤٠٩٣ واحمد فی المسند ١٨٩/٤۔

ترجمہ: ''حضرت عبداللہ بن بسر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''جنگ عظیم کے پیش

آنے اور شہر (قسطنطنیہ) کی فتح کے حاصل ہونے کے درمیان چھ سال کا عرصہ ہوگا اور ساتویں سال دجال ظہور پذیر ہو جائے گا''۔ اس روایت کو ابوداؤد نے نقل کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ حدیث زیادہ صحیح ہے''۔

تشریح: قوله: بين الملحمة وفتح المدينة ست سنين:

ایک سے وہ مدینہ مراد ہے جس کا گذشتہ حدیث میں ذکر ہوا ہے اور دوسرے سے قسطنطنیہ مراد ہے۔ دونوں حدیثوں میں تعارض واضح ہے' کیونکہ گذشتہ حدیث میں مذکور مدت کے مخالف ہے۔

اس کا جواب اس طرح ممکن ہے کہ ''الملحمة'' میں الف لام قسطنطنیہ کے علاوہ دوسری لڑائیوں پر دلالت کرتا ہے، لہٰذا الف لام گذشتہ ''الملحمة'' کے اعتبار سے عہدی ہے، اور س کی دلیل یہ ہے کہ یہاں ''الملحمة'' کے بعد بطور صفت العظمٰی وغیرہ ذکر نہیں ہے۔

قوله: ويخرج الدجال في السابعة:

مطلب یہ ہے کہ چھٹے سال کے آخر میں فتح مدینہ ہوگا، تو اور ساتویں سال کے شروع میں مسلمان دجال کی طرف لوٹیں گے۔ بعض لوگوں کا یہ کہنا بہت ہی بعید ہے کہ کوئی بعید نہیں کہ سات سال کی مدت سات ماہ سے مشتبہ ہو جائے

قوله: رواه ابوداؤد وقال هذا اصح:

مطلب یہ ہے کہ یہ حدیث گذشتہ حدیث کی بنسبت زیادہ صحیح ہے چنانچہ یہ دلالت ہے کہ ان دونوں احادیث میں تعارض ہے اور ان کے درمیان تطبیق ممتنع ہے اور اصح روایت کو ترجیح حاصل ہے۔ حاصل یہ ہے کہ ملحمۃ عظمٰی اور خروج دجال کے درمیانی مدت کا عرصہ سات سال ہونا راجح ہے سات ماہ سے۔

تخریج: اسی طرح ابن ماجہ نے بھی اس کو نقل کیا ہے۔

۵۴۲۷ : وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ يُوْشِكُ الْمُسْلِمُوْنَ اَنْ يَّحَاصِرُوْا اِلَى الْمَدِيْنَةِ حَتّٰى يَكُوْنَ اَبْعَدَ مَسَالِحِهِمْ سَلَاحٌ وَسَلَاحٌ قَرِيْبٌ مِّنْ خَيْبَرَ. (رواه ابوداود)

اخرجه ابو داؤد في السنن ٤٩٩/٤ حديث رقم ٤٢٩٩ واحمد في المسند ٤٠٢/٢۔

ترجمہ: ''حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما نے بیان فرمایا کہ وہ وقت آنے والا ہے جب اہل اسلام مدینہ تک محصور کر دیئے جائیں گے' بالآخر ان کا دور ترین مورچہ سلاح ہوگا اور سلاح مقام خیبر کے نزدیک ایک جگہ ہے''۔ (ابوداؤد)

تشریح: قوله: يوشك المسلمون ان يحاصروا الى المدينة:

''يحاصروا'': مجہول کا صیغہ ہے۔

''المدينة'': سے مدینۃ النبی مراد ہے

مسلمانوں کا پریشان ہو کر مدینہ منورہ میں پناہ کیوں لیں گے؟ اس میں کئی احتمال ہیں:

❶ اس وجہ سے کہ کفار مسلمانوں کا محاصرہ کر لیں گے

٭ مسلمان کفار سے بھاگ کھڑے ہوں گے اور مدینہ منورہ اور "سلاح" جو کہ خیبر کے قریب ایک جگہ ہے کے درمیان جمع ہو جائیں گے۔

٭ بعض مسلمان مدینہ منورہ کے قلعے میں داخل ہو جائیں گے اور بعض مدینہ منورہ کی حفاظت کیلئے مدینہ منورہ کے اردگرد کھڑے ہونگے، اور اگلے جملہ "حتی یکون ابعد مسالحهم" سے آخری توجیہہ کا واضح ہونا معلوم ہو رہا ہے۔

"مسالحهم": اس میں میم مفتوح ہے۔

سلاح : سین کے فتحہ کے ساتھ اور قاموس میں لکھا ہے کہ "سلاح" بروزن سحاب وقطام، خیبر کے نشیبی علاقے میں ایک جگہ کا نام ہے۔

مسالحهم: فعل ناقص کا اسم مؤخر ہونے کی بناء پر مرفوع بنا کر ضمہ کے ساتھ نقل کیا گیا ہے، اس صورت میں فعل ناقص کیلئے خبر مقدم "ابعد" بنے گی اور ایک نسخے میں لفظ "سلاح" مرفوع ومنون منقول ہے، اور ایک نسخے میں "حاء" کے کسرہ کے ساتھ نقل کیا گیا ہے۔

ابن الملکؒ فرماتے ہیں: "سلاح" ایک نسخہ میں تنوین کے ساتھ منقول ہے اور دوسرے نسخے میں کسرہ پر مبنی منقول ہے۔ اور بعض کا کہنا ہے کہ اہل حجاز کے نزدیک "سلاح" کسرہ پر مبنی ہے اور بنو تمیم کے نزدیک غیر منصرف ہے۔

نہایہ میں لکھا ہے کہ "المسالح"، "المسلح" کی جمع ہے، اور المسلحة سے مراد وہ جماعت ہے جو دشمنوں سے سرحد کی حفاظت کرتی ہے۔ ان کو "المسلحة"، اس لئے کہا جاتا ہے کہ ان کے پاس اسلحہ ہوتا ہے۔ یا اس لئے کہا جاتا ہے یہ لوگ "مسلحہ" میں رہتے ہیں، اور مسلحہ بمنزلہ سرحد کے ہے یہاں کچھ لوگ بیٹھ کر نگرانی کرتے ہیں، تاکہ دشمن کہیں بے خبری میں شب خون نہ مار جائے۔ اور یہ لوگ جب دشمن کو دیکھ لیتے ہیں، تو فوراً اپنے ساتھیوں کو اطلاع کر دیتے ہیں، تاکہ وہ دشمن کے مقابلہ کیلئے تیار ہو جائیں۔

قوله: سلاح قريب من خيبر:

"قریب": صفت ہے اس کا موصوف محذوف ہے۔) ای موضع قریب

یہ آخری جملہ راوی کا کلام ہے، جو انہوں نے بطور تفسیر کے ذکر کیا ہے۔ اور مطلب یہ ہے کہ ان کی بعید ترین سرحد، خیبر کی یہ قریب ترین جگہ ہوگی۔ اور یہ دلیل ہے، کہ اس وقت مسلمانوں پر انتہائی تنگی ہوگی اور کفار ان کا چاروں طرف سے احاطہ کئے ہوں گے۔

۵۴۲۸ :وَعَنْ ذِیْ مِخْبَرٍ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ سَتُصَالِحُوْنَ الرُّوْمَ صُلْحًا اٰمِنًا فَتَغْزُوْنَ اَنْتُمْ وَهُمْ عَدُوًّا مِّنْ وَّرَاءِ كُمْ فَتُنْصَرُوْنَ وَتَغْنِمُوْنَ وَتَسْلَمُوْنَ ثُمَّ تَرْجِعُوْنَ حَتّٰی تَنْزِلُوْا بِمَرْجٍ ذِیْ تُلُوْلٍ فَيَرْفَعُ رَجُلٌ مِنْ اَهْلِ النَّصْرَانِيَّةِ الصَّلِيْبَ فَيَقُوْلُ غَلَبَ الصَّلِيْبُ فَيَغْضَبُ رَجُلٌ مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ فَيَدُقُّهٗ فَعِنْدَ ذٰلِكَ تَغْدِرُ الرُّوْمُ وَتَجْمَعُ الْمَلْحَمَةَ وَزَادَ بَعْضُهُمْ فَيَثُوْرُ

الْمُسْلِمُوْنَ اِلٰی اَسْلِحَتِهِمْ فَيَقْتَتِلُوْنَ فَيُكْرِمُ اللّٰهُ تِلْكَ الْعَصَابَةَ بِالشَّهَادَةِ. (رواه ابوداود)

اخرجه ابو داوٗد فی السنن ٤٨١/٤حدیث رقم ٤٢٩٢ وابن ماجه ١٣٦٩/٢حدیث رقم ٤٠٨٩ واحمد فی المسند ٩١/٤

ترجمہ: ''حضرت ذی مخبر رضی اللہ عنہ (جو حضور اقدس ﷺ کے خادم اور شاہ حبشہ نجاشی کے بھتیجے تھے) نے بیان فرمایا کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ ارشاد فرماتے ہوئے سنا کہ: ''مسلمانو! جلد وہ وقت آنے کو ہے جب تم رومیوں (یعنی عیسائیوں) سے ایک ایسی صلح کا معاہدہ کرو گے جو پر امن مصالحت ہوگی (یعنی طرفین میں سے کسی کو بھی مصالحت شکنی اور وعدہ خلافی کا خطرہ نہیں ہوگا) اور پھر (اس مصالحت اور معاہدہ کے تحت) تم اور رومی باہم مجمع ہو کر اپنے سوا کسی اور دشمن کے مقابلہ میں جنگ کر دیں گے چنانچہ (خدا کی طرف سے اس دشمن کے خلاف) تمہاری مدد و نصرت کی جائے گی' تم مال غنیمت پاؤ گے اور تمہاری حفاظت اور سلامتی رہے گی (یعنی تمہارا جانی و مالی نقصان نہیں ہوگا) اس کے بعد جب تم (فتح و غلبہ حاصل کر کے) واپس ہو گے تو تم اور وہ رومی ایک ایسے مقام پر ٹھہرو گے جو سرسبز و شاداب ہوگی اور جہاں ٹیلے ہوں گے' وہاں عیسائیوں (یعنی رومیوں) میں سے ایک شخص صلیب بلند کر کے اعلان کرے گا کہ صلیب غالب آ گئی (یعنی وہ عیسائی یہ دعویٰ کرے گا کہ اس جنگ میں صلیب کی برکت سے فتح حاصل ہوئی ہے) اس بات پر مسلمانوں میں سے ایک آدمی غضب ناک ہو جائے گا (کیونکہ اس کا خیال یہ ہوگا کہ یہ بات مسلمانوں کے نظریات کے مخالف ہے کہ فتح و کامرانی اور غلبہ کو سوائے رب ذوالجلال اور اس کے برحق دین کے کسی اور چیز کا موھون منت قرار دیا جائے یا اس کی طرف منسوب کیا جائے) چنانچہ وہ مسلمان اس صلیب کو توڑ ڈالے گا اور اس وقت رومی نہ صرف بدعہدی کریں گے اور مصالحت کو ختم کر دیں گے بلکہ (مسلمانوں کی) خونریزی کے لئے اپنے لوگوں کو جمع کر لیں گے''۔ بعض راویوں نے ان الفاظ کا اضافہ نقل کیا ہے کہ ''اس کے بعد مسلمان بھی اپنے ہتھیاروں کی طرف دوڑیں گے (یعنی ان رومیوں سے جنگ کی تیاری کر لیں گے) اور ان سے قتال کریں گے' حق تعالیٰ شانہ مسلمانوں کی اس جماعت کو رتبہ شہادت کا اعزاز بخشیں گے۔ (ابوداؤد)

راویٔ حدیث:

ذو مخبر۔ میم کے کسرہ خائے معجمہ کے سکون اور بائے موحدہ کے فتحہ کے ساتھ ''مخبر'' ہے۔ نجاشی کے بھتیجے ہیں۔ نبی کریم ﷺ کے خادم ہیں۔ جبیر بن نفیر وغیرہ نے ان سے روایت کی ہے ان کا شمار ''شامیوں'' میں کیا جاتا ہے اور ان کی حدیثیں ان ہی میں ملتی ہیں۔

تشریح: قوله: ستصالحون الروم.....ثم ترجعون

ستصالحون الروم: یہ خطاب مسلمانوں سے ہے۔

صلحا: مفعول مطلق ہے، اور غیر باب سے ہے۔ (بایں طور کہ یہ ثلاثی مجرد کا مصدر ہے جبکہ فعل ثلاثی مزید فیہ سے ہے)' یا (مزید فیہ کا مصدر ہے مگر) حروف زائدہ محذوف ہیں۔

آمنا: ہمزہ کے مد کے ساتھ' یہ'' صلحًا'' کے لئے صفت ہے: "صلحاذا أمن" یا اسناد مجازی ہے۔

"هم "ضمیر کا مرجع''الروم المصالحون معكم" ہے۔

تنصرون: مجہول کا صیغہ ہے

تغنمون :اس مفعول بہ "الأموال" محذوف ہے۔

تسلمون: یعنی قتال کے دوران قتل ہونے اور زخمی ہونے سے محفوظ رہو گے اور دشمن سے لوٹ آؤ گے۔

تنزلوا حتى تنزلوا ......:مسلمانوں اور اہل روم دونوں سے خطاب ہے، یعنی''تم اور اہل روم پڑاؤ ڈالو گے''۔

مرج: میم کے فتحہ اور راء کے سکون کے ساتھ اس کا معنی ہے باغیچہ۔ نہایہ میں لکھا ہے: "مرج" سرسبز و شادابی والی وسیع جگہ کو کہتے ہیں۔

تلول: تاء کے ضمہ کے ساتھ'' تل" تاء کے فتحہ کے ساتھ' کی جمع ہے۔ بمعنی ٹیلہ۔

صلیب یہ مربع شکل کی ایک لکڑی ہوتی ہے جس کے بارے میں عیسائیوں کا عقیدہ ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام کو جس لکڑی پر سولی چڑھا دیا گیا تھا، وہ اس شکل کی لکڑی تھی۔

تغدر: دال کے کسرہ کے ساتھ ہے۔

الى أسلحتهم : (جار مجرور کا متعلق محذوف ہے۔)ای ناهضين و مسرعين

فيكرم الله تلك العضابة بالشهادة: ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿ اَحۡيَآءٌ عِنۡدَ رَبِّهِمۡ يُرۡزَقُوۡنَ فَرِحِيۡنَ﴾[آل عمران : ۱۶۹۔۱۷۰] وہ لوگ زندہ ہیں اپنے پروگادر کے مقرب ہیں ان کو رزق بھی ملتا ہے وہ خوش ہیں''

اسنادی حیثیت: امام ابوداوؒد نے اس حدیث پر سکوت کیا ہے، اور امام حاکم نے اس روایت کو اپنی کتاب مستدرک میں نقل کر کے فرمایا ہے کہ یہ روایت صحیح ہے۔(ذکرہ میرک)

تخریج: اسی طرح ابن ماجہ نے بھی نقل کیا ہے۔

۵۴۲۹ : وَعَنْ عَبْدِ اللّٰهِ ابْنِ عَمْرٍو عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اُتْرُكُوا الْحَبَشَةَ مَا تَرَكُوْكُمْ فَإِنَّهُ لَايَسْتَخْرِجُ كَنْزُ الْكَعْبَةِ اِلَّا ذُوالسُّوَيْقَتَيْنِ مِنَ الْحَبَشَةِ. (رواہ ابوداود)

اخرجه ابو داوٗد في السنن ٤٩٠/٤حديث رقم ٤٣٠٩ والنسائي في السنن ٤٤/٦رقم ٣١٧٧ ، واحمد في المسند ٣٧١/٥

ترجمہ:''حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما نبی اکرم ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا:''تم حبشیوں کو ان کے حال پر رہنے دو اور ان سے کسی قسم کا تعرض نہ کرو تاوقتیکہ وہ تمہیں کچھ نہ کہیں اور تم سے تعرض نہ کریں اور (جان لو) بلاشبہ کعبہ کا خزانہ چھوٹی چھوٹی پنڈلیوں والا حبشی ہی نکلے گا''۔(ابوداود)

راویٔ حدیث:

عتبہ بن غزوان۔ عتبہ بن غزوان مازنی ہیں۔ قدیم الاسلام ہیں۔ ''عتبہ'' میں عین مہملہ مضموم' تائے فوقیہ ساکن اور بائے موحدہ ہے۔ پہلے ''حبشہ'' کی طرف ہجرت کی پھر ''مدینہ'' کی طرف ہجرت کی۔ جنگ بدر میں شریک ہوئے۔ ایک قول ہے کہ یہ چھ مردوں کے بعد ساتویں اسلام لانے والے ہیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان کو بصرہ کا حاکم بنادیا تھا۔ یہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس آئے تو انہوں نے ان کو وہیں کا والی بنا کر پھر واپس کر دیا۔ ۱۵ھ میں جب کہ ان کی عمر ستاون (۵۷) سال کی تھی راستہ ہی میں وفات پائی۔ ان سے خالد بن عمیر روایت کرتے ہیں۔

تشریح: قولہ: اترکوا الحبشة ماترکوکم:

قاموس میں لکھا ہے کہ'' الحبش'' اور'' الحبشة ''حاء اور باء کی حرکت کے ساتھ ہے۔ سیاہ فام لوگوں کی جنس سے ہیں۔

ما ترکوکم: (''ما'' بمعنی ''ما دام'' ہے۔) مادام أنهم ترکوکم۔

قولہ: فانه لایستخرج کنزا لکعبة ....:

''کنز الکعبة'': اس سے مراد وہ خزانہ ہے جو کعبہ کے نیچے مدفون ہے۔

یا وہ خزانہ جس کو اللہ نے کعبہ کے نیچے زمین میں پیدا فرمایا ہے۔

بعض کا کہنا ہے کہ اس سے کعبہ کے وہ ہدایا مراد ہیں، جن کو اہل سدانہ نے جمع کرتے ہیں۔ (کذا فی الازہار)

ذو السویقتین'' (:''ذو'' بمعنی ''صاحب'' ہے۔) ای صاحب دقیق الساقین''

من الحبشة یعنی وہ شخص حبشیوں میں سے ہوگا، اور اُن کا امیر ہوگا۔ یا اس سے مراد جنس حبش ہے کیونکہ اکثر حبشیوں کی پنڈلیاں پتلی پتلی ہوتی ہیں۔

امام نوویؒ فرماتے ہیں: ''السویقتین'' یہ'' الساقین'' کی تصغیر ہے اور پنڈلیاں پتلی ہونے کی وجہ سے تصغیر کا صیغہ ذکر کیا گیا۔

یہ حدیث اس ارشاد باری: ﴿حرمًا آمنًا﴾ [القصص:۵۷] ''کیا ہم نے ان کو امن وامان والے حرم میں جگہ نہیں دی۔'' کے معارض نہیں ہے۔ کیونکہ آیت شریفہ کا مطلب یہ ہے کہ قرب قیامت اور دنیا کی بربادی تک کے لئے حرم کو اللہ تعالیٰ نے امن کا گہوارہ بنایا ہے۔

بعض کا کہنا ہے کہ (حرم امن دینے والا تو تمام زمانوں کے لئے ہے مگر) ذوالسویقتین کے واقعہ کی اس حکم سے تخصیص کی گئی ہے۔

قاضی عیاضؒ فرماتے ہیں کہ پہلا قول زیادہ واضح ہے میں (ملا علی قاری) کہتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ نے اکثر احوال کے اعتبار

سے حرم کو امن کی جگہ بنایا ہے، اور حضرت ابن زبیرؓ کا قصہ اور قرامطہ کا واقعہ دیگر اس قسم کے اور واقعات اس پر دلالت کرتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ کے حرم کو امن والی جگہ بنا دینے کا مطلب یہ ہے کہ اللہ نے حکم فرمایا ہے، کہ لوگ حرم میں داخل ہونے والوں کو مأمون سمجھیں اور کوئی بھی حرم میں آنے والوں کو کچھ نہ کہے۔ جیسا کہ بعض اہل توفیق نے اس موقع پر کہ جب قرامطہ زنادقہ کے رئیس نے اس سوال کیا تھا ''کلام اللہ کا یہ حصہ کیا ہوا؟: ﴿ومن دخله كان آمنا﴾ [آل عمران۔۹۷] ''اور جو شخص اس میں داخل ہو جاوے وہ امن والا ہو جاتا ہے۔'' کہا تھا کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ جو اس میں داخل ہو جائے اس کو امن دو، اور اس کے ساتھ تعارض مت کرو۔

۵۴۳۰ : وَعَنْ رَجُلٍ مِنْ اَصْحَابِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ دَعُوْا الْحَبْشَةَ مَادَعُوْكُمْ وَاتْرُكُوْا التُّرْكَ مَاتَرَكُوْكُمْ. (رواه ابوداود والنسائی)

اخرجه ابو داؤد في السنن ٤/٤٨٥ حديث رقم ٤٣٠٢ والنسائي في السنن ٤/٦ ٤ حديث رقم ٣١٧٧

ترجمہ: ''اصحاب پیغمبر ﷺ میں سے ایک صحابی سے روایت ہے کہ حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''تم اہل حبشہ سے کوئی تعرض نہ کرو جب تک کہ وہ تم سے کوئی تعرض نہیں کرتے اور اہل ترک کو بھی ان کے حال پر رہنے دو جب تک کہ وہ تمہیں تمہارے حال پر رہنے دیں''۔ (ابوداؤد' نسائی)

تشریح: قوله: دعوالجشة ماودعوكم:

دعوا: دال کی تخفیف کے ساتھ' بمعنی اتركوا' علامہ تورپشتیؒ فرماتے ہیں کہ نثر میں تو'' الودع'' سے ماضی بہت ہی کم استعمال ہوتا ہے مگر بعض اشعار میں مروی ہے، چنانچہ شاعر کہتا ہے: ؏

غاله　في　الحب　حتى　ودعه

احتمال ہے کہ حدیث میں ''ما وادعوكم'' کے الفاظ ہوں بمعنی ''ما سالموكم'' بعض ناقلین حدیث سے لکھنے میں الف رہ گیا ہو۔

علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں کہ ناقلین حدیث پر اس قسم کے طعن کی کوئی ضرورت نہیں ہے کیونکہ قرآن شریف میں: ﴿ما ودعك ربك﴾ [الضحیٰ۔۳] کو ایک قراءت میں دال کی تخفیف کے ساتھ بھی پڑھا گیا ہے، بمعنی ما تركك.

چنانچہ کلام عرب میں مستعمل ہے: انی لآتيه بالغدايا والعشايا.

حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا فرمان ہے: ارجعن مأزورات غير مأجورات.

مظہرؒ فرماتے ہیں کہ حضور علیہ السلام کا کلام (کسی کے کلام کے) تابع نہیں ہے بلکہ متبوع ہے اور عرب کے تمام فصحاء کی فصاحت حضور علیہ السلام کی فصاحت سے کئی درجے کم ہے، نیز عرب میں مختلف لغات مستعمل تھیں، ان میں سے بعض لغات ختم ہو گئیں، تو حضور علیہ السلام نے ان لغات میں کلام فرما کر اُن کو دوبارہ زندہ کیا۔

شمرؒ فرماتے ہیں کہ نحویین کا کہنا ہے کہ عرب نے ''دعوا'' کے مصدر اور ماضی کو ختم کر دیا لیکن حضور علیہ السلام کی فصاحت

سب سے بڑھ کر ہے۔

میں (ملا علی قاری) کہتا ہوں کہ حضور ﷺ نے اس حدیث مبارکہ میں کو استعمال فرما کر دونوں کو زندہ کیا ہے۔

مسند احمد اور صحیح مسلم کی اس مرفوع روایت میں کہ جس کو ابن عباسؓ اور ابن عمرؓ نے نقل کیا ہے' مصدر کو ذکر کر کے مصدر کے استعمال کو دوبارہ زندہ فرمایا۔"**لینھین اقوام عن ودعھم الجمعات اولیختمن اللہ علی قلوبھم ثم لیکونن من الغافلین**"۔

"**دعوا**" کا مصدر اور ماضی ایسا شاذ ہے جو قیاس کے موافق ہے لیکن استعمال کے مخالف ہے جیسا کہ لفظ "**المسجد**" اور اس کے نظائر میں ہے۔

قولہ: واترکوا الترك ما ترکوکم :

علامہ خطابیؒ فرماتے ہیں کہ ارشاد باری: ﴿وَقَاتِلُوا الْمُشْرِكِينَ كَافَّةً﴾[التوبة:٣٦] "ان مشرکین سے سب سے لڑنا۔" اور اس حدیث میں تطبیق یہ ہے کہ آیت شریفہ مطلق ہے اور حدیث مقید ہے' چنانچہ مطلق کو مقید پر محمول کیا جائے گا، اور یہ حدیث آیت شریفہ کے عموم کیلئے مخصص ہوگی، جیسا کہ مجوسیوں کے حق میں اس آیت مبارکہ میں حدیث "**سنوا بھم سنة اھل الکتاب**" کی وجہ سے تخصیص کی گئی اور مجوسیوں سے باوجود یہ کہ وہ کافر ہیں، جزیہ وصول کیا گیا۔

علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں اور احتمال ہے کہ آیت شریفہ نے حدیث کو منسوخ کر دیا ہو کہ شروع میں اسلام ضعیف تھا (اور بعد میں قوی ہو گیا) اور حبشیوں اور ترکوں کی تخصیص کر کے ان کو چھوڑ دینے کا حکم اس وجہ سے تھا کہ حبشیوں کے ممالک اور صحابہ کے درمیان بڑے وسیع صحرا حائل تھے، اس لئے مسلمانوں کو حبشیوں کے پاس جانے کا مکلّف نہیں بنایا' اور ترکوں کے ساتھ لڑائی بہت سخت ہوتی تھی اور ان کے علاقے ٹھنڈے تھے جبکہ صحابہ کرامؓ گرم علاقے سے تعلق رکھتے تھے اس لئے حضور علیہ السلام نے صحابہؓ کو ترکوں کے ساتھ لڑنے کا مکلّف نہیں بنایا۔ ہاں اگر العیاذ باللہ یہ لوگ مسلمانوں کے علاقے پر قبضہ کرنے کیلئے حملہ کریں تو ان کے خلاف جہاد چھوڑنا ہرگز جائز نہیں ہوگا، کیونکہ ایسی حالت میں جہاد فرض عین ہے جبکہ پہلی حالت میں فرض کفایہ ہے۔

میں (ملا علی قاریؒ) کہتا ہوں کہ حضور ﷺ نے "**ما ترکوکم**" فرما کر اسی مطلب کی طرف اشارہ کیا۔ حاصل یہ کہ اس حدیث میں ترکِ قتال کا امر رخصت اور اباحت کیلئے ہے وجوب کیلئے نہیں ہے اگرچہ قتال اقدامی ہی کیوں نہ ہو۔ کیونکہ مسلمان تُرکوں اور حبشیوں سے اقدامی قتال بھی کر چکے ہیں، اور ابھی تک کوئی زمانہ اس سے خالی نہ رہا اور اللہ تعالیٰ نے اسلام اور مسلمانوں کو قوت و شان و شوکت عطا فرمائی ہے۔

تخریج: طبرانیؒ نے حضرت ابن مسعودؓ سے ایک حدیث مرفوع نقل کی ہے جس کے الفاظ یہ ہیں:

"**اترکوا الترك ما ترکوکم فان اول من یسلب أمتی ملکھم وما خولھم اللہ بنو قنطوراء**"

نہایہ میں لکھا ہے کہ قنطوراء حضرت ابراہیم علیہ السلام کی باندی تھی جس سے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اولاد پیدا ہوئی، تُرک اور چین کی قوم انہیں میں سے ہے۔ اس کی مزید تحقیق ابوبکرہ کی روایت میں آگے آرہی ہے۔

۵۴۳۱: وَعَنْ بُرَيْدَةَ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِي حَدِيْثٍ يُقَاتِلُكُمْ قَوْمٌ صِغَارُ الْاَعْيُنِ يَعْنِي التُّرْكَ قَالَ تَسُوْقُوْنَهُمْ ثَلٰثَ مَرَّاتٍ حَتّٰى تُلْحِقُوْهُمْ بِجَزِيْرَةِ الْعَرَبِ فَاَمَّا فِي السِّيَاقَةِ الْاُوْلٰى فَيَنْجُوْا مِنْ هَرَبَ مِنْهُمْ وَاَمَّا فِي الثَّانِيَةِ فَيَنْجُوْا بَعْضٌ وَيُهْلَكُ بَعْضٌ وَاَمَّا فِي الثَّالِثَةِ فَيُصْطَلَمُوْنَ اَوْ كَمَا قَالَ. (رواہ ابوداود)

اخرجه ابو داؤد في السنن ٤٨٧/٤ حديث رقم ٤٣٠٥ واحمد في المسند ٣٤٨/٥۔

ترجمہ: ''حضرت بریدہ بن اسلمی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ وہ نبی اکرم ﷺ سے اس حدیث کے سلسلے میں جس میں یہ پیشینگوئی ہے کہ ''تم سے ایک چھوٹی آنکھوں والی قوم یعنی ترک قوم جہاد کرو گے'' یہ بھی نقل کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''تم اس قوم کے لوگوں کو تین مرتبہ ہانکو گے (یعنی تم ان پر غلبہ پالو گے اور انہیں مغلوب کر کے بھاگنے پر مجبور کرو گے) حتی کہ تم ان کو جزیرۂ عرب (کی سرحد کے پار) تک دھکیل دو گے۔ جب تم ان کو پہلی بار ہانکو گے تو بھاگ کھڑے ہونے والے لوگ نجات پالیں گے (زندہ رہیں گے) جب دوسری مرتبہ شکست دے کر بھگاؤ گے تو ان میں سے کچھ تو نجات پالیں گے اور کچھ ہلاک ہو جائیں گے' لیکن جب تیسری مرتبہ شکست دے کر بھگاؤ گے تو اس وقت ان کا جڑ سے خاتمہ کر دیا جائے گا۔ یا جیسے حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا''۔ (ابوداؤد)

تشریح: قولہ: يقاتلكم قوم ...... حتى تلحقوهم بجزيرة العرب:

يقاتلكم: بظاہر ''حدیث'' مضاف ہے، اور'' يقاتلكم'' مضاف الیہ ہے، لیکن تمام نسخوں میں لفظ'' حدیث '' کو بغیر اضافت کے تنوین کے ساتھ نقل کیا گیا ہے۔ چنانچہ اس صورت میں'' يقاتلكم''، مبتدا محذوف کی خبر ہے ای ''هو يقاتلكم'' ...... اور یہ جملہ لفظ ''حدیث'' کے لئے صفت ہے۔ معنوی اعتبار سے تقدیری عبارت یوں ہے: ''في حديث هو ان ذالك الحديث يقاتلكم''.

''يعني الترك'' : راوی کی طرف سے تفسیر ہے۔

قال: فاعل کی ضمیر ''رسول اللہ ﷺ'' کی طرف لوٹ رہی ہے۔ یا حضرت ابن مسعودؓ کی طرف لوٹ رہی ہے۔

تسوقونهم: '' السوق'' مصدر سے ماخوذ ہے۔

جزيرة العرب: بعض حضرات فرماتے ہیں کہ ''جزیرۃ العرب'' سے بلاد عرب مراد ہیں، اور ان کو جزیرۃ العرب اس لئے کہا جاتا ہے کہ مختلف دریاؤں اور نہروں مثلاً بحر الحبشہ، بحر فارس، بحر دجلہ اور فرات نے ان بلاد کا احاطہ کیا ہوا ہے۔ امام مالکؒ فرماتے ہیں کہ جزیرۃ العرب سے مراد حجاز، یمامہ، یمن اور وہ علاقے ہیں، جن تک فارس اور روم کی حکومت نہیں پہنچی۔

(ذکرہ الطیبی واتبعہ ابن ملکؒ)

قولہ: فامافي السياقة الاولى ......

من هرب منهم: جو بعض ہلاک ہو جائیں گے وہ یا تو اپنی موت سے مر جائیں گے یا وہ گرفتار کر کے مار دیئے جائیں

گے۔دوسری بات زیادہ صحیح معلوم ہوتی ہے۔

"یصطلمون": مجہول کا صیغہ ہے اور "الصلم" بمعنی "القطع المستاصل" سے ماخوذ ہے۔ای لیستاصلون بالسیف ویحصدون .

او کما قال یعنی رسول اللہ ﷺ نے یہی مذکورہ الفاظ ارشاد فرمائے ہیں، یا ان کے ہم مفہوم دوسرے الفاظ ارشاد فرمائے ہیں۔اور یہ راوی کا انتہائی تقویٰ ہے، کہ روایت بالمعنی کو گوارہ نہیں کیا۔

۵۴۳۲ : وَعَنْ اَبِیْ بَکْرَۃَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ یَنْزِلُ اُنَاسٌ مِّنْ اُمَّتِیْ بِغَائِطٍ یُسَمُّوْنَہُ الْبَصْرَۃَ عِنْدَ نَھْرٍ یُقَالُ لَہُ دَجْلَۃَ یَکُوْنُ عَلَیْہِ جَسْرٌ یَکْثُرُ اَھْلُھَا وَیَکُوْنُ مِنْ اَمْصَارِ الْمُسْلِمِیْنَ وَاِذَا کَانَ فِیْ اٰخِرِ الزَّمَانِ جَآءَ بَنُوْقَنْطُوْرَآءَ عِرَاضُ الْوُجُوْہِ صِغَارُ الْاَعْیُنِ حَتّٰی یَنْزِلُوْا عَلٰی شَطِّ النَّھْرِ فَیَتَفَرَّقُ اَھْلُھَا ثَلٰثَ فِرَقٍ فِرْقَۃٌ یَاْخُذُوْنَ فِیْ اَذْنَابِ الْبَقَرِ وَالْبَرِیَّۃِ وَھَلَکُوْا وَفِرْقَۃٌ یَاْخُذُوْنَ لِاَنْفُسِھِمْ وَھَلَکُوْا وَفِرْقَۃٌ یَجْعَلُوْنَ ذَرَارِیَھُمْ خَلْفَ ظُھُوْرِھِمْ وَیُقَاتِلُوْنَھُمْ وَھُمْ شُھَدَآءُ .

(رواہ ابو داود)

اخرجہ ابو داوٗد فی السنن ٤٨٧/٤ حدیث رقم ٤٣٠٦ واحمد فی المسند ٤٥/٥۔

ترجمہ:"حضرت ابوبکرہ رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا:"میری اُمت کے کچھ افراد ایک نشیبی زمین پر پہنچ کر پڑاؤ ڈالیں گے جس جگہ کا نام بصرہ قرار دیں گے' وہ جگہ ایک نہر کے پاس ہوگی جس کو دجلہ کا نام دیا جائے گا اس نہر پر پل ہوگا' بصرہ میں رہنے والوں کی آبادی بہت کثیر ہو جائے گی اور یہ مسلمانوں کی بڑی آباد جگہوں میں شمار کیا جائے گا اور پھر جب زمانہ آخر ہوگا تو قنطورا کی اولاد اہل بصرہ سے جنگ کے لئے آئے گی' ان کے منہ چوڑے چکلے اور آنکھیں چھوٹی چھوٹی ہوں گی' حتیٰ کہ نہر کے کنارے قیام پزیر ہو جائیں گے اور (ان کو دیکھ کر) شہر کے لوگ تین طبقات میں بٹ جائیں گے تو بیلوں کی دموں اور جنگل میں پناہ حاصل کرے گا حالانکہ وہ لوگ موت وتباہی کے گھاٹ اتر کر رہیں گے (یعنی وہ اپنی اس حیلہ بازی کے باوجود دشمن کی زد سے محفوظ نہیں رہ پائیں گے کیونکہ حملہ آور مشرک عداوت کی بنیاد پر بدامنی اور فسادات کی جو آگ بھڑکائیں گے وہ ایسے حیلوں بہانوں سے سرد یا محدود نہیں ہوگی) اور دوسرا طبقہ اپنی جانوں کے لئے امان طلب کرے گا مگر ان لوگوں کو بھی موت اور تباہی کے گھاٹ اترنا پڑے گا اور تیسرا طبقہ وہ ہوگا جو اپنی اولاد اور اپنی عورتوں کو پیچھے چھوڑے گا (یعنی اپنے اہل و عیال سے بے نیاز ہو کر اور ان کے بارے میں اپنے محبت کے جذبات کو کچل کر حملہ آور کے مقابلے پر چٹان بن جائے گا یا یہ کہ وہ لوگ اپنے بال بچوں کو اپنے پیچھے لے کر محاذ پر جائیں گے اور وہاں) دشمنوں سے جنگ کرے گا اور ان میں سے اکثر مارے جائیں گے جنہیں رتبہ شہادت کے اعزاز سے نوازا جائے گا"۔ (ابوداؤد)

تشریح:قولہ:ینزل اناس من امتی......یکثر اھلھا:

أناسٌ: ہمزہ کے ضمہ کے ساتھ "ناس" میں ایک لغت ہے۔

غائط: زمین کا نشیبی حصہ۔ (ذکرہ شارح)۔ فائق میں لکھا ہے: ای بوادمطمئن

"البصرۃ": بائے موحدہ فتحہ کے ساتھ ہے اور ایک نسخہ میں کسرہ کے ساتھ ہے۔ قاموس میں لکھا ہے کہ "بصرۃ" ایک معروف شہر ہے، اس کو "صاد" کے کسرہ کے ساتھ پڑھا جاتا ہے۔ یا "بسرۃ" کا معرب ہے جس کا معنی ہے کثیر الطرق.

عرض مرتب: بظاہر "بسے راہ" ہونا چاہئے۔ اھ۔

علامہ حلبیؒ نے "حاشیۃ الشفاء" میں لکھا ہے کہ "البصرۃ" کی باء کو مفتوح، مضموم اور مکسور تینوں طرح پڑھنا درست ہے البتہ مفتوح پڑھنا زیادہ فصیح ہے۔ اس شہر کی تعمیر عتبہ بن غزوان نے حضرت عمرؓ کے زمانہ خلافت میں کی۔ اس شہر کی سرزمین پر کبھی بھی بتوں کی پوجا نہیں کی گئی۔ جب "البصرۃ" کی طرف نسبت کی جاتی ہے تو اس کو باء کے کسرہ اور فتحہ کے ساتھ پڑھا جائے گا۔ مغنی نے لکھا ہے کہ نسبت کی صورت میں کسرہ فتحہ سے زیادہ فصیح ہے۔

میں (ملا علی قاری) کہتا ہوں کہ نسبت کی صورت میں کسرہ کے زیادہ فصیح ہونے کی وجہ شاید یہ ہے کہ باء کے پڑوس میں راء بھی مکسور ہے۔

اشرفؒ فرماتے ہیں "بصرۃ" سے حضور علیہ السلام کی مراد "مدینۃ السلام" یعنی بغداد ہے، کیونکہ دریائے دجلہ اور اس کا پل دریائے دجلہ کے درمیانی مقام پر ہے بصرہ کے درمیان نہیں ہے اور حضور علیہ السلام نے بصرہ کو معرف باللام اس لئے ذکر فرمایا کہ بغداد میں ایک جگہ ہے جو اس شہر کے دروازے کے قریب ہے جس کو "باب بصرہ" کہا جاتا ہے، چنانچہ حضور علیہ السلام نے بغداد کو اس کے ایک مقام بصرہ کے نام سے بیان فرمایا۔ یا حذف مضاف کے ساتھ ذکر فرمایا ہے۔ جیسا کہ ارشاد باری: ﴿واسأل القریۃ﴾ [یوسف۔۸۲] اور اس میں بستی (مصر) والوں سے پوچھ لیجئے۔" میں مضاف محذوف ہے۔ حضور علیہ السلام کے عہد مبارک میں نہ تو بغداد کی موجودہ ہیئت موجود تھی اور نہ کوئی بڑا شہر تھا۔ اسی وجہ سے حضور علیہ السلام نے اپنے کلام "ویکون من امصار المسلمین"" میں "یکون" کو مضارع کے صیغہ کے ساتھ ذکر کیا۔

قولہ: ویکون من أمصار المسلمین:

عہد رسالت تک یہ مختلف بستیاں تھیں کسری کے شہروں کے تباہ و برباد ہونے کے بعد۔ نیز ہمارے زمانے میں کسی نے بھی نہیں سنا کہ ترک قوم بصرہ میں کبھی قتال ولڑائی کیلئے داخل ہوئی ہو۔

حدیث کا مطلب یہ ہے کہ میری امت کے بعض لوگ دجلہ کے پاس پڑاؤ ڈالیں گے اور وہیں پر مکمل طور پر سکونت اختیار کرلیں گے اور اس طرح وہاں مسلمانوں کا ایک شہر آباد ہو جائے گا، اور یہی وہ بغداد ہے۔

قولہ: واذا کان فی آخر الزمان ...... علی شط النہر:

"نھر": "ھاء" کو مفتوح اور ساکن دونوں طرح پڑھنا درست ہے۔

"دجلۃ": دال کے کسرہ اور فتحہ دونوں کے ساتھ پڑھنا درست ہے۔ بغداد کی نہر ہے۔

اھلھا: ضمیر مجرور'' البصرة'' کی طرف راجع ہے۔

کان: فعل ناقص کا اسم ضمیر مستتر ہے۔

جاء: حدیث شریف میں مضارع کی بجائے ماضی کا صیغہ ''جاء'' ذکر کیا، تا کہ اس فعل کے یقینی تحقق پر دلالت کرے۔ گویا کہ یوں واقع ہو چکا ہے۔

قنطوراء: قاف مفتوح، نون ساکن اور الف مقصور ہے، اور بعض نے الف ممدودہ کے ساتھ پڑھا ہے، یعنی بنوقنطوراء اہل بغداد سے لڑنے کیلئے آئیں گے۔

''قنطوراء'': ترک قوم کے جد امجد کا نام ہے۔ بعض کا کہنا ہے کہ قنطوراء ابراہیم علیہ السلام کی باندی تھی۔ ابراہیم علیہ السلام کی اس باندی سے اولاد پیدا ہوئی پھر انہیں کی نسل میں ترک قوم ہوئی۔ لیکن یہ بات محل نظر ہے کیونکہ ترک قوم یافث بن نوح کی اولاد میں سے ہے۔ اور یافث بن نوح کا زمانہ ابراہیم علیہ السلام کے زمانے سے بہت پہلے ہے۔ (کذا ذکرہ بعضھم)

اس اشکال کا جواب اس طرح دیا جا سکتا ہے کہ ابراہیم علیہ السلام کی باندی قنطوراء یافث بن نوح کی اولاد میں سے تھی یا یہ کہا جائے کہ قنطوراء کے ابراہیم علیہ السلام کی جاریہ ہونے سے مراد یہ ہے کہ قنطوراء ایک لڑکی تھی جو ابراہیم علیہ السلام کی طرف اس وجہ سے منسوب تھی کہ یہ ابراہیم علیہ السلام کی اولاد میں سے تھی اور یافث بن نوح کی اولاد میں سے ایک شخص نے اس سے شادی کر لی تھی، پھر اس قنطوراء سے ترک قوم کا جد امجد پیدا ہوا۔ اس تقریر کے مطابق اشکال بھی ختم ہو جاتا ہے، اور قنطوراء کی یافث بن نوح اور ابراہیم علیہ السلام دونوں کی طرف نسبت کرنا بھی درست ہو جاتا ہے۔

عراض الوجوہ: بدل ہے یا عطف بیان ہے۔'' صغار الأعین'' کی بھی یہی ترکیب ہے۔

قوله: فيفرق أهلها ثلاث فرق ......في البرية وهلكوا:

''فرق'' بفاء کے کسرہ وراء کے فتحہ کے ساتھ'' فرقة'' کی جمع ہے۔

فرقة: اس کو مرفوع اور منصوب دونوں طرح پڑھنا جائز ہے۔

یاخذون فی اذناب البقر: یہ ماخوذ ہے'' اخذ فی الشیء'' بمعنی شرع فیه سے

فی البریة: یہ عبارت پہلے والے جملے کیلئے بطور تتمیم و تکمیل ذکر کی گیا، کیونکہ بیل کی دُم پکڑنے میں مشغول ہونا عموماً ہوتا ہی شہر سے باہر کھیتوں میں ہے۔ شہر سے باہر کھلی جگہ کو ''البریة'' کہا جاتا ہے جبکہ شہر کو ''البحریة'' کہا جاتا ہے۔ یہی الفاظ ارشاد باری ﴿ظھر الفساد فی البر والبحر﴾ [الروم:٤١] ''خشکی اور تری میں لوگوں کے اعمال کے سبب بلائیں پھیل رہی ہیں۔'' میں وارد ہوئے ہیں۔

یا'' فی البریة'' سے مراد یہ ہے کہ وہ یکسوئی اختیار کریں گے اور صحراء و خلوت کو شہر و جلوت پر ترجیح دیں گے۔

پہلے والے معنی کے اعتبار سے ''فی البریة'' ترکیب میں صفت یا حال واقع ہو رہا ہے۔ اور دوسرے معنی کے اعتبار سے بدل الکل یا بدل البعض واقع ہو رہا ہے، اور ہو سکتا ہے کہ ''فی'' تعلیلیہ ہو۔

وھلکوا : ان لوگوں کی یہ ہلاکت ان کے اعمال وافعال کا نتیجہ ہوگی۔ مطلب یہ ہے کہ ان جماعتوں میں سے ایک جماعت والے لڑائی سے اعراض کر کے اپنے آپ کو اور اپنے مویشیوں کو بچانے کیلئے بھاگیں گے، اور بیلوں پر سوار ہو کر دیہاتوں اور جنگلوں میں حیران وسرگردان پھر رہے ہونگے اور وہیں مر جائیں گے۔

یا مطلب یہ ہے کہ لڑائی سے اعراض کر کے زراعت میں مشغول ہو جائیں گے اور ہل چلانے کیلئے بیلوں کو لیکر بلند مقامات کی طرف نکلیں گے، اور بیلوں کو ہانکتے رہیں گے۔ اور اسی حالت میں مر جائیں گے۔

علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں کہ" **یأخذون فی اذناب البقر**" کا معنی ہے: "**یوقعون الأخذ فی الأذناب**" جیسا کہ "**یجرح فی عراقیبھا نصلی**" میں۔ گویا کہ وہ لوگ کسی اور کام کی پرواہ ہی نہیں کریں گے، اور بیلوں کے پیچھے چل کر ان کو کھیتی باڑی کیلئے استعمال کرنے میں اتنے مشغول ہو جائیں گے، کہ اور وہیں ہلاک ہو جائیں گے۔

قولہ: وفرقة یأخذون أنفسھم فھلکوا :

یہ لوگ ہاتھوں سے ہلاک ہونگے اور شاید اس گروہ سے مستعصم باللہ اور اس کے ساتھی مسلمان مراد ہیں، جنہوں نے اپنے اور اہل بغداد کیلئے امان طلب کیا اور تمام کے تمام ہاتھوں سے ہلاک ہو گئے۔ شارحؒ فرماتے ہیں کہ حدیث شریف میں بصرہ سے مراد بغداد ہے کیونکہ بغداد حضور علیہ السلام کے عہد مبارک میں بصرہ کی بستیوں میں سے ایک بستی تھی، چنانچہ حضور علیہ السلام نے بول کر مراد لیا ہے، اور یہ واقعہ اسی طرح پیش آیا جس طرح آپ علیہ السلام نے ذکر کیا، مگر بصرہ سے یہی معروف موجود بصرہ مراد ہے، تو پھر شاید یہ حدیث میں مذکورہ واقعہ بعد میں پیش آئے، کیونکہ ابھی تک کسی نے نہیں سنا کہ کفار بصرہ میں لڑائی کیلئے داخل ہو گئے ہوں۔

قولہ: وفرقة یجعلون ذراریھم خلف...... :

"**الشھداء**" سے کامل شہداء مراد ہیں۔

مطلب یہ ہے کہ تیسرے گروہ والے وہ لوگ ہونگے جو اللہ کی راہ میں جہاد کریں گے، اور مسلمانوں پر ترکوں کے غلبہ حاصل کرنے سے پہلے ہی ترکوں کے خلاف جہاد کریں گے ان میں سے اکثر افراد تو شہید ہو جائیں گے۔ اور تھوڑے سے افراد غازی بن کر واپس لوٹیں گے۔ اشرفؒ اور دوسرے بعض حضرات نے اسی طرح ذکر کیا ہے۔ یہ پیشینگوئی حضور علیہ السلام کا معجزہ ہے، کہ وہ واقعہ اسی طرح ہوا جس طرح حضور ﷺ نے حدیث میں خبر دی تھی۔ یہ لڑائی ماہ صفر بمطابق ۶۵۶ھ ہوئی۔

۵۴۳۳ : وَعَنْ اَنَسٍ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ يَا اَنَسُ اِنَّ النَّاسَ يُمَصِّرُوْنَ اَمْصَارًا وَاِنَّ مِصْرًا مِنْهَا يُقَالُ لَـهُ الْبَصْرَةُ فَاِنْ اَنْتَ مَرَرْتَ بِهَا اَوْ دَخَلْتَهَا فَاِيَّاكَ وَسِبَاخَهَا وَكَلَاءَ هَا وَنَخِيْلَهَا وَسُوْقَهَا وَبَابَ اُمَرَآئِهَا وَعَلَيْكَ بِضَوَاحِيْهَا فَاِنَّهٗ يَكُوْنُ بِهَا خَسْفٌ وَقَذْفٌ وَرَجْفٌ وَقَوْمٌ يَبِيْتُوْنَ وَيُصْبِحُوْنَ قِرَدَةً وَخَنَازِيْرَ۔ (رواہ ابوداؤد)

اخرجه ابو داؤد في السنن ٤/٤٨٨ حديث رقم ٤٣٠٧۔

ترجمہ: ''حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے (ان کو مخاطب کر کے) ارشاد فرمایا: ''انس (رضی اللہ عنہ!) لوگ کچھ نئے شہر بسائیں گے اور ان شہروں میں ایک شہر بصرہ نامی ہوگا پس اگر تمہارا اس شہر کے پاس سے گزر ہو یا وہاں جانا ہو تو اس کے اس علاقے سے دور رہنا جہاں کھاری زمین ہے' اور اس کی چراگاہوں سے بھی دور رہنا' اسی طرح وہاں کی کھجوروں' وہاں کے بازار' وہاں کے بادشاہوں اور سرداروں کے دروازوں سے بھی بچتے رہنا۔ صرف اس شہر اطراف میں کہ جس کو ضواحی کہا جاتا ہے پڑے رہنا! کیونکہ (جن مقامات پر جانے سے تمہیں منع کر رہا ہوں) وہاں' زمین میں دھنسا دیے جانے' پتھروں کی بارش اور سخت زلزلوں کا عذاب نازل ہوگا۔ نیز ان جگہوں میں ایک ایسی جماعۃ ہوگی جس کے افراد (ایک دن) رات میں عیش و راحت کی نیند سوئیں گے' لیکن جب صبح اٹھیں گے تو ان کی صورتیں بندر اور سور جیسی ہوں گی۔

تشریح: قوله: ان الناس يمصرون...... وسوقها وباب امرائها:

يمصرون: ''صاد'' مشدد ہے۔

أمصار: (ہمزہ کے فتحہ کے ساتھ) مصر کی جمع ہے۔ ''يمصرون أمصاراً'' بمعنی ''يتخذون بلاداً'' ہے۔ التمصير بمعنی اتخاذ المصر، جیسا کہ علامہ طیبیؒ نے ذکر کیا ہے چنانچہ تقدیری عبارت ''يتخذون امصارا'' ہے اور اس میں صفت تجرید ہوئی ہے۔ شارحؒ نے مذکورہ عبارت کا معنی اس طرح بیان کیا ہے: ''يضعون أساس مصرٍ وبناء ہ۔

وان مصرا منها: ضمیر مجرور کا مرجع ''الامصار'' ہے۔

أو دخلتها: اس عبارت میں ''او'' بیان نوع کیلئے ہے شک کیلئے نہیں ہے۔

فاياك وسباخها: عبارت کی تقدیر ''فاحذر سباخها'' ہے۔ ''سباخ'' سین کے کسرہ کے ساتھ یہ ''سبخة'' ۔ سین کے فتحہ اور باء کے کسرہ کے ساتھ۔ کی جمع ہے، جس کا معنی ہے: شوریلی زمین۔

علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں: سبخة کا معنی ہے ایسی زمین جس پر نمک کا اثر ہو چکا ہو اور اس میں کسی درخت لگنے کی امید نہ ہو۔

كلاء: کاف کے فتحہ اور لام کی تشدید اور لام کے بعد الف ممدودہ کے ساتھ' بصرہ میں ایک جگہ کا نام ہے۔ شارحؒ فرماتے ہیں کہ ''كلاء'' نہر کے اس کنارے کو کہتے ہیں، جس پر کشتیاں لنگر انداز ہوتی ہیں، اور بعض حضرات نے لکھا ہے کہ ''كلاء'' چراگاہ کو کہتے ہیں۔ اور اس کی تائید ان دوسرے بعض نسخوں سے ہوتی ہے، جن میں یہ کلمہ لام کی تخفیف کے ساتھ بغیر الف ممدودہ کے منقول ہے، اور سید جمال الدینؒ والے نسخے نے اسی طرح اس کلمہ کو ذکر کرنے پر اکتفاء کیا ہے۔

بعض حضرات نے اس کلمہ کو ''فعلاء'' کے وزن پر قرار دے کر اس کو غیر منصرف پڑھا ہے۔ یہ باعث خوف کوئی بات ہوگی۔

ونخليها: ان کھجوروں سے بچنے کی تاکید یا تو اس لئے فرمائی کہ ان میں شبہ ہوگا یا باعث خوف کوئی بات ہوگی۔

وسومها: ان بازاروں سے بچنے کی تاکید یا تو اس لئے فرمائی کہ ان بازاروں میں اللہ کی یاد اور آخرت سے غفلت ہوگی یا

ان بازاروں میں فضول کام ہونگے یا ان بازاروں میں فاسد معاملات ہورہے ہونگے وغیرہ وغیرہ۔

وباب امرائها: مالداروں کے دروازوں پر جانے سے پرہیز کرنے کی تاکید اس لئے فرمائی کہ ان دروازوں پر ان حکمرانوں کی طرف سے بہت زیادہ ظلم ہوتا ہوگا۔

قوله: وعليك بضواحيها.......:

"ضواحي": ضاحية کی جمع ہے جس کا معنی ہے دھوپ کے سامنے والا کنارہ۔

بعض حضرات فرماتے ہیں کہ ضواحیھا سے وہاں کے پہاڑ مراد ہے۔ اس عبارت میں خلوت ویکسوئی کا حکم ارشاد فرمایا۔ اور کلام کا معنی ہے "الزم نواحيها".

قوله: فانه يكون بها خسف وقذف ورجف:

فانه يكون بها: بعض حضرات نے تو لکھا ہے کہ ضمیر مجرور کا مرجع "سباخ" ہے، لیکن صحیح یہ ہے کہ ضمیر کا مرجع "المواضع المذكورة" ہے۔

قذف: سے مراد تیز ٹھنڈی ہوا کا چلنا ہے یا زمین کا مُردوں کو باہر پھینکنا مراد ہے۔ یا وہاں کے لوگوں پر آسمان سے پتھر کا برسایا جانا مراد ہے۔

قوله: وقوم يبيتون ....: وقوم يبيتون: "قوم" مبتدا محذوف کی خبر ہے اور تقدیری عبارت اس طرح ہے: "اهل ذالك المصر قوم يبيتون. یا قوم مبتداء مؤخر ہے اور خبر مقدم محذوف ہے اور تقدیری عبارت اس طرح ہے فيها قوم، جیسا کہ شارحؒ نے فرمایا، بظاہر قوم کا خسف: پر عطف ہے اور عبارت کی تقدیر اس طرح ہے: "يكون بها قوم يمسون طيبين".

ويصبحون قردة: ضمیر مرفوع اس قوم کے نوجوانوں کی طرف راجع ہے یعنی اس قوم کے نوجوان تو بندر بن گئے ہونگے اور بوڑھے خنزیر بن گئے ہونگے۔

علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں، کہ اس عبارت سے مقصود ان کی شکلوں کا مسخ ہونا بیان کرنا ہے، لیکن اس مقصود کو سخت ترین انداز سے تعبیر کیا۔

بعض حضرات نے لکھا ہے کہ اس قوم سے مراد قدریہ ہے کیونکہ اس امت میں خسف (زمین میں دھنسا) اور مسخ (شکلوں کا بگڑ جانا) مقدر کا انکار کرنے والوں کیلئے ہے۔

قوله: رواه: اصل میں اس مقام پر خالی جگہ چھوڑ دی گئی ہے۔

علامہ جزریؒ فرماتے ہیں، کہ اس حدیث کو ابوداؤد نے ایسی سند کے ساتھ نقل کیا ہے جس پر راوی نے کوئی دوٹوک بات نہیں کی بلکہ یوں فرمایا: مجھے یہ روایت صرف عیسیٰ بن اُنس عن انس بن مالک کی سند سے معلوم ہے۔

۵۴۳۴ : وَعَنْ صَالِحِ بْنِ دِرْهَمٍ يَقُولُ انْطَلَقْنَا حَاجِّيْنَ فَإِذَا رَجُلٌ فَقَالَ لَنَا إِلَى جَنْبِكُمْ قَرْيَةٌ يُقَالُ

لَهَا الْاُبُلَّةُ قُلْنَا نَعَمْ قَالَ مَنْ يَّضْمَنُ لِىْ مِنْكُمْ اَنْ يُّصَلِّىَ لِىْ فِىْ مَسْجِدِ الْعَشَّارِ رَكْعَتَيْنِ اَوْ اَرْبَعًا وَيَقُوْلُ هٰذِهٖ لِاَبِىْ هُرَيْرَةَ سَمِعْتُ خَلِيْلِىْ اَبَا الْقَاسِمِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ اِنَّ اللّٰهَ عَزَّوَجَلَّ يَبْعَثُ مِنْ مَسْجِدِ الْعَشَّارِ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ شُهَدَاءَ لَا يَقُوْمُ مَعَ شُهَدَآءِ بَدْرٍ غَيْرُهُمْ (رواہ ابوداود) وَقَالَ هٰذَا الْمَسْجِدُ مِمَّا يَلِىْ النَّهَرَ وَسَنَذْكُرُ حَدِيْثَ اَبِى الدَّرْدَاءِ اِنَّ فُسْطَاطَ الْمُسْلِمِيْنَ فِىْ بَابِ ذِكْرِ الْيَمَنِ وَالشَّامِ اِنْشَآءَ اللّٰهُ تَعَالٰى.

اخرجه ابو داوٗد فى السنن ٤٨٩/٤ حديث رقم ٤٣٠٨

ترجمہ: ''حضرت صالح بن درہم تابعیؒ بیان فرماتے ہیں کہ ہم حج کے لئے (بصرہ سے مکہ) روانہ ہوئے تو وہاں (کسی جگہ) ایک شخص (یعنی حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ) کو کھڑے دیکھا' انہوں نے ہم سے دریافت فرمایا کہ کیا تمہارے علاقہ کے گردنواح میں ایک بستی ہے جس کو ابلہ کا نام دیا جاتا ہے ہم نے جواب دیا کہ ہاں ہے انہوں نے فرمایا کہ تم میں سے کون شخص اس بات کی ضمانت دیتا ہے کہ وہ میری طرف سے مسجد عشار میں دو رکعت' بلکہ چار رکعت نماز پڑھے اور یہ کہے کہ اس رکعتوں کا ثواب ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کو پہنچے میں نے اپنے سچے صادق ابوالقاسم (محمد) ﷺ کو یہ ارشاد فرماتے ہوئے سنا ہے کہ بلاشبہ خداتعالیٰ مسجد عشاء سے روز قیامت شہداء کو اٹھائے گا اور بدر کے شہداء کے ہمراہ ماسوا ان اور کوئی نہیں ہوگا (قیامت کے دن بدر کے شہداء کے ساتھ جو شہداء اپنی اپنی قبر سے اٹھیں گے وہ اسی مسجد کے شہداء ہوں گے یا یہ کہ قیامت روز مقام ورتبہ کے لحاظ سے شہداء بدر کے ہمسران شہداء کے علاوہ اور کوئی شہید نہیں ہوگا۔ اس روایت کو ابوداوٗد نے روایت کیا ہے اور کہا کہ یہ مسجد بصرہ کے اس نواحی علاقہ میں ہے جو دریائے فرات کی جانب ہے اور حضرت ابودرداء رضی اللہ عنہ کی حدیث ان فُسْطَاطَ الْمُسْلِمِيْنَ ...... کو ہم ان شاءاللہ تعالیٰ یمن وشام کے ذکر کے بیان میں نقل کریں گے''۔

تشریح: قولہ: انطقنا حاجين ......يقال لها الابلة:

فاذا رجل: ''رجل'' سے ابوہریرہؓ مراد ہے۔ ''رجل'' مبتدا ہے اور اس کی خبر محذوف ہے اور ''فقال'' کا اس پر عطف ہے اور عبارت کی تقدیر اس طرح ہے **فاذا رجل واقف فقال.**

الى جنبكم قرية يقال لها الابلة: کلمہ استفہام محذوف ہے۔

الابلة: ہمزہ اور باء کے ضمہ اور لام کی تشدید کے ساتھ بصرہ کے سمندر والی جانب بصرہ کے قریب ایک مشہور شہر کا نام ہے۔ (کذافی نہایہ) اور یہ سیر وسیاحت کیلئے مشہور چار مقامات میں سے ایک ہے اور بصرہ سے زیادہ قدیم شہر ہے۔

امام میرکؒ نے تصحیح سے نقل کر کے ذکر کیا ہے کہ اصمعیؒ نے لکھا ہے کہ ''الأبلة'' نبطی کلمہ ہے۔ شارحؒ فرماتے ہیں کہ ''الأبلة'' دنیا کی جنت کہلاتی ہیں۔ دنیا کی جنتیں چار ہیں: اول اُبلۃ بصرۃ، دوم غوطۂ دمشق، سوم: سغد سمرقند، چہارم: شعب بوان، پھر بعض حضرات کے نزدیک بوان سے ''کرمان'' مراد ہے۔ اور بعض کے نزدیک فارس میں ''نوبندجان'' مراد ہے۔

قولہ: من يضمن لى منكم ......هذه لابى هويرة:

من یضمن: استفہام التماس اور سوال کیلئے ہے۔

العشار: امام میرکؒ فرماتے ہیں کہ "العشار" کا "عین" مفتوح اور "شین" مشدد ہے یہ ایک مشہور مسجد ہے، جس میں لوگ برکت کیلئے نماز پڑھتے ہیں۔

او أربعا: ای اربع رکعاتٍ "او" بیان نوع کیلئے ہے یا "بل" کے معنی میں ہے۔

هذه لابی هريرة: کا مشارالیہ "الصلاۃ" ہے یا "ثواب الصلاۃ" ہے۔

علامہ طیبیؒ نے لکھا ہے کہ بعض حضرات نے فرمایا ہے کہ اگر یہ اعتراض کیا جائے کہ نماز بدنی عبادت ہے اور بدنی عبادت میں نیابت جائز نہیں ہے تو پھر حضرت ابو ہریرہؓ کے اس ارشاد کا کیا مطلب ہے؟

تو اس اعتراض کا جواب یہ ہے کہ ممکن ہے کہ حضرت ابو ہریرہؓ نے نماز کو حج پر قیاس کیا ہو اور نماز کے بارے میں بھی ان کا یہی مذہب ہو اگرچہ حج میں مالی شائبہ ہے۔

اور یہ بھی ممکن ہے کہ حضرت ابو ہریرہؓ کے اس ارشاد کا مطلب یہ ہو کہ اس نماز کا ثواب ابو ہریرہؓ کیلئے ہو کیونکہ یہ بعض کے ہاں جائز ہے۔ علماء حنفیہ فرماتے ہیں کہ حج عن الغير (حج بدل) کے بارے میں اصل یہ ہے کہ انسان کیلئے یہ جائز ہے کہ اپنے کسی عمل چاہے وہ عمل نماز ہو چاہے حج ہو چاہے صدقہ وروزہ ہو چاہے ذکر وتلاوت کا ثواب کسی دوسرے کو چاہے وہ زندہ ہو چاہے مر گیا ہو، کو دے سکتا ہے۔ چنانچہ جب کوئی انسان اس طرح کوئی نیک عمل کرے اور دوسرے کیلئے اس کا ثواب بخش دے تو یہ اہل سنت والجماعت کے نزدیک جائز ہے، اور اس کا ثواب اس شخص تک پہنچ جاتا ہے۔

قوله: سمعت خليلي أباالقاسم:

علامہ تورپشتی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ متعدد احادیث میں حضرت ابو ہریرہؓ سے "سمعت خليلي" کے کلمات صادر ہوئے ہیں، گویا کہ یہ کلمات خواب دیکھنے کی بنیاد پر حضرت ابو ہریرہؓ سے صادر نہیں ہوئے، بلکہ آپؓ کے دل میں حضور علیہ السلام کے لئے جو سچی محبت تھی اس کی وجہ سے ایسا ارشاد فرماتے تھے، لیکن اگر حضرت ابو ہریرہؓ اپنی اس بات میں غور کرتے تو ان پر یہ بات واضح ہو جاتی، کہ یہ بات خلاف ادب ہے کیونکہ حضور علیہ السلام کا ارشاد ہے: "لو كنت متخذا من الناس خليلالا تخذت ابابكر خليلا"

"اگر میں لوگوں میں سے کسی کو اپنا خلیل بناتا تو ابوبکر کو اپنا خلیل بناتا۔"

دوسری حدیث میں حضور علیہ السلام کا ارشاد ہے: "انی ابرأ الی كل خليل من خلته"

"میں ہر خلیل کی دوستی سے بری ہوں"

چنانچہ کسی کیلئے بھی درست نہیں ہے کہ حضور علیہ السلام کے خلیل ہونے کا دعویٰ ہے، جب حضور علیہ السلام نے ہر خلیل کی دوستی سے براءت ظاہر کردی۔

علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں کہ اگر علامہ تورپشتی رحمۃ اللہ علیہ اچھی طرح اس عبارت میں تأمل کرتے تو ان کو یہ اشکال پیدا نہ ہوتا کیونکہ

محب صادق ومحبوب کے درمیان سے احتشام کے پردے اٹھ ہی جاتے ہیں۔

علاوہ ازیں ابو ہریرہؓ نے تو دوستی کو اپنی طرف منسوب کیا، حضور علیہ السلام کی طرف منسوب نہیں کیا، کیونکہ جب سے حضرت ابو ہریرہؓ نے اسلام کو قبول کیا اس وقت سے انہوں نے حضور علیہ السلام کے دربار سے غیر حاضری نہیں کی، حالانکہ ان پر بہت زیادہ فاقے آئے تھے اور بہت محتاجی کی حالت تھی، جبکہ دوسرے صحابہ کرامؓ اپنی تجارت اور کھیتی باڑی میں مصروف رہتے تھے۔

ملا علی قاریؒ فرماتے ہیں: امام طیبیؒ کی فرمودہ علت معلول ہے، اور محل کلام ہے۔ اس لئے کہ اس طرح تو اس وقت ہی کہا جا سکتا ہے، جہاں دونوں دوست برابر درجے کے ہوں اور بادشاہوں کو لوہاروں کے ساتھ کوئی نسبت نہیں ہوتی، تو کہاں صاحب نبوت ورسالت کا درجہ اور کہاں حاضری وغیر حاضری کی وجہ سے حضرت ابو ہریرہؓ کا درجہ، تاکہ حضور علیہ السلام کے بارے میں یوں کہا جاسکے کہ حضور علیہ السلام حضرت ابو ہریرہؓ کے خلیل والی عبارت میں وصف کی اضافت فاعل کی طرف یا مفعول کی طرف کسی طرح اور کس معنی میں درست ہوگی، حالانکہ یہ بات واضح ہے کہ اگر اس طرح کی بات حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ سے بھی صادر ہوتی تو اس پر انکار ہوتا کیونکہ یہ قول بظاہر حدیث نبوی "لو کنت متخذا...... "[الحدیث]، کے مخالف ہوتا۔

امام نوویؒ فرماتے ہیں کہ "خلۃ" کا اصل معنی "الاختصاص" اور "الاستقصاء" ہے، یعنی مختص ہونا اور انتہائی درجے تک پہنچ جانا۔

بعض دوسرے حضرات کا کہنا ہے کہ "الخلۃ" کا اصل معنی ہے "الانقطاع الی من خاللت" (ساری چیزوں سے منقطع ہو کر ایک اس شخص کی طرف متوجہ ہونا جس سے دوستی ہو) "الخلۃ" بمعنی "الحاجۃ" سے مأخوذ ہے، اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کو خلیل اللہ کا لقب اس لئے ملا کہ انہوں نے صرف اللہ تعالیٰ کے سامنے اپنی حاجت رکھنے پر اکتفاء کیا۔

بعض حضرات فرماتے ہیں "الخلۃ" کا معنی ہے ایسی خالص محبت جو تخلل اسرار کا موجب ہو۔

بعض حضرات فرماتے ہیں کہ "الخلۃ" کا معنی ہے، محبت ومہربانی۔ یہ قاضی عیاضؒ کا کلام ہے۔

ابن الانباریؒ فرماتے ہیں: "الخلیل" کا معنی ہے، کامل محبت والا عاشق اور ایسا محبوب جو محبت کا حق ادا کرے اور اس کی محبت میں کوئی نقص وخلل نہ ہو۔

واحدیؒ نے لکھا ہے، کہ یہ قول مختار ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ ابراہیم علیہ السلام کا خلیل ہے اور حضرت ابراہیم علیہ السلام اللہ تعالیٰ کا خلیل ہے۔ لیکن اگر خلیل خلۃ بمعنی حاجت سے ماخوذ مانا جائے تو پھر اللہ تعالیٰ کو حضرت ابراہیم علیہ السلام کا خلیل نہیں کہا جا سکتا اھ۔

مذکورہ بالا کلام سے یہ بات واضح ہوگئی، مذکورہ بالا معانی کے اعتبار سے خلت، حضرت ابو ہریرہؓ پر صادق نہیں آتی، چنانچہ حضرت ابو ہریرہؓ کیلئے کس طرح یہ درست ہے کہ تمام صحابہ کرامؓ میں سے اپنے آپ کو مختص کر کے یوں کہے: سمعت خلیلی.

"ابا القاسم": یہ "خلیلی" سے بدل ہے یا عطف بیان ہے۔

قولہ: یقول: ان اللہ ...... ھذا المسجد مما یلی النھر:

یقول: "سمعت" کے لئے مفعول ہے۔

شهداء لاتقوم شهداء بدر غيرهم: یہ معلوم نہیں کہ یہ شہداء اس امت کے شہداء ہونگے یا سابقہ امتوں کے شہداء ہونگے۔

یلی النهر: "النهر" سے نہر فرات مراد ہے۔

قوله: وسنذکرحدیث ابی الدرداء ان فسطاط المسلمین ....:

یہ مکمل حدیث یوں ہے:

"ان فسطاط المسلمین یوم الملحمة بالغوطة الی جانب المدینة یقال لها دمشق من خیر مدائن الشام.

الفصل الثالث:

۵۴۳۵ : عَنْ شَقِيْقٍ عَنْ حُذَيْفَةَ قَالَ كُنَّا عِنْدَ عُمَرَ فَقَالَ اَيُّكُمْ يَحْفَظُ حَدِيْثَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِي الْفِتْنَةِ فَقُلْتُ اَنَا اَحْفَظُ كَمَا قَالَ قَالَ هَاتِ اِنَّكَ لَجَرِيٌّ وَكَيْفَ قَالَ قُلْتُ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ فِتْنَةُ الرَّجُلِ فِي اَهْلِهِ وَمَالِهٖ وَنَفْسِهٖ وَوَلَدِهٖ وَجَارِهٖ يُكَفِّرُهَا الصِّيَامُ وَالصَّلٰوةُ وَالصَّدَقَةُ وَالْاَمْرُ بِالْمَعْرُوْفِ وَالنَّهْيُ عَنِ الْمُنْكَرِ فَقَالَ عُمَرُ لَيْسَ هٰذَا اُرِيْدُ اِنَّمَا اُرِيْدُ الَّتِيْ تَمُوْجُ كَمَوْجِ الْبَحْرِ قَالَ قُلْتُ مَالَكَ وَلَهَا يَا اَمِيْرَ الْمُؤْمِنِيْنَ اِنَّ بَيْنَكَ وَبَيْنَهَا بَابًا مُغْلَقًا قَالَ وَيُكْسَرُ الْبَابُ اَوْيُفْتَحُ قَالَ قُلْتُ لَابَلْ يُكْسَرُ قَالَ ذٰلِكَ اَحْرٰى اَنْ لَا يُغْلَقَ اَبَدًا قَالَ فَقُلْنَا لِحُذَيْفَةَ هَلْ كَانَ عُمَرُ يَعْلَمُ مَنِ الْبَابُ قَالَ نَعَمْ كَمَا يَعْلَمُ اَنَّ دُوْنَ غَدٍ لَيْلَةً اِنِّيْ حَدَّثْتُهٗ حَدِيْثًا لَيْسَ بِالْاَغَالِيْطِ قَالَ فَهِبْنَا اَنْ نَسْاَلَ حُذَيْفَةَ مَنِ الْبَابُ فَقُلْنَا لِمَسْرُوْقٍ سَلْهُ فَسَاَلَهٗ فَقَالَ عُمَرُ.

(متفق علیه)

اخرجه مسلم فی صحیحه ۲۲۱۸/٤حدیث رقم (۲٦-۱٤٤)والبخاری فی صحیحه ۱۳/حدیث رقم ۷۰۹٦ والترمذی فی السنن ٤٥٤/٤حدیث رقم ۲۲۵۸ وابن ماجه فی السنن ۱۳۰٥/۲حدیث رقم ۳۹۰۰ واحمد فی المسند ۳۸٦/٥

ترجمہ: "حضرت شقیق تابعیؒ حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے بیان فرمایا: "ہم (ایک روز) حضرت عمر فاروق رضی کے پاس حاضر خدمت تھے کہ انہوں نے ہم سے دریافت فرمایا کہ تم میں سے کونسا شخص رسول اللہ ﷺ کے اس فرمان کو یاد رکھنے والا ہے جو آپ ﷺ نے فتنہ کے متعلق ارشاد فرمایا تھا' میں نے عرض کیا کہ مجھے یاد ہے اور بالکل ایسے یاد رکھے ہوئے ہوں جیسے آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا تھا (یعنی میرے حافظہ میں وہ حدیث بغیر کمی اور بیشی کے من وعن محفوظ ہے) حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے یہ سن کر فرمایا کہ "اچھا' چلو سناؤ' تم روایت

حدیث میں بہت دلیر ہو' تم اس تمام فرمان کی کیفیت بیان کرو جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جیسے ارشاد فرمایا تھا''۔ حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں نے بیان کیا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ ''انسان کا فتنہ (یعنی اس کی آزمائش اور ابتلا) اس کے گھر والوں کی صورت میں ہے' اس کے مال کی صورۃ میں ہے' اس کے نفس فلاں ہے' اس کی اولاد میں ہے اور اس کے ہمسایہ میں ہے! اس کے اس فتنہ کو (اور اس فتنہ کے سبب وہ وہ جو صغیرہ گناہ کرتا ہے' اس کو روزے' نماز' صدقہ' امر بالمعروف اور نہی عن المنکر دور کر دیتے ہیں''۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے (یہ حدیث سن کر) فرمایا کہ میرا مدعا اس فتنے سے نہیں تھا' میں تو اس فتنہ کے متعلق واقفیت چاہتا تھا جو سمندر کی موجوں کی طرح جوش مارے گا؟ حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں نے عرض کیا کہ امیر المؤمنین! بھلا آپ کو اس فتنہ سے کیا سروکار؟ آپ کے اور اس فتنہ کے مابین تو ایک بند دروازہ رکاوٹ ہے۔ یعنی اس فتنہ کے بارے میں کیوں متفکر ہیں' اس کے برے اثرات آپ کے تو ضرررساں نہیں کیونکہ یہ تو آپ کی حیاتِ طیبہ کے بعد ظہور پزیر ہوگا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا ''اچھا یہ بتاؤ کہ وہ دروازہ کہ جس سے فتنہ نکلے گا توڑا جائے گا (یعنی اس کو اس طرح توڑا جائے گا یا کھولا جائے گا؟ حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ بیان فرماتے ہیں کہ میں نے جواب دیا کہ ''دروازہ کھولا نہیں جائے گا بلکہ توڑ دیا جائے گا (یعنی اس کو اس طرح توڑ پھوڑ کر برابر کر دیا جائے گا کہ پھر اس کا بند ہونا یا اس کا قابل مرمت ہونا ممکن نہیں ہوگا'' حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے (یہ سن کر) فرمایا ''وہ دروازہ (اگر کھولا نہیں بلکہ توڑا جائے گا تو پھر تو اسی لائق بن جائے گا کہ وہ کبھی بھی بند نہ کیا جا سکے گا''۔ حدیث کے راوی حضرت شقیقؒ کہتے ہیں کہ میں نے حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ سے پوچھا کہ کیا حضرت عمر رضی اللہ عنہ دروازے سے متعلق جانتے تھے؟ حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ ہاں! حضرت عمر رضی اللہ عنہ دروازے سے متعلق واقف تھے جس طرح وہ اس بات سے واقفیت رکھتے تھے کہ کل کے دن سے پہلے رات آئے گی (یعنی جس طرح ہر شخص یقینی طور پر علم رکھتا ہے کہ کل آنے والے دن سے پہلے رات کا آنا یقینی ہے اسی طرح حضرت عمر رضی اللہ عنہ یقینی طور پر جانتے تھے کہ دروازہ سے مراد کون ہے) اور بلاشبہ میں نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے وہ حدیث بیان کی جس میں غلطیاں نہیں ہیں۔ حضرت شقیقؒ کہتے ہیں کہ (اس کے بعد) ہمیں حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ سے یہ دروازے کی مراد سے متعلق پوچھ لینے کی ہمت نہ ہوسکی' البتہ ہم نے حضرت مسروقؒ سے عرض کیا (جو وہاں موجود تھے) کہ آپ حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ سے پوچھ لیجئے' چنانچہ انہوں نے حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ سے پوچھا تو حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ نے ارشاد فرمایا کہ دروازے سے مراد حضرت عمر رضی اللہ عنہ ہیں''۔ (بخاری ومسلم)

تشریح: قولہ: انا أحفظ كما قال:

كما قال: مصدر محذوف ''حفظاً'' کی صفت واقع ہو رہی ہے اور عبارت کی تقدیر یوں ہے: ''أنا أحفظ مقوله عليه السلام حفظاً مماثلا لما قال'' علامہ طیبیؒ نے اس طرح ذکر کیا ہے۔'' احفظ'' متکلم کا صیغہ ہے اسم تفضیل نہیں ہے، جیسا کہ بعض لوگوں کو وہم ہوا ہے۔

قوله: قال: هات انك لجرى و كيف قال:

هات: قاموس میں لکھا ہے کہ **هاتِ** (تاء کے کسرہ کے ساتھ) بمعنی **اعطني.**

جری: **الجراء ة** مصدر سے فعیل کے وزن پر صفت مشتقہ ہے اور" **الجراء ة**" کا معنی ہے "**الاقدام علی الشئی**". مطلب یہ ہے کہ اے حذیفہ! آپ گھبراتے نہیں ہیں، اور ایسی احادیث جن کو نہ میں جانتا ہوں اور نہ آپ کے ساتھی جانتے ہیں کہ بارے میں جرأت کر کے یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ آپ حضور علیہ السلام کے صریح ارشادات کو اچھی طرح جانتے ہیں"۔ اسی لئے حضرت عمرؓ نے" **هات**" کے بعد" وکیف قال" فرمایا:

و کیف قال؟ : قال کے فاعل کی ضمیر کا مرجع نبی ﷺ ہے۔ علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں:" **و کیف قال**" کا "**هات**" پر عطف ہو رہا ہے۔ اور عبارت کی تقدیر یہ ہے:"**هات ما قال وبين كيفيته**" اھ۔

"اے حذیفہ! آپ کی زیادہ جرأت اور حضور علیہ السلام سے زیادہ سوالات پوچھنے کی وجہ سے آپ نے حضور علیہ السلام سے ایسی احادیث محفوظ کر لی ہیں جو ہمیں معلوم نہیں ہیں، چنانچہ وہ احادیث لاؤ اور ہمیں سناؤ"۔

قوله: فتنة الرجل في اهله وماله ونفسه وولده وجاره: اهل: اس سے عیال یعنی بیوی اور باندی مراد ہے، یا رشتہ دار مراد ہیں۔

ان کے علاوہ دوسری اس قسم کی چیزوں سے آزمائش ہوگی۔ مطلب یہ ہے کہ ہمزہ بندے سے سوال ہوگا، اور ان حقوق میں کوتاہی سے گنہگار ہو جاتا ہے) اس لئے بندے کو چاہیے کہ نیکیاں کر کے اپنے گناہوں کو معاف کروا دیں، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے ﴿ إِنَّ الْحَسَنٰتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّاٰتِ ﴾[هود-١١٤] "بے شک نیک کام (نامۂ اعمال سے مٹا دیتے ہیں برے کاموں کو۔" اور اسی کی طرف حدیث کے اگلے الفاظ سے اشارہ ہوتا ہے۔

قوله: فقال عمر: ليس هذا أريد:

طیبیؒ فرماتے ہیں، کہ حضرت عمرؓ نے جب یہ دریافت کیا کہ تم میں سے کون فتنے کے بارے میں حضور علیہ السلام کی حدیث جانتا ہے؟ تو یہ بھی احتمال تھا کہ فتنہ سے آزمائش مراد ہو جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ: ﴿ وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوْعِ وَنَقْصٍ مِّنَ الْاَمْوَالِ وَالْاَنْفُسِ وَالثَّمَرٰتِ وَبَشِّرِ الصّٰبِرِيْنَ ﴾[البقرة-١٥٥] "اور (دیکھو) ہم تمہارا امتحان کریں گے کسی قدر خوف سے اور فاقہ سے اور مال اور جان اور پھلوں کی کمی سے اور آپ ایسے صابرین کو بشارت سنا دیجئے۔" میں مذکور ہے اور یہ بھی احتمال تھا کہ فتنہ سے قتل و قتال مراد ہو، لیکن چونکہ واقعۃً حضرت عمرؓ کا مقصود فتنے سے قتل و قتال تھا اس لئے فرمایا:"**ليس هذا أريد** (میرا یہ مقصود نہیں ہے)

قوله: انما أريد التي تموج كموج البحر :

یعنی جیسا کہ جوش کے وقت سمندر کی لہریں تیزی کے ساتھ ایک دوسرے سے ٹکرا کر ایک پریشان کن منظر پیش کرتی ہیں۔ "**التي تموج كموج البحر**" سے آپس کے اختلاف کی شدت اور اس اختلاف سے پیدا ہونے والے قتل و قتال کی شدت کی

طرف اشارہ کیا ہے۔

مالك و لها: استفہام انکاری ہے۔

يا امير المؤمنين : اس عبارت کا ماقبل اور مابعد دونوں کے ساتھ متعلق ہونا ممکن ہے۔

ان بينك و بينها بابا مغلقا : یہ جملہ، جملہ مستأنفہ معللہ ہے۔

ويكسر الباب أويفتح: یعنی کیا دروازے کے سخت ہونے کی وجہ سے اس کو توڑا جائے گا؟ استفہام مقدر ہے اسی لئے مقابلے میں "او يفتح" ذکر کیا، یا کہ دوراز ے کے نرم وآسان ہونے کی وجہ سے اس کو کھول دیا جائے گا؟

قلت: لا: عبارت کی تقدیر" لا يفتح" ہے "لا" کی نفی فعل قریب کی طرف سے ہے اس لئے بطور استدراک آگے ارشاد فرمایا "بل يكسر": اور اس کا فائدہ یہ ہے کہ تائید پیدا ہوگئی۔

علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں، کہ اگر اعتراض کیا جائے کہ جواب میں اتنا کہنا کافی تھا "يكسر" تو "لا" اور "بل" کو کیوں ذکر کیا گیا تو اس کا جواب یہ ہے کہ لا اور بل کی وجہ سے اس پر تنبیہ ہوگئی کہ اس دروازے کا توڑا جانا ظاہر ہے اس لئے یہ اس دروازے کے توڑے جانے کو "یا" کے ساتھ ذکر کرنے کا مقام نہیں ہے، چنانچہ "أم" کے ذریعے سوال نہ کیا جائے۔ اس طرح کی تنبیہ کیلئے اس طرح کی عبارت کی یہ وضاحت بار بار ذکر کی گئی ہے اھ۔

ملاعلی قاریؒ فرماتے ہیں کہ علامہ طیبیؒ کے اس جواب میں کئی وجوہ سے سقم ہے۔

اول: اس جواب میں ایک بہت بڑے فصیح و بلیغ صحابی حضرت عمرؓ پر اعتراض ہے۔

دوم اس جواب میں اس دروازے کے توڑے جانے کے ظاہر ہونے کا دعویٰ بھی کوئی معنی نہیں رکھتا کیونکہ کسی انتہائی غبی شخص کو بھی اس کا وہم نہیں ہوا۔

سوم! حرف تردید "او" تو حضرت حذیفہ کے کلام میں واقع ہوا ہے اور ان دونوں (یعنی "أم" اور "اوْ") میں فرق ہے۔ بلکہ بظاہر تو یہ حضرت حذیفہؓ کے جواب پر اعتراض ہے، کیونکہ یہ بات اپنے مقام پر واضح کی گئی ہے کہ "أم" متصلہ کا جواب تعیین کے ساتھ دیا جاتا ہے "نعم" یا "لا" کے ساتھ نہیں دیا جاتا، کیونکہ "نعم" اور "لا" تعیین کا فائدہ نہیں دیتے، البتہ "او" جب ہمزہ کے ساتھ استعمال ہو تو اس کا حکم اور ہے، چنانچہ " أجاء ك زيدٌ او عمرو" کے جواب میں "نعم" یا "لا" کہنا درست ہے، کیونکہ اس عبارت سے بغیر تعیین کے کسی ایک کے بارے میں سوال کرنا مقصود ہے کہ کیا ان میں سے کوئی ایک تمہارے پاس آیا ہے یا نہیں؟ اور بلاشبہ یہاں جواب میں یہ معنی مقصود نہیں ہے بلکہ تعیین مقصود ہے، اور دروازہ توڑے جانے کے حکم سے یہی مقصود ہے، زیادہ سے زیادہ یہ ہوا کہ "کسر، باب" کے مقابل "فتح باب" کی پہلی نفی کی کے ذیل میں اس بات کی تحقیق کی گئی ہے اور بعد میں "کسر باب کا حکم لگایا" تاکہ حصر کا فائدہ حاصل ہو، جیسا کہ کلمہ توحید میں کیونکہ اگر اتنا کہا جاتا: الله موجودٌ یا الله ثابتٌ، یا الله محقق، تو اللہ کے غیر کی نفی کا فائدہ اس عبارت سے حاصل نہ ہوتا' اس لئے ان عبارات کی بجائے "لا اله الا الله" کی تعبیر اختیار کی۔

قوله:ذاك احرى ان لا يغلق ابدا:

ذاك: صحیح نسخوں میں اسی طرح بغیر لام کے موجود ہے،(اور مشار الیہ محذوف ہے)ای"**ذاك الباب الذی من وصفه ان یکسر ولا یفتح**"۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ دروازے کے کھل جانے کے بعد تو اس دروازے کے بند ہو جانے کی امید کی جاسکتی ہے لیکن اگر دروازہ توڑ دیا جائے تو پھر کوئی امید تو نہیں رہتی۔اس معنی کی تائید اس روایت سے بھی ہوتی ہے،جس کو امام ترمذیؒ نے ثوبانؓ سے نقل کیا ہے:"**اذا وضع السیف فی امتی لم یرفع عنها الی یوم القیامة**"۔

قوله:قال:فقلنا لحذیفة هل كان عمر یعلم من الباب؟:

بظاہر تو "**ما الباب؟**" کہنا چاہئے تھا تو گویا کہ وہ اپنی فراست سے سمجھ گئے کہ باب سے کوئی شخص مراد ہے، حقیقی دروازہ مراد نہیں ہے۔

"دروازے کا توڑا جانا" حضرت عمرؓ کی شہادت پر شاہد ہے۔گویا کہ حضرت عمرؓ اصلاح وصواب کا ایک دروازہ تھے' اسلام کی عزت ووقار کیلئے چابی تھے' اور مخلوق کے درمیان فتنوں سے حفاظت کا ذریعہ تھے، اللہ تعالیٰ ان سے راضی ہوگیا اور دارالسلام میں داخل فرمادیا۔

قوله:قال نعم كما یعلم ان دون ......لیس بالأغالیط:

كما یعلم :('ما" مصدریہ ہے۔)

مطلب یہ ہے کہ کل کے آنے کا تصوررات گزرنے کے بعد ہی کیا جاسکتا ہے، گویا کہ حضرت حذیفہؓ نے امن وامان کے زمانہ کو بمنزلہ موجودہ دن کے قرار دیا، فتنوں کے زمانے کو آئندہ کل کی مانند قرار دیا، اور رات کو(امن وامان اور فتنوں کے) درمیان میں حائل کی مانند قرار دیا۔حضرت حذیفہؓ نے کیا ہی اچھی تعبیر اختیار کی، کہ فتنے کے ظہور کے وقت کو آئندہ کل سے تعبیر کیا اور جیسا کہ آئندہ کل رات کے بعد آتی ہے، اسی طرح وہ فتنہ ان کے بعد آئے گا، اس فتنے کی شدت اور خفاء کی وجہ سے اس طرح تعبیر اختیار کی کیونکہ رات کی ہلاکت زیادہ بڑی مصیبت ہوتی ہے۔

حاصل یہ کہ حضرت عمرؓ کا یہ جاننا کہ وہ دروازہ میں ہی ہوں، ایک واضح بات ہے، جس میں کسی عقلمند کو کوئی شک نہیں۔

انی حدثته: یہ جملہ مستأنفہ ہے' اس میں تعلیل کا معنی بھی ہے۔

حدیثاً :اس کی صفت محذوف ہے ای "**حدیثا ظاهر ا**"۔

أغالیط:"**أغلوطة**" کی جمع ہے۔

علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں، کہ حضرت حذیفہؓ کے اس فرمان کا مطلب یہ تھا کہ میں نے حضرت عمرؓ کے سامنے ایسی بات بیان کی ہے کہ جس میں" أغالیط" کی طرح کا کوئی ابہام واحتمال نہیں تھا' بلکہ اچھی طرح تصریح کر دی۔

اس مقام پر یہ بات بھی قابل غور ہے کہ حضرت حذیفہؓ نے حضور علیہ السلام کے بتائے ہوئے راز کی حفاظت کو ترجیح دی، اور حضرت عمرؓ کے سوال کا جواب صراحت کے ساتھ نہیں دیا، بلکہ کنایہ اشارہ کے ساتھ جواب دیا، کہ آپ کی زندگی میں ان فتنوں میں سے کوئی فتنہ ظاہر نہیں ہوگا، گویا کہ حضرت حذیفہؓ نے فتنوں کو ''دارالامن'' کے مقابل دار کے ساتھ تشبیہ دی، اور حضرت عمرؓ کی زندگی کو بند دروازے کے ساتھ تشبیہ دی اور آپؓ کی موت کو اس دروازے کے کھل جانے کے ساتھ تشبیہ دی، اس دروازے کے توڑے جانے سے حضرت عمرؓ کی شہادت کی طرف اشارہ کیا، اور اس دروازے کے کھل جانے سے آپؓ کی موت کی طرف اشارہ کیا۔

حاصل یہ کہ حضرت حذیفہؓ کا یہ کلام صریح نہیں تھا، بلکہ اشارات وتلویح کے قبیل سے تھا، لیکن حضرت عمرؓ ان ہستیوں میں سے تھے، کہ جن پر کلام کے اشارات مخفی نہیں تھے، چہ جائیکہ واضح کلام (مخفی رہے) بلکہ حضرت عمرؓ بھی اصحاب اسرار وارباب الانوار میں سے تھے، چنانچہ حضرت عمرؓ کا یہ سوال تو صرف تحقیق حال کیلئے تھا اور اس بات کو جاننے کیلئے تھا، کہ کیا صحابہؓ میں سے کوئی صحابی ایسا باقی ہے جس کو اس دروازے کا علم ہو اور اسی وجہ سے حضرت حذیفہؓ نے ''نعم'' کہہ کر بڑے یقین سے جواب دیا۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

(ملا علی قاریؒ فرماتے ہیں) کہ طیبیؒ کا یہ فرمانا محل اشکال ہے کہ اسی راز کی وجہ سے حضرت عمرؓ نے ان سے یہ فرمایا تھا: انك لجری۔ کیونکہ سید الکونین حضور ﷺ سے سُنی ہوئی حق بات کو ظاہر کرنا کونسی خرابی ہے اس کو بطور انکار کے جرأت کہا جاسکے۔ چنانچہ صحیح بات وہی ہے جو ہم نے ماقبل میں ذکر کی ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم

قوله: قال: فيهنا أن نسال ......:

قال: فاعل کی ضمیر شقیقؒ کی طرف لوٹتی ہے۔

''هبنا'': هاء کے کسرہ کے ساتھ یہ ''الهيبة'' سے ماخوذ ہے۔

فقال عمر: یعنی حضرت عمرؓ ہی وہ دروازہ ہیں، مطلب یہ ہے کہ اپنے اصحاب واحباب سے فتنوں کو روکنے والے ہیں یا مطلب یہ ہے کہ حق بات کہنے کا دروازہ ہیں۔

تخریج: جامع میں اس طرح مذکور ہے: **''فتنة الرجل في أهله وما له وولده ونفسه وجاره يكفرها الصيام والصدقة والأمر بالمعروف والنهي عن المنكر''**

اس حدیث کو شیخین، امام ترمذی اور ابن ماجہ نے حضرت حذیفہؓ سے روایت کیا ہے۔

۵۴۳۶ : وَعَنْ أَنَسٍ قَالَ فَتْحُ الْقُسْطُنْطِينِيَّةِ مَعَ قِيَامِ السَّاعَةِ. (رواه الترمذى وقال هذا حديث غريب)

اخرجه الترمذى فى السنن ٤/٤٢ حديث رقم ٢٢٣٩ واحمد فى المسند ٥/٢٣٢

ترجمہ: ''حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انہوں نے فرمایا: ''قسطنطنیہ کا فتح ہونا' قیامت کے وقوع

کے قریبی زمانہ میں ہوگا'' اس روایت کو ترمذی نے نقل کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ حدیث غریب ہے۔

تشریح: قوله: فتح القسطنطينة مع قيام الساعة:

الساعة: (مضاف محذوف ہے) ای: "مع قرب قيامها" ہے۔

اس کی تحقیق ماقبل میں گذر ہو چکی ہے۔

(سند یا متن کے اعتبار سے) غریب ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم واحکم

بَابُ أَشْرَاطِ السَّاعَةِ

قیامت کی علامات کا بیان

''اشراط الساعة'' سے مراد ''علامات قیامت'' ہیں۔ نہایہ میں لکھا ہے: ''أشراط'' کا معنی ہے '' العَلامات'' اس کا واحد ''شرط'' ہے شین اور راء کی حرکت کے ساتھ۔ اور اسی وجہ سے بادشاہ کے ''شرط'' کو ''شرط'' کہا جاتا ہے۔ کیونکہ انہوں نے اپنے لئے کچھ علامات مقرر کی ہوئی ہوتی ہیں، جن سے وہ پہچانے جاتے ہیں۔(ابوعبیدہ)

خطابیؒ نے بعض اہل لغت سے اس تفسیر کا منکر ہونا نقل کیا ہے اور کہا ہے: اشراط الساعة ما ينكره الناس من صغار امورها قبل ان تقوم الساعة.اھ۔ یعنی'' اشراط الساعة'' سے وہ چھوٹے امور مراد ہیں جن کو قیامت قائم ہونے سے پہلے لوگ عجیب سمجھیں گے.اھ۔ گویا کہ انہوں نے یہ بات قاموس سے اخذ کی ہے۔ چنانچہ قاموس میں لکھا ہے: الشرط شین اور راء کی حرکت کے ساتھ' بمعنی علامت، کسی چیز کا پہلا حصہ گھٹیا قسم کا مال۔

اور یہ اس بات کے منافی نہیں کہ '' الشرط'' کے دو معانی ہوں، اور ان میں سے ہر معنی اس مقام کے مناسب لہٰذا انکار کا کوئی مطلب نہیں، مزید برآں بعض اہل لغت کا یہ کہنا: ''أشراط الساعة ما ينكره الناس'' علی الاطلاق درست نہیں ہے کیونکہ ایسے لوگ بھی ہیں جو قیامت کے چھوٹے امور کو عجیب اور اوپری نگاہوں سے نہیں دیکھتے، کیونکہ ان کو اول درجہ میں تو علماء کرام سے علم الیقین حاصل ہوتا ہے، اور آخری درجہ میں مقام مشاہدہ میں عین الیقین بھی حاصل ہوتا ہے۔

الفصل الاول:

چھ علاماتِ قیامت

۵۴۳۷ : عَنْ اَنَسٍ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ اِنَّ مِنْ اَشْرَاطِ السَّاعَةِ اَنْ يُّرْفَعَ الْعِلْمُ وَيَكْثُرَ الْجَهْلُ وَيَكْثُرَ الزِّنَا وَيَكْثُرَ شُرْبُ الْخَمْرِ وَيَقِلَّ الرِّجَالُ وَيَكْثُرَ النِّسَاءُ حَتّٰى يَكُوْنَ لِخَمْسِيْنَ اِمْرَاَةً الْقَيِّمُ الْوَاحِدُ وَفِيْ رِوَايَةٍ يَقِلُّ الْعِلْمُ يَظْهَرُ الْجَهْلُ. (متفق علیه)

اخرجه البخاري في صحيحه ۱/۱۷۸ رقم ۸۰ ومسلم في صحيحه ۲۰۵٦/٤ حديث رقم ۲٦۷۱/۹

وابوداؤد في السنن ٣٩٠/١حديث رقم ٦٠والترمذي في السنن ٤٢٦/٤حديث رقم ٢٢٠٥والنسائي ٢٤٤/٧حديث رقم ٤٤٥٦ وابن ماجه في السنن ١٣٤٧/٢حديث رقم ٤٠٤٥ والدارمي ١٣٤/١حديث رقم ٤٧٦، واحمد في المسند ١٧٦/٣۔

ترجمہ: ''حضرت انس رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ ارشاد فرماتے ہوئے سنا: ''یقیناً قیامت کی علامات میں سے ایک علامت یہ ہے کہ علم اٹھالیا جائے گا (یعنی حقیقی علماء اس دنیا سے رخصت ہو جائیں گے یا یہ کہ اہل علم کا مقام و مرتبہ لوگوں کی نظروں میں کم رہ جائے گا) جہالت کی زیادتی ہو جائے گی (یعنی ہر طرف جہالت و نادانی کا دور دورہ ہوگا جو اگرچہ علم و دانش کا دعویٰ کریں گے لیکن درحقیقت علم و عرفان عقل و دانائی سے ان کا کوئی علاقہ نہ ہوگا دور ہوں گے) بدکاری عالم ہو جائے گی (یعنی لوگوں میں عفت و عزت و ناپید ہو جائے گی) شراب نوشی کثرت سے ہونے لگے گی مردوں کی تعداد کم ہو جائے گی (جن کے دم سے عالم کا نظام استوار و مستحکم ہوتا ہے) عورتوں کی آبادی زیادہ ہو جائے گی یہاں تک کہ پچاس عورتوں کا کفیل و ذمہ دار ایک مرد ہوگا۔ اس سے یہ مراد نہیں کہ ایک مرد کی پچاس بیویاں ہونگی بلکہ یہ مراد ہے کہ ایک ایک مرد پر پچاس پچاس عورتوں کی کفالت و خبرگیری کا بوجھ ہوگا جن میں مائیں' خالائیں' دادیاں' بہنیں' پھوپھیاں وغیرہ سب شامل ہوں گی''۔

تشریح: **قوله:یرفع العلم** :

قوله:ویکثر شرب الخمر :

شرب کے ''شین'' کو مضموم اور مفتوح دونوں طرح پڑھنا درست ہے۔ اس ارشاد باری ﴿ فَشَارِبُوْنَ شُرْبَ الْهِيْمِ ﴾ [الواقعة:٥٥] میں شرب کو ''شین'' کے ضمہ اور فتحہ کے ساتھ پڑھا گیا ہے۔ اور ''شین'' کا کسرہ بھی جائز ہے۔ قاموس میں لکھا ہے کہ شرب کسمع شربۃ ویثلث۔ شراب کا کثرت سے پینا عباد و بلاد میں فساد کا ذریعہ ہے۔

قوله:حتى یکون لخمسین امرأة القیم الواحد:

القیم: یاء مشددہ کے کسرہ کے ساتھ۔

قوله:وفی روایة یقل العلم ویظهر الجهل:

بظاہر ''یرفع'' کی بجائے ''یقل'' ہے، اور ''یکثر'' کی بجائے ''یظهر'' ہے۔ اور تقدیر اس طرح ہے: ''ان یقل العلم ویظهر الجهل'' شاید یہ روایت پر مبنی ہے۔ کیونکہ آخر میں تو یہی ہوگا کہ سارا کا سارا علم اٹھالیا جائے گا۔ جیسا کہ ایک حدیث میں وارد ہوا ہے جس کو سجزی نے حضرت ابن عمرؓ سے مرفوعاً نقل کیا ہے:

''لا تقوم الساعة حتى یرفع الرکن والقرآن''۔

نیز مسند احمد، صحیح مسلم اور جامع ترمذی میں حضرت انسؓ کی یہ روایت منقول ہے:

''لا تقوم الساعة حتى لا یقال فی الأرض الله الله''۔

تخریج: سید جمال الدینؒ نے لکھا ہے کہ اس حدیث کو امام ترمذی اور ابن ماجہ نے بھی نقل کیا ہے۔ جامع میں لکھا ہے کہ اس حدیث کو امام احمد، شیخین، ترمذی، نسائی اور ابن ماجہ نے حضرت انسؓ سے ان الفاظ کے ساتھ نقل کیا ہے:

"ان من اشراط الساعة ان يرفع العلم ويظهر الجهل ويفشو الزنا ويشرب الخمر، ويذهب الرجال ويبقى النساء حتىٰ يكون لخميسن امرأةً قيم واحدٌ".

امام احمد اور شیخین نے حضرت ابن مسعودؓ اور حضرت ابو موسیٰؓ سے ایک مرفوع حدیث کی ہے: "ان بين يدى الساعة لأياماً ينزل فيها الجهل ويرفع فيها العلم ويكثر فيها الهرج والمرج وهو القتل".

۵۴۳۸ : وَعَنْ جَابِرِ بْنِ سَمُرَةَ قَالَ سَمِعْتُ النَّبِيَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ اِنَّ بَيْنَ يَدَيِ السَّاعَةِ كَذَّابِيْنَ فَاحْذَرُوْهُمْ۔ (رواه مسلم)

اخرجه مسلم فی صحيحه ۱۴۵۴/۳ حديث رقم ۱۸۲۲/۱۰ وابن ماجه فی سنة ۱۳۰۴/۲ حديث رقم ۳۹۵۲ واحمد فی المسند ۸۶/۵

ترجمہ: حضرت جابر رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ ارشاد فرماتے ہوئے سنا: قیامت آنے سے پہلے جھوٹوں کی پیدائش بڑھ جائے گی لہٰذا تم ان سے محتاط رہنا"۔ (مسلم)

تشریح: قوله: ان بين يدى الساعة كذا بين: مظہرؒ فرماتے ہیں کہ اس سے مراد کثرت جہل، قلت علم، موضوع احادیث ذکر کرنا اور حضور علیہ السلام کی طرف جھوٹی باتیں منسوب کرنا ہے، اور اس بات کا بھی احتمال ہے، کہ اس سے مراد نبوت کا دعویٰ کرنا ہو، جیسا کہ آپ ﷺ کے زمانے میں ہوا اور بعد والے زمانے میں بھی ہوا، اور وہ جماعت مراد ہو جو فاسد خواہشات کا دعویٰ کرتی ہو، اور حضور علیہ السلام کی طرف اپنے باطل عقائد منسوب کرتی ہو، جیسا کہ تمام اہل بدعت کرتے ہیں۔

قوله: فاحذروهم: ابن الملکؒ نے شرح مشارق میں لکھا ہے، کہ "فاحذروهم" کے الفاظ صحیح مسلم میں مذکور نہیں ہے، لیکن دوسری بعض روایات میں وارد ہوئے ہیں۔ اور بعض کا کہنا ہے کہ یہ حضرت جابرؓ کا قول ہے۔ اھ۔ اور جامع میں یہ روایت مکمل طور پر مشکوٰۃ والے الفاظ کے ساتھ مذکور ہے، اور فرمایا کہ اس حدیث کو امام احمد اور امام مسلمؒ نے حضرت جابر بن سمرۃؓ سے نقل کیا ہے۔

۵۴۳۹ : وَعَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ قَالَ بَيْنَمَا النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يُحَدِّثُ اِذْجَآءَ اَعْرَابِيٌّ فَقَالَ مَتٰى السَّاعَةُ قَالَ اِذَا ضُيِّعَتِ الْاَمَانَةُ فَانْتَظِرِ السَّاعَةَ قَالَ كَيْفَ اِضَاعَتُهَا قَالَ اِذَا وُسِّدَ الْاَمْرُ اِلٰى غَيْرِ اَهْلِهٖ فَانْتَظِرِ السَّاعَةَ۔ (رواه البخاری)

اخرجه البخاری فی صحيحه حديث رقم ۵۹

ترجمہ: "حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا کہ (ایک روز) رسول اللہ ﷺ صحابہؓ سے (کسی سلسلہ میں) گفتگو فرما رہے تھے کہ اچانک ایک دیہاتی (مجلس نبوی میں) آیا اور عرض کرنے لگا کہ قیامت کا وقوع کب ہوگا؟

حضور ﷺ نے فرمایا کہ جب امانت کو تلف کیا جانے لگے تم پھر تم قیامت کے منتظر رہنا"۔اس بدو نے پوچھا کہ امانت کا تلف کیا جاتا کیسے ہوگا اور یہ نوبت کب آئے گی؟ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا:"جب حکومت کی ذمہ داری نا اہل لوگوں کو سونپی جانے لگے تو (سمجھنا کہ یہ امانت کا تلف ہوجانا ہے اور اس وقت) قیامت کے منتظر رہنا"۔(بخاری)

تشریح:قوله:اذا ضيعت الامانة فانتظر الساعة:

ضيعت: التضييع مصدر سے مجہول کا صیغہ ہے،اور ایک نسخہ میں" الاضاعة" مصدر سے (اضيعت) ہے۔

یعنی جس وقت امانت میں خیانت کر کے اس کو ضائع کیا جانے لگے

یا مطلب یہ ہے کہ جس وقت امانت غیر امانت دار افراد (یعنی خیانت کرنے والوں) کے پاس رکھی جانے لگے۔

قال :كيف اضاعتها؟:ان الفاظ سے دوسرے نسخے کی تائید ہوتی ہے،جس میں" ضيعت" کی بجائے"اضيعت" ہے،مطلب یہ ہے کہ جب امت امانت کا خیال رکھ رہی ہوگی اور عام لوگ بھی امانت کا اہتمام کریں گے تو پھر امانت کیسے ضائع ہوگی؟

قوله:قال اذا اوسد الامر الى غير أهله فانتظر الساعة:

وُسِد: واؤ کے ضمہ اور سین کی تشدید کے ساتھ،اور سین کی تخفیف بھی جائز ہے۔جیسا کہ مقدمہ میں گزر چکا ہے۔

"الأمر": اس سے مراد سلطنت کا انتظام ہے یا امارت یا قضاء یا حکومت ہے۔

نا اہل لوگوں سے مراد وہ جن میں ان امور کے استحقاق کی شرائط موجود نہ ہوں مثلاً عورتیں، بچے، جاہل، فاسق، بخیل، بزدل اور غیر قریشی، یہ لوگ ان امور کے مستحق نہیں ہیں اگر چہ یہ سلاطینِ زمانہ ہی کی نسل سے کیوں نہ ہوں۔ یہ تو خلیفہ مسلمین کا حال ہوگا اسی پر اولوالامر اور دوسرے ارباب مناصب مثلاً تدریس،فتویٰ،امامت،خطابت وغیرہ کا حال قیاس کر لیں۔

علامہ تورپشتی رحمہ اللہ فرماتے ہیں اس کا مطلب یہ ہے کہ امور کی نگرانی نا اہل لوگوں کے ہاتھوں میں چلی جائے اور ان نا اہلوں کو انتظام حوالے کر دیا جائے،اور امر سے خلافت اور خلافت سے متعلقہ امور مثلاً قضاء،امارت وغیرہ مراد ہیں۔

"توسيد" وسادة سے مأخوذ ہے،کہا جاتا ہے:" وسدته الشيئ "سین کی تخفیف کے ساتھ فتوسده۔لفظ"الى" کو ذکر کرنے میں اشکال ہے۔اس لئے کہ حق تو یہ تھا کہ "وسد الأمر لغير اهله" کہا جاتا،لیکن "لام" کی جگہ "الى" ذکر کیا،تا کہ اس کی طرف امر کی اسناد پر دلالت کرے۔اھ۔

قاموس میں لکھا ہے کہ "الى" لام کا مترادف بن کر استعمال ہوتا ہے،جیسا کہ اس ارشاد باری تعالیٰ:﴿والأمر اليك﴾ [النمل:۳۳] میں ("الى" لام کے معنی میں) ہے،اور یہ عبارت "والأمر لك"لیکن یہ کہنا زیادہ واضح ہے: "والأمر راجع اليك" قرار دی جائے۔اور حدیث کے بارے میں احسن بات یہ ہے کہ ("وسد" میں)" تفويض "اور "اسناد" کے معنی کی تضمین ہے جیسا کہ ہم نے شروع میں اس طرف اشارہ کیا۔

فانتظر الساعة:

کیونکہ قرب قیامت کی دلیل ہے۔ خلافت وقضاء وغیرہ کا نااہل کے سپرد ہو جانا، قیامت کے قرب کی دلیل ہے اس لئے کہ اس سے خلل پیدا ہوگا۔ اور نظام ناقص ہوگا' امور دینیہ کمزور پڑ جائیں گے' اور اسلامی احکام ضعیف ہو جائیں گے۔

علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں کہ یہ اس وجہ سے ہوگا کہ حکمرانوں کا فساد وتغیر رعایا کے فساد وتغیر کو مستلزم ہے، جیسا کہ کہا گیا ہے: **الناس علی دین ملوکھم** (لوگ اپنے حکمرانوں کے دین پر ہوتے ہیں)۔

قاضی عیاضؒ فرماتے ہیں کہ (اعرابی کے سوال کے جواب میں حضور علیہ السلام نے) دونوں جملے، جملہ مستأنفہ کی صورت میں ذکر فرمائے، تا کہ تاکید کا فائدہ دیں۔

دوسری وجہ یہ کہ جب پہلے سوال کا حقیقی جواب ممکن نہیں تھا جو اس کے مطابق ہوتا۔ کیونکہ قیامت کا متعین وقت امور غیب میں سے ہے نہ کسی مقرب فرشتے کو اس کا علم ہے اور نہ کسی مقرب نبی کو، تو حضور علیہ السلام نے حقیقی جواب سے عدول کر کے ایسی بات ارشاد فرمائی جو سوال میں پوچھی گئی چیز پر علامات کے واسطے سے اشارۃً دلالت کرے، اور دوسرے سوال کا جواب بھی پہلے سوال کے جواب (کے اسلوب) کی طرح دیا تا کہ کلام میں نسق برقرار رہے۔

علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں بظاہر چاہئے تو یہ تھا کہ پہلے سوال کے جواب میں صرف **اذا ضیعت الامانۃ** پر اکتفاء فرماتے اور دوسرے سوال کے جواب "متی" ارشاد فرماتے۔ (یعنی صرف "متی وسد الامر" فرماتے۔) تا کہ جواب سوال کے مطابق ہوتا' لیکن حضور علیہ السلام نے پہلے سوال کے جواب میں "**فانتظر الساعۃ**" کی زیادت اس لئے فرمائی تا کہ یہ بات واضح ہو جائے کہ امانت کے ضائع ہونے کا وقت قیامت قائم ہونے کا وقت نہیں ہے بلکہ قیامت کی علامت میں سے ایک علامت ہے۔ لہذا "اذا" شرطیہ نہیں ہے اور دوسرے سوال کی تاویل یہ ہے (یعنی گویا اصل سوال یوں تھا): "**متی تضیع الامانۃ و کیف حصول التضیع**" اس کے جواب میں یہ فرمایا: "**اذا وسد الامر**" چنانچہ حضور علیہ السلام نے پہلے سوال کے جواب میں کلام کو طویل کیا تا کہ ایک زائد معنیٰ حاصل ہو جائے اور دوسرے سوال کے جواب کو بطور تفنن کے لئے اختصار کے ساتھ ذکر کیا کیونکہ کلام اس پر دلالت کر ہی رہا ہے۔

(ملا علی قاریؒ فرماتے ہیں) کہ اس تقریر سے یہ وہم ہوتا ہے کہ دوسرے سوال کے جواب میں "**فانتظر الساعۃ**" موجود نہیں ہے حالانکہ ایسا نہیں ہے بلکہ دونوں سوالوں کے جواب میں "**فانتظر الساعۃ**" موجود ہے تو ممکن ہے علامہ طیبیؒ کے پاس موجودہ نسخے میں دوسرے جواب میں یہ جملہ مذکور نہ ہو۔ واللہ اعلم

توضیح: جامع کے الفاظ یہ ہیں: "**اذا وسد الأمر الی غیر اھلہ فانتظر الساعۃ**، اس حدیث کو امام بخاری نے ابی ہریرہؓ سے روایت کیا ہے۔

۵۴۴۰ : وَعَنْهُ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا تَقُوْمُ السَّاعَةُ حَتّٰى يَكْثُرَ الْمَالُ وَيَفِيْضَ حَتّٰى يُخْرِجَ الرَّجُلُ زَكَاةَ مَالِهِ فَلَا يَجِدُ اَحَدًا يَقْبَلُهَا مِنْهُ وَحَتّٰى تَعُوْدَ اَرْضُ الْعَرَبِ مُرُوْجًا وَاَنْهَارًا (رواہ مسلم وفی روایۃ لہ) قَالَ تَبْلُغُ الْمَسَاكِنُ اِهَابَ اَوْ يِهَابَ۔

اخرجه البخاري في صحيحه ۸۱/۱۳حديث رقم ۷۱۲۰ومسلم في صحيحه ۷۰۱/۲حديث ۱۵۷/۲۰۔

ترجمہ:''حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:''قیامت کا قیام نہیں ہو گا حتی کہ مال و دولت کی ریل پیل ہو جائے گی اور ایسی فراوانی ہوگی کہ ایک شخص اپنے مال کی زکوۃ نکالے گا لیکن وہ کوئی ایسا آدمی نہیں پا سکے گا جو اس سے زکوۃ کے مال کو قبول کرلے (کیونکہ مال و دولت کی فراوانی کسی شخص کو محتاج اور ضرورت مند نہیں چھوڑے گی اور کوئی آدمی اس طرح کے مال لینے پر تیار نہیں ہوگا اور وقوع قیامت نہیں ہوگا) حتی کہ عرب کی سرزمین باغ و بہار اور نہروالی (یعنی بے حساب مال و دولت فراہم کرنے والی) بن جائے گی)۔
(مسلم) اور مسلم ہی کی ایک اور روایت میں یوں ہے کہ (قیامت کا قیام نہیں ہوگا حتی کہ) رہائشگاہوں اور آباد جگہوں کا سلسلہ اہاب یا یہاب تک پہنچ جائے گا''۔

تشریح:**قوله:لاتقوم الساعة حتى يكثر ......يقبلها منه**:

مال کی یہ فروانی آزمائش کے لئے ہوگی۔

''یفیض''اور''یکثر'' دونوں کی''یاء''مفتوح ہے اور یہ عطف تفسیری ہے۔یعنی مال کی فروانی اس طرح ہوگی، کہ ہر طرف مال پانی کی طرح بہتا ہوگا، تاکہ لوگ مکمل طور پر اس کی طرف مائل ہو جائیں۔لیکن یعنی مال کی کثرت اور حالات کی خرابی کی وجہ سے دوسروں کے مال میں قلت رغبت کی وجہ سے کوئی قبول نہیں کرے گا۔

یخرج:یاء کے ضمہ کے ساتھ ہے۔

قوله:وحتى تعود ارض العرب مروجاو انهارا:

تعود:بمعنی''تصير''یا''ترجع''ہے۔

مروج: میم کے ضمہ کے ساتھ بمعنی'' رياض ''یعنی درختوں، پودوں، پھول وں و پھلوں کی کثرت سے، جب تک ساری زمین باغات نہ بن جائے۔

نہایہ میں لکھا ہے: **المرج** کا معنی ہے ایسی کشادہ سرسبز زمین جس میں مویشیاں جس طرح چاہے مخلوط ہو کر چرتے ہوں. اھ۔

اس میں اشارہ ہے اس بات کی طرف جو بعض لوگوں نے کہی ہے کہ''دنیا بیوقوف لوگوں کیلئے اس لحاظ سے ایک باغ ہے کہ جس طرح جانور جو کہ آخرت سے غافل ہوتے ہیں باغ میں لاپرواہی کے ساتھ کھاتے پیتے ہیں، اسی طرح یہ بیوقوف لوگ بھی آخرت سے غافل ہو کر کھاتے پیتے ہیں۔

قوله:تبلغ المساكن اهاب أويهاب:

اهاب:اس لفظ کا ہمزہ مکسور اور''باء''مفتوح ہے۔اور''او''بیان نوع کے لئے ہے۔

يهاب:اسکی''یاء''مکسور ہے صفت''ازدواج''کے پیش نظر یہی (یاء کا مکسور ہونا) زیادہ مناسب ہے۔اور ایک صحیح نسخے

میں "یھاب" یاء کے ساتھ مذکور ہے۔" اھاب" اور" یھاب" مدینہ منورہ کے قریب دو جگہیں ہیں۔ اور"او" بیان نوع کیلئے ہے۔" البقعة" کی تاویل میں ہونے کی وجہ سے ان دونوں کو غیر منصرف پڑھا گیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ مدینہ منورہ اور اس کے اردگرد کی آبادی بہت بڑھ جائے گی۔

اور ایک شارح فرماتے ہیں کہ ایک ۔نسخے میں" یھاب" کی بجائے" نھاب" نون مکسورہ کے ساتھ ہے، اور اس کو"یاء" مکسورہ کے ساتھ بھی نقل کیا گیا ہے۔

امام نوویؒ فرماتے ہیں:" اھاب" کا ہمزہ مکسورہ ہے، اور" یھاب" کی یاء کو مفتوح اور مکسور دونوں طرح پڑھنا درست ہے۔ قاضی عیاضؒ نے شرح المشارق میں صرف یاء کے کسرہ ہی کا ذکر کیا ہے۔ اور قاضی عیاضؒ نے بعض حضرات سے" نھاب" نون کے ساتھ نقل کیا ہے، لیکن مشہور پہلی روایت ہے۔ اور" کتاب" میں مذکور ہے کہ" نھاب" بھی مدینہ منورہ کے قریب چند میل کے فاصلے پر واقع ایک جگہ ہے۔

علامہ تورپشتی رحمہ اللہ فرماتے ہیں مطلب یہ ہے کہ مدینہ کی آبادی بڑھ جائے گی، یہاں تک کہ اس آبادی کا سلسلہ" اھاب" تک پہنچ جائے گا، اور راوی کو یا تو شک ہے یا (راوی) دونوں جگہوں کا قائل ہے یا" او" کو تخییر کیلئے ذکر کیا ہے۔ میرکؒ نے" تصحیح" سے نقل کیا ہے۔ کہ" اھاب" کا ہمزہ مکسورہ ہے اور" بقعة" کی تاویل کی وجہ سے یہ غیر منصرف ہے اور 'یھاب" کی "یاء" مکسور ہے۔ قاضی عیاضؒ نے تو اسی طرح" یاء" کے کسرہ کے ساتھ ذکر کیا ہے، لیکن دوسروں نے" یاء" کے فتحہ کے ساتھ مقید کیا ہے۔ اور کہا گیا ہے، کہ" نھاب" نون کے ساتھ گویا کہ یہ تصحیف ہے، اور یہ شک راوی کی طرف سے ہے، اور قاموس میں لکھا ہے، کہ" الاھاب" بروزن کتاب بمعنی چمڑہ اور بروزن سحاب مدینہ منورہ کے قریب ایک جگہ کا نام ہے، اور (صاحب قاموس نے)" یھاب" کا ذکر اس میں نہیں کیا ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

۵۴۴۱ : وَعَنْ جَابِرٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَكُوْنُ فِي اٰخِرِ الزَّمَانِ خَلِيْفَةٌ يَقْسِمُ الْمَالَ وَلَا يَعُدُّهُ وَفِيْ رِوَايَةٍ قَالَ يَكُوْنُ فِي اٰخِرِ اُمَّتِيْ خَلِيْفَةٌ يَحْثِي الْمَالَ حَثْيًا وَلَا يَعُدُّهُ عَدًّا. (رواه مسلم)

اخرجه مسلم فی صحیحه ۲۲۳۵/٤ حدیث رقم (٦٩-٢٩١٤)۔

ترجمہ:" حضرت جابر رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: عالم دنیا کے آخری زمانہ میں ایک خلیفہ (یعنی عادل بادشاہ) پیدا ہوگا جو ضرورت مندوں، مستحقین کو خوب مال تقسیم کرے گا اور اس کو گن گن کر نہیں دے گا۔ یعنی لوگوں میں بے حساب مال و دولت لٹائے گا" اور ایک دوسری روایت میں یہ الفاظ ہیں کہ میری امت کے دور آخر میں ایک خلیفہ پیدا ہوگا جو لوگوں کو لپ بھر بھر کر (یعنی وافر مقدار میں) مال و دولت دے گا اور اس کو شمار نہیں کرے گا جیسا کہ شمار کیا جاتا ہے"۔ (مسلم)

تشریح: قوله: يكون فی آخر...... ولا يعده:

یکون: یہاں تامہ ہے بمعنیٰ ”یوجد“ ہے۔

یعد: یاء مفتوح، عین مضموم اور دال مشدد ہے۔ مطلب یہ ہے کہ بغیر حساب و کتاب کے تھوک کے حساب سے مال و دولت تقسیم کرے گا۔ ابن الملک ؒ فرماتے ہیں کہ یہ بھی احتمال ہے کہ ”یعدہ“ باب افعال ”الاعداد“ مصدر سے ماخوذ ہو، اس کا معنی ہے، کوئی چیز ذخیرہ کرنا۔ اس صورت میں مطلب یہ ہوگا کہ ”وہ خلیفہ دشمن کے مقابلے کیلئے مال جمع نہیں کرے گا، اور نہ اس کے پاس کوئی خزانہ ہوگا جیسا کہ انبیاء علیہم السلام کیا کرتے تھے۔ اور ایک شارح فرماتے ہیں کہ ”لا یعدہ“ ”یاء“ کے فتحہ اور عین کے ضمہ کے ساتھ بمعنیٰ ”لا یحصیہ“ ہے یا ”یاء“ کے ضمہ اور عین کے کسرہ کے ساتھ بمعنیٰ ”لا یدخرہ“ ہے۔ بعض نسخوں میں اسی طرح منقول ہے، لیکن اگلی عبارت: ”وفی روایۃ قال......الخ اس احتمال کو از روئے معنیٰ ومبنیٰ ضعیف قرار دے رہی ہے۔

قولہ: وفی روایۃ قال: یکون ......:

یحثی: یاء کے فتحہ اور ثاء کے کسرہ کے ساتھ۔

”حثیا: مفعول مطلق ہے، مبالغہ کیلئے ذکر کیا گیا ہے۔ ای حثیاً بلیغاً، پھر اس کو ”ولا یعدہ عدًا“ سے مزید مؤکد کیا۔ ”عدًا“ مصدر ہے یہ دلالت کرتا ہے کہ یہ فعل مضارع ثلاثی ہے، رباعی نہیں ہے۔

امام نووی ؒ فرماتے ہیں کہ یہ خلیفہ چلو بھر بھر کر مال اس لئے تقسیم کرے گا کہ اموال غنائم اور فتوحات کی کثرت ہوگی اور دوسری وجہ یہ کہ یہ خلیفہ سخی ہوگا۔

ابن الملک ؒ فرماتے ہیں: اس میں یہ راز ہے کہ اس خلیفہ کیلئے اللہ کی طرف سے زمین کے خزانے ظاہر کردیئے جائیں گے یا یہ خلیفہ کیمیاء جانتا ہوگا، یا اس خلیفہ کی یہ کرامت ہوگی کہ پتھر بھی اس کیلئے سونا بن جائے گا، جیسا کہ بعض اولیاء کے بارے میں منقول ہے۔

۵۴۴۲ : وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ یُوْشِكُ الْفُرَاتُ اَنْ یَّحْسُرَ عَنْ كَنْزٍ مِّنْ ذَهَبٍ فَمَنْ حَضَرَ فَلَا یَاْخُذْ مِنْهُ شَیْئًا . (متفق علیہ)

اخرجه البخاری فی صحیحه ۷۸/۱۳ حدیث رقم ۷۱۱۹ ومسلم فی صحیحه ۲۲۱۹/۴ حدیث رقم (۳۰-۲۸۹۴) وابو داؤد فی السنن ۴۹۳/۴ حدیث رقم ۴۳۱۳ والترمذی فی السنن ۶۰۲/۴ حدیث رقم ۲۵۶۹ وابن ماجه ۱۳۴۳/۲ حدیث رقم ۴۰۴۶۔

ترجمہ: ”حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ”عنقریب ایک ایسا وقت آئے گا جب دریائے فرات سونے کا خزانہ ظاہر کرے گا (یعنی اس کا پانی خشک ہو جائے گا اور اس کے اندر سے سونے کا خزانہ برآمد ہوگا) پس جو شخص اس وقت وہاں حاضر اس کو چاہئے کہ اس خزانہ میں سے کچھ نہ لے“۔ (بخاری ومسلم)

تشریح: قولہ: یوشك الفرات ان یحسر عن کنز من ذهب:

یحسر: سین کو مضموم اور مکسور دونوں طرح پڑھنا درست ہے۔ بمعنی **یکشف** ۔ چنانچہ نہایہ میں لکھا ہے کہا جاتا ہے:
"**حسرت العمامة عن رأسي حسرت ثوبي عن بدني**" **اى كشفتهما**
اور ایک شارحؒ فرماتے ہیں: **اى ان يظهر ويكشف نفسه عن كنز** ۔ اس میں اشارہ ہے کہ "**یحسر**" فعل متعدی ہے۔

خلخالیؒ جو مصابیح کے شراح میں سے ہیں، فرماتے ہیں: **اى سيظهر فرات عن نفسه كنزًا**، اس میں اشارہ ہے کہ کلام میں "قلب" ہے اور یہ کلام "**عرضت الناقة على الحوض**" کے قبیل سے ہے۔ قاموس میں لکھا ہے **حسره يحسره ويحسره كشفه وحسر الشى حسورا انكشف** ۔ لہٰذا یہ فعل متعدی اور لازم دونوں طرح استعمال ہوتا ہے اور لازم ہونے کی صورت میں کسی بھی تکلف کی ضرورت نہیں، اسلئے اولیٰ یہ ہے کہ اس کو لازم پر محمول کر لیا جائے۔ چنانچہ مطلب یہ ہوگا:
"**يقرب الفرات ان ينكشف انكشافا صادرا عن كنز عظيم**"

من ذهب: "ذهب" کی صفت "کثیر" مقدر ہے۔

قوله: فمن حضر فلاياخذ منه شيئًا:
چنانچہ غیر حاضر تو بدرجہ اولیٰ کچھ بھی نہ لے۔ اس لئے کہ اس خزانے میں سے کچھ لینے کی وجہ سے بہت زیادہ لڑائی جھگڑا اور قتل وقتال ہوگا۔

فلا ياخذ: یہ فعل نہی کا صیغہ ہے۔ اس میں اور یہ بھی احتمال ہے کہ "**فلا يأخذ**" مضارع منفی کا صیغہ ہو، اس کی تائید "**فلا يأخذون منه شيئا**" سے ہو رہی ہے۔

تخریج: اس حدیث کو ابوداؤد اور امام ترمذیؒ نے بھی نقل کیا ہے۔

۵۴۴۳ : وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا تَقُوْمُ السَّاعَةُ حَتّٰى يَحْسُرَ الْفُرَاتُ عَنْ جَبَلٍ مِّنْ ذَهَبٍ يَقْتَتِلُ النَّاسُ عَلَيْهِ فَيُقْتَلُ مِنْ كُلِّ مِائَةٍ تِسْعَةٌ وَّتِسْعُوْنَ وَيَقُوْلُ كُلُّ رَجُلٍ مِنْهُمْ لَعَلِّيْ اَكُوْنُ اَنَا الَّذِيْ اَنْجُوْ . (رواه مسلم)

اخرجه البخاری فی صحيحه ۷۸/۱۳حديث رقم ۷۱۱۹ومسلم فی صحيحه ۲۲۱۹/۴حديث رقم (۳۰-۲۸۹۴) وابو داؤد فی السنن ۴۹۳/۴حديث رقم ۴۳۱۳ والترمذی فی السنن ۶۰۲/۴حديث رقم ۲۵۶۹ وابن ماجه ۱۳۴۳/۲ حديث رقم ۴۰۴۶۔

ترجمہ: "حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: "قیامت کا قیام نہیں ہو گا حتی کہ دریائے فرات سونے کا پہاڑ برآمد کرے گا! لوگ اس کے حصول کی خاطر مرنے مارنے پر آجائیں گے، پس ان لوگوں میں سے ننانوے فیصد لوگ قتل کر دیے جائیں گے اور ہر شخص یہ کہے گا کہ شاید میں (زندہ بچ جاؤں اور اپنی مراد میں کامیابی سے ہمکنار ہو جاؤں، یعنی ہر شخص اس آرزو پر لڑے گا کہ شاید میرا مفاد و مقصد پورا ہو جائے اور

اس دولت پر قبضہ جمالوں چنانچہ ننانوے فیصد لوگ اس توقع میں اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھیں گے"۔ (مسلم)

تشریح: بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ ایک ہی قضیہ ہے مگر روایت متعدد الفاظ سے منقول ہے۔

عن جبل من ذهب: ای"عن كنز عظيم مقدار جبل من ذهب.

یہ بھی ہوسکتا ہے کہ یہ اور قضیہ ہو اور ''سونے کے پہاڑ'' سے سونے کی کان مراد ہو۔

قوله:لعلي اكون انا الذي أنجو:

علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں: یہ کلام "أنا الذی سمتنی أمی حیدرة" (میں وہ شخص ہوں کہ میری ماں نے میرا نام ''حیدر رکھا'' ہے۔) کی طرح ہے ای "أنا الذی ینجو "مبتدا کا لحاظ کرتے ہوئے' خبر کا مبتدا پر محمول کیا ہے' اسم موصول کی رعایت نہیں کی گئی۔اھ۔

یعنی ہر شخص اس امید پر لڑے گا کہ شاید میں زندہ بچ جاؤں چنانچہ وہ مال سمیٹنے کی امید پر باقیوں کو قتل کردے گا اس طرح اس غلط امید کے ساتھ اپنے اعمال کو ضائع کر بیٹھیں گے۔

علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں اس میں کنایہ ہے' کیونکہ اصل تو یہ تھا کہ یوں کہا جاتا: "أنا الذی افوز به" لیکن اس کی بجائے "انجو" فرمایا: اس لئے کہ جب قتل ہونے سے بچ جائے گا تو خود بخود تمام دولت کا تنہا مالک ہو جائے گا۔

۵۴۴۴: وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ تَقِيءُ الْاَرْضُ اَفْلَاذَ كَبِدِهَا اَمْثَالَ الْاُسْطُوَانِ مِنَ الذَّهَبِ وَالْفِضَّةِ فَيَجِيءُ الْقَاتِلُ فَيَقُوْلُ فِيْ هٰذَا قَتَلْتُ وَيَجِيءُ الْقَاطِعُ فَيَقُوْلُ فِيْ هٰذَا قَطَعْتُ رَحِمِيْ وَيَجِيءُ السَّارِقُ فَيَقُوْلُ فِيْ هٰذَا قُطِعَتْ يَدِيْ ثُمَّ يَدَعُوْنَهُ فَلَا يَاخُذُوْنَ مِنْهُ شَيْئًا. (رواه مسلم)

اخرجه مسلم فی صحیحه ۷۰۱/۲ حدیث رقم (۶۲-۱۰۱۳) والترمذی فی السنن ٤٢٧/٤ حدیث رقم ٢٢٠٨

ترجمہ: ''حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''(علامات قیامت میں سے ایک علامت یہ بھی ہے کہ) زمین اپنے جگر کے ٹکڑوں کو باہر پھینک دے گی جو سونے چاندی کے ستونوں کی طرح ہوں گے۔ پس جس آدمی نے محض مال حاصل کرنے کی خاطر قتل کا ارتکاب کیا ہوگا آئے گا اور (بطور افسوس کہے گا کہ (کیا) اسی کے لئے میں نے لوگوں کو قتل کیا ہے اور جس شخص اپنے اعزہ اقرباء کے ساتھ رشتے کو منقطع کیا ہو گا) آئے گا اور کہے گا کہ (کیا) میں نے اسی مال کی خاطر اپنے رشتہ داروں سے ناطہ توڑا ہے اور پھر چوری کا ارتکاب کرنے والا اور کہے گا کہ (کیا) اسی مال کے سبب میرا ہاتھ کاٹا گیا ہے (یعنی ان سب کے کہنے کی مراد یہ ہوگی کہ مال و دولت ایسی چیز ہے جس کی محبت میں اور جس کو حاصل کرنے کے لئے ہم نے ایسے ایسے گناہ کئے اور ایسی ایسی پریشانیوں سے دوچار ہوئے لیکن اب یہ مال و دولت ایسی صورت میں دکھائی دے رہا ہے کہ اس کی کوئی اہمیت نہیں رہ گئی ہے اور ہمیں اس کی کوئی حاجت و ضرورت محسوس نہیں ہوتی) چنانچہ وہ سب لوگ اس مال و دولت کو یوں

ہی چھوڑ دیں گے کہ کوئی بھی اس میں سے کچھ نہیں لے گا''۔ (مسلم)

تشریح: قوله:تقئ الارض ......من الذهب والفضة "تقيء" :"القيء" سے مضارع معروف کا صیغہ ہے

افلاذ : ہمزہ کے فتحہ کے ساتھ ،"فلذة" کی جمع ہے،'' فلذة'' کا معنی ہے کسی چیز کا وہ ٹکڑا جس کو لمبائی میں کاٹا گیا ہو۔ زمین کے اندر موجود خزانوں کو جگر کے ٹکڑوں سے تعبیر کیا' اور اونٹ کے پیٹ میں موجود جگر کے ساتھ تشبیہ دی' کیونکہ زمین کے خزانے زمین کے اندر موجودہ اشیاء میں سب سے پسندیدہ چیز ہیں، جیسا کہ اونٹ کا جگر اونٹ کے پیٹ میں موجودہ اعضاء میں سے عرب کے نزدیک سب سے زیادہ پسندیدہ چیز ہے۔ اور ہم نے'' پیٹ میں موجود'' کی تعبیر اس لئے اختیار کی کہ ابن عربی فرماتے ہیں: "فلذ"، صرف اونٹ کے جگر کو کہتے ہیں۔ لہٰذا مطلب یہ ہوا کہ زمین اپنے اندر کے خزانوں کو باہر نکال کر ظاہر کر دیگی۔

الاسطوان : ''ہمزہ'' اور'' طاء'' مضموم ہے اور ایک دوسرے نسخے میں الاسطوانة ہے، یہ واحد ہے اور الاسطوان جنس ہے' اور'' أمثال"، چونکہ جمع ہے اس لئے اس کے مناسب'' الاسطوان'' ہی ہے۔

من الذهب والفضة: من بیانیہ ہے اور یہ عبارت پچھلے اجمال کا بیان ہے۔

قاضی عیاضؒ فرماتے ہیں اس کا مطلب ہے کہ زمین اپنے اندر کے خزانوں کو باہر پھینک دے گی۔ اور کہا گیا ہے کہ زمین کے اندر جو معدنیاتی رگیں ہیں ان کو باہر پھینک دیگی۔ اور "أمثال الاسطوان" والی عبارت اس پر دلالت کرتی ہے زمین کے معدنیات کو"افلاذ الكبد"(جگر کے ٹکڑوں) کے ساتھ ہیئت وشکل میں تشبیہ دی ہے، چونکہ''الفلذة " جگر کے اُس ٹکڑے کو کہا جاتا ہے جس کو لمبائی میں کاٹا گیا ہو۔

میں (ملا علی قاریؒ) کہتا ہوں کہ ممکن ہے کہ حدیث میں اس ارشاد باری کی طرف اشارہ ہو:﴿اذا زلزلت الارض زلزالها واخرجت الأرض اثقالها﴾ [الزلزلة۔۱-۲]۔''جب زمین اپنی سخت جنبش سے ہلائی جاوے گی اور زمین اپنے بوجھ باہر نکال پھینکے گی۔''

قوله:فيجئ القاتل ......:

"قطعت" مجہول کا صیغہ ہے اگر اس لفظ کو معروف کے صیغہ کے ساتھ نقل کیا جاتا تو اس کی بھی توجیہ ہو سکتی ہے۔ یعنی یہ میرے ہاتھ کے کاٹے جانے کا سبب بنا؟

يدعونه: دال کے فتحہ کے ساتھ ہے۔

تخریج: امام ترمذیؒ نے بھی اسی طرح روایت کیا ہے۔

۵۴۴۵ : وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَالَّذِیْ نَفْسِیْ بِيَدِهٖ لَا تَذْهَبُ الدُّنْيَا حَتّٰى يَمُرَّ الرَّجُلُ عَلَى الْقَبْرِ فَيَتَمَرَّغُ عَلَيْهِ وَيَقُوْلُ يٰلَيْتَنِیْ كُنْتُ مَكَانَ صَاحِبِ هٰذَا الْقَبْرِ وَلَيْسَ بِهِ الدِّيْنُ اِلَّا الْبَلَاءُ۔ (رواه مسلم)

اخرجه مسلم في صحيحه ٢٢٣١/٤حديث رقم (٥٤-١٥٧) وابن ماجه في السنن ١٣٤٠/٢حديث رقم ٤٠٣٧

ترجمہ: ''حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے یہ دنیا اس وقت تک اختتام پذیر نہیں ہوگی جب تک کہ ایسا دور نہیں آجائے گا کہ کوئی شخص قبر کے پاس سے گزرے گا اور پھر لوٹ کر قبر پر آئے گا اور (حسرت سے) کہے گا کہ کاش! میں اس قبر والے کی جگہ ہوتا اور اس کی وجہ اس کا دین نہ ہوگا بلکہ فتنہ اور آزمائش کے سبب وہ یہ خواہش کرے گا''۔ (مسلم)

تشریح: قوله: والذي نفسي بيده ......فيتمرغ عليه:

''الرجل'' اور ''القبر'' میں الف لام جنس کیلئے لہٰذا یہ دونوں اسم نکرہ کی قوت میں ہیں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ الف لام استغراقیہ ہو، اور ہر شخص اس بات میں برابر ہو۔

يتمرغ عليه: ابن الملکؒ فرماتے ہیں: مطلب یہ ہے کہ قبر کے سرہانے سے چمٹا ہوگا اور مٹی میں لوٹ پوٹ ہوگا۔

قوله: ويقول: ياليتني كنت مكان صاحب ......:

الدين: دال کے کسرہ کے ساتھ ہے۔

یعنی اس شخص کو اس کا دین اس تمنا و آرزو پر نہیں اُبھارے گا، بلکہ دنیا کی آزمائش، مصائب، فتنوں کی کثرت اور دوسری تکالیف اس کو اس تمنا و آرزو پر اُبھاریں گی۔

مظہرؒ فرماتے ہیں: ''دین'' سے یہاں ''عادت'' مراد ہے، اور ''ليس به الدين الا البلاء'' یہ ''يتمرغ'' کی ضمیر سے حال ہے۔ یعنی ''قبر کے سرہانے لوٹ پوٹ ہوگا اور موت کی تمنا کرے گا، اس حال میں کہ یہ لوٹ پوٹ ہونا اس کی عادت نہ ہوگی، بلکہ زمانے کے مصائب کی وجہ سے اس طرح کر رہا ہوگا''۔

علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں یہ بھی درست ہے کہ ''دین'' کو حقیقی معنی پر محمول کیا جائے۔ اس صورت میں معنی یہ ہوگا، کہ اس شخص کا لوٹ پوٹ ہونا اور موت کی تمنا کرنا دین کے کسی فتنے کی وجہ سے نہ ہوگا، بلکہ دنیا کے کسی فتنے کی وجہ سے ہوگا۔

تخریج: اس حدیث کو ان الفاظ کے ساتھ صرف امام مسلم نے نقل کیا، البتہ الفاظ پر امام مسلم اور امام بخاری دونوں کا اتفاق ہے: ''لا تقوم الساعة حتى يمر الرجل بقبر الرجل فيقول: يا ليتني مكانه'' (كذا ذكره ميرك عن التصحيح) میں (ملا علی قاریؒ) کہتا ہوں جامع میں یہی الفاظ احمد اور شیخین کی طرف منسوب ہیں۔ ابو نعیم نے ابن مسعودؓ سے ایک حدیث نقل کی ہے۔ ''لا يخرج الدجال حتى لا يكون شيء احب الى المؤمن من خروج نفسه''

.نیز حضرت ابو ہریرہؓ سے ایک حدیث نقل کی ہے جس کے الفاظ یہ ہیں:

''يوشك ان يكون الموت احب الى المؤمن من الماء البارد يصب عليه العسل فيشربه''

.نیز حضرت ابوذرؓ سے منقول ہے:

"أتى يأتي على الناس زمان تمر الجنازة فيهم يقول الرجل: يا ليت أني مكانه"

اورابن سعدؒ نے ابوسلمہ بن عبدالرحمٰنؒ سے نقل کیا ہے، فرماتے ہیں کہ حضرت ابوہریرہؓ بیمار ہوئے تو میں ان کی عیادت کیلئے اُن کے پاس گیا، میں نے کہا: اے اللہ! ابوہریرہ کو شفا دے، اس پر حضرت ابوہریرہؓ نے فرمایا: اللهم لا ترجعها۔ پھر فرمانے لگے اے ابوسلمہ! عنقریب لوگوں پر ایسا زمانہ آئے گا جس میں لوگوں کو موت سونے سے زیادہ محبوب ہوگی اور اگر تم زندہ رہے تو عنقریب ایسا وقت آئے گا کہ ایک شخص قبر کے پاس سے گزرے گا تو کہے گا: کاش! کہ میں تیری جگہ ہوتا۔

۵۴۴۶ : وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا تَقُوْمُ السَّاعَةُ حَتّٰى تَخْرُجَ نَارٌ مِنْ اَرْضِ حِجَازٍ تُضِيْءُ اَعْنَاقَ الْاِبْلِ بِبُصْرٰى. (متفق عليه)

اخرجه البخاري في صحيحه ۷۸/۱۳ حديث رقم ۷۱۱۸ ومسلم في صحيحه ۲۲۷/٤ حديث رقم (٤٢-٢٩٠٢)

ترجمہ: ''حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''قیامت کا قیام نہیں ہوگا حتی کہ حجاز سے ایک آگ ظاہر ہوگی جو بصریٰ (شہر شام) کے اونٹوں کی گردنوں کو روشن کر دے گی''۔ (بخاری ومسلم)

تشریح: قوله: لاتقوم الساعة......

أرض الحجاز: حجاز سے مکہ، مدینہ اور اردگرد کے علاقے مراد ہیں۔

تضيء: تاء کے ضمہ کے ساتھ ہے۔

"اعناق" : "عنق" عین اور نون کے ضمہ کے ساتھ کی جمع ہے' مشہور عضو ہے۔ (گردن) اور بعض کا کہنا ہے کہ عنق عین اور نون کے فتحہ کے ساتھ' کی جمع ہے جس کا معنی ہے'' جماعت'' بصری باء کے ضمہ کے ساتھ) شام کے علاقہ حوران کا شہر ہے۔

امام نوویؒ فرماتے ہیں: روایت اسی طرح ہے کہ اعناق' تضیء'' کا مفعول بہ ہونے کی بناء پر منصوب ہے۔ کہا جاتا ہے: اضاء ت النار وأضاء ت غيرها.

اور'' بصری '' باء کے ضمہ کے ساتھ شام کا معروف شہر ہے۔ اس کے اور دمشق کے درمیان تین منزل کا فاصلہ ہے ہمارے زمانے میں مدینہ منورہ کے مشرقی جانب میں حرہ کی پچھلی جانب میں ۶۵۶ھ میں یہ آگ نمودار ہوئی تھی۔ یہ بہت تیز اور خطرناک آگ تھی۔ اہل شام اور دوسرے تمام شہروں کے لوگوں کو اس آگ کے بارے میں تواتر کے ساتھ معلوم ہے اور مجھے تو مدینہ کے اس شخص نے بتایا جو خود اس وقت وہاں موجود تھا۔

علامہ تورپشتی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس آگ کو اہل مدینہ اور مدینہ کے آس پاس رہنے والوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا' جس میں کوئی شک وشبہ نہیں، یہ آگ تقریباً پچاس دن تک جلتی رہی یہ آگ بھڑکتی اور زمین سے ان پتھروں کو اٹھا کر باہر پھینکتی جو آگ میں جل کر انگارہ کی طرح بن چکے ہوتے اور ایسا نقشہ پیش کرتی جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں جہنم کی آگ کے

بارے میں فرمایا ہے: ﴿اِنَّهَا تَرْمِيْ بِشَرَرٍ كَالْقَصْرِ كَاَنَّهٗ جِمٰلَتٌ صُفْرٌ﴾ [المرسلات۔۳۲۔۳۳] ''وہ انگارے برساوے گا جیسے بڑے بڑے محل جیسے کالے کالے اونٹ۔'' اور اس آگ کے نکلنے کی جگہ سے مدینہ منورہ کے صحراؤں میں اس طرح زرد رنگ کے مائع کا سیلاب بہتا جیسا کہ پیتل کو پگھلا دیا گیا ہو۔ یہ زرد رنگ کا مائع کچھ دیر بہہ کر منجمد ہو جاتا، اور ''خبث حدید'' کی طرح ہو جاتا۔

قاضی عیاضؒ فرماتے ہیں: اگر یہ اعتراض کیا جائے کہ اس حدیث میں مذکور آگ کو مدینہ منورہ سے نکلی ہوئی مذکورہ بالا آگ پر کیسے محمول کیا جا سکتا ہے، جبکہ اس سے اگلی حدیث میں منقول ہے کہ حضور علیہ السلام نے فرمایا:

"اول اشراط الساعة نار تحشر الناس۔"

''قیامت کی پہلی نشانی یہ ہے کہ آگ ظاہر ہوگی جو لوگوں کو جمع کرے گی''

اور ابھی تک وہ نشانی نہیں پائی گئی تو اس کا جواب یہ ہے کہ اس حدیث میں مطلقاً علامات مراد نہیں، بلکہ جو قیامت سے متصل وہ علامات مراد ہیں جو قیامت کے عنقریب قائم ہونے پر دلالت کرتی ہیں، کیونکہ قیامت کی علامات میں سے تو حضور علیہ السلام کی بعثت بھی ہے حالانکہ حضور علیہ السلام کی بعثت سے پہلے یہ آگ ظاہر نہیں ہوئی یا حدیث میں مذکور آگ سے لڑائیوں اور فتنوں کی آگ مراد ہے جیسا کہ تاتاریوں کا فتنہ جو مشرق سے مغرب تک پھیلا۔

توضیح: امام میرکؒ ''تصحیح'' سے نقل کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ امام حاکم نے یہ عجیب کام کیا کہ اس حدیث کو اپنی کتاب مستدرک میں نقل کیا ہے، اور اس کی سند یوں بیان کی ہے: رشد بن سعد عن عقبة عن الزهری عن ابن المسیب عن ابی هریره اور پوری روایت من وعن ذکر کی ہے۔ شیخین پر استدراک کیا ہے، حالانکہ روایت دونوں میں موجود ہے۔ اور اس سے زیادہ عجیب بات یہ ہے کہ رشد بن سعد کے طریق سے روایت نقل کی ہے، حالانکہ حفاظ حدیث کا رشد بن سعد کے ضعیف ہونے پر اتفاق ہے اھ۔

لیکن اس کا جواب پہلے گذر چکا ہے کہ انہوں نے صحیحین کی سند کے علاوہ دوسری سند ذکر کی ہے، چنانچہ یہ حدیث مستدرک ہی ہے۔ اور اس کی دلیل یہ ہے کہ یہ حدیث رشد کے طریق سے منقول ہے، اور ممکن ہے کہ رُشد، حاکمؒ کے نزدیک قوی ہو، یا ان کی اس حدیث کا متابع ہو یا شاہد ہو جس سے حدیث کا ضعف ختم ہو گیا ہو۔ مزید برآں بہت کم راوی ایسے ہیں کہ جن کے ضعف پر محدثین کا اجماع ہو۔ واللہ اعلم۔

۵۴۴۷ : وَعَنْ اَنَسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَوَّلُ اَشْرَاطِ السَّاعَةِ نَارٌ تَحْشُرُ النَّاسَ مِنَ الْمَشْرِقِ اِلَى الْمَغْرِبِ۔ (رواه البخاری)

اخرجه البخاری فی صحیحه ۷۸/۱۳ تعلیقا فی الباب ۲۴ باب خروج النار واحمد فی المسند ۱۰۸/۳

ترجمہ: ''حضرت انس رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''علامات قیامت میں سے پہلی نشانی وہ آگ ہوگی جو لوگوں کو مشرق سے مغرب کی جانب ہانک کر جمع کر دے گی''۔ (بخاری)

تشریح: قوله: اول اشراط الساعة ......:

نار: بھڑکنے والا شعلہ مراد ہے، یا ابھرتا ہوا فتنہ مراد ہے۔

تخریج: طیالسی نے حضرت انس ؓ سے یہ حدیث ان الفاظ کے ساتھ نقل کی ہے:

"اول شيء يحشر الناس نار تحشرهم من المشرق الى المغرب".

جامع میں اس طرح لکھا ہے، اور اس سے گذشتہ اشکال زائل ہو جاتا ہے۔

۵۴۴۸: عَنْ اَنَسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا تَقُوْمُ السَّاعَةُ حَتّٰى يَتَقَارَبَ الزَّمَانُ فَتَكُوْنَ السَّنَةُ كَالشَّهْرِ وَالشَّهْرُ كَالْجُمْعَةِ وَتَكُوْنُ الْجُمْعَةُ كَالْيَوْمِ وَيَكُوْنُ الْيَوْمُ كَالسَّاعَةِ وَتَكُوْنُ السَّاعَةُ كَالضَّرْمَةِ بِالنَّارِ۔ (رواه الترمذى)

اخرجه الترمذى فى السنن ٤/٤٩٠ حديث رقم ٢٣٣٢

ترجمہ: ''حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: قیامت کا وقوع نہیں ہو گا حتی کہ زمانہ قریب ہو جائے گا (مراد گردش زمانہ یعنی لیل ونہار کے آنے جانے کی رفتار میں تیزی آ جائے گی اور زمانہ کی تیز رفتاری اس کیفیت وحالت کے ساتھ ہو گی کہ) سال مہینہ کی مانند' مہینہ ہفتہ کی مانند ہو جائے گا اور ایک گھنٹہ اتنا مختصر معلوم ہو گا جیسے آگ چنگاری (گھاس کے تنکے پر) سلگ جاتی ہے (یعنی فوراً فٹ جل کر بجھ جاتی ہے)۔'' (ترمذی)

تشریح: قوله: لاتقوم الساعة يتقارب الزمان...... ويكون اليوم كا لساعة:

اس کے کئی مطلب ہو سکتے ہیں:

1. "الزمان" سے دنیا وآخرت کا زمانہ مراد ہے۔
2. ایک زمانے کے لوگ بُرائی میں دوسرے زمانے کے لوگوں کے قریب ہو جائیں گے۔
3. بُرائی کے حوالے سے بذاتِ خود زمانہ اس طرح مختصر ہو جائے گا کہ پہلا وقت آخری وقت کے مشابہ ہو جائے گا۔
4. دن اور رات مختصر ہو جائیں گے، اور اگلی عبارت سے یہی آخری مطلب زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے۔

فتكون: اس کو مرفوع ومنصوب دونوں طرح پڑھنا درست ہے' یہ بصیغۂ مؤنث کا صیغہ ہے بصیغۂ مذکر پڑھنا بھی درست ہے۔

علامہ تورپشتی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

ممکن ہے کہ اس کا مطلب یہ ہو کہ زمانے کی برکت ختم ہو جائے گی اور ہر جگہ وقت کا فائدہ ختم ہو جائے گا۔

یا مطلب یہ ہے کہ لوگوں کو تفکرات اور مصائب میں پھنس جانے اور بڑے بڑے فتنوں کی وجہ سے دل ودماغ کی پریشانی

کی وجہ سے اس بات کا احساس تک نہیں ہوگا۔ کہ دن اور رات کیسے اور کب گزر گئے۔

اگر کوئی یہ اعتراض کرے کہ عرب تو خوشی کو دن رات کے مختصر ہونے سے اور نا گواریوں کو دن اور رات کے طول سے تعبیر کرتے ہیں، تو اس کا جواب یہ ہے کہ عرب دن رات کے اختصار و طول سے جو معنی مراد لیتے ہیں وہ یہ معنی نہیں ہے جو یہاں مراد لیا گیا ہے، کیونکہ وہاں تو خوشی کی وجہ سے وقت کے طویل ہو جانے اور مصیبت کی وجہ سے وقت کے مختصر ہو جانے کی تمنا ہوتی ہے، لیکن یہاں یہ معنی مراد ہے کہ زمانے کے مصائب و پریشانیوں کی وجہ سے دن اور رات کے گزر جانے کا احساس ختم ہو جائے گا، اور وہ معنی بھی درست ہے۔

والشهر: "الشهر" کا عطف "السنة" پر ہے، اور تقدیر یہ ہے: **اى ويكون الشهر.**

الجمعة: میم کو مضموم و ساکن دونوں طرح پڑھنا درست ہے، اور جمعہ سے مراد ہفتہ ہے۔

تكون: مؤنث کے صیغہ کے ساتھ ہے۔ اور مرفوع و منصوب دونوں طرح پڑھنا جائز ہے۔ یہ "تصير" کے معنی میں ہے۔

قوله: وتكون الساعة كالضرمة بالنار:

الضرمة: ضاد مفتوح ہے، اور راء کو مفتوح و ساکن دونوں طرح پڑھنا درست ہے، یعنی گھڑی آگ کا شعلہ بھڑکنے اور بجھ جانے کی طرح جلدی سے گزر جائے گی۔ قاضی عیاضؒ فرماتے ہیں: **اى كزمان ايقاد الضرمة** (یعنی اتنی دیر کے برابر ہو جائے گا جتنی دیر میں ماچس کی تیلی یا کسی تنکے پر آگ کا شعلہ سلگ جاتا ہے) "**الضرمة**" سے مراد وہ چیز ہے جس کو شروع میں آگ لگائی جاتی ہے، مثلاً تیلی وغیرہ۔ قاموس میں لکھا ہے کہ "**الضرمة**" حرکت کے ساتھ ہے۔ آگے لکھتے ہیں: **السعفة أو لتسجة فى طرفها نار۔**

ازہار میں لکھا ہے: "**الضرمة**" ضاد کے فتحہ اور راء کے سکون کے ساتھ ہے۔ اس کا معنی ہے کھجور کی ٹہنی یا "شیخ" نائی گھاس......:

چنانچہ "**الساعة**" سے مراد لغوی ساعت ہے اور لغت میں "**الساعة**" سے مراد وہ ادنیٰ لمحہ و لحظہ و طرفہ ہے جس پر زمانے کا اطلاق ہو سکتا ہو۔

علامہ خطابیؒ فرماتے ہیں: زمانے کی یہ تیز رفتاری امام مہدی علیہ السلام کے زمانے میں ہوگی، یا حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے نزول کے زمانے میں ہوگی یا دونوں کے زمانوں میں ہوگی۔ ملا علی قاریؒ فرماتے ہیں: یہ آخری بات زیادہ مناسب ہے، کیونکہ مذکورہ بالا حالت خروج دجال کے زمانے میں ہوگی اور دجال دونوں کے زمانے میں ہوگا۔

اگر کوئی یہ اعتراض کرے کہ جب سال مہینہ کے برابر، مہینہ ہفتہ کے برابر، ہفتہ ایک دن کے برابر، دن ایک ساعت اور گھنٹہ چنگاری کی طرح ہو جائے گا۔ تو "**يتقارب الزمان**" کی کیا توجیہ ہوگی اور کیا معنی ہوگا؟

اس کا جواب یہ ہے کہ سال مہینوں، ہفتوں، دنوں اور گھنٹوں پر مشتمل ہوتا ہے، چنانچہ ایک سال میں بارہ ۱۲/ مہینے، اڑتالیس ۴۸/

ہفتے، تین سو ساٹھ/۳۶۰ دن اور چار ہزار تین سو بیس/۴۳۲۰ گھنٹے ہوتے ہیں، چنانچہ جب سال مہینے کے برابر ہو جائے گا، تو سال کے ہفتے ایک مہینہ کے ہفتوں کے برابر یعنی چار ہفتوں کے برابر ہو جائیں گے، اور سال کے دن مہینہ کے دنوں کے برابر یعنی تیس دنوں کے برابر ہو جائیں گے، اور سال کے گھنٹے مہینہ کے گھنٹوں کے برابر یعنی تین سو ساٹھ/۳۶۰ گھنٹوں کے برابر ہو جائیں گے، اور ہر گھنٹہ بغیر کسی کمی بیشی کے سال کے اعتبار سے اتنا ہوگا جتنا کہ دن کا بارھواں جزء ہوتا ہے، ہاں آگ کے سلگنے کے وقت میں کمی زیادتی ہو سکتی ہے، اس لئے کہ شرعاً اور عرفاً آگ کے سلگنے کی دیر کا اندازہ مقرر نہیں اور خود اپنی آنکھوں سے دیکھنے والا بھی اس کا اندازہ نہیں لگا سکتا۔ اس لئے حضور علیہ السلام نے "یتقارب الزمان" فرمایا' یہ نہیں فرمایا کہ " یتساوی الزمان"۔ اھ۔

اس حدیث کی مزید تحقیق اور اس سے متعلقہ ہر زمانے میں نمازوں کی ادائیگی کے مسئلہ کی وضاحت آئندہ باب میں حضرت نواس ؓ کی حدیث میں آجائے گی۔

۵۴۴۹ : وَعَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ حَوَالَةَ قَالَ بَعَثَنَا رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لِنَغْنَمَ عَلٰى اَقْدَامِنَا فَرَجَعْنَا فَلَمْ نَغْنَمْ شَيْئًا وَعَرَفَ الْجَهْدَ فِيْ وُجُوْهِنَا فَقَامَ فِيْنَا فَقَالَ اَللّٰهُمَّ لَا تَكِلْهُمْ اِلَيَّ فَاَضْعُفَ عَنْهُمْ وَلَا تَكِلْهُمْ اِلٰى اَنْفُسِهِمْ فَيَعْجِزُوْا عَنْهَا وَلَا تَكِلْهُمْ اِلَى النَّاسِ فَيَسْتَاْثِرُوْا عَلَيْهِمْ ثُمَّ وَضَعَ يَدَهٗ عَلٰى رَاْسِيْ ثُمَّ قَالَ يَا ابْنَ حَوَالَةَ اِذَا رَاَيْتَ الْخِلَافَةَ قَدْ نَزَلَتِ الْاَرْضَ الْمُقَدَّسَةَ فَقَدْ دَنَتِ الزَّلَازِلُ وَالْبَلَابِلُ وَالْاُمُوْرُ الْعِظَامُ وَالسَّاعَةُ يَوْمَئِذٍ اَقْرَبُ مِنَ النَّاسِ مِنْ يَدِيْ هٰذِهٖ اِلٰى رَاْسِكَ .

اخرجه ابو داوٗد فی السنن ۳/ ٤١ حديث رقم ۲٥۳٥

ترجمہ: "حضرت عبداللہ بن حوالہ رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا کہ (ایک دفعہ) رسول اللہ ﷺ نے ہمیں جہاد کرنے کے لئے روانہ فرمایا تا کہ ہم مال غنیمت حاصل کر سکیں (اور اپنی معاشی ضروریات کو پورا کر لیں) ہمارا وہ سفر پیدل تھا اور (جب) ہم اس جہاد سے لوٹے چنانچہ حضور ﷺ ہمارے چہروں پر اداسی اور مایوسی کے آثار محسوس کر کے کہ ہمیں تسلی دینے اور ہمارے حق میں دعا فرمانے کے لئے ہمارے درمیان کھڑے ہوئے اور (بطور دعا) فرمایا کہ "پروردگار! ان لوگوں کو میرے سپرد نہ فرما' ایسا نہ ہو کہ میں ان کی خبر گیری کی استطاعت نہ رکھوں۔ نہ ان کو خود ان کے حوالے فرما کیونکہ یہ اپنے معاملات کی ذمہ داری اٹھانے سے عاجز ہوں گے اور نہ ان کو دوسرے لوگوں کے حوالہ فرما یعنی دوسروں کا محتاج نہ بنا کیونکہ لوگ ان کی حاجتوں اور ضروتوں پر اپنی حاجتوں اور ضرورتوں کو مقدم رکھیں گے"۔ (حضرت عبداللہ بن حوالہ ؓ کا بیان ہے کہ) اس کے بعد رسول اللہ ﷺ نے اپنا دست اقدس میرے سر پر رکھا اور فرمایا "اے ابن حوالہ (جب تم دیکھو کہ خلافت مقدس سرزمین یعنی شام میں پہنچ چکی ہے (یعنی مسلمانوں کا دارالخلافہ مدینہ شام کی بجائے ملک شام بن گیا ہے) تو سمجھ لینا کہ زلزلے عموم' اور وہ بڑے بڑے حادثے کہ جن کا تعلق قیامت سے ہے قریب آ پہنچے ہیں اور اس وقت قیامت لوگوں سے اس قدر ہوگی جتنا میرا ہاتھ تمہارے سر کے قریب ہے"۔

راویٔ حدیث:

عبداللہ بن حوالۃ۔ یہ عبداللہ بن حوالہ ''ازدی'' ہیں ''شام'' میں ٹھہرے۔ ان سے جبیر بن نفیر رضی اللہ عنہ وغیرہ روایت کرتے ہیں۔ ۸۰ھ میں شام میں انتقال کیا۔ ''حوالہ'' میں حائے مہملہ مفتوح اور واؤ غیر مشدد ہے۔

تشریح: قوله: بعثنا رسول الله ﷺ ...... في وجوهنا:

على أقدامنا: (متعلق محذوف ہے) ای: "ما شين على اقدامنا" "بعثنا" کی ضمیر سے حال ہے ای "بعثنا رجالاً غير ركاب (ہمیں اس حال میں بھیجا کہ ہم پیدل جا رہے تھے سوار نہیں تھے)۔

فرجعنا: (حال مقدر ہے) ای فرجعنا سالمين مامونين.

الجهد: ''جیم'' مفتوح ہے اور ایک نسخے میں مضموم ہے۔ قاموس میں لکھا ہے: الجهد: جیم کے فتحہ کے ساتھ بمعنیٰ ''طاقت'' اور جیم کے ضمہ کے ساتھ بمعنیٰ ''مشقت'' ہے۔

ابن الملکؒ فرماتے ہیں کہ ''الجهد'' جیم کے فتحہ کے ساتھ بمعنیٰ ''مشقت'' ہے اور ضمہ کے ساتھ بمعنیٰ ''طاقت'' ہے میں کہتا ہوں بظاہر یہ دو لغات ہیں۔ اور اس سے ''مشقت'' مراد ہے۔ ایک شارحؒ نے جیم کے فتحہ کی تصریح کی ہے۔ اور سید صاحبؒ نے اپنی اصل میں ''جیم'' کے فتحہ ہی پر اکتفاء کیا ہے۔ ای "عرف مشقة ألم فقد الغنيمة" (یعنی آپؐ غنیمت حاصل نہ ہونے کی اداسی کو سمجھ گئے۔)

قوله: فقام فينا فقال: ...... فيستأثروا عليهم:

فقام: (حال مقدر ہے) "قام خطيباً".

فينا: (في "اجل" کے معنیٰ میں ہے یا ظرفیہ ہے) ای "لأ جلنا"، او فيما بيننا ـ

لا تكلهم: "الوكول" مصدر سے ماخوذ ہے۔

الى: (مضاف محذوف ہے) ای "الى امرى"

فاضعف عنهم: جواب نہی ہونے کی وجہ سے منصوب ہے، اور وجہ یہ ہے کہ انسان کو کمزور و عاجز پیدا کیا گیا، اور مخلوق تو عاجز ہے، تو دوسرے کے حوالے سے کیوں عاجز نہ ہو، اور اسی وجہ سے حضور علیہ السلام سے دعا میں منقول ہے:

"اللهم لا تكلني الى نفسي طرفة عين ولا اقل من ذالك فانك ان تكلني الى نفسي تكلني الى ضعف وعورة وذنب وخطيئة وانى لا اثق الا برحمتك"

اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿قُل لَّآ أَمْلِكُ لِنَفْسِي ضَرًّا وَلَا نَفْعًا إِلَّا مَا شَآءَ ٱللَّهُ﴾ [يونس: ٤٩]

''آپ فرمادیجئے کہ میں (خود) اپنی ذات خاص کے لئے تو کسی نفع (کے حاصل کرنے) کا اور کسی ضرر (کے دفع کرنے) کا اختیار رکھتا ہی نہیں مگر جتنا (اختیار) اللہ کو منظور ہو۔''

اور توحید کامل کا یہی وہ سبق ہے جو "لا حول و لا قوۃ الا باللہ" میں دیا گیا ہے۔

ابن عدیؒ نے اپنی کتاب "الکامل" میں ایک حدیث نقل کی ہے:

"حضرت الیاس اور حضرت خضر علیہما السلام ہر سال موسم حج میں ایک دوسرے سے ملتے ہیں اور دونوں ایک دوسرے کے سر کے بالوں کو حلق کرتے ہیں اور پھر یہ کلمات کہتے ہوئے ایک دوسرے سے جدا ہوتے ہیں:

"بسم اللہ ما شاء' لا یسوق الخیر الا اللہ ما شاء اللہ' لا یصرف السوء الا اللہ ما شاء اللہ ما کان من نعمۃ فمن اللہ ما شاء اللہ لا حول و لا قوۃ الا با للہ".

چونکہ حضور علیہ السلام کی ذات اقدس کو اللہ تعالیٰ کے ہاں سب سے زیادہ قرب حاصل تھا، اس لئے آپ نے ان لوگوں کی ذمہ داری نہ سونپے جانے کی دعا سب سے پہلے اپنے متعلق کی (اپنی عاجزی کا اظہار سب سے پہلے کیا۔ مترجم)

فیعجزوا: جیم کو مفتوح و مکسور دونوں طرح پڑھنا درست ہے۔ قاموس میں لکھا ہے کہ عجز باب سمع وضرب دونوں سے آتا ہے۔

حضور ﷺ نے دعا میں اُن صحابہ کو اپنی ذاتِ اقدس سے مؤخر فرمایا' اس میں اس ارشاد باری تعالیٰ کی طرف اشارہ ہے:

﴿اَلنَّبِيُّ اَوْلٰى بِالْمُؤْمِنِيْنَ مِنْ اَنْفُسِهِمْ﴾ [الاحزاب:٦] "نبی مؤمنوں کے ساتھ خود ان کے نفس سے بھی زیادہ تعلق رکھتے ہیں۔"

ولا تکلھم الی الناس:

"الناس" سے مخلوق مراد ہے، لیکن اُنس کی وجہ سے بطور خاص "الناس" کا ذکر کیا۔

فیستاثروا علیھم: "فیعجزوا" سے عدول کرتے ہوئے "فیستاثروا" فرمایا تا کہ اشارہ ہو کہ وہ دوسرے لوگ اپنا عجز ظاہر کرنے پر اکتفاء نہیں کریں گے، بلکہ اپنے لئے اچھی چیز کا انتخاب کریں گے، اور دوسروں کو ردی اور بیکار چیزیں دیں گے، چنانچہ اس میں امت کو شہود کی تعلیم دی ہے، کہ اور مخلوق کی طرف توجہ نہ کریں، اور اپنی تمام ضروریات اللہ کے سپرد کر کے اللہ ہی پر اعتماد کریں، کیونکہ جو شخص صرف اللہ پر بھروسہ کرتا ہے اللہ تعالیٰ اس شخص کیلئے دنیا و آخرت دونوں کے کاموں میں کفایت کرتا ہے، جیسا کہ خود اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿وَمَنْ يَّتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ فَهُوَ حَسْبُهٗ﴾ [الطلاق:٣] "اور جو شخص اللہ پر توکل کرلے گا تو اللہ تعالیٰ اس (کی اصلاح مہمات) کے لئے کافی ہے"۔

علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں: کہ مطلب یہ ہے کہ اے اللہ! ان لوگوں کو میرے سپرد نہ کر ایسا نہ ہو کہ میں کمزور پڑ جاؤں اور ان کے کاموں کی کفایت نہ کر سکوں اور ان کو خود ان کے سپرد بھی نہ فرما، کیونکہ نفس کی شہوات اور شرور کی وجہ سے اپنے امور کی صحیح طرح نگرانی نہیں کر سکیں گے، اور نہ ان کو دوسروں کے حوالے فرما وہ لوگ اپنے آپ کو مقدم رکھیں گے، اور ان کو پیچھے رکھیں گے اور ان کے حقوق ضائع ہو جائیں گے، بلکہ اے اللہ! یہ تیرے بندے ہیں ان کے ساتھ اس طرح معاملہ فرما جس طرح آقا اپنے

غلاموں کے ساتھ کرتے ہیں۔

قوله:ثم وضع يده على رأسي:

سر پر ہاتھ رکھنے کی حکمت عنقریب آئے گی، مزید یہ کہ اس میں برکت بھی ہے، یہ بھی ہوسکتا ہے کہ بات ختم ہونے تک حضور علیہ السلام کا دست اقدس عبداللہ بن حوالہؓ کے سر پر رکھا رہا ہو، اور یہ بھی ممکن ہے کہ ہاتھ رکھ کر پھر اُٹھا لیا ہو۔

قوله:اذارأيت الخلافة قد نزلت الأرض ......:

خلافت سے مراد خلافت نبوت ہے جیسا کہ بنواُمیہ کے زمانہ خلافت میں ہوا۔

الزلازل: (مضاف محذوف ہے) ای"وقوع الزلازل" یہ زلزے قیامت کے اُس خطرناک زلزلہ کیلئے مقدمات اور ہونگے جس کی خبر اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں دی ہے:﴿اذا زلزلت الأرض زلزالها﴾[الزلزلة:١] "جب (زمین اپنی سخت جنبش سے ہلائی جاوے گی"۔"الزلزلة" بمعنی"الحركة"اور"زلزال"مصدر ہے۔

البلابل: "بلبلة" کی جمع ہے۔نہایہ میں لکھا ہے:اس کا معنی ہے غم،صدمہ،رنج اور"بلبلة الصدر"کا معنی ہے سینے کا وسوسہ۔

هذه: اس کا مشار الیہ"الموضوعة على رأسك"ہے۔

قوله:ورواه......:

مشکوۃ کے اصل نسخہ میں لفظ"رواه"کے بعد خالی جگہ ہے، لیکن جزریؒ نے حاشیہ میں اس عبارت کا الحاق کیا ہے:"ابو داؤد واسناده حسن ورواه الحاكم في صحيحه"۔

اور ایک نسخہ میں خالی جگہ میں یہ عبارت ملحق ہے:"رواه ابو داؤد والحاكم"۔

٥٤٥٠ : وَعَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذَا اتُّخِذَ الْفَيْءُ دِوَلًا وَالْاَمَانَةُ مَغْنَمًا وَالزَّكٰوةُ مَغْرَمًا وَتُعُلِّمَ لِغَيْرِ الدِّيْنِ وَاَطَاعَ الرَّجُلُ اِمْرَاَتَهُ وَعَقَّ اُمَّهُ وَاَدْنٰى صَدِيْقَهُ وَاَقْصٰى اَبَاهُ وَظَهَرَتِ الْاَصْوَاتُ فِي الْمَسَاجِدِ وَسَادَ الْقَبِيْلَةَ فَاسِقُهُمْ وَكَانَ زَعِيْمُ الْقَوْمِ اَرْذَلَهُمْ وَاُكْرِمَ الرَّجُلُ مَخَافَةَ شَرِّهٖ وَظَهَرَتِ الْقَيْنَاتُ وَالْمَعَازِفُ وَشُرِبَتِ الْخُمُوْرُ وَلَعَنَ اٰخِرُ هٰذِهِ الْاُمَّةِ اَوَّلَهَا فَارْتَقِبُوْا عِنْدَ ذٰلِكَ رِيْحًا حَمْرَاءَ وَزَلْزَلَةً وَخَسْفًا وَمَسْخًا وَقَذْفًا وَاٰيَاتٍ تَتَابَعُ كَنِظَامٍ قُطِعَ سِلْكُهٗ فَتَتَابَعَ . (رواه الترمذي)

اخرجه الترمذي في السنن ٤/٤٢٨ حديث رقم ٢٢١١

ترجمہ: "حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: جب مال غنیمت کو دولت قرار دیدیا جائے اور جب زکوٰۃ کو تاوان سمجھا جانے لگے اور جب علم کو غرض دینی چھوڑ کر کسی اور مفاد و مقصد

کے تحت حاصل کیا جانے لگے اور جب مرد اپنی بیوی کا تابعدار اور اپنی والدہ کا نافرمان بن جائے اور آدمی اپنے کو قریب اور اپنے والد کو دور کرنے لگے اور جب مساجد میں آوازیں بلند ہونے لگیں اور جب قوم و جماعت کے سربراہ‘ اس قوم و جماعت کے فاسق لوگ بن جائیں اور جب قوم و جماعت کے زعیم و سربراہ اس قوم و جماعت کے کمینہ و رذیل شخص ہونے لگیں اور جب آدمی کی تعظیم اس کے شر اور فتنہ کے اندیشہ کے باعث جانے لگے اور جب لوگوں میں گانے والیوں اور ساز و باجوں کا رواج ہو جائے اور جب شرابیں پی جانے لگیں اور جب اس امت کے پچھلے لوگ آئندہ لوگوں کو برا کہنے لگیں اور ان پر لعنت بھیجنے لگیں تو اس وقت تم ان چیزوں کے جلدی ظاہر ہونے کا انتظار کرو سرخ یعنی تیز و تند اور شدید ترین طوفانی آندھی کا‘ زلزلہ کا‘ زمین میں دھنس جانے کا‘ صورتوں کے مسخ و تبدیل ہو جانے کا اور پتھروں کے برسنے کا‘ نیز ان چیزوں کے علاوہ قیامت اور ان علامات کا انتظار کرو‘ جو اس طرح پے مسلسل رونما ہوں گی جیسے ہار کی لڑی ٹوٹ جائے اور اس کے (پروے ہوئے) دانے لگا تار گرنے لگتے ہیں۔ (ترمذی)

تشریح: قوله: اذا اتخذالفی ‘دولا:

اتخذ: فعل مجہول کا صیغہ ہے۔ بمعنی ’’اخذ‘‘۔

دولا: دال کے کسرہ وضمہ اور واؤ کے فتحہ کے ساتھ’’ دولة‘‘ دال کے ضمہ یا فتحہ کے ساتھ کی جمع ہے اس کا معنی ہے’’ لینے دینے میں غلبہ‘‘۔ قاموس میں لکھا ہے:’’ الدولة ‘‘ کا معنی ہے انقلاب الزمان والعقبة فی المآل ویضم، او الضم فیه والفتح فی الحرب، او هما سواء او الضم فی الآخرة والفتح فی الدنیا الجمع دول مثلثة.

ابن الملکؒ کی شرح میں لکھا ہے: ازہریؒ فرماتے ہیں،’’ الدولة‘‘ دال کے ضمہ کے ساتھ۔ حاصل شدہ مال یعنی مالِ غنیمت کو کہا جاتا ہے، ،اور’’ الدولة‘‘ دال کے فتحہ کے ساتھ تنگی اور پریشانی کی حالت سے فراخی اور راحت کی طرف منتقل ہونا۔

علامہ تورپشتی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: مطلب یہ ہے کہ جب مالدار اور عہدوں والے اپنے آپ کو فقراء کے حقوق پر ترجیح دیں گے (حق تلفی کر کے مالِ غنیمت کو ذاتی دولت کی طرح استعمال کریں گے) یا مطلب یہ کہ غنیمت کا مال زبردستی چھین لیا کریں گے، جیسا کہ اہل جاہلیت اور ظالموں کا شیوہ رہا ہے۔

قوله: والأمانة مغنما والزكوة مغرما:

یعنی لوگوں کی امانتوں میں خیانت کریں گے اُن کو اپنا ذاتی حق سمجھ کر اس طرح استعمال کریں گے جیسا کہ مالِ غنیمت کو اپنا حق سمجھ کر لیتے ہیں۔ اور زکوۃ کا اداء کرنا لوگوں پر شاق ہو گا حتی کہ اس کو غرامت کریں گے۔ (یعنی جیسے کوئی شخص ان سے جرمانہ وصول کرے تو جرمانہ کی ادائیگی بھاری معلوم ہوتی ہے۔)

قوله: وتعلم لغير الدين:

وتعلم: باب تفعل سے مجہول کا صیغہ ہے۔

لغير الدين: علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں کہ جامع ترمذیؒ اور جامع الاصول میں لفظ ’’الدین‘‘ الف لام کے ساتھ اسی طرح

مذکور ہے، جبکہ مصابیح کے ایک نسخہ میں الف لام کے بغیر مذکور ہے البتہ لفظ اور معنی کے اعتبار سے پہلا ضبط اولیٰ ہے۔ اور مطلب یہ ہے کہ لوگ مال و دولت اور عزت و جاہ کیلئے علم دین سیکھیں گے۔ غلبۂ اسلام کی خاطر دین اور دینی احکام کو مسلمانوں میں پھیلانے کیلئے نہیں سیکھیں گے۔

قوله: واطاع الرجل امرأته وعق امه:

یعنی بیوی اللہ کے حکم کے خلاف جو مطالبات کرے گی، خاوند اس کی اطاعت کرے۔ والدہ جب کسی کام کا حکم دے گی یا کسی کام سے روکے گی تو اس کی نافرمانی کریگا۔ یہ دونوں جملے زمانے کے انقلاب پر دلالت کرتے ہیں، کیونکہ معاملہ برعکس ہو جائے گا، جیسا کہ آئندہ جملوں میں بیان ہوا ہے۔

قوله: وأدنى صديقه واقصى اباهٔ:

اپنے دوست اجنبی کو قریب کرے گا' اور اپنے رشتہ داروں میں سے سب سے زیادہ قریبی رشتہ دار کو اپنے سے دور کر دے گا، حالانکہ شفقت کرنے والوں میں سے سب سے زیادہ مشفق والد ہی ہے۔

ابن الملکؒ فرماتے ہیں: اگرچہ ماں باپ دونوں کی نافرمانی کرنا کبیرہ گناہ ہے، لیکن والدہ کی نافرمانی کا بطور خاص ذکر تاکید کیلئے کیا ہے' یا "أقصى أباه" بمنزلہ "عق أباه" ہے، اس طرح دونوں کی نافرمانی کا ذکر ہو گیا۔

میں (ملا علی قاریؒ) کہتا ہوں کہ اس میں تفنن اور سجع ہے' نیز "عق" کے مقابلہ میں "أقطى" میں مبالغہ ہے۔ علاوہ ازیں والد کی نافرمانی سے والدہ کی نافرمانی بطریق اولیٰ معلوم ہو ہے۔

علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں: "ادنى صديقه واقصى اباه' یہ "اطاع الرجل وعق امه" کے مقابلے میں ہے، اول میں ناجائز ہے، کیونکہ صرف دوست کو قریب کرنا تو اچھی بات ہے، بخلاف ثانی کے' چونکہ افراد جمع دونوں ناجائز ہیں۔ (یعنی مرد کا بیوی کی اطاعت کرنا، خواہ والدہ کا فرماں بردار ہو یا نہ ہو)

ملا علی قاریؒ فرماتے ہیں کہ یہ محل نظر ہے، کیونکہ مباح امور میں بیوی اور والدہ کی اطاعت کرنا مستحب ہے، اور گناہ کے کاموں میں ممنوع ہے۔

امام طیبیؒ کی بات میں غرابت اس وجہ سے ہے کہ ان کی بیان کردہ تفصیل کی صورت میں بالعکس لازم آتا ہے، اسی طرح سے پہلے دونوں میں ہے، چونکہ بہر حال یہ متصور تو ہو سکتا ہے کہ کوئی شخص صالح دوست کو قریب کرے اور صالح باپ کو دور کرے۔

ہماری اس تشریح کی تائید ان کی اس بات سے بھی ہوتی ہے: "بیوی کی جانب کو والدہ کی جانب پر ترجیح اس لئے دی کہ بیوی محل شہوت ہے اور والدہ اللہ کی رضا کا سبب ہے۔"

بطور خاص والدہ کا ذکر اس لئے کیا کہ ماں کا حق زیادہ ہے' اور دوسری وجہ یہ کہ بچے کی تربیت میں والدہ زیادہ مشقت تکلیف برداشت کرتی ہے، اس لئے والدہ کی نافرمانی والد کی نافرمانی سے زیادہ قبیح فعل ہے۔

اور "ادنى صديقه" کا مطلب ہے کہ اپنی مجالست اور جی بہلانے کیلئے دوست کو قریب کرے گا اور "أقصى اباه' کا

مطلب یہ کہ ہے، والد کو دور رکھتا ہے، ان کے ساتھ اٹھتا بیٹھتا نہیں، اور ان کے ساتھ موانست نہیں کرتا۔

قولہ: وظهرت الأصوات في المساجد:

(مضاف محذوف ہے) ای: "ظهر رفع الأصوات".

یہ مسئلہ ہمارے اس زمانے میں بہت زیادہ ہے۔ علماء کرام نے اس بات کی تصریح کی ہے کہ مسجد میں آواز بلند کرنا حرام ہے، خواہ ذکر ہی کیوں نہ ہو۔

قولہ: وساد القبيلة فاسقهم وكان زعيم لقوم ارذلهم:

وساد القبيلة: "قبیلہ" کے حکم میں شہر اور محلّہ بھی داخل ہے۔

اور وہ فاسق ظالم تو بطریق اولیٰ ہونگے اور ہمارے زمانے میں ان کی بھی کثرت ہے اور ظاہر یہ ہے کہ ان اُمور کی کثرت قیامت کی علامت ہے' ورنہ تو کوئی وقت بھی ایسا نہیں گزرا جس میں یہ امور پائے نہ گئے ہوں۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿وَكَذَٰلِكَ جَعَلْنَا فِي كُلِّ قَرْيَةٍ أَكَابِرَ مُجْرِمِيهَا لِيَمْكُرُوا فِيهَا﴾ [الانعام: ۱۲۳] "اور اسی طرح ہم نے ہر بستی میں وہاں رئیسوں ہی کو جرائم کا مرتکب بنایا تاکہ وہ لوگ وہاں شرارتیں کریں۔"

أرذل: یعنی سب سے زیادہ بخیل شخص، یا حسب ونسب کے اعتبار سے سب زیادہ گھٹیا شخص۔

علامہ سیوطیؒ فرماتے ہیں: "زعیم القوم" کا مطلب ہے قوم کا سردار،

قاموس میں لکھا ہے: الزعیم: کفیل' ضامن' سید القوم قوم کا سردار' قوم کی طرف سے بات کرنے والا۔

یاد رہے کہ تمام نسخوں میں "زعیم" مرفوع ہے اور "أرذلهم" منصوب ہے حالانکہ اس کے برعکس ہونا چاہئے تھا، الّا یہ کہ "الزعیم" سے کریم مراد لیا جائے اور "أرذل" سے احمق، غریب اور گھٹیا رتبے والا شخص مراد لیا جائے۔

قولہ: واكرم الرجل...... شربت الخمور.......:

مخافة شره: یعنی کوئی اور وجہ مثلاً کسی خیر کی امید وغیرہ نہیں ہوگی۔

القينات: قاف کے فتحہ اور یاء کے سکون کے ساتھ۔ گانے والی باندیاں۔

المعازف: میم کے فتحہ اور زاء کے کسرہ کے ساتھ۔ لہو ولعب کے آلات۔

شربت: مجہول کا صیغہ ہے۔

الخمور: اس سے مراد خمر کی انواع ہیں۔ اور مراد یہ ہے کہ شرابیں کھلم کھلا پی جانے لگیں۔

قولہ: ولعن آخر هذه الامة اولها:

اس میں اشارہ ہے کہ یہ علامت اس امت کی خصوصیات میں سے ہے اور سابقہ امتوں میں ایسا نہیں ہوا تھا، اور یہی بات مناسب ہے کہ قیامت کی علامات میں سے ہو، اور اس کی تائید اس بات سے ہوتی ہے کہ یہود ونصاریٰ سے اگر پوچھا جائے کہ

تمہاری ملت میں سب سے افضل شخص کون ہے؟ تو وہ جواب میں یہی کہیں گے کہ موسیٰ اور عیسیٰ علیہ السلام کے اصحاب۔

علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں مطلب یہ ہے کہ بعد والے لوگ پہلے والے لوگوں پر طعن کریں گے، ان کو برائی سے یاد کریں گے اور اعمال صالحہ میں ان کی اقتداء نہیں کریں گے، گویا کہ انہوں نے پہلے والے لوگوں پر لعنت بھیجی۔

ملا علی قاریؒ فرماتے ہیں کہ جب "لعن" کا حقیقی معنی متحقق ہے، تو پھر مجازی معنی مراد لینے کی کیا ضرورت ہے۔ اور ایسے واقعات بہت زیادہ موجود ہیں، حالانکہ اللہ تعالیٰ اولین کے بارے میں خود ارشاد فرماتے ہیں:

﴿وَالسّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ مِنَ الْمُهٰجِرِيْنَ وَالْاَنْصَارِ وَالَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُمْ بِاِحْسَانٍ ۙ رَّضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ﴾

[التوبة:۱۰۰]

"اس کی شان یہ ہے کہ جب وہ کسی چیز کا ارادہ کرتا ہے تو اس سے فرما دیتا ہے ہو جا تو وہ ہو جاتی ہے وہ (ذات) پاک ہے جس کے ہاتھ میں ہر چیز کی بادشاہت ہے اور اسی کی طرف تم کو لوٹ کر جانا ہے۔"

نیز ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿لَقَدْ رَضِيَ اللّٰهُ عَنِ الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ يُبَايِعُوْنَكَ تَحْتَ الشَّجَرَةِ﴾ [الفتح:۱۸]

"بالتحقیق اللہ تعالیٰ ان مسلمانوں سے خوش ہوا جبکہ یہ لوگ آپ سے درخت (سمرہ) کے نیچے بیعت کر رہے تھے۔"

قرآن وحدیث ان پہلے لوگوں (یعنی صحابہ) کے مناقب وفضائل سے بھرے ہوئے ہیں، اور صحابہ کرامؓ ہی وہ مبارک ہستیاں ہیں جنہوں نے حضور علیہ السلام کی نصرت کا حق ادا کیا، اور اللہ کے راستے میں جہاد کرنے کا حق اداء کر کے مختلف ممالک کو فتح کیا۔ حضور علیہ السلام سے شریعت کے تمام علوم کو محفوظ کیا، جن سے علماء کرام اور مشائخ عظام نے استفادہ کیا اور اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں خود ہمیں یہ تعلیم دی کہ ہم ان پاک ہستیوں کے حق میں یوں کہیں:

﴿رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا وَلِاِخْوَانِنَا الَّذِيْنَ سَبَقُوْنَا بِالْاِيْمَانِ﴾ [الحشر:۱۰]

"اے ہمارے پروردگار! ہم کو بخش دے اور ہمارے ان بھائیوں کو (بھی) جو ہم نے پہلے ایمان لا چکے ہیں۔"

ایک ملعون جماعت جو یا تو کافر ہیں یا دیوانے ہیں ان مقدس ہستیوں کے بارے میں صرف لعن طعن پر ہی اکتفاء نہیں کرتے بلکہ محض اپنے ناپاک اور فاسد خیالات اور بے کار سمجھ کی وجہ سے یہ کہہ کر ان مقدس ہستیوں کی طرف کفر منسوب کرتے ہیں، کہ حضرت ابوبکرؓ حضرت عمر اور حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہم اجمعین نے خلافت پر ناحق قبضہ کر لیا، حالانکہ خلافت حضرت علیؓ کا حق تھا۔ حالانکہ یہ بات بااجماع سلف وخلف باطل ہے، اور ان منکرین کے انکار کا کوئی اعتبار نہیں، اور قرآن وحدیث میں کونسی ایسی دلیل ہے کہ جس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ حضور علیہ السلام کے بعد خلافت حضرت علیؓ کا حق تھا، نیز صحابہؓ میں سے جن لوگوں نے حضرت علیؓ کے زمانہ خلافت میں ان کی مخالفت کی تھی وہ مخالفت اجتہادی رائے پر مبنی تھی، جو مستوجب لعنت نہیں ہے۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ خطا اجتہادی تھی، اور اگر ہم یہ فرض کر لیں گے کہ وہ مسی تھے تو ممکن ہے کہ وہ توبہ کر کے مرے ہوں، یا اللہ کی مشیت کے تحت باقی ہوں غالب امید ہے کہ اللہ تعالیٰ گزشتہ خدمات کے بدلے میں ان کی مغفرت

کرے گا۔

ابن عساکر نے حضرت علیؓ سے ایک حدیث مرفوع نقل کی ہے:

یکون لأصحابی زلة غفرها الله لهم بقتهم معی"۔

حضور علیہ السلام نے فرمایا: "میرے بعض صحابہ کرامؓ سے اگر لغزش ہو بھی جائے تو اللہ تعالیٰ ان کو میری صحبت اور میرے ساتھ تعلق رکھنے کی برکت سے بخش دے گا۔"

اور ہم لوگ اکثر و بیشتر صغیرہ کبیرہ گناہوں کا ارتکاب کرتے رہتے ہیں، اس کے باوجود اپنے پروردگار کی رحمت اور حضور علیہ السلام کی شفاعت کے امیدوار رہتے ہیں، تو اس امت کے اکابر اور اس ملت اسلام کے انصار کے بارے میں نیک گمان اور اچھی امید کیوں نہ کی جائے۔

اور عجیب بات ہے کہ رافضی گروہ، تمام انسانوں میں فاسق ترین ظالم ترین احمق و اجہل العلمین ہیں۔ خوشخبری ہے ان لوگوں کیلئے جن کے اپنے عیوب ان کو دوسروں کی عیب جوئی سے باز رکھیں۔ نیز حضور علیہ السلام کا ارشاد ہے:

لاتذکرو اموتاکم الابخیر۔

"اپنے مُردوں کو بُرائی کے ساتھ یاد نہ کرو"۔

نیز ارشاد نبوی ﷺ ہے: **اذا ذکرا صحابی دامسکرا۔**

"جب تمہارے سامنے میرے صحابہ ﷺ کا ذکر ہو تو اپنی زبانوں کو قابو میں رکھو"۔

نیز ابن عساکرؒ نے حضرت جابرؓ سے مرفوع حدیث نقل کی ہے:

"حضرت ابوبکر اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما کی محبت ایمان کی علامت ہے اور ان سے بغض رکھنا کفر ہے' انصارؓ سے محبت رکھنا ایمان کی علامت ہے اور ان سے بغض رکھنا کفر ہے' عرب سے محبت رکھنا ایمان کی علامت ہے اور ان سے بغض رکھنا کفر کی ہے، اور جو میرے صحابؓ کو بُرے الفاظ سے یاد کرے، اس پر اللہ کی لعنت ہے، اور جس نے ان کے بارے میں میرے حکم کی فرمانبرداری کی میں قیامت کے دن اس کی پاسداری کروں گا۔"

قوله: فارتقبو اعند ذلك ....:

فارتقبوا: یہ "اذا" کا جواب ہے۔

عند ذالك ای "عند وجود ما ذكر.

ومسخا: جیسی چال ہوگی ویسے ہی مختلف انداز میں شکلیں بدل جائیں گی۔

تتابع: ایک تاء کے حذف کے ساتھ ہے۔

نظام: نون کے کسرہ کے ساتھ موتیوں کا ہار۔

سلكه: سین کے کسرہ کے ساتھ

فتتابع: ضمیر مرفوع کا مرجع لڑی میں پروئے گئے جواہر و موتی ہیں۔ یہ تتابع فعل ماضی ہے جبکہ گذشتہ "تتابع" فعل مضارع تھا۔

اسنادی حیثیت: امام ترمذی نے یہ فرمایا حدیث غریب ہے۔

تخریج: امام احمدؒ اور حاکمؒ نے حضرت ابن عمرؓ سے حدیث مرفوع نقل کی ہے:

"الآيات خرزات منظومات في سلك فانقطع السلك فيتبع بعضها بعضا۔"

"قیامت کی نشانیاں دھاگے میں پروئے ہوئے دانوں کی طرح ہیں، پس وہ دھاگہ ٹوٹ چکا ہے اور وہ دانے پے در پے گر رہے ہیں۔"

۵۴۵۱ : وَعَنْ عَلِيٍّ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اِذَا فَعَلَتْ اُمَّتِيْ خَمْسَ عَشْرَةَ خَصْلَةً حَلَّ بِهَا الْبَلَاءُ وَعَدَّ هٰذِهِ الْخِصَالَ وَلَمْ يَذْكُرْ تُعُلِّمَ لِغَيْرِ الدِّيْنِ قَالَ وَبَرَّ صَدِيْقَهٗ وَجَفَا اَبَاهُ وَقَالَ وَشُرِبَتِ الْخَمْرُ وَلُبِسَ الْحَرِيْرُ ۔ (رواه الترمذی)

اخرجه الترمذی فی السنن ٤/٤٢٨ حديث رقم ٢٢١٠

ترجمہ: "حضرت علی رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: "جب میری امت کے لوگ ان پندرہ خصال کو اپنائے گی تو اس پر (وہ) آفات اور عذاب آئیں گے (جو اوپر حدیث میں مذکور ہوئے ہیں) پھر حضور اکرم ﷺ نے ان پندرہ خصلتوں کو شمار فرمایا لیکن حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اس روایت میں اس بات کا تذکرہ نہیں فرمایا کہ جب علم کو دین کے علاوہ کسی دوسری غرض سے حاصل کیا جانے لگے"۔ (نیز ان دونوں حدیثوں کے الفاظ میں ایک فرق یہ بھی ہے کہ) حضرت علی رضی اللہ عنہ نے (اس جملہ اَدْنٰى صَدِيْقَهٗ کہ جب آدمی اپنے دوست کو تو اپنے قریب کرنے لگے...... کے بجائے) یہ روایت فرمایا کہ جب آدمی اپنے دوست کے ساتھ حسن سلوک اور اپنے باپ کے ساتھ بدسلوکی کرنے لگے اور انہوں نے (جب شرابیں پی جانے لگیں کے بجائے) جب شراب پی جانے لگے (یعنی "شراب" کو جمع کے صیغہ کے بجائے واحد کے صیغہ کے ساتھ) روایت فرمایا اسی طرح (جب علم کو دین کے علاوہ کسی دوسری غرض سے سکھایا جانے لگے کے بجائے جب ریشمی کپڑا پہنا جانے لگے)" نقل کیا ہے"۔ (ترمذی)

تشریح: عشرة: "شین" کو ساکن اور مکسور دونوں طرح پڑھنا درست ہے۔

تعلم لغير الدين: علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں: یہ آخری جملہ صاحب مصابیح کا کلام ہے، چونکہ امام ترمذیؒ نے ترتیب وار دو حدیثیں نقل کی ہیں، اور ان دونوں میں پندرہ کی وضاحت کی ہے۔

وبر صديقه: "ادنی" کی جگہ لفظ "بر" مذکور ہے۔

جفا أباه: "أقصٰى" کی جگہ "جفا" مذکور ہے یہ عبارت کا اختلاف ہے۔

شَرِبت الخمور ": فعل اور فاعل میں تغیر کے ساتھ "شرب الخمر" مذکور ہے۔

لبس: مجہول کا صیغہ ہے۔

صاحب مختصر فرماتے ہیں کہ "لبس الحریر" کا جملہ "لعن آخر هذه الامة اولها" کی جگہ ذکر کیا ہے۔ لیکن یہ صحیح نہیں ہے کیونکہ "لعن آخر...... الخ" حضرت علیؓ کی اس روایت میں موجود ہے۔ چنانچہ صحیح بات یہ ہے کہ "لبس الحریر" کا جملہ "تعلم لغیر الدین" کی جگہ ذکر کیا گیا ہے۔ پس دونوں روایتوں میں پندرہ باتوں کے ذکر میں مطابقت ہے۔ لہٰذا علامہ طیبیؒ کی یہ بات درست ہے کہ دونوں روایتوں میں پندرہ باتوں کا ذکر ہے' اور صاحب مختصر کی یہ بات درست نہیں ہے، کہ دونوں روایتوں میں مجموعی طور پر پندرہ باتوں کا ذکر ہے، تاہم گذشتہ حدیث میں مذکور باتیں سولہ ہیں اھ۔

لیجئے میں ان باتوں کو تفصیل کے ساتھ ذکر کرنے لگا ہوں جن کو مؤلف نے اجمالی طور پر ذکر کیا ہے، بلکہ اتنا اختصار کیا ہے کہ مطلب سمجھنے میں مخل ہے۔ چنانچہ جامع میں منقول ہے:

"اذا فعلت امتی خمس عشرة خصلة حل بها البلاء اذا كان المغنم دولاً 'والأمانة مغنما' والزكاة مغرما' واطاع الرجل زوجته' وعق امه' وبر صديقه' وجفا اباه' وارتفعت الاصوات في المساجد' وكان زعيم القوم ارذلهم' واكرم الرجل مخافة شره' وشربت الخمور' ولبس الحرير' واتخذت القينات والمعازف' ولعن آخر هذه الامة .

"جب میری امت یہ پندرہ خصلتیں سرانجام دے گی تو ان پر آزمائش آئے گی: جب مال غنیمت کو دولت قرار دیا جائے' امانت کو غنیمت سمجھا جائے' جب مرد اپنی بیوی کا تابعدار ہو جائے اور اپنی ماں کا نافرمان ہو جائے۔ اپنے دوست کو قریب کرنے لگے اور اپنے باپ کو دور کرنے لگے' جب مساجد میں آوازیں بلند ہونے لگیں اور جب قوم و جماعت کے سربراہ اس قوم و جماعت کے فاسق لوگ بن جائیں' جب آدمی کی تعظیم اس کے شر کے اندیشہ کے باعث کی جانے لگے' جب شرابیں پی جانے لگیں' جب ریشم پہنا جانے لگے' جب لوگوں میں گانے والیوں اور ساز و باجوں کا رواج ہو جائے اور جب امت کے پچھلے لوگ پہلے لوگوں پر لعنت کرنے لگیں۔

اولها فليترتقبوا عند ذالك ريحا حمراء او خسفا او مسخا". رواه الترمذی عن علیؓ.

"او" بیان نوع کیلئے ہے، اور "واؤ" جمع کیلئے ہے۔ اس طرح تطبیق ہو جاتی ہے۔

۵۴۵۲ : **وَعَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ مَسْعُوْدٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا تَذْهَبُ الدُّنْيَا حَتّٰى يَمْلِكَ الْعَرَبَ رَجُلٌ مِّنْ اَهْلِ بَيْتِىْ يُوَاطِئُ اسْمُهٗ اِسْمِىْ** (رواه الترمذی وابوداود وفی روایة له) **قَالَ لَوْ لَمْ يَبْقَ مِنَ الدُّنْيَا اِلَّا يَوْمٌ لَطَوَّلَ اللّٰهُ تَعَالٰى ذٰلِكَ الْيَوْمَ حَتّٰى يَبْعَثَ اللّٰهُ فِيْهِ رَجُلًا مِّنِّىْ اَوْ مِنْ اَهْلِ بَيْتِىْ يُوَاطِئُ اِسْمُهٗ اِسْمِىْ وَاسْمُ اَبِيْهِ اِسْمَ اَبِىْ يَمْلَاُ الْاَرْضَ قِسْطًا وَّعَدْلًا كَمَا مُلِئَتْ ظُلْمًا وَّجَوْرًا ۔**

اخرجه ابو داؤد فی السنن ٤٧٣/٤ حدیث رقم ٤٢٨٢ والترمذی فی السنن ٤٣٨/٤ حدیث رقم ٢٢٣٠ وابن ماجه ٩٢١/٢ حدیث رقم ٢٧٧٩ واحمد فی المسند ٣٧٦/١۔

ترجمہ: ''حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا'' دنیا اس وقت تک اپنے اختتام کو نہیں پہنچے گی جب تک عرب پر ایک شخص حکمران بن جائے گا جو میرے اہل بیت سے رشتہ داری رکھتا ہوگا میں سے ہوگا اور وہ میرا ہم نام ہوگا'' (ترمذی وابوداؤد) اور ابوداؤد کی ایک روایت میں یہ الفاظ ہیں کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''اگر دنیا اپنے اختتام کو پہنچنے میں صرف ایک دن بھی باقی رہ جائے گا تو اللہ تعالیٰ اس دن لمبا فرمادے گا' یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ میری نسل سے یا یہ فرمایا کہ میرے اہل بیت میں سے ایک شخص کو پیدا کرے جو میرا ہم نام ہوگا اور جس کے باپ کا نام میرے باپ کے نام پر ہوگا اور وہ تمام روئے زمین کو (عرب کی سرزمین کو) اس قدر عدل وانصاف سے بھر دے گا جس قدر اس وقت سے پہلے تمام روئے زمین ظلم وجور سے بھری تھی''۔

تشریح: قوله لا تذهب الدنيا......اسمه اسمي:

حتی یملك العرب: تمام اہل اسلام مراد ہیں، کیونکہ جو بھی اسلام کا حامل ہو وہ عربی ہے۔

اس شخص کا نام ''محمد'' اور لقب ''مہدی'' ہوگا، وہ حضور علیہ السلام کی دکھلائی ہوئی راہ لوگوں کو دکھائے گا۔

علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں کہ (عربوں کا ذکر تو کیا) لیکن عجموں کا ذکر نہیں کیا، حالانکہ عجم بھی مراد ہیں' اس لئے کہ وہ شخص جب عربوں پر حکومت حاصل کر لے گا، اور ان کا موقف ایک ہو جائے گا، اور ایک ہاتھ کی انگلیوں کی طرح آپس میں متفق ہو جائیں گے تو تمام اقوام پر غالب آجائیں گے۔ اس توجیہہ کی تائید حضرت ام سلمہؓ کی حدیث سے ہوتی ہے جو عنقریب آرہی ہے اھ۔

عرض مرتب: اسی باب میں آگے ام سلمہ کی دو روایات آرہی ہیں بظاہر مراد دوسری روایت ہے ملاحظہ فرمائیے: ۵۴۵۶۔ اھ۔

یہ توجیہہ بھی ہو سکتی ہے کہ صرف عربوں کا ذکر اس لئے کیا کہ امام مہدی علیہ السلام کے زمانے میں عرب غالب ہونگے یا اس لئے کہ عربوں کو شرافت حاصل ہے، یا یہ عبارت اکتفاء کی قبیل سے ہے اور مراد عرب وعجم دونوں ہیں، جیسا کہ ارشاد باری: ﴿سرابيل تقيكم الحر﴾ [النحل: ٨١] ''اور ایسے کرتے بنائے جو تمہاری لڑائی سے تمہاری حفاظت کریں'' میں ہے (صرف حرارت کے ذکر پر اکتفاء کیا ورنہ کپڑے گرمی وسردی دونوں سے بچاؤ کا ذریعہ ہیں۔)

زیادہ واضح بات یہ ہے کہ صرف عربوں کا ذکر اس لئے کیا کہ تمام کے تمام عرب امام مہدی علیہ السلام کی اطاعت کریں گے۔ بخلاف عجم (مراد کی عرب کی ضد) کے'' کہ اُن میں سے بعض امام مہدی کی اطاعت کی مخالفت کریں گے۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

او من اهل بتی: ''او'' راوی کی طرف سے شک ہے۔

جامع کے الفاظ یہ ہیں: ''حتى يبعث فيه رجل من اهل بيتي۔ (یہاں تک کہ ان میں ایک شخص مبعوث ہوگا جو میرے اہل بیت سے رشتہ داری رکھتا ہوگا۔)

اس بات میں اختلاف ہے کہ امام مہدی علیہ السلام، حضرت حسنؓ کی اولاد میں سے ہونگے یا حضرت حسینؓ کی اولاد میں سے؟ ممکن ہے کہ امام مہدی علیہ السلام دونوں نسبتوں کے حامل ہوں زیادہ واضح بات یہ کہ باپ کی جانب سے حسنی ہونگے، اور ماں کی جانب سے حسینی ہونگے۔ جیسا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بیٹوں میں حضرت اسماعیل علیہ السلام اور حضرت اسحاق علیہ السلام کے بارے میں ہوا کہ بنی اسرائیل کے تمام انبیاء حضرت اسحاق علیہ السلام کی اولاد میں پیدا ہوئے اور حضرت اسماعیل علیہ السلام کی اولاد میں ہمارے پیارے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پیدا ہوئے۔ (جو خاتم الانبیاء ہیں)، اور تمام انبیاء کے قائم مقام ہوگئے پس اسی طرح جب کہ امت کے اکثر اکابر علماء و مشائخ عظام حضرت حسینؓ کی اولاد میں گذرے ہیں تو مناسب ہے کہ حضرت حسنؓ کی اولاد میں ایسا ایک ولی عطاء ہو جو خاتم الاولیاء ہو اور تمام اولیاء و اصفیاء کے قائم مقام ہو جائے۔

علاوہ ازیں بعض حضرات کا کہنا ہے کہ جب حضرت حسنؓ خلافت سے معزول ہوئے، تو ان کو مرتبہ قطب کا جھنڈا عطا کر دیا گیا، جیسا کہ احادیث نبویہ میں حضرت حسنؓ کی منقبت میں مذکور ہے۔ پس مناسب یہ ہے کہ نبوت عیسویہ کے مقارن ان کو نسبت مھدویہ عطاء کی جائے، اور اس معنی میں ابو اسحاق کی صریح حدیث جو حضرت علیؓ سے منقول ہے، آگے آ جائے گی۔ واللہ اعلم۔

عرض مرتب: ابو اسحاق کی حدیث فصل ثالث میں آئے گی۔ دیکھئے حدیث: ۵۴۶۲۔

قولہ: یواطیء اسمہ اسمی وسم ابیہ اسم أبي: چنانچہ اُس شخص موعود کا نام محمد بن عبد اللہ ہوگا یہ حدیث شریف شیعوں کی اس بات کی تردید ہے، کہ مہدی موعود قائم ومنتظر ہی ہے، اور وہ محمد بن الحسن العسکری ہیں۔

قولہ: یملأ الارض قسطا وعدلا ....:

یملأ الأرض: یہ جملہ مستأنفہ ہے' امام مہدی علیہ السلام کے حسب (ان کے خاندانی شرافت) کا بیان ہے' جیسا کہ ماقبل جملے میں ان کے نسب کا بیان تھا۔

''الأرض'' سے ساری زمین مراد ہے یا عرب اور اس کے تابع زمین مراد ہے اور ''زمین'' سے مراد زمین پر بسنے والے ہیں۔

قسطًا: ''قاف'' مکسور ہے۔ **عدلا:** ''قسطا'' کی تفسیر ہے، ''قسطًا'' اور ''عدلاً'' دونوں کو تاکید کیلئے ذکر کیا ہے اور اگلے جملے میں (ظلما وجورا) بھی دونوں اسی غرض سے لائے گئے ہیں۔

یعنی جیسا کہ امام مہدی علیہ السلام کے ظاہر ہونے سے پہلے زمین ظلم سے بھر گئی تھی۔

''ظلمًا وجورا'': یہ بھی ممکن ہے کہ دونوں میں تغایر پیدا کیا جاء کہ ظلم کو قاصر و لازم (جس کا اثر دوسروں تک نہ پہنچے) اور جور کی تعدی و متعدی (جس کا اثر دوسروں تک پہنچے) بنایا جائے۔ اسی طرح **قسط** سے مراد ہر صاحب حق کو اس کا حق دینا' اور ''عدل'' سے مراد انصاف، شریعت کے مطابق فیصلہ کرنا، مظلوم کی مدد کرنا، اور ظالم سے انتقام لینا مراد ہو۔ چنانچہ یہ حدیث اس ارشاد باری تعالیٰ کو جامع ہو جائے گی: ﴿ان اللہ یأمر بالعدل والاحسان﴾ [النحل: ۹۰] ''بیشک اللہ تعالیٰ اعتدال اور احسان اور اہل قرابت کو دینے کا حکم فرماتے ہیں'' کہ دین نام ہے اللہ کے حکم کی تعظیم اور اللہ کی مخلوق پر شفقت کا۔

اس حدیث کو امام احمدؒ اور امام ابوداؤدؒ نے حضرت علیؓ سے مرفوعا یوں نقل کیا ہے:

"لو لم يبق من الدهر الا يوم لبعث الله رجلا من اهل بيتي يملأها عدلا كما ملئت جورا"

اور ابن ماجہ نے حضرت ابوہریرہؓ سے یہ حدیث ان الفاظ کے ساتھ مرفوعاً نقل کی ہے:

"لو لم يبق من الدنيا الا يوم لطول الله ذالك اليوم حتى يملك رجل من اهل بيتي يملك جبال الديلم والقسطنطنية"۔

قاموس میں لکھا ہے: الديلم معروف پہاڑ کا نام ہے۔

اور اس کو رویانی نے حضرت حذیفہؓ سے موفوعاً نقل کیا ہے:

"المهدى رجل من ولدى وجهه كالكوكب الدرى"۔

۵۴۵۳ : وَعَنْ اُمِّ سَلَمَةَ قَالَتْ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ الْمَهْدِىُّ مِنْ عِتْرَتِىْ مِنْ اَوْلَادِ فَاطِمَةَ (رواه ابو داود)

اخرجه ابو داوٗد في السنن ٤/٤٧٤ حديث رقم ٤٢٨٤ وابن ماجه في السنن ٢/١٣٦٨ حديث رقم ٤٠٨٦

ترجمہ: "حضرت اُم سلمہ رضی اللہ عنہا نے بیان فرمایا کہ میں نے پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ ارشاد فرماتے ہوئے سماعت کیا: "مہدیؒ میری عترت (قوم یا ملت) میں سے اور فاطمہ رضی اللہ عنہا کی اولاد میں سے ہوں گے"۔ (ابوداؤد)

تشریح: قوله المهدى من عترتى ....:

"عترتی": بعض شارحین فرماتے ہیں: "عترة" کا معنی ہے صلبی اولاد اور بعض اوقات رشتہ داروں کو بھی کہہ دیا جاتا ہے۔
میں (ملا علی قاریؒ) کہتا ہوں کہ دونوں معانی کے اعتبار سے اگلے جملہ "من اولاد فاطمة" کا بیان بننا مناسب نہیں ہے۔

نہایہ میں لکھا ہے: "عترة" کا معنی ہے، خاص رشتہ دار اور عترة النبى عليه السلام سے عبدالمطلب کی اولاد مراد ہے۔
بعض کا کہنا ہے کہ: سارے قریش مراد ہیں۔ مشہور و معروف یہی ہے کہ اس سے وہ لوگ مراد ہیں جن کو زکوۃ کا مال لینا حرام ہے۔

میں (ملا علی قاریؒ) کہتا ہوں کہ پہلا معنی مراد لینا مقصد کے زیادہ مناسب ہے لیکن پہلا معنی مراد لینا اس کے بھی منافی نہیں ہے کہ مقام کی مناسبت سے کوئی اور معنی مراد لیا جائے۔

اور ایک قول یہ ہے کہ ایک حدیث کی رو سے اس سے مراد اہل بیت ہیں۔ اور بعض کا کہنا ہے ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن اور حضور علیہ السلام کی اولاد مراد ہے۔

ایک قول کے مطابق اہل وعیال اور قریبی رشتہ دار مراد ہیں، اور ایک قول کے مطابق حضور علیہ السلام کی نسل کے لوگ اور قریبی افراد مراد ہیں، جوہری نے اسی پر اکتفاء کیا ہے۔ میں (ملا علی قاریؒ) کہتا ہوں، کہ یہاں اسی پر اکتفاء کرنا مناسب ہے۔

تخریج: اس حدیث کو ابن ماجہ نے بھی اسی طرح نقل کیا ہے، اور حاکم نے بھی اس حدیث کو روایت کیا ہے اور اس کو صحیح

قرار دیا ہے۔

واضح رہے کہ دار قطنی نے الافراد میں حضرت عثمانؓ سے نقل کیا ہے: "المهدی من ولد العباس عمی" "مہدی میرے چچا عباس کی اولاد میں سے ہوگا۔"

اول تو اس کی سند ضعیف ہے۔ ثانی یہ کہ اس حدیث میں مذکور مہدی سے وہ مہدی مراد ہے، جو خلفاء عباسیہ میں گزرے ہیں۔

یا یہ کہ مہدی موعود کی ایک نسبت نسبی عباسیوں کی طرف بھی ہوگئی۔ چنانچہ امام احمدؒ اور ابن ماجہؒ نے حضرت علیؓ سے ایک حدیث مرفوع نقل کی ہے:

"المهدی من اهل البیت یصلحه الله فی لیلة او فی ساعة واحدة من اللیل حیث یتفق علی خلافته اهل الحل والعقد فیها" یعنی اللہ ان کے معاملہ کی اصلاح فرمائے گا اور ان کی قدر و منزلت کو ایک ہی رات میں بلند کر دے گا یا رات کی ایک گھڑی میں۔ جس کی صورت یہ ہوگی کہ اہل حل و عقد ان کی خلافت پر متفق ہوں گے۔

۵۴۵۴ : وَعَنْ اَبِیْ سَعِیْدِ الْخُدْرِیِّ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اَلْمَهْدِیُّ مِنِّیْ اَجْلَی الْجَبْهَةِ اَقْنَی الْاَنْفِ یَمْلَاُ الْاَرْضَ قِسْطًا وَعَدْلًا كَمَا مُلِئَتْ ظُلْمًا وَجَوْرًا یَمْلِكُ سَبْعَ سِنِیْنَ. (رواه ابوداود)

اخرجه ابو داوٗد فی السنن ٤/٤٧٤ حدیث رقم ٤٢٨٥ واحمد فی المسند ١٧/٣۔

ترجمہ: "حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: "مہدیؑ میری نسل میں سے ہوں گے جن کی پیشانی نہایت کشادہ اور منور ہوگی اور بلند ناک والے ہوں گے وہ روئے زمین پہ اس قدر عدل وانصاف پھیلا دیں گے جس قدر پہلے کہ وہ ظلم و ستم سے لبریز تھی وہ (یعنی مہدیؑ) سات برس تک روئے زمین پر برسر اقتدار اور حکمران رہیں گے"۔ (ابوداؤد)

تشریح: المهدی منی : یعنی میری نسل یا میری اولاد یا میرے قبیلہ یا میرے اہل بیت میں سے ہوگا۔

قوله: المهدی منی اجلی الجهة أقنی الانف :

"اجلی" : شارحؒ فرماتے ہیں: أجلی بمعنی واسع ہے نہایہ میں لکھا ہے: حفیف الشعر مابین النز عتین من الصد غین والذی انحسر الشعر عن جبهته۔

علامہ طیبیؒ نے اسی طرح اختصار کے ساتھ ذکر کیا ہے۔ نہایہ میں لکھا ہے: النزعتان سر کا وہ جگہ جہاں بال نہ ہوں، اور "الجلا" الف مقصورہ کے ساتھ کا معنی ہے سر کے اگلے حصے کا بالوں سے خالی ہونا یا آدھے سر کا بالوں سے خالی ہونا۔

اور صفت کا صیغہ "اجلی" اور "جلواء" آتا ہے، اور "جبهة جلواء" کا معنی ہے کشادہ پیشانی۔ اس تشریح سے سابق شارحؒ کے قول کی تائید ہوتی ہے، اور یہی تشریح مقام کے موافق و مطابق ہے۔

"اقنی الأنف": شارحؒ فرماتے ہیں: اقنی ای مرتفع. نہایہ میں لکھا ہے: القنا فی الأنف طوله ودقة ارنبته مع حدب فی وسطه کہا جاتا ہے: رجل اقنی و امرأة قنواء اھ۔ چنانچہ اس کلام میں تجرید ہے اور الأرنبة کا معنی ہے ناک کا کنارہ جیسا کہ قاموس میں لکھا ہے۔

"الحدب" کا معنی ہے "الارتفاع" (بلندی) جو "الانخفاض" کی ضد ہے، مطلب یہ ہے کہ چپٹی ناک نہ ہوگی کیونکہ ایسی ناک بری لگتی ہے۔

قوله: یملأ الارض قسطا وعدلا .....

سبع سنین: اور آگے جو راوی کا قول" اوثمان سنین او تسع سنین" منقول ہے یہ راوی کی طرف سے شک ہے، پس یہ بھی احتمال ہے کہ مذکورہ بالا حدیث سبع سنین کے بارے میں یقینی ہو۔ اور اس کی تائید ابوداؤد میں موجود ام سلمہؓ کی اس روایت سے بھی ہوتی ہے جو آگے آرہی ہے۔

یہ بھی احتمال ہے کہ روایت شک کے ساتھ ہو اور راوی نے شک والے الفاظ نقل ہی نہ کیے ہوں ہو اور صرف یقینی لفظ (یعنی "سبع سنین") پر اکتفاء کرلیا ہو۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

اسنادی حیثیت: ابن عربی نے اس حدیث کو صحیح قرار دیا ہے۔

تخریج: حاکم نے اس حدیث کو اپنی کتاب مستدرک میں نقل کیا ہے۔

۵۴۵۵ : وَعَنْهُ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِي قِصَّةِ الْمَهْدِيِّ قَالَ فَيَجِيْءُ إِلَيْهِ الرَّجُلُ فَيَقُوْلُ يَا مَهْدِيُّ اَعْطِنِي اَعْطِنِي قَالَ فَيَحْثِي لَهُ فِي ثَوْبِهِ مَا اسْتَطَاعَ اَنْ يَحْمِلَهُ . (رواه الترمذی)

اخرجه الترمذی فی السنن ٤٣٩/٤ حدیث رقم ٢٢٣٣ وابن ماجه ١٣٦٧/٢ حدیث رقم ٤٠٨٣ واحمد فی المسند ٢١/٣۔

ترجمہ: "حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ نبی اکرم ﷺ سے حضرت امام مہدیؒ کے واقعہ کے متعلق یہ بھی روایت فرماتے ہیں کہ آپ ﷺ نے (ان کے عدل وانصاف کا تذکرہ فرما کر مزید یہ بھی) فرمایا کہ مہدیؒ (کی فیاضی کا یہ عالم ہوگا کہ ان) کے پاس ایک شخص آئے گا اور عرض کرے گا کہ مجھے کچھ عنایت فرمایئے' مجھے کچھ عطا کیجئے۔ چنانچہ مہدیؒ اس کو دونوں ہاتھوں سے بھر بھر کر اتنا دیں گے کہ جتنا اپنے کپڑے میں بھر کر اٹھا کر لے جانے کی واستطاعت رکھ سکے (یعنی خود کسی مخصوص پیمانے سے نہیں بلکہ دوسرے کے اٹھا کر لے جانے کی طاقت کے بقدر دیں گے"۔ (ترمذی)

تشریح: اعطنی اعطنی: تکرار تاکید کی غرض سے ہے، اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ وہ شخص یہ کہہ رہا ہو کہ" مجھے بار بار دیجئے"۔ کیونکہ سخاوت واحسان امام مہدی علیہ السلام کی عادت ہوگی۔ یعنی جب امام مہدیؒ مال پر اس شخص کی حرص دیکھیں گے اور ہر وقت اس شخص کو مانگتا ہوا دیکھیں گے، تو ان کو بہت زیادہ مال دے دیں گے، تاکہ آئندہ سوال نہ کرے اور اس کو پریشانی

سے نکال دیں گے۔

۵۴۵۶ : وَعَنْ اُمِّ سَلَمَةَ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ يَكُوْنُ اِخْتِلَافٌ عِنْدَ مَوْتِ خَلِيْفَةٍ فَيَخْرُجُ رَجُلٌ مِّنْ اَهْلِ الْمَدِيْنَةِ هَارِبًا اِلٰى مَكَّةَ فَيُخْرِجُوْنَهُ وَهُوَ كَارِهٌ فَيُبَايِعُوْنَهُ بَيْنَ الرُّكْنِ وَالْمَقَامِ وَيُبْعَثُ اِلَيْهِ بَعْثٌ مِّنَ الشَّامِ فَيُخْسَفُ بِهِمْ بِالْبَيْدَآءِ بَيْنَ مَكَّةَ وَالْمَدِيْنَةِ فَاِذَا رَاَى النَّاسُ ذٰلِكَ اَتَاهُ اَبْدَالُ الشَّامِ وَعَصَائِبُ اَهْلِ الْعِرَاقِ فَيُبَايِعُوْنَهُ ثُمَّ يَنْشَأُ رَجُلٌ مِّنْ قُرَيْشٍ اَخْوَالُهُ كَلْبٌ فَيَبْعَثُ اِلَيْهِمْ بَعْثًا فَيَظْهَرُوْنَ عَلَيْهِمْ وَذٰلِكَ بَعْثُ كَلْبٍ وَيَعْمَلُ فِي النَّاسِ بِسُنَّةِ نَبِيِّهِمْ وَيُلْقِي الْاِسْلَامُ بِجِرَانِهٖ فِي الْاَرْضِ فَيَلْبَثُ سَبْعَ سِنِيْنَ ثُمَّ يُتَوَفّٰى وَيُصَلِّيْ عَلَيْهِ الْمُسْلِمُوْنَ. (رواہ ابو داؤد)

اخرجه ابو داوٗد في السنن ٤/٤٧٥ حديث رقم ٤٢٨٦ واحمد في المسند ٦/٣١٦

ترجمہ: ''حضرت اُم سلمہ رضی اللہ عنہا نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت نقل کرتی ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: (قرب قیامت میں) جب خلیفہ (یعنی اس دور کے سربراہ مملکت) کی وفات ہوگی تو (نیا حکمران منتخب کرنے اور نامزد کرنے کے سلسلہ میں اصحاب الرائے لوگوں کے درمیان) اختلاف ونزاع پیدا ہو جائے گا' اسی دوران اہل مدینہ میں سے ایک آدمی (مدینہ سے) نکل کر مکہ کی طرف بھاگ جائے گا' مکہ کے لوگ (جب اس شخص کے مقام و حیثیت کو پہچانیں اور جانیں گے تو) اس کے پاس آئیں گے اور اس کو (گھر سے) باہر نکال کر لائیں گے (تاکہ اس کو اپنا حکمران منتخب کرلیں) وہ شخص اگرچہ (فتنہ کے اندیشہ سے) اس منصب کا قبول کرنا پسند نہیں کرے گا مگر لوگ (منت سماجت کر کے اس کو تیار کریں گے اور) اس کے ہاتھ پر بیعت کرلیں گے' یہ بیعت (خانہ کعبہ میں) حجراسود اور مقام ابراہیم کے درمیان جگہ میں ہوگی' اس کے بعد اس کے مقابلہ پر شام (کے بادشاہ) کی جانب سے ایک فوجی لشکر روانہ کیا جائے گا لیکن اس کو لشکر والوں مکہ اور مدینہ کے درمیان واقع مقام بیداء پر زمین بوس کر دیا جائے گا' اور پھر جب لوگوں اس بات کی اطلاع پہنچے گی کہ (شام کا) لشکر مکہ پہنچنے سے پہلے ہی زمین میں دھنسا دیا گیا ہے' تو ملک شام کے ابدال اور عراق کے عصائب اس شخص کی خدمت میں پہنچیں گے اور اس کے ہاتھ پر بیعت کرلیں گے پھر قریش میں سے ایک نوجوان ظاہر ہوگا جس کی ننھیال قبیلہ کلب کی مدد حاصل کرے گا) لیکن اس شخص کا لشکر اسی قریشی کے لشکر پر غالب آجائے گا پھر وہ شخص لوگوں کے درمیان ان کے پیغمبر (محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم) کی روش اور ان کی سنت کی پیروی کرتے ہوئے (ملک وملت کا) نظم ونسق چلائے گا اور دین اسلام اپنی گردن زمین پر ڈال دے گا وہ شخص سات سال تک قائم وبرقرار رہے گا' اور مسلمان اس کی نماز جنازہ پڑھیں گے''۔ (ابوداؤد)

تشریح: قوله:يكون اختلاف عند موت الخليفة.....بعث من الشام:

''خليفة'' سے مراد غلبہ کے ذریعے حاصل کی ہوئی سلطنت کا حکمران ہے۔

فيخرج رجل من اهل المدينة: امارت کا منصب حاصل کرنے کو ناپسندیدہ سمجھنے کی وجہ سے نکل آئے گا، یا اس صورتِ

حال میں پیدا ہونے والے فتنے کے خوف سے نکلے گا۔

''المدینة'' سے مدینہ منورہ مراد ہے یا وہ شہر مراد ہے، جس میں مذکورہ خلیفہ کا انتقال ہوگا۔

هاربًا الی مكة: کیونکہ مکہ ہر پناہ لینے والے کیلئے پناہ گاہ ہے اور ہر سکونت پذیر کیلئے عبادت گاہ ہے۔

علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں: اس شخص سے امام مہدی علیہ السلام مراد ہیں اس کی دلیل یہ ہے کہ اس حدیث کو امام ابوداؤدؒ نے'' **باب المهدی**'' میں ذکر کیا ہے۔

''**المقام**'' سے مقام ابراہیم مراد ہے۔ ان تین مقدس اشیاء (حجر اسود، مقام ابراہیم، آبِ زمزم) کے درمیان کی جگہ کو قدیم زمانے میں ''حطیم'' کہا جاتا تھا۔ اس جگہ کا یہ نام اس لئے رکھا گیا تھا، کہ جو شخص اس مقام پر قسم اٹھاتا اور پھر قسم توڑ دیتا یا وعدہ خلافی کرتا تو اس کی گردن توڑ دی جاتی تھی۔ اس کی حکومت ختم ہو جاتی (حطیم کا معنی بھی ہے ''جدا کی ہوئی چیز'')

یبعث الیه: مجہول کا صیغہ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اس مبارک شخص سے مقابلہ اور لڑائی کیلئے لشکر بھیج دیا جائے گا، حالانکہ یہ مبارک شخص حضور علیہ السلام کی اولاد میں سے ہوگا اور اس کا قیام بلاحرام یعنی مکہ مکرمہ میں ہوگا۔

قوله: فیخسف بهم بالبیداء بین مكة والمدینة:

یہ خسف امام مہدی علیہ السلام کی کرامت کی وجہ سے ایسا ہوگا۔

البیداء باء مفتوح اور یاء ساکن ہے۔

بین مكة والمدینة: ''مکہ'' کے ذکر کو مقدم کرنے کی وجہ شاید اس کی فضیلت ہو یا اس لئے کہ مکہ زیادہ پرانا ہے۔

علامہ تورپشتیؒ فرماتے ہیں کہ ''**البیداء**'' حرمین کے درمیان ایک چٹیل میدان ہے اور حدیث میں وارد ہوا ہے: ''**یخسف بالبیداء بین المسجدین**'' ''مقام بیداء میں دو مسجدوں کے درمیان دھنسا دیا جائے گا لیکن اس سے وہ مقام بیداء مراد نہیں ہے، جو مقام ذوالحلیفہ کے سامنے ہے کیونکہ یہ زمین کا مبارک حصہ ہے۔

ملا علی قاریؒ فرماتے ہیں: یہ کوئی بعید نہیں کہ مذکورہ بالا بیداء سے یہی بیداء مراد ہو جبکہ بظاہر معلوم بھی یہی ہوتا ہے، لیکن شاید علامہ تورپشتی رحمۃ اللہ علیہ کو کوئی نقل صریح دلیل مل گئی ہو، یا اس بنیاد پر فرمایا ہو کہ پہلے زمانے میں اہل شام کا راستہ مدینہ منورہ سے نہیں تھا، اسی وجہ سے مقام جحفہ کو ان کیلئے میقات قرار دیا گیا، لیکن وہ لوگ اپنے معروف راستے کو چھوڑ کر مدینہ منورہ اس لئے جاتے تھے کہ وہاں ان کا دنیوی مفاد ہوتا تھا لیکن جب ان کا مقصد امام مہدی علیہ السلام سے لڑنا اور مقابلہ کرنا ہوگا، تو ظاہری بات ہے کہ وہ اپنے لئے مسافت مزید طویل کرنے کی بجائے معروف راستہ اختیار کریں گے جو کہ مختصر ہے، تاکہ جلدی سے جا کر امام مہدی علیہ السلام سے مقابلہ کریں۔

قوله: فاذا رأی الناس ذلك ...... فیبایعونه:

ذالك: مشارالیہ ''**ما ذكر من خرق العادة**'' یعنی جب خرق عادت کے طور پر امام مہدی علیہ السلام کی وجہ سے لشکر کا دھنس جانا دیکھیں گے۔

ابدال کی تحقیق:

"ابدال الشام": نہایہ میں لکھا ہے کہ شام کے ابدال اولیاء کرام کی ایک جماعت ہے، ابدال کا واحد بَدَل بروزن جَمل ہے یا بَدَل بروزِ حِمل ہے، ان کو ابدال اس لئے کہا جاتا ہے، کہ جب بھی ان میں سے کوئی فوت ہو جاتا ہے، ان کے بدلے میں کوئی دوسرا مقرر کر دیا جاتا ہے۔

جوہریؒ فرماتے ہیں، ابدال، نیک بندوں کی ایک جماعت ہے جن کے وجود سے کسی بھی وقت دنیا خالی نہیں رہتی جب ان میں سے کوئی فوت ہو جاتا ہے اللہ اس کے بدلے میں کسی اور کو اس درجے پر پہنچا دیتا ہے۔

ابن دریدؒ فرماتے ہیں کہ ابدال کی واحد بدیل ہے۔

ملا علی قاریؒ فرماتے ہیں: ابن درید کی بات کی تائید اس سے بھی ہوتی ہے کہ ان اُبدال کو بُدلاء بھی کہا جاتا ہے، چنانچہ یہ شریف کی طرح ہے جس کی جمع اشراف اور شرفاء آتی ہے۔

قاموس میں لکھا ہے کہ ابدال، اولیاء اللہ کی ایک جماعت ہے جن کی برکت سے اللہ تعالیٰ اس کائنات کے نظام کو برقرار رکھتا ہے، اور ان کی تعداد ستر/۷۰ رہتی ہے، اس میں چالیس ابدال تو شام میں رہتے ہیں، اور تیس/۳۰ باقی ملکوں میں ہوتے ہیں۔ انتہیٰ۔

بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ شام سے شام کی جانب شام کے قریبی ممالک مراد ہیں، خاص دمشق شام مراد نہیں ہے۔ واللہ اعلم بالمرام۔

"بعض ابدال کی وجہ تسمیہ":

بعض دوسرے حضرات فرماتے ہیں کہ ان کو ابدال اس لئے کہا جاتا ہے، کہ وہ کبھی ایک جگہ سے دوسری جگہ نقل مکانی کر جاتے ہیں، جس جگہ سے انہوں نے نقل مکانی کی ہوتی ہے، وہاں وہ اپنے اصلی شکل کے مشابہ ایک شکل کو ٹھہرا لیتے۔ اپنی اصلی شکل کے بدل میں۔

ان کو ابدال کہنے کی وجہ یہ بھی ہوسکتی ہے کہ یہ لوگ عبادت وریاضت کے ذریعے بری خصلتیں اپنے اندر سے ختم کر کے ان کے بدلے میں اچھی خصلتیں پیدا کر لیتے ہیں، یا یہ کہ یہ وہ لوگ ہیں جن کے گناہوں کو اللہ تعالیٰ نے نیکیوں سے تبدیل کر دیا ہے۔

شیخ عبدالقادر جیلانیؒ فرماتے ہیں، کہ ان کو اُبدال اس لئے کہا جاتا ہے کہ انہوں نے موت تک اپنی چاہتوں کو چھوڑ کر اللہ کی چاہت پورا کرنے کو اپنا مقصود بنا لیا ہوتا ہے، اور یہ بات ان لوگوں کے ہاں گناہ کے برابر ہے کہ بھول سے یا غلطی سے یا کسی غلبہ حال کی صورت میں اللہ کی چاہت کے ساتھ اپنی چاہت کو شریک کر دے، اور ایسی حالت میں اللہ ان کو اپنی رحمت کے طفیل بیداری اور ادراک عطاء فرماتے ہیں، اور یہ اپنے اس حال سے لوٹ آتے ہیں۔ اور اللہ سے معافی طلب کرتے ہیں۔

شاید عارف بن فارض نے اسی معنی کی طرف اپنے اس شعر میں اشارہ کر دیا ہو:

ولو خطرت لی فی سواك ارادة
علی خاطری سهواً حكمت بردتی

''اگر میرے دل میں غلطی سے بھی تیرے علاوہ کسی اور کا خیال پیدا ہو جائے تو میں اپنے مرتد ہونے کا فیصلہ کرتا ہوں۔''

اور ایسا اس لئے ہوتا ہے کہ ''حسنات الابرار سیئات المقربین'' یعنی جو باتیں نیکوکاروں کے نزدیک نیکی کی باتیں ہوتی ہیں، مقرب بندے ان کو بھی گناہ سمجھتے ہیں۔ ہر شخص اپنے متعین پانی کا اپنا مشرب جانتا ہے۔

وعصائب اهل العراق عصائب بمعنی خیار یہ مأخوذ ہے عصبة القوم بمعنی خیار القوم ، اور شاید یہ لفظ ارشاد باری تعالیٰ: ﴿ونحن عصبة﴾ [یوسف۔۸] سے مأخوذ ہے۔

یا عصائب بمعنی ''طوائف'' (جماعتیں) کیونکہ العصابة بمعنی الجماعة کے آتا ہے، کیونکہ العصابة، توصب سے مأخوذ ہے، جس کا معنی ہے ایک دوسرے کیلئے کوشش کرنا اور پٹی باندھنا اور جماعت کے افراد بھی ایک دوسرے کی مرہم پٹی کرتے اور ایک دوسرے کیلئے کوشش کرتے ہیں۔ اور ایک دوسرے کی کمربستی کرتے ہیں۔

نہایہ میں لکھا ہے، العصائب، عصابة کی جمع ہے، جس کا معنی ہے دس ۱۰ سے لے کر چالیس ۴۰ تک افراد کی جماعت اور العصائب کا اسی مادے سے واحد کا صیغہ موجود نہیں اور یہی لفظ العصائب، حضرت علیؓ کی اس حدیث میں بھی وارد ہوا ہے: ''الأبدال بالشام والنجباء بمصر والعصائب بالعراق'' ''ابدال شام میں ہوں گے نجباء میں مصر میں ہوں گے اور ''عصائب'' عراق میں ہوں گے''۔ مطلب یہ کہ مختلف گروہوں کا لڑائی کیلئے جمع ہونا عراق میں ہوگا۔

بعض حضرات فرماتے ہیں: العصائب سے زاہدوں کی ایک جماعت مراد ہے لیکن ''الابدال'' اور ''النجباء'' کے ساتھ قریب مذکور ہونے کی وجہ سے ''العصائب'' سے تعبیر کیا۔

ابونعیم اصفہانیؒ نے ''حلية الأولياء'' میں اپنی سند سے حضرت ابن عمرؓ سے حضور علیہ السلام کا یہ ارشاد نقل کیا ہے:

''ہر زمانے میں میری امت میں پانچ سو کی تعداد میں نیک بندے ہوتے ہیں، اور چالیس ۴۰ ابدال ہوتے ہیں، نہ تو ان پانچ سو افراد میں کمی آتی ہے اور نہ چالیس میں''۔ پھر شاید صحابہ نے عرض کیا، یا رسول اللہ! ہمیں ان کے اعمال بتا دیں۔ حضور علیہ السلام نے ارشاد فرمایا: ''ان لوگوں کو معاف کر دیتے ہیں، جو ان پر ظلم کرے، اور جو ان کے ساتھ بُرائی کا معاملہ کرے، یہ ان کے ساتھ اچھائی کا معاملہ کرتے ہیں، اور اللہ تعالیٰ نے ان کو جو کچھ دیا ہوتا ہے اُس میں لوگوں کے ساتھ ہمدردی کرتے ہیں''۔

اسی سند کے ساتھ عبداللہ بن مسعودؓ سے بھی حضور علیہ السلام کا یہ ارشاد منقول ہے:

''مخلوق میں اللہ کے ساتھ بندے مخصوص ہیں''۔ آگے ابن مسعودؓ نے حدیث کو بیان کیا یہاں تک کہ حضور علیہ السلام کے اس ارشاد پر پہنچے کہ ''انہی سات بندوں کی وجہ سے اللہ تعالیٰ لوگوں کو زندگی دیتا ہے اور مارتا ہے، بارش برساتا ہے اور غلے اُگاتا ہے، اور مصائب کو زائل کرتا ہے۔ عبداللہ بن مسعودؓ سے پوچھا گیا، کس طرح ان کی وجہ سے

اللہ لوگوں کو زندہ کرتا ہے اور مارتا ہے؟ فرمایا: اس طرح کہ وہ سات بندے اللہ تعالیٰ سے امتوں کی کثرت کا سوال کرتے ہیں، اللہ کے حکم سے بچے پیدا ہو جاتے ہیں، وہ اللہ تعالیٰ سے جابر لوگوں کیلئے بد دعا کرتے ہیں چنانچہ اللہ کی طرف سے وہ ہلاک ہو جاتے ہیں، وہ بارش مانگتے ہیں، تو اللہ تعالیٰ بارش برسا دیتا ہے، وہ اللہ سے غلہ مانگتے ہیں، تو اللہ تعالیٰ زمین سے سبزہ اور غلہ اُگا دیتا ہے، اور دُعا کرتے ہیں، تو اللہ مصائب کو زائل کر دیتا ہے"۔ حاصل یہ کہ ابدال اور عصائب امام مہدیؒ کے پاس آئیں گے۔

اخواله کلب: قبیلہ کلب ایک چھوٹا سا قبیلہ ہوگا اس شخص کی والدہ قبیلہ کلب کی ہوگی، اس عبارت میں امام مہدیؒ کے غلبہ کی نیک فالی، ایک خفی اشارہ اور واضح بشارت ہے۔

علامہ تورپشتی رحمہ اللہ فرماتے ہیں مطلب یہ ہے کہ اس قریشی کی والدہ قبیلہ بنوکلب سے ہوگی اور وہ نوجوان امام مہدیؒ سے ان کے معاملہ میں مخالفت کرے گا، چنانچہ امام مہدیؒ کے خلاف اپنے ننھیال بنوکلب سے مدد حاصل کرے گا۔

امام مہدیؒ کے ہاتھ پر بیعت کرنے والے ہیں اور ضمیر مجرور کا مرجع وہ لشکر ہے جو کلبی نے مقابلہ کیلئے بھیجا ہوگا۔

و ذالك: مشار الیہ کلبی کا مبعوث لشکر ہے۔

بعث كلب: کلب کا لشکر جس کو کلب نے بھیجا ہوگا۔

يلقى: یاء کے ضمہ کے ساتھ۔

الاسلام: اسلام کو اونٹ کے ساتھ تشبیہ دی ہے، جو انسان کا فرمانبردار رہتا ہے۔

بجرانه: جران (جیم کے کسرہ کے ساتھ، جیم کے بعد راء اور آخر میں نون کے ساتھ) بمعنی اونٹ کی گردن کا اگلا حصہ یعنی پوری گردن رکھ دے گا۔ یہاں پر مجازاً جزء بول کر کل مراد ہے۔ جیسا کہ غلام پر رقبة کا اطلاق کیا جاتا ہے۔

نہایہ میں لکھا ہے **الجران** کا معنی ہے گردن کا باطن اور یہ لفظ اس معنی میں اس حدیث میں وارد ہوا ہے:

"ان ناقته ﷺ وضعت جرانها"

اسی طرح حضرت عائشہؓ کی حدیث میں ہے: **"حتی ضرب الحق بجرانه"** "یہاں تک کہ حق (یعنی اسلام جڑ پکڑ جائے گا"۔ یعنی اسلام کو استقامت اور قرار مل جائے گا، جیسا کہ اونٹ جب بیٹھتا ہے تو راحت حاصل کرنے کیلئے اپنی گردن زمین پر بچھاتا ہے۔

بعض حضرات فرماتے ہیں، کہ جب اسلام کو قوت واستقامت مل جائے، فتنوں سے محفوظ ہو، اور احکام الٰہی اور سنت زمین پر استحکام کے ساتھ جاری ہوں، تو کہا جاتا ہے **"ضرب الاسلام بجرانه"**. "اسلام نے جڑ پکڑ لی"۔

فيلبث: "یاء" اور "باء" مفتوح ہیں

شیخ زکریاؒ نے اپنے رسالہ جس کا اکثر حصہ صوفیاء کے کلام کی تعریف پر مشتمل ہے، میں فرماتے ہیں، کہ قطب جس کو غوث بھی کہا جاتا ہے، وہ شخص ہے جو ہر زمانے میں اس تمام عالم کے انسانوں میں اس کی اونٹنی بیٹھ جائے گی سے اللہ تعالیٰ کی ایک

خاص نظر کا محل ہوتا ہے جس پر فیض مرتب ہوتا ہے اور یہ شخص گویا کہ اللہ تعالیٰ اور اس کے بندوں کے درمیان واسطہ ہوتا ہے اپنے اندازے کے مطابق اپنے علاقے کے لوگوں پر اللہ کے خزانوں سے لیے ہوئے فیض کو تقسیم کرتا ہے، پھر فرمایا ہے، کہ **أوتاد**، چار ہیں اور ان کے ٹھکانے عالم کے چار اطراف یعنی مشرق، مغرب اور شمال، جنوب ہیں، ہر ایک کا ٹھکانہ اپنی جہت میں ہوتا ہے۔

ملا علی قاریؒ فرماتے ہیں: یہ وہ قطب ہیں جو انتظار میں کھڑے ہو کر قطب الأقطاب جس کو غوث اعظم کہا جاتا ہے، سے فیض حاصل کرتے ہیں، اور یہ چار قطب بمنزلہ وزراء کے ہیں، جو ایک وزیر اعظم کے حکم کے تحت کام کرتے ہیں، جب ان چار میں سے کوئی ایک فوت ہو جاتا ہے، اس کے بدلے میں دوسرا قطب بنا دیا جاتا ہے، پھر فرمایا ہے کہ اُبدال نیک لوگوں کی وہ جماعت ہے جن سے کائنات خالی نہیں ہوتی، جب ان میں سے کوئی ایک مر جاتا ہے، اللہ اس کی جگہ کسی اور کو مقرر کر دیتا ہے، اور ان کی تعداد سات ہے۔

ملا علی قاریؒ فرماتے ہیں: کہ لغوی اعتبار سے ابدال تو تمام رجال الغیب پر صادق آتا ہے، لیکن اُبدال کا ایک اور معنی گزر چکا ہے، پس ابدال کو اس معنی پر محمول کرنا اولیٰ ہے، اور شاید ان کی کثرت کی وجہ سے ان کو اس کے ساتھ خاص کر دیا گیا ہو۔

یا اس وجہ سے کہ ان کے غلبہ کی وجہ سے ان میں کثرت سے بدَل آتے رہتے ہوں، کیونکہ اُبدال تو چالیس ہوتے ہیں، جیسا کہ گذشتہ حدیث میں مذکور ہے یا ستر ہوتے ہیں، جیسا کہ صاحب قاموس نے لکھا ہے۔ چنانچہ شیخ زکریاؒ کا یہ قول کہ ''وہ سات ہیں'' وہم پر مبنی ہے۔

پھر شیخ زکریاؒ فرماتے ہیں، نقباء وہ لوگ ہیں، جو ''جی'' (نفوس) کے راز نکلواتے ہیں، اور ان کی تعداد تین سو ہوتی ہے۔

ملا علی قاریؒ فرماتے ہیں، شاید انہوں نے یہ معنی '' نقب'' بمعنی '' ثقب'' سے لیا ہو۔ جبکہ زیادہ ظاہر یہ ہے کہ نقباء نقیب کی جمع ہے، اور نقیب اس شخص کو کہا جاتا ہے جو قوم کے ہر مسئلہ یں حاضر ہوتا ہے، اور اپنی قوم کے مسائل کی نگرانی کرتا ہے، اور ضامن ہوتا ہے، جیسا کہ قاموس میں لکھا ہے اور اس معنی میں یہ لفظ ارشاد باری ﴿**وبعثنا منهم اثنى عشر نقيبا**﴾ [المائدۃ:۱۲] ''اور ہم نے ان میں سے بارہ سردار مقرر کئے'' میں وارد ہوا ہے آیت کا مطلب یہ کہ ہر جماعت میں سے ایک ایسے شخص کو بھیجا جو ان کے احوال کی نگرانی اور تفتیش کرتا تھا۔

یا مطلب یہ کہ وہ شخص اپنی اس جماعت کے ہر اس بات کی کفالت کرتا تھا جو وہ لوگ بتاتے اور معاہدہ کرتے، جیسا کہ بیضاویؒ میں لکھا ہے۔ بظاہر یہ لوگ پانچ سو کی تعداد میں ہوتے ہیں، جیسا کہ حدیث میں گزر گیا۔

پھر شیخ زکریاؒ نے فرمایا کہ ''**النجباء**'' وہ لوگ ہیں، جو انسانوں کا بوجھ اٹھانے میں مشغول رہتے ہیں، اور ان کی تعداد چالیس ہوتی ہے۔ ملا علی قاریؒ فرماتے ہیں، شاید انہوں نے یہ معنی لغت سے لیا ہے کیونکہ قاموس میں لکھا ہے، **ناقة نجيب ونجيبة** اور اس کی جمع **نجائب** آتی ہے لیکن اس کے بارے میں بھی زیادہ مناسب یہ ہے کہ نجیب ہے۔ اس کی جمع '' **نجباء**'' آتی ہے۔ '' **المنتجب** '' بمعنی '' **المختار**'' (چنیدہ برگزیدہ) اور '' **نجائب القرآن**'' بمعنی '' **أفضل القرآن**'' قرآن

کریم کے افضل ترین مقامات)

ابن عساکرؒ نے حضرت ابن مسعودؓ سے ایک مرفوع حدیث نقل کی ہے:

''اللہ تعالیٰ کیلئے بندوں میں سے تین سو خاص بندے ہیں، جن کے دل حضرت آدم علیہ السلام کے دل جیسے ہیں، اور چالیس ایسے خاص بندے ہیں جن کے دل حضرت موسیٰ علیہ السلام کے دل جیسے ہیں، اور سات ایسے خاص بندے ہیں، جن کے دل ابراہیم علیہ السلام کے دل جیسے ہیں، اور پانچ ایسے خاص بندے ہیں جن کے دل حضرت کے دل جیسے ہیں، اور تین ایسے خاص بندے ہیں، جن کے دل حضرت میکائیل علیہ السلام کے دل جیسے ہیں، اور ایک ایسا خاص بندہ ہے جس کا دل حضرت اسرافیل علیہ السلام کے دل جیسا ہے، جب یہ ایک خاص بندہ مرجاتا ہے تو ان تین خاص بندوں میں سے کوئی ایک اس کی جگہ مقرر ہو جاتا ہے، اور جب ان تین خاص بندوں میں سے کوئی ایک مرجاتا ہے، تو اُن پانچ میں سے کوئی ایک اُس کی جگہ مقررر کر دیا جاتا ہے، اور جب اُن پانچ خاص بندوں میں سے کوئی مر جاتا ہے، تو اُن سات بندوں میں سے کوئی ایک اُس کی جگہ مقرر کر دیا جاتا ہے، اور جب ان سات میں سے کوئی مر جاتا ہے، تو اُن چالیس میں سے کوئی اس کی جگہ مقرر کر دیا جاتا ہے، اور جب اُن چالیس میں سے کوئی مرجاتا ہے، تو تین سو میں سے کوئی اس کی جگہ مقرر کر دیا جاتا ہے اور جب اُن تین سو میں سے کوئی ایک مرجاتا ہے، تو باقی عام انسانوں میں سے کوئی ایک اس کی جگہ مقرر کر دیا جاتا ہے، ان لوگوں کی برکت سے اللہ اس امت سے مصیبت کو اُٹھا لیتا ہے۔ انتہی

ملا علی قاریؒ فرماتے ہیں، اللہ کے فضل و کرم اور بہت بڑی سخاوت سے امید ہے کہ جب ان بلند مراتب میں حلول ہو تو مجھے بھی بطریق بدل مقرر کر دے اگرچہ عوام کے درجہ سے بڑھا کر خواص کے کم تر درجہ تک کیوں نہ ہو، اور یہ نعمت حسن خاتمہ کی ایک بڑی نعمت سمیت عطاء فرمادے۔

یہ حدیث اس احتمال پر بھی دلالت کرتی ہے جو ہم نے ذکر کر دی کہ یہ ابدال خاص قسم کے ابدال نہیں ہیں، بلکہ اچھے احوال والے عام انسان بھی مراد ہو سکتے ہیں۔

نیز اس حدیث میں یہ ذکر نہیں کیا گیا کہ کوئی ایسا شخص بھی ہے جس کا دل حضور علیہ السلام کے دل اطہر جیسا ہے، اس میں تنبیہ ہے اس بات پر کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے مخلوقات میں حضور علیہ السلام کے قلب اطہر سے زیادہ اشرف، اکرم اور پاکیزہ کوئی دل پیدا نہیں کیا۔

نیز اس حدیث سے انسانوں کے خواص پر فرشتوں کے خواص کی فضیلت معلوم ہوتی ہے، اسی طرح حضرت میکائیل اور اسرافیل علیہما السلام کا حضرت جبرائیل علیہ السلام سے افضل ہونا معلوم ہوتا ہے، جبکہ جمہور کی رائے اس کے خلاف ہے۔ واللہ اعلم۔

عارف ہمدانی شیخ علاء الدولہؒ نے "العروة الوثقى" میں لکھا ہے: کہ ''ابدال'' بدلاء سبعہ میں سے ہے' جیسا کہ آنحضرت ﷺ نے خبر دی ہے کہ وہ ان سات میں سے ہوگا اور ان کا سردار ہوگا۔

ملا علی قاریؒ فرماتے ہیں، کہ اس حدیث کی سند کا ثقہ راویوں پر مشتمل ہونا ضروری ہے۔ نیز عارف صمدانی شیخ علاء الدولہ فرماتے ہیں، کہ حضور علیہ السلام کے زمانے میں قطب اویس قرنیؓ کے چچا عصامؒ تھے، ان کے مناسب تھا کہ کہتے انی لاجد نفس الرحمن من قبل الیمن' (مجھے یمن کی جانب سے نفسِ رحمانی محسوس ہوتی ہے)۔ عصامؒ اللہ کی تجلی کا مظہر تھے، جیسا کہ حضور علیہ السلام اس الٰہی تجلی کا ایک خاص مظہر تھے، جو اس ذات یعنی اللہ کے ساتھ مخصوص ہے۔

ملا علی قاریؒ فرماتے ہیں، کہ عارف صمدانی شیخ علاء الدولہؒ کے اس کلام سے اس گذشتہ بات کی تائید ہو جاتی ہے کہ حضور علیہ السلام کے ساتھ آپ کے مقام اعظم میں کوئی بھی شریک نہیں، لیکن عصامؒ کے قطب ہونے میں بہت بڑا اشکال ہے۔ جبکہ ان کے بارے میں یہ بھی معلوم نہیں کہ صحابہ میں سے تھے یا تابعین میں سے بخلاف اویس قرنی، کہ ان کے بارے میں تو حدیث میں وارد ہوا ہے کہ تابعین کے سردار ہیں

وہ اشکال یہ ہے کہ جب حضور علیہ السلام کے زمانے میں خلفاء اربعہ موجود تھے، اور تمام صحابہ موجود تھے جو باجماع اُمت انبیاء کے بعد افضل ترین انسان ہیں، پھر قطبیت کا یہ بڑا مقام عصامؒ کو کیسے ملا (اور صحابہ کی مقدس ہستیوں کو کیوں نہیں ملا؟)۔ نیز علامہ یافعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ قطب جس کو غوث کہتے ہیں، کے احوال عوام اور خواص سے اللہ کی طرف سے چھپا دیئے جاتے ہیں، چنانچہ ملا علی قاریؒ فرماتے ہیں، یہ بات غالب احوال کے اعتبار سے درست ہے، چونکہ سید عبد القادرؒ کا قطب ہونا مسلّم ہے۔

یاد رہے کہ کئی سارے لوگوں نے مہدی ہونے کا دعویٰ کیا ہے۔ بعض لوگ تو وہ ہیں، جنہوں نے لغوی معنیٰ ''ہدایت یافتہ'' مراد لیتے ہوئے دعویٰ کیا ہے، چنانچہ ان پر کوئی اشکال نہیں، لیکن بعض ایسے لوگ بھی ہیں جنہوں نے مہدی ہونے کا جھوٹا دعویٰ کیا، اور اس پر ان کے ساتھ کمینہ لوگ جمع ہو گئے جنہوں نے مختلف شہروں اور ملکوں میں فساد پھیلایا، چنانچہ ان کو قتل کر دیا گیا، اور لوگوں کو اس سے راحت مل گئی۔

بعض نے واقعہ محول کو دیکھا تو ان کے شیخ نے اس کو ''آفاق'' پر محمول کیا۔ حالانکہ حق یہ تھا کہ اس واقعہ حال کو ''انفس'' پر محمول کرتے تاکہ اختلاف نہ ہوتا (اس کے آگے ملا علی قاری رحمہ اللہ لکھتے ہیں):

ومنهم من رأى واقعة الحال فحملها شيخه على الآفاق، وكان حقه أن يحملها على الأنفس لئلا يحصل الاختلاف. وهو رئيس النور بخيشة احد مشايخ الكبروية.

ہندوستان میں گمراہ لوگوں کی ایک جماعت ظاہر ہوئی ہے، جو اپنے آپ کو مہدویہ کہلاتی ہے، یہ لوگ عملی ریاضتیں اور سفلی کش کیا کرتے تھے، اور یہ لوگ نِرے جاہل تھے، ان کا یہ عقیدہ تھا، کہ ''مہدی موعود'' ان کا شیخ تھا جو ظاہر ہوا، پھر وفات پا گیا اور خراسان کے ایک شہر میں دفن کر دیا گیا، ان کے علاوہ کوئی اور مہدی نہیں آئے گا، اور ان کی ایک بڑی کھلی گمراہی یہ بھی تھی، کہ ان کا یہ عقیدہ تھا کہ جو شخص ان کا یہ عقیدہ نہ رکھے وہ کافر ہے۔

ملا علی قاریؒ فرماتے ہیں: ہمارے شیخ عارف باللہ شیخ علی متقیؒ نے امام مہدی علیہ السلام کی تمام علامات کو ایک رسالہ میں جمع

کیے ہیں جو علامہ سیوطیؒ کے رسالہ سے ماخوذ ہیں، اور مکہ میں موجود چاروں مسلک کے علماء سے استفتاء کیا، اور تمام نے ان لوگوں کو قتل کرنا، ہر اس شخص کیلئے واجب قرار دیا جو ان لوگوں کو قتل کرنے کی قدرت رکھے۔

اسی طرح شیعہ میں سے امامیہ فرقے کا یہ عقیدہ بھی بالکل باطل ہے، کہ "مہدی موعود" دراصل محمد بن حسن عسکری ہیں، جن کا انتقال نہیں ہوا، بلکہ وہ عوام وخواص کی نظروں سے اوجھل ہو گئے، اور وہ امام زمانہ ہیں، اور اپنے وقت پر ظاہر ہو کر اپنے ملک کا حاکم بن جائے گا، لیکن یہ بات اہل سنت والجماعت کے نزدیک مردود ہے، اور اس کے دلائل علم کلام کی کتابوں میں مکمل طور پر موجود ہیں، جبکہ عارف صمدانی شیخ علاء الدولہ نے اپنی کتاب "العروة الوثقى" میں اس بات کی تصریح کی ہے:

> محمد بن حسن عسکری جب لوگوں کی آنکھوں سے اوجھل ہو گئے تو شروع میں ابدال کی جماعت میں داخل ہو گئے اور ان میں ایک عرصہ تک رہے، یہاں تک کہ ان ابدال میں سے کوئی باقی نہ رہا تو یہ ابدال کے سردار بنے، پھر ابطال کے دارہ میں یعنی چالیس مخصوص افراد کی جماعت میں داخل ہو گئے، اور ان میں ایک عرصہ تک رہے، یہاں تک کہ جب ان اُبطال میں سے بھی کوئی باقی نہ رہا تو یہ اُبطال کے سردار بن گئے اور سیاح، یعنی سات مخصوص بندوں کی جماعت میں داخل ہو گئے اور ان میں ایک عرصہ تک رہے، یہاں تک کہ جب ان میں سے کوئی باقی نہ رہا تو سیاح کے سردار بن گئے، اور اوتاد یعنی پانچ مخصوص بندوں کی جماعت میں داخل ہو گئے اور ان کے درمیان ایک عرصہ تک رہے یہاں تک کہ ان میں سے جب کوئی باقی نہ رہا تو یہ اوتاد کے سردار بن گئے اور اُفذاذ یعنی اللہ کے مخصوص تین بندوں کی جماعت میں داخل ہو گئے اور ان کے درمیان ایک عرصہ تک رہے، یہاں تک کہ جب ان میں سے کوئی باقی نہ رہا، تو یہ افذاذ کے سردار بن گئے، پھر جب قطب کے درجہ پر فائز علی بن حسن بغدادی فوت ہو گئے، اور بغداد میں مقام شونیز میں دفن کر دیئے گئے، اور اپنی زندگی میں انیس/۱۹ برس تک قطب کے درجہ پر رہے، تو یہ محمد بن حسن عسکری قطب کے درجہ پر فائز ہوئے، اور اس عالی مرتبہ کے ساتھ مشرف ہوئے، اور اس کے بعد دنیا سے رحلت فرما گئے۔
> انتہی

عارف صمدانی شیخ علاء الدین کا یہ تفصیلی قول مولانا عبدالرحمٰن جامیؒ نے اپنی کسی کتاب میں ان سے نقل کیا ہے اور عقیدہ کے سلسلہ میں اس پر اعتماد کیا ہے، لیکن یہ بات مخفی نہیں ہے کہ شیخ علاء الدولہ تو محمد بن حسن عسکریؒ کے بہت بعد میں آئے تھے، یہ قول شیخ علاء الدولہ کے زمانے میں موجود شخص کی طرف بھی منسوب نہیں بظاہر مولانا عبدالرحمٰن جامی نے یہ قول بطریق کشف کے نقل کیا ہے، اسی طرح ان کے علاوہ دوسروں سے بھی کوئی صورت ممکن نہیں سوائے اسی کے، اور یہ بات مخفی نہ رہے کہ عقائد کی بنیاد دلائل یقینیہ پر ہوتی ہے، اور اس جیسی بات کہ جس کی بنیاد کشف پر ہو، ظنی دلیل بننے کی صلاحیت نہیں رکھتی، اور اسی وجہ سے فقہاء کرام نے فقہی فروع میں صوفیائے کرام کے ان اقوال کا کوئی اعتبار نہیں کیا جن کا تعلق کشف سے ہو یا خواب کی حالت سے ہو اگرچہ حضور علیہ السلام کی طرف منسوب کیوں نہ ہوں۔ لیکن امام مہدیؑ کے احوال پر مشتمل وہ احادیث جن کو علامہ سیوطیؒ نے جمع کیا ہے، شیعہ کے باطل اور فاسد عقائد کی تردید کرتی ہیں، بلکہ شیعہ نے تو اپنے ایمان کی تمامیت اور اسلام کی بنیاد اس بات پر رکھی ہے کہ محمد بن حسن عسکری زندہ ہیں، قائم ومنتظر ہیں حضرت یہ وہی مہدی موعود ہے۔ جن کا ذکر صاحب مقام محمود حوض مورود کی

زبان مبارک نے کیا ہے۔

تخریج وتوضیح: حافظ سیوطیؒ، ابوداؤد پر اپنی تعلیق میں فرماتے ہیں، کہ ابدال کا ذکر صحاح ستہ میں نہیں ہوا، صرف ابو داؤد کی اس حدیث میں ہوا جو یہاں منقول ہے، اس حدیث کو حاکم نے بھی نقل کیا ہے اور اس کو صحیح قرار دیا۔

۵۴۵۷ : وَعَنْ اَبِیْ سَعِیْدٍ قَالَ ذَکَرَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ بَلَاءً یُصِیْبُ هٰذِهِ الْاُمَّةَ حَتّٰی لَا یَجِدُ الرَّجُلُ مَلْجَأً یَلْجَأُ اِلَیْهِ مِنَ الظُّلْمِ فَیَبْعَثُ اللّٰهُ رَجُلًا مِّنْ عِتْرَتِیْ وَاَهْلِ بَیْتِیْ فَیَمْلَأُ بِهِ الْاَرْضَ قِسْطًا وَّ عَدْلًا کَمَا مُلِئَتْ ظُلْمًا وَجَوْرًا یَرْضٰی عَنْهُ سَاکِنُ السَّمَآءِ وَسَاکِنُ الْاَرْضِ لَا تَدَعُ السَّمَآءُ مِنْ قَطْرِهَا شَیْئًا اِلَّا صَبَّتْهُ مِدْرَارًا وَلَا تَدَعُ الْاَرْضُ مِنْ نَبَاتِهَا شَیْئًا اِلَّا اَخْرَجَتْهُ حَتّٰی تَتَمَنَّی الْاَحْیَآءُ الْاَمْوَاتَ یَعِیْشُ فِیْ ذٰلِكَ سَبْعَ سِنِیْنَ اَوْ ثَمَانَ سِنِیْنَ اَوْ تِسْعَ سِنِیْنَ .

اخرجه احمدفی المسند ۳۷/۳ والحاکم فی المستدرك ۴/۴۶۵۔

ترجمہ: حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا کہ (ایک روز) رسول اللہ ﷺ نے ایک بلا وآفت کا تذکرہ فرمایا جو اس امت کو اپنی گرفت میں لے لیگی یہاں تک کہ کسی شخص کو کوئی ایسی جائے پناہ نہیں ملے گی جہاں وہ (اس آفت وبلا کی شکل میں ظاہر ہونے والے) ظلم وستم سے بچاؤ حاصل کر سکے (پھر جب ظلم وستم اور ناانصافی کا وہ دور اپنی حد کو پار کر جائے گا تو) اللہ تعالیٰ میری قوم یا ملت اور میرے اہل بیت میں سے ایک ایسے آدمی کو (کہ جو عدل وانصاف اور علم ودانائی میں یکتا ہوگا اور جو ''مہدی'' کے لقب سے ملقب ہوگا' مسلمانوں کا قائد بنا کر) بھیجے گا' وہ شخص روئے زمین کو اس طرح عدل وانصاف سے کو پھیلا دے گا جس طرح پہلے وہ ظلم وستم سے لبریز تھی' اس سے آسمان والے بھی خوش ہوں گے (یعنی فرشتے اور انبیاء (کی روحیں) اور (تمام) زمین کے رہنے والے بھی راضی و مطمئن ہوں گے (خواہ وہ کسی جنس اور نوع سے تعلق رکھتے ہوں' یہاں تک کہ جنگل کے جانور اور پانی کی مچھلیاں بھی) آسمان اپنی بارش کے قطروں میں سے کچھ باقی رکھے بغیر موسلا دھار (پانی) برسائے گا اور زمین اپنی نباتات میں سے کچھ باقی رہے بغیر سب کچھ اُگا ڈالے گی یہاں تک کہ زندہ لوگ مرجانے والوں کے متعلق آرزو کرنے لگیں گے وہ شخص (یعنی مہدیؑ) اس خوشحال وکامرانی کے سات برس یا آٹھ برس یا نو برس باحیات گا''۔

تشریح: قوله: ذکر رسول الله ﷺ ...... ملئت ظلما وجورا:

بلاء: (تنوین تعظیم کیلئے ہے)۔ بلاء عظیما

من الظلم: (جار مجرور کا متعلق محذوف ہے) ای ''وبلاءً ناشئا من الظلم''.

فیملأبه: باء سببت کے لئے ہے ای: ''بسبب وجود ذالك الرجل''. (یعنی اس آدمی کے وجود کے سبب سے اللہ تعالیٰ ......)

الارض: تمام کی تمام زمین مراد ہے۔

فیملأ: اور ایک ضعیف نسخہ میں ''تملا'': فعل مجہول کے صیغہ مونث کے ساتھ وارد ہوا ہے۔ چنانچہ ''الارض'' مرفوع ہوگا۔

قوله: یرضی عنه ساکن ....:

قسطا: نسبت سے تمیز واقع ہو رہا ہے۔ اور یہ جملہ مستأنفہ ہے۔

مدرارا: فائق میں لکھا ہے، المدرار بمعنی ''الكثير الدر'' اور ''مفعال'' کے وزن میں مذکر و مونث برابر ہیں۔ چنانچہ کہا جاتا ہے: امرأة معطار مطفال' اور مررارا ''السماء'' سے حال ہونے کی بناء پر منصوب ہے یعنی ''صبته'' کے فاعل سے حال ہے۔

نباتها: (مضاف محذوف ہے) ای: ''من انواع نباتاتها'' (یعنی مختلف قسم کی نباتات میں سے کچھ نہیں چھوڑے گی۔)

الأحياء: ہمزہ کے فتحہ کے ساتھ ''الحی'' کی جمع ہے اور مرفوع ہے، اس کو ہمزہ کے کسرہ کے ساتھ اور منصوب پڑھنا غلط ہے۔

الأموات: یہ منصوب ہے اور اس کے برعکس (''الأحياء'' کو منصوب اور ''الأموات'' کو مرفوع پڑھنا) غلط ہے۔

علامہ تورپشتی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں، ''الأحياء'' فاعل ہونے کی بناء پر مرفوع ہے، اور کلام میں حذف ہے: ای ''یتمنون حياة الأموات'' او ''يتمنون كونهم أحياء'' یعنی زندہ لوگ مردوں کی زندگی یا ان کے زندہ ہو جانے کی تمنا کریں گے، اور یہ تمنا اس لئے کریں گے تا کہ وہ خیر اور امن دیکھ لیں، جس امن و خیر کی حالت میں یہ لوگ ہیں اور وہ ان کے ساتھ شریک ہو جائیں، اور جس نے ''الاحیاء'' کو باب افعال کا مصدر بنا کر منصوب پڑھا ہے، اور ''یتمنی'' کا فاعل ''الأموات'' کو قرار دیا ہے، تو یہ بات محال ہے۔

فی ذالك: ''ذالك'' سے مذکورہ بالا عدل اور مختلف قسم کی خیروں کی طرف اشارہ ہے۔

سبع سنين: اکثر روایات میں اسی مقدار کو یقین کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔

او ثمان سنين: یہ راوی کا شک ہے۔

قوله: رواه :

مشکوۃ کے اصل نسخہ میں اس مقام پر خالی جگہ چھوڑ دی گئی ہے، اور بعد یہ میں عبارت شامل کی گئی: ''رواه الحاكم فی مستدركه وقال صحيح'' اس کو امام حاکم نے اپنی مستدرک میں روایت کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ حدیث صحیح ہے۔ لیکن جزری نے نقل کیا ہے کہ علامہ ذہبیؒ نے فرمایا: اسناده مظلم. (اس کی سند تاریک ہے۔)

۵۴۵۸ : وَعَنْ عَلِيٍّ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَخْرُجُ رَجُلٌ مِّنْ وَّرَاءِ النَّهْرِ يُقَالُ لَهُ الْحَارِثُ حَرَّاثٌ عَلٰى مُقَدِّمَتِهِ رَجُلٌ يُقَالُ لَهُ مَنْصُوْرٌ يُوَطِّنُ اَوْ يُمَكِّنُ لِاٰلِ مُحَمَّدٍ كَمَا مَكَّنَتْ

قُرَيْشٌ لِرَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَجَبَ عَلٰى كُلِّ مُؤْمِنٍ نَصْرُهُ اَوْ قَالَ اِجَابَتُهُ .

(رواہ ابو داود)

اخرجه ابو داوٗد فی المسند ٤٧٧/٤ حدیث رقم ٤٢٩٠۔

ترجمہ: ''حضرت علی رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''ماوراء النہر (کے کسی شہر میں ایک شخص ظاہر ہوگا جس کو حارث حرّاث کے نام دیا جائے گا' دستے کے لشکر کے اگلے حصہ پر ایک شخص ہوگا جس کا نام منصور ہوگا' وہ حارث' آلِ محمد ﷺ کو جگہ یا ٹھکانہ دے گا جیسا کہ اللہ کے رسول ﷺ کو قریش کے لوگوں نے ٹھکانہ دیا تھا (پس) ہر مسلمان پر واجب ہوگا کہ اس شخص کی موافقت ونصرت کرے یا یہ فرمایا کہ (ہر مسلمان پر واجب ہوگا کہ) اس شخص کی اطاعت کرے''۔ (ابوداؤد)

تشریح: قوله: يخرج رجل من وراء النهر...... يقال له منصور:

حراث براء کی تشدید کے ساتھ صفت ہے، بمعنی زراع (کھیتی کرنے والا۔)

على مقدمته: (مضاف محذوف ہے) ''على مقدمة جيشه'' ہے، (اس کے لشکر کے اگلے حصہ پر۔)

منصور: اس شخص کا نام ہوگا، یا صفت ہوگی۔ بعض کا کہنا ہے، کہ منصور سے مراد ابو منصور ماتریدیؒ ہیں ایک مشہور جلیل القدر امام ہیں اور عقائد میں حنفیہ کے اصول کا مدار ان ہی پر ہے، لیکن اس حدیث کو اس باب میں ذکر کرنا مناسب نہیں ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

مزید یہ کہ اس باب کا عنوان ''اشراط الساعة'' ہے، اور ''قیامت کی علامات'' امام مہدیؒ کے نزول کے علاوہ دوسری علامات کو بھی شامل ہیں۔ خواجہ عبید اللہ سمرقندی نقشبندی فرماتے ہیں کہ منصور ہی حضرت خضر علیہ السلام ہیں۔ لیکن اس جیسی بات یا تو کسی نقلی دلیل سے کہی جاسکتی ہے، یا کشف کی بنیاد پر کہی گئی ہے۔

قوله: يوطن أويمكن......لرسول الله ﷺ:

يوطن: ''توطين'' کا اصل معنی ہے ''کسی کو کوئی ٹھکانہ یا مکان دینا''

او يمكن: ''او''، راوی کی طرف سے شک کیلئے ہے اور اسی سے یہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿الذين ان مكناهم في الارض﴾ [الحج: ٤١]: ''اور یہ لوگ ایسے ہیں کہ اگر ہم ان کو دنیا میں حکومت دے دیں تو'' یا یہ۔ ''او'' واؤ کے معنی میں ہے، یعنی وہ شخص محمد ﷺ کی آل کو مال، خزانوں اور ہتھیار کی صورت میں اسباب مہیا کرے گا۔ اور اپنے لشکر کے ذریعے حکومت وخلافت کو قوی، مضبوط اور مستحکم بنائے گا۔

لآلِ محمد: آلِ محمد سے عمومی طور پر حضور علیہ السلام کی تمام ذریت مراد ہے، اور خصوصی طور پر امام مہدی مراد ہیں۔ یا لفظ ''آل'' زائد ہے، یعنی ''محمد'' مہدی مراد ہے۔

كما مكنت قريش: ''ما'' مصدریہ ہے ای: ''كتمكين قريش''. (قریش کے ٹھکانہ دینے کی طرح)

قریش کے وہ لوگ مراد ہیں جو ایمان لائے تھے، ابو طالب اگرچہ اہل سنت کے نزدیک ایمان نہیں لائے تھے، مگر ان کا شمار ان لوگوں میں ہے جنہوں نے حضور علیہ السلام کو ٹھکانہ دیا تھا۔

علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں: "یمکن لآلِ محمد ﷺ" سے مراد "زمین میں ٹھکانہ دینا ہے" جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿مَكَّنّٰهُمْ فِي الْاَرْضِ مَا لَمْ نُمَكِّنْ لَّكُمْ﴾ [الانعام:٦] "جن کو ہم نے دنیا میں ایسی قوت دی تھی کہ تم کو وہ قوت نہیں دی" یعنی کہ ہم نے ان کو مال میں کشادگی عطا فرمائی اور دشمنوں کے خلاف مدد و نصرت فرمائی۔

"کما مکنت قریش لرسول الله ﷺ" سے قریش کی وہ مدد و نصرت مراد ہے جو انہوں نے آخر میں کی تھی چونکہ شروع زمانے میں اگرچہ قریش نے حضور علیہ السلام کو مکہ سے نکالا تھا لیکن باقی ماندہ قریش اور ان کی اولاد نے جب اسلام قبول کر لیا، تو انہوں نے حضور علیہ السلام کو اور آپ کے صحابہ کو ٹھکانہ دیا اور آپؐ کی وفات کے بعد بھی صحابہ کرامؓ کی نصرت کی۔ (انتہیٰ)

یہ بات مخفی نہیں کہ آیت میں "تمکین" سے مراد وہ تمکین نہیں ہے جو حدیث میں مذکور ہے، مزید یہ کہ "تمکین" مشبہ سے مراد ابتدائی تمکین ہے لہٰذا شبہ کو آخر امر پر محمول کرنا درست ہیں۔

علامہ طیبیؒ کے الفاظ "قریش نے حضور علیہ السلام کو مکہ سے نکالا تھا" سے بظاہر حضور علیہ السلام کی توہین کا وہم ہوتا ہے، لیکن ایسا نہیں، اس لئے بعض حضرات نے اس شخص کے کفر کا فتویٰ دیا ہے جو مطلقاً اس طرح کہے۔ اور اس کی تاویل یہ ہے کہ کفار مکہ آپ کے مکہ سے مدینہ ہجرت کر کے جانے کا سبب بنے، چنانچہ ارشاد باری: ﴿وَكَاَيِّنْ مِّنْ قَرْيَةٍ هِيَ اَشَدُّ قُوَّةً مِّنْ قَرْيَتِكَ الَّتِيْٓ اَخْرَجَتْكَ﴾ [محمد:۱۳] "اور بہت سے بستیاں ایسی تھیں جو قوت میں آپ کی اس بستی سے بڑھی ہوئی تھیں جس کے رہنے والوں نے اپنے کو گھر سے بے گھر کر دیا ہے اس میں مضاف محذوف ہے، اور اس کے احکام کا اجزاء مضاف الیہ اور اخراج پر کیا ہے۔ باعتبار سبب کے ہے جیسا کہ بیضاویؒ نے لکھا ہے۔

قوله: وجب نصره ....:

ضمیر مجرور کا مرجع "الحارث" ہے، ظاہر تو یہی ہے، البتہ مجرور کا مرجع منصور قرار دینا ابلغ ہے، یا یہ دونوں مذکورہ اشخاص کی طرف لوٹ رہی ہے، یا مہدی کی طرف لوٹ رہی ہے، جس پر مقام قرینہ ہے۔

او قال اجابته: راوی کو شک ہے، اور "اجابة" سے مراد دعوت قبول کرنا اور نصرت کیلئے تیار ہونا ہے۔

توضیح: امام ابوداؤد نے اس حدیث کو "باب مہدی" میں نقل کیا ہے، کیونکہ متبادر یہی ہے، یا ان کے نزدیک اس پر کوئی ظاہری دلیل قائم ہوگی۔

اسنادی حیثیت: سیدؒ فرماتے ہیں کہ اس کی سند میں انقطاع ہے۔

۵۴۵۹: وَعَنْ اَبِیْ سَعِیْدِ ِالْخُدْرِیِّ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَالَّذِیْ نَفْسِیْ بِيَدِهٖ لَا تَقُوْمُ السَّاعَةُ حَتّٰى تُكَلِّمَ السِّبَاعُ الْاِنْسَ وَحَتّٰى تُكَلِّمَ الرَّجُلَ عَذَبَةُ سَوْطِهٖ وَشِرَاكُ نَعْلِهٖ وَيُخْبِرَهٗ فَخِذُهٗ بِمَا اَحْدَثَ اَهْلُهٗ بَعْدَهٗ (رواه الترمذی)

اخرجه الترمذی فی السنن ٤ / ٤١٣ حدیث رقم ٢١٨١ واحمد فی المسند ٣ / ٨٤

ترجمہ: ''حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''قسم ہے اس ذات عالی کی جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے' وقوع قیامت اس وقت تک نہیں ہو سکے گا جب تک درندے انسانوں سے گفتگو کرنے لگیں گے اور جب تک آدمی کے کوڑے (چابک) کا پھندنا اور اس کے جوتے کا تسمہ اس سے ہمکلام نہ ہونے لگے گا اور (اسی پر بس نہیں بلکہ) انسان کی ران اس کو اطلاع نہ ہونے لگے گا کہ اس کے اہل و عیال نے اس کی عدم موجودگی میں کون سے نئے کام اور کیا نئی بات کی ہے''۔ (ترمذی)

تشریح: قوله: والذی بیده ....:

نفسی السباع: درندے مثلاً شیر یا شکاری پرندے مثلاً باز وغیرہ مراد ہیں۔ دونوں مراد لینے میں کوئی مانع نہیں ہے۔

الانس: جنس انسان مراد ہے چاہے کافر ہو چاہے مسلمان ہو۔

وحتی تکلم الرجل عذبة سوطه: اس عبارت میں مفعول کو مقدم کرنا ''تفنن'' کیلئے ہے، یا یہ بتانے کیلئے کہ مفعول کو مقدم کرنا بھی جائز ہے، مزید برآں اس صورت میں فاعل کی تاخیر واجب ہے۔

عذبة: عین اور ذال کے فتحہ کے ساتھ' بمعنی کنارہ، جیسا کہ قاموس وغیرہ میں ہے۔ اور ایک شارحؒ فرماتے ہیں کہ ''عذبة'' کا معنی ہے کوڑے کا پھندنا، جو بعض اوقات کوڑے کے سرے پر ہوتا، اور اس سے گھوڑے کو مار کر ہانکا جاتا ہے۔

''عذبة'' عذب الماء، سے ماخوذ ہے، کیونکہ کوڑے کے مارنے سے گھوڑا اچھی طرح چلنے لگتا ہے، اور سوار کو راحت ملتی ہے۔

بعض کا کہنا ہے کہ ''العذاب'' سے ماخوذ ہے، کیونکہ اس سے گھوڑے کو سزا دی جاتی ہے، اور گھوڑا چلنے پر راضی ہو جاتا ہے، اور اس سے گھوڑے والا گھوڑے کی عادت کی اصلاح کرتا ہے۔

تخریج: اسی طرح حاکم نے بھی اس روایت کو نقل کیا ہے، اور اس کو صحیح قرار دیا ہے۔

۵۴۶۰: وَعَنْ اَبِیْ قَتَادَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اَلْاٰیَاتُ بَعْدَ الْمِائَتَیْنِ.

(رواه ابن ماجة)

اخرجه ابن ماجه فی السنن ٢ / ١٣٤٨ حدیث رقم ٤٠٥٧

ترجمہ: ''حضرت ابوقتادہ رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''علامات قیامت دو سو سال کے بعد ظہور پزیر ہوں گی''۔ (ابن ماجہ)

تشریح: یعنی قیامت کی علامتیں ۲۰۰ سال بعد کامل طور پر ظاہر ہونگی۔

ان دوسو ۲۰۰ سالوں کی ابتداء کب سے ہے؟ اس سے کئی احتمال ہیں:

❶ ہجرت نبوی کے وقت سے مراد ہے۔

۲ اسلام کو شان و شوکت حاصل ہونے کے وقت سے ہے۔

۳ حضور علیہ السلام کی وفات سے اس کی ابتداء مراد ہے۔

۴ یہ بھی احتمال ہے کہ ''المائتین'' میں الف لام عہد کیلئے ہو، اور'' مائتین'' سے مراد ہزار سال کے بعد دوسو سال ہوں۔ اور یہ وہ وقت ہوگا، جب قیامت کی چھوٹی نشانیاں ظاہر ہو چکی ہونگی اور امام مہدی کے ظہور، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ظہور، اور دوسری پے در پے علامات مثلاً مغرب سے سورج کے طلوع ہونے، دابۃ الأرض کے نکلنے، اور یاجوج ماجوج کے نکلنے کا زمانہ قریب ہو چکا ہوگا۔

علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں ''الآیات بعد المائتین'' مبتدا خبر ہیں (اور مضاف محذوف ہے) ای ''تتابع الآیات بعد المائتین'' ہے، (یعنی قیامت کی نشانیوں کا پے در پے ظاہر ہونا دوسو/۲۰۰ سالوں کے بعد ہوگا۔) اور اس کی تائید گذشتہ حدیث کے جملے ''و آیات تتابع کنظام قطع سلکه فتتابع' سے ہو رہی ہے. بظاہر دوسو/۲۰۰ سالوں کا اعتبار اس حدیث کے بیان کے بعد سے ہے (انتہی) اور عقل مند لوگوں کیلئے اس توجیہ کا غیر واضح ہونا پوشیدہ نہیں۔

تخریج: اسی طرح حاکم نے مستدرک حاکم میں بھی نقل کیا ہے۔

۵۴۶۱ : وَعَنْ ثَوْبَانَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذَا رَاَيْتُمُ الرَّايَاتِ السُّوْدَ قَدْ جَآءَتْ مِنْ قِبَلِ خُرَاسَانَ فَأْتُوْهَا فَاِنَّ فِيْهَا خَلِيْفَةَ اللّٰهِ الْمَهْدِيُّ۔

رَوَاهُ احمد وَالْبَيْهَقِيُّ فِيْ دَلَائِلِ النُّبُوَّةِ

اخرجه الترمذی فی السنن ٤/٤٦٠حدیث رقم ٢٢٦٩ وابن ماجه فی السنن ١٣٦٧/٢حدیث رقم ٤٠٨٤ والبیهقی فی دلائل النبوة ٥١٦/٦

ترجمہ: ''حضرت ثوبانؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''جب ایسے سیاہ جھنڈوں کو دیکھو جو خراسان کی جانب آئے ہوں تو تم ان کا استقبال کرنا' کیونکہ اس میں اللہ تعالیٰ کے خلیفہ حضرت مہدی ہوں گے''۔ اس روایت کو امام احمدؒ نے اور دلائل النبوۃ میں بیہقی نے نقل کیا ہے''۔

تشریح: قوله: اذا رایتم...... فاتوھا:

رأیتم: اس سے عام خطاب مقصود ہے اور'' رؤیة'' سے رؤیت بصری مراد ہے۔

ممکن ہے کہ'' سواد'' خراسان کی جانب سے آنے والے مسلمانوں کے لشکروں کی کثرت سے کنایہ ہو، بظاہر یہ حارث اور منصور کے لشکر ہونگے۔

فاتوھا: ضمیر منصوب'' الرایات '' کی طرف راجع ہے، یعنی ان جھنڈوں کی طرف متوجہ ہو جانا اور ان کے حاملین کا استقبال کرنا اور ان لشکروں کے امیر کا حکم قبول کرنا۔

قوله: فان فیھا خلیفة الله المهدی:

چنانچہ یہ اس بات کے منافی نہیں ہے کہ امام مہدیؒ کا ابتدائی ظہور حرمین شریفین میں ہوگا۔

یہ بظاہر اس بات کے جواز پر دلالت کرتی ہے، کہ کوئی شخص اگر حق اور عدل کے راستے پر چلے تو اس کو "خلیفۃ اللہ" کہا جا سکتا ہے۔ حالانکہ پہلے اس کا ممنوع ہونا معلوم ہو چکا ہے، لیکن اس کی یہ تاویل بھی کی گئی ہے، کہ اس سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے انبیاء علیہم السلام کا خلیفہ مقرر کیا گیا ہے چنانچہ یہ صحیح ہے کہ اللہ کی طرف سے نامزد کو اللہ کی طرف منسوب کیا جا سکتا ہے اور اسی کی نظیر یہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ﴾[النساء: ۸۰]: "جس شخص نے رسول کی اطاعت کی اس نے اللہ تعالیٰ کی اطاعت کی"۔

تخریج: اسی طرح امام حاکم نے بھی اس حدیث کو اپنی کتاب مستدرک میں نقل کیا ہے۔ اور اس کو صحیح قرار دیا ہے۔

۵۴۶۲: وَعَنْ اَبِيْ اِسْحٰقَ قَالَ قَالَ عَلِيٌّ وَنَظَرَ اِلٰى ابْنِهِ الْحَسَنِ وَقَالَ اِنَّ ابْنِيْ هٰذَا سَيِّدٌ كَمَا سَمَّاهُ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَسَيَخْرُجُ مِنْ صُلْبِهِ رَجُلٌ يُسَمّٰى بِاسْمِ نَبِيِّكُمْ يُشْبِهُهٗ فِي الْخُلُقِ وَلَا يُشْبِهُهٗ فِي الْخَلْقِ ثُمَّ ذَكَرَ قِصَّةً يَمْلَاُ الْاَرْضَ عَدْلًا۔ (رواه ابوداود ولم يذكر القصة)

اخرجه ابو داؤد في السنن ٤٧٧/٤ حديث رقم ٤٢٩٠

ترجمہ: "ابو اسحاق رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اپنے لخت جگر حسن رضی اللہ عنہ کی طرف نگاہ ڈالی اور فرمایا کہ میرا یہ بیٹا سردار ہے جیسا کہ پیغمبر خدا نے بھی اس کو یہی فرمایا تھا' عنقریب اس کی نسل سے ایک شخص ظاہر ہوگا جس کا نام تمہارے نبی ﷺ کے نام کے موافق ہوگا' وہ باطنی سیرت یعنی اپنے اخلاق و کردار میں حضور ﷺ سے مشابہت رکھتا ہوگا گو ظاہری شکل و صورت میں آپ ﷺ کا ہم شکل نہیں ہوگا اس کے بعد حضرت علی رضی اللہ عنہ نے وہ باتیں بیان فرمائیں جن میں فرمایا گیا ہے کہ وہ شخص زمین پر عدل و انصاف کو پھیلا دے گا"۔ اس روایت کو ابوداؤدؒ نے نقل کیا ہے لیکن انہوں نے زمین کو عدل و انصاف سے بھر دینے والی بات کا تذکرہ نہیں فرمایا!"۔

تشریح: **قوله: وعن ابی اسحاق**: بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ ان سے ابو اسحاق سبیعی ہمدانی کوفی مراد ہیں۔

قوله: قال قال علی ونظر الی ابنه الحسن قال:

قال: یہ جملہ قول اور مقولہ کے درمیان جملہ معترضہ حالیہ ہے، اور دوبارہ لفظ "قال" تاکید کیلئے ذکر کیا، یا طوالت کے وہم سے۔

قوله: ان ابنی هذا ...... حضرت حسنؓ کی تخصیص کی طرف اشارہ کیا، تاکہ حضرت حسینؓ یا جنس ابن کا وہم نہ ہو۔

"**سيد كما سماه رسول الله ﷺ**": (جیسا کہ رسول کریم ﷺ نے اس کے بارے میں ارشاد فرمایا ہے) سے حضور علیہ السلام کی اس حدیث کی طرف اشارہ ہے جو آگے مناقب حسنؓ میں آئے گی: "**ان ابنی هذا سيد ولعل الله ان يصلح به بين فئتين عظيمتين من المسلمين**"

"میرا یہ بیٹا سردار ہے اور امید ہے کہ اللہ اس کے ذریعے مسلمانوں کی دو بڑی جماعتوں کے درمیان مصالحت کرائے"۔

"الخلق": خاء مضموم ہے، اور لام کو مضموم ساکن دونوں طرح پڑھنا درست ہے۔

ولا یشبهه الخلق:

یعنی حضور علیہ السلام کی شکل وصورت کے مشابہ کلی طور پر نہیں ہوگا، چونکہ بعض چیزوں میں ان کا حضور السلام کے مشابہ ہونا تو ثابت ہے، جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔

"قصة" کو "یملأ الأرض" کی طرف مضاف کرنا بھی جائز ہے، اور بغیر اضافت کے بھی جائز ہے۔

یہ حدیث اس بات کی صریح دلیل ہے جو ہم نے پہلے ذکر کی کہ امام مہدیؒ، حضرت حسنؓ کی اولا میں سے ہونگے، حسینؓ کی طرف ان کی نسبت ماں کی طرف سے ہے تاکہ دلائل میں تطبیق ہو جائے، اور اسی روایت کی بناء پر شیعوں کی یہ بات باطل ہو جاتی ہے کہ امام مہدیؒ موعود وہی محمد بن حسن عسکری ہیں، جو زندہ ومنتظر ہیں۔ کیونکہ محمد بن حسن عسکری تو بالاتفاق حضرت حسینؓ کی اولاد میں سے تھے۔

اگر کوئی یہ اعتراض کرے کہ ممکن ہے کہ اس حدیث میں حضرت علیؓ کی مراد مہدیؒ کے علاوہ کوئی اور ہو؟

اس کا جواب یہ ہے کہ "یملأ الأرض عدلاً" سے یہ اعتراض باطل ہو جاتا ہے، کیونکہ نہ تو حضرت حسنؓ کی اولاد میں کوئی ایسا شخص گزرا ہے، اور نہ ہی حضرت حسینؓ کی اولاد میں کوئی ایسا شخص گذرا ہے کہ جس کا زمین کو عدل وانصاف سے بھر دینا ثابت ہو، صرف مہدی موعود کے بارے میں ہی ایسی بات منقول ہے۔

قوله: رواه ابوداود لم یذکر القصة: یہ کلام جامع الاصول کا کلام ہے۔ صاحب مشکوۃ نے ان سے نقل کیا ہے، اور یہی مطلب ہے علامہ طیبیؒ کی اس بات کا کہ "لم یذکر القصة" میں الف لام عہد کیلئے ہے، اور یہ کلام جامع الاصول کا ہے۔ سنن ابوداؤد میں نہیں ہے۔

یاد رہے کہ اس حدیث "لا مهدی الا عیسی بن مریم" کے بارے میں تمام محدثین کا اتفاق ہے کہ یہ ضعیف ہے، جیسا کہ جزریؒ نے اس کی تصریح کی ہے، علاوہ ازیں یہ حدیث بالا "لا فتی الا علی" کے باب سے ہے۔

علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں، کہ وہ احادیث، کہ جن سے امام مہدیؒ کا ظہور، اور حضور علیہ السلام کی ذریت میں سے حضرت فاطمہؓ کی اولاد میں ہونا، ثابت ہوتا ہے حدیث بالا "لا مهدی الا عیسی بن مریم" سے زیادہ صحیح ہیں، اس لئے فیصلہ انہی احادیث پر ہوگا، اس حدیث ضعیف پر نہیں۔

فرمایا کہ احتمال اس بات کا بھی ہے کہ حدیث میں نفی کمال کی ہو۔ ای: "لا مهدی کاملا معصوماً الا عیسٰی بن مریم". (انتہی)۔

دار قطنیؒ نے اپنی "سنن میں محمد بن علی سے نقل کیا ہے: قال ان لمهدینا آیتین لم تکونا منذ خلق الله السموت والأض ینکسف القمر لاول لیلة من رمضان وتنکسف الشمس فی النصف منه۔

"ہمارے مہدیؒ کی دو علامتیں ایسی ہیں، کہ جب سے زمین آسمان پیدا ہوئے ہیں، وہ علامتیں ابھی تک وجود میں نہیں آئی:

① رمضان کی پہلی رات کو چاند گرہن ہو جائے گا۔ ② نصف رمضان کو سورج گرہن ہو جائے گا۔
جلال الدین سیوطیؒ کی کتاب "العرف الوردی فی اخبار المھدی" میں اسی طرح مذکور ہے۔

۵۴۶۳ : وَعَنْ جَابِرِ ابْنِ عَبْدِ اللّٰهِ قَالَ فُقِدَ الْجَرَادُ فِیْ سَنَةٍ مِّنْ سِنِیِّ عُمَرَ الَّتِیْ تُوُفِّیَ فِیْهَا فَا هْتَمَّ بِذٰلِكَ هَمًّا شَدِیْدًا فَبَعَثَ اِلَی الْیَمَنِ رَاكِبًا اِلَی الْعِرَاقِ وَرَاكِبًا اِلَی الشَّامِ یَسْئَلُ عَنِ الْجَرَادِ هَلْ اُرِیَ مِنْهُ شَیْئًا فَاَتَاهُ الرَّاكِبُ الَّذِیْ مِن قِبَلِ الْیَمَنِ بِقَبْضَةٍ فَنَثَرَهَا بَیْنَ یَدَیْهِ فَلَمَّا رَاٰهَا عُمَرُ كَبَّرَ فَقَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ یَقُوْلُ اِنَّ اللّٰهَ عَزَّوَجَلَّ خَلَقَ اَلْفَ اُمَّةٍ سِتُّمِائَةٍ مِنْهَا فِی الْبَحْرِ وَاَرْبَعُ مِائَةٍ فِی الْبَرِّ فَاِنَّ اَوَّلَ هَلَاكِ هٰذِهِ الْاُمَّةِ الْجَرَادُ فَاِذَا هَلَكَ الْجَرَّادُ تَتَا بَعَتِ الْاُ مَمُ كَنِظَا مِ السِّلْكِ ۔ رواه البيهقي في شعب الايمان ۔

رواه البيهقي في شعب الايمان ۲۳٤/۷ حدیث رقم ۱۰۱۳۲ ۔

ترجمہ: "حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا کہ اس سال کی بات ہے جس سال حضرت عمرؓ کا انتقال ہوا کہ ٹڈیاں کم ہو گئیں (یعنی خلافت عمر کے آخری برس میں سرزمین مدینہ اور اس کے اردگرد کے علاقوں میں ٹڈی دَل پیدا نہیں ہوا) حضرت عمر رضی اللہ عنہ (نے اس کو خاص طور سے محسوس کیا اور) ٹڈی دل نہ آنے پر انتہائی متفکر اور مغموم ہوئے (کہ کہیں ٹڈیوں کا مکمل خاتمہ تو نہیں ہو گیا) پھر انہوں نے ایک سوار یمن کی جانب ایک سوار عراق کی جانب اور ایک سوار شام کی جانب روانہ فرمایا تا کہ وہ پہنچ کر لوگوں سے پوچھیں کہ آیا کسی شخص نے کہیں کچھ ٹڈیاں دیکھی ہیں یا نہیں؟ چنانچہ جس سوار کو یمن روانہ فرمایا تھا وہ ایک مٹھی ٹڈیاں لے کر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس آیا اور ان کے سامنے وہ ٹڈیاں چھوڑ دیں' حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ٹڈیاں دیکھیں تو (خوشی سے) اللہ اکبر کا نعرہ بلند کیا اور پھر فرمایا کہ (میں ٹڈیوں کے مکمل خاتمہ کے خوف سے اس لئے رنجیدہ ہو گیا تھا کہ) میں نے آنحضرت ﷺ کو یہ ارشاد فرماتے ہوئے سنا ہے اللہ بزرگ و برتر نے حیوانات کی ہزار قسمیں پیدا کی ہیں' ان میں چھ سو دریا میں ہیں (یعنی بحری حیوانات) اور چار سو جنگل میں (یعنی خشکی کے حیوانات) ہیں اور (جب قیامت آنے کو ہو گی تو) ان میں سب سے پہلے اس امتہ میں ٹڈی دل ہلاک ہوں گی' چنانچہ جب ٹڈیاں ہلاک ہوں گی تو پھر ان کے بعد دوسری انواع حیوانات بھی) اس طرح پے در پے ہلاک ہونا شروع ہو جائیں گی جس طرح ہار کی ڈوری کھل جاتی ہے اور موتی یکے بعد دیگرے گر کر بکھرنے لگ جاتے ہیں"۔ (اس روایت کو بیہقی نے شعب الایمان میں نقل کیا ہے)"۔

تشریح: قوله: فقد الجرد...... هل أرى منه شيا:

بذالك: اس سے "فقد الجراد" کی طرف اشارہ ہے۔

العراق: یعنی مشرق کی طرف، عبارت میں "تفنن" ہے۔

مغرب کی طرف سوار نہ بھیجنے کی متعدد وجوہ ہو سکتی ہیں:

1. وجہ شاید دور ہونا ہو۔
2. اس وجہ سے کہ مغربی ممالک سمندر پار تھے۔
3. اس وجہ سے کہ ان علاقوں میں ٹڈیاں پہلے سے ہی کم تھیں۔

يسال: ضمیر کا مرجع حضرت عمرؓ ہیں، یا ''كل من الركبان يتفحص''، یعنی ہر وہ سوار جو ٹڈیاں تلاش کرنے گیا تھا۔

هل أرى: ''أرى'' کو معروف اور مجہول دونوں طرح روایت کیا گیا ہے، ('' هل أرى'' مقولہ ہے اور قول محذوف ہے جو حال بن رہا ہے، اور عبارت کی تقدیر یہ ہے:) ''قائلاً هل أرى''.

شيئاً: اس کی صفت محذوف ہے، ''شيئاً من اثره او خبره''

قوله: فاتاه الراكب.......:

قبضة: قاف اور ضاد کے فتحہ کے ساتھ، بمعنی ''مقبوضة'' ہے۔

وقال: ضمیر فاعل حضرت عمرؓ کی طرف راجع ہے۔

'' أمة'' سے مراد جنس حیوانات کی ہر ہر جنس ہے، جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ میں ہے:

﴿ وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْأَرْضِ وَلَا طٰٓئِرٍ يَّطِيْرُ بِجَنَاحَيْهِ إِلَّآ أُمَمٌ أَمْثَالُكُمْ ﴾ [الانعام:۳۸]

''اور جتنے قسم کے جاندار زمین پر چلنے والے ہیں اور جتنے قسم کے پرند جانور ہیں کہ اپنے دونوں بازوؤں سے اڑتے ہیں ان میں سے کوئی قسم ایسی نہیں جو تمہاری ہی طرح کے گروہ نہ ہوں''

ست: مرفوع ہے۔

منها: الالف کی طرف راجع ہے۔

ستمائة أو اربعمائة: ایک اور نسخہ میں'' ستمائة ''اور'' اربعمائة''، الف امة سے بدل ہونے کی بناء پر منصوب ہے۔

فان...... الامة'' هذه الامة'' سے'' الف امة''، کی طرف اشارہ ہے، گویا کہ جنس مراد ہے۔ اور ایک روایت میں لفظ ''هلاك'' کے بغیر صرف ''ان اول هذه الامة'' منقول ہے، اس صورت میں'' هلاكًا''، مقدر ہوگا (ای ان اول هذه الامة هلاكا) یعنی ان میں سے سب سے پہلے اس امت میں ٹڈی دل ہلاک ہوں گے، یا (خلقاً مقدر ہے اور) تقدیری عبارت یوں ہو: ان اول هذه الامة خلقا الجراد اور ممکن ہے کہ'' امة'' سے مراد حضور علیہ السلام کی امت ہو۔

قوله: فاذا هلك لجراد تتابعت الامم كنظام السلك:

كنظام السلك: (عبارت میں مضاف محذوف ہے اور عبارت کی تقدیر یہ ہے): ای "كتتابع خرز منظوم الخيط في النثر" یعنی جس طرح جب موتیوں کے ہار کا دھاگہ ٹوٹ جاتا ہے تو موتی پے در پے گر کر بکھرنے لگتے ہیں۔ (یا عبارت کی تقدیر یہ ہے:) ای "كتتابع وجود الخرز في حال نظام السلك" یعنی جس طرح ہار کے دھاگے میں موتی پے در پے پروئے ہوتے ہیں۔

تشبیہ سے مقصود "پے در پے ہونا" بتانا ہے، اور دونوں صورتوں میں یہ مقصود حاصل ہے، لیکن ہلاکت میں مشابہت کے لحاظ سے پہلی صورت میں تشبیہ کامل اور ابلغ ہے۔

بَابُ الْعَلَامَاتِ بَيْنَ يَدَيِ السَّاعَةِ وَذِكْرُ الدَّجَّالِ

قیامت سے پہلے ظاہر ہونے والی نشانیاں اور ذکر دجال

قوله: باب العلامة: اور ایک نسخہ میں "بابُ عَلَامات" ہے۔

قوله: "بين يدى الساعة: یہاں "بین" بمعنی "قدام" ہے۔ اصل تو یہ ہے کہ "بین" "سامنے والی جگہ" کے معنی میں استعمال ہو لیکن بعد میں "زمانہ" کیلئے بھی استعمال کیا جانے لگا۔

قوله: ذكر الدجال : یہ "تخصيص بعد التعميم" کے باب سے ہے۔

"دجال" دجل سے ماخوذ ہے۔ "دَجَل" کا معنی ہے: "ساح فى الارض" (زمین میں چلنا پھرنا) نیز کوئی کسی کو حق دے تو کہا جاتا ہے: "دجل فلان الحق"، نہایہ میں لکھا ہے "دجل" کا اصل معنی ہے، خلط کرنا، چنانچہ جب کوئی کسی بات کو خلط ملط کردے تو کہا جاتا ہے: دَجَل۔ "دجال" مبالغہ کے اوزان میں سے "فعال" کے وزن پر ہے، جس کا معنی ہے: بہت زیادہ جھوٹا، دھوکہ دینے والا، اور دجال وہی ہے جو آخری زمانے میں ظاہر ہوگا، اور معبود ہونے کا دعویٰ کرے گا۔

الفصل الاول:

۵۴۶۴: عَنْ حُذَيْفَةَ بْنِ اَسِيْدِ الْغِفَارِيِّ قَالَ اِطَّلَعَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَلَيْنَا وَنَحْنُ نَتَذَاكَرُ فَقَالَ مَا تَذْكُرُوْنَ قَالُوْا نَذْكُرُ السَّاعَةَ قَالَ اِنَّهَا لَنْ تَقُوْمَ حَتّٰى تَرَوْا قَبْلَهَا عَشْرَ اٰيَاتٍ فَذَكَرَ الدُّخَانَ وَالدَّجَّالَ وَالدَّابَّةَ وَطُلُوْعَ الشَّمْسِ مِنْ مَغْرِبِهَا وَنُزُوْلَ عِيْسَى بْنِ مَرْيَمَ وَ يَاجُوْجَ وَمَاجُوْجَ وَثَلَاثَةَ خُسُوْفٍ خَسْفٌ بِالْمَشْرِقِ وَخَسْفٌ بِالْمَغْرِبِ وَخَسْفٌ بِجَزِيْرَةِ الْعَرَبِ وَاٰخِرُ ذٰلِكَ نَارٌ تَخْرُجُ مِنَ الْيَمَنِ تَطْرُدُ النَّاسَ اِلٰى مَحْشَرِهِمْ وَفِيْ رِوَايَةٍ نَارٌ تَخْرُجُ مِنْ قَعْرِ عَدْنٍ تَسُوْقُ النَّاسَ اِلَى الْمَحْشَرِ وَفِيْ رِوَايَةٍ فِي الْعَاشِرَةِ وَرِيْحٌ تُلْقِي النَّاسَ فِي الْبَحْرِ ۔ (رواه مسلم)

اخرجه مسلم فى صحيحه ٢٢٢٥/٤ حديث رقم (٣٩-٢٩٠١) وابو داؤد فى السنن ٤٩١/٤ حديث رقم ٤٣١١ والترمذى فى السنن ٤١٤/٤ حديث رقم ٢١٨٣

ترجمه: "حضرت حذیفہ بن اسید غفاری رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا کہ (ایک روز) ہم لوگ آپس میں (قیامت

کے بارے میں) محو گفتگو تھے کہ نبی اکرم ﷺ ہماری طرف آ نکلے اور دریافت فرمایا کہ تم لوگ کس چیز کے بارے میں بات چیت کر رہے ہو؟ صحابہؓ نے عرض کیا کہ ہم قیامت کا تذکرہ کر رہے ہیں تو (اس موقع پر) آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا: ہرگز وقوع قیامت نہیں ہوگا حتیٰ کہ تم اس سے پہلے دس علامات کو دیکھ لو گے' پھر آپ ﷺ نے (ترتیب سے ان کا) ذکر فرمایا: ① دھواں ② دجال ③ دابۃ الارض ④ سورج کا سمت مغرب سے طلوع ہونا ⑤ حضرت عیسیٰ بن مریم علیہ السلام کا نزول ہونا ⑥ یاجوج و ماجوج کا نکل آنا اور (چھٹی' ساتویں اور آٹھویں نشانیوں کے طور پر آپ ﷺ نے تین خسوف کا (یعنی تین جگہوں پر زمین کے دھنسنے کا) ذکر فرمایا ایک تو مشرقی علاقہ میں' دوسرے مغربی علاقہ میں اور تیسرے جزیرۂ عرب کے علاقہ اور دسویں نشانی' جو ان سب کے بعد عیاں ہوگی وہ آگ ہے جو یمن کی طرف سے نمودار ہوگی اور لوگوں کو ہانک کر زمین حشر کی طرف جمع کرے گی اور ایک حدیث میں یوں ہے کہ وہ ایک ایسی آگ ہوگی جو (یمن کے مشہور شہر عدن کے آخری کنارے سے نمودار ہوگی اور لوگوں کو ہانک کر ان کے حشر کے مقام میں لے جائے گی نیز ایک اور روایت میں دسویں نشانی کے طور پر یمن کی طرف سے یا عدن کے آخری کنارے سے آگ کے نکلنے کی بجائے) ایک ایسی ہوا کا تذکرہ کیا گیا ہے جو لوگوں کو سمندر میں پھینک ڈالے گی''۔
(مسلم)

تشریح: قولہ: عن حذیفه بن اسیدی الغفاری قال: اطلع النبی ﷺ علینا ونحن نتذاکر:

أسید: ہمزہ مفتوح اور سین مکسور ہے۔ ان کا (ذکرہ ابن الملکؒ) نے کیا ہے' مؤلفؒ نے ''الاکمال'' میں ان کا ذکر نہیں کیا ہے۔

الغفاری: غین کے کسرہ کے ساتھ۔ اس قبیلہ کی طرف منسوب ہے جس میں سے حضرت ابوذرؓ تھے۔

اطلع: طاء کی تشدید کے ساتھ۔ بمعنی أشرَفَ (جھانکنا) یعنی نبی کریم ﷺ نے اپنی تشریف آوری کے ذریعہ ہمیں اپنے اس چہرہ انور کی زیارت کا شرف بخشا، جس کے دونوں رخساروں پر چمکنے والا نور سورج چاند کی روشنی سے زیادہ تھا، دونوں جگ کا نور روشنی اسی سے مستفاد ہے۔

قولہ: فقال: ماتذکرون قالوا نذکر الساعة:

قالوا: ایک اور نسخہ میں ''قلنا'' ہے۔

نذکر الساعة: یعنی قیامت کے امور کے بارے میں بات چیت کر رہے ہیں اور اس بات کا مذاکرہ کر رہے ہیں، کہ قیامت کسی بھی وقت آسکتی ہے۔ ''آیات'': اس سے مراد ''علامات'' ہیں۔

قولہ: قال انها لن تقوم ...... فذکر الدخان:

الدخان: علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں کہ اس ''دخان'' سے وہی مراد ہے جس کا ذکر اس ارشاد باری میں ہے:

﴿**یوم تأتی السماء بدخان مبین**﴾[الدخان۔۱۰] ''اس روز کا انتظار کیجئے کہ آسمان کی طرف ایک نظر آنے والا

دھواں پیدا ہو‘‘ یہ نشانی حضور علیہ السلام کے عہد مبارک میں ظاہر ہوگئی تھی۔انتہیٰ۔

اس کی تائید ابن مسعودؓ کے اس قول سے ہوتی ہے کہ’’ دخان سے مرادوہ قحط ہے جو قریش پر آیا تھا،اور (ضعف وکمزوری کی شدت سے) فضاء میں موجود ہوا ان کو دھویں کی مانند معلوم ہوتی تھی‘‘۔لیکن حضرت حذیفہؓ فرماتے ہیں کہ’’ دخان سے حقیقی دھواں مراد ہے۔‘‘ کیونکہ حضور ﷺ سے جب اس دخان کے بارے میں پوچھا گیا،تو ارشاد فرمایا:

قال : يملأ بين المشرق والمغرب يمكث أربعين يوما وليلة‘والمؤمن يصير كالزكام والكافر كالسكران ’’وہ دھواں مشرق سے مغرب تک پھیل جائے گا،اور چالیس روز تک رہے گا،اور مؤمن زکام میں مبتلا شخص کی طرح ہو جائے گا۔اور کافر نشہ میں مدہوش شخص کی طرح ہوجائیں گے‘‘۔

’’**المؤمن يصير كالزكام**‘‘ میں مضاف محذوف ہے ای ’’**كصاحب الزكام**‘‘ ۔ یا یہ مصدر بمعنی اسم مفعول ’’**المزكوم**‘‘ ہے،یا مبالغہ کیلئے ’’**زيد عدلٌ**‘‘ کے باب سے ہے۔

قوله: والدابة:

’’دابة‘‘ سے مراد وہی ہے جس کا ذکر قرآن مجید کی اس آیت میں ہے:﴿**اخرجنا لهم دابة من الارض تكلمهم**﴾ [النمل:۸۲] تو ہم ان کے لئے زمین سے ایک (عجیب) جانور نکالیں گے کہ وہ ان سے باتیں کرے گا‘‘

قوله:طلوع الشمس من مغربها:

بعض لوگ فرماتے ہیں،کہ یہ دابّہ تین بار نکلے گا،ایک مرتبہ امام مہدیؑ کے زمانے میں دوسری مرتبہ حضرت عیسیٰؑ کے زمانے میں اور تیسری مرتبہ مغرب سے سورج نکلنے کے بعد۔(یذکرہ ابن الملکؒ)

قوله:ونزول عيسى بن مريم:

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا نزول حضرت امام مہدیؑ کے ظہور کے متصل بعد ہوگا،چنانچہ صرف عیسیٰ علیہ السلام کے نزول کا ذکر اکتفاء کے باب سے ہے۔

طبرانیؒ نے اَوس بن اُوس سے حدیث مرفوع نقل کی ہے:**ينزل عيسى بن مريم عند المنارة البيضاء شرقي دمشق۔**

’’عیسیٰ بن مریمؑ دمشق میں جامع مسجد کے مشرقی سفید منارہ کے پاس اُتریں گے‘‘۔

امام ترمذیؒ نے مجمع بن جاریہ سے حدیث مرفوع نقل کی ہے:**يقتل ابن مريم الدجال بباب لد۔**

’’عیسیٰ بن مریمؑ،دجال کو باب لُد کے پاس قتل کریں گے‘‘۔

نہایہ میں لکھا ہے:’’لُد‘‘ شام میں ایک جگہ کا نام ہے۔بعض حضرات فرماتے ہیں کہ فلسطین میں ایک جگہ کا نام ہے۔امام سیوطیؒ کی ترمذی کی شرح میں اس طرح مذکور ہے۔

قاموس میں لکھا ہے" لُد "۔لام کے ضمہ کے ساتھ۔فلسطین میں ایک بستی کا نام ہے۔عیسیٰ بن مریم" بابِ لد کے پاس دجال کو قتل کریں گے"۔

کہ ان نشانیوں کے ظہور کی ترتیب یہ ہوگی پہلے دھویں کا ظہور ہوگا،اس کے بعد دجال نکلے گا،اس کے بعد حضرت عیسیٰ علیہ السلام آسمان سے نازل ہوں گے،پھر یاجوج ماجوج نکلیں گے۔اس کے بعد دابۃ الارض نکلے گا،پھر آخر میں سورج مغرب سے طلوع ہوگا۔کیونکہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے زمانے میں تمام کفار ایمان قبول کرلیں گے،اور تمام لوگ ملت واحدہ بن جائیں گے،اور اگر سوورج کا مغرب سے طلوع ہونا،دجال کے نکلنے اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے نازل ہونے سے پہلے مانا جائے،تو پھر کفار کا ایمان قبول نہ ہوگا(حالانکہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے زمانے میں کفار کا ایمان قبول کرنا معتبر ہوگا)چنانچہ واؤ یہاں مطلق جمع کے لئے ہے(یعنی کہ اس حدیث میں مطلقاً صرف نشانیوں کو ایک جگہ ذکر کرنا مقصود ہے۔ترتیب کا لحاظ نہیں ہے)اس لئے اس حدیث پر یہ اشکال نہ کیا جائے کہ عیسیٰ علیہ السلام کا نازل ہونا،تو مغرب سے طلوعِ شمس سے پہلے ہوگا،اور نہ آئندہ حدیث:"ان اول الآیات خروجا طلوع الشمس"پر اشکال کیا جائے۔

قولہ:یأجوج ومأجوج:

"الف" کے ساتھ بھی پڑھا جاسکتا ہے اور ہمزہ کے ساتھ بھی جائز ہے۔(یہاں مضاف محذوف ہے)ای:"خروج یاجوج ومأجوج۔

قولہ:وثلاثۃ خسوف:

ابن الملکؒ فرماتے ہیں کہ ویسے تو(عذابِ الٰہی کے طور پر)زمین کا دھنس جانا،مختلف جگہوں میں ہو چکا ہے،لیکن احتمال ہے،کہ حدیث میں مذکورہ تین خسوف سے مراد پہلے ہونے والے خسوف کے علاوہ پہلے والے خوف سے زیادہ سخت اور زیادہ مقدار کا خوف ہو۔

قولہ:خسفٌ بالمشرق...... بجزیرۃ العرب:

تینوں جگہ لفظ" خسف "مرفوع ہے،مبتدا محذوف احدھما، ثانیھا ' ثالثھا کے لئے خبر ہے،یا خبر مقدم محذوف "منھا" کے لئے مبتدا مؤخر ہے،اگر جر کے ساتھ مروی ہو تو بدل ہونے کی بناء پر مجرور ہوگا۔

قولہ:وآخر ذالك نار یخرج من الیمن تطرد الناس الی محشرھم:

ایک اور روایت میں اس کی جگہ "تخرج من ارض الحجاز"(ایک آگ سرزمین حجاز سے نکلے گی۔)کے الفاظ منقول ہیں۔

قاضی عیاضؒ فرماتے ہیں کہ شاید یہ آگ(جس کا بطور قیامت کی نشانی کا ذکر ہوا)ایک نہیں بلکہ دو ہونگی،اور وہ دونوں لوگوں کو ہانک کر میدانِ حشر میں لے جائیں گی،یا آگ تو ایک ہی ہوگی،مگر ابتداء یمن سے نکلے گی،اور پھر حجاز میں ظاہر ہو جائے گی۔(ذکرہ القرطبیؒ)

مذکورہ بالا حدیث اور بخاری کی اس حدیث: "ان اول اشراط الساعة نار تخرج من المشرق الی لمغرب" (قیامت کی نشانیوں میں سے پہلی نشانی وہ آگ ہوگی جو مشرق سے مغرب کی طرف نکلے گی) میں تطبیق کی صورت یہ ہے کہ اس حدیث میں جو اس نشانی کو آخری نشانی کہنا مذکورہ بالا نشانیوں کے اعتبار سے ہے اور بخاری کی روایت میں آگ کو جو پہلی نشانی کہا، اس اعتبار سے ہے کہ آگ قیامت کی ان نشانیوں میں سے جن کے بعد دنیا کی کوئی چیز باقی نہیں رہے گی، سب سے پہلی نشانی ہوگی، بلکہ اس کے ختم ہوتے ہی صور پھونکا جائے گا، بخلاف اُن نشانیوں کے جن کا اس حدیث میں ذکر کیا گیا ہے، کہ ان میں سے ہر نشانی کے بعد دنیا کی چیزیں باقی رہیں گی۔ بعض محققین علماء نے اسی طرح ذکر کیا ہے۔

تطرد: بمعنی تسوق (ہانکے گی) اور فاعل کی ضمیر کا مرجع "النار" ہے۔

محشر: شین کو مفتوح اور مکسور دونوں طرح پڑھنا درست ہے۔ بمعنی **مجمع و موقف** (جمع ہونے کی جگہ کھڑا ہونیکی جگہ)۔ بعض حضرات فرماتے ہیں کہ "محشر" سے مراد ملک شام ہے، کیونکہ ایک صحیح حدیث میں وارد ہوا ہے کہ حشر ملک شام میں ہوگا لیکن بظاہر مراد یہ ہے کہ اس آگ کی ابتداء ملک شام سے ہوگی یا ملک شام کی زمین اس قدر وسیع کر دی جائے گی، کہ پورے عالم کے لوگ اس میں سما جائیں گے۔

قوله: نار تخرج من قعر عدن تسوق الناس الی المحشر:

"قعر عدن" سے مراد اس زمین کی آخری حد ہے۔ "عدن" غیر منصرف ہے "لقعۃ" کی تاویل میں ہونے کے اعتبار سے۔ اور بعض کا کہنا ہے کہ "وموضع" کی تاویل میں ہونے کے اعتبار سے منصرف ہے۔ مشارق میں لکھا ہے: کہ "عدن" یمن کے ایک مشہور شہر کا نام ہے۔ قاموس میں لکھا ہے، عدن دال کی حرکت کے ساتھ یمن کا ایک جزیرہ ہے۔

قوله: وریح تلقی الناس فی البحر:

ان دونوں روایتوں میں تطبیق کی صورت یہ ہے کہ اس دوسری روایت میں الناس (لوگوں) سے مراد "کفار" ہیں، اور ان کی آگ کے ساتھ ایسی تیز ہوا بھی ہوگی کہ جس کے اثر سے تیزی کے ساتھ یہ لوگ سمندر میں گر جائیں گے، اور وہیں سمندر ان کفار کے حشر کی جگہ ہوگی یا فجار کا ٹھکانہ ہوگا، جیسا کہ حدیث میں وارد ہوا ہے، کہ سمندر آگ بن جائے گا، اور اسی کو قرآن کریم کی اس آیت: ﴿ وَإِذَا الْبِحَارُ سُجِّرَتْ ﴾ [التکویر: ٦] "اور جب دریا بھڑ ہائے جاویں گے" میں بیان کیا گیا ہے، بخلاف مؤمنین کے کہ ان کے لئے جو آگ نکلے گی، وہ بمنزلہ کوڑے کے صرف ڈرانے اور ان لوگوں کو موقف اعظم میدان حشر کی طرف ہانکنے کیلئے ہوگی۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

تخریج: ابوداؤد، ترمذی اور نسائی نے بھی اس حدیث کو نقل کیا ہے۔

٥٤٦٥ : وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ بَادِرُوْا بِالْاَعْمَالِ سِتًّا الدُّخَانَ وَالدَّجَّالَ وَدَابَّةَ الْاَرْضِ وَطُلُوْعَ الشَّمْسِ مِنْ مَغْرِبِهَا وَاَمْرَ الْعَامَّةِ وَخُوَیْصَّةَ اَحَدِكُمْ.

(رواہ مسلم)

اخرجه مسلم فی صحیحه ۲۲۶۷/٤ حدیث رقم (۱۲۹-۲۹٤۷) وابن ماجه فی السنن ۱۳٤۸/۲ حدیث رقم واحمد فی المسند ۳۲٤/۲

ترجمہ: ''حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''چھ'' چیزوں کے ظاہر ہونے سے تم اعمال صالحہ کو جلدی کرلو (اور وہ چھ چیزیں یہ ہیں) دھواں' دجال' دآبۃ الارض' سمت مغرب سے سورج کا طلوع ہونا' امر عامہ (یعنی وہ فتنہ عام جو تمام لوگوں کو اپنی لپیٹ میں لے لے) اور تم میں سے کسی ایک کے ساتھ مخصوص فتنہ)۔'' (مسلم)

تشریح: قوله: بادروا ستا...... وخويصة احدكم:

بالاعمال: صفت محذوف ہے یعنی ''بالأعمال الصالحة النافعة فی الآخرة'' (ایسے اعمال صالحہ جو آخرت میں فائدہ دیں)۔

ستا: (مضاف الیہ محذوف ہے، ای'' ست ایات ''یعنی قیامت کے برپا ہونے کی چھ نشانیاں ہیں، ان نشانیوں کے بعد عمل کرنا مشکل ہوگا اور اگر کر بھی لیا جائے گا تو قبول نہ ہوگا۔

خويصة: خاء کے ضمہ، واؤ کے فتحہ یاء کے سکون اور صاد کی شدید کے ساتھ'' خاصة'' کی تصغیر ہے۔

اس سے مراد وہ فتنہ جس میں مخصوص افراد مبتلا ہوں گے۔ بعض کا کہنا ہے کہ اس سے مراد موت ہے۔

یا اس سے مراد انسان کے وہ مشاغل ہیں جو مال و جان وغیرہ سے متعلق ہیں، اور ان کو تصغیر کے صیغہ کے ساتھ اس لئے ذکر کیا کہ ایسے مسائل قیامت کے دوسرے مسائل، حساب و کتاب وغیرہ کے مقابلے میں چھوٹے ہیں۔

قیامت کی چھوٹی چھوٹی نشانیاں ان مذکورہ بالا چھ نشانیوں سے پہلے ظاہر ہونگیں۔ کیونکہ ان بڑی نشانیوں کے ظاہر ہونے کے بعد حالت یاًس ہے، جس میں ایمان معتبر نہیں ہوگا، چونکہ ان نشانیوں کے ظہور کے وقت انسان ایمان لانے پر مجبور ہوگا، اور کسی عمل پر مجبوری کے وقت مکلف کو کوئی ثواب نہیں ملتا اور جب ثواب ملنا ختم ہو جاتا ہے، تو مکلف ہونا بھی ختم ہو جاتا ہے۔

قاضی عیاضؒ فرماتے ہیں: حضور علیہ الصلوۃ السلام نے صحابہ کرامؓ کو ان چھ نشانیوں کے ظاہر ہونے سے پہلے پہلے عمل میں سبقت کرنے کی ترغیب اس لئے دی، کہ ان نشانیوں کے ظاہر ہونے کی وجہ سے انسانوں پر ایسا خوف و ہراس طاری جائے گا، کہ عمل سے غافل ہو جائیں گے، یا اس لئے کہ ان چھ نشانیوں کے ظاہر ہونے کے بعد توبہ اور اعمال کے قبول ہونے کا دروازہ بند ہو جائے گا۔

فائق میں لکھا ہے، کہ ان چھ نشانیوں سے پہلے اعمال میں لگنے کا مطلب یہ ہے کہ ان چھ نشانیوں کے ظہور سے پہلے اعمال صالحہ لگن اور شوق کے ساتھ کیے جائیں اور اعمال صالحہ کا اہتمام کیا جائے۔

تخریج: اسی طرح اس حدیث کو امام احمد نے بھی اپنی کتاب ''مسند احمد'' میں نقل کیا ہے۔

۵۴۶۶ : وَعَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عَمْرٍو قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ اِنَّ اَوَّلَ

الأیاتِ خُرُوْجًا طُلُوْعُ الشَّمْسِ مِنْ مَغْرِبِهَا وَخُرُوْجُ الدَّابَّةِ عَلَى النَّاسِ ضُحًى وَاَيُّهُمَا مَا كَانَتْ قَبْلَ صَاحِبَتِهَا فَالْاُخْرٰى عَلٰى اَثَرِهَا قَرِيْبًا. (رواہ مسلم)

اخرجه مسلم فی صحیحه ۲۲٦٠/٤ حدیث رقم (١١٨-٢٩٤١) واخرجه ابو داؤد فی السنن ٤٩٠/٤ حدیث رقم ٤٣١٠ واخرجه ابن ماجه فی السنن ١٣٥٣/٢۔

ترجمہ: ''حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما نے بیان فرمایا کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ ارشاد فرماتے ہوئے سنا: نمودار ہونے کے لحاظ سے قیامت کی نشانیوں میں سب سے پہلی نشانی آفتاب کا اس کی مغربی سمت سے طلوع ہونا ہے اور چاشت کے وقت لوگوں کے سامنے پر دابۃ الارض کا نکلنا اوران سے اس کا بات کرنا ہے ان دونوں مذکورہ علامات میں سے جو علامات پہلے رونما ہوگی اس کے پیچھے ہی دوسری علامات بھی وقوع پزیر ہو جائے گی''۔ (مسلم)

تشریح: قوله: ان اول الآیات خروجا......مغربها:

علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں، اگر کوئی یہ اشکال کرے کہ سورج کا مغرب سے نکلنا قیامت کی سب سے پہلی نشانی نہیں ہے۔ کیونکہ دھواں اور دجال کا ظہور اس سے پہلے ہوگا؟

تو اس کا جواب یہ ہے کہ قیامت کی نشانیاں دو قسم کی ہیں:

ایک قسم وہ امور جو قیامت کے قریب ہونے کی نشانیاں ہیں (یہ نشانیاں دلالت کریں گی کہ قیامت کا وقت قریب ہے)۔

دوسری قسم وہ امور جو قیامت برپا ہونے کی نشانیاں ہیں۔ (یہ نشانیاں علامت ہیں کہ قیامت کا وقت آ گیا ہے)۔

پہلی قسم کی نشانیوں میں دھویں کا ظاہر ہونا اور دجال کا نکلنا وغیرہ شامل ہے۔

دوسری قسم کی نشانیوں میں سورج کا مغرب سے طلوع ہونا، زلزلہ، آگ کا نکلنا اور لوگوں کو محشر کی طرف ہانکنا وغیرہ شامل ہے۔

مغرب سے سورج کے نکلنے کو پہلی نشانی اس لئے کہا گیا کہ یہ دوسری قسم کی نشانیوں کی ابتداء میں ہوگی۔ اور اس کی تائید حضرت ابو ہریرہؓ کی اگلی روایت سے ہوتی ہے: ''لا تقوم الساعة حتى تطلع الشمس من مغربها'' [الحدیث]۔

''قیامت اس وقت تک قائم نہیں ہوگی جب تک سورج مغرب سے طلوع نہ ہو''

قوله: وخروج الدابة على الناس ضحى:

''خروج الدابة''، طلوع الشمس پر عطف کی بناء پر مرفوع ہے، اور '' طلوع الشمس'' خبر اول ہے، اس سے لازم آتا ہے، کہ پہلی نشانی ایک سے زائدہ ہیں۔ اس لئے ابن الملکؒ فرماتے ہیں، شاید کہ واؤ ''او'' کے معنی میں ہے، اور اس کی تائید اس روایت سے بھی ہوتی ہے، جس میں ''او خروج الدابة'' مذکور ہے۔

ضحیٌ: تنوین کے ساتھ بمعنی ''وقت ارتفاع النهار'' (سورج بلند ہونے کا وقت)۔

دونوں نشانیوں کی طرف اول نشانی ہونے کی نسبت میں ابہام ہے، اوران میں سے ایک کی طرف اول ہونے کی نسبت

مجازی ہے، اسی وجہ سے "ایھما ما کانت"...... فرمایا۔

قوله: وایهما کانت قبل ......:

وأيهما: اور جامع میں "فایتھما" (فاء اور تانیث کے ساتھ) مذکور ہے۔

ما کانت: "ما" زائدہ ہے۔ عبارت کی تقدیر یہ ہے: "وأی الآیتین المذکورتین وقعت؟

"الثر" ہمزہ اور ثاء کے فتحہ کے ساتھ، اور ہمزہ کے کسرہ اور ثاء کے سکون کے ساتھ بھی درست ہے، بمعنی عقبٌ، (جار مجرور کا متعلق محذوف ہے اور عبارت کی تقدیر یہ ہے): "فالاخریٰ تحصل عقبها".

قریبا: موصوف محذوف ہے، تقدیر یہ ہے، حصولاً قربا یا وقوعا قریباً.

ان دونوں نشانیوں کی آپس میں ترتیب کے بارے میں کلام پہلے گزر چکا ہے۔

ابن الملکؒ فرماتے ہیں، کہ اگر کوئی یہ اعتراض کرے کہ ان دونوں نشانیوں میں سے کوئی بھی نشانی قیامت کی نشانیوں میں سے پہلی نشانی نہیں ہے کیونکہ بعض نشانیوں تو اس سے پہلے ظاہر ہو چکی ہوں گی، تو اس کا جواب یہ ہے کہ بعض علامات قیامت کے قریب ہونے پر ہیں، اور بعض نشانیاں قیامت کے قائم و برپا ہونے پر دال ہیں۔ پہلی قسم کی نشانیوں میں سب سے پہلی نشانی حضور علیہ السلام کا معبوث ہونا ہے، اور یہاں دوسری قسم کی نشانیاں مراد ہیں، اور جہاں تک بات ہے اس حدیث کی "ان اول لها خروج الدجال" تو یہ حدیث صحیح نہیں ہے۔ (کذا فی جامع الاصول)

تخریج: اسی طرح اس روایت کو امام احمد، ابوداؤد اور ابن ماجہؒ نے بھی نقل کیا ہے۔

قیامت کی سب سے پہلی علامت

۵۴۶۷ : وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ ثَلٰثٌ اِذَا خَرَجْنَ لَا یَنْفَعُ نَفْسًا اِیْمَانُهَا لَمْ تَكُنْ اٰمَنَتْ مِنْ قَبْلُ اَوْكَسَبَتْ فِیْ اِیْمَانِهَا خَیْرًا طُلُوْعُ الشَّمْسِ مِنْ مَغْرِبِهَا وَالدَّجَّالُ وَدَابَّةُ الْاَرْضِ . (رواہ مسلم)

اخرجه مسلم فی صحیحه ۱۳۸/۱ حدیث رقم (۲۴۹-۱۵۸) وابو داؤد فی السنن ۴۹۲/۴ حدیث رقم ۴۳۱۲

ترجمہ: "حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: تین باتیں جس وقت ظاہر ہو جائیں گی تو پھر کسی ایسے شخص کا ایمان لانا (اور کفر سے توبہ کرنا) کہ جو اس سے پہلے صاحب ایمان نہ ہوگا کوئی نفع نہ دے سکے گا اور نہ اس شخص کا اپنے ایمان کی حالت میں نیک عمل کرنا نفع بخش ہوگا اگر اس نے اس سے پہلے وہ نیک عمل نہ کیا ہوگا (یعنی اس وقت معاصی سے ثابت ہونا بھی معتبر نہ ہوگا) اور وہ تین چیزیں یہ ہیں، آفتاب کا اپنی مغربی سمت سے طلوع ہونا، دجال اور دابۃ الارض کا نمودار ہونا"۔ (مسلم)

تشریح: ثلاثه اذا خرجن ......:

ثلاث: (مضاف الیہ مقدر ہے) ای "ثلاث آیات"۔

خرجن: اس میں تغلیب ہے۔ یا "خرجن" بمعنی ظہرت ہے اور مراد تینوں ہیں۔

سورج کا مغرب سے طلوع ہونا اس نشانی کو پہلے ذکر کیا، حالانکہ وقوع پذیر ہونے میں متاخر ہے، وجہ یہ ہے کہ ایمان اور توبہ کے قبول نہ ہونے کا اصل مدار اسی پر ہے، اگرچہ خروج دجال اور دابۃ الارض کا ذکر بھی ساتھ ملا دیا گیا ہے۔

تخریج: اسی طرح امام ترمذیؒ نے بھی اس حدیث کو نقل کیا ہے۔

۵۴۶۸ : وَعَنْ اَبِیْ ذَرٍّ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ حِيْنَ غَرَبَتِ الشَّمْسُ اَتَدْرِیْ اَيْنَ تَذْهَبُ هٰذِهٖ قُلْتُ اَللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ اَعْلَمُ قَالَ فَاِنَّهَا تَذْهَبُ حَتّٰى تَسْجُدَ تَحْتَ الْعَرْشِ فَتَسْتَأْذِنُ فَيُؤْذَنُ لَهَا وَ يُوْشِكُ اَنْ تَسْجُدَ وَلَا يُقْبَلُ مِنْهَا وَ تَسْتَأْذِنُ فَلَا يُؤْذَنُ لَهَا وَيُقَالُ لَهَا اِرْجِعِیْ مِنْ حَيْثُ جِئْتِ فَتَطْلَعُ مِنْ مَغْرِبِهَا فَذٰلِكَ قَوْلُهٗ تَعَالٰى وَالشَّمْسُ تَجْرِیْ لِمُسْتَقَرٍّ لَّهَا قَالَ مُسْتَقَرُّهَا تَحْتَ الْعَرْشِ (متفق عليه)

اخرجه البخاري في صحيحه ٢٩٧/٦ حديث رقم ٣١٩٩ ومسلم في صحيحه ١٣٨/١ حديث رقم (٢٥١-١٥٩) والترمذي في السنن ٤١٦/٤ حديث رقم (١٥٦)

ترجمہ: "حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا کہ (ایک روز) جس وقت سورج غروب ہوا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم (مجھ سے) دریافت فرمانے لگے کیا تم خبر رکھتے ہو یہ سورج کدھر جا رہا ہے؟ میں نے عرض کیا کہ اللہ اور اس کا رسول ہی بخوبی واقف ہیں! آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: یہ آفتاب جاتا ہے یہاں تک کہ عرش کے نیچے پہنچ کر سجدہ ریز ہو جاتا ہے پھر اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں حاضری کی درخواست کرتا ہے پھر اس کو اجازت عنایت کی جاتی ہے اور حکم دیا جاتا ہے کہ مشرق کی طرف لوٹ جائے اور اپنی مشرقی سمت سے طلوع کرے اور (یاد رکھو) وہ وقت جلد ہی آنے والا ہے جب آفتاب (حسب معمول) سجدہ کرے گا لیکن اس کا سجدہ قبول نہیں ہوگا اور اجازت طلب کرے گا لیکن اس کو اجازت مرحمت نہیں کی جائے گی اور یہ حکم دیا جائے گا کہ جہاں سے آیا اسی طرف لوٹ جا چنانچہ وہ اپنی مغربی سمت سے طلوع کرے گا اور یہی مراد ہے اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کی کہ ﴿وَالشَّمْسُ تَجْرِیْ لِمُسْتَقَرٍّ لَّهَا﴾ (یعنی آفتاب اپنے مستقر کی طرف سے چلا جاتا ہے) نیز آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے (آفتاب کے "مستقر" کی وضاحت میں) فرمایا ہے کہ آفتاب کا مستقر یعنی اس کے ٹھہرنے کا مقام عرش کے نیچے ہے"۔ (بخاری)

تشریح: قوله: أتدری این...... فیؤذن لها:

هذه: سے "الشمس" کی طرف اشارہ ہے، اور یہ اشارہ تعظیم کیلئے ہے۔

بعض محققین فرماتے ہیں، کہ حدیث پاک قرآن کی اس آیت: ﴿وَجَدَهَا تَغْرُبُ فِیْ عَيْنٍ حَمِئَةٍ﴾ [الكهف۔ ٨٢] "تو آفتاب ان کو ایک سیاہ رنگ کے پانی میں ڈوبتا ہوا دکھائی دیا ہے کے منافی نہیں ہے۔ کیونکہ "عین حمئة" سے دراصل حد نگاہ

مراد ہے، جب کہ حدیث میں یہ ہے کہ سورج غروب ہونے کے بعد عرش کے نیچے سجدہ کرتا ہے۔

علامہ خطابیؒ فرماتے ہیں: یہ احتمال بھی ہے، کہ اس سے مراد یہ ہے کہ سورج عرش کے نیچے پہنچ کر وہاں ٹھہر جائے گا، اور اس ٹھہرنے کی کیفیت کا احاطہ انسانی علم نہیں کر سکتا۔

فتستاذن: سید صاحب کی اصل کتاب میں اور بعض تصحیح شدہ نسخوں میں بھی یہ فعل اور اگلا فعل دونوں مرفوع ہیں۔

قوله: يوشك ان تسجد ...... كمستقر لها:

لا يقبل: مذکر کا صیغہ ہے، ای لايقبل السجود (یعنی سجدہ کرنا قبول نہ ہوگا۔) اور ظرف نائب فاعل ہے، اور اس فعل کو مؤنث کے صیغہ کے ساتھ "لا تقبل" بھی نقل کیا گیا ہے، اس صورت میں نائب فاعل "السجدة" ہوگا۔

منها: یہ ضمیر "الشمس" کی طرف لوٹ رہی ہے، یہ مرفوع ہے۔ اور بعض کا کہنا ہے کہ منصوب ہے، یہی ترکیب ہے اگلی عبارت کا ہے۔

"لمستقر لها" کی تفسیر کے بارے میں علامہ خطابیؒ نے بعض مفسرین سے نقل کیا ہے: **ان معناه ان الشمس تجرى لاجل قدرلها۔** یعنی اس عالم کی مدت کی انتہاء تک چلتا رہے گا۔

بعض حضرات فرماتے ہیں: **مستقرها غاية ما تنتهى اليه فى صعودها وارتفاعها لا طول يوم من الصيف، ثم تأخذ فى النزول فى اقصى مشارق الشتاء لاقصر يوم فى السنة.**

قوله: مستقرها تحت العرش":

اس بات کا انکار نہیں کیا جا سکتا، کہ سورج اللہ کے عرش کے نیچے ٹھہرتا ہے نہ ہم اس کو دیکھ سکتے ہیں، اور نہ اس کا ادراک کر سکتے ہیں، مگر چونکہ حضور علیہ السلام نے ایک غیبی خبر دی ہے، اس لئے نہ ہم اس کو جھٹلاتے ہیں، اور نہ اس کی کیفیت بیان کرتے ہیں، چونکہ ہمارا علم اس کا احاطہ نہیں کر سکتا۔ (ذکرہ طیبیؒ)

تخریج: امام ترمذیؒ اور نسائیؒ نے بھی اس حدیث کو نقل کیا ہے۔

۵۴۶۹ : وَعَنْ عِمْرَانَ بْنِ حُصَيْنٍ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ مَا بَيْنَ خَلْقِ اٰدَمَ اِلٰى قِيَامِ السَّاعَةِ اَمْرٌ اَكْبَرُ مِنَ الدَّجَّالِ. (رواه مسلم)

اخرجه مسلم فى صحيحه ٢٢٦٧/٤ حديث رقم (١٢٦-٢٩٤٦)

ترجمہ: "حضرت عمران بن حصین رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ ارشاد فرماتے ہوئے سنا: آدم کی پیدائش سے لے کر وقوع قیامت تک (یعنی کائنات انسانی کے تمام دور میں ابتلاء واختلال اور استدراج کے لحاظ سے) دجال کے فتنہ سے بڑا کوئی فتنہ نہیں"۔ (مسلم)

تشریح: **قوله: مابين خلق آدم ....** "ما" نافیہ ہے، اور "امر" سے مراد فتنہ ہے۔

کیونکہ دجال کا فتنہ، آزمائش اور دھوکہ بہت سخت ہوگا۔

تخریج: جامع میں ہے اس حدیث کو امام احمد اور مسلم نے ہشام بن عامر سے نقل کیا ہے، چنانچہ اصول کی تحقیق کرنی چاہیئے، تاکہ یہ بات واضح ہو جائے۔

۵۴۷۰ : وَعَنْ عَبْدِ اللّٰهِ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِنَّ اللّٰهَ لَا يَخْفٰى عَلَيْكُمْ إِنَّ اللّٰهَ لَيْسَ بِأَعْوَرَ وَإِنَّ الْمَسِيْحَ الدَّجَّالَ أَعْوَرُ عَيْنِ الْيُمْنٰى كَأَنَّ عِنَبَةٌ طَافِيَةٌ۔ (متفق عليه)

اخرجه البخاري في صحيحه ۹۰/۱۳ حديث رقم ۷۱۲۳ ومسلم في صحيحه ۲۲۴۷/٤ حديث رقم (۱۰۰-۱۶۹) وابو داؤد في السنن ٤٩٤/٤ حديث رقم ٤٣١٦ وابن ماجه في السنن ۱۳۵۳/۲ حديث رقم ٤٠٧١ واحمد في المسند ۳۳/۲۔

ترجمہ: ''حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: بلاشبہ اللہ تعالیٰ تم پر پوشیدہ نہیں ہے یقیناً اللہ تعالیٰ کانا نہیں ہے جب کہ مسیح دجال دائیں آنکھ سے کانا ہوگا اور اس کی وہ آنکھ یوں محسوس ہوگی جیسے وہ انگور کا ایک پھولا ہوا دانا ہے''۔ (بخاری و مسلم)

تشریح: قوله:ان الله لايخفى عليكم:

یعنی ثبوتی اور سلبی صفات کے اعتبار سے اور عیوب و نقائص اور تمام زمانی و مکانی امور حادثہ سے منزہ ہونے کے اعتبار سے کسی پر مخفی نہیں، چنانچہ یہ جملہ اگلے کلام (ان الله ليس باعور) کیلئے بطور تمہید ذکر کیا گیا ہے۔

قوله:ان الله ليس باعور:

اس کا مفہوم مخالف معتبر نہیں، کیونکہ اس کلام سے مقصود اللہ تعالیٰ سے عیوب و نقائص کی نفی کرنا ہے۔ اللہ تعالیٰ کیلئے صفت کمال کے ساتھ اعضاء کا اثبات مقصود نہیں ہے۔ طیبیؒ فرماتے ہیں، اس جملہ سے اللہ کی تنزیہ مقصود ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے (خود اپنا) وصف بیان فرمایا ہے: ﴿ويجعلون لله البنات سبحانه ولهم ما يشتهون﴾ [النحل: ۵۷] ''اور اللہ تعالیٰ کے لئے بیٹیاں تجویز کرتے ہیں سبحان اللہ! اور اپنے لئے چاہتی چیز (یعنی بیٹے)۔''

قوله:ان الميسع الدحال أعورعين اليمنى:

المسیح: معروف اور درست قول یہی ہے کہ ''المسیح'' میں حاء مہملہ کے ساتھ ہے۔

''مسیح''، فعیل بمعنی فاعل ہے، لانه يمسع الارض جميعها (کیونکہ دجال بڑی تیزی سے تمام زمین پر گھوم پھرے گا۔)

یا فعیل بمعنی مفعول ہے، لانه ممسوح العين (کیونکہ اس کی ایک آنکھ ممسوح ہے۔)

علامہ سیوطیؒ ابوبکر بن العربی سے نقل کر کے فرماتے ہیں جس نے لفظ ''المسیح'' سین مشدد کے ساتھ پڑھا یا خاء کے ساتھ پڑھا اس نے تحریف کی۔ انتہی۔

یہ لقب ''دجال'' اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے درمیان مشترک ہے۔ لیکن حضرت عیسیٰؑ پر ''المسیح'' کا اطلاق بمعنی ''ما

سح" ہو تو مطلب یہ ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام بیمار پر ہاتھ پھیرتے تو مریض ان کی برکت سے شفایاب ہو جاتا، اور اگر بمعنیٰ "ممسوح" اطلاق کیا جائے، تو مطلب یہ ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام اپنی ماں کے پیٹ سے پاکیزگی کی حالت میں دنیا کے اندر تشریف لائے ہیں۔

قاموس میں لکھا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو "مسیح" ان کی برکت کی وجہ سے کہا جاتا ہے۔

اس کے اشتقاق کے سلسلے میں میں نے مشارق الانوار کی شرح میں پچاس اقوال نقل کیے ہیں۔

"دجال" کو "مسیح" "بمعنیٰ" "ماسح" اس کے نحوست پھیلانے کے اعتبار سے کہا جاتا ہے۔

یا دجال کو مسیح "ممسوح بالشوم" کے معنیٰ میں کہا جاتا ہے۔ (یعنی منحوس کے معنیٰ میں ہے)

"یا ممسوح الوجه بالكذب" کے معنیٰ میں کہا جاتا ہے۔ (یعنی بہت جھوٹا کے معنیٰ میں ہے)

"عين اليمنٰى" میں موصوف کی اضافت صفت کی طرف کی گئی ہے، اور جن کے نزدیک (یہ ترکیب) جائز نہیں ہے، مثلاً علامہ طیبیؒ وغیرہ تو انہوں نے تقدیر عبارت یہ بیان کی ہے: عين الجثة اليمنٰى او عين الجهة اليمنٰى.

قوله: كان عنه عنبة طافية:

كان: نون کی تشدید کے ساتھ ہے۔

عينه: اس سے وہ کانی آنکھ مراد ہے، یا دوسری صحیح آنکھ مراد ہے۔

عنبة: ای كان عينه شبيهة بعنبة اس عبارت میں بلیغ تشبیہ ہے۔

طافية: فاء کے بعد "یا" اور "ہمزہ" دونوں پڑھنا جائز ہیں بمعنیٰ مرتفعة. امام میرکؒ فرماتے ہیں، کہ "طافیہ" "یاء" اور "ہمزہ" دونوں کے ساتھ نقل کیا گیا ہے اور دونوں درست ہیں۔

علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں مطلب یہ ہے کہ وہ آنکھ دوسری آنکھ سے اُبھری ہوئی ہے۔ کیونکہ یہ "الطفو" سے ماخوذ ہے جس کا معنیٰ ہے "پانی کے اوپر کی سطح پر کسی چیز کا آ جانا (انتھی)" اسی سے "طافی" ہے، وہ مچھلی (جو مر جانے کے بعد پانی کی سطح کے اوپر آ جائے۔)

حدیث باب اُس روایت "وہ آنکھ نہ تو اُبھری ہوئی ہوگی اور نہ دھنسی ہوئی ہوگی" کے منافی نہیں کیونکہ ان دونوں روایتوں میں مطابقت کی صورت ہے اور وہ یہ کہ ان مختلف روایتوں کو مختلف آنکھوں پر محمول کیا جائے، اور مطلب یہ ہو کہ ایک آنکھ تو انگور کے دانے کی طرح ابھری ہوئی ہوگی اور دوسری آنکھ نہ ابھری ہوئی ہوگی اور نہ دھنسی ہوئی ہوگی۔

ابن الملکؒ شرح المشارق میں فرماتے ہیں: "طافئة" ہمزہ کے ساتھ۔ اس کا معنیٰ وہ آنکھ جس کی بینائی ختم ہوگئی ہو، اور بغیر ہمزہ کے بھی منقول ہے جس کا معنیٰ ہے "اُبھری ہوئی چیز"۔

علامہ تورپشتی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ دجال کے جسمانی اوصاف کے متعلق وارد احادیث میں اس کی آنکھ کے متعلق مختلف قسم

کے اوصاف منقول ہیں، اور ان روایتوں میں مطابقت پیدا کرنا بہت مشکل ہے، ہم اللہ تعالیٰ سے سوال کرتے ہیں کہ وہ ان روایتوں میں تطبیق کی توفیق عطاء فرمائے۔ اللہ کی توفیق سے ہم ہر ایک حدیث جس میں دجال کے اوصاف کا ذکر ہے، کی وضاحت کریں گے۔ (روایات میں اس کی آنکھ کے بارے میں یہ اوصاف بیان ہوئے ہیں)

۱ اس حدیث میں آنکھ کے متعلق طافية (ابھری ہوئی) فرمایا۔

۲ ایک حدیث میں "جاحظ العين كأنها كوكب" فرمایا۔ یعنی دجال کی آنکھ اس طرح ابھری ہوئی ہوگی جیسا کہ کوکب یعنی ستارہ رکھا گیا ہو۔

۳ ایک حدیث میں ہے: ليست بناتئة ولا حجراء کہ دجال کی آنکھ نہ تو ابھری ہوئی ہوگی اور نہ دھنسی ہوئی ہوگی۔

چنانچہ ان روایتوں میں تطبیق کے بارے میں یوں کہا جا سکتا ہے کہ ان مختلف اوصاف کا تعلق مختلف آنکھوں سے ہے، اور اس کی تائید ابن عمرؓ کی اس حدیث سے بھی ہوتی ہے، جس میں ارشاد ہے: انه اعور عين اليمنى "دجال دائیں آنکھ سے کانا ہے۔" اور حذیفہؓ کی حدیث میں ہے: انه ممسوح العين عليها ظفرة غليظة۔ "دجال کی آنکھ مٹی ہوئی ہے جس پر موٹا ناخن ہے۔"

اور ان ہی کی ایک روایت میں یہ ہے: انه اعور عين اليسرى "دجال بائیں آنکھ سے کانا ہے۔"

چنانچہ ان مختلف قسم کے اوصاف میں تطبیق کے بارے میں یہی کہا جائے گا، کہ ایک آنکھ تو بالکل غائب ہے اور دوسری آنکھ عیب دار ہے، چنانچہ دونوں آنکھوں کو "عوراء" کہا جا سکتا ہے، کیونکہ یہ "عور" سے ماخوذ ہے، جس کا معنی "عیب" ہے (اور دجال کی دونوں آنکھوں میں عیب ہے)۔ شیخ محی الدینؒ نے بھی اسی طرح کی بات ذکر کی ہے (کذا فی شرح طیبیؒ)

۵۴۷۱ : وَعَنْ اَنَسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَا مِنْ نَبِيٍّ اِلَّا قَدْ اَنْذَرَ اُمَّتَهُ الْاَعْوَرَ الْكَذَّابَ اِلَّا اِنَّهُ اَعْوَرُ وَاِنَّ رَبَّكُمْ لَيْسَ بِاَعْوَرَ مَكْتُوْبٌ بَيْنَ عَيْنَيْهِ كُفْرٌ. (متفق عليه)

اخرجه البخاري في صحيحه ٤١٥/١٣حديث رقم ٧٤٣١ومسلم في صحيحه ٢٢٤٨/٤حديث رقم (١٠١-٢٩٣٣) وابو داوٗد في السنن ٤٩٤/٤حديث رقم ٤٣١٦ والترمذي في السنن ٤٤٧/٤حديث رقم ٢٢٤٥

ترجمہ: "حضرت انس رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: کوئی پیغمبر نہیں گزرا مگر اس نے اپنی کو جھوٹے کانے سے ڈرایا ہو (یاد رکھو) بلاشبہ دجال کانا ہوگا اور تمہارا پروردگار کانا نہیں ہے' نیز اس (دجال) کی دونوں آنکھوں کے درمیان ک ف ر (یعنی لفظ کفر) لکھا ہوا ہوگا"۔ (بخاری و مسلم)

تشریح: قوله: مامن نبي الا قد انذر امته الاعور الكذاب:

اس حدیث میں یہ اشکال نہ کیا جائے کہ روایات سے ثابت ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام نازل ہونگے اور نزول کے بعد حضرت عیسیٰؑ، دجال کو قتل کریں گے، اور زمین پر شریعت محمدی ﷺ کے مطابق حکومت کریں گے، کیونکہ انبیاء نے جب اپنی امتوں کو ڈرایا، تو ان کو دجال کے خروج کا وقت متعین طور پر معلوم نہیں تھا۔ اس روایت کے بعض طرق میں آتا ہے کہ آپ نے فرمایا: "ان

يخرج وانا فيكم فانا حجيجه "

"اگر میری موجودگی میں دجال نکل آیا تو میں اس سے مقابلہ کروں گا۔" یہ بھی اس توجیہ پر محمول ہے۔ مزید یہ کہ حضور علیہ السلام نے یہ ارشاد اس وقت فرمایا تھا کہ جس وقت آپ ﷺ کو دجال کے خروج کا وقت اور اس کی علامات وحی کے ذریعے معلوم نہیں ہوئی تھیں۔ پھر جب آپ ﷺ کو دجال کی علامات اور خروج کا وقت معلوم ہو گیا تو صحابہؓ کو اس کی خبر دی۔

علاوہ ازیں یہ بھی احتمال ہے کہ ابہام اس اس سبب سے ہو کہ بعض اوقات علامات کا وجود کسی شرط پر موقوف ہوتا ہے، چنانچہ اُس شرط کی عدم موجودگی کی صورت میں علامات کے ظاہر ہونے کے بغیر بھی خروج دجال کا تصور ہو سکتا ہے، اور اس کی مثال حضرات انبیاء کرام علیہم السلام کا اللہ سے ڈرنا ہے، حالانکہ ان کی عصمت ثابت ہے اور آخرت کے عذاب سے مامون ہیں۔ اسی طرح ان جلیل القدر صحابہ کرام کا خوف جن کو صادق مصدوق حضرت محمد ﷺ نے اپنی زبان سے جنت کی خوشخبری سنائی تھی (لیکن پھر بھی مذکورہ بالا نوعیت کے ابہام کی وجہ سے ان کو خوف رہتا تھا)

یا حضور ﷺ کو (خروج دجال کے بارے میں) ابہام اس لئے تھا کہ اللہ تعالیٰ پر کوئی چیز لازم و واجب نہیں ہے، اور نہ اللہ کے افعال اسباب پر موقوف ہیں، اور نہ اسباب اللہ کے افعال کے وجود کو متعین کرتے ہیں، اور نہ تاثیر رکھتے ہیں، شاید یہی راز ہے کہ حضور ﷺ نے بھی" ان يخرج وانا فيكم "فرمایا (جس سے بظاہر خروج دجال کے وقت میں ابہام معلوم ہو رہا ہے)۔ واللہ اعلم۔

دجال سے ہر وہ شخص مراد ہے جو الوہیت کا دعویٰ کرے، جیسا کہ فرعون، شداد، نمرود اور دوسرے سرکش کافر، اور یہ بات تو ہر صاحب نظر پر واضح ہے کہ ان میں سے کوئی بھی نقصان وعیب سے خالی نہیں تھا، خواہ عیب باطنی تھا یا ظاہری تھا۔

لیکن جب قیامت کا وقت قریب آ جائے گا، تو آنکھیں اندھی ہو جائیں گی، چالاکی ختم ہو جائے گی اور دجال موعود کی شرارت فتنہ اور آزمائش تمام انسانوں پر ظاہر ہو گی، اور حقیقی ربّ کی کبریاء تو اتنی ہے کہ اس کی مکمل حقیقت کو نہیں پہچانا جا سکتا، اور اُس رب کی جلالی اور جمالی تجلیات کا شمار نا ممکن ہے۔ شیخ ابومدین مغربی فرماتے ہیں:

لا تنكر الباطل في طوره
فانه بعض ظهوراته

چنانچہ ہر سالک کو چاہئے کہ امتثال امر اور اجتناب نواہی کے بعد ہمیشہ یہ دعا کرے:

"اللهم ارنا الا شياء كما هي' وارنا الباطل باطلاً وارزقنا اجتنابه وارنا الحق حقاً وارزقنا اتباعه"

"اے اللہ ہمیں تمام اشیاء ایسی دکھا جیسے ان کی حقیقت ہے، ہمیں باطل کا باطل ہونا سمجھا دے اور اُس سے پرہیز کی توفیق عطاء فرما دے، اور حق کا حق ہونا سمجھا دے، اور اس کی اتباع کی توفیق عطاء فرما دے۔"

قوله: ألا انه اعور وان ربكم ليس بأعور:

الا: کلمہ تنبیہ ہے۔

اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات' نقصان وعیب سے پاک ہیں۔حضور علیہ السلام نے اپنے اس ارشاد میں لوگوں کے عقل وفہم کی سطح کے موافق ارشاد فرمایا ہے، جیسا کہ ارشاد ہے:

"کلم الناس علی قدر عقولهم" "لوگوں کے ساتھ ان کی عقل وفہم کے بقدر بات کرو۔"

اس کی نظیر قرآن کی یہ آیت ہے: ﴿ اِنَّ الَّذِیْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ عِبَادٌ اَمْثَالُكُمْ فَادْعُوْهُمْ فَلْیَسْتَجِیْبُوْا لَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ اَلَهُمْ اَرْجُلٌ یَّمْشُوْنَ بِهَاۤ اَمْ لَهُمْ اَیْدٍ یَّبْطِشُوْنَ بِهَاۤ اَمْ لَهُمْ اَعْیُنٌ یُّبْصِرُوْنَ بِهَاۤ اَمْ لَهُمْ اٰذَانٌ یَّسْمَعُوْنَ بِهَا﴾ [الاعراف:۱۹۴۔۱۹۵] "واقعی تم اللہ کو چھوڑ کر جن کی عبادت کرتے ہوئے وہ بھی تم ہی جیسے بندے ہیں تم ان کو پکارو پھر ان کو چاہئے کہ تمہارا کہنا کردیں اگر تم سچے ہو کیا ان کے پاؤں ہیں جن سے وہ چلتے ہیں یا ان کے ہاتھ میں یا ان کے ہاتھ میں جن سے کسی چیز کو تھام سکیں یا ان کی آنکھیں ہیں جن سے وہ دیکھتے ہیں یا ان کے کان ہیں جن سے وہ سنتے ہیں"۔

مطلب یہ ہے کہ جب یہ بت عبادت کرنے والوں کے اعتبار سے مکمل طور پر عاجز ہیں، اور ان کے آلات واعضاء ناقص ہیں، تو پھر یہ معبود بننے کی صلاحیت کس طرح رکھتے ہیں۔اس کا مطلب ہرگز یہ نہیں کہ اگر بالفرض ان بتوں کیلئے صحیح سالم اعضاء ہوتے تو پھر ان کو معبود بنانا درست ہوتا۔

روایت کیا گیا ہے، کہ ابراہیم علیہ السلام نے اپنی ماں سے پوچھا، میرا رب کون ہے؟ کہنے لگی میں تیرا رب ہوں۔ابراہیم علیہ السلام نے پوچھا، تیرا رب کون ہے؟ کہنے لگی تیرا باپ۔ابراہیم علیہ السلام نے پوچھا میرے باپ کا رب کون ہے؟ کہنے لگی نمرود۔ابراہیمؑ نے پوچھا نمرود کا ربّ کون ہے؟ کہنے لگی وہی بڑا اور آخری رب ہے، کیونکہ اس کا لشکر بہت زیادہ ہے۔ابراہیمؑ نے فرمایا، کہ اگر نمرود ہی بڑا رب ہے تو پھر اس کی شکل اتنی بُری اور قبیح کیوں ہے حالانکہ اس کے نوکر خوبصورت ہیں؟

کلام کا خلاصہ یہ ہے کہ حضور علیہ السلام نے دجال کے اس بڑے عیب اور اس ظاہری نقصان کو اس کے جھوٹا ہونے اور کافر ہونے کی علامت قرار دیا، تاکہ دجال کے دھوکہ اور مکر وفریب کو قبول کرنے میں لوگوں کیلئے کوئی عذر باقی نہ رہے مزید برآں عقلی اور نقلی دلائل اس بات پر دلالت کرتے ہیں، کہ جسم الٰہ نہیں ہوسکتا، اور عیب دار حادث معبود نہیں ہوسکتا۔

قوله: مکتوب بین عینیه ك. ف. ر:

اس میں اشارہ ہے کہ دجال کفر کی طرف دعوت دے گا، رشد وہدایت کی طرف دعوت نہیں دے گا، چنانچہ اس سے اجتناب ضروری ہے، اور یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس اُمت کے حق میں بہت بڑی نعمت ہے، کہ اس کی دونوں آنکھوں کے درمیان "کفر" کو ظاہر فرمادیا۔

علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں، ممکن ہے کہ اس صراحت سے مراد یہ ہے کہ معنی کے اعتبار سے کوئی مسامحت نہ ہوگی۔

امام نوویؒ فرماتے ہیں، یہ اس علامت کا بیان ہے جو دجال کے جھوٹا ہونے کی ایسی واضح قطعی دلیل ہے جس کو ہر صاحب عقل پہچانے گا، اور صرف اس کے جسم ہونے اور دوسرے قطعی دلائل پر اکتفاء نہیں کیا کیونکہ بعض لوگوں کی عقلوں کی رسائی دلائل تک نہیں ہوتی۔

۵۴۷۲ : وَعَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَلَا اُحَدِّثُكُمْ حَدِيْثًا عَنِ الدَّجَّالِ مَا حَدَّثَ بِهٖ نَبِيٌّ قَوْمَهُ اِنَّهُ اَعْوَرُ وَاِنَّهُ يَجِيْءُ مَعَهُ بِمِثْلِ الْجَنَّةِ وَالنَّارِ فَالَّتِيْ يَقُوْلُ اِنَّهَا الْجَنَّةُ هِيَ النَّارُ وَاِنِّيْ اُنْذِرُكُمْ كَمَا اَنْذَرَ بِهٖ نُوْحٌ قَوْمَهُ. (متفق علیه)

اخرجه البخاری فی صحیحه ۳۷۰/۶حدیث رقم ۳۳۳۷ومسلم فی صحیحه ۲۲۵۰/۴حدیث رقم (۱۰۹-۲۹۳۶)

ترجمہ: ''حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا کہ (ایک روز) رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''خبردار میں تمہیں دجال کے بارے میں ایسی بات بتائے دیتا ہوں جو کسی اور پیغمبر نے اپنی امت کو نہیں بتائی ہے (اور وہ بات یہ ہے کہ) دجال کانا ہوگا اور وہ اپنے ہمراہ جنت و دوزخ کی مانند دو چیزیں لے کر آئے گا' پس وہ جس چیز کو جنت کہے گا درحقیقت وہ جہنم میں لے جانے والی ہوگی ہوگی لہٰذا میں تمہیں اس (دجال) سے ڈراتا ہوں جیسا کہ نوح علیہ السلام نے اپنی امت کو اس سے ڈرایا تھا''۔ (بخاری ومسلم)

تشریح: قولہ الا احد ثکم حدیثا...... بمثل الجنة و النار:

''الا'': کلمہ تنبیہ ہے' اور ''ما'' نافیہ ہے ما حدث. یہ بھی ممکن ہے کہ ہمزہ استفہام کا ہو، اور '' لا '' نافیہ ہو اور جواب میں '' بلٰی '' مقدر ہو، یا جواب فوری طور پر ارشاد فرمایا ہو (حتی کہ مخاطبین کو موقع ہی نہ مل سکا ہو کہ وہ 'بلٰی' یا کچھ اور کہہ پائے ہوں)

انه اعور: یعنی وہ ایک قبیح صورت والا ہوگا، اور اس کا حلیہ جادوگروں کی طرح کا ہوگا۔ اگلے جملہ کا حاصل یہی ہے۔

و انه: یہ ضمیر، ضمیر شان ہے۔

بمثل الجنة: اور ایک روایت میں (''مثل الجنة'' کی بجائے) ''لمثال الجنة'' ہے۔ (والنار)

باء تعدیہ کیلئے ہے۔

مطلب یہ ہے کہ لوگوں کی نگاہوں میں جنت و جہنم کی طرح دکھائی دینے والی دو چیزیں ساتھ لیکر آئے گا۔ لیکن اللہ تعالیٰ مؤمنین کے حق میں ان کی حقیقتوں کو بدل دیگا۔ یا باء زائدہ ہے ای: ''یسیر معه مثلهما''. جنت و جہنم جیسی دو چیزیں اس کے ساتھ چلیں گی۔ اس توجیہ کی تائید اس روایت سے بھی ہوتی ہے، جس میں ''یجیء معه تمثال الجنة و النار'' کے الفاظ وارد ہوئے ہیں، (کہ دجال کے ساتھ جنت و جہنم کی تصویر یا مجسمہ ہوگا) یعنی جار و مجرور کی بجائے صرف '' تمثال'' ۔ تاء کے کسرہ کے ساتھ وارد ہوا ہے۔

قولہ: فالتی یقول...... هی النار:

فالتی: (موصوف محذوف ہے) ای ''فالصورة التی''

یعنی وہ آگ بادی النظر میں نعمت معلوم ہوگی درحقیقت عذاب دینے والی آگ ہوگی۔ بظاہر یہ عبارت اکتفاء کے باب سے ہے۔ اس کی دلیل اگلی حدیث ہے، اور تقدیری عبارت یہ ہے ''والتی یقول انها النار هی الجنة'' (جس کو وہ جہنم کہے

گا، حقیقت میں وہ جنت ہوگی)۔

اس کی نظیر دنیا ہے کہ اہل اللہ عارفین کی نظروں میں دنیا کی تکلیف نعمت ہے، اور اس کی نعمت عذاب کا باعث ہے۔ اس کی مشقت عطاء ہے اور اور عطاء ایک مشقت ہے۔ اس کا حسن اور قبح مختلف ہے۔ جیسا کہ دریائے نیل کہ موسیٰ علیہ السلام اور ان کے متبعین کیلئے پانی تھا اور فرعونیوں کیلئے موت کا خون تھا۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: [من القرآن ماهو شفا ءورحمة للمؤمنين] [الاسراء: ۸۲] ''اور ہم قرآن میں ایسی چیزیں نازل کرتے ہیں کہ وہ ایمان والوں کے حق میں تو شفا اور رحمت ہیں''۔

شارحؒ فرماتے ہیں: مطلب یہ ہے کہ جو دجال کی اس جنت میں داخل ہوگا، وہ جہنم کا مستحق قرار پائے گا، کیونکہ اس شخص نے دجال کی تصدیق کی، چنانچہ اس عبارت میں مسبب پر سبب کا اطلاق کیا گیا ہے۔

میں کہتا ہوں اور اسی طرح جو شخص دجال کی بات نہیں مانے گا، اور دجال اس کو اپنی آگ میں داخل کریگا، وہ جنت کا مستحق ہو جائے گا، کیونکہ اس شخص نے دجال کی تکذیب کی۔ لیکن زیادہ ظاہر یہ ہے کہ (مجازاً مسبب پر سبب کا اطلاق نہیں کیا گیا بلکہ حقیقۃً) بالفعل دجال کی جنت جہنم بن جائے گی، اور اس کی آگ جنت بن جائے گی، جیسا کہ حدیث میں ارشاد ہے:

''القبر روضة من رياض الجنة او حفرة من حفر النار''

''قبر جنت کے باغیچوں میں سے ایک باغیچہ ہے یا جہنم کے گڑھوں میں سے ایک گڑھا ہے۔''

اور اسی سے اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: ﴿یانار کونی بردًا وسلامًا علی ابراهیم﴾ [الانبیاء: ۶۹] ''جب انھوں نے متفق ہو کر لوگ میں ڈال دیا تو اس وقت ہم نے (آگ کو) حکم دیا کہ اے آگ تم ٹھنڈی اور بے گزند ہو جا ابرہیم کے حق میں''۔

اور اسی طرح اس مکدر دنیا کا حال ہے جس کو قید خانہ کہا گیا ہے کہ یہ دنیا (اپنی تمام تر مشقتوں اور تنگیوں کے باوجود) ان اہل اللہ کیلئے جنت بن جاتی ہے، جو مقام رضاء پر فائز ہیں، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿ولمن خاف مقام ربه جنتان﴾ [الرحمن: ۴۶] ''اور جو شخص اپنے رب کے سامنے کھڑے ہونے سے ڈرتا رہتا ہو اس کے لئے دو باغ ہوں گے ان میں سے ایک جنت دنیا میں ہے اور دوسری جنت آخرت میں ہوگی۔ اسی طرح یہ دنیا ان دنیاداروں کیلئے جن کو اللہ سے تعلق نہیں ہے، ''وسم'' میں ''سم'' ''درهم'' اور دینار میں ''نار'' کی مانند ہے، اور بسا اوقات اس بات کا احساس نہیں ہوتا، جیسا کہ مجنون، جنون میں اور زخمی شخص کو زخم کی ابتدائی حالت میں احساس نہیں ہوتا۔ یہی مطلب ہے اس شعر کا:

سوف ترى اذا انجلى الغبار
أفرس تحت رجلك ام حمار

''عنقریب جب یہ غبار چھٹ جائے گا تو تجھے معلوم ہو جائے گا کہ تم گھوڑے پر سوار ہو یا گدھے پر۔''

امام نوویؒ فرماتے ہیں، کہ یہ احادیث اہل حق کے مذہب کی دلیل ہیں کہ دجال کا وجود ہوگا، وہ ایک شخص متعین ہوگا، جس کے ذریعے اللہ تعالیٰ لوگوں کا امتحان لیں گے اور اس کو اپنے جیسے بعض اختیارات دے گا، مثلاً جس کو وہ قتل کرے گا اسی کو زندہ

کرنے کی قدرت رکھے گا، اس کے پاس دنیا کی رونق ہوگی زمین کے خزانے اس کے تابع ہو جائیں گے، آسمان کو بارش برسائے کا حکم دے گا تو آسمان بارش برسائے گا۔ زمین کو سبزہ اُگانے کا حکم دے گا (تو زمین سے سبزہ اُگے گا،) یہ سب کچھ اللہ کی قدرت اور مشیت سے ہوگا۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ دجال کو عاجز کر دے گا، چنانچہ یہ کسی بھی شخص کو نہ قتل کر سکے گا اور نہ کچھ اور کر سکے گا۔ پھر عیسیٰ علیہ السلام اس کو قتل کر دیں گے، اور ایمان والوں کو اللہ تعالیٰ ثابت قدمی عطا فرمائے گا۔ یہ بہت خطرناک فتنہ ہوگا جو تمام عقول کو دہشت زدہ کر دے گا، تمام انسانوں کو حیران کر دے گا، اور زمین پر انتہائی تیزی کے ساتھ پھیلے گا، اور نہ اس قدر ٹھہرنے پائے گا کہ ضعفاء حدث ونقص کے دلائل (دجال کا حادث اور بدن میں ظاہری نقص والا ہونا اس کے جھوٹا ہونے کی دلیل ہے) میں تأمل کر سکیں اور تصدیق کرنے والے اس کی تصدیق کر لیں گے، اسی وجہ سے انبیاء کرام نے اپنی قوموں کو اس کے فتنے سے ڈرایا اور اس کے باطل وناقص ہونے پر اور اس کے دلائل کے ابطال پر تنبیہ کی۔ اور جن لوگوں کے ساتھ اللہ کی توفیق شامل حال ہوگی وہ ان دلائل کی بناء پر جو اس کے الٰہ ہونے کو جھٹلاتے ہیں، اور اس دجال کے حال کا علم ہونے کی بناء پر اس دجال کے فتنہ سے دھوکہ نہیں کھائیں گے۔

قوله: وانى انذر كم انذر به نوح قومه:

اگر یہ کہا جائے کہ نوح علیہ السلام کو بطور خاص کیوں ذکر کیا گیا؟

تو اس کا جواب یہ ہے کہ مشہور انبیاء میں نوح علیہ السلام سب سے قدیم نبی ہیں، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے اس ارشاد میں نوح علیہ السلام کا خصوصی طور پر کو ذکر کیا ہے۔: ﴿شرع لكم من الدين ما وصى به نوحا﴾ [الشوریٰ:۱۳] ''اللہ تعالیٰ نے تم لوگوں کے واسطے ہی دین مقرر کیا جس کا اس نے نوح کو حکم دیا تھا۔''

اگر یہ بات ثابت ہو جائے کہ نوح سے پہلے والے انبیاء نے بھی اپنی قوموں کو ڈرایا ہے، پھر تو یہ جواب ٹھیک ہے، ورنہ یہ حقیقتاً اولویت پر محمول ہے اور اس پر یہ حدیث دلالت کرتی ہے:

''انه لم يكن نبى بعد نوح الا قد انذر الدجال قومه'' (نوحؑ کے بعد کوئی بھی نبی ایسا نہیں گزرا جنہوں نے اپنی قوم کو دجال سے نہ ڈرایا ہو''۔

اور جہاں تک آیت مبارکہ میں نوح کے ذکر کی تقدیم کی بات ہے، تو اس کی وجہ یہ ہے کہ نوحؑ تمام اولوالعزم رسولوں میں سب سے پہلے رسول ہیں، اسی وجہ سے تو دوسری آیت: ﴿واذا اخذنا من النّبيين ميثاقهم ومنك ومن نوح وابراهيم وموسٰى وعيسٰى بن مريم﴾ [الاحزاب: ۷] اور جب کہ ہم نے تمام پیغمبروں سے ان کا اقرار اور آپ سے بھی اور نوح اور ابراہیم اور موسیٰ اور عیسیٰ ابن مریم سے بھی میں حضور علیہ السلام کو پہلے ذکر کیا کیونکہ رتبہ کے اعتبار سے آپ ﷺ تمام انبیاء میں مقدم ہیں۔ حاصل یہ کہ یہی پانچ اولوالعزم رُسل ہیں، جن کا ذکر دونوں مذکورہ آیتوں میں یکجا طور پر کیا گیا ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

۵۴۷۳ : وَعَنْ حُذَيْفَةَ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اِنَّ الدَّجَّالَ يَخْرُجُ وَاِنَّ مَعَهٗ مَآءً وَنَارًا فَاَمَّا الَّذِىْ يَرَاهُ النَّاسُ مَآءً فَنَارٌ تُحْرِقُ وَاَمَّا الَّذِىْ يَرَاهُ النَّاسُ نَارًا فَمَآءٌ بَارِدٌ عَذْبٌ فَمَنْ

اَدْرَكَ ذٰلِكَ مِنْكُمْ فَلْيَقَعْ فِي الَّذِيْ يَرَاهُ نَارًا فَاِنَّهٗ مَآءٌ عَذْبٌ طَيِّبٌ (متفق عليه و زاد مسلم) وَاَنَّ الدَّجَّالَ مَمْسُوْحُ الْعَيْنِ عَلَيْهَا ظَفَرَةٌ غَلِيْظَةٌ مَكْتُوْبٌ بَيْنَ عَيْنَيْهِ كَافِرٌ يَقْرَؤُهٗ كُلُّ مُؤْمِنٍ كَاتِبٌ وَغَيْرُ كَاتِبٍ ۔

أخرجه البخاري في صحيحه ٤٩٤/٦ حديث رقم ٣٤٥٠ ومسلم في صحيحه ٢٢٤٩/٤ حديث رقم (١٠٥-٢٩٣٤)

ترجمہ:''حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے نقل کرتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: دجال اس حالت میں ظہور پزیر ہوگا کہ اس کے ہمراہ پانی اور آگ ہوں گے' تاہم لوگ جس چیز کو پانی خیال کریں گے وہ در حقیقت جلانے والی ہوگی اور جس چیز کو لوگ آگ خیال کریں گے وہ درحقیقت ٹھنڈا اور میٹھا پانی ہوگا پس تم میں سے جو شخص اس کو (یعنی دجال کو یا اس کی فریب کاریوں کی مذکورہ صورتوں کو) پائے تو اس کو چاہئے کہ وہ اس شے میں گرے جس کو وہ آگ خیال کرتا ہو (یعنی دجال اس کی تکذیب سے ناراض ہو کر اس کو اپنی آگ میں ڈال دے گا) کیونکہ درحقیقت وہ (آگ نہیں ہوگی بلکہ) نہایت شیریں اور عمدہ پانی ہوگا۔ (بخاری و مسلم) اور مسلم نے اپنی روایت میں ان الفاظ کا اضافہ کیا ہے کہ'' دجال ممسوح العین ہوگا (یعنی اس کی ایک آنکھ کی جگہ پیشانی کی طرح بالکل سپاٹ ہوگی کہ وہاں آنکھ کا کوئی ابھار معلوم نہ ہوگا) اور اس پر (یعنی دوسری آنکھ پر) بھاری ناخنہ ہوگا گویا اس کی ایک آنکھ تو بالکل غائب ہی ہوگی اور دوسری آنکھ پر بھی گوشت یا کھال کا ایک بھاری ٹکڑا ہوگا یا یہ مراد یہ ہے کہ اس غائب آنکھ پر ناخنہ ہوگا) اور اس کی آنکھوں کے درمیان'' کافر'' کا لفظ لکھا ہوگا اور اس لفظ کو ہر مؤمن پڑھے گا خواہ وہ لکھنے پڑھنے سے واقفیت رکھتا ہوگا یا نہیں جانتا ہو''۔

تشریح: قوله: ان معه ماء ونارا:

''ماء'' سے مراد پانی سے پیدا ہونے والے عیش وراحت کے اسباب، جن کو ماقبل حدیث میں جنت سے تعبیر کیا گیا تھا اور دجال ان کی طرف ان لوگوں کو راغب کرے گا، جو اس کی بات مانیں گے۔ اور ''نار'' سے مراد وہ چیزیں ہیں جو بظاہر تکلیف وعذاب کا سبب ہونگی، دجال ان سے اس شخص کو ڈرائے گا جو اس کی بات نہ مانے گا۔

قوله: فاما الذي يراه الناس ...... فماء بارد عذب:

ماء عذب : وہ شرین پانی جو پیاس کو بجھائے۔ مطلب یہ ہے کہ جو شخص اس کو جھٹلائے گا، دجال غصہ میں آ کر اس کو اس آگ میں پھینکے گا، اللہ تعالیٰ اُس آگ کو ٹھنڈا شیرین پانی بنا دے گا، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے نمرود کی آگ کو حضرت ابراہیم علیہ السلام کیلئے ٹھنڈی اور سلامتی والی بنا دیا تھا۔ اور جو شخص دجال کی تصدیق کرے گا، دجال اس کو پانی دے گا، تو اللہ اس پانی کو جلانے والی سخت آگ بنا دے گا۔ حاصل یہ کہ دجال کے فتنہ میں کوئی حقیقت نہیں ہوگی بلکہ وہ اس کی طرف سے ایک تخیل ہوگا، اور شعبدہ بازی ہوگی، جیسا کہ جادوگر اور شعبدہ باز کرتے ہیں۔

اور یہ احتمال بھی ہے کہ آگ اور پانی ہوں' اللہ تعالیٰ ان کو تبدیل کر دے، کیونکہ اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے۔

قوله: فمن ادرك ذلك...... فانه ماء عذب طيب:

"ذالك" سے دجال کی طرف اشارہ ہے یا مذکورہ بالا تلبیس کی طرف اشارہ ہے۔

یعنی چاہئے کہ اس کی تکذیب کرے، اور وہ جو ظاہری آگ میں ڈالے گا، اس کی پرواہ نہ کرے۔ حقیقت کے اعتبار سے وہ آگ پانی ہی ہوگا، یا اس آگ کی حقیقت بدل جائے گی یا انجام کے اعتبار سے وہ آگ پانی ہوگا۔ واللہ اعلم بالحال

یہ کلام اکتفاء کے باب سے ہے، اور مقدر عبارت یہ ہے **ولا يصدق مغترا بما يراه معه ماء فانه نار و عذاب وحجاب**: "اُس دجال کے پاس جو پانی ہوگا، اس سے دھوکہ کھا کر اس کی تصدیق نہ کرے، کیونکہ وہ پانی درحقیقت آگ عذاب اور حجاب ہوگا۔"

قوله: وان الدجال ممسوح العين عليها طفرة غليظة:

دجال کے ایک آنکھ کی جگہ پیشانی کی طرح بالکل ہموار ہوگی، اور وہاں آنکھ کا نشان تک نہ ہوگا۔

قاضی عیاض فرماتے ہیں کہ حدیث سابق اور اس کے نظائر کی رو سے اس کی ایک آنکھ ختم ہوگئی ہوگی۔

عليها: ضمیر کا مرجع "العين الاخرى" ہے۔ لیکن دوسری آنکھ پر گوشت کا یہ ٹکڑا اس طرح ہوگا، کہ آنکھ کی سیاہی کو مکمل طور پر نہیں چھپائے گا، کہ بالکل اندھا ہو جائے۔

ظفرة: ظاء اور فاء کے فتحہ کے ساتھ۔ یعنی گوشت یا کھال کا ٹکڑا ہوگا یا ممسوح آنکھ پر ناخن ہوگا۔

قوله: مكتوب بين عينيه كافر...... وغير كاتب:

كل مؤمن كاتب: "كاتب": مؤمن سے بدل ہونے کی بناء پر مجرور ہے۔ ایک اور نسخہ میں "کُل" سے بدل البعض ہونے کی بناء پر مرفوع ہے۔ اور مسلم کی ایک حدیث مرفوع میں حضرت انسؓ سے یوں مروی ہے:

"**الدجال ممسوح العين مكتوبٌ بين عينيه كافر يقراه كل مسلم۔**"

۵۴۷۴ : وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَلدَّجَّالُ اَعْوَرُ الْعَيْنِ الْيُسْرٰى جُفَالُ الشَّعْرِ مَعَهُ جَنَّتُهُ وَنَارُهُ فَنَارُهُ جَنَّةٌ وَجَنَّتُهُ نَارٌ. (رواه مسلم)

اخرجه مسلم فى صحيحه ٢٢٤٩/٤ حديث رقم (١٠٤-٢٩٣٤) وابن ماجه فى السنن ١٣٥٣/٢ حديث رقم ٤٠٧١ واحمد فى المسند ١١٥/٣

ترجمہ: "حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: "دجال بائیں آنکھ کا کانا ہوگا اس کے جسم پر کثیر و گنجان بال ہوں گے اور اس کے ہمراہ اس کی جنت ہوگی اور اس کی آگ ہوگی لیکن اس کی آگ درحقیقت جنت ہوگی اور اس کی جنت درحقیقت میں آگ ہوگی"۔ (مسلم)

تشریح: **قوله: قال الدجال اعور العين اليسرىٰ:**

پہلے یہ بات گزر چکی کہ دجال دائیں آنکھ سے کانا ہے، اور یہ کہ اس کی ایک آنکھ مسح ہوگی چنانچہ ان تینوں قسم کی روایات کی

تطبیق کیلئے یوں کہا جائے گا کہ دجال کی ایک آنکھ ممسوح ہے، اور دوسری آنکھ میں عیب ہے، چنانچہ اس کی ہر آنکھ کے بارے میں ''عوراء'' کہنا صحیح ہے، کیونکہ عوراء، ''عور'' سے ماخوذ ہے، جس کا معنی ''عیب'' ہے۔

بعض کا کہنا ہے کہ روایات کا اختلاف دیکھنے والے افراد کے اختلاف کے اعتبار سے ہے۔ چنانچہ بعض لوگوں کو دجال دائیں آنکھ سے کانا دکھائی دے گا، اور بعض لوگوں کو بائیں آنکھ سے کانا دکھائی دیگا۔ تاکہ اس کے باطل ہونے پر دلالت کرے، کیونکہ جب لوگ دیکھیں گے کہ اس کی شکل وصورت ناقص ہے، تو معلوم ہو جائے گا، کہ یہ تو جادوگر ہے، جھوٹا ہے۔

شارحؒ فرماتے ہیں، ممکن ہے کہ ان دو روایتوں میں سے ایک راوی کا سہو ہو۔ جامع میں لکھا ہے کہ امام بخاریؒ نے اپنی تاریخ میں حضرت ابوہریرہؓ سے حدیث مرفوع نقل کی ہے: ''الدجال عینه خضراء'' دجال کی ایک آنکھ سبز رنگ کی ہے۔

قوله: جفال الشعر:

جفال: جیم کے ضمہ کے ساتھ۔ بمعنی کثیر یعنی اس کے سر پر بال کثرت سے ہونگے۔ (کذا فی الفائق)

قوله: معه جنته وناره فناره جنته وجنته نار:

اس کی وضاحت ماقبل میں گذر چکی ہے۔

تخریج: اسی طرح امام احمد اور ابن ماجہ نے بھی اس روایت کو نقل کیا ہے۔

۵۴۷۵ : ۱۲/۵۳۳۵ وَعَنِ النَّوَّاسِ بْنِ سَمْعَانَ قَالَ ذَكَرَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ الدَّجَّالَ فَقَالَ اِنْ يَّخْرُجْ وَاَنَا فِيْكُمْ فَاَنَا حَجِيْجُهٗ دُوْنَكُمْ وَاِنْ يَّخْرُجْ وَلَسْتُ فِيْكُمْ فَامْرُءٌ حَجِيْجُ نَفْسِهٖ وَاللّٰهُ خَلِيْفَتِيْ عَلٰى كُلِّ مُسْلِمٍ اِنَّهٗ شَابٌّ قَطَطٌ عَيْنُهٗ طَافِيَةٌ كَاَنِّيْ اُشَبِّهُهٗ بِعَبْدِ الْعُزّٰى بْنِ قَطَنٍ فَمَنْ اَدْرَكَهٗ مِنْكُمْ فَلْيَقْرَاْ عَلَيْهِ فَوَاتِحَ سُوْرَةِ الْكَهْفِ وَفِيْ رِوَايَةٍ فَلْيَقْرَاْ عَلَيْهِ بِفَوَاتِحِ سُوْرَةِ الْكَهْفِ فَاِنَّهَا جِوَارُكُمْ مِنْ فِتْنَتِهٖ اِنَّهٗ خَارِجٌ خَلَّةً بَيْنَ الشَّامِ وَالْعِرَاقِ فَعَاثٍ يَمِيْنًا وَعَاثٍ شِمَالًا يَا عِبَادَ اللّٰهِ فَاثْبُتُوْا قُلْنَا يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَمَا لَبْثُهٗ فِي الْاَرْضِ قَالَ اَرْبَعُوْنَ يَوْمًا يَوْمٌ كَسَنَةٍ وَّيَوْمٌ كَشَهْرٍ وَّيَوْمٌ كَجُمُعَةٍ وَسَائِرُ اَيَّامِهٖ كَاَيَّامِكُمْ قُلْنَا يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ فَذٰلِكَ الْيَوْمُ الَّذِيْ كَسَنَةٍ اَيَكْفِيْنَا فِيْهِ صَلٰوةُ يَوْمٍ قَالَ لَا اُقْدُرُوْا لَهٗ قَدْرَهٗ قُلْنَا يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَمَا اِسْرَاعُهٗ فِي الْاَرْضِ قَالَ كَالْغَيْثِ اِسْتَدْبَرَتْهُ الرِّيْحُ فَيَاْتِيْ عَلَى الْقَوْمِ فَيَدْعُوْهُمْ فَيُؤْمِنُوْنَ بِهٖ فَيَاْمُرُ السَّمَآءَ فَتُمْطِرُ وَالْاَرْضَ فَتُنْبِتُ فَتَرُوْحُ عَلَيْهِمْ سَارِحَتُهُمْ اَطْوَلَ مَا كَانَتْ ذُرًى وَّاَسْبَغَهٗ ضُرُوْعًا وَّاَمَدَّهٗ خَوَاصِرَ ثُمَّ يَاْتِي الْقَوْمَ فَيَدْعُوْهُمْ فَيَرُدُّوْنَ عَلَيْهِ قَوْلَهٗ فَيَنْصَرِفُ عَنْهُمْ فَيُصْبِحُوْنَ مُمْحِلِيْنَ لَيْسَ بِاَيْدِيْهِمْ شَيْءٌ مِّنْ اَمْوَالِهِمْ وَيَمُرُّ بِالْخَرِبَةِ فَيَقُوْلُ لَهَا اَخْرِجِيْ كُنُوْزَكِ فَتَتْبَعُهٗ كُنُوْزُهَا كَيَعَاسِيْبِ النَّحْلِ ثُمَّ يَدْعُوْا رَجُلًا مُّمْتَلِئًا شَبَابًا فَيَضْرِبُهٗ بِالسَّيْفِ فَيَقْطَعُهٗ جَزْلَتَيْنِ رَمْيَةَ الْغَرَضِ

ثُمَّ يَدْعُوهُ فَيُقْبِلُ وَيَتَهَلَّلُ وَجْهُهُ يَضْحَكُ فَبَيْنَمَا هُوَ كَذٰلِكَ إِذْ بَعَثَ اللّٰهُ الْمَسِيحَ بْنَ مَرْيَمَ فَيَنْزِلُ عِنْدَ الْمَنَارَةِ الْبَيْضَاءِ شَرْقِيِّ دِمَشْقَ بَيْنَ مَهْزُوْدَتَيْنِ وَاضِعًا كَفَّيْهِ عَلٰى أَجْنِحَةِ مَلَكَيْنِ إِذَا طَأْطَأَ رَأْسَهُ قَطَرَ وَإِذَا رَفَعَهُ تَحَدَّرَ مِنْهُ مِثْلُ جُمَانٍ كَاللُّؤْلُؤِ فَلَا يَحِلُّ لِكَافِرٍ يَجِدُ مِنْ رِيْحِ نَفْسِهِ إِلَّا مَاتَ وَنَفْسُهُ يَنْتَهِي حَيْثُ يَنْتَهِي طَرْفُهُ فَيَطْلُبُهُ حَتّٰى يُدْرِكَهُ بِبَابِ لُدٍّ فَيَقْتُلُهُ ثُمَّ يَأْتِي عِيْسٰى قَوْمٌ قَدْ عَصَمَهُمُ اللّٰهُ مِنْهُ فَيَمْسَحُ عَنْ وُجُوْهِهِمْ وَيُحَدِّثُهُمْ بِدَرَجَاتِهِمْ فِي الْجَنَّةِ فَبَيْنَمَا هُوَ كَذٰلِكَ إِذَا أَوْحَى اللّٰهُ إِلٰى عِيْسٰى أَنِّيْ قَدْ أَخْرَجْتُ عِبَادًا لِّيْ لَا يَدَانِ لِأَحَدٍ بِقِتَالِهِمْ فَحَرِّزْ عِبَادِيْ إِلَى الطُّوْرِ وَيَبْعَثُ اللّٰهُ يَأْجُوْجَ وَمَأْجُوْجَ وَهُمْ مِنْ كُلِّ حَدَبٍ يَّنْسِلُوْنَ فَيَمُرُّ أَوَائِلُهُمْ عَلٰى بُحَيْرَةِ طَبَرِيَّةَ فَيَشْرَبُوْنَ مَا فِيْهَا وَيَمُرُّ اٰخِرُهُمْ فَيَقُوْلُ لَقَدْ كَانَ بِهٰذِهٖ مَرَّةً مَاءٌ ثُمَّ يَسِيْرُوْنَ حَتّٰى يَنْتَهُوْا إِلٰى جَبَلِ الْخَمَرِ وَهُوَ جَبَلُ بَيْتِ الْمَقْدِسِ فَيَقُوْلُوْنَ لَقَدْ قَتَلْنَا مَنْ فِي الْاَرْضِ هَلُمَّ فَلْنَقْتُلْ مَنْ فِي السَّمَاءِ فَيَرْمُوْنَ بِنُشَّابِهِمْ إِلَى السَّمَآءِ فَيَرُدُّ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ نُشَّابَهُمْ مَخْضُوْبَةً دَمًا وَيُحْصَرُ نَبِيُّ اللّٰهِ وَاَصْحَابُهٗ حَتّٰى تَكُوْنَ رَأْسُ الثَّوْرِ لِأَحَدِهِمْ خَيْرًا مِنْ مِائَةِ دِيْنَارٍ لِأَحَدِكُمُ الْيَوْمَ فَيَرْغَبُ نَبِيُّ اللّٰهِ عِيْسٰى وَاَصْحَابُهٗ فَيُرْسِلُ اللّٰهُ عَلَيْهِمُ النَّغَفَ فِيْ رِقَابِهِمْ فَيُصْبِحُوْنَ فَرْسٰى كَمَوْتِ نَفْسٍ وَاحِدَةٍ ثُمَّ يُهْبِطُ نَبِيُّ اللّٰهِ عِيْسٰى وَاَصْحَابُهٗ إِلَى الْاَرْضِ فَلَا يَجِدُوْنَ فِي الْاَرْضِ مَوْضِعَ شِبْرٍ إِلَّا مَلَأَهُ زَهْمُهُمْ وَنَتْنُهُمْ فَيَرْغَبُ نَبِيُّ اللّٰهِ عِيْسٰى وَاَصْحَابُهٗ إِلَى اللّٰهِ فَيُرْسِلُ اللّٰهُ طَيْرًا كَأَعْنَاقِ الْبُخْتِ فَتَحْمِلُهُمْ فَتَطْرَحُهُمْ حَيْثُ شَآءَ اللّٰهُ وَفِيْ رِوَايَةٍ تَطْرَحُهُمْ بِالنَّهْبَلِ وَيَسْتَوْقِدُ الْمُسْلِمُوْنَ مِنْ قِسِيِّهِمْ وَنُشَّابِهِمْ وَجِعَابِهِمْ سَبْعَ سِنِيْنَ ثُمَّ يُرْسِلُ اللّٰهُ مَطَرًا لَا يَكُنُّ مِنْهُ بَيْتُ مَدَرٍ وَّلَا وَبَرٍ فَيَغْسِلُ الْاَرْضَ حَتّٰى يَتْرُكَهَا كَالزَّلْفَةِ ثُمَّ يُقَالُ لِلْاَرْضِ أَنْبِتِيْ ثَمَرَتَكِ وَرُدِّيْ بَرَكَتَكِ فَيَوْمَئِذٍ تَأْكُلُ الْعِصَابَةُ مِنَ الرُّمَّانَةِ وَيَسْتَظِلُّوْنَ بِقِحْفِهَا وَيُبَارَكُ فِي الرِّسْلِ حَتّٰى أَنَّ اللِّقْحَةَ مِنَ الْإِبِلِ لَتَكْفِي الْفِئَامَ مِنَ النَّاسِ وَاللِّقْحَةَ مِنَ الْبَقَرِ لَتَكْفِي الْقَبِيْلَةَ مِنَ النَّاسِ وَاللِّقْحَةَ مِنَ الْغَنَمِ لَتَكْفِي الْفَخِذَ مِنَ النَّاسِ فَبَيْنَا هُمْ كَذٰلِكَ إِذْ بَعَثَ اللّٰهُ رِيْحًا طَيِّبَةً فَتَأْخُذُهُمْ تَحْتَ اٰبَاطِهِمْ فَتَقْبِضُ رُوْحَ كُلِّ مُؤْمِنٍ وَكُلِّ مُسْلِمٍ وَيَبْقٰى شِرَارُ النَّاسِ يَتَهَارَجُوْنَ فِيْهَا تَهَارُجَ الْحُمُرِ فَعَلَيْهِمْ تَقُوْمُ السَّاعَةُ (رواہ مسلم) إِلَّا الرِّوَايَةَ الثَّانِيَةَ وَهِيَ قَوْلُهٗ تَطْرَحُهُمْ بِالنَّهْبَلِ إِلٰى قَوْلِهٖ سَبْعَ سِنِيْنَ۔ (رواہ الترمذی)

أخرجه مسلم فی صحیحه ٤/٢٢٥٠ حدیث رقم (١١٠-٢٩٣٧) وابو داوٗد فی السنن ٤/٤٩٦ حدیث رقم ٤٣٢١ والترمذی فی السنن ٤/٤٤٢ حدیث رقم ٢٢٤٠ وابن ماجه فی السنن ٢/١٣٥٦ حدیث رقم ٤٠٧٥

ترجمہ: ''حضرت نواس بن سمعان رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دجال کا تذکرہ کرتے ہوئے

فرمایا اگر وہ اس وقت نکل آئے تو میں تم میں موجود ہوں میں تمہاری طرف سے اس کے خلاف جھگڑوں گا اور اگر وہ ایسے موقع پر نکلے جب کہ میں تم میں موجود نہ ہوں تو ہر شخص اپنی طرف سے جھگڑنے والا ہوگا اللہ تعالیٰ میری طرف سے ہر مسلمان کا محافظ ہے۔ وہ دجال نوجوان ہے نہایت گھنگریالے بالوں والا اس کی آنکھ ابھری ہوئی ہے گویا کہ میں اس کو عبد العزیٰ بن قطن سے مشابہ قرار دیتا ہوں جو شخص تم میں سے اس کو پالے تو وہ سورۃ کہف کی ابتدائی آیات اس پر پڑھے اور ایک روایت میں سورۃ کہف کی ابتدائی آیات کا تذکرہ ہے اور یہ بھی ارشاد فرمایا کہ یہ آیات اس کے فتنہ سے تمہاری حفاظت کرنیوالی ہیں وہ شام وعراق کے درمیان والے راستہ سے نکلے گا اور دائیں بائیں فساد بپا کر دے گا۔ اے اللہ کے بندو ثابت قدم رہنا میں نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ وہ زمین میں کتنا عرصہ رہے گا؟ آپ ﷺ نے فرمایا چالیس سال اور ایک دن ایک سال کی طرح ہوگا اور ایک دن ایک مہینے کی طرح ہوگا اور ایک دن پورے ہفتے کی طرح ہوگا اور بقیہ دن تمہارے عام دنوں کی طرح ہوں گے۔ ہم نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ! وہ دن جو ایک سال کی مانند ہوگا کیا اس میں ہمیں ایک دن کی نمازیں کافی ہو جائیں گی؟ فرمایا نہیں! بلکہ تم اس کے لئے وقت کا اندازہ لگاؤ۔ ہم نے عرض کیا یا رسول اللہ! زمین میں اس کی تیز رفتاری کا کیا حال ہوگا؟ آپ ﷺ نے فرمایا جس طرح بادل جس کو پیچھے سے ہوا دھکیل رہی ہو چنانچہ اس کا گزر ایک قوم کے پاس سے ہوگا وہ ان کو دعوت دے گا وہ اس پر ایمان لے آئیں گے چنانچہ وہ آسمان کو حکم دے گا تو وہ ان پر بارش برسائے گا۔ زمین کو حکم دے گا تو وہ ان کے لئے کھیتیاں اگائے گی۔ ان کے چر کر آنے والے جانور شام کو لمبی کوہانوں کے ساتھ لوٹیں گے اور ان کے تھن زیادہ دودھ سے بھرے ہوئے ہوں گے اور ان کی کوکھیں زیادہ کھینچی ہوئی ہوگی پھر اس کا گزر ایک ایسی قوم کے پاس سے ہوگا جنہیں وہ دعوت دے گا وہ اس کی بات کو رد کر دیں گے وہ ان سے لوٹ کر جائے تو صبح کے وقت وہ لوگ قحط زدہ ہو جائیں گے ان کے ہاتھوں میں ان کے اموال میں سے کوئی چیز نہ ہوگی اس کا گزر ویرانے کے پاس سے ہوگا تو وہ اسے کہے گا اپنے خزانے اگل دو تو اس کے خزانے اس طرح اس کے پیچھے چلیں گے جس طرح شہد کی مکھیاں چلتی ہیں پھر وہ ایک آدمی کو بلائے گا جو بھرپور جوان ہوگا اس کو تلوار سے دو ٹکڑے کر دے گا اور تیر پھینکنے کے فاصلے کے برابر اس کو پھینک دے گا پھر اس کے بلائے گا تو وہ اس کی طرف متوجہ ہوگا اور اس کا چہرہ خوشی سے تمتما رہا ہوگا۔ وہ اسی حال میں ہوگا جب اللہ تعالیٰ مسیح کو بھیجے گا چنانچہ وہ دمشق کے مشرقی سفید کنارے کے پاس اتریں گے وہ دو زعفرانی کپڑے پہنے ہوئے ہوں گے اور اپنے دونوں ہاتھ فرشتوں کے پروں پر رکھے ہوئے ہوں گے جب وہ اپنا سر جھکائیں گے تو اس سے پانی کے قطرے ٹپکیں گے اور جب سر کو اٹھائیں گے تو موتیوں کی طرح اس سے قطرے گریں گے کوئی کافر ایسا نہیں ہوگا جو ان کے سانس کی ہوا کو پائے اور زندہ رہے اور ان کا سانس اس مقام تک جائے گا جہاں ان کی نظر کی انتہاء ہوگی۔ آپ مسیح دجال کو تلاش کریں گے یہاں تک کہ اس کو باب لد پر پالیں گے اور اس کو قتل کر ڈالیں گے پھر عیسیٰ علیہ السلام ایسے لوگوں کے پاس آئیں گے جنہیں اللہ نے دجال سے محفوظ رکھا ہوگا آپ ان کے چہروں کو پونچھیں گے اور جنت میں ان کے درجات کی وضاحت فرمائیں گے وہ اسی دوران میں ہوں گے کہ اللہ تعالیٰ عیسیٰ علیہ السلام کی طرف وحی فرمائیں گے کہ میں نے اپنے ایسے بندوں کو نکالا ہے جن سے لڑائی کی کسی کو طاقت نہیں۔ تم میرے بندوں کو لے کر طور کی طرف چلے جاؤ چنانچہ اللہ تعالیٰ یاجوج ماجوج کو بھیجیں گے جو ٹیلے سے کھسکتے ہوئے نظر آئیں گے ان کا پہلا گروہ بحیرہ طبریہ کے پاس سے

گزرے گا وہ اس کا تمام پانی پی جائیں گے جب ان کا پچھلا گروہ آئے گا تو وہ اس طرح کہے گا یہاں بھی کسی وقت پانی تھا وہ چلتے چلتے جبل خمر تک پہنچیں گے (یہ بیت المقدس کا ایک پہاڑ ہے) وہ کہیں گے ہم نے زمین کے سب لوگوں کو قتل کر ڈالا آؤ اب آسمان والوں کو بھی قتل کریں۔ چنانچہ وہ اپنے تیر آسمان کی طرف پھینکیں گے تو اللہ تعالیٰ ان کے تیروں کو خون سے بھرا لت پت واپس کریں گے اللہ کے نبی عیسیٰ علیہ السلام ان کے ساتھ محصور ہوں گے اور بیل کا ایک سر وہ سو دینار سے بہتر ہوگا آج کے سو دینار تو اللہ تعالیٰ کے پیغمبر عیسیٰ علیہ السلام اور ان کے اصحاب اللہ کی بارگاہ میں التجاء کریں گے چنانچہ اللہ تعالیٰ یاجوج ماجوج پر ان کی گردنوں میں نغف نامی بیماری پیدا کریں گے چنانچہ وہ ایک ہی صبح میں ایک ہی نفس کی طرح سب مر جائیں گے پھر اللہ کے پیغمبر عیسیٰ علیہ السلام اور ان کے ساتھ زمین پر اتریں گے زمین میں ایک بالشت بھی جگہ ایسی نہیں ہوگی جو ان کی لاشوں اور بدبو سے اٹی ہوئی نہ ہوگی پس اللہ تعالیٰ کے پیغمبر عیسیٰ علیہ السلام ان کے صحابہ اللہ کی بارگاہ میں رجوع کریں گے تو اللہ تعالیٰ ایسے پرندے بھیج دیں گے جو بختی اونٹوں کی گردنوں جیسے ہوں گے جو انہیں اٹھا کر اس جگہ پھینک دیں گے جہاں اللہ تعالیٰ چاہیں گے اور ایک روایت میں ہے کہ ان کو نہبل میں پھینک دیں گے اور مسلمان ان کی کمانیں اور نیزے اور ترکشوں سے سات سال تک آگ جلائیں گے پھر اللہ جل شانہ ایک بارش بھیجیں گے جس سے کوئی کچا اور بالوں والا گھر بھی خالی نہیں رہے گا تو اس طرح اللہ تعالیٰ زمین کو دھو ڈالیں گے یہاں تک کہ وہ شیشہ کی طرح ہو جائے گی پھر زمین کو کہا جائے گا اپنی فصلیں اگاؤ اور اپنی برکتوں سے سیراب کرو تو اس وقت ایک گروہ ایک انار کو کھائے گا اور اس کے چھلکے میں وہ سایہ لیں گے اور لوگوں کو دودھ میں برکت دی جائے گی۔ یہاں تک کہ ایک گابھن اونٹنی وہ ایک جماعت کے لئے کافی ہوگی اور ایک گابھن گائے ایک قبیلہ کے لئے کافی ہوگی اور ایک گابھن بکری ایک خاندان کے لئے کافی ہوگی وہ اسی حالت میں ہوں گے کہ اللہ تعالیٰ ایک پاکیزہ ہوا بھیجیں گے جو ان کے بغلوں کے نیچے والے حصے کو متاثر کرے گی ہر مؤمن اور مسلم کی روح کو قبض کرلے گی اور بدترین لوگ رہ جائیں گے جو گدھے کی طرح جفتی کریں گے ان پر قیامت کا قیام ہوگا۔ یہ مسلم کی روایت ہے سوائے اسکے کہ تطرنهم بالنهبل سے الی قوله سبع سنين یہ الفاظ اس میں نہیں۔ (ترمذی)

تشریح: قوله: عن النواس ...... فأنا حجيجه دونكم: نواس بن سمعان: "نواس" واؤ کی تشدید کے ساتھ ہے اور "سمعان" سین کے کسرہ اور فتحہ کے ساتھ ہے۔

حجیج: فعیل بمعنی فاعل ہے، حجۃ (بمعنی دلیل) سے ماخوذ ہے، یعنی میں دلیل کے ذریعے اس پر غالب آؤں گا۔

"دونکم": بمعنی قدامکم یعنی میں دجال کو تم لوگوں سے ہٹاؤں گا، اور میں تمہارے آگے ہونگا اور تمہارا امام ہوں گا۔ اس عبارت سے اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ حضور علیہ السلام دلیل وحجت کے ذریعے دجال پر غالب آنے کیلئے اپنی امت میں سے کسی معاون کی مدد کے محتاج نہ ہوں گے۔ (کذا ذکرہ طیبیؒ)

اور زیادہ واضح بات یہ ہے کہ حضور علیہ السلام دجال کو اپنے نبوت کے نور سے دفع کریں گے، اور دجال کے وہ باطل امور جو خلاف عادت ہوں گے، کو اپنے خلاف عادت معجزات سے بغیر کسی دلیل کے دفع کریں گے، کیونکہ دجال کا باطل ہونا تو اہل معرفت کے نزدیک سورج سے زیادہ واضح ہے۔

دوسری وجہ یہ بھی ہے، کہ دجال اُس وقت اپنی باطل دعوت کیلئے عزم کر کے اُٹھے گا، وہ مجادلہ اور اثبات ادلہ کی طرف التفات کرے گا ہی نہیں، ورنہ تو۔الحمد للہ سبحانہ وتعالیٰ۔ اُمت محمدی میں بہت سارے ایسے لوگ ہونگے جو دلیل وحجت کے ذریعے اس کے باطل ہونے کو ثابت کر سکتے ہونگے۔ خصوصاً خاتم الأولیاء امام مہدی علیہ السلام اور زبدۃ الانبیاء حضرت عیسیٰ علیہ السلام تو دلائل کے ذریعے دجال کو آسانی سے شکست دے سکیں گے۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ دجال کے ساتھ مناظرہ کرنا کوئی فائدہ مند نہیں ہوگا، بلکہ اس کی شکست یا تو اس طرح ہے کہ حضور علیہ السلام کی موجودگی میں اس کا ظہور ہوا تو آپ ﷺ کے وجود کی برکت سے وہ معدوم گا، اور اگر بعد میں آئے گا، تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی سانسوں کی گرمی سے پگھل کر،ان کے ہاتھوں قتل ہوگا۔ ملا علی قاریؒ فرماتے ہیں، اس مسئلہ میں میری رائے یہی ہے واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم۔

علامہ تورپشتی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اگر اشکال کیا جائے کہ کیا یہ بات احادیث سے ثابت نہیں ہوئی کی کہ دجال امام مہدیؑ کے بعد نکلے گا، اور عیسیٰؑ اس کو قتل کریں گے، اس طرح دوسرے واقعات بھی دلالت کرتے ہیں، کہ جب تک حضور علیہ السلام موجود ہیں، دجال نہیں آ سکتا، بلکہ قرون اولیٰ کے لوگ بھی اس کو نہیں دیکھیں گے تو پھر آپ کے اس ارشاد: "ان یخرج و انا فیکم" کا کیا مطلب ہے؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ اس کلام میں حضور علیہ السلام نے توریہ کیا ہے تا کہ آپؐ کی اُمت کو دجال کے فتنے کا خوف پیدا ہو جائے، اللہ کی طرف متوجہ ہوں اور اپنی دین کی حفاظت کیلئے چوکنے ہو جائیں۔

مظہرؒ فرماتے ہیں یہ احتمال ہے کہ حضور علیہ السلام کا اس کلام سے مقصود یہ بتانا ہو، کہ دجال کا خروج یقینی ہے، لہٰذا اس کے خروج میں بالکل شک نہ کرو، کیونکہ یقیناً وہ نکلے گا، اور بتانا بھی مقصود ہو کہ اس کے خروج کا متعین وقت آپؐ کو بھی معلوم نہیں ہے، جیسا کہ آپؐ کو قیامت کے واقع ہونے کا متعین وقت معلوم نہیں۔

علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں: "دونوں توجیہات میں سے دوسری توجیہ ہی درست ہے، کیونکہ ممکن ہے حضور علیہ السلام نے یہ ارشاد اُس وقت فرمایا ہو جس وقت تک آپؐ کو دجال کے خروج کے بارے میں وحی کے ذریعے بتایا نہ گیا ہو۔"

میں (ملا علی قاریؒ) کہتا ہوں، کہ حق یہ تھا کہ علامہ طیبیؒ یہ فرماتے کہ دوسری توجیہ ظاہر ہے، (یہ نہیں کہنا چاہئے تھا کہ یہی درست ہے) کیونکہ امکا نکلے ہوئے ہوئے کسی ایک کے حق میں یہ کہنا "یہی درست ہے" صحیح نہیں ہے۔ کیونکہ دونوں میں خطا کا احتمال ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

حضور علیہ السلام کے کلام کا خلاصہ یہ ہے کہ اگر میں دجال کے خروج کے وقت تمہارے درمیان ہو تو اس کے شر کے مقابلہ میں تمہاری طرف سے میں کفایت کروں گا۔

قولہ: وان یخرج ولست فیکم فامرؤ حجیج نفسه:

"امرؤ" مرفوع ہے، اور عبارت کی تقدیر اس طرح ہے: "فکل امری ءٍ یحاجه" یعنی ہر شخص اپنی طرف سے اس سے مقابلہ کرے اُس کا جواب دے۔ اور اُس پر غلبہ حاصل کرے۔ (طیبیؒ)

یعنی چاہئے کہ ہر شخص اپنی طرف سے اپنی دلیل پیش کر کے خود ہی اُس کا شر دفع کرے، (قالہ ابن الملکؒ)، لیکن یہ ساری بات اس تقدیر پر ہے کہ دجال بات سُنے بھی ورنہ مطلب یہ ہوگا کہ ہر شخص کو چاہئے کہ دجال کو جھٹلائے، اُس کی عذاب والی صورت (آگ میں داخل ہونے) کو اختیار کرے، اور اُس کی شرارت سے اپنا دفاع کرے۔

قوله: واللہ خليفتي على كل مسلم:

یعنی اللہ تعالیٰ ہر مسلمان کا نگران ومحافظ ہوگا مؤمن کی مدد کرے گا' اور اس سے دجال کے شر کو دفع کرے گا یہ اس بات کی دلیل ہے کہ صاحب یقین مسلمان کی ہمیشہ مدد کی جاتی ہے، اگرچہ اُس کے پاس نبی اور امام نہ بھی ہو، چنانچہ اس میں شیعہ کے فرقہ امامیہ پر رد ہے۔

قوله: انه شاب قطط...... الغرى بن قطن:

انه: ضمیر کا مرجع دجال ہے۔ یہ جملہ مستانفہ ہے، جس میں دجال کے بعض احوال اور بعض ایسے امور بیان ہوئے ہیں، جو دجال کے شر سے دفاع کیلئے کار آمد ہیں۔

شاب: اس میں اشارہ ہے اس بات کی طرف کہ ابن صیاد، دجال نہیں ہے، اور اس بات کی طرف بھی اشارہ ہے کہ سفید بالوں کی صورت میں انسان کو جو وقار حاصل ہوتا ہے، دجال اُس وقار سے محروم ہوگا، اور اُس کے ظاہر میں بھی سیاہی (بالوں کی سیاہی) ہوگی جو دل کی باطنی سیاہی کی دلیل ہوگی۔

قطط: قاف، اور طاء کے فتحہ کے ساتھ۔ اس کا معنی ہے بہت زیادہ گھونگریالے بال۔ اس میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ بالوں میں کنگھی کرنا مستحب ہے۔ تاکہ اس کی بُری حالت میں اُس کے ساتھ مشابہت نہ ہو۔

طافية: فاء کے بعد یاء اور ہمزہ دونوں درست ہیں۔ ''بھری ہوئی''۔

أشبهه: باء کی تشدید کے ساتھ ہے۔ بمعنی امثلہ

العزىٰ: ''عین'' مضموم اور زاء مشدد ہے۔

قطن: ''قاف'' اور ''طاء'' دونوں مفتوح ہیں۔ ایک شارحؒ فرماتے ہیں کہ یہ ایک یہودی تھا۔

علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں: کہا گیا ہے کہ عبد العزیٰ ابن قطن ایک یہودی تھا، لیکن بظاہر یوں لگتا ہے کہ وہ کوئی مشرک تھا۔ کیونکہ ''العزیٰ'' ایک بُت کا نام تھا، اور اس بات کی تائید حواشی میں منقول بعض حضرات کے اس قول سے بھی ہوتی ہے کہ عبد العزیٰ قبیلہ خزاعہ کا ایک شخص تھا جو زمانہ جاہلیت میں مر چکا تھا۔

علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں کہ حضور علیہ السلام نے ''کانه عبد العزیٰ'' نہیں فرمایا کیونکہ حضور علیہ السلام کو اس تشبیہ (یعنی تشبیہ دینے میں کوئی شک تو نہیں تھا، لیکن چونکہ حضور علیہ السلام کو عبد العزیٰ کی معرفت عالم کشف یا خواب میں حاصل ہوئی تھی، اس لئے آپؐ نے ''کانی'' کی تعبیر اختیار کی، اور خواب کی حکایت تعبیر کرنے میں انداز یہی ہونا چاہئے، واللہ اعلم۔

اس مقام پر یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ چونکہ اس دنیا میں اس سے بڑھ کر اس جیسی قبیح صورت والا کوئی نہیں تھا، اس لئے تمام

وجوہ میں تو کیا بلکہ بعض وجوہ میں بھی اس کے ساتھ کسی کی مشابہت نہیں تھی، اس لئے حضور علیہ السلام نے یقین والی تعبیر سے عدول کر کے یہ مذکورہ بالا تعبیر اختیار کی۔ اور فعل حال کے صیغے میں اس کی اُس صورت جو مستقبل بعید میں ظاہر ہوگی' کہ استحضار کی طرف اشارہ ہے۔

قوله: فمن ادركه منكم فليقرأ عليه فواتح سورة الكهف:

"فواتح سورة الكهف" سے مراد سورۂ کہف کے شروع سے لیکر ﴿ان يقولون الا كذبًا﴾ [الکھف:۵] "اور وہ لوگ بالکل ہی جھوٹ بکتے ہیں" تک کی آیات ہیں۔ کیونکہ یہ آیات اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات کی معرفت پر دلالت کرتی ہیں۔

قوله: فانها جوار كم من فتنته:

سید صاحب اور شیخ جزریؒ کے نسخہ میں اور کئی تصحیح شدہ نسخوں میں "جوار" جیم کے کسرہ اور آخر میں راء کے ساتھ منقول ہے' اور بعض نسخوں میں 'جیم' کے فتحہ اور آخر میں 'زاء' کے ساتھ یعنی "جواز" منقول ہے۔

"جواز" جیم کے فتحہ اور آخر میں زاء کے ساتھ۔ اس کا معنی ہے وہ چیک جو بندہ، بادشاہ یا اُس کے نائب سے لیتا ہے، تاکہ راستے میں تلاشی لینے والے کوئی روک ٹوک نہ کریں، شارح مصابیح نے اسی (ضبط) پر اکتفاء کیا ہے۔ اور اس کو ابن الملکؒ نے ذکر کر کے ہے کہا ہے، کہ بعض نسخوں میں جیم کے کسرہ اور آخر میں راء کے ساتھ مروی ہے تو اس کا معنی ہے" حافظكم" (تمہارا محافظ) انتہیٰ۔

بردہ کی بعض شروات میں لکھا ہے کہ لفظ" جوار" میں جیم کا کسرہ اور ضمہ دونوں جائز ہیں، لیکن کسرہ زیادہ فصیح ہے اس کا معنی ہے: الامان

مؤلفؒ کے کلام سے تو بظاہر یہی معلوم ہو رہا ہے، کہ یہ روایت مسلم کی روایت ہے، لیکن جزریؒ نے اپنی کتاب حصن حصین میں اس بات کی تصریح کی ہے، کہ یہ روایت امام ابوداؤد نے نواسؓ سے نقل کی ہے، لیکن اُس کے الفاظ یہ ہیں:

"من ادرك الدجال فليقرأ عليه فواتحها فانها جوار له من فتنته"

"جو شخص دجال کو جائے اسے چاہئے کہ وہ اس کے سامنے سورۂ کہف کی ابتدائی آیات کی تلاوت کرے۔ کیونکہ وہ آیات تمہیں دجال کے فتنہ سے حفاظت وپناہ میں رکھنے والی ہوں گی۔"

یاد رہے کہ حصن حصین میں اس بارے میں متعدد روایات موجود ہیں، چنانچہ ایک روایت میں ہے:

"من قرأها اى الكهف كما انزلت كانت له نورا من مقامه الى مكة ومن قرأ بعشر آياتٍ من آخرها فخرج الدجال لم يسلط عليه"

"جس شخص نے سورۂ کہف اس طرح پڑھی کہ جس طرح یہ سورت نازل ہوئی تھی تو اُس کے مقام سے لے کر مکہ مکرمہ تک اُس کو نور ملے گا، اور جس نے اس سورت کی آخری دس ۱۰ آیتیں پڑھیں تو جب دجال نکلے گا، تو وہ اس شخص پر مسلط نہیں ہو سکے گا۔"

اس کو نسائی نے اور حاکم نے اپنی کتاب مستدرک میں ابو سعید خدریؓ سے نقل کیا ہے، اور یہ الفاظ نسائی کے ہیں، اور امام نسائی فرماتے ہیں، اس کو حدیث مرفوع قرار دینا غلط ہے، صحیح یہ ہے کہ یہ حدیث موقوف ہے۔

طبرانیؒ نے بھی اوسط میں ابو سعیدؓ کی حدیث نقل کی ہے، جس کے مرفوع اور موقوف ہونے میں بھی اختلاف ہے اور اس کے الفاظ یہ ہیں:

"من قرأ سورة الكهف كانت له نوراً يوم القيامة من مقامه الى مكة ومن قرأ بعشر آيات من آخرها ثم خرج الدجال لم يضره".

"جس کے شخص کے سورۂ کہف پڑھے اس کے لئے قیامت کے دن اس کے مقام سے مکہ تک نور ہوں گی اور جو شخص اس صورت کی آخری دس آیات پڑھے گا اور پھر دجال نکل آیا تو وہ اس شخص کو نقصان نہیں پہنچائے گا۔"

امام ابوداؤد اور امام مسلمؒ نے ابودرداءؓ سے حدیث مرفوع نقل کی ہے:

"من حفظ عشر آياتٍ من اولها عصم من الدجال"

"جو شخص سورۂ کہف کی شروع والی دس آیتوں کو یاد کرے گا، دجال کے فتنہ سے محفوظ ہوگا۔"

ابوداؤد اور نسائی کی ایک روایت میں ابودرداءؓ سے ("من الدجال" کی بجائے) "من فتنة الدجال" (دجال کے فتنہ سے) کے الفاظ وارد ہوئے ہیں۔

ابودرداء سے مروی مسلم اور ابوداؤد کی ایک روایت میں یہ الفاظ آئے ہیں: من حفظ عشر آيات۔ جو شخص (سورۂ کہف کی) دس آیات یاد کرے گا الخ"۔

ابودرداءؓ سے نسائی کی ایک اور روایت میں یہ الفاظ منقول ہیں:

"من قرأ العشر الاواخر من الكهف عصم من فتنة الدجال"

جو شخص سورۂ کہف کی آخری دس آیات کی تلاوت کرے گا اس کو دجال کے فتنہ سے بچا لیا جائے گا۔

ابودرداءؓ سے ترمذیؒ کی ایک روایت میں یہ الفاظ منقول ہیں:

"من قرأ ثلاث آيات من الكهف عصم من فتنة الدجال"

"جو شخص سورۂ کہف کی تین آیات پڑھے گا اس کو دجال کے فتنہ سے محفوظ رکھا جائے گا۔

مسلم اور اصحاب اربعہ کی ایک روایت میں نواس بن سمعانؓ سے یہ الفاظ منقول ہیں:

"من ادرك الدجال فليقرأ عليه فواتحها".

"جو شخص دجال کو پائے اس کو چاہئے کہ وہ اس کے سامنے سورۂ کہف کی ابتدائی آیات تلاوت کرے۔

بعض حضرات نے تطبیق کیلئے یہ فرمایا ہے، کہ تین آیات اور دس آیات والی روایتوں میں مطابقت اس طرح ہے، کہ دس

آیات والی حدیث بعد میں ارشاد فرمائی گئی ہے۔ اور جس نے دس آیات والی حدیث پر عمل کیا تو اس کا عمل تین آیات والی حدیث پر بھی ہو گیا۔

بعض کا کہنا ہے کہ تین آیات والی حدیث مؤخر ہے، اور جس کی حفاظت تین آیات سے ہو گئی تو دس آیات کی کوئی ضرورت نہ رہی، اور یہ نسخ کے احکام کے زیادہ قریب ہے۔

میں (ملا علی قاریؒ) کہ صرف احتمال کی بنیاد پر نسخ کا حکم لگانا درست نہیں۔ مزید برآں کہ نسخ انشاء میں ہوتا ہے، اخبار میں نہیں ہوتا۔ لہٰذا زیادہ واضح بات یہ ہے کہ سورۂ کہف کا کم سے کم حصہ کہ جس کو پڑھنا دجال کے شر سے محفوظ ہونے کا ذریعہ ہے، تین آیات کا پڑھنا ہے، اور ان کا یاد کرنا اولیٰ ہے۔ اور یہ بات زیادہ حصہ مثلاً دس آیات کو پڑھنے یا حفظ کرنے کے منافی نہیں ہے۔ جیسا کہ مخفی نہیں ہے۔

بعض نے تطبیق کی یہ صورت بیان فرمائی ہے، کہ دس آیات والی حدیث کا تعلق حفظ سے ہے، اور تین آیات والی حدیث کا تعلق تلاوت سے ہے۔ چنانچہ جس شخص نے دس آیات حفظ کر لیں، اور تین آیات پڑھ لیں، یہ اُس کے لئے دجال کے فتنہ سے محفوظ ہونے کا سبب ہوگا۔

بعض نے تطبیق کیلئے یوں فرمایا ہے کہ جس نے دس آیات یاد کر لیں، وہ دجال کی ملاقات سے محفوظ ہو جائے اور جس نے تین آیات پڑھیں وہ دجال کے فتنہ سے محفوظ ہوگا، اگر ملاقات نہ ہو۔

بعض حضرات نے فرمایا: کہ ''حفظ'' سے مراد زبانی پڑھنا ہے، اور ''عصم'' سے مراد جال کی آفات سے حفاظت ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالاحوال

قوله: انه خارج خلة بين الشام ولعراق:

خلة: خائے معجمہ کے فتحہ اور لام کی تشدید کے ساتھ ''خلة'' کا اصل معنی ہے ریتلی زمین میں بنا ہوا راستہ، اور ایک شارحؒ فرماتے ہیں: (''خلة بين الشام والعراق'' کا معنی ہے) ''من سبيل بينهما'' (ان دونوں جگہوں کے درمیان سے گذرنے والے راستے سے) چنانچہ اس میں اشارہ ہے کہ ''خلة'' منصوب بنزع الخافض ہے۔ اور اس کی تائید نہایہ کی اس عبارت ''في طريق بينهما'' سے ہوتی ہے۔

امام نوویؒ فرماتے ہیں کہ ہمارے علاقوں کے نسخوں میں خلة ''خاء'' کے فتحہ اور ''تاء'' کی تنوین کے ساتھ منقول ہے۔ اور قاضی (عیاضؒ) فرماتے ہیں کہ اس میں مشہور یہ ہے کہ ''حلة'' حائے مہملہ اور تاء کے نصب کے ساتھ ہے۔ یعنی بغیر تنوین کے ہے۔

میں (ملا علی قاریؒ) کہتا ہوں مناسب یہ ہے کہ ''حلة'' بغداد میں دجلہ کے کنارے کے پاس ایک بستی کا نام ہے۔ یہاں کے لوگ دوسری جگہوں کے لوگوں سے زیادہ شریر ہیں۔

فرماتے ہیں کہ بعض حضرات نے ''حله'' لام کو ضمہ اور ھائے ضمیر کے ساتھ نقل کیا ہے بمعنی نزول

وحلول۔ (اترنا) اور پھر فرماتے ہیں کہ ہمارے بلاد میں حمیدیؒ نے بھی جمع بین صحیحین میں اسی طرح ذکر کیا ہے۔

قوله: فعاث يميناً وعاث شمالا يا عباد الله فاثبتوا:

عاث: عین مہملہ اور ثاء مثلثہ کے ساتھ "العيث" (مصدر) سے ماضی ہے، جس کا معنی ہے بہت زیادہ فساد پھیلانا۔ قاضیؒ فرماتے ہیں کہ بعض حضرات نے عاث' کو بصیغہ اسم فاعل نقل کیا ہے۔ اشرفؒ فرماتے ہیں کہا گیا ہے کہ اس میں درست یہ ہے کہ 'فعاث' 'بصیغہ اسم فاعل ہے کیونکہ اس کا عطف ماقبل اسم فاعل'' خارج'' پر ہے۔

میں (ملاعلی قاریؒ) کہتا ہوں کہ اکثر نسخوں میں بشمول سید صاحب کا نسخہ 'عاث'' بصیغہ فعل ماضی کے منقول ہے۔ اور بعض نسخوں میں'' عاثٍ'' بروزن'' قاضٍ'' ہے جو عثی بمعنی 'عيث'' سے ماخوذ ہے۔ اور یہی زیادہ صحیح ہے اور قرآن مجید کی اس آیت: ﴿ولا تعثوا في الارض مفسدين﴾ [البقرة: ٦٠] ''اور حد (اعتدال) سے نکلو فساد و (فتنہ کے کرتے ہوئے سرزمین میں'' کے موافق ہے۔ بہر حال یہ کہنا کہ یہی لغت صحیح ہے، درست نہیں ہے۔ کیونکہ یہ دونوں الگ الگ لغات ہیں، اور فساد پھیلانے کے معنی میں ہیں، جیسا کہ لغت کی کتابوں میں مذکور ہے۔ حاصل یہ ہے کہ دجال فساد پھیلائے گا یا مفسد ہو۔

يميناً و شمالاً: یہ دونوں'' عاث'' کے لیے مفعول فیہ ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ دجال دائیں بائیں اپنے لشکر بھیجے گا، اور صرف اُن علاقوں میں فساد پھیلانے پر اکتفاء نہیں کرے گا جن علاقوں سے وہ گزرے گا، اور اس کی طرف بڑے بڑے سمجھدار اور رہنما قسم کے لوگ متوجہ ہو جائیں گے۔ اور اس کے شر سے کوئی مؤمن محفوظ نہیں رہے گا اور اس کے فتنے سے کوئی جگہ کوئی ٹھکانہ خالی نہیں رہے گا۔

يا عباد الله: یہ خطاب ان لوگوں سے ہے جو اُس زمانے میں موجود ہونگے۔ یا مخاطبین سے ہے کہ، اگر بالفرض تم نے وہ زمانہ پالیا۔ تو اپنے دین پر ثابت قدم رہنا۔ اگر چہ دجال تمہیں سزا دے۔

علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں: یہ خطاب عام ہے ہر وہ شخص مراد ہے جو دجال کا زمانہ پائے۔

پھر بعض حضرات فرماتے ہیں کہ اس قول سے حضور ﷺ نے اپنی اُمت کے دلوں کو مائل کیا ہے اور دجال کا جو شر آئندہ آئے گا، اُس میں ثابت قدمی اور اللہ تعالیٰ پر ایمان اور حضور علیہ السلام کے لائے ہوئے دین کی تصدیق کی ترغیب دی ہے۔

قوله: يا رسول الله مالبثه ...... وسائر أيامه كأيامكم:

لبثه: (لام کے فتحہ اور باء کے سکون کے ساتھ)

آگے ایک حدیث آئے گی:

"يمكث الدجال في الارض اربعين سنة السنة كالشهر......". [الحدیث] ''دجال زمین پر چالیس سال رہے گا (اس وقت) ایک سال ایک مہینہ کی مانند ہوگا الخ۔

لیکن امام بغویؒ نے شرح السنہ میں نقل کیا ہے کہ یہ روایت مسلم کی اس روایت کا معارضہ نہیں کرسکتی، اور اگر وہ حدیث صحیح ہو تو پھر مطلب یہ ہے کہ دجال کے قیام کی دو صورتیں ہیں، ان میں سے ایک قیام خاص قسم کا قیام ہے، جو ایک متعین وصف کے

ساتھ موصوف ہوگا، جس کا علم اللہ ہی کو ہے۔

یعنی ان چالیس سالوں کا ایک دن زمانے کی لمبائی میں ایک سال کے برابر ہوگا، یا پریشانیوں اور رنج وغم کے اعتبار سے ایک سال کے برابر ہوگا۔

ابن الملک ؒ فرماتے ہیں مطلب یہ ہے کہ پہلے دن مؤمنوں پر اتنا رنج وغم چھا جائے گا، اور دجال کی آزمائش اتنی سخت ہوگی کہ وہ دن لوگوں کو ایک سال کے برابر معلوم ہوگا۔ دوسرے دن دجال کا مکر وفریب کم ہو جائے گا، اور اس کی قوت کم ہو جائے گی، تو لوگوں کو وہ دن مہینے کے برابر معلوم ہوگا۔ اور تیسرا دن ایک ہفتے کے برابر معلوم ہوگا۔ اس لئے کہ حق کی قدر ہر وقت بڑھتی ہے اور باطل کی قوت گھٹتی ہے، حتیٰ کہ باطل کا نام ونشان ختم ہو جاتا ہے۔

یا مطلب یہ ہے کہ (پہلے دن تو اس فتنے اور آزمائش کی شدت زیادہ ہوگی اس لئے ایک دن سال کے برابر معلوم ہوگا، لیکن اس کے بعد) لوگ اس آزمائش اور فتنے کے عادی ہو جائیں گے اس لئے فتنہ ہلکا معلوم ہوگا۔ یہاں تک کہ اس فتنے کی شدت لوگوں کیلئے بالکل ختم ہو جائے گی۔ لیکن یہ قول مردود ہے۔ اس لئے کہ راوی کی ذکر کردہ بات کے مناسب نہیں ہے۔

قوله: فذلك اليوم الذى كسنة ...... اقدروا له قدره:

بلکہ یہ کلام دلالت کرتا ہے کہ دن حقیقۃً سال کے برابر ہو جائے گا، اور یہ کوئی ناممکن بات نہیں ہے، اس لئے کہ اللہ تعالیٰ اس بات پر قادر ہے، کہ دن کے ہر جزء کو اتنا بڑھا دے کہ خلاف عادت دن سال کے بقدر ہو جائے، جیسا کہ دن کی ساعات کو بڑھاتا ہے، (انتہیٰ)۔ اس پر ایک اشکال ہے، وہ یہ کہ اس قول کا مفہوم تب ہی ممکن ہو سکتا ہے، جب زمانے کی مقدار بڑھ جائے، جیسا کہ شب معراج میں حضور علیہ السلام کیلئے اتنی بڑی مسافت کے سفر کیلئے زمانے کی مقدار بڑھ گئی، لیکن یہ بات مخفی نہیں کہ ہر نماز کے وجوب کا سبب تو اُس نماز کا مقررہ وقت ہے، یعنی صبح صادق کا طلوع، زوال آفتاب، غروب شمس اور شفق کا غائب ہونا اور یہ تب ہی متصور ہو سکتا ہے کہ دنوں اور راتوں میں حقیقۃً تعدد ہو اور تعدد مفقود ہے۔

چنانچہ تحقیق وہی ہے جو علامہ تورپشتی ؒ نے کی ہے، وہ فرماتے ہیں کہ یہ ٹکڑا آنحضرت ﷺ کی اس حدیث کے معارض ہے: **يوم كسنة ويوم كشهر ويوم كجمعة** "اور دن ایک سال کی مانند ہوگا اور ایک دن ایک مہینہ کی مانند ہوگا اور ایک دن جمعہ کی مانند ہوگا۔" اور دوسری طرف فرمایا: **سائر ايامه كأيامكم**، اس (کے فتنہ) کے تمام ایام تمہارے ایام کی مانند ہوں گے۔" اور یہ تاویل درست نہیں ہے، کہ اس دن کے مصائب پریشانی اور فتنے کی شدت کی وجہ سے اس دن کو طول کے ساتھ متصف کیا گیا ہے۔ کیونکہ صحابہ کرامؓ نے سوال کیا، اے اللہ کے رسول! کیا سال کے برابر اس دن میں ہمارے لئے ایک دن ایک رات کی (پانچ) نمازیں کافی ہونگی؟ حضور علیہ السلام نے فرمایا نہیں۔

چنانچہ اللہ کی توفیق اور مدد سے صحیح مطلب بیان کرتا ہوں، اور وہ یہ ہے کہ صادق ومصدوق حضرت محمد ﷺ کی احادیث سے یہ بات معلوم ہو چکی ہے، کہ دجال کے ساتھ ایسی چیزیں ہوں گی جو انسانوں کو شبہ میں مبتلا کریں گی، اور ایسا جادو ہوگا جو عقل والوں سے عقل کو چھین لے گا، اور آنکھوں والوں سے بصیرت چھین لے گا، شیاطین اُس کیلئے مسخر ہو جائیں گے۔ جنت جہنم اپنے

ساتھ لائے گا' اپنے دعویٰ کے مطابق مردہ کو زندہ کرے گا، اور زندہ کو مارے گا، اور لوگوں کو گمراہ کرنے کیلئے کبھی بارش برسائے گا، اور سبزہ اُگائے گا، اور کبھی قحط سالی مسلط کرے گا، اور بہت سخت جادو کا مالک ہوگا۔

اس لئے یہی کہا جا سکتا ہے، کہ دجال لوگوں کی بینائی اور قوت سماعت کو اس طرح سلب کرے گا، کہ لوگوں کو ایسا معلوم ہوگا، کہ اس پورے عالم میں ایک ہی حالت ہے۔ یعنی روشنی ہی روشنی ہے، کوئی تاریکی نہیں ہے، صبح ہی صبح ہے، رات نہیں ہے اور یہ سمجھیں گے کہ رات اپنی چادریں اس عالم پر بچھاتی نہیں اور سورج اپنی روشنی کو لپیٹتا نہیں' اور لوگ حیران و سرگردان ہونگے، اور زمانے کے طویل ہونے کا التباس ہوگا، دن اور رات کے تبدیل ہونے کی واضح علامات لوگوں سے اوجھل ہو جائیں گی۔ اور ان کے ذہنوں اور دلوں کی ایک عجیب کیفیت ہوگی، چنانچہ اس وقت کے لئے نبی کریمؐ نے مسلمانوں کو حکم دیا کہ اس عظیم صدمہ کے وقت پوری پوری جدوجہد کریں ہر نماز کیلئے اُس وقت تک اندازے کے ساتھ وقت مقرر کریں جب تک یہ تاریکی اور شدت (جادو کا اثر) ختم نہ ہو جائے۔ اس مقام پر ہمیں یہی توجیہ سمجھ میں آئی ہے۔ حق تک پہنچنے کی توفیق اللہ ہی دیتا ہے، اور وہی ہمارے لئے کافی اور اچھا کارساز ہے۔

شرح مسلم میں امام نوویؒ نے لکھا ہے کہ علماء فرماتے ہیں کہ یہ حدیث اپنے ظاہر پر محمول ہے، اور یہ تین ایام اسی مقدار کے بقدر طویل ہونگے، جو مقدار حدیث میں مذکور ہے، اور اس کی دلیل اگلا جملہ "وسائر ایامہ کایامکم" ہے۔ اور حضور علیہ السلام کے ارشاد "اقدروا لہ قدرہ" کے بارے میں قاضی عیاضؒ فرماتے ہیں کہ یہ حکم اس زمانے کے ساتھ مخصوص ہے جو حضور علیہ السلام نے ہمارے لئے مشروع فرمایا ہے۔

علماء فرماتے ہیں، اگر یہ حدیث نہ ہوتی اور یہ معاملہ حضور علیہ السلام ہمارے اجتہاد کے سپرد فرما دیتے تو ہم دیگر ایام میں بھی انہی معروف اوقات کی نمازوں پر اکتفاء کرتے۔ مطلب یہ ہے کہ جب فجر کے بعد اتنا وقت گزر جائے جتنا عام ایام میں فجر اور ظہر کے درمیان ہوتا ہے، تو ظہر کی نماز پڑھنا، پھر جب ظہر کے بعد اتنا وقت گزر جائے، جتنا عام ایام میں ظہر اور عصر کے درمیان ہوتا ہے، تو عصر کی نماز پڑھنا، پھر جب عصر کے بعد اتنا وقت گزر جائے، جتنا عام ایام میں عصر اور مغرب کے درمیان ہوتا ہے، تو مغرب کی نماز پڑھنا، اور جب مغرب کے بعد اتنا وقت گزر جائے، جتنا عام ایام میں مغرب اور عشاء کے درمیان ہوتا ہے، تو عشاء کی نماز پڑھنا، اور اسی طرح جب عشاء کے بعد اتنا وقت گزر جائے، جتنا وقت عام ایام میں عشاء اور فجر کے درمیان ہوتا ہے، تو فجر پڑھنا، یہاں تک کہ وہ دن ختم ہو جائے۔ دوسرے دن کو جس کی مقدار ایک ماہ کے برابر ہوگی اور تیسرے دن کہ جس کی مقدار ایک ہفتہ کے برابر ہوگی، کو بھی پہلے دن پر قیاس کیا جائے اور ہر نماز کیلئے اسی طرح وقت مقرر کیا جائے۔ انتہیٰ۔

حاصل یہ کہ اوقات نماز کے اسباب ہیں اور مسبّب کو سبب پر مقدم کرنا صرف اُن خاص صورتوں میں جائز ہے، جن میں شریعت نے اجازت دی ہو، جیسا کہ عرفات میں عصر کی نماز کو اپنے وقت سے مقدم کر کے پڑھی جاتی ہے، چنانچہ "اقدروا لہ قدرہ" کی تقدیر یہ ہے: قدروا لأداءِ الصلوات الخمس قدر یوم کذا (پانچوں نمازوں کی ادائیگی کیلئے عام دن کی مقدار کا اندازہ کرو اور تخمینہ لگاؤ)

مگر زیادہ واضح بات وہ جو ایک شارح نے ذکر کی ہے۔"قدروا بوقت صلوٰة يوم في يوم كسنة مثلاً قدره الذي كان له في سائر الايام"۔(مثلاً ایک سال کے برابر طویل دن میں نمازوں کیلئے اتنی مقدار کا وقت مقرر کرو، جتنا عام دنوں میں نمازوں کا وقت ہوتا ہے) جیسا کہ ایک شخص اگر گرفتار کیا گیا ہو، اور اُس کیلئے وقت میں شک پیدا ہو جائے (کسی سے وقت معلوم کرنے کی صورت بھی نہ ہو) تو وہ نمازوں کیلئے اوقات مقرر کرے گا۔

قوله:قلنا يارسول الله وما اسراعه قال :كالغيث استد برته الريح:

مااسراعة:(مضاف محذوف ہے)ای:"وما قدر اسراعه" او"ما كيفية اعجاله في سير ها الخ"(یعنی چلتے وقت اور فاصلے طے کرتے وقت دجال کی تیز رفتاری کس قدر ہوگی؟ یا دجال کی تیز رفتاری کی کیا کیفیت ہوگی؟)

علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں: شاید صحابہ کرامؓ کو دجال کے بارے میں معلوم تھا، کہ زمین پر (کس قدر) تیزی سے چلے گا، اس لئے اُس کی کیفیت کے بارے میں حضور ﷺ سے سوال کیا، جیسا کہ صحابہ کرامؓ کو یہ معلوم تھا کہ دجال زمین میں قیام کرے گا، اس لئے اُنہوں نے دجال کے قیام کی مقدار کے بارے میں پوچھتے ہوئے عرض کیا تھا "ما لبثه"ای ما مدة لبثه(دجال کے قیام کی کتنی مدت ہوگی۔)

بارش سے بادل مراد ہے، گویا مسبّب پر سبب کا اطلاق کیا ہے، (یعنی بادل کی رفتار کے بقدر تیز رفتاری کے ساتھ چلے گا۔)

استدبرته الريح:ابن الملکؒ فرماتے ہیں: یہ جملہ حال ہے یا" الغيث"کے لئے صفت ہے اور" الغيث"میں"ل" عہد ذہنی کا ہے۔ اور مطلب یہ ہے کہ نہ اس کی کیفیت کا ادراک کیا جا سکتا ہے، اور نہ اس کی قیمت کا اندازہ لگانا ممکن ہے۔

قوله:فيأتي على القوم ......وامده خواصره:

فتمطر: امطار سے ماخوذ ہے وہ اتنی بارش برسائے گا کہ نہریں جاری ہو جائیں گے۔ اتنا سبزہ اُگائے گی کہ ہر جگہ پھول ہی پھول نظر آئیں گے، اور یہ سب کچھ اللہ تعالیٰ کی طرف سے بطور استدراج ہوگا۔ ان کے جو مویشی صبح کے وقت چراگاہ کی طرف نکلے تھے وہ زوال شمس کے بعد اس طرح لوٹیں گے۔

كانت:ضمیر کا مرجع"سارحتهم"ہے اور" اطول"، حال ہونے کی بناء پر منصوب ہے۔

ذرى: ذال معجمہ کے ضمہ اور راء کے فتحہ کے ساتھ ہے اور ذال کا کسرہ بھی منقول ہے۔ یہ ذروة ذال پر کسرہ، فتحہ اور ضمہ تینوں جائز ہیں) کی جمع ہے اور" ذروة "، اصل میں"کسی چیز کی بلند جگہ" کو کہتے ہیں یہاں" ذروة" سے مراد"کوہان کی چوٹی" ہے۔ اور کوہان کا بڑا ہونا، فربہ ہونے سے کنایہ ہے۔

اسبغ :بمعنی اتم ہے اور ضمیر مجرور کا مرجع"ما كانت "ہے(یعنی اُن کے تھن (دودھ کی کثرت کی وجہ سے) مکمل طور پر بھر جائیں گے۔ ضروعاً:ضاد کے ضم کے ساتھ،یہ"ضرع "کی جمع ہے، جس کا معنی ہے"تھن"۔

یہ دودھ کی کثرت سے کنایہ ہے۔

امده: "المد" سے اسم تفضیل کا صیغہ ہے۔ ضمیر مجرور"ما كانت"کی طرف لوٹ رہی ہے۔

خواصر: خاصرۃ کی جمع ہے، اور حیوان کے پہلو کے نیچے والی جگہ (کوکھ) کو کہا جاتا ہے۔ اور کوکھ کا لمبا ہونا' شکم سیری اور کثرت اکل سے کنایہ ہے۔

قوله: ثم يأتي القوم نيه عوهم...... كيعاسيب النحل:

یعنی دوسری قوم کے پاس آئے گا'' یاتی '' کے بعد ''علی ''نہ لانے میں اشارہ ہے کہ پہلی قوم کے پاس دجال کا آنا اُس قوم کیلئے درحقیقت نقصان کا باعث ہوگا، جبکہ دوسری قوم کیلئے ایسا نہیں ہوگا۔

فیردون علیه قوله: یعنی دجال کی دعوت کو قبول نہیں کریں گے یا یہ کہ دجال کے دعویٰ کو دلیل سے باطل کر دیں گے۔

فینصرف عنهم: اس میں اشارہ ہے کہ دجال کے پاس اجباری قدرت (مجبور کرنے کی قدرت) نہیں ہوگی۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿اِنَّ عِبَادِيْ لَيْسَ لَكَ عَلَيْهِمْ سُلْطٰنٌ اِلَّا مَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْغٰوِيْنَ﴾ [الحجر: ٤٢] ''واقعی میرے ان بندوں پر تیرا ذرہ بھی بس نہ چلے گا ہاں مگر جو لوگ گمراہ لوگوں میں تیری راہ پر چلنے لگے (تو چلے) یعنی اللہ تعالیٰ اس کو اس قوم کی طرف سے پھیر دے گا۔''

ممحلین: میم کے ضمہ اور حاء کے ساتھ' بمعنی داخلین فی المحل. علامہ تورپشتی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: امحل القوم کا معنی ہے ''اصابھم المحل'' یعنی بارشوں کا منقطع ہو جانا' زمین کا سبزہ سے خالی ہو جانا،

حاصل یہ کہ دجال کی دعوت کا انکار کرنے کی وجہ سے مؤمن طرح طرح کے سخت مصائب میں مبتلا ہو جائیں گے، لیکن اللہ تعالیٰ نے حضور علیہ السلام کی برکت سے اولیاء اللہ کی جو صفات ان کو دی ہوں گی ان صفات کی وجہ سے یہ لوگ اللہ کی قضاء پر راضی ہو کر صبر و شکر کے ساتھ یہ سختیاں اور مصائب برداشت کریں گے۔

الخربة: راء کے کسرہ کے ساتھ ویران زمین۔

''کنوز'': مراد دفن کیے ہوئے خزانے مراد ہیں، یا زمین کے معدنیات مراد ہیں۔

فتتبعه: ''فاء'' فصیحیہ ہے۔ ای: فتخرج فتعقب الدجال. كيعاسيب النحل: ای: ''كما يتبع النحل اليعسوب'' (جیسا کہ شہد کی مکھیاں اپنے سردار کے پیچھے اڑتی ہیں)۔

امام نوویؒ فرماتے ہیں: '' الیعاسیب'' سے مراد شہد کی مکھیاں کا نر ہیں۔ ابن قتیبہ وغیرہ نے اس کی یہی تفسیر بتائی ہے۔ قاضی عیاضؒ فرماتے ہیں: ''یعاسیب النحل'' سے شہد کی مکھیوں کی جماعت مراد ہے، خاص نر مراد نہیں ہیں، لیکن جماعت کو''یعسوب'' سے اس لئے تعبیر کیا حالانکہ وہ ان کا امیر ہوتا ہے' چونکہ جب مکھیوں کا سردار اُڑتا ہے، تو مکھیوں کی پوری جماعت اس کی اتباع میں اُڑتی ہے۔ اسی وجہ سے سردار کو'یعسوب'' کہا جاتا ہے۔

دیلمی نے حضرت علیؓ سے مرفوع حدیث نقل کی ہے:

''علي يعسوب المؤمنين والمال يعسوب المنافقين'' ''علیؓ مؤمنوں کے سردار ہیں، اور مال و دولت منافقوں کا سردار ہے''۔

چنانچہ کلام میں ایک قسم کا "قلب" ہے، چونکہ کلام یوں ہونا چاہئے تھا "کنحل الیعاسیب"۔
"یعاسیب" کو جمع کے صیغہ کے ساتھ ذکر کرنے میں شاید اُن خزانوں کی کثرت کی طرف اشارہ ہے، جو دجال کے پیچھے چلیں گے۔ یا اور اس سے مراد اُس کے امراء و وکلاء کی جماعت ہے۔
اشرفؒ فرماتے ہیں: "کالیعاسیب" دجال کے اتباع کی سرعت سے کنایہ ہے۔ یعنی خزانے دجال کے پیچھے بڑی تیزی سے چلیں گے۔
علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں: "کالیعاسیب" اگر "الدجال" سے حال ہو جائے تو الخربة "البقاع" کی صفت بن جائے گی اور اگر "الکنوز" سے حال ہو جائے تو موصوف کا جمع اور مفرد ہونا دونوں طرح جائز ہے۔

قوله: ثم یدعو رجلا...... ویتهلل وجهه یضحك:

ممتلئا: رجلاً سے حال ہے ای تاماً کاملاً قویاً۔

شبابا: نسبت سے تمیز نسبت ہے۔

علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں "الممتلئ شبابا" سے مراد بھرپور نوجوان ہے (یعنی وہ جوان جو اپنے جوبن پر ہو۔)

جزلتین: جیم کے فتحہ کے ساتھ ہے اور کسرہ بھی جائز ہے۔ بمعنی قطعتین۔

رمیة الغرض: ای قدر حذف الهدف ہدف کے فاصلے کے بقدر۔ "رمیة" مقدر عامل کی وجہ سے منصوب ہے، اور اس کا فائدہ یہ ہے لوگوں کو اچھی طرح معلوم ہو جائے کہ یہ نوجوان یقینی طور پر بغیر کسی شک و شبہ کے قتل کیا جا چکا ہے۔ جیسا کہ جادوگر اور شعبدہ باز کرتے ہیں۔
امام نوویؒ فرماتے ہیں کہ "الجزلة" جیم کے فتحہ کے ساتھ مشہور ہے اور ابن درید نے کسرہ کے ساتھ روایت کیا ہے اور "رمیة الغرض" کا مطلب یہ ہے کہ اُس نوجوان کے بدن کے دونوں ٹکڑے ایک دوسرے سے اتنے فاصلہ پر کر دے گا، جتنا فاصلہ تیر پھینکنے والے اور نشانہ کے درمیان ہوتا ہے۔ یہی ظاہر اور مشہور مفہوم ہے۔ اس کو قاضیؒ نے حکایت کیا ہے۔
پھر (امام نوویؒ) فرماتے ہیں کہ میرے نزدیک اس عبارت میں تقدیم و تاخیر ہے، اور عبارت کی تقدیر یہ ہے: "فیصیبه اصابة رمیة الغرض فیقطعه جزلتین" اور صحیح پہلا مفہوم ہے۔
علامہ تورپشتی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "رمیة الغرض" سے مراد تلوار کا تیزی کے ساتھ بدن میں سرایت کرنا یا تلوار کا سینے پر لگنا ہے۔
علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں اس کی تائید کہ امام نوویؒ کی اس تاویل سے ہوتی ہے جو انہوں نے اگلی حدیث کے اس جملہ "ثم یمشي الدجال بین القطعتین" کے تحت ذکر کی ہے۔
یضحك: یقبل کی ضمیر سے حال ہے۔ ای: "یقبل ضاحکاً بشاشا، فیقول هذا کیف یصلح الٰهاً؟" (وہ نوجوان ہنستے ہوئے بشاشت کے ساتھ آگے بڑھے گا، اور کہے گا یہ معبود کیسے ہو سکتا ہے؟)

قولہ: فبینما ھو کذلك اذبعث اللّٰہ...... بین مھروذتین:

فبینما: صحیح روایت کے مطابق میم کے ساتھ ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿بَلْ نَقْذِفُ بِالْحَقِّ عَلَى الْبَاطِلِ فَيَدْمَغُهُ فَإِذَا هُوَ زَاهِقٌ﴾ [الانبیاء: ۱۸] ''بلکہ ہم حق بات کو باطل پھینک مارتے ہیں سو وہ (حق) اس (باطل) کا بھیجا نکال دیتا ہے (یعنی اس کو مغلوب کر دیتا ہے) سو وہ (مغلوب ہو کر) دفعتاً جاتا رہتا ہے''

''**شرقی**'': ''مفعول فیہ ہونے کی بناء پر منصوب ہے، اور ''**دمشق**'' کی طرف مضاف ہے۔

''**دمشق**'' دال کے کسرہ اور میم کے فتحہ کے ساتھ ہے'' ''میم'' کا کسرہ بھی جائز ہے' شام کا مشہور شہر ہے آج کل شام کے زیر حکومت ہے۔

جامع میں لکھا ہے: طبرانیؒ نے اُوس بن اُوس سے نقل کیا ہے:

ینزل عیسی ابن مریم عند المنارۃ البیضاء شرقی دمشق۔

''عیسیٰ علیہ السلام دمشق کے مشرقی جانب کے سفید منارہ پر اُتریں گے''۔

علامہ سیوطیؒ نے ابن ماجہ پر اپنی تعلیق میں لکھا ہے کہ حافظ ابن کثیر فرماتے ہیں، کہ ایک روایت میں ہے **ان عیسی علیہ الصلوٰۃ والسلام ینزل بیت المقدس**، عیسیٰ علیہ السلام بیت المقدس میں اتریں گے۔ اور ایک روایت اُردن میں ایک اور روایت کے مطابق ''مسلمانوں کے لشکروں کے اجتماع گاہ میں اُتریں گے۔

ملا علی قاریؒ فرماتے ہیں کہ عیسیٰ علیہ السلام کا بیت المقدس میں اُترنا جس حدیث میں منقول ہے، وہ حدیث ابن ماجہ کی ہے، اور میرے نزدیک یہی راجح ہے۔ اور یہ روایت دوسری روایات کے منافی نہیں ہے، کیونکہ بیت المقدس دمشق کے مشرقی جانب میں واقع ہے، اور بیت المقدس مسلمانوں کا اجتماع گاہ بھی ہے، اور اُردن بھی ایک ضلع ہے، جیسا کہ صحاح میں ہے، اور بیت المقدس اس میں داخل ہے، اور اس وقت اگرچہ بیت المقدس میں سفید منارہ نہیں ہے، لیکن حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے اُترنے سے پہلے بن جائے گا۔ واللہ اعلم

مھروذتین، میں ''ذال'' (نقطہ والی) بھی منقول ہے اور ''دال'' (بغیر نقطہ کے) بھی۔

مطلب یہ ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام اس حال میں آسمان سے اُتریں گے کہ ایسے کپڑے پہنے ہونگے جو ورس کے ساتھ یا زعفران کیسے رنگے ہوئے ہونگے۔ امام نوویؒ فرماتے ہیں کہ اس کلمہ کو دال کے ساتھ بھی نقل کیا گیا ہے، اور ذال کے ساتھ بھی، اور ذال کا استعمال اکثر ہے۔ لیکن متاخرین اور متقدمین سب کے نزدیک دونوں صورتیں مشہور ہیں، اور نسخوں میں اکثر ''دال'' کے ساتھ منقول ہے، اور مطلب یہ ہے کہ ایسے کپڑے پہنے ہوئے ہونگے، جو ورس یا زعفران کے ساتھ رنگے ہوئے ہونگے۔ انتہیٰ۔

ابن انباری فرماتے ہیں کہ یہ کلمہ دال اور ذال دونوں کے ساتھ نقل کیا جاتا ہے۔ اور ''**بین مھروذتین**'' بمعنی **مخصرتین**

،جیسا کہ حدیث میں وارد ہوا ہے۔اور ہم نے اس حدیث ہی میں سنا ہے،اور اس طرح کی کئی اشیاء ہیں جو صرف حدیث میں ہی سنی جاتی ہیں۔ اور المخصرة کا معنی وہ کپڑا جس میں ہلکا سا زرد رنگ ہو،جیسا کہ نہایہ میں لکھا ہے۔

قوله: واضعًا کفیه...... مثل جمان کاللؤلؤ: یہ عبارت ترکیب میں حال واقع ہو رہی ہے۔اس عبارت میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے نزول کی کیفیت بیان ہوئی ہے جیسا کہ اس سے پہلے والی عبارت میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے لباس اور جمال کی کیفیت بیان ہوئی تھی۔پھر اس کے بعد حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ایک اور حالت بیان فرمائی۔

طأطأ: دو ہمزوں کے ساتھ۔

قَطر: بمعنی عَرَق (پسینہ ٹپکنا)۔

تحدر: دال کی تشدید کے ساتھ ہے۔

منه: ضمیر مجرور کا مرجع "شعرہٖ" ہے۔

الجمان: جیم کے ضمہ اور "میم" کی تخفیف کے ساتھ اور میم کو مشدد پڑھنا بھی درست ہے کا معنی چاندی کے دانے۔نہایہ میں لکھا ہے الجمان (جیم کے ضمہ اور میم کی تخفیف کے ساتھ) چاندی کے وہ دانے جو بڑے موتیوں کی شکل پر چاندی سے بنائے جائیں۔

قاموس میں لکھا ہے: "الجمان" بروزن "غُراب"، موتی یا موتی کی شکل پر بنی ہوئی کسی بھی چیز کے معنی میں آتا ہے۔

شارحؒ فرماتے ہیں: الجمان کی "میم" مشدد ہے۔ابن الملکؒ فرماتے ہیں: الجمان (میم کی تشدید کے ساتھ) بمعنی چھوٹے موتی اور الجمان (میم کی تخفیف کے ساتھ) بمعنی چاندی سے بنے ہوئے دانے۔چمک اور سفیدی کے اعتبار سے موتی کی طرح ہونگے۔

علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں حدیث شریف میں حضرت عیسیٰ کے سر مبارک سے گرنے والے قطروں کو بڑا ہونے میں "جمان" کے ساتھ تشبیہ دی، پھر "جمان" کو چمک اور سفیدی میں "اللؤلو" (موتی) کے ساتھ تشبیہ دی،اور چہرے کا حسن تو یہی ہے کہ بڑا ہو، چمکدار اور حسین ہو۔

بعض حضرات کا کہنا ہے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی صفت بیان کرتے ہوئے "الجمان" سے مراد چاندی کے دانے ہیں۔ملا علی قاریؒ فرماتے ہیں: بلکہ حدیث کے لفظ "کاللؤلؤ" کی وجہ سے یہی معنی (چاندی کے دانے) متعین ہے۔

قوله: فلا یحل لکافر ......فیطلبه حتی یدرکه بباب لد فیقتله:

لا یحل: حاء کے کسرہ کے ساتھ ہے۔

نفسه: "فاء" مفتوح کے ساتھ ہے۔

قاضی عیاضؒ فرماتے ہیں میرے نزدیک "لا یحل" بمعنی "حق واجب"، آگے فرماتے ہیں: بعض حضرات نے "لا یحل" کو "حاء" کے ضمہ کے ساتھ روایت کیا ہے لیکن یہ ایک وہم اور غلطی ہے۔

علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں عبارت کا معنی یہ ہے "لا یحصل ولا یحق ان یجد من ریح نفسه وله حال من الاحوال الا حال الموت" (یہ نہیں ہوگا کہ کسی کافر تک حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے سانس کی ہوا پہنچے اور اُس کافر کیلئے موت کے علاوہ کوئی اور حال ہو) "یجد" اپنے ماقبل "ان" سے مل کر بتاویل مصدر ہو کر "یحل" کیلئے فاعل ہے۔

طرفه: (راء کے سکون کے ساتھ) بمعنی **لحظة ولمحة** (آنکھ کی نگاہ)

ممکن ہے کہ دجال اس حکم (عیسیٰ علیہ السلام کی سانس کی ہوا لگنے سے کافر کا مر جانے) سے اس مصلحت وحکم کے پیش نظر مستثنیٰ ہو کہ وہ جب حضرت عیسیٰؑ کے ہاتھوں قتل ہو تو عیسیٰ اپنی خون آلود تلوار پر اُس کا خون لوگوں کو دکھائے، تا کہ مؤمنین کے دلوں میں دجال کا ساحر و کذاب ہونا پختگی کے ساتھ جم جائے۔

اور یہ بھی ممکن ہے، کہ آسمان سے اُترنے کے بعد شروع میں تو حضرت عیسیٰؑ کو یہ کرامت (حضرت عیسیٰؑ کی سانس کی ہوا سے کافر کے مر جانے کی کرامت) حاصل ہو لیکن جب حضرت عیسیٰؑ دجال کی طرف متوجہ ہو جائیں، تر واُس وقت یہ کرامت اُٹھا لی جائے، کیونکہ کسی کرامت کیلئے یہ ضروری نہیں کہ وہ ہمیشہ رہے۔

بعض حضرات فرماتے ہیں کہ یہ سانس جس کی ہوا سے کافر مرے گا، یہ عام معمول کی سانس نہیں ہوگی بلکہ اس سے مراد خاص سانس (پھونک) ہے، جس سے مقصود کافر کو ہلاک کرنا ہوگا، چنانچہ حضرت عیسیٰؑ کی سانس کی ہوا سے دجال کے ہلاک نہ ہونے کی وجہ یہ ہے کہ حضرت عیسیٰؑ کو دجال کا اس طرح مارنا مقصود ہی نہیں ہوگا۔

بعض حضرات فرماتے ہیں: کہ حدیث سے یہ تو مفہوم ہو رہا ہے کہ جس کافر کو عیسیٰؑ کی سانس کی ہوا پہنچے گی، وہ کافر مر جائے گا، لیکن یہ بات مفہوم نہیں ہو رہی، کہ سانس کی ہوا نکلتے ہی کافر مر جائے گا۔ لہٰذا ممکن ہے کہ مذکورہ بالا حکمت کے پیش نظر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی سانس کی ہوا دجال کو قتل کرنے کے بعد دجال اور دوسرے کفار تک پہنچے۔

ملا علی قاریؒ فرماتے ہیں کہ ہمارے شیخ مولانا عبداللہ سندیؒ نے اسی طرح محفوظ کیا ہے۔ پھر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی شان بھی عجیب ہے کہ بعض لوگوں کے حق میں تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پھونک سے مردہ زندہ ہوتے تھے، اور بعض لوگوں کے حق میں آپؑ کی پھونک سے زندہ مر جائیں گے۔

لُد: (لام کے ضمہ اور دال کی تشدید کے ساتھ) اسم منصرف ہے اور یہ شام میں ایک پہاڑ کا نام ہے۔ اور بعض حضرات کے نزدیک بیت المقدس کی ایک بستی کا نام ہے اور امام نوویؒ نے اسی کو ذکر کیا ہے، اور دوسرے حضرات نے اور اقوال بھی بیان کئے ہیں، اس مقام کو "لُد" اس لئے کہا جاتا ہے کہ وہاں درخت بہت ہیں۔ علامہ سیوطیؒ نے ترمذی کی شرح میں ذکر کیا ہے کہ نہایہ میں لکھا ہے: لُد، شام میں ایک جگہ کا نام ہے اور بعض حضرات فرماتے ہیں فلسطین میں ایک جگہ کا نام ہے۔

فیقتله: جامع میں لکھا ہے: اس حدیث کو امام ترمذی اور امام احمدؒ نے نقل کیا ہے اور مجمع بن ساریہ سے اس طرح کے الفاظ منقول ہیں: "یقتل ابن مریم الدجال بباب لُد۔" "ابن مریم دجال کو باب لد کے پاس قتل کریں گے"

عصمهم: بمعنی "حفظهم" اور ضمیر مجرور کا مرجع "شر الدجال" ہے یعنی دجال کے شر سے اللہ نے ان کو محفوظ رکھا ہوگا۔

قوله:ثم ياتي عيسى الى قوم...... فحرز عبادي الى الطور:

فيمسح عن وجوههم:

ایک مطلب تو یہ ہے کہ ان لوگوں کے سفر کی وجہ سے جو غبار اُن کے چہروں پر لگا ہوگا، حضرت عیسیٰ علیہ السلام بہت زیادہ اکرام کیلئے اُن کے چہروں سے گرد وغبار صاف کریں گے۔

دوسرا مطلب یہ ہے کہ ان لوگوں کو جو بہت زیادہ پریشانی اور آزمائش لاحق ہوگی، اُس کی وجہ سے ان کے چہروں پر غم ورنج کے آثار ہونگے، حضرت عیسیٰؑ اُنکو دجال کے قتل ہو جانے کی خوشخبری سُنا کر اُن کے چہروں سے غم ورنج کے آثار کو ختم کردینگے۔

امام نوویؒ فرماتے ہیں کہ "يمسح عن وجوههم" یا تو ظاہر پر محمول ہے، مطلب یہ کہ حضرت عیسیٰؑ تبرک کیلئے اُن لوگوں کے چہروں پر اپنا ہاتھ پھیریں گے، یا مؤمنوں پر دجال کا جو خوف طاری ہوگا، اس خوف کو زائل کردیں گے۔

أني: ہمزہ مفتوح اور مکسور دونوں طرح پڑھنا درست ہے۔

قد أخرجت عبادا لي: یعنی اپنے فیصلے کے تحت ایک جماعت ظاہر کردی ہے۔

لايدان لاحد: طاقت کو ید (ہاتھ) سے اس لئے تعبیر کیا کہ انسان اپنا دفاع اور حملہ دونوں ہاتھوں کے ذریعے کرتا ہے اور ید کی تثنیہ مبالغہ کیلئے ذکر کیا، گویا کہ ان کے دفاع سے لوگ اس طرح عاجز ہیں کہ دونوں ہاتھ ختم ہو چکے ہوں، اور یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ تثنیہ کے صیغے میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ لوگ دونوں سے عاجز ہونگے۔

حرز: "تحريز" سے مأخوذ ہے اور تحريز" حرز" سے مأخوذ ہے۔

قوله:ويبعث الله ياجوج وماجوج ...... وهو جبل بيت المقدس:

ياجوج مأجوج: ان کو ہمزہ اور الف دونوں کے ساتھ پڑھنا جائز ہے۔ ضمیر کا مرجع يأجوج مأجوج بتاويل "جميع القبيلتين" ہے جیسا کہ اللہ کا ارشاد ہے:

﴿هذان خصمان اختصموا﴾ [الحج:١٩] یہ (جن کا اوپر آیات میں ذکر ہوا) دو فریق ہیں جنہوں نے دوبارہ اپنے رب کے (دین کے باہم) اختلاف کیا۔

حدب: حاء اور دال کے فتحہ کے ساتھ بمعنی زمین کی بلند جگہ۔

ينسلون: یاء کے فتحہ اور سین کے کسرہ کے ساتھ۔

بحيرية طبرية: مرکب اضافی ہے، بحيرة" بحرة" کی تصغیر ہے" بحيره طبريه" شام میں واقع ایک جھیل ہے جو دس کوس لمبی ہے۔ طبرية (طاء اور باء کے فتحہ کے ساتھ) ایک جگہ کا نام ہے۔ شارحؒ فرماتے ہیں: کہ شام اُردن کا ایک قصبہ ہے۔

فيشربون ما فيها: "ما فيها" سے مراد اُس جھیل کا پانی ہے۔

قوله:لقد قتلنا من في الارض ...... مخضوبة دما:

لقد كان هذه: " هذه" سے " بحيرة " کی طرف یا البقعة کی طرف اشارہ ہے۔

ماء : کی صفت محذوف ہے۔اور تقدیر" ماءٌ كثير " ہے۔

الخمر : خاء اور میم مفتوح اور ان کے بعد راء ہے۔کا اصل معنی "گھنی جھاڑی" ہے،لیکن حدیث کے اگلے جملہ سے اس کی تفسیر کی گئی۔

وهو جبل بيت المقدس: کیونکہ اس پہاڑ پر گھنی جھاڑیاں بہت ہیں۔"الخمر" ہر اُس چیز کو کہتے ہیں جو ڈھانپنے والی ہو چاہے درخت ہو چاہے عمارت ہو یا چاہے کوئی اور چیز۔(کذافی النھایۃ)

يقولون لقد قتلنا من في الأرض:

"من في الارض" سے مراد زمین پر رہنے والے لوگ۔یہ سارے محفوظ اور محصور تھے۔

هلم: (آجاؤ) اس کلمہ میں یأ جوج مأ جوج کے امیر یا اُن کے بڑے کو خطاب ہے۔یا یہ خطاب عام ہے کسی ایک کے ساتھ خاص نہیں۔

نہایہ میں لکھا ہے کہ" هلم" میں دو لغات ہیں،اہل حجاز اس لفظ کو فتحہ پر مبنی پڑھ کر اس کا اطلاق مفرد،تثنیہ،جمع،مذکر اور مونث سب پر کرتے ہیں۔اور بنو تمیم اس لفظ کو تثنیہ،جمع اور مونث کیلئے مختلف صیغوں کے ساتھ استعمال کرتے ہیں،چنانچہ کہا جاتا ہے هلم، هلمي، هلما هلموا.

نشابهم: نون کے ضمہ اور شین کی تشدید کے ساتھ اس کا مفرد" نشابة" ہے بمعنی سهام،اور"باء"زائد ہے۔

الى السماء: مضاف محذوف ہے اور عبارت کی تقدیر "الى جهة السماء" ہے۔

مخضوبة : بمعنی مضبوغة (رنگے ہوئے)۔

دماً: ترکیب میں تمیز ہے۔

الثور : بمعنی" البقر"،باوجود اس کے کہ اُن علاقوں میں اچھی طرح ارزانی ہوگی،بیل کا سر سو دینار سے بہتر ہوگا۔
علامہ تورپشتی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں،کہ ان لوگوں پر فاقہ اس حد تک پہنچ جائے گا،اور بیل کا سر اس لئے ذکر کیا گیا تاکہ باقی چیزوں کو قیمت میں اس پر قیاس کیا جائے۔

قوله: ويحصر نبي الله واصحابه..... فرسى كموت نفس واحد:

نبي الله: اس لفظ میں اس بات پر تنبیہ ہے کہ باوجود اس کے کہ عیسیٰ علیہ السلام،حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شریعت پر کاربند ہونگے پھر بھی عیسیٰؑ کی نبوت باقی رہے گی۔قاضیؒ فرماتے ہیں کہ حضرت عیسیٰؑ اور اُن کے ساتھی یأ جوج مأ جوج کی ہلاکت کیلئے اور اُن کی طرف سے آنے والی سختیوں سے نجات کیلئے اللہ کی طرف متوجہ ہو کر آہ وزاری کریں گے۔چنانچہ اللہ تعالیٰ ان کی دُعا قبول کرے گا،اور یأ جوج مأ جوج کو نغف بیماری کے ذریعے ہلاک کرے گا،جیسا کہ حدیث میں ارشاد فرمایا:"فيرسل الله عليهم".

النغف: نون اور غین کے ساتھ اُن کیڑوں کو کہتے ہیں جو اونٹ اور بکری کی ناک میں پیدا ہوتے ہیں۔

فرسٰی: "هلكى" کے وزن پر اور اسی کے معنی میں ہے۔ یہ "فريس" کی جمع ہے جیسا کہ قتلیٰ، قتيل کی جمع ہے۔ یہ فرس الذئب الشاة (بھیڑیا نے بکری کو قتل کر کے چیر پھاڑ ڈالا) سے ماخوذ ہے اور اسی سے فريسة الأسد بھی ماُخوذ ہے۔

اوران کا یکدم مرجانا اللہ کی کمال قدرت اور مشیت کی وجہ سے ہوگا۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿مَا خَلْقُكُمْ وَلَا بَعْثُكُمْ إِلَّا كَنَفْسٍ وَّاحِدَةٍ﴾ [لقمن:٢٨] "تم سب کا پیدا کرنا اور زندہ کرنا بس ایسا ہی ہے جیسا ایک شخص کا"۔

علامہ تورپشتی رحمہ اللہ فرماتے ہیں مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا قہر جو ہر چیز پر غالب ہے، ان تمام یاجوج ماجوج کو ایک ہی وقت میں موت کے گھاٹ اتار دے گی۔ اور مرے ہوئے پڑے ہونگے۔

دو کلمے" النغف" اور" فرسى" کو ذکر کر کے اس بات پر تنبیہ کی کہ اللہ تعالیٰ اُن یأجوج مأجوج کو تھوڑی سی دیر میں ایک کمزور مخلوق یعنی نغف کے ذریعے اس طرح ہلاک کرے دیگا، جیسا کہ درندہ کسی جانور کو چیر پھاڑ کر ہلاک کر دیتا ہے، جبکہ اس سے پہلے ان کے دماغوں میں اتنی سرکشی بھڑک رہی تھی کہ یہ دعویٰ کرنے لگے کہ ہم نے تو آسمان والوں کو بھی قتل کر دیا۔

قوله: ثم يهبط نبى الله عيسى ...... الا ملأه زهمهم ونتنهم:

الأرض سے تمام زمین مراد ہے اور ضمیر ذکر کر کے" فيها" کہنے کی بجائے اسم ظاہر ذکر کر کے" في الارض" کہنے کی یہی وجہ ہے، لہٰذا پہلے لفظ" الارض" میں" ال" عہدی ہے اور دوسرے لفظ" الارض" میں استغراق کیلئے ہے، اور اس کی دلیل استثناء ہے اور اس سے معلوم ہوا کہ یہ قاعدہ "المعرفة اذا اعيدت تكون عينا للأولى" (معرفہ کا جب تکرار ہو تو دوسرے معرفہ سے بعینہٖ پہلا مراد ہوتا ہے) غالب احوال پر مبنی ہے۔ یا یہ قاعدہ وہاں چلے گا جہاں اس قاعدے سے پھیرنے والا کوئی قرینہ نہ ہو۔

زهمهم: زاء مفتوح ہے، اور کبھی مضموم بھی پڑھی جاتی ہے، اور" ھاء" مفتوح ہے۔ شارحؒ فرماتے ہیں کہ" زاء" مضموم ہے اور اس لفظ کو" زاء" اور" ھاء" کی حرکت کے ساتھ نقل کیا جاتا ہے، اور "زهمهم" کی تفسیر "نتنهم" کر رہا ہے۔ نتنٌ کی تاء ساکن ہے۔

علامہ تورپشتی رحمہ اللہ فرماتے ہیں، الزهم (زاء اور ھاء کی حرکت کے ساتھ) تیرے قول" زهمت" ھاء کے کسرہ کے ساتھ يدى،" کا مصدر ہے" زهومة" سے مشتق ہے، فهي زهمة أي دسمة. میرے علم کے مطابق اکثر روایات میں یوں ہی ہے، اور اس میں معنوی اعتبار سے کمزوری ہے اور" زاء" کا ضمہ اور" ھاء" کا فتحہ یعنی زُهَم معنی کے اعتبار سے زیادہ صحیح ہے اور زهم، زهمة (زاء کے ضمہ اور" ھاء" کے سکون کے ساتھ) کی جمع ہے جس کا معنی ہے" بدبودار ہوا"۔ شارحؒ فرماتے ہیں کہ نقل اور معنی کے اعتبار سے زیادہ صحیح یہی ہے اور یہ قاموس کے موافق ہے کیونکہ قاموس میں لکھا ہے: الزهومة اور الزهمة (" ھاء" کے ضمہ کے ساتھ) کا معنی ہے سڑے ہوئے گوشت کی بدبُو۔ اور الزهم (ضمہ کے ساتھ) بمعنی بدبودار ہوا، اور الزهم (حرکت کے ساتھ) زهمت (بروزن فرح) يدى کا مصدر ہے اور زهمة بمعنی دسمة ہے انتہیٰ۔

بعض حضرات فرماتے ہیں کہ مصدر کا اطلاق کر کے وصف مراد ہے تاکہ مبالغہ کا فائدہ دے جیسا کہ" رجل عدل" میں ہے۔

قوله: فيرغب نبي الله عيسى...... وفي رواية تطر حهم بالنهبل:

حضرت عیسیٰؑ کا اپنے ساتھیوں کو دعا میں اپنے ساتھ شریک کرنے میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ اہم امور کیلئے دعا کی قبولیت میں ہیئت اجتماعی کی بہت بڑی تاثیر ہے یا عیسیٰ علیہ السلام کے ساتھیوں کو ذکر کرنے میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ حضرت عیسیٰؑ کے ساتھی ہی اللہ سے دُعا اور اللہ کے سامنے آہ وزاری کیلئے باعث اور سبب ہیں۔

البخت: باء کے ضمہ اور خاء کے سکون کے ساتھ۔

طير: طائر کی جمع ہے اور کبھی "طیر" کا اطلاق واحد پر بھی ہوتا ہے۔ اس وجہ سے بصیغۂ اگلا فعل مونث کے ذکر کیا۔

فتحملهم: ضمیر مرفوع کا مرجع "الطیر" ہے۔

حيث شاء الله: سمندر میں یا آبادی سے باہر خالی میدانوں میں یا کوہ قاف کے پیچھے یا عالم فناء میں۔

النهبل: نون اور "باء" کے فتحہ اور "ھاء" کے سکون کے ساتھ ایک جگہ کا نام ہے۔ بعض حضرات فرماتے ہیں، کہ "نھبل" بیت المقدس میں ایک جگہ کا نام ہے۔

بعض حضرات فرماتے ہیں کہ "نھبل" اس جگہ کا نام ہے جہاں سے سورج طلوع ہوتا ہے۔ قاموس میں لکھا ہے نھبل کا معنی زیادہ عمر رسیدہ۔ امام ترمذیؒ نے دجال کی حدیث میں روایت کیا ہے: **فتطرحهم بالنهبل**، لیکن یہ غلطی ہے، درست لفظ **مهبل** (میم کے ساتھ) ہے انتہیٰ۔ اس لفظ کو "مھبل" نہ تو لفظاً کسی نے ذکر کیا اور نہ معنیً۔

لیکن اس میں یہ اشکال ہے کہ اس جگہ میں اتنی لاشیں کیسے سمائیں گی، چنانچہ (اس اشکال کا جواب یہ ہوسکتا ہے کہ) ہوسکتا ہے بعض لاشیں "نھبل" مقام میں گرادیں گے، یا یہ کہ خلاف عادت مقام نھبل میں یہ لاشیں سما جائیں۔

قوله: ويستوقد المسلمون...... حتى يستر كها كالزلقة:

قسيهم: قاف اور "سین" کے کسرہ اور "یاء" کی تشدید کے ساتھ **قوس** کی جمع ہے، اور ضمیر مجرور یاجوج ماجوج کی طرف لوٹ رہی ہے۔

جعاب: جیم کے کسرہ کے ساتھ۔ **جعبة** (جیم کے فتحہ کے ساتھ) کی جمع ہے جس کا معنی ہے تیر کا کنارہ۔

مطراً: صفت محذوف ہے اور تقدیر یہ ہے: **مطراً عظيماً**۔

لا يكن: یاء کے فتحہ، کاف کے ضمہ اور نون کی تشدید کے ساتھ: "**كننت الشيئ**" بمعنی "**سترته وصنته عن الشمس**" سے ماخوذ ہے یعنی کسی چیز کی حفاظت کرنا۔ اور "**يكن**" باب افعال سے یعنی **اكننت الشيئ** سے ماخوذ ہو تو بھی یہی معنی ہے۔ اس فعل کا مفعول محذوف ہے اور پورا جملہ **مطراً** کی صفت ہے۔

مدر: "میم" اور "دال" کے فتحہ کے ساتھ بمعنی **تراب وحجر**۔

ولا وبر: **دبر** بمعنی **صوف وشعر** اور اس عبارت سے مقصود یہ ہے کہ یہ بارش شہر کی آبادی پر بھی برسے گی اور دیہات

کی آبادی پر بھی۔ امام نوویؒ یہ مطلب بیان فرماتے ہیں کہ کوئی مکان بھی زمین تک پانی کے نیچے سے مانع نہیں ہوگا، اور" المدر " بمعنی کا معنی ہے سخت مٹی۔ قاضی عیاضؒ فرماتے ہیں: مطلب یہ کہ پانی اور زمین کے درمیان کوئی چیز حائل نہیں ہوگی۔ اور پانی تمام جگہوں تک پہنچ جائے گا۔

کالزلفة: "زاء" اور "لام" مفتوح ہے اور لام کو ساکن بھی پڑھا جا سکتا ہے۔ اور لام کے بعد "فاء" ہے، اور بعض فرماتے ہیں: کہ لام کے بعد قاف ہے، اور یہ لفظ آئینہ کے معنی میں آتا ہے۔ بعض حضرات فرماتے ہیں: اس کا معنی ہے وہ حوض جس میں بارش کا پانی جمع کیا جائے۔ مطلب یہ ہے کہ پانی تمام زمین پر اس طرح پھیل جائے گا، کہ دیکھنے والا اُس میں اپنا چہرہ دیکھ سکے گا۔

امام نوویؒ فرماتے ہیں: اس لفظ کو "زاء" اور "لام" کے فتحہ کے ساتھ روایت کیا گیا ہے۔ اور لام کے بعد 'فاء' اور "قاف" دونوں مروی ہیں، اور "زاء" کے ضمہ، لام کے سکون اور آخر میں 'فاء' کے ساتھ بھی نقل کیا گیا ہے۔

قاضی عیاضؒ فرماتے ہیں اس لفظ کو 'لام' کے فتحہ اور سکون دونوں کے ساتھ اور آخر میں "فاء" اور "قاف" دونوں کے ساتھ نقل کیا گیا ہے اور ساری صورتیں صحیح ہیں۔ ملا علی قاریؒ فرماتے ہیں کہ صحیح جو کہ اکثر علماء کی رائے ہے وہ یہ ہے کہ "زاء" اور "لام" مفتوح ہیں، اور آخر میں "فاء" ہے، اور قاموس نے اسی پر اکتفاء کرتے ہوئے آئندہ مذکورہ معانی کو ذکر کیا ہے۔ واللہ اعلم۔

چنانچہ صاحب قاموس فرماتے ہیں کہ علماء کرام کا اس لفظ الزلفة کے معنی میں اختلاف ہے چنانچہ ثعلب، ابو زید اور دوسرے بعض حضرات فرماتے ہیں: کالزلفة کا معنی ہے کالمرآة۔ اور صاحب مشارق نے یہ معنی حضرت ابن عباسؓ سے بھی نقل کیا ہے، اور فرمایا کہ زمین کو آئینہ کے ساتھ صفائی اور چمک میں تشبیہ دی ہے۔ اور بعض حضرات فرماتے ہیں: " کالزلفة " کا معنی " کمصانع الماء " کہ زمین ان حوضوں کی مانند ہو جائے گی جن میں بارش کا پانی جمع کیا جاتا ہے۔

اور ابو عبیدہ فرماتے ہیں: " کالزلفة " کا معنی ہے "الاجانة الخضراء"۔ اور بعض حضرات فرماتے ہیں اس کا معنی ہے کالصحفة، اور بعض حضرات فرماتے ہیں: کالزلفة، کا معنی کالروضة (باغیچہ کی طرح) ہے۔

العصابة: عین کے کسرہ کے ساتھ بمعنی جماعت۔

قوله: ثم يقال للأرض ...... لتكفي الفامن الناس:

قحف: "قاف" کے کسرہ کے ساتھ بمعنی قشر (چھلکا)۔ امام نوویؒ فرماتے ہیں: " قحف "، کا معنی انار کے چھلکے کا گڑھا اور اس کو انسان کی کھوپڑی کے ساتھ تشبیہ دی ہے۔ " قحف " (کوپڑی کا وہ حصہ ٹوٹ کر جدا ہو جائے) اس گول ہڈی (کھوپڑی) کو کہتے ہیں جو دماغ کے اوپر ہوتی ہے۔ اور بعض حضرات فرماتے ہیں: هو ما انفلق من جمجمته وانفصل۔

شارحؒ فرماتے ہیں کہ اس سے انار کا اوپر والا آدھا چھلکا مراد ہے۔ اور اصل میں " قحف " اُس گول ہڈی کو کہا جاتا ہے، جو دماغ کے اوپر ہوتی ہے اور کھوپڑی کی شکل پر لکڑی کے پیالے کو بھی کہا جاتا ہے۔ گویا کہ نصف صاع کے بقدر پیالہ اور یہاں چھلکے کے لئے استعارۃً استعمال ہوا ہے۔

یبارك: مجہول کے صیغہ کے ساتھ ہے۔

الرسل: ''راء'' کے کسرہ اور سین کے سکون کے ساتھ ہے۔

اللقحة: لام کے کسرہ کے ساتھ اور فتحہ بھی جائز ہے دودھ دینے والی اونٹنی کو کہتے ہیں۔ امام نوویؒ فرماتے ہیں: '' اللقحة'' میں لام کا کسرہ اور فتحہ دونوں مشہور لغات ہیں، اور کسرہ زیادہ مشہور ہے اور اس سے مراد وہ اونٹنی جس کے بچہ جننے کا وقت قریب ہو۔ ''مختصر'' میں لکھا ہے: اللقحة، اونٹنی کے علاوہ دوسرے جانوروں میں سے بھی اُس مادہ جانور کو کہا جاتا ہے جس کے بچہ جننے کا وقت قریب ہو۔ چنانچہ ''من الابل' میں'' من'' بیانیہ ہے۔

لتكفي: ضمیر مرفوع کا مرجع '' اللقحة'' ہے، اور مراد اس سے اونٹنی نہیں بلکہ اونٹنی کا دودھ ہے۔

الفئام (ہمزہ کے ساتھ۔ رجال کے وزن پر ہے، اور عوام ہمزہ کو یاء سے بدل دیتے ہیں، اور الفئام بمعنی الجماعة.

من الناس: اس کا مفرد من لفظہ (اسی مادہ سے مفرد) نہیں ہے، اور یہاں '' الناس'' سے مراد قبیلہ کے اکثر افراد ہیں، جیسا کہ قبیلہ'' فخذ'' سے زیادہ ہوتا ہے جس کی آئندہ وضاحت آئے گی۔

امام نوویؒ فرماتے ہیں: '' الفئام'' قاف کے کسرہ اور اس کے بعد ہمزہ ممدودہ کے ساتھ بمعنی الجماعة الكثيرة لغت میں یہی مشہور ومعروف ہے، اور حدیث میں ''فاء'' کے کسرہ اور ہمزہ کے ساتھ روایت کیا گیا ہے۔

قاضیؒ فرماتے ہیں، کہ بعض اہل لغت ہمزہ کو جائز قرار نہیں دیتے۔ بلکہ ''یاء'' کے ساتھ استعمال کرتے ہیں۔

مشارق میں لکھا ہے: اور خلیلؒ نے اس کو حکایت کیا ہے، کہ اس لفظ کی ''فاء'' مفتوح ہے، اور فرمایا ہے کہ صاحب العین نے اس لفظ کو بغیر ہمزہ کے ''یاء'' کے ساتھ ذکر کیا ہے۔ خطابیؒ نے لکھا ہے کہ بعض نے ''فاء'' کے فتحہ اور ''یاء'' کی تشدید کے ساتھ ذکر کیا ہے جو فحش غلطی ہے۔

قاضیؒ فرماتے ہیں: الفخذ (خاء کے سکون کے ساتھ) یہاں پر عزیز و اقارب کی جماعت کے معنی میں ہے، اور فخذ کا اطلاق 'بطن' سے کم افراد کی جماعت پر ہوتا ہے، اور "بطن" کا اطلاق 'قبیلہ' سے کم افراد کی جماعت پر ہوتا ہے۔ اور وہ لفظ "الفخذ" جو 'ران' کے معنی میں آتا ہے ''خاء'' کے سکون اور کسرہ دونوں کے ساتھ جائز ہے۔

قوله: فبينا هم كذلك اذ ...... و كل مسلم:

فبينا: میم کے بغیر "هم" مبتدا ہے، اور اس کی خبر "كذالك" ہے، اور "نا" مضاف الیہ کے عوض میں آیا ہے، اور اس کا عامل'' اذ بعث الله'' ہے، اور 'اذ'' مفاجاۃ کیلئے ہے، اور عبارت کا مطلب یہ ہے کہ جن اوقات میں لوگ عیش و عشرت اور وسعت کی زندگی گزار رہے ہونگے، اسی اثناء میں اچانک اللہ تعالیٰ ان پر ایسی ہوا بھیج دے گا۔

آباط: ہمزہ ممدودہ کے ساتھ' ابطٌ کی جمع ہے۔

فتقبض: فاعل کی ضمیر کا مرجع'' ریحًا'' ہے۔'' ریح'' کی طرف فعل کا اسناد مجازی ہے۔

و كل مسلم: امام نوویؒ فرماتے ہیں: اسی طرح تمام نسخوں میں حرف عطف ''واؤ'' کے ساتھ وارد ہوا ہے، یعنی ظاہر یہ

ہے کہ کلمہ شک ''او'' ہوتا، کیونکہ اہل سنت والجماعت میں سے ارباب حق کے نزدیک مؤمن اور مسلم میں کوئی فرق نہیں ہے۔ لہٰذا مختلف اوصاف کے اعتبار سے تعمیم اور تغایر مقصود ہے۔ جیسا کہ قرآن مجید میں ہے: ﴿ تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ وَقُرْاٰنٍ مُّبِيْنٍ ﴾ [الحجر:١] ''دو آیتیں ہیں کامل کتاب اور قرآن واضح کی'' اور دوسری جگہ ارشاد گرامی ہے: [اِنَّ الْمُسْلِمِيْنَ وَالْمُسْلِمٰتِ وَالْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ] [الاحزاب:٣٥] ''بے شک اسلام کے کام کرنے والے مرد اور اسلام کے کام کرنے والی عورتیں اور ایمان لانے والے مرد اور ایمان لانے والی عورتیں'' یا دونوں (مسلمان اور مؤمن) کے درمیان لغوی فرق کی بناء پر ''واؤ'' کو ذکر کیا کیونکہ لغت میں مؤمن تصدیق کرنے والے کو اور مسلمان پیروی کرنے والے کو کہتے ہیں۔ لیکن چونکہ دونوں اوصاف ایک دوسرے کے بغیر مفید نہیں ہیں۔ اسلئے ایک ہی موصوف کیلئے دونوں صفات ذکر کر دی گئیں، اور برابر درجے میں ایک ہی موصوف پر دونوں صفات کا اطلاق کیا یا اس وجہ سے ''واؤ'' دونوں کے درمیان ذکر کیا کہ نفس الامر میں ایک صفت دوسری پر غالب ہے۔ واللہ اعلم

علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں تکرار سے یہاں استیعاب مقصود ہے یعنی وہ ہوا تمام بہتر لوگوں کی روحوں کو قبض کرے گی۔

قولہ: ویبقی شرار الناس...... فعلیهم تقوم الساعة۔ شِرار شین کے کسرہ کے ساتھ شَرّ کی جمع ہے۔

فیها: ضمیر مجرور کا مرجع ''تلك الازمنة'' یا ''الارض'' ہے۔

تهارج الحمر: ای کاخطلاط الحمر، یعنی جانوروں کا باہم جفتی کرنا۔ بعض حضرات فرماتے ہیں کہ آپس میں لڑیں گے، کیونکہ ''هرج'' کا اصل معنی قتل کرنا، گھوڑے کے دوڑ کی تیزی اور هرج، حدیث میں بمعنی اختلاط۔ امام نوویؒ فرماتے ہیں: مطلب یہ ہے کہ مرد، عورتوں کے ساتھ لوگوں کے سامنے علانیہ طور پر جماع کریں گے، جیسا کہ گدھے کرتے ہیں۔

الهرج: راء کے سکون کے ساتھ بمعنی جماع۔ چنانچہ هرج زوجته بمعنی جامعها۔ اس کے مضارع کی ''راء'' مفتوح، مضموم اور مکسور تینوں طرح جائز ہے۔

صرف انہی لوگوں پر قیامت قائم ہوگی کسی اور پر نہیں، اور عنقریب حدیث آئیگی:

''لا تقوم الساعة الا علی شرار الناس'' قیامت بدترین لوگوں ہی پر آئے گی۔''

اور ایک اور روایت میں ہے:

''لا تقوم الساعة حتی لا یقال فی الارض الله الله''. ''قیامت قائم نہ ہوگی حتی کہ زمین پر اللہ اللہ کرنے والا بھی نہ رہے گا۔''

قولہ: رواہ مسلم......:

هی: اس کا مرجع روایة ہے، اور ایک اور نسخہ میں هو (مذکر کی ضمیر) ہے اور هو کا مرجع ''الخبر'' ہے۔

٥٤٧٦ : وَعَنْ اَبِیْ سَعِیْدِنِ الْخُدْرِیِّ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ یَخْرُجُ الدَّجَّالُ فَیَتَوَجَّهُ قِبَلَهٗ رَجُلٌ مِّنَ الْمُؤْمِنِیْنَ فَیَلْقَاهُ الْمَسَالِحُ مَسَالِحُ الدَّجَّالِ فَیَقُوْلُوْنَ لَهٗ اَیْنَ تَعْمِدُ فَیَقُوْلُ

اَعْمِدُ اِلٰی هٰذَا الَّذِیْ خَرَجَ قَالَ فَیَقُوْلُوْنَ لَهٗ اَوَمَا تُؤْمِنُ بِرَبِّنَا فَیَقُوْلُ مَا بِرَبِّنَا خَفَاءٌ فَیَقُوْلُوْنَ اقْتُلُوْهُ فَیَقُوْلُ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ اَلَیْسَ قَدْ نَهٰکُمْ رَبُّکُمْ اَنْ تَقْتُلُوْا اَحَدًا دُوْنَهٗ فَیَنْطَلِقُوْنَ بِهٖ اِلَی الدَّجَّالِ فَاِذَا رَاٰهُ الْمُؤْمِنُ قَالَ یَا اَیُّهَا النَّاسُ هٰذَا الدَّجَّالُ الَّذِیْ ذَکَرَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قَالَ فَیَاْمُرُ الدَّجَّالُ بِهٖ فَیُشَجُّ فَیَقُوْلُ خُذُوْهُ وَشُجُّوْهُ فَیُوْسَعُ ظَهْرُهٗ وَبَطْنُهٗ ضَرْبًا قَالَ فَیَقُوْلُ اَوَمَا تُؤْمِنُ بِیْ قَالَ فَیَقُوْلُ اَنْتَ الْمَسِیْحُ الْکَذَّابُ قَالَ فَیُؤْمَرُ بِهٖ فَیُؤْشَرُ بِالْمِیْشَارِ مِنْ مَّفْرِقِهٖ حَتّٰی یُفَرَّقَ بَیْنَ رِجْلَیْهِ قَالَ ثُمَّ یَمْشِی الدَّجَّالُ بَیْنَ الْقِطْعَتَیْنِ ثُمَّ یَقُوْلُ لَهٗ قُمْ فَیَسْتَوِیْ قَائِمًا ثُمَّ یَقُوْلُ لَهٗ اَتُؤْمِنُ بِیْ فَیَقُوْلُ مَا ازْدَدْتُّ فِیْكَ اِلَّا بَصِیْرَةً قَالَ ثُمَّ یَقُوْلُ یَا اَیُّهَا النَّاسُ اِنَّهٗ لَا یَفْعَلُ بَعْدِیْ بِاَحَدٍ مِنَ النَّاسِ قَالَ فَیَاْخُذُهُ الدَّجَّالُ لِیَذْبَحَهٗ فَیُجْعَلُ مَا بَیْنَ رَقَبَتِهٖ اِلٰی تَرْقُوَتِهٖ نُحَاسًا فَلَا یَسْتَطِیْعُ اِلَیْهِ سَبِیْلًا قَالَ فَیَاْخُذُ بِیَدَیْهِ وَرِجْلَیْهِ فَیَقْذِفُ بِهٖ فَیَحْسِبُ النَّاسُ اِنَّمَا قَذَفَهٗ اِلَی النَّارِ وَاِنَّمَا اُلْقِیَ فِی الْجَنَّةِ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ هٰذَا اَعْظَمُ النَّاسِ شَهَادَةً عِنْدَ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ. (رواہ مسلم)

اخرجه مسلم فی صحیحه ۲۲۵۶/۴ حدیث رقم (۱۱۳-۲۹۳۸)

ترجمہ: ''حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: '' (جس وقت) تو صاحب ایمان لوگوں میں سے ایک مؤمن (اس کا شر رفع کرنے کے لئے) اس کی جانب روانہ ہوگا (راستہ میں) اس شخص کو کچھ مسلح لوگ ملیں گے جو دجال کے محافظ ہوں گے' یہ لوگ اس مسلمان سے پوچھیں گے کہ تم کہاں جانے کا ارادہ رکھتے ہو؟ وہ مسلمان جواب دے گا کہ میں اس شخص کی جانب جانے کا ارادہ رکھتا ہوں جو وہاں (فتنہ وفساد پھیلانے کے لئے) ظاہر ہوا ہے یعنی دجال! آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا (یہ سن کر) دجال کے محافظ اس سے کہیں گے کہ تم ہمارے رب (دجال) کو نہیں مانتے؟ وہ شخص جواب دے گا کہ ہمارے پروردگار کی صفات کسی سے مخفی نہیں ہیں دجال کے آدمی (یہ سن کر آپس میں یہ چہ مگوئیاں کریں گے کہ اس کو قتل کر دو (کیونکہ یہ ہمارے پروردگار کو نہیں مانتا) لیکن بعض لوگ آپس ہی میں پھر یہ کہیں گے کہ کیا تمہیں تمہارے رب دجال نے اس بات سے روکا نہیں کہ تم نے اس کے حکم کے بغیر کسی کو قتل نہیں کرتا آخر کار وہ لوگ اس مسلمان شخص کو دجال کے پاس لے جائیں گے اور وہ جب دجال کو دیکھ لے گا تو (ان کی نشانیوں سے پہچان کر) یہ اعلان کرے گا کہ لوگو! جان لو' یہ وہی دجال ہے جس کا ذکر رسول اللہ ﷺ نے (اپنی احادیث کے ذریعہ) فرمایا تھا آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا: دجال اس شخص کی بات سنتے ہی مشتعل ہو جائے اور اس کو چت لٹانے کا حکم دے گا (اور بعض حضرات نے یہ مراد لیا ہے کہ زمین پر پیٹ کے بل یعنی الٹا لٹانے کا حکم دے گا جیسا کہ مجرم کو سزا مارنے کے لئے اوندھا لٹا دیا جاتا ہے) چنانچہ اس شخص کو چت لٹا دیا جائے گا پھر دجال ازراہ تاکید وتشدید) کہے گا کہ اس کو پکڑ و اور اس کو توڑ ڈالو چنانچہ اس شخص کی پیٹ پر اس قدر ضربیں لگائی جائیں گی اور مارا جائے گا کہ اس کی پیٹھ اور پیٹ پلپلا ہو جائے گا اور پھیل جائے گا

آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا: اس کے بعد دجال پوچھے گا کہ کیا تو اب بھی مجھ پر ایمان نہیں لاتے ہو؟ وہ شخص جواب دے گا کہ (ہرگز نہیں) تو قول وعمل میں جھوٹا مسیح (دجال) ہے پھر (دجال کی طرف سے اس شخص کو چیرنے اور ٹکڑے ٹکڑے کر دینے) کا حکم دیا جائے گا اور (اس حکم کے مطابق) اس کو آرے سے سر کی طرف سے چیرا جائے گا یہاں تک کہ اس کی دونوں ٹانگوں کے درمیان سے آپ کے دو ٹکڑے کر دیئے جائیں گے آنحضرت ﷺ نے فرمایا: دجال (اپنے کارنامہ پر فخر کرتے ہوئے' ان دونوں ٹکڑوں کے درمیان ٹہلتا پھرے گا اور پھر کہے گا کہ کھڑا ہو جا' وہ مسلمان شخص (زندہ ہو کر) بالکل صحیح سلامت کھڑا ہو جائے گا تب دجال پوچھے گا کہ اب تو مجھ پر ایمان لے آئے گا؟ وہ شخص جواب دے گا کہ (ہرگز نہیں) اب تو تمہارے بارے میں میرا یقین وبصیرت اور بڑھ چکا ہے (یعنی تو نے جس طرح مجھے پہلے تو قتل کیا اور پھر دوبارہ زندہ کر دیا اس سے مجھے کامل یقین ہو گیا ہے تو جھوٹا دجال ہی ہے) آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا: اس کے بعد وہ مسلمان شخص (وہاں موجود لوگوں کو مخاطب کر کے) کہے گا کہ لوگو! (آگاہ رہو) اس دجال نے جو کچھ میرے ساتھ کیا ہے (یعنی پہلے قتل کرنا اور پھر دوبارہ زندہ کر دینا) اب کسی دوسرے آدمی کے ساتھ ایسا نہیں کر سکے گا"۔ حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا: پھر دجال اس شخص کو ذبح کرنے کی خاطر پکڑے گا چاہے گا مگر ہنسلی کی ہڈی اور اس کی گردن کے درمیانی حصہ کو تانبے کا بنا دیا جائے گا (یعنی اس کی پوری گردن تانبے کی طرح سخت اور ٹھوس ہو جائے گی تا کہ اس پر تلوار وغیرہ اثر انداز ہی نہ ہو سکے' شرح السنۃ میں معمر کا یہ قول ہے کہ مجھ تک جو روایت پہنچی ہے اس میں یہ الفاظ ہیں کہ اس شخص کی گردن پر تانبے کا تختہ رکھ دیا جائے گا) جس کی وجہ سے وہ اس کو مار نہیں کر سکے گا' اس کے بعد جھنجھلا کر) اس شخص کو دونوں بازوؤں اور ٹانگوں سے پکڑ کر اس کو اٹھائے گا اور (اپنی آگ میں) پھینک دے گا' لوگ تو یہی سمجھیں گے کہ اس کو آگ میں پھینکا گیا ہے حالانکہ درحقیقت وہ جنت میں پھینکا گیا ہوگا (یہ بیان کرنے کے بعد) رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: یہ شخص رب العالمین کے نزدیک شہادت کے اعتبار سے بہت بڑے درجہ کا پر فائز ہوگا"۔ (مسلم)

تشریح: قوله:يخرج الدجال...... فيلقاه المسالح مسالح الدجال:

قبله: قاف کے کسرہ اور باء کے فتحہ کے ساتھ بمعنی جانبه۔

رجل: تنوین تعظیم کیلئے ہے اور عبارت کی تقدیر" رجل عظیم" ہے۔

ابو اسحاق ابراہیم بن سفیان الفقیہ صحیح مسلم کے راوی فرماتے ہیں کہا جاتا ہے، یہ شخص خضر علیہ السلام تھے اور اسی طرح معمر فرماتے ہیں اور اس کا تقاضا یہ ہے کہ خضر علیہ السلام زندہ ہیں، اور علماء کا اس میں اختلاف ہے چنانچہ جمہور فقہاء، محدثین اور بعض صوفیاء اور دوسرے حضرات کا مذہب یہ ہے کہ خضر علیہ السلام وفات پا چکے ہیں، اور جمہور صوفیا اور بعض فقہا کہ تو فرماتے ہیں، کہ حضر علیہ السلام زندہ ہیں۔ امام نوویؒ فرماتے ہیں یہی صحیح ہے شیخ جزریؒ نے اس بات کو ذکر کیا ہے۔

المسالح: میم کے ضمہ اور "لام" کے کسرہ کے ساتھ" المسلحة" کی جمع ہے، اور" المسالح" سے مراد سرحدوں کے مسلح محافظ۔ "مسالح الدجال" المسالح سے بدل ہونے کی بناء پر مرفوع ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ "المسالح" میں

الف لام مضاف الیہ کے عوض ہے، یا الف لام عہد کیلئے ہے۔

قاضی عیاضؒ فرماتے ہیں شاید اس سے مراد دجال کے لشکر کا اگلا حصہ ہے اور" مسالح" کا اصل معنیٰ "اسلحہ کی جگہ" ہے۔ پھر اس لفظ کو" "سرحد" کے معنی میں استعمال کیا جانے لگا پھر مورچوں میں بیٹھنے والے فوجیوں کیلئے یہ لفظ استعمال کیا جانے لگا، پھر لشکر کے اگلے حصہ کیلئے استعمال کیا جانے لگا، چونکہ لشکر کے اگلے حصے کی حیثیت پچھلے حصہ کیلئے وہی ہے جو حیثیت سرحدی محافظین کی دیگر عوام (یعنی غیر سرحدی محافظین) کے لئے ہے۔

قولہ: فیقولون له این تعمد؟ فیقول...... ما بربنا خفاء:

تعمد: (میم کے کسرہ کے ساتھ' بمعنی خروج عن الحق (حق سے بغاوت اختیار کی ہے) یا خرج بمعنی خروج علی الخلق (مخلوق کے خلاف بغاوت اختیار کی ہے۔) یا مطلب یہ ہے کہ باطل دعویٰ کے ساتھ ظاہر ہوا ہے اور اشارہ تحقیر کیلئے ہے۔

ما بربنا: "ربّ" سے ان کی مراد دجال ہے، کیونکہ یہ لوگ دجال کے پاس جاہ ومال دیکھیں گے۔ عبارت کی تقدیر یا "ما بربی وربنا" ہے چنانچہ اس میں تغلیب ہے یا تقدیر "ما بربنا معشر المؤمنين" ہے۔

خفاء: "ما" نافیہ ہے، یعنی ہمارے ربّ کی صفات کسی سے پوشیدہ نہیں ہیں ہم اپنے ربّ کو چھوڑ کر کسی اور کی طرف متوجہ ہوں یا اپنے ربّ پر اعتماد چھوڑ دیں۔ شاعر کہتا ہے:

ففی کل شیئ له شاهد
یدل علی انه واحد

(ہر چیز میں دلیل موجود ہے جو دلالت کرتی ہے کہ ربّ ایک ہے)۔

اور اللہ تعالیٰ کے علاوہ ہر ایک پر حادث ہونے کے آثار بالکل نمایاں ہیں، اور انواع نقصان واضح ہیں اور سب سے قوی وقطعی دلیل یہ ہے کہ مخلوقیت مخلوق ہونا)، رب ہونے کے منافی ہے اور بندہ ہونا ربّ ہونے کے منافی ہے' اور کہاں مٹی کا بنا ہوا اور کہاں ربّ الارباب اور کیسے اس طرح ممکن ہے جبکہ مٹی سے بنے ہوئے ہیں

اور اس (ارشاد نبوی) میں گذشتہ ایک حدیث نبوی کی طرف اشارہ ہے، جس میں ارشاد فرمایا: "ان الله لا یخفی علیکم ان الله لیس باعور". علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں: کہ اس مؤمن شخص کا یہ کہنا "ما بربنا خفاءٌ". اُن لوگوں کی تکذیب ہوگی اور اُن لوں کے مکر وفریب کا بیان ہوگا۔

قولہ: فیقولون اقتلوه فیقول...... انت المسیح الکن اب:

ان تقتلوا: "من" محذوف ہے، اور عبارت کی تقدیر "من قتلکم" ہے۔

احد دونه: مضاف محذوف ہے اور عبارت کی تقدیر یہ ہے: "دون علمه یا دون امره یا دون اذنه.

یعنی جب وہ صاحب یقینی مؤمن دجال کو دیکھے گا، اور اس کی علامات پہچان لے گا، تو لوگوں کی یاد دہانی کیلئے اور فتنہ کی

وضاحت کے لئے کہے گا۔

قولہ: فیأمر الدجال به فیشبح..... انت المسیح الکواب: مضاف محذوف ہے اور "به" کی تقدیر "بضربه" ہے۔

یشبح: بائے موحدہ کے فتحہ اور تشدید کے ساتھ

فیقبل: یعنی دجال تاکید کے ساتھ انتہائی غصہ میں آ کر یہ کہے گا۔

شجو: شین کے ضمہ اور جیم کی تشدید کے ساتھ۔ بمعنی "اکسروا راسه": ایک نسخہ میں" فشبحو "شین کے فتحہ" باء" کے کسرہ "حاء" کے ساتھ ہے بمعنی مدوہ علی بطنه (اُس کو پیٹ کے بل گھسیٹیں گے) یا بمعنی مدوہ علی قفاه (اُس کو گدی کے بل گھسیٹیں گے)۔ تشج الحرباء علی العود بمعنی امتد، اور تشبیح الشئ کسی چیز کو چوڑا کر دینا۔

فیوسع: واؤ ساکن اور سین مفتوح ہے۔

اُس کی پیٹھ اور پیٹ کو بہت زیادہ مارا جائے گا۔

أماتو من بی؟: ایک اور نسخہ میں "او ما تؤمن بی؟ کے الفاظ ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ" کیا تم میری اُلوہیت کا انکار کرتے ہو اور مجھ پر اور میری ربوبیت پر ایمان نہیں لاتے؟"۔

انت المسیح: الکذاب: اس سے یہ اشارہ ہے کہ" وہ جھوٹا مسیح ہوگا جس کو سچا مسیح قتل کرے گا"۔

قولہ: قال فیؤمر ابه فیؤشر بالمنشار...... حتی یفرق بین رجلیه:

یؤشر: "یاء" کے ضمہ اس کے بعد ہمزہ اور شین کے فتحہ کے ساتھ۔ ہمزہ کو واؤ سے بدل دینا بھی جائز ہے) ٹکڑے ٹکڑے کر دیا جائے گا۔

المشار: میم مکسور ہے اس بعد ہمزہ ساکنہ ہے اور ہمزہ کو یاء سے بدلنا بھی درست ہے اور بعض نسخوں میں میم کے بعد نون ساکن ہے) کا معنی وہ آلہ جس سے کسی چیز کو کاٹا جاتا ہے۔

مفرقة: اس کی میم مفتوح ہے اور راء کو فتحہ اور کسرہ دونوں کے ساتھ پڑھنا جائز ہے، اور" مفرقة" کا معنی ہے سر کے درمیان کی وہ جگہ جہاں مانگ نکالی جاتی ہے۔

حتی یفرق: مجہول کا صیغہ ہے، راء کی تخفیف اور تشدید دونوں جائز ہیں۔

بین رجله: یعنی ٹانگوں کی دونوں جانبوں کے درمیان تک۔

امام نوویؒ فرماتے ہیں: یشبح، شین اور شین کے بعد" باء" اور" باء" کے بعد حاء کے ساتھ منقول ہے، اور اسی طرح شبحوہ بمعنی "مدوہ علی بطنه". اور شجوہ (جیم کے ساتھ) شج سے ماخوذ ہے۔ اور" شج" سر کے زخم کے معنی میں آتا ہے۔ یہ روایت ہمارے نزدیک راجح ہے، اور یؤشر کو ہمزہ کے ساتھ روایت کیا گیا ہے، اور" المئشار" میں میم کے بعد

ہمزہ ہے اور یہ افصح ہے۔

ان دونوں (یوشر اور المنشار) میں ہمزہ کی اس طرح تخفیف بھی جائز ہے کہ "یؤشر" میں واؤ سے بدل دیا جائے اور "المنشار" میں "یاء" سے بدل دیا جائے۔ اور "المنشار" نون کے ساتھ بھی جائز ہے۔ اسی لئے "نشرت الخشبة" "(میں نے لکڑی کو چیر دیا) کہا جاتا ہے، اور "مفرقة" (راء کے کسرہ کے ساتھ) سر کے وسط کے معنی میں آتا ہے۔ انتہی

علامہ جزریؒ فرماتے ہیں: اس روایت کو تین طرح سے نقل کیا گیا ہے:

پہلی صورت: یشج: کو "شین، باء، اور حاء کے ساتھ نقل کیا جائے، اور "شجوه" کو جیم کے ساتھ نقل کیا جائے، جو "الشج" بمعنی سر اور چہرے کا زخم سے ماخوذ ہے۔

دوسری صورت یہ ہے کہ یشبح (مضارع) اور شبحوه (ماضی) دونوں "شین، باء، اور حاء" کے ساتھ نقل کیے جائیں۔

تیسری صورت یہ ہے کہ "یشج" اور "شجوه" دونوں جیم کے ساتھ منقول ہوں۔

اس تیسری صورت کو مؤلفؒ نے ذکر کیا ہے، دوسری صورت کو حمیدی نے ذکر کیا ہے اور اس دوسری صورت کو قاضی عیاضؒ نے صحیح قرار دیا ہے، اور ملا علی قاریؒ فرماتے ہیں کہ ہمارے اصحاب کی ایک جماعت کے ہاں راجح روایت کی پہلی صورت ہے۔ واللہ اعلم

شارحؒ فرماتے ہیں کہ "شرت الخشبة بالمیشار" کا معنی ہے "میں نے لکڑی کو آری سے چیر دیا" اور حدیث میں صرف "یاء" کے ساتھ وارد ہوا ہے۔ اور اس کی دلیل "فیوشر" ہے۔

ملا علی قاریؒ فرماتے ہیں کہ اس میں کچھ بحث ہے اس لئے کہ "فیوشر" میں تو اس بات کا بھی احتمال ہے کہ ہمزہ کے ساتھ ہو اور ہمزہ واؤ سے بدل گئی ہو، اور یہ بھی احتمال ہے کہ واؤ اصلیہ ہو۔ اسی طرح "المیشار" میں "یاء" بھی درست ہے، اور ہمزہ بھی پھر "یاء" میں یہ بھی ممکن ہے کہ ہمزہ "یاء" سے بدل گیا ہو اور یہ بھی ممکن ہے کہ واؤ "یاء" سے بدل گئی ہو اور یہ اس بات کے منافی نہیں ہے کہ یہ کلمہ میم کے بعد ہمزہ کے ساتھ ہو یا عبارت میں تفنن کی بنیاد پر "المنشار" (نون کے ساتھ) ہو جبکہ عوام کی زبان پر بھی لغت کے اعتبار سے یہی (نون کے ساتھ) مشہور ہے۔

قاموس میں لکھا ہے: "أشر الخشبة بالمیشار" کا معنی ہے "شقه" (چیرنا) اور "نشر الخشب" بمعنی "نحته" (چھیلنا، تراشنا) اور "وشر" (بغیر ہمزہ کے) الخشب بالمیشار أشر الخشب بالمُشار میں ایک لغت ہے، اس سے معلوم ہوا کہ اصل ہمزہ ہے اور واؤ یعنی "وشر" کا معنی چیرنا اور نون یعنی "نشر" کا معنی صرف چھیلنا اور تراشنا ہے۔

قوله: ثم یمشی الدجال...... بأحدمن الناس:

"القطعتین" سے اس شخص کے بدن کے دو ٹکڑے مراد ہیں، اور دجال کا اُن دو ٹکڑوں کے درمیان سے گزرنا۔ اس بات کو ظاہر کرنے کیلئے ہوگا کہ یہ شخص حقیقۃً قتل ہو چکا ہے۔

ما ازددت: دال کے فتحہ کے ساتھ ہے۔ شارحؒ فرماتے ہیں، کہ پہلی دال مکسور ہے اور فعل مجہول کا صیغہ ہے۔ ملا علی قاریؒ

فرماتے ہیں، اس کی صحت اس بات پر موقوف ہے کہ مفعولین کی طرف متعدی ہو۔ قاموس سے بظاہر معلوم ہو رہا ہے، کہ یہ فعل لازم ہے اس لئے کہ فرمایا: "زاده الله خيراً فزاد وازداد". اور اس بات کی طرف اشارہ کیا کہ "زاد" لازم اور متعدی دونوں طرح استعمال ہوتا ہے، اور "ازداد"، صرف لازم ہے، متعدی نہیں کیونکہ ازداد کو فعل مطاوع استعمال کیا گیا ہے، البتہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد: ﴿لِيَزْدَادُوْا اِيْمَانًا مَّعَ اِيْمَانِهِمْ﴾ [الفتح:٤] تا کہ ان کے پہلے ایمان کے ساتھ ان کا ایمان اور زیادہ ہو" اس بات پر صراحۃً دلالت کرتا ہے کہ "ازداد" مفعول واحد کی طرف متعدی ہے، اور "زاد" لازم بھی ہے، اور متعدی بھی پھر متعدی ہونے کی صورت میں ایک مفعول کی طرف بھی متعدی ہے، اور دو مفعولوں کی طرف بھی جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿فَزَادَهُمْ اِيْمَانًا﴾ [آل عمران:١٧٣] "تو اس نے ان کے ایمان کو اور زیادہ کر دیا" بعض کا کہنا ہے کہ "ایمانًا" تمیز ہونے کی بناء پر منصوب ہے۔ حاصل معنی "ما زدت ہے:

فيك: (مضاف محذوف ہے۔) ای "في معرفتك" ہے، مطلب یہ کہ تیرے اس قتل کرنے اور پھر زندہ کرنے کی وجہ سے تیری پہچان' میں صرف اس بات کے یقین کی زیادتی ہی حاصل ہوئی ہے کہ تم جھوٹے اور فریبی ہو۔

ايها الناس انه: یہ ضمیر ضمیر شان ہے' یا یہ ضمیر "الدجال" کی طرف لوٹ رہی ہے۔

لا يفعل: اس کا مفعول محذوف ہے ای: "لا يفعل ما فعل بى من القتل والاحياء فى الظاهر" (یعنی میرے ساتھ جو کچھ بظاہر کیا یعنی قتل کیا پھر زندہ کیا، یہ کام کسی اور کے ساتھ نہیں کر سکے گا)۔

بعدى: ای "بعد فعله بى' (میرے ساتھ ایسا کرنے کے بعد)۔

باحدٍ من الناس: اس میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ دجال کو جو قدرت اللہ کی طرف سے دی گئی ہوگی وہ سلب کر لی جائے گی، اور اس کے خوف کے بارے میں لوگوں کو تسلی مل جائے گی۔

قوله: فيأخذه الدجال ليذ بحه...... وانما القى فى الجنة:

يجعل: "یاء" مضموم ہے، اور ایک نسخہ میں 'یاء' مفتوح ہے۔ ای فيجعل الله.

ترقوة: تاء کے فتحہ، راء کے سکون، قاف کے ضمہ اور واؤ کے فتحہ کے ساتھ: العظم الذى بين ثغرة النحرو العاتق، ہنسلی کی ہڈی (مجازاً گلا مراد لیتے ہیں)۔

اليه: (مضاف محذوف ہے) "الى وصل قتله" ہے اور اس کو نقصان پہنچانے پر قادر نہیں ہوگا۔

سبيلاً: تمیز ہے، اور مراد تعرض کا راستہ ہے۔

يحسب: سین پر کسرہ اور فتحہ دونوں جائز ہیں۔

انما قذفه: یہ مصدر کی تاویل میں ہے ای "فيحسب الناس قذفه اليها". اور زیادہ واضح وہ بات ہے جو زمخشری نے ذکر کی ہے کہ "انما "ہمزہ کے فتحہ کے ساتھ' حصر کا فائدہ بھی دیتا ہے جیسا کہ دونوں بھی ("انما"، ہمزہ کے کسرہ کے ساتھ او "انما" ہمزہ کے فتحہ کے ساتھ) قرآن کی اس آیت میں جمع ہیں: ﴿قُلْ اِنَّمَا يُوْحٰى اِلَيَّ اَنَّمَا اِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ﴾

[الانبیاء:۱۰۸] اور اس بات کی تائید ''وانما القی'' سے ہو رہی ہے۔

القی: مجہول کا صیغہ ہے۔

فی الجنة: لام عہد کیلئے ہے۔ یعنی وہ در حقیقت دنیا کے باغات میں سے کسی ایک باغ میں ڈالا گیا ہوگا اور یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ دجال اُس شخص کو اپنی آگ میں پھینک دے گا، لیکن اللہ تعالیٰ اُسی آگ کو اُس شخص کیلئے باغیچہ بنا دے گا۔ جیسا کہ حضرت ابراہیمؑ کیلئے نمرود کی آگ کو ٹھنڈا کیا اور سلامتی کا باعث بنا دیا، چنانچہ اس شخص کیلئے بھی وہ آگ باغ بن جائے گی۔ بہر حال گذشتہ قتل کے علاوہ دجال کے ہاتھوں دوبارہ کوئی موت واقع نہ ہوگی۔

قوله: هذا اعظم الناس شهادة عند رب العالمين:

حدیث کے اس جملے میں ''شہادت'' سے مراد وہی پہلی موت ہے۔ یہ بات اچھی طرح ذہن نشین فرمالیجئے کیونکہ اس مقام پر بہت سے لوگ مطلب بیان کرنے میں پھسل گئے ہیں، جیسا کہ علامہ طیبیؒ سے بھی خطا ہوئی ہے، چنانچہ وہ فرماتے ہیں: ''لوگ تو یہی خیال کریں گے کہ دجال نے اس شخص کو آگ میں پھینک دیا ہے لیکن درحقیقت وہ جنت میں پھینکا گیا ہوگا، اور وہ دار البقاء ہے۔ اس کی دلیل اگلا جملہ ''هذا اعظم الناس شهادة'' ہے۔ اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد اسی کے مانند ہے: ﴿لا تحسبن الذين قتلوا في سبيل الله امواتا بل احياءٌ عند ربهم يرزقون فرحين﴾ [آل عمران۔۱۶۹] ''اور (اے مخاطب) جو لوگ اللہ کی راہ میں قتل کئے گئے ان کو مرے مت خیال کرو بلکہ وہ لوگ زندہ ہیں اپنے پروردگار کے قریب ہیں انکو رزق بھی ملتا ہے وہ خوش ہیں'' ای يسرحون في ثمار الجنة

میں (ملا علی قاریؒ) کہتا ہوں: یہ تو: ''انه لا يفعل بعدي باحد من الناس'' کے معارض ہے بتکلّف اس کا جواب یہ ہو سکتا ہے کہ اس جملے میں ''بعدی'' سے ''بعد قتلي ثانيا'' مراد ہے یعنی دجال مجھے دوبارہ قتل کرنے کے بعد کسی دوسرے آدمی کے ساتھ ایسا نہیں کر سکے گا۔ واللہ اعلم۔ اور ابو سعیدؓ کی اگلی حدیث سے ہماری اس توجیہ کی تائید ہو رہی ہے۔

۵۴۷۷ : وَعَنْ اُمِّ شَرِيْكٍ قَالَتْ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَيَفِرَّنَّ النَّاسُ مِنَ الدَّجَّالِ حَتّٰى يَلْحَقُوْا بِالْجِبَالِ قَالَتْ اُمُّ شَرِيْكٍ قُلْتُ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ فَاَيْنَ الْعَرَبُ يَوْمَئِذٍ قَالَ هُمْ قَلِيْلٌ.

(رواه مسلم)

اخرجه مسلم في صحيحه ۲۲۶۶/٤حديث رقم (۱۲۵-۲۹٤۵) والترمذي في السنن ٦۸۱/٥حديث رقم ٤٦٦۲/٦

ترجمه: ''حضرت اُم شریک رضی اللہ عنہا نے بیان فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: لوگ دجال (فتنہ اور اس کے فریب و دجل کے خطرہ) سے بھاگ کر پہاڑوں میں جا چھپیں گے''۔ اُم شریک نے بیان فرمایا کہ میں نے (یہ سن کر) عرض کیا یا رسول اللہ ان ایام میں اھل عرب کہاں ہوں گے؟ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: (اس وقت) اھل عرب بہت قلیل تعداد میں ہوں گے اور دجال سے جہاد و مقابلہ کرنے کی استطاعت نہیں رکھیں گے''۔ (مسلم)

تشریح: قوله:وعن ام شريك......حتی يلحقوا بالجبال:

شريك: شین کے فتحہ اور راء کے کسرہ کے ساتھ انصاریہ یا قرشیہ ہیں۔

''الناس'': اس سے مؤمنین مراد ہیں۔

علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں:'' فاين'' میں ''فاء'' شرط محذوف کی جزاء ہونے کی وجہ سے مذکور ہے۔ای:''اذا كان هذا حال الناس فأين المجاهدون في سبيل الله''(یعنی جب لوگوں کا حال یہ ہوگا، تو اُس وقت اللہ کی راہ میں جہاد کرنے والے، اسلام کے قلعہ کو دشمن سے بچانے والے اور مسلمانوں کی طرف سے دشمن کے حملہ کا دفاع کرنے والے عرب اُس وقت کہاں ہونگے۔)'' العرب''اللہ کی راہ میں مقابلہ کرنے والوں سے کنایہ ہے۔

تخریج: ترمذی نے بھی اس حدیث کو اسی طرح نقل کیا ہے۔(ذکرہ السید) جامع کے الفاظ یہ ہیں:

''ليفرن الناس من الدجال في الجبال''

''وہ لوگ دجال کی وجہ سے بھاگ کر پہاڑوں میں جا چھپیں گے''۔

اس روایت کو ان الفاظ کے ساتھ امام احمد، امام مسلم اور امام ترمذیؒ نے نقل کیا ہے۔

۵۴۷۸ : وَعَنْ اَنَسٍ عَنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ يَتْبَعُ الدَّجَّالَ مِنْ يَّهُوْدِ اِصْفَهَانِ سَبْعُوْنَ اَلْفًا عَلَيْهِمُ الطَّيَالَسَةُ۔

اخرجه مسلم في صحيحه ۲۲۶۶/۴ حديث رقم (۱۲۴-۲۹۲۴) وابن ماجه في السنن ۱۳۵۹/۲ حديث رقم ۴۰۷۷۔

ترجمہ: ''حضرت انس پیغمبر خدا ﷺ سے روایت نقل فرماتے ہیں کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: اصفہان کے ستّر ہزار یہودی دجال کے تابعدار بنیں گے جن کے سروں پر طیلسائیں (سیاہ چادریں) ہوں گی''۔(مسلم)

تشریح: قوله:يتبع الدجال من يهود.......:

يتبع:''یاء''مفتوح،''تاء'' ساکن اور''باء''مفتوح ہے۔شارحؒ فرماتے ہیں:یہ'' الاتباع''مصدر سے مشتق ہے۔

اصفهان:ہمزہ کے فتحہ وکسرہ دونوں کے ساتھ درست ہے اور صاد کے بعد''فاء'' ہے۔فارس کا معروف شہر ہے۔

امام نوویؒ فرماتے ہیں: اس کلمہ میں ہمزہ کا کسرہ اور فتحہ دونوں جائز ہیں، اور صاد کے بعد''فاء'' اور''باء'' دونوں جائز ہیں۔اھ

مشکوٰۃ کے تمام نسخوں میں فاء کے ساتھ ہے'اور المشارق میں ہمزہ کے فتحہ کے ساتھ منقول ہے، اور ابوعبید العکبر ی نے ہمزہ کے کسرہ کے ساتھ مقید کیا ہے، اور اہل خراسان فاء کے ساتھ بولتے ہیں۔

قاموس میں لکھا ہے کہ صحیح یہ ہے کہ یہ کلمہ عجمی ہے اور کبھی اس کے ہمزہ کو مکسور پڑھا جاتا ہے، اور کبھی اس کی فاء کو باء سے تبدیل کیا جاتا ہے۔

مُغنی میں لکھا ہے کہ اس کا ہمزہ مکسور اور مفتوح پڑھنا دونوں طرح درست ہے اور اہل مشرق میں کو فائے مفتوح کے ساتھ اور اہل مغرب میں باء کے ساتھ ہے، انتہیٰ۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اصفہان دو ہیں، اور اس طرح یہ تحقیق ابن الملکؒ کی نقل کردہ تحقیق کے مطابق ہو جائے گی، کہ اس سے خراسان کا اصفہان مراد ہے، مغرب کا اصفہان مراد نہیں ہے لیکن ان کی یہ بات کہ ''خراسان کا اصفہان مراد ہے'' مسامحت سے خالی نہیں ہے کیونکہ اصفہان تو عراق میں ہے لیکن چونکہ خراسان بھی مشرق کی جانب واقع ہے اور عراق سے زیادہ مشہور ہے' تو اس ادنیٰ درجے کے تعلق کی وجہ سے اصفہان کی نسبت خراسان کی طرف کی گئی ہے۔

سبعون الفًا: اور ایک روایت میں ''تسعون'' ہے لیکن صحیح اور مشہور پہلی روایت ہی ہے۔ (ذکرہ ابن الملکؒ)

طيالسة: طاء کے فتحہ اور لام کے کسرہ کے ساتھ ''طیلسان'' کی جمع ہے جو ایک معروف لباس ہے۔

قاموس میں لکھا ہے ''الطيلس'' اور ''الطيلسان'' میں ''لام'' کو مفتوح، مکسور اور مضموم تینوں طرح پڑھنا درست ہے۔

قاضی عیاضؒ وغیرہ سے منقول ہے کہ یہ کلمہ عجمی ہے اس کو عربی زبان میں داخل کیا گیا ہے اصل میں اس کو ''تالِسان'' کہا جاتا ہے، جس کی جمع ''طيالسة'' ہے، اور جمع میں ھاء عجمی ہونے کی وجہ سے ہے۔

اس حدیث سے علماء نے یہ استدلال کیا ہے کہ یہ لباس پہننا مذموم ہے اس حدیث کو علامہ سیوطیؒ نے ایک رسالہ میں ذکر کیا ہے جس کا نام انہوں نے ''طی اللسان عن الطیلسان'' رکھا ہے۔

۵۴۷۹ : وَعَنْ اَبِیْ سَعِيْدِنِ الْخُدْرِيِّ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَأْتِي الدَّجَّالُ وَهُوَ مُحَرَّمٌ عَلَيْهِ اَنْ يَّدْخُلَ نِقَابَ الْمَدِيْنَةِ فَيَنْزِلُ بَعْضَ السِّبَاخِ الَّتِيْ تَلِي الْمَدِيْنَةَ فَيَخْرُجُ اِلَيْهِ رَجُلٌ وَهُوَ خَيْرُ النَّاسِ اَوْ مِنْ خِيَارِ النَّاسِ فَيَقُوْلُ اَشْهَدُ اَنَّكَ الدَّجَّالُ الَّذِيْ حَدَّثَنَا رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ حَدِيْثَهٗ فَيَقُوْلُ الدَّجَّالُ اَرَاَيْتُمْ اِنْ قَتَلْتُ هٰذَا ثُمَّ اَحْيَيْتُهٗ هَلْ تَشُكُّوْنَ فِي الْاَمْرِ فَيَقُوْلُوْنَ لَا فَيَقْتُلُهٗ ثُمَّ يُحْيِيْهِ فَيَقُوْلُ وَاللّٰهِ مَا كُنْتُ فِيْكَ اَشَدَّ بَصِيْرَةً مِنِّي الْيَوْمَ فَيُرِيْدُ الدَّجَّالُ اَنْ يَقْتُلَهٗ فَلَا يُسَلَّطُ عَلَيْهِ. (متفق علیه)

اخرجه البخاری فی صحیحه ۱۰۱/۱۳ حدیث رقم ۷۱۳۲ والترمذی ۴۴۶/۴ حدیث رقم ۲۲۴۲ واحمد فی المسند ۳۲/۵۔

ترجمہ: ''حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا کہ پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''دجال (جب دنیا میں) آئے گا یعنی ظاہر ہوگا (تو مدینہ طیبہ میں بھی داخل ہونے کی غرض سے اس کی جانب روانہ ہوگا تا کہ اس شہر مقدس میں اپنے فتنہ کی لپیٹ میں ان کو لیلے) لیکن مدینہ کے راستوں میں اس کا داخل ہونا ممنوع ہو جائے گا (یعنی اللہ تعالیٰ اس کو محفوظ و مامون رکھیں اور دجال اس میں داخل ہونے پر قدرت نہیں پائے گا) آخروہ مدینہ کے قریبی کسی کھاری زمین میں پڑاؤ ڈالے گا پھر اس کے پاس ایک ایسا آدمی آئے گا (جو اس زمانہ کے) لوگوں میں سے

بہترین ہوگا وہ شخص (دجال کے سامنے) کہے گا کہ میں گواہی دیتا ہوں کہ تو وہی دجال ہے جس کی خبر ہمیں اللہ کے پیغمبر (محمد ﷺ) نے اس کے احوال و علامات بیان کرنے کے ذریعہ دی ہے۔ دجال (یہ سن کر اپنے اردگرد کے لوگوں سے) کہے گا کہ تمہارا کیا خیال ہے اگر میں اس شخص کو قتل کر دوں پھر اس کو زندہ بھی کردوں تو کیا پھر بھی تم میرے (خدا ہونے) کے بارے میں تردد میں پڑو گے وہ لوگ جواب دیں گے کہ ہم کو پھر کوئی شک وشبہ نہیں رہے گا! پس دجال اس شخص کو جان سے قتل کر دے گا اور پھر اس کو زندہ کر دے گا (اور وہی سوال کرے گا جو گزشتہ حدیث میں گزرا) تب وہ آدمی جواب دے گا کہ بخدا اب تو تم سے متعلقہ میری بصیرت اور میرا الیقین اور زیادہ پختہ ہوگیا (یعنی پہلے تو صرف علم وخبر کی بنیاد پر میں تجھ کو دجال قرار دیتا تھا مگر اب اس تجربہ و دلیل کی بنیاد پر کہ تو نے مجھے پہلے جان سے مارا اور پھر زندہ کر دیا میرے اس یقین میں اور زیادہ اضافہ ہوگیا کہ تو جھوٹا دجال ہی ہے اور تیرا خدائی دعویٰ سراسر باطل ہے دجال چاہے گا کہ اس شخص کو قتل کر دے مگر وہ اس پر قادر نہیں ہوگا''۔ (بخاری ومسلم)

تشریح: قولہ: یاتی الدجال...... التی تلی المدینۃ:

وھو محرمٌ علیہ: یہ جملہ حالیہ ہے۔

امام نوویؒ نے تصریح کی ہے، کہ'' نقاب '' کا نون مکسور ہے، یہ'' نقب ''۔نون کے فتحہ کے ساتھ۔کی جمع ہے، جس کا معنی ہے پہاڑوں کے درمیان کا راستہ اور''أنقاب'' جمع قلت ہے۔(کذا فی النھایہ)

السباخ: سین کے کسرہ کے ساتھ شور زمین جس میں پودے اُگانے کی صلاحیت نہ ہو۔

اور آگے آئے گا کہ وہ اُحد کے پڑاؤ ڈالے گا۔

قولہ: فیخرج الیہ رجل ...... حدثنا رسول اللہ ﷺ حدیثہ:

''رجل'': اس میں تنوین تعظیم کیلئے ہے ای''رجل عظیم''

وھو خیر الناس: یعنی اُس وقت کے لوگوں میں سب سے بہتر ہوگا۔ یا مطلقاً لوگوں میں سے بہترین شخص ہوگا، اور اس بات کا بھی احتمال ہے کہ نبی کریمؐ کو تردد ہوا ہو اور'' أوْ ''تخییر کیلئے ہو اور یہ بھی احتمال ہے کہ'' أو'' راوی نے ذکر کیا ہو، اس صورت میں یہ''شک'' کیلئے ہوگا اور یہ بات پہلے گزر چکی ہے کہ اصح قول کے مطابق اس سے حضرت خضر علیہ السلام مراد ہیں۔

بظاہر''حدیثہ'' کی بجائے''حدیثك'' کہنا چاہئے تھا اس لئے علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں کہ'' حدیثہ'' میں ضمیر ذکر کرنے میں اسم ظاہر''الدجال'' کی رعایت کی گئی ہے۔ کیونکہ اسم ظاہر غائب کے حکم میں ہے اور ضمیر مخاطب کی رعایت نہیں کی گئی۔ اس کے برعکس (حضرت علیؓ کا) یہ قول ہے:''انا الذی سمتنی اُمی حیدرۃ''.

قولہ: فیقول الدجال أریتم ان قتلت ......:

فیقولون لا : ای لا نشك. اس جواب میں اس بات کا بھی احتمال ہے کہ یہ نفی اثبات امر کی طرف متوجہ ہو اور اس بات کا بھی احتمال ہے کہ نفی امر کی طرف متوجہ ہو۔

امام نوویؒ فرماتے ہیں کہ "ان قتلت هذا ثم احييته اتشكون في الأمر؟ فيقولون: لا" میں اشکال ہے کیونکہ دجال جو کچھ ظاہر کرے گا اس میں اس کی ربوبیت پر کوئی دلالت نہیں ہے کیونکہ اس کی ذات میں نقص تو واضح ہے اور دجال کا حادث ہونا اور اس کے جھوٹا ہونے کے مختلف دوسرے دلائل نمایاں ہیں، اسی طرح اس کی آنکھوں کے درمیان کفر کا لکھا ہوا ہونا، اس کے باطل ہونے کی واضح دلیل ہے، لیکن اس کا یہ جواب دیا جا سکتا ہے کہ ممکن ہے کہ وہ لوگ دجال کی بات کا یہ جواب اس کے خوف سے دیں بطور تصدیق نہ دیں۔

اور یہ بھی احتمال ہے کہ اس کا مطلب یہ ہو، کہ ہمیں تیرے کفر اور جھوٹا ہونے میں کوئی شک نہیں کیونکہ جس نے اس کے کفر اور جھوٹا ہونے میں شک کیا اس نے کفر کیا اور اس کے خوف سے یہ توریہ کر کے اس کو دھوکہ دیں گے، اور یہ بھی احتمال ہے کہ جو "لا نشك" کہہ کر جواب دیں گے یہ یہود اور دوسرے وہ لوگ ہوں گے جن کی مقدر میں بدبختی لکھی ہوئی ہے۔

مني: "اشد" کے متعلق ہے۔ اور "اليوم": "اشد" کے لئے مفعول فیہ ہونے کی بناء پر منصوب ہے۔

يسلط: لام مشدد کے فتحہ کے ساتھ ہے۔

دجال کے عاجز ہونے میں ایک صریح دلیل ہے کہ شروع میں دجال کی قدرت عارضی تھی اور اللہ تعالیٰ نے دجال کو بطور ڈھیل اور دوسرے لوگوں کیلئے بطور امتحان عطاء کی تھی، پھر اس سے یہ قدررت سلب کر لی گئی۔ جیسا کہ اس سے روح نکال لی جائے گی اور زمین پر پڑا ہوا ایک مردار کا بدن رہ جائے گا۔ جس سے کتے گوشت نوچیں گے اور کسی صاحب عقل وفہم نے کیا ہی اچھی بات کی ہے کہ کہاں مٹی کا بنا ہوا بندہ اور کہاں رب الارباب، (یعنی مٹی سے بنا ہوا بندہ رب کیسے ہو سکتا ہے۔)

کلاباذیؒ فرماتے ہیں کہ یہ حدیث اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ دجال کے پاس ایسی کوئی طاقت نہیں کہ جو کچھ وہ چاہے گا کر گزرے گا، بلکہ دجال جب کوئی حرکت کرے گا، تو اللہ تعالیٰ جو چاہے گا وہ کرے گا۔ اور دجال کی یہ ظاہری قدرت صرف انسانوں کی آزمائش کیلئے ہوگی تاکہ جو گمراہ ہو وہ اس پر حجت تام ہو جائے، اور جو جیئے سو (یعنی ہدایت پائے) دلیل سے ہے (ہدایت پائے)۔ اور اللہ جسے چاہتا ہے گمراہ کر دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے ہدایت دے دیتا ہے۔

۵۴۸۰ : وَعَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ عَنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ يَاْتِي الْمَسِيْحُ مِنْ قِبَلِ الْمَشْرِقِ هِمَّتُهُ الْمَدِيْنَةُ حَتّٰى يَنْزِلَ دُبُرَ اُحُدٍ ثُمَّ تَصْرِفُ الْمَلٰئِكَةُ وَجْهَهُ قِبَلَ الشَّامِ وَهُنَالِكَ يَهْلِكُ. (متفق عليه)

اخرجه مسلم في صحيحه ٢/١٠٠٥ حديث رقم (٤٨٦-١٣٨٠) والترمذي في السنن ٤/٤٤٦ حديث رقم ٢٢٤٣ ـ

ترجمہ: "حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ پیغمبر خدا ﷺ سے نقل کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: مسیح دجال مدینہ منورہ میں داخل ہونے کا ارادہ لے کر مشرق کی جانب سے آئے گا یہاں تک کہ وہ اُحد پہاڑ کے پیچھے (جو مدینہ منورہ سے تین میل کے فاصلہ پر ہے) آ کر پڑاؤ ڈالے گا پھر (مذکورہ شخص کے واقعہ کے بعد) فرشتے اس کا رخ شام کی جانب پھیر ڈالیں گے تاکہ جہاں سے آیا ہے وہیں چلا جائے) اور وہ دجال وہاں (یعنی شام میں) قتل کر دیا

جائے گا۔ حضرت عیسیٰ دجال کو شام کے ایک علاقہ باب لُد میں قتل کریں گے''۔ (بخاری و مسلم)

تشریح: قوله: یاتی المسیح من قبل المشرق ......: قبل: قاف کے کسرہ اور باء کے فتحہ کے ساتھ بمعنی جهة۔

دبر: دال اور باء کے ضمہ کے ساتھ۔

''تصرف قبل الشام'': یہ بھی دجال کے بطلان کی دلیل اور اس کے عجز و نقصان کی نشانی ہے کیونکہ اُلٹے پاؤں پیچھے چلا جائے گا، اور اس شہر میں داخل ہونے کی قدرت نہیں ہوگی جس میں سید الکونین ﷺ کی قبر ہے اور ظاہر ہے کہ مکہ مکرمہ میں تو نہ ابتداءً داخل ہو سکے گا اور نہ انتہاءً داخل ہو سکے گا۔

۵۴۸۱ : وَعَنْ اَبِیْ بَکْرَةَ عَنِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ لَا یَدْخُلُ الْمَدِیْنَةَ رُعْبُ الْمَسِیْحِ الدَّجَّالِ لَھَا یَوْمَئِذٍ سَبْعَةُ اَبْوَابٍ عَلٰی کُلِّ بَابٍ مَلَکَانِ ۔ (رواه البخاری)

اخرجه البخاری فی صحیحه ۹۵/٤ حدیث رقم ۱۸۷۹

ترجمہ: ''حضرت ابوبکرہ رضی اللہ عنہ نبی اکرم ﷺ سے نقل فرماتے ہیں کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: مدینہ میں مسیح دجال کا رعب (یعنی اس خوف) داخل نہ ہو سکے گا اس دن مدینہ کے سات دروازے ہوں گے اور ہر دروازے پر دو فرشتے مامور ہوں گے جو (دجال کے) مدینہ میں داخلہ سے مانع ہوں گے''۔ (بخاری)

تشریح: قوله: عنابی بکرة عن النبی قال لایدخل المدینة ......: بکرة: ''تاء'' کے ساتھ ہے۔

رعب: راء کے ضمہ اور عین کے سکون کے ساتھ اور دونوں پر ضمہ بھی جائز ہے۔ بمعنی خوف۔

باب سے مطلق راستہ مراد ہے یا اس وقت کے قلعہ کا دروازہ مراد ہے۔

علامہ سیوطیؒ فرماتے ہیں، کہ لوگوں میں جو یہ مشہور ہے کہ حضور علیہ السلام کے اس دنیا سے رخصت ہونے کے بعد حضرت جبرئیل علیہ السلام کا زمین پر آنا موقوف ہو گیا ہے۔ تو یہ بات بے اصل ہے اس غلط خیال کی تردید کیلئے وہ روایت دلیل ہے جس کو طبرانی نے نقل کیا ہے: ان جبریل یحضر موت کل مؤمن یکون علی طهارة۔

''حضرت جبرئیل علیہ السلام ہر اس مؤمن کی موت کے وقت آتے ہیں، جو طہارت کی حالت میں ہو''۔

ایک اور حدیث ابونعیم نے ''الفتن'' میں نقل کی ہے کہ حضور علیہ السلام نے ارشاد فرمایا:

یمر الدجال بالمدینة فاذا هو بخلق عظیم فقال: من أنت؟ قال أنا جبریل بعثنی لامنع حرم رسوله۔

''جب دجال مدینہ منورہ کے پاس سے گزرے گا تو اس وقت اچانک اس کی ملاقات ایک عظیم ہستی سے ہوگی دجال پوچھے گا، تم کون ہو؟ وہ مبارک ہستی جواب دے گی میں جبرئیل ہوں، مجھے اللہ تعالیٰ نے حضور علیہ السلام کے حرم کی حفاظت کیلئے بھیجا ہے۔'' (انتہی)۔

اس جملہ (حضور علیہ السلام کے حرم کی حفاظت کیلئے بھیجا ہے) کا مفہوم مخالف (مکہ مکرمہ کے حرم کی حفاظت نہیں کروں گا)

معتبر نہیں ہے، کیونکہ یہ اکتفاء کے باب سے ہے۔

اور یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ حضور علیہ السلام کے حرم کی حفاظت تو حضرت جبرئیل علیہ السلام کے حوالے کر دی گئی ہو لیکن مکہ مکرمہ کے حرم کی حفاظت اللہ تعالیٰ بذاتِ خود کرے، جیسا کہ سورۃ الفیل میں اس کی طرف اشارہ ہے۔ اور عنقریب تمیم داریؓ کی روایت آ رہی ہے جس میں ہے:

فلأدع قرية الاهبطتها في أربعين ليلة غير مكه وطيبة محر متان علي كلتا هما۔

''دجال کہے گا، میں چالیس دن کے اندر اندر ہر ہر بستی میں جاؤں گا سوائے مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ کے، کہ یہ دونوں شہر مجھ پر حرام ہیں۔''

اور اس پر حضور علیہ السلام نے اس پر تقریر ثبت فرمائی ثابت ہے، (یعنی حضور نے اسکی تردید نہیں فرمائی) امام احمدؒ نے ابو سعیدؓ سے ایک مرفوع حدیث نقل کی ہے:

الدجال لا يولد لہ و لا يدخل المدينة و لا مكة۔

''دجال کی اولاد نہ ہوگی اور نہ مدینہ منورہ میں داخل ہوگا اور نہ مکہ مکرمہ میں۔''

۵۴۸۲ : وَعَنْ فَاطِمَةَ بِنْتِ قَيْسٍ قَالَتْ سَمِعْتُ مُنَادِیَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يُنَادِیْ الصَّلٰوةُ جَامِعَةٌ فَخَرَجْتُ اِلَى الْمَسْجِدِ فَصَلَّيْتُ مَعَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَلَمَّا قَضٰى صَلَاتَهٗ جَلَسَ عَلَى الْمِنْبَرِ وَهُوَ يَضْحَكُ فَقَالَ لِيَلْزَمْ كُلُّ اِنْسَانٍ مُصَلَّاهُ ثُمَّ قَالَ هَلْ تَدْرُوْنَ لِمَ جَمَعْتُكُمْ قَالُوْا اَللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ اَعْلَمُ قَالَ اِنِّیْ وَاللّٰهِ مَا جَمَعْتُكُمْ لِرَغْبَةٍ وَّلَا لِرَهْبَةٍ وَلٰكِنْ جَمَعْتُكُمْ لِاَنَّ تَمِيْمًا الدَّارِیَّ كَانَ رَجُلًا نَصْرَانِيًّا فَجَآءَ وَاَسْلَمَ وَحَدَّثَنِیْ حَدِيْثًا وَّافَقَ الَّذِیْ كُنْتُ اُحَدِّثُكُمْ بِهٖ عَنِ الْمَسِيْحِ الدَّجَّالِ حَدَّثَنِیْ اَنَّهٗ رَكِبَ فِیْ سَفِيْنَةٍ بَحْرِيَّةٍ مَعَ ثَلٰثِيْنَ رَجُلًا مِّنْ لَخْمٍ وَجُذَامٍ فَلَعِبَ بِهِمُ الْمَوْجُ شَهْرًا فِی الْبَحْرِ فَاَرْفَاُوْا اِلٰى جَزِيْرَةٍ حِيْنَ تَغْرُبُ الشَّمْسُ فَجَلَسُوْا فِیْ اَقْرُبِ السَّفِيْنَةِ فَدَخَلُوا الْجَزِيْرَةَ فَلَقِيَتْهُمْ دَآبَّةٌ اَهْلَبُ كَثِيْرُ الشَّعْرِ لَا يَدْرُوْنَ مَا قُبُلُهٗ مِنْ دُبُرِهٖ مِنْ كَثْرَةِ الشَّعْرِ قَالُوْا وَيْلَكِ مَا اَنْتِ قَالَتْ اَنَا الْجَسَّاسَةُ قَالُوْا وَمَا الْجَسَّاسَةُ قَالَتْ اَيُّهَا الْقَوْمُ اِنْطَلِقُوْا اِلٰى هٰذَا الرَّجُلِ فِی الدَّيْرِ فَاِنَّهٗ اِلٰى خَبَرِكُمْ بِالْاَشْوَاقِ قَالَ لَمَّا سَمَّتْ لَنَا رَجُلًا فَرِقْنَا مِنْهَا اَنْ تَكُوْنَ شَيْطَانَةً قَالَ فَانْطَلَقْنَا سِرَاعًا حَتّٰى دَخَلْنَا الدَّيْرَ فَاِذَا فِيْهِ اَعْظَمُ اِنْسَانٍ مَا رَاَيْنَاهُ قَطُّ خَلْقًا وَاَشَدُّهٗ وَثَاقًا مَجْمُوْعَةٌ يَدَاهُ اِلٰى عُنُقِهٖ مَا بَيْنَ رُكْبَتَيْهِ اِلٰى كَعْبَيْهِ بِالْحَدِيْدِ قُلْنَا وَيْلَكَ مَا اَنْتَ قَالَ قَدْ قَدَرْتُمْ عَلٰى خَبَرِیْ فَاَخْبِرُوْنِیْ مَا اَنْتُمْ قَالُوْا نَحْنُ اُنَاسٌ مِّنَ الْعَرَبِ رَكِبْنَا فِیْ سَفِيْنَةٍ بَحْرِيَّةٍ فَلَعِبَ بِنَا الْبَحْرُ شَهْرًا فَدَخَلْنَا الْجَزِيْرَةَ فَلَقِيَتْنَا دَآبَّةٌ اَهْلَبُ فَقَالَتْ اَنَا الْجَسَّاسَةُ اِعْمِدُوْا اِلٰى هٰذَا فِی الدَّيْرِ

فَاَقْبَلْنَا اِلَيْكَ سِرَاعًا وَفَزِعْنَا مِنْهَا وَلَمْ نَاْمَنْ اَنْ تَكُوْنَ شَيْطَانَةً فَقَالَ اَخْبِرُوْنِىْ عَنْ نَخْلِ بَيْسَانَ قُلْنَا عَنْ اَيِّ شَانِهَا تَسْتَخْبِرُ قَالَ اَسْئَلُكُمْ عَنْ نَخْلِهَا هَلْ تُثْمِرُ قُلْنَا نَعَمْ قَالَ اَمَا اِنَّهَا تُوْشِكُ اَنْ لَّا تُثْمِرَ قَالَ اَخْبِرُوْنِىْ عَنْ بُحَيْرَةِ الطَّبَرِيَّةِ قُلْنَا عَنْ اَيِّ شَانِهَا تَسْتَخْبِرُ ؟ قَالَ هَلْ فِيْهَا مَآءٌ قُلْنَا هِىَ كَثِيْرَةُ الْمَآءِ قَالَ اَمَا اِنَّ مَآئَهَا يُوْشِكُ اَنْ يَّذْهَبَ قَالَ اَخْبِرُوْنِىْ عَنْ عَيْنِ زُغَرَ قُلْنَا عَنْ اَيِّ شَانِهَا تَسْتَخْبِرُ؟ قَالَ هَلْ فِى الْعَيْنِ مَآءٌ وَهَلْ يَزْرَعُ اَهْلُهَا بِمَآءِ الْعَيْنِ قُلْنَا نَعَمْ هِىَ كَثِيْرَةُ الْمَآءِ وَاَهْلُهَا يَزْرَعُوْنَ مِنْ مَآئِهَا قَالَ اَخْبِرُوْنِىْ عَنْ نَبِيِّ الْاُمِّيِّيْنَ مَا فَعَلَ قُلْنَا قَدْ خَرَجَ مِنْ مَكَّةَ وَنَزَلَ يَثْرِبَ قَالَ اَقَاتَلَهُ الْعَرَبُ قُلْنَا نَعَمْ قَالَ كَيْفَ صَنَعَ بِهِمْ فَاَخْبَرْنَاهُ اَنَّهُ قَدْ ظَهَرَ عَلٰى مَنْ يَّلِيْهِ مِنَ الْعَرَبِ وَاَطَاعُوْهُ قَالَ اَمَا اِنَّ ذٰلِكَ خَيْرٌ لَّهُمْ اَنْ يُّطِيْعُوْهُ وَاِنِّىْ مُخْبِرُكُمْ عَنِّىْ اِنِّىْ اَنَا الْمَسِيْحُ الدَّجَّالُ وَاِنِّىْ يُوْشِكُ اَنْ يُّؤْذَنَ لِىْ فِى الْخُرُوْجِ فَاَخْرُجَ فَاَسِيْرَ فِى الْاَرْضِ فَلَا اَدَعُ قَرْيَةً اِلَّا هَبَطْتُّهَا فِىْ اَرْبَعِيْنَ لَيْلَةً غَيْرَ مَكَّةَ وَطَيْبَةَ هُمَا مُحَرَّمَتَانِ عَلَىَّ كِلْتَاهُمَا كُلَّمَا اَرَدْتُّ اَنْ اَدْخُلَ وَاحِدًا مِنْهُمَا اِسْتَقْبَلَنِىْ مَلَكٌ بِيَدِهِ السَّيْفُ صَلْتًا يَصُدُّنِىْ عَنْهَا وَاِنَّ عَلٰى كُلِّ نَقْبٍ مِّنْهَا مَلٰئِكَةً يَّحْرُسُوْنَهَا قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَطَعَنَ بِمِخْصَرَتِهٖ فِى الْمِنْبَرِ هٰذِهٖ طَيْبَةُ هٰذِهٖ طَيْبَةُ هٰذِهٖ طَيْبَةٌ يَعْنِى الْمَدِيْنَةَ اَلَا هَلْ كُنْتُ حَدَّثْتُكُمْ فَقَالَ النَّاسُ نَعَمْ اِلَّا اَنَّهٗ فِىْ بَحْرِ الشَّامِ اَوْ بَحْرِ الْيَمَنِ لَا بَلْ مِنْ قِبَلِ الْمَشْرِقِ مَا هُوَ وَاَوْمَا بِيَدِهٖ اِلَى الْمَشْرِقِ . (رواه مسلم)

اخرجه مسلم فی صحیحه ۲۲٦۱/٤حدیث رقم (۱۱۹-۲۹٤۲) وابو داوٗد فی السنن ٥۰۰/٤حدیث رقم ٤۳۲٦ والترمذی ٥۲/٤ ٤حدیث رقم ۲۲٥۳

ترجمہ: ''حضرت فاطمہ بنت قیس رضی اللہ عنہا نے بیان فرمایا کہ (ایک روز) میں نے رسول اللہ ﷺ کے موذن کی کا یہ اعلان ''نماز جمع کرنے والی ہے'' سن کر مسجد کی طرف گئی اور پھر میں نے رسول اللہ ﷺ کے ہمراہ نماز ادا کی۔ جب رسول اللہ ﷺ اپنی نماز سے فارغ ہو چکے تو منبر پر تشریف فرما ہوئے چاہیے کہ ہر شخص اپنے نماز پڑھنے کی جگہ پر ہی قائم رہے اس وقت حسب عادت آپ ﷺ کے ہونٹوں پر مسکراہٹ دکھائی دے رہی تھی' آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ چاہیے کہ ہر شخص اپنے نماز پڑھنے کی جگہ پر ہی قائم رہے یعنی کوئی شخص مسجد سے نکل کر ابھی جائے نہیں سب لوگ اپنی اپنی جگہ بیٹھے رہیں' پھر آپ نے پوچھا کہ کیا تم لوگ اس بات کا علم رکھتے ہو میں نے تمہیں کیوں جمع کیا ہے؟ صحابہ نے عرض کیا کہ اللہ اور اس کا رسول ہی بخوبی واقف ہیں! آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''خدا کی قسم میں نے تمہیں نہ تو کسی قابل رغبت چیز کی خاطر جمع کیا اور نہ کسی خوف وخطرہ کے لائق چیز کی خاطر یعنی تمہیں یہاں پر ٹھہرانے سے مقصد نہ تو تمہیں کوئی چیز دینا ہے اور نہ کسی دشمن وغیرہ سے ڈرانا ہے بلکہ میں نے تمہیں اس لئے جمع کیا ہے کہ تمیم داری' جو ایک نصرانی (عیسائی) آدمی تھا' ~~آیا~~ نے اسلام قبول کر لیا اور اس نے مجھ کو مسیح دجال کے متعلق ایسا واقعہ

بتلایا جوان بیانات سے موافقت رکھتا ہے جو میں تم سے بیان کرتا ہوں۔ (چنانچہ میں نے مناسب سمجھا کہ تمیم داری کا وہ بیان کردہ قصہ تم سے بھی بیان کردوں تا کہ دجال کے بارے میں تمہارا یقین اور زیادہ پختہ ہو جائے اور میری بتائی ہوئی باتیں مشاہدہ کے قریب ہو جائیں تو سنو) مجھ سے تمیم داری نے بیان کیا کہ وہ ایک (مرتبہ) قبیلہ لخم وجذام کے تیس افراد کے ہمراہ ایک بحری کشتی میں سوار ہو کر روانہ ہوئے تو پانی کی موج ایک ماہ تک کشتی سمندر میں ان سواروں کو لے کر پھرتی رہی (یعنی کشتی سمندر کی ایک ایسی موج میں گھر گئی جو مسلسل ایک ماہ تک اس کو اِدھر اُدھر لئے پھری اور اس نے سواروں کو منزل مقصود تک نہ پہنچنے دیا) یہاں تک کہ اس موج نے کشتی کو (ایک روز) غروب آفتاب کے وقت ایک جزیرہ کے قریب پہنچا دیا اور سارے سوار ان چھوٹی کشتیوں میں جو کہ بڑی کشتی کے ہمراہ تھیں بیٹھ کر اس جزیرہ میں داخل ہوئے' وہاں ان سے ایک چوپائے کا سامنا ہو گیا جو بہت بالوں والا تھا اور بالوں ہی کے وافر ہونے کی وجہ سے لوگوں کو اس کے اگلے اور پچھلے حصہ پر آگاہی نہیں ہو رہی تھی یعنی اس چوپایہ کے جسم پر اتنے زیادہ بال تھے کہ پورا جسم چھپ کر رہ گیا تھا اور لوگ نہیں پہچان سکتے تھے کہ اس کا اگلا حصہ کون سا ہے اور پچھلا کون سا) لوگوں نے (اس کو دیکھ کر فرط حیرت سے) کہا کہ تیری تباہی ہو' تو کون ہے اور کیا ہے؟ یعنی آخر تیری اصل و ماہیت کیا ہے تو کوئی جن ہے یا انسان ہے؟ اس چوپایہ نے جواب دیا کہ میں جاسوس ہوں تم لوگ میرے ساتھ اس شخص کے پاس چلو جو دیر میں ہے کیونکہ اسے تمہارے متعلق خبریں سننے کا بہت اشتیاق ہے۔ تمیم داریؓ نے بیان کیا کہ جب اس چوپایہ نے ہم سے ایک آدمی کا تذکرہ کیا (اور ہمیں اس کے پاس چلنے کو کہا) تو ہمیں بڑا ڈر لگا کہ وہ شخص کہیں بشکل انسان شیطان نہ ہو' بہرحال ہم تیزی کے ساتھ چل پڑے اور جب گرجے میں پہنچ گئے تو کیا دیکھتے ہیں کہ وہاں ایک بڑی جسامت والا اور نہایت خوفناک آدمی موجود ہے' اس جیسی جسامت اور ایسی سخت بندشوں میں بندھا آدمی ہم نے اس سے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا' اس طرح بندھا ہوا تھا کہ اس کے ہاتھ گردن تک اور گھٹنوں کے درمیان سے ٹخنوں تک لوہے کی زنجیروں سے بندھے ہوئے تھے ہم نے (اس کو دیکھ کر فرط حیرت سے) کہا کہ تیری تباہی ہو' تو کون ہے اور کیا ہے؟ اس نے جواب میں کہا ہے کہ جب تم میری خبر پر تو قادر ہو چکے ہو اور معلوم کر چکے ہو (اور یہاں تک پہنچنے میں کامیاب ہو گئے تو اب میں تم سے اپنے بارے میں کچھ نہیں پوشیدہ نہیں رکھوں گا بلکہ سب کچھ تم سے بیان کردوں گا لیکن پہلے) مجھے اپنے بارے میں آگاہ کرو (اور جو کچھ تم سے پوچھوں اس کا جواب دو) کہ تم کون ہو (اور کہاں سے آئے ہو؟) ہمارے لوگوں نے اسے تعارف کروایا کہ ہم اہل عرب ہیں بحری کشتی میں سوار ہوئے تھے اور اپنی منزل مقصود کی جانب روانہ تھے) کہ سمندری طوفان نے ایک ماہ تک ہمارے ساتھ کھیل کیا (یعنی ہمیں گھیرے رکھا اور اب لا کر یہاں جزیرہ میں ڈال دیا) ہم اس جزیرہ میں داخل ہوئے' یہاں ہمیں ایک کثیر بالوں والا چوپایہ ملا اور اس نے بتلایا کہ میں جاسوس ہوں تم لوگ اس آدمی کے پاس چلے جاؤ جو خانقاہ میں موجود ہے چنانچہ ہم بڑی تیزی کے ساتھ تیرے پاس آ پہنچے اس نے کہا کہ اچھا مجھے یہ آگاہ کرو کہ بیسان میں کھجوروں کے جو درخت ہیں وہ پھل آور ہیں نہیں؟ ہم نے کہا کہ ہاں پھل آور ہیں! اس نے کہا کہ جان لو جلد ہی وہ زمانہ آنے والا ہے جب بیسان کے کھجور کے درخت پھل آور نہ رہیں گے (گویا اس نے اس طرف اشارہ کیا کہ قیامت جلد ہی آنے والی ہے) اس نے کہا کہ

اب مجھے بحیرۂ طبریہ کے بارے میں آگاہ کرو کہ آیا اس میں پانی ہے یا نہیں؟ ہم نے کہا کہ اس میں تو وافر پانی ہے اس نے کہا سن لو! بلاشبہ عنقریب اس کا پانی ختم ہو جائے گا پھر اس نے پوچھا کہ مجھے آگاہ کرو کہ زغر کے چشمہ میں پانی ہے یا نہیں اور وہاں کے لوگ اس چشمہ کے پانی سے کاشتکاری کرتے ہیں یا نہیں؟ ہم نے کہا کہ ہاں اس چشمہ میں وافر پانی ہے اور وہاں کے لوگ اسی پانی کے ذریعہ زراعت کرتے ہیں اس کے بعد اس نے کہا کہ اب مجھے اُمیوں یعنی اہل عرب کے نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) کے بارے میں بتاؤ اس نے کیا کیا؟ ہم نے کہا کہ انہوں نے مکہ کو چھوڑ مکہ چھوڑ کر اب مدینہ طیبہ کی جانب ہجرت فرمائی ہے اس نے پوچھا کہ کیا عرب کے لوگوں نے ان سے جنگ کی ہے؟ ہم نے کہا کہ ہاں! پھر اس نے پوچھا کہ انہوں نے اہل عرب سے کیا معاملہ کیا؟ ہم نے جواب دیا کہ وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم غلبہ حاصل کر چکے ہیں ان اہل عرب پر جو ان کے قربی ہیں اور انہوں نے ان کی اطاعت اختیار کر لی ہے اس نے کہا کہ تم یاد رکھو! ان لوگوں کا ان کی اطاعت کرنا ہی ان کے حق میں بہتر ہے اور اب میں تمہیں اپنے بارے میں باخبر کرتا ہوں۔ میں درحقیقت مسیح یعنی دجال ہوں' عنقریب ایسا وقت آ جائے گا جب مجھے ظہور پزیر ہونے کی اجازت دیدی جائے گی' اس وقت میں ظاہر ہو جاؤں گا اور چالیس دنوں تک زمین پر چلوں پھروں گا یہاں تک کوئی علاقہ ایسا نہیں چھوڑوں گا جس میں داخل نہیں ہوں گا' سوائے مکہ اور طیبہ یعنی مدینہ کے ان دونوں شہروں کے داخلہ میں مجھ پر پابندی لگا دی گئی ہے (اور اس پابندی کی صورت یہ ہوگی کہ) جب میں ان دونوں شہروں میں سے کسی شہر میں جانے کا ارادہ لے کر جاؤں گا تو ایک فرشتہ میرے مقابلہ میں آ جائے گا جس کے ہاتھ میں ننگی تلوار ہوگی وہ فرشتہ مجھ کو اس شہر میں داخل ہونے سے روک دے گا' درحقیقت ان میں سے ہر ایک شہر کے تمام راستوں پر فرشتے تعینات کر دیئے گئے ہیں جو اس شہر کی نگہبانی کرتے ہیں''۔ راوی کا بیان ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے (تمیم داری کا یہ پورا قصہ سنانے کے بعد صحابہؓ پر اپنی خوشی ظاہر کرنے کے لئے کہ دیکھو دجال کے بارے میں تمہیں جو کچھ بتایا کرتا تھا اس کی مکمل تصدیق و تائید اس واقعہ سے ہو جاتی ہے' نیز آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تمام شہروں پر مدینہ کی فضیلت و بڑائی کو ظاہر کرنے کے لئے جوش میں) اپنا عصاء مبارک منبر پر مار کر (تین مرتبہ) یہ ارشاد فرمایا کہ یہ طیبہ ہے۔ یہ طیبہ ہے یہ طیبہ ہے یعنی مدینہ (پھر فرمایا) یاد رکھو' کیا میں تمہیں اسی بات سے آگاہ نہیں کرتا تھا (جو دجال کے بارے میں اس قصہ سے عیاں ہوتی ہے؟) صحابہؓ نے عرض کیا ہاں! ہمیں اسی طرح کی بات بتایا کرتے تھے اس کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ''یاد رکھو! دجال شام کے سمندر میں ہے یا یمن کے سمندر میں' نہیں بلکہ وہ مشرق کی طرف سے نکلے گا' یہ فرما کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہاتھ سے مشرق کی طرف اشارہ فرمایا''۔ (مسلم)

تشریح: **فاطمہ بنت قیس**: یہ قریشی ہیں اور حضرت ضحاک کی بہن ہیں، شروع میں ہجرت کرنے والی عورتوں میں سے ہیں۔ ان سے بہت سارے حضرات نے روایات نقل کی ہیں۔ بڑی حسین، عقل منداور باکمال عورت تھیں۔ حضور علیہ السلام نے اپنے آزاد کردہ غلام حضرت اُسامہ بن زیدؓ سے ان کا نکاح کرا دیا تھا۔

قوله: سمعت منادي رسول الله صلى الله عليه وسلم ...... الصلوٰة جامعة:

ینادی: اس کی نحوی ترکیب وہی ہے جو قرآن کی آیت کی ہے۔﴿ سَمِعْنَا مُنَادِيًا يُّنَادِيْ لِلْاِيْمَانِ ﴾ [آل عمران: ۱۹۳]

الصلاۃ: یہ منصوب اور مرفوع دونوں طرح درست ہے اور اسی طرح جامعة (کہ اس کو بھی دونوں طرح پڑھا جا سکتا ہے۔

امام نوویؒ فرماتے ہیں کہ "الصلوٰۃ" منصوب ہے اور پہلا لفظ "جامعة" اغراء کی بناء پر منصوب ہے اور دوسرا لفظ جامعة حال ہونے کی بناء پر منصوب ہے۔

علامہ تورپشتی رحمہ اللہ فرماتے ہیں "الصلوٰۃ" مرفوع ہونے کی صورت میں تقدیر "هذه الصلوٰة جامعة" ہے اور یہ بھی جائز ہے کہ "جامعة" حال ہونے کی بناء پر منصوب ہو۔ اور چونکہ نماز کی طرف لوگوں کو بلانا مقصود ہے، اس لئے (مقصودی معنی کے اعتبار سے) نصب ہی اجود و اشبہ (زیادہ مناسب) ہے، (انتہی)۔

حاصل یہ کہ ترکیب کی تین مذکورہ بالا صورتیں ہیں، جو کہ واضح ہیں۔

اور ایک شارحؒ فرماتے ہیں کہ یہ جملہ "ینادی" کا مفعول ہے اس لئے کہ "ینادی" قول کے معنی میں ہے اور اس جملہ کی چار ترکیبیں ہیں، جیسا کہ "صلوٰة العید" کے باب میں گزرا، چنانچہ اس کی وضاحت کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

پہلی ترکیب: "الصلوٰة" اور "جامعة" دونوں کو مبتدا خبر ہونے کی بناء پر مرفوع پڑھا جائے۔

دوسری ترکیب: دونوں لفظوں کو منصوب پڑھا جائے کہ "الصلوٰة" فعل محذوف کیلئے مفعول بہ ہو اور "جامعةً" حال ہو۔ اور عبارت کی تقدیر یہ ہو: "احضروا الصلوٰة حال كونها جامعةً"

تیسری ترکیب: "الصلوٰة" مرفوع ہو، "هذه" محذوف کیلئے خبر ہونے کی بناء اور "جامعةً" منصوب ہو حال ہونے کی بناء پر۔

چوتھی ترکیب: "الصلوٰة" فعل محذوف "احضروا" کے لئے مفعول بہ ہونے کی بناء پر منصوب ہو اور "جامعةٌ" ہی مبتدا محذوف کیلئے خبر ہونے کی بناء پر مرفوع ہو، اور عبارت کی تقدیر یہ ہو: احضروا الصلوٰة وهي جامعةٌ۔

لیکن یہ چوتھی ترکیب ضعیف ہے۔ کیونکہ اس میں حرف عطف کو مقدر مانا گیا۔ بہر حال تمام صورتوں میں یہ جملہ "ینادی" کے لئے مفعول بہ ہونے کی بناء پر محل نصب میں ہے کیونکہ "ینادی"، قول کے معنی میں ہے۔

قوله: فخرجت الى المسجد فصليت مع رسول الله ﷺ: حضرت فاطمہ بنت قیسؓ کے نماز کیلئے گھر سے مسجد جانے کے بارے میں کئی احتمال ہیں:

اول: نہی وارد ہونے سے پہلے کا واقعہ ہے۔

دوم: (یہ واقعہ) رات کے وقت ہوا تھا۔

سوم: عید کی نماز پر قیاس کرتے ہوئے یہ کہا جائے گا، کہ جماعت کی نماز کیلئے عورتوں کا گھر سے نکلنا جائز تھا۔

یہ نفل نماز تھی یا پانچ وقتی فرض نمازوں میں سے کوئی نماز تھی۔

قولہ:فلما قضی صلاتہ...... احد نکم بہ عن المیسح الدجال لمیلزم: زاء مفتوح ہے۔

الداری: حضرت تمیمؓ اپنے دادا، جس کا نام دار تھا، کی طرف منسوب ہیں، اور ایک صحیح نسخے میں ''تمیم الداری'' ہے، اور پہلی روایت صحیح ہے۔ علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں: جامع الاصول اور مصابیح کے اکثر نسخوں میں اسی طرح ہے۔ حمیدی کی کتاب اور مصابیح کے بعض نسخوں میں 'تمیم الداری ''بغیر تنوین کے ہے، اور مسلم میں ہے:'' لأن تمیم الداری''.

اور یہ (تمیم داریؓ کا نبی کریم کی خدمت میں یہ واقعہ سنانا) ایسا ہی ہے جیسا کہ حدیث میں آتا ہے: ''رُبّ حامل فقهٍ الی من هو افقه منه''

اور اس سے معلوم ہوا کہ راویوں کی کثرت کو اسناد کی قوت میں دخل ہے، اسی وجہ سے بطور استشہاد فرمایا۔

قولہ:حدثنی انہ رکب فی ...... فدخلوا الجزیرۃ:

حدثنی: (نبی کریم ﷺ کا تمیم داری سے روایت کرنا) یہ ''روایت اکابر از اصاغر'' کے قبیل سے ہے۔ اور اس میں اس متکبر جاہل پر رد ہے جو چھوٹوں سے علم حاصل کرنے سے کتراتا ہے، جبکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿سَاَصْرِفُ عَنْ اٰیٰتِیَ الَّذِیْنَ یَتَکَبَّرُوْنَ فِی الْاَرْضِ بِغَیْرِ الْحَقِّ﴾ [الاعراف:۱۴۶]

میں ایسے لوگوں کو اپنے احکام سے برگشتہ ہی رکھوں گا جو دنیا میں تکبر کرتے ہیں جس کا ان کو کوئی حق حاصل نہیں'

اور حضور علیہ السلام کا ارشاد ہے: کلمة الحق ضالة المؤمن فحيث وجدها فهو احق بها۔

''حکمت کا کلمہ مؤمن کا گم شدہ مال ہے جہاں اس کو ملے، وہی اُس کا زیادہ حقدار ہے۔''

اور حضرت علیؓ کا کلام ہے: انظر ماقال ولا تنظر الی من قال

''اُس بات کو دیکھو جو کہی جارہی ہے، اُس شخص کو نہ دیکھے جو وہ بات کہہ رہا ہے۔''

قولہ:حتی انہ رکب فی سیفتۃ......مدخلوا الجزیرۃ:

'' بحریۃ'' کی قید لگا کر ''بریہ'' یعنی اونٹ سے احتراز کیا، کیونکہ اُونٹ کو 'سفینۃ البر ''(صحرائی کشتی) کہا جاتا ہے۔ اور بعض کا کہنا ہے کہ نہر کی چھوٹی کشتی سے احتراز مقصود ہے۔

لخم: لام کے مفتوح فتحہ اور خاء ساکن ہے' یہ منصرف ہے اور غیر منصرف بھی پڑھا جاتا ہے۔ ایک معروف قبیلے کا نام ہے۔

جذام: اس میں جیم مضموم ہے۔

اللعب: اصل میں بے فائدہ قول و فعل کو کہتے ہیں اور یہاں پانی کی لہروں کے کشتی کو اس کی منزل مقصود سے ہٹانے اور دائیں بائیں پھیرنے کیلئے بطورہ استعارہ استعمال کیا گیا۔

فارفأوا: دو ہمزوں کے ساتھ۔ علامہ تورپشتی رحمہ اللہ کی شرح میں لکھا ہے کہ اصمعیؒ فرماتے ہیں، ارفات السفینۃ أرفتها ارفاء اور بعض حضرات مضارع کے دوسرے ہمزہ کو یاء سے بدل کر یعنی'' ارفی ''پڑھتے ہیں، اور اسم ظرف'' مرفا'' ہے، چنانچہ

"مرفا السفن" کا معنی ہے وہ جگہ جہاں کشتیاں کھڑی کی جاتی ہیں۔

أقرب: ہمزہ کے فتحہ اور "راء" کے ضمہ کے ساتھ "قارب" راء کے کسرہ کے ساتھ کی جمع ہے، لیکن "قارب" میں راء کا فتحہ مشہور ہے اور راء کا ضمہ بھی منقول ہے اور یہ خلاف قیاس جمع ہے کیونکہ قیاس کے مطابق تو "قوارب" ہونا چاہئے تھا۔

امام نوویؒ فرماتے ہیں: "أقرب" راء کے ضمہ کے ساتھ "قارب" کی جمع ہے جس میں راء کا کسرہ اور فتحہ دونوں جائز ہیں۔

"قارِب" اُس چھوٹی کشتی کو کہتے ہیں، جو بڑی سمندری کشتی کی ساتھ رکھی رہتی ہے، اور کشتی کی سواریاں ساحل پر آنے جانے اور مختلف دوسرے کاموں کیلئے اس کو استعمال کرتی ہیں۔

نہایہ میں لکھا ہے: "أقرب" شاید "قارب" کی جمع ہے۔ "فاعل" کے وزن پر آنے والے اسم کی جمع کا "أفعل" کے وزن پر آنا معروف نہیں ہے۔ حمیدی نے اس کے انکار کی طرف اشارہ کیا ہے۔ اور علامہ خطابیؒ فرماتے ہیں کہ یہ خلاف قیاس جمع ہے۔

"الجزیرة": اس میں الف لام عہدی کیلئے ہے۔ وہاں کا موجودہ جزیرہ مراد ہے۔

قوله: فلقيتهم دابة...... فانه الى خبر كم بالا شواق:

"الهلب": اس کا معنی "بال" ہے۔ بعض کا کہنا ہے کہ سخت بال کو "الهلب" کہا جاتا ہے، اور بعض کا کہنا ہے دم کے بال گھنے ہوں تو ان کو "الهلب" کہا جاتا ہے، اور لفظ أهلب اس لئے ذکر کیا کہ "دابہ" کا اطلاق مذکر اور مونث دونوں پر ہوتا ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْأَرْضِ﴾ [الانعام: ۳۸] "اور چلنے قسم کے جاندار زمین پر چلنے والے ہیں" [کذا قالوا]

لیکن راجح یہ ہے کہ دابة، "حیوان" کی تاویل میں ہے، اسی وجہ سے "کثیر الشعر" فرمایا۔ یہ عبارت ماقبل کیلئے تفسیر اور عطف بیان ہے۔ پھر مزید وضاحت کیلئے اگلا کلام بطور جملہ مستانفہ فرمایا۔

"قبلہ": قاف اور باء اور "دُبرہ" میں دال اور باء مضموم ہیں۔

علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں کہ "ما" استفہامیہ ہے، اور "یدرون"، یعلمون کے معنی میں ہے کیونکہ استفہام بطور تعلیق کے وارد ہوا ہے، اور حرف استفہام کے بعد مضاف کا مقدر ماننا ضروری ہے۔ ای: "ما نسبة قبله من دبره؟

من كثرة الشعر: ("من" سببیہ ہے) ای من أجلها وسببها (بالوں کی کثرت کی وجہ سے)

الجساسة: امام نوویؒ فرماتے ہیں کہ "الجساسة" جیم مفتوح اور پہلی سین مہملہ مشدد ہے۔

کہا گیا ہے کہ اس جانور کا نام "جساسة" اس لئے رکھا گیا کہ وہ جاسوسی کر کے دجال کو معلومات فراہم کرتا تھا۔ عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ سے منقول ہے کہ یہ وہی دابہ ہے جس کا ذکر قرآن میں آیا ہے۔

انطلقو الى...... الدير: فی الدیر جار اور مجرور حال ہے اور اس میں عامل اسم اشارہ یا حرف تنبیہ ہے۔

الدیر: دال کے فتحہ اور یاء کے سکون کے ساتھ۔ مغرب میں لکھا ہے کہ" الدیر" ، راھب کے رہنے کی جگہ کو کہتے ہیں، اور یہاں "الدیر" سے "قصر" مراد ہے جیسا کہ عنقریب آئے گا۔ ایک شارحؒ فرماتے ہیں،" دیر "عیسائیوں کی عبادت گاہ کو کہتے ہیں، اور اس کی اصل واؤ کے ساتھ ہے۔ انتہی۔ اس کی اصل "دارْ" ہے جس کا الف واؤ سے بدل کر آیا ہے، اور یہ" دور " سے ماخوذ ہے، کیونکہ" دار" (گھر) میں بھی دیواروں کا دائرہ ہوتا ہے۔ یا اسمیں لوگوں کا آنا جانا ہوتا ہے، یا اس لئے کہ دار (گھر) میں انسان زندگی گزارتا ہے، اور اسی کو ٹھکانہ بناتا ہے، پھر الف کو یاء سے بدل دیا گیا، تاکہ فرق ہو سکے۔ اور" دیر النصارٰی" سے مراد یہ ہے کہ وہ عیسائیوں کی عبادت گاہ کی طرح ہے، یا یہ کہ اصل میں عیسائیوں کی عبادت گاہ پر" دیر" کا اطلاق ہوتا ہے، اور کبھی" بیت الخمر "(شراب خانہ) پر "الدیر" کا اطلاق ہوتا ہے۔

الی خبر کم: یہ "بالأشواق" کے متعلق ہے۔

بالأشواق: ہمزہ کے فتحہ کے ساتھ" یہ" شوق" کی جمع ہے۔ ای "کثیر الشوق" (بہت زیادہ مشتاق) اور" باء" الصاق کیلئے ہے۔ علامہ تورپشتی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: أی شدید نزاع النفس الی ما عندکم من الخبر، حتی کان الاشواق ملصقة به او کانه مهتم بها. (یعنی تمہارے پاس موجود چیز کو جاننے کے لئے انتہائی پیچ و تاب میں ہے......)

قوله: لما سمت لنا رجلا ...... قلنا ویلك ماأنت:

فرقنا: راء کے کسرہ کے ساتھ۔ بمعنی "خفنا" ہم ڈر گئے۔

أن تکون شیطانة: (مضاف محذوف ہے) ای: "کراهة ان تکون شیطانة" مطلب یہ ہے کہ ہمیں اندیشہ ہوا کہ کہیں وہ جانور شیطان نہ ہو اور یہ شخص بھی کہیں شیطان نہ ہو جس کا اس سے تعلق ہو۔

علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں:" أن تکون شیطانة "ضمیر مجرور سے (منها) بدل ہے۔

سراعًا (" مسرعین " کی تاویل میں ہو کر حال ہے۔) ای حال کو ننا مسرعین۔ (یعنی دانحالیکہ کو ہم بہت تیزی سے چل رہے تھے)

اعظم انسان: یعنی جسم کے اعتبار سے بڑا انسان مراد ہے، یا ہیئت کے اعتبار سے ڈراؤنا انسان مراد ہے۔

رأیناه:" انسان " کی صفت ہے، اور یہ احتراز ہے اُس شخص سے جس کو نہیں دیکھا اور چونکہ یہ کلام اس معنی میں ہے: "ما رأینا مثله" اس لئے "قط" کہنا بالکل درست ہے، جبکہ" قط "ماضی منفی کے ساتھ خاص ہے۔ اس لفظ کو کئی طرح سے استعمال کیا جاتا ہے۔

(۱) افصح لغت کے مطابق "قط" میں قاف مفتوح اور طاء مشدد و مضموم ہے، (۲) کبھی قاف کو کسرہ دیا جاتا ہے، (۳) کبھی قاف کو بھی طاء کی طرح ضمہ دیا جاتا ہے۔ (۴) کبھی "طاء" کو ضمہ کے ساتھ مخفف پڑھا جاتا ہے۔ (۵) طاء کے سکون کے ساتھ بھی جائز ہے (مغنی)

اور ایک نسخہ میں "ما رأیناه قط" وارد ہوا ہے۔

خلقا: "اعظم" سے تمیز ہے۔

وثاقا: واؤ کو مفتوح اور مکسور دونوں طرح پڑھنا درست ہے۔ "وثاق" کا معنی زنجیر اور طوق وغیرہ کی بیڑی ہے۔

اشرف فرماتے ہیں کہ مفعول کی ضمیر "اعظم" کی طرف راجع ہے۔ ای "ما رأينا قط اعظم انسان خلقاً۔ اور "خلقا" "أعظم انسان" سے تمیز ہونے کی بناء پر منصوب ہے۔

علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں یہ بھی احتمال ہے کہ مضاف محذوف ہو۔ ای "ما رأيناه مثل ذالك الاعظم" اور "اشد" مرفوع ہے اس کا "اعظم" پر عطف ہے، "ما" نہ تو صحیح مسلم میں ہے، نہ حمیدی کی کتاب میں نہ جامع الاصول میں اور نہ مصابیح کے اکثر نسخوں میں اور شاید کہ جس نے "ما" کی زیادتی کی ہے اُس نے "قط" کو دیکھ کر ایسا کیا ہے کیونکہ "قط" ماضی منفی میں استعمال ہوتا ہے، یا اس کی وہی توجیہ ہے جو کسی قائل کے اس قول میں ہے:

"لله يبقى على الأيام ذو حيد".

"مجموعة": منصوب ہے، اور بعض نسخوں میں مرفوع ہے۔ بمعنی مضمومة.

ما بين ركبتيه الى كعبيه: شروع میں بظاہر واؤ آنی چاہیے تھی تا کہ معنی یہ ہوتا "ومجموعة ساقاه عليه" اور "بالحديد" دونوں کیلئے قید ہوتا۔ علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں کہ "ما" موصولہ ہے، محلا مرفوع ہے۔

دوسری جگہ (حدیث کے جملہ "ما بين ركبتيه الى كعبيه") میں لفظ "مجموعة" کو حذف کر دیا گیا کیونکہ مذکور لفظ "مجموعة" اس محذوف پر دلیل ہے۔

قلنا ويلك ما أنت؟: اُس شخص کو عجیب وغریب پایا، اس لئے "من" کی جگہ "ما" کا استعمال کیا۔

اور یہ بھی ممکن ہے کہ سوال اُس شخص کے وصف اور حال کے بارے میں کیا گیا ہو (اس لئے "من" کی جگہ "ما" استعمال کیا گیا) کیونکہ ان کو یہ تو معلوم ہو گیا تھا کہ وہ ایک آدمی ہے۔

اور کبھی "ما" "من" کے معنی میں آتا ہے، جیسا کہ اس ارشاد باری میں ہے: ﴿ وَالسَّمَآءِ وَمَا بَنٰهَا﴾[الشمس :۵] اور (قسم ہے) آسمان کی اور اس (ذات) کی جس نے اس کو بنایا"۔

اور یہ بھی ممکن ہے کہ ماقبل کی مشاکلت کی رعایت کی گئی ہو۔

علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں، گویا جب انہوں نے ایک عجیب وغریب مخلوق کو دیکھا جو معروف ہیئت سے خارج تھی، تو ان پر اس مخلوق کا معاملہ مخفی ہو گیا اور "من أنت؟" کی بجائے "ما أنت" کہنے لگے۔

قوله: قدر تم على خبرى فاخبرونى ما انتم ...... يوشك ان يذهب:

اس نے بھی "من انتم" نہیں کیا کہ اُس کی یہ بات ان لوگوں کی بات کے مطابق ہو جائے اور ان کے اس فعل کے بدلے میں اس نے بھی اس طرح کہہ دیا۔

علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں کہ جس طرح ان لوگوں نے سوال کرتے ہوئے "ما أنت؟" کہا اسی طرح اُس نے بھی ان لوگوں سے سوال کرتے ہوئے "ما أنتم؟" کہہ دیا۔

ابن الملکؒ فرماتے ہیں: "ما أنتم؟" بمعنی "من أنتم؟" یا بمعنی "ما حالکم؟" ہے

"قالوا": اس میں تکلم سے غائب کی طرف "انتقال" ہوا ہے، (ذکرہ ابن الملکؒ)

اور یہ بھی ممکن ہے کہ تقدیر یہ ہو: "قال بعضنا" اس تقدیر پر غائبین کو حاضرین پر غلبہ دیا گیا ہے۔

اعمدوا: میم کے کسرہ کے ساتھ۔ بمعنی قصد کرنا۔

الی هذه: اسم اشارہ سے "الرجل" کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

فی الدیر: "الدیر" سے "قصر کبیر" بڑا محل مراد ہے۔

بیسان: علامہ طیبیؒ نے ذکر کیا ہے کہ "بیسان" بائے موحدہ کے فتحہ اور یاء تحتیہ کے سکون کے ساتھ شام کی ایک بستی ہے۔

ابن الملکؒ فرماتے ہیں کہ اُردن کے قریب ایک بستی کا نام ہے۔

قاموس میں لکھا ہے کہ شام کی ایک بستی کا نام ہے اور "مرو" میں بھی ایک بستی ہے، اسی طرح "یمامہ" میں بھی ایک مقام کا نام ہے۔

اور ایک نسخہ میں "باء" کی بجائے نون ہے۔ (یعنی "نیسان" ہے۔) لیکن مجھے لغت میں اس کی کوئی ایسی اصل نہیں ملی جو اس مقام کے مناسب ہو، اور قاموس میں تو لکھا ہے کہ "نیسان"، رومی مہینوں میں ساتواں مہینہ ہے۔

أما: میم کی تخفیف کے ساتھ یہ تنبیہ کیلئے ہے۔

الطبریة: "طاء" اور "باء" دونوں مفتوح ہیں۔ قاموس میں لکھا ہے کہ "الطبریة" حرکت کے ساتھ اُردن کی ایک بستی ہے اس کی طرف نسبت کرتے ہوئے "طبرانی" کہا جاتا ہے۔

البحیرة: "البحر" کی تصغیر ہے۔

قوله: قال: اخبرونی عن عین زعر ...... یزرعون من مائها:

زغر: شروع میں زاء، پھر غین اور آخر میں راء ہے "زفر" کے وزن پر ہے، یہ شام کا ایک علاقہ ہے، یہاں سبزہ بہت کم اُگتا ہے۔ شارحؒ فرماتے ہیں: "زغر" شام میں ایک جگہ کا نام ہے۔ امام نوویؒ فرماتے ہیں کہ "زغر" شام کی جانب ایک معروف شہر ہے۔

کہا گیا ہے کہ "زُغر" کا غیر منصرف ہونا معرفہ اور تانیث کی وجہ سے ہے، کیونکہ یہ لفظ اصل میں ایک عورت کا نام تھا، پھر نقل کر دیا گیا یعنی اس کی تانیث "بلدة" یا "بقعة الارض" کی تاویل میں ہونے کی وجہ سے نہیں ہے کیونکہ ایسی صورت

میں بعض اوقات ''البلد''اور''المکان'' کی تاویل کرتے ہوئے اس کو مذکر مان لیتے ہیں۔

هل في العين: ای فی عینہ اوتلك العین یعنی وہاں کے چشمے میں یا اس چشمے میں۔ چنانچہ الف لام مضاف الیہ کے عوض میں ہے یا الف لام عہدی ہے۔

ماءٌ؟: پانی سے مراد زیادہ پانی ہے۔ حدیث کا اگلا جملہ''**نعم هي كثيرة الماء**''اس کی دلیل ہے۔

''**اهلها**'' کی ضمیر مجرور کا مرجع ''**العين**'' ہے یا''**البلدة**'' ہے اور دوسرا احتمال راجح ہے۔ کیونکہ یہی اگلی عبارت میں ''**بماء العين**'' سے معلوم ہو رہا ہے۔

بظاہر گذشتہ جوابات کی طرح یہاں بھی دجال نے دوسرا جملہ ''**أما انها يوشك ان لا يبقى فيها ماء يزرع به اهلها**'' کہا ہوگا۔ (یعنی''عنقریب ہی وہ زمانہ آنے والا ہے کہ اُس چشمے میں اتنا پانی نہیں رہے گا جس سے وہاں کے لوگ اپنی کھیتی باڑی کر سکیں۔)

ان مذکورہ سوالات اور جوابات میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ یہ امور دجال کے خروج کی علامات ہیں، اور دجال کے ظہور کی نحوست سے یہ برکات ختم ہو جائیں گی۔ اور یہ سوال و جواب درحقیقت مابعد کیلئے بطور تمہید تھے۔

قوله: قال اخبروني عن نبي الاميين...... خير لهم ان يطيعوه:

''**فعل**'' فاء اور عین دونوں مفتوح ہیں، اور مطلب یہ ہے کہ مبعوث ہونے کے بعد حضور علیہ السلام نے کیا کیا؟

علامہ ابن الملکؒ نے ''شرح المشارق'' میں لکھا ہے کہ ''امیین'' سے دجال کی مراد عرب ہیں، کیونکہ عموماً عرب نہ پڑھ سکتے تھے اور نہ لکھ سکتے تھے، اور حضور علیہ السلام کی امیین کی طرف اضافت کرنے میں حضور علیہ السلام پر طنز ہے کہ حضور علیہ السلام کی بعثت صرف عربوں کیلئے ہوئی ہے جیسا کہ بعض یہودی گمان کرتے تھے، یا طنز اس طرح ہے کہ حضور علیہ السلام کی بعثت تو ان پڑھ لوگوں کی طرف ہوئی تھی، سمجھداروں، عقل مند اور ذی شعور لوگوں کی طرف نہیں ہوئی تھی۔

علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں: **ذالك** کا مشار الیہ'' **اطاعوه**'' کا مفہوم ہے۔ اور''**ان يطيعوه**'': مزید وضاحت کیلئے ہے، اور یہ بھی ممکن ہے کہ مشار الیہ حضور علیہ السلام ہوں، اور''**خير**'' کا اسناد''**أن يطيعوه**'' کی طرف ہو۔ توجیہ کے مطابق'' **خيرٌ**''اسم تفضیل کا صیغہ نہیں ہوگا، یا''**أن يطيعوه**''مبتدا مؤخر ہے اور'' **خيرٌ**'' خبر مقدم ہے اور یہ سارا جملہ''**ان**'' کی خبر ہے۔

علامہ تورپشتی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: یہاں ایک اشکال ہوسکتا ہے، وہ یہ کہ دجال کا یہ بیان ایک ایسے شخص کے بیان کی مانند ہے کہ جس کو معرفت حق حاصل ہو، لہٰذا اس کے قول کی کیا وجہ ہوسکتی ہے۔

اس کا ایک جواب تو یہ ہے کہ اس کی مراد دنیاوی خیر ہو، یعنی اہل عرب کا ان کی طاعت کر لینا بہتر ہے چونکہ اگر وہ اس نبی کی مخالفت کریں گے تو وہ نبی ان کو جڑ سے اکھاڑ پھینکے گا' ان کا قلع قمع کر دے گا۔

اور دوسرا احتمال یہ ہے کہ یہ ''**صرفه**'' کے قبیل سے ہو، کہ اللہ تعالیٰ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی میں طعن کرنے سے اس کو روک دیا ہو۔ اور اس نے مغلوب شخص کی طرح سب کچھ کہہ ڈالا، اور خلاف حقیقت بیان کرنے کی اس کو جسارت نہ ہو

سکی ہو۔

والفضل ما شهدت به الاعداء

"حقیقی فضیلت اور بزرگ تو وہی ہے جس کی دشمن بھی گواہی دیں"

قوله:واني مخبر كم عني ...... ملائكةيحر سونها:

اني: ہمزہ کو مکسور اور مفتوح دونوں طرح پڑھنا درست ہے۔

واني: ہمزہ کو دونوں طرح پڑھنا درست ہے۔

تینوں افعال (یعنی فأخرج، فاسیر اور خلا أدع) منصوب ہیں، اور ان کو مرفوع پڑھنا بھی جائز ہے۔

اربعين ليلة: "أسير" فعل کیلئے ظرف ہے،

کسی آبادی کو بھی نہ چھوڑنا اس دجال کے چلنے کی قوت پر دلالت کرتا ہے، دجال کا نام "مسیح" رکھنے کی ایک وجہ یہی ہے فعیل بمعنی فاعل ہے کیونکہ اس کا گزر مسح کی طرح ہوگا۔

غير مكة: "مكة" کا "قرية" سے استثناء ہوا ہے اور "قرية" چونکہ نکرہ ہے، اور نفی کے تحت واقع ہوا ہے اس لئے استغراق کا فائدہ حاصل ہے اور استثناء درست ہے۔

وطيبة: اس کا "مكة" پر عطف ہے، اور "طيبة" طاء کے فتحہ یاء کے سکون اور بائے موحدہ کے ساتھ مدینہ منورہ کا ایک نام ہے، جیسا کہ ایک نام کا "طابة" ہے۔

كلما اردت ان ادخل واحة او واحداً: (موصوف محذوف ہے۔) ای "حرماً واحداً"

صلتا: صاد کے فتحہ کے ساتھ اور کبھی ضمہ کے ساتھ بھی پڑھا جاتا ہے۔ بمعنی "مجرداً عن الغمد". شارحؒ فرماتے ہیں: "صلتا" صاد کے فتحہ اور ضمہ کے ساتھ مصدر ہے فاعل کے معنی میں ہے یا مفعول کے معنی میں ہے۔ "الملك" سے حال ہے، یعنی "السيف" سے حال ہے، یہ "أصلت سيفه" بمعنی "جرده من غلافه" (تلوار کو اس کے غلاف سے باہر نکالا) سے ماخوذ ہے۔

يصدني عنها: یہ جملہ مستانفہ ہے یا حالیہ ہے اور ضمیر "الملك" کی طرف راجع ہے یا "السيف" کی طرف مجازاً راجع ہے، یا حقیقۃً "اللہ" کی طرف راجع ہے۔ اور چونکہ اللہ ہر وقت مسلمان کے دل میں ہوتا ہے، اور زبان پر اُس کا ذکر ہوتا ہے، اس لئے لفظ اللہ کو ضمیر کا مرجع بطور بیان قرار دینا ہے۔ جیسا کہ اس ارشاد باری میں تحقیق گذر چکی ہے۔: ﴿قُلْ هُوَ اللّٰهُ أَحَدٌ﴾

نقب: نون کے فتحہ اور قاف کے سکون کے ساتھ بمعنی "راستہ" یا دروازہ"

منها: ضمیر کا مرجع كل واحدة.

ملائكة يحرسونها: یعنی اس فرشتہ کے علاوہ فرشتے ہیں، جو آفات او بلیات سے اس کی حفاظت کرتے ہیں، اور بظاہر

اس فرشتہ سے حضرت جبرائیل علیہ السلام مراد ہیں، جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔ واللہ اعلم

قوله: قال رسول الله ﷺ وطعن...... وعن المدينة ومكة:

طعن: اس سے پہلے "قد" محذوف ہے۔

المخصرة: میم کے کسرہ اور صاد کے فتحہ کے ساتھ۔ بمعنی "العصا" (چھڑی، لاٹھی) فائق میں لکھا ہے "المخصرة" اُس لکڑی کو کہتے ہیں جس کے ذریعہ خطیب خطبہ دیتے وقت یا بادشاہ تقریر کرتے وقت اشارہ کرتا ہے۔

علامہ تورپشتی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ "المخصرة" کوڑے کی طرح ہوتا ہے، اور ہر وہ چیز جس کو انسان اپنے ہاتھ میں پکڑے رکھتا ہے، مثلاً لاٹھی وغیرہ اس کو "المخصرة" کہا جاتا ہے۔

ایک شارح فرماتے ہیں: "المخصرة" اُس لکڑی یا لاٹھی وغیرہ کو کہا جاتا ہے جس کو انسان اپنے ہاتھ میں رکھتا ہے، اور اپنے پہلو کے ساتھ لگا کر اُس کے ساتھ ٹیک لگائے۔ اور بعض کا کہنا ہے کہ "المخصرة" کوڑے کی طرح کی چیز ہوتی ہے۔

في المنبر: "في" "على" کے معنی میں ہے، جیسا کہ اس ارشاد باری میں في، "على" کے معنی میں ہے: ﴿ولأصلبنكم في جذوع النخل﴾ [طٰہٰ: ۷۱] اور تم سب کو کھجوروں کے درختوں پر لٹکواتا ہوں"

یا طعن، "اوقع" کے معنی کو متضمن ہے۔ جیسا کہ "يجرح في عراقيبها نصلي" میں ہوا ہے۔

هذه طيبة: یہ جملہ "قال" کے لئے مقولہ ہے، اور اس سے پہلے والا جملہ قول اور مقولہ کے درمیان جملہ معترضہ حالیہ ہے۔

هذه طيبة: حضور علیہ السلام نے تاکید کی غرض سے تین بار اس جملے کا تکرار فرمایا۔

يعني المدينة: حضور علیہ السلام لفظ "هذه" سے جو کہ محسوس اشیاء کی طرف اشارہ کرنے کیلئے وضع کیا گیا ہے مدینہ منورہ مراد لے رہے تھے۔

علامہ تورپشتی رحمہ اللہ فرماتے ہیں، جب تمیم داری کا یہ قصہ حضور علیہ السلام کی اُس بات کے موافق ہوئی جو حضور علیہ السلام نے صحابہ سے بیان فرمائی تھی، تو حضور علیہ السلام کو خوشی ہوئی۔

الا: کلمہ تنبیہ ہے۔

هل كنت حدثتكم؟: یعنی کیا میں نے تم لوگوں کو اس طرح کی بات بتائی تھی۔

قوله: الا انه في بحر الشام ......:

بعض حضرات فرماتے ہیں، کہ جب حضور علیہ السلام نے صحابہ کرام کو تمیم داری کا واقعہ سنایا، تو ابہام میں مصلحت کے پیش نظر صحابہ کو دجال کا ٹھکانہ تعین کے ساتھ واضح نہیں فرمایا، اور بحر شام اور بحر یمن کے درمیان شک اور تردد کے ساتھ صحابہ کو دجال کا ٹھکانہ بتایا عرب اُس زمانے میں انہی دو سمندروں میں سفر کرتے تھے۔

یہ بھی احتمال ہے کہ ایک ہی سمندر ہو، بحر شام سے اُس سمندر کی وہ جانب مراد ہو جو شام کی طرف ہے اور بحر یمن سے اسی

سمندر کی وہ جانب مراد ہو جو یمن کی طرف ہے، اور یہ سمندر جزیرۂ عرب کی ایک جانب پھیلا ہوا ہے، اس کے بعد حضور علیہ السلام نے پہلے دو قولوں سے اضراب کر کے یقین کے ساتھ فرمایا: **لابل هو من قبل المشرق ماهو۔**

لا بل من قبل المشرق ما هو: "ما" زائدہ ہے، یا موصولہ بمعنیٰ " الذی " ہے، ای **"الجانب الذی هو فيه"**۔ قاضی عیاضؒ فرماتے ہیں: "ما" یہاں زائدہ ہے، نافیہ نہیں ہے۔ اور مقصود یہ بتانا ہے، کہ وہ جگہ مشرق کی جانب ہے۔ علامہ تور پشتی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں یہ بھی احتمال ہے کہ یہ خبر ہو۔ ای "الذی هو فيه" (یعنی وہ جنس میں وہ ہے او "الذی هو يخرج منه" (یعنی وہ جس سے وہ نکلے گا۔)

واوما: دو ہمزوں کے ساتھ ہے۔

اشرفؒ فرماتے ہیں، کہ ممکن ہے کہ پہلے حضور علیہ السلام کو دجال کے ٹھکانے کے بارے میں شک ہو، اور آپ کا یہ خیال ہو، کہ ان تین جگہوں میں سے کسی ایک جگہ میں دجال رہتا ہے، چنانچہ اسی شک کے ساتھ جب آپ علیہ السلام نے بحر شام اور بحر یمن کا ذکر فرمایا، تو اسی وقت وحی کے ذریعے آپ کے یقین کے ساتھ معلوم ہو گیا، یا آپ کا ظن غالب ہو گیا کہ اس کا قید خانہ مشرق کی جانب ہے' اسی لئے پہلی دو جگہوں کی نفی فرمائی اور ان سے اعراض کر کے تیسری جگہ کی وضاحت کی۔

۵۴۸۳ : وَعَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عُمَرَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ رَاَيْتُنِي اللَّيْلَةَ عِنْدَ الْكَعْبَةِ فَرَاَيْتُ رَجُلًا اٰدَمَ كَاَحْسَنِ مَا اَنْتَ رَاءٍ مِنْ اُدْمِ الرِّجَالِ لَهُ لِمَّةٌ كَاَحْسَنِ مَا اَنْتَ رَاءٍ مِنَ اللِّمَمِ قَدْ رَجَّلَهَا فَهِيَ تَقْطُرُ مَاءً مُتَّكِئًا عَلٰى عَوَاتِقِ رَجُلَيْنِ يَطُوْفُ بِالْبَيْتِ فَسَاَلْتُ مَنْ هٰذَا فَقَالُوْا هٰذَا الْمَسِيْحُ بْنُ مَرْيَمَ قَالَ ثُمَّ اِذَا اَنَا بِرَجُلٍ جَعْدٍ قَطَطٍ اَعْوَرِ الْعَيْنِ الْيُمْنٰى كَاَنَّ عَيْنَهُ عِنَبَةٌ طَافِيَةٌ كَاَشْبَهِ مَنْ رَاَيْتُ مِنَ النَّاسِ بِابْنِ قَطَنٍ وَاضِعًا يَدَيْهِ عَلٰى مَنْكِبَيْ رَجُلَيْنِ يَطُوْفُ بِالْبَيْتِ فَسَاَلْتُ مَنْ هٰذَا فَقَالُوْا هٰذَا الْمَسِيْحُ الدَّجَّالُ (متفق عليه وفى رواية قال) فِي الدَّجَّالِ رَجُلٌ اَحْمَرُ جَسِيْمٌ جَعْدُ الرَّاْسِ اَعْوَرُ عَيْنِ الْيُمْنٰى اَقْرَبُ النَّاسِ بِهِ شَبَهًا ابْنُ قَطَنٍ وَذُكِرَ حَدِيْثُ اَبِيْ هُرَيْرَةَ لَا تَقُوْمُ السَّاعَةُ حَتّٰى تَطْلُعَ الشَّمْسُ مِنْ مَغْرِبِهَا فِيْ بَابِ الْمَلَاحِمِ وَسَنَذْكُرُ حَدِيْثَ ابْنِ عُمَرَ قَامَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِي النَّاسِ فِيْ بَابِ قِصَّةِ ابْنِ صَيَّادٍ اِنْ شَاءَ اللّٰهُ تَعَالٰى۔

أخرجه البخاري في صحيحه ۴۷۷/۶حديث رقم ۳۴۴۰ومسلم في صحيحه ۱۵۴/۱حديث رقم (۲۷۳-۱۶۹) ومالك في الموطأ ۹۲۰/۲حديث رقم ۲من كتاب صفة النبي ﷺ واحمد في المسند ۱۵۴/۲۔

ترجمہ: "اور حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے منقول ہے کہ (ایک روز) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: "آج رات میں نے اپنے آپ کو (خواب میں یا کشف کی حالت میں) کعبہ کے نزدیک دیکھا' وہاں مجھ کو ایک ایسا گندمی رنگت والا شخص دکھائی دیا جو ایسے آدمی کی مانند تھا جس کو تم گندمی رنگ کا سب سے بہتر اور خوب صورت دیکھنے والے ہو' اس کے (سر پر) بہت بال تھے جو کاندھوں تک لٹکے ہوئے تھے اور بالوں کے اعتبار سے بھی وہ کسی ایسے

آدمی کی طرح تھا جیسے شخص کو تم ایسے بال رکھنے والوں میں سب سے خوبصورت دیکھتے ہو‘ اس شخص نے بالوں میں کنگھی بھی کر رکھی تھی اور بالوں سے پانی کے قطرے گر رہے تھے‘ وہ شخص دو آدمیوں کے کاندھوں پر ہاتھ رکھ کر کعبۃ اللہ کا طواف کر رہا تھا! میں نے (اس شخص کو دیکھ کر طواف کرنے والوں سے) پوچھا کہ یہ کون ہے۔ انہوں نے جواب دیا کہ یہ مسیح بن مریم ہیں! اس کے بعد رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: پھر اچانک مجھے ایسا شخص دکھائی دیا جو گھنگریالے اور بہت کھڑے بالوں والا تھا‘ وہ داھنی آنکھ سے کانا تھا‘ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جیسے اس کی آنکھ انگور کا ابھرا ہوا دانہ یا بے نور ہے‘ جن لوگوں کو میں نے دیکھا ہے ان میں سے وہ ابن قطن کے ساتھ زیادہ مشابہت رکھتا تھا‘ وہ شخص بھی دو آدمیوں کے کاندھوں پر ہاتھ رکھ کر کعبۃ اللہ کا طواف کر رہا تھا‘ میں نے اس کے بارے میں بھی پوچھا کہ یہ کون ہے؟ تو لوگوں نے جواب دیا کہ یہ مسیح دجال ہے“۔ (بخاری ومسلم) ایک اور روایت میں یوں نقل کیا گیا ہے کہ حضور ﷺ نے دجال کے متعلق فرمایا کہ ”وہ ایک ایسا شخص ہے جس کی رنگت سرخ ہے‘ سر کے بال گھنگریالے ہیں‘ داھنی آنکھ سے کانا ہے‘ لوگوں میں سے قطن کا بیٹا مشابہت کے لحاظ سے اس سے بہت قرب رکھتا ہے“۔ اور حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی یہ حدیث: لَا تَقُوْمُ السَّاعَةُ حَتّٰى تَطْلُعَ الشَّمْسُ مِنْ مَغْرِبِهَا فِيْ بَابِ الْمَلَاحِمِ میں ذکر کی جا چکی ہے نیز حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کی اس روایت: قَامَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِي النَّاسِ ...... کو ان شاء اللہ ہم ابن صیاد کے قصہ کے باب میں ذکر کریں گے۔

تشریح: قوله: رايتني الليلة عند...... هذا المسيح بن مريم:

الليلة: اس سے گذشتہ رات مراد ہے، اگر یہ بات دن کے وقت کہی گئی ہے۔

عند الكعبة: فعل کیلئے ظرف ہے یا مفعول سے حال ہے۔ ای ”رأيت نفسي عند الكعبة“ ہے (یعنی میں نے اپنے آپ کو کعبہ کے پاس دیکھا۔)

آدم: مد کے ساتھ بمعنی أسمر (گندمی رنگ والا) ہے۔

”أدم“: ہمزہ کے ضمہ اور دال کے سکون کے ساتھ آدم کی جمع ہے، جیسا کہ ”حمر“ أحمر کی جمع ہے۔ (علی مافی النهاية)، اور بعض نسخوں میں جو دال کا ضمہ مذکور ہے، سو یہ کاتب کا سہو ہے۔

لمة: لام کے کسرہ اور میم کی تشدید کے ساتھ۔ ان بالوں کو کہا جاتا ہے، جو کان کی لو سے نیچے تک ہوں۔

اللمم: لام کے کسرہ اور پہلی میم کے فتحہ کے ساتھ۔ ”یہ لمة“ کی جمع ہے۔

تقطر ماء: شاید اس سے وہ پانی مراد ہے جس سے بالوں کو کنگھی کرنے سے پہلے گیلا کیا جاتا ہے، کیونکہ خشک بالوں میں کنگھی نہیں ہوسکتی، اور یہ بھی احتمال ہے کہ مزید پاکیزگی اور خوبصورتی سے کنایہ ہو۔

متكئا: یہ بمعنی ”معتمدا“ ہے ”رجلا“ کے لئے دوسری صفت ہے، یا ”رجلا“ سے حال ہے کیونکہ ”رجلا“ موصوف ہے اور ”آدم“ اس کی صفت ہے۔

عواتق: "عاتق" کی جمع ہے۔ عاتق کندھے کی وہ جگہ جہاں چادر رکھی جاتی ہے۔ علامہ سیوطیؒ فرماتے ہیں: مونڈھے اور گردن کی درمیانی جگہ کو "عاتق" کہا جاتا ہے۔ یہاں ترکیب (یعنی اس ارشاد باری کی طرح ہے: ﴿**فقد صنعت قلوبكما**﴾ [تحریم: ٤] "تو تمہارے دل غافل ہو رہے ہیں" اور اس حدیث کی ترکیب (یعنی بھی اسی طرح ہے: جس میں "**انصاف ساقية**" آیا ہے۔

يطوف بالبيت: جملہ مستأنفہ ہے، یا حال ہے۔

فسألت: مفعول بہ محذوف ہے۔ یعنی طواف کرنے والوں سے یا فرشتوں سے پوچھا

من هذا: اس میں اسی اشارہ ہے کہ بعض اوقات بعض اشیاء کا کشف تو ہو جاتا ہے، لیکن کچھ خفاء رہ جاتا ہے۔

قوله: قال: ثم اذا أنا برجل جعد ...... هذا المسيح الدجال:

جعد: جیم کے فتحہ اور عین کے سکون کے ساتھ۔ گھونگریالے بالوں یا چھوٹے بالوں کو کہا جاتا ہے۔ (قاموس)

قطط: پہلی "طاء" مفتوح ہے اور کبھی اس کو مکسور بھی پڑھا جاتا ہے۔ قاموس میں لکھا ہے: **القط القصير الجعد من الراس كا لقطط محركة:**

أعور: مضاف ہے اور مجرور ہے۔

طافية: میں فاء مکسور اور اس کے بعد یا ہے، اور ایک اور نسخے میں فاء کے بعد ہمزہ ہے۔

علامہ سیوطیؒ فرماتے ہیں کہ "**طافية**" کو ہمزہ اور یاء دونوں کے ساتھ نقل کیا گیا ہے، اور اس کا معنی ہے وہ آنکھ جس کی بینائی ختم ہو گئی ہو، اور اکثر علماء نے اس کو صحیح قرار دیا ہے کہ وہ آنکھ جو اُبھری ہوئی ہو جیسا کہ انگور کا دانہ اُبھرا ہوا ہوتا ہے۔

قاضی عیاضؒ فرماتے ہیں کہ دجال کی دونوں آنکھوں میں عیب ہے اس کی داہنی آنکھ مٹی ہوئی ہوگی۔ "**طافئة**"۔ ہمزہ کے ساتھ ہے۔ اور بائیں آنکھ موجود تو ہوگی مگر اُبھری ہوئی ہوگی، گویا کہ وہ ایک ستارہ ہے، اور یہ "**طافية**" یاء کے ساتھ ہے۔

كاشبه من رأيت: علامہ جزریؒ فرماتے ہیں: رأیت، بصیغہ متکلم ومخاطب دونوں طرح منقول ہے، اور یہی زیادہ واضح ہے۔ میں کہتا ہوں کہ اکثر نسخوں میں یہ بصیغہ متکلم منقول ہے، اور مقام تشبیہ میں یہی خطاب عام کی نسبت زیادہ درست ہے۔ "**كاشبه**" میں کاف زائد ہے، اور تشبیہ میں مبالغہ کا فائدہ دے رہا ہے۔ ای "**هو اشبه من ابصرته من الناس بابن قطن**" (میں نے جن لوگوں کو دیکھا ہے ان میں سے دجال ابن قطن کے بہت زیادہ مشابہ تھا)۔

ابن قطن: قاف اور طاء دونوں مفتوح ہیں۔ ایک یہودی تھا۔ اور "**بابن**" جار مجرور "**أشبه**" کے متعلق ہے۔ اور اگلی روایت میں "**أقرب الناس به شبها ابن قطن**" کے الفاظ ہیں۔ ممکن ہے کہ وجہ شبہ اگلے اوصاف مذکورہ ہوں یا وجہ شبہ یہ ہو کہ ابن قطن کی آنکھ بھی اُبھری ہوئی تھی۔

واضعًا: یہ "**الدجال**" سے حال ہے۔

على منكبي رجلين: ان دو شخصوں سے بظاہر دجال کے وہ رفیق مراد ہیں، جو دجال کے باطل موقف کے لئے اس کی

اعانت کریں گے، جیسا کہ ان دو اشخاص جن کے کاندھے پر حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہاتھ رکھے ہوئے نظر آئیں گے سے مراد حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے مددگار اور رفیق ہوں اور ممکن ہے وہ دونوں حضرات حضرت خضرؑ اور حضرت امام مہدیؑ ہوں۔

یطوف بالبیت:

اس میں اس بات کی طرف اشارہ ہے، کہ اس دربار سے کوئی بھی شخص مستغنی نہیں ہے۔ اور اسی در پر آ کر انسان اپنے مقاصد کو حاصل کر سکتا ہے۔ اور ارشادِ ربانی: ﴿مثابة للناس﴾ [البقرة:۱۲۵] اور (وہ وقت بھی قابل ذکر ہے کہ) جس وقت ہم نے خانہ کعبہ کو لوگوں کا مصد اور (مقام) امن (ہمیشہ سے (مقرر سے) رکھا۔ میں بھی اسی کی طرف اشارہ ہے۔ اسی وجہ سے زمانہ جاہلیت اور زمانہ بعثت دونوں میں کفار بیت اللہ کا طواف نہیں چھوڑتے تھے، اور آج بھی یہودیوں اور عیسائیوں کو یہ تمنا ہے کہ بیت اللہ کی زیارت کا اور اس کے اردگرد طواف کرنے کا شرف حاصل کریں۔

علامہ تورپشتی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ دجال کے کافر ہونے کے باوجود بیت اللہ کا طواف کرے گا' اس کی تاویل یہ ہے کہ حضور علیہ السلام کا خواب مکاشفات میں سے تھا۔ اور حضور علیہ السلام کو کشف کے ذریعے یہ بات بتائی گئی، کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اپنی اس حسین ہیئت کے ساتھ جس کے ساتھ آسمان سے نازل ہوئے تھے، دین کی حفاظت کرنے اور اس کی قوت قائم کرنے کیلئے مرکز دین کے اردگرد رہیں گے، اور دجال اپنی اس بُری صورت کے ساتھ جس کے ساتھ وہ ظاہر ہوگا، دین میں فساد پھیلانے کی غرض سے مرکزِ دین کے اردگرد رہے گا۔

ھذا المسیح الدجال:

علامہ تورپشتی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ دجال کا نام "مسیح" رکھنے کی جتنی وجوہات ہیں، ان میں سے میرے نزدیک سب سے راجح وجہ یہ ہے کہ دجال سے تمام بھلائیاں "مسح" کردی گئی ہیں، پس یہ "**مسیح الضلالة**" (گمراہی کا مسیحا) ہے، جیسا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے تمام برائیاں "مسح" کردی گئی ہیں، اور وہ "**مسیح الھدایه**" (ہدایت کا مسیحا) ہیں۔

کہا گیا ہے کہ حضرت عیسی کی "مسیح" وجہ تسمیہ یہ ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام جس مریض کو بھی مسح کرتے تھے تو اس کو شفاء مل جاتی تھی۔

بقول بعض حضرت عیسیٰ اپنی ماں کے پیٹ سے دنیا میں اس حالت میں تشریف لائے کہ ان کے بدن پر تیل ملا ہوا تھا۔

رابع: بعض کا کہنا ہے، اس لئے کہ حضرت عیسیٰ زمین میں سفر فرماتے تھے۔

خامس: بعض کا کہنا یہ ہے کہ مسیح صدیق ہے' اور دجال کو مسیح اسلئے کہا جاتا ہے کہ اسکی ایک آنکھ مسح ہوگئی تھی، اُس سے دیکھ نہیں سکتا تھا اور کانے شخص کو مسیح کہا جاتا ہے۔ (انتہی)

دجال کو مسیح اسلئے کہا جاتا ہے کہ وہ چند ہی دنوں میں مکہ اور مدینہ کے علاوہ تمام روئے زمین کو مسح کرے گا۔ چنانچہ "مسیح" فعیل بمعنیٰ فاعل ہے۔ اور دجال کو "**مسیح الدجال**" اسلئے کہا جاتا ہے کہ وصف "مسیح" کا غالب استعمال حضرت عیسیٰؑ کیلئے ہوتا ہے۔ چنانچہ دجال کے وصف میں "مسیح" کے ساتھ لفظ "الدجال" لگا دیا جاتا ہے تاکہ حق و باطل میں تمیز ہو سکے۔

توضیح: کہا گیا ہے کہ اس حدیث کو امام مسلمؒ نے "باب الاسراء" میں بیان کیا ہے۔

قوله: وفي رواية...... ابن قطن:

رجل: یہ "هو" مبتدا محذوف کی خبر ہے۔ ای هو رجل۔

قوله: وسنذكر حديث ابن عمر ....:

"ان شاء الله" کا تعلق "سنذكر" کے ساتھ ہے۔

گویا کہ مؤلفؒ کی رائے یہ ہے کہ اس حدیث کو اس باب میں ذکر کرنا زیادہ مناسب ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

الفصل الثانی:

۵۴۸۴ : وَعَنْ فَاطِمَةَ بِنْتِ قَيْسٍ فِي حَدِيْثِ تَمِيْمِ الدَّارِيِّ قَالَتْ قَالَ فَإِذَا اَنَا بِامْرَأَةٍ تَجُرُّ شَعْرَهَا قَالَ مَا اَنْتِ قَالَتْ اَنَا الْجَسَّاسَةُ اِذْهَبْ اِلَى ذٰلِكَ الْقَصْرِ فَاَتَيْتُهُ فَإِذَا رَجُلٌ يَجُرُّ شَعْرَهُ مُسَلْسَلٌ فِي الْاَغْلَالِ يَنْزُوْ فِيْمَا بَيْنَ السَّمَاءِ وَالْاَرْضِ فَقُلْتُ مَنْ اَنْتَ قَالَ اَنَا الدَّجَّالُ . (رواه ابوداود)

اخرجه ابو داؤد في السنن ٤/٥٩٩ حديث رقم ٤٣٢٥۔

ترجمہ: "حضرت فاطمہ بنت قیس رضی اللہ عنہا نے تمیم داری سے منقول حدیث کے متعلق بیان فرمایا کہ تمیم داریؓ نے کہا کہ (جب میں جزیرہ میں پہنچا تو) اچانک میرا گزر ایک ایسی عورت کے پاس سے ہوا جو اپنے بالوں کو گھسیٹ کر چل رہی تھی۔ تمیمؓ نے پوچھا: تو کون ہے؟ اس نے جواب دیا کہ میں (دجال کیلئے) جاسوسی کرنے والی ہوں تم اس محل کے جانب چلے جاؤ! تمیمؓ کا بیان ہے کہ میں اس محل میں پہنچا تو اچانک ایسا آدمی دکھائی دیا ہے جو اپنے بالوں کو گھسیٹتا ہے۔ زنجیروں میں جکڑا ہوا ہے اور طوق پڑے ہوئے ہیں اور آسمان و زمین کے درمیان اچھل کود رہا ہے میں نے پوچھا کہ تو کون ہے؟ تو اس نے بتلایا کہ میں دجال ہوں"۔ (ابوداؤد)

تشریح: قال فاذا: فاعل کی ضمیر "تمیم" کی طرف لوٹ رہی ہے، اور ایک نسخے میں "قالت" ہے اور مطلب یہ ہے کہ حضرت فاطمہ بنت قیسؓ تمیم داریؓ سے نقل کرتے ہوئے فرماتی ہیں۔

فاذا أنا بامرأة: گزشتہ حدیث "فلقيتهم دابة اهلب" کے الفاظ منقول ہیں۔ جبکہ اس حدیث میں "فاذا أنا بامرأة" کے الفاظ منقول ہیں۔

کہا گیا ہے کہ ممکن ہے کہ دجال کے دو جاسوس ہوں۔ ایک جاسوس وہ دابہ اور دوسرا جاسوس یہ عورت ہو۔

اور یہ بھی احتمال ہے کہ جاسوس اصل میں شیطان ہو جو کبھی دابہ کی صورت میں ظاہر ہوتا ہو اور کبھی عورت کی صورت میں، کیونکہ شیطان کو مختلف شکلیں اختیار کرنے کی قدرت دی گئی ہے۔

اور یہ بھی احتمال ہے کہ (جاسوس تو عورت ہو مگر) عورت کو مجازاً "دابہ" سے تعبیر کیا گیا ہو۔ جیسا کہ ارشاد باری: ﴿إِنَّ شَرَّ

الدَّوَآبِّ عِنْدَ اللّٰهِ الصُّمُّ الْبُكْمُ﴾ [الانفال:۲۲] ''بے شک بدترین خلائق اللہ کے نزدیک وہ لوگ ہیں جو بہرے ہیں، گونگے ہیں'' میں ہے۔

میں (ملا علی قاریؒ) کہتا ہوں کہ استشہاد کیلئے قرآن کی اس آیتکو پیش کرنا زیادہ ظاہر ہے: ﴿وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْأَرْضِ إِلَّا عَلَى اللّٰهِ رِزْقُهَا﴾ [ھود:٦] اور کوئی (رزق کھانے والا) جاندار روئے زمین پر چلنے والا ایسا نہیں کہ جس کی روزی اللہ کے ذمہ نہ ہو کیونکہ اس آیت میں لفظ ''دابة'' دونوں قسم کی مخلوق کو شامل ہے، بخلاف پچھلی آیت کے، کہ اس میں ''دواب'' سے حیوانات مراد ہیں۔ چنانچہ قرآن کی اس آیت: ﴿إِنْ هُمْ إِلَّا كَالْأَنْعَامِ بَلْ هُمْ أَضَلُّ سَبِيلًا﴾ [الفرقان:٤٤] ''یہ تو چوپایوں کی طرح ہیں (کہ وہ بات سنتے ہیں سمجھتے نہیں ہیں بلکہ ان سے بھی زیادہ بے بہرہ ہیں کے معنی میں ہے۔

''تجر شعرها'': ''امرأة'' کے لئے صفت ہے اور اس عورت کے بالوں کے لمبا ہونے سے کنایہ ہے۔

''شعر'' عین کو متحرک اور ساکن دونوں طرح پڑھنا درست ہے۔

قوله: اذهب الٰی ذلك القصر......:

ای ''قصر'' کو گزشتہ حدیث میں ''دیر'' سے تعبیر کیا گیا تھا۔

مسلسل: ''رجل'' کے لئے دوسری صفت ہے۔ ای رجل مقيد بالسلاسل (زنجیروں میں جکڑا ہوا مرد)۔

فی الاغلال: (فی بمعنی ''مع''۔) ای مع الاغلال (زنجیروں کے ساتھ طوق)

ینزو: نون کے سکون اور زاء کے ضمہ کے ساتھ۔ اچھلنا کودنا۔

اور قائلین کا کہنا کہ یہ (یعنی فیما بین السماء والارض) ''مسلسل'' کے متعلق ہے۔ (اس صورت میں مطلب ہوگا وہ زنجیروں میں آسمانوں وزمین کے درمیان لٹکا ہوا ہے) یہ بات بعید ہے۔

۵۴۸۵ : وَعَنْ عُبَادَةَ بْنِ الصَّامِتِ عَنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ إِنِّي حَدَّثْتُكُمْ عَنِ الدَّجَّالِ حَتّٰى خَشِيْتُ أَنْ لَّا تَعْقِلُوْا أَنَّ الْمَسِيْحَ الدَّجَّالَ قَصِيْرٌ أَفْحَجُ جَعْدٌ أَعْوَرُ مَطْمُوْسُ الْعَيْنِ لَيْسَتْ بِنَاتِئَةٍ وَلَا حَجْرَآءَ فَإِنْ أُلْبِسَ عَلَيْكُمْ فَاعْلَمُوْا أَنَّ رَبَّكُمْ لَيْسَ بِأَعْوَرَ. (رواه ابوداود)

اخرجه ابو داوٗد فی السنن ٤٩٥/٤ حديث رقم ٤٣٢٠ واحمد فی المسند ٣٢٤/٥۔

ترجمہ: ''حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ رسول اللہ ﷺ سے نقل فرماتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''میں نے تم لوگوں سے دجال سے متعلق اس خطرہ سے (مکرر) بیان کیا ہے کہ کہیں (محض ایک دفعہ بتلانے سے) تمہاری سمجھ میں نہ آئے۔ بلاشبہ دجال چھوٹے قد کا ہے' پھڈا ہے' اس کے بال مڑے ہوئے ہیں (ایک آنکھ سے) کانا ہے اور (دوسری) آنکھ سلپٹ یعنی بالکل محو ہو چکی ہے' اس کی آنکھ نہ ابھری ہوئی ہے اور نہ اندر کو دھنسی ہوئی۔ اس کے بعد بھی اگر تم پر اس کا معاملہ ملتبس ہو جائے (یعنی میں نے دجال کا جو حلیہ بیان کیا ہے وہ بھول جانے کے سبب اور اس کے مافوق الفطرت کے کارناموں کی وجہ سے اس کا دعویٰ الوہیت اگر تمہیں کسی وجہ میں تشویش میں

ڈالے تو) اتنی بات یاد رکھنا کہ تمہارا پروردگار کانا نہیں ہے''۔ (ابوداؤد)

تشریح: قوله: انی حدثتکم عن الدجال حتی خشیت ان لاتعقلوا:

مطلب یہ ہے کہ میں نے جو دجال کے بارے میں تمہیں باتیں بتائیں ہیں، ان کی کثرت کی وجہ سے تم کہیں ان باتوں کو بھول نہ جاؤ۔

علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں: ''حتی'' حدثتکم کے لئے غایت ہے۔ ای حدثتکم احادیث تی خشیت ان یلتبس علیکم الامر فلاتعقلوه فاعقلوه کہ میں نے تم لوگوں کو دجال کے بارے میں متفرق باتیں بتائی ہیں مجھے یہ خوف ہے کہ کہیں تم لوگوں کو التباس نہ ہو جائے اور تم ان باتوں کو اچھی طرح سمجھ نہ پاؤ، چنانچہ خوب سمجھ لو۔

قوله: ان المسیح الدجال ...... ولا جحراء:

ان: اس میں ہمزہ مکسور ہے۔ یہ جملہ ''ان المسیح الدجال'' مستأنفہ ہے۔ دجال سے متعلقہ ان باتوں کی تاکید کیلئے ہے، جن کے بارے میں صحابہ کرامؓ کو التباس ہونے کا اندیشہ تھا۔ (انتہی)۔

کہا گیا ہے کہ خشیت'' رجوت'' کے معنی میں ہے اور ''لا'' زائدہ ہے۔

قصیر: اس صفت کا گذشتہ حدیث میں مذکورہ صفت ''اعظم انسان'' کے ساتھ تعارض ہے۔

ان دونوں میں تطبیق اس طرح ہے کہ یہ کوئی بعید نہیں کہ دجال پست قد کا طن انسان ہو، اور ان اوصاف کی دجال کے بہت بڑے فتنہ باز ہونے سے بہت مناسبت ہے۔

یا ''اعظم انسان'' میں عظمت سے دجال کی ''ہیبت کی عظمت'' مراد ہو۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ ممکن ہے ظاہر ہونے کے وقت اللہ اس کی ہیئت کو تبدیل کر دے۔

أفحج: جیم سے پہلے حاء ہے۔ وہ شخص کہ جس کے قدم کے اگلے حصے قریب اور ایڑیاں دور ہوں اور ٹانگوں کے درمیان کشادگی ہو اور ''اروح'' اس کے برعکس ہے۔

اور نہایہ میں لکھا ہے'' الفحج '' کا معنی ہے دونوں رانوں کے درمیان معمول سے زیادہ فاصلہ کا ہونا۔

جعد: مبتدا ''شعره'' محذوف ہے۔

اعور: (اس کا مبتدا محذوف ہے۔) ''احدیٰ عینیه''

مطموس العین: یعنی دوسری آنکھ کے اعتبار سے یہ آنکھ مٹ چکی ہوگی۔

لیست: ضمیر مرفوع کا مرجع ''عینه'' ہے۔

ناتئة: ''النتوء'' مصدر سے اسم فاعل کا صیغہ ہے، جس کا معنی ''ابھری ہوئی'' ہے۔

حجراء: حاء کے فتحہ اور جیم کے سکون کے ساتھ'' دھنسی ہوئی''۔

یہ جملہ منفیہ آنکھ کے ممسوح (ہموار) ہونے کی تاکید کیلئے ذکر کیا گیا ہے۔ اور یہ بات اس کے منافی نہیں ہے کہ دوسری آنکھ انگور کے دانے کی طرح اُٹھی ہوئی ہوگی۔ جیسا کہ اس کی وضاحت پچھلی حدیث میں گذر چکی ہے واللہ اعلم۔

قولہ: فان البس علیکم:

البس: مجہول کا صیغہ ہے۔

(اس جملہ کے دو مطلب ہو سکتے ہیں:)

1. میں نے دجال کے بارے میں جو احوال بتائے ہیں، اگر ان کے بھول جانے کی وجہ سے دجال کا معاملہ تم پر مشتبہ ہو جائے۔
2. دجال جو خلاف عادت کام کرے گا، اگر ان کی وجہ سے اس کے الوہیت کا دعویٰ کرنے والا معاملہ تم پر مشتبہ ہو جائے۔

قولہ: فاعلموا ان ربکم لیس باعور:

یعنی ربوبیت کی وہ کم از کم صفت جس کی معرفت ضروری ہے وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ حدوث و عیوب خصوصاً نظر آنے والے ظاہری عیوب سے پاک ہے،

تخریج: اسی طرح اس حدیث کو امام نسائیؒ نے بھی نقل کیا ہے۔

۵۴۸۶ : وَعَنْ اَبِیْ عُبَیْدَةَ ابْنِ الْجَرَّاحِ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ اِنَّهٗ لَمْ يَكُنْ نَبِيٌّ بَعْدَ نُوْحٍ اِلَّا قَدْ اَنْذَرَ الدَّجَّالَ قَوْمَهٗ وَاِنِّیْ اُنْذِرُكُمُوْهُ فَوَصَفَهٗ لَنَا قَالَ لَعَلَّهٗ سَيُدْرِكُهٗ بَعْضُ مَنْ رَاٰنِیْ اَوْ سَمِعَ كَلَامِیْ قَالُوْا يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ فَكَيْفَ قُلُوْبُنَا يَوْمَئِذٍ قَالَ مِثْلُهَا يَعْنِی الْيَوْمَ اَوْ خَيْرٌ . (رواہ الترمذی وابوداود)

اخرجه ابو داؤد فی السنن ۱۱۷/۵ حدیث رقم ۴۷۵۶ والترمذی فی السنن ٤٤٠/٤ حدیث رقم ۲۲۳٤ واحمد فی المسند ۱۷۸/۲۔

ترجمہ: ''حضرت عبیدہ بن الجراح رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا کہ میں نے پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ ارشاد فرماتے ہوئے سنا: ''اس میں کوئی شبہ نہیں کہ نوح علیہ السلام کے بعد کوئی نبی نہیں گزرا مگر اس نے اپنی امت کو دجال سے ڈرایا تھا اور میں بھی (بار بار مختلف مواقع پر دجال کے احوال مکر و تلبیس اور اس کی حقیقت و حیثیت کا تذکرہ کر کے) تمہیں اس سے ڈراتا رہتا ہوں'' اس کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم سے دجال کا تعارف کروایا اور پھر ارشاد فرمایا: ''شاید ان لوگوں میں سے کہ جنہوں نے مجھے دیکھا ہے یا میرا کلام سنا ہے' کوئی شخص اس (کے زمانہ) کو پالے' صحابہؓ نے (یہ سن کر) عرض کیا کہ یا رسول اللہ! اس وقت ہمارے دلوں کی (یعنی اہل ایمان کے قلوب کی) کیا کیفیت؟'' فرمایا بالکل اسی طرح اس وقت ہے یا اس سے بھی بہتر''۔ (ترمذی' ابوداؤد)

راوئ حدیث:

ابوعبیدۃ بن الجراح۔ یہ ابوعبیدہ عامر ابن عبداللہ بن جراح رضی اللہ عنہ فہری وقریشی ہیں۔ان کا نسب باپ کی طرف سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ''فہر بن مالک'' پر مل جاتا ہے۔عشرہ مبشرہ میں سے ہیں۔اس امت کے امین کے لقب سے ملقب ہیں۔ حضرت عثمان بن مظعون رضی اللہ عنہ کے ساتھ اسلام لائے۔حبشہ کی دوسری مرتبہ ہجرت کی۔تمام غزوات میں آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ شریک ہوئے۔آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ غزوۂ احد میں ثابت قدم رہے۔انہوں نے ہی خود کی ان دوکڑیوں کو جو آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے چہرہ انور میں گھس گئی تھیں کھینچا تھا۔جن کی وجہ سے آپ رضی اللہ عنہ کے آگے کے دو دانت شہید ہو گئے تھے۔یہ لمبے قد کے دبلے 'خوبصورت اور ہلکی داڑھی والے تھے۔طاعون ''عمواس'' ۱۸ھ میں ان کا انتقال مقام ''اردن'' میں ہوا۔''بیسان'' میں دفن ہوئے۔ان کی نمازِ جنازہ حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ نے پڑھائی۔ان کی عمر اٹھاون (۵۸) سال کی ہوئی۔ان سے ایک جماعت صحابہ رضی اللہ عنہم روایت کرتی ہے۔

تشریح: قوله:انه لم یکن نبی...... وانی انذر کموه:

انه:یہ ضمیر،ضمیر شان ہے۔

قد انذر الدخال قومه:دوسرے مفعول (یعنی ''الدجال'') کو اہتمام کی وجہ سے مقدم کیا گیا ہے۔ماقبل میں گزرا ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام نے اپنی قوم کو دجال سے ڈرایا ہے۔پس معلوم ہوا کہ نوح علیہ السلام کی قید احترازی نہیں ہے۔

قوله:لعله سیدرکه بعض من رآنی او سمع کلامی:

یعنی دجال کے جلدی ظہور کی صورت میں بعض صحابہ اس کے زمانے کو پالیں گے۔

اور کہا گیا ہے کہ یہ ارشاد حضرت خضر علیہ السلام کے باقی رہنے پر دال ہے۔

''او'': یہ راوی کی طرف سے شک کیلئے نہیں ہے بلکہ بیان نوع کیلئے ہے۔کیونکہ رؤیت سے سماع لازم نہیں آتا،چنانچہ ''او' مانعۃ الخلو کا فائدہ دینے کیلئے ہے کیونکہ (رؤیت اور سماع کا) جمع ممکن ہے۔اور بعض کا کہنا ہے کہ مطلب یہ ہے کہ یا میری حدیث یوں سن لے کہ میری حدیث اس تک پہنچ جائے،اگرچہ کچھ بعد میں پہنچے۔

قوله:قالوا یا رسول الله ......:

اس میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ دجال کا جادو ایمان والوں کے دلوں میں اثر نہیں کرے گا،اگرچہ ان کی نگاہوں (یعنی یقین سے کم درجے میں کچھ باتوں کا خیال آجائے)

'' مثلها'':ضمیر مجرور کا مرجع ''قلوبکم'' ہے۔

''او خیر'':''او'' راوی کے شک پر دلالت کے لئے ہے۔اور اشخاص کے اعتبار سے نوع کے بیان کیلئے بھی ہوسکتا ہے۔

اسنادی حیثیت: کہا گیا ہے کہ امام ترمذیؒ نے اس حدیث کو حسن قرار دیا ہے۔

۵۴۸۷ : وَعَنْ عَمْرِو بْنِ حُرَيْثٍ عَنْ اَبِي بَكْرٍ الصِّدِّيْقِ قَالَ حَدَّثَنَا رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ الدَّجَّالُ يَخْرُجُ مِنْ اَرْضٍ بِالْمَشْرِقِ يُقَالُ لَهَا خُرَاسَانُ يَتْبَعُهُ اَقْوَامٌ كَاَنَّ وُجُوْهَهُمُ الْمَجَانُ الْمُطْرَقَةُ ۔ (رواه الترمذى)

اخرجه الترمذى فى السنن ٤٤١/٤ حديث رقم ٢٢٣٧ وابن ماجه فى السنن ١٣٥٣/٢ حديث رقم ٢٢٣٧ واحمد فى المسند ٤/١

ترجمہ: ''حضرت عمرو بن حریث' سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے نقل فرماتے ہیں کہ انہوں نے بیان فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ نے ہم سے بیان فرمایا کہ ''دجال روئے زمین کے ایک ایسے علاقہ سے نکلے جو مشرق میں واقع ہے اور جس کو خراسان کا نام دیا جاتا ہے' اس کی پیروکار بہت سی قومیں ہوں گی اور ان لوگوں کے چہرے تہہ بہ تہہ پھولی ہوئی ڈھال کی طرح ہوں گے''۔ (ترمذی)

تشریح: **قوله:عن عمرو بن حريث عن ابى بكر الصديق رضى الله عنهما:**

حريث: از ''حرث '' بمعنیٰ '' زرع'' کی تصغیر ہے۔

عنهما: میں تثنیہ کی ضمیر ہے، اس لئے کہ اس حدیث میں (چھوٹے) صحابی (بڑے) صحابی سے روایت کرر ہے ہیں۔

قوله:حدثنا رسول الله قال ...... يتبعه اقوام:

قال: جملہ مستانفہ ہے'' حدثنا'' کی تاکید کیلئے ذکر کیا گیا ہے۔ یا امام شاطبی اور ان کے متبعین کے مذہب پر کہ فعل بھی بدل بن سکتا ہے۔ یہ بدل ہے، اور یہی صحیح ترین قول ہے، یا تقدیری عبارت یوں ہے:''حدثنا اشياء من جملتها قال''

''خراسان'': اس میں ''خاء'' مضموم ہے۔ قاموس میں لکھا ہے کہ خراسان، عراق اور ماوراء النہر کے درمیان ایک معروف شہر ہے، اور اب اس علاقے کا بڑا شہر ہرات ہے، جس کا نام خراسان رکھا گیا ہے، جیسا کہ دمشق کو شام کا نام دیا گیا ہے۔

يتبعه: تاء کے سکون اور یاء کے فتحہ کے ساتھ ہے اور ایک نسخہ میں تاء کی تشدید اور باء کے کسرہ کے ساتھ ہے۔

اقوام: یعنی یہ عجیب وغریب طرح کے انسان جو جنات کے مشابہ ہونگے۔

قوله: كان وجوهم المجان المطرقة:

المجان: میم کے فتحہ اور نون کی تشدید کے ساتھ '' المجن'' میم کے کسرہ کے ساتھ کی جمع ہے ''ڈھال''۔

المطرقة: سیدؒ کے اور دوسرے اکثر نسخوں میں یہ لفظ ''میم'' کے ضمہ اور ''طاء'' کے سکون کے ساتھ منقول ہے۔

علامہ سیوطیؒ فرماتے ہیں کہ یہ لفظ ''راء'' کی تشدید اور تخفیف کے ساتھ دونوں طرح نقل کیا گیا ہے۔ چنانچہ باب افعال سے اسم مفعول ہے، یا باب تفعیل سے۔

''طراق'' طاء کے کسرہ کے ساتھ' وہ چمڑہ جو ڈھال کے بقدر کاٹا جاتا ہے، اور ڈھال کی پشت پر چپکا دیا جاتا ہے۔

مطلب یہ ہے کہ اُن کے چہرے چوڑے ہونگے اور ان کے رخسار ڈھال کی طرح ابھرے ہوئے ہونگے۔ اور یہ وصف

ماوراء النہر کے علاقوں میں اُزبک اور ترک لوگوں میں پایا جاتا ہے۔ اور ممکن ہے کہ یہ لوگ دجال کے پاس آئیں، جیسا کہ لفظ "یتبعه" اس کی طرف اشارہ کر رہا ہے، یا یہ لوگ اُس وقت خراسان میں موجود ہونگے۔ (میری دعا ہے کہ) اللہ تعالیٰ خراسان کو زمانے کی آفات سے محفوظ فرمائے۔

تخریج: اسی طرح ابن ماجہ اور حاکمؒ نے بھی اس روایت کو نقل کیا ہے۔

۵۴۸۸ : وَعَنْ عِمْرَانَ بْنِ حُصَيْنٍ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ سَمِعَ بِالدَّجَّالِ فَلْيَنْأَ مِنْهُ فَوَاللّٰهِ اِنَّ الرَّجُلَ لَيَاتِيهِ وَهُوَ يَحْسِبُ اَنَّهُ مُؤْمِنٌ فَيَتْبَعُهُ مِمَّا يُبْعَثُ بِهِ مِنَ الشُّبُهَاتِ.

(رواه ابوداود)

اخرجه ابو داؤد فی السنن ٤٩٥/٤ حديث رقم ٤٣١٩ واحمد فی المسند ٤٣١/٤۔

ترجمہ: "حضرت عمران بن حصین رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا کہ پیغمبر خدا ﷺ نے ارشاد فرمایا: جو شخص دجال کے ظاہر ہونے کی خبر سنے اس کو چاہئے کہ وہ اس سے کنارہ کش رہے بخدا ایک شخص دجال کے پاس آئے گا اور وہ یہ گمان رکھتا ہوگا کہ میں مؤمن ہوں لیکن وہ ان شبہ میں ڈال دینے والی چیزوں کی وجہ سے اس کے پیچھے لگ جائے گا جو چیزیں دیکر وہ بھیجا گیا ہوگا۔ (ابوداؤد)

تشریح: قوله: من سمع بالدجال ......:

فلینأ: یاء کے فتحہ نون کے سکون اور ہمزہ کے فتحہ کے ساتھ' نأیٰ ینأیٰ سے امر غائب کا صیغہ ہے الف جزم کی وجہ سے حذف کیا گیا ہے بمعنی **فلیبعد**

دجال سے دور رہنے کی ترغیب اس لئے دی کہ دجال سے دور رہنے میں سعادت ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿ وَلَا تَرْكَنُوْٓا اِلَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا فَتَمَسَّكُمُ النَّارُ﴾[هود۔ ۱۱۳] "اور (اے مسلمانو) ان ظالموں کی طرف مت جھکو کبھی تم کو بھی دوزخ کی آگ لگ جاوے"" الركون " کا معنی ہے قریب ہونا۔

یحسب: سین کو مکسور اور مفتوح دونوں طرح پڑھنا درست ہے۔

یتبعه: باء کی تشدید اور تخفیف دونوں درست ہیں۔ بمعنی يطيعه. (یعنی اس کی پیروی کرنے لگے گا)

یبعث به: یا کو مضموم و مفتوح دونوں طرح پڑھنا درست ہے۔

"**الشبهات**": اس سے وہ امور مراد ہیں، جو اشکال میں مبتلا کر دیتے ہیں، مثلاً سحر کرنا، اور مُردوں کو زندہ کرنا وغیرہ۔ چنانچہ اس کا تابع کافر ہو جائے گا، اور اس کو احساس بھی نہیں ہوگا۔

۵۴۸۹ : وَعَنْ اَسْمَآءَ بِنْتِ يَزِيْدَ بْنِ السَّكَنِ قَالَتْ قَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَمْكُثُ الدَّجَّالُ فِي الْاَرْضِ اَرْبَعِيْنَ سَنَةً السَّنَةُ كَالشَّهْرِ وَالشَّهْرُ كَالْجُمُعَةِ وَالْجُمُعَةُ كَالْيَوْمِ وَالْيَوْمُ كَاضْطِرَامِ السَّعَفَةِ فِي النَّارِ . (رواه في شرح السنة)

اخرجه البغوی فی شرح السنة ۱۵/۶۲ حدیث رقم ۴۲۶۴ واحمد فی المسند ۶/۴۵٤۔

ترجمہ: ''حضرت اسماء بنت یزید بن سکن رضی اللہ عنہا نے بیان فرمایا کہ نبی اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا: روئے زمین پر دجال چالیس برس تک رہے گا' (اس وقت) سال مہینہ کے برابر ہوگا' مہینہ ہفتہ کے برابر اور ہفتہ ایک دن کے برابر ہوگا اور ایک دن اتنے کم عرصہ کا ہوگا جتنے عرصہ میں کھجور کی خشک شاخ آگ میں جل جاتی ہے اس روایت کو بغوی نے شرح السنۃ میں روایت کیا ہے''۔

راویٔ حدیث:

تشریح: اُسماء بنت یزید بن السکن: یہ انصاریہ ہیں' بڑی دیندار اور عقل مند خاتون تھیں۔ ''السکن'' میں سین اور کاف دونوں مفتوح ہیں۔

قوله:یمکث الدجال فی الارض اربعین سنة ...... کالجمة والیوم:

ماقبل میں گذرا ہے کہ دجال زمین پر چالیس یوم تک رہے گا۔

دونوں میں تطبیق یہ ہے کہ روایات کا اختلاف' کمیت اور کیفیت کے اختلاف کی وجہ سے ہو' جیسا کہ ''**السنة کالشهر**'' اس کی طرف اشارہ کررہا ہے۔ یا عرست انقضاء پر محمول ہو کہ وقت تیزی کے ساتھ گزرے گا، جیسا کہ پہلے ایک حدیث میں گذرا: ''**یوم کسنة**''

علاوہ ازیں روایات کا یہ اختلاف احوال وافراد کے اختلاف پر بھی محمول ہوسکتا ہے۔

قوله:الیوم کا ضطرام السعفة فی النار:

السعفة: سین اور عین کے فتحہ کے ساتھ ''**السعف**'' کا واحد ہے۔ ''**السعفه**'' کا معنی ہے کھجور کی ٹہنی۔ یعنی جتنی دیر میں کھجور کے پتے آگ میں جل جاتے ہیں۔

''**الاضطرام**'' اس کا معنی ہے: **الاشتعال و الالتهاب**، اور مطلب یہ ہے کہ دِن ایک گھڑی کی طرح گزرے گا۔

۵۴۹۰ : **وَعَنْ اَبِیْ سَعِیْدِ نِالْخُدْرِیِّ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ یَتْبَعُ الدَّجَّالَ مِنْ اُمَّتِیْ سَبْعُوْنَ اَلْفًا عَلَیْهِمُ السِّیْجَانُ.** (رواہ فی شرح السنة)

اخرجه البغوی فی شرح السنة ۱۵/۶۲ حدیث رقم ۴۲۶۵۔

ترجمہ: ''حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: میری اُمت میں سے ستر ہزار افراد کہ جن کے سروں پر سیجان (چادریں) پڑی ہوں گے دجال کی اطاعت اختیار کرلیں گے'' (اس روایت کو بغوی نے شرح السنۃ میں نقل کیا ہے)''۔

تشریح: **قوله:یتبع الدجال من امتی ....:**

امتی ''اُمت'' سے امت دعوت بھی مراد ہوسکتی ہے اور اُمت اجابت بھی اور زیادہ واضح یہی ہے کہ امت دعوت مراد

ہے۔ کیونکہ پہلے گزر گیا کہ یہ لوگ اصفہان کے یہود ہونگے۔

''السیجان'': سین کے کسرہ کے ساتھ ہے یہ'' ساج'' کی جمع ہے جیسا کہ'' تیجان''، تاج کی جمع ہے اور'' ساج'' کا معنی ہے سبز رنگ کی چادر۔

ابن الملکؒ فرماتے ہیں، جب مالدار لوگ ستر ہزار کی تعداد میں ہونگے، تو فقراء کے بارے میں آپ کا کیا گمان ہے۔ (کہ وہ کتنی تعداد میں ہوں گے)

میں (ملا علی قاریؒ) کہتا ہوں کہ فقراء، مفلس ہونے کے سبب سے اللہ کی امان میں ہوں گے، الا یہ کہ فقراء بھی ایسے ہوں جن کو مال وجاہ کی حرص ہو، تو وہ بھی مالداروں کے حکم میں ہیں، اور کثرتِ مال حاصل کرنے کیلئے مال والے کی اتباع کرتے ہیں، چاہے وہ مال والا حق پر ہو، چاہے باطل پر ہو، جیسا کہ پہلے زمانے میں یعنی یزید، حجاج اور ابن زیاد کے زمانے میں اسکا مشاہدہ کیا جا چکا ہے۔ اور اسی طرح ہر سال بلکہ روزانہ لوگوں میں فاسد و کاسد اغراض و مناصب کا سد کیلئے فساد بڑھتا جا رہا ہے اور ہم اللہ تعالیٰ سے عفو، عافیت اور حسن خاتمہ کا سوال کرتے ہیں۔

اسنادی حیثیت: کہا گیا ہے کہ اس حدیث کی سند میں ابو ہارون راوی متروک ہے۔

۵۴۹۱ : وَعَنْ اَسْمَاءَ بِنْتِ يَزِيْدَ قَالَتْ كَانَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِيْ بَيْتِيْ فَذَكَرَ الدَّجَّالَ فَقَالَ اِنَّ بَيْنَ يَدَيْهِ ثَلٰثَ سِنِيْنَ سَنَةٌ تُمْسِكُ السَّمَاءُ فِيْهَا ثُلُثَ قَطْرِهَا وَالْاَرْضُ ثُلُثَ نَبَاتِهَا وَالثَّانِيَةُ تُمْسِكُ السَّمَاءُ ثُلُثَيْ قَطْرِهَا وَالْاَرْضُ ثُلُثَيْ نَبَاتِهَا وَالثَّالِثَةُ تُمْسِكُ السَّمَاءُ قَطْرَهَا كُلَّهٗ وَالْاَرْضُ نَبَا تَهَا كُلَّهٗ وَلَا يَبْقٰى ذَاتُ ظِلْفٍ وَّلَا ذَاتُ ضِرْسٍ مِّنَ الْبَهَآئِمِ اِلَّا هَلَكَ وَاِنَّ مِنْ اَشَدِّ فِتْنَتِهٖ اَنَّهٗ يَاْتِي الْاَعْرَابِيَّ فَيَقُوْلُ اَرَاَيْتَ اِنْ اَحْيَيْتُ لَكَ اِبِلَكَ اَلَسْتَ تَعْلَمُ اَنِّيْ رَبُّكَ فَيَقُوْلُ بَلٰى فَيُمَثِّلُ لَهُ الشَّيْطَانُ نَحْوَ اِبِلِهٖ كَاَحْسَنِ مَا يَكُوْنُ ضُرُوْعًا وَّاَعْظَمِهٖ اَسْنِمَةً قَالَ وَيَاْتِي الرَّجُلَ قَدْ مَاتَ اَخُوْهُ وَمَاتَ اَبُوْهُ فَيَقُوْلُ اَرَاَيْتَ اِنْ اَحْيَيْتُ لَكَ اَبَاكَ وَاَخَاكَ اَلَسْتَ تَعْلَمُ اَنِّيْ رَبُّكَ فَيَقُوْلُ بَلٰى فَيُمَثِّلُ لَهُ الشَّيَاطِيْنَ نَحْوَ اَبِيْهِ وَاَخِيْهِ قَالَتْ ثُمَّ خَرَجَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لِحَاجَتِهٖ ثُمَّ رَجَعَ وَالْقَوْمُ فِي اهْتِمَامٍ وَّغَمٍّ مِّمَّا حَدَّثَهُمْ قَالَتْ فَاَخَذَ بِلَحْمَتَيِ الْبَابِ فَقَالَ مَهْيَمْ اَسْمَاءُ قُلْتُ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ لَقَدْ خَلَعْتَ اَفْئِدَتَنَا بِذِكْرِ الدَّجَّالِ قَالَ اِنْ يَّخْرُجْ وَاَنَا حَيٌّ فَاَنَا حَجِيْجُهٗ وَاِلَّا فَاِنَّ رَبِّيْ خَلِيْفَتِيْ عَلٰى كُلِّ مُؤْمِنٍ فَقُلْتُ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ وَاللّٰهِ اِنَّا لَنَعْجِنُ عَجِيْنَنَا فَمَا نَخْبِزُهٗ حَتّٰى نَجُوْعَ فَكَيْفَ بِالْمُؤْمِنِيْنَ يَوْمَئِذٍ قَالَ يُجْزِئُهُمْ مَا يُجْزِئُ اَهْلَ السَّمَاءِ مِنَ التَّسْبِيْحِ وَالتَّقْدِيْسِ -

اخرجه ابن ماجه فى السنن ۱۳۵۹/۲ حديث رقم ۴۰۷۷ واحمد فى المسند ۴۵۵/۶

ترجمہ: ''حضرت اسماء بنت یزید بن سکن رضی اللہ عنہا نے بیان فرمایا کہ (ایک روز) نبی کریم ﷺ میرے گھر

میں تشریف فرما تھے کہ آنحضرت ﷺ نے دجال کا تذکرہ فرمایا اور ارشاد فرمایا: ''دجال کے ظہور پذیر ہونے سے قبل تین سال ایسے (بے برکت) ہوں گے کہ پہلے سال تو آسمان تہائی بارش کو اور زمین تہائی نباتات کو روک لے گی پھر دوسرے سال آسمان دو تہائی بارش کو اور زمین دو تہائی اناج و نباتات کو روک لے گی اور پھر تیسرے سال آسمان تمام بارش اور زمین اپنی تمام نباتات کو روک لے گی یہاں تک کہ جس وقت دجال ظاہر ہوگا تو تمام روئے زمین پر قحط کا دور دورہ ہوگا صرف انسان سخت ترین معاشی و غذائی بحران سے دو چار ہوں گے بلکہ مویشیوں اور چوپایوں میں بھی بھکری پھیل چکی ہوگی چنانچہ نہ تو کوئی کھر والا جانور باقی رہے گا اور نہ وحشی جانوروں میں سے کوئی کچلی والا بلکہ سب ہلاک ہو جائیں گے اور اس کے برعکس دجال بہت سے خزائن کا مالک و قابض سمجھا جائے گا جس کی وجہ سے معاشی بحران سے نجات پانے کی آسان صورت صرف دجال کی اتباع و اطاعت نظر آئے گی' اس طرح لوگوں میں اپنی خدائی کا سکہ جمانے اور گمراہی کا سخت ترین فتنہ پھیلانے کے لئے وہ ان چیزوں کا سہارا لے گا) چنانچہ اس کا سخت ترین فتنہ یہ ہوگا کہ وہ علم و دانائی سے بے بہرہ ایک دیہاتی کے پاس آئے گا اور اس سے کہے گا کہ تمہارا کیا خیال ہے' اگر میں تیرے ان اونٹوں کو زندہ کر دوں (جو قحط کی وجہ سے مر گئے ہیں) تو کیا تو یہ مان لے گا کہ میں تیرا پروردگار ہوں؟ دیہاتی جواب دے گا کہ ہاں میں تجھے اپنا پروردگار تسلیم کر لوں گا۔ تب شیطان اس کے اونٹوں کی صورت اختیار کر لے گا اور وہ اونٹ تھنوں کی درازی اور کوہانوں کی بلندی کے لحاظ سے اس کے اونٹوں سے بہتر دکھائی دیں گے۔ آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا: دجال کا اسی طرح کا ایک سنگین فتنہ یہ ہوگا کہ پھر وہ ایک شخص کے پاس آئے گا جس کا باپ اور بھائی مر گئے ہوں گے اور اس سے کہے گا کہ تیرا کیا خیال ہے' اگر میں تیرے (مرے ہوئے) بھائی اور باپ کو زندہ کر دوں تو کیا تو مان لے گا کہ میں تیرا پروردگار ہوں؟ وہ شخص جواب دے گا کہ کیوں نہیں! (میں تجھے اپنا پروردگار مان لوں گا) تب پھر شیاطین اس شخص کے بھائی اور باپ کی شکل و صورت اختیار کر لیں گے۔ حضرت اسماء رضی اللہ عنہا کا بیان ہے کہ آنحضرت ﷺ یہ فرما کر کسی ضرورت سے باہر تشریف لے گئے اور پھر تھوڑی دیر کے بعد مجلس میں تشریف لے آئے اس وقت حاضرین مجلس جو باتیں حضور ﷺ نے ان کو بتلائی تھیں انہیں سن کر غم و فکر کی کیفیت میں تھے۔ حضرت اسماء رضی اللہ عنہا نے عرض کیا کہ یا رسول اللہؐ! آپ ﷺ نے تو (دجال کا ذکر کر کے) ہمارے دل (مارے دہشت کے) نکال لئے ہیں۔ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا میں تو دلائل و حجت سے اس کو مغلوب کر دوں گا اور اگر وہ اس وقت نکلا جب میں دنیا میں موجود نہ ہوں گا تو اس بات میں کوئی شبہ نہیں کہ میرا رب ہر مؤمن کے لئے میرا وکیل و خلیفہ ہوگا پھر میں نے عرض کیا کہ یا رسول اللہؐ بھوک حالت میں انسان کی بے صبری کا عالم تو یہ ہوتا ہے کہ ہم آٹا گوندھتے ہیں اور اس کی روٹی پکا کر فارغ نہیں ہوتے کہ بھوک سے ہم بے قرار ہو جاتے ہیں تو (ایسی صورت میں اس وقت جب کہ قحط سالی پھیلی ہوئی ہوگی' غذائی اشیاء دجال کے تسلط میں ہوں گی اور کھانے پینے کی چیزیں صرف وہی شخص پا سکے گا جو دجال کی اتباع کرے گا) آخر میں مؤمنین کا کیا حال ہوگا (یعنی وہ اپنی بھوک کو کیسے مٹائیں گے اور انہیں صبر و قرار کس طرح نصیب ہوگا؟) آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا: ان کے لئے وہی چیز کفایت کرے گی جو آسمان والوں یعنی فرشتوں کو کافی ہوتی ہے یعنی اللہ رب العزت کی تسبیح و تقدیس''۔

تشریح: قوله: ان بين يديه ثلاث سنين ...... الاهلك؟

سنة: یہ مرفوع ہے اور ایک نسخہ میں منصوب ہے۔

قطرها: قاف کے فتحہ کے ساتھ۔ اس سے مراد معمول کے مطابق شہروں میں برسنے والی بارش ہے۔

الأرض: اس کا عطف "السماء" پر ہے۔

ثلث نباتها: اگرچہ وہ زمین بارش کے پانی کے علاوہ کسی اور پانی سے سیراب ہوتی ہو۔

والثانية: (موصوف "السنة" محذوف ہے۔) ای "السنة الثانية" یہ بھی مرفوع ہے، اور اس کو بدل یا مفعول فیہ ہونے کی بناء پر منصوب پڑھنا بھی درست ہے۔

فلا يبقى: مذکر کے صیغہ کے ساتھ بھی منقول ہے اور مؤنث کے صیغہ کے ساتھ بھی۔

ذات ظلف: ظاء مکسور ہے، گائے، بکری اور ہرن۔ اور ذات ضرس 'درندوں کو کہتے ہیں۔

الا هلك: (عبارت کی تقدیر یہ ہے:) "لا يبقى في حال من الاحوال الا في حال الهلاك". (یعنی وہ باقی نہیں رہے گا احوال میں سے کسی بھی حال میں مگر حالت ہلاکت میں)

قوله: وان من أشد فتنه..... وأعظمه اسنمة:

الاعرابى: اس سے مراد بدوی اور جواس کی طرح غبی اور ناسمجھ ہو۔

يمثل: ثاء کے کسرہ کے ساتھ ہے جبکہ فتحہ بھی درست ہے)۔

نحو: بمعنی "مِثَال"۔ ای "مثال ابله من الشياطين" جیسا کہ ایک نسخہ میں ہے: "فيمثل له الشياطين نحو ابله"

كأحسن ما يكون: ("ما" مصدریہ ہے) ای "كأحسن اكوانه"

ضروعًا: تمیز ہونے کی وجہ سے منصوب ہے۔

أعظمه: (ضمیر کا مرجع "ما يكون" ہے) ای "اعظم ما يكون من جهة السمن" یعنی جسامت کے اعتبار سے بڑے کوہان والے ہونگے۔

أسنمة: نون کے کسرہ کے ساتھ "السنام" کی جمع ہے۔

قوله: قال وياتي الرجل قد مات ...... ونحوأ خيه:

قال: یہ تاکید کی غرض سے دوبارہ ذکر ہوا ہے، یا چونکہ بیچ میں طویل فاصلہ آ گیا تھا اس لئے بطور تائید کے اعادہ کیا۔

ويأتي الرجل: اس جملے کا عطف "يأتي الأعرابى" پر ہے، چنانچہ یہ بھی ان شدید فتنوں میں سے ہے۔

قد مات أخوه: بطور مثال کے بھائی کا ذکر کیا ہے۔

ومات ابوه: بظاہر یہ واؤ "أوْ" معنی میں ہے، اسی وجہ سے فعل کا اعادہ کیا ہے۔

فیقول أرأیت: یہ خطاب پر اُس شخص سے ہوگا جس کا والد مر گیا ہوگا یا جس کے والدین مر گئے ہوں گے۔

أخاك: سب مراد ہیں، یا صرف بھائی مراد ہے۔

الشیاطین: ترکیب مفعول اول ہے۔ "نحو" مفعول ثانی ہے۔ اور ایک نسخے میں "یمثل" کے بصیغہ مجہول ہے اور "الشیاطین" مرفوع ہے۔ بعض حضرات فرماتے ہیں کہ الشیاطین، منصوب بنزع الخافض ہے، اور اس کی تقدیر "من الشیاطین" کے مطابق ہے۔ اس "نحو" کو اختلاف عاملین کی بناء پر مرفوع اور منصوب دونوں طرح پڑھا جاسکتا ہے۔

قوله: ثم خرج رسول الله ﷺ...... فاخذ بلحمتي الباب:

غم: صحابہ کرامؓ شدید غم میں مبتلا تھے، اور لفظ "اهتمام" کے بعد لفظ "غمّ" کی زیادتی تاکید کیلئے ہے۔

مما حدثهم: ("من" اجلیہ ہے اور "ما" مصدریہ ہے) ای "من أجل تحديثه اياهم به"

بلحمتي: لام کے فتحہ اور حاء کے سکون کے ساتھ، بمعنی ناحية۔ مشکوۃ کے تمام نسخوں میں یہ لفظ اسی طرح منقول ہے۔

(ذکرہ ابن الملکؒ فی شرح مصابیح)

اور مصابیح کے ایک شارح نے لکھا ہے کہ یہ لفظ "بلجفتي الباب"۔ حاء کی جگہ جیم اور میم کی جگہ فاء کے ساتھ ہے۔

علامہ تورپشتی رحمہ اللہ فرماتے ہیں، کہ صحیح الفاظ یہ ہیں: "فاخذ بلجفتي الباب". اس سے مراد "عضادتان" دروازے کے جانبوں کے ستون ہیں، اس کی تفسیر "جانبیہ" بیان کی گئی ہے۔ اور اسی سے "الجاف البئر" ہے یعنی کنویں کے جوانب۔ اور مصابیح میں جو "بلحمتي الباب" کے الفاظ منقول ہیں، یہ درست نہیں، اصحاب حدیث کی کتابوں میں یہ لفظ اسی طرح معروف جو ہم نے ذکر کیا۔

میں (ملا علی قاریؒ) کہتا ہوں اس وضاحت کی تائید قاموس سے ہوتی ہے: اللجف حفر في جانب البئر ولجيفتا الباب جانباه، لیکن تمام نسخے "بلحمتي الباب" کے ضبط پر متفق ہیں۔ چنانچہ قاموس میں لکھا ہے کہ "اللحمة" کا معنی ہے "گوشت کا ٹکڑا"۔ چنانچہ یہاں تجرید مان لی جائے اور کہا جائے کہ "بلحمتي الباب" سے مراد دروازے کے دو ٹکڑے ہیں کیونکہ دروازے کے دو حصے کبھی آپس میں جڑتے ہیں، اور کبھی جدا ہوتے ہیں۔ مصابیح کے تمام راویوں کو غلط قرار دینے کے مقابلہ میں یہ توجیہ کرنا بہتر ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

قوله: فقال مهيم اسماء؟...... على كل مؤمن:

مهيم: "میم" مفتوح، "ھاء" ساکن اور "یاء" مفتوح ہے۔ قاموس میں لکھا ہے: مهيم کلمہ استفہام ہے، جس کا معنی ہے، ای ما حالك؟ او ما شأنك؟ یا ما ورائك؟ او احدث لك شيء؟

قاضی عیاضؒ فرماتے ہیں کہ مهيم یمنی زبان کا کلمہ ہے جس کا معنی ہے ما الحال؟ (یا ما الخبر؟ کیا حال ہے؟) (کیا خبر ہے؟)

"أسماء:" منادیٰ ہے حرف ندا محذوف ہے۔

والا فان ربی خلیفتی علی کل مؤمن: یہ حدیث گذشتہ حدیث کے ان الفاظ "فامرؤ حجیج نفسه" کے منافی نہیں ہے، کیونکہ مطلب یہ ہے کہ ہر شخص کیلئے ضروری ہے، کہ یقینی دلائل کے ذریعے اپنا خود دفاع کرے اور اگر حضور علیہ السلام موجود ہوئے تو پھر کسی کی ضرورت نہیں ہے، بلکہ حضور علیہ السلام ہی اللہ کی تائید کے ساتھ دفاع کریں گے، اور اگر حضورؐ موجود نہ ہوئے تو پھر اللہ تعالیٰ ہی اپنے دین کی حفاظت کرے گا، اور اپنے نبی اور اپنے اولیاء میں سے محمدؐ کے پیرکاروں کی حفاظت کرے گا۔

قوله: یا رسول الله !.......:

لنعجن: جیم مکسور ہے۔

نخبزه: "باء" کو مکسور اور مضموم دونوں طرح پڑھنا درست ہے۔

فکیف بالمؤمنین: "باء" زائد ہے، ای "کیف حالهم"

یجزئ: "یا" مضموم ہے، یہ مہموز اللام ہے، ای: "یکفیهم ما یکفی"۔

مظہرؒ فرماتے ہیں: مطلب یہ ہے کہ جو اُس وقت کی سختیوں اور پریشانیوں میں مبتلا ہوگا، اُس کو کھانے پینے کی ضرورت نہ ہوگی جیسا کہ فرشتوں کو کھانے پینے کی کوئی احتیاج نہیں ہے۔

علامہ طیبیؒ نے دور کی بات کہی کہ حضرت اُسماءؓ کے اس قول کا مطلب یہ ہے کہ ہم لوگ روٹی پکانے کیلئے آٹا گوندھتے ہیں، لیکن دجال کے اس ذکر کا خیال آنے سے جو دلوں کو نکال دینے والا ہے، خوف کے مارے ہم روٹی پکانا چھوڑ دیتے ہیں، تو آخر اُن لوگوں کا کیا حال ہوگا، جو اس زمانے کی سختیوں میں مبتلا ہونگے؟ چنانچہ "یجزئهم" کا مطلب یہ ہے کہ تسبیح اور تقدیس کی برکت سے اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو صبر و استقامت نصیب فرمائے گا۔ حدیث میں وارد ہوا ہے:

"کلمة: سبحان الله وبحمده عبادة الخلق وبها یقطع أرزاقهم"۔

سبحان الله وبحمده پڑھنا مخلوق کی عبادت ہے اور اس کی برکت سے مخلوق کو رزق دیا جاتا ہے۔

اس حدیث کو امام بزارؒ نے حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے نقل کیا ہے۔

" الاقطاع" کا معنی ہے "بیت المال سے مستحق کیلئے مال الگ کرنا" لیکن پھر یہ لفظ مطلقاً اعانت کے معنی میں استعمال ہونے لگا ہے۔

قوله: رواه: مشکوٰۃ کے اصل نسخے میں یہاں خالی جگہ ہے۔ بعض لوگوں نے "احمد وابو داؤد الطیالسی کے الفاظ کا الحاق کیا ہے۔ اور کہا گیا ہے کہ اس حدیث کو امام احمد نے عبدالرزاق عن معمر عن قتادہ عن شہر بن حوشب عنھا روایت کیا ہے اور وہ اس حدیث کو اس راویہ سے نقل کرنے میں منفرد ہیں۔

الفصل الثالث:

۵۴۹۲: عَنِ الْمُغِيْرَةِ بْنِ شُعْبَةَ قَالَ مَا سَأَلَ أَحَدٌ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنِ الدَّجَّالِ

اَكْثَرَ مِمَّا سَأَلْتُهُ وَاِنَّهُ قَالَ لِيْ مَا يَضُرُّكَ قُلْتُ اِنَّهُمْ يَقُوْلُوْنَ اِنَّ مَعَهُ جَبَلَ خُبْزٍ وَّنَهَرَ مَآءٍ قَالَ هُوَ اَهْوَنُ عَلَى اللّٰهِ مِنْ ذٰلِكَ ۔ (متفق علیه)

اخرجه البخاری فی صحیحه ۸۹/۱۳حدیث رقم ۷۱۲۲ومسلم فی صحیحه ۲۲۵۸/٤حدیث رقم(۱۱۵-۲۹۳۹)
واحمد فی المسند ۴۳٤/۵۔

ترجمہ:''حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا کہ دجال کے بارے میں اللہ کے پیغمبر ﷺ سے جس قدر میں نے دریافت کیا ہے کسی اور نے نہیں کیا! چنانچہ (ایک مرتبہ) آپ ﷺ نے مجھ سے ارشاد فرمایا کہ'' دجال تمہیں کوئی ضرر نہیں دے سکے گا۔ میں نے عرض کیا کہ لوگ یہ کہتے ہیں کہ اس کے ساتھ روٹیوں کا پہاڑ ہوگا اور پانی کی نہر اس وقت جب کہ لوگ قحط سالی سے دوچار ہوں گے اگر کوئی شخص بھوک و پیاس سے اضطرار کی حالت کو پہنچ جائے تو وہ کیا کرے؟ آنحضرت ﷺ نے فرمایا: دجال اللہ تعالیٰ کے نزدیک اس سے زیادہ بے قدر ہے''۔(بخاری و مسلم)

تشریح: قوله:وانه قال لی:مایضرك:

وانه: ہمزہ کے کسرہ کے ساتھ ہے۔ واؤ حالیہ ہے' یا عاطفہ ہے، اور دوسرے جملے کا جملہ منفیہ پر عطف ہے۔ اور عبارت کی تقدیر یہ ہے:''وقال انه'' واؤ مطلق جمع کیلئے ہے، اور ضمیر ضمیر شان ہے، یا حضور علیہ السلام کی طرف عائد ہے۔

مایضرك؟: علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں، یہ جملہ حال واقع ہورہا ہے، اور مطلب یہ ہے کہ میں دجال کے بارے میں سوال کرنے کا بہت زیادہ مشتاق تھا' باوجود یکہ حضور علیہ السلام نے فرمایا تھا کہ دجال تمہیں کوئی ضرر نہیں پہنچا سکے گا، کیونکہ اللہ تعالیٰ اُس کے شر سے تیری کفایت کرے گا۔

میں (ملا علی قاریؒ) کہتا ہوں ظاہر یہ ہے کہ یہ جملہ خبریہ تقریریہ ہے اور یہ بھی ممکن ہے، کہ لفظوں کے اعتبار سے جملہ خبریہ ہو اور معنی کے اعتبار سے انشائیہ کی قسم دعائیہ ہو، اور بصیغۂ مضارع اس لئے ذکر کیا ہے تاکہ زمانہ مستقبل میں اس کے وجود کی توقع پر دلالت کرے، واللہ تعالیٰ اعلم با الحال۔

قوله:قلت انهم یقولون......ونهر ماء:

انهم: ضمیر کا مرجع'' الناس'' ہے، یا'' اهل الکتاب'' ہے، یا'' الیهود'' ہے۔

خبز: خاء مضموم' باء ساکن اور آخر میں زاء ہے، ای:''معه من الخبز قدر الجبل'' اور ایک نسخہ میں'' جبل خبز'' ہے، اور اسی طرح مصابیح میں بھی ہے لیکن گویا کہ یہ تصحیف ہے۔

''نهر'': ھاء مفتوح ہے۔ یہ زیادہ فصیح لغت ہے اور''ھاء'' کو ساکن بھی پڑھا جاتا ہے اور یہ زیادہ مشہور ہے۔

اس میں اشارہ ہے کہ دجال کے زمانے میں پانی کا قحط بھی لوگوں کیلئے بہت بڑی آزمائش ہوگی اور فساد کے عام ہونے کی وجہ سے برکت کا زوال ہوگا۔ یہ ایک مستقل سوال ہے جس کا ماقبل سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

علامہ طیبیؒ نے بعید از کار بات کہی کہ'' قلت...... جملہ مستانفہ ہے، ایک سوال مقدر کا جواب ہے۔ ای''سألته یوماً

فقال لی: ما یضرك؟ قلت کیف ما یضلنی وانهم یقولون: ان معه جبل خبز (میں نے حضور ﷺ سے ایک دن پوچھا تو حضور ﷺ نے فرمایا کہ دجال تجھے نقصان نہیں پہنچا سکے گا، میں نے عرض کیا کہ کس طرح دجال مجھے نقصان نہیں پہنچا سکے گا، جبکہ لوگ کہتے ہیں، کہ اُس کے ساتھ روٹیوں کا پہاڑ ہوگا)۔

قوله: قال: هو أهون علی الله من ذالك:

مطلب یہ ہے کہ اُس کے یہ مظاہر حقیقی نہیں ہونگے بلکہ لوگوں کی آزمائش کیلئے نظر بندی اور فریب کاری ہوگی اور دجال کے اس نظر بندی اور شعبدہ بازی کے بعد مؤمن اپنے ایمان پر جما رہے گا، اور کافر پھسل جائے گا۔

یا اس جملے کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ دجال کو اتنا حقیر و ذلیل کر دے گا، کہ وہ ان مظاہر میں سے کسی چیز کو بھی اپنے صدق کی دلیل نہیں بنا سکے گا، بالخصوص جب کہ اللہ نے اس کی ذات میں ہی اس کے کفر و کذب کی ایسی نشانی رکھ دی ہے کہ جو بندہ لکھنا پڑھنا نہیں جانتا وہ بھی اس کو پڑھ سکے گا۔

مسلمؒ کی شرح میں ہے کہ قاضی عیاضؒ فرماتے ہیں، اس کا مطلب یہ ہے کہ دجال اللہ تعالیٰ کے ہاں اتنا ذلیل و حقیر ہے کہ اس کے ہاتھ پر جو خلاف عادت اُمور ظاہر ہونگے دجال اُن امور میں سے کسی چیز کے ذریعے بھی مؤمنین کو گمراہ نہیں کر سکے گا، اور نہ مؤمنین کے دلوں میں کچھ شکوک و شبہات ڈال سکے گا، بلکہ اس سے تو مؤمنین کے ایمان میں مزید اضافہ ہوگا، اور کفار و منافقین اور ان جیسے لوگوں کے خلاف حجت قائم ہو جائے گی اور اس ارشاد گرامی کا یہ مطلب نہیں ہے کہ دجال کے پاس کچھ بھی نہیں ہوگا۔

۵۴۹۳ : وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ عَنِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قَالَ یَخْرُجُ الدَّجَّالُ عَلٰی حِمَارٍ اَقْمَرَ مَا بَیْنَ اُذُنَیْهِ سَبْعُوْنَ بَاعًا ۔ (رواه البیهقی فی کتاب البعث والنشور)

لم یخرج احادیث الدجال فی کتاب البعث والنشور للبیهقی ،الصادر عن مرکز الخدمات والابحاث الثقافیة، بیروت، بتحقیق الشیخ عامر احمد حیدر، فقد ذکر المحقق فی مقدمته: (انه وقع لی انی رایت فی کتاب شرح مسلم للنووی ۴۷/۱۸ عبارة بعزوها للبیهقی فی کتابه البعث ولم احدها فی النسخة التی اعتمدت علیها) ثم ساق العبارة والنقص الواقع فی هذا النسخة هی احادیث الرجال وقصة ابن الصیاد واللّٰه تعالٰی اعلم ۔

ترجمه: ”حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نبی اکرم ﷺ سے نقل فرماتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا: ”دجال ایک ایسے گدھے پر سوار ہو کر نکلے گا جو انتہائی سفید ہوگا اور اس گدھے کے دونوں کانوں کے درمیان ستر باع چوڑائی فاصلہ ہوگا“۔ اس روایت کو بیہقی نے کتاب البعث والنشور میں نقل کیا ہے“۔

تشریح: قوله: یخرج الدجال علی خمار اقمر ......:

حمارٍ أقمر: چٹا سفید گدھا، (نہایہ) اس میں اشارہ ہے کہ دجال کا گدھا دجال سے حسین ہوگا۔

ما بین اذنیه: یہ عبارت ترکیب نحوی کے اعتبار سے ”حمار“ کے لئے دوسری صفت ہے۔

باعا: انسان کے دونوں ہاتھوں کے پھیلانے کی مقدار کو ”باع“ کہا جاتا ہے۔

بَابُ قِصَّةِ ابْنِ صَيَّادٍ

ابن صیاد کے قصے کا بیان

سید صاحب کے نسخے میں اور مشکوٰۃ کے دوسرے اکثر معتمد نسخوں میں لفظ (بغیر الف لام کے) اسی طرح لکھا ہے۔ البتہ بعض نسخوں میں ابن الصیاد (یعنی الصیاد کے الف لام کے ساتھ) ہے۔ قاموس میں لکھا کہ ابن صائد یا ابن صیاد وہ شخص ہے جس کے بارے میں خیال کیا جاتا تھا کہ وہ دجال ہے۔ اکمل ؒ فرماتے ہیں، کہ ابن صائد کا نام عبداللہ ہے اور بعض حضرات فرماتے ہیں، کہ اس کا نام صیاف تھا۔

اور بعض حضرات کا کہنا ہے کہ ابن صائد تھا، اور یہ مدینہ کے یہود میں سے ایک یہودی تھا۔ بعض حضرات فرماتے ہیں، کہ ابن صائد یہودیوں میں آکر شامل ہو گیا تھا بچپن میں اس کی حالت کاہنوں جیسی تھی۔ ایک سچ بولتا اور متعدد جھوٹ بولتا، پھر یہ جب بڑا ہو گیا تو مسلمان ہو گیا، اور (مسلمان ہونے کی) کچھ علامات بھی ظاہر ہوئیں، مثلاً حج کیلئے گیا، اور مسلمانوں کے ساتھ جہاد کیا، پھر اس کے بارے میں ایسے احوال ظاہر ہوئے اور ایسی باتیں سننے میں آئیں جو اس کے دجال ہونے پر دلالت کرتی تھیں۔ بعض حضرات کا کہنا ہے کہا اس نے توبہ کر لی تھی، اور مدینہ منورہ میں وفات پائی۔ بعض علماء فرماتے ہیں کہ واقعہ حرہ کے دن وہ غائب ہو گیا تھا۔

ابن الملک ؒ فرماتے ہیں، کہ ابن صیاد کے بارے میں اختلاف ہے، چنانچہ کہا گیا ہے کہ ابن صیاد ہی دجال ہے۔ اور اس کے بارے میں جو کہا جاتا ہے، کہ مدینہ منورہ میں وفات پا گیا تھا۔ اس بات کا کوئی ثبوت نہیں کیونکہ منقول ہے، کہ یوم حرہ کو ابن صیاد غائب تھا، اور جہاں تک اس بات کا تعلق ہے، کہ دجال کی تو نہ اولاد ہو گی نہ وہ مدینہ اور مکہ میں داخل ہو سکے گا، اور کافر ہو گا۔ تو ان ساری باتوں کا تعلق اُس وقت سے ہے، جس وقت اس کا ظہور ہو گا، اور کہا گیا ہے کہ ابن صیاد دجال نہیں تھا۔

منقول ہے کہ حضرت جابرؓ اس بات پر قسم اُٹھاتے تھے کہ ابن صیاد ہی دجال ہے اور انہوں نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو بھی حضور علیہ السلام کی موجودگی میں اس بات پر قسم اٹھاتے ہوئے سنا' مگر نبی کریم ؐ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اس فعل پر کوئی نکیر نہیں فرمائی تھی۔ تمیم داریؓ کے قصے سے بظاہر یہ معلوم ہو رہا ہے، کہ ابن صیاد دجال نہیں تھا۔ البتہ ابن صیاد کا معاملہ اللہ کی طرف سے لوگوں کیلئے ایک بڑی آزمائش تھی، جس کے شر سے اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو محفوظ فرمایا۔

میں (ملا علی قاریؒ) کہتا ہوں کہ تمیم الداریؓ کا قصہ اس کے منافی نہیں کیونکہ ممکن ہے کہ دجال کے مختلف ابدان ہوں۔ اس کا

ظاہر عالم حس وخیال میں احوال کے اختلاف کے ساتھ بدلتا رہتا ہو، اور اس کا باطن عالم مثال میں زنجیروں اور بیڑیوں کے ساتھ ہو۔ اور شاید اس کے کمال درجے کے فتنے کے ظہور کی راہ میں موت کی زنجیریں اور رسالت کے طوق رکاوٹ بنے ہوئے ہوں۔ واللہ اعلم

الفصل الاول:

۵۴۹۴ : عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ ابْنِ عُمَرَ اَنَّ عُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِ انْطَلَقَ مَعَ رَسُولِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِي رَهْطٍ مِّنْ اَصْحَابِهِ قِبَلَ ابْنِ صَيَّادٍ حَتّٰى وَجَدُوْهُ يَلْعَبُ مَعَ الصِّبْيَانِ فِي اُطُمِ بَنِيْ مَغَالَةَ وَقَدْ قَارَبَ ابْنُ صَيَّادٍ يَوْمَئِذٍ الْحُلُمَ فَلَمْ يَشْعُرْ حَتّٰى ضَرَبَ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ظَهْرَهٗ بِيَدِهٖ ثُمَّ قَالَ اَتَشْهَدُ اَنِّي رَسُولُ اللّٰهِ فَنَظَرَ اِلَيْهِ فَقَالَ اَشْهَدُ اَنَّكَ رَسُولُ الْاُمِّيِّيْنَ ثُمَّ قَالَ ابْنُ صَيَّادٍ اَتَشْهَدُ اَنِّيْ رَسُولُ اللّٰهِ فَرَصَّهُ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ثُمَّ قَالَ اٰمَنْتُ بِاللّٰهِ وَبِرُسُلِهٖ ثُمَّ قَالَ لِابْنِ صَيَّادٍ مَا ذَا تَرٰى قَالَ يَاْتِيْنِيْ صَادِقٌ وَّكَاذِبٌ قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ خُلِّطَ عَلَيْكَ الْاَمْرُ قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنِّيْ خَبَّاْتُ لَكَ خَبِيْئًا وَخَبَّاَلَهٗ يَوْمَ تَاْتِي السَّمَآءُ بِدُخَانٍ مُّبِيْنٍ فَقَالَ هُوَ الدُّخُّ فَقَالَ اِخْسَا فَلَنْ تَعْدُوَ قَدْرَكَ قَالَ عُمَرُ يَا رَسُولَ اللّٰهِ اَتَاْذَنُ لِيْ فِيْهِ اَنْ اَضْرِبَ عُنُقَهٗ قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنْ يَّكُنْ هُوَ لَا تُسَلَّطُ عَلَيْهِ وَاِنْ لَّمْ يَكُنْ هُوَ فَلَا خَيْرَلَكَ فِيْ قَتْلِهٖ قَالَ ابْنُ عُمَرَ انْطَلَقَ بَعْدَ ذٰلِكَ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَاُبَيُّ بْنُ كَعْبٍ الْاَنْصَارِيُّ يَؤُمَّانِ النَّخْلَ الَّتِيْ فِيْهَا ابْنُ صَيَّادٍ فَطَفِقَ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَتَّقِيْ بِجُذُوْعِ النَّخْلِ وَهُوَ يَخْتِلُ اَنْ يَّسْمَعَ مِنِ ابْنِ صَيَّادٍ شَيْئًا قَبْلَ اَنْ يَّرَاهُ وَابْنُ صَيَّادٍ مُضْطَجِعٌ عَلٰى فِرَاشِهٖ فِيْ قَطِيْفَةٍ لَّهٗ فِيْهَا زَمْزَمَةٌ فَرَاَتْ اُمُّ ابْنِ صَيَّادٍ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَهُوَ يَتَّقِيْ بِجُذُوْعِ النَّخْلِ فَقَالَتْ اَيْ صَافُ وَهُوَ اسْمُهٗ هٰذَا مُحَمَّدٌ فَتَنَاهَى ابْنُ صَيَّادٍ قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَوْ تَرَكَتْهُ بَيَّنَ قَالَ عَبْدُ اللّٰهِ بْنُ عُمَرَ قَامَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِي النَّاسِ فَاَثْنٰى عَلَى اللّٰهِ بِمَا هُوَ اَهْلُهٗ ثُمَّ ذَكَرَ الدَّجَّالَ فَقَالَ اِنِّيْ اُنْذِرُكُمُوْهُ وَمَا مِنْ نَّبِيٍّ اِلَّا قَدْ اَنْذَرَ قَوْمَهٗ لَقَدْ اَنْذَرَ نُوْحٌ قَوْمَهٗ وَلٰكِنِّيْ سَاَقُوْلُ لَكُمْ فِيْهِ قَوْلًا لَّمْ يَقُلْهُ نَبِيٌّ لِقَوْمِهٖ تَعْلَمُوْنَ اَنَّهٗ اَعْوَرُ وَاَنَّ اللّٰهَ لَيْسَ بِاَعْوَرَ۔ (متفق علیه)

اخرجه البخاري في صحيحه ۱۷۱/۶ حديث رقم ۳۰۵۵ ومسلم في صحيحه ۲۲۴۴/۴ حديث رقم (۹۵-۲۹۳۰) اخرجه ابو داؤد في ۵۰۳/۴ حديث رقم ۴۳۲۹ واخرجه الترمذي ۵۰۱/۴ حديث رقم ۲۲۴۹ واحمد في المسند ۱۴۸/۲

ترجمہ: ''حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ (ایک روز) سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ صحابہ کرامؓ کی ایک جماعت میں شریک ہو کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ ابن صیاد کے پاس گئے اور انہوں نے اس کو (یہودیوں کے قبیلہ) بنو مغالہ کے محل میں بچوں کے ساتھ کھیلتا ہوا پایا' وہ وہ ان دنوں بالغ ہونے کے قریب تھا' ابن صیاد ان سب کی آمد سے بے خبر کھیلتا رہا۔ یہاں تک کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی پشت پر اپنا دست مبارک مارا اور (جب وہ متوجہ ہوا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے) اس سے پوچھا کہ کیا تو بات کی شہادت دیتا ہے کہ میں اللہ کا پیغمبر ہوں؟ ابن صیاد نے یہ سن کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو گھورا اور کہا کہ میں گواہی دیتا ہوں کہ تم امیوں یعنی ان پڑھ لوگوں کے پیغمبر ہو اور پھر ابن صیاد پوچھنے لگا کہ کیا تم اس بات کی گواہی دیتے ہو کہ میں اللہ کا پیغمبر ہوں؟ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو (پکڑ لیا) اور پھر خوب زور سے بھینچا اور فرمایا ''میں اللہ پر اور اس کے رسولوں پر ایمان لایا'' اس کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے دریافت فرمایا کہ (اچھا یہ بتا) تو کیا دیکھتا ہے یعنی غیبی اشیاء میں سے کیا کچھ تجھ پر ظاہر ہوتا ہے؟ اس نے جواباً کہا کبھی تو میرے پاس سچا فرشتہ آتا ہے اور کبھی جھوٹا (شیطان) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کا یہ جواب سن کر) ارشاد فرمایا کہ تیرا معاملہ اُلجھ گیا'' پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ میں نے تمہارے لئے اپنے جی میں ایک بات کو چھپایا ہے اور جو بات آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ابن صیاد کے لئے چھپائی تھی وہ یہ آیت یوم تاتی السماء بدخان مبین تھی اس نے جواباً کہا کہ وہ (پوشیدہ بات جو تمہارے جی میں ہے) دُخ ہے ''دُخ'' ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: دفع ہو جا! تو اپنی حیثیت سے آگے ہرگز نہیں بڑھ سکے گا'' حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! اگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم مجھے اجازت دیں تو میں اس کی گردن ماردوں (یعنی قتل کردوں)؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ابن صیاد اگر وہی دجال ہے (جس کو قرب قیامت ظہور پذیر ہوتا ہے) تو پھر تجھے اس پر مسلط نہیں دیا جائے گا یعنی اس کو قتل کرنے پر قادر نہیں ہوسکو گے کیونکہ اس کو قتل کرنا تو صرف حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے لئے مقدر ہے اور اگر یہ دجال نہیں ہے تو پھر اس کو قتل کرتا تمہارے لئے کوئی بھلائی نہیں رکھتا۔ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کا بیان ہے کہ اس کے بعد (ایک مرتبہ) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کھجور کے درختوں کے اس باغ میں تشریف لے گئے جہاں ابن صیاد موجود تھا اس وقت آپ کے ہمراہ حضرت ابی ابن کعب انصاری رضی اللہ عنہ بھی تھے' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم (وہاں پہنچ کر) کھجور کی شاخوں کی اوٹ میں پوشیدہ چلنے لگے تا کہ ابن صیاد کو پتہ نہ چل سکے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس کے مطلع ہونے سے پہلے اس کی کچھ باتیں سن لیں اور اس طرح چھپ کر ابن صیاد کی باتوں کو سننے سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا مقصد یہ تھا کہ خود آپ صلی اللہ علیہ وسلم بھی اور صحابہ کو اس کی اصلیت اور حقیقت کا علم ہو جائے کہ آیا کوئی کاہن ہے یا جادوگر یا کچھ اور؟ اس وقت ابن صیاد ایک چادر میں لپٹا ہوا اپنے بستر پر لیٹا ہوا تھا اور اس چادر کے اندر سے (لایعنی) گنگناہٹ سنائی دے رہی تھی۔ اتنے میں ابن صیاد کی ماں نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو کھجور کی شاخوں کی اوٹ میں (کھڑا) دیکھ لیا اور کہنے لگی' ارے صاف! یہ ابن صیاد کا نام تھا (دیکھ) یہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کھڑے ہیں' ابن صیاد نے (سن کر) گنگناہٹ بند کر لی (یعنی وہ بالکل خاموش ہو گیا اور جو ہلکی ہلکی سی آواز آ رہی تھی وہ بھی رک گئی (یہ دیکھ کر) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے (صحابہؓ سے) فرمایا: اگر ابن صیاد کی ماں اس کو اسی حال میں چھوڑے رکھتی یعنی میری موجودگی سے باخبر نہ کرتی تو آج وہ اپنی اصلیت اور حقیقت کو آشکارا کر دیتا

یعنی اس کی باتوں سے یہ معلوم ہو جاتا کہ وہ کون ہے اور کیا ہے۔ حضرت عبداللہ ابن عمر رضی اللہ عنہما کا بیان ہے کہ اس کے بعد جب آنحضرت ﷺ لوگوں کے سامنے (خطبہ کیلئے) کھڑے ہوئے تو پہلے اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا بیان کی جو اس کے لائق ہے' پھر دجال کا تذکرہ فرمایا یا آپ ﷺ نے اس کی فتنہ پردازی اور اس حقیقت کے پیش نظر کہ اس میں دجال کی بعض شبیہیں پائی جاتی تھیں دجال کا ذکر کرنا اور اس کے احوال سے آگاہ کرنا مناسب سمجھا اور ارشاد فرمایا میں تمہیں دجال سے ڈراتا ہوں اور نوح کے بعد کوئی نبی ایسا نہیں گزرا جس نے اپنی قوم کو دجال سے نہ ڈرایا ہو اور نوح علیہ السلام نے بھی اپنی قوم کو اس سے ڈرایا ہے لیکن میں تمہیں دجال کے متعلق ایک ایسی بات اور ایک ایسی نشانی بتائے دیتا ہوں جو کسی اور نبی نے اپنی قوم کو نہیں بتلائی ہے' پس تم باخبر رہو کہ دجال کانا ہوگا اور بلاشبہ اللہ تعالیٰ کانا نہیں ہے''۔ (بخاری ومسلم)

تشریح: **قولہ: عن عبد الله بن عمر أن ابن الخطاب رضی الله تعالٰی عنه:**

''**عنه**:'' مفرد کی ضمیر اس لئے ذکر کی گئی ہے کہ اصل ''مروی عنہ'' حضرت عمر رضی اللہ عنہ ہیں، ان کے بیٹے (عبداللہ) کا ذکر تبعاً ہوا ہے۔ اور ایک نسخے میں ''**عنه**'' کی بجائے ''**عنهما**'' ہے جس سے یہ وہم پیدا ہوتا ہے، کہ (حضرت عمرؓ کے والد) ''خطاب'' بھی اس میں شامل ہیں لیکن یہ درست نہیں ہے۔

''**رهط**'': دس سے کم افراد کی جماعت پر بولا جاتا ہے۔

قولہ: حتی وجدوه یلعب مع الصبیان فی اطم بنی مغالة:

قبل: قاف کے کسرہ اور باء کے فتحہ کے ساتھ بمعنی ''جانب''۔

حتی وجدوه: کہا گیا ہے کہ یہاں '' **حتی**'' حرف ابتداء ہے اور اس کے بعد والا جملہ مستانفہ ہے، اور انتہاء غایت کا فائدہ دے رہا ہے۔

یلعب مع الصبیان: یہ جملہ ''**وجدوه**'' کے مفعول سے حال ہے۔

'' **مغالة**'': اس کی میم کو مفتوح اور مضموم دونوں طرح پڑھا گیا ہے اور میم کے بعد غین ''نقطہ والی'' ہے، لفظ میم کے ضمہ اور بغیر نقطہ کی عین کے ساتھ نقل کیا ہے یہ ایک قبیلہ کا نام ہے۔

الاطم: ہمزہ اور طاء کے ضمہ کے ساتھ۔ کوٹھی، بنگلہ، ہر وہ قلعہ جو پتھروں سے تعمیر کیا گیا ہو، اور ہر چوکور کمرہ جو چھت دار ہو۔ اس کی جمع ''**آطام**'' اور '' **اطوم**'' آتی ہے، جیسا کہ قاموس میں ہے۔ امام نوویؒ فرماتے ہیں کہ مشہور یہ ہے کہ '' **مغالة**'' میم کے فتحہ اور غین معجمہ کی تخفیف کے ساتھ ہے۔

قولہ: وقد قارب ابن صیاد۔۔۔انك رسول الله الامین:

الحلم: حاء اور لام کے ضمہ کے ساتھ اور لام کے سکون کے ساتھ بھی درست ہے

افلم یشعر: عین مضموم ہے۔

فنظر الیه: مطلب یہ ہے کہ ابن صیاد نے غصیلی نظروں سے یا غفلت کی نگاہ سے حضور علیہ السلام کی طرف دیکھا' اور اسی

وجہ سے اس پر اس نگاہ کی برکت مرتب نہ ہوئی' جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿تراهم ينظرون اليك وهم لا يبصرون﴾ "اوران کو آپ دیکھتے ہیں گویا کہ وہ آپ کو دیکھ رہے ہیں اور وہ کچھ بھی نہیں دیکھتے"۔

"انك رسول الاُميين": قاضی عیاضؒ فرماتے ہیں کہ" اميين " سے مراد عرب ہیں، کیونکہ عربوں کی اکثریت ایسی تھی جو نہ لکھنا جانتے تھے اور نہ پڑھنا جانتے تھے، اور یہ بات اگرچہ منطوق (مفہوم موافق) کے اعتبار سے حق ہے، لیکن مفہوم مخالف کے اعتبار سے ایک باطل معنی کی طرف اشارہ ہے، اور وہ مفہوم مخالف یہ ہے کہ حضور علیہ السلام کی بعثت عجم کیلئے نہیں تھی۔ جیسا کہ بعض یہودیوں کا بھی خیال ہے، اور اگر ابن صیاد کی مراد اس جملے سے یہی ہو تو پھر تو واضح ہے کہ یہ اُن جھوٹی اور لغو باتوں میں سے ہے، جو شیطان اُس کو القاء کیا کرتا تھا۔ اور یہ بھی ممکن ہے، کہ یہ بات ابن صیاد نے یہودیوں سے سنی ہو کیونکہ ابن صیاد بھی یہودی تھا، اور ابن صیاد کی یہ بات حکماء کے انداز کے مطابق تھی، کیونکہ حکماء کا یہ زعم تھا کہ وہ انبیاء سے مستغنی ہیں۔

قوله:قال ابن صياد:أتشهدأني رسول الله ؟

یہ بھی ممکن ہے کہ ابن صیاد کی اسی رسالت سے مراد رسالت نبویہ ہو جیسا کہ کلام کے مقابلہ سے معلوم ہو رہا ہے، اور یہ بھی ممکن ہے کہ اس رسالت سے لغوی رسالت مراد ہو، کیونکہ ابن صیاد کو بھی تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے لوگوں کی آزمائش کیلئے بھیجا گیا تھا۔

قوله:فرصه النبی ﷺ:

رصه: صاد کی تشدید کے ساتھ ای "ضغطه حتى ضم بعضه الى بعضٍ، اور اسی سے اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد وارد ہوا ہے:

﴿كانهم بنيان مرصوص﴾ [الصف:٤] "گویا کہ وہ ایک عمارت ہیں کہ جس میں سیسہ پلایا گیا ہے" (امام خطابیؒ نے یہ بات ذکر کی ہے۔) امام نوویؒ فرماتے ہیں: ہمارے ان علاقوں کے اکثر نسخوں میں "فرفضه" فاء اور اس کے بعد ضاد معجمہ کے ساتھ ہے، اس کا معنی ہے فتركه وقطع سؤاله وجوابه وجداله من هذا الباب، (یعنی حضور نے اس کو چھوڑ دیا اور اس کے ساتھ سوال وجواب اور اس بارے میں مجادلہ ترک کر دیا)۔ شارح فرماتے ہیں کہ فرضه بمعنی کسَرہ ہے اور کہا گیا ہے کہ صحیح روایت "فرصه" صاد کے ساتھ ہے جس کا معنی ہے: نچوڑنا، تنگ کرنا۔ سختی کرنا۔

قوله: آمنت بالله وبرسله:

امام طیبیؒ فرماتے ہیں کہ "آمنت بالله وبرسله" کا "فرصه" پر عطف ہے، اور "ثم" رتبہ میں تراخی کے لئے ہے۔ اور حضور علیہ السلام نے " ارخاء العنان " کے طور پر یہ بات فرمائی یعنی "میں تو اللہ اور اللہ کے رسولوں پر ایمان لایا ہوں تم غور کر کے بتاؤ کہ کیا تم اللہ کے رسولوں میں سے ہو؟" (انتہی)

یہ تقریر محل نظر ہے چونکہ اس کلام سے اس بات کا وہم ہو سکتا ہے کہ دجال کے بارے میں رسول ہونے یا نہ ہونے کا تردد جائز ہے، مگر اس کا فاسد ہونا کسی سے بھی پوشیدہ نہیں۔

صحیح بات یہ ہے کہ حضور علیہ السلام نے مفہوم کلام کا اعتبار کیا جیسا کہ دجال نے کیا تھا، اور مطلب یہ ہے کہ "میں اللہ کے

رسولوں پر ایمان لایا ہوں اور تم اُن میں سے نہیں ہو اور اگر تم اُن میں سے ہوتے تو تجھ پر ایمان لے آتا'' اور حضور علیہ السلام کی یہ بات بھی بطور فرض وتقدیر کے تھی، یا یہ بات آپؐ کو اپنے خاتم النّبیین ہونے کے علم ہونے سے پہلے تھی، ورنہ تو خاتم النّبیین ہونے کے علم کے بعد تو ایسی بات بطور فرض کے بھی درست نہیں۔

چنانچہ بعض علماء نے تصریح کی ہے کہ اگر کوئی شخص نبوت کا دعویٰ کرے اور دوسرا شخص اس سے معجزہ کا مطالبہ کرے، تو یہ مطالبہ کرنے والا کافر ہے۔ابن صیاد نے حضور ﷺ کے سامنے نبوت کا دعویٰ کیا، لیکن اس کے باوجود حضور علیہ السلام نے اس کو قتل نہیں کیا، اس عدم قتل کی وجہ میں متعدد احتمال ہیں:

اول تو اس وجہ سے کہ اس وقت وہ بچہ تھا، اور بچوں کو قتل کرنے سے منع کیا گیا تھا۔

دوم اس وجہ سے کہ یہودی اس وقت ذمی تھے اور انہوں نے اس بات پر صلح کی تھی، کہ اُن کو اُن کے حال پر رہنے دیا جائے گا، اور ابن صیاد بھی انہی یہود میں سے تھا یا اُن کے حلفاء میں سے تھا، چنانچہ ابن صیاد کے اس قول کی وجہ سے اس کا عہد ذمہ ختم نہیں ہوا۔(كذا قاله بعض علمائنا الشراح)

ابن الملکؒ فرماتے ہیں کہ یہ بات اس کی دلیل ہے کہ والد کا عہد اپنے چھوٹے بچے کی طرف سے کافی ہے۔

کہا گیا ہے کہ ابن صیاد نے اس موقع پر نبوت کا صریح دعویٰ نہیں کیا تھا، اس لئے کہ "أتشهد" جملہ استفہامیہ ہے اس میں کوئی تصریح نہیں ہے۔ملا علی قاریؒ فرماتے ہیں کہ اس قول سے میری اس بات کی تائید ہوتی ہے جو میں نے پہلے ذکر کی تھی کہ اس بات کا بھی احتمال ہے'' رسول'' سے لغوی معنی (فرستادہ) مراد ہوں۔

قوله:ثم قال لابن صياد ماذا ترىٰ؟۔۔۔۔خلط عليك الامر:

"ماذا": "ذا" زائدہ، ہے اور ''ما'' استفہامیہ ہے اور مطلب یہ ہے کہ تم کیا دیکھتے ہو اور تم پر کونسے غیبی امور کا انکشاف ہوتا ہے؟

يأتيني صادق: (اس کا موصوف محذوف ہے) **اى خبر صادق وخبر كاذب اوملك صادق وشيطان كاذب** (یعنی کبھی سچی خبر آتی ہے اور کبھی جھوٹی خبر آتی ہے) یا کبھی فرشتہ آتا ہے ابر کبھی جھوٹا شیطان آتا ہے۔

بقول بعض سوال کا حاصل یہ ہے کہ ''تمہارے پاس جو آتا ہے وہ تمہیں کیا کہتا ہے''؟ اور اس کا مجمل جواب یہ ہے کہ ''وہ مجھے کچھ باتیں بتاتا ہے، جو کبھی سچی ہوتی ہیں، اور کبھی جھوٹی''۔

خلط: مجہول کا صیغہ ہے اور مبالغہ اور تکثیر کیلئے لام کی تشدید کے ساتھ مذکور ہے اور لام کی تخفیف بھی جائز ہے۔

خلط عليك الأمر: یعنی سچی باتیں جھوٹی باتوں کے ساتھ مخلوط ہوگئی ہیں۔

امام نوویؒ فرماتے ہیں: مطلب یہ ہے کہ ''جو باتیں تیرا شیطان تیرے پاس لاتا ہے، وہ مخلوط باتیں ہیں''۔

علامہ خطابیؒ فرماتے ہیں: مطلب یہ ہے کہ بعض اوقات اس کی باتیں درست ثابت ہوتیں اور بعض اوقات جھوٹی ثابت ہوتیں، اس وجہ سے ابن صیاد کیلئے یہ معاملہ مشتبہ ہوگیا۔

قوله:انى خبأت لك ۔۔۔۔ اخسأ فلن تعدو قدرك:

خبیئا: (اس کا موصوف محذوف ہے) ای "اسماً مضمراً" (یعنی میں نے دل میں ایک بات چھپائی ہے تم وہ بات مجھے بتادو۔) ابن الملکؒ فرماتے ہیں کہ حضور علیہ السلام نے ابن صیاد کا اس طرح سے امتحان اس لئے لیا تا کہ اس کا بطلان صحابہ کے سامنے واضح ہوجائے۔ ابن صیاد ایک کاہن تھا، شیطان باتیں لے کر آتا' اس کی زبان پر جاری کر دیتا تھا۔

وخبأله: یہ جملہ "قد" کی تقدیر کے ساتھ یا بغیر "قد" کے جملہ حالیہ ہے۔

قوله: فقال هو الدخ :

"الدخ": دال کے ضمہ اور خاء کی تشدید کے ساتھ ہے۔ بعض نے اس پر فتحہ کہا ہے۔ اور دال کا کسرہ بھی منقول ہے۔

نہایہ میں لکھا ہے کہ "الدخ" دال کے ضمہ اور فتحہ کیساتھ، دخان (دھواں) کے معنی میں ہے کیونکہ مراد اس سے یہ آیت تھی۔ ﴿یوم تأتی السماء بدخان مبین﴾ [الدخان: ۱۰] "اس روز کا انتظار کیجئے کہ آسمان کی طرف ایک نظر آنے والا دھواں پیدا ہوگا"۔

بعض حضرات فرماتے ہیں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام دجال کو "جبل دخان" پر قتل کریں گے، چنانچہ احتمال ہے کہ اس کے قتل کی طرف تعریض ہو۔

قاموس میں ہے "الدخ" دال کے ضمہ کے ساتھ بمعنی "دُخان" ہے۔

ملا علی قاریؒ فرماتے ہیں، اگر دال کے ضمہ اور خاء کی تخفیف کے ساتھ مروی ہوتو زیادہ مناسب ہوگا، ایک تو اس وجہ سے کہ اس میں دُخان کی طرف اشارہ ہوگا، دوسری وجہ یہ ہے کہ اس میں ابن صیاد کے ادراک کے ناقص ہونے کی تصریح ہوگی جیسا کہ کاہنوں کی حالت ہوتی ہے (کہ ادھوری بات حاصل کرتے ہیں)۔

امام نوویؒ فرماتے ہیں کہ یہ لفظ دال کے ضمہ اور خاء معجمہ کی تشدید کے ساتھ ہے، اور یہ "دُخان" میں ایک لغت ہے' اور "خبأت" کا معنی یہ ہے کہ "میں نے تمہارے لئے "دُخان" کا لفظ دل میں سوچا ہے"۔ صحیح ومشہور یہ ہے کہ حضور علیہ السلام نے سورہ دُخان کی یہ آیت اپنے دِل میں سوچی تھی ﴿فارتقب یوم تأتی السماء بدخان مبین﴾ [الدخان۔ ۱۰] "سو آپ (ان کے لیے) اس روز کا انتظار کیجئے کہ آسمان کی طرف ایک نظر آنے والا دھواں پیدا ہوگا"

قاضی عیاضؒ فرماتے ہیں: صحیح ترین قول یہ ہے کہ حضور ﷺ نے جو آیت اپنے دل میں سوچی تھی ابن صیاد اُس میں سے صرف ایک ہی ناقص لفظ بتا سکا جیسا کہ کاہنوں کی عادت ہوتی ہے، کہ شہاب ثاقب کے آنے سے پہلے شیطان جتنا کچھ بھی حاصل کر لیتا ہے وہ کاہن کو القاء کر دیتا ہے، اس پر دارمی کی وہ روایت دلالت کرتی ہے جو انہوں نے روایت کی ہے۔ قاضی عیاض

قوله: فقال: اخسا فلن تعدو قدرك :

"اخسأ": "سین کے فتحہ اور ہمزہ کے سکون کے ساتھ یہ کلمۂ زجر واستہانت ہے۔ یہ" الخسوء "بمعنی" زجر الکلب" (کتے کو دھتکارنا) سے مأخوذ ہے، چنانچہ مطلب یہ ہے "امکث صاغراً" (ذلیل ہوکر رہو) یا "أبعد حقیراً" (حقارت کی حالت میں دور رہو) یا "اسکت مزجوراً" (دفع ہوکر خاموش رہو)۔

قلت تعدو: دال کے ضمہ کے ساتھ'

یعنی تو اس مرتبہ ومقام سے آگے نہیں بڑھے گا، جو مرتبہ ومقام کاہنوں کو حاصل ہوتا ہے کہ صرف بعض باتوں تک (شیطان کے القاء کی وجہ سے) رسائی ہو جاتی ہے۔ یہ وضاحت امام نوویؒ نے ذکر کی ہے۔

علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں: مطلب یہ ہے کہ "تم کاہنوں کی طرح اس طریقے سے پوشیدہ باتوں کو ظاہر کرنے سے نبوت کے دعویٰ تک تجاوز نہیں کر سکتے یہاں تک کہ تم یہ کہہ سکو کہ کیا تم میرے رسول اللہ ہونے کی گواہی دیتے ہو؟

میں (ملا علی قاریؒ) کہتا ہوں اس مسئلے کا خلاصہ اور اس جملے کا حاصل یہ ہے کہ "تم نے اگرچہ ایک پوشیدہ بات کی خبر دے دی ہے، مگر تم ہرگز اس حد سے تجاوز نہیں کر سکتے جو تمہارے لئے مقرر ہے"۔ اور اس کا مطلب یہ ہے کہ کہانت انسان کو اس مرتبہ سے بلند نہیں کر سکتی جس مرتبہ پر وہ ہوتا ہے اگرچہ اس کی کہانت درست ہو۔

قوله:قال عمر...... فلا خير لك في قتله:

اس عبارت میں التفات یا تجرید ہے۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما اس وقت ان کے ساتھ ہوں جس پر بعد والی عبارت، "**فقال:قال عمر**" دلالت کرتی ہے۔

أضرب: ایک اور نسخہ میں "**فلاء ضرب**" ہے اور ایک تیسرے نسخہ میں "**أن أضرب**" کے الفاظ ہیں۔

لا تسلط: مجہول کے صیغہ کے ساتھ مجزوم واقع ہے۔ اور ایک اور نسخہ میں رفع کے ساتھ واقع ہے،

قوله:وان لم يكن هو فلا خير لك في قتله:

اس کو قتل کرنے میں کسی خیر کے نہ ہونے کی وجہ وہی ہے جو پہلے ذکر کر دی گئی۔ یعنی اس وجہ سے کہ اس وقت چھوٹا بچہ تھا یا وہ ذمی تھا یا اس وجہ سے کہ اس کے کلام میں احتمال تھا، اس بارے میں یہ مختلف اقوال ہیں لیکن درمیانی قول زیادہ اصح ہے۔

علامہ ابن الملکؒ فرماتے ہیں چونکہ یہاں قرائن ہی تھے جو ابن صیاد کے دجال ہونے پر دلالت کرتے تھے، اس لئے حضور علیہ السلام نے یہ بات شک کی صورت میں بیان فرمائی۔ واللہ اعلم۔

قاضی عیاضؒ فرماتے ہیں کہ "**ان يكن هو**" میں "**هو**" ضمیر "**دجال**" کی طرف لوٹ رہی ہے۔ اور اس کی دلیل وہ حدیث ہے جس میں منقول ہے کہ حضور علیہ السلام نے فرمایا:

"**ان يكن هو فلست صاحبه انما صاحبه عيسىٰ بن مريم' والا يكن هو فليس لك ان تقتل رجلا من اهل العهد**" "اگر وہ دجال ہی ہے تو تم اس کو قتل نہیں کر سکتے' اس کو تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہی قتل کریں گے اور اگر وہ دجال نہیں ہے تو تمہارے لئے یہ جائز نہیں کہ تم کسی ذمی شخص کو قتل کرو۔"

"**هو**" یہ "**كان**" کی خبر ہے، اور "**كان**" کا اسم ضمیر مستتر ہے۔ جبکہ حق یہ تھا کہ "**يكنه**" کی تعبیر اختیار کی جاتی، چنانچہ منصوب متصل کی جگہ ضمیر مرفوع منفصل استعمال کی گئی جیسا کہ اس کے برعکس "**لو لاه**" میں ہے۔ اور یہ بھی احتمال ہے کہ یہ ضمیر "**يكن**" میں مستتر ضمیر کی تاکید ہو، اور خبر محذوف ہو اور عبارت کی تقدیر یہ ہو: **ان يكن هو هذا**

طیبیؒ فرماتے ہیں یہ بھی ممکن ہے کہ تقدیری عبارت "**ان يكن هو الدجال**" ہو، "**هو**" ضمیر فصل ہو، یا "مبتدا ہو، اور

"الدجال" اس کی خبر ہو اور پھر پورا جملہ یکن کی خبر ہو۔(انتہیٰ) اس آخری توجیہہ کے مطابق "یکنْ" کی ضمیر مستتر ضمیر شان ہو گی جیسا کہ واضح ہے۔

قوله: قال ابن عمر...... قول أن يراه:

"اُبی": "رسول اللہ" پر عطف کی وجہ سے مرفوع ہے، یا مفعول معہ ہونے کی بناء پر منصوب ہے۔

يؤمان: "أمه يؤمه" بمعنیٰ "قصد" سے ہے۔

التي فيها: ای "في ما بينها" او "في بستانها" (وہ جن درختوں کے درمیان تھا۔ یا جس باغ میں تھا)

طفق: فاء کے کسرہ کے ساتھ بمعنی شَرَعَ.

آپؐ ابن صیاد سے پوشیدہ چل رہے تھے تاکہ اس کے غافل ہونے کی حالت میں اس تک پہنچ جائیں، کیونکہ ایسی حالت رھبان کے بطلان کی بڑی دلیل ہے۔

"**يختل**": خاء کے سکون اور تاء کے کسرہ کے ساتھ "الختل" سے ماخوذ ہے جس کا معنی ہے کسی چیز کو حیلے کے ساتھ طلب کرنا۔ اور اس کا مفعول محذوف ہے۔ ای يخدع ابن صياد ۔ یعنی ابن صیاد کے ساتھ تدبیر لڑا رہے تھے۔

أن يسمع: (لام مقدر ہے) ای لیسمع۔ امام نوویؒ فرماتے ہیں: اس سے معلوم ہوا کہ جس شخص کے فتنہ کا خوف ہو تو اس کے احوال کو واضح کرنا اور اس کے مبہم اُمور کو ظاہر کرنا جائز ہے۔

قوله: وابن صياد مضطجع۔۔۔لو تركته بين:

قطيفة: اوڑھنے کی رئیں دار چادر یا چھوٹا لحاف۔

له فيها زمزمة: امام نوویؒ فرماتے ہیں کہ صحیح مسلم کے اکثر نسخوں میں (زمزمة) دو زاؤں کے ساتھ مذکور ہے لیکن بعض نسخوں میں یہ لفظ دو راؤں کے ساتھ (رمرمة) مذکور ہے، اور بخاری میں یہ لفظ دونوں طرح منقول ہے۔ "زمزمة" کا معنی ہے ایسی آواز جو بالکل سمجھ میں نہ آئے یا تھوڑی تھوڑی سمجھ میں آئے۔ شارحؒ فرماتے ہیں کہ (زمزمة) ایسی آواز کو کہتے ہیں جو بالکل سمجھ میں نہ آئے۔ یہ اصل میں "بادل کی گرج" کو کہتے ہیں۔

أي: حرف نداء ہے۔

صاف: "فاء" کے ضمہ کیساتھ ہے اور ایک اور نسخہ میں "فاء" کے کسرہ کے ساتھ ہے اس بناء پر کہ اس کی اصل "صافی" ہے، چنانچہ "یاء" کو حذف کر کے کسرہ پر اکتفاء کیا گیا۔ "وهو اسمه" سے بظاہر پہلی صورت کی تائید ہوتی ہے۔ ممکن ہے کہ "اسم" وصف کے معنی میں ہو کیونکہ اسم کبھی عام معنی یعنی لقب اور علم وغیرہ میں استعمال کیا جاتا ہے۔

لو تركته بين: یعنی اس کے دل میں جو باتیں ہیں ان کو ظاہر کر دیتا۔ (كذا في شرح السنه)

امام نوویؒ نے اس کا مطلب یہ بیان کیا ہے کہ اپنے کلام کے اختلاف کی وجہ سے تمہارے سامنے ایسی بات ظاہر کر دیتا جس کی وجہ سے اس کا مرتبہ تمہاری نظروں میں ہلکا ہو جاتا۔

قوله: قال عبد الله بن عمر:

بظاہر آئندہ عبارت مستقل اور حدیث ہے جس کو یہاں استطراداً ذکر کیا گیا ہے اور اسی وجہ سے حرف عطف کو ذکر نہیں کیا۔ اس کے بعد عبداللہ ابن عمر رضی اللہ عنہما نے فرمایا۔

قوله: اني انذر كموه وما من نبي وقد أنذر قومه:

تعلمون: خبر بمعنی امر ہے ای "اعلموا"

ان الله : أن کا ہمزہ مفتوح ہے "انه" پر عطف کی وجہ سے یا ہمزہ مسکورہ ہے اور یہ جملہ حالیہ ہے۔

ليس بأعور : اللہ کی تنزیہ کے حوالہ سے یہ ایک واضح بات ہے۔

علامہ تورپشتی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ہوسکتا ہے کہ کسی بھی نبی پر یہ بات منکشف نہ ہوئی ہو یا اُن کو بتائی نہ گئی ہو، کہ دجال کانا ہو گا۔ اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ پہلے انبیاء میں سے بعض کو بتائی گئی ہو لیکن اپنی قوم کو یہ بات بتانے کی قدرت ان کو نہ دی گئی ہو، تاکہ یہ کرامت حضور علیہ السلام کو حاصل ہو کہ حضور علیہ السلام ہی وہ نبی ہوں جو دجال کی اس صفت کو بیان کر کے اپنی مضبوط دلیل قائم کریں اور آپ ہی ایسی نشانی بتائیں جس کو نا صرف اہل فراست وعقل بلکہ جاہل عوام بھی پہچان سکیں۔

مسلم کی شرح میں امام نوویؒ فرماتے ہیں کہ ابن صیاد کے معاملہ میں فیصلہ کرنا مشکل ہے اور اس بات میں اشتباہ ہے کہ کیا یہ مسیح دجال ہی ہے یا کوئی اور؟ لیکن اس بات میں کوئی شک نہیں کہ دجالوں میں سے ایک دجال ضرور تھا۔ علماء نے فرمایا ہے کہ احادیث سے بظاہر یہ معلوم ہو رہا ہے کہ حضور علیہ السلام کے پاس ابن صیاد کے مسیح دجال ہونے نہ ہونے کے بارے میں وحی نہیں آئی تھی البتہ آپ کو دجال کی صفات وحی کے ذریعے بتائی گئی تھیں، اور ابن صیاد میں ایسے قرائن موجود تھے، جو اس کے مسیح دجال ہونے کا احتمال رکھتے تھے۔ اسی وجہ سے آپ نے ابن صیاد کے مسیح دجال ہونے نہ ہونے کا قطعی حکم بیان نہیں فرمایا' اور اسی وجہ سے آپ نے حضرت عمر سے ارشاد فرمایا کہ "دجال کی اولاد نہ ہوگی جبکہ ابن صیاد کی اولاد ہے' اور یہ بھی ارشاد فرمایا، کہ "دجال مکہ اور مدینہ میں داخل نہیں ہو سکے گا، جبکہ ابن صیاد مدینہ میں موجود تھا اور مکہ جا رہا تھا چنانچہ اس ارشاد میں (ابن صیاد کے دجال ہونے کی) کوئی دلیل نہیں کیونکہ آپ نے دجال کی جن صفات کے بارے میں خبر دی تھی، وہ اس کے فتنہ برپا کرنے اور ظاہر ہونے کے وقت کی صفات ہیں۔

علامہ خطابیؒ فرماتے ہیں کہ ابن صیاد کے بڑا ہو جانے کے بعد کے بارے میں سلف صالحین سے مختلف قسم کی روایات منقول ہیں، چنانچہ منقول ہے کہ اس نے اپنی اس بات سے توبہ کر لی تھی اور مدینہ میں وفات پائی۔ اور لوگوں نے جب اس کی نماز جنازہ پڑھنے کا ارادہ کیا تو اس کے چہرے سے کپڑا ہٹایا گیا حتی کہ لوگوں نے اسے دیکھا بھی تھا اور لوگوں نے یہ بھی کہا گیا تھا کہ (اس کی موت کے) گواہ ہو جاؤ۔

(علامہ خطابیؒ) فرماتے ہیں کہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما اور حضرت جابرؓ دونوں ابن صیاد کے دجال ہونے پر قسم اٹھاتے تھے اور انکو کسی قسم کا کوئی شک نہیں۔ چنانچہ حضرت جابرؓ سے کسی نے کہا کہ ابن صیاد تو مسلمان ہو گیا ہے اس پر حضرت جابرؓ نے جواب دیا کہ اگرچہ مسلمان ہو گیا ہو (مگر وہ دجال ہی ہے) پھر ان سے کہا گیا کہ ابن صیاد تو مکہ مکرمہ میں داخل ہوا تھا مدینہ میں رہتا تھا اس پر انہوں نے فرمایا کہ اگرچہ مکہ میں داخل ہوا تھا (پھر بھی وہ دجال ہی تھا)۔

امام ابوداوُدؒ نے حضرت جابرؓ سے صحیح سند کے ساتھ نقل کیا ہے قال: فقد ناابن صیاد یوم الحرۃ کہ واقعۂ حرہ کے دن ابن صیاد غائب ہوگیا۔ اس روایت سے اُس قائل کی تردید ہوتی ہے، جس نے روایت کیا ہے کہ ابن صیاد مدینہ میں فوت ہوا تھا اور لوگوں نے اس کی نماز جنازہ پڑھی تھی۔

امام مسلمؒ نے اس بارے میں کئی روایات نقل کی ہیں کہ حضرت جابرؓ اس بات پر قسم اٹھاتے تھے کہ ابن صیاد ہی دجال ہے اور انہوں نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو حضور علیہ السلام کے سامنے اس بات پر قسم اٹھاتے ہوئے سنا تھا، اور حضور علیہ السلام نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی اس بات پر کوئی انکار نہیں فرمایا۔

امام بیہقیؒ نے ''کتاب البعث والنشور''، میں لکھا ہے کہ ابن صیاد کے بارے میں علماء کا آپس میں بہت زیادہ اختلاف ہے کہ کیا وہ دجال تھا یا نہیں؟ جن حضرات کی رائے یہ ہے کہ مسیح دجال ابن صیاد کے علاوہ کوئی اور ہے انہوں نے حضرت تمیم داریؓ کی اس حدیث سے استدلال کیا ہے جو ''جساسہ'' کے قصہ میں وارد ہوئی ہے۔ اور ممکن ہے کہ ابن صیاد اور مسیح دجال کی صفات میں موافقت پائی جاتی ہو جیسا کہ صحیح حدیث میں منقول ہے کہ لوگوں میں دجال کے ساتھ سب سے زیادہ مشابہت عبدالعزی بن قطن رکھتا ہے، حالانکہ وہ دجال نہیں تھا۔ (امام بیہقیؒ نے مزید) فرمایا کہ ابن صیاد ایک فتنہ تھا جس کے ذریعے اللہ نے اپنے بندوں کو آزمایا، اور مسلمانوں اس فتنہ سے محفوظ رکھا اور ان کو اس کے شر سے بچایا۔ یہ تو علامہ بیہقی کی بات تھی ان کے نزدیک راجح یہ ہے کہ ابن صیاد دجال نہیں تھا۔

(ملا علی قاریؒ فرماتے ہیں) ہم یہ بات پہلے بیان کر چکے ہیں کہ حضرت ابن عمر اور حضرت جابرؓ سے صحیح روایت میں منقول ہے، کہ ابن صیاد ہی مسیح دجال ہے۔

اور اگر یہ اشکال ہو کہ ابن صیاد نے حضور علیہ السلام کے سامنے نبوت کا دعویٰ کیا، آپ نے اس کو قتل کیوں نہیں کیا؟ تو اس کا جواب دو طرح سے ہے جس کو امام بیہقی اور دوسرے حضرات نے نقل کیا ہے۔

پہلا جواب ابن صیاد اس وقت نابالغ بچہ تھا۔ اس جواب کو قاضی عیاضؒ نے راجح قرار دیا ہے۔

دوسرا جواب: ابن صیاد یہود کا حلیف تھا، اور یہود بطور ذمی مدینہ میں رہتے تھے۔ امام خطابیؒ نے دوسرے جواب پر جزم کیا ہے۔ اور فرمایا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی مدینہ تشریف آوری کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور یہود کے درمیانی صلح نامہ لکھا گیا اس صلح نامہ میں یہ بات مذکور تھی کہ مسلمان یہودیوں کو انکے حال پر چھوڑ دیں۔ اور ابن صیاد یا تو یہودی تھا یا ان میں داخل ہو کر ان کا حلیف بن گیا تھا۔

علامہ خطابیؒ فرماتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے آیتِ دخان کو دل میں سوچ کر ابن صیاد کا امتحان اسلئے لیا کہ آپ کو یہ بات پہنچی تھی کہ ابن صیاد کہانت کا دعویٰ کرتا ہے اور غیبی امور کے بارے میں بات کرتا رہتا ہے۔ چنانچہ حضورؐ نے اس کا امتحان لیا تاکہ اس کی حقیقتِ حال ظاہر ہو اور صحابہ کرامؓ کے سامنے اس کا بطلان ظاہر ہو جائے اور معلوم ہو جائے کہ یہ تو کاہن و جادوگر ہے جس کے پاس شیطان آتا ہے اور اس کو وہ باتیں القاء کرتا ہے جو باتیں شیاطین کاہنوں کو القاء کرتے ہیں۔ آپؐ نے امتحان لینے کے بعد فرمایا کہ تم اپنے اس مرتبے سے آگے نہیں بڑھ سکو گے۔ اس کے برعکس انبیاء علیہم الصلوٰۃ والتسلیمات کی طرف اللہ تعالیٰ کی

طرف سے غیب کی باتیں وحی کے ذریعے آتی تھیں جو واضح اور بے غبار ہوا کرتی تھیں، اور اسی طرح اولیاء کرام کو جو اللہ تعالیٰ کی جانب سے کرامات کا الہام ہوتا ہے۔ (وہ بھی ابن صیاد کے حال سے مختلف ہے۔)

تخریج: اس حدیث کو امام ابوداؤدؒ اور امام ترمذیؒ نے نقل کیا ہے۔

۵۴۹۵ : وَعَنْ اَبِیْ سَعِیْدِ الْخُدْرِیِّ قَالَ لَقِیَهٗ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ وَاَبُوْ بَكْرٍ وَّعُمَرُ یَعْنِیَ ابْنَ صَیَّادٍ فِیْ بَعْضِ طُرُقِ الْمَدِیْنَةِ فَقَالَ لَهٗ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اَتَشْهَدُ اَنِّیْ رَسُوْلُ اللّٰهِ فَقَالَ هُوَ اَتَشْهَدُ اَنِّیْ رَسُوْلُ اللّٰهِ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اٰمَنْتُ بِاللّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ مَاذَا تَرٰی قَالَ اَرٰی عَرْشًا عَلَی الْمَآءِ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ تَرٰی عَرْشَ اِبْلِیْسَ عَلَی الْبَحْرِ قَالَ وَمَا تَرٰی قَالَ اَرٰی صَادِقَیْنِ وَكَاذِبًا اَوْكَاذِبَیْنِ وَصَادِقًا فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ لُبِّسَ عَلَیْهِ فَدَعُوْهُ ۔ (رواہ مسلم)

اخرجه مسلم فی صحیحه ۲۲٤۱/٤ حدیث رقم (۸۷-۲۹۲۵) والترمذی ٤٤۸/٤ حدیث رقم ۲۲٤۷۔

ترجمہ: ”حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا کہ (ایک روز) رسول اللہ ﷺ سیدنا ابوبکر صدیق اور سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہما ان سب کا سامنا مدینہ کے ایک راستہ میں ابن صیاد سے ہوگیا' رسول اللہ ﷺ نے اس سے پوچھا: کیا تو اس بات کی شہادت دیتا ہے کہ میں اللہ کا پیغمبر ہوں؟ ابن صیاد نے جواباً پوچھا کہ کیا آپ (ﷺ) اس کی شہادت دیتے ہیں کہ میں اللہ کا پیغمبر ہوں؟ رسول اللہ ﷺ نے (یہ سن کر) ارشاد فرمایا: میں خدائے تعالیٰ پر' اس کے فرشتوں پر' اس کی کتابوں پر اور اس کے پیغمبروں پر ایمان لایا (پھر آپؐ نے پوچھا: اچھا تو یہ بتا) تو کیا چیز دیکھتا ہے؟ اس نے کہا کہ میں پانی پر قائم ایک تخت دیکھتا ہوں۔ حضور ﷺ نے فرمایا: تو شیطان کے تخت کو سمندر پر دیکھتا ہے۔ پھر فرمایا: اس کے علاوہ اور کیا دیکھتا ہے؟ ابن صیاد نے کہا کہ کبھی دو سچوں کو دیکھتا ہوں (جو سچی خبریں لایا کرتے ہیں اور ایک جھوٹے کو دیکھتا ہوں جو جھوٹی خبریں لایا کرتا ہے) اور کبھی دو جھوٹوں کو دیکھتا ہوں اور ایک سچے کو اس کے بعد رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اس کے لئے معاملہ (یعنی کہانت) کو ملتبس کر دیا گیا ہے' اس کو چھوڑ دو (یعنی یہ تو درست گفتگو کرنے کے بھی قابل نہیں ہے کہ اس کا کوئی جواب دیا جائے''۔ (مسلم)

تشریح: قوله: لقیه رسول الله ا وابو بکر وعمر یعنی ابن صیاد:

یعنی ابن صیاد: مراد یہ ہے کہ ابوسعید خدریؓ کے کلام ''لقیه'' میں ضمیر منصوب بارز کا مرجع ہے۔

قوله: آمنت بالله وملائکته ورسوله:

اس سے متعلقہ بحث ماقبل میں گذر چکی ہے۔

قوله: تری عرش ابلیس علی البحر۔

میں (ملا علی قاری) کہتا ہوں: سمندر پر ابلیس کا تخت ہونے کے بارے میں تو امت محمدیہ کے بعض افراد کو بھی کشف ہوا

ہے۔ یہ بات ہم ماقبل میں بیان کر چکے ہیں۔

قوله:قال:أرى صادقين و كاذبا او كاذبين و صادقاً:

مطلب یہ ہے کہ میرے پاس دو بندے آتے ہیں، جو مجھے سچی خبریں دیتے ہیں، اور ایک بندہ آتا ہے جو جھوٹی خبریں سناتا ہے۔ ابن صیاد نے ''او'' کلمہ شک کے ساتھ بات کو ذکر کیا اور صادق اور کاذب کے عدد میں اس کو شک تھا یہ اس کے جھوٹا ہونے کی دلیل ہے، اس لئے کہ جس کی تائید اللہ کی طرف سے ہوتی ہے اس کو اس طرح شک نہیں ہوتا۔

قوله:فقال رسول الله ﷺ:لبس عليه فدعوه:

لُبس: لام کے ضمہ اور بائے موحدہ کے کسرہ اور تخفیف کے ساتھ ہے۔ اگر باء کی تشدید کے ساتھ ہوتا تو تاکید اور تکثیر کا فائدہ دیتا۔

''فدعوه'': اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کو چھوڑ دو کیونکہ یہ کوئی ایسی بات نہیں کر رہا کہ جس پر اعتماد کیا جا سکے۔

۵۴۹۶ : وَعَنْهُ اَنَّ ابْنَ صَيَّادٍ سَاَلَ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنْ تُرْبَةِ الْجَنَّةِ فَقَالَ دَرْمَكَةٌ بَيْضَآءُ مِسْكٌ خَالِصٌ. (رواه مسلم)

اخرجه مسلم في صحيحه ٢٢٤٣/٤ حديث رقم (٩٣-٢٩٢٨) واحمد في المسند ٤/٣۔

ترجمہ:''حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ ابن صیاد نے نبی اکرم ﷺ سے سوال کیا جنت کی مٹی کے متعلق (یعنی وہ کیسی ہے؟) کہ جنت کی مٹی کیسی ہے؟ تو آپ ﷺ نے جواباً ارشاد فرمایا: وہ میدہ کی طرح سفید اور خالص مشک کی طرح خوشبودار ہے''۔ (مسلم)

تشریح: **قوله:درمكة بيضاء مسك خالص:**

''درمكة'': کے بارے میں قاموس میں لکھا ہے کہ ''درمك'' جعفر کے وزن پر ہے۔ اس کا معنی ہے میدہ یا نرم مٹی۔ اور نہایہ میں لکھا ہے کہ ''درمكة'' کا معنی ہے سفید آٹا۔ اور جنت کی مٹی کو سفیدی اور نرمی و ملایمت میں سفید آٹے کے ساتھ تشبیہ دی ہے، اور خوشبو کے اعتبار سے مشک کے ساتھ تشبیہ دی ہے۔ (انتہی)

اور کہا جاتا ہے: دقيق حواری: حاء کے ضمہ، واؤ کی تشدید اور راء کے فتحہ کے ساتھ معنی سفید رنگ کھانا۔

''بیضاء'' صفت مؤکدہ ہے اور ''مسك خالص'' خبر ثانی ہے۔

۵۴۹۷ : وَعَنْ نَافِعٍ قَالَ لَقِيَ ابْنُ عُمَرَ ابْنَ صَيَّادٍ فِيْ بَعْضِ طُرُقِ الْمَدِيْنَةِ فَقَالَ لَهٗ قَوْلاً اَغْضَبَهٗ فَانْتَفَخَ حَتّٰى مَلَاَ السِّكَّةَ فَدَخَلَ ابْنُ عُمَرَ عَلٰى حَفْصَةَ وَقَدْ بَلَغَهَا فَقَالَتْ لَهٗ رَحِمَكَ اللّٰهُ مَا اَرَدْتَّ مِنِ ابْنِ صَيَّادٍ اَمَا عَلِمْتَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اِنَّمَا يَخْرُجُ مِنْ غَضْبَةٍ يَغْضَبُهَا. (رواه مسلم)

اخرجه مسلم في صحيحه ٢٢٤٦/٤ حديث رقم (٩٨-٢٩٣٢) واحمد في المسند ٢٨٣/٦۔

ترجمہ: ''حضرت نافع نے بیان فرمایا کہ (ایک روز) حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کی ملاقات مدینہ کے ایک راستہ میں ابن صیاد سے ہوگئی تو انہوں نے اس سے کوئی ایسی بات کہہ ڈالی جس نے اس کو غصہ دلایا دیا اور جوش غضب سے اس قدر پھول گیا حتی کہ تمام گلی کو اس نے بھر دیا اس کے بعد جب ابن عمر رضی اللہ عنہما (اپنی بہن) اُم المؤمنین سیدہ حفصہ رضی اللہ عنہا کے پاس گئے' جن کو اس قصہ کی اطلاع پہنچ چکی تھی' تو انہوں نے فرمایا: ابن عمر خدا تم پر رحم فرمائے' تم نے ابن صیاد سے کیا چاہا تھا (کہ اس کو اس قدر غضبناک کر دیا) کیا تمہیں خبر نہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا تھا: دجال کسی بات پر غضبناک ہو کر ظہور پذیر ہو جائے گا۔ (مسلم)

تشریح: **قوله:لقی ابن عمر۔۔۔وقد بلغها:**

السكة: سین کے کسرہ اور کاف کی تشدید کے ساتھ۔ بمعنی الطریق. (راستہ)

غضبة: ضاد کے سکون کے ساتھ۔ ایک بار کا غصہ۔

أغضبه: فاعل کی ضمیر'' قولاً'' کی طرف لوٹ رہی ہے، اور یہ اسناد مجازی ہے یا ابن عمر رضی اللہ عنہما کی طرف لوٹ رہی ہے۔

ما أردت من ابن صياد: ''ما'' استفہامیہ ہے،'' أردت'' کے لیے مفعول بہ مقدم ہے۔

يغضبها: جملہ محلاً مجرور ہے، اور ضمیر مفعول مطلق کا نائب ہونے کی وجہ سے منصوب ہے۔ ای **يغضب غضبة۔**

قوله:فقالت: رحمك الله:

یہ جملہ دعائیہ ہے۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ زندوں کو بھی اس طرح کے کلمات سے دعا دی جا سکتی ہے۔ اگرچہ اب عرف اس کے برعکس ہے (کہ آج کل معاشرے میں صرف مُردوں کیلئے ان کلمات سے دعا کی جاتی ہے۔)

قوله:انما يخرج من غضبة يغضبها:

یعنی دجال کو غصہ آئے گا، اور مشتعل ہو کر غصہ کی وجہ سے نکل پڑے گا، اور نبوت کا دعویٰ کرے گا، چنانچہ اے عبداللہ! تم اس سے بات نہ کرو کہ مبادا وہ (تمہاری بات پر غصہ ہو کر) نکل پڑے اور فتنے ظاہر ہوں۔ (ذکرہ طیبیؒ)

مظہرؒ فرماتے ہیں مطلب یہ ہے کہ دجال غصے کی حالت میں بھی نکلے گا۔

۵۴۹۸ : وَعَنْ اَبِیْ سَعِیْدِ نِ الْخُدْرِیِّ قَالَ صَحِبْتُ ابْنَ صَیَّادٍ اِلٰی مَکَّۃَ فَقَالَ لِیْ مَا لَقِیْتُ مِنَ النَّاسِ یَزْعُمُوْنَ اَنِّی الدَّجَّالُ اَلَسْتَ سَمِعْتَ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یَقُوْلُ اِنَّہٗ لَا یُوْلَدُ لَہٗ وَقَدْ وُلِدَ لِیْ اَلَیْسَ قَدْ قَالَ ھُوَ کَافِرٌ وَّاَنَا مُسْلِمٌ اَوَلَیْسَ قَدْ قَالَ لَا یَدْخُلُ الْمَدِیْنَۃَ وَلَا مَکَّۃَ وَقَدْ اَقْبَلْتُ مِنَ الْمَدِیْنَۃِ وَاَنَا اُرِیْدُ مَکَّۃَ ثُمَّ قَالَ لِیْ فِیْ اٰخِرِ قَوْلِہٖ اَمَا وَاللّٰہِ اِنِّیْ لَاَ عْلَمُ مَوْلِدَہٗ وَمَکَانَہٗ وَاَیْنَ ھُوَ وَاَعْرِفُ اَبَاہُ وَاُمَّہٗ قَالَ فَلَبَّسَنِیْ قَالَ قُلْتُ لَہٗ تَبًّا لَّکَ سَائِرَ الْیَوْمِ قَالَ وَقِیْلَ لَہٗ اَیَسُرُّکَ اَنَّکَ ذَاکَ الرَّجُلُ قَالَ فَقَالَ لَوْ عُرِضَ عَلَیَّ مَا کَرِھْتُ۔ (رواہ مسلم)

اخرجه مسلم فی صحیحه ٢٢٤٢/٤ حدیث رقم (٨٩-٢٩٢٧) واحمد فی المسند ٢٦/٣

ترجمہ: ''حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا کہ (ایک مرتبہ) میں مکہ کی جانب سفر کے دوران ابن صیاد کے ساتھ تھا' اس نے مجھ سے اپنی اس تمام تکلیف کی شکایت کی جو لوگوں سے اس کو پہنچی تھی' وہ کہنے لگا کہ لوگ مجھ کو دجال خیال کرتے ہیں یا کہتے ہیں (حالانکہ تم اس بات سے واقف ہو کہ یہ بات خلاف حقیقت ہے) ابوسعیدؓ! کیا تم نے رسول اللہ ﷺ کو یہ ارشاد فرماتے ہوئے نہیں سنا کہ دجال کے اولاد نہیں ہوگی' حالانکہ میری اولاد ہے' کیا آپ ﷺ نے یہ نہیں ارشاد فرمایا کہ دجال کافر ہوگا حالانکہ میں مسلمان ہوں' کیا یہ آپ نے یہ ارشاد نہیں فرمایا کہ دجال مدینہ اور مکہ میں داخل نہیں ہو سکے گا' حالانکہ میں مدینہ سے آیا ہوں اور مکہ کی طرف جانا چاہتا ہوں۔ ابوسعید رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ابن صیاد نے آخری بات مجھ سے یہ کہی کہ خبردار! بخدا میں دجال کے وقت ولادت اور اس کے مکان کا علم رکھتا ہوں (کہ وہ کہاں پیدا ہوگا اور اس بات کی بھی خبر رکھتا ہوں وہ (اس وقت) کہاں ہے اور اس کے ماں باپ کو بھی پہچانتا ہوں ابوسعید رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ (یہ باتیں کہہ کر) ابن صیاد نے مجھے شبہ میں ڈال دیا میں نے کہا تو ہمیشہ کے لئے غارت ہو۔ ابوسعید کہتے ہیں کہ اس وقت موجود لوگوں میں سے کسی نے ابن صیاد سے پوچھا کہ کیا تجھ کو اچھا معلوم ہوگا کہ تو خود ہی دجال ہو۔ ابوسعید نے فرمایا کہ اس نے (یہ سن کر) جواب دیا کہ ہاں' اگر وہ تمام چیزیں (یعنی مکر و فریب تلبیس اور شعبدہ بازی وغیرہ جو دجال کو دی گئیں تھی) مجھے دے دی جائیں تو میں برا نہ سمجھوں''۔ (مسلم)

تشریح: **قوله: صحبت ابن صياد الى مكة۔۔۔يرعمون الى الدجال:**

''**الى مكة**'': متوجھین کے متعلق ہو کر حال ہے۔

ما لقيت: ''ما'' استفہامیہ تعجبیہ ہے۔ **اى شيئا عظيما لقيت**

يزعمون انى دجال: بعض حضرات کی رائے یہ ہے کہ یہ جملہ استینافیہ ہے (یہ ایک سوال مقدر کا جواب ہے۔) گویا کہ جب ابن صیاد نے کہا: مجھے لوگوں سے کیا تکلیف پہنچی ہے؟ تو اس پر سوال ہو: **ماذا تشكوا منهم؟** (تمہیں لوگوں سے کیا شکایت ہے؟) تو اس کے جواب میں اس نے کہا ''**يزعمون انى دجال**'' وہ سمجھتے ہیں کہ میں دجال ہوں۔

دوسرا احتمال یہ ہے کہ یہ جملہ'' **لقيت** '' کی ضمیر مرفوع سے حال ہے۔ (مجھے لوگوں سے کیا تکلیف پہنچی ہے درانحالیکہ وہ ایسا گمان کرتے ہیں۔

قوله: اما والله انى لا علم مولده۔۔۔فلبنى:

''**مولده**'': ظرف زمان ہے چنانچہ معنی یہ ہوگا ولادت کا زمانہ۔ ممکن ہے کہ ابن صیاد اس بات میں سچا ہو اور یہ بھی احتمال ہے کہ جھوٹا ہو۔

فلبسنى: بائے موحدہ مخففہ مفتوحہ کے ساتھ ہے۔ امام نوویؒ فرماتے ہیں، کہ یہ لفظ (باء) کی تخفیف کے ساتھ ہے جس کا معنی یہ ہے کہ ابن صیاد نے مجھے اپنے بارے میں شبہ میں ڈال دیا اور مجھے اس کے بارے میں شک ہونے لگا ہے کہ اس نے پہلے تو اس نے ''**انا مسلم**'' کہہ کر اپنے مسلمان ہونے کا اظہار کیا' اور پھر ''**انى لا علم مولده ومكانه**'' کہہ کر علم غیب کا دعویٰ کیا

اور جو علم غیب کا دعویٰ کرے وہ کافر ہے۔اس بات سے مجھے اس کے اسلام اور کفر کے بارے میں اشتباہ ہو گیا۔
ابن الملکؒ فرماتے ہیں: "فلبسنی" باء کی تشدید کے ساتھ باب تفعیل سے ہے۔اور مطلب یہ ہے کہ ابن صیاد نے دجال کی جائے سکونت اور زمانہ پیدائش کو واضح نہیں کیا بلکہ مشتبہ چھوڑ دیا چنانچہ اس کا معاملہ مجھ پر الجھا کر دیا۔یا مطلب یہ ہے کہ اس نے "وقد ولد لي وقد أقبلت من المدينة وأنا اريد مكة" کہہ کر مجھے شک میں ڈال دیا۔اور پہلے اس کے بارے میں گمان یہ تھا کہ وہ دجال ہے۔
تبا: موحدہ کی تشدید کے ساتھ ہے۔بمعنی ہلاکت وخسارہ۔
عرض بصیغہ مجہول ہے۔

۵۴۹۹ : وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ لَقِيتُهُ وَقَدْ نَفَرَتْ عَيْنُهُ فَقُلْتُ مَتّٰى فَعَلَتْ عَيْنُكَ مَآ اَرٰى قَالَ لَآ اَدْرِىْ قُلْتُ لَا تَدْرِىْ وَهِيَ فِىْ رَاسِكَ قَالَ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ خَلَقَهَا فِىْ عَصَاكَ قَالَ فَنَخَرَ كَاَشَدِّ نَخِيْرِ حِمَارٍ سَمِعْتُ. (رواه مسلم)

اخرجه مسلم في صحيحه ٢٢٤٦/٤ حديث رقم (٩٩-٢٩٣٢)۔

ترجمہ: ''حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما نے بیان فرمایا کہ میں (ایک مرتبہ) ابن صیاد سے ملا اس وقت اس کی آنکھ سوجی ہوئی تھی' میں نے پوچھا کہ تیری اس آنکھ میں جو کچھ (ورم) دیکھ رہا ہوں یہ کب سے ہے؟ اس نے جواب دیا کہ مجھے نہیں معلوم کب سے ہے۔میں نے کہا ''تم نہیں جانتے' حالانکہ آنکھ تیرے سر میں ہے'' اس نے کہا کہ اگر اللہ تعالیٰ چاہے تو آنکھ کو تمہارے عصا میں پیدا کر دے۔ابن عمر کہتے ہیں کہ (اس کے بعد) ابن صیاد نے اپنی ناک سے گدھے کی کرخت آواز سے بھی زیادہ خوفناک آواز میں چیخا جس کو میں نے سنا''۔(مسلم)

تشریح: قوله: لقيته وقد نفرت عينه:
وقد نفرت: ''فاء'' کے فتحہ کے ساتھ پڑھا گیا ہے۔اس کا معنی ہے سوجنا۔'' نفرت عينه'' آنکھ کا سوجنا۔شارحؒ فرماتے ہیں کہ ''نفرت'' میں فاء کی جگہ قاف کے ساتھ بصیغہ مجہول ''نقرت'' بمعنی استخرجت بھی پڑھا گیا ہے۔
امام نوویؒ فرماتے ہیں کہ یہ لفظ نون اور قاف کے فتحہ کے ساتھ ہے' بمعنی ورمت و نتات قاضی عیاضؒ نے اس میں بہت ساری وجوہ ذکر کی ہیں، اور ظاہر یہ ہے کہ یہ تصحیف ہے۔
قوله: فقلت: متى فعلت عينك وهي رأسك:
اس جملہ میں فعل کی اسناد ''عین'' کی طرف مجازا ہے، اور اس سے مراد یہ ہے۔ متى فعل الله بعينك ما أرى؟ (یعنی یہ سوجن جو میں دیکھ رہا ہوں اللہ نے تیری آنکھ کے ساتھ یہ معاملہ کب کیا؟۔)
قلت لا تدرى: استفہام انکاری مقدر ہے۔
وهي في رأسك: یہ جملہ ''عین کی طرف راجع ضمیر سے حال ہے۔
قوله: ان شاء الله خلقها في عصاك:

قاضی عیاضؒ فرماتے ہیں، کہ ابن صیاد کا یہ جملہ" لا تدری " کے جواب میں ہے۔ یعنی یہ ممکن ہے کہ انسان کی آنکھ میں کوئی تکلیف ہو، مگر اس انسان کو اس کا احساس نہ ہو جس طرح کوئی بزرگ اپنے رب سے مناجات میں لگا ہوا ہو، اور اس دوران اس کو کوئی چیز کاٹ لے اور اس کو احساس نہ ہو۔ یا کئی لوگوں کو دیکھا گیا ہے کہ ان کو کسی خوشی یا غمی کی وجہ سے بھوک کی تکلیف کا احساس نہیں ہوتا۔

قوله: قال فنخر كاشد نخير حمار سمعت:

نخر: نون اور خاء کے فتحہ کے ساتھ ہے۔ یہ اس آواز کو کہتے ہیں جو گدھا اپنی ناک سے نکالتا ہے۔

۵۵۰۰ : وَعَنْ مُحَمَّدِ بْنِ الْمُنْكَدِرِ قَالَ رَأَيْتُ جَا بِرَ بْنَ عَبْدِ اللّٰهِ يَحْلِفُ بِاللّٰهِ اَنَّ ابْنَ صَيَّادِ الدَّجَّالُ قُلْتُ تَحْلِفُ بِاللّٰهِ قَالَ اِنِّی سَمِعْتُ عُمَرَ يَحْلِفُ عَلٰى ذٰلِكَ عِنْدَ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَلَمْ يُنْكِرْهُ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ. (متفق علیه)

اخرجه البخاري في صحيحه ۳۲۳/۱۳ حديث رقم ۷۳۵۵ ومسلم في صحيحه ۲۲۴۳/٤ حديث رقم (۹٤-۲۹۲۹) وابو داؤد في السنن ٥٠٦/٤ حديث رقم ٤٣٣١۔

ترجمه: ''حضرت محمد بن منکدر تابعیؒ نے بیان فرمایا کہ میں نے حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ کو دیکھا کہ وہ اللہ کی قسم کھا کر یہ بات کہتے تھے کہ ابن صیاد ہی دجال ہے' میں نے ان سے عرض کیا کہ آپ اللہ کی قسم کھا رہے ہیں! (حالانکہ ابن صیاد کا دجال ہونا قطعی نہیں محض ظنی ہے) انہوں نے فرمایا کہ میں نے سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ کو سنا' وہ اس بات پر نبی اکرم ﷺ کے سامنے قسم کھاتے تھے کہ ابن صیاد دجال ہے اور نبی اقدس ﷺ نے اس پر کوئی نکیر نہیں فرمائی اگر یہ بات قطعی نہ ہوتی تو یقیناً حضور ﷺ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کی اس بات کی تردید کرتے''۔ (بخاری ومسلم)

تشریح: قوله: عن محمد بن المنكدر.... فلم ينكره النبی ﷺ:

یعنی حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا اس بات پر حضور ﷺ کے سامنے قسم کھانا اور حضور ﷺ کا انکار نہ کرنا اس بات کی دلیل ہے کہ ابن صیاد کا دجال کرنا یقین ہے۔ بعض لوگوں نے کہا ہے کہ شاید حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا قسم کھانا اس بات پر ہو کہ ابن صیاد ان دجالوں میں سے ایک ہے جو نبوت کا دعویٰ کرینگے اور لوگوں کو گمراہ کرینگے نہ کہ وہ مخصوص دجال۔ اس لئے کہ نبی اکرم ﷺ نے اس بات کی وضاحت اور تصریح نہیں فرمائی ہے، کہ یہ ابن صیاد وہ مخصوص دجال ہے۔ لیکن ظاہر یہ ہے کہ دجال کا اطلاق فرد کامل پر ہوتا ہے۔ اور ان کا قسم کھانا غلبہ ظن پر محمول ہے نہ کہ یقین پر۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

ایک شارح نے" فلم ينكره " کی تشریح اس طرح کی ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے انکار اس لئے نہیں کیا کہ آپؐ نے اپنے اس ارشاد گرامی" يخرج في امتي دجالون كذابون قريبا من ثلاثين " کے ذریعہ جن دجالوں سے ڈرایا تھا یہ انہی میں سے ہے، اور ابن صیاد بھی ان لوگوں میں سے ایک تھا، اس لئے کہ اس نے بھی نبوت کا دعویٰ کر دیا تھا۔ پس حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا قسم کھانا خلاف حقیقت نہیں تھا، بلکہ عین حقیقت ہے۔ انکار نہ کرنے سے مراد یہ ہے کہ اس ابن صیاد میں بھی دجال کی ایک صفت ہے۔ واللہ اعلم بالحال۔

الفصل الثانی:

۵۵۰۱ : عَنْ نَافِعٍ قَالَ كَانَ ابْنُ عُمَرَ يَقُوْلُ وَاللّٰهِ مَا اَشُكُّ اَنَّ الْمَسِيْحَ الدَّجَّالَ ابْنُ صَيَّادٍ ۔

(رواه ابوداود والبيهقى فى كتاب البعث والنشور)

اخرجه ابو داؤد في السنن ٤/ ٥٠٦ حديث رقم ٤٣٣٠۔

ترجمہ: ''حضرت نافعؒ نے بیان فرمایا کہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کہا کرتے تھے کہ اللہ کی قسم! مجھے اس بات میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ مسیح دجال' ابن صیاد ہی ہے اس روایت کو ابوداؤد نے اور بیہقی نے کتاب البعث والنشور میں نقل کیا ہے۔''

تشریح: '' ابن الصیاد'': اور ایک نسخہ میں بغیر لام کے ہے۔

اسنادی حیثیت: اس حدیث کو امام ابوداؤدؒ نے سند کے ساتھ نقل کیا ہے۔

۵۵۰۲ : وَعَنْ جَابِرٍ قَالَ فَقَدْنَا ابْنَ صَيَّادٍ يَوْمَ الْحَرَّةِ. (رواه ابوداود)

اخرجه ابو داؤد في السنن ٤/ ٥٠٦ حديث رقم ٤٣٣٢۔

ترجمہ: ''حضرت جابر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ہم نے واقعہ حرہ کے دن ابن صیاد کو غائب پایا تھا''۔ (ابوداؤد)

تشریح: قوله: قد فقدنا ابن صياد يوم الحرة:

بعض نسخوں میں ''فقد'' مجہول کے صیغہ کے ساتھ اور'' ابن صیاد ''

یوم الحرة: اس سے مراد وہ دن ہے، جب یزید ابن معاویہؓ نے اہل مدینہ پر غلبہ حاصل کیا تھا۔

بعض لوگوں نے کہا ہے کہ یہ روایت اس روایت کے خلاف ہے کہ جس میں یہ ہے کہ'' ابن صیاد مدینہ میں مرا'' لیکن درحقیقت مخالف نہیں ہے۔ (ذکرہ الطیبیؒ) اگر غائب ہونے کے معنی کو عام رکھا جائے ،جس میں موت بھی شامل ہے تو پھر ان دونوں روایتوں میں کوئی تضاد نہیں۔

اسنادی حیثیت: امام ابوداؤد نے اس حدیث کو سند صحیح کے ساتھ روایت کیا ہے۔

۵۵۰۳ : وَعَنْ اَبِىْ بَكْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَمْكُثُ اَبُوا الدَّجَّالِ ثَلَاثِيْنَ عَامًا لَا يُوْلَدُ لَهُمَا وَلَدٌ ثُمَّ يُوْلَدُ لَهُمَا غُلَامٌ اَعْوَرُ اَضْرَسُ وَاَقَلُّهُ مَنْفَعَةً تَنَامُ عَيْنَاهُ وَلَا يَنَامُ قَلْبُهُ ثُمَّ نَعَتَ لَنَا رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَبَوَيْهِ فَقَالَ اَبُوْهُ طِوَالٌ ضَرْبُ اللَّحْمِ كَاَنَّ اَنْفَهُ مِنْقَارٌ وَّاُمُّهُ امْرَاَةٌ فِرْضَاخِيَّةٌ طَوِيْلَةُ الْيَدَيْنِ فَقَالَ اَبُوْبَكْرَةَ فَسَمِعْنَا بِمَوْلُوْدٍ فِى الْيَهُوْدِ بِالْمَدِيْنَةِ فَذَهَبْتُ اَنَا وَالزُّبَيْرُ بْنُ الْعَوَّامِ حَتّٰى دَخَلْنَا عَلٰى اَبَوَيْهِ فَاِذَا نَعْتُ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِيْهِمَا فَقُلْنَا هَلْ لَكُمَا وَلَدٌ فَقَالَا مَكَثْنَا ثَلَاثِيْنَ عَامًا لَا يُوْلَدُ لَنَا وَلَدٌ ثُمَّ وُلِدَ لَنَا غُلَامٌ اَعْوَرُ اَضْرَسُ وَاَقَلُّهُ مَنْفَعَةً تَنَامُ عَيْنَاهُ وَلَا يَنَامُ قَلْبُهُ قَالَ فَخَرَجْنَا مِنْ عِنْدِهِمَا فَاِذَا هُوَ مُنْجَدِلٌ فِى الشَّمْسِ فِىْ قَطِيْفَةٍ

وَلَهُ هَمْهَمَةٌ فَكَشَفَ مِنْ رَّأْسِهِ فَقَالَ مَا قُلْتُمَا قُلْنَا وَهَلْ سَمِعْتَ مَا قُلْنَا قَالَ نَعَمْ تَنَامُ عَيْنَايَ وَلَا يَنَامُ قَلْبِيْ. (رواه الترمذی)

اخرجه الترمذی فی السنن ٤/٤٤٩ حدیث رقم ٢٢٤٨ واحمد فی المسند ٥/٤٠

ترجمہ: ''حضرت ابوبکرہ رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا کہ (ایک روز) رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: دجال کے والدین تیس برس اس حالت میں بسر کریں گے کہ ان کے ہاں کوئی بچہ پیدا نہ ہوگا' پھر ان کے ہاں ایک لڑکا جنم لے گا جو بڑے دانتوں والا یعنی کیچلیوں والا ہوگا۔ بعض حضرات نے کہا ہے کہ ''وہ پیدائشی دانتوں والا پیدا ہوگا۔ وہ (لوگوں کو) بہت کم نفع رساں ثابت ہوگا اس کی دونوں آنکھیں سوتی ہوں گی لیکن اس کا دل نہیں سوئے گا۔ اس کے بعد پیغمبر خدا ﷺ نے ہمارے سامنے اس کے ماں باپ کے کچھ احوال کا تذکرہ فرمایا گیا اور فرمایا ''اس کا باپ انتہائی لمبے قد کا اور کم گوشت والا یعنی دبلا ہوگا اس کی ناک مرغ جیسے جانور کی) چونچ کی مانند لمبی اور پتلی ہوگی اور اس کی ماں بے ڈھنگی موٹی چوڑی اور لمبے ہاتھ والی ایک عورت ہوگی''۔ ابوبکرہ رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ ہم نے مدینہ کے یہودیوں میں ایک (عجیب وغریب) پیدا ہونے والے بچے کے بارے میں سنا تو میں اور زبیر بن العوام رضی اللہ عنہ (اس کو دیکھنے کی غرض سے) چل پڑے یہاں تک کہ ہم اس لڑکے کے ماں باپ کے پاس پہنچے تو کیا دیکھتے ہیں کہ وہ بالکل ویسے ہی ہیں جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے ہم سے ان (دجال کے والدین) کے متعلق بتلایا تھا' ہم نے ان دونوں سے پوچھا کہ تمہارا کوئی بچہ ہے؟ انہوں نے بتایا کہ ہم نے تیس برس ایسے حال میں بسر کئے کہ ہمارا کوئی بچہ نہ تھا' پھر ہمارے ہاں ایک کانا لڑکا پیدا ہوا جو بڑے دانتوں والا اور بہت کم نفع پہنچانے والا ہے' اس کی آنکھیں سوتی ہیں مگر اس کا دل نہیں سوتا۔ ابوبکرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ہم دونوں (ان کی یہ بات سن کر) ان دونوں کے پاس سے نکل پڑے اور پھر دفعتہً ہماری نگاہ اس لڑکے (یعنی ابن صیاد) پر پڑی جو دھوپ میں چادر میں لپٹا ہوا پڑا تھا اور اس (کی چادر) میں سے گنگناہٹ کی سی ایک ایسی آواز آرہی تھی جو سمجھ میں آنے والی نہ تھی۔ اس نے سر سے چادر ہٹا کر ہم سے پوچھا کہ تم نے کیا کہا ہے؟ ہم نے (حیرت زدہ ہوکر کہا) کہ (ہم تو سمجھے کہ تو سو رہا ہے) کیا تو نے ہماری بات سن لی ہے؟ اس نے کہا ہاں! میری آنکھیں سوتی ہیں مگر میرا دل نہیں سوتا''۔ (ترمذی)

تشریح: قوله: يمكث أبوا الدجال ثلاثين عاما۔۔۔اقله منفعة:

یہاں پر دجال سے مراد شاید عام ہو، کہ کسی ایک دجال کے والدین تیس سال تک بغیر اولاد کے رہیں گے۔ لہٰذا یہ (حدیث) سابق اور آئندہ کلام کے منافی نہیں۔

أضرس: بڑی داڑھ والے کو کہتے ہیں، یا بعض نے کہا ہے کہ وہ شخص جس کی پیدائشی طور پر داڑھیں ہوں۔ جزریؒ فرماتے ہیں کہ میرے نزدیک یہ ''اضر شی'' سے تصحیف ہے۔

قوله: تنام عيناه ولا ينام قلبه:

قاضی صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں وہ جاگتے ہوئے افکار فاسدہ کے بارے میں سوچتا ہے اور وسوسے اور غلط خیالات

شیطان اس کے ذہن میں ڈالتا ہے۔ اس وجہ سے سوتے ہوئے بھی اس کے ذہن میں اور دل میں یہی خیالات پیدا ہوتے ہیں۔ جس طرح حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا دل افکار صالحہ کی وجہ سے نہیں سوتا تھا کیونکہ آپ پر وحی اور الہام کا تانتا بندھا رہتا تھا۔

قوله: قال ابوه طوال۔۔۔ طويلة اليدين:

طوال: طاء کے ضمہ اور واؤ کی تخفیف کے ساتھ، یہ "طویل" کا مبالغہ ہے۔ اور تشدید میں زیادہ مبالغہ ہے۔ لیکن روایت واؤ مخففہ کے ساتھ ہے۔

فرضاخية: فاء کے کسرہ اور یائے تحتیہ کی تشدید کے ساتھ

طويلة اليدين: باقی انسانوں کی نسبت سے ہے۔ اور یا اس کے اپنے باقی اعضاء کی نسبت سے ہے۔

قوله: فذهبت أنا والزبير۔۔۔ ولا ينام قلبه:

منجدل: بکسر الدال ہے۔ اس کا معنی ہے زمین پر اوندھے منہ لیٹا ہونا۔

همهمة: ای زمزمة۔ (زمزمة کی تحقیق ماقبل میں گزر چکی ہے۔)

ایک شارح فرماتے ہیں "همهمة" وہ کلام جو بالکل سمجھ میں نہ آئے۔ یہ درحقیقت سینے سے آواز نکالنے کو کہتے ہیں۔ "النهاية" میں ہے کہ "همهمة" کا اصل معنی ہے: "صوت البقر" (گائے کی آواز)

۵۵۰۴ : وَعَنْ جَابِرٍ اَنَّ امْرَاَةً مِّنَ الْيَهُوْدِ بِالْمَدِيْنَةِ وَلَدَتْ غُلَامًا مَمْسُوْحَةً عَيْنُهٗ طَالِعَةٌ نَابُهٗ فَاَشْفَقَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَنْ يَّكُوْنَ الدَّجَّالُ فَوَجَدَهٗ تَحْتَ قَطِيْفَةٍ يُهَمْهِمُ فَاٰذَنَتْهُ اُمُّهٗ فَقَالَتْ يَا عَبْدَ اللّٰهِ هٰذَا اَبُو الْقَاسِمِ فَخَرَجَ مِنَ الْقَطِيْفَةِ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَالَهَا قَاتَلَهَا اللّٰهُ لَوْ تَرَكَتْهُ لَبَيَّنَ فَذَكَرَ مِثْلَ مَعْنٰى حَدِيْثِ ابْنِ عُمَرَ فَقَالَ عُمَرُ ابْنُ الْخَطَّابِ ائْذَنْ لِّيْ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ فَاَقْتُلَهٗ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنْ يَّكُنْ هُوَ فَلَسْتَ صَاحِبَهٗ اِنَّمَا صَاحِبُهٗ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ وَاِلَّمْ يَكُنْ هُوَ فَلَيْسَ لَكَ اَنْ تَقْتُلَ رَجُلًا مِنْ اَهْلِ الْعَهْدِ فَلَمْ يَزَلْ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مُشْفِقًا اَنَّهٗ هُوَ الدَّجَّالُ۔ (رواه في شرح السنة)

اخرجه البغوی فی شرح السنة ۷۸/۱۵ حديث رقم ۴۲۷۴ واحمد فی المسند ۳۶۸/۳۔

ترجمه: "حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ مدینہ کی ایک یہودی عورت نے ایک بچہ کو جنم دیا تھا جس کی آنکھ (یعنی داہنی آنکھ اور بعض حضرات نے کہا ہے کہ بائیں آنکھ) مسخ اور ہموار تھی اور اس کی کچلیاں باہر نکلی ہوئی تھیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم (کو جب ایسے لڑکے کے متعلق اطلاع ملی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم) کو اندیشہ ہوا کہ کہیں یہ دجال نہ ہو۔ پس (جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس کو دیکھنے کی غرض سے گئے تو) آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو ایک چادر کے نیچے لیٹا ہوا پایا' درآنحالیکہ وہ دھیمی آواز میں کچھ گنگنا رہا تھا جس کا مطلب سمجھ میں نہیں آ رہا تھا ماں نے کہا' عبداللہ یعنی ابن صیاد! یہ ابوالقاسم (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) ہیں وہ (یہ سنتے ہی) چادر سے باہر نکل آیا' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: اس عورت کو کیا ہوا' خدا اسے

غارت کرے (کہ اس نے لڑکے کو میری موجودگی سے باخبر اور ہوشیار کر دیا) اگر وہ اس کو اس کے حال پر چھوڑ دیتی (اور میری آمد سے آگاہ نہ کرتی) تو بلاشبہ وہ اپنی حقیقت حال کو آشکارا کر دیتا''۔ اس کے بعد حضرت جابر رضی اللہ عنہ یا راوی نے سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کی (اس) حدیث کے مطابق بیان کیا (جو باب کے شروع میں نقل کی جا چکی ہے چنانچہ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے درخواست کی کہ یا رسول اللہ! آپ ﷺ اجازت مرحمت فرما دیں تو میں اس کو قتل کر ڈالوں؟ حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا: اگر یہ (ابن صیاد) وہی دجال ہے تو اس کے قتل کرنے والے تم نہیں ہو بلکہ اس کے قاتل عیسیٰ بن مریم علیہما السلام ہوں گے اور اگر یہ وہ دجال نہیں ہے تو تمہیں ایک ایسے شخص کو قتل کرنے کی کوئی اجازت نہیں ہے جو اہل ذمہ میں سے ہے (یعنی ان غیر مسلموں میں سے ہے جن کے جان و مال کی حفاظت ہمارے ذمہ ہو چکی ہے اور جن کو ''ذمی'' کہا جاتا ہے) اس کے بعد آنحضرت ﷺ ہمیشہ خوف اس بات سے خائف رہے کہ ابن صیاد کہیں دجال نہ ہو''۔ اس روایت کو بغوی نے شرح السنۃ میں روایت کیا ہے''۔

تشریح: **قوله: ان امرأة من اليهود۔۔۔طالعة نابه:**

طالعة: شرح السنہ میں اسی طرح ہے کہ بظاہر ''**طالعانابه**'' ہونا چاہئے تھا' الا یہ کہ اُس سے جنس مراد ہو' اور تعدد تحمل پر محمول ہے۔ چنانچہ مطلب یہ ہوگا: **طالعة انیاء به** اور قاموس میں لکھا ہے کہ انیاب ان دانتوں کو کہتے ہیں جو رباعی کے پیچھے ہوتے ہیں۔ پس تعدد دو اطراف کے اعتبار سے ہے، اور جمع اس لئے ہے کہ جمع کی اقل مقدار دو ہیں۔ یہ حدیث ''اضرس'' والی روایت کی مؤید ہے جو ماقبل میں گذر چکی ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

قوله: فاشفق رسول الله ﷺ۔۔۔ لو تركته لبين:

ما لها: ''ما'' استفہامیہ ہے' مبتدا واقع ہو رہا ہے، اور ''**لها**'' اس کیلئے خبر ہے۔

قوله: فذكر مثل معنى حديث الخ:

ائذن لي فاقتله: '' اذن '' سے فعل امر ہے۔ ''**فاقتله**'' اس امر کا جواب ہے اور یہ جواب امر محلاً منصوب ہے۔

بعض محققین نے کہا ہے ابن صیاد کے بارے میں جو احادیث و روایات منقول ہیں، گو ان کے درمیان اختلاف و تضاد ہے، لیکن اس حدیث جو یہ بات منقول ہے کہ آپ ہمیشہ ابن صیاد کے دجال ہونے میں شک میں رہتے۔ اس کی توجیہ یہ ہے کہ جب تک آپ کو مسیح دجال کے بارے میں پورے حقائق کا علم نہیں تھا' اس وقت تک ابن صیاد کو دجال سمجھتے تھے۔ لیکن تمیم داری اور وحی کے ذریعے آپ کو یقین ہو گیا کہ ابن صیاد دجال نہیں ہے۔ اس کی تائید حضرت ابو سعید خدریؓ کی اس حدیث سے بھی ہوتی ہے جس میں سفر مکہ کے دوران اس سے ملاقات اور گفتگو کا ذکر ہے۔ ابن صیاد کے والدین اور دجال کے والدین کے توافق اوصاف کے بارے میں کوئی قطعی بات نہیں کہی جا سکتی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا اور ان کے بیٹے ابن عمر رضی اللہ عنہما کا اس کے بارے میں قسم کھانا' (یعنی ابن صیاد کے دجال ہونے کی قسم کھانا) اور حضور ﷺ کا اس پر نکیر نہ فرمانا بھی اس وقت کی بات ہے جب صورت حال واضح نہیں تھی' اور اس میں دجال کی بعض علامات ایسی تھیں کہ جس سے نبی کریم ﷺ کو اندیشہ ہوا۔

بَابُ نُزُوْلِ عِیْسٰی

عیسیٰ علیہ السلام کے نزول کا بیان

۵۵۰۵ : عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ وَالَّذِیْ نَفْسِیْ بِیَدِهٖ لَیُوْشِكَنَّ اَنْ یَنْزِلَ فِیْكُمُ ابْنُ مَرْیَمَ حَكَمًا عَدْلًا فَیَكْسِرُ الصَّلِیْبَ وَیَقْتُلَ الْخِنْزِیْرَ وَیَضَعُ الْجِزْیَةَ وَیَفِیْضُ الْمَالَ حَتّٰی لَا یَقْبَلَهٗ اَحَدٌ حَتّٰی تَكُوْنَ السَّجْدَةُ الْوَاحِدَةُ خَیْرًا مِنَ الدُّنْیَا وَمَا فِیْهَا ثُمَّ یَقُوْلُ اَبُوْ هُرَیْرَةَ فَاقْرَءُوْا اِنْ شِئْتُمْ وَاِنْ مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ اِلَّا لَیُؤْمِنَنَّ بِهٖ قَبْلَ مَوْتِهٖ اَلْاٰیَةَ . (متفق علیه)

اخرجه البخاری فی صحیحه ٦/٤٩٠ حدیث رقم ٣٤٤٨ ومسلم فی صحیحه ١/١٣٥ حدیث رقم (٢٤٢-١٥٥) واخرجه الترمذی فی السنن ٤/٤٣٩ حدیث رقم ٢٢٣٣ وابن ماجه فی السنن ٢/١٣٦٣ حدیث رقم ٤٠٧٨۔

ترجمہ: ''حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے' البتہ ضرور بالضرور ایک ایسا وقت جلد آنے والا ہے جب عیسیٰ بن مریم (آسمان سے زمین پر) اتریں گے ایک حاکم عادل ہونے کی حیثیت سے وہ صلیب کو توڑ دیں گے' سور کو مار دیں گے (یعنی اس کو پالنا اور کھانا مطلق حرام وممنوع اور اس کو مار ڈالنا مباح کر دیں گے) جزیہ کو لینا بند کر دیں گے (ان کے زمانہ میں) مال و دولت کی اس قدر کثرت ہوگی کہ کوئی اس کا لینے والا نہ رہے گا اور اس وقت ایک سجدہ دنیا اور دنیا میں موجود تمام چیزوں سے بہتر ہوگا''۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ (اتنا حصہ بیان کرنے کے بعد فرماتے ہیں) کہ اگر تمہیں اس بات میں کسی درجہ میں کوئی شک وشبہ پیدا ہو اور دلیل حاصل کرنا) چاہتے ہو تو اس آیت شریفہ کی قراۃ کر لو۔ ''اہل کتاب میں سے کوئی بھی شخص ایسا نہ بچے گا جو عیسیٰ علیہ السلام پر ان کی وفات سے پہلے ایمان نہ لے آئے گا''۔ (بخاری ومسلم)

تشریح: قوله: والذین نفسی بیده --- فیکسر الصلیب:

حکمًا: پہلے دونوں حرفوں کے فتحہ کے ساتھ بمعنی حاکماً۔ ''زید عدل'' کے قبیل سے ہے۔

عدلا: یہ بمعنی ''عادلا'' ہے

فیکسر: یہ مجہول کا صیغہ ہے، یہ مرفوع ہے اور بعض کا کہنا ہے کہ منصوب ہے۔

'فا' تفریعیہ ہے، یا یہ 'فا' تفصیل کیلئے۔ 'حکم' اور 'عدل' کی

شرح السنہ وغیرہ میں ذکر ہے کہ مراد یہ ہے کہ عیسائی مذہب کو ختم کر دینگے، اور دین اسلام کو قوت دینگے۔

ابن الملک فرماتے ہیں کہ 'صلیب' نصاریٰ کی اصطلاح میں وہ مثلث لکڑی ہے جس پر ان کے دعویٰ کے مطابق عیسیٰ علیہ السلام کو پھانسی دی گئی تھی اور کبھی اس لکڑی پر مسیح کی تصویر بھی ہوتی ہے۔

قولہ: یقتل الخنزیر:

شرح السنہ میں یہ مذکور ہے کہ اس میں اس بات کا بیان ہے کہ خنزیر نجس العین ہے، حضرت عیسیٰ اس کو شریعت اسلامی کی وجہ سے قتل کرینگے، اور قابل انتفاع پاک چیز کا اتلاف مباح نہیں ہے۔ کسی دنیاوی یا دینی مصلحت کی وجہ سے ہو تو جائز ہے۔

قولہ: یضع الجزیۃ:

اہل کتاب سے جزیہ کو اٹھا دینگے، ان کو اسلام کی دعوت دیں گے اور ان سے دین اسلام کے علاوہ کوئی اور دین تسلیم نہیں کرینگے۔ بعض لوگوں نے کہا ہے، کہ ان سے جزیہ کا حکم اٹھا دینگے، کیونکہ کوئی آدمی بھی محتاج نہیں ہوگا۔ کیونکہ ہر آدمی کے پاس مال کی کثرت ہوگی۔

قولہ: یفیض المال۔۔۔حتی الخ:

یفیض: 'یا' فتحہ کے ساتھ ہے۔ **فاض یفیض** سے ماخوذ ہے۔

حتی تکون السجدۃ الواحدۃ: سجدہ سے مراد یا تو نفس سجدہ ہے، یا 'بعض' بول کر 'کل' مراد ہے یعنی سجدہ بول کر مراد نماز ہے۔

امام طیبیؒ فرماتے ہیں کہ پہلا "**حتی**" **یفیض الماء** کے متعلق ہے،، اور دوسرا "**حتی**" **فیکسر الصلیب** کے مفہوم کے لئے غایت ہے۔

اور زیادہ درست یہ ہے کہ دوسرا 'حتی' پہلے (حتی) سے بدل ہے۔ یا پہلے کیلئے غایت ہے، اور اس کی علت کے قائم مقام ہے۔ امام تورپشتی رحمہ اللہ فرماتے ہیں، کہ درحقیقت تو سجدے کی یہ عظمت ہمیشہ ہے لیکن یہاں پر مراد یہ ہے کہ لوگ اللہ کے احکامات میں رغبت کریں گے اور دنیا سے کنارہ کشی اختیار کر لیں گے، حتی کہ ان کے نزدیک اس وقت ایک سجدہ دنیا و ما فیہا سے زیادہ محبوب ہوگا۔

ثم یقول ابو ھریرۃؓ الخ: امام طیبیؒ فرماتے ہیں کہ اس آیت سے آخری زمانے میں نزول عیسیٰ پر استدلال کیا گیا ہے دونوں ضمیر "**بہ**" اور "**موتہ**" حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی طرف راجع ہیں۔ معنوی اعتبار سے توضیحی عبارت یوں ہے: **وان من اھل الکتاب احد الالیؤ منن بعیسی قبل موت** کہ اہل کتاب میں سے ہر شخص حضرت عیسیٰ علیہ السلام ان کی وفات سے پہلے ایمان لائے گا۔ اور یہ وہ اہل کتاب ہونگے جو ان کے نزول کے وقت موجود ہوں گے۔ پس اس وقت صرف ملت اسلام ہی ہوگی۔ (انتھی)

اور بعض لوگوں نے کہا ہے کہ اس آیت کا مطلب یہ ہے کہ اہل کتاب میں سے حضرت محمدؐ پر مرنے سے پہلے ایمان لائے

گا۔ اس صورت میں "بہ" ضمیر کا مرجع حضرت محمدؐ اور "موتہ" میں ضمیر کا مرجع "کتابی" ہوگا۔

اور بعض نے یہ مطلب بیان کیا ہے اہل کتاب میں سے ہر کوئی اپنے مرنے سے پہلے حضرت عیسیٰ پر ایمان لائے گا، کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اللہ کے بندے ہیں اور ان کی بندی کے بیٹے ہیں مگر ان کا ایمان ان کو نفع نہیں پہنچا سکے گا۔

اور بعض کا کہنا ہے کہ "بہ" میں ضمیر لفظ "اللہ" کی طرف راجع ہے۔ مطلب یہ ہوگا کہ اہل کتاب میں ہر کوئی مرنے کے وقت اللہ پر ایمان لائے گا، مگر اس وقت ان کا ایمان لانا، ان کو فائدہ نہیں دے گا۔ آیت کے سلسلہ میں اولیٰ مذہب حضرت ابو ہریرہؓ کا ہے۔

۵۵۰۶: وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَيَنْزِلَنَّ ابْنُ مَرْيَمَ حَكَمًا عَادِلاً فَلَيَكْسِرَنَّ الصَّلِيْبَ وَلَيَقْتُلَنَّ الْخِنْزِيْرَ وَلَيَضَعَنَّ الْجِزْيَةَ وَلَيَتْرُكَنَّ الْقِلَاصَ فَلَا يُسْعٰى عَلَيْهَا وَلَتَذْهَبَنَّ الشَّحْنَاءُ وَالتَّبَاغُضُ وَالتَّحَاسُدُ وَلَيَدْعُوَنَّ اِلَى الْمَالِ فَلَا يَقْبَلُهُ اَحَدٌ (رواہ مسلم وفی روایة) لَهُمَا قَالَ كَيْفَ اَنْتُمْ اِذَا نَزَلَ ابْنُ مَرْيَمَ فِيْكُمْ وَاِمَامُكُمْ مِنْكُمْ۔

اخرجه البخاری فی صحیحه ٤٩١/٦ حدیث رقم ٣٤٤٩ ومسلم فی صحیحه ١٣٥/١ حدیث رقم ١٥٢/٢٤٣ واحمد فی المسند ٤٩٤/٢۔

ترجمہ: "حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: البتہ ضرور بالضرور عیسیٰ بن مریم ایک عادل حکمران کی حیثیت سے نزول فرمائیں گے' صلیب کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیں گے' سور کو مار دیں گے' ذمیوں سے جزیہ کو موقوف کر دیں گے اور جوان اونٹنیوں کو چھوڑ دیا جائے گا کہ ان سے سواری اور بوجھ لادنے کا کام نہیں لیا جائے گا اور یقیناً لوگوں کے دلوں سے کینہ' بغض اور حسد زائل ہو جائے گا اور یقیناً حضرت عیسیٰ علیہ السلام لوگوں کو مال و دولت عطا کرنے کی غرض سے بلائیں گے لیکن (استغنا و بے نیازی کا یہ عالم ہوگا کہ) کوئی بھی مال و دولت کو قبول کرنے والا نہ ہوگا"۔ (مسلم) اور بخاری و مسلم کی ایک روایت میں یہ ہے کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: اس وقت تمہاری کیفیت کیا ہوگی؟ (یعنی تم کتنا سکون و کیف محسوس کرو گے) جب عیسیٰ بن مریم علیہ السلام تمہارے درمیان نزول فرمائیں گے اور تمہارا امام تم ہی میں سے (یعنی اہل قریش میں سے یا تمہاری ملت کا کوئی بھی فرد) ہوگا"۔

تشریح: قوله: واللہ لینزلن ابن مریم حکما عادل:

اور ایک نسخہ میں "عادلاً" کی بجائے "عدلا" کا لفظ ہے۔ یہ لفظ زیادہ بلیغ ہے "عادلا" سے۔

قوله: فليكسرن الصليب، وليقتلن الخنزير وليضعن الجزية:

اس کی تشریح ماقبل میں گزر چکی ہے۔

قوله: وليتركن القلاص فلا يسعى عليه:

"لیترکن" بصیغہ معروف ہے، جبکہ بعض نسخوں میں بصیغہ مجہول مذکور ہے۔

قلاص: قاف کے کسرہ کے ساتھ ہے، یہ جمع کا صیغہ ہے۔ اس کا واحد ''قلوص'' بفتح القاف آتا ہے۔ اور ''قلوص'' جوان اونٹنی کو کہتے ہیں۔

اس جملے کے متعدد مطالب بیان کیئے گئے ہوں:

اول: اس اونٹنی کی ضرورت نہ ہونے کی وجہ سے اسکو کام میں نہیں لایا جائے گا۔ کیونکہ اسکے علاوہ اور بہت اونٹنیاں ہونگی۔

ثانی: اس کا معنی یہ ہے کہ زکوٰۃ میں قلاص اونٹنی کو قبول نہیں کیا جائے گا، کیونکہ اس کو لینے والا کوئی نہیں ہوگا۔

ثالث: نہایہ میں مذکور ہے کہ اس کی زکوٰۃ چھوڑ دی جائے گی، پس اس کے لئے کوئی ساعی نہیں ہوگا۔

بعض نے کہا ہے کہ اس اونٹنی کے ساتھ کوئی چرانے والا کوئی نہیں ہوگا۔ چنانچہ صحاح میں ہے: **کل من ولی امر قوم فھو ساع علیھم:** کہ جس کسی کو کسی قوم کا امیر بنا دیا گیا، تو وہ شخص اس قوم کا مالک اور ذمہ دار ہے۔

مظہرؒ نے کہا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اونٹوں کا صدقہ اور زکوٰۃ لینا چھوڑ دیں گے۔ اور وہ کسی کو بھی یہ صدقہ لینے کا حکم نہیں دینگے کیونکہ اس صدقہ کو لینے والا کوئی نہیں ہوگا، تمام لوگ اس سے مستغنیٰ ہوں گے، اور ''سعی'' سے مراد عمل ہے۔

امام طیبیؒ فرماتے ہیں کہ ''ترک القلاص'' میں یہ بھی ممکن ہے کہ یہ تجارت حصول مال کے لئے کوشش اور اشیائے ضرورت کے حصول کی کوششوں کو چھوڑنے کا کنایہ ہو۔ کیونکہ لوگ ان سب سے مستغنیٰ ہوں گے۔

قولہ: ولتذھبن الشحناء والتباغض والتحاسد:

الشحناء: شین کے فتحہ کے ساتھ ہے، دشمنی جو دل کو غصہ سے پر کر دے۔

''تباغض'' دشمنی کا سبب ہے۔

''تحاسد'' تباغض کیلئے کا باعث ہے۔ تباغض، شحناء اور تحاسد، یہ تینوں چیزیں دنیا کے ساتھ محبت کا نتیجہ ہے۔ یہ تینوں چیزیں ختم ہو جائیں گی، کیونکہ لوگوں کے دلوں سے دنیا کی محبت نکل جائے گی، جب دنیا کی محبت نہ رہے گی تو اس کا نتیجہ بھی نہیں رہے گا۔

اشرفؒ نے کہا ہے شحناء، تباغض اور تحاسد، ختم ہو جائیں گے، کیونکہ اس وقت تمام لوگ ملت اسلام پر ہوں گے۔ اور ان تینوں کا سبب اکثر اختلاف دین ہے۔ جب اختلاف دین نہیں رہے گا تو یہ بھی نہیں رہیں گے۔

میں (ملا علی قاریؒ) کہتا ہوں اب تو اکثر ممالک ملت اسلام پر متفق ہیں، اور اس کے باوجود ان میں یہ تینوں بیماریاں موجود ہیں۔ ان چیزوں کا باعث اور سبب حب جاہ اور حرام مال کی طرف رغبت ہے۔

قولہ: ولید عون الی المال فلا یقبلہ احد:

لیدعون: اور ایک نسخہ میں واؤ کے ضمہ کے ساتھ ضبط ہے، اور یہ ضبط امام نوویؒ کی طرف منسوب ہے۔ اور اس کی کوئی وجہ نظر نہیں آ رہی ہے۔ پس درست وہی ہے جو اصول معتمدہ میں ہے کہ واؤ کے فتحہ اور نون کے تشدید کے ساتھ ہے۔ اور اس کا فاعل ضمیر ہے جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی طرف راجع ہے۔

قوله: رواه مسلم وفي رواية لهما:
مسلم کے ذکر کے قرینہ کے ساتھ مراد مسلم اور بخاری ہے۔

قوله: قال كيف انتم ـــ واما مكم منكم:
"امامکم منکم" سے مراد یہ ہے کہ وہ تمہارے دین والا ہوگا، اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ" امامکم منکم " سے مراد قریش ہے۔ یعنی امام مہدی تمہارے امام ہوں گے۔ اور حاصل اس کا یہ ہے کہ تمہارا امام عیسیٰ علیہ السلام کے علاوہ ایک ہوگا۔ کیونکہ عیسیٰ علیہ السلام کی حیثیت خلیفہ کی ہوگی۔ اور کہا گیا ہے، کہ یہ دلیل ہے اس بات کی کہ عیسیٰ علیہ السلام، محمد ﷺ کی امت میں سے نہیں ہوں گے، بلکہ وہ ملت اور امت کیلئے معین ہوں گے۔

شرح السنہ میں لکھتے ہیں: معمر فرماتے ہیں: وانكم واما مكم منكم، اور ابن أبی ذئب، نے ابن شھاب: سے نقل کرتے ہوئے فرمایا: فاما مكم منكم، (تمہارا امام تم میں سے ہوگا) ابن ابی ذئب اس کے معنی بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں: فأمكم بكتاب ربكم وسنة نبيكم. (وہ تمہاری امت 'تمہارے رب کی کتاب اور تمہارے نبی کی سنت کے مطابق کرائیں گے)

امام طیبیؒ فرماتے ہیں: "أمكم" کی ضمیر "عیسیٰ" کی طرف راجع ہے، اور "منکم" حال ہے۔ أي يؤمكم عيسىٰ حال كونه من دينكم.

اور "امامکم منکم" کے ایک معنی یہ بھی ہو سکتے ہیں: اس وقت تمہارا کیا حال ہوگا کہ جب اللہ تعالیٰ کے ہاں تمہارا اکرام ہو رہا ہوگا اور درآنحالیکہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام تم میں نازل ہوں گے اور تمہارا امام تم میں سے ہوگا اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام تمہارے دین کی تکریم کی خاطر تمہارے امام کی اقتداء کریں گے اس معنی کی تائید اگلی روایت سے بھی ہوتی ہے۔ (انتھی) اس سلسلہ کا مزید کلام عنقریب آگے آئے گا۔

۵۵۰۷ : وَعَنْ جَابِرٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا تَزَالُ طَآئِفَةٌ مِّنْ اُمَّتِيْ يُقَاتِلُوْنَ عَلَى الْحَقِّ ظَاهِرِيْنَ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ قَالَ فَيَنْزِلُ عِيْسٰى ابْنُ مَرْيَمَ فَيَقُوْلُ اَمِيْرُهُمْ تَعَالَ صَلِّ لَنَا فَيَقُوْلُ لَا اِنَّ بَعْضَكُمْ عَلٰى بَعْضٍ اُمَرَآءُ تَكْرِمَةَ اللّٰهِ هٰذِهِ الْاُمَّةَ. (رواه مسلم)

اخرجه مسلم في صحيحه ۱۳۷/۱ حديث رقم (۲٤۷-۱۵٦) واخرجه ابو داوٗد في السنن ۱۱/۳ حديث رقم ۲٤۸٤ والترمذي في السنن ٤۳۷/٤ حديث رقم ۲۲۲۹ وابن ماجه في السنن ٤/۱ واحمد في المسند ۲۷۹/۵۔

ترجمہ: "حضرت جابر رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: "میری اُمت میں سے ہمیشہ کوئی جماعت حق کی خاطر جہاد کرتی رہے گی اور (اپنے دشمنوں پر) غالب رہے گی' قیامت (کے قریب) تک یہی سلسلہ برقرار رہے گا پھر آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا۔ جب حضرت عیسیٰ بن مریم علیہ السلام (آسمان سے نزول فرمائیں گے اور اس وقت مسلمان نماز کی ادائیگی کے لئے حاضر ہوں گے) تو لوگوں کے امیر (یعنی امام مہدیؒ) عیسیٰ علیہ السلام سے کہیں گے کہ تشریف لائیے ہمیں نماز پڑھائیے (کیونکہ امامت کا حق اسی شخص کو ہوتا ہے جو افضل ہو اور ظاہر ہے کہ آپ کامل رسول و نبی ہونے کی حیثیت سے اس وقت سب سے افضل ہوں گے) لیکن عیسیٰ علیہ السلام ان

سے کہیں گے کہ میں امامت نہیں کروں گا (تا کہ کوئی یہ وہم نہ کرنے لگے کہ شاید دین محمدی منسوخ ہو چکا ہے) اور بلا شبہ تم میں سے بعض لوگ بعض پر امام و امیر ہیں اس وجہ سے کہ اللہ تعالیٰ نے اس امت محمد یہ کو اعزاز و بزرگی عنایت کی ہے۔ (مسلم)

تشریح: لا تزال طائفة من امتی یقاتلون علی الحق ظاهرین الی یوم القیامة:

ظہور حق کیلئے یہ مقاتلہ حسی ہوگا، یا معنوی ہوگا۔ یا مطلب یہ ہے کہ وہ اس وقت حق پر ہوں گے۔ اور اپنے دشمنوں پر غالب ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿الا ان حزب الله هم الغالبون﴾ کہ اللہ ہی کا گروہ غالب رہے گا۔

قوله: فال فينزل عيسى ابن مريم الخ:

تعال: لام کے فتحہ کے ساتھ ہے۔ بمعنی احضر وتقدم

صل لنا: یہ جملہ بدل ہے یا استناف بیان ہے۔

اور ایک روایت میں "تعال صل لنا" کی بجائے "تعال فصل لنا" ہے۔

قوله: فيقول لا ۔۔۔۔ تكرمة الله هذه الامة:

میں تمہارا امام نہیں بن سکتا، تا کہ میری امامت کی وجہ سے یہ توہم نہ کیا جائے کہ تمہارا دین منسوخ ہو چکا ہے۔ اور بعض لوگوں نے کہا ہے کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ نماز آپ کی امامت کیلئے قائم کی گئی ہے۔ پس آپ اس امامت کیلئے اولیٰ ہیں۔ لیکن پہلے قول کی تائید اگلے کلام سے بھی ہوتی ہے۔

تكرمة الله، منصوب ہے، کیونکہ یہ مفعول لہ ہے۔ اور اس کا عامل محذوف ہے۔ ای "شرع الله أن يكون امام المسلمين منهم، وأميرهم من عدادهم، تكرمة لهم وتفخيما لشانهم".

تكرمة الله: یہ مصدر ہے اور ماقبل جملہ کے مضمون کی تاکید ہے۔

تفتازانیؒ "شرح العقائد" میں فرماتے ہیں: صحیح ترین بات یہ ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام لوگوں کو نماز پڑھائیں گے اور ان کو امامت کرائیں گے، اور مہدی ان کی اقتدا کریں گے، کیونکہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام افضل ہیں۔ اور افضل کا امامت کرنا اولیٰ ہے۔

ابن ابی شریفؒ فرماتے ہیں کہ یہ مسلم شریف کی روایت: **اما مكم منكم** کے موافق ہے میں ہے، لیکن حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی حدیث کے مخالف ہے۔

لیکن ان دونوں روایتوں میں یوں جمع بھی ممکن ہے، کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام جب اولاً اتریں گے تو یہ بتلانے کے لئے کہ وہ شریعت کے احکام کے مطابق فیصلہ کرنے میں مقتدا اور امام ہیں، نماز پڑھائیں گے۔ پھر جب دوبارہ ان کو امامت کی دعوت دی جائے گی، تو وہ اشارہ کریں گے کہ مہدی امامت کرائیں تا کہ اس امت کا اکرام واضح ہو جائے۔

میں (ملا علی قاریؒ) کہتا ہوں کہ ان دونوں روایتوں اس کے برعکس بھی جمع ممکن ہے۔ "**امامكم منكم**" کا ظاہر یہی بتاتا ہے کہ امام، مہدی علیہ السلام ہی ہوں گے۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالمرام۔

اور ان کی افضلیت سے کسی غیر کی اقتداء کا بطلان لازم نہیں آتا۔

وَهٰذَا الْبَابُ خَالٍ عَنِ الْفَصْلِ الثَّانِي :

اور اس باب میں دوسری فصل نہیں ہے۔

الفصل الثالث:

۵۵۰۸ : عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ ابْنِ عَمْرٍو قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَنْزِلُ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ إِلَى الْأَرْضِ فَيَتَزَوَّجُ وَيُوْلَدُ لَهٗ وَيَمْكُثُ خَمْسًا وَّأَرْبَعِيْنَ سَنَةً ثُمَّ يَمُوْتُ فَيُدْفَنُ مَعِيَ فِيْ قَبْرِيْ فَأَقُوْمُ أَنَا وَعِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ فِيْ قَبْرٍ وَّاحِدٍ بَيْنَ أَبِيْ بَكْرٍ وَعُمَرَ. (رواه ابن الجوزی فی کتاب الوفاء)

رواه ابن ماجه فی کتاب الوفاء

ترجمہ: ''حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما نے بیان فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: حضرت عیسیٰ بن مریم علیہ السلام زمین پر نازل ہوں گے تو وہ نکاح کریں گے اور ان کو اولاد دی جائے گی دنیا میں پینتالیس سال تک قیام پذیر رہیں گے' پھر وفات پا جائیں گے اور وہ میری قبر یعنی میرے مقبرہ میں میرے پاس دفن کیے جائیں گے (چنانچہ قیامت کے دن) میں اور عیسیٰ علیہ السلام دونوں ایک مقبرہ سے ابوبکر وعمر رضی اللہ عنہما کے درمیان (یعنی حضرات شیخین کی ہمراہی میں) اٹھیں گے' اس روایت کو ابن جوزی نے کتاب الوفا میں روایت کیا ہے''۔

تشریح: قوله: ويمكث خمسا واربعين سنة:

یہ روایت اس روایت کے ظاہر کے خلاف ہے:

"ان عيسى رفع به الى السماء وعمره ثلاث وثلاثون ويمكث في الارض بعد نزوله سبع سنين"

اس کا مجموعہ چالیس (۴۰) سال بنتے ہیں۔لیکن زمین پر سات سال تک ان کے رہنے کا ذکر امام مسلم نے کیا ہے۔پس جمع کی مذکورہ بالا صورت متعین ہے۔یا صحیح کی روایت کو ترجیح حاصل ہے،اور یہ بھی ممکن ہے کہ پانچ کا عدد الغاء کسر کی خاطر ساقط ہو یوں چالیس رہ گئے۔اب کوئی تعارض نہ رہا۔

قوله: فيدفن معي في قبري:

"معی" سے مراد ساتھ اور قریب ہونا ہے۔''قبری'' سے مراد ''مقبرہ'' ہے۔اور مقبرہ کو قبر سے اس لیے تعبیر کیا ہے کہ دونوں قبریں قریب ہی ہیں تو گویا کہ دونوں ایک ہی قبر میں ہیں۔

قوله: فاقوم انا وعيسى في قبر واحد بين ابي بكر وعمر: (یہاں "فی" بمعنی "من" ہے) ای من قبر واحد، چنانچہ قاموس میں لکھا ہے کہ "فی" "من" کے معنی میں (بھی) آتا ہے۔(وکذا فی المعنی)

حال کیلئے ظرف ہے، أي: حال كوننا قائمين واقفين بين أبي بكر وعمر. شیخین میں سے ایک آپ دونوں حضرات کے دائیں جانب ہوں گے، اور بظاہر وہ حضرت ابوبکرؓ ہی ہوں گے، اور دوسرے آپ کے بائیں جانب ہوں گے، بظاہر وہ حضرت عمر فاروقؓ ہی ہوں گے۔ اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے شایان شان یہی ہے، کہ وہ نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام اور ابوبکر صدیقؓ کے درمیان ہوں۔ لیکن عنقریب جزریؒ کا کلام میں آ رہا ہے کہ وہ حضرت عمرؓ کے بعد یعنی حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے پرے دفن ہوں گے، اور یہ بات شاید انہوں نے اس اعتبار سے کہی ہو کہ ان کی وفات بعد میں ہوگی، لہٰذا بعد میں ہی دفن ہوں گے یا اس وجہ سے کہی کہ امت کی کرامت ظاہر ہو۔ یوں کہ شیخین دو عظیم الشان نبیوں کے درمیان ہوں گے۔

بَابُ قُرْبِ السَّاعَةِ وَاَنَّ مَنْ مَّاتَ فَقَدْ قَامَتْ قِيَامَتُهٗ

قیامت کا قرب اور جو شخص مر گیا اسکی قیامت آ گئی کا بیان

قوله: باب قرب الساعة:

اور ایک نسخہ میں: ''باب قرب القيامة'' ہے اور ''قیامت'' کو 'ساعة'' کے لفظ سے تعبیر کیا کیونکہ یہ اچانک آئے گی۔ سو اس کا واقع ہونا، اس کم سے کم ممکنہ وقت میں ہوگا جس کو زمانہ کہا جا سکتا ہے اگرچہ یہ انتہاء کے اعتبار سے طویل ہوگی۔ اس لئے ''ساعة'' کہا۔ اور بعض نے کہا ہے کہ ''قیامت پر ساعة کا اطلاق اس کی طوالت کی بنا پر تسمیہ بالضد کے طور پر کیا ہے، جس طرح کو کافور حبشی کہہ دیا جاتا ہے۔

قوله: وان من مات فقد قامت قيامته:

اس جملہ کا عطف ''قرب الساعة'' پر ہے نہ کہ صرف ''الساعة'' پر۔ کیونکہ اس صورت میں معنی کی خرابی لازم آئے گی۔ امام تورپشتیؒ فرماتے ہیں کہ ''الساعة'' زمانے کے اجزاء میں سے ایک جزء ہے، اور اس سے ''قیامت'' کو بھی تعبیر کیا گیا ہے۔

قرآن وسنت میں قیامت کی تین اقسام مذکور ہیں:

اول القیامۃ الکبریٰ: لوگوں کو جزاء کے لئے اٹھایا جانا

ثانی القيامة الوسطیٰ: ایک قرن کے لوگوں کا موت کے باعث ختم ہو جانا۔

ثالث القيامة الصغریٰ: یہ انسان کی موت ہے۔

یہاں قیامت سے مراد یہی قیامت صغریٰ ہے۔ اور ظاہر یہ ہے کہ ''الساعة'' سے مراد قیامت کبریٰ ہے۔ چاہے اس سے مراد ''نفخة اولى'' ہو، چونکہ نبی کریم ﷺ '' کا ارشاد گرامی ہے: اتقوم الساعة الا على شرار الناس''.

یا ''نفخة ثانية'' مراد ہو، جو کہ ایک بڑی آفت ہے اور کتاب اللہ اور سنت رسول میں مذکور و معروف ہے۔

احادیث باب میں سے ایک حدیث نبی ﷺ کا یہ فرمان ہے: ''بعثت انا و الساعة كهاتين'' اس میں ساعت سے مراد دونوں ہو سکتے ہیں۔ حضرت عائشہؓ کی آئندہ آنے والی حدیث قیامت وسطی پر دلالت کر رہی ہے۔ اور میرا گمان ہے کتاب اللہ میں ''الساعة'' اس معنی میں استعمال نہیں ہوا ہے۔

اور قیامت صغریٰ والے معنی پر بھی صرف دیلمی کی روایت دال ہے جو حضرت انسؓ سے مرفوعاً مروی ہے:

"اذا مات احد کم فقد قامت قیامته"

اور ترجمۃ الباب اسی حدیث کو بنایا ہے، مگر آئندہ مذکور روایات اس کے مطابق نہیں ہیں، کیونکہ روایات میں لفظ " ساعة" کہیں وارد نہیں ہوا۔

چنانچہ یہ کہا بہتر ہے کہ قیامت تین حصوں پر مشتمل ہے:

① کبریٰ: اس کو" طامة جامعة" سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

② وسطیٰ: یعنی نفخه۔ اس کے نتیجہ میں عام موت واقع ہوگی۔

③ صغریٰ: اماتت جماعت یعنی ایک زمانے کے لوگوں کا وفات پا جانا۔

قیامت کا اطلاق ان تینوں پر ہوتا ہے۔ اور تن تنہا مر جانے والے شخص کی موت پر بھی قیامت کا اطلاق ہوتا ہے۔ واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم۔

۵۵۰۹ : وَعَنْ شُعْبَةَ عَنْ قَتَادَةَ عَنْ اَنَسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بُعِثْتُ اَنَا وَالسَّاعَةُ كَهَاتَيْنِ قَالَ شُعْبَةُ وَسَمِعْتُ قَتَادَةَ يَقُوْلُ فِي قِصَصِهٖ كَفَضْلِ اِحْدٰهُمَا عَلَى الْاُخْرٰى فَلَا اَدْرِيْ اَذَكَرَهٗ عَنْ اَنَسٍ اَوْ قَالَهٗ قَتَادَةُ. (متفق علیه)

اخرجه البخاری فی صحیحه ۳۴۷/۱۱حدیث رقم ۶۵۰۴ومسلم فی صحیحه ۲۲۶۸/۲حدیث رقم (۱۳۳-۲۹۵۱) وابن ماجه۱۳۴۱/۲حدیث رقم ۴۰۴۰ والدارمی فی السنن ۴۰۴/۲حدیث رقم ۲۷۵۹ واحمد فی المسند ۳۰۹/۴۔

ترجمہ: "حضرت شعبہؒ حضرت قتادہؒ سے اور وہ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کرتے ہیں کہ جناب رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: "میں اور قیامت' کو ان دو انگلیوں (یعنی شہادت کی انگلی اور بیچ کی انگلی) کی مانند بھیجا گیا ہے۔ حضرت شعبہؒ کا بیان ہے کہ میں نے حضرت قتادہؒ سے سنا' وہ (حضور اقدس ﷺ کے اپنی بعثت مبارکہ اور وقوع قیامت کو دو انگلیوں سے تشبیہ دینے کا مطلب بیان فرماتے ہوئے) اپنے وعظ میں کہہ رہے تھے کہ جس طرح ان دونوں میں سے ایک انگلی دوسری انگلی سے بڑھی ہوئی ہے۔ شعبہ نے فرمایا: میں نہیں جانتا کہ قتادہ نے یہ مراد حضرت انس رضی اللہ عنہ سے نقل کی ہے یا قتادہ نے اپنی طرف سے بیان کی ہے۔ (بخاری ومسلم)

تشریح: قوله: بعثت أنا والساعة كهاتين:

"الساعة" اس میں رفع اور نصب دونوں جائز ہیں۔ بعض نسخوں میں رفع ہے اور بعض میں نصب ہے۔

امام نوویؒ فرماتے ہیں کہ "الساعة" کو نصب اور رفع دونوں کے ساتھ روایت کیا گیا ہے۔

ہمارے علماء میں سے ایک شارح فرماتے ہیں کہ روایت میں "الساعة" مرفوع ہے، البتہ اس کو منصوب پڑھنا اس طور پر جائز ہے، کہ اس "واو" کو "مع" کے معنی میں لے لیں۔

"کھاتین": قاضی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ حضور ﷺ کی بعثت اور قیامت میں وہ نسبت ہے جو ایک انگلی کو دوسری انگلی سے

نسبت ہے اور یہی معنی اس قول کا ہے جس میں یہ ہے کہ جیسے وسطی کی فضیلت سبابہ پر آگے نکلنے میں ہے اور اسی بات پر حضرت ابن شدادؓ کی روایت دلالت کر رہی ہے۔ جو عنقریب آ رہی ہے۔

اور زیادہ درست یہ ہے کہ یہ کہا جائے کہ بعثت نبوی کے زمانہ اور قیامت میں فاصلہ اتنا ہے کہ جتنا دو انگلیوں کے درمیان ہوتا ہے۔ یعنی بہت کم فاصلہ ہوتا ہے۔ اور اس قول کی تائید صاحب النہایہ کے کلام سے ہو رہی ہے۔

اس میں ایک اور احتمال بھی ہے وہ یہ کہ اس سے مراد یہ ہو کہ آپ کی دعوت قیامت کے ساتھ ملی ہوئی ہے۔ دونوں ایک دوسرے سے جدا نہیں ہو سکتیں۔ کہ جس طرح سباب ''وسطی'' سے جدا نہیں ہو سکتی۔

ایک اور شارح فرماتے ہیں کہ اس سے مراد یہ ہے کہ آپؐ کا دین قیامت کے ساتھ متصل ہوگا، یعنی قیامت اور اس دین کے درمیان کوئی اور دین حائل نہیں ہوگا، اور نہ ان دونوں کے درمیان کسی اور دعوت کا فاصلہ آئے گا۔ جس طرح سبابہ اور وسطی کے درمیان کوئی چیز حائل نہیں۔

امام طیبیؒ فرماتے ہیں کہ پہلی توجیہ کی تائید حضرت مستورؓد بن شداد کی روایت سے ہوتی ہے، جو عنقریب آئے گی۔ (ملا علی قاری) میں کہتا ہوں کہ یہ بات قابل غور ہے۔ میں نظر ہے۔ اس لئے کہ ہر حدیث میں ایک ایسے معنی کی رعایت کی گئی ہے جس کی رعایت دوسری حدیث میں نہیں کی گئی، اور یہ بات ملحوظ رکھنا اس لیے بہتر ہے کہ تاسیس تاکید سے اولی ہے۔ علاوہ ازیں اس حدیث میں اگر دونوں معنی مراد لئے جائیں تو تب بھی کسی محظور کا ارتکاب لازم نہیں آتا۔ کیونکہ دونوں میں باہم کوئی تعارض نہیں ہے۔ ہاں البتہ پہلے معنی سے قریب ہونے کی تشبیہ میں مبالغہ کے جو معنی مفہوم ہوتے ہیں، یہ معنی دوسرے سے مفہوم نہیں ہو رہے۔ اس وجہ سے بعض نے اسی کو اختیار کیا ہے۔ اور اس کی تائید اس بات سے بھی ہوتی ہے کہ یہ راوی کی تفسیر کے موافق ہے۔

قوله: قال شعبة وسمعت قتاده يقول في قصصه:

قصص: قاف کے فتحہ کے ساتھ ہے، قص، یقص مصدر ہے، اور اس کا معنی ہے وعظ کرنا، قصہ بیان کرنا، روایت کرنا اور اسی سے اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: ﴿نحن نقص عليك احسن القصص﴾ [یوسف: ۳] ''ہم نے جو یہ قرآن آپ کے پاس بھیجا ہے'' اور ایک نسخہ میں قاف کے کسرہ کے ساتھ بھی یہ ہے۔ ایسے میں یہ قصة کی جمع ہوگی۔

امام طیبیؒ فرماتے ہیں: '' كفضل احداهما''، بدل ہے ''كهاتين'' سے اور اس کی وضاحت کر رہا ہے۔

''الساعة'' میں رفع عطف کی وجہ سے ہے، (کیونکہ اس کا عطف ''أنا'' پر ہے) ای بعثت انا والساعة بعثا متفا ضلا مثل فضل احداهما اور جب اس کو منصوب پڑھیں گے، تو یہ درست نہیں ہوں گے یعنی اس وقت ان دونوں میں معیت کا قصد ضروری ہوگا۔ لیکن یہ دعویٰ جو اس حدیث میں ہے مبالغہ کی بنیاد پر ہے۔ جیسا کہ آنے والی حدیث میں اس کو یوں تعبیر کیا گیا ہے: ''بعثت في نفس الساعة'' ۔ ''نفس الساعة'' سے ''قرب الساعة'' مراد ہے۔

قوله: فلا أدري اذكره عن انس او قاله قتادة:؟

بہرحال (شعبہؒ نے فرمایا کہ) مجھے نہیں معلوم کہ یہ مراد حضرت قتادہؒ نے خود بیان کی یا انہوں نے اس کو حضرت انس رضی اللہ عنہ سے سن کر روایت کیا ہے (اور اگر یہ متعین بھی ہو جائے کہ قتادہؒ نے یہ مراد اپنی طرف سے نہیں بتلائی تھی بلکہ اس کو حضرت

انس رضی اللہ عنہ سے سن کر روایت کیا ہے تو پھر یہ احتمال رہے گا کہ یہ مراد اپنی طرف سے حضرت انس رضی اللہ عنہ نے بیان کی تھی یا آنحضرت ﷺ نے خود ہی یہ مطلب بھی واضح فرمایا تھا اور اس کو حضرت انس رضی اللہ عنہ نے آنحضرت ﷺ سے سن کر روایت کیا ہے ویسے حضرت مستور بن شداد کی ایک روایت آ رہی ہے اس میں یہ صراحت موجود ہے کہ اپنی یہ مراد خود آنحضرت ﷺ نے بیان فرمائی تھی۔

تخریج: اس حدیث کو احمد اور ترمذی نے حضرت انسؓ سے اور احمد اور شیخین نے سہل بن سعد سے روایت کیا ہے۔

۵۵۱۰ : وَعَنْ جَابِرٍ قَالَ سَمِعْتُ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ قَبْلَ اَنْ يَّمُوْتَ شَهْرًا تَسْأَلُوْنِي عَنِ السَّاعَةِ وَاِنَّمَا عِلْمُهَا عِنْدَ اللّٰهِ وَاُقْسِمُ بِاللّٰهِ مَا عَلَى الْاَرْضِ مِنْ نَفْسٍ مَنْفُوْسَةٍ يَاْتِيْ عَلَيْهَا مِائَةُ سَنَةٍ وَّهِيَ حَيَّةٌ يَوْمَئِذٍ . (رواہ مسلم)

اخرجه مسلم في صحيحه ١٩٦٦/٤ حديث رقم (٢١٨-٢٥٣٨) واحمد في المسند ٣٢٢/٣۔

ترجمہ: ”حضرت جابر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے نبی اکرم ﷺ کو وفات سے ایک ماہ قبل یہ بات ارشاد فرماتے ہوئے سنا کہ تم لوگ مجھ سے قیامت کے وقت کے متعلق سوال کرتے ہو تو حقیقت یہ ہے کہ اس کے وقت متعین کا علم محض اللہ تعالیٰ کو ہے اور میں حق تعالیٰ شانہ کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ اس وقت روئے زمین پر ایسا کوئی زندہ انسان باقی نہیں ہے جس پر سو برس کی مدت بیت جائے اور وہ اس کے بعد بھی زندہ ہی رہے“۔ (مسلم)

تشریح: قوله: تسألوني عن الساعة وانما علمها عند الله:

تسألوني: نون کی تشدید اور تخفیف دونوں کے ساتھ پڑھ سکتے ہیں۔ اور حاضر کا صیغہ ہے، خطاب صحابہ سے ہے۔ اس سے پہلے استفہام انکاری کا ہمزہ مقدر ہے۔ یعنی ”اتسألوني“ ”الساعة“ سے مراد قیامت ہے یعنی نفخہ اولیٰ یا ثانیہ

وانما علمها عند الله: امام طیبیؒ فرماتے ہیں کہ یہ جملہ حال مؤکدہ ہے، اور اشکال کو رفع کرنے کیلئے ہے۔ ان کے سوال کو ان پر ہی لوٹایا ہے۔ اور ”**وانما علمها عند الله**“ اس کی تاکید ہے۔

قوله: وأقسم بالله الخ:

واقسم بالله: یہ جملہ اس حال کیلئے تاکید ہے۔ ای **تسألوني عن القيامة الكبرىٰ وعلمها عند الله ما أعلمه هو القيامة الصغرى** (یعنی تم مجھ سے قیامت کے بارے میں سوال کرتے ہو، جبکہ اس کا علم صرف اللہ کو ہے۔ اور جو مجھ کو معلوم ہے وہ قیامت صغریٰ ہے) اور امام طیبیؒ کی یہ تشریح ہماری بیان کردہ قیامت کی تقسیم کی تائید کر رہی ہے۔

ما على الارض: ”ما“ نافیہ ہے۔

من نفس: ”من“ زائدہ استغراق کیلئے ہے۔

منفوسة: یہ ”نفس“ کی صفت ہے۔ کہا جاتا ہے: **نفست المرأة غلامًا اذا ولدت نفسا**، از باب سمع، اور مجہول بھی مستعمل ہے زچگی کے بعد عورت نافس اور نفساء کہلاتی ہے اور بچہ کو ”منفوس“ کہا جاتا ہے۔

شاعر کہتا ہے:

کما سقط المنفوس بین القوابل

یاتی علیها...... : یہ جملہ بھی "نفس" کی صفت ہے۔

اشرفؒ فرماتے ہیں: آنحضرت ﷺ کے اس ارشادِ گرامی کا مطلب یہ ہے: ماتبقی نفس مولودۃ الیوم مائۃ سنۃ کہ آج جو شخص بھی ہے، وہ سو سال تک باقی نہیں رہے گا، اس سے مراد صحابہؓ کی موت تھی، آنحضرت ﷺ کا یہ ارشاد غالب پر محمول ہے، وگرنہ تو بعض صحابہ سو سال سے زیادہ زندہ رہے ہیں۔ مثلاً حضرت انسؓ بن مالک اور حضرت سلمان رضی اللہ عنہ وغیرہ۔ اور زیادہ ظاہر مطلب یہ ہے: لا تعیش نفس مائۃ سنۃ بعد هذا القول جیسا کہ اگلی حدیث بھی اس مفہوم پر دلالت کر رہی ہے، لہٰذا باعتبار غالب کی قید کی ضرورت نہیں ہے۔ (اس بات کے بعد کوئی بھی نفس سو سال زندہ نہیں رہے گا)

اور ممکن ہے کہ اس زمانہ کے مولودین، اس حدیث کے ارشاد فرمانے کے وقت سے لے کر سو سال کے اندر اندر گزر چکے ہوں۔ اس معنی کی تائید محققین کے اس استدلال سے بھی ہوتی ہے کہ انہوں نے "بابا رتن ہندی" جیسے لوگوں کے دعویٰ صحابیت کی تردید کی ہے۔ باقی رہی یہ بات کہ اس حدث کا ظاہر حضرت خضر اور الیاس علیہما السلام کی عدم حیات پر دلالت کرتا ہے۔

جیسا کہ امام بغویؒ، معالم التنزیل میں لکھتے ہیں: چار انبیاء زندہ ہیں۔ دو زمین پر ہیں: ① حضرت خضرؑ اور ② حضرت الیاسؑ اور دو آسمان پر ہیں: ① حضرت عیسیٰ ② حضرت ادریس، تو حدیث باب سے یہ چار حضرات مخصوص ہیں، یا یہ مراد ہے: ما من نفس منفوسۃ من أمتی، (میری امت کا کوئی زندہ نشان الخ) اور ایک نبی دوسرے نبی کا امتی نہیں ہوتا۔

بعض کا کہنا ہے کہ "علی الارض" کی قید سے حضرت خضرؑ اور حضرت الیاسؑ پہلے ہی خارج ہیں، چونکہ وہ اس وقت بحر میں تھے۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

۵۵۱۱: وَعَنْ اَبِیْ سَعِیْدٍ عَنِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قَالَ لَا یَاْتِیْ مِائَةُ سَنَةٍ وَعَلَی الْاَرْضِ نَفْسٌ مَنْفُوْسَةٌ الْیَوْمَ. (رواہ مسلم)

اخرجه مسلم في صحيحه ١٩٦٦/٤ حديث رقم (٢١٩-٢٥٣٩) والترمذي في السنن ٤٥٠/٤ حديث رقم ٢٢٥٠ واحمد في المسند ٣٧٩/٣۔

ترجمہ: "حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے منقول رہے کہ نبی اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا: اس وقت جو لوگ روئے زمین پر (یعنی صحابہؓ) زندہ ہے ان میں سے کوئی بھی شخص بھی ایسا نہیں کہ اس پر سو برس کا عرصہ گزر جائے اور وہ تب بھی زندہ ہی رہے"۔ (مسلم)

تشریح: قولہ: لا یأتی مائۃ سنۃ وعلی الارض نفس منفوسۃ:

"وعلی الأرض نفس منفوسۃ: یہ جملہ حالیہ ہے۔

"الیوم": یہ ظرف ہے "منفوسۃ" کے لئے۔ (ذکرہ طیبیؒ) ابن الملکؒ فرماتے ہیں کہ اس سے نبی اکرم ﷺ کے زمانے کی طرف اشارہ ہے۔

۵۵۱۲: وَعَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ كَانَ رِجَالٌ مِّنَ الْاَعْرَابِ یَاْتُوْنَ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ فَیَسْاَلُوْنَهٗ

عَنِ السَّاعَةِ فَكَانَ يَنْظُرُ اِلٰى اَصْغَرِهِمْ فَيَقُوْلُ اِنْ يَّعِشْ هٰذَا لَا يُدْرِكُهُ الْهَرَمُ حَتّٰى تَقُوْمَ عَلَيْكُمْ سَاعَتُكُمْ. (متفق علیه)

اخرجه البخاري في صحيحه ۳٦۱/۱۱ حديث رقم ٦٥۱۱ ومسلم في صحيحه ۲۲٦۹/٤ حديث رقم (۱۳٦-۲۹۵۲) واحمد في المسند ۱۹۲/۳۔

ترجمہ: ''حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے بیان فرمایا کہ کچھ دیہاتی لوگ نبی اکرم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا کرتے تھے اور یہ سوال کرتے رہتے تھے کہ وقوع قیامت کب ہوگا؟ آنحضرت ﷺ (یہ سوال سن کر) اس بچہ کی جانب دیکھتے جوان دریافت کرنے والوں کے ہمراہ ہوتا تھا اور پھر فرماتے کہ اگر یہ بچہ زندہ رہا تو اس کے بوڑھا ہونے سے پہلے پہلے تم پر تمہاری قیامت آ جائیں گی''۔ (بخاری ومسلم)

تشریح: **قوله: كان رجال من الاعراب ......:**

ظاہر یہ ہے کہ ان کا سوال'' قیامة کبریٰ'' کے بارے میں تھا۔ اور آنے والا جواب، جواب علی اسلوب الحکیم ہے۔

لا يدركه: رفع کے ساتھ ہے' اور بعض کا کہنا ہے کہ جزم کے ساتھ ہے۔ ای لا يلحقه.

الهرم: ھا اور راء کے فتحہ کے ساتھ ہے۔ اور ''ھرم'' سے مراد بڑھاپا ہے۔

قوله: حتى تقوم عليكم ساعتكم

یہاں ساعت سے مراد قیامت ہے میرے نزدیک اس ''ساعت'' سے مراد ''ساعت صغریٰ'' ہے۔ جبکہ بعض دیگر شراح کے نزدیک اس سے مراد ''ساعة وسطیٰ'' ہے۔ اور مراد اس سے سب کا مر جانا ہے اور یہی ظاہر ہے۔ یا اکثر کا مر جانا ہے، اور یہی غالب ہے۔

قاضیؒ صاحب فرماتے ہیں کہ ''الساعة'' سے مراد اس قرن کا ختم ہونا ہے، جس قرن میں ان کا شمار ہوتا تھا' اسی وجہ سے اضافت انہی کی طرف فرمائی۔

اور بعض نے یہ کہا ہے کہ اس سے مراد ان میں سے ہر ایک کی موت ہے۔

الفصل الثاني:

۵۵۱۳: عَنِ الْمُسْتَوْرِدِ بْنِ شَدَّادٍ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ بُعِثْتُ فِي نَفَسِ السَّاعَةِ فَسَبَقْتُهَا كَمَا سَبَقَتْ هٰذِهٖ هٰذِهٖ وَاَشَارَ بِاِصْبَعَيْهِ السَّبَّابَةَ وَالْوُسْطٰى. (رواه الترمذی)

اخرجه الترمذي في السنن ٤۲۹/٤ حديث رقم ۲۲۱۳

ترجمہ: ''حضرت مستورد بن شداد رضی اللہ عنہ نبی اکرم ﷺ سے نقل فرماتے ہیں کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: مجھے قیامت ہی کی ابتدا میں مبعوث کیا گیا ہے (یعنی مجھے ایسے دور میں بھیجا گیا ہے جس میں قیامت کی علامت کا آغاز ہو گیا ہے) اور میں قیامت سے بس اتنا ہی آگے بڑھ گیا ہوں جس قدر کہ یہ (بیچ کی انگلی اس (شہادت کی)

انگلی سے بڑھی ہوئی ہے یہ فرما کر آپ ﷺ نے اپنی دونوں انگلیوں یعنی شہادت کی انگلی اور بیچ کی انگلی کی جانب اشارہ فرمایا"۔(ترمذی)

تشریح: قوله: بعثت في نفس الساعة:

"نفس": نون اور فاء کے فتحہ کے ساتھ ہے۔ اور اس سے مراد"قرب الساعة" ہے۔

نَفَسَ کا معنی ہے سانس لینا۔ قیامت کا نَفَسَ اس کی علامات کا ظہور ہے۔

اسی باب سے اللہ کا ارشاد ہے:﴿ وَالصُّبْحِ إِذَا تَنَفَّسَ ﴾[التکویر۔۱۸] "اور قسم ہے صبح کی وہ کرنے لگے" صبح کے تنفس کا مطلب ہے اس کے طلوع کے آثار کا ظہور ہو جائے۔ اور قیامت کی علامات میں نبی ﷺ کی بعثت پہلی علامت ہے۔ یہ امام توریشتی کے کلام کا معنی ہے۔

اور اظہر یہ ہے کہ اس کا معنی یہ ہے کہ"مجھے اور قیامت کو کمال اتصال کی وجہ سے قریب قریب وقت میں بھیجا گیا ہے"۔ اور دونوں کے درمیان انفصال بہت کم تھا اس لئے اس کا اعتبار نہیں کیا گیا۔ آگے"فسبقتها الخ" سے اس معنی کی تائید ہو رہی ہے۔

قوله: فسبقها كما سبقت هذه هذه:

یہ سبقت وجوداً ہے، کہ وسطی آگے نکلی ہوئی ہے سبابہ سے۔ یا حساب کے اعتبار سے جب ہم ابتداء ابہام سے کریں گے۔ یعنی پہلے سبابہ آتی ہے، اس کے بعد وسطی آتی ہے، اور ابہام کو چھوڑ کر سبابہ کو اس لئے ذکر کیا کہ ابہام اور وسطی میں بہت فاصلہ ہے، جبکہ سبابہ اور وسطی میں فاصلہ بالکل نہیں ہے۔

پھر اس کے بعد راوی نے نبی ﷺ کے اشارے کی وضاحت لف نشر مرتب کے طور پر کر دی ہے۔ کہ پہلے"هذه" سے مراد سبابہ اور دوسرے"هذه" سے مراد وسطی ہے۔

تخریج: امام بیہقی رحمہ اللہ حضرت سہل بن سعدؓ سے مرفوعاً روایت کرتے ہیں:

مثلي ومثل الساعة كفرسي رهان، مثلي ومثل الساعة كمثل رجل بعثه قومه طليعة، فلما خشي أن يسبق الاح بثوبه أتيتم أتيتم أنا ذاك أنا ذاك.

۵۵۱۴: عَنْ سَعْدِ بْنِ أَبِىْ وَقَّاصٍ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ إِنِّىْ لَأَرْجُوْا أَنْ لَّا تَعْجِزَ أُمَّتِىْ عِنْدَ رَبِّهَا أَنْ يُّؤَخِّرَهُمْ نِصْفَ يَوْمٍ قِيْلَ لِسَعْدٍ وَكَمْ نِصْفُ يَوْمٍ قَالَ خَمْسُمِائَةِ سَنَةٍ. (رواہ ابوداؤد)

اخرجه ابو داؤد في السنن ٤/٥١٧ حديث رقم ٤٣٥٠ واحمد في المسند ١/١٧٠۔

ترجمہ: "حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ نبی اکرم ﷺ سے روایت نقل فرماتے ہیں کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: بے شک میں امید کرتا ہوں کہ میری امت اپنے پروردگار کی نظر میں اس قدر بے قدر و بے حقیقت اور عاجز نہیں ہو جائے گی کہ اس کا رب اس کو آدھے دن کی بھی مہلت عنایت نہ فرمادے"۔ حضرت سعد بن ابی وقاصؓ سے یہ پوچھا گیا کہ آدھا دن آدھے دن کی مقدار کیا ہوگی؟ انہوں نے جواب دیا کہ پانچ سو برس"۔(ابوداؤد)

تشریح: قوله: اني لا رجو ان لا تعجز......:

تعجز: جیم کے کسرہ کے ساتھ، ضمہ بھی جائز ہے۔

"ان لا تعجز أمتی": أرجو کا مفعول ہے۔ أی: أرجو عدم عجز أمتی.

یوم: أن لا تعجز سے بدل ہے۔ ابن الملکؒ نے اسی کو اختیار کیا ہے۔ یا اس کے متعلق ہے اور "عن" مقدر ہے جیسا کہ طیبیؒ کا کہنا ہے۔

امام طیبیؒ فرماتے ہیں: "عدم عجز" کنایہ ہے قرب کے درجات اور اللہ کے ہاں مقام ومنزلت سے ہے۔ اس کی مثال بادشاہ کے مقرب کا یہ قول ہے: انی لا أعجز أن یولینی الملک کذا و کذا. اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ مجھے بادشاہ کی نگاہ میں ایسا مقام ورتبہ حاصل ہے، کہ بادشاہ میری ہر امید کو پورا کرے گا، لہٰذا حدیث کا مطلب یہ ہوا کہ مجھے امید ہے کہ میری امت کو اللہ تعالیٰ کے نزدیک رتبہ حاصل ہوگا۔

قولہ: قال: خمسمائة سنة: راوی نے نصف یوم کی تفسیر پانچ سو سال بیان فرمائی

اللہ جل شانہ کے اس فرمان کی طرف نظر کرتے ہوئے: ﴿وَاِنَّ یَوْمًا عِنْدَ رَبِّكَ كَاَلْفِ سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّوْنَ﴾ [الحج:٤٧]

"اور آپ کے رب کے پاس کا ایک دن (یعنی قیامت کے دن امتداد ین) پر برابر ایک ہزار سال کے کہ تم لوگوں کو شمار کے موافق"۔

﴿یُدَبِّرُ الْاَمْرَ مِنَ السَّمَآءِ اِلَى الْاَرْضِ ثُمَّ یَعْرُجُ اِلَیْهِ فِیْ یَوْمٍ كَانَ مِقْدَارُهٗۤ اَلْفَ سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّوْنَ﴾ [السجدۃ:٥]

"وہ آسمان سے لے کر زمین تک ہر امر کی تدبیر کرتا ہے پھر ہر امر اسی کے حضور میں پہنچ جاوے گا ایک ایسے دن میں جس کی مقدار تمہاری شمار کے موافق ایک ہزار برس کی ہوگی"

۵۵۱۵ : عَنْ اَنَسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ مَثَلُ هٰذِهِ الدُّنْیَا مَثَلُ ثَوْبٍ شُقَّ مِنْ اَوَّلِهٖ اِلٰى اٰخِرِهٖ فَبَقِیَ مُتَعَلِّقًا بِخَیْطٍ فِیْ اٰخِرِهٖ فَیُوْشِكُ ذٰلِكَ الْخَیْطُ اَنْ یَّنْقَطِعَ ۔

رواہ البیهقی فی شعب الایمان

رواہ البیهقی فی شعب الایمان ٢٦٠/٧ حدیث رقم ١٠٢٣٨۔

ترجمہ: "حضرت انس رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا کہ جناب رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: "اس دنیا (کے فنا کے نزدیک آجانے اور قیامت کے قریب پہنچ جانے) کی مثال اس کپڑے کی مانند ہے جس کو اس کے شروع سے لے کر آخر تک پھاڑ دیا گیا ہو اور اس کے ٹکڑے آخر میں صرف ایک دھاگے سے جڑے ہونے کی وجہ سے لٹکے ہوں اور عنقریب وہ دھاگہ بھی ٹوٹ جانے والا ہو پس دنیا بھی اپنی فنا اور خاتمہ کے اتنا ہی نزدیک ہو چکی ہے' اس روایت کو بیہقی نے شعب الایمان میں روایت کیا ہے"۔

تشریح: قولہ: مثل هذه الدنیا ـــــ الی آخرہ:

شق: شین کے ضمہ کے ساتھ ہے۔

من أوله الی آخره: یہاں غایت "مغیا" میں داخل نہیں ہے، جیسا کہ اس ارشاد باری تعالیٰ میں (غایت "مغیا" میں

داخل نہیں:

﴿وأتموا الصيام الى الليل﴾ [البقرہ:١٧٨] ''رات تک روزہ کو پورا کیا کرو''

قوله:فبقي متعلقا بخيط في آخره فيوشك ذلك الخيط ان بتقطع :

دونوں ضمیریں ''ثوب'' کی طرف راجع ہیں۔

ذلك الخيط : یہ عبارت ہے اس قلیل زمانہ سے جس میں دین محمدی کا دَور دورہ ہوگا۔

بَابٌ لَا تَقُوْمُ السَّاعَةُ اِلَّا عَلٰی شِرَارِ النَّاسِ

قیامت کا قیام شریر لوگوں پر ہوگا کا بیان

سیدؒ کی اصل میں ''باب'' تنوین کے ساتھ ہے، اور طیبیؒ کے نسخہ میں ''باب'' اضافت کے ساتھ مروی ہے۔ امام طیبیؒ فرماتے ہیں کہ لفظ ''باب'' مضاف ہو رہا ہے جملہ محکیہ '' لا تقوم الساعة الی علی شرار الناس'' کی طرف۔ یہ ترجمۃ الباب ''تسمية الشيء بالحمل على سبيل الحكاية'' کے قبیل سے ہے۔ جیسا کہ '' تأبط شرا'' برق نحره اور ''شاب قرناها'' نام رکھا جاتا ہے' اور جیسا کہ '' زيد منطلق ''اور'' بيت شعر'' کسی کا نام رکھ دیا جائے۔

۵۵۱۶ : عَنْ اَنَسٍ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ لَا تَقُوْمُ السَّاعَةُ حَتّٰى لَا يُقَالَ فِي الْاَرْضِ اَللّٰهُ اَللّٰهُ وَفِيْ رِوَايَةٍ قَالَ لَا تَقُوْمُ السَّاعَةُ عَلٰى اَحَدٍ يَقُوْلُ اَللّٰهُ اَللّٰهُ. (رواه مسلم)

اخرجه مسلم في صحيحه ۱۳۱/۱ حديث رقم (۲۳٤-۱٤۸) والترمذي ٤۲٦/٤ حديث رقم ۲۲۰۷ واحمد في المسند ۱۰۷/۳

ترجمہ: ''حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ جناب رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: '' قیامت کا وقوع اس وقت تک نہ ہوگا جب تک روئے زمین پر اللہ کا نام لینا موقوف نہ ہو جائے''۔ اور ایک دوسری روایت میں یہ الفاظ ہیں کہ وقوع قیامت ایسے آدمی پر نہیں ہوگا جو اللہ اللہ پکارتا ہوگا''۔ (مسلم)

تشریح: قوله: لاتقوم الساعة حتى لايقال في الارض الله الله :

الله الله: دونوں کلمات مرفوع ہیں، اس صورت میں پہلا ترکیبی احتمال یہ ہے کہ پہلا لفظ جلالہ مبتدا ہے، اور دوسرا لفظ جلالہ خبر ہے۔ تکرار تاکید کے لئے ہو اور مراد کثرت ذکر ہو۔

ایک نسخہ میں دونوں منصوب ہیں۔ اس صورت میں یہ ''منصوب علی التحذیر'' ہے۔ أی: اتقو الله و اعبدوه: یعنی اللہ سے ڈرو اور اسی کی بندگی کرو۔

مرفوع پڑھنے کی صورت میں اس اللہ اللہ کا معنی ہوگا۔

① الله حسبي: اللہ ہی مجھے کافی ہے۔

② الله المعبود یعنی اللہ ہی معبود ہے۔

اللہ ہی عبادت کے لائق وحقدار ہے اس کے علاوہ کوئی اس لائق نہیں کہ اس کی عبادت کی جاتی۔

منصوب پڑھنے کی صورت میں مطلب یہ بیان کیا گیا ہے: **لا تقوم الساعة حتى لا يبقى في الأرض مسلم يحذر الناس من الله۔** یعنی قیامت اس وقت تک نہیں آئے گی جب تک روئے زمین پر کوئی ایک مسلمان بھی لوگوں کو اللہ سے ڈراتا رہے گا۔)

بعض کا کہنا ہے کہ مطلب یہ ہے کہ جب اللہ کا ذکر کرنا چھوڑ دیا جائے گا تو پھر لوگوں کے بقاء کی حکمت بھی باقی نہیں رہے گی۔اس سے معلوم ہوتا ہے کہ عالم کی بقاء باعمل علماءِ صالحین اور عامۃ المؤمنین کی برکت سے ہے۔چنانچہ امام طیبیؒ نے "**حتى لا يقال في الأرض الله الله**" کی تشریح "**حتى لا يذكر اسم الله ولا يعبد**" کے ساتھ کی ہے۔اللہ جل شانہ کا یہ فرمان بھی یہی معنی رکھتا ہے: ﴿وَيَتَفَكَّرُوْنَ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا ۚ﴾ [آل عمران: ۱۹۱] "اور زمین اور آسمان کے پیدا ہونے میں غور کرتے ہیں (اور کہتے ہیں) کہ اے ہمارے پروردگار آپ نے اس کو لایعنی پیدا نہیں کیا" یعنی اے ربّ آپ نے یہ سب کچھ باطل و بے مقصد پیدا نہیں کیا، بلکہ کسی مقصد وحکمت کے تحت پیدا کیا ہے، تاکہ میں آپ کا ذکر کروں اور عبادت کروں۔لہٰذا جب خدا کا ذکر ہی نہیں رہا، عبادت کا سلسلہ ختم ہوگیا تو یہ جہاں اسی قابل ہے کہ یہ ملیامیٹ کر دیا جائے، اور قیامت بپا ہو جائے۔مظہرؒ فرماتے ہیں: یہ دلیل ہے کہ علماء وصلحاء کی برکت سارے جہاں کے انسان وجنات، حیوانات، جمادات ونباتات وغیرہ کو پہنچتی ہے۔

قوله: وفي رواية: قال: لاتقوم الساعة على احد......:

اس روایت میں بھی لفظ جلالہ دونوں طرح مروی ہے۔

تخریج: اسی طرح اس روایت کو امام احمد اور ترمذیؒ نے بھی نقل کیا ہے۔

۵۵۱۷ : وَعَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ مَسْعُوْدٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا تَقُوْمُ السَّاعَةُ اِلَّا عَلٰى شِرَارِ الْخَلْقِ. (رواہ مسلم)

اخرجه مسلم في صحيحه ۲۲٦۸/٤ حديث رقم (۱۳۱-۲۹٤۹) وابن ماجه في السنن ۱۳٤۰/۲ حديث رقم ٤۰۳۹ واحمد في المسند ٤۰۳۹۔

ترجمہ: "حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے بیان فرمایا کہ جناب رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: قیامت کا قیام محض بدکار انسانوں پر ہوگا"۔ (مسلم)

تشریح: قوله: لاتقوم الساعة......:

شرار: شین کے کسرہ کیساتھ، شرّ کی جمع ہے۔

تعارض: امام طیبیؒ فرماتے ہیں اگر یہ کہا جائے کہ اس حدیث اور حدیث سابق: **لاتزال طائفة من امتي يقاتلون على الحق ظاهرين...... يوم القيامة** کے درمیان تطبیق کیسے ہوگی؟؟ تو ہم کہتے ہیں کہ حدیث سابق میں استغراق ازمنہ اور عموم ہے اور یہ حدیث مخصص ہے۔

ابویعلی نے اپنی مسند میں، اور حاکم نے مستدرک میں ابوسعیدؓ سے مرفوعاً نقل کیا ہے:

لا تقوم الساعة حتى لا يحج البيت اور سجریؒ، ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مرفوعاً نقل کرتے ہیں: **لا تقوم الساعة حتى يرفع الركن والقرآن** ۔ قیامت قائم نہ ہوگی یہاں تک کہ رکن اور قرآن کو یہ اٹھالیا جائے۔"

۵۵۱۸:وَعَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا تَقُوْمُ السَّاعَةُ حَتّٰى تَضْطَرِبَ اَلْيَاتُ نِسَاءِ دَوْسٍ حَوْلَ ذِى الْخَلَصَةِ وَذُوْا لُخَلَصَةُ طَاغِيَةُ دَوْسٍ اِلَّتِىْ كَانُوْا يَعْبُدُوْنَ فِى الْجَاهِلِيَّةِ. (متفق علیه)

اخرجه البخاری فی صحیحه ۷۶/۱۳حدیث رقم ۷۱۱۶ومسلم فی صحیحه ۲۲۳۰/۴حدیث رقم (۵۱-۲۹۰۶) واحمد فی المسند ۲۶۲/۲۔

ترجمہ: "حضرت ابو ہریرہؓ نے بیان فرمایا کہ جناب رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: قیام ت کا قیام اس وقت تک نہیں ہو سکے گی جب تک قبیلہ دوس کی عورتیں ذوالخلصہ کے اردگرد (طواف کرتے ہوئے) اپنے سرین نہ مٹکانے لگیں"۔ (اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ یا کسی اور راوی نے ذوالخلصہ کی مراد بیان کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ) ذوالخلصہ قبیلہ دوس کا ایک ایسا بت ہے جس کی دور جاہلیت میں وہ پرستش کیا کرتے تھے"۔ (بخاری ومسلم)

تشریح: **قوله:لاتقوم الساعة حتى تضطرب۔۔۔ ذى الخالصة:**

دوس: یہ دال کے فتحہ اور واؤ کے سکون کے ساتھ ہے۔

أليات: ہمزہ اور لام دونوں کے فتحہ کے ساتھ' یہ جمع ہے **الية** کی۔ ہمزہ کے فتحہ اور لام کے سکون کے ساتھ۔

الية: اصل میں اعضاء کے اصل گوشت کو کہتے ہیں۔ بعض کا کہنا ہے کہ" **اليه** "، کمر اور ران کے ابھرے ہوئے گوشت کو کہتے ہیں، جو کہ بیٹھنے کی جگہ کا گوشت ہے۔

عرضِ مرتب:

صاحب القاموس الوحید لکھتے ہیں: **الألية**: ① سرین، سرین کی چربی اور گوشت۔ ② پنڈلی یا پیر کا اُبھرا ہوا گوشت، ج: **الايا**.

قوله:وذوالخلصة :طاغية دوس التى كا نو ايعبد ون فى الجاهلية:

بظاہر یہ تفسیر ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے بیان کی ہے یا ان کے علاوہ کسی اور روای کی بیان کردہ ہے۔

الخلصة: خائے معجمہ کے فتحہ اور لام کے ساتھ۔ النہایہ میں لکھا ہے کہ یہ بت خانہ تھا۔ یہاں دوس' خثعم اور بجیلہ وغیرہ کے بت تھے۔

بعض کا کہنا ہے کہ" **ذو الخلصة** "ایک بت کا نام تھا۔ لیکن یہ محلِ نظر ہے چونکہ "ذو" صرف اسم جنس کی طرف ہی مضاف ہوتا ہے۔ "دوس" یمن کا ایک قبیلہ ہے۔ جیسا کہ زمانہ جاہلیت میں ان کی عادت تھی۔

۵۵۱۹: وَعَنْ عَآئِشَةَ قَالَتْ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ لَا يَذْهَبُ اللَّيْلُ وَالنَّهَارُ حَتّٰى يُعْبَدَ اللَّاتُ وَالْعُزّٰى فَقُلْتُ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُ لَاَ ظُنُّ حِيْنَ اَنْزَلَ اللّٰهُ هُوَ الَّذِىْ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ اَنَّ ذٰلِكَ تَامًّا قَالَ اِنَّهٗ سَيَكُوْنُ مِنْ ذٰلِكَ مَا شَآءَ اللّٰهُ ثُمَّ يَبْعَثُ اللّٰهُ رِيْحًا طَيِّبَةً فَتُوُفِّيَ كُلُّ مَنْ كَانَ فِىْ قَلْبِهٖ مِثْقَالَ حَبَّةٍ مِّنْ خَرْدَلٍ مِنْ اِيْمَانٍ فَيَبْقٰى مَنْ لَّا خَيْرَ فِيْهِ فَيَرْجِعُوْنَ اِلٰى دِيْنِ اٰبَآئِهِمْ. (رواه مسلم)

اخرجه مسلم في صحيحه ٤/٢٢٣١ حديث رقم ٥٢-٢٩٠٧۔

ترجمہ: ''حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے بیان فرمایا کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ ارشاد فرماتے ہوئے سنا کہ سلسلہ روز وشب نہ تھمے گا (یعنی) قیامت نہیں آئے گی جب تک لات وعزیٰ کی پرستش نہ کی جانے لگے گی (حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا بیان گے کہ جب) میں نے آپ ﷺ کا یہ ارشاد گرامی سنا تو میں نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! جب اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: ﴿هُوَ الَّذِىْ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ (تو چونکہ اس آیت سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ تمام مذاہب باطل میں مذہب اسلام سچا اور غالب دین و مذہب ہے اور کم سے کم عرب میں بتوں کی پرستش کا خاتمہ ہو جائے گا' اس لئے یقین کی حد تک) میرا خیال تھا کہ بت پرستی رواج مٹ جانے والا ہے (اور یہ کہ آئندہ کبھی بت پرستی نہیں ہوگی' لیکن اب آپ ﷺ اس بات کی پیشن گوئی فرمارہے ہیں؟) آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: درحقیقت عنقریب ایسا ہی ہو کر رہے گا (یعنی اسلام کی روشنی غالب رہے گی اور کفر وشرک کا چراغ گل ہو جائے گا مگر اتنی مدت تک) جب تک کہ اللہ تعالیٰ چاہے گا پھر اللہ تعالیٰ ایک عمدہ ہوا بھیجے گا جس کے ذریعہ ہر ایسا انسان وفات پا جائے گا جس کے دل میں رائی کے دانہ کے بقدر بھی ایمان ہوگا اور (دنیا میں) صرف وہی شخص زندہ رہے گا جس میں کوئی نیکی نہیں ہوگی (یعنی اس وقت روئے زمین پر ایسا کوئی شخص باقی نہیں بچے گا جس میں ایمان واسلام ہو' جو قرآن پڑھنے والا' نماز' روزہ' حج اور دوسرے ارکان اسلام کو بجالانے والا ہو اور علم دین کا حامل ہو) پس تمام لوگ اپنے آباء واجداد کے مذہب یعنی کفر وشرک کی طرف لوٹ جائیں گے''۔

(مسلم)

تشریح: قوله: لا يذهب الليل والنهار... ان ذلك تاما:

حتى يعبد: صیغہ تذکیر کے ساتھ ہے، بصیغہ مؤنث پڑھنا بھی درست ہے۔

والعزى: عین مہملہ کے ضمہ اور زائے مشددہ کے ساتھ۔

ان كنت: ''ان'' مخففه من المثقلة ہے اور لام فارقہ ہے۔ مظہر فرماتے ہیں تقدیر عبارت یوں ہے: انه كنت اظن۔ ای ان الشأن كنت لاحسب

قوله: قال: انه سيكون من ذلك......:

فتوفى: صیغہ مجہول کیساتھ ہے، اور ایک نسخہ میں صیغہ معروف کے ساتھ ہے، اور ایک تاء محذوف ہے، ای: تتوفى. اس

تقدیر پر توفی کا"ریح" کی طرف اسنادمجازاً ہوگا۔

"کل": منصوب علی المفعولیہ ہوگا۔عبارت کی معنوی تقدیر یوں ہوگی:تمیت کل من کان فی قلبه. (ہراس شخص کو مار ڈالے گی جس کے دل میں الخ)

من خردل: "من" بیانیہ ہے۔"حبة" کا بیان ہے۔

من ایمان: "من" بیانیہ ہے، "ایمان"، مثقال کا بیان ہے۔

ان ذلك تامًا: "ان" ہمزہ کے فتحہ کے ساتھ ہے"اظن" کا مفعول ہے اور حین انزل اللّٰہ"اس کا ظرف ہے۔امام طیبیؒ فرماتے ہیں: حمیدی کے نسخہ میں "تام" مرفوع ہے "ان" کی خبر ہونے کی وجہ سے اور صحیح مسلم اور شرح النسائی میں نصب کے ساتھ ہے۔صورت میں یہ"حال" ہے۔اور اس میں عامل"اسم اشارہ"ہوگا۔اور خبر محذوف ہے۔یا"کان"مقدر کی خبر ہے۔

انه سیکون من: ضمیر شان ہے،اور"من" تبعیضیہ ہے۔

حین أنزل الله: کنت اظن کے لئے ظرف ہے، أی: کنت أظن حین انزال تلك الآیة.

قوله:فیبقی من لا خیر فیه فیرجعون الی دین آبائهم:

"من" کے لفظ کی رعایت کرتے ہوئے فیه میں واحد کی ضمیر استعمال کی،اور"فیرجعون" میں"من" کے معنی کی رعایت کرتے ہوئے جمع کی ضمیر لائی گئی ہے،جیسا کہ اس آیت کریمہ میں ہے:

﴿وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَبِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَمَا هُمْ بِمُؤْمِنِيْنَ﴾ [البقرة:۸] "اور ان لوگوں میں بعضے ایسے ہیں جو کہتے ہیں ہم ایمان لائے اللہ پر اور آخری دن پر حالانکہ وہ بالکل ایمان والے نہیں"۔

نبی کریم ﷺ کا یہ جواب گرامی:"فتوفی کل من کان فی قلبه" آنخضرت ﷺ کے اس ارشاد گرامی کی نظیر ہے:

ان الله لایقبض العلم انتز اعا ینتزعه من العباد ولکم یقبض العلم بقبض العلماء حتی اذا لم یبق عالما اتخذ الناس رؤوسا جهالا...... "بلاشبہ اللہ تعالیٰ علم کو کھینچ کر قبض نہیں کرے گا کہ بندوں سے کھینچ لے گا لیکن علم کو اس طرح قبض کرے گا کہ علماء کو اٹھالے گا۔حتیٰ کہ جب کوئی عالم نہیں چھوڑے گا تو لوگ جاہلوں کو سردار بنالیں گے۔"

۵۵۲۰ : وَعَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عَمْرٍو قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَخْرُجُ الدَّجَّالُ فَيَمْكُثُ اَرْبَعِيْنَ لَا اَدْرِیْ اَرْبَعِيْنَ يَوْمًا اَوْ شَهْرًا اَوْعَامًا فَيَبْعَثُ اللّٰهُ عِيْسَى بْنَ مَرْيَمَ كَاَنَّهٗ عُرْوَةُ بْنُ مَسْعُوْدٍ فَيَطْلُبُهٗ فَيُهْلِكُهٗ ثُمَّ يَمْكُثُ فِي النَّاسِ سَبْعَ سِنِيْنَ لَيْسَ بَيْنَ اثْنَيْنِ عَدَاوَةٌ ثُمَّ يُرْسِلُ اللّٰهُ رِيْحًا بَارِدَةً مِنْ قِبَلِ الشَّامِ فَلَا يَبْقٰى عَلٰى وَجْهِ الْاَرْضِ اَحَدٌ فِيْ قَلْبِهٖ مِثْقَالُ ذَرَّةٍ مِنْ خَيْرٍ اَوْ اِيْمَانٍ اِلَّا قَبَضَتْهُ حَتّٰى لَوْ اَنَّ اَحَدَكُمْ دَخَلَ فِيْ كَبِدِ جَبَلٍ لَدَخَلَتْهُ عَلَيْهِ حَتّٰى تَقْبِضَهٗ قَالَ فَيَبْقٰى شِرَارُ النَّاسِ فِيْ خِفَّةِ الطَّيْرِ وَاَحْلَامِ السِّبَاعِ لَا يَعْرِفُوْنَ مَعْرُوْفًا وَلَا يُنْكِرُوْنَ مُنْكَرًا فَيَتَمَثَّلُ لَهُمُ

الشَّيْطَانُ فَيَقُوْلُ اَلَا تَسْتَحْيُوْنَ فَيَقُوْلُوْنَ فَمَا تَاْمُرُنَا فَيَاْمُرُهُمْ بِعِبَادَةِ الْاَوْثَانِ وَهُمْ فِىْ ذٰلِكَ دَارٌّ رِزْقُهُمْ حَسَنٌ عَيْشُهُمْ ثُمَّ يُنْفَخُ فِى الصُّوْرِ فَلَا يَسْمَعُهُ اَحَدٌ اِلَّا اَصْغٰى لِيْتًا وَرَفَعَ لِيْتًا قَالَ فَاَوَّلُ مَنْ يَّسْمَعُهُ رَجُلٌ يَلُوْطُ حَوْضَ اِبِلِهٖ فَيَصْعَقُ وَيَصْعَقُ النَّاسُ ثُمَّ يُرْسِلُ اللّٰهُ مَطَرًا كَاَنَّهُ الطَّلُّ فَيَنْبُتُ مِنْهُ اَجْسَادُ النَّاسِ ثُمَّ يُنْفَخُ فِيْهِ اُخْرٰى فَاِذَا هُمْ قِيَامٌ يَنْظُرُوْنَ ثُمَّ يُقَالُ يَاَيُّهَا النَّاسُ هَلُمَّ اِلٰى رَبِّكُمْ وَقِفُوْهُمْ اِنَّهُمْ مَسْئُوْلُوْنَ فَيُقَالُ اَخْرِجُوْا بَعْثَ النَّارِ فَيُقَالُ مِنْ كَمْ كَمْ فَيُقَالُ مِنْ كُلِّ اَلْفٍ تِسْعَ مِائَةٍ وَتِسْعَةً وَّتِسْعِيْنَ قَالَ فَذٰلِكَ يَوْمٌ يَجْعَلُ الْوِلْدَانَ شِيْبًا وَذٰلِكَ يَوْمَ يُكْشَفُ عَنْ سَاقٍ ۔

اخرجه مسلم فی صحيحه ٢٢٥٨/٤ حديث رقم (١١٦-٢٩٤٠)۔

ترجمہ: ”حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما نے بیان فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: دجال ظاہر ہوگا اور چالیس تک قیام کرے گا۔ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ مجھے نہیں معلوم اس موقع پر چالیس سے حضور ﷺ نے کیا مراد لیا تھا' آیا چالیس دن یا چالیس ماہ اور یا چالیس برس۔ پس پھر خدا تعالیٰ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو بھیجے گا جو گویا عروہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مشابہت رکھتے ہوں گے وہ دجال کو تلاش کریں گے اور اس کو قتل کر دیں گے' اس کے بعد حضرت عیسیٰ علیہ السلام سات برس تک اہل دنیا میں زندہ رہیں گے اور اس زمانہ میں دو شخصوں کے درمیان بھی کوئی دشمنی و عداوت نہیں ہوگی' پھر خدا تعالیٰ ایک ٹھنڈی سرد ہوا بھیجے گا جو شام کی جانب سے چلے گا (جس کے باعث کوئی مومن زندہ نہ رہے گا) چنانچہ اس وقت روئے زمین پر ایسا کوئی شخص زندہ نہ رہے گا جس کے دل میں رائی کے دانہ کے بقدر بھی نیکی یا ایمان میں سے کچھ ہو اور وہ ہوا اس کی روح قبض نہ کر لے یہاں تک کہ اگر تم میں سے کوئی آدمی (بالفرض) پہاڑ کے اندر بھی چلا گیا ہوگا تو وہ ہوا پہاڑ میں داخل ہو کر اس شخص کا پیچھا کرے گی اور اس کی روح قبض کرے گی''۔ آپ ﷺ نے فرمایا: اس کے بعد (روئے زمین) پر صرف بدکار اور بدترین لوگ زندہ رہ جائیں گے جو پرندوں کی طرح تیز رو اور درندوں کی مانند مضبوط و سخت ہوں گے وہ نہ تو نیکی و بھلائی کو اچھا جانیں گے اور نہ ہی برائی سے پرہیز کریں گے' پھر شیطان انسان کی شکل و صورت اختیار کر کے ان کے سامنے آئے گا اور کہے گا کہ کیا تم کو شرم و حیا نہیں آتی ہے گویا یہ شیطان کا مکر وہ تلبیس ہوگا کہ وہ اس بہانہ و فریب لوگوں کو بتوں کا پجاری بنانے کے لئے اختیار کرے گا) وہ لوگ شیطان سے کہیں گے تم ہماری راہنمائی کرو ہم کیا کریں (یعنی ہمارے بارے میں جو تمہارا مقصود ہے اس کو ظاہر کرو تا کہ ہم اس کے مطابق عمل کریں) پس شیطان ان کو بت پوجنے کا حکم دے گا' یعنی شیطان ان کو اس دھوکہ میں مبتلا کرے گا کہ تم لوگ وسیلہ اختیار کرنے کے طور پر بتوں کی پرستش کیا کرو تا کہ خدا تم سے راضی ہو۔ چنانچہ کفار یہی کہا کرتے تھے کہ ہم بتوں کو محض خدا کو خوش کرنے کے لئے پوجتے ہیں اور قرآن نے ان کی اس خام خیالی کی خبر ان الفاظ میں دی ہے: ما نعبدهم الا ليقربونا...... بہرحال وہ لوگ شیطان کے کہنے کے مطابق بتوں کے پجاری بن جائیں گے اور بدعمل بدکردار اور اخلاقی پستی کا شکار ہو جائیں گے لیکن) وہ اپنی اس تمام بدعملی کے باوجود ایسے ہوں گے ان کے رزق میں فراوانی اور کثرت ہوگی اور وہ عیش و عشرت کی زندگی بسر کر رہے ہوں گے پھر (قیامت قائم کرنے کے سلسلہ) صور پھونکا جائے گا اور جو وہ شخص بھی اس صور میں پھونکنے کی آواز سنے گا

وہ شخص اپنی گردن کو ایک جانب کو جھکائے گا اور دوسری جانب کو بلند کرے گا اس صور کی آواز کو سب سے پہلے سننے والا وہ آدمی ہوگا جو اپنے اونٹ (کو پانی پلانے) کے حوض کو لپائی کر رہا ہوگا اور وہ اسی حالت میں مرجائے گا اور دوسرے تمام لوگ بھی اسی طرح اپنے کام میں مصروف ہونے کی حالت میں ہی مرجائیں گے (یعنی کسی کو بھی اتنی مہلت بھی نہیں دی جائے گی جس کام میں مشغول ہے اس کو پورا کرنے) اس کے بعد اللہ تعالیٰ بارش بھیجے گا جو شبنم کی طرح ہوگی (یعنی ہلکی بارش جس کو پھوار بھی کہا جاسکتا ہے) اور اس بارش کے ذریعہ لوگوں کے بدن اُگ جائیں گے (یعنی صحیح سالم اور تازہ ہو جائیں گے) (جو قبروں میں گل چکے ہوں گے) پھر چالیس سال کے بعد) دوسرا صور پھونکا جائے گا جس کو سن کر تمام لوگ (جو اپنی قبروں اور زمین کے نیچے سے زندہ ہو کر نکلیں گے) دفعتاً اٹھ کھڑے ہوں گے اور قیامت کے ہولناک منظر کو دیکھ رہے ہوں گے پھر اعلان کیا جائے گا کہ لوگو! اپنے پروردگار کی طرف آؤ اور فرشتوں کو حکم دیا جائے گا کہ ان سب کو روکے رکھو ان سے ان کے اعمال کے متعلق سوال کیا جائے گا اور ان سے حساب لیا جائے گا پھر (پروردگار کی طرف سے) فرشتوں کی طرف سے بارگاہ رب العزت میں عرض کیا جائے گا کہ کتنے لوگوں میں سے کتنے لوگوں کو علیحدہ کر دیا جائے؟ یعنی جن لوگوں کا داخلہ دوزخ میں ہوتا ہے ان کا تناسب کیا ہے اور انکو کتنے لوگوں میں سے کس مقدار کے حساب سے الگ کیا جائے فرشتوں کو حکم دیا جائے گا ہر ہزار شخص میں سے نوسو ننانوے لوگوں کو جہنم میں ڈالنے کے لئے الگ کر لو یہ کہہ کر آپ ﷺ نے فرمایا: یہ وہ دن ہے جو بچوں کو بوڑھا کر دے گا اور یہ وہ دن ہے جس میں پنڈلی سے پردہ ہٹا دیا جائے گا"۔ (مسلم) اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی روایت لا تنقطع الھجرۃ توبہ کے باب میں ذکر کی جا چکی ہے۔

تشریح: قوله:يخرج الدجال فيمكث أربعين:

مدت اقامت کا مذکور نہ ہونا یا تو اس وجہ سے ہے کہ آنحضرت ﷺ نے مبہم رکھا یا حضور علیہ الصلوۃ والسلام نے مدت اقامت ذکر فرمائی تھی مگر راوی سے نسیان ہوگیا اسی لئے "لا ادری" الخ فرمایا۔

قوله:لا ادري أربعين يوما أو شهرا أوعاما:

تورپشتی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "لا ادری"، تا "فيبعث" یہ جملہ صحابی کا مقولہ ہے، لہٰذا مطلب یہ ہوا کہ نبی کریم علیہ الصلوۃ والسلام نے اربعین کے ساتھ کسی مدت کا ذکر نہیں فرمایا، کہ وہ کونسی مدت ہے، چالیس دن، چالیس ماہ یا چالیس سال۔

قوله:يمكث في الناس سبع سنين ليس بين النين عداوه:

"يمكث في الناس سبع سنين": اس سے متعلقہ مباحث ماقبل میں گذر چکی ہیں۔

من خير أو ايمان: أو، برائے شک ہے۔ اور ایک احتمال یہ ہے کہ تخییر فی التعبیر کیلئے ہے۔

فما ذا تأمرنا: "ما" موصولہ ہے، اور عائد محذوف ہے، أي: به یا "ما" استفہامیہ ہے، أي: أي شيء تأمرنا لنطيعك فيه؟ وهم في ذلك: جملہ حالیہ ہے۔

ينفخ: صیغہ مجہول کے ساتھ ہے۔

أحلام: جمع ہے، حلم (حائے مہملہ کے ضمہ کے ساتھ) کی، یا حِلم (حاء مہملہ کے کسرہ کے ساتھ)

كبد: بمعنی وسط و جوف. كبد السماء بھی اسی سے مأخوذ ہے۔
خفة: خائے معجمہ کے کسرہ اور فاء کی تشدید کے ساتھ۔
فيمثل: از باب انسانی صورت اختیار کرنا۔
الطل: طاء مہملہ کے فتحہ اور لام کی تشدید کے ساتھ، ننھے ننھے سے قطروں والی بارش۔

قوله: يا ايها الناس! هلم۔۔۔ وتسعة وتسعين:

هلم: صاحب قاموس لکھتے ہیں: هلم، ہائے تنبیہ اور "لم" سے مرکب ہے، حجازیوں کے ہاں یہ کلمہ تذکیر و تانیث اور مفرد و جمع کے لئے یکساں (طور پر مستعمل) ہے۔
الولدان: "وليد" کی جمع ہے۔
شيبا: شین کے کسرہ کے ساتھ، اشيب کی جمع ہے، جیسا کہ بيض، أبيض کی جمع ہے۔
دار: راء کی تشدید کے ساتھ، بمعنی کثیر۔
قفوهم: مشکوۃ کے نسخہ میں "وقفوهم" ہے، یعنی حرف عطف کے ساتھ ہے۔ امام طیبیؒ فرماتے ہیں: اس صورت میں یہاں عبارت مقدر ہوگی۔ أی: يقال: يا أيها الناس! هلم الى ربكم، ويقال الملائكة قفوهم. بغیر حرف عطف کی صورت میں اگلا جملہ مستانفہ ہوگا۔
من كم؟: كم؟: پہلا "كَمْ" خبر مقدم اور دوسرا "كَمْ" مبتدا مؤخر ہے۔ یا مفعول (بہ) ہیں، فعل محذوف (نخرج) کیلئے۔

تسعمائة: منصوب ہے، ای: اخرجوا للنار من كل ألف تسعمائة
قوله: فذلك يوم يجعل۔۔ يكشف عن ساق:
يجعل: یہ بمعنی "يصير" ہے۔
يوم يجعل: اکثر نسخوں میں "يوم" مرفوع ومنون ہے۔ امام طیبیؒ فرماتے ہیں: (یوم مرفوع ہونے کی تقدیر پر) "يجعل الولدان شيبا" صفت ہوگا۔ اور اسناد مجازی ہوگا۔ ایک نسخہ میں "يوم" مبنی علی الفتح ہے، اس صورت میں مابعد جملہ کی طرف مضاف ہوگا، اور اسناد حقیقی ہوگا، پہلے معنی ابلغ واوفق ہیں۔ چونکہ قرآن حکیم میں بھی اسی طرح وارد ہوا ہے:
﴿ يَوْمًا يَّجْعَلُ الْوِلْدَانَ شِيبًا ﴾ [المزمل: ١٧] اس دن سے کیسے بچو گے جو بچوں کو بوڑھا کر دے گا"
يوم يكشف: اکثر نسخوں میں "يوم" مرفوع ومنون ہے، اور بعض میں مبنی علی الفتح ہے مابعد کی طرف مضاف ہے۔ یہ صورت قرآن کریم کی اس آیت کے موافق ہے: ﴿يوم يكشف عن ساق﴾ "جس دن پنڈلی کو کھولا جائے گا"۔
قوله: ذكر حديث معاوية ......
وہ مکمل حدیث یوں ہے: لا تنقطع الهجرة حتى تنقطع التوبة، ولا تنقطع التوبة حتى تطلع الشمس من مغربها۔

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی مذکور بالا حدیث اس حدیث کے معارض ہے: **لاهجرة بعد الفتح**۔
لہٰذا ہجرت ثانیہ سے مراد "**هجرة من المعصية الى الطاعة**" (معصیت سے طاعت کی طرف ہجرت) ہے، یا "**هجرة من ديار البدعة الى ديار السنة** (دیار بدعت سے دیارِ سنت کی طرف ہجرت) مراد ہے یا **هجرة من بلاد الشر الى بلاد الخير**" (بلاشبہ شر سے بلاد خیر کی طرف ہجرت)۔
فى باب التوبة: اس میں اعتراض فعلی کے ساتھ ساتھ اعراض قولی تھی ہے وہ یہ کہ حدیث اس باب کے زیادہ مناسب تھی۔ واللّٰه تعالٰى اعلم بالصواب ۔

بَابُ النَّفْخِ فِي الصُّوْرِ

صور پھونکے جانے کا بیان

"صور" اصل میں نرسنگھا (سنکھ) اور قرنا کو کہتے ہیں جس میں پھونکنے سے ایک بلند آواز پیدا ہوتی ہے اور یہاں وہ مخصوص نرسنگا (سنکھ) مراد ہے جس کو حضرت اسرافیل علیہ السلام پھونکیں گے حضرت اسرافیل کا یہ صور پھونکنا دو مرتبہ ہوگا' ایک بار تو اس وقت جب قیامت آنے کو ہوگی اور اس صورت کی آواز سے تمام لوگ مر جائیں گے اور دوسری بار اس وقت جب تمام لوگوں کو میدان حشر میں جمع کرنے کے لئے دوبارہ زندہ کرنا مقصود ہوگا' چنانچہ اس صور کی آواز سے تمام لوگ زندہ ہو کر میدانِ حشر میں جمع ہوں گے۔

دو نفخوں کے درمیان کتنا وقفہ ہوگا

۵۵۲۱ : عَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَا بَيْنَ النَّفْخَتَيْنِ اَرْبَعُوْنَ قَالُوْا يَا اَبَا هُرَيْرَةَ اَرْبَعُوْنَ يَوْمًا قَالَ اَبَيْتُ قَالُوْا اَرْبَعُوْنَ شَهْرًا قَالَ اَبَيْتُ قَالُوا اَرْبَعُوْنَ سَنَةً قَالَ اَبَيْتُ ثُمَّ يَنْزِلُ اللّٰهُ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً فَيَنْبُتُوْنَ كَمَا يَنْبُتُ الْبَقْلُ قَالَ وَلَيْسَ مِنَ الْاِنْسَانِ شَيْءٌ لَّا يَبْلٰى اِلَّا عَظْمًا وَّاحِدًا وَّهُوَ عَجْبُ الذَّنَبِ وَمِنْهُ يُرَكَّبُ الْخَلْقُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ (متفق عليه وفي رواية لمسلم) كُلُّ ابْنِ اٰدَمَ يَاْكُلُهُ التُّرَابُ اِلَّا عَجْبُ الذَّنَبِ مِنْهُ خُلِقَ وَفِيْهِ يُرَكَّبُ.

اخرجه البخاري في صحيحه ٦٨٩/٨ حديث رقم ٤٩٣٥ ومسلم في صحيحه ٢٢٧٠/٤ حديث رقم (١٤١۔٢٩٥٥) وابو داؤد في السنن ١٠٨/٥ حديث رقم ٤٧٤٣، واحمد في المسند ٣٢٢/٢۔

ترجمہ: "حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا کہ جناب رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: دونوں نفخوں (یعنی پہلی بار لوگوں کو مارنے کے لئے اور دوسری بار زندہ کر کے میدان حشر کی طرف جمع کرنے کے لئے دونوں مرتبہ پھونکے جانے والے صور) کا درمیان وقفہ چالیس ہوگا لوگوں نے (یہ سن کر) سوال کیا کہ ابو ہریرہ! کیا (چالیس سے) چالیس دن مراد ہیں؟ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے جواب دیا کہ میں نہیں جانتا! پھر لوگوں نے سوال کیا کہ کیا چالیس مہینے مراد ہیں؟ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے کہا کہ میں نہیں جانتا۔ ان لوگوں نے پھر پوچھا کہ کیا چالیس سال

مراد ہیں؟ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے پھر یہی کہا کہ میں نہیں جانتا۔ اس کے بعد حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے بیان حدیث کا سلسلہ جاری رکھتے ہوئے کہا کہ) اور جناب رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا پھر اللہ تعالیٰ آسمان سے پانی نازل کرے گا اور اس پانی سے لوگ (یعنی انسان اور تمام جاندار) اس طرح اُگیں گے جیسے سبزہ اُگتا ہے''۔ نیز آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: انسان کے جسم و بدن کی کوئی عضو اور کوئی حصہ ایسا نہیں ہے جو پرانا اور بوسیدہ نہ ہو جاتا ہو (یعنی گل سڑ کر ختم نہ ہو کا نے والا ہو) سوائے ایک ہڈی کے جس کو عجب الذنب کہتے ہیں اور قیامت کے دن ہر جاندار کی اسی ہڈی سے اس کو پیدا کیا جائے گا اور اس کے تمام جسم کو مرکب کیا جائے گا''۔ (بخاری ومسلم)

تشریح: ''عَجَبُ الذَّنَبْ'' اس ہڈی کو کہتے ہیں جو ریڑھ کے دونوں کولھوں کے درمیان اس جگہ پر ہوتی ہے جہاں جانور کی دم کا جوڑ ہوتا ہے اور عام طور پر اس کو ریڑھ کی ہڈی سے تعبیر کیا جاتا ہے اور بعض روایتوں میں عجب الذنب میں ''عجب'' کے بجائے ''عجم'' کا لفظ ہے ویسے ''عجب'' اور ''عجم'' دونوں کے ایک ہی معنی ہیں یعنی اصل اور جڑ' نیز ''ذنب'' کے معنی دم کے ہیں' مذکورہ ہڈی چونکہ اس جگہ ہوتی ہے جہاں دم کا جوڑ ہوتا ہے اس لئے اس کا نام عجب الذنب یا عجم الذنب ہے حاصل یہ کہ ریڑھ کی ہڈی گویا انسان کا بیج ہے کہ اسی سے ابتدائی تخلیق ہوتی ہے اور قیامت کے دن دوبارہ اسی کے ذریعہ تمام اعضاء جسمانی کو از سرنو ترکیب دیا جائے گا پس مرنے کے بعد انسان یا کوئی بھی جاندار گل سڑ کر نابود ہو جاتا ہے اور اس کے پورے جسم کی ہڈیوں کو مٹی کھا جاتی ہے مگر ریڑھ کی ہڈی نہ تو گلتی سڑتی ہے اور نہ اس کو مٹی کھاتی ہے واضح رہے کہ یہ ان لوگوں کی حالت کا بیان ہے جن کے بدن گل سڑ جاتے ہیں پیغمبر لوگ اس سے مستثنیٰ ہیں کیونکہ ان کا سارا بدن محفوظ رہتا ہے اور اللہ تعالیٰ نے زمین پر انبیاء کے جسموں کو کھانا حرام کیا ہے' یہی بات ان لوگوں کے حق میں کہی جا سکتی ہے جو اس بارے میں انبیاء کے حکم میں ہیں یعنی شہداء اور اولیاء اللہ اور وہ مؤذن جو محض اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کے لئے اذان دیتے ہیں چنانچہ یہ سب لوگ اپنی قبروں میں اسی طرح زندہ ہیں جس طرح اس دنیا میں زندہ لوگ ہیں۔

قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کی کبریائی و جبروت کا اظہار

۵۵۲۲ : وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقْبِضُ اللّٰهُ الْاَرْضَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَيَطْوِى السَّمَآءَ بِيَمِيْنِهٖ ثُمَّ يَقُوْلُ اَنَا الْمَلِكُ اَيْنَ مُلُوْكُ الْاَرْضِ. (متفق عليه)

اخرجه البخاري في صحيحه ٥٥١/٨ حديث رقم ٤٨١٢ ومسلم في صحيحه ٢١٤٨/٤ حديث رقم (٢٣-٢٧٨٧) والدارمي في السنن ٤١٨/٢ حديث رقم ٢٧٩٩۔

ترجمہ: ''حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا کہ جناب رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''قیامت کے دن اللہ تعالیٰ زمین کو اپنی مٹھی میں پکڑ لے گا اور آسمانوں کو اپنے داہنے ہاتھ میں لپیٹ لے گا اور پھر اعلان کرے گا میں بادشاہ ہوں (یعنی حقیقی بادشاہی میرے سوا کسی کو زیب نہیں دیتی اور میں ہی شہنشاہ ہوں) کہاں ہیں وہ لوگ جو زمین پر اپنی بادشاہی کا دعویٰ کرتے تھے؟''۔ (بخاری ومسلم)

۵۵۲۳ : وَعَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عُمَرَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَطْوِى اللّٰهُ

السَّمٰوٰتِ یَوْمَ الْقِیَامَةِ ثُمَّ یَاخُذُ هُنَّ بِیَدِهِ الْیُمْنٰی ثُمَّ یَقُوْلُ اَنَا الْمَلِكُ اَیْنَ الْجَبَّارُوْنَ اَیْنَ الْمُتَکَبِّرُوْنَ ثُمَّ یَطْوِی الْاَرْضِیْنَ بِشِمَالِهِ وَفِی رِوَایَةٍ یَاْخُذُهُنَّ بِیَدِهِ الْاُخْرٰی ثُمَّ یَقُوْلُ اَنَا الْمَلِكُ اَیْنَ الْجَبَّارُوْنَ اَیْنَ الْمُتَکَبِّرُوْنَ. (رواه مسلم)

اخرجه مسلم فی صحیحه ۲۱٤۸/٤حدیث رقم (۲٤-۲۷۸۸) وابو داوٗد فی السنن ۱۰۵/۵حدیث رقم ٤۷۳۲ واخرجه ابن ماجه فی السنن ۱۹/۱حدیث رقم۱۹۸

ترجمہ:''حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے بیان فرمایا کہ جناب رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:''خدا تعالیٰ روز قیامت تمام آسمانوں کو لپیٹ دے گا اور پھر ان کو داہنے ہاتھ میں پکڑ کے اعلان فرمائے گا کہ بادشاہ میں ہوں! کہاں ہیں ظلم وستم ڈھانے والے' کہاں ہیں (اپنی قوت قسمت پر) گھمنڈ کرنے والے؟ پھر زمینوں کو اپنے بائیں ہاتھ میں لپیٹ لے گا اور ایک روایت میں یوں ہے کہ زمینوں کو اپنے دوسرے ہاتھ میں لے پکڑ کر اعلان فرمائے گا: ''بادشاہ میں ہوں کہاں ہیں بادشاہ یعنی وہ لوگ جو روئے زمین پر اپنی بادشاہی کا دعویٰ کیا کرتے تھے؟ کہاں ہیں ظلم و جبر کرنے والے''۔(مسلم)

قیامت کے دن کی کچھ باتیں یہودی عالم کی زبانی

۵۵۲۴ : وَعَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ مَسْعُوْدٍ قَالَ جَآءَ حَبْرٌ مِّنَ الْیَهُوْدِ اِلَی النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ یَا مُحَمَّدُ اِنَّ اللّٰهَ یُمْسِكُ السَّمٰوَاتِ یَوْمَ الْقِیَامَةِ عَلٰی اَصْبَعٍ وَالْاَرْضِیْنَ عَلٰی اِصْبَعٍ وَّالْجِبَالَ وَالشَّجَرَ عَلٰی اِصْبَعٍ وَّالْمَآءَ وَالثَّرٰی عَلٰی اِصْبَعٍ وَسَآئِرَ الْخَلْقِ عَلٰی اِصْبَعٍ ثُمَّ یَهُزُّ هُنَّ فَیَقُوْلُ اَنَا الْمَلِكُ اَنَا اللّٰهُ فَضَحِكَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ تَعَجُّبًا مِمَّا قَالَ الْحَبْرُ تَصْدِیْقًا لَّهٗ ثُمَّ قَرَأَ وَمَا قَدَرُوْا اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِهٖ وَالْاَرْضُ جَمِیْعًا قَبْضَتُهٗ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ وَالسَّمٰوَاتُ مَطْوِیّٰتٌ بِیَمِیْنِهٖ سُبْحٰنَهٗ وَتَعَالٰی عَمَّا یُشْرِکُوْنَ. (متفق علیه)

اخرجه البخاری فی صحیحه ۵۵۱/۸حدیث رقم۴۸۱۱ومسلم فی صحیحه ۲۱٤۷/٤حدیث رقم (۱۹-۲۷۸٦) والترمذی ۳٤۵/۵حدیث رقم ۳۲۳۸۔

ترجمہ:''حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا کہ (ایک روز) نبی اکرم ﷺ کی خدمت میں یہود کا ایک عالم حاضر ہوا اور کہنے لگا اے محمد ﷺ! خدا تعالیٰ روز قیامت آسمانوں کو ایک انگلی پر زمینوں کو ایک انگلی پر تمام پہاڑوں اور درختوں کو ایک انگلی پانی اور گیلی مٹی کو ایک انگلی پر اور بقیہ تمام تر مخلوق کو ایک انگلی پر روک رکھے گا اور انگلیوں کو ہلاتے ہوئے اعلان فرمائے گا' میں ہوں بادشاہ' میں ہوں خدا (یہ سن کر) رسول اللہ ﷺ اس یہودی عالم کی زبانی ان باتوں پر اظہار تعجب فرماتے ہوئے اور اس کی تصدیق فرماتے ہوئے مسکرائے اور پھر آپ ﷺ نے یہ آیت شریف تلاوت فرمائی:﴿وَمَا قَدَرُوْا اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِهٖ ......﴾ اور (افسوس ہے کہ) ان لوگوں نے (یعنی مشرکوں

نے) خدائے تعالیٰ کی کچھ عظمت نہ جانی...... جیسی عظمت اعلان فرمائے گا حالانکہ (اس کی وہ شان ہے کہ) ساری زمین اس کی مٹھی میں ہوگی قیامت کے دن اور تمام آسمان لپیٹے ہوں گے اس کے داہنے ہاتھ میں (اور کوئی دوسرا ایسا ہے پس) وہ پاک و برتر ہے ان کے شرک سے۔اس روایت کو بخاری نے نقل کیا ہے''۔

قیامت کے دن زمین وآسمان کی تبدیلی کے متعلق

۵۵۲۵ : وَعَنْ عَآئِشَةَ قَالَتْ سَاَلْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنْ قَوْلِهٖ يَوْمَ تُبَدَّلُ الْاَرْضُ غَيْرَ الْاَرْضِ وَالسَّمٰوٰتُ فَاَيْنَ يَكُوْنُ النَّاسُ يَوْمَئِذٍ قَالَ عَلَى الصِّرَاطِ. (رواه مسلم)

اخرجه مسلم في صحيحه ٢١٥٠/٤ حديث رقم (٢٩-٢٧٩١) وابن ماجه في السنن ١٤٣٠/٢ حديث رقم ٤٢٧٩ والدارمي في السنن ٤٢٣/٢ حديث رقم ٢٨٠٩ واحمد في المسند ٣٥/٦

ترجمہ: ''حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے بیان فرمایا کہ میں نے جناب رسول اللہ ﷺ سے خدا تعالیٰ کے اس فرمان :يَوْمَ تُبَدَّلُ الْاَرْضُ غَيْرَ الْاَرْضِ وَالسَّمٰوٰتُ جس دن زمین کو اس کے علاوہ دوسری زمین سے بدل دیا جائے گا اور آسمان بھی (یعنی قیامت کے دن موجودہ زمین وآسمان کو بدل دیا جائے گا اور ان کے علاوہ نئے زمین و آسمان پیدا کیے جائیں گے) کے متعلق سوال کیا کہ اس روز جب کہ زمین وآسمان کی تبدیلی واقع ہوگی) لوگ کہاں ہوں گے؟ تو آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: پل صراط پر''۔ (مسلم)

تشریح: لفظ صراط کے اصل معنی ''راستہ'' کے ہیں اور یہاں حدیث میں ''صراط'' سے مراد ''پل صراط'' ہے یعنی وہ پل جس کے بارے میں شارع نے خبر دی ہے کہ وہ دوزخ کی پشت پر بنا ہوا ہے جو بال سے باریک اور تلوار سے تیز ہے اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ پل صراط کے بجائے کوئی بھی ''صراط'' مراد ہو۔

۵۵۲۶ : وَعَنْ اَبِىْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اَلشَّمْسُ وَالْقَمَرُ مُكَوَّرَانِ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ

(رواه البخاري)

اخرجه البخاري في صحيحه ٢٩٧/٦ حديث رقم ٣٢٠٠۔

ترجمہ: ''حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا کہ جناب رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: قیامت کے روز سورج اور چاند کو لپیٹ دیئے جائیں گے''۔ (بخاری)

حضرت اسرافیل علیہ السلام صور پھونکنے کے لئے ہر وقت تیار ہیں

۵۵۲۷ : عَنْ اَبِىْ سَعِيْدِ ٱلْخُدْرِيِّ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَيْفَ اَنْعَمُ وَصَاحِبُ الصُّوْرِ قَدِ الْتَقَمَهٗ وَاَصْغٰى سَمْعَهٗ وَحَنّٰى جَبْهَتَهٗ يَنْتَظِرُ مَتٰى يُؤْمَرُ بِالنَّفْخِ فَقَالُوْا يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ وَمَا تَاْمُرُنَا قَالَ قُوْلُوْا حَسْبُنَا اللّٰهُ وَنِعْمَ الْوَكِيْلُ. (رواه الترمذي)

اخرجه الترمذی فی السنن ٥٣٦/٤ حدیث رقم ٢٤٣١ واحمد فی المسند ٧٣/٣۔

ترجمہ: ''حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا کہ جناب رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: میں کیسے عیش وراحت سے بیٹھ سکتا ہوں جب کہ صور پھونکنے والا حضرت اسرافیل علیہ السلام صور کو (پھونکنے کے لئے) منہ میں لیے ہوئے ہیں' اپنا کان (بارگاہ حق جل مجدہ کی طرف) جھکائے ہوئے ہیں کہ جب بھی حکم صادر ہو فوراً پھونک دیں اور پیشانی جھکائے ہوئے (بالکل تیاری کی حالت میں) ہیں اور منتظر ہیں کہ کب صور پھونکنے کا حکم فرمایا جائے''۔ (یہ سن کر) صحابہؓ نے عرض کیا کہ تو پھر آپ ﷺ ہمیں کیا حکم فرماتے ہیں؟ (یعنی آپ ﷺ ہماری کیا راہنمائی فرماتے ہیں کہ ایسے وقت میں ہمارا کیا ہونا چاہیئے) آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: (جب بھی) کوئی آفت و مصیبت آئے تو بس اپنے پروردگار کی طرف صدق دل سے متوجہ ہو جاؤ اور اس کے دربار میں میں التجا کرو اور اس کے فضل وکرم پر بھروسہ واعتماد رکھو' نیز یہ پڑھا کرو: حَسْبُنَا اللّٰهُ وَنِعْمَ الْوَكِيْلُ اور ہمیں اللہ کافی ہے اور وہی بہترین کارساز ہے''۔

۵۵۲۸ : وَعَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عَمْرٍو عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ الصُّوْرُ قَرْنٌ يُنْفَخُ فِيْهِ۔

(رواه الترمذی وابوداود والدارمی)

اخرجه ابو داوٗد فی السنن ١٠٧/٥ حدیث رقم ٤٧٤٢ والترمذی فی السنن ٥٣٦ حدیث رقم ٢٤٣٠ والدارمی فی السنن ٤١٨/٢ حدیث رقم ٢٧٩٨ واحمد فی المسند ١٦٢/٢۔

ترجمہ: ''حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نبی کریم ﷺ سے نقل فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: صور سے مراد ایک سینگ ہے''۔ (ترمذی)

الفصل الثالث:

ناقور' راجفہ اور رادفہ کے معنی

۵۵۲۹ : وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ فِي قَوْلِهٖ تَعَالٰى فَإِذَا نُقِرَ فِي النَّاقُوْرِ الصُّوْرُ قَالَ وَالرَّاجِفَةُ النَّفْخَةُ الْاُوْلٰى وَالرَّادِفَةُ الثَّانِيَةُ .

اخرجه البخاری فی صحيحه ٣٦٧/١١ تعليقافی الباب ٤٣ باب نفخ الصور۔

ترجمہ: ''حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے منقول ہے کہ انہوں نے اللہ تعالیٰ کے فرمان (فَإِذَا نُقِرَ فِي النَّاقُوْرِ) کی تفسیر بیان فرماتے ہوئے فرمایا کہ ''نَاقُوْر'' سے مراد صور ہے انہوں نے اس آیت يَوْمَ تَرْجُفُوا الرَّاجِفَةُ تَتْبَعُهَا الرَّادِفَةُ کی تفسیر بیان کرتے ہوئے) ارشاد فرمایا کہ (راجفۃ سے مراد پہلی دفعہ صور میں پھونکنا اور رادفہ سے مراد دوسری مرتبہ صور میں پھونکنا) امام بخاری نے اس روایت کو ترجمۃ الباب میں ذکر کیا ہے''۔

تشریح: دونوں آیتیں مع ترجمہ اس طرح ہیں:

❶ فَاِذَا نُقِرَ فِی النَّاقُوْرِo فَذٰلِكَ يَوْمَئِذٍ يَّوْمٌ عَسِيْرٌo

''پھر جس وقت صور پھونکا جائے گا سو وہ وقت یعنی وہ دن کافروں پر ایک سخت دن ہوگا''۔

❷ يَوْمَ تَرْجُفُ الرَّاجِفَةُ تَتْبَعُهَا الرَّادِفَةُo

''جس دن ہلا دینے والی چیز (زمین و پہاڑ اور تمام چیزوں کو ہلا ڈالے گی جس کے بعد ایک پیچھے آنے والی آئے گی''۔

''راجف''اصل میں ''رجف'' سے نکلا ہے جس کے معنی ہلنے اور لرزنے کے ہیں اور ''رادفۃ'' کا لفظ ردف سے نکلا ہے جس کے معنی ہیں کسی چیز کا کسی چیز کے پیچھے پیچھے پہنچنا۔

۵۵۳۰ : وَعَنْ اَبِیْ سَعِيْدٍ قَالَ ذَكَرَرَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ صَاحِبَ الصُّوْرِ وَقَالَ عَنْ يَمِيْنِهٖ جِبْرَئِيْلُ وَعَنْ يَسَارِهٖ مِيْكَائِيْلُ ۔

اخرجه احمدفی المسند ۱۰/۳ وابو داؤد ۲۹۳/٤ حديث رقم ۳۹۹۹۔

ترجمہ: ''حضرت ابوسعید رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا کہ ایک روز رسول اللہ ﷺ نے صور پھونکنے والے یعنی حضرت اسرافیل علیہ السلام کا رزکرہ فرمایا اور ارشاد فرمایا کہ صور پھونکنے کے وقت ان کے داہنی طرف حضرت جبرئیل علیہ السلام اور بائیں جانب حضرت میکائیل علیہ السلام ہوں گے۔

۵۵۳۱ : وَعَنْ اَبِیْ رَزِيْنَ الْعُقَيْلِيِّ قَالَ قُلْتُ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ كَيْفَ يُعِيْدُ اللّٰهُ الْخَلْقَ وَمَا اٰيَةُ ذٰلِكَ فِیْ خَلْقِهٖ قَالَ اَمَا مَرَرْتَ بِوَادِیْ قَوْمِكَ جَدْبًا ثُمَّ مَرَرْتَ بِهٖ يَهْتَزُّ خَضِرًا قُلْتُ نَعَمْ قَالَ فَتِلْكَ اٰيَةُ اللّٰهِ فِیْ خَلْقِهٖ كَذٰلِكَ يُحْيِ اللّٰهُ الْمَوْتٰى ۔رواهما رزين

رواه رزين واخرجه احمد فی المسند ۱۱/٤

ترجمہ: ''حضرت ابورزین عقیلی رضی اللہ عنہ نے ارشاد فرمایا کہ میں نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ ﷺ حق تعالیٰ مخلوقات کو پھر سے کیسے زندہ کر کے اٹھا لے گا؟ کر کے اٹھائے گا (جب کہ ان کے اجسام بوسیدہ ہوکر اور گل سڑ کر مٹی میں مل چکے ہوں گے) اور کیا اس کی کوئی علامت اللہ تعالیٰ کی مخلوق میں موجود ہے؟ (جس کو دیکھ کر دوبارہ زندہ کئے جانے کے نظریہ پر استدلال کیا جا سکے؟) آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا: تمہارا کبھی قحط اور خشک سالی کے دور میں اپنی قوم کے جنگل اور کھیتوں کے درمیان سے گزر ہوا ہے؟ جہاں سبزہ کا نام ونشان تک نظر نہیں آتا (بلکہ ساری زمین بالکل بنجر اور خشک دکھائی دیتی ہے) پھر جب تمہارا (بارش کے بعد) وہاں سے گزر ہوا ہوگا تو تمہیں (سب کھیت) لہلہاتے ہوئے سرسبز و شاداب نظر آئے ہوں گے میں نے عرض کیا کہ جی ہاں ایسا ہی ہے تو آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''پس مخلوقات میں قدرت الٰہی کی یہی علامت ہے اور اللہ تعالیٰ مردوں کو ایسے ہی زندہ فرمائے گا ان دونوں روایتوں کو رزین نے نقل کیا ہے''۔

بَابُ الْحَشْرِ

حشر کا بیان

''حشر'' کے اصل معنی ہیں جمع کرنا' اکٹھا کرنا' ہانکنا! چنانچہ قیامت کے دن کو یوم الحشر (حشر کا دن) اسی اعتبار سے کہتے ہیں کہ اس دن تمام مردے اپنی قبروں وغیرہ سے زندہ کر کے اٹھائے جائیں گے اور سب کو اس جگہ پر جمع کیا جائے گا جس کو ''محشر'' سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

واضح رہے کہ حشر دو ہوں گے' ایک تو مذکورہ بالا معنی میں قیامت آنے کے بعد اور دوسرے حشر کا تعلق قیامت سے پہلے علامات قیامت سے ہے جس کا ذکر پیچھے ذکر چکا ہے ایک آگ مشرق کی طرف سے نمودار ہوگی جو لوگوں کو گھیر کر زمین شام کی طرف لے جائے گی اور وہاں اکٹھا کر دے گی! یہاں عنوان باب میں ''حشر'' کے پہلے معنی مراد ہیں' اگرچہ اس باب میں بعض ایسی احادیث بھی نقل ہوں گی جو بظاہر دونوں معنی کا احتمال رکھتی ہیں' اسی لئے علماء کے ان کے بارے میں اختلافی اقوال ہیں کہ بعض حضرات نے ان کو دونوں معنی پر محمول کیا ہے اور بعض نے ان کے خلاف کہا ہے اور زیادہ صحیح بات یہی ہے کہ ان احادیث کا محمول پہلے ہی معنی ہیں۔

الفصل الاول :

۵۵۳۲ : عَنْ سَهْلِ بْنِ سَعْدٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يُحْشَرُ النَّاسُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ عَلٰى اَرْضٍ بَيْضَآءَ عَفْرَآءَ كَقُرْصَةِ النَّقِيِّ لَيْسَ فِيْهَا عَلَمٌ لِاَحَدٍ. (متفق علیہ)

اخرجه البخاري في صحيحه ۱۱/۳۷۲حديث رقم ۶۵۲۱ واخرجه مسلم في صحيحه ۴/۲۱۵۰حديث رقم (۲۸-۲۷۹۰)

ترجمہ: ''حضرت سہل بن سعد رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا کہ جناب رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: روز قیامت تمام انسانوں کو ایسی سفید زمین پر جمع کیا جائے گا جو سرخی مائل ہوگی اور (گولائی کے اعتبار سے) میدے کی روٹی کی مانند ہوگی اور اس زمین پر کسی (کے مکان وعمارت وغیرہ) کی کوئی نشانی اور بلند جگہ نہیں ہوگی (بلکہ ہموار چٹیل میدان ہوگا)''۔ (بخاری ومسلم)

اہل جنت کا پہلا کھانا

۵۵۳۳ : وَعَنْ اَبِیْ سَعِیْدِ الْخُدْرِیِّ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ تَکُوْنُ الْاَرْضُ یَوْمَ الْقِیَامَۃِ خُبْزَۃً وَّاحِدَۃً یَتَکَفَّأُھَا الْجَبَّارُ بِیَدِہٖ کَمَا یَتَکَفَّأُ اَحَدُکُمْ خُبْزَتَہٗ فِی السَّفَرِ نُزُلاً لِاَھْلِ الْجَنَّۃِ وَاَتٰی رَجُلٌ مِّنَ الْیَھُوْدِ فَقَالَ بَارَکَ الرَّحْمٰنُ عَلَیْکَ یَا اَبَا الْقَاسِمِ اَلَا اُخْبِرُکَ بِنُزُلِ اَھْلِ الْجَنَّۃِ یَوْمَ الْقِیَامَۃِ قَالَ بَلٰی قَالَ تَکُوْنُ الْاَرْضُ خُبْزَۃً وَّاحِدَۃً کَمَا قَالَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فَنَظَرَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اِلَیْنَا فَضَحِکَ حَتّٰی بَدَتْ نَوَاجِذُہٗ ثُمَّ قَالَ اَلَا اُخْبِرُکَ بِاِدَامِھِمْ بَالَامَ وَالنُّوْنَ قَالُوْا وَمَا ھٰذَا قَالَ ثَوْرٌ وَنُوْنٌ یَاکُلُ مِنْ زَائِدَۃِ کَبِدِ ھِمَا سَبْعُوْنَ اَلْفًا۔ (متفق علیہ)

اخرجہ البخاری فی صحیحہ ۳۷۲/۱۱حدیث رقم ۶۵۲۰ومسلم فی صحیحہ ۲۱۵۱/۴حدیث رقم (۳۰-۲۷۹۲)۔

ترجمہ: ''حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا کہ جناب رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: روز قیامت تمام زمین ایک روٹی ہوگی جس کو غالب و زبردست ذات اپنے ہاتھوں سے اس طرح الٹ پلٹ کرے گا جیسے تم میں سے کوئی آدمی دوران سفر اس کو الٹ پلٹ کرتا (یعنی جلدی) روٹی پکاتا ہے اور یہ روٹی جنتیوں کی مہمانی ہوگی''۔ (جناب رسول اللہ کے اس ارشاد کے بعد) ایک یہودی آیا اور کہنے لگا کہ اے ابوالقاسم! مہربان ذات آپ پر برکات نازل فرمائے کیا میں آپ ﷺ کو بتاؤں کہ قیامت کے دن اہل جنت کی مہمانی کس کھانے سے ہوگی؟ حضور ﷺ نے فرمایا: ہاں بتاؤ! اس یہودی نے کہا کہ تمام زمین ایک روٹی ہوگی' جیسا کہ آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا تھا (یہ سن کر) آنحضرت ﷺ نے (اظہار تعجب کا خاطر اور ہمیں یہ بتانے کے لئے کہ یہ یہودی ٹھیک کہہ رہا ہے چاروں طرف دیکھا اور ہنسنے لگے یہاں تک کہ آپ ﷺ کی نوکدر دانت دکھائی دینے لگے اس کے بعد اس یہودی نے کہا کہ کیا میں آپ ﷺ کو یہ بتلاؤں کہ اہل جنت کا سب سے پہلے کیا سالن ہوگا؟ (جس سے وہ روٹی لگا کر کھائیں گے) وہ ''بالام'' اور ''نون'' ہے۔ صحابہؓ (''بالام'' کی مراد اس لئے انہوں) نے پوچھا کہ یہ اس بالام کی مراد کیا ہے؟ انہوں نے جواب دیا کہ (بالام کا مطلب) بیل ہے اور نون (کے بارے میں تمہیں معلوم ہے کہ مچھلی کو کہتے ہیں) اور ان دونوں یعنی بیل اور مچھلی کے گوشت کے اس ٹکڑے سے جو الگ سے بڑھا ہوا جگر کا زائد ہوتا ہے ستر ہزار آدمی روٹی کھائیں گے''۔ (بخاری و مسلم)

تشریح: ''زائدہ کبد'' (یعنی جگر کا زائد حصہ) اصل میں جگر ہی کے اس چھوٹے ٹکڑے کو کہتے ہیں جو اسی کے ساتھ ایک جانب ہوتا ہے اس حصہ کو بہت لذیذ اور پسندیدہ سمجھا جاتا ہے۔

ایک احتمال یہ ہے کہ صحابہؓ کے پوچھنے پر ''بالام'' کے جو معنی بیان کئے گئے ہیں وہ اس یہودی عالم نے نہیں بلکہ خود آنحضرت ﷺ نے بیان کئے ہوں اور ہوا یہ ہو کہ جب صحابہؓ اس لفظ کے معنی نہ سمجھے اور انہوں نے اس بارے میں سوال کیا تو اس

سے پہلے کہ یہودی عالم جواب دیتا آنحضرت ﷺ کو بذریعہ وحی اس عبرانی لفظ کے معنی بتا دیئے گئے اور آپ ﷺ نے صحابہؓ کے سامنے بیان فرما دیئے۔

حشر کا ذکر

۵۵۳۴ : وَعَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يُحْشَرُ النَّاسُ عَلٰى ثَلٰثِ طَرَائِقَ رَاغِبِيْنَ رَاهِبِيْنَ وَاثْنَانِ عَلٰى بَعِيْرٍ وَثَلٰثَةٌ عَلٰى بَعِيْرٍ وَاَرْبَعَةٌ عَلٰى بَعِيْرٍ وَعَشَرَةٌ عَلٰى بَعِيْرٍ وَتَحْشُرُ بَقِيَّتَهُمُ النَّارُ تَقِيْلُ مَعَهُمْ حَيْثُ قَالُوْا وَتَبِيْتُ مَعَهُمْ حَيْثُ بَاتُوْا وَتُصْبِحُ مَعَهُمْ حَيْثُ اَصْبَحُوْا وَتُمْسِیْ مَعَهُمْ حَيْثُ اَمْسَوْا. (متفق علیه)

اخرجه البخاری فی صحیحه ۳۷۷/۱۱حدیث رقم ۶۵۲۲ومسلم فی صحیحه ۲۱۹۳/٤حدیث رقم (۵۹-۲۸۶۱)اخرجه النسائی ١١٥/٤ حدیث رقم ۲۰۸۵۔

ترجمہ: ''حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا کہ جناب رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: حشر میں لوگوں کو تین قسم کی حالتوں پر اکٹھا کیا جائے گا ایک قسم کے لوگ تو وہ ہوں گے جو جنت کی آرزو رکھنے والے ہوں گے' دوسری قسم کے لوگ وہ ہوں گے جو جہنم کا خوف رکھنے والے ہوں گے' اور ان دونوں قسموں میں سے جو لوگ سوار ہونے کی حالت میں ہوں گے ان کی صورت یہ ہوگی کہ دو ایک اونٹ پر سوار ہوں گے (یعنی جس شخص کا مقام جس قدر عظیم ہوگا وہ اتنے ہی کم لوگوں کے ساتھ نہایت راحت و آرام اور کشادگی و وسعت کے ساتھ سوار ہوگا اور جس کا مرتبہ جتنا ادنیٰ ہوگا وہ اتنے زیادہ افراد کے ساتھ تنگی کے ساتھ سوار ہوگا) اور تیسری قسم باقی تمام لوگوں پر مشتمل ہوگی جن کو آگ جمع کرے گی اور وہ آگ ہر وقت ان لوگوں کے ساتھ رہے گی اور کسی آن بھی ان سے علیحدہ نہ ہوگی یہاں تک کہ جہاں وہ لوگ قیلولہ کریں گے (یعنی استراحت کے لئے رکیں گے) وہیں آگ بھی قیلولہ کرے گی' جہاں وہ لوگ رات گزاریں گے وہیں آگ ان کے ساتھ گزارے گی' جہاں وہ لوگ صبح کریں گے ہیں آگ بھی ان کے ساتھ صبح کرے گی اور جہاں وہ لوگ شام کریں گے وہیں آگ بھی ان کے ساتھ شام کرے گی''۔ (بخاری و مسلم)

تشریح: میرے (ملا علی قاریؒ) کے مطابق ''تین قسموں'' میں سے ایک یعنی پہلی قسم کے لوگ تو سوار ہوں گے اور باقی دونوں قسموں کے لوگ پیدل اور منہ کے بل چلنے والے ہوں گے جیسا کہ آگے دوسری فصل میں آنے والی حدیث سے واضح ہوگا! لیکن بعض شارحین نے کہا ہے کہ پہلی دونوں قسموں کے لوگ سواریوں پر ہوں گے اور باقی تمام لوگ پیدل چلتے ہوئے آئیں گے' نیز انہوں نے کہا ہے کہ اونٹ سواریوں کی مذکورہ تعدادوں کا ذکر دراصل ان دونوں قسموں کے لوگ کے فرقی مراتب کی تفصیل کو بطور کنایہ و تمثیل بیان کرنے کے لئے ہے کہ جو شخص جتنا زیادہ عالی مرتبہ ہوگا وہ اتنی ہی زیادہ راحت و سہولت اور سرعت و سبقت کے ساتھ میدانِ حشر میں پہنچے گا۔

پہلی دونوں قسموں کا تعلق اہل ایمان سے ہے جن میں سے ایک تو وہ لوگ ہوں گے جو اس دنیا میں اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم

کے امیدوار رہتے ہیں اور اس نے اپنے نیک بندوں کے لئے جنت اور وہاں کی نعمتوں کا جو وعدہ کیا ہے اس کا اشتیاق ان پر غالب رہتا ہے اور یہ وہ بندگان خاص ہیں جن کے بارے میں فرمایا گیا ہے:

لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ اور دوسرے وہ لوگ ہیں جو اس کے عذاب کے خوف میں رہتے ہیں اور دوزخ کی آگ کا ڈر ان پر غالب رہتا ہے اور اس سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم کی امید و اشتیاق میں کی جانے والی اطاعت و عبادات اس اطاعت و عبادت سے افضل ہے جو اللہ تعالیٰ کے ڈر اور خوف سے کی جائے۔

''چار ایک اونٹ پر اور دس ایک اونٹ ہوں گے'' چار اور دس کے درمیان کے دوسرے اعداد کا ذکر اس لئے نہیں کیا گیا ہے کہ ان کو ذکر کردہ اعداد پر قیاس کر کے مفہوم اخذ کیا جا سکتا ہے! اس طرح ''ایک اونٹ پر ایک آدمی کا سوار ہونا'' ذکر نہیں کیا گیا ہے جب کہ یقینی طور پر محشر میں آنے والوں میں ایسے افراد بھی ہوں گے جو اپنے اپنے اونٹ پر تنہا ہوں گے اور ان کی سواری میں ان کا کوئی شریک نہیں ہوگا! تو اصل بات یہ ہے کہ وہ انبیاء اور رسولوں کا مرتبہ ہے اور یہاں انبیاء اور رسولوں کا حشر نہیں بلکہ ''لوگوں'' کے حشر کا ذکر کرنا مقصود ہے! ایک بات یہ بھی بتا دینا ضروری ہے کہ ایک ایک اونٹ پر دو اور دو سے زائد لوگوں کے سوار ہونے کی دونوں صورتیں محتمل ہو سکتی ہیں یا تو یہ ہوگا کہ ایک اونٹ جتنے لوگوں کی سواری کے لئے متعین ہوگا وہ سب لوگ اس پر ایک ساتھ بیٹھیں گے اور یا یہ ہوگا کہ تناوب (باری متعین کرنے) کے طور پر بیٹھیں گے کہ ہر شخص بار بار سے سوار ہوتا رہے گا۔

اب آخر میں یہ بات جان لیجئے کہ اس بارے میں علماء کے اختلافی اقوال ہیں کہ یہاں حدیث میں لوگوں کو محشر میں جمع کئے جانے کا جو ذکر ہے اس کا تعلق کس وقت سے ہے؟ بعض حضرات نے کہا ہے کہ یہ اس حشر کا ذکر ہے جو قیامت کے دن آخرت میں برپا ہوگا اور ہر شخص کو دوبارہ زندہ کر کے محشر میں لایا جائے گا' جب کہ بعض دوسرے حضرات کا کہنا ہے کہ یہ آخرت کے حشر کا ذکر نہیں ہے بلکہ وہ ''حشر'' مراد ہے جو قیامت کے قریب واقع ہوگا کہ لوگوں کو تمام علاقوں سے اکٹھا کر کے ملک شام کے علاقہ میں ایک جگہ کہ جس کو ''محشر'' ہی سے تعبیر کیا گیا ہے جمع کیا جائے گا اور جس کو قیامت کی علامت میں سے کہا گیا ہے' ان حضرات کی دلیل یہ ہے کہ آخرت میں جو حشر ہوگا اس میں تمام لوگ پا پیادہ ہوں گے جیسا کہ ایک دوسری حدیث میں بیان فرمایا گیا ہے اور بعض حضرات نے یہ کہا ہے کہ آخرت میں کئی حشر ہوں گے ایک تو قبر سے نکلتے وقت اور تمام لوگوں کے دوبارہ زندہ کئے جانے کے فوراً بعد اور دوسرا حشر اس کے بعد ہوگا! اس میں بعضوں کو سواریاں ملیں گی اور بعض پیدل اور بعض منہ کے بل چل کر آئیں گے! بہر حال زیادہ صحیح قول یہی معلوم ہوتا ہے کہ آخرت کا حشر مراد ہے۔

میدانِ حشر میں ہر شخص ننگے بدن' ننگے پاؤں اور غیر مختون آئے گا

۵۵۳۵ : وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اِنَّكُمْ مَحْشُوْرُوْنَ حُفَاةً عُرَاةً غُرْلًا ثُمَّ قَرَأَ كَمَا بَدَأْنَا اَوَّلَ خَلْقٍ نُعِيْدُهٗ وَعْدًا عَلَيْنَا اِنَّا كُنَّا فَاعِلِيْنَ وَاَوَّلُ مَنْ يُكْسٰى يَوْمَ الْقِيَامَةِ اِبْرَاهِيْمُ وَاِنَّ نَاسًا مِنْ اَصْحَابِيْ يُؤْخَذُ بِهِمْ ذَاتَ الشِّمَالِ فَاَقُوْلُ اُصَيْحَابِيْ اُصَيْحَابِيْ فَيَقُوْلُ اِنَّهُمْ لَنْ يَزَالُوْا مُرْتَدِّيْنَ عَلٰى اَعْقَابِهِمْ مُذْ فَارَقْتَهُمْ فَاَقُوْلُ كَمَا قَالَ الْعَبْدُ الصَّالِحُ وَكُنْتُ عَلَيْهِمْ شَهِيْدًا مَّا

دُمْتُ فِيهِمْ إِلٰى قَوْلِهِ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ. (متفق علیه)

اخرجه البخاری فی صحیحه ۳۸٦/٦حدیث رقم ۳۳٤۹ومسلم فی صحیحه ۲۱۹٤/٤حدیث رقم (۵۸۔۲۸٦۰) والترمذی فی السنن ۵۲۲/٤ حدیث رقم ۲٤۲۳ واخرجه النسائی فی ۱۱۹/٤ حدیث رقم ۲۰۸۷ واحمد فی المسند ۲۲۰/۱۔

ترجمه: ''حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نبی اکرم ﷺ سے روایت نقل فرماتے ہیں کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: تم (روز قیامت) اس حال میں اٹھائے جاؤ گے کہ تم ننگے پاؤں' ننگے بدن اور بے ختنہ ہو گے'' اس کے بعد آپ ﷺ نے (بطور تائید واستشہاد) یہ آیت شریف تلاوت فرمائی: كَمَا بَدَأْنَا أَوَّلَ خَلْقٍ نُعِيدُهُ وَعْدًا عَلَيْنَا إِنَّا كُنَّا فَاعِلِينَ یعنی جس حالت میں ہم نے ان کو ابتدائی تخلیق میں (ننگے پاؤں' ننگے بدن اور بے ختنہ بطن مادر سے) پیدا کیا تھا اسی حالت میں ان کو دوبارہ (روز قیامت) پیدا کر کے قبروں سے اٹھائیں گے یہ وعدہ (کہ ہم ان کو دوبارہ پیدا کریں گے) ہم پر لازم ہے اور یقیناً ہم نے (جو وعدہ کیا ہے اس کو پورا) کر کے رہیں گے پھر آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: روز قیامت سب سے پہلا وہ آدمی جسے لباس پہنایا جائے گا وہ حضرت ابراہیم علیہ السلام (پھر فرمایا) اور (اس وقت جب کہ لوگوں کو میدان حشر سے جنت اور دوزخ کی طرف لے جایا جائے گا' میں دیکھوں گا کہ) میرے کچھ صحابہ کو بائیں جانب سے پکڑ لیا جائے گا (یعنی جہنم کی جانب لے جانے کے لئے انہیں علیحدہ کر دیا جائے گا)' میں دیکھ کر بطریق حیرت واستعجاب اور ان کو نجات دلانے کے لئے) کہوں گا کہ یہ میرے صحابی ہیں' یہ میرے صحابی ہیں (ان کو کہاں لے جا رہے ہو؟) اللہ تعالیٰ فرمائیں گے (بے شک یہ تمہارے صحابی ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ) جب سے تم ان سے جدا ہوئے' یہ برابر دین سے منحرف ہوتے رہے (اس لئے ان کو جہنم میں لے جایا جا رہا ہے) میں (یہ سن کر) وہی بات کہوں گا جو بندہ صالح یعنی حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے کہا تھا کہ وَكُنْتُ عَلَيْهِمْ شَهِيدًا مَا دُمْتُ فِيهِمْ إِلٰى قَوْلِهِ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ تک یعنی جب تک میں ان کے درمیان رہا' میں ان کے احوال سے واقف رہا......''۔ (بخاری ومسلم)

تشریح: ''اور بے ختنہ ہوں گے'' میں اس طرف اشارہ ہے کہ قیامت کے دن جب مردے اپنی اپنی قبروں سے اٹھیں گے تو ان کے جسم و بدن کے تمام اجزاء یک جا ہو کر مل جائیں گے اور پورا جسم اسی طرح کا ہو جائے گا جیسا کہ اس دنیا میں تھا' اس کی دلیل یہ ہے کہ ختنہ کی وہ کھال جو کاٹ کر پھینک دی جاتی ہے اور جو اس دنیا میں ضائع کر دیئے جانے کے قابل ہے جب وہ قیامت کے دن اپنی جگہ (یعنی ختنہ کے مقام پر) واپس آ کر جسم کا حصہ بن جائے گی تو دوسرے اجزا جیسے بال اور ناخن وغیرہ بطریق روئی پیدا ہوں گے اور اپنی اپنی جگہ لگ جائیں گے! پس یہ حقیقت نہ صرف یہ کہ حق تعالیٰ کے کمال علم اور کائنات کے ایک ایک جز وکل پر اس کے محیط ہونے کی دلیل ہے بلکہ اشیاء ممکنات کے تعلق سے اس کی قدرت کاملہ کی لامتناہی وسعتوں کی بھی علامت ہے۔

سب سے پہلے جس شخص کو لباس پہنایا جائے گا وہ حضرت ابراہیم علیہ السلام ہیں حضرت ابراہیم علیہ السلام کو یہ فضیلت محض اس لئے حاصل ہوگی وہ ان لوگوں میں سب سے پہلے شخص ہیں جو فقراء اور ضرورت مندوں کو کپڑے پہناتے ہیں اور ان کی ستر پوشی کرتے ہیں یا یہ کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام وہ سب سے پہلے شخص ہیں جن کو اللہ تعالیٰ کی راہ میں بے لباس کیا گیا تھا جب

کہ انہیں نمرود کی آگ میں ڈالا گیا تھا بس ان کی یہ مخصوص نوعیت کی فضیلت ہمارے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم پر ان کی افضلیت کو ثابت نہیں کرتی بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو سب سے پہلے لباس پہنایا جانا ان کے اس اعزاز و اکرام کے طور پر ہوگا کہ وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے روحانی اور دینی باپ ہیں علاوہ ازیں یہ بھی دیکھنا ہوگا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو جو اولیت حاصل ہوگی وہ حقیقی ہے یا اضافی؟ بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان کی یہ اولیت حقیقی نہیں بلکہ اضافی ہے یعنی ان کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے علاوہ اور تمام لوگوں میں سب سے پہلے لباس پہنایا جائے گا! اس کی تائید اس روایت سے بھی ہوتی ہے جس میں یہ نقل کیا گیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو جن کپڑوں میں دفن کیا گیا ہے آپ صلی اللہ علیہ وسلم قیامت کے دن انہیں کپڑوں میں اٹھ کر (میدانِ حشر میں) آئیں گے نیز جامع صغیر میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے ترمذی کی یہ روایت نقل کی گئی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

انا اول من تنشق عنه الارض فاكسى حلة من حلل الجنة ثم اقوم عن يمين العرش ليس احد من الخلائق يقوم ذلك المقام غيرى.

''(قیامت کے دن) سب سے پہلے میں زمین کے شق ہونے پر اٹھوں گا اور جنت کا لباس پہنوں گا اور پھر عرش کے دائیں طرف کھڑا ہوں گا اور اس جگہ مخلوقات میں سے میرے علاوہ کسی اور کو کھڑا ہونا نصیب نہیں ہوگا''۔

''میں وہی کہوں گا جو بندہ صالح حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے کہا تھا الخ'' یعنی جس طرح حضرت عیسیٰ علیہ السلام قیامت کے دن اپنی قوم کی گمراہی اور بدعقیدگی و بدعملی سے اپنی برأت کا اظہار کریں گے اور اپنی گمراہ قوم کے معاملہ کو حق تعالیٰ کے عدل و انصاف پر چھوڑ دیں گے اسی طرح میں بھی یہی کہوں گا کہ پروردگار! میری امت کے یہ وہ لوگ ہیں جو دنیا میں میری موجودگی کے درمیان ایمان و عمل کی سیدھی راہ پر گامزن تھے اور میں ان کا نگہبان و ذمہ دار تھا۔ لیکن جب میں دنیا سے اٹھ گیا تو انہوں نے اپنے نفس اور شیطان کے فریب میں مبتلا ہو کر گمراہی کو اختیار کر لیا' اب ان کا معاملہ تیرے اوپر موقوف ہے' تیری عادل و منصف بارگاہ ان کے بارے میں جو چاہے فیصلہ کرے وہ سراسر عادلانہ اور منصفانہ ہوگا! آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی اس بات کو واضح کرنے کے لئے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے تعلق سے قرآن کریم کی جو آیت پڑھی وہ پوری یوں ہے: ﴿وَكُنْتُ عَلَيْهِمْ شَهِيْدًا مَّا دُمْتُ فِيْهِمْ فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِي كُنْتَ اَنْتَ الرَّقِيْبَ عَلَيْهِمْ ط وَاَنْتَ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْدٌ o اِنْ تُعَذِّبْهُمْ فَاِنَّهُمْ عِبَادُكَ وَاِنْ تَغْفِرْ لَهُمْ فَاِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ o﴾ یعنی (قیامت کے دن جب اللہ تعالیٰ نصاریٰ کو سنانے اور ان کو شرمندہ کرنے کے لئے حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے فرمائے گا کہ کیا تم نے اپنی قوم کو عقیدہ تثلیث یعنی تین خدا ماننے کی تلقین و تبلیغ کی تھی تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام اپنی برأت کا اظہار کریں گے اور کہیں گے کہ میں نے تو ان کو صرف تیری بندگی کرنے کی تلقین و تبلیغ کی تھی اور) لیکن جب آپ نے مجھے (اس دنیا) سے اٹھا لیا (اور ان کے اوپر سے میری نگہبانی ختم ہوگئی تو) پھر صرف آپ ان کے احوال پر مطلع رہے اور آپ ہر چیز کی پوری واقفیت رکھتے ہیں اب اگر (ان کی بدعقیدگی و بدعملی کے لئے) آپ ان کو سزا دیں تو یہ آپ کے بندے ہیں اور اگر آپ ان کو معاف فرما دیں تو بے شک زبردست حکمت والے ہیں۔

واضح رہے کہ یہاں حدیث میں ''صحابہ'' سے مراد وہ صحابہ نہیں جن کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں بھی اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے نسبت حاصل رہی اور جن کو حقیقت میں ''صحابہ'' کہا جاتا ہے کیونکہ ان کے بارے میں یقینی طور پر معلوم

ہے کہ آنحضرت ﷺ کے بعد ان میں سے کوئی بھی صحابی مرتد نہیں ہوا اور نہ کسی نے عقیدہ وعمل کی کوئی ایسی گمراہی اختیار کی جس کی بنا پر انہیں دوزخی کہا جا سکے لہٰذا ''صحابہ'' سے مراد وہ اجڈ دیہاتی ہیں جو آنحضرت ﷺ کے زمانہ میں مشرف باسلام ہو گئے تھے لیکن آپ ﷺ کی وفات کے بعد مسیلمہ کذاب اور اسود وغیرہ کے اتباع کرنے کے سبب مرتد ہو گئے تھے۔

۵۵۳۶ : وَعَنْ عَآئِشَةَ قَالَتْ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يُحْشَرُ النَّاسُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ حُفَاةً عُرَاةً غُرْلاً قُلْتُ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ الرِّجَالُ وَالنِّسَاءُ جَمِيْعًا يَنْظُرُ بَعْضُهُمْ اِلٰى بَعْضٍ فَقَالَ يَا عَآئِشَةُ اَلْاَمْرُ اَشَدُّ مِنْ اَنْ يَّنْظُرَ بَعْضُهُمْ اِلٰى بَعْضٍ. (متفق علیه)

اخرجه البخاری فی صحیحه ۳۷۷/۱۱ حدیث رقم ۶۵۲۷ ومسلم فی صحیحه ۲۱۹۴/۴ حدیث رقم (۵۶-۲۸۵۹) واخرجه النسائی فی السنن ۱۱۴/۴ حدیث رقم ۲۰۸۴ وابن ماجه فی السنن ۱۴۲۹/۲ حدیث رقم ۴۲۷۶۔

ترجمہ: ''حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا بیان ہے کہ میں نے جناب رسول اللہ ﷺ کو یہ ارشاد فرماتے ہوئے سنا کہ روز قیامت (میدانِ حشر میں) لوگ ننگے پاؤں اور ننگے بدن جمع کیے جائیں گے'' (حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے بیان فرمایا کہ) میں نے یہ سن کر) عرض کیا کہ یا رسول اللہ! کیا مرد وعورت اکٹھے اسی حالت میں ہوں گے اور وہ آپس میں ایک دوسرے کو برہنہ دیکھ رہے ہوں گے؟ یعنی اس طرح تو عورتیں مردوں کو اور مرد کو عورتیں کو ننگا دیکھیں گے تو پھر ایسی حالت میں سب کو اکٹھا کرنے میں کیا مصلحت وحکمت ہے؟ آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا: عائشہ اس دن کا معاملہ اس سے کہیں زیادہ سنگین وہولناک ہوگا کہ کوئی کسی کی جانب نگاہ اٹھا کر دیکھے''۔ (بخاری ومسلم)

۵۵۳۷ : وَعَنْ اَنَسٍ اَنَّ رَجُلاً قَالَ يَا نَبِيَّ اللّٰهِ كَيْفَ يُحْشَرُ الْكَافِرُ عَلٰى وَجْهِهٖ يَوْمَ الْقِيَامَةِ قَالَ اَلَيْسَ الَّذِيْ اَمْشَاهُ عَلَى الرِّجْلَيْنِ فِي الدُّنْيَا قَادِرٌ عَلٰى اَنْ يُّمْشِيَهٗ عَلٰى وَجْهِهٖ يَوْمَ الْقِيَامَةِ. (متفق علیه)

اخرجه البخاری فی صحیحه ۴۹۲/۸ حدیث رقم ۴۷۶۰ ومسلم فی صحیحه ۲۱۶۱/۴ حدیث رقم (۵۴-۲۸۰۶)۔

ترجمہ: ''حضرت انس رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ ایک آدمی نے عرض کیا کہ یا نبی اللہ ﷺ قیامت کے روز کافر کو اس کے منہ کے بل چلا کر کیسے لایا جائے گا یعنی کسی کے لئے منہ کے بل چلنا کیسے ممکن ہوگا؟ حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا: حقیقت یہ ہے کہ جس ذات (یعنی اللہ رب العزت) نے اس (کافر) کو دنیا میں پاؤں کے بل چلا دیا وہی ذات روز قیامت اسے منہ کے بل چلانے پر بھی قدرت رکھتی ہے''۔ (بخاری ومسلم)

۵۵۳۸ : وَعَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ يَلْقٰى اِبْرَاهِيْمُ اَبَاهُ اٰذَرَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَعَلٰى وَجْهِ اٰذَرَ قَتَرَةٌ وَغَبَرَةٌ فَيَقُوْلُ لَهٗ اِبْرَاهِيْمُ اَلَمْ اَقُلْ لَّكَ لَا تَعْصِنِيْ فَيَقُوْلُ لَهٗ اَبُوْهُ فَالْيَوْمَ لَا اَعْصِيْكَ فَيَقُوْلُ اِبْرَاهِيْمُ يَا رَبِّ اِنَّكَ وَعَدْتَنِيْ اَنْ لَّا تُخْزِيَنِيْ يَوْمَ يُبْعَثُوْنَ فَاَيُّ خِزْيٍ اَخْزٰى مِنْ اَبِي الْاَبْعَدِ فَيَقُوْلُ اللّٰهُ تَعَالٰى اِنِّيْ حَرَّمْتُ الْجَنَّةَ عَلَى الْكَافِرِيْنَ ثُمَّ يُقَالُ لِاِبْرَاهِيْمَ انْظُرْ مَا تَحْتَ رِجْلَيْكَ فَيَنْظُرُ فَاِذَا هُوَ بِذِيْخٍ مُتَلَطِّخٍ فَيُؤْخَذُ بِقَوَآئِمِهٖ فَيُلْقٰى فِي النَّارِ. (رواه البخاری)

اخرجه البخاری فی صحیحه ۳۸۷/۶ حدیث رقم ۳۳۵۰۔

ترجمہ:''حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نبی کریم ﷺ سے نقل فرماتے ہیں کہ نبی اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا: روز قیامت ابراہیم علیہ السلام اپنے باپ آذر سے ایسی حالت میں ملاقات کریں گے کہ آذر کا چہرہ (پریشانی اور غم و افسوس کی وجہ سے) کالا اور غبار آلود ہوگا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام (یہ دیکھ کر افسردگی اور حسرت کے عالم میں) اس سے کہیں گے کہ کیا (دنیا میں) تم سے یہ نہیں کہا کرتا تھا کہ (میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو کچھ بتاتا اور تعلیم دیتا ہوں اس میں میری مخالفت اور نافرمانی نہ کر؟ نہ کیا کر؟ تو پھر ان کا باپ آزادان سے کہے گا کہ اب میں تمہاری مخالفت و نافرمانی نہیں کروں گا (خدا کے لئے میری سفارش کر کے میرے لئے نجات کی کوئی سبیل پیدا کردو) حضرت ابراہیم علیہ السلام (باپ کی یہ بات سن کر) درخواست کریں گے کہ میرے پروردگار! تو نے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ اس روز جب لوگوں کو اٹھایا جائے گا تو کو ذلیل و رسوا نہ کرے گا' پس اس ذلت سے بڑھ کر ذلت و رسوائی اور کیا ہو سکتی ہے کہ میرا باپ تیرے رحم و بخشش سے اس قدر دور ہے۔ اللہ تعالیٰ فرمائے گا (کہ ابراہیم علیہ السلام آج کے دن تمہارے باپ کے حق میں مغفرت و نجات کی تمہاری گزارش قبول نہیں ہو سکتی کیونکہ وہ کافر ہے) اور حقیقت یہ ہے کہ میں نے جنت کو کفار پر حرام کر دیا ہے پھر حضرت ابراہیم علیہ السلام سے کہا جائے گا کہ نیچے دیکھو تمہارے پیروں میں کیا چیز ہے حضرت ابراہیم علیہ السلام (یہ سن کر) اپنے پیروں کی جانب نظر کریں گے تو یہ دکھائی دے گا کہ (ان کا باپ) آذر ایک گھنے بالوں والے بجو کی شکل میں مٹی اور گوبر میں لتھڑا ہوا پڑا ہے پھر اس (آذر) کے پاؤں پکڑ کر جہنم میں پھینک دیا جائے گا''۔ (بخاری)

۸/۵۵۳۹ وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَعْرَقُ النَّاسُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ حَتّٰى يَذْهَبَ عَرَقُهُمْ فِي الْاَرْضِ سَبْعِيْنَ ذِرَاعًا وَّيُلْجِمُهُمْ حَتّٰى يَبْلُغَ اٰذَانَهُمْ. (متفق عليه)

اخرجه البخاري في صحيحه ٣٩٢/١١ حديثرقم ٦٥٣٢ ومسلم في صحيحه ٢١٩٦/٤ حديث رقم (٦١-٢٨٦٣) واحمد في المسند ٤١٨/٢

ترجمہ:''حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا کہ جناب رسول اللہ ﷺ نے روز قیامت (میدان حشر میں نامہ اعمال لوگوں کے سامنے لائے جائیں گے اور حساب و کتاب کا آغاز ہوگا) لوگ پسینہ سے شرابور ہو جائیں گے حتی کہ وہ پسینہ زمین کے اندر ستر گز تک چلا جائے گا اور ان کے لئے لگام بن جائے گا یہاں تک کہ ان کے کانوں تک سرایت کر جائے گا یعنی وہ پسینہ ان کے دہنوں تک پہنچ کر لگام کی طرح ان کے منہ کو جکڑے گا کہ وہ گفتگو کی بھی قدرت نہیں رکھ سکیں گے''۔ (بخاری و مسلم)

۵۵۴۰ : وَعَنِ الْمِقْدَادِ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ تُدْنَى الشَّمْسُ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ مِنَ الْخَلْقِ حَتّٰى تَكُوْنَ مِنْهُمْ كَمِقْدَارِ مِيْلٍ فَيَكُوْنُ النَّاسُ عَلٰى قَدْرِ اَعْمَالِهِمْ فِي الْعَرَقِ فَمِنْهُمْ مَنْ يَّكُوْنُ اِلٰى كَعْبَيْهِ وَمِنْهُمْ مَنْ يَّكُوْنُ اِلٰى رُكْبَتَيْهِ وَمِنْهُمْ مَنْ يَّكُوْنُ اِلٰى حِقْوَيْهِ وَمِنْهُمْ مَنْ يُّلْجِمُهُمُ الْعَرَقُ اِلْجَامًا وَّاَشَارَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِيَدِهٖ اِلٰى فِيْهِ. (رواه مسلم)

اخرجه البخاري في صحيحه ٣٩٢/١١ حديث رقم ٦٥٣٢ ومسلم في صحيحه ٢١٩٦/٤ حديث رقم

(٦١-٢٨٦٣) واحمد فی المسند ٤١٨/٢

ترجمہ: ''حضرت مقداد رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا کہ میں نے جناب رسول اللہ ﷺ کو یہ ارشاد فرماتے ہوئے سنا: قیامت کے روز (حشر کے میدان میں) سورج کو مخلوق کے قریب کر دیا جائے گا یہاں تک کہ وہ ان سے ایک میل کی مسافت صرف دور رہ جائے گا پس تمام لوگ اپنے اپنے عمل اور کردار کے مطابق پسینہ میں ڈوبے ہوں گے' چنانچہ ان میں سے بعض اشخاص ایسے ہوں گے جن کے ٹخنوں تک پسینہ ہوگا بعض افراد ایسے ہوں گے جن کے گھٹنوں تک پسینہ ہوگا' کچھ ایسے لوگ ہوں گے جو کمر تک پسینہ میں شرابور ہوں گے اور بعض لوگ وہ ہوں گے جن کے لئے ان کا پسینہ لگام بن جائے گا یعنی ان کی دہن (منہ) تک پسینہ آیا ہوگا بلکہ دہن کے اندر تک پہنچ جائے گا یہ فرما کر آنحضرت ﷺ نے اپنے دست مبارک سے اپنے دہن مبارک کی جانب اشارہ فرمایا''۔ (مسلم)

۵۵۴۱ : وَعَنْ اَبِیْ سَعِیْدِ الْخُدْرِیِّ عَنِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قَالَ یَقُوْلُ اللّٰهُ تَعَالٰی یَا اٰدَمُ فَیَقُوْلُ لَبَّیْكَ وَسَعْدَیْكَ وَالْخَیْرُ كُلُّهٗ فِیْ یَدَیْكَ قَالَ اَخْرِجْ بَعْثَ النَّارِ قَالَ وَمَا بَعْثُ النَّارِ قَالَ مِنْ كُلِّ اَلْفٍ تِسْعَ مِائَةٍ وَّتِسْعَةً وَّتِسْعِیْنَ فَعِنْدَهٗ یَشِیْبُ الصَّغِیْرُ وَتَضَعُ كُلُّ ذَاتِ حَمْلٍ حَمْلَهَا وَتَرَی النَّاسَ سُكٰرٰی وَمَا هُمْ بِسُكٰرٰی وَلٰكِنَّ عَذَابَ اللّٰهِ شَدِیْدٌ قَالُوْا یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ وَاَیُّنَا ذٰلِكَ الْوَاحِدُ قَالَ اَبْشِرُوْا فَاِنَّ مِنْكُمْ رَجُلًا وَّمِنْ یَاجُوْجَ وَمَاجُوْجَ اَلْفٌ ثُمَّ قَالَ وَالَّذِیْ نَفْسِیْ بِیَدِهٖ اَرْجُوْ اَنْ تَكُوْنُوْا رُبُعَ اَهْلِ الْجَنَّةِ فَكَبَّرْنَا فَقَالَ اَرْجُوْ اَنْ تَكُوْنُوْا ثُلُثَ اَهْلِ الْجَنَّةِ فَكَبَّرْنَا فَقَالَ اَرْجُوْ اَنْ تَكُوْنُوْا نِصْفَ اَهْلِ الْجَنَّةِ فَكَبَّرْنَا قَالَ مَا اَنْتُمْ فِی النَّاسِ اِلَّا كَالشَّعْرَةِ السَّوْدَآءِ فِیْ جِلْدِ ثَوْرٍ اَبْیَضَ اَوْ كَشَعْرَةٍ بَیْضَآءَ فِیْ جِلْدِ ثَوْرٍ اَسْوَدَ . (متفق علیه)

اخرجه البخاری فی صحیحه ٣٨٢/٦ حدیث رقم ٣٣٤٨ ومسلم فی صحیحه ٢٠١/١ حدیث رقم (٣٧٩-٢٢٢) واخرجه الترمذی فی السنن ٣٠٢/٥ حدیث رقم ٣١٦٨۔

ترجمہ: ''حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ نبی اکرم ﷺ سے روایت نقل فرماتے ہیں کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''(روز قیامت محشر میں) اللہ تعالیٰ اعلان فرمائے گا کہ اے آدم!'' آدم جواب دیں گے کہ میں تیری جناب میں حاضر ہوں اور تیری اطاعت کے لئے تیار ہوں تمام تر خیر و بھلائیاں تیری قدرتوں میں مضمر ہیں۔ اللہ تعالیٰ حکم فرمائے گا: اھل دوزخ کا لشکر نکال لو یعنی ہمیں تمہاری اولاد میں سے جن لوگوں کو دوزخ میں بھیجنا منظور ہے ان کو علیحدہ کر لو۔ آدم عرض کریں گے کہ اھل جہنم کے لشکر کی تعداد کیا ہے (کس تناسب سے نکالنا ہوگا؟) اللہ تعالیٰ فرمائے گا کہ ہر ہزار میں سے نو سو ننانوے (یعنی دوزخیوں کا تناسب یہ ہے کہ ہر ہزار میں سے ایک آدمی جنت میں جائے گا اور باقی دوزخ میں ڈالے جائیں گے!) یہ حکم خداوندی سن کر بچہ بوڑھاپے کی عمر کو پہنچ جائے گا اور ہر حاملہ اپنا حمل ضائع کرے گی۔ اور اس وقت) تم دیکھو گے کہ لوگ گویا نشہ میں مدہوش ہیں حالانکہ وہ (شراب جیسے نشہ سے) مدہوش نہ ہوں گے بلکہ عذاب الٰہی بہت سختی اور شدت والا ہے (یعنی لوگوں کی وہ سرمستی و مدہوشی' عذاب الٰہی کے

خوف ودہشت کے باعث ہوگی) صحابہؓ نے (جب یہ بات سنی کہ اھل جنت کا تناسب ہزار میں سے صرف ایک ہوگا تو انہوں نے خوف وحسرت سے) عرض کیا کہ وہ ایک (جو ہزار میں سے نکل کر جنت میں جائے گا) ہم میں سے کون (خوش قسمت ہوگا)؟ آنحضرت ﷺ نے (ان کو سمجھانے اور تسلی دینے کے لئے) فرمایا اطمینان رکھو غم نہ کھاؤ (جنت میں جانے والا) ایک شخص تم میں سے ہوگا اور (جہنم میں داخل ہونے والے ایک ہزار افراد یاجوج وماجوج میں سے ہوں گے۔ پھر آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے میں توقع رکھتا ہوں کہ (اے میری امت کے ایماوالوں!) تم اہل جنت کی مجموعی تعداد کا چوتھائی حصہ ہوگے۔ ابوسعید رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا کہ یہ سن کر مارے خوشی کے ہم نے نعرہ تکبیر بلند کیا (کہ یہ تو اللہ تعالیٰ کی بڑی نعمت ہے ہم اتنی بڑی تعداد میں جنت میں جانے والے ہوں گے) آنحضرت ﷺ نے پھر (اور بڑی خوشخبری دینے کے لئے) فرمایا کہ مجھے امید ہے کہ تم اہل جنت کی مجموعی تعداد کا تہائی حصہ ہوگے (یہ سن کر ہم اور خوش ہوتے اور) ہم نے پھر نعرہ تکبیر بلند کیا پھر آپ ﷺ نے فرمایا کہ "میں تم لوگوں یعنی امت محمدی ﷺ کی یہ ایک عظیم فضیلت ہے کہ جنت میں جانے والوں میں سے سب سے بڑی تعداد اسی امت کی ہوگی جب کہ اس دنیا میں) لوگوں کے درمیان تمہاری تعداد اتنی کم ہے جیسا کہ سفید بیل کے جسم پر ایک کالا تل یا ایک سیاہ بیل کے جسم پر ایک سفید بال ہو"۔ (بخاری ومسلم)

۵۵۴۲ : وَعَنْهُ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ يَكْشِفُ رَبُّنَا عَنْ سَاقِهٖ فَيَسْجُدُ لَهٗ كُلُّ مُؤْمِنٍ وَمُؤْمِنَةٍ وَيَبْقٰى مَنْ كَانَ يَسْجُدُ فِي الدُّنْيَا رِيَآءً وَسُمْعَةً فَيَذْهَبُ لِيَسْجُدَ فَيَعُوْدُ ظَهْرُهٗ طَبَقًا وَاحِدًا. (متفق عليه)

اخرجه البخاري في صحيحه ٦٦٣/٨ حديث رقم ٤٩١٩ ومسلم في صحيحه ١٦٨/١ حديث رقم (٣٠٢-١٨٣)

ترجمہ: "حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا کہ میں نے جناب رسول اللہ ﷺ کو یہ ارشاد فرماتے ہوئے سنا: "(روز قیامت) ہمارا پروردگار اپنی پنڈلی سے حجاب اٹھائے گا تو سب مؤمن مرد وعورت اس کے سامنے سجدہ میں گر جائیں گے' لیکن وہ شخص سجدہ نہیں کر سکے گا جو دنیا میں دکھانے اور سنانے (ریاکاری) کے لئے سجدہ کیا کرتا تھا گو وہ سجدہ کرنے لگے گا مگر اس کی پشت (جھکنے اور اٹھنے کے وقت مڑ نہ سکنے والی) ایک بے جوڑ ہڈی بن جائے گی جس کی وجہ سے وہ سجدہ کرنے پر قدرت نہ رکھ سکے گا"۔ (بخاری ومسلم)

۵۵۴۳ : وَعَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَيَاتِيَ الرَّجُلُ الْعَظِيْمُ السَّمِيْنُ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ لَا يَزِنُ عِنْدَ اللّٰهِ جَنَاحَ بَعُوْضَةٍ وَقَالَ اِقْرَؤُا فَلَا نُقِيْمُ لَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَزْنًا.

(متفق عليه)

اخرجه البخاري في صحيحه ٤٢٦/٨ حديث رقم ٤٧٢٩ ومسلم في صحيحه ٢١٤٧/٤ حديث رقم (١٨-٢٧٨٥)

ترجمہ: "حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا کہ جناب رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: روز قیامت (حشر کے میدان میں) جاہ ومال کے اعتبار سے) ایک لحیم (موٹا اور شحیم آدمی آئے گا لیکن اللہ کے نزدیک وہ مچھر کے پر کے بقدر بھی کوئی اوقات اور رتبہ نہ رکھتا ہوگا اور (اے ایمان والو) تم یہ آیت پڑھا کرو (تاکہ تم باخبر ہو جاؤ کہ وہ

دنیادار جواپنی دنیاوی جاہ قسمت پر نازاں اور فرماں ہیں اور اپنے کردار و عمل کو بہترین گمان کرتے ہیں درحقیقت وہ بے حیثیت ہیں اوران کے تمام اعمال وکردار ضائع و نابود ہو جانے والے ہیں اور وہ آیت یہ ہے کہ فَلَا نُقِيمُ لَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَزْنًا قیامت کے دن ہم انہیں کوئی مقام کوئی رتبہ وشرف نہ دیں گے۔اس روایت کو بخاری ومسلم نے روایت کیا ہے۔

الفصل الثانی:

۵۵۴۴ : عَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَرَأَرَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ هٰذِهِ الْاٰيَةَ يَوْمَئِذٍ تُحَدِّثُ اَخْبَارَهَا قَالَ اَتَدْرُوْنَ مَآ اَخْبَارُ هَا قَالُوا اَللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ اَعْلَمُ قَالَ فَاِنَّ اَخْبَارَهَا اَنْ تَشْهَدَ عَلٰى كُلِّ عَبْدٍ وَّاَمَةٍ بِمَا عَمِلَ عَلٰى ظَهْرِهَا اَنْ تَقُوْلَ عَمِلَ عَلَيَّ كَذَا وَكَذَا يَوْمَ كَذَا وَكَذَا قَالَ فَهٰذِهٖ اَخْبَارُهَا.

(رواہ احمد والترمذی وقال هذا حدیث حسن صحیح غریب)

اخرجه الترمذی فی السنن ٥/٤٣٥ حدیث رقم ٢٤٢٩ واحمد فی المسند ٢/ ٣٧٤۔

ترجمہ:''حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا کہ (ایک روز) رسول اللہ ﷺ نے یہ آیت شریفہ تلاوت فرمائی: يَوْمَئِذٍ تُحَدِّثُ اَخْبَارَهَا (جس دن زمین اپنی خبریں بیان کرے گی اور پوچھا کہ کیا تم خبر رکھتے ہو زمین کی خبریں (جو روز قیامت سنائے گی) کیا ہوں گی؟ صحابہؓ نے عرض کیا کہ اللہ تعالیٰ اور اس کا رسول ہی بخوبی علم رکھتے ہیں۔آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: زمین کی خبریں یہ ہوں گی کہ وہ (زمین) ہر بندے اور ہر لونڈی یعنی ہر مرد وعورت کے ہر اس عمل کی گواہی دے گی جو اس نے اس کی پشت پر سرانجام دیا ہوگا (یعنی) وہ اس طرح کہے گی کہ میری پشت پر (فلاں مرد نے فلاں عورت نے) فلاں دن فلاں وقت میں فلاں عمل کیا (یعنی فلاں شخص نے فلاں فلاں وقت فلاں نیک کام کیا ہے اور فلاں وقت فلاں برا کام کیا ہے) پھر آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: بس یہی (گواہی دینا) زمین کی خبریں ہیں''۔اس روایت کو احمد' ترمذی نے نقل کیا ہے اور امام ترمذی نے کہا ہے کہ یہ حدیث حسن صحیح غریب ہے۔

۵۵۴۵ : وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَا مِنْ اَحَدٍ يَمُوْتُ اِلَّا نَدِمَ قَالُوْا وَمَا نَدَامَتُهٗ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ قَالَ اِنْ كَانَ مُحْسِنًا نَدِمَ اَنْ لَّا يَكُوْنَ ازْدَادَ وَاِنْ كَانَ مُسِيْئًا نَدِمَ اَنْ لَّا يَكُوْنَ نَزَعَ. (رواہ الترمذی)

اخرجه الترمذی فی السنن ٤/ ٥٢٢ حدیث رقم ٢٤٠٣ ،والنسائی فی السنن ٤/ ٢ حدیث رقم ١٨١٨ والدارمی فی السنن ٢/ ٤٠٣ حدیث رقم ٢٧٥٨ واحمد فی المسند ٢/ ٢٦٣۔

ترجمہ:''حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ایسا کوئی شخص نہیں ہے جو وفات پائے اور نادم اور حسرت زدہ نہ ہو (یعنی ہر مرنے والا کسی کو درجے میں شرمسار اور پشیمان ہوتا ہے' پس قبل اس کے کہ موت آئے' اپنی حیات نبوی کو غنیمت سمجھو اور مرنے سے پہلے زیادہ سے زیادہ اعمال صالحہ کرلو) صحابہؓ نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! کس بات پر ندامت اور پشیمانی ہوتی ہے؟ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: اگر وہ (مرنے والا) نیکوکار رہوتا ہے تو اس لئے پشیمان ہوتا ہے کہ اس نے اور زیادہ نیکی کیوں نہیں کی اور اگر وہ بدکار رہوتا ہے تو اس لئے

پشیمان ہوتا ہے کہ وہ برائی سے باز کیوں نہ آیا ہے''۔(ترمذی)

۵۵۴۶ : وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يُحْشَرُ النَّاسُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ ثَلٰثَةَ اَصْنَافٍ صِنْفًا مُشَاةً وَّصِنْفًا رُكْبَانًا وَّصِنْفًا عَلٰى وُجُوْهِهِمْ قِيْلَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ وَكَيْفَ يَمْشُوْنَ عَلٰى وُجُوْهِهِمْ قَالَ اِنَّ الَّذِىْ اَمْشَاهُمْ عَلٰى اَقْدَامِهِمْ قَادِرٌ عَلٰى اَنْ يُّمْشِيَهُمْ عَلٰى وُجُوْهِهِمْ اِمَّآ اِنَّهُمْ يَتَّقُوْنَ بِوُجُوْهِهِمْ كُلَّ حَدَبٍ وَّشَوْكٍ. (رواه الترمذی)

اخرجه الترمذی فی السنن ٥٢٢/٤ حديث رقم ٢٤٠٣، والنسائی فی السنن ٢/٤ حديث رقم ١٨١٨ والدارمی فی السنن ٤٠٣/٢ حديث رقم ٢٧٥٨ واحمد فی المسند ٢٦٣/٢۔

ترجمہ:''حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا کہ جناب رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: قیامت کے روز میدان حشر میں لوگوں کو تین قسم کی حالتوں میں لایا جائے گا ایک قسم کے لوگ تو وہ ہوں گے جو پیادہ حالت میں آ رہے ہوں گے (میدان حشر میں)' ایک قسم کے لوگ وہ ہوں گے جو سوار ہونے کی حالت میں آ رہے ہوں گے اور ایک قسم کے لوگ وہ ہوں گے جو منہ کے بل (یعنی الٹے) چل کر آ رہے ہوں گے عرض کیا گیا کہ یا رسول اللہ! (پاؤں کے بل چلنے کی عادت کے بالکل خلاف) لوگوں کا منہ کے بل چل کر آنا کیسے ممکن ہوگا؟ فرمایا: حقیقت یہ ہے کہ جس ذات نے ان کو پاؤں کے بل چلایا ہے وہ ان کو منہ کے بل چلانے پر بھی قدرت رکھتا ہے اور آگاہ رہو! کہ وہ لوگ منہ کے بل چلنے میں اپنے منہ کو بلندی اور کانٹوں سے بچائیں گے''۔(ترمذی)

۵۵۴۷ : وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ سَرَّهٗ اَنْ يَّنْظُرَ اِلٰى يَوْمِ الْقِيَامَةِ كَاَنَّهٗ رَاْىُ عَيْنٍ فَلْيَقْرَاْ اِذَا الشَّمْسُ كُوِّرَتْ وَاِذَا السَّمَآءُ انْفَطَرَتْ وَاِذَا السَّمَآءُ انْشَقَّتْ.

(رواه احمد والترمذی)

اخرجه الترمذی فی السنن ٤٠٣/٥ حديث رقم ٣٣٣٣ واحمد فی المسند ١٠٠/٢۔

ترجمہ:''حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما نے بیان فرمایا کہ جناب رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: جو آدمی قیامت کے روز (کے حالات) کو اس طرح دیکھنا پسند کرتا ہو جیسے وہ (ظاہری) آنکھوں سے دیکھ رہا ہو تو اس کو چاہئے کہ سورہ اِذَا الشَّمْسُ كُوِّرَتْ اور سورۃ اِذَا السَّمَآءُ انْفَطَرَتْ اور سورۃ اِذَا السَّمَآءُ انْشَقَّتْ پڑھے''۔(احمد)

الفصل الثالث:

۵۵۴۸ : عَنْ اَبِىْ ذَرٍّ قَالَ اِنَّ الصَّادِقَ الْمَصْدُوْقَ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ حَدَّثَنِىْ اَنَّ النَّاسَ يُحْشَرُوْنَ ثَلٰثَةَ اَفْوَاجٍ فَوْجًا رَاكِبِيْنَ طَاعِمِيْنَ كَاسِيْنَ فَوْجًا يَسْحَبُهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ عَلٰى وُجُوْهِهِمْ وَتَحْشُرُهُمُ النَّارُ وَفَوْجًا يَمْشُوْنَ وَيَسْعَوْنَ وَيُلْقِى اللّٰهُ الْاٰفَةَ عَلَى الظَّهْرِ فَلَا يَبْقٰى حَتّٰى اَنَّ الرَّجُلَ لَتَكُوْنَ لَهُ الْحَدِيْقَةُ يُعْطِيْهَا بِذَاتِ الْقَتَبِ لَا يَقْدِرُ عَلَيْهَا. (رواه النسائی)

اخرجه الترمذی فی السنن ٤٠٣/٥ حديث رقم ٣٣٣٣ واحمد فی المسند ١٠٠/٢۔

ترجمہ: ''حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا کہ صادق و مصدوق ﷺ نے مجھ سے ارشاد فرمایا: تمام لوگ (میدان حشر کی طرف) تین قسم کی جماعتوں میں جمع کئے جائیں گے' ایک جماعت تو ایسی حالت میں آ رہی ہوگی کہ سواریوں پر سوار ہوگی اور زادِراہ کی آسانیوں و سہولتوں کے ساتھ مطمئن اور راحت و آرام اور سہولت میں ہوں گے' ایک جماعت اس حال میں آ رہی ہوگی جس کو فرشتے زمین پر منہ کے بل گھسیٹ کر لا رہے ہوں گے اور ہانک کر جہنم کی جانب لے جائیں گے اور ایک جماعت ایسی ہوگی جو دوڑتے ہوئے آئیں گے یعنی لوگ سہولت و اطمینان کے ساتھ نہیں بلکہ بے اطمینانی اور پریشانی کے ساتھ چلتے ہوئے آئیں گے) اور خدا تعالیٰ (سواری کے جانوروں کی) پشت پر آفت بھیج دے گا جس کی وجہ سے سواری کے جانور نایاب ہو جائیں گے یہاں تک کہ اگر کسی شخص کے پاس باغ ہوگا تو وہ باغ دے کر اس کے بدلہ میں ایک اونٹ لینا چاہے گا لیکن وہ (اس قدر اونچی قیمت ادا کرنے کے باوجود) اس اونٹ کو لینے پر قدرت نہ رکھ سکے گا''۔ (نسائی)

بَابُ الْحِسَابِ وَالْقِصَاصِ وَالْمِيْزَانِ

حساب' قصاص اور میزان کا بیان

''حِسَاب'' کے معنی ہیں گننا' شمار کرنا! اور یہاں مراد ہے قیامت کے دن بندوں کے اعمال و کردار کو گننا اور ان کا حساب کرنا! واضح رہے کہ حق تعالیٰ کی علیم و خبیر ذات کو سب کچھ معلوم ہے اور بندہ اس دنیا میں جو بھی عمل کرتا ہے وہ اس پر روشن وعیاں ہے لیکن قیامت کے دن بندوں کے اعمال و کردار کا حساب اس لئے ہوگا تا کہ ان پر حجت قائم ہو اور تمام مخلوق پر واضح ہو جائے کہ دنیا میں کس نے کیا کیا ہے اور کون کس درجہ کا آدمی ہے! پس قیامت کے دن کا یہ حساب قرآن مجید اور صحیح احادیث سے ثابت ہے اور اس کا بابت عقیدہ رکھنا ہر مسلمان پر واجب ہے۔

''قِصَاص'' کے معنی بدلہ و مکافات کے ہیں یعنی جس شخص نے جیسا کیا ہے اس کے ساتھ ویسا ہی کرنا! مثلاً اگر کسی شخص نے کسی شخص کو قتل کیا ہے تو اس کے بدلہ میں اس کو بھی قتل کرنا اور اگر کسی شخص نے کسی شخص کو زخمی کیا ہے تو اس کے بدلہ میں اس کو بھی زخمی کرنا قصاص کہلاتا ہے قیامت کے دن' جان کا بدلہ' زخم اور تکلیف ہوگا اور دنیا میں جس نے جس کے ساتھ جو کچھ بھی کیا ہوگا کہ خواہ اس کو آزردہ کیا ہو اور خواہ کوئی بھی جسمانی اور روحانی اذیت پہنچائی ہو اور وہ چیونٹی یا مکھی ہی کیوں نہ ہو' تو قیامت کے دن اس سے اس کا بدلہ لیا جائے اگرچہ وہ مکلف نہ ہو' چنانچہ تمام حیوانات کو بھی قیامت کے دن اسی لئے اٹھایا جائے گا تا کہ ان کو بھی ایک دوسرے کا بدلہ دلوایا جا سکے مثلاً اگر کسی سینگ والی بکری نے کسی بے سینگ بکری کو مارا ہوگا تو اس دن اس کو قصاص یعنی بدلہ دینا ہوگا۔

''مِيْزَان'' اس چیز سے تعبیر ہے' جس کے ذریعہ بندوں کے اعمال کی مقدار و حیثیت جانی جا سکے اور جمہور علماء کا قول ہے کہ وہ چیز میزان یعنی ترازو ہی کی شکل میں ہوگی جس کے دو پلے ہوں گے اور ایک زبان ہوگی اور دونوں پلوں کے درمیان مشرق و

مغرب جیسا فاصلہ ہوگا' اس میزان کے ذریعہ بندوں کے اعمال تولے جائیں گے' یعنی ایک پلے میں نیکیوں کے اعمال نامے اور دوسرے پلے میں برائیوں کے اعمال نامے رکھے جائیں گے اور بعض حضرات نے یہ کہا ہے کہ حسنات یعنی نیک اعمال کو اچھی صورتوں میں اور سیئات یعنی برے عمل کو بری صورتوں میں ڈھال دیا جائے گا اور ان دونوں کو تولا جائے گا لیکن بعض روایتوں میں پہلا قول ہی زیادہ صحیح معلوم ہوتا ہے اور اس سلسلہ میں جو نصوص ہیں ان کا ظاہری مفہوم بھی اسی پر دلالت کرتا ہے۔

الفصل الاول:

۵۵۴۹ : عَنْ عَائِشَةَ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ لَيْسَ اَحَدٌ يُحَاسَبُ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اِلاَّ هَلَكَ قُلْتُ اَوَ لَيْسَ يَقُوْلُ اللّٰهُ فَسَوْفَ يُحَاسَبُ حِسَابًا يَّسِيْرًا فَقَالَ اِنَّمَا ذٰلِكَ الْعَرْضُ وَلٰكِنْ مَنْ نُوْقِشَ فِي الْحِسَابِ يَهْلِكُ. (متفق علیه)

اخرجه البخاری فی صحیحه ۱۱/۴۰۰حدیث رقم ۶۵۳۶ومسلم فی صحیحه ۴/۲۲۰۴حدیث رقم (۷۹-۲۸۷۶) والترمذی فی السنن ۴/۵۳۳حدیث رقم ۲۴۲۶ واحمد فی المسند ۶/۲۰۶۔

ترجمہ: ''حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے نے بیان فرمایا ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: قیامت کے دن جس سے حساب لیا جائے گا وہ ہلاک ہو جائے گا (یعنی جس شخص سے پوچھ کچھ شروع ہوگی اور تفتیش کی جائے گی اس کا بچ نکلنا ممکن نہیں ہوگا' نیز یہاں ''تباہ ہونے'' سے مراد عذاب میں (مبتلا ہونا ہے) حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا بیان ہے کہ (جب میں نے یہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ایک کلیہ کے طور پر سنا تو میرے ذہن میں خلجان پیدا ہوا اور اسی اشکال کو دور کرنے کے لئے) میں نے عرض کیا کہ ''کیا اللہ تعالیٰ نے اہل نجات کے متعلق یہ نہیں فرمایا کہ ''فَسَوْفَ يُحَاسَبُ حِسَابًا يَّسِيْرًا'' (جس شخص کا نامہ اعمال اس کے داہنے ہاتھ میں دیا جائے گا' پس جلد ہی اس کا حساب آسان ہوا اور اگر حساب آسان ہوگا تو اس کی ہلاکت کا کیا مطلب؟) آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے (میرے اس اشکال کو رفع فرمانے کے لئے) فرمایا: یہ آسان حساب صرف پیش کرنا اور بیان محض ہے' لیکن جس شخص سے حساب لینے میں جانچ پڑتال سے کام لیا جائے گا (یعنی جس کو سخت باز پرس اور دارو گیر سے گزرنا پڑے گا) اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ ہلاک ہو جائے گا۔ (بخاری ومسلم)

۵۵۵۰ : وَعَنْ عَدِيِّ بْنِ حَاتِمٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَا مِنْكُمْ مِنْ اَحَدٍ اِلاَّ سَيُكَلِّمُهٗ رَبُّهٗ لَيْسَ بَيْنَهٗ وَبَيْنَهٗ تَرْجُمَانٌ وَلَا حِجَابٌ يَحْجُبُهٗ فَيَنْظُرُ اَيْمَنَ مِنْهُ فَلَا يَرٰى اِلاَّ مَا قَدَّمَ مِنْ عَمَلِهٖ وَيَنْظُرُ اَشْاَمَ مِنْهُ فَلَا يُرٰى اِلاَّ مَا قَدَّمَ وَيَنْظُرُ بَيْنَ يَدَيْهِ فَلَا يَرٰى اِلاَّ النَّارَ تِلْقَاءَ وَجْهِهٖ فَاتَّقُوا النَّارَ وَلَوْ بِشِقِّ تَمْرَةٍ. (متفق علیه)

اخرجه البخاری فی صحیحه ۱۱/۴۰۰حدیث رقم ۶۵۳۶ومسلم فی صحیحه ۴/۲۲۰۴حدیث رقم (۷۹-۲۸۷۶) والترمذی فی السنن ۴/۵۳۳حدیث رقم ۲۴۲۶ واحمد فی المسند ۶/۲۰۶۔

ترجمہ: ''حضرت عدی بن حاتم رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: قیامت کے روز تم میں سے کوئی فرد بھی ایسا نہ ہوگا کہ جس سے اس کا رب گفتگو نہ فرمائے گا (اور پھر منظر ایسا ہوگا کہ) بندے اور

اللہ رب ذوالجلال کے درمیان کوئی ترجمان (رابطہ سمجھانے کے لئے واسطہ) نہ ہوگا اور نہ کوئی حائل و پردہ ہوگا (کہ جو بندے کو اس کے پروردگار سے چھپائے) جب بندہ اپنی دائیں طرف نگاہ اٹھائے گا تو اس کو وہ چیز نظر آئے گی جو اس نے آگے بھیجی ہوگی (یعنی نیک اعمال جو اپنے اجسام ظاہرہ کی صورت میں دکھائی دینگے یا ان اعمال کی جزا و انعامات) اور جب بائیں طرف نظر ڈالے گا تو اس کو وہی کچھ نظر آئے گا جو اس نے آگے بھیجا ہوگا یعنی برے اعمال اور جب وہ اپنے آگے دیکھے گا تو اس کو اپنے منہ کے سامنے آگ دکھائی دے گی' پس (اے لوگو) تم آگ سے بچو اگرچہ کھجور کے ایک ٹکڑے (کے صدقہ) ہی سے کیوں نہ ہو"۔ (بخاری ومسلم)

قیامت کے دن مؤمن پر رحمت الٰہیہ

۵۵۵۱ : وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ اللّٰهَ يُدْنِي الْمُؤمِنَ فَيَضَعُ عَلَيْهِ كَنَفَهٗ وَيَسْتُرُهٗ فَيَقُوْلُ اَتَعْرِفُ ذَنْبَ كَذَا اَتَعْرِفُ ذَنْبَ كَذَا فَيَقُوْلُ نَعَمْ اَیْ رَبِّ حَتّٰى قَرَّرَهٗ بِذُنُوْبِهٖ وَرَاٰى فِي نَفْسِهٖ اَنَّهٗ قَدْ هَلَكَ قَالَ سَتَرْتُهَا عَلَيْكَ فِي الدُّنْيَا وَاَنَا اَغْفِرُهَا لَكَ الْيَوْمَ فَيُعْطٰى كِتَابُ حَسَنَاتِهٖ وَاَمَّا الْكُفَّارُ وَالْمُنَافِقُوْنَ فَيُنَادٰى بِهِمْ عَلٰى رُؤُسِ الْخَلَائِقِ هٰؤُلَاءِ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا عَلٰى رَبِّهِمْ اَلَا لَعْنَةُ اللّٰهِ عَلَى الظّٰلِمِيْنَ. (متفق عليه)

اخرجه البخاری فی صحيحه ٤٠٠/١١ حديث رقم ٦٥٣٦ ومسلم فی صحيحه ٢٢٠٤/٤ حديث رقم (٢٨٧٦-٧٩) والترمذی فی السنن ٥٣٣/٤ حديث رقم ٢٤٢٦ واحمد فی المسند ٢٠٦/٦۔

ترجمہ: "حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما نے بیان فرمایا کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: (روز قیامت) حق تعالیٰ ایمان والے شخص کو اپنے (فضل وکرم اور اپنی رحمت کے) نزدیک کرے گا اور (پھر) اس کو اپنی حفاظت اور اپنی عنایت کے سائے میں چھپائے گا تاکہ وہ اہل محشر پر اپنی لغزشوں اور اپنی بداعمالیوں سے کھل جانے کے باعث نادم وشرمسار اور ذلیل ورسوانہ ہو) پھر اللہ تعالیٰ اس (مؤمن) سے پوچھے گا کہ کیا تو اس گناہ کو جانتا ہے' کیا تو اس گناہ کو جانتا ہے' یعنی کیا تم اپنے فلاں فلاں گناہوں اور جرائم کے معترف ہو اور یاد ہے کہ کیا کچھ کر کے آئے ہو؟ وہ (مؤمن) عرض کرے گا کہ اے میرے رب جی ہاں! میں اپنی بدعملی کا اعتراف کرتا ہوں غرضیکہ خداوند کریم اس (مؤمن) سے اس کے تمام جرموں کے بارے میں اعتراف و اقرار کروالے گا اور وہ (مؤمن) دل ہی دل میں سوچ رہا ہوگا کہ (ان معاصی کی پاداش میں) میں اب ضرور تباہ ہونے ہی والا ہوں ہلاک ہو جاؤں! لیکن اللہ تعالیٰ فرمائے گا کہ "میں نے دنیا میں تیرے معاصی اور جرائم کو چھپائے رکھا ستاری کا معاملہ کیا اور آج بھی تیرے ان گناہوں کو بخش دوں گا"۔ پس اس (مؤمن) کو اس کی نیکیوں نامہ اعمال عطا کیا جائے گا اور جہاں تک کفار ومنافقین کا تعلق ہے تو ان کو تمام مخلوق کے سامنے طلب کیا جائے گا اور پکار کر کہا جائے گا کہ یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے اپنے رب پر بہتان (شرک) باندھا تھا' سن لو! ظالمین پر اللہ کی لعنت ہے"۔ (بخاری ومسلم)

مسلمانوں کے دشمن ان کے لئے دوزخ سے نجات کا عوضانہ ہوں گے

۵۵۵۲ : وَعَنْ اَبِیْ مُوْسٰی قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذَا كَانَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ دَفَعَ اللّٰهُ اِلٰى كُلِّ مُسْلِمٍ يَهُوْدِيًّا اَوْ نَصْرَانِيًّا فَيَقُوْلُ هٰذَا فِكَاكُكَ مِنَ النَّارِ. (رواه مسلم)

اخرجه مسلم في صحيحه ٢١١٩/٤ حديث رقم (٤٩-٢٧٦٧) وابن ماجه في السنن ١٤٣٢/٢ حديث رقم ٤٢٨٥ـ

ترجمہ: ”حضرت ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا کہ جناب رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ”جب روز قیامت ہوگا تو اس وقت اللہ تعالیٰ ہر مسلمان کسی یہودی یا کسی نصرانی (یعنی کافر) سپرد کرے گا اور فرمائے گا کہ یہ شخص دوزخ سے تیری آزادی (برأت) ہے یعنی دوزخ کی آگ سے تیری نجات کا سبب ہے“۔ (مسلم)

قیامت کے دن حضرت نوح علیہ السلام کی بابت اُمت محمدیہ (ﷺ) کی گواہی

۵۵۵۳ : وَعَنْ اَبِیْ سَعِيْدٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يُجَاءُ بِنُوْحٍ يَوْمَ الْقِيَامَةِ فَيُقَالُ لَهٗ هَلْ بَلَّغْتَ فَيَقُوْلُ نَعَمْ يَا رَبِّ فَتُسْئَلُ اُمَّتُهٗ هَلْ بَلَّغَكُمْ فَيَقُوْلُوْنَ مَا جَاءَنَا مِنْ نَّذِيْرٍ فَيُقَالُ مَنْ شُهُوْدُكَ فَيَقُوْلُ مُحَمَّدٌ وَاُمَّتُهٗ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَيُجَاءُ بِكُمْ فَتَشْهَدُوْنَ اَنَّهٗ قَدْ بَلَّغَ ثُمَّ قَرَاَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا. (رواه البخاری)

اخرجه مسلم في صحيحه ٢١١٩/٤ حديث رقم (٤٩-٢٧٦٧) وابن ماجه في السنن ١٤٣٢/٢ حديث رقم ٤٢٨٥ـ

ترجمہ: ”حضرت ابوسعید رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا کہ جناب رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ”روز قیامت (حشر کے میدان میں) حضرت نوح علیہ السلام کو لایا جائے گا اور ان سے سوال کیا جائے گا کہ کیا آپ نے (خدا تعالیٰ کے پیغامات) پہنچا دیے تھے؟ وہ عرض کریں گے کہ اے میرے رب جی ہاں! (میں نے تیرے احکام دین و ہدایت اپنی امت کے لوگوں تک پہنچا کر آیا ہوں) پھر حضرت نوح علیہ السلام کی امت سے سوال کیا جائے گا کہ کیا نوح علیہ السلام نے تم تک ہمارے احکام پہنچا دیے وہ قوم منکرین جائے گی اور کہنے لے گی کہ ہمارے پاس تو کوئی بھی ڈرانے والا (خواہ وہ نوح ہوں یا اور کوئی نبی) نہیں آیا تھا اور پھر حضرت نوح علیہ السلام سے پوچھا جائے گا کہ آپ کی گواہی دینے والا کون ہوگا؟ (اے میرے رب جی ہاں! یعنی اگر چہ خدا تعالیٰ اس بات سے بخوبی واقف ہو ں گے کہ حضرت نوح علیہ السلام اپنی بات سچے ہیں اور اپنے عہدہ رسالت کی ذمہ داری صحیح طرح نباہ کر آرہے ہیں مگر خدا تعالیٰ یہ مطالبہ گواہ لانے کا محض ان کی قوم کے غلط دعویٰ پر حجت قائم کے لئے فرمائیں گے چنانچہ حضرت نوح علیہ السلام میرے ی گواہی دینے والے سیدنا حضرت محمد ﷺ اور ان کی امت کے لوگ ہیں اس کے بعد رسول اللہ ﷺ نے (صحابہؓ سے) فرمایا کہ تب تمہیں لایا جائے گا اور تم یہ گواہی دو گے کہ حضرت نوح علیہ السلام نے اپنی

امت کو احکام خداوندی پہنچائے تھے۔ پھر رسول اللہ ﷺ نے (اسی حقیقت واقعہ کی تائید کے لئے) یہ آیت شریفہ تلاوت فرمائی (جس میں حق تعالیٰ امت محمدیہ کو مخاطب کر کے ارشاد فرماتا ہے) کہ ﴿وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا﴾ "اور اسی لئے ہم نے (اے مسلمانو!) تمہیں نیک و عادل اور افضل امت بنایا ہے تاکہ تم ان لوگوں کے بارے میں (کہ جو تم سے پہلے گزرے ہیں اور کفر و شرک پر قائم رہے ہیں) گواہ رہو اور تمہارے گواہ رسول اقدس (ﷺ) ہوں گے"۔ اس روایت کو بخاری نے نقل کیا ہے۔

تشریح: حضرت نوح علیہ السلام کا یہ کہنا ہے کہ بے شک اے پروردگار! میں نے تیرے احکام اپنی امت کے لوگوں تک پہنچائے تھے' قرآن کریم کی اس آیت کے منافی نہیں ہے جس میں یوں ہے کہ:

یوم یجمع اللہ الرسل فیقول ماذا اجبتم قالوا لا علم لنا انك انت علام الغیوب

"اس دن (میدانِ حشر میں) اللہ تعالیٰ رسولوں کو جمع کرے گا اور پھر ان سے پوچھے گا کہ تمہیں (تمہاری امت کی طرف سے تمہاری دعوت و تبلیغ دین کا) کیا جواب ملا تو وہ کہیں گے کہ ہمیں علم نہیں' بلاشبہ پوشیدہ باتوں کو آپ ہی بہت زیادہ جاننے والے ہیں"۔

کیونکہ اس آیت کی مراد تو یہ کہ "اجابت" کا سوال ہوگا جس کے بارے میں وہ رسول اپنی لاعلمی ظاہر کریں گے جب کہ یہاں حدیث میں حضرت نوح علیہ السلام سے جس سوال کا ذکر ہے وہ "دعوت و تبلیغ" کے بارے میں ہوگا اور ظاہر ہے کہ "اجابت" اور "دعوت و تبلیغ" دو الگ الگ چیزیں ہیں۔

حضرت نوح علیہ السلام یہ کہیں گے کہ میرے گواہ حضرت محمد ﷺ اور ان کی امت کے لوگ ہیں یعنی اصل گواہ تو امت محمدی ﷺ کے لوگ ہیں کہ حضرت نوح علیہ السلام کے دعوے کی گواہی وہی دیں گے اور حضرت محمد ﷺ ان کے مزکی ہوں گے' اس صورت میں کہا جائے گا کہ اصل گواہ یعنی امت محمد ﷺ کے لوگوں سے پہلے مزکی یعنی آنحضرت ﷺ کا ذکر کرنا آپ ﷺ کی تعظیم و توقیر کے اظہار کے لئے ہوگا اور ویسے یہ بھی بعید نہیں کہ خود آنحضرت ﷺ بھی نوح علیہ السلام کی گواہی دیں کیونکہ وہ وقت اور جگہ ہی ایسی ہوگی جہاں زیادہ سے زیادہ مدد و نصرت پہنچانے کی ضرورت ہوگی رسول اللہ ﷺ نے (صحابہؓ سے) فرمایا کہ تب تمہیں پیش کیا جائے گا۔ ان الفاظ کا اسلوب بیان بتاتا ہے کہ اس وقت جب کہ دربار الٰہی میں لوگوں کی سب سے بڑی پیشی ہوگی' آنحضرت ﷺ حاضر و ناظر ہوں گے یعنی آپ ﷺ پوری کارروائی کے دوران موجود رہیں گے اور شاہد ہوں گے چنانچہ جب انبیاء اور رسولوں کی پیشی ہوگی تو سب سے پہلے حضرت نوح علیہ السلام کو پیش کیا جائے گا اور پھر ان کے گواہوں یعنی امت محمدی ﷺ کے لوگوں کو لایا جائے گا۔

"اور تم یہ گواہی دو گے......" یعنی حضرت نوح علیہ السلام کے کہنے کے مطابق تم ان کی گواہی دو گے اور تمہارے نبی ﷺ تمہارے مزکی ہوں گے یا یہ کہ تم گواہی دو گے اور تمہارے ساتھ نبی بھی گواہی دیں گے۔

اس آیت کریمہ: ﴿وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا ......﴾ میں جو یہ فرمایا گیا ہے کہ مسلمان قیامت کے دن گزشتہ امتوں کے بارے میں گواہی دیں گے اور ان (مسلمانوں) کی گواہی ان کے پیغمبر ﷺ دیں گے' تو ان گزشتہ لوگوں کے بارے

میں مسلمانوں کی گواہی کی مثال تو یہی ہے کہ وہ (مسلمان) حضرت نوح علیہ السلام کے بارے میں گواہی دیں گے کہ انہوں نے اپنی امت کے لوگوں تک خدا کے احکام پہنچائے تھے اور ان (مسلمانوں) کے بارے میں ان کے پیغمبر کی طرف سے گواہی کی صورت یہ ہوگی کہ ایک حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ جب قیامت کے دن گزشتہ انبیاء اور رسولوں کی امتیں انکار کرتے ہوئے کہیں گی کہ ہم تک کسی نبی نے کچھ نہیں پہنچایا اور ہمیں خدا کے احکام نہیں بتائے تو وہ رسول اور انبیاء امت محمدی کے لوگوں کو اپنا گواہ بنائیں گے اور جب مسلمان ان کی گواہی دیں گے تو ان سے پوچھا جائے گا کہ (تم لوگ تو ان امتوں کے بعد دنیا میں آئے تھے) تمہیں کیسے معلوم ہوا کہ ان انبیاء نے اپنی امت کے لوگوں کو خدا کے احکام پہنچائے تھے اور تم یہ گواہی کس بنا پر دے رہے ہو؟ تو وہ (مسلمان) جواب دیں گے کہ اس سلسلہ میں ہم نے کتاب اللہ کو ناطق پایا تھا (یعنی قرآن مجید نے ہمیں اس بارے میں بالکل سچی خبر دی تھی) چنانچہ اسی کی بنا پر ہم یہ گواہی دے رہے ہیں! اس کے بعد ان رسولوں کی امتوں کے لوگ مسلمانوں کی صداقت و عدالت یعنی ان کے معتبر ہونے کی اور ان کی سچائی کے بارے میں جرح کریں گے تب آنحضرت ﷺ مسلمانوں کا سچا اور معتبر ہونا ثابت کریں گے اور گواہی دیں گے کہ یقیناً یہ لوگ قابل اعتماد اور اپنی بات میں سچے ہیں پس اپنی امت کے بارے میں رسول اللہ ﷺ کے گواہ دینے کے یہی معنی ہیں اور اسی اعتبار سے آپ ﷺ کو اپنی امت کا گواہ کہا گیا ہے کہ جب آپ ﷺ نے اپنی امت کو سچا اور گزشتہ امتوں کے بارے میں ان کی گواہی کو معتبر ثابت کیا تو گویا آپ ﷺ نے بھی گواہی دی اور اسی لحاظ سے حضرت نوح علیہ السلام یہ کہیں گے کہ میرے گواہ حضرت محمد ﷺ اور ان کی امت کے لوگ ہیں۔

قیامت کے دن جسم کے اعضاء شہادت دیں گے

۵۵۵۴ : وَعَنْ اَنَسٍ قَالَ كُنَّا عِنْدَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَضَحِكَ فَقَالَ هَلْ تَدْرُوْنَ مِمَّا اَضْحَكُ قَالَ قُلْنَا اَللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ اَعْلَمُ قَالَ مِنْ مُّخَاطِبَةِ الْعَبْدِ رَبَّهٗ يَقُوْلُ يَا رَبِّ اَلَمْ تُجِرْنِىْ مِنَ الظُّلْمِ قَالَ يَقُوْلُ بَلٰى قَالَ فَيَقُوْلُ فَاِنِّىْ لَا اُجِيْزُ عَلٰى نَفْسِىْ اِلَّا شَاهِدًا مِّنِّىْ قَالَ فَيَقُوْلُ كَفٰى بِنَفْسِكَ الْيَوْمَ عَلَيْكَ شَهِيْدًا وَبِالْكِرَامِ الْكَاتِبِيْنَ شُهُوْدًا قَالَ فَيُخْتَمُ عَلٰى فِيْهِ فَيُقَالُ لِاَرْكَانِهٖ اَنْطِقِىْ قَالَ فَتَنْطِقُ بِاَعْمَالِهٖ ثُمَّ يُخَلّٰى بَيْنَهٗ وَبَيْنَ الْكَلَامِ قَالَ فَيَقُوْلُ بُعْدًا لَّكُنَّ وَسُحْقًا فَعَنْكُنَّ كُنْتُ اُنَاضِلُ. (رواہ مسلم)

اخرجه مسلم فی صحیحه ٤/٢٢٨٠ حديث رقم (١٧-٢٩٦٩)۔

ترجمہ: ''حضرت انس رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا کہ (ایک روز) ہم جناب رسول اللہ ﷺ کے پاس حاضر تھے کہ آپ ﷺ یکایک ہنسنے لگے اور آپ پوچھنے لگے: کیا تم جانتے ہو میں کیوں ہنس رہا ہوں؟ حضرت انس رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ ہم نے عرض کیا: اللہ اور اس کا رسول ہی بخوبی واقف ہیں۔ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: میں (قیامت کے دن) بندے کا اپنے پروردگار سے منہ در منہ کلام کرنے کو سوچ کر ہنس رہا ہوں! (اس وقت) بندہ کہے گا کہ اے پروردگار کیا تو نے مجھ کو ظلم سے نجات اپناہ نہیں دی؟ (یعنی کیا تو نے یہ نہیں فرمایا ہے کہ میں اپنے بندوں پر ذرہ

برابر بھی ظلم نہیں کرتا) آنحضرت ﷺ نے فرمایا (یہ سن کر) اللہ تعالیٰ فرمائے گا ہاں واقعی تمہیں (میں نے پناہ دی ہے اور میں بلاشبہ بندوں پر ظلم نہیں کرتا) تب بندہ کہے گا کہ اگر تو نے مجھے ظلم سے نجات دینے کا اعلان کر رکھا ہے تو) میں اپنے لئے اس کے علاوہ اور کچھ نہیں چاہت رکھتا کہ میرے نفس کے خلاف گواہی دینے والا سوائے میری ذات کے کوئی اور نہ ہو۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا: (بندے کی یہ بات سن کر) اللہ تعالیٰ فرمائے گا کہ "(مجھے اس پر کوئی اعتراض نہیں ہے) آج کے دن تیری ذات ہی تیرے بارے میں گواہی دینے کے لئے کافی ہے اور دیکھنے والے معزز فرشتے گواہی کے لئے کافی ہیں" آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا: پھر بندے کے منہ پر مہر لگا دی جائے گی (یعنی اس کی قوت گویائی کو معطل کر دیا جائے گا) اور اس کے بعد اس کے تمام اعضاء وجسم سے کہا جائے گا کہ تم کلام کرو' چنانچہ اس کے اعضاء بدن اس کے (ان) اعمال کو بیان کریں گے اس نے جن اعمال کو ان اعضاء کے استعمال سے کیا ہوگا ذریعہ کئے تھے پھر اس بندے اور اس کی گویائی کے درمیان سے پابندی ختم کر دی جائے گی (یعنی اس کے منہ کو جو مہر لگائی گئی تھی اس کو توڑ دیا جائے گا اور اس کی قوت گویائی بحال ہو جائے گی جس سے وہ پہلے کی طرح گفتگو کرنے لگ جائے گا) آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا: "بندہ کہے گا ((اپنے ہی اعضاء کو) کہ دور ہو بدبختو اور ہلاک ہو' میں تو تمہاری ہی طرف سے اور تمہاری ہی نجات کے لئے لڑ جھگڑا کر رہا تھا"۔ (مسلم)

روزِ قیامت دیدارِ الٰہی

٥٥٥٥ : وَعَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالُوْا يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ هَلْ نَرٰى رَبَّنَا يَوْمَ الْقِيٰمَةِ قَالَ هَلْ تُضَآرُّوْنَ فِی رُؤْيَةِ الشَّمْسِ فِی الظَّهِيْرَةِ لَيْسَتْ فِی سَحَابَةٍ قَالُوْا لَا قَالَ فَهَلْ تُضَآرُّوْنَ فِی رُؤْيَةِ الْقَمَرِ لَيْلَةَ الْبَدْرِ لَيْسَ فِی سَحَابَةٍ قَالُوا لَا قَالَ فَوَالَّذِیْ نَفْسِیْ بِيَدِهٖ لَا تُضَآرُّوْنَ فِیْ رُؤْيَةِ رَبِّكُمْ اِلَّا كَمَا تُضَآرُّوْنَ فِیْ رُؤْيَةِ اَحَدِ هِمَا قَالَ فَيَلْقَى الْعَبْدَ فَيَقُوْلُ اَیْ فُلْ اَلَمْ اُكْرِمْكَ وَاُسَوِّدْكَ وَاُزَوِّجْكَ وَاُسَخِّرْلَكَ الْخَيْلَ وَالْاِبِلَ وَاَذَرْكَ تَرْاَسُ وَتَرْبَعُ فَيَقُوْلُ بَلٰى قَالَ فَيَقُوْلُ اَفَظَنَنْتَ اَنَّكَ مُلَاقِیَّ فَيَقُوْلُ لَا فَيَقُوْلُ فَاِنِّیْ قَدْ اَنْسَاكَ كَمَا نَسِيْتَنِیْ ثُمَّ يَلْقَى الثَّانِیْ فَذَكَرَ مِثْلَهٗ ثُمَّ يَلْقَى الثَّالِثَ فَيَقُوْلُ لَهٗ مِثْلَ ذٰلِكَ فَيَقُوْلُ يَا رَبِّ اٰمَنْتُ بِكَ وَبِكِتَابِكَ وَبِرُسُلِكَ وَصَلَّيْتُ وَصُمْتُ وَتَصَدَّقْتُ وَيُثْنِیْ بِخَيْرٍ مَا اسْتَطَاعَ فَيَقُوْلُ هٰهُنَا اِذًا ثُمَّ يُقَالُ الْاٰنَ نَبْعَثُ شَاهِدًا عَلَيْكَ وَيَتَفَكَّرُ فِیْ نَفْسِهٖ مَنْ ذَا لَّذِیْ يَشْهَدُ عَلَیَّ فَيُخْتَمُ عَلٰى فِيْهِ وَيُقَالُ لِفَخِذِهٖ اِنْطِقِیْ فَتَنْطِقُ فَخِذُهٗ وَلَحْمُهٗ وَعِظَامُهٗ بِعَمَلِهٖ وَذٰلِكَ لِيُعَذِّرَ مِنْ نَفْسِهٖ وَذٰلِكَ الْمُنَافِقُ وَذٰلِكَ الَّذِیْ سَخِطَ اللّٰهُ عَلَيْهِ (رواه مسلم وذكر حديث ابي هريرة) يَدْخُلُ مِنْ اُمَّتِیْ الْجَنَّةَ فِیْ بَابِ التَّوَكُّلِ بِرِوَايَةِ ابْنِ عَبَّاسٍ.

اخرجه مسلم في صحيحه ٤ / ٢٢٨٠ حديث رقم (١٧-٢٩٦٩)۔

ترجمہ: "حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے بیان فرمایا کہ (ایک مرتبہ) صحابہؓ نے عرض کیا کہ یارسول اللہ ﷺ!

کیا روز قیامت (اپنی آنکھوں سے) اپنے پروردگار کا دیدار کریں گے؟ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: کیا دوپہر کے وقت جبکہ بادل نہ ہو تم آفتاب کو دیکھنے میں کوئی مشقت و تکلیف اٹھاتے ہو؟ انہوں نے کہا کہ نہیں (ہم تو ایسے میں باآسانی چاند کو دیکھ لیتے ہیں! آنحضرت ﷺ نے فرمایا: تو کیا چودھویں رات میں جب آسمان پر بادل بھی نہ چھائے ہوئے ہوں ہو تم چاند کو دیکھنے میں کوئی مشقت اٹھاتے ہو؟ انہوں نے کہا کہ نہیں (ہم تو ایسے میں باآسانی چاند کو دیکھ لیتے ہیں! آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا: پس قسم ہے اس عالی کی جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے جس طرح تم سورج اور چاند کو دیکھنے میں کوئی مشقت و تکلیف نہیں اٹھاتے اسی طرح (قیامت کے دن) اپنے پروردگار کو دیکھنے میں کوئی مشقت و تکلیف نہیں اٹھاتے۔ پھر آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا: جب بندے اپنے پروردگار کو دیکھیں گے تو اللہ تعالیٰ ایک بندے کو خطاب کر کے فرمائے گا کہ اے بندے! کیا میں نے تجھے (جنس حیوان اور دیگر مخلوقات پر) فوقیت نہیں عطا کی تھی کیا میں نے تجھے تیری بیوی نہیں عنایت کی تھی؟ (جو میں نے تیری ہی جنس سے پیدا کی تھی اور پھر تیرے اور اس کے درمیان انس و محبت اور پیار کا رشتہ قائم کیا تھا) کیا میں نے گھوڑوں اور اونٹوں (اور دیگر کارآمد جانوروں اور چیزوں) کو تیرے لئے مسخر نہیں کیا تھا اور کیا میں نے تجھے یہ تیری قوم کا سردار نہیں بنایا تھا سردار ہوا اور چوتھائی مال غنیمت حاصل کرے؟ (واضح رہے کہ یہ زمانہ جاہلیت میں بھی رواج تھا کہ کسی بھی قوم و قبیلہ کا سردار غنیمت کے مال میں سے اپنے لئے چوتھائی حصہ لیتا تھا اور باقی مال پوری قوم کے لئے چھوڑ دیتا تھا) وہ بندہ (یہ سن کر) عرض کرے گا کیوں نہیں میرے مولا یہ سب کچھ ہوا تھا (یعنی تو نے اپنے جن انعامات کا کو گنوایا ہے وہ سب مجھے دنیا میں حاصل ہوئی تھیں)'' آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا: اس کے بعد پروردگار پوچھے گا کہ کیا تو جانتا ہے کہ کبھی تو مجھ سے ملے گا؟ بندہ عرض کرے گا کہ نہیں! (مجھے یہ خیال نہیں رہا تھا اور میں ایسی غفلت میں پڑ گیا تھا کہ اس بات کو بھول ہی گیا) پس پروردگار فرمائے گا کہ تو میں تجھے فراموش کروں گا (یعنی آج میں بھی تجھے اپنی رحمت سے دور کر دوں گا) جیسا کہ تو نے دنیا میں میرے ذکر اور میری فرمانبرداری کو فراموش کر دیا تھا''۔

پھر اللہ رب العزت دوسرے بندے سے ملاقات اور خطاب فرمائے گا اس کے بعد حضور اقدس ﷺ نے پروردگار اور اس بندے کے درمیان اسی گفت و شنیدہ کا تذکرہ فرمایا جو پہلے بندے کے سلسلے میں نقل کیا گیا ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ تیسرے بندے سے ملاقات و خطاب فرمائے گا اور اس سے وہی ارشاد فرمائے گا جو اس نے پہلے بندہ سے فرمایا تھا اور وہ (تیسرا بندہ) عرض کرے گا کہ ''میرے پروردگار! میں تجھ پر تیری کتاب پر اور تیرے پیغمبروں پر ایمان لایا تھا میں نماز پڑھتا روزہ رکھتا تھا اور زکوۃ دیتا تھا'' اور اس طرح جتنا ہو سکے گا وہ اپنے خیر کے اعمال کی تعریف کرے گا۔ اللہ تعالیٰ (اس کی یہ تمام باتیں سن کر) ارشاد فرمائے گا کہ تم یہیں ٹھہرو ہم ابھی تم پر گواہ پیدا کئے دیتے ہیں بندہ (یہ سن کر) اپنے دل میں سوچے گا کہ بھلا وہ کون ہوگا جو اب میرے خلاف گواہی دے سکے گا لیکن ساتھ ہی اُس کے منہ کو مہر لگا دی جائے گی (یعنی اس کی قوت گویائی کو معطل کر دیا جائے گا اس کی ران سے کہا جائے گا کہ بول چنانچہ اس کی ران اس کا خفا و ناراض ہوں گے (مذکورہ سوال و جواب اس شخص کے منہ کو مہر لگانا اور اس کے اعضاء کے ذریعہ گواہی دلوانا) اس لئے ہوگا تاکہ بندہ کی بداعمالیاں ثابت ہو جائیں اور وہ کوئی عذر نہ کر سکے (یا یہ معنی ہیں کہ یہ سب کچھ اس لئے ہوگا تاکہ اللہ تعالیٰ خود صاحب عذر ہو یعنی اس بندے کو سزایاب اور مبتلائے عذاب ہونے کی ذمہ

داری اسی پر ڈال سکے) اور یہ تیسرا بندہ (جو اپنی نیکیوں کے بارے میں دعویٰ کرے گا لیکن خود اس کے اعضاء جسم اس کے دعوے کی تردید کریں گے) درحقیقت منافق شخص ہوگا اور یہ وہ بندہ ہے جس سے حق تعالیٰ خفا و ناراض ہوں گے"۔ (مسلم) اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت: یَدْخُلُ مِنْ اُمَّتِیْ الْجَنَّةَ بروایت ابن عباسؓ وکل کے باب میں ذکر کی جا چکی ہے۔

تشریح: "اسی طرح تم اپنے پروردگار کو دیکھنے میں کوئی شک وشبہ نہیں کرو گے کا مطلب یہ ہے کہ جس طرح تمہیں سورج اور چاند کو دیکھنے میں کوئی تکلیف نہیں ہوتا' کوئی دقت نہیں اٹھانا پڑتی' کسی مشکل کا سامنا نہیں کرنا پڑتا' اسی طرح تم قیامت کے دن اپنے پروردگار کو بھی بلا تکلف دیکھو گے! واضح رہے کہ لفظ تضارون ت کے پیش اور ر کی تشدید کے ساتھ منقول ہے اور ر کی تشدید کے بغیر بھی نقل کیا گیا ہے اور یہ لفظ ر کی تشدید کے ساتھ ہو تو اس کی اصل "مضارت" ہوگی جس کے معنی ضرر و نقصان کے ہیں اور اگر یہ لفظ ر کی تشدید کے بغیر ہو تو پھر اس کی اصل "ضیر" ہوگی اور اس کے معنی بھی ضرر و نقصان کے ہیں پس لفظی ترجمہ کے اعتبار سے لا تضارون کے معنی یہ ہوں گے کہ پروردگار کے دیدار کے وقت تم آپس میں لڑائی جھگڑے' دھکم پیل' مخالفت و موافقت اور تصدیق و تکذیب کے ذریعہ ایک دوسرے کو نقصان و تکلف نہیں پہنچاؤ گے کیونکہ اس کا دیدار اس طرح واضح و عام اور ہر ایک کے لئے عیاں ہوگا کہ ہر شخص بڑی آسانی اور اطمینان کے ساتھ اس کو دیکھے گا بعض حضرات نے یہ معنی بیان کئے ہیں کہ اس کے دیدار کے وقت تم میں سے کوئی بھی ایک دوسرے کے لئے پردہ اور رکاوٹ نہیں بنے گا اور مجمع البحار میں یہ لکھا ہے کہ تضارون کا لفظ مضارت سے ہے) اور مضارت کے معنی کسی کے دیدار کے وقت اجتماع و ازدحام کا ہونا (اور اس کی وجہ سے ایک دوسرے کو تکلیف و پریشانی اٹھنا) مراد ہیں اسی طرح قاضی عیاض مالکی نے یہ کہا ہے کہ "مضارت" کے معنی مضایقت یعنی ایک دوسرے کو تنگ گیری میں مبتلا کرنا مراد ہیں اور یہ معنی اجتماع و ازدحام کے قریب ہیں نیز انہوں نے کہا ہے کہ مضایقت یعنی آپس میں ایک دوسرے کو تنگ گیر ہونے کا اطلاق کسی ایسی چیز کو دیکھنے کے موقع پر ہوتا ہے جو بالکل مخصوص نوعیت اور خاص انداز سے کسی ایک محدود جگہ پر ہو اور مجمع و ہجوم کی وجہ سے ہر شخص آسانی کے ساتھ اس کے ساتھ اس کو نہ دیکھ سکتا ہو' پس اس صورت میں لا تضارون کا مطلب یہ ہوگا کہ تم پروردگار کے دیدار کے وقت ہر ایک دوسرے سے ملے اور جڑے ہوئے اور تنگ گیری میں مبتلا نہیں ہو گے جیسا کہ محدود جگہ پر مجمع و ہجوم کے وقت کسی چیز کو دیکھنے کی صورت میں ہوتا ہے بلکہ جس طرح تم سب اپنی اپنی جگہ پر رہتے ہوئے اطمینان و فراغت کے ساتھ سورج اور چاند کو دیکھتے ہو اسی طرح قیامت کے دن تم سب اپنی اپنی جگہ پر بہ فراغت اپنے پروردگار کا دیدار کرو گے۔

ایک روایت میں یہ لفظ تضارون کے بجائے تضامون ہے یعنی ر کی جگہ م ہے' پھر تضامون کا لفظ بھی دونوں طرح منقول ہے یعنی ت کے پیش اور م کی تشدید کے ساتھ بھی آیا ہے اور م کی تشدید کے بغیر بھی' تشدید کی صورت میں یہ لفظ ضم سے مشتق ہوگا اور بغیر تشدید کی صورت میں "ضیم" سے "ضم" اجتماع و ازدحام کے معنی میں ہے اور "ضیم" ظلم و زیادتی کرنے کے معنی ہیں! لیکن دونوں صورتوں میں مفہوم وہی ہوگا جو (تضارون) کے تحت بیان کیا گیا ہے۔

"تو میں بھی تجھے فراموش کر دوں گا......" کا حاصل یہ ہے کہ جب میں نے تجھ کو دنیا میں اپنے ان انعامات سے نوازا اور تجھ

پر اتنے بڑے بڑے احسانات کئے تو تیرا فرض تھا کہ تو میری اطاعت وعبادت اور میرے احکام کی اتباع و پیروی کے ذریعہ میرا شکر ادا کرتا اور میرے دیدار کا امیدوار رہتا تا کہ میں تجھے اور زیادہ انعام وجزا دیتا اور دنیا کی طرح آج کے دن بھی تجھے سر بلند و سرخ رو کرتا پس جب کہ تو نے دنیا میں میری ان نعمتوں اور میرے ان احسانات کے باوجود مجھے فراموش کر دیا تھا اور میری طرف سے غافل ہو گیا تھا تو اب میں بھی احسان اور اچھا سلوک نہ کر کے تیرے ساتھ وہی معاملہ کروں گا جو کسی غافل اور احسان فراموش شخص کے ساتھ کیا جاتا ہے اور اس طرح میں تجھے اپنی رحمت سے دور کر دوں گا واضح رہے کہ یہی مضمون اس آیت کریمہ میں بھی بیان کیا گیا ہے۔

﴿قَالَ كَذٰلِكَ اَتَتْكَ اٰيٰتُنَا فَنَسِيْتَهَا وَكَذٰلِكَ الْيَوْمَ تُنْسٰى﴾ اللہ تعالیٰ فرمائے گا کہ ایسا ہی (چاہئے تھا) تیرے پاس (دنیا میں) ہماری آیتیں آئیں تو نے ان کو بھلا دیا اسی طرح آج (یہاں قیامت) کے دن ہم تجھ کو بھلا دیں گے۔

''چنانچہ اس کی ران' اس کا گوشت اور اس کی ہڈی ......'' کے بارے میں یہ بتا دینا ضروری ہے کہ قرآن کریم میں ہاتھ' پاؤں' زبان اور کھال کا بولنا اور بندے کے اعمال کے سلسلے میں گواہی دینا مذکور ہے' جب کہ یہاں ''ران' گوشت اور ہڈی کے بولنے اور گواہی دینے کا ذکر ہے' تو زیادہ صحیح بات یہ ہے کہ حدیث کے اس جملہ کا اصل مقصد بھی یہی بیان کرنا ہے کہ بندے کے تمام اعضائے جسم بولیں گے اور اس کے اعمال کے بارے میں گواہی دیں گے جن میں ہاتھ اور پاؤں وغیرہ بھی شامل ہیں جیسا کہ پیچھے حضرت انس رضی اللہ عنہ کی روایت میں گزرا۔

۱۰ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت کا مطلب یہ ہے کہ صاحب مصابیح نے يَدْخُلُ مِنْ اُمَّتِي الْجَنَّةَ ...... کی حدیث حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت سے یہاں اس باب میں نقل کیا تھا لیکن صاحب مشکوۃ نے اس حدیث کو حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل کیا ہے اور اس باب کی بجائے التوکل میں ذکر کیا ہے لیکن واضح رہے کہ یہ حدیث حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے ان الفاظ میں منقول ہے: يدخل من امتي سبعون الفا بغير حساب هو الذين لا يسترقون ولا يتطيرون وعلى ربهم يتوكلون پس صحیح بات تو یہ تھی کہ یہاں يَدْخُلُ مِنْ اُمَّتِي الْجَنَّةَ ...... کے بجائے) یوں کہا جاتا کہ: يَدْخُلُ الْجَنَّةَ مِنْ اُمَّتِي ......!"

الفصل الثّانی:

اُمتِ محمدیہ میں سے حساب کے بغیر جنت میں جانے والوں کی تعداد

۵۵۵۶ : وَعَنْ اَبِي اُمَامَةَ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ وَعَدَنِي رَبِّي اَنْ يُّدْخِلَ الْجَنَّةَ مِنْ اُمَّتِي سَبْعِيْنَ اَلْفًا لَا حِسَابَ عَلَيْهِمْ وَلَا عَذَابَ مَعَ كُلِّ اَلْفٍ سَبْعُوْنَ اَلْفًا وَثَلٰثُ حَثَيَاتٍ مِّنْ حَثَيَاتِ رَبِّي ۔ (رواه احمد والترمذى وابن ماجة)

اخرجه مسلم في صحيحه ٢٢٨٠/٤ حديث رقم (١٧-٢٩٦٩)۔

ترجمہ: ''حضرت ابوامامہ رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا کہ میں نے جناب رسول اللہ ﷺ کو یہ ارشاد فرماتے ہوئے سنا کہ میرے رب نے مجھ سے وعدہ فرمایا ہے کہ وہ میری امت میں سے ستر ہزار افراد کو جنت میں داخل کیا جائے گا درانحالیکہ نہ ان سے ان کے اعمال کا حساب ہوگا اور نہ ہی اعمال کی سزا اور عذاب لاگو کیا جائے گا اور (ان ستر ہزار میں سے) ہر ہزار کے ہمراہ ستر ہزار مزید ہوں گے نیز تین چلو میرے رب کے چلوؤں میں سے ہوں گے جو سب جنت میں جائیں گے''۔ (احمد' ترمذی' ابن ماجہ)

قیامت کے دن خدا کی عدالت میں لوگ تین مرتبہ پیش ہوں گے

۵۵۵۷ : وَعَنِ الْحَسَنِ عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يُعْرَضُ النَّاسُ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ثَلٰثَ عَرَضَاتٍ فَاَمَّا عَرْضَتَانِ فَجِدَالٌ وَّمَعَاذِيْرُ وَاَمَّا الْعَرْضَةُ الثَّالِثَةُ فَعِنْدَ ذٰلِكَ تَطِيْرُ الصُّحُفُ فِى الْاَيْدِىْ فَاٰخِذٌ بِيَمِيْنِهٖ وَاٰخِذٌ بِشِمَالِهٖ .

(رواه احمدو الترمذی وقال لا يصح هذا الحديث من قبل ان الحسن لم يسمع من ابی هريرة)

اخرجه مسلم فی صحيحه ٤/ ٢٢٨٠ حديث رقم (١٧-٢٩٦٩)۔

ترجمہ: ''حضرت حسن بصری' حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کرتے ہیں کہ انہوں نے کہا کہ جناب رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: قیامت کے روز لوگ (اللہ کی عدالت میں) تین بار پیش کئے جائیں گے اور دو مرتبہ تو بحث و مباحثہ اور اعزار کو پیش کرنا ہوگا اور جب تیسری مرتبہ پیش پیش کئے جائیں گے تو اس وقت (چونکہ پوچھ کچھ جانچ پڑتال اور حساب و کتاب کا مرحلہ گزر چکا ہوگا اس لئے) اعمال نامے اڑ اڑ کر لوگوں کے ہاتھوں میں پہنچ جائیں گے پس ان میں سے کچھ (بانصیب اور سعادتمند لوگ اپنے دائیں ہاتھ میں اعمال نامے لینے والے ہوں گے اور کچھ لوگ (کہ جو اہل شقاوت و بے نصیب ہوں گے) اپنے بائیں ہاتھوں میں اعمال نامے لیں گے اس روایت کو امام احمد اور ترمذی نے نقل کیا ہے اور ترمذیؒ نے کہا ہے کہ یہ روایت اس اعتبار سے صحیح نہیں ہے کہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے حضرت حسن بصری کا سماع ثابت نہیں ہے۔

۵۵۵۸ : وَقَدْ رَوَاهُ بَعْضُهُمْ عَنِ الْحَسَنِ عَنْ اَبِیْ مُوْسٰى۔

اخرجه مسلم فی صحيحه ٤/ ٢٢٨٠ حديث رقم (١٧-٢٩٦٩)۔

ترجمہ: ''نیز بعض محدثین نے اس روایت کو حضرت حسن بصری سے اور انہوں نے حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے''۔

خدا کے نام کی برکت

۵۵۵۹ : وَعَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عَمْرٍو قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ اللّٰهَ سَيُخَلِّصُ رَجُلًا مِّنْ اُمَّتِیْ عَلٰى رُؤُسِ الْخَلَائِقِ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فَيَنْشُرُ عَلَيْهِ تِسْعَةً وَّتِسْعِيْنَ سِجِلًّا كُلُّ سِجِلٍّ

کے امیدوار رہتے ہیں اور اس نے اپنے نیک بندوں کے لئے جنت اور وہاں کی نعمتوں کا جو وعدہ کیا ہے اس کا اشتیاق ان پر غالب رہتا ہے اور یہ وہ بندگان خاص ہیں جن کے بارے میں فرمایا گیا ہے:

لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ اور دوسرے وہ لوگ ہیں جو اس کے عذاب کے خوف میں رہتے ہیں اور دوزخ کی آگ کا ڈر ان پر غالب رہتا ہے اور اس سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم کی امید واشتیاق میں کی جانے والی اطاعت و عبادات اس اطاعت وعبادت سے افضل ہے جو اللہ تعالیٰ کے ڈر اور خوف سے کی جائے۔

''چار ایک اونٹ پر اور دس ایک اونٹ ہوں گے'' چار اور دس کے درمیان کے دوسرے اعداد کا ذکر اس لئے نہیں کیا گیا ہے کہ ان کو ذکر کردہ اعداد پر قیاس کر کے مفہوم اخذ کیا جا سکتا ہے! اس طرح ''ایک اونٹ پر ایک آدمی کا سوار ہونا'' ذکر نہیں کیا گیا ہے جب کہ یقینی طور پر محشر میں آنے والوں میں ایسے افراد بھی ہوں گے جو اپنے اپنے اونٹ پر تنہا ہوں گے اور ان کی سواری میں ان کا کوئی شریک نہیں ہوگا! تو اصل بات یہ ہے کہ وہ انبیاء اور رسولوں کا مرتبہ ہے اور یہاں انبیاء اور رسولوں کا حشر نہیں بلکہ ''لوگوں'' کے حشر کا ذکر کرنا مقصود ہے! ایک بات یہ بھی بتا دینا ضروری ہے کہ ایک ایک اونٹ پر دو اور دو سے زائد لوگوں کے سوار ہونے کی دونوں صورتیں محتمل ہو سکتی ہیں یا تو یہ ہوگا کہ ایک اونٹ جتنے لوگوں کی سواری کے لئے متعین ہوگا وہ سب لوگ اس پر ایک ساتھ بیٹھیں گے اور یا یہ ہوگا کہ تناوب (باری متعین کرنے) کے طور پر بیٹھیں گے کہ ہر شخص باری باری سے سوار ہوتا رہے گا۔

اب آخر میں یہ بات جان لیجئے کہ اس بارے میں علماء کے اختلافی اقوال ہیں کہ یہاں حدیث میں لوگوں کو محشر میں جمع کئے جانے کا جو ذکر ہے اس کا تعلق کس وقت سے ہے؟ بعض حضرات نے کہا ہے کہ یہ اس حشر کا ذکر ہے جو قیامت کے دن آخرت میں بڑا ہوگا اور ہر شخص کو دوبارہ زندہ کر کے محشر میں لایا جائے گا' جب کہ بعض دوسرے حضرات کا کہنا ہے کہ یہ آخرت کے حشر کا ذکر نہیں ہے بلکہ وہ ''حشر'' مراد ہے جو قیامت کے قریب واقع ہوگا کہ لوگوں کو تمام علاقوں سے اکٹھا کر کے ملک شام کے علاقہ میں ایک جگہ کہ جس کو ''محشر'' ہی سے تعبیر کیا گیا ہے جمع کیا جائے گا اور جس کو قیامت کی علامت میں سے کہا گیا ہے' ان حضرات کی دلیل یہ ہے کہ آخرت میں جو حشر ہوگا اس میں تمام لوگ پا پیادہ ہوں گے جیسا کہ ایک دوسری حدیث میں بیان فرمایا گیا ہے اور بعض حضرات نے یہ کہا ہے کہ آخرت میں کئی حشر ہوں گے ایک تو قبر سے نکلتے وقت اور تمام لوگوں کے دوبارہ زندہ کئے جانے کے فوراً بعد اور دوسرا حشر اس کے بعد ہوگا! اس میں بعضوں کو سواریاں ملیں گی اور بعض پیدل اور بعض منہ کے بل چل کر آئیں گے! بہرحال زیادہ صحیح قول یہی معلوم ہوتا ہے کہ آخرت کا حشر مراد ہے۔

میدانِ حشر میں ہر شخص ننگے بدن' ننگے پاؤں اور غیر مختون آئے گا

۵۵۳۵ : وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اِنَّكُمْ مَحْشُوْرُوْنَ حُفَاةً عُرَاةً غُرْلًا ثُمَّ قَرَأَ كَمَا بَدَأْنَا اَوَّلَ خَلْقٍ نُعِيْدُهُ وَعْدًا عَلَيْنَا اِنَّا كُنَّا فَاعِلِيْنَ وَاَوَّلُ مَنْ يُكْسٰى يَوْمَ الْقِيَامَةِ اِبْرَاهِيْمُ وَاِنَّ نَاسًا مِنْ اَصْحَابِيْ يُؤْخَذُ بِهِمْ ذَاتَ الشِّمَالِ فَاَقُوْلُ اُصَيْحَابِيْ اُصَيْحَابِيْ فَيَقُوْلُ اِنَّهُمْ لَنْ يَزَالُوْا مُرْتَدِّيْنَ عَلٰى اَعْقَابِهِمْ مُذْ فَارَقْتَهُمْ فَاَقُوْلُ كَمَا قَالَ الْعَبْدُ الصَّالِحُ وَكُنْتُ عَلَيْهِمْ شَهِيْدًا مَا

ہوگا؟ (کہاں میری ایک نیکی کا یہ ایک چھوٹا سا پرچہ اور کہاں میرے تمام گناہوں پر مشتمل یہ دفتر کے دفتر؟ اس صورت میں اس ایک پرچہ کو اتنے عظیم دفاتر کے مقابلہ میں وزن کرنے کا حاصل کیا ہوگا؟) اللہ تعالیٰ ارشاد فرمائیں گے کہ "(تو جا کر دیکھ تو سہی) بلاشبہ تیرے ساتھ ظلم نہیں کیا جائے گا! آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا: پھر ان رجسٹروں کا گھٹا ترازو کے ایک پلڑے میں رکھ دیا جائے گا اور اس پرچہ کو دوسرے پلے میں پس وہ رجسٹر کا پلڑا اڑنے لگے گا اور وہ پرچہ بھاری ہونے کی وجہ سے جھک جائے گا (یعنی ان رجسٹروں کا بوجھ کم ہوگا اور اس پرچہ کا بوجھ زیادہ ہوگا) حاصل یہ کہ اللہ تعالیٰ کے نام سے زیادہ وزن دار کوئی چیز نہیں ہوگی کیونکہ اللہ کا نام سب سے بڑا اور سب سے بوجھ کم ہوگا اگرچہ گناہوں کے بڑے سے بڑے پہاڑ جیسے رجسٹر کیوں نہ ہوں"۔ (ترمذی، ابن ماجہ)

تشریح: "سجل" (جس کا عام ترجمہ "رجسٹر" کیا گیا ہے) کے خاص معنی "وسیع وضخیم کتاب" کے ہیں اور بعض حضرات نے کہا ہے کہ "سجل" اصل میں "طومار" کو کہتے ہیں یعنی کاغذات کا پلندہ جس کو لپیٹ کر اس میں لکھتے ہیں اور بعضوں نے یہ کہا ہے کہ "سجل" فرشتے کا نام ہے جو بندوں کے اعمال لکھتا ہے بہرحال یہاں حدیث میں "سجل" سے مراد وہ کتاب یا رجسٹر اور یا طومار ہے جس میں بندوں کے اعمال لکھے ہوں گے۔

پھر ایک پرچہ نکالا جائے گا جس میں اشھدان لا الہ الا اللہ وان محمد عبدہ ورسولہ لکھا ہوگا" کے بارے میں ایک احتمال تو یہ ہے کہ یہ کلمہ وہ ہوگا جو اس نے دنیا میں پہلی مرتبہ اپنی زبان سے ادا کیا ہوگا اور دوسرا احتمال یہ ہے کہ اس نے کسی اور مرتبہ یہ کلمہ پڑھا ہوگا جو حق تعالیٰ کی بارگاہ میں مقبول ہوگیا ہوگا اور یہی احتمال زیادہ صحیح معلوم ہوتا ہے۔

قیامت کے دن تین ہولناک واقعے

۵۵۶۰ : وَعَنْ عَآئِشَةَ اَنَّهَا ذَكَرَتِ النَّارَ فَبَكَتْ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَا يُبْكِيْكِ قَالَ ذَكَرْتُ النَّارَ فَبَكَيْتُ فَهَلْ تَذْكُرُوْنَ اَهْلِيْكُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَمَّا فِيْ ثَلٰثَةِ مَوَاطِنَ فَلَا يَذْكُرُ اَحَدٌ اَحَدًا عِنْدَ الْمِيْزَانِ حَتّٰى يَعْلَمَ اَيَخِفُّ مِيْزَانُهٗ اَمْ يَثْقُلُ وَعِنْدَ الْكُتُبِ حَتّٰى يُقَالَ هَآؤُمُ اقْرَءُ وْا كِتٰبِيَهْ حَتّٰى يَعْلَمَ اَيْنَ يَقَعُ كِتَابُهٗ اَفِيْ يَمِيْنِهٖ اَمْ فِيْ شِمَالِهٖ مِنْ وَّرَآءِ ظَهْرِهٖ وَعِنْدَ الصِّرَاطِ اِذَا وُضِعَ بَيْنَ ظَهْرَيْ جَهَنَّمَ. (رواہ ابوداود)

اخرجه ابو داوٗد في السنن ۱۱۶/۵ حديث رقم ۴۷۵۵ واحمد في المسند ۱۱۰/۶ واحمد في المسند ۱۱۰/۶۔

ترجمہ: "حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے منقول ہے کہ (ایک روز) انہوں نے دوزخ کو یاد کیا پھر رونے لگیں یعنی اچانک ان کے دل میں دوزخ کا خیال آ گیا تو خوف ودہشت کے مارے ان پر گریہ طاری ہوگیا۔ رسول اللہ ﷺ نے (ان کو ایسے زاروقطار روتے ہوئے دیکھا تو) پوچھا کہ کیا چیز تمہیں رلا رہی ہے؟ انہوں نے کہا کہ آتش جہنم کی یاد آ گئی تھی' (اس کی دہشت اور خوف سے) مجھے رونا آ گیا اور ہاں کیا آپ ﷺ روز قیامت اپنے اھل کو بھی یاد رکھیں گے؟ رسول اللہ ﷺ نے (یہ سن کر فرمایا) کہ (ویسے تو صرف اہل بیت ہی نہیں روز قیامت میں اپنی تمام اور

کے متعلق مرفکر و متفکر ہونے لگا لیکن) حقیقیہ یہ ہے کہ اس دن تین ایسے مقامات ہوں گے جہاں کوئی کسی کو یاد نہ رہ سکے گا یعنی مخصوص طور پر کسی کا خیال نہیں ہوگا۔ البتہ شفاعت عظمیٰ عمومی طور پر تمام خلائق کے لئے برحق ہے) ایک موقع تو وہ ہوگا جب اعمال و کردار کا وزن کرنے کے لئے ترازو قائم کیا جائے گا الا یہ معلوم نہ ہو جائے کہ اس کی میزان بھاری رہی یا ہلکی یعنی جب تک اعمال تل نہ لیں گے اور وہ پتہ نہ چل جائے گا کہ نیک اعمال پلڑا جھک رہا ہے یا اوپر اٹھ رہا ہے' تب تک ہر انسان اپنے ہی فکر و غم میں سرگرداں ہوگا۔ دوسرا موقع وہ ہوگا جب اعمال نامے (ہاتھوں میں) سپرد کردیئے جائیں گے یہاں تک یہ نہ کہا جانے لگے کہ اس وقت تک ہر انسان فکر و غم میں سرگرداں ہوگا اور جب تک یہ معلوم نہ ہو جائے کہ پیٹھ کے پیچھے سے اعمال نامہ دائیں ہاتھ میں دیا گیا ہے' یا بائیں ہاتھ میں دیا گیا ہے (یعنی دوسرا ہولناک موقع وہ ہوگا جب ہر ایک کے بارے میں نجات یا عذاب کا فیصلہ ہونے کو ہوگا اور لوگوں کے اعمال نامے ان کی پیٹھ کے پیچھے سے ان کے ہاتھوں میں تھما دیئے جائیں گے چنانچہ جو شخص نجات یافتہ ہوگا اس کا اعمال نامہ اس کے دائیں ہاتھ میں پہنچ جائے گا اور جو شخص لائق عذاب قراط دیا جائے گا اس کا اعمال نامہ اس کے بائیں ہاتھ میں ہوگا اور اس طرح اس وقت تک جب تک یہ معلوم نہ ہو جائے کہ کس کا اعمال نامہ اس کے دائیں ہاتھ میں اور کس اعمال نامہ اس کے بائیں ہاتھ میں دوبارہ ہے اور جس کا اعمال نامہ دائیں میں آئے گا وہ مارے خوشی کے یہ نہ کہہ اٹھے کہ آؤ میرا اعمال نامہ پڑھ لو' تب ادھر آؤ میرے نامہ اعمال پڑھو اور کسی کو کسی کا ہوش و خیال نہیں رہے گا) اور تیسرا موقع وہ ہوگا جب لوگ پل صراط (پر سے گزرنے) کے قریب ہوں گے اور وہ پل صراط دوزخ کے اوپر (یعنی اس کے دہانے پر) رکھا جائے گا (یہاں تک کہ) یہ معلوم نہ ہو جائے کہ اس پر سے عافیت کے ساتھ گزر کر جنتی بن گیا یا جہنم میں گر پڑا ہے''۔ (ابوداؤد)

الفصل الثالث:

حساب کتاب کا خوف

۵۵۶۱ : عَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ جَآءَ رَجُلٌ فَقَعَدَ بَيْنَ يَدَيْ رَسُولِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ يَا رَسُولَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ لِيْ مَمْلُوْكِيْنَ يُكَذِّبُوْنَنِيْ وَيَخُوْنُوْنَنِيْ وَيَعْصُوْنَنِيْ وَاَشْتِمُهُمْ وَاَضْرِبُهُمْ فَكَيْفَ اَنَا مِنْهُمْ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذَا كَانَ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ يُحْسَبُ مَا خَانُوْكَ وَعَصَوْكَ وَكَذَّبُوْكَ وَعِقَابُكَ اِيَّاهُمْ فَاِنْ كَا عِقَابُكَ اِيَّاهُمْ بِقَدْرِ ذُنُوْبِهِمْ كَانَ كِفَافًا لَّالَكَ وَلَا عَلَيْكَ وَاِنْ كَانَ عِقَابُكَ اِيَّاهُمْ دُوْنَ ذَنْبِهِمْ كَانَ فَضْلًا لَّكَ وَاِنْ كَانَ عِقَابُكَ اِيَّاهُمْ فَوْقَ ذُنُوْبِهِمْ اُقْتُصَّ لَهُمْ مِنْكَ الْفَضْلُ فَتَنَحَّى الرَّجُلُ وَجَعَلَ يَهْتِفُ وَيَبْكِيْ فَقَالَ لَهٗ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَمَا تَقْرَاُ قَوْلَ اللّٰهِ تَعَالٰى وَنَضَعُ الْمَوَازِيْنَ الْقِسْطَ لِيَوْمِ الْقِيٰمَةِ فَلَا تُظْلَمُ نَفْسٌ شَيْئًا وَاِنْ كَانَ مِثْقَالَ حَبَّةٍ مِّنْ خَرْدَلٍ اَتَيْنَا بِهَا وَكَفٰى بِنَا حَاسِبِيْنَ فَقَالَ الرَّجُلُ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ

صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَا اَجِدُلِيْ وَلِهٰؤُلَاءِ شَيْئًا خَيْرًا مِنْ مُّفَارَقَتِهِمْ اُشْهِدُكَ اَنَّهُمْ كُلُّهُمْ اَحْرَارٌ ۔

(رواہ الترمذی)

اخرجه الترمذی فی السنن ۵/ ۳۰۰ حدیث رقم ۳۱۶۵ واحمد فی المسند ۶/ ۲۸۰۔

ترجمه: ''ام المؤمنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے بیان فرمایا کہ (ایک روز) جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں ایک آدمی حاضر ہوا اور آپ کے سامنے بیٹھ گیا اور عرض کرنے لگا کہ یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! میری ملکیت میں کچھ غلام ہیں جو میرے ساتھ جھوٹ بولتے ہیں اور مجھ سے خیانت کرتے ہیں اور میری نافرمانی کرتے ہیں' چنانچہ میں (بطور تنبیہ وتادیب) انہیں برا بھلا کہہ لیتا ہوں اور انہیں مارتا ہوں تو ان کی وجہ سے روز قیامت (اللہ تعالیٰ کے ہاں) مجھ سے کیا معاملہ کیا جائے گا (یعنی کیا مجھے ان کو برا بھلا کہنے' ڈانٹنے پیٹنے کا حساب دینا ہوگا اور ان معاملات کے باعث میرا مواخذہ ہوگا؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا جب روز قیامت ہوگا) اور ہر شخص ہر ہر عمل و کردار کے متعلق جانچ پڑتال ہوگی) تو ان غلاموں نے تمہارے مال میں جو خیانت کی ہوگی' تمہاری جو نافرمانی کی ہوگی اور تمہارے ساتھ جو جھوٹ بولا ہوگا' اس سب کا حساب لیا جائے گا' اسی طرح تم نے انہیں جو مار پیٹ سب وشتم کے ذریعہ سزا دی ہوگی اس کا بھی حساب لیا جائے گا کے' پس اگر تمہاری دی ہوئی سزا (رائج ضابطہ اخلاق وقانون اور عام عادت معمول کے مطابق) ان کے تصور روز جرموں کے بقدر ہوئی تو تمہارا معاملہ برابر سرابر رہے گا کہ نہ تمہیں کوئی ثواب ملے گا اور نہ تم پر کوئی عذاب ہوگا' اور تم نے ان کو سزا دی ہوگی وہ اگر ان کی خطاؤں سے کم ثابت ہوئی تو تمہیں ایک زائد حق حاصل ہوگا (یعنی تمہارا ان کو ان کے جرائم سے کم سزا دینا ان پر تمہارے لئے ایک ایسے حق کو واجب کردے گا اگر تم چاہو گے تو اس کے بدلہ میں نہیں نعمتیں دی جائیں گی ورنہ نہیں) اور تمہاری دی ہوئی سزا ان کی خطاؤں سے بڑھ کر ہوگی تو پھر ان کے لئے تم سے اس زیادتی کا بدلہ لیا جائے گا (یعنی خدا تعالیٰ کی یہ تقضاء فرمائے گا کہ تم نے چونکہ اپنے ان غلاموں کو ان کے جرائم سے زیادہ سزا دی تھی جس کا تمہیں کوئی حق نہیں تھا لہٰذا اب تم اپنے ان غلاموں کو اس ظلم و ناانصافی کا بدلہ دو وہ آدمی (آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد سن کر) الگ بیٹھ کر رونے اور چیخ و پکار کرنے لگ گیا پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اس ارشاد کو ثابت اور مزید پختہ فرمانے کے لئے ارشاد فرمایا کہ کیا تم (قرآن کریم) میں یہ فرمان خداوندی نہیں پڑھتے ہو کہ: ﴿وَنَضَعُ الْمَوَازِيْنَ الْقِسْطَ لِيَوْمِ الْقِيٰمَةِ فَلَا تُظْلَمُ نَفْسٌ شَيْئًا وَاِنْ كَانَ مِثْقَالَ حَبَّةٍ مِّنْ خَرْدَلٍ اَتَيْنَا بِهَا وَكَفٰى بِنَا حٰسِبِيْنَ﴾ یعنی حق تعالیٰ شانہ ارشاد فرماتے ہیں کہ ''اور قیامت کے روز ہم عدل و انصاف کے کئی ترازو قائم کریں گے (جن کے ذریعہ سب کے اعمال کا ٹھیک ٹھیک وزن کیا جائے گا) پس کسی پر ظلم نہیں کیا جائے گا (یعنی جس کا بھی حق ہوگا وہ وہ اسے ضرور مل کر رہے گا اور اگر (کسی کا) عمل رائی کے دانہ کے برابر ہوگا تو (اس کو نظر انداز کر کے چھوڑا نہ جائے گا بلکہ) ہم اس کو (بھی وہاں) حاضر کرلیں گے اور ہم حساب لینے والے کافی ہیں (یعنی ہمارے وزن اور حساب کے بعد حساب کتاب کی اور کسی مرافعہ کی ضرورت نہیں ہوگی کیونکہ ہم سے بڑھ کر عدل و انصاف کرنے والا اور کوئی نہیں ہے اور اس وقت ہمارا فیصلہ۔ فیصلہ آخری اور سو فیصد درست ہوگا جس پر کسی کو شک وشبہ کرنے کی ہم گنجائش ہی نہیں چھوڑیں گے)'' اس شخص نے (یہ سن کر) عرض کیا کہ یارسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) میں اپنے اور ان غلاموں کے حق میں اور اپنے حق میں اس سے بہتر کوئی بات نہیں سمجھ پا رہا کہ ان کو چھوڑ دوں (یعنی اس صورت میں میرا خیال

ہے کہ قیامت کے دن کے محاسبہ ومواخذہ سے بچنے اور وہاں کی جواب دہی سے محفوظ رہنے کی خاطر سب سے بہترین یہی ہے کہ میں ان کو آزاد کر دوں) لہٰذا میں آپ ﷺ کو گواہ بناتا ہوں کہ وہ سب غلام آزاد ہیں''۔ (ترمذی)

آسان حساب اور سخت حساب

۵۵۶۲ : وَعَنْهَا قَالَتْ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ فِيْ بَعْضِ صَلَاتِهِ اَللّٰهُمَّ حَاسِبْنِيْ حِسَابًا يَسِيْرًا قُلْتُ يَا نَبِيَّ اللّٰهِ مَا الْحِسَابُ الْيَسِيْرُ قَالَ اَنْ يَّنْظُرَ فِيْ كِتَابِهٖ فَيَتَجَاوَزَ عَنْهُ اِنَّهٗ مَنْ نُوْقِشَ الْحِسَابَ يَوْمَئِذٍ يَا عَائِشَةُ هَلَكَ ۔ (رواہ احمد)

اخرجه احمد فی المسند ٦/٤٨۔

ترجمہ: ''حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے بیان فرمایا کہ میں نے جناب رسول اللہ ﷺ کو کسی نماز میں یہ دعا مانگتے ہوئے سنا کہ اَللّٰهُمَّ حَاسِبْنِيْ حِسَابًا يَّسِيْرًا یا میرے مولا! مجھ سے آسان حساب لیجئے گا! میں نے عرض کیا کہ اے پیغمبر خدا نبیؐ! آسان حساب سے کیا مراد ہے اور اس کی کیا صورت ہوگی؟ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: آسان حساب یہ ہوگا کہ بندہ اپنے اعمال نامے کو ملنے کے بعد دیکھ چکا ہوگا اور پھر اللہ تعالیٰ اس سے معافی اور بخشش کا معاملہ فرما دے گا اور عائشہ! دراصل بات یہ ہے کہ اس روز جس شخص کے حساب میں تحقیق وتفتیش کی گئی تو (بس سمجھ لو کہ) وہ برباد ہو گیا اس کا مبتلائے عذاب وعتاب ہونے سے بچنا بہت مشکل ہوگا''۔ (احمد)

مؤمن پر قیامت کے دن کا سہل ہونا

۵۵۶۳ : وَعَنْ اَبِيْ سَعِيْدِ الْخُدْرِيِّ اَنَّهٗ اَتٰى رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ اَخْبِرْنِيْ مَنْ يَّقْوٰى عَلَى الْقِيَامِ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ الَّذِيْ قَالَ اللّٰهُ عَزَّوَجَلَّ يَوْمَ يَقُوْمُ النَّاسُ لِرَبِّ الْعَالَمِيْنَ فَقَالَ يُخَفَّفُ عَلَى الْمُؤْمِنِ حَتّٰى يَكُوْنَ عَلَيْهِ كَالصَّلٰوةِ الْمَكْتُوْبَةِ ۔

رواه البيهقى فى البعث والنشور راجع الملاحظة فى الحديث رقم ٥٤٩٣۔

ترجمہ: ''حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے نے بیان فرمایا کہ وہ (ایک بار) رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کرنے لگے کہ (یارسول اللہ ﷺ) آپ مجھے بتلائیے گا' کہ قیامت کا وہ دن جس کے متعلق فرمان خداوندی یہ ہے: ﴿يَوْمَ يَقُوْمُ النَّاسُ لِرَبِّ الْعَالَمِيْنَ﴾ (جس روز تمام انسان رب کائنات کے حضور کھڑے ہوئے ہوں گے' کس شخص کو مالک دوجہاں کے سامنے (حساب کیلئے) کھڑے ہونے کی تاب ہوگی؟ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: روز قیامت مؤمن کے لئے آسان کر دیا جائے گا یہاں تک کہ وہ دن اس پر فرض نماز (کی ادائیگی کے وقت) کے بقدر رہ جائے گا''۔

تشریح: حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ نے آنحضرت ﷺ سے سوال کرتے ہوئے قرآن کے جن الفاظ کا حوالہ دیا' وہ دراصل پارہ عمّ' سورۃ تطفیف وَيْلٌ لِّلْمُطَفِّفِيْنَ کی ایک آیت ہے' اس سورۃ میں قیامت کے دن کے احوال اور اس دن

اعمال کی جزاء وسزا دیئے جانے کا ذکر ہے اور چونکہ وہ دن خدا کے عدل وانصاف کے اظہار کا دن ہوگا اس مناسبت سے اس سورۃ میں خاص طور سے بعض ان اعمال پر وعید مذکور ہے جو حقوق العباد سے تعلق رکھتے ہیں اور سماجی زندگی میں نہایت قابل نفرین سمجھتے ہیں جیسے ناپ تول میں کمی کرنے والوں کو ان الفاظ میں تہدید کی گئی ہے کہ ﴿اَلَا یَظُنُّ اُولٰٓئِکَ اَنَّھُمْ مَّبْعُوْثُوْنَ لِیَوْمٍ عَظِیْمٍ یَوْمَ یَقُوْمُ النَّاسُ لِرَبِّ الْعٰلَمِیْنَ﴾ کیا ان لوگوں کو (جو ناپ تول میں کمی کر کے حقوق العباد کو نقصان پہنچاتے ہیں) اس کا یقین نہیں ہے کہ وہ ایک بڑے سخت دن میں زندہ کر کے اٹھائے جائیں گے جس دن کہ تمام لوگ ایک ایک جہاں کے پروردگار کے سامنے کھڑے ہوں گے (پس اس دن سے ڈرنا چاہئے اور ہر اس برائی سے اجتناب کرنا چاہئے جس سے بندوں کے حقوق پر اثر پڑتا ہو' جس سے لوگوں کو نقصان پہنچتا ہو اور جس سے سماجی زندگی باہمی اطمینان واعتماد سے محروم ہوتی ہو' جیسے کم ناپنا اور کم تولنا) منقول ہے کہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما نے اس سورت کی تلاوت شروع کی اور جب اس آیت: ﴿یَوْمَ یَقُوْمُ النَّاسُ لِرَبِّ الْعٰلَمِیْنَ﴾ پر پہنچے تو خوف وخشیت الٰہی سے بے حال ہوگئے اور ان پر گریہ طاری ہوگیا اور پھر اس طرح روئے کہ اس کے بعد آگی آیتوں کی تلاوت جاری رکھنے پر قادر نہیں ہو سکے گا۔

بہر حال حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ کے سوال کا حاصل یہ تھا کہ ایک تو قیامت کا دن خود اپنے اندر ہول ودہشت اور خوف وپریشانی کے صد ہزار عالم لئے ہوگا اور اس پر اپنے اعمال کا کچا چٹھا لے کر خداوند ذوالجلال کی پُر ہیبت بارگاہ میں پیش ہونا ہوگا' اس کے عدل وانصاف کی ہیبت اور اس کے لئے اس کی عدالت میں' اس کی پُر جلال بارگاہ میں کھڑا ہو سکے؟ لہٰذا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بشارت عطا فرمائی کہ مسلمانوں کو بہر حال اطمینان رکھنا چاہئے کہ وہ دن اپنی تمام ہولناکیوں کے باوجود ان کے حق میں ایک آسان دن ہوگا وہ چونکہ اللہ تعالیٰ کی رحمت اور اس کے فضل وکرم کے سائے میں رہیں گے اس لئے قیامت کا وہ پورا دن بس اتنے عرصہ میں گزر جائے گا جتنے عرصہ میں کوئی شخص فرض نماز پڑھ لیتا ہے' پس اس سلسلے میں ایک بات تو یہ ذہن میں رہنی چاہئے کہ ''مسلمان'' سے مراد کامل مسلمان ہے' یعنی عقیدۂ فکر کے اعتبار سے پختہ وصالح' اعمال وکردار کے اعتبار سے پاکباز ومتقی اور پروردگار کی اطاعت وعبادت میں کامل! اسی طرح ''فرض نماز کے بقدر'' سے مراد وہ عرصہ ہے جس میں فرض نماز کی جس کی نہایت چار رکعتیں ہیں ادا کی جاتی ہیں یا یہ کہ فرض نماز کا پورا وقت مراد ہے یعنی جتنی دیر تک ایک فرض نماز ادا کرنے کا وقت رہتا ہے اتنی دیر میں قیامت کا پورا دن گزر جائے گا۔ رہی یہ بات کہ ''مسلمانوں کے حق میں قیامت کے دن کا فرض نماز کی ادائیگی کے وقت کے بقدر ہونے'' سے کیا یہ مراد ہے کہ ان کے حق میں قیامت کا دن واقعتاً اتنے مختصر سے عرصہ پر محیط ہوگا یا یہ مراد ہے کہ وہ دن ہوگا تو بہت زیادہ لمبا وطویل لیکن مسلمانوں کو وہ اتنا بڑا دن بس ایسا محسوس ہوگا جیسے ایک فرض نماز کے وقت کے بقدر ہو کر گزر گیا ہو؟ تو اس سلسلہ میں دوسرا پہلو مراد ہے یعنی وہ دن اپنی اتنی طوالت اور اتنی شدت وسختیوں کے باوجود مسلمانوں کے لئے اتنا ہلکا بنا دیا جائے گا کہ ان کو وہ پورا دن ایک فرض نماز کے مختصر ترین عرصہ کے بقدر گزرتا ہوا معلوم ہوگا جب کہ کافروں کے حق میں اس کے برعکس ہوگا' چنانچہ یہ تو اس دن میں بھی عام طور پر دیکھا جاتا ہے کہ وقت اور مقدار کے اعتبار سے شب وروز کی گردش ہر شخص کے لئے یکساں ہوتی ہے لیکن جو لوگ عیش وراحت اور خوشحالی کے ساتھ ہوتے ہیں ان کے لئے چوبیس گھنٹوں کے وہی دن ورات لمحوں کے برابر گزرتے محسوس ہوتے ہیں جو مصائب وآلام اور پریشان حالی میں مبتلا لوگوں کے لئے سالوں

کے برابر گزرتے معلوم ہوتے ہیں اس سے یہ بھی ظاہر ہوا کہ قیامت کے دن کا مسلمانوں کے حق میں آسان و ہلکا ہونا یکساں نوعیت نہیں رکھے گا بلکہ ہر مسلمان کے عقیدہ و عمل کے مراتب کے اعتبار سے الگ الگ نوعیت رکھے گا کہ جو شخص دنیا میں اپنے عقیدہ و عمل کے اعتبار سے زیادہ کامل رہا ہوگا وہ اس دنیا کو اور وہاں کے احوال کو اتنا ہی زیادہ آسان و ہلکا محسوس کرے گا اور دنیا میں جس شخص کا عقیدہ و عمل جتنا زیادہ کمزور رہا ہوگا وہ اس دن کو اتنا ہی کم آسان و ہلکا محسوس کرے گا یہاں تک کہ کفار کو وہ دن پچاس ہزار سال کے برابر معلوم ہوگا' چنانچہ قرآن کریم کے ان الفاظ میں اسی طرف اشارہ ہے:

﴿تَعْرُجُ الْمَلٰٓئِكَةُ وَالرُّوْحُ اِلَيْهِ فِيْ يَوْمٍ كَانَ مِقْدَارُهٗ خَمْسِيْنَ اَلْفَ سَنَةٍ فَاصْبِرْ صَبْرًا جَمِيْلًا اِنَّهُمْ يَرَوْنَهٗ بَعِيْدًا وَنَرٰهُ قَرِيْبًا﴾

''فرشتے اور (اہل ایمان کی) روحیں اس کے پاس (عالم بالا میں چڑھ کر جاتی ہیں (اور وہ عذاب) ایسے دن میں ہوگا جس کی مقدار دنیا کے) پچاس ہزار سال کے برابر ہے تو آپ ﷺ (اہل کفر کی مخالفت پر) صبر کیجئے اور صبر بھی ایسا جس میں شکایت کا نام نہ ہو یہ لوگ (یعنی اہل کفر) اس دن کو بدعقیدگی کی وجہ سے بعد از وقوع دیکھ رہے ہیں اور ہم اس کو (وقوع سے) قریب دیکھ رہے ہیں''۔

چنانچہ اس آیت میں ''اس دن'' سے مراد قیامت کا دن ہے جو اپنی درازی اور سختی کے اعتبار سے کفر کو اتنا لمبا معلوم ہوگا اور جس طرح ایمان کے مراتب میں تفاوت ہونے کی وجہ سے وہ ان اہل ایمان میں سے کچھ کو بہت آسان اور ہلکا معلوم ہوگا اور کچھ کو کم آسان و ہلکا معلوم ہوگا' اسی اعتبار سے ایک آیت میں اس دن کو ایک ہزار سال کے برابر فرمایا گیا ہے' پس بعض کافروں کو ہزار سال کے برابر اور بعض کافروں کو پچاس ہزار سال کے برابر معلوم ہوگا۔

نیز باری تعالیٰ کے اس ارشاد سے بھی اس بات کی تائید ہوتی ہے:

﴿فَاِذَا نُقِرَ فِي النَّاقُوْرِ فَذٰلِكَ يَوْمَئِذٍ يَوْمٌ عَسِيْرٌ عَلَى الْكَافِرِيْنَ غَيْرُ يَسِيْرٍ﴾

''پھر جس وقت صور پھونکا جائے گا سو وہ وقت (یعنی وہ دن) کافروں پر ایک سخت دن ہوگا جس میں ذرا آسانی نہ ہوگی''۔

دوسرے لفظوں میں اس کا مفہوم یہ ہوگا کہ اہل ایمان پر وہ دن بہت ہلکا اور آسان ہوگا اور وہ ہلکا و آسان ہونا ان کے ایمان و عمل کے اعتبار سے تفاوت رکھے گا۔

بہرحال اس حدیث میں مسلمانوں کے لئے واضح طور پر یہ ہدایت ہے کہ اگر وہ قیامت کے دن کو اپنے حق میں زیادہ سے زیادہ آسان و ہلکا اور جلدی گزر جانے والا بنانا چاہتے ہیں تو ان کو چاہئے کہ وہ اپنے ایمان و عقیدہ کو زیادہ سے زیادہ پختہ بنائیں اور اپنی عملی زندگی کو زیادہ سے زیادہ طاعت و عبادت اور رضاالٰہی کے کاموں سے معمور کریں۔

۵۵۶۴ : وَعَنْهُ قَالَ سُئِلَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنْ يَوْمٍ كَانَ مِقْدَارُهٗ خَمْسِيْنَ اَلْفَ سَنَةٍ مَا طُوْلُ هٰذَا الْيَوْمِ فَقَالَ وَالَّذِيْ نَفْسِيْ بِيَدِهٖ اِنَّهٗ لَيُخَفَّفُ عَلَى الْمُؤْمِنِ حَتّٰى يَكُوْنَ اَهْوَنَ عَلَيْهِ مِنَ الصَّلٰوةِ الْمَكْتُوْبَةِ يُصَلِّيْهَا فِي الدُّنْيَا ۔

رواہ البیہقی فی شعب الایمان ۳۲۴/۱ فی من فصل واحمد فی المسند ۷۵/۳۔

ترجمہ: ''حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا کہ جناب رسول اللہ ﷺ سے اس دن (قیامت کے روز) کے متعلق دریافت کیا گیا جو پچاس ہزار سال کے برابر ہوگا کہ اس دن کی طوالت و درازی کی کیا حقیقت اور صورت ہوگی (یعنی انسان اتنا لمبا قیام کیسے کرے گا)؟ آنحضرت ﷺ نے (یہ سن کر) ارشاد فرمایا: اس ذات کی قسم جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے وہ دن کامل مسلمان پر سہل اور معمولی ہو جائے گا یہاں تک کہ وہ دن اس کے حق میں اس فرض نماز (کے وقت) سے بھی زیادہ آسان اور ہلکا ہو جائے گا جس کو وہ دنیا میں پڑھتا تھا ان دونوں روایات کو بیہقی نے کتاب البعث والنشور میں نقل کیا ہے۔

کمال ایمان رکھنے والے لوگ حساب کتاب کے بغیر جنت میں جائیں گے

۵۵۶۵ : وَعَنْ اَسْمَآءَ بِنْتِ يَزِيْدَ عَنْ رَّسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ يُحْشَرُ النَّاسُ فِي صَعِيْدٍ وَّاحِدٍ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فَيُنَادِيْ مُنَادٍ فَيَقُوْلُ اَيْنَ الَّذِيْنَ كَانَتْ تَتَجَافٰى جُنُوْبُهُمْ عَنِ الْمَضَاجِعِ فَيَقُوْمُوْنَ وَهُمْ قَلِيْلٌ فَيَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ بِغَيْرِ حِسَابٍ ثُمَّ يُؤْمَرُ لِسَآئِرِ النَّاسِ اِلَى الْحِسَابِ ۔

رواہ البیہقی فی شعب الایمان ۔

ترجمہ: ''اسماء بنت یزید رضی اللہ عنہا (ابن سکن) رسول اللہ ﷺ سے روایت نقل فرماتی ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''روز قیامت لوگوں کو ایک فراخ و ہموار میدان میں اکٹھا کیا جائے گا' پھر ایک پکارنے والا پکار دے گا کہ کہاں ہیں وہ لوگ جن کے پہلو آرام گاہوں سے علیحدہ رہتے تھے (یہ ندا سننے کے بعد) اہل محشر میں سے بہت تھوڑے لوگ (جو اہل اسلام میں ہوں گے) کھڑے ہوں گے (یعنی مجمع سے نکل کر باہر آئیں گے) اور حساب کتاب کے (مرحلہ سے گزرے) بغیر جنت میں داخل ہو جائیں گے' پھر باقی لوگوں سے حساب لینے کا حکم دیا جائے گا''۔ اس روایت کو امام بیہقی نے شعب الایمان میں روایت کیا ہے''۔

تشریح: تَتَجَافٰى جُنُوْبُهُمْ عَنِ الْمَضَاجِعِ :(جن کے پہلو بستر اور خواب گاہوں سے جدا رہتے تھے) سے مراد یا تو وہ بندگانِ خدا ہیں جو رات میں اپنی پُرسکون نیند کی راحت سے صرف نظر کر کے اور اپنے آرام دہ بستروں اور خواب گاہوں کو چھوڑ کر اپنے خالق کی بارگاہ میں حاضری دیتے ہیں اور نماز تہجد پڑھتے ہیں اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ شاید وہ لوگ مراد ہوں جو صلوٰۃ الاوبین پڑھتے ہیں! نیز یہ بھی احتمال ہے کہ ان سے وہ لوگ مراد ہوں جو عشاء اور فجر کی نماز پڑھتے ہیں بہرحال حدیث کے ان الفاظ سے قرآن کریم کی ان آیتوں کی طرف اشارہ مقصود ہے جن میں اللہ تعالیٰ نے اپنے عبادت گزار اور پاکباز بندوں کو یوں متعارف کرایا ہے کہ: ﴿اِنَّمَا يُؤْمِنُ بِاٰيٰتِنَا الَّذِيْنَ اِذَا ذُكِّرُوْا بِهَا خَرُّوْا سُجَّدًا وَّسَبَّحُوْا بِحَمْدِ رَبِّهِمْ وَهُمْ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ تَتَجَافٰى جُنُوْبُهُمْ عَنِ الْمَضَاجِعِ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ خَوْفًا وَّ طَمَعًا وَّمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ مَّا اُخْفِيَ لَهُمْ مِّنْ قُرَّةِ اَعْيُنٍ جَزَآءً بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ﴾ بس ہماری آیتوں پر تو وہ لوگ ایمان لاتے ہیں کہ جب ان کو وہ آیتیں یاد دلائی جاتی ہیں تو وہ سجدے میں گر پڑتے ہیں اور اپنے رب کی تسبیح و تحمید کرنے لگتے ہیں اور وہ لوگ (ایمان لانے اور خدا کے احکام ماننے سے)

تکبر نہیں کرتے (جیسا کہ کافر لوگ تکبر کرتے ہیں اور از راہ نخوف خدا کا حکم ماننے سے انکار کرتے ہیں) نیز (رات کو) ان کے پہلو خواب گاہوں سے علیحدہ رہتے ہیں (خواہ عشاء فجر کی نماز یا تہجد کی نماز اور خواہ صلوٰۃ الاوابین پڑھنے کے لئے اور ان کے پہلو خواب گاہوں سے صرف علیحدہ ہی نہیں رہتے بلکہ وہ لوگ اپنے رب کو ثواب کی) امید اور (عذاب کے) خوف سے پکارتے ہیں اور ہماری دی ہوئی چیزوں میں سے (ہماری راہ میں) خرچ کرتے ہیں' پس کسی شخص کو خبر نہیں جو آنکھوں کی ٹھنڈک کا سامان ایسے لوگوں کے لئے خزانہ غیب میں موجود ہے' یہ ان کو ان کے نیک اعمال کا صلہ ملا ہے''۔ پس ان آیات میں ان صفات اور خوبیوں کا ذکر ہے جو اہل ایمان کا خاصہ ہیں اور جن میں سے بعض صفات تو ایسی ہیں جن پر خود ایمان ہی موقوف ہے اور بعض صفات ایسی ہیں جن پر ایمان کا کامل ہونا موقوف ہے نیز مذکورہ بالا حدیث سے معلوم ہوا کہ ایمان وعمل کا کمال رکھنے والے بندگانِ خاص قیامت کے دن حساب کتاب کے مرحلہ سے محفوظ رہیں گے ان پر کوئی سختی نہیں ہوگی ان سے کوئی مواخذہ نہیں ہوگا اور وہ اپنے رب کی بے پایاں عنایتوں اور رحمتوں کے سائے میں رہتے ہوئے حساب کتاب کے بغیر سیدھے جنت میں پہنچا دیئے جائیں گے۔

''بہت تھوڑے لوگ'' میں اس طرف اشارہ ہے کہ چونکہ اس دنیا میں اہل ایمان کی تعداد اہل کفر کی تعداد سے کم ہے اور برے لوگوں کے مقابلہ میں نیک لوگ کم ہوتے ہیں لہٰذا آخرت میں بھی اس دن ایسے لوگوں کی تعداد جو حساب کے بغیر جنت میں داخل کئے جانے کی سعادت کے سزاوار ہوں گے نسبتاً کم نکلے گی پس یہ بات قرآن کریم سے بھی ثابت ہے کہ اہل حق اور نیکوکار لوگ ہمیشہ اقلیت میں ہوتے ہیں اور اہل باطل وبدکار لوگوں کی اکثریت ہوتی ہے جیسا کہ ایک جگہ فرمایا گیا ہے۔

اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَقَلِيْلٌ مَّاهُمْ مگر ہاں جو لوگ ایمان رکھتے ہیں اور نیک کام کرتے ہیں اور ایسے لوگ بہت ہی کم ہیں! اور ایک موقع پر یوں ارشاد ہوا ہے:

﴿وَقَلِيْلٌ مِّنْ عِبَادِيَ الشَّكُوْرُ﴾ اور میرے بندوں میں (اطاعت وعبادت کے ذریعہ میرا) شکر ادا کرنے والے کم ہی ہوتے ہیں اس سے معلوم ہوا کہ اہل ایمان اور اہل حق کا اقلیت میں ہونا اور اس اقلیت میں ہونے کی وجہ سے ان کا مختلف قسم کے سماجی' معاشرتی اور سیاسی مصائب وآلام میں مبتلا ہونا اور طرح طرح کے ظلم وجور سہنا ان کے لئے کوئی ایسی بات نہیں ہے جس سے وہ تنگ دل اور مایوسی کا شکار ہوں بلکہ حقیقت میں ان کے خدا کی طرف سے ان کے لئے ایک اعزاز اور ایک سعادت ہے اور آخرکار جس کا صلہ انہیں ابدی راحتوں اور نعمتوں کی صورت میں ملنے والا ہے خدا کے ان بندگان خاص یعنی ایمان وعمل کا کمال رکھنے والوں کو حساب کتاب کے بغیر جنت میں اس لئے داخل کیا جائے گا کہ انہوں نے دنیا میں ہدایت کے راستہ کو اختیار کیا' خدا اور اس کے رسول کے احکام کی فرمانبرداری کی' دین کی راہ پر استقامت واستقلال کے ساتھ چلے' خدا کی رضا وخوشنودی کے لئے اطاعت وعبادت کی مشقت برداشت کی' دنیا کی لذتوں اور راحتوں کو ترک کیا اور اس طرح انہوں نے ''صبر'' کا مقام اختیار کیا تو پھر ان کو خدا کے یہاں کی سعادتوں اور بے پایاں راحتوں کا مستحق ہونا ہی ہے اور ایسے ہی لوگوں کو مخاطب کر کے اللہ تعالیٰ اپنی کتاب میں یوں بشارت دیتا ہے کہ: ﴿قُلْ يٰعِبَادِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوْا رَبَّكُمْ ۭ لِلَّذِيْنَ اَحْسَنُوْا فِيْ هٰذِهِ الدُّنْيَا حَسَنَةٌ ۭ وَاَرْضُ اللّٰهِ وَاسِعَةٌ ۭ اِنَّمَا يُوَفَّى الصّٰبِرُوْنَ اَجْرَهُمْ بِغَيْرِ حِسَابٍ﴾ (اے محمد ﷺ) آپ ﷺ (مومنین کو میری طرف سے) کہیں

کہ اے میرے ایمان والے بندو! تم اپنے پروردگار سے ڈرتے ہو (یعنی اطاعت پر دوام اور گناہوں سے پرہیز کرو) جو لوگ اس دنیا میں نیکی کرتے ہیں ان کے لئے نیک صلہ ہے اور اللہ کی زمین فراخ ہے (یعنی اگر تمہیں دین کی راہ میں اپنا وطن بھی چھوڑنا پڑے تو اس سے بھی دریغ نہ کرو اور ہجرت کر کے دوسری جگہ چلے جاؤ) اور (ہم وعدہ کرتے ہیں کہ دین کی راہ میں) استقلال اختیار کرنے والوں (اور ہر طرح کی مشقت و تکلیف پر صبر کرنے والوں) کو ان کا صلہ بے حساب ملے گا۔

میزان اور پل صراط کے بارے میں کچھ باتیں: اہل سنت کا عقیدہ ہے کہ اللہ تعالیٰ قیامت کے دن میدانِ حشر میں (ترازو) کھڑی کرے گا جس کے دو پلے اور ایک چوٹی ہوگی اور اس ترازو کے ذریعہ بندوں کے نیک اور برے اعمال کو وزن کرے گا معتزلہ مرجیہ اور خارجیہ فرقے کے لوگوں کو ''ترازو'' کے وجود سے انکار ہے وہ کہتے ہیں کہ ''ترازو'' سے مراد ''میزانِ عدل'' ہے اعمال کا تولنا اور وزن کرنا مراد نہیں ہے لیکن قرآن کریم اور احادیث نبویہ کی رو سے یہ لوگ جھوٹے ہیں اور خود اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ:

﴿وَنَضَعُ الْمَوَازِيْنَ الْقِسْطَ لِيَوْمِ الْقِيٰمَةِ فَلَا تُظْلَمُ نَفْسٌ شَيْئًا ۭ وَاِنْ كَانَ مِثْقَالَ حَبَّةٍ مِّنْ خَرْدَلٍ اَتَيْنَا بِهَا ۭ وَكَفٰى بِنَا حٰسِبِيْنَ﴾ اور وہاں ہم قیامت کے دن عدل کے لئے ترازو رکھیں گے (اور سب کے اعمال کا وزن کریں گے) پس کسی پر کسی بات کا ظلم نہ ہوگا اگر رائی کے دانہ کے برابر بھی کسی کی نیکی ہوگی تو اسے دی جائے گی (یعنی اس نیکی کو وہاں حاضر کر کے میزانِ عدل میں رکھا جائے گا) اور ہم ہی حساب کے لئے کافی ہیں۔ ایک موقع پر یوں فرمایا ہے:

﴿فَاَمَّا مَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِيْنُهٗ فَهُوَ فِيْ عِيْشَةٍ رَّاضِيَةٍ وَاَمَّا مَنْ خَفَّتْ مَوَازِيْنُهٗ فَاُمُّهٗ هَاوِيَةٌ﴾

''(پھر اعمال کے وزن کے بعد) جس شخص (کے ایمان و عمل) کا پلہ بھاری ہوگا وہ ہمیشہ عیش و راحت میں رہے گا اور جس شخص (کے ایمان و عمل) کا پلہ ہلکا ہوگا وہ دوزخ میں جائے گا''۔

پس عدل کی تعریف سب کی اور گرانی درست نہیں' بلکہ اظہار عدل کے لئے درحقیقت ترازو میں اعمال کو تولنا مراد ہے اور علماء نے لکھا ہے کہ یہ ترازو اللہ تعالیٰ کے اپنے دست قدرت میں ہوگی کیونکہ بندوں کا حساب اللہ تعالیٰ نے اپنے ہاتھ میں رکھا ہے! چنانچہ ایک روایت میں آیا ہے کہ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ترازو ہوگی' ایک گروہ کو اللہ تعالیٰ بلند کرے گا اور ایک کو پست کرے گا۔

بیان کیا گیا ہے کہ بندوں کی نیکیاں رائی کے دانہ اور چھوٹی چھوٹی چیونٹیوں کے برابر ہوں گی جو بہت خوبصورت ہوں گی' انہیں نور کے پلے میں رکھا جائے گا' اللہ تعالیٰ کی رحمت سے یہ پلہ بھاری ہو جائے گا' برائیوں کی شکل بہت بھونڈی ہوگی اور انہیں ظلمت کے پلے میں رکھا جائے گا اور اللہ تعالیٰ کے حکم سے یہ پلہ ہلکا ہو جائے گا اعمال کے تلنے میں لوگوں کا حال تین طرح سے ہوگا بعض وہ ہوں گے جن کے نیک اعمال کا پلہ برے اعمال کے پلہ کی نسبت سے بھاری ہوگا' ایسے لوگ بہشت میں جائیں گے' دوسرا گروہ ان لوگوں کا ہوگا جن کے نیک اعمال کی نسبت ان کے برے اعمال کا پلہ بھاری ہوگا ایسے لوگ دوزخ میں جائیں گے' تیسرا گروہ ایسے لوگوں پر مشتمل ہوگا جن کے نیک اعمال اور برے اعمال کے دونوں پلے برابر ہوں گے' ایسے لوگوں کو اعراف میں پہنچا دیا جائے گا اور پھر خواہ شفاعت کی وجہ سے عذاب سے پہلے ہی خواہ سزا کے بعد ان کو بھی جنت میں داخل کر دیا جائے گا۔

اہل سنت کے نزدیک' پل صراط پر ایمان لانا بھی واجب ہے' یہ وہ پل ہے جو دوزخ کی پیٹھ پر سے گزرتا ہے اور جو بال سے زیادہ باریک اور آگ سے زیادہ گرم اور تلوار سے زیادہ تیز ہے۔ قیامت کے دن تمام مخلوق کو اس پل پر سے گزارا جائے گا جو اہل جنت ہوں گے وہ اپنے ایمان وعمل کے مراتب کے مطابق آسانی یا پریشانی کے ساتھ پل پر سے گزر کر جنت میں چلے جائیں گے اور جو اہل دوزخ ہوں گے وہ اس پر سے گر کر دوزخ میں جا پڑیں گے اہل ایمان کو ان کے عمل کے مطابق نور عطا کیا جائے گا جس کی روشنی میں وہ اس پل کے راستہ کو طے کریں گے ان میں سے بعض سوار ہو کر اور دوڑنے کے برابر ہو جائیں گے بعض گھٹنوں کے بل اور بعض سرین کے بل رینگتے ہوئے جائیں گے۔ پل صراط کی مسافت آخرت کے سالوں کے حساب سے تین ہزار سال ہے! ایک روایت میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ دوزخ پر سات پل ہیں اور ہر پل کے درمیان ستر برس کی مسافت جتنا فاصلہ ہے اور ہر پل تلوار کی دھار جتنا تیز ہے اس کے اوپر سے گزرنے والے گروہوں میں سے پہلا گروہ وہ آنکھ جھپکتے ہی گزر جائے گا دوسرا گروہ اس طرح گزرے گا جس طرح بجلی اچک لے جاتی ہے۔ تیسرا گروہ ہوا کی طرح گزر جائے گا' چوتھا گروہ پرندوں کی سی تیزی کے ساتھ گزر جائے گا پانچواں گروہ گھوڑوں کی طرح دوڑ کر گزر جائے گا۔ چھٹا گروہ دوڑتے ہوئے آدمیوں کی طرح سے عبور کرے گا اور ساتواں گروہ پیدل چلنے والے لوگوں کی طرح گزر جائے گا' ان سب کے بعد آخر میں ایک گروہ باقی رہ جائے گا جب انہیں گزرنے کے لئے کہا جائے گا تو وہ اپنا پاؤں پل صراط پر رکھیں گے' مگر ان کے پاؤں لرزنے لگیں گے' چنانچہ وہ گھٹنوں کے بل چلنے لگیں گے اور دوزخ کی آگ کی چنگاریاں ان کے پاؤں اور پوست تک پہنچیں گی' تب یہ لوگ پیٹ کے بل گھسٹتے چلیں گے پھر ہاتھوں کے ذریعہ پل کے ساتھ لپٹ جائیں گے' آگ بھی ان سے لپٹ جائے گی' تب آگ سے چھٹکارا پانے کے لئے وہ پیٹ کے بل گھسٹنے لگیں گے یہاں تک کہ دوزخ کو عبور کر لیں گے' عبور کرنے کے بعد پلٹ کر دوزخ کی طرف نگاہ دوڑائیں گے اور کہیں گے کہ جس اللہ نے اس (دوزخ) سے ہمیں پار کر دیا ہے وہ پاک ہے' بے شک اس نے اپنے لطف وکرم سے میرے حال پر مہربانی فرمائی ہے' آج تک از اول تا آخر اس نے میرے سوا کسی پر فضل نہیں کیا' مجھے اپنے فضل سے پل صراط کے پنجہ سے رہائی دلائی۔

بَابُ الْحَوْضِ وَالشَّفَاعَةِ

حوض وشفاعت کا بیان

امام قرطبیؒ فرماتے ہیں: آنحضرت ﷺ کے لئے دو حوض ہوں گے۔ ایک حوض میدان حشر میں صراط سے پہلے ہوگا، اور دوسرا حوض جنت میں ہوگا۔ اور دونوں کا نام حوض کوثر ہوگا۔ کلام عرب میں ''کوثر'' کے معنی ہیں ''خیر کثیر''۔

صحیح بات یہ ہے کہ میدان حشر میں جو حوض عطاء ہوگا وہ ''میزان'' کے مرحلے سے پہلے ہوگا۔ چنانچہ لوگ اپنی قبروں سے پیاسے نکلیں گے، اور پہلے حوض پر آئیں گے، پھر میزان قائم ہوگا۔ اسی طرح میدان محشر میں ہر پیغمبر کا اپنا حوض ہوگا۔

میں (ملا علی قاری) کہتا ہوں جامع کی ایک حدیث میں ہے: ان لكل نبي حوضا وانه يتباهون أيهم اكثر وارده، واني أرجو ان أكون اكثرهم وارده.

''ہر نبی کیلئے ایک حوض ہے، اور تمام انبیاء آپس میں ایک دوسرے پر فخر کریں گے، کہ کس کے حوض پر پانی پینے والے زیادہ آتے ہیں، اور میں امید رکھتا ہوں کہ میرے حوض پر آنے والے سب سے زیادہ ہوں گے''۔ اس حدیث کو امام ترمذیؒ نے حضرت سمرہؓ سے روایت کیا ہے۔ (ملاحظہ ہو حدیث: ۵۵۹۴)

عرض مرتب: ہمارے مرقات کے نسخہ میں ''اكثرهم واره'' ہے۔ جبکہ ترمذی کے نسخوں میں ''اكثرهم واردة'' ہے۔

امام راغبؒ فرماتے ہیں: شفع کے معنی ہیں کسی شئے کو دوسری شئے سے ملانا، ضم کرنا۔ اسی سے لفظ ''شفاعت'' نکلا ہے۔ اس لفظ کا استعمال اکثر وبیشتر اس وقت ہوتا ہے جو کوئی ''اعلیٰ مرتبہ والا'' کسی ''ادنیٰ مرتبہ والے'' سے ملتا ہے۔ ''شفاعت'' قیامت کے دن ہوگی۔

الفصل الاول:

۵۵۶۲ : عَنْ اَنَسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بَيْنَا اَنَا اَسِيْرُ فِى الْجَنَّةِ اِذَا اَنَا بِنَهْرٍ حَافَتَاهُ قِبَابُ الدُّرِّ الْمُجَوَّفِ قُلْتُ مَا هٰذَا يَا جِبْرَئِيْلُ قَالَ هٰذَا الْكَوْثَرُ الَّذِىْ اَعْطَاكَ رَبُّكَ فَاِذَا طِيْنُهُ مِسْكٌ اَذْفَرُ (رواه البخاري).

اخرجه البخاري في صحيحه ٤٦٤/١١ حديث رقم ٦٥٨١ واحمد في المسند ١٦٤/٣۔

ترجمہ: ''حضرت انس رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''میں (معراج کی رات میں)

جنت میں چہل قدمی کر رہا ہے کہ اسی دوران اچانک کہ اچانک میرا گزر ایک ایسی نہر پر ہوا جس کے دونوں کناروں پر خولدار موتیوں کے گنبد تھے میں نے پوچھا کہ جبرائیل یہ کیا ہے؟ انہوں نے کہا یہ وہ حوض کوثر ہے جو آپ ﷺ کو آپ کے پروردگار نے عنایت فرمایا ہے۔ پھر جو میں نے دیکھا تو اس کی مٹی مثل مشک تیز خوشبودار تھی''۔ (بخاری)

تشریح: قوله: بینا أنا أیر۔۔۔ الدر المجوف:

(نهر): ھاء کے فتحہ اور سکون دونوں کے ساتھ درست ہے۔

حافتاه: فاء کے فتحہ کے ساتھ۔

قباب الدر: قاف کے کسرہ کے ساتھ ہے، قبة کی جمع ہے (قاف کے ضمہ کے ساتھ ہے)۔

المجوف: یعنی ہر گنبد بہت بڑا موتی ہے، جو اندر سے کھوکھلا ہے، اور قابل رہائش ہے۔

قوله: قلت ماهذا ......: حضرت جبرائیل علیہ السلام نے درحقیقت اس آیت مبارکہ ﴿انا أعطیناك الكوثر﴾ [الكوثر-ا] کی طرف اشارہ کیا۔ کوثر، بروزن فَوْعَل ہے۔ کثرة سے مشتق ہے۔ کوثر سے مراد وہ خیر کثیر ہے جو اللہ جل شانہ نے آنحضرت ﷺ کو عطاء فرمائی ہے۔ اس خیر سے مراد قرآن یا نبوت یا کثرت یا تمام مراتب عالیہ ہیں۔ اور مراتب عالیہ میں مقام محمود، لواء ممدود، اور حوض مورود بھی شامل ہیں۔ ان تمام میں کوئی منافات نہیں، بلکہ یہ تمام چیزیں کوثر کے مفہوم میں شامل ہیں۔ اگرچہ کوثر ''حوض کوثر'' کے معنی میں مشہور ہے۔

أذفر: انتہائی خوشبودار۔ امام طیبیؒ نے فرمایا: ''أذفر'' کا مطلب ہے، طیب الريح، پاکیزہ خوشبودار، الذفر کا اطلاق مطلقاً ''بو'' پر ہوتا ہے، خواہ وہ خوشبو ہو یا بدبو۔

کس جگہ کون سے معنی مراد ہوں گے، اس کا فیصلہ اس کے مضاف یا صفت کو دیکھ کر کیا جاتا ہے۔

(ملاحظہ ہو حدیث ۵۶۰۷)

۵۵۶۷ : وَعَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عَمْرٍو قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ حَوْضِيْ مَسِيْرَةُ شَهْرٍ وَزَوَايَاهُ سَوَآءٌ وَمَآءُهٗ اَبْيَضُ مِنَ اللَّبَنِ وَرِيْحُهٗ اَطْيَبُ مِنَ الْمِسْكِ وَكِيْزَانُهٗ كَنُجُوْمِ السَّمَآءِ مَنْ يَّشْرَبُ مِنْهَا فَلَا يَظْمَأُ اَبَدًا ۔ (متفق علیه)

اخرجه البخاری فی صحیحه ٤٦٣/١١ حدیث رقم ٦٥٧٩ ومسلم فی صحیحه ١٧٩٣/٤ حدیث رقم (٢٧-٢٢٩٢) واحمد فی المسند ٣٨٤/٣۔

ترجمہ: ''حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما نے بیان فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''میرا حوض یعنی حوض کوثر ایک مہینہ کی مسافت کے برابر طویل و عریض ہے اور اس کے چاروں کنارے یکساں ہیں (یعنی لمبائی چوڑائی میں وہ مربع ہے) اس کا پانی دودھ سے زیادہ سفید اور اس کی کستوری سے زیادہ عمدہ خوشبو ہے اور اس کے آب خورے (اپنی چمک دمک اور کثرت و زیارتی کے اعتبار سے آسمان کے ستاروں کی طرح ہیں اور جو آدمی اس سے پانی پی لے گا وہ پھر پیاسا نہ ہوگا''۔

(بخاری و مسلم)

تشریح: عمرو: واؤ کے ساتھ ہے۔
زوایاہ: زاویۃ کی جمع ہے۔زاویہ کا مطلب ہے جانب
یعنی بالکل مربع ہے، لمبی چوڑائی بالکل برابر ہے۔بعض کا کہنا ہے، کہ اس حوض کی گہرائی بھی اتنی ہی ہے۔
قولہ:ماۂ: استیناف بیانی ہے۔

عرض مرتب:

لفظ **أبیض** سے متعلقہ چند فوائد حدیث ۵۵۹۲ میں **ماؤہ ...... اللبن** کے تحت ملاحظہ فرمائیے۔
امام نوویؒ فرماتے ہیں: نحویوں کا کہنا ہے کہ فعل تعجب اور افعل التفضیل، الوان وعیوب (کے معنی پر دلالت کرنے والے مصادر) سے نہیں آتے۔البتہ بوقت ضرورت مصدر سے پہلے لفظ أشد، ابلغ وغیرہ کا اضافہ کر کے بنائے جا سکتے ہیں۔لہٰذا'' **ما أبیض زیدا**''، اور'' **زید ابیض من عمرو**'' وغیرہ کہنا درست نہیں۔اس حدیث مبارکہ کا یہ جملہ'' **أبیض من اللبن**'' نحویوں کے اس مسئلہ کے خلاف پر دلالت کر رہا ہے۔یہ مانعین کے خلاف حجت ہے۔بہر حال یہ بھی ایک لغت ہے اگر چہ قلیل الاستعمال ہے۔

قولہ: کیزا نه کنجوم السماء۔۔ ابدا:
کیزانه: ''کوز'' کی جمع ہے۔
کنجوم السماء: وجہ تشبیہ کثرت ونورانیت ہے۔(یعنی اپنی چمک دمک اور کثرت وزیادتی کے اعتبار سے آسمان کے ستاروں کی طرح ہیں۔)
من یشرب: مرفوع ہے۔اور ایک نسخہ میں مجزوم ہے۔امام طیبیؒ فرماتے ہیں، مرفوع پڑھنے کی صورت میں ''من'' ''موصولہ ہے۔اور مجزوم پڑھنے کی وجہ یہ ہے کہ ''من'' شرطیہ ہے۔
منھا: ضمیر مجرور ''کیزان'' کی طرف عائد ہے۔اور ایک روایت میں ''منه'' ہے۔اس صورت میں ضمیر کا مرجع ''حوض'' یا ''حوس کا پانی'' ہے۔
فلا یظمأ: ہمزہ کے رفع کے ساتھ ہے، اور بعض کا کہنا ہے کہ جزم کے ساتھ ہے۔
اس سے معلوم ہوا کہ جنت میں پانی یا کسی بھی مشروب کا پینا پیاس کی وجہ سے نہیں بلکہ تحصیل لذات کیلئے ہوگا۔جیسا کہ جنت میں کوئی چیز کھانا، بھوک کی وجہ سے نہیں بلکہ از راہ تنعم ہوگا۔قرآن کریم میں اس حقیقت کی طرف یوں اشارہ فرمایا گیا ہے:
﴿ اِنَّ لَكَ اَلَّا تَجُوْعَ فِيْهَا وَلَا تَعْرٰى وَاَنَّكَ لَا تَظْمَؤُا فِيْهَا وَلَا تَضْحٰى﴾ [طٰه: ۱۱۸-۱۱۹] ''یہاں جنت میں تو تمہارے لئے (آرام) ہے کہ تم نہ کبھی بھوکے رہو گے اور نہ ننگے رہو گے اور نہ یہاں پیاسے رہو گے اور نہ دھوپ میں ہو گے''۔

۵۵۶۸ : وَعَنْ اَبِىْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ حَوْضِىْ اَبْعَدُ مِنْ اَيْلَةَ مِنْ عَدَنٍ لَهُوَ اَشَدُّ بَيَاضًا مِنَ الثَّلْجِ وَاَحْلٰى مِنَ الْعَسَلِ بِاللَّبَنِ وَلَاٰنِيَتُهٗ اَكْثَرُ مِنْ عَدَدِ النُّجُوْمِ وَاِنِّىْ

لَاَصُدُّ النَّاسَ عَنْهُ كَمَا يَصُدُّ الرَّجُلُ اِبِلَ النَّاسِ عَنْ حَوْضِهٖ قَالُوْا يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اَتَعْرِفُنَا يَوْمَئِذٍ قَالَ نَعَمْ لَكُمْ سِيْمَاءٌ لَيْسَتْ لِاَحَدٍ مِّنَ الْاُمَمِ تَرِدُوْنَ عَلَيَّ غُرًّا مُحَجَّلِيْنَ مِنْ اَثَرِ الْوُضُوْءِ. (رواہ مسلم)

اخرجه مسلم في صحيحه ۲۱۷/۱ حديث رقم (۳۶-۲۴۷) والترمذي في السنن ۵۴۴/۴ حديث رقم ۳۴۴۵ وابن ماجه في السنن ۱۴۳۱/۲ حديث رقم ۴۲۸۲ واحمد في المسند ۴۲۴/۴

ترجمہ: "حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے نے بیان فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: "میرے حوض یعنی "حوض کوثر" کی دونوں اطراف کا درمیانی فاصلہ ایلہ اور عدن کی درمیانی مسافت سے بھی زیادہ ہے۔ اور بے شک اس حوض کا پانی برف سے بھی زیادہ سفید اور ایسے شہد سے بھی زیادہ میٹھا ہوگا جس میں دودھ ملا ہوا ہو اور اس کے آبخورے آسمان کے تاروں سے بھی کثیر ہوں گے اور یقیناً میں دوسری امتوں کے افراد کو اپنے حوض پر آنے سے ایسے ہٹاؤں اور بھگاؤں گا جس طرح کوئی شخص اغیار کے گذارش کی اونٹوں کو اپنے حوض پر آنے سے ہٹاتا ہے (اور اس روکنے کی وجہ یہ ہوگی کہ آپ کی امت کی اس فضیلت و خصوصیات میں دوسرے لوگ شریک نہ ہوں اور اس امت کے لوگ دوسری امتوں کے لوگوں سے ممتاز و منفرد رہیں)" صحابہ نے یہ سن کر گذارش کی کہ یا رسول اللہ! کیا (اس وقت) آپ ﷺ پہچان کریں گا؟ (یعنی تمام مخلوق کے اجتماع کیا آپ کے لئے ممکن ہوگا کہ اپنی امت اور دوسری امتوں کے لوگوں کے درمیان امتیاز کرلیں اور وہ کون سی علامت ہوگی جس کو دیکھ کر آپ ﷺ اپنے امتیوں کو پہچان کر حوض کوثر پر آنے دیں گے اور دوسروں کو منع فرمائیں گے؟) آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: "ہاں میں تمہاری (بڑی آسانی کے ساتھ) پہچان کرلوں گا دراصل تمہاری ایک خاص علامت ہوگی؛ جس سے دوسری امت کے لوگ محروم ہوں گے اور وہ علامت یہ ہوگی کہ جس وقت تم میرے پاس آؤ گے تو تمہاری پیشانیاں اور تمہارے ہاتھ پاؤں وضو کی نورانیت کے سبب تابندہ اور چمکدار رہوں گے۔" (مسلم)

تشریح: قوله: ان حوضي ابعد۔۔۔ من عدد النجوم:

ایلة: ہمزہ کے فتحہ، اور یائے تحیۃ کے سکون کے ساتھ ہے۔ أبعد من ایلة کا مطلب ہے: "ازید من بُعد ایلة" یعنی ایلہ اور عدن کے فاصلے سے بھی زیادہ ہے۔ ایلہ ایک شہر کا نام ہے، جو بحر یمن سے ملے ہوئے شام کے آخری علاقوں کے پاس ساحل کے قریب واقع ہے۔

عدن: عین اور دال دونوں کے فتحہ کے ساتھ ہے۔ منصرف بھی پڑھا جاتا ہے، اور غیر منصرف بھی پڑھا جاتا ہے۔ بحر ہند سے ملے ہوئے یمن کے آخری شہروں میں سے ہے۔

امام طیبیؒ فرماتے ہیں: پہلا "من"، أبعد کے متعلق ہے۔ اور دوسرا "من" بُعد مقدر کے متعلق ہے۔

اس حدیث اور اگلی حدیث: ما بين عدن وعمان۔ (عین کے فتحہ اور میم کی تشدید کے ساتھ شام کا ایک شہر ہے۔) اور "ما بين صنعاء والمدينة" اور اس جیسی دیگر احادیث کے درمیان تطبیق کرتے ہوئے یوں کہا جائے گا کہ مذکورہ شہروں کے درمیانی فاصلوں کے ذریعہ، درازی کو ظاہر کرنا مقصود ہے۔ تحدید مراد نہیں، بلکہ تمثیل اور تقریب کیلئے یہ فاصلے ذکر فرمائے ہیں۔

مطلب یہ ہے کہ آپ ﷺ نے اس سلسلہ میں جو احادیث ارشاد فرمائیں آپ ﷺ نے اپنے مخاطبین کی سمجھ بوجھ اور ذاتی

معلومات کا لحاظ کرتے ہوئے فرمائی ہیں، ان کے سامنے بطور مثال وتخمینہ کے بیان فرمایا، کہ میرے حوض کے دوسروں کا درمیانی فاصلہ تقریباً اتنا ہے، جتنا فلاں دوشہروں کے درمیان کا فاصلہ ہے۔

قاضی فرماتے ہیں: مقدار حوض کی احادیث میں اختلاف کی وجہ یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ نے سامعین کی معلومات کے مطابق، بطور تمثیل وتخمینہ کے ان مقداروں کا ذکر فرمایا تھا۔

لھو: ہاء کے ضمہ کے ساتھ، ہے اس کو ساکن پڑھنا بھی درست ہے۔ اور لام لام ابتداء ہے۔ اور مرجع ''حوض'' ہے۔ ممکن ہے کہ آنحضرت ﷺ نے برف شام میں دیکھی ہو۔

أحلی: سے مراد'' ألذ''(زیادہ لذیذ) ہے۔

من العسل باللبن: (باللبن کا متعلق محذوف ہے)، أی المخلوط باللبن.

آنیته: اناء کی جمع ہے۔ بمعنی ظروف۔ آنیة سے مراد آبخورے وغیرہ ہیں۔

عرض مرتب: اس سلسلہ کی احادیث، حدیث ۵۵۹۲ کی شرح کے ذیل میں ملاحظہ فرمائیے۔ عمان اردن کا دار الخلافہ ہے۔ جو کہ مدینہ سے ایک ہزار کلومیٹر کے فاصلہ پر ہے۔

قوله: انی لاصد الناس ......:

اور اس روکنے کی وجہ یہ ہوگی کہ امت محمدی ﷺ کی اس فضیلت وخصوصیت میں دوسرے لوگ شریک نہ ہوں، اور اس امت کے لوگ دوسری امتوں کے لوگوں میں ممتاز ومنفرد رہیں۔

سیما: مد اور قصر کے ساتھ، بمعنیٰ علامت۔ اللہ جل شانہ کے اس فرمان میں لفظ ''سیما'' اس معنی میں استعمال ہوا ہے۔:

﴿ سِيمَاهُمْ فِي وُجُوهِهِم مِّنْ أَثَرِ السُّجُودِ﴾[الفتح۔۱۹] ''آثار یوم تاثیر سجدہ کے ان کے چہروں میں نمایاں ہیں۔''

لیست: ضمیر کا مرجع ''السیماء'' ہے۔

لأحد من الأمم: تمیز بمنزلہ علم کے ہوگی۔

تردون: راء کے کسرہ کے ساتھ، ورود بمعنیٰ ''مرور'' سے مشتق ہے۔

غرا: أغرّ کی جمع ہے۔ أغر اس کو کہتے ہیں جس کی پیشانی میں سفیدی ہو۔

محجلین: جیم مشددہ کے فتحہ کے ساتھ، ''محجل'' کی جمع ہے۔ ''محجل'' اس کو کہتے ہیں جس کے پاؤں اور ہاتھوں میں سفیدی ہو۔

الوضوء: واؤ کے ضمہ کے ساتھ، (یہاں مضاف محذوف ہے۔) ای استعمال الوضوء۔ اور ایک نسخہ میں واؤ کے فتحہ کے ساتھ ہے۔ وضوء کا پانی۔

غرا محجلین: یہ دونوں منصوب علی الحالیۃ ہیں۔ اور ''سیما'' سے مراد بظاہر یہی دونوں وصف ہیں۔

یہ دونوں وصف اس امت کی خصوصیات میں سے ہیں۔ اگر چہ یہ مسئلہ اختلافی ہے، کہ کیا تمام انبیاء اور ان کی امتوں کے لئے وضوء کی مشروعیت تھی، یا نہیں، سوائے اس کے نہیں کہ یہ اسی امت کی خصوصیت ہے۔ اور بعض حضرات نے فرمایا: وضوء کی

مشروعیت انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کے لئے تھی، ان کی امتوں کے لئے نہیں تھی۔ اس مسئلہ میں یہ امر بھی اس امت مرحومہ کی عظیم فضیلت اور بڑے رتبہ کی بات ہے۔

۵۵۶۹ : وَفِیْ رِوَایَةٍ لَهٗ عَنْ اَنَسٍ قَالَ تُرٰی فِیْهِ اَبَارِیْقُ الذَّهَبِ وَالْفِضَّةِ كَعَدَدِ نُجُوْمِ السَّمَآءِ۔

اخرجه البخاری فی ۴۶۳/۱۱حدیث رقم ۶۵۸۰ومسلم فی صحیحه ۱۸۰۱/۴حدیث رقم (۴۳-۲۳۰۳) والترمذی فی السنن ۵۴۲/۴حدیث رقم ۲۴۴۲ وابن ماجه فی السنن ۱۴۳۹/۲حدیث رقم ۴۳۰۵۔

ترجمہ: ''اور صحیح مسلم ہی کی ایک دوسری روایت جو حضرت انسؓ سے نقل کی گئی ہے میں یہ الفاظ ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا: اس حوض میں سونے چاندی کے پیالے ہوں گے جو (اپنی چمک دمک اور) تعداد کے لحاظ سے آسمان کے ستاروں کی مانند دکھائی دیں گے۔

تشریح: قولہ: تری فیہ اباریق ......:

تری: فعل مضارع مجہول کے صیغہ کے ساتھ ہے۔

اور شاید کہ اختلاف وصفیں، شاربین کے اختلاف مراتب کے باعث ہوگا، کہ شاربین اولیاء بھی ہوں گے اور صالحین بھی ہوں گے۔

۵۵۷۰ : وَفِیْ اُخْرٰی لَهٗ عَنْ ثَوْبَانَ قَالَ سُئِلَ عَنْ شَرَابِهٖ فَقَالَ اَشَدُّ بَیَاضًا مِّنَ اللَّبَنِ وَاَحْلٰی مِنَ الْعَسَلِ یَغُتُّ فِیْهِ مِیْزَابَانِ یَمُدَّانِهٖ مِنَ الْجَنَّةِ اَحَدُهُمَا مِنْ ذَهَبٍ وَالْاٰخَرُ مِنْ وَّرِقٍ ۔

اخرجه مسلم فی صحیحه ۱۷۹۹/۴حدیث رقم (۳۷-۲۳۰۱) وابن ماجه فی السنن ۱۴۳۸/۲حدیث رقم ۴۳۰۳۔

ترجمہ: ''اور صحیح مسلم ہی کی ایک روایت میں حضرت ثوبان رضی اللہ عنہ سے ان الفاظ کے ساتھ نقل کیا گیا ہے کہ انہوں نے بیان فرمایا کہاں سے اس حوض کے پانی کے متعلق سوال کیا گیا تو آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: اس کا پانی دودھ سے زیادہ سفید اور شہد سے زیادہ شیریں ہے۔ اس حوض کو لبریز رکھنے کے لئے اس میں دو زوردار پرنالے گرتے ہیں جو جنت (کی اس نہر) سے نکلتے ہیں (جس کا نام بھی کوثر ہے) ان میں سے ایک سونے کا پرنالہ اور دوسرا چاندی کا''۔

تشریح: قولہ: سئل عن شرابہ ......:

سیاق سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ سوال نبی کریم ﷺ سے پوچھا گیا تھا۔

شرابہ: یہاں ''شراب'' بمعنی مشروب ہے۔

یغت: غین معجمہ کے ساتھ، اور کسرہ کے ساتھ بھی درست ہے، اور تائے فوقیہ کی تشدید کے ساتھ۔ بمعنی یصب ویسیل۔

قاضیؒ فرماتے ہیں: ''یغت فیہ میزابان'' کا مطلب یہ ہے کہ دونوں پرنالے قوت کے ساتھ مسلسل گرتے رہتے ہیں ''غت'' کے اصل معنی ہیں ''الضغط''

میزاب: میم کے کسرہ کے ساتھ ہے۔ حافظ ابوموسیٰ فرماتے ہیں: میم کے فتحہ کے ساتھ بھی ہے۔ وزب الماء سے مشتق

ہے۔وزب کا مطلب ہے"سال"۔"میزاب" اصل میں"موزاب" تھا۔واؤ کو یاء سے بدل دیا چونکہ واؤ ساکن تھا اور ماقبل مسکور تھا۔میم پرفتحہ پڑھنے کی وجہ واضح نہیں۔

صاحب قاموس لکھتے ہیں:"أزب الماء" ضرب کی طرح ہے۔بمعنیٰ جری' "میزاب" اسی سے مشتق ہے۔

یا یہ فارسی کالفظ ہے،معرب ہے۔اس تقدیر پر"میزاب" میں ہمزہ پڑھنا اور ہمزہ کو یاء سے بدل کر پڑھنا ہر دو درست ہے۔مزید لکھتے ہیں:وزب الماء کا مطلب ہے"سال" اور اسی سے"میزاب" مشتق ہے۔یا یہ فارسی کا لفظ ہے۔معرب ہے اور اس کا مطلب ہے"بل الماء"،ہمزہ کے ساتھ'اس کو عربی بنالیا گیا' یہی وجہ ہے کہ اس کی جمع "مآزیب" آتی ہے۔

یمدانه:میم کے ضمہ کے ساتھ ہے۔اور ایک نسخہ میں یاء تحتیہ کے ضمہ اور میم کے کسرہ کے ساتھ ہے۔

من الجنة:(یہاں کچھ عبارت محذوف ہے۔)ای انهار الجنة او من الحوض الذی له فی الجنة یعنی جنت کی نہروں سے یا اس حوض سے کہ جو جنت میں ہے،جسے"نہر کوثر" سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

ورق:راء کے کسرہ اور سکون کے ساتھ ہے۔

جنت میں سونا چاندی کا وجود ان کے دو جدا جدا رنگوں سے زینت حاصل کرنے کیلئے ہوگا۔ایسا نہیں ہوگا،جیسا کہ دنیا میں ہوتا ہے کہ سونا ایک نادر چیز سمجھی جاتی ہے۔

اور ممکن ہے کہ سونے کا پرنالہ شہد کی نہر کا ہو،اور چاندی کا پرنالہ دودھ کی نہر سے گرتا ہو۔

یا یہ کہ کسی ایک سے پانی اور دوسرے سے شہد گرتا ہو۔یا یہ کہ دودھ اور شہد حوض سے مخلوط آتا ہو۔واللہ تعالیٰ اعلم۔

عرضِ مرتب:

یہ عبارت یہاں لانے کی غرض سمجھ میں نہیں آئی،حالانکہ ماقبل میں حضرت ابو ہریرہ کا نام صراحت کے ساتھ سند میں موجود ہے۔

یاد رہے حوض کوثر اور نہر کوثر دونوں الگ الگ ہیں،نہر کوثر جنت کے اندر ہوگی جب کہ حوض کوثر جنت سے باہر میدان حشر میں ہوگا۔

۵۵۷۱ : وَعَنْ سَهْلِ بْنِ سَعْدٍ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنِّي فَرَطُكُمْ عَلَى الْحَوْضِ مَنْ مَرَّ عَلَيَّ شَرِبَ وَمَنْ شَرِبَ لَمْ يَظْمَأْ اَبَدًا لَيَرِدَنَّ عَلَيَّ اَقْوَامٌ اَعْرِفُهُمْ وَيَعْرِفُوْنَنِيْ ثُمَّ يُحَالُ بَيْنِيْ وَبَيْنَهُمْ فَاَقُوْلُ اِنَّهُمْ مِنِّي فَيُقَالُ اِنَّكَ لَا تَدْرِيْ مَا اَحْدَثُوْا بَعْدَكَ فَاَقُوْلُ سُحْقًا لِّمَنْ غَيَّرَ بَعْدِيْ (متفق علیه)

اخرجه البخاری فی صحیحه ٤٦٤/١١ حدیث رقم ٦٥٨٣ ومسلم فی صحیحه ١٧٩٣/٤ حدیث رقم (٢٦-٢٩٠) وابن ماجه فی السنن ١٤٣٩/٢ حدیث رقم ٤٣٠٤ واحمد فی المسند ٢٥٧/١۔

ترجمہ:"حضرت سہل بن سعد رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:میں حوض کوثر پر تمہارا پیش

خیمہ (یعنی وہاں تم سب سے پہلے پہنچ کر تمہارا استقبال کروں گا) جس شخص کا گزر میرے پاس سے ہوگا وہ اس حوض کوثر کا پانی پیئے گا اور جو شخص بھی اس سے سیرابی حاصل کرے گا وہ کبھی پیاس محسوس نہ کرے گا۔ وہاں میرے پاس (میری امت کے) کچھ ایسے لوگ بھی آئیں گے جنہیں میں جانتا ہوں گا اور وہ مجھے جانتے اور پہچانتے ہوں گے لیکن پھر میرے اور ان کے درمیان کوئی رکاوٹ قائم کردی جائے گی (تا کہ وہ مجھ سے اور حوض کوثر سے دور رہیں) میں یہ (دیکھ کر تعجب اور افسوس) کہوں گا کہ یہ لوگ تو میرے اپنے ہیں؟ (یعنی یہ لوگ میری امت کے افراد ہیں یا یہ کہ یہ وہ لوگ ہیں جو میرے صحابی رہے ہیں' پھر ان کو میرے حوض پر آنے کیوں نہیں دیا جا رہا ہے؟) اس کے جواب میں مجھے بتایا جائے گا کہ آپ ﷺ کو خبر نہیں' انہوں نے آپ ﷺ کے بعد کیا کیا نئی باتیں پیدا کی ہیں (یہ سن کر) میں کہوں گا کہ وہ لوگ دور ہوں مجھ سے دور خدا کی رحمت سے دور' جنہوں نے میری وفات کے بعد میرے دین اور میری سنت کو تبدیل کر ڈالا''۔ (بخاری و مسلم)

تشریح: قولہ: انی فرط طلم علی الحوض ---- انهم منی:

فرط: فاء اور راء دونوں کے فتحہ کے ساتھ۔ امام نوویؒ فرماتے ہیں: فرط: فاء اور راء کے فتحہ کے ساتھ، ''فارط'' اس شخص کو کہتے ہیں جو آگے جا کر حوض اور ڈول اور رسی وغیرہ، غرض یہ ہے کہ پانی کے انتظامات مکمل کرتا ہے۔ اب حدیث کا مطلب یہ ہو گا: میں حوض میں تم سے پہلے پہنچوں گا الخ

قاضی عیاضؒ نے فرمایا: اس حدیث کا ظاہر اس بات پر دلالت کرتا ہے، کہ اس حوض سے پینے کی سعادت، حساب کے بعد آگ سے نجات پالینے کے بعد حاصل ہوگی۔

لیردن: ورود سے مشتق ہے۔

قولہ: فیقال: انك لاتدری ما أحدثوا بعدك:

''آپ کے بعد کیا کیا باتیں پیدا کی ہیں'' یعنی مرتد ہو گئے تھے۔ چونکہ یہ بات ثابت ہے کہ اس امت کا کوئی بھی گناہ گار خواہ اس کا گناہ کتنا ہی بڑا کیوں نہ ہو، حوض کوثر پر آنے اور اس کا پانی پینے سے نہیں روکا جائے گا۔ اس بات کی دلیل اگلا جملہ (**سحقا سحقا لمن غیر بعدی**) بھی ہے۔

قولہ: فأقول: سحقا ......:

سحقا سحقا: سین کے ضمہ اور حاء کے سکون کے ساتھ، دونوں پر ضمہ بھی درست ہے۔ اور تکرار برائے تاکید ہے۔ ای بعدًا وهلاكًا. دونوں، منصوب علی المصدریۃ ہیں۔ اور یہ جملہ دعائیہ ہے۔ یعنی عذاب کی بد دعا۔

۵۵۷۲ : وَعَنْ اَنَسٍ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ يُحْبَسُ الْمُؤْمِنُوْنَ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ حَتّٰى يُهَمُّوْا بِذٰلِكَ فَيَقُوْلُوْنَ لَوِ اسْتَشْفَعْنَا اِلٰى رَبِّنَا فَيُرِيْحُنَا مِنْ مَّكَانِنَا فَيَاْتُوْنَ اٰدَمَ فَيَقُوْلُوْنَ اَنْتَ اٰدَمُ اَبُوا النَّاسِ خَلَقَكَ اللّٰهُ بِيَدِهٖ وَاَسْكَنَكَ جَنَّتَهٗ وَاَسْجَدَ لَكَ مَلٰٓئِكَتَهٗ وَعَلَّمَكَ اَسْمَآءَ كُلِّ شَیْءٍ اِشْفَعْ لَنَا عِنْدَ رَبِّكَ حَتّٰى يُرِيْحَنَا مِنْ مَّكَانِنَا هٰذَا فَيَقُوْلُ لَسْتُ هُنَاكُمْ وَيَذْكُرُ خَطِيْئَتَهُ الَّتِیْ اَصَابَ

اَكْلَهُ مِنَ الشَّجَرَةِ وَقَدْ نُهِيَ عَنْهَا وَلٰكِنِ ائْتُوْا نُوْحًا اَوَّلَ نَبِيٍّ بَعَثَهُ اللّٰهُ اِلٰى اَهْلِ الْاَرْضِ فَيَاْتُوْنَ نُوْحًا فَيَقُوْلُ لَسْتُ هُنَاكُمْ وَيَذْكُرُ خَطِيْئَتَهُ الَّتِيْ اَصَابَ سُوَالَهُ رَبَّهُ بِغَيْرِ عِلْمٍ وَلٰكِنِ ائْتُوْا اِبْرَاهِيْمَ خَلِيْلَ الرَّحْمٰنِ قَالَ فَيَاْتُوْنَ اِبْرَاهِيْمَ فَيَقُوْلُ اِنِّيْ لَسْتُ هُنَاكُمْ وَيَذْكُرُ ثَلٰثَ كَذِبَاتٍ كَذَبَهُنَّ وَلٰكِنِ ائْتُوْا مُوْسٰى عَبْدًا اٰتَاهُ اللّٰهُ التَّوْرَاةَ وَكَلَّمَهُ وَقَرَّبَهُ نَجِيًّا قَالَ فَيَاْتُوْنَ مُوْسٰى فَيَقُوْلُ اِنِّيْ لَسْتُ هُنَاكُمْ وَيَذْكُرُ خَطِيْئَتَهُ الَّتِيْ اَصَابَ قَتْلَهُ النَّفْسَ وَلٰكِنِ ائْتُوْا عِيْسٰى عَبْدَ اللّٰهِ وَرَسُوْلَهُ وَرُوْحَ اللّٰهِ وَكَلِمَتَهُ قَالَ فَيَاْتُوْنَ عِيْسٰى فَيَقُوْلُ لَسْتُ هُنَاكُمْ وَلٰكِنِ ائْتُوْا مُحَمَّدًا عَبْدًا غَفَرَ اللّٰهُ لَهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِهِ وَمَا تَاَخَّرَ قَالَ فَيَاْتُوْنِّيْ فَاَسْتَاْذِنُ عَلٰى رَبِّيْ فِيْ دَارِهِ فَيُؤْذَنُ لِيْ عَلَيْهِ فَاِذَا رَاَيْتُهُ وَقَعْتُ سَاجِدًا فَيَدَعُنِيْ مَا شَآءَ اللّٰهُ اَنْ يَدَعَنِيْ فَيَقُوْلُ اِرْفَعْ مُحَمَّدُ وَقُلْ تُسْمَعْ وَاشْفَعْ تُشَفَّعْ وَسَلْ تُعْطَهْ قَالَ فَاَرْفَعُ رَاْسِيْ فَاُثْنِيْ عَلٰى رَبِّيْ بِثَنَاءٍ وَتَحْمِيْدٍ يُعَلِّمُنِيْهِ ثُمَّ اَشْفَعُ فَيَحُدُّ لِيْ حَدًّا فَاَخْرُجُ فَاُخْرِجُهُمْ مِنَ النَّارِ وَاُدْخِلُهُمُ الْجَنَّةَ ثُمَّ اَعُوْدُ الثَّانِيَةَ فَاَسْتَاْذِنُ عَلٰى رَبِّيْ فِيْ دَارِهِ فَيُؤْذَنُ لِيْ عَلَيْهِ فَاِذَا رَاَيْتُهُ وَقَعْتُ سَاجِدًا فَيَدَعُنِيْ مَا شَآءَ اللّٰهُ اَنْ يَدَعَنِيْ ثُمَّ يَقُوْلُ اِرْفَعْ مُحَمَّدُ وَقُلْ تُسْمَعْ وَاشْفَعْ تُشَفَّعْ وَسَلْ تُعْطَهْ قَالَ فَاَرْفَعُ رَاْسِيْ فَاُثْنِيْ عَلٰى رَبِّيْ بِثَنَاءٍ وَتَحْمِيْدٍ يُعَلِّمُنِيْهِ ثُمَّ اَشْفَعُ فَيَحُدُّ لِيْ حَدًّا فَاَخْرُجُ فَاُخْرِجُهُمْ مِنَ النَّارِ وَاُدْخِلُهُمُ الْجَنَّةَ ثُمَّ اَعُوْدُ الثَّالِثَةَ فَاَسْتَاْذِنُ عَلٰى رَبِّيْ فِيْ دَارِهِ فَيُؤْذَنُ لِيْ عَلَيْهِ فَاِذَا رَاَيْتُهُ وَقَعْتُ سَاجِدًا فَيَدَعُنِيْ مَا شَآءَ اللّٰهُ اَنْ يَدَعَنِيْ ثُمَّ يَقُوْلُ اِرْفَعْ مُحَمَّدُ وَقُلْ تُسْمَعْ وَاشْفَعْ تُشَفَّعْ وَسَلْ تُعْطَهْ قَالَ فَاَرْفَعُ رَاْسِيْ فَاُثْنِيْ عَلٰى رَبِّيْ بِثَنَاءٍ وَتَحْمِيْدٍ يُعَلِّمُنِيْهِ ثُمَّ اَشْفَعُ فَيَحُدُّ لِيْ حَدًّا فَاَخْرُجُ فَاُخْرِجُهُمْ مِنَ النَّارِ وَاُدْخِلُهُمُ الْجَنَّةَ حَتّٰى مَا يَبْقٰى فِي النَّارِ اِلَّا مَنْ قَدْ حَبَسَهُ الْقُرْاٰنُ اَيْ وَجَبَ عَلَيْهِ الْخُلُوْدُ ثُمَّ تَلَا هٰذِهِ الْاٰيَةَ عَسٰى اَنْ يَّبْعَثَكَ رَبُّكَ مَقَامًا مَّحْمُوْدًا قَالَ وَهٰذَا الْمَقَامُ الْمَحْمُوْدُ الَّذِيْ وَعَدَهُ نَبِيَّكُمْ ﷺ (متفق علیه)

اخرجه البخاری فی صحیحه ۱۱/٤۱۷حدیث رقم ٦٥٦٥ومسلم فی صحیحه ۱/۱۸۰حدیث رقم (۳۲۲-۱۹۳) واخرجه الترمذی فی السنن٤/٥۳۷حدیث رقم ۲٤۳٤ واخرجه ابن ماجه فی السنن ۲/٤٤۲ حدیث رقم ٤۳۱۲ والدارمی فی السنن ۱/٤۱حدیث رقم ٥۲ واحمد فی المسند ۳/۱٤٤۔

ترجمہ: ''حضرت انس رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: قیامت کے روز (حشر کے میدان میں) مؤمنین کو روکے رکھا جائے گا (یعنی تمام مخلوق کو ایک جگہ پر ایسے محصور رکھا جائے گا کہ کوئی شخص بھی کسی طرح کی نقل و حرکت نہیں کر سکے گا اور ہر شخص سکتے کی سی کیفیت میں ٹھہرا رہے گا) حتیٰ کہ تمام لوگ اس (محصور ہو جانے) کی وجہ سے شدید ترین پریشانی اور فکر سے دوچار ہو جائیں گے پھر وہ آپس میں چہ مگوئیاں کرنے لگیں گے کہ کاش ہمیں کوئی ایسا شخص مل

جاتا جو ہمارے رب کے حضور ہماری شفاعت کرتا اور ہمیں اس سختی و پریشانی سے چھٹکارا دلاتا اور پھر (کچھ لوگ سب کی نمائندگی کرتے ہوئے) حضرت آدم علیہ السلام کی خدمت میں جائیں گے اور ان سے کہیں گے کہ آپ آدم ہیں، تمام انسانوں کے باپ ہیں۔ آپ کو اللہ تعالیٰ نے (بلا کسی واسطہ وسیلہ کے) اپنے دست مبارک سے (یعنی اپنی قدرت کاملہ سے) فرمایا ہے، آپ کو جنت کا رہائشی و باسی بنایا، اپنے فرشتوں سے (تحیہ کا) سجدہ آپ کو کرایا اور آپ کو تمام اشیاء کے نام سکھلائے، براہ کرم آپ علیہ السلام اپنے رب سے (کہ جس نے آپ علیہ السلام کو اس قدر فضائل اور اعزات سے نوازا ہے) ہماری شفاعت فرما دیجئے کہ وہ ہمیں اس (تکلیف و مشقت اور شدید ترین ہولناکی کی) جگہ سے نجات دے دے۔ حضرت آدم علیہ السلام (یہ سماعت فرما کر جواب دیں گے) کہ میں تمہارے اس معاملہ کی شفاعت کی اہلیت نہیں رکھتا (یعنی میں یہ مرتبہ (درجہ نہیں رکھتا کہ آج کے دن بارگاہ کبریائی میں شفاعت کرنے کا حوصلہ کروں) پھر حضرت آدم علیہ السلام اپنی اس لغزش کا تذکرہ (بطور عدم اہلیت شفاعت) جو انہوں نے (گیہوں درخت کھانے کی صورت میں) کی تھی (اس کے بعد وہ کہیں گے کہ) تم لوگوں کو نوح علیہ السلام کے پاس جانا چاہئے (وہ تمہاری شفاعت کر سکتے ہیں) کیونکہ وہ پہلے پیغمبر ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے اہل دنیا کی ہدایت کے لئے مبعوث کیا تھا) وہ لوگ حضرت نوح علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوں گے (اور ان سے شفاعت کے لئے درخواست کریں گے) حضرت نوح علیہ السلام جواب دیں گے کہ میں تمہارے اس امر میں شفاعت کی اہلیت نہیں رکھتا ہوں! اور وہ اپنی اس لغزش کا تذکرہ فرمائیں گے (اس طور پر کہ یہ وجہ ہے میرے شفاعت کے حوصلہ نہ کرنے کی) جو انہوں نے بے جانے بوجھے اللہ تعالیٰ سے (اپنے بیٹے کو غرق ہونے سے نجات کے لئے دعا مانگنے کی صورت میں تھی (پھر وہ مشورہ دیں گے کہ) تمہیں ابراہیم علیہ السلام کے پاس" جو اللہ تعالیٰ کے خلیل (دوست) ہیں جانا چاہئے! آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا: وہ لوگ (یہ سن کر) ابراہیم خلیل اللہ کی خدمت میں حاضر ہوں گے (اور ان سے شفاعت کی گذارش کریں گے) حضرت ابراہیم علیہ السلام جواب دیں گے کہ میں اس بات کی اہلیت نہیں رکھتا اور وہ دنیا میں تین مرتبہ اپنے جھوٹ بولنے کا تذکرہ فرمائیں گے (پھر وہ مشورہ دیں گے کہ) تم لوگ موسیٰ علیہ السلام کے پاس جاؤ جو اللہ کے وہ بندے ہیں جن میں اللہ تعالیٰ نے (اپنی عظیم الشان کتاب) توریت عطا کی اور بنی اسرائیل کے تمام انبیاء کو ان کا تابع بنایا اور جن کو خدا نے براہ راست اپنا کلیم ہونے کا اعزاز بخشا اور ان کو اپنا کمال قرب عطا فرما کر اپنا محرم اسرار بنایا"۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا: وہ لوگ (یہ سن کر) حضرت موسیٰ علیہ السلام کے پاس آئیں گے (اور ان سے شفاعت کے لئے درخواست کریں گے) موسیٰ علیہ السلام ان کو جواب دیں گے کہ میں اس مرتبہ کا سزاوار نہیں ہوں! اور وہ اپنی اس لغزش کا تذکرہ فرمائیں گے جو ایک قبطی کو مار ڈالنے کی صورت میں ہوگئی ہیں (یعنی انہوں نے طیش میں آ کر ایک قبطی کو مکا مار دیا تھا جس سے وہ مر گیا۔ پھر وہ مشورہ دیں گے کہ تمہیں عیسیٰ علیہ السلام کے پاس جانا چاہئے جو حق تعالیٰ کے بندے اور اس کے رسول ہیں۔ وہ سراسر روحانی (اللہ کی روح سے خاص تعلق رکھنے والے) ہیں اور وہ اللہ کا کلمہ ہیں (بایں طور کہ محض کلمہ کن سے پیدا ہوئے تھے) آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا: وہ لوگ (یہ سن کر) حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوں گے (اور ان سے شفاعت کی درخواست کریں گے) حضرت عیسیٰ علیہ السلام ان سے فرمائیں گے کہ میں اس مرتبہ کی اہلیت نہیں رکھتا! البتہ تم لوگ محمد ﷺ کے پاس جاؤ جو خدا کے ایسے بندے ہیں جن کے اگلے پچھلے تمام گناہ

خدا تعالیٰ نے معاف فرما دیئے ہوئے ہیں (یقیناً وہی تم لوگوں کی شفاعت کر سکیں گے) آنحضرت ﷺ نے فرمایا: تب لوگ (شفاعت کی درخواست لے کر) میرے پاس آئیں گے اور میں (ان کی شفاعت کا ارادہ کر لوں گا اور مقصد کی خاطر) اللہ رب العزت کی بارگاہ میں حاضر ہونے کی اجازت چاہوں گا' اللہ تعالیٰ مجھے اپنی بارگاہ میں پیش ہونے کی اجازت دی جائے گی! میں جب اس کی بارگاہ میں جا کر اس کی جانب نگاہ کروں تو اس کی ہیبت وخوف کے مارے اور اس کی تعظیم کرنے کے لئے) سجدہ میں گر جاؤں گا اور اللہ تعالیٰ جتنا عرصہ مناسب سمجھے اتنے عرصہ کے لئے مجھے سجدہ میں پڑا رہنے دے گا۔ پھر اللہ تعالیٰ فرمائے گا کہ محمد (ﷺ)! سر اٹھایئے اور کہئے کیا کہنا چاہتے ہو آپ کی بات قبول کی جائے گی اور آپ شفاعت کیجئے (جس کے حق میں چاہیں)' آپ کی شفاعت قبول کی جائے گی اور جو چاہے مانگیئے میں آپ کو عطا کروں گا آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا: (یہ سن کر) میں اپنا سر اٹھاؤں گا اور اس حمد وتعریف کے ساتھ کہ جو پروردگار مجھے سکھلائے گا اس کی حمد وثنا بیان کروں گا' پھر میں شفاعت کروں گا اور میرے لئے شفاعت کی ایک حد مقرر کر دی جائے گی' اس کے بعد میں (اللہ تعالیٰ کی عدالت سے) باہر آؤں گا اور اس (متعینہ) جماعت کو دوزخ سے نکلوا کر جنت میں داخل کراؤں گا پھر (دوسری جماعتوں کے حق میں شفاعت کرنے کے لئے) میں دوبارہ در رب العزت پر حاضر ہو کر اس کی خدمت میں پیش ہونے کی اجازت طلب کروں گا مجھے اس کی بارگاہ میں حاضر ہونے کی اجازت عطا کی جائے گی اور جب میں اس کی عدالت میں پہنچ کر اس کو دیکھوں گا تو سجدہ ریز ہو جاؤں گا اور اللہ تعالیٰ جب تک چاہے گا مجھے سجدہ ریز رہنے دے گا پھر فرمائے گا کہ محمد ﷺ اپنا سر اٹھایئے اور جو بھی کہنا چاہتے ہیں کہئے آپ کی بات کو قبول کیا جائے گا اور شفاعت کیجئے۔ آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''(یہ سن کر) میں اپنا سر اٹھاؤں گا اور اس حمد وتعریف کے ساتھ کہ جو پروردگار مجھے سکھلائے گا اس کی مدح وثنا اور اس کی حمد کروں گا پھر میں شفاعت کروں گا اور میرے لئے شفاعت کی ایک حد مقرر کر دی جائے گی اس کے بعد میں (حق تعالیٰ کی عدالت سے) باہر نکلوں گا اور اس متعینہ جماعت کو دوزخ سے نکلوا کر جنت میں ان کا داخلہ کرواؤں گا اور پھر میں تیسری مرتبہ اللہ تعالیٰ کی عدالت میں جا کر اس کی خدمت میں پیش ہونے کی اجازت چاہوں گا' مجھے اس کی بارگاہ میں پیش ہونے کی اجازت عطا کی جائے گی اور جب میں پروردگار کے حضور حاضر ہو کر اس کی جانب نگاہ اٹھاؤں گا تو سجدے میں گر پڑوں گا اور اللہ تعالیٰ جب تک چاہے گا مجھے سجدہ کی ہی حالت میں چھوڑے رکھے گا۔ پھر فرمائے گا محمد (ﷺ) اپنا سر اٹھایئے جو بھی کہنا چاہتے ہیں کہئے آپ کی بات قبول کی جائے گی اور شفاعت کیجئے میں قبول کروں گا اور مانگئے میں آپ کو عطا کروں گا''۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا: (یہ سن کر) میں اپنا سر اٹھاؤں اور اس کی حمد وتعریف کے ساتھ کہ جو پروردگار مجھے سکھلائے گا اس کی حمد وثنا بیان کروں گا پھر میں شفاعت کروں گا اور میرے لئے شفاعت کی ایک حد مقرر کر دی جائے گی۔ اس کے بعد میں (اللہ تعالیٰ کی عدالت سے) اور اس متعینہ جماعت کو دوزخ سے نکلوا کر جنت میں داخل کراؤں گا' یہاں تک کہ دوزخ میں ان کے علاوہ اور کوئی باقی نہ بچے گا جن کو قرآن نے روکا ہو گا (یعنی اس آخری شفاعت کے بعد جہنم میں وہی لوگ باقی بچیں گے جن کے بارے میں قرآن نے خبر دی ہے کہ وہ ہمیشہ ہمیشہ دوزخ میں رہیں گے' اس کا مطلب یہ ہے کہ بس وہ لوگ جہنم میں باقی بچیں گے باہر نکل آؤں گا جو (قرآن کے حکم کے بموجب) ہمیشہ ہمیشہ کے لئے عذاب دوزخ کے مستوجب قرار پا چکے ہیں (اور وہ کفار ہیں) پھر آنحضرت ﷺ نے (یا

حضرت انس یا حضرت قتادہؒ نے اس بات کو مدلل و مؤید کرنے کے لئے) قرآن کریم کی یہ آیت تلاوت فرمائی ﴿ عَسٰى أَنْ يَّبْعَثَكَ رَبُّكَ مَقَامًا مَّحْمُوْدًا ﴾ امید ہے کہ آپ ﷺ کا رب آپ ﷺ کو مقام محمود میں جگہ دے گا اور پھر (آنحضرت ﷺ نے یا حضرت انسؓ نے یا حضرت قتادہؒ نے) فرمایا کہ یہی وہ مقام محمود ہے جس کا وعدہ خدا نے تمہارے نبی ﷺ سے کیا ہے''۔ (بخاری ومسلم)

تشریح: قوله:محبس المؤمنون۔۔۔حتى يهموا:

يهموا: مجہول کے صیغہ کے ساتھ ہے۔

اور ایک نسخہ میں ''يهموا'' یاء کے فتحہ اور ہاء کے ضمہ کے ساتھ، معروف کے صیغہ کے ساتھ ہے۔ یہ کوئی چیز نہیں ہے۔ تور پشتی رحمہ اللہ نے فرمایا: بصیغہ مجہول ہے۔ أي يحزنوا لما امتحنوا به من الحبس، عرب کے اس قول سے ماخوذ ہے: أهمني الامر، یہ جملہ اس وقت بولتے ہیں، جب کوئی معاملہ قلق میں ڈال دے، اور رنجیدہ کردے۔

قوله:فيقولون:لو استشفعنا الى ربنا فيريحنا من مكاننا:

(''لو'' تمنی کے معنی میں ہے۔ ''استشفعنا'' کا ہمزہ طلب ماخذ کیلئے ہے۔) أى ليت طلبنا أحدا ليشفع لنا

امام طیبیؒ فرماتے ہیں: یہ ''لو'' طلب اور تمنی ہر دو معنی کو متضمن ہے۔

فيريحنا: اراحة سے مشتق ہے۔ اور (فيريحنا) کے منصوب ہونے کی وجہ یہ ہے کہ ''لو'' کے جواب میں آنے والی فاء کے بعد ''أن'' مقدر ہوتا ہے۔ معنوی اعتبار سے عبارت یوں ہوگی: لو استشفعنا أحدا الى ربنا فيشفع لنا، فيخلصنا مما نحن فيه من الكرب والحبس.

اساس البلاغۃ میں فرماتے ہیں: (کہا جاتا ہے) شفعت له الى فلان (کسی سے کسی کی سفارش کرنا)، وأنا شافعه (سفارش کرنے والا) وشفيعه (سفارش کرنے والا) واستشفعني اليه فشفعت له (سفارش قبول کرنا) واستشفع بی.

اعمش کہتا ہے:

مضى زمن والناس يستشفعونني
فهل لى الى ليلى الغداة شفيع

قوله:فياتون آدم فيقولون۔۔۔ من مكهافنا هذا: ایک زمانہ گزر گیا اور لوگ مجھ سے سفارش کرنے کی درخواست کررہے ہیں تو کیا کل کوئی لیلیٰ کے ہاں میری سفارش کرے گا''۔

أنت آدم: یہ جملہ عرب کے اس قول: أنا أبو النجم وشعرى شعرى (میں ابو نجم ہوں اور میرے شعر تو میرے کے قبیل سے ہے۔ اس جملہ میں کمال کے معنی مبہم ہیں، جس کی مراد معلوم نہیں، چنانچہ اگلے جملے سے اس کی تشریح فرمادی۔

وأسكنك جنته: اس جملہ میں حصول آمال وصول منال اور اس حسن مآل کی طرف اشارہ ہے جس کا خواہاں ہر نفس ہے۔

وأسجد لك ملائكته: یہ سجدہ ''سجدہ تحیہ'' تھا۔ اس جملہ میں اس کمال جاہ وعظمت کی طرف اشارہ ہے، جو حضرت آدم

علیہ السلام کو حاصل تھا۔

وعلمك أسماء كل شيء: اس جملہ میں فضیلت عظمیٰ اور مرتبہ کبریٰ کی طرف اشارہ ہے۔ امام طیبیؒ نے فرمایا: ''اشیاء کی جگہ'' کل شيء فرمایا، اور مراد اس سے ''مسمّیات'' ہیں۔ اس کی دلیل یہ آیت کریمہ ہے: ﴿**وعلم آدم الأسماء كلها**﴾ [البقرة:۳۱] **أي: اسماء المسميات** (یعنی ایک ایک کر کے تمام مسمیات کے نام بتلائے۔)

هذا: اس کا مشار الیہ'' **المكان**'' ہے۔ یہاں اسم اشارہ عظمت شان بیان کرنے کیلئے لایا گیا ہے۔) **أى هذا المكان العظيم والموقف الأليم.**

قوله: فيقول: لست هناكم ـــ الى أهل الارض:

بعض کا کہنا ہے کہ ''هنا'' کے ساتھ جب'' کاف'' لگا ہو تو یہ مشار الیہ بعید کی طرف اشارہ کیلئے ہوتا ہے۔ چنانچہ اس جملہ کا مطلب یہ ہے: **أنا بعيد من مقام الشفاعة.** (میں شفاعت سے دور ہوں)

قاضی بیضاویؒ فرماتے ہیں: اس کا مطلب یہ ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام اہل محشر کے نمائندوں سے فرمائیں گے میں اس مکان و منزلت کا شخص نہیں ہوں جس قدر تم میرے بارے میں گمان رکھتے ہو۔ اس سے مراد مقام شفاعت ہے۔

قاضی عیاضؒ فرماتے ہیں: یہ کنایہ ہے کہ میرا رتبہ مطلوبہ رتبہ سے کم ہے۔ اور ان کا یہ فرمانا، ایک طرف تو اضع پر دلالت کرتا ہے، اور دوسری طرف اس بات کو نمایاں کرتا ہے کہ یہ معاملہ بہت بڑا ہے، جس کا لوگ ان سے مطالبہ کر رہے ہیں۔ فرمایا، اس میں یہ اشارہ بھی ہو سکتا ہے، کہ یہ مقام میرا نہیں بلکہ میرے علاوہ کسی اور کا ہے۔

عسقلانیؒ نے فرمایا: ایک روایت میں یہ الفاظ بھی ہیں: **لست لها.** اسی طرح دوسرے مواضع میں ہے۔ اور ایک روایت میں یہ الفاظ ہیں: **لست لصاحبك ذاك.** یہ الفاظ مذکورہ بالا اشارہ کی تائید کرتے ہیں۔

ويذكر خطيئته التى اصاب:

اپنی لغزش کا ذکر کرنا درحقیقت، شفاعت کے معاملے میں پس و پیش کرنے کا اعتذار ہے۔ صلہ کی طرف عائد ضمیر محذوف ہے۔ **أى التى اصابها.**

أكله من الشجرة: ''خطيئة'' سے بدل ہونے کی وجہ سے منصوب ہے۔ **اى يذكر اكله من الشجرة.** (یعنی ان کو درخت سے کھانا یاد آئے گا) (ذکرہ البیضاوی)

امام طیبیؒ نے فرمایا: یہ بھی جائز ہے کہ یہ محذوف ضمیر مبہم کا بیان ہو۔ جیسا کہ اللہ جل شانہ کا یہ فرمان ہے: ﴿ **فَسَوّٰهُنَّ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ** ﴾ [البقرة:۲۹] ''سو درست کر کے بنائے سات آسمان''۔

عنها: ضمیر'' **الشجرة**'' یا'' **الخطيئة**'' کی طرف لوٹ رہی ہے۔ یہ جملہ مفعول سے حال ہے۔

قوله: ولكن ائتو ـــ ا أهل الأرض: یہ جملہ ایک اشکال پیدا کرتا ہے۔ اشکال کی تقریر یہ ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام سے پہلے بھی دنیا میں کچھ نبی حضرت آدم علیہ السلام، حضرت شیث علیہ السلام اور حضرت ادریس علیہ السلام وغیرہ تشریف لا چکے تھے۔ تو حضرت نوح علیہ السلام دنیا والوں کی طرف مبعوث ہونے والے پہلے نبی کیوں کر ہوئے؟

اس اشکال کے متعدد جوابات دیئے گئے ہیں:

پہلا جواب یہ: اولویت ''اهل ارض'' کے ساتھ مقید ہے۔

لیکن اس جواب پر بخاری ''باب التیمم'' میں مروی حضرت جابرؓ کی روایت سے اشکال ہوتا ہے:

وكان النبي يبعث خاصة الى قوم خاصة.

اس کا جواب یہ دیا گیا کہ نوح علیہ السلام کی اصل بعثت میں عموم نہیں تھا۔ ''اهل ارض'' سے مراد طوفان نوح کے بعد کے موجودین ہیں۔ (انتھی) اس جواب کا محل نظر ہونا مخفی نہیں بلکہ بالکل واضح ہے۔

دوسرا جواب: یہ تینوں نبی تھے۔ ان میں رسول کوئی نہیں تھا۔

لیکن اس جواب پر ابوذرؓ کی اس حدیث سے اشکال ہوتا ہے، جو ابن حبانؒ میں مروی ہے۔ وہ روایت تقریباً صریح ہے کہ حضرت شیث علیہ السلام پر صحف کا نزول ہوا تھا۔ اور انزال صحف رسالت کی علامت ہے۔ (انتھی)۔

یہ بات بھی بحث سے خالی نہیں۔ چونکہ انزال صحف اس بات کو لازم نہیں کہ ''منزل علیہ'' رسول بھی ہو۔ چونکہ یہ احتمال موجود ہے کہ ان صحائف میں فقط ایسے اعمال ہوں جو ''منزل علیہ'' کے ساتھ مخصوص ہوں۔

اور یہ بھی احتمال ہے کہ ممکن ہے صحف میں امر و نہی نہ ہوں، بلکہ مواعظ و نصائح ہوں، جو خود ان ہی کے ساتھ مخصوص ہوں۔

لہٰذا یہ کہنا زیادہ واضح ہے کہ یہ تینوں حضرات انبیاء، مومنوں اور کافروں دونوں کی طرف بھیجے گئے تھے، البتہ نوح علیہ السلام اہل ارض کی طرف بھیجے گئے تھے۔ اس وقت سارے کے سارے اہل ارض کافر تھے۔

بعض کا کہنا ہے کہ حضرت نوحؑ نبی مبعوث یعنی مرسل تھے، اور ان سے پہلے انبیاء غیر مرسل تھے۔ مثلاً جیسا کہ آدم اور ادریس علیہم السلام وغیرہ۔ مؤرخین کے بیان کے مطابق وہ نوح علیہ السلام کے جدّ امجد تھے۔

قاضی عیاضؒ فرماتے ہیں: بعض کا کہنا ہے کہ حضرت ادریسؑ (ہی درحقیقت) حضرت الیاسؑ ہیں۔ اور وہ بنی اسرائیل کے انبیاء میں سے تھے۔ پس وہ حضرت نوح علیہ السلام سے متأخر ہوئے۔ لہٰذا یہ صحیح ہے، کہ حضرت نوح علیہ السلام پہلے مبعوث نبی ہیں، اور ادریس علیہ السلام نبی مرسل تھے۔ البتہ حضرت آدم علیہ السلام اور شیث علیہ السلام دونوں اگرچہ نبی تھے، مگر یہ فرق تھا کہ حضرت آدم علیہ السلام اپنے بیٹوں کی طرف رسول بنا کر بھیجے گئے تھے، اس وقت ان کے بیٹے کفر میں مبتلا نہیں ہوئے تھے، حضرت آدم علیہ السلام اپنے بیٹوں کو ایمان اور اللہ کی طاعت کی تعلیم پر مامور تھے۔ آپؑ کے بعد حضرت شیث علیہ السلام آپ کے جانشین ہوئے، برخلاف نوح علیہ السلام کے، کہ وہ کفار اہل ارض کی طرف مبعوث کئے گئے تھے۔ یہ تقریر اس قول کے انتہائی قریب ہے کہ حضرت آدم اور ادریس علیہما السلام رسول نہیں تھے۔ (بلکہ نبی تھے)

ایک جواب یہ دیا جاتا ہے، کہ حضرت آدم علیہ السلام کے بعد پہلے نبی مبعوث حضرت نوح علیہ السلام تھے اور شیث علیہ السلام ان کے خلیفہ تھے، ان کی اولویت اضافی ہے۔ یا یہ کہ وہ اولوالعزم انبیاء میں سے پہلے نبی مبعوث ہیں۔ اس اعتبار سے اولویت حقیقی ہوگی۔ یہ سب مناسب قول ہے۔ اس سے اشکال زائل ہوتا ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالحال۔

دیگر شراح نے بھی اس سے ملتی جلتی توجیہات ذکر کی ہیں۔ وہ توجیہات بعینہٖ ذکر کی جاتی ہیں:

شرح مسلم میں مازریؒ فرماتے ہیں:

قوله: فياتون نوحا۔۔۔۔ خليل الرحمن:

فيقول: ایک نسخہ میں (فیقول کے بعد) "انی" (بھی) ہے حضرت نوحؑ نے اپنے بیٹے کو غرق ہونے سے بچا لینے کی جو درخواست کی تھی وہ اس بات سے لاعلمی کی بناء پر تھی کہ یہ سوال کرنا جائز نہیں ہے۔ اسی وجہ سے ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿إِنَّهُ لَيْسَ مِنْ أَهْلِكَ إِنَّهُ عَمَلٌ غَيْرُ صَالِحٍ فَلَا تَسْئَلْنِ مَا لَيْسَ لَكَ بِهِ عِلْمٌ﴾ [هود:٤٦]

امام طیبیؒ فرماتے ہیں: سؤله ربه بغير علم، یہ عبارت حضرت آدم علیہ السلام کی بابت گزری ہوئی عبارت "أكله من الشجرة وقد نهي عنها" کی جگہ واقع ہے۔ اور "بغير علم"، حال ہے "سؤاله" کی ضمیر مضاف الیہ سے۔ أي: صادرا عنه بغير علم اور "ربه": سؤاله کے لئے مفعول ہے۔ اور وہ سوال اس آیت میں مذکور ہے: ﴿إِنَّ ابْنِي مِنْ أَهْلِي وَإِنَّ وَعْدَكَ الْحَقُّ﴾ [هود:٤٥] "اے میرے رب میرا بیٹا میرے گھر والوں میں سے ہے اور آپ کا (یہ) وعدہ بالکل سچا ہے" انہوں نے اپنے رب سے درخواست کی تھی کہ ان کے بیٹے کو غرق ہونے سے بچا لیا جائے۔ اور "بغیر علم" سے مراد یہ ہے کہ اسی لیے ارشاد باری تعالیٰ ہے: [فلا تسألن ماليس لك به علم]

قوله: فياتون ابراهيم۔۔۔ وقربه نجيا:

ويذكر ثلاث كذبات كذبهن: امام بیضاویؒ لکھتے ہیں: حضرت ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام کی طرف منسوب وہ تین کذبات یہ ہیں: پہلا: ﴿انی سقیم﴾ [الصافات:٨٩] میں بیمار ہونے کو ہوں۔

دوسرا: [بل فعله كبيرهم هذا] [الانبياء-٦٣] "کہ نہیں جب کہ ان کے بڑے (گرو) سے کی" اور تیسرا: وہ جو انہوں نے حضرت سارہؑ کے بارے میں فرمایا تھا: هي أختي اور حق بات یہ ہے کہ تینوں باتیں تعریفات ہیں۔

عرض مرتب: ان "کذبات" پر تفصیلی کلام روایت نمبر ۵۷۰۴ کے تحت ملاحظہ فرمائیے۔

ولكن ائتوا موسى عبد۔۔۔۔ فيعول لست هناكم: آتاه الله: یہ جملہ مستانفہ بیانیہ تعلیلہ ہے۔

قربه نجيا: فاعل یا مفعول سے حال ہے۔ اي مناجياله أو مناجي

قتله النفس: اور ایک نسخہ میں بغیر ضمیر کے ہے۔ اي: قتل النفس.

قوله: فياتون عيسى۔۔۔ روح الله وكلمته:

روح الله: اس میں اضافت تشریفی ہے۔ ("روح اللہ کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ) وہ مردوں کو زندہ کیا کرتے تھے۔

قوله: فيأتون عيسى۔۔ وما تأخر: "غفر الله له تقدم من ذنبه وما تاخر"

امام نوویؒ فرماتے ہیں کہ اس کے معنی میں اہل علم کا اختلاف ہے۔

قاضیؒ لکھتے ہیں: بقول بعض "ماتقدم" سے مراد قبل از نبوت صادر ہونے والے امور ہیں اور "ما تاخر" سے مراد ہے کہ بعد از نبوت آپ کو اس سے محفوظ رکھا جائے گا۔

بعض کا کہنا ہے کہ اس سے مراد وہ امور ہیں جن کا صدور آپؐ سے سہوا یا تاویلا ہوا۔ اس کو طبرانی نے نقل کیا ہے اور قشیری

نے اسی کو مختار قرار دیا ہے۔

ما تقدم سے مراد آنحضرت کے اب بھی آدم علیہ الصلوۃ والسلام **وما تأخر من ذنوب أمته.** سے مراد آپؐ کی امت کے گناہ ہیں۔

ایک قول یہ ہے کہ آپؐ مغفولہ ہیں آپؐ سے مؤاحدہ نہیں ہوگا اگر آپؐ سے گناہ کا ضرور ہوگا۔

کہا گیا ہے کہ اس میں آپؐ کے گناہوں سے منزہ ہونے کا بیان ہے۔

قوله:قال فيأتوني فأستا ذن على ربي في داره فيؤذن لي عليه:

"**فيا توني**" نون کی تشدید وتخفیف کے ساتھ، جیسا کہ اس آیت کریمہ میں ہے:﴿**أتحاجوني في الله وقد هدان**﴾

[الانعام۔۸۰]

قوله:فاذا رأيته۔۔۔وأذ خلهم الجنة:

فاذا رايته مشارق (کی روایت) میں یہ الفاظ ہیں:**فاذا أنا رأيته.** یعنی "أنا" کا اضافہ ہے۔ابن الملکؒ لکھتے ہیں:**أی: انی رأتینی** یہ **التفات من التكلم الى الغيبة**" ہے۔

فيدعني ما شاء الله أن يدعني: مسند احمد کی روایت میں یوں ہے:**أنه يسجد قدر جمعة من جمع الدنيا.**

(كذا ذكره السيوطیؒ في حاشية مسلم.)

فيحد: یاء کے ضمہ اور حاء کے فتحہ کے ساتھ ہے۔ایک نسخہ میں اس کے برعکس ہے۔

حدًا: مصدر ہے یا اسم ہے،**أی. مقداراً معينا في باب الشفاعة.**

ابن الملکؒ لکھتے ہیں:شفاعت کئی طرح کی ہوگی:

پہلی شفاعت "موقف" سے راحت حاصل کرنے کیلئے ہوگی۔

دوسری شفاعت جنت میں بلا حساب داخلہ کیلئے ہوگی۔

تیسری شفاعت پل صراط سے گزرتے وقت ہوگی۔

چوتھی شفاعت اخراج من النار کیلئے ہوگی۔

چنانچہ حدیث میں صرف دو قسموں کا ذکر ہے،اور دوسری قسموں کا ذکر موجود نہیں ہے۔واللہ تعالیٰ اعلم۔

قوله:حتى مايبقى في النار الا من قد حبسه القرآن اى وجب عليه الخلود:

وجب: بمعنىٰ ثبت وتحقق۔

قوله:قال:وهذا المقام المعمود الذى وعده نبيكم:

"**هذا**":مبتدا ہے"**المقام**"،خبر ہے اور مابعد (یعنی المحمود الذی الخ) صفت ہے۔

وعده: اى الله سبحانه. اور ایک نسخہ میں صیغہ مجہول کے ساتھ "**وعدنبيكم**" ہے۔اس صورت میں "قال" کا فاعل نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام کے علاوہ کوئی اور ہوگا۔یہ صورت بالکل واضح ہے اور صورت میں کوئی اشکال وارد نہیں ہوتا اور اگر

قائل نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام کو قرار دیا جائے تو اس صورت میں توجیہ ہوگی کہ موضع مضمر میں اسم ظاہر کو ذکر کر دیا گیا ہے۔ گویا کہ اصل میں وعدنیه ہے امام طیبیؒ فرماتے ہیں: احتمال ہے کہ قال کا فاعل راوی ہو۔ اور ایک احتمال یہ ہے کہ فاعل نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام ہی ہوں، اس صورت میں تجرید ہوگی۔ والله سبحانه وتعالیٰ أعلم.

۵۵۷۳: وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِذَا كَانَ يَوْمُ الْقِيٰمَةِ مَاجَ النَّاسُ بَعْضُهُمْ فِي بَعْضٍ فَيَاْتُوْنَ اٰدَمَ فَيَقُوْلُوْنَ اشْفَعْ إِلٰى رَبِّكَ فَيَقُوْلُ لَسْتُ لَهَا وَلٰكِنْ عَلَيْكُمْ بِإِبْرَاهِيْمَ فَإِنَّهُ خَلِيْلُ الرَّحْمٰنِ فَيَاْتُوْنَ إِبْرَاهِيْمَ فَيَقُوْلُ لَسْتُ لَهَا وَلٰكِنْ عَلَيْكُمْ بِمُوْسٰى فَإِنَّهُ كَلِيْمُ اللّٰهِ فَيَاْتُوْنَ مُوْسٰى فَيَقُوْلُ لَسْتُ لَهَا لٰكِنْ عَلَيْكُم بِعِيْسٰى فَإِنَّهُ رُوْحُ اللّٰهِ وَكَلِمَتُهُ فَيَاْتُوْنَ عِيْسٰى فَيَقُوْلُ لَسْتُ لَهَا وَلٰكِنْ عَلَيْكُمْ بِمُحَمَّدٍ فَيَاْتُوْنِيْ فَأَقُوْلُ أَنَا لَهَا فَأَسْتَاْذِنُ عَلٰى رَبِّيْ فَيُؤْذَنُ لِيْ وَيُلْهِمُنِيْ مَحَامِدَ أَحْمَدُهُ بِهَا لَا تَحْضُرُنِي الْاٰنَ فَأَحْمَدُهُ بِتِلْكَ الْمَحَامِدِ وَأَخِرُّ لَهُ سَاجِدًا فَيُقَالُ يَا مُحَمَّدُ ارْفَعْ رَأْسَكَ وَقُلْ تُسْمَعْ وَسَلْ تُعْطَهْ وَاشْفَعْ تُشَفَّعْ فَأَقُوْلُ يَا رَبِّ أُمَّتِيْ أُمَّتِيْ فَيُقَالُ انْطَلِقْ فَأَخْرِجْ مَنْ كَانَ فِيْ قَلْبِهِ مِثْقَالُ شَعِيْرَةٍ مِّنْ إِيْمَانٍ فَأَنْطَلِقُ فَأَفْعَلُ ثُمَّ أَعُوْدُ فَأَحْمَدُهُ بِتِلْكَ الْمَحَامِدِ ثُمَّ أَخِرُّ لَهُ سَاجِدًا فَيُقَالُ يَا مُحَمَّدُ ارْفَعْ رَأْسَكَ وَقُلْ تُسْمَعْ وَسَلْ تُعْطَهْ وَاشْفَعْ تُشَفَّعْ فَأَقُوْلُ يَا رَبِّ أُمَّتِيْ أُمَّتِيْ فَيُقَالُ انْطَلِقْ فَأَخْرِجْ مَنْ كَانَ فِيْ قَلْبِهِ مِثْقَالُ ذَرَّةٍ أَوْ خَرْدَلَةٍ مِنْ إِيْمَانٍ فَأَنْطَلِقُ فَأَفْعَلُ ثُمَّ أَعُوْدُ فَأَحْمَدُهُ بِتِلْكَ الْمَحَامِدِ ثُمَّ أَخِرُّ لَهُ سَاجِدًا فَيُقَالُ يَا مُحَمَّدُ ارْفَعْ رَأْسَكَ وَقُلْ تُسْمَعْ وَسَلْ تُعْطَهْ وَاشْفَعْ تُشَفَّعْ فَأَقُوْلُ يَا رَبِّ أُمَّتِيْ أُمَّتِيْ فَيُقَالُ انْطَلِقْ فَأَخْرِجْ مَنْ كَانَ فِيْ قَلْبِهِ أَدْنٰى أَدْنٰى أَدْنٰى مِثْقَالَ حَبَّةِ خَرْدَلَةٍ مِّنْ إِيْمَانٍ فَأَخْرِجْهُ مِنَ النَّارِ فَأَنْطَلِقُ فَأَفْعَلُ ثُمَّ أَعُوْدُ الرَّابِعَةَ فَأَحْمَدُهُ بِتِلْكَ الْمَحَامِدِ ثُمَّ أَخِرُّ لَهُ سَاجِدًا فَيُقَالُ يَا مُحَمَّدُ ارْفَعْ وَأْسَلْ وَقُلْ تُسْمَعْ وَسَلْ تُعْطَهْ وَاشْفَعْ تُشَفَّعْ فَأَقُوْلُ يَا رَبِّ ائْذَنْ لِيْ فِيْمَنْ قَالَ لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ قَالَ لَيْسَ ذٰلِكَ لَكَ وَلٰكِنْ وَعِزَّتِيْ وَجَلَالِيْ وَكِبْرِيَائِيْ وَعَظَمَتِيْ لَأُخْرِجَنَّ مِنْهَا مَنْ قَالَ لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ۔ (متفق عليه)

اخرجه البخاری فی صحیحه ۴۷۳/۱۳حدیث رقم ۷۵۱۰ومسلم فی صحیحه ۱۸۲/۱حدیث رقم (۳۲۶-۱۹۳)

ترجمہ: "حضرت انس رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: جب روز قیامت ہوگا تو (حشر کے میدان میں) لوگ ایک دوسرے کے ساتھ شدید ترین بے چینی اور اضطراب و بے قراری کے عالم میں ملیں گے۔ چنانچہ وہ حضرت آدم علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوں گے اور ان سے گذارش کریں گے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے پروردگار سے شفاعت فرما دیجئے (کہ وہ ہمارے حساب و کتاب کا حکم جاری فرما دے اور ہمیں اجر و ثواب یا عذاب دے کر ہمارا معاملہ

ایک طرف کرے) حضرت آدم علیہ السلام جواباً فرمائیں گے میں شفاعت کی لیاقت نہیں رکھتا' البتہ تم لوگ ابراہیم علیہ السلام کے پاس جاؤ (تمہاری شفاعت کر سکیں گے) وہ اللہ تعالیٰ کے خلیل ہیں' چنانچہ وہ لوگ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوں گے اور حضرت ابراہیم علیہ السلام بھی ان سے جواباً یہ فرمائیں گے کہ میں شفاعت کی اہلیت نہیں رکھتا ہوں' البتہ تم لوگ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے پاس چلے جاؤ وہ کلیم اللہ ہیں (اور تمہاری شفاعت کر سکیں گے) وہ لوگ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوں گے اور حضرت موسیٰ علیہ السلام بھی اپنے پروردگار کی عدالت میں شفاعت کی اہلیت نہیں رکھتا ہوں' البتہ تم لوگ عیسیٰ علیہ السلام کے پاس چلے جاؤ جو اللہ تعالیٰ کی جانب سے روح ہیں اور اللہ تعالیٰ کا کلمہ ہیں۔ وہ لوگ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوں گے اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام بھی یہی جواب دیں گے کہ میں شفاعت کی اہلیت اور لیاقت نہیں رکھتا البتہ تم محمد ﷺ کے پاس چلے جاؤ (وہی یقیناً تمہاری شفاعت کر سکیں گے)''۔ آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا: تب لوگ میرے پاس آئیں گے (اور مجھ سے شفاعت کی درخواست کریں گے) میں ان سے جواباً کہوں گا کہ میں بلاشبہ شفاعت کی اہلیت و لیاقت رکھتا ہوں پھر میں اپنے پروردگار کی عدالت میں پیش ہونے کی اجازت طلب کروں گا' مجھے پیش ہونے کی اجازت رحمت فرمائی جائے گی اور (اس کے ساتھ ہی) اللہ تعالیٰ اپنی تعریف کے ایسے کلمات میرے دل میں ڈالے گا جس کے ذریعہ (اس وقت) میں اس کی حمد و ثنا کروں گا اور وہ حمد و ثنا (کن الفاظ اور کس اسلوب میں ہوگی) اس وقت مجھے معلوم نہیں ہے' بہر حال (جب میں اس کی بارگاہ میں پیش ہوں گا اور اس کو دیکھوں گا تو) سجدہ ریز ہو جاؤں گا اور اس کی وہی حمد و ثنا بیان کروں گا' پھر مجھ سے کہا جائے گا کہ محمد! اپنا سر اٹھایئے اور آپ جو بھی کہنا چاہتے ہیں کہئے آپ کی بات کو قبول کیا جائے گا اور آپ مانگئے (جو آپ چاہیں) آپ کو عنایت کیا جائے گا اور آپ شفاعت کیجئے آپ کی شفاعت کو قبول کیا جائے گا۔ میں (سجدہ سے سر اٹھانے کے بعد یا سجدہ ہی میں) عرض کروں گا کہ میرے پروردگار! میری امت کو بخش دیجئے' میری امت پر رحم فرمایئے (یا یہ مطلب ہے کہ میرے پروردگار میں اپنی امت کے بارے میں شفاعت کرتا ہوں) مجھ سے کہا جائے گا کہ جاؤ ہر اس شخص کو (دوزخ سے) نکال لو جس کے دل میں ایک جو کے بقدر بھی ایمان موجود ہے' پس میں جاؤں گا اور پروردگار کے حکم کے مطابق عمل کروں گا' اس کے بعد میں پھر بارگاہ رب العزت میں حاضر ہوں گا اور انہیں الفاظ میں اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا بیان کرتا ہوا سجدہ میں گر پڑوں گا پھر مجھ سے کہا جائے گا کہ محمد! اپنا سر اٹھایئے جو کہنا چاہتے ہیں کہئے کہو تمہاری بات سنی جائے گی جو مانگنا چاہتے ہیں مانگئے میں دوں گا اور جو شفاعت کرنا چاہتے ہو کرو میں قبول کروں گا میں عرض کروں گا میرے پروردگار میری امت کو بخش دیجئے' میری امت پر رحم فرمایئے! مجھ سے کہا جائے گا کہ جاؤ اور ہر اس شخص کو جہنم سے باہر نکال لیجئے جس کے دل میں ذرّے یا ایک رائی کے دانہ کے بقدر معمولی مقدار میں بھی ایمان ہے پس میں جاؤں گا اور پروردگار کے حکم کے مطابق عمل کروں گا' اس کے بعد پھر میں اپنے پرودگار کی عدالت میں حاضر ہو جاؤں گا اور انہی کلمات حمد کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی تعریف بیان کروں گا۔ پھر مجھ سے کہا جائے گا کہ محمد اپنا سر اٹھایئے اور کہئے جو بھی آپ کہنا چاہتے ہیں آپ کی بات کو قبول کیا جائے گا اور جو مانگنا چاہتے ہیں مانگیئے آپ کو عنایت کیا جائے گا اور آپ شفاعت کیجئے آپ کی شفاعت کو قبولیت بخشی جائے گی میں عرض کروں گا کہ میرے پروردگار میری امت کو بخش دیجئے' میری امت پر رحم فرمایئے مجھ سے کہا جائے گا کہ جاؤ اور ہر اس شخص کو (دوزخ

سے) نکال لو جس کے دل میں رائی کے کمتر سے کمتر سے بھی کمتر دانہ کے بقدر بھی ایمان موجود ہے۔ پس میں جاؤں گا اور پروردگار کے حکم کے مطابق عمل کروں گا۔ اس کے بعد پھر میں چوتھی مرتبہ حق تعالیٰ کی عدالت میں میں حاضر ہوں گا اور انہیں الفاظ میں اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا بیان کرتا ہوا سجدہ ریز ہو جاؤں گا' پھر مجھ سے پوچھا جائے گا کہ محمد اپنا سر اٹھائیے جو کہنا چاہتے ہیں کہیے تمہاری بات سنی جائے گی جو مانگنا چاہتے ہو مانگئے آپ کو دیا جائے گا اور جو شفاعت کرنا چاہتے ہو کرو آپ کی شفاعت کو قبول کیا جائے گا۔ میں عرض کروں گا میرے پروردگار (اب) مجھے اس شخص کی بھی شفاعت کی اجازت مرحمت فرما دیجئے جس نے لا الٰہ الا اللہ کہا ہو پروردگار فرمائے گا کہ نہیں' اس کا تم سے کوئی تعلق نہیں ہے بلکہ اپنے عزت و جلال اور اپنی ذاتی و صفاتی عظمت و بڑائی کی قسم اس شخص کو میں خود ہی لازماً جہنم سے نکال لوں گا جس نے لا الٰہ الا اللہ کہا ہوگا"۔

(بخاری و مسلم)

تشریح: قوله: ماج بعضهم في بعض ه۔۔۔فيقول لست لها: في بعض: (جار مجرور محذوف سے مل کر حال ہے) ای داخلین فیهم.

لست لها:۔ (جار مجرور محذوف سے مل کر "لست" کی خبر ہے۔) ای لست کائنا للشفاعة ولا مختصا بها. امام طیبیؒ نے فرمایا: کہ یہ لام آیت قرآنی کے اس لام کے مثل ہے: ﴿امتحن الله قلوبهم للتقوىٰ﴾[الحجرات۔۳] "جن کے دلوں کو اللہ تعالیٰ نے تقوی کے لئے خالص کر دیا ہے"۔

صاحب کشاف فرماتے ہیں: لام، محذوف کے متعلق ہے۔ اور یہ لام وہی لام ہے، جو عرب کے اس قول میں ہے: أنت لهذا الأمر ای کائن له و مختص له.

کسی کہنے والے نے کہا ہے:

أنت لها أحمد من بين البشر.

اور اسی طرح ان مثالوں میں ہے: ① أنا لها ② ليس ذلك له

قوله: ولكن عليهم ابراهيم۔۔ولكن عليهم بمحمد:

قوله: لكن عليكم بابراهيم ای الزموه۔ چنانچہ باء زائدہ ہے۔ یا مطلب یہ ہے: تشفعوا وتوسلوا به.

فيقول: حضرت موسیٰ علیہ السلام لوگوں کے اشفع الى ربك کے جواب میں یہ جملہ (لست لها الخ) ارشاد فرمائیں گے۔ یا پھر لوگوں کے شفاعت کے مطالبے کے بغیر ہی ابتداء ہی یہ جملہ ارشاد فرما دیں گے؛ چونکہ معاملہ کی نزاکت کا علم انہیں ہو ہی چکا ہوگا۔

فانه كلم الله: اس موقع پر کلام انہی کے شایان شان ہے۔

فانه روح الله و كلمته: اس جملہ کا مطلب یہ ہے کہ وہ پاکیزہ روح والے ہیں، اور ان کا کلمہ مستجاب ہے۔

قوله: فيا تونی فاقول۔۔۔شعيرة من ايمان:

فيأتونی: نون کی تشدید اور تخفیف کے ساتھ،

فایتاذن علی ربی: یعنی اللہ جل شانہ سے ہم کلام ہونے کی یا اس کی بارگاہ میں داخل ہونے کی اجازت چاہوں گا۔

ویلمنی کامد احمد بها: یہ الہام بھی اسی وقت ہی ہوگا۔

المحامد: حمد کی جمع ہے، غیر قیاسی طور پر، جیسا کہ "محاسن"، "حسن" کی جمع ہے۔ یا "محامد" **محمدة** کی جمع ہے۔

أخر: خائے معجمہ کے کسرہ اور راء کی تشدید کے ساتھ۔

ساجدا: حال ہے۔

یا رب أمتی أمتی: یعنی میری امت پر رحم فرمائیے۔ ان کی بخشش فرما دیجئے، ان کے ساتھ عزت والا معاملہ فرمائیے۔

"**أمتی أمتی**" کی تکرار برائے تاکید ہے۔ یا ان سے مراد سابقین ولاحقین ہیں۔ (یعنی پہلے لفظ "امتی" سے "سابقین" اور دوسرے لفظ "امتی" سے "لاحقین" کے حق میں دعا ہے)

فأخرج...... شعیرة: امام نوویؒ نے فرمایا "شعیر" کے برابر ایمان کی مقدار اللہ ہی جانتا ہے۔

مثقال: ایک مخصوص وزن کا باٹ ہے۔

اس بارے میں علماء کے مختلف اقوال ہیں۔ اور یہ اختلاف درحقیقت، اصل ایمان کے اختلاف پر مبنی ہے۔ درست بات یہی ہے کہ مذکورہ جملوں میں جس چیز کو جو یا رائی یا ذرہ کے برابر فرمایا گیا ہے۔ اس سے حقیقی ایمان مراد نہیں، بلکہ از قسم خیر و بھلائی وہ چیز مراد ہے جو ایمان کے ثمرات ونتائج، ایقان کی روشنی اور عرفان کے نور سے دل میں پیدا ہوتی ہے۔ اس چیز پر ایمان کا اطلاق حقیقۃً اس لئے نہیں کیا جا سکتا کہ محققین کے مطابق اصل ایمان نہ تو گھٹتا بڑھتا ہے، اور نہ اس کو مقدار یا حصہ میں بانٹا جا سکتا ہے۔ اور علماء کے اقوال کو محض لفظی اختلاف اور صوری نزاع پر محمول کیا ہے۔

فأفعل: یعنی ان لوگوں کو جہنم سے باہر نکالوں گا جن کی تعیین باری تعالیٰ کی طرف سے ہو چکی ہوگی۔

قوله: فأخرج من كان...... واشفع تشفع:

مثقال ذرة: اشیاء موزونہ میں سب سے قلیل مقدار ہے۔ بعض کا کہنا ہے کہ سورج کی روشنی میں نظر آنے والے سوئی کے سرے کے برابر باریک باریک ذرات کو ذرۃ کہا جاتا ہے۔ بعض کا کہنا ہے، کہ چھوٹی چیونٹی مراد ہے۔

أو خردلة من ایمان: اس "أوْ" میں متعدد احتمالات ہیں:

① برائے تخییر ہے۔ ② تنویع کیلئے ہے۔ ③ برائے شک ہے۔

من كان في قلبه ادنى ادنى ادنى: اُدنیٰ کو تین بار ذکر کرنے سے قلت میں مبالغہ مقصود ہے۔

قوله: فأقول: یارب ائذن لی فمن قال لا اله الا الله:

یعنی اگرچہ انہوں نے اپنے ایمان کی حالت میں یا ایمان لانے کے بعد اپنی پوری زندگی میں کلمہ طیبہ بھی صرف ایک ہی مرتبہ کیوں نہ زبان سے ادا کیا ہو۔ چونکہ فی الجملہ یہ عمل بھی عمل لاحق ہے، اور یہ مسلمہ ہے کہ أن الله لا یضیع أجر من أحسن عملا، اور ایک حدیث میں مطلقاً آتا ہے: من قال لا اله الا الله دخل الجنة. یہ حدیث دخول اولی اور آخری ہر دو کو شامل ہے۔

امام طیبیؒ فرماتے ہیں: اس سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ "بمثقال شعیرة من ایمان" اور "مثقال ذرة أو خردلة الایمان"، سے وہ اصل ایمان مراد نہیں ہے، جس کو "تصدیق قلبی" سے تعبیر کیا جاتا ہے، بلکہ اس اصل ایمان کے علاوہ کچھ اور مراد ہے۔ دلوں میں پائے جانے والے ایمان کے ثمرات مراد ہیں۔ اس کی دو صورتیں ہیں۔

پہلی صورت یہ ہے کہ "ثمرہ" سے از دیاد یقین مراد ہو، اور طمانیت نفس مراد ہو۔ چونکہ ظاہری ادلہ مدل علیہ کے لئے بہت قوی ہیں اور اس کی قوت کے لئے زیادہ مثبت ہیں۔

دوسری صورت یہ ہے کہ "ثمرہ" سے مراد "عمل" ہو اور یہ کہ عمل کی وجہ سے ایمان گھٹتا بڑھتا ہے۔ اور اس توجیہ کی تائید حضرت ابو سعید خدریؓ کی اگلی حدیث سے بھی ہوتی ہے:

ولم یبق الا أرحم الراحمین، فیقبض قبضة من نار فیخرج منها قوما لم یعملوا خیرا قط.

قوله: (لیس ذلك لك ......

۵۵۷۴ : وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ عَنِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اَسْعَدُ النَّاسِ بِشَفَاعَتِیْ یَوْمَ الْقِیَامَةِ مَنْ قَالَ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ خَالِصًا مِنْ قَلْبِهٖ اَوْ نَفْسِهٖ (رواه البخاری)

اخرجه البخاری فی صحیحه ۱۹۳/۱ حدیث رقم ۹۹، واحمد فی المسند ۳۷۳/۲

ترجمہ: "اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت بیان کرتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: قیامت کے دن میری شفاعت کے لئے نصیبہ والا شخص وہ ہوگا جس نے (دنیا میں) خلوص تہ دل سے' یا یہ کہ فرمایا کہ خلوص تہ نفس سے لا الٰہ الا اللہ کہا ہوگا"۔ (بخاری و مسلم)

تشریح: قوله: خالصامن قلبه او نفسه:

یعنی ایمان میں شک و شرک کی آمیزش نہیں کی، ایمان کو نفاق، سمعہ اور ریاء سے پاک رکھا۔

أو نفسه: راوی کو شک ہے۔

بعض حضرات کا کہنا ہے، کہ "اسعد"

اصل یہاں فعل کے معنی میں ہے۔ بعض کا کہنا ہے کہ نہیں، یہ اپنے اصل معنی میں ہے۔ اگر چہ ہر مؤمن کو آپ کی شفاعت کی سعادت حاصل ہوگی لیکن مؤمن مخلص زیادہ سعادت مند ہے۔ چونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شفاعت، محشر کی ہولنا کیوں میں، مخلوق کو محشر کی ہولنا کی سے راحت پہنچانے کیلئے ہوگی۔ اور ابو طالب جیسے بعض کافروں کے حق میں تخفیف عذاب کیلئے ہوگی۔

کرمانیؒ نے فرمایا: اس سے مراد وہ "خوش بخت" ہے جو اخلاص کے اس انتہائی درجہ پر فائز نہیں ہوگا۔ اور تاکید کی دلیل یہ ہے کہ "قلب" کا ذکر کیا گیا ہے۔ اور اخلاص کا محل قلب ہے۔ لہٰذا یہ مفید تاکید ہے۔ جیسا کہ اللہ جل شانہ کا یہ فرمان: ﴿ فَاِنَّهٗ اٰثِمٌ قَلْبُهٗ ﴾ [البقرة: ۲۸۳] "اس کا قلب گناہ گار ہوگا"۔

قاضیؒ نے فرمایا: "اسعد" یہاں "سعید" کے معنی میں ہے۔ چونکہ اہل توحید کے علاوہ کسی بھی شخص کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شفاعت کی سعادت حاصل نہیں ہوگی۔ یا "من قال" سے مراد وہ شخص ہے کہ جس کے پاس کوئی ایسا عمل نہ ہو کہ جس کے باعث

وہ مستحق جنت ہو پائے اور جہنم سے چھٹکارا حاصل کر پائے۔ چنانچہ ایسا شخص شفاعت کا زیادہ مستحق ہے، اور مزید یہ کہ شفاعت سے انتفاع زیادہ ہوگا۔

امام طیبیؒ فرماتے ہیں: یہ بات پہلے گزر چکی ہے، کہ شفاعت سے بہرہ مند وہی شخص ہوگا جس کا ایمان ثمر بار ہوگا، خواہ مزید طمانینت کی صورت میں خواہ عمل کی صورت میں۔ اور چونکہ یقین اور عمل کے مراتب مختلف ہیں، للہٰذا تفضیل بھی حسب مراتب ہو گی۔

اسی وجہ سے ''من قلبه'' کے ذریعے ''خالصاً'' کی تاکید لائی گئی۔ ای: خالصاً كائنا من قلبه۔ اور یہ بات تو معلوم ہی ہے کہ اخلاص کا محل معدن دل ہے، چنانچہ ''من قلبه'' کے ذکر سے تاکید وتقریر ہوگئی۔ جیسا کہ اللہ جل شانہ کے اس فرمان میں ہے: ﴿ فَاِنَّهٗۤ اٰثِمٌ قَلْبُهٗ ﴾[البقرة۔۲۸۳]

صاحب کشاف فرماتے ہیں۔

اگر یہ کہا جائے کہ ''فانه آثم'' پر اکتفاء کیوں نہیں کیا گیا؟ ''قلب'' کا ذکر کرنے کا کیا فائدہ ہے؟ اور جہاں تک گناہ گار ہونے کا تعلق ہے تو گناہ گار تو فی الجملہ (سارا جسم) ہے، صرف قلب گناہ گار نہیں ہے۔

میں کہتا ہوں: كتمان شهادت یہ ہے کہ آدمی شہادت کو چھپائے رکھے اور زبان پر نہ لائے تو چونکہ آدمی، قلب کے باعث ہی آثم اور مفتری بنتا ہے اس لئے فعل کی نسبت ''قلب'' کی طرف کر دی گئی۔ چونکہ فعل کی اسناد جوارح کی طرف کرنا ابلغ ہے، جیسا کہ آپ تاکید کی غرض سے یوں کہتے ہیں: هذا مما أبصرته عيني، ومما سمعته أذني، ومما عرفه قلبي، (یہ چیز تو ان چیزوں میں سے ہے جس کو میری آنکھوں نے دیکھا ہے، میرے کانوں نے سنا ہے، اور میرے دل نے پہچانا ہے۔)

توضیح: الجامع کی روایت میں یہ الفاظ ہیں: خالصاً مخلصا من قبله. اس روایت میں ''أو من نفسه'' کے الفاظ موجود نہیں ہیں۔

۵۵۷۵ : وَعَنْهُ قَالَ اُتِیَ النَّبِیُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِلَحْمٍ فَرُفِعَ اِلَيْهِ الذِّرَاعُ وَكَانَتْ تُعْجِبُهٗ فَنَهَسَ مِنْهَا نَهْسَةً ثُمَّ قَالَ اَنَا سَيِّدُ النَّاسِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ يَوْمَ يَقُوْمُ النَّاسُ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ وَتَدْنُو الشَّمْسُ فَيَبْلُغُ النَّاسُ مِنَ الْغَمِّ وَالْكَرْبِ مَالَا يُطِيْقُوْنَ فَيَقُوْلُ النَّاسُ اَلَا تَنْظُرُوْنَ مَنْ يَّشْفَعُ لَكُمْ اِلٰى رَبِّكُمْ فَيَاْتُوْنَ اٰدَمَ وَذَكَرَ حَدِيْثَ الشَّفَاعَةِ وَقَالَ فَاَنْطَلِقُ فَاٰتِيْ تَحْتَ الْعَرْشِ فَاَقَعُ سَاجِدًا لِّرَبِّيْ ثُمَّ يَفْتَحُ اللّٰهُ عَلَيَّ مِنْ مَحَامِدِهٖ وَحُسْنِ الثَّنَاءِ عَلَيْهِ شَيْئًا لَمْ يَفْتَحْهُ اللّٰهُ لِاَحَدٍ قَبْلِيْ ثُمَّ قَالَ يَا مُحَمَّدُ ارْفَعْ رَاْسَكَ تُعْطَهْ وَاشْفَعْ تُشَفَّعْ فَاَرْفَعُ رَاْسِيْ فَاَقُوْلُ اُمَّتِيْ يَا رَبِّ اُمَّتِيْ يَارَبِّ اُمَّتِيْ يَارَبِّ فَيُقَالُ يَا مُحَمَّدُ اَدْخِلْ مِنْ اُمَّتِكَ مَنْ لَّا حِسَابَ عَلَيْهِمْ مِنَ الْبَابِ الْاَيْمَنِ مِنْ اَبْوَابِ الْجَنَّةِ وَهُمْ شُرَكَآءُ النَّاسِ فِيْمَا سِوٰى ذٰلِكَ مِنَ الْاَبْوَابِ ثُمَّ قَالَ وَالَّذِيْ نَفْسِيْ بِيَدِهٖ اِنَّ مَا بَيْنَ الْمِصْرَاعَيْنِ مِنْ مَصَارِيْعِ الْجَنَّةِ كَمَا بَيْنَ مَكَّةَ وَهَجَرَ. (متفق عليه)

اخرجه البخاری فی صحيحه ۳۹۵/۸حديث رقم ٤٧١٢ ومسلم فی صحيحه ۱۸٤/۱حديث رقم (۳۲۷-۱۹٤) والترمذی فی السنن ٢٤٤/٤حديث رقم ۱۸۳۷، وابن ماجه ۱۰۹۹/۲حديث رقم ۳۳۰۷ واحمد فی المسند ۲/٤٣٥۔

ترجمہ: ''حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا کہ (ایک روز) رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں (پکا ہوا) گوشت لایا گیا جس میں سے آپ کی خدمت میں دست کا گوشت پیش کیا گیا جو آپ ﷺ کو پسند اور مرغوب تھا۔ آپ ﷺ نے اس میں سے دانتوں سے نوچ نوچ کر تناول فرمایا اور پھر آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا'' یعنی قیامت کے دن' جس روز تمام لوگ عام جہانوں کے پروردگار کے حضور اس کا فیصلہ سننے کے منتظر کھڑے ہوں گے' تمام لوگوں کا سردار ہوں گا' اس دن سورج (لوگوں کے سروں کے) نزدیک ترین ہوگا اور لوگوں کی حالت (مسلسل کھڑے رہنے' ماحول کے ہولناک اور غمناک ہونے اور انتہائی شدید گرمی کی تپش کے باعث) اس قدر کربناک اور غم وفکر سے بوجھل ہوگی کہ وہ ہمت ہار بیٹھیں گے' اور نہایت حیرانی وپریشانی کے عالم میں) ایک دوسرے سے چہ مگوئیاں کریں گے کہ تمہاری نظر میں کوئی ایسا شخص نہیں ہے جو تمہارے پروردگار سے تمہارے حق میں شفاعت کر سکے (اور وہ تمہیں اس کرب واذیت کی حالت سے نجات عطا کر دے) چنانچہ لوگ حضرت آدم علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوں گے''۔ اس کے بعد حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے یا خود آنحضرت ﷺ نے شفاعت کے سلسلے میں حدیث کے (وہی) اجزا بیان کئے (جو پہلے ایک حدیث میں بیان ہو چکے ہیں کہ لوگ یکے بعد دیگرے کئی پیغمبروں کے پاس جا کر شفاعت کی گذارش کریں گے اور وہ سب جواب دیں گے کہ ہم اس کام کی اہلیت نہیں رکھتے اور پھر وہ لوگ شفاعت کی گذارش لے کر میرے پاس آئیں گے یہ ذکر کرنے کے بعد آپ ﷺ نے فرمایا: پس میں لوگوں کے پاس سے روانہ ہوں گا اور عرش کے نیچے آؤں گا اور وہاں (اللہ تعالیٰ کی عدالت میں) اپنے پروردگار کے سامنے سجدہ ریز ہو جاؤں گا' پھر اللہ تعالیٰ مجھ پر اپنی حمد اور بہترین ثنا کے وہ الفاظ واسلوب منکشف کردے گا جو مجھ سے پہلے اس نے کسی پر منکشف نہیں کئے ہوں گے جیسا کہ پہلے ایک حدیث میں اس طرف اشارہ کیا جا چکا ہے' پھر پروردگار فرمائے گا کہ محمد! اپنا سر اٹھایئے اور جو آپ چاہتے ہیں مانگیے آپ کو دیا جائے گا آپ جو بھی شفاعت کرنا چاہتے ہیں شفاعت کیجئے آپ کی شفاعت کو قبول کیا جائے گا (یہ سن کر) میں اپنا سر اٹھاؤں گا اور عرض کروں گا کہ میرے پروردگار! میری امت کو بخش دیجئے' تب کہا جائے گا کہ اے محمد! آپ ﷺ اپنی امت میں سے ان لوگوں کو جن سے حساب و کتاب نہیں ہوگا (اور جو حساب کے بغیر جنت کے مستحق ہیں) جنت کے دروازوں میں سے داہنے دروازے سے جنت میں داخل کر دیجئے اور وہ لوگ اس دروازہ کے علاوہ دوسرے (جانبوں کے دروازوں کے استعمال کرنے کے حق میں بھی لوگوں کے ساتھ شریک ہیں اس کے بعد آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا: قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ قدرت میری جان ہے' جنت کے دروازوں میں سے ہر ایک دروازے کے دونوں کواڑوں کا درمیانی فاصلہ اتنا ہی ہے جتنا کہ مکہ اور حجر درمیانی مسافت ہے''۔ (بخاری ومسلم)

تشریح: قوله: أتي النبيُّ بلحم ۔۔۔نهس منها نهسة:

كانت: ضمر کا مرجع'' الذراع'' ہے۔

فنهس: سین مہملہ کے ساتھ، اور یہ بھی کہا گیا کہ شین معجمہ کے ساتھ ہے۔ قاضی عیاضؒ فرماتے ہیں: اکثر رواۃ نے سین مہملہ کے ساتھ روایت کیا ہے۔ اور ابن ہامان نے شین معجمہ کے ساتھ روایت کیا ہے۔

النهس: سین مہملہ کے ساتھ، اس کا معنی ہے: الأ خذ با طراف الأ سنان۔ (دانتوں کے کناروں سے نوچنا)۔ اور النهش، شین معجمہ کے ساتھ اس کا معنی ہے: الأ خذ بالأضراس (ڈاڑھ سے نوچنا)

قوله: قال :انا سيد الناس يوم القيامة۔۔۔مالا يطيقون:

سرداری بایں طور حاصل ہوگی، کہ اس دن ہر ایک شخص آپ ﷺ کی شفاعت کا محتاج ہوگا، جب سب لوگ نہایت مضطرب و پریشان ہوں گے، تو آخر میں آپ ﷺ ہی کے پاس شفاعت کی درخواست لے کر آئیں گے۔ اس کی تائید اس حدیث سے بھی ہوتی ہے: أنا سيد ولد آدم يوم القيامة ولا فخر، وبيدى لواء الحمد ولا فخر، وما من نبي يومئذ آدم فمن سواه الا تحت لوائي، وأنا اول من تنشق عنه الأرض ولا فخر، وأنا أول شافع وأول مشفع ولا فخر.

اس حدیث کو امام ترمذی، امام احمدؒ، اور امام ابن ماجہؒ نے ابوسعید سے روایت کیا ہے۔

امام طیبیؒ فرماتے ہیں: " يوم يقوم الناس لرب العالمين" بدل ہے، "يوم القيامة" سے۔

ابن الملکؒ فرماتے ہیں: احتمال یہ ہے کہ یہ سائل کے جواب میں ارشاد فرمایا گیا ہو، یعنی سائل نے پوچھا ہو: ما يوم القيامة؟ میں کہتا ہوں کہ ممکن ہے، کہ یہ " أعني " فعل محذوف کیلئے مفعول بہ ہو، یا "هو" مبتدا محذوف کی وجہ سے مرفوع ہے۔ اور " يوم" منصوب علی الحکایۃ ہے۔

فيبلغ الناس: " الناس" منصوب ہے۔ اور ایک نسخہ میں "الناس" مرفوع ہے۔

من الغم: ("من" سببیہ ہے)۔ أى من اجله وسببه.

ما لا يطيقون: یعنی اس تکلیف پر مزید صبر کرنے پر قادر نہیں ہوں گے۔ اور جزع فزع کرنے لگیں گے۔ اور یہی گرمی پسینے کی لگام کا موجب بنے گی۔

قوله: وقال: فانطلق ۔۔۔ ذلك من ابواب الجنة:

فآتي: مدّ کے ساتھ ہے۔

اس حدیث اور حضرت انسؓ سے مروی اس حدیث: "علي ربي في داره " کے درمیان تطبیق یوں ہوگی کہ اللہ تعالیٰ کا گھر جنت ہے۔ اور جنت عرش الٰہی کے نیچے ہی ہے۔

تطبیق کی ایک اور صورت یہ بیان کی گئی ہے، کہ حضرت انسؓ کی حدیث جنت کے بارے میں ہے۔ اور حضرت ابوہریرہؓ کی حدیث کا تعلق موقف سے ہے۔

سل تعطه: جملہ مستانفہ ہے۔

يا رب: ان الفاظ کو تین بار کہنا تاکید اور مبالغہ کی غرض سے ہوگا یا ان الفاظ کو بار بار دہرانے سے گناہ گاروں کے طبقوں کی طرف اشارہ کرنا مقصود ہوگا۔

قولہ: وھم شرکاء الناس فیما سوی ذلك من الابواب:
یعنی اس دروازہ کے علاوہ باقی تمام دروازے دوسرے سب لوگوں کیلئے مشترک ہوں گے اور مذکورہ لوگ بھی ان دروازوں کو استعمال کرنے کا حق رکھیں گے۔ ان لوگوں کے اعزاز وتکریم کی خاطر اللہ تعالیٰ کی طرف سے ازراہ عنایت جنت کے دائیں طرف کا دروازہ ان ہی لوگوں کے لئے مخصوص ہوگا، ان کے علاوہ کسی اور کو اس دروازہ سے داخلہ کی اجازت نہیں ہوگی۔

قولہ: والذی نفسی بیدہ ......:

المصراعین: میم کے کسرہ کے ساتھ۔ (دروازہ کے دو پٹ)

ھجر: ہاء اور جیم، دونوں کے فتحہ کے ساتھ، منصرف ہے۔ اور غیر منصرف بھی استعمال ہوتا ہے۔ الصحاح میں لکھتے ہیں: **ھجر**، ایک شہر کا نام ہے۔ منصرف ہے۔ اور ایک شارح کا کہنا ہے، کہ یہ بحرین کا ایک قریہ ہے۔ اور بعض کا کہنا ہے، کہ یہ مدینہ کا ایک قریہ ہے۔ قول اول معتمد ہے۔

مظہرؒ نے فرمایا: **المصراعان البابان المغلقان علی منفذ واحد.** (وہ دروازے جو ایک ہی منفذ پر بند ہوتے ہیں) "**مصراع**" بروزن "**مِفعال**" **الصرع** سے مشتق ہے، بمعنی الالقاء. بند دروازہ کو مصراع اس وجہ سے کہتے ہیں، کہ دروازہ "کثیر الالقاء والافع" ہوتا ہے۔ (یعنی اس سے بکثرت آمدورفت ہوتی ہے)

۵۵۷۶ : وَعَنْ حُذَيْفَةَ فِي حَدِيْثِ الشَّفَاعَةِ عَنْ رَّسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ وَتُرْسَلُ الْاَمَانَةُ وَالرَّحْمُ فَتَقُوْمَانِ جَنْبَتَيِ الصِّرَاطِ يَمِيْنًا وَشِمَالاً (رواہ مسلم)

اخرجہ مسلم فی صحیحہ ۱۸۴/۱ حدیث رقم (۳۲۹-۱۹۵)۔

ترجمہ: "حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ ﷺ سے شفاعت کے متعلق (تفصیلی) حدیث روایت فرماتے ہوئے بیان کیا کہ آپ ﷺ نے (پھر بعد میں یہ بھی) ارشاد کہ "امانت اور رحم یعنی قرابت داری کو بھیجا جائے گا اور وہ دونوں پل صراط کے دائیں بائیں اطراف میں کھڑی ہو جائیں گے"۔ (مسلم)

تشریح: جنبتی: جیم، نون، باء اور تاء چاروں پر فتحہ ہے۔

تورپشتی رحمہ اللہ نے فرمایا: "**جنبتی الصراط**" سے مراد صراط کا دایاں اور بایاں ناحیہ مراد ہے۔

حدیث کا مطلب یہ ہے کہ امانت اور رحم دونوں چونکہ نہایت اہمیت اور بہت زیادہ فضیلت رکھتی ہیں اس لئے یہ دونوں باتیں ان چیزوں میں سے ہیں جن کی رعایت ملحوظ رکھنا بندوں پر لازم ہے۔ اسی وجہ سے قیامت کے دن ممثل ہو کر امین اور خائن واصل اور قاطع کے حق میں گواہی دیں گی۔ چنانچہ جس شخص نے اپنی دنیاوی زندگی میں ان دونوں کی رعایت رکھی ہوگی، یہ دونوں اس کے حق میں جھگڑیں گی، اور جس شخص نے ان دونوں کو ضائع کیا ہوگا، اس کے خلاف گواہی دیں گی۔ تاکہ دونوں طرح کے لوگوں کے درمیان امتیاز ہو جائے۔

اس حدیث میں اس امر کی ترغیب ہے کہ ان دونوں کے حقوق کی ادائیگی اور ان کی بہر صورت ملحوظ رکھنے کا پورا پورا اہتمام رکھنا چاہیے۔

امام طیبیؒ نے فرمایا: ممکن ہے کہ "امانت" سے مراد امانت عظمی ہو، کہ جس کا ذکر اللہ جل شانہ کے اس فرمان میں ہے: ﴿ اِنَّا عَرَضْنَا الْاَمَانَةَ عَلَى السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَالْجِبَالِ ﴾ [الاحزاب:٧٢] "ہم نے یہ امانت (یعنی احکام جو بمنزلہ امانت کے ہیں) آسمان وزمین اور پہاڑوں کے سامنے پیش کی تھی" اور صلہ رحمی سے مراد "صلہ کبری" ہو (یعنی اعلی درجہ کی صلہ رحمی) کہ جس کا ذکر اللہ عزوجل کے اس ارشاد گرامی میں ہے: ﴿ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمُ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ وَّخَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِيْرًا وَّنِسَآءً ۚ وَاتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِيْ تَسَآءَلُوْنَ بِهٖ وَالْاَرْحَامَ ﴾ [النساء:١] "اے لوگو! اپنے پروردگار سے ڈور جس نے تم کو اپنی جاندار سے اس کا جوڑا پیدا کیا اور ان دونوں میں سے بہت سے مرد اور عورتیں پھیلائیں اور تم اللہ تعالیٰ سے ڈور جس کے نام سے ایک دوسرے کو مطالبہ کرتے ہو" چنانچہ حدیث کے مفہوم میں امر اللہ کی تعظیم اور مخلوقِ خدا پر شفقت بھی داخل ہو جائے گی۔ اور گویا کہ اسلام ایمان و دین کے دو گوشوں کے ذکر پر اکتفاء کیا ہے۔

۵۵۷۷ : وَعَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عَمْرِو بْنِ الْعَاصِ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ تَلَا قَوْلَ اللّٰهِ تَعَالٰى فِيْ اِبْرَاهِيْمَ رَبِّ اِنَّهُنَّ اَضْلَلْنَ كَثِيْرًا مِّنَ النَّاسِ فَمَنْ تَبِعَنِيْ فَاِنَّهٗ مِنِّيْ وَقَالَ عِيْسٰى اِنْ تُعَذِّبْهُمْ فَاِنَّهُمْ عِبَادُكَ فَرَفَعَ يَدَيْهِ فَقَالَ اَللّٰهُمَّ اُمَّتِيْ اُمَّتِيْ وَبَكٰى فَقَالَ اللّٰهُ تَعَالٰى يَا جِبْرَئِيْلُ اِذْهَبْ اِلٰى مُحَمَّدٍ وَّرَبُّكَ اَعْلَمُ فَاسْئَلْهُ مَا يُبْكِيْهِ فَاَتَاهُ جِبْرَئِيْلُ فَسَاَلَهٗ فَاَخْبَرَهٗ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِمَا قَالَ فَقَالَ اللّٰهُ لِجِبْرَئِيْلَ اِذْهَبْ اِلٰى مُحَمَّدٍ فَقُلْ اِنَّا سَنُرْضِيْكَ فِيْ اُمَّتِكَ وَلَا نَسُوْٓءُكَ.

(رواه مسلم)

اخرجه مسلم في صحيحه ١٩١/١ حديث رقم (٣٤٦-٢٠٢)۔

ترجمہ: "حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما روایت نقل فرماتے ہیں کہ (ایک روز) رسول اللہ ﷺ نے (اپنی مجلس میں لوگوں کے سامنے) حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بارے میں (یہ بیان کرنے کے لئے کہ وہ قیامت کے دن اپنی امت کے بارے میں اللہ تعالیٰ کی عدالت میں کیا عرض کریں گے) یہ آیت تلاوت فرمائی: ﴿ رَبِّ اِنَّهُنَّ اَضْلَلْنَ كَثِيْرًا مِّنَ النَّاسِ فَمَنْ تَبِعَنِيْ فَاِنَّهٗ مِنِّيْ ﴾ (اور آیت کا بقیہ حصہ یہ ہے وَمَنْ عَصَانِيْ فَاِنَّكَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ) اور مکمل آیت کا ترجمہ یہ ہے کہ اے میرے پروردگار! یہ بت بہت سے لوگوں کی گمراہی کا سبب بنے ہیں' پس ان لوگوں میں سے جنہوں نے میری تابعداری اختیار کی' یعنی توحید' اخلاص اور توکل کی راہ پر گامزن ہوئے وہ وہی لوگ میرے اپنے اور میرے حلقہ میں شامل ہیں اور جنہوں نے میری نافرمانی کی تو یقیناً تو بہت بخشنے والا رحم فرمانے والا ہے) پھر آپ ﷺ نے (اسی سلسلہ میں) حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں یہ آیت تلاوت فرمائی (اس بات کے بیان میں کہ وہ روز قیامت اپنی آیت کے متعلق پروردگار سے کیا عرض کریں گے) اِنْ تُعَذِّبْهُمْ فَاِنَّهُمْ عِبَادُكَ (اور آیت کا بقیہ حصہ یہ ہے وَاِنْ تَغْفِرْ لَهُمْ فَاِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ) اور مکمل آیت کا ترجمہ اس طرح ہے: اگر تو ان کو مبتلائے سزا و عذاب کر دے تو بہر حال وہ تیرے ہی بندے ہیں' یعنی تو ان کا مطلق مالک ہے اور مالک کو اس بات سے کون روک سکتا ہے"۔ اگر تو ان کو بخش دے تو بلاشبہ تو زبردست بہت حکمت والا ہے"۔ یعنی تجھ پر کوئی غالب نہیں ہے' تو جو چاہے حکم کر سکتا ہے' کوئی بھی تیرے حکم کو پس پشت

ڈالنے کی ہمت نہیں رکھتا پھر یہ کہ تیری حکمت و دانائی میں بھی ذرہ برابر شبہ نہیں' تو ہر ایک کے بارے میں وہی حکم کرتا ہے جس کا وہ مستحق و مستوجب ہوتا ہے اور ہر کسی کو وہی مقام دیتا ہے جس کا وہ لائق اور اہل ہوتا ہے) اس کے بعد آپ ﷺ نے اپنے دونوں ہاتھ اٹھائے اور دعا کی کہ پروردگار میری امت کو بخش دے میری امت پر رحم فرما اور (یہ دعا کرتے ہوئے) آپ ﷺ رونے لگے۔ (فوراً) اللہ تعالیٰ نے حضرت جبرئیل علیہ السلام کو حکم دیا کہ محمد (ﷺ) کے پاس جاؤ اور حالانکہ اے جبرئیل علیہ السلام تمہارا رب بخوبی اس سے واقف ہے (اس کو کچھ جاننے کے لئے کسی سے پوچھنے کی کوئی حاجت نہیں ہے) مگر (محمد ﷺ کی دلجوئی اور پروردگار کی عنایت و توجہ کے اظہار کی خاطر) ان سے پوچھو کہ آپ ﷺ کو کیا چیز رلا رہی ہے (یہ حکم سنتے ہی) حضرت جبرائیل علیہ السلام آنحضرت ﷺ کے پاس آئے اور آپ ﷺ سے رونے کا سبب پوچھا' آپ ﷺ نے اپنے الفاظ میں ان سے بیان فرمایا پھر (حضرت جبرئیل علیہ السلام اللہ تعالیٰ کی عدالت میں واپس جا کر صورت حال بتلائی اور تب) اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: محمد ﷺ کے پاس جاؤ اور کہو کہ (جب وقت آئے گا تو) ہم یقیناً آپ کو آپ کی امت کے بارے میں راضی و خوش کر دیں گے اور آپ کو ہرگز غمزدہ نہ ہونے دیں گے''۔ (مسلم)

تشریح: قولہ: تلاقول اللہ تعالٰی ---- فانہ منی:

فی ابراھیم علیہ السلام: (ابراہیم سے پہلے لفظ ''سورۃ'' مضاف محذوف ہے۔) ای: **فی سورۃ ابراھیم.** یا تقدیری عبارت یوں ہے: **حاکیا فی حقہ.**

آیت کا بقیہ حصہ ہے: ﴿**ومن عصانی فانك غفور رحیم**﴾ یعنی شرک سے ہلکے درجے میں جس کی چاہیں مغفرت کریں، اور جس پر چاہیں فضل فرماتے ہوئے رحم فرمائیں۔ یا یہ کہ آپ عاصی مشرک کی مغفرت فرماتے ہیں، بایں طور کہ دنیا میں ایمان واطاعت کی توفیق عطا فرمادیتے ہیں اور آخرت میں زیادہ سے زیادہ ثواب کی صورت میں رحم فرما فرماتے ہیں۔

قولہ: وقال عیسی علیہ السلام ان تعذبھم فانھم عبادك:

امام نوویؒ نے فرمایا: ''قال''، مصدر ہے۔ **أی قال قولاً وقالاً وقیلاً.** ''**عیسی**'' مضاف الیہ ہے۔ اور ''قال'' کا عطف، ''**تلا**'' کے معمول پر ہے۔ أی: **تلا قول اللہ وقول عیسی.**

آیت کا اگلا باقی حصہ یہ ہے: ﴿**وان تغفر لھم فانك أنت العزیز الحکیم**﴾ ''اور اگر آپ ان کو معاف کر دیں تو آپ زبردست ہیں حکمت والے ہیں'' یعنی تجھ پر کوئی غالب نہیں ہے چونکہ تو قوی و قادر ہے، تو جو چاہے حکم کر سکتا ہے، کوئی بھی تیرے حکم کو پس پشت ڈالنے کی طاقت نہیں رکھتا، اور تو حکیم ہے کہ ہر ایک کے بارے میں وہی حکم کرتا ہے، جس کا وہ مستوجب ہے، اور ہر چیز کو وہی جگہ دیتا ہے، جہاں کی وہ سزاوار ہے۔

قولہ: فقال اللھم امتی امتی ......:

اللھم امتی أمتی:

یعنی اے پروردگار! میری امت کو بخش دے، میری امت پر رحم فرما۔ شاید کہ وجہ تکرار یہی ہے۔ یا یہ کہ تاکید مراد ہے۔ یا اس سے مراد اولین وآخرین ہیں۔

وبکی: رونے کی وجہ یہ تھی کہ آنحضرت ﷺ کو حضرت ابراہیم خلیل اللہ اور حضرت عیسیٰ روح اللہ کا شفاعت کرنا یاد آیا تو اپنی امت پر خوف محسوس فرمانے لگے۔

وربك اعلم: جملہ معترضہ حالیہ ہے۔ اگلے جملے سے پیدا ہونے والے وہم کے دفعیہ کیلئے ذکر فرمایا۔

فا سأله: ہمزہ کے ساتھ اور نقل کے ساتھ۔

"ولا نسوؤك": یعنی کسی بھی شخص کے بارے میں آپ کو رنجیدہ نہیں کریں گے، بلکہ سب کو نجات دے دیں گے، آپ کی رضامندی کی خاطر انہیں بھی راضی کر دیں گے۔ یہ بھی ایک قسم کی تاکید ہے، چونکہ "سنرضیك" سے بعض اوقات یہ وہم ہو سکتا ہے، کہ "ہم آپ کو آپ کی امت کے بعض افراد کے بارے میں راضی وخوشی کر دیں گے۔ اس وجہ سے بعض لوگوں نے فرمایا: "حضرت محمدؐ کی امت کا اگر ایک بھی فرد جہنم میں ہوگا تو آپؐ راضی نہیں گے"

عرض مرتب: آگے آنے والا کلام درحقیقت امام طیبیؒ کی تشریحات کی صرف تردید ہے، اس لئے وہ سارا کلام حذف کر دیا ہے۔

امام طیبیؒ فرماتے ہیں: تکریر مزید تقریر کے لئے ہے۔

اسی وجہ سے حدیث میں "انا سنرضيك" کے ذریعہ جواب دیا گیا، اولاً تو "انّ"، پھر ضمیر تعظیم اور سین تاکید اور پھر اس کے بعد **لا نسوؤك** ذکر فرمایا، یہ **"على سبيل الطرد والعكس"** "تقریر بعد تقریر" ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿**ولسوف يعطيك ربك فترضى**......﴾ [الضحی:۵] "اور عنقریب اللہ تعالیٰ آپ کو (آخرت میں بکثرت نعمتیں) دے گا سو آپ خوش ہو جاویں گے" حرف استقبال کے شروع میں لام ابتداء لایا گیا، اور حرف تاکید و تاخیر کو جمع کیا، چنانچہ معنوی تقدیر یوں ہوگی: **لأنت سوف يعطيك ربك وإن تأخر العطاء۔**

"وربك أعلم": یہ جملہ از "باب تتمیم" ہے، جو ذہن کی وہم سے حفاظت کے لئے لایا گیا ہے۔ یہ جملہ، اس ارشاد باری تعالیٰ کی طرح ہے: ﴿قَالُوْا نَشْهَدُ اِنَّكَ لَرَسُوْلُ اللّٰهِ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ اِنَّكَ لَرَسُوْلُهٗ وَاللّٰهُ يَشْهَدُ اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ لَكٰذِبُوْنَ﴾ [المنافقون:۱] "تو کہتے ہیں کہ ہم (دِل سے) گواہی دیتے ہیں کہ آپ بے شک اللہ کے رسول ہیں اور یہ تو اللہ کو معلوم ہے کہ آپ اللہ کے رسول ہیں (اس میں تو ان کے قول کی تکذیب نہیں کی جاتی) اور (باوجود اس کے) اللہ تعالیٰ گواہی دیتا ہے کہ یہ منافقین (اس کہنے میں جھوٹے ہیں)۔"

امام نوویؒ فرماتے ہیں: یہ حدیث کئی فوائد پر مشتمل ہے۔

اوّل: آنحضرت ﷺ اپنی امت پر کمال شفیق ہیں، کہ اپنی اُمت کے لوگوں کی صلاح وفلاح کی طرف ہر لمحہ متوجہ رہتے تھے۔

دوم: اس امت مرحومہ کیلئے بشارت عظیمہ ہے، کہ اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ سے وعدہ فرمایا ہے، کہ ہم آپ ﷺ کو آپ ﷺ کی اُمت کے بارے میں راضی وخوش کر دیں گے، رنجیدہ نہیں کریں گے۔ اور یہ بات اس مرحومہ امت کیلئے انتہائی امید افزا ہے۔

سوم: آنحضرت ﷺ اللہ کے ہاں عظیم المرتبت ہیں۔

چہارم: حضرت جبرائیل علیہ السلام کو بھیج کر سوال کرنے کی حکمت یہ تھی کہ آنحضرت ﷺ کے فضل وشرف کا اظہار تھا۔ اور یہ کہ آنحضرت ﷺ کا مرتبہ اللہ کے ہاں بہت بلند ہے حتی کہ انہیں راضی کیا جائے گا۔ اور اعزاز وتکریم کی جائے گی۔

تخریج: اس حدیث کو اسی طرح بخاری اور امام نسائیؒ نے بھی ذکر کیا ہے۔ (ذکرہ السید)

۵۵۷۸ : وَعَنْ اَبِیْ سَعِیْدِ الْخُدْرِیِّ اَنَّ نَاسًا قَالُوْا یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ هَلْ نَرٰی رَبَّنَا یَوْمَ الْقِیَامَةِ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ نَعَمْ هَلْ تُضَآرُّوْنَ فِیْ رُؤْیَةِ الشَّمْسِ بِالظَّهِیْرَةِ صَحْوًا لَیْسَ مَعَهَا سَحَابٌ وَهَلْ تُضَآرُّوْنَ فِیْ رُؤْیَةِ الْقَمَرِ لَیْلَةَ الْبَدْرِ صَحْوًا لَیْسَ فِیْهَا سَحَابٌ قَالُوْا لَا یَارَسُوْلَ اللّٰهِ قَالَ مَا تُضَآرُّوْنَ فِیْ رُؤْیَةِ اَحَدِهِمَا اِذَا كَانَ یَوْمَ الْقِیَامَةِ اَذَّنَ مُؤَذِّنٌ لِیَتَّبِعْ كُلُّ اُمَّةٍ مَا كَانَتْ تَعْبُدُ فَلَا یَبْقٰی اَحَدٌ كَانَ یَعْبُدُ غَیْرَ اللّٰهِ مِنَ الْاَصْنَامِ وَالْاَنْصَابِ اِلَّا یَتَسَاقَطُوْنَ فِی النَّارِ حَتّٰی اِذَا لَمْ یَبْقَ اِلَّا مَنْ كَانَ یَعْبُدُ اللّٰهَ مِنْ بَرٍّ وَفَاجِرٍ اَتَاهُمْ رَبُّ الْعَالَمِیْنَ قَالَ فَمَا ذَا تَنْظُرُوْنَ یَتَّبِعُ كُلُّ اُمَّةٍ مَا كَانَتْ تَعْبُدُ قَالُوْا یَارَبَّنَا فَارَقْنَا النَّاسَ فِی الدُّنْیَا اَفْقَرَمَا كُنَّا اِلَیْهِمْ وَلَمْ نُصَاحِبْهُمْ۔

اخرجه مسلم فی صحیحه ١٦٤/١ حدیث رقم (٢٩٩-١٨٢)۔

ترجمہ: ''حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ (ایک روز مجلس نبوی ﷺ میں چند) لوگوں نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ کیا روز قیامت ہم اپنے رب کو دیکھ لیں گے؟ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ہاں تم دیکھ لوگے''۔ (پھر آپ ﷺ نے دیدار الٰہی کے ثبوت کی مزید وضاحت اور تفہیم کی خاطر لوگوں سے پوچھا کہ) کیا تم لوگ دوپہر کے وقت جب کہ آسمان پر ابر کا کوئی ٹکڑا بھی نہ ہو سورج کو دیکھنے میں کوئی رکاوٹ ومشقت محسوس کرتے ہو؟ اور کیا تم لوگ شفاف چودھویں رات میں جب کہ آسمان پر ابر کا کوئی ایک ٹکڑا بھی نہ ہو چاند کو دیکھنے میں کوئی رکاوٹ ومشقت محسوس کرتے ہو؟'' لوگوں نے عرض کیا کہ ہرگز نہیں یا رسول اللہ! فرمایا: تو پھر قیامت کے دن تمہیں خدا تعالیٰ کے دیدار میں بھی کو دقت اور رکاوٹ کا سامنا نہیں کرنے پڑے گا' ہاں جیسا کہ تم ان دونوں (یعنی سورج وچاند) میں سے کسی کو دیکھنے میں رکاوٹ و تکلیف محسوس کرتے ہو۔ (اس کے بعد آپ ﷺ نے فرمایا) جب قیامت کا دن برپا ہوگا (اور تمام مخلوق میدان محشر میں اکٹھی ہو جائے گی' تو ایک منادی نداء دے گا کہ جو طبقہ (دنیا میں) جس شئی کی پرستش کرتا تھا وہ اسی کے پیچھے رہے' چنانچہ جو لوگ اللہ تعالیٰ کے بجائے بتوں اور انصاب سے پجاری تھے۔ ان میں سے کوئی ایک بھی باقی نہیں بچے گا اور سب کے سب جہنم میں گر پڑیں گے۔ کیونکہ انصاب اور بت کہ جن کی پوجا ہوتی تھی' دوزخ میں پھینکے جائیں گے' لہٰذا ان کے ساتھ ان کی پوجا کرنے والے بھی دوزخ میں ڈالے جائیں گے) یہاں تک کہ جب ان لوگوں کے علاوہ کوئی باقی نہ بچے گا جو اللہ تعالیٰ کی عبادت کرتے تھے وہ خواہ نیک ہوں یا بد' تو تمام جہانوں کا پروردگار ان کے پاس آئے گا اور فرمائے گا کہ تم کس کے منتظر ہو؟ ہر گروہ اس شئے کے پیچھے پیچھے چلا جا رہا ہے جس کی وہ عبادت کرتا تھا (تو تم پھر یہاں کیوں کھڑے ہو تم بھی کیوں نہیں چلے جاتے وہ لوگ جواب دیں گے کہ ہمارے پروردگار! ہم نے دنیا میں اس امت کی کہ جو دنیا میں غیر اللہ کی پرستش کیا

کرتی تھی اور اب اپنے معبودوں کے پیچھے پیچھے دوزخ میں جا رہی ہے) مکمل طور پر علیحدہ اختیار کر رکھی ہے حالانکہ ہم (اپنی دنیاوی ضرورتوں میں) ان لوگوں (کی امداد اور تعاون) کی ضرورت رکھتے تھے لیکن ہم نے کبھی ان کی صحبت وہم نشینی کو گوارا نہیں کیا (اور نہ کبھی ان کے پیچھے لگ کر غیر اللہ کے پجاری بنے بلکہ ہمیشہ ان کے مدمقابل رہے اور محض تجھے راضی کرنے کے لئے ان سے جنگ و جدال کرتے رہے' پس اب جب کہ ہم ان کی کسی درجہ میں ضرورت و حاجت بھی نہیں رکھتے۔ ضرورت مند بھی نہیں ہیں اور ان سب کی منزل بھی دوزخ ہے' تو ہم ان کے ساتھ کیسے چلے جاتے)۔

تشریح: **قوله:یا رسول الله هل نری ربنا یوم القیامة؟ قال نعم:**

قال نعم:ای ترون ربنا (یعنی ہاں تم اپنے رب کو دیکھو گے۔)

امام سیوطیؒ نے اپنی بعض تعلیقات میں یہ بات ذکر کی ہے، کہ قیامت کے دن موقف میں رؤیت باری تعالیٰ ہر مرد اور ہر عورت کو حاصل ہوگی، حتیٰ کہ کہا گیا ہے، کہ منافقین اور کافرین کو بھی رؤیت باری تعالیٰ کا اعزاز حاصل ہوگا۔ اس کے بعد پھر فوراً ہی ان کو محجوب کر دیا جائے گا، تا کہ وہ ہمیشہ اس دیدار کی حسرت کرتے رہیں۔

اور میں کہتا ہوں: یہ مسئلہ محل کلام ہے۔

اول: چونکہ قرآن کریم میں آتا ہے: ﴿**کلا انهم عن ربهم یومئذ لمحوبون**﴾ [المطففین:۱۵] ''ہرگز ایسا نہیں یہ لوگ اس روز (ایک تو) اپنے ربّ (کا دیدار دیکھنے) سے روک دیئے جائیں گے۔''

دوم: آنحضرت ﷺ کا فرمان ہے، جیسا کہ آگے آرہا ہے: **حتی اذا لم یبق الا من کان یعبد الله أتاهم رب العالمین.**

سوم: اللہ تعالیٰ کے دیدار کی لذّت، اگر چہ دیدار ایک بار ہی کیوں نہ ہو، ہر محنت ومشقت کو بھلا ڈالے گی، بلکہ ہر حسرت کافور ہو جائے گی۔ چونکہ یہ بات تو واضح ہے، کہ دیدارِ باری تعالیٰ تو اہل جنت کو بھی دائما حاصل نہیں ہوگا۔

فرماتے ہیں: اور جہاں تک جنت میں حق تعالیٰ کے دیدار کا سوال ہے، تو اس پر اہل سنت کا اجماع ہے، کہ وہاں حق تعالیٰ کا دیدار نبیوں، ہر امت کے رسولوں' صدیقین اور اس امت محمدیہ کے افراد میں سے مؤمن مردوں کو حاصل ہوگا۔

اُمت محمدیہ کی عورتوں کے سلسلے میں تین اقوال ہیں:

اول: ان کو وہاں اللہ رب العزت کا دیدار نصیب نہیں ہوگا۔

دوم: ان کو بھی وہاں رؤیت باری تعالیٰ کا اعزاز حاصل ہوگا۔

سوم: ان کو بھی وہاں دیدار نصیب ہوا کرے گا، مگر تمام دنوں میں نہیں بلکہ چند مخصوص دنوں مثلاً عید کے دنوں میں، دوسرے دنوں میں نہیں ہوگا۔

فرشتوں کے بارے میں دو اقوال ہیں:

اول: انہیں رؤیت باری تعالیٰ حاصل نہیں ہوگی۔

ثانی: وہ بھی اپنے ربّ کا دیدار کریں گے۔

جنات کے بارے میں بھی اختلافی اقوال ہیں:

قولہ:هل تضا رون۔۔۔۔ ليس معها سحاب:

تضارون: تاء کے ضمہ اور فتحہ کے ساتھ، راء کی تشدید اور تخفیف کے ساتھ۔ ہمارے شیخ مرحوم مولانا عبداللہ سندھیؒ نے فرمایا: اس میں چار صورتیں ہیں۔ لیکن یہ محل نظر ہے۔

پہلی صورت: تاء کے ضمہ اور راء کی تشدید کے ساتھ، یہ باب مفاعلہ سے ہے۔ مبنی معروف بھی ہوسکتا ہے اور مبنی مجہول بھی۔

دوسری صورت: تاء کے فتحہ اور راء کی تخفیف کے ساتھ، یہ باب تفاعل سے ہوگا۔ ایک تاء محذوف ہے۔ اس صورت میں اس کا بصیغہ معروف ہونا متعین ہے۔

تیسری صورت: تاء کے ضمہ اور راء کی تخفیف کے ساتھ، بصیغہ مجہول ہے۔ ضاره يضيره سے مشتق ہے۔ يا ضاره يضوره سے مشتق ہے، بمعنی ضرّه۔ صاحب قاموس کے بیان کے موافق۔

چوتھی صورت: تاء کے فتحہ اور راء کی تخفیف کے ساتھ، قواعد عربیہ کے مطابق یہ کوئی صورت نہیں بنتی۔

صحوا: أصحت السماء، سے نکلا ہے۔ یہ اس وقت کہتے ہیں، جب آسمان دھند سے خالی ہو۔ (کذا ذکرہ شارح) قاموس میں لکھتے ہیں: الصحو، ذهاب الغيم. (دلوں کا ختم ہوجانا)

ليس معها سحاب: یہ جملہ تاکید ہے۔ "السحاب" سے مراد "حجاب" ہے۔ خواہ وہ حجاب "رائی" کی طرف سے ہو، یا "مرئی" کی طرف سے ہو۔ اسی مضمون کو ایک اور مثال کے ذریعہ مزید مؤکد کرتے ہوئے فرمایا: وهل تضارون في روية القمر الخ۔

قولہ:وهل تضارون في روية القمر۔۔۔ في روية احدهم

ليس فيها: کی ضمیر "السماء" کی طرف راجع ہے۔ اگرچہ "السماء" ماقبل میں مذکور نہیں مگر مقام اس کا قرینہ ہے۔ یا تقدیری عبارت یوں ہے: في جهة رؤية القمر من السماء.

سحاب: سے مراد حجاب ومانع ہے۔

یہاں "يوم القيامة" سے مراد موقف اور اس کے بعد دخول جنت مراد ہے۔

قولہ:الا كما تضارون في رؤية أحدهما:

یہ جملہ مبالغہ اور تعلیق بالمحال کے طور پر ارشاد فرمایا۔ کہ اگر تم سورج اور چاند کو دیکھنے میں کوئی رکاوٹ یا تکلیف محسوس کرتے ہو، تو یقیناً اللہ تعالیٰ کو دیکھنے میں بھی رکاوٹ وتکلیف محسوس کروگے۔ یہ تشبیہ ظہور اور تحقق رؤیت مع التنزہ عن صفات الحدوث مثلاً مقابلہ اور جہت، میں ہے فقط۔

شمس وذکر کا ذکر شاید اس بات کی طرف اشارہ ہے، کہ مؤمنین کو باری تعالیٰ کی رؤیت شب وروز حاصل ہوگی۔ انتہاء درجہ کا ظہور ہوگا۔ اور تجلی کے تفاوت کی طرف اشارہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے نیکوکار بندوں کے مراتب کی نسبت سے تجلی فرمائے گا۔

قولہ:اذا كان يوم القيامة۔۔۔ يتسا قطون في النار:

لیتبع: تاء مفتوحہ کی تشدید اور بائے موحدہ کے کسرہ کے ساتھ، ایک نسخہ میں تاء کے سکون اور باء کے فتحہ کے ساتھ ہے۔

غیر اللہ من الأصنام: "من بیانیہ" ہے۔ من الاصنام "غیر اللہ" کا بیان ہے۔

الأنصاب: نصب کی جمع ہے۔ نون کے فتحہ وضمہ، اور صاد کے سکون کے ساتھ، اور دونوں کے ضمہ کے ساتھ بھی۔

"نصب"، اس پتھر کو کہتے ہیں، جو کسی خاص جگہ پر خاص اس مقصد کیلئے نصب کیا جائے کہ اس کی پوجا ہو، اور اس کے سامنے قربت و نیکی کی نیت سے جانور ذبح کیا جائے۔ پس ہر وہ چیز جو اس مقصد کیلئے نصب کی جائے اور اس کی پرستش کیا جائے۔ پس ہر وہ چیز کہ جو اس مقصد کیلئے نصب کی جائے، اور اس کی پرستش و تعظیم کا عقیدہ رکھا جائے، خواہ وہ پتھر ہو یا لکڑی، یا کوئی دوسری چیز وہ "نصب" ہی کہلائے گی۔

قولہ: حتی اذا لم یبق ......:

أتاهم رب العالمین: (یہاں مضاف محذوف ہے۔) أی: أتاه امر رب العالمین. جیسا کہ اس بات کی طرف اگلا جملہ (فما ذا تنتظرون) اشارہ کر رہا ہے۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ تجلیات الٰہیہ اور تعریفات ربانیہ کو "اتیان" سے تعبیر کیا گیا ہو۔

أتاهم رب العالمین: اس کی توضیح میں متعدد اقوال بصیغۂ قیل ذکر کئے ہیں۔ پہلے وہ اقوال ذکر کئے جا رہے ہیں۔ پھر محدثین کا تفصیلی کلام پیش کیا جائے گا:

1. مراد "اللہ کے امر کا آنا" ہے۔ جیسا کہ قال: فماذا تنتظرون کے الفاظ میں اس طرف اشارہ ہے کہ تم کس کا انتظار کر رہے ہو۔
2. اور یہ بھی ممکن ہے کہ تجلیات الالھیۃ، والتعریفات ربانیۃ. کو "اتیان" سے تعبیر کیا ہو کیا ہے کہ یہ قول برحق ہے اور اعتبار رکئے جانے کے زیادہ لائق ہے۔
3. بقول بعض یہاں "ایتان" اس بات نے کیا یہ ہے کہ وہ لوگ اللہ تعالیٰ کی زیادت کریں گے۔ چونکہ جو شخص غائب ہو اس کی دیدار اسکی آمد کے بعد ہی ہو سکتا ہے۔ پس "رؤیت" کو محاذا "ایتان" بغیر کیا گیا ہے۔
4. "آنا" اللہ تعالیٰ کے افعال میں سے ایک فعل ہے۔
5. بعض ملائکہ کا آنا مراد ہے قاضی عیاض فرماتے ہیں: یہ توجیہ میرے نزدیک حدیث کے زیادہ مناسب ہے۔
6. اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کی پاس اپنی مخلوفات میں سے ملائکہ کی صورت میں آئے گا۔ مخلوفات کی صفات اللہ کی صفات کے مشابہ نہیں ہو سکتیں۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ ان کا امتحان لے گا۔ پس جب فرشتہ یا یہ صورت کہے گی کہ میں تمہارا راب ہوں تو لوگ اس میں مخلوق کی علامت دیکھیں گے جن کب وہ چھپنا ئیں گے اور انہیں اس بات کا علم ہوگا کہ وہ ان کا رب نہیں ہے چنانچہ وہ لوگ اس سے اللہ کی پناہ مانگیں گے۔
7. بقول بعض رؤیت حقیقی مراد ہے، البتہ ہم اس کی کیفیت کا اندازہ نہیں کر سکتے۔
8. تورپشتی فرماتے ہیں "اللہ کا آنا" اللہ میں اس کی تفسیر "اللہ کے حکم کا آنا" اور "اللہ کے عزاب کا آنا" کی گئی ہے کتاب اللہ کے الفاظ ان دونوں معنیٰ کو محتمل ہیں جہاں تک بات ہے اس حدیث کی تو اس کی تاویل "اس کے امر کا آنا" ہے۔ اور اس کا

قرینہ "فماذا انتظرون" کے الفاظ ہیں۔بعض سلف اس میں تاویل کرنے سے بچتے ہیں۔

أفقر ما کنا الیهم: "افقر" منصوب علی الظرفیہ ہے۔أی: فی افقرا کواننا الی الناس.امام طیبیؒ نے لکھا ہے أفقر: "فارقنا" کی ضمیر سے حال ہے۔"ما" مصدریہ ہے۔اور" وقت مقدر" ہے۔

۵۵۷۹ : وَفِیْ رِوَایَةِ اَبِیْ هُرَیْرَةَ فَیَقُوْلُوْنَ هٰذَا مَکَانُنَا حَتّٰی یَاتِیَنَا رَبُّنَا فَاِذَا جَآءَ رَبُّنَا عَرَفْنَاهُ۔وَفِیْ رِوَایَةِ اَبِیْ سَعِیْدٍ فَیَقُوْلُ هَلْ بَیْنَکُمْ وَبَیْنَهٗ اٰیَةٌ تَعْرِفُوْنَهٗ فَیَقُوْلُوْنَ نَعَمْ فَیُکْشَفُ عَنْ سَاقٍ فَلَا یَبْقٰی مَنْ کَانَ یَسْجُدُ لِلّٰهِ تَعَالٰی مِنْ تِلْقَآءِ نَفْسِهٖ اِلَّآ اَذِنَ اللّٰهُ لَهٗ بِالسُّجُوْدِ وَلَا یَبْقٰی مَنْ کَانَ یَسْجُدُ اِتِّقَآءً وَّرِیَآءً اِلَّا جَعَلَ اللّٰهُ ظَهْرَهٗ طَبَقًا وَّاحِدَةً کُلَّمَآ اَرَادَ اَنْ یَّسْجُدَ خَرَّعَلٰی قَفَاهُ ثُمَّ یُضْرَبُ الْجِسْرُ عَلٰی جَهَنَّمَ وَتَحِلُّ الشَّفَاعَةُ وَیَقُوْلُوْنَ اَللّٰهُمَّ سَلِّمْ سَلِّمْ فَیَمُرُّ الْمُؤْمِنُوْنَ کَطَرْفِ الْعَیْنِ وَکَالْبَرْقِ وَکَالرِّیْحِ وَکَالطَّیْرِ وَکَاَجَاوِیْدِ الْخَیْلِ وَالرِّکَابِ فَنَاجٍ مُّسَلَّمٌ وَمَخْدُوْشٌ مُّرْسَلٌ وَمَکْدُوْشٌ فِیْ نَارِ جَهَنَّمَ حَتّٰی اِذَا خَلَصَ الْمُؤْمِنُوْنَ مِنَ النَّارِ فَوَالَّذِیْ نَفْسِیْ بِیَدِهٖ مَا مِنْ اَحَدٍ مِّنْکُمْ بِاَشَدَّ مُنَا شَدَةً فِی الْحَقِّ قَدْ تَبَیَّنَ لَکُمْ مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ لِلّٰهِ یَوْمَ الْقِیَامَةِ لِاِخْوَانِهِمُ الَّذِیْنَ فِی النَّارِ یَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا کَانُوْا یَصُوْمُوْنَ مَعَنَا وَیُصَلُّوْنَ وَیَحُجُّوْنَ فَیُقَالُ لَهُمْ اَخْرِجُوْا مَنْ عَرَفْتُمْ فَیُحَرَّمُ صُوَرُهُمْ عَلَی النَّارِ فَیُخْرِجُوْنَ خَلْقًا کَثِیْرًا ثُمَّ یَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا مَا بَقِیَ فِیْهَآ اَحَدٌ مِّمَّنْ اَمَرْتَنَا بِهٖ فَیَقُوْلُ ارْجِعُوْا فَمَنْ وَجَدْتُّمْ فِیْ قَلْبِهٖ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ مِّنْ خَیْرٍ فَاَخْرِجُوْهُ فَیُخْرِجُوْنَ خَلْقًا کَثِیْرًا ثُمَّ یَقُوْلُ ارْجِعُوْا فَمَنْ وَجَدْ تُّمْ فِیْ قَلْبِهٖ مِثْقَالَ نِصْفِ دِیْنَارٍ مِّنْ خَیْرٍ فَاَخْرِجُوْهُ فَیُخْرِجُوْنَ خَلْقًا کَثِیْرًا ثُمَّ یَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا لَمْ نَذَرْ فِیْهَا خَیْرًا فَیَقُوْلُ اللّٰهُ شَفَعَتِ الْمَلٰٓئِکَةُ وَشَفَعَ النَّبِیُّوْنَ وَشَفَعَ الْمُؤْمِنُوْنَ وَلَمْ یَبْقَ اِلَّآ اَرْحَمُ الرّٰحِمِیْنَ فَیَقْبِضُ قَبْضَةً مِّنَ النَّارِ فَیُخْرِجُ مِنْهَا قَوْمًا لَمْ یَعْمَلُوْا خَیْرًا قَطُّ قَدْ عَادُوْا حُمَمًا فَیُلْقِیْهِمْ فِیْ نَهْرٍ فِیْ اَفْوَاهِ الْجَنَّةِ یُقَالُ لَهٗ نَهْرُ الْحَیٰوةِ فَیَخْرُجُوْنَ کَمَا تَخْرُجُ الْحَبَّةُ فِیْ حَمِیْلِ السَّیْلِ فَیَخْرُجُوْنَ کَاللُّؤْلُؤِ فِیْ رِقَابِهِمُ الْخَوَاتِمُ فَیَقُوْلُ اَهْلُ الْجَنَّةِ هٰٓؤُلَآءِ عُتَقَاءُ الرَّحْمٰنِ اَدْخَلَهُمُ الْجَنَّةَ بِغَیْرِ عَمَلٍ عَمِلُوْهُ وَلَا خَیْرٍ قَدَّمُوْهُ فَیُقَالُ لَهُمْ لَکُمْ مَا رَاَیْتُمْ وَمِثْلَهٗ مَعَهٗ (متفق علیه)

اخرجه البخاری فی صحیحه ۴۲۰/۱۳حدیث رقم ۷۴۳۹ومسلم فی صحیحه ۱۶۷/۱حدیث رقم (۳۰۲-۱۸۳) واحمد فی المسند ۵۳۴/۲۔

ترجمہ: "حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت میں یہاں یوں نقل کیا گیا ہے کہ وہ لوگ (جو خدا تعالیٰ کو اپنا معبود حقیقی اور معبود واحد جانتے اور مانتے تھے یہ کہیں گے کہ ہم اسی جگہ پر کھڑے رہیں گے جب تک ہمارا پروردگار ہمارے پاس نہیں

آئے گا یعنی جب تک وہ ہم پر اس طرح سے تجلی نہ فرمائے جس کی وجہ سے ہم یہ جان لیں اور تسلی کر لیں کہ یہی ہمارا رب ہے اور جب ہمارا پروردگار (اپنی تجلی وصفات کے کو عیاں کرنے کی صورت میں کہ جس کے سبب ہم اس کو پہچاننے کی صلاحیت رکھتے ہیں) ہمارے پاس آ جائے گا تو ہم اس کی (اچھی طرح) پہچان کر لیں گے اور حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے نقل کردہ روایت کے الفاظ یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ ان سے پوچھے گا کہ کیا تمہارے اور تمہارے رب کے درمیان کوئی علامت ہے جس کے ذریعے تم اس کی پہچان کر سکتے ہو وہ کہیں گے کہ جی ہاں علامت ہے تب اللہ تعالیٰ اپنی پنڈلی سے تجلی فرمائے گا اور اس موقع پر اللہ تعالیٰ ہر اس شخص کو سجدہ کی اجازت وتوفیق عنایت کر دے گا جو (دنیا میں ریا اور سمعۃ کے لئے اور کسی خوف اور لالچ کی وجہ سے نہیں بلکہ خود اپنے نفس کے تقاضے یعنی ذاتی اخلاص وللّٰہیت کے ساتھ اللہ تعالیٰ کو سجدہ کرتا تھا اور ہر وہ شخص کہ (جو دنیا میں) کسی خوف سے یا لوگوں کو دکھانے سنانے کے لئے خدا تعالیٰ کے سامنے سجدہ کیا کرتا تھا اللہ تعالیٰ اس کی کمر کو ایک بے جوڑ ہڈی بنا دے گا چنانچہ وہ سجدہ میں جانے کے لئے جھکنے کا ارادہ کرے گا تو گدی کے بل گر پڑے گا پھر دوزخ کے اوپر (اس کے بیچوں بیچ) پل صراط کو رکھا دیا گا اور شفاعت کرنے کی اجازت دے دی جائے گی' چنانچہ تمام انبیاء (اپنی اپنی امتوں کے حق میں طلب استقامت وسلامتی کے لئے) یہ دعا کریں گے کہ اے اللہ! ان کو (پل صراط کے اوپر سے) سلامتی سے گزار دے' ان کو جہنم میں جا گرنے سے بچا لینا۔ پس مسلمان لوگ (پل صراط کے اوپر سے اس طرح) گزریں گے کہ کچھ لوگ تو پلک جھپکنے میں گزر جائیں گے' کچھ بجلی کی چمک کی طرح نکل جائیں گے' کچھ ہوا کے جھونکے کی مانند' بعض پرندوں کی اڑان کے مانند گزریں گے۔ پس ان میں سے کچھ مسلمان تو وہ ہوں گے جو دوزخ کی آگ سے بالکل سلامتی اور نجات یافتہ ہوں گے (یعنی پل صراط کے اوپر سے گزرتے ہوئے یہ لوگ کسی تکلیف اور عذاب کا شکار نہ ہوں گے) اور کچھ مسلمان وہ ہوں گے جو زخم کھا کر نکلیں گے اور (دوزخ کی آگ سے) نجات پائیں گے' نیز کچھ مسلمان وہ ہوں گے جو پارہ پارہ کیے جائیں گے اور دوزخ میں دھکیل دیئے جائیں گے' یہاں تک کہ جب تمام مؤمنین آتش جہنم سے نجات پالیں گے تو قسم ہے اس ذات پاک کی جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے ثابت شدہ حق کو حاصل کرنے کے لئے تم میں کسی مؤمن سے زیادہ شدید جدوجہد اور سختی اور مضبوطی کرنے والا کوئی نہ ہوگا قیامت کے دن اپنے ان بھائیوں کی نجات کیلئے اللہ تعالیٰ کے حضور میں کریں گے جو دوزخ میں ہونگے۔ وہ مؤمن کہیں گے کہ "ہمارے پروردگار! یہ لوگ ہمارے ساتھ نماز ادا کیا کرتے تھے اور ہمارے ساتھ حج کرتے تھے (یعنی انکی نمازیں ہماری نمازوں کے طریقہ وانداز پر تھیں اور ان کا حج ہمارے ہی حج کے طرز پر تھا پس تو ان کو بھی جہنم سے بچا لے ان سے کہا جائے گا کہ چلے جاؤ اور جن لوگوں کو تم (اپنی مذکورہ شہادت کی روشنی میں) پہچانتے ہو انہیں (جہنم سے) نکال لو' پس ان کے جسم کو جہنم کی آگ پر حرام قرار دیدیا جائے گا۔ چنانچہ وہ مؤمن بہت سے لوگوں کو جہنم سے آزاد کروالائینگے۔ پھر درخواست کریں گے کہ ہمارے پروردگار! جن لوگوں کو تو نے (دوزخ) سے نکالنے کا حکم دیا تھا (یعنی اہل نماز' اہل زکوۃ اور اہل حج وغیرہ) ان میں سے اب تو جہنم میں کوئی نہیں بچا اللہ تعالیٰ فرمائیگا کہ اچھا پھر چلے جاؤ اور ہر اس شخص کو بھی دوزخ سے نکال لو جس کے دل میں تم ایک دینار کے بقدر بھی نیکی پاؤ۔ پس وہ مؤمن (جائیں گے اور کثیر افراد کو جہنم سے نکال لائیں گے اس کے بعد پھر اللہ تعالیٰ ان سے فرمائے گا اور اب ہر شخص کو دوزخ سے نکال لو جس کے دل میں آدھے دینار کے بقدر بھی خیر پاؤ' پس وہ مؤمن جائیں

گے اور بہت سے لوگوں کو دوزخ سے نکال لائیں گے' پھر اللہ تعالیٰ حکم دے گا کہ جاؤ اور اب اس شخص کو دوزخ سے نکال لو جس کے دل میں تم از قسم نیکی ذرہ کے بقدر بھی کچھ دیکھو۔ پس وہ مؤمن جائیں گے اور کثیر افراد کو جہنم سے نکال لائیں گے اور کہیں گے کہ پروردگار! ہم نے دوزخ میں بھلائی کو باقی نہیں چھوڑا (یعنی دوزخ میں اب ایسا کوئی شخص باقی نہیں بچا ہے جس کے دل میں اصل ایمانی کے علاوہ ادنیٰ سے ادنیٰ درجہ کی اور ذرہ برابر بھی بلکہ ذرہ سے بھی کمتر کوئی نیکی ہو خواہ اس نیکی کا تعلق اعمال سے ہو یا افعال قلب سے) حق تعالیٰ شانہ ارشاد فرمائیں گے کہ فرشتوں نے شفاعت کر لی اور انبیاء نے بھی شفاعت کر لی) اور اہل ایمان نے بھی شفاعت کر لی اور ان سب کی شفاعت کا تعلق ان لوگوں سے تھا جن کا نامہ اعمال میں کسی نہ کسی درجہ میں خیر موجود تھی خواہ وہ نیکی ذرہ کے برابر یا اس سے کمتر درجہ ہی کیوں نہ ہو اور اس طرح اب ایسی کوئی شخصیت پیچھے نہیں رہی (جو خود بھلائی پہنچانے یا بھلائی پہنچانے والے سے سفارش و شفاعت کے ذریعہ کسی کے ساتھ رحم و مروت اور عنایت و ہمدردی کا معاملہ کرے لیکن ابھی ارحم الراحمین کی ذات باقی ہے (جس کی رحمت جس کا کرم اور جس کی عنایت ہر ایک پر سایہ فگن ہے اور اس کی رحمت وعنایت کے اثرات کا مقابلہ کسی کا ترحم وعنایت نہیں کر سکتا اور (یہ فرما کر) اللہ تعالیٰ دوزخ میں سے اپنی مٹھی بھر کر (ان) افراد کو نکال باہر کرے گا جنہوں نے کبھی بھی کوئی (چھوٹی یا بڑی) خیرات و نیکی کو کیا ہی نہ ہوگا' یہ لوگ دوزخ میں (جلتے رہنے کے باعث) کوئلہ بن گئے ہوں گے چنانچہ وہ انہیں ایسی نہر میں ڈال دے گا جو جنت کے دروازوں کے سامنے بہہ رہی ہوگی اور جس کو "نہر حیات" کہا جائے گا اور پھر وہ لوگ ایسے باہر نکلیں گے جیسے دانہ دانہ سیلاب کی گیلی مٹی میں اگتا ہے (یعنی جس طرح سیلابی کوڑے کچرے میں پڑا ہوا دانہ جلد ہی اُگ آتا ہے اور خوب سرسبز و شاداب دکھائی دیتا' اس طرح یہ لوگ بھی اس نہر میں غوطہ دلائے جانے کے بعد بہت جلد بہتر جسمانی حالت میں واپس لوٹ آئیں اور اپنی جسمانی تر و تازگی اور شادابی و توانائی میں خوب تر دیکھے جائیں گے)) نیز یہ لوگ (اس نہر سے) موتی کی طرح ہو کر باہر آئیں گے' ان کی گردنوں میں مہریں لٹک رہی ہونگی چنانچہ (جب اہل جنت ان لوگوں کو (ان کی منفرد نشانی کے ساتھ) دیکھیں گے تو کہیں گے کہ یہ وہ سعادتمند اشخاص ہیں جو خود خدائے رحمان کے آزاد کردہ ہیں ان کو اللہ تعالیٰ نے (اپنے خاص فضل و کرم کے تحت اس امر کے باوجود جنت میں داخل فرمایا ہے کہ انہوں نے (دنیا میں) نہ کوئی عمل خیر کیا تھا اور نہ انہوں نے (کم سے کم افعال قلب ہی کی صورت میں' کوئی نیکی کر کے آگے بھیجی تھی اور پھر (اللہ تعالیٰ) ان نو آزاد لوگوں سے فرمائے گا کہ) بلکہ جنت میں تم جو کچھ دیکھ رہے ہو (یعنی تمہاری تا حد نگاہ تمہیں جو اعلیٰ سے اعلیٰ نعمتیں دکھائی دے رہی ہیں) نہ صرف یہ بلکہ ان ہی جیسی اور بہت سی نعمتیں بھی' سب تمہارے لئے ہیں"۔ (بخاری و مسلم)

تشریح: **قوله: وفي رواية ابي هريرة۔۔۔عرفناه:**

بعض حضرات کا کہنا ہے، کہ پہلی مرتبہ میں ان کو رؤیت کا تحقق نہیں ہوگا حتی کہ وہ کہیں گے: **هذا مكاننا حتى يأتينا ربنا**، چونکہ ان کے ساتھ اس وقت منافق بھی ہوں گے، اور وہ اپنے رب سے حجاب میں ہوں گے۔ جب منافقین ان سے علیحدہ ہو جائیں گے۔ تو حجاب اٹھ جائے گا۔ چنانچہ جب باری تعالیٰ کو دیکھیں گے، تو پکار اٹھیں گے: انت ربنا. اگلے جملہ کا مطلب یہی ہے۔

قوله:هل بينه وبينكم آية تعرفونه:

یعنی کوئی ایسی نشانی کہ جس کے ذریعے تم کو پہچان لو گے؟ یہ نشانی وہ محبت و معرفت ہے جو توحید کا نتیجہ ہے اور ایمان و تصدیق کا ثمرہ ہے۔

قوله:فيقولون:نعم فكيشف عن ساق:

''يكشف'': مجہول کے صیغہ کے ساتھ ہے۔ بعض کا کہنا ہے، کہ یہ بصیغۂ معروف ہے۔

''كشف ساق'' کا مطلب بعض لوگوں نے زوالِ خوف و ہول بیان کیا ہے۔

امام نوویؒ شرح مسلم میں یہ بیان: **طبقة واحدة** کا مطلب بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

(یعنی اس کو پیٹھ و کمر کی ہڈیوں کے جوڑ بالکل ختم کر دیئے جائیں گے اور اس کی پوری پیٹھ ایک تختہ بن جائے گی تا کہ وہ جھک نہ سکے اور نہ سجدہ کر سکے)۔

قوله:فلا يبغى من كان ــــ على قفا :

شیخ فرماتے ہیں: امام ابو سلیمان کے کلام سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ دنیا اگر چہ دار الابتلاء ہے، بعض احوال میں جزاء (یہاں بھی) تحقق ہو جاتی ہے۔ جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿**وما أصابكم من مصيبة فبما كسبت أيديكم**﴾ [الشوریٰ۔۳۰] آخرت بھی اسی طرح ہے۔ اگر چہ دار الجزاء ہے، کبھی یہاں بھی آزمائش ہو جاتی ہے۔ مثلاً تجلی اور سجود (کہ یہ آزمائش ہیں)۔ اور اسی طرح کے بعض دیگر معاملات، اور دلیل یہ ہے کہ قبر آخرت کی منازل میں سے وہ پہلی منزل ہے کہ جہاں آزمائش ہوتی ہے، آگے فرماتے ہیں: اس حدیث کا مطلب اگر یہی ہے تو یہی ہے وگرنہ اس کا مطلب یہ ہے کہ نبی کریمؐ نے ہر طرح کی مماثلت و مشابہت سے منزہ ہونے کے معنی مراد لئے ہیں۔

الجسر: جیم کے کسرہ کے ساتھ، اور فتحہ کے ساتھ۔ صاحب قاموس لکھتے ہیں: ''**الجسر**'' وہ جس کے ذریعہ (نہر وغیرہ کو) عبور کیا جاتا ہے۔ اور اس کو (جیم کے) کسرہ کے ساتھ بھی پڑھا جاتا ہے۔ **جسر** سے مراد ''موضع صراط'' ہے۔ جیسا کہ ایک روایت میں آتا ہے۔

تحل: حاء کے کسرہ کے ساتھ ہے، اور ضمہ بھی درست ہے۔

قوله:اللهم سلم سلم:

''سلم'': امر حاضر کا صیغہ ہے۔

تکرار برائے کثرت ہے۔ یا اہل شفاعت میں سے ہر ایک کا علیحدہ علیحدہ اعتبار کرتے ہوئے مکرر ارشاد فرمایا۔ یا اپنی دعائیں الحاح کرتے ہوئے مکرر کہیں گے، جیسا کہ آدابِ دعا میں سے ہے۔

قوله:فيمر المؤمنون ــــ والر كاب:

كطرف العين: اور مصابیح میں'' **كطرفة العين** '' کے الفاظ ہیں۔ مصابیح کے ایک شارح فرماتے ہیں: تاء برائے وحدت ہے۔ عرب کہتے ہیں: **طرف طرفا**، پلک جھپکنا۔

أجاوید جمع ہے، أجواد کی۔ اور ''أجواد'' کا مفرد'' جواد'' ہے۔ ''جواد'' اس گھوڑے کو کہتے ہیں جو (سب پر) سبقت لے جائے۔ (كذا فى النهاية) جواد: '' جاد'' بمعنی'' أسرع فی السیر'' (تیز چلنا) سے صیغہ صفت ہے۔ ''أجاوید الخیل'' میں صفت کی اضافت موصوف ہے۔

والرکاب: راء کے کسرہ کے ساتھ، '' الخیل'' پر عطف ہے۔ اس سے مراد اونٹ ہیں۔ اس کا واحد اس کے لفظ سے نہیں آتا۔

فناج: فاء تفصیلہ ہے یا تفریعیہ ہے۔ اس پل پر سے گزرنے والے لوگ، عقیدہ، عمل اور معرفت کے اعتبار سے تین فرقوں میں ہوں گے۔ چنانچہ حدیث کے اگلے جملہ فناج مسلم الخ سے اسی کا بیان ہے۔

مسلم: لام مفتوحہ کی تشدید کے ساتھ۔

ومخدوش: اصل عبارت یوں ہے: ومنهم مجروح.

مکدوس: سین مہملہ کے ساتھ۔ بمعنی مدفوع

فی نار جهنم: (''مدفوع'' محذوف کے متعلق ہے۔) ای: ومنهم مدفوع فی نار جهنم.

یہ وہ لوگ ہوں گے جن کا کوئی ماویٰ وملجا نہیں ہوگا، یہ وہ لوگ ہوں جن کے مخلد فی النار ہونے کا فیصلہ ہو چکا ہوگا۔ (كذا قاله شارح) یہ بات درست نہیں، کیونکہ حدیث میں آتا ہے: فیمر المؤمنون الخ۔ الا یہ کہ یوں کہا جائے کہ ''فناج'' کا عطف'' فیمر'' پر ہے، یہ کہ یہ اس کی تفریع ہو۔ اور'' منهم'' کی ضمیر، '' جمیع المارة علی الجسر'' کی طرف عائد ہے۔

بعض روایات میں ''مکدوش'' یعنی شین معجمہ کے ساتھ ہے۔ ای مکدوش فی نار جهنم ''مکدوش'' کدشه سے مشتق ہے۔ جس کا معنی ہے سختی سے ہانکنا دھکیلنا ہے اور کا معنی ہے زخمی کرنا۔

امام نوویؒ فرماتے ہیں: اصول میں ''مکدوس''، سین مہملہ کے ساتھ ہے۔ قاضی عیاضؒ نے اکثر راویوں سے بھی یوں ہی نقل کیا ہے۔ فرمایا: عذری نے اس کو شین معجمہ کے ساتھ روایت کیا ہے۔ شین معجمہ کے ساتھ اس کا مطلب ہے: دھتکارا ہوا رکنا۔ اور سین مہملہ کے ساتھ اس کا مطلب ہے: بعض اشیاء کا بعض پر ہونا اور ''تکدست الدواب فی سیرها'' اسی سے مشتق ہے۔

النہایہ میں لکھتے ہیں: مکدوس فی النار یعنی اس کے ہاتھوں اور پیروں کو باندھ کر جہنم میں ڈال دیا جائے گا۔

امام طیبیؒ فرماتے ہیں: صراط پر سے گزرنے والے مؤمنین کے تین طبقات ہوں گے:

ایک طبقہ تو وہ ہوگا جو بالکل صحیح سالم ہوگا۔ اس کو کسی قسم کی کوئی تکلیف نہ پہنچے گا گی۔

دوسرا طبقہ وہ ہوگا جو زخمی ہوگا پھر چھوٹ جائے گا اور خلاصی پا جائے گا۔

تیسرا طبقہ وہ ہوگا جو پارہ پارہ کیا جائے گا، اور گرے گا پڑے گا، اور پھر جہنم میں ڈال دیا جائے گا۔

خلص: لام کے فتحہ کے ساتھ ''حتی'': یہ غایت ہے۔'' مرور البعض علی الصراط وسقوط البعض فی النار''

(بعض کا پل پر سے گزرنا اور بعض کا آگ میں گرنا) کیلئے۔

امام طیبیؒ فرماتے ہیں: ''حتی'' یہ ''مکدوس فی النار'' کیلئے غایت ہے۔یعنی پچھاڑے ہوئے لوگ دوزخ میں رہیں گے یہاں تک کہ وہ اپنے گناہ کے بقدر عذاب بھگت کر یا کسی کی سفارش کے ذریعہ یا اللہ تعالیٰ کے فضل سے دوزخ سے چھٹکارا نہ پالے۔

''مکدوس'' کی جگہ لفظ ''المؤمنون'' کا ذکر کرنا علت کی طرف اشارہ ہے، اور یہ کہ صفت ایمان، جہنم میں ہمیشہ رہے کے منافی ہے۔

ما من أحد منکم: یہ خطاب مؤمنین کو ہے۔

بأشد: ''ما'' کی خبر ہے۔اور ''مناشدة'' تمیز ہونے کی بناء پر منصوب ہے۔ای اشد مطالبة ومنا ظرة۔اور فی الحق: ''مناشدة'' کے لئے ظرف ہے۔

وقد تبین لکم: پہلا ترکیبی احتمال یہ ہے کہ یہ جملہ ''الحق'' کی صفت ہے چونکہ ''الحق'' نکرہ کے معنیٰ میں ہے۔ای: فی حق قد تبین (یعنی ایسا حق جو تمہارے لئے خصم کے مقابلہ میں ظاہر ہو چکا ہے۔

دوسرا ترکیبی احتمال یہ ہے کہ یہ جملہ حالیہ ہو۔ذوالحال ''أشد'' میں ضمیر مستتر ہے یا ''الحق'' ہے۔ایک شارح کا کہنا ہے کہ یہ ''الحق'' سے حال ہے اور عبارت کی تقدیر یوں ہے: ما من احد منکم بأشد مناشدة فی حال أن تبین لکم الامر الحق۔

من المؤمنین: ''أشد'' کے متعلق ہے۔أی: بأشد مناشدة من المؤمنین۔موضع ضمیر میں اسم ظاہر کو ذکر کیا ہے۔

للہ: ''مناشدة'' کے متعلق ہے۔اور یوم القیامة: یہ ''أشد'' کیلئے ظرف ہے۔أی: یناشدون اللہ۔

لأخوانھم: لام سببیہ ہے۔أی: لأجل أخوانھم۔ (یعنی اپنے بھائیوں کے لئے)

امام نوویؒ فرماتے ہیں: اسکا مطلب یہ ہے کہ اپنے ثابت شدہ کو حاصل کرنے کے لئے کسی مومن سے زیادہ شدید کوئی نہ ہوگا کہ جس قدر تم لوگ قیامت کے دن اپنے بھائیوں کی نجات کے لئے اللہ تعالیٰ کے دربار میں ہوں گے۔

ہمارے علماء میں سے ایک شارح لکھتے ہیں: اس کا مطلب یہ ہے کہ قیامت کے دن اپنے گناہ گار بھائیوں کی جہنم سے خلاصی کے لئے تم سے زیادہ شدید جدوجہد کرنے والا کوئی نہ ہوگا جس وقت تمہارے لئے حق واضح ہوگا۔

قولہ: فیقال لھم: اخرجوا من عرفتم۔۔۔۔ أمر تنا بہ:

عرفتم: یعنی جن لوگوں کو تم ان اوصاف سے متصف مانتے ہو ان کو نکال لو۔

فتحرم: راء مشددہ کے فتحہ کے ساتھ۔

صورھم: سے پہلے مضاف محذوف ہے۔أی تغیر صورھا (ان کی صورتوں کا متغیر ہونا)

مطلب یہ ہے کہ دوزخ کی آگ کو اس بات سے منع کر دیا جائے کہ وہ ان اہل ایمان کو کھائے یا اس طرح جلائے کہ ان کے چہرے اس قدر سیاہ ہو جائیں کہ ان کی پہچان نہ ہو سکے۔پس شفاعت کرنے والے مؤمنین ان گناہ گار مؤمنین کو ان کی

پیشانیوں سے پہچان لیں گے۔

قوله:فيقول ارجعوا۔۔۔۔ دينار من خير فأخرجوه:

شرح السنہ میں قاضی عیاضؒ فرماتے ہیں: ''خیر'' یقین کے معنی میں ہے۔فرمایا: صحیح بات یہ ہے کہ یہاں ''خیر'' سے مراد وہ چیز ہے جو اصل ایمان سے زائد ہوگی۔ چونکہ اصل ایمان کہ جس کو تصدیق کہتے ہیں ایک ایسا جوہر ہے جو ناقبل تجزی ہے۔ جس نیکی کو اجزا اور حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ وہ اصل ایمان سے زائد چیز ہے۔ جیسے عمل صالح۔ ذکر خفی، یا جیسا کہ اعمال قلبیہ مثلاً کسی غریب و مسکین پر شفقت کرنا، یا خوف الٰہی اور نیتِ صادقہ وغیرہ۔

قوله:ربنا لم نذر فيها خيرا:

خيرا:(مضاف محذوف ہے۔)أي:أهل خير (یعنی دوزخ میں ہم نے کسی اہل خیر کی نہیں چھوڑا)

امام طیبیؒ نے فرمایا: ''ربنا لم نذر فيها خيرا'' کا مطلب یہ ہے کہ اے ہمارے رب، دوزخ میں اب ایسا کوئی شخص باقی نہیں بچا ہے جس کے دل میں ایمان کے ثمرات میں سے کوئی چیز باقی ہو، مثلاً یقین کی زیادتی یا عمل صالح وغیرہ،

''خیر'' کو موضع ذات میں ذکر کیا، جیسا کہ بطور مبالغہ عدل کو موضع صاحب عدل میں ذکر کیا جاتا ہے، مثلاً رجل عدل. اور اس سے مراد معنی مصدری ہوتے ہیں بطور مبالغہ گویا کہ یہ آدمی خود عدل ہے۔ بلکہ وہ سراپا عدل ہے۔

''عدل'' مصدر بمعنی ''عادل'' ہے۔ یا (عدل سے پہلے) مضاف مقدر ہے۔ أي: صاحب عدل. جیسا کہ اللہ جل شانہ کا یہ فرمان: ﴿واسئل القرية﴾[یوسف:۸۲] ''اور اس بستی (یعنی مصر) والوں سے پوچھ لیجئے'' واللہ تعالیٰ اعلم۔

قوله:فيقول الله شفعت الملائكة ولم يبق الا ارحم الراحمين :

(مستثنی منہ محذوف ہے۔)أي لم يبق احد ممن يرحم على أحد یعنی وہ ایسا ارحم الراحمین کہ جس کی رحمت ہر چیز کو وسیع ہے۔ اور اس کی رحمت کے مقابلے میں ہر رحمت ''لا شيئ'' کی مانند ہے۔

قوله:فيقبض قبضة۔۔۔ يقال له نهر الحياة:

قبضة: یعنی مٹھی بھر۔

قوما لم يعملوا خيرا قط: یعنی جن لوگوں کے پاس مجرد ایمان کے علاوہ کوئی خیر زائد نہیں ہوگی۔

امام نوویؒ نے فرمایا: یہ وہ لوگ ہیں جن کے پاس صرف ایمان ہوگا۔ ان کے بارے میں شفاعت کی اجازت بھی نہیں ہو گی۔ اور اس بات کا علم صرف اللہ جل شانہ کی ذات ہی کو ہوگا، کہ ان کے دلوں میں ایمان کے علاوہ کچھ بھی نہیں ہے۔ یہ دلیل ہے کہ صرف وہی عمل نافع ہے جو درست نیت کے ساتھ کیا گیا ہو۔

نیز یہ دلیل ہے یہ کہ ایمان زیادۃ و نقصان کو قبول کرتا ہے' اہل سنت کا مذہب بھی یہی ہے۔ میں کہتا ہوں کہ محققین کا مذہب یہ ہے کہ وہ تصدیق جو علی التحقق 'ایمان' ہے زیادت و نقصان کو قبول نہیں کرتی۔ تفاوت تو محض اس کے انوار' ثمرات اور نتائج میں ہے اس کے انوار و ثمرات حقائق ایقان و دقائق عرفان' مراتب احسان اور منازل عرفان ہیں۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

قد عادوا: یہ جملہ صفت ہے، یا حال ہے۔ ''عادوا'' بمعنی ''صاروا'' ہے۔

حمما: حاء کے ضمہ اور میم کے فتحہ کے ساتھ، "حمة" کی جمع ہے، بمعنی فحم (کوئلہ)

فیلقیھم: یعنی اللہ تعالیٰ ان کو نہر میں ڈالنے کا حکم دے گا۔ یا خود براہ راست انہیں نہر میں ڈال دیگا۔

نھر: ھاء کے فتحہ اور سکون کے ساتھ بمعنی ہے۔

فی افواہ الجنة: (محذوف "کائن" کے متعلق ہو کر صفت ہے۔) ای کائن فی أفواہ الجنة. أوائل الجنة.

" **أفواہ**": **فوھة** کی جمع ہے۔ **فوھة:** فاء کے ضمہ اور واؤ مشددہ کے فتحہ کے ساتھ ہے، "**افواہ**" جمع غیر قیاسی ہے۔

أفواہ الأزفة والانھار اوائلھا. (کذا ذکرہ الطیبیؒ)

اور یہ بھی ممکن ہے کہ "أفواہ" کنایہ ہو "ابواب جنت" سے۔

قوله: فیخرجون کما تخرج الحبةفی حمیل السیل :

الحبة: حاء کے کسرہ اور باء موحدہ کی تشدید کے ساتھ۔

حمیل: حاء کے فتحہ اور میم کے کسرہ کے ساتھ، بمعنی "محمولہ"

شرح السنہ میں لکھتے ہیں: **الحبة:** باء کے کسرہ کے ساتھ، یہ ایک جامع لفظ ہے۔ سبزیوں کے وہ بیج جو ہوا چلنے کے وقت بکھر جاتے ہیں، اور پھر جب اگلے سال بارش ہوتی ہے تو اُگ جاتے ہیں۔

امام کسائیؒ فرماتے ہیں، "جب ریاحین" مراد ہیں۔ اور گندم وغیرہ کو "حب" کہا جاتا ہے، کچھ اور نہیں کہا جاتا۔ اور حبة، "حبّ" سے ہے "جب" فتحہ کے ساتھ ہے۔

حمیل: اس سے مراد وہ کوڑا اور مٹی وغیرہ ہے جو سیلاب بہا کر لاتا ہے۔ اور جب اتفاق سے اس میں "حبة" جگہ پکڑ جائے اور سیلاب کی گزرگاہ کے کنارہ پر اُگ جائے تو چوبیس (۲۴) گھنٹے کے اندر پھوٹ جاتا ہے، اور بہت تیزی سے بڑھتا ہے۔ اور امام نوویؒ فرماتے ہیں کہ یہ تشبیہ سرعت ظہور میں ہے۔

قوله: فیخرجون کا للؤلؤفی رقابھم الخواتم:

خواتم: خاتم کی جمع ہے۔ جمع اس لئے ذکر کی تاکہ جمع کے مقابلے میں جمع آجائے۔

اس سے مراد وہ علامت ہے جو ان کی گردنوں میں نمایاں ہوگی۔ تاکہ یہ لوگ ان لوگوں سے ممتاز ہو جائیں جو عمل کے واسطہ سے مغفورین ہو کر جنت میں داخل ہوں گے۔ (کذا قالہ شارح)

صاحب تحریر فرماتے ہیں: "خواتیم" سے یہاں مراد سونے وغیرہ کا وہ زیور ہے جو گلے میں لٹکایا جاتا ہے، اس کے ذریعے سے وہ پہچانے جائیں گے۔

قوله: فیقول اھل الجنة .....:

أدخلھم: ایک نسخہ میں "أدخلھم" کے بعد لفظ جلالہ "اللہ" ہے۔

بغیر عمل: اور یک صحیح نسخہ میں "بغیر عمل عملوہ" کا اضافہ ہے۔

ما رأیتم: امام طیبیؒ فرماتے ہیں کہ عبارت میں حذف ہے۔ أی: فینظرون فی الجنة الی اشیاء ینتھی مدّ بصرھم

الیھا، فیقال لھم:لکم ما رأیتم ومثلہ معہ.

اور میں کہتا ہوں کہ اس میں اللہ جل شانہ کے اس قول کی طرف اشارہ ہے:

﴿ولمن خاف مقام ربہ جنتان﴾ [الرحمٰن ٤٦] ''اور جو شخص اپنے رب کے سامنے کھڑے ہونے سے ڈرتا رہتا ہو اس کے لئے دو باغ ہوں گے''۔

① ''جنتان'' سے مراد یہ ہے کہ ایک ظاہری جنت اور ایک باطنی جنت ہوگی۔

② ایک جنت از راہِ عدل ملے گی اور ایک جنت از راہ فضل ملے گی۔

٥٥٨٠ : وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذَا دَخَلَ اَهْلُ الْجَنَّةِ الْجَنَّةَ وَاَهْلُ النَّارِ النَّارَ يَقُوْلُ اللّٰهُ تَعَالٰى مَنْ كَانَ فِىْ قَلْبِهٖ مِثْقَالَ حَبَّةٍ مِّنْ خَرْدَلٍ مِّنْ اِيْمَانٍ فَاَخْرِجُوْهُ فَيَخْرُجُوْنَ قَدِ امْتَحَشُوْا وَعَادُوْا حُمَمًا فَيُلْقَوْنَ فِىْ نَهْرِ الْحَيٰوةِ فَيَنْبُتُوْنَ كَمَا يَنْبُتُ الْحَبَّةُ فِىْ حَمِيْلِ السَّيْلِ اَلَمْ تَرَوْا اَنَّهَا تَخْرُجُ صَفْرَآءَ مُلْتَوِيَةً . (متفق علیہ)

اخرجہ البخاری فی صحیحہ ٤١٦/١١حدیث رقم ٦٥٦٠ومسلم فی صحیحہ ١٨٢/١حدیث رقم (٣٠٤-١٨٤)۔

ترجمہ: ''حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''جب جنت والے جنت میں اور دوزخ والے دوزخ میں داخل ہو جائیں گے تو اللہ تعالیٰ فرمائے گا کہ جس آدمی کے دل میں رائی کے ایک دانہ کے بقدر بھی ایمان ہو تو اس کو دوزخ سے نکال لو چنانچہ یہ لوگ جہنم سے باہر نکلیں گے اور اس وقت ان کا حال یہ ہوگا کہ وہ جل کر کوئلہ کی مانند بن گئے ہوں گے پھر یہ لوگ نہر حیاۃ میں ڈال دیئے جائیں گے اور وہ ایسے تروتازہ نکلیں گے جیسے سیلاب کے کوڑے کچرے میں گھاس کا دانہ آگ آتا ہے' کیا تم نے دیکھا نہیں وہ دانہ کس طرح لپٹا ہوا زرد (تروتازہ) نکلتا ہے''۔ (بخاری و مسلم)

تشریح: قولہ:یقول اللّٰہ تعالٰی: (یہ خطاب کس سے ہوگا؟ اس میں متعدد احتمال ہیں)

① یہ خطاب انبیاء سے ہوگا۔ ② انبیاء کے علاوہ دیگر شفعاء سے ہوگا۔ ③ ملائکہ سے ہوگا۔ اور یہی زیادہ ظاہر ہے، جیسا کہ آگے حضرت ابوہریرہؓ کی ایک روایت میں صراحتاً عنقریب آئے گا۔

قولہ:من کان فی قلبہ مثقال۔۔۔فاخرجوہ:

بعض کا کہنا ہے کہ اس حدیث سے یہ پتہ چلتا ہے کہ اللہ جل شانہ جن مٹھی بھر لوگوں کو جہنم سے نکالے گا یہ وہ مؤمنین ہوں گے جن کے پاس ایمان کے علاوہ کوئی خیر، کوئی عمل نہیں ہوگا۔ نہ کہ کفار جیسا کہ ظاہری عبارت سے ابہام ہو رہا ہے۔ کیونکہ یہ مخالف اجماع ہے۔

قولہ:فیخرجون قدامترحشوا:

فیخرجون: صیغہ مجہول کے ساتھ ہے۔

قد امتحشوا: صیغۂ معروف کے ساتھ ہے بمعنیٰ احترقوا. یہ جملہ حالیہ ہے۔ کہا گیا ہے کہ یہ صیغۂ مجہول کے ساتھ ہے۔ گویا کہ یہ متعدی ہے ''محش'' کے معنی میں ہے (آگ کا جلد کو جلانا)۔ صاحب النہایہ فرماتے ہیں: المحش احراق الجلد وظهور العظم. صاحب قاموس لکھتے ہیں: ''امتحش'' کے معنی ہیں ''احترق'' (جلنا)

عسقلانیؒ فرماتے ہیں: ''امتحشوا'': احترقوا، کے ہم وزن وہم معنی ہے۔ بعض کا کہنا ہے کہ مثناۃ کے ضمہ اور حاء کے کسرہ کے ساتھ ہے۔ لغت میں ''امتحش'' کا متعدی ہونا معروف نہیں۔ ''امتحش'' کو فعل لازمی سنا گیا ہے، ''محش'' کا ''مطاوع'' ہے۔

امام نوویؒ فرماتے ہیں: یہ لفظ تاء کے فتحہ، حاء مہملہ اور شین معجمہ کے ساتھ ہے۔ روایات میں یہ لفظ اسی طرح وارد ہوا ہے۔ خطابی اور ہروی نے یہ لفظ اسی طرح ضبط کیا ہے۔ اور قاضی عیاضؒ نے اپنے شیوخ سے نقل کیا ہے اس کا معنیٰ ہے ''احترقوا''۔ قاضیؒ نے فرمایا: اس لفظ کو ہمارے بعض شیوخ نے تاء کے ضمہ اور حاء کے کسرہ کے ساتھ نقل کیا ہے۔

ألم تروا: رؤیت، ''بصارت'' کے معنی میں ہے۔ یا ''علم'' کے معنی میں ہے۔

ملتوية: کا مطلب ہے: ''ملفوفه مجتمعة'' (لپٹا ہوا)۔ بعض نے اس کا مطلب ''منحنية'' (ٹیڑھا بڑھا ہوا) بیان کیا ہے۔

۵۵۸۱ : وَعَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ اَنَّ النَّاسَ قَالُوْا يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ هَلْ نَرٰى رَبَّنَا يَوْمَ الْقِيَامَةِ فَذَكَرَ مَعْنٰى حَدِيْثِ اَبِيْ سَعِيْدٍ غَيْرَ كَشْفِ السَّاقِ وَقَالَ يُضْرَبُ الصِّرَاطُ بَيْنَ ظَهْرَانَيْ جَهَنَّمَ فَاَكُوْنُ اَوَّلَ مَنْ يَّجُوْزُ مِنَ الرُّسُلِ بِاُمَّتِهٖ وَلَا يَتَكَلَّمُ يَوْمَئِذٍ اِلَّا الرُّسُلُ وَكَلَامُ الرُّسُلِ يَوْمَئِذٍ اَللّٰهُمَّ سَلِّمْ سَلِّمْ وَفِيْ جَهَنَّمَ كَلَالِيْبُ مِثْلَ شَوْكِ السَّعْدَانِ لَا يَعْلَمُ قَدْرَ عَظْمِهَا اِلَّا اللّٰهُ تَخْطَفُ النَّاسَ بِاَعْمَالِهِمْ فَمِنْهُمْ مَنْ يُّوْبَقُ بِعَمَلِهٖ وَمِنْهُمْ مَنْ يُّخَرْدَلُ ثُمَّ يَنْجُوْا حَتّٰى اِذَا فَرَغَ اللّٰهُ مِنَ الْقَضَآءِ بَيْنَ عِبَادِهٖ وَاَرَادَ اَنْ يُّخْرِجَ مِنَ النَّارِ مَنْ اَرَادَ اَنْ يُّخْرِجَهٗ مِمَّنْ كَانَ يَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ اَمَرَ الْمَلٰٓئِكَةَ اَنْ يُّخْرِجُوْا مَنْ كَانَ يَعْبُدُ اللّٰهَ فَيُخْرِجُوْنَهُمْ وَيَعْرِفُوْنَهُمْ بِاٰثَارِ السُّجُوْدِ وَحَرَّمَ اللّٰهُ عَلَى النَّارِ اَنْ تَاْكُلَ اَثَرَ السُّجُوْدِ فَكُلُّ ابْنِ اٰدَمَ تَاْكُلُهُ النَّارُ اِلَّا اَثَرَ السُّجُوْدِ فَيَخْرُجُوْنَ مِنَ النَّارِ قَدِ امْتَحَشُوْا فَيُصَبُّ عَلَيْهِمْ مَآءَ الْحَيٰوةِ فَيَنْبُتُوْنَ كَمَا تَنْبُتُ الْحِبَّةُ فِيْ حَمِيْلِ السَّيْلِ وَيَبْقٰى رَجُلٌ بَيْنَ الْجَنَّةِ وَالنَّارِ وَهُوَ اٰخِرُ اَهْلِ النَّارِ دُخُوْلًا الْجَنَّةَ مُقْبِلًا بِوَجْهِهٖ قِبَلَ النَّارِ فَيَقُوْلُ يَا رَبِّ اصْرِفْ وَجْهِيْ عَنِ النَّارِ وَقَدْ قَشَبَنِيْ رِيْحُهَا وَاَحْرَقَنِيْ ذَكَاؤُهَا فَيَقُوْلُ هَلْ عَسَيْتَ اَنْ اَفْعَلَ ذٰلِكَ اَنْ تَسْئَلَ غَيْرَ ذٰلِكَ فَيَقُوْلُ لَا وَعِزَّتِكَ فَيُعْطِي اللّٰهَ مَا شَآءَ اللّٰهُ مِنْ عَهْدٍ وَمِيْثَاقٍ فَيَصْرِفُ اللّٰهُ وَجْهَهٗ عَنِ النَّارِ فَاِذَا اَقْبَلَ بِهٖ عَلَى الْجَنَّةِ وَرَاٰى بَهْجَتَهَا سَكَتَ مَا شَآءَ اللّٰهُ اَنْ يَّسْكُتَ ثُمَّ قَالَ يَا رَبِّ قَدِّمْنِيْ عِنْدَ

بَابِ الْجَنَّةِ فَيَقُوْلُ اللّٰهُ تَبَارَكَ وَتَعَالٰى اَلَيْسَ قَدْ اَعْطَيْتَ الْعُهُوْدَ وَالْمِيْثَاقَ اَنْ لَّا تَسْاَلَ غَيْرَهٗ فَيَقُوْلُ لَا وَعِزَّتِكَ لَا اَسْئَلُكَ غَيْرَ ذٰلِكَ فَيُعْطِي رَبَّهٗ مَا شَآءَ اللّٰهُ مِنْ عَهْدٍ وَّمِيْثَاقٍ فَيُقَدِّمُهٗ اِلٰى بَابِ الْجَنَّةِ فَاِذَا بَلَغَ بَابَهَا فَرَاٰى زَهْرَتَهَا وَمَا فِيْهَا مِنَ النَّضْرَةِ وَالسُّرُوْرِ فَسَكَتَ مَا شَآءَ اللّٰهُ اَنْ يَّسْكُتَ فَيَقُوْلُ يَا رَبِّ اَدْخِلْنِي الْجَنَّةَ فَيَقُوْلُ اللّٰهُ تَبَارَكَ وَتَعَالٰى يَا ابْنَ آدَمَ! مَا اَغْدَرَكَ! اَلَيْسَ قَدْ اَعْطَيْتَ الْعُهُوْدَ وَالْمِيْثَاقَ اَنْ لَّا تَسْاَلَ غَيْرَ الَّذِيْ اُعْطِيْتَ فَيَقُوْلُ يَا رَبِّ لَا تَجْعَلْنِيْ اَشْقٰى خَلْقِكَ فَلَا يَزَالُ يَدْعُوْ حَتّٰى يَضْحَكَ اللّٰهُ مِنْهُ فَاِذَا ضَحِكَ اَذِنَ لَهٗ فِيْ دُخُوْلِ الْجَنَّةِ فَيَقُوْلُ تَمَنَّ فَيَتَمَنّٰى حَتّٰى اِذَا انْقَطَعَ اُمْنِيَّتُهٗ قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰى تَمَنَّ مِنْ كَذَا وَكَذَا اَقْبَلَ يُذَكِّرُهٗ رَبُّهٗ حَتّٰى اِذَا انْتَهَتْ بِهِ الْاَمَانِيُّ قَالَ اللّٰهُ لَكَ ذٰلِكَ وَمِثْلُهٗ مَعَهٗ وَفِيْ رِوَايَةِ اَبِيْ سَعِيْدٍ قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰى لَكَ ذٰلِكَ وَعَشَرَةُ اَمْثَالِهٖ .

اخرجه البخاری فی صحیحه ۴۴٤/۱۱ حدیث رقم ۶۵۷۳ ومسلم فی صحیحه ۱۶۳/۱ حدیث رقم (۲۹۹-۱۸۲) وابن ماجه فی السنن ۱۴۳۰/۲ حدیث رقم ۴۲۸۰، واحمد فی المسند ۲۹۳/۲۔

ترجمہ: ''حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ (ایک مرتبہ) لوگوں نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! کیا روز قیامت ہم اپنے رب کو دیکھ سکیں گے؟ اس کے بعد حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے مضمون کے اعتبار سے اسی حدیث کو ذکر فرمایا جس کو پیچھے حضرت ابو سعید رضی اللہ عنہ سے (باختلاف الفاظ) نقل کیا جا چکا ہے مگر حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے (پنڈلی کھلنے) کا تذکرہ نہیں فرمایا اور پھر کہا کہ (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے) جب جہنم کے اوپر پل بنا دیا جائے گا تو تمام رسولوں میں اس پل کے اوپر سے اپنی امت کے ہمراہ اس کو پار کرنے والا سب سے پہلا رسول میں ہوگا اور سوائے پیغمبروں کے کوئی بھی اس روز بات کرنے کی جسارت نہیں کر سکے گا اور رسول بھی صرف اتنا کہیں گے کہ اے اللہ! سلامتی رکھنا۔ (اس پل کے) دونوں طرف دوزخ میں سعدان کے کانٹوں جیسے آنکڑے ہوں گے' ان آنکڑوں کی بڑائی کی مقدار کا اللہ تعالیٰ کے علاوہ کوئی علم نہیں رکھتا' وہ آنکڑے لوگوں کو ان کے برے اعمال کے باعث اپنے شکنجہ میں پھنسا لیں گے' پس ان لوگوں میں سے کچھ تو ایسے لوگ ہوں گے جو اپنے اعمال (بری پاداش) میں ہلاک وتباہ کر دیئے جائیں گے اور بعض وہ ہوں گے جو (ان آنکڑوں کی گرفت کی وجہ سے) کاٹ کر ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے جائیں گے لیکن پھر نجات پا جائیں گے (یعنی آنکڑوں کے اُچکنے کے باعث ان کے بدن کا گوشت جگہ جگہ سے چر جائے گا اور پورا جسم بری طرح زخمی ہو جائے گا اور پھر وہ اسی حالت میں جیسے کیسے پل کو عبور کر ہی لیں گے یا اگر دوزخ میں جا گریں گے تو وہاں کچھ عرصہ تک اپنے معاصی کا عذاب و عقاب سہنے کے بعد بالآخر ہمیشہ ہمیشہ کے لئے نجات پا جائیں گے پس یہ گناہ گار و فاسق مسلمانوں کے حال کا تذکرہ ہوا ہے) پھر جب اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کے فیصلہ سے فارغ ہو جائے گا اور یہ چاہے گا کہ جو لوگ لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ کی شہادت ان میں سے جن کو وہ چاہے دوزخ سے نکال لے تو فرشتوں کو حکم فرما دے گا کہ تم ان تمام لوگوں کو جہنم سے نکال لو جو خدا تعالیٰ کو معبود برحق وواحد تسلیم کرتے تھے (اور شرک کے قریب بھی نہیں پھٹکتے تھے) چنانچہ فرشتے ان لوگوں کو دوزخ سے نکال لیں گے اور ان کی پیشانیوں پر سجدہ کے نشانات دیکھ کر ان کی شناخت کریں گے اور چونکہ اللہ تعالیٰ نے آتش دوزخ پر

حرام قرار دیدیا ہے کہ وہ سجدوں کے نشان کو کھالے اس لئے دوزخ کی آگ تمام بدن انسانی کو کھا جائے گی (یعنی جلا ڈالے گی) مگر سجدوں کے نشان کو نہیں کھائے گی۔ بہر حال وہ لوگ دوزخ سے اس حالت میں باہر لائے جائیں گے کہ وہ آگ میں جلتے رہنے کی وجہ سے بھی سیاہ ہو چکے ہوں گے' پس ان پر آب حیات ڈالا جائے گا اور وہ (اس پانی کے اثر سے) اس طرح تر و تازہ ہو جائیں گے جس طرح سیلاب کے کوڑے کچرے میں پڑا ہوا دانہ (بہت جلد) اُگ آتا ہے اور ایک آدمی جو اہل جہنم میں سے جنت میں داخل ہونے والا آخری شخص ہوگا' جنت اور دوزخ کے درمیان کھڑا رکھا جائے گا اس کا منہ دوزخ کی طرف ہوگا' وہ درخواست کرے گا کہ میرے پروردگار! (بس اتنا کرم کردے کہ) میرا چہرہ جہنم سے پھیر دے' دوزخ کی آگ کی بدبو نے مجھے سخت اذیت میں مبتلا کر رکھا ہے اور اس کے شعلوں کی حرارت و تپش مجھے بھسم کئے دے رہی ہے' اللہ تعالیٰ فرمائے گا کہ اگر میں ایسا کردوں تو ہوسکتا ہے کہ تو پھر کچھ اور آرزو کرنے لگے۔ وہ عرض کرے گا کہ مجھے تیری عزت کی قسم میں اور کچھ نہیں مانگوں گا پھر وہ کچھ اور عہد و پیمان کرے گا (جو اللہ تعالیٰ چاہے گا) اور اللہ تعالیٰ اس کا منہ جہنم کی جانب سے پھیر دے گا' مگر جب اس کا منہ پھیر ڈالے گا اور وہ جنت کی زیبائش و آرائش اور تر و تازگی اور رونق کا نظارہ کرے گا تو (پہلے تو) اس وقت تک چپ چاپ (کھڑا دیکھتا) رہے گا' جب تک اللہ تعالیٰ کی مرضی ہوگی کہ وہ چپ رہے اور پھر درخواست کرے گا کہ میرے پروردگار! مجھے جنت کے دروازے کے قریب کردے۔ اللہ تعالیٰ فرمائے گا کیا تو نے یہ عہد و پیمان نہیں کیے تھے کہ تو اپنی اس درخواست کے علاوہ (کہ میرا منہ جہنم کی جانب سے ہٹا دیجئے' کوئی درخواست پیش نہیں کرے گا وہ گڑگڑائے گا کہ میرے پروردگار! تو مجھے اپنی مخلوق میں سب سے زیادہ بدبخت نہ بنا (کہ تیری یہ ساری مخلوق تو جنت کے اندر ہے اور میں اتنا بدنصیب ہوں کہ جنت کے قریب بھی نہیں جا سکتا' مگر جب وہ جنت کے دروازہ تک پہنچ جائے گا اور جنت کی چمک دمک اور اس کے اندر کی چیزوں کی تر و تازگی اور شادمانی کا نظارہ کرے گا تو پہلے اس وقت تک چپ چاپ (کھڑا دیکھتا) رہے گا' جب تک اللہ تعالیٰ کی مرضی ہوگی کہ وہ چپ رہے اور پھر عرض کرے گا کہ میرے پروردگار! مجھے جنت میں داخل فرما دیجئے۔ اللہ تعالیٰ فرمائے گا' ابن آدم! افسوس تو کس قدر دھوکے باز اور وعدہ فراموش ہے؟ کیا تو نے عہد و پیمان نہیں کیا تھا کہ تو اپنی اس درخواست کے علاوہ جو تیری خواہش کے مطابق منظور کر لی گئی تھی' کوئی اور درخواست ظاہر نہیں کرے گا۔ وہ عرض کرے گا کہ میرے پروردگار! (یقیناً میں نے وعدے کئے تھے لیکن جب میں نے تیری شان عفو اور تیری بے پناہ رحم و کرم اور فضل کے بارے میں سوچا اور اس بات پر غور کیا کہ خود تو نے اپنے کلام مجید میں فرمایا ہے: لَا تَایْئَسُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ الخ تو مجھے معلوم ہوا کہ مجھے ان کفار کی مانند نہیں ہونا جو تیری رحمت سے ناامید ہو گئے ہیں' میں تیرے کرم اور تیری وسعت رحمت سے ہر لحہ امید رکھنے والا ہوں' پس تیرا دامن رحمت تھام کر عرض کرتا ہوں کہ) مجھے اپنی مخلوق میں سب سے زیادہ بدبخت و شقی نہ کرنا غرضیکہ وہ اسی طرح آہ و زاری کرتا رہے گا یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ ہنسنے لگے گا اور خدا تعالیٰ اور ہنسنے لگے گا تو اس کو جنت میں داخل ہونے کی اجازت مرحمت فرما دیگا' پھر فرمائے گا کہ تو اور جو کچھ آرزو اور خواہش رکھتا ہو تو اس کو ظاہر کر اور جو کچھ مانگنا چاہتا ہے مانگ لے چنانچہ وہ (دل کھول کر) اپنی آرزئیں اور تمنائیں ظاہر کرے گا اور جب اپنی آخری سے آخری آرزو بھی پوری کرالے گا تو اللہ تعالیٰ فرمائے گا کہ (ارے نادان) فلاں چیز کو بھی مانگ لے' میں آج تجھے ہر چیز عطا کروں گا یہاں تک کہ جب وہ خواہشات بھی پوری ہو جائیں گی تو حق

تعالیٰ شانہ ارشاد فرمائے گا کہ نہ صرف یہ سب کچھ (جو تیری خواہش پر تجھے عطا ہوئی ہیں) تجھے عطا کیا گیا بلکہ ان ہی کی مثل مزید نعمتیں تجھے عطا کی جاتی ہیں اور حضرت ابو سعید رضی اللہ عنہ کی روایت میں یوں ہے کہ حق تعالیٰ شانہ ارشاد فرمائے گا "نہ صرف یہ تمام چیزیں تیرے لئے ہیں بلکہ ان کے ساتھ مزید دس گنا (یعنی بے شمار) اور نعمتیں تیرے لئے ہیں"۔

(بخاری ومسلم)

تشریح: **قوله: وقال: يضرب الصراط۔۔۔ اللهم سلم:** قال: اس کا فاعل نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام ہیں۔ یا حضرت ابو ہریرہؓ ہیں۔ اس صورت میں یہ حدیث مرفوع ہوگی۔

"**ظهراني جهنم**": مراد جہنم کے مابین الطرفین ہیں۔ اس توجیہہ سے اس روایت میں بھی تطبیق ہو جائے گی کہ جس میں یہ الفاظ وارد ہوئے ہیں: **على متنها وظهرها وفوقها**.

يجوز من الرسل بأمته: باء برائے تعدیہ ہے۔ أی: **من يجاوزهم عنها**.

ولا يتكلم يومئذ: الا الرسل: ابن الملکؒ نے فرمایا: "**يومئذٍ**" سے مراد پل صراط پر سے گزرنے کا وقت مراد ہے۔ اس موقع پر یہ تشریح اس لئے ضروری ہے، کہ کئی مواقع پر کسی کو بھی کسی بھی قسم کی بات کی مجال نہ ہوگی۔

میں کہتا ہوں اس کی دلیل اللہ جل شانہ کا یہ قول ہے: ﴿**هذا يوم لا ينطقون**﴾[المرسلات۔۳۵] لیکن بعض مواقع پر لوگ عمومی طور پر کلام کریں گے۔ اس صورت میں یہ حصر مفید تقیید ہوگا۔ (یعنی اس وقت کے ساتھ ہی مقید ہوگا)

سلم سلم: تکرار برائے تاکید ہے۔

قوله: وفي جهنم كلاليب۔۔۔ تخطف الناس باعمالهم:

كلاليب: غیر منصرف ہے چونکہ منتہی الجموع کے وزن پر ہے۔ "**كلاب**" جیم کے ضمہ کے ساتھ۔ کی جمع ہے۔ یا "**كلوب**"۔ کاف کے فتحہ اور لام کی تشدید کے ساتھ کی جمع ہے۔ آگ نکالنے کیلئے مڑے ہوئے سر کی لوہے کی وہ سلاخ کہ جس پر گوشت لٹکایا جاتا ہے، نیز وہ سلاخ کہ جس کے ذریعہ تنور سے روٹیاں وغیرہ نکالی جاتی ہیں۔

السعدان: سین کے فتحہ اور عین کے سکون کے ساتھ، مشہور درخت ہے، اس کے بڑے بڑے کانٹے ہوتے ہیں۔ اس درخت کے کانٹے کو "**حسك السعدان**" کہتے ہیں۔ یہ کانٹا سر پستان کی مانند ہوتا ہے۔

عظمها: عین کے کسرہ اور ظاء کے فتحہ کے ساتھ ہے۔

تخطف: طاء کے فتحہ کے ساتھ، طاء کے کسرہ کے ساتھ بھی مروی ہے۔ پہلی لغت اولیٰ ہے۔ چونکہ یہ لغت قرآن مجید کے موافق ہے۔ اور قرآنی لغت فصیح لغت ہے۔ امام نوویؒ فرماتے ہیں: طاء کے فتحہ اور کسرہ کے ساتھ مروی ہے۔

تخطف الناس بأعمالهم : باء سببیہ ہے۔ اور" اعمال" سے مراد اعمال قبیحہ ہیں۔ أی: **بسبب أعمالهم القبيحة** (یعنی اپنے قبیح اعمال کے سبب ہے) **او بحسب أعمالهم السيئة**.

قوله: فمنهم من يعبن بعمله۔۔۔ ثم ينجو:

فمنهم: ضمیر سے مراد مطلقاً انسان مراد ہیں، یا عاصی (گناہ گار) مراد ہیں، یا مخطوفین (اچک لئے گئے لوگ) مراد ہیں۔

یوبق: وبق یوبق بمعنی ہلاک ہونا سے مشتق ہے۔اور" اوبق" از باب افعال اس کا معنی ہے، دوسرے کو ہلاک کرنا۔
صاحب النہایہ لکھتے ہیں: وبق یبق ویوبق فھو وبق کا معنی ہے"ہلاک کرنا" أوبقه غیره فھو بق کا معنی ہے ہلاک کرنا
بعمله: عمل سے مراد عمل قبیح ہے۔
یخردل: دال مہملہ کے ساتھ، صیغہ مجہول کے ساتھ۔ بمعنی یصرع (بچھاڑ دینا) او یقطع قطعا کالخردلة. (رائی کی طرح چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کرنا) النہایہ میں لکھا ہے:.المخردل: المقطع تقطعه کلالیب الصراط حتی یھوی فی النار. کہا جاتا ہے: خردلت اللحم، دال اور ذال کے ساتھ، گوشت کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے بنانا۔
ابن الملک فرماتے ہیں: بعض کا کہنا ہے کہ صراط پر لگے ہوئے آنکڑے اس کے جسم کے گوشت کو کاٹ ڈالیں گے اور اس کے اعضاء نکال ڈالیں گے۔
ثم ینجو: یعنی آگ میں گرنے سے نجات پا جائے گا۔قصہ مختصر یہ کہ کافر ہلاک ہو جائے گا، اور فاسق شدید زخمی ہو جائے گا۔ پھر وہ بھی نجات پا جائے گا۔

قوله: حتی اذا فرغ الله ـــ فونھم بآثار السجود:
فراغت سے مراد حکم ہے۔ یعنی اپنے اپنے عمل کے اعتبار سے جو جنت کا مستحق ہوگا، وہ جنت میں بھیج دیا جائے گا۔ اور جو جہنم کا مستوجب ہوگا وہ جہنم میں بھیج دیا جائے گا۔
من کان یعبد الله: یعنی جو اللہ کی عبادت کرتا تھا، یا اللہ کی وحدانیت کا قائل تھا یا اللہ تعالیٰ کی عبادت توحید کے ساتھ کیا کرتا تھا۔

اللہ جل شانہ کا فرمان ہے: ﴿سیماھم فی وجوھھم من اثر السجود﴾ [الفتح: ۲۹]
"ان کے آثار بوجہ تاثیر سجدہ کے ان کے چہروں میں نمایاں ہیں"

حرم اللہ النار ـــ الا أثر السجود:

أثر السجود: سے ان کے چہرے یا پیشانیاں مراد ہیں۔
امام نووی فرماتے ہیں: اس سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ دوزخ کی آگ جسم کے ان اعضاء کو نہیں جلائے گی جن سے سجدہ کیا جاتا ہے۔ اور وہ جسم کے سات حصے ہیں۔ پیشانی، دونوں ہاتھ، دونوں زانوں، اور دونوں پاؤں۔
قاضی عیاض فرماتے ہیں: " أثر السجود" سے مراد صرف پیشانی ہے۔ اور مختار قول اوّل ہے۔
میں کہتا ہوں: دوسرے قول کی تائید نص قرآنی سے ہوتی ہے، جیسا کہ ماقبل میں گزرا۔ مزید یہ کہ مسلم کی روایت بھی اس کی مؤید ہے: الا دارة الوجه. ماقبل سے بھی یہی متبادر ہوتا ہے۔ چنانچہ ان کی صورتیں آگ پر حرام کر دی جائیں گی۔ پس یہی معتمد ہے۔

فکل ابن آدم: سے مراد بنی آدم کے اعضاء سے صادر ہونے والے افعال کے آثار مراد ہیں۔
تا کله النار الا أثر السجود: یہ جملہ ماقبل کی تاکید ہے۔

قولہ:۔۔۔ فی حمیل السیال:

قد امتحشوا: بمعنی احترقوا۔ اس کی تحقیق ماقبل میں گزر چکی ہے۔

فیصب علیهم ماء الحیاة: ماقبل میں یہ بات گزر چکی ہے، کہ انہیں ''نہر حیات'' میں ڈالا جائے گا۔ اور ہوسکتا ہے، کہ یہ اختلاف اختلاف اشخاص پر محمول ہو۔

ینبتون کما...... الحیا السیل: حمیل: یہ بمعنی ''محمول'' ہے۔

قولہ: ویبقی رجل بین الجنة۔۔۔ فیصرف وجهه عن النار:

دخولا: تمیز ہونے کی بناء پر منصوب ہے۔

الجنة: منصوب ہے، ''دخولاً'' کا مفعول ہے۔

مقبل: بمعنی ''متوجہ'' یہ خبر دوئم ہے۔ یا دوسرے مبتدا مقدر ''ھو'' کی خبر ہے۔

قبل: قاف کے کسرہ اور باء کے فتحہ کے ساتھ بمعنی جہت۔

قشبنی: قاف کے فتحہ، شین معجمہ اور بائے موحدہ کے ساتھ۔ ای آذانی واهلکنی (مجھے تکلیف دی اور ھلک کر دیا) بعض حضرات نے اس کا مطلب ''سمتی وأهلکنی'' بیان کیا ہے یعنی یہ ''القشیب'' سے ماخوذ ہے' یہ ایک مہلک زہر ہے۔ مقدمہ میں ہے: أی: ملأ خیاشیمی. (میری ناک کی جڑ کو بھر دیا)'' قشب'' سم (زہر) کو کہتے ہیں اس کا اطلاق ہر تکلیف دہ چیز کے پہنچنے پر ہوتا ہے۔ داؤدیؒ فرماتے ہیں: معناه غیر جلدی وصورتی (میری جلد اور میری صورت کو متغیر کر دیا۔)

ذکاؤها: ذال معجمہ کے ضمہ اور مد کے ساتھ، ایک صحیح نسخہ میں قصر کے ساتھ ذکاھا ہے۔

امام نوویؒ فرماتے ہیں: یہ لفظ مدّ کے ساتھ ہے اور ذال معجمہ مفتوح ہے۔ اس حدیث کی تمام روایات میں یہ لفظ یوں ہی واقع ہے۔ ''ذکاؤها'' کا مطلب ہے: لهبها واشتعالها وشدة وهجها. (آگ کا بھڑکنا) قصر والی لغت زیادہ مشہور ہے۔ اور بعض کا کہنا ہے کہ مد اور قصر کے ساتھ دو لغات ہیں۔

هل عسیت: یعنی کیا تم سے یہ توقع کی جاسکتی ہے۔

ان أفعل ذلك: فعل کا صلہ حرفی محذوف ہے۔ أی: بلك. ذلك کا مشار الیہ'' صرف الوجه'' ہے۔

یہ جملہ شرطیہ ''عسی'' کے اسم وخبر کے درمیان جملہ معترضہ کے طور پر واقع ہے۔ ''عسی'' کی خبر یا گلا جملہ (ان تسأل غیر ذلك) ہے۔

أن تسأل غیر ذلك: یعنی کیا یہ توقع کی جاسکتی ہے، کہ اس کے بعد تم کوئی سوال نہیں کرو گے؟ امام طیبیؒ فرماتے ہیں: اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ سوال کیوں کر درست ہوسکتا ہے۔ حالانکہ وہ'' ما کان'' اور'' ما یکون'' کا علم رکھتا ہے؟

میں کہتا ہوں: اس کا مطلب یہ ہے: أنکم یا بنی آدم لما عهد منکم من رخاوة الوعد ونقض العهد أحقاء بأن یقال لکم. یا هؤلاء ما ترون هل یتوقع منکم ذلك ام لا؟ سارے جواب کا حاصل یہ ہے کہ ''عسی'' کے معنی کا

تعلق مخاطب سے، نہ کہ اللہ جل شانہ کی ذات سے۔

وعزتك: ای: لا أسئلك غير ذاك. (یعنی میں اس کے علاوہ اور نہیں مانگوں گا)

فيعطى: اس کا مفعول اول محذوف ہے۔

ما شاء: یہ "يعطى" کا مفعول ثانی ہے۔"ما شاء " کا مطلب ہے: جو اس نے مقدر کر رکھا تھا اس کا فیصلہ کر رکھا تھا۔ یا اس نے جو عہد و میثاق کا ارادہ کیا تھا۔ یعنی ایسی کوئی قسم کہ جس کے ذریعے عہد کو پختہ اور مؤکد کیا جا سکے۔

قوله: مغاذا قبل على الجنة۔۔۔ فيقدمه الى باب الجنة:

اقبل: صیغہ معروف کے ساتھ ہے۔ اور ایک نسخہ میں مجہول کے صیغہ کے ساتھ ہے۔

به: ضمیر "وجه" کی طرف عائد ہے۔ ای: بوجهه.

بهجة: بمعنی "حسن"۔

رأى بهجتها و كثرة خيرها سكت: اصول میں اسی طرح ہے کہ دونوں فعلوں کے درمیان کوئی حرف عطف نہیں ہے۔ بظاہر دونوں میں سے ایک " اذا" کا جواب ہے۔ اور دوسرے کا عطف شرط و جزاء پر ہے۔

"رأى بهجتها" کو مجوزین کے مذہب پر حال قرار دینا بھی درست ہے۔"مشارق" کے الفاظ یہ ہیں: فاذا أقبل على الجنة ورآها سكت. (جب وہ جنت کی طرف رخ کرے گا اور اس کو دیکھے گا تو خاموش ہو جائے گا)

قال يا رب قدمني عند باب الجنة: "یہاں عند" بمعنیٰ "الى" ہے، جیسا کہ عنقریب آ رہا ہے۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ ظرف حال مقدرہ ہو۔

ليس: ضمیر "ضمیر شان" ہے۔

لا اكون اشقى خلقك: یعنی مجھے بد بخت ترین انسان مت بنا۔ "شقاوت" سے یہاں "حرمان" مراد ہے۔ یعنی میں محروم نہیں ہونا چاہتا

فما عسيت: ما استفہامیہ ہے۔ ای: فهل عسيت.

اعطيت: صیغہ مجہول کے ساتھ ہے۔

فيقول...... غير ذلك: یہ ما قبل والے "لا" کی تاکید و بیان ہے۔ اور ایک صحیح نسخہ میں "لا اسأل غير ذلك" ہے۔

فيعطى: کا مفعول اول "الرجل" محذوف ہے۔ اور" فيقدمه" کا فاعل اللہ جل شانہ ہے۔

قوله: فاذا بلغ بها۔۔۔ اشقى خلقك:

زهرتها: زاء کے فتحہ کے ساتھ، عبارت میں مضاف محذوف ہے۔ ای: زهرة من فيها۔ یعنی اہل جنت کی اچھی گزران دیکھ کر کہے گا۔ الزهرة کا مطلب ہے" البياض "، (سفیدی)۔ زهرة الدنيا، دنیا کی چمک دمک۔

النضرة: سے مراد حسن و رونق ہے۔

یعنی عالی شان محلات، حوروں کی کثرت اور عیش و عشرت کے اسباب میں مگن لوگوں کی خوشی اور سرور دیکھے گا۔

فسكت: مشکوۃ کے تمام نسخوں میں فاء کے ساتھ "فسكت" ہے۔ امام طیبیؒ نے فرمایا: صحیح بخاری کے تمام نسخوں میں اور مصابیح کے اکثر نسخوں میں "فسكت" فاء کے ساتھ ہے۔ اس تقدیر پر" اذا" کا جواب محذوف ہے۔ معنوی تقدیر یوں ہے: اذا رأى ما تحير فسكت. (جب وہ حیران کن چیزیں دیکھے گا تو خاموش ہو جائے گا اس کی نظیر اللہ جل شانہ کا یہ فرمان ہے: ﴿وَسِيقَ الَّذِينَ اتَّقَوْا رَبَّهُمْ إِلَى الْجَنَّةِ زُمَرًا حَتَّىٰ إِذَا جَاءُوهَا وَفُتِحَتْ أَبْوَابُهَا﴾ [الزمر: ۷۳] "اور جو لوگ اپنے رب سے ڈرتے تھے وہ گروہ گروہ ہو کر جنت کی طرف روانہ کیئے جاویں گے یہاں تک کہ جب اس (جنت) کے پاس پہنچیں گے اور اس کے دروازے (پہلے سے) کھلے ہوئے ہونگے۔" (انتہٰی)

بعض کا کہنا ہے کہ واؤ زائدہ ہے۔ اس واؤ کو" واؤ ثمانیہ" کہتے ہیں۔ اس کی مثال اللہ جل شانہ کا یہ فرمان ہے: ﴿وَيَقُولُونَ خَمْسَةٌ سَادِسُهُمْ كَلْبُهُمْ﴾ [الکھف: ۲۲] "اور بعضے کہیں گے کہ وہ سات میں آٹھواں ان کا کتا ہے"۔

ابو البقاءؒ فرماتے ہیں: ایک قوم کے نزدیک واؤ زائدہ ہے۔ محققین کے نزدیک یہ واؤ زائدہ نہیں اور جواب محذوف ہے۔ جو أطمأنوا یا اس سے ملتا جلتا ہے۔

ويلك ابن آدم: ایک شارح کا کہنا ہے کہ" ويلك" منصوب مصدر ہونے کی بناء پر اگر مضاف ہو۔ عدم اضافت کی صورت میں مرفوع علی الابتداء ہوگا۔ اور اگر فعل مضمر مان لیا جائے تو یہ منصوب ہوگا۔ مثلاً ويل للزيد، ويلاً لزيد، اى: أهلك الله اهلاكا أو هلكت هلاكا۔

ما أغدرك: غین معجمہ اور دال مہملہ کے ساتھ، ہے اور "ما" تعجبیہ ہے۔ عبارت کی معنوی تقدیر یوں ہوگی: يستحق أن يتعجب منك لكثرة غدرك فى عهودك بأن لا تسأل غيره۔

اور ممکن ہے کہ "ما" استفہامیہ ہو، اور ہمزہ صیرورت کیلئے ہو۔ أى: أى شىء صيرك غادرا فى عهودك. (کس چیز نے تجھ کو تیرے عہد و پیمان میں غدر کرنے والا بنا دیا)

اور ایک نسخہ میں عین مہملہ اور ذال معجمہ کے ساتھ (أعذرك) ہے۔ اى: أى شىء جعلك فى هذا السؤال معذورا؟ (کس چیز نے تجھ کو اس سوال میں معذور کر دیا)

أعطيت: صیغہ مجہول کے ساتھ ہے۔

امام طیبیؒ فرماتے ہیں: اگر یہ سوال کیا جائے کہ سوال و جواب میں مطابقت نہیں ہے' کیونکہ سوال تو یہ تھا: أليس قد أعطيت العهود والميثاق؟ (کیا تو نے عہد و پیمان نہیں کیا تھا) میں کہتا ہوں گویا کہ اصل ارشاد یوں ہے: يارب بلى! اعطيت العهود والميثاق، ولكن تأملت فى كرمك وعفوك ورحمتك، وقولك: ﴿لا تيأسوا من روح الله انه لا ييأس من روح الله الا القوم الكفرون﴾ [یوسف۔۸۷] فوقفت على انى لست من الكفار الذين أيسوا من روح الله وطمعت فى كرمك وسعة رحمتك، فسألت ذلك) اے میرے رب بے شک میں نے عہد و پیمان کیا تھا لیکن جب میں نے تیری شان عفو اور تیری بیکراں رحمت کی طرف دیکھا، اور اس بات پر غور کیا کہ خود تو نے اپنے قرآن مجید میں فرمایا ہے: ﴿لا تيأسوا من روح الله﴾ تو مجھے معلوم ہوا کہ میں ان کافروں میں سے نہیں ہوں، جو تیری رحمت سے نا

امید ہو گئے ہیں۔ میں تیری رحمت سے ہر لحہ امید رکھنے والا ہوں، پس تیرا دامن رحمت تھام کر عرض کرتا ہوں۔ تو گویا کہ اللہ تعالیٰ اس کی بات کو پسند فرماتے ہوئے ہنس پڑیں گے۔(انتہی)۔ اگلے جملہ کا مطلب بھی یہی ہے۔

قوله: فلا یزال یدعو احتی .....: ضحك کنایہ ہے، رضا سے۔

منه: (من سببیہ ہے۔) أي: من اجله وسبب کلامه ودعائه.

تمن: امر حاضر کے صیغہ کے ساتھ ہے۔

أمنيته: ہمزہ کے ضمہ اور یاء تحتانیہ کی تشدید کے ساتھ ہے۔

تمن کذاو کذا: مظہرؒ فرماتے ہیں: "من" بیانیہ ہے۔ أي: تمن من کل جنس ما تشتهی منه۔ (جس جنس کی جس چیز کی تمہیں خواہش ہے اس کی تمنا کرو۔

امام طیبیؒ فرماتے ہیں: اور اسی کے مثل اللہ جل شانہ کا یہ قول ہے: ﴿یغفر لکم من ذنوبکم﴾ [الاحقاف: ۳۱] "اللہ تعالیٰ تمہارے گناہ معاف کردے گا" اور ایک احتمال یہ ہے کہ "من" زائدہ ہو، امام اخفشؒ کے مذہب پر کلام مثبت میں واقع ہو سکتا ہے۔

اقبل یذکرہ ربه: یہ جملہ سابقہ جملہ سے بدل ہے، از راہ بیان۔ اور اس کو تنازع عاملین کے قبیل سے قرار دینا بھی درست ہے۔ (انتہی) اقبل بمعنی "شرع" ہے۔

یذکرہ: کاف کی تشدید کے ساتھ، اور مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اس بندہ پر الہام فرمائیں گے اور اس بات کی تلقین فرمائیں گے کہ کن کن چیزوں کی تمنا کرنی چاہئے۔

حتی اذا انتهت به الأماني: یعنی جب تمام خواہشات ختم ہو جائیں گی، اور کوئی تمنا باقی نہیں رہے گی۔

قال الله: لك ذلك: کا مشار الیہ محذوف ہے، أي: ذلك مسؤلك ومأمولك. (یہ ہے وہ چیز جو تو نے مانگی تھی اور جس کی تجھ آرزو تھی)

ومثله معه: اور یہ اللہ کی طرف سے از راہ فضل ہوگا۔

وفي رواية لك ذلك: یعنی تو نے جو تمنائیں کی۔

وعشرة امثاله: یعنی کیفیت میں اس کے مثل ہیں، اگرچہ کمیت میں بھی اس کے مثل ہوں گی۔ اس توجیہ سے تدافع مرتفع، اور تمانع مندفع ہو جاتا ہے۔ واللہ سبحانہ وتعالیٰ۔

۵۵۸۲ : وَعَنِ ابْنِ مَسْعُوْدٍ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اٰخِرُ مَنْ يَّدْخُلُ الْجَنَّةَ رَجُلٌ فَهُوَ يَمْشِيْ مَرَّةً وَيَكْبُوْ مَرَّةً وَتَسْفَعُهُ النَّارُ مَرَّةً فَاِذَا جَاوَزَهَا اِلْتَفَتَ اِلَيْهَا فَقَالَ تَبَارَكَ الَّذِيْ نَجَانِيْ مِنْكَ لَقَدْ اَعْطَانِيَ اللّٰهُ شَيْئًا مَا اَعْطَاهُ اَحَدًا مِّنَ الْاَوَّلِيْنَ وَالْاٰخِرِيْنَ فَتُرْفَعُ لَهٗ شَجَرَةٌ فَيَقُوْلُ اَيْ رَبِّ اَدْنِنِيْ مِنْ هٰذِهِ الشَّجَرَةِ فَلِاَ سْتَظِلَّ بِظِلِّهَا وَاَشْرَبَ مِنْ مَّائِهَا فَيَقُوْلُ اللّٰهُ يَا ابْنَ اٰدَمَ لَعَلِّيْ اِنْ

أُعْطِيتُكَهَا سَأَلْتَنِيْ غَيْرَهَا فَيَقُوْلُ لَا يَا رَبِّ وَيُعَاهِدُهُ اَنْ لَّا يَسْاَلَهُ غَيْرَهَا وَرَبُّهُ يَعْذِرُهُ لِاَنَّهُ يَرٰى مَا لَا صَبْرَلَهُ عَلَيْهِ فَيُدْنِيْهِ مِنْهَا فَيَسْتَظِلُّ بِظِلِّهَا وَيَشْرَبُ مِنْ مَآئِهَا ثُمَّ تُرْفَعُ لَهُ شَجَرَةٌ هِيَ اَحْسَنُ مِنَ الْاُوْلٰى فَيَقُوْلُ اَىْ رَبِّ اَدْنِنِىْ مِنْ هٰذِهِ الشَّجَرَةِ لِاَشْرَبَ مِنْ مَآئِهَا وَاَسْتَظِلَّ بِظِلِّهَا لَا اَسْاَلُكَ غَيْرَهَا فَيَقُوْلُ يَا ابْنَ اٰدَمَ اَلَمْ تُعَاهِدْنِي اَنْ لَّا تَسْاَلَنِيْ غَيْرَهَا فَيَقُوْلُ لَعَلِّى اِنْ اَدْنَيْتُكَ مِنْهَا تَسْاَلُنِى غَيْرَهَا فَيُعَاهِدُهُ اَنْ لَّا يَسْاَلَهُ غَيْرَهَا وَرَبُّهُ يَعْذِرُهُ لِاَنَّهُ يَرٰى مَا لَا صَبْرَ لَهُ عَلَيْهِ فَيُدْنِيْهِ مِنْهَا فَيَسْتَظِلُّ بِظِلِّهَا وَيَشْرَبُ مِنْ مَآئِهَا ثُمَّ تُرْفَعُ لَهُ شَجَرَةٌ عِنْدَ بَابِ الْجَنَّةِ هِيَ اَحْسَنُ مِنَ الْاُوْلَيَيْنِ فَيَقُوْلُ اَىْ رَبِّ اَدْنِنِى مِنْ هٰذِهٖ فَلِاَسْتَظِلَّ بِظِلِّهَا وَاَشْرِبَ مِنْ مَآءِ هَالَا اَسْاَلُكَ غَيْرَهَا فَيَقُوْلُ يَا ابْنَ اٰدَمَ اَلَمْ تُعَاهِدْنِي اَنْ لَّا تَسْاَلَنِيْ غَيْرَهَا قَالَ بَلٰى يَا رَبِّ هٰذِهٖ لَا اَسْاَلُكَ غَيْرَهَا وَرَبُّهُ يَعْذِرُهُ لِاَنَّهُ يَرٰى مَا لَا صَبْرَلَهُ عَلَيْهِ فَيُدْنِيْهِ مِنْهَا فَاِذَا اَدْنَا مِنْهَا سَمِعَ اَصْوَاتَ اَهْلِ الْجَنَّةِ فَيَقُوْلُ اَىْ رَبِّ اَدْخِلْنِيْهَا فَيَقُوْلُ يَا ابْنَ اٰدَمَ مَا يَصْرِيْنِىْ مِنْكَ؟ اَيُرْضِيْكَ اَنْ اُعْطِيْكَ الدُّنْيَا وَمِثْلَهَا قَالَ اَىْ رَبِّ اَتَسْتَهْزِئُ مِنِّى وَاَنْتَ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ فَضَحِكَ ابْنُ مَسْعُوْدٍ فَقَالَ اَلَا تَسْاَلُوْنِى مِمَّ اَضْحَكُ فَقَالُوْا مِمَّ تَضْحَكُ فَقَالَ هٰكَذَا ضَحِكَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالُوْا مِمَّ تَضْحَكُ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ قَالَ مِنْ ضِحْكِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ حِيْنَ قَالَ اَتَسْتَهْزِئُ مِنِّى وَاَنْتَ رَبُّ الْعَالَمِيْنَ فَيَقُوْلُ اِنِّى لَا اَسْتَهْزِئُ مِنْكَ وَلٰكِنِّى عَلٰى مَا شَآءَ قَادِرٌ. (رواه مسلم)

اخرجه مسلم فی صحيحه ١٧٩٤/١ حديث رقم (٣١٠-١٨٧) والدارمی فی السنن ٤٠٩/٢ حديث رقم ٢٧٧٧ واحمد فی المسند ٤١١/١۔

ترجمہ: ”حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ”جنت میں داخل ہونے والوں میں سب آخری وہ شخص ہوگا جو (جنت جہنم سے نکل کر چلے گا تو) ایک مرتبہ یعنی ایک قدم آگے چلے گا اور دوسری مرتبہ (یعنی دوسرے قدم پر) منہ کے بل گر پڑے گا اور تیسری مرتبہ (یعنی تیسرے قدم پر) آتش جہنم (کی گرمی اور تپش) اس کے جسم کو جھلس ڈالے گی (جس کی وجہ سے اس کے بعض اعضاء جسم جل جائیں گے اور اس کی جلد کی رنگت بدل جائے گی) پھر جب وہ (ایسے گرتا مرتا) دوزخ (کی گرمی و تپش کی زد) سے تجاوز کر جائے گا تو مڑ کر (دوزخ کی طرف) دیکھے گا اور کہے گا کہ بہت عالیشان ہے وہ ذات خداوندی جس نے مجھے تجھ سے چھٹکارا دلایا' بخدا میرے پروردگار نے مجھے وہ چیز عنایت فرمادی جو اس نے اگلے پچھلے لوگوں میں سے کسی کو عطا نہیں کی' پھر اس کی نگاہ کے سامنے ایک درخت بلند کر دیا جائے گا (جس کے نیچے پانی کا چشمہ ہوگا) وہ (اس درخت اور چشمے کو دیکھ کر) درخواست کرے گا کہ میرے پروردگار! مجھے اس درخت کے نزدیک کر دے تاکہ میں اس کا سایہ حاصل کر سکوں اور اس کے چشمہ سے سیرابی حاصل کر لوں' اللہ تعالیٰ فرمائے گا ابن آدم! اگر میں نے تیری اس خواہش کو پورا کر دیا تو شاید تو کوئی آرزو کرنے لگ جائے! وہ عرض کرے گا کہ

میرے پروردگار! ایسا نہیں ہوگا' اس کے بعد وہ خدائے بزرگ سے عہد و پیمان کرے گا اس بات پر کہ وہ اس کے علاوہ اور کچھ نہیں مانگے گا! چونکہ وہ شخص ایک ایسی چیز دیکھے گا جو اس کو بے صبر کر دے گی اس لئے اس کا پروردگار اس کو معذور قرار دیکر اسی سے درگزر کرے گا اور اس کو درخت کے نزدیک کر دے گا! وہ شخص اس درخت کے سایہ میں سایہ حاصل کرے گا اور اس کے چشمے کے پانی سے سیرابی حاصل کرے گا پھر اس کے سامنے دوسرا درخت کھڑا کیا جائے گا جو پہلے درخت سے زیادہ اچھا ہوگا' وہ شخص (اس درخت کو دیکھ کر) کہے گا کہ میرے پروردگار مجھ کو اس درخت کے قریب کر دیجئے تا کہ اس کا سایہ حاصل کرلوں اور اس کے چشمے سے سیرابی حاصل کروں نیز میں اب اس درخت کے علاوہ کچھ اور نہیں مانگوں گا' حق تعالیٰ اس سے فرمائے گا کہ ابن آدم! کیا تو نے مجھ سے یہ عہد نہیں کیا تھا کہ تو اس (پہلے) درخت کے سوا کسی اور چیز کی درخواست مجھ سے نہیں کرے گا۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ فرمائے گا اگر میں تجھے اس درخت کے قریب کر دوں تو شاید تو مجھ سے کچھ اور سوال کرنے لگ جائے پس اس کا پروردگار اس کو معذور جان کر اس سے درگزر کرے گا کیونکہ وہ ایک ایسی چیز دیکھے گا جو اس کو بے صبر کر دے گی اور پھر اللہ تعالیٰ اس کو اس درخت کے نزدیک لے جائے گا' وہ شخص اس درخت کے سایہ میں بیٹھے گا اور اس کے چشمہ کا پانی پئے گا اور (تیسرا) اور درخت اس کے سامنے کھڑا کر دیا جائیگا جو جنت کے دروازہ کے قریب اور پہلے دونوں درختوں کی نسبت زیادہ عمدہ اور اچھا ہوگا' وہ شخص (اس درخت کو دیکھ کر) عرض کرے گا کہ اے میرے پروردگار! مجھے اس درخت کے نزدیک کر دیجئے تا کہ میں اس کا سایہ حاصل کرسکوں اور اس کے چشمے میں سے پانی پیوں' حق تعالیٰ اس سے فرمائے گا' ابن آدم! کیا تو نے مجھ سے یہ عہد نہیں کیا تھا کہ اس کے سوا کسی اور چیز کی مجھ سے درخواست نہیں کرے گا۔ وہ عرض کرے گا کہ ہاں (میں نے بے شک عہد کیا تھا لیکن اب یہ میرا آخری سوال ہے) اس کے علاوہ اور کچھ نہیں مانگوں گا۔ پس اس کا پروردگار اس کو معذور جان کر اس سے درگزر کرے گا کیونکہ وہ شخص ایک ایسی چیز دیکھے گا جو اس کو بے صبر کر دے گی اور پھر خدا تعالیٰ اس درخت کے نزدیک کر دے گا اور جب وہ اس درخت کے قریب چلا جائے گا تو وہ جنت والوں کی آوازیں (جو ان باتوں پر مشتمل ہوں گی جو جنتی لوگ اپنی بیویوں اور اپنے دوست واحباب سے کریں گے) سنے گا تو وہ شخص (بے قرار و مجبور ہو کر پھر) گذارش کرے گا کہ میرے پروردگار! اب مجھے جنت میں بھی پہنچا دیجئے حق تعالیٰ ارشاد فرمائیں گے۔ ابن آدم! وہ کونسی چیز ہے جو تجھ سے (یعنی تیرے بار بار خواہش و آرزو کرنے سے) میرا پیچھا چھڑا دے؟ کیا تو اس سے بھی راضی ہوگا یا نہیں کہ میں تجھ کو دنیا بھر کے بقدر یا اسکے ساتھ اسی کے بقدر مزید بھی جنت میں جگہ عطا کر دوں؟ وہ شخص (انتہائی خوشی و مسرت اور تعجب اور حیرت کے عالم میں) کہے گا کہ پروردگار کہیں آپ میرا ٹھٹا تو نہیں اڑا رہے ہیں' حالانکہ آپ تو تمام جہانوں کے پروردگار ہیں! (حدیث کے یہ الفاظ بیان کرنے کے بعد) حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ ہنسے اور پھر حدیث سننے والوں سے پوچھنے لگے کیا تم یہ نہیں پوچھو گے کہ میں کیوں ہنسا؟ لوگوں نے پوچھا کہ ہاں بتائیے آپ کیوں ہنسے تھے۔ فرمایا اسی طرح رسول اللہ ﷺ بھی ہنسے تھے اور جب صحابہؓ نے کرام نے پوچھا تھا کہ یا رسول اللہ! آپ ﷺ ہنسے کیوں؟ تو آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ میں اس وجہ سے ہنسا کہ جب وہ شخص کہے گا کہ پروردگار! کہیں تو میرا ٹھٹا تو نہیں اڑا رہا' حالانکہ یقیناً آپ تمام جہانوں کے پروردگار ہیں؟ تو پھر پروردگار عالم اس پر ہنس پڑے گا! بہرحال اللہ تعالیٰ (اس آدمی کی یہ بات سماعت فرما کر) فرمائے گا کہ نہیں میں تجھ سے مذاق نہیں کر

رہا ہوں (اور بخوبی واقف ہوں کہ تو اس عطاو بخشش کا مستحق نہیں ہے) لیکن (یہ سب تجھ کو اس لئے عطا کر رہا ہوں کہ) میں جو چاہوں کر سکتا ہوں (کہ ہر چیز کا مالک و مختار اور قادر مطلق و کامل میں ہی ہوں) اس روایت کو مسلم نے نقل کیا ہے۔

تشریح: قولہ: قال: آخر من یدخل الجنة۔۔۔ من الا ولین ولا آخرین:

"فھو": امام طیبیؒ فرماتے ہیں: ممکن ہے کہ فاء تفصیلیہ ہو، بایں طور کہ اولاً دخول جنت کو مبہم رکھا، اور پھر دوسری مرتبہ میں دخول جنت کی کیفیت کو تفصیل کے ساتھ ذکر فرمایا۔

اور یہ بھی ممکن ہے کہ فاء تعقیب اخبار کیلئے ہو۔ اور اس کا مابعد، وجود کے اعتبار سے اس کے ماقبل سے مقدم ہو۔ تو گویا عبارت کی معنوی تقدیر یوں ہے: أخبر کم عقیب ھذا القول حالہ، فھو یمشی قبل دخولہ فی الجنة مرة۔

یکبوا: بائے موحدہ کے ضمہ کے ساتھ۔ بمعنی، یقف بعض کا کہنا ہے کہ وہ منہ کے بل گرے گا۔

مرة: (کی صفت محذوف ہے۔) أی: مرة أخری. (دوسری مرتبہ)

تسفعه: فاء کے فتحہ کے ساتھ، بمعنی تحرقه۔ (اس کو جلا دی گئی)

(مرة) کوئی مخصوص علامت لگا دی جائے گی، بایں طور کہ چہرہ سیاہ کر دیا جائے یا آنکھیں نیلی کر دی جائیں۔ عرب کہتے ہیں: سفع من النار، آگ کے جلنے کا نشان۔ اور" سفعت الشیء من النار" اس وقت کہتے ہیں جب آپ کسی شئے پر کوئی علامت لگائیں۔ ابن الملکؒ: أی تلفحه لفحا یسیرا یعنی آپ اس کو تھوڑا سا جھائے گی۔ جس سے اس کی جلد کا رنگ متغیر ہو جائے گا۔

بعض نے کہا کہ اس کا مطلب ہے: تعلمه علامة ای اثرا منھا. (آپ اس پر علامت لگائے گی یعنی اپنا اثر اس پر ظاہر کرے گی۔

صاحب قاموس فرماتے ہیں: لفحت النار بحرھا کا معنی ہے" جلانا" اور، وسفع الشیء از باب منع اس کا معنی ہے علامت لگانا داغنا معمولی سا جھلسانا والسموم وجھه لفحه لفحا یسیرا.

تبارك: اس کا معنی ہے۔ تعظم تعالٰی أو تکاثر خیرہ۔

تبارك الذی نجا: نجات کی نعمت سے مسرور ہو کر یہ جملہ کہے گا۔

لقد عطانی اللہ ......: قسم محذوف کا جواب ہے۔ خوشی کی وجہ سے قسم کھائے گا، کہ نجات کی نعمت عظمٰی سے اس کے علاوہ کوئی بھی بہرہ ور نہیں ہوا۔ اور شاید کہ اس کی وجہ یہ ہوگی کہ وہ دوزخ سے نکلنے کے وقت کسی اور کو اپنے ساتھ نہ دیکھے گا اور یہ نہ جان پائے گا کہ نیکو کار جنت کی نعمتوں اور وہاں کے عیش و راحت میں ہیں، اس لئے وہ یہی سمجھے گا، کہ اس وقت میرے ربّ نے دوزخ سے باہر لانے کی صورت میں جو نعمت عطاء کی ہے، اتنی بڑی نعمت اس نے اگلے پچھلے لوگوں میں سے کسی کو عطاء نہیں کی۔ اور اسے یہ بھی معلوم ہوگا، کہ کتنے ہی نیکو کار دار القرار کی نعمتوں کے مزے لوٹ رہے ہیں۔

قوله: فترفع له شجرة۔۔۔ ویشرب من مائھا:

فترفع له شجرة: اس درخت کے پاس پانی کا ایک چشمہ ہوگا۔ اس بات کی تصریح عنقریب آ رہی ہے۔

فیقول: ای: رب: ''أی'' اصل میں نداءِ قریب کیلئے ہے۔ یا بعید کیلئے ہے۔ پس کبھی تو وہ ربّ کے عبد سے قرب کو دیکھے گا، جیسا کہ اللہ جل شانہ کا فرمانا ہے: ﴿نحن أقرب الیہ من حب الورید﴾[ق:١٦] ''اور ہم انسان کے اس قدر قریب ہیں کہ اس کی رگ گردن سے بھی زیادہ'' اور کبھی عبد کو ربّ سے بعید سمجھے گا جیسا کہ کہا جاتا ہے: یا للتراب، ورب الأرباب

أدنني: ادناء مصدر سے امر حاضر کا صیغہ ہے، بمعنی قربني۔

فلأ ستظل: پہلے لام کے کسرہ کے ساتھ، یہ فعل منصوب ہے۔

امام طیبیؒ فرماتے ہیں کہ فاء سببیہ ہے اور لام زائدہ ہے۔ یا برعکس ہے۔ یعنی فاء زائدہ اور لام تعلیلیہ ہے۔

اس میں مسامحت ہے، جو کہ مخفی نہیں۔ کلام میں تجرید ہے۔

أعطیتکھا: ھاء ضمیر ''مسئلہ'' یا ''اُمنیۃ'' کی طرف عائد ہے۔

سألتني غیرھا: یہ جواب شرط ہے، جو خبر ''لعل'' پر دلالت کر رہا ہے۔

یعذرہ: یاء کے فتحہ اور ضمہ کے ساتھ، یعنی اس کو معذور قرار دے گا۔

نہایۃ میں لکھتے ہیں: ''أعذر'' کبھی ''جعلہ موضع العذر'' کے معنی میں آتا ہے۔

مشارق میں لکھا ہے: عذرتہ اور أعذرتہ کا مطلب ہے: قبلت عذرہ.

صاحب مصباح لکھتے ہیں: عذرتہ فیما صنع عذرا، باب ''ضرب'' سے ہے۔ اس کا مطلب ہے: رفعت عنہ اللوم، (میں نے اس سے علامت کو اٹھا دیا) اس کا اسم مفعول کا صیغہ ''معذور'' آتا ہے۔ ''أعذرتہ''، یہ لغت الف کے ساتھ ہے۔ اور ''اعتذر'' کا مطلب ہے: طلب قبول معذرتہ. (قبول معذرت کو طلب کرنا) اور ''اعتذر عن فعلہ'' کا مطلب ہے: أظھر عذرہ. (اپنا عذر ظاہر کرنا)

یری ما لا صبر علیہ: اصول میں اسی طرح ہے کہ پہلی دو مرتبہ کے الفاظ اسی طرح ہیں۔ بعض اصول میں تیسری مرتبہ کی عبارت بھی یہی ہے۔ اور اکثر نسخوں میں علیھا ہے، ''ما'' نعمۃ کی تاویل میں ہے اور ''علی'' بمعنی ''عن'' ہے۔ جیسا کہ امام نوویؒ نے شرح مسلم میں لکھا ہے۔ علامہ سیوطیؒ نے مسلم شریف کے حاشیہ میں اس کو برقرار رکھا ہے۔

أحسن من الأولی: بھی مبتدا محذوف کی خبر ہے۔ یہ ''ترقي من الأدنی الی اعلیٰ'' ہے۔

فیقول...... بظلھا: واؤ مطلق جمع کیلئے ہے، چونکہ بظاہر سائے سے راحت حاصل کرنا، پانی پینے سے مقدم ہے۔

لا أسألك غیرھا: اما طیبیؒ فرماتے ہیں یہ حال ہے۔ اور اس میں ''استظل'' اور ''اشرب'' کا تنازع ہے۔

تسألني: مرفوع ہے۔

یا رب ھذہ: یہ اسم اشارہ محلاً منصوب ہے، اس کا فعل محذوف ہے، اور ما بعد ما لا فعل، اس فعل محذوف کی تفسیر کر رہا ہے۔ أی: ھذہ أسألك۔ (میں تجھ سے یہ طلب کر رہا ہوں)

لا أسألك غیرھا: جملہ حالیہ ہے یا مستانفہ ہے۔

لا صبر لہ علیہ: اور بعض نسخوں میں ''علیھا'' ہے۔ ان دونوں سے متعلقہ کلام ماقبل میں گزر چکا ہے۔

سمع اصوات اهل الجنة: یعنی اس کے کانوں میں جنتی لوگوں کی اپنی بیویوں کے ہمراہ اور دوست احباب سے گفتگو وغیرہ سنیں گے، تو اس کا جی بھی چاہے گا، وہ ان سے انس حاصل کرے، یا ان کے نغمے سنے، پس وہ بھی ارادہ کرے گا، کہ کسی طرح قریب ہو جائے اور جنتیوں کے نغموں سے لذت حاصل کرے۔

یصرینی: یاء کے فتحہ اور صاد مہملہ کے سکون کے ساتھ۔

صاحب النہایہ فرماتے ہیں: ایک روایت میں " **ما یصریك منی** " ہے۔ **ای مایقطع مسألتك وینعك من سؤالی** (یعنی تیرے سوال کو کیا چیز قطع کرے گی؟ اور مجھ سے مانگنے میں کیا چیز حائل بنے گی؟) عرب کہتے ہیں: **صریت الشیء ای قطعته** (یعنی میں نے چیز کو کاٹ دیا)، اور کہتے ہیں: **صریت الماء ای جمعته وحبسته** (یعنی میں نے پانی جمع کر لیا، اور روک لیا)۔ (انتھی)

حدیث کا مطلب یہ ہے کہ اے بندہ! تو بار بار سوال کر رہا ہے، حالانکہ آپ نے تو عہد کیا تھا کہ تو نہیں مانگے گا۔ پس کونسی چیز ہے، جو تیرے مجھ سے اس مانگنے کے سلسلے کو ختم کرے گی، کہ تو مجھ سے راضی ہو جائے۔

تورپشتی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: **صری عنه شیء** کا مطلب ہے "**دفع**"، اور " **صریته** " کا مطلب ہے " **منعته**" اور " **صریت ما بینهم صریا** " کا مطلب ہے " **فصلت**"، عرب کہتے ہیں: **اختصمنا الی الحاکم فصری ما بیننا ای قطع ما بیننا وفصل**، بہتر ہے کہ یوں کہا جائے (کہ اس کا مطلب یہ ہے): **ما یفصل بینی وبینك أی ما الذی یرضیك حتی تترك مناشدتك؟** اور مطلب یہ ہے کہ میں نے تیرے سوال کو بار بار پورا کیا، اور تو نے یہ عہد کیا کہ تو پھر دوبارہ کوئی اور چیز نہیں مانگے گا، تو اپنے کئے ہوئے وعدہ کو وفا نہیں کرتا، پس کوئی ایسی چیز بتا جو اس قضیہ میں میرے تیرے درمیان فیصلہ کر دے۔ یہ کلام درحقیقت مجاز واتساع پر محمول ہے۔

فرمایا: کتاب المصابیح میں " **ما یصرینی منك**" کے الفاظ ہیں' یہ غلط ہے۔ اور درست یہ ہے: **ما یصریك منی کذا.** متقن اہل روایت نے یوں روایت کیا ہے۔

مظہرؒ فرماتے ہیں: ممکن ہے کہ یہ قلب پر محمول ہو۔ اصل تو یہ تھا: **ما یصریك منی**، بوجہ علم کے " قلب" کر دیا گیا۔ کلام عرب اور ان کے استعمال میں " قلب" ذائع شائع ہے۔

امام طیبیؒ فرماتے ہیں: روایت صحیح ہے۔ اور حدیث کا مفہوم علی سبیل الکنایہ درست ہے۔

امام نوویؒ فرماتے ہیں: صحیح مسلم کے نسخہ میں " **ما یصرینی منك**" یاء کے فتحہ اور صاد مہملہ کے سکون کے ساتھ ہے۔ مسلم کے علاوہ کی روایات میں " **ما یصریك منی** " ہے۔ ابراہم حربیؒ فرماتے ہیں: یہی درست ہے، اور صحیح مسلم وغیرہ کی روایت کا انکار کیا ہے۔ حالانکہ ایسی بات نہیں ہے بلکہ دونوں روایات صحیح ہیں۔ "سائل" جب "مسؤل" سے ناامید ہو جاتا ہے، تو "مسؤل عنہ" بھی ناامید ہو جاتا ہے۔ اور مطلب یہ ہے کہ کونسی چیز تجھے راضی کرے گی، اور تیرے مجھ سے مانگنے (کے سلسلے) کو ختم کرے گی؟

قوله: أیرضیك أن ـــ وانت رب العالمین:

الدنیا: "قدر" مضاف محذوف ہے۔ ~~أی قدر الدنیا~~۔ (دنیا کے بقدر)

أستهزی منی: کا مطلب ہے: أتحلنی محل المستهزأ به. (یعنی کیا آپ مجھے ایسے شخص کے قائم مقام قرار دے رہے ہیں جس سے استہزا کیا جا رہا ہو)

وأنت رب العالمین: یہ جملہ حالیہ ہے۔ جب ''استهزاء'' کا مسند الیہ اللہ جل شانہ ہو تو اس کا مطلب ہوتا ہے: انزال الهوان علیه واحلاله ایاه محل الاستهزاء به. (کذا ذکرہ شارح)

شرح مسلم للنوویؒ میں فرماتے ہیں: سائل کا یہ سوال درحقیقت خوشی سے پھولے نہ سمانے کی وجہ سے ہوگا۔ قاضی عیاضؒ فرماتے ہیں، یہ کلام اس شخص سے اس وجہ سے صادر ہوگا، کہ وہ اپنے آپ پر قابو نہیں رکھ پائے گا، چونکہ اس کو ایک ایسی خوشی حاصل ہوگی جس کا کھٹکا کبھی اس کے دل پر بھی نہیں گزرا ہوگا۔ پس اس کی زبان دہشت اور مسرت وفرح کے باعث قابو میں نہیں ہوگی، اور اس طرح کی گفتگو کرے گا، جیسا کہ عام زندگی میں مخلوق سے کرتا ہے۔ اس کے مثل وہ حدیث توبہ ہے، کہ جس میں آتا ہے، کہ بندہ جب اپنی سواری کو زاد راہ سمیت پا کر خوشی سے بے قابو ہو جاتا ہے، تو کہتا ہے: أنت عبدی وأنا ربك (تو میرا بندہ اور میں تیرا رب) (انتھیٰ)

ابن الملکؒ اس کی وضاحت کرتے ہوئے فرماتے ہیں: بندہ کی زبان سے یہ جملہ کیوں کر صادر ہو سکتا ہے، حالانکہ (حقائق پر سے) پردہ اٹھ چکا ہوگا، عالم اور جاہل کو اللہ تعالیٰ کی معرفت یکساں طور پر حاصل ہو چکی ہوگی کہ اللہ کے جناب میں کیا جائز ہے، اور کیا ناجائز ہے۔

ہم کہتے ہیں اس عالم کا رتبہ اس عالم عارف کے رتبہ کا ہے کہ جس پر اللہ تعالیٰ کی عطاؤں کے باعث خوشی کا غلبہ ہو، اس موقع پر اس کی مسرت کی فراوانی اس قدر ہوگی، جس قدر کہ اس شخص کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ ہوگا، کہ جس کی سواری، اس کے زادِراہ سمیت کسی لق ودق صحرا میں کہیں گم ہو جائے، اور وہ خود آس کا دامن چھوڑ بیٹھے اور بالکل نا امید ہو جائے، اور پھر اچانک اسے اس کی سواری توشہ سمیت مل جائے، اور اپنی سواری کی لگام پکڑ کر فرط جذبات میں آ کر یہ کہہ بیٹھے: اللهم أنت عبدی وأنا ربك.

قوله: فضحك ابن مسعود۔۔۔ وأنت رب العالمین:

الا: تخفیف کے ساتھ ہے۔

تسألونی: نون کی تشدید اور تخفیف ہر دو کے ساتھ۔

مم أضحك: (اصل میں '' من ما أضحك'' تھا۔ ''ما'' استفہامیہ ہے۔) أی: من أی شیء أضحك؟ (میں کس چیز سے ہنس رہا ہوں)

من ضحك رب العالمین: امام تورپشتی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''ضحك '' کی نسبت اللہ کی طرف ہو یا اور رسول اللہ ﷺ کی طرف، اگرچہ لفظی اعتبار سے یکساں معلوم ہوتی ہے، لیکن معنوی اعتبار سے دونوں نسبتوں میں تباین ہے۔ اللہ تعالیٰ کی طرف ''ضحك'' کی نسبت کو اللہ تعالیٰ کی اپنے بندے سے کمال رضا اور ارادہ اُخیر پر محمول کیا جائے گا۔ کہ اللہ تعالیٰ اپنے جس بندے سے خیر کا ارادہ کرتا ہے اس پر رحم فرماتا ہے۔

قاضیؒ فرماتے ہیں: آنحضرت ﷺ کا ہنسنا، اس تعجب وسرور کی بناء پر تھا، جو ایک گناہ گار بندے پر اللہ تعالیٰ کے کمال لطف

ومہربانی اور کمال رضا کو دیکھ کر آپ ﷺ کے اندر پیدا ہوا تھا۔

رہی حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی ہنسی کی بات، تو وہ بیان حدیث کے وقت ان الفاظ پر پہنچ کر آنحضرت ﷺ کی اتباع میں ہنسے۔ جس کی دلیل یہ جملہ ہے: **هكذا ضحك رسول الله ﷺ**۔

میں کہتا ہوں: ظاہر یہ ہے کہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی ہنسی کا سبب یہ تھا، کہ انہیں یہ بات موجب ضحک معلوم ہوئی۔ ایسا نہیں تھا کہ وہ محض نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام کی تقلید اور حکایت فعل کے خاطر ہنسے، چونکہ وہ امر اختیاری نہیں تھا۔ اور آنحضرت ﷺ سے ضحک کا صدور، کسی فعل غریب یا قول عجیب جیسے باعث کے بغیر تو ہونے سے رہا۔

قوله: فیقول انی لا استهزی منك ولكنی ......:

"**قادر**": اور ایک نسخہ میں **قدیر** ہے۔

امام طیبیؒ نے فرمایا: اگر تم کہو کہ باعث استدراک کیا چیز تھی؟ تو میں کہوں گا، وہ باعث ایک مقدر چیز ہے۔ چونکہ جب اللہ تعالیٰ نے بندے سے یہ فرمایا: **أیرضیك أن أعطیك الدنیا ومثلها معها**، تو بندے کو یہ بات بہت مستبعد معلوم ہوئی کہ چونکہ وہ اس عطاء وبخشش کا مستحق نہیں ہے، اسی استبعاد کی وجہ سے بندہ کہے گا: **أتستهزئ بی؟** (آپ میرا ٹھٹا تو نہیں اڑا رہے ہیں؟) اللہ سبحانہ وتعالیٰ فرمائیں گے، ہاں! خوب جانتا ہوں، کہ تو اس عطاء وبخشش کا حقدار نہیں ہے، تجھے وہ چیز دے رہا ہوں جسے تو مستبعد سمجھتا ہے، چونکہ میں جس چیز پر چاہوں قادر ہوں۔

تخریج: امام مسلمؒ نے اس حدیث کو حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے روایت کیا ہے۔

۵۵۸۳ : وَفِیْ رِوَایَةٍ لَهُ عَنْ اَبِیْ سَعِیْدٍ نَحْوَهُ اِلاَّ اَنَّهُ لَمْ یَذْکُرْ فَیَقُوْلُ یَا ابْنَ اٰدَمَ مَا یَصْرِیْنِیْ مِنْكَ اِلٰی اٰخِرِ الْحَدِیْثِ وَزَادَ فِیْهِ وَیُذَکِّرُهُ اللّٰهُ سَلْ کَذَا وَکَذَا حَتّٰی اِذَا انْقَطَعَتْ بِهِ الْاَمَانِیُّ قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰی هُوَ لَكَ وَعَشَرَةُ اَمْثَالِهٖ قَالَ ثُمَّ یَدْخُلُ بَیْتَهُ فَتَدْخُلُ عَلَیْهِ زَوْجَتَاهُ مِنَ الْحُوْرِ الْعِیْنِ فَیَقُوْلَانِ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ اَحْیَاكَ لَنَا وَاَحْیَانَا لَكَ قَالَ فَیَقُوْلُ مَا اُعْطِیَ اَحَدٌ مِثْلَ مَا اُعْطِیْتُ.

اخرجه مسلم فی صحیحه ۱۷۵/۱ حدیث رقم (۳۱۱-۱۸۸)۔

ترجمہ: "اور صحیح مسلم ہی کی ایک دوسری روایت میں حضرت ابوسعید خدریؓ سے اسی طرح کے الفاظ منقول ہے مگر اس روایت میں: فَیَقُوْلُ یَا ابْنَ اٰدَمَ مَا یَصْرِیْنِیْ مِنْكَ...... سے آخر حدیث تک الفاظ بیان نہیں کئے ہیں البتہ ان الفاظ کا اضافہ ہے کہ پھر اللہ تعالیٰ اس شخص کو یاد دلائیں گے اور بتلائیں گے کہ فلاں فلاں چیز مانگ اور جب (وہ سب کچھ مانگ لے گا اور) اس کی خواہشات کی تکمیل ہو جائے گی تو اللہ تعالیٰ ارشاد فرمائیں گے کہ نہ صرف یہ تمام چیزیں (جس کے حصول کی تو نے تمنا اور آرزو کی ہے بلکہ ان سے دس گناہ مزید بھی تجھے عطا کیا جاتا ہے"۔ آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا: اس کے بعد وہ شخص جنت میں محل میں جائے گا' وہاں اس کے پاس حورعین میں سے اس کی دو بیویاں آئیں گی اور کہیں گی کہ تمام تر تعریف اسی خدا کو زیبا ہے جس نے (اس عالیشان محل میں کہ جہاں عیش وراحت جاودانی کے سوا نہ کوئی غم وفکر ہے اور نہ موت کا خوف' تمہیں ہماری خاطر اور ہمیں تمہاری خاطر وجود بخشا"۔ آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا: وہ شخص (والہانہ)

کہے گا کہ جتنا مجھے عطا کیا گیا ہے اتنا کسی اور کو نہیں دیا گیا''۔

تشریح: قوله: عن أبی سعید نحوه۔۔۔۔ وزادفیه یعنی حضرت ابوسعید خدریؓ سے، حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی روایت کے جیسے الفاظ منقول ہیں۔ پچھلی روایت کے الفاظ میں کچھ کمی ہے، اور اس روایت میں کچھ اضافہ ہے۔

یذکره: تشدید کے ساتھ،

امام نوویؒ نے فرمایا: ''زوجتاه'' تاء کے ساتھ، ''زوجة'' کا تثنیہ ہے۔ روایت میں یہ لفظ یوں ہی وارد ہوا ہے۔ اور یہی لغت صحیح معروف ہے۔

قوله: فتقولان: الحمد الذی احیاك لنا وأحیانا لك:

احیاك لنا واحیا نا لك: (أحیا'' بمعنی ''خلق'' ہے۔) أی: خلقك لنا وخلقنا لك، (یعنی تجھ کو ہمارے لئے پیدا کیا اور ہم کو تمہارے لئے پیدا کیا۔) ''خلق'' کی جگہ'' احیاء'' کی تعبیر ''خلود'' کے معنیٰ کی طرف اشارہ ہے۔ اور اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ جس گھر میں اللہ تعالیٰ نے ان دونوں کو اکٹھا کیا ہے، یہ وہ گھر ہے جہاں موت نہیں، یہ گھر ہمیشہ کی خوشیوں اور سرمدی حیات کا گہوارہ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿وان الدار الآخرة لهی الحیوان﴾ [العنکبوت: ٦٤] ''اور اصل زندگی عالم آخرت ہیں اگر ان کو اس کا علم ہوتا''۔

قوله: ما أعطی احدمثل أعطیت:

یہ بات وہ اس لئے کہے گا کہ اسے اس وقت تک کانوں کان بھی خبر نہیں ہوگی، کہ یہ عطاء کی بارشیں کسی اور پر بھی برسی ہیں۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

۵۵۸۴ : وَعَنْ اَنَسٍ اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قَالَ لَیُصِیْبَنَّ اَقْوَامًا سَفْعٌ مِنَ النَّارِ بِذُنُوْبٍ اَصَابُوْهَا عَقُوْبَةً ثُمَّ یُدْخِلُهُمُ اللّٰهُ الْجَنَّةَ بِفَضْلِهٖ رَحْمَتِهٖ فَیُقَالُ لَهُمُ الْجَهَنَّمِیُّوْنَ. (رواه البخاری)

اخرجه البخاری فی صحیحه ٤١٦/١١ حدیث رقم ٦٥٥٩ واخرجه ابن ماجه فی السنن ١٤٤٣/٢ حدیث رقم ٤٣١٥ واحمد فی المسند ١٣٣/٣۔

ترجمہ: ''حضرت انس رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''مسلمانوں کے بہت سے ایسے طبقات ہوں گے جنہیں ان کے ان گناہوں کی سزا میں جو انہوں نے کئے ہوں گے جہنم کی آگ جھلسا دے گی اور ان کی جلد تبدیل کر ڈالے گی اور پھر اللہ تعالیٰ محض اپنے خاص فضل و کرم اور رحمت کے تحت ان کو (دوزخ سے چھٹکارا دلا کر) جنت میں داخل فرمائے گا اور ان لوگوں کو ''جہنمی'' قرار دیا جائے گا''۔ (بخاری)

تشریح: قوله: لیصیبن اقواما۔۔۔ورحمة:

لیصیبن: (یہاں قسم محذوف ہے۔) ای۔ واللہ لیصیبن۔

سفع: سین کے فتحہ اور فاء کے سکون کے ساتھ، بمعنی آگ کی لپٹ کی سیاہی۔ آگ کی کوئی نشانی، (کذا فی المقدمة)۔ بعض کا کہنا ہے ''سفع'' کا مطلب ہے ''احراق قلیل'' (تھوڑا سا جلنا)

بذنوب: میں باء "سببیہ" ہے۔ أصابوھا: یہ جملہ محل جر میں "ذنوب" کی صفت ہے۔ عقوبة: مفعول لہ ہے۔
بفضله ورحمته: سید کے اصل نسخہ میں اور بعض نسخوں میں عبارت یوں ہی ہے۔ اور بعض نسخوں میں "بفضل رحمته" ہے۔

قوله: فيقال لهم: الجهنميون:
امام طیبیؒ نے فرمایا: ان لوگوں کو "جہنمی" کے نام سے پکارا جانا، ان کی تحقیر و تذلیل کے لئے نہیں ہوگا، بلکہ ان لوگوں کو اور خوش کرنے اور نعمت یاد دلانے کے طور پر ہوگا، تاکہ ان لوگوں کو یہ بات معلوم رہے، کہ وہ "عتقاء الله" یعنی اللہ تعالیٰ کے آزاد کردہ ہیں۔

تخریج: اس روایت کو ابوداؤد اور امام ترمذیؒ نے بھی اسی طرح روایت کیا ہے۔

۵۵۸۵ : وَعَنْ عِمْرَانَ بْنِ حُصَيْنٍ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَخْرُجُ اَقْوَامٌ مِّنَ النَّارِ بِشَفَاعَةِ مُحَمَّدٍ فَيُدْخَلُوْنَ الْجَنَّةَ وَيُسَمَّوْنَ الْجَهَنَّمِيِّيْنَ رواه الْبُخَارِىُّ وَفِىْ رِوَايَةٍ يَخْرُجُ قَوْمٌ مِّنْ اُمَّتِىْ مِنَ النَّارِ بِشَفَاعَتِىْ يُسَمَّوْنَ الْجَهَنَّمِيِّيْنَ۔

اخرجه البخاري في صحيحه ۴۱۸/۱۱ حديث رقم ۶۵۶۶ والترمذي ۶۱۶/۴ حديث رقم ۲۶۰۰ وابن ماجه في السنن ۱۴۴۳/۲ حديث رقم ۴۳۱۵۔

ترجمہ: "حضرت عمران بن حصین رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: "کئی طبقات کو محمد (ﷺ) کی شفاعت کے نتیجہ میں جہنم سے نکال کر جنت میں داخل کیا جائے گا اور انہیں جہنمی کہا جائے گا"۔ (بخاری)
اور ایک دوسری روایت میں میں یوں ہے کہ آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا: "میری امت میں سے بہت سے افراد میری شفاعت کے نتیجہ میں جہنم سے نکال لیئے جائیں گے اور ان کا نام "جہنمی" رکھا جائے گا"۔

تشریح: قوم: اور ایک نسخہ میں "اقوام" ہے۔
شفاعة محمد: اور ایک نسخہ میں "ﷺ" کے الفاظ بھی ہیں۔
فيدخلون: مجہول کے صیغہ کے ساتھ ہے۔ بعض کا کہنا ہے کہ فعل معروف کا صیغہ ہے۔
ويسمون الجهميين: مصابیح میں "الجهنميون" ہے۔ ایک شارح کا کہنا ہے کہ روایت واؤ کے ساتھ ہے۔ حالانکہ حق یہ تھا کہ یاء کے ساتھ ہوتی، چونکہ یہ "يسمون" کا مفعول ہے۔
ایک احتمال یہ بھی ہے کہ یہ "علم" ہو، اسی وجہ سے اس میں تغیر نہیں ہوا۔

تخریج: اس حدیث کو ابوداؤد، ترمذی اور ابن ماجہ نے بھی اسی طرح روایت کیا ہے۔

۵۵۸۶ : وَعَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ مَسْعُوْدٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنِّىْ لَاَعْلَمُ اٰخِرَ اَهْلِ النَّارِ خُرُوْجًا مِنْهَا وَاٰخِرَ اَهْلِ الْجَنَّةِ دُخُوْلًا رَجُلٌ يَخْرُجُ مِنَ النَّارِ حَبْوًا فَيَقُوْلُ اللّٰهُ اِذْهَبْ

فَادْخُلِ الْجَنَّةَ فَيَاتِيهَا فَيُخَيَّلُ اِلَيْهِ اَنَّهَا مَلْاٰى فَيَقُوْلُ يَارَبِّ وَجَدْتُّهَا مَلْاٰى فَيَقُوْلُ اللّٰهُ اذْهَبْ فَادْخُلِ الْجَنَّةَ فَاِنَّ لَكَ مِثْلَ الدُّنْيَا وَعَشَرَةَ اَمْثَالِهَا فَيَقُوْلُ اَتَسْخَرُ مِنِّى اَوْتَضْحَكُ مِنِّى وَاَنْتَ الْمَلِكُ فَلَقَدْ رَاَيْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ضَحِكَ حَتّٰى بَدَتْ نَوَاجِذُهٗ وَكَانَ يُقَالُ ذٰلِكَ اَدْنٰى اَهْلِ الْجَنَّةِ مَنْزِلَةً. (متفق علیه)

اخرجه البخاری فی صحیحه ۴۱۸/۱۱حدیث رقم ۶۵۷۱ومسلم فی صحیحه ۱۷۳/۱حدیث رقم (۳۰۸-۱۹۶) واخرجه الترمذی فی السنن ۶۱۴/۴حدیث رقم ۶۱۴/۴حدیث رقم ۲۵۹۵۔

ترجمہ: ''حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''میں یقیناً اس شخص کو بخوبی جانتا ہوں جو سب سے آخر میں جہنم سے نکلے گا اور سب سے آخر میں جنت میں داخل ہوگا ایسا آدمی ہوگا جو گھٹنوں کے بل گھسٹ کر جہنم سے نکلے گا' اللہ تعالیٰ اس سے فرمائے گا جاؤ اور جنت میں چلے جاؤ وہ شخص جب وہاں جائے گا تو اس کے خیال میں جنت ایسے نظر آئے گی کہ گویا وہ بالکل بھر گئی ہے۔ وہ شخص عرض کرے گا کہ اے میرے پروردگار میں نے تو اسے بھرا ہوا پایا ہے (میری جگہ تو اس میں نہیں ہے)؟ اللہ تعالیٰ فرمائے گا: تو جا اور جنت میں داخل ہو' وہاں تیرے لئے دنیا (کی مسافت) برابر اور اس سے دس گنا اور زیادہ جگہ تیرے لئے (مخصوص کر دی گئی) ہے وہ شخص (سراسیمگی کی حالت میں) گویا ہوگا کہ (پروردگار!) کیا تو مجھ سے مذاق کر رہا ہے یا یہ کہے گا کہ تو مجھ سے ہنسی کر رہا ہے حالانکہ آپ تو (بادشاہوں کے بھی) بادشاہ ہیں؟'' حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ میں نے دیکھا کہ رسول اللہ ﷺ یہ بات ارشاد فرما کر ہنسنے لگے یہاں تک کہ آپ ﷺ کی کچلیاں نظر آنے لگیں''۔ اور کہا جاتا تھا کہ یہ آدمی اہل جنت میں سب سے چھوٹے درجہ کا آدمی ہوگا''۔ (بخاری ومسلم)

تشریح: انی اعلم آخر اهل النار خروجاً منها وآخر اهل الجنة دخولا. بظاہر یہ دونوں لازم وملزوم ہیں۔ لہٰذا دونوں کو یکجا ذکر کرنا برائے توضیح ہے۔ اور یہ بھی بعید نہیں کہ یہ اس وہم کیلئے قید احترازی ہو کہ ہوسکتا ہے، کہ کوئی جنتی، موقف ہی میں روک لیا جائے۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

قوله: رجل تخرج من النار ۔۔۔اذهب فارجل الجنة:

حبوا: حال ہے، یا مصدر ہے۔'' حبا الصبی'' سے مشتق ہے۔ جب بچہ گھٹنوں کے بل چلے یا بیٹھے بیٹھے اپنے چوتڑوں کے بل آگے کھسکے تو ''حبا الصبی'' کہتے ہیں۔ ''حبوا'' کا مطلب ہے'' زحفاً'' جیسا کہ ایک روایت میں آتا ہے۔

فیأتیها: یعنی جب وہ جنت کے قریب آئے گا، یا یہ کہ جب وہ جنت میں داخل ہوگا۔

فیخیل الیه: یعنی اللہ تعالیٰ اسے یوں دکھلائیں گے۔

ملاٰی: ملآن کا مؤنث ہے۔

الجنة: ''ال'' جنس کا ہے یا عہد کا ہے۔

قوله: فان لك مثل الدنيا وعشرة أمثالها:

یعنی وسعت و قیمت کے اعتبار سے دنیا برابر اور اس سے دس گناہ زیادہ جگہ تیرے لئے ہے۔ یہ اضافہ کما بھی ہوگا اور کیفاً بھی۔ اس میں اللہ جل شانہ کے اس فرمان کی طرف اشارہ ہے: ﴿من جاء بالحسنة فله عشر امثالها﴾ [الانعام: ١٦٠] ''جو شخص نیک کام کرے گا اس کو (کل دوم) اس کے دس حصے ملیں گے'' مؤمن چونکہ تارک دنیا ہوتا ہے، اس اعتبار سے دنیا مؤمن کے حق میں قید خانہ ہوتی ہے، چنانچہ بندۂ مومن کو جزا دی جائے گی، تو از روئے عدل تو اس کے مثل ہوگی، اور از روئے فضل کئی گنا بڑھ چڑھ کر ہوگی۔

تسخر: خاء کے فتحہ کے ساتھ۔

اؤ تضحك مني: راوی کو شک ہے۔

وأنت الملك: یہ جملہ حالیہ ہے۔

نواجذ: آخری داڑھوں کو کہتے ہیں۔

قوله: وكان يقال ......:

بظاہر یہ کلام حضرت عمرانؓ کا ہے، یا ان کے بعد کے کسی راوی کا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ صحابہؓ یا سلف یہ حدیث بیان کرنے کے بعد یہ کہا کرتے تھے، کہ حدیث میں جس شخص کا ذکر کیا گیا ہے، اور جس کو جنت میں اتنی بڑی جگہ ملنے کا تذکرہ ہے وہ مرتبہ اور درجہ کے اعتبار سے تمام جنتیوں میں سب سے کمتر ہوگا۔

۵۵۸۷ : وَعَنْ اَبِی ذَرٍّ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اِنِّی لَاَ عْلَمُ اٰخِرَ اَهْلِ الْجَنَّةِ دُخُوْلاً الْجَنَّةَ وَاٰخِرَ اَهْلِ النَّارِ خُرُوْجًا مِنْهَا رَجُلاً یُؤْتٰی بِهٖ یَوْمَ الْقِیَامَةِ فَیُقَالُ اَعْرِضُوْا عَلَیْهِ صِغَارَ ذُنُوْبِهٖ وَارْفَعُوْا عَنْهُ کِبَارَهَا فَتُعْرَضُ عَلَیْهِ صِغَارَ ذُنُوْبِهٖ فَیُقَالُ عَمِلْتَ یَوْمَ کَذَا وَکَذَا وَعَمِلْتَ یَوْمَ کَذَا وَکَذَا وَکَذَا وَکَذَا فَیَقُوْلُ نَعَمْ لَا یَسْتَطِیْعُ اَنْ یُّنْکِرَوَهُوَ مُشْفِقٌ مِنْ کِبَارِ ذُنُوْبِهٖ اَنْ تُعْرَضَ عَلَیْهِ فَیُقَالُ لَهٗ فَاِنَّ لَكَ مَکَانَ کُلِّ سَیِّئَةٍ حَسَنَةٌ فَیَقُوْلُ رَبِّ قَدْ عَمِلْتُ اَشْیَآءَ لَا اَرَاهَا هٰهُنَا وَلَقَدْ رَاَیْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ ضَحِكَ حَتّٰی بَدَتْ نَوَاجِذُهٗ (رواه مسلم)

اخرجه مسلم في صحيحه ١٧٧/١ حديث رقم (٣١٤-١٩٠) والترمذي ٦١٤/٤ حديث رقم ٢٥٩٦-

ترجمہ: ''حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: میں بلاشبہ میں اس شخص سے بخوبی واقف ہوں جو اہل جنت میں سے سب سے آخر میں جنت میں داخل ہوگا اور اہل جہنم میں سے سب سے آخر میں جہنم سے نکلے گا' یہ ایک ایسا شخص ہوگا جس کو روز قیامت جب (پروردگار کے حضور میں) حاضر کیا جائے گا تو (فرشتوں سے) کہا جائے گا کہ اس کے صغیرہ گناہوں کی فرد جرم اس کے سامنے کردو اور اس کے بڑے بڑے گناہوں کو ابھی اس سے دور رکھو۔ چنانچہ اس کے چھوٹے چھوٹے گناہ اس کے آگے کردی جائے گی اور پھر اس سے سوال کیا جائے گا کہ (بتا) کیا تو نے فلاں فلاں دن فلاں فلاں (برے کام کئے تھے اور فلاں فلاں دن طاعت کو ترک کیا تھا' وہ اعتراف کرے گا کہ ہاں (واقعتاً مجھ

سے یہ گناہ سرزد ہوئے ہیں) وہ اپنے ان گناہوں سے انکار نہیں کر سکے گا کیونکہ وہ اپنے بڑے بڑے گناہوں کے خوف میں مبتلا ہوگا (اور یہ سوچ گا کہ اگر خدا تعالیٰ نے میرے بڑے بڑے جرائم کی مندرجہ فرد جرم کو ظاہر کر دیا تو پھر بہت سی سخت پرسش اور مواخذہ سے دوچار ہونا پڑے گا پس اس سے کہا جائے گا کہ تجھے ہر بدی کا بدلہ میں ایک نیکی عنایت کی جاتی ہے وہ شخص کہے گا کہ میرے پروردگار! میں نے اور بھی بہت سے اعمال بد کا ارتکاب کیا تھا جو مجھے یہاں دکھائی ہی نہیں دے رہے حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں نے دیکھا' رسول اللہ ﷺ سے یہ بیان فرما کر ہنسنے لگے یہاں تک کہ آپ ﷺ کے نوکدار دانت نظر آنے لگیں"۔ (مسلم)

تشریح: قوله: اني لأعلم آخر۔۔۔ان تعرض عليه:

دخولا الجنة: (صلۂ حرفی محذوف ہے۔) أي: فيها.

اعرضوا: ہمزہ اور راء کے کسرہ کے ساتھ۔

یعنی بڑے گناہ مٹا دو، یا چھپا دو۔

قوله: فيقول: نعم: یعنی ہر ہر ظہور جرم کے بعد "نعم" کہے گا، یا یہ کہ دونوں جرموں کے اعتراف کے بعد "نعم" کہے گا۔

لا يستطيع أن ينكر: ۔جملہ مستانفہ ہے، یا حالیہ ہے۔

قوله: فيقال له: فان لك مكان كل سيئة حسنة .....:

اس کا باعث یہ ہوگا کہ وہ تائب تھا۔ اللہ جل شانہ کا فرمان ہے:

﴿إِلَّا مَن تَابَ وَآمَنَ وَعَمِلَ عَمَلًا صَالِحًا فَأُولَٰئِكَ يُبَدِّلُ اللَّهُ سَيِّئَاتِهِمْ حَسَنَاتٍ﴾ [الفرقان: ۷۰] "مگر جو (شرک ومعاصی سے) توبہ کرے اور ایمان (بھی) لے آئے اور نیک کام کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں (گذشتہ) گناہوں کی جگہ نیکیاں عنایت جائے گی"

لیکن یہ اشکال ہوتا ہے، کہ یہ شخص سب سے آخر میں دوزخ سے نکلنے والا کیسے ہوگا؟

پہلا جواب: ممکن ہے کہ یوں کہا جائے، توبہ کے بعد یہ شخص گناہوں کا مرتکب ہونے کے باعث مستوجب عقاب ہوا۔

دوسرا جواب: سیئات کا حسنات سے مبدل ہونا یہ رب الأرباب کے فضل سے ہوگا۔ یہی بات زیادہ ظاہر ہے۔ اور اس کی تائید اس بات سے بھی ہوتی ہے کہ وہ اس لمحہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے فضل وکرم کی طمع رکھتا ہوگا۔

لا أراها ههنا: "یہاں" سے مراد صحائف ہیں، یا "موضع تبدیل" ہے۔

۵۵۸۸ : وَعَنْ أَنَسٍ أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ يُخْرَجُ مِنَ النَّارِ أَرْبَعَةٌ فَيُعْرَضُونَ عَلَى اللَّهِ ثُمَّ يُؤْمَرُ بِهِمْ إِلَى النَّارِ فَيَلْتَفِتُ أَحَدُهُمْ فَيَقُولُ أَيْ رَبِّ لَقَدْ كُنْتُ أَرْجُو إِذَا أَخْرَجْتَنِي مِنْهَا أَنْ لَا تُعِيدَنِي فِيهَا قَالَ فَيُنْجِيهِ اللَّهُ مِنْهَا. (رواه مسلم)

اخرجه مسلم في صحيحه ۱۸۰/۱ حديث رقم (۱۹۲/۳۲۱) واحمد في المسند ۲۸۵/۳۔

ترجمہ: "حضرت انس رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: "(آخر میں جہنم سے جن لوگوں کو

آزاد کیا جائے گا ان میں سے) چار آدمی وہ ہوں گے جن کو جب دوزخ سے نکالا جائے گا اور اللہ تعالیٰ کے حضور میں حاضر کیا جائے گا تو ان کے بارے میں یہ حکم ہوگا کہ ان کو دوزخ میں بھیج دیا جائے۔ اس کے بعد جب ان کو دوزخ کی طرف لے جایا جائے گا تو ان میں سے ایک آدمی مڑ کر دیکھے گا اور (بڑی حسرت کے ساتھ) کہے گا اے میرے رب! میں تو یہ توقع رکھتا تھا کہ جب آپ مجھے جہنم سے باہر نکال دیں گے؟ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''اللہ تعالیٰ (یہ بات سن کر) اسے جہنم سے خلاصی اور رہائی عطا کردے گا''۔ (مسلم)

تشریح: قولہ: یخرج من النار اربعة ......:

ابن الملکؒ فرماتے ہیں: یہ لوگ جہنم سے نکلنے والے آخری لوگ ہوں گے۔

فینجیہ: تخفیف اور تشدید کے ساتھ ہے۔

امام طیبیؒ فرماتے ہیں: اور شاید کہ یہ خروج۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔ اس ''ورود'' کے بعد ہوگا، جس کا ذکر اللہ جل شانہ کے اس فرمان میں ہے: ﴿وان منکم الا واردھا﴾ [مریم۔ ۷۱] ''اور تم میں سے کوئی بھی نہیں جس کا اُس پر گذر نہ ہو'' اور بعض کا کہنا ہے، کہ ورود سے مراد ''دخول'' ہے۔ کہ جہنم بجھی ہوئی ہوگی، مؤمن اس کو عبور کریں گے اور غیر مؤمن کو یہ گرائے گی۔ اگلی حدیث میں بھی اسی مفہوم کی طرف اشارہ ہے۔

۵۵۸۹ : وَعَنْ اَبِیْ سَعِیْدٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ یُخْلَصُ الْمُؤْمِنُوْنَ مِنَ النَّارِ فَیُحْبَسُوْنَ عَلٰی قَنْطَرَةٍ بَیْنَ الْجَنَّةِ وَالنَّارِ فَیُقْتَصُّ لِبَعْضِهِمْ مِنْ بَعْضٍ مَظَالِمَ کَانَتْ بَیْنَهُمْ فِی الدُّنْیَا حَتّٰی اِذَا هُذِّبُوْا وَنُقُّوْا اُذِنَ لَهُمْ فِیْ دُخُوْلِ الْجَنَّةِ فَوَالَّذِیْ نَفْسُ مُحَمَّدٍ بِیَدِهٖ لَاَحَدُهُمْ اَهْدٰی بِمَنْزِلِهٖ فِی الْجَنَّةِ مِنْهُ بِمَنْزِلِهٖ کَانَ لَهٗ فِی الدُّنْیَا. (رواہ البخاری)

اخرجه البخاری فی صحیحه ۱۱/۳۹۵ حدیث رقم ۶۵۳۵ واحمد فی المسند ۱۳/۳۔

ترجمہ: ''حضرت ابوسعید رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''جب ایمان والوں کو جہنم سے رہائی دیدی جائے گی تو ان کو (جنت میں پہنچانے سے پہلے) جنت اور جہنم کے درمیان ایک پل پر روک لیا جائے گا اور پھر ان سے ایک دوسرے کو ان کے پاس حقوق ومطالبات اور حق تلفیوں کا بدلہ چکا جائے گا (یعنی جو بھی شخص دنیا میں اپنے ذمے کسی کا حق رکھتا ہو اور اس کو ادا کرنے سے پہلے مر گیا ہوگا تو اس وقت اس سے وہ حق ادا کردیا جائے گا) یہاں تک کہ جب وہ لوگ (ہر قسم کی بدیوں اور جرائم کے میل وسنگ سے) بالکل پاک وصاف ہو جائیں گے تو ان کو جنت میں داخل ہونے کی اجازت عطا کردی جائے گی۔ پس قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ قدرت میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی جان ہے (جب وہ لوگ جنت میں پہنچ جائیں گے تو) ان میں سے ہر شخص اپنے اس مکان کو جو اس کے لئے جنت میں متعین ہوگا اپنے دنیا کے مکان سے زیادہ پہچاننے والا ہوگا''۔ (بخاری)

تشریح: قولہ: یخلص المؤمنون۔۔۔اذن لهم فی دخول الجنة:

چار افراد میں سے ایک کا ذکر کیا اور اس ایک پر نجات کا حکم لگایا۔ شئے مذکور پر اعتماد کرتے ہوئے باقی تین چیزوں کا ذکر چھوڑ

دیا۔ چونکہ اخراج من النار اور نجات من النار میں علت متحد ہے۔ اس لئے کہ کافر تو یقینی طور پر جہنم ہی میں رہے گا اس میں سے کبھی بھی باہر نہیں نکل پائے گا۔ چنانچہ شخص مذکور ایک مرتبہ پھر اس میں داخل ہوگا، اسی وجہ سے فرمایا حتی اذا هذبوا...... ۔

اس کے مثل یہ اسلوب ہے۔ کہ کئی اشیاء مراد ہوتی ہیں، بعض ذکر کی جاتی ہیں، اور بعض کا ذکر چھوڑ دیا جاتا ہے۔ اللہ جل شانہ کا فرمان ہے: ﴿ فِيهِ ءَايَـٰتٌۢ بَيِّنَـٰتٌ مَّقَامُ إِبْرَٰهِيمَ ۖ وَمَن دَخَلَهُۥ كَانَ ءَامِنًا ﴾ [آل عمران:۹۷] ''اس میں کھلی نشانیاں ہیں منجملہ ان کے ایک مقام ابراہیم ہے اور جو شخص اس میں داخل ہو جاوے وہ امن والا ہو جاتا ہے'' کہ لفظ ''آیات'' جمع ذکر کیا، مگر تفصیل میں دو چیزیں ذکر کیں: ① ﴿مقام ابراهيم﴾ ② ﴿ومن دخله كان آمنا﴾۔

صاحب کشاف لکھتے ہیں کہ ان دو نشانیوں کا ذکر کیا اور باقی نشانیوں کا ذکر نہیں کیا گیا، چونکہ یہ دو نشانیاں بھی تکاثر آیات پر دال ہیں۔ ''ذکر بعض اور ترکِ بعض'' کے قبیل سے جریر کا یہ قول ہے:

كانت حنيفة اثلاثا فثلثهم ☆ من العبيد وثلث من مواليها

(قبیلہ حنفیہ کے لوگ تین تہائی ہیں۔ ان میں سے ایک تہائی غلام ہیں اور ایک تہائی مالی ہیں)

اس تحقیق کو ذہن نشین فرمالیجے۔

يخلص: اس باب افعال سے مشتق مانتے ہوئے مجہول کے صیغہ کے ساتھ پڑھا گیا ہے۔ اور ایک نسخہ میں لام کی تشدید کے ساتھ ہے یعنی از باب تفعیل ''التخليص'' مصدر سے ہے۔ ایک اور نسخہ میں یاء کے فتحہ، اور لام کے ضمہ کے ساتھ، خلاص سے ہے۔ صاحب نہایہ فرماتے ہیں: ''خلص'' کا مطلب ہے: سلم ونجا. (نجات پانا' بری ہونا ہائی پانا)

''القنطرة'': سے مراد ''صراط ممدود'' ہے۔

مظالم: مظلمة لام کے کسرہ کے ساتھ کی جمع ہے۔ ''مظلمة'' اس چیز کو کہتے ہیں جس کا مطالبہ مظلوم، ظالم سے کرے۔

نقوا: ''تنقيه'' سے مشتق ہے۔ اس کا عطف ''هذبوا'' پر ہے۔ اور یہ عطف تفسیری ہے۔

هذبوا: صیغہ مجہول کے ساتھ ہے، التهذيب سے مشتق ہے۔

بمنزله: باء ''الیٰ'' کے معنیٰ میں ہے۔ ای الی منزله صاحب قاموس کے بیان کے موافق باء ''الی'' کے معنیٰ میں بھی آتا ہے۔ جیسا کہ اللہ جل شانہ کا یہ فرمان ہے: ﴿وقد أحسن بى﴾ [یوسف:۱۰۰] أى: وقد أحسن الى، اور مطلب یہ ہے کہ اس کو جنت میں اپنے گھر کا پتہ زیادہ اچھی طرح معلوم ہوگا۔

امام طیبیؒ فرماتے ہیں: هدى، باء کے متعدی نہیں ہوتا، بلکہ ''الی'' اور ''لام'' کے ساتھ واسطے سے متعدی ہوتا ہے۔ لہٰذا مناسب یہ معلوم ہوتا ہے، کہ یہ ''لصوق'' کے معنیٰ کو متضمن ہو، أى: الصق بمنزله هاديا اليه. اسی معنیٰ میں اللہ جل شانہ کا یہ فرمان ہے: ﴿يهديهم ربهم بايمانهم تجرى من تحتهم الانهار﴾ [یونس:۹] ''ان کا رب بوجہ ان کے حوض ہونے کے ان کے مقصد (یعنی جنت) تک پہنچا دے گا ان کے (مسکن کے) نیچے نہریں جاری ہوں گی'' یعنی اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو آخرت میں ان کے نور ایمانی کے ذریعے جنت کی طرف کا راستہ دکھلائے گا'' تجرى من تحتها الأنهار''، یہ ماقبل کا بیان و تفسیر ہے۔ چونکہ سبب سعادت کا کو تھا فنا' سعادت تک پہنچنے کے مترادف ہے۔

۵۵۹۰ : وَعَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَايَدْ خُلُ اَحَدُ إِلْجَنَّةَ اِلَّا اُرِیَ مَقْعَدَهٗ مِنَ النَّارِ لَوْاَسَاءَ لِيَزْدَادَ شُكْرًا وَّلَا يَدْخُلُ النَّارَ اَحَدٌ اِلَّا اُرِیَ مَقْعَدَهٗ مِنَ الْجَنَّةِ لَوْ اَحْسَنَ لِيَكُوْنَ عَلَيْهِ حَسْرَةً ۔ (رواه البخاری)

اخرجه البخاری فی صحيحه ۱۱/ ۴۱۸ حديث رقم ۶۵۶۹، واحمد فی المسند ۲/ ۵۴۱۔

ترجمہ: ”حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ”کوئی بھی شخص (جس کو جنتی قرار دیدیا جائے گا) اس وقت تک جنت میں داخل نہ ہو سکے گا جب تک اس کو جہنم میں وہ مقام نہ دکھا دیا جائے گا جو اس کا ٹھکانہ تھا' اگر وہ برے کام کرتا اور یہ اس لئے ہوگا تاکہ وہ دنیا میں اعمال بد سے کنارہ کش رہنے کی توفیق ملنے اور جہنم سے بچ کر جنت میں داخل ہونے پر) زیادہ سے زیادہ شکر ادا کر سکے اور کوئی بھی شخص (جس کو جہنم کا مستحق قرار دیدیا گیا ہو) اس وقت تک جہنم میں نہیں داخل ہوگا جب تک کہ اس کو جنت میں وہ جگہ نہ دکھا دی جائے گی جو اس کے لئے متعین تھی اگر وہ نیک کام کرتا اور یہ اس لئے ہوگا کہ وہ زیادہ سے زیادہ حسرت و پشیمانی میں مبتلا ہو (اور پھر ہمیشہ ہمیشہ کف افسوس ہی ملتا رہے)“۔ (بخاری)

تشریح: اری: صیغۂ مجہول کے ساتھ ہے۔”اراءۃ“ سے مشتق ہے۔

مقعدہ: مفعول ثانی ہونے کی وجہ سے منصوب ہے۔

من النار: ”مقعدہ“ کا بیان ہے۔

لو أساء: اس کا مفعول بہ محذوف ہے۔ نیز ”لو أساء“ فرمانا بطور فرض کے ہے، اور جزاء محذوف ہے۔ أی: لو أساء العمل وعصی ربه فرضاً وتقديراً لكان ذلك مقعده.

ليزداد شكرا: یہ ”أری“ کی علت ہے۔ (اس دکھائے جانے میں دو احتمال ہیں)

① احتمال ہے کہ یہ دیکھایا جانا قبر میں ہو۔ جیسا کہ اس کی تائید بعض احادیث سے ہوتی ہے۔

② یہ اراءت (دیکھایا جانا) قیامت کے دن ہو، جیسا کہ اس حدیث کے ظاہر سے متبادر ہوتا ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

قوله: ولا يدخل النار احد ......:

أحسن: اس کا مفعول بہ محذوف ہے، نیز جواب بھی محذوف ہے۔ أی: لو احسن العمل لكان ذلك مقعده. ایک احتمال ہے کہ ”لو“ دونوں جگہ برائے تمنی ہے۔ (یعنی اس کو وہ جگہ دکھا کر بتایا جائے گا کہ اگر تم دنیا میں برائی کی راہوں پر نہ چلتے اور نیک کام کیا کرتے تو جنت میں تمہیں یہ ٹھکانہ عطا ہوتا)۔

لیکون: ضمیر ”الاراءۃ“ کی طرف راجع ہے۔ اور چونکہ یہ مصدر ہے، اسی وجہ سے اس کا فعل مذکر لایا گیا ہے۔

حسرۃ: منصوب ہے ”کان“ کی خبر ہونے کی وجہ سے۔ اور ایک نسخہ میں ”حسرۃ“ رفوع ہے۔ اس صورت میں ”کان“ تامہ ہوگا۔

۵۵۹۱ : وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذَا صَارَ اَهْلُ الْجَنَّةِ اِلَى الْجَنَّةِ

وَاَهْلُ النَّارِ اِلَى النَّارِ جِيْءَ بِالْمَوْتِ حَتّٰى يُجْعَلَ بَيْنَ الْجَنَّةِ وَالنَّارِ ثُمَّ يُذْبَحُ ثُمَّ يُنَادِيْ مُنَادٍ يَا اَهْلَ الْجَنَّةِ لَا مَوْتَ وَيَا اَهْلَ النَّارِ لَا مَوْتَ فَيَزْدَادُ اَهْلُ الْجَنَّةِ فَرْحًا اِلٰى فَرْحِهِمْ وَيَزْدَادُ اَهْلُ النَّارِ اِلٰى حُزْنِهِمْ. (متفق علیہ)

اخرجه البخاری فی صحیحه ٤١٥/١١ حدیث رقم ٦٥٤٨ ومسلم فی صحیحه ٢١٨٩/٤ حدیث رقم (٤٣-٢٨٥٠) والترمذی فی السنن ٥٩٦/٤ حدیث رقم ٢٥٥٧ وابن ماجه فی السنن ١٤٤٧/٢ حدیث رقم ٤٣٢٧ واحمد فی المسند ١١٨/٢۔

ترجمہ: ''حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما نے بیان فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: جنت والے جنت میں اور جہنم والے جہنم میں (اپنی اپنی جگہ) جائیں گے تو موت کو (ایک مینڈھا کی صورت میں) لایا جائے گا اور اس کو جنت و دوزخ کے درمیان لٹا کر ذبح کر ڈالا جائے گا' پھر اعلان کرنے والا پکارے گا کہ اے جنت والو! (سن لو) اب موت کا کوئی وجود نہیں ہوگا (جو بھی شخص جہاں اور جس حالت میں ہے' اس پر کبھی موت طاری نہ ہوگا' ہر ایک کو ہمیشہ ہمیشہ کی زندگی دیدی گئی ہے) اور اے دوزخ والو! (تم بھی سن لو) اب موت کا کوئی وجود نہیں رہا۔ (یہ اعلان سن کر) اہل جنت کی فرحت و مسرت کا کوئی ٹھکانہ نہیں رہے گا اور اہل دوزخ رنج و غم کے دریا میں اور مزید ڈوب جائیں گے''۔ (بخاری و مسلم)

تشریح: **قوله: اذا صار أهل الجنة ...۔ ثم يذبحها:**

ایک روایت میں یہ آتا ہے: أنه يوتى به على صورة كبش أملح، (اور موت کو ذبح اس لئے کیا جائے گا) تا کہ لوگوں کو غایت درجہ کا یقین ہو جائے۔

عسقلانیؒ فرماتے ہیں: اس میں حکمت اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ یہ ان کا فدیہ ہوگا، جیسا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بیٹے کا فدیہ دنبہ کی صورت میں دیا گیا۔

اور ''الاملح'' میں اہل جنت اور اہل جہنم کے دو وصفوں کی طرف اشارہ ہے، چونکہ ''املح'' اس کو کہتے ہیں جس میں سیاہی بھی ہو اور سفیدی بھی ہو۔

قوله: ثم ينادى مناد ......:

یا اهل الجنة لا موت: اور بعض روایات میں یوں ہے: لا موت أبدا بل خلود بلا موت (یعنی موت کا ہمیشہ ہمیشہ کے لئے خاتمہ ہو گیا' بلکہ ہمیشہ ہمیشہ رہنا ہے اب موت نہیں آئے گی)

حزنهم: حاء کے ضمہ، اور زاء کے سکون کے ساتھ، دونوں پر فتحہ پڑھنا بھی درست ہے۔ قرأت سبعہ بھی اس کے موافق ہے۔

تورپشتی رحمہ اللہ فرماتے ہیں اس کا مطلب یہ ہے کہ موت کو ایک صورت مثالی دی جائے گی، جیسا کہ ایک اور روایت میں آتا ہے: يؤتى بكبش له عين، (الحدیث)۔ اور یہ سب کچھ اس لئے ہوگا، تا کہ لوگ اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں، چہ جائیکہ وہ اپنی بصیرت سے اس کا ادراک کریں۔ معانی جس وقت فہم کے مدارک سے بلند ہو جاتے ہیں، اور اپنی کبر شان کی وجہ سے نفوس کی معراج سے بلند و بالا ہو جاتے ہیں، تو عالمِ حس میں وہ معانی قالب دھار لیتے ہیں۔ یہاں تک کہ قلوب میں متصور ہو جاتے

ہیں، اور نفوس میں مستقر ہو جاتے ہیں، پھر یہ کہ معانی دار الآخرۃ میں ناظرین کیلئے ایسے ہی منکشف ہوتے ہیں، جسے اس دار فانی میں مختلف صورتیں منکشف ہوتی ہیں۔

۵۵۹۲: وَعَنْ ثَوْبَانَ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ حَوْضِي مِنْ عَدَنَ إِلَى عُمَّانَ الْبَلْقَاءِ مَاءُهُ أَشَدُّ بَيَاضًا مِنَ اللَّبَنِ وَأَحْلٰى مِنَ الْعَسَلِ وَأَكْوَابُهُ عَدَدُ نُجُومِ السَّمَاءِ مَنْ شَرِبَ مِنْهُ شَرْبَةً لَمْ يَظْمَأْ بَعْدَهَا أَبَدًا أَوَّلُ النَّاسِ وُرُودًا فُقَرَاءُ الْمُهَاجِرِينَ الشُّعْثُ رُؤُوسًا الدُّنْسُ ثِيَابًا الَّذِينَ لَا يَنْكِحُونَ الْمُتَنَعِّمَاتِ وَلَا يُفْتَحُ لَهُمُ السُّدَدُ. (رَوَاهُ أَحْمَدُ وَالتِّرْمِذِيُّ وَابْنُ مَاجَةَ وَقَالَ التِّرْمِذِيُّ هٰذَا حَدِيثٌ غَرِيبٌ)

اخرجه الترمذی فی السنن ۹۴۳/۴حدیث رقم ۲۴۴۴ وابن ماجه فی السنن ۱۴۳۸/۲حدیث رقم ۴۳۰۳ واحمد فی المسند ۲۷۵/۵۔

ترجمہ: ''حضرت ثوبان رضی اللہ عنہ نبی کریم ﷺ سے روایت نقل کرتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''میرے حوض (کوثر) کی لمبائی عدن اور عمان بلقاء کی درمیانی مسافت کے برابر ہے' اس کا پانی دودھ سے زیادہ سفید اور شہد سے زیادہ میٹھا ہوگا' اس کے آب خورے آسمان کے ستاروں کی تعداد میں ہوں گے۔ جو شخص ایک مرتبہ بھی اس سے پانی پئے گا وہ کبھی بھی پیاسا نہ ہوگا' اس حوض پر پانی پینے کے لئے سب سے پہلے آنے والے لوگ فقراء مہاجرین ہوں گے' وہی فقراء مہاجرین جو اس دنیا میں اپنی مفلسی وقناعت کے باعث) پراگندہ بال اور پریشان حال اور بوسیدہ کپڑوں میں دکھائی دیتے تھے جو ناز ونعم میں پلنے والی لڑکیوں سے (اگر اپنے نکاح کا پیغام بھیجیں تو ان سے) نکاح کے لائق نہیں ہوتے (یعنی معاشرتی طور پر ان کے برابر سمجھے نہیں جاتے اور جن کے لئے (گھروں کے) دروازے نہیں کھولے جاتے''۔ اس روایت کو احمد' ترمذی نے روایت کیا اور ابن ماجہ نے کہا ہے کہ یہ حدیث غریب ہے''۔

تشریح: عدن: عین اور دال کے فتحہ کے ساتھ، کبھی اسے منصرف پڑھتے ہیں اور کبھی غیر منصرف پڑھتے ہیں۔ یہ یمن کے ان شہروں میں سے ہے، جو بحر ہند کے ساتھ ملے ہوئے ہیں۔

عمان: عین مہملہ کے ضمہ، اور میم کی تشدید کے ساتھ، ''بلقاء'' کی طرف مضاف ہے۔

بلقاء: بائے موحدہ کے فتحہ، لام کے سکون اور قاف ممدودہ کے ساتھ۔

امام طیبیؒ نے فرمایا: عمان، شام کا ایک شہر ہے۔ اور شرح السنہ میں لکھا ہے کہ شام میں واقع ایک جگہ ہے۔ اور عین کے ضمہ اور میم کی تخفیف کے ساتھ بحرین میں واقع ایک جگہ کا نام ہے۔ میں کہتا ہوں: اصول معتمدہ اور تصحیح شدہ نسخے پہلے ضبط پر متفق ہیں۔ اور یہی معتمد ہے، پھر زیادہ ظاہر یہ ہے کہ بلقاء شام کا ایک شہر ہے۔ اور عمان اس میں واقع ایک جگہ کا نام ہے۔ ''عمان کی'' اضافت ''بلقاء'' کی طرف، قرب کی وجہ سے کی گئی ہے، جیسا کہ اس بات کی طرف عسقلانیؒ نے اشارہ فرمایا ہے۔

حدیث کا مطلب یہ ہے کہ آخرت میں مجھے جو حوض کوثر عطا ہوگا اس کی لمبائی کا فاصلہ اتنا ہے، جتنا دنیا کے ان دو شہروں کے درمیان کا فاصلہ ہے۔ حوض کوثر کی وسعت بیان کرنے کیلئے مختلف حدیثوں میں مختلف شہروں اور علاقوں کے درمیانی فاصلہ کا ذکر کیا گیا ہے۔ مثلاً:

حضرت انسؓ کی حدیث میں حوض کوثر کی لمبائی ایلہ اور صنعاء کے درمیانی فاصلے کے بقدر بیان کی گئی ہے۔
حضرت ابن عمرؓ کی حدیث میں جرباء اور اذرح کے درمیانی فاصلے کے بقدر بیان کی گئی ہے۔
حضرت ابن عمروؓ کی حدیث میں میسرۃ شہرین دو مہینے کی مسافت) کا ذکر ہے۔
حضرت حارثہ بن وہبؓ کی حدیث میں صنعاء اور مدینہ کے درمیانی فاصلہ کے بقدر بیان کی گئی ہے۔

اس طرح کی سب حدیثوں کا مقصد صرف حوض کے طول وعرض کی وسعت وزیادت کو ظاہر کرنا ہے۔حوض کوثر کی لمبائی کی حد بندی بتانا مقصود نہیں ہے۔پس جس موقع پر مخاطب وسامع جن علاقوں اور شہروں کے درمیانی فاصلوں اور جس مسافت کی سمجھ اور معلومات رکھتا تھا، اس کے مطابق تمثیل کے طور پر شہروں اور علاقوں کی مسافت کا ذکر فرمایا۔اور یہ بھی بعید نہیں، کہ یہ اختلاف مقادیر، اختلاف ناظرین وشاربین، ان کے وسعت صدور، اور حذاقت بصر کے اختلاف کے باعث ہو، جیسا کہ وسعت قبر کا مختلف ہونا، اور جنت کے منازل کا مختلف ہونا سالکین کے اعتبار سے ہے۔واللہ تعالیٰ اعلم۔

قولہ:ماء ہ اشد بیا ضامن اللبن:

اس سے اشارۃً یہ پتہ چلتا ہے، کہ سپید رنگ پسندیدہ ہے، بخلاف بعض لوگوں کے کہ انہوں نے اپنی طبع مقلوب کے مقتضیٰ کی وجہ سے زرد کو محبوب قرار دیا ہے۔اور نہایت ہی عجیب وغریب ہیں، وہ لوگ کہ جو اپنی بیویوں کے سرخ سرخ ہونٹوں کو سیاہ کرنے پر تلے ہوتے ہیں، حالانکہ سیاہ رنگ دل کو مغموم کرنے کا باعث ہوتا ہے"شواذ"اور درد جگر جیسے امراض پیدا کرتا ہے۔

قولہ:وأحلى من العسل:

أحلى سے مراد "ألذّ" ہے۔أى: ألذ من العسل، مزید یہ کہ شہد میں بندوں کیلئے شفاء بھی ہے۔نیز شرب اب نوشی کی مذمت کی طرف اشارہ ہے چونکہ اس میں حرارت ہوتی ہے، قطع نظر کرتے ہوئے اس فساد کے جو شراب نوشی میں پایا جاتا ہے۔

قولہ:واکوابہ عدد نجوم السماء:

اکواب: کوب کی جمع ہے۔"کوب"اس کوزہ کو کہتے ہیں جس کا دستہ نہ ہو، جیسا کہ شروحات میں مذکور ہے۔صاحب قاموس کے بیان کے موافق"کوب"، اس کوزہ کو کہتے ہیں جس کی خرطوم نہ ہو۔

عدد نجوم السماء:"عدد"، مبتدا محذوف کی خبر ہونے کی وجہ سے مرفوع ہے۔ای: عدد اکوابہ عدد نجوم السماء.(اس کے آب خوروں کی تعداد آسمان کے ستاروں کی تعداد کے برابر ہے۔)

اور بعض نسخوں میں"عدد"منصوب بنزع الخافض ہے۔أى: بعدد نجوم السماء.یہ احتمال زیادہ ظاہر ہے۔

قولہ:من شرب منہ لم یظمأ بعدھا أبدا:

اس میں پینے والوں کے مراتب کے تفاوت کی طرف اشارہ ہے۔اور واردین کی پیاس کے رفع کے اختلاف کی طرف اشارہ ہے۔

قولہ:أول الناس ورودا فقراء المھاجرین:

صلۂ حرفی محذوف ہے۔أى:"ورودا علیہ".

یہ شرف خصوصی اس لئے ہوگا کہ ان کی پیاس ظاہری بھی ہوگی اور معنوی بھی۔ رسول اللہ ﷺ نے بیان فرمایا: "اجوعکم فی الدنیا اشبعکم فی الآخرۃ،" تم میں سے جو لوگ دنیا میں سب سے زیادہ بھوکے رہتے ہیں وہی لوگ آخرت میں سب سے زیادہ شکم سیر ہوں گے"۔ اس پر پیاسے کو قیاس کر لیا جائے۔ نیز اللہ تعالیٰ جنت میں (ایسے ہی لوگوں کو) حکم دے گا: ﴿كُلُوا وَاشْرَبُوا هَنِيئًا بِمَا أَسْلَفْتُمْ فِي الْأَيَّامِ الْخَالِيَةِ﴾ [الحاقة: ٢٤] "کھاؤ پیو میوے کے ساتھ ان اعمال کے صلہ میں جو تم نے بامید صلہ گذشتہ ایام (یعنی زمانہ قیام دنیا میں کئے)۔"

مہاجرین سے مراد وہ لوگ ہیں جو آنحضرت ﷺ کے زمانے میں مکہ سے ہجرت کر کے مدینہ آ گئے تھے اور آں حضرت ﷺ ان کے قائد تھے، نیز انہی لوگوں کے حکم میں وہ لوگ بھی ہیں جنہوں نے دین کی خاطر اپنے وطن اصلی سے اللہ تعالیٰ کی خاطر ہجرت کی، اور اس پر اکتفاء نہیں کیا، بلکہ انہوں نے راحت، چین اور خوشحالی کی زندگی پر فقر و افلاس کو شہرت و ناموری پر گمنامی و گوشہ گیری کو ترجیح دی، اور رضائے الٰہی کیلئے جاہ و مال کے حصول کی جدوجہد کو ترک کر کے اپنے مولیٰ کو راضی کرنے کی خاطر علم و عمل کی تحصیل میں منہمک ہوئے۔

الشعث: شین معجمہ کے ضمہ، اور عین مہملہ کے سکون کے ساتھ، أشعث کی جمع ہے أشعث، مثلثہ کے ساتھ ہے، بمعنی متفرق الشعر. (پراگندہ بال)

رؤوسا: تمیز ہے۔ "رأس" کا اطلاق کبھی چہرہ کو بھی شامل ہوتا ہے، چنانچہ اس اطلاق کے مطابق سر کے بالوں کے حکم میں داڑھی بھی شامل ہو جائے گی۔

الدنس: دال مہملہ کے ضمہ اور نون کے ضمہ ساتھ اور کبھی اس کو ساکن بھی پڑھا جاتا ہے۔ "دنس" کی جمع ہے بمعنی وسخ.

لا ينكحون: فعل مجہول کے صیغہ کے ساتھ، أي: لا يزوجون لو خطبوا. (یعنی اگر وہ پیغام نکاح بھیجیں تو نکاح کے قابل نہ سمجھے جائیں)

المتنعمات: عین کے کسرہ کے ساتھ، ایک نسخہ میں یاء کے فتحہ اور کاف کے کسرہ کے ساتھ ہے۔

اور مطلب یہ ہے کہ اگر یہ اپنے نکاح کا پیغام بھیجیں تو خوشحال گھرانے کی لڑکیوں سے نکاح کے قابل نہیں سمجھے جاتے، چونکہ یہ تارک شہوات اور زاہد فی لذات ہوتے ہیں۔

السدد: سین کے ضمہ، دال اولی اور ثانیہ مہملتین کے فتحہ کے ساتھ، سدة کی جمع ہے۔ "سدة" گھر کے دروازے کو کہتے ہیں۔

وجہ تسمیہ یہ ہے کہ دروازہ گھر میں داخل ہونے والے راستے کو بند کرتا ہے۔

(اس جملہ کے دو مطلب ہو سکتے ہیں)

① بالفرض والتقدیر یہ لوگ اگر أرباب دنیا کے دروازے پر آ کھڑے ہوں، تو ان کے لئے گھروں کے دروازے نہیں کھولے جاتے۔

② اس بات سے کنایہ ہے کہ یہ لوگ اپنی ظاہری حالت کی وجہ سے دنیا داروں کے یہاں کسی دعوت و ضیافت میں بلائے

جانے کے قابل نہیں سمجھے جاتے، اور انکی طرف کوئی التفات نہیں کرتا، اور انکے قدم برنجان ہونے کو نیک شگون نہیں سمجھتے۔

تخریج: اس روایت کو امام حاکمؒ نے بھی ذکر کیا ہے کہ دنیا میں دین کی خاطر انہوں نے ہی سب سے زیادہ بھوک پیاس کی صعوبت برداشت کی، اور پریشانی اور تباہ حالی کا شکار ہوئے سب سے زیادہ۔

۵۵۹۳ : وَعَنْ زَيْدِ ابْنِ اَرْقَمَ قَالَ كُنَّا مَعَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَنَزَلْنَا مَنْزِلًا فَقَالَ مَا اَنْتُمْ جُزْءٌ مِّنْ مِّائَةِ اَلْفِ جُزْءٍ مِّمَّنْ يَّرِدُ عَلَيَّ الْحَوْضَ قِيْلَ كَمْ كُنْتُمْ يَوْمَئِذٍ قَالَ سَبْعَ مِائَةٍ اَوْ ثَمَانَ مِائَةٍ. (رواه ابو داود)

اخرجه ابو داؤد فى السنن ١١٠/٥ حديث رقم ٤٧٤٦ واحمد فى المسند ٣٦٩/٤۔

ترجمہ: ''حضرت زید بن ارقم رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا کہ (ایک سفر میں) ہم لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ تھے کہ ایک جگہ ہم قیام پزیر ہوئے' وہاں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے (اس وقت موجود صحابہؓ سے) ارشاد فرمایا کہ (آخرت میں) جو لوگ میرے پاس حوض کوثر پر آئیں گے ان کی تعداد کا تم لاکھواں جزء بھی نہیں ہو (تم ان کے ایک لاکھ اجزاء میں سے ایک جزء بھی نہیں ہو)''۔ حضرت زید بن ارقم رضی اللہ عنہ سے دریافت کیا گیا کہ اس روز آپ لوگوں کی تعداد کتنی تھی؟ انہوں نے جواب دیا کہ سات سو یا آٹھ سو''۔ (ابوداؤد)

تشریح: جزء: سید کے اصل نسخہ اور دیگر بہت سے نسخوں میں یہ لفظ مرفوع ہے۔ اور ایک نسخہ میں یہ لفظ منصوب ہے۔ ابن الملکؒ فرماتے ہیں اس ''ما'' کو اگر ''ما'' مشابہہ بہ ''بلیس'' قرار دیتے ہوئے اہل حجاز کے مذہب پر عمل دیا جائے تو '' جزء '' کو منصوب پڑھنا درست ہے۔ اور بنو تمیم کی لغت کے مطابق اس کو مرفوع پڑھنا بھی درست ہے، اس عدد سے تحدید و تعین مراد نہیں ہے، بلکہ حوض کوثر پر پانی پینے کیلئے آنے والے مؤمن انسان و جنات کی کثرت و بہتات کو بیان کرنا مراد ہے۔

قوله: كم كنتم يومئذ: ''كم''

استفهامیہ ہے، محل نصب میں کان کی خبر ہے۔ اى كم رجلا اوعددا كنتم حين اذ كنتم معه فى السفر.

سبع: منصوب ہے ''کان'' محذوف کی خبر ہونے کی وجہ سے۔ أى كنا سبعمائة۔ (یعنی ہم سات سو تھے) اور ایک نسخہ میں یہ مرفوع ہے۔ أى: كان عددنا سبعمائة. (یعنی تعداد سات سو تھی)

سبعمائتهأو ثمانية:

① ہوسکتا ہے کہ یہ شک زید سے روایت کرنے والے روای کی طرف سے ہو۔

② یہ ''أو'' بمعنی ''بل'' جا ہو۔

③ احتمال ہے کہ یہ تردد زید کی طرف سے ہو، اور مراد یہ ہے کہ ہم لوگوں کی تعداد ان دو اعداد کے درمیان تھی۔ سات سو سے کم نہیں، اور آٹھ سو سے زیادہ نہیں۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

۵۵۹۴ : وَعَنْ سَمُرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ لِكُلِّ نَبِيٍّ حَوْضًا وَاِنَّهُمْ لَيَتَبَا

هُونَ أَيُّهُمْ أَكْثَرُ وَارِدَةً وَإِنِّي لَأَرْجُوْ أَنْ أَكُونَ أَكْثَرَهُمْ وَارِدَةً. (رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَقَالَ هٰذَا حَدِيثٌ غَرِيبٌ)

اخرجه الترمذی فی السنن ٥٤٢/٤ حدیث رقم ٢٤٤٣۔

ترجمہ: ''حضرت سمرہ رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: (آخرت میں) ہر نبی کو ایک حوض دیا جائے گا (اور ہر امت) اپنے نبی کے حوض پر آ کر پانی پئیں گے پس سارے انبیاء باہم اس پر فخر کریں گے کہ کس کے حوض پر آنے والے کی تعداد زیادہ ہے اور مجھے توقع ہے کہ میرے حوض پر آنے والوں کی تعداد ان میں سے سب سے زیادہ ہوگی''۔ (ترمذی)

تشریح: **لیتباهون:** ھاء کے فتحہ کے ساتھ۔

یعنی انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام یہ دیکھ رہے ہوں گے، کہ کس نبی کی اُمت زیادہ ہے۔ (ذکرہ الطیبیؒ)

أیهم بعض کا کہنا ہے، کہ'' **ایهم** ''، موصولہ ہے اور اس کا صدر صلہ محذوف ہے۔ یا یہ مبتدا خبر ہیں۔ جیسا کہ کہتے ہیں: **یتباهی العلماء أیهم اکثر علماً** (علماء باہم فخر کرتے ہیں کہ ان میں کون سب سے بڑھ کر علم والا ہے)

قوله: وانی لأرجوأن اکون اکثرهم واردة:

ممکن ہے کہ اس امید کے وقت آنحضرت ﷺ کو اس بات کا علم نہ دیا گیا ہو کہ جنت میں آنحضرت ﷺ کی اُمت کی اسی (۸۰) صفیں ہوں گی، اور باقی امتوں کی چالیس (۴۰) صفیں ہوگی۔ جیسا کہ ماقبل میں گزرا۔ معتمد عقیدہ یہی ہے کہ اس حوض سے حقیقی حوض ہی مراد ہے۔

امام طیبیؒ نے بڑی عجیب بات ارشاد فرمائی کہ ممکن ہے، کہ یہ اپنے ظاہر پر محمول ہو۔ اس صورت میں اس کا بالکل واضح مطلب یہ ہوگا کہ ہر نبی کو ایک حوض عطا ہوگا۔ اور اس کو مجازی معنیٰ پر بھی محمول کیا جا سکتا ہے۔ اور اس حوض سے مراد علم وہدایت ہو۔ اور اسی کے مثل آنحضرت ﷺ کا یہ فرمان ہے: **منبری علی حوضی،** (میرا منبر میرے حواض پر ہوگا) اس میں ایک توجیہ یہی ہے۔ اسی کی طرف آنحضرت ﷺ کا یہ ارشاد گرامی اشارہ کرتا ہے: **ما من نبی من الأنبیاء الا أعطی من الآیات ما مثله آمن علیه البشر، وانما کان الذی أوتیته وحیا أوحاه الله الی فأرجوأن أکون أکثرهم تبعا یوم القیامة.**

میں کہتا ہوں کہ یہ مفہوم حوض حسّی کے منافی نہیں، جو حوض حسّی مختلف درجات واردہ پر مبنی ہوگا، کہ انبیاء کی جانب سے ملنے والے علم وہدایت سے جس نے جتنا اخذ فیض کیا ہوگا اس کو ویسا ہی حوض ملے گا)

بلکہ میں تو یہ کہتا ہوں کہ ہر حوض کے پانی کی صفائی، روانی، کثرت ولذت میں بھی لازمی طور پر فرق ہوگا، جس کا جیسا مذہب ہوگا مذہب کے موافق اس کے حوض کا پانی ہوگا۔ یہ بالکل اس ارشاد باری کی طرز پر ہوگا:

﴿فَانْفَجَرَتْ مِنْهُ اثْنَتَا عَشْرَةَ عَيْنًا قَدْ عَلِمَ كُلُّ أُنَاسٍ مَّشْرَبَهُمْ﴾ [البقرة: ٦٠] ''فوراً اس سے پھوٹ نکلے بارہ چشمے (اور بارہ ہی خاندان تھے بنی اسرائیل کے چنانچہ) معلوم کر لیا ہر شخص نے اپنے پانی پینے کا موقع''۔

۵۵۹۵ : وَعَنْ أَنَسٍ قَالَ سَأَلْتُ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَنْ يَّشْفَعَ لِي يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فَقَالَ أَنَا

فَاعِلٌ قُلْتُ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَأَيْنَ أَطْلُبُكَ قَالَ اُطْلُبْنِي أَوَّلَ مَا تَطْلُبُنِي عَلَى الصِّرَاطِ قُلْتُ فَإِنْ لَّمْ أَلْقَكَ عَلَى الصِّرَاطِ قَالَ فَاطْلُبْنِي عِنْدَ الْمِيْزَانِ قُلْتُ فَإِنْ لَّمْ أَلْقَكَ عِنْدَ الْمِيْزَانِ قَالَ فَاطْلُبْنِي عِنْدَ الْحَوْضِ فَإِنِّي لَا أُخْطِئُ هٰذِهِ ـ الثَّلٰثَ الْمَوَاطِنَ رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَقَالَ هٰذَا حَدِيْثٌ غَرِيْبٌ ـ

اخرجه الترمذي في السنن ٥٣٧/٤ حديث رقم واحمد في المسند ١٧٨/٣ـ

ترجمہ: ''حضرت انس رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا کہ (ایک مرتبہ) میں نے نبی کریم ﷺ سے گذارش کی کہ آپ ﷺ روز قیامت (عام شفاعت کے علاوہ خصوصی طور پر صرف) میری شفاعت فرمائیں۔ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ہاں میں شفاعت کردوں گا۔ میں نے پوچھا یا رسول اللہ! میں آپ کو کس جگہ ڈھونڈوں اور آپ ﷺ مجھے کہاں ملیں گے؟ آپ ﷺ نے جواباً فرمایا: سب سے پہلے مجھے پل صراط پر ڈھونڈنا۔ میں نے عرض کیا کہ اگر میں آپ کو پل صراط پر نہ مل سکا تو؟ فرمایا: تو پھر میزان کے پاس ڈھونڈ لینا۔ میں نے عرض کیا کہ اگر میں میزان کے پاس بھی آپ کو نہ مل سکا تو؟ فرمایا (اگر ان دونوں جگہ پر نہ مل پاؤں) تو پھر حوض پر مجھے ڈھونڈنا میں ان تین جگہوں سے کہیں نہیں جاؤں گا''۔ اس حدیث کو امام ترمذی نے نقل کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ حدیث غریب ہے۔

تشریح: قوله: فاين اطلبك:

امام طیبیؒ فرماتے ہیں: سائل کی غرض یہ تھی کہ قیامت کے دن جس لحہ مجھے آپ کی شفاعت کی سخت ضرورت ہوگی، اس وقت میں آپ کو کہاں تلاش کروں گا۔ تو آنحضرت ﷺ نے جواب دیا: اطلبني على الصراط وعند الميزان والحوض، آنحضرت ﷺ کے جواب کا حاصل یہ تھا، کہ قیامت کے دن یہ تین مواقع اور یہ تین مقام ایسے ہوں گے، جہاں لوگوں کو بہت زیادہ پریشانی اور ہولناکی کا سامنا کرنا پڑے گا۔

اگر یہ اشکال پیدا ہو کہ یہ حدیث بظاہر حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی اس حدیث کے خلاف ہے جو باب الحساب کی دوسری فصل میں گزری ہے: فهل تذكرون أهليكم يوم القيامة؟ فقال ﷺ: "أما في ثلاثة مواطن فلا يذكر أحد أحداً". حضرت عائشہ صدیقہؓ نے آپ ﷺ سے پوچھا، کہ آپ ﷺ قیامت کے دن اپنے اہل وعیال کو یاد رکھیں گے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ''اس دن ان تینوں مواقع پر کوئی بھی کسی کو یاد نہیں رکھے گا''۔

میں کہتا ہوں: حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو مذکورہ جواب اس لئے دیا، کہ وہ آپ ﷺ کی زوجہ مطہرہ تھیں، کہیں وہ حضور ﷺ کی شفاعت پر اعتماد کر کے نہ بیٹھ جائیں۔ اس کے برخلاف آپ ﷺ نے حضرت انسؓ کو یہ جواب اس لئے دیا کہ وہ نا امید نہ ہو جائیں۔ میں کہتا ہوں، یہ بھی محل اشکال ہے، کہ حضرت انسؓ آنحضرت ﷺ کے خادم تھے، وہ بھی آنحضرت ﷺ پر اعتماد کر سکتے تھے، مزید یہ کہ نا امید ہونا حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے شایان شان بھی نہیں تھا۔

لہٰذا زیادہ بہتر توجیہ یہ ہے کہ پہلی حدیث غائبین پر محمول ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ اس دن ان تین مواقع پر جن لوگوں کے سامنے ان کے اہل خانہ وغیرہ نہیں ہوں گے، وہ از خود انہیں یاد نہیں کریں گے۔ اور دوسری حدیث اُمت کے حاضرین پر

محمول ہے۔

قولہ:قال اطلبنی اول ما تطلبنی ......:

"ماتطلبنی":(''ما''مصدریہ ہے۔)أي:في أول طلبك اياي.

اورایک تاویل یہ ہے کہ منصوب علی الظرفیہ ہے۔امام طیبیؒ نے فرمایا:یہ منصوب علی المصدریۃ ہے۔

فاطلبني عند الميزان: اس سے یہ پتہ چلتا ہے،کہ میزان صراط کے بعد ہوگا۔

لا اخطئ: ہمزہ کے ضمہ،طاء کے کسرہ اوراس کے بعد ہمزہ ہے۔

هذه الثلاث: أي:البقاع.ایک نسخہ میں تاء کے ساتھ ہے۔اس صورت میں تقدیری عبارت: **هذه الثلاثة المواطن"** ہوگی۔

مطلب یہ ہے کہ میں ان تین جگہوں کے علاوہ کہیں نہیں ہوں گا،ایسا نہیں ہوگا کہ میں ان تینوں جگہوں میں سے کہیں بھی نہ ملوں۔لہٰذاتم مجھ سے ان ہی جگہوں میں سے کسی جگہ پر ملنا۔

اگر یہ کہا جائے کہ حوض،صراط کے بعد ہوگا،تو اس پر حدیث باب سے اشکال وارد ہوتا ہے:

أن جماعة يدفعون عن الحوض بعد أن كادوا يردون ويذهب بهم الى النار.

اشکال یہ ہوتا ہے،کہ جو آدمی صراط پر سے ایک مرتبہ گزر کر حوض پر پہنچے گا،تو اس کا مطلب تو یہ ہے کہ وہ نجات پا گیا،تو صراط پر لوٹنا کیوں کر ہوگا؟ممکن ہے کہ اس کا مطلب یہ ہو کہ وہ اتنے فاصلے پر ہوں گے کہ ان کو حوض دکھائی دے رہا ہوگا،تو وہ لوگ جہنم کی طرف دھکیل دیئے جائیں گے صراط سے چھٹکارا پانے سے پہلے ہی۔شیخ ابن حجر عسقلانیؒ کی تحقیق یہی ہے۔

۵۵۹۶ : وَعَنِ ابْنِ مَسْعُوْدٍ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ قِيْلَ لَهٗ مَا لْمَقَامُ الْمَحْمُوْدُ قَالَ ذٰلِكَ يَوْمٌ يَّنْزِلُ اللّٰهُ تَعَالٰى عَلٰى كُرْسِيِّهٖ فَيَاطِّ كَمَا يَاطِّ الرَّحْلُ الْجَدِيْدُ مِنْ تَضَا يُقِهٖ وَهُوَ كَسَعَةِ مَا بَيْنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ يُجَاءُ بِكُمْ حُفَاةً عُرَّاةً غُرْلًا فَيَكُوْنُ اَوَّلَ مَنْ يُّكْسٰى اِبْرَاهِيْمُ يَقُوْلُ اللّٰهُ تَعَالٰى اكْسُوْا خَلِيْلِيْ فَيُؤْتٰى بِرَيْطَعَيْنِ بَيْضَاوَيْنِ مِنْ رِيَاطِ الْجَنَّةِ ثُمَّ اُكْسٰى عَلٰى اَثَرِهٖ ثُمَّ اَقُوْمُ عَنْ يَمِيْنِ اللّٰهِ مَقَامًا يَغْبِطُنِيْ الْاَوَّلُوْنَ وَالْاٰخِرُوْنَ ۔(رواہ الدارمی)

اخرجه الدارمی فی السنن ۲/۴۱۹ حدیث رقم ۲۸۰۰۔

ترجمہ: ''حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نبی اکرم ﷺ سے روایت نقل فرماتے ہیں کہ حضور اقدس ﷺ سے سوال کیا گیا کہ مقام محمود کس خصوصیت اور اہمیت کا حامل ہے؟ جس کا اس آیت میں آپ ﷺ سے وعدہ فرمایا گیا ہے۔(عَسٰٓى اَنْ يَّبْعَثَكَ رَبُّكَ مَقَامًا مَّحْمُوْدًا) تو آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: اس دن (کہ جب مجھے یہ مقام محمود عطا ہوگا) اللہ تعالیٰ اپنی کرسی پر جلوہ افروز ہوگا اور وہ کرسی چر چرائے گی جیسا کہ نئے چمڑے کی زین اپنے تنگ ہونے کی وجہ سے چر چراتی ہے اور اس کرسی کی کشادگی و وسعت اتنی ہے جتنی کہ زمین و آسمان کا درمیانی خلا' پھر تم سب کو لایا جائے گا اس حال میں کہ تم ننگے

پاؤں ننگے بدن اور بے ختنہ ہو گے اور اس روز سب سے پہلے جس آدمی کو لباس پہنایا جائے گا وہ سیدنا ابراہیم علیہ السلام ہوں گے چنانچہ اللہ تعالیٰ (فرشتوں) کو حکم فرمائے گا کہ میرے خلیل کو لباس پہناؤ چنانچہ جنتی کپڑوں میں سے دو چادریں جو ملائم اور سفید کتان کی ہوں گی لاکر حضرت ابراہیم کو پہنائی جائیں گی ان کے بعد مجھ کو لباس پہنایا جائے گا اور پھر میں حق تعالیٰ شانہ کے دائیں طرف کھڑا ہوں گا اور (یہ اعزاز ملنے پر) اگلے پچھلے سب لوگ مجھ پر رشک کریں گے"۔ (دارمی)

تشریح: قوله: ما المقام المحمود:

یعنی وہ مقام محمود کہ جس کا اس آیت میں آپ ﷺ سے وعدہ کیا گیا ہے:

﴿عَسٰۤى اَنْ یَّبْعَثَكَ رَبُّكَ مَقَامًا مَّحْمُوْدًا﴾ [الاسراء:۷۹] "امید ہے کہ آپ کا رب آپ کو مقام محمود میں جگہ دے گا"۔

قوله: ذلك يوم ينزل الله تعالىٰ على كرسيه:

"یوم": مرفوع ومنون ہے جیسا کہ ہمارے علماء کی ایک جماعت نے تصریح کی ہے۔ اس پر فتحہ پڑھنا بھی درست ہے۔ بہر دو تقدیر "یوم" خبر ہے۔ دوسری صورت تو بالکل واضح ہے۔ البتہ پہلی صورت میں تقدیری عبارت یوں ہوگی: ذلك اليوم الذى أبلغ فيه المقام المحمود. (یہ وہ دن ہے جس میں مقام محمد پہنچوں گا)

اس میں کئی تاویلات کی گئی ہیں، جو یہ ہیں:

① بعض کا کہنا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے نزول کا مطلب اس کی مملکت کا ظہور اور اس کے حکم کا محسوس ہونا ہے۔
② بقول بعض اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی عظمت کے ساتھ تجلی فرمائے گا اور اپنے وصف کبریاء کے ساتھ اس دن متوجہ ہوگا۔
③ یہ تعبیر بطور استعارہ تمثیلیہ ہے۔ جیسا کہ قاضی نے اپنے اس کلام میں اس کی طرف اشارہ کیا ہے۔
④ ممکن ہے کہ یہ اس بات سے کنایہ ہو کہ اللہ تعالیٰ کے دن عدل وانصاف کے مطابق فیصلہ کرے گا۔
⑤ اس فضل کا اظہار مقصود ہے جو آنحضرت ﷺ کی شفاعت پر موقوف ہے۔ آنحضرتؐ کی مزید فضیلت کی طرف اشارہ ہے۔

قوله: ويجاء بكم حفاة عراة غرلا:

مطلب یہ ہے کہ اس وقت تمہاری حالت یہ ہوگی۔

قوله: فيكون أول من يكسى ابراهيم۔۔۔ من رياط الجنة:

"اول" منصوب ہے اور "ابراهيم" مرفوع ہے۔ ایک نسخہ میں بالکل اس کے برعکس ہے۔ امام طیبیؒ فرماتے ہیں: پہلی صورت تقدیم وتاخیر پر محمول ہے جیسا کہ اللہ جل شانہ کا یہ ارشاد گرامی ہے:

﴿ان خير من استاجرت القوى الأمين﴾ [القصص-۲۶]

يقول الله تعالىٰ: جملہ مستانفہ بیانیہ ہے۔

اكسوا: ہمزہ اور سین کے ضمہ کے ساتھ، امر کا صیغہ ہے۔ اور مخاطبین ملائکہ ہیں۔

ویاط: راء کے کسرہ کے ساتھ، ریطة راء کے فتحہ کے ساتھ۔ کی جمع ہے۔

قوله: ثم أكسى على أثره: اس ٹکڑے سے متعلقہ تشریح حدیث: ۵۵۳۵ کے تحت ملاحظہ فرمائیے۔

أكسى: فعل مجہول کے صیغہ کے ساتھ ہے۔

أثر: ہمزہ اور ثاء کے فتحہ کے ساتھ، نیز ہمزہ کے کسرہ اور ثاء کے سکون کے ساتھ۔

يغبطني: باء موحدہ کے کسرہ کے ساتھ،

اگر یہ اشکال ہو کہ سوال وجواب کے درمیان مطابقت کیسے ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اصل جواب تو صرف یہ جملہ ہے: ثم أقوم عن يمين الله مقامًا يغبطني الأولون والآخرون. اس سے پہلے کلام کی وضاحت یہ ہے کہ اولاً آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس وقت کا ذکر فرمایا جب وقت محمود حاصل ہوگا، اور اس کے ساتھ ہی اس کے احوال واھوال کا ذکر فرمایا تاکہ دل ودماغ میں اچھی طرح بیٹھ جائیں، پھر اصل بات کا جواب ارشاد فرمایا: أقوم عن يمين الله الخ اور جواب کا حاصل یہ ہے کہ مقام محمود وہ مقام ہے جہاں قیامت کے دن میں اللہ تعالیٰ کے دائیں جانب کھڑا ہوں گا۔

امام طیبیؒ فرماتے ہیں: یہ ارشاد گرامی اس بات کا صریح ثبوت ہے کہ ہمارے نبی حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم پوری کائنات انبیاء ورسل اور تمام مقربین پر فضیلت رکھتے ہیں۔

عرضِ مرتب:

امام طیبیؒ کا باقی ماندہ کلام ثم اكسى على أثره سے متعلق ہے، وہ کلام حدیث ۵۵۳۵ کے تحت ملاحظہ فرمائیے۔

قوله: فيئط كما يئط الرحل الجديد براكبه:

اس جملہ کی بھی متعدد تاویلات کی گئی ہیں:

1. امام طیبیؒ فرماتے ہیں: یہ مبالغہ ہے اور اللہ تعالیٰ کی عظمت تجلی کی تصویر کشی ہے بطریق تشریح:
2. وقيل: أي: من تضايق الكرسي بملائكة الله، بقول بعض مطلب یہ ہے کہ کرسی ملائکہ کی وجہ سے تنگ ہو جائے گی۔ یہ تمثیل ہے اس میں ان ملائکہ کی کثرت کا بیان ہے جو عرش باری تعالیٰ کا احاطہ کیا ہوں گے۔

سعة: سین کے فتحہ اور کسرہ کے ساتھ، اور ایک نسخہ میں "يسعه مابين السماء والارض" ہے۔ قاموس میں لکھتے ہیں: وسعه الشيء یہ يضعه سعة ہے جو دعة اور دية کی طرح ہے، اور مغرب میں لکھا ہے: کہا جاتا ہے: وسع الشيء المكان، یہ اس وقت کہا جاتا ہے جب جگہ اس کو اپنے اندر سمو لے جائے اور تنگ نہ پڑے۔ یہ جملہ حال ہے، اور ضمیر "کرسی" کی طرف راجع ہے۔ أي: والحال أن الكرسي يسع ما بين السماء والأرض. (یعنی درانحالیکہ کرسی آسمان وزمین کے درمیان سماتی ہے) یہ اس آیت مبارکہ کی طرف اشارہ ہے: ﴿وسع كرسيه السموات والأرض﴾ [البقرة۔ ۲۵۵] لیکن ایک حدیث میں آیا ہے: ان الارض بجنب السماء كحلقته في فلاة

اس طرح ہر آسمان اپنے سے اوپر والے آسمان کے مقابلہ میں ہے اور ساتوں آسمان اور ساتوں زمین کرسی کے مقابلہ میں ہے ایسی میں جیسے کسی بہت بڑے وسیع وعریض میدان میں کوئی حلقہ ہو۔ اور اس کے عرش کے مقابلہ میں اس کی کرسی کی بھی یہی

حیثیت ہے۔ امام طیبیؒ لکھتے ہیں: "وھو یسعه" حال ہے، یا یہ جملہ معترضہ ہے، جو دفع توہم کیلئے لایا گیا ہے۔

۵۵۹۷ : وَعَنِ الْمُغِیْرَةَ بْنِ شُعْبَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ شِعَارُ الْمُؤْمِنِیْنَ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ عَلَى الصِّرَاطِ رَبِّ سَلِّمْ سَلِّمْ (رواه الترمذی وقال هذا حدیث غریب)

اخرجه الترمذی فی السنن ٥٣٦/٤ حدیث رقم ٢٤٣٢۔

ترجمه: "حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: قیامت کے روز پل صراط کو پار کرتے وقت اہل ایمان کی خاص علامت یہ الفاظ ہوں گے رَبِّ سَلِّمْ سَلِّمْ (اے میرے مالک بچائے گا اے میرے مالک بچالینا)۔ اس روایت کو ترمذی نے نقل کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ حدیث غریب ہے۔

تشریح: شعار: شین معجمہ کے ساتھ۔ یعنی وہ علامت ہے جس کے ذریعہ کہ ہر امت کے وہ لوگ جو اپنے پیغمبر اور رسول کے متبع اور تابعدار تھے، آپس میں ایک دوسرے کو پہچانیں گے ان کا یہ قول ہوگی۔

سلم سلم: تکرار برائے الحاح ہوگا۔ یا تکرار سے تکثیر مراد ہے۔ اور ممکن ہے کہ مؤمنین کا شعار انبیاء کا یہ قول ہو جو ان کے حق میں دعا تھا۔ اس کی تائید ابن عمرؓ کی اس حدیث سے ہوتی ہے جو طبرانیؒ نے روایت کی ہے۔

وشعار أمتي اذا حملوا على الصراط یا لا اله الا أنت،

دونوں روایات میں جمع کرنا ممکن ہے، بایں طور کہ یہ اس اُمت کی خصوصیات میں سے ہے، اور پہلا شعار تمام اُمتوں کیلئے ہوگا۔ تاہم زیادہ ظاہر یہ ہے کہ "سلم سلم" کے شناختی الفاظ صرف مؤمنین کاملین کا "شعار" ہوں گے۔ اور ان شہداء صالحین کا شعار ہوں گے، کہ جن کو انبیاء اور رسولوں کی اتباع کے طفیل شفاعت کا رتبہ حاصل ہوگا۔

ابن مردویہ حضرت عائشہ صدیقہؓ سے مرفوعاً نقل کرتے ہیں:

شعار المومنین یوم یبعثون من قبورھم لا اله الا الله وعلى الله فلیتوکل المؤمنون.

"قیامت کے دن جب لوگوں کو قبروں سے اٹھایا جائے گا، تو اس وقت اہل ایمان کا شعار لآ اله الا الله، وعلى الله فلیتوکل المؤمنون ہوگا۔"

نیز شیرازیؒ حضرت عائشہ ؓ سے نقل کرتے ہیں: شعار المؤمنین یوم القیامة فی ظلم القیامة لا اله الا أنت.

"قیامت کے دن اس دن کے ہولناک اندھیروں میں اہل ایمان کا شعار لآ اله الآ انت ہوگا"۔

تخریج: اس حدیث کو امام حاکمؒ نے بھی روایت کیا ہے۔

۵۵۹۸ : وَعَنْ اَنَسٍ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قَالَ شَفَاعَتِیْ لِاَهْلِ الْكَبَآئِرِ مِنْ اُمَّتِیْ ۔

(رواه الترمذی وابوداود)

اخرجه ابو داوٗد فی السنن ١٠٦/٥ حدیث رقم ٤٧٣٩ والترمذی فی السنن ٥٣٩ حدیث رقم ٢٤٣٥ واحمد فی المسند ٢١٣/٣۔

ترجمه: "حضرت انس رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: گناہ کبیرہ کے مرتکبین کے حق میں

میری شفاعت محض میری امت کے افراد کے لئے خاص ہو گی۔ (ترمذی، ابوداؤد)

تشریح: مطلب یہ ہے کہ کبیرہ گناہوں کی معافی کے لئے میری شفاعت صرف میری اُمت کے لوگوں کے حق میں مخصوص ہو گی، دوسری امتوں کیلئے نہیں ہو گی۔

امام طیبیؒ فرماتے ہیں: یہاں جس شفاعت کا ذکر ہے، اس سے وہ شفاعت مراد ہے، جو اہل کبائر کو عذاب سے نجات اور خلاصی دلوانے کیلئے ہو گی۔ مووی کی شرح مسلم میں قاضی عیاضؒ فرماتے ہیں: اہل سنت کا مذہب یہ ہے کہ شفاعت کا جواز عقلی اور وجوب شفاعت دلائل سمعیہ کی تصریح کی وجہ سے ہے ارشادی باری تعالیٰ ہے:

﴿يَوْمَئِذٍ لَّا تَنفَعُ الشَّفَاعَةُ إِلَّا مَنْ أَذِنَ لَهُ الرَّحْمَٰنُ وَرَضِيَ لَهُ قَوْلًا﴾ [طٰہٰ: ۱۰۹] ''اور اس روز (کسی کو کسی) سفارش نفع نہ دے گی مگر ایسے شخص کو کہ جس کے واسطے اللہ تعالیٰ نے اجازت دے دی اور اس شخص کے واسطے بولنا پسند کر لیا ہو''۔

نیز اس بارے میں اتنی زیادہ احادیث منقول ہیں، کہ ان کا مجموعہ حد تواتر کو پہنچتا ہے۔ اس لئے تمام سلف صالحین اور ان کے بعد کے لوگوں یعنی تمام اہل سنت کا اس پر اجماع واتفاق ہے۔ ہاں، خوارج اور معتزلہ کے بعض طبقے اس کے منکر ہیں، وہ قیامت کے دن کی شفاعت کے قائل نہیں ہیں۔ ان کا عقیدہ ہے کہ گناہ گار ہمیشہ ہمیشہ جہنم میں رہیں گے۔

اس سلسلے میں ان کے دلائل ملاحظہ ہوں:

ان کی پہلی دلیل اللہ جل شانہ کا یہ فرمان ہے: ﴿فما تنفعهم شفاعة الشافعين﴾ [المدثر: ۴۸] ''سو (اس حالت مذکورہ ہیں) ان کو سفارش کرنے والوں کی سفارش نفع نہ دے گی''

دوسری دلیل اللہ عز وجل کا یہ ارشاد گرامی ہے: ﴿ما للظالمين منن حميم ولا شفيع يطاع﴾ [غافر: ۱۸] (اور غم سے) گھٹ گھٹ جاویں گے (اس روز) ظالموں کا نہ کوئی دلی دوست ہو گا اور نہ کوئی سفارشی جس کا کہا مانا جاوے''۔

ان دونوں دلیلوں کا پہلا جواب تو یہ ہے کہ ان آیات کے مصداق ''کفار'' ہیں۔ اور ظلم سے مراد ''شرک'' ہے۔ اور احادیث شفاعت میں ان کا یہ تاویل کرنا باطل ہے، کہ یہ شفاعت زیادت درجات کیلئے ہو گی۔ اور الفاظ حدیث ان کے مذہب کے بطلان پر، اور مستوجب النار لوگوں کے جہنم سے اخراج پر بالکل صریح ہیں۔

میں کہتا ہوں شفاعت کی پانچ قسمیں ہیں:

پہلی قسم: یہ صرف آنحضرت ﷺ کے واسطے مخصوص ہے۔ اس شفاعت کا تعلق تمام لوگوں کو موقف کی ہولنا کیوں سے خلاصی دلا کر حساب وکتاب جلد شروع کرانے سے ہو گا۔

دوسری قسم: کچھ لوگوں کو حساب کے بغیر جنت میں داخل کر دینے کیلئے ہو گی۔ اس شفاعت کا ثبوت بھی صرف ہمارے پیارے نبی حضرت محمد مجتبیٰ ﷺ کیلئے منقول ہے۔

تیسری قسم: یہ شفاعت ان لوگوں کیلئے ہو گی جو مستوجب جہنم ہوں گے۔ چنانچہ ہمارے نبی اکرم ﷺ ان لوگوں کے حق میں شفاعت فرمائیں گے، جن لوگوں کیلئے اللہ تعالیٰ چاہے گا۔

چوتھی قسم: یہ شفاعت ان لوگوں کیلئے ہو گی جنہیں ان کے گناہوں کی پاداش میں دوزخ میں ڈالا جا چکا ہو گا، پس ان لوگوں

کی شفاعت کے سلسلے میں جو حدیثیں منقول ہیں ان سے ثابت ہوتا ہے، کہ وہ لوگ آنحضرت ﷺ، ملائکہ اور اپنے مسلمان بھائیوں کی جانب سے کی جانے والی شفاعت کے نتیجے میں دوزخ سے نکال کر جنت میں پہنچائے جائیں گے، اور پھر آخر میں خود اللہ تعالیٰ اپنی خاص رحمت کے تحت ان تمام لوگوں کو عذابِ دوزخ سے نجات عطاء فرمائے گا جنہوں نے "لا الٰہ الا اللہ" کہا ہوگا۔

پانچویں قسم: یہ اہل جنت کے درجات کی بلندی کے لئے ہوگی۔

۵۵۹۹ : وَ رَوَاهُ ابْنُ مَاجَةَ عَنْ جَابِرٍ.

اخرجه ابو داوٗد فی السنن ۱۰۶/۵ حدیث رقم ۴۷۳۹ والترمذی فی السنن ۵۳۹ حدیث رقم ۲۴۳۵ واحمد فی المسند ۲۱۳/۳۔

ترجمہ: اور ابن ماجہ نے اس روایت کو حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے"۔

تشریح: جامع میں ہے کہ اس روایت کو امام احمد، امام ابوداؤد، امام ترمذی، امام ابن حبان اور امام حاکمؒ نے حضرت انسؓ سے، امام ترمذی، ابن ماجہ، اور امام حاکم نے حضرت جابرؓ سے، امام طبرانیؒ نے حضرت ابن عباسؓ سے، اور خطیب نے ابن عمرؓ سے اور حضرت کعب بن عجرہ رضی اللہ عنہم سے نقل کیا ہے۔

حضرت ابوالدرداءؓ سے مروی خطیبؒ کی ایک روایت میں آتا ہے:

شفاعتی لأهل الذنوب من أمتي وان زنى وان سرق على رغم أنف أبي الدرداء۔ "میری شفاعت میری امت کے گناہ گاروں کے لیے ہے اگر چہ وہ زنا کرے اگر چہ وہ چوری کرے ابودرداء کی ناک خاک آلود ہو جائے۔"

حضرت علیؓ سے مروی خطیبؒ ہی کی ایک روایت میں یہ الفاظ آئے ہیں:

شفاعتي لأمتي من أحب أهل بيتي. "میری شفاعت میری اُمت کے ان لوگوں کو حاصل ہوگی جو میرے اہل بیت سے محبت رکھتا ہوگا۔"

ابونعیم "الحلیہ" میں عبدالرحمٰن بن عوفؓ سے نقل کرتے ہیں:

شفاعتي مباحة الا لمن سبّ أصحابي.

"میری شفاعت مواح ہوگی سوائے اس شخص کے جو میرے صحابہ کو برا بھلا کہے گا۔"

ابن منیع نے حضرت زید بن ارقم اور مزید دس سے زائد صحابہؓ سے حدیث شفاعت کو ان الفاظ کے ساتھ روایت کیا ہے:

شفاعتي يوم القيامة حق فمن لم يؤمن بها لم يكن من أهلها۔ "قیام کے دن میری شفاعت برحق ہے۔ پس جو شخص میری شفاعت پر ایمان نہیں لاتا وہ میری شفاعت کے اہل لوگوں میں سے نہیں۔"

۵۶۰۰: وَعَنْ عَوْفِ بْنِ مَالِكٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَتَانِي اٰتٍ مِّنْ عِنْدِ رَبِّي فَخَيَّرَنِي بَيْنَ اَنْ يَدْخُلَ نِصْفَ اُمَّتِي الْجَنَّةَ وَبَيْنَ الشَّفَاعَةِ فَاخْتَرْتُ الشَّفَاعَةَ وَهِيَ لِمَنْ مَا تَ لَا يُشْرِكُ بِاللّٰهِ . (رواه الترمذی وابن ماجة)

اخرجه الترمذی فی السنن ٥٤١/٤ حدیث رقم ٢٤٤١ وابن ماجه ١٤٤١/٢ حدیث رقم ٤٣١١ واحمد فی المسند ٢٣/٦۔

ترجمہ: "حضرت عوف بن مالک رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: "میرے پروردگار کے پاس سے ایک فرشتہ میرے پاس آیا اور اس نے (پروردگار عالم کی طرف سے) مجھے ان دو باتوں میں سے ایک بات منتخب کرنے کا اختیار دیا کہ یا تو میری نصف امت کو اللہ تعالیٰ جنت میں داخل کردے گا یا (سب کے حق میں) شفاعت کا حق مجھے عطا ہوگا۔ پس میں نے اپنی تمام امت کے حق میں شفاعت کا حق ملنے کو پسند کر لیا (تا کہ بلا استثناء تمام مؤمن و مسلمان اس سے مستفید ہو سکیں اور کوئی بھی محروم نہ رہے) چنانچہ میری شفاعت (میری امت میں سے) ہر اس فرد کے حق میں جس نے اس حال میں اپنی جان دی ہو کہ اللہ کا کسی کو شریک قرار نہیں دیتا تھا حاصل یہ کہ روز قیامت تمام اہل ایمان کو میری شفاعت نصیب ہونا یقینی ہے"۔ (ترمذی، ابن ماجہ)

تشریح: آت: اس کی تنوین برائے تعظیم ہے۔

فخیرنی: کی ضمیر "ربی" کی طرف عائد ہے۔ یا "آتٍ" کی طرف لوٹ رہی ہے۔

أن یدخل: یاء کے فتحہ اور خاء کے ضمہ کے ساتھ، جیسا کہ اصول معتمدہ میں ہے۔ اور ایک صحیح نسخہ میں صیغہ مجہول کے ساتھ ہے۔ اور ایک نسخہ میں یاء کے ضمہ اور خاء کے کسرہ کے ساتھ یعنی صیغہ معروف کے ساتھ ہے۔ اس کا فاعل اللہ تعالیٰ ہے، یا اس کا فاعل "ملك" ہے، مجازاً۔

"نصف": پہلے دو احتمالات کی بنیاد پر مرفوع ہے اور تیسرے احتمال کے مطابق منصوب ہے۔

"الجنة": تمام روایات میں منصوب ہے، مفعول ثانی ہے۔

قوله: فاخترت الشفاعة ......:

یہاں "اُمت" سے مراد امت اجابت ہے۔ اور دونوں چیزوں میں سے شفاعت کو منتخب فرمانے کی حکمت یہ تھی کہ اس دن شفاعت کی احتیاج زیادہ ہوگی۔

سید جمال الدین محدث کے نسخہ سے منقول ہے کہ "ان تدخل" تائے مثناۃ کے ساتھ از ثلاثی مجرد معروف کے صیغہ پر کے ساتھ ہے۔ اور "نصف" مرفوع ہے۔ اور اس کا مرفوع ہونا تکلف سے خالی نہیں۔ بلکہ مرفوع پڑھنا باعث تعسف ہے، اور یہ کہنا پڑے گا، کہ اس نے مضاف الیہ سے کسب تانیث کیا ہے۔ یہ لفظ باب افعال سے فعل معروف مخاطب کے صیغہ کے ساتھ "تُدخل" بھی ضبط کیا گیا ہے لیکن "نصف امتی" اس کو مسترد کر رہا ہے۔ اور اس جیسی جگہ میں یہ کہنا ہے کہ عبارت میں "التفات" ہے، یہ خود نا قابل التفات ہے۔

تخریج: اس حدیث کو ابن حبان نے حضرت عوفؓ سے اور امام احمدؒ نے حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ سے روایت کیا ہے۔

۵۷۰۱ : وَعَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ اَبِي الْجَدْعَآءِ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ يَدْخُلُ الْجَنَّةَ بِشَفَاعَةِ رَجُلٍ مِّنْ اُمَّتِيْ اَكْثَرُ مِنْ بَنِيْ تَمِيْمٍ. (رواه الترمذی والدارمی وابن ماجة)

اخرجه الترمذي في السنن٤/٠٤٥حديث رقم ٢٤٣٨ وابن ماجه في السنن ١٤٤٣/٢حديث رقم ٤٣١٦ والدارمي ٤٢٣/٢حديث رقم ٢٨٠٨ واحمد في المسند ٤٦٩/٣۔

ترجمہ: ''حضرت عبداللہ بن ابی جدعاء رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ ارشاد فرماتے ہوئے سنا: میری امت کے ایک (جلیل القدر) شخص کی شفاعت سے بنی تمیم کے افراد کی تعداد سے بھی زیادہ لوگ جنت میں داخل ہوں گے''۔ (ترمذی' دارمی' ابن ماجہ)

راویٔ حدیث:

عبداللہ بن ابی الجدعاء۔ یہ عبداللہ ابن ابی جدعا ''تمیمی'' ہیں۔ ان کا تذکرہ وحدان میں آتا ہے۔ ان سے عبداللہ بن شقیق رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں ان کا شمار بصریوں میں کیا جاتا ہے۔ جامع الاصول اور معتمد نسخوں میں جدعاء جیم کے فتحہ اور دال مہملہ کے سکون کے ساتھ مروی ہے اور یہی ضبط عسقلانیؒ کی طرف بھی منسوب ہے۔ لیکن سیدؒ کے نسخہ میں ذال معجمہ کے ساتھ ہے۔ اس کی تائید ''التقریب'' کی عبارت سے ہوتی ہے، کہ یہ لفظ جیم کے فتحہ، اور ذال معجمہ کے سکون کے ساتھ ہے۔ تقریب اور سیر کے نسخہ میں ذال معجمہ کے ساتھ ہے۔ تقریب میں لکھا ہے کہ یہ کنانی صحابی ہیں۔ ان سے صرف دو حدیثیں مروی ہیں۔ ان سے روایت کرنے میں عبداللہ بن شقیق رضی اللہ عنہ متفرد ہیں۔ ''وُحدان'' کا یہ لفظ ان رواۃ کے حق میں بھی استعمال کیا گیا ہے جو شیخین (امام مسلمؒ و امام بخاریؒ) میں سے کسی ایک سے روایت کرتے ہیں)

مؤلفؒ کا کہنا ہے کہ یہ تمیمی ہیں۔ ان کا ذکر ''وحدان'' میں کیا جاتا ہے۔ ان سے عبداللہ بن شقیق کو روایت کا شرف حاصل ہے۔ ان کا شمار بصریین میں ہوتا ہے۔

تشریح: ''بنی تمیم'': یہ ایک بہت بڑے قبیلے کا نام تھا۔ بعض کا کہنا ہے، کہ'' رجل'' سے مراد حضرت عثمان بن عفانؓ ہیں۔ بعض کا کہنا ہے کہ وہ اویس قرنیؒ ہیں۔ اور بعض نے کسی اور کا نام بتایا ہے۔ زین العربؒ فرماتے ہیں یہ قول زیادہ قریب ہے۔

۵۶۰۲ : وَعَنْ اَبِیْ سَعِیْدٍ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ قَالَ اِنَّ مِنْ اُمَّتِیْ مَنْ یَّشْفَعُ لِلْفِئَامِ وَمِنْھُمْ مَنْ یَّشْفَعُ لِلْقَبِیْلَةِ وَمِنْھُمْ مَنْ یَّشْفَعُ لِلْعَصَبَةِ وَمِنْھُمْ مَنْ یَّشْفَعُ لِلرَّجُلِ حَتّٰی یَدْخُلُوا الْجَنَّةَ (رواه الترمذي)

اخرجه الترمذي في السنن ٥٤١/٤حديث رقم ٢٤٤٠ واحمد في المسند ٢٠/٣۔

ترجمہ: ''حضرت ابوسعید رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''میری امت میں سے (جن اشخاص کو شفاعت کا حق و اذن حاصل ہوگا' جیسے علماء' شہداء اور صلحاء' ان میں سے) کوئی تو (اپنے متعلقین کی) کئی جماعتوں کے حق میں شفاعت کرے گا' کوئی ایک عصبہ (کے لوگوں کے برابر اپنے متعلقین) کے حق میں شفاعت کرے گا اور کوئی اپنے متعلق) صرف ایک ہی شخص کے حق میں سفارش کرے گا' غرضیکہ اسی طرح ہر ایک کی شفاعت کے نتیجہ میں تمام امت جنت میں چلی جائے گی''۔ (ترمذی)

تشریح: قوله: ان من امتي من يشفع الفئام:

فئام: فاء کے کسرہ اور اس کے بعد ہمزہ کے ساتھ اور کبھی کبھار اس ہمزہ کو بدل بھی دیا جاتا ہے۔ جوہریؒ کا کہنا ہے کہ " فئام " کا اطلاق جماعت پر ہوتا ہے۔ اس لفظ کا کوئی واحد من لفظہ نہیں، عامۃ الناس اس لفظ کو " فیام " پڑھتے ہیں۔ میں کہتا ہوں: زیادہ ظاہر یہ ہے کہ اس لفظ سے مراد یہاں قبائل ہیں، جیسا کہ بعض کا کہنا ہے کہ یہ معنوی طور " فئة " کی جمع ہے۔ اور قرینہ اگلا جملہ (ومنهم من يشفع للقبلية) ہے۔

قوله: ومنهم من يشفع للقبيلة ......:

"القبيلة": اس کا اطلاق ایسی کثیر الافراد قوم پر ہوتا ہے، جن کا دادا ایک ہو۔

"العصبة: عین کے ضمہ اور صاد کے سکون کے ساتھ، ۱۰ سے ۴۰ مردوں تک پر اس لفظ کا اطلاق ہوتا ہے۔ اس لفظ سے اس کا واحد نہیں آتا۔ اور زیادہ ظاہر یہ ہے کہ اس سے جمع مراد ہے، اگرچہ دو افراد ہی کیوں نہ ہوں۔ اور قرینہ اگلا جملہ (ومنهم من يشفع للرجل) ہے۔

ممکن ہے کہ یہ کہا جا سکے کہ ایک آدمی سے لے کر عصبہ تک کے درمیان افراد کا ذکر اس حدیث میں نہیں کیا گیا، چونکہ " رجل " پر " الرجل " "برہان جلی" کے طور پر دلالت کر رہا ہے، جیسا کہ عورت پر "قیاسی خفی" کے طور پر دلالت کر رہا ہے۔

حتى يدخلوا: امام طیبیؒ فرماتے ہیں: ممکن ہے کہ یہ يشفع کی غایت ہو۔ اور ضمیر "جميع الامة (ساری امت) کی طرف راجع ہو۔ أي: ينتهي شفاعتهم الى أن يدخلوا جميعهم الجنة. اور یہ بھی ممکن ہے، کہ " حتى " کے معنی میں ہو، اس صورت میں مطلب یہ ہوگا: الشفاعة لدخول الجنة. (شفاعت جنت میں داخلہ کے لئے ہوگی)۔

اسنادی حیثیت: امام ترمذیؒ نے اس حدیث کو حسن قرار دیا ہے۔

۵۶۰۳ : وَعَنْ اَنَسٍ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ اللّٰهَ عَزَّوَجَلَّ وَعَدَنِي اَنْ يُدْخِلَ الْجَنَّةَ مِنْ اُمَّتِي اَرْبَعَ مِائَةِ اَلْفٍ بِلَا حِسَابٍ فَقَالَ اَبُوبَكْرٍ وَزِدْنَا يَا رَسُولَ اللّٰهِ قَالَ وَهٰكَذَا فَحَثَا بِكَفَّيْهِ وَجَمَعَهُمَا فَقَالَ اَبُوبَكْرٍ زِدْنَا يَا رَسُولَ اللّٰهِ قَالَ وَهٰكَذَا فَقَالَ عُمَرُ دَعْنَا يَا اَبَا بَكْرٍ فَقَالَ اَبُوبَكْرٍ وَمَا عَلَيْكَ اَنْ يُدْخِلَنَا اللّٰهُ كُلَّنَا الْجَنَّةَ فَقَالَ عُمَرُ اِنَّ اللّٰهَ عَزَّوَجَلَّ اِنْ شَاءَ اَنْ يُدْخِلَ خَلْقَهُ الْجَنَّةَ بِكَفٍّ وَاحِدٍ فَعَلَ فَقَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ صَدَقَ عُمَرُ. (رواه في شرح السنة)

اخرجه البغوي في شرح السنة ۱۶۳/۱۵ حديث رقم ۴۳۳۵ واحمد في المسند ۱۶۵/۳۔

ترجمہ: "حضرت انس رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: خدائے بزرگ برتر نے مجھ سے یہ وعدہ فرمایا ہے کہ وہ میری امت میں سے چار لاکھ افراد کو بغیر حساب کتاب کے جنت میں داخل فرمائے گا"۔ سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ نے (یہ ارشاد سن کر) عرض کیا کہ یا رسول اللہ! ہماری اس تعداد میں زیادتی فرما دیجئے (یعنی اللہ تعالیٰ سے اس تعداد میں اور اضافہ کرنے کی دعا و گذارش فرما دیں یا آپ فرما ہی زیادہ تعداد دیں تا کہ اللہ تعالیٰ اسی کو پورا فرما دے) آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اچھا' اتنا اور زیادہ (فرما کر) آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دونوں ہتھیلیوں کو ملا کر کے چلو بنایا۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے پھر عرض کیا کہ یا رسول اللہ! ہماری اس تعداد و مقدار میں مزید اضافہ فرما دیجئے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے پھر (چلو بنا کر) فرمایا

کہ "اچھا اتنا اور زیادہ"۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ بھی اس مجلس میں موجود تھے انہوں نے محسوس کر کے کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ (بس اب) ہمیں ہمارے حال پر رہنے دیجئے (یعنی اتنی رعایت نہ کرائیے کہ ہم خداتعالیٰ کے فضل وعنایت پر ہی بھروسہ کرلیں اور عذاب خداوندی کے خوف سے اس طرح بے فکر ہو جائیں کہ عمل کرنا ہی چھوڑ بیٹھیں) حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے (یہ سن کر) کہا کہ اگر اللہ تعالیٰ ہم سب کو (بغیر حساب ومواخذہ کے) جنت میں بھیج دے تو تمہیں کیا نقصان ہو گا؟ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جواب دیا کہ اگر اللہ عزوجل اپنی تمام تر مخلوق کو جنت میں داخل کرنا چاہے تو کر سکتا ہے (پھر بار بار اضافہ کی گذارش کی حاجت ہی کیا ہے) نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے (حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی یہ بات سن کر) فرمایا کہ "عمرؓ نے بالکل سچ کہا"۔ اس روایت کو بغوی نے شرح السنۃ میں نقل کیا ہے"۔

تشریح: **قوله: ان الله عزوجل وعدني... قال: وهكذا:**

اس مفہوم پر حضرت ابوامامہؓ کی یہ حدیث دلالت کرتی ہے:

قال: سمعت رسول الله ﷺ يقول: "وعدني ربي أن يدخل الجنة من أمتي سبعين ألفا لا حساب عليهم ولا عذاب، مع كل ألف سبعون ألفاً، وثلاث حثيات من حثيات ربي". [كذا ذكره الطيبي رحمه الله تعالىٰ]

یہ بات بہت مستحسن ہے، مگر "آپ کی شفاعت کے ذریعہ" کے الفاظ پر اس حدیث میں کوئی دلالت نہیں ہے، اور ظاہر یہی ہے کہ یہ لوگ بغیر شفاعت خاصہ کے ہی جنت میں داخل ہوں گے، اگرچہ شفاعت عامہ میں داخل ہوں گے۔

زدنا يا رسول الله: یہ جملہ اس بات کی دلیل ہے، کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو امور اخرویہ اور تصرفات ربوبیت میں مدخل ومجال حاصل ہے اسی قدر کہ جس قدر آپ کو اللہ تعالیٰ نے رتبات جلیلہ اور اعلیٰ خصائل وخصوصیات سے نوازا ہے۔

وهكذا: (یہاں فعل محذوف ہے۔) ای: **وفعل هكذا**، اگلا جملہ (**فحثى بكفيه وجمعهما**) اس کی تفسیر ہے۔

وهكذا وحثى بكفيه وجمعهما: (یعنی اپنے دونوں ہاتھوں کو ملا کر چلّو بنایا) بظاہر یہ اللہ جل شانہ کے فعل کی حکایت ہے۔ اس وجہ سے شراح فرماتے ہیں: **حثيات** کا ذکر بطور مثال کے ذکر فرمایا ہے، چونکہ عطاء کرنے والے کریم کی شان تو یہ ہوتی ہے، کہ جب اس سے مزید کا سوال کیا جاتا ہے، تو وہ بن شمار کئے لپ بھر بھر کر دیتا ہے اور کبھی مٹھی بھر دیتا ہے۔ قصہ مختصر یہ کہ "حثی" کنایہ ہے مبالغہ فی الکثرۃ سے۔ وگرنہ تو (حقیقت یہ ہے کہ) نہ کوئی کف ہے، اور نہ کوئی حثی۔

قوله: فقال عمر: دعنايا أبا بكر... كلنا الجنة:

یعنی ہمیں ہمارے اسی اجمالی حال پر رہنے دیجئے۔ تاکہ ہم اعتدال پر رہیں، اور خوف ورجاء کے درمیان رہیں۔

وما عليك: ("ما" کا اسم محذوف ہے) ای **ما بأس وضرر عليك** (مجھ کو کوئی نقصان نہیں۔)

أن يدخلنا الله كلنا: بمعنی **جميعنا** ہے۔ یہ **يدخلنا** کی ضمیر متصل کی تاکید ہے۔

قوله: فقال عمر: ان الله عزوجل شاء......:

یعنی میں تمہاری کہی ہوئی بات سے بڑھ کر ایسی معتمد بات کہتا ہوں، جو منقول بھی اور معقول بھی ہے۔

خلقه: "خلق" سے مراد تمام مخلوقات ہیں۔ انسان وجنات، خواہ مؤمن ہوں، خواہ کافر ہوں، خواہ مطیع وفرمان بردار ہوں یا

فاسق وفاجر ہوں۔

فعل: جیسا کہ اللہ جل شانہ کا فرمان ہے: ﴿ولو شاء لهداكم أجمعين﴾ [النحل:۹] ''اور اگر اللہ چاہتا تو سب کو (منزل) مقصود تک پہنچا دیتا'' اور دوسری جگہ فرمایا: ﴿وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَفْعَلُ مَا يُرِيْدُ﴾ [البقرة:۲۵۳] ''لیکن اللہ تعالیٰ جو چاہتے ہیں وہی کرتے ہیں''۔

بعض حضرات کا کہنا کہ ''كف واحد'' سے مراد اس کی عطاء وفضل ہے۔ یعنی اگر اللہ تعالیٰ اپنی تمام کی تمام مخلوق کو جنت میں اپنے فضل وکرم سے داخل کرنا چاہے تو کر سکتا ہے۔ چونکہ وہ تو اس سے بھی زیادہ وسعت رکھتا ہے۔

صاحب قاموس کا بیان ہے کہ ''كف'' کا اطلاق ہاتھ، یا کوع (انگوٹھے کی طرف والا کلائی کا کنارہ) تک ہوتا ہے۔

صاحب المغرب کا کہنا ہے، کہ ''کف'' مؤنثات سماعیہ میں سے ہے۔ ابن حاجبؒ نے اپنے رسالہ میں اس کلمہ کو واجب التانیث کلمات میں شمار کیا ہے۔ قصہ مختصر ''كف واحد'' ''عطاء واحد'' یا ''مقبوض واحد'' کی تاویل میں ہے۔

قوله: فقال النبی ﷺ صدق عمر:

تورپشتی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: آنحضرت ﷺ نے ابوبکر صدیقؓ کو حضرت عمر فاروقؓ کے کلام کے مثل جواب نہیں دیا، چونکہ نفوس قدسیہ کی توجہ میں بشارتوں کا بہت بڑا دخل ہوتا ہے۔ پس اللہ تعالیٰ شفاعت کرنے والے کی شفاعت کے سبب سے اپنی مخلوق کو فوج درفوج، قبیل در قبیل عذاب سے نجات دے گا، پھر جو لوگ ان شافعین کی شفاعت سے قاصر ہوں گے، ان کو اللہ تعالیٰ اپنے فضل وکرم اور اپنی رحمت سے نجات عطاء کرے گا، اور یہ وہ لوگ ہوں گے جن کا ایمان سلامت ہوگا، مگر کبھی بھی کوئی خیر کا کام نہیں کیا ہوگا۔ جیسا کہ ماقبل حدیث میں گزرا۔ بعض عارفین کا کہنا ہے حضرت ابوبکر صدیقؓ کا فرمودہ باب تضرع ومسکنت سے تھا، اور حضرت عمر فاروقؓ کا ارشاد گرامی باب تسلیم وتفویض سے تھا۔ میں (ملا علی قاری) کہتا ہوں تسلیم ہی راہ سلامتی ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

تخریج: سیدؒ کا بیان ہے کہ اس حدیث کو امام احمدؒ نے اپنی مسند میں روایت کیا ہے۔

۵۶۰۴: وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يُصَفُّ اَهْلُ النَّارِ فَيَمُرُّبِهِمُ الرَّجُلُ مِنْ اَهْلِ الْجَنَّةِ فَيَقُوْلُ الرَّجُلُ مِنْهُمْ يَا فُلَانُ اَمَا تَعْرِفُنِيْ اَنَا الَّذِيْ سَقَيْتُكَ شَرْبَةً وَقَالَ بَعْضُهُمْ اَنَا الَّذِيْ وَهَبْتُ لَكَ وَضُوْءً فَيَشْفَعُ لَهٗ فَيُدْخِلُهُ الْجَنَّةَ. (رواه ابن ماجة)

اخرجه ابن ماجه في السنن ۲/ ۱۲۱۵ حديث رقم ۳۶۸۵

ترجمہ: ''حضرت انس رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: اہل ایمان میں سے جنہیں (اپنے گناہوں کے سبب) دوزخی قرار دیا جا چکا ہوگا وہ اہل جنت یعنی علماء (اخیار اور صلحاء وابرار کی راہوں میں) صف باندھ کر کھڑے رہتے ہیں اور پھر جب ایک جنتی ان کے سامنے سے گزرے گا تو ان دوزخیوں میں سے ایک شخص (اس جنتی کا نام لے کر) کہے گا اے فلانے! کیا تم مجھے نہیں جانتے ہو؟ میں وہ آدمی ہوں جس نے ایک بار تجھے پانی پلایا تھا انہیں میں سے کوئی آدمی یہ کہے گا کہ میں وہی شخص ہوں جس نے ایک دفعہ تجھے وضو کے لئے پانی دیا تھا وہ جنتی (یہ سن کر) اس کے حق

میں شفاعت کرے گا اور اس کو جنت میں داخل کروالے گا''۔ (ابن ماجہ)

تشریح: قولہ: یصف اھل النار:

یصف: یاء کے ضمہ صاد کے فتحہ، اور فاء کی تشدید کے ساتھ، بمعنی یجعل صفا. اور ایک نسخہ میں یاء کے فتحہ، صاد کے ضمہ کے ساتھ ہے بمعنی یصیر صفا. (صف بن جائیں گے)

أھل النار: اس سے مراد گناہ گار مؤمنین، اور فجار ہیں۔ یہ صفیں اہل جنت میں علماء خیار اور صلحاء ابرار کے راستوں میں بنی ہوں گی، جیسا بلکہ اسی انداز سے مساکین وسائلین، اغنیاء کی راہوں میں کھڑے ہوتے ہیں۔

یا فلان: نام سے کنایہ ہے۔

قولہ: فقیول الرجل منهم یاو فلان ......:

وضوء ا: واؤ کے فتحہ کے ساتھ، وضو کا پانی۔ اور اسی پر قیاس کر لیا جائے کہ اگر کسی نے کسی کو کوئی لقمہ، کوئی کپڑا، کسی بھی قسم کی اعانت، کسی بھی قسم کا کلی یا جزئی عطیہ دیا ہوگا، اگر چہ کھجور کا ایک ٹکڑا ہی ہو، یا کوئی بھی بات کہی ہوگی یہ سب کام آئے گی چونکہ ''ڈوبتے کو تنکے کا سہارا''۔

فیدخله الجنة: (اس کے دو مطالب ہو سکتے ہیں:)

پہلا مطلب: اس شخص کے دخول جنت کا سبب بن جائے گا

دوسرا مطلب: وہ اسے اپنے ہمراہ جنت میں لے جائے گا۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

مظہر فرماتے ہیں: آنحضرت ﷺ نے اس ارشاد کے ذریعے گویا اس امر کی ترغیب دی ہے، کہ اپنے مسلمان بھائیوں اور خصوصاً بزرگ و نیک لوگوں کے ساتھ حسن سلوک واحسان کا برتاؤ کرنا چاہئے اور جب بھی ان کی ہم نشینی وصحبت میسر ہو جائے اس کو اختیار کرنے کا موقع گنوانا نہ چاہئے، کیونکہ ان کی محبت، دنیا میں زینت اور آخرت میں حصول نور کا باعث ہے۔

۵۶۰۵ : وَعَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اِنَّ رَجُلَيْنِ مِمَّنْ دَخَلَ النَّارَ اشْتَدَّ صِيَاحُهُمَا فَقَالَ الرَّبُّ تَعَالٰى اَخْرِجُوْ هُمَا فَقَالَ لَهُمَا لِاَیِّ شَیْءٍ اِشْتَدَّ صِيَاحُكُمَا قَالَ فَعَلْنَا ذٰلِكَ لِتَرْحَمَنَا قَالَ فَاِنَّ رَحْمَتِیْ لَكُمَا اَنْ تَنْطَلِقَا فَتُلْقِيَا اَنْفُسَكُمَا حَيْثُ كُنْتُمَا مِنَ النَّارِ فَيُلْقِیْ اَحَدُهُمَا نَفْسَهٗ فَيَجْعَلُهَا اللّٰهُ عَلَيْهِ بَرْدًا وَسَلَامًا وَيَقُوْمُ الْاٰخَرُ فَلَا يُلْقِیْ نَفْسَهٗ فَيَقُوْلُ لَهُ الرَّبُّ تَعَالٰى مَا مَنَعَكَ اَنْ تُلْقِیَ نَفْسَكَ كَمَآ اَلْقٰى صَاحِبُكَ فَيَقُوْلُ رَبِّ اِنِّیْ لَا رْجُوْاَنْ لَّا تُعِيْدَنِیْ فِيْهَا بَعْدَ مَآ اَخْرَجْتَنِیْ مِنْهَا فَيَقُوْلُ لَهُ الرَّبُّ لَكَ رَجَآ ئُكَ فَيُدْخَلَانِ جَمِيْعًا اِلْجَنَّةَ بِرَحْمَةِ اللّٰهِ (رواه الترمذی)

اخرجه الترمذی فی السنن ٤/ ٦١٥ حدیث رقم ٢٥٩٩۔

ترجمہ: ''حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: (اہل ایمان میں سے) جو لوگ (اپنے جرائم کی سزا میں) دوزخ میں داخل ہوں گے ان میں سے دو شخص بہت زیادہ چیخ و پکار کریں گے (یعنی رونا

دھونا اور آہ وفریاد شروع کر دیں گے اور خوب شور مچائیں گے) پروردگار (دوزخ کے فرشتوں کو) حکم فرمائے گا کہ انہیں باہر نکال لاؤ اور جب وہ باہر آئیں گے تو ان سے پوچھے گا کہ کیوں اتنی شدید چیخ پکار کر رہے ہو؟ وہ کہیں گے کہ ہم اس لئے چیخ چلا رہے تھے تا کہ آپ کی رحمت ہماری طرف متوجہ ہو جائے (اور ہمیں خوب معلوم ہے کہ آپ اس آدمی کو محبوب رکھتے ہیں جو آپ کے سامنے روئے دھوئے اور آہ وفریاد کرے) اللہ تعالیٰ فرمائے گا تمہارے حق میں میری رحمت یہی ہے کہ تم لوٹ جاؤ اور جہاں پہلے تھے وہیں اپنے آپ کو ڈال دو"۔ ان میں سے ایک شخص تو (یہ سنتے ہی کامل اطاعت اور رضائے الٰہی کی طلب میں) لوٹ جائے گا اور خود کو جہنم کی آگ میں ڈال دے گا اور اللہ تعالیٰ اس آگ کو اس کے لئے باعث راحت و ٹھنڈک اور حفاظت والی بنا دے گا (کہ جیسا کہ اس نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے لئے آگ کو گل وگلزار بنا دیا تھا) اور دوسرا آدمی (اپنے کو اس معاملہ میں بالکل بے بس پاتا ہوا اور اللہ تعالیٰ کے لطف وکرم پر کامل یقین رکھتے ہوئے) وہیں کھڑا رہے گا اور خود کو آگ میں نہیں ڈالے گا! حق تعالیٰ شانہ اس دریافت فرمائے گا کہ آخر تو نے خود کو آگ میں کیوں نہیں ڈالا جب کہ تیرا ساتھی (میرا حکم سنتے ہی چلا گیا اور) آگ میں کود پڑا؟ وہ عرض کرے گا کہ اے میرے مالک! میں تو اسی امید پر قائم ہوں کہ تو نے جب مجھے دوبارہ وہاں نہیں بھیجے گا جہاں سے نکال چکا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرمائے گا: تمہارے حق اسی کو پورا کیا جاتا ہے جو تم نے امید وابستہ کی جاتی ہے۔ چنانچہ وہ دونوں آدمی حق تعالیٰ کی رحمت وعنایت کے سبب اکٹھے جنت میں داخل کر دیئے جائیں گے"۔ (ترمذی)

تشریح: **قوله: ان رجلن ممن دخل النا...... : لای شئی اشتد صیاحکما:** پہلے تو تم اچھے بھلے خاموش تھے، اب یکا یک یہ کیا ہوا؟

فان رحمی لکم ان تنطلقافتلقیا انفسکما حیث کنتما فی النار: اس سے اشارۃً یہ پتہ چلتا ہے، کہ فقط ظاہری تضرع، مفید رحمت نہیں، جب تک کہ انقیاد باطنی نہ ہو۔ اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿ اِنَّ رَحْمَتَ اللّٰهِ قَرِيْبٌ مِّنَ الْمُحْسِنِيْنَ ﴾ [الاعراف: ٥٦] "بے شک اللہ تعالیٰ کی رحمت نزدیک ہے نیک کام کرنے والوں سے۔"

امام طیبیؒ فرماتے ہیں: " أن تنطلقا فتلقیا" یہ ان کی خبر ہے۔ یہاں یہ اشکال ہوسکتا ہے کہ "اطلاق الی النار"، اور "القاء النفس فی النار" (اپنے آپ کو آگ میں ڈالنا) کو کیوں کر رحمت کہا جا سکتا ہے؟

اس کا مختصر جواب یہ ہے کہ یہ ارشاد سبب کو مسبب پر حمل کرنے کے اسلوب سے تعلق رکھتا ہے، اس کی تحقیق یہ ہے کہ جب ان دونوں نے جناب باری تعالیٰ میں تفریط کا معاملہ کیا اور امتثال امر میں کوتاہی دکھائی تو انہیں امتثال امر کا حکم دیا گیا کہ تم دونوں اپنے آپ کو جہنم میں ڈال دو۔ اس میں تنبیہ ہے کہ رحمت خداوندی کا مستحق وہی شخص ہوتا ہے جو ہر حالت میں اسی کے حکم کی اطاعت وفرمانبرداری کرے۔

كما ألقى صاحبك: (ما مصدریہ ہے۔) أی: كالقائه فيها.

پہلے نے امتثال امر، خوف وعمل کے سبب کیا اور دوسرے نے علم وأمل پر عمل کیا۔

فيدخلان: صیغہ مجہول کے ساتھ ہے۔ أی **فيدخلهما الله.**

اور یہ رحمت بھی درحقیقت ان دونوں کے عمل ومعرفت پر مرتب ہوئی۔

۵۶۰۶: وَعَنِ ابْنِ مَسْعُوْدٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَرِدُ النَّاسُ النَّارَ ثُمَّ يَصْدُرُوْنَ مِنْهَا بِاَعْمَالِهِمْ فَاَوَّلُهُمْ كَلَمْحِ الْبَرْقِ ثُمَّ كَالرِّيْحِ ثُمَّ كَحُضْرِ الْفَرَسِ ثُمَّ كَالرَّاكِبِ فِي رَحْلِهِ ثُمَّ كَشَدِّ الرَّجُلِ ثُمَّ كَمَشْيِهِ (رواہ الترمذی والدارمی)

اخرجه الترمذی فی السنن ۲۹۷/۵ حدیث رقم ۳۱۵۹ والدارمی فی السنن ۴۲۴/۲ حدیث رقم ۲۸۱ واحمد فی المسند ۴۳۳/۱۔

ترجمہ: ''حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: لوگ یعنی اہل ایمان (پل صراط کو عبور کرتے وقت آگ پر پیش ہوں گے (یعنی اس کو اپنی آنکھوں سے دیکھیں گے) اور پھر اپنے اپنے اعمال کے مطابق اس سے آگے نکل جائیں گے (اور پل صراط کو آسانی کے ساتھ یا پریشانی سے پار کرلیں گے) چنانچہ ان میں اول اور سب سے افضل ایسے لوگ ہوں گے جو (پل صراط پر سے بجلی) کوندے کی مانند پار ہو جائیں گے۔ پھر (وہ لوگ ہوں گے جو) ہوا کے جھونکے کی مانند' پھر (وہ لوگ ہوں گے جو) گھوڑے کے دوڑنے کی طرح' پھر (وہ لوگ ہوں گے جو) اپنے اونٹ پر سوار ہونے کی طرح پھر (وہ لوگ ہوں گے جو) آدمی کے دوڑنے کی طرح اور پھر (وہ لوگ ہوں گے جو) آدمی کے (معمول کے مطابق) پیدل چلنے کی طرح (گزر جائیں گے)''۔ (اس روایت کو ترمذی اور داری نے نقل کیا ہے۔

تشریح: قوله: يرد الناس النار:

''یرد'' بروزن ''یعد''، فعل مضارع کا صیغہ ہے۔ ''ورود'' بمعنی ''حضور'' سے مشتق ہے۔ کہتے ہیں: وردت ماء کذا (پانی پر آنا) اس ''مرور'' کو ''ورود'' اس وجہ سے کہا جاتا ہے کہ جو بھی شخص صراط سے گزرے گا وہ آگ کا مشاہدہ کرلے گا، اسی منہج پر اللہ جل شانہ کے اس قول مبارکہ میں تاویل کی جاتی ہے: ﴿وان منكم الا واردها﴾ ''اور تم میں سے کوئی بھی نہیں جس کا اس پر سے گذر نہ ہو''۔

اور اس (حدیث باب) سے اشارۃً یہ پتہ چلتا ہے، کہ لوگ اس وقت سخت پیاسے ہوں گے' پل پر سے اس لئے گزریں گے تاکہ حوض تک پہنچ سکیں۔

تورپشتی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: ''ورود'' کے لغوی معنی ''قصد الماء'' (پانی کا ارادہ کرنا) ہیں۔ پھر اس لفظ کا استعمال دوسرے معنی میں ہونے لگا۔ ''ورود'' سے مراد یہاں ''جواز'' ہے أی: الجواز علی جسر جهنم. (جہنم کو یاد کرنا)

قوله: ثم يصدرون بأعمالهم:

يصدرون منها: دال کے ضمہ کے ساتھ، بمعنی ينصرون عنها. چونکہ ''صدر'' جس وقت ''من'' کے واسطے سے متعدی ہوتا ہے، تو ''انصراف'' کے معنی کو مقتضی ہوتا ہے۔ یہ توسعاً ہے۔ یہاں اس سے نجات مراد ہے۔ چونکہ یہاں انصراف تو ہوگا، نہیں۔ یہاں صرف جسر جہنم پر سے مرور وعبور ہوگا۔ لفظ ''نجات'' کی جگہ لفظ ''صدور'' استعمال کیا، چونکہ ورود وصدور میں مناسبت ہے۔

امام طیبیؒ فرماتے ہیں: "ثم يصدرون" کے "ثم" کے مثل یہ "ثم" ہے جو اللہ جل شانہ کے اس فرمان میں ہے: ﴿ ثُمَّ نُنَجِّي الَّذِينَ اتَّقَوا ﴾ [مریم:۷۲] پھر ہم ان لوگوں کو نجات دیدیں گے جو اللہ سے ڈر (ایمان لاتے تھے) کہ "ثم" تراخی فی الرتبہ کیلئے ہے، نا کہ تراخی فی الزمان کیلئے۔ اللہ جل شانہ نے لوگوں کے آگ پر پیش ہونے اور کے متقین کے جہنم سے نجات پانے درمیان تفاوت کو واضح فرمایا ہے۔ اسی طرح نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے آگ پر لوگوں کے پیش ہونے اور آگ سے لوگوں کے لوٹنے کے درمیان فرق کو واضح فرمایا، کہ "صدور" سے مراد "انصراف" ہے۔ (انتھی)

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ جب ورود کا عمل شروع ہوگا، تو لوگ آگ کے خوف سے چھٹکارا پاتے چلے جائیں گے۔ رؤیت نار کا مشاہدہ، اس کے شعلوں کا لپکنا، اس کا دھواں، اس کے کانٹوں کا چھونا وغیرہ حسب مراتب ہوگا جو جس قدر تیزی سے یا آہستہ گزرے گا اس کے مطابق اس کو سامنا ہوگا

قولہ: فاولهم كامع البرق ...... : كحضر الفرس: اس کا معنی ہے گھوڑے کی طرح تیز دوڑنا۔ اور حضر: حاء کے ضمہ، اور ضاد کے سکون کے ساتھ، اس کا معنی ہے "بہت تیز دوڑنا"

كالراكب في رحله: "في" بمعنی "على" ہے، اور "رحل" بمعنی "راحلة" ہے۔ "على" کی بجائے "في" ذکر کیا، "تمكن في السير" مضبوطی کے ساتھ جم کر چلنا کے معنی کو ظاہر کرنے کے لئے ہے۔

بعض کا کہنا ہے: اس سے وہ "راکب" مراد ہے جو اپنے ٹھکانے پر ہو چونکہ وہ اس وقت بہت ہی تیز دوڑتا ہے۔

الفصل الثالث:

۵۷۰۷ : وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ اَنَّ رَسُولَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اِنَّ اَمَامَكُمْ حَوْضِي مَابَيْنَ جَنْبَيْهِ كَمَا بَيْنَ جَرْبَاءَ وَاَذْرُحَ قَالَ بَعْضُ الرُّوَاةِ هُمَا قَرْيَتَانِ بِالشَّامِ بَيْنَهُمَا مَسِيرَةُ ثَلٰثِ لَيَالٍ وَفِي رِوَايَةٍ فِيهِ اَبَارِيقُ كَنُجُومِ السَّمَآءِ مَنْ وَرَدَهُ فَشَرِبَ مِنْهُ لَمْ يَظْمَأْ بَعْدَهَا اَبَدًا (متفق عليه)

اخرجه البخاري في صحيحه ٤٦٣/١١ حديث رقم ٦٥٧٧، واخرجه مسلم في صحيحه ١٧٩٧/٤ حديث رقم ٢٢٩٩/٣٤ وابن ماجه في السنن ١٤٣٨/٢ حديث رقم ٤٣٠٣ واحمد في المسند ٢١٠/٢۔

ترجمہ: "حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے منقول ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: تمہارے سامنے (روز قیامت) میرا حوض کوثر (ظاہر ہونے والا) ہے جس کے دونوں طرف کا درمیانی فاصلہ اتنا ہے جتنی جَرْبا اور اَذْرُح کی درمیانی مسافت ہے"۔ کسی راوی کا کہنا ہے کہ جربا اور اذرح ملک شام میں دو بستیاں ہیں جن کے درمیان تین دن کا فاصلہ ہے اور ایک دوسری حدیث میں یہ الفاظ بھی ہیں کہ (اس حوض) کے دونوں کناروں پر آب خورے رکھے ہوں گے جو (چمک دمک اور کثرت کے اعتبار سے) آسمان کے ستاروں کی طرح معلوم ہوں گے' جو شخص اس حوض پر آئے گا اور اس کا پانی پئے گا وہ پھر کبھی پیاس محسوس نہیں کرے گا"۔ (بخاری ومسلم)

تشریح: **قولہ: ان امامكم مسيرة ثلاث ليال:**

أمامکم: ہمزہ کے فتحہ کے ساتھ ہے۔

جرباء: جیم کے فتحہ رائے موحدہ کے سکون اور الف ممدودہ کے ساتھ ہے۔

أذرح: ہمزہ کے فتحہ، ذال معجمہ کے سکون، راء کے ضمہ، اور حاء مہملہ کے ساتھ ہے۔

فائدہ: ''جرباء'' اور'' أذرح'' یہ دونوں کلمات غیر منصرف ہیں۔

صاحب قاموس فرماتے ہیں: '' جرباء'' ایک بستی کا نام ہے، جو'' أذرح '' کے قریب واقع ہے۔ یہ کہنا غلط ہے کہ ان دونوں کے درمیان تین دن رات کی مسافت ہے۔ حدیث کے بعض رواۃ نے چونکہ زیادت کو ساقط کر دیا ہے، اس وجہ سے اس حدیث کا مفہوم سمجھنے میں وہم ہو جاتا ہے۔ چنانچہ دار قطنیؒ نے اس زیادت کو ذکر کیا ہے: **ما بین ناحیتی حوضی کما بین المدینة وجرباء وأذرح،**

یعنی ''میرے حوض کے دونوں کناروں کا درمیانی فاصلہ اتنا ہے جتنا کہ مدینہ اور جرباء واذرح کے درمیان کا فاصلہ ہے''۔

قولہ: فیہ أباریق کنجوم السماء: (جار مجرور کا متعلق محذوف ہے۔) ای: **موضوع فی اطرافہ أو علی جوانبہ.**

یعنی کثرت وزیادتی، صفائی ستھرائی اور چمک دمک میں آسمان کے ستاروں کی طرح ہیں۔

قولہ: من وردہ فشرب منہ لم یظمأ بعدھا:

''بعدھا'': کی ضمیر'' الشربة '' کی طرف عائد ہے۔ یا'' الشرب '' کی طرف لوٹ رہی ہے۔ ''شرب'' مصدر ہے، اور مصدر مذکر ومؤنث دونوں طرح استعمال ہوتا ہے۔

جنت میں پانی یا کسی بھی مشروب کا پینا پیاس کی وجہ سے نہیں ہوگا، بلکہ برائے مثلاً تفکہ اور تکیف (یعنی لذت حاصل کرنے اور کیفیت معلوم کرنے کے لئے ہوگا۔) کے ہوگا۔

تخریج: اسی حدیث کو امام احمدؒ، امام ترمذیؒ، امام ابن ماجہؒ نے ان الفاظ کے ساتھ روایت کیا ہے:

الکوثر نھر فی الجنة حافتاہ من ذھب ومجراہ علی الدر والیاقوت، تربتہ أطیب ریحا من المسك، وماؤہ أحلی من العسل، وأشد بیاضا من اللبن۔ ''کوثر جنت کی نہر ہے۔ اس کے کنارے سونے کے ہیں۔ اس کی مٹی مشک سے زیادہ خوشبودار ہے اس کا پانی شہد سے زیادہ میٹھا ہے اور دودھ سے زیادہ سفید ہے۔''

۵۶۰۸، ۵۶۰۹ : وَعَنْ حُذَيْفَةَ وَاَبِیْ هُرَيْرَةَ قَالَا قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَجْمَعُ اللّٰهُ تَبَارَكَ وَتَعَالٰى النَّاسَ فَيَقُوْمُ الْمُؤْمِنُوْنَ حَتّٰى تُزْلَفَ لَهُمُ الْجَنَّةُ فَيَأْتُوْنَ اٰدَمَ فَيَقُوْلُوْنَ يَا اَبَانَا اسْتَفْتِحْ لَنَا الْجَنَّةَ فَيَقُوْلُ وَهَلْ اَخْرَجَكُمْ مِنَ الْجَنَّةِ اِلَّا خَطِيْئَةُ اَبِيْكُمْ لَسْتُ بِصَاحِبِ ذٰلِكَ اِذْهَبُوْا اِلٰى ابْنِیْ اِبْرَاهِيْمَ خَلِيْلِ اللّٰهِ قَالَ فَيَقُوْلُ اِبْرَاهِيْمُ لَسْتُ بِصَاحِبِ ذٰلِكَ اِنَّمَا كُنْتُ خَلِيْلًا مِنْ وَّرَآءَ وَرَآءَ اِعْمَدُوْا اِلٰى مُوْسٰى الَّذِیْ كَلَّمَهُ اللّٰهُ تَكْلِيْمًا فَيَأْتُوْنَ مُوْسٰى فَيَقُوْلُ لَسْتُ بِصَاحِبِ ذٰلِكَ

اذهبوا الى عيسى كلمة الله وروحه فيقول عيسى لست بصاحب ذلك فياتون محمدا فيقوم فيؤذن له وترسل الامانة والرحم فتقومان جنبتى الصراط يمينا وشمالا فيمر اولكم كالبرق قال قلت بابى انت وامى اى شىء كمر البرق قال الم تروا الى البرق كيف يمر ويرجع فى طرف عين ثم كمر الريح ثم كمر الطير وشد الرجال تجرى بهم اعمالهم ونبيكم قائم على الصراط يقول رب سلم سلم حتى تعجز اعمال العباد حتى يجىء الرجل فلا يستطيع السير الا زحفا قال وفى حافتى الصراط كلاليب معلقة مامورة تاخذ من امرت به فمخدوش ناج ومكردس فى النار والذى نفس ابى هريرة بيده ان قعر جهنم لسبعين خريفا. (رواہ مسلم)

اخرجه البخاری فی صحیحه ٤١٧/١١ حدیث رقم ٦٥٦٥ ومسلم فی صحیحه ١٨٦/١ حدیث رقم (١٩٥-٣٢٩) وابن ماجه فی السنن ١٤٤٢/٢ حدیث رقم (٤٣١٢)

ترجمہ: ”حضرت حذیفہ اور حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہما دونوں نے بیان فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: (روز قیامت) خدائے بابرکت وعالیشان (میدان حشر میں) لوگوں کو اکٹھا فرمائے گا اور پھر سب اہل ایمان (حساب کتاب اور آخری فیصلہ کے منتظر) کھڑے رہیں گے حتیٰ کہ جنت کو ان کے قریب کر دیا جائے گا پس (ہر امت کے خاص خاص) مومن حضرت آدم علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوں گے اور عرض کریں گے کہ اے ہمارے باپ! ہمارے لئے جنت کو کھلوا دیجئے (تاکہ ہم اپنی اس ابدی آرام گاہ میں داخل ہو جائیں) حضرت آدم علیہ السلام ان سے فرمائیں گے کہ (کیا تم خبر نہیں رکھتے) تمہیں جنت سے تمہارے باپ ہی کی خطا نے نکلوایا تھا (لہٰذا) اس کام (یعنی تمہارے حق میں شفاعت کرنے اور جنت کھلوانے) کی میں اہلیت نہیں رکھتا' تم لوگ میرے بیٹے ابراہیم علیہ السلام کے پاس چلے جاؤ جو اللہ کے دوست (اور اللہ کے رسولوں میں افضل اور خاتم الانبیاء کے جد اعلیٰ ہیں آنحضرت ﷺ نے فرمایا لوگ یہ سن کر حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پاس چلے جائیں ان سے وہی گذارش کریں گے جو انہوں نے حضرت آدم علیہ السلام سے کی تھی (حضرت ابراہیم علیہ السلام بھی ان کو یہی جواب دیں گے کہ میں اس کام کی اہلیت نہیں رکھتا ہوں' میں خدا کا خلیل آج سے پہلے پہلے ہی تھا' تم لوگ موسیٰ علیہ السلام کے پاس چلے جاؤ جنہیں حق تعالیٰ نے اپنے ساتھ (بلاواسطہ ورابطہ) کلام فرمانے کا شرف واعزاز بخشا ہے چنانچہ وہ لوگ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہو جائیں گے اور وہ بھی یہی جواب دیں گے کہ میں اس کام کی اہلیت نہیں رکھتا ہوں' تم لوگ عیسیٰ علیہ السلام کے پاس چلے جاؤ جو اللہ کا کلمہ ہیں (یعنی ظاہری سبب کے بغیر صرف کلمہ کن سے پیدا ہوئے! چنانچہ (وہ لوگ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہو جائیں گے اور) حضرت عیسیٰ علیہ السلام بھی یہی جواب دیں گے کہ میں اس کام کی اہلیت نہیں رکھتا ہوں بالآخر (اس وقت یہ بات واضح ہو جائے گی کہ شفاعت کا انحصار صرف خاتم الانبیاء محمد ﷺ پر ہے کیونکہ بارگاہ رب العزت میں سب سے زیادہ اعزاز وقرب کے ساتھ انہیں کو نوازا گیا ہے اور تمام پیغمبروں میں سب سے زیادہ ممتاز ومشہور انہی کی ذات اقدس ہے' چنانچہ وہ لوگ محمد (ﷺ) کی خدمت میں حاضر ہوں گے اور محمد ﷺ (عرش الٰہی کے دائیں جانب) کھڑے ہو کر تمام نوع انسانی کو

میدان حشر کی سختیوں اور پریشانیوں سے راحت دلانے کی شفاعت کرنے کی اجازت چاہیں گے۔ پس آپ ﷺ کو اجازت عطا کی جائے گی (اور جیسا کہ پیچھے گزرا آپ ﷺ بارگاہ رب العزت میں حاضر ہو کر سجدہ ریز ہو جائیں گے اور پھر حکم خداوندی پر سر اٹھائیں گے اور گذارشات کریں گے) پھر جب حساب و کتاب کا مرحلہ گزر جائے گا اور تمام لوگ پل صراط پر سے گزرنے والے ہوں گے تو امانت اور رحم (ناتے) کو (صورت دے کر) لایا جائے گا اور یہ دونوں (اپنا حق اور انصاف مانگنے کے لئے) پل صراط کے دائیں بائیں جانب کھڑی ہو جائیں گی' پھر (پل صراط پر سے لوگوں کا گزرنا شروع ہوگا تو) ایک طبقہ جو تم میں سب سے افضل اور سب سے پہلے گزرنے والا ہوگا بجلی کی طرح (نہایت سرعت سے) پل کو عبور کرلے گا''۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ میں نے (یہ سن کر) عرض کیا کہ (یارسول اللہ ﷺ) آپ ﷺ پر میرے ماں باپ فدا ہوں' بجلی کی طرح گزرنے کی صورت کیا ہوگی! آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: کیا تم نے نہیں دیکھا کہ بجلی کی چمک کس طرح گزر جاتی ہے اور پل جھپکتے ہی واپس آجاتی ہے (مطلب یہ ہے کہ وہ لوگ پل صراط پر سے بس اسی طرح گزر جائیں گے جیسے پلک جھپک گئی ہو) پھر (کچھ لوگ) پرندوں کی مانند اور (کچھ لوگ) مردوں کے دوڑنے (یا پیادہ چلنے والوں کی طرح) گزر جائیں گے اور ان کو ان کے اعمال کی طاقت و نورانیت اور پاکیزگی چلائیگی (یعنی جس کے اعمال جس درجہ کے ہوں گے اس کے گزرنے کی رفتار بھی اسی درجہ کی ہوگی) اور (اس وقت جب کہ مسلمان پل صراط کو پار کر رہے ہوں گے) تمہارے نبی ﷺ پل صراط پر سے کھڑے ہوئے یہ دعا فرما رہے ہوں گے پروردگار انہیں بچائیو! پروردگار انہیں بچائیو!'' (یعنی پروردگار! ان کو سلامتی کے پار کرادے ان کو دوزخ میں گرنے سے بچالے) اور پھر کچھ بندوں کے اعمال عاجز ہوں گے' یعنی جن بندوں کے اعمال ناقص و کمتر ہوں گے یا ان کے پاس ایسے اعمال نہ ہوں گے جو انہیں پل پار کر واسکیں تو وہ لوگ پل پر سے گزرتے وقت سخت قسم کی پریشانیوں اور رکاوٹوں سے دوچار ہوں گے) یہاں تک کہ ایک شخص (جو اپنے اعمال کی بہت زیادہ خرابی کے باعث چلنے کی بالکل سکت نہیں رکھے گا) گھسٹتا ہوا اور اپنے سرین کے بل سرکتا ہوا آئے گا''۔ اس کے بعد حضور اقدس ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''اور پل صراط کے دونوں طرف آنکڑے لٹکے ہوں گے اور ان کو (اللہ تعالیٰ کی طرف سے) یہ حکم دیا گیا ہوگا کہ وہ ہر اس شخص کو اپنے شکنجہ میں لے لیں جو اس کے قابل قرار دیدیا گیا' چنانچہ وہ آنکڑے ایسے لوگوں کو پکڑیں گے اور پھر) ان میں سے کچھ لوگ تو ان آنکڑوں کی مصیبت جھیل کر اور زخمی ہو کر (دوزخ کی آگ سے) نجات یافتہ ہو جائیں گے اور کچھ لوگوں کو ہاتھ پاؤں باندھ کر جہنم میں پھینک دیا جائے گا قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ میں ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی جان ہے دوزخ کا گہراؤ ستر سال کی مسافت کے بقدر ہے''۔ (مسلم)

تشریح: قوله: يجمع الله تبارك ..... استقع لنا الجنة:

''الناس'': سے مراد مخلوق ہے۔ انسانوں کا ذکر ان کے شرف و معزز ہونے کی وجہ سے فرمایا، چونکہ اُرباب تکلیف میں انسان عمدہ اصل ہیں۔

فيقوم المؤمنون: پھر تمام لوگوں میں سے صرف خاص مومنین کھڑے ہوں گے۔

حتى تزلف: تاء کے ضمہ، زاء کے سکون، لام کے فتحہ، اور فاء کے ساتھ ہے۔

اسی مفہوم میں یہ آیت کریمہ ہے:﴿و اذا الجنة أزلفت علمت نفس ما أحضرت﴾ [التکویر:۱۳۔۱٤] ''اور جب جنت نزدیک کردی جاوے گی (تو اس وقت) ہر شخص ان اعمال کو جان لے گا جو لے کر آیا ہے (اور اب ایسا واقعہ ہونے والا ہے''۔

'' استفتح '':اس کا ہمزہ طلب کیلئے ہے۔ ای اطلب فتح بابها (یعنی اے ہمارے باپ ہمارے لئے جنت کو کھلوا دیجئے، تاکہ ہم اس میں داخل ہو جائیں۔)

قوله:فیقول هل اجرجکم من الجنة الاخطیئة أبیکم۔۔۔ خلیل الله :

مطلب یہ ہے کہ صاحب خطیئہ، شفاعت کی صلاحیت نہیں رکھتا، بلکہ وہ تو خود فروتنی کا محتاج ہے۔ یہی مفہوم حدیث کا یہ اگلا جملہ ادا کر رہا ہے۔لست بصاحب ذلك:

ذلك:اس کا مشار الیہ المقام ہے۔یعنی شفاعت کبری کے بلند مقام کا میں اہل نہیں ہوں۔اور وہ عظیم مرتبہ کہ جسے ''مقام محمود'' کہتے ہیں وہ تو ''صاحب لواء ممدود'' (یعنی آنحضرتؐ) کے ساتھ مخصوص ہے۔

اذهبوا الی ابنی ابراهیم الله۔ چونکہ وہ ''افضل الرسل'' ہیں۔اور خاتم الانبیاء کے جد اعلی ہیں، پس ان کے پاس جاؤ اور اپنی یہ درخواست ان کے ہاں پیش کرو۔

قوله:فیقول ابراهیم ۔۔۔من ورا ٔ ورا:

ذلك: سے مقام محمود موعود کی طرف اشارہ ہے۔

من وراء وراء:فتحہ کے ساتھ ہیں، جیسا کہ اُصول معتمدہ اور تصحیح شدہ مقروءۃ نسخوں میں ہے۔امام نوویؒ فرماتے ہیں:'' وراء وراء'' تکرار کے ساتھ ہے،دونوں کا مبنی علی الفتح غیر منون ہونا مشہور ہے اور دونوں کو مبنی علی الضم پڑھنا بھی درست ہے۔ ابوالبقاءؒ فرماتے ہیں: درست بات یہ ہے کہ یہ دونوں مبنی علی الضم ہیں۔چونکہ ان کی تقدیر'' من وراء ذلك'' ہے۔فرمایا: اگرچہ پہلے فتحہ پڑھنا صحیح تھا۔شیخ ابوعبداللہ فرماتے ہیں: فتحہ اصح ہے۔یہ کلمہ'' شذر مزر''اور'' شغر بغر'' کی طرح مرکب ہے۔ چنانچہ یہ دونوں مبنی علی الفتح ہیں۔اور اگر یہ منصوب و منون ہوتے تو یہ بھی جائز تھا۔

قوله:اعمدوا الی موسیٰ۔۔۔لست بصاحب ذلك:

اعمدوا: میم کے کسرہ کے ساتھ۔

یعنی تم لوگ موسیٰ علیہ السلام کے پاس جاؤ، جن کو اللہ تعالیٰ نے کتاب کے واسطے کے بغیر، اور بغیر حجاب، ہم کلامی کے شرف سے نوازا ہے۔صاحب التحریرؒ نے فرمایا: حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام یہ بات بطور تواضع وانکساری کے فرمائیں گے، کہ اس بلند و بالا درجہ کا لائق میں نہیں ہوں۔ گویا ان کا مطلب یہ ہوگا کہ پروردگار کی جانب سے مجھے جو فضیلت و خصوصیت اور عزت عطاء ہوئی ہے، وہ حضرت جبرائیل علیہ السلام کے واسطے سے مجھ تک پہنچی ہے۔ تمہیں چاہئے کہ تم موسیٰ علیہ السلام کے پاس جاؤ، کیونکہ انہیں ہم کلامی کی سعادت بغیر کسی واسطے کے، براہ راست حاصل ہوئی ہے۔

فرمایا: (وراء کی) تکرار اس وجہ سے فرمائی کہ ہمارے نبی اکرم محمد مصطفیٰ ﷺ کو سماع کی سعادت بغیر کسی واسطے کے براہ

راست حاصل ہوئی ہے۔اور رؤیت کا اعزاز بھی حاصل ہے۔تو گویا حضرت ابراہیم علیہ السلام کا کلام یوں تھا: أنا وراء موسی الذی ھو وراء محمد ﷺ. (میں موسیٰ کے ورے میں جو محمدؐ کے ورے میں۔)

قولہ: فیاتون موسیٰ۔۔۔ کلمۃ اللہ وروحہ:

کلمۃ اللہ وروحہ: مجرور علی البدلیۃ ہے۔اور دونوں کو مرفوع پڑھنا اور منصوب علی المدحت پڑھنا بھی درست ہے۔

قولہ: فیقول عیسی لست بصاحب ذلک:

اور اس وقت شفاعت کا معاملہ ہمارے نبی خاتم الرسل، مقدم الکل پر منحصر ہو کر رہ جائے گا۔

قولہ: فیأتون محمدا فقیوم فیؤذن لہ:

فیأتون محمدا: ضمیر متکلم کی جگہ اسم ظاہر کو ذکر کیا علی سبیل التفات یا علی طریق التجرید۔

فیقوم: اور پھر محمد ﷺ عرش کے دائیں جانب کھڑے ہوں کر بنی نوع انسان سے محشر کی ہولناکیوں، اور غموں کے ازالہ کیلئے شفاعت کی اجازت چاہیں گے۔

فیؤذن لہ: پس آپ سجدے میں پڑ جائیں گے، جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔

قولہ: وترسل الامانۃ والرحم:

فتقومان: مؤنث کے صیغہ کے ساتھ ذکر کرنا مؤنث کو مذکر پر غلبہ دیتے ہوئے ہے۔اور مذکر پڑھنے کی صورت میں "الرحم" مذکر کو "الامانۃ" مؤنث پر غلبہ ہوگا۔

جنبتي: جیم اور نون کے فتحہ کے ساتھ، بمعنی طرفین۔

یمیناً وشمالا: ماقبل کیلئے بمنزلہ بیان ہے۔دونوں منصوب علی البدلیۃ ہیں، یا منصوب علی الظرفیۃ ہیں۔

قولہ: فیمر اولکم کالبرق۔۔۔تجری بھم اعمالھم:

فیمر أولکم: "عام غائب" سے "خاص حاضر" کی طرف التفات ہے۔

کالبرق: وجہ تشبیہ "سرعۃ فی السیر" ہے۔(اور مطلب یہ ہے کہ سب سے پہلے گزرنے والے لوگ نہایت سرعت کے ساتھ پل کو پار کر جائیں گے۔)

قال: ضمیر ابو ہریرہؓ کی طرف راجع ہے۔

قلت: بأبی انت وأمی: باء برائے تعدیہ ہے۔(اور جار مجرور کا متعلق فعل محذوف ہے۔) أی: أفدیک بھما.

أی: استفہامیہ ہے۔یعنی کون سی چیز اس کے مشابہ ہے اور مطلب یہ ہے کہ کس چیز کو آپ برق کے مشابہ بتا رہے ہیں؟

کیف یمر: یعنی کس تیزی سے گزر جاتی ہے۔

ویرجع فی طرفۃ عین: یہ ارشاد گرامی علی سبیل الاستطراد فرمایا، یا معنی مرادی کیلئے بطور تتمیم ذکر فرمایا، تو یہ گویا کہ جواب ہو گیا: انہ یشبھہ فی سرعۃ السیر. (یہ سرعت سیر میں اس کے مشابہ ہے۔) (کذا حررہ الشراح).

میرے نزدیک یہ تشبیہ تشبیہ مرکب ہے، "سرعت مرور" اور "ضیاء ظھور" سے، تا کہ نور علی نور ہو۔اور تا کہ بدن اور روح

دونوں کی طرف اشارہ ہو جائے۔ اور ظاہر و باطن کی طرف، اور کمیت و کیفیت کی طرف بھی اور اس سے مرور کی طرف بھی اشارہ ہے، کہ جو سوال میں مذکور ہے، جواب میں ایک امر زائد کا ہونا ضروری ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

اور بظاہر یہ انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والتسلیم ہوں گے۔ اور ایک احتمال یہ بھی ہے، کہ یہ اس امت کے صوفیاء واصفیاء ہوں چونکہ یہی لوگ أرباب جذبات الٰہیہ ہیں۔

شد الرجال: "شد" بمعنی الجری. (دوڑنا) اور "رجال" رجل کی جمع ہے، یا راجل کی جمع ہے۔

امام طیبیؒ فرماتے ہیں: "أی شیء کمر البرق" کا مطلب ہے: ما الذی یشبهه من المارین بمر البرق. اور "ألم تروا الی البرق" بیان ہے، تشبیہ بالبرق کا۔ یعنی سرعة مرورهم علی الصراط کسرعة لمعان البرق. (یعنی ان کا جنتر جہنم پر سے تیزی سے گرنا تیزی سے بجلی چمکنے کی مانند ہے) گویا کہ سائل نے اس بات کو، مستبعد جانا کہ انسان اس قدر تیز رفتاری سے گزرے گا، چنانچہ آپ علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ایک دوسری چیز یعنی مشبہ کے بارے میں پوچھا تو جواب دیا کہ یہ مستبعد نہیں ہے، کوئی اچھنبے کی بات نہیں کہ اللہ تعالیٰ اعمال کے سبب سے ایسا ہی کر دے۔ ملاحظہ فرمائیں یہ جملہ: "تجری بهم أعمالهم" کہ "جریان" کی نسبت "اعمال" کی طرف کی گئی ہے۔ أی: تجری وهی ملتبسة بهم. اس کی دلیل یہ آیت کریمہ ہے: ﴿وَهِيَ تَجْرِي بِهِمْ فِي مَوْجٍ كَالْجِبَالِ﴾ [هود: ٤٢]۔ "اور وہ کشتی ان کو لے کر پہاڑ جیسی موجوں میں چلے گی" اور یہ بھی ممکن ہے کہ باء برائے تعدیہ ہو۔ أی: تجعلهم جارین. (جو ان کو جاری بنا دے گی)

قوله: ویسیکم قائم علی الصراط ـ ـ ـ الازحفا:

حتی تعجز: "تجری" کے متعلق ہے اور ما قبل جملہ معترضہ بیانیہ ہے، یا حالیہ ہے۔ أی: تجری بهم أعمالهم تعجز أعمالهم عن الجریان بهم.

حتی یجیٔ الرجل: یہ بدل اور توضیح ہے "حتی تعجز" کے لئے۔

السیر: صراط پر سے مرور،

زحفا: کا مطلب ہے حبواً جیسا کہ ما قبل میں گزرا۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

قال: کا فاعل نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام ہیں، اور اگر حضرت ابو ہریرہؓ ہوں تو اس صورت میں یہ حدیث مرفوع ہوگی۔

حافتیه: فاء کی تخفیف کے ساتھ، بمعنی "حانبین". (اطراف)

کلالیب: کلاب کی جمع ہے۔

تأخذ: واحد مؤنث کے صیغہ کے ساتھ ہے۔ اگر یہ باء اور ہمزہ کے فتحہ اور خاء کے سکون کے ساتھ بصیغۂ مصدر ہوتا، تو اس کی بھی ایک بہترین توجیہ تھی۔

فمخدوش: (مبتدا مؤخر ہے۔) أی فمنهم مجروح.

مکردس: دال مہملہ کے فتحہ، اور سین مہملہ کے ساتھ، بعض کا کہنا ہے کہ یہ شین معجمہ کے ساتھ ہے۔ "مکردس" اس شخص کو کہتے ہیں، جس کے دونوں ہاتھ اور دونوں پاؤں باندھ کر کسی جگہ ڈال دیا جائے۔

نہایہ میں ہے کہ یہ سین مہملہ کے ساتھ ہے، اور پھر فرمایا،" مکردش " بھی اس کے ہم معنی ہے، اور ایک نسخہ میں " مکدوس " ہے، سین مہملہ کے ساتھ، بمعنی مدفوع فی النار. (ذکرہ فی النھایة). اور پھر فرمایا کہ یہ لفظ معجمہ کے ساتھ بھی مروی ہے، " کدش " بمعنی " السوق الشدید" سختی سے ہانکنا سے ماخوذ ہے۔" کدش " کے معنی " الطرد والجرح" (ہٹانا' خراش لگانا' زخمی کرنا) بھی آتے ہیں۔ قاموس میں لکھا ہے: کدسه ای صرعه، اور معجمہ کے ساتھ (یعنی سختی سے ہٹانا)

قوله: والذی نفس ابی هریرة بیده: اس جملہ سے اس بات کی تائید ہوتی ہے کہ "قال و فی حافیه" کی ضمیر فاعل کا مرجع ابوہریرہ ہے

قوله: ان قعر جهنم لسبعین خریفا:

دمامینیؒ فرماتے ہیں: (اصل عبارت یوں ہے) ای: مسافة السیر الیه لسبعین خریفا.

صاحب مغنیؒ فرماتے ہیں: اس کی وجہ یہ ہے کہ" قعر "مصدر ہے قعرت البئر (کنویں کی گہرائی میں پہنچنا)۔ کا مطلب یہ ہے کہ اس کی گہرائی تک ستر (۷۰) سال میں پہنچے گا۔ اور اس ایک نسخہ میں واؤ کے ساتھ ہے۔

امام نوویؒ فرماتے ہیں: بعض اصول میں "سبعون "، واؤ کے ساتھ ہے۔ اس کی وجہ اعراب بالکل ظاہر ہے۔ اور اس عبارت میں حذف ہے۔ ای: مسافة قعر جهنم مسیرة سبعین خریفا اصول میں اور روایات میں لفظ "سبعون" یاء کے ساتھ ہے' یہ بھی صحیح ہے' اور اس کی تقدیری عبارت یہ ہے۔ کہ مضاف کو حذف کر دیا گیا اور مضاف الیہ کے اس کے اعراب کے ساتھ باقی رہنے دیا گیا۔ یا تقدیری عبارت یوں ہے: ان قلوع قعر جهنم لکائن فی سبعین خریفا۔ اور سبعین خریفا" محذوف کیلئے ظرف ہے۔

۵۶۱۰ : وَعَنْ جَابِرٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَخْرُجُ مِنَ النَّارِ قَوْمٌ بِالشَّفَاعَةِ كَاَنَّهُمُ الثَّعَارِيْرُ قُلْنَا مَا الثَّعَارِيْرُ قَالَ اِنَّهُ الضَّغَابِيْسُ (متفق علیه)

اخرجه البخاری فی صحیحه ۱۱/۴۱۶ حدیث رقم ۶۵۵۸ واحمد فی المسند ۳/۳۷۶۔

ترجمہ: "حضرت جابر رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: وہ لوگ جو شفاعت کے صدقے دوزخ سے نکالے جائیں گے ان کی مثال ایسی ہوگی گویا وہ " ثَعَارِیْر " ہیں۔ ہم نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! " ثَعَارِیْر " کیا ہوتے ہیں! آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا: وہ کھیرے ککڑیاں ہیں"۔ (بخاری ومسلم)

تشریح: الثعاریر: ثائے مثلثہ، عین مہملہ، اور دو "راؤں" کے ساتھ، یہ" ثعرور " کی جمع ہے، جیسا کہ "عصفور" کی جمع " عصافیر "ہے۔

انه: جیسا کہ بعض نسخوں میں ہے۔ اور ایک نسخہ میں (صرف)" قال "ہے۔ (اس کے بعد "انه" نہیں ہے)

الضغابیس: ضاد، غین، بائے موحدہ، یائے تحتانیہ اور سین مہملہ کے ساتھ،" ضغبوس " کی جمع ہے۔

صاحب نہایہ فرماتے ہیں:" الثغاریر " چھوٹی ککڑیوں کو کہتے ہیں، وجہ تشبیہ یہ ہے کہ ککڑیاں بڑی تیزی سے پھلتی پھولتی

ہیں۔ بعض کا کہنا ہے، کہ یہ ''طرثوت'' کے سر کی مانند ہوتی ہے' سفید ہوتی ہے اس کی سفیدی کی وجہ سے تشبیہ دی ہے اس کا واحد ''طرثوث'' ہے۔ یہ نباتات میں سے ہے اور کھائی جاتی ہے۔ ''ضغا بیس'' چھوٹی ککڑیوں کو کہتے ہیں۔

۵۶۱۱ : وَعَنْ عُثْمَانَ ابْنِ عَفَّانَ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَشْفَعُ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ثَلٰثَةٌ اَلْاَ نْبِيَآءُ ثُمَّ الْعُلَمَاءُ ثُمَّ الشُّهَدَآءُ (رواه ابن ماجة)

اخرجه ابن ماجه في السنن ۲/ ۱۴۴۳ حديث رقم ۴۳۱۳۔

ترجمہ: ''حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: روز قیامت تین قسم کی شخصیات شفاعت کر سکیں گے' اول انبیاء' پھر (باعمل) علماء اور پھر شہداء''۔ (ابن ماجہ)

تشریح: قوله: عن عثمان بن عفان ......:

عفان: منصرف وغیر منصرف دونوں طرح درست ہے۔

ثلاثة: (اس کی تمیز محذوف ہے۔) أي: ثلاثة أصناف من الأصفياء.

''ثم'' کے ذریعہ عطف کرنا صراحت کے ساتھ دلالت کر رہا ہے کہ علماء شہداء سے اُفضل ہیں، جیسا کہ شیرازی نے حضرت انسؓ سے، ابن عبدالبر نے حضرت ابوالدرداءؓ سے، اور ابن جوزی نے علل میں نعمان بن بشیر سے مرفوعاً نقل کیا:

يوزن يوم القيامة مداد العلماء ودم الشهداء، فيرجح مداد العلماء على دم الشهداء۔ ''قیامت کے دن علماء (کے قلموں) کی سیاہی اور شہیدوں کے خون کو تولا جائے گا' چنانچہ علماء (کے قلموں) سیاہی شہداء کے خون پر غالب ہو جائے گی)۔

اس حدیث میں جس قدر مبالغہ ہے فضلاء پر مخفی نہیں۔ سنن ابی داؤد میں ابوالدرداء سے مروی ایک مرفوع حدیث میں یہ الفاظ ہیں: يشفع الشهيد في سبعين من أهله. ''شہید اپنے اہل خانہ میں سے ستر (۷۰) افراد کی سفارش کرے گا۔''

بَابُ صِفَةِ الْجَنَّةِ وَاَهْلِهَا

جنت اور اہل جنت کے حالات کا بیان

''دار ثواب'' کو جنت کہا گیا ہے، چونکہ اس میں کئی جنتیں ہیں۔ ''الجنۃ'' کا مطلب ہے وہ باغ کہ جس میں سایہ دار گھنے درخت ہوں جس لفظ میں بھی ''ج ن ن'' کا مادہ ہوگا وہ ستر کے معنی پر دلالت کرتا ہے۔ مثلاً الجنة' الجنة' الجنة' اور ان جیسے دیگر الفاظ۔ تو گویا کہ جنت کو اس کے گنجان ہونے اور سایہ دار ہونے کی وجہ سے ''جنت'' کہا جاتا ہے ''جنة'' مصدر مرہ ہے 'جنة بمعنیٰ 'سترة'' سے مشتق ہے۔ چنانچہ ''جنة'' کا معنیٰ گویا ''جنة'' ''سترہ'' واحدۃ ہے بس ''جنۃ'' کی وجہ تسمیہ یہ ہوئی کہ یہ اپنے بہت زیادہ گنجان ہونے کی وجہ سے ''سترہ واحدہ'' ہے

''دار الثوب'' کو ''جنت'' کہا جاتا ہے۔ جس کی وجہ تسمیہ متعدد ہو سکتی ہیں: ① چونکہ اس میں کئی جنتیں ہیں۔ ② اس وجہ سے کہ یہ لوگوں کی نگاہوں سے مخفی ہے، تاکہ ایمان بالغیب رہے، ایمان بالعیان نہ ہو۔ ③ اس وجہ سے کہ اللہ تعالیٰ نے آنکھوں کی ٹھنڈک (کے سامان) کو ان کے مکینوں سے چھپا کر رکھا ہوا ہے۔ واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم۔

اَلْفَصْلُ الْاَوَّلُ:

۵۶۱۲: عَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰى اَعْدَدْتُ لِعِبَادِیَ الصَّالِحِيْنَ مَالَا عَيْنٌ رَاَتْ وَلَا اُذُنٌ سَمِعَتْ وَلَا خَطَرَ عَلٰى قَلْبِ بَشَرٍ وَاقْرَؤُا اِنْ شِئْتُمْ فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ مَّآ اُخْفِیَ لَهُمْ مِنْ قُرَّةِ اَعْيُنٍ (متفق عليه)

اخرجه البخاری فی صحيحه ۳۱۸/۶حديث رقم ۳۲۴۴،ومسلم فی صحيحه۲۱۷٤/٤حديث رقم (۲-۲۸۲٤) والترمذی فی السنن ۳۲۳/۵حديث رقم ۳۱۹۷، وابن ماجه فی سننه ۱٤٤۷/۲حديث رقم ٤۳۲۸ والدارمی فی السنن ٤۳۲/۲حديث رقم ۲۸۲۸، واحمد فی المسند ۳۱۳/۲۔

ترجمہ: ''حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''میں نے اپنے نیکوکار بندوں کے لئے ایسی نعمتیں تیار کی ہوئی ہیں کہ (آج تک) نہ کسی آنکھ نے ان (جیسی چیزوں کو) دیکھا ہے نہ کسی کان نے ان (جیسی خوبیوں) کو سنا ہے اور نہ کسی انسان کے دل میں ان (کی حقیقت وصورت) کا خیال وتصور ہی پیدا ہوا ہے اگر تم اس بات کی تائید وتصدیق چاہو تو یہ آیت تلاوت کر لو ''فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ مَّآ اُخْفِیَ لَهُمْ مِنْ قُرَّةِ اَعْيُنٍ (بخاری ومسلم) کوئی

شخص بھی واقفیت نہیں رکھتا (جو لوگ تہجد گزار ہیں اور راہ خدا میں اپنی مالی قربانی دینے والے ہیں) ان کے لئے کیا آنکھوں کی ٹھنڈک چھپا رکھی ہے''۔

تشریح: قوله: أعددت لعبادی الصالحين مالا عين رأت لعبادی: یائے متکلم کے فتحہ اور سکون کے ساتھ۔

ما لا عين رأت: امام طیبیؒ فرماتے ہیں: ''ما'' موصولہ ہے، یا موصوفہ ہے، ''عین'' چونکہ سیاقِ نفی میں واقع ہوا ہے لہٰذا مفید استغراق ہے۔ اس توجیہ کے بعد معنوی تقدیر یوں ہوگی: ما رأت العيون كلهن ولا عين واحدة منهن. حدیث کے اس جملہ کا اسلوب وہی ہے جو اس آیت کریمہ کا ہے: ﴿ما لظالمين من حميم ولا شفيع يطاع﴾ [غافر۔۱۸]

ایک احتمال یہ ہے کہ نفی کا تعلق رؤیت اور عین دونوں کے ساتھ معاً ہو، ای: لا رؤية ولا عين دوسرا احتمال یہ ہے صرف نفی رؤیت ہو، أی لا رؤية، پہلی توجیہ کی صورت میں غرض عین ہے، اور ''رؤیت'' اس کے ساتھ اس لئے ملا دی گئی تاکہ معلوم ہو جائے کہ انتفاء موصوف امر محقق ہے، اس میں کوئی نزاع نہیں ہے۔ اور وہ اپنے تحقیق میں اس درجہ کو پہنچا ہوا ہے گویا کہ وہ نفی صفت اور اس کے عکس پر شاہد ہے۔

قوله: ولا اذن سمعت ولا خطر علی قلب بستر:

أذن: ہمزہ اور ذال کے ضمہ کے ساتھ، ذال کے سکون کے ساتھ بھی درست ہے۔

امام طیبیؒ فرماتے ہیں: یہ (حدیث)، اللہ جل شانہ کے اس قول کے باب سے ہے: ﴿يوم لا ينفع الظالمين معذرتهم﴾ [غافر۔۵۲] حدیث کے اس جملہ کا مطلب یہ ہوا: لا قلب ولا خطور أو لا خطورا. پہلی توجیہ کے مطابق قلب مخطر ہے، چنانچہ انتفاء صفت کو، انتفاء ذات کی دلیل قرار دیا۔ أی: اذا لم يجعل ثمرة القلب وهو الاخطار، فلا قلب جیسا کہ اللہ جل شانہ کا یہ فرمان ہے: ﴿ان في ذلك لذكرى لمن كان له قلب﴾ [ق:۳۷] ''اس میں اس شخص کے لئے بڑی عبرت ہے جس کے پاس (فہم) دل ہو۔'' اگر یہ سوال کیا جائے کہ تیسرے جملے میں ''بشر'' کا لفظ ذکر کرنے کی کیا وجہ ہے؟ تو میں کہتا ہوں کہ یہی وہ لوگ ہیں، جو اپنے ربّ کی نعمتوں سے مستفید ہو سکیں گے، بخلاف ملائکہ کے۔

یہ حدیث (متن والی)، آیت کریمہ کیلئے بمنزلہ تفصیل کے ہے، آیت علم کی نفی کر رہی ہے، اور حدیث حصول علم کے طریقے کی نفی کر رہی ہے۔

قوله: واقرؤوا ......:

واقرأوا: بظاہر یہ (اگلا حصہ) مرفوع ہے، اور اس کی تائید عاطف سے ہوتی ہے۔ اور زیادہ ظاہر یہ ہے کہ یہ (حصہ) موقوف ہے۔

ان شئتم: کا مطلب ہے اگر تم اشتہاد اعتقاد کا ارادہ کر رہے ہو تو

فلا تعلم: یہ جملہ محل نصب میں ''اقرأوا'' کا مفعول ہے، یا تقدیری عبارت یوں ہے: آية فلا تعلم الخ.

نفس: بمعنی متنفس، نہ کوئی فرشتہ اور نہ غیر فرشتہ

ما أخفى لهم: (یعنی جمہور قراء) نے ''أخفى'' کو، یاء کے فتحہ کے ساتھ، بصیغہ مجہول۔ پڑھا ہے اور حمزہ کی قراءت میں

یاء کے سکون کے ساتھ، بصیغہ متکلم فعل مضارع ہے۔اس قرأت کی مؤید حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی قراءت ہے، کہ انہوں نے نون عظمت کے ساتھ (یعنی بصیغہ جمع متکلم) پڑھا ہے۔اور ایک قراءت میں ہمزہ کے فتحہ کے ساتھ ہے، اس صورت میں اس کا فاعل لفظ اللہ ہوگا۔

کشاف میں لکھتے ہیں: اس آیت کا مطلب یہ ہے، کہ نہ سارے نفوس جانتے ہیں نہ کوئی ایک شخص ہی جانتا ہے، نہ کوئی مقرب فرشتہ، اور نہ کوئی نبی مرسل یعنی ثواب کی جو نوع عظیم اللہ جل شانہ نے ان کیلئے ذخیرہ کررکھی ہے، اور تمام مخلوقات سے چھپا کررکھی ہوئی ہے، اسے اللہ کے علاوہ کوئی نہیں جانتا، وہ چھپا کررکھی گئی چیز ایسی ہے، کہ جس سے ان کی آنکھیں ٹھنڈی ہوجائیں گی، اس نعمت سے بڑھ کر کوئی نعمت نہیں، اور نہ اس نعمت سے بڑھ کر کسی چیز کی طمع ہوگی۔

شرح السنہ میں فرماتے ہیں: کہا جاتا ہے: أقر الله عينك، یعنی اللہ، آنکھ کے آنسو کو ٹھنڈا کرے، کیونکہ فرحت وراحت کے آنسو ٹھنڈے ہوتے ہیں۔(حکاہ الاصمعی)

ان کے علاوہ دوسرے حضرات کا کہنا ہے، کہ اس جملہ کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تیری امنگوں کو پورا کرے، حتی کہ تیرا جی راضی ہوجائے، اور تیری آنکھ کو قرار نصیب ہوتا کہ تو اپنی شے محبوب کے علاوہ ادھر ادھر آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھے۔

امام طیبیؒ فرماتے ہیں: چنانچہ اس لفظ کی پہلی توضیح سے یہ بات سامنے آئی کہ "القرۃ" بمعنی "البرد" (ٹھنڈک) سے ہے۔اور دوسری توضیح سے پتہ چلتا ہے، کہ یہ "قرار" سے مشتق ہے۔

اور "أعددت لعبادي" اس بات کی دلیل ہے، کہ جنت پیدا کی جاچکی ہے، اس کی تائید اس بات سے بھی ہوتی ہے، کہ حضرت آدم وحواء علیہم السلام کی جائے قرار جنت تھی، اور مزید یہ کہ قرآن میں یہ لفظ "اسمائے غالبہ لاحقہ بالاعلام" کے نہج پر آیا ہے جیسا کہ النجم، الثریاء اور الکتاب وغیرہ ہیں اس کی وضاحت یہ ہے کہ لفظ "جنت" کا اطلاق ہر اس باغ پر ہوتا تھا جس کے درخت گھنے ہوں، پھر اس لفظ کا غالب استعمال "دار الثواب" پر ہونے لگا ہم نے "لا حقه للاعلام" کی قید اس لئے لگائی کہ اعلام پر "ال" کا دخول لازم نہیں ہے۔

اس بات کی مزید تحقیق یہ ہے کہ یہ لفظ (یعنی جنت) منقول شرعی ہے علی سبیل التغلیب۔اور تغلیب اسی وقت ہوتی ہے جب وہ شئے موجود ومعہود ہو، اور اسی طرح "النار" کہ منقول ہونے کے بعد اس لفظ کا استعمال "دار العقاب" (جہنم) پر ہوتا ہے، علی سبیل الغلبہ، اگرچہ "دار العقاب" زمہریر، مہل اور ضریع جیسی چیزوں پر بھی مشتمل ہے۔اور اگر ایسا نہ ہوتا تو جنت 'طلب قصور وحور وولدان کے قائم مقام نہ ہوتی' اور جہنم' طلب وقایہ از زمہریر' مہل اور کے قائم مقام نہ ہوتی۔

تخریج: اس حدیث کو امام احمد، ترمذی اور ابن ماجہ نے بھی حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت کیا ہے، مگر اس میں یہ الفاظ موجود نہیں: اقرأوا ان شئتم الخ۔ جیسا کہ الجامع میں ہے اس سے اس کے موقوف ہونے کی تائید ہوتی ہے۔

امام طبرانیؒ نے سہل بن سعد سے اس حدیث کو مرفوعاً، ان الفاظ کے ساتھ نقل کیا ہے:

ان في الجنة ما لا عين رأت ولا أذن سمعت ولا خطر على قلب أحد۔ "بلاشبہ جنت میں وہ کچھ ہے جو نہ کسی آنکھ نے دیکھا نہ کسی کان نے سنا اور نہ کسی کے دل پر کھٹکا۔"

اسی حدیث کو امام طبرانیؒ نے الاوسط میں، اور امام بزارؒ نے حضرت ابو سعیدؓ سے ان الفاظ کے ساتھ روایت کیا ہے:
في الجنة ما لا عين رأت، ولا أذن سمعت، ولا خطر على قلب بشر. ''جنت میں وہ کچھ ہے جو کسی آنکھ نے دیکھا نہیں کسی کان نے سنا نہیں اور کسی انسان کے دل پر خیال گذرا۔''
طبرانیؒ، ابن عباس سے مرفوعاً روایت کرتے ہیں: لما خلق الله تعالىٰ جنت عدن خلق فيها ما لا عين رأت، ولا أذن سمعت، ولا خطر على قلب بشر. ثم قال لها: تكلمي، فقالت: ﴿قد أفلح المؤمنون﴾ ''جب اللہ تعالیٰ جنت عدن کو پیدا کا تو اس اس میں وہ کچھ پیدا کیا جو کسی آنکھ نے دیکھا نہیں کسی کان نے سنا نہیں اور کسی انسان کے دل پر کھٹکا نہیں اور پھر اس سے فرمایا: تو وہ بولی:]قد أفلح المؤمنون۔

حدیث کا شانِ ورود:

حافظ ابن حجرؒ فرماتے ہیں: اس حدیث کا شان ورود یہ ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنے رب سے سوال کیا کہ اہل جنت میں سے عظیم مرتبہ والا کون شخص ہے؟ تو فرمایا: غرزت كرامتهم بيدي وختمت عليها، فلا عين رأت (ان کی کرامت کو میں نے اپنے ہاتھ سے بویا' اور اس پر مہر لگا دی چنانچہ اس کو کسی آنکھ نے دیکھا نہیں......۔ اس حدیث کو مسلم اور ترمذی نے روایت کیا ہے۔ (انتھی)
اور یہ بات مخفی نہ رہے کہ'' ما أخفي لهم '' میں ضمیر جمع کا مصداق ایک خاص قوم ہے۔ (اور اس آیت میں اسی خاص قوم کا ذکر ہے:) ﴿تَتَجَافٰى جُنُوْبُهُمْ عَنِ الْمَضَاجِعِ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ خَوْفًا وَّطَمَعًا وَّمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ﴾ [السجدة:١٦]
''ان کے پہلو خواب گاہوں سے علیحدہ ہوتے ہیں اس طور پر کہ وہ لوگ اپنے رب کو امید سے اور خوف سے پکارتے ہیں اور ہماری دی ہوئی چیزوں میں سے خرچ کرتے ہیں'' اس سے مراد تہجد گزار، اور اوّابین پڑھنے والے ہیں۔ اور چونکہ یہ لوگ اپنے اعمال لوگوں سے چھپا کر کرتے تھے، تو اللہ تعالیٰ نے انہیں انعام بھی ایسا ہی دیا کہ جس انعام کو اللہ تعالیٰ نے تمام مخلوقات سے چھپا کر رکھا ہے۔

۵۶۱۳ : وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَوْضِعُ سَوْطٍ فِي الْجَنَّةِ خَيْرٌ مِّنَ الدُّنْيَا وَمَا فِيْهَا۔ (متفق عليه)

اخرجه البخاري في صحيحه ١٥/٦ حديث رقم ٢٧٩٦ والترمذي في السنن ٢١٦/٥ حديث رقم ٣٠٦٣ وابن ماجه في السنن ١٤٤٨/٢ حديث رقم ٤٣٣٠ والدارمي ٤٢٨/٢ حديث رقم ٢٨٢٠ واحمد في المسند ٣١٥/٢۔

ترجمہ: ''حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: جنت کے اندر ایک کوڑے کے بقدر جگہ بھی دنیا اور جو کچھ دنیا میں ہے سب سے بہتر ہے''۔ (بخاری ومسلم)

تشریح: مطلب یہ ہے کہ اتنی تھوڑی سی جگہ یا کوڑا رکھنے کے برابر جگہ' دنیا وما فیہا سے' کمیت کے اعتبار سے بھی بہتر ہے اور کیفیت کے اعتبار سے بھی بہتر ہے۔
کیونکہ جنت اور جنت کی تمام نعمتیں سرمدی ہیں جب کہ دنیا اور دنیا کی تمام چیزیں فنا ہو جانے والی ہیں۔ ابن الملکؒ

فرماتے ہیں: سوائے کلام اللہ تعالیٰ، اس کی صفات اور تمام انبیاء کے۔ انتہی۔ لیکن اس استثناء کی غرابت مخفی نہیں۔

اور پھر فرمایا: جو چیز باقی رہنے والی ہے، اس کا مقابلہ وہ چیز نہیں کر سکتی جو معرض فنا میں ہے۔ میں کہتا ہوں لفظ "خیر" یہاں مجرد زیادت کیلئے ہے۔

تورپشتی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: حدیث میں کوڑے کا ذکر خاص طور پر کیا گیا، کیونکہ جب سوار کسی جگہ اترنا چاہتا ہے، تو اپنا کوڑا وہاں ڈال دیتا ہے، تا کہ دوسرا شخص وہاں نہ اترے، اور وہ جگہ اس کے ٹھہرنے کیلئے مخصوص ہو جائے۔

الجامع میں ہے: اس حدیث کو بخاری، ترمذی اور ابن ماجہ نے سہل بن سعدؓ سے، اور امام ترمذیؒ نے حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت کیا ہے۔ پس مؤلفؒ کا اس حدیث کو متفق علیہ کہنا دو اعتبار سے محل توقف ہے۔

عرض مرتب: اول: اس کو صرف بخاری نے روایت کیا ہے' امام مسلم نے روایت نہیں کیا' لہٰذا یہ حدیث متفق علیہ نہیں۔

ثانی: بخاری نے اس حدیث کو ابو ہریرہؓ سے نہیں بلکہ سہل بن سعدؓ سے روایت کیا ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

الجامع کی روایت میں یہ الفاظ وارد ہوئے ہیں:

لقيد سوط أحدكم من الجنة خير مما بين السماء والأرض.

تخریج: اس حدیث کو امام احمدؒ نے حضرت ابو ہریرہؓ سے نقل کیا ہے۔

۵۶۱۴ : وَعَنْ اَنَسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ غَدْوَةٌ فِي سَبِيْلِ اللّٰهِ اَوْ رَوْحَةٌ خَيْرٌ مِّنَ الدُّنْيَا وَمَا فِيْهَا وَلَوْاَنَّ امْرَاَةً مِّنَ النِّسَآءِ اَهْلِ الْجَنَّةِ اِطَّلَعَتْ اِلَى الْاَرْضِ لَاَضَاءَتْ مَا بَيْنَهُمَا وَلَمَلَاَتْ مَا بَيْنَهُمَا رِيْحًا وَلَنَصِيْفُهَا عَلٰى رَاْسِهَا خَيْرٌ مِّنَ الدُّنْيَا وَمَا فِيْهَا (رواه البخاري)

اخرجه البخاري في صحيحه ٤١٨/١١حديث رقم ٦٥٦٨ومسلم في صحيحه ١٤٩٩/٣حديث رقم (١١٢-١٨٨٠)والنسائي في السنن ١٥/٦حديث رقم ٣١١٨ والدارمي ٤٣٥/٢حديث رقم ٢٨٣٨، واحمد في المسند ٢٦٤/٣

ترجمہ: "حضرت انس رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: "ایک صبح کا وقت یا ایک شام کا وقت راہ خدا میں نکلنا دنیا سے اور دنیا کی تمام چیزوں سے بہترین ہے اور اگر اہل جنت کی عورتوں میں سے کسی کی عورت (یعنی کوئی حور) زمین کی طرف جھانک لے تو مشرق و مغرب کے درمیان (یعنی ہر جگہ) کو روشن و منور کر دے اور مشرق سے لے کر مغرب تک کی تمام فضا کو خوشبو سے معطر کر ڈالے' نیز اس کے سر کا ایک دوپٹہ اس دنیا اور دنیا کے اندر کی سو چیزوں سے بہتر ہے"۔ (بخاری)

تشریح: غدوۃ: دن کے ابتدائی حصہ میں ایک بار جانا۔

روحۃ: دن کے آخری حصہ میں، یا رات کے ابتدائی حصہ میں ایک بار جانا۔

"أو": برائے تنویع ہے، نہ کہ برائے شک۔ أي: **كل واحدة منهما في سبيل مرضاته.**

فی سبیل اللہ: خدا کی راہ سے مراد، جہاد، حج، ہجرت اور طلب علم وغیرہ کیلئے گھر سے نکلنا ہے۔

بہتر ہونے کا مطلب یہ ہے کہ جزاء وثواب، مآل ومآب کے اعتبار سے بہتر ہے۔

قوله: ولو ان امراۃ۔۔۔ما بینهما ریحا:

اطلعت: طاء کی تشدید کے ساتھ ہے۔

بینهما: (اس ضمیر کے مرجع میں تین احتمال ہیں:)

① ضمیر کا مرجع مشرق ومغرب ہیں۔

② یہ ضمیر آسمان وزمین کی طرف عائد ہے۔

③ جنت وزمین کی طرف لوٹ رہی ہے۔ زیادہ ظاہر یہ ہے کہ جنت اور زمین کی طرف راجع ہو، چونکہ عبارت میں بھی یہی دونوں صریحاً مذکور ہیں۔

"نصیف" بمعنی" خمار" ہے۔ (یعنی دوپٹا اور اوڑھنی)

قوله: ولنصیفها علی رأسها:

یہ جملہ مستانفہ ہے۔ اس کی قید سے یہ بتانا مقصود ہے، کہ اس کے جسم کے اس حصے کا یہ ادنی سا کپڑا اس قدر بہتر ہے، تو پورے جسم کا لباس کس قدر بہتر ہوگا۔ اور جب نور کی اوڑھنی کا عالم یہ ہے تو خود جنت اور جنت کی نعمتیں کیسی ہوں گی۔

تخریج: الجامع میں یہ حدیث ان الفاظ کے ساتھ ہے:

غدوة في سبيل الله أو روحة خير من الدنيا وما فيها.

اس روایت کو احمد، شیخین، اور ابن ماجہ نے حضرت انسؓ سے، بخاری، ترمذی اور نسائی نے سہل بن سعدؓ سے، مسلم اور ابن ماجہ نے حضرت ابوہریرہؓ سے، اور ترمذیؒ نے حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے روایت نقل کیا ہے۔

اور امام احمد، مسلم، اور نسائی نے حضرت ایوبؓ سے ان الفاظ کے ساتھ مرفوعاً نقل کیا ہے:

غدوة في سبيل الله اوروحة خير مما طلعت عليه الشمس وغربت. ایک صبح کا وقت یا ایک شام کا وقت راہ خدا میں نکلنا دینا اور دنیا کی تمام چیزوں سے بہتر ہے۔

طبرانی اور ضیاء نے سعید بن عامر سے ان الفاظ میں مرفوعاً روایت کیا ہے: **لو أن امرأة من نساء أهل الجنة أشرفت الى الأرض لملأت الأرض من ريح المسك ولاذهبت ضوء الشمس والقمر.** "اگر اہل جنت کی عورتوں میں سے کوئی ایک عورت اگر دنیا کی طرف جھانک لے تو زمین مشک کی خوشبو سے بھر جائے اور سورج اور چاند کی روشنی کو ختم کر دے۔"

احمد، شیخین، ترمذی، اور ابن ماجہ نے حضرت انسؓ سے ان لفظوں کے ساتھ روایت کی ہے:

لغدوة في سبيل الله أو روحة خير من الدنيا وما فيها' ولقاب قوس أحدكم أو موضع قده في الجنة خير من الدنيا وما فيها، ولو اطلعت امرأة من ناء أهل الجنة الى الأرض لملأت ما بينهما ريحا، ولأضاء ت ما بينهما، ولنصيفها على رأسها خير من الدنيا وما فيها.

القد: قاف کے کسرہ، اور دال کی تشدید کے ساتھ، قوس کے وتر کو کہتے ہیں، اور بعض کا کہنا ہے کہ کوڑے کو کہتے ہیں۔

۵۶۱۵ : وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ فِی الْجَنَّةِ شَجَرَةً یَسِیْرُ الرَّاکِبُ فِیْ ظِلِّهَا مِائَةَ عَامٍ لَا یَقْطَعُهَا وَلَقَابُ قَوْسِ اَحَدِکُمْ فِی الْجَنَّةِ خَیْرٌ مِّمَّا طَلَعَتْ عَلَیْهِ الشَّمْسُ اَوْتَغْرُبُ. (متفق علیه)

اخرجه البخاری فی صحیحه ٤١٥/١١حدیث رقم ٦٥٥٢ومسلم فی صحیحه ٢١٧٥/٤حدیث رقم (٦-٢٨٢٦) والترمذی فی السنن ٣٧٣/٥حدیث رقم ٣٢٩٢ والدارمی ٤٣٦/٢حدیث رقم ٢٨٣٩ واحمد فی المسند ٢٥٧/٢۔

ترجمہ: ''حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''جنت میں ایک ایسا پیڑ ہے (جیسے طوبیٰ کہتے ہیں) اگر کوئی سوار اس درخت کے سائے میں سو سال تک بھی چلتا رہے تب بھی وہ اس کی مسافت کو طے نہ کر سکے گا اور جنت میں تم میں سے کسی کی کمان کے بقدر جگہ ان تمام چیزوں سے بہتر و برتر ہے جن پر آفتاب طلوع یا غروب ہوتا ہے''۔ (بخاری ومسلم)

تشریح: **قوله: ان فی الجنة شجرة یسیر الراکب فی ظلها مائة عام لا یقطعها:**

ابن جوزیؒ فرماتے ہیں: کہا جاتا ہے کہ یہ درخت طوبیٰ ہے۔ عسقلانیؒ فرماتے ہیں: اس کا شاہد سند احمد، طبرانی اور ابن ماجہ میں ہے۔

''ظلها'': سے مراد ''ناحیتها'' (درخت کا کنارہ) ہے، وگرنہ تو اہل دنیا کے عرف میں سایہ اسے کہتے ہیں جو سورج کی تپش اور تکلیف سے بچائے۔ حالانکہ اللہ جل شانہ کا فرمان ہے: ﴿لا یرون فیها شمسا ولا زمهریرا﴾ [الانسان:١٣] ''نہ وہ تپش پائیں گے اور نہ جاڑ اور یہ حالت ہوگی کہ درختوں کے سائے ان پر جھکے ہوں گے''۔

اور یہ بھی کہا جاتا ہے، کہ ظل سے مراد یہاں وہ چیز ہے جو سورج کی شعاؤں کے مقابل ہے، اور اسی قبیل سے ظہور صبح سے طلوع شمس کا درمیانی وقفہ ہے۔ اس وجہ سے اللہ جل شانہ نے فرمایا: ﴿وظل ممدود﴾ [الواقعة: ٣٠] ''اور لمبا لمبا سایہ ہوگا'' اور ممکن ہے کہ درختوں کیلئے ''نور باہر'' ہو، جو اپنے ماتحت کیلئے بمنزلہ سحاب ساتر ہو۔

لا یقطعها: یعنی سوار، اس سائے کے مقام انتہاء تک نہیں پہنچ پائے گا۔

قوله: ولقاب قوس أحدکم ......:

فائق میں لکھتے ہیں: ''قاب'' اور ''قیب''، ''قاد'' اور ''قید'' کی طرح ہیں، بمعنیٰ ''القدر'' یہ اس علامت کو کہتے ہیں جس سے دو اشیا کی درمیانی مسافت معلوم کی جاتی ہے۔ عرب کے اس قول سے مشتق ہے: قوبوا فی هذه الأرض. یہ جملہ اس وقت بولتے ہیں، جب زمین کو اس انداز سے روندا جائے کہ نشانات ثبت ہو جائیں۔

امام تورپشتی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: سفر کے دوران سوار اترنے کی جگہ اپنا کوڑا ڈال دیا کرتا تھا، اور جو شخص پیدل ہوتا تھا، جس جگہ ٹھہرنا چاہتا وہاں اپنی کمان ڈال دیتا تھا، تاکہ وہ جگہ اس کے ٹھہرنے کیلئے مخصوص ہو جائے۔ (انتہیٰ)

اس حدیث کا زیادہ ظاہر معنی یہ ہے: أي لقدر موضع قوس أحدكم في الجنة أو لمقداره وقيمته، لو فرض أنه قوّم فيها. کہ تم میں سے کسی قوس کے رکھنے کی جگہ کی قدر یا اس کی مقدار اور اس کی قیمت اگر فرض کیا جائے کہ اس کی وہاں قیمت لگائی جائے۔

"الشمس": اس سے مراد دنیا کا سورج ہے۔

او تغرب: اور ایک نسخہ میں أو غربت ہے۔ "أو" برائے شک ہے، یا برائے تخییر ہے، یا بمعنی واؤ ہے، کیونکہ "ما طلعت عليه الشمس أو تغرب" سے مراد "ما بين الخافقين" ہے، جس کو "الدنيا وما فيها" سے تعبیر کیا گیا ہے۔

تخریج: الجامع کی روایت کے الفاظ یہ ہیں:

"جنت میں ایک درخت ہے کہ تیز ترین گھوڑ سوار اس کے سائے میں سو سال چلے تو اس کو قطع نہ کر پائے۔ان في الجنة لشجرة يسير الراكب الجواد المضمر السريع في ظلها مائة عام لا يقطعها۔

اس حدیث کو احمد، شیخین اور ترمذی نے ابو سعیدؓ سے اور شیخین، ترمذی اور ابن ماجہ نے ابو ہریرہؓ سے نقل کیا ہے۔

٥٦١٦ : وَعَنْ اَبِيْ مُوْسٰى قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ لِلْمُؤْمِنِ فِي الْجَنَّةِ لَخَيْمَةً مِّنْ لُؤْلُؤَةٍ وَّاحِدَةٍ مُجَوَّفَةٍ عَرْضُهَا وَفِيْ رِوَايَةٍ طُوْلُهَا سِتُّوْنَ مِيْلًا فِيْ كُلِّ زَاوِيَةٍ مِنْهَا اَهْلٌ مَّا يَرَوْنَ الْاٰخَرِيْنَ يَطُوْفُ عَلَيْهِمُ الْمُؤْمِنُ وَجَنَّتَانِ مِنْ فِضَّةٍ اٰنِيَتُهُمَا وَمَا فِيْهِمَا وَجَنَّتَانِ مِنْ ذَهَبٍ اٰنِيَتُهُمَا وَمَا فِيْهِمَا وَمَا بَيْنَ الْقَوْمِ وَبَيْنَ اَنْ يَّنْظُرُوْا اِلٰى رَبِّهِمْ اِلَّا رِدَاءُ الْكِبْرِيَاءِ عَلٰى وَجْهِهٖ فِيْ جَنَّةِ عَدْنٍ (متفق عليه)

اخرجه البخاري في صحيحه ٣١٨/٦ حديث رقم ٣٢٤٣، ومسلم في صحيحه ٢١٨٢/٤ حديث رقم (٢٣-٢٨٣٨) والترمذي في السنن ٥٨١/٤ حديث رقم ٢٥٢٨ والدارمي ٤٢٩/٢ حديث رقم ٢٨٢٢، واحمد في المسند ٤٠٠/٤۔

ترجمہ: "حضرت ابو موسیٰ رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: "صاحب ایمان کو جنت میں ایک ایسا خیمہ ملے گا جو پورا ایک خولدار تراشے ہوئے موتی کا ہوگا جس کی چوڑائی ایک اور روایت میں ہے کہ "جس کی لمبائی ساٹھ میل کی مسافت کے بقدر ہوگی' اس خیمہ کے ہر گوشہ میں اس (مؤمن) کے اہل خانہ ہوں گے اور ایک کونہ میں رہنے والے دوسری جانب والوں کو دیکھ نہ پائیں گے۔ ان سب اہل خانہ کے پاس مومن چکر لگاتا رہے گا۔ (مومن کے لئے) دو جنتیں چاندی کی ہوں گی کہ ان جنتیوں کے برتن' باسن (مکانات ومحلات اور خانہ داری کے دوسرے ضروری و آرائشی سامان تخت کرسی' میز پلنگ' جھاڑ' فانوس غرضیکہ سب اشیاء جنت) سب چاندی کے ہوں اور دو جنتیں سونے کی ہونگی کہ ان جنتوں کے برتن باسن اور ان میں ہر شئے سونے کی ہوگی اور جنت العدن میں جنتیوں اور ان کے رب تعالیٰ کی جانب انکے دیکھنے کے درمیان کوئی چیز رکاوٹ نہ ہوگی سوائے اللہ تعالیٰ کی ذات کی عظمت ورفعت کے پردہ کے"۔ (بخاری ومسلم)

تشریح: قوله: ان للمؤ من في الجنة...يطوف عليهم المؤمن: لخيمة: (تنوین برائے تعظیم ہے۔

)أی لخیمۃ عظمیۃ.

لؤلؤۃ: بمعنی الدر، اس کو تین طریقہ سے پڑھا جاتا ہے: ① ہمزتین کے ساتھ۔ ② ہمزتین کو واؤ سے بدلا جائے۔ ③ پہلے ہمزہ کو واؤ سے بدلا جائے، اور دوسرے کو اس کے حال پر چھوڑ دیا جائے۔

عرضھا: طول بطریق اولیٰ (ساٹھ ۶۰ گز) ہوگا۔

وفی روایۃ طولھا: اسی پر اس کے عرض کو قیاس کرلیا جائے۔ اور دونوں روایتوں سے پتہ چلتا ہے کہ اس کا طول وعرض ساٹھ (۶۰) میل ہوگا۔

فی کل زاویۃ: یعنی چاروں گوشوں میں سے ہر ہر گوشہ ایسا ہوگا۔

منھا: ضمیر ''خیمہ'' کی طرف عائد ہے۔

''أھل'': سے مراد بیویاں اور دوسرے افراد ہیں۔

ما یرون: کی ضمیر کا مصداق'' اھل'' ہیں۔ معنی کا لحاظ کرتے ہوئے جمع کی ضمیر لوٹائی۔

الآخرین: جنت کے دوسرے کونے میں موجود لوگ۔

المؤمنون: سید کے اصل نسخہ میں اور مشکوٰۃ کے بہت سے نسخوں میں جمع کا صیغہ ہے۔ اور مشکوٰۃ کے بعض نسخوں میں واحد کا صیغہ (مؤمن) ہے۔ امام طیبیؒ فرماتے ہیں: بخاری، شرح السنہ، اور مصابیح کے نسخوں میں مسلم، حمیدی اور جامع الاصول میں ''المؤمن'' ہے۔ جنس مراد ہونے کی وجہ سے جمع کا صیغہ (المؤمنون) ذکر کیا گیا ہے۔

بعض شارحین اور ان کی اتباع میں ابن الملکؒ کا کہنا ہے ''یطوف علیھم المؤمن'' کا مطلب ہے: یجامع المؤمن الأھل، (مؤمن اپنی بیویوں سے جماع کرے گا۔) اور ''طواف'' یہاں ''مجامعت'' سے کنایہ ہے۔

قولہ: وجنتان من فضۃ آینتھما وما فیھما:

جنتان: مبتدا ہے۔ اس کی خبر محذوف ہے: أی للمؤمن جنتان۔ بعض لوگوں کا کہنا کہ اس کا عطف'' الأھل'' پر ہے، یہ بہت ہی اچھنبے کی بات ہے۔ چونکہ مفہوم بعید از معنی ہے اگر چہ لفظی اعتبار سے قریب ہے۔ شارح مزید فرماتے ہیں، کہ'' جنتان'' (دو درجے) سے ''درجتان'' یا'' قصران'' (دو محل) مراد ہیں۔

یعنی ان جنتیوں کی ہر چیز مکانات ومحلات، ساز وسامان مثلاً چار پائیاں اور درختوں کی ٹہنیاں وغیرہ بھی۔

بعض کا کہنا ہے، کہ'' من فضۃ''، آنیتھا کی خبر ہے۔ اور یہ جملہ'' جنتان'' کی صفت ہے۔

یا'' من فضۃ'' صفت ہے ''جنتان'' کے لیے اور'' آنیتھما'' کی خبر محذوف ہے۔ أی: آنیتھما وما فیھما کذلک. یا ''آنیتھما''، فاعل ہے ظرف کا۔ أی تفضض آنیتھما، اگلا جملہ بھی اسی طرح ہے مبنی اور معنی کے اعتبار سے۔

قولہ: وجنتان من ذھب آنیتھما وما فیھما:

اس (حدیث) کے ظاہر سے پتہ چلتا ہے، کہ دونوں جنتیں صرف اور صرف چاندی کی ہوں گی، دو جنتیں صرف اور صرف خالص سونے کی ہوں گی۔ اور ایک روایت میں یوں ہے: لبنۃ من ذھب ولبنۃ من فضۃ. (اس کی ایک اینٹ سونے کی ہے

اور ایک اینٹ چاندی کی ہے۔)

پس ان دونوں روایتوں میں تطبیق ہوگی:

① پہلی روایت میں ان چیزوں کا ذکر ہے جو جنت کے اندر ہوں گی، جیسے برتن وغیرہ، اور دوسری روایت میں جنت کے درودیوار کی خوبی بیان کی گئی ہے۔

② اس سے مراد تبعیض ہے نہ کہ تلمیع۔

③ یہ کہ خالص سونے کی دو جنتیں کاملین خائفین کیلئے ہوں گی، کیونکہ خوف، کمال طاعت میں انتہائی مؤثر ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ولمن خاف مقام ربه جنتٰن﴾[الرحمن: ٣٦] ''اور خالص چاندی کی دو جنتیں ان ارباب کمال کیلئے ہوں گی، جن میں کمال کامل نہ تھا'' چنانچہ اس فرمان باری تعالیٰ میں اسی طرف اشارہ ہے:

﴿ومن دونهما جنتان﴾ [الرحمن: ٦٣] ''اور ان دونوں باغوں سے کم درجہ میں دو باغ اور ہیں''

حاصل یہ ہے کہ ''اُولین'' سے مراد ''سابقون'' ہیں، اور ''آخرین'' سے ''لاحقون'' مراد ہیں۔ اور ملمعہ جنت ''مخلوط'' لوگوں کیلئے ہوگی۔ واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم۔

امام بیہقی رحمہ اللہ نے فرمایا: قرآن وحدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ جنتیں چار ہیں: چنانچہ اللہ جل شانہ کا فرمان ہے:

﴿ولمن خاف مقام ربه جنتان﴾[الرحمن ٤٦] اور پھر ان دونوں بہشتوں کا نقشہ بیان فرمایا ہے، ہمیں ابو موسیٰ رضی اللہ عنہ سے یہ روایت پہنچی کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا:

جنتان آنيتهما وما فيهما من ذهب، وجنتان آنيتهما وما فيهما من فضة. دو جنتیں ہیں ان کے برتن اور جو کچھ ان میں موجود ہے وہ سونے کا ہے اور دو جنتیں ہیں ان کے برتن اور جو کچھ ان دو جنتوں میں ہے وہ چاندی کا ہے۔

میں کہتا ہوں: ہماری کہی ہوئی بات کی تائید اس حدیث سے ہوتی ہے: **جنتان من ذهب للسابقين، وجنتان من فضة لأصحاب اليمين.** ''سابقین کے لئے سونے کی دو جنتیں ہیں اور اصحاب یمین کے لئے چاندی کی دو جنتیں ہیں۔

اور کوئی بعید نہیں کہ جنت کی دو انواع مراد ہوں، جنت کی ایک نوع سونے کی ہے، اور دوسری نوع چاندی کی ہے۔ اور ہوسکتا ہے کہ ارباب کمال کیلئے بھی دو جنتیں سونے کی ہوں اور دو جنتیں چاندی کی ہوں گی، ان کے محلات کے دائیں اور بائیں تزئین کی خاطر۔ نہ یہ کہ سونے کا فقدان ہوگا، یا سونے کی قیمت زیادہ ہونے کی وجہ سے ایسا ہوگا۔ واضح رہے، کہ ''جنتان'' گو تثنیہ ہے مگر کبھی کبھی تثنیہ سے کثرت مراد ہوتی ہے۔ اس کی تائید اس سے ہوتی ہے کہ جنت کے دروازے اور طبقات آٹھ ہیں۔ چنانچہ ''منجاۃ'' میں فرماتے ہیں کہ جنتیں آٹھ ہیں:

① جنتِ عدن ② جنت الفردوس ③ جنت الخلد ④ جنت النعیم

⑤ جنت المأویٰ ⑥ دار السلام ⑦ دار القرار ⑧ دار المقامہ۔

قوله: وما بين القوم ......:

یعنی اہل جنت کیلئے کوئی مانع نہیں ہوگا۔

الکبریاء: سے مراد "صفت عظمت" ہے۔

علی وجهه: (جار مجرور "ثابتا" محذوف سے مل کر) "الرداء" سے حال ہے۔ (اور "وجہ" سے مراد "ذات" ہے۔) ای ثابتا علی ذاته

فی جنة عدن: ای کائن فی جنة اقامة وخلود،

"فی جنة عدن" بدل ہے "فی الجنة" سے۔ (کذا قیل) اس سے اختصاص کا وہم ہوتا ہے، حالانکہ وصف اقامت وخلود، جنس جنت کا وصف غیر منفك ہے لہٰذا مفہوم موہوم کا کوئی اعتبار نہیں۔

امام طیبیؒ فرماتے ہیں: "علی وجهه"، رداء الکبریاء سے حال ہے۔ اور اس میں عامل "لیس" کے معنی ہیں۔ "فی الجنة"، اس استقرار سے متعلق ہے جو ظرف میں ہے۔ اور مفہوم مخالف کے طور پر یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ جنت کے علاوہ میں یہ حصر منتفی ہے۔ میں کہتا ہوں، یہ بات تسلیم ہے لیکن حدیث میں "جنة عدن" کے الفاظ ہیں۔

امام تورپشتی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: یعنی جب اللہ تعالیٰ مؤمن کو جنت میں اس کا ٹھکانا عطا فرمائیں گے، تو کدورت جسمانیہ کے حجاب اٹھ جائیں گے۔ موانع حسیہ مضمحل ہو چکے ہوں گے، اور بندہ جب اپنے ربّ کی زیارت کی خاطر اپنے ربّ کی طرف نگاہ اٹھائے گا، تو درمیان میں اللہ جل شانہ کی ہیبت جلال اور سبحات جمال حائل ہوں گے۔ پھر اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر کرم وفضل کرتے ہوئے اپنی رحمت ورأفت کے ذریعہ ہی اس (ہیبت جلال اور سبحات جمال) کو مرتفع فرمائے گا۔ اسی معنی میں شاعر کے یہ اشعار ہیں:

اشتاقه فاذا بدا — أطرقت من اجلاله
لا خيفة بل هيبة — وصيانة لجماله
وأصدعنها تجلدا — وأروم طيف خياله۔

تخریج: الجامع کی روایت میں یہ الفاظ ہیں: ان للمؤمن فی الجنة لخیمة من لؤلوة واحدة مجوفة، طولها ستون میلا، للمؤمن فیها أهلون، یطوف علیهم المؤمن، فلا یری بعضهم بعضا. جنت میں مؤمن کو ایک ایسا خیمہ ملے گا جو پورا ایک خولدار تراشے ہوئے موتی کا ہوگا۔ اس کی لمبائی ساٹھ میل ہے اس میں مؤمن کے اہل خانہ ہوں گے' مؤمن ان کے پاس چکر لگائے گا چنانچہ ایک کونے میں رہنے والے جنتی' دوسرے کونے میں رہنے والے اہل جنت کو دیکھ نہیں پائیں گے۔

اس حدیث کو امام مسلمؒ نے ابو موسیٰؓ سے روایت کیا ہے۔

اور اس حدیث کو امام احمدؒ مسلم اور ترمذیؒ نے ابو موسیٰؓ سے یوں نقل کیا ہے: فی الجنة خیمة من لؤلؤة مجوفة عرضها ستون میلا، وفی کل زاویة منها أهل ما یرون الآخرین یطوف علیهم المؤمن. جنت میں مؤمن کو ایسا خیمہ ملے گا جو پورا ایک خولدار تراشے ہوئے موتی کا ہوگا۔ اس کی لمبائی ساٹھ میل کی مسافت کے بقدر ہوگی۔ اس خیمہ کے ہر گوشہ میں اس مؤمن کے اہل خانہ ہوں گے' جنت کے ایک کونے میں رہنے والے اہل جنت' جنت کے دوسرے کونے میں رہنے

والے اہل جنت کو دیکھ نہیں پائیں گے' ان سب اہل خانہ کے پاس مؤمن چکر لگا تا رہے گا۔

اس حدیث کو امام احمد اور طبرانی نے حضرت ابو موسیٰؓ سے مرفوعاً نقل کیا ہے:

جنان الفردوس أربع: جنتان من ذهب حليتهما وآنيتهما وما فيهما، وجنتان من فضة حليتهما وآنيتهما وما فيهما، وما بين القوم وبين أن ينظروا الى ربهم الا رداء الكبرياء على وجهه في جنة عدن، وهذه الأنهار تشخب من جنة عدن، ثم تصدر بعد ذلك أنهارا.

۵۶۱۷ : وَعَنْ عُبَادَةَ بْنِ الصَّامِتِ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِي الْجَنَّةِ مِائَةُ دَرَجَةٍ مَا بَيْنَ كُلِّ دَرَجَتَيْنِ كَمَا بَيْنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ وَالْفِرْدَوْسُ اَعْلَاهَا دَرَجَةً مِنْهَا تُفَجَّرُ اَنْهَارُ الْجَنَّةِ الْاَرْبَعَةِ وَمِنْ فَوْقِهَا يَكُوْنُ الْعَرْشُ فَاِذَا سَاَلْتُمُ اللّٰهَ فَاسْئَلُوْهُ الْفِرْدَوْسَ (رواه الترمذی ولم اجده فی صحیحین ولا فی الحمیدی)

اخرجه الترمذی فی السنن ۵۸۳/٤حدیث رقم ۲۵۳۱ وابن ماجه فی السنن ۱٤٤۸/۲حدیث رقم ٤۳۳۱ وللبخاری نحوه۱۱/۱٦حدیث رقم ۲۷۹۰۔

ترجمہ:"حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: "جنت میں سو درجے ہیں ان میں سے ہر دو درجوں کے درمیان اس قدر دوری ہے جس قدر آسمان و زمین کے مابین ہے اور فردوس (اپنی حقیقت اور صورت دونوں لحاظ سے) تمام جنتوں سے بلند درجہ جنت ہے اور جنت کی چاروں نہریں اسی فردوس سے نکلتی ہیں اور فردوس ہی کے اوپر عرشِ خداوندی ہے' پس جب تم خدا سے جنت طلب کرو تو جنت الفردوس کو طلب کیا کرو (جو سب سے اعلیٰ و برتر ہے)"۔ اس روایت کو ترمذی نے روایت کیا ہے اور مجھے یہ حدیث نہ تو صحیحین میں ملی ہے اور نہ کتاب حمیدی میں"۔

تشریح: **قوله: في الجنة مائة درجة ـ ـ ـ السماء والأرض:**

ممکن ہے کہ کثرت مراد ہو' اس کی تائید اس حدیث سے ہوتی ہے جو امام بیہقیؒ حضرت عائشہ صدیقہؓ سے مرفوعاً نقل کرتے ہیں: **عدد درج الجنة عدد آي القرآن، فمن دخل الجنة من أهل القرآن فليس فوقه درجة.**

"جنت کے درجوں کی تعداد قرآن کی آیات کی تعداد کے برابر ہے۔ پس اہل قرآن میں سے جو شخص جنت میں داخل ہو گا اس سے اوپر کوئی درجہ نہ ہوگا۔"

اور یہ بھی ممکن ہے، کہ جنت میں سو درجے ہوں۔ ہر اہل جنت کیلئے اصناف نعمت وغیرہ کے اعتبار سے یہ اقل سے اقل درجہ کا بیان ہو۔

اور یہ بھی ممکن ہے کہ سو (۱۰۰) سے یہ خاص عدد ہی مراد ہو، اور اس کے ذریعے جنت کے کثیر درجات میں سے صرف ان سو درجوں کو بیان کرنا مقصود ہو، جن میں سے ہر دو درجوں کا درمیانی فاصلہ مذکورہ فاصلہ سے کم ہوگا، یا زیادہ ہوگا۔

دیلمیؒ نے مسند فردوس میں حضرت ابو ہریرہؓ سے یہ روایت مرفوعاً نقل کی ہے:

ان فی الجنة درجاً لا ینالها الا أصحاب الهموم.

''جنت میں کچھ ایسے درجات ہیں جن تک اصحاب ہموم کے علاوہ اور کوئی نہیں پہنچے گا''۔

قوله: والفردوس أعلاه درجة۔۔۔انهار الجنة الاربعه:

فردوس جنت کا نام ہے۔ یہ نام قرآن کریم کی اس آیت میں مذکور ہے:﴿قد افلح المؤمنون أولئك هم الوارثون الذین یرثون الفردوس﴾ [المؤمنون۔۱۰۔۱۱]

اعلاها: ضمیر'' جنان '' کی طرف عائد ہے۔

یعنی تمام جنتوں سے یا ہر فرد کے اعتبار سے یا مجموع کے اعتبار سے بلند درجہ جنت ہے۔

النہایہ میں ہے کہ ''فردوس'' لغت میں اس باغ کو کہتے ہیں جس میں انگور کی بیلیں اور درخت ہوں۔ اسی سے جنت الفردوس ہے۔ میں کہتا ہوں کہ کسی وصف زائد کا اضافہ ضرور ہونا چاہئے تا کہ غیر سے ممتاز ہو جائے۔ جیسا کہ اگلے کلام میں اسی طرف اشارہ ہے۔

''منها'': الجامع کی روایت میں'' ومنها'' ہے۔ جس میں ہاضمیر ''جنة الفردوس'' کی طرف راجع ہے۔

تفجر: صیغہ مجہول کے ساتھ، بمعنی تشقق وتجری۔

الأربعة: مرفوع ہے'' أنهار '' کی صفت ہے۔ چار نہروں سے مراد پانی، دودھ، شہد اور شراب کی وہ نہریں ہیں جن کا ذکر قرآن کریم کی ان آیات میں ہے:﴿فِيهَآ أَنْهَٰرٌ مِّن مَّآءٍ غَيْرِ ءَاسِنٍ وَأَنْهَٰرٌ مِّن لَّبَنٍ لَّمْ يَتَغَيَّرْ طَعْمُهُۥ وَأَنْهَٰرٌ مِّنْ خَمْرٍ لَّذَّةٍ لِّلشَّٰرِبِينَ وَأَنْهَٰرٌ مِّنْ عَسَلٍ مُّصَفًّى﴾ [محمد:۱۵]

قوله: ومن فوقها یکون عرش الرحمن:

اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ فردوس سب جنتوں سے افضل اور سب سے اوپر ہے۔ اسی وجہ سے آنحضرت ﷺ نے امت تعلیم اور علو ہمت کیلئے فرمایا: فاذا سألتم الله فاسألوه الفردوس

چونکہ یہ جنت ''سر الجنه'' (جنت کا راز) ہے۔ جیسا کہ طبرانی نے حضرت عرباض۔ عین کے ضمہ اور راء کی تشدید کے ساتھ۔ سے روایت کیا ہے۔ یعنی وسطها وخیرها.

طبرانی نے حضرت سمرہؓ سے مرفوعاً نقل کیا ہے:

الفردوس ربوة الجنة وأعلاها وأوسطها ومنها تفجر الانهار الاربعة.

ابن مردویہ ابوأمامہؓ سے مرفوعاً نقل کرتے ہیں:

ان أهل الفردوس یسمعون اطیط العرش. ''بے شک اہل جنت عرش کے چرچرانیکی آواز سنیں گے''۔

الجامع میں (حدیث باب سے متعلق) فرماتے ہیں: اس حدیث کو ابن ابی شیبہ، احمد، ترمذی اور امام حاکم نے اپنی مستدرک میں روایت کیا ہے۔

قوله: ولم اجده فی الصحیحین ولا فی کتاب الحمیدی:۔

مؤلفؒ نے جامع الاصول کے بارے میں خاموشی اختیار کی ہے، شاید اس وجہ سے کہ کسی مانع کی وجہ سے اس کا تتبع نہیں کر پائے۔

اس کلام کا حاصل یہ ہے کہ مؤلفؒ نے صاحب مصابیح پر اعتراض کیا ہے، کہ اس حدیث کو ''صحاح'' میں ذکر کیا ہے۔ حالانکہ یہ حدیث ''حسان'' کے علاوہ میں نہیں پائی جاتی۔ امام میرکؒ نے فرمایا: مصنف نے اسی طرح لکھا ہے اور شیخ جزریؒ نے تصحیح المصابیح میں اس کی موافقت کی ہے۔

میں کہتا ہوں: اس حدیث کو امام بخاریؒ نے کتاب الجہاد میں حضرت ابو ہریرہؓ سے نقل کیا ہے۔ اور ان دونوں یعنی حضرت ابو ہریرہؓ اور حضرت عبادہ بن صامتؓ کی روایتوں میں معمولی تفاوت ہے۔ صاحب مشکوٰۃ اور شیخ کو یوں کہنا چاہئے تھا: **ورواه البخاري من حديث أبي هريرة، مع تفاوت يسير.**

حافظ ابن حجرؒ، احادیث مشکاۃ کی تخریج میں فرماتے ہیں: **وعجيب من ادخال البغوي له في أحاديث الصحيحين** (تم كلامه).

بعض کا کہنا ہے، کہ صاحب المشارق نے بھی اس حدیث کو بخاری کی طرف منسوب کیا ہے۔ اور بعض کا کہنا ہے کہ یہ حدیث صحیح بخاری میں دو جگہ موجود ہے۔ ''کتاب **الجهاد**'' میں ہے اور ''باب **و كان عرشه على الماء**'' میں ہے۔ صحیح مسلم میں بھی **باب فضل الجهاد في سبيل الله**'' میں موجود ہے۔ پس ''حافظ'' کو غیر ''حافظ'' پر ترجیح حاصل ہے۔

۵۶۱۸ : وَعَنْ اَنَسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ فِي الْجَنَّةِ لَسُوْقًا يَاْتُوْنَهَا كُلَّ جُمُعَةٍ فَتَهُبُّ رِيْحُ الشِّمَالِ فَتَحْثُوا فِيْ وُجُوْهِهِمْ وَثِيَابِهِمْ فَيَزْدَادُوْنَ حُسْنًا وَجَمَالًا فَيَرْجِعُوْنَ اِلٰى اَهْلِيْهِمْ وَقَدِ ازْدَادُوْا حُسْنًا وَّجَمَالًا فَيَقُوْلُ لَهُمْ اَهْلُوْهُمْ وَاللّٰهِ لَقَدِ ازْدَدْتُّمْ بَعْدَنَا حُسْنًا وَجَمَالًا فَيَقُوْلُوْنَ وَاَنْتُمْ وَاللّٰهِ لَقَدِ ازْدَدْتُّمْ بَعْدَنَا حُسْنًا وَجَمَالًا۔ (رواه مسلم)

اخرجه مسلم في صحيحه ٢١٧٨/٤ حديث رقم (١٣-٢٨٣٣) احمد في المسند ٢٨٤/٣۔

ترجمہ: ''حضرت انس رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: جنت میں ایک بازار ہے جس میں ہر جمعہ کو اہل جنت آیا کریں گے اور وہاں شمالی ہوا چلے گی جو اہل جنت کے چہروں اور ان کے ملبوسات پر (خوشبو اور مہک) چھڑک دے گی جس سے وہاں موجود اہل جنت پہلے سے بھی زیادہ حسین و جمیل ہو جائیں گے اور پھر جب وہ لوگ بہت زیادہ حسین و جمیل بن کر (اس بازار سے) اپنے اپنے اہل خانہ کے پاس لوٹیں گے تو وہ گھر والے ان سے کہیں گے کہ ہم سے الگ ہو کر تمہارا حسن و جمال اتنا بڑھ گیا ہے اسکے جواب میں وہ کہیں گے کہ اور خدا کی قسم! ہمارے جانے کے بعد تمہارے حسن و جمال میں بھی اضافہ ہو گیا ہے''۔ (مسلم)

تشریح: قوله: ان في الجنة لسوقا يأتونها كل جمعة:

یعنی ایک اجتماع گاہ ہو گی جہاں پسندیدہ صورتیں ہوں گی۔

جمعة: جیم اور میم دونوں کے ضمہ کے ساتھ، نیز جیم کے ضمہ اور میم کے سکون کے ساتھ۔

امام نوویؒ فرماتے ہیں: بازار سے مراد اہل جنت کی اجتماع گاہ ہے، جہاں ہفتہ میں ایک دن وہاں لوگ جمع ہوا کریں گے۔ اور ہفتہ سے بھی حقیقی ہفتہ مراد نہیں، کیونکہ جنت میں نہ سورج ہوگا۔ اور نہ دن رات کی گردش، بلکہ وہاں ہمیشہ یکساں وقت رہے گا۔ لہٰذا ہفتہ سے ایک ہفتہ کے بقدر وقت کا عرصہ مراد ہے۔

میں کہتا ہوں کہ جنت میں دن رات کے وقت کی پہچان ہوگی، بایں طور کہ نور کے پردے اٹھائے اور گرائے جایا کریں گے، جیسا کہ بعض روایات میں آتا ہے۔ اسی کے ذریعے جمعہ اور عید اور ان سے متعلقہ امور مثلاً زیارت اور رؤیت وغیرہ کا پتہ چلا کرے گا۔

چنانچہ الجامع کی ایک روایت میں ہے:

ان اهل الجنة ليحتاجون الى العلماء في الجنة، وذلك أنهم يزورون الله تعالىٰ في كل جمعة فيقول لهم: تمنوا على ما شئتم، فيلتفتون الى العلماء فيقولون: ماذا نتمنى؟ فيقولون: تمنوا عليه كذا وكذا. فهم يحتاجون اليهم في الجنة، كما يحتاجون اليهم في الدنيا."بے شک اہل جنت بھی علماء کے محتاج ہوں گے اور یہ اس طرح کہ وہ ہر جمعہ کو اللہ تعالیٰ کی زیارت کیا کریں گے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ اہل جنت سے فرمائے گا تم لوگ جو چاہے مجھ سے تمنا کرو۔ پس وہ علماء کے پاس آئیں گے اور کہیں گے کہ ہم کیا تمنا کریں؟ تو علماء ان سے کہیں گے کہ اللہ تعالیٰ سے یہ تمنا کرو فلاں تمنا کرو چنانچہ وہ جنت میں بھی علماء کے محتاج ہوں گے جس طرح کے وہ دنیا میں علماء کے محتاج ہوتے ہیں۔"

اس کو ابن عساکرؒ نے حضرت جابرؓ سے نقل کیا ہے۔

جنت میں جمعہ کے دن کو "یوم المزید" کہنا اس دن کو دوسرے تمام ایام سے امتیاز بخشتا ہے۔ واللّٰہ تعالی اعلم بالمرام۔

قوله: فتهب ريح الشما ......: تهب: ہاء کے ضمہ، اور بائے موحدہ کی تشدید کے ساتھ۔

الشمال: شین کے فتحہ کے ساتھ بغیر ہمزہ کے۔

"ريح الشمال" کا ذکر خاص طور پر اس وجہ سے فرمایا کہ عرب میں اس کو "ريح المطر" کہا جاتا ہے۔

تحثوا: بمعنی" تنثر" اور ضمیر غائب الريح کی طرف لوٹ رہی ہے۔ اور مفعول محذوف ہے۔ أی **تنثر تلك الريح المسك وأنواع الطيب.**

في وجوههم: "وجوه" سے مراد "ابدان" ہیں۔ اور چہرے کا ذکر اس وجہ سے کیا گیا کہ یہ "اشرف الاعضاء" ہے۔ یا اس سے مراد ذوات ہیں۔ أی ذواتها.

فيزدادون: حسنا وجمالا: ان دونوں صفات کا جمع کرنا برائے تاکید ہے۔ یا ایک سے مراد زینت ہے اور دوسرے سے حسن صورت مراد ہے۔

حسنا وجمالا: بعض کا کہنا ہے کہ ان کا حسن ان کی حسنات کے بقدر بڑھے گا۔

ازددتم: (جمع مذکر کا صیغہ ہونے میں تین احتمال ہیں): ① اس میں تغلیب ہے، چونکہ لفظ "اہل" عام ہے۔ جو عورتوں اور

بچوں کو بھی شامل ہے۔ ② جمع مذکر کا صیغہ برائے تعظیم وتکریم ہے۔ ③ جمع مذکر کا صیغہ مشاکلت ومقابلہ کے طور پر ذکر فرمایا ہے۔

(خوبصورتی کے اضافہ کا نسب کیا ہوگا؟ اس میں تین احتمال ہیں):

① خوبصورتی میں اضافہ کا سبب وہ شمالی ہوا ہوگی۔ ② ان کے حسن وجمال کا عکس ان کے گھر والوں پر پڑے گا، جس سے وہ سب بھی پہلے کی نسبت کہیں زیادہ حسین وجمیل نظر آئیں گے۔ ③ تأثیر حال اور ترقی مآل کے سبب سے ان کے حسن وجمال میں اضافہ ہوگا۔

۵۶۱۹ : وَعَنْ اَبِی هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَوَّلَ زُمْرَةٍ يَّدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ عَلٰى صُوْرَةِ الْقَمَرِ لَيْلَةَ الْبَدْرِ ثُمَّ الَّذِيْنَ يَلُوْنَهُمْ كَاَشَدِّ كَوْكَبٍ دُرِّيٍّ فِي السَّمَآءِ اِضَآءَةً قُلُوْبُهُمْ عَلٰى قَلْبِ رَجُلٍ وَّاحِدٍ لَا اخْتِلَافَ بَيْنَهُمْ وَلَا تَبَاغُضَ لِكُلِّ امْرِءٍ مِّنْهُمْ زَوْجَتَانِ مِنَ الْحُوْرِ الْعِيْنِ يُرٰى مُخُّ سُوْقِهِنَّ مِنْ وَّرَآءِ الْعَظْمِ وَاللَّحْمِ مِنَ الْحُسْنِ يُسَبِّحُوْنَ اللّٰهَ بُكْرَةً وَّعَشِيًّا لَا يَسْقُمُوْنَ وَلَا يَبُوْلُوْنَ وَلَا يَتَغَوَّطُوْنَ وَلَا يَتْفُلُوْنَ وَلَا يَمْتَخِطُوْنَ اٰنِيَتُهُمُ الذَّهَبُ وَالْفِضَّةُ وَاَمْشَاطُهُمُ الذَّهَبُ وَوَقُوْدُ مَجَامِرِهِمُ الْاَلُوَّةُ رَشْحُهُمُ الْمِسْكُ عَلٰى خَلْقِ رَجُلٍ وَّاحِدٍ عَلٰى صُوْرَةِ اَبِيْهِمْ اٰدَمَ سِتُّوْنَ ذِرَاعًا فِي السَّمَآءِ. (متفق علیه)

اخرجه البخاری فی صحیحه ۳۱۸/٦حدیث رقم ۳۲٤٥،ومسلم فی صحیحه ۲۱۷۹/٤حدیث رقم (۱۵-۲۸۳٤) والترمذی فی السنن ٥۷۸/٤حدیث رقم ۲۵۲۲، والدارمی فی السنن ٤۳۰/۲حدیث رقم ۲۸۲۳، واحمد فی المسند ۱٦/۳۔

ترجمہ: ''حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: سب سے پہلی وہ جماعت جو جنت میں داخل ہوگی (یعنی انبیاء ورسل علیہم السلام) وہ چودھویں رات کے چاند کی طرح روشن ومنور ہوں گے اور ان کے بعد جو لوگ داخل ہوں گے (یعنی علماء، اولیاء، شہداء اور صلحاء) وہ آسمان کے سب سے زیادہ چکمدار ستارے کی طرح تابندہ ہوں گے تمام اہل جنت کے دل ایک انسان کے دل کی طرح ہوں گے (یعنی ان کے درمیان اس طرح باہمی محبت والفت ہوگی کہ وہ سب ایک دل اور یک جان معلوم ہوں گے)۔ اور ان کے درمیان نہ تو کوئی اختلاف ہوگا اور نہ ہی کینہ وبغض پنہاں ہوگا ان میں سے ہر ایک جنتی کے لئے حورعین میں سے دو دو بیویاں ہوں گی ان کے حسن وجمال کی وجہ سے ان کی پنڈلیوں کی ہڈی کا گودا ہڈی اور گوشت سے باہر نظر آئے گا۔ تمام جنتی صبح وشام (یعنی ہر وقت) اللہ تعالیٰ کی تسبیح کرتے رہیں گے وہ نہ تو بیمار ہوں گے' نہ پیشاب کریں گے' نہ پاخانہ کریں گے' نہ تھوکیں گے اور رینٹھ نکیں گے' ان کے برتن سونے چاندی کے ہوں گے' ان کی کنگھیاں سونے کی ہوں گی' ان کی انگیٹھیوں کا ایندھن ''خوشبودار عود'' ہوگا۔ ان کا پسینہ کستوری کی مانند اور تمام اہل جنت ایک آدمی کی سی عادت وسیرت کے ہوں گے (یعنی سب کے سب یکساں طور پر خوش خلق وملنسار اور ایک دوسرے سے گہری الفت ومحبت رکھنے والے ہوں گے) نیز وہ سب شکل وصورت میں باپ آدم کی طرح ہوں گے

اور ساٹھ گز اونچا قد رکھتے ہوں گے"۔ (بخاری ومسلم)

تشریح: قولہ:ان اول زمرۃ۔۔۔ لیلۃ البدر:

زمرۃ: زاء کے ضمہ کے ساتھ، بمعنی جماعت۔ جنت میں سب سے پہلے انبیاء واولیاء داخل ہوں گے۔ (کذا قالہ شارح) اور بظاہر یہ اعزاز صرف اور صرف انبیاء کرام علیہم الصلوات والتسلیمات کے ساتھ خاص ہے۔ اور سورج کی طرح چمکتے دمکتے چہرے کے ساتھ جنت میں داخل ہونا ہمارے نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام کیلئے مخصوص ہوگا۔

قولہ:ثم الذین یلونھم۔۔۔۔فی السماء اضاءۃ:

یعنی یہ دوسری جماعت کے لوگ قرب ومرتبہ میں ان کے قریب ترین ہوں گے، یعنی علماء، اولیاء، شہداء اور صلحاء۔

کاشد: یہ صفت اس جماعت کے ہر ہر فرد میں ہوگی۔

دری: دال کے ضمہ، راء اور یاء دونوں کی تشدید کے ساتھ، بہت ہی تابندہ روشن اور چمکدار۔

"دریّ": یہ (اسم منسوب ہے) "در" کی طرف منسوب ہے۔ اس لفظ کی لغوی اور معنوی تمام تر تحقیقات ماقبل میں گزر چکی ہیں۔

اضائۃ: تمیز ہے۔ یہ وجہ شبہ کا بیان ہے۔ امام طیبیؒ نے فرمایا: مضاف الیہ کو مفرد ذکر کیا، تاکہ نوع کوکب میں مفید استغراق ہو۔ یعنی اذا تفصیت کوکبا کوکبا رأیتھم کاشد اضاءۃ.

قولہ:قلوبھم علی قلب۔۔۔۔ ولا تباغض:

قلوبھم: ضمیر "اہل جنت" کی طرف عائد ہے۔ یا "الزمرۃ الا خیرۃ" کی طرف لوٹ رہی ہے۔ پہلا احتمال اولیٰ ہے۔

یعنی ان کے درمیان باہمی ربط واتفاق اس قدر ہوگا، کہ وہ سب ایک دل اور ایک جان معلوم ہوں گے۔

لا اختلاف بینھم ولا تباغض: یہ جملہ "قلوبھم علی رجل واحد" کی تفسیر ہے۔ یہ معنی درحقیقت اللہ جل شانہ کے اس قول سے مقتبس ہے: ﴿ونزعنا ما فی صدورھم من غل اخوانا علی سرر متقابلین﴾ [الحجر:۴۷] "اور ان کے دلوں میں جو کینہ تھا ہم وہ سب دور کردیں گے کہ سب بھائی بھائی کی طرح (الفت ومحبت) رہیں گے تختوں پر آمنے سامنے بیٹھا کریں گے"۔

قولہ:لکل امریء منھم زوجتان۔۔۔من الحسن:

الحور: حاء کے ضمہ کے ساتھ، گورے گورے بدن والی عورت۔ حور سے مشتق ہے۔ حور کہتے ہیں، خالص سپیدی کو، اسی سے لفظ "حواری" اور "حواریون" بنا ہے۔

العین: عین کے کسرہ کے ساتھ ہے۔

یری: صیغہ مجہول کے ساتھ ہے۔

سوقھن: سوق جمع ہے، "ساق" کی۔ (یہاں مضاف محذوف ہے۔) أی مخ عظام سوقھن.

من وراء العظم واللحم: واؤ مطلق جمع کیلئے ہے۔ یا ''ترتیب ترقی'' کیلئے ہے۔

من الحسن: ''من'' تعلیلیہ ہے۔ اور مطلب یہ ہے کہ ان کی لطافت خلقت کی وجہ سے ان کی پنڈلیوں کی ہڈیوں کا گودا باہر سے نظر آئے گا۔

امام طیبیؒ فرماتے ہیں: یہ کلام تتمیم کے لئے ہے۔ اس رؤیت سے ذہن میں کسی درجہ میں نفر پیدا ہوسکتا تھا۔ چنانچہ اس تصور سے دل ودماغ کو بچانے کے لئے من الحسن کے الفاظ ارشاد فرمائیے۔

بظاہر جن صفات سے متصف دو حوروں کا تذکرہ ابھی گزرا ہے، یہ ہر اہل جنت کو ملیں گی۔ البتہ خواص کو ان کے مقامات کے موافق مزید ملیں گی۔

امام طیبیؒ نے فرمایا: بظاہر یہ تثنیہ برائے تکریر ہے نا کہ برائے تحدید، جیسا کہ اللہ جل شانہ کے اس قول میں ہے: ﴿فارجع البصر کرتین﴾ [الملك:٤] ''بار بار نگاہ ڈال کر دیکھ'' چونکہ روایات میں آتا ہے، کہ ایک ایک جنتی کو کئی کئی حوریں عطاء ہونگی۔

قوله: یسبحون الله بکرۃً وعشیاً:

اللہ کی تسبیح بیان کریں گے یعنی اللہ جل شانہ کو صفات نقصان سے منزہ قرار دیں گے اور صفات کمال کو اس کے لئے ثابت کریں گے چونکہ نفی واثبات متلازم ہیں، جیسا کہ کلمہ توحید کے بارے میں تحقیق یہی ہے، کہ ان دونوں کو جمع کرنا تاکید کیلئے ہے، اور اس آیت میں بھی اسی طرف اشارہ ہے: عواهم فیها سبحانك اللّٰهم [یونس:١٠] ''ان کے منہ سے یہ بات نکلے گی کہ سبحان اللہ''۔

مطلب یہ ہے کہ وہ ہر وقت اللہ کو یاد کریں گے۔ ''بکرۃً وعشیاً''، سے مراد لیل ونہار ہیں۔ جزء بول کر کُل مراد لیا گیا ہے مجازاً۔ امام طیبیؒ فرماتے ہیں: اس سے ہیشگی مراد ہے۔ جیسا کہ عرب کہتے ہیں: أنا عند فلان صباحاً ومساءً. اس سے یہ دو اوقات مراد نہیں ہوتے بلکہ ہمیشہ مراد ہوتا ہے۔

قوله: لایسقمون۔۔۔ ولا یمتخلون:

لا یسقمون: قاف کے فتح اور ضمہ کے ساتھ، صاحب قاموس فرماتے ہیں: السقم، باب سمع اور کرم دونوں سے استعمال ہوتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ نہ بیمار ہوں گے، نہ انہیں ضعف لاحق ہوگا، اور نہ بڑھاپا آئے گا۔

ولا یتفلون: فاء کے ضمہ اور کسرہ کے ساتھ ہے۔

ولا یمتخطون: یعنی ان کے مونہوں اور ناک میں فاضل رطوبتیں پیدا ہی نہ ہونگی چہ جائیکہ ان رطوبتوں کے اخراج کی ضرورت پیش آئے۔ چونکہ جنت تو پاکیزہ کے لئے پاکیزہ مسکن ہے' آلائشوں اور آلودگیوں کا یہاں کیا کام؟۔

قوله: آنیتهم الذهب والفضة۔۔۔ رشحهم المسك:

آنیتهم: اناء کی جمع ہے۔ بمعنی ظروف.

یعنی زیب وزینت کی خاطر برتنوں کو ملمع کیا گیا ہوگا۔ یا یہ کہ بعض برتن سونے کے ہوں گے۔ چنانچہ اس تقدیر پر واؤ بمعنی ''أوْ'' برائے تنویع ہے۔

أمشاطهم: "مشط" کی جمع ہے۔

وقود: واؤ کے فتحہ کے ساتھ ہے۔ بمعنی ایندھن۔ مجامر: مباخر. (انگیٹھیاں)

الألوة: ہمزہ کے فتحہ اور ضمہ، لام کے ضمہ اور واؤ کی تشدید کے ساتھ۔ امام نوویؒ فرماتے ہیں: اس سے مراد "عود ہندی" ہے۔ اور ایک شارح فرماتے ہیں: المجمر: میم کے فتحہ کے ساتھ ما یوضع فیه الجمر ویحترق فیه العود. (جس میں انگارے رکھے جاتے ہیں اور اس میں عود جلائی جاتی ہے) اور "المجمر" میم کے کسرہ کے ساتھ یہ آلہ کا صیغہ ہوگا۔

اگر یہ اشکال ہو کہ جنت میں آگ تو ہوگی نہیں؟

اس کا جواب یہ ہے کہ یہ انگیٹھیاں بغیر آگ کے ہی مہک اٹھیں گے۔ میں کہتا ہوں کہ نور سے مہکیں گی، یہ غایت سرور ہے۔ صاحب النہایہ لکھتے ہیں: " المجامر" یہ المجمر کی جمع ہے "الجمر" میم کے کسرہ کے ساتھ ہے، **وهي التي توضع فيه النار للبخور، وبالضم هو الذي يتبخر به وأعد له الجمر.**

امام طیبیؒ فرماتے ہیں: " المجامر" سے مراد یہاں اس حدیث میں پہلے معنی مراد ہیں۔ اور اضافت کا فائدہ یہ ہے کہ " الوة" ہی نفس وقود ہے، بخلاف متعارف کے، کیونکہ ان کا ایندھن " ألوة" کے علاوہ دیگر چیزیں ہوتی ہیں۔ (انتہی)

یہ ساری چیزیں لذت وشہوت کے طور پر ہونگیں، وگرنہ تو نہ ان کے بال ملتبد ہوں گے، نہ میلے ہوں گے، نہ ان کے جسموں سے بدبو آئے گی، اور نہ کپڑوں سے بلکہ مشک سے زیادہ خوشبودار ہونگے، چنانچہ ان کو ان چیزوں کی ضرورت بوجہ احتیاج نہ ہوگی، بلکہ زیادتِ نعمت اور تلذّذ کے طور پر استعمال کریں گے۔

ورشحهم المسك: یعنی ان کا پسینہ بھی خوشبودار ہوگا۔ ان کے پسینہ کی خوشبو مشک کی خوشبو کی طرح ہوگی، یہ تشبیہ بلیغ ہے۔

قوله: على خلق رجل واحد:

خلق: خاء اور لام دونوں کے ضمہ کے ساتھ، لام کو ساکن پڑھنا بھی درست ہے،

اس جملہ کا مطلب ماقبل میں گزر چکا ہے۔ اور مطلب یہ ہے کہ سب ایک عمر کے دکھائی دیں گے یعنی تیس (۳۰) سال یا تیں (۳۳) سال کے ہوں گے۔ جیسا کہ عنقریب آگے حدیث میں آ رہا ہے۔ اور یہی معنی مراد لینا اگلے جملے کے زیادہ مناسب ہیں:

على صورة ابيهم آدم: یعنی ان کا قد حضرت آدم علیہ السلام کی طرح ہوگا۔

ستون ذرا عافي السماء: طول سے کنایہ ہے۔ (قالہ الطیبیؒ)

اور بعض کا کہنا ہے، کہ عرض سات (گز) ہوگا۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

امام نوویؒ فرماتے ہیں: " خلق": خاء اور لام کے ضمہ کے ساتھ، اور خاء کے فتحہ اور لام کے سکون کے ساتھ، یہ دونوں طرح صحیح ہے۔ اور "لا اختلاف بينهم، ولا تباغض' قلوبهم، على قلب واحد": کے الفاظ سے " خلق"، بضم اللام کے معنی کو ترجیح حاصل ہوتی ہے۔ اور " لا يمتخطون ولا يتفلون" کے الفاظ سے فتحہ کو ترجیح حاصل ہوتی ہے۔

امام طیبیؒ فرماتے ہیں: اس کی بنیاد پر،'' علی صورۃ أبیھم آدم'' کو'' علی خلق رجل واحد'' سے بدل قرار دینا درست نہیں۔ بلکہ مبتدا محذوف کی خبر ہے۔ آگے لکھتے ہیں: فاذا قیل: الموصوفون بالصفات المذکورۃ کلھا علی خلق رجل واحد حسن الا بدال انتھی.

اس بات میں یہ اختلاف ہے کہ حدیث میں موجود الفاظ کی مراد کیا ہے۔ البتہ اس بات میں کوئی اختلاف نہیں کہ سارے کے سارے اہل جنت خلقت اور اخلاق دونوں اعتبار سے کامل ہوں گے۔ اگر چہ لائق اعتبار چیز اخلاق ہیں۔ کہ اچھے اخلاق موجب خلق ہوتے ہیں۔ اسی وجہ سے کہا گیا ہے کہ '' ظاہر باطن کا عنوان ہے''۔ چنانچہ مروی ہے کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے جس نبی کو بھی پیدا کیا اسے حسن صورت اور حسن صوت کے ساتھ نوزا لیکن یہ ارشاد باری تعالیٰ: ﴿وانك لعلى خلق عظيم﴾ بانگ دہل یہ اعلان کر رہا ہے کہ آنحضرت ﷺ کو اخلاقیات میں امتیازی شان حاصل ہے۔ مؤمن مؤمن کا آئینہ ہے، چنانچہ جس قدر آئینہ صاف ہوگا، اسی کے بقدر اس کا عکس ہوگا محبوب ومطلوب کی صورت بھی اسی طرح جلوہ گر ہوگی۔

الجامع کی روایت میں یہ الفاظ ہیں: أول زمرۃ تدخل الجنۃ علی صورۃ القمر لیلۃ البدر، والثانیۃ علی لون أحسن کوکب دری فی السماء' لکل رجل منھم زوجتان، علی کل زوجۃ سبعون حلۃ یبدوا مخ ساقھا من ورائھا. اس حدیث کو امام احمد اور امام ترمذیؒ نے حضرت ابوسعید سے روایت کیا ہے۔

۵۶۲۰ : وَعَنْ جَابِرٍ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ اَهْلَ الْجَنَّةِ يَاْ كُلُوْنَ فِيْهَا وَيَشْرَبُوْنَ وَلَا يَتْفُلُوْنَ وَلَا يَبُوْلُوْنَ وَلَا يَتَغَوَّطُوْنَ وَلَا يَمْتَخِطُوْنَ قَالُوْا فَمَا بَالُ الطَّعَامِ قَالَ جُشَاءٌ وَرَشْحٌ كَرَشْحِ الْمِسْكِ يُلْهَمُوْنَ التَّسْبِيْحَ وَالتَّحْمِيْدَ كَمَا تُلْهَمُوْنَ النَّفَسَ. (رواہ مسلم)

اخرجه مسلم في صحيحه ۴/ ۲۱۸۰ حديث رقم (۱۸-۲۸۳۵) والدارمي في السنن ۲/ ۴۳۱ حديث رقم ۲۸۲۸، واحمد في المسند ۳/ ۳۴۹۔

ترجمہ: '' حضرت جابر رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: اہل جنت جنت میں (خوب) کھائیں پئیں گے، لیکن نہ تو تھوکیں گے، نہ پیشاب کریں گے نہ پاخانہ کریں گے اور نہ ریزش ناک سنکیں گے''۔ یہ سن کر بعض صحابہ نے عرض کیا کہ (جب جنتی لوگ پاخانہ نہیں کریں گے) تو پھر کھانے کے فضلہ کے اخراج کا نظام کیا ہوگا آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: '' کھانے کا فضلہ ڈکار اور پسینہ ہو جائے گا جو کستوری کی خوشبو کی طرح مہکتا ہوگا اور دلوں میں تسبیح وتحمید یعنی سبحان اللہ، الحمد للہ کا ورد اور ذکر الٰہی (اس طرح) ڈال دیا جائے گا (کہ وہ ان کی لازمی عادت ومعمول بن جائے گا) جیسے سانس جاری ہے''۔ (مسلم)

تشریح: یمتخطون: باب افتعال سے ہے۔ اور ماقبل حدیث میں جو گزرا وہ باب تفعل سے تھا۔

قولہ: فما بال الطعام --- کرشح المسك:

جشاء: جیم کے ضمہ کے ساتھ (ڈکار کو کہتے ہیں۔)، وھو تنفس المعدۃ من الامتلاء. اور ایک شارح لکھتے ہیں: '' جشا'' اس آواز کو کہتے ہیں جو شکم سیری کے وقت منہ سے خارج ہوتی ہے۔ اس آواز کے ساتھ منہ سے ہوا بھی خارج ہوتی

ہے"جشاء" یہ مبتدا محذوف کی خبر ہے۔ أی: هو جشاء.

قاموس میں لکھتے ہیں: طعم الشيء حلاوته ومرارته، وما بينهما يكون في الطعام والشراب. صاحب قاموس کی یہ تحقیق، اس آیت [وهو يطعم ولا يطعم] میں موجود تنزیہ کے معنی کو تام کر رہی ہے۔

الجامع کی ایک روایت میں یہ الفاظ ہیں:

ولكن طعامه ذلك جشاء ورشح كرشح المسك. يلهمون التسبيح والتحميد كما تلهمون النفس: "لیکن ان کا کھانا ڈکار اور پسینہ ہو جائے گا جو مشک کی طرح مہکتا ہوگا۔ ان کو تسبیح وتحمید کا الہام کیا جائے گا (یعنی ان کے دل میں تسبیح وتحمید ڈالی جائے گی) جس طرح تم لوگوں کا سانس کا الہام کیا جاتا ہے۔

قوله: يلهون الشبيح ......:

یہاں سے اہل جنت کے بعض احوال کا بیان ہے۔ یہ کلام مستانفہ بیانیہ ہے۔

اس وجہ سے عارفین فرماتے ہیں: ﴿ولمن خاف مقام ربه جنتان﴾ [الانفطار:٤٦] "اور جو شخص اپنے رب کے سامنے کھڑے ہونے سے ڈرتا رہتا ہو اس کے لئے دو باغ ہوں گے" جنت عاجلہ دنیا میں ہے اور جنت آجلہ عقبٰی میں ہے۔ پہلی جنت دوسری جنت کیلئے وسیلہ ہے اور دوسری جنت پہلی کا نتیجہ ہے۔ اللہ جل شانہ کے اس فرمان میں اسی مفہوم کی طرف اشارہ کیا گیا ہے: ﴿ان الأبرار لفي نعيم﴾ [الانفطار:١٣] "نیک لوگ بے شک آسائش یں ہوں گے" کیونکہ کریم کے دائمی ذکر سے اعلیٰ کوئی نعمت نہیں۔" ﴿وان الفجار لفي جحيم﴾ [الانفطار:١٤] "اور بدکار (یعنی کافر) لوگ بے شک دوزخ میں ہوں گے) کہ حجاب باری تعالیٰ سے بڑھ کر کوئی عذاب نہیں۔

امام طیبی فرماتے ہیں" ايحاء " کے معنی ہیں: القاء الشيء في الروع، الہام اس القاء کے ساتھ مخصوص ہے جو اللہ کی طرف سے ہو ملأ اعلیٰ کی جہت سے ہو۔ لہٰذا" تلهمون" فرمانا علی سبیل المشاکلۃ ہے چونکہ اس سے "تنفس" مراد ہے۔

۵۶۲۱ : وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ يَّدْخُلُ الْجَنَّةَ يَنْعَمُ وَلَا يَبْأَسُ وَلَا يَبْلٰى ثِيَابُهُ وَلَا يَفْنٰى شَبَابُهُ (رواه مسلم)

اخرجه مسلم في صحيحه ٢١٨١/٤ حديث رقم (٢١-٢٨٣٦) والترمذي في السنن ٥٨٠/٤ حديث رقم ٢٥٢٦، والدارمي في السنن ٤٢٨/٢ حديث رقم ٢٨١٩، واحمد في المسند ٣٧/٢۔

ترجمہ: "حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: جو شخص بھی جنت میں جائے گا وہ خوش عیش رہے گا نہ فکر وغم اس کے پاس پھٹکے گا نہ اس کے کپڑے پرانے اور بوسیدہ ہوں گے اور نہ اس کی جوانی فنا ہوگی"۔ (مسلم)

تشریح: قوه: من يدخل الجنة ينعم ولا يبأس:

ينعم: عین کے فتحہ کے ساتھ، بمعنی "خوش عیش ہونا"۔

لا يبأس: بائے موحدہ کے سکون اور ہمزہ مفتوحہ کے ساتھ، بمعنی لا يفقر ولا يهتم، امام طیبیؒ فرماتے ہیں: ولا يبأس، ما

قبل "ینعم"، کی تاکید ہے اصل کے اعتبار سے واؤ نہیں آنا چاہیئے تھا، لیکن تقریر کی خاطر علی سبیل الطرد والعکس ذکر فرمایا۔ جیسا کہ اللہ جل شانہ کے اس فرمان میں ہے: ﴿لَّا يَعْصُونَ اللَّهَ مَآ أَمَرَهُمْ وَيَفْعَلُونَ مَا يُؤْمَرُونَ﴾ [التحریم:٦] میں کہتا ہوں، الجامع کی روایت میں بغیر واؤ کے أی: "لا یبأس" ہے۔

لا یبلی: لام کے فتحہ کے ساتھ، مذکر اور مؤنث کے صیغہ کے ساتھ پڑھا گیا ہے۔

قاضیؒ فرماتے ہیں: اس کا مطلب یہ ہے کہ جنت دار القرار اور دار الثبات ہے۔ تغیر کا کہیں دور دور تک نام ونشان نہیں۔ لہٰذا اس کی نعمتیں کبھی پرانی نہیں ہونگی، نہ ان میں فساد آئے گا، نہ ان میں تغیر آئے گا، کیونکہ وہ دار الأ ضداد نہیں، کون وفساد کا محل نہیں۔

۵۶۲۲ ۔۵۶۲۳ : وَعَنْ اَبِیْ سَعِیْدٍ وَاَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَا اِنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قَالَ يُنَادِیْ مُنَادٍ اِنَّ لَكُمْ اَنْ تَصِحُّوا فَلَا تَسْقَمُوْا اَبَدًا وَاِنَّ لَكُمْ اَنْ تَحْيَوْا فَلَا تَمُوْتُوْا اَبَدًا وَّاِنَّ لَكُمْ اَنْ تَشِبُّوْا فَلَا تَهْرَمُوْا اَبَدًا وَاَنَّ لَكُمْ اَنْ تَنْعَمُوْا فَلَا تَبْاَسُوْا اَبَدًا. (رواہ مسلم)

اخرجه مسلم فی صحیحه ۲۱۸۱/٤ حدیث رقم(۲۲-۲۸۳۷)، واخرجه الترمذی فی السنن ٤۳۹/٥ حدیث رقم ۳۲٤٦، والدارمی فی السنن ٤۳۱/۲ حدیث رقم ۲۸۲٤، واحمد فی المسند ۹٥/۳۔

ترجمہ: "حضرت ابوسعید خدری وحضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہما نے بیان فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: جنت میں ایک منادی اعلان کیا کرے گا کہ (اے جنتیو!) تم (ہمیشہ) صحت مند رہو گے تمہیں کبھی بھی کوئی بیماری لاحق نہیں ہوگی تم زندہ وجاوید رہو گے موت کبھی تمہارے پاس بھی نہیں آئے گی تم سدا جوان رہو گے کبھی بھی بوڑھے نہ ہونے پاؤ گے اور تم عیش وعشرت کی زندگی گزارو گے غمگین ورنجیدہ نہ ہو گے"۔ (مسلم)

تشریح: ینادی مناد: یہ اعلان جنت کے اندر ہوگا۔ بقول منادی یہ جملہ اس وقت کہے گا، جب وہ جنت کو دور سے دیکھیں گے۔

ان لکم: "ان" ہمزہ کے کسرہ کے ساتھ ہے۔ (نداء قول کے معنیٰ کو متضمن ہے۔) أی: قائلا ان لکم أن تصحوا....

أن تصحوا: صاد کے کسرہ اور حاء کی تشدید کے ساتھ،

تحیوا: یاء کے فتحہ کے ساتھ،

تشبّوا: شین معجمہ کے کسرہ اور باء موحدہ کی تشدید کے ساتھ،

فلا تھر موا: راء کے فتحہ کے ساتھ، أی لا تشیبوا.

امام طیبیؒ نے فرمایا: یہ نداء وبشارت اس نداء میں موجود سرور مسرت سے زیادہ لذیذ وشہی ہوگی۔ اس کے برعکس میں متنبی نے کہا ہے:

أشد الغم عندی فی سرور
تیقن عنه صاحبه ارتحالا

(میرے نزدیک خوشی میں شدید ترین غم اس شخص کا ہے جس کے ساتھ کا کوچ کرنا یقینی ہو)

۵۶۲۴ : وَعَنْ اَبِیْ سَعِيْدِ إِلْخُدْ رِیْ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اِنَّ اَهْلَ الْجَنَّةِ يَتَرَاءَ وْنَ اَهْلَ الْغُرَفِ مِنْ فَوْ قِهِمْ كَمَا تَرَاءَ وْنَ الْكَوْكَبَ الدُّرِّيَّ الْغَابِرَ فِي الْاُ فُقِ مِنَ الْمَشْرِقِ اَوِالْمَغْرِبِ لِتَفَاضُلِ مَا بَيْنَهُمْ قَالُوْا يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ تِلْكَ مَنَازِلُ الْاَنْبِيَاءِ لَا يَبْلُغُهَا غَيْرُ هُمْ قَالَ بَلٰى وَالَّذِیْ نَفْسِیْ بِيَدِهٖ رِجَالٌ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَصَدَّقُوْا الْمُرْسَلِيْنَ (متفق عليه)

اخرجه البخاری فی صحیحه ۳۲۰/۶حدیث رقم ۳۲۵۶،ومسلم فی صحیحه ۲۱۷۷/٤حدیث رقم (۱۱-۲۸۳۱)،والترمذی فی السنن ٥٩٥/٤حدیث رقم ۲۵۵٦، والدارمی فی السنن ٤٣٣/٢حدیث رقم ٢٨٣٠ واحمد فی المسند ٣٣٥/٢۔

ترجمہ:''حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: جنت والے لوگ اپنے اوپر کے درجات کے لوگوں کا یوں نظارہ کریں گے جس طرح تم لوگ اس روشن ستارے کا نظارہ کرتے ہو جو آسمان کے مشرقی یا مغربی افق میں ڈوب رہا ہوتا ہے اور یہ (بالا خانوں کی بلندی) باہم درجات و مراتب کے مختلف و متفرق ہونے کی وجہ سے ہوگی۔ صحابہ نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ ﷺ بالا خانہ کے پُرشکوہ محلات کیا انبیاء کی رہائشگاہیں ہوں گی جن تک انبیاء کے سوا کسی کی رسائی نہیں ہوگی؟ آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا: کیوں نہیں قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضے میں میری جان ہے ان بلند و بالا محلات اور بالا خانوں تک ان لوگوں کی بھی رسائی ہوگی جو اللہ پر ایمان لائے اور جنہوں نے پیغمبروں کی تصدیق کی''۔(مسلم و بخاری)

تشریح: قوله:ان أهل الجنة۔۔۔لتفاضل مابينهم:

الغرف:غین کے ضمہ اور راء کے فتحہ کے ساتھ ہے۔'' **غرفة** '' کی جمع ہے۔

أفق:ہمزہ اور فاء کے ضمہ کے ساتھ۔اس کی جمع ''آفاق'' آتی ہے۔

أو المغرب: بظاہر یہ ''أوْ'' تخيير فی التشبيه کے لئے ہے۔جیسا کہ ان آیات میں ہے:﴿أو كصيب من السماء﴾ [البقرة:١٩] ''یا ان منافقوں کی ایسی مثال ہے جیسے بارش ہو آسمان کی طرف سے''اور ﴿أو كظلمات فی بحر لجیّ﴾''یا وہ ایسے ہیں جیسے بڑے گہرے سمندر کے اندرونی اندھیرے'' یہ او شک کیلئے نہیں ہے۔

غابر:غین معجمہ اور بائے موحدہ کے ساتھ ہے'یہ ''غبور'' سے مشتق ہے۔اس صورت میں اس کا مطلب ہوگا''الباقی ''۔اور ایک نسخہ میں ہمزہ کے ساتھ''غیور'' سے مشتق ہے۔اس صورت میں اس کا مطلب ہوگا **الذاهب فی الأفق العبيد الغور فيه**۔امام تورپشتی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

'' **الغابر** '':اس لفظ کے ضبط اہل لغت میں کا اختلاف ہے۔بعض نے الف کے بعد ہمزہ کے ساتھ''غائر '' روایت کیا ہے اس صورت میں یہ ''غور'' سے ماخوذ ہے غربی جانب میں اس کا انحطاط مراد ہے اور بعض نے اس کو باء کے ساتھ''غابر ''از غبور روایت کیا ہے۔اس صورت میں مراد یہ ہے کہ فجر کی روشنی پھیل جانے کے بعد افق پر باقی رہنے والا۔کیونکہ اس وقت میں

چمکدار ستارہ ہی واضح ہوتا ہے۔اور بلاشبہ پہلی روایت تصحیف کا نتیجہ ہے۔(انتھی) لیکن اس کی تصحیف کی وجہ ذکر نہیں فرمائی ایک شارح لکھتے ہیں کہ "غابر" "غور" بمعنی انحطاط سے روایت کیا گیا ہے۔ یہ تصحیف' چونکہ یہ حدیث کے ان الفاظ "من المشرق "چونکہ شرقی جانب میں انحطاط کو کب منصور نہیں ہے اور"من المشرق والمغرب "مصابیح میں اسی طرح ہے یعنی واؤ کے ساتھ ہے۔اور درست (ضبط)" من المشرق الی المغرب" کہا گیا ہے جیسا کہ کتاب مسلم میں ہے۔

مؤلف فرماتے ہیں کہ شرح السنہ' جامع الاصول اور ریاض الصالحین میں اسی طرح واؤ کے ساتھ ہے۔کہا گیا ہے کہ مشرق ومغرب دونوں کا یکجا ذکر کیا اور آسمان کو ذکر نہیں کیا گیا' کیونکہ بعد وا تارہ معاً (دوری اور روشن کرنا یک لخت) مقصود ہے۔امام نوویؒ فرماتے ہیں:الغابر الذاهب الماضی ای الذی تدلی للغروب وبعد عن العیون۔

بعض (نسخوں یا روایت) میں العازب، عین مہملہ اور زاء کے ساتھ ہے،اس کا مطلب ہوتا ہے: البعید فی الأفق،بہر حال سب کے معنی ایک ہی ہیں۔

امام طیبیؒ "الکوکب" کی دوہری صفت لانے کی بابت لکھتے ہیں: اگر آپ یہ کہیں کہ "الکوب" کو'لدری' اور پھر "الدری" کے ساتھ مقید کرنے کا کیا فائدہ ہے؟ میں کہتا ہوں کہ یہ بتانے کے لئے یہ از باب تمثیل ہے۔یہ کئی امور پر مشتمل ہے 'رائی فی الجنة کی رؤیت کو صاحب غرقہ سے تشبیہ دی اور وجہ شبہ استضاء مع البعد ہے۔

اور اگر یہ کہا جائے کہ "غائر" کہنا درست نہیں، کیونکہ غروب کے وقت چمک تو ختم ہو چکی ہوتی ہے۔اس کا جواب یہ ہے کہ اس سے مراد وہ ستارہ ہے جو ڈوبنے کے قریب ہو،جیسا کہ یہ آیت:﴿حتی اذا بلغن أجلهن﴾ [البقرة-۲۳۴] أی شارفن بلوغ أجلهن.یعنی قریب پہنچ جائیں لیکن یہ تاویل جانب شرقی میں درست نہیں،الا یہ کہ یوں کہا جائے کہ یہ عرب کے اس قول کے قبیل سے ہے: متقلدا سیفا ورمحا اوعلفته تبنا وماء باردا. چنانچہ تقدیری عبارت یوں ہوگی: أی طالعا فی الأفق من المشرق وغائرا فی المغرب.

لتفاضل ما بینهم:یہ علت کا بیان ہے۔

قوله:قال:بلی:......

رجال:(مبتدا ہے،اور خبر محذوف ہے۔) أی:هم رجال.(یا فاعل ہے اور فعل محذوف ہے۔) أی:یبلغها رجال.

اور "رجال" سے مراد" رجال کاملین" ہیں۔اس کی دلیل یہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿رجال لا تلهیهم تجارة ولا بیع عن ذکر الله﴾ [النور:۳۷] "جن کو اللہ کی یاد سے نہ خرید غفلت میں ڈالنے والی ہے اور نہ فروخت"۔

قوله:صدقوا المرسلین:ارشاد باری تعالیٰ ہے:﴿وعباد الرحمن الذین یمشون علی الأرض ......اولئك یجزون العرفة بما صبروا﴾[الفرقان:۷۵]"ایسے لوگوں کو (جنت میں رہنے کو) بالا خانے ملیں گے بوجہ ان کے (دین واطاعت) پر ثابت قدم رہنے کے"۔

لفظ"مرسلین" جمع لانے میں اس بات کی طرف ~~مشیر ہے~~ کہ یہ مرتبہ علیا عام سابقین کے لئے ہے۔

اوراسی قبیل سے یہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:﴿كذبت قوم نوح المرسلين﴾.

تخریج: اسی طرح اس روایت کوامام احمد، ابن حبان اور دارمی نے ابوسعید سے اور امام ترمذیؒ نے حضرت ابوہریرہؓ سے ذکر کیا ہے۔

اس حدیث کوامام احمد، شیخین اور ابن حبان نے حضرت سہل بن سعدؓ سے ان الفاظ کے ساتھ روایت کیا ہے:

ان أهل الجنة ليتراء ون أهل الغرف في الجنة، كما تراء ون الكوكب في السماء.

''بے شک اہل جنت درجات کے لوگوں کا یوں نظارہ کریں گے جس طرح تم لوگ آسمان میں ستارے کا نظارہ کرتے ہو۔''

امام احمد، ترمذی، ابن ماجہ اور ابن حبان نے ابوسعید سے، طبرانی نے حضرت جابر بن سمرہ سے، اور ابن عساکر نے ابن عمر اور حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہم سے ان الفاظ کے ساتھ روایت کیا ہے:

ان أهل الدرجات العلى ليراهم من هو أسفل منهم كما ترون الكوكب الطالع في أفق السماء، وان أبابكر وعمر منهم وانعما. اعلیٰ درجات والے اہل جنت اپنے سے نچلے درجات کے اہل جنت کا اس طرح نظارہ کریں گے جس طرح تم لوگ آسمان میں طلوع ہونے والے ستارہ کا نظارہ کرتے ہوا۔ ابوبکر اور عمر رضی اللہ عنہما انہی اعلیٰ درجات کے لوگوں میں سے ہیں۔

حدیث کے بعض طرق میں یہ الفاظ وارد ہوئے ہیں:

قيل: وما معنى أنعما؟ قال: أهل لذلك هما.

ابن عساکر ابوسعید سے مرفوعاً نقل کرتے ہیں: **ان أهل عليين ليشرف أحدهم على الجنة فيضيئ وجهه** اہل علیین میں سے کوئی شخص غیر اہل علیین کی جنت کی طرف جھانکے گا تو اس کا چہرہ اہل جنت کو اس طرح روشن کردے گا جس طرح چودھویں رات میں چاند اہل دنیا کو روشن کرتا ہے اور ابوبکر وعمر انہی (اہل علیین کے لوگوں) میں سے ہیں **لأهل الجنة كما يضيئ القمر ليلة البدر لأهل الدنيا، وان أبا بكر وعمر منهم وأنعما.**

ابن ابی دنیا کتاب الأخوان میں اور امام بیہقی حضرت ابوہریرہؓ سے مرفوعاً نقل کرتے ہیں:

ان في الجنة لعمدًا من ياقوت عليها غرف من زبرجد، ولها أبواب مفتحة تضيئ كما يضيئ الكوكب الدرى، يسكنها المتحابون في الله، والمتجالسون في الله، والمتلاقون في الله. بے شک جنت میں یاقوت کے ایسے ستون ہیں جن پر زبرجد کے بالا خانے ہیں ان بالا خانوں کے ایسے کھلے ہوئے دروازے ہیں جو اس طرح سے روشنی کرتے ہیں جس طرح انتہائی چمکدار ستارہ روشنی کرتا ہے۔ ان بالا خانوں میں وہ لوگ رہیں گے جو اللہ کی خاطر باہم محبت کرتے ہیں اور اللہ ہی کے لیے باہم مجلس آرائی کرتے ہیں اور اللہ کی خاطر باہم ملتے ہیں۔

امام احمد، ابن حبان اور بیہقی حضرت مالک اشعری سے، اور امام ترمذی حضرت علیؓ سے مرفوعاً روایت کرتے ہیں:

ان في الجنة غرفا يرى ظاهرهما من باطنها وباطنها من ظاهرها، أعدها الله تعالى لمن أطعم الطعام، ألان الكلام وتابع الصيام، وصلى بالليل والناس نيام. بے شک جنت میں کچھ ایسے بالا خانے ہیں جن کا باہر کا حصہ اندر

سے دکھائی دیتا ہے اور اندر کا حصہ باہر سے دکھائی دیتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے یہ بالا خانہ اس شخص کے لئے تیار کر رکھا ہے جو کھانا کھلاتے ہیں' نرم کلام کرتے ہیں' مسلسل روزے رکھتے ہیں اور رات کو ایسے وقت میں نماز پڑھتے ہیں جب لوگ سور ہے ہوتے ہیں۔

۵۶۲۵ : وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ یَدْخُلُ الْجَنَّةَ اَقْوَامٌ اَفْئِدَتُهُمْ مِثْلُ اَفْئِدَةِ الطَّیْرِ. (رواه مسلم)

اخرجه مسلم في صحيحه ٢١٨٣/٤ حديث رقم (٢٧-٢٨٤٠) واحمد في المسند ٣٣١/٢۔

ترجمہ: ''حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: جنت میں ایسے لوگوں کے کئی طبقات داخل ہوں گے جن کے دل پرندوں کے دلوں کی طرح ہوں گے''۔ (مسلم)

تشریح: قوله: يدخل الجنة أقوام ..... امام نوویؒ فرماتے ہیں بعض کے بقول یہ تشبیہ ان کی رقت کے ساتھ ہے۔ جیسا کہ مروی ہے: اهل اليمن أرق أفئدة و ألين قلوبا. اور بقول بعض کہ وجہ تشبیہ خوف وہیبت ہے۔ اور حیوانات میں سے سب سے زیادہ خوف وفزع پرندوں کو ہوتا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿انما يخشى الله من عباده العلماء﴾ [فاطر: ۲۸] ''(اور) اللہ سے اس کے وہی بندے ڈرتے ہیں جو اس کی عظمت کا علم رکھتے ہیں۔'' اور کہا گیا ہے کہ یہ تشبیہ ''توکل'' میں ہے:

جیسا کہ مروی ہے: لو أنكم تتوكلون على الله حق توكله لرزقكم كما يرزق الطير تغدو خماصا وتروح بطانا. ''اگر تم لوگ اللہ تعالیٰ پر اس طرح توکل کرو جس طرح توکل کرنے کا حق ہے تو تم کو رزق اس طرح عطا کرے گا جس طرح پرندوں کو عطا کرتا ہے کہ وہ صبح کے وقت خالی پیٹ نکلتے ہیں اور شام کو بھرے پیٹ واپس آتے ہیں۔''

ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿وَكَاَیِّنْ مِّنْ دَآبَّةٍ لَّا تَحْمِلُ رِزْقَهَا اَللّٰهُ یَرْزُقُهَا وَاِیَّاكُمْ وَهُوَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ﴾ [العنكبوت: ۶۰] ''اور بہت سے جانور ایسے ہیں جو اپنی غذا اٹھا کر نہیں رکھتے اللہ ہی ان کو (اس قدر) روزی پہنچاتا ہے اور تم کو بھی' وہ سب کچھ سنتا ہے سب کچھ جانتا ہے۔''

تخریج: اسی طرح اس حدیث کو امام احمد نے بھی روایت کیا ہے۔

۵۶۲۶ : وَعَنْ اَبِیْ سَعِیْدٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ اللّٰهَ تَعَالٰی یَقُوْلُ لِاَهْلِ الْجَنَّةِ یَا اَهْلَ الْجَنَّةِ فَیَقُوْلُوْنَ لَبَّیْكَ رَبَّنَا وَسَعْدَیْكَ وَالْخَیْرُ كُلُّهٗ فِیْ یَدَیْكَ فَیَقُوْلُ هَلْ رَضِیْتُمْ فَیَقُوْلُوْنَ وَمَا لَنَا لَا نَرْضٰی یَا رَبِّ وَقَدْ اَعْطَیْتَنَا مَا لَمْ تُعْطِ اَحَدًا مِّنْ خَلْقِكَ فَیَقُوْلُ اَلَا اُعْطِیْكُمْ اَفْضَلَ مِنْ ذٰلِكَ فَیَقُوْلُوْنَ یَا رَبِّ وَاَیُّ شَیْءٍ اَفْضَلُ مِنْ ذٰلِكَ فَیَقُوْلُ اُحِلُّ عَلَیْكُمْ رِضْوَانِیْ فَلَا اَسْخَطُ عَلَیْكُمْ بَعْدَهٗ اَبَدًا (متفق عليه)

اخرجه البخاري في صحيحه ٤١٥/١١ حديث رقم ٦٥٤٩، ومسلم في صحيحه ٢١٧٦/٤ حديث رقم

۲۸۲۹/۹، والترمذی فی السنن ۵۹۵/٤ حدیث رقم ۲۵۵۵۔

ترجمہ: ''حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: اللہ تعالیٰ اہل جنت کو (مخاطب کرنے کے لئے) پکارے گا کہ ''اے جنت والو! تمام جنتی (یہ آواز سن کر) جواب دیں گے کہ اے ہمارے پروردگار ہم تیری جناب میں حاضر ہیں اور تیری اطاعت کے لئے مستعد اور تیار ہیں' تمام تر بھلائی تیرے ہی قبضہ قدرت اور ارادے میں ہے (کہ جس کو چاہے عطا کرے)۔ اللہ تعالیٰ پوچھیں گے کیا تم (جنت کا انعام پا کر) مجھ سے رضا مند ہو گئے ہو؟'' وہ عرض کریں گے کہ اے میرے پروردگار ہم آپ سے بھلا کیوں نہ خوش ہوں گے جب کہ آپ نے تو ہمیں وہ (بڑی سے بڑی نعمت اور سرفرازی عطا فرمائی ہے جو اپنی مخلوق میں سے کسی کو بھی عطا نہیں کی۔ حق تعالیٰ شانہ فرمائے گا: کیا میں اس سے بھی بڑی اور اس سے بھی اہم اور افضل نعمت تمہیں عطا نہ کروں؟ وہ کہیں گے اس سے بھی بڑی اور اس سے بھی اہم اور افضل اور کیا ہوگی؟ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: میں تمہیں اپنی رضا و خوشنودی عنایت کروں گا اور پھر تم سے کبھی ناراض نہیں ہوں گا''۔ (بخاری و مسلم)

تشریح: قوله: لبيك ربنا... من خلقك:

لبيك ربنا: (حرف ندا محذوف ہے۔) أي: يا ربّنا.

الخير: ''ال'' جنس ہے یا استغراق کے لیے ہے۔

وما لنا لا نرضى: استفہام تقریری ہے۔

يا رب: اصل میں ''یا ربّی'' تھا۔ اور قیاس یہ ہے کہ ''یا ربنا'' ہونا چاہئے تھا۔ تو گویا کہ یہ کلام ہر ہر قائل کے اعتبار سے ہے۔

وقد اعطيتنا......: جملہ حالیہ ہے۔

قوله: فيقول: احل عليكم ......:

أحل: ہمزہ کے ضمہ اور حاء کے کسرہ کے ساتھ۔ بمعنی ''أنزل''۔

رضواني: راء کے ضمہ اور کسرہ ہر دو کے ساتھ درست ہے۔

امام طیبیؒ فرماتے ہیں: یہ حدیث مبارکہ اس آیت کریمہ سے ماخوذ ہے:

﴿وَعَدَ اللّٰهُ الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا وَمَسٰكِنَ طَيِّبَةً فِيْ جَنّٰتِ عَدْنٍ ؕ وَرِضْوَانٌ مِّنَ اللّٰهِ اَكْبَرُ ؕ﴾ [التوبة: ٧٢] ''اللہ تعالیٰ نے مسلمان مردوں اور مسلمانوں عورتوں سے ایسے باغوں کا وعدہ کر رکھا ہے جن کے نیچے سے نہریں چلتی ہوں گی جن میں وہ ہمیشہ رہیں گے اور نفیس مکانوں کا جو کہ ان ہمیشگی کے باغوں میں ہوں گے اور (ان سب نعمتوں کے ساتھ) اللہ تعالیٰ کی رضا مندی سب (نعمتوں) سے بڑی چیز ہے۔''

صاحب شافی لکھتے ہیں: اللہ کی خوشنودی تمام چیزوں سے بڑھ کر ہے، کیونکہ اللہ جل شانہ کی خوشنودی (ہی) ہر کامیابی وسعادت کا سبب ہے، کیونکہ جب ان کا رب ان سے راضی ہوگا تو ان کو تعظیم و کرامت حاصل ہوگی، اور کرامت کئی گنا ثواب سے بڑی ہے، اس لئے کہ بندہ جب جان لیتا ہے، کہ میرا مولا مجھ سے راضی ہے، تو اس کے نفس میں یہ بات اس کے علاوہ تمام

نعمتوں سے بڑھ کر ہوتی ہے۔

ناراضگی کی وجہ سے کم ہوتی ہے، اور نہ اس میں کوئی لذت پاتا ہے، اگر چہ وہ بڑی ہی کیوں نہ ہو۔ امام طیبیؒ فرماتے ہیں: اصناف کرامت میں سے سب سے بڑی کرامت اللہ تعالیٰ کی رؤیت ہے۔ میں (ملا علی قاریؒ) کہتا ہوں اور شاید کہ اس کی وجہ یہ ہے، کہ یہ تحصیل لقاء اور نعمتوں کی تمام انواع کو شامل ہے۔

۵۶۲۷ : وَعَنْ اَبِی هُرَیْرَةَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ اَدْنٰی مَقْعَدِ اَحَدِكُمْ مِنَ الْجَنَّةِ اَنْ یَّقُوْلَ لَهٗ تَمَنَّ فَیَتَمَنّٰی وَیَتَمَنّٰی فَیَقُوْلُ لَهٗ هَلْ تَمَنَّیْتَ فَیَقُوْلُ نَعَمْ فَیَقُوْلُ لَهٗ فَاِنَّ لَكَ مَا تَمَنَّیْتَ وَمِثْلَهٗ مَعَهٗ (رواه مسلم)

اخرجه مسلم فی صحیحه ۱۶۷/۱ حدیث رقم (۳۰۱/۱۸۲) واحمد فی المسند ۳۱۵/۲۔

ترجمہ: ”حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: تم میں سے جو شخص سب سے کمتر درجہ اور کم ملکیت و مقام والا جنتی ہوگا اس کا یہ رتبہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ اس سے فرمائے گا جو بھی خواہش رکھتے ہو اس کو بیان کرو اور جو کچھ چاہتے ہو مانگو“۔ وہ اپنی آرزوئیں ظاہر کرتا رہے گا یعنی وہ جنتی اپنی تمام دلی تمنائیں بیان کر دے گا اور جس قدر بھی مانگ سکتا ہوگا مانگے گا) اللہ تعالیٰ (اس کی آرزوئیں اور خواہشات سماعت فرما کر) ارشاد فرمائے گا کہ کیا تم اپنی آرزوئیں بیان کر چکے (اور اپنے دل میں جو کچھ خواہش رکھتے ہو سب ظاہر کر چکے) وہ عرض کرے گا کہ جی ہاں! حق تعالیٰ ارشاد فرمائے گا تم نے جو آرزوئیں بیان کیں اور جو کچھ مانگا نہ صرف وہ بلکہ اسی کی مثل مزید اس کے ساتھ تمہیں عطا کیا گیا“۔ (مسلم)

تشریح: قوله: ان ادنی مقدع احدکم ......: أدنی: بمعنی اقل ہے۔

فیتمنی یتمنی: تکریر برائے تکثیر ہے۔ امام طیبیؒ فرماتے ہیں: ”أن یقول له“ ان کی خبر ہے۔ (”هل تمنیت“ کا مفعول محذوف ہے۔ ای: جمع أمانیك) اور اس کا مطلب یہ ہے کہ سب سے ادنی درجہ کا جنتی بھی ایسا ہوگا، کہ اس کی تمام آرزوئیں، مرادیں، تمنائیں، چاہیں پوری ہونگی حتی کہ اسی دل میں مزید کوئی خواہش نہ رہے گی۔ ایک شاعر بھی کچھ یوں ہی کہتا ہے:

لم یبق وجودك لی شیئا أؤمله ☆ ترکتنی أصحاب الدنیا بلا أمل

(تیرا وجود میرے لئے کوئی ایسی چیز باقی نہیں رہا کہ جس کی میں امید کروں مجھے دنیاداروں نے بغیر امید کے چھوڑ دیا۔)

(ملا علی قاریؒ لکھتے ہیں) اور اس حدیث میں اشارہ ہے کہ جس شخص کی تمناؤں کا منتہٰی اس کے مولیٰ کی رضا ٹھہری، اور ملاقات ٹھہری تو اس کیلئے اس سے بڑھ کر کسی عطاء و نوازش کا تصور نہیں کیا جا سکتا ہے۔

۵۶۲۸ : وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ سَیْحَانُ وَجَیْحَانُ وَالْفُرَاتُ وَالنِّیْلُ کُلٌّ مِّنْ اَنْهَارِ الْجَنَّةِ ۔ (رواه مسلم)

اخرجه مسلم فی صحیحه ۲۱۸۳/۴ حدیث رقم (۲۶-۲۸۳۹) واحمد فی المسند ۴۴۰/۲۔

ترجمہ: ”حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: سیحان، جیحان، فرات اور نیل؛

ان سب دریاؤں کا تعلق جنت کی نہروں اور چشموں سے ہے"۔ (مسلم)

تشریح: سیحان: سین کے فتحہ اور حاء مہملہ کے ساتھ۔ اس کا لغوی معنی ہے پانی کا سطح زمین پر بہنا۔ اس کا نون زائدہ ہے۔

جیحان: جیم کے فتحہ اور حاء مہملہ کے ساتھ۔ یہ "جحن الصبی" سے مشتق ہے۔ یہ جملہ اس وقت کہتے ہیں، جب بچہ کی غذا خراب ہو ٹھیک نہ ہو۔ اس کا نون اصلی ہے۔ اور یہ دونوں نہریں ملکِ شام میں واقع ہیں۔

امام نوویؒ فرماتے ہیں: سیحان اور جیحان، سیحون اور جیحون چاروں الگ الگ دریا ہیں۔ مذکورہ بالا حدیث میں جن دو دریاؤں کا ذکر ہے، یہ دونوں بلادِ اُرمن میں بہتے ہیں۔ سیحان کو "نہر مصیصہ" اور جیحان کو "نہر اُردن" کہتے ہیں۔ یہ دونوں دریا بہت ہی بڑے ہیں۔ یہی بات درست ہے۔ جوہریؒ کا یہ کہنا کہ "جیحان، شام میں ہے" یہ صحیح نہیں۔ صاحب "نہایۃ الغریب" فرماتے ہیں: سیحان اور جیحان یہ دونوں دریا مصیصہ اور طرطوس کے نزدیک بہتے ہیں۔ اور اس بات پر سب کا اتفاق ہے کہ دریائے جیحون خراسان میں بہتا ہے۔ اور بعض کا کہنا ہے کہ دریائے سیحون ہندوستان میں ہے۔

الفرات: یہ دریا کوفہ میں بہتا ہے۔

النیل: یہ دریا مصر میں بہتا ہے۔ سیحون ہند کا دریا ہے۔ اور جیحون بلخ کا دریا ہے جو خوارزم تک جاتا ہے۔ (کذا قالہ شارح)
بعض کا بیان ہے، کہ سیحان شام میں، اور بعض کا کہنا ہے، کہ ہندوستان میں بہتا ہے اور جیحان بلخ میں ہے۔

کل: اس کی تنوین عوض کی ہے۔ أی: کل واحد منها

عرض مرتب:

حدیث کے اس جملہ کے بارے میں علماء کے مختلف اقوال ہیں۔ اس سلسلہ میں ملا علی قاریؒ نے چند محدثین کے اقوال ذکر کئے ہیں۔ وہ سب ہی اقوال قریب قریب ہیں، اس لئے ان اقوال کا خلاصہ پیش کیا جاتا ہے۔

ا۔ امام نوویؒ شرح مسلم میں لکھتے ہیں کہ قاضی عیاضؒ نے فرمایا: "ان دریاؤں کا تعلق جنت سے ہے" کا مطلب یہ ہے کہ ایمان ان شہروں میں ہے اور ان نہروں کے پانیوں سے نشو ونما پانے والے اجسام جنت میں ہوں گے۔

قول اصح یہ ہے کہ حدیث کے یہ الفاظ اپنے ظاہری معنی پر محمول ہیں۔ یعنی حقیقت میں ان چاروں نہروں کا مادہ جنت سے ہے۔ اور جنت بھی اللہ کی مخلوق ہے جو معرض وجود میں آ چکی ہے۔ اہل سنت کا مذہب یہی ہے۔

امام مسلم کتاب الایمان میں حدیث اسراء کے ذیل میں روایت کرتے ہیں: ان الفرات والنیل یجریان من الجنة "بے شک فرات اور نیل جنت سے بہتے ہیں۔" اور بخاری میں ہے کہ "من أصل سدرة المنتهى" یعنی سدرۃ المنتہٰی کی جڑ سے نکلتے ہیں۔

معالم التنزیل میں حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے مروی ہے:

ان الله تعالى أنزل هذه الأنهار من عين واحدة من عيون الجنة، من أسفل درجة من درجاتها على جناحي جبريل، استودعها الجبال وأجراها في الأرض، وجعل فيها منافع للناس، وذلك قوله تعالى

﴿وأنزلنا من السماء ما بقدر﴾فاذا كان عند خروج يأجوج ومأجوج أرسل الله جبريل يرفع من الأرض القرآن والعلم، والحجر الأسود ومقام ابراهيم، وتابوت موسٰى، وهذه الأنهار، فذلك قوله تعالٰى:﴿وانا علٰى ذهاب به لقادرون﴾ [المؤمنون:۱۸] ''بے شک اللہ تعالیٰ نے ان دریاؤں کو جنت کے چشموں میں سے ایک چشمہ سے اتارا ہے۔ یہ چشمہ جنت کے درجوں میں سے سب سے نیچے کے درجہ سے بہتا ہے' اور جنت کے درجات حضرت جبرائیل کے دو دو پروں پر ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے یہ پہاڑوں کو بطور امانت سونپتا ہے اور جو زمین میں جاری کر دیا ہے اور اس میں لوگوں کے لئے فائدہ رکھے ہیں اور یہ اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد گرامی کی تفسیر ہے: [وانزلنا من السماء......]۔ پس جب یاجوج و ماجوج کے خروج کا وقت قریب آئے گا تو اللہ تعالیٰ حضرت جبرائیلؑ کو بھیجے گا وہ زمین پر سے قرآن علم حجر اسود مقام ابراہیم اور حضرت موسیٰ کے تابوت کو اور ان دریاؤں کو اٹھالیں گے اور یہ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کی تفسیر ہے:﴿حجر وانا علٰى ذهاب له لقادرون﴾ (المؤمنون:۱۸)

۴۔ قاضیؒ لکھتے ہیں: مراد یہ ہے کہ ان دریاؤں کا پانی دیگر پانیوں کی بنسبت زیادہ شیریں اور کثیر المنافع ہے، گویا یہ دریا جنت کی نہروں اور چشموں سے نکلے ہیں۔ اور ایک احتمال یہ ہے کہ اس سے مراد انہار اربعہ ہوں جو انہار جنت کی اصل اور انبیاء ہیں۔ اور ان کو انہار اربعہ کے اسماء سے موسوم کیا جو دنیا کی سب سے بڑی مشہور نہریں ہیں' جن کا پانی انتہائی شیریں اور بے حد مفید ہے عرب کے لئے یہ کلام بطور تشبیہ و تمثیل کے فرمایا تا کہ یہ بات معلوم ہو جائے دنیا میں جو منافع و نعمتوں کے نمونے ہیں یہ آخرت میں ہوں گے۔

اور اسی طرح اس دنیا میں جو نقصانات و مکروہات ہیں، (وہ سب آخرت کے امور کریہہ کی ایک جھلک ہیں)

۵۔ ان چاروں دریاؤں کا تعلق جنت کی نہروں اور چشموں سے ہے کیونکہ ان دریاؤں کے پانی میں خاص شیرینی اور انہضام ہے' ان میں برکات الٰہیہ شامل ہیں اور انبیاء کرام علیہم الصلوات والتسلیمات یہاں جلوہ افروز ہوئے ہیں اور ان دریاؤں سے مستفید ہوئے ہیں۔ اور اس (حدیث) کی نظیر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد گرامی ہے، جو آپ علیہ الصلوٰۃ والسلام نے مدینہ کی عجوہ کھجور کے بارے میں ارشاد فرمایا تھا: انها من ثمار الجنة.

۶۔ دنیا کے ان چار دریاؤں کو جنت کے چار دریاؤں کے ساتھ موسوم کیا، کیونکہ ان دریاؤں کو دنیا میں وہی مرتبہ حاصل ہے، جو جنت کے ان چار دریاؤں کو جنت میں حاصل ہے۔

۷۔ اشتراک اسماء کی وجہ سے مسمیات میں بھی اشتراک ہے، چنانچہ لکھتے ہیں: (كذا ذكر شارح من علمائنا).

۵۶۲۹ : وَعَنْ عُتْبَةَ بْنِ غَزْوَانَ قَالَ ذُكِرَ لَنَا اَنَّ الْحَجَرَ يُلْقٰى فِي شَفَةِ جَهَنَّمَ فَيَهْوِيْ فِيْهَا سَبْعِيْنَ خَرِيْفًا لَا يُدْرِكُ لَهَا قَعْرًا وَاللّٰهِ لَتُمْلَاَنَّ وَلَقَدْ ذُكِرَلَنَا اَنَّ مَا بَيْنَ مِصْرَاعَيْنِ مِنْ مَّصَارِيْعِ الْجَنَّةِ مَسِيْرَةَ اَرْبَعِيْنَ سَنَةً وَلَيَاتِيَنَّ عَلَيْهَا يَوْمٌ وَهُوَ كَظِيْظٌ مِنَ الزِّحَامِ. (رواه مسلم)

اخرجه مسلم فی صحیحه ۲۲۷۸/٤ حدیث رقم (١٤-٢٩٦٧) واحمد فی المسند ۳۷۱/۲۔

ترجمہ: ''حضرت عتبہ بن غزوان رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا کہ ہمارے سامنے یہ ذکر کیا گیا (یعنی حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم

سے یہ روایت نقل کی گئی) کہ (آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا) ''اگر جہنم کے (اوپری) کنارے سے کوئی پتھر پھینکا جائے تو وہ ستر سال تک نیچے گرتا چلا جائے گا لیکن جہنم کی تہہ تک نہیں پہنچے گا' بخدا جہنم (اتنی گہری اور وسیع ہونے کے باوجود کفار سے) مکمل بھر جائے گی''۔ اور (حضرت عتبہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ) ہمارے سامنے حضور اقدس ﷺ کا یہ ارشاد گرامی بھی ذکر کیا گیا کہ ''جنت کے کسی بھی ایک دروازے کے دونوں بازوؤں کے درمیان چالیس برس کی مسافت کے بقدر فاصلہ ہے اور ایک دن ایسا آئے گا کہ جنت اتنی وسعت وکشادگی کے باوجود لوگوں سے بھرپور ہوگی''۔ (مسلم)

تشریح: قوله: وعن عتبة بن عزوان قال: ذكر لنا:

عتبة: عین مہملہ کے ضمہ، تائے مثناۃ فوقانیہ کے سکون اور بائے موحدہ کے ساتھ ہے۔ جیسا کہ ''الاکمال فی ضبط اسماء الرجال'' میں مذکور ہے۔

ابن غزوان: غین کے فتحہ، اور زاء کے سکون کے ساتھ، بعض کا کہنا ہے کہ یہ ابتدائی ابتدائی چھ مردوں کے بعد ساتویں اسلام لانے والے مسلمان ہیں۔

قال: ذكر لنا: یہ مرفوع کے حکم میں ہے۔ چونکہ صحابی کبیر کے بارے میں غالب یہی ہے کہ انہوا نے یہ ارشاد گرامی خود آنحضرت ﷺ ہی سے سنا ہوگا، یا کسی صحابی سے سنا ہوگا۔ اور مراسیل صحابہ بالاتفاق حجت ہیں۔ چنانچہ **ذكر لنا**، ''**بلغنا**'' کے معنی میں ہے۔

قوله: ان الحجر يلقى في شفة ......:

شفة: شین کے فتحہ اور کسرہ کے ساتھ ہے۔ اس کی جمع ''شفا''۔ بکسر السین۔ آتی ہے۔ بمعنی طرف.

لا يدرك لها قعرا: یہ تعبیر'' '' **لا يصل الى قعرها**'' سے ابلغ ہے۔

والله لتملأن: صیغۂ مجہول کے ساتھ ہے۔ اور ضمیر جہنم کی طرف عائد ہے۔

آنحضرت ﷺ کے اس فرمودہ کا مطلب یہ ہے کہ خدا کی قسم، جہنم اتنی گہری اور وسیع وعریض ہونے کے باوجود کافروں سے ضرور بالضرور بھری جائے گی۔ جہنم کی وسعتوں کو بیان کرنے کے بعد راوی حضرت عتبہؓ جنت کے احوال ذکر فرما رہے ہیں۔

مصراع سے مراد ''باب'' ہے۔ أي: **ما بين طرفي باب من أبوابها.**

''**عليها**'' کی ''**ها**'' ضمیر اور ''**هو**'' ضمیر کا مرجع ''**ما**'' ہے۔ کیونکہ ''**ما**'' عبارت ہے ''**أماكن**'' سے' اس لئے معنی کا لحاظ کرتے ہوئے ''**ها**'' ضمیر لوٹائی گئی۔ اور لفظ کا لحاظ کرتے ہوئے ''**هو**'' ضمیر لوٹائی گئی۔ (یہ جملہ حالیہ ہے۔) أي: **والحال أن ما بينهما الخ.**

كظيظ: ظائے معجمہ کے ساتھ، بمعنی ''**مملوء**''، یہ فعیل بمعنی ''مفعول'' ہے۔ اور بعض کا کہنا ہے، کہ یہ ''**ممتلیء**'' کے معنی میں ہے۔

الزحام: زائے معجمہ کے کسرہ کے ساتھ، بمعنی کثرت۔

الفصل الثانی:

۵۶۳۰ : عَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ قَالَ قُلْتُ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ مِمَّ خُلِقَ الْخَلْقُ قَالَ مِنَ الْمَآءِ قُلْنَا الْجَنَّةُ مَا بِنَآئُهَا قَالَ لَبِنَةٌ مِّنْ ذَهَبٍ وَّلَبِنَةٌ مِّنْ فِضَّةٍ وَّمِلَاطُهَا الْمِسْكُ الْاَذْفَرُ وَحَصْبَآؤُهَا اللُّؤْلُؤُ وَالْيَاقُوْتُ وَتُرْبَتُهَا الزَّعْفَرَانُ مَنْ يَّدْخُلُهَا يَنْعَمُ وَلَا يَبْأَسُ وَيَخْلُدُ وَلَا يَمُوْتُ وَلَا تَبْلٰی ثِيَابُهُمْ وَلَا يَفْنٰی شَبَابُهُمْ ۔

(رواه احمد والترمذی والدارمی)

اخرجه الترمذی فی السنن ٥٨٠/٤حديث رقم ٢٥٢٦، والدارمی ٤٢٩/٢حديث رقم ٢٨٢١ واحمد فی المسند ٣٠٥/٢۔

ترجمہ: ''حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا کہ میں نے پوچھا یا رسول اللہ! مخلوق کی تخلیق کس چیز سے کی گئی؟ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: پانی سے۔ پھر ہم نے عرض کیا کہ جنت کا سامان تعمیر کیا تھا یعنی اس کی عمارت پتھر یا اینٹ کی ہے یا مٹی اور یا لکڑی وغیرہ کی؟ فرمایا: جنت کی ایک اینٹ سونے کی ہے اور ایک اینٹ چاندی کی اور اس کا گارا (یا وہ مصالحہ جس سے اس کی اینٹیں جوڑی جوڑی گئی ہیں نہایت خوشبودار کستوری کا ہے اس کی کنکریاں (رنگ اور چمک دمک میں) موتی اور یاقوت ہیں اور اس کی مٹی زعفران ہے جو شخص اس (جنت میں) داخل ہوگا' عیش و عشرت میں رہے گا کبھی غمزدہ اور رنجیدہ نہ ہو گا' سدا زندہ رہے گا مرے گا نہیں' نہ اس کا لباس پرانا اور بوسیدہ ہوگا اور نہ اس کی جوانی ختم ہوگی''۔ (احمد' ترمذی' دارمی)

تشریح: قوله:قال :من الماء:

الماء: سے مراد ''نطفہ'' ہے۔ یہ بظاہر، اللہ جل شانہ کے اس قول سے مقتبس ہے:

﴿وجعلنا من الماء کل شيء حي﴾ [الانبياء:٣٠] ''اور ہم نے (بارش کے) پانی سے جاندار چیز کو بنایا''۔

(اس آیت میں) ''جعل'' معنیٰ ''خلق'' ہے اور ''حي'' سے مراد ''حیوان'' (ذی حیات) ہے۔ أی خلقنا من الماء کل حیوان (یعنی ہم نے ہر حیوان کو پانی سے پیدا کیا) اس کی دلیل اللہ جل شانہ کا یہ قول ہے: ﴿والله خلق کل دابة من ماء﴾ [النور:٤٥] ''اور اللہ ہی نے ہر ہر چلنے والے جاندار کو (بری یا بحری) پانی سے پیدا کیا'' اور یہ بایں طور کہ پانی اس کے مواد کا جزو اعظم ہے۔''

یا اس وجہ سے ہے کہ ہر مخلوق (حیوانات) کی بہت بڑی ضرورت پانی ہی ہے۔ اور ہر حیوان خواہ انسان ہو یا غیر انسان سب سے زیادہ فائدہ پانی ہی سے حاصل کرتا ہے۔ (آیت میں لفظ) ''حیّ'' کو منصوب بھی پڑھا گیا ہے'' کل '' کی صفت ہونے کی وجہ سے' یا مفعول ثانی ہونے کی وجہ سے، اور ظرف لغو ہے۔ اور (یہاں) ''شیء'' سے مراد حیوان ہے۔

قوله:قلنا الجنة ما بمائها...... وتربتها الزعفران:

قلنا: اور ایک ضعیف نسخہ میں '' قلت'' ہے۔

لبنة من ذهب ولبنة من فضة: دو انواع کا ذکر اس وجہ سے ہے کہ جنتیں دو ہوں گی۔ جیسا کہ ما قبل میں گزر چکا ہے۔

ملاطها: میم کے کسرہ کے ساتھ، وہ مصالحہ اور گارا جس سے اینٹیں جوڑی جاتی ہیں۔(یعنی چنائی کی جاتی ہے۔)
الأذخر: تیز خوشبودار، صاحب النہایہ فرماتے ہیں: الملاط الطین الذی یجعل بین ساقتی البناء یملط به الحائط ای یخلط.

قوله: حصباؤها اللؤلؤ والمرجان:

یعنی جنت کی نہروں کی چھوٹی چھوٹی کنکریاں رنگت اور صفائی میں موتی اور یاقوت کی طرح ہیں۔

قوله: وتربتها الزعفران:

اس کی مٹی زعفران کی طرح زرد اور خوشبودار ہے۔ سفید، سرخ، اور زرد یہ تینوں رنگ، رنگہائے زیب وزینت شمار کئے جاتے ہیں، اس وجہ سے ان تینوں رنگوں کو جنت کی مختلف چیزوں میں سمو دیا گیا ہے۔ اور اس زینت کی تکمیل کیلئے سرسبز درخت ہوں گے۔ اور چونکہ سیاہ رنگ دل کو مغموم کرتا ہے، چنانچہ یہ رنگ اہل عناد ہی کے ساتھ مخصوص ہوگا۔

قوله: من یدخلها ینعم......:

"ینعم" اور "یبأس" دونوں مفتوح العین ہیں۔ تورپشتی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: مصابیح اور دیگر بعض کتب حدیث میں ("یبأس" کی جگہ) یبؤس، ہمزہ کے ضمہ کے ساتھ ہے، کیونکہ واؤ ضمہ پر دلالت کرتا ہے۔ کہا جاتا ہے بأس الأمر یبؤس اذا اشتد: اور بأس یبأس اذا افتقر غلطی درحقیقت رسم الخط میں ہے، اور درست لفظ "لا یبأس" ہے۔(انتہیٰ)
قاموس میں لکھتے ہیں: البأس: العذاب والشدة فی الحرب. "بأس" اور "بؤس" بھی اسی سے مشتق ہیں، باب کرم اور سمع سے استعمال ہوتے ہیں، بمعنی اشتدت حاجته، لفظ "بأساء" بھی اسی سے نکلا ہے۔
یتجدد: یعنی ہمیشہ ہمیشہ کی بقاء حاصل ہوگی۔
لا تبلی: تاء فوقانیہ کے فتحہ کے ساتھ ہے۔ یعنی نہ ان کا لباس پرانا ہوگا، اور نہ ہی دیگر ساز وسامان پرانا ہوگا۔
ولا یفنی شبابهم: یعنی نہ تو وہ بوڑھے ہوں گے، نہ بوڑھاپے کے باعث سٹھیائیں گے۔ اور نہ مرور زمان سے ان میں کسی قسم کا کوئی تغیر واقع ہوگا، کیونکہ وہ پیدا ہی وہاں کی ابدی نعمتوں کے لیے کئے گئے ہیں۔

۵۶۳۱: وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَا فِي الْجَنَّةِ شَجَرَةٌ اِلَّا وَسَاقُهَا مِنْ ذَهَبٍ.

(رواه الترمذی)

اخرجه الترمذی فی السنن ۵۷٦/٤ حدیث رقم ۲۵۲۵۔

ترجمہ: "حضرت ابوہریرہؓ نے بیان فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: جنت میں موجود ہر درخت کا تنا سونے کا ہوگا"۔(ترمذی)

تشریح: البتہ ان درختوں کی ٹہنیاں اور شاخیں مختلف قسموں کی ہوں گی۔ کوئی سونے کی ہوگی، تو کوئی چاندی کی، کوئی یاقوت کی، کوئی زمرد کی، کوئی لؤلؤ کی، کوئی مرصع وملمعہ ہوگی، طرح طرح کے پھولوں اور شگوفوں اور اصناف انوار سے مزین ہو

گی، اور ان ٹہنیوں کے اوپر طرح طرح کے پھل اور میوہ جات ہونگے، اور نیچے پانی کی نہریں بہتی ہوں گی۔

۵۶۳۲ : وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ فِي الْجَنَّةِ مِائَةَ دَرَجَةٍ مَّا بَيْنَ كُلِّ دَرَجَتَيْنِ مِائَةُ عَامٍ. (رواه الترمذی وقال هذا حديث حسن غريب)

اخرجه الترمذی فی السنن ۵۸۲/٤ حديث رقم ۲۵۲۹۔

ترجمہ: ”حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا کہ رسول اللہ رضی اللہ عنہ نے ارشاد فرمایا: جنت میں سو درجے ہیں اور ہر دو درجوں کے درمیان سال کی مسافت کے بقدر فاصلہ ہے۔ اس روایت کو ترمذی نے نقل کیا ہے اور انہوں نے کہا ہے کہ یہ حدیث غریب ہے“۔

تشریح: قال...... درجة:

ابن الملکؒ فرماتے ہیں: ”المائة“ سے کثرت مراد ہے اور ”الدرجة“ سے ”مرقاۃ (سیڑھی)“ مراد ہے۔

میں کہتا ہوں: زیادہ ظاہر یہ ہے کہ ”درجات“ سے ”مراتب عالیہ“ مراد ہیں۔ اللہ جل شانہ کا فرمان ہے: ﴿هم درجات عند الله﴾ [آل عمران ۔۱۶۳] ”یہ مذکورین درجات میں مختلف ہوں گے اللہ تعالیٰ کے نزدیک“ یعنی وہ لوگ اپنے رب کے ہاں، اپنے اعمال کے اعتبار سے مختلف درجوں میں ہوں گے، جیسا کہ اہل نار، کہ وہ اپنی شدت کفر کے اعتبار سے جہنم کے مختلف درجات میں ہوں گے۔ جیسا کہ اس مفہوم کی طرف اللہ جل شانہ کا یہ فرمان اشارہ کر رہا ہے: ﴿اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ فِي الدَّرْكِ الْاَسْفَلِ مِنَ النَّارِ﴾ [النساء: ۱٤٥] ”بلاشبہ منافقین دوزخ کے سب سے نیچے کے طبقہ میں جائیں گے۔“ اس کی تائید اگلی حدیث سے بھی ہوتی ہے، اور اس اگلے جملہ سے بھی: ما بين كل درجتين مائة عام یعنی ہر دو درجوں کے درمیان سو سال کی مسافت ہے۔

۵۶۳۳ : وَعَنْ اَبِيْ سَعِيْدٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ فِي الْجَنَّةِ مِائَةَ دَرَجَةٍ لَوْ اَنَّ الْعَالَمِيْنَ اجْتَمَعُوْا فِيْ اِحْدَاهُنَّ لَوَسِعَتْهُمْ. (رواه الترمذی وقال هذا حديث)

اخرجه الترمذی فی السنن ۵۸۳/٤ حديث رقم ۲۵۳۲، واحمد فی المسند ۲۹/۳۔

ترجمہ: ”حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: جنت میں سو درجے ہیں کہ اگر ان میں سے کسی ایک درجہ میں تمام جہانوں والے جمع ہو جائیں تو وہ سب کے لئے کافی ہوگا“۔ اس روایت کو ترمذی نے نقل کیا ہے اور انہوں نے کہا ہے کہ یہ حدیث غریب ہے۔

تخریج: اس حدیث کو ابن حبان نے دوسرے طریق سے روایت کیا ہے۔ اور اس کو صحیح قرار دیا ہے۔

۵۶۳۴ : وَعَنْهُ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِيْ قَوْلِهٖ تَعَالٰى وَفُرُشٍ مَّرْفُوْعَةٍ قَالَ ارْتِفَاعُهَا لَكَمَا بَيْنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ مَسِيْرَةُ خَمْسِ مِائَةِ سَنَةٍ (رواه الترمذی وقال حديث غريب)

اخرجه الترمذی فی السنن ۵۸٦/٤ حديث رقم ۲۵٤۰، واحمد ی المسند ۷۵/۳۔

ترجمہ: ”حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا کہ رسول اللہ نے حق تعالیٰ کے اس فرمان: وَفُرُشٍ مَّرْفُوْعَةٍ

(اور اونچے اونچے فرش اور بچھونے ہوں گے) کی تفسیر میں یہ بات ارشاد فرمائی "ان بچھونوں کی بلندی اس قدر ہوگی جتنی آسمان اور زمین کے مابین کی مسافت ہے یعنی پانچ سو سال کی مسافت کا راستہ"۔ اس روایت کو ترمذی نے نقل کیا ہے اور انہوں نے کہا ہے کہ یہ حدیث غریب ہے"۔

تشریح: قوله: ارتفا عها لكما الخ : ارتفاعها: ضمیر "فرش" کی طرف لوٹ رہی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جنت کے درجوں میں جو فرش اور بچھونے ہوں گے، وہ اتنے اتنے اونچے ہونگے کہ بظاہر ایسے نظر آئے گا، کہ وہ آسمان تک بلند ہیں۔

یا "درجات" کی طرف لوٹ رہی ہے، اور دوسری تقدیر پر مطلب یہ ہوگا، کہ جن اونچے اونچے بچھونوں کا ذکر ہے، وہ جنت کے ان درجات میں بچھے ہونگے جو زمین سے آسمان تک کی مسافت کے بقدر بلند ہوں گے۔

لكما: اس کی ترکیب میں تین احتمال ہیں: اور خبر ہے "ارتفاعها" مبتدا کی۔

① یہ خبر ثانی ہے۔ ② یہ بدل ہے۔ ③ یہ بیان ہے۔

مبتدا کی خبر پر لام کے داخل ہونے کی نظیر شاعر کا یہ قول ہے:

اُم الحليس لعجوز شهرية ☆ ترضى من اللحم بعظم الرقبة

"ام الحلیس کی ایک بہت ہی بوڑھی عورت ہے وہ گوشت کی بجائے گردن کی ہڈی پر راضی ہو جاتی ہے۔"

الشهربة: بڑی بوڑھی، بوڑھی کھوسٹ، اور "شهرة" بھی اسی کے مثل ہے۔ جیسا کہ صاحب صحاح کا کہنا ہے۔

"لكما": میں کاف اسم ہے۔ زجاجؒ اس آیت کریمہ ﴿ان هذان لساحران﴾ [طه: ٦٣] کے بارے میں فرماتے ہیں، متقدمین نحاۃ کا کہنا ہے کہ ضمیر محذوف ہے: ای: انه هذان لساحران، ان نحاۃ کا کہنا ہے کہ اصل تو یہ ہے کہ لام مبتدا پر داخل ہو، البتہ خبر پر داخل کرنا بھی صحیح ہے۔

صاحب کشاف اس آیت کریمہ: ﴿فرش مرفوعة﴾ کے بارے میں فرماتے ہیں: أي: نضدت حتى ارفعت۔ أو مرفوعة على الأسرة، بعض کا کہنا ہے، کہ "فرش" سے مراد عورتیں ہیں کیونکہ عورت کیلئے کبھی "فراش" کا لفظ بھی کنایۃً استعمال ہوتا ہے۔ اور اس کی دلیل اللہ جل شانہ کا یہ فرمان ہے: ﴿انا أنشأناهن انشاء﴾ [الواقعة: ٣٥] "ہم نے (وہاں کی) ان عورتوں کو خاص طور پر بنایا ہے" پہلی تفسیر کے مطابق ضمیر عورتوں کی طرف لوٹ رہی ہے۔ کیونکہ "فراش" کا ذکر "صاحب فراش" (یعنی عورتوں) پر دلالت کرتا ہے۔

چنانچہ مطلب یہ ہوگا: هن مرفوعة على الفرش او السرر مراد یہ ہے کہ حورانِ جنت، حسن و جمال میں دنیا کی عورتوں سے فائق ہونگی، جیسا کہ بعض کا کہنا ہے۔ کیونکہ ہر صاحب فضیلت رفیع القدر ہوتا ہے۔

لیکن ایک حدیث سے یہ ثابت ہوتا ہے، کہ جنت میں مؤمن عورتیں حوروں سے بھی زیادہ حسین و جمیل ہونگی، اور ان کو حوروں پر فضیلت اس نماز روزے کے سبب حاصل ہوگی، جو وہ دنیا میں کیا کرتی تھیں۔

تورپشتی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: [فرش مرفوعة] کی یہ تفسیر: ارتفاع الفرش المرفوعة في الدرجات، وما بين كل درجتين من الدرجات، كما بين السماء والأرض، جنت کے درجات میں بچھے ہوئے بچھونوں کی بلندی اور درجات

میں سے ہر دو درجوں کے درمیان کا فاصلہ اتنا ہے جتنا آسمانوں زمین کے درمیان کا فاصلہ ہے۔اس حدیث کے ذیل میں ذکر کردہ تمام وجوہ معانی سے اُوثق واُعرف ہے،اور اس کی تائید اس حدیث سے ہوتی ہے:

ان للجنة مائة درجة ما بين كل درجتين كما بين السماء والأرض.

امام طیبیؒ نے اس کلام کا معارضہ کیا ہے۔میں اس کلام کو ذکر کرنے سے اعراض کرتے ہوئے ساری بحث کو چھوڑ رہا ہوں۔

اسنادی حیثیت:امام ترمذیؒ نے اس حدیث کو موقوفاً ذکر کیا ہے۔

۵۶۳۵:وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ اَوَّلَ زُمْرَةٍ يَّدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ضَوْءُ وُجُوْهِهِمْ عَلٰى مِثْلِ ضَوْءِ الْقَمَرِ لَيْلَةَ الْبَدْرِ وَالزُّمْرَةُ الثَّانِيَةُ عَلٰى مِثْلِ اَحْسَنِ كَوْكَبٍ دُرِّيٍّ فِي السَّمَآءِ لِكُلِّ رَجُلٍ مِّنْهُمْ زَوْجَتَانِ عَلٰى كُلِّ زَوْجَةٍ سَبْعُوْنَ حُلَّةً يُرٰى مُخُّ سَاقِهَا مِنْ وَّرَآئِهَا.

(رواه الترمذی)

اخرجه الترمذی فی السنن ۵۸٤/٤ حدیث رقم ۲۵۳۵، وابن ماجه ۱٤٤۹/۲ حدیث رقم ٤۳۳۳ والدارمی ٤۳۳/۲ حدیث رقم ۲۸۳۲، واحمد فی المسند ۱٦/۳۔

ترجمہ:''حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:روز قیامت سب سے پہلی وہ جماعت جو جنت میں داخل ہوگی (یعنی جماعت انبیاء علیہم السلام) ان کے چہروں کی تابانی اور چمک چودھویں رات کے چاند کی روشنی کی مانند ہوگی اور دوسری جماعت کے لوگ (جو انبیاء کے بعد جنت میں داخل ہوں گے اور وہ اولیاء صلحاء ہیں) ان کے چہروں کی چمک دمک آسمان کے سب سے زیادہ روشن اور چمکدار ستارے کی طرح تابندہ ہوگی۔نیز ان (جنتیوں) میں سے ہر شخص کی دو بیویاں ہوں گی اور ہر بیوی کے جسم پر (لباس کے) ستر سوٹ ہوں گے (اور وہ دونوں بیویاں اتنی صاف وشفاف اور حسین وجمیل ہوں گی کہ) ان کی پنڈلیوں کے اندر کا گودا ستر جوڑوں کے باہر سے دکھائی دے رہا ہوگا''۔(ترمذی)

تشریح:قوله :ان اول زمرة يدخلون......:

جنت میں داخل ہونے والی یہ پہلی جماعت انبیاء کی ہوگی۔

قوله:لزمرة يدخلون...... :چودھویں رات کے چاند سے تشبیہ اس لیے دی کہ وہ انتہائی روشن وچمکدار ہوتا ہے،گویا کہ وہ اپنے جوبن پر ہوتا ہے۔

زمرہ ثانیہ سے مراد اُولیاء وصلحاء ہیں۔ہر ایک کے چہرہ کا نور اپنے مراتب کے اعتبار سے ہوگا۔

حلة: حاء کے ضمہ اور لام کی تشدید کے ساتھ،'' حلة '' کا اطلاق عام طور پر دو کپڑوں پر ہوتا ہے۔

يرى: رؤیت بصری مراد ہے۔**مخ ساقها من ورائها:**

ہر بیوی کی پنڈلی کی ہڈی کا گودا ان کے اعضاء اور کپڑوں کی کمال لطافت کی وجہ سے لباس کے ستر جوڑوں کے اوپر نظر آتا ہوگا۔

مذکورہ بالا حدیث اور اس حدیث: أدنى أهل الجنة من له اثنتان وسبعون زوجة وثمانون ألف خادم، کے درمیان تطبیق یوں ہوگی، کہ اس حدیث میں جن دو بیویوں کا ذکر ہے، وہ تو اس صفت سے متصف ہونگی کہ ان کی پنڈلیوں کے اندر کا گودا ان کے لباس کے ستر (۷۰) جوڑوں کے اوپر سے بھی نظر آئے گا، اور یہ اس بات کے منافی نہیں کہ ان دو بیویوں کے علاوہ کثیر تعداد میں جو حوریں عطاء ہوں گی وہ اس درجہ کمال وخوبصورتی وغیرہ کو پہنچی ہوئی نہ ہونگی۔

زیادہ ظاہر یہ ہے کہ ہر جنتی کو دنیاوی عورتوں میں سے دو دو بیویاں ملیں گی، اور ادنی سے ادنی جنتی کو فی الجملہ بہتر (۷۲) بیویاں ملیں گی، یعنی دو بیویاں دنیا کی عورتوں میں سے ملیں گی، اور ستر (۷۰) بیویاں جنت کی حوروں میں سے ملیں گی۔ واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم۔

تخریج: اس حدیث کو امام احمدؒ نے بھی اپنی مسند میں ذکر کیا ہے۔

۵۶۳۶ : وَعَنْ اَنَسٍ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ يُعْطَى الْمُؤْمِنُ فِي الْجَنَّةِ قُوَّةَ كَذَا وَكَذَا مِنَ الْجِمَاعِ قِيْلَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اَوَيُطِيْقُ ذٰلِكَ قَالَ يُعْطَى قُوَّةَ مِائَةٍ (رواه الترمذی)

اخرجه الترمذی فی السنن ۵۸٤/٤ حدیث رقم ۲۵۳٦۔

ترجمہ: ”حضرت انس رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ نبی اقدس ﷺ نے فرمایا: جنت میں مومن کو مباشرت کی اتنی اتنی قوت عنایت فرمائی جائے گی۔ پوچھا گیا یا رسول اللہ! کیا ایک مرد اتنی عورتوں سے جنسی اختلاط کی طاقت رکھے گا؟ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: (جنت میں) ایک آدمی کو سو مردوں کی قوت دی جائے گی (اور جب اس کو اتنی زیادہ قوت مردانگی مل جائے گی تو پھر وہ کئی کئی عورتوں سے مباشرت کی قوت کیوں نہ رکھ سکے گا“۔ (ترمذی)

تشریح: قوله: يعطى المؤمن في الجنة: قوة كذا وكذا من الجماع: یہ کنایہ ہے، کہ اس کو کئی عورتوں مثلاً دس عورتوں سے جماع کی قوت عطاء کی جائے گی۔

أو يطيق ذلك: واؤ کے فتحہ کے ساتھ ہے، ”ذلك“ سے ”كذا وكذا من الجماع“ کے مضمون جملہ کی طرف اشارہ ہے۔

يعطى قوة مائة: اس کی تمیز محذوف ہے۔ أي مائة رجل. (كذا قيل) او مائة مرة من الجماع. (سو مرتبہ جماع) اور مطلب یہ ہے کہ جب جنتی کو اس قدر قوت حاصل ہوگی تو وہ اس قدر مباشرت پر بھی قادر ہوگا۔

الجامع کی روایت کے الفاظ یہ ہیں: يعطى المؤمن في الجنة قوة مائة في النساء۔

اس حدیث کو امام ترمذیؒ اور ابن حبان نے حضرت انسؓ سے نقل کیا ہے۔

جامع کی ایک اور روایت میں یہ الفاظ وارد ہوئے ہیں:

ان الرجل من أهل الجنة ليعطى قوة مائة رجل في الأكل والشرب والشهوة والجماع، حاجة أحدهم عرق يفيض من جلده، فاذا بطنه قد ضمر.

”اہل جنت میں سے ایک مرد کو کھانے پینے، شہوت اور جماع کی قوت سو مردوں کی قوت کے برابر ہوگی“ اس حدیث

کو امام طبرانی نے حضرت زید بن ارقم رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے۔

۵۶۳۷ : وَعَنْ سَعْدِ بْنِ اَبِیْ وَقَّاصٍ عَنِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اَنَّهٗ قَالَ لَوْ اَنَّ مَا یُقِلُّ ظُفُرٌ مِمَّا فِی الْجَنَّةِ بَدَا لَتَزَخْرَفَتْ لَهٗ مَا بَیْنَ خَوَافِقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَلَوْ اَنَّ رَجُلًا مِّنْ اَهْلِ الْجَنَّةِ اَطَّلَعَ فَبَدَا اَسَاوِرُهٗ لَطَمَسَ ضَوْئُهٗ ضَوْءَ الشَّمْسِ كَمَا تَطْمِسُ الشَّمْسُ ضَوْءَ النُّجُوْمِ (رواه الترمذی وقال هذا حدیث غریب)

اخرجه الترمذی فی السنن ٤/٥٨٥ حدیث رقم ٢٥٣٨، واحمد فی المسند ١/١٦٩۔

ترجمہ: ”حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ نبی اکرم ﷺ سے روایت نقل فرماتے ہیں کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ”جنت کی اشیاء (یعنی زینت و آرائش کی اشیاء) میں سے اگر ناخن کے بقدر بھی کوئی چیز دنیا میں ظاہر ہو جائے تو آسمان و زمین کے کناروں کی درمیان تمام دنیا اس کی وجہ سے بارونق ہو جائے اور حقیقت یہ ہے کہ اگر جنتیوں میں سے کوئی شخص دنیا میں جھانک لے اور اس کے (ہاتھوں کے) کنگن نمایاں ہو جائیں تو ان کی چمک دمک سورج کی روشنی کو ماند کر دے جیسا کہ سورج ستاروں کی روشنی کو ماند کر دیتا ہے۔ اس روایت کو ترمذی نے نقل کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ حدیث غریب ہے۔

تشریح: قوله: لو أن مایقل۔۔۔ والارض:

یقل: یاء کے ضمہ، قاف کے کسرہ اور لام کی تشدید کے ساتھ ہے۔

ظفر: ظاء اور فاء دونوں کے ضمہ کے ساتھ، نیز فاء کے سکون کے ساتھ ہے۔

امام طیبیؒ فرماتے ہیں کہ ”ما“ موصولہ ہے، اور عائد محذوف ہے۔ أی: ما یقله.

قاضیؒ فرماتے ہیں: أی قدر ما مستقل بحمله ظفر ویحمل علیها.

مما فی الجنة: ”ما“ کنایہ ہے نعیم (جنت کی نعمتوں) سے۔

له: لام سببیہ ہے۔ ای لذلك المقدار وسببه من الاعتبار۔

خوافق: بمعنی اطراف، اور بعض نے اس کا معنی ”منتہیٰ“ بیان کیا ہے۔ بعض کا کہنا ہے کہ ”خافقان“ سے مراد مشرق ومغرب ہیں۔ (کذا ذکرہ شارح)۔ قاضیؒ فرماتے ہیں: خوافق، ”خافقة“ کی جمع ہے بمعنی جانب۔ ”خافقة“ اصل میں اس جانب کو کہتے ہیں جس سے ریاح خارج ہوتی ہیں۔ ”خفقان“ کی وجہ سے، اور مشرق ومغرب کو بھی خافقان کہتے ہیں۔

امام طیبیؒ نے فرمایا: فعل کو مونث اس وجہ سے ذکر کیا ہے کہ ”ما“ کنایہ ہے ”أماکن“ سے، جیسا کہ اللہ جل شانہ کے اس فرمان میں ہے: ﴿ اَضَآءَتْ مَا حَوْلَهٗ ﴾ [البقرة: ١٧] ”جب روشن کر دیا اس آگ نے اس شخص کے گرداگرد کی چیزوں کو اپنی حالت میں سلب کر دیا“ یہ ایک توجیہ ہے۔

قوله: ولو ان رجلا من ......:

اطلع: طاء کی تشدید کے ساتھ۔
أساور: " أسورة " کی جمع ہے اور أسورة، " سوار " کی جمع ہے۔"اساور" سے مفرد (یعنی "سوار") کے معنی مراد ہیں۔ چنانچہ "تیسیر الاصول" میں " فبدا سواره " کے الفاظ ہیں۔
لما تطمس الشمس: اور ایک نسخہ میں " کما یطمس ضوء الشمس " ہے۔
اس حدیث کا مفہوم کئی مختلف احادیث کے ذیل میں گزر چکا ہے۔ بعض صحیح بخاری کی ہیں، اور بعض صحیحین میں ہیں۔ الجامع میں کی روایت میں یہ الفاظ ہیں: ان الرجل من أهل عليين ليشرف على أهل الجنة فتضئ الجنة لوجهه كانه كوكب دريّ۔
اس حدیث کو امام ابوداؤدؒ نے ابوسعید سے روایت کیا ہے۔

۵۶۳۸ : وَعَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَهْلُ الْجَنَّةِ جُرْدٌ مُّرْدٌ كَحْلٰى لَا يَفْنٰى شَبَابُهُمْ وَلَا يَبْلٰى ثِيَابُهُمْ. (رواه الترمذی والدارمی)

اخرجه الترمذی فی السنن ٥٨٦٥ حديث رقم ٢٥٣٩، والدارمی ٤٣١/٢ حديث رقم ٢٨٢٥ واحمد فی المسند ٢٤٣/٥۔

ترجمہ: "حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: اہل جنت کے جسم پر بھی بال نہ ہوں گے اور ڈاڑھی کے بال بھی نہ ہوں گے' ان کی آنکھیں سرگیں ہوں گی' ان کی جوانی کبھی ختم نہ ہوگی اور ان کے کپڑے کبھی بوسیدہ اور پرانے نہیں ہوں گے"۔ (ترمذی' دارمی)

تشریح: قوله: أهل الجنة جرد مرد ......:
جرد: جیم کے ضمہ، اور راء کے سکون کے ساتھ، " أجرد " کی جمع ہے۔ " أجرد "، اس شخص کو کہتے ہیں جس کے جسم پر بال نہ ہوں، " أجرد " کی ضد " أشعر " آتی ہے۔
مرد: "امرد" کی جمع ہے۔ " امرد" کے معنی ہیں وہ لڑکا کہ جس کی ٹھوڑی پر کوئی بال نہ ہو۔ اور کبھی "امرد" سے مراد "حسین" ہوتا ہے۔
کحلی: کاف کے فتحہ کے ساتھ، بروزن مرضی بمعنی فعیل۔ یعنی " مکحول " کے معنی میں ہے۔ جس کی پلکوں کی جڑیں پیدائشی طور پر سیاہ ہوں (اور یوں لگتا ہو کہ اس نے آنکھوں میں سرمہ لگا رکھا ہے۔) [کذا قالہ شارح]۔
صاحب النہایہ فرماتے ہیں: الكحل: کاف اور حاء کے فتحہ کے ساتھ: سواد فی أجفان العین خلقة: (آنکھوں کے پپوٹوں میں موجود فطری سیاہی کو کہتے ہیں) اور اس صفت سے متصف شخص کو " أکحل " اور " کحیل " کہتے ہیں۔ اور "کحیل" کی جمع " کحلی " آتی ہے۔

۵۶۳۹ : عَنْ مُعَاذِ بْنِ جَبَلٍ اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ يَدْخُلُ اَهْلُ الْجَنَّةِ الْجَنَّةَ جُرْدًا مُّرْدًا مُكَحَّلِيْنَ اَبْنَآءَ ثَلٰثِيْنَ اَوْ ثَلٰثٍ وَّثَلٰثِيْنَ سَنَةً (رواه الترمذی

اخرجه الترمذی فی السنن ٥٨٩/٤ حدیث رقم ٢٥٤٥، والدارمی فی السنن ٤٣١/٢ حدیث رقم ٢٨٢٦، واحمد فی المسند ٢٤٣/٥۔

ترجمہ: ''حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ نبی اقدس ﷺ نے ارشاد فرمایا: اہل جنت جنت میں اس حال میں داخل ہوں گے کہ ان کا جسم بالوں کے بغیر ہوگا بے داڑھی کے نوجوان ہوں گے ان کی آنکھیں سرگیں ہوں گی اور تیں یا تینتیس سال کی عمر کے معلوم ہوں گے''۔ (ترمذی)

تشریح: قوله:یدخل اهل الجنة الجنة ......:

مکحلین: یعنی ان کی آنکھیں پیدائشی طور پر سرگین ہوں گی۔

سرگین تو نہ ہونگی، البتہ سرگین معلوم ہوں گی۔

او ثلاث: (مضاف محذوف ہے۔) أی: أو أبناء ثلاث، ''او'' راوی کے شک کو ظاہر کر رہا ہے۔

اسنادی حیثیت: بقول بعض امام ترمذیؒ نے اس حدیث کو ''حسن'' بھی قرار دیا ہے۔

۵۶۴۰ : وَعَنْ أَسْمَآءَ بِنْتِ أَبِي بَكْرٍ قَالَتْ سَمِعْتُ رَسُولَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَذُكِرَلَهُ سِدْرَةُ الْمُنْتَهٰى قَالَ يَسِيْرُ الرَّاكِبُ فِي ظِلِّ الْفَنَنِ مِنْهَا مِائَةَ سَنَةٍ أَوْ يَسْتَظِلُّ بِظِلِّهَا مِائَةُ رَاكِبٍ شَكَّ الرَّاوِيْ فِيْهَا فِرَاشُ الذَّهَبِ كَاَنَّ ثَمَرَهَا الْقِلَالُ (رواه الترمذی وقال هذا حدیث غریب)

اخرجه الترمذی فی السنن ٥٨٧/٤ حدیث رقم ٢٥٤١۔

ترجمہ: ''حضرت اسماء بنت ابوبکر رضی اللہ عنہا نے بیان فرمایا کہ جس وقت رسول اللہ ﷺ کے سامنے سدرۃ المنتہیٰ کا تذکرہ کیا گیا' میں نے آپ ﷺ کو یہ ارشاد فرماتے ہوئے سنا کہ (سدرۃ المنتہیٰ ایسا درخت ہے کہ) کوئی (تیز رفتار) سوار سو برس تک اس کی شاخوں کے سائے تلے چلتا رہے یا یہ فرمایا کہ اس کے سائے میں بیک وقت سو سوار سایہ حاصل کر سکیں' اس درخت پر سونے کی ٹڈیاں ہیں اس درخت کا پھل مٹکوں کے برابر ہے۔ اس روایت کو ترمذی نے نقل کیا ہے اور انہوں نے کہا ہے کہ یہ حدیث غریب ہے''۔

تشریح: قوله: وذكرله سدرة المنتهى: جملہ حالیہ ہے۔ أی: والحال أنه ذكر لرسول الله ﷺ.

بعض کا بیان ہے، کہ ''سدرۃ المنتہیٰ'' ساتویں آسمان میں ہے، عرش کے دائیں طرف ہے، اور اس کا پھل موضع ہجر کے مٹکوں کے برابر ہے۔

''المنتهیٰ'' اسم ظرف کا صیغہ ہے، بمعنی ''موضع الانتهاء'' وہ جگہ جس پر انتہاء ہے۔ یا ''انتہاء'' مصدر کے معنی میں ہے۔ گویا کہ یہ درخت جنت کے انتہائی کنارے پر واقع ہے۔ اور بعض کا کہنا ہے کہ اس کے آگے کسی کو بھی جانے کا حکم نہیں ہوا۔ اس کے پرے کا کسی کو بھی کچھ بھی علم نہیں' نہ ملائکہ کو اور نہ کسی اور کو۔

قوله:یسیرا الراکب مائة :

الفنن: بمعنی ''غصن'' اس کی جمع ''افنان'' ~~آتی ہے~~۔ اسی معنی میں اللہ جل شانہ کا یہ فرمان ہے:

﴿ذواتا أفنان﴾ [الرحمٰن:٤٨] ''(اور وہ) دونوں باغ کثیر شاخوں ہوں گے'' اس کی جمع ''فنون'' آتی ہے۔
(كذا حققه الراغب)

منہا: ضمیر ''سدرۃ'' کی طرف عائد ہے۔
پہلا جملہ زیادہ بلیغ ہے۔ اور ممکن ہے، کہ طول وعرض میں مبالغہ مقصود ہو۔ (اس صورت میں) ''أوْ'' برائے تخییر ہے، یا برائے تنویع ہے، کہ اختلاف اماکن پر محمول ہو، یا بعض اشخاص کے اعتبار سے ہے۔

قولہ فیھا فراش الذھب ......:
فراش: فاء کے فتحہ کے ساتھ، '' فراشۃ '' کی جمع ہے۔ بعض کا کہنا ہے، کہ '' فراش الذھب '' اس آیت کریمہ کی تفسیر ہے: ﴿اذ يغشى السدرة ما يغشى﴾ [النجم-١٦]، حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے اس آیت کریمہ کی تفسیر ''یغشاھا فراش من ذھب'' بیان کی ہے۔ ان کا مستدل بھی یہی حدیث ہے۔ امام ابوالفتح العجلیؒ اپنی تفسیر میں لکھتے ہیں: شاید یہ مراد ہے، کہ اس درخت پر جو نورانی فرشتے ہیں، ان کے پر اس طرح چمکتے اور جھلملاتے ہیں، جیسے پروانوں کے پر چمکتے ہیں۔ گویا کہ وہ ''مذہبہ'' ہیں۔ یعنی (سونے سے ملمع کیئے ہوئے)
القلال: قاف کے کسرہ کے ساتھ۔ ''قلۃ'' کی جمع ہے۔ یعنی گویا اس کے پھل ''ھجر'' کے گھڑوں کی مانند بڑے بڑے ہیں۔

۵۶۴۱ : وَعَنْ اَنَسٍ قَالَ سُئِلَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَا الْكَوْثَرُ قَالَ ذٰلِكَ نَهْرٌ اَعْطَانِيْهِ اللّٰهُ يَعْنِيْ فِي الْجَنَّةِ اَشَدُّ بَيَاضًا مِنَ اللَّبَنِ وَاَحْلٰى مِنَ الْعَسَلِ فِيْهِ طَيْرٌ اَعْنَاقُهَا كَاَعْنَاقِ الْجُزُرِ قَالَ عُمَرُ اِنَّ هٰذِهٖ لَنَاعِمَةٌ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَكَلَتُهَا اَنْعَمُ مِنْهَا. (رواه الترمذي)

اخرجه الترمذي في السنن ٥٨٧/٤ حديث رقم ٢٥٤٢، وابن ماجه في السنن ١٤٥٠/٢ حديث رقم ٤٣٣٤، واحمد في المسند ٢٢١/٣۔

ترجمہ: '' حضرت انس رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ سے دریافت کیا گیا کہ کوثر کیا ہے؟ تو آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا: وہ ایک نہر ہے جو اللہ تعالیٰ نے مجھے عنایت فرمائی ہے یعنی جنت میں۔ اس نہر کا پانی دودھ سے زیادہ سفید اور شہد سے زیادہ میٹھا ہے اس میں ایسے پرندے ہیں جن کی گردنیں اونٹ کی گردنوں کی طرح لمبی ہیں''۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے پوچھا کہ وہ پرندے تو بہت خوش عیش وخوشحال؟ آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا: ان پرندوں کو کھانے والے (جنتی) ان پرندوں سے بھی زیادہ خوشحال وخوش عیش ہوں گے''۔ (ترمذی)

تشریح: قولہ: ذاك نھر --- من العسل:
نھر: ہاء کے فتحہ، اور سکون کے ساتھ۔
الجزر: جیم کے ضمہ اور زاء کے ساتھ، ''جزور'' کی جمع ہے۔
کوثر پانی کی ایک نہر ہے۔ اس کے دونوں طرف ایک ایک حوض ہے۔ ایک حوض میدان محشر میں ہے، اور دوسرا حوض جنت

میں ہے" کوثر" کثرة سے ماخوذ ہے، کوثر کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ اس نہر کا اکثر حصہ جنت میں ہے۔ یا یہ کہ مآل کے اعتبار سے نہر کوثر مکمل طور پر جنت میں ہے۔

أشد بياضا من اللبن وأحلى من العسل: اس میں اشارہ ہے کہ اس نہر کا پانی لبن اور عسل کے مخصوص اوصاف خوشگواری اور لذت دونوں کو جامع ہوگا۔ (اس حدیث میں) اس آیت کریمہ کی طرف اشارہ ہے:

﴿وفيها ما تشهيه الأنفس وتلذ الأعين﴾ [الزخرف:۷۱] "اور وہاں وہ چیزیں ملیں گی جن کو جی چاہے گا اور جن سے آنکھوں کو لذت ہوگی۔

قوله: طير أعناقها كأعناق الجزر:

مطلب یہ ہے کہ اس نہر میں یا نہر کے اطراف میں ایسے بڑے بڑے پرندے ہیں، کہ جن کی گردنیں اونٹوں کی طرح لمبی ہیں، یہ پرندے ذبح ہونے کیلئے بالکل تیار حالت میں ہوں گے، تا کہ حوض کوثر سے سیراب ہونے والے ان کے گوشت سے لطف اندوز ہوسکیں۔

قوله: قال عمر: ان هذه لناعمة ......:

"هذه " کا مشارالیہ" الطير " ہے، یہ مذکر و مؤنث دونوں طرح استعمال ہوتا ہے۔

أكلتها: ہمزہ، کاف اور لام، تینوں کے فتحہ کے ساتھ،" آکل "اسم فاعل کی جمع ہے۔ جیسے، طلبة، "طالب "کی جمع ہے۔ تصحیح شدہ تمام نسخوں اور جزریؒ کے اصل نسخہ میں" أكلة " (بروزن طلبة) ہے۔ اور سیدؒ کے اصل نسخہ میں (یہ نسخہ بھی صحیح ہے) "آكلتها"، مد اور کاف کے کسرہ کے ساتھ ہے، اس نسخہ کے مطابق توجیہ یہ ہوگی کہ کبھی واحد بھی جمع کیلئے استعمال ہوتا ہے، اور ایک نسخہ میں" آكلها" اسم فاعل مذکر کے صیغہ کے ساتھ ہے۔ ایک اور نسخہ میں" آكلوها"، جمع مذکر کے صیغہ کے ساتھ ہے۔

ناعمة: متنعمه، یا نعمت طیبہ۔ (یعنی عمدہ اور خوشگوار)

تخریج: امام حاکم نے حضرت انسؓ سے اس حدیث کو ان الفاظ کے ساتھ مرفوعاً نقل کیا ہے:

الكوثر نهر أعطانيه الله في الجنة، ترابه مسك، أبيض من اللبن، وأحلى من العسل، ترده طير أعناقها مثل أعناق الجزر، أكلتها أنعم منها۔ کوثر نہر ہے جو اللہ تعالیٰ نے مجھے جنت میں عطا کی ہے اس کی مٹی کستوری ہے (اس نہر کا پانی) دودھ سے زیادہ سفید ہے شہد سے زیادہ میٹھا ہے اس نہر پر ایسے پرندے آتے ہیں جن کی گردنیں اونٹوں کی گردنوں کی مانند ہیں ان کو کھانے والے ان سے زیادہ نعمتوں میں ہوں گے۔

۵۶۴۲ : وَعَنْ بُرَيْدَةَ اَنَّ رَجُلاً قَالَ يَا رَسُولَ اللّٰهِ هَلْ فِي الْجَنَّةِ مِنْ خَيْلٍ قَالَ اِنَّ اللّٰهَ اَدْخَلَكَ الْجَنَّةَ فَلَا تَشَآءُ اَنْ تُحْمَلَ فِيهَا عَلٰى فَرَسٍ مِّنْ يَا قُوْتَةٍ حَمْرَآءَ يَطِيْرُبِكَ فِي الْجَنَّةِ حَيْثُ شِئْتَ اِلَّا فَعَلْتَ وَسَاَلَهُ رَجُلٌ فَقَالَ يَا رَسُولَ اللّٰهِ هَلْ فِي الْجَنَّةِ مِنْ اِبِلٍ قَالَ فَلَمْ يَقُلْ لَهُ مَا قَالَ لِصَاحِبِهٖ

فَقَالَ اِنْ يُّدْ خِلْكَ اللّٰهُ الْجَنَّةَ يَكُنْ لَّكَ فِيهَا مَا اشْتَهَتْ نَفْسُكَ وَلَذَّتْ عَيْنُكَ (رواه الترمذی)

اخرجه الترمذی فی السنن ٥٨٨/٤ حدیث رقم ٢٥٤٤، واحمد فی المسند ٣٥٢/٥۔

ترجمہ: "حضرت بریدہ رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ ایک آدمی نے عرض کیا کہ یارسول اللہ! کیا جنت میں گھوڑے بھی ہوں گے؟ آنحضور اقدس ﷺ نے ارشاد فرمایا: اگر تجھے جنت میں داخل کر دیا گیا اور تم نے گھوڑے پر سوار ہونے کی خواہش ظاہر کی تو جنت میں سرخ یاقوت کے گھوڑے کو لایا جائے گا اور تم کو اس پر سوار کیا جائے گا اور تم جنت میں جہاں گھومنا پھرنا چاہو گے وہ گھوڑا برق رفتاری کے ساتھ دوڑے گا اور گویا) تمہیں اڑا کر لے جائے گا (اس کے بعد) آپ ﷺ سے ایک اور آدمی نے پوچھا اور کہا کہ یارسول اللہ! کیا جنت میں اونٹ بھی ہوں گے؟ حضرت بریدہ رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ آنحضرت ﷺ نے اس آدمی کو وہ جواب نہیں دیا جو آپ ﷺ نے اس کے ساتھی کو دیا تھا۔ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: اگر اللہ تعالیٰ نے تمہیں جنت میں پہنچا دیا تو وہاں تمہیں ہر وہ چیز ملے گی جس کو تمہارا دل چاہے گا اور جس سے تمہاری آنکھیں فرحت محسوس کریں گی"۔ (ترمذی)

تشریح: قوله: ان الله أدخلك..... الا فعلت:

الفرس: صاحب قاموس فرماتے ہیں: لفظ" فرس " کا استعمال مذکر و مؤنث دونوں (یعنی گھوڑا اور گھوڑی) کیلئے ہوتا ہے۔

لذت عينك: یہ "لذلذاذا ولذةلذیذ پانا۔ سے مشتق ہے۔ اور باب سمع سے آتا ہے۔

ان الله،" ان" ہمزہ کے کسرہ اور نون کے سکون کے ساتھ، یہ شرطیہ ہے نون کا کسرہ التقائے ساکنین کی وجہ سے ہے، لفظ جلالہ مرفوع ہے "ما اضمرعا مله على شريطة التفسير " کی بنیاد پر۔ اور وہ فعل مفسر "ادخلك الجنة " ہے لفظ جلالہ کو مبتدا قرار دیتے ہوئے مرفوع پڑھنا درست نہیں ہے' کیونکہ یہ حرف شرط کے بعد واقع ہے۔

فلا تشأ: جواب شرط ہے۔

يطير: صیغۂ مذکر اور مؤنث ہر دو کے ساتھ۔

فعلت: فعل معروف صیغہ واحد مذکر حاضر کے ساتھ ہے۔ اور ایک نسخہ میں بصیغۂ مجہول ہے۔

لفظ فعلت کا ترجمہ اختلاف نسخ کو مدِ نظر رکھتے ہوئے یوں ہوگا:

صیغہ خطاب کے ساتھ معروف پڑھنے کی صورت میں لفظی ترجمہ یوں ہوگا مگر یہ کہ تم یہ کام کرلو گے۔

صیغہ خطاب کے ساتھ مجہول پڑھنے کی صورت میں ترجمہ یوں ہوگا: مگر یہ کہ تو (اپنے مقصد میں کامیاب) کیا جائے گا۔

صیغہ غائب کے ساتھ مجہول پڑھنے کی صورت میں ترجمہ یوں ہوگا: مگر یہ کہ تمہارے لئے ایسا کیا جائے گا۔ اور ضمیر فرس کی طرف عائد ہوگی۔

قاضیؒ فرماتے ہیں: کلام کی تقدیر (یعنی تقدیری عبارت یوں) ہے: ان أدخلك الله الجنة فلا تشاء ان تحمل على فرس كذلك الا حملت عليه، اور مطلب یہ ہے کہ جو "جی" میں آئے گا، وہ ملے گا، حتی کہ اگر تمہاری چاہت اس قسم کے گھوڑے پر سواری کی ہوگی تو یہ چاہت بھی پوری ہو جائے گی۔

دوسرا احتمال یہ ہے کہ اس کا مطلب یہ ہو: ان أدخلك الله الجنة فلا تشاء أن يكون لك مركب من ياقوتة حمراء يطيربك حيث شئت، ولا ترضى به فتطلب فرسا من جنس ما تجده في الدنيا حقيقة وصفة، اور مطلب یہ ہے کہ تمہیں ایسی سواریاں ملیں گے جو تمہیں فرس معہود کی جگہ کفایت کر دیں گے۔

اس مفہوم کی تائید ایک اور روایت سے بھی ہوتی ہے:

اذا أدخلت الجنة أتيت الفرس من ياقوتة له جناحان فحملت عليه،

اور شاید کہ جب نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام نے دنیا اور جنت کی سواریوں فرق کو تمثیل وتصور فرق بیان کرنے کا ارادہ فرمایا تو جنتی گھوڑے کی مثال بیان فرمائی' اور اسی پر جنت کی عمارتوں، باغات اور نہروں وغیرہ کی صفات کو قیاس کر لیا جائے۔ ان کے حقائق کا علم تو اللہ ہی کو ہے۔

امام طیبیؒ فرماتے ہیں: پہلی توجیہ کو شیخ تورپشتی ؒ نے اختیار کیا ہے۔ اور'' الا حملت '' کی تقدیر کا تقاضا یہ ہے کہ'' الا فعلت'' صیغۂ مجہول کے ساتھ مروی ہو، کیونکہ یہ استثناء مفرغ ہے۔ أی: لا تكون بمطلوبك الا مسعفا، اور اگر صیغہ معروف کے ساتھ ہو تو تقدیری عبارت یوں ہوگی: فلا تكون بمطلوبك الا فائزا. پچھلی دونوں صورتوں میں سے دوسری توجیہ اسلوب حکیم کے قریب ہے۔ چونکہ سائل نے دنیا کے معروف گھوڑے کے بارے میں پوچھا تھا۔ اور آنحضرت ﷺ نے جواب میں جنت کے گھوڑے کا ذکر فرمایا کہ یہ گھوڑا ایسے جوہر سے بنا ہوگا جو ہمارے نزدیک ثابت ترین جوہر ہے اور وجود کے اعتبار سے زیادہ دائمی ہے' سفید رنگت کا اور خالص وصاف عمدہ جوہر ہے اور اس کی برق رفتاری کو'' طیر'' سے تشبیہ دی اور اس کو دوسری روایت میں'' جناحان'' کے ساتھ مقید ذکر فرمایا ہے۔

قوله: ان يدخلك الله الجنة الخ،

اس جملہ میں اس آیت کریمہ کی طرف اشارہ ہے: ﴿ وَفِيهَا مَا تَشْتَهِيهِ الْأَنفُسُ وَتَلَذُّ الْأَعْيُنُ ﴾ [الزخرف: ۷۱] ''اور وہاں وہ چیزیں ملیں گے جن کو جی چاہے گا اور جن سے آنکھوں کو لذت ہوگی''۔

۵۶۴۳ : وَعَنْ اَبِیْ اَیُّوبَ قَالَ اَتٰی النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اَعْرَابِیٌّ فَقَالَ یَا رَسُولَ اللّٰہِ اِنِّی اُحِبُّ الْخَیْلَ اَفِی الْجَنَّۃِ خَیْلٌ قَالَ رَسُولُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اِنْ اُدْخِلْتَ الْجَنَّۃَ اُوْتِیْتَ بِفَرَسٍ مِّنْ یَا قُوْتَۃٍ لَّہٗ جَنَاحَانِ فَحُمِلْتَ عَلَیْہِ ثُمَّ طَارَبِکَ حَیْثُ شِئْتَ (رواه الترمذی وقال هذا حديث ليس اسناده بالقوی وابو سورة الراوی يضعف فی الحديث وسمعت محمد بن اسمعيل يقول ابو سورة هذا منكر الحديث يروی مناكير)

اخرجه الترمذی فی السنن ۵۸۸/۴ حديث رقم ۲۵۴۴، واحمد فی المسند ۳۴۷/۵۔

ترجمہ:'' حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا کہ ایک دیہاتی نبی اقدس ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا کہ یارسول اللہ! میں گھوڑوں سے محبت کرتا ہوں کیا جنت میں گھوڑے بھی ہوں گے؟ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد

فرمایا: اگر تمہیں جنت میں داخل کر دیا گیا تو تجھے یاقوت کا ایک گھوڑا دیا جائے گا جس کے دو بازو (پر) ہوں گے پھر تجھے اس گھوڑے پر سوار کیا جائے گا اور تم جہاں گھومنا پھرنا چاہو گے وہ گھوڑا تمہیں اڑ کر تمہیں لے جائے گا"۔ اس روایت کو ترمذی نے نقل کیا ہے اور کہا ہے کہ اس حدیث کی اسناد قوی نہیں ہے اور ابوسورہ جو اس حدیث کے راوی ہیں کسی سبب سے فن حدیث میں یا اسناد حدیث میں ضعیف شمار کئے جاتے ہیں' نیز میں نے حضرت محمد بن اسماعیل بخاری کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ ابوسورہ منکر الحدیث ہیں وہ منکر حدیثیں نقل کرتے ہیں"۔

تشریح: قوله: أفي الجنة خيل:

یعنی کیا جنت میں گھوڑے نہیں ہونگے۔ یا مطلب یہ ہے کہ چونکہ جنت میں گھوڑوں سے تو مستغنی ہونگے، کیا استغناء کے باوجود وہاں گھوڑے ہوں گے؟

قوله: ان ادخلت الجنة اوتيت بفرس ......:

یاقوتہ: بعض حضرات کا کہنا یہ کہ" **یاقوتة** " سے مراد مشہور و معروف جوہر یا قوت کی جنس مراد ہے۔ بعض نے اس جملہ کا مطلب یہ بیان کیا ہے، کہ وہاں جو گھوڑے ہوں گے، وہ ایک اور جنس کے ہوں گے، ان گھوڑوں کے ہوتے ہوئے معروف گھوڑوں کی ضرورت نہیں ہوگی، اس کی تائید اگلی حدیث سے بھی ہوتی ہے۔

طبرانیؒ حضرت ابوایوبؓ سے مرفوعاً ناقل ہیں:

ان أهل الجنة يتزاورون على النجائب، بيض كأنهن الياقوت، وليس في الجنة شيء من البهائم، الا ابل والطير "بے شک اہل جنت ایسی سفید عمدہ اونٹنیوں پر بیٹھ کر ایک دوسرے کی زیارت کو جائیں گے جو گویا یاقوت ہیں' اور جنت میں کوئی جانور نہیں ہوگا سوائے اونٹ اور پرندوں کے۔

ابوسورة: سین مہملہ کے فتحہ کے ساتھ ہے۔

۵۶۴۴: وَعَنْ بُرَيْدَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَهْلُ الْجَنَّةِ عِشْرُوْنَ وَمِائَةُ صَفٍّ ثَمَانُوْنَ مِنْهَا مِنْ هٰذِهِ الْاُمَّةِ وَاَرْبَعُوْنَ مِنْ سَائِرِ الْاُمَمِ۔ (رواه الترمذی والدارمی والبیهقی فی کتاب البعث النشور)

اخرجه الترمذی فی السنن ۵۸۹/۴ حدیث رقم ۲۵۳۶، وابن ماجه ۱۴۳۴/۲ حدیث رقم ۴۲۸۹، والدارمی ۴۳۴/۲ حدیث رقم ۲۸۳۵، واحمد فی المسند ۳۵۵/۵۔

ترجمہ: "حضرت بریدہ رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: "جنت والوں کی ایک سو بیس قطاریں ہوں گی' ان میں سے اسّی صفیں اس اُمت (محمدیہ) کی ہوں گی اور چالیس باقی تمام امتوں کے لوگوں کی۔ اس روایت کو ترمذی و دارمی نے اور بیہقی نے کتاب البعث والنشور میں روایت کیا ہے"۔

تشریح: قوله: ثمانون منها من هذه الا مة ......:

ثمانون: (اس کی تمیز محذوف ہے۔) **ای ثمانون صفا۔**

أربعون: (اس کی تمیز بھی محذوف ہے۔) **ای اربعون صفا۔**

من هذه الامة: (جار مجرور کا متعلق محذوف ہے' جو "ثمانون" کے لئے خبر واقع ہو رہا ہے۔)

ای ثمانون صفا من جملة العدد کائنون من هذه الأمة۔

حدیث میں مذکور عدد سے اس امت کی تکثیر بیان کرنا مقصود ہے (نا کہ تحدید) کہ اُمتِ محمد یہ کے جنتیوں کی تعداد، دوسری تمام امتوں کے مقابلے میں دو تہائی ہوگی۔

امام طیبیؒ فرماتے ہیں: مذکورہ بالا حدیث اور ماقبل میں گزری ہوئی اس حدیث میں بظاہر تعارض معلوم ہوتا ہے: والذی نفسی بیده أرجو أن تکونوا ربع أهل الجنة، فکبرنا، فقال ﷺ: أرجو أن تکونوا ثلث أهل الجنة فکبرنا، فقال ﷺ: أرجو ان تکونوا نصف أهل الجنة.

اس ذات کی قسم ہے جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے مجھے امید ہے کہ تم لوگ اہل جنت کا ایک چوتھائی ہو گے۔ یہ سن کہ ہم نے اللہ اکبر کہا' پھر آپؐ نے فرمایا: مجھے امید ہے کہ تم لوگ اہل جنت کا ایک تہائی ہو گے تو ہم پھر نے اللہ اکبر" کہا' پھر آپؐ نے فرمایا: مجھے امید ہے کہ تم اہل جنت کا نصف ہو گے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ ہو سکتا ہے کہ (۸۰) صفوں کے اشخاص کی تعداد، ۴۰ صفوں (کے اشخاص) کے برابر ہو۔

ایک احتمال یہ ہے جیسے ان کی تعداد ثلث اور ربع سے زیادہ ہو گی، اسی طرح ممکن ہے کہ یہ نصف سے بڑھ جائے بطور آنحضرتؐ کی کرامت کے۔

میں کہتا ہوں یہی احتمال زیادہ ظاہر ہے، کیونکہ کبھی نصف کا اطلاق تو ہوتا ہے، مگر عدد اور وصف میں تساوی مراد نہیں ہوتی۔ اسی وجہ سے اقل اور اکثر کو بھی نصف سے تعبیر کر دیا جاتا ہے۔

تخریج: اس حدیث کو امام احمد، ابن ماجہ، ابن حبان اور حاکمؒ نے ابو ہریرہؓ سے روایت کیا ہے۔ اور امام طبرانیؒ نے ابن عباس، ابن مسعود اور اُبو موسیٰ رضی اللہ عنہم سے روایت کیا ہے۔

۵۶۴۵ : وَعَنْ سَالِمٍ عَنْ اَبِيْهِ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بَابُ اُمَّتِيْ الَّذِيْ يَدْخُلُوْنَ مِنْهُ الْجَنَّةَ عَرْضُهٗ مَسِيْرَةُ الرَّاكِبِ الْمُجَوِّدِ ثَلٰثًا ثُمَّ اِنَّهُمْ لَيُضْغَطُوْنَ عَلَيْهِ حَتّٰى تَكَادُ مَنَاكِبُهُمْ تَزُوْلُ (رواه الترمذی وقال هذا حدیث ضعیف وسالت محمد بن اسمعیل عن هذا الحدیث فلم یعرفه وقال یخلد بن ابی بکر یروی المناکیر)

اخرجه الترمذی فی السنن ٤ / ٥٩٠ حدیث رقم ٢٥٤٨۔

ترجمہ: "حضرت سالم تابعیؒ اپنے والد محترم (حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما) سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے بیان فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: میری امت کے اس دروازہ کی چوڑائی جس سے وہ جنت میں داخل ہوں گے اس سوار کی تین دن کی مسافت کے بقدر ہوگی جو گھوڑے کو تیز دوڑانا خوب مہارت رکھتا ہے پھر بھی وہ لوگ (یعنی میری امت کے جنتی) اس دروازے سے داخل ہوتے وقت نہایت تنگی اور مشکل سے دو چار ہوں گے یہاں تک کہ ان کے کاندھے باہم ایک دوسرے سے ٹکرائیں گے یعنی باوجودیکہ وہ دروازہ اس قدر چوڑا ہو گا مگر جب اہل اسلام گروہ در گروہ

اندر داخل ہوں گے تو وہ دروازہ بھی تنگ معلوم ہوگا اور وہ لوگ ایک دوسرے کے کاندھے سے رگڑ کھاتے ہوئے بمشکل دروازہ پار کریں گے''۔ اس روایت کو ترمذی نے نقل کیا ہے اور انہوں نے کہا ہے کہ یہ حدیث ضعیف ہے' جب میں نے حضرت محمد بن اسماعیل بخاری سے اس حدیث کے راوی کے بارے میں پوچھا تو انہوں نے فرمایا کہ میں نہیں جانتا اور فرمایا کہ خالد بن ابی بکر منکر روایتیں بیان کرتے ہیں''۔

تشریح: قوله: باب امتی الذین ۔۔۔ المجود ثلاثا:

لیضغطون: بھینچنا، بھیڑ کرنا، تنگی کرنا۔

باب أمتي الذين: اصول معتمدہ اور تصحیح شدہ نسخوں میں'' الذين ''صیغہ جمع کے ساتھ مذکور ہے۔ اور ایک نسخہ میں صیغہ مفرد کے ساتھ ہے۔ اس صورت میں''باب'' کی صفت ہوگا، اور معنوی اعتبار سے یہی ظاہر ہے۔

''**المجود**'': تجوید مصدر سے، اسم فاعل کا صیغہ ہے۔ ایک شارح کا کہنا یہ ہے، کہ'' مجود ''اس راکب کو کہتے ہیں جو گھوڑے کو اچھی طرح ایڑ لگاتا ہو۔ **جوّدته أي جعلته جيداً** سے مأخوذ ہے۔

أساس البلاغہ میں لکھتے ہیں: **يجود في صنعته، أي يفوق فيها** (وہ اس کاریگری میں فائق ہے) **أجاد الشيء وجوّده، أي: أحسن فيما فعل:** بہتر بنانا، عمدہ کرنا۔ **فرس جواد:** عمدہ نسل کا گھوڑا۔

امام طیبیؒ فرماتے ہیں: **المجود،** ''**الراكب**'' کی صفت ہونے کا احتمال رکھتا ہے۔ **أي: الراكب الذي يجود ركض الفرس،** (یعنی وہ گھڑسوار جو ایڑی خوب لگاتا ہو) اور دوسرا احتمال یہ ہے کہ مضاف الیہ ہو، اور اضافت لفظیہ ہو۔ **أي: الفرس الذي يجود في عدوه.**

ثلاثا: ''**ميسرة** '' کیلئے ظرف ہے۔ اور'' **ثلاثا** '' کی تمیز محذوف ہے۔ **اى ثلاث ليال أو سنين.**

تین سال کی مسافت مراد لینا زیادہ ظاہر ہے۔ کیونکہ اس میں زیادہ مبالغہ ہے، نیز یہ کہ ۳ کا عدد برائے تحدید نہیں، بلکہ تکثیر مراد ہے، تاکہ مذکورہ بالا حدیث، اس حدیث: **ما بين مصراعين من مصاريع الجنة ميسرة أربعين سنة** کے مخالف نہ ہو۔ (جنت کے پٹوں میں سے دو پٹوں کی درمیانی مسافت چالیس سال کی مسافت کے برابر ہے)

یا یہ کہا جائے کہ پہلے آنحضرت ﷺ کو بذریعہ وحی اس دروازے کی چوڑائی کم بتائی گئی ہو، (جس کو آپ ﷺ نے تین سال کی مسافت کے فاصلے سے تعبیر فرمایا) اور پھر بعد میں اس دروازہ کی زیادہ چوڑائی بتلائی گئی، (جس کو آپ ﷺ نے چالیس سال کی مسافت کے ذریعے واضح فرمایا۔)

یا اختلاف اصحاب کے اعتبار سے اختلاف أبواب پر محمول کیا جائے کہ جنت میں داخل ہونے والوں کے اعتبار سے مختلف چوڑائی معلوم ہوگی۔ جس دروازے کے ذریعے کم لوگ داخل ہوں گے، وہ دروازہ بہت زیادہ چوڑا معلوم ہوگا، اور جس دروازے سے لوگ بڑی تعداد میں داخل ہوں گے، وہ بہت زیادہ عریض ہونے کے باوجود تنگ معلوم ہوگا۔ یعنی بعض لوگ جن دروازوں سے جنت میں داخل ہوں گے ان کی چوڑائی تین سال کی مسافت کے بقدر ہوگی اور بعض کی چالیس سال کی مسافت کے بقدر ہوگی۔ (واللہ اعلم)

قولہ: ھذا حدیث ضعیف ......

مصابیح میں اس حدیث کو ضعیف منکر بتایا ہے۔ اس کے ایک شارح لکھتے ہیں: یعنی یہ حدیث منکر ہے کیونکہ یہ حدیث ان احادیث صحیحہ کے مخالف ہے جو اس معنی میں وارد ہوئی ہیں۔ اور بعض تو ما قبل میں گذر چکی ہیں۔

امام ترمذیؒ نے اس حدیث کے ضعف پر امام بخاری کی باتؒ سے استدلال کیا ہے کہ انہوں نے اس حدیث سے اپنی ناواقفیت کا اظہار کیا ہے۔ اور یہ اصول ہے کہ جب کوئی ایسا محدث جو احادیث کے طرق کا احاطہ رکھتا ہو، وہ یہ کہے کہ میں فلاں حدیث کی واقفیت نہیں رکھتا تو یہ اس بات کی دلیل ہوتی ہے، کہ وہ حدیث ضعیف ہے۔ چنانچہ امام بخاریؒ کا اس حدیث کے بارے میں عدم معرفت کا اظہار اس حدیث کے ضعیف ہونے کی علامت ہے۔

یروی المناکیر: اتنی بات واضح رہے کہ اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ اس کی یہ روایت بھی منکر ہو۔

سید جمال الدینؒ فرماتے ہیں: لفظ "یخلد" صاحب مشکوٰۃ کا سہو ہے، راوی کا اصل نام خالد بن أبی بکر ہے۔ چونکہ ترمذیؒ میں اور کتب اسماء رجال میں خالد بن ابی بکر ہی منقول ہے۔ اھ۔ "یخلد" لام کے ضمہ کے ساتھ ہے۔

۵۶۴۲ : وَعَنْ عَلِيٍّ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ فِي الْجَنَّةِ لَسُوقًا مَّا فِيهَا شِرًى وَلَا بَيْعٌ اِلَّا الصُّوَرُ مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَآءِ فَاِذَا اشْتَهَى الرَّجُلُ صُوْرَةً دَخَلَ فِيهَا .

(رواہ الترمذی وقال ھذا حدیث غریب)

اخرجہ الترمذی فی السنن ۵۹۲/٤ حدیث رقم ۲۵۵۰ واحمد فی المسند ۱۵٦/۱۔

ترجمہ: "حضرت علی رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: جنت میں ایک بازار ہے جس کے اندر بیع وشراء نہ ہوگی بلکہ وہاں مردوں اور عورتوں کی (مختلف طرح کی حسین وجمیل) صورتیں دکھائی دیں گی جو شخص (خواہ مرد ہو یا عورت) وہاں جس صورت کو پسند کرے گا اس میں بدل جائے گا اور اسی صورت کا ہو جائے گا۔ اس حدیث کو ترمذی نے نقل کیا ہے اور انہوں نے کہا ہے کہ یہ حدیث غریب ہے"۔

تشریح: قولہ: ان فی الجنة لسوقا ما فیھا شری ولا بیع الا الصور:

سوق: مؤنث سماعی ہے۔

شری: کسرہ اور قصر کے ساتھ، بمعنی اشتراء۔

ما: مشابہ بہ "لیس" ہے۔

الا الصور: منصوب ہے۔ ایک نسخہ میں مرفوع ہے۔

تشریح: امام طیبیؒ فرماتے ہیں کہ: فصل اول میں حضرت انسؓ کی حدیث میں گزر چکا ہے، کہ "سوق" سے مراد مجمع ہے، اس کی تائید اسی حدیث کے ان الفاظ: "ما فیھا شری ولا بیع الا الصور" سے بھی ہوتی ہے۔

فرمایا: اس صورت میں یہ مستثنیٰ منقطع ہوگا۔ اور استثناء متصل بھی ہوسکتا ہے، بایں طور کہ تبدیل ہیئت کو بیع وشری کی جنس سے مان لیا جائے، جیسا کہ اللہ جل شانہ کا یہ فرمان ہے:

﴿یَوْمَ لَا یَنْفَعُ مَالٌ وَّلَا بَنُوْنَ اِلَّا مَنْ اَتَی اللّٰهَ بِقَلْبٍ سَلِیْمٍ﴾ [الشعراء: ۸۸، ۸۹] ''اس دن کہ (نجات) کے لیے نہ مال کام آوے گا اور نہ اولاد مگر ہاں (اس کی نجات ہوگی) جو اللہ کے پاس (کفر و شرک سے) پاک مال لے کر آ وے گا'' ایک توجیہ کے مطابق، وگرنہ معتمد یہی ہے کہ مستثنیٰ منقطع ہے۔

کہا گیا ہے کہ اس حدیث کی مراد میں دو احتمال ہیں:

پہلا احتمال یہ ہے کہ وہاں ہر طرف ایک سے بڑھ کر ایک حسین و جمیل صورت ہوگی، جنتیوں میں سے جب کوئی کسی بھی خاص صورت کو چاہے گا اور تمنا کرے گا، تو اللہ تعالیٰ اپنے قبضۂ قدرت سے اس شخص کو وہی صورت عطاء فرما دے گا۔

دوسرا مطلب یہ ہے کہ ''صور'' سے مراد سامان زیب و زینت ہے، کہ جو بھی جنتی اپنے لئے جیسا لباس، جیسا زیور اور تاج وغیرہ پسند کرے گا، جس چیز میں بھی رغبت ہوگی، وہی عطا ہو جائے گی، اس صورت میں ''دخول'' سے مراد ''تزین'' ہوگا۔ کہا جاتا ہے: لفلان صورة حسنة ای هیئة ملیحة۔

جو بھی احتمال مراد ہو اتنی بات بہر حال ہے، کہ یہ تغیر و تبدل صفت میں ہوگا، نہ کہ ذات میں۔

امام طیبیؒ فرماتے ہیں کہ ان دونوں کو جمع کرنا بھی ممکن ہے تاکہ حضرت انسؓ کی اس حدیث سے بھی موافقت ہو جائے:

فتهب ریح الشمال فتحثوا فی وجوههم وثیابهم، فیزدادون حسنا وجمالا۔ (پس شمالی ہوا چلے گی وہ ان کے چہروں اور کپڑوں پر لگے گی چنانچہ ان لوگوں کے حسن و جمال میں اضافہ ہو جائے گا۔) الحدیث

میں کہتا ہوں کہ وہ حدیث اللہ جل شانہ کے اس فرمان مبارک سے مقتبس ہے:

﴿وفیها ما تشتهیه الأنفس وتلذ الأعین﴾ [الزخرف: ۷۱] ''اور وہاں وہ چیزیں ملیں گے جن کو جی چاہے گا اور جن سے آنکھوں کو لذت ہوگی'' اور اس وجہ سے ہے کہ یہ دن ''یوم المزید''، ''یوم اللقاء'' اور ''یوم الجمعه'' ہے۔ واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم۔ اس حدیث کے مناسب مزید کلام آگے بھی آ رہا ہے۔

اسنادی حیثیت: امام ترمذیؒ نے فرمایا کہ یہ حدیث غریب ہے۔

۵۶۴۷ : وَعَنْ سَعِیْدِ بْنِ الْمُسَیَّبِ اَنَّهٗ لَقِیَ اَبَا هُرَیْرَةَ فَقَالَ اَبُوْهُرَیْرَةَ اَسْاَلُ اللّٰهَ اَنْ یَّجْمَعَ بَیْنِیْ وَبَیْنَكَ فِیْ سُوْقِ الْجَنَّةِ فَقَالَ سَعِیْدٌ اَفِیْهَا سُوْقٌ قَالَ نَعَمْ اَخْبَرَنِیْ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ اَهْلَ الْجَنَّةِ اِذَا دَخَلُوْهَا نَزَلُوْا فِیْهَا بِفَضْلِ اَعْمَالِهِمْ ثُمَّ یُؤْذَنُ لَهُمْ فِیْ مِقْدَارِ یَوْمِ الْجُمُعَةِ مِنْ اَیَّامِ الدُّنْیَا فَیَزُوْرُوْنَ رَبَّهُمْ وَیُبْرِزُ لَهُمْ عَرْشَهٗ وَیَتَبَدّٰی لَهُمْ فِیْ رَوْضَةٍ مِّنْ رِیَاضِ الْجَنَّةِ فَیُوْضَعُ لَهُمْ مَنَابِرُ مِّنْ نُوْرٍ وَمَنَابِرُ مِنْ لُؤْلُؤٍ وَّمَنَابِرُ مِّنْ یَاقُوْتٍ وَّمَنَابِرُ مِنْ زَبَرْجَدٍ وَّمَنَابِرُ مِنْ ذَهَبٍ وَمَنَابِرُ مِّنْ فِضَّةٍ وَیَجْلِسُ اَدْنَاهُمْ وَمَا فِیْهِمْ دَنِیٌّ عَلٰی کُثْبَانِ الْمِسْكِ وَالْکَافُوْرِ مَا یُرَوْنَ اَنَّ اَصْحَابَ الْکَرَاسِیِّ بِاَفْضَلَ مِنْهُمْ مَجْلِسًا قَالَ اَبُوْهُرَیْرَةَ قُلْتُ یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ وَهَلْ نَرٰی رَبَّنَا قَالَ نَعَمْ هَلْ تَتَمَارُوْنَ فِیْ رُؤْیَةِ الشَّمْسِ وَالْقَمَرِ لَیْلَةَ الْبَدْرِ قُلْنَا لَا قَالَ کَذٰلِكَ لَا تَتَمَارُوْنَ فِیْ رُؤْیَةِ رَبِّکُمْ وَلَا

يَبْقٰى فِي ذٰلِكَ الْمَجْلِسِ رَجُلٌ اِلَّا حَاضَرَهُ اللّٰهُ مُحَاضَرَةً وَ حَتّٰى يَقُوْلَ لِلرَّجُلِ مِنْهُمْ يَا فُلَانَ ابْنَ فُلَانٍ اَتَذْكُرُ يَوْمَ قُلْتَ كَذَا وَ كَذَا فَيُذَكِّرُهُ بِبَعْضِ غَدَرَاتِهِ فِي الدُّنْيَا فَيَقُوْلُ يَا رَبِّ اَفَلَمْ تَغْفِرْ لِي فَيَقُوْلُ بَلٰى فَبِسَعَةِ مَغْفِرَتِيْ بَلَغْتَ مَنْزِلَتَكَ هٰذِهٖ فَبَيْنَمَا هُمْ عَلٰى ذٰلِكَ غَشِيَتْهُمْ سَحَابَةٌ مِّنْ فَوْقِهِمْ فَاَمْطَرَتْ عَلَيْهِمْ طِيْبًا لَمْ يَجِدُوْا مِثْلَ رِيْحِهٖ شَيْئًا قَطُّ وَيَقُوْلُ رَبُّنَا قُوْمُوْا اِلٰى مَآ اَعْدَدْتُّ لَكُمْ مِنَ الْكَرَامَةِ فَخُذُوْا مَا اشْتَهَيْتُمْ فَنَاْتِي سُوْقًا قَدْ حَفَّتْ بِهِ الْمَلٰئِكَةُ فِيْهَا مَا لَمْ تَنْظُرِ الْعُيُوْنُ اِلٰى مِثْلِهٖ وَلَمْ تَسْمَعِ الْاٰذَانُ وَلَمْ يَخْطُرْ عَلَى الْقُلُوْبِ فَيُحْمَلُ لَنَا مَا اشْتَهَيْنَا لَيْسَ يُبَاعُ وَلَا يُشْتَرٰى وَفِي ذٰلِكَ السُّوْقِ يَلْقٰى اَهْلُ الْجَنَّةِ بَعْضُهُمْ بَعْضًا قَالَ فَيُقْبِلُ الرَّجُلُ ذُوالْمَنْزِلَةِ وَالْمُرْتَفِعَةِ فَيَلْقٰى مَنْ هُوَ دُوْنَهٗ وَمَافِيْهِمْ دَنِيٌّ فَيَرُوْعُهٗ مَا يَرٰى عَلَيْهِ مِنَ اللِّبَاسِ فَمَا يَنْقَضِي اٰخِرُ حَدِيْثِهٖ حَتّٰى يَتَخَيَّلُ عَلَيْهِ مَا هُوَ اَحْسَنُ مِنْهُ وَذٰلِكَ اِنَّهٗ لَا يَنْبَغِيْ لِاَحَدٍ اَنْ يَّحْزَنَ فِيْهَا ثُمَّ نَنْصَرِفُ اِلٰى مَنَازِلِنَا فَيَتَلَقَّانَا اَزْوَاجُنَا فَيَقُلْنَ مَرْحَبًا وَاَهْلًا لَقَدْ جِئْتَ وَاِنَّ بِكَ مِنَ الْجَمَالِ اَفْضَلَ مِمَّا فَارَقْتَنَا عَلَيْهِ فَنَقُوْلُ اِنَّا جَالَسْنَا الْيَوْمَ رَبَّنَا الْجَبَّارَ وَيَحِقُّنَا اَنْ نَّنْقَلِبَ بِمِثْلِ مَا انْقَلَبْنَا.

(رواه الترمذی وابن ماجة وقال الترمذی هذا حديث غريب)

اخرجه الترمذی فی السنن ٥٩١/٤ حديث رقم ٢٥٤٩، وابن ماجه ١٤٥٠/٢ حديث رقم ٤٣٣١۔

ترجمہ: ''حضرت سعید بن مسیب تابعی سے منقول ہے کہ (ایک مرتبہ بازار میں) وہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے ملے تو حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے کہا کہ میں حق تعالیٰ شانہ سے دعا کرتا ہوں کہ (جس طرح آج مدینہ کے بازار میں ہم دونوں کی ملاقات ہوئی ہے ایسے ہی بازار جنت میں بھی ہم دونوں کو ملا دیں۔ حضرت سعید نے (یہ سن کر) عرض کیا کہ کیا جنت میں (بیع وشراء کے لئے) بازار بھی ہوگا؟ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے جواب دیا: ''ہاں'' (جنت میں بازار بھی ہوگا مگر وہاں کا بازار دنیا کے بازار جیسی ضروریات کی تکمیل کی خاطر نہیں ہوگا) مجھے رسول اللہ ﷺ نے بتلایا تھا کہ جب اہل جنت لوگ جنت میں داخل ہوں گے تو اپنے اپنے اعمال کی بڑائی اور زیادتی کے اعتبار سے جنت (کی منازل اور درجات) میں فروکش ہوں گے (یعنی جو جس قدر اعلیٰ اور زیادہ اعمال والا ہوگا اسی کے اعتبار سے اس کو بلندتر درجہ اور خوب تر مکان ومنزل ملے گی) پھر ان کو دنیاوی دنوں کے اعتبار سے جمعہ کے دن اجازت دی جائے گی اور وہ سب اس روز اپنے رب کا دیدار کریں گے پروردگار ان کے سامنے اپنا عرش ظاہر کردے گا اور جنتیوں کو اپنا دیدار کرانے کے لئے جنت کے ایک بڑے باغیچہ میں جلوہ فروز ہوگا' پس (پروردگار کی زیارت کو آنے والے) اہل جنت کے لئے اس باغ میں (مختلف درجات) نور کے منبر' موتیوں کے منبر' یاقوت کے منبر' زمرد کے منبر سونے کے منبر اور چاندی کے منبر رکھے جائیں گے جن پر وہ جنتی (اعمال وافعال اور مراتب ودرجات کے تفاوت کے اعتبار سے) تشریف رکھیں گے' (کہ جو جنتی جس درجہ ومرتبہ کا ہوگا اسی کے مطابق اس کے ان منبروں میں ~~سے ایک~~ منبر مخصوص ہوگا) نیز ان جنت والوں میں سے جو جنتی ادنیٰ مرتبہ ودرجہ

کا ہوگا (یعنی صرف مرتبہ کے اعتبار سے ادنیٰ) نہ کہ ان میں کوئی معمولی اور ذلیل ہوگا' وہ مشک وکافور کے ٹیلوں پر تشریف رکھے گئے (گویا منبر اور کرسیاں اعلیٰ بلند رتبہ وشرف کے لوگوں کی نشست گاہیں ہوں گی اور ٹیلے ان سے ادنی درجہ کے اہل جنت کی نشست گاہیں ہوں گے لیکن ٹیلوں پر بیٹھنے والے لوگوں کو یہ احساس نہیں ہوگا کہ منبر اور کرسیوں پر تشریف رکھنے والے لوگ نشست گاہ کے لحاظ سے ان سے زیادہ فضیلت اور برتری رکھتے ہیں۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے کا بیان ہے کہ میں نے عرض کیا یارسول اللہ! کیا اس دن ہم اپنے پروردگار کو دیکھیں گے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ہاں یقیناً کیا تم (دن میں) سورج کو اور (چاندنی رات میں) چودھویں رات کے چاند کو دیکھنے میں کوئی شبہ رکھتے ہو؟'' ہم نے عرض کیا کہ ہرگز نہیں' فرمایا: ''ایسے ہی تمہیں اس روز اپنے رب کا دیدار کرنے میں کوئی شک وشبہ نہیں ہوگا اور دیدار الٰہی کی اسی مجلس میں ایسا کوئی شخص باقی نہیں رہے گا جس سے پروردگار تمام حجابات اٹھا کر آمنے سامنے کلام نہ فرمائے گا یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ حاضرین میں سے ایک آدمی کو خطاب کر کے فرمائے گا کہ اے فلاں بن فلاں کیا تجھے وہ دن یاد ہے جب تو نے ایسا ایسا کہا تھا (یعنی اپنی زبان سے فلاں فلاں بات کی تھی) یا ایسے کاموں کا ارتکاب کیا تھا جو شرعی طور ناجائز تھے وہ شخص یہ سن کر گویا توقف کرے گا اور کی ہوئی خطاؤں اور لغزشوں۔ پس پروردگار اس کو کچھ وہ وعدہ خلافیاں یاد کروائے گا جن کا اس نے دنیا میں ارتکاب کیا ہوگا (یعنی اس کے دنیا کے وہ گناہ یاد دلائے گا جن کے ارتکاب میں عہد ربوبیت کا توڑنا لازم آتا ہے) تب وہ آدمی گویا ہوگا کہ میرے پروردگار کیا آپ نے میرے وہ گناہ معاف نہیں فرما دیئے تھے (یعنی میرا جنتی شمار ہو کر جنت میں آ جانا اس بات کو ظاہر نہیں کرتا کہ میں نے جو وہ گناہ کئے تھے آپ نے ان کو بخش دیا ہے) پروردگار فرمائے گا: ''بلاشبہ میں نے تیرے وہ گناہ بخش دیئے ہیں اور تو میری وسعت بخشش ہی کے طفیل (آج) اس مقام وشرف کو پہنچا ہے''۔ پھر وہ لوگ اسی حالت اور اسی جگہ پر ہوں گے کہ ایک بادل آ کر ان کے اوپر چھا جائے گا اور ان پر ایسی عمدہ خوشبو ان پر چھڑکے گا کہ انہوں نے اس جیسی مہک کبھی بھی کسی شے میں نہیں محسوس کی ہوگی۔ اس کے بعد ہمارا پروردگار فرمائے گا کہ (لوگو) اٹھ کر اس چیز کی طرف آؤ جو ہم نے تم پر لطف وکرم کرنے کے لئے تمہاری خاطر تیار کر رکھی ہے اور تم اپنی پسند وخواہش کے مطابق جو چاہو لے لو (آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ یہ سن کر) ہم جنتی لوگ اس بازار میں پہنچیں گے جس کو فرشتے گھیرے ہوئے ہوں گے اس بازار میں وہ وہ اشیاء ہوں گی جن میں جیسی کوئی شئے (پہلے) نہ کسی آنکھ نے دیکھی ہوگی نہ کسی کان نے سنی ہوگی اور نہ کسی کے دل میں ان کا تصور آیا ہوگا پھر جو بھی ہم آرزو کریں گے وہ ہمیں لا کر اس بازار میں سے دیدیا جائے گا درآنحالیکہ اس بازار میں خرید وفروخت جیسا کوئی معاملہ نہیں ہوگا (بلکہ وہ بازار درحقیقت اہل جنت کو ان کی من پسند چیزیں عطا کئے جانے کا مرکز ہوگا) نیز اس بازار میں تمام جنتی آپس میں ایک دوسرے سے ملیں گے''۔ آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا: (اس بازار میں باہمی ملاقاتوں کے وقت) ایک بلند مرتبہ شخص ایک ایسے آدمی کی جانب متوجہ ہوگا اور اس سے ملاقات کرے گا جو (مرتبہ میں) اس سے کمتر ہوگا' لیکن جنتیوں میں (کسی کا اعلیٰ اور کسی کا کمتر ہونا صرف مرتبہ اور درجہ کے لحاظ سے ہوگا) یہ نہیں کہ کوئی معمولی اور ذلیل خیال کیا جائے گا (گویا ذاتی لحاظ سے تو ہر جنت والا بلند حیثیت اور بلند عزت ہوگا تاہم دنیا میں اختیار کئے جانے والے اعمال وافعال کی نسبت سے کچھ لوگ اعلیٰ مرتبہ کے ہوں گے اور کچھ لوگ ان سے کم مرتبہ کے' بہرحال اس شرف عظیم کے حامل شخص کو وہ لباس تعجب میں ڈال دے گا جس میں ادنی درجہ کا جنتی ملبوس ہوگا اور

ان دونوں کا سلسلہ گفتگو (یا ان کے خیالات کا سلسلہ) ختم بھی نہ ہونے پائے گا کہ وہ بلند مرتبہ شخص محسوس کرے گا کہ میرے مخاطب کا لباس تو میرے لباس سے بھی اعلیٰ اور عمدہ ہے اور یہ (یعنی کمتر درجہ والے شخص کے جسم پر اعلیٰ لباس کا آ جانا اس وجہ سے ہوگا کہ جنت میں کسی شخص کو رنجیدہ اور غمزدہ ہونے کا مرحلہ نہیں پیش آئے گا (آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا) اس کے بعد ہم سب جنتی اپنے اپنے محلات اور اپنی رنگشاہوں کی طرف لوٹیں گے اور وہاں ہماری بیویاں (یعنی اور جنت کی حوریں) ہمیں آگے بڑھ کر لیں گی تو مرحبا' خوش آمدید کہہ کر ہمارا استقبال کریں گی اور ہر بیوی اپنے مرد سے کہے گی کہ تم ایسی حالت میں واپس آئے ہو کہ تمہارا حسن ترقی کر کے اس سے بھی زیادہ ہو چکا ہے' جس پر تم ہم سے علیحدہ ہوئے تھے پس ہم اپنی بیویوں سے کہیں گے کہ آج ہم نے اپنے رب ذوالجلال کے ہم نشین رہ کر آئے ہیں' جو جسم و بدن اور حسن و جمال کی ہر کمی کو پورا کر کے خوب تر بنانے والا ہے' لہٰذا ہم اپنی اس شان کے ساتھ لوٹنا زیب دیتا ہے' جس شان کے ساتھ کہ ہم آئے ہیں (کیونکہ جس شخص کو اس ذات کی ہم نشینی حاصل ہو جائے کہ تمام تر حسن و جمال اسی کے نور کا پرتو ہے' تو وہ آدمی زیادہ حسین کیونکر نہ ہوگا) اس روایت کو ترمذی اور ابن ماجہ نے روایت کیا ہے' نیز امام ترمذی نے کہا ہے یہ حدیث غریب ہے''۔

تشریح: قوله: أنه لقی أبا هريرة:

سیاق سے پتہ چلتا ہے' کہ یہ ملاقات کسی بازار میں ہوئی تھی۔

قوله: أخبر نی رسول الله ۔۔۔ عليكبتان المسك والكافور:

ان: سیدؒ وغیرہ کے نسخہ میں ''ان'' ہمزہ کے فتحہ کے ساتھ ہے۔ اور ایک نسخہ میں ''انّ'' میں ہمزہ کے کسرہ کے ساتھ ہے۔ کسرہ علی سبیل الحکایہ ہے۔ ای لخبر هو قوله: ان یا تقدیری عبارت یوں ہے: قائلا ان.

يبرز: ابراز سے مشتق ہے۔ اور ضمیر فاعل ربّ کی طرف راجع ہے۔

مطلب یہ ہے کہ وہ اپنے لطف و کرم کی انتہاء دکھائے گا۔ جیسا کہ اس ارشاد باری تعالیٰ میں اسی طرف اشارہ ہے: ﴿الرحمن على العرش استوىٰ﴾ [طه: ٥] (اور) وہ بڑی رحمت والا عرش پر قائم ہے'' وگرنہ تو ما قبل میں گزر چکا کہ عرش جنت کی چھت ہے' اور اس لئے بھی تا کہ تنزیہ جہت بھی برقرار رہے۔

يتبدى: دال کی تشدید کے ساتھ ظاہر ہونا۔

فی روضة: (اس کی تنوین برائے تعظیم ہے۔) ای: فی روضة عظيمة.

فوتضع لهم منابر: یعنی اونچی اونچی کرسیاں رکھی جائیں گی۔

زبرجد: زاء کے فتحہ' باء موحدہ' رائے ساکنہ' اور جیم مفتوحہ کے ساتھ' ایک معروف جوہر ہے۔

یعنی اپنے اعمال و احوال کے تفاوت کے اعتبار سے بیٹھیں گے۔

قوله: ويجلس أدناهم ۔۔۔ منهم مجلسا: ويجلس ادناهم: یعنی صرف مرتبہ کے اعتبار سے ادنیٰ ہوگا۔

وما فيهم دنیء: یہ جملہ حالیہ ہے۔ أی: الحال أنه ليس فی الجنة دون وخسيس. امام طیبیؒ فرماتے ہیں کہ یہ جملہ ما قبل عبارت سے پیدا ہو سکنے والے ایک وہم کا ازالہ ہے' کہ ''أدنیٰ'' کا لفظ ''دناءة'' سے ہے' جس کے معنی ذات کے اعتبار سے

ذلیل وحقیر اور ادنی ہے۔ پس واضح رہے کہ "ادنی" سے مراد اعلیٰ درجات اور زیادہ سے زیادہ مراتب رکھنے والے جنتیوں کے مقابلے پر کم تر درجہ اور قلیل المراتب ہے۔

کثبان: کاف کے ضمہ، اور ثائے مثلثہ کے سکون کے ساتھ، " کثیب " کی جمع ہے۔ ریت کے مستطیل ٹیلے۔ کثبت الشیء سے مأخوذ ہے، جس کے معنی ہیں: جمعته. (جمع کرنا) یعنی ادنی مرتبہ کے لوگ ٹیلوں پر بیٹھیں گے۔

والکافور: مجرور ہے، اس کا عطف " مسك " پر ہو رہا ہے۔ صاحب قاموس (کافور کے بارے میں) لکھتے ہیں: هو نبت طيب نوره كنور الاقحوان أو الطلع، أو وعائه طيب معروف يكون من شجر بجبال بحر الهند والصين، يظل خلقا كثيرا، وتألفه النمورة، وحشبه أبيض هش، ويوجد في اجوافه الكافور، وهو انواع، ولونها احمر وانما بيض بالتصعيد مع الكرم وعين في الجنة.

قوله: مایرون ---- منهم مجلسا:

ما یرون: صیغہ مجہول کے ساتھ ہے۔ "الا راء ة " سے مشتق ہے۔ اور ضمیر "جالسين على الكثبان " کی طرف لوٹ رہی ہے۔ اور "رؤیت" "ظن" کے معنی میں ہے۔ أی: لا يظنون ولا يتوهمون.

" أصحاب الكراسي " سے مراد "ارباب المنابر " ہیں۔

یعنی ٹیلوں پر بیٹھنے والوں کے دل میں یہ احساس بھی نہ آئے گا ہم کرسیوں والوں سے نیچے ہیں چہ جائیکہ انہیں بلند مرتبہ کی محرومی کا احساس اور غم ہو، کیونکہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿الحمد لله الذى أذهب عنا الحزن﴾ [فاطر: ٣٤] "اور کہیں گے کہ اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے جس نے ہم سے (رنج وغم دور کر دیا ہے" بلکہ وہ تو مقام رضا پر فائز ہوں گے، اور کاتب تقدیر کی قدر وقضاء پر سر تسلیم خم کرنے کی لذت سے لطف اندوز ہو رہے ہوں گے۔

قوله: هل نرى ---- في رؤية ربكم:

هل نرى ربنا: یعنی کیا اللہ جل شانہ واقعی تجلی ذات فرمائیں گے۔

تتمارون: راء کے فتحہ کے ساتھ، ایک نسخہ میں تاء ہے۔ ای تشکون؟

في رؤية الشمس: مصدر کی اضافت مفعول کی طرف ہے۔ أی: رؤيتكم الشمس

والقمر: أی وفي رؤية القمر.

"ليلة البدر": یہ فرما کر ہلال اور دوسری راتوں کے چاند سے احتراز ہے، چونکہ چودھویں کے علاوہ راتوں میں چاند کی چاندنی اپنے مکمل جوبن پر نہیں ہوتی۔

قلنا: لا: (فعل محذوف ہے۔) أی: لانشك في رؤية الشمس والقمر. (یعنی سورج اور چاند کو دیکھنے میں ہمیں کوئی شک نہیں)

قال كذلك: تشبیہ صرف اور صرف کمال ظہور میں ہے، نا کہ کسی اور امر میں۔

قوله: ولايتعى في ذلك المجلس ---- منزه لتلك هذه:

محاضرة: ضاد معجمہ کے ساتھ، ''حضور'' سے ماخوذ ہے۔ صاد مہملہ کے ساتھ تصحیف ہے۔ تورپشتی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ حاء مہملہ اور ضاد معجمہ کے ساتھ ہے۔ اور مطلب یہ ہے کہ اس وقت درمیان سے حجاب اٹھ جائے گا، اور اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کے ساتھ بغیر حجاب وترجمان کے کلام فرمائے گا۔ اس مفہوم کو اس حدیث میں واضح طور پر بیان کیا گیا ہے:

ما منكم من أحد الا ويكلمه ربه ليس بينه وبينه ترجمان.

تم میں سے ہر شخص سے اس کا رب اس طرح کلام کرے گا کہ اس کے اور رب کے درمیان کوئی ترجمان نہیں ہوگا''

''حاضره الله محاضرة '' کا مطلب ہے: خاطبه الله مخاطبة وحاوره محاورة.

يا فلان: فتحہ کے ساتھ ہے، اور ایک نسخہ میں ضمہ کے ساتھ ہے۔

ابن فلان: ''ابن'' منصوب ہے، اور ''فلان'' منصرف ہے،'' ابن فلان '' کنایہ ہے، مخاطب کے نام اور اس کے والد کے نام سے۔

امام احمد اور امام ابوداؤد، حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً نقل کرتے ہیں:

انكم تدعون يوم القيامة بأسمائكم وأسماء آبائكم فأحسنوا أسمائكم. ''بلاشبہ قیامت کے دن تم لوگ اپنے اور اپنے باپوں کے نام سے پکارے جاؤ گے۔ لہٰذا تم لوگ اپنے نام اچھے رکھو''۔

اتذكر قلت كذا وكذا: کنایہ ہے خلاف شرع بات سے، تو وہ یہ سن کر گویا توقف کرے گا، اور اپنے کیے ہوئے گناہوں کے اظہار میں تأمل کرے گا۔

فيذكره: کاف کی تشدید کے ساتھ، أي: فيعلمه الله.

غدراته: غین معجمہ کے فتحہ، اور دال مہملہ کے ساتھ،'' غدرة '' کی جمع ہے۔ بمعنی الغدر، غدر کا مطلب ہے ترک وفا۔ یہاں معاصی مراد ہیں۔ اور مطلب یہ ہے کہ اللہ اس کے دنیا کے وہ گناہ یاد دلائے گا جن کے ارتکاب میں عہد ربوبیت کا توڑنا لازم آتا ہے۔

فيقول...... تغفرلي: یعنی میرا جنت میں داخل کیا جانا کیا اس بات کی علامت نہیں ہے کہ میں نے جو گناہ کیے تھے، آپ نے ان کو بخش دیا ہے۔؟

فيقول بلى: کیوں نہیں! میں نے تیرے وہ گناہ معاف کر دیئے۔

سبعة: سین کے فتحہ کے ساتھ ہے اور کسرہ بھی درست ہے۔

امام طیبیؒ فرماتے ہیں: اس جملہ کا عطف ایک جملہ محذوفہ پر ہے۔ أي: **غفرت لك فبلغت بسعة رحمتي هذه المنزلة الرفيعة.** اور تقدیم تخصیص پر دلالت کرتی ہے۔ أي: **بلوغك تلك المنزلة كائن بسعة رحمتي لا بعملك.** (یعنی تیرا اس منزلہ کو پہنچا میری وسیع رحمت کی بدولت ہے اور نہ کہ تیرے عمل کی بدولت)

قوله: فبينا هم على ذلك...... أهل الجنة بعضهم:

فبينا: اور ایک نسخہ میں ''فبينما'' ہے۔

هم: ضمیر "اهل جنت" کی طرف عائد ہے۔

على ذلك: یعنی آپس میں محوِ سخن ہوں گے۔

طيبا: (تنوین برائے تعظیم ہے۔) أي: طيباً عظيما.

حفت: فاء کی تشدید کے ساتھ، بمعنی احاطت.

فيها: بعض اصول معتمدہ میں یوں ہی ہے۔ ہاء ضمیر "سوق" کی طرف لوٹ رہی ہے۔

العيون: عین کے ضمہ کے ساتھ، عین کی جمع ہے۔

"الى مثله": اکثر شراح کے نسخوں میں یہ لفظ مفقود ہے۔

مظہرؒ فرماتے ہیں: "ما" موصولہ ہے، موصول اپنے صلہ کے ساتھ مل کر محل نصب میں بدل ہے، ضمیر منصوب مقدر سے جو "ما اعددت کے "ما" کی طرف عائد ہے۔

دوسرا احتمال یہ ہے کہ محل رفع میں ہو اور مبتدا محذوف کی خبر ہو۔ أي: المعد لكم.

امام طیبیؒ فرماتے ہیں: "ما" موصوفہ بدل ہے "سوق" سے۔ ایک شارح کا کہنا ہے، کہ یہ مبتدا ہے، اور اس کی خبر محذوف ہے۔ أي: فيها اور میرے خیال کے مطابق ہی بات زیادہ بجا اور بہتر ہے۔

الآذان: ہمزہ ممدودہ کے ساتھ، اذن کی جمع ہے یعنی کان۔ اور نہ اس کے مثل سنا ہوگا۔

ولم يخطر: طاء کے ضمہ کے ساتھ، اور نہ اس کے مثل دل پر خیال گزرا ہوگا۔

مشہور حدیث قدسی کا مفہوم بھی یہی ہے:

اعددت لعبادی الصالحين مالاعين رأت 'ولارأت سمعت 'ولا خطر على قلب بشر۔

"میں نے اپنے نیک بندوں کے لئے وہ کچھ تیار کر رکھا ہے جو نہ کسی آنکھ نے دیکھا نہ کسی کان نے سنا اور نہ کسی بشر کے دل پر اس کا خیال گزرا۔

یہ حدیث ابو ہریرہؓ سے منقول ماقبل میں گزر چکی ہے۔

فيحمل لنا ما اشتيهنا: پھر اس بازار میں پسند کردہ اشیاء ان کے محلات تک پہنچا دی جائیں گی۔

ليس يباع فيها ولا يشترى: یہ جملہ حالیہ ہے۔ "ما اشتهينا" کے "ما" سے حال ہے۔ "ما" کنایہ ہے "شيء محمول" سے۔ اور "يباع" کی ضمیر بھی اسی "ما" کی طرف لوٹ رہی ہے۔

ذلك السوق: مذکر و مؤنث دونوں طرح استعمال ہوتا ہے۔ اور تانیث اکثر و اشہر ہے۔

يلقى: لقاء سے مراد فقط رؤیت ہے۔

قال: کا فاعل نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام ہیں۔ اور اگر اس کا فاعل حضرت ابو ہریرہؓ ہوں تو یہ حدیث حقیقۃً مرفوع ہوگی۔ اور اگر یہ موقوف بھی ہو تو بھی حکماً مرفوع ہوگی۔

قوله: فيقبل الجل۔۔ان يجزن فيها:

یقبل: اقبال سے ماُخوذ ہے۔ بمعنی یجيء ویتوجه.

قوله: فیقتل الرجل ذو۔۔۔ فیتلفا نا ازواجنا:

دونه: یعنی مرتبہ میں کم ہوگا۔

من دنی: "من " نفی استغراق میں مبالغہ کیلئے ہے۔ اور ایک صحیح نسخہ بغیر "من " کے ہے۔ جیسا کہ خود اس حدیث کے آغاز میں (" وما فیهم دنی " بغیر " من " کے) ہے۔

فیروعه: راء کے ضمہ کے ساتھ بمعنی یعجب.

مما یری: رؤیت بمعنی بصارت ہے۔

علیه: ضمیر " من دونه " کی طرف عائد ہے۔ من اللباس: "ما" کا بیان ہے۔ (کذاذکرہ شارح)۔

بظاہر دونوں ضمیروں کا مرجع اس کے برعکس ہے۔

امام طیبیؒ فرماتے ہیں: ضمیر مجرور ہوسکتا ہے، کہ "من " کی طرف عائد ہو۔ اور " روع " کراہت سے مجاز ہو، اور یہ بھی احتمال ہے، کہ " الرجل ذی المنزلة " کی طرف راجع ہو۔ اس صورت میں " الروع " بمعنی " الاعجاب" ہوگا۔ أی یعجبه حسنه فیدخل فی روعه ما یتمنی مثل ذلك لنفسه.

آخر حدیثه: شارح کا کہنا ہے، کہ ضمیر "من "کی طرف عائد ہے۔ أی: حدیث من هو دونه مع الرجل الرفیع المنزلة، اور میں کہتا ہوں ممکن ہے کہ کلام میں " قلب " ہو۔

حتی یتخیل علیه: صیغہ معروف کے ساتھ ہے اور ایک نسخہ میں مبنی بصیغۂ مجہول ہے أی: حتی یتصور له أن علیه.

ذلك: کا مشارالیہ " تخیل " ہے۔

لأنه: یہ ضمیر شان ہے۔

یحزن: زاء کے فتحہ کے ساتھ، بمعنی یغتم. حزن یہاں فعل لازم کے طور پر استعمال ہوا ہے۔ از باب سمع، نا کہ از باب نصر، کیونکہ باب نصر سے متعدی استعمال ہوتا ہے۔ اور فعل متعدی کے معنی مراد لینا اس مقام کے مناسب نہیں۔

فیها: ضمیر " حنة" کی طرف عائد ہے۔

قوله: فیتلقا نا ازواجنا ......:

فیتلقانا: تلقی سے مشتق ہے بمعنی یتقبلنا، اور ایک نسخہ میں فیلقانا ہے۔ اللقاء (یعنی ملاقات) سے ماخوذ ہے۔

أزواجنا: دنیا والی عورتیں اور جنتی حوریں مراد ہیں۔

قوله: ویحقنا ان نتقلب بمثل ما انقلبنا:

یحقنا: حاء کے کسرہ اور قاف کی تشدید کے ساتھ، چنانچہ "مصباح" میں ہے کہ حق الشیء، بمعنی ثبته باب ضرب اور نصر سے ہے۔ اور قاموس میں ہے کہ حق جب لازم استعمال ہو تو بلاشک کے معنی میں آتا ہے۔ اور جب متعدی أی حقه استعمال ہوتا ہے۔ تو " أوجبه " کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ چنانچہ " یحقنا" یوجبنا و یلزمنا کے معنی میں ہے۔ اور

یہ بھی ممکن ہے، باب حذف وایصال سے ہو۔ أي: یحق لنا ویلیق لنا.

انقلبنا: "انقلاب" سے ماخوذ ہے، بمعنی انصرفنا

۵۶۴۸ : وَعَنْ اَبِی سَعِیْدٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اَدْنٰی اَھْلِ الْجَنَّۃِ الَّذِیْ لَہٗ ثَمَانُوْنَ اَلْفَ خَادِمٍ وَاثْنَتَانِ وَسَبْعُوْنَ زَوْجَۃً وَتُنْصَبُ لَہٗ قُبَّۃٌ مِّنْ لُؤْ لُؤٍ وَزَبَرْ جَدٍ وَیَا قُوْتٍ کَمَا بَیْنَ الْجَابِیَۃِ اِلٰی صَنْعَآءَ وَبِھٰذَا الْاِسْنَادِ قَالَ مَنْ مَاتَ مِنْ اَھْلِ الْجَنَّۃِ مِنْ صَغِیْرٍ اَوْ کَبِیْرٍ یُرَدُّوْنَ بَنِیْ ثَلٰثِیْنَ فِی الْجَنَّۃِ لَا یَزِیْدُوْنَ عَلَیْھَا اَبَدًا وَکَذَالِکَ اَھْلُ النَّارِ وَبِھٰذَا الْاِسْنَادِ قَالَ اِنَّ عَلَیْھِمُ التِّیْجَانَ اَدْنٰی لُؤْ لُؤَۃٍ مِنْھَا لِتُضِیْءُ مَا بَیْنَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَبِھٰذَا الْاِسْنَادِ قَالَ الْمُؤْمِنُ اِذَا اشْتَھَی الْوَلَدَ فِی الْجَنَّۃِ کَانَ حَمْلُہٗ وَوَضْعُہٗ وَسِنُّہٗ فِیْ سَاعَۃٍ کَمَا یَشْتَھِیْ وَقَالَ اِسْحٰقُ بْنُ اِبْرَاھِیْمَ فِیْ ھٰذَا الْحَدِیْثِ اِذَا اشْتَھَی الْمُؤْ مِنُ فِی الْجَنَّۃِ الْوَ لَدَ کَانَ فِیْ سَاعَۃٍ وَلٰکِنْ لَایَشْتَھِیْ.

(رواہ الترمذی وقال ھذا حدیث غریب وروی ابن ماجۃ الرابعۃ والدارمی الاخیرۃ)

اخرجه الترمذی فی السنن ٤/٥٩٩حدیث رقم ٢٥٦٢، وابن ماجه فی السنن ٢/١٤٥٢حدیث رقم ٤٣٣٨، والدارمی ٢/٤٣٤ حدیث رقم ٢٨٣٤، واحمد فی المسند ٣/٧٦۔

ترجمہ: "حضرت ابوسعید رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: اہل جنت میں سب سے کم رتبہ کا جو آدمی ہوگا ہوگا اس کے اسی ہزار خادم اور بہتر بیویاں ہوں گی (جن میں سے دو بیویاں دنیا کی عورتوں میں سے اور ستر بیویاں حوران جنت میں سے ہوں گی) اس لئے جو خیمہ لگایا جائے گا وہ موتی زمرد اور یاقوت سے (بنا ہوا ہوگا یا ان اشیاء سے مرصع اور آراستہ) ہوگا"۔ اسی اسناد کے ساتھ (حضرت ابوسعید رضی اللہ عنہ سے نقل کی جانے والی) ایک روایت میں یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: وہ لوگ جو جنت والے ہیں دنیا میں خواہ چھوٹی عمر میں مریں یا بڑی عمر میں جنت کے اندر تیس تیس سال کی عمر میں لوٹا کر بھیجے جائیں گے اور وہ کبھی بھی اس عمر سے زیادہ کے نہیں ہوں گے' اہل جہنم کا بھی یہی حال ہوگا"۔ اور اسی اسناد کے ساتھ ایک روایت میں یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جنتیوں کے سروں پر جو تاج ہوں گے ان میں سے جو سب سے معمولی اور کم حیثیت موتی ہوگا وہ بھی ایسا ہوگا کہ مشرق سے مغرب تک کی درمیانی تمام جگہ کو تابندہ و تجلی کر دے"۔ اور اسی اسناد کے ساتھ ایک روایت یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اگر (بالفرض) کوئی مسلمان جنت میں اولاد کا آرزو کرے گا تو (اس کی خواہش اس طرح پوری ہو جائے گی کہ) بچہ کا حمل قرار پانا' اس کا پیدائش اور اس کا انتہائی عمر (یعنی تیس سال کی عمر) تک پہنچنا سب کچھ ایک لمحہ میں عمل پذیر ہو جائے گا"۔ حضرت ابواسحٰق بن ابراہیمؒ اس آخری روایت کے بارے میں فرماتے ہیں کہ اگر کوئی مومن جنت میں اولاد کا آرزومند ہوگا تو اس کی خواہش ایک لمحہ میں پوری ہو جائے گی لیکن حقیقت یہ ہے کہ ایسی خواہش کوئی بھی نہیں کرے گا۔ اس روایت کو ترمذی نے نقل کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ حدیث غریب ہے۔ ابن ماجہ نے چوتھی روایت نقل کی ہے اور دارمی نے صرف آخر کا حصہ (جو ابواسحٰق سے منقول ہے) نقل کیا ہے"۔

تشریح: قوله:اهل الجنة۔۔۔واثنتان وسبعون زوجة:

ادنیٰ جنتی سے مراد وہ جنتی ہے جسے سب سے کم خدام اور کم عورتیں ملیں گی۔

اثنتان: اور ایک نسخہ میں (اثنتان کی بجائے) ''اثنان ''بصیغہ مذکر ہے۔ممکن ہے کہ معنی کا لحاظ رکھتے ہوئے کہ حور ''زوج '' کے معنی میں ہو اس لئے مذکر لایا گیا ہو۔

قوله: وتنصب له قبه ۔۔۔الی ضعاء:

تنصب: صیغہ مجہول کے ساتھ ہے۔

قاضیؒ نے اس کے دو مطلب بیان فرمائے ہیں:

اول: وہ خیمہ موتی، زمرد اور یاقوت سے بنا ہو گا۔ دوم: وہ خیمہ ان چیزوں سے مرصع ومزین ہو گا۔

جابیة: شام کا ایک شہر ہے۔

صنعاء: یہ یمن کا شہر ہے۔ ایک شارح کا کہنا ہے کہ یہ یمن میں واقع ایک قصبہ کا نام ہے۔ اور بعض کا کہنا ہے کہ طوفانِ نوح کے بعد سب سے پہلے یہی شہر تعمیر کیا گیا۔

حدیث کے اس جملہ کا مطلب یہ ہے کہ اس قبہ کی فسحت ووسعت طول وعرض میں ان دو جگہوں کے درمیانی فاصلے کی بقدر ہوگی۔

امام سیوطیؒ الجامع الصغیر میں فرماتے ہیں:

اس حدیث کو امام احمد، ترمذی اور ابن حبان اور ضیاء وغیرہ نے ابو سعیدؓ سے نقل کیا ہے۔

قوله: وبهذا الاسناد۔۔۔وكذلك اهل النار:

یعنی حضرت ابو سعید سے سند متصل کے ساتھ روایت کیا ہے۔

قال: اس کا فاعل نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام ہیں۔ یا ابو سعیدؓ ہیں۔ دوسری صورت میں یہ حدیث مرفوع ہوگی۔ اور مصابیح میں ''وبه قال'' ہے۔

''به'': ضمیر کا مرجع ''الا سناد المذكور'' ہے۔

یردون: ''یعودون'' (یعنی لوٹانا) کے معنی میں ہے، یہ بطور تغلیب ہے چونکہ صغیر کے حق میں رڈ کا کوئی مطلب ہی نہیں بنتا، یا ''یصیرون'' (ہوجانا) کے معنی میں ہے۔

فی الجنة: اس کا تعلق ''یردون'' سے ہے۔

لا یزیدون علیها أبدا: یعنی ایسی زیادہ نہیں ہوگی کہ جوان کے ابدان واعضاء، شعور واشعار میں تغیر کا باعث ہو۔ وگرنہ جنت میں قیام کا عرصہ وزمانہ تو ہمیشہ بڑھتا ہی چلا جائے گا۔

وكذلك اهل النار: یعنی اس طرح دوزخی بھی تیس تیس سال ہی کی عمر کے ہوکر دوزخ میں جائیں گے اور جنتیوں کی طرح وہ دوزخی بھی ہمیشہ تیس کی عمر کے رہیں گے۔ ان کے جسموں وغیرہ میں بھی زیادتی نہیں ہوگی۔

اہل جنت اور اہل دوزخ کیلئے ہمیشہ کی عمر تیس سال مقرر ہونا شاید اس لئے ہو کہ جو مستحقین سکون وراحت ہیں انہیں کامل

راحت نصیب ہو سکے اور جو مستحق عذاب ہوں انہیں کامل عذاب ملے۔

امام طیبیؒ فرماتے ہیں: اگر آپ یہ کہیں کہ حدیث باب اور مسلم شریف کے باب البکاء میں مروی حضرت ابو ہریرہؓ کی اس حدیث: ''صغارهم دعا میص الجنة'' میں (تعارض ہے تو) توافق کیسے ہوگا؟

میں کہتا ہوں: ''فی الجنة'' ظرف ہے'' یردون'' کے لئے۔ یہ اس بات کے منافی نہیں کہ وہ قبل از رد ''دعا میص'' نہیں تھے۔ (یعنی تیس سال کی عمر میں لوٹا کر بھیجا جاتا) اس بات کے منافی نہیں کہ پہلے وہ ''دعا میض'' تھے)

قوله: وبهذا الاسنادقال: ان علیهم۔۔۔ المشرق والمغرب:

''علیهم'': (یہاں) میں مضاف محذوف ہے۔ أي: علی رؤوس أهل الجنة.

التیجان: تائے مثناۃ فوقانیہ کے کسرہ کے ساتھ، ''تاج'' کی جمع ہے۔

لتضیٔ: بعض نسخوں میں تانیث کے ساتھ ہے۔ ممکن ہے، کہ مضاف نے مضاف الیہ سے کسب تانیث کی ہو۔ یہاں یہ متعدی ہے اور ممکن ہے کہ لازمی ہو۔ اس صورت میں تقدیری عبارت یوں ہوگی: لیضيء به ما بینها الاماکن، یعنی اہل دنیا پر یہ موتی ظاہر ہو جائے یعنی جنتیوں کے سروں کے جو تاج کا سب سے معمولی موتی بھی ایسا ہوگا کہ مشرق ومغرب کے درمیان کے حصے کو روشن ومنور کر دے گا۔

قوله: وبهذا الاسناد قال :المؤمن ۔۔ ولکن لایشتهي:

یعنی اگر بالفرض کوئی مؤمن جنت میں اولاد کا خواہش مند ہوگا، تو اس کی خواہش اس طرح پوری کی جائے گی کو اگر لڑکے کی خواہش ہوئی تو لڑکا پیدا ہوگا، اور اگر لڑکی کی خواہش ہوگی تو لڑکی پیدا ہوگی، وغیرہ۔ اور بچہ کا حمل ٹھہرنا، اس کی ولادت، اور تیس (۳۰) سال کی انتہائی عمر تک پہنچنا سب کچھ ایک ساعت میں ہو جائے گا۔ چونکہ انتظار موت سے زیادہ شدید ہوتا ہے۔ اور جنت میں نہ تو موت ہے، اور نہ ہی حزن۔

قال: اسحق بن ابراهیم: '' قال '' کا مقولہ حقیقتاً ''ولکن لایشتهي'' ہے۔

یہ ابن حبیب بصری ہیں۔ معمر بن سلیمان سے روایت کرتے ہیں۔ اور ان سے روایت کرنے والوں میں ابو عبدالرحمٰن نسائیؒ وغیرہ شامل ہیں۔ ان کی وفات ۲۵۷ھ میں ہوئی۔

فی هذا الحدیث: یعنی اس حدیث: ''اذا اشتهی المؤمن في الجنة الولد کان في ساعة'' میں یہ بیان فرمایا یا اس حدیث کی شرح میں فرماتے ہیں: اور یہ جملہ دلالت کر رہا ہے کہ جب وہ یہ حاجت کرے گا تو پل بھر میں پوری ہو جائے گی۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ کوئی بھی ایسی خواہش نہیں کرے گا۔

قوله: روی ابن ماجه الرابعة والدارمي في الأخيرة: یعنی ابن ماجہؒ نے حدیث کے فقرات میں سے صرف چوتھا فقرہ روایت کیا ہے۔ اور یعنی امام دارمیؒ نے صرف آخر کا وہ حصہ نقل کیا ہے جو ابو اسحٰق بن ابراہیم سے منقول ہے۔

''تیسیر الاصول الی جامع الاصول'' میں ابو رزین سے مروی ہے:

قوله: قال: قال رسول الله ﷺ: لا یکون لأهل الجنة ولد.

اس حدیث کو امام ترمذیؒ نے نقل کیا ہے۔ ابوسعید خدریؓ کی ایک روایت میں یہ اضافہ بھی ہے:

ان اشتهى الولد كان حمله و وضعه وسنه في ساعة واحدة. قال بعضهم: لكن لا يشتهي.

۵۶۴۹: وَعَنْ عَلِيٍّ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ فِي الْجَنَّةِ لَمُجْتَمَعًا لِلْحُوْرِ الْعِيْنِ يَرْفَعْنَ بِاَصْوَاتٍ لَمْ تَسْمَعِ الْخَلَائِقُ مِثْلَهَا يَقُلْنَ نَحْنُ الْخَالِدَاتُ فَلَا نَبِيْدُ وَنَحْنُ النَّاعِمَاتُ فَلَا نَبْأَسُ وَنَحْنُ الرَّاضِيَاتُ فَلَا نَسْخَطُ طُوْبٰى لِمَنْ كَانَ لَنَا وَكُنَّا لَهٗ (رواه الترمذی)

اخرجه الترمذی فی السنن ۶۰۰/۴ حدیث رقم ۲۵۶۴، واحمد فی المسند ۱۵۶/۱۔

ترجمہ: ''حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے بیان فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: جنت میں حوران عین کے مجتمع ہونے کا ایک مقام ہوگا (جہاں وہ حوریں آپس میں ملاقات اور سیر و تفریح کی غرض سے اکٹھی ہوا کریں گی) اور وہاں بلند آواز سے گیت گائیں گی (ان کی آواز اس قدر دلکش اور حسین ہوگی کہ) مخلوقات میں سے کسی نے ان جیسی آوازیں کبھی نہیں سنی ہونے گی، وہ حوریں اس طرح کا گیت گائیں گی: ہمیں زندگی میں دوام حاصل ہے، ہم کبھی موت کی آغوش میں نہیں جائیں گی ہم ناز و نعیم میں رہنے والی ہیں ہم کبھی رنج و الم سے دوچار نہ ہونے لگی ہم اپنے پروردگار یا اپنے شوہروں سے رضا مند اور خوش رہنے والی ہیں ہم کبھی ناراض نہ ہوں گی ہر اس شخص کے لئے خوشخبری ہے جو (جنت میں) ہمارے لئے ہے اور ہم اس کے لئے ہیں''۔ (ترمذی)

تشریح: قوله: ان في الجنة لمجتمعا للحور العين:

لمجتمعا: دوسرے میم کے فتحہ کے ساتھ ''موضع اجتماع''، اور ممکن ہے، کہ مصدر ہو، ''اجتماع'' کے معنی میں۔

حور: امام راغبؒ فرماتے ہیں: ''حور'' جمع ہے۔ اس کا مفرد ''أحور''، ''حوراء'' ہے۔ بعض کا کہنا ہے، کہ وہ آنکھ انتہائی حسین ہے جس آنکھ کی سیاہی میں تھوڑی سی سفیدی ہو۔ بقر وحشی کو اس کے آنکھ کے حسن کی وجہ سے ''أعین'' اور ''عیناء'' کہا جاتا ہے۔ اس کی جمع ''عین'' آتی ہے۔ عورتوں کو اسی سے تشبیہ دی جاتی ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وحور عين كأمثال اللؤلؤ المكنون﴾ [الواقعة: ۲۲، ۲۳] ''اور ان کے لئے گوری گوری بڑی آنکھوں والی عورتیں ہوں گی (مراد حوریں ہیں) جیسے (حفاظت سے) پوشیدہ رکھا ہوا موتی''۔

ابن ماجہ اور ابن مردویہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے واسطہ سے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام سے نقل کرتے ہیں:

الحور العين خلقهن من تسبيح الملائكة ''حور عین کو ملائکہ کی تسبیح سے پیدا کیا گیا ہے۔''

اور ابن مردویہؒ اور خطیب حضرت انسؓ سے مرفوعاً نقل کرتے ہیں:

الحور العين خلقن من الزعفران. ''حور عین نہ زعفران سے پیدا کی گئی ہیں''

میں کہتا ہوں: ان دونوں حدیثوں میں کوئی تعارض نہیں۔ کیونکہ پہلی حدیث میں ''من'' تعلیلیہ ہے، فتامل۔

قوله: يرفعن بأصوات...... :

بأصوات: باء زائدہ، تعدیہ کی تاکید کے واسطے ہے۔ یا ''أصوات'' سے مراد نغمات ہیں۔ اور مفعول محذوف ہے۔ أي:

يرفعن أصواتهن بأنغام.

فلا تبيد: "باد" بمعنیٰ "هلك وفنى" (ختم ہونا ہلاک ہونا) سے ماخوذ ہے۔

الناعمات: اى متنعمات. (نازونعم والی۔ خوب رو اور نرم و گداز جسم والی)

فلا نبأس: یعنی ہم اپنے مولیٰ کے علاوہ کسی دوسرے کی فقیر و محتاج نہیں ہونگی۔

لمن كان...... له: یعنی بلند و بالا جنات میں۔

۵۶۵۰ : وَعَنْ حَكِيمِ بْنِ مُعَاوِيَةَ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ فِي الْجَنَّةِ بَحْرَالْمَاءِ وَبَحْرَ الْعَسَلِ وَبَحْرَ اللَّبَنِ وَبَحْرَ الْخَمْرِ ثُمَّ تَشَقَّقُ الْاَ نْهَا رُ بَعْدَ (رواه الترمذى)

اخرجه الترمذى فى السنن ٦٠٣/٤ حديث رقم ٢٥٧١، واحمد فى المسند ٥/٥۔

ترجمہ: "حکیم بن معاویہ رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: جنت میں ایک دریا پانی کا ہے اور ایک دریا شہد کا ہے اور ایک دریا دودھ کا ہے اور ایک دریا شراب کا ہے اور پھر (جنت میں اہل جنت کے داخل ہونے کے بعد) ان دریاؤں سے اور نہروں کو جاری کیا جائے گا۔ (ترمذی)

راویٔ حدیث:

حکیم بن معاویہ۔ یہ "نمیری" ہیں ملا علی قاری رحمۃ اللہ علیہ نے حکیم بن معاویہ کو قیشری و بصری لکھا ہے۔۔ یہ بہز بن حکم کے والد ہیں وہ بھی رجالِ حدیث میں سے ہیں۔

تشریح: امام بخاریؒ نے فرمایا: ان کا صحابی ہونا محل نظر ہے۔ ان سے روایت کرنے والوں میں ان کے بھتیجے معاویہ بن حکیم اور قتادہ رضی اللہ عنہم شامل ہیں۔ (کذا ذکرہ المؤلف)

قوله: ان فى الجنة بحر الماء......:

امام طیبیؒ فرماتے ہیں: "البحر" سے مراد دریائے دجلہ اور فرات وغیرہ جیسے دریا ہیں۔ اور "النهر" سے مراد نہر معقل جیسی نہریں مراد ہیں، کہ ایک سے دوسری نکلتی ہے۔ پھر اس سے جداول بنتے ہیں۔ (انتہیٰ)

ظاہر یہ ہے کہ ان احادیث میں جن "بحار" کا ذکر ہے، یہ دراصل وہی "انہار" ہیں جن کا ذکر قرآن میں ہے: ﴿فِيهَآ أَنْهٰرٌ مِّنْ مَّآءٍ غَيْرِ اٰسِنٍ ۚ وَأَنْهٰرٌ مِّنْ لَّبَنٍ لَّمْ يَتَغَيَّرْ طَعْمُهٗ ۚ وَأَنْهٰرٌ مِّنْ خَمْرٍ لَّذَّةٍ لِّلشّٰرِبِيْنَ ۚ وَأَنْهٰرٌ مِّنْ عَسَلٍ مُّصَفًّى ۭ﴾ [محمد: ۱۵] "اس میں بہت سی نہریں تو ایسے پانی کی ہیں جس میں ذرا تغیر نہیں ہوگا اور بہت سی نہریں دودھ کی ہیں جن کا ذائقہ ذرا بدلا ہوا نہ ہوگا اور بہت نہریں شراب کی ہیں جو پینے والوں کو بہت لذیذ معلوم ہوں گی اور بہت سی نہریں ہیں شہد کی جو بالکل صاف ہوگا۔"

تشقق: میں دو تائیں تھیں، ایک تاء کو تخفیف حذف کر دیا گیا۔

یہ نہریں وہ ہوں گی جو حدیث میں مذکورہ دریاؤں سے نکلیں گی۔ اور پھر ان نہروں سے چھوٹی نہریں شاخ در شاخ نکل کر ابرار

واخیار کے خیموں کی طرف جاری ہوں گی، اور محلات کے نیچے بہیں گی۔

بعض حضرات کا کہنا ہے کہ "بحار" سے مراد "انہار" ہیں۔ "بحار" کو "انہار" کہنے کی وجہ یہ ہے کہ انہار میں جریان ہوتا ہے، برخلاف بحارِ دنیا کے، چونکہ ان میں غالب یہی ہے کہ وہ محل قرار ہوتے ہیں۔

۵۶۵۱ : وَرَوَاهُ الدَّارِمِیُّ عَنْ مُعَاوِيَةَ۔

اخرجه الدارمی فی السنن ۴۳۵/۲ حدیث رقم ۲۸۳۶۔

ترجمہ: "دارمی نے اس روایت کو معاویہؓ سے روایت کیا ہے"۔

تنبیہ: "معاويه" سے مراد معاویہ بن سفیان ہیں۔ چونکہ معاویہ ابوحکیم کا صحابی ہونا معروف نہیں ہے۔

تشریح: میں نے الجامع الصغیر میں دیکھا کہ سیوطیؒ فرماتے ہیں: اس حدیث کو امام احمد، اور امام ترمذی نے معاویہ بن حیدہ سے نقل کیا ہے۔ لیکن مؤلف نے "الاکمال فی ضبط اسماء الرجال" میں ان کا نام ذکر نہیں کیا ہے۔

الفصل الثالث:

۵۶۵۲ : عَنْ اَبِی سَعِيْدٍ عَنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اِنَّ الرَّجُلَ فِی الْجَنَّةِ لَيَتَّكِیُٔ فِی الْجَنَّةِ سَبْعِيْنَ مَسْنَدًا قَبْلَ اَنْ يَّتَحَوَّلَ ثُمَّ تَاْتِيْهِ امْرَاَةٌ فَتَضْرِبُ عَلٰى مَنْكِبِهٖ فَيَنْظُرُ وَجْهَهٗ فِی خَدِّهَا اَصْفٰى مِنَ الْمَرْاٰةِ وَاِنَّ اَدْنٰى لُؤْلُؤَةٍ عَلَيْهَا تُضِیْءُ مَا بَيْنَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ فَتُسَلِّمُ عَلَيْهِ فَيَرُدُّ السَّلَامَ وَيَسْاَلُهَا مَنْ اَنْتِ فَتَقُوْلُ اَنَا مِنَ الْمَزِيْدِ وَاِنَّهٗ لَيَكُوْنُ عَلَيْهَا سَبْعُوْنَ ثَوْبًا فَيَنْفُذُهَا بَصَرُهٗ حَتّٰى يُرٰى مُخَّ سَاقِهَا مِنْ وَّرَآءِ ذٰلِكَ وَاِنَّ عَلَيْهَا مِنَ التِّيْجَانِ اَدْنٰى لُؤْلُؤَةٍ مِنْهَا لَتُضِیْءُ مَا بَيْنَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ. (رواه احمد)

اخرجه احمد فی المسند ۷۵/۳۔

ترجمہ: "حضرت ابوسعید رضی اللہ عنہ رسول اللہ ﷺ سے روایت نقل فرماتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا: جنت میں (آرام و راحت میں) جنتی آدمی (اپنے خاص) باغ میں کروٹ بدلنے سے پہلے ستر تکیوں پر ٹیک لگائے گا' جنت میں پھر جنت کی عورتوں میں سے ایک عورت اس کے پاس آ جائے گی اور (اس کو اپنی طرف رغبت دلانے اور مائل کرنے کی غرض سے) اس کے کاندھے پر تھپکی دے گی' وہ مرد اس طرف متوجہ ہوگا اس کے رخساروں میں' جو آئینہ سے زیادہ صاف اور شفاف ہوں گے اپنا چہرہ دیکھے گا اور حقیقت یہ ہے کہ اس عورت کے (کسی زیور یا تاج میں جڑا ہوا) ایک کمتر درجہ کا موتی بھی (اس قدر بیش قیمت اور نظر پر شکوہ ہوگا کہ) اگر وہ دنیا میں آ جائے تو مشرق سے مغرب تک (کی ہر چیز) کو روشن و منور کر دے۔ پھر وہ عورت اس مرد کو سلام کرے گی اور مرد اس کے سلام کا جواب دے گا اور اس سے پوچھے گا تو کون ہے؟ وہ کہے گی کہ میں "مزید" میں سے ہوں۔ صورت حال یہ ہوگی کہ اس عورت کے بدن پر ستر (رنگ برنگ) کپڑوں کا (تہ در تہ لباس ہوگا اور اس شخص کی نگاہ اس تمام (ستر کپڑوں کے) لباس سے بھی متجاوز ہو جائے گی (یعنی وہ

لباس کے نیچے چھپے ہوئے عورت کے حسن و جمال اور اس کے دلکش بدن کا خد و خال کی نزاکت و لطافت کا نظارا کرے گا) حتی کہ وہ شخص اس عورت کی پنڈلی کے گودے کو لباس کے پیچھے سے دیکھ رہا ہوگا (اور اس عورت کے سر پر تاج رکھے ہوں گے اور ان تاجوں کا معمولی سا ہیرا بھی ایسا ہوگا کہ اگر وہ (دنیا میں آ جائے) تو مشرق سے مغرب تک (کی ہر شی) کو منور و تابندہ کر دے"۔ (احمد)

تشریح: قوله:ان الرجل في الجنة۔۔۔ قبل أن يتحول:

سبعين مسندا: میم کے فتحہ اور ضمہ ہر دو کے ساتھ، البتہ نون مفتوح ہی ہے۔ "مسند" منصوب ہے "سبعين" کی تمیز ہونے کی وجہ سے اور "سبعين" منصوب بنزع الخافض ہے۔ أي:علي سبعين مسندا۔

قيل: یہ "ليتكيء" کے لئے، ظرف ہے۔ یہ ترکیب بالکل واضح ہے اور امام طیبیؒ نے عجیب بات فرمائی کہ "سبعين مسندا" ان مفرین کی تائید کرتا ہے جنہوں نے ﴿وفرش مرفوعة﴾ [الواقعة۔۳۴] کی تفسیر "منضودة بعضها فوق بعض" کی ہے اور "قبل أن يدحول" یہ ظرف ہے یأتیة" کے لئے۔اھ۔ پہلی بات میں از روئے معنی غرامت کا ہونا اور دوسری بات میں از روئے مبنی غرابت کا ہونا مخفی نہیں۔

قوله:ثم تأتيه امرأه۔۔۔أنا من المزيد: علي منكبه: ایک نسخہ میں (صیغہ تثنیہ کے ساتھ) "منكبيه" ہے۔

اصفي: (حال ہے۔) اي حال كون خدها اصفيٰ

قوله:انا من المزيز:

اس سے مراد وہ "مزید" ہے جس کا ذکر اس آیت میں ہے: ﴿لهم مايشاؤون فيها ولد ينا مزيد﴾ [ق:۳۵] "ان کو بہت کچھ ہے جو جو چاہیں گے اور ہمارے پاس اور بھی زیادہ (نعمت) ہے" اور افضل ترین "مزید" کا ذکر اللہ جل شانہ کے اس ارشاد گرامی میں ہے: ﴿للذين أحسنوا الحسنٰى وزيادة﴾ [یونس:۲۶] "جن لوگوں نے نیکی کی ان کے واسطے خوبی (یعنی جنت) ہے اور مزید برآں (اللہ عز و جل کا دیدار) بھی" اس سے مراد جنت اور رؤیت باری تعالیٰ ہے۔ اس کو "زیادہ" اس لئے فرمایا کہ "حسنیٰ" ہی جنت ہے اور یہ وہ چیز ہے جس کا اللہ تعالیٰ نے وعدہ فرمایا کہ وہ مکلف لوگوں کے اعمال کی جزاء کے طور پر محض اپنے فضل سے عطا فرمائے گا اور زیارت اور فضل پر فضل۔

انه: ضمیر شان ہے۔

قوله:وان عليها من اليتجان: أن أدني:

"ان" ہمزہ کے کسرہ کے ساتھ یہ "ان" زائدہ ہے۔ اور پہلے "ان" کی خبر لؤلؤة منها لتضيي پر جو لام داخل ہے اس کی نظیر یہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿أَلَمْ يَعْلَمُوْٓا أَنَّهٗ مَنْ يُّحَادِدِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَأَنَّ لَهٗ نَارَ جَهَنَّمَ﴾ [التوبة:۶۳] "کیا ان کو خبر نہیں کہ جو شخص اللہ کی اور اس کے رسول ﷺ کی مخالفت کرے گا (جیسا کہ یہ لوگ کر رہے ہیں) تو یہ بات ٹھہر چکی ہے کہ ایسے شخص کو دوزخ کی آگ اس طور پر نصیب ہوگی۔" (انتہی)

اور ظاہر یہ ہے کہ اگر زائدہ ہوتا تو لام مبتدا کی خبر پر داخل ہوتا، اور جملہ پہلے "ان" کی خبر ہے۔ علاوہ ازیں یہ بے غبار بات

ہے کہ آیت بالا میں دوسرا "ان" زائدہ نہیں ہے، بلکہ زیادت تاکید اور کے لئے نسبت میں مبالغہ کیلئے ہے۔

الفصل الثالث:

۵۶۵۳ : وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ كَانَ یَتَحَدَّثُ وَعِنْدَهٗ رَجُلٌ مِّنْ اَهْلِ الْبَادِیَةِ اِنَّ رَجُلاً مِّنْ اَهْلِ الْجَنَّةِ اسْتَاذَنَ رَبَّهٗ فِی الزَّرْعِ فَقَالَ لَهٗ اَلَسْتَ فِیْمَا شِئْتَ قَالَ بَلٰی وَلٰكِنِّیْ اُحِبُّ اَنْ اَزْرَعَ فَبَذَرَ فَبَادَرَ الطَّرْفُ نَبَاتُهٗ وَاسْتِوَآؤُهٗ وَاسْتِحْصَادُهٗ فَكَانَ اَمْثَالَ الْجِبَالِ فَیَقُوْلُ اللّٰهُ تَعَالٰی دُوْنَكَ یَا ابْنَ اٰدَمَ فَاِنَّهٗ لَا یُشْبِعُكَ شَیْءٌ فَقَالَ الْاَعْرَابِیُّ وَاللّٰهِ لَا تَجِدُهٗ اِلَّا قُرَشِیًّا اَوْ اَنْصَارِیًّا فَاِنَّهُمْ اَصْحَابُ زَرْعٍ وَاَمَّا نَحْنُ فَلَسْنَا بِاَصْحَابِ زَرْعٍ فَضَحِكَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ۔

اخرجه البخاری فی صحیحه ۲۷/۵، حدیث رقم ۲۳۴۸، واحمد فی المسند ۵۱۱/۲۔

ترجمہ: "حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ (ایک روز) نبی اقدس ﷺ کے پاس ایک دیہاتی مسلمان آدمی بیٹھا ہوا تھا اور آپ ﷺ یہ حدیث بیان فرمارہے تھے کہ "اہل جنت میں سے ایک آدمی اپنے رب سے کاشتکاری کی اجازت طلب کرے گا' خداوند تعالیٰ اس سے فرمائے گا کہ کیا اس جنت میں جو کچھ چاہتے ہو میسر نہیں ہے؟ (یعنی جب یہاں ہر جنس کی چیز موجود ہے جس کی تمہیں خواہش ہو' تو پھر کھیتی کے ذریعہ کیا حاصل کرنا ہے؟) وہ شخص عرض کرے گا کہ بے شک یہاں سب کچھ میسر ہے لیکن میری آرزو یہی ہے کہ میں کھیتی کروں۔ آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا' بہر حال اس شخص کو کاشتکاری کی اجازت دیدی جائے گی اور وہ زمین میں بیج بوئے گا اور پلک جھپکتے ہی سبزہ اُگ آئے گا اور جب ہی کھیتی بڑھ کر پک کر کٹ جائے گی اور پہاڑوں کی مانند انبار لگ جائیں گے' تب اللہ تعالیٰ اس شخص سے فرمائے گا: ابن آدم! دیکھ تیری آرزو پایہ تکمیل تک پہنچ گئی' حقیقت یہ ہے کہ کوئی چیز تیرا پیٹ نہیں بھر سکتی"۔ راوی کہتے ہیں کہ (یہ حدیث سن کر) وہ دیہاتی (جو حضور ﷺ کے پاس بیٹھا ہوا تھا) کہنے لگا خدا کی قسم وہ شخص یقیناً یا تو قریشی ہوگا یا انصاری۔ پس (اس دیہاتی کی یہ بات سن کر) رسول اللہ ﷺ ہنسنے لگے"۔ (بخاری)

تشریح: قوله: ان رجلا من أهل الجنة استأذن ربه في الزرع:

"ان" بر سبیل حکایت ہمزہ کے کسرہ کے ساتھ ہے۔ اس صورت میں "ان" بھی کلام محکی کا حصہ ہوگا۔ اور بعض نسخوں میں "ان" ہمزہ کے فتحہ کے ساتھ ہے، اس صورت میں یہ "یتحدث" کا مفعول ہوگا۔ اور درمیان والا جملہ حالیہ معترضہ ہوگا۔ امام طیبیؒ فرماتے ہیں: ان، ہمزہ کے کسرہ کے ساتھ، "یتحدث" کا مفعول ہے۔ آنحضرت ﷺ کے ملفوظ کی حکایت کے طور پر۔

استأذن ربه في الزرع: اپنی دنیا کی عادت کے موافق یا چونکہ آخرت میں زراعت نہیں ہوگی۔

فقال: ایک نسخہ میں "فيقال له" ہے۔

قوله: فقال ألست فيما شئت۔۔۔فانه لا يشبعك شيئ:

فبذر: فاء فصیحیہ ہے

چنانچہ اس شخص کو کھیتی کرنے کی اجازت دے دی جائے گی، اور وہ جنت کی زمین میں بیج ڈالے گا۔

الطرف: راء کے سکون کے ساتھ پلک جھپکنے سے پہلے ہی سبزہ اُگ آئے گا۔ اور کھیتی بڑھ کر پک کر کٹ جائے گی۔ کھیتی کی کٹائی کیلئے نہ بندوں کی ضرورت پڑے گی، اور نہ کٹائی دینے کی نوبت پیش آئے گی۔ اور کھیتیوں کے پہاڑ برابر انبار لگ جائیں گے۔

فیقول الله تعالٰی: یا ابن آدم: یعنی اللہ تعالیٰ فرمائے گا، اے بنی آدم! لے تیری چاہت پوری ہوگئی۔ اللہ جل شانہ کا یہ کلام علی سبیل التوبیخ ہوگا۔ اس کی دلیل یہ اگلا جملہ ہے: **فانه لا یشبعك شیء**۔ آنحضرت ﷺ نے اپنے اس ارشاد گرامی میں وہ مفہوم واضح فرمایا ہے، جس کو لوگوں کے عرف میں ان الفاظ میں تعبیر کیا جاتا ہے: ''**کل اناء یترشح بما فیه**'' (ہر برتن سے وہ کچھ جھلکتا ہے جو اس میں ہوتا ہے) اور کسی نے یوں بیان کیا ہے: **الناس یموتون کما یعیشون، ویحشرون کما یموتون**. (لوگ اسی طرح مرتے ہیں جس طرح وہ جیتے ہیں اور اسی طرح وہ اٹھائے جائیں گے جس طرح مرتے ہیں۔)

یعنی جنت میں کاشت کی آرزو کرنے والا آدمی یا تو مکہ کا رہائشی ہوگا یا مدینہ کا کیونکہ یہی لوگ کھیتی باڑی کیا کرتے ہیں جہاں تک ہم صحرا نشین دیہاتیوں کا حال ہے' کھیتی باڑی سے ہمیں سروکار رہی نہیں ہے ہم جنگلات میں اونٹ بکری چرا کر اور محنت مزدوری کر کے دودھ اور کھجوروں پر گزر بسر کر لیتے ہیں ان چیزوں کے علاوہ اور کسی چیز کی آرزو نہیں رکھتے۔

قوله: فقال الاعرابی والله...... :

''اَوْ'' برائے تنویع ہے۔

فانهم: ضمیر دونوں قبیلوں کے مجموعہ کی طرف لوٹ رہی ہے۔ یعنی فی الجملہ مراد ہے۔ اگرچہ کھیتی باڑی کا کام زیادہ تر انصار کیا کرتے تھے۔

فأما: فاء کے ساتھ ہے، اور ایک صحیح نسخہ میں'' **وأما** '' ہے۔

آنحضرتؐ کے اس ضحک کا باعث اس بدوی کی فطانت تھی اور یہ بھی ممکن ہے خفتی کے سوال اور اس کے بدیع جواب کو سن کر ہنس پڑے ہوں۔

۵۶۵۴ : وَعَنْ جَابِرٍ قَالَ سَالَ رَجُلٌ رَسُولَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَيَنَامُ اَهْلُ الْجَنَّةِ قَالَ النَّوْمُ اَخُ الْمَوْتِ وَلَا يَمُوتُ اَهْلُ الْجَنَّةِ ۔ (رواه البيهقى فى شعب الا يمان)

رواه البيهقى فى شعب الايمان ١٨٣/٤ حديث رقم ٤٧٤٥۔

ترجمہ: ''حضرت جابر رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا کہ ایک آدمی نے رسول اللہ ﷺ سے دریافت کیا کہ کیا جنت والے سوئیں گے؟ آپ ﷺ نے جواباً ارشاد فرمایا: نیند یعنی سونا' موت کا بھائی ہے اور حقیقت یہ ہے کہ جنت والے تو نہیں مریں گے (اور جب وہ مریں گے نہیں تو سوئیں گے بھی نہیں) اس روایت کو بیہقی نے شعب الایمان میں روایت کیا ہے۔

تشریح: **قوله: النوم اخو الموت ......**:

یعنی جب وہ مریں گے نہیں تو سوئیں گے بھی نہیں۔ جواب کے اس اسلوب کو ''دلیل برہانی'' کہتے ہیں۔ اور یہ اسلوب ذہن میں زیادہ اچھی طرح راسخ ہوتا ہے۔ اور مختصر جواب مثلاً نہیں' کے مقابلے میں زیادہ اطمینان بخش ہوتا ہے۔

بَابُ رُؤْيَةِ اللّٰهِ تَعَالٰى

دیدارِ الٰہی کا بیان

"رؤية" کی اضافت لفظ جلالہ کی طرف، باب اضافة المصدر الی مفعوله کے قبیل سے ہے۔

الفصل الاول :

۵۶۵۵ : عَنْ جَرِيْرِ بْنِ عَبْدِ اللّٰهِ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّكُمْ سَتَرَوْنَ رَبَّكُمْ عَيَانًا وَفِى رِوَايَةٍ قَالَ كُنَّا جُلُوْسًا عِنْدَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَنَظَرَ اِلَى الْقَمَرِ لَيْلَةَ الْبَدْرِ فَقَالَ اِنَّكُمْ سَتَرَوْنَ رَبَّكُمْ كَمَا تَرَوْنَ هٰذَا الْقَمَرَ لَا تُضَامُّوْنَ فِى رُؤْيَتِهٖ فَاِنِ اسْتَطَعْتُمْ اَنْ لَّا تُغْلَبُوْا عَلٰى صَلٰوةٍ قَبْلَ طُلُوْعِ الشَّمْسِ وَقَبْلَ غُرُوْبِهَا فَافْعَلُوْا ثُمَّ قَرَاَوَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ قَبْلَ طُلُوْعِ الشَّمْسِ وَقَبْلَ غُرُوْبِهَا (متفق عليه)

اخرجه البخاری فی صحیحه ۴۱۹/۱۳ حدیث رقم ۷۴۳۵ ومسلم ۴۳۹/۱ حدیث رقم (۲۱۱-۶۳۳) واخرجه ابو داؤد ۹۷/۵ حدیث رقم ۴۷۲۹، واخرجه الترمذی ۵۹۲/۴ حدیث ۲۵۵۱، وابن ماجه ۶۳/۱ حدیث رقم ۱۷۷، والدارمی ۴۱۹/۲ حدیث رقم ۲۸۰۱، واحمد فی المسند ۱۶/۳۔

ترجمہ: "حضرت جریر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: "جلد ہی ایسا وقت آنے والا ہے جب (قیامت میں) تم کھلی آنکھوں اپنے پروردگار کو دیکھو گے"۔ ایک روایت میں حضرت جریر رضی اللہ عنہ نے یہ بیان فرمایا کہ (ایک روز) ہم لوگ رسول اللہ ﷺ کے پاس بیٹھے ہوئے تھے کہ آپ ﷺ نے چودھویں رات کے چاند کی جانب نگاہ اٹھا کر دیکھا اور فرمایا: "تم اپنے پروردگار کا یوں دیدار کرو گے جس طرح اس چاند کو دیکھ رہے ہو اس (پروردگار) کو دیکھنے میں تم کوئی رکاوٹ دقت محسوس نہ کرو گے پس اگر تم استطاعت رکھو تو تم اس نماز کو جو طلوع آفتاب سے پہلے کی ہے یعنی نماز فجر اور اس نماز کو جو غروب آفتاب سے پہلے کی ہے (یعنی نماز عصر) نہ چھوڑو تو لازمی طور پر ایسا کیا کرو پھر آنحضرت ﷺ نے یہ آیت شریفہ تلاوت فرمائی: وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ قَبْلَ طُلُوْعِ الشَّمْسِ وَقَبْلَ غُرُوْبِهَا اور تم اپنے پروردگار کی حمد و پاکی بیان کرو یعنی نماز پڑھو طلوع آفتاب سے پہلے اور غروب آفتاب سے پہلے"۔ (بخاری ومسلم)

تشریح: قوله: انکم سترون ربکم عیانا سترون: رؤیة بصارت کے معنی میں ہے۔

عیانا: عین کے کسرہ کے ساتھ۔مصدر موکد ہے۔یا حال موکد ہے فاعل سے، یا مفعول سے۔یعنی" معاینین"یاء کے کسرہ کے ساتھ کے معنی میں ہے۔یا "معاینا"یاء کے فتحہ کے معنی میں ہے۔"معاینة" کہتے ہیں رائی اور مرئی کے درمیان سے رفع حجاب کو۔صاحب قاموس لکھتے ہیں: لقیه عیانا أی معاینة لم یشك فی رؤیته ایاه. (یعنی اس نے اس سے ملاقات کی یا اس کو دیکھا اور اس کے دیکھنے میں کوئی شک نہیں)

امام طیبیؒ فرماتے ہیں: "عیانا" کا مطلب ہے "جهارا" (یعنی روز روز ملاقات کرنا) اور ممکن ہے کہ یہ رؤیت عین ظاہرہ کے ذریعہ عین محسوسہ کے ساتھ ہو۔

رؤیت باری تعالیٰ ممکن ہے؟

امام نوویؒ فرماتے ہیں: اہل سنت والجماعت کا متفقہ عقیدہ ہے کہ اللہ جل شانہ کا دیدار ایک ایسی حقیقت ہے، جس کا وجود عقلاً درست ہے، محال نہیں ہے۔اور اس بات پر بھی تمام علماء کا اتفاق ہے، کہ حق تعالیٰ کا یہ دیدار آخرت میں نصیب ہوگا۔اس کا ثبوت بہت سے دلائل منقولہ سے ہے۔اور اس بات پر بھی تمام امت کا اجماع ہے، کہ دیدار باری تعالیٰ صرف مومنین کو حاصل ہوگا، کافر اس سے محروم رہیں گے۔

اہل بدعت، معتزلہ، خوارج اور بعض مرجئہ کا زعم یہ ہے، کہ رؤیت باری تعالیٰ محال ہے، اور یہ کہ مخلوقات میں سے کسی بھی مخلوق میں رؤیت باری تعالیٰ کی تاب نہیں ہے۔ان کا یہ زعم خطأ صریح اور جہل قبیح ہے۔

کتاب اللہ اور سنت کے دلائل' اجماع صحابہ اور ان کے بعد اسلاف کے اتفاق کی رو سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ رؤیت باری تعالیٰ آخرت میں مومنین کیلئے ثابت ہے۔اس مسئلہ کے ثبات میں آنحضرت ﷺ کی احادیث تقریباً بیس (۲۰) صحابہ کرامؓ سے منقول ہیں۔اس کی تائید بہت سی مشہور آیات کریمہ سے ہوتی ہے۔مبتدعہ کے اعتراضات کے جواب اہل سنت متکلمین کی کتب میں دیکھے جاسکتے ہیں۔

یہاں ایک دوسرا سوال یہ ہے کہ ممکن ہے؟ تو جمہور سلف وخلف متکلمین وغیرہ کا کہنا ہے، کہ ہاں! دنیا میں بھی ہوسکتی ہے۔

امام ابوقاسم قشیریؒ اپنے معروف رسالہ میں امام ابوبکر بن فورک سے ناقل ہیں: اس مسئلہ میں امام ابوالحسن شعری سے دوقول مروی ہیں۔پہلا قول وقوع کا ہے، اور دوسرا قول عدم وقوع کا ہے۔

پھر اہل حق کا مذہب یہ ہے کہ رؤیت ایک قوت ہے، جو اللہ تعالیٰ نے اپنی مخلوق کو عطا کی ہے۔اس رؤیت کیلئے نہ تو شعاعیں شرط ہیں، اور نہ ہی رائی اور مرئی کا آمنے سامنے ہونا وغیرہ شرط ہے، لیکن عادت یہ چل رہی ہے کہ ہمارا ایک دوسرے کو دیکھنا ان امور کے وجود کے ساتھ اتفاقاً ہوتا ہے اگرچہ یہ شرط نہیں ہے۔ہمارے ائمہ متکلمین نے اس کو واضح دلائل سے ثابت کیا ہے۔دیدار باری تعالیٰ کے اثبات سے اللہ تعالیٰ کے لئے کسی خاص جگہ، کسی خاص جہت وسمت کا اثبات کا لازم نہیں آتا۔بلکہ مومنین اللہ جل شانہ کو بغیر کسی جہت کے دیکھیں گے (بالکل اسی طرح کہ) جس طرح مومنین اللہ کے بارے میں علم رکھتے ہیں مگر اس کو کسی جہت میں قرار نہیں دیتے۔

میں کہتا ہوں: جیسا کہ اللہ تعالیٰ ہمیں بغیر کسی جہت، بغیر آمنے سامنے ہوئے وغیرہ دیکھا کرتا ہے۔حاصل یہ ہے کہ غائب

کو حاضر پر قیاس نہ کیا جائے، خاص طور سے خالق کو مخلوق پر (تو بالکل قیاس نہیں کرنا چاہئے) اسی وجہ سے کہا گیا: **لا يقاس الملوك بالحدادين.** (بادشاہوں کو لوہاروں پر قیاس نہیں کرنا چاہئے)

قوله: قال: كنا جلوسا۔۔۔ لاتضامون في رؤيته:

جلوسا: جالس کی جمع ہے۔

اکملؒ فرماتے ہیں۔ بدر کامل مراد ہے، چودھویں کے چاند کو بدر کہنے کی وجہ یہ ہے کہ یہ طلوع ہونے میں غروب شمس سے مبادرت کرتا ہے۔

فقال انكم سترون ربكم كما ترون هذا القمر: جیسا کہ تمہیں یہ چاند واضح طور پر دکھائی دے رہا ہے۔ اگلا جملہ مستانفہ ہے یا بیان حال ہے۔

لا تضامون: تاء کے ضمہ اور میم کی تخفیف کے ساتھ، "الضيم" بمعنی "الظلم" سے ماخوذ ہے۔ حافظ ابن حجرؒ فرماتے ہیں: **وهو الأكثر.** چنانچہ مطلب یہ ہوا: **لا يظلم بعضكم ببعض بالتكذيب والانكار.** اور ایک نسخہ میں تاء کے فتحہ، اور میم کی تشدید کے ساتھ ہے، "التضامن" بمعنی "التزاحم" سے ماخوذ ہے۔ ایک اور نسخہ میں تاء کے ضمہ اور میم کی تشدید کے ساتھ ہے۔ "المضامة" بمعني "المزاحمة" سے مشتق ہے۔ اس تقدیر پر اسے معروف بھی پڑھا جا سکتا ہے اور مجہول بھی۔ مادہ اشتقاق خواہ کچھ بھی ہو، مگر مطلب یہی ہے: **لا تشكون.** جامع الاصول میں فرماتے ہیں: بعض سامعین کو یہ تخیل ہوتا ہے کہ "**كما ترون**" کا کاف مرئی کو تشبیہ دینے کیلئے ہے، حالانکہ کاف، تشبیہ رؤیت کیلئے ہے۔ اور رؤیت رائی کا فعل ہے۔ چنانچہ مطلب یہ ہوا: **ترون ربكم رؤية ينزاح معه الشك كرؤيتكم القمر ليلة البدر، لا ترتابون فيه ولا تمترون.**

فرمایا: **ولا تضامون** "میم کی مخفف کے ساتھ "**الضيم الظلم**" سے مشتق ہے۔ چنانچہ مطلب یہ ہوا: **انكم ترونه جميعكم لا يظلم بعضكم بعضاً في رؤيته، فيراه البعض دون البعض.** (تم لوگ سب کے سب اس کو دیکھو اس کو دیکھنے کے بارے میں تم میں سے بعض بعض پر ظلم نہیں کریں گے کہ اس کو بعض دیکھ لیں اور بعض نہ دیکھیں۔) اور میم کی تشدید کے ساتھ ہو تو تاء کے فتحہ اور **تضمام بمعني الازدحام** سے ماخوذ ہے اس صورت میں مطلب یہ ہوگا: **لا يزدحم بعضكم بعضا في رؤيته، ولا يضم بعضكم الى بعض من ضيق، كما يجري عند رؤية الهلال مثلاً دون رؤية القمر فانه يراه كل منكم موسعا عليه منفردا به**

قوله: فان استطعتم أن لا تغلبوا۔۔۔ فافعلوا :

ان لاتغلوا بصیغۂ مجہول کے ساتھ ہے۔

قاضیؒ فرماتے ہیں: "**ان استطعتم**" کا ترتب "**سترون**" پر ہے بواسطہ فاء، یہ دلالت کرتا ہے، کہ نمازوں پر مواظبت کرنے والا شخص اس لائق ہے کہ اپنے ربّ کا دیدار کر لے۔ اور "**لا تغلبوا على صلاة قبل طلوع الشمس وقبل غروبها**" کی معنوی تقدیر یہ ہے: **لا تصيروا مغلوبين بالاشتغال عن صلاتي الصبح والعصر** (یعنی تم لوگ مشغولات میں پڑ کر صبح اور عصر کی نماز کے معاملہ میں مغلوب مت ہو)

قولہ: ثم قرأ: ﴿سبح بحمد ربك قبل طلوع الشمس وقبل غروبها﴾: ''وسبح'' اس کا عطف ماقبل میں موجود اس آیت پر ہے: ﴿فاصبر علی مایقولون﴾ اس کی دو تفسیریں کی گئی ہیں:

۱۔ ''تسبیح'' سے مراد ''صلاۃ'' ہے۔ أی وصل فی هذین الوقتین (یعنی ان دو وقتوں میں نماز پڑھیے) ''جز'' بول کر ''کل'' مراد ہے' کہ تسبیح سے مراد آغاز صلوٰۃ میں پڑھی جانے والی ثناء ہے جس کے بعد سورہ فاتحہ پڑھی جاتی ہے جو اللہ تعالیٰ کی حمد وثناء پر مشتمل ہے۔ اس معنی پر آیت کا اگلا حصہ: ﴿ومن آناء الليل فسبح وأطراف النهار لعلك ترضى﴾ [طٰہٰ: ۱۳۰] (''ترضیٰ'' کو علامت مضاف کے) فتحہ وضمہ کے ساتھ ہے۔ ای علی رجاء ان تکون راضیا أو مرضیا أو جمعا مبشتا۔ (یعنی تیرے راضی یا مرضی ہونے کی امید پر......)۔

۲۔ ''تسبیح'' سے مراد ''تنزیہ باری تعالیٰ'' ہے یعنی اللہ تعالیٰ کو شرک اور اسی جیسی دیگر صفات نقصان وزوال اور حدوث وانتقال سے منزہ ومبرا اقرار دینا۔ اور حمد سے مراد کمال ثناء یعنی نعت وجمال اور وصف جلال کا بیان ہے۔

تخریج: الجامع میں ہے کہ اس روایت کو احمد، شیخین اور اصحاب اربعہ نے روایت کیا ہے، لیکن اس روایت میں قراءت کی آیت کا ذکر نہیں ہے۔

۵۶۵۶: وَعَنْ صُهَيْبٍ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اِذَا دَخَلَ اَهْلُ الْجَنَّةِ الْجَنَّةَ يَقُوْلُ اللّٰهُ تَعَالٰى تُرِيْدُوْنَ شَيْئًا اَزِيْدُكُمْ فَيَقُوْلُوْنَ اَلَمْ تُبَيِّضْ وُجُوهَنَا اَلَمْ تُدْخِلْنَا الْجَنَّةَ وَتُنَجِّنَا مِنَ النَّارِ قَالَ فَيُرْفَعُ الْحِجَابُ فَيَنْظُرُوْنَ اِلٰى وَجْهِ اللّٰهِ تَعَالٰى فَمَآ اُعْطُوْا شَيْئًا اَحَبَّ اِلَيْهِمْ مِنَ النَّظَرِ اِلٰى رَبِّهِمْ ثُمَّ تَلَا لِلَّذِيْنَ اَحْسَنُوا الْحُسْنٰى وَزِيَادَةٌ۔ (رواه مسلم)

اخرجه مسلم فی صحیحه ۱۶۳/۱ حدیث رقم (۲۹۷-۱۸۱) والترمذی ۵۹۳/۴ حدیث رقم ۲۵۵۲، واحمد فی المسند ۱۵/۶۔

ترجمہ: ''حضرت صہیب رضی اللہ عنہ نبی اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت نقل فرماتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''جب سب جنت والے جنت میں (اپنی اپنی جگہ) جا پہنچیں گے تو اللہ تعالیٰ فرمائے گا کہ (تم کسی اور چیز کی آرزو رکھتے ہو (جو ان نعمتوں کے علاوہ ہو جو تم کو مل چکی ہیں)؟ اہل جنت (یہ سن کر) عرض کریں گے کہ (پروردگار!) کیا آپ نے ہمارے چہروں کو تابندہ اور منور نہیں کر دیا' کیا آپ نے ہمیں جنت میں داخل نہیں فرمایا' کیا آپ نے ہمیں دوزخ کی آگ سے نہیں بچا لیا (اتنی بڑی بڑی نعمتوں سے بڑھ کر اور کیا نعمت ہو سکتی ہے جس کی ہم مدینہ آرزو رکھیں؟) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''تب رکاوٹ ختم کر دی جائے گی اور اہل جنت ذات خداوندی کے دیدار کریں گے (جو صورت وجسم اور جہت ومقام کی قیود وشرائط سے پاک ومنزہ ہے) اور اس وقت معلوم ہوگا کہ اہل جنت کو ایسی کوئی نعمت عنایت نہیں ہوئی ان کو اپنے پروردگار کے دیدار سے زیادہ بہتر پسندیدہ ہو۔ پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس آیت مبارکہ کی تلاوت فرمائی: لِلَّذِيْنَ اَحْسَنُوا الْحُسْنٰى وَزِيَادَةٌ۔

تشریح: قولہ: تردلون شیئا ازید کم --- فیرفع الحجاب: قولہ: [للذین احسنوا الحسنی

وزیادہ]

"الحسنی": سے مراد جنت ہے۔ اور" زیادة" سے مراد زیارت وجہ باری تعالیٰ ہے۔ اور" زیادہ" کی تنکیر برائے تعظیم ہے أی زیادة عظیمة۔ یعنی ایسی عظیم زیادت کہ جس کی قدر کا اندازہ نہیں کیا جا سکتا اور جس کی حقیقت کا ادراک نہیں کیا جا سکتا۔

امام طیبیؒ فرماتے ہیں: جب کلام منزل کی تفسیر منزل علیہ شخصیت نے خود کر دی ہے' تو جو اس سے تجاوز کرے گا تحقیق اس نے ان (ﷺ) کے طریقہ سے تجاوز کیا۔

ملا علی قاریؒ فرماتے ہیں: امام طیبیؒ کی مراد یہ ہے کہ زمخشریؒ نے اس میں عدول کرتے ہوئے تاویل سے کام لیا ہے، اور اس طرح ان (یعنی صاحب کشاف) کی اتباع کرنے والوں مثلاً بیضاویؒ نے کیا ہے کہ خود نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام سے مروی اس کی تفسیر کو "قیل" کے صیغہ کے ساتھ ذکر کیا ہے۔ "تریدون" سے پہلے حرف استفہام مقدر ہے۔ تنجنا: جیم کے ساتھ۔

فیرفع: بصیغۂ مجہول ہے۔ یہ رفع حجاب رفع تعجب کے لئے ہوگا۔ گویا کہ ان سے کہا جا رہا ہے کہ یہ وہ مزید اللہ سبحانہ وتعالیٰ حجاب سے منزہ ہے۔ چونکہ وہ ایسا محبوب ہے جو محجوب نہیں ہے' چونکہ محبوب تو مغلوب ہوتا ہے لہٰذا مطلب یہ ہے کہ ناظرین کی نگاہوں سے حجاب اٹھا دیا جائے گا۔ جیسا کہ اس معنی پر اگلا جملہ دلالت کر رہا ہے۔

الفصل الثانی:

۵۶۵۷ : وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ اَدْنٰى اَهْلِ الْجَنَّةِ مَنْزِلَةً لَمَنْ يَّنْظُرُ اِلٰى جَنَانِهٖ وَاَزْوَاجِهٖ وَنَعِيْمِهٖ وَخَدَمِهٖ وَسُرُرِهٖ مَسِيْرَةَ اَلْفِ سَنَةٍ وَاَكْرَمَهُمْ عَلَى اللّٰهِ مَنْ يَّنْظُرُ اِلٰى وَجْهِهٖ غُدْوَةً وَّعَشِيَّةً ثُمَّ قَرَاَ وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ نَّاضِرَةٌ اِلٰى رَبِّهَا نَاظِرَةٌ (رواه احمد والترمذی)

اخرجه احمد فی المسند ٦٤/٢ والترمذی ٥٩٣/٤ حدیث٢٥٥٣۔

ترجمہ: "حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما نے بیان فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: "جنتیوں میں قدر و مرتبہ کے لحاظ سے سب سے معمولی درجہ کا وہ آدمی ہوگا جو اپنے باغات' اپنی بیویوں' اپنی نعمتوں' اپنے خدام اور اپنے (بیٹھنے و استراحت کرنے کے) تخت و کرسی کو ایک ہزار سال کی مسافت کے بقدر رقبہ میں پھیلے ہوئے دیکھ رہا ہوگا (یعنی جنت کی لامحدود وسعت میں وہ ادنیٰ مرتبہ کا شخص بھی اس قدر نوازا جائے گا کہ اس کی املاک مقبوضہ ایک ہزار سال کی مسافت کے بقدر دور تک پھیل رہی ہوں گی اور وہ اپنی چیزوں کو دیکھ دیکھ کر فرحت وخوشی محسوس کرے گا) اور اللہ تعالیٰ کے نزدیک سب سے زیادہ معظم اور مکرم وہ آدمی ہوگا جو صبح و شام اپنے پروردگار کی ذات اقدس کی زیارت سے لطف اندوز ہوں گے۔ پھر آنحضرت ﷺ نے یہ آیت شریفہ تلاوت فرمائی: ﴿وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ نَّاضِرَةٌ اِلٰى رَبِّهَا نَاظِرَةٌ﴾ "بہت سے چہرے اس روز اپنے پروردگار کے دیدار سے تر و تازہ اور خوش و خرم ہوں گے"۔ (ترمذی)

تشریح: قوله: ان ادنى اهل الجنة... الف سنة:

جنان: جیم کے کسرہ کے ساتھ، باغات۔

غدوۃ: غین کے ضمہ کے ساتھ۔ ترکیبی اعتبار سے عبارت میں تقدیم وتاخیر ہے۔

قوله: واکرمهم على الله ـــ غدوة وعشية:

اور اسی کی مانند یہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿إِنَّ خَيْرَ مَنِ اسْتَأْجَرْتَ الْقَوِيُّ الْأَمِينُ﴾ [القصص: ٢٦] ''کیونکہ اچھا نوکر وہ شخص ہے جو مضبوط (ہو اور) امانت دار (بھی) ہو''۔

أكرمهم: منصوب ہونے کی تقدیر پر ''أدنی'' کا معطوف ہے۔ اور ایک نسخہ میں (أکرمهم) مرفوع ہے۔ اس صورت میں اس کا عطف ''ان'' کے اسم وخبر کے مجموعہ پر ہوگا ای **واكثرهم كرامة على الله واعدهم منزلة وأقربهم رتبة عنده سبحانه**۔

اس کی تائید حضرت بریدہ کی حدیث مرفوع سے ہوتی ہے جسے امام حاکمؒ نے نقل کیا ہے:

ان أهل الجنة يدخلون على الجبار كل يوم مرتين، فيقرأ عليهم القرآن، وقد جلس كل امرىء منهم مجلسه الذى هو مجلسه على منابر الدر والياقوت والزمرد والذهب والفضة بالأعمال، فلا تقر أعينهم قط كما تقرّ بذلك، ولم يسمعو اشيئا أعظم منه، ولا أحسن منه ثم ينصرفون الى رحالهم وقرة أعينهم ناعمين الى مثلها من الغد.

''بے شک اہل جنت ''جبار'' (یعنی اللہ تعالیٰ) خدمت اور روزانہ دربار میں حاضری دیں گے' چنانچہ وہ ان کے سامنے قرآن کی تلاوت کرے گا' ان میں سے ہر شخص اپنے اعمال کے موافق موتیوں' یاقوت' زمرد' سونے اور چاندی کے بنے ہوئے منبروں پر اپنی نشست پر بیٹھا ہوگا۔ پس ان کی آنکھیں اسی طرح کبھی بھی ٹھنڈی نہ ہوں گی جس طرح سے یہاں ٹھنڈی ہوں گی' اس نے زیادہ عظیم الشان اور زیادہ خوبصورت کوئی چیز نہ سنی ہوگی پھر وہ اپنی آرامگاہوں میں چلے جائیں گے ان کی آنکھیں ٹھنڈی ہوں گی' درآنحالیکہ وہ گذشتہ کل کی طرح نعمتوں میں ہوں گے۔''

قوله: ثم قرأن ......: ﴿الى ربها ناظرة﴾:

امام طیبیؒ فرماتے ہیں: ''ناظرۃ'' کا صلہ مقدم ہے یا تو رعایت فاصلہ کی وجہ سے تاکہ ناضرة، باسرة اور فاقرة کے ساتھ مطابقت ہو جائے۔ یا اس وجہ سے کہ رفع حجاب کے وقت دیدار باری تعالیٰ سے مشرف یاب ہونے والوں کی تمام تر توجہ صرف اور صرف اللہ جل شانہ کی طرف ہوگی اور یہ کوئی مستبعد بھی نہیں کیونکہ عارفین اس دنیا میں رہتے ہوئے محبت کی آگ میں اس طرح سے جلتے رہتے ہیں، کہ کائنات کی طرف توجہ ہی نہیں کرتے۔ اس کی تائید فصل ثالث (کے بالکل آخر) میں مروی حدیث جابرؓ سے ہوتی ہے:

فينظر اليهم وينظرون اليه، فلا يلتفتون الى شيء من النعيم ماداموا ينظرون اليه، حتى يحتجب عنهم ويبقى نوره وبركته عليهم فى ديارهم ''پس وہ اہل جنت کو دیکھے گا اور اہل جنت اس کو دیکھیں گے' جب تک وہ وہ لوگ اس کو دیکھتے رہیں گے اس دوران وہ جنت کی نعمتوں میں سے کسی بھی نعمت کی طرف التفات نہیں کریں گے' حتی کہ وہ خود ان

سے حجاب میں ہو جائے گا اور اس کا نور اور اس کی برکت ان کے گھروں میں باقی رہ جائے گی۔''

تخریج: اسی طرح اس حدیث کو امام طبرانیؒ نے بھی روایت کیا ہے۔ اور ہناد ''كتاب الزهد'' میں عبید بن عمر سے مرسلاً روایت کرتے ہیں۔

ان أدنى أهل الجنة منزلا لرجل له دار من لؤلؤة واحدة منها غرفها وأبوابها.

۵۶۵۸ : وَعَنْ اَبِیْ رَزِیْنٍ الْعُقَیْلِیِّ قَالَ قُلْتُ یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اَکُلُّنَا یَرٰی رَبَّهٗ مُخْلِیًا بِهٖ یَوْمَ الْقِیَامَةِ قَالَ بَلٰی قَالَ قُلْتُ وَمَا اٰیَةُ ذٰلِكَ فِیْ خَلْقِهٖ قَالَ یَا اَبَا رَزِیْنٍ اَلَیْسَ کُلُّکُمْ یَرَی الْقَمَرَ لَیْلَةَ الْبَدْرِ مُخْلِیًا بِهٖ قَالَ بَلٰی قَالَ فَاِنَّمَا هُوَ خَلْقٌ مِّنْ خَلْقِ اللّٰهِ وَاللّٰهُ اَجَلُّ وَاَعْظَمُ۔ (رواہ ابوداود)

اخرجه ابو داؤد فی السنن ۹۹/۵ حدیث رقم ۴۷۳۱ وابن ماجه ۶۴/۱ حدیث رقم ۱۸۰ واحمد فی المسند ۱۱/۴۔

ترجمہ: ''حضرت ابورزین عقیلی رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا کہ میں نے عرض کیا یا رسول اللہ! کیا (روز قیامت) ہم میں سے ہر آدمی اپنے پروردگار کو دیکھے گا؟ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''ہاں'' ابورزین کا بیان ہے کہ پھر میں نے پوچھا کہ کیا رب تعالیٰ کی مخلوقات میں اس کی کیا مثال ہے؟ فرمایا: ابورزین! کیا تم میں سے ہر آدمی چودھویں رات کے چاند کو بلا مزاحمت غیر تنہا نہیں دیکھتا!'' میں نے عرض کیا کیوں نہیں ضرور دیکھتا ہے فرمایا: چاند تو اس کے علاوہ کچھ نہیں کہ وہ پروردگار کی مخلوق میں سے ایک مخلوق ہے جب کہ اللہ بہت بزرگ و عالیشان ہے یعنی جب چاند کو جو پروردگار کی ایک مخلوق ہے' ہر شخص بلا مزاحمت و رکاوٹ دیکھ سکتا ہے تو جب بزرگ و برتر اپنا دیدار کرانا چاہے گا' اس کو ہر شخص بلا مزاحمت و رکاوٹ کیوں نہ دیکھ سکے گا''۔ (ابوداؤد)

تشریح: قوله: یارسول الله أکلنا یری ربه مخلیا یوم القیامة:

مخلیا: میم مضموم، خائے معجمہ ساکنہ، لام مکسورہ اور یائے تحتیہ مفتوحہ مخففہ کے ساتھ۔ أی: خالیا بربه بحیث لا یزاحمه شیء فی الرؤیة بعض کا کہنا ہے کہ میم کے فتحہ اور یاء کی تشدید کے ساتھ ہے یہ اصل میں '' مخلوی '' تھا۔ (کذا ذکرہ الجزری رحمہ اللہ) ابن الملکؒ نے دوسرے (ضبط) پر اقتصار کیا ہے۔

صاحب النہایہ لکھتے ہیں: کہا جاتا ہے: خلوت به معه والیه، اختلیت به اذا انفرد به، والمعنی کلکم یراہ منفردا بنفسه.

قوله: قال: بلی ......:

قال: قلت: تصحیح شدہ اکثر نسخوں میں '' قال'' کے بعد ''قلت'' کا اضافہ ہے۔

قال: بلی: أی: قلت وبلی.

امام طیبیؒ فرماتے ہیں: رؤیت باری تعالیٰ کے قائل اس شخص نے رؤیت باری تعالیٰ کو عام رؤیت پر قیاس کیا۔ کیونکہ جم غفیر جب ایک چیز کو دیکھ رہا ہوتا ہے تو لوگوں کی رؤیت میں تفاوت ہوتا ہے، خصوصاً جب کہ شئے مرئی میں کسی درجہ کا خفاء ہو۔ کیونکہ

ازدہام ہوتا ہے۔ بعض دیکھنے والے اس چیز کو مکمل طور پر دیکھ رہے ہوتے ہیں، اور بعض کو کچھ کم دکھائی دے رہا ہوتا ہے۔ چنانچہ ''مخلیا به'' سے کمال رؤیت کا اثبات ہے۔ اس لئے چودھویں رات کے چاند سے تشبیہ دینے کی جواب سے مطابقت ہے کہ بدر سے تشبیہ کیوں دی ہے ہلال سے تشبیہ کیوں نہیں دی۔

الفصل الثالث:

۵۶۵۹ : عَنْ اَبِیْ ذَرٍّ قَالَ سَاَلْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ هَلْ رَاَيْتَ رَبَّكَ قَالَ نُوْرٌ اَنّٰی اَرَاهُ۔ (رواہ مسلم)

اخرجه مسلم ۱۵۸/۱ حدیث رقم (۲۸۵-۱۷۵) والترمذی ۳۶۹/۵ حدیث ۳۲۸۲۔

ترجمہ: ''حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے پوچھا کہ کیا آپ ﷺ نے شب معراج میں اپنے رب تعالیٰ کی زیارت کی ہے؟ آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''پروردگار تو ایک نور ہے میں اس کو دیکھنے کی کہاں تاب لاسکتا ہوں''۔ (مسلم)

تشریح: **قوله**: نور أنی أراه: دیگر ائمہ محدثین سے بھی ابن الملک کے قول کی مانند اقوال مروی ہیں۔ چنانچہ ملاحظہ فرمایئے:

أني: ہمزہ کے فتحہ اور نون کی تشدید کے ساتھ اکثر نسخوں میں اسی طرح ہے۔ اور ''کیف'' کے معنی میں ہے۔ اور نسخوں میں ''نورانی'' یائے نسبت کی تشدید کے ساتھ ہے۔ الف نون زائدہ ہیں برائے مبالغہ جیسا کہ لفظ ''ربانی''۔ اس صورت میں ''راہ'' بمعنی ''اظنہ'' ہوگا یعنی ''رؤیت'' بمعنی ''رای'' ہے۔ اگر یہ ہمزہ کے ضمہ کے ساتھ پڑھا جاتا تو اس کا معنی زیادہ واضح ہوتا اور یہ بھی ممکن ہے کہ ''اراہ'' بمعنی ''الصرہ'' ہو۔

ابن الملکؒ فرماتے ہیں اس رات کی رؤیت میں اختلاف ہے۔ یہی حدیث فریقین کی دلیل ہے چونکہ روایات مختلف ہیں بایں طور کہ ہمزہ کے فتحہ اور نون مفتوحہ کے ساتھ روایت کیا ہے۔ اس صورت میں استفہام انکاری ہے۔ اور نون کے کسرہ کے ساتھ روایت کیا گیا ہے اس صورت میں یہ دلیل ہوگا اثبات کرنے والوں کے لئے اور حکایت ماضی بصیغہ حال ہوگی۔ (انتھی)

امام نوویؒ فرماتے ہیں ایک دوسری روایت میں ''روایت نور 'انی''' ہمزہ کے فتحہ اور نون مفتوحہ کی تشدید کے ساتھ تمام راویوں نے اسی طرح روایت کیا ہے تمام اصول میں۔ اور اس کا معنی ہے حجابه نور فکیف أراه۔ نور اس کا حجاب ہے چنانچہ میں اس کو کیسے دیکھ سکتا ہوں۔ امام احمدؒ ''نورانی اراہ'' کے بارے میں فرماتے ہیں کہ نون کی تشدید کے ساتھ ہے۔ یعنی یہ کلام موجب ہے۔

امام طیبیؒ فرماتے ہیں ان کی مراد یہ ہے بلکہ تقریر مستلزم ایجاب ہے۔

ای نور حیث اراہ جہاں بھی دیکھتا نور ہی نور تھا مازریؒ فرماتے ہیں اس کا مطلب یہ ہے کہ ''نور'' نے مجھ کو رؤیت سے باز رکھا جیسا کہ عادت جاری ہے چونکہ کمال نور ادراک سے مانع ہوتا ہے اور ''نورانی'' بھی مروی ہے یعنی ''نور'' کی طرف نسبت کے ساتھ

اس آیت:﴿الله نور السموات والأرض﴾ [النور:۳۵] ''اللہ تعالیٰ نور (ہدایت) دینے والا ہے آسمانوں کا اور زمین کا''اور متعدد احادیث میں اللہ جل شانہ کیلئے لفظ''نور''استعمال ہوا ہے۔اس کے متعدد معانی بیان کئے گئے ہیں:

① ذو نور (نوروالا) ② منوِّر (روشن کرنے والا) ③ آسمان وزمین والوں کو ہدایت دینے والا ④ اپنے مؤمن بندوں کے دل منور کرنے والا۔

ملا علی قاریؒ فرماتے ہیں:اس کی تائید اس آیت سے بھی ہوتی ہے:﴿مثل نوره كمشكاة فيها مصباح﴾ [النور:۳۵] ''اس کے نور (ہدایت) کی حالت رجیبہ ایسی ہے جیسے (فرض کرو) ایک طاق ہے (اور) اس میں ایک چراغ (رکھا ہے)''

عرض مرتب:

مولانا ادریس کاندھلویؒ لکھتے ہیں:''نور'': هو الذى ظاهر بنفسه ومظهر لغيره: یعنی وہ بذاتِ خود ظاہر اور روشن ہے اور دوسروں کو ظاہر اور روشن کرنے والا ہے۔نور اس چیز کو کہتے ہیں، جو ظاہر بنفسہ ہو، اور دوسرے کیلئے مظہر ہو۔آسمان وزمین سب ظلمتِ عدم میں مستور تھے، اللہ نے ان کو عدم کی ظلمت سے نکال کر نورِ وجود عطاء کیا، جس سے سب ظاہر ہو گئے، اس لئے وہ ''نور السموات والأرض''ہے۔

در ظلمت عدم ہمہ بودیم بے خبر ☆ نورِ وجود شہود از تو یافتیم

(عقائد الاسلام ص ۵۷،۵۶)

۵۶۶۰ : وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ مَا كَذَبَ الْفُؤَادُ مَارَاى وَلَقَدْ رَاٰهُ نَزْلَةً اُخْرٰى قَالَ رَاٰهُ بِفُؤَادِهٖ مَرَّتَيْنِ (رواه مسلم وفي رواية الترمذي قال) رَاٰىٰ مُحَمَّدٌ رَبَّهٗ قَالَ عِكْرَمَةُ قُلْتُ اَلَيْسَ اللّٰهُ يَقُوْلُ لَا تُدْرِكُهُ الْاَبْصَارُ وَهُوَ يُدْرِكُ الْاَبْصَارَ قَالَ وَيْحَكَ ذٰلِكَ اِذَا تَجَلّٰى بِنُوْرِهِ الَّذِىْ هُوَ نُوْرُهٗ وَقَدْ رَاٰى رَبَّهٗ مَرَّتَيْنِ۔

اخرجه مسلم في صحيحه ۱۶۱/۱ حديث رقم (۲۹۱-۱۷۸) والترمذي ۳۶۸/۵ حديث رقم ۳۲۷۹۔

ترجمہ:حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما حق تعالیٰ کے اس فرمان مَا كَذَبَ الْفُؤَادُ مَارَاٰى وَلَقَدْ رَاٰهُ نَزْلَةً اُخْرٰى (اور محمد ﷺ کے دل نے محمد ﷺ سے غلط نہیں کہا اس چیز کے متعلق جس کو انہوں نے دیکھا تھا) یعنی رب تعالیٰ کی ذات اقدس کو۔ اور حقیقت یہ ہے کہ انہوں نے پروردگار کو ایک بار اور بھی دیکھا تھا کی تفسیر میں فرماتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے ذات خداوندی کو اپنے دل کی آنکھوں سے دونوں مرتبہ دیکھا۔ (مسلم) اور ترمذی کی روایت میں یوں ہے کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے (مذکورہ آیت کی تفسیر میں) فرمایا:''محمد ﷺ نے اپنے رب تعالیٰ کی زیارت کی ہے''۔حضرت عکرمہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ (میں نے یہ سن کر اپنا اشکال ظاہر کیا اور) حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے کہا کہ (قرآن کریم میں اپنی ذات کے بارے میں) حق تعالیٰ یہ نہیں فرماتے کہ لَا تُدْرِكُهُ الْاَبْصَارُ وَهُوَ يُدْرِكُ الْاَبْصَارَ (پھر آپ کیسے کہتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے اللہ تعالیٰ کا دیدار کیا ہے؟) حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے عکرمہؒ کے اس اشکال کو رفع کرنے کے لئے فرمایا کہ تم پر افسوس ہے کہ (تم حقیقت تک رسائی نہ کر سکے بات دراصل یہ ہے کہ) یہ (مفہوم جو تم نے

اس آیت کے ذریعہ پیش کیا ہے) اس کا تعلق اس موقع سے ہے جب اللہ تعالیٰ اپنی خاص تجلی ظاہر فرمائے اور اپنے اس نور کے ساتھ ظاہر ہو جو اس کی ذات خاص کا نور ہے اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ آنحضرت ﷺ نے اپنے پروردگار کو دو مرتبہ دیکھا''۔

عرض مرتب:

اس حدیث کے ذیل میں بہت سی مباحث ہیں۔ ہم نے ان مباحث کو حتی الامکان سہل انداز میں ترتیب دینے کی بھرپور کوشش کی ہے۔ (انتھی)

اول: ان دونوں آیتوں کا مدلول ومحمول کیا ہے؟

دوم: کیا واقعہ معراج میں آنحضرت ﷺ کو دیدار باری تعالیٰ ہوا؟

سوم: شب معراج میں آنحضرت ﷺ کو اللہ تعالیٰ سے بلا واسطہ کلام کرنے کا شرف حاصل ہوا یا نہیں؟

چہارم: نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام نے حضرت جبرائیل علیہ السلام کی زیارت کتنی بار کی؟

پنجم: [ثم دنی فتدلی] اس آیت کا مصداق کون ہے؟

واقعہ معراج اور زیارتِ باری تعالیٰ:

یہ مسئلہ اختلافی ہے کہ واقعہ معراج میں نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اپنے ربّ کی زیارت کی یا نہیں؟ بہت سے حضرات نے اس کا انکار کیا ہے۔ مثلاً حضرت عائشہ صدیقہؓ، حضرت عبداللہ بن مسعود، جنید، ثوری اور ابوسعید خراز اور محدثین ومتکلمین کی ایک جماعت کا مذہب بھی یہی مروی ہے۔ صاحب ''المعرف'' نے اس کو جمہور کا موقف قرار دیا ہے۔ ان حضرات کی دلیل حضرت عائشہ صدیقہؓ کی حدیث ہے۔

ابن عباسؓ، ابوذرؓ، کعبؓ، حسنؒ، عبداللہ بن مسعودؓ، ابو ہریرہؓ، ابراہیم تیمیؒ، حضرت انسؓ، عکرمہؒ، ربیعؒ، احمد بن حنبلؒ، ابوالحسن اشعری اور ان کے اصحاب میں سے ایک جماعت اور مفسرین کی ایک جماعت کا موقف یہ ہے کہ دیدار باری تعالیٰ ہوا ہے۔ ان کا مستدل ابن عباسؓ، اسماءؓ اور انسؓ کی حدیث ہے۔

واقعہ معراج میں زیارتِ باری تعالیٰ اپنی آنکھ سے کی، یا دل سے، یا دونوں سے، سب طرح کے اقوال ہیں:

① ایک جماعت کا کہنا ہے، کہ یہ زیارتِ باری تعالیٰ ''دل'' کے ذریعہ کی تھی، آنکھ کے ذریعہ نہیں کی تھی۔ ان کا مستدل یہ آیت ہے: ﴿ما كذب الفؤاد ما رأى﴾ [النجم:۱۱] ''قلب نے دیکھی ہوئی چیز میں کوئی غلطی نہیں کی''۔

② ایک جماعت کا کہنا ہے کہ یہ زیارت اپنی آنکھ کے ذریعہ کی تھی۔ ایک مرتبہ قلب مبارک کے ذریعہ اور ایک بار نگاہ اقدس کے ذریعہ۔

③ دونوں مرتبہ زیارت قلب اطہر کے ذریعہ کی۔

④ یہ زیارت اپنے قلب منور سے کی تھی۔ اور آپ علیہ الصلوٰۃ والسلام کی بصارت آپ علیہ الصلوٰۃ والسلام کے قلب مصفی میں

رکھ دی گئی تھی۔

۵ یہ زیارت اپنے قلب مطہر سے کی تھی، بایں طور کہ آپؐ کا قلب مزکی آپؐ کی نگاہ اطہر میں تھا۔ خلاصہ یہ ہے:
مذکورہ بالا مباحث کیلئے ملاحظہ فرمایئے ملا علی قاریؒ کی تحقیقات:

اس موقع پر سورۂ نجم کی ابتدائی آیات کی بالاستیعاب مع مختصر تفسیر و تشریح بیان کرنا فائدہ سے خالی نہ ہوگا۔ چنانچہ قارئین کی خاطر وہ آیات سیاق و سباق اور مختصر تشریح کے ساتھ پیش خدمت ہیں۔ تاکہ یہ مبحث خوب سے خوب تر ہو کر تشنگانِ علم کی پیاس کو بجھا سکے۔

وَالنَّجْمِ اِذَا هَوٰی (۱) مَا ضَلَّ صَاحِبُكُمْ وَمَا غَوٰی (۲) وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰی (۳) اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْیٌ يُّوْحٰی (٤) عَلَّمَهٗ شَدِيْدُ الْقُوٰی (٥) ذُوْ مِرَّةٍ فَاسْتَوٰی (٦) وَهُوَ بِالْاُفُقِ الْاَعْلٰی (٧) ثُمَّ دَنَا فَتَدَلّٰی (٨) فَكَانَ قَابَ قَوْسَيْنِ اَوْ اَدْنٰی (٩) فَاَوْحٰی اِلٰی عَبْدِهٖ مَاۤ اَوْحٰی (١٠) مَا كَذَبَ الْفُؤَادُ مَا رَاٰی (١١) اَفَتُمٰرُوْنَهٗ عَلٰی مَا يَرٰی (١٢) وَلَقَدْ رَاٰهُ نَزْلَةً اُخْرٰی (١٣) عِنْدَ سِدْرَةِ الْمُنْتَهٰی (١٤) عِنْدَهَا جَنَّةُ الْمَاْوٰی (١٥) اِذْ يَغْشَی السِّدْرَةَ مَا يَغْشٰی (١٦) مَا زَاغَ الْبَصَرُ وَمَا طَغٰی (١٧) لَقَدْ رَاٰی مِنْ اٰيٰتِ رَبِّهِ الْكُبْرٰی (١٨)

''تارے کی قسم جب غائب ہونے لگے۔ کہ تمہارے رفیق (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) نہ راستہ بھولے ہیں نہ بھٹکے ہیں۔ اور نہ خواہش نفس سے منہ سے بات نکالتے ہیں۔ یہ (قرآن) تو حکم خدا ہے جو (ان کی طرف) بھیجا جاتا ہے۔ ان کو نہایت قوت والے نے سکھایا۔ (یعنی جبرئیل) طاقتور نے پھر وہ پورے نظر آئے۔ اور وہ (آسمان کے) اونچے کنارے میں تھے۔ پھر قریب ہوئے اور آگے بڑھے۔ تو وہ کمان کے فاصلے پر یا اس سے بھی کم۔ پھر خدا نے اپنے بندے کی طرف جو بھیجا سو بھیجا۔ جو کچھ انہوں نے دیکھا ان کے دل نے اس کو جھوٹ نہ جانا۔ کیا جو کچھ وہ دیکھتے ہیں تم اس میں ان سے جھگڑتے ہو اور انہوں نے اس کو ایک اور بار بھی دیکھا ہے۔ پرلی حد کی بیری کے پاس۔ اسی کے پاس رہنے کی جنت ہے۔ جبکہ اس بیری پر چھا رہا تھا جو چھا رہا تھا۔ ان کی آنکھ نہ تو اور طرف مائل ہوئی اور نہ (حد سے) آگے بڑھی۔ انہوں نے اپنے پروردگار (کی قدرت) کی کتنی ہی بڑی بڑی نشانیاں دیکھیں۔''

ذالك اذا تجلی الخ:

کیا رؤیتِ باری تعالیٰ دنیا میں ممکن ہے؟

چنانچہ صاحب ''التعرف'' لکھتے ہیں: **وأجمعوا انه لا یری فی الدنیا**

اسی سلسلۂ کلام میں آگے فرماتے ہیں: **وزعم بعض الناس**

واقعہ معراج اور اللہ تعالیٰ سے ہم کلامی:

واقعہ معراج میں آنحضرت ﷺ نے باری تعالیٰ سے براہ راست تکلم فرمایا کہ نہیں؟

قاضی عیاضؒ فرماتے ہیں: یہ مسئلہ اختلافی ہے کہ لیلۃ الاسراء میں نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اپنے ربّ سے براہ راست کلام کیا یا نہیں؟ اشعری اور متکلمین کی ایک جماعت اس کے اثبات کی قائل ہے۔ چنانچہ یہ مذہب جعفر بن محمد، ابن مسعود اور ابن عباس رضی اللہ عنہم وغیرہ کی طرف منسوب ہے۔

صاحب ''التحریر'' کے نزدیک ثبوت رؤیت مختار ہے، وہ لکھتے ہیں:

اس مسئلہ میں دلائل تو بہت سارے ہیں' لیکن ہم قوی ترین دلائل سے استدلال کرتے ہیں۔

پہلی دلیل: حضرت عبد اللہ ابن عباسؓ کی یہ حدیث ہے: **أتعجبون أن تكون الخلة لابراهيم عليه الصلوٰة والسلام و كلام لموسى عليه الصلوٰة والسلام والرؤية لمحمد عليه الصلوٰة والسلام۔**

''کیا تم تعجب کرتے ہو کہ حضرت ابراہیم کو ''خلت'' سے نوازا گیا حضرت موسیٰ کو ہم کلامی کا شرف عطا ہوا اور حضرت محمد ﷺ کو رؤیت باری تعالیٰ کی نعمت سے ہمکنار کیا گیا''۔

میں (ملا علی قاری) کہتا ہوں:

اولاً: اس کلام میں یہ بات منصوص نہیں کہ اس رؤیت سے مراد رؤیت بصریہ ہے، کیونکہ اختصاص کا احتمال ہے یعنی ممکن ہے کہ یہ آنحضرت ﷺ کی خصوصیات میں سے ہو۔ علاوہ ازیں اس کلام کا ظاہر تو یہ ہے کہ خلّت وکلام کی یہ صفات ہمارے نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کیلئے ثابت نہیں ہیں، حالانکہ یہ دونوں صفات آنحضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کیلئے ثابت ہیں، جیسا کہ بڑے بڑے علماء نے ذکر کیا ہے۔

دوسری دلیل: اس باب میں اصل، حضرت ابن عباسؓ کی حدیث ہے، اور حضرت عبداللہ بن عباسؓ ''حبر الامۃ'' ہونے کے ساتھ، مسائل معضلہ میں علماء کے مرجع بھی تھے، چنانچہ اس مسئلہ میں حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے ان سے مراجعت کی، اور پوچھا: **هل رأى محمد صلوٰت الله عليه وسلامه ربه؟** تو ابن عباسؓ نے انہیں بتایا کہ ہاں! دیکھا ہے۔

جواب: ممکن ہے کہ حضرت عبد اللہ بن عمرؓ کے ذہن میں یہ سوال، اس آیت کریمہ: ﴿**ولقد رآه نزلة أخرى**﴾[النجم۔۱۳] کی تفسیر سے پیدا ہوا ہو، جیسا کہ حضرت عکرمہ کو ہوا تھا۔ کہ ضمیر (یعنی ''راہ'' کی ضمیر منصوب) حضرت جبرائیل علیہ السلام کی طرف راجع ہے، یا اللہ جل جلالہ کی طرف۔ چنانچہ انہوں نے بتایا کہ آپ علیہ الصلوٰۃ والسلام نے انہیں دیکھا ہے، یعنی دل (کی آنکھ) سے۔ جیسا کہ مسلم کی روایت اس پر دلالت کر رہی ہے۔

تیسری دلیل: اس مسئلہ میں حدیث عائشہ صدیقہؓ قادح نہیں۔ کیونکہ ان کی روایت میں اس بات کا ذکر موجود نہیں ہے، کہ انہوں نے یہ فرمایا ہو: **سمعت النبي ﷺ يقول: أرى ربي.**

جواب: حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی روایت بھی تو ایسی ہی ہے کہ انہوں نے بھی تو یہ نہیں کہا: **سمعت النبي ﷺ يقول: ما رأيت ربي مطلقا.** چہ جائیکہ انہوں نے ''عين البصر'' کے ساتھ مقید کیا ہو۔

چوتھی دلیل: حضرت عائشہ صدیقہؓ کا مذکورہ بیان ان آیات مبارکہ کی تاویل میں ہے: ﴿**ما كان لبشر أن يكلمه الله......**﴾ [الشوریٰ:۵۱] اور ﴿**لا تدركه الأبصار**﴾[الانعام:۱۰۳] کی تاویل میں ہے۔

جواب: یہ دونوں آیتیں تو دلیل منع ہیں، علاوہ ازیں غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما بھی تو متأول ہیں۔

پانچویں دلیل: حضرت عبداللہ بن عباس کی اس سلسلہ یعنی اثبات رؤیت کی روایات صحیح ہیں، پس ثبوت کا قائل ہونا ضروری ہے، اور چونکہ یہ معاملہ بھی ایسا نہیں کہ جو مدرک بالعقل ہو، اور ظن کی بنیاد پر اخذ کرلیا ہو۔ لہٰذا یہ سماعاً ہی ہوگا۔ اور کوئی بھی یہ نہیں سکتا کہ حضرت عبداللہ بن عباس نے اس مسئلہ میں کلام اپنے ظن واجتہاد سے کیا ہے۔

جواب: عین ظاہرہ کے ساتھ رؤیت کی تو تصریح نہیں ہے، البتہ آیت کی تقدیر پر تسلیم ہے۔ تو بلاشبہ یہ بات اجتہاد سے حاصل کردہ ہے، اور انہوں نے آیت کے اطلاق سے اخذ کیا ہے۔

چھٹی دلیل: معمر بن راشد کی موجودگی میں جس وقت حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اور ابن عباسؓ کے اس اختلاف کا ذکر آیا، تو فرمایا: **عائشة ما عندنا بأعلم من ابن عباس.** کہ حضرت عائشہ صدیقہؓ ہمارے نزدیک، حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے بڑی عالم نہیں ہیں۔

جواب: اول تو اس میں مناقشہ ہے۔ یہ بات فائدہ تامہ سے خالی ہے۔ ثانیاً یہ ''فیہ ما فیہ'' ہے۔ ثالثاً، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اس مسئلہ میں کوئی تن تنہا نہیں ہیں، بلکہ ان کی موافقت فرمانے والوں میں حضرت عبداللہ بن مسعودؓ وغیرہ جیسی دیگر عظیم ہستیاں بھی ہیں۔ تعارض کی تقدیر اور تساقط تناقض کے بعد بھی حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا کلام ثابت ہے، اور مسئلہ محقق ہو جاتا ہے۔

ساتویں دلیل: حضرت عبداللہ بن عباسؓ مثبتِ امر ہیں، اور دیگر حضرات ''نافی'' ہیں۔ ''مثبت'' کو ''نافی'' پر تقدیم حاصل ہے۔

جواب: یہ ضابطہ اسی وقت تک ہے جب کہ مثبت مستند الی حسن ہو، وگرنہ تو آداب بحث میں ہے کہ مانع کا کلام معتبر ہے، خصوصاً جب کہ سندِ منع کے ساتھ ہو، حتیٰ کہ خصم برہان بھی لے آئے۔ اس لئے کہ اصل تو ''عدم'' ہے۔ وجود اپنے تحقق میں دلیل قطعی، کا محتاج ہوتا ہے خواہ وہ دلیل قطعی عقلی ہو یا نقلی۔ (انتہیٰ)

امام نوویؒ فرماتے ہیں: اس کا حاصل یہ ہے:

اکثر علماء کے نزدیک راجح یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے لیلۃ الاسرا میں اللہ جل شانہ کو اپنے سر میں موجود آنکھ سے دیکھا ہے۔ اور اس کا اثبات رسول اللہ ﷺ سے سن کر ہی ہوسکتا ہے۔ اور یہ ایسی بات ہے کہ اس میں شک مناسب نہیں۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے نفی رؤیت کسی حدیث کی بنیاد پر نہیں کی ہے' اگر ان کے پاس کوئی حدیث ہوتی تو وہ ذکر فرماتیں۔

اور جہاں تک تعلق ہے اس آیت: ﴿لا تدركه الأبصار﴾ [الانعام۔۱۰۳] حضرت عائشہؓ کے استدلال کا تو جواب یہ ہے کہ ''ادراک'' کا معنی ہے 'احاطہ' اور اللہ تعالیٰ کا احاطہ ہو نہیں سکتا۔ لہٰذا جب نص میں نفس احاطہ کا لفظ وارد ہے تو اس سے نفی رؤیت بغیر احاطہ کے لازم نہیں آتی۔

ان کا دوسرا مستدل یہ آیت ہے: ﴿وما كان لبشر أن يكلمه الله﴾ [الشوریٰ۔۵۱] ''اور کسی بشر کی (حالت موجودہ میں) یہ شان نہیں کہ اللہ تعالیٰ اس سے کلام فرمائے....'' تو اس کا جواب یہ ہے کہ حالت رؤیت میں رؤیت' وجود کلام کو لازم

نہیں۔پس وجود رویت بغیر کلام کے بھی ممکن ہے۔

۵۶۶۱ : وَعَنِ الشَّعْبِيِّ قَالَ لَقِيَ ابْنُ عَبَّاسٍ كَعْبًا بِعَرَفَةَ فَسَأَلَهُ عَنْ شَيْءٍ فَكَبَّرَ حَتّٰى جَاوَبَتْهُ الْجِبَالُ فَقَالَ ابْنُ عَبَّاسٍ إِنَّا بَنُوْهَاشِمٍ فَقَالَ كَعْبٌ إِنَّ اللّٰهَ تَعَالٰى قَسَمَ رُؤْيَتَهُ وَكَلَامَهُ بَيْنَ مُحَمَّدٍ وَّمُوْسٰى فَكَلَّمَ مُوْسٰى مَرَّتَيْنِ وَرَاٰهُ مُحَمَّدٌ مَرَّتَيْنِ قَالَ مَسْرُوْقٌ فَدَخَلْتُ عَلٰى عَآئِشَةَ فَقُلْتُ هَلْ رَاٰى مُحَمَّدٌ رَبَّهُ فَقَالَتْ لَقَدْ تَكَلَّمْتُ بِشَيْءٍ قَفَّ لَهُ شَعْرِيْ قُلْتُ رُوَيْدًا ثُمَّ قَرَاْتُ لَقَدْ رَاٰى مِنْ اٰيٰتِ رَبِّهِ الْكُبْرٰى فَقَالَتْ اَيْنَ تَذْهَبُ بِكَ إِنَّمَا هُوَ جِبْرَئِيْلُ مَنْ اَخْبَرَكَ اَنَّ مُحَمَّدًا رَاٰى رَبَّهُ اَوْ كَتَمَ شَيْئًا مِمَّا اُمِرَبِهٖ اَوْ يَعْلَمُ الْخَمْسَ الَّتِيْ قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰى إِنَّ اللّٰهَ عِنْدَهُ عِلْمُ السَّاعَةِ وَيُنَزِّلُ الْغَيْثَ فَقَدْ اَعْظَمَ الْفِرْيَةَ وَلٰكِنَّهُ رَاٰى جِبْرَئِيْلَ لَمْ يَرَهُ فِيْ صُوْرَتِهٖ إِلَّا مَرَّتَيْنِ مَرَّةً عِنْدَ سِدْرَةِ الْمُنْتَهٰى وَمَرَّةً فِيْ اَجْيَادٍ لَهُ سِتُّمِائَةِ جَنَاحٍ قَدْ سَدَّ الْاُفُقَ (رواه الترمذی وروی الشیخان مع زیادة واختلاف وفي رواية) يَتِهِمَا قَالَ قُلْتُ لِعَآئِشَةَ فَاَيْنَ قَوْلُهُ ثُمَّ دَنٰى فَتَدَلّٰى فَكَانَ قَابَ قَوْسَيْنِ اَوْ اَدْنٰى قَالَتْ ذَاكَ جِبْرَئِيْلُ عَلَيْهِ السَّلَامُ كَانَ يَاْتِيْهِ فِيْ صُوْرَةِ الرَّجُلِ وَاِنَّهُ اَتَاهُ هٰذِهِ الْمَرَّةَ فِيْ صُوْرَتِهِ الَّتِيْ هِيَ صُوْرَتُهُ فَسَدَّ الْاُفُقَ۔

اخرجه البخاری ۴۷۲/۸ حدیث رقم ۴۸۵۵ والترمذی ۳۱۷/۵ حدیث رقم ۳۲۷۸۔

ترجمہ: "حضرت شعبیؒ نے فرمایا کہ میدان عرفات کے اندر عرفہ میں سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما نے حضرت کعب احبار رضی اللہ عنہ سے ملاقات فرمائی اور ان سے ایک بات کے متعلق پوچھا (اور وہ بات یہ تھی کہ کیا دنیا میں اللہ تعالیٰ کا دیدار ممکن ہے)؟ حضرت کعب (نے اس سوال کو اتنا عجیب وغریب سمجھا اور انہوں نے فرط حیرت سے) اللہ اکبر کا نعرہ بلند کیا حتیٰ کہ پہاڑوں نے بھی اس کا جواب دیا (یعنی اس زوردار نعرے کی بازگشت سے پہاڑ بھی گونج اٹھے)۔حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا کہ ہم تو بنو ہاشم ہیں! حضرت کعب رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ "(اچھا تمہارے سوال کا مقصد اب میری سمجھ میں آیا تو سنو): اللہ تعالیٰ نے اپنے دیدار اور اپنے کلام کے اعزاز کو حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور سیدنا موسیٰ علیہ السلام کے درمیان تقسیم فرمایا ہے (یعنی ایک کو اپنے کلام کے شرف سے نوازا جب کہ دوسرے کو اپنے دیدار کی دولت دی) چنانچہ موسیٰ علیہ السلام سے خدا تعالیٰ نے دوبارہ کلام فرمایا۔ایک مرتبہ تو وادی ایمن میں اور دوسری مرتبہ کوہ طور پر) اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے (معراج کی رات میں) دو مرتبہ اللہ تعالیٰ کا دیدار فرمایا۔حضرت مسروق (جو حدیث کے راوی ہیں اور جن سے حضرت شعبیؒ یہ نقل کرتے ہیں) کا بیان ہے کہ (میدان عرفات میں حضرت کعبؓ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے درمیان ہونے والی اس بات چیت کو سن کر) میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی خدمت میں حاضر ہوا اور ان سے عرض کیا کہ کیا ہمارے آقا حضرت محمد نے خدا تعالیٰ کا دیدار کیا ہے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے جواب دیا کہ (مسروق) تم نے ایسی بات پوچھی ہے جس سے میرے جسم کے رونگٹے کھڑے ہو گئے ہیں (یعنی ہمارا مذہبی عقیدہ تو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات اس سے بہت اعلیٰ اور بالا ہے کہ وہ کسی کو نظر آ سکے لہٰذا میرے نزدیک دنیا میں اس کے دیدار کا واقع ہونا محال ہے لیکن تم نے جو سوال کیا ہے اس کو

سن کر اس پاک ذات کی عظمت وخوف کے مارے میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے) میں نے درخواست کی کہ آپ رکیئے ذرا (یعنی میرے اس سوال سے اتنا جلد پریشان نہ ہوں میں چاہتا ہوں کہ آپ ذرا میری بات پوری طرح سن لیں' پھر میں نے دیدار الٰہی کے ثبوت میں یہ آیت پڑھی: لَقَدْ رَاٰى مِنْ اٰيٰتِ رَبِّهِ الْكُبْرٰى (گویا حضرت مسروقؒ نے اس آیت کے ذریعہ یہ ظاہر کیا کہ میرے نزدیک آیت میں ''بڑی نشانی'' سے مراد آنحضرت ﷺ کا بچشم سر یا بچشم قلب دیدار الٰہی کا حاصل ہونا ہے جو پروردگار کی عظمت شان یا آنحضرت ﷺ کی تعظیم وتکریم پر دلالت کرتا ہے)۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے یہ سن کر فرمانے لگیں کہ ''(مسروق) یہ آیتیں تمہیں کدھر لے جارہی ہیں؟ (یعنی تم درست نہیں سمجھ رہے ہو' ان آیتوں کا مطلب آنحضرت ﷺ کو دیدار الٰہی حاصل ہونا نہیں ہے بلکہ) ''بڑی نشانی'' سے مراد حضرت جبرئیل علیہ السلام ہیں (جن کو آنحضرت ﷺ نے ان کی اصل صورت میں دیکھا) جو شخص تمہیں یہ بتلائے محمد (ﷺ) نے معراج کی شب میں اپنے رب کا دیدار کیا ہے' یا یہ خبر دے کہ آنحضرت ﷺ نے ان باتوں میں سے کچھ چھپا لیا ہے جن کو ظاہر کرنے کا انہیں حکم دیا گیا تھا اور یا یہ بتائے کہ آنحضرت ﷺ ان پانچ غیبی اشیاء کا علم رکھتے تھے جن کے بارے میں حق تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: اِنَّ اللّٰهَ عِنْدَهٗ عِلْمُ السَّاعَةِ وَيُنَزِّلُ الْغَيْثَ ...... تو بلاشبہ اس نے محمد ﷺ پر بہت بڑا جھوٹ بولا (جہاں تک اس آیت کا تعلق ہے جو تم نے بطور دلیل پیش کی ہے) اس کی مراد اس کے علاوہ کچھ نہیں ہے کہ آنحضرت ﷺ نے جبرئیل امین علیہ السلام کو (ان کی اصل صورت میں ایک مرتبہ تو سدرۃ المنتہیٰ کے نزدیک (جیسا کہ اس آیت: لَقَدْ رَاٰهُ نَزْلَةً اُخْرٰى عِنْدَ سِدْرَةِ الْمُنْتَهٰى میں فرمایا گیا ہے) اور ایک مرتبہ (مکہ کے نشیبی علاقہ) اجیاد میں اور (آنحضرت ﷺ نے جبرئیل کو ان کی اصل صورت میں اس حال میں دیکھا کہ ان کے چھ سو پر تھے اور انہوں نے آسمان کے تمام کنارے کو گھیر رکھا تھا۔ اس روایت کو ترمذیؒ نے (انہی لفظوں میں) اور بخاری ومسلم نے کچھ اضافے اور کچھ الفاظ کے اختلاف کے ساتھ نقل کیا ہے نیز بخاری اور مسلم کی ایک روایت میں یہ الفاظ ہیں کہ مسروق نے (حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے عرض کیا کہ ''اگر آنحضرت ﷺ نے اللہ تعالیٰ کو نہیں دیکھا) تو پھر اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کا محمل کیا ہے؟: ثُمَّ دَنَا فَتَدَلّٰى فَكَانَ قَابَ قَوْسَيْنِ اَوْ اَدْنٰى حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے جواباً فرمایا: ان سب کی ضمیروں کا مرجع جبریل امین جو عام طور پر آنحضرت ﷺ کے پاس کسی انسان کی شکل وصورت میں (اور وہ بھی اکثر وبیشتر ایک صحابی حضرت دحیہ کلبی رضی اللہ عنہ کی صورت میں) آتے تھے اور اس مرتبہ (مکہ کے نشیبی علاقہ اجیاد میں) اپنی اصل صورت میں آئے اور انہوں نے آسمان کے تمام کنارے کو گھیر رکھا تھا''۔

تشریح: **فقال ابن عباس: انا بنو هاشم:**

ملا علی قاریؒ فرماتے ہیں: امام طیبیؒ کی بات میں بُعد ہے، کیونکہ حدیث کے کسی بھی لفظ کی دلالت نہ ثبوت غیظ پر ہے، اور نہ تفکر در جواب پر۔ مزید یہ کہ ایک شخص کا سالہا سال کا ایک اعتقاد ہو، تو لمحہ بھر تفکر کے بعد خلاف اعتقاد کا یقین کیسے حاصل ہو سکتا ہے۔

قوله: وراٰه محمد مرتين:

اس کی دلیل یہ آیت کریمہ ہے: ﴿ولقد راٰہ نزلة اخرى﴾ [النجم:١٣] ''اور انھوں نے (یعنی پیغمبر نے) اسفرشتہ کو ایک اور دفعہ صورت اصلیت میں) دیکھا تھا'' یہ اس پر دلالت کرتا ہے کہ حضرت کعب کا موقف یہ تھا کہ'' راٰہ '' کی ضمیر جل جلالہ کی طرف عائد ہے، نا کہ جبرائیل کی طرف، بخلاف حضرت عائشہ صدیقہؓ کے۔لیکن اس میں نہ رؤیت بصیرت پر دلالت ہے، اور نہ رؤیت بصر پر۔مزید یہ کہ ﴿ما کذب الفؤاد ما رای﴾ [النجم:١١] ''قلب نے دیکھی ہوئی چیز میں کوئی غلطی نہیں کی'' پہلے معنی کا مؤید ہے۔اور اسی وجہ سے ابن عباسؓ کی یہ بات صحیح ہے، کہ آپ نے قلب اطہر سے دو مرتبہ دیدار باری تعالیٰ کیا۔جیسا کہ ماقبل میں گذر چکا ہے۔اللہ تعالیٰ اعلم۔

قوله: ثم قرأت: ﴿لقد رأى من آيات الكبرىٰ﴾[النجم-١٩] ''انھوں نے اپنے پروردار(کی قدرت) کے بڑے بڑے عجائبات دیکھے''

اس آیت کا ظاہر حضرت مسروق کے مدعیٰ سے مناسبت نہیں رکھتا۔بلکہ بعض مفسرین فرماتے ہیں: **انها المعينة لما رأى فيما سبق من قوله :** ﴿ما كذب الفؤاد ما رأى﴾، لہٰذا یہ آیت حضرت مسروقؒ کے مطلوب کی نقیض ہے،اسی وجہ سے امام طیبیؒ نے لکھا ہے: **اى: قرأت الآيات التى خاتمتها هذه الآية، كما تشهد له الرواية الأخرى، أعنى قوله: قلت العائشة: فأين قوله:** ﴿ثم دنا﴾ میں ملاعلی قاریؒ) کہتا ہوں: اول تو اس میں بُعد ہے۔ثانی، یہ کہ دوسری روایت میں لفظ رأى نہیں ہے،لہٰذا زیادہ ظاہر یہ ہے کہ آیت کبری سے مراد آیت عظمیٰ ہے اللہ جل شانہ کی عظمت کی یا آنحضرتؐ کی تعظیم کی۔اور اس رؤیت سے رؤیت بصری یا رؤیت قلبی مراد ہے۔

قوله: فقالت أين بك: امام طیبیؒ اس جملہ کی وضاحت میں لکھتے ہیں: یعنی آیت کے معنی سمجھنے میں اور جو تم نے سمجھا، اس میں تم سے غلطی ہوئی ہے۔اذھاب کی نسبت آیة کی طرف مجازی ہے۔اھ۔: **اى أين تذهب بك الآية الكبرى.**

قوله: انما هو جبريل:

''هو'' سے مراد آیت کبریٰ ہے، خبر کی رعایت کی وجہ سے ضمیر مذکر لائی گئی ہے۔اور اس کی دلیل وہ ہے جو آگے آرہی ہے: **أن له ستمائة جناح قد سدّ الأفق،** اور اس کی تائید'' **من أخبرك ان محمدا رأى ربه**'' سے بھی ہو رہی ہے۔

۵۶۶۲ : وَعَنِ ابْنِ مَسْعُوْدٍ فِی قَوْلِهٖ فَكَانَ قَابَ قَوْسَيْنِ اَوْ اَدْنٰى وَفِی قَوْلِهٖ مَا كَذَبَ الْفُؤَادُ مَارَاٰى وَفِی قَوْلِهٖ لَقَدْ رَاٰى مِنْ اٰيَاتِ رَبِّهِ الْكُبْرٰى قَالَ فِيْهَا كُلِّهَا رَاٰى جِبْرَئِيْلَ لَهٗ سِتُّمِائَةِ جَنَاحٍ متفق عليه وفي رواية الترمذى قَالَ مَا كَذَبَ الْفُؤَادُ مَارَاٰى قَالَ رَاٰى رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ جِبْرَئِيْلَ فِیْ حُلَّةٍ مِّنْ رَفْرَفٍ قَدْ مَلَاَ مَا بَيْنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ وَلَهٗ وَلِلْبُخَارِیِّ فِیْ قَوْلِهٖ وَلَقَدْ رَاٰى مِنْ اٰيَاتِ رَبِّهِ الْكُبْرٰى قَالَ رَاٰى رَفْرَفًا اَخْضَرَ سَدَّ اُفُقَ السَّمَآءِ۔

اخرجه البخارى ٤٧٦/٨حديث رقم ٤٨٥٦، واخرجه مسلم ١٥٨/١حديث رقم ١٧٤/٢٨١ والترمذى ٣١٩/٥حديث ٣٢٨٣۔

ترجمہ: حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد فَكَانَ قَابَ قَوْسَيْنِ اَوْ اَدْنٰى اور اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد

مَا كَذَبَ الْفُؤَادُ مَا رَاٰى اور حق تعالیٰ کے اس فرمان لَقَدْ رَاٰى مِنْ اٰيٰتِ رَبِّهِ الْكُبْرٰى ان سب آیتوں کی تفسیر میں فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے جبرئیل امین علیہ السلام کو (ان کی اصل صورت میں) دیکھا اور ان کا حال یہ تھا کہ ان کے چھ سو پر تھے اور ترمذیؒ کی روایت میں یہ الفاظ ہیں جبریل امین کہ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے خدا تعالیٰ کے اس فرمان مَا كَذَبَ الْفُؤَادُ مَا رَاٰى کی تفسیر میں فرمایا ''حضور اقدس ﷺ نے جبرئیل امین علیہ السلام کو دیکھا درانحالیکہ وہ سبز لباس پہنے ہوئے تھے اور زمین و آسمان کی درمیان تمام فضا ان سے بھری ہوئی تھی۔ نیز ترمذی اور بخاری کی ایک اور روایت میں یوں ہے کہ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے حق تعالیٰ کے فرمان وَلَقَدْ رَاٰى مِنْ اٰيٰتِ رَبِّهِ الْكُبْرٰى کی تفسیر میں کہا کہ حضور اقدس ﷺ نے سبز لباس میں ملبوس (جبریل علیہ السلام) کو دیکھا جنہوں نے پورے آسمانی افق کو گھیر رکھا تھا۔''

عرض مرتب:

سورۂ نجم کی ابتدائی آیات کی تفسیر و تحقیق کے بارے میں حضرت عبداللہ بن مسعود کا موقف ماقبل میں صراحت کے ساتھ بیان ہو چکا ہے۔ وہاں ملاحظہ فرمائیے۔ **قوله: وعن ابن مسعود في قوله......:**

تشریح: قوله: وفي رواية الترمذي ......: قال: کا اعادہ برائے تاکید ہے۔

رأى النبي: اور ایک صحیح نسخہ میں '' **رسول الله ﷺ** '' کے الفاظ ہیں۔

رفرف: اس لفظ کے بارے میں محدثین ولغوین کی توضیحات کا خلاصہ یہ ہے

① **رفرف:** جمع ہے، اس کا واحد **رفرفة** ہے اور جمع الجمع '' **رفارف** '' ہے۔ (النھایۃ)

② **رفرف:** کے قریب ایک لفظ '' **رف** '' بھی مستعمل ہے۔ '' **رف** '' کی جمع '' **رفوف** '' آتی ہے۔ '' **رف** '' کے معنی ہیں: نرم وملائم کپڑا، شبہ طاق۔ '' **رفوف** '' ان کپڑوں کو کہا جاتا ہے، جن سے بچھانے کیلئے بچھونے بنائے جاتے ہیں۔ اور دیباج کے باریک کپڑوں کو بھی کہا جاتا ہے۔ (قاموس)

③ '' **رف** '' اور '' **رفرف** '' سے افعال بھی مأخوذ ہیں: چنانچہ کہا جاتا ہے: **رف الطائر و رفرف الطائر بجناحيه**۔ بطور فعل کے ثلاثی مجرد سے (زیادہ) مستعمل ہے۔ (قاموس)

④ دونوں ہم معنی ہیں، البتہ '' **رفرف** '' نسبۃً خاص ہے۔ جیسا کہ امام سیوطیؒ کی اس وضاحت سے معلوم ہوتا ہے۔ جو انہوں '' مختصر النھایہ '' میں کی ہے۔

صاحب النھایہ لکھتے ہیں اس سے مراد بساط ہے۔ اور بعض کا کہنا ہے کہ '' فراش '' مراد ہے۔

ملا علی قاریؒ فرماتے ہیں: اقرب یہ ہے کہ اس سے مراد سبز کپڑے ہیں۔ اس کی تائید اس آیت کریمہ سے بھی ہوتی ہے: ﴿**متكئين على رفرف خضر**﴾ [الرحمٰن:۷۶] ''وہ لوگ بستر شجر پر تکیہ لگائے بیٹھے ہوں گے''۔ واضح رہے کہ یہاں '' **رفرفًا خضرا** '' سے مراد '' **ذا رفرف أخضر** '' ہے۔

۵۶۶۳ : وَسُئِلَ مَالِكُ ابْنُ اَنَسٍ عَنْ قَوْلِهٖ تَعَالٰى اِلٰى رَبِّهَا نَاظِرَةٌ فَقِيْلَ قَوْمٌ يَّقُوْلُوْنَ اِلٰى ثَوَابِهٖ فَقَالَ مَالِكٌ كَذَبُوْا فَاَيْنَ هُمْ عَنْ قَوْلِهٖ تَعَالٰى كَلَّاۤ اِنَّهُمْ عَنْ رَّبِّهِمْ يَوْمَئِذٍ لَّمَحْجُوْبُوْنَ قَالَ مَالِكٌ اَلنَّاسُ

يَنظُرُوْنَ اِلَى اللّٰهِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ بِاَعْيُنِهِمْ وَقَالَ لَوْ لَمْ يَرَ الْمُؤْمِنُوْنَ رَبَّهُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ لَمْ يُعَيِّرِاللّٰهُ الْكُفَّارَ بِالْحِجَابِ فَقَالَ كَلَّا اِنَّهُمْ عَنْ رَّبِّهِمْ يَوْمَئِذٍ لَّمَحْجُوْبُوْنَ. (رواه في شرح السنة)

اخرجه البغوی فی شرح السنة ۲۳۹/۱۵۔

ترجمہ: ''(فقہ کے مشہور امام) امام مالک بن انس سے اللہ حق تعالیٰ کے فرمان اِلٰى رَبِّهَا نَاظِرَةٌ کے متعلق سوال کیا گیا اوران کو بتلایا گیا کہ کچھ لوگ (یعنی معتزلہ اوران کے ہمنوا دیگر اہل بدعت) یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ اس آیت میں ''خدا تعالیٰ کی جانب دیکھنے'' سے (مراد اللہ تعالیٰ کی ذات کو دیکھنا نہیں ہے بلکہ) اس کے ثواب کو دیکھنا مراد ہے؟ تو حضرت امام مالکؒ نے فرمایا کہ انہوں نے جھوٹ کہا ہے' آخر ان کی سمجھ کہاں کدھر چلی گئی ہے! وہ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان: كَلَّا اِنَّهُمْ عَنْ رَّبِّهِمْ يَوْمَئِذٍ لَّمَحْجُوْبُوْنَ پر غور کیوں نہیں کرتے پھر حضرت امام مالکؒ نے فرمایا: ''(بلاشبہ) مسلمان لوگ روز قیامت اللہ تعالیٰ کو اپنی آنکھوں سے دیکھیں گے اور فرمایا اگر (یہی بات) ہوتی کہ اہل ایمان قیامت کے دن اپنے پروردگار کو نہیں دیکھیں گے تو خدا تعالیٰ اہل کفر کو دیدار الٰہی سے محرومی کا عار نہ دلاتا اور یہ نہ فرماتا کہ كَلَّا اِنَّهُمْ عَنْ رَّبِّهِمْ يَوْمَئِذٍ لَّمَحْجُوْبُوْنَ (اس روایت کو بغوی نے شرح السنۃ میں روایت کیا ہے)''۔

تشریح: قوله: كلاانهم عن ربهم يومئذ لمحجوبون:

عن ربهم: حرف جر کی وجہ تقدیم میں کئی احتمال ہیں:

① اہتمام شان کیلئے ہے۔ ② برائے تعظیم ہے۔
③ اختصاص کی وجہ سے مقدم کیا گیا ہے۔ ④ فواصل کی رعایت کے پیش نظر ایسا کیا گیا ہے۔

یومئذ مراد قیامت کا دن ہے، یا وقت جزاء مراد ہے۔

قوله: قال مالك الناس ينظرون الى الله القيامة بأعينهم:

الناس: ينظرون الى الله...... اس کا تفصیلی بیان ماقبل میں گذر چکا ہے۔ اس سے مراد مومنین ہیں چونکہ حقیقت میں ناس'' تو مومنین ہی ہیں' باقی لوگ تو نسناس'' ہیں۔

۵۶۶۴: وَعَنْ جَابِرٍ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بَيْنَا اَهْلُ الْجَنَّةِ فِي نَعِيْمِهِمْ اِذْ سَطَعَ لَهُمْ نُوْرٌ فَرَفَعُوْا رُءُوْسَهُمْ فَاِذَا الرَّبُّ قَدْ اَشْرَفَ عَلَيْهِمْ مِنْ فَوْقِهِمْ فَقَالَ السَّلَامُ عَلَيْكُمْ يَا اَهْلَ الْجَنَّةِ قَالَ وَذٰلِكَ قَوْلُهُ تَعَالٰى سَلَامٌ قَوْلًا مِّنْ رَّبٍّ...... قَالَ فَيَنْظُرُ اِلَيْهِمْ وَيَنْظُرُوْنَ اِلَيْهِ فَلَا يَلْتَفِتُوْنَ اِلٰى شَيْءٍ مِّنَ النَّعِيْمِ مَادَامُوْا يَنْظُرُوْنَ اِلَيْهِ حَتّٰى يَحْتَجِبَ عَنْهُمْ وَيَبْقٰى نُوْرُهٗ (رواه ابن ماجة)

اخرجه ابن ماجه ۶۵/۱ حديث رقم ۱۸۴۔

ترجمہ: ''حضرت جابر رضی اللہ عنہ نبی اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت نقل فرماتے ہیں کہ ''(آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا) جب اہل جنت اپنی حاصل شدہ نعمتوں سے راحت ولذت اٹھانے میں مصروف ہوں گے کہ اچانک ان کے سامنے ایک عظیم روشنی پھیلے گی وہ (اس نور کو دیکھنے کے لئے) اپنا سر بلند کریں گے تو کیا دیکھیں گے کہ ان کے اوپر پروردگار تجلی فرماتے

ہوئے ہوگا اور پروردگار ان سے فرمائے گا کہ اہل جنت! السلام علیکم اور یہ (یعنی اس وقت پر رب تعالیٰ کا جنتیوں کو سلام کرنا) قرآن کریم میں خدا تعالیٰ کے اس فرمان: سَلَامٌ قَوْلًا مِّنْ رَّبٍّ...... سے ثابت ہے' حضور اقدس ﷺ نے ارشاد فرمایا: پھر اللہ تعالیٰ اہل جنت کی جانب دیکھے گا اور جنتی اللہ تعالیٰ کو دیکھیں گے اور وہ دیدار الٰہی میں اس قدر محو ہوں گے کہ اس وقت جنتیوں کی نعمتوں میں سے کسی چیز کی طرف توجہ والتفات نہیں کریں گے تا آنکہ پروردگار ان کی نظروں سے اوجھل ہو جائے اور اس کا نور باقی رہ جائے گا"۔ (ابن ماجہ)

تشریح: قوله: عن النبی ٌبینا۔۔۔من فوقهم:

بینا : اور ایک نسخہ میں "**بینما**" ہے۔

قوله: فقال :السلام علیکم یا أهل الجنة:

ان "اہل جنت" کی تعیین میں ملا علی قاریؒ لکھتے ہیں شاید کہ اس سے مراد وہ جماعت ہے جس کے بارے میں یہ فرمایا گیا ہے: **أن کثر أهل الجنة البله.**

اس کی تائید ایک حدیث سے ہوئی ہے جس کو دار قطنی نے "الافراد" میں اور دیلمی نے مسند فردوس میں حضرت ابو ہریرہؓ سے مرفوعاً ذکر کیا ہے:

أهل شغل الله فی الدنیا هم أهل شغل الله فی الآخرة، وأهل شغل أنفسهم فی الدنیا هم أهل شغل أنفسهم فی الاخرة

دنیا میں اللہ کے شغل میں لگنے والے لوگ ہی آخرت میں اللہ کے رسول کے شغل میں لگنے والے ہوں گے اور دنیا میں اپنے آپ میں مشغول ہونے والے لوگ ہی آخرت میں اپنے آپ میں مشغول ہونے والے ہوں گے۔"

اور قرآن کریم کی اس آیت میں بھی اسی طرف اشارہ ہے:

﴿إِنَّ أَصْحٰبَ الْجَنَّةِ الْيَوْمَ فِي شُغُلٍ فٰكِهُوْنَ هُمْ وَأَزْوَاجُهُمْ فِيْ ظِلٰلٍ عَلَى الْأَرَآئِكِ مُتَّكِـُٔوْنَ لَهُمْ فِيْهَا فَاكِهَةٌ وَّلَهُمْ مَّا يَدَّعُوْنَ سَلٰمٌ قَوْلًا مِّنْ رَّبٍّ رَّحِيْمٍ﴾ [یس: ۵۵-۵۸] "اہل جنت بے شک اپنے مشغلوں میں خوش دِل ہوں گے وہ اور ان کی بیبیاں سایوں میں مسہریوں پر تکیہ لگائے بیٹھے ہوں گے ان کے لئے وہاں (ہر طرح کے) میوے ہوں گے اور جو کچھ مانگیں گے ان کو ملے گا ان کو پروردگار مہرباں کی طرف سلام فرمایا جاوے گا"۔

بَابُ صِفَةِ النَّارِ وَأَهْلِهَا

دوزخ اور اہل دوزخ کے احوال کا بیان

۵۶۶۵ : عَنْ اَبِىْ هُرَيْرَةَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ نَارُكُمْ جُزْءٌ مِّنْ سَبْعِيْنَ جُزْءً مِّنْ نَارِ جَهَنَّمَ قِيْلَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اِنْ كَانَتْ لَكَافِيَةً قَالَ فُضِّلَتْ عَلَيْهِنَّ بِتِسْعَةٍ وَّسِتِّيْنَ جُزْءً كُلُّهُنَّ مِثْلُ حَرِّهَا (متفق عليه واللفظ للبخارى وفى رواية مسلم) نَارُكُمُ الَّتِىْ يُوْقِدُ ابْنُ اٰدَمَ فِيْهَا عَلَيْهَا وَكُلُّهَا بَدَلَ عَلَيْهِنَّ وَكُلُّهُنَّ ۔

اخرجه البخارى ۳۸۰/٦حديث رقم ۳۲٦۵،ومسلم ۲۱۸٤/٤حديث رقم (۳۰-۲۸٤۳) والترمذى ٦۱۱/٤ حديث ۲۵۸۹، وابن ماجه ۱٤٤٤/۲حديث٤۳۱۸، واحمد فى المسند ۳۱۳/۲،ومالك فى الموطأ ۹۹٤/۲ حديث رقم ۱من كتاب جهنم ، والدارمى ٤۳۸/۲حديث رقم ۲۸٤۷۔

ترجمہ: "حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: "تمہاری (دنیا کی) آگ آتش جہنم کے ستر حصوں میں سے ایک حصہ ہے عرض کیا گیا کہ یارسول اللہ! (عذاب دینے کے لئے قوم یقیناً دنیا کی آگ ہی کافی تھی (پھر اس سے بھی زیادہ شدید حرارت وتپش والی آگ کو وجود دینے کی کیا ضرورت تھی؟) آنحضرت ﷺ نے فرمایا: "دوزخ کی آگ کو یہاں (دنیا) کی آگ سے انہتر حصہ بڑھا دیا گیا ہے اور ان انہتر حصوں میں سے ہر ایک حصہ تمہاری (دنیا کی) آگ کی مثل ہے"۔ اس روایت کو بخاری ومسلم نے نقل کیا ہے لیکن (یہاں مذکورہ) الفاظ بخاری کے ہیں اور صحیح مسلم کی رویت کے الفاظ یہ ہیں کہ (آپ ﷺ نے فرمایا) "تمہاری (دنیا کی) یہ آگ جس کو ابن آدم (انسان) جلاتا ہے دوزخ کی آگ کے ستر اجزاء میں سے ایک جزء ہے۔ نیز مسلم کی روایت میں عَلَيْهِنَّ اور كُلُّهُنَّ کی بجائے عَلَيْهَا اور كُلُّهَا کے الفاظ ہیں یعنی بخاری کی روایت میں ہے"۔

تشریح: قوله: نار كم جزء۔۔۔ ان كانت لكافية:

نار كم: ترمذیؒ کی روایت میں "نار كم هذه" ہے۔

ترمذیؒ کی روایت میں یہ اضافہ ہے: لكل جزء منها حرها.

ان كانت : "ان" مخففہ از مثقلہ ہے، اور لام "لام فارقہ" ہے۔ یعنی یارسول اللہ! فساق وفجار کو عذاب دینے کیلئے تو دنیا کی

آگ بھی کافی تھی، پھر اس سے بھی زیادہ حرارت وتپش والی آگ پیدا کرنے کی کیا ضرورت تھی۔

قولہ: قال :فضلت۔۔۔ مثل حرھا:

فضلت: ضمیر'' نار جھنم '' کی طرف عائد ہے۔

علیھن: ضمیر'' انیار الدنیا'' کی طرف عائد ہے۔

یعنی جہنم کی آگ کے انہتر (۶۹) حصوں میں سے ہر ہر حصہ کی حرارت دنیا کی آگ یعنی تمہاری دنیا کی آگ کی حرارت کے مثل ہے۔ جواب کا حاصل یہ ہے کہ دنیا کی آگ کافی نہیں۔ یعنی اس آگ کو دنیا کی آگ کی بنسبت کہیں زیادہ درجہ حرارت رکھنا چاہئے، حکمت اس کی مقتضی ہے، کہ اللہ کا عذاب، مخلوق کے عذاب سے شدید ہو۔ اس وجہ سے کتاب وسنت میں اصناف عذاب میں سے آگ کا ذکر بکثرت کیا گیا ہے۔ چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ فَمَآ اَصْبَرَهُمْ عَلَى النَّارِ﴾ [البقرۃ:۱۷۵] ''سو دوزخ کے لئے کیسے باہمت ہیں'' اور دوسری جگہ فرمایا: ﴿ فَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِىْ وَقُوْدُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ﴾ [البقرۃ:۲۴] ''پھر ذرا بچتے رہو دوزخ سے جس کا ایندھن آدمی اور پتھر ہیں''

دنیا میں آگ کا پیدا کرنا اسی وجہ سے ہے تا کہ آخرت کے عذاب کا ایک نمونہ اور جھلک اس دنیا میں دکھائی جا سکے۔

امام غزالیؒ الاحیاء میں لکھتے ہیں جان لیجئے کہ آپ نے قیاس میں خطا کی ہے چوں کہ دنیا کی آگ کو جہنم کی آگ سے کوئی مناسبت نہیں ہے، اور دنیا میں عذاب کی سخت ترین صورت آگ کا کا عذاب ہوتا ہے اس لئے جہنم کی آگ کی معرفت اس دنیاوی آگ کے ذریعہ کرائی۔ اور اگر اہل جہنم کو دوزخ میں اس دنیاوی آگ کی مانند آگ ملے تو وہ جہنم کی آگ سے بھاگ کر اس دنیاوی آگ میں جا پڑیں۔

یوقد: ایقاد سے ماخوذ ہے۔ اور یہ بھی ممکن ہے، کہ از باب تفعیل ''تقید'' مصدر سے ہو اس صورت میں قاف کی تشدید کے ساتھ ہوگا۔

علیھا و کلھا بدل علیھن و کلھن: منصوب ہے۔ لف ونشر مرتب ہے۔

۵۶۶۶ : وَعَنِ ابْنِ مَسْعُوْدٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يُؤْتٰى بِجَهَنَّمَ يَوْمَئِذٍ لَّهَا سَبْعُوْنَ اَلْفَ زِمَامٍ مَّعَ كُلِّ زِمَامٍ سَبْعُوْنَ اَلْفَ مَلَكٍ يَجُرُّوْنَهَا. (رواہ مسلم)

اخرجه مسلم فی ۲۱۸۴/۴ حدیث رقم (۲۹-۲۸۴۲) والترمذی ۶۰۴/۴ حدیث رقم ۲۵۷۳۔

ترجمہ: ''حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''اس دن (یعنی روز قیامت) دوزخ کو لایا جائے گا اس کی ستر ہزار باگیں ہوں گی اور ہر باگ پر ستر ہزار فرشتے تعینات ہوں گے جو اس کو کھینچ کر لا رہے ہوں گے''۔ (مسلم)

تشریح: قولہ: یوتی بجھنم یومئذلھا ......:

بجھنم: باء برائے تعدیہ ہے۔

جہنم کو اس جگہ سے لایا جائے گا جہاں اللہ تعالیٰ نے اس کو پیدا فرمایا اور اس کی دلیل یہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَجِایْٓءَ یَوْمَئِذٍ بِجَهَنَّمَ ﴾ [الفجر:۲۳] ''(میدان حشر میں) آویں گے اور اس روز جہنم کو لایا جائے گا''

زمام: زاء کے کسرہ کے ساتھ۔

یجرونها: راء کی تشدید کے ساتھ، ای یسحبونها۔ (کھینچ رہے ہوں گے)

پل صراط کے علاوہ جنت میں جانے کا کوئی راستہ نہ ہوگا، اور لگام میں ڈال کر کھینچنے میں اس کی ہولناکی کی طرف اشارہ ہے۔ اور محشر میں وہ اسی شخص کو اپنا لقمہ بنائے گی جس کے بارے میں حکمِ خداوندی ہوگا۔

۵۶۶۷ : وَعَنِ النُّعْمَانِ بْنِ بَشِيْرٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ اَهْوَنَ اَهْلِ النَّارِ عَذَابًا مَّنْ لَهُ نَعْلَانِ وَشِرَاكَانِ مِنْ نَّارٍ يَغْلِيْ مِنْهُمَا دِمَاغُهُ كَمَا يَغْلِي الْمِرْجَلُ مَا يُرٰى اَنَّ اَحَدًا اَشَدُّ مِنْهُ عَذَابًا وَاَنَّهُ لَاَهْوَنُهُمْ عَذَابًا (متفق عليه)

اخرجه البخاري ۴۲۴/۱۱ حديث رقم ۶۵۶۱و۶۵۶۲، واخرجه مسلم ۱۹۶/۱ واخرجه الترمذي ۸/۴ ا لحديث رقم ۲۶۰۴ والدارمي ۴۳۹/۲ حديث رقم ۲۸۴۸، واحمد في المسند ۷۸/۳۔

ترجمہ: ''حضرت نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: '' بلاشبہ دوزخیوں میں سے جو شخص سب سے ہلکے عذاب میں سے دوچار ہوگا اس کو آگ کے دو جوتے پہنائے جائیں گے جن کے اوپر آگ کے دو تسمے ہوں گے (یعنی ان جوتیوں کے تلوے بھی آگ کے ہوں گے جو پیروں کے نچلے حصہ میں لگے ہوں گے اور ان کے تسمے بھی آگ کے ہوں گے جو پیروں کے اوپر والی جانب سے لگے ہوں گے اور ان دونوں (یعنی جوتیوں کے تلووں اور تسموں کی تپش وحرارت سے اس کا دماغ ایسے پک رہا ہوگا جیسے دیگ پک رہی ہوتی ہے۔ وہ شخص چونکہ دوسرے دوزخیوں کی حالت وکیفیت سے انجان ہوگا اس لئے) یہ خیال کرے گا کہ اس سے زیادہ سخت ترین عذاب میں کوئی گرفتار نہیں حالانکہ وہ سب سے ہلکے عذاب میں مبتلا ہوگا''۔

تشریح: النعمان: نون کے ضمہ کے ساتھ ہے۔ باپ بیٹا دونوں یہ بھی صحابی ہیں۔

من نار: (محذوف کے متعلق ہو کر صفت ہے۔) ای کائنة منها

یری: بصیغہ مجہول ہے اور رویت بمعنی ''ظن'' ہے۔

المرجل: میم کے کسرہ اور جیم کے فتحہ کے ساتھ، پیتل کی دیگچی۔ (کذا قالہ شارح)۔ عسقلانیؒ فرماتے ہیں اور ہر اس برتن کو بھی ''رجل'' کہا جاتا ہے جس میں پانی ابالا جاتا ہو خواہ وہ برتن کسی بھی مادہ سے بنا ہوا ہو۔ حاصل یہ ہے کہ اس کی کیفیت وہی ہو گی جو اس آیت کریمہ میں بیان کی گئی ہے: ﴿**یغلی فی البطون کغلی الحمیم**﴾ [الدخان:۴۵-۴۶] ''(اور) وہ پیٹ میں ایسے کھولے گا جیسا کہ تیار گرم پانی کھولتا ہے'' اور بعض لوگوں کی کیفیت عذاب ان کے اعمال کے اعتبار سے بالکل مختلف ہوگی، چنانچہ کئی لوگ ایسے ہوں گے جن کو جہنم کی نہروں میں غوطے دیئے جا رہے ہونگے۔

قوله: وانه أهونهم عذابا:

(یہ جملہ حالیہ ہے۔) ای والحال انه...... اور ''ان'' ہمزہ کے کسرہ کے ساتھ ہے۔ اس سے صراحتاً معلوم ہوتا ہے کہ

عذاب کے اعتبار سے اہل جہنم میں تفاوت ہوگا۔

الجامع میں مسلم شریف کی حدیث حضرت نعمان بن بشیر سے ان الفاظ کے ساتھ مروی ہے:

أهون أهل النار عذابا يوم القيامة رجل يوضع في قدميه جمرتان يغلي منهما دماغه.

''دوزخیوں میں سے جو شخص سب سے ہلکے عذاب سے دوچار ہوگا اس کے پیروں پر دو انگارے رکھے جائیں گے ان سے اُس کا دماغ پک رہا ہوگا''۔

ممکن ہے کہ یہ حدیث مؤمنین میں سے ادنی درجہ کے گناہ گاروں کے متعلق ہو اور متن میں موجود حدیث کفار میں سے ادنی درجہ کے گناہ گاروں کے بارے میں ہو۔ جیسا کہ اگلی حدیث اس پر دلالت کر رہی ہے۔

۵۶۶۸ : وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَهْوَنُ اَهْلِ النَّارِ عَذَابًا اَبُو طَالِبٍ وَّهُوَ مُتَنَعِّلٌ بِنَعْلَيْنِ يَغْلِيْ مِنْهُمَا دِمَاغُهٗ. (رواه البخاری)

اخرجه مسلم ١٩٦/١ حديث رقم (٣٦٢-٢١٢) واحمد في المسند ٢٩٠/١

ترجمہ: ''حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے بیان فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: جہنم والوں میں سب سے ہلکا عذاب ابوطالب کو ہوگا وہ آگ کی جوتیاں پہنے ہوں گے جن سے ان کا دماغ کھولتا رہے گا''۔ (بخاری)

تشریح: قوله: اهون اهل النار...... : '' اهل النار '' سے مراد کفار ہیں۔

أبو طالب: کیونکہ مفسرین کا اتفاق ہے کا مصداق ابوطالب ہے۔ ﴿انك لا تهدى من أجبت﴾ [القصص: ٥٦] ''ہم بے سمجھ لوگوں سے الجھنا نہیں چاہتے آپ جس کو چاہیں ہدایت نہیں کر سکتے''۔

متنعل: باب تفعل سے ہے۔ اور ایک صحیح نسخہ میں باب انفعال سے ہے۔ بمعنی متلبس.

يغلي منهما: اور ایک نسخہ میں منها ہے۔ اس تقدیر پر عبارت یوں ہوگی: من جهة نعله، اور جنس مراد ہوگی۔ پہلی صورت میں تقدیر یوں ہوگی: من نعلهما.

اس کے عذاب میں تخفیف اس وجہ سے ہوگی کہ یہ صاحب، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو کفار کی ایذا رسانیوں سے بچایا کرتے تھے، تو ''جزاءً وفاقاً'' کے تحت ان کی سزا میں تخفیف کی جائے گی۔

توضیح و تخریج: الجامع الصغیر میں امام سیوطیؒ نے اس حدیث کو احمد و مسلم کی طرف منسوب کیا ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

۵۶۶۹ : وَعَنْ اَنَسٍ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ يُؤْتٰى بِاَنْعَمِ اَهْلِ الدُّنْيَا مِنْ اَهْلِ النَّارِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ فَيُصْبَغُ فِي النَّارِ صِبْغَةً ثُمَّ يُقَالُ يَا ابْنَ اٰدَمَ هَلْ رَاَيْتَ خَيْرًا قَطُّ هَلْ مَرَّبِكَ نَعِيْمٌ قَطُّ فَيَقُوْلُ لَا وَاللّٰهِ يَا رَبِّ وَيُؤْتٰى بِاَشَدِّ النَّاسِ بُؤْسًا فِي الدُّنْيَا مِنْ اَهْلِ الْجَنَّةِ فَيُصْبَغُ صِبْغَةً فِي الْجَنَّةِ فَيُقَالُ لَهٗ يَا ابْنَ اٰدَمَ هَلْ رَاَيْتَ بُؤْسًا قَطُّ وَهَلْ مَرَّبِكَ شِدَّةٌ قَطُّ فَيَقُوْلُ لَا وَاللّٰهِ يَا رَبِّ مَا مَرَّبِيْ بُؤْسٌ قَطُّ وَلَا رَاَيْتُ شِدَّةً قَطُّ.

(رواه مسلم)

اخرجه مسلم ٢١٦٢/٤ حديث رقم (٥٥-٢٨٠٧) واحمد في المسند ٢٠٣/٣۔

ترجمہ: ''حضرت انس رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: قیامت کے روز اہل جہنم میں سے ایک ایسے آدمی کو لایا جائے گا جو دنیا میں بہت عیش اور راحت کی زندگی بسر کر رہا تھا (یعنی اسے ہر آسائش میسر تھی) پھر اس کو جہنم میں ایک بار غوطہ دیا جائے گا پھر اس سے پوچھا جائے گا کہ اے ابن آدم! کیا تو نے دنیا میں کبھی کوئی راحت و بھلائی دیکھی تھی اور کوئی عیش و آرام اٹھایا تھا؟ وہ جہنمی چنانچہ وہ کہے گا اے میرے رب، بخدا نہیں (کبھی ایک آن بھی راحت میسر نہیں آئی)۔اس طرح جنت والوں میں سے میں ایک ایسے شخص کو لایا جائے گا جو دنیا میں بہت زیادہ بدحالی کا شکار رہا ہوگا' پھر اس کو جنت میں ایک مرتبہ غوطہ دیا جائے گا اور کہا جائے گا کہ اے ابن آدم! کیا تو نے دنیا میں کوئی غم اٹھایا تھا اور کسی مشقت وکلفت سے دوچار ہوا تھا؟ وہ جنتی جواب دے گا کہ اے میرے پروردگار بخدا نہیں مجھ پر کبھی کوئی غم نہیں آیا اور میں نے کوئی مشقت وکلفت نہیں اٹھائی''۔(مسلم)

تشریح: قوله: يوتى بأنعم اهل الدنيا۔۔۔ في النار رصبغة:

من اهل النار: ''من بيانيه'' ہے، محلاً حال ہے۔

يوم القيامة: ''يؤتى'' کے لئے ظرف ہے۔

فيصبغ: صیغۂ مجہول کے ساتھ ہے۔

صبغة: صاد مہملہ کے فتحہ کے ساتھ، بمعنی غمسة، ''ملزوم'' بول کر ''لازم'' مراد ہے۔ چونکہ عام طور پر صبغ، ''غمس'' کے ذریعے ہی ہوتا ہے۔ صاحب النہایہ (اس جملہ کی وضاحت کرتے ہوئے) فرماتے ہیں: أي يغمس في النار غمسة كما يغمس الثوب في الصبغ. (یعنی اس کو آگ میں غوطہ دیا جائیگا جس طرح کپڑے کو رنگ میں ڈبویا جاتا ہے)

قوله: يا ابن آدم هل ۔۔۔ لا والله يارب:

قط: کلام میں مبالغہ ہے، بایں طور کہ استفہام مجرد رؤیت و مرور کے بارے میں ہے۔ نا کہ ذوق، تمتع اور سرور کے بارے میں۔

والله يا رب: نفی کو نداء اور قسم کے ساتھ مؤکد کرنا درحقیقت شدت عذاب کا اظہار ہے، کہ اس تکلیف کو دیکھ کر اپنی پچھلی پوری زندگی کے عیش و عشرت کو بھول جائے گا یا آگے ملنے والی نعمتوں کو دیکھ کر اپنی پوری زندگی کے عیش و عزت کو بھول جائے گا وہ نعمت بھی کیا نعمت ہے جس کا انجام جہنم ہو اور وہ سختی بھی کیا سختی ہے جس کا انجام جنت ہے۔

قوله: يؤتى باشد الناس

بؤسا...... : بائے موحدہ کے ضمہ کے ساتھ، سختی و مشقت وغیرہ کیونکہ دنیا میں طرح طرح کے مصائب میں گرفتار رہا ہوگا۔

'' الجنة'': سے مراد جنت کی نہریں ہیں یا نہر کوثر میں غوطہ دیا جائے گا۔

فقيول: لا والله يا رب مامربي بؤس قط: جنتی کو چونکہ اس خطاب سے بے حد لذت حاصل ہوگی اس لئے وہ جواب میں اطناب سے کام لے گا۔ اور خوشی سے پھولے نہ سماتے ہوئے کلام میں ''قلب'' کر جائے گا۔

۵۶۷۰ : وَعَنْهُ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ يَقُوْلُ اللّٰهُ لِاَهْوَنِ اَهْلِ النَّارِ عَذَابًا يَوْمَ الْقِيَامَةِ لَوْ اَنَّ لَكَ مَا فِي الْاَرْضِ مِنْ شَيْءٍ اَكُنْتَ تَفْتَدِيْ بِهٖ فَيَقُوْلُ نَعَمْ فَيَقُوْلُ اَرَدْتُّ مِنْكَ اَهْوَنَ مِنْ هٰذَا وَاَنْتَ فِيْ صُلْبِ اٰدَمَ اَنْ لَّا تُشْرِكَ بِيْ شَيْئًا فَاَبَيْتَ اِلَّا اَنْ تُشْرِكَ بِيْ۔ (متفق علیہ)

اخرجه البخاري ٣٦٣/٦ حديث رقم ٣٣٣٤، واخرجه مسلم ٢١٦٠/٤ حديث (٥١-٢٨٠٥)۔

ترجمہ: ''حضرت انس رضی اللہ عنہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت نقل فرماتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: اللہ تعالیٰ قیامت کے روز دوجہنم والوں میں سے اس آدمی سے جو سب سے ہلکے عذاب میں مبتلا ہوگا فرمائے گا کہ اگر تمہاری ملکیت میں روئے ارض کی املاک میں سے کچھ ایسا ہوتا جس کو تو بدلہ میں دے سکتا (اور اس کے عوض دوزخ کے عذاب سے خواہ وہ کتنا ہی ہلکا ہو چھٹکارا پاسکتا' تو کیا تو ایسا کرتا وہ جہنمی جواب دے گا کہ ہاں! اللہ تعالیٰ فرمائے گا کہ بدنصیب انسان' میں نے تو اسی وقت جب تو آدم کی پشت میں تھا' اس (بدلہ میں کوئی چیز دینے) سے بھی آسان و سہل چیز تمہارے لئے متعین کر دی تھی اور وہ یہ کہ تو میرے ساتھ کسی کو شریک نہ کرنا' مگر تم نے اس سے گردانی کی (اور میرے احکام کی کوئی پابندی نہیں کی) یہاں تک کہ (کسی طرح کے غیر اللہ کی پرستش کر کے) میرا شریک ٹھہرا کر رہا' پس اب میں اس عذاب جہنم کے عوض میں کوئی چیز قبول نہیں کروں گا خواہ تو دنیا جہان کا سب کچھ جمع کرلائے''۔ (بخاری و مسلم)

تشریح: قوله: يقول الله لأهون ـــ تفتدى به:

ما...... شيىء: ''من'' زائدہ برائے استغراق ہے۔ یعنی بالفرض اس وقت اگر تو روئے زمین کی تمام چیزوں کا مالک ہوتا اور تجھ سے اس عذاب کے بدلے میں وہ سب کچھ طلب کرلیا جاتا۔

تفتدى: ''افتداء'' سے مشتق ہے۔ بمعنی اعطاء۔

قوله: فيقول أردت منك اهون :......

فيقول: کی ضمیر لفظ جلالہ کی طرف عائد ہے۔

هذا: یعنی طلب کی تھی۔ ''سبب'' کو ''مسبب'' کی جگہ ذکر کیا گیا ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کی مراد ہیں۔

اس بات پر سلف وخلف کا اتفاق ہے: کہ اللہ تعالیٰ نے جو چاہا وہ ہوگیا' اور اس نے جو نہیں چاہا وہ نہیں ہوا۔ اور ساری بات کا حاصل یہ ہے کہ میں نے اس سے سہل و آسان چیز کا حکم دیا تھا۔

وأنت فى صلب آدم: یہ جملہ حالیہ ہے۔ أى: تعلق الأمربك والحال انك فى صلب آدم. (یعنی میرا حکم تیرے متعلق ہو چکا تھا در انحالیکہ تو آدم کی پشت میں تھا)

اس جملہ میں اس قصۂ میثاق کی طرف اشارہ ہے، جس کا ذکر اس آیت میں ہے:

﴿الست بربكم قالوا بلى﴾ [الاعراف ۲:۱۷۲] ''اس سے مراد توحید و عبادت ہے۔'' اس مفہوم کی طرف یہ اگلا جملہ بھی اشارہ کررہا ہے۔

أن لا تشرك بى شيئا: یہ بدل ہے، یا بیان ہے ''أهون'' کا۔

فابیت الا أن تشرك بی: مستثنیٰ منہ محذوف ہے۔ أی: فابیت کل شیء الا أن تشرك بی. بس بلا شبہ اب میں اس عذابِ دوزخ کے بدلہ میں کوئی چیز قبول نہیں کرونگا۔ خواہ تو دنیا کی تمام چیزیں ہی کیوں نہ لے آئے۔ جیسا کہ اللہ جل شانہ کا فرمانا ہے: ﴿إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا لَوْ أَنَّ لَهُمْ مَا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا وَمِثْلَهُ مَعَهُ لِيَفْتَدُوا بِهِ مِنْ عَذَابِ يَوْمِ الْقِيَامَةِ مَا تُقُبِّلَ مِنْهُمْ﴾ [المائدہ:۳۶] ''یقیناً جو لوگ کافر ہیں اگر ان کے پاس تمام دنیا بھر کی چیزیں ہوں اور ان چیزوں کے ساتھ اتنی چیزیں اور بھی ہوں تا کہ وہ اس کو دے کر روز قیامت کے عذاب سے چھوٹ سکیں تب بھی وہ چیزیں ان سے قبول نہ کی جاویں گی'' اور دوسری جگہ فرمایا:

﴿وَلَوْ أَنَّ لِلَّذِينَ ظَلَمُوا مَا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا وَمِثْلَهُ مَعَهُ لَافْتَدَوْا بِهِ مِنْ سُوءِ الْعَذَابِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ﴾ [الزمر:۴۷]

''اور اگر ظلم (یعنی شرک وکفر) کرنے والوں کے پاس دنیا بھر کی تمام چیزیں ہوں اور ان چیزوں کے ساتھ اتنی چیزیں اور بھی ہوں تو وہ لوگ قیامت کے دن سخت عذاب سے چھوٹ جانے کے لئے (بے تامل) دینے لگیں۔''

امام طیبیؒ فرماتے ہیں: قوله لو أن لك ما فی الارض جمیعًا (میں لو کے بعد فعل محذوف ہے): ای لو ثبت ان لك الخ. چونکہ ''لو'' اپنے بعد فعل ماضی کا تقاضا کرتا ہے، اور جب ''لو'' کے بعد'' أن ''مفتوحہ واقع ہو تو حذف فعل واجب ہوتا ہے، کیونکہ ''ان'' میں پائے جانے والے تحقیق وثبات معنی بمنزلہ فعل محذوف کے ہیں۔ اور ''اردت منك'' کے ظاہری الفاظ معتزلہ کے مذہب کے موافق ہیں۔ چونکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ اے بندے! میں نے تجھ سے توحید کا ارادہ کیا تھا' پس تو نے میری مراد کی خلاف ورزی کی اور تو نے شرک کیا۔

مظہرؒ فرماتے ہیں: ''ارادہ'' یہاں ''امر'' کے معنی میں ہے۔ (یعنی چاہنے سے مراد حکم دینا ہے) ''ارادہ'' اور ''امر'' میں فرق یہ ہے کہ کائنات میں جو بھی ہوتا ہے لامحالہ سب اس کے ارادے اور مشیت سے ہوتا ہے۔ جب کہ امر کبھی ارادۂ ومشیت کے خلاف بھی ہوتا ہے۔

میں کہتا ہوں: اس کی مزید وضاحت یہ ہے کہ ایمان لانے کا امر (حکم) عام مکلفین کو ہے اور مشیت ایمان کا تعلق بعض مکلفین سے ہے اور مشیت کفر کا تعلق بھی بعض مکلفین سے ہے۔ اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿وَلَوْ شَاءَ اللَّهُ لَجَمَعَهُمْ عَلَى الْهُدَىٰ﴾ [الانعام:۳۵] ''اور اگر اللہ کو منظور ہوتا تو ان سب کو راہ پر جمع کر دیتا''۔

ایک اور جگہ قرآن کریم میں یوں فرمایا: ﴿وَلَٰكِنِ اخْتَلَفُوا فَمِنْهُمْ مَنْ آمَنَ وَمِنْهُمْ مَنْ كَفَرَ ۚ وَلَوْ شَاءَ اللَّهُ مَا اقْتَتَلُوا وَلَٰكِنَّ اللَّهَ يَفْعَلُ مَا يُرِيدُ﴾ [البقرۃ:۲۵۳] ''لیکن وہ لوگ باہم (دین میں) مختلف ہوئے' سو ان میں کوئی تو ایمان لایا اور کوئی کافر رہا (اور نوبت قتل وقتال کو پہنچی اور اگر اللہ تعالیٰ کو منظور ہوتا تو وہ لوگ باہم قتل وقتال نہ کرتے لیکن اللہ تعالیٰ جو چاہتے ہیں وہی کرتے ہیں'' ایک اور جگہ یوں ارشاد فرمایا: ﴿ولو یشاء الله لهدی الناس جمیعا﴾ [الرعد:۳۱]

اور ایک جگہ یوں ارشاد فرمایا: ﴿فریقا هدی وفریقا حق علیهم الضلالة﴾ [الاعراف:۳۰] ''بعض لوگوں کو تو اللہ نے ہدایت دی ہے اور بعض پہ گمراہی کا ثبوت ہو چکا ہے''۔

امام طیبیؒ فرماتے ہیں: زیادہ ظاہر یہ ہے کہ ارادہ کو یہاں میثاق (یعنی عہد لینے) پر محمول کیا جائے کہ جس کا ذکر اس آیت کریمہ میں ہے: ﴿ وَاِذْ اَخَذَ رَبُّكَ مِنْ بَنِىْٓ اٰدَمَ مِنْ ظُهُوْرِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ ﴾ [الاعراف:۔۱۷۲] ''اور جب کہ آپ کے ربّ نے اولاد آدم کی پشت سے ان کی اولاد کو نکالا''۔

اور اس کا قرینہ خود حدیث قدسی کے یہ الفاظ: و أن في صلب آدم ہیں۔ چنانچہ ''أبيت الا أن تشرك بي میں''اس ارشاد باری تعالیٰ کی طرف اشارہ ہے: ﴿ اَوْ تَقُوْلُوْٓا اِنَّمَآ اَشْرَكَ اٰبَآؤُنَا مِنْ قَبْلُ ﴾ [الاعراف:۱۷۳] ''یا یوں کہنے لگو کہ (اصل) شرک تو ہمارے بڑوں نے کیا ہم ان کے بعد ان کی نسل میں ہوئے'' اور (حدیث میں موجود) ''اباء'' کو نقض عہد (عہد توڑنے) پر محمول کیا ہے۔

اور '' ألا تشرك'' میں ''استثناء مفرغ'' ہے۔ اور مستثنیٰ منہ کو حذف کر دیا گیا، باوجودیکہ کلام موجب ہے، کیونکہ اباء میں امتناع کے معنی ہیں۔ لہٰذا کلام غیر موجب ہے۔ اي ما اخترت الا لشرك یعنی تو نے شرک ہی کو ترجیح دی۔
اس موضوع پر یہ کلام مستحسن ہے، مگر ''ارادہ'' سے ''أخذ میثاق'' کے معنی مراد لینا محتاج بیان ہے۔ تاکہ ماقبل والے اشکالات دور ہو جائیں۔ واللہ سبحانہ تعالیٰ اعلم۔

۵۶۷۱ : وَعَنْ سَمُرَةَ بْنِ جُنْدُبٍ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ مِنْهُمْ مَّنْ تَاْخُذُهُ النَّارُ اِلٰى كَعْبَيْهِ وَمِنْهُمْ مَّنْ تَاْخُذُهُ النَّارُ اِلٰى رُكْبَتَيْهِ وَمِنْهُمْ مَّنْ تَاْخُذُهُ النَّارُ اِلٰى حُجْزَتِهٖ وَمِنْهُمْ مَّنْ تَاْخُذُهُ النَّارُ اِلٰى تَرْقُوَتِهٖ . (رواه مسلم)

اخرجه مسلم ۲۱۸۵/٤حدیث رقم (۳۳-۲۸٤۵)،والنسائی ۱۱۲/۸حدیث رقم ۵۰۱۰ وابن ماجه ۲۳/۱ حدیث رقم ٦۰ واحمد في المسند ۱۰/۵۔

ترجمه: ''حضرت سمرہ بن جندب رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ نبی اقدس ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''اہل جہنم میں سے کچھ لوگ ایسے ہوں گے جنہیں آگ ان کے ٹخنوں تک پکڑے گی' کچھ لوگ ایسے ہوں گے جن کے دونوں گھٹنوں تک آگ پہنچی ہوگی کچھ لوگ وہ ہوں گے جن کی کمر تک آگ پہنچی ہوگی اور کچھ لوگ وہ ہوں گے جن کی گردن تک آگ پہنچی ہوگی''۔ (مسلم)

تشریح: قوله: منهم من تاخذه ......:

منهم: ضمیر سے مراد ''اہل نار'' ہیں۔

حجزته: حاء کے ضمہ' جیم کے سکون اور زاء کے ساتھ ہے۔ ازار باندھنے کی جگہ۔

ترقوته: تاء کے ضمہ اور قاف کے فتحہ کے ساتھ، ''حلق''۔ صاحب الصحاح فرماتے ہیں: تاء پر ضمہ نہ پڑھا جائے۔ صاحب النہایہ لکھتے ہیں: '' الترقوته ''اس ہڈی کو کہتے ہیں جو تغرہ نحر اور عاتق کے درمیان ہوتی ہے یہ دو ہڈیاں ہوتی ہیں جو دونوں جانب ہوتی ہیں۔ (اس کو ہنسلی کی ہڈی کہتے ہیں)۔ بروزن '' فعلوه''، پہلے حرف کے فتحہ کے ساتھ۔

اس حدیث سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اہل جہنم کو دی جانے والی عقوبات متفاوت ہیں، بعض کو عقوبت شدید ہوگی اور بعض کو خفیف۔ اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ بعض کو عذاب ~~ہوگا~~، اور بعض کو بالکل عذاب نہ ہو۔ اور اس کی تائید پچھلی حدیث سے بھی ہوتی ہے:

وهو متنعل بنعلين يغلى منها دماغه.

امام طیبیؒ نے فرمایا کہ حدیث کا ابتدائی حصہ شرح السنہ میں ابوسعید سے مروی ہے:

اذا خلص المؤمنون من النار...... فيأتونهم فيعرفونهم بصورهم لا تأكل النار صورهم.''جب مؤمنین جہنم سے خلاصی پائیں گے سب تو وہ ان کے پاس آئیں گے چنانچہ وہ ان کی صورتوں سے ان کو پہچان لیں گے آپ ان کی صورتوں کو پاس کھائے گی۔''

۵۶۷۲ : وَعَنْ اَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَا بَيْنَ مَنْكِبَيِ الْكَافِرِ فِي النَّارِ مَسِيْرَةُ ثَلٰثَةِ اَيَّامٍ لِلرَّاكِبِ الْمُسْرِعِ وَفِي رِوَايَةٍ ضِرْسُ الْكَافِرِ مِثْلُ اُحُدٍ وَّغِلَظُ جِلْدِهٖ مَسِيْرَةُ ثَلٰثٍ (رواه مسلم وذكر حديث ابى هريرة) اِشْتَكَتِ النَّارُ اِلٰى رَبِّهَا فِي بَابِ تَعْجِيْلِ الصَّلٰوةِ ۔

اخرجه البخاري ۱۱/۱۵/۱۱ حديث رقم ۶۵۵۱، ومسلم ۲۱۸۹/۴ حديث رقم (۴۵-۲۸۵۲) واحمد في المسند ۳۲۸/۲۔

ترجمہ:''حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:''جہنم میں کافر کے جسم کو اس قدر موٹا اور فربہ بنا دیا جائے گا کہ اس کے دونوں کندھوں کا درمیانی فاصلہ تیز رفتار سوار کی تین دن کی مسافت کے برابر ہوگا''۔اور ایک روایت میں یوں ہے کہ جہنم میں کافر کی ایک داڑھ احد پہاڑ کے برابر ہوگی اور اس کے جسم کی کھال کی موٹائی تین دن کی مسافت ہوگی''۔ (مسلم) اور حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت: اِشْتَكَتِ النَّارُ اِلٰى رَبِّهَا فِي بَابِ تَعْجِيْلِ الصَّلٰوةِ میں نقل کی جا چکی ہے''۔

تشریح: قوله: مابين منكبي ---- المسرع:

قاضیؒ فرماتے ہیں: کافر کے اعضاء کو بڑھا دیا جائے گا، تاکہ انہیں آگ کا عذاب زیادہ سے زیادہ پہنچے۔قرطبیؒ فرماتے ہیں کہ ایسا کفار کے ساتھ ہوگا۔کئی احادیث اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ متکبرین کو میدانِ حشر میں اس حالت میں لایا جائے گا، کہ چیونٹیوں کی مانند گے، اور ان کی صورتیں مردوں کی طرح ہوں گی، اور پھر انہیں ہانک کر جہنم کے قید خانے میں لے جا کر ڈال دیا جائے گا۔

ابن الملکؒ شرح المشارق میں فرماتے ہیں: کہ شیخ اکمل نے اس کو محل نظر قرار دیتے ہوئے کہا ہے کہ یہ حدیث اس بات پر دلالت کرتی ہے، کہ ان کے جسم آگ میں بہت بڑے بڑے ہوں گے۔اور جو (روایت) انہوں نے ذکر کی اس کا تعلق محشر سے ہے۔

میں کہتا ہوں: بظاہر متکبرین سے مراد عاصی مؤمنین ہیں۔اور امام قرطبیؒ کے کلام کا محمل بھی یہی ہے تاکہ اگلی حدیث: ''ضرس الكافر يوم القيامة مثل أحد'' کے ساتھ موافقت ہو جائے۔

زیادہ ظاہر یہ ہے کہ ان کو میدانِ حشر میں تو چیونٹیوں جیسے جسم میں لایا جائے گا۔جہاں لوگوں کے تلوؤں تلے خوب روندے جائیں گے۔اس کے بعد ان کے بدن پھر سے بڑے بڑے ہو جائیں گے۔اور دوزخ میں ڈال دیئے جائیں گے، اور پھر وہ اسی

طرح رہیں گے۔

ابن الملکؒ نے فرمایا: مسلم کی روایت میں "في النار" کے الفاظ موجود نہیں ہیں۔ (کذا قال النووی)

امام قرطبیؒ کے قول کی بہترین توجیہہ یہ ہے کہ حدیث مذکور کی دلالت اس بات پر نہیں ہے، کہ ان کے جسم محشر میں بڑے نہیں ہوں گے۔ کیونکہ متکبرین کو چیونٹیوں سے تشبیہ دینے سے مقصود حقارت ہے' صورۃً تشبیہ دینا مقصود نہیں، وگرنہ "في صورة الرجال" کہنے کے کوئی معنی نہیں بنتے۔ انتہی۔ اس کا کئی اعتبار سے محل محنت ہونا مخفی نہیں۔

قوله: وفي رواية ضرس الكافر... مسيرة ثلاث:

غلظ: غین کے کسرہ اور لام کے فتحہ کے ساتھ۔

ثلاث: (اس کی تمیز محذوف ہے۔) أي: ليال. امام طیبیؒ فرماتے ہیں: جامع الاصول میں بھی اسی طرح ہے۔ اور تانیث باعتبار "ليالي" کے ہے۔

امام نوویؒ فرماتے ہیں: یہ سب کچھ اس لئے کیا جائے گا تاکہ انہیں زیادہ سے زیادہ عذاب ہوسکے۔ اللہ تعالیٰ اس پر بھی قادر ہے اور اس پر ایمان لانا واجب ہے صادق ومصدوق مخبر نے اس کی خبر دی ہے۔

تخریج: الجامع الصغیر میں پہلی روایت کو شیخین کی طرف، اور دوسری روایت کو مسلم کی طرف منسوب کیا ہے۔ اور بزارؒ حضرت ثوبانؓ سے مرفوعاً نقل کرتے ہیں:

ضرس الكافر مثل أحد وغلظ جلده أربعون ذراعا بذراع الجبار.

(جہنم میں) کافر کی داڑھ اُحد پہاڑ کی مانند ہوگی اور اس (کے جسم) کی جلد کی موٹائی جبار (یعنی اللہ تعالیٰ) کے گز کے حساب سے چالیس گز ہوگی۔"

ابن ماجہ کی ابوسعید سے مروی ایک مرفوع حدیث میں یہ الفاظ آئے ہیں:

ان الكافر ليعظم حتى ان ضرسه أعظم من أحد، وفضيلة جسده على ضرسه كفضيلة جسد أحدكم على ضرسه.

"بے شک کافر (جسمانی اعتبار سے) بہت بڑا ہوگا' حتی کہ اس کی داڑھ احد پہاڑ سے زیادہ بڑی ہوگی اور اس کے جسم کو اس کی داڑھ پر ایسی فضیلت حاصل ہے جیسی تم میں سے کسی کے جسم کو اس کی داڑھ پر فضیلت حاصل ہوتی ہے"۔

قوله: وذكر حديث ابي هريرة......

یہ تنبیہ کرنا مقصود ہے کہ یہ روایت مکرر تھی اس لئے تکرار کو حذف کر دیا ہے۔ یا اعتراض کرنا مقصود ہے کہ اس روایت کا موقع محل فلاں باب تھا۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

۵۶۷۳ : عَنْ اَبِي هُرَيْرَةَ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اُوْقِدَ عَلَى النَّارِ اَلْفَ سَنَةٍ حَتّٰى اِحْمَرَّتْ ثُمَّ اُوْقِدَ عَلَيْهَا اَلْفَ سَنَةٍ حَتّٰى ابْيَضَّتْ ثُمَّ اُوْقِدَ عَلَيْهَا اَلْفَ سَنَةٍ حَتّٰى اسْوَدَّتْ فَهِيَ سَوْدَآءُ مُظْلِمَةٌ (رواه الترمذي)

اخرجه الترمذی ٤/ ٦١٢ حدیث رقم ٢٥٩٠، وابن ماجه ٢/ ١٤٤٥ حدیث رقم ٤٣٢٠۔

ترجمہ: ''حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نبی اکرم ﷺ سے روایت نقل فرماتے ہیں کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: جہنم کی آگ کو ایک ہزار سال تک دھکایا گیا حتی کہ وہ سفید ہوگئی پھر ایک ہزار سال مزید دھکایا گیا جس سے وہ سیاہ ہوگئی پس اب دوزخ کی آگ بالکل سیاہ ہے (یعنی اُس میں روشنی پیدا کرنے والا مادہ ہی نہیں)''۔ (ترمذی)

تشریح: قوله: اوقد على النار الف سنة:

او قد: صیغہ مجہول کے ساتھ ہے۔

على النار: نائب فاعل ہے۔ امام طیبیؒ فرماتے ہیں: یہ مفہوم اس آیت کریمہ کے قریب ہے:

﴿يوم يحمى عليها فى نار جهنم﴾ [التوبة: ٣٥] ''جو کہ اس روز واقع ہوگی کہ ان کو دوزخ کی آگ میں (اول) تپایا جائے گا'' اس آگ کے اوپر تہہ بہ تہہ کئی طبقات ہوں گے۔

احمرت: راء مشددہ کے ساتھ، سرخی میں مبالغہ مقصود ہے۔

فهى سوداء مظلمة: اور الجامع کی روایت میں '' كما فى الليل المظلم '' کا اضافہ ہے۔

یہ حدیث اس بات کی دلیل ہے کہ دوزخ معرض وجود میں آچکی ہے۔ جیسا کہ اہل السنۃ والجماعۃ کا مسلک ہے۔ برخلاف معتزلہ اور بعض مبتدعہ کے، اہل سنت والجماعت کے مسلک کی ایک بڑی دلیل اللہ جل شانہ کا یہ فرمان ہے:

﴿أعدت للكافرين﴾ [البقرة۔ ٢٤] کہ '' أعدت '' ماضی کا صیغہ ہے۔

تخریج: اس حدیث کو ابن ماجہ نے بھی روایت کیا ہے۔

۵۶۷۴ : وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ضِرْسُ الْكَافِرِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ مِثْلُ اُحُدٍ وَّفَخِذُهٗ مِثْلُ الْبَيْضَآءِ وَمَقْعَدُهٗ مِنَ النَّارِ مَسِيْرَةُ ثَلٰثٍ مِّثْلُ الرَّبَذَةِ (رواه الترمذی)

اخرجه الترمذی فی ٤/ ٦٠٦ حدیث رقم ٢٥٧٨۔

ترجمہ: ''حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''روز قیامت (دوزخ میں) کافر کی ایک داڑھ احد پہاڑ کے بقدر ہوگی پہاڑ کے برابر اور اس کی ران بیضا (پہاڑ) کے برابر ہوگی اور جہنم میں اس کے بیٹھنے کی جگہ تین دن کی مسافت کے بقدر ہوگی جیسا کہ زبدہ ہے (یعنی مدینہ سے مقام زبذۃ تک درمیانی مسافت کے بقدر)''۔ (ترمذی)

تشریح: قوله: وفخذه مثل البيضاء:

فخذه: فاء کے فتحہ اور خاء کے کسرہ کے ساتھ۔ ضمیر کافر کی طرف راجع ہے۔ صاحب قاموس لکھتے ہیں: ''فخذ'' بروزن ''کتف'' ''ساق'' اور ''ورک'' کا درمیانی حصہ (یعنی ران ہے) اور، یہ مؤنث ہے۔ اور کبھی اس کو کسرہ کے ساتھ بھی پڑھا جاتا ہے۔

البيضاء: صاحب النہایہ فرماتے ہیں: یہ ایک پہاڑ کا نام ہے۔ شارح کا کہنا ہے کہ یہ بلاد عرب میں ایک جگہ ہے۔ اور

بعض کا کہنا ہے کہ یہ پہاڑ ہے۔

مقعده: اسم ظرف ہے، بیٹھنے کی جگہ۔

من النار: اور ایک روایت میں "فیھا" ہے۔

الربذة: راء کے فتحہ، بائے موحدہ اور ذال معجمہ کے ساتھ، مدینہ میں ایک مشہور قصبہ تھا۔ (کذا فی النہایہ) بعض کا کہنا ہے کہ مکہ کے قریب تھا۔ اور بعض کا کہنا ہے، کہ یہ مدینہ کے قصبوں میں سے ایک قصبہ تھا، جو وہاں سے تین رات کی مسافت پر واقع تھا۔ اور ایک شارح کا کہنا ہے کہ یہ ذات عرق کے قریب واقع تھا۔

"مثل الربذة": کا مطلب ہے مدینہ سے ربذہ تک کا فاصلہ۔ (انتھی)، " مثل الربذة " (یہاں مضاف محذوف ہے۔) ای مثل بعد الربذہ۔ اومثل مسافة الربذة (یعنی اس کی مسافت اتنی ہے جتنی کہ مدینہ سے ربذہ تک کی یا جتنا کہ مدینہ سے ربذہ دور ہے) کیونکہ آنحضرت ﷺ نے یہ ارشاد گرامی مدینہ میں ارشاد فرمایا تھا۔ اور اس کی تائید اس روایت سے ہوتی ہے: أن مقعده فی النار ما بینی وبین الربذه

ابن الملکؒ فرماتے ہیں: یہ مدینہ کی بستیوں میں سے ایک بستی ہے۔ اس جگہ پر حضرت ابوذر غفاریؓ کی قبر ہے۔ اور بعض کا کہنا ہے کہ ربذہ شام میں واقع ایک پہاڑ کا نام ہے۔

تخریج: اس حدیث کو امام احمد اور امام حاکم نے ان الفاظ کے ساتھ نقل کیا ہے: ضرس الکافر یوم القیامة مثل أحد، وعرض جلده سبعون ذراعاً وعضده مثل البیضاء، وفخدد مثل ورقان، ومقعده فی النار ما بینی وبین الربذة.

"قیامت کے دن کافر کی داڑھ احد (پہاڑ) کی مانند ہوگی اور اس (کے جسم) کی لمبائی کی موٹائی ستر گز ہوگی اور اس کا بازو بیضاء (پہاڑ کے برابر ہوگا اس کی ران "ورقان" (ایک جگہ کا) بقدر ہوگی اور جہنم میں اس کے بیٹھنے کی جگہ کی مسافت میرے اور ربذہ کے درمیانی فاصلہ کے بقدر ہوگی"۔

۵۶۷۵ : وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ غِلَظَ جِلْدِ الْكَافِرِ اِثْنَانِ وَاَرْبَعُوْنَ ذِرَاعًا وَاِنَّ ضِرْسَهُ مِثْلُ اُحُدٍ وَاِنَّ مَجْلِسَهُ مِنْ جَهَنَّمَ مَا بَيْنَ مَكَّةَ وَالْمَدِيْنَةِ. (رواه الترمذی)

اخرجه الترمذی ٦٠٦/٤ حدیث رقم ٢٥٧٧۔

ترجمہ: "حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: "جہنمی کافر کی کھال کی موٹائی بیالیس ہاتھ ہوگی اس کی داڑھ احد پہاڑ کے برابر ہوں گے اور دوزخ میں اس کے بیٹھنے کی جگہ مکہ اور مدینہ کے درمیانی فاصلہ کے بقدر لمبی چوڑی ہوگی"۔ (ترمذی)

تشریح: قوله: ان جلد الکافر الثان واربعون ذراعا ......

الجامع کی روایت میں یہ الفاظ ہیں: اثنتان وأربعون ذراعا بذراع الجبار

صاحب قاموس لکھتے ہیں: الذراع، ذال کے کسرہ کے ساتھ، کہنی سے درمیانی انگلی کے آخری سرے تک کے حصے کو کہتے

ہیں، اور "ساعد" کو بھی کہتے ہیں۔ یہ دونوں کلمات کبھی مذکر بھی استعمال ہوتے ہیں۔ (کہا جاتا ہے:): ذرع الثوب، أی قاسه بها.

مجلس: اسم ظرف ہے موضع جلوس.

تخریج: اس حدیث کو امام حاکمؒ نے بھی روایت کیا ہے۔

٥٦٧٦ : وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ الْكَافِرَ لَيُسْحَبُ لِسَانَهُ الْفَرْسَخَ وَالْفَرْسَخَيْنِ يَتَوَطَّأُهُ النَّاسُ (رواه احمد والترمذی وقال هذا حديث غريب)

اخرجه الترمذی ٦٠٦/٤ حديث رقم ٢٥٨٠، واحمد في المسند ٩٢/٢۔

ترجمہ: "حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما نے بیان فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: "کافر (دوزخ میں) اپنی زبان تین تین میل اور چھ چھ میل تک گھسیٹے گا اور لوگ اس کو (اپنے پیروں سے) روندیں گے یعنی اس کی زبان پر چل پھر رہے ہوں گے (احمد' ترمذی) اور ترمذی نے کہا ہے کہ یہ حدیث غریب ہے۔

تشریح: قوله: ان الكافر ليسحب ......:

ليسحب: حاء کے فتحہ کے ساتھ بمعنی یجر، ممکن ہے کہ یہ مبنی للمفعول ہو۔ بلکہ مرادی معنی کے اعتبار سے یہی زیادہ ظاہر ہے۔ الجامع میں بھی یوں ہی ضبط کیا ہے۔ البتہ اس کے الفاظ یہ ہیں: لیسحب لسانه وراءہ. اپنے پیچھے اپنی زبان گھسیٹے گا۔

٥٦٧٧ : وَعَنْ اَبِىْ سَعِيْدٍ عَنْ رَّسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ الصَّعُوْدُ جَبَلٌ مِنَ النَّارِ يَتَصَعَّدُ فِيْهِ سَبْعِيْنَ خَرِيْفًا وَّيُهْوٰى بِهٖ كَذٰلِكَ فِيْهِ اَبَدًا (رواه الترمذی)

اخرجه الترمذی ٦٠٥/٤ حديث رقم ٢٥٧٦، واحمد في المسند ٧٥/٣۔

ترجمہ: "حضرت ابوسعید رضی اللہ عنہ رسول اللہ ﷺ سے نقل فرماتے ہیں کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: صَعُوْدٌ (جس کا ذکر قرآن کریم کی اس آیت شریفہ :سارهقه صعودا میں ہے) جہنم میں ایک پہاڑ ہے جس پر کافر کو ستر سال تک چڑھایا جائے گا اور وہاں سے اسی طرح (ستر سال تک) گراتا رہے گا اور برابر یہی سلسلہ جاری رہے گا (یعنی کافر جہنمی ہمیشہ اس پہاڑ پر چڑھائے اور گرائے جاتے رہیں گے)"۔ (ترمذی)

تشریح: قوله: الصعود جبل من النار ......:

الصعود: صاد کے فتحہ کے ساتھ، اور لام عہد کا ہے۔ "الصعود" سے اس آیت کریمہ کی طرف اشارہ ہے: ﴿سأرهقه صعودا﴾ [المدثر:١٧] ای سأغشيه عقبة صعبة المسلك۔ (یعنی میں اس کو دشوار چڑھائی والے صعود نامی پہاڑ چڑھنے کے لئے برانگیختہ کروں گا)

صاحب قاموس فرماتے ہیں: "الصعود": صاد کے فتحہ کے ساتھ، "هبوط" کی ضد ہے۔ "صعود:" دوزخ کی ایک پہاڑ، دشوار گزار گھاٹی۔ اس ارشاد گرامی کا مقصود یہ ہے کہ یہ پہاڑ بہت بڑا ہے۔

يتصعد فيه: صیغہ مجہول کے ساتھ ہے۔ یعنی کافر کو اس پہاڑ پر چڑھنے کا مکلف بنایا جائے گا۔ اور ایک نسخہ میں صیغہ

معروف کے ساتھ ہے۔أی یطلع فی ذلك الجبل، (یعنی اس پہاڑ پر چڑھے گا۔)

سبعین خریفا: (مضاف محذوف ہے۔)أی:مدة سبعین عاماً.

یھوی به: صیغہ مجہول کے ساتھ ہے۔یعنی اس کو اس پہاڑ سے نیچے گرنے کا مکلف بنایا جائے گا۔

اور ایک نسخہ میں یاء کے فتحہ اور واؤ کے کسرہ کے ساتھ ہے۔یعنی کافر اس پہاڑ سے نیچے اترے گا۔ھوی یھوی ھوی 'مثل رمی یرمی' بمعنی "سقط" (گرنا) سے ماخوذ ہے اور باء برائے تعدیہ ہے۔

"ابدا": یہ قید دونوں فعلوں کے ساتھ ہے۔أی: یکون دائما فی الصعود و الھبوط.(یعنی وہ ہمیشہ چڑھنا اترنا رہے گا)ان تمام تشریحات سے آنحضرت ﷺ کے ایک اور ارشاد:" ان السفر قطعة من سقر" کی معنوی لطافت کا بھی پتہ چلتا ہے۔اور اس کے ساتھ ساتھ اس میں لطافت نقطیہ اور حساب ابجدی کی طرف اشارہ بھی ہے۔

اور اسی بات سے، حضرت علیؓ سے مروی اس روایت کا جواب بھی ہو جاتا ہے۔وہ فرماتے ہیں:

لو لم یقل النبی ﷺ هکذا لعکست، وقلت:ان سقر قطعة من السفر.

لیکن آنحضرت ﷺ کے کلام میں جو حسن ہے، اور مبالغہ زائدہ سے جو احتراز ہے، وہ کسی پر مخفی نہیں۔علاوہ ازیں واقعہ سے مطابقت بھی ہے، اور آیت کی تفسیر کی طرف اشارہ بھی ہے۔اور وہ لطافت و ظرافت بھی ہے جس کی طرف ہم نے اشارہ کیا۔

تخریج: الجامع کی روایت میں یہ الفاظ ہیں:ثم یھوی فیه کذلك أبدا

اس کو امام احمد، امام ترمذی ابن حبان اور حاکم نے حضرت ابو سعید خدریؓ سے نقل کیا ہے۔

۵۶۷۸:وَعَنْهُ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ فِي قَوْلِهٖ كَالْمُهْلِ اَیْ كَعَكَرِ الزَّيْتِ فَاِذَا قُرِّبَ اِلٰى وَجْهِهٖ سَقَطَتْ فَرْوَةُ وَجْهِهٖ فِيْهِ (رواہ الترمذی)

اخرجه الترمذی ٤/ ٦٠٨ حدیث رقم ٢٥٨٤، واخرجه احمد فی المسند ٣/ ٧٠-٧١۔

ترجمہ:" حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ رسول اللہ ﷺ سے روایت نقل فرماتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے حق تعالیٰ کے اس فرمان (یعنی اس آیت شریفہ: اِنَّ شَجَرَةَ الزَّقُّوْمِ طَعَامُ الْاَثِيْمِ كَالْمُهْلِ يَغْلِيْ فِي الْبُطُوْنِ میں لفظ مھل کی تفسیر فرماتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ وہ زیتون کے تیل کی تلچھٹ کی طرح ایک چیز ہوگی جب اس مھل) کو جہنمی کے چہرے کے پاس لے جایا جائے گا تو (مارے گرمی کے) اس کے منہ کی کھال اس میں گر جائے گی"۔(ترمذی)

تشریح: کالمھل: یعنی اللہ جل شانہ کے اس فرمان:﴿وان یستغیثوا یغاثوا بماء کالمھل یستوی الوجوه﴾ میں وارد لفظ "مہل" کی وضاحت کرتے ہوئے فرمایا۔

عکر: کاف اور عین دونوں کے فتحہ کے ساتھ، بمعنی" دردیه" امام طیبیؒ فرماتے ہیں: اس کا معنی ہے زیتون کا میل کچیل۔

اور ایک شارح نے بہت ہی عجیب بات کی ہے کہ "مھل" کی تفسیر "صدید" بیان کی ہے، باوجودیکہ واضح نص موجود ہے۔

قرب: قاف کے ضمہ اور راء کی تشدید کے ساتھ، ضمیر "المھل" کی طرف راجع ہے۔

فروة: بمعنی الجلد والفرو. صاحب النہایہ فرماتے ہیں: فروة وجهه أی جلدته.(چہرہ کی کھال) یہ اصل میں "

فروۃ الراس" (مع بالوں کے سر کے کھال) سے مأخوذ ہے۔" فروہ" اس کھال کو کہتے ہیں جس پر بال اُگتے ہیں۔ چہرہ کی کھال کیلئے بطور استعارہ استعمال ہوا ہے۔

۵۶۷۹ : وَعَنْ اَبِیْ ھُرَیْرَۃَ عَنِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ اِنَّ الْحَمِیْمَ لَیُصَبُّ عَلٰی رُؤُسِھِمْ فَیَنْفُذُ الْحَمِیْمُ حَتّٰی یَخْلُصَ اِلٰی جَوْفِہٖ فَیَسْلُتَ مَا فِیْ جَوْفِہٖ حَتّٰی یَمْرُقَ مِنْ قَدَمَیْہِ وَھُوَ الصَّھْرُ ثُمَّ یُعَادُ کَمَا کَانَ ۔ (رواہ الترمذی)

اخرجه الترمذی ٤/٦٠٧ حدیث رقم ٢٥٨٢، واحمد فی المسند ٢/٣٧٤۔

ترجمہ: "حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نبی اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت نقل فرماتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: جب جہنم والوں کے سر پر کھولتا ہوا پانی ڈالا جائے گا تو وہ گرم پانی اندر اترتا چلا جائے گا حتی کہ اس کے پیٹ تک سرایت کر جائے گا اور ان چیزوں کو کاٹ ڈالے گا جو پیٹ کے اندر ہیں (یعنی آنتیں وغیرہ) یہاں تک کہ وہ گرم پانی (پیٹ کے اندر کی چیزوں کو کاٹتا اور گلاتا ہوا) اس کے دونوں قدموں سے باہر نکل آئے گا اور "صہر" کے یہی معنی ہیں پھر وہ دوزخی کہ جس کے ساتھ گرم پانی کا یہ عمل ہوگا) دوبارہ پہلے اسی حال میں لوٹا دیا جائے گا"۔ (ترمذی)

تشریح: قولہ: ان الحمیم لصب علی رؤسھم ......

یعنی آنحضرت ؐ نے اللہ تعالیٰ کے اس فرمان ﴿یصب من فوق رؤوسھم الحمیم﴾ [الحج:١٩] (اور) ان کے سر کے اوپر سے گرم پانی چھوڑا جاوے گا" میں وارد لفظ "حمیم" کے بارے میں فرمایا۔

حمیم: انتہائی تیز گرم پانی۔

ینفذ: نفوذ سے مأخوذ ہے۔ جس کا معنی ہے التأثیر و الدخول فی الشیء۔

یعنی اس کی حرارت کا اثر اس کے سر سے اس کے پاؤں تک پہنچے گا۔

یخلص: لام کے ضمہ کے ساتھ۔

الی جوفه: ضمیر کے مرجع میں دو احتمال ہیں: ① رأسه. ② بطنه. اور یہی (یعنی دوسرا مرجع) معنی ظاہر و متبادر ہے۔ بلکہ یہی معنی درست ہے۔ اس کی دلیل اور قرینہ اگلا جملہ ہے۔

فیسلت: لام کے ضمہ کے ساتھ "سلت" کے اصل معنی ہیں: القطع، (کأنا) "سلت القصعة" سے مأخوذ ہے، جس کا معنی ہے "برتن میں لگے ہوئے کھانے کو چاٹنا"۔

اور قاضیؒ فرماتے ہیں: أی یذھب ویمرق

حتی یمرق: راء کے ضمہ کے ساتھ، بمعنی نکلنا۔

الصھر: صاد کے فتحہ کے ساتھ بمعنی "الاذابة" یعنی پگھلانا

اور یہ لفظ جس کی وضاحت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مذکورہ تفصیل کے ساتھ بیان فرمائی، قرآن کریم کی اس آیت میں مذکور ہے: ﴿یصھر به ما فی بطونھم والجلود﴾ [الحج۔٢٠] (اور) اس سے ان کے پیٹ کی چیزیں (یعنی انتڑیاں اور (ان کی)

کھالیں سب گل جاویں گی'' اوران لوگوں کے لئے شدید یہ وعید بھی ہے جس کا بیان اس آیت مبارکہ میں ہے: ﴿ولهم مقامع من حديد﴾ [الحج:۲۱] ''اوران کے (مارنے کے) لیے لوہے کے گرز ہوں گے''۔

ثم يعاد: ضمیر ''ما في جوفه'' کی طرف راجع ہے۔اس کی دلیل اللہ جل شانہ کا یہ فرمان ہے: ﴿كُلَّمَا نَضِجَتْ جُلُوْدُهُمْ بَدَّلْنٰهُمْ جُلُوْدًا غَيْرَهَا لِيَذُوْقُوا الْعَذَابَ﴾ [النساء: ٥٦] ''ایک دفعہ ان کے کھال جل چکے گی تو ہم پہلی کھال کی جگہ فوراً دوسری کھال پیدا کردیں گے تا کہ عذاب ہی بھگتتے رہیں''۔ ''العذاب'' سے مراد شدتِ عذاب ہے۔

۵۶۸۰ : وَعَنْ اَبِي اُمَامَةَ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِي قَوْلِهٖ يُسْقٰى مِنْ مَّآءٍ صَدِيْدٍ يَتَجَرَّعُهٗ قَالَ يُقَرَّبُ اِلٰى فِيْهِ فَيَكْرَهُهٗ فَاِذَآ اُدْنِيَ مِنْهُ شَوٰى وَجْهَهٗ وَوَقَعَتْ فَرْوَةُ رَاْسِهٖ فَاِذَا شَرِبَهٗ قَطَعَ اَمْعَآءَهٗ حَتّٰى يَخْرُجَ مِنْ دُبُرِهٖ يَقُوْلُ اللّٰهُ تَعَالٰى وَسُقُوْا مَآءً حَمِيْمًا فَقَطَّعَ اَمْعَآءَهُمْ وَيَقُوْلُ وَاِنْ يَّسْتَغِيْثُوْا يُغَاثُوْا بِمَآءٍ كَالْمُهْلِ يَشْوِى الْوُجُوْهَ بِئْسَ الشَّرَابُ ۔

اخرجه الترمذي ٦٠٨/٤ حديث رقم ٢٥٨٤، واحمد في المسند ٢٦٥/٥۔

ترجمہ: ''حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نبی اقدس ﷺ سے روایت نقل فرماتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے حق تعالیٰ کے اس فرمان يُسْقٰى مِنْ مَّآءٍ صَدِيْدٍ يَتَجَرَّعُهٗ کی تفسیر بیان کرتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ ''جب وہ پانی اس (عاصی) کے چہرے کے پاس لایا جائے گا تو وہ بہت ناک بھوں چڑھائے گا اور پھر جب وہ پانی اس کے دہن کے قریب کیا جائے گا تو اس کے منہ کے گوشت کو بھون ڈالے گا اور اس کے سر کی کھال گر جائے گی اور جب وہ (دوزخی) اس پانی کو پئے گا (تو وہ پانی پیٹ میں جا کر اس کی) آنتوں کو پاش پاش کردے گا' پھر وہ پاخانہ کے راستے سے باہر نکل آئے گا' چنانچہ خداوندی ہے :وَسُقُوْا مَآءً حَمِيْمًا فَقَطَّعَ اَمْعَآءَهُمْ اسی طرح (قرآن میں ایک اور جگہ یوں فرمایا گیا ہے :وَاِنْ يَّسْتَغِيْثُوْا يُغَاثُوْا بِمَآءٍ كَالْمُهْلِ يَشْوِى الْوُجُوْهَ بِئْسَ الشَّرَابُ۔ (ترمذی)

تشریح: قوله: عن النبي ؐ في قوله ......:

في قوله: اور ایک نسخہ میں لفظ ''تعالیٰ'' کا اضافہ بھی ہے۔

صديد: بعض کا کہنا ہے کہ ''صدید'' زخم کے اس پانی کو کہتے ہیں جس میں بہتا ہوا خون ہو۔

یعنی اس کو ایک بار میں نہ پی سکے گا، بلکہ اس کی کڑواہٹ اور حرارت کے باعث گھونٹ گھونٹ کر کے پیئے گا۔ اسی منظر کو قرآن کریم نے ان الفاظ کے ساتھ بیان کیا ہے:

﴿وَلَا يَكَادُ يُسِيْغُهٗ وَيَاْتِيْهِ الْمَوْتُ مِنْ كُلِّ مَكَانٍ وَّمَا هُوَ بِمَيِّتٍ وَمِنْ وَّرَآئِهٖ عَذَابٌ غَلِيْظٌ﴾ [ابراهيم:۱۷] ''اور گلے سے آسانی کے ساتھ اتارنے کی کوئی صورت نہ ہوگی اور ہر (چہار) طرف سے ان پر (سامان) موت کی آمد ہوگی وہ اور کسی طرح مرے گا نہیں اور اس کو سخت عذاب کا سامنا ہوگا۔''

يقرب: رائے مشددہ کے فتحہ کے ساتھ۔

ادني: صیغہ مجہول کے ساتھ ہے۔

شربه: ضمیر منصوب متصل "الصدید" کی طرف عائد ہے۔

قطع: طاء کی تشدید کے ساتھ (ثلاثی مجرد کی بجائے مزید فیہ سے لانا)، برائے مبالغہ وکثرت ہے۔

تخرج: ضمیر "امعاء" کی طرف عائد ہے۔ اور ایک نسخہ میں یاء کے ساتھ ہے۔ اس صورت میں ضمیر "الصدید" کی طرف راجع ہوگی۔

دبر: دال مہملہ اور بائے معجمہ، دونوں کے ضمہ کے ساتھ "قُبُل" کی ضد ہے۔

یقول: ضمیر اللہ عزوجل کی طرف عائد ہے۔ یعنی قرآن کریم میں ایک اور جگہ یوں ارشاد فرمایا: ﴿وان یستغیثوا﴾ اس میں "سین" طلب ماخذ کیلئے ہے۔ أی یطلبوا الغیاث بالماء علی عادتهم الاستغاثه فی طلب الغیث "غیث" بارش کو کہتے ہیں۔

یغاثوا: کا معنی ہے یجابوا ویؤتوا قبول کیا جائے۔

کالمهل: آنحضرت ﷺ سے ثابت تفسیر کے مطابق اس سے مراد "صدید" ہے یا "عکر الزیت"

یشوی الوجوه: یعنی ابتداءً تو یوں ہوگا، اور پھر انتہاءً وہ پانی پیٹ اور دیگر تمام اعضاء تک پہنچ جائے گا۔

بئس الشراب: (مخصوص بالذم محذوف ہے۔) جو کہ المھل یا الماء ہے۔

۵۶۸۱ : وَعَنْ اَبِیْ سَعِیْدٍ الْخُدْرِیِّ عَنِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قَالَ لَسُرَادِقُ النَّارِ اَرْبَعَةُ جُدُرٍ كِثَفُ كُلِّ جِدَارٍ مَسِيْرَةُ اَرْبَعِیْنَ سَنَةً (رواه الترمذی)

اخرجه الترمذی ۶۰۸/۴ حدیث رقم ۲۵۸۴، واخرجه احمدفی المسند ۲۹/۳۔

ترجمہ: "حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ نبی اقدس ﷺ سے روایت نقل فرماتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا: "دوزخ کے احاطہ کے لئے چار دیواریں ہوں گی جن میں سے ہر دیوار کی چوڑائی چالیس سال کی مسافت کے بقدر ہوگی"۔ (ترمذی)

تشریح: قوله: لسرادق النار اربعة ......:

لسرادق: لام کے کسرہ، سین کے ضمہ اور قاف کے جر کے ساتھ۔ اور ایک نسخہ میں فتحہ اور رفع کے ساتھ ہے۔ (یعنی لام کے فتحہ او قاف کے ضمہ کے ساتھ) امام طیبیؒ فرماتے ہیں: لام کے فتحہ کے ساتھ پڑھنے کی صورت میں یہ مبتدا ہوگا، اور لام کے کسرہ کے ساتھ پڑھنے کی صورت میں یہ خبر ہوگا۔ اور یہی وجہ اعراب زیادہ ظاہر ہے۔

صاحب النہایہ فرماتے ہیں: سرادق، ہر اس شئے کو کہتے ہیں جو کسی شئے کا احاطہ کرے، خواہ وہ شئے محیط دیوار ہو، یا مضرب ہو یا خیمہ ہو۔ میں کہتا ہوں: "سرادق النار"، درحقیقت اس آیت کریمہ میں موجود لفظ "سرادق" کی طرف اشارہ ہے: ﴿انا أعتدنا للظالمین نارا أحاط بهم سرادقها﴾ [الکہف: ۲۹] "بے شک ہم نے ایسے ظالموں کے لئے آگ تیار رکھی ہے کہ اس آگ کی قناتیں ان کو گھیرے ہوں گی"۔

صاحب قاموس لکھتے ہیں: السرادق الذی یمدّ فوق البیت. (سرادق وہ ہے جو گھر کے اوپر پھیلایا جائے) اس کی جمع

"سرادقات" آتی ہے۔اور ایک شارح کا کہنا ہے:هو الذی یمد فوق صحن الدار .(سرادق وہ ہے جو گھر کے صحن پر تانا جائے) میں کہتا ہوں کہ یہاں آیت کریمہ میں لفظ "سرادق" کے اعم مراد ہیں۔یعنی ایسی شئ محیط جو تمام جہات سے احاطہ کئے ہو،اور ممکن ہے کہ "سرادقِ نار" سے مراد کے وہ سخت آگ ہو کہ جس میں دھواں وغیرہ بھی ہو۔اسی وجہ سے "سرادق النار" کی تعبیر اختیار فرمائی ہے۔

جدر: جیم اور دال دونوں کے ضمہ کے ساتھ۔

یہ اس کے منافی نہیں کہ ان کے اوپر سے کوئی چیز انکا احاطہ نہیں کئے ہوگی، کیونکہ بہت سی صحیح احادیث سے ثابت ہے کہ جہنم جہنمیوں میں سے ہر ہر جہنمی کا مکمل احاطہ کئے ہوگی۔حتی کہ ہر جہنمی کا گمان یہی ہوگا، کہ اس کے علاوہ کسی اور کو عذاب نہیں ہو رہا، بس وہی انتہائی مشکل اور مصیبت میں ہے، کسی دوسرے کی خبر اس وجہ سے نہیں ہوگی کہ جب مصیبت عام ہوتی ہے، تو اس کا سہنا آسان ہو جاتا ہے، خصوصاً جب کہ اس کو یہ معلوم ہو کہ اس کا عذاب کسی دوسرے سے کم ہے۔

کثف: کاف کے ضمہ اور ثائے مثلثہ کے ساتھ، سید کے نسخہ اور دوسرے بہت سے نسخوں میں "کثف" مرفوع ہے۔بعض نسخوں میں کسرہ اور فتحہ کے ساتھ ہے۔اکثر شراح بھی اسی پر ہیں اور یہی زیادہ ظاہر ہے۔صاحب المفاتیح اور خلخالی کا کہنا ہے کہ یہ کاف کے کسرہ اور ثائے مثلثہ کے فتحہ کے ساتھ ہے، بمعنی الغلظ. چنانچہ معنی یہ ہوں گے: کثافة کل جدار وغلظه. (یعنی ہر ایک دیوار کی موٹائی اور دبازت

ایک شارح کا کہنا ہے کہ فتحہ اور کسرہ کے ساتھ بمعنی "الغلظ" ہے۔صاحب النہایہ فرماتے ہیں: کثف، "کثیف" کی جمع ہے بمعنی "الثخین الغلیظ" لیکن یہ بات مخفی نہ رہے کہ یہاں جمع کے معنی مناسبت نہیں رکھتے' کیونکہ اس کی اضافت "کل جدار" کی طرف ہے۔ہاں! ایک نسخہ میں ضمتین کے ساتھ بحالت جری منقول ہے، "جدر" کی صفت ہونے کی وجہ سے۔اور "کل"، مرفوع علی الابتداء ہے۔یہ وجہ اعراب لفظاً اور معناً ہر اعتبار سے واضح ہے۔واللہ تعالیٰ اعلم۔

۵۶۸۲ : وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَوْ اَنَّ دَلْوًا مِّنْ غَسَّاقٍ يُهْرَاقُ فِي الدُّنْيَا لَاَنْتَنَ اَهْلُ الدُّنْيَا. (رواه الترمذی)

اخرجه الترمذی ٨/٤، ٦٠ حديث رقم ٢٥٨٤، واحمد فی المسند ٢٨/٣۔

ترجمہ: "حضرت ابوسعید رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: دوزخیوں کے زخموں سے جو زرد رنگ کا مدہ نکلے گا (یعنی خراب خون اور پیپ) اگر اس کا ایک ڈول بھر کر دنیا میں انڈیل دیا جائے تو یقیناً تمام دنیا والے گل سڑ کر بدبودار ہو جائیں"۔(ترمذی)

تشریح: غساق: تخفیف اور تشدید کے ساتھ، جہنمیوں کا بہتا ہوا صدید اور دھوون۔اور بعض کا کہنا ہے کہ جہنمیوں کے آنسو جو بہہ رہے ہوں گے، اور بعض کا کہنا ہے، کہ اس سے "زمہریر" مراد ہے۔(کذا فی النہایۃ)

اور بعض کا کہنا ہے، کہ اس سے مراد وہ انتہائی ٹھنڈا، بدبودار صدید ہے، کہ جس کی ٹھنڈک کے باعث اسے پی نہیں سکے گا۔ جس طرح کہ وہ "ماء حمیم" کو اس کی شدت حرارت کی وجہ سے نہیں پی سکے گا۔میں کہتا ہوں یہی معنی مراد لینا زیادہ مناسب ہے،

کیونکہ اس آیت کریمہ: ﴿فليذوقوه حميم وغساق﴾[ص:۵۷] ''کھولتا ہوا پانی اور پیپ ہے سو یہ لوگ اس کو چکھیں'' اور ایک دوسری آیت: ﴿لا يذوقون فيها بردا ولا شرابا الا حميما وغساقا﴾ ''اور اس میں نہ تو وہ کسی ٹھنڈک (یعنی راحت) کا مزہ چکھیں ہیں اور نہ پینے کی چیز کا بجز گرم پانی اور پیپ کے'' میں دونوں الفاظ کو یکجا ذکر کیا ہے۔ فہم سامع پر اعتماد کرتے ہوئے لف ونشر مشوش کے ساتھ ذکر کیا ہے۔

دلوا من غساق: سے مراد یہ ہے کہ اگر تھوڑا سا غساق بھی دنیا میں انڈیل دیا جائے۔

یهراق: ہاء کے فتحہ کے اور سکون کے ساتھ،

في الدنيا: یعنی اہل دنیا کی زمین پر ڈال دیا جائے۔

لأنتن أهل الدنيا: کا مطلب ہے، صار واذی نتن منه. '' اهل '' مرفوع علی الفاعلیہ ہے، اور اصول معتمدہ میں بھی یوں ہی ہے تو گویا بعض نسخوں میں یہ اس وہم کی وجہ سے منصوب ہے کہ '' أنتن ''، کا ہمزہ برائے تعدیہ ہے۔ ایک شارح کا کہنا ہے أنتن الشيء أي: تغير وصار ذانتن، چنانچہ ''اہل'' کو منصوب پڑھنا درست نہیں بلکہ مرفوع پڑھنا ہی درست ہے۔

(کذا قالہ الامام التورپشتی رحمہ اللہ۔)

صاحب قاموس لکھتے ہیں: نتن، '' فوح '' کی ضد ہے۔ اباب کرم اور ضرب دونوں ابواب سے مستعمل ہے۔ اس کا مصدر ''نتانة '' آتا ہے۔ أنتن فهو منتن، کسرتین اور ضمتین کے ساتھ، جیسا کہ قندیل۔ میں کہتا ہوں کہ کسرتین کی توجیہہ یہ ہے کہ میم کا کسرہ تبعاً ہے۔ جیسا کہ ﴿الحمد لله﴾ میں ہے، کہ شاذ طور پر دال کے کسرہ کے ساتھ پڑھا گیا ہے اور ضمہ کے ساتھ پڑھا گیا ہے (دو وجہ سے۔ اول) مابعد تابع کرتے ہوئے، اور (دوم) دونوں کلمات کو بمنزلہ یک کلمہ شمار کرتے ہوئے کیونکہ اکثر و بیشتر دونوں کلمات اکھٹے استعمال ہوتے ہیں۔

تخریج: اس حدیث کو ابن حبان نے اپنی ''صحیح'' میں اور حاکم نے اپنی مستدرک میں ذکر کیا ہے۔

۵۶۸۳: وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَرَأَ هٰذِهِ الْاٰيَةَ اِتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقَاتِهٖ وَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُسْلِمُوْنَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَوْاَنَّ قَطْرَةً مِّنَ الزَّقُّوْمِ قُطِرَتْ فِيْ دَارِ الدُّنْيَا لَاَ فْسَدَتْ عَلٰى اَهْلِ الْاَرْضِ مَعَايِشَهُمْ فَكَيْفَ بِمَنْ يَكُوْنُ طَعَامَهٗ.

(رواه الترمذی وقال هذا حديث حسن صحيح)

اخرجه الترمذی ٦٠٩/٤ حديث رقم ٢٥٨٥ واخرجه ابن ماجه ١٤٤٦/٢ حديث رقم ٤٤٠٨ واحمد في المسند ٣٠١/١۔

ترجمہ: ''حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے منقول ہے کہ ایک روز رسول اللہ ﷺ نے یہ آیت: اِتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقَاتِهٖ وَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ تلاوت فرمائی اور پھر ارشاد فرمایا: اگر (دوزخ کے) زقوم یعنی تھوہر کے درخت کا ایک قطرہ بھی اس دنیا کے میں گر جائے تو یقیناً دنیا والوں کے سامان زندگی کو تباہ و برباد کردے پھر (سوچو) اس شخص کی کیا کیفیت وحالت ہوگی جس کی خوراک ہی زقوم ہوگی''۔ اس روایت کو ترمذی نے نقل کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ حدیث حسن صحیح ہے''۔

تشریح: قوله :يأيها الذين آمنوا اتقو الله :حق تعاته:

اللہ جل شانہ سے ''کما حقہ'' ڈرنے کا مطلب یہ ہے کہ واجبات کی بجا آوری ہو اور سیئات سے اجتناب کیا جائے۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے اس کی تفسیر یہ بیان کی ہے: وهو أن يطاع فلا يعصي' ويشكر فلا يكفر ويذكر فلا ينسي۔ ''کہ اس کا اطاعت کی جائے نافرمانی نہ کی جائے اس کا شکر ادا کیا جائے ناشکری نہ کی جائے اس کو یاد کیا جائے فراموش نہ کیا جائے۔'' اس روایت کو امام حاکم نے رسول اللہ ﷺ نے نقل کیا ہے۔

اور اس کو اسی طرح ابن حاتم اور ابن مردویہ نے بھی روایت کیا ہے۔ اور محدثین نے اس کو صحیح قرار دیا ہے۔ اگر اس تفسیر کو کمال تقوی کی تفسیر قرار دیا جائے پھر تو کوئی اشکال نہیں ہے۔ اور اگر اصل تقوی کی تفسیر قرار دیا جائے تو پھر یہ منسوخ ہے اور ناسخ یہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: [فاتقوا الله ما استطعتم] (اللہ سے جس قدر ہو سکے ڈرو) جیسا کہ اس کو بعض اہل علم نے ذکر کیا ہے اور بعض عارفین فرماتے ہیں: هو أن ينزه الطاعة عن الالتفات اليها، وعن توقع المجازات عليها. ''اطاعت وفرمانبرداری میں اس حد تک اخلاص ہونا چاہئے کہ خود اپنی طاعت کی طرف بھی دھیان نہ جائے اور نہ اس پر ملنے والی جزاء وثواب کی توقع اور امید رکھے''۔

قوله:﴿ولا تموتن الا وانتم مسلمون﴾:

ملا علی قاریؒ اس کی تفسیر میں لکھتے ہیں: أي موحدون منقادون تائبون جامعون بين الخوف والرجاء، غالبون حسن الظن بالمولى جل وعلا في الآخرة والأولى یہ درحقیقت اسلام پر دوام حکم دیا جارہا ہے' کیونکہ اس مقام پر نہی کا تعلق کلام میں موجود قید کے ساتھ ہے۔

قوله:لوان قطرة من الزقوم...... :

الزقوم: یہ ایک درخت ہے، جو جہنم کے بیچوں بیچ پیدا ہوتا ہے۔ ایک شارح فرماتے ہیں کہ زقوم انتہائی بدذائقہ، بدبودار اور کڑوا ہوتا ہے۔ اہل جہنم کو یہ کھانے پر مجبور کیا جائے گا۔

قطرت: صیغہ معروف کے ساتھ ہے۔

معايشهم: یاء کے ساتھ ہے، اور ہمزہ کے ساتھ بھی پڑھا جاتا ہے۔ ''معيشة '' کی جمع ہے۔

صحاح میں لکھتے ہیں: کہ ''زقوم'' ان (یعنی اہل عرب) کے ہاں کا ایک قسم کا کھانا تھا جس میں کھجور اور مکھن ڈالا جاتا تھا اور ''زقوم'' کا فعل ''زقم '' آتا ہے جس کا معنی ہے کھانا۔ اور مطلب یہ ہے کہ آخرت کا زقوم، درحقیقت ان کی دنیا کے زقوم کے بدلہ میں ہوگا، جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿ان شجرة الزقوم طعام الأثيم﴾ [الدخان:۴۳۔۴۴] ''بے شک زقوم کا درخت بڑے مجرم (یعنی کافر) کا کھانا ہوگا جو (کریہہ صورت ہونے میں) تیل کی تلچھٹ جیسا ہوگا''۔

ابن عباسؓ فرماتے ہیں: جب یہ آیت: ﴿ان شجرة الزقوم طعام الأثيم﴾ نازل ہوئی، تو ابوجہل نے کہا: التمر بالزبد نتزقمه، اس پر یہ آیات نازل ہوئیں: ﴿انها شجرة تخرج في أصل الجحيم﴾ [الصافات:٦٤] ''وہ ایک درخت ہے جو قعر دوزخ میں سے نکلتا ہے......''۔

امام طیبیؒ فرماتے ہیں: ''زقوم'' بروزن فعول ہے یہ ''زقم'' سے ماخوذ ہے، جس کے معنی ہیں: اللقم الشدید والشرب المفرط. (بہت پیتا نگلنا ہڑپ کرنا' جلدی کھانا)

اتقوا اللہ حق تقاتہ ولا تموتن الا وانتم مسلمون: امام طیبیؒ اس کی تفسیر بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں: یعنی تقویٰ میں مبالغہ کرو حتی کہ قابل استطاعت امور میں سے کوئی بھی امر نہ چھوڑو۔ اللہ جل شانہ کے اس فرمان کا مطلب یہی ہے: [فاتقوا اللہ ما استطعتم] [التغابن:۱٦] ''تو جہاں تک تم سے ہو سکے اللہ سے ڈرتے رہو' اور آیت: [ولاتموتن الاوانتم مسلمون] [آل عمران:۱۰۲] ''اور بجز اسلام کے اور کسی حالت پر جان مرد ینا'' اس معنی کی تاکید ہے' یعنی تم حالت اسلام کے علاوہ کسی اور حالت پر مت ہونا جب تم کو موت آئے۔ پس جو شخص اس حالت پر مواظبت اختیار کرے گا اور دوام اختیار کرے گا وہ بحالت اسلام مریگا' دنیا میں آفات سے اور آخرت میں عقوبات سے محفوظ وسالم رہے گا۔ اور جو شخص اس کا حق ادا نہ کرے گا اور اس سے پیچھے ہٹے گا وہ آخرت کے عذاب میں پڑے گا۔ اسی وجہ سے اس کے بعد ''لو ان قطرۃ من الزقوم. الخ'' ارشاد فرمایا۔

۵٦۸۴ : وَعَنْ اَبِیْ سَعِیْدٍ عَنِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ وَھُمْ فِیْھَا کَالِحُوْنَ قَالَ تَشْوِیْہِ النَّارُ فَتَقَلَّصُ شَفَتُہُ الْعُلْیَا حَتّٰی تَبْلُغَ وَسَطَ رَاْسِہٖ وَیَسْتَرْخِیْ شَفَتُہُ السُّفْلٰی حَتّٰی تَضْرِبَ سُرَّتَہٗ.

(رواہ الترمذی)

اخرجہ الترمذی ٤/ ٦١٠ حدیث رقم ٢٥٨٧، واحمد فی المسند ٣/ ٨٨۔

ترجمہ: ''حضرت ابوسعید رضی اللہ عنہ نبی اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت نقل فرماتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے آیت قرآنی کے ان الفاظ) وَھُمْ فِیْھَا کَالِحُوْنَ کی تفسیر بیان کرتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ'' آتش جہنم کافر کے منہ (کے گوشت) کو بھون ڈالے گی جس سے اس کے اوپر کا ہونٹ اوپر کو سکڑ جائے گا حتی کہ سر کے درمیانی حصہ تک جا پہنچے گا اور نیچے کا ہونٹ لٹک جائے گا حتی کہ ناف تک جا پہنچے گا''۔ (ترمذی)

تشریح: قولہ: ھم فیھا کالحون:

ھم سے مراد کفار ہیں۔ ''ھا'' ضمیر جہنم کی طرف لوٹ رہی ہے۔

کالحون: ای عابسون یعنی آگ سے جل جانے کی وجہ سے ترش رو ہونگے۔ (کذاذکرہ طیبی)۔ ایک شارح فرماتے ہیں یعنی ان کے دانت دکھائی دے رہے ہوں گے۔ نبی کریم نے اس کی جو تفسیر بیان بیان فرمائی ہے اس کے پیش نظر اس لفظ کے یہی معنی زیادہ مناسب معلوم ہوتے ہیں۔ جیسا کہ روای نے اگلے کلام میں ذکر کیا ہے۔

قولہ: قال تشویہ النار ......:

قال: اس کا اعادہ برائے تاکید ہے۔

تشویہ: تاء کے فتحہ کے ساتھ، بمعنی ''تحرق'' اور ضمیر منصوب متصل ''کافر'' کی طرف راجع ہے۔

تشوی فعل مضارع کا صیغہ ہے، اور ایک تاء حذف ہوئی ہے۔

شفته: شین کے فتحہ اور کسرہ کے ساتھ۔ بمعنی ہونٹ

حتی تبلغ: بلوغ بمعنی "وصول" پہنچنا ہے۔ اور ضمیر "شفة" کی طرح راجع ہے۔

وسط: سین کے سکون اور فتحہ کے ساتھ۔

تسترخي: بصیغۂ مذکر ومؤنث ہر دو طرح پڑھنا درست ہے۔ بمعنی تسترسل۔ (یعنی لٹکنا)

السفلی: أسفل کی تانیث ہے۔ جیسا کہ علیا، أعلی کی تانیث ہے۔

۵۶۸۵: وَعَنْ اَنَسٍ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَآيُّهَا النَّاسُ ابْكُوْا فَاِنْ لَّمْ تَسْتَطِيْعُوْا فَتَبَاكُوْا فَاِنَّ اَهْلَ النَّارِ يَبْكُوْنَ فِي النَّارِ حَتّٰى تَسِيْلَ دُمُوْعُهُمْ فِيْ وُجُوْهِهِمْ كَاَنَّهَا جَدَاوِلُ حَتّٰى يَنْقَطِعَ الدُّمُوْعُ فَتَسِيْلَ الدِّمَآءُ فَتَقَرَّحَ الْعُيُوْنَ فَلَوْاَنَّ سُفُنًا اُزْجِيَتْ فِيْهَا لَجَرَتْ رَوَاهُ فِيْ شَرْحِ السُّنَّةِ۔

اخرجه ابن ماجه ١٤٤٦/٢ حديث رقم ٤٣٢٤۔

ترجمہ: "حضرت انس رضی اللہ عنہ نبی اقدس ﷺ سے روایت نقل فرماتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا: "لوگو (خدا کے خوف) سے رویا کرو اور (رونا چونکہ اختیاری چیز نہیں ہے اس لئے) اگر تمہیں رونا نہ آئے تو تکلف سے رویا کرو (یعنی ان احوال کا تصور کرو جن سے خدا تعالیٰ کے خوف کے باعث رونا آجائے اور رقت طاری کردے) حقیقت یہ ہے کہ جہنم والے جہنم میں روئیں گے حتی کہ ان کے آنسو خون بن کر ان کے رخساروں پر یوں بہنے لگیں گویا وہ نالیاں ہیں اور جب ان کے آنسو نہ رہیں گے تو خون بہنا شروع ہو جائے گا اور آنکھیں لہولہان ہو جائیں گی ان کی آنکھوں سے بہنے والے آنسو اور خون اس قدر زیادہ ہوں گے کہ اگر ان کے آنسوؤں کے بہاؤ میں کشتیاں چھوڑ دی جائیں تو ضرور وہ بھی چلنے لگیں اس روایت کو بغوی نے اپنے اسناد کے ساتھ) شرح السنۃ میں نقل کیا ہے۔

تشریح: قوله: يا ايها الناس ابكوا فان لم تسطيعوا فتباكوا:

ابكوا: ہمزہ وصلی کے کسرہ کے ساتھ، اور کاف کے ضمہ کے ساتھ، بکی یبکی سے امر کا صیغہ ہے، یعنی اپنے گناہوں پر اللہ سے ڈرو۔ یا یہ کہ اپنے رب سے ملاقات کے شوق میں روؤ، جیسا کہ اللہ جل شانہ نے انبیاء واصفیاء کی حالت بیان کرتے ہوئے فرمایا: ﴿واذا تتلى عليه آيات الرحمن خروا سجدا وبكيا﴾ [مریم: ۵۸] "اور جب ان کے سامنے رحمٰن کی آیتیں پڑھی جاتی تھیں تو سجدہ کرتے ہوئے اور روتے ہوئے (زمین پر) گر جاتے تھے" بعض سلف نے اس آیت پر سجدہ کیا اور فرمایا: هذه السجدة فاين البكاء؟ (سجدہ تو یہ ہو گیا لیکن رونا کہاں سے لائیں؟)

یعنی اگر حقیقی رونے پر قدرت نہ ہو۔ کیونکہ رونا اختیاری چیز نہیں ہے۔

فتباكوا: کاف کے فتحہ کے ساتھ، باب تفاعل سے امر کا صیغہ ہے۔ اور مطلب یہ ہے کہ اپنے نفسوں کو بتکلف رلاؤ، اس جملہ میں اس آیت کریمہ: ﴿ليضحكوا قليلا وليبكوا كثيرا﴾ [التوبة ۔ ۸۲] کی طرف اشارہ ہے۔

قوله: فان اهل النار يبكون في النار حتى تسيل دموعهم في وجوههم ......:

فان أهل النار: سے مراد کفار ہیں۔ اسمیں بھی احتمال ہے کہ فجار مراد ہوں۔

فی ووھھم: "فی" بمعنی "علی" ہے۔"فی" کے ذریعہ سے یہ تعبیر "علی" کے مقابلہ میں ابلغ ہے۔اس کی تائید اس اگلے جملے سے بھی ہوتی ہے۔

کأنها: کی ضمیر "دموع" کی طرف راجع ہے۔

جداول: جدول کی جمع ہے۔"جدول" چھوٹی نہر کو کہتے ہیں۔

فتسیل: منصوب و مرفوع دونوں طرح پڑھا گیا ہے۔

فتقرح: راء مفتوح کی تشدید کے ساتھ۔اس کو بھی مرفوع و منصوب دونوں پڑھا گیا ہے۔یہ فعل مضارع کا صیغہ ہے باب تفعل سے۔دو تاؤں میں سے ایک تاء (خفت و سہولت کی غرض سے) محذوف ہے۔بمعنی فتخرج.

منه: کی ضمیر "السیلان" کی طرف عائد ہے۔

العیون: عین کے ضمہ اور کسرہ کے ساتھ، "عین" کی جمع ہے۔

اور ایک نسخہ میں "فتقرح"، قاف کے سکون اور راء کے فتحہ کے ساتھ ہے۔اس تقدیر پر "عیون" منصوب ہوگا۔صاحب قاموس کے بیان کے مطابق "قرح" از باب فتح بمعنی "جرح" ہے۔اس تقدیر پر معنی یوں ہوگا:فتخرج دموعهم او دمائهم عیونهم،اور آنسوؤں کی اس قدر زیادتی ہوگی کہ الخ

سفنا: سین اور فاء کے ضمہ کے ساتھ، "سفینة" کی جمع ہے۔بمعنی کشتیاں

أزجیت: صیغہ مجہول کے ساتھ ہے، جو "ازجاء" زاء اور جیم کے ساتھ۔سے مشتق ہے، بمعنی ارسلت،

فیها: کی ضمیر "الدموع" یا "الدماء" کی طرف لوٹ رہی ہے۔

۵۶۸۶ : وَعَنْ اَبِی الدَّرْدَاءِ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ یُلْقٰی عَلٰی اَهْلِ النَّارِ الْجُوْعُ فَیَعْدِلُ مَا هُمْ فِیْهِ مِنَ الْعَذَابِ فَیَسْتَغِیْثُوْنَ فَیُغَاثُوْنَ لِطَعَامٍ مِنْ ضَرِیْعٍ لَّا یُسْمِنُ وَلَا یُغْنِیْ مِنْ جُوْعٍ فَیَسْتَغِیْثُوْنَ بِالطَّعَامِ فَیُغَاثُوْنَ بِطَعَامٍ ذِیْ غُصَّةٍ فَیَذْكُرُوْنَ اَنَّهُمْ كَانُوْا یُجِیْزُوْنَ الْغُصَصَ فِی الدُّنْیَا بِالشَّرَابِ فَیَسْتَغِیْثُوْنَ بِالشَّرَابِ فَیُرْفَعُ اِلَیْهِمُ الْحَمِیْمُ بِكَلَالِیْبِ الْحَدِیْدِ فَاِذَا دَنَتْ مِنْ وُّجُوْهِهِمْ شَوَتْ وُجُوْهَهُمْ فَاِذَا دَخَلَتْ بُطُوْنَهُمْ قَطَّعَتْ مَا فِیْ بُطُوْنِهِمْ فَیَقُوْلُوْنَ اُدْعُوْا خَزَنَةَ جَهَنَّمَ فَیَقُوْلُوْنَ اَلَمْ تَكُ تَاْتِیْكُمْ رُسُلُكُمْ بِالْبَیِّنٰتِ قَالُوْا بَلٰی قَالُوْا فَادْعُوْا وَمَا دُعٰٓؤُا الْكٰفِرِیْنَ اِلَّا فِیْ ضَلٰلٍ قَالَ فَیَقُوْلُوْنَ اُدْعُوْا مَالِكًا فَیَقُوْلُوْنَ یٰمٰلِكُ لِیَقْضِ عَلَیْنَا رَبُّكَ قَالَ فَیُجِیْبُهُمْ اِنَّكُمْ مّٰكِثُوْنَ قَالَ الْاَعْمَشُ نُبِّئْتُ اَنَّ بَیْنَ دُعَآئِهِمْ وَاِجَابَةِ مَالِكٍ اِیَّاهُمْ اَلْفُ عَامٍ قَالَ فَیَقُوْلُوْنَ اُدْعُوْا رَبَّكُمْ فَلَا اَحَدٌ خَیْرٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ فَیَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا غَلَبَتْ عَلَیْنَا شِقْوَتُنَا وَكُنَّا قَوْمًا ضَآلِّیْنَ رَبَّنَآ اَخْرِجْنَا مِنْهَا فَاِنْ عُدْنَا فَاِنَّا ظٰلِمُوْنَ قَالَ فَیُجِیْبُهُمْ اِخْسَئُوْا فِیْهَا وَلَا تُكَلِّمُوْنَ قَالَ فَعِنْدَ ذٰلِكَ یَئِسُوْا مِنْ كُلِّ خَیْرٍ وَّعِنْدَ ذٰلِكَ یَاْخُذُوْنَ فِی الزَّفِیْرِ وَالْحَسْرَةِ وَالْوَیْلِ قَالَ عَبْدُ اللّٰهِ بْنُ عَبْدِالرَّحْمٰنِ وَالنَّاسُ لَا

يَرْفَعُوْنَ هٰذَا الْحَدِيْثَ . (رواہ الترمذی)

اخرجه الترمذی ٤/ ٦٠٥ حديث رقم ٢٦٨٦ـ

ترجمہ: "حضرت ابو درداء رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا کہ نبی اقدس ﷺ نے ارشاد فرمایا: "جہنم والوں پر بھوک اس طرح مسلط کردی جائے گی کہ اس بھوک کی اذیت بھی اس سزا کے مثل ہوگی جس میں جہنمی پہلے سے گرفتار ہوں گے چنانچہ وہ بھوک کی اذیت سے بے تاب و بے قرار ہو کر فریاد کریں گے اور ان کی فریاد رسی ضریع کے کانٹے دار کھانے سے کی جائے گی جو نہ فربہی پیدا کرے گا اور نہ ہی بھوک سے بے نیاز کرے گا۔ (بھوک نہ مٹائے گا) پھر وہ (پہلے کھانے کو لاحاصل دیکھ کر) دوسری بار پھر فریاد کرنے لگیں گے اور اس بار ان کی فریاد رسی ایسے کھانے سے کی جائے گی جو گلے میں اٹک جانے والا ہوگا' اس موقع پر یاد کرے گا کہ جب (دنیا میں) کھاتے وقت ان کے گلے میں کوئی چیز پھنس جاتی تھی تو اس کو وہ کسی پینے والی چیز کے ذریعہ گزارا کرتے تھے' چنانچہ وہ (اپنے گلے میں پھنسے ہوئے کھانے کو نیچے اتارنے کی خاطر) کسی پینے والی چیز کی التجا کریں گے' اس وقت انہیں کھولتا ہوا تیز گرم پانی دیا جائے گا جس کو لوہے کے کانٹوں سے پکڑ کر اٹھایا جائے گا (یعنی جن برتنوں میں وہ تیز گرم پانی ہوگا وہ زنبوں کے ذریعہ پکڑ کر اٹھائے جائیں گے اور اٹھانے والے یا تو فرشتے ہوں یا براہ راست دست قدرت ان کو اٹھا کر دوزخیوں کے منہ کو لگائے گی) اور جب گرم پانی کے وہ برتن ان کے چہروں کے نزدیک ہوں گے تو ان کے چہروں (کے گوشت) کو بھون ڈالیں گے اور جب ان برتنوں کے اندر کی چیز (جو ان کو پینے کے لئے دی جائیں گی جیسے پیپ پیلا پانی وغیرہ) ان کے پیٹ میں داخل ہوگی تو پیٹ کے اندر کی چیزوں (یعنی آنتوں وغیرہ) کو جلا گلا پاش پاش کردے گی پس ایسے حالات میں گھر کر جہنمی (بے تابانہ (جہنم پر) متعین فرشتوں سے التجا کریں گے اے دوزخ کے سنتریو! اللہ تعالیٰ سے دعا کرو (کہ کم سے کم ایک ہی دن کے لئے ہمارے اوپر مسلط اس عذاب کو ہلکا کردے) دوزخ کے سنتری جواب دیں گے کہ (اب ہم سے دعا کے لئے کہتے ہو) کیا خدا کے پیغمبر خدائی معجزے اور واضح دلائل لے کر تمہارے پاس نہیں آئے تھے اور (تم سے یہ نہ کہا کرتے تھے کہ شرک و کفر بغاوت و نافرمانی کا راستہ چھوڑ دو اور خدا کی اطاعت و فرمانبرداری کا راستہ اختیار کرلو تاکہ کل روز قیامت عذاب جہنم سے محفوظ رہ سکو) وہ پکاریں گے کہ بے شک (اللہ کے پیغمبر ہمارے پاس خدا تعالیٰ کے واضح اور صریح احکام لے کر آتے تھے' لیکن وائے افسوس ہم گمراہ رہے اور ایمان و سلامتی کے راستہ کو نہ اپنا سکے) دوزخ کے سنتری کہیں گے کہ تو پھر تم خود ہی دعا کرتے رہو (اور اپنا معاملہ سمجھو ہم تمہارے لئے کچھ نہیں کر سکتے) اور کافروں کی دعا کو محض خسارہ اور لاحاصل ہے آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا: جہنمی (جب جہنم کے سنتریوں سے دعا و شفاعت کرنے میں مراد کو نہ پاسکیں گے اور ہر طرف سے مایوسی ہی دکھائی دے گی تو وہ یقین کرلیں گے کہ ہمیں عذاب خداوندی سے چھٹکارا اور خلاصی تو اب ملتی نہیں' پھر کیوں نہ موت ہی مانگی جائے چنانچہ وہ آپس میں کہیں گے کہ مالک یعنی داروغہ جہنم کو (مدد کے لئے) پکارو اور پھر وہ التجا کریں گے کہ اے مالک! اپنے پروردگار سے دعا کرو کہ وہ ہمیں موت دے دے (تاکہ ہمیں آرام مل جائے) حضور اقدس ﷺ نے فرمایا: "اہل دوزخ کی یہ فریاد سن کر) مالک خود اپنی طرف سے یا پروردگار کی طرف سے جواب دے گا کہ (اس دوزخ سے نجات یا موت کا خیال چھوڑ دو) بلاشبہ تمہیں ہمیشہ کے لئے اسی سزا اور عذاب میں رہنا ہے"۔ حضرت اعمش جو (اس حدیث کے ایک راوی ہیں) کہتے ہیں کہ بعض

صحابہؓ نے (بطریق مرفوع یا موقوف) مجھ سے بیان کیا کہ مالک سے ان اہل جہنم کی فریاد اور مالک کی طرف سے ان کو جواب دینے کے درمیان ایک ہزار سال کا وقفہ ہوگا (یعنی وہ دوزخی مالک سے التجا کرنے کے بعد ایک ہزار سال تک جواب کے منتظر رہیں گے اور اس دوران بھی اس عذاب میں مبتلا رہیں گے) آنحضرت ﷺ نے فرمایا: پھر وہ دوزخی (آپس میں) کہیں گے کہ اب ہمیں اپنے رب سے ہی اپنی خلاصی کی فریاد کرنی چاہئے کیونکہ وہی قادر مطلق، رحیم و کریم اور غفار ہے، ہمارے حق میں بھلائی و بہتری کرنے والا اس پروردگار سے بہتر اور کوئی نہیں، چنانچہ وہ التجا کریں گے کہ ہمارے پروردگار! ہم پر ہماری بدبختی و بدنصیبی غالب آ گئی اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ہم (توحید کے راستہ سے) گمراہی کا شکار ہو گئے تھے، اے پروردگار! ہمیں دوزخ (اور یہاں کے عذاب سے) رہائی عطا فرما دے اگر ہم اس کے بعد پھر اسی راستہ کو اپنائیں تو اپنے اوپر ظلم کرنے والے ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ ان کو جواب دے گا: دور ہو کم بختو، کتوں کی طرح ذلیل و خوار رہو اور) اسی دوزخ میں پڑے رہو اور (رہائی و نجات کے بارے میں مجھ سے کلام بھی نہ کرو (تمہاری خلاصی قطعاً نہیں ہو سکتی) حضور اقدس ﷺ نے فرمایا: بالآخر وہ اہل دوزخ ہر بھلائی سے ناامید رہ جائیں گے اور تب وہ چیخ و پکار اور حسرت و افسوس کرنے لگیں گے۔ حضرت عبداللہ بن عبدالرحمٰنؒ (جو اس حدیث کے راوی ہیں) ان کا بیان ہے کہ "اس حدیث کو مرفوع قرار نہیں دیا جاتا"۔ لیکن ترمذی نے اس حدیث کو (مرفوع) نقل کیا ہے جیسا کہ روایت کے آغاز سے معلوم ہوتا ہے"۔

تشریح: قوله: يلقى على أهل النار الجوع ولا يغني من جوع:

فيعدل: یاء کے فتحہ اور دال کے کسرہ کے ساتھ، اور ضمیر "جوع" کی طرف راجع ہے۔ أي: فيساوي الجوع.

یعنی ان پر جو بھوک مسلط کی جائے گی، اس کی دردناکی، دوزخ کے تمام عذابوں کی دردناکیوں کے برابر ہوگی۔

ضريع: ایک خاردار جھاڑی ہے جو حجاز میں ہوتی ہے۔ یہ ایسی زہریلی اور کڑوی گھاس ہوتی ہے کہ جس کے پاس بھی کوئی جانور نہیں پھٹکتا، اور اگر کوئی جاندار اس کو کھا لیتا ہے، تو مر جاتا ہے۔ یہاں اس سے مراد آگ کا کانٹا ہے، جو ایلوا سے زیادہ کڑوا، مردار سے زیادہ بدبودار، اور آگ سے زیادہ تپا ہوا ہوگا۔

لا يسمن: یعنی بالکل فائدہ نہیں دے گا، اور نہ بھوک مٹائے گا، اگرچہ زیادہ مقدار میں ہی کیوں نہ کھائے۔

ولا يغني من جوع: یعنی بھوک دور نہ ہوگی، اور نہ ذرہ برابر تسکین ہوگی، اس میں اس آیت کریمہ کی طرف اشارہ ہے:

﴿ليس لهم طعام الا من ضريع﴾[الغاشية-٦]الى آخره-قوله: فيستغيثون بالاطعام---فقطعت مافي بطونهم:

فيغاثو ن بطعام ذى غصة: یعنی دوسری مرتبہ ان کو کھانے کیلئے ہڈی یا آگ کے کانٹے وغیرہ کی طرح کی کوئی ایسی چیزیں دی جائیں گی، جو گلے میں جا کر پھنس جائیں گی۔ نہ حلق سے نیچے اتر سکیں گی، اور نہ باہر آ سکیں گی۔ حدیث کے اس جملہ میں اس آیت کی طرف اشارہ ہے:

﴿إِنَّ لَدَيْنَا أَنكَالًا وَجَحِيمًا وَطَعَامًا ذَا غُصَّةٍ وَعَذَابًا أَلِيمًا﴾ [المزمل: ۱۲-۱۳] "ہمارے یہاں بیڑیاں ہیں اور دوزخ ہے اور گلے میں پھنس جانے والا اور دردناک عذاب ہے" أي يؤتون بطعام ذى غصة.

یجیزون: زاء کے ساتھ، "اجازۃ" سے مشتق ہے بمعنی یسیغون.

الغصص: غصّۃ کی جمع ہے۔ وھی ما اعترض فی الحلق فاشرق علی ما فی القاموس.

الحمیم: مرفوع ہے۔

بکلا لیب الحدید: یعنی فرشتے تیز گرم پانی کے برتن زنبوروں کے ذریعے پکڑ کر یا براہ راست دستِ قدرت ان برتنوں کو اٹھا کر دوزخیوں کے منہ کو لگائے گا۔

فاذا دنت: کی ضمیر "أوانی الحمیم" کی طرف راجع ہے۔

فاذا دخلت: کی ضمیر "انواع مشروبات" صدید اور غساق وغیرہ کی طرف راجع ہے
یعنی انتڑیاں ٹکڑے ٹکڑے ہو جائیں گی۔

فیقولون ادعوا خزنۃ جھنم:

"خزنہ": ادعوا کا مفعول ہے۔ کلام میں حذف ہے۔ أی: یقول الکفار بعضھم لبعض: ادعوا خزنۃ جھنم فیدعونھم، ویقولون لھم: ﴿ادعوا ربکم یخفف عنا یوما من العذاب﴾ (یعنی بعض کفار دوسرے بعض کفار سے کہیں گے جہنم نے بلا ناغہ کو بلاؤ چنانچہ وہ ان کو بلائیں گے اور ان سے کہیں گے تم بھی اپنے پروردگار سے دعا کرو کہ کسی دن تو تم سے عذاب ہلکا کر دے۔"

فیقولون: ضمیر "خزنۃ" کی طرف راجع ہے۔

قولہ: قالوا: فادعوا ۔۔ الا فی ضلال:

قالوا: کی ضمیر کا مرجع الخزنۃ ہے۔ یہ کلام تھکما ہوگا۔

فادعوا: یعنی تم خود جسے پکارنا چاہو، پکارو ہم تو کافروں کی شفاعت کرنے سے رہے۔

ضلال: بے فائدہ ہے۔ کیونکہ خواہ وہ خود دعا کریں یا کسی اور سے دعا کرائیں۔ لیکن اس سے یہ ہرگز ثابت نہیں ہوتا، کہ کافر و مشرک کی دعا اس دنیا میں بھی قبول نہیں ہوتی، جیسا کہ بعض علماء نے سمجھا ہے۔ حالانکہ اس دنیا میں شیطان تک کی درخواست جو اس نے اپنی عمر کی درازی کیلئے کی تھی اللہ تعالیٰ نے قبول فرمالی۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالحال۔

امام طیبیؒ نے فرمایا: بظاہر "خزنۃ جھنم"، ادعوا کا مفعول نہیں ہے، بلکہ یہ منادای ہے، تا کہ قرآن کی اس آیت کریمہ سے مطابقت ہو جائے: ﴿وَقَالَ الَّذِينَ فِي النَّارِ لِخَزَنَةِ جَهَنَّمَ ادْعُوا رَبَّكُمْ يُخَفِّفْ عَنَّا يَوْمًا مِّنَ الْعَذَابِ﴾ [غافر: ۴۹] "اور (اس کے بعد) جتنے لوگ دوزخ میں ہوں گے جہنم کے مؤکل فرشتوں سے (درخواست کے طور پر) کہیں گے تم بھی اپنے پروردگار سے دعا کرو کہ کسی دن تو ہم سے عذاب ہلکا کر دے"، اور فرشتوں کا یہ کلام أولم تك تأتیکم "الزام برائے حجت و توبیخ ہوگا" کہ دعاء و تضرع کا وقت تو گزر چکا اور دعا کی قبولیت کے اسباب تو معطل ہو گئے۔ وہ کہیں گے: تم پکارو، ہم تو اللہ کے معاملہ میں جرأت نہیں دکھا سکتے۔ "فادعوا"، رجاء منفعت کیلئے نہیں، بلکہ خبث و خسران پر دلالت کیلئے ہے۔ کیونکہ اس وقت تو کسی ملک مقرب کی دعا قبول نہ ہوگی، چہ جائیکہ کافروں کی سنی جائے۔

قوله:فیقولون ادعوا مالكا۔۔۔ انكم ماكثون:

یعنی دوزخی جب جہنم کے داروغوں سے دعاء وشفاعت کرانے میں ناکام ہو جائیں گے اور انہیں سخت مایوسی کا منہ دیکھنا پڑے گا، تو وہ یقین کر لیں گے کہ ہم کو عذابِ خداوندی سے نجات ملنے والی نہیں ہے، پھر کیوں نہ موت ہی مانگیں۔

فیقولون یامالك لیقض: یعنی اپنے ربّ سے دعا مانگیں کہ وہ ہماری موت کا فیصلہ صادر فرما دے، تا کہ ہمیں راحت مل جائے۔ یا ہمیں موت دے دے تا کہ ہمیں آرام مل جائے۔

قال: کی ضمیر نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام کی طرف راجع ہے۔

فیجیبهم انکم ماکثون: مالک خود اپنی طرف سے یا پروردگار کی طرف سے جواب دے گا کہ اس دوزخ سے نجات یا موت کا خیال دل سے نکال دو، تمہیں ہمیشہ ہمیشہ اس میں رہنا ہے۔

قوله:قال الأعمش:۔۔۔:

اعمشؒ اس حدیث کے راویوں میں سے ہیں، اور اجل تابعین میں سے ہیں۔

نبئت: بائے موحدہ مشددہ کے کسرہ کے ساتھ، یعنی بعض صحابہ نے بطریق مرفوع یا موقوف مجھ سے بیان کیا ہے کہ وہ دوزخی مالک سے التجا کرنے کے بعد ایک ہزار سال تک جواب کا انتظار کریں گے اور پھر آپس میں ایک دوسرے سے کہیں گے۔

قوله:فیقولون :ادعوا ربکم فلا احد ۔۔۔ فاناظا لمون:

"لا" مشابہ بلیس ہے۔

خیر من ربکم: کیونکہ وہی ہماری مغفرت پر قادر ہے، اور رحیم ہے۔

شقوتنا: شین کے کسرہ اور قاف کے سکون کے ساتھ۔ اور ایک قرأت میں قاف اور شین دونوں پر فتحہ اور ان کے بعد الف ہے۔ یہ دو لغتیں ہیں۔ شقاوۃ، سعادۃ کا متضاد ہے۔

مذکورہ جملے کا مطلب یہ ہے کہ ہماری تقدیر کہ جس میں ہمارا خاتمہ بد لکھ دیا گیا، پوری ہو کر رہی اور ہم خود اپنی بدبختی کا شکار ہو گئے۔ اور ہم توحید کے راستے سے ہٹ گئے۔

فان عدنا فانا ظالمون: یہ کہنا بھی کذب پر مبنی ہوگا، چونکہ اللہ تعالیٰ ان کی ان باتوں کا پول کھولتے ہوئے ارشاد فرماتا ہے: ﴿ولو ردّوا لعادوا لما نهوا عنه وانهم لكذبون﴾ [الانعام: ۲۸] "تب بھی یہ وہی کام کریں جس سے انکو منع کیا گیا تھا اور یقیناً یہ بالکل جھوٹے ہیں"۔

قوله:قال فیجیبهم۔۔۔ والحسرة والویل:

اللہ تعالیٰ ان کو براہ راست جواب دے گا، یا کسی واسطے سے جواب دے گا، یہ "اجابت اعراض" ہوگی۔

اخسؤوا فیها: یعنی دور رہو، کتوں کی طرح ذلیل وخوار ہو کر یعنی ذلیل وخوار ہو کر جہنم میں پڑے رہو۔

ولا تکلمونی: رہائی ونجات کے بارے میں مجھ سے کوئی بات نہ کرو۔ چونکہ تمہاری گلوخلاصی ہرگز نہیں ہو سکتی۔

یئسوا من کل خیر: یعنی عذاب سے نجات وتخفیف ہر قسم کی تمنائیں اور امیدیں توڑ بیٹھیں گے۔

الزفیر: بعض کا کہنا ہے کہ ''زفیر'' کے اصل معنی ہیں گدھے کی ابتدائی آواز، اور ''شہیق'' گدھے کی آخری آواز کو کہتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿لهم فيها زفير وشهيق﴾ [هود: ١٠٦] کہ ان میں ان کی چیخ وپکار پڑی رہے گی''

الحسرۃ: سے مراد ''ندامت'' ہے۔

قوله: قال عبد الرحمن الخ :

الویل: یعنی سخت ہلاکت وعذاب۔ بعض کا کہنا ہے کہ ویل، جہنم کی ایک وادی ہے۔ ان دونوں کا عطف ''الزفیر'' پر ہے۔

عبدالرحمن اس حدیث کے ایک راوی ہیں۔ یہ محدثین میں سے ہیں اور اصحاب تخریج میں سے ہیں۔ عام محدثین نے اس حدیث کو مرفوع بیان نہیں کرتے۔

بلکہ اس حدیث کو (حضرت ابوالدرداء کا اپنا بیان یعنی) موقوف بتاتے ہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ حدیث بہر صورت مرفوع حدیث ہی کے حکم میں ہے۔ کیونکہ اس کے احوال (دوزخیوں کی گفتگو اور دوزخ کے عذاب وغیرہ سے متعلق جو مضمون ہے وہ) کوئی بھی صحابی (آنحضرت ﷺ سے سنے بغیر) اپنی طرف سے بیان کر ہی نہیں سکتا۔

ترمذیؒ نے اس حدیث کو مرفوعاً نقل کیا ہے، جیسا کہ روایت کے ابتدائیہ سے معلوم ہوتا ہے۔

٥٦٨٧ : وَعَنِ النُّعْمَانِ بْنِ بَشِيْرٍ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ اَنْذَرْتُكُمُ النَّارَ اَنْذَرْتُكُمُ النَّارَ فَمَا زَالَ يَقُوْلُهَا حَتّٰى لَوْ كَانَ فِيْ مَقَامِيْ هٰذَا سَمِعَهُ اَهْلُ السُّوْقِ وَحَتّٰى سَقَطَتْ خَمِيْصَةٌ كَانَتْ عَلَيْهِ عِنْدَ رِجْلَيْهِ. (رواه الدارمی)

اخرجه الدارمی فی المسند ٢/٤٢٥ الحديث رقم ٢٨١٢، واحمد فی المسند ٢٦٨۔

ترجمہ: ''حضرت نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا کہ (ایک روز) میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ ارشاد فرماتے ہوئے سنا: (لوگو!) میں تمہیں آتش جہنم سے ڈرا چکا ہوں' میں تمہیں آتش دوزخ سے ڈرا چکا ہوں''۔ آپ ﷺ یہ الفاظ بار بار فرما رہے تھے (اور ایک عجب حالت وکیفیت کے عالم میں جھوم جھوم کر اتنی بلند آواز سے فرما رہے تھے کہ) اگر آپ اس مقام پر تشریف رکھے ہوئے جہاں اس وقت میں بیٹھا ہوں تو یقیناً آپ ﷺ کی آواز بازار والے سنتے یہاں تک کہ اس وقت (اس جھومنے کی وجہ سے آنحضرت ﷺ کی کالی کملی' جو کاندھے پر پڑی تھی پیروں میں گر پڑی تھی''۔

تشریح: قوله: انذرتم النار :

یعنی میں نے تم کو دوزخ کے وجود کی خبر دے دی، اور جہنم کی شدت وسختی سے آگاہ کر دیا اور اس کے عذاب کی مختلف صورتوں سے بھی آگاہ کر دیا۔ اور یہ بھی بتا دیا کہ کس طریقہ سے تم اس جہنم سے بچ سکتے ہو۔ میں نے یہاں تک کہہ دیا: **اتقوا النار ولو بشق تمرة** ''جہنم کی آگ سے بچو اگرچہ کھجور کا ایک ٹکڑا نہیں کیوں نہ ہو۔

جملہ اولی اور ثانیہ دونوں سے زمانہ حال میں انذار مراد ہے۔ اور چونکہ اس امر کا وقوع یقینی ہے، گویا کہ واقع ہو چکا ہے، اس لئے بصیغۂ ماضی تعبیر کیا، یا جملۂ اولیٰ اخبار ہے، اور جملۂ ثانیہ انشاء ہے۔ یا تکرار برائے تاکید ہے، ایک نسخہ میں یہ جملہ تین بار ہے۔

ما زال یقولها: اس جملہ کو بار بار دہراتے رہے، اور آواز میں بلندی آتی گئی۔

فی مقامی هذا: یعنی یہ حدیث بیان کرتے وقت راوی جس جگہ موجود تھا۔

یعنی نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام نے، حضرت نوح علیہ السلام کے اس قول کے مقتضی پر عمل پیرا ہوتے ہوئے اپنی آواز کو بلند فرمایا۔﴿ثم انی دعوتهم جهارا ثم انی أعلنت لهم أسررت لهم واسرارا﴾ [نوح:۸-۹] ''پھر (بھی) میں نے ان کو بلند آواز بلایا پھر میں نے ان کو (خطاب خاص کے طور پر)۔

خمیصة: کپڑوں کی ایک نوع ہے۔ یعنی اس وقت آنحضرت ﷺ پر جذب الٰہی کی کیفیت طاری ہوگئی اور ہیبت حسیہ کے باعث آپ ﷺ کو (چادر گرنے کا) احساس نہ ہوا۔

۵٦٨٨ : وَعَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عَمْرِو بْنِ الْعَاصِ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَوْ اَنَّ رَصَاصَةً مِّثْلَ هٰذِهٖ وَاَشَارَ اِلٰى مِثْلِ الْجُمْجُمَةِ اُرْسِلَتْ مِنَ السَّمَآءِ اِلَى الْاَرْضِ وَهِيَ مَسِيْرَةُ خَمْسِ مِائَةِ سَنَةٍ لَبَلَغَتِ الْاَرْضَ قَبْلَ اللَّيْلِ وَلَوْ اَنَّهَآ اُرْسِلَتْ مِنْ رَاْسِ السِّلْسِلَةِ لَسَارَتْ اَرْبَعِيْنَ خَرِيْفًا اللَّيْلَ وَالنَّهَارَ قَبْلَ اَنْ تَبْلُغَ اَصْلَهَآ اَوْ قَعْرَهَا . (رواه الترمذی)

اخرجه الترمذی ٤/ ٦١١ حدیث رقم ۲۵۸۸ واحمد فی المسند ۲/ ۱۹۷۔

ترجمہ: ''حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہما نے بیان فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''اگر سیسہ (رانگے) کا ایک گولہ جو اس کے برابر ہو اور آنحضرت ﷺ نے (سر کی جانب) کہ کھوپڑی جیسا ہو (یعنی سیسے کا وہ گولہ جو کھوپڑی کی طرح گول اور بھاری ہونے کی وجہ سے بہت جلد نیچے گر جانے والا ہو) آسمان سے زمین کی طرف لڑھکایا جائے، جس کا درمیانی فاصلہ پانچ سو سال کی مسافت کے بقدر ہے تو یقیناً وہ (گولا) ایک رات پوری ہونے سے بھی پہلے (یعنی بہت مختصر مدت میں) زمین پر پہنچ جائے لیکن اگر اس کو زنجیر کے سرے سے چھوڑا جائے تو چالیس سال تک گرتے رہنے کے باوجود اس زنجیر کی جڑ یعنی اس کی آخری کڑی تک یا یہ فرمایا کہ اس کی تہ تک نہ پہنچے''۔ (ترمذی)

تشریح: قوله: عبد الله بن عمرو بن العاص:

العاص: اکثر صحیح نسخوں میں حذف یاء کے ساتھ ہے۔ اور ایک نسخہ میں یاء کے ساتھ ہے۔ امام نوویؒ شرح مسلم کے مقدمہ میں فرماتے ہیں کہ کتب حدیث وفقہ وغیرہ میں ''ابن العاص'' حذف یاء کے ساتھ ہے۔ یہ ایک لغت ہے۔ اور فصیح صحیح یہ ہے کہ العاصی، یاء کے اثبات کے ساتھ ہے۔ اور اسی طرح ''شداد بن الهادی''، اور ابن ''أبی الموالی'' ہے۔ پس ان تمام اسماء اور اس کے مشابہ اسماء میں اثبات یاء ہی فصیح وصحیح ہے۔ کتب حدیث میں جو بغیر یاء کے لکھا ہوا ہے اس کو عادت نہ بنایا جائے۔

میں کہتا ہوں: اس کو فصیح وصحیح کہنا غیر صحیح ہے۔ کیونکہ اثبات یاء اور حذف یاء کلام افصح میں کتابۃً اور قراءۃً دونوں طرح ثابت ہے۔ رسم الخط میں اس کا حذف قراءت میں اثبات سے زیادہ ہے۔ قراءت میں اثبات یاء، حذف کے مقابلہ میں مشہور ہے۔ جیسا کہ ''المهتد، المتعال باق اور'' راق '' وغیرہ۔ جو کتابت صحابہ رضوان اللہ علیہم کی طرف منسوب ہے امام نوویؒ سے یہ بات انتہائی مستبعد ہے، خصوصاً اس وجہ سے کہ امام نوویؒ تو محدثین کے اتباع میں سے ہیں اور فقہاء متورعین میں سے ہیں۔

صحیح یہ ہے کہ عاص معتل العین ہے، نا کہ معتل اللام، جیسا کہ صاحب قاموس کی تحقیق ہے، کہ الأعياص من قريش اولاد أمية بن عبد الشمس الأكبر، وهم: العاص، وأبو العاص، والعيص وأبو العيص. لہٰذا لفظ "عاص" ہماری زیرِ نظر بحث سے بالکلیہ خارج ہے، اس میں "یاء" کا اثبات تو بالکلیہ درست نہیں۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

قوله: لوان رصاصة۔۔۔ قبل الليل:

رصاصة: راء کے فتحہ اور دوسری صاد مہملہ کے ساتھ، بمعنی "قطعة من الرصاص". صاحب قاموس لکھتے ہیں: رصاص بروزن "سحاب" مشہور ہے۔ سیدؒ کے نسخہ میں "رضاضة" ہے، یعنی راء اور دوسری ضاد معجمہ کے ساتھ، صاحب النہایہ کے بیان کے مطابق اس کا مطلب ہے چھوٹی چھوٹی کنکریاں، اور مصابیح کے نسخوں میں "رضراضة" ہے، دوسری راء مہملہ اور دوسری ضاد معجمہ کے ساتھ، کٹے ہوئے پتھر، جیسا کہ ایک شارح کا بیان ہے۔ یہ کاتبین کا سہو ہے، یا صاحب کتاب کا سہو ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

امام تورپشتی رحمہ اللہ کا کہنا ہے، کہ مصابیح کے تمام نسخوں میں رصاصة کی جگہ "رضراضه" ہے، یہ غلط ہے۔ حالانکہ ترمذی میں بھی نہیں ہے، ممکن ہے کہ دوسروں کی غلطی ہو۔

هذه: سے محسوس ومعین شی کی طرف اشارہ ہے، جیسا کہ اگلے جملے میں راوی کا بیان ہے۔

وأشار الى مثل الجمجمة: مشکوۃ کے صحیح نسخوں میں دوسری جیم کے ضمہ کے ساتھ ہے، بمعنی قدح صغير.

مظہرؒ نے فرمایا: یہ لفظ دوسری خائے معجمہ کے ساتھ ہے بمعنی حبة صغيرة صفراء، اور بعض کا کہنا ہے، کہ یہ لفظ دوسری جیم کے ساتھ ہے بمعنی عظم الرأس المشتمل على الدماغ. کہا گیا ہے کہ قول اول اصح ہے۔ انتہیٰ۔

جملہ حالیہ ہے۔

أرسلت: بمعنی أدليت، "ان" کے اسم کی صفت ہے، اور درمیان کا کلام (وأشار الى مثل الجمجمة) جملہ معترضہ ہے۔

وهي: سے مراد "مسافة ما بينهما" ہے۔

قوله: ولو انهار ارسلت من رامس السماء ......:

اس زنجیر کا ذکر قرآن کریم کے ان الفاظ میں ہے:

﴿ثُمَّ فِي سِلْسِلَةٍ ذَرْعُهَا سَبْعُونَ ذِرَاعًا فَاسْلُكُوهُ﴾ [الحاقة:٣٢]

"پھر دوزخ میں اس کو داخل کرو پھر ایک ایسی زنجیر میں جس کی پیمائش ستر گز ہے اس کو جکڑ دو"۔

"السبعين" سے کثرت ومبالغہ مراد ہے۔ یا یہ کہا جائے کہ یہ ذراع جبار ہوگا (جس کی مقدار اللہ ہی جانتا ہے) اور ایک شارح کا کہنا ہے کہ اس سے مراد "رأس سلسلة الصراط" ہے۔ یہ معنی انتہائی بعید ہے۔

خريفا: سے مراد "سنه" ہے۔

الليل والنهار: یعنی چالیس سال تک مسلسل دن رات لڑھکنے کے باوجود الخ۔

قبل أن تبلغ أصلها: ضمیر" سلسله " کی طرف عائد ہے۔

أو قعرها: راوی کو شک ہے۔"قعر" سے مراد"نہایت" ہے۔"اصل" کے یہ معنی یا حقیقی ہیں، یا مجازی ہیں۔ پس اس تردد کا تعلق لفظ مسموع سے ہے۔(کہ راوی نے کیا الفاظ سنے تھے) امام طیبیؒ نے نہایت بعید بات کہی کہ اس سے مراد قعر جہنم ہے۔ چونکہ "سلسله" میں قعر کا کوئی مطلب نہیں۔ میں کہتا ہوں کہ اس جگہ جہنم کا تو ذکر ہی نہیں اگرچہ جہنم کی گہرائی بھی بہت زیادہ ہے۔ چنانچہ حضرت انسؓ سے مرفوعاً مروی ہے:

لو أن حجرا مثل سبع خلفات القى من شفير جهنم هوى فيها سبعين خريفا لا يبلغ قعرها.

"اگر سات گابھن اونٹنیوں کے مانند ایک پتھر دوزخ کے کنارے سے ڈالا جائے تو وہ ستر سال تک اس میں گرتا چلا جائے گا' پر اس کی تہہ کو نہ پہنچ پائے گا۔"

"خلفات" سے مراد گابھن اونٹنیاں ہیں۔ تورپشتی کی بیان کردہ تفسیر و تشریح اس مقام کے زیادہ مناسب ہے۔

۵۶۸۹ : وَعَنْ اَبِي بُرْدَةَ عَنْ اَبِيْهِ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اِنَّ فِي جَهَنَّمَ لَوَادِيًا يُّقَالُ لَهٗ هَبْهَبُ يَسْكُنُهٗ كُلُّ جَبَّارٍ. (رواه الدارمی)

اخرجه الدارمی ۴۲۷/۲ حدیث رقم ۲۸۱۶۔

ترجمہ: "حضرت ابوبردہؒ (تابعی) اپنے والد (حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ) سے روایت نقل کرتے ہیں کہ نبی اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: "دوزخ کے اندر ایک ایسا نالا ہے جسے هبهب کا نام دیا جاتا ہے اس نالہ میں ہر اس شخص کو رہنا ہوگا جو متکبر و سرکش' حق سے دور مخلوق پر سختی کرنے والا ہے"۔ (دارمی)

تشریح: قوله: ان فی جهنم لوادیا......:

وادیا: صاحب قاموس لکھتے ہیں: **هو مفرج بين الجبال او تلال او آكام.** پہاڑوں یا ٹیلوں کے درمیان کی کشادہ جگہ۔

هبهب: بائے ثانیہ کے ضمہ کے ساتھ، بغیر تنوین کے، جزریؒ کے نسخہ اور دوسرے بہت سے نسخوں میں اسی طرح ہے۔ اور غیر منصرف ہونے کی وجہ شاید یہ ہے کہ یہ" بقعة " کی تاویل میں ہے، اور (دوسرا سبب) علمیت ہے۔ سیدؒ کے نسخہ میں دونوں بائیں ساکن ہیں۔ اس کی کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آتی۔

الا یہ کہ یوں کہا جائے کہ" هب" امر کا صیغہ" هبة" سے، هبهب درحقیقت امر کا تکرار ہے۔ تو گویا کہ وادی یا وہاں موجود افراد بزبان حال یا قال عام خطاب کرتے ہوئے کہتے ہیں: **هب هب.** واللہ تعالیٰ اعلم بالمرام

صاحب النہایہ لکھتے ہیں: **الهبهب السريع. وهبهب السراب اذا برق.** تورپشتی رحمہ اللہ نے اس کی وجہ تسمیہ یہ بیان کی ہے:

① **لسرعة وقوع في المجرمين.** (بہت تیزی سے مجرمین کے درپے ہونے کی وجہ سے)

② **أو لشدة أجيج النار فيه.** (اس وجہ سے کیا آگ یہاں بہت تیزی سے بڑھک رہی ہوئی)

③ **أو للمعانه عند الاضطرام والالتهاب.** واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

یسکنه: اس میں ''حذف وایصال'' ہے۔ أی: یسکن فیه.

''جبار'' کا مطلب ہے: وہ متکبر وعنید جو حق سے بعید اور مخلوق پر شدید ہو۔

ابن مردویہ ابن عمر سے روایت کرتے ہیں:

الفلق سجن فی جهنم یحبس فیه الجبارون والمتکبرون، وان جهنم لتعوذ بالله منه.

''دوزخ میں ''فلق'' نامی ایک وادی ہے جس میں ظالم وجابر اور متکبروں کو قید کیا جائے گا۔ جہنم اس وادی سے اللہ تعالیٰ کی پناہ چاہتی ہے۔''

ابن جریر نے حضرت ابو ہریرہؓ سے ان الفاظ کے ساتھ روایت کیا ہے:

الفلق جب فی جهنم مغطی. ''فلق'' دوزخ میں ایک ڈھانپا ہوا کنواں ہے۔

الفصل الثالث:

۵۶۹۰ : **عَنِ ابْنِ عُمَرَ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ يَعْظُمُ اَهْلُ النَّارِ فِي النَّارِ حَتّٰى اَنَّ بَيْنَ شَحْمَةِ اُذُنِ اَحَدِهِمْ اِلٰى عَاتِقِهٖ مَسِيْرَةُ سَبْعِ مِائَةِ عَامٍ وَاِنَّ غِلَظَ جِلْدِهٖ سَبْعُوْنَ ذِرَاعًا وَاِنَّ ضِرْسَهٗ مِثْلُ اُحُدٍ** ۔ احمد بن حنبل' مسند۔

اخرجه احمد فی المسند ۲/۲٦۔

ترجمه: ''حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما نبی اکرم ﷺ سے روایت نقل فرماتے ہیں کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''دوزخ والے دوزخ میں بہت بڑے ہو جائیں (جس سے ان کو عذاب بھی زیادہ معلوم ہوگا) یہاں تک کہ ایک جہنمی کے کان کی لو سے اس کی گردن تک کا فاصلہ سات سو برس کی مسافت کے بقدر ہوگا اس کی کھال کی موٹائی ستر گز کی ہوگی اور اس کی ایک داڑھ احد پہاڑ کے برابر ہوگی''۔

تشریح: حتی ان: ہمزہ کے کسرہ اور فتحہ کے ساتھ۔

ذراعا: اس کا عطف ''حتی'' کے مدخول پر ہے۔ یا سابقہ جملہ پر ہے۔

وان ضرسه مثل أحد: اس کا عطف بھی ماقبل پر ہے۔

۵۶۹۱ : **وَعَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ الْحَارِثِ بْنِ جَزْءٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ فِي النَّارِ حَيَّاتٍ كَاَمْثَالِ الْبُخْتِ تَلْسَعُ اِحْدٰهُنَّ اللَّسْعَةَ فَيَجِدُ حَمْوَتَهَا اَرْبَعِيْنَ خَرِيْفًا وَاِنَّ فِي النَّارِ عَقَارِبَ كَاَمْثَالِ الْبِغَالِ الْمُوْكَفَةِ تَلْسَعُ اِحْدٰهُنَّ اللَّسْعَةَ فَيَجِدُ حَمْوَتَهَا اَرْبَعِيْنَ خَرِيْفًا.** (رواهما احمد)

اخرجه احمد فی المسند ٤/۱۹۱۔

ترجمه: ''حضرت عبداللہ بن حارث بن جزء رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''جہنم کے اندر میں بختی اونٹ کے برابر (بہت بڑے بڑے) سانپ ہیں ان میں سے کوئی ایک سانپ اگر کسی کو ایک بار ڈس لے تو وہ

شخص چالیس برس تک اس کی زہریلی اذیت میں مبتلا رہے گا اس طرح جہنم کے اندر میں جو بچھو ہیں وہ پالان بندھے خچروں کے برابر (بڑے بڑے) ہیں اور ان میں سے کوئی بچھو اگر ایک بار کسی کو ڈنگ مادے تو وہ اس کی زہریلی درد کی اذیت میں چالیس سال تک مبتلا رہے گا"۔ ان دونوں روایتوں کو احمد نے نقل کیا ہے۔

تشریح: قوله: ان فی النار حیات ......:

البخت: بائے موحدہ کے ضمہ، خاء کے سکون کے ساتھ، اس کا مفرد "بختی" ہے۔

صاحب قاموس فرماتے ہیں: "بخت": باء کے ضمہ کے ساتھ، خراسانی اونٹ کو کہتے ہیں۔

حموتها: حاء کے فتحہ اور میم کے سکون کے ساتھ زہر کا اثر

المؤكفة: ہمزہ یا واؤ دونوں طرح صحیح ہے اور کاف کے فتحہ کے ساتھ اکفت الحمار وأوكفته بمعنی "شددت عليه الأكاف" سے ماخوذ ہے۔

۵۶۹۲ : وَعَنِ الْحَسَنِ قَالَ حَدَّثَنَا اَبُو هُرَيْرَةَ عَنْ رَّسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ الشَّمْسُ وَالْقَمَرُ ثَوْرَانِ مُكَوَّرَانِ فِي النَّارِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ فَقَالَ الْحَسَنُ وَمَا ذَنْبُهُمَا فَقَالَ اُحَدِّثُكَ عَنْ رَّسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَسَكَتَ الْحَسَنُ ۔ (رواه البيهقي في كتاب البعث والنشور)

اخرجه ابن ماجه ١٤٣٦/٢ حديث رقم ٤٢٩٨، واحمد في المسند ٣٤٩/٢۔

ترجمہ: "حضرت حسن بصریؒ نے بیان فرمایا کہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے ہمیں رسول اللہ سے نقل کر کے یہ حدیث بیان کی کہ (آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا:) روز قیامت آفتاب و ماہتاب کو پنیر کے دو ٹکڑوں کی طرح لپیٹ کر (دوزخ کی) آگ میں ڈال دیا جائے گا حضرت حسنؒ کہتے ہیں کہ (میں نے یہ حدیث سن کر حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے سوال کیا کہ) آخر آفتاب و ماہتاب کا کیا گناہ ہے (کہ ان کو آگ کے سپرد کر دیا جائے گا۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے جواب دیا کہ میں نے جو کچھ بیان کیا ہے وہ رسول اللہ ﷺ سے حدیث نقل کی ہے۔ حضرت حسنؒ یہ سن کر خاموش ہو گئے۔ اس روایت کو بیہقیؒ نے کتاب البعث والنشور میں نقل کیا ہے۔

تشریح: ثوران: ثائے مثلثہ کے فتحہ کے ساتھ، اصل میں "كثورين" تھا۔ یہ تشبیہ بلیغ ہے جیسا کہ عرب کا قول یہ ہے: زيد اسد. (زید شیر ہے)

مكوران: واؤ مفتوحہ مشددہ کے ساتھ۔

تاکہ دوزخ کی آگ میں ان دونوں کی حرارت وتمازت بھی شامل ہو جائے (اور دوزخیوں پر عذاب کی شدت اور بڑھ جائے)۔ جیسا کہ امام دیلمیؒ نے مسند فردوس میں حضرت عمرؓ سے بطریق نقل کیا ہے:

الشمس والقمر وجوههما الى العرش وقفاهما في الدنيا.

"سورج اور چاند کا رخ عرش کی طرف ہے اور ان کی پشت دنیا کی طرف ہے۔"

اس میں تنبیہ ہے کہ اگر ان دونوں کا رُخ دنیا کی طرف ہوتا، تو دنیا والوں میں ان کی حرارت وتمازت برداشت کرنے کی طاقت

نہیں تھی۔

ابن الملکؒ فرماتے ہیں کہ دونوں کو لپیٹ کر ایک ساتھ جہنم میں ڈال دیا جائے گا۔ گویا کہ یہ "کور العمامة" سے مأخوذ ہے۔ اسی قبیل سے اللہ جل شانہ کا یہ فرمان ہے: ﴿یکور اللیل علی النهار ویکون النهار علی اللیل﴾ [الزمر: ۵]
''وہ رات (کی ظلمت) کو دن (کی روشنی کے محل یقینی ہوا) پر لپیٹا ہے اور دن (کی روشنی) کو رات پر لپیٹا تا ہے''

صاحب النہایہ فرماتے ہیں: اسی سے حضرت ابو ہریرہؓ کی یہ حدیث ہے:

یجاء بالشمس والقمر ثورین مکورین فی النار

اور روایت میں '' ثوران'' ثائے مثلثہ کے ساتھ ہے۔ گویا کہ دونوں مسخ کر دیئے جائیں گے۔ (لفظ ثوران) نون کے ساتھ بھی روایت کیا گیا ہے جو تصحیف ہے۔ اور بہت ہی عجیب بات ہے کہ شیخ جزریؒ اور سیدؒ کے نسخوں میں نون ہے اور ھامش میں ثائے مثلثہ کے ساتھ مذکور ہے۔ ثائے مثلثہ کی ایک مؤید روایت امام سیوطیؒ نے ''البدور'' میں حضرت انسؓ اور کعب احبار سے بھی نقل کی ہے جس میں ''ثوران عقیران'' کے الفاظ ہیں۔ فقال: کی ضمیر ابو ہریرہؓ کی طرف راجع ہے۔

امام طیبیؒ فرماتے ہیں: حضرت ابو ہریرہؓ نے اپنے مذکورہ جواب کے ذریعے گویا حضرت حسن بصریؒ کو متنبہ کیا کہ تم قیاس کو صریح نص کے مقابل لا رہے ہو، اور یہ سمجھ رہے ہو کہ دخول جہنم کا اصل موجب عمل ہے حالانکہ اصل چیز اللہ کی مشیت ہے، کہ وہ جو چاہے کرے اور جو ارادہ کرے حکم صادر کر دے۔

میں کہتا ہوں: حضرت حسن بصریؒ کے سوال کا مقصد یہ تھا کہ حضرت ابو ہریرہؓ وہ حکمت بھی بیان کر دیں، جو سورج اور چاند کو دوزخ کی آگ کے سپرد کیے جانے کے پیچھے کارفرما ہے، حالانکہ یہ دونوں اللہ جل شانہ کے حکم کے مطیع وفرمان بردار ہیں، اور جہنم جو کہ "دار البوار" ہے، وہ تو کفار وفجار کیلئے ہے۔ اور حضرت ابو ہریرہؓ کے جواب کا مطلب یہ ہوا کہ میں نے آنحضرت ﷺ سے جو کچھ سنا اس کو تمہارے سامنے بیان کر دیا، اس سے زیادہ مجھے بھی کچھ معلوم نہیں۔

فسکت الحسن: معلوم ہوا کہ حضرت حسن کا سوال حسن تھا، اور حضرت ابو ہریرہؓ کا جواب بھی مستحسن تھا۔

اس کا ایک جواب یہ ہے کہ دخول نار معذب بالنار ہونے کو لازم نہیں، جیسا کہ ملائکہ جہنم۔ (کہ وہ جہنم میں تو نہیں لیکن معذب بالنار نہیں ہیں)

چنانچہ بعض علماء فرماتے ہیں کہ سورج اور چاند کو دوزخ میں اس لئے ڈالا جائے گا، تا کہ مشرکین شرمندہ ہوں، کہ جن چیزوں کی وہ پرستش کیا کرتے تھے، خدا مانتے تھے، اب دیکھو ان کا کیا حال ہے۔

قرطبیؒ فرماتے ہیں کہ حضرت ابن عباسؓ نے کعب احبار کے اس قول کی تکذیب کی ہے، اور فرمایا:

"هذه یهودیة یرید ادخالها فی الاسلام، واللہ تعالیٰ أکرم من أن یعذبهما، وهما دائبان فی طاعته".

اس کے بعد آنحضرت ﷺ کی یہ حدیث بیان کی:

انهما یعود ان الی ما خلقا منه، وهو نور العرش، فیختلطان.

اس کا حاصل یہ ہے کہ یہ دونوں نور بن جائیں گے۔ اور نور کو نار کے ذریعے عذاب نہیں دیا جائے گا۔ اور اس وجہ سے جہنم مؤمن

سے کہے گی: جز یا مؤمن فان نورك أطفأ لهبي.

لہٰذا اتا ٔل سے معلوم ہوگا کہ ابن عباس کے قول اور کعب اخبار کے قول میں کوئی منافات نہیں۔ مزید یہ کہ یہ حدیث بھی ثابت نہیں۔ امام سیوطیؒ البدور میں فرماتے ہیں: اس حدیث کو ابو الشیخ نے "العظمة" میں ابو عصمہ نوح بن ابی مریم، عن مقاتل، اور ابن حبان نے عن عکرمہ عن ابن عباس نقل کیا ہے۔ اور ابو عصمہ کذاب ووضاع ہے۔

الجامع الصغیر میں ہے: الشمس والقمر مكوران يوم القيامة.

اس حدیث کو امام بخاریؒ نے حضرت ابو ہریرہؓ سے نقل کیا ہے۔

ابن مردویہ حضرت انسؓ سے مرفوعاً نقل کرتے ہیں:

الشمس والقمر ثوران عقيران في النار، ان شاء أخرجهما وان شاء تركهما.

بعض کا کہنا ہے کہ "عقيران" کا مطلب ہے: اپاہج، یعنی یہ دونوں چلتے نہیں ہیں۔

۵۶۹۳ : وَعَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا يَدْخُلُ النَّارَ اِلَّا شَقِيٌّ قِيْلَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ وَمَنِ الشَّقِيُّ قَالَ مَنْ لَّمْ يَعْمَلْ لِلّٰهِ بِطَاعَةٍ وَلَمْ يَتْرُكْ لَهُ بِمَعْصِيَةٍ. (رواه ابن ماجة)

اخرجه البخاری ۵۹۵/۸ حديث رقم ۴۸۵۰، ومسلم ۲۱۸۶/۴ حديث رقم (۳۶-۲۸۴۶)، واخرجه الترمذی ۵۹۸/۴ حديث رقم ۲۵۶۱، واحمد فی المسند ۳۱۴/۲۔

ترجمہ: "حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: "دوزخ میں وہی آدمی داخل ہوگا جو بدبخت ہے" سوال کیا گیا کہ یا رسول اللہ! بدبخت کون ہے؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا: شقی وہ ہے جو نہ تو خدا تعالیٰ کی رضا جوئی کی خاطر (فرض واجب) عبادات وطاعات کو بجالائے اور نہ خدا تعالیٰ کی رضا کے حصول کے لئے (یعنی اس کے خوف سے) گناہ ومعصیت سے پرہیز کرے"۔ (ابن ماجہ)

تشریح: لم يعمل الله: یعنی اللہ تعالیٰ کی خوشنودی ورضا کی خاطر اعمال نہیں بجالاتا، یا یہ کہ اللہ تعالیٰ کا حکم نہیں بجالاتا۔ یہ حکم عام ہے یعنی اس سے مراد کافر بھی ہے اور فاجر بھی ہے۔ چنانچہ اللہ جل شانہ کے اس فرمان: لا يصلاها الا الأشقى الذي كذب وتولى میں جس دخول کا ذکر ہے وہ خلود پر محمول ہے۔

امام طیبیؒ فرماتے ہیں کہ "باء" دونوں جگہ زائدہ ہے، اور مرۃ کا وزن اور تنکیر برائے تقلیل ہے۔ باء کی زیادتی برائے تاکید ہے جو جانب رحمت کی ترجیح پر دال ہے۔ اور یہ کہ اگر کسی نے اللہ کی تھوڑی سی طاعت بھی کی ہوگی، تو اجر ضرور ملے گا۔ اور اسی طرح اگر اللہ کے خوف سے یا اللہ کیلئے کسی بھی معصیت کو ترک کیا ہوگا، اللہ اس کے اجر کو ضائع نہیں کرے گا، جیسا کہ اللہ جل شانہ کا فرمان ہے:

﴿وَاَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ وَنَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوٰى فَاِنَّ الْجَنَّةَ هِيَ الْمَاْوٰى﴾ [النازعات: ۴۰-۴۱]

"اور جو اپنے پروردگار کے سامنے کھڑے ہونے سے ڈرتا اور دل کو خواہشوں سے روکتا رہا اس کا ٹھکانا بہشت ہے۔"

بَابُ خَلْقِ الْجَنَّةِ وَالنَّارِ

جنت اور دوزخ کی تخلیق کا بیان

اس باب میں وہ احادیث ذکر کی جائیں گی جن سے ثابت ہوتا ہے کہ جنت اور جہنم دونوں کی تخلیق ہو چکی ہے اور وہ دونوں موجود ہیں۔ جیسا کہ اہلسنّت والجماعت کا مسلک ہے۔ اس باب میں وہ احادیث بھی شامل ہیں جن میں ان دونوں سے متعلق بعض خصوصیات کا ذکر ہے، اور یہ بیان ہے کہ جنت کس کیلئے پیدا کی گئی ہے، اور دوزخ کس کیلئے پیدا کی گئی ہے۔

۵۶۹۴ : عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ تَحَاجَتِ الْجَنَّةُ وَالنَّارُ فَقَالَتِ النَّارُ اُوْثِرْتُ بِالْمُتَكَبِّرِيْنَ وَالْمُتَجَبِّرِيْنَ وَقَالَتِ الْجَنَّةُ فَمَالِي لَايَدْخُلُنِيْ اِلَّا ضُعَفَاءُ النَّاسِ وَسَقَطُهُمْ وَغِرَّتُهُمْ قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰى لِلْجَنَّةِ اِنَّمَا اَنْتِ رَحْمَتِيْ اَرْحَمُ بِكِ مَنْ اَشَاءُ مِنْ عِبَادِيْ وَقَالَ لِلنَّارِ اِنَّمَا اَنْتَ عَذَابِيْ اُعَذِّبُ بِكِ مَنْ اَشَاءُ مِنْ عِبَادِيْ وَلِكُلِّ وَاحِدَةٍ مِّنْكُمَا مِلْؤُهَا فَاَمَّا النَّارُ فَلَا تَمْتَلِئُ حَتّٰى يَضَعَ اللّٰهُ رِجْلَهٗ تَقُوْلُ قَطْ قَطْ قَطْ فَهُنَا لِكَ تَمْتَلِئُ وَيَزْوِیْ بَعْضُهَا اِلٰى بَعْضٍ فَلَا يَظْلِمُ اللّٰهُ مِنْ خَلْقِهٖ اَحَدًا وَاَمَّا لْجَنَّةُ فَاِنَّ اللّٰهَ يُنْشِئُ لَهَا خَلْقًا (متفق عليه)

اخرجه البخاری ۵۹۵/۸ حدیث رقم ۴۸۵۰، ومسلم ۲۱۸۶/۴ حدیث رقم (۳۶-۲۸۴۶)، واخرجه الترمذی ۵۹۸/۴ حدیث رقم ۲۵۶۱، واحمد فی المسند ۳۱۴/۲۔

ترجمہ: ''حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: جنت و دوزخ نے باہم مناظرہ کیا چنانچہ دوزخ کہنے لگی کہ مجھے غرور کرنے والوں اور سرکش ظالم لوگوں کے لئے خاص کیا گیا ہے اور جنت کہنے لگی میرا خیال یہ ہے کہ مجھ میں کمزور وناتواں کم مرتبہ دنیا سے کنارہ کش لوگ داخل ہوں گے جو لوگوں کی نظروں میں گرے ہوئے ہیں اور جو بھولے بھالے اور فریب میں آ جانے والے ہیں۔ (یہ سن کر) اللہ تعالیٰ نے جنت سے فرمایا: ''تو اظہار رحمت کا ذریعہ ہے اور میرے کرم کی آماجگاہ ہے' میں اپنے بندوں سے جس کو اپنی رحمت سے نوازنا چاہتا ہوں ان پر تیرے ذریعہ ہی رحمت وعنایت فرماتا ہوں'' اور دوزخ سے فرمایا: ''تو میرے عذاب کا محل ومظہر ہے میں اپنے بندوں میں سے جس کو عذاب دینا چاہتا ہوں میں ان پر تیرے ذریعہ ہی اپنا عذاب وغضب مسلط کرتا ہوں اور میں تم دونوں ہی کو لوگوں سے بھر دوں گا البتہ جہنم کا حال تو یہ ہوگا کہ وہ اس وقت تک نہیں بھرے گی جب تک کہ اس پر حق تعالیٰ اپنا قدم اس پر نہ رکھیں گے چنانچہ

جب اللہ تعالیٰ اپنا پاؤں رکھ دے گا تو دوزخ چیخ اٹھے گی کہ بس' بس' بس اس وقت دوزخ (اللہ تعالیٰ کی قدرت سے بھر جائے گی اور اس کے حصوں کو ایک دوسرے کے قریب کر دیا جائے گا (پس وہ سمٹ جائے گی) مطلب یہ کہ اللہ تعالیٰ اپنی مخلوق میں سے کسی سے ناانصافی نہ کرے گا جنت کا معاملہ تو (اس کے بھرنے کے لئے) اللہ تعالیٰ نئے لوگ پیدا کر دے گا"۔ (بخاری ومسلم)

تشریح: قوله: تحاجت الجنة و النار۔۔۔مقطهم وغرتهم:

تحاجت: جیم کی تشدید کے ساتھ ہے۔

ان دونوں کا یہ مکالمہ بزبان حال ہوا یا بزبان قال ہوا دونوں احتمال ہیں۔ امام طیبیؒ فرماتے ہیں: اس حدیث میں جس محاجہ کا ذکر ہے یہ حقیقۃً ہوا ہے۔ چونکہ اللہ تعالیٰ اس بات پر قادر ہے کہ ان کو قوت تمیز وخطاب عطا فرمادے یا تمثیل پر محمول ہے۔

میں کہتا ہوں: پہلی بات ہی قابل اعتماد ہے۔ چونکہ اہل السنۃ والجماعۃ کا مذہب ہے: أن لله علما في الجمادات وسائر الحيوانات سوى لح قلاء لا يقف عليها غيره، فلها صلاة وتسبيح وخشية. لہٰذا ضروری ہے کہ آدمی اس پر ایمان لائے اور اس کا علم اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے سپرد کر دے۔ انتھی، اس پر بہت سے دلائل شاہد ہیں۔ یہ ان دلائل کے ذکر کا محل نہیں ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

أوثرت: صیغہ مجہول کے ساتھ، "ایثار" سے مشتق ہے۔ بمعنی اخترت.

بالمتكبرين: یعنی جو قبول حق میں تکبر کرتے ہیں۔

المتجبرين: یعنی جو لوگوں پر ظلم ڈھاتے ہیں۔

بعض کا کہنا ہے کہ یہ دونوں ہم معنی ہیں۔ البتہ دونوں کو یکجا ذکر کرنا برائے تاکید ہے۔ بعض کا کہنا ہے کہ متکبر وہ شخص ہے، جو ایسی چیز پر برائی جتلائے جو اس میں موجود نہ ہو۔ اور متجبر اس شخص کو کہتے ہیں، جس تک رسائی نہ ہوتی ہو۔ اور بعض کا کہنا ہے کہ متجبر وہ شخص ہے جو ضعفاء ومساکین کی بالکل پروانہ کرتا ہو۔

"نما": "(ما" بمعنی" أي شيء" ہے اور جار مجرور کا متعلق محذوف ہے،) أي: فاي شيء وقع لي.

ضعفاء الناس: یعنی جانی اور مالی طور پر کمزور لوگ۔

سقطهم: سین اور قاف دونوں کے فتحہ کے ساتھ،

یا حصر باعتبار اغلب کے ہے۔

وغرتهم: غین معجمہ کے کسرہ اور راء کی تشدید کے ساتھ،

ابن حجرؒ فرماتے ہیں: اکثر حضرات نے اس کو غین معجمہ کے فتحہ، راء، اور ثائے مثلثہ کے ساتھ نقل کیا ہے بمعنی أهل الحاجة، غوث بمعنی "جوع" سے ماخوذ ہے، یہ لفظ غین معجمہ کے کسرہ، رائے مشددہ اور تائے مثناۃ فوقیہ کے ساتھ بھی روایت کیا گیا ہے۔ بمعنی البله و الغافلون. مسلم شریف کے اکثر نسخوں میں یہ لفظ موجود ہے۔ اور دوسرے حضرات نے اس کو عین مہملہ، جیم، زائے مفتوحہ، اور تائے مثناۃ کے ساتھ ذکر کیا ہے۔ یعنی" عجزة" یہ عاجز کی جمع ہے، نیز عین اور جیم کے ضمہ کے ساتھ

عُجُز بھی روایت کیا گیا ہے، یہ بھی ''عاجز'' کی جمع ہے۔

قوله: قال الله تعالىٰ لجنة ۔۔ ارحم بك من أسماء من عبادي:

خطاب میں پہلے جنت کو مخاطب فرمایا' کیونکہ حدیث قدسی ہے: ''سبقت رحمتي غضبي'' (میری رحمت میرے غضب پر غالب ہے۔)

اس کلام میں جنت کی دلجوئی ہے، بایں طور کہ جنت کو اس بات کا دھچکا تھا کہ میں صرف ضعیف و مسکین لوگوں کے لئے رہ گئی ہوں۔ اس مکالمہ میں جہنم کی گفتگو جنت کی گفتگو سے وزنی تھی۔

انما انت رحمتي: یعنی تو میری رحمت کا مظہر ہے۔

شرح السنہ میں فرماتے ہیں، جنت کو ''رحمتی'' کہنے کی وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی رحمت کا اظہار اس کے ذریعے کرے گا۔ جیسا کہ فرمایا: **أرحم بك من أشاء من عبادي**

وگرنہ تو حقیقت یہ ہے کہ رحمت اللہ تعالیٰ کی صفاتِ اُزلیہ میں سے ہے۔ اللہ تعالیٰ کی کوئی بھی صفت حادث نہیں، اور نہ اللہ تعالیٰ کا کوئی نام حادث ہے۔ اللہ تعالیٰ کی ذات قدیم، اس کے تمام اسماء قدیم اور اس کی تمام صفات بھی قدیم ہیں۔

معالم میں لکھتے ہیں: **الرحمة ارادة الله الخير لأهله. وقيل: ترك عقوبة من يستحقها واسداء الخير الى من لا يستحق**، پہلے قول کے مطابق رحمت، صفتِ ذات ہے، اور دوسرے قول کے مطابق (باری تعالیٰ کے) فعل کی صفت ہے۔

قوله: وقال للنار ۔۔۔ من عذابي:

یعنی میں اپنے بندوں میں سے جس کو عذاب دینا چاہوں گا، اس کیلئے تجھے ہی ذریعہ بناؤں گا، اور میری ناراضگی و غضب کا اظہار کا منشا بھی تو ہی ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ جنت و جہنم، مؤمن و کافر، اللہ تعالیٰ کے وصف جمال و جلال کا کامل مظہر ہیں۔ عمومی حالات میں کسی کو خصوص حاصل نہیں ہے۔ اور یہ بات تو معلوم ہی ہے، کہ ان میں سے ایک از بابِ عدل اور دوسری از بابِ فضل ہے۔

قوله: لكل واحدة منكما ملؤها ۔۔۔ من خلقها احدا:

کیونکہ ان دونوں کا کمال ان کے مکمل طور پر بھرنے میں ہے۔

فأما النار فلا تمتلي: اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿يوم نقول لجهنم هل امتلأت وتقول هل من مزيد﴾ [ق۔۳۰]

''جس دن کہ ہم دوزخ سے کہیں گے تو پھر بھی گئی اور وہ کہے گی کہ کچھ اور بھی ہے''

حتى يضع الله: یعنی اللہ تعالیٰ اس جہنم کے اوپر یا جہنم کے اندر پاؤں نہ رکھے۔

رجله: اگلی روایت میں ''قدمه'' ہے۔ سلف کا مذہب تسلیم و تفویض مع التنزیہ ہے۔ اور خلف میں سے اُرباب تاویل کا مذہب یہ ہے کہ قدم سے مراد اس کی مخلوق میں سے کسی کا پیر ہے اور اس سے یہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿ان لهم قدم صدق عند ربهم﴾ [یونس۔۲] مشکوۃ کی روایت میں لفظ ''فیها'' ہے ہاں ''فی'' کبھی ''علی'' کے معنی میں بھی آتا ہے' جیسا کہ قرآن مجید میں ہے: ﴿ولأصلبتكم في جذوع النحل﴾ [طہ۔۷۱] اور ایک قول یہ ہے کہ اس سے مراد ''تسکین فور'' ہے

۔جیسا کہ کسی امر کا ابطال مقصود ہوتا ہے تو کہا جاتا ہے: وضعته تحت قدمي ۔(ذکرہ فی النهاية)
شرح السنہ میں لکھا ہے کہ اس حدیث میں مذکور قدم ورجل اللہ تعالیٰ کی صفات میں سے ہیں' اللہ تعالیٰ تکییف وتشبیہ سے منزہ ہے۔ اور اسی طرح کتاب وسنت میں اس قبیل کے جو امور مذکور ہیں مثلاً ہاتھ انگلیاں آنکھ' آنا' نزول پس اس پر ایمان لانا فرض ہے' اور اس میں غور خوض کرنے سے رکنا واجب ہے۔اور ہدایت یافتہ وہی ہے جو راہ تسلیم پر گامزن ہو' اور اس میں غور وخوض کرنے والا زائغ ہے' اور انکار کرنے والا ''معطل'' ہے اور کیفیت بیان کرنے والا ''مشبہ'' ہے اللہ تعالیٰ ظالموں کی باتوں سے بہت بالا واعلیٰ ہے۔کوئی اس کے مثل نہیں وہ سننے والا اور دیکھنے والا ہے۔(انتھی) یہ تحقیق امام مالک کے مذہب کے موافق ہے۔

اور ہمارے امام اعظم کا طریق یہی ہے جیسا کہ امام صاحبؒ نے ''الفقہ الاکبر'' میں اس طرف اشارہ فرمایا ہے۔پس تسلیم اسلم ہے۔واللہ تعالیٰ اعلم۔

تقول: کی ضمیر کا مرجع ''النار'' ہے۔جملہ مستانفہ بیانیہ ہے یا حالیہ ہے۔وگرنہ تو بظاہر یوں کہنا چاہئے تھا: فتقول

قط: قاف کے فتحہ اور طاء کے سکون کے ساتھ، اور ایک نسخہ میں اس کے کسرہ اور تنوین کے ساتھ ہے۔ایک اور نسخہ میں بغیر تنوین کے ہے۔تصحیح شدہ نسخوں میں یہ لفظ تین مرتبہ ہے۔اور شارح کے قول کا مفہوم مخالف یہ ہے کہ یہ لفظ دو مرتبہ ہے، ملاحظہ ہوں شارح کے الفاظ: أي: بسكون الطاء، أي: كفي كفي، ایک احتمال یہ بھی ہے کہ طاء پر کسرہ ہو، أي: حسبي حسبي.

امام نوویؒ فرماتے ہیں: اس میں تین لغات ہیں:

(۱) دونوں میں اسکان طاء، (۲) طاء کے کسرہ اور تنوین کے ساتھ۔(۳) طاء کے کسرہ کے ساتھ بغیر تنوین کے۔

قاموس میں لکھتے ہیں: '' قط '' جب'' حسب '' کے معنی میں ہو تو صرف '' مَنْ '' کی طرح ہے، اور ''قط'' (جب اپنے خاص معنی میں ہو تو) منون ومجرور ہوگا، ان دو پر اقتصار کرنا اس بات کی طرف اشارہ ہے، کہ کسرہ بغیر تنوین کے ضعیف ہے۔

تمتلي: ضمیر النار کی طرف راجع ہے۔پس اس وقت دوزخ، اللہ تعالیٰ کی قدرت سے بھر جائے گی۔

يزوى: مجہول کے صیغہ کے ساتھ، بمعنی يضم ويجمع.

بعضها الى بعض: کیونکہ انتہائی بھر چکی ہوگی۔

قوله: فلا يظلم الله من خلقه أحدا: مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی مخلوقات میں سے کسی ایک پر بھی کبھی بھی ظلم نہیں کرے گا۔اور دوزخ کا پیٹ بھرنے کیلئے کوئی ایسا فیصلہ بھی نہیں کرے گا، جس کو صورتاً ظلم سے تعبیر کیا جا سکتا ہو۔ورنہ اصل بات یہ ہے کہ اگر پروردگار بے گناہ لوگوں ہی کو دوزخ میں ڈال کر اس کا پیٹ بھرے تو حقیقت میں اس کو ظلم نہیں کہیں گے کیونکہ اپنی ملکیت میں کسی بھی تصرف کو ظلم قرار نہیں دیا جا سکتا، مگر اللہ تعالیٰ صورۃً بھی ظلم نہیں کرے گا۔

قوله: واما الجنة فان الله تعالىٰ ينشئ لها خلقا:

یعنی اللہ تعالیٰ جنت کو بھرنے کیلئے اپنے پاس سے نئے لوگ پیدا کرے گا۔اور پھر ان لوگوں کو اس میں داخل کرے گا جنہوں نے نیک عمل نہیں کیا ہوگا' کبھی بھی کوئی یہ اللہ تعالیٰ کا فضل ہے جیسا کہ اگر وہ جہنم کو بھرنے کیلئے مزید مخلوق پیدا کرے تو وہ عدل ہی

ہے۔واللہ تعالیٰ اعلم۔

۵۶۹۵ : وَعَنْ اَنَسٍ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ لَا تَزَالُ جَهَنَّمُ يُلْقٰى فِيْهَا وَتَقُوْلُ هَلْ مِنْ مَّزِيْدٍ حَتّٰى يَضَعُ رَبُّ الْعِزَّةِ فِيْهَا قَدَمَهٗ فَيُزْوِى بَعْضُهَآ اِلٰى بَعْضٍ فَتَقُوْلُ قَطُّ قَطُّ بِعِزَّتِكَ وَكَرَمِكَ وَلَا يَزَالُ فِي الْجَنَّةِ فَضْلٌ حَتّٰى يُنْشِئَ اللّٰهُ لَهَا خَلْقًا فَيُسْكِنُهُمْ فَضْلَ الْجَنَّةِ (متفق عليه وذكر حديث انس) حُفَّتِ الْجَنَّةُ بِالْمَكَارِهِ فِي كِتَابِ الرِّقَاقِ۔

اخرجه البخاری ۵۹٤/۸ حدیث رقم ٤٨٤٨، ومسلم ۲۱۸۷/٤ حدیث رقم (۳۷-۲۸٤۸) واخرجه الدارمی فی السنن ٤۳۷/۲ حدیث رقم ۲۸٤۳، واحمد فی المسند ۱۳/۳۔

ترجمہ: ''حضرت انس رضی اللہ عنہ نبی اقدس ﷺ سے روایت نقل فرماتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''دوزخ میں مسلسل (لوگوں) کو ڈالا جاتا رہے گا اور وہ کہتی رہے گی کہ کچھ اور بھی ہے؟ آخر کار تمام عزتوں کا مالک خدا وبرتر اس پر اپنا پاؤں رکھ دے گا اور جہنم کے حصے ایک دوسرے میں مل جائیں گے (جس سے دوزخ سمٹ جائے گی) تب وہ پکارے گی بس بس تیری عزت اور تیرے کرم کی قسم میں بھر گئی' اسی طرح جنت کے اندر وسعت وزیادتی ہی رہے گی (یعنی جنتیوں کے جنت میں پہنچ جانے کے باوجود اس کا بہت سا حصہ خالی ہوگا) یہاں تک کہ رب العزت جنت (کے ان خالی محلات مکانات کو پُر کرنے) کے لئے نئی مخلوق پیدا کر دے گا جن کو ان خالی جگہوں میں سکونت دے گا''۔ (بخاری ومسلم)
اور حضرت انس رضی اللہ عنہ کی روایت کتاب الرقاق میں نقل کی جا چکی ہے۔

تشریح: قوله:حتی یضع رب العزة فیها قدمه:
اس مضمون سے متعلقہ کلام ماقبل میں گزر چکا ہے۔

قوله:فتقول قطقط بعزتك و كرمتك:قط: لفظ''قط'' دومرتبہ ہے،تثنیہ سے کثرت مراد ہے،یا انحصار عدد ہے۔

کرمك: ''کرم'' کے معنی ہیں عطاء میں زیادت۔

ولایزال فی الجنة فضل ..... :

یسکنهم: ''اسکان'' سے مشتق ہے۔

امام نوویؒ فرماتے ہیں: حدیث مبارکہ کا یہ جملہ:''وأما الجنة فان الله ینشیء لها خلقا'' اہل السنہ والجماعۃ کے اس مسئلہ کی دلیل ہے کہ ثواب،اعمال پر موقوف نہیں ہے۔کیونکہ اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ لوگ اس وقت پیدا کئے جائیں گے اور انہیں بغیر کوئی عمل کئے جنت عطا کر دی جائے گی۔

امام طیبیؒ فرماتے ہیں: معتزلہ یہ کہہ سکتے ہیں کہ بے گناہ لوگوں سے ظلم کی نفی اس بات کی دلیل ہے کہ اگر انہیں عذاب دیتا تو یہ ظلم ہوتا،اور ہمارا (یعنی اہل السنہ والجماعۃ کا) مذہب بھی بعینہ یہی ہے۔

جواب: اگر چہ ہمارا مذہب یہی ہے، اگر اللہ ان بے گناہ لوگوں کو عذاب دے تو ظلم نہ ہوگا، کیونکہ یہ تصرف غیر کی ملک میں نہیں۔لیکن اللہ تعالیٰ اپنے لطف وکرم کے باعث ایسا کرے گا نہیں۔قصہ مختصر یہ کہ نفی ظلم درحقیقت اثبات کرم ہے۔

قولہ: وذکر حدیث انس بالمکارہ فی کتاب الرقاق:

یہ مکمل حدیث یوں ہے: وحفت النار بالشھوات.

کیونکہ حضرت انسؓ کی اس حدیث کو اس باب میں ذکر کرنے کے مقابلے میں "کتاب الرقاق" میں ذکر کرنا زیادہ مناسب ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

الفصل الثانی:

۵۲۹۶ : عَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ لَمَّا خَلَقَ اللّٰهُ الْجَنَّةَ قَالَ لِجِبْرَئِيْلَ اذْهَبْ فَانْظُرْ اِلَيْهَا فَذَهَبَ فَنَظَرَ اِلَيْهَا وَاِلٰى مَااَعَدَّ اللّٰهُ لِاَهْلِهَا فِيْهَا ثُمَّ جَآءَ فَقَالَ اَىْ رَبِّ وَعِزَّتِكَ لَا يَسْمَعُ بِهَا اَحَدٌ اِلَّا دَخَلَهَا ثُمَّ حَفَّهَا بِالْمَكَارِهِ ثُمَّ قَالَ يَاجِبْرَئِيْلُ اذْهَبْ فَانْظُرْ اِلَيْهَا قَالَ فَذَهَبَ فَنَظَرَ اِلَيْهَا ثُمَّ جَآءَ فَقَالَ اَىْ رَبِّ وَعِزَّتِكَ لَقَدْ خَشِيْتُ اَنْ لَّا يَدْخُلَهَا اَحَدٌ قَالَ فَلَمَّا خَلَقَ اللّٰهُ النَّارَ قَالَ يَا جِبْرَئِيْلُ اِذْهَبْ فَانْظُرْ اِلَيْهَا قَالَ فَذَهَبَ فَنَظَرَ اِلَيْهَا ثُمَّ جَآءَ فَقَالَ اَىْ رَبِّ وَعِزَّتِكَ لَا يَسْمَعُ بِهَا اَحَدٌ فَيَدْخُلَهَا بِالشَّهَوَاتِ ثُمَّ قَالَ يَا جِبْرَئِيْلُ اذْهَبْ فَانْظُرْ اِلَيْهَا قَالَ فَذَهَبَ فَنَظَرَ اِلَيْهَا فَقَالَ اَىْ رَبِّ وَعِزَّتِكَ لَقَدْ خَشِيْتُ اَنْ لَّا يَبْقٰى اَحَدٌ اِلَّا دَخَلَهَا۔

(رواہ الترمذی وابوداود والنسائی)

اخرجہ ابو داؤد فی السنن ۱۰۸/۵ حدیث رقم ۴۷۴۴، واخرجہ الترمذی ۵۹۸/۴ حدیث رقم ۲۵۶۰، واخرجہ النسائی حدیث رقم ۶۷۶۳، واخرجہ احمد فی المسند ۳۳۲/۲۔

ترجمہ: "حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نبی اقدس ﷺ سے روایت نقل فرماتے ہیں کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: "اللہ تعالیٰ نے جب جنت کو پیدا فرمایا تو حضرت جبرئیل علیہ السلام سے فرمایا کہ ذرا جاؤ اور جنت کی طرف دیکھ کر آؤ (میں نے کتنی عمدہ اور کس قدر نازک اور دیدہ زیب چیز بنائی ہے) چنانچہ جبرئیل امین گئے اور جنت کو اور اس کی ان تمام اشیاء کو جو حق تعالیٰ نے اہل جنت کے لئے تیار کر رکھی ہیں دیکھا پھر واپس آ کر عرض کیا کہ پروردگار تیری عزت کی قسم (تو نے اتنی اعلیٰ اور نفیس جنت بنائی ہے اور اس کو ایسے ایسے سامان راحت سے معمور کیا ہے کہ) جو شخص بھی اس کے متعلق سنے گا وہ یقیناً اس میں داخل ہونے کی خواہش اور آرزو رکھے گا۔ تب اللہ تعالیٰ نے جنت کے چاروں طرف باڑ لگادی ایسی چیزوں کی جو نفس کو ناگوار ہیں پھر فرمایا کہ جبرئیل! جاؤ اور دوبارہ جنت کو دیکھ کر آؤ' چنانچہ وہ گئے اور جنت کو (اس اضافہ کے ساتھ جو چاروں طرف باڑ کی صورت میں دکھائی دے رہا تھا) دیکھ کر واپس آئے اور عرض کیا کہ پروردگار! تیری عزت کی قسم مجھے خطرہ ہے کہ اب تو شاید کوئی بھی اس میں داخل ہونے کی خواہش نہ کرے (کیونکہ اس کے گرد مکروہات نفس کا جو احاطہ قائم کر دیا گیا ہے اس کو عبور کرنے کے لئے خواہشات نفسانی کو کچلنا پڑے گا اور ظاہر ہے کہ انسان خواہشات نفس کو مار کر جنت تک پہنچنا دشوار سمجھے گا) آنحضرت ﷺ نے فرمایا: "اسی طرح جب خدا تعالیٰ نے جہنم کو پیدا کیا تو حکم دیا کہ جبرئیل! ذرا جاؤ جہنم

کو دیکھ کر آؤ (کہ میں نے کتنی ہولناک اور بری چیز بنائی ہے) حضور اقدس ﷺ نے ارشاد فرمایا: پس جبرئیل گئے اور دوزخ کو دیکھ کر واپس آئے تو عرض کیا کہ پروردگار! تیری عزت وجلال کی قسم جو کوئی بھی اس کے متعلق سنے گا وہ (ڈر کے مارے) اس میں جانے کی خواہش بالکل نہ رکھے گا' تب اللہ تعالیٰ نے دوزخ کے چاروں طرف خواہشات اور لذات دنیا کی باڑ بنا دی اور جبرئیل سے فرمایا کہ جبرئیل جاؤ اور جہنم کو پھر دیکھ کر آؤ۔ آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''چنانچہ حضرت جبرئیل علیہ السلام گئے اور دوزخ کو (اس احاطہ کے اضافہ کے ساتھ دیکھ کر واپس آئے اور کہنے لگے اے میرے پروردگار! تیری عزت وجلال کی قسم' مجھے خطرہ ہے کہ اب کوبھی باقی نہ رہے گا بلکہ اس میں داخل ہو جائے گا کیونکہ جو خواہشات نفس اور لذاتِ دنیا کا احاطہ دوزخ کے چاروں طرف دکھائی دے رہا وہ اس قدر دلفریب اور جہنم میں نہ جائے کہ نفس طبیعت کی پیروی کرنے والوں میں سے ایسا کوئی بھی نہیں ہوگا جو ان خواہشات ولذات کی طرف نہ لپکے اور اس کے نتیجہ میں جہنم میں نہ جائے''۔

تشریح: قوله: اذهب :ما نظر اليها ۔۔۔ الا دخلها:

فانظر اليها: نظر سے مراد ''نظر اعتبار'' ہے۔

'' **ما أعد الله لاهلها** سے مراد ہے'' کے مصداق کے عموم سے چیزیں جو اللہ تعالیٰ نے اپنے نیک بندوں کے لئے تیار رکھی ہیں جن کو کسی آنکھ نے دیکھا نہیں کسی کان نے سنا نہیں اور کسی انسان کے دل پر ان کا خیال تم نہ گزرا ہوگا۔

ثم جاء وقال: اى رب: یعنی پھر اسی جگہ آ کر، یا کسی خاص مقررہ جگہ یا عرش کے نیچے آ کر عرض کیا: اے ربّ! تیری عزت کی قسم جو کوئی بھی اس کے بارے میں سنے گا، وہ اس میں داخل ہونا پسند کرے گا الخ، اور أي: حرف نداء ہے، کہنے والوں نے کہا ہے:

فالأذن تعشق قبل العين أحيانا. (کبھی کبھی آنکھ سے پہلے کان بھی عاشق ہو جاتے ہیں)

قوله: ثم حفها بالمكاره۔۔۔ ان لايدخلها أحد:

بالمكاره: ''كره'' کی غیر قیاسی جمع ہے، جس کے معنی ہیں مکروہ۔

یہاں ''مکارہ'' سے مراد وہ شرعی امور ہیں جن کا انسان کو مکلف بنایا گیا ہے، کہ جن کی ادائیگی انسانوں پر شاق ہے۔ یہ حدیث اس بات پر دلالت کرتی ہے، کہ اس جہاں کی معنوی چیزیں، عالم آخرت میں حسی صورتیں رکھتی ہیں۔

ثم قاليا جبريل اذهب فابنظر اليها: یعنی جنت کو دوبارہ دیکھ کر آؤ کہ جنت کے چاروں طرف جن چیزوں کا احاطہ کیا گیا۔

قال: کی ضمیر نبی کریم علیہ الصلوۃ والسلام کی طرف راجع ہے۔ اکثر اصول میں ''قال'' موجود نہیں ہے۔ یہ حدیث ماقبل میں گزر چکی ہے۔

قال...... فيدخلها: تصحیح شدہ اکثر نسخوں میں یہ لفظ موجود نہیں ہے۔

یہ حدیث درحقیقت اس حدیث: ''**حفت الجنة بالمكاره وحفت النار بالشهوات**'' ''جنت کو ایسی چیزوں سے ڈھلینا گیا ہے جو نفس کو ناگوار ہیں اور دوزخ کو خواہشات سے ڈھانپا گیا ہے'' کی تفسیر ہے۔ اور اس کے ہم معنی وہ روایت ہے جسے

امام سیوطیؒ نے ''الجامع الکبیر'' میں ذکر کیا ہے: ان الله بنى مكة على المكروهات والدرجات.
بعض ارباب حال نے کیا خوب کہا ہے:

لو لا المشقة ساد الناس كلهم ☆ الجود يفقد والاقدم قتال

الفصل الثالث:

۵۶۹۷ : عَنْ اَنَسٍ اَنَّ رَسُولَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ صَلّٰى لَنَا يَوْمًا الصَّلٰوةَ ثُمَّ رَقِيَ الْمِنْبَرَ فَاَشَارَ بِيَدِهٖ قِبَلَ قِبْلَةِ الْمَسْجِدِ فَقَالَ قَدْ اُرِيْتُ الْاٰنَ مُذْ صَلَّيْتُ لَكُمُ الصَّلٰوةَ الْجَنَّةَ وَالنَّارَ مُمَثَّلَتَيْنِ فِيْ قِبَلِ هٰذِهِ الْجِدَارِ فَلَمْ اَرَ كَالْيَوْمِ فِي الْخَيْرِ وَالشَّرِّ (رواه البخاری)

اخرجه البخاری ۱/ ۵۱۵ حدیث رقم ۴۱۹۔

ترجمہ: ''حضرت انس رضی اللہ عنہ بیان فرماتے ہیں کہ پھر وہ منبر پر تشریف فرما ہوے۔ اور مسجد کے قبلہ کی جانب اپنے دست اقدس سے اشارہ کر کے فرمایا کہ ابھی جب میں نے تمہیں نماز پڑھائی تو مجھے اس دیوار کی جانب بہشت و جہنم کی تمثیلیں دکھائی گئیں' واقعہ یہ ہے کہ میں نے جتنی اچھی چیز اور جتنی بری چیز آج دیکھی ہے اس جیسی اچھی اور بری چیز پہلے کبھی نہیں دیکھی''۔ (بخاری)

تشریح: قوله: صلى لنا يوما ..... :

صلى لنا يوما الصلاة: لام عہد ذہنی کا ہے جو معنوی طور پر نکرہ کے حکم میں ہوتا ہے۔

رقی: قاف کے کسرہ کے ساتھ بمعنی صعد.

قبل: قاف کے کسرہ اور بائے موحدہ کے فتحہ کے ساتھ، بمعنی جانب وجہت۔

قد أريت: صیغہ مجہول کے ساتھ، اراءۃ سے ماخوذ ہے۔

مذصليت لكم الصلاة: یعنی جب میں نے تمہیں نماز پڑھائی، یا تمہیں نماز پڑھانے کے زمانہ سے لے کر میرے منبر پر چڑھنے تک۔

متمثلتين: ثائے مثلثہ کی تشدید کے ساتھ، بمعنی مصورتین، یہ تمثیلیں اجمالی تھیں، اور ہوسکتا ہے کہ وہ تفصیلی ہوں۔

قبل: قاف کے کسرہ اور باء کے فتحہ کے ساتھ، اور ایک نسخہ میں قاف اور باء دونوں کے ضمہ کے ساتھ، بمعنی المقابلة.
صاحب قاموس لکھتے ہیں: القبل، ضمہ کے ساتھ، اور قاف اور باء دونوں کے ضمہ کے ساتھ ''دبر'' کی نقیض ہے۔ رأيته قبلا، حرکت کے ساتھ اور دوہرے ضمہ کے ساتھ جیسے صرد 'عنب أى: عيانا ومقابلة.

کرمانیؒ فرماتے ہیں: اگر آپ یہ کہیں '' الآن '' حال پر دال ہے، اور '' أريت '' ماضی ہے، تو دونوں میں جمع کی کیا صورت ہوگی؟ فرمایا: یہ کبھی ماضی کو حال کیلئے ہے۔ کے قریب کرنے '' صليت ' کے بارے میں آپ کیا کہیں گے' یہ تو یقیناً ماضی کے لئے ہے، یہاں کیا توجیہ ہوگی؟ فرمایا، ہر خبر دینے والا' اور انشائیہ کلام کرنے والا زمانہ حاضر مراد لیتا ہے' اس کی مراد وہ لحظہ حاضرہ

نہیں ہوتا جو نا قابل تقسیم ہے' جس کو حال کہا جاتا ہے۔اھ۔اور مطلب یہ ہے کہ ''حال'' پر مقام پر تحصیل مرام میں مقام کے مناسب حال ہونا ہے۔

قوله:فلم أر کالیوم فی الخیر والشر:

''لم أر'' کا مفعول ''مرئیا'' محذوف ہے۔أی **لم أر مرئیا کمرئی الیوم فی الخیر ولا مرئیا کمرئی الیوم فی الشر**۔یعنی میں نے جتنی اچھی چیز اور جتنی بری چیز آج دیکھی ہے،اس جیسی اچھی اور بُری چیز پہلے کبھی نہیں دیکھی،چونکہ جنت،حور وقصور وغیرہ جیسی خیروں کو جامع ہے اور جہنم ویل وثبور جیسے شرور کو جامع ہے،چنانچہ امام طیبیؒ فرماتے ہیں:کاف موضع ''حال'' میں ہے اور ذوالحال مفعول ہے جو جنت وجہنم ہے۔اور مطلب یہ ہے: **لم أر الجنة والنار فی الخیر والشر یوما من الأیام مثل ما رأیت الیوم**.(میں نے ایام میں سے کسی بھی دن جنت اور جہنم کو خیر وشر میں اس طرح نہیں دیکھا جس طرح آج دیکھا ہے۔

اس حدیث کو امام مسلمؒ نے حضرت انسؓ سے روایت کیا ہے:

عرض علی الجنة والنار آنفا فی عرض هذا الحائط، فلم أر کالیوم فی الخیر والشر، ولو تعلمون ما اعلم لضحکتم قلیلا ولبکیتم کثیرا.''ابھی مجھ پر جنت وجہنم کو اس دیوار کے عرض پر پیش کیا گیا میں نے حتیٰ اچھی چیز اور جتنی بری چیز آج دیکھی ہے اس جیسی اچھی اور بری چیز پہلے کبھی نہیں دیکھی اور اگر تم وہ کچھ جان لو جو میں جانتا ہوں تو تم سے بہت کم اور روتے زیادہ''۔

بَابُ بَدْأَ الْخَلْقِ وَذِكْرِ الْاَنْبِيَاءِ

جنت اور دوزخ کی تخلیق کا بیان

البدء : بائے موحدہ مفتوح، اس کے بعد دال ساکن اور پھر ہمزہ ہے، بمعنی ''ابتداء''۔ مناسب یہ ہے کہ اس لفظ کو واؤ کے ساتھ نہ لکھا جائے تا کہ اس کا ضبط ''بُدُوْء'' ''بُدُو'' سے مشتبہ نہ ہو۔ چونکہ ان کے معنی ہیں ظہور، اس لفظ کی تحقیق میرے اس رسالے میں موجود ہے جو بخاری شریف کے پہلے باب ''کیف کان بدء الوحی الی رسول اللہ ﷺ'' پر تعلیقات پر مشتمل ہے۔ ہاں اگر یاء کے ساتھ لکھا جائے تو مناسب توجیہ ہو سکتی ہے۔

الفصل الاول:

۵۶۹۸ : عَنْ عِمْرَانَ بْنَ حُصَيْنٍ قَالَ اِنِّى كُنْتُ عِنْدَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذْجَاءَهُ قَوْمٌ مِّنْ بَنِىْ تَمِيْمٍ فَقَالَ اقْبَلُوْا الْبُشْرٰى يَا بَنِىْ تَمِيْمٍ قَالُوْا بَشَّرْتَنَا فَاعْطِنَا فَدَخَلَ نَاسٌ مِّنْ اَهْلِ الْيَمَنِ فَقَالَ اقْبَلُوْا الْبُشْرٰى يَآ اَهْلَ الْيَمَنِ اِذْ لَّمْ يَقْبَلْهَا بَنُو تَمِيْمٍ قَالُوْا قَبِلْنَا جِئْنَاكَ لِنَتَفَقَّهَ فِى الدِّيْنِ وَلِنَسْاَلَكَ عَنْ اَوَّلِ هٰذَا الْاَمْرِ مَا كَانَ قَالَ كَانَ اللّٰهُ وَلَمْ يَكُنْ شَىْءٌ قَبْلَهٗ وَكَانَ عَرْشُهٗ عَلَى الْمَاءِ ثُمَّ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَكَتَبَ فِى الذِّكْرِ كُلَّ شَىْءٍ ثُمَّ اَتَانِىْ رَجُلٌ فَقَالَ يَا عِمْرَانُ اَدْرِكْ نَاقَتَكَ فَقَدْ ذَهَبَتْ فَانْطَلَقْتُ اَطْلُبُهَا وَاَيْمُ اللّٰهِ لَوَدِدْتُ اَنَّهَا قَدْ ذَهَبَتْ وَلَمْ اَقُمْ (رواہ البخاری)

اخرجہ البخاری ۲۸۶/۶، حدیث رقم ۳۱۹۰، واخرجہ الترمذی ۶۸۸/۵ حدیث رقم ۳۹۵۱ واخرجہ احمد فی المسند ۴۲۶/۴۔

ترجمہ: ''حضرت عمران بن حصین رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا کہ (ایک روز) میں رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر تھا کہ بنو تمیم (قبیلہ) کے کچھ لوگ حضور اقدس ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے' آپ ﷺ نے ان سے فرمایا کہ اے بنو تمیم! بشارت حاصل کرو' انہوں نے عرض کیا کہ آپ ﷺ نے (دین کی تعلیمات کی صورت میں) ہمیں بشارت تو دیدی اب کچھ اور بھی عنایت فرما دیجئے۔ اتنے میں یمن والوں میں سے کچھ افراد آپ ﷺ کی خدمت میں آئے' آپ ﷺ نے ان سے فرمایا کہ (یمن کے لوگو! تم خوشخبری قبول کر لو' بنو تمیم کے لوگوں نے تو بشارت حاصل نہیں کی''۔ اہل یمن نے عرض کیا کہ) یا

رسول اللہ ﷺ! ہم نے بشارت قبول کی اور ہم اسی لئے آپ ﷺ کی خدمت میں پیش ہوتے ہیں کہ آپ ﷺ سے دینی اور مذہبی فہم وشعور معلومات اور آگاہی حاصل کریں' چنانچہ ہم آپ سے ابتدائے آفرینش اور مبداء عالم کے بارے میں پوچھنا چاہتے ہیں کہ اس (کائنات کے وجود میں آنے اور مخلوقات کی پیدائش) سے پہلے کیا چیز موجود تھی؟ حضور اقدس ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''صرف حق تعالیٰ شانہ کی ذات موجود تھی (ازل الازل میں) اس کے ساتھ (اور اس سے پہلے) کسی چیز کا وجود نہیں تھا' اور اس کا عرش پانی پر تھا' پھر رب تعالیٰ نے آسمانوں اور زمین کو وجود بخشا اور لوح محفوظ میں تمام امور کو لکھا''۔ (حدیث کے راوی حضرت عمران بن حصین رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ میں آنحضرت ﷺ کا ارشاد گرامی یہیں تک سن پایا تھا کہ) ایک آدمی میرے پاس آیا اور کہنے لگا کہ عمران جاؤ' اپنی اونٹنی کو تلاش کرو وہ بھاگ گئی ہے' (یہ سنتے ہی میں اپنی اونٹنی کو تلاش کرنے کے لئے نکل آیا اور اب میں خدا کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ کاش میں اس موقع مجلس پر نبوی ﷺ سے اٹھ کر نہ جاتا خواہ میری اونٹنی جاتی رہتی''۔ (بخاری)

تشریح: اذ جاء ہ قوم: اذ ظرفیہ ہے: أی وقت مجیئهم. (یعنی ان کے آنے کے وقت)

بنی تمیم: ایک مشہور اور عظیم قبیلہ ہے۔

اقبلوا: بائے موحدہ کے فتحہ کے ساتھ، بمعنی تقبلوا منی. (تم مجھ سے قبول کرلو)

البشری: بائے موحدہ کے ضمہ کے ساتھ، اس سے کوئی مطلق بشارت بھی مراد ہو سکتی ہے اور خاص بھی۔

وہ چونکہ سمجھ نہ پائے کہ آنخضرت کا اشارہ کس بشات کی طرف ہے، اور نہ انہیں یہ سجھائی دیا کہ اس بشارت کا استقبال کیسے کریں، کہ جس بشارت پر کامیابیاں ہی کامیابیاں ہیں۔

قالوا: بشرتنا و اعطنا: انہوں نے اس بشارت کو احسان عرفی پر محمول کیا، اور احسان عرفی کے نتیجہ کے طور پر حاصل ہونے والے حسی عطیہ کا مطالبہ کر بیٹھے، اور اس کا مقتضی دنیا کی محبت کا غلبہ، اور مراتب آجلہ سے غفلت تھی۔

امام طیبیؒ نے فرمایا: اقبلوا البشری کا مطلب یہ ہے: مجھ سے ایسی چیز حاصل کرو جس کا تقاضا یہ ہو کہ اس پر تمہیں جنت کی بشارت دی جائے یعنی تفقہ فی الدین اور اس پر عمل۔

قولہ: فدخل ناس من اهل الیمن...... عن اول هذا الامر ما کان:

اللہ تعالیٰ کے اس فرمان پر عمل پیرا ہوتے ہوئے: ﴿فلو لا نفر من کل فرقة منهم طائفة لیتفقهوا فی الدین ولینذروا قومهم اذ ارجعوا الیهم لعلهم یحذرون﴾ [التوبۃ۔۱۲۲] ''ایسا کیوں نہ کیا جائے کہ ان کی ہر ہر بڑی جماعت سے ایک ایک چھوٹی جماعت (جہاد میں) میں جایا کرے تا کہ (یہ) باقی ماندہ لوگ دین کے سمجھ بوجھ حاصل کرتے رہیں اور تا کہ یہ لوگ اپنی (اس) قوم کو جب وہ ان کے پاس واپس آویں ڈراویں تا کہ وہ (ان سے دین کی باتیں سن کر برے کاموں سے) احتیاط رکھیں''، اور چونکہ اہل یمن کی نیت تفقہ فی الدین کے بارے میں خالص، اور کھری تھی، دنیا کی طمع لے کر نہیں آئے تھے، تو انہیں بشارت، قبول، علم وعمل اور وصول سب کچھ حاصل ہو گیا۔ اور بنو تمیم ان تمام سے محروم ہو گئے، حقیر چیز کو طلب کرنے کی وجہ سے۔

ولنسالك: (اس کا عطف ماقبل پر ہو رہا ہے یا فعل محذوف پر ہے:) أی: و جئنا لنسئلك.

ما کان: "ما" بمعنی "أي شيء" ہے أي: أي شيء كان أول هذا؟ امام طیبیؒ فرماتے ہیں: " ما کان "میں "ما" استفہامیہ ہے۔ أي: أي شيء كان أول الأمر بکرر سوال اس لئے کیا کہ معاملہ بہت ہی مہتم بالشان تھا۔

قوله: قال: كان الله:

یعنی ازل سے اللہ تھا، جیسا کہ وہ ابدالآباد تک رہے گا، اور تغیر وحدوث کے اوصاف سے پاک ہے، کہ یہ اوصاف (یعنی تغیر وحدوث) مخلوق کے ہیں، چونکہ جس کا "قدم" ثابت ہو اس کا معدوم ہونا محال ہے۔

قوله: ولم يكن شيء قبله:

چونکہ ہر شیء کا خالق وموجد وہی ہے، لہٰذا اس موجد واجب الوجود سے پہلے کسی اور چیز کے وجود کا تصور تک نہیں ہو سکتا۔ اور اس کا حاصل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا وجود ہر شئے کے وجود سے مقدم ہے، اس سے پہلے کسی بھی چیز کا وجود نہیں تھا، آنحضرت ﷺ نے جواب مکرر ارشاد فرمایا، چونکہ مقام کا مقتضیٰ یہی تھا۔ پس قصہ مختصر اللہ تعالیٰ کی ذات اول قدیم بلا ابتداء ہے، جیسا کہ اس کی ذات آخر کریم بلا انتہاء ہے۔

امام طیبیؒ فرماتے ہیں کہ ولم يكن شيء قبله "حال" ہے۔ اور کوفیوں کے مذہب پر "خبر" ہے۔ معنوی اعتبار سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔ أي: كان الله في الازل منفردا موحدا. یہی مذہب امام اخفش کا ہے، چونکہ وہ خبر" كان واخواتها" پر واؤ کا دخول جائز قرار دیتے ہیں، جیسے كان زيد وأبوه قائم، کہ" أبوه قائم " یہ جملہ خبر ہے باوجود یہ کہ اس پر واؤ داخل ہے، اور اس جواز کی وجہ یہ ہے کہ "خبر" "حال" کے مشابہ ہوتی ہے۔

میں کہتا ہوں: چونکہ سوال "اول" کے بارے میں تھا، تو آپ نے اولیت واَزلیت کو بیان کرتے ہوئے غیر اللہ سے قبلیت کی نفی فرمادی، اور معیت کے معنی سے کوئی تعرض نہیں فرمایا، اسی وجہ سے صوفیا کے کلام میں یہ عبارت ملتی ہے: كان الله ولم يكن معه شيء (اللہ ازل سے ہے اس کے ساتھ کوئی شئی نہ تھی۔) اور پھر فرماتے ہیں: والآن على ما عليه كان، لأن وجود الشيء الممكن في جنب وجود الواجب كلا شيء. (اللہ آج بھی اسی طرح ہے جس طرح ازل سے تھا چونکہ شئی ممکن کا وجود ذات واجب الوجود کے مقابلہ میں "لاشئ" کی مانند ہے۔) اور اسی وجہ سے بعض صوفیاء فرماتے ہیں: ليس في الدار غيره ديار. ایک اور کہتا ہے: سوى الله، والله ما في الوجود. یا اس وجہ سے کہ اشیاء، اللہ تعالیٰ کی صفات وذات کا مظہر ہیں۔ ایک روایت میں ہے:

" كنت كنزا مخفيا، فاحببت أن أعرف، فخلقت الخلق لأعرف۔" (میں مخفی خزانہ تھا میں نے چاہا کہ میں پہچانا جاؤں پس میں نے مخلوق کو پیدا کیا تا کہ میں پہچانا جاؤں)

اللہ جل شانہ کے اس فرمان ﴿وما خلقت الجن والانس الا ليعبدون﴾ [الذاريات۔٥٦] میں وارد لفظ "ليعبدون" کی تفسیر میں "حبر الامت" نے" ليعرفون" کی ہے۔ یہ تفسیر بھی مذکورہ بالا روایت کی طرف اشارہ ہے۔

تورپشتی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: یہ "فصل" مستقل بنفسہ ہے، اس کا اس فصل ثانی سے کوئی امتزاج نہیں۔ اور فصل ثانی " وكان عرشه على الماء ثم خلق السموات والأرض": چونکہ دونوں فصلوں میں منافات ہے۔ اس لئے کہ " وكان

عرشه على الماء" کو اگر قول اول کا تتمہ قرار دیں گے تو قول اول اور قول ثانی میں مناقضہ ہوگا۔ چونکہ قدیم وہ ذات ہے من لم يسبقه شيء ولم يعارضه في الأولية. اور "وكان عرشه على الماء": اس جملہ میں اس طرف اشارہ ہے کہ عرش اور پانی مبدأ تکوین ہیں، عرش اور پانی کی تخلیق زمین وآسمان کی تخلیق سے پہلے ہوئی ہے، عرش کے نیچے، آسمان وزمین سے پہلے، سوائے پانی کے کچھ بھی نہ تھا، کیفیت جو بھی ہو، اللہ سبحانہ تعالیٰ ہی سب کا خالق ہے، وہی ذات کائنات کی ہر شئے کو اپنی قوت وقدرت سے تھامے ہوئے ہے۔ (انتہیٰ کلامہ)

امام طیبیؒ فرماتے ہیں: شیخ کی اس سے مراد یہ ہے کہ معطوف علیہ اس جملہ: " ولم يكن قبله شيء " کے ساتھ مقید ہے، اور اگر معطوف علیہ کو غیر مستقل قرار دیا جائے تو ایک امر محذور کا ارتکاب لازم آئے گا، اور اگر اس کو مستقل قرار دیا جائے، اور دوسرے کا عطف پہلے پر قرار دیا جائے، تو محذور لازم نہیں آئے گا، اس صورت میں لفظ "كان" دونوں جگہ پر اپنے مدخول کے حال کے مناسب ہوگا، چنانچہ پہلے سے مراد ازلیت وقدم ہے، اور دوسرے سے مراد حدوث بعد العدم ہے۔

حاصل یہ ہے کہ " وكان عرشه على الماء " کا عطف مجموعہ پر ہے، یعنی " كان الله ولم يكن قبله شئ" پر ہے۔ اور یہ باب اخبار سے ہے پس واؤ بمنزلہ "ثم" ہے۔

عسقلانیؒ فرماتے ہیں: ماء سے مراد "ماء البحر" نہیں ہے، بلکہ وہ مراد ہے جو عرش کے نیچے ہے، جیسے اللہ نے چاہا۔

ابن الملکؒ فرماتے ہیں: اس کا عرش پانی پر تھا، پانی ہوا کی پشت پر تھا، اور ہوا اللہ تعالیٰ کی قدرت سے قائم تھی۔

بعض حضرات نے لکھا ہے کہ عرش اور پانی کی تخلیق آسمان وزمین کی تخلیق سے پہلے ہوئی ہے، پھر اللہ تعالیٰ نے زمین وآسمان کو پانی سے پیدا فرمایا، بایں طور کہ پانی پر اپنی تجلی ڈالی، تو وہ موجیں مارنے لگا، اور اتھل پتھل ہوئی اور اس میں جھاگ پیدا ہوگئی، اور پھر وہ جھاگ اس جگہ جمع ہوگئی جہاں کعبہ شریف ہے، اسی وجہ سے مکہ کو "ام القریٰ" کہا جاتا ہے، پھر اس کے نیچے زمین بچھائی گئی، پھر اس روئے زمین پر پہاڑوں کو پیدا کیا، تاکہ زمین ڈولے نہ، اور ایک قول یہ ہے کہ سب سے پہلے جو پہاڑ پیدا کیا گیا وہ "جبل ابوقبیس" ہے۔ اس پانی میں تموج اور اضطراب سے دھوئیں کی شکل میں جو بخارات اوپر کی طرف بلند ہوئے ان بخارات سے آسمان کو پیدا کیا گیا، اس کا اجمالی ذکر سورۃ حٰم فصلت میں ہے۔ اور تفصیل کتب مفسرین اور سیر مؤرخین میں ہے۔ (واللہ سبحانہ و تعالیٰ اعلم بالاولین والآخرین۔)

قوله: وكتب في الذكر كل شيء:

كتب: بمعنی أثبت.

"في الذكر " اس سے مراد "لوح محفوظ" ہے۔ اور "كل شئ" سے مراد " جميع ما هو كائن " ہے۔

قوله: فانطلقت اللبها ...... :

فانطلقت اطلبها: جملہ حالیہ ہے، یا مستانفہ تعلیلیہ ہے۔

وأيم الله: ہمزہ کے فتحہ کے ساتھ، یا ہمزہ قطعی کے ساتھ یاء تحتیہ ساکنہ، اور میم کے ضمہ کے ساتھ، لفظ جلالہ کی طرف مضاف ہے۔ یہ مستقل کلمہ ہے، جمع نہیں ہے۔ شارح کا کہنا ہے کہ سیبویہ کے نزدیک " أيم الله، قسم کیلئے موضوع ہے، اور اس کا

ہمزہ وصلی ہے۔ اسماء میں سے وہ ایک ہی لفظ ہے جس میں الف وصل مفتوح ہے۔ اور اس کی تقدیر ہے أی: أیم اللہ مسمی. کوفیوں کے نزدیک " ایم " "ایمن " کی محذوف شکل ہے۔ جو یمین کی جمع ہے اور اس کا ہمزہ قطعی ہے۔

أنها قد ذھبت ولم اقم: یعنی اے کاش! میں اس وقت مجلس نبوی سے اٹھ کر نہ جاتا بھلے سے میری اونٹنی جاتی رہتی، تا کہ میں آنحضرت ﷺ کی مبارک صحبت اور ان حقائق وعلوم سے بہرہ ور ہوتا۔

۵۲۹۹ : وَعَنْ عُمَرَ قَالَ قَامَ فِينَا رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَقَامًا فَاَخْبَرَنَا عَنْ بَدْءِ الْخَلْقِ حَتّٰى دَخَلَ اَهْلُ الْجَنَّةِ مَنَازِلَهُمْ وَاَهْلُ النَّارِ مَنَازِلَهُمْ حَفِظَ ذٰلِكَ مَنْ حَفِظَهُ وَنَسِيَهُ مَنْ نَسِيَهُ .

(رواہ البخاری)

اخرجه البخاری ۲۸٦/٦ حدیث رقم ۳۱۹۲، واخرجه ابو داوٗد ٤٤١/٤ حدیث ٤٢٤٠ واخرجه الترمذی ٤١٩/٤ حدیث رقم ۲۱۹۱، واخرجه احمد فی المسند ۳۸٥/٥۔

ترجمہ: " امیر المؤمنین سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا کہ (ایک روز) رسول اللہ ﷺ ہمارے سامنے کھڑے ہوئے آنحضرت ﷺ نے (اس وعظ کے دوران) ابتدائے آفرینش سے (روز قیامت) بہشت وجہنم میں داخل ہونے تک کے تمام احوال وکوائف کا تذکرہ فرمایا۔ جس شخص نے ان باتوں کو محفوظ کر لیا اس کو یاد ہیں اور جس شخص نے بھلا دیا وہ بھول گیا ہے"۔ (بخاری)

تشریح: قوله: قام فینا رسول اللہؐ ..... :

قال: قام فینا: جار مجرور "خطیبا" محذوف کے متعلق ہے۔

مقاما: (اس کی تنوین برائے تعظیم ہے۔) أی قیاما عظیما.

فاخبرنا عن بدٔ الخلق ..... : پس مبدأ اور معاد کا ذکر فرمایا، یعنی دخول جنت کے وقت تک کے، تمام امتوں کے احوال بیان کیے، اور اپنی امت کے احوال خیر وشر بیان فرمائے، حتی کہ اہل جنت، جنت میں اور اہل جہنم، جہنم میں داخل ہوں گے۔

امام طیبیؒ نے فرمایا: " حتی "اخبرنا" کے لئے غایت ہے۔ أی: أخبرنا مبد من بدء الخلق حتی انتھی الی دخول أهل الجنة الجنة. (یعنی آپؐ نے بدء الخلق سے احوال کا آغاز کرتے ہوئے تمام احوال بیان کئے حتی کہ آخر میں آپؐ نے اہل جنت کے جنت میں داخل ہونے کا ذکر فرمایا) صادق وامین کے قول سے مستفاد معنی میں تحقیق کیلئے موضع مضارع میں ماضی کو ذکر کیا۔ عسقلانیؒ فرماتے ہیں: أی: أخبرنا عن المبدأ شیئا بعد شیء الی أن انتھی الاخبار عن حال الاستقرار فی الجنة والنار. (یعنی آنحضرتؐ نے ہمیں مبدا کے بارے میں ایک چیز کے بعد دوسری چیز بیان کی یہ یہاں تک کہ آپؐ نے ہمیں جنت وجہنم میں استقراء کی حالت کے بارے میں بتا دیا)

یہ حدیث اس بات پر دلالت کرتی ہے، کہ آنحضرت ﷺ نے اس دن ایک ہی مجلس میں مخلوقات کے مبدأ، معاد اور معاش کے تمام احوال بیان فرمائے، اور ایک ہی مجلس میں ان تمام باتوں کا ذکر خارق عادت کاموں میں سے ایک امر عظیم ہے۔

۵۷۰۰ : وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ یَقُوْلُ اِنَّ اللّٰهَ تَعَالٰی كَتَبَ كِتَابًا قَبْلَ اَنْ یَّخْلُقَ الْخَلْقَ اِنَّ رَحْمَتِی سَبَقَتْ غَضَبِی فَهُوَ مَكْتُوْبٌ عِنْدَهٗ فَوْقَ الْعَرْشِ.

(متفق علیه)

اخرجه البخاری ۲۸۷/۶، حدیث رقم ۳۱۹۴، ومسلم ۲۱۰۸/۴ حدیث رقم (۱۴-۲۷۵۱) واخرجه الترمذی ۵۱۳/۵ حدیث رقم ۳۵۴۳، واخرجه ابن ماجه ۱۴۳۵/۲ حدیث ۴۲۹۵ واخرجه احمدفی المسند ۴۶۶/۲۔

ترجمہ: ''حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ ارشاد فرماتے ہوئے سنا: اللہ تعالیٰ نے تخلیق کائنات سے پہلے ایک کتاب تحریر کی جس میں یہ بھی درج ہے کہ ''میری رحمت'' میرے غضب پر غالب ہے اور وہ (کتاب یا مذکورہ عبارت) خدا تعالیٰ کے پاس عرش کے اوپر لکھی ہوئی موجود ہے''۔ (بخاری و مسلم)

تشریح: قولہ: ان اللہ تعالٰی کتب --- سبقت غضبی:

کتب: بمعنی ''أثبت''، یا ملائکہ کو کتابت کا حکم دیا۔

کتابا: بمعنی ''مکتوب'' ہے۔ اور اس کتاب سے مراد لوح محفوظ ہے۔ یا یہ کہ علیحدہ سے مستقل کوئی کتاب لکھی۔

انّ: ہمزہ کے کسرہ اور فتحہ کے ساتھ۔

سبقت: بمعنی'' غلبت''، جیسا کہ ایک روایت میں یہی لفظ وارد ہوا ہے۔ اور مطلب یہ ہے کہ میری رحمت کے حق دار لوگوں پر میری رحمت کے آثار بنسبت میرے غضب کے آثار حق دار لوگوں پر میرے غضب کے پر غالب ہیں۔ اور حاصل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کے ساتھ خیر، نعمت اور مثوبت کا ارادہ، شر و نقمت اور عقوبت کے ارادہ سے زیادہ فرماتے ہیں۔ چونکہ ''رحمت عام'' ہے، اور ''غضب'' خاص ہے، جیسا کہ ﴿الرحمٰن الرحیم﴾ کے بارے میں کہا گیا کہ رحمٰن کی رحمت مؤمن و کافر دونوں پر ہے۔ بلکہ جمیع موجودات پر ہے، اسی وجہ سے ''الرحمٰن'' کا اطلاق غیر اللہ پر کرنا درست نہیں۔ لہٰذا اس تفصیل کے بعد، ''انَ'' کا کسرہ، بر سبیل الحکایت ہے، اور'' ان'' بھی فی الجملہ مکتوب کا حصہ ہے۔ اور ''ان'' کا فتحہ علی سبیل البدلیت ہوگا۔ بہر تقدیر وہ مکتوب جملہ یہی ہے، اور اس کی تائید اس اگلے جملہ (فهو متكوب عنده فوق العرش) سے ہوتی ہے۔

قولہ: فهو مكتوب عنده فوق العرش:

وہ کتاب تمام مخلوقات سے پوشیدہ ہے۔ اور تمام خلائق کے احاطۂ ادراک سے ماوراء ہے۔

اور بعض کا کہنا ہے کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ جل شانہ کے علم میں ثابت ہے، البتہ لوح محفوظ کی بعض معلومات پر وہ بعض لوگ مطلع ہو سکتے ہیں کہ جن کو اللہ تعالیٰ مطلع کرنے کا ارادہ فرمائے، مثلاً انبیاء، ملائکہ، ارباب کشف میں سے مخلص اولیاء، خصوصاً اسرافیل علیہ السلام۔ چونکہ وہ اس کتاب کے مؤکل ہیں، وہ ہی اس کتاب کے امور پر مطلع ہونے کے بعد جبرئیل، میکائیل اور عزرائیل علیہ السلام کے متعلقہ مفوضہ امور سے انہیں آگاہ کرتے ہیں۔ جیسا کہ بعض آثار و اخبار سے معلوم ہوتا ہے۔ ''کتاب'' کی تفسیر ''لوح محفوظ'' یا ''قضاء اجمالی و تفصیلی'' کرنے والوں کے نزدیک یہاں بوجہ استیناف ہمزہ کا مکسورہ ہونا متعین ہے۔

امام نوویؒ فرماتے ہیں: اللہ کے غضب ~~کا مرجع عاصیوں~~ کو عقاب ہے، اور اس کی رضا کا مرجع فرمانبرداروں کو ثواب ہے۔

یہاں سبقت سے مراد، کثرتِ رحمت اور اس کا شمول ہے۔ دوسری حدیث میں مروی غلبت کا مفہوم بھی یہی ہے، جیسا کہ کہا جاتا ہے: غلب علی فلان الکرم والشجاعۃ، یہ اس وقت کہا جاتا ہے کرم وشجاعت کا ظہور بکثرت ہو۔

میں کہتا ہوں: ان دونوں کو اگر ان کے حقیقی معنی پر ہی محمول رہنے دیا جائے، مجاز پر محمول نہ کیا جائے تب بھی درست ہے، (اور اس کی وجہ وہی ذکر کی ہے جو اوپر تورپشتی رحمۃ اللہ علیہ کے کلام میں ذکر ہوئی)۔ چنانچہ لکھتے ہیں: لأن رحمة الله سابقة على غضبه باعتبا التعلق بالنسبة الى كل أحد من مخلوقاته فان اول الرحمة نعمة الايجاد، ثم نعمة الامداد، فلا يخلوا من النعمتين أحد من العباد، وكذا منحه سبحانه بالنسبة الى محنه غالبة كثيرة شاملة لعموم الخلائق، سواء من أطاعه أو عصاه في البلاد.

امام طیبیؒ فرماتے ہیں: "ان" کو ہمزہ مفتوحہ کے ساتھ پڑھا جائے تو "کتابا" سے بدل ہے، اور ہمزہ مکسورہ کے ساتھ پڑھنے کی صورت میں مضمون کتاب کی حکایت ہے۔ اور اس ارشاد باری تعالیٰ کی مانند ہے: ﴿كتب ربكم على نفسه الرحمة﴾ [الانعام۔٥٤] ،یعنی اللہ تعالیٰ نے اپنے اوپر قطعی طور پر لازم کرلیا ہے کہ وہ اپنے بندوں پر رحم فرمائے گا، بخلاف ان اعمال کے جن پر غضب کے مقتضی کا ترتب ہوتا ہے۔ چونکہ اللہ جل شانہ غفور وکریم ہے، اپنے فضل کے باعث درگزر فرمائے گا۔

وانی اذا أوعدته أو وعدته ☆ لمخلف ايعادی ومنجز موعدی

"سبقت" سے اس کا وقوع قطعی مراد ہے، میں کہتا ہوں مؤمنین کی تخصیص ضروری ہے۔ وگرنہ تو کافر کو عذاب ہونا مقطوع الوقوع ہے۔ بلکہ اس ارشادی باری کی وجہ سے واجب الحصول ہے: ﴿ان الله لايغفر ان يشرك به﴾ [النساء۔٤٨] اور تخلف اخبار باری تعالیٰ میں قطعی طور پر غیر جائز ہے۔ (یعنی ممکن نہیں بلکہ محال ہے۔) اور میں نے اس مسئلہ پر ایک خصوصی رسالہ لکھا ہے جس کا نام "القول السيد في خلت الوعيد" ہے

٥٧٠١ : وَعَنْ عَآئِشَةَ عَنْ رَّسُولِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ خُلِقَتِ الْمَلٰئِكَةُ مِنْ نُّوْرٍ وَخُلِقَ الْجَآنُّ مِنْ مَّارِجٍ مِّنْ نَّارٍ وَخُلِقَ اٰدَمُ مِمَّا وُصِفَ لَكُمْ (رواه مسلم)

اخرجه ٤/٢٢٩٤ حديث رقم (٦٠-٢٩٩٦) واحمد فی المسند ١٦٨/٦۔

ترجمہ: "اُم المؤمنین سیدنا عائشہ رضی اللہ عنہا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت نقل فرماتی ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: فرشتوں کی تخلیق نور سے کی گئی ہے اور جنات کی تخلیق آگ کے شعلے سے کی گئی ہے' جس میں دھواں ملا ہوتا ہے اور آدم علیہ السلام کو اس چیز سے پیدا کیا گیا ہے جو تمہیں بتادی گئی ہے"۔ (مسلم)

تشریح: قوله: خلقت الملائكة من نورو خلق الجان من مارج:

الجان: سے مراد جنس جانّ ہے۔ امام نوویؒ نے فرمایا کہ "جانّ" سے مراد جنّ ہے۔ اور ایک شارح کا کہنا ہے کہ "ابو الجن" مراد ہے۔ اور یہی زیادہ مناسب ہے چونکہ اس کے مقابلے میں آدمؑ کا ذکر ہے۔ (اور آدم علیہ السلام "ابوالبشر" ہیں)۔ اور بعض کا کہنا ہے کہ اس سے "ابلیس" مراد ہے۔

من مارج من نار:

قرآن کریم میں ہے: ﴿وخلق الجان من مارج من نار﴾ [الرحمن ـ ۱۵]

اور ایک جگہ فرمایا: ﴿والجان خلقناه من قبل من نار السموم﴾ [الحجر ـ ۲۷]

خلق: صیغہ مجہول کے ساتھ ہے جیسا کہ پچھلے صیغہ جات بھی مجہول ہیں۔

وصف: فعل مجہول ہے، "وصف" بمعنی بیّن،

" مما وصف لكم " سے ان ارشادات گرامی کی طرف اشارہ ہے:

(۱) ﴿خلقه من تراب﴾ [آل عمران ـ ۵۹] "کہ ان (کے قالب) کو مٹی سے بنایا" (۲) ﴿خلق الانسان من صلصال كالفخار﴾ "اسی نے انسان کو ایسی مٹی سے کہ ٹھیکرے کی بجتی تھی پیدا کیا"۔

(۳) ﴿ولقد خلقنا الانسان من صلصال من حمأ مسنون﴾ [الحجر ـ ۲۶] "اور ہم نے انسان کو بجتی ہوئی مٹی سے جو کہ سڑے ہوتے گارے کی بنی تھی پیدا کیا"۔

(۴) ﴿انی خالق بشرا من طین﴾ [ص: ۷۱] "کہ میں گارے سے ایک انسان بنانے والا ہوں"۔

تخریج: اسی طرح اس حدیث کو امام احمدؒ نے بھی روایت کیا ہے۔ نیز حکیم ترمذیؒ نے اور، ابن عدی نے الکامل میں سند حسن کے ساتھ حضرت ابو ہریرہؓ سے مرفوعاً نقل کیا ہے: خلق الله آدم من تراب الجابية وعجنه بماء الجنة۔ "اللہ تعالیٰ نے حضرت آدمؑ کو "جابیہ" کی مٹی سے پیدا کیا اور اس (مٹی کو جنت کے پانی سے گوندھا)

صاحب قاموس کے بیان کے مطابق " جابيه " دمشق کا ایک قصبہ ہے۔ اور "باب الجابیہ" اس کے دروازوں میں سے ایک دروازہ ہے۔

ابن عساکر، حضرت ابو سعیدؓ سے مرفوعاً نقل کرتے ہیں:

خلقت النخلة والرمان والعنب من فضل طينة آدم.

طبرانی، ابوامامہ سے مرفوعاً نقل کرتے ہیں: خلق الحور العين من الزعفران.

"حوعرین کو زعفران سے پیدا کیا گیا ہے۔

حکیم ترمذیؒ نے اور ابن ابی الدنیاؒ نے "فی مکاید الشیطان" میں، اور ابوالشیخ نے "العظمة" میں اور ابن مردویہ نے حضرت ابوالدرداءؓ سے مرفوعاً روایت کیا ہے:

خلق الله عز وجل الجن ثلاثة أصناف صنف حيات وعقارب وخشاش الأرض، وصنف كالريح فی الهواء، وصنف عليهم الحساب والعقاب، وخلق الله الانس ثلاثة أصناف: صنف كالبهائم، وصنف أجسادهم أجساد بنی آدم وأرواحهم أرواح الشياطين، وصنف فی ظل الله يوم لا ظل الا ظله. "اللہ عزوجل نے جن کو پیدا کیا اس کی تین اصناف بنائیں۔ ایک صنف سانپ' بچھو'" اور زمین کے کیڑے مکوڑے ہیں ایک صنف ہوا کی نمانند ہے اور ایک صنف وہ ہے جس سے جنات وعقاب کا معاملہ متعلق ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کی تین اصناف پیدا فرمائیں۔ ایک صنف جانوروں کی مانند ہے۔ ایک صنف ایسی ہے کہ ان کے جسم بنی آدم کے جسموں کی مانند ہیں اور ان کی روحیں

شیطانوں کی روحوں کی مانند ہیں اور ایک صنف وہ ہے جو اللہ کے سائے تلے ہوگی اس دن کہ جس دن اس کے سائے کے علاوہ کوئی سایہ نہ ہوگا''۔

اس جملہ: ''وصنف علیهم الحساب والعقاب'' میں امام ابوحنیفہؒ کے قول کی طرف اور جنات کے حق میں ثواب کے بارے میں ان (یعنی امام صاحبؒ) کے توقف کی طرف اشارہ ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

۵۷۰۲ : وَعَنْ اَنَسٍ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ لَمَّا صَوَّرَ اللّٰهُ اٰدَمَ فِي الْجَنَّةِ تَرَكَهُ مَا شَاءَ اللّٰهُ اَنْ يَتْرُكَهُ فَجَعَلَ اِبْلِيْسُ يُطِيْفُ بِهٖ يَنْظُرُ مَا هُوَ فَلَمَّا رَاٰهُ اَجْوَفَ عَرَفَ اَنَّهٗ خُلِقَ خَلْقًا لَا يَتَمَالَكُ (رواہ مسلم)

اخرجه مسلم ۲۰۱۶/٤ حديث رقم (۱۱۱/۲۶۱۱)، واحمد في المسند ۲۲۹/۳۔

ترجمہ: ''حضرت انس رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''جب خدا تعالیٰ نے جنت میں آدم علیہ السلام کی صورت اور نقشہ بنایا تو اس نقشہ و پیکر کو جب تک چاہا جنت میں رکھے رکھا' اس عرصہ میں ابلیس اس پیکر کے گرد چکر لگاتا رہا اور معاینہ کرتا رہا کہ یہ کیا ہے اور کیسا ہے (یعنی وہ یہ اندازہ لگانا چاہتا تھا کہ خدا تعالیٰ اس خاک کے نقشہ و پیکر میں اپنے بندوں کی جونئی مخلوق پیدا کرنا چاہتا ہے اس کی حیثیت و حقیقت کیا ہوگی) اور جب اس نے دیکھا کہ یہ پیکر خاکی اندر سے کھوکھلا ہے تو جان گیا کہ یہ ایک ایسی مخلوق پیدا کی گئی ہے جو (اپنے نفس کی خوہشات پر) قابو نہ رکھ سکے گی''۔ (مسلم)

تشریح: قوله: لما صور الله آدم في الجنة تركه ماشاء الله أن يتركه:

تورپشتی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: میں اس حدیث کو بہت ہی مشکل سمجھتا ہوں، کیونکہ کتاب وسنت سے تو یہ ثابت ہوتا ہے کہ آدم علیہ السلام کی تخلیق زمین کے اجزاء سے ہوئی ہے، اور جس وقت انہیں جنت میں داخل کیا گیا تو وہ جیتے جاگتے ایک انسان تھے، اور اس کی تائید نص قرآنی کے مفہوم سے بھی ہوتی ہے، چنانچہ فرمایا: ﴿وقلنا يا آدم اسكن أنت وزوجك الجنة﴾ [البقرة۔ ۳۵] ''ہم نے حکم دیا کہ اے آدم رہا کرو تم اور تمہاری بیوی بہشت میں'' ایک شارح فرماتے ہیں کہا گیا کہ یہ احتمال ہے کہ یہ دونوں کلمات یعنی ''في الجنة'' کسی راوی کا سہو ہوں، راوی کو سننے میں مغالطہ ہوا ہو۔

قاضیؒ فرماتے ہیں احادیث اس بات پر دلالت کرتی ہیں، کہ حضرت آدم علیہ السلام کو اس روئے زمین کی مٹھی بھر مٹی سے بنایا، مٹی کو گوندھ کر چھوڑ دیا، یہاں تک کہ طین ہوگئی، پھر مزید چھوڑے رکھا، یہاں تک کہ صلصال ہوگئی، یہ سارا عمل مکہ اور طائف کے درمیان ''بطن نعمان'' میں ہوا بطن نعمان عرفات کی ایک وادی ہے۔ اور یہ اس بات کے منافی نہیں کہ ان کو پیکر وصورت جنت میں عطا ہوئے۔ کیونکہ ممکن ہے کہ مٹی کو زمین میں ہی گوندھا گیا ہو، اور پھر چھوڑ دیا گیا ہو، حتیٰ کہ اس پر مختلف اطوار گزر گئے اور جب اس مٹی میں قبول صورت کی استعداد پیدا ہوگئی، تو وہ خمیر جنت میں لایا گیا ہو، اور پھر صورت عطا کر کے روح پھونکی گئی ہو۔ اور اللہ جل شانہ کا یہ فرمان: ﴿يا آدم اسكن أنت وزوجك الجنة﴾ [البقرة۔ ۱۳۵] اس بات پر سرے سے دلالت نہیں کرتا، کہ آدم علیہ السلام کے قالب میں روح پھونکنے کے بعد انہیں جنت میں داخل کیا گیا ہو، چونکہ ''سکون'' سے مراد استقرار وتمکن ہے۔ اور حکم استقرار اس بات کو لازم نہیں کہ حضرت آدم علیہ السلام کو اس وقت تک جنت حاصل نہیں ہوئی تھی۔ اور یہ کیسے

ہوسکتا ہے حالانکہ بہت سی روایات اس کی مؤید ہیں، کہ حضرت حواء علیہا السلام کی تخلیق، حضرت آدم علیہ السلام کے جنت میں ہوئی۔ اور وہ بھی مأمور تھیں۔ اور ممکن ہے حضرت آدم علیہ السلام کے جسم کا مادہ عالم سفلی کا ہو، اور ان کو عطا کردہ صورت، کہ جو انہیں تمام مخلوقات سے ممتاز کرتی تھی، اور ملائکہ سے مشابہ کرتی تھی عالم علوی کی ہو۔ آنحضرت ﷺ نے ان کے مادہ کی نسبت زمین کی طرف فرمائی کیونکہ ان کا وہ مادہ زمین سے پیدا شدہ تھا، اور حصول صورت کی نسبت جنت کی طرف فرمائی کیونکہ حصول صورت جنت میں ہوئی تھی۔

قوله: فجعل ابليس يطيف به ينظر ما هو:

فجعل: افعال شروع کے معنی میں ہے۔

يطيف به: علامت مضارع کے ضمہ کے ساتھ، امام نوویؒ فرماتے ہیں: "**طاف بالشيء يطوف طوفا وطوافا، وأطاف به يطيف**" کا مطلب ہوتا ہے کسی چیز کے اردگرد گھومنا، چکر لگانا۔

ينظر ما هو: استئناف بیانی ہے یا حال ہے۔ "**نظر**" بمعنی تفکر وتأمل یعنی وہ یہ غور وفکر کرنے لگا، کہ اس مخلوق کا انجام کیا ہوگا، اس کی سرگرمیاں کیا ہونگی؟

قوله: فلما رأه أجوف عرف انه خلق خلقا لا يتمالك:

"اندر سے کھوکھلا" کا مطلب یہ ہے کہ وہ قوی اور مضبوط نہیں، نہ اس میں قوت ہوگی نہ ثابت قدمی ہوگی، اپنے معاملات میں ڈانوں ڈول، متغیر الاحوال، حوادثات کا شکار ہوگا،

"**تمالك**" کے معنی ہیں "**تماسك**"۔

اور بعض نے اس کے معنی یہ بیان کئے کہ وہ اپنے نفس پر قابو نہیں رکھ سکے گا، طبعی خواہشات پر قدغن نہیں لگا سکے گا، اور بعض نے کہا کہ وہ وساوس سے نہیں بچ سکے گا۔ اور بعض نے کہا کہ غصہ کے وقت بے قابو ہو جایا کرے گا۔

امام نوویؒ نے فرمایا: انسان میں صفت "**اجوف**" اللہ تعالیٰ کی صفات میں سے صفت "صمد" کا متقابل ہے۔ بعض کا کہنا ہے کہ "سید" کو "صمد" اس وجہ سے کہتے ہیں، کہ حوائج ورغائب میں اسی کا قصد وارادہ کیا جاتا ہے۔ **صمدت الامر** (کام کا ارادہ کرنا) سے ماخوذ ہے۔ اور بعض نے کہا ہے کہ وہ معرض آفت میں ہونے سے منزہ ہے۔ "**صمد**" بمعنی "**المصمد**" سے مأخوذ ہے۔ "مصمد" اس کو کہتے ہیں جس کا پیٹ نہ ہو۔ انسان اپنی حوائج کے پورا کرنے کیلئے غیر کا محتاج ہوتا ہے۔ اور پیٹ بھرنے کیلئے کھانے پینے کا محتاج ہوتا ہے۔ لہٰذا ظاہری اور باطنی کسی بھی اعتبار سے اس میں تماسک نہ ہوگا۔ میں کہتا ہوں: شاید کہ جنس جنات صفت اُجوف سے خالی ہے، تاکہ انسان کی ہیئت مخصوصہ سے (مندرجہ ذیل امور پر) استدلال تام ہو سکے۔

۵۷۰۳ : وَعَنْ اَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اخْتَتَنَ إِبْرَاهِيمُ النَّبِيُّ وَهُوَ ابْنُ ثَمَانِيْنَ سَنَةً بِالْقَدُوْمِ (متفق عليه)

اخرجه البخاري ۳۳۸/۶ حديث رقم ۳۳۵٦ ومسلم ۱۸۳۹/٤ حديث رقم ۲۳۷۰/۱۵۱، واخرجه احمد في المسند ۳۲۲/۲۔

ترجمہ: ''حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے اسی برس کی عمر میں قدوم کے ذریعہ اپنا ختنہ کیا''۔ (بخاری و مسلم)

تشریح: حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اللہ کے حکم سے اپنا ختنہ خود کیا، چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿واذ ابتلی ابراھیم ربہ بکلمات فأتمھن﴾ [البقرۃ۔۱۲۴] اور جس وقت امتحان کیا حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کا ان کے پروردگار نے چند باتوں میں اور وہ ان کو پورے طور پر بجالائے''۔

وھو: واؤ حالیہ ہے۔

مؤطا میں ہے کہ اس وقت آپ کی عمر مبارک ایک سو بیس (۱۲۰) سال تھی۔ بعض کا کہنا ہے کہ اول صحیح ہے۔
(کذا ذکرہ الاکمل فی شرح المشارق)

القدوم: قاف کے فتحہ اور دال مخففہ کے ضمہ کے ساتھ، اور ایک نسخہ میں دال کی تشدید کے ساتھ ہے۔

صاحب قاموس فرماتے ہیں: '' **قدوم** '' نجار کا اوزار ہے، اور ایک جگہ کا نام ہے جہاں ابراہیم علیہ السلام نے ختنہ کیا تھا، ''**قدوم**'' دال کی تشدید کے ساتھ (قَدُّوم) بھی پڑھا گیا ہے۔

امام طیبیؒ فرماتے ہیں: کہ ''قدوم'' دال کی تخفیف کے ساتھ نجار کا ایک معروف آلہ ہے' اور تشدید کے ساتھ ہو تو ایک جگہ کا نام ہے۔ اور بعض کا کہنا ہے کہ ''قدوم'' دال کی تخفیف کے ساتھ بھی (جگہ کا نام) ہے، جامع الاصول میں اور کتاب الحمیدی میں بھی اسی طرح ہے۔ امام بخاریؒ نے فرمایا: **قال أبو الزناد، وھو راوی الحدیث: اختتن ابراھیم بالقدوم مخففة**

امام تورپشتی رحمہ اللہ نے فرمایا: بعض محدثین (لفظ ''قدوم'' کو) تشدید کے ساتھ پڑھتے ہیں یہ غلطی ہے۔

امام نوویؒ فرماتے ہیں: بخاری شریف کی روایت میں لفظ ''قدوم'' کی دال کی حرکت میں اختلاف ہے۔ اگر ''قدوم'' دال کی تخفیف کے ساتھ پڑھا جائے تو اس کے معنی ہیں '' **بسول** '' (بڑھئی کا ایک اوزار ہے)۔ ''قدوم'' شام میں واقع ایک جگہ کا نام بھی ہے۔ اس کو دونوں طرح دال کی تخفیف اور تشدید کے ساتھ پڑھا جا سکتا ہے۔ پس جس روایت میں یہ لفظ دال کی تشدید کے ساتھ منقول ہے، اس میں ''قدوم'' سے مذکورہ علاقہ ہی مراد ہے۔ اور جس روایت میں دال کی تخفیف کے ساتھ وارد ہوا ہے، اس میں بسولہ اور مذکورہ گاؤں، دونوں کا احتمال ہے کہ (اس سے بسولہ بھی مراد ہو سکتا ہے اور مذکورہ گاؤں بھی)۔ اکثر حضرات نے ''قدوم'' کو دال کی تخفیف کے ساتھ پڑھا ہے۔

تخریج: اس حدیث کو امام احمدؒ نے بھی روایت کیا ہے۔

۵۷۰۴ : وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَمْ يَكْذِبْ اِبْرَاهِيْمُ اِلَّا ثَلٰثَ كَذِبَاتٍ ثِنْتَيْنِ مِنْهُنَّ فِيْ ذَاتِ اللّٰهِ قَوْلُهٗ اِنِّيْ سَقِيْمٌ وَقَوْلُهٗ بَلْ فَعَلَهٗ كَبِيْرُهُمْ هٰذَا وَقَالَ بَيْنَا هُوَ ذَاتَ يَوْمٍ وَسَارَةُ اِذَا اَتٰى عَلٰى جَبَّارٍ مِنَ الْجَبَابِرَةِ فَقِيْلَ لَهٗ اِنَّ هٰهُنَا رَجُلًا مَعَهُ امْرَاَةٌ مِنْ اَحْسَنِ النَّاسِ فَاَرْسَلَ اِلَيْهِ فَسَاَلَهٗ عَنْهَا مَنْ هٰذِهٖ قَالَ اُخْتِيْ فَاَتٰى سَارَةَ فَقَالَ لَهَا اِنَّ هٰذَا الْجَبَّارَ اِنْ يَعْلَمْ اَنَّكِ امْرَاَتِيْ

يَغْلِبُنِيْ عَلَيْكِ فَاِنْ سَاَ لَكِ فَاَخْبِرِيْهِ اِنَّكِ اُخْتِيْ فَاِنَّكِ اُخْتِي فِي الْاِسْلَامِ لَيْسَ عَلَى وَجْهِ الْاَرْضِ مُؤْمِنٌ غَيْرِي وَغَيْرُكِ فَاَرْسَلَ اِلَيْهَا فَاُتِيَ بِهَا قَامَ اِبْرَاهِيْمُ يُصَلِّيْ فَلَمَّا دَخَلَتْ عَلَيْهِ ذَهَبَ يَتَنَا وَلُهَا بِيَدِهٖ فَاُخِذَ وَيُرْوٰى فَغُطَّ حَتّٰى رَكَضَ بِرِجْلِهٖ فَقَالَ اُدْعِيْ اللّٰهَ لِيْ وَلَا اُضُرُّكِ فَدَعَتِ اللّٰهَ فَاُطْلِقَ ثُمَّ تَنَا وَلَهَا الثَّانِيَةَ فَاُخِذَ مِثْلَهَا اَوْ اَشَدَّ فَقَالَ اُدْعِي اللّٰهَ لِي وَلَا اَضُرُّكِ فَدَعَتِ اللّٰهَ فَا طْلَقَ فَدَعَا بَعْضَ حَجَبَتِهٖ فَقَالَ اِنَّكَ لَمْ تَاْ تِنِيْ بِاِنْسَانٍ اِنَّمَا اَتَيْتَنِيْ بِشَيْطَانٍ فَاَخْدَمَهَا هَا جَرَ فَاَتَتْهُ وَهُوَ قَائِمٌ يُصَلِّي فَاَوْمَاَ بِيَدِهٖ مَهْيَمْ قَالَتْ رَدَّ اللّٰهُ كَيْدَ الْكَافِرِ فِي نَحْرِهٖ وَاَخْدَمَ هَاجَرَ قَالَ اَبُوهُرَيْرَةَ تِلْكَ اُمُّكُمْ يَا بَنِي مَاءِ السَّمَآءِ . (متفق علیه)

اخرجه البخاری ٣٨٨/٦حدیث رقم ٣٣٥٨، واخرجه مسلم ١٨٤٠/٤حدیث رقم ٢٣٧١/١٥٤، واخرجه الترمذی ٥٣٧/٤حدیث رقم ٢٤٣٤، واحمد فی المسند ٢٨١/١۔

ترجمہ: ''حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے کبھی جھوٹ نہیں بولا سوائے تین جھوٹ کے اور ان میں سے بھی دو جھوٹ خدا تعالیٰ کی خاطر بولے تھے۔ ان میں کا ایک تو ان کا یہ قول تھا کہ ''میں آج کچھ علیل سا ہوں''۔ دوسرا ان کی یہ بات تھی ''بلکہ یہ کارنامہ ان کے بڑے نے انجام دیا ہے'' اور آنحضرت ﷺ نے فرمایا: '(سیدنا ابراہیم علیہ السلام کی زبان سے جو تیسرا جھوٹ نکلا تھا وہ ان کی یہ بات تھی کہ ''یہ میری بہن ہے''۔ اور یہ اس وقت کا قصہ ہے) جب سیدنا ابراہیم علیہ السلام اور ان کی بیوی سارہؓ (ہجرت کر کے ملک شام کی جانب سفر کر رہے تھے کہ ان) کا گزر ایک بڑے ظالم و جابر حاکم کے شہر سے ہوا (چنانچہ اس حاکم کو بتایا گیا کہ یہاں (اس شہر میں) ایک شخص آیا ہوا ہے جس کے ساتھ ایک نہایت خوبصورت خاتون ہے' اس حاکم نے (یہ سنتے ہی) ایک گماشتہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو بلانے کے لئے بھیجا اور جب حضرت ابراہیم علیہ السلام اس کے پاس گئے تو اس نے پوچھا کہ یہ خاتون کون ہے؟ یعنی اور تمہاری کیا لگتی ہے؟ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جواب دیا کہ یہ میری بہن ہے۔ پھر حضرت ابراہیم علیہ السلام سارہ رضی عنہ عنھا کے پاس واپس پہنچے اور (ان کو اس ظالم حکمران کے غلط ارادے سے خلاصی حاصل کرنے کی تدبیر بتائی اور) کہا کہ اگر اس ظالم کے علم میں یہ بات آ گئی کہ تم میری بیوی ہو تو تمہیں زبردستی مجھ سے چھین لے گا۔ پس اگر وہ (تمہارے اور میرے رشتہ کے متعلق) پوچھے تو اس کو بتانا کہ تم میری بہن ہو اور بلا شبہ ازراہِ اسلام تم میری بہن ہو (لہٰذا خود کو میری بہن بتاتے وقت دینی اخوت کی نیت رکھنا اور یہ نیت اس لئے بھی صحیح ہوگی کہ) اس کرہ ارض پر میرے اور تمہارے علاوہ کوئی اور مومن نہیں ہے۔ لہٰذا اس ظالم نے ایک گماشتہ بھیج کر حضرت سارہؓ کو طلب کیا اور اُدھر تو حضرت سارہؓ کو وہ اس کے پاس لے گیا) اِدھر حضرت ابراہیم علیہ السلام (اپنی قیام گاہ) پر نماز کی ادائیگی کے لئے کھڑے ہو گئے۔ سارہ جب اس ظالم کے پاس پہنچیں تو وہ ان کا حسن و جمال دیکھ کر از خود رفتہ ہو گیا اور تو ان سے پوچھے اور تحقیق کئے بغیر کہ انکا حضرت سارہ سے کیا رشتہ ہے اور ان کے یہ جواب دینے سے پہلے کہ وہ انکی بہن ہے وہ ان کی طرف ہاتھ بڑھانے (اور ان کی عفت و عصمت کو اپنی ہوس کا نشانہ بنانے) لگا مگر (اللہ تعالیٰ نے سارہ کی مدد کی اور وہ ظالم پکڑا گیا۔

ایک روایت میں (یا تو "فاخذ" کے بجائے یا اس لفظ کے ساتھ مزید) "فخط" کا لفظ بھی نقل کیا گیا ہے (بہرحال) وہ (عتاب خداوندی کی پکڑ کا شکار ہونے کے بعد) زمین پر اپنا پاؤں مارنے لگا (یعنی جس طرح کوئی آسیب زدہ یا مرگی میں مبتلا شخص زمین پر زور زور سے پاؤں پٹختا ہے اسی طرح وہ بھی اپنے پیر پٹخنے لگا) پھر اس نے (سارہؓ سے) کہا کہ (میں اپنے ارادۂ بد سے باز آیا تم حق تعالیٰ سے التجا کرو کہ وہ مجھے اس مصیبت سے نجات دے میں وعدہ کرتا ہوں کہ) میں تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچاؤں گا (یعنی تمہارے ساتھ کوئی تعرض نہیں کروں گا) چنانچہ حضرت سارہؓ نے دعا کی اور اس ظالم کا چھٹکارا ہو گیا' لیکن اس نے دوبارہ دست درازی کرنی چاہی اور پھر پہلے کی طرح بلکہ اس سے بھی شدید (عتاب خداوندی میں پکڑا گیا اس نے پھر (حضرت سارہؓ سے) کہا کہ حق تعالیٰ سے التجا کرو کہ وہ مجھے اس مصیبت سے نجات دے اور میں (اب صدق دل کے ساتھ یقین دلاتا ہوں کہ) تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچاؤں گا۔ حضرت سارہؓ نے پھر اللہ تعالیٰ سے دعا کی اور اس ظالم کی گلوخلاصی ہو گئی۔ اس کے بعد اس ظالم نے اپنے دربانوں میں سے کسی کو بلایا اور کہا کہ تو میرے پاس انسان کو نہیں لایا ہے (کہ جس پر قابو پا سکتا) بلکہ تم کسی جن کو میرے ہاں لے آئے ہو (کہ پر قابو تو کیا پانا ہے الٹا خود آسیف و مصیبت کا شکار ہو جاتا ہوں) یہ تو تو نے میرے لئے موت کا سامان فراہم کر دیا ہے) پھر اس نے سارہؓ کی خدمت و نوکری کے لئے ہاجرہ نام کی ایک لونڈی دی (اور ان کو واپس بھیج دیا) حضرت شاہ سیدنا ابراہیم کے پاس آئیں درآنحالیکہ وہ نماز ادا کرنے میں مصروف تھے (کیونکہ اس وقت تک ان کو اس ظالم حکمران کے شکنجہ سے سارہؓ کی رہائی کی اطلاع نہ ملی تھی' وہ بدستور نماز میں اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ تھے اور سارہؓ کی باعفت و عافیت واپسی کی التجائیں کر رہے تھے) حضرت ابراہیم علیہ السلام نے (ان کو دیکھا تو) دوران نماز میں اپنے ہاتھ کے اشارہ سے پوچھا کہ کیا حال ہے اور تم پر کیا بیتی؟ حضرت سارہؓ نے کہا کہ اللہ تعالیٰ نے اس کافر کی بدنیتی کو اسی پر الٹ دیا (یعنی اس نے مجھے اپنی ہوس کا نشانہ بنانے کے لئے جس بدنیتی کا اظہار کیا وہ الٹے اس کے گلے پڑ گئے' میرے بارے میں تو اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہو سکا البتہ خود سزائے الٰہی کا شکار ہوا۔) اور اس نے خدمت کے لئے ہاجرہ کو میرے ہمراہ بھیجا۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ (یہ حدیث بیان کرنے کے بعد) فرمانے لگے کہ اے آسمان کے پانی کے بیٹو! وہی ہاجرہ تم سب کی ماں ہیں"۔ (بخاری ومسلم)

تشریح: قوله: کم یکذب ابراهیم الاثلاث کذبات:

کذبات: ذال کے فتحہ کے ساتھ، اور ایک نسخہ میں ذال کے کسرہ کے ساتھ ہے۔

امام میرکؒ شیخ سے نقل کرتے ہوئے لکھتے ہیں: "کذبات"، اسم ہے نا کہ صیغہ صفت، چونکہ کہا جاتا ہے: کذب کذبۃ، جیسا کہ "رکع رکعۃ" اگر یہ صیغہ صفت ہوتا تو جمع میں ساکن ہوتا۔ اور ابوالبقاءؒ فرماتے ہیں: یوں کہنا بہتر ہے کہ جمع میں ذال مفتوح ہوتا ہے۔ میں کہتا ہوں اور یہ (اختلاف) شاید اس وجہ سے ہے کہ مصدر، بالکسر اور بالفتح دونوں طرح آتا ہے۔ جیسا کہ قاموس سے مفہوم ہوتا ہے۔ لیکن فتحہ چونکہ معنی اسی کے ساتھ مخصوص ہے، برخلاف کسرہ کے۔ کیونکہ کسرہ اسم اور مصدر دونوں میں مشترک ہے لہٰذا فتحہ اجود ہے۔

اس حصر پر اشکال ہوتا ہے، کہ مسلم شریف کی روایات میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کا کوکب کے باب میں ﴿هذا

ربی﴾ فرمانے کو بھی فی الجملہ کذبات میں شمار کیا گیا ہے۔

اس کا یہ جواب دیا گیا کہ یہ واقعہ زمانہ طفولیت کا ہے۔ وہ اس وقت تک مکلف نہیں ہوئے تھے، یا یہ استفہام توبیخی پر محمول ہے۔ مازریؒ فرماتے ہیں: تمام انبیاء معصوم ہیں، ان سے کوئی بھی گناہ سرزد نہیں ہوسکتا، خواہ وہ جھوٹ ہو قلیل ہو یا کثیر ہو، (یا کوئی اور معصیت ہو) کیونکہ انبیاء کرام کے بارے میں یہ کہنا کہ ان سے جھوٹ کا صدور ہوسکتا ہے، درحقیقت انبیاء کی باتوں پر سے وثوق اٹھا دیتا ہے، اس لئے کہ منصب نبوت اس سے بہت ہی بلند وبالا ہے۔ اور وہ امور جو دعوت وتبلیغ سے تعلق نہیں رکھتے اور صغائر میں شمار ہوتے ہیں، جیسا کہ دنیا کے کسی حقیر معاملہ میں کوئی ایک آدھ جھوٹ، تو اس کا وقوع ممکن ہے۔

سلف وخلف سے انبیاء کی عصمت کے بارے میں دو قول مروی ہیں:

عیاضؒ فرماتے ہیں: انبیاء سے کذب کا صدور مطلقاً نہیں ہوسکتا۔ اور جہاں تک بات ہے کذبات مذکورہ کی (یعنی انبیائے کے ان اقوال کی کہ جنہیں کذبات سے تعبیر کیا گیا ہے)، تو ان اقوال کا کذب ہونا خود ان کی ذات کے اعتبار سے نہیں، سامعین کے اعتبار سے ہے، کہ یہ تینوں باتیں صورۃً جھوٹ تھیں (مگر حقیقت میں جھوٹ نہیں تھیں)۔

میں کہتا ہوں: ہمارے علماء میں سے ایک شارح اس کی موافقت کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ ان اقوال کو کذبات کہا گیا، اگرچہ یہ تعریضات کے قبیل سے ہیں۔ ان کی علو شان کے پیش نظر یہی کہا جائے گا، کہ انہوں نے حق، کنایۃً بیان کیا۔ اور دوسرے لوگوں کے اعتبار سے یہ بمنزلہ کذب کے ہے۔ یا یہ کہ یہ باتیں چونکہ صورۃً کذب تھیں اس وجہ سے انہیں کذبات سے تعبیر کیا گیا۔

اکملؒ شرح المشارق میں لکھتے ہیں: احتمال ہے کہ اس سے کذب حقیقی مراد ہو، کیونکہ نفی سے استثناء کرنا اثبات ہے۔ لہٰذا عذر کا محتاج ہے، کہ اصلاح کی خاطر جھوٹ بولنا جائز ہے، تو ظالم کے دفع ظلم کیلئے جھوٹ بولنے کے بارے میں آپ کا کیا گمان ہے؟

ابن الملکؒ فرماتے ہیں: یہ احتمال کیسے ہوسکتا ہے حالانکہ ابراہیم علیہ السلام کا کلام خود قرینہ حالیہ ومقالیہ موجود ہے کہ انہوں نے مجازی معنی مراد لئے تھے، ظاہری معنی مراد نہیں لئے تھے، ملاحظہ ہو، ان کا حضرت سارہ سے فرمودہ یہ کلام: "انك أختي في الاسلام" تو حضرت ابراہیم علیہ السلام کا "في السلام" کہنا یہ اس بات کا قرینہ ہے کہ ان کی مراد یہ نہیں تھی کہ وہ میری نسبی بہن ہے۔

اور "بل فعله كبيرهم" کا جواب یہ ہے کہ جماد سے فعل کا صدور محال ہے، یہ استحالہ خود اس بات کا قرینہ ہے کہ حضرت ابراہیم مؤول تھے، یا مجازی معنی مراد لے رہے تھے۔ لہٰذا یہ بھی کذب نہیں۔ میں کہتا ہوں، اور خاص طور پر جب کہ "بل فعله" پر وقف کا قول بھی ہے۔ اور "كبير كم هذا": جملہ ابتدائیہ ہے۔

قوله: ثنتين منهن في ذات الله :

اثنتین منھن: یہ "ثلاث كذبات" سے بدل ہے۔

في ذات الله: اس کے کئی مطلب ہوسکتے ہیں:

(۱) دو جھوٹ خدا کیلئے بولے تھے۔

(۲) اللہ کے حکم سے بولے تھے۔

(۳) فیما یتعلق بتنزیه ذاته عن الشریك

(۴) اس سے قرآن مراد ہے۔أی: فی کلامه، اور یہ تعبیر اس وجہ سے اختیار کی گئی کہ یہ متکلم سے کبھی جدا نہیں ہوتا، جیسا کہ اشعری کی رائے ہے۔ (کذا ذکرہ ابن الملک)

(۵) ایک شارح اس کی وضاحت کرتے ہوئے فرماتے ہیں: أی: فی أمر الله وما یختص به، کیونکہ اس کلام سے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اپنی کوئی ذاتی غرض وابستہ نہیں تھی ﴿انی سقیم﴾ سے ان کی غرض یہ تھی کہ وہ اس عذر کے ذریعے سے پیچھے رہنا چاہتے تھے، تاکہ اصنام کے ساتھ یہ وہ کچھ کر گزریں، جو کچھ کہ انہوں نے کیا۔ اور "بل فعلوا" الخ سے ان کی غرض اپنے خصم کو الزام حجت دینا مقصود ہے کہ وہ گمراہ اور بے وقوف ہیں، کہ ایسی چیزوں کی پوجا میں لگے ہوئے ہیں جو چیزیں انہیں نہ نفع پہنچا سکتی ہیں اور نہ نقصان پہنچا سکتی ہیں۔

اور بعض کا کہنا ہے کہ احتمال ہے کہ مضاف محذوف ہو۔یعنی: فی کلام ذات الله یعنی دو کذبات کا ذکر اللہ تعالیٰ میں موجود ہے، تیسرے کذب کا ذکر کلام اللہ میں موجود نہیں ہے، وہ تیسرا کذب یہ تھا کہ انہوں نے حضرت سارہ کے بارے میں کہا کہ "هی أختی".

امام نوویؒ فرماتے ہیں: یہ بھی " فی ذات الله " تھا، بایں طور کہ وہ کافر و ظالم ایک فاحشہ عظیمہ کا ارتکاب کرنا چاہتا تھا، (اور آپ علیہ الصلوٰۃ والسلام کا اپنے اس کلام سے مقصود حضرت ہاجرہ کا دفاع تھا)۔ دو کا ذکر خصوصی طور پر اس لئے کیا کہ یہ دو فعل تو فی ذات اللہ تھے، البتہ تیسرا فعل ایسا تھا کہ جس میں اپنی ذاتی منفعت بھی تھی۔

صاحب المغرب لکھتے ہیں: " ذو " بمعنیٰ " صاحب " دو چیزوں کا تقاضا کرتا ہے (۱) موصوف (۲) مضاف الیہ مؤنث کیلئے کہتے ہیں: امرأة ذات مال. پھر اس لفظ کا استعمال اس کے مقتضی سے ہٹ کر ہونے لگا، اور اس اسم کو دیگر اسماء تامہ کی طرح استعمال کیا جانے لگا کہ اسے کسی دوسری چیز کی احتیاج نہیں ہوتی، مثلاً یوں کہا جانے لگا: ذات قدیمة او محدثة، بغیر کسی علامت تانیث میں تغیر کے منسوب استعمال ہونے لگا، مثلاً الصفات الذاتیة، اور لفظ "نفس" اور "شیء" کی طرح استعمال ہونے لگا۔ ابو سعید سے منقول ہے: کل شیء ذات و کل ذات شیء۔ (ہر شی ذات ہے اور ہر ذات شی ہے)

امام طیبیؒ فرماتے ہیں: " فی ذات الله " کا مطلب ہے: فی الدفع عن ذات الله ما لا یلیق بجلاله. اس کی دلیل وہ جملہ ہے جو ایک اور حدیث میں ہے:

ما فیها کذبة الا ما حل عن دین الله. أی جادل وخاصم وذب عن دین الله.

اور یہ "تعریض" کے معنی میں ہے چونکہ یہ "کنایہ" کی ایک نوع ہے۔ تعریض کی ایک قسم وہ ہے جسے "استدراج" کہتے ہیں۔ استدراج کی تعریف یہ ہے: وهو ارخاء العنان مع الخصم فی المجاراة لیعثر حیث یرید تبکیته. حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنی قوم سے گفتگو میں یہی طرز اختیار کی۔

قولہ: مرفوع ہے، اور ایک نسخہ میں مجرور ہے۔

انی سقیم: حضرت ابراہیم علیہ السلام نے یہ جملہ اس وقت ارشاد فرمایا کہ جب ان کی عید تھی اور کچھ لوگوں نے حضرت ابراہیم علیہ السلام سے اصرار کیا کہ وہ بھی ان کے ساتھ چلیں۔ حضرت کا ارادہ یہ تھا کہ نہ جاؤں اور یہیں رہتے ہوئے اپنے منصوبہ کو عملی جامہ پہناؤں، اس بات کے پیش نظر انہوں نے ایک نظر ستاروں پر ڈالی اور فرمایا: انی سقیم، ان کے اس فعل میں ایہام تھا، کہ ستاروں کی گردش سے انہوں نے استدلال کیا کہ وہ عنقریب بیمار ہو جائیں گے لہٰذا انہیں یہیں رہنے دیا جائے، اور یوں انہیں اصنام کے ساتھ دو دو ہاتھ کرنے کا موقع مل جائے گا۔

یا یہ کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اس جملہ" انی سقیم " سے اپنی جسمانی علالت مراد نہیں لی تھی بلکہ "ناسازئ قلب" مراد تھی کہ ان لوگوں نے نجوم کو معبود بنا رکھا تھا، یا چونکہ وہ بتوں کو پوجتے تھے۔

قولہ: وقولہ: بل فعلہ کبیرھم ھذا:

قولہ: یہ بھی دونوں طرح پڑھا گیا ہے۔ مذکورہ بالا واقعہ اس وقت کا ہے کہ جب انہوں نے سب مورتیوں کو توڑ پھوڑ ڈالا تھا، اور سب سے بڑے بت کے شانے پر کلہاڑا رکھ کر واپس لوٹ آئے تھے۔

کبیرھم ھذا: یعنی ان بتوں سے پوچھو اگر یہ بولتے ہیں، اس جملہ میں درحقیقت اس امر پر تنبیہ تھی کہ وہ الٰہ جو اپنے آپ کو نقصان سے نہ بچا سکا، شکست وریخت سے نہ بچا سکا، اس سے یہ توقع کیسے کی جاسکتی ہے، کہ دوسرے کو نقصان سے بچا سکے گا۔ اور دوسری تنبیہ اس بات پر تھی کہ جو ذات نطق سے عاجز ہے۔ اس میں قوت گویائی نہیں، وہ معبود بننے کی صلاحیت نہیں رکھتی، کیونکہ الٰہ تو وہ ذات ہو سکتی ہے جو کامل صفات جلالیہ اور جمالیہ سے متصف ہو۔

قولہ: وقال بینا ھو ذات ۔۔۔ قال۔۔ اختی:

وقال: یعنی آنحضرت ﷺ نے تیسرے جھوٹ کے متعلق بیان کرتے ہوئے فرمایا۔

واضح رہے کہ یہ واقعہ نمرود کی ہلاکت کے بعد کا ہے۔

سارۃ: حضرت ابراہیم علیہ السلام کی چچازاد بہن تھیں۔

أتی: امام طیبیؒ نے فرمایا: "أتی ..... :' "بینا" کا جواب ہے۔ أی بینا ھما یسیران ذات یوم، اذ أتیا علی بلد جبار من الجبابرۃ، فوشی بھما.

من ھذہ: امام طیبیؒ نے فرمایا: من ھذہ؟ سوال کا بیان ہے۔ أی: سأل الجبار من ھذہ؟

قال: أختی: یعنی دین کے اعتبار سے میری بہن ہیں۔ اور بعض کا کہنا ہے: کہ یہ جھوٹ تھا، مگر جائز تھا، بلکہ دفع ظلم کیلئے یہ جھوٹ بولنا واجب تھا، جیسا کہ شرح مسلم میں مذکور ہے۔ لیکن اس کلام کو "تعریض پر" محمول کرنا اولیٰ ہے، کیونکہ آنحضرت ﷺ کا فرمان ہے: ان فی المعاریض لمندوحۃ عن الکذب، اس حدیث کو ابن عدی اور بیہقی نے عمران بن حصین سے روایت کیا ہے۔ مزید یہ کہ "أختی" یہ کلام بھی تعریض سے خالی نہیں، کیونکہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے یہ نہیں کہا: ھذہ أختی یا ھی أختی.

فاتي: کا فاعل حضرت ابراہیم علیہ السلام ہیں۔

ان يعلم: ان: شرطیہ ہے۔ بمعنی "ان علم" ہے۔

يغلبني عليك: یعنی تمہیں مجھ سے زبردستی ظلماً چھین لے جائے گا۔

فان سالك: یعنی بالفرض اگر تمہیں اس ظالم کے پاس پہنچادیا گیا اور وہ تم سے تمہارا نسب اور تمہاری نسبت پوچھے۔

فاخبريه أنك أختي: یعنی اس کے سامنے وہی رشتہ ظاہر کرنا جو میں نے بتلایا ہے۔

فانك أختي في الاسلام:

اور یہ بات بالکل حقیقی تھی، کیونکہ وہاں کوئی تیسرا آدمی ایسا نہ تھا کہ جسے یہ دین کی نسبت حاصل تھی۔

ليس...... غيرك: جار مجرور" لیس " کی خبر محذوف کے متعلق ہے۔ أی: موجود. امام طیبیؒ فرماتے ہیں:" **فانك أختي في الاسلام**" سے مراد اللہ جل شانہ کا یہ فرمان تھا: ﴿**انما المؤمنون اخوة**﴾ [الحجرات۔۱۰] "مسلمان تو سب بھائی ہیں" یعنی ایمان، اہل ایمان کے مابین اخوت کا ایسا رشتہ قائم کردیتا ہے، جو ہر رشتہ سے بڑھ کر ہوتا ہے۔ کیونکہ روئے زمین پر میرے اور تیرے سواء کوئی مؤمن نہیں ہے۔ (انتہیٰ)

لیکن اس موقع پر یہ اشکال ہوتا ہے، کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے سرزمین پر صرف دو مؤمنوں کے وجود کی خبر دی، حالانکہ قرآن کریم ایک تیسرے مؤمن کے وجود کی شہادت دے رہا ہے۔ ﴿**فا من له لوط**﴾ [العنکبوت۔۲۶] اس کا یہ جواب ممکن ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی" **علی وجه الأرض** " سے مراد یہ تھی کہ اس وقت اس شہر میں جہاں یہ واقعہ پیش آیا تھا ہم دونوں کے علاوہ کوئی اور مؤمن نہیں، اور اس وقت حضرت لوط علیہ السلام بھی اس شہر میں موجود نہیں تھے۔ (ذکرہ العسقلانی)

بعض کا کہنا ہے کہ سیاسی احکامات میں اس بادشاہ کا دین یہ تھا کہ صرف شادی شدہ خواتین سے ہی تعرض کرتا تھا۔ اس کا گمان تھا کہ جب بیوی اپنے شوہر کو اختیار دے سکتی ہے تو بادشاہ کو قدرت دینے سے روکنے کا اختیار نہیں بلکہ بادشاہ، شوہر کے مقابلے میں زیادہ حقدار ہے۔ اور بے شوہر والیوں پر دست درازی کی کوئی صورت نہیں' الا یہ کہ وہ راضی ہوں۔

یا یہ کہ اس جابر کی عادت تھی کہ کسی شخص سے اس کی بہن کو نہیں چھینتا تھا، اور ان پر دست درازی نہیں کرتا تھا، الا یہ کہ وہ خود راضی ہو۔

اور یہ احتمال بھی ہے کہ اگر بادشاہ کو پتہ چل جاتا کہ وہ ان کی بیوی ہے تو ہوسکتا ہے کہ طلاق دینے پر مجبور کردیتا یا انہیں حاصل کرنے کی حرص میں حضرت ابراہیمؑ کو قتل کرنے کا ارادہ کرلیتا۔

اور بعض کا کہنا ہے کہ بادشاہ کا مذہب یہ تھا کہ انبیاء کی قرابات سے تمتع وتزوج حلال نہیں۔

قام ابراهيم : جملہ مستانفہ بیانیہ ہے۔ گویا کہ کسی کہنے والے نے کہا: **فما ذا فعل بعد؟** (تو اس کے بعد انہوں نے کیا؟) تو جواب دیا: **قام ابراهيم**. (یعنی ابراہیمؑ کھڑے ہوگئے)

يصلي: جملہ حالیہ ہے۔ یا مستانفہ تعلیلیہ ہے۔ چنانچہ اللہ جل شانہ کے اس فرمان: ﴿**يا أيها الذين آمنوا استعينوا بالصبر والصلوٰة**﴾ [البقرۃ۔۱۵۳] کے موجب پر عمل پیرا ہوتے ہوئے نماز پڑھنے کیلئے کھڑے ہوگئے، جیسا کہ ہمارے

آنحضرت ﷺ کی عادت مبارکہ تھی۔ امام احمد، اور ابوداؤد حضرت حذیفہؓ سے نقل کرتے ہیں:

كان ﷺ اذا حزبه أمر صلى.

فلما دخلت: صیغہ معروف کے ساتھ ہے، اور ایک نسخہ میں "ادخلت" ہے۔

عليه: کی ضمیر "جبار" کی طرف عائد ہے۔

ذهب يتناولها بيده: یعنی پکڑنے لگا یا چھونے لگا۔ یعنی بغیر کسی سوال وجواب کے یا سوال وجواب تو کر چکا تھا، لیکن ان کے حسن وجمال کی وجہ سے وہ شہوت کے ہاتھوں مجبور ہو چکا تھا۔

ادعي الله لي: لام تعلیلیہ ہے۔ أي: لأجلي الخلاص. (تم میرے لئے اللہ سے دعا کرو کہ وہ مجھے اس مصیبت سے نجات دے دے۔)

فاطلق: یعنی وہ پکڑ ختم ہوگئی۔

ثم تناولها الثانية: یعنی دوبارہ پکڑنے کا ارادہ کیا۔

فأخذ مثلها: (وہ ان کا حسن وجمال دیکھ کر از خود رفتہ ہو گیا اور) بغیر کوئی سوال وجواب کئے ان پر دست درازی کرنے لگا۔ یا سوال وجواب کے بعد یہ ناپاک کام کرنا چاہا۔

فأخذ ثلاثی مجرد سے صیغہ مجہول کے ساتھ، أي: **حبس نفسه وضغط:** (یعنی اس کا گلا گھٹنے لگا حتی کہ گلے سے آواز سنائی دینے لگی۔)

اور ابن الملکؒ فرماتے ہیں: " **فاخذ**" بصیغۂ مجہول ہے۔ أي: **حبس عن امساكها، او عوقب بذنبه، او اغمي عليه**

اور ایک نسخہ میں خاء کی تشدید کے ساتھ ہے۔ شارح کا کہنا ہے: **فاخذ،** "تاخيذ" سے مبنی للمجہول ہے، **أي هو استجلاب قلب شخص برقية او غيرها، كالسحر بحيث يصل له خوف او هيمان أو جنون.** (قالہ العسقلانی)۔

فأخذ کو مخفف پڑھنے کی تائید مؤلفؒ کے اس قول سے ہوتی ہے۔ "ویروی" یعنی" **فأخذ**" کی بجائے (یا اس لفظ کے ساتھ مزید) "**فغط** " کا لفظ بھی نقل کیا گیا ہے۔

فغط: غین معجمہ کے ضمہ او طائے مہملہ کی تشدید کے ساتھ بمعنی **خنق.**

حتى ركض برجليه :

ابن الملکؒ نے فرمایا: **أي حصر حصراً شديداً**، اور کہا گیا ہے کہ " **غط** " یہاں "خنق" کے معنی میں ہے۔ أي: **أخذ بمجامع مجاري نفسه حتى يسمع له غطط نخير وهو صوت بالأنف،**

عسقلانیؒ نے فرمایا: **أي اختنق حتى صار كالمصروع.**

فأخذ مثلها: ہاء ضمیر "**الأخذة الأولى** "کی طرف عائد ہے۔

او أشده: صلہ محذوف ہے: **أي بل أشد منها.**

حجبته: حاء اور جیم دونوں کے فتحہ کے ساتھ، حاجب کی جمع ہے۔ جس طرح طلبه، طالب کی جمع ہے۔

لم تاتنی بانسان: تو میرے پاس انسان کو نہیں لایا کہ جس پر میں قابو پالیتا۔

انما اتیتنی شیطان: بلکہ تو کسی جن کو میرے پاس لایا ہے کہ اس پر قابو پانے کے بجائے اس نے مجھے پچھاڑ دیا اور مجھے قتل کرنے کا ارادہ ہے۔

امام طیبیؒ فرماتے ہیں: '' انما أتیتنی شیطان'' سے اس کی مراد یہ تھی کہ تم میرے پاس کوئی متمرّد جن لے آئے ہو، یہ لوگ جنات سے بہت زیادہ ہیبت کھاتے تھے، اور جنات کے معاملات کو بہت بڑا سمجھتے تھے۔

فاخدمها هاجر: کا مطلب ہے: جعل الجبار هاجر خادمة لسارة، جب اس حاکم نے حضرت سارہؓ کی بزرگی کا اس طور پر مشاہدہ کیا اور جان لیا کہ یہ کوئی معمولی عورت نہیں ہے، بلکہ اپنے خدا کے نزدیک بہت بلند و بالا مقام و مرتبہ اور کمال درجہ کا تقرب رکھتی ہے، یا تلافی مافات کیلئے، کیونکہ حضرت سارہ سے تعرض کر کے انہیں دلی صدمہ پہنچایا تھا۔

فاتته: ضمیر فاعل کا مرجع حضرت ابراہیم علیہ السلام ہیں۔

وهو قائم يصلي: کیونکہ اس وقت تک ان کو اس ظالم کے پنجہ سے سارہ کی رہائی کی خبر نہیں ہوئی تھی۔ یا یہ کہ سارا معاملہ کھل کر سامنے آچکا تھا، اور پہلے سے زیادہ عبادت میں مشغول ہو گئے، تاکہ ''عبد صبور'' کے درجہ سے ترقی کر کے ''عبد شکور'' کے رتبہ پر فائض ہو جائیں۔ پہلے احتمال کی تائید اگلے جملے سے ہوتی ہے۔

فأوما: دوہرے ہمزہ کے ساتھ، بمعنی أشار، اور ضمیر کا مرجع ابراہیم ہیں۔ یعنی بحالتِ نماز حضرت سارہؓ کی طرف اشارہ کیا۔

مهيم: میم کے فتحہ اور ہاء کے سکون کے ساتھ، بمعنی ما شأنك و ما بالك؟ یہ کلمہ یمانیہ ہے، استفہام کیلئے مستعمل ہے، اور یہاں '' أو ما'' کی تفسیر کیلئے ہے۔ أي: أوما بيده بما يفهم منه معناه.

''مهيم'' یہ '' أو ما'' کا ترجمہ نہیں ہے، وگرنہ تو یوں کہنا چاہئے تھا: فأوما بيده وقال: مهيم؟

قالت: رد الله كيد الكافر في نحره أي: على صدره. حضرت سارہؓ کا یہ جملہ قرآن کریم کے اس جملہ کی ترجمانی کرتا ہے: ﴿ولا يحيق المكر السيىء الا بأهله﴾ [فاطر-۴۳] ''اور بری تدبیروں کا وبال (حقیقی) ان تدبیروں والوں ہی پر پڑتا ہے''۔

اور اسی قبیل سے آنحضرت ﷺ کی یہ دعاء ماثورہ ہے: اللّٰهم انا نجعلك في نحورهم، ونعوذبك من شرورهم.

'' هاجر '': اس سے مراد حضرت اسماعیل علیہ السلام کی والدہ ہیں۔

بعض نے '' هاجر'' کی وجہ تسمیہ یہ بیان کی ہے، کہ انہوں نے شام سے مکہ کی طرف ہجرت کی تھی۔

بعض کا کہنا ہے کہ حضرت سارہؓ کے ہاں اولاد نہ ہوتی تھی، حضرت سارہ نے ابراہیم علیہ السلام سے کہا: مجھے امید ہے، کہ اس کے بطن سے آپ کے یہاں کوئی بچہ ہوگا، ان دونوں حضرات ابراہیم علیہ السلام کی عمر مبارک سو (۱۰۰) برس تھی، (نقلہ ابن الملکؒ)

قوله:قال ابو هريرة تلك امكم يابنى السماء:

أمكم: مراد حضرت ہاجرہ ہیں۔"أمّ" سے مراد "جدۃ" ہیں۔

يا بنى ماء السماء: قاضیؒ نے فرمایا: بعض کا کہنا ہے کہ" يا بنى ماء السماء " کا خطاب اہل عرب سے ہے اہل عرب کو بنی ماء السماء اس لئے کہا کہ وہ بارش کے انتظار میں رہا کرتے تھے، ان کے گزر بسر کا سارا دارومدار بارش پر تھا۔ اگرچہ تمام اہل عرب حضرت ہاجرہؓ کے بطن سے نہیں تھے، لیکن ان میں سے اکثر و بیشتر حضرت اسماعیل علیہ السلام ہی کی اولاد میں سے تھے، اسلئے اکثر واغلب کا اعتبار کرتے ہوئے تمام اہل عرب کو"بنی ماء السماء" سے خطاب کیا گیا۔

بعض کا کہنا ہے کہ"بنی ماء السماء" سے مراد انصار ہیں۔ کیونکہ وہ عامر بن حارثہ الازدی کی اولاد ہیں جو نعمان بن منذر کا دادا تھا، اور اس کا لقب"ماء السماء" تھا، چونکہ اس کے ذریعہ بارش طلب کی جاتی تھی۔

اور ایک احتمال یہ ہے کہ "بنی ماء السماء"سے مراد"بنو اسماعیل" ہوں، اور ان کو"بنی ماء السماء" کہنا ان کے نسبی ونسلی شرف عظمت کے اظہار کے طور پر تھا۔

ابن الملکؒ نے فرمایا: بعض کا کہنا ہے کہ"بنی ماء السماء" سے بنو اسماعیل کی طرف اشارہ ہے کہ وہ حضرت ہاجرہ کی اولاد میں سے تھے، اور زمزم کا چشمہ حضرت اسماعیل علیہ السلام کی وجہ سے پھوٹا تھا، اور اس کا پانی آسمان سے (زمین پر آیا) تھا۔ واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم۔

امام طیبیؒ فرماتے ہیں: اگر آپ یہ کہیں کہ صادق ومصدوق نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام، حضرت ابراہیم علیہ السلام کی براءت کا اظہار فرما رہے ہیں، اور دوسری طرف حدیث شفاعت میں ہے کہ وہ اپنے خلاف حجت قائم فرما رہے ہیں: **وانی کنت کذبت ثلاث کذبات فذکرھا، ثم قال نفسی نفسی نفسی** تو ایسا کیوں ہے؟ یہ ہیں تو معاریض ان کو کذب قرار دینا تو"اخبار الشیٔ علی خلاف ما ھو بہ" کے قبیل سے ہے۔

میں کہتا ہوں اگرچہ ہم نے توریہ کا اعتبار کرتے ہوئے اس کلام کو کذبات کے مفہوم سے خارج کر دیا ہے، اس کو معاریض کہا ہے، تو بلاشبہ اس صورت مسئلہ کا ظاہر راہ مستقیم سے ہٹا ہوا ہے۔ چنانچہ حبیب نے نامناسب ہونے کے باعث براءت خلیل کے مقصد کے پیش نظر اس کو معاریض کہا، اور خلیل کی نظر رتبۂ شفاعت پر تھی اور وہ حبیب کے ساتھ مخصوص تھی، (انہوں نے) اپنے اس کلام کو"کذبات" سے تعبیر کیا۔

۵۷۰۵ : وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نَحْنُ اَحَقُّ بِا لشَّكِّ مِنَ الْاِبْرَاهِيْمَ اِذْ قَالَ رَبِّ اَرِنِیْ كَيْفَ تُحْيِ الْمَوْتٰى وَيَرْحَمُ اللّٰهُ لُوْطًا لَقَدْ كَانَ يَاْوِی اِلٰى رُكْنٍ شَدِيْدٍ وَلَوْ لَبِثْتُ فِی السِّجْنِ طُوْلَ مَا لَبِثَ يُوْسُفُ لَاَجَبْتُ الدَّاعِیَ (متفق علیه)

اخرجه البخاری ٤١٠/٦ حديث رقم ٣٣٧٢، واخرجه مسلم ١٨٣٩/٤ حديث رقم (١٥٢-١٥١) واخرجه ابن ماجه ١٣٣٥/٢ حديث رقم ٤٠٢٦ واحمد فی المسند ٣٢٦/٢۔

ترجمہ:"حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے بیان فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:"ہم سیدنا ابراہیم علیہ السلام

سے بڑھ کر شک کرنے کے لائق ہیں' جب انہوں نے عرض کیا تھا رَبِّ اَرِنِیْ کَیْفَ تُحْیِ الْمَوْتٰی (اے پروردگار! مجھے دکھا دے کہ تو مردوں کو کیسے زندگی بخشے گا) اور حق تعالیٰ حضرت لوط علیہ السلام پر رحم فرمائے جو زبردست سہارے کی پناہ لینا چاہتے تھے۔ اور اگر میں قید خانے میں اتنی طویل مدت تک رہتا جتنی مدت حضرت یوسف علیہ السلام رہے تو میں بلانے والے کی دعوت کو ضرور قبول کر لیتا''۔ (بخاری ومسلم)

تشریح: قوله: عن احق بالشك ... رب دلى كيف تحى: الموتى:

مکمل آیت یوں ہے: ﴿قال أولم تؤمن قال بلٰى ولكن ليطمئن قلبى﴾

ابن الملکؒ نے فرمایا: آنحضرت ﷺ کی مراد یہ تھی کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام سے یہ کلام شک کی وجہ سے صادر نہیں ہوا، بلکہ مزید علم کی طلب کی خاطر تھا، اور اس اضافہ کا میں اُحق ہوں، کیونکہ اللہ جل شانہ کی طرف سے میں مأمور ہوں: ﴿قل رب زدنى علما﴾ [طٰہٰ: ۱۱۴] ''اور آپ یہ دعا کیا کیجئے اے میرے رب میرا علم بڑھا دیجئے'' اور لفظ'' اشك '' کا استعمال بطریق ''مشاکلت'' فرمایا۔

امام مزنیؒ نے فرمایا: اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر شک وتردد حضرت ابراہیم علیہ السلام میں راہ پا سکتا تو یقیناً ہم میں بھی راہ پاتا، کہ ہم اس کے زیادہ حقدار ہیں، اور تم یہ جانتے ہو کہ مجھ میں شک وتردد کا کسی طرح گزر نہیں ہوا، تو جان لو! کہ حضرت ابراہیم (بھی) ہماری ہی طرح (کمال ایقان وعرفان کے درجہ پر فائز) تھے، (ان کے دل ودماغ میں بھی کسی طرح کا کوئی تردد وشک راہ نہیں پا سکتا)۔ آنحضرت ﷺ کا حضرت ابراہیمؑ کو اپنے اوپر ترجیح دینا انکسار وتواضع کے طور پر تھا، یا یہ کہ آپ ﷺ کا یہ ارشاد: **نحن أحق بالشك من إبراهيم**، اس وحی: '' **أنا خير ولد آدم**'' کے آنے سے پہلے کا ہے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے اس سوال کا منشأ علم یقین سے اور آگے بڑھ کر عین الیقین کے درجہ پر پہنچنا تھا، جب حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے یہاں کے مشرکوں (کے قلب ودماغ میں خدائے واحد کا یقین پیدا کرنے کیلئے ان کے سامنے) یہ دلیل پیش کی کہ میرا رب تو وہ ہے جو زندگی بخشتا ہے اور موت دیتا ہے تو اس موقع پر آپؑ نے (اللہ سے) یہ سوال کیا، تا کہ ان کی دلیل آنکھوں کے سامنے بھی آ جائے۔

خطابیؒ اس کی وضاحت کرتے ہوئے فرماتے ہیں: آنحضرت ﷺ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے تئیں جو کچھ ارشاد فرمایا وہ از راہ انکسار وتواضع تھا، یہ اس بات کا اعتراف نہیں ہے کہ آنحضرت ﷺ کو خود بھی شک تھا اور ابراہیم علیہ السلام کو بھی تھا، بلکہ اس جملہ میں دونوں سے شک کی نفی کرنا مقصود ہے۔ یعنی جب مجھے کوئی شک نہیں' اور احیائے موتی کے سلسلہ میں باری تعالیٰ کی قدرت کے بارے میں کوئی شبہ نہیں ہے تو حضرت ابراہیمؑ تو اولیٰ ہیں کہ وہ اس بارے میں شک وارتیاب نہ کریں۔ نیز اس میں آگاہی ہے کہ حضرت ابراہیم کا یہ سوال کرنا شک کی بناء پر نہیں تھا بلکہ طلب زیادت علم کی خاطر تھا۔ اور احیائے موتی کی کیفیت کی معرفت حاصل کرنا چاہتے تھے' نفس کو جس قدر طمانینت علم کیفیت سے ہوتی ہے' اس قدر طمانینت ''علم امنیہ'' سے نہیں ہوتی اور علم بہر دو صورت حاصل ہے اور شک (یہاں ویسے بھی) مرفوع ہے۔

مصابیح کے بعض نسخوں میں: نحن أحق من ابراهيم کے الفاظ ہیں، یعنی ''بالشك'' کے الفاظ نہیں ہیں۔ چنانچہ ایک

شارح لکھتے ہیں: أى نحن أحق منه بالسؤال الذى سأله. يريد به تعظيم أمره، وأن سؤاله هذا لم يكن لنقصان في عقيدته، بل لكمال فكرته، وعلو همته الطالبة لحصول الاطمئنان بالوصول الى درجة العيان، فرماتے ہیں بعض روایات میں یوں ہے نحن أحق بالشك من ابراهيم عليه الصلوٰة والسلام اور اس کا مطلب وہی ہے جو ہم نے ذکر کیا۔

قوله: ويرحم الله لوطا:

بعض حضرات کا کہنا ہے کہ اس انداز سے کلام کی ابتداء کرنا یہ ایک خاص اسلوب ہے، وہ یہ کہ جب کسی شخص کے ایسے قول وفعل کا ذکر کرتے ہیں، جو تقصیر سے تعلق رکھتا ہو، یا اس شخص کو وہ کام یا کلام نہ کرنا چاہئے تھا، تو کہتے ہیں ''رحم الله''، اللہ اس شخص پر رحم کرے، یا اللہ اس شخص کو معاف فرما، کہ اس نے ایسا کام کیا یا ایسی بات کہی۔ ''يرحم الله لوطا'' کلام کی اسی نوع سے تعلق رکھتا ہے جس نوع سے یہ آیت کریمہ ہے: ﴿عفا الله عنك لم أذنت لهم﴾ [التوبة-۴۳] ''اللہ تعالیٰ نے آپ کو معاف (تو) کردیا (لیکن) آپ نے ان کو (ایسی جلدی) اجازت کیوں دی تھی''

ابن الملک رحمہ اللہ فرماتے ہیں: اس جملہ میں حضرت لوط علیہ السلام کی تقصیر کی طرف اشارہ ہے۔ ایک شارح قاضی رحمہ اللہ کی اتباع کرتے ہوئے لکھتے ہیں: وكأنه استغرب منه وعده بادرة، اذ لا ركن أشد من الركن الذى كان يأوى اليه وهو عصمة الله وحفظه، اور میرے نزدیک یہ معنی اخذ کرنا ادب کا طریقہ نہیں ہے۔ کیونکہ نبی کریم زندہ ومردہ عام لوگوں کی غیبت کرنے سے منع فرماتے تھے تو یہ کیسے تصور کیا جاسکتا ہے کہ نبی کریم کسی نبی کے بارے میں کوئی ایسی بات فرمائیں گے جو نبی کے رتبہ میں نقص کا وہم پیدا کرتی ہو یا اس کی علو ہمت سے تنزل کا وہم پیدا کرتی ہو۔ پس مطلب یہ ہوا کہ وہ جبلت بشریہ کے مقتضی کے مطابق بعض امور سور ضرور یہ میں عشرہ قویہ کی استعانت کی طرف مائل تھے پس ہمارے لئے اس قسم کا محال جائز ہے چونکہ ہم تعلق بالدسباب مع الاعناد علی رب اصدر باب کے معاملہ میں ارباب کمال کی متابعت کے مامور ہیں۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

مذکورہ بالا تقریر وتحریر کو الجامع الصغیر کی اس روایت سے بھی تقویت ملتی ہے، جس کو امام حاکم نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً روایت کیا ہے:

رحم الله لوطاً كان يأوى الى ركن شديد، وما بعث الله بعده نبيا الا فى ثروة من قومه.

اور اسی قبیل سے یہ ارشاد باری تعالیٰ ہے جس میں حضرت شعیب علیہ الصلوٰۃ والسلام کی حکایتِ حال ہے:

﴿ولو لا رهطك لرجمناك وما أنت علينا بعزيز﴾ [هود-۹۱] ''اور اگر تمہارے خاندان کا پاس نہ ہوتا تو ہم تم کو (کبھی کا) سنگسار کر چکے ہوتے اور ہماری نظر میں تمہاری تو کچھ خیر ہی نہیں''۔

اور ایسا ہی معاملہ ہمارے نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام کا تھا، کہ آپ آبی طالب وغیرہ کے قریبی ہونے کی وجہ سے معظم ومکرم اور محفوظ تھے۔ اس آیت کریمہ میں اس طرف اشارہ ہے: ﴿ألم يجدك يتيما فآوىٰ﴾ [الضحى-۶]

قوله: ولو لبثت فى السجن طول ~~ما لبث~~ يوسف:

جیسا کہ مروی ہے کہ نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام کسی راستہ پر کھڑے ہوئے اپنی کسی زوجۂ مطہرہ سے کچھ گفتگو فرما رہے تھے کہ آپ علیہ الصلوٰۃ والسلام کے کسی صحابی کا وہاں سے گزر ہوا، تو آپ علیہ الصلوٰۃ والسلام نے واضح فرما دیا کہ یہ میری فلاں زوجہ طاہرہ ہے۔ یہ سن کر وہ صاحب فرمانے لگے: یارسول اللہ! کیا آپ کے بارے میں بھی کوئی گمان کیا جا سکتا ہے؟ آنحضرت ﷺ نے فرمایا: ان الشیطان لیجری من ابن آدم مجری الدم لیکن حضرت یوسفؑ نے صبر کیا۔

تورپشتی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

یہ بعینہٖ وہی بات ہے جو ہم نے ماقبل میں ذکر کی ہے، جیسا کہ مخفی نہیں۔ بعض حضرات کا کہنا ہے کہ اس حدیث مبارکہ میں حضرت یوسف علیہ الصلوٰۃ والسلام کی تقصیر کی طرف اشارہ ہے، بایں طور کہ انہوں نے ''ترک وسائل'' نہیں کیا اور پیش آمدہ امور کو اللہ کے سپرد نہیں کیا۔ میں کہتا ہوں مباشرت اسباب، تفویض الأمر الی اللہ کے منافی نہیں ہے، بلکہ بعض عارفین فرماتے ہیں: ان مرتبة الجمع هي مباشرة السبب مع ملاحظة عمل الرب.

بعض حضرات کا کہنا ہے کہ اس حدیث میں سیدنا حضرت یوسف علیہ الصلوٰۃ والسلام کی تقصیر کی طرف اشارہ ہے، وہ یوں کہ آپ علیہ الصلوٰۃ والسلام اللہ کے رسول تھے، چنانچہ اس وجہ سے آپ نے اہل سجن کو دعوت (الی اللہ) دی: ﴿أرباب متفرقون خیر﴾ [یوسف۔۳۹]، اور اس وقت تک بادشاہ کو دعوت دینے کی کوئی صورت نہ تھی، چنانچہ جب دعوت کا موقع ملا تو اپنے ذاتی مسئلہ یعنی براءت نفس کو حق اللہ یعنی دعوت الی اللہ پر مقدم کیا۔

میں کہتا ہوں یہ ظاہر البطلان ہے، خواہ ان کو رسول عام فرض کیا جائے یا خاص۔ بہر تقدیر براءت نفس کا معاملہ، آزادی کے مقابلہ میں اہم تھا، تا کہ کسی طاعن کو ان کے بارے میں طعن کا موقع نہ ملتا، اور ہماری اس بات کی دلیل مندرجہ ذیل روایات ہیں۔

ابن جریر اور ابن مردویہ نے حضرت ابوہریرہ سے مرفوعاً نقل کیا ہے:

رحم الله یوسف علیه السلام أن کا ن لذاأناه حلیما الوکنت انا المحبوس ثم ارسل الیه لخربت سربعا۔

اور ایک مرسل روایت میں یوں ہے: رحم الله في یو سف اوأنا أتا تی الرسول بعد یول الجمس لأسرعت الاجابة حین قال: ﴿ ارجع الی ربك فاسأله مابال السنوة﴾ [یوسف۔۵۰] آپ نے فرمایا کہ تم اپنی سرکار کے پاس جا پھر اس سے دریافت کر کہ (کچھ تم کو خبر ہے) ان کو عورتوں کا کیا حال ہے'' اس حدیث کو امام احمد نے ''الزھد'' میں اور ابن المنذر نے حسن سے روایت کیا ہے۔

۵۷۰۶ : وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ مُوسٰى كَانَ رَجُلاً حَيِيًّا سِتِّيْرًا لَا يُرٰى مِنْ جِلْدِهٖ شَیْءٌ اسْتِحْيَاءً فَاٰذَاهُ مَنْ اٰذَاهُ مِنْ بَنِیْ اِسْرَائِيْلَ فَقَالُوْا مَا تَسَتَّرَ هٰذَا التَّسَتُّرَ اِلَّا مِنْ عَيْبٍ بِجِلْدِهٖ اِمَّا بَرَصٌ اَوْ اُدْرَةٌ وَاِنَّ اللّٰهَ اَرَادَ اَنْ يُّبَرِّئَهٗ فَخَلَا يَوْمًا وَحْدَهٗ لِيَغْتَسِلَ فَوَضَعَ ثَوْبَهٗ عَلٰى حَجَرٍ فَفَرَّ الْحَجَرُ بِثَوْبِهٖ فَجَمَعَ مُوْسٰى فِیْ اَثَرِهٖ يَقُوْلُ ثَوْبِیْ يَا حَجَرُ ثَوْبِیْ يَا حَجَرُ حَتّٰى اِنْتَهٰى اِلٰى مَلَاءٍ مِّنْ بَنِیْ اِسْرَآئِيْلَ فَرَاَوْهُ عُرْيَانًا اَحْسَنَ مَا خَلَقَ اللّٰهُ وَقَالُوْا وَاللّٰهِ مَا بِمُوْسٰى مِنْ بَاسٍ

وَاَخَذَ ثَوْبَهٗ وَطَفِقَ بِالْحَجَرِ ضَرْبًا فَوَاللّٰهِ اِنَّ بِالْحَجَرِ لَنَدَبًا مِّنْ اَثَرِ ضَرْبِهٖ ثَلٰثًا اَوْ اَرْبَعًا اَوْ خَمْسًا.

(متفق علیه)

اخرجه البخاری ۳۸۵/۱حدیث رقم ۲۷۸، واخرجه مسلم ۱۸٤۱/٤حدیث رقم (۱۵٦-۳۳۹) واخرجه الترمذی ۳۳۵/۵حدیث رقم ۳۲۲۱، واحمد فی المسند ۵۱٤/۲۔

ترجمہ: ''حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''موسیٰ علیہ السلام ایک انتہائی شرمیلے اور پردہ سخت اہتمام فرمانے والے انسان تھے' ان پر شرم وحیا اس قدر غالب تھی کہ ان کے بدن کی کھال کہیں سے بالکل بھی دکھائی نہ دیتی تھی' ایک مرتبہ بنی اسرائیل کے کچھ ایسے لوگوں نے جو آپ کو تکلیف واذیت دینے کے درپے رہتے تھے ان کو اذیت دی (بایں صورت کہ) انہوں نے مشہور کر دیا کہ موسیٰ علیہ السلام کا اپنے جسم کو اس قدر احتیاط واہتمام کے ساتھ ڈھانپنا ضرور کسی ان کے جسمانی عیب کی وجہ سے ہے یا تو برص (کوڑھ) ہے یا خصیے پھولے ہوئے ہیں۔ (جب یہ بات بہت پھیل گئی تو) اللہ تعالیٰ نے چاہا کہ موسیٰ علیہ السلام پر جو عیب لگایا جا رہا ہے وہ ان کو اس سے بری ثابت کرے اور ان کی بے عیبی کو ظاہر وثابت کرے' چنانچہ ایک روز موسیٰ علیہ السلام تنہائی میں نہانے کے لئے گئے اور اپنے کپڑے اتار کر ایک پتھر پر رکھ دیئے تو وہ پتھر ان کے کپڑوں کو لے کر بھاگنے لگا' موسیٰ علیہ السلام نے یہ (ماجرا دیکھا تو نہایت حیرانی و اضطراب کے عالم میں بے اختیار) اس پتھر کے پیچھے یہ کہتے ہوئے بھاگنے لگے کہ اے پتھر میرے کپڑے دے' ارے او پتھر میرے کپڑے دے' یہاں تک کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام دوڑتے ہوئے بنی اسرائیل کے ہجوم تک آ پہنچے' ہجوم نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کا برہنہ جسم دیکھا تو ان کو خدا کی مخلوق میں ایک بہترین اور بے عیب جسم کا انسان پایا' تب انہوں نے (بیک آواز) کہا کہ بخدا موسیٰ کا جسم ہر عیب ونقصان سے پاک ومبرا ہے اور موسیٰ علیہ السلام نے پتھر کو (لاٹھی سے) مارنا شروع کیا' خدا کی قسم موسیٰ علیہ السلام کے مارنے کی وجہ سے اس پتھر پر نشان پڑ گئے' تین نشان یا چار نشان یا پانچ نشان''۔

(بخاری ومسلم)

تشریح: **قوله: ان موسٰی کان رجلا حیسیا۔۔۔ اسرائیل:**

حییا: پہلی یائے تحتانیہ کے کسرہ، اور دوسری کی تشدید کے ساتھ، بروزن فعیل، أی: مستحیا ستیر سین کے فتحہ، تائے فوقانیہ کی تخفیف وکسرہ کے ساتھ۔ ایک شارح نے '' ستیر '' کے معنیٰ '' مستور '' بیان کئے ہیں۔ اور بظاہر یہ 'ساتر' کا مبالغہ ہے، اس کی تائید ان نسخوں سے ہوتی ہے جن میں سین اور تائے فوقانیہ مشددہ مکسور ہیں۔

''لا یری من جلده شیء'': اس کو صفت کاشفہ قرار دیا گیا ہے، مگر یہ ظاہر نہیں ہے، بلکہ مستانفہ بیانیہ ہے، کہ ان کے کثیر الستر ہونے کا بیان ہے۔

آذاہ: مدّ کے ساتھ ہے۔

قوله: فقالوا ما تستر هذا۔۔۔ اوادرة:

فقالوا: ''من'' کے معنیٰ کا اعتبار کرتے ہوئے جمع کا صیغہ لایا گیا ہے، اور ماقبل میں لفظ کا اعتبار کرتے ہوئے صیغہ مفرد لایا

گیا تھا

أدرة: ہمزہ کے ضمہ، اور دال مہملہ کے سکون کے ساتھ، نفخة الخصية (خصیہ کا پھولنا)، (على ما في النهاية)

قوله: وان الله اراد۔۔۔ مابموسٰی من باس:

يبرئه: راء کی تشدید کے ساتھ۔

وحده: "منفردا" کے معنی میں ہو کر حال ہے۔ أي: انفرد عن الناس وقتاما حال كونه منفردا.

ففر الحجر بثوبه: باء برائے تعدیہ ہے۔

أثره: ہمزہ اور ثاء دونوں کے فتحہ کے ساتھ اور کبھی ہمزہ کے کسرہ اور ثائے مثلثہ کے سکون کے ساتھ پڑھا جاتا ہے۔

ثوبي: (فعل محذوف کے لئے مفعول بہ ہے۔) أي: أعطني ثوبي. یا (مبتدا محذوف ہے۔ أي: مطلوبي ثوبي)

يا حجر کا تکرار برائے تکثیر ہے۔

فرأوه عريانا أحسن ما خلق الله: امام طیبیؒ فرماتے ہیں: "عریانا" اور "أحسن" دونوں حال ہیں کیونکہ "رؤیت" "بمعنی "نظر" ہے۔

ما بموسى: "ما" مشابہ "بلیس" ہے۔ "طفق" بمعنی "شروع" ہے۔

بالحجر ضربا: (مفعول مطلق ہے۔) أي يضربه ضربا. حرف جار فعل مقدر کے متعلق ہے، جیسا کہ اس آیت کریمہ میں ہے: ﴿فطفق مسحا بالسوق والأعناق﴾ [ص-٣٣] پھر تو میرے سامنے لاؤ سوانھوں نے ان کی پنڈلیوں اور گردنوں پر (تلوار سے) ہاتھ صاف کرنا شروع کیا"۔

قوله: فوالله ان بالحجر..... :

لندبا: نون اور دال ہر دو کے فتحہ کے ساتھ۔ (ضرب کا نشان)

ثلاثا أو أربعا أو خمسا: کا تعلق "ضرب" کے ساتھ ہے یا "ندب" کے ساتھ ہے، یہ راوی کے شک کا بیان ہے۔

امام طیبیؒ فرماتے ہیں: ثلاثا: أي ندبات ثلاثا، "ان" کے اسم کے لئے بیان وتفسیر ہے۔

٥٧٠٧ : وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بَيْنَا اَيُّوْبُ يَغْتَسِلُ عُرْيَانًا فَخَرَّ عَلَيْهِ جَرَادٌ مِّنْ ذَهَبٍ فَجَعَلَ اَيُّوْبُ يَحْثِيْ فِي ثَوْبِهٖ فَنَادَاهُ رَبُّهٗ يَا اَيُّوْبُ اَلَمْ اَكُنْ اَغْنَيْتُكَ عَمَّا تَرٰى قَالَ بَلٰى وَعِزَّتِكَ وَلٰكِنْ لَا غِنٰى بِيْ عَنْ بَرَكَتِكَ (رواه البخاري)

اخرجه البخاري ٣٨٧/١حديث رقم ٢٧٩، وابن ماجه ١٤٢٨/٢،حديث رقم ٤٢٧٤، واحمد في المسند ٢١٤/٢۔

ترجمه: "حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: "حضرت ایوب علیہ السلام (جب طویل اور سخت ترین مرض کی آزمائش میں کامیاب ہوئے اور وہ تندرستی کی نعمت سے نوازے گئے تو انہوں نے غسل صحت کیا اور اسی غسل صحت کے دوران وہ) برہنہ حالت نہا رہے تھے کہ (خدا تعالیٰ نے ان کے گھر پر سونے کی ٹڈیوں کی

بارش فرمائی اور وہ) سونے کی ٹڈیاں ان کے اوپر (یعنی دائیں بائیں) گرنے لگیں' سیدنا ایوب علیہ السلام ان ٹڈیوں کو جمع کر کے اپنے کپڑے میں رکھنے لگے (سونے کی ٹڈیوں میں ان کی یہ توجہ اور انہماک دیکھی تو) ان کے پروردگار نے ان کو مخاطب کر کے کہا کہ ایوب (علیہ السلام) جو چیز تم دیکھ رہے ہو کیا ہم نے اس سے تمہیں بے پرواہ نہیں کر دیا ہے؟ حضرت ایوب رضی اللہ عنہ نے جواباً عرض کیا! تیری عزت کی قسم بلاشبہ تو نے مجھے اس چیز سے بے پروا کر دیا ہے لیکن میں تیری برکت اور تیری نعمت ورحمت کی فراوانی سے ہرگز بے نیاز نہیں ہوں"۔ (بخاری)

تشریح: قوله: بينا ايوب يغتسل... يحثى في ثوبه:

مراد یہ ہوسکتی ہے کہ حضرت ایوب علیہ الصلوٰۃ والسلام کے جسم مبارک پر تہبند کے علاوہ اور کوئی کپڑا نہیں تھا، جیسا کہ اگلا جملہ: "يحثى في ثوبه" اس پر دلالت کر رہا ہے۔ اور یہ بھی احتمال ہے کہ وہ اس وقت کسی پوشیدہ جگہ پر بالکل برہنہ نہا رہے ہوں، جیسا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بارے میں پوشیدہ جگہ پر بالکل عریاں نہانا مذکور ہوا، اور ان کے ہاں اس کا شرعی جواز بھی تھا۔ لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس طرف اشارہ فرمایا ہے کہ اپنے مولیٰ سے شرم وحیاء کی خاطر ستر پوشی اولیٰ ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جس مکارم اخلاق کی تکمیل کے لئے دنیا میں تشریف لائے تھے، اس کا تقاضا بھی یہی تھا۔

فخر: خائے معجمہ اور رائے مشددہ کے ساتھ'

جراد: جنس مراد ہے۔

يحثى: اى يضعهفي ثوبه: كذا في النهاية.

زیادہ ظاہر یہ ہے کہ حضرت ایوب علیہ السلام برستی ہوئی سونے کی ٹڈیوں کو دونوں ہاتھوں سے یا ایک ہاتھ سے سمیٹ سمیٹ کر اس تہبند میں رکھتے جا رہے تھے، جو انہوں نے نہانے سے پہلے باندھا تھا یا بعد میں پہنا تھا، یا ثوب سے مراد وہ کپڑا ہو جو انہوں نے اس وقت تک پہنا نہیں تھا، (بلکہ ان کے قریب ہی رکھا ہوا ہو) اور مصابیح میں "يحثى في ثوبه" ہے۔ مصابیح کے ایک شارح اس کا مطلب بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں: أي: **يجمعه في ذيله ويضم طرف الذيل الى نفسه.**

قوله: فنا داه ربه ..... :

فناداه ربه: ندا "ندائے تلطف" ہے۔ امام طیبیؒ فرماتے ہیں: حضرت ایوب علیہ السلام سے اللہ تعالیٰ کا مذکورہ خطاب، اظہار ناراضگی اور عتاب کے طور پر نہیں تھا، بلکہ بطور تلطف وامتحان کے تھا، کہ کیا وہ اللہ تعالیٰ کے اس انعام پر شکر ادا کرتے ہوئے مزید شکر کرتے ہیں، اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا ولكن لاغنی الخ۔

غنى: غین کے کسرہ، نون کے فتحہ اور الف مقصورہ کے ساتھ بمعنی استغناء. اور ایک روایت میں یہ الفاظ آئے ہیں:

من يشبع من رحمتك أو من فضلك.

اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے، کہ جائز مال ودولت میں اضافہ کی حرص اس شخص کے حق میں روا ہے جس کو اپنے نفس پر اعتماد ہو، کہ اس مال ودولت پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرنے میں کوتاہی نہیں ہوگی، اور اس کو مقاصد ومصارف میں خرچ کرے گا، جن سے حق تعالیٰ راضی ہوتا ہے۔ اور اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ حلال طریقہ سے آیا ہوا مال حلال' مستقبل کے اعتبار سے برکت ہوتا

ہے۔

امام طیبیؒ فرماتے ہیں: اس کے مثل آنحضرت ﷺ کا وہ فرمان ہے جو آنحضرت ﷺ نے حضرت عمرؓ کے اس قول: '' اعطه أفقر اليه مني'' کے جواب میں ان سے ارشاد فرمایا تھا:

ما جاءك من هذا المال وأنت غير مشرف ولا سائل فخذه، وما لا فلا تتبعه نفسك.

۵۷۰۸ : وَعَنْهُ قَالَ اسْتَبَّ رَجُلٌ مِّنَ الْمُسْلِمِيْنَ وَرَجُلٌ مِّنَ الْيَهُوْدِ فَقَالَ الْمُسْلِمُ وَالَّذِيْ اصْطَفٰى مُحَمَّدًا عَلَى الْعٰلَمِيْنَ فَقَالَ الْيَهُوْدِيُّ وَالَّذِيْ اصْطَفٰى مُوْسٰى عَلَى الْعٰلَمِيْنَ فَرَفَعَ الْمُسْلِمُ يَدَهُ عِنْدَ ذٰلِكَ فَلَطَمَ وَجْهَ الْيَهُوْدِيِّ فَذَهَبَ الْيَهُوْدِيُّ اِلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَاَخْبَرَهُ بِمَا كَانَ مِنْ اَمْرِهٖ وَاَمْرِالْمُسْلِمِ فَدَعَا النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَسَاَلَهُ عَنْ ذٰلِكَ فَاَخْبَرَهُ فَقَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا تُخَيِّرُوْنِيْ عَلٰى مُوْسٰى فَاِنَّ النَّاسَ يَصْعَقُوْنَ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فَاَصْعَقُ مَعَهُمْ فَاَكُوْنُ اَوَّلَ مَنْ يُفِيْقُ فَاِذَا مُوْسٰى بَاطِشٌ بِجَانِبِ الْعَرْشِ فَلَا اَدْرِيْ كَانَ فِيْمَنْ صَعِقَ فَاَفَاقَ قَبْلِيْ اَوْ كَانَ فِيْمَنِ اسْتَثْنَى اللّٰهُ وَفِيْ رِوَايَةٍ فَلَا اَدْرِيْ اَحُوْسِبَ بِصَعْقَةِ يَوْمِ الطُّوْرِ اَوْ بُعِثَ قَبْلِيْ وَلَا اَقُوْلُ اِنَّ اَحَدًا اَفْضَلُ مِنْ يُّوْنُسَ بْنِ مَتّٰى۔

اخرجه البخاري في صحيحه ٤٤١/٦ حديث رقم ٣٤٠٨ ومسلم ١٨٤٤/٤ حديث رقم (١٦٠-٢٣٧٣) واخرجه ابو داؤد ٥٣/٥ حديث رقم ٤٦٧١، واحمد في المسند ٢٦٤/٢۔

ترجمه: '' حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا کہ ایک مرتبہ ایک مسلمان شخص اور ایک یہودی آدمی کے درمیان بدکلامی ہوگئی' مسلمان نے کہا قسم ہے اس ذات کی جس نے محمد ﷺ کو تمام جہانوں کے انسانوں سے بہترین قرار دیا ہے اس کے جواب میں یہودی نے یہ کہا کہ قسم ہے اس ذات کی جس نے موسیٰ علیہ السلام کو تمام جہانوں کے لوگوں سے بہترین قرار دیا اس پر مسلمانوں نے (طیش میں آ کر) یہودی پر ہاتھ اٹھا دیا اور اس کے گال پر طمانچہ رسید کر دیا یہودی (شکایت لے کر) نبی اقدس ﷺ کے پاس گیا اور آپ ﷺ کے سامنے اپنا اور اس مسلمان کا پورا واقعہ رکھا' نبی کریم ﷺ نے مسلمانوں کو طلب بلوایا اور اس سے صورت حال کی تحقیق کی' اس نے (یہودی کے بیان کردہ واقعہ کی تردید نہیں کی بلکہ) آپ ﷺ کو جوں کی توں ساری بات بتا دی۔ نبی اکرم ﷺ نے (فریقین کے بیانات سن کر) ارشاد فرمایا: مجھ کو موسیٰ علیہ السلام پر فضیلت نہ دو اس لئے کہ قیامت کے دن (صور پھونکے جانے پر) جب سب لوگ بے ہوش ہو کر گر جائیں گے تو ان کے ساتھ میں بھی بے ہوش ہو جاؤں گا پھر سب سے پہلے ہوش میں آنے والا شخص میں ہوں گا' مگر جب (میں ہوش میں آؤنگا تو کیا دیکھونگا کہ) موسیٰ علیہ السلام عرش کا پایہ تھامے کھڑے ہوں گے اور میں نہیں جانتا کہ موسیٰ علیہ السلام بے ہوش ہو جانے والے لوگوں میں شامل ہوں گے لیکن ان کو مجھ سے پہلے افاقہ ہو جائے گا یا یہ ہوگا کہ انہیں خدا تعالیٰ نے مستثنیٰ قرار دے دیا ہوگا (اور وہ بے ہوش کر گر پڑنے والے لوگوں میں شامل ہی نہیں ہوں گے) ایک روایت میں یوں ہے کہ اور میں

نہیں کہہ سکتا کہ آیا موسیٰ کی طور کے دن کی بیہوشی کو ہی (قیامت کے دن کی) اس بے ہوشی کی جگہ پر شمار کر لیا جائے گا یا یہ ہوگا کہ (بے ہوش ہو کر وہ بھی روز قیامت کریں گے لیکن) وہ مجھ سے بھی پہلے ہوش میں آ جائیں گے۔ (پھر آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا) اور میں تو یہ بھی نہیں کہتا کہ کوئی شخص یونس بن متی سے زیادہ فضیلت رکھتا ہے۔''

تشریح: قوله: استب رجل ۔۔۔ وامر المنم:

استب: بائے موحدہ کی تشدید کے ساتھ بمعنی شتم، از باب افتعال ماخوذ ہے (یعنی دونوں نے ایک دوسرے کو برا بھلا کہا۔)

والذی اصطفی ..... : یہاں ''محلوف علیه'' مقدر ہے۔

اصطفی موسٰی علی العالمین: اپنے زمانہ کے لوگوں میں سب سے بہتر قرار دیا، لیکن اس کے کلام کے ظاہر سے معارضہ لازم آتا تھا۔ اور اس کی بات کا حاصل یہ تھا کہ صفت اصطفاء میں انبیاء مشترک ہیں، حالانکہ یہ بات علماء کی تحقیق کے خلاف ہے، چنانچہ صحابی نے اس کی بات کی تردید کی۔

ذلك: کا مشار الیہ محذوف ہے۔: **القول الموهم لخلاف الأدب.**

فلطم وجه اليهودی: یعنی مسلم نے اس یہودی کو زبان درازی سے روکنے کے لئے اور ازراہ تادیب ایک تھپڑ رسید کر دیا۔

فسأله — عن ذلك: مشار الیہ محذوف ہے أی: **الامر.**

قوله: لاتجيزونی علی موسی:

لا تخيرونی: تاء کے ضمہ اور یاء کی تشدید کے ساتھ، '' **تخيير** '' بمعنی '' اصطفاء '' سے ماخوذ ہے۔ **أی لا تجعلونی خيرا**، یہ وہی مفہوم ہے، جو ایک حدیث میں '' **لا تفضلونی** '' کے الفاظ میں وارد ہوا ہے۔

علی موسٰی : یعنی موسیٰ علیہ السلام اور دیگر انبیاء پر مجھے ایسی فضیلت مت دو کہ جو موہم نقص ہو۔ یا لڑائی جھگڑے کا باعث بنے، چونکہ تفضیل کا معاملہ علی سبیل التفصیل قطعی نہیں ہے۔

قوله: فان الناس يصعقون ۔۔۔ استثنی الله:

فان الناس: ''ال'' استغراق کا ہے۔

يصعقون: عین کے فتحہ کے ساتھ ہے۔

يوم القيامة: یہ کیفیت نفخہ اولی کے وقت پیش آئے گی۔

فأصعق: **صعق الرجل** سے ماخوذ ہے، گھبراہٹ طاری ہونے پر بے ہوش ہو جانا، اور بعض مرتبہ موت بھی واقع ہو جاتی ہے، پھر اس لفظ کا زیادہ تر استعمال موت کے معنی میں ہونے لگا۔ یہ صعقہ ''صعقہ فزع'' ہے، بعث سے پہلے ہوگا۔

کیونکہ افاقہ کا لفظ غشی، اور بعث فی الموت دونوں کے لئے مستعمل ہے۔

فاذا موسٰی باطش: ایک شارح نے '' <u>باطش</u> '' کے معنی ''قوی'' بتائے ہیں۔ اور ظاہر یہ ہے کہ '' **آخذ** '' کے معنی میں

ہے۔

فلا ادری کان: (اس سے پہلے ہمزہ استفہامیہ محذوف ہے۔) أی: أکان.

فأفاق قبلی: اپنی مخصوص فضیلت کی وجہ سے۔

أو کان فیمن استثنی اللہ: اس استثناء سے وہ استثناء مراد ہے جو اس آیت میں ہے: ﴿**ونفخ فی الصور فصعق من فی السموات ومن فی الأرض الا من شاء اللہ**﴾ [الزمر۔٦٨] ''اور (قیامت کے روز) صور میں پھونک ماری جاوے گی سو تمام آسمان اور زمین والوں کے ہوش اڑ جاویں گے مگر جس کو اللہ چاہے'' اس کا مطلب یہ ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام بھی ان لوگوں میں سے ہونگے جن کو بے ہوش ہونے سے مستثنیٰ قرار دیا ہے۔اس اعتبار سے یہ بھی ایک عظیم منقبت ہے۔

عسقلانیؒ نے فرمایا: یعنی اگر وہ مجھ سے پہلے ہوش میں آجاتے ہیں، تو یہ کھلم کھلا فضیلت ہے، اور اگر وہ مستثنیٰ لوگوں میں سے ہوں تب بھی فضیلت ہے۔

تفضیل بین الانبیاء کی نہی اس شخص کے بارے میں ہے جو شخص اپنی رائے سے بیان کرے' اس کا تعلق اس شخص کے ساتھ نہیں ہے جو دلیل کے ساتھ بیان کرے

یا کسی دوسرے نبی کے مقابلے میں اس انداز سے افضل واشرف ہونا مت کہو کہ اس مفضول نبی کی تحقیر وتوہین ہو، یا باہم خصومت وعداوت کا سبب ہو،

یا مذکورہ ارشاد گرامی کی مراد یہ ہے کہ کسی نبی کو کسی نبی کے مقابلے میں فضل وشرف کے تمام انواع کے ساتھ اس طرح فضیلت مت دو کہ اس مفضول نبی کیلئے کوئی بھی فضیلت باقی نہ رہے۔

یا یہ کہ اس ارشاد میں نفس نبوت کے اعتبار سے فضیلت دینے کی ممانعت مراد ہے کیونکہ نفس نبوت کے اعتبار سے تمام انبیاء برابر ہیں، اور ہر نبی یکساں حیثیت رکھتا ہے۔البتہ مختلف مخصوص خصائص وفضائل کے اعتبار سے تفاضل موجود ہے۔اس کی دلیل اللہ جل شانہ کا یہ فرمان ہے: ﴿**تلك الرسل فضلنا بعضهم علی بعض**﴾ [البقرۃ۔٢٥٣] یہ حضرت مرسلین ایسے ہیں ہم نے ان میں سے بعضوں کو بعضوں پر فوقیت دی ہے''۔

اور ایک دوسری دلیل یہ آیت کریمہ ہے: ﴿**ولقد فضلنا بعض النبیین علی بعض**﴾ [الاسراء۔٥٥] ''اور ہم نے بعض نبیوں کو بعض پر فضیلت دی ہے''۔

قوله: وفی راویة .....:

بصعقة یوم الطور: مصدر کی اضافت ہے ظرف کی طرف، اور ایک نسخہ میں ضمیر کے ساتھ ہے۔ أی: **بصعقه.** ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿**فلما تجلی ربه للجبل جعله دکا وخر موسٰی صعقا**﴾ [الاعراف۔١٤٣]

صاحب قاموس فرماتے ہیں: **صعق کسمع صعقا' ویحرك وصعقة وتصعاقا، فهو صعق 'ککتف غشی علیه.**

" بعث " کے مجازی معنی افاقہ مراد ہیں، اس سے دونوں روایتوں میں تطبیق ہو جائے گی۔

اس حدیث میں جس صعقہ کا ذکر ہے یہ " نفخه فزع " کے بعث سے پہلے ہوگا، البتہ بعث میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہی سب سے مقدم ہیں، حضرت موسیٰ علیہ السلام کی یہ فضیلت جزوی ہے، اس کی بنیاد پر ان کو سابقہ انبیاء پر فضیلت حاصل نہیں ہو سکتی۔ اللہ تعالیٰ ہمیں ان کے حقوق کی معرفت عطا فرمائے، ہمیں ان ہی کی محبت پر جیتا رکھے، اور ان ہی کے طریقے پر رکھتے ہوئے ہمارا خاتمہ فرمائے۔ اور قیامت کے دن انہی کے زمرہ میں ہمارا حشر فرمائے۔

متی: میم کے فتحہ، تائے مثناۃ فوقیہ کی تشدید اور الف مقصوریٰ کے ساتھ ہے۔ بعض کا کہنا ہے کہ " متی " حضرت یونس علیہ السلام کی والدہ کا نام تھا، جیسا کہ جامع الاصول میں ہے۔ بعض کا کہنا ہے، کہ " أحد " موضع اثبات میں ہے، چونکہ معنی یہ ہیں: " لا أفضل أحدا علی یونس "

۵۷۰۹ : وَفِي رِوَايَةِ اَبِيْ سَعِيْدٍ قَالَ لَا تُخَيِّرُوْا بَيْنَ الْاَ نْبِيَآءِ (متفق عليه وفي رواية ابي هريرة) لَا تُفَضِّلُوْا بَيْنَ اَنْبِيَآءِ اللّٰهِ ـ

اخرجه مسلم في صحيحه ۱۸۴۵/۴ حديث رقم (۱۶۳-۲۳۷۴)، وابو داوٗد ۵۱/۵ حديث رقم ۴۶۶۸۔

ترجمہ: " حضرت ابو سعید رضی اللہ عنہ کی روایت یہ الفاظ ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے (دونوں فریقوں کے بیانات سماعت فرما کر) فرمایا: تم خدا تعالیٰ کے انبیاء کو باہمی طور پر فضیلت نہ دو "۔ (بخاری و مسلم) اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت کے الفاظ یہ ہیں کہ " تم اللہ کے نبیوں میں کسی ایک کو دوسرے پر برتری نہ دو۔ "

تشریح: قوله: لاتخیرو' بین الانبیاء:

تورپشتی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: " لا تخیرونی علی موسٰی " کا مطلب ہے: " لا تفضلونی علیه " میں کہتا ہوں: یہ کلام آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اولاً بطور تواضع ارشاد فرمایا تھا، پھر امت کو باز رکھنا مقصود تھا، کہ اپنی طرف سے انبیاء کے درمیان تخییر نہ کریں۔ چونکہ یہ " مفضی الی العصبیت " ہے، اور شیطان اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے کہیں افراط و تفریط میں مبتلا کر دے، بایں طور کہ فاضل کو اس کی فضیلت سے زیادہ بڑھا چڑھا کر پیش کریں اور مفضول کی فضیلت میں اور زیادہ کمی کے مرتکب ہوں اور گمراہی کی کھائی میں جا پڑیں۔ اسی اندیشہ کے پیش نظر یہ ارشاد فرمایا: لا تخیروا بین الانبیاء، یعنی اپنی خواہشات نفسانی اور اپنے رائے کی بنیاد پر مجھے بڑھا چڑھا کر پیش مت کرو، بلکہ اللہ تعالیٰ نے تمہیں جو بیان عطا فرمایا ہے (اس کی بنیاد پر مجھ سے معاملہ کرو)۔ اسی قبیل سے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد گرامی ہے:

ولا أقول ان أحدا خیر من یونس بن متی.

یعنی میں اپنی طرف سے نہیں کہتا، نبوت و رسالت کے معاملے میں ان سے بہتر کسی کو نہیں کہتا، کیونکہ نبوت و رسالت کی شان، اختلاف اشخاص سے بدلا نہیں کرتی۔ بلکہ ہم یہ کہتے ہیں، کہ جس جس کو بھی شرف نبوت سے نوازا گیا وہ سب برابر ہیں، اگر چہ ان کے مراتب مختلف ہیں، رسولوں کے بارے میں بھی ہم یہی اعتقاد رکھتے ہیں۔ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے اس آیت کریمہ میں اسی طرف اشارہ فرمایا ہے:

﴿لا نفرق بين أحد من رسله﴾ [البقرة-٢٨٥] ''کہ ہم اس کے پیغمبروں میں سے کسی میں تفریق نہیں کرتے''
آنحضرت ﷺ نے حضرت یونس علیہ السلام کا ذکر خصوصی طور پر اس وجہ سے فرمایا کہ قرآن کریم میں ان کا قصہ مذکور ہے کہ جس میں ان کا اپنی قوم کو چھوڑ چھاڑ کر چلتے جانے، قلت تحمل کا ذکر ہے، چنانچہ اللہ جل شانہ کا فرمان ہے: ﴿ولا تكن كصاحب الحوت﴾ [القلم:٤٨] ''اور (تنگدلی میں) مچھلی (پیٹ میں جانے) والے (پیغمبر یونس علیہ السلام) کی طرح نہ ہو جائیے''۔
اور ایک دوسری جگہ فرمایا: ﴿وهو مليم﴾ [الصافات-١٤٢] ''اور یہ اپنے کو ملامت کر رہے تھے''
آنحضرت ﷺ نے اس اندیشہ کے پیش نظر کہ کہیں ان کی امت کے ضعیف لوگوں کے باطن میں کوئی ایسی بات نہ گھر کر جائے کہ جس کا نتیجہ ان (یعنی یونسؑ) کی تنقیص کی صورت میں ظاہر ہو۔ تو انہیں تنبیہ فرما دی کہ یہ عمل ان کی فضیلت میں قادح نہیں، ان سے جو بھی ہوا اس تمام کے باوجود ان کی شان دوسرے انبیاء و مرسلین کی طرح ہے۔ یہ اس باب میں جامع قول ہے۔

قوله: وفي رواية لا تفضلوا بين انبياء الله:

لا تفضلوا: یعنی اکثر نسخوں میں ضاد معجمہ کے ساتھ ہے، جس طرح انبیاء کے مابین تفضیل کا قول ممنوع ہے اسی طرح رسولوں کے درمیان بھی ممنوع ہے۔ چونکہ یہ فساد اعتقاد کا سبب بنتا ہے۔ اور یہ کفر ہے۔
اور ایک نسخہ میں صاد کے ساتھ (لاتفصلوا) ہے، اور یہ بالکل ظاہر ہے۔ یعنی ان کے درمیان تفریق مت پیدا کرو۔ چونکہ اللہ جل شانہ کا فرمان ہے: ﴿لا نفرق بين أحد منهم﴾ [البقرة-١٣٦، آل عمران-٨٣]

٥٧١٠ : وَعَنْ اَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَا يَنْبَغِي لِاَحَدٍ اَنْ يَّقُوْلَ اِنِّي خَيْرٌ مِّنْ يُّوْنُسَ بْنَ مَتّٰى (متفق عليه وفي رواية للبخاري) **قَالَ مَنْ قَالَ اَنَا خَيْرٌ مِّنْ يُّوْنُسَ بْنِ مَتّٰى فَقَدْ كَذَبَ ۔**

اخرجه البخاري ٣٩٨/٦ حديث رقم ٣٣٦٥ ومسلم ١٨٤٦/٤ حديث رقمم (١٦٦-٢٣٧٦) واخرجه ابو داؤد في ٥١/٥ حديث رقم ٤٦٦٩، والدارمي في سننه ٣٩٩/٢ حديث رقم ٢٧٤٦۔

ترجمہ: ''حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: کسی کو یہ بات زیب نہیں دیتی کہ وہ یہ کہے کہ میں یونس علیہ السلام بن متی سے بہتر ہوں''۔ (بخاری و مسلم) اور بخاری کی ایک روایت میں یوں ہے کہ آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا: جو شخص یہ کہے کہ میں یونس بن متی سے بہتر ہوں تو بلاشبہ اس نے کذب بیانی کی''۔

تشریح: الجامع الصغیر میں امام سیوطیؒ نے مسلم شریف کی جو روایت ذکر کی ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ حدیث قدسی ہے۔ چنانچہ مسلم کی روایت میں ہے:

عن أبي هريرة: قال الله تعالى: لا ينبغي لعبد أن يقول: أنا خير من يونس بن متي.

امام خطابیؒ فرماتے ہیں: حضرت یونس علیہ السلام کا نام ذکر کرنے کی وجہ یہ ہے کہ اللہ جل شانہ نے ''اولو العزم من الرسل'' میں ان کا ذکر نہیں فرمایا، (بلکہ یوں) فرمایا:
﴿فاصبر لحكم ربك ولا تكن كصاحب الحوت اذ نادىٰ وهو مكظوم﴾ [القلم-٤٨] ''تو آپ اپنے رب کی

(اس) تجویز پر صبر سے بیٹھے رہے اور (تنگدلی میں) مچھلی (پیٹ میں جانے) والے (پیغمبر یونس علیہ السلام کی طرح نہ ہو جائیے جب کہ یونس نے دعا کی اور وہ غم سے گھٹ رہے تھے"

کہ ان کا رتبہ "اولو العزم والصبر من الرسل" سے کم بتلایا ہے۔ نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام فرماتے ہیں:

اذا لم آذن لكم أن تفضلو نی علی یونس بن متی، فلا یجوز لکم أن تفضلونی علی غیره من ذوی العزم من أجلة الأنبیاء صلوات الله وسلامه علیهم.

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد گرامی تواضع اور کسر نفسی پر محمول ہے، یہ ارشاد گرامی اس حدیث: "أنا سید ولد آدم ولد اس حدیث میں جس صعقہ کا ذکر ہے یہ" نفخه فزع" کے بعث سے پہلے ہوگا، البتہ بعث میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہی سب سے مقدم ہیں، حضرت موسیٰ علیہ السلام کی یہ فضیلت جزوی ہے، اس کی بنیاد پر ان کو سابقہ انبیاء پر فضیلت حاصل نہیں ہو سکتی۔ اللہ تعالیٰ ہمیں ان کے حقوق کی معرفت عطا فرمائے، ہمیں ان ہی کی محبت پر جیتا رکھے، اور ان ہی کے طریقے پر رکھتے ہوئے ہمارا خاتمہ فرمائے۔ اور قیامت کے دن انہی کے زمرہ میں ہمارا حشر فرمائے۔ ولا فخر" کے مخالف نہیں ہے۔ چونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ ارشاد گرامی کسی فخر ومباہات کے طور پر نہیں فرمایا، بلکہ تحدیث بالنعمہ کے طور پر فرمایا، اور یہ بتانا مقصود تھا کہ قیامت کے دن کی سیادت اللہ جل شانہ نے مجھے عنایت فرمائی ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

۵۷۱۱ : وَعَنْ اُبَیِّ بْنِ كَعْبٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ الْغُلَامَ الَّذِیْ قَتَلَهُ الْخَضِرُ طُبِعَ كَافِرًا وَلَوْ عَاشَ لَاَرْهَقَ اَبَوَیْهِ طُغْیَانًا وَّكُفْرًا (متفق علیه)

اخرجه مسلم ۱۸۵۰/٤ حدیث رقم (۲۳۸۰/۱۷۲) وابو داؤد ۸۰/۵ حدیث رقم ٤۷۰۵ والترمذی ۲۹۲/۵ حدیث رقم ۳۱۵۰

ترجمہ: "حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: حضرت خضر علیہ السلام نے جس لڑکے کو قتل کر دیا تھا وہ طبعاً کافر پیدا ہوا تھا اور اگر وہ لڑکا زندہ رہتا تو ضرور اپنے والدین کو سرکشی اور کفر میں ڈالتا"۔ (بخاری ومسلم)

تشریح: قوله: ان الغلام الذی قتله الخضر طبع کافرا:

خضر: خاء کے فتحہ اور ضاد کے کسرہ، اور ایک نسخہ میں خاء کے کسرہ اور ضاد کے سکون کے ساتھ ہے۔

"لأرهق ابويه" کی وضاحت میں ملا علی قاریؒ نے مندرجہ ذیل تین توضیحات ذکر کی ہیں۔

① أی: لکفهما. (دشوار کام کا حکم دینا)

② أی: غشیهما طغیانا و کفرا. (مبتلا کرنا)

③ معناه حملهما. (اکسانا، برانگیختہ کرنا)۔

طبع کفرا: یعنی پیدائش کے وقت سے ہی اس کے مقدر میں یہ لکھا ہوا تھا، کہ یہ لڑکا کفر اختیار کرے گا۔ یہ حدیث اس روایت کے منافی نہیں کہ جس میں یہ فرمایا گیا ہے: کل مولود یولد علی فطرة الاسلام."ہر بچہ فطرت اسلام پر پیدا ہوتا

ہے"۔فطرت سے مراد قبول اسلام کی استعداد ہے۔اور یہ استعداد اس کے جبلی طور پر شقی ہونے کے منافی نہیں۔اس کی تائید مندرجہ ذیل احادیث مبارکہ اور آیات کریمہ سے ہوتی ہے۔

① ابن عدیؒ "الکامل" میں، اور طبرانی "الکبیر" میں ابن مسعودؓ سے مرفوعاً نقل کرتے ہیں:

خلق اللہ یحیٰ بن زکریا فی بطن أمه مؤمنا، وخلق فرعون فی بطن أمه کافرا.

② ایک حدیث مشہور میں ہے: **ان بعد نفخ الروح فی کل مولود یکتب شقی او سعیدد۔**

ہر مولود میں روح پھونکنے کے بعد اس کا "شقی" اور "سعید" ہونا لکھ دیا جاتا ہے۔

③ اس کے موافق یہ آیت کریمہ ہے: ﴿**یوم یاتی لا تکلم نفس الا باذنه فمنهم شقی وسعید**﴾ [ھود۔۱۰۵] "جس وقت وہ دن آوے گا کر شخص بردن (اللہ کی اجازت کے بات تک (بھی) ہ کر سکے گا پھر ان میں بعضے شقی ہوں گے اور بعضے سفید ہوں گے"۔

قاضی عیاضؒ فرماتے ہیں: یہ حدیث اہل سنت والجماعت کے اس مسئلہ کی بہت واضح دلیل ہے کہ بندہ کو اپنے فعل پر قدرت نہیں سوائے اس کے کہ اللہ کا ارادہ شامل حال ہو اور تیسیر کا معاملہ فرمائے۔ برخلاف معتزلہ کے۔اس مسئلہ میں معتزلہ کا مذہب بالکل برعکس ہے، ان کا کہنا ہے: بندہ کا فعل خود اس کی طرف سے ہے، بندہ کو ہدایت اور ضلالت پر قدرت حاصل ہے۔اور اس سے یہ معلوم ہوا کہ جن لوگوں کے لئے آگ کا فیصلہ کر دیا گیا ہے ان کے دلوں پر مہر لگا دی ہے' ان کے آگے بھی دیوار بنا دی گئی اور پیچھے بھی دیوار بنا دی گئی ہے' یا حجاب مستور ہے' اور ان کے دلوں میں روگ ہیں تاکہ اس کا سابقہ نام ہو جائے 'اور اس کا کلمہ نافذ ہو جائے کوئی اس کے حکم کو رد نہیں کر سکتا' اور نہ کوئی اس کے امر وقضاء کو لوٹا سکتا ہے۔

اس حدیث سے ان لوگوں نے استدلال کیا ہے جو یہ کہتے ہیں کفار کے نابالغ بچے جہنم میں ہوں گے۔میں کہتا ہوں اس مسئلہ میں تفصیل اولیٰ ہے، بایں طور کہ جو بچہ بالطبع کافر ہو گا وہ جہنم میں جائے گا، اور جو بچہ فطرت پر پیدا ہو وہ جنت میں جائے گا، اس تفصیل کے بعد ائمہ کے اقوال میں تطبیق بھی ہو جائے گی، اور یہ مسئلہ ہمارے امام اعظم ابوحنیفہؒ کے توقف کے قول کے قریب قریب ہو جائے گا۔واللہ تعالیٰ اعلم۔

اس کا مؤید حدیث کا اگلا جملہ **ولو عاش لأرھق أبویه** بھی ہے:

"اگر یہ لڑکا زندہ رہتا تو بڑا ہو کر اپنے ماں باپ کو سرکشی میں مبتلا کر دیتا"، یعنی اپنے والدین کی گمراہی کا سبب بنتا۔

اس لڑکے کو قتل کرنے کی علت مرکبہ اس حدیث میں یہ بیان ہوئی ہے کہ وہ لڑکا بالطبع کافر تھا اور اگر بڑا ہو جاتا تو مضل وفاجر ہوتا۔

امام نوویؒ نے فرمایا: چونکہ اس لڑکے کے والدین مؤمن تھے، لہٰذا وہ لڑکا بھی (بالتبع) مؤمن ٹھہرا۔ میں کہتا ہوں تو پھر اس لڑکے کو قتل کرنا کیوں کر درست ٹھہرا۔ وہ فرماتے ہیں پس اس میں تاویل کرنا ضروری ہے۔

ایک تاویل یہ ہے: کہ اگر یہ لڑکا بالغ ہو یا تو کافر ہو گا اور اگر زندہ رہا تو اطنے والدین کو سرکشی میں مبتلا کر دیتا یعنی ان کے ساتھ سرکشی کا معاملہ کرتا اور حقوق والدین کی وجہ سے کفران نعمت کا مرتکب ہوتا۔

دوسری تاویل یہ ہوسکتی ہے: حملهما أن يتبعاه فيطغيا. (اپنے ماں باپ کو اپنی تابعداری پر ابھارتا چنانچہ وہ دونوم گمراہ وسرکش ہوجاتے۔)

ابن الملکؒ فرماتے ہیں کہ اگر آپ یہ کہیں: کسی شخص کے بارے میں یہ اندیشہ ہو کہ وہ مستقبل میں کافر ہو جائے گا، تو اس شخص کو فی الحال قتل کرنا درست نہیں۔ لہٰذا حضرت خضر علیہ السلام نے اس کو کفر کے خوف سے کیسے قتل کر دیا؟

میں کہتا ہوں: ممکن ہے کہ ان کی شریعت میں یہ فعل درست ہو۔ میں کہتا ہوں کہ اس سلسلہ میں اللہ جل جلالہ کی تقریر اور حضرت موسیٰ کی تقریر صریح ہے بلکہ یہ دلالت کر رہا ہے کہ اس طرح کی صورت حال میں یہ ہماری شریعت میں بھی جائز ہے اگر قطعی طور پر اس بات کا علم ہوجائے کہ یہ طبعًا کافر ہے جیسا کہ صاحب شرع نے اس حدیث میں تقریر فرمائی ہے۔ لہٰذا اس لڑکے کا مؤمن ہونا تب تو باطل ٹھہرا کیونکہ تمام ادیان میں اجماعی طور پر یہ بات ناجائز رہی ہے کہ کسی مؤمن کو بغیر گناہ کے قتل کر دیا جائے۔

وہ فرماتے ہیں: یا ہم یہ کہتے ہیں: یہ علم "لدنی" تھا۔ اس کا مشرب، ظاہر سے ہٹ کر ہوتا ہے، لہٰذا ہم اس کی کیفیت سے بحث نہیں کرتے۔

میں کہتا ہوں: احکام طریقت میں شریعت اور حقیقت میں مخالفت نہیں ہے۔ اور جو شخص ان دونوں میں تفریق کا قائل ہے وہ مرتبہ "جمع" کو نہیں پہنچ سکتا ہے، وہ "زندقہ" کی طرف منسوب ہوگا۔ پھر یہ معاملہ دو حال سے خالی نہیں اگر خضر علیہ السلام نبی تھے تو ان کا عمل شریعت کے موافق ہونا ضروری ہے اور اگر وہ "ولی" تھے، تو ان کیلئے اس جیسے اہم قضیہ میں اپنے علم لدنی اور اپنے الہام پر اعتماد کرنا درست نہ تھا۔

بہر حال اس حدیث میں اس حکمت کا بیان ہے کہ حضرت خضر علیہ السلام نے اس بچہ کو کسی حکمت کے پیش نظر قتل کیا؟ گویا کہ اس حدیث میں ان کے اعتذار کی تصریح ہے، بخلاف آیت قرآنی کے کہ اس میں اس کی طرف تلویح ہے۔

۵۷۱۲ : وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ عَنِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اِنَّمَا سُمِّیَ الْخَضِرُ لِاَنَّهٗ جَلَسَ عَلٰی فَرْوَةٍ بَیْضَآءَ فَاِذَا هِیَ تَهْتَزُّ مِنْ خَلْفِهٖ خَضْرَآءَ (رواه البخاری)

اخرجه البخاری ٤٣٣/٦ حديث رقم ٣٤٠٢ والترمذی ٢٩٣/٥ حديث رقم ٣١٥١۔

ترجمہ: "حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نبی اقدس ﷺ سے روایت نقل کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: حضرت خضر علیہ السلام کا نام "خضر" (یعنی سرسبز وشاداب) اس لئے مشہور ہوا کہ وہ ایک خشک وبنجر سفید زمین پر (یا بالکل خشک گھاس پر) بیٹھے تو یکا یک وہ زمین (یا خشک گھاس) ان کے اٹھنے کے بعد سرسبز وشاداب ہو کر لہلہانے لگی"۔

تشریح: انما سمی الخضر: مرفوع ہے۔ (ای انما سمی الخضر خضل) اور ایک نسخہ میں منصوب ہے۔ ای انما سمی الرجل المشهور الخضر.

فروة: صاحب البنایہ لکھتے ہیں: الفروة: الأرض اليابسة (خشک زمین) وقيل: الهشيم اليابس من النبات. (خشک گھاس) میں کہتا ہوں: دونوں کا ایک ہی معنی ہے اور، دونوں کا حاصل بھی ایک ہی ہے۔ ایک شارح دوسرے قول

کو مختار قرار دیتے ہوئے فرماتے ہیں: المراد بالفروة الهشيم اليابس، شبهه بالفرو. وقيل: الأرض اليابسة (خشک زمین) وقیل: جلدة وجه الأرض: وقيل: قطعة نبات مجتمعة يابسة۔ میں کہتا ہوں یہ زیادہ واضح ہے۔

امام طیبیؒ فرماتے ہیں: شاید کہ صاحب النہایہ کا دوسرا قول زیادہ مناسب ہے کیونکہ " فاذا هي تهتزّ من خلفه خضرا" (میں "خضرا") تمییز ہے یا حال ہے۔ فكانه نظر الخضر عليه والسلام الى مجلسه ذلك، فاذا هي تتحرك من جهة الخضر والنضارة (انتهى).

"من خلفه" فرمایا، حالانکہ نمو و اہتزاز تو ان کے موضع جلوس میں ظاہر ہوا تھا۔ یہ اشارہ ہے، کہ وہ سبزہ اس مخصوص جگہ تک منحصر نہیں رہا بلکہ بڑھتے بڑھتے "فروة بيضاء" کی انتہاء تک پہنچ گیا۔

خضرا: شارح لکھتے ہیں خاء کے فتحہ، ضاد کے کسرہ، اور تنوین کے ساتھ، ای: نباتا أخضر ناعما. اور "خضراء" بروزن صغراء بھی مروی ہے۔ میں کہتا ہوں: ضبط شدہ اکثر معتمد نسخوں میں بھی یوں ہی ہے۔ لیکن پہلا نسخہ اَولیٰ ہے، کیونکہ وجہ تسمیہ کے اعتبار سے مبنی اور معنی میں تطبیق ہو جاتی ہے۔

تخریج: امام سیوطیؒ نے الجامع الصغیر میں ان الفاظ کو بعینہٖ احمد، شیخین اور ترمذی نے حضرت ابو ہریرۃ سے اور طبرانی نے حضرت ابن عباس سے اسناداً نقل کیا ہے۔

۵۷۱۳ : وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ جَآءَ مَلَكُ الْمَوْتِ اِلٰى مُوْسٰى بْنِ عِمْرَانَ فَقَالَ لَهٗ اَجِبْ رَبَّكَ قَالَ فَلَطَمَ مُوْسٰى عَيْنَ مَلَكِ الْمَوْتِ فَفَقَاَهَا قَالَ فَرَجَعَ الْمَلَكُ اِلَى اللّٰهِ تَعَالٰى فَقَالَ اِنَّكَ اَرْسَلْتَنِيْ اِلٰى عَبْدٍ لَّكَ لَا يُرِيْدُ الْمَوْتَ وَقَدْ فَقَاَ عَيْنِيْ فَرَدَّ اللّٰهُ اِلَيْهِ عَيْنَهٗ وَقَالَ ارْجِعْ اِلٰى عَبْدِيْ فَقُلِ الْحَيٰوةُ تُرِيْدُ فَاِنْ كُنْتَ تُرِيْدُ الْحَيٰوةَ فَضَعْ يَدَكَ عَلٰى مَتْنِ ثَوْرٍ فَمَا تَوَارَتْ يَدُكَ مِنْ شَعْرِهٖ فَاِنَّكَ تَعِيْشُ بِهَا سَنَةً قَالَ ثُمَّ مَهْ ؟ قَالَ ثُمَّ تَمُوْتُ قَالَ فَالْاٰنَ مِنْ قَرِيْبٍ رَبِّ اَدْنِنِيْ مِنَ الْاَرْضِ الْمُقَدَّسَةِ رَمْيَةً بِحَجَرٍ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَاللّٰهِ لَوْ اِنِّيْ عِنْدَهٗ لَاَرَيْتُكُمْ قَبْرَهٗ اِلٰى جَنْبِ الطَّرِيْقِ عِنْدَ الْكَثِيْبِ الْاَحْمَرِ (متفق عليه)

اخرجه البخاري ٤٤٠/٦ حديث رقم ٣٤٠٧ ومسلم ١٨٤٢/٤ حديث رقم (١٥٧-٢٣٧٢/١٥٨) واخرجه الترمذي ٥٦٤/٥ حديث رقم ٣٦٤٩، والنسائي ١١٨/٤ حديث رقم ٢٠٧٩، واحمد في المسند ٣١٥/٢۔

ترجمہ: "حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: "(جب حضرت موسیٰ بن عمران علیہما السلام کے دنیا سے رحلت فرمانے کا وقت قریب آیا تو ان کے پاس موت کا فرشتہ (عزرائیل علیہ السلام) آیا اور کہنے لگا کہ اپنے پروردگار کے بلاوے کو قبول کیجئے (یعنی آپ کی روح قبض ہونے کا وقت آ چکا ہے واصل الٰہی ہونے کے لئے مستعد ہو جائیں) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: حضرت موسیٰ علیہ السلام نے (یہ سن کر) فرشتہ موت کی آنکھ پر مار دیا اور اس کو پھوڑ دیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: موت کا فرشتہ دربار الٰہی میں واپس گیا اور عرض کیا کہ (پروردگار!) تو

نے مجھے (روح قبض کرنے کے لئے) اپنے ایک ایسے بندے کے پاس بھیجا جو موت کو قبول کرنا چاہتا اور یہ کہ اس نے (مار کر) میری آنکھ بھی پھوڑ دی ہے۔ آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''اللہ تعالیٰ نے (فرشتہ موت کی یہ شکایت سن کر) اس کی آنکھ کو صحت کے ساتھ اس کی طرف لوٹا دیا اور حکم دیا کہ میرے بندہ (موسیٰ علیہ السلام) کے پاس پھر جاؤ اور ان کو میرا یہ پیغام پہنچاؤ کہ کیا تم مزید زندگی کی طلب رکھتے ہو؟ اگر تم مزید زندگی کے طلب گار ہو تو کسی بیل کی کمر پر اپنا (ایک) ہاتھ (یا دونوں ہاتھ) رکھ دو' تمہارے یہ ہاتھ جتنے بالوں کو چھپالیں گے' اُتنے ہی سال تم مزید زندہ رہو گے (فرشتہ نے دوبارہ حاضر خدمت ہو کر حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ کا یہ پیغام سنایا تو) انہوں نے کہا کہ اس (طویل زندگی کے بعد بالآخر موت ہی ہے) تو پھر وہ آج ہی کیوں نہ آجائے (میں اسی وقت موت کی آغوش میں جانے کے لئے حاضر ہوں' لیکن میری یہ دعا ضرور ہے کہ) رب کریم (تدفین کے لئے) مجھے سرزمین مقدس (یعنی بیت المقدس) سے نزدیک کر دے خواہ ایک پھینکے ہوئے پتھر کے بقدر ہو''۔ (اس کے بعد) رسول اللہ ﷺ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو مخاطب کر کے ارشاد فرمایا کہ اگر میں بیت المقدس کے قریب ہوتا تو تمہیں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قبر (کا نشان) دکھا دیتا جو ایک راستہ کے کنارے پر سرخ ٹیلے کے نزدیک ہے''۔ (بخاری ومسلم)

تشریح: **ففقا**: فاء، قاف اور ہمزہ کے ساتھ، تینوں حروف مفتوح ہیں۔ یعنی آنکھ کو پھوڑ دیا اور اندھا کر دیا۔ کہا جاتا ہے: **فقأ فلان عين فلان اى غلبه بالحجة.** (یعنی حجت میں غالب آنا)

مه: میم کے فتحہ اور ہاء کے سکون کے ساتھ، اصل میں ''ما'' تھا، الف کو حذف کر دیا گیا اور ہاء پر وقف کر دیا، حرکت وسکون کے مابین تعذر کی وجہ سے۔ امام نوویؒ فرماتے ہیں: یہ ھاء ''ھائے سکتہ'' اور ''ما'' استفہامیہ ہے۔ أی: **ثم ماذا يكون أحياة أم موت؟** (یعنی پھر اس کے بعد کیا ہوگا؟ زندگی یا موت؟)

فقل: الحياة تريد: الحياة مفعول ہے،'' **تريد** ''فعل مؤخر کا۔ اور فعل سے پہلے یا مفعول سے پہلے کوئی کلمہ استفہام مقدر ہے۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ'' **الحياة** ''، ہمزہ ممدودہ کے ساتھ ہو (یعنی'' **آلحياة** ''ہو)۔ جیسا کہ اس آیت کریمہ میں ہے: ﴿**قل آلذكرين حرم أم الأنثيين**﴾ [الانعام۔۱۴۳] ''آپ (ان سے) کہئے کہ کیا اللہ تعالیٰ نے ان دونوں نروں کو حرام کیا ہے یا ان دونوں مادہ کو'' چنانچہ تقدیری عبارت یوں ہوگی: **آلحياة تريد أم الموت؟** (کیا آپ زندگی چاہتے ہیں یا موت؟)

فما توارت: ایک نسخہ میں ''**فما وارت**'' ہے۔

يدك: مرفوع ہے اور ایک نسخہ میں منصوب ہے۔

من شعرة: ''ما'' کا بیان ہے۔ اور ایک نسخہ میں ''**من شعره**'' ضمیر کے ساتھ ہے۔ أی: **من شعر متن الثور.**

ایک شارح کا کہنا ہے،'' **فما توارت** ''یہ لفظ مسلم کے راویوں میں سے کسی راوی کی غلطی ہے۔ اور بخاری شریف میں یوں ہے: **فله بما غطت يده بكل شعرة سنة.**

اور قاضیؒ فرماتے ہیں:'' **فما توارت يدك** '' صحیح مسلم میں اسی طرح مذکور ہے، اور بظاہر'' **فما وارت يدك** '' رفع کے ساتھ ہے، اور غلطی بعض راویوں کی ہے۔ ~~بلکہ~~ بلکہ بخاری شریف کی روایت کے یہ الفاظ ہیں: **فله بما غطت يده**

بکل شعرة سنة. اور احتمال یہ بھی ہے کہ "یدك" منصوب بنزع الخافض ہو۔ اور" توارت" میں ضمیر مرفوع مؤنث لائی گئی چونکہ یہ "شعرة" کے لئے مفسر ہے۔

امام طیبیؒ فرماتے ہیں:" من شعرة": "ما" کا بیان ہے۔ اور ضمیر "متن ثور" کی طرف راجع ہے۔ اور" ما وارت یده" اس کا ایک" قطعہ" ہے، لہٰذا" قطعة" کا اعتبار کرتے ہوئے ضمیر مؤنث کی لائی گئی، أی القطعة التی توارت بیدك أو تحت یدك. (انتھی)

اور بعض کا کہنا ہے کہ پہلی تاء زائدہ ہے، چونکہ اس کا معنی ہے: وارت أی عظت. (ذکرہ الاکمل)

قوله: انك أرسلتني الى عبد لك...... ارجع الى عبدی.

امام طیبیؒ فرماتے ہیں: اگر آپ یہ پوچھیں کہ فرشتہ کے کلام" عبدلك "اور ارشاد باری تعالیٰ" عبدی "میں کیا فرق ہے؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ فرشتہ کا قول ایک قسم کے طعن پر دلالت کر رہا ہے کیونکہ لفظ" عبد" نکرہ ذکر کیا ہے اور" لا یرید الموت" اس نوع طعن کا بیان ہے۔ اور ارشاد باری تعالیٰ "عبدی" اس کی تفخیم شان اور تعظیم مکان پر دال ہے، بایں طور کہ اللہ جل شانہ نے "عبد" کی اضافت اپنی طرف فرمائی ہے، جس میں فرشتہ کے طعن کا رد بھی ہے۔

ملا علی قاریؒ، امام نوویؒ کی آخری بات کا رد کرتے ہوئے فرماتے ہیں: یہ بات انتہائی بعید ہے، کیونکہ وہاں اور انبیاء کی قبریں بھی تھیں ان کی وجہ سے تو فتنہ برپا نہیں ہوا (تو حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قبر کی وجہ سے کیوں کر فتنہ برپا ہوگا) مزید یہ کہ (اگر بیت المقدس میں دفن کرنے میں امکان فتنہ تھا تو) کسی بھی جگہ دفن کرنے میں امکان فتنہ بہر حال ہے۔ لہٰذا حضرت موسیٰ علیہ السلام کا اشارہ اس طرف تھا کہ ان کی قبر اس قریہ مقدسہ کے قریب ہو، اندر نہ ہو۔ اور ممکن ہے، کہ بیت المقدس کے بیوت اس وقت حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قبر کے قریب تک (پھیلے ہوئے) ہوں۔

حالانکہ ہارون علیہ السلام ان سے عمر میں بڑے تھے، اور علمائے امت کے نزدیک بڑی قدر و منزلت رکھتے تھے۔ نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ارشاد گرامی ہے: حق کبیر الاخوة علیهم کحق الوالد علی ولده.

"بڑے بھائی کا چھوٹے بھائیوں پر حق اس طرح ہے جس طرح والدین کا حق اپنی اولاد پر ہوتا ہے"

میں (ملا علی قاری) کہتا ہوں یہ اچھی توجیہ ہے، مگر "زعم" کی تعبیر غیر مستحسن ہے

۵۷۱۴: وَعَنْ جَابِرٍ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ عُرِضَ عَلَيَّ الْاَنْبِيَاءُ فَاِذَا مُوْسٰى ضَرْبٌ مِّنَ الرِّجَالِ كَاَنَّهٗ مِنْ رِّجَالِ شَنُوْءَةَ وَرَاَيْتُ عِيْسٰى بْنَ مَرْيَمَ فَاِذَا اَقْرَبُ مَنْ رَّاَيْتُ بِهٖ شَبَهًا عُرْوَةُ بْنُ مَسْعُوْدٍ وَرَاَيْتُ اِبْرَاهِيْمَ فَاِذَا اَقْرَبُ مَنْ رَّاَيْتُ بِهٖ شَبَهًا صَاحِبُكُمْ يَعْنِيْ نَفْسَهٗ وَرَاَيْتُ جِبْرَئِيْلَ فَاِذَا اَقْرَبُ مَنْ رَّاَيْتُ بِهٖ شَبَهًا دِحْيَةُ بْنُ خَلِيْفَةَ. (رواہ مسلم)

اخرجه مسلم فی صحیحه ۱/۱۵۳ حدیث رقم (۱۶۷/۲۷۱)۔

ترجمہ:" حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ نبی اقدس ﷺ نے ارشاد فرمایا: جب انبیاء میرے سامنے لائے گئے تو میں نے دیکھا کہ موسیٰ علیہ السلام دبلے پتلے مرد ہیں یوں معلوم ہوئے گویا قبیلہ بنوشنوة کے مردوں میں سے ہیں اور

میں نے عیسیٰ بن مریم علیہ السلام کو دیکھا تو وہ ان لوگوں میں سے جن کو میں نے دیکھ رکھا ہے سب سے زیادہ عروہ بن مسعودؓ کے مشابہ معلوم ہوتے تھے اور میں نے ابراہیم علیہ السلام کو دیکھا تو وہ میرے دیکھے ہوئے لوگوں میں سے تمہارے ہم نشین یعنی مجھ (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) سے زیادہ مشابعت رکھنے والے دکھائی دیئے اور میں نے جبرئیل علیہ السلام کو دیکھا تو وہ میرے دیکھے ہوئے لوگوں میں دحیہ بن خلیفہ سے بہت مشابہت رکھتے ہیں"۔ (مسلم)

تشریح: دحية: دال کے کسرہ اور فتحہ کے ساتھ بھی پڑھا جاتا ہے یہ صحابی تھے۔ اور شکل وصورت کے اعتبار سے لوگوں میں سب سے زیادہ خوبصورت تھے۔

شبھا: شین اور باء دونوں کے فتحہ کے ساتھ۔

"نبی" رسول کے مقابلے میں اعم ہے۔ یہ واقعہ لیلۃ الاسراء میں مسجد اقصیٰ میں پیش آیا، یا آسمانوں پر پیش آیا جیسا کہ اگلی حدیث سے معلوم ہوتا ہے۔ اس ملاقات کے وقت ان انبیاء کرام کی ارواح مقدسہ کو ان کے ان اجسام کے ساتھ کہ جو وہ دنیا میں رکھتے تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے لایا گیا، (كذا ذكره ابن الملك تبعا لشارح من علمائنا). اور یہی ظاہر ہے۔

قاضیؒ فرماتے ہیں: شاید کہ ان کی ارواح کو ان صورتوں میں متمثل کیا گیا ہو، اور یہ صورتیں ان انبیاء کرام کی اصل صورتوں جیسی تھیں۔ یا ان کی جسمانی صورتیں متماثل کی گئی ہیں۔ اور یہ مشاہدہ حالت منام میں ہوا یا حالت بیداری میں۔

قوله: فاذا موسٰى ضرب من الرجل كأنه من رجال شنوءة:

شنوءة: شین معجمہ کے فتحہ، نون کے ضمہ، واؤ کے سکون، اور پھر پہلے ہمزہ اور اس کے بعد تائے مدورہ ہے، ہمزہ کو واؤ سے بدلنا اور ادغام کرنا بھی درست ہے۔ ابن السکیتؒ فرماتے ہیں: شنوة تشدید کے ساتھ غیر مہموز ہے، یہ ایک مشہور قبیلہ ہے۔

قوله: ورأيت عيسى بن مريم ـ عروة بن مسعود:

بعض کا کہنا ہے کہ عروۃ بن مسعود، عبداللہ بن مسعودؓ کے بھائی ہیں، یہ بات درست نہیں ہے۔

قوله: ورأيت جبريل ..... :

انبیاء کرام کے حلیۂ مبارک کے ساتھ حضرت جبرئیل علیہ السلام کا حلیہ مبارک ذکر کرنے کی وجہ یہ ہے کہ انبیاء کرامؑ کے جناب میں کثیر الملازمہ بھی تھے اور آسمانی خبروں کے زمین تک پہنچانے میں لازم کی حیثیت رکھتے تھے۔

۵۷۱۵ : وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ رَاَيْتُ لَيْلَةَ اُسْرِيَ بِي مُوْسٰى رَجُلًا اٰدَمَ طُوَالًا جَعْدًا كَاَنَّهٗ مِنْ رِجَالِ شَنُوْئَةَ وَرَاَيْتُ عِيْسٰى رَجُلًا مَرْبُوْعَ الْخَلْقِ اِلَى الْحُمْرَةِ وَالْبَيَاضِ سَبْطَ الرَّاْسِ وَرَاَيْتُ مَالِكًا خَازِنَ النَّارِ وَالدَّجَّالَ فِيْ اٰيَاتٍ اَرَاهُنَّ اللّٰهُ اِيَّاهُ فَلَا تَكُنْ فِيْ مِرْيَةٍ مِنْ لِّقَائِهٖ (متفق عليه)

اخرجه البخاري ٣١٤/٦ حديث رقم ٣٢٣٩، ومسلم ١٥١/١ حديث رقم ٦٥/٢٦٧ واخرجه احمد في المسند ٢٤٥/١۔

ترجمہ: "حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت نقل فرماتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: میں

نے معراج کی رات موسیٰ علیہ السلام کو دیکھا وہ گندمی رنگت والے اور دراز قد تھے' گھنگھریالے بالوں والے تھے اور (جسم و بدن کے اعتبار سے) یوں لگتے تھے جیسے قبیلہ بنوشنوۃ کے کوئی فرد اور میں نے عیسیٰ علیہ السلام کو دیکھا وہ خلقی طور پر متوسط قد و قامت کے تھے (نہ بہت لمبے تھے نہ چھوٹے اور نہ بہت موٹے تھے نہ پتلے) سرخ وسفید رنگت والے تھے (جیسے خود رسول اقدس ﷺ کے جسم مبارک کا رنگ تھا) اور سیدھے بالوں والے تھے (یعنی گھونگھریالے نہیں) تھے اور میں نے دوزخ کے دروغہ مالک کو اور دجال کو بھی دیکھا!'' اور آنحضرت ﷺ کا ان سب کو دیکھنا خدا تعالیٰ کی قدرت کی ان نشانیوں اور علامات کے طور پر تھا جو آپ کو اللہ نے شب معراج میں خصوصی طور پر دکھائیں اسلئے (اس حدیث کو پڑھنے اور سننے والے!) اس امر میں کوئی شک وشبہ نہ کر' آنحضرت ﷺ نے ان سب کو دیکھا اور ملاقات فرمائی''۔ (بخاری)

تشریح: قوله: رأيت ليلة۔۔۔ من رجال شنوءة:

ليلة اسرى باضافت کے ساتھ ہے اور ایک نسخہ میں ('' ليلة '' کی تنوین کے ساتھ ہے اور '' رؤیت '' بمعنی '' بصارت '' ہے۔

رجلا: اى كونه على صورة الرجل۔

آدم: صاحب النہایہ لکھتے ہیں: آدم: أي أسمر شديد السمرة. (گہری گندمی رنگت والا)

طوالا: طاء کے ضمہ اور واؤ کی تخفیف کے ساتھ، مبالغہ کا صیغہ ہے، جیسا کہ عجاب، عجيب سے اسم مبالغہ کا صیغہ ہے۔ اور '' طوال '' طاء کے کسرہ کے ساتھ، طویل کی جمع ہے۔

جعدا: '' سبط '' کی ضد ہے، اى غير مسترسل الشعر. اور ممکن ہے کہ انقباض شعر ان کی غیر شعوری حدت باطنی کی طرف اشارہ ہو۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ معتدل المزاج بھی تھے۔

قوله: ورأيت عيسى رجلا ۔۔۔ سبط الرائين:

الى الحمرة والبياض: یعنی رنگت سرخی اور سفیدی کی طرف مائل تھی، نہ تو انتہائی سرخ تھے اور نہ انتہائی سپید تھے، سفیدی سرخی لئے ہوئے تھی، حضرت نبی اکرم علیہ الصلوٰۃ والسلام میں بھی یہ دونوں صفات موجود تھیں، جیسا کہ شمائل کی روایات سے معلوم ہوتا ہے۔

سبط الرأس: باء کے کسرہ اور فتحہ کے ساتھ، کبھی ساکن بھی پڑھا جاتا ہے۔ صاحب قاموس لکھتے ہیں: السبط: اس کو حرکت کے ساتھ اور بروزن بھی پڑھا جاتا ہے'' کتف '' یہ الجعد کی ضد ہے اس کا معنی ہے مسترسل شعر الرأس.

'' سبط الرأس '' سے پتہ چلتا ہے، کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر صفت جمال کا غلبہ تھا، اور حضرت موسیٰ علیہ السلام پر صفات جلال کا غلبہ تھا، اور آنحضرت ﷺ چونکہ مرتبۂ کمال پر فائز تھے، ان کے بال مبارک بھی ایسے تھے۔

قوله: ورأيت مالكا خازن النار والدجال فى آيات أراهن الله اياه:

یہ جملہ روایت کا حصہ نہیں، بلکہ راوی کا ادراج ہے، راوی نے یہ جملہ سامعین کا استبعاد دور کرنے کے لیے بڑھایا ہے۔ اور ممکن تھا کہ سینوں میں کوئی بات کھٹکتی۔ اگر یہ جملہ آنحضرت ﷺ کا فرمودہ ہوتا تو یوں ہونا چاہئے تھا: أراهن الله اياي.

(کذا ذکرہ شارح)۔ بظاہر، ('' اياه '') ضمیر '' دجال '' کی طرف لوٹ رہی ہے۔ اور آیات سے مراد وہ خرق عادت امور ہیں جو

دجال کو بطور استدراج اور عباد کیلئے مقدر فرمائے ہیں۔ واللہ تعالٰی اعلم۔

امام طیبیؒ نے فرمایا: قولہ: "فی آیات "یعنی معراج کی شب، میں نے جو علامات دیکھیں تھی ان میں یہ مذکورہ علامات بھی دیکھیں تھیں، اور شاید کہ یہ وہی آیات ہیں جن کا ذکر اس آیت کریمہ میں ہے: ﴿لقد رأى من آیات ربه الكبرى﴾ [النجم۔۱۸] "انھوں نے اپنے پروردگار (کی قدرت) کے بڑے بڑے عجائبات دیکھے" لہٰذا اس تقدیر پر کلام میں التفات ہے کہ " أیای " کی جگہ " أیاه " ذکر فرمایا، یا راوی نے روایت کا یہ ٹکڑا بالمعنی روایت کیا ہے۔ اور بظاہر " فلا تکن فی مریة من لقائه " کا تعلق، حدیث کے ابتدائی حصہ سے ہے جو موسیٰ علیہ السلام کے بارے میں ہے۔ اور یہ جملہ درحقیقت قرآن کریم کی اس آیت مبارکہ کی طرف تلمیح ہے:

﴿ولقد آتینا موسیٰ الکتاب فلا تکن فی مریة من لقائه﴾ [السجدۃ۔۲۳] "اور ہم نے موسیٰ کو کتاب دی تھیں سو آپ اس کے ملنے میں کچھ شک نہ کیجئے" کہا گیا ہے کہ " آپ ﷺ حضرت موسیٰ علیہ السلام سے اپنی ملاقات کے بارے میں شک مت کیجئے"۔ اس تفصیل کے پیش نظر حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور دیگر آیات کا تذکرہ "علی سبیل التبیعته والادماج" ہوگا۔ لہٰذا حدیث کے اس جملہ کا مطلب یہ ہوگا، کہ " اے محمد! آپ نے جو علامات دیکھی ہیں ان آیات کی رؤیت کے بارے میں شک مت کیجئے" اس تقدیر پر " فلا تکن " کا خطاب آنحضرت ﷺ کو ہے، اور سارے کا سارا کلام متصل ہوگا، راوی کی طرف سے صرف لفظ " ایاہ " میں تغیر ہے۔ اور اس کی تصدیق شیخ محی الدینؒ کے اس قول سے بھی ہوتی ہے جو انہوں نے اس حدیث کی شرح میں فرمایا " حضرت قتادہ اس آیت کی تفسیر یہ کیا کرتے تھے، کہ آنحضرت ﷺ شب معراج میں حضرت موسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام سے ملے تھے"۔

قتادہ کی بیان کردہ اس تفسیر کی موافقت مفسرین کی ایک جماعت نے کی ہے ان میں مجاہد، کلبی اور سدی وغیرہ شامل ہیں۔ اس تفصیل کی روشنی میں اس کا مطلب یہ ہوگا: " فلا تکن فی شك من لقائك موسی " شارحین اس بات کی طرف گئے ہیں کہ " فی آیات أراهن الله " راوی کا کلام ہے۔

مظہرؒ فرماتے ہیں: " فلا تکن " کا خطاب عام ہے، اس کا مخاطب قیامت کی صبح تک آنے والا ہر وہ شخص ہے جو بھی اس حدیث کو سنے۔ اور " لقائه " کی ضمیر "دجال" کی طرف عائد ہے۔ ای: اذا کان خروجه موعودا فلا تکن فی شك من لقائه، دوسرے بعض حضرات فرماتے ہیں کہ ضمیر " ماذکر " کی طرف لوٹ رہی ہے۔ أی: فلا تکن فی شك من رؤیة ما ذکر من الآیات الی یوم القیامة.

تخریج: سیوطیؒ نے الجامع الصغیر میں والدجال تک کے الفاظ ذکر کئے ہیں۔ اور فرمایا کہ اس حدیث کو امام احمد اور شیخین نے بھی روایت کیا ہے۔

۵۷۱۶ : وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ لَیْلَةَ اُسْرِیَ بِیْ لَقِیْتُ مُوْسٰی فَنَعَتَهٗ فَاِذَا رَجُلٌ مُضْطَرِبٌ رَجِلُ الشَّعْرِ كَاَنَّهٗ مِنْ رِّجَالِ شَنُوْءَةَ وَلَقِیْتُ عِیْسٰی رَبْعَةٌ اَحْمَرُ كَاَنَّمَا خَرَجَ مِنْ دِیْمَاسٍ یَعْنِی الْحَمَّامَ وَرَاَیْتُ اِبْرٰهِیْمَ وَاَنَا اَشْبَهُ وُلْدِهٖ بِهٖ قَالَ فَاُتِیْتُ

بِإِنَائَيْنِ أَحَدُهُمَا لَبَنٌ وَالْآخَرُ فِيهِ خَمْرٌ فَقِيلَ لِي خُذْ أَيَّهُمَا شِئْتَ فَأَخَذْتُ اللَّبَنَ فَشَرِبْتُهُ فَقِيلَ لِي هُدِيْتَ الْفِطْرَةَ أَمَّا إِنَّكَ لَوْ أَخَذْتَ الْخَمْرَ غَوَتْ أُمَّتُكَ (متفق علیه)

اخرجه البخاری ۴۲۸/۶حدیث رقم ۳۳۹۴ومسلم ۱۵۴/۱حدیث رقم (۱۶۸/۲۷۲) والترمذی ۲۸۰/۵حدیث رقم ۳۱۳۰

ترجمہ:''حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:''اس رات جب مجھے بلندی پر لے جایا گیا یعنی شب معراج میں میں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے ملاقات کی اس کے بعد آپ ﷺ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی خصوصیات بیان کرتے ہوئے بتلایا کہ وہ ایک مضطرب شخص نظر آئے' گھنگھریالے بالوں والے تھے اور ایسا لگتا تھا جیسے وہ قبیلہ شنوءۃ کے کوئی آدمی ہوں۔حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے بھی میری ملاقات ہوئی'ان کا درمیانی قد و قامت کے تھے اور رنگ سرخ تھا اور (ایسا لگتا تھا) جیسے (ابھی نہا کر) دیماس یعنی حمام سے نکلے ہوں''اور میں نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو دیکھا اور میں ان کے اولاد میں سے سب سے زیادہ ان کے مشابہت رکھتا ہوں۔آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''پھر میرے سامنے دو پیالے لائے گئے' جن میں سے ایک میں دودھ تھا اور ایک میں شراب تھی اور مجھ سے کہا گیا کہ ان میں سے جس کو پسند کریں لیجئے لو (چاہے شراب پسند کرلو چاہے دودھ) میں نے دودھ کا پیالہ لے لیا اور پی لیا' تب مجھ سے کہا گیا (یعنی فرشتوں نے کہا) کہ آپ کو فطرت کی راہ دکھائی گئی ہے (یعنی اللہ تعالیٰ نے آپ کو دین اسلام کا وہ راستہ سمجھا دیا جو اصل میں انسانی فطرت ہے اور جس پر ہر شخص پیدا ہوتا ہے) سن لیں! اگر آپ (اس وقت) شراب پی لیتے تو آپ کی امت گمراہ ہو جاتی''۔(بخاری ومسلم)

تشریح: قوله:ليلة اسرى بى ـــ من رجال شنوة:

''ليلة'':ظرف مقدم ہے''لقيت موسى'' کے لئے۔

رجل الشعر: جیم کے کسرہ،سکون،اور فتحہ کے ساتھ،صاحب قاموس لکھتے ہیں شعر رجل وككتف وجبل بين السبوطة والجعودة.صاحب النہایہ فرماتے ہیں: أى: لم يكن شديد الجعودة، ولا شديدة السبوطة، بل بينهما.(یعنی آپ نے تو بہت زیادہ گھنگھریالے بالوں والے تھے اور نہ بہت زیادہ سیدھے بالوں تھے' بلکہ آپؑ کے بال ان دونوں صفات کے درمیان تھے) میں کہتا ہوں: ظاہر یہ ہے کہ'' سبوطة '' کے مقابلے میں'' جعودة'' غالب تھی،تا کہ یہ حدیث پچھلی حدیث کے منافی نہ رہے کہ جس میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بارے میں گزرا کہ ان کے بالوں میں''جعودة'' تھی (یعنی گھنگھریالہ پن تھا۔)

قوله:ولقيت عيسى ـــ يعنى الحمام:

ربعة: بائے موحدہ کے سکون کے ساتھ،اور فتحہ بھی درست ہے۔(على ما ذكر العسقلانى) بمعنی: مربوع الخلق. صاحب النہایہ لکھتے ہیں:أى لا طويل ولا قصير.(یعنی نہ دراز قد تھے اور نہ کوتاہ قد تھے)''ربعة '' کی تانیث''نفس'' کی تاویل میں ہے۔(اى نفس ربعة)

دیماس: دال کے کسرہ کے ساتھ، اور فتحہ بھی درست ہے۔(علی ما فی القاموس) بمعنی الكن والسرب والحمام. (منزل' گھر تہہ خانہ' غسل خانہ)

جوہری کہتے ہیں: دیماس، دال کے فتحہ کے ساتھ، ہو تو اس کی جمع'' دیامیس '' آئے گی، جیسا کہ ''شیطان'' کی جمع ''شیاطین''۔ اگر دال کے کسرہ کے ساتھ ہو تو اس کی جمع'' دیامیس '' آتی ہے مثل، قیراط، قراریط.

''رجل مضطرب '': قاضیؒ اور دیگر شراح فرماتے ہیں: آپ علیہ الصلوٰۃ والسلام کی مراد یہ تھی کہ سیدنا موسیٰ علیہ السلام ''مستقیم القد'' اور ''حاد'' تھے، چونکہ ''حاد'' قلق اور متحرک ہوتا ہے گویا کہ اس میں اضطراب ہوتا ہے۔ اسی وجہ سے کہا جاتا ہے: رمح مضطرب، وہ نیزہ جو طویل بھی ہو اور مستقیم بھی۔

بعض کا کہنا ہے کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی خشیت کی وجہ سے مضطرب تھے، یہ انبیاء و صدیقین کی صفت ہے، جیسا کہ آنحضرت ﷺ کے بارے میں مروی ہے:

أنه عليه الصلوٰة والسلام كان يصلي ولقلبه أزيز كأزيز المرجل.

يعني الحمام چونکہ دیماس متعدد معانی میں مستعمل ہے اسی وجہ سے راوی نے آنحضرت کے مرادی معنی کی وضاحت کردی۔ عسقلانیؒ فرماتے ہیں:'' دیماس '' کی تفسیر ''حمام''، عبدالرزاق نے ذکر کی ہے۔ اس سے ان کا وصف بیان کرنا مقصود ہے کہ ان کی صاف ستھری رنگت، بدن کی تر و تازگی اور چہرے پر پانی کی کثرت کی وجہ سے یوں لگ رہا تھا کہ گویا وہ حمام سے تشریف لا رہے ہیں۔

قوله: ورأيت ابراهيم وأنا أشبه ولده به:

یعنی میں نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو دیکھا اور میں ان کی اولاد میں سے مطلقاً، یا حضرت اسماعیلؑ کی اولاد میں سے سب سے زیادہ ان کے مشابہ ہوں، باعتبار صورت کے بھی اور سیرت کے بھی۔ اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ مشابہت صوری، مشابہت معنوی کا عنوان ہے۔

قوله: فأتيت باناء ين أحدهما لبن۔۔۔ فأخذت اللبن فشربته:

تورپشتی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس دنیا میں پائی جانے والی محسوسات کی عالم بالا میں مخصوص صورتیں مقرر ہیں تاکہ معانی کا ادراک ہو سکے۔ چنانچہ دودھ، عالم حسی میں مولود کی جسمانی نشو و نما کا سب سے پہلا ذریعہ ہے۔ دودھ سے ''مولود'' کی طرف اشارہ ہے۔ اور فطرت کہ جس سے قوت روحانی تمامیت کے درجے کو پہنچتی ہے۔ کو دودھ کی صورت میں ظاہر کیا گیا، کہ اس سے انسانی خاصیت پروان چڑھتی ہے۔

بعض حضرات فرماتے ہیں کہ دودھ کیلئے'' أحدهما لبن '' کی تعبیر، اور شراب کیلئے'' فيه خمر '' کی تعبیر اختیار فرمائی۔ (کہ'' لبن '' کے ساتھ لفظ'' في ''استعمال نہیں کیا اور'' خمر '' کے ساتھ ذکر فرمایا،) گویا کہ برتن بھی دودھ تھا، دودھ کو برتن پر غلبہ دیتے ہوئے، اور ''خمر'' چونکہ منہی عنہ ہے اس لئے اس کی تقلیل کو ظاہر کرنے کیلئے ''في ''ارشاد فرمایا اور یہ کہنا بھی ممکن ہے کہ'' خمر'' کی تنوین تقلیل کے لئے ہو۔

آنحضرت ﷺ کی خدمت میں یہ دونوں چیزیں پیش کرنے کا مقصد ملائکہ پر آپؐ کی فضیلت کا اظہار تھا، کہ آپؐ درست چیز کو اختیار اور پسند فرماویں گے۔

قوله: فقيل لی هديت الفطرة:

یعنی فرشتوں نے کہا۔ اخبار ودُعاء ہر دو کو محتمل ہے۔ اخبار کیلئے ہونا زیادہ ظاہر ہے جیسا کہ عنقریب حدیث کے آخر میں آرہا ہے۔

قاضیؒ فرماتے ہیں: اس فطرت سے مراد وہ فطرت اصلی ہے جس پر اللہ تعالیٰ نے ہر شخص کو پیدا کیا۔ اور ان چیزوں سے اعْراض فطرت میں سے ہے، مثلاً جیسا کہ شراب، کہ وہ عقل کو خراب کر دیتی ہے، حالانکہ عقل ہی وہ چیز ہے جو خیر کے کاموں کی طرف داعی ہے، شر سے روکنے والی ہے اور صلاح دارین اور خیر المنازل تک لے جاتی ہے۔ جیسا کہ دودھ کا پینا، کہ دودھ بہترین غذا ہے، اور سب سے پہلی پرورش ونشونما بھی دودھ ہی سے ہوتی ہے۔

ابن الملکؒ فرماتے ہیں: اس موقع پر ملائکہ کا یہ جملہ اپنے اندر ایک قسم کا لطف ومناسبت سموئے ہوئے ہے، عالم حسی میں دودھ، خلوص وبیاض کا ایک مجموعہ ہے، اور یہی وہ چیز ہے کہ جو مولود کیلئے پہلی غذا بھی ہے، عالم قدسی میں ہدایت وفطرت کو قرار دیا، اور ہدایت وفطرت وہ چیز ہے جس سے قوت روحانیہ تام ہوتی ہے، بخلاف خمر کے، چونکہ وہ سراپا فساد ہے اس کو عالم بالا میں ''غوایہ'' قرار دیا، خمر وہ چیز ہے جو قوت روحانیہ میں فساد برپا کر دیتی ہے۔ جیسا کہ اس کی تائید اسی حدیث کے اگلے جملے (اما انك أخذت الخمر) سے ہوتی ہے **قوله: أما انك لو أخذت الخمر،**

یعنی اگر آپ شراب پی لیتے یا فقط پکڑ لیتے اور نہ پیتے، غرض یہ کہ خمر کی طرف ادنیٰ درجے میں بھی مائل ہو جاتے تو آپ کی اُمت کسی نہ کسی درجے میں اس گمراہی کا شکار ہو ہی جاتی۔ اگر آنحضرتؐ نوش فرما لیتے تو آپ ﷺ کی امت کیلئے بھی حلال ہو جاتی، اور امت خمر کے ضرر وشر کا شکار ہو جاتی۔ انبیاءؑ چونکہ معصوم ہوتے ہیں، اسی وجہ سے ''غویت'' نہیں کہا، حالانکہ ''مقابلہ'' کا تقاضا یہی تھا (کہ ''غویت'' کہا جاتا)۔

حدیث کے اس جملے سے یہ معلوم ہوا کہ مقتدیٰ (رہبر ورہنما) خواہ نبی ہو یا عالم ہو یا سلطان وغیرہ ہو، اس کی استقامت اس کے اُتباع وپیروکاروں کی استقامت کا ذریعہ اور سبب بنتی ہے، کیونکہ مقتدیٰ کی حیثیت وہی ہے جو اعضاء کی بنسبت دل کو حاصل ہے۔

۵۱۰۵ وعن ابن عباسٍ قَالَ سِرْنَا مَعَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بَيْنَ مَكَّةَ وَالْمَدِيْنَةِ فَمَرَرْنَا بِوَادٍ فَقَالَ اَيُّ وَادٍ هٰذَا فَقَالُوْا وَادِی الْاَزْرَقِ قَالَ كَاَنِّيْ اَنْظُرُ اِلٰى مُوْسٰى فَذَكَرَ مِنْ لَوْنِهٖ وَشَعْرِهٖ شَيْئًا وَاضِعًا اِصْبَعَيْهِ فِيْ اُذُنَيْهِ لَهٗ جُؤَارٌ اِلَى اللّٰهِ بِالتَّلْبِيَةِ مَارًّا بِهٰذَا الْوَادِيْ قَالَ ثُمَّ سِرْنَا حَتّٰى اَتَيْنَا عَلٰى ثَنِيَّةٍ فَقَالَ اَيُّ ثَنِيَّةٍ هٰذِهٖ قَالُوْا هَرْشٰى اَوْ لِفْتٌ فَقَالَ كَاَنِّيْ اَنْظُرُ اِلٰى يُوْنُسَ عَلٰى نَاقَةٍ حَمْرَاءَ عَلَيْهِ جُبَّةُ صُوْفٍ خِطَامُ نَاقَتِهٖ خُلْبَةٌ مَارًّا بِهٰذَا الْوَادِيْ مُلَبِّيًا۔ (رواه مسلم)

اخرجه مسلم ۱۵۲/۱ حدیث رقم (۲۶۹-۱۶۶) واخرجه احمدفی المسند ۲۱۵/۱۔

ترجمہ: ''حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے بیان فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی معیت میں ہم نے مکہ اور مدینہ کی درمیانی راہ کا سفر کیا' جب ایک جنگل کے پاس سے ہمارا گزر ہوا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا کہ یہ کون سا جنگل ہے؟ ہم نے عرض کیا کہ یہ وادی ازرق ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے (یہ سن کر) ارشاد فرمایا: گویا میں موسیٰ علیہ السلام کو دیکھ رہا ہوں'' پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے رنگ اور ان کے بالوں کا کچھ تذکرہ فرمایا (کہ ان کا رنگ گندمی اور بال خمدار ہیں اور مزید کلام فرماتے ہوئے یہ بھی ارشاد فرمایا کہ) انہوں نے اپنی انگلیاں (مؤذن کی مانند) کانوں میں دے رکھی ہیں اور روتے گڑگڑاتے' بآواز بلند اپنے پروردگار کے حضور لبیک لبیک کہتے (محرم کی طرح) اس جنگل سے گزر رہے ہیں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا بیان ہے کہ پھر ہم نے سفر جاری رکھا حتی کہ ہم ایک گھاٹی میں داخل ہوئے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا کہ یہ کون سی گھاٹی اور پہاڑ ہے؟ لوگوں نے بتایا: یہ ہرشا پہاڑ ہے یا لفت پہاڑ ہے! آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ (سن کر) ارشاد فرمایا: ''گویا میں یونس علیہ السلام کو دیکھ رہا ہوں جو سرخ اونٹنی پر سوار ہیں اور موٹی اون کے جبہ میں ملبوس ہیں' ان کی اونٹنی کی نکیل کھجور کی رسی کی ہے اور وہ لبیک لبیک کہتے ہوئے اس گھاٹی سے گزر رہے ہیں''۔ (مسلم)

تشریح: **قوله: سرنا مع رسول الله ﷺ--- مارا بهذا لوادی:**

سرنا: سیر سے مشتق ہے۔

أذنیه: ذال کے ضمہ اور سکون کے ساتھ، أذن کا تثنیہ ہے۔

أصبعیه: أصبع کا تثنیہ ہے۔ دونوں جگہ تثنیہ کا صیغہ لانا بطور ''لف ونشر'' کے ہے۔

جؤار: جیم کے ضمہ اور ہمزہ کے ساتھ، کبھی ہمزہ کو واؤ سے بدل دیتے ہیں۔

قوله: ثم سرنا حتی أتینا علی ثنیة ......:

ثنیة: ثائے مثلثہ کے فتحہ و کسرہ، نون، اور یائے تحتانیہ مشددہ کے ساتھ۔

هرشی: ھاء، پھر راء، اس کے بعد شین معجمہ اور پھر الف مقصورہ ہے جو بصورت یاء لکھا جاتا ہے۔ جیسا کہ سکری.

وادی الازرق: حرمین کے درمیان واقع جگہ کا نام ہے۔ اسی وادی کو ''ازرق'' کہنے کی وجہ یہ ہے کہ یہ وادی نیلگوں تھی، اور بعض کا کہنا ہے کہ ''أزرق'' نامی کسی شخص کی طرف منسوب ہے۔

لفت: اکثر نسخوں میں لام کے کسرہ اور فاء کے سکون کے ساتھ ہے۔ اور امام طیبیؒ نے اس کا تین طرح سے مروی ہونا نقل کیا ہے۔

(۱) لام کے کسرہ، فاء کے سکون (۲) لام کے کسرہ اور فاء کے فتحہ کے ساتھ (۳) لام اور فاء دونوں کے فتحہ کے ساتھ۔

علیه جبة صوف: اون کا جبہ زیب تن کرنا زہد و تواضع کے باعث تھا، یہ حدیث صوفیائے کرام اور انکے متبع بعض علماء مثلاً امام کسائی کا ماخذ ہے۔ اور شاید کہ یہ جبہ انہوں نے ہیئت معتاد سے ہٹ کر زیب تن کیا ہوا تھا، اور یہ بھی ممکن ہے کہ حضرت یونس علیہ السلام کی شریعت میں محرم کیلئے جبہ وغیرہ پہننا مطلقاً جائز ہو۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

خطام: بروزن "زمام" بمعنی لگام۔

خلجة: خائے معجمہ کے ضمہ، لام کے سکون، نیز خاء اور لام ہر دو کے ضمہ کے ساتھ، اس کے بعد بائے موحدہ اور پھر ھاء، بمعنی لیفة نخل.

واضعاً: لفظ "موسیٰ" سے حال ہے۔ امام طیبیؒ فرماتے ہیں: "واضعا" اور "مارا"، دونوں حال مترادفہ ہیں، یا حال متداخلہ ہیں، اور ذوالحال "موسیٰ" ہیں۔ حال اور ذوالحال کے درمیان راوی یعنی آنحضرت ﷺ کا کلام ہے۔

مارا، ملبیا: دونوں، لفظ "یونس" سے "حال" ہیں۔

اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ حج شعائر اللہ میں سے ہے۔ انبیاء کرامؑ کا جیتے جی اور دنیا سے پردہ فرمانے کے بعد حج کرنا شعائر انبیاء میں سے ہے۔ نیز حج اور تلبیہ کی ترغیب معلوم ہوتی ہے۔

امام نوویؒ فرماتے ہیں: یہاں یہ سوال ہوتا ہے کہ انبیاء کرام کا حج کرنا، تلبیہ پڑھنا، کیسے ممکن ہے۔ حالانکہ وہ اس دنیا سے رحلت فرما چکے ہیں، اور دار الآخرۃ، دار العمل نہیں؟

اس کے متعدد جواب دیئے گئے ہیں:

پہلا جواب: انبیاء شہداء کی مانند ہیں، بلکہ ان سے بھی افضل ہیں، اور شہداء کے بارے میں قرآنی فیصلہ یہ ہے:

﴿لا تقولوا لمن يقتل في سبيل الله أموات بل أحياء ولكن لا تشعرون﴾ "جو لوگ اللہ کی راہ میں قتل کئے جاتے ہیں ان کی نسبت یوں بھی مت کہو کہ وہ (معمولی مردوں کی طرح) مردے ہیں بلکہ وہ تو ایک ممتاز حیات کے ساتھ زندہ ہیں لیکن تم (اس) حواس سے (اس حیات کا) دراک نہیں کر سکتے) لہٰذا ان حضرات کا حج کرنا، نمازیں پڑھنا، اور بارگاہ باری میں بقدر استطاعت تقرب حاصل کرنا کوئی بعید نہیں، اگر چہ یہ حضرات وفات پا چکے ہیں مگر ہیں تو اسی دنیا میں جو دار العمل ہے، حتی کہ جب اس کی مدت ختم ہو جائے گی اور آخرت شروع ہو جائے گی، تو تب عمل منقطع ہو جائے گا۔

دوسرا جواب: تلبیہ دعا ہے، اور دعا اعمال آخرت میں سے ہے۔ چنانچہ اللہ جل شانہ کا فرمان ہے:

﴿دعواهم فيها سبحانك اللهم وتحيتهم فيها سلام وآخر دعواهم أن الحمد لله رب العالمين﴾ [یونس۔۱۰]

"ان کے منہ سے یہ بات نکلے گی کہ سبحان اللہ اور ان کا باہمی سلام ہوگا السلام علیکم اور ان کی (اس وقت کی باتوں میں) اخیر بات یہ بات ہوگی "الحمد الله رب العلمين"

تیسرا جواب: یہ واقعہ آنحضرت ﷺ کے خواب کا ہے، لیلۃ الاسراء کے علاوہ کسی اور شب کا، جیسا کہ ابن عمر رضی اللہ عنہ کی روایت میں ہے: بينما أنا نائم رأيتني اطوف بالكعبة، اور حدیث میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا پورا قصہ ذکر کیا ہے۔ میں کہتا ہوں اور انبیاء کے خواب حق وصدق ہیں۔

چوتھا جواب: آنحضرت ﷺ نے انبیاء کرام علیہم الصلوات والتسلیمات کے جن افعال کا تذکرہ کیا، یہ احوال درحقیقت ان انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام کی حیات مبارکہ کے ہیں۔ آنحضرت ﷺ کو یہ دکھایا گیا کہ یہ انبیاء کرام اپنی زندگیوں میں یہ اعمال کس انداز سے کیا کرتے تھے، جیسا کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا: كأني أنظر الى موسى!

میں کہتا ہوں کہ بظاہر "كانى أنظر الى موسى" یہ جملہ ارشاد فرمانا ان حضرات کے ماضی کے ان واقعات کا زمانہ حال میں غایت استحضار کے ساتھ بیان کرنا مقصود ہے۔

پانچواں جواب: ممکن ہے کہ یہ اس وحی کا اخبار ہو جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف ان کے بارے میں جو وحی آئی تھی، اگرچہ آنحضرتؐ نے ان کو نہیں دیکھا تھا۔

میں کہتا ہوں کہ "كأنى أنظر اليهما" اس جواب کی تردید کررہا ہے۔ (انتهى كلام القاضى عياض).

یہ حدیث اس بات کی دلیل ہے کہ اذان وغیرہ کے موقع پر رفع صوت کے وقت، انگلیاں کان میں رکھنا مستحب ہے۔ یہ استحباب واستنباط ان ہی حضرات کے مذہب پر درست ہے، جو حضرات ہم سے سابقہ شرائع کو ہمارے شریعت ہونے کے قائل ہیں۔

میں کہتا ہوں: یہ استنباط اس وقت تام ہوسکتا ہے جب یہ کہا جائے کہ تلبیہ کے وقت، کانوں میں انگلیاں دینا مستحب ہے، اور میرا گمان نہیں کہ کوئی ایک شخص بھی اس کا قائل ہو۔ اذان کے وقت، کانوں میں انگلیاں ڈالنے کے مسئلہ میں اس حدیث سے استدلال اس وجہ سے ہے کہ باب الاذان میں اس مسئلہ کی مستقل دلیل کی قلت ہے۔

۵۷۱۸ : وَعَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ خُفِّفَ عَلٰى دَاوٗدَ الْقُرْاٰنُ فَكَانَ يَاْمُرُ بِدَوَابِّهٖ فَتُسْرَجُ فَيَقْرَءُ الْقُرْاٰنَ قَبْلَ اَنْ تُسْرَجَ دَوَابُّهٗ وَلَا يَاْكُلُ اِلَّا مِنْ عَمَلِ يَدَيْهِ. (رواه البخاری)

اخرجه البخاری ٦/٤٥٣ حديث رقم ٣٤١٧، واحمد فی المسند ٢/٣١٤

ترجمہ: "حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: "حضرت داؤد علیہ السلام پر زبور کی تلاوت آسان کردی گئی تھی' وہ اپنے جانوروں پر زین کسنے کا حکم دیتے اور قبل اس کے کہ زین کسنے کا کام تمام ہو' مکمل زبور کی تلاوت کر لیتے تھے اور حضرت داؤد علیہ السلام اپنے ہاتھ کی محنت کی روزی استعمال کرتے تھے"۔ (بخاری)

تشریح: قوله: فيقرأ القرآن قبل أن تسرج دوابه:

فيقرأ القرآن: یہ لفظ اصل میں" القرآن " بمعنی "جمع" سے مأخوذ ہے، ہر جمع کردہ چیز کے بارے میں آپ یوں کہہ سکتے ہیں: قد قرأته،

"قرآن" کو قرآن کہنے کی وجہ یہ ہے کہ قرآن قصص، اَوامر، نواہی، اواعید، مواعید، آیات وسور کو جامع ہے، قرآن، غفران اور کفران کی مانند مصدر ہے۔ "قرآن" کا اطلاق کبھی نفسِ قراءت پر بھی ہوتا ہے۔ کہتے ہیں: قرأ قراءة وقرآنا، میں کہتا ہوں: اسی قبیل سے اللہ جل شانہ کا یہ فرمان بھی ہے: ﴿فاذا قرأناه فاتبع قرآنه﴾ [القيامة-١٨] "جب ہم اس کو پڑھنے لگا کریں (یعنی جب ہمارا فرشتہ پڑھنے لگا کرے) تو آپ اس کے تابع ہو جایا کیجئے"۔

تورپشتی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: یہاں "قرآن" سے مراد "زبور" ہے، اور "زبور" کو قرآن کہنا باعتبار قراءت کے اس کے اعجاز کا قصد ہے، اور یہ حدیث اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں میں سے جس بندے کیلئے چاہے وقت کو لپیٹ دیتا ہے جیسا کہ وہ جس کیلئے چاہتا ہے، مکان کو سمیٹ دیتا ہے، اور یہ ایسا باب ہے کہ اس کے ادراک کی کوئی سبیل نہیں سوائے فیضِ ربانی کے۔

میں کہتا ہوں: اس کا حاصل یہ ہے کہ یہ خرق عادت ہے۔ کسی کیلئے بسط زمان ہو گیا اور کسی کیلئے طیّ لسان. پہلا مفہوم اظہر ہے۔ شب اسراء میں یہی فضیلت نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام کو بصورت اکمل حاصل ہوئی کہ آپ کی خاطر بسط زمان بھی ہوا اور طی لسان بھی۔ اور آنحضرت کے متبعین میں بھی اس کا ظہور ہوا جیسا کہ سیدنا حضرت علی کرم اللہ وجھہ کے بارے میں حکایت ہے کہ وہ اپنی سواری کی ایک رکاب میں پاؤں رکھتے وقت قرآن کریم کی تلاوت شروع کرتے اور دوسری رکاب میں پاؤں ڈالنے کے وقت تک پورے قرآن کریم کی تلاوت تحقق مبانی اور فہم معانی سمیت ختم فرما لیتے تھے۔

مولانا نور الدین عبد الرحمٰن الجامی قدس اللہ سرہ السامی اپنی کتاب " **نفحات الأنس في حضرات القدس** "میں اپنے بعض مشائخ سے ناقل ہیں: حجر اسود اور رکن اسعد کے استیلام سے لے کر باب کعبہ شریف کے محاذات تک پہنچنے کے درمیانی عرصہ میں قرآن کریم مکمل فرما لیا کرتے تھے۔ شیخ شہاب الدین سہروردیؒ نے حضرت سے ایک کلمہ ایک ایک حرف، اول سے آخر تک بغور سنا، **قدس الله أسرارهم ونفعنا ببركة أنوارهم.**

قوله: ولا ياكل الا من عمل يديه:

جیسا کہ اللہ جل شانہ کا فرمان ہے: ﴿**وألنا له الحديد أن اعمل سبغت**﴾ [سبا۔۱۰۔۱۱]

اور ہم نے ان کے واسطے لوہے کو نرم کر دیا (اور یہ حکم دیا) کہ تم پوری زرہیں بناؤ"

يديه، تثنیہ کا صیغہ اس بات کی طرف مشعر ہے کہ ان کا یہ کام دونوں ہاتوں کے مرہونِ منّت تھا، لہٰذا ان کا اجر بھی دوہرا ہوا، الجامع کی روایت میں بصیغہ مفرد مروی ہے، اس کو جنس پر محمول کیا جائے۔

ابن لال نے ابوسعیدؓ سے مرفوعاً روایت ہے:

أفضل الاعمال الكسب من الحلال.

"افضل ترین عمل حلال کمانا ہے۔"

تخریج: اس روایت کو امام احمدؒ نے بھی نقل کیا ہے۔

۵۷۱۹ : **وَعَنْهُ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ كَانَتِ امْرَاَتَانِ مَعَهُمَا ابْنَاهُمَا جَآءَ الذِّئْبُ فَذَهَبَ بِابْنِ اَحَدٰهُمَا فَقَالَتْ صَاحِبَتُهَا اِنَّمَا ذَهَبَ بِابْنِكِ وَقَالَتِ الْاُخْرٰى اِنَّمَا ذَهَبَ بِابْنِكِ فَتَحَا كَمَتَا اِلٰى دَاوُدَ فَقَضٰى بِهٖ لِلْكُبْرٰى فَخَرَجَتَا عَلٰى سُلَيْمَانَ بْنِ دَاوُدَ فَاَ خْبَرَتَاهُ فَقَالَ ائْتُوْنِى بِالسِّكِّيْنِ اَشُقُّهُ بَيْنَكُمَا فَقَالَتِ الصُّغْرٰى لَا تَفْعَلْ يَرْحَمُكَ اللّٰهُ هُوَ ابْنُهَا فَقَضٰى بِهٖ لِلصُّغْرٰى.** (متفق عليه)

اخرجه البخاري ٤٥٨/٦حديث رقم ٣٤٢٧ومسلم ١٣٤٤/٣حديث رقم (١٧٢٠/٢٠)والنسائي ٢٣٥/٨ حديث رقم ٥٤٠٢، واخرجه احمدفي المسند ٣٢٢/٢۔

ترجمہ: "حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نبی اقدس ﷺ سے روایت نقل فرماتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے (حضرت داؤد علیہ السلام کے دور کا) یہ واقعہ بیان فرمایا کہ "دو خواتین تھیں اور ان دونوں کے پاس ایک ایک لڑکا تھا" (ایک دن) ایک بھیڑیا آیا اور ان میں سے ایک عورت کے لڑکے کو اٹھا کر لے گیا (اب دونوں خواتین آپس میں جھگڑنے لگیں) ایک سہیلی

نے دوسری سے کہا کہ بھیڑیا تیرے لڑکے کو لے کر گیا ہے' اور دوسری نے کہا کہ نہیں' وہ لے کر ہی تیرے لڑکے کو گیا تھا' آخر کار دونوں اپنا مقدمہ لے کر حضرت داؤد علیہ السلام کی مجلس میں آ پہنچیں اور حضرت داؤد علیہ السلام نے (دونوں کے بیانات سن کر) موجود لڑکے کا فیصلہ بڑی عمر کی خاتون کے حق میں فرمایا۔ پھر وہ دونوں عورتیں حضرت سلیمان علیہ السلام کے پاس آئیں اور ان سے (پورا قضیہ اور حضرت داؤد علیہ السلام کا فیصلہ) بیان کیا (نیز انہوں نے سیدنا سلیمان علیہ السلام سے اپنا فیصلہ دینے کو کہا) حضرت سلیمان علیہ السلام نے (صورت واقعہ کی نزاکت اور پیچیدگی کو سمجھ کر (اپنے خادموں سے) کہا کہ ذرا چھری اٹھا لاؤ' میں اس لڑکے کے دو ٹکڑے کر کے تم دونوں میں تقسیم کر دیتا ہوں۔ چھوٹی عمر کی عورت (نے ان کا) یہ فیصلہ سنا تو تڑپ اٹھی اور کہنے لگی: خدا آپ پر رحم کرے ایسا نہ کیجئے گا! لڑکا بڑی عمر والی عورت ہی کو دے دیجئے' یہ اسی کا ہے (یہ دیکھ کر) حضرت سلیمان علیہ السلام نے چھوٹی عمر والی عورت کے حق میں فیصلہ کیا اور اس کو لڑکا دلوا دیا''۔

(بخاری و مسلم)

تشریح: قولہ: کانت امرأتا ن معہما ابنا ہما:

اس سارے نزاع کی وجہ شاید یہ ہوئی کہ وہ دونوں بچے ہم شکل تھے، یا ان دونوں میں سے ایک عورت واقعی جھوٹی تھی، وہ اپنے مفقود بچے کے عوض اس بچہ سے انس حاصل کرنا چاہتی تھی، یا دیگر اغراض فاسدہ کار فرما تھیں۔

قولہ: فقضٰی بہ للکبری:

حضرت داؤد علیہ السلام کے اس فیصلہ کی بنیاد یہ تھی کہ وہ بچہ بڑی عورت کے پاس تھا، اور شرعی قاعدہ بھی یہی ہے کہ صاحب الید اُولیٰ ہے۔ یا حضرت داؤد علیہ السلام نے یہ فیصلہ علم قیافہ کی بنیاد پر کیا۔ جیسا کہ امام شافعیؒ فرماتے ہیں۔

قولہ: فقضی بہ للصغری: شارح کا فرماتے ہیں کہ ان دونوں حضرات کا صادر کردہ فیصلہ برحق تھا، چونکہ دونوں مجتہد تھے، اور ان دونوں حضرات کے فیصلہ کی بنیاد فقط قرینہ تھا، البتہ اتنی بات ضرور ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کا فیصلہ ظاہر کے اعتبار سے اقوی تھا، اور بعض کا کہنا ہے کہ ہوسکتا ہے کہ ان حضرات کی شریعت میں ''قرینہ'' بمنزلہ ''بینہ'' کے ہو، یعنی اگر چہ اس قضیہ میں ایک عورت صاحب الید بھی تھی، واللہ اعلم

شرح مسلم للنوویؒ میں فرماتے ہیں: احتمال ہے کہ داؤد علیہ السلام نے بچہ کا فیصلہ بڑی کیلئے اس لئے کر دیا ہو کہ وہ بچہ بڑی سے مشابہت رکھتا ہوگا، یا اس وجہ سے کہ وہ صاحب الید تھی، اور حضرت سلیمان علیہ السلام نہایت لطیف تدبیر کے واسطے سے اصل صورتِ حال تک پہنچنے میں کامیاب ہوئے، ان کا ارادہ یہ تھا کہ ان دونوں کی محبت وشفقت کا امتحان لیا جائے تا کہ معاملہ نکھر کر سامنے آ جائے، جب معاملہ نکھر کر سامنے آ گیا تو آنحضرت نے کبریٰ کے اقرار کے باعث بچہ کا فیصلہ صغریٰ کے حق میں صادر فرمایا۔ یہ فیصلہ مجرد شفقت کی بناء پر نہیں کیا تھا۔ میں کہتا ہوں: عبارت اقرار پر دلالت سے قاصر ہے، اور نہ ہی اشارۂ اقرار معلوم ہوا ہے۔

فرمایا: علماء فرماتے ہیں: اس کی نظیر حکام کے وہ فیصلے ہیں، جن کے ذریعے وہ کسی معاملہ کی تہہ تک پہنچتے ہیں۔ میں کہتا ہوں کہ ابن قیم جوزیؒ نے اس مسئلہ کی تحقیق ''الفراسة فی السياسة'' نامی کتاب میں کی ہے۔

امام نوویؒ فرماتے ہیں: یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ حضرت سلیمان علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اپنے والد داؤد علیہ الصلوٰۃ والسلام کا فیصلہ کیسے توڑ ڈالا؟ اس کے متعدد جواب ہیں:

پہلا جواب: حضرت داؤد علیہ الصلوٰۃ والسلام نے یہ فیصلہ بالجزم نہیں کیا تھا۔

دوسرا جواب: حضرت داؤد علیہ الصلوٰۃ والسلام کا فتویٰ تھا۔ یہ فیصلہ نہیں تھا

تیسرا جواب: ممکن ہے کہ ان کی شریعت میں اس بات کی گنجائش ہو کہ فیصلہ ہو چکنے کے بعد خصم اگر دوسرے قاضی کے پاس مرافعت کرے، اور دوسرا قاضی پہلے فیصلہ کے برعکس رائے رکھتا ہو، تو وہ پہلے قاضی کے حکم کو فسخ کر سکتا ہے۔

میں کہتا ہوں: ان جوابات میں سے ہر جواب محل نظر ہے۔ بہتر توجیہ یہ ہے کہ یوں کہا جائے کہ ان دونوں حضرات کے نزدیک قرینہ کا اعتبار اولیٰ تھا، البتہ اگر کبریٰ کا اقرار درست ہو کہ یہ بچہ صغریٰ کا ہے تو اس صورت میں تو کوئی اشکال سرے سے ہی نہیں ہوتا، چونکہ اقرار بعد الحکم تو ہمارے ہاں بھی معتبر ہے، جیسا کہ فیصلہ ہو چکنے کے بعد ''محکوم علیہ'' یہ اعتراف کر لے کہ حق اس کے خصم کا ہے، واللہ تعالیٰ اعلم۔

۵۷۲۰ : وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ سُلَيْمٰنُ لَاَ طُوْفَنَّ اللَّيْلَةَ عَلٰى تِسْعِيْنَ امْرَاَةٍ وَفِيْ رِوَايَةٍ بِمِائَةِ امْرَاَةٍ كُلُّهُنَّ تَاْتِيْ بِفَارِسٍ يُجَاهِدُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَقَالَ لَهُ الْمَلَكُ قُلْ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ فَلَمْ يَقُلْ وَنَسِيَ فَطَافَ عَلَيْهِنَّ فَلَمْ تَحْمِلْ مِنْهُنَّ اِلَّا امْرَاَةٌ وَّاحِدَةٌ جَاءَتْ بِشِقِّ رَجُلٍ وَاَيْمُ الَّذِيْ نَفْسُ مُحَمَّدٍ بِيَدِهٖ لَوْ قَالَ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ لَجَاهَدُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فُرْسَانًا اَجْمَعُوْنَ. (متفق عليه)

اخرجه البخاری ٤٥٤/٦حديث رقم ٢٨١٩ومسلم ١٢٧٦/٣حديث رقم (١٦٥٤/٢٥) والترمذی ٩٢/٤حديث رقم ١٥٣٢ والنسائی ٢٥/٧حديث رقم ٣٨٣١

ترجمہ: ''حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا کہ جناب کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''(ایک روز) حضرت سلیمان علیہ السلام نے یہ بات کہی (یعنی یہ عزم وارادہ کیا) کہ آج شب میں اپنی نوے بیویوں اور ایک اور روایت کے مطابق سو بیویوں سے ازدواجی تعلق قائم کروں گا ان میں سے ہر بیوی ایک شہ سوار کو جنم دے گی جو راہ خدا میں جہاد کرے گا۔ (چونکہ انہوں نے اس عزم وارادہ کے وقت' جو ہر حال ایک نیک مقصد تھا ''ان شاءاللہ'' نہیں کہا اس لئے اس) فرشتہ نے جو دائیں جانب ہوتا ہے یا حضرت جبرئیل علیہ السلام نے اور یا کسی بھی فرشتہ نے انہیں تلقین کی کہ آپ ''ان شاءاللہ'' کہہ لیجئے! لیکن حضرت سلیمان علیہ السلام ''ان شاءاللہ'' کہنا بھول گئے' پھر انہوں نے (حسب ارادہ) ان سب بیویوں کے ساتھ مباشرت کی اور ان میں سے کوئی بھی حاملہ نہ ہوئی سوائے ایک بیوی کے اور اس نے بھی آدھا مرد یعنی ناقص الخلقت بچہ کو جنم دیا''۔ (اور پھر اس وقت حضور اقدس ﷺ نے ارشاد فرمایا) قسم ہے اس ذات پاک کی جس کے قبضہ قدرت میں محمد (ﷺ) کی جان ہے' سلیمان علیہ السلام اگر ''ان شاءاللہ'' کہہ لیتے تو ضرور ہر بیوی سے بیٹا پیدا ہوتا اور وہ سب اللہ کے راستہ میں جہاد کرتے اور سب کے سب شہ سوار بہادر ثابت ہوتے''۔ (بخاری ومسلم)

تشریح: قوله:فكال له الملك قل :ان ساء الله الك:

لأطوفن:''طواف''۔یہاں کنایہ ہے''جماع'' سے۔

أيم الله:اس کے بارے میں لفظی اور معنوی تحقیق ماقبل میں گذر چکی ہے۔اور امام تورپشتی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: أيم الله اصل میں'' أيمن الله'' تھا،نون حذف کر دیا گیا،'' أيم'' اسم ہے قسم کیلئے موضوع ہے۔یہ لفظ میم کے ضمہ اور نون کے ساتھ ہے، اکثر نحویوں کے نزدیک اس کا الف وصلی ہے۔اسماء میں کوئی بھی اسم ایسا نہیں کہ جس کا الف وصلی مفتوح ہو،سوائے'' ایم'' کے، اس کی تقدیر یوں ہے:'' أيمن الله قسمي''نون حذف کرنے کے بعد'' أيم الله''پڑھا جاتا ہے،ہمزہ کے فتحہ اور کسرہ دونوں کے ساتھ۔

قوله:لأطوفن الليلة على تسعين امرأة وفي رواية بمائة امرأة:

حافظ عسقلانیؒ فرماتے ہیں: روایات میں مختلف تعداد مروی ہے۔ایک روایت میں چھہتر (۷٦) ہے۔ایک روایت میں نوے(۹۰) ہے۔ایک روایت میں ننانوے(۹۹) ہے،اور ایک روایت میں(۱۰۰) ہے۔ان روایات میں تطبیق کی صورت یہ ہے کہ ساٹھ حرائر تھیں،اور باقی سرائر تھیں۔یا اس کے برعکس،اور ستر کا عدد مبالغہ پر محمول ہے،نوے والی روایت کو حذف کسر پر محمول کیا جائے گا،اور سو والی روایت کو جبر عدد پر محمول کیا جائے گا۔

نسي: بروزن علم ہے اور نون کے ضمہ اور سین کی تشدید کے ساتھ بھی مروی ہے اور یہی زیادہ بہتر ہے،اس صورت میں مطلب یہ ہوگا،کہ انہیں یہ بات بھلا دی گئی،فراموش کر دی گئی۔کہ دل اور زبان دونوں کو جمع کرنا''ارباب جمع''اور اصحاب عرفان کے نزدیک اکمل درجہ رکھتا ہے۔

بعض حضرات کا کہنا ہے کہ یہ حدیث اس بات پر دلالت کرتی ہے،کہ کسی بھی کام کے ارادہ وعزم کے اظہار کے وقت یہ کہنا مستحب ہے،کہ میں فلاں کام کروں گا ان شاء اللہ تعالیٰ کی میشئت کے ساتھ معلق کرنے اللہ کا فائدہ یہ ہوگا کہ اس کام میں اللہ جل شانہ کی طرف سے مدد و برکت شامل ہو جائے گی۔اور مطلوبہ امر آسانی وسہولت کے ساتھ پایۂ تکمیل تک پہنچ جائے گا۔چنانچہ قرآنی تعلیمات بھی یہی ہیں:؟؟﴿ولا تقولن لشيء اني فاعل ذلك غدا الا أن يشاء الله﴾ [الکھف۔۲۳] ''اور آپ کسی کام کی نسبت یوں نہ کہا کیجئے کہ میں اس کو کل کروں گا مگر اللہ کے چاہنے کو ملا دیا کیجئے''۔

فرسانا:''جاهدوا'' کی ضمیر سے حال ہے۔

أجمعون:(''جاهدوا کی'')ضمیر کی تاکید ہے،اور بعض نے''أجمعين ''منصوب علی الحالیۃ،روایت کیا ہے،اور رفع والی روایت ہی معتمد ہے۔

تخریج: الجامع کی روایت میں یہ الفاظ وارد ہوئے ہیں:

قال سليمان بن داود:لأطوفن الليلة على مائة امرأة، كلهن تأتي بفارس يجاهد في سبيل الله. فقال له صاحبه:قل ان شاء الله، فلم يقل ان شاء الله، فطاف عليهن، فلم تحمل منهن الا امرأة واحدة جاءت بشق انسان، والذى نفس محمد بيده لو قال:ان شاء الله، لم يحنث وكان دركا لحاجته.

اس حدیث کو امام احمدؒ، شیخین اور نسائی نے حضرت ابو ہریرہؓ سے نقل کیا ہے۔

۵۷۲۱ : وَعَنْهُ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ كَانَ زَكَرِيَّاءُ نَجَّارًا (رواه مسلم)

اخرجه مسلم ١٨٤٧/٤ حديث (١٦٩-٢٣٧٩) وابن ماجه ٧٢٧/٢ حديث رقم ٢١٥٠ واحمد فى المسند ٢٩٦/٢۔

ترجمہ: ''حضرت ابو ہریرہؓ نے بیان فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''حضرت زکریا علیہ السلام بڑھئی تھے''۔ (مسلم)

تشریح: زکریا: قصر ومدّ ہر دو کے ساتھ مروی ہے۔ حضرت زکریاء علیہ السلام بڑھئی کا کام کرتے تھے، اور اپنی ہاتھ کی کمائی کھاتے تھے، اس حدیث اور اس سے پہلے والی حضرت داؤد علیہ السلام سے متعلقہ حدیث اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ کسب سنّت انبیاء ہے۔ توکل کے منافی نہیں۔ جیسا کہ بعض انبیاء کرام اور اولیاء اصفیاء کی ایک جماعت کا وطیرہ رہا ہے، البتہ علماء کے ہاں یہ مسئلہ بہرحال اختلافی ہے، کہ دونوں میں سے افضل کیا ہے۔ اس کی تحقیق ''کتاب الاً حیاء'' میں ملاحظہ فرمائیے۔

تخریج: اس حدیث کو امام احمدؒ اور امام ابن ماجہؒ نے بھی روایت کیا ہے۔

۵۷۲۲ : وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَنَا اَوْلَى النَّاسِ بِعِيْسَى ابْنِ مَرْيَمَ فِي الْاُوْلٰى وَالْاٰخِرَةِ اَلْاَنْبِيَاءُ اِخْوَةٌ مِنْ عَلَّاتٍ وَاُمَّهَاتُهُمْ شَتّٰى وَدِيْنُهُمْ وَاحِدٌ وَلَيْسَ بَيْنَنَا نَبِيٌّ۔ (متفق عليه)

اخرجه البخارى فى صحيحه ٤٧٧/٦ حديث رقم ٣٤٤٢-٣٤٤٣ ومسلم ١٨٣٧/٤ حديث رقم (١٤٥-٢٣٦٥)

ترجمہ: ''حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''دنیا اور آخرت میں (یا آغاز وانجام میں) حضور عیسیٰ کا سب سے زیادہ قرابتدار اور قریبی میں ہی ہوں اور تمام انبیاء باہم سوتیلے بھائی ہیں جن کا باپ تو ایک ہے لیکن مائیں جدا جدا ہیں' ان سب کا دین ومذہب کی اصل ایک ہی ہے اور ہمارے (یعنی میرے اور عیسیٰ علیہ السلام کے) درمیان کوئی نبی نہیں ہے''۔ (بخاری ومسلم)

تشریح: قوله: أنا أولى الناس بعيسى ابن مريم فى الأولى والاخرة:

حافظ ابن حجرؒ فرماتے ہیں: أى: اقربهم اليه، چونکہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اپنے بعد آنحضرت ﷺ کی آمد کی بشارت دی تھی۔ مذکورہ حدیث اور اس آیت کریمہ میں کوئی منافات نہیں: ﴿ان اولى الناس بابراهيم للذين اتبعوه وهذا النبى﴾ [آل عمران-٦٨] ''بلاشبہ سب آدمیوں میں زیادہ خصومت رکھنے والے (حضرت) ابراہیم کے ساتھ البتہ وہ لوگ تھے جنہوں نے ان کا اتباع کیا تھا اور یہ نبی (ﷺ) ہیں'' چونکہ اس آیت میں اولویت بالاقتداء مراد ہے۔ اور حدیث میں اولویت باعتبار قرب مراد ہے۔ انتہی

لیکن یہ بات بھی مخفی نہیں کہ مجرد قرب عہد مراد ہو تو حدیث کا اگلا جملہ الانبياء اخوة اس مفہوم سے میل نہیں کھاتا۔ لہٰذا اولیٰ وہ ہی بات ہے جو قاضیؒ نے ارشاد فرمائی: من أن الموجب لكونه اولى الناس بعيسى عليه الصلوٰة والسلام أنه كان أقرب المرسلين اليه وان دينه متصل بدينه، وأن عيسى كان مبشرا به، ممهدا لقواعد دينه، داعيا

للخلق الیٰ تصدیقه.

قوله: الانبياء اخوة من علامت وأمها لهم شي:

فرمایا: یہ جملہ مستانفہ ہے۔ یہ حکم سابق کی دلیل ہے۔ گویا کہ سائل نے اولویت کے مقتضیٰ کے بارے میں سوال کیا تو آپ ﷺ نے اس کا جواب ارشاد فرمایا۔ اور یہ بیان فرمایا، کہ انبیاء کا باہمی اخوت کا رشتہ، اور انبیاء اور دیگر تمام لوگوں کے آپس کے اُخوت کے رشتہ جدا جدا ہیں، اور اس کو نسب کی مانند قرار دیا کہ نسب اُقرب الأسباب ہے، اور پھر اپنے زمانہ کو ان کے زمانے کے قریب، اور اپنی دعوت کو ان کی دعوت سے متصل قرار دیا، جیسا کہ ''**ليس بيننا نبی**'' اس پر دلالت کر رہا ہے۔

اگر یہ سوال کیا جائے کہ حدیث باب اور اس آیت کریمہ: ﴿**ان اولی الناس بابراهيم للذين اتبعوه وهذا النبی**﴾ [آل عمران۔٦٨] ''بلاشبہ سب آدمیوں میں زیادہ خصوصیت رکھنے والے (حضرت) ابراہیم کے ساتھ البتہ وہ لوگ تھے جنہوں نے ان کا اتباع کیا اور یہ نبی (ﷺ) ہیں'' میں تطبیق کی صورت کیا ہوگی، تو اس کا جواب یہ ہے کہ حدیث آنحضرت کے متبوع ہونے پر اور آیت آنحضرت ﷺ کے تابع ہونے کے بارے میں ہے۔ اور آنحضرت ﷺ خواہ تابع ہوں خواہ متبوع ہوں فضیلت بہر حال حاصل ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿**ثم أوحينا اليك أن اتبع ملة ابراهيم حنيفا**﴾ [النحل۔١٢٣] ''پھر ہم نے آپ کے پاس وحی بھیجی کہ آپ ابراہیم کے طریقے پر جو کہ بالکل ایک طرف کے ہو رہے تھے چلئے'' اس آیت کی تفسیر ماقبل میں گزر چکی ہے۔

امام طیبیؒ نے فرمایا: ''**الأنبياء اخوة من علات**'' جملہ مستانفہ ہے، ''**أنا أولی الناس بعيسی بن مريم فی الاولی والآخرة**'' کے موجب کا بیان ہے۔ لہٰذا ''بیان'' کو ''مبین'' پر محمول کیا جائے یعنی تمام انبیاء برابر ہیں، اس اعتبار سے کہ تمام انبیاء کا مقصد بعثت ایک ہی تھا یعنی توحید۔ اس اعتبار سے کسی کو بھی کوئی خصوصیت حاصل نہیں ہے، لیکن میں ''**أخص الناس بعيسی**'' ہوں چونکہ انہوں نے میری بعثت سے پہلے میری آمد کی بشارت سنائی، انہوں نے میری ملت کے قواعد کی بنیادیں ڈالیں، اور پھر آخری زمانے میں میری شریعت کی اتباع کریں گے۔ اور میرے دین کی مدد و نصرت فرمائیں گے، گویا کہ ہم دونوں ایک ہیں۔

''**الأولی والآخرة**'' ممکن ہے کہ اس سے دنیا اور آخرت مراد ہوں، اور یہ بھی ممکن ہے کہ ''**الاولی**'' سے مراد ''**الحالة الاولی**'' یعنی ان کا بشر ہونا مراد ہو، اور ''**الآخرة**'' سے مراد ''**الحالة الآخرة**'' یعنی دین اسلام کا حامی و ناصر ہونا مراد ہو۔

قوله: و ليس بيننا نبی:

اس کے متعدد مطلب بیان کئے گئے ہیں:

پہلا مطلب: ہمارے درمیان مطلقاً کوئی نبی نہیں۔

دوسرا مطلب: ہمارے درمیان کوئی صاحب شریعت نبی نہیں۔

تیسرا مطلب: ہمارے درمیان کوئی ''اولوالعزم من الرسل'' نہیں۔

چوتھا مطلب: ابن الملکؒ فرماتے ہیں کہ ہمارے درمیان کوئی نہیں البتہ ان کے بعد میں نبی ہوں۔ جیسا کہ ارشاد باری

تعالیٰ ہے: ﴿ومبشرا برسول یأتی من بعدی اسمه أحمد﴾ [الصف:٦] اوراس سے ان قائلین کے قول کی نفی بھی ہوگئی جو یہ کہتے ہیں کہ عیسیٰ علیہ السلام کے بعد ان کے حواری کو نبوت عطا ہوئی، انتہیٰ۔ گویا کہ انہوں نے نفی کو اطلاق پر محمول کیا۔

تخریج: الجامع کی روایت میں یہ الفاظ منقول ہیں:

"أنا أولی الناس بعیسی بن مریم فی الدنیا والآخرة، ولیس بینی وبینه نبی، والأنبیاء أولاد علات وأمهاتهم شتی، ودینهم واحد۔"

اس حدیث کو امام احمد، شیخین، ابو داؤد رحمہم اللہ اجمعین نے روایت کیا ہے۔ یہ روایت ترتیب رعایت کے مطابق ہے، چنانچہ اس کا حسن کسی پر مخفی نہیں۔

۵۷۲۳ : وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كُلُّ بَنِيْ اٰدَمَ يَطْعَنُ الشَّيْطٰنُ فِي جَنْبَيْهِ بِإِصْبَعَيْهِ حِيْنَ يُوْلَدُ غَيْرَ عِيْسٰى ابْنِ مَرْيَمَ ذَهَبَ يَطْعَنُ فَطَعَنَ فِي الْحِجَابِ. (متفق علیه)

اخرجه البخاری ٣٢٧/٦ حدیث رقم ٣٢٨٦ ومسلم فی ١٨٣٨/٤ حدیث رقم (١٤٧-٢٣٦٦)۔

ترجمہ: "حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: "جس وقت ہر انسان پیدا ہوتا ہے تو شیطان اس کی دونوں ﷺ پہلوؤں میں اپنی دو انگلیوں سے کچوکے لگاتا ہے لیکن عیسیٰ بن مریم اس سے محفوظ رہے اس نے ان کے پہلو بھی کچوکا لگایا تھا لیکن وہ محض پردے میں کچوکا لگا سکا مار سکا"۔ (بخاری و مسلم)

تشریح: قوله: كل بنی آدم ـــ حین یولد:

یطعن: عین کے فتحہ کے ساتھ، ضمہ بھی درست ہے، "طعنه بالرمح طعنا" بمعنی "زجره وضربه" سے ماخوذ ہے، از باب نصر و منع، (قاموس) "طعن" سے مراد "مس" ہے۔ جیسا کہ ایک روایت میں وارد ہوا ہے۔

جنبیه: تثنیہ کا صیغہ کمال عداوت کی طرف مشعر ہے، نیز یہ کہ یہ مردود نا صرف دنیاوی بلکہ اخروی امور میں بھی مخلوق کو گمراہ کرنے کے درپے رہتا ہے۔

حین یولد: اس میں ولادت کا بالکل ابتدائی زمانہ مراد ہے۔ اور لفظ "یولد" مفرد ذکر کیا گیا ہے لفظ "کل" کا اعتبار کرتے ہوئے۔

قوله غیر عیسی ـــ فطعن فی الحجاب:

یہ درحقیقت ان کی دادی "حنہ" کی اس دعا کا اثر تھا، جو انہوں نے مریم علیہا السلام کیلئے مانگی تھی۔ قرآن کریم نے اس دعا کو ان الفاظ میں ذکر کیا ہے:

﴿وانی سمیتها مریم وانی أعیذها بك وذریتها من الشیطان الرجیم﴾ [آل عمران ـ ٣٦] "اور میں نے اس لڑکی کا نام مریم (علیہا السلام) رکھا اور میں اس کو اس کی اولاد کو آپ کی پناہ میں دیتی ہوں شیطان مردود سے"۔

شیطان نے مشیمہ میں کچوکا لگایا، مگر اس کچوکے کے اثر سے حضرت عیسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام محفوظ رہے، امام طیبیؒ فرماتے ہیں: یہ حدیث اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ یہاں حقیقی معنی مراد ہیں، جیسا کہ وسوسہ کے بارے میں گزرا۔

میں کہتا ہوں، مکمل حدیث یوں ہے: حین یولد فیستھل صارخا من مس الشیطان غیر مریم وابنها علیهما الصلوٰة والسلام، گویا کہ راوی نے اس حدیث میں صرف حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے نام پر اقتصار کرتے ہوئے، کیونکہ یہاں مقصود اصلی صرف اتنی بات ہی تھی، یا کلام میں بعض قیودات لگی ہونے کے پیش نظر صرف عیسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ہی ذکر کیا۔

تخریج: الجامع میں امام سیوطیؒ اس حدیث کو بخاری کی طرف منسوب کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ مسلم کی روایت میں یہ الفاظ وارد ہوئے ہیں: کل بنی آدم یمسه الشیطان یوم ولدته أمه الا مریم وابنها.

۵۷۲۴ : وَعَنْ اَبِیْ مُوْسٰی عَنِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قَالَ کَمُلَ مِنَ الرِّجَالِ کَثِیْرٌ وَّلَمْ یُکْمَلْ مِنَ النِّسَآءِ اِلَّا مَرْیَمُ بِنْتُ عِمْرَانَ وَاٰسِیَةُ امْرَاَةُ فِرْعَوْنَ وَفَضْلُ عَائِشَةَ عَلَی النِّسَآءِ کَفَضْلِ الثَّرِیْدِ عَلٰی سَائِرِ الطَّعَامِ (متفق علیه وذکر حدیث انس یا خیرالبریة وحدیث ابی هریرة) اَیُّ النَّاسِ اَکْرَمُ وحدیث بن عمر الکریم ابن الکریم فی باب المفاخرة والعصبیة۔

اخرجه البخاری فی صحیحه ٤٤٦/٦حدیث رقم٣٤١١ومسلم فی ١٨٨٦/٤حدیث رقم (٢٤٣١٧٠)
واخرجه الترمذی ٢٤٢/٤حدیث رقم ١٨٣٤ واخرجه ابن ماجه ١٠٩١/٢حدیث رقم ٣٢٨٠، واخرجه فی المسند ٣٩٤/٤

ترجمہ: "حضرت ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ نبی اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت نقل فرماتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: مرد تو کئی ذو کمال گزرے ہیں (جیسے انبیاء، خلفاء، علماء اور اولیاء اللہ) لیکن خواتین میں سے چند ہی درجہ کمال پر فائز ہوئیں اور وہ عمران علیہ السلام کی بیٹی مریم اور فرعون کی بیوی آسیہ ہیں۔ نیز تمام خواتین پر سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کو ایسی فضیلت وفوقیت حاصل ہے جیسی کھانوں پر ثرید کو فضیلت ہے۔ (بخاری ومسلم) اور حضرت انس رضی اللہ عنہ کی روایت یا خیر البریه الخ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت ای الناس اکرم ...... اور حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کی روایت الکریم ابن الکریم ...... باب المفاخرة والعصبیه میں نقل کی جا چکی ہے۔

تشریح: قوله: کمل من الرجال کثیر:

کمل: از باب نصر، کرم اور علم، (قاموس ابن الملکؒ "شرح المشارق" میں فرماتے ہیں: " کمل " میں تین لغات ہیں، میم کے کسرہ والی لغت ضعیف ہے۔ میں کہتا ہوں: ضمہ کی لغت صحیح ہے، معنی لازمی کی موافقت کے اعتبار سے، یعنی کامل ہوئے یا یہ بلغ کمال پہنچے

کمل: ہمارے نسخہ میں میم کے ضمہ کے ساتھ ہے۔ ایک نسخہ میں فتحہ کے ساتھ ہے، اور کسرہ بھی درست ہے۔

قوله: ولم یکمل من النساء الا مریم بنت عمران وآسیة امراة فرعون:

تقدیری عبارت یوں ہے: الا قلیل منهن،

چونکہ کامل عورتوں کی تعداد دو ہی تھی اس لئے نام صراحت کے ساتھ ذکر فرما دیئے، بخلاف رجال کے، کیونکہ رجال کی تعداد اور ان کا استقصاء، بطور انحصار کے ذکر کرنا امر مستبعد تھا، خواہ ان کاملین رجال سے مراد فقط انبیاء یا اولیاء ہی کیوں نہ ہوں۔

حافظ ابن حجرؒ فرماتے ہیں: اس حصر سے ان دونوں خواتین کے نبی ہونے پر استدلال کیا گیا ہے، کیونکہ انسانوں میں سب سے کامل انبیاء ہیں پھر اولیا ءصدیقین اور شہداء۔ اگر یہ دونوں غیر نبی ہوتیں تو لازم تھا کہ عورتوں میں ولی، صدیقہ یا شہیدہ وغیرہ بھی نہ پائی جائیں۔ کرمانیؒ فرماتے ہیں: کمال سے انکی نبوت کا ثبوت لازم نہیں آتا، **لأنه يطلق لتمام الشيء وتناهيه في بابه**، لہٰذا مراد یہ ہے کہ انہوں نے تمام نسوانی فضائل حاصل کیے۔

میں کہتا ہوں اس مقال سے بھی اشکال مرتفع نہیں ہوتا، سوائے اس کے کہ یوں کہا جائے کہ عورت کے کامل ہونے سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہ اس قدر کامل ہوگئی کہ نبوت بھی اس کو لازم ہوگئی ہو، بلکہ اتنا کمال مراد ہے کہ جس کے ذریعے ولایت حاصل ہو جائے۔

ان دونوں خواتین کے نام بطور حصر ذکر کرنے کا مقصد ان کی خصوصیت بتلانا ہے، کہ یہ خواتین جس درجہ کامل ٹھہری ہیں، اس قدر کمال ان کے زمانے کی عورتوں، یا پچھلی امتوں میں سے کسی بھی عورت کو، یا کبھی بھی کسی بھی عورت کو نہ حاصل ہوا ہے، نہ حاصل ہوگا۔

عورت اور نبوت:

علماء کا اجماع ہے کہ عورت کو نبوت نہیں مل سکتی، عورت نبی نہیں ہوسکتی، اور اس کی دلیل اللہ جل شانہ کا یہ فرمان ہے: ﴿وما أرسلنا من قبلك الا رجالا﴾ [یوسف۔۱۰۹] ”اور ہم نے آپ سے پہلے مختلف بستیوں والوں میں جتنے (رسول) بھیجے سب آدمی ہی تھے“ لیکن امام اشعریؒ سے حضرت حواء، سارہ ام موسیٰ، ہاجرہ، آسیہ اور مریم علیہن السلام کا نبی ہونا منقول ہے۔ اور یہ اس بنیاد پر درست قرار دیا جاسکتا ہے کہ نبی اور رسول میں فرق ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

ابن الملکؒ اعتراض سابق کا جواب دیتے ہوئے شرح المشارق میں لکھتے ہیں: کسی شی میں کمال' کامل کو حاصل ہونا غیر کو حاصل ہونے سے اولیٰ ہے۔ اور نبوت عورتوں کیلئے مناسب و اُولی بھی نہیں، چونکہ نبوت کا مبنیٰ ظہور و دعوت پر ہے، اور عورتیں تستر کی پابند ہیں، چنانچہ نبوت، عورتوں کے حق میں کمال نہیں، بلکہ صدیقیت ان کے حق میں کمال ہے۔ اور صدیقیت کا درجہ ویسے بھی نبوت کے قریب ہے۔ (انتہیٰ)

اور یہ بات مخفی نہ رہے کہ یہ دعویٰ نبوت و رسالت کے ترادف کے قول پر تام ہوسکتا ہے، وگرنہ تو جیسا کہ جمہور کا مذہب ہے کہ رسول تبلیغ پر مامور ہوتا ہے، بخلاف نبی کے، لہٰذا نبوت سے عدم تستر لازم نہیں آتا، باوجود یہ کہ رسالت بھی تستر کے منافی نہیں، کما لایخفی. واللہ تعالیٰ اعلم۔

قوله: وفضل عائشة على النساء كفضل الثريد على سائر الطعام:

(اس کے کئی مطالب ہوسکتے ہیں)

پہلا مطلب: دنیا بھر کی عورتوں کی جنس پر ہے۔

دوسرا مطلب: حضرت عائشہ کی فضیلت مذکورہ تمام خواتین پر۔

تیسرا مطلب: حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی فضیلت اپنے زمانے کی عورتوں پر۔

چوتھا مطلب: حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی فضیلت اس امت کی عورتوں پر۔

پانچواں مطلب: حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی فضیلت ازواج مطہرات پر۔

فائدہ: امام طیبیؒ فرماتے ہیں: "عائشة" کا عطف "آسیه" پر کرنے کے بجائے ایک مستقل جملہ کی صورت میں ذکر کرنا اس بات پر تنبیہ ہے کہ حضرت عائشہ صدیقہؓ کو باقی تمام خواتین کے مقابلے میں ایک ایسی خصوصیت حاصل ہے جو ان کو دوسروں سے ممتاز کرتی ہے۔ طرز بیان کے اس اسلوب کی نظیر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد گرامی ہے:

حبب الی من الدنیا ثلاث: الطیب والنساء وجعل قرة عینی فی الصلوٰة۔

میں کہتا ہوں عن قریب ایک اور روایت آرہی ہے جو اس کے خلاف پر دلالت کر رہی ہے، مزید یہ کہ لفظ "ثلاث" حدیث میں ثابت نہیں۔

تورپشتی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: ثرید کے ساتھ تشبیہ دینے کی وجہ یہ ہے کہ "ثرید" عرب کے کھانوں میں سے افضل ترین کھانا ہے، ان کے ہاں اس کھانے سے بڑھ کر کسی کھانے سے سیری حاصل نہیں ہوتی، اور بعض کا کہنا ہے کہ اہل عرب اس ثرید کو بہت زیادہ سراہتے تھے کہ جس میں گوشت ڈلا ہوا ہو، اور ایک روایت میں ہے: سید الطعام اللحم، تو گویا کہ حضرت عائشہ صدیقہؓ کو عورتوں پر وہی فضیلت حاصل ہے، جو فضیلت گوشت کو دوسرے کھانوں پر حاصل ہے، اور اس میں راز یہ ہے کہ گوشت والی ثرید بہت جامع ہوتی ہے، کہ اس میں غذائیت وقوت بھی ہے اور لذت بھی، اس کے تناول کرنے میں کوئی مشقت نہیں اور چبانے میں کوئی دقت نہیں۔ اور خوراک کی نالی "مریٔ" سے آسانی اور تیزی کے ساتھ گزر جاتی ہے، چنانچہ "ثرید" کے ذریعہ مثال یہ بتانے کیلئے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا خوب سیرت بھی تھیں اور خوب صورت بھی، ان کے نطق میں حلاوت تھی، تو لہجہ میں فصاحت بھی تھی، رزانت رائے بھی تھی اور صانت عقل تھی، اور شوہر کو محبوب بھی تھیں، ایسی عورت ہی بیوی بننے، ہم کلام ہونے اور انس حاصل کئے جانے کے قابل ہے، اور ان کی بابت اتنی بات بھی کافی ہے کہ انہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے وہ کچھ سمجھا جو دوسری خواتین نہ سمجھ پائیں۔ اور نبی کریمؐ سے جو انہوں نے روایت کیا ان کی مثل تو مردوں نے بھی روایت نہیں کیا۔

حضرت عائشہ، حضرت خدیجہ، اور حضرت فاطمہؓ میں سے کون افضل ہے، یہ مسئلہ اختلافی ہے۔ اکملؒ فرماتے ہیں: ابوحنیفہؒ سے مروی ہے، کہ حضرت خدیجہ کے بعد حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا تمام جہانوں کی عورتوں سے افضل ہیں۔ میں کہتا ہوں ان **عائشةبعد خدیجةافضل نساء العالمین** حضرت خدیجہ اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی تساوی کا احتمال رکھتا ہے، کیونکہ حضرت خدیجہ عارفین سابقین میں سے ہیں، اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فاضلین لاحقین میں سے ہیں۔ حافظ ابن حجرؒ فرماتے ہیں. حضرت فاطمہؓ بالاجماع حضرت خدیجہؓ اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے افضل ہیں پھر حضرت خدیجہ اور پھر حضرت عائشہ۔

امام سیوطیؒ "شرح النقایہ" میں فرماتے ہیں: ہمارا اعتقاد ہے کہ حضرت مریم وفاطمہ افضل النساء ہیں۔ ترمذیؒ کی ایک روایت میں ہے کہ جس کو صحیح قرار دیا ہے: **حسبك من نساء العالمین مریم بنت عمران، وخدیجة بنت خویلد وفاطمة بنت محمد علیه السلام، وآسیة امرأة فرعون.**

صحیحین میں حضرت علیؓ سے مروی ہے:

خير نسائها مريم بنت عمران، وخير نسائها خديجة بنت خويلد.

صحیح کی ایک روایت ہے: فاطمة سيدة نساء هذه الأمة.

امام نسائیؒ حضرت حذیفہؓ سے نقل کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: هذا ملك من الملائكه استأذن ربه ليسلم علي ويبشرني أن حسنا وحسينا سيدا شباب أهل الجنة، وأمهما سيدة نساء أهل الجنة.

حارث بن أبی امامہ نے اپنی مسند میں سند صحیح کے ساتھ ایک مرسل روایت ذکر کی ہے:

مريم خير نساء عالمها، وفاطمة خير نساء عالمها.

اس حدیث کو امام ترمذیؒ نے حضرت علیؓ سے ان الفاظ کے ساتھ موصولاً نقل کیا ہے:

خير نسائها مريم وخير نسائها فاطمة.

درمنثور میں بحوالہ ابن عساکرؒ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے: قال: قال رسول الله ﷺ: سيدة نساء أهل الجنة مريم بنت عمران، ثم فاطمة، ثم خديجة، ثم آسية امرأة فرعون.

ابن ابی شیبہ، عبدالرحمٰن بن أبی لیلۃ سے ناقل ہیں:

قال: قال رسول الله ﷺ: فاطمة سيدة نساء العالمين بعد مريم ابنة عمران.

امام سیوطیؒ فرماتے ہیں: امہات المؤمنین میں سے حضرت خدیجہ اور حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہما افضل ہیں۔

آنحضرت ﷺ کا ارشاد گرامی ہے: كمل من المرجال كثير، ولم يكمل من النساء الا مريم وآسية وخديجة، وفضل عائشة على النساء كفضل الثريد على سائر الطعام.

اور ایک روایت میں یہ الفاظ منقول ہیں: الا ثلاث: مريم وآسية وخديجة.

ان دونوں میں اُفضل کون ہے؟ اس بارے میں متعدد اقوال ہیں:

تیسرا قول یہ ہے کہ توقف کیا جائے۔

میں کہتا ہوں کہ عماد ابن کثیر نے حضرت خدیجہؓ کی افضلیت کو صحیح قرار دیا ہے۔ کیونکہ جب حضرت عائشہ صدیقہؓ نے آنحضرت ﷺ سے یہ کہا: قد رزقك الله خيرا منها، تو آنحضرت ﷺ نے جواباً یہ ارشاد فرمایا:

لا والله ما رزقني الله خيرا منها آمنت بي حين كذبني الناس، وأعطتني ما لها حين حرمني الناس.

ابن داؤد سے پوچھا گیا تو انہوں نے فرمایا: حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو حضرت جبرائیل کا سلام نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام نے پہنچایا۔ اور حضرت خدیجہؓ کو ان کے ربّ کا سلام حضرت جبرائیل علیہ السلام نے پہنچایا، چنانچہ آنحضرت ﷺ کی زبان مبارک پر یہ افضل ٹھہریں۔

پھر ان سے پوچھا گیا کہ حضرت فاطمہؓ افضل ہیں یا ان کی والدہ افضل ہیں؟ تو فرمایا: حضرت فاطمہؓ آنحضرت ﷺ کے جسم کا ایک ٹکڑا ہیں، ہم ان کے برابر تو کسی کو بھی قرار نہیں دیتے۔

سبکیؒ سے اس بارے میں پوچھا گیا تو انہوں نے جواب دیا کہ ہمارے نزدیک مختار یہی ہے کہ فاطمہ بنت محمد سب سے

افضل ہیں، ان کے بعد ان کی والدہ ماجدہ حضرت خدیجہؓ اور پھر ان کے بعد حضرت عائشہ، اور پھر اس مسئلہ کی دلیل ذکر فرمائی۔

ابن العماد سے مروی ہے کہ حضرت خدیجہ، حضرت فاطمہؓ سے افضل ہیں از روئے اُمومت کے، نا کہ از روئے سیادت کے، واللہ تعالیٰ اعلم۔

تخریج: الجامع کی روایت میں حضرت آسیہؓ کا نام حضرت مریمؑ پر مقدم ہے۔ اور یہ اضافہ ہے:

و ان فضل عائشة الخ

اس حدیث کو امام احمد، شیخین، ترمذی اور ابن ماجہ نے روایت کیا ہے۔

قوله: وذكر حديث انس، يا خير البرية:

اس حدیث کا مختصر سا پس منظر یہ ہے کہ ایک اعرابی نے آنحضورﷺ کو خطاب کرتے ہوئے کہا: یاخیر البریة، آنحضرتﷺ نے ارشاد فرمایا: ذاك ابراهيم.

قوله: حديث ابی هريرة: أی الناس أكرم:

مکمل حدیث یوں ہے: فقال النبی ﷺ: أكرمهم عند الله أتقاهم، قالوا: ليس عن هذا نسئلك. قال: "فأكرم الناس يوسف نبی الله ابن نبی الله ابن نبی الله ابن خليل الله". [الحدیث]

قوله: وحديث ابن عمر الكريم ابن الكريم:

مکمل حدیث یوں ہے: ابن الكريم ابن الكريم يوسف بن يعقوب بن اسحاق بن ابراهيم.

الفصل الثانی:

۵۷۲۵ : وَعَنْ اَبِی رَزِیْنٍ قَالَ قُلْتُ یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اَیْنَ کَانَ رَبُّنَا قَبْلَ اَنْ یَّخْلُقَ خَلْقَهٗ قَالَ کَانَ فِی عَمَاءٍ مَاتَحْتَهٗ هَوَاءٌ وَّمَا فَوْقَهٗ هَوَاءٌ وَخَلَقَ عَرْشَهٗ عَلَی الْمَآءِ۔

(رواه الترمذی وقال يزيد بن هارون العماء ای ليس معه شیء)

اخرجه الترمذی ٥/٢٦٩ حديث رقم ٣١٠٩ وابن ماجه فی السنن ١/٦٤ رقم ١٨٢

ترجمہ: "حضرت ابورزین رضی اللہ عنہ بیان نے بیان فرمایا کہ میں نے عرض کیا کہ یا رسول اللہﷺ ہمارا پروردگار اپنی مخلوقات کی تخلیق سے پہلے کہاں تھا؟ آنحضرتﷺ نے ارشاد فرمایا: عماء میں تھا۔ نہ اس کے نیچے کی طرف ہوا تھی اور نہ اس کے اوپر کی طرف، اس نے اپنا عرش پانی پر قائم فرمایا"۔ اس روایت کو امام ترمذیؒ نے نقل کیا ہے اور انہوں نے کہا کہ یزید بن ہارون نے وضاحت کی ہے کہ "عماء" سے مراد یہ ہے کہ اس کے ساتھ کوئی چیز نہیں تھی"۔

راویٔ حدیث:

اُبی رزین: مؤلفؒ فرماتے ہیں: ان کا نام لقیط بن عامر بن صبرہ ہے۔ "لقیط"، لام کے فتحہ، اور قاف کے سکون کے ساتھ ہے۔ اور "صبرہ"، صاد مہملہ اور بائے موحدہ کے کسرہ کے ساتھ ہے۔ عقیلی ہیں، مشہور صحابی رسول ہیں، ان کا شمار اہل طائف میں

ہوتا ہے۔ان سے روایت کرنے والوں میں ان کے بیٹے عاصم، اور ابن عمر وغیرہ شامل ہیں۔

قوله: ابن كان۔۔۔كان في عماء:

عما: عین کے فتحہ اور الفظ ممدودہ کے ساتھ، صاحب الفائق لکھتے ہیں: العماء: السحاب الرقيق. اور بعض کا کہنا ہے: ای السحاب الكثيف المطبق. اور بعض کا قول ہے: شبه الدخان يركب رأس الجبال وعن الجرمي الضباب. اور صاحب النہایہ لکھتے ہیں: ''عماء'' فتحہ اور مد کے ساتھ ''سحاب'' کو کہتے ہیں

صاحب قاموس لکھتے ہیں: هو السحاب المرتفع او الكثيف، أو المطر الرقيق، أو الأسود، أو الأبيض، أو هو الذى هراق مؤه آگے لکھتے ہیں:

كان في عماء: أى في غيب هوية الذات بلا ظهور مظاهر الصفات.

اسی مفہوم کو دوسری حدیث میں یوں بیان کیا گیا ہے:

كنت كنزا مخفيا فاحببت أن أعرف، فخلقت الخلق لأعرف.

علاوہ ازیں اس ارشاد باری تعالیٰ: ﴿وما خلقت الجن والانس الا ليعبدون﴾ [الذاریات۔۵۶] میں بھی اسی طرف اشارہ ہے، بایں طور کہ ''حبر الأمہ''، حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے اس کی تفسیر ليعرفون مروی ہے۔

شیخ علاؤ الدولہ اپنی کتاب العروہ میں رقم طراز ہیں: فاثبت تجلى الذات أوّلا بقوله: كنت كنزا مخفيا، ثم تجليه بالصفة لآحدية بقوله: أجبت أن أعرف. ثانيا: ثم تجلليه بالصفة الواحدة بقوله: فخلقت الخلق لأعرف. ثالثا: في اصطلاحات الصوفيه للكاشي: العماء هى الحضرة الأحدية عندنا لأنه لا يعرفه أحد غيره، فهو في حجاب الجلال.

ازہری لکھتے ہیں: نحن نؤمن به ولا نكيفه بصفة. أى نجر اى، للفظ على ما جاء عليه من غير تأويل مع التنزيه عمالا يجوز عليه من الحدوث والتبديل.

قوله: قال يزيدبن هارون: العماء ليس معه شيء:

اس جملہ میں عارفین کے اس کلام کی طرف اشارہ ہے: كان الله ولم يكن معه شيء، والآن على ما هو عليه كان اور اس ارشاد باری تعالیٰ کی طرف بھی اشارہ ہے: ﴿كل من عليها فان﴾

۵۷۲۶ : وَعَنِ الْعَبَّاسِ ابْنِ عَبْدِ الْمُطَّلِبِ زَعَمَ اَنَّهٗ كَانَ جَالِسًا فِى الْبَطْحَاءِ فِى عِصَابَةٍ وَرَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ جَالِسٌ فِيْهِمْ فَمَرَّتْ سَحَابَةٌ فَنَظَرُوْا اِلَيْهَا فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَا تُسَمُّوْنَ هٰذِهٖ قَالُوْا السَّحَابُ قَالَ وَالْمُزْنُ قَالُوْا وَالْمُزْنَ قَالَ وَالْعِنَانَ قَالُوْا وَالْعِنَانَ قَالَ هَلْ تَدْرُوْنَ مَا بُعْدُ مَا بَيْنَ السَّمَاءِ وَالْاَرْضِ قَالُوا لَا نَدْرِى قَالَ اِنَّ بُعْدَ مَا بَيْنَهُمَا اِمَّا وَاحِدَةٌ وَاِمَّا اثْنَتَانِ اَوْ ثَلٰثٌ وَّسَبْعُوْنَ سَنَةً وَالسَّمَآءُ الَّتِىْ فَوْقَهَا كَذٰلِكَ حَتّٰى عَدَّى سَبْعَ سَمٰوٰتٍ ثُمَّ فَوْقَ

السَّمَآءِ السَّابِعَةِ بَحْرٌ بَيْنَ اَعْلَاهُ وَاَسْفَلُهُ كَمَا بَيْنَ سَمَآءٍ اِلٰى سَمَآءٍ ثُمَّ فَوْقَ ذٰلِكَ ثَمَانِيَةَ اَوْ عَالٍ بَيْنَ اَظْلَافِهِنَّ وَوَرِكِهِنَّ مِثْلَ مَا بَيْنَ سَمَآءٍ اِلٰى سَمَآءٍ ثُمَّ عَلٰى ظُهُوْرِهِنَّ وَالْعَرْشُ بَيْنَ اَسْفَلِهٖ وَاَعْلَاهُ مَا بَيْنَ سَمَآءٍ اِلٰى سَمَآءٍ ثُمَّ اللّٰهُ فَوْقَ ذٰلِكَ (رواه الترمذی وابوداود)

اخرجه ابوداود فی السنن ۹۳/۵حدیث رقم ۴۷۲۳ واخرجه الترمذی فی سننه ۳۸۵/۵حدیث رقم ۳۳۲۰ وابن ماجه فی السنن ۶۹/۱حدیث رقم ۱۹۳ واحمد فی المسند ۲۰۶/۱

ترجمہ:''حضرت عباس بن عبدالمطلب رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا کہ وہ (ایک مرتبہ) بطحائے مکہ (مقام محصب) میں لوگوں کی ایک جماعت کے ہمراہ بیٹھے ہوئے تھے جب کہ رسول اللہ ﷺ بھی ان میں جلوہ افروز تھے کہ اچانک ابر کا ایک ٹکڑا گزرا' لوگ اس کی جانب تکنے لگے: رسول اللہ ﷺ نے ان سے پوچھا کہ تم اس کے قرار دیتے ہو؟ انہوں نے جواب دیا کہ ''سحاب''! اقدس ﷺ نے ارشاد فرمایا: اور اس کو ''مزن'' بھی کہتے ہیں؟ لوگ کہنے لگے اچھا اسے مزن بھی کہتے ہیں۔ تو حضور اقدس ﷺ نے فرمایا اور اس کو ''عنان'' بھی کہا جاتا ہے وہ لوگ کہنے لگے اچھا اسے عنان بھی کہتے ہیں۔ اس کے بعد آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: کیا تم لوگ جانتے ہو' آسمان اور زمین کے درمیان کتنی مسافت کے بقدر دوری ہے؟ انہوں نے جواب دیا کہ ہم تو اس کی واقفیت نہیں رکھتے۔ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''زمین و آسمان کے درمیان یا تو اکہتر سال یا بہتر سال یا تہتر سال کی مسافت کے بقدر فاصلہ ہے اور اس (پہلے) آسمان کے اوپر جو (دوسرا) آسمان ہے ان دونوں کے درمیان کا فاصلہ بھی اتنا ہی ہے۔ یونہی آنحضرت ﷺ نے ساتوں آسمانوں کا ذکر کیا (کہ ہر آسمان اپنے سے نچلے اوپر سے ستر سال کی مسافت کے بقدر فاصلہ پر ہے' پھر ساتویں آسمان کے اوپر سمندر ہے' اس سمندر کی تہ اور اس کے اوپر کی سطح کے درمیان بھی اس قدر فاصلہ ہے جس قدر ایک آسمان سے دوسرے آسمان کے درمیان ہے اور اس سمندر کے اوپر آٹھ فرشتے ہیں جو پہاڑی بکروں کی طرح ہیں' ان کے کھروں اور ان کی سرینوں کے درمیانی بھی اس قدر فاصلہ ہے جتنا کہ ایک آسمان سے دوسرے آسمان کے درمیان ہے اور پھر ان فرشتوں کی پشت پر عرش الٰہی ہے جس کے نیچے کے حصہ اور اوپر کے حصہ کے درمیان بھی اسی قدر فاصلہ ہے جس قدر ایک آسمان سے دوسرے آسمان کے درمیان ہے اور اس عرش کے اوپر ذات خداوندی ہے''۔ (ترمذی' ابوداؤد)

تشریح: **بطحاء**: مکہ میں واقع **مقبرة المعلی** سے اوپر ایک مشہور جگہ ہے۔ **بطحاء** کا اطلاق کبھی کبھار مکہ پر ہوتا ہے۔

امام طیبی فرماتے ہیں: لفظ ''زعم'' کا استعمال، اور حضرت عباسؓ کی طرف اس کی اسناد کرنا یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے، کہ حضرت عباسؓ اس وقت تک حلقۂ اسلام میں داخل نہیں ہوئے تھے، جن کے ساتھ حضرت عباسؓ اس موقع پر تھے جیسا کہ بطحاء کا لفظ دلالت کر رہا ہے۔ میں کہتا ہوں: وجہ دلالت یہ ہے کہ مقام بطحاء اکثر و بیشتر کفار کی اجتماع گاہ بنا رہتا تھا۔ اور اس جگہ ان کی مشاورت ہوتی تھی اور اسی جگہ وہ تاریخ ساز فیصلہ ہوا کہ:

بنی ہاشم کا مقاطعہ کیا جائے۔ اور نہ ان سے خرید و فروخت کا معاملہ کریں گے، نہ ان سے مشاورت کریں گے نہ ان سے

مناکحت کریں گے، نہ ان کے ساتھ اٹھنا بیٹھنا کریں گے حتی کہ محمد ﷺ کی مدد ونصرت اور حمایت چھوڑ دیں، جیسا کہ سیر میں معروف ہے۔

فصل ثالث میں موجود حضرت ابو ہریرہؓ کی حدیث اس بات پر صراحۃً دلالت کرتی ہے کہ یہ جماعت مسلمان تھی، جہاں تک تعلق ہے لفظ "زعم" کے استعمال کا، تو واضح رہے کہ زعم اکثر و بیشتر قول محقق کے معنی میں بھی آتا ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

قوله: ماتسمون هذه؟۔۔۔ قالوا: والمزن:

ما تسمون هذه؟: "ما" استفہامیہ ہے، "تسمون" کا مفعول اول ہے اور هذه: "تسمون" کا مفعول ثانی ہے۔

قالوا: السحاب: السحاب لیت کی بناء پر منصوب ہے۔ أی **نسميه الحجاب** ۔ اور مبتدا محذوف کی خبر مانتے ہوئے مرفوع پڑھنا بھی درست ہے۔

قوله: قال اهل تدرون۔۔۔ كمابين سما الى سماء: أى هي السحاب۔ والسماء: مرفوع ہے، منصوب پڑھنا بھی درست ہے۔

بعض کا کہنا ہے کہ راوی کے شک کو ظاہر کرتا ہے، یا باعتبار اختلاف تکثیر اماکن کے تنویع پر محمول ہے اس جملہ سے امام طیبیؒ کے فرمودہ جملہ کی بھی تصدیق ہوتی ہے کہ احادیث میں سبعین کے عدد سے تکثیر مراد ہوتی ہے نا کہ تحدید۔ اس کی دلیل وہ حدیث ہے: **أن ما بين السماء والأرض، وبين سماء وسماء ميسرة خمسمائة عام.** اس حدیث میں تکثیر کے معنی مراد لینا ابلغ ہے، بلکہ مقام بھی اسی کا داعی ہے۔

قوله: ثم فوق ذلك ثمانية ۔۔۔ بين سماء الى سماء: اوعال: وعل کی جمع ہے۔ بمعنی وحشی بکرے۔ اس کو تیس **شاة الجبل** بھی کہتے ہیں۔ پہاڑی بکرا۔

اظلاف: ظلف (ظاء معجمہ کے کسرہ کے ساتھ) کی جمع ہے، گائے، بکری اور ہرن کے کھر کو "**ظلف**" کہتے ہیں۔ دابہ کے کھر کو "حافر" اور بعیر کے کھر کو "خف" کہتے ہیں۔

ورك: واؤ کے فتحہ اور راء کے کسرہ کے ساتھ۔

ثمانية أوعال: بعض کا کہنا ہے کہ اوعال سے مراد ملائکہ ہیں جو پہاڑی بکروں کی شکل میں ہوں گے، حدیث کا اگلا جملہ بھی اسی کے موافق ہے: **على ظهورهن العرش.** بظاہر اس آیت کریمہ کی طرف اشارہ ہے۔: ﴿**الذين يحملون العرش ومن حوله يسبحون بحمد ربهم**﴾ [غافر: ۷] "جو فرشتے کہ عرش (الٰہی) کو اٹھائے ہوئے ہیں اور فرشتے اس کے گرداگرد ہیں وہ اپنے ربّ کی تسبیح اور تحمید کرتے ہیں"۔

قوله: ثم الله فوق ذلك:

امام طیبیؒ فرماتے ہیں: اس کلام سے آنحضرت ﷺ کا مقصود یہ تھا کہ صحابہ کرام کو عالم سفلی سے عالم بالا کی طرف مشغول کیا جائے وہ، آسمان وعرش کی ملکوت میں تفکر کریں، تا کہ وہ اس کی مدد سے اپنے خالق ورازق ربّ کی طرف ترقی کریں، بتوں کی پوجا سے استنکاف برتیں، اور اللہ کے ساتھ شریک مت کریں، آنحضرت ﷺ نے پہلے بادل پھر آسمانوں، پھر سمندر پھر پہاڑی بکروں

پھر عرش سے صاحب عرش کی طرف ترقی فرمائی اور یہ فوقیت باعتبار عظمت کے ہے نا کہ از روئے مکان۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ بڑا نہایت عالی مرتبت اور عظیم البرہان ہے، اور ایک شارح کا کہنا ہے، اللہ تعالیٰ کا رتبہ، اس کا حکم اور عظمت واستیلاء کے اعتبار سے فوق العرش ہے۔

۵۷۲۷ : وَعَنْ جُبَيْرِ بْنِ مُطْعَمٍ قَالَ اَتَى رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَعْرَابِيٌّ فَقَالَ جُهِدَتِ الْاَنْفُسُ وَجَاعَ الْعِيَالُ وَنُهِكَتِ الْاَمْوَالُ وَهَلَكَتِ الْاَنْعَامُ فَاسْتَسْقِ اللّٰهَ لَنَا فَاِنَّا نَسْتَشْفِعُ بِكَ عَلَى اللّٰهِ وَنَسْتَشْفِعُ بِاللّٰهِ عَلَيْكَ فَقَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ سُبْحَانَ اللّٰهِ سُبْحَانَ اللّٰهِ فَمَا زَالَ يُسَبِّحُ حَتّٰى عُرِفَ ذٰلِكَ فِي وُجُوْهِ اَصْحَابِهٖ ثُمَّ قَالَ وَيْحَكَ وَاِنَّهٗ لَا يُسْتَشْفَعُ بِاللّٰهِ عَلٰى اَحَدٍ شَانُ اللّٰهِ اَعْظَمُ مِنْ ذٰلِكَ وَيْحَكَ اَتَدْرِيْ مَا اللّٰهُ اِنَّ عَرْشَهٗ عَلٰى سَمٰوٰتِهٖ لَهٰكَذَا وَقَالَ بِاَصَابِعِهٖ مِثْلَ الْقُبَّةِ عَلَيْهِ وَاِنَّهٗ لَيَئِطُّ بِهٖ اَطِيْطَ الرَّحْلِ بِالرَّاكِبِ۔ (رواه ابوداود)

اخرجه ابو داود ٥/٩٤ حديث رقم ٤٧٢٦ والنسائي ١٦/٣ حديث رقم ١٥٢٨ واحمد في المسند ٢٥٦/٣۔

ترجمہ: ''جبیر بن مطعم رضی اللہ عنہ بیان فرمایا کہ (ایک مرتبہ) رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں ایک دیہاتی آیا اور عرض کرنے لگا کہ (ہمارے ہاں قحط سالی کے باعث) انسانی جانیں مشقت کا شکار ہوگئیں بال بچے بھوک پیاس سے بلک رہے ہیں مال وجائیداد کی تباہی کا شکار ہوگئے اور جانور ہلاک ہونے لگے ہیں لہٰذا آپ اللہ تعالیٰ سے ہمارے لئے بارش کا سوال کیجئے' ہم اللہ تعالیٰ کے حضور آپ ﷺ کو وسیلہ بناتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کے وسیلہ سے آپ سے سفارش طلب کرتے ہیں۔ حضور اقدس ﷺ نے یہ سن کر فرمایا: اللہ تعالیٰ کی ذات پاک ومنزہ ہے' اللہ تعالیٰ کی ذات پاک ومنزہ ہے''۔ آپ ﷺ مسلسل یہی تسبیح دھراتے جارہے تھے حتیٰ کہ آپ کے صحابہ کے چہروں میں یہ بات پہچانی جارہی تھی گیا' پھر آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''اے شخص تجھ پر افسوس ہے' درحقیقت خدا کو کسی کے ہاں شفیع مقرر نہیں کیا جاتا اور نہ اس کو وسیلہ بنایا جاتا ہے' اس بات میں کوئی شبہ نہیں کہ خدا کی ذات اور اس کی حیثیت اس سے بہت اعلیٰ وبالا ہے کہ اس کو کسی کا وسیلہ وذریعہ بنایا جائے۔ تجھ پر افسوس! کیا تو آگاہ نہیں ہے کہ اللہ کیا ہے؟ (یعنی کس عظمت ورفعت کا حامل ہے) حقیقت یہ ہے کہ اس کا عرش اس کے آسمانوں کو اس طرح گھیرے ہوئے ہے یہ کہہ کر آپ ﷺ نے اپنی انگلیوں کو ہتھیلی کے اوپر قبہ کی صورت میں دکھایا (یعنی آپ ﷺ نے ہاتھ کو گنبد کی صورت میں بنا کر دکھایا کہ جس طرح یہ گنبد نما ہاتھ ہتھیلی کو گھیرے ہوئے ہے اسی طرح اللہ تعالیٰ کا عرش زمین اور تمام آسمانوں تک کو اپنے نیچے گھیرے ہوئے ہے) اور وہ عرش اس قدر وسیع وعریض ہونے کے باوجود یوں چرچراتا ہے جیسے اونٹ کا پالان یا گھوڑے کی زین (بھاری بھرکم) سوار کے چرچراتی ہے''۔ (ابوداؤد)

تشریح: قوله: جهدت الانفس۔۔۔ونستشفع بالله عليك جهدت: مجہول کے ساتھ ہے، جہد (جیم کے فتحہ کے ساتھ) بمعنی ''مشقت'' سے ماخوذ ہے۔ اور جیم کے ضمہ کے ساتھ بمعنی ''طاقت''۔

العیال: عین کے کسرہ کے ساتھ۔ بیوی، اولاد اور غلام وغیرہ۔

نہك: نون کے ضمہ اور ہاء کے کسرہ کے ساتھ۔

الأنعام: نعم کی جمع ہے۔ اونٹ، گائے اور بکری۔

قوله: فقال النبي سبحان الله ..... : لا يستشفع: صیغہ مجہول کے ساتھ ہے۔

انه لا يستشفع: "انه" کی ضمیر ضمیر شان ہے۔

شان الله: جملہ مستانفہ تعلیلیہ ہے۔

لهكذا: لام ابتدائیہ ہے۔ اور "هكذا" خبر "ان" ہے

مثل القبة عليه: عرش سے حال ہے۔ امام طیبیؒ فرماتے ہیں: یہ حال ہے۔ **اى مما ثلا لها على ما فى**

ليئط: ہمزہ کے کسرہ اور ہائے مہملہ کی تشدید کے ساتھ۔

تشریح: چونکہ ظاہری اسلوب موہم تساوی فی القدر یا تشارک فی الامر ہے۔

امام خطابیؒ فرماتے ہیں:

میں کہتا ہوں: ممکن ہے اس کا مطلب یہ ہو کہ اللہ تعالیٰ کا عرش، اس کی عظمت و آیات کی وجہ سے تسبیح و تنزیہ کی آوازیں نکالتا ہے۔ حاملین عرش بھی اللہ جل شانہ کی ذات وصفات کی معرفت میں حیران وسرگردان ہیں۔ عرش ایسے چرچراتا ہے، جیسے نیا کجاوہ کسی بھاری بھرکم سوار کے بیٹھنے کی وجہ سے چرچراتا ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالقول السدید۔

۵۷۲۸ : وَعَنْ جَابِرِ بْنِ عَبْدِ اللّٰهِ عَنْ رَّسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اُذِنَ لِيْ اَنْ اُحَدِّثَ عَنْ مَلَكٍ مِنْ مَلٰئِكَةِ اللّٰهِ مِنْ حَمَلَةِ الْعَرْشِ اِنَّ مَابَيْنَ شَحْمَةِ اُذُنَيْهِ اِلٰى عَاتِقَيْهِ مَسِيْرَةُ سَبْعِمِائَةِ عَامٍ (رواه ابوداود)

اخرجه ابو داود في السنن ٥/١٩٦ حديث رقم ٤٧٢٧۔

ترجمہ: "حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ رسول اللہ ﷺ سے روایت نقل فرماتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا: "مجھ کو (منجانب اللہ) یہ اجازت دی گی ہے کہ میں رب العزۃ کے ان فرشتوں میں سے ایک فرشتوں کا حال سناؤں جو عرش کو اٹھانے والے ہیں' اس فرشتہ کے کان کی لو سے اس کے کندھے تک کا درمیانی فاصلہ سات سو سال کی مسافت کے بقدر ہے"۔ (ابوداؤد)

تشریح: **من ملك**: (مضاف محذوف ہے اور تنوین برائے تعظیم ہے) أى: عن وصف ملك عظيم.

أن: ہمزہ کے فتحہ اور کسرہ، دونوں کے ساتھ ہے۔

أذنيه الى عاتقيه: الجامع الصغیر کی روایت میں دونوں جگہ بصیغہ مفرد مروی ہے۔

واضح رہے کہ حاملین عرش فرشتے، دوسرے ملائکہ سے زیادہ قوی ہیں، کیونکہ "المطایا بقدر عطایا" ہوتی ہیں صرف ان خاص نتوں کے ذکر پر اکتفا کرنا درحقیقت اشارہ ہے کہ باقی فرشتوں کی عظمت وقدرت کا اس سے از خود اندازہ لگالو۔

۵۷۲۹ : وَعَنْ زُرَارَةَ بْنِ اَوْفٰى اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ لِجِبْرَئِيْلَ هَلْ رَاَيْتَ رَبَّكَ فَانْتَفَضَ جِبْرَائِيْلُ وَقَالَ يَا مُحَمَّدُ اِنَّ بَيْنِيْ وَبَيْنَهٗ سَبْعِيْنَ حِجَابًا مِنْ نُّوْرٍ لَوْ دَنَوْتُ مِنْ بَعْضِهَا

لَاُ حْتَرَقْتُ هٰكَذَا فِي الْمَصَابِيْحِ۔

مصابيح السنة ٤/ ٣٠ حديث رقم ٤٤٥٧۔

''حضرت زرارہ بن اوفی سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت جبرئیل علیہ السلام سے پوچھا کہ کیا تم نے اپنے پروردگار کو دیکھا ہے؟ جبرئیل امین (یہ سن کر) کانپ گئے اور کہنے لگے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) میرے اور پروردگار عالم کے درمیان نور کے ستر پردے حائل ہیں' اگر ان پردوں میں سے کسی کے نزدیک ہو گیا تو یقیناً میں جل جاؤں گا''۔ مصابیح میں (حضرت زرارہ سے) یونہی روایت ہے۔

راویٔ حدیث:

زرارۃ بن ابی اوفی۔ یہ ''زرارہ'' ابی اوفی کے بیٹے ہیں۔ مؤلف فرماتے ہیں یہ صحابہ میں سے ہیں ان کی وفات حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں ہوئی۔ ''زرارہ'' زائے معجمہ کے ضمہ کے ساتھ ہے۔

۵۷۳۰ : وَرَوَاهُ اَبُو نَعِيْمٍ فِي الْحِلْيَةِ عَنْ اَنَسٍ اِلَّا اَنَّهُ لَمْ يَذْكُرْ فَانْتَقَضَ جِبْرَئِيْلُ ۔

ابو نعيم في الحلية ۔

ترجمہ: لیکن ابو نعیم نقل کردہ روایت میں فانتقض (حضرت جبرئیل علیہ السلام کانپ اٹھے) کے الفاظ نہیں ہیں''۔

تشریح: الجامع میں لکھا ہے کہ طبرانی نے اوسط میں حضرت انس کی حدیث ان الفاظ کے ساتھ ذکر کی ہے:

سألت جبريل: هل ترى ربك؟ قال: ان بيني وبينه سبعين حجابا من نور لو رأيت أدناها لاحترقت.

۵۷۳۱ : وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ اللّٰهَ خَلَقَ اِسْرَافِيْلَ مُنْذُ يَوْمِ خَلَقَهُ صَافًّا قَدَمَيْهِ لَا يَرْفَعُ بَصَرَهُ بَيْنَهُ وَبَيْنَ الرَّبِّ تَبَارَكَ وَتَعَالٰى سَبْعُوْنَ نُوْرًا مَا مِنْهَا مِنْ نُوْرٍ يَدْنُوْا مِنْهُ اِلَّا احْتَرَقَ ۔ (رواه الترمذي وصححه)

اخرجه البيهقي ضمن حديث طويل في شعب الايمان ١/ ١٧٦ حديث رقم ١٥٧۔

ترجمہ: ''حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے بیان فرمایا کہ جناب کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: جس دن سے رب کائنات نے حضرت اسرافیل علیہ السلام کو پیدا فرمایا وہ اسی دن سے اپنے قدموں کو صف بستہ کئے (بالکل تیار) کھڑے ہیں' وہ اپنی نگاہ تک نہیں اٹھاتے ان کے اور پروردگار بزرگ و عالیشان کے درمیان نور کے ستر پردے (حائل) ہیں اگر اسرافیل (بفرض محال) ان نور (کے پردوں میں سے) کسی ایک نور (کے پردے) کے نزدیک جا پہنچیں تو وہ یقیناً جل جائیں گے''۔ اس روایت کو ترمذی نے نقل کیا ہے اور انہوں نے کہا ہے کہ یہ حدیث صحیح ہے''۔

تشریح: یوم: میم کے فتحہ کے ساتھ، مضاف ہے، اور ایک نسخہ میں منون مجرور ہے۔

صافا: فاء کی تشدید کے ساتھ، حال ہے۔ أي حال كون اسرافيل واقا.

قدمیه: ''صافا'' کا مفعول ہے

منذ: میم کے ضمہ اور کسرہ کے ساتھ، یہ مبنی علی الضم ہے، جب اس کے بعد اسم مجرور ہو تو یہ حرف جر "من" کا معنی دیتا ہے، زمانہ ماضی میں۔ اور "فی" کے معنی دیتا ہے زمانہ حال میں۔ مظہرؒ نے فرمایا: "منذ" حرف جر بمعنی "فی" ہے۔

امام طیبیؒ نے فرمایا: "صافا" اسرافیل سے حال ہے، تاکہ ضمیر منصوب سے،

منذیوم: "صافا" کیلئے ظرف ہے۔ "فی" کے معنی میں نہیں ہے اگرچہ بعض اسی کے قائل ہیں۔

نحویوں کا اتفاق ہے کہ "مذ" اور "منذ" دونوں اسماء زمان پر ہی داخل ہوتے ہیں۔ پھر فرماتے ہیں: اگر مراد زمانہ ماضی کی وہ ابتداء ہو کہ جس کی انتہاء میں آپ ہیں، تو یہ دونوں ابتداء کیلئے ہوں گے۔ جیسے: ما رایته مذ یومین أو مذسنة كذا. أي: انتفى الرؤية من ابتداء يومين أنا في آخرها. اور یہ دونوں "فی" کے معنی میں نہیں ہوں گے، اگرچہ بعض اس کے قائل ہیں۔ اھ۔ چنانچہ مطلب یہ ہوا کہ "ان الله خلق اسرافيل صافا قدميه من اول مدة خلقه۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت اسرافیلؑ کو اس حال میں پیدا کیا کہ وہ پیدائش کے وقت سے ہی اپنے دونوں پیروں کو صف بستہ کئے بالکل تیار کھڑے ہیں۔

قوله لا يرفع بصره ..... :

نگاہ نہ اٹھانے میں دو احتمال ہیں:

(۱) غایت ادب کی وجہ سے نگاہ آسمان کی طرف نہیں اٹھاتے۔

(۲) خوف کی وجہ سے ان کی نگاہ لوح محفوظ سے اٹھتی ہی نہیں۔

سبعون نورا: یعنی نور کے پردے، غیاب کے اسرار اور نقاب کے استار ہیں، حتی کہ اس کو خود اس کے علاوہ کوئی نہیں جانتا، چنانچہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ولا يحيطون به علما﴾ [طٰہٰ۔ ۱۱۰] "اور اس کو ان کا علم احاطہ نہیں کر سکتا"۔

۵۷۳۲ : وَعَنْ جَابِرٍ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ لَمَّا خَلَقَ اللّٰهُ اٰدَمَ وَذُرِّيَّتَهٗ قَالَتِ الْمَلٰئِكَةُ يَا رَبِّ خَلَقْتَهُمْ يَاكُلُوْنَ وَيَشْرَبُوْنَ وَيَنْكِحُوْنَ وَيَرْكَبُوْنَ فَاجْعَلْ لَهُمُ الدُّنْيَا وَلَنَا الْاٰخِرَةَ قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰى لَا اَجْعَلُ مَنْ خَلَقْتُهٗ بِيَدَيَّ وَنَفَخْتُ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِي كَمَنْ قُلْتُ لَهٗ كُنْ فَكَانَ .

(رواه البيهقي في شعب الايمان)

رواه البيهقي في شعب الايمان ۱۷۲/۱ حديث رقم ۱۷۲۔

"حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: "جب اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام اور ان کی آل کو وجود بخشا تو فرشتوں نے عرض کیا کہ پروردگار! آپ نے تو ایسے لوگوں کو وجود بخشا ہے جو کھاتے ہیں پیتے ہیں شادی بیاہ کرتے ہیں اور سواری کرتے ہیں تو ہماری گذارش یہ ہے کہ دنیا (کی تمام نعمتیں) ان لوگوں کا حق اور حصہ بنا دیجئے اور آخرت (کی تمام نعمتیں) ہمارا حق اور حصہ قرار فرما دیجئے"۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: جس مخلوق کو میں نے اپنے ہاتھ سے پیدا کیا اور اس میں اپنی روح پھونکی اس کو اس مخلوق کے برابر قرار نہیں دوں گا جس کو میں نے کن کہا تو وہ پیدا ہو گئی"۔ (اس روایت کو بیہقی نے شعب الایمان میں نقل کیا ہے"۔

بیدی: تثنیہ کے صیغہ کے ساتھ ہے اور، مفرد کے صیغے کے ساتھ بھی روایت کیا گیا ہے۔
امام طیبیؒ فرماتے ہیں: ''لا اجعل'' میں دو احتمال ہیں: (۱) ''اجعل'' کی نفی ہو (۲) ''لا'' ان کی بات کی تردید کیلئے ہو، اور ''اجعل'' سے جملہ استفہام انکاری ہو، اور یہ زیادہ ابلغ ہے مبالغہ اور بلاغت کے اعتبار سے کیونکہ نفی پر مکرر دلالت کر رہا ہے۔ اگر چہ پہلا احتمال زیادہ ظاہر ہے، فتدبر۔ اور مطلب یہ ہے کہ جس کو میں نے بغیر کسی واسطے کے تدریجاً پیدا کیا جو معجون کمال کا مرکب ہے، جس میں ہدایت وضلالت کی قابلیت پیدا کی، جس کو جمال وجمال کا مظہر بننے کی استعداد سے نوازا الخ۔
امام طیبیؒ کے کلام کا حاصل یہ ہے کہ وہ مخلوق کہ جس کی تخلیق میرے ہاتھوں سے ہوئی یعنی آدم اور اس کی اولاد میں نے اس کی تخلیق کسی دوسرے کے سپرد نہیں کی، اور اس میں اپنی روح پھونکی یہ اس مخلوق کے مساوی نہیں کہ جس کو میں نے ''کن'' سے پیدا کیا، یعنی ملائکہ کو۔ ''روح'' کی اضافت لفظ جلالہ کی طرف اضافت تشریفی ہے، جیسا کہ ''بیت اللہ'' میں۔
ابن الملکؒ فرماتے ہیں بشر اور مَلَک عزت وکرامت میں برابر نہیں ہو سکتے، شرف وکرامت کے اعتبار سے تو انسان فرشتے سے بہت اونچا ہے، اور اس کا مقام ومرتبہ بہت اعلیٰ ہے۔ بشر کے ملائکہ سے افضل ہونے کے مسئلہ کی ایک دلیل یہ حدیث بھی ہے۔

میں کہتا ہوں اس کی وجہ شاید یہ ہے کہ فرشتوں کو معصوم پیدا کیا گیا ہے۔ اسی وجہ سے جحیم سے ممنوع اور نعیم سے محروم ہیں۔ اور بشر کی تخلیق چونکہ طاعت ومعصیت کے لئے ہوئی ہے عطایا وبلایا کے ذریعہ آزمایا جاتا ہے چنانچہ جو ان کو بجالاتا ہے وہ دونوں جہانوں میں ثواب کا مستحق ٹھہرتا ہے۔ پس جو انسان ان سے اعراض کرتا ہے وہ دونوں جہان میں عتاب وعذاب کا مستوجب ہوتا ہے۔

الفصل الثالث:

۵۷۳۳: عَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اَلْمُؤْمِنُ اَكْرَمُ عَلَى اللّٰهِ مِنْ بَعْضِ مَلَائِكَتِهٖ.

(رواہ ابن ماجۃ)

اخرجہ ابن ماجہ ۲/ ۱۳۰۱ حدیث رقم ۳۹۴۷۔

ترجمہ: ''حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''(کامل درجہ کے) مؤمن (یعنی انبیاء اور اولیاء) اللہ تعالیٰ کے ہاں اس کے کچھ فرشتوں سے زیادہ معزز ومحترم ہیں''۔ (ابن ماجہ)

تشریح: امام طیبیؒ فرماتے ہیں کہ ''مؤمن'' سے مراد عام مؤمنین اور ''بعض الملائكة'' سے مراد عام ملائکہ ہیں محی السنۃؒ اللہ جل شانہ کے اس فرمان: ﴿ولقد کرمنا بنی آدم﴾ [الاسراء: ۷۰] ''اور ہم نے آدم کی اولاد کو عزت دی'' کی تفسیر کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔ یہ کہنا اولیٰ ہے کہ عام مؤمن عام فرشتوں سے افضل ہیں اور خواص مؤمن، خواص فرشتوں سے افضل ہیں۔ چنانچہ اللہ جل شانہ کا فرمان ہے: ﴿ان الذین آمنوا وعملوا لصالحات أولئك هم خير البرية﴾ [البینۃ-۷] ''بے شک جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے اچھے کام کیئے وہ لوگ بہترین خلائق ہیں''۔
اہل السنّت والجماعت اسی سے استدلال کرتے ہیں، کہ انسان فرشتوں سے افضل ہے (انتھی) یہ بات مخفی نہ رہے کہ

خواص مؤمنین سے مراد انبیاء ورسل ہیں۔اور خواص ملائکہ سے مراد جبرئیل علیہ السلام، حضرت میکائیل علیہ السلام اور حضرت اسرافیل علیہ السلام وغیرہ مراد ہیں۔اور عام مؤمنین سے مراد اولیائے کاملین ہیں، جیسے خلفاء اور تمام علماءؒ اور عام ملائکہ سے مراد تمام ملائکہ ہیں۔بعض لوگوں کے بیان کردہ اجمال کے مقابلے میں یہ تفصیل زیادہ بہتر ہے۔

بشر کے ملائکہ سے افضل ہونے کا مطلب یہ ہے کہ چونکہ اس جنس بشر میں رسل پائے گئے ہیں یا یہ کہ اس جنس بشر میں کامل ترین افراد ہیں' جو اس جنس ملائکہ میں معدوم ہیں۔

میں کہتا ہوں کہ اس حدیث: المؤمن اعظم حرمة من الكعبه، کو ابن ماجہ نے ابن عمر کی سند کے ساتھ ان الفاظ کے ساتھ بیان کیا ہے: أن النبی ﷺ قال: ونظر الى الكعبة، لحرمة المؤمن اعظم عند الله حرمة منك. یہ ایک طویل حدیث کا ایک ٹکڑا ہے۔

۵۷۳۴ : وَعَنْهُ قَالَ اَخَذَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِيَدِىْ فَقَالَ خَلَقَ اللّٰهُ التُّرْبَةَ يَوْمَ السَّبْتِ وَخَلَقَ فِيْهَا الْجِبَالَ يَوْمَ الْاَحَدِ وَخَلَقَ الشَّجَرَ يَوْمَ الْاِثْنَيْنِ وَخَلَقَ الْمَكْرُوْهَ يَوْمَ الثُّلٰثَاءَ وَخَلَقَ النُّوْرَ يَوْمَ الْاَرْبِعَآءِ وَبَثَّ فِيْهَا الدَّوَّابَّ يَوْمَ الْخَمِيْسِ وَخَلَقَ اٰدَمَ بَعْدَ الْعَصْرِ مِنْ يَّوْمِ الْجُمُعَةِ فِي اٰخِرِ الْخَلْقِ وَاٰخِرِ سَاعَةٍ مِّنَ النَّهَارِ وَفِيْمَا بَيْنَ الْعَصْرِ وَالَى اللَّيْلِ۔

اخرجه مسلم ٤/٢١٤٩ حديث رقم (٢٧-٢٧٨٩)۔

ترجمہ: ''حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا کہ (ایک روز) رسول اللہ ﷺ نے میرا ہاتھ پکڑا اور ارشاد فرمانے لگے کہ (جانتے ہو اللہ تعالیٰ نے جب چھ دن میں دنیا کو پیدا فرمایا تو کون سی چیز کس دن بنائی؟ میں تمہیں بتاتا ہوں) اللہ تعالیٰ نے مٹی یعنی زمین کو ہفتہ کے دن پیدا فرمایا' اس زمین پر پہاڑوں کو اتوار کے دن پیدا فرمایا' درختوں کو پیر کے دن پیدا فرمایا' بدی اور خراب چیزوں کو منگل کے دن وجود بخشا' روشنی کو بدھ کے دن وجود بخشا' جانوروں کو روئے زمین پر جمعرات کے دن پھیلایا اور آدم کو جمعہ کے دن عصر کے بعد پیدا کیا اور یہ آخری پیدائش دن کے بالکل آخری حصہ میں عصر کے بعد سے رات کے درمیان ہوئی''۔

تشریح: خلق النور: ایک نسخہ میں راء کے بجائے نون یعنی (النون) ہے۔اکملؒ فرماتے ہیں: مسلم شریف کی روایت میں راء کے ساتھ ''النور'' ہے۔اور مسلم کے علاوہ کی روایت میں نون کے ساتھ ''النون'' ہے۔''نون'' بمعنی حوت (مچھلی) واضح رہے کچھ تصحیح شدہ نسخوں میں اور اصول معتمدہ میں لفظ ''النور'' ہی مذکور ہے۔

الاربعاء: ہمزہ کے فتحہ' بائے موحدہ کے کسرہ اور الف ممدودہ کے ساتھ۔صاحب قاموس فرماتے ہیں: مثلثۃ الباء ہے الف ممدوہ کے ساتھ۔

قوله: أخذ رسول الله ﷺ بيدي:

ہاتھ پکڑنے سے بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ حضرت ابو ہریرہؓ کو آنحضرت ﷺ سے کمال قرب حاصل تھا۔اس خاص کیفیت کو ذکر کرنا اس بات کی دلیل ہے کہ حضرت ابو ہریرہؓ کو یہ حدیث کس قدر اچھی طرح یاد ہے۔ہاتھ پکڑنے میں ممکن ہے کہ

ان اشیاء کی تعداد کی طرف اشارہ کرنا مقصود ہو، خلق آدم سے صرف نظر کرتے ہوئے، چونکہ خلق آدم بمنزلہ علت غائیہ اور فذلکہ ایمائیہ کے تھی۔

قوله: خلق الله التربة يوم السبت:

ہفتہ کے دن سے مراد گویا اس دن کا وہ بالکل آخری حصہ مراد ہے جس پر دن کا اختتام ہوتا ہے۔ اس حصہ کو "عشية الاحد (اتوار کی رات کا ابتدائی حصہ) کہتے ہیں۔ اس اعتبار سے وہ وقت گویا اتوار ہی کا ایک حصہ ہے، چنانچہ یہ حدیث، قرآن عزیز کی اس آیت کریمہ: ﴿ولقد خلقنا السموات والأرض وما بينهما فى ستة ايام وما مسنا من لغوب﴾ [ق-۳۸] کے منافی نہیں۔

قوله: خلق فيها الجبال يوم الأحد:

حدیث کا یہ ٹکڑا درحقیقت قرآن کریم کی آیت مبارکہ کی تفسیر ہے: ﴿قل أنكم لتكفرون بالذى خلق الأرض فى يومين وتجعلون له أندادا ذلك رب العالمين وجعل فيها رواسى من فوقها﴾ [فصلت:۹-۱۰]

قوله: خلق المكروه يوم الثلاء:

"المكروه" پر "ال" جنس کا ہے۔

اللہ عزوجل کا فرمان ہے:

وبارك فيها وقدرفيها أقواتها فى أربعةأيام [فصلت:۱۰]

قوله: خلق النور يوم الاربعاء:

اختلاف روایت کے پیش نظر تطبیق یوں ہوگی کہ نور اور نون دونوں کو بدھ کے دن ہی پیدا کیا گیا ہو۔ نور کی تعریف یہ ہے: هو الظاهر بنفسه المظهر لغيره اھ۔ بظاہر نور سے مراد خود اس کی ذات اور وہ چیز ہے جس میں اس کا ظہور ہے۔ چنانچہ اللہ جل شانہ کے اس ارشاد گرامی کے مناسب ہو جائے گا: ﴿ثم استوى الى السماء وهى دخان فقال لها وللأرض ائتيا طوعا أوكرها قال لتا أتينا طائعين فقضا هن سبع سموت فى يومين وأوحى فى كل سماء امرها وزينا السماء الدنيا بمصابيح وحفظا ذلك تقدير العزيز العليم﴾.

قوله: وبث فيها الدواب يوم الخميس:

یہ حدیث ماقبل میں گزری ہوئی اس بات کی منافی نہیں: قضاء سبع السموات وخلقهن فى يومين. ائمہ کی ایک جماعت اسی بات کی قائل ہے کہ جمعہ کے دن، عصر کے بعد سے رات تک کا حصہ دعاء کی قبولیت کا ہے۔

الجامع کی روایت میں یہ الفاظ وارد ہوئے ہیں: فى آخر الخلق فى آخر ساعة من ساعات الجمعة.

اسنادی حیثیت: اس حدیث کو امام احمدؒ نے اپنی مسند میں مرفوعاً نقل کیا ہے۔ لیکن تفسیر ابن کثیر میں ذکر کردہ کلام کا خلاصہ یہ ہے کہ یہ حدیث "غرائب مسلم" میں سے ہے۔ اس حدیث میں امام بخاریؒ وغیرہ محدثین نے کلام کیا ہے، اور اس حدیث کو کعب اَحبار کا کلام قرار دیا ہے۔ اور حضرت ابوہریرہؓ نے یہ کلام کعب احبار سے سنا ہے، بعض راویوں کو اشتباہ ہو گیا تو انہوں نے اس کو

مرفوعاً ذکر کر دیا ہے۔ واللہ اعلم۔

۵۷۳۵ : وَعَنْهُ قَالَ بَيْنَمَا نَبِيُّ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ جَالِسٌ وَاَصْحَابُهٗ اِذَا اَتٰى عَلَيْهِمْ سَحَابٌ فَقَالَ نَبِيُّ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ هَلْ تَدْرُوْنَ مَا هٰذَا قَالُوا اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ اَعْلَمُ قَالَ هٰذِهِ الْعِنَانُ هٰذِهٖ رَوَايَا الْاَرْضِ يَسُوْقُهَا اللّٰهُ اِلٰى قَوْمٍ لَا يَشْكُرُوْنَهٗ وَلَا يَدْعُوْنَهٗ ثُمَّ قَالَ هَلْ تَدْرُوْنَ مَا فَوْقَكُمْ قَالُوا اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ اَعْلَمُ قَالَ فَاِنَّهَا الرَّقِيْعُ سَقْفٌ مَحْفُوْظٌ وَمَوْجٌ مَكْفُوْفٌ ثُمَّ قَالَ هَلْ تَدْرُوْنَ مَا بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهَا قَالُوا اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ اَعْلَمُ قَالَ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهَا خَمْسُمِائَةِ عَامٍ ثُمَّ قَالَ هَلْ تَدْرُوْنَ مَا فَوْقَ ذٰلِكَ قَالُوا اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ اَعْلَمُ قَالَ سَمَاءٌ اِنْ بُعْدُ مَا بَيْنَهُمَا خَمْسُمِائَةٍ ثُمَّ قَالَ كَذٰلِكَ حَتّٰى عَدَّ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ مَا بَيْنَ كُلِّ سَمَائَيْنِ مَا بَيْنَ السَّمَاءِ وَالْاَرْضِ ثُمَّ قَالَ هَلْ تَدْرُوْنَ مَا فَوْقَ ذٰلِكَ قَالُوا اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ اَعْلَمُ قَالَ اِنَّ فَوْقَ ذٰلِكَ الْعَرْشُ وَبَيْنَهٗ وَبَيْنَ السَّمَاءِ بُعْدُ مَا بَيْنَ السَّمَائَيْنِ ثُمَّ قَالَ هَلْ تَدْرُوْنَ مَا الَّذِيْ تَحْتَكُمْ قَالُوا اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ اَعْلَمُ قَالَ اِنَّهَا الْاَرْضُ ثُمَّ قَالَ هَلْ تَدْرُوْنَ مَا تَحْتَ ذٰلِكَ قَالُوا اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ اَعْلَمُ قَالَ اِنَّ تَحْتَهَا اَرْضًا اُخْرٰى بَيْنَهُمَا مَسِيْرَةُ خَمْسِمِائَةِ سَنَةٍ حَتّٰى عَدَّ سَبْعَ اَرَضِيْنَ بَيْنَ كُلِّ اَرَضِيْنَ مَسِيْرَةُ خَمْسِمِائَةِ سَنَةٍ ثُمَّ قَالَ وَالَّذِيْ نَفْسُ مُحَمَّدٍ بِيَدِهٖ لَوْ اَنَّكُمْ دَلَّيْتُمْ بِحَبْلٍ اِلَى الْاَرْضِ السُّفْلٰى لَهَبَطَ عَلَى اللّٰهِ ثُمَّ قَرَاَ هُوَ الْاَوَّلُ وَالْاٰخِرُ وَالظَّاهِرُ وَالْبَاطِنُ وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ (رواه احمد والترمذی وقال) قِرَاءَةُ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ الْاٰيَةَ تَدُلُّ عَلٰى اَنَّهٗ اَرَادَ لَهَبَطَ عَلٰى عِلْمِ اللّٰهِ وَقُدْرَتِهٖ وَسُلْطَانِهٖ وَعِلْمُ اللّٰهِ وَقُدْرَتُهٗ وَسُلْطَانُهٗ فِيْ كُلِّ مَكَانٍ وَهُوَ عَلَى الْعَرْشِ كَمَا وَصَفَ نَفْسَهٗ فِيْ كِتَابِهٖ۔

اخرجه ابود اود ۵/۹۳حدیث رقم۴۷۲۳ والترمذی ۵/۳۷۶حدیث رقم ۳۲۹۸ وابن ماجه ۱/۶۹حدیث رقم ۱۹۳ واحمد فی المسند ۱/۲۰۶۔

ترجمہ: ''حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا کہ نبی اقدس صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام تشریف فرما تھے کہ بادل کا ایک ٹکڑا گزرا' آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے (ابر کے اس ٹکڑے کی جانب اشارہ فرما کر (صحابہؓ سے) پوچھا کہ تم لوگ جانتے ہو یہ کیا ہے صحابہ نے (حسب عادت) جواب دیا کہ اللہ تعالیٰ اور اس کا رسول ہی بخوبی واقف ہیں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''یہ عنان (یعنی ابر) ہے اور یہ ابر زمین کو سیراب کرنے والے ہیں' جنہیں اللہ تعالیٰ ان لوگوں کی جانب ہانک کر لے جاتا ہے جو نہ اس کا شکر ادا کرتے ہیں اور نہ اس سے دعا اور درخواست کرتے ہیں''۔ پھر فرمایا جانتے ہو تمہارے اوپر (جو آسمان ہے وہ) کیا چیز ہے؟ صحابہؓ نے جواب دیا کہ اللہ تعالیٰ اور اس کا رسول صلی اللہ علیہ وسلم بخوبی واقف ہیں! آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: تمہارے اوپر کی چیز رقیع ہے جو ایک محفوظ چھت اور تھمادی ہوئی موج ہے۔ پھر فرمایا: تمہیں معلوم ہے کہ تمہارے اور آسمان کے درمیان کتنا فاصلہ ہے؟ صحابہؓ نے جواب دیا کہ اللہ تعالیٰ اور اس کا رسول ہی بخوبی واقف ہیں! آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے

ارشاد فرمایا: تمہارے اور آسمان کے درمیان پانچ سو برس (کی مسافت کے بقدر فاصلہ ہے)''۔ پھر فرمایا: تمہیں معلوم ہے کہ آسمان کے اوپر کیا ہے؟ صحابہؓ نے جواب دیا کہ اللہ اور اس کا رسول ہی بخوبی واقف ہیں! آپ ﷺ نے فرمایا: اس آسمان کے بعد پھر اوپر نیچے دو آسمان ہیں اور ان دونوں آسمانوں کے درمیان بھی پانچ سو سال کے برابر فاصلہ ہے''۔ اسی طرح آپ ﷺ نے یکے بعد دیگرے ہر آسمان کے بارے میں بتلایا' یہاں تک کہ ساتوں آسمان کے بارے میں بتایا کہ ان میں سے ہر ایک آسمان سے دوسرے آسمان کا تک فاصلہ اس قدر ہے جس قدر زمین سے آسمان کے درمیان ہے۔ اس کے بعد آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا تمہیں معلوم ہے' پھر اس (آخری آسمان) کے اوپر کیا ہے؟ صحابہ کرام نے جواب دیا کہ اللہ اور اس کا رسول ہی بخوبی واقف ہیں؟ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: اس ساتویں اور آخری آسمان کے اوپر عرش ہے اور اس عرش اور اس کے نیچے آسمان کے درمیان اتنا ہی فاصلہ ہے جتنا دو آسمانوں کے درمیان ہے۔ پھر آپ ﷺ نے پوچھا: تم جانتے ہو؟ تمہارے نیچے کیا چیز ہے؟ صحابہ نے عرض کیا اللہ تعالیٰ اور اس کا رسول ہی بخوبی واقف ہیں۔ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: سب سے اوپر کی زمین ہے۔ پھر آپ نے پوچھا تمہیں معلوم ہے اس کے نیچے کیا ہے؟ صحابہ نے عرض کیا کہ اللہ تعالیٰ اور اس کا رسول بھی بخوبی واقف ہیں۔ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: اس کے نیچے ایک اور زمین ہے اور ان دونوں زمینوں کا درمیانی فاصلہ پانچ سو سال کی مسافت کے راستہ کے برابر ہے''۔ اس طرح آپ ﷺ نے سات زمینیں گنائیں اور بتایا کہ ان میں سے ہر ایک زمین سے دوسری زمین تک کا درمیانی فاصلہ پانچ سو سال کی مسافت کے برابر ہے پھر فرمایا: قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ قدرت میں محمد ﷺ کی جان ہے۔ اگر تم سب سے نیچے والی زمین پر رسی لٹکاؤ تو اللہ تعالیٰ ہی پر پہنچ جائے گی (یعنی علم الٰہی سے باہر نہ ہوگی)''۔ اس کے بعد آنحضرت ﷺ نے (بطور دلیل و تائید) یہ آیت شریفہ تلاوت فرمائی ﴿هُوَ الْاَوَّلُ وَالْاٰخِرُ وَالظَّاهِرُ وَالْبَاطِنُ وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ﴾ یعنی وہی (اللہ) اول (قدیم) ہے (کہ اس کی کوئی ابتدا نہیں ہے) اور آخری (باقی) ہے (کہ اس کی کوئی انتہا اور اختتام نہیں ہے) اور (اپنی صفات کے لحاظ سے) عیاں ہے اور (اپنی ذات کے لحاظ سے) مخفی ہے اور (دونوں جہاں کی) تمام (کلی و جزئی) چیزوں کا کامل علم رکھنے والا ہے (کہ اس کا علم نہایت کامل و اکمل ہے اور ایک ایک چیز کے ہر ہر گوشہ پر محیط ہے''۔ اس روایت کو احمد اور ترمذیؒ نے نقل کیا ہے' نیز ترمذیؒ نے کہا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کا اپنے ارشاد کے بعد اس آیت کو پڑھنا اس پر دال ہے کہ حق تعالیٰ کا علم اس کی قدرت اور اس کی حکومت ہر جگہ ہے اور وہ بذاتِ خود (یعنی اس کی تجلی) عرش پر ہے جیسا کہ خود اسی نے اپنی کتاب میں اپنا وصف بیان کیا ہے''۔

تشریح: قولہ: بینما نبی اللہ ا جانس۔۔۔ ولا ید عونہ:

قال: ھذہ العنان: اس میں ''تفنن'' ہے کہ وحدت کا اعتبار کرتے ہوئے مؤنث والا اسم اشارہ استعمال فرمایا۔ اور جنس کا اعتبار کرتے ہوئے اسم اشارہ برائے مذکر کا استعمال فرمایا۔

یسوقھا اللہ: یا ہانکنے کا حکم دیتا ہے۔

الی قوم لا یشکرونہ: بلکہ کفران کرتے ~~ہیں کہ بارش~~ برسنے کو ستاروں کے اقتران وافتراق اور طلوع وغروب کی طرف

منسوب کرتے ہوئے، یوں کہتے ہیں: مطرنا بنوء کذا.

ولا يدعونه: یعنی نہ اس کا ذکر کرتے ہیں اس سے مانگتے ہیں، نہ اس کی عبادت کرتے ہیں، بلکہ بتوں کی پوجا کرتے ہیں، لیکن اس کا کرم ہر کس وناکس پر ہے، کہ دیگر تمام أنام وانعام کی طرح وہ ان کو بھی رزق بھی دیتا ہے، عافیت بھی عطا کرتا ہے۔

قوله: ثم قال: هل تدرون۔۔۔ بعد ما بين السما تين:

رقیع: آسمان دنیا کو کہتے ہیں۔ اور بعض کا کہنا ہے کہ ہر آسمان کو "رقیع" کہتے ہیں۔ اس کی جمع "أرقعة" آتی ہے۔

أرضين: راء کے فتحہ اور سکون ہر دو کے ساتھ درست ہے۔

دليتم: لام مفتوحہ کی تشدید کے ساتھ، (از باب تفعیل) کنویں میں ڈول لٹکانا، باب افعال اور نصر سے بھی اسی معنی میں مستعمل ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿فادلى دلوه﴾ [یوسف۔۱۹] "اس نے اپنا ڈول ڈالا"

العنان: عین کے فتحہ کے ساتھ ہے۔

أتى عليهم سحاب:

ایک نسخہ میں "سحاب" کی بجائے سحابة ہے۔

ان فوق ذلك العرش: فوق، خبر مقدم کیلئے ظرف ہے اور "العرش" "ان" کا اسم مؤخر ہے۔

قوله: وهو على العرش كما وصف نفسه في كتابه:

امام طیبیؒ نے فرمایا: "كما" کا کاف منصوب علی المصدر ہے۔ أی: وهو مستوٍ على العرش استواء مثل ما وصف نفسه به في كتابه وهو متأثر بعلمه باستوئه عليه۔

امام ترمذیؒ کے قول میں اشارہ ہے کہ " لهبط على الله" میں اس ارشاد باری تعالیٰ کی وجہ سے بھی (تاویل کرنا ضروری ہے) ﴿على العرش استوى﴾ [طہ۔۵] "عرش پر قائم ہے" هذه روايا الأرض: بعض کا کہنا ہے کہ تقدیری عبارت یوں ہے: بل هذه روايا الأرض مگر یہ واضح نہیں ہے۔

موج مكفوف: آسمان مشبہ ہے، چھت مشبہ بہ ہے اور وجہ تشبیہ گرنے سے محفوظ ہونا ہے، نیز آسمان کو موج سے تشبیہ دی ہے۔ اور وجہ تشبیہ "تعلیق" ہے کہ جس طرح پانی کی کوئی موج ہوا میں معلق ہو جاتی ہے، اسی طرح آسمان بھی بغیر کسی ستون اور سہارے کے خلاء میں معلق ہے۔

ما بين كل سماء من ما بين السماء والأرض: اس میں تفنن فی العبارۃ ہے۔

قوله: والذين نفس محمد بيده۔۔۔ لهبط على الله:

دليتم: میں تجرید یا تاکید ہے۔

على الله: یعنی اللہ کے علم یا ملک میں اترے گی۔ جیسا کہ اس کی وضاحت امام ترمذیؒ کے کلام میں آ رہی ہے اور مطلب یہ

ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے علم سے، قدرت سے، اپنی مملکت کے سفلیات کا احاطہ کئے ہوئے ہے جیسا کہ وہ اپنی ملکوت کے علویات کا احاطہ کئے ہوئے ہے، اور یہ کلام ارشاد فرمانے کی غرض اس ممکنہ وہمہ کو دور کرنا ہے، کہ اللہ جل شانہ کا قبضۂ قدرت صرف عالم بالا کے ساتھ مخصوص ہے۔ اسی وجہ سے کہا گیا کہ حضرت یونس علیہ السلام کی معراج مچھلی کے پیٹ میں ہوئی اور ہمارے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی معراج آسمانوں پر۔ قرب دونوں کو حاصل ہوا، جیسا کہ اللہ جل شانہ اپنے قرب کو بیان کرتے ہوئے فرماتا ہے: ﴿ونحن أقرب اليه من حبل الوريد﴾ [ق-١٦] البتہ قرب معنوی "تشریف لدنی" سے متفاوت ہے، اسی قبیل سے فرائض ونوافل کا قرب ہے۔

۵۷۳۶ : وَعَنْهُ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ كَانَ طُوْلُ اٰدَمَ سِتِّيْنَ ذِرَاعًا سَبْعَ اَذْرُعٍ عَرْضًا۔

اخرجه احمد فی المسند ٢/٥٣٥۔

ترجمہ: "اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: حضرت آدم علیہ السلام کی قد و قیامت (خلقی لحاظ سے) ساٹھ گز لمبی اور سات گز چوڑی تھی۔

تشریح: حافظ ابن حجرؒ فرماتے ہیں کہ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا اپنا دست مبارک مراد ہے۔ اور ممکن ہے کہ موجود لوگوں کا ہاتھ مراد ہو۔ پہلا احتمال زیادہ ظاہر ہے۔ چونکہ ہر آدمی کا ذراع اپنی کہنی کے اعتبار سے ہوتا ہے، اور اگر ذراع سے مراد ذراع متعارف ہے تو یہ کھلی حقیقت ہے کہ یہ ہاتھ حضرت آدم علیہ السلام کے قد کے مقابلے میں بہت چھوٹا ہے۔ واللہ اعلم۔

میں کہتا ہوں: صاحب قاموس لکھتے ہیں: ذراع، ذال کے کسرہ کے ساتھ اصل میں (بانہہ کو کہتے ہیں، یعنی) کہنی کے سرے سے لے کر بیچ کی انگلی کے سرے تک کو، اور ساعد کو کہتے ہیں۔ کبھی ان دونوں کی جمع "أذرُع" بھی استعمال ہوتی ہے ہمزہ کے فتحہ، ذال کے سکون اور راء کے ضمہ کے ساتھ۔

ماقبل میں ایک متفق علیہ حدیث میں یہ بات گزری:

أن الله تعالى خلق آدم وطوله ستون ذراعا.

لہٰذا یہ کہنا اولیٰ ہوگا، کہ "ذراع طولا" سے مراد موجود لوگوں کا ہاتھ ہے کہ یہی متبادر الی الفہم ہے۔ اور "سبع أذرع عرضا" سے خود حضرت آدم علیہ السلام کا ہاتھ مراد ہو، یوں ان روایات میں تطبیق بھی ہو جائے گی، اور "دور" بھی ختم ہو جائے گا اور "دور" ویسے بھی ممنوع ہے۔

۵۷۳۷ : وَعَنْ اَبِىْ ذَرٍّ قَالَ قُلْتُ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اَىُّ الْاَنْبِيَاءِ كَانَ اَوَّلَ قَالَ اٰدَمُ قُلْتُ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ وَنَبِىٌّ كَانَ قَالَ نَعَمْ نَبِىٌّ مُكَلَّمٌ قُلْتُ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ كَمِ الْمُرْسَلُوْنَ قَالَ ثَلٰثُمِائَةٍ وَبِضْعَةَ عَشَرَ جَمًّا غَفِيْرًا وَفِىْ رِوَايَةٍ عَنْ اَبِىْ اُمَامَةَ قَالَ اَبُوْذَرٍّ قُلْتُ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَمْ وَفَاءُ عِدَّةِ الْاَنْبِيَاءِ قَالَ مِائَةُ اَلْفٍ وَاَرْبَعَةٌ وَعِشْرُوْنَ اَلْفًا الرُّسُلُ مِنْ ذٰلِكَ ثَلٰثُمِائَةٍ وَخَمْسَةَ

عَشَرَ جَمًّا غَفِيْرًا۔

اخرجه احمد في المسند ۱۷۸/۵۔

ترجمہ: ''حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا کہ میں نے عرض کیا: یارسول اللہ ﷺ انبیاء میں سے سب سے پہلے کون آئے؟ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: سیدنا آدم علیہ السلام! میں نے عرض کیا حضرت آدم علیہ السلام نبی تھے؟ آپ نے ارشاد فرمایا ہاں وہ نبی تھے' انہیں خدا تعالیٰ سے ہم کلامی کا شرف بھی حاصل ہوا تھا۔ اس کے بعد میں نے سوال کیا یا رسول اللہ (ﷺ) انبیاء میں رسول کتنے ہوئے ہیں؟ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: خاصی بڑی جماعت تھی (جو رسول ہوئے ہیں تقریباً) تین سودس سے کچھ زیادہ ہی ہوں گے''۔ اور ایک دوسری روایت میں حضرت ابوامامہؓ (تابعی) سے یہ الفاظ منقول ہیں کہ حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کا بیان ہے میں نے عرض کیا: ''یارسول اللہ ﷺ تمام انبیاء کی کل تعداد (خواہ وہ رسول ہوں یا غیر رسول کیا ہے؟ آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا: ایک لاکھ چوبیس ہزار' ان میں تین سو پندرہ پیغمبر گزرے ہیں جو کافی بڑی تعداد ہے''۔

تشریح: **قوله: یا رسول الله ای الانبیاء ۔۔۔ قال بنی مکلم:**

کان أول: منصوب ہے۔

قال: آدم: مرفوع ہے، (''هو'' مبتدا محذوف کی خبر ہے۔) أی: **هو آدم**.

ونبي كان: امام طیبیؒ فرماتے ہیں: ماقبل کلام ''أي الأنبياء؟'' کا تقاضا یہ ہے کہ یہاں اس جملہ میں ہمزہ استفہام کو مقدر مانا جائے۔ أی: **أو هو نبي كان؟**

قال نبي نعم: لفظ ''نعم'' کے بعد لفظ ''نبی'' یہاں اس لئے ذکر فرمایا تاکہ ''مکلم'' اس پر متفرع ہو سکے۔ یعنی وہ مخصوص نبی نہیں تھے بلکہ نبی مکلم تھے ان پر صحیفوں کا نزول ہوا تھا۔

قوله: قلت یارسول الله! کم المرسلون:

صاحب الکشاف اس آیت کریمہ: ﴿**وما أرسلنا من قبلك من رسول ولا نبي**﴾ [الحج۔۵۲] کے ذیل میں فرماتے ہیں کہ یہ آیت اس بات کی دلیل ہے کہ رسول اور نبی میں فرق ہے۔ رسول اور نبی میں فرق یہ ہے کہ رسول اس پیغمبر کو کہتے ہیں، کہ جسے معجزات کے ساتھ ساتھ کتاب بھی دی گئی ہو، اور نبی اس پیغمبر کو کہتے ہیں، جس پر کوئی کتاب نازل نہ ہوئی، مزید یہ کہ وہ پچھلی شریعت کی طرف دعوت کا مامور ہو۔ اھ۔ نبی اور رسول میں جو فرق مشہور ہے وہ یہ ہے کہ رسول وہ ہے جو تبلیغ پر مامور ہو، اور نبی اُعم ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

قوله: قال ثلاثمائة وبضعة عشر جما غفيرا:

آنحضرت ﷺ نے کوئی خاص عدد بالجزم ذکر نہیں کیا بلکہ مبہم رکھا، تاکہ اصل تعداد میں کوئی کمی بیشی نہ ہو۔

جما غفيرا: ''غفیر'' بمعنی ''کثیر'' النہایہ میں اس لفظ کی شرح میں لکھتے ہیں: أی: **مجتمعين كثيرين**۔ ''**جما**'' اصل میں ''**جموم**'' اور ''**جمة**'' بمعنی اجتماع وکثرت سے مأخوذ ہے۔ اور ''**غفير**'' **غفر** بمعنی **التغطية والستر** سے مشتق

ہے،، دونوں کلمات کا استعمال مواضع شمول واحاطہ میں ہوتا ہے۔عرب لفظ جما کو بغیر صفت کے استعمال نہیں کرتے، یہ منصوب علی المصدریۃ ہے جیسا کہ" طوا" اور "قاطبة"، کہ یہ اسماء موضع مصدر (میں استعمال ہونے) کیلئے وضع کیے گئے ہیں۔

قوله:وفي رواية عن أبي أمامة ..... :

ابو امامہ سے مراد جلیل القدر صحابی أبو اُمامہ الباہلی نہیں ہیں، بلکہ أبو اُمامۃ سہل بن حنیف الانصاری الأوسی ہیں۔ آنحضرت ﷺ کی وفات سے دو (۲) سال قبل پیدا ہوئے، اپنے صغر کی وجہ سے آنحضرت ﷺ سے حدیث کا سماع نہیں کر سکے، اس وجہ سے بعض حضرات نے ان کو تابعین میں شمار کیا ہے۔ابن عبدالبر نے بہر حال انہیں صحابہ ہی میں شمار کیا ہے۔اور پھر فرمایا کہ وہ مدینہ کے جلیل القدر کبار علماء تابعین میں سے تھے، اپنے والد اور ابوسعید وغیرہ سے سماع حدیث کیا۔ان سے ایک جماعت روایت کرتی ہے۔۱۱۰ میں ۹۲ سال کی عمر میں وفات پائی۔

اس حدیث میں اگر چہ ایک مخصوص تعداد کا ذکر بالجزم ہے لیکن یہ تعداد قطعی نہیں ہے۔انبیاء ورسل کی تعداد کے بارے میں کوئی خاص تعداد متعین نہیں کرنی چاہئے بلکہ اجمالی عقیدہ رکھنا چاہئے، (کہ انبیاء کی ٹھیک تعداد اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے، اللہ تعالیٰ نے جتنے بھی رسول اور نبی بھیجے، ہم ان سب کو برحق رسول و نبی مانتے ہیں)۔اس اجمال کے نتیجے میں نہ کوئی نبی انبیاء کے زمرے سے باہر رہے گا اور نہ کوئی غیر نبی ان کے زمرہ میں شامل ہوگا۔

۵۷۳۸ : وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَيْسَ الْخَبَرُ كَالْمُعَايَنَةِ اِنَّ اللّٰهَ تَعَالٰى اَخْبَرَ مُوْسٰى بِمَا صَنَعَ قَوْمُهُ فِي الْعِجْلِ فَلَمْ يُلْقِ الْاَلْوَاحَ فَلَمَّا عَايَنَ مَا صَنَعُوا اَلْقَى الْاَلْوَاحَ فَانْكَسَرَتْ رَوَى الْاَحَادِيْثَ الثَّلٰثَةَ اَحْمَدُ ۔

اخرجه احمد في المسند ۲۷۱/۱

ترجمہ: "حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: "کسی واقعہ کی غائبانہ اطلاع صورت واقعہ کو عینی مشاہدے میں لانے کی مانند نہیں ہوتی" چنانچہ حق تعالیٰ شانہ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو ان کی قوم کے اس عمل کے متعلق میں خبر دی کہ انہوں نے بچھڑے کی عبادت شروع کر دی تو انہوں نے (مارے غصے کے) تختیوں کو نہیں پھینکا لیکن جب وہ اپنی قوم میں واپس تشریف لائے اور اپنی آنکھوں سے قوم کے اس عمل کے متعلق تو (اس درجہ غضبناک ہو گئے کہ) تختیوں کو پھینک ڈالا اور وہ ٹوٹ گئیں"۔ان تینوں حدیثوں کو احمد نے نقل کیا ہے"۔

تشریح: ان الله تعالىٰ: جملہ مستانفہ ہے، اس میں تعلیل کے معنی ہیں۔ای لان الله تعالىٰ۔

فانكسرت: ضمیر الالواح کی طرف راجع ہے۔

ان الواح کا ٹوٹ جانا مشعر ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام اس وقت کس قدر غضبناک تھے۔

الواح کے القاء میں اشارہ ہے کہ ان الواح سے اہل ایمان ہی منتفع ہو سکتے ہیں، اور جب وہ کفر و سرکشی اختیار کریں گے، تو ان الواح کے باقی رکھنے کا کوئی فائدہ نہیں لیکن بظاہر ان الواح کے ٹوٹنے سے کوئی اہم شئی ضائع نہیں ہوئی ہوگی۔

امام طیبیؒ فرماتے ہیں: ان الله تعالى أخبر الخ، یہ کلام درحقیقت ماقبل کلام" ليس الخبر كالمعانية" کے لئے

استشہاد وتقریر ہے، بایں طور کہ اللہ جل شانہ نے جب یہ فرمایا: ﴿قَالَ فَاِنَّا قَدْ فَتَنَّا قَوْمَكَ مِنْ بَعْدِكَ وَاَضَلَّهُمُ السَّامِرِيُّ﴾ [طٰہٰ: ٨٥] تو الواح کو نہیں پھینکا، اور اگلی بات خود قرآن کریم نے ذکر کی ہے: ﴿ وَلَمَّا رَجَعَ مُوْسٰٓى اِلٰى قَوْمِهٖ غَضْبَانَ اَسِفًا ۙ قَالَ بِئْسَمَا خَلَفْتُمُوْنِيْ مِنْۢ بَعْدِيْ ۚ اَعَجِلْتُمْ اَمْرَ رَبِّكُمْ ۚ وَاَلْقَى الْاَلْوَاحَ وَاَخَذَ بِرَاْسِ اَخِيْهِ يَجُرُّهٗٓ اِلَيْهِ ۭ قَالَ ابْنَ اُمَّ اِنَّ الْقَوْمَ اسْتَضْعَفُوْنِيْ وَكَادُوْا يَقْتُلُوْنَنِيْ ڮ فَلَا تُشْمِتْ بِيَ الْاَعْدَاۗءَ وَلَا تَجْعَلْنِيْ مَعَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ﴾ [الاعراف۔ ١٥٠] ''اور جب موسیٰ اپنی قوم کی طرف واپس آئے غصے اور رانج میں بھرے ہوئے تو فرمایا کہ تم نے میرے بعد یہ بڑی نامعقول حرکت کی کیا ہے اپنے رب کے حکم (آنے) سے پہلے ہی تم نے جلد بازی کر لی اور جلدی سے تختیاں ایک طرف رکھیں اور اپنے بھائی کا سر پکڑ کر اپنی طرف گھسیٹنے لگے''۔

امام طبرانیؒ نے اپنی اوسط میں اور امام حاکمؒ نے اپنی مستدرک میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے ان کی موافقت کی ہے۔ طبرانی نے حدیث کا صرف ابتدائی حصہ: ليس الخبر كالمعاينة، حضرت انسؓ سے نقل کیا ہے، اور اسی طرح خطیبؒ نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے۔

بَابُ فَضَائِلِ سَيِّدِ الْمُرْسَلِيْنَ صَلَوَاتُ اللّٰهِ وَ سَلَامُهُ عَلَيْهِ

سیّد المرسلین صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کے فضائل ومناقب کا بیان

آنحضرت صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کے فضائل کی تفصیل اور آپ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کے فضائل کی تحصیل ایسا شرف وکرم ہے جو نا قابل حد اور نا قابل احاطہ ہے بلکہ ممکن ہی نہیں کہ اس کا شمار کیا جا سکے اور استقصاء کیا جا سکے۔ تاہم مؤلف کتاب (صاحب مشکوٰۃ) نے اس باب میں فضائل ومناقب کا بڑا حصہ ذکر فرمایا ہے جو بقیہ اوصاف حمیدہ پر دلالت کرتے ہیں۔

الفصل الاول:

۵۷۳۹ : عَنْ اَبِی هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بُعِثْتُ مِنْ خَيْرِ قُرُوْنِ بَنِیْ اٰدَمَ قَرْنًا فَقَرْنًا حَتّٰى كُنْتُ مِنَ الْقَرْنِ الَّذِیْ كُنْتُ مِنْهُ ۔ (رواه البخاری)

اخرجه البخاری فی صحیحه ٥٦٦/٦ حدیث رقم ٣٥٥٧ واحمد فی المسند ٣٧٣/٢۔

ترجمہ: "حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے' فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے ارشاد فرمایا: مجھے بنی آدم کے بہترین طبقوں میں پیدا کیا گیا' ایک قرن کے بعد دوسرا قرن گزرتا رہا' یہاں تک کہ میں اس قرن میں پیدا ہوا جس میں' میں پیدا ہوا ہوں۔" (بخاری)

راوی حدیث:

ابو ہریرہ۔ یہ مشہور صحابی ابو ہریرہؓ ہیں۔ ان کے نام اور نسب میں خاصا اختلاف پایا جاتا ہے۔ زیادہ مشہور یہ ہے کہ قبل از اسلام ان کا نام "عبد شمس" یا "عبد عمرو" تھا اور اسلام لانے کے بعد "عبد اللہ" یا "عبد الرحمٰن" نام رکھا گیا۔ یہ کہ قبیلہ "دوس" کے فرد ہیں۔ حاکم ابواحمد رحمہ اللہ نے فرمایا کہ ہمارے نزدیک ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کے نام کے بارے میں سب سے زیادہ صحیح بات یہ ہے کہ ان کا نام عبدالرحمٰن صخر ہے۔ ان کی کنیت ان کے نام پر اس طرح غالب آ گئی گویا ان کا نام ہی نہیں رکھا گیا۔ غزوہ خیبر کے سال اسلام لائے اور آنحضرت صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کے ہمراہ شریک ہوئے۔ پھر آنحضرت صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کی معیت کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنا لیا اور علم کے شوق میں پابندی کے ساتھ حاضر رہنے لگے۔ صرف پیٹ بھر کھانے پر اکتفاء کرتے۔ آپ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم جہاں تشریف لے جاتے یہ بھی ساتھ رہتے۔ صحابہ رضی اللہ عنہم میں سب سے زیادہ مضبوط حافظے اور یادداشت والے تھے۔ آپ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کے ساتھ لگے رہنے کی

برکت سے ان کو وہ چیزیں مستحضر رہتی تھیں جو دوسروں کو یاد نہ ہوتیں' خود ان کا بیان ہے کہ میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں عرض کیا اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم! میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے بہت سی باتیں سنتا ہوں وہ مجھے یاد نہیں رہتیں۔ پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اپنی چادر بچھاؤ چنانچہ آپؐ نے میرے لیے قوت یاداشت کی دعا فرمائی۔ میں نے چادر بچھادی۔ امام بخاری رحمہ اللہ نے فرمایا کہ ان کی روایات کثرت کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ وہ آٹھ سو سے زیادہ آدمیوں سے روایت نقل کرتے ہیں۔ ان میں صحابہ جیسے ابن عمر اور ابن عباس اور جابر اور انس رضی اللہ عنہم اور تابعین رحمہم اللہ سب شامل ہیں۔ مدینہ میں ۵۷ھ یا ۵۸ھ یا ۵۹ھ میں اٹھتر (۷۸) سال کی عمر میں وفات پائی۔

نام کی وجہ تسمیہ:

ان کے پاس ہر وقت چھوٹی سی بلی رہتی تھی۔ یہ اس کو اٹھائے رکھتے تھے اس لئے ان کا نام ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ ہوگیا۔

تشریح ۞ اس حدیث اور اگلی میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے آباؤ اجداد کی خاندانی شرافت اور فضل و کمال کا ذکر باعتبار قبائل کے ہے' مذہب کے اعتبار سے فضیلت بیان کرنا مقصود نہیں۔

قرنًا فقرنًا بعض کا کہنا ہے کہ: یہ خبر سے حال ہے **فقرنًا** میں فاء ترتیب کے لئے ہے یعنی یہ فضیلت اور شرف یکے بعد دیگرے ہر قرن کے لوگوں میں منتقل ہوتی رہی۔

کنت : **وجدت** کے معنی میں ہے۔

ایک زمانے کے لوگوں کو ''قرن'' کہتے ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے **خیر القرون قرنی** میرا زمانہ سب سے بہترین زمانہ ہے۔ شرح السنہ میں ہے ہر ایسے طبقہ کو قرن کہا جاتا ہے جن میں اقتران وقت پایا جاتا ہو۔

زمانے کو قرن اس لئے کہتے ہیں کہ یہ ایک اُمت کو دوسری امت سے اور ایک عالم کو دوسرے عالم سے ملاتا ہے۔

اصل کے اعتبار سے ''قران'' مصدر ہے **قرنت** بمعنی **وصلت** کا پھر اس کو ظرف زمان اور ایک زمانے لوگوں کا اسم قرار دیا گیا۔

قرن کتنے سال کا ہوتا ہے؟

بعض کا کہنا ہے کہ قرن اسی سال کا ہوتا ہے۔ بعض حضرات کہتے ہیں چالیس سال کا ہوتا ہے بعض سو سال کے قائل ہیں۔

یہاں پہلا قول مراد ہے۔ پس مطلب یہ ہوا کہ مجھے بنی آدم کے بہترین طبقوں میں پیدا کیا گیا۔ طبقہ بطبقہ یہاں تک کہ میں اس قرن میں ہوا جس میں میں پیدا ہوا۔ یہ حدیث آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی فضیلت تمام بنی آدم پر اور آپ کی امت کی فضیلت تمام امتوں پر ثابت کررہی ہے۔ امام طیبیؒ فرماتے ہیں: ''**حتی کنت**'' بعثت کی غایت ہے اور بعث سے مراد یہ ہے ایک باپ کی پشت سے یکے بعد دیگرے دوسرے باپ کی طرف منتقل ہوتے رہے۔

یہاں تک کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس زمانے میں ظاہر ہوئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سب سے پہلے بنی اسماعیل کی طرف' پھر بنی اسماعیل سے کنانہ کی طرف کنانہ سے قریش کے طرف قریش سے بنی ہاشم کے طرف منتقل ہوئے۔

جیسے آپ کہتے ہیں خذ الافضل :فالأکمل واعمل الاحسن والأجمل۔ اعمال میں افضل کو اور اکمل کو اختیار کرو اچھائی اور نیکی کا برتاؤ کرو اسی مفہوم میں ابن رومی کا یہ شعر ہے۔

کم من اب قد علا بابن ذری شرف
کما علا برسول الله عدنان

''کتنے ہی باپ اپنے بیٹوں کی وجہ سے شرافت کی بلندیوں پر پہنچے ہیں جیسے عدنان رسول اللہ ﷺ کی وجہ سے بلند و بالا ہوئے۔''

اور ''حتی ظهر فی القرن الذی وجد'' ایک نسخہ میں صراحتاً بھی موجود ہے۔''

امام ابن جوزیؒ نے کتاب الوفاء میں کعب احبارؒ سے روایت نقل فرمائی ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے آنحضرت ﷺ کی تخلیق کا ارادہ فرمایا تو حضرت جبرائیل علیہ السلام کو مٹی لانے کا حکم فرمایا حضرت جبرائیل آپ ﷺ کی قبر مبارک کی جگہ سے مٹھی بھر مٹی لے کر خدمت میں حاضر ہوئے اس کو تسنیم سے گوندھا گیا پھر اس مٹی کو جنت کی نہروں میں غوطہ دیا گیا اور آسمانوں میں گھمایا گیا اس طرح فرشتے حضرت آدم علیہ السلام کی شناخت سے قبل آپ ﷺ سے واقف ہو گئے آپ ﷺ کے نور کی چمک حضرت آدم علیہ السلام کی پیشانی میں نظر آتی تھی حضرت آدم علیہ السلام سے فرمایا گیا: اے آدم یہ آپ کی اولاد کے رسولوں کا سردار ہے۔ پھر جب حضرت حوا علیہا السلام کے رحم میں حضرت شیث آئے تو یہ نور حضرت آدم علیہ السلام سے حوا علیہا السلام میں منتقل ہوا۔ حضرت حوا علیہا السلام ہر بطن میں دو بچے جنتی تھیں صرف حضرت شیث علیہ السلام کو آنحضرت ﷺ کے شرف کی وجہ سے اکیلا جنا۔ پھر ایک پاک باپ کی پشت سے دوسرے پاک باپ کی پشت کی طرف منتقل ہوتے رہے اور آخر میں آمنہ نے عبداللہ بن عبدالمطلب سے جنا۔ میں نے آنحضرت ﷺ کی ولادت باسعادت کے متعلق اپنے رسالہ المورد فی المولد میں ذکر کیا ہے۔

۵۷۴۰ : وَعَنْ وَاثِلَةَ بْنِ الْاَسْقَعِ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰى كِنَانَةَ مِنْ وُلْدِ اِسْمٰعِيْلَ وَاصْطَفٰى قُرَيْشًا مِّنْ كِنَانَةَ وَاصْطَفٰى مِنْ قُرَيْشٍ بَنِيْ هَاشِمٍ وَاصْطَفَانِيْ مِنْ بَنِيْ هَاشِمٍ (رواه مسلم وفي رواية للترمذي) اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰى مِنْ وُلْدِ اِبْرَاهِيْمَ اِسْمٰعِيْلَ وَاصْطَفٰى مِنْ وُلْدِ اِسْمٰعِيْلَ بَنِيْ كِنَانَةَ ۔

اخرجه مسلم ۱۷۸۲/٤حديث رقم (۱۔۲۲۷٦) واخرجه الترمذى ٥٤٤/٥حديث رقم ۳٦۰٥ واحمد فى المسند ۱۰۷/٤۔

ترجمہ: ''حضرت واثلہ بن اسقع رضی اللہ عنہ سے مروی ہے' فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو ارشاد فرماتے ہوئے سنا: ''بلاشبہ اللہ تعالیٰ نے اولادِ اسماعیل (علیہ السلام) سے کنانہ کو چنا اور کنانہ سے قریش کو چنا اور قریش میں سے بنو ہاشم کو چنا اور بنو ہاشم میں سے مجھ کو چنا۔ (مسلم) اور ترمذیؒ کی ایک روایت میں یہ الفاظ ہیں کہ ''بلاشبہ اللہ تعالیٰ نے ابراہیم علیہ السلام کی اولاد سے اسماعیل علیہ السلام کو چنا اور اولادِ اسماعیل سے بنو کنانہ کو چنا''۔

تشریح: ''کنانہ'' ف کے کسرہ کے ساتھ ہے جو خزیمہ کی اولاد میں سے ہے۔

ولد واؤ اور لام کے فتحہ کے ساتھ ہے اور واؤ کے ضمہ اور لام کے سکون کے ساتھ بھی پڑھا جا سکتا ہے۔

قریش نضر بن کنانہ کی اولاد ہیں یہ مختلف علاقوں میں پھیلے ہوئے تھے قصیٰ بن کلاب نے ان سب کو مکہ مکرمہ میں جمع کیا اس لئے قصی بن کلاب کو قریش کا لقب ملا (قریش قرش سے ہے جس کے معنی جمع اور منظم کرنے کے ہیں) کیونکہ اس شخص نے ان سب کو جمع کیا تھا اس لئے اس کا لقب قریش پڑا۔ بنو کنانہ کی اولاد میں نضر کی اولاد کے علاوہ کسی کو قریش نہیں کہا جاتا ہے کیونکہ وہ ان کے ساتھ اجتماعیت میں شریک نہیں ہوئے تھے۔

شرح السنہ میں آپ ﷺ کا سلسلہ نسب اس طرح ہے:

ابوالقاسم محمد بن عبداللہ بن عبدالمطلب بن ہاشم بن عبدمناف بن قصی بن کلاب بن مرۃ بن کعب بن لؤی بن غالب بن فہر بن مالک بن نضر ابن کنانہ بن خزیمہ ابن مدرکہ ابن الیاس بن مضر بن نزار بن معد بن عدنان۔ عدنان سے اوپر کا نسب نامہ زیادہ وثوق کے ساتھ نہیں بتایا جا سکتا۔ (ان اسماء کو میں نے اپنے رسالہ "المسطورة" میں ضبط کیا ہے)۔

۵۷۴۱ : وَعَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَنَا سَيِّدُ وُلْدِ اٰدَمَ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَاَوَّلُ مَنْ يَنْشَقُّ عَنْهُ الْقَبْرَ وَاَوَّلُ شَافِعٍ وَاَوَّلُ مُشَفَّعٍ ۔ (رواه مسلم)

اخرجه مسلم فی صحيحه ١٧٨٢/٤ حديث رقم (٣-٢٢٧٨) وابو داؤد ٥٤/٥ حديث رقم ٤٦٧٣ والترمذی ٥٤٨/٥ حديث رقم ٣٦١٥ والدارمی ٤١/١ حديث رقم ٥٢ واحمد فی المسند ٢/٣۔

ترجمہ: "حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: قیامت کے دن میں اولاد آدم کا سردار ہوں گا اور میں پہلا شخص ہوں گا جس سے قبر شق ہوگی (یعنی سب سے پہلے قبر سے میں ہی اٹھوں گا) اور سب سے پہلے میں شفاعت کروں گا اور سب سے پہلے میری ہی شفاعت قبول ہوگی"۔ (مسلم)

تشریح: سید: مسلم شریف کی شرح نووی میں امام ہرویؒ کا قول منقول ہے سید وہ شخص ہے جو اپنی قوم میں عزت و شرف کے اعتبار سے فائق ہو۔ دیگر حضرات فرماتے ہیں کہ سیّد اس شخص کو کہتے ہیں کہ مصیبت و پریشانی کے وقت جس سے پناہ مانگی جاتی ہے جو ان کے دکھ، تکلیف اور خوف کو دور کرنے کی کوشش کرتا ہے۔

قوله :انا سيد ولد آدم۔

يوم القيامه: قیامت کے دن کی قید لگائی۔ حالانکہ آنحضرت ﷺ دنیا و آخرت دونوں جہانوں کے سردار ہیں۔ سو یہ قید اس لئے لگائی ہے کہ اس دن آنحضرت ﷺ کی سرداری کا ظہور کسی بھی منازع و معاند شخص کے بغیر ہوگا۔ بخلاف دنیا کے کتنے کفار بادشاہ اور مشرکین آپ ﷺ کے مخالف رہے۔

آنحضرت ﷺ کا یہ ارشادِ گرامی: **انا سيّد ولد آدم يوم القيامه**: معنی کے اعتبار سے اللہ تعالیٰ کے ارشاد مبارک: **لمن الملك اليوم لله الواحد القهار** کے نزدیک ہے۔ باوجودیکہ اس سے پہلے بھی (یعنی دنیا میں) بادشاہت اللہ ہی کی تھی لیکن لوگ بادشاہت کا دعویٰ کرتے تھے یا یہ کہ دوسروں کی طرف بادشاہت کی نسبت مجازی ہے۔ دنیا میں ہر نسبت ختم ہو جائے گی (اور اس دن صرف ایک حقیقی نسبت ہی باقی رہے گی وہ ہے اللہ کی بادشاہی)۔

کیونکہ اہل سنت والجماعت کا مذہب ہے کہ انسان فرشتوں سے افضل ہے جب آپ ﷺ سب انسانوں کے سردار ہیں تو فرشتوں سے بطریقہ اولیٰ وافضل ہوئے۔

بعض احادیث میں جو یہ فرمایا گیا ہے: **لا تفضلونی بین الانبیاء** (مجھ کو دوسرے انبیاء سے افضل نہ کہو) تو اس کے پانچ جوابات ہیں:

① آپ ﷺ کا یہ قول مبارک اس وقت کا ہے جبکہ تمام انسانوں پر آپ کی فضیلت کی وحی نازل نہیں ہوئی تھی۔
② آپ ﷺ نے کسر نفسی کے طور پر فرمایا۔
③ ممانعت کا تعلق اس تفضیل سے ہے جو نبی مفضول کی تنقیص کا سبب بنے۔
④ ممانعت کا تعلق اس تفضیل سے ہے جو مختلف نبیوں کے ماننے والوں کے درمیان باہمی خصومت وعداوت کا سبب ہو۔
⑤ اس ارشاد میں نفس نبوت کے اعتبار سے فضیلت دینے کی ممانعت مراد ہے کیونکہ نفس نبوت کے اعتبار سے تمام انبیاء برابر ہیں اور فضائل ومناقب میں انبیاء کو ایک دوسروں پر فضیلت حاصل ہے جس کا اعتقاد رکھنا ضروری ہے کیونکہ یہ بات خود قرآن کریم سے ثابت ہے اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی ہے: **تلك الرسل فضلنا بعضهم على بعض**۔ بعض انبیاء کو ہم نے دوسروں پر فضیلت دی۔

واول من ينشق عندالقبر:

آپ ﷺ سب سے پہلے قبر سے اٹھیں گے اور میدان محشر میں بھی سب سے پہلے تشریف لائیں گے۔ امام ترمذیؒ نے حضرت انسؓ سے روایت یوں نقل کی ہے: **انا اول الناس خروجا اذا بعثوا وانا خطيبهم اذا وفدوا وانا مبشرهم اذ ايسوا لواء الحمد يومئذ بيدى ولا فكر**۔

''قیامت کے دن جب لوگوں کو قبروں سے اٹھایا جائے گا تو سب سے پہلے میں اٹھوں گا' جب سب جمع ہو جائیں گے تو میں ان کا ترجمان ہوں گا' جب مایوس ہوں گے میں ان کو خوشخبری سنانے والا ہوں گا' اس دن میرے ہاتھ میں حمد کا جھنڈا ہوگا اور اس دن میں اپنے رب کے ہاں سب سے زیادہ معزز ہوں گا اس میں فخر کی بات نہیں''

ترمذی اور حاکم کی ایک روایت میں ابن عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

① **أنا اول من تنشق عنه الارض ثم ابوبكر ثم عمر ثم آتى اهل البقيع فيحشرون سعى ثم انتظر اهل مكة**۔ کہ قیامت کے دن سب سے پہلے میں اٹھایا جاؤں گا پھر ابوبکرؓ اٹھائے جائیں گے پھر عمرؓ اٹھائے جائیں گے پھر جنت البقیع والوں کو اٹھایا جائے گا وہ میرے ساتھ چلیں گے پھر میں مکہ والوں کا منتظر ہوں گا۔

حضرت ابوہریرہؓ سے ترمذیؒ نے روایت کی ہے:

② **أنا اول من تنشق عنه الارض فأكسى حلة من حلل الجنة ثم اقوم عن يمين العرش ليس احد من الخلائق يقوم ذلك المقام غيرى**۔ قیامت کے دن سب سے پہلے زمین سے مجھے اٹھایا جائے گا اور جنت کا جوڑا پہنایا جائے گا پھر میں عرش کی دائیں جانب ایسے مقام میں کھڑا ہو جاؤں گا جہاں میرے علاوہ کوئی کھڑا نہ ہوگا۔

مشفع: مشفع فاء کی تشدید اور فتحہ کے ساتھ (یعنی اسم مفعول ہے) اس حدیث سے بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات کا افضل المخلوقات اور اکمل الموجودات ہونا ثابت ہو رہا ہے۔

اس روایت کو مسلمؒ کے علاوہ ابوداؤد نے بھی نقل کیا ہے ایک روایت امام ترمذی اور احمدؒ سے بھی ہے ابن ماجہ میں حضرت ابو سعید خدریؓ کی روایت ہے: انا سیّد ولد آدم یوم القیامة ولا فخر۔

وما من بني يومئذ آدم فمن سواه الا تحت لوائي وأنا أول من ينشق عنه الارض ولا وخر وأنا اول شافع اول مشفع ولافخر۔

''میں قیامت کے دن تمام انسانوں کا سردار ہوں گا یہ بات فخر کے لئے نہیں کہہ رہا (بلکہ حقیقت ہے) میرے ہاتھ میں اس دن حمد کا جھنڈا ہوگا اس میں بھی فخر نہیں میں پہلا شفاعت کرنے والا شخص ہوں گا اور میری ہی شفاعت سب سے پہلے قبول ہوگی اس میں فخر کی کوئی بات نہیں۔''

جنت میں سب سے زیادہ تعداد امتِ محمدیہ علی صاحبہا الصلوۃ والسلام کی ہوگی

۵۷۴۲ : وَعَنْ اَنَسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَنَا اَكْثَرُ الْاَنْبِيَاءِ تَبَعًا يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَاَنَا اَوَّلُ مَنْ يَّقْرَعُ بَابَ الْجَنَّةِ ۔ (رواہ مسلم)

اخرجه مسلم ۱۸۸/۱ حدیث رقم ۱۹۶/۳۳۱۔

ترجمہ: ''حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے' فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: قیامت کے دن میرے تبعین سب سے زیادہ ہوں گے اور سب سے پہلے جو شخص جنت کا دروازہ کھٹکھٹائے گا (یعنی دستک دے گا) وہ بھی میں ہی ہوں گا''۔ (مسلم)

تشریح: جنت کا دروازہ آپ کے لئے کھول دیا جائے گا اور اس میں داخل ہو جائیں گے۔

تبعا: تاء اور باء کے فتحہ کے ساتھ' تابع کی جمع ہے بمعنی اتباع یعنی پیروکار مراد ہیں پہلے ایک حدیث میں گزر چکا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی امت تمام اہل جنت کی مجموعی تعداد کا دو تہائی حصہ ہوگی اس سے معلوم ہوا کہ اتباع کی کثرت متبوع شخص کی فضیلت و برتری کا باعث بنتی ہے جیسے قراء کے حلقہ میں امام عاصم کا مرتبہ بلند تر ہے اور فقہاء میں امام ابوحنیفہؒ کو بہت بلند و بالا حصہ نصیب ہوا ہے کیونکہ ائمہ فقہ میں سے ان ہی کا مسلک زیادہ راجح ہے اور مسلمانوں کی اکثریت اسلام کے فروعی احکام میں ان ہی کی پیروکار ہے

یقرع: قرع راء کے فتحہ کے ساتھ (باب فتح یفتح سے)۔

۵۷۴۳ : وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اٰتِي بَابَ الْجَنَّةِ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فَاَسْتَفْتِحُ فَيَقُوْلُ الْخَازِنُ مَنْ اَنْتَ فَاَقُوْلُ مُحَمَّدٌ فَيَقُوْلُ بِكَ اُمِرْتُ اَنْ لَّا اَفْتَحَ لِاَحَدٍ قَبْلَكَ (رواہ مسلم)

کی مثال ایسے ہے جیسے ایک محل ہو جس کی تعمیر بہت عمدہ کی گئی ہو لیکن اس (محل) کی دیوار میں ایک اینٹ کی جگہ خالی چھوڑ دی گئی اور جب لوگ اس محل کے گرد پھر کر عمارت کو دیکھیں تو عمارت کی شان و شوکت اور در و دیوار کے حسن تعمیر کو دیکھ کر تعجب کرتے ہوں' مگر ایک اینٹ کے بقدر اس خالی جگہ کو دیکھ کر کمی سی محسوس کرتے ہوں۔ پس میں اس اینٹ کی جگہ کو بھرنے والا ہوں' میرے ذریعے اس عمارت کی تکمیل ہوگئی اور انبیاء و رسل کے سلسلہ کا اختتام ہوا اور ایک روایت میں یہ الفاظ ہیں کہ "پس میں ہی وہ اینٹ ہوں (جس کی جگہ خالی رکھی گئی تھی) اور میں ہی نبیوں کے سلسلہ کو پایۂ اختتام تک پہنچانے والا ہوں"۔

تشریح: تُرِكَ مِنْهُ مَوْضِعُ لَبِنَةٍ : یہ جملہ مستأنفہ ہے یا حال ہے لفظ قد مقرر مانیں یا نہ مانیں۔ فَطَافَ بِهِ النُّظَّارُ نون کے ضمہ اور طاء معجمہ کی تشدید کے ساتھ' دیکھنے والے۔

"انا" ضمیر فصل ہے تاکید اور حصر کا فائدہ دے رہی ہے۔

ختم بی البنیان : یہ جملہ حالیہ ہے یا استینافیہ ہے اور دین کی عمارت مراد ہے۔

خاتم : خاتم تاء کے کسرہ کے ساتھ ہے اور فتحہ بھی دیا جاتا ہے اس میں آپ ﷺ کے اس قول مبارک کی طرف اشارہ ہے:

بعثت لاتم مکارم الاخلاق۔ میں مکارم اخلاق کو پورا کرنے کے لئے پیدا کیا گیا ہوں۔

امام طیبیؒ کہتے ہیں ماقبل کے تمام انبیاء و رسل ہدایت' علم و دین اور پیغام و احکام اور ان کے مجموعے کو ایک ایسی عمارت کے ساتھ تشبیہ دی جو نہایت شاندار اور مضبوط ہے لیکن اس کی دیوار میں ایک اینٹ کے برابر جگہ خالی چھوڑ دی گئی تھی جس کو ہمارے نبی ﷺ نے آکر پُر فرما دیا۔ یہ اس صورت میں ہے کہ: **الا موضع تلك البينة** کو مستثنیٰ منقطع بنائیں مستثنیٰ۔ متصل بھی ہو سکتا ہے کیونکہ حاصل معنی یہ ہے کہ ان کو ساری جگہیں اچھی لگتی ہیں سوائے اس اینٹ کی جگہ کے اور وہ مصلح اس محبت اور حق کے حقیقت کی معانی کے سوا کچھ بھی نہیں جن کے ساتھ انہیں خاص کیا گیا ہے اور اہل معرفت اس کا اہتمام کرتے ہیں اور اس کی تائید ایک دوسری روایت میں ان الفاظ سے ہوتی ہے: **فأنا اللبنة۔**

۵۷۴۶ : وَعَنْهُ قَالَ : قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَا مِنَ الْاَنْبِيَآءِ مِنْ نَبِيٍّ اِلَّا قَدْ اُعْطِيَ مِنَ الْاٰيَاتِ مَا مِثْلُهٗ اٰمَنَ عَلَيْهِ الْبَشَرُ وَاِنَّمَا كَانَ الَّذِىْ اُوْتِيْتُ وَحْيًا اَوْحَى اللّٰهُ اِلَيَّ فَاَرْجُوْ اَنْ اَكُوْنَ اَكْثَرَهُمْ تَابِعًا يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ۔ (متفق عليه)

اخرجه البخاری فی صحيحه ۳/۹ حديث رقم ٤٩٨١ اخرجه مسلم فی صحيحه ١٣٤/١ حديث رقم (۲۳۹۔۱۵۲) واحمد فی المسند ٣٤١/٢۔

ترجمہ: "حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے' فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: انبیاء میں سے ہر ایک نبی کو اسی قدر معجزات عطا ہوئے جس قدر انسان اس پر ایمان لائے اور جو معجزہ مجھ کو ملا وہ خدا کی وحی ہے جو اس نے (صرف اور صرف) میری طرف بھیجی (اور خوارق عادت کی بنا پر) اس کی بناء پر مجھے یقین ہے کہ قیامت کے دن میرے متبعین کی تعداد سب پیغمبروں کے متبعین سے زیادہ ہوگی"۔ (بخاری و مسلم)

کی مثال ایسے ہے جیسے ایک محل ہو جس کی تعمیر بہت عمدہ کی گئی ہو لیکن اس (محل) کی دیوار میں ایک اینٹ کی جگہ خالی چھوڑ دی گئی اور جب لوگ اس محل کے گرد پھر کر عمارت کو دیکھیں تو عمارت کی شان وشوکت اور در و دیوار کے حسن تعمیر کو دیکھ کر تعجب کرتے ہوں' مگر ایک اینٹ کے بقدر اس خالی جگہ کو دیکھ کر کمی سی محسوس کرتے ہوں۔ پس میں اس اینٹ کی جگہ کو بھرنے والا ہوں' میرے ذریعے اس عمارت کی تکمیل ہوگئی اور انبیاء ورسل کے سلسلہ کا اختتام ہوا اور ایک روایت میں یہ الفاظ ہیں کہ ''پس میں ہی وہ اینٹ ہوں (جس کی جگہ خالی رکھی گئی تھی) اور میں ہی نبیوں کے سلسلہ کو پایۂ اختتام تک پہنچانے والا ہوں''۔

تشریح: تُرِكَ مِنْهُ مَوْضِعُ لَبِنَةٍ : یہ جملہ مستأنفہ ہے یا حال ہے لفظ قد مقدر مانیں یا نہ مانیں۔ فَطَافَ بِهِ النُّظَّارُ نون کے ضمہ اور طاء معجمہ کی تشدید کے ساتھ' دیکھنے والے۔

"انا" ضمیر فصل ہے تاکید اور حصر کا فائدہ دے رہی ہے۔

ختم بی البنیان : یہ جملہ حالیہ ہے یا استینافیہ ہے اور دین کی عمارت مراد ہے۔

خاتم : خاتم تاء کے کسرہ کے ساتھ ہے اور فتحہ بھی دیا جاتا ہے اس میں آپ ﷺ کے اس قول مبارک کی طرف اشارہ ہے: **بعثت لاتم مکارم الاخلاق۔** میں مکارم اخلاق کو پورا کرنے کے لئے پیدا کیا گیا ہوں۔

امام طیبیؒ کہتے ہیں ماقبل کے تمام انبیاء ورسل ہدایت' علم ودین اور پیغام واحکام اور ان کے مجموعے کو ایک ایسی عمارت کے ساتھ تشبیہ دی جو نہایت شاندار اور مضبوط ہے لیکن اس کی دیوار میں ایک اینٹ کے برابر جگہ خالی چوڑ دی گئی تھی جس کو ہمارے نبی ﷺ نے آکر پُر فرمادیا۔ یہ اس صورت میں ہے کہ: **الا موضع تلك البينة** کو مستثنیٰ منقطع بنائیں مستثنیٰ۔ متصل بھی ہوسکتا ہے کیونکہ حاصل معنی یہ ہے کہ ان کو ساری جگہیں اچھی لگتی ہیں سوائے اس اینٹ کی جگہ کے اور وہ مصلح اس محبت اور حق کے حقیقت کی معانی کے سوا کچھ بھی نہیں جن کے ساتھ انہیں خاص کیا گیا ہے اور اہل معرفت اس کا اہتمام کرتے ہیں اور اس کی تائید ایک دوسری روایت میں ان الفاظ سے ہوتی ہے: **فأنا اللبنة۔**

۵۷۴۶ : وَعَنْهُ قَالَ :قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَا مِنَ الْاَنْبِيَآءِ مِنْ نَبِيٍّ اِلَّا قَدْ اُعْطِيَ مِنَ الْاٰيَاتِ مَا مِثْلُهٗ اٰمَنَ عَلَيْهِ الْبَشَرُ وَاِنَّمَا كَانَ الَّذِيْ اُوْتِيْتُ وَحْيًا اَوْحَى اللّٰهُ اِلَيَّ فَاَرْجُوْ اَنْ اَكُوْنَ اَكْثَرَهُمْ تَابِعًا يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ۔ (متفق علیه)

اخرجه البخاری فی صحیحه ۳/۹حدیث رقم ٤٩٨١اخرجه مسلم فی صحیحه ١٣٤/١حدیث رقم (۲۳۹۔۱۵۲) واحمد فی المسند ۳٤١/٢۔

ترجمہ: ''حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے' فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: انبیاء میں سے ہر ایک نبی کو اسی قدر معجزات عطا ہوئے جس قدر انسان اس پر ایمان لائے اور جو معجزہ مجھ کو ملا وہ خدا کی وحی ہے جو اس نے (صرف اور صرف) میری طرف بھیجی (اور خوارق عادت کی بنا پر) اس کی بناء پر مجھے یقین ہے کہ قیامت کے دن میرے متبعین کی تعداد سب پیغمبروں کے متبعین سے زیادہ ہوگی''۔ (بخاری ومسلم)

تشریح: قوله :ما من الانبياء من بني...... آمن عليه البشر۔

پہلا من تبعیضیہ ہے اور دوسرا من مبالغہ کے لئے لایا گیا ہے۔ای لیس نبی من الانبیاء ۔مطلب یہ ہے کہ انبیاء میں سے کوئی نبی ایسا نہیں گزرا اور جامع میں لفظ قد سے پہلے واؤ ہے "آیات" سے معجزات وخوارق عادت اشیاء مراد ہیں اور "من" بیان اور ما مثله آمن عليه البشر بیان کے لئے ہے۔

ترکیب: ماء موصولہ ہے اور "مثله" مبتدا اور "آمن" اس کی خبر ہے "علیه" جار مجرور آمن کے متعلق ہے کیونکہ آمن اطلاع کے معنی کو متضمن ہے۔گویا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یوں فرمایا: آمن للاطلاع عليه البشر (ہر نبی کو معجزات میں سے صرف اتنا دیا گیا جس پر انسان ایمان لا سکے۔)

علیہ متعلق ہے حال محذوف کے آمن البشر واقفا او مطلعا علیہ بنے گی اور "آمن" کا مفعول محذوف ہے۔معنی یہ بنے گا ہر نبی کو اتنے ہی معجزات دیئے گئے ہیں جس کو اپنے دعوی کی دلیل کے طور پر پیش کر سکے۔اور وہ اس نبی کے زمانے تک مخصوص ہوتا تھا اور باقی رہا نبی کے دنیا سے رخصت ہونے کے ساتھ اس کا معجزہ بھی ختم ہو گیا یہ ہمارے بعض شارحین کا قول ہے جیسا کہ طیبیؒ کہتے ہیں۔

(من الانبياء من نبی) میں پہلا "من" بیانیہ ہے اور دوسرا "من" زائدہ نفی کے بعد لایا گیا ہے۔

ما مثله میں ما موصولہ ہے "اعطی" کا مفعول ثانی واقع ہو رہا ہے۔

مثلہ مبتداء اور آمن اس کی خبر ہے پھر یہ پورا جملہ موصول کا صلہ ہے اور موصول کی طرف ضمیر عائد علیہ کی ضمیر مجرور ہے۔

علیہ حال محذوف کے متعلق ہے۔ای مغلوبا علیه فی التحدی والمباراۃ اور آیات سے معجزات مراد ہیں یہاں "مثل" اسی طرح ہے جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد: فاتوا بسورة من مثله میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کفار کو فصاحت و بلاغت اور حسن عبارت کے ساتھ مثال پیش کرنے کا حکم فرمایا یعنی کہ اللہ تعالیٰ نے ہر نبی کو کچھ ایسے معجزات دیئے جن کو وہ اپنے دعویٰ (یعنی نبوت) کی دلیل کے طور پر پیش کر سکے اور دیکھنے والے ایمان لانے پر مجبور ہو جائیں اور ہر نبی کا معجزہ اپنے زمانے کے ساتھ خاص رہا جب نبی کا زمانہ ختم ہو گیا تو وہ معجزہ بھی ختم ہو گیا۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانے میں مثلاً جادو کا بڑا زور تھا اللہ تعالیٰ نے آپ علیہ السلام کو عصا اور ید بیضا کا معجزہ دیا ان دونوں معجزوں نے تمام جادوگروں کا چراغ گل کر دیا اور حضرت موسیٰ علیہ السلام پر ایمان لانے پر مجبور کر دیا حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے زمانے میں طب کا بڑا زور تھا حضرت عیسیٰ علیہ السلام طب سے بھی اعلیٰ چیز لے کے آئے۔آپ علیہ السلام مردوں کو زندہ کر دیتے تھے کوڑھی کو تندرست اور نابینا کو بینا بنا دیتے تھے اور ہمارے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں فصاحت و بلاغت کا زور تھا چنانچہ قرآن آیا اور سب کو باطل کر دیا۔

طیبیؒ کے قول "اور سب کو باطل کر دیا" میں تامل ہے۔ٹھیک بات یہ ہے یوں کہا جائے کہ قرآن مشہور معجزہ بن کر آیا جو انقراض زمان بلکہ ابد الاباد تک رہے گا۔کیونکہ اس کو جنتوں میں بھی پڑھا جائے گا اور باری تعالیٰ سے بھی سنا جائے گا۔ انما كان الذی اوتيت کا یہی معنی ہے۔

قوله :وانما كان الذى ......

جامع میں ہے "الذی اوتیته" موصول محذوف کی صفت ہے۔ای کان خرق العادة الذی اعطیته بالخصوص (یعنی وہ مخصوص معجزہ جو مجھے دیا گیا ہے)۔

"وحی" اللہ تعالیٰ کا منزل کلام ہے جو روح الامین کے ذریعہ اتارا گیا۔"وحی" سے مراد قرآن کریم ہے جو بذات خود ایک دعوت ہے اور الفاظ کے اعتبار سے معجزہ جو آنحضرت ﷺ کی وفات سے ختم نہیں ہوا ہمیشہ کے لئے باقی ہے۔بخلاف دیگر انبیاء کے معجزات کے کہ وہ نبی کی وفات کے ساتھ ختم ہو گئے۔

قاضی عیاضؒ فرماتے ہیں دیگر معجزات کے علاوہ جو سب سے بڑا معجزہ مجھے دیا گیا ہے وہ قرآن ہے۔یہاں وحی سے مراد یہی قرآن ہے جو الفاظ اور معنی کے اعتبار سے فصاحت و بلاغت کے اعلیٰ درجہ پر ہے جس کا فائدہ اور منفعت دوسرے سارے معجزات سے زیادہ ہے کیونکہ قرآن کریم دعوات و دلائل پر مشتمل ہے اور مرور زمان کے باوجود مستمر رہے گا۔قیامت تک قرآن کریم سے ہر زمانے اور ہر طبقے کے لوگ متنفع ہوتے رہیں گے اسی لئے آنحضرت ﷺ نے "فارجو ان أكون اكثرهم تابعا يوم القيامه" کے یقین کا اظہار فرمایا اور اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کی اُمید کو پورا بھی فرما دیا جیسے کہ پہلے گزرا۔واللہ تعالیٰ اعلم

تخریج: اس حدیث کو امام احمد رحمہ اللہ نے بھی روایت کیا ہے۔

آنحضرت ﷺ کے پانچ خصائص کا بیان

۵۷۴۷ : وَعَنْ جَابِرٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اُعْطِيْتُ خَمْسًا لَمْ يُعْطَهُنَّ اَحَدٌ قَبْلِىْ نُصِرْتُ بِالرُّعْبِ مَسِيْرَةَ شَهْرٍ وَجُعِلَتْ لِيَ الْاَرْضُ مَسْجِدًا وَطَهُوْرًا فَاَيُّمَا رَجُلٍ مِّنْ اُمَّتِيْ اَدْرَكَتْهُ الصَّلٰوةُ فَلْيُصَلِّ وَاُحِلَّتْ لِيَ الْمَغَانِمُ وَلَمْ تَحِلَّ لِاَحَدٍ قَبْلِيْ وَاُعْطِيْتُ الشَّفَاعَةَ وَكَانَ النَّبِيُّ يُبْعَثُ اِلٰى قَوْمِهٖ خَاصَّةً وَبُعِثْتُ اِلَى النَّاسِ عَامَّةً ۔ (متفق عليه)

اخرجه البخاری ۴۳۵/۱ حديث رقم ۳۳۵ ومسلم ۳۷۰/۱ حديث رقم (۵۲۱/۳) والنسائی فی السنن ۲۰۹/۱ حديث رقم ۴۳۲ ۔(۱۱) احمد فی المسند ۹۸/۱۔

ترجمہ: "حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے' فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:" مجھے پانچ چیزیں ایسی عطا کی گئی ہیں جو مجھ سے پہلے کسی کو عطا نہیں ہوئیں' (ایک تو) مجھے اس رعب کے ذریعے نصرت ملی ہے جو ایک مہینے کی مسافت کی دوری پر اثر انداز ہوتا ہے (دوسرے) ساری زمین کو میرے لئے مسجد اور "پاک کرنے والی" قرار دیا گیا' چنانچہ میری امت کا ہر (وہ) شخص جس کو نماز پالے' نماز پڑھ لے' (تیسرے) میرے لئے مال غنیمت حلال کر دیا گیا' مجھ سے پہلے کسی کے لئے حلال نہیں تھا' (چوتھے) مجھ کو شفاعت عظمیٰ عامہ عطا کی گئی اور (پانچویں) مجھ سے پہلے نبی صرف اپنی قوم کی طرف ہی مبعوث ہوتے تھے جب کہ میں روئے زمین کے تمام لوگوں کی طرف مبعوث ہوا ہوں"۔(بخاری و مسلم)

تشریح: بالرعب: راء کے ضمہ اور عین کے سکون کے ساتھ اور دونوں کے ضمہ کے ساتھ۔شرح الطیبی میں ہے کہ

''الرعب'' کا معنی فزع اور خوف ہے اللہ تعالیٰ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے دشمنوں کے دل میں ڈال دیا تھا ایک مہینہ کی مسافت پر بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا سن کر خوفزدہ ہو جاتے تھے۔ **وجعلت الارض مسجدا و طهورا۔**

اہل کتاب کو اپنے مخصوص مقامات کے علاوہ کہیں نماز پڑھنے کی اجازت نہیں تھی۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے اس امت کی آسانی اور سہولت کے لئے بیت الخلاء غسل خانہ اور مقبرہ کے علاوہ پوری روئے زمین پر جس جگہ چاہے نماز پڑھنے کی اجازت دیدی۔ طهورا سے تیمم مراد ہے۔ اس کی تفصیل ہم ماقبل میں بیان کر چکے ہیں۔ بعض اس حصہ کا مطلب یوں بیان کرتے ہیں۔ اہل کتاب کو اس وقت تک کہیں نماز پڑھنے کی اجازت نہیں تھی جب تک اس خاص جگہ کی پاکی کا یقین نہ ہوتا اور ہمارے لئے جب تک ناپاکی کا یقین نہ ہو پوری روئے زمین پر نماز پڑھنے کی اجازت ہے۔ اگلے جملہ میں اس حکم کا عموم صراحت کے ساتھ بیان فرمایا ہے اور ما قابل کلام پر تفریع کی ہے۔

واحلت لی المغانم ولم تحل لاحد قبلی۔ کفار سے حاصل ہونے والے مال کی غنیمت کہا جاتا ہے۔

لم تحل معروف ہے ایک نسخے میں صیغہ مجہول کے ساتھ ہے۔ یعنی کسی نبی کے لیے حلال نہ تھی۔ وہ لوگ مال غنیمت جمع کر کے ایک جگہ رکھ دیتے تھے آگ آ کر اس کو جلا دیتی تھی یہ بعض شارحین کا قول ہے۔

ابن ملک کہتے ہیں ماقبل کے لوگ میں اگر حیوانات مال غنیمت میں پاتے تو وہ غانمین کی مالک ہوتے تھے۔ نبی کی ملک نہیں ہوتے تھے۔ پس یہ خصوصیت ہے کہ ہمارے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو خمس اور صفی لینا جائز کر دیا۔ اگر چوپاؤں کے علاوہ کوئی چیز مال غنیمت کے طور پر پاتے تو اس کو ایک جگہ جمع کر دیتے تھے آگ اس کو آ کر جلا دیتی تھی۔

میں (ملا علی قاری) کہتا ہوں اس زمانے میں مال غنیمت جلانے میں شاید حکمت یہ تھی کہ ان لوگوں کی نیت درست رہے اور جہاد میں مرتبہ اخلاص باقی رہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو زیادہ جانتا ہے اور اپنے بندوں پر بہت مہربان ہے۔ **قوله: واعطيت الشفاعة۔**

الشفاعه پر الف لام عہدی ہے عمومی شفاعت ہے جو آلام محشر سے خلاصی کے لئے ہوگی جسے مقام محمود کا نام دیا گیا ہے یہ وہ مقام ہے جس کی بابت اولین و آخرین آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر رشک کریں گے۔

قوله و كان النبی يبعث خاصة ......

کے شروع میں لام استغراق کے لئے ہے۔ ای **و كان كل نبی من قبلی۔** امام طیبیؒ کہتے ہیں کہ ''النبی'' پر لام استغراق جنس کے لئے ہے اور مفرد پر الف لام داخل کرنے سے زیادہ عموم پیدا ہوتا ہے بنسبت جمع کے جیسا کہ علم معانی والے کہتے ہیں **استغراق المفرد أشمل من استغراق الجمع۔**

بعض کا کہنا ہے کہ: ''النبی'' پر ال نحویوں کے ہاں ''جنسی'' ہے اور اصولیوں ہاں ''عہدی'' ہے جو تعیین ذات کے لئے نہیں بلکہ اس ماہیت کو بیان کرنے کے لئے آیا ہے جس کا تعلق عقل سے ہے اور وہ ماہیت یہی نبوت ہے۔

حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے مروی امام احمد رحمۃ اللہ علیہ کی ایک روایت میں ہے:

اعطيت مالم يعطه احد من الانبياء قبلی نصرت بالرعب واعطيت مفاتيح الارض وسميت أحمد و

جعل لتراب طھوراً و جعلت امتی خیر الامم۔ مجھے وہ کچھ عطا کیا گیا جو مجھ سے پہلے کسی نبی کو عطا نہیں ہوا' مجھے رعب کے ذریعہ نصرت عطا ہوئی' زمین کے خزانوں کی چابیاں عطا ہوئیں' میرا احمد نام رکھا گیا اور میرے لئے مٹی کو پاکیزہ بنایا گیا اور میری امت کو خیر الامم بنایا گیا۔

حارث اور ابن مردویہ نے حضرت انسؓ سے روایت کیا ہے:

اعطیت حلال خلاص اعطیت صلاۃ فی الاخوف واعطیت السلام وھو تحیۃ اھل الجنۃ۔ واعطیت آمین ولم یعطھا احد ممن کان قبلکم ان یکون اللہ اعطاھا ھارون' فان موسٰی کان یدعو و یؤمن ھارون۔

"مجھے تین خصلتیں عطا کی گئیں: ① صفوں کے ساتھ نماز پڑھنا' ② اور سلام جو جنت والوں کا سلام ہے اور ③ مجھے لفظ آمین دیا گیا جو مجھ سے قبل سوائے ہارون علیہ السلام کے کسی کو نہیں دیا گیا حضرت موسیٰ علیہ السلام دعا مانگتے تو حضرت ہارون علیہ السلام آمین کہتے تھے۔"

۵۷۴۸ : وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ فُضِّلْتُ عَلَى الْاَ نْبِيَآءِ بِسِتٍّ اُعْطِيْتُ جَوَامِعَ الْكَلِمِ وَنُصِرْتُ بِا لرُّعْبِ وَاُحِلَّتْ لِيَ الْغَنَا ئِمُ وَجُعِلَتْ لِيَ الْاَ رْضُ مَسْجِدًا وَّطَهُوْرًا وَّاُرْسِلْتُ اِلَى الْخَلْقِ كَآفَّةً وَّخُتِمَ بِيَ النَّبِيُّوْنَ ۔ (رواہ مسلم)

اخرجہ مسلم فی صحیحہ ۱/ ۳۷۱ حدیث رقم (۵۔۵۲۳) واحمد فی المسند ۲/ ۴۱۲

ترجمہ: "حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے' فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: "مجھے چھ چیزوں کے ذریعہ دیگر انبیاء پر فوقیت و برتری دی گئی ہے: ① مجھے جوامع الکلم دیئے گئے ہیں۔ ② دشمنوں کے دل میں میرا رعب ڈالنے کے ذریعہ میری مدد کی گئی ہے۔ ③ مال غنیمت میرے لئے حلال کر دیا گیا ہے۔ ④ ساری زمین کو میرے لئے مسجد اور پاک کرنے والی بنا دیا گیا ہے۔ ⑤ ساری مخلوق کے لئے مجھے نبی بنا کر بھیجا گیا۔ ⑥ اور انبیاء کا سلسلہ مجھ پر ختم کیا گیا"۔ (مسلم)

تشریح: تورپشتی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں حضرت جابرؓ کی حدیث میں پانچ کا ذکر ہے اس اختلاف میں کوئی تضاد کی بات نہیں' یہ اختلاف زمان ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو پہلے پانچ انعامات دیئے گئے ہوں آپ نے اس کو بیان فرمایا پھر چھٹا انعام ملا تو اس کو ملا کے چھ بیان کر دیئے۔

ابن مالک کہتے ہیں اگر کوئی یہ اعتراض کرے کہ یہ دعویٰ تو تب تام ہوگا جب اس کی کوئی دلیل ہو۔

اگر ثابت ہو جائے پھر تو کوئی کلام نہیں' ورنہ یہ کہا جائے گا پانچ کے ساتھ چھٹے کو بطور خبر کے ذکر کیا ہے جو مستقبل میں ملنا یقینی تھا اس کی وجہ سے ماضی سے تعبیر کیا۔

صاحب خلاصہ کہتے ہیں ممکن ہے کہ پانچ اور چھ کا اختلاف مقام کی مناسبت کی وجہ سے ہو اس صورت میں اگر شفاعت کو ان چھ کے ساتھ ملائیں تو سات ہو جائیں گے میں کہتا ہوں اور یہ بھی ممکن ہے کہ سات سے بھی زیادہ ہوں جیسا کہ عنقریب آ رہا

ہے اور ماقبل میں بھی گزر چکا ہے' واللہ تعالیٰ اعلم۔

قولہ :اعطیت جوامع الکلم۔

مطلب یہ ہے کہ مجھے الفاظ کے اختصار کی قوت دی گئی ہے چنانچہ میں بہت کم الفاظ میں کثیر معانی کا اظہار کرتا ہوں۔

میں نے ایسی حدیثیں جمع کی ہیں جو دو کلمات پر مشتمل ہیں اور جملہ کا کم از کم دو کلمات پر مشتمل ہونا بہرحال ضروری ہے۔ اس سے کم کی صورت میں اثر کسی کلام میں ممکن نہیں۔ جیسے آپ ﷺ کا ارشاد ہے: العدۃ دین' المستشار مؤتمن' لاتغضب اور اسی طرح کی اور کئی مثالیں ہیں۔ ابویعلی نے اپنی مسند میں حضرت عمرؓ سے روایت کیا ہے: مجھے جوامع الکلم عطا ہوئے ہیں اور کلام کو میرے لئے نہایت مختصر کر دیا گیا ہے۔

شرح السنۃ میں کہا گیا ہے جوامع الکلم سے قرآن کریم مراد ہے۔ اللہ تعالیٰ نے محض اپنے لطف و کرم سے الفاظ میں بے شمار احکام و معانی کو جمع فرمایا ہے۔

بعض کہتے ہیں کہ کلام کا اختصار معنی کو زیادہ کرنے کا سبب ہوتا ہے۔ ایک قلیل الحروف کلمہ معانی کثیر اور انواع کلام کو شامل ہوتا ہے۔

قولہ :ونصرت بالرعب یہاں مطلقاً ہے جبکہ ماقبل روایت میں ایک مہینے کی مسافت کا ذکر تھا۔

قولہ واحلت لی: یعنی میری وجہ سے میری امت کے لئے حلال ہوئی۔

قولہ :وارسلت الی الخلق کافۃ : جن وانس حیوانات و جمادات ساری مخلوق کے لئے رسول بنا کر بھیجا گیا جس کا تفصیلی ذکر میں اپنی کتاب الصلوٰۃ العلیہ علی صلوٰت الحمدیہ میں کر دیا ہے۔

طیبیؒ کہتے ہیں کافۃ کو مفعول مطلق رسالۃ کی صفت بنا کر مفعول بنا سکتے ہیں۔ ای ارسلت رسالۃ عامۃ لھم محیطاً بھم۔ میں ایسی عمومی رسالت کے ساتھ مبعوث ہوں جو تمام کائنات کو محیط ہے یا حال واقع ہے حال کی صورت میں دو احتمال ہیں۔

① اگر فاعل سے حال بنائیں تو آخر کی تاء مبالغہ کے لئے ہوگی روایۃ اور علامۃ کی تاء کی طرح۔

② الخلق سے حال ہے یعنی الخلق مجموعین (ساری مخلوق کے لئے) **قولہ :وختم بی النبیون۔** یعنی انبیاء کا وجود ہی ختم کر دیا ہے میرے بعد کوئی نبی نہیں پیدا ہوگا اور نزول عیسیٰ باعث اشکال نہیں کیونکہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا نزول دین محمدی ہی کی ترویج کے لئے ہوگا۔

طیبیؒ فرماتے ہیں آپ ﷺ کے بعد وحی کا دروازہ بند کر دیا رسالت کا سلسلہ منقطع ہو گیا اور تمام دلائل اور احکام کے مکمل ہونے کے بعد لوگوں کو انبیاء اور ان کی دعوت سے بے نیاز کر دیا گیا' کیونکہ خدا کا دین مکمل ہو گیا۔ جیسا کہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿الیوم اکملت لکم دینکم﴾۔

البتہ الہام کا دروازہ اب بھی کھلا ہے کیونکہ الہام خدائی نصرت ہے جس کے ذریعہ کاملین کی مدد کرتا ہے دائمی ضرورت ہونے کی وجہ سے اس کو ختم نہیں فرمایا انسان وعظ و نصیحت' اور اسباب نجات کا محتاج ہے کیونکہ انسان وساوس اور شہوات میں گرا

رہتا ہے اس مشکل وقت میں تزکیہ اور تنبیہ کا سلسلہ ازبس ضروری ہے اس لئے جہاں اللہ تعالیٰ نے وحی کا دروازہ خاص حکمت کی وجہ سے بند فرمایا ہے وہاں اپنے لطف وکرم سے بندوں کے لئے الہام اور کشف وغیرہ کا دروازہ کھلا رکھا۔

تخریج: امام ترمذی نے بھی اسی طرح روایت کیا ہے۔

حضرت سائب ابن زید سے مروی طبرانی کی ایک روایت میں ہے: پانچ خصلتوں کے ساتھ مجھے دوسرے انبیاء پر فضیلت دی گئی ہے۔ ① میں تمام مخلوق کے لئے نبی بنا کر بھیجا گیا' ② میری امت کے لئے میری شفاعت محفوظ رکھی گئی' ③ میرے آگے پیچھے ایک ماہ کی مسافت کے برابر رعب کے ذریعہ میری نصرت کی گئی' ④ ساری زمین کو میرے لئے مسجد اور پاک کرنے والی قرار دیا گیا' ⑤ مال غنیمت کو میرے لئے حلال کر دیا گیا جبکہ مجھ سے پہلے کسی نبی کے لئے حلال نہ تھا)۔

حضرت امامہؓ سے مروی بیہقی رحمہ اللہ کی ایک روایت میں ہے:

"مجھے چار خصلتوں کے ساتھ فضیلت دی گئی: ① میرے لئے ساری زمین کو مسجد اور پاک کرنے والی بنایا گیا' ② میں ساری مخلوق کے لئے نبی بنا کر بھیجا گیا' ③ مجھ کو اس رعب کے ذریعہ نصرت عطا ہوئی جو سامنے کی جانب دو مہینوں کی مسافت کی دوری پر اثر انداز ہوتا ہے' ④ میرے لئے مال غنیمت کو حلال قرار دیا گیا۔

طبرانی میں حضرت ابوالدرداءؓ کی ایک روایت ہے:

مجھے چار خصلتوں کے ساتھ فضیلت عطا ہوئی: ① میں اور میری امت نماز میں فرشتوں کی طرح صف بناتے ہیں' ② پاک مٹی کو میرے لئے پاکی حاصل کرنے کا ذریعہ بنایا (یعنی تیمّم کیلئے پاک مٹی کو استعمال کرنے کی اجازت عطا ہوئی)' ③ اور زمین کو میرے لئے مسجد اور پاک کرنے والی قرار دیا گیا' ④ مال غنیمت کو میرے لئے حلال قرار دیا گیا۔ بعض احادیث مبارکہ کے براہ راست الفاظ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے آپ ﷺ کو چند مخصوص خصلتیں عطا ہوئیں لیکن ان (احادیث) کا مفہوم (یعنی مفہوم مخالف) آپ ﷺ نے فضائل کے حصر پر دلالت نہیں کرتا کیونکہ آپ ﷺ کے فضائل غیر منحصر ہیں۔

آنحضرت ﷺ کے لئے خزانوں کی کنجیاں

۵۷۴۹ : وَعَنْهُ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ بُعِثْتُ بِجَوَامِعِ الْكَلِمِ وَنُصِرْتُ بِالرُّعْبِ وَبَيْنَا اَنَا نَائِمٌ رَاَيْتُنِيْ اُتِيْتُ بِمَفَاتِيْحِ خَزَائِنِ الْاَرْضِ فَوُضِعَتْ فِيْ يَدِيْ (متفق عليه)

اخرجه البخاری ۱۲۸/۶ حديث رقم ۲۹۷۷ واخرجه مسلم فی صحيحه ۳۷۱/۱ حديث رقم (۶-۵۲۲) والنسائی فی السنن ۳/۶ حديث رقم ۳۰۸۷ واحمد فی المسند ۲۶۴/۲۔

ترجمہ: "حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: مجھے جوامع الکلم کے ساتھ مبعوث کیا گیا ہے' رعب کے ذریعہ مجھ کو نصرت عطا فرمائی گئی ہے اور میں سویا ہوا تھا' میں نے خواب میں دیکھا کہ زمین کے خزانوں کی کنجیاں مجھے دینے کے لئے لائی گئیں اور میرے ہاتھ میں رکھ دی گئیں"۔ (بخاری ومسلم)

تشریح: الخ ۔۔۔ آنحضرت ﷺ کی مراد یہ تھی کہ اللہ تعالیٰ ان کو اور ان کی امت کو کئی علاقوں کی فتح نصیب

کریں گے اور طرح طرح خزانے حاصل ہوں گے۔ یا خزائن الارض سے مراد زمینی معدنیات جیسے سونا چاندی وغیرہ ہیں۔

اُمتِ محمدیہ صلی اللہ علیہ وسلم پر خصوصی عنایاتِ ربّانی

۵۷۵۰: وَعَنْ ثَوْبَانَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ اللّٰهَ زَوٰى لِيَ الْاَرْضَ فَرَاَيْتُ مَشَارِقَهَا وَمَغَارِبَهَا وَاِنَّ اُمَّتِيْ سَيَبْلُغُ مُلْكُهَا مَا زُوِيَ لِيْ مِنْهَا وَاُعْطِيْتُ الْكَنْزَيْنِ الْاَحْمَرَ وَالْاَبْيَضَ وَاِنِّيْ سَاَلْتُ رَبِّيْ لِاُمَّتِيْ اَنْ لَّا يُهْلِكَهَا بِسَنَةٍ عَامَّةٍ لَا يُسَلِّطَ عَلَيْهِمْ عَدُوًّا مِنْ سِوٰى اَنْفُسِهِمْ فَيَسْتَبِيْحَ بَيْضَتَهُمْ وَاِنَّ رَبِّيْ قَالَ يَا مُحَمَّدُ اِنِّيْ قَضَيْتُ قَضَاءً فَاِنَّهٗ لَا يُرَدُّ وَاِنِّيْ اَعْطَيْتُكَ لِاُمَّتِكَ اَنْ لَّا اُهْلِكَهُمْ بِسَنَةٍ عَامَّةٍ وَاَنْ لَّا اُسَلِّطَ عَلَيْهِمْ عَدُوًّا مِنْ سِوٰى اَنْفُسِهِمْ فَيَسْتَبِيْحَ بَيْضَتَهُمْ وَلَوِاجْتَمَعَ عَلَيْهِمْ مَنْ بِاَقْطَارِهَا حَتّٰى يَكُوْنَ بَعْضُهُمْ يُهْلِكُ بَعْضًا وَيَسْبِيْ بَعْضُهُمْ بَعْضًا (رواه مسلم)

اخرجه مسلم ۲۲۱۵/٤حديث رقم (۱۹۔۲۸۸۹) وابو داؤد ٤/٥٠٤حديث رقم۴۲۵۲ والترمذی ٤/١٠٤ حديث رقم حديث رقم ٢١٧٦ وابن ماجه ١٣٠٤/٢ حديث رقم ٣٩٥٢ واحمد فی المسند ٢٧٨/٥۔

ترجمہ: (آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے غلام) "حضرت ثوبان رضی اللہ عنہ سے مروی ہے' فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: "اللہ تعالیٰ نے میرے لئے روئے زمین کو سمیٹا۔ چنانچہ میں نے زمین کے مشرق و مغرب دیکھ لئے (یعنی روئے زمین مجھے دکھائی) اور بلاشبہ میری امت عنقریب روئے زمین کے ان تمام علاقوں کی بادشاہت سے سرفراز ہوگی جو سمیٹ کر مجھ کو دکھائے گئے ہیں' اور سرخ اور سفید دو خزانے عطا کئے گئے ہیں۔ نیز میں نے اپنے ربّ سے سوال کیا تھا کہ میری امت کو عام قحط سے ہلاک نہ کرے اور یہ کہ میری امت پر مسلمانوں کے علاوہ کسی (غیر مسلم) دشمن کو مسلط نہ کرے جو ان کی اجتماعیت اور مرکزیت کو تباہ کر دے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اے محمد! جب میں کسی بات کا فیصلہ کر لیتا ہوں تو وہ بدلا نہیں جاتا' پس میں تمہاری امت کے حق میں تمہیں اپنا یہ عہد و فیصلہ دیتا ہوں کہ مسلمانوں کو نہ تو عام قحط میں ہلاک کروں گا اور نہ خود ان کے علاوہ کوئی اور دشمن ان پر مسلط کروں گا جو ان کی مرکزیت کو تباہ کر دے اگرچہ ان (مسلمانوں) پر تمام روئے زمین کے غیر مسلم دشمن جمع ہو کر حملہ آور ہوں البتہ یہ خود ہی آپس میں ایک دوسرے کو قتل کریں گے اور ایک دوسرے کو قید کریں گے"۔ (مسلم)

تشریح: تورپشتی رحمہ اللہ کہتے ہیں: زویت الشیء کا معنی جمع کرنا اور قبضہ کرنا ہے مراد یہ ہے دور کے علاقوں کو اتنا قریب کر دیا کہ سب کو اپنے سامنے دیکھا اور پوری زمین کو سمیٹ کر ایک ہتھیلی کے برابر کر دیا۔

امام خطابی فرماتے ہیں کہ بعض نے "منہا" میں "من" کو تبعیضیہ کہا ہے لیکن ان کو وہم ہوا ہے من تبعیضیہ نہیں بلکہ ماقبل جملے کی تفصیل کے لئے ہے اور مطلب یہ ہے کہ پوری زمین کو ایک ہی مرتبہ میرے لئے سمیٹا گیا چنانچہ میں نے اس کے مشرق و

مغرب کو دیکھا پھر اس زمین کو میری امت کے لئے تھوڑا تھوڑا کر کے کھولا جا تا رہے گا حتیٰ کہ میری امت کی بادشاہت اس کے ہر حصے میں پہنچے گی۔

میں کہتا ہوں جن لوگوں نے "من" کو تبعیضیہ کہا ہے شاید اس لئے کہا ہے کیونکہ اب تک مسلمانوں کی بادشاہت پوری روئے زمین کو نہیں پہنچی ہے اس لئے "الارض" سے مرادارضِ اسلام ہو کیونکہ منھا کی ضمیر اسی طرف لوٹ رہی ہے۔علی سبیل الاستفہام۔اللہ بہتر جانتا ہے۔

واعطیت الکنز: الاحمر والابیض الاحمر والابیض: دونوں ماقبل سے بدل ہیں۔سونا چاندی کے خزانے مراد ہیں اور تورپشتیؒ فرماتے ہیں ان دونوں خزانوں کے ذریعہ قیصر وکسریٰ کی سلطنت کی طرف اشارہ ہے کیونکہ اس زمانے میں فارس میں دینار (سونے کے سکے) اور روم میں درہم (چاندی کے سکے) رائج تھے۔

بسنة عامة طیبیؒ کہتے ہیں "السنة" سے مراد قحط اور خشک سالی ہے اور یہ اسماء غالبہ میں سے ہے۔

من سوی انفسھم: یہ "عدواً" کی صفت ہے، تقریری عبارت یوں ہے: **عدواً کائنا من سوی انفسھم** اور یہ قید اس لئے لگائی کہ اس سے قبل آپ ﷺ نے باہمی دشمنی بھی پیدا نہ کرنے کی درخواست کی تھی جو قبول نہیں ہوئی جس کا ذکر اگلی حدیث میں آرہا ہے۔

"**فیستبیح**" **یستبیح** کا فاعل عدو ہے۔یہ ان اسماء میں سے ہے جن کو مفرد اور جمع لانا برابر ہے۔جو ان کے خون کو مباح کر دے کہتے ہیں اس سے اجتماعی استیصال مراد ہے۔

طیبیؒ کہتے ہیں **البیضة** سے مراد ملی نظام کا مرکز اور بادشاہت ہے یہ **بیضة الدار** سے ماخوذ ہے جس کا معنی مکان کا بیچ اور بڑا حصہ ہے اس سے مراد ایسا دشمن ہے جو ان کا استیصال کرے یعنی ان کو جڑ سے اکھاڑ دے اور سب کو ہلاک کر دے۔

بعض کہتے ہیں مراد یہ ہے کہ جب انڈا ختم ہو جاتا ہے اور اندر موجود اشیاء سفیدی، زردی یا چوزہ اگر اصل باقی رہے تو کبھی نہ کبھی تو اس سے فائدہ ضرور حاصل ہوتا ہے یہاں نفی دونوں چیزوں کی ایک ساتھ پائے جانے کی نفی ہے اس سے یہ معلوم ہوتا کبھی دشمن غالب آ جائے گا لیکن استیصال نہیں کر سکے گا۔

فانه لایرد: بخلاف اس حکم کے جو وجود شئی کی شرط کے ساتھ عدم وجود شئی کی شرط کے ساتھ معلق ہو۔جیسا کہ اس کی تحقیق "باب الدعاورد البلاء" میں گزر چکی ہے۔

اعطیتك میں کاف **اعطیت** کا مفعول اول ہے **ان لا اھلکھم** ۔ بتاویل مصدر ہو کر مفعول ثانی ہے کہ جس طرح **سالت ربی ان لا یھلکھا** میں **ان لا یھلکھا** مفعول ثانی ہے۔

ولو اجتمع علیھم من: "من" موصولہ ہے۔**ای الذین ھم**: **(باقطارھا)** اقطار جمع ہے قطر کی تمام اطراف مراد ہے۔مطلب یہ ہے کہ اگر تمام روئے زمین کے مخالف طاقتیں مل کر یہ چاہیں کہ مسلمانوں کی مجموعی طاقت کو ختم کر دیں تو ان کی اجتماعی ہیئت کے مرکز کو ختم نہ کر سکیں گی۔

ولو اجتمع کا جواب محذوف ہے جس پر آپ ﷺ کا قول **ان لا اسلط علیھم** دلالت کر رہا ہے۔**یھلك بعضا و**

یسبی' لیسبی یرمی کی طرح ہے۔مرفوع ہے کیونکہ "یھلك" پر اس کا عطف ہے۔بعضھم : ہے بعضاکی صفت "آخر" محذوف ہے ایک نسخہ میں "یسبی" نصب کے ساتھ ہے' اس صورت میں اس کا عطف "یکون" پر ہوگا۔

طیبیؒ کہتے ہیں: "حتی یکون" میں حتی "کی" کے معنی میں ہے: لکی یکون بعض امتك یھلك بعضا۔ پس آپ ﷺ کا قول مبارک: انی اذا قضیت قضاء فلا یرد۔ ہے یعنی جب میں کسی کام کا فیصلہ کرتا ہوں تو اس کو ضرور کرتا ہوں۔

حضرت خباب ابن الارتؓ کی روایت بھی اس پر دلالت کرتی ہے حضرت خباب فرماتے ہیں آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: أني سألت الله ثلاثا فأعطاني اثنتين و منعني واحدة' سألته أن لا یھلك امتي بسنة فأعطاني' و سألته ان لا یسلط علیھم عدوا من غیرھم فأعطانیھا و سألته ان لا یذیق بعضھم بأس بعض فمنعنیھا۔ میں نے اللہ تعالیٰ سے تین چیزیں مانگیں تھیں اللہ نے دو مجھے عطا کردیں اور ایک سے محروم رکھا میں نے اللہ سے مانگا تھا کہ میری امت کو قحط سے ہلاک نہ کیا جائے' مجھے عطا کر دیا۔ مسلمانوں کے علاوہ کسی دشمن کو ان پر مسلط نہ کیجئے۔ وہ بھی عطا فرما دیا' میری امت آپس میں دست وگریبان نہ ہو۔ (یعنی مسلمان مسلمان سے برسرِ پیکار نہ ہوں) میری یہ درخواست قبول نہیں ہوئی۔

مظہرؒ کہتے ہیں تقدیر خلق کے اعتبار سے اللہ تعالیٰ کے ہاں دو تقدیریں ہیں۔ تقدیر مبرم (اٹل' تقدیر معلق (جو کسی عمل سے معلق ہوتی ہے) تقدیر معلق بدلتی ہے (اس کی مثال یوں سمجھیں ایک شخص کہتا ہے اگر آپ میرا فلاں کام کردیں تو اتنے دوروپے دوں گا اگر نہ کرو گے تو وہ رقم نہیں ملے گی) اس میں اللہ تعالیٰ محو واثبات کرتا رہتا ہے چنانچہ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں ارشاد فرمایا۔ "اللہ جو چاہے مٹادے اور جو چاہے ثابت رکھے۔"

تقدیر مبرم: جو ہر حالت میں نافذ ہو کے رہتی ہے کسی مقتضیٰ علیہ اور مقتضیٰ لہ پر موقوف نہیں ہوتی۔ اس میں محو واثبات ہرگز نہیں ہوتا۔ چنانچہ باری تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿لا معقب لحکمه﴾ اللہ (جو چاہتا ہے) حکم کرتا ہے اس کے حکم کو کوئی ہٹانے والا نہیں اور آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا: لا مرد لقضائه ولا مرد لحکمه اور "اذا قضیت قضاء فلا یرد" تقدیر کی دوسری کے قبیل سے ہے۔

اور اسی وجہ سے آنحضرت ﷺ کی امت کے حق میں یہ دعا قبول نہ ہوئی اور اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ انبیاء مستجاب الدعوات ہوتے ہیں' البتہ ان کی اس جیسی دعا قبول نہیں ہوتی۔

۵۷۵۱ : وَعَنْ سَعْدٍ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَرَّ بِمَسْجِدِ بَنِيْ مُعَاوِيَةَ دَخَلَ فَرَكَعَ فِيْهِ رَكْعَتَيْنِ وَصَلَّيْنَا مَعَهٗ وَدَعَا رَبَّهٗ طَوِيْلًا ثُمَّ انْصَرَفَ فَقَالَ سَاَلْتُ رَبِّيْ ثَلَاثًا فَاَعْطَانِيْ ثِنْتَيْنِ وَمَنَعَنِيْ وَاحِدَةً سَاَلْتُ رَبِّيْ اَنْ لَّا يُهْلِكَ اُمَّتِيْ بِالسَّنَةِ فَاَعْطَانِيْهَا وَسَاَلْتُ اَنْ لَّا يُهْلِكَ اُمَّتِيْ بِالْغَرَقِ فَاَعْطَانِيْهَا وَسَاَلْتُهٗ اَنْ لَّا يَجْعَلَ بَاْسَهُمْ بَيْنَهُمْ فَمَنَعَنِيْهَا۔ (رواہ مسلم)

اخرجہ مسلم فی صحیحہ ۲۲۱۶/۴ حدیث رقم (۲۰۔(۲۸۹۰/۲۱) واحمد فی المسند ۱۸۲/۱۔

ترجمہ: "حضرت سعد (بن ابی وقاص) رضی اللہ عنہ سے مروی ہے' فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ (انصار کے ایک قبیلہ)

بنی معاویہ کی مسجد کے قریب سے گزرے تو اندر (مسجد میں) تشریف لائے اور وہاں دو رکعت نماز پڑھی' ہم نے بھی آپ ﷺ کے ساتھ نماز پڑھی (نماز کے بعد) آپ ﷺ نے اپنے ربّ سے بڑی طویل دعا مانگی (یعنی دیر تک دعا میں مصروف رہے) پھر ہماری طرف متوجہ ہوئے اور ارشاد فرمایا: ''میں نے (آج اپنی دعا میں) اپنے ربّ سے تین چیزوں کا سوال کیا تھا' ان میں سے دو چیزیں تو اس نے عطا کر دی ہیں' اور ایک چیز سے منع کر دیا' ایک چیز کی درخواست میں نے یہ کی تھی کہ میری امت کو قحط (عام) میں ہلاک نہ کیا جائے' اس درخواست کو اللہ تعالیٰ نے قبول کر لیا' دوسری درخواست میں نے یہ کی تھی کہ میری امت کو پانی میں غرق کر کے ہلاک نہ کیا جائے اور میری یہ درخواست بھی قبول فرمالی گئی' تیسری درخواست یہ تھی کہ میری امت کے لوگ آپس میں دست و گریباں نہ ہوں (یعنی مسلمان' مسلمان سے برسر پیکار نہ ہوں اور آپس میں ایک دوسرے کے خلاف محاذ آرائی نہ کریں) میری یہ درخواست قبول نہیں ہوئی''۔ (مسلم)

تشریح: وعن سعد یہ حضرت سعد ابن ابی وقاص ہیں جو عشرہ مبشرہ میں سے ہیں ان رسول اللہ ﷺ...... بنی معاویة بنو معاویہ انصار مدینہ کے ایک قبیلہ کا نام ہے۔ بعض کہتے ہیں ان کی مسجد مدینہ منورہ کی حدود میں تھی۔

ترکیب: دخل یہ جملہ حال ہے یا استینا فیہ ہے بغوی کی روایت میں فدخل ہے دعا ربه طویلا یعنی بہت دیر تک دعا میں مصروف رہے یا یہ کہ نماز کے بعد بڑی طویل دعا مانگی آپ کے صحابہ بھی آپ کے ساتھ دعا میں شریک ہوئے یا آپ کی دعا پر آمین کہتے رہے۔ طویلاً کو صلوٰۃ اور دعا دونوں سے مقید ماننا زیادہ بہتر ہے ثم انصرف پھر جب نماز اور دعا سے فارغ ہوئے تو ہماری طرف متوجہ ہو کر فرمانے لگے۔ سالت ربی ثلاثاً ثلاثاً سے یا تو دعا مراد ہے یعنی میں نے اپنے پروردگار سے تین دعائیں مانگی یا عدد مراد ہے یعنی تین مرتبہ دعا مانگی فاعطانی ثنتین و منعنی واحدة اس جملے میں اس مانگی ہوئی دعا کی مزید وضاحت ہے: قوله وسألت ان لا یهلك امتی بالغرق: ' یعنی جس طرح فرعون کی قوم دریائے نیل میں غرق کر کے ہلاک کر دی گئی' یا نوح علیہ السلام کی قوم پانی کے طوفان میں مبتلا کر کے نیست و نابود کر دی گئی۔ اس طرح میری پوری امت پانی میں ڈبو کر ہلاک نہ کی جائے بالغرق غین اور راء کے فتحہ کے ساتھ ہے ایک نسخے میں راء کے سکون کے ساتھ ہے۔

تورات میں آنحضرت ﷺ کے اوصاف کا ذکر

۵۷۵۲ : وَعَنْ عَطَاءِ بْنِ يَسَارٍ قَالَ لَقِيْتُ عَبْدَ اللّٰهِ بْنَ عَمْرِوبْنِ الْعَاصِ قُلْتُ اَخْبِرْنِي عَنْ صِفَةِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِي التَّوْرَاةِ قَالَ اَجَلْ وَاللّٰهِ اِنَّهٗ لَمَوْصُوْفٌ فِي التَّوْرَاةِ قَالَ بِبَعْضِ صِفَتِهٖ فِي الْقُرْاٰنِ يٰۤاَيُّهَا النَّبِيُّ اِنَّاۤ اَرْسَلْنٰكَ شَاهِدًا وَّمُبَشِّرًا وَّنَذِيْرًا وَحِرْزًا لِّلْاُمِّيِّيْنَ اَنْتَ عَبْدِيْ وَرَسُوْلِيْ سَمَّيْتُكَ الْمُتَوَكِّلَ لَيْسَ بِفَظٍّ وَلَا غَلِيْظٍ وَلَاسَخَّابٍ فِي الْاَسْوَاقِ وَلَا يَدْفَعُ بِالسَّيِّئَةِ السَّيِّئَةَ وَلٰكِنْ يَعْفُوْ وَيَغْفِرُ وَلَنْ يَّقْبِضَهُ اللّٰهُ حَتّٰى يُقِيْمَ بِهِ الْمِلَّةَ الْعَوْجَاءَ بِاَنْ يَّقُوْلُوْا لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ

وَيَفْتَحُ بِهَا اَعْيُنًا عَمْيًا وَآذَانًا صُمًّا وَقُلُوْبًا غُلْفًا۔ (رواه البخاري)

اخرجه البخاري في صحيحه ٣٤٢/٤ حديث رقم ٢١٢٥ واحمد في المسند ١٧٤/٢۔

ترجمہ: ''حضرت عطا ابن یسار (جلیل القدر تابعی) سے مروی ہے' فرماتے ہیں کہ میں حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہما کی ملاقات سے مشرف ہوا' تو میں نے ان سے درخواست کی کہ آپ مجھے رسول اللہ ﷺ کی وہ صفات بتائیں جن صفات کا تورات میں ذکر ہے۔ حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ ضرور بتاؤں گا' خدا کی قسم تورات میں آنحضرت ﷺ کی ان بعض صفات و خصوصیات کا ذکر ہے جو قرآن کریم میں مذکور ہیں' چنانچہ (اللہ تعالیٰ نے تورات میں آپ ﷺ کی جو صفات و خصوصیات ذکر کی ہیں' ان کو اپنی زبان اور اپنے اسلوب میں اس طرح بیان کیا جا سکتا ہے کہ) اے نبی' ہم نے آپ کو امت کے لئے شاہد' خوشخبری دینے والا' ڈرانے والا اور امیوں کو پناہ دینے والا بنا کر بھیجا ہے۔ اے محمد (ﷺ)! تم میرے بندے ہو (کہ عبودیت و بندگی کا وہ مرتبہ خاص تمہیں حاصل ہے جو کسی اور کو نصیب نہیں) تم (بندوں کی طرف بھیجے جانے والے میرے خاص رسول' میں نے تمہارا متوکل رکھا ہے (یعنی تمہیں توکل و اعتماد کی وہ دولت عطا کی ہے جو کسی اور کو نہیں ملی' اسی بناء پر تم اپنے تمام معاملات و مہمات میں اپنی طاقت و صلاحیت پر اعتماد کرنے کے بجائے صرف میری ذات اور میرے حکم پر بھروسہ رکھتے ہو) نہ تم بدخو ہو' نہ سخت گو اور سخت دل' اور نہ بازاروں میں شور و غل مچانے والے ہو''۔ (تورات میں یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ) وہ (محمد) برائی کا بدلہ برائی سے نہیں دیں گے (یعنی وہ اپنے ساتھ برائی کرنے والے سے انتقام نہیں لیں گے اور اس کو سزا نہیں دیں گے) بلکہ درگزر کریں گے اور (احسان پر احسان یہ کریں گے کہ برائی کرنے والے کے لئے) دعائے مغفرت کریں گے اور اللہ تعالیٰ ان (محمد ﷺ) کی روح کو اس وقت تک قبض نہ کرے گا جب تک ان کے ذریعہ کج رو اور گمراہ قوم کو راہِ راست پر نہ لے آئے اس طرح کہ قوم کے لوگ اعتراف و اقرار کر لیں گے کہ خدا کے سوا کوئی معبود نہیں اور اس وقت تک ان کی روح قبض نہیں کی جائے گی) جب تک کہ اللہ تعالیٰ کلمہ طیبہ (لا الٰہ الا اللہ) کے ذریعہ اندھی آنکھوں' بہرے کانوں اور بے حس دلوں کو درست نہ کر دے''۔ اس روایت کو بخاری نے (عطا بن یسار سے) نقل کیا ہے نیز یہی حدیث دارمیؒ نے بھی عطا بن یسار ہی سے مروی ہے۔

تشریح: قلت جملہ استینافیہ ہے ماقبل کے بیان کے لئے ہے۔ ''اجل'' ہمزہ اور جیم کے فتحہ کے ساتھ اور لام ساکن ہے (حروف ایجاب میں سے ہے)۔

طیبیؒ فرماتے ہیں یہ حرف خاص طور پر خبر کی تصدیق کے لئے آتا ہے بعض حضرات نے اس کو استفہام کے بعد لانا بھی جائز قرار دیا ہے۔ یہاں امر کے جواب میں واقع ہے۔ کلام کی اصل تاویل یوں ہے: ''قراء ت التوراة هل وجدت صفة رسول الله صلى الله عليه وسلم فيها وأخبرني قال: أجل۔ اى نعم اخبرك''

والله انه لموصوف في التوراة ببعض صفة في القرآن: قوله : يا ايها النبي انا ارسلناك شاهدا۔

شاهدا حال مقدرہ ہے کاف سے یا فاعل سے یا دونوں سے۔ یعنی آپ ﷺ کی گواہی آپ کی امت اور تصدیق و تکذیب کرنے والے سب کے حق میں اللہ کے ~~ہاں مقبول ہوگی~~ خواہ حق میں ہو یا ان کے خلاف جس طرح عادل شخص کی گواہی عدالت

میں قبول کی جاتی ہے۔
طیبیؒ نے ذکر کیا ہے یہاں شاہداً سے یا تو قیامت کے دن انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کی تبلیغ کی صداقت وعدالت اور امت کے افعال پر گواہی دینا مراد ہے۔ یا معنی یہ ہے: جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **فکیف اذا جئنا من کل امة بشھید وجئنابك علی ھؤلاء شھیدا۔** [النساء: ٤١]
''پس کیا حال ہوگا جس وقت کہ ہر امت میں سے ایک گواہ ہم لائیں گے اور آپ کو ان لوگوں پر گواہی بنا کر لائیں گے۔''
چنانچہ:
آپ ﷺ کی امت جب انبیاء کے دعویٰ کی صداقت پر گواہی دے گی تو آپ ﷺ اپنی امت کی گواہی کا تذکیہ فرمائیں گے جس کا ذکر خود قرآن میں موجود ہے۔ چنانچہ باری تعالیٰ کا ارشاد ہے **وکذلك جعلناکم امة وسطا لتکونوا شھداء علی الناس ویکون الرسول علیکم شھیدا۔** [البقرة: ٤١]
ہم نے اسی طرح تمہیں معتدل امت بنایا ہے تا کہ تم لوگوں پر گواہی ہو جاؤ اور رسول ﷺ تم پر گواہ ہو جائیں۔''
اس کا ذکر پہلے بھی آ چکا ہے۔
یا یہ معنی ہے کہ "**شاھد القدرتنا وارادتنا فی الخلق**" مخلوق میں ہماری قدرت وارادہ کے شاہد ہیں جیسا کہ اس کی طرف مبشراً سے اشارہ فرمایا۔ مبشراً مومنین کے لئے اجر وانعام کی خوشخبری دینے والا۔
ونذیرا کفار کو عذاب وعقاب سے ڈرانے والا۔
وحرزا حاء کے کسرہ اور راء کے سکون کے ساتھ ہے۔ **للامیین** قاضیؒ فرماتے ہیں **ای حصنا موئلا للعرب......**
"امیین" سے مراد اہل عرب ہیں ان کو ''امی'' سے اس لئے تعبیر کیا گیا ہے کہ ان کی اکثریت پڑھنا لکھنا نہیں جانتی تھی۔
شیطانی گمراہیوں اور نفسانی آفات سے پناہ مراد لی جائے تو بھی صحیح ہے کیونکہ اس میں کوئی شک نہیں کہ آنحضرت ﷺ کا وجود تمام عالم کے لئے ملجاوماویٰ ہے۔
یا ان کو ام القریٰ یعنی مکہ مکرمہ کی طرف منسوب کر کے اُمی کہا گیا۔
یا عرب کے نبی اُمی ﷺ کی طرف نسبت کر کے اُمی کہا گیا اس مقام میں یہ توجیہ زیادہ بہتر ہے کیونکہ یہ تمام امت کو شامل ہے چاہے عرب ہو یا عجم اور اس میں ان یہود پر رد بھی ہوگا جو آپ ﷺ کو صرف عرب کا نبی مانتے تھے چونکہ اس نوید کے ذکر سے ماعداہ کی نفی نہیں ہوتی۔ خصوصاً جب کہ باری تعالیٰ کا ارشاد: ﴿**وما ارسلنك الا کافة للناس بشیرا و نذیرا**﴾ [سباء: ٢٨]
''ہم نے آپ کو تمام لوگوں کے لئے خوشخبریاں سنانے والا اور ڈرانے والا بنا کر بھیجا ہے۔'' اسی وجہ سے آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا:
اگر موسیٰ علیہ السلام زندہ ہوتے ان کو بھی میری اتباع کے بغیر کوئی چارہ نہ ہوتا۔
ابن ملکؒ فرماتے ہیں پناہ سے مراد آنحضرت ﷺ کی قوم وملت کا عذاب استیصال سے محفوظ ہونا ہو یا مراد ہو کہ جب تک آپ اپنی امت کے درمیان موجود ہیں اللہ تعالیٰ آپ کی امت کو محفوظ رکھے گا۔ چنانچہ باری تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿**وما کان اللہ لیعذبھم وانت فیھم**﴾ [الأنفال: ٣٢] ''یہ ممکن نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ ان (مسلمانوں) پر عذاب نازل کرے اور آپ ﷺ

ان میں موجود ہوں۔"

قولہ :انت عبدی: قرآن کریم کے سات مقامات میں اللہ تعالیٰ نے اپنے اسم مبارک اللہ کی طرف آپ ﷺ کی اس صفت کی اضافت کی ہے اور یہ اضافت اضافت تشریفی ہے۔ اور کہیں لفظ جلالہ اللہ کی ضمیر کی طرف اضافت کی ہے **و رسولی** آپ میرے اخص الخاص رسول ہیں قرآن کریم میں متعدد مقامات میں اس کو بیان فرمایا ہے چنانچہ باری تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿**هوالذی ارسل رسوله بالهدی**﴾ [التوبة : ٣٢ ۔ الفتح : ٢٨ ۔ الصف : ٩] "وہی ہے جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور دین حق کے ساتھ بھیجا" رسول کی اضافت ضمیر کی طرف عبدی ہے جیسے کہا جاتا ہے: "**اکرم زید عبده**" کہ زید نے اپنے غلام کی عزت کی۔ یہ اس وقت کہا جاتا ہے جب اس کے بہت سے غلام ہوں اس میں سے ایک کی خاص طور پر عزت کرے۔ جب مطلقاً اسم جنس آجائے تو اس سے فرد کامل مراد ہوتا ہے **سمیتك المتوكل** یعنی تمہیں توکل واعتماد کی وہ دولت عطا کی ہے جو کسی اور کو نہیں ملی کیونکہ تم اپنے تمام معاملات و مہمات میں صرف میری ذات اور اس حکم پر بھروسہ رکھتے ہو۔ قرآن کریم کی ان آیات پر عمل پیرا ہوتے ہوئے: ﴿**وتوكل على الله**﴾ [النحل : ٨١ ۔ الأنفال : ٦١ ۔ الأحزاب : ٣ و ٤٨] ﴿**وتوكل على الحي الذى لا يموت**﴾ [الفرقان : ٥٨] سے دیا ہے اس کی گواہی قرآن کی مندرجہ ذیل آیات بھی دیتی ہیں یعنی آپ ﷺ کو توکل کی خاص طور پر ترغیب دی گئی ہے۔

﴿**لا نسألك رزقا نحن نرزقك**﴾ [طٰہٰ : ١٣١] "ہم تجھ سے روزی نہیں مانگتے بلکہ ہم خود تجھے روزی دیتے ہیں۔"

﴿**ورزق ربك خير وابقٰى**﴾ [طٰہٰ : ١٣١] "تیرے رب کا دیا ہوا ہی (بہت) بہتر اور بہت باقی رہنے والا ہے۔"

﴿**ومن يتق الله يجعل له مخرجا ويرزقه من حيث لا يحتسب**﴾ [الطلاق : ٢۔٣] "جو شخص اللہ سے ڈرتا ہے اللہ اس کے لئے چھٹکارے کی شکل نکال دیتا ہے اور اسے ایسی جگہ سے روزی دیتا ہے جس کا اسے گمان بھی نہ ہو۔"

یہ تمام آیتیں آپ ﷺ کے اسی توکل کی طرف اشارہ کرتی ہیں۔

قولہ :لیس بفظ : مخاطب کے صیغے سے غائب کی طرف التفات تفنن کے لئے ہے۔

طیبیؒ فرماتے ہیں احتمال ہے کہ یہ آپ ﷺ کے خصائص بیان کرنے والی تورات کی دوسری آیت ہو اور یہ احتمال بھی ہے کہ جملہ حال ہو: **المتوكل** سے بھی یا **سميتك** کے کاف ضمیر سے اس صورت میں اس میں التفات ہوگا اور اس کا معنی ہے کہ نہ وہ بدخو اور نہ ہی بدزبان ہیں۔

ولا غليظ۔ اس کے تین معنی ہوسکتے ہیں: بداخلاق، بدعمل، سخت دل۔ یہاں آخری معنی زیادہ واضح معلوم ہوتا ہے۔ کیونکہ باری تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿**ولو كنت فظا غليظ القلب**﴾ [آل عمران : ١٥٩] "اگر آپ بدزبان اور سخت دل ہوتے تو یہ سب آپ کے پاس سے چھٹ جاتے۔ یہاں "غلیظ القلب" کا معنی ہے سخت دل۔ اس میں اس جانب اشارہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کے ان دونوں اعضائے کریمہ کو طبعی طور پر پاک رکھا تھا۔

چنانچہ کلبیؒ کہتے ہیں "فظا" کا استعمال قول میں ہوتا ہے اور "غلیظ القلب" کا استعمال عمل میں۔

ولا سخاب خاء مشددہ کے ساتھ یعنی چیخنے والا۔ **في الاسواق:** طیبیؒ فرماتے ہیں آنحضرت ﷺ اتنے نرم خو اور شریف

النفس تھے کہ سوئے خلق کی وجہ سے لوگوں پر آواز بلند نہیں کرتے (یعنی بداخلاقی نام کی کوئی چیز آپ میں نہیں پائی جاتی) اور نہ کمینے لوگوں کی طرح بازاروں میں چیختے بلکہ نہایت نرمی اور شفقت سے پیش آتے۔ میں کہتا ہوں یہ باری تعالیٰ کا ارشاد: ﴿فبما رحمة من الله لنت لهم﴾ [ال عمران : ۱۵۹] یا اس آیت: ﴿رجال لا تلهيهم تجارة ولا بيع عن ذكر الله﴾ [النور : ۳۷] سے ماخوذ ہے۔

قوله :يدفع بالسئة السيئة: برائی سے پیش آنے والوں سے انتقام نہیں لیں گے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿وجزاء سيئة سيئة مثلها فمن عفا واصلح فاجره على الله﴾ [الشوریٰ : ۴۰]

''اور برائی کا بدلہ اسی جیسی برائی ہے اور جو معاف کر دے اور اصلاح کر لے اس کا اجر اللہ کے ذمے ہے۔''

اور ایک جگہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿ادفع بالتي هي احسن﴾ ''برائی کو اس طریقے سے دور کریں جو سراسر بھلائی والا ہے'' لفظ ''سیئۃ'' کا اطلاق اپنی اجزاء پر یا تو مشاکلۃ ومقابلہ کے طور پر ہے یا اس وجہ سے کہ وہ صورۃ سیئہ ہے۔ سیئہ کو حسنہ سے رفع کرنے کو بھی مشاکلۃ سیئہ سے تعبیر کیا جاتا ہے یا اچھائی کے ذریعہ اس کو دور کرنے کی طرف اضافت کر کے گویا اس کو سیئہ کہا گیا ہے انہی بزرگوں کا یہ قول ہے **حسنات الابرار سيئات المقربين** جیسے کہا جاتا ہے **ولكن يعفو ويغفر**: یعنی برائی کرنے والے کو معاف کریں گے۔ درگزر کریں گے یا احسان پے احسان کریں گے یا یہ کہ برائی کرنے والے کے لئے دعا مغفرت کریں گے جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿فاعف عنهم واصفح﴾ [المائدۃ : ۱۳] ان کو معاف فرما دیجئے اور درگزر فرما دیں دوسری جگہ ارشاد ہے: ﴿فاعف عنهم واستغفرلهم﴾ ''سو آپ ان سے درگزر کریں اور ان کے لئے استغفار کریں''۔ اور کبھی آپ ﷺ ان کے ساتھ احسان والا معاملہ فرماتے اور احسان کے ساتھ ملتے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا حکم ہے: ﴿والكاظمين الغيظ والعافين عن الناس والله يحب المحسنين﴾ ''جو لوگ غصہ پینے والے اور لوگوں سے درگزر کرنے والے ہیں اللہ تعالیٰ ان نیک کاروں سے محبت کرتا ہے''۔ **ولن يقبض**: واحد مذکر غائب کے صیغے کے ساتھ ہے۔ اور ایک نسخہ میں میں **ولن نقبض** ہے۔ صحیح نسخہ میں یوں ہے: **لن يقبضه الله** کے الفاظ ہیں۔ لفظ جلالہ کے اضافہ کے ساتھ۔ آگے آنے والے تمام افعال بھی نون کے ساتھ ہے طیبیؒ فرماتے ہیں: **ولن يقبضه** : یہ لفظ یاء کے ساتھ ہے جیسا کہ مشکوٰۃ کی روایت میں ہے اور اس کی تائید شرح السنہ کی روایت ''**لن يقبضه الله**'' سے ہوتی ہے۔ **حتى يقيم به** یعنی ان کے ذریعے بہ کی ضمیر کا مرجع آپ ﷺ ہیں **الملمدة العوجاء** یعنی ٹیڑھی اور گمراہ قوم۔ قرآن کریم نے بھی کفار کی مذمت ان ہی الفاظ سے کی ہے: ﴿ويصدون عن سبيل الله ويبغونها عوجا﴾ جبکہ دین اسلام کی مدح میں فرمایا: ﴿ذالك الدين القيم﴾ [التوبة : ۳۶] یہی دین درست ہے۔ دوسری جگہ ارشاد فرمایا: ﴿وانك لتهدى الى صراط مستقيم﴾ [الشوریٰ : ۵۲] ''بے شک آپ راہ راست کی رہنمائی کر رہے ہیں''۔

قاضی عیاضؒ کہتے ہیں **الملة العوجاء** سے ملت ابراہیمی مراد ہے کیونکہ وہ ایام فترۃ میں ٹیڑھی ہو گئی تھی کسی نے ابراہیم علیہ السلام کے دین کو گھٹا دیا تھا کسی نے بڑھا دیا تھا اور کسی نے بدل دیا تھا اور یہ سلسلہ یونہی چلتا رہا۔ یہاں تک کہ آنحضرت محمد ﷺ جب مبعوث ہوئے تو آپ ﷺ نے دوبارہ اس کو زندہ کیا اللہ اس کو ہمیشہ قائم ودائم رکھے۔

بان يقولوا لااله الاالله ۔

"یقیم" متعلق ہے اس میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ توحید کا ہمیشہ سے قائم کرنا اس کلمہ کے خصوصی تقاضوں میں سے ہے۔

شارح مصابیح کہتے ہیں اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ولن نقبضه اى رسول الله حتى نقيم به الملة العوجاء اى حتى نجعلها مستقيمة﴾ "یعنی رسول اللہ ﷺ کی روح کو اس وقت تک قبض نہیں کریں گے جب تک کہ ہم کج رو اور گمراہ قوم کو راہ راست پر نہ لے آئیں اور مقصود یہ ہے کہ عرب نے اپنی طرف سے جس دین کو ایجاد کر کے ملت ابراہیمی کے نام سے اپنایا ہوا ہے۔ باقی: "الملة العوجاء" توسع کی بناء پر فرمایا گیا ہے جیسے کہا جاتا ہے: الكفر ملة واحده۔

يفتح : یاء اور نون کے ساتھ (یعنی صیغہ غائب اور جمع متکلم کے ساتھ) جیسا کہ "یقبض" میں گزرا ہے یہ منصوب ہے کیونکہ اس کا عطف "یقیم" پر ہے سید کے نسخے میں رفع کے ساتھ ہے۔ قطع کی وجہ سے۔ اى وهو يفتح أو نحن نفتح (یعنی جب تک وہ نہ کھول دے یا ہم نہ کھول دیں) بھا یعنی اس کلمہ لا الہ الا اللہ کے ذریعہ ایک نسخہ میں بہ کے ساتھ ہے اس صورت میں آپ ﷺ مراد ہوں گے یا القول مراد ہوگا۔ اعینا مشکوۃ کے تمام نسخوں میں فتحہ کے ساتھ ہے۔ عمیا عین کے ضمہ کے ساتھ اعمیٰ کی جمع ہے طیبیؒ فرماتے ہیں بخاری، دارمی، حمیدی اور جامع الاصول میں کی روایت اسی طرح ہے جبکہ مصابیح میں "يفتح به اعين عمياء" صیغہ مجہول کے ساتھ منقول ہے پہلا قول روایۃ و درایۃ زیادہ صحیح ہے۔ میں کہتا ہوں درایۃً صحیح تر کہنے کی وجہ شاید یہ ہے کہ معطوف علیہ بالاتفاق بصیغہ معروف ہے چاہے یاء کے ساتھ ہو یا نون کے ساتھ۔

و آذانا...... ہمزہ کے مد کے ساتھ اذن کی جمع ہے۔

صما: یہ جمع ہے اصم کی۔

غلفا غین کے ضمہ کے ساتھ "اغلف" کی جمع ہے یعنی وہ شخص جو فہم نہ رکھتا ہو گویا کہ اس کا دل غلاف میں بند ہے ان اعضاء کو یہاں اس لئے ذکر کیا ہے کیونکہ یہ علوم و معارف کے آلات ہیں کفار کے متعلق باری تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿ختم الله على قلوبهم وعلى سمعهم وعلى ابصارهم غشاوة﴾ [البقرة : ۷] "اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں پر اور ان کے کانوں پر مہر کر دی ہے اور ان کی آنکھوں پر پردہ ہے" اور فرمایا: ﴿صم بكم عمي فهم لايعقلون﴾ [البقرة : ۱۷] "گونگے اور اندھے ہیں انہیں عقل نہیں۔"

اس جگہ زبان کا ذکر نہیں کیا شاید وجہ یہ ہے کہ زبان ان سب کی ترجمان ہے اور برتن میں وہی کچھ چھلکتا ہے جو کچھ اس میں ہوتا ہے۔

طیبیؒ کہتے ہیں اگر آپ یہ کہیں کہ حضرت عبداللہ بن عمرو ابن العاصؓ کے قول: "انه لموصوف في التورات ببعض صفة في القرآن" (تو کیا واقعی یہ تمام اوصاف قرآن میں صراحت کے ساتھ موجود ہیں؟) (کہ آنحضرت ﷺ کے جو بعض اوصاف و فضائل قرآن کریم میں ذکر کئے ہیں وہ تورات میں بھی مذکور ہیں) کا تقاضا یہ ہے کہ وہ تمام اوصاف قرآن میں موجود ہوں۔

میں کہتا ہوں ہاں! تورات میں مذکور سارے اوصاف قرآن کریم میں ثابت ہیں: ﴿یاایھاالنبی انا ارسلناك﴾ سورہ احزاب میں سورہ اور جمعہ کی آیت: ﴿ھوالذی بعث فی الامیین رسولا منھم یتلوا علیھم آیاته ویزکیھم ویعلمھم الکتاب میں ہے اور ﴿سمیتك المتوکل ولکن یعفو ویغفر﴾ باری تعالیٰ کا قول: ﴿ولو کنت فظا غلیظ القلب﴾ سے لے کر ﴿ان الله یحب المتوکلین﴾ تک میں ولا سخاب فی الاسواق باری تعالیٰ کا قول فسبح بحمد ربك و کن من الساجدین میں کیونکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ بس تسبیح وتحمید کرتے رہیں اور اپنے آپ کو ان لوگوں سے بنایئے جن کو سجود کرنے میں وافر حصہ نصیب ہوا ہے۔ نہ اس سے پہلو بچایئے اور نہ اس کو چھوڑ کر دوسری چیزوں میں مشغول ہوں اسی وجہ سے خود آپ ﷺ نے بھی ارشاد فرمایا: ما أوحی الی ان اکون من التاجرین' ولکن اوحی الی ان اکون من الساجدین۔ اللہ تعالیٰ نے مجھے تاجر بننے کا حکم نہیں دیا بلکہ ساجدین میں سے ہونے کا حکم دیا ہے۔

حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ کا قول: ''ولا سخاب فی الاسواق'' باری تعالیٰ کے قول: ﴿ولا شفیع یطاع﴾ کے قبیل سے ہے۔

ولا سخاب میں دو احتمال ہیں: ① صرف شور وغل کی نفی مراد ہے۔ ② دونوں کی نفی معاً مراد ہے' یہاں یہی مراد ہے۔ میں کہتا ہوں یہاں فی الاسواق کی قید کی نفی مراد لینا زیادہ بہتر ہے کیونکہ اس صورت میں بآواز بلند قرآن کریم کی تلاوت کرنا اور مساجد میں خطبہ دینے سے احتراز ہوگا (کیونکہ بآواز بلند قرآن کریم پڑھنا اور خطبہ دینا بغیر کسی کراہت کے جائز ہے) اور فرمایا: ولا یدفع بالسیئة السیئة باری تعالیٰ کے ارشاد: ولا تستوی الحسنة ولا السیئة ادفع بالتی ھی احسن﴾ [فصلت : ۳٤] میں موجود ہے ترجمہ نیکی اور بدی برابر نہیں ہوتی برائی کو بھلائی سے دفع کرو۔ آپ ؐ کا قول: ''حتی یقیم به الملة العوجاء'' اس آیت مبارکہ: ﴿قل انما یوحٰی الی انما الٰھکم الٰه واحدء﴾ [الانبیاء : ۱۰۸] میں ہے (تو کہہ مجھ کو تو حکم یہی آیا ہے کہ تمہارا معبود ایک ہی ہے) کہ میں توحید کا اثبات اور شرک کی نفی کروں۔''

اگر آپ کہیں یفتح بھا اعینا عمیا اور باری تعالیٰ کے ارشاد: ﴿ما انت بھادی العمی عن ضلالتھم ......﴾ [النمل : ۸۱ ۔ الروم : ۵۳] کے درمیان تطبیق کیسے ہوگی (کیونکہ پہلے کا معنی ہے لا الٰہ الا اللہ کے ذریعہ آپ ﷺ اندھی آنکھوں کو درست کریں گے) ''اور نہ آپ اندھوں کو ان کی گمراہی سے ہٹا کر رہنمائی کر سکتے ہیں کیونکہ بہرا آدمی کوئی بات نہیں سن پاتا یعنی حق سے مکمل طور پر گریزاں اور متنفر ہے آپ ان کو نفع نہیں پہنچا سکتے ہیں) جواب فاعل معنوی پر حرف نفی اس پر دلالت کرتا ہے کلام فاعل میں ہے وہ اس طرح کہ آنحضرت ﷺ کو قوم کے ایمان پر بہت زیادہ حریص ہونے کی وجہ سے اس شخص کے شمار کیا گیا ہے جس کو بذات خود ہدایت دینے کا دعویٰ ہو تو آپ ﷺ سے فرمایا گیا: انت لست بمستقل فیه بلکہ: ﴿انك لتھدی الی صراط مستقیم﴾ [الشوریٰ: ۵۲] (ہدایت کے مالک آپ نہیں بلکہ آپ اللہ کے حکم سے صراط مستقیم کی طرف رہنمائی فرماتے ہیں)۔ حاصل یہ ہے کبھی ہدایت کی نسبت آپ ﷺ کی طرف ہوتی ہے اس بات کی رعایت کرتے ہو کہ آپ ﷺ بھی اسباب ہدایت میں سے ہیں اسی کی طرف باری تعالیٰ کا ارشاد: ﴿وانك لتھدی﴾ آپ تو سب بندوں کو قرآن کریم کے ذریعہ سے اللہ تک پہنچنے کی سیدھی راہ بتلاتے ہیں ہدایت دینا اللہ کا کام ہے کیونکہ ہدایت کی حقیقت اللہ کی طرف راجع ہے اللہ تعالیٰ کا ارشاد

ہے انك لاتهدی من احببت ترجمہ آپ جسے چاہیں ہدایت نہیں دے سکتے بلکہ اللہ تعالیٰ ہی جیسے چاہے ہدایت کرتا ہے۔ پس یہ باری تعالیٰ کا قول : ﴿وما رميت اذ رميت ......﴾[الانفال : ۱۷] جیسا ہے (اور تو نے نہیں پھینکی مٹھی خاک کی جس وقت پھینکی تھی) یعنی بظاہر کام تمہارے ہاتھوں سے لیا گیا اور وہ فوق العادت قوت پیدا کر دی جسے تم اپنے کسب واختیار سے حاصل نہ کر سکتے تھے۔

اسی ذات نے آپ کو اس کی قدرت دی اور دشمن کو اس کی وجہ سے شکست دی۔ زیادہ واضح بات یہ ہے کہ جہاں اللہ تعالیٰ نے ہدایت نہ دینا چاہا وہاں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے بھی ہدایت کی نفی کی ہے اور جہاں ہدایت دینا چاہا وہاں آپ کی طرف اثبات فرما دیا' اس لئے کوئی منافات نہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کی ہدایت کے مظہر ہیں جس طرح شیطان اس کی گمراہی کا مظہر ہے۔ اصل مالک تو اللہ تعالیٰ ہیں وہ جس کو چاہے ہدایت دے جس کو چاہے گمراہ کرے جس کو وہ گمراہ کرتا ہے کوئی ہدایت نہیں دے سکتا جس کو وہ ہدایت دے اس کو کوئی گمراہ نہیں کر سکتا۔

۵۷۵۳ : وَكَذَا الدَّارِمِيُّ عَنْ عَطَاءٍ عَنِ ابْنِ سَلَامٍ نَحْوَهُ وَذُكِرَ حَدِيْثُ اَبِيْ هُرَيْرَةَ نَحْنُ الْاٰخِرُوْنَ فِيْ بَابِ الْجُمُعَةِ۔

اخرجه الدارمي في السنن ١٦/١ حديث رقم ٦۔

ترجمہ: اور البتہ دارمی میں عطاء بن یسار کی یہ روایت (عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہما کی بجائے) عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ (مشہور صحابی رضی اللہ عنہ) سے مروی ہے''۔ اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی وہ روایت (جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے فضائل سے متعلق ہے اور) جس کی ابتداء: ''نحن الآخرون'' کے الفاظ سے ہوتی ہے باب الجمعہ میں گزر چکی ہے۔

تشریح: شارح مصابیح کہتے ہیں مصابیح کے تمام نسخوں میں ''رواہ عطا بن سلام'' لکھا ہوا ہے یہ غلط صحیح رواہ عطا عن ابن سلام ہے۔ ابن سلام سے مراد عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ ہیں اور عطاء سے مراد وہ راوی ہیں جو عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں خلاصہ یہ ہے عطاء ابن یسار اس حدیث کو عبداللہ ابن عمرو کی سند سے روایت کر رہے ہیں جیسے بخاری نے اس کو روایت کیا ہے۔ عبداللہ ابن سلام رضی اللہ عنہ کی سند سے بھی روایت کرتے ہیں جیسے دارمی نے اس کو نقل کیا ہے صحاح کے لئے مناسب بخاری کی روایت ذکر کرتے اور پھر تائید کے لئے دارمی کی روایت ذکر کرتے' جیسا کہ مقابل میں التزام کریں اسی وجہ سے صاحب مشکوٰۃ کو بغوی رحمہ اللہ پر اشکال ہوا ہے قطع نظر اس کے کہ مصابیح کے تمام نسخوں میں غلطی واقع ہوئی ہے۔

الفصل الثانی:

مسلمانوں کے لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تین دعائیں

۵۷۵۴ : عَنْ خَبَّابِ بْنِ الْاَرَتِّ قَالَ صَلّٰى بِنَا رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ صَلٰوةً فَاَطَالَهَا قَالُوْا يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّيْتَ صَلٰوةً لَمْ تَكُنْ تُصَلِّيْهَا قَالَ اَجَلْ اِنَّهَا صَلٰوةُ رَغْبَةٍ وَرَهْبَةٍ وَاِنِّيْ سَاَلْتُ

اللّٰهَ فِيهَا ثَلٰثًا فَاَعْطَانِي اثْنَتَيْنِ وَمَنَعَنِي وَاحِدَةً سَاَلْتُهُ اَنْ لَّا يُهْلِكَ اُمَّتِي بِسَنَةٍ فَاَعْطَانِيهَا وَسَاَلْتُهُ اَنْ لَّا يُسَلِّطَ عَلَيْهِمْ عَدُوًّا مِنْ غَيْرِهِمْ فَاَعْطَانِيهَا وَسَاَلْتُهُ اَنْ لَا يُذِيقَ بَعْضَهُمْ بَاْسَ بَعْضٍ فَمَنَعَنِيهَا۔

(رواه الترمذی والنسائی)

اخرجه النسائي في السنن ۲۱۶/۳ حديث رقم ۱۶۳۸ واخرجه الترمذی فی السنن ٤٠٨/٤ حديث رقم ۲۱۷۵ واحمد فی المسند ۱۰۹/۵۔

ترجمہ: ''حضرت خباب بن ارت رضی اللہ عنہ سے مروی ہے' فرماتے ہیں کہ (ایک دن) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں نماز پڑھائی اور اس کو خلاف معمول کافی طویل کیا' ہم نے (نماز سے فراغت کے بعد) عرض کیا کہ یا رسول اللہ! آج تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اتنی طویل نماز پڑھائی حالانکہ آپ کا معمول اتنی طویل نماز پڑھانے کا نہیں ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''ہاں! یہ نماز (زیادہ طویل اس وجہ سے ہوئی کہ یہ) امید اور خوف کی نماز تھی (یعنی اس نماز کے دوران اللہ تعالیٰ سے کچھ دعائیں مانگ رہا تھا اور جہاں ان دعاؤں کی قبولیت کی امید تھی وہیں عدم قبولیت کا خوف بھی تھا اس لئے میں بہت زیادہ خشوع وخضوع اور عرض ودرخواست میں مصروف رہا جس سے پوری نماز زیادہ طویل ہوگئی) حقیقت یہ ہے کہ میں نے نماز میں اللہ تعالیٰ سے تین (چیزوں) کی درخواست کی' ان میں سے اللہ تعالیٰ نے مجھے دو عطا کر دی ہیں' اور ایک سے انکار کر دیا' میں نے اللہ تعالیٰ سے ایک درخواست تو یہ کی کہ وہ میری امت کو یعنی عام قحط (یا اسی طرح کی کسی بھی ایسی بلا) میں مبتلا نہ کرے جس سے (پوری) امت ہلاک وتباہ ہو جائے' میری یہ درخواست پوری ہوئی' دوسرے درخواست یہ تھی کہ مسلمانوں پر کوئی غیر مسلم دشمن مسلط نہ کرنا میری یہ درخواست بھی پوری ہوئی' میں نے (تیسری) درخواست یہ کی تھی کہ مسلمان آپس میں ایک دوسرے کو ہلاکت وعقوبت سے دوچار نہ کریں (یعنی وہ آپس میں لڑائی نہ کریں) لیکن میری یہ درخواست منظور نہیں ہوئی''۔

تشریح: فاطالها یعنی نماز کے ارکان میں طوالت فرمائی یا اس میں طویل دعا مانگی۔

شارح فرماتے ہیں یعنی ہاں یہ ایسی نماز تھی جس میں اللہ تعالیٰ سے ثواب کی امید بھی تھی اور اللہ تعالیٰ کا خوف بھی۔ میں کہتا ہوں یوں کہنا زیادہ مناسب ہے کہ یہ ثواب کے لحاظ سے امید وخواہش اور عقاب کے لحاظ سے خوف ودہشت کی نماز تھی کہ ان دو باعثوں میں سے کبھی ایک غالب آتا کبھی دوسرا۔

مفسرین کہتے ہیں باری تعالیٰ کے قول: ﴿يدعون ربهم خوفاً و طمعاً﴾ (اپنے رب کو خوف اور امید کے ساتھ پکارتے ہیں) میں واؤ بمعنی او ہے اور او مانعۃ الخلو کے لئے ہے۔

سألته ان لا يهلك امتی لسنة ۔ سنة سے مراد عام قحط ہے عام وباء بھی اس میں داخل ہے۔ مقصود یہ ہے کہ صفحہ ہستی سے نہ مٹا دیں۔

وسألته' ان لا يسلط عليهم عدواً من غيرهم : ''غیرھم'' سے مراد کفار ہیں آپس کی دشمنی اہون ہے کیونکہ اس سے مجموعی ہلاکت واقع نہیں ہوتی اور نہ ہی اعلاء کلمۃ السفلی ہوتا ہے۔

طیبیؒ کہتے ہیں یہ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کے قبیل سے ہے جو ﴿ویلبسکم شیعا﴾[الانعام] (کہ تم کو گروہ گروہ کر کے سب کو بھڑا دے اور تمہارے ایک کو دوسرے کی لڑائی چکھا دے) یعنی تم میں سے ہر ایک گروہ کا پیروکار ہو گا تمہارے درمیان لڑائی چھڑ جائے گی اور گھمسان کی جنگ ہو گی۔ تم ایک دوسرے کی گردن مارو گے اس طرح ہر گروہ دوسرے کو لڑائی کا مزہ چکھائے گا۔ مقصد یہ ہے کہ تم اپنی خواہشات کی بھینٹ چڑھتے ہوئے گروہوں میں بٹ جاؤ گے معالم میں سند متصل کے ساتھ امام بخاری سے حضرت جابرؓ کی روایت ہے حضرت جابرؓ فرماتے ہیں۔ جب آیت: ﴿قل هو القادر علی ان یبعث علیکم عذابا من فوقکم﴾ نازل ہوئی تو آپ ﷺ نے فرمایا میں آپ کی ذات کی پناہ میں آتا ہوں ﴿او من تحت ارجلکم﴾ کے جواب میں بھی فرمایا: اعوذ بوجھك جب ﴿او یلبسکم شیعا ویذیق بعضکم باس بعض﴾ پڑھی تو فرمایا هذا اهون او هذا ایسر یعنی یہ آسان ہے۔

راوی کو شک ہے کہ آپ ﷺ نے لفظ اهون فرمایا یا ایسر البتہ معنی دونوں کا ایک ہی ہے۔

مسلمان تین چیزوں سے محفوظ رہیں گے

۵۷۵۵ : وَعَنْ اَبِیْ مَالِكٍ الْاَ شْعَرِيِّ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ اللّٰهَ عَزَّوَجَلَّ اَجَارَكُمْ مِنْ ثَلَاثِ خِلَالٍ اَنْ لَّا یَدْعُو عَلَیْكُمْ نَبِیُّكُمْ فَتَهْلِكُوْا جَمِیْعًا وَاَنْ لَّا یَظْهَرَ اَهْلُ الْبَاطِلِ عَلٰی اَهْلِ الْحَقِّ وَاَنْ لَّا تَجْتَمِعُوْا عَلٰی ضَلٰلَةٍ . (رواہ ابوداود)

اخرجه ابو داؤد ٤/٤٥٢ حدیث رقم ٤٢٥٣۔

ترجمہ: ''حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''اللہ عزوجل نے تمہیں تین چیزوں سے محفوظ رکھا ہے (ایک تو یہ کہ) تمہارا نبی تمہارے لئے بددعا نہ کرے جس سے تم سب ہلاک ہو جاؤ۔ (دوسرے یہ کہ) اہل باطل اگرچہ اہل حق پر غالب نہ ہوں (اگرچہ اہل باطل کثیر تعداد میں اور اہل حق قلیل تعداد میں ہیں) اور (تیسرے یہ کہ) تم سب گمراہی پر جمع نہ ہو''۔ (ابوداؤد)

تشریح: قوله :ان لا یدعو علیکم نبیکم۔ یعنی تمہارا نبی تمہارے لئے بددعا نہ کرے جس سے تم ہلاک و برباد ہو جاؤ۔ جیسا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اور حضرت نوح علیہ السلام نے دعا کی تھی (ذکرہ ابن الملک) لیکن حضرت موسیٰ علیہ السلام کی بددعا خالص اپنی قوم کے خاص افراد قبط کے لئے تھی نا کہ سبط کے لئے جیسا کہ مخفی نہیں۔

چنانچہ آنحضرت ﷺ کا ایک ارشاد ہے: ''لا تزال طائفة من امتی ظاهرین علی الحق حتی تقوم الساعة''۔ قیامت آنے تک ہمیشہ میری امت میں سے کوئی نہ کوئی گروہ حق کے ساتھ غالب رہے گا۔ اس حدیث کو حاکم نے حضرت عمرؓ سے روایت کیا ہے:

ابن ماجہ میں حضرت ابوہریرہؓ سے یہ روایت منقول ہے: ''لا تزال طائفة من امتی قوامة علی امر الله لا یضرها من خالفها'' کہ آپ ﷺ نے فرمایا ہمیشہ میری امت میں سے کوئی نہ کوئی گروہ اللہ کے حکم پر قائم رہے گا اور ان کا دشمن ان کو کوئی

نقصان نہیں پہنچا سکے گا اور شاید یہ مضمون باری تعالیٰ کے اس قول سے ماخوذ ہے: ﴿یریدون ان یطفؤ نورا للہ بافواھھم ویأبی اللہ الا ان یتم نورہ ولو کرہ الکافرون﴾ ''وہ چاہتے ہیں کہ اللہ کے نور کو اپنے منہ سے بجھا دیں اور اللہ تعالیٰ ان انکاری ہے مگر اسی بات کا کہ اپنا نور پورا کرے گو کافر ناخوش رہیں۔''

مصابیح میں بجائے اہل الحق کے علی الحق کا لفظ ہے مصابیح کے شارح کہتے ہیں یعنی اگر وہ حق کو مٹا کر اس کا نور بجھانا چاہیں تو نہ بجھا سکیں گے اگرچہ اصل روایت میں لفظ اہل الحق ہے' کیونکہ ظہور سے کلی ظہور مراد ہے کہ جس سے مسلمان بالکل ختم ہو جائیں نہ کوئی گروہ باقی رہے اور نہ کوئی جماعت باقی رہے ایسا کبھی نہ ہوگا۔

تورپشتیؒ فرماتے ہیں باطل وگمراہ لوگوں اہل حق پر غالب نہ ہونے کا مطلب یہ ہے کہ دشمن تعداد و طاقت میں زیادہ ہونے کے باوجود اس طرح غالب نہ آئے گا کہ جس سے اہل حق ختم ہو جائیں اور حق کا نور ہی بجھ جائے۔ الحمد للہ یہ کبھی بھی نہیں ہوا باوجودیکہ امت مسلمہ گاہے بگاہے دشمن کے تسلط کی وجہ سے کرب و بلاء میں مبتلا رہی ہے اور امت مسلمہ کو ہمیشہ دشمن کا سامنا رہا ہے پھر بھی حق روشن ہے شریعت کی عمارت کھڑی ہے ہرگز اس کا نور بجھا سکیں اور نہ کبھی اس کے نشانات کو مٹا سکیں گے

وان لا تجمعوا علی ضلالۃ ایسا کبھی نہ ہوگا کہ ساری امت باطل پر متفق ومتحد ہو جائے۔ حدیث کا یہ جملہ گویا اس امر کی دلیل ہے کہ اجماع حجت ہے (اور اجماع سے مراد اپنے زمانہ کے مجتہد و بابصیرت علماء کا کسی حکم شرعی پر متفق ہونا ہے بے شک جو لوگوں کے ہاں اچھا ہے وہ اللہ کے ہاں بھی اچھا ہے اس کی تائید باری تعالیٰ کے اس ارشاد سے بھی ہوتی ہے: ﴿ومن یشاقق الرسول من بعد ما تبین لہ الھدی ویتبع غیر سبیل المومنین نولہ ما تولی ونصلیہ جھنم وساء ت مصیرا﴾ [الأعراف: ۱۲] ترجمہ جو شخص باوجود راہ ہدایت کے واضح ہو جانے کے بھی رسول کے خلاف رہے اور تمام مؤمنوں کی راہ چھوڑ کر چلے ہم اسے ادھر ہی متوجہ کر دیں گے جدھر وہ خود متوجہ ہوا اور دوزخ میں ڈال دیں گے وہ پہنچے گا بہت ہی بری جگہ۔ اجماع کے ماخذ میں یہ آیت سب سے بہترین ماخذ ہے امام شافعیؒ نے اجماع کو اس آیت سے مستنبط فرمایا ہے۔

طیبیؒ فرماتے ہیں حرف نفی زائدہ ہے جیسے باری تعالیٰ کے قول: للہ ﴿وما منعک الا تسجد﴾ [الاعراف: ۱۲] میں ماء زائد ہے اس کا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ یہ جس فعل پر داخل ہو اس میں تاکید' تحقیق کا معنی پیدا کر دیتا ہے۔ اس لئے کہ ثواب کا معنی لینا تب درست ہوگا جب مثبت یا منفی ہو۔

اس اُمت پر دو تلواریں جمع نہ ہوں گی

۵۷۵۶ : وَعَنْ عَوْفِ بْنِ مَالِكٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَنْ يَّجْمَعَ اللّٰهُ عَلٰى هٰذِهِ الْاُمَّةِ سَيْفَيْنِ سَيْفًا مِّنْهَا وَسَيْفًا مِنْ عَدُوِّهَا (رواہ ابوداود)

اخرجہ ابو داوٗد فی ۴۸۵/۴ حدیث رقم ۴۳۰۱ واحمد فی المسند ۵۷۵/۶۔

ترجمہ: ''حضرت عوف بن مالک رضی اللہ عنہ سے مروی ہے' فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: اللہ تعالیٰ اس امت پر دو تلواریں جمع نہیں کرے گا ایک تلوار تو خود مسلمانوں کی اور دوسری تلوار ان کے دشمنوں کی''۔ (ابوداؤد)

تشریح: یعنی بلکہ دونوں میں سے آسان کو اللہ تعالیٰ نے اختیار فرمایا۔ چنانچہ اس حدیث میں دو باتوں کی طرف اشارہ ہے۔

① امت مسلمہ کے بقاء کی طرف۔ ② امت مسلمہ کے قیامت تک محفوظ رہنے کی بشارت ہے۔ کیونکہ مسلم میں جابر بن سمرہؓ کی مرفوع روایت ہے: اس دین میں برابر ہمیشہ مسلمانوں کی ایک جماعت ایسی قائم رہے گی جو قیامت تک اس دین کی خاطر لڑتی رہے گی۔

قاضی کہتے ہیں اس حدیث کا مطلب یہ ہے کہ اس امت پر مسلمانوں اور ان کے دشمنوں کی تلواریں بیک وقت اس طرح اکٹھی نہیں ہوں گی جس سے ان کا استیصال ہو جائے بلکہ جب مسلمان آپس میں لڑنے جھگڑنے لگیں گے تو اللہ تعالیٰ ان پر غیر مسلم طاقت مسلط کر دے گا جس کا ظلم و جور مسلمانوں کو اتحاد کے جھنڈے کے نیچے لے آئے گا اور وہ آپس میں لڑنا جھگڑنا چھوڑ کر باہم شیر و شکر ہو جائیں گے۔ (وهو من قول الشيخ التوربشتي)

امام طیبیؒ کہتے ہیں ظاہر یہ ہے کہ یوں کہا جائے کہ اللہ تعالیٰ نے مجھ سے وعدہ فرمایا ہے کہ اس امت کے لوگوں پر ایک ساتھ دو لڑائیاں جمع نہیں ہوں گی کہ آپس میں بھی ایک دوسرے کے خلاف لڑیں اور کسی غیر مسلم دشمن کے خلاف بھی نبرد آزما ہوں بلکہ ان میں سے ایک ہوگی پہلی ہوگی تو دوسری نہ ہوگی دوسری ہوگی تو پہلی ختم ہو جائے گی کیونکہ یہ ماقبل کی احادیث کے موافق ہے۔

آنحضرت ﷺ کی نسل و نسبی فضیلت

۵۷۵۷ : وَعَنِ الْعَبَّاسِ اَنَّهٗ جَآءَ اِلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَكَاَنَّهٗ سَمِعَ شَيْئًا فَقَامَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَلَى الْمِنْبَرِ فَقَالَ مَنْ اَنَا فَقَالُوْا اَنْتَ رَسُوْلُ اللّٰهِ قَالَ اَنَا مُحَمَّدُ بْنُ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عَبْدِ الْمُطَّلِبِ اِنَّ اللّٰهَ خَلَقَ الْخَلْقَ فَجَعَلَنِيْ فِيْ خَيْرِهِمْ ثُمَّ جَعَلَهُمْ فِرْقَتَيْنِ فَجَعَلَنِيْ فِيْ خَيْرِهِمْ فِرْقَةً ثُمَّ جَعَلَهُمْ قَبَائِلَ فَجَعَلَنِيْ فِيْ خَيْرِهِمْ قَبِيْلَةً ثُمَّ جَعَلَهُمْ بُيُوْتًا فَجَعَلَنِيْ فِيْ خَيْرِهِمْ بَيْتًا فَاَنَا خَيْرُهُمْ نَفْسًا وَّخَيْرُهُمْ بَيْتًا ۔ (رواه الترمذي)

اخرجه الترمذي ٥٤٥/٥ حديث رقم ٣٦٠٧ واحمد في المسند

ترجمہ: ''حضرت عباس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ وہ (غضبناک ہو کر) نبی کریم ﷺ کی خدمت میں آئے گویا کہ انہوں نے (آپ کے نسب یا حسب میں طعن) سنا تھا۔ انہوں نے اس کی خبر آپ ﷺ کو دی۔ آنحضرت ﷺ نے منبر پر کھڑے ہوئے اور فرمایا کہ تم لوگ جانتے ہو میں کون ہوں؟ صحابہؓ نے عرض کیا کہ آپ اللہ کے رسول ہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: میں محمد بن عبداللہ بن عبدالمطلب ہوں (مشہور و معروف تھے) حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مخلوق (جنات و انسان) کو پیدا کیا تو مجھے اس مخلوق میں سے بہتر مخلوق (نوع انسانی) میں پیدا کیا' پھر اس بہترین مخلوق (نوع انسانی) کے اللہ تعالیٰ نے دو طبقے کئے (ایک عرب دوسرا عجم) اور مجھے ان دونوں طبقوں میں سے بہترین طبقہ (عرب) میں پیدا کیا' پھر اللہ تعالیٰ نے اس بہترین طبقہ (عرب) کو قبائل در قبائل کیا اور مجھے ان قبائل میں سے بہترین قبیلہ (قریش) میں پیدا کیا' پھر اللہ

تعالیٰ نے اس بہترین قبیلہ (قریش) کے مختلف گھرانے بنائے اور مجھے ان گھرانوں میں سے بہترین گھرانے (بنوہاشم) میں پیدا کیا' پس میں ان (تمام نوع انسانی اور تمام اہل عرب) میں (ذات وحسب) کے اعتبار سے بھی سب سے بہتر واعلیٰ ہوں اور خاندان وگھرانے کے اعتبار سے بھی سب سے بہتر ہوں"۔ (ترمذی)

تشریح: طیبیؒ فرماتے ہیں: "فکانه سمع" یہ (کلام) محذوف کا سبب ہے۔ ای جاء العباس غضبان بسبب ما یسمع طعنا من الکفار فی رسول اللہ۔ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کی طرح: ﴿لولا أنزل هذا القرآن علی رجل من القريتين عظيم﴾ [الزخرف: ۳۱] وہ یہ تھا کہ حضرت عباسؓ نے کفار کو یہ کہتے سنا کہ اگر اللہ میاں کو مکہ ہی کے کسی شخص کو اپنا نبی اور رسول بنانا تھا تو اس شہر کے بڑے بڑے صاحب دولت وثروت جیسے ولید ابن مغیرہ اور عروہ ابن مسعود جیسے اونچے درجے کے سرداروں کو بناتے ان کو چھوڑ کر محمد کا انتخاب کرنے کی کیا ضرورت تھی اس طرح کے دوسرے تحقیر کے الفاظ بھی کہتے تو آپ ﷺ نے سرزنش کر کے یہ واضح کیا کہ خدا کا آخری نبی بننے اور خدا کی طرف سے نبوت اور آخری کتاب پانے کا سب سے زیادہ مستحق میں ہی تھا کیونکہ آپ ﷺ کا نسب عظمت کے اعتبار سے زیادہ بلند اور اور حسب کے اعتبار سے اعلیٰ واشرف ہے اسی وجہ سے جب انہوں نے انت رسول اللہ کہا تو ﴿انا محمد بن عبدالله﴾ سے بنیادی جواب کا اظہار فرمایا۔ اس تاویل کی تائید اس روایت سے بھی ہوتی ہے جو امام بخاریؒ نے ابوسفیان سے نقل کی ہے کہ جب روم کے بادشاہ ہرقل نے ابوسفیانؓ سے آپ ﷺ کے نسب کے متعلق پوچھا تو ابوسفیانؓ نے جواب دیا هو فینا ذو نسب یعنی وہ ہم میں صاحب نسب ہیں ہرقل کہنے لگا میں اس نبی کا نسب نامہ پوچھ رہا ہوں آپ کہتے ہیں وہ ہم میں صاحب نسب ہیں۔ رسول تو ذونسب قوم ہی میں پیدا ہوا کرتے ہیں آپ نے دیکھا ہرقل نے نسب کو تبعث کے لئے کیسے ظرف بنا کر لفظ فی کے ساتھ ذکر کیا ہے یعنی رسول نسب کے اعتبار سے انسب ہی ہوتا ہے (آپ اس کا سلسلہ نسب بتائیں) پھر دوبارہ آپ ﷺ نے بطور تحدیث نعمت اور ترغیب امت کی خاطر اپنے حسب ونسب کی طہارت ونظافت کو عمومی وخصوصی طور پر بیان فرمایا۔ قوله: فقال: ان الله خلق الخلق۔ یہاں خلق سے مراد جن وانس ہیں طیبیؒ نے دور کی بات لکھی ہے کہ فرشتوں کو بھی اس میں داخل کیا ہے۔ فانا خیرهم نفسا و خیرهم بیتا۔ اسی کی طرف باری تعالیٰ نے بھی اشارہ فرمایا: ﴿لقد جاءكم رسول من انفسكم﴾ [التوبة: ۱۲۸] "ترجمہ تمہارے پاس ایک ایسے پیغمبر تشریف لائے ہیں جو تمہاری جنس سے ہیں یعنی جنس بشریت سے ہیں" دوسری آیت ہے: ﴿لقد من الله علی المومنين اذ بعث فيهم رسولا من انفسهم﴾ [آل عمران: ۱٦٤] "بے شک مسلمانوں پر اللہ کا بڑا احسان ہے کہ ان ہی میں سے ایک رسول ان میں بھیجا جو انہیں اس کی آیتیں پڑھ کر سناتا ہے"۔

طیبیؒ فرماتے ہیں آپ ﷺ نے "ثم جعلهم فرقتين کے بعد ثم جعلهم قبائل فرما کے عرب کے چھ طبقات کی طرف اشارہ فرمایا ہے۔ وہ طبقات یہ ہیں: شعب' قبیلہ' عمارہ' بطن' فخذ' فصیلہ۔

شعب قبائل کا مجموعہ ہوتا ہے اور "عمارہ" بطون کا مجموعہ ہوتا ہے بطن "افخاذ" کا مجموعہ ہوتا ہے۔ "فخذ" فصائل کا مجموعہ ہوتا ہے۔

(آپ ﷺ کے نسب میں) خزیمہ شعب ہے' کنانہ قبیلہ ہے' قریش عمارہ ہے' قصی بطن ہے' ہاشم فخذ اور عباس فصیلة

ہے۔

شعب کو شعب اس لئے کہتے ہیں کہ تمام قبائل کی شاخیں اسی سے نکلتی ہیں۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا قول "خلق الخلق" سے مراد ملائکہ اور ثقلین (جن وانس) ہیں **فجعلنی فیه خیرهم** کا معنی ہے مجھے بہترین طبقہ عرب میں پیدا کیا پھر اسی طرح آخر تک یہ اعزاز برقرار رہا۔

بے شک اللہ تعالیٰ کے فضل کرم سے میں ازل سے ہی اپنی ذات کے اعتبار سے تمام مخلوق میں بہترین رہا۔ بایں طور کہ سب سے پہلے انسان بنایا پھر رسول بنایا پھر رسولوں میں بھی خاتم الرسل بنایا' میرے ذریعہ ہی دائرہ رسل کو مکمل کیا۔ قبیلہ کے اعتبار سے بھی میں ان سب میں بہتر ہوں کیونکہ مجھے اللہ تعالیٰ ایک پاکیزہ عمدہ نسب سے دوسرے پاکیزہ عمدہ نسب کی طرف منتقل فرماتا رہا' حتی کہ میں اشرف واکمل قبائل سے ہوتا ہوا عبداللہ کے صلب سے ان کے نکاح کے بعد پیدا ہوا۔ پس میں اللہ کے ہاں ساری مخلوق سے افضل واکرم ہوں۔ جامع کی روایت میں یہ الفاظ آئے ہیں:

ان الله خلق الخلق' فجعلنی فی خیر فرقهم' وخیر الفرقتین' ثم خیر القبائل' فجعلنی فی خیر القبیلة' ثم خیر البیوت' فجعلنی فی خیر بیوتهم' فأنا خیرهم نفسا و خیرهم بیتا۔

"جب اللہ نے مخلوق کو پیدا کیا تو مجھے اس مخلوق میں سے بہترین مخلوق (نوع انسانی) میں پیدا کیا پھر بہترین قبائل میں سے بہترین قبیلہ (قریش) میں پھر گھرانوں میں سے سب سے بہترین گھرانہ (بنی عبدالمطلب) میں پیدا کیا تو میں ذات اور گھرانے کے اعتبار سے تمام نوع انسانی میں افضل ہوں

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو نبوت کب عطا ہوئی؟

۵۷۵۸ : وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالُوْا یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ مَتٰی وَجَبَتْ لَكَ النُّبُوَّةُ قَالَ وَاٰدَمُ بَیْنَ الرُّوْحِ وَالْجَسَدِ (رواه الترمذی)

اخرجه الترمذی ۵/ ۵۴۶ حدیث رقم ۳۶۰۹۔

ترجمہ: "حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے' فرماتے ہیں کہ (ایک دن) صحابہؓ نے پوچھا کہ یارسول اللہ! آپ صلی اللہ علیہ وسلم نبوت کے لئے کس وقت نامزد ہوئے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: "(اس وقت جبکہ) آدم علیہ السلام روح اور بدن کے درمیان تھے"۔ (ترمذی)

تشریح: **بین الروح والجسد** کا مطلب یہ ہے کہ جب ان کا پتلا بغیر روح کے زمین پر پڑا ہوا تھا یعنی ان کی روح کا تعلق ان کے جسد خاکی کے ساتھ قائم نہیں ہوا تھا۔

امام طیبیؒ فرماتے ہیں تو یہ جملہ صحابہ کرام کے سوال متی وجبت کا جواب ہے۔ ای **وجبت فی هذه الحالة** یعنی اس وقت نامزد ہوئی عامل اور صاحب حال دونوں محذوف ہیں۔

تخریج: اس حدیث کو ابن سعد اور ابونعیم نے کتاب الحلیہ میں میسرۃ الفخر سے اور ابن سعد ابن ابی الجدعاء سے روایت کیا ہے۔

طبرانی نے الکبیر میں حضرت عبداللہ ابن عباسؓ سے کنت نبیا و آدم بین الروح والجسد کے الفاظ کے ساتھ نقل کیا ہے جامع الاصول میں بھی اسی طرح ہے۔ابن ربیع کہتے ہیں امام احمدؒ اور بخاریؒ نے کتاب التاریخ میں اس روایت کو ذکر کیا ہے اور حاکم کہتے ہیں یہ روایت صحیح ہے ابونعیم نے دلائل النبوۃ میں اس روایت کے علاوہ ابو ہریرہؓ کی روایت کنت اول النّبیین فی الخلق و آخرھم فی البعث مرفوعا نقل کیا ہے باقی عوم الناس کی زبان میں جو الفاظ مشہور ہیں کہ کنت نبیا و آدم بین الماء ولطین اس روایت کے متعلق سخاویؒ فرماتے ہیں ان الفاظ کے ساتھ میں اس حدیث سے واقف نہیں ہوں چہ جائیکہ یہ زیادت:و کنت نبیا ولا ماء ولا طین۔ ''میں اس وقت نبی تھا جبکہ نہ پانی تھا اور نہ مٹی تھی)

ابن حجر عسقلانی فرماتے ہیں کہ زیادت تو ضعیف ہے اور اس کا مقابل قوی ہے۔زرکشیؒ فرماتے ہیں ان الفاظ کے ساتھ اس حدیث کی کوئی اصل نہیں لیکن ترمذی میں ہے:متی کنت نبیا۔ قال :و آدم بین الروح والجسد (کہ آدم علیہ السلام کی روح جسد خاکی سے متعلق بھی نہیں ہوئی تھی)۔

امام سیوطیؒ فرماتے ہیں ترمذی کی اس روایت:ولا آدم ولا ماء ولا طین میں عوام نے یہ کے الفاظ اپنی طرف سے بڑھائے ہیں ان الفاظ کی کوئی اصل نہیں۔

آنحضرت ﷺ اور ختم نبوت

۵۷۵۹ : وَعَنِ الْعِرْبَاضِ بْنِ سَارِيَةَ عَنْ رَّسُولِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَنَّهٗ قَالَ اِنِّي عِنْدَ اللّٰهِ مَكْتُوْبٌ خَاتِمُ النَّبِيِّيْنَ وَاِنَّ اٰدَمَ لَمُنْجَدِلٌ فِيْ طِيْنَتِهٖ وَسَاُخْبِرُكُمْ بِاَوَّلِ اَمْرِيْ دَعْوَةُ اِبْرَاهِيْمَ وَبِشَارَةُ عِيْسٰى وَرُؤْيَا اُمِّيَ الَّتِيْ رَاَتْ حِيْنَ وَضَعَتْنِيْ وَقَدْ خَرَجَ لَهَا نُوْرًا اَضَآءَ لَهَا مِنْهُ قُصُوْرُ الشَّامِ ۔ (رواه في شرح السنة)

اخرجه البغوی فی شرح السنة ١٣/ ٢٠٧ حديث رقم ٣٦٢٦

ترجمہ:''حضرت عرباض بن ساریہ رضی اللہ عنہ رسول اللہ ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا:''میں اللہ تعالیٰ کے ہاں اسی وقت سے خاتم النّبیین لکھا ہوا ہوں جب کہ آدم علیہ السلام اپنی گندھی ہوئی مٹی کی صورت میں پڑے ہوئے تھے اور میں تمہیں ابھی اپنے معالے (نبوت) کے بارے میں بتاتا ہوں میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعا ہوں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی بشارت ہوں اور اپنی والدہ کا خواب ہوں جو انہوں نے میری پیدائش کے وقت دیکھا تھا' انہوں نے دیکھا کہ ان کے سامنے ایک نور ظاہر ہوا جس نے ان پر شام کے محلات کو روشن کر دیا تھا''۔اس روایت کو بغویؒ نے (اپنی اسناد کے ساتھ) شرح السنہ میں نقل کیا ہے''۔

تشریح: خاتم : خاتم خاء کے فتحہ اور کسرہ کے ساتھ (یعنی دونوں پڑھا جا سکتا ہے۔مکتوب کے لئے نائب فاعل ہونے کی وجہ سے مرفوع ہے بعض کا کہنا ہے کہ تمیز ہونے کی وجہ سے مضوب ہے۔ای مکتوب من ھذه الحيثية (میرا نام خاتم النّبیین کی حیثیت سے پہلے ہی لکھا ہوا تھا) وان آدم لمنجدل۔

لفظ منجدل: جدال سے مشتق ہے کسی چیز کا زمین پر گرا دینا۔ای و الحال انه لساقط و ملقي (یعنی حال یہ ہے کہ اس وقت حضرت آدم کا کیچڑ کا پتلا زمین پر پڑا ہوا تھا فی طینته اس سے خلقت مراد ہے۔ یہ حرف مشبہ بالفعل کی خبر ثانی ہے اس لئے کہ جملہ ''مکتوب'' کی ضمیر سے حال ہے۔ای کتبت خاتم الانبیاء في الحال التي آدم مطروح علی الارض حاصل في اثناء خلقته لما یفرغ من تصویره وتعلق الروح به۔یعنی میرا خاتم النّبیین کی حیثیت سے اس دنیا میں مبعوث ہونا اللہ تعالیٰ کے ہاں اس وقت سے لکھا جا چکا تھا جبکہ آدم علیہ السلام کے پتلے میں جان تک نہیں پڑی تھی بلکہ ان کا پتلا بن کر تیار بھی نہیں ہوا تھا بن رہا تھا (یعنی پیدائش کے مراحل سے گزر رہے تھے) ابھی تک حضرت آدم علیہ السلام کی روح ان کے جسد خاکی سے متعلق بھی نہیں ہوئی تھی تمام شارحین نے اسی طرح ذکر کیا ہے۔ (کذا ذکره الشراح)

قوله :دعوة ابراهیم ۔

لفظ دعوۃ رفع کے ساتھ ہے۔ یہ خبر ہے مبتداء محذوف کی۔ای هو دعوة ابراهیم۔ یہاں اس سے مراد حضرت ابراہیم علیہ السلام کی وہ دعا ہے جو تعمیر کعبہ کے وقت مانگی تھی۔ربنا وابعث فیهم رسولا منهم۔ [البقرة : ١٢٩] ترجمہ میرے پروردگار اس جماعت (بنی اسماعیل) میں ان ہی میں سے ایک رسول بھیج۔''وبشارة عیسٰی'' چنانچہ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعا کو شرف قبولیت بخشا اور ایک نسخہ میں (لفظ دعوۃ) جر کے ساتھ ہے۔ ماقبل سے بدل ہونے کی وجہ سے ''بشارۃ عیسیٰ'' کی ترکیب بھی اسی ماقابل کی طرح ہے۔ مراد اس آیت میں موجود خوشخبری ہے:﴿ومبشرا برسول یأتي بعدی اسمه احمد﴾[الصف : ٦] (اے بنی اسرائیل) اپنے بعد آنے والے ایک رسول کی میں تمہیں خوشخبری سنانے والا ہوں جن کا نام احمد ہے۔

قوله:ورؤیا امي التي رأت حین وضعتني۔طیبی وغیرہ شارحین نے لکھا ہے کہ ان الفاظ سے مراد خواب میں دیکھنا بھی ہوسکتا ہے اور بیداری میں دیکھنا بھی مراد ہوسکتا ہے۔پہلی صورت میں پیدائش کے وقت سے کچھ پہلے کا عرصہ مراد ہوگا چنانچہ ابن جوزیؒ نے کتاب الوفاء میں اسی طرح کی روایت نقل کی کہ جب آنحضرت ﷺ کی والدہ ماجدہ حضرت آمنہ کے ہاں ولادت کا وقت قریب آیا تو انہوں نے خواب دیکھا ایک فرشتہ آ کر کہنے لگا کہ کہو میں اس بچے (یعنی آنحضرت ﷺ) کو ہر حسد کرنے والے کے شر سے خدائے واحد کی پناہ میں دیتی ہوں حضرت آمنہ نے اس سے پہلے استقرار حمل کے وقت بھی خواب میں دیکھا تھا کہ ایک فرشتہ آیا اور کہنے لگا کیا تم جانتی ہو تمہارے پیٹ میں اس امت کا سردار نبی ہے۔

دوسری صورت (یعنی اگر بحالت بیداری دیکھنا) مراد ہو تو میں محذوف ہوگا۔اس پر آگے کی عبارت دلالت کرتی ہے۔

وقد خرج۔خرج ظہر کے معنی میں ہے۔یعنی حضرت آمنہ سے ایسا نور ظاہر ہوا کہ ملک شام کے محل و مکانات سامنے نظر آنے لگے۔اس نور سے مراد نبوت و رسالت کی روشنی ہے جس نے مشرق سے لے کر مغرب تک پوری روئے زمین کو منور کر دیا جس سے کفر و شرک کا اندھیرا چھٹ گیا۔ایک نسخے میں لفظ ''قصور'' نصب کے ساتھ ہے۔ یہ صورت میں قصور سے خالی نہیں کیونکہ ''منه'' پہلے سے موجود ہے ورنہ تو ''اضاء'' خود لازمی و متعدی دونوں طرح آتا ہے۔

۵۷۶۰ : وَ رَوَاہُ اَحْمَدُ عَنْ اَبِیْ اُمَامَةَ مِنْ قَوْلِهٖ :سَاُخْبِرُکُمْ اِلٰی اٰخِرِہٖ ۔

اخرجه احمد فی المسند ١٢٧/٤۔

ترجمہ: ''امام احمد نے بھی اس روایت کو ساخبیر کم سے آخر تک ابوامامہؓ سے نقل کیا ہے''۔

تشریح: میں کہتا ہوں صحیح ابن حبان اور حاکم میں حضرت عرباض سے انی عندالله المکتوب خاتم النّبیین وان آدم لمنجدل فی طینته کے الفاظ منقول ہیں اور ابن عساکر نے حضرت عبادہ بن صامت سے روایت کیا ہے: انا دعوة ابراهیم وکان آخر من بشربی عیسی بن مریم۔ میں حضرت ابراہیم کی دعا ہوں اور عیسیٰ بن مریم نے میری خوشخبری سنائی۔

آنحضرت صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کے خصائص

۵۷۶۱ : وَعَنْ اَبِیْ سَعِیْدٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اَنَا سَیِّدُ وُلْدِ اٰدَمَ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ وَلَا فَخْرَ وَبِیَدِیْ لِوَاءُ الْحَمْدِ وَلَا فَخْرَ وَمَا مِنْ نَبِیٍّ یَوْمَئِذٍ اٰدَمُ فَمَنْ سِوَاهُ اِلَّا تَحْتَ لِوَائِیْ وَاَنَا اَوَّلُ مَنْ تَنْشَقُّ عَنْهُ الْاَرْضُ وَلَا فَخْرَ۔ (رواه الترمذی)

اخرجه الترمذی فی السنن ٥٤٨/٥حدیث رقم ٣٦١٥ وابن ماجه فی السنن ١٤٤٠/٢حدیث رقم ٤٣٠٨ واحمد فی المسند ٢/٣۔

ترجمہ: ''حضرت ابوسعید رضی اللہ عنہ سے مروی ہے' فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:'' قیامت کے دن میں تمام اولادِ آدم کا سردار ہوں گا اور میں یہ بات بطور فخر نہیں کہتا میرے ہاتھ میں (قیامت کے دن مقام محمود میں) حمد کا جھنڈا ہوگا اور میں یہ بات بطور فخر نہیں کہتا' اس دن کوئی بھی نبی خواہ وہ آدم ہوں یا کوئی اور ایسا نہیں ہوگا جو میرے جھنڈے کے نیچے نہیں آئے گا اور (قیامت کے دن) سب سے پہلے مجھے قبر سے اٹھایا جائے گا۔ میں یہ بات بطور فخر نہیں کہتا''۔ (ترمذی)

تشریح: قوله :انا سیّد ولد آدم ولا فخر یعنی میں یہ بات بطور فخر نہیں کہہ رہا بلکہ اللہ کے فضل کے اقرار' تحدیث نعمت اور مامور بہ کی تبلیغ کے لئے کہہ رہا ہوں۔ بعض نے اس کا مطلب یہ بیان کیا ہے کہ میں یہ بات اپنی ذات پر فخر کرتے ہوئے نہیں کہہ رہا بلکہ اس ذات پر فخر کرتے ہوئے کہہ رہا ہوں جس نے یہ مجھے مرتبہ مجھے عطا فرمایا۔

میں کہتا ہوں ممکن ہے کہ اس کا مطلب یہ ہو: ولا فخر لی بهذه السیادة...... کہ مجھے اس سیادت پر فخر نہیں بلکہ اللہ کی عبادت و بندگی پر فخر ہے کیونکہ وہ موجب ''حسنیٰ وزیادت'' ہے۔

طیبیؒ فرماتے ہیں یہ جملہ حال موکدہ ہے۔ای قول هذا ولا فخر۔ میں فخر کی حالت میں نہیں کہہ رہا (یا کہہ تو رہا ہوں لیکن یہ کہنا فخر سے خالی ہے)۔

تورپشتیؒ فرماتے ہیں فخر یہ ہے کہ کوئی شخص اشیاء خارجیہ مثلاً قال وحال سے اپنے آپ کو دوسرے لوگوں سے بلند و برتر سمجھے اور غرور و گھمنڈ میں مبتلا ہو جائے۔

امام نوویؒ فرماتے ہیں انا سیّد ولد آدم ۔اس کی دو وجہیں ہیں۔

① باری تعالیٰ کے ارشاد واما بنعمة ربك فحدث[الضحی : ۱۱] کے حکم کی بجا آوری کے لئے فرمایا۔

② اور اس حکم کا اظہار کرنے کے لئے فرمایا: جس کی ترغیب وتبلیغ امت میں واجب تھی تاکہ امت اس پر اعتقاد رکھے اور اس کے مطابق آپ کی توقیر وتعظیم کرے، جس کا حکم خود باری تعالیٰ نے دیا۔

امام راغب اصفہانیؒ فرماتے ہیں اگر آپ کو یہ اشکال ہو کہ انسان کا خود اپنی تعریف کرنا کیسے مستحسن ہوسکتا ہے۔ حالانکہ اس کی قباحت دلیل سے ثابت ہے لقمان حکیم سے کسی نے پوچھا وہ کون سی چیز ہے جو حق ہونے کے باوجود اچھی نہیں؟ آپ نے فرمایا اپنی تعریف کرنا۔

ہم کہتے ہیں اگر مخاطب متکلم کے احوال سے واقف نہ ہو تو اس کی آگاہی کے لئے اپنی تعریف کرنا جائز ہے۔ اس کی مثال یوں سمجھیں معلم اپنے متعلم سے کہتا ہے: اسمع منی فانك لاتجد مثلی۔ یہ سبق مجھ سے پڑھ لے میری طرح اس کو پڑھانے والا تجھے نہیں ملے گا

اور اسی طرح حضرت یوسف علیہ السلام کا قول ہے: ﴿اجعلنی علی خزآئن الارض انی حفیظ علیم﴾ [یوسف :۵۵] (ترجمہ مجھ کو مقرر کر ملک کے خزانوں پر میں نگہبان ہوں خوب جاننے والا) بعض محققین سے پوچھا گیا انسان کی وہ کون سی چیز ہے جس کو اللہ کی خاطر کیا جائے تو قبیح نہیں ہوتی باوجود شرع میں وارد ہونے کے تو انہوں نے یہ شعر پڑھا:

ويقبح من سواك الشیء عندی ☆ وتفعله فيحسن منك ذكيا

امام غزالیؒ احیاء علوم الدین میں فرماتے ہیں: حضرت عمرؓ نے فرمایا: المدح هو الذبح۔ تعریف کرنا ذبح کرنا ہے۔ اس وجہ سے کہ مذبوح عمل میں سست ہو جاتا ہے۔ ممدوح کا حال بھی یہی ہے کیونکہ مدح سرائی سستی پیدا کرتی ہے اور انسان کو کبر اور خود پسندی میں مبتلا کر دیتی ہے۔ ذبح کی طرح یہ بھی مہلک چیز ہے۔ اگر مدح سرائی ان مہلکات سے خالی ہو تو کوئی حرج نہیں بلکہ بسا اوقات مدح سرائی مستحب ہے۔ اسی وجہ سے آنحضرت ﷺ نے اپنے صحابہ کی مدح سرائی فرمائی ہے اعلیٰ مراتب پر فائز ہونے کی وجہ سے صحابہ کرامؓ میں تکبر اور خود پسندی پیدا ہونے کا شائبہ تک نہ تھا بلکہ آنحضرت ﷺ کی مدح سرائی سے ان میں مزید اعمال کی رغبت پیدا ہو جاتی تھی آپ ﷺ کو ان حضرات میں مبعوث کرنے کا مقصد بھی یہی تھا کہ آپ ﷺ ہر طریقہ سے ان میں مکارم اخلاق پیدا فرمائیں۔

میں کہتا ہوں اس کی نظیر یہ ہے کہ جب بھرے مجمع میں عالم کا قابل وعاقل شاگرد یا شیخ کا مرید قابل وعاقل مرید اس کی تعریف کرتا ہے تو شیخ اور عالم میں مزید علم ومجاہدہ کی رغبت پیدا ہوتی ہے اور یہ اعلیٰ مراتب تک پہنچنے کا سبب بنتا ہے۔

ہاں مخاطب کی عقل میں فتور ہو تو اس سے نقصان ہوتا ہے کیونکہ (مخاطب تکبر اور خود پسندی میں مبتلا ہو کر ضائع ہو جاتا ہے)

پس ہم زیادتی (یعنی رزق) کے بعد کمی سے اور (علم) میں اضافہ کے بعد نقصان سے اللہ کی پناہ مانگتے ہیں۔ حکماء کا قول ہے کہ کسی چیز میں اضافہ نہ ہونے کا مطلب اس میں نقصان کا ہونا ہے۔ جس شخص کے کل اور آج میں فرق نہ ہو وہ مغبون ہے۔

حدیث میں ہے: منهومان لايشبعان۔ کہ دو بھوکے کبھی سیر نہیں ہوتے۔ ① دنیا کا بھوکا ② علم کا بھوکا۔

قرآن کریم میں ہے: ﴿وقل رب زدنی علما﴾ [طٰہٰ : ۱۱۴] آپ کہہ دیجئے اے میرے رب میرے علم میں اضافہ فرما۔

نہایہ میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو جس شرف و عظمت سے نوازا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے امت کو اس کی خبر دی بطور تحدیث نعمت کے ارشاد فرمایا تا کہ امت کو علم ہو جائے اور امت آپ کی محبت کے ذریعہ ایمان کو مضبوط بنائے۔ اسی وجہ سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس جملہ کے بعد فوراً "**ولا فخر**" کے کلمات ارشاد فرمائے کہ یہ یعنی یہ فضیلت محض اللہ کے فضل و کرم سے ہے بذاتِ خود پانے کی طاقت نہ تھی اس لئے مجھے اس پر فخر کرنے کی ضرورت نہیں۔

وبیدی: قیامت کے دن مقام محمود میں میرے پاس ہوگا یا میرے تصرف میں ہوگا۔ **لواء الحمد**: حمد کا جھنڈا ہوگا۔ لواء لام کے کسرہ اور الف ممدودہ کے ساتھ یہ علَم ہے۔ قیامت کے دن اہل خیر و شر کے لئے مخصوص مقامات ہوں گے جو جگہ جگہ نصب کئے ہوں گے۔ ہر متبوع کا ایک جھنڈا ہوگا جس سے اس کی قدر و منزلت کا پتہ چلے گا' خواہ وہ اہل حق سے ہو خواہ اہل شر سے۔ بہر کیف جھنڈا نصب ہونے والے مقامات میں سب سے اعلیٰ مقام مقام حمد ہے۔

النہایۃ میں ہے کہ: "**اللواء**" سے مراد "**رایہ**" ہے۔ پس امیر جیش ہی تھامتا ہے۔ مراد یہ ہے کہ قیامت کے دن آپ صلی اللہ علیہ وسلم حمد میں منفرد ہوں گے اور تمام مخلوق کے سامنے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی شہرت کا اظہار ہوگا۔ چنانچہ "لواء" کو مقام شہرت میں ذکر کیا۔

طیبیؒ فرماتے ہیں: "**لواء الحمد**" سے مراد شہرت ہوگی اور یہ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو حمد کی یہ امتیازی شان ہوگی جو تمام مخلوق میں (شہرت) ناموری اور حمد کے ساتھ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم یکتا ہوں گے۔ نمبر۲: قیامت کے دن حقیقتاً آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا کوئی پرچم ہوگا جس کا نام **لواء الحمد** ہے۔ تورپشتیؒ کی تشریح سے بھی یہی کچھ واضح ہوتا ہے تورپشتیؒ فرماتے ہیں اللہ کے نیک بندوں کے مقامات میں مقام حمد سے اعلیٰ وارفع کوئی مقام نہیں۔ قیامت کے دن سارے مقامات اس مقام سے نیچے ہوں گے جو کہ ہمارے پیارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم دنیا و آخرت دونوں میں سید المرسلین و احمد الخلائق ہیں اس لئے قیامت کے دن ان ہی کو یہ پرچم عطا ہوگا تا کہ اولین و آخرین سب کو اپنے جھنڈے جگہ عطا فرمائیں۔ اسی کی طرف آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے قول مبارک "**آدم ومن دونه تحت لوائي**" سے اشارہ فرمایا کہ آدم اور ان کے علاوہ انبیاء میرے جھنڈے کے نیچے ہوں گے۔ اسی وجہ سے اپنی کتاب کا آغاز حمد سے فرمایا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اسم گرامی احمد و محمد کو اسی سے مشتق کیا۔

قیامت کے دن آپ صلی اللہ علیہ وسلم مقام محمود پر کھڑے کئے جائیں گے اور اس مقام محمود پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر ثناء کے ایسے کلمات کھلیں گے جو نہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے کسی پر کھلے تھے اور نہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کسی پر کھلیں گے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو جو شرف نصیب ہوا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی برکت سے امت کو بھی اسی سے نوازا گیا کتب سابقہ میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی امت کے اوصاف بھی یہی بیان کئے گئے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی امت میں ایسے حمد سرا ہیں کہ جو غمی اور خوشی دونوں حالتوں میں اللہ کی حمد و ثنا کرتے ہیں تمام تعریفیں اللہ ہی کے لئے ہیں اس میں کوئی فخر کی بات نہیں۔ اس لئے کہ اس سے مرتبہ قرب پیدا ہوتا ہے کہ جس پر مقام رضاء سے لقاء ناشی ءمرتب ہوتا ہے اور فناء بالبقاء اس کا اعلیٰ درجہ ہے کیونکہ اس سے اپنے مولیٰ کی طرف ایسی توجہ حاصل ہوتی ہے کہ جس سے انسان ماسوا اللہ سب کو بھول جاتا ہے۔

قوله :وما من نبي يومئذ آدم: لفظ "آدم" مرفوع ہے بعض کا کہنا ہے کہ "من" کہتے ہیں نبی کے محل یا لفظ "نبی" سے

بدل یا عطف بیان ہونے کی وجہ سے مجرور ہے اور " فمن سواہ الا تحت لوائی " ہے۔
طیبیؒ فرماتے ہیں لفظ نبی نکرہ ہے تحت النفی ہے اور "من" استغراقیہ استغراق جنس کا فائدہ دے رہا ہے۔ اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا قول مبارک "آدم فمن" (نبی کے) محل سے عطف بیان یا بدل ہے۔ "من" موصولہ ہے اور صلہ لفظ "سواہ" صلہ ہے اور یہ اس لئے صحیح ہے کہ فمن ظرف ہے اور "فمن سواہ" کے شروع میں فاتفصیلہ واؤ ترتیب سے راجح قرار دیا ہے۔ عرب کے قول "الامثل فالامثل" کی طرز پر ہے۔

قولہ: وانا اول من تنشق عنہ الارض ولا فخر رواہ الترمذی۔

جامع الاصول میں یہ زیادت بھی منقول ہے: وانا اول شافع واول مشفع ولا فخر۔ اس حدیث کو امام احمدؒ ترمذی اور ابن ماجہ نے روایت کیا ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم حبیب خدا ہیں

۵۷۶۲ : وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ جَلَسَ نَاسٌ مِّنْ اَصْحَابِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَخَرَجَ حَتّٰى اِذَا دَنَا مِنْهُمْ سَمِعَهُمْ يَتَذَاكَرُوْنَ قَالَ بَعْضُهُمْ اِنَّ اللّٰهَ اتَّخَذَ اِبْرَاهِيْمَ خَلِيْلًا وَقَالَ اٰخَرُ مُوْسٰى كَلَّمَهُ تَكْلِيْمًا وَقَالَ اٰخَرُ فَعِيْسٰى كَلِمَةُ اللّٰهِ وَرُوْحُهُ وَقَالَ اٰخَرُ اٰدَمُ اصْطَفَاهُ اللّٰهُ فَخَرَجَ عَلَيْهِمْ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَقَالَ قَدْ سَمِعْتُ كَلَامَكُمْ وَعَجَبَكُمْ اِنَّ اِبْرَاهِيْمَ خَلِيْلُ اللّٰهِ وَهُوَ كَذٰلِكَ وَمُوْسٰى نَجِيُّ اللّٰهِ وَهُوَ كَذٰلِكَ وَعِيْسٰى رُوْحُ اللّٰهِ وَكَلِمَتُهُ وَهُوَ كَذٰلِكَ وَاٰدَمُ اصْطَفَاهُ اللّٰهُ وَهُوَ كَذٰلِكَ اَلَا وَاَنَا حَبِيْبُ اللّٰهِ وَلَا فَخْرَ وَاَنَا حَامِلُ لِوَاءِ الْحَمْدِ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ تَحْتَهٗ اٰدَمُ فَمَنْ دُوْنَهٗ وَلَا فَخْرَ وَاَنَا اَوَّلُ شَافِعٍ وَاَوَّلُ مُشَفَّعٍ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَلَا فَخْرَ وَاَنَا اَوَّلُ مَنْ يُحَرِّكُ حَلَقَ الْجَنَّةِ فَيَفْتَحُ اللّٰهُ لِيْ فَيُدْخِلُنِيْهَا وَمَعِيَ فُقَرَاءُ الْمُؤْمِنِيْنَ وَلَا فَخْرَ وَاَنَا اَكْرَمُ الْاَوَّلِيْنَ وَالْاٰخِرِيْنَ عَلَى اللّٰهِ وَلَا فَخْرَ (رواہ الترمذی والدارمی)

اخرجه الترمذي في السنن ٥/٥٤٨ حديث رقم ٣٦١٦ والدارمي في السنن ١/٣٩ حديث رقم ٤٧۔

ترجمہ: "حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے فرماتے ہیں کہ (ایک دن) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کچھ صحابی (مسجد نبوی میں) بیٹھے ہوئے آپس میں باتیں کر رہے تھے اسی اثناء میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنے حجرۂ مبارکہ سے باہر تشریف لائے اور جب ان کے قریب ہوئے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں باتیں کرتے ہوئے سنا' کسی نے کہا کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اپنا خلیل بنایا۔ دوسرے صحابی نے کہا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام سے اللہ تعالیٰ نے کلام فرمایا' ایک اور صحابی نے کہا...... حضرت عیسیٰ علیہ السلام اللہ تعالیٰ کا کلمہ اور اس کی روح ہیں (یعنی وہ نظام قدرت کے مروجہ اسباب و ذرائع کے بغیر محض اللہ تعالیٰ کے کلمہ کن سے پیدا ہوئے۔ شیر خواری کے زمانہ میں لوگوں سے باتیں کیں' اور اللہ تعالیٰ نے

روح الامین کو ان کی ماں کے پاس بھیجا' جس نے پھونک ماری اور اس کے نتیجہ میں ان کی پیدائش ہوئی' اس کے علاوہ ان کی روحانیت کے اور بہت سے آثار و کرشمے ظاہر ہوئے یہاں تک کہ وہ مردوں کو زندہ کر دیتے تھے)۔ ایک صحابی نے یہ کہا کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو برگزیدہ کیا (یعنی انسان اول ہونے کے لئے انہی کا انتخاب کیا' ان کو تمام چیزوں کے نام سکھائے اور ان کے سامنے فرشتوں سے سجدہ کرایا) بہر حال (صحابہؓ اپنی باتوں کے دوران نبیوں کے خصوصی اوصاف تعجب کے ساتھ ذکر کر رہے تھے کہ) اسی دوران آپ ﷺ ان کے پاس پہنچ گئے اور فرمایا کہ میں نے تمہاری باتیں سن لی ہیں اور تمہارا تعجب کرنا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام خدا کے خلیل ہیں تو بے شک ان کی یہی شان ہے (تمہیں تعجب ہے کہ) حضرت عیسیٰ علیہ السلام خدا کا کلمہ اور اس کی روح ہیں' تو بے شک ان کی بھی یہی شان ہے' (تمہیں تعجب ہے کہ) حضرت آدم علیہ السلام کو خدا نے برگزیدہ کیا' تو بے شک ایسا ہی ہے۔ لیکن تمہیں معلوم ہونا چاہئے کہ میں خدا کا حبیب ہوں اور میں یہ بات فخر از راہِ فخر نہیں کہتا' قیامت کے دن سب سے پہلے شفاعت کرنے والا میں ہوں گا' سب سے پہلے میری ہی شفاعت قبول کی جائے گی اور میں یہ بات از راہِ فخر نہیں کہتا' جنت کا دروازہ کھٹکھٹانے والوں میں سب سے پہلا شخص میں ہی ہوں گا چنانچہ اللہ تعالیٰ (فرشتوں کو حکم کے ذریعہ) جنت کا دروازہ میرے لئے کھول دے گا اور (سب سے پہلے) مجھے جنت میں داخل کرے گا اس وقت میرے ساتھ مؤمن فقراء ہوں گے اور میں یہ بات بطور فخر نہیں کہتا اور بلاشبہ تمام اگلے پچھلوں (خواہ وہ انبیاء ہوں یا دوسرے لوگ) سب ہی سے اللہ کے ہاں افضل و اکرم ہوں اور میں یہ بات از راہِ فخر نہیں کہتا"۔ (ترمذی' دارمی)

تشریح: حتی اذا دنا منهم سمعهم

ترکیب: لفظ **سمعهم** : دنا کی ضمیر فاعل سے حال ہے اور اس سے پہلے "قد" مقدر ہے۔ "**یتذاکرون**": **سمعهم** کی ضمیر منصوب سے حال ہے۔ طیبیؒ نے یہی ترکیب ذکر کی ہے۔ ظاہر رأیہ ہے کہ "**سمعهم**" اذا کا جواب ہے اور قال **بعضهم** یا تو جملہ استینا ہے یتذاکو کا بیان ہے یا یتذاکرون کی ضمیر سے حال ہے حرف قد کے ساتھ یا بغیر حرف قد کے وقال آخر: **فعیسٰی**۔ یعنی اگر بات فضیلت کی ہے تو عیسیٰ علیہ السلام **کلمة الله وروحه** یعنی حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کی بنسبت زیادہ بلند مرتبہ ہیں۔

طیبیؒ کہتے ہیں "فعیسٰی" کے شروع میں جو فاء ہے یہ فاء جزائیہ ہے شرط محذوف کا جواب ہے تقدیری عبارت یوں ہے: **اذا ذکرتم الخلیل فاذکروا عیسٰی**۔ یعنی اگر تم حضرت خلیل کی تعریف کر رہے ہو تو عیسیٰ علیہ السلام کی تعریف بھی کرو (وہ بھی تعریف کے حقدار ہیں یہ شرف ان کو آپ لوگوں نے تو نہیں دیا بلکہ اللہ تعالیٰ نے عطا فرمایا ہے)۔

جیسے باری تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿فلم تقتلوهم﴾ [الأنفال: ۱۷] یعنی اگر تم ان لوگوں کو قتل کرنے پر فخر کرتے ہو۔ تو بلاشبہ تم لوگوں نے انہیں قتل نہیں کیا۔

قوله :فخرج علیهم رسول الله۔ اس کو مکرر لانے کی دو وجہیں ہو سکتی ہیں:

① یا تو اس کے ساتھ اس چیز کو متعلق کرنے کے لئے جس کو پہلے متعلق نہیں کیا گیا تھا۔

۞ آپ ﷺ پہلے کسی اور جگہ گئے تھے پھر وہاں سے دوسری جگہ تشریف لائے۔

قد سمعت کلامکم و عجبکم۔ عجبکم۔ عین اور جیم کے فتحہ کے ساتھ ہے یہ جملہ "قلدت سفا و رمحا" کے قبیل سے ہے۔

قولہ :ان ابراھیم خلیل اللہ: "ان ہمزہ کے فتحہ کے ساتھ ہونے کی صورت میں۔

یہ جملہ یا تو ماقبل (یعنی کلامکم) سے بدل ہوگا یا (سمعت کے لئے) مفعول بہ ہوگا۔ اگر "ان" پڑھا جائے تو یہ جملہ مستانفہ ہوگا۔ وھو کذلك: یعنی بے شک ان کی یہی شان ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے خلیل ہی ہیں۔

قولہ :موسٰی نجیااللہ: "نجیاً" نعیل کے وزن پر "النجوی" سے بمعنی فاعل یا مفعول ہے یعنی کلیم اللہ کے معنی میں ہے۔

قولہ :ألا وانا حبیب اللہ: "الا" حرف تنبیہ ہے معطوف اور معطوف علیہ کے درمیان تاکید کے لئے لایا گیا ہے میں خدا کا حبیب ہوں یعنی محب اور محبوب دونوں ہوں۔

ولا فخر:

طیبیؒ فرماتے ہیں آپ ﷺ نے شروع میں: "وھو کذالك" سے مذکور انبیاء کے مذکورہ فضائل کا اثبات فرمایا پھر مخاطبین کو تنبیہ کرتے ہوئے فرمایا کہ آپ ﷺ ان سب سے افضل اور اکمل ہیں اور ان سب میں علیحدہ علیحدہ جو خصوصیات پائی جاتی تھیں میں ان سب کا جامع ہوں۔ چنانچہ حبیب خلیل کلیم ومشرف سب کچھ ہے۔ اھ

خلیل اور حبیب میں فرق:

واضح رہے کہ خلیل اور حبیب میں فرق ہے۔ "خلیل خلة" سے مشتق ہے جس کے معنی حاجت اور غرض کے ہیں ابراہیم علیہ السلام کی حاجت مندی صرف اللہ کے سامنے تھی اسی وجہ سے اللہ نے بھی ان کو خلیل بنایا جبکہ حبیب صفت مشبہ کا صیغہ ہے بمعنی فاعل ومفعول چنانچہ آپ ﷺ اللہ کے محبّ (اللہ سے محبت کرنے والے) اور محبوب (محبت یافتہ) دونوں ہیں خلیل اپنی حاجت مندی کی وجہ سے محبوب کا محبّ کا ہے جبکہ حبیب بغیر غرض کے محب ہے حاصل یہ ہے خلیل بمنزلہ سالک وطالب مرید کے ہے اور حبیب بمنزلہ مراد مجذوب کے ہے۔

باری تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿یجتبی الیه من یشاء ویهدی الیه من ینیب﴾ [الشوریٰ : ١٣] جسے چاہتا اپنا برگزیدہ بناتا ہے اور جو بھی اس کی طرف رجوع کرے وہ اس کی صحیح راہنمائی کرتا ہے۔

اسی (فرق کی) وجہ سے کہا گیا ہے کہ خلیل کا فعل اللہ کی رضا سے ہوتا ہے جبکہ حبیب کا درجہ یہ ہے کہ اللہ کا فعل اس کی رضا سے ہوتا ہے۔ چنانچہ باری تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿فلنولینك قبلة ترضاها﴾ [البقرة : ١٤٤] اب ہم آپ کو اس قبلہ کی جانب متوجہ کریں گے جس سے آپ خوش ہو جائیں یعنی آپ کا قبلہ آپ کو دیں گے۔ اور دوسری جگہ فرمایا: ﴿ولسوف یعطیك ربك فترضٰی﴾ [الضحیٰ : ٥]

بعض کا قول ہے کہ خلیل کی معرفت حد طمع میں ہوتی ہے جیسے حضرت ابراہیم نے فرمایا تھا: ﴿والذی اطمع ان یغفرلی﴾ [الشعراء : ٨٢] (اللہ وہی ذات ہے) جس سے میں نے امید بندھی ہوئی ہے کہ وہ روز جزا میں میرے گناہ کو بخش دے گا۔ جبکہ حبیب کو مغفرت مرتبہ یقین ہوتا ہے جیسے باری تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿لیغفرلك الله ماتقدم من ذنبك وما تأخر﴾ [الفتح : ٢] ترجمہ تاکہ اللہ جو کچھ تیرے گناہ آگے ہوئے یا جو پیچھے ہوئے سب کو معاف فرمائے۔

خلیل نے عرض کیا: ﴿ولا تخزنی یوم یبعثون﴾ [الشعراء : ٨٧] ترجمہ جس دن کہ لوگ دوبارہ جلائے (اٹھائے) جائیں مجھے رسوا نہ کر۔

جبکہ حبیب کے حق میں خود باری تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿یوم لا یخزی الله النبی والذین آمنوا معه﴾ [التحریم : ٨] ترجمہ اس دن (یعنی قیامت) اللہ تعالیٰ نبی (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) کو اور ایمان داروں جو جوان کے ساتھ ہیں رسوانہ کرے گا۔

خلیل فرما رہے ہیں: ﴿واجعل لی لسان صدق فی الآخرین﴾ [الشعراء : ٨٤] اور میرا ذکر خیر پچھلے لوگوں میں بھی باقی رکھ۔ جبکہ اللہ نے اپنے حبیب سے فرمایا: ﴿ورفعنا لك ذکرك﴾ [الشراح : ٤] ہم نے تیرا ذکر بلند کر دیا۔ خلیل عرض کرتے ہیں: ﴿واجعلنی من ورثة جنة النعیم﴾ [الشعراء : ٨٥] مجھے نعمتوں والی جنت کے وارثوں میں سے بنا دے اور حبیب سے خود کہا جا رہا ہے: ﴿انا اعطیناك الکوثر﴾ [الکوثر : ١] یقیناً ہم نے تجھے (حوض) کوثر (اور بہت کچھ) دیا۔

بارگاہِ خداوندی میں دوستی اور محبوبیت کا سب سے بلند و برتر درجہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو حاصل ہے اس کی سب سے واضح دلیل قرآن کریم کی یہ آیت ہے: ﴿قل ان کنتم تحبون الله فاتبعونی یحببکم الله﴾ [آل عمران : ٣١] "آپ کہہ دیجئے اگر تم اللہ تعالیٰ سے محبت رکھتے ہو تو میری تابعداری کرو خود اللہ تم سے محبت کرے گا۔"

قوله :انا حامل لواء الحمد اضافت کے ساتھ ہے اسم فاعل اپنے معمول کی طرف مضاف ہے اس کو اضافت لفظیہ کہا جاتا ہے **یوم القیامه تحته آدم فمن دونه ولافخر وانا اول شافع واول مشفع**۔ "مشفع" کے معنی "مقبول الشفاعه" کے ہیں۔

قوله :یوم القیامة ولا فخر وانا اول من یحرك حلق الجنة حلق حاء کے فتحہ کے ساتھ کبھی کسرہ بھی پایا جاتا ہے حلق جمع ہے حلقة کی یہاں اس سے مراد جنت کے دروازہ کا حلقہ مراد ہے۔ کبھی اس کے لام کو فتحہ اور کبھی کسرہ دیا جاتا ہے کیونکہ لغت میں "حلقة" حرکت کے ساتھ یا تو حالق کی جمع ہے یا ضعیف لغت ہے اور جمع "حلق" ہے حرکت کے ساتھ اور بروزن "بدر"۔

قوله :و معیی فقراء المؤمنین یہاں "فقراء المومنین" سے مہاجر و انصار اور دیگر حضرات مراد ہیں جو اپنے اپنے درجات و مراتب کے اعتبار سے آگے پیچھے جنت میں جائیں گے۔ جیسا کہ ایک روایت میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "میری امت کے فقراء اغنیاء سے پانچ سو سال پہلے جنت میں داخل ہوں گے۔ یہ اس بات کی واضح دلیل ہے کہ فقیر (صابر) شکر گزار غنی سے بہتر ہے۔

طیبیؒ فرماتے ہیں یہ ان کی اللہ کے ہاں فضیلت وعزت کی دلیل ہے کیونکہ وہ اللہ کے حبیب کی اطاعت اور اس کی صفات کو

اپنانے کی وجہ سے اللہ کی (ان سے) محبت کے مستحق ہوئے ہیں اور صوفیاء کے نزدیک فاقہ واحتیاج کا نام فقر نہیں بلکہ ان کے ہاں صرف اللہ تعالیٰ کا محتاج ہونے اور اللہ سے بھی اس کی رضا وخوشنودی کے علاوہ اور کچھ نہ مانگنے کا نام فقر ہے۔

امام ثوریؒ فرماتے ہیں فقر کی صفت یہ ہے کہ مال واسباب نہ ہونے پر سکون خاطر حاصل ہو اور جب مال میسر ہو تو اس کو خرچ کیا جائے۔ سہل ابن عبداللہ سے کسی نے پوچھا کیا نبی کریم ﷺ نے فقر سے پناہ نہیں مانگی؟ فرمانے لگے آنحضرت ﷺ نے نفس کے فقر سے پناہ مانگی ہے اس کے مقابلے میں جس غناء کی تعریف کی ہے اس سے بھی غنائے نفس مراد ہے۔ چنانچہ آپ ﷺ کا ارشاد ہے: الغنی غنی النفس اصل مالداری نفس کا غناء ہے۔ اسی طرح جو فقر مذموم ہے وہ بھی نفس کا فقر ہے اسی فقر سے اللہ کے نبی نے خدا کی پناہ مانگی ہے۔

میں (ملا علی قاریؒ) کہتا ہوں وہ غناء وفقر مذموم ہے جو ''سالک'' کو اس کے مولیٰ سے غافل کر دے۔

غایت یہ ہے کہ فقر کی حالت بہت سی برائیوں سے اسلم ہے اسی لئے حق تعالیٰ نے اپنے اکثر انبیاء واولیاء نے فقر کی حالت کو اختیار کیا اوران کا یہ فقر ان کے مراتب ودرجات میں بلندی کا باعث بنا۔

حجۃ الاسلام امام غزالیؒ فرماتے ہیں کہ کافر فقیر کو عذاب دوزخ غنی کافر کے عذاب سے ہلکا ہوگا۔ چنانچہ جب فقر کافر کو جہنم میں نفع پہنچا سکتا ہے تو مومن کو جنت میں کیوں نفع نہیں پہنچائے گا (ضرور نفع پہنچائے گا) اسی وجہ سے آنحضرت ﷺ کا ارشاد ہے: اجوعکم فی الدنیا اشبعکم فی الآخرۃ ولا فخر میں نے دنیا میں تمہیں بھوکا رکھا ہے آخرت میں تمہارا شکم سیر کروں گا اس میں فخر کی کوئی بات نہیں۔

قولہ: ونا اکرم الاولین والآخرین علی اللہ ولا فخر: یہ کلی فضیلت کی طرف اشارہ ہے۔

اُمتِ محمدی کی خصوصیت

۵۷۶۳: وَعَنْ عَمْرِو بْنِ قَيْسٍ أَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ نَحْنُ الْاٰخِرُوْنَ وَنَحْنُ السَّابِقُوْنَ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَاِنِّيْ قَائِلٌ قَوْلاً غَيْرَ فَخْرٍ اِبْرَاهِيْمُ خَلِيْلُ اللّٰهِ وَمُوْسٰى صَفِيُّ اللّٰهِ وَاَنَا حَبِيْبُ اللّٰهِ وَمَعِيَ لِوَاءُ الْحَمْدِ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَاَنَّ اللّٰهَ وَعَدَنِيْ فِيْ اُمَّتِيْ وَاَجَارَهُمْ مِنْ ثَلٰثٍ لَا يَعُمُّهُمْ بِسَنَةٍ وَّلَا يَسْتَأْصِلُهُمْ عَدُوٌّ وَّلَا يَجْمَعُهُمْ عَلٰى ضَلَالَةٍ۔ (رواہ الدارمی)

اخرجه الدارمی فی السنن ۱/۴۲ حدیث رقم ٥٤ واحمد فی المسند ۲/۲۴۳

ترجمہ: ''حضرت عمرو بن قیس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: (دنیا میں آنے کے اعتبار سے) ہم آخر میں آنے والے ہیں لیکن قیامت کے دن (جنت میں داخل ہونے اور دیگر فضائل کے اعتبار سے) ہم سبقت لے جانے والے ہوں گے اور میں تم سے کہتا ہوں اور یہ کہنے سے فخر کرنا مقصود نہیں ہے (بلکہ ایک حقیقت کا اظہار مقصود ہے) کہ ابراہیم علیہ السلام تو خدا کے خلیل ہیں' موسیٰ علیہ السلام خدا کے برگزیدہ ہیں' (اللہ تعالیٰ نے ان کو اپنی ہمکلامی کے لئے چنا) اور میں خدا کا حبیب ہوں (کہ دنیا وآخرت میں) میری حیثیت محبّ کی بھی ہے اور محبوب کی بھی) اور قیامت کے دن

(مقام محمود میں) حمد کا پرچم میرے پاس ہوگا (جو میرے احمد اور محمد ہونے کی علامت ہوگا) نیز اللہ تعالیٰ نے مجھ سے وعدہ کیا ہے خیر کثیر عطا کرنے کا اور تین چیزوں سے بچانے کا وعدہ کیا ہے (ایک تو یہ کہ) وہ مسلمانوں کو عمومی قحط میں مبتلا نہیں کرے گا۔ دوسرے یہ کہ کوئی دشمن ان کا بالکلیہ استیصال نہ کر سکے گا اور تیسرے یہ کہ ان سب کو گمراہی پر جمع نہیں کرے گا (یعنی یہ ممکن نہیں ہوگا کہ ساری اسلامی دنیا کسی گمراہی کی بات پر اتفاق کرلے)۔" (دارمی)

راوئ حدیث:

عمرو بن قیس ۔ یہ عمرو بن قیس ہیں اور بعض نے کہا ہے کہ ان کا نام عبداللہ بن عمرو القرشی عامری ہے' نابینا تھے۔ مشہور صحابی رسول ابن ام مکتوم رضی اللہ عنہ کے بیٹے ہیں۔ ام مکتوم کا نام "عاتکہ" ہے۔ یہ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا بنت خویلد کے ماموں کے بیٹے ہیں۔ مکہ میں ابتداء میں ہی اسلام لے آئے تھے۔ یہ مہاجرین اولین میں سے ہیں۔ حضرت مصعب بن عمر رضی اللہ عنہ کے ساتھ ہجرت کی ہے۔ بہت سی مرتبہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو مدینہ پر اپنا خلیفہ مقرر فرمایا۔ آخری بار خلیفہ اس وقت فرمایا تھا جب کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم حجۃ الوداع کے لئے تشریف لے جا رہے تھے۔ عہد رسالت میں کبھی کبھی اذان دیتے تھے۔ مدینہ میں انتقال فرمایا اور بعض نے کہا ہے کہ وہ جنگ قادسیہ میں شہید ہوئے۔

تشریح: من ثلاث تمیز محذوف ہے۔ ای خصال۔

ولا یجمعهم علی ضلالة (کہ تمام مسلمان گمراہی پر جمع نہیں ہوں گے) شاید اللہ سبحانہ وتعالیٰ ہدایت پر بھی بیک وقت سب کو جمع نہ کرے (بعض ہدایت پر ہوں گے بعض نہیں ہوں گے) کیونکہ باری تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿لو شاء ربك لجعل الناس امة واحدة ولا یزالون مختلفین الا من رحم ربك﴾ [ھود: ۱۱۸] اگر آپ کا پروردگار چاہتا تو سب لوگوں کو ایک ہی راہ پر ایک گروہ کر دیتا وہ تو برابر اختلاف کرنے والے ہی رہیں گے مگر جن پر رحم کیا تیرے ربّ نے۔

(یعنی اللہ کی تقدیر اور قضا میں یہ بات ثابت ہے کہ کچھ لوگ ایسے ہوں گے جو جنت کے اور کچھ (ایسے ہوں گے جو) جہنم کے مستحق ہوں گے)

جس نے یہ کہا ہے کہ: اختلاف الامة رحمة (امت کا اختلاف رحمت ہے) گویا اس کا ماخذ یہی آیت ہے۔ یہاں اختلاف سے مراد اجتہادی اختلاف مراد ہے نہ کہ باطل اختلاف کیونکہ وہ یقینی طور سے رحمت نہیں ہے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم قائد المرسلین اور خاتم النّبیین ہیں

۵۷۶۴ : وَعَنْ جَابِرٍ اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اَنَا قَائِدُ الْمُرْسَلِیْنَ وَلَا فَخْرَ وَاَنَا خَاتِمُ النَّبِیِّیْنَ وَلَا فَخْرَ وَاَنَا اَوَّلُ شَافِعٍ وَمُشَفَّعٍ وَلَا فَخْرَ۔ (رواہ الدارمی)

اخرجه الدارمی فی ۱/ ٤٠ حدیث رقم ٤٩۔

ترجمہ: "حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: "(روزِ قیامت) میں مرسلین کا قائد ہونگا

اور میں یہ بات ازراہِ فخر نہیں کہتا' میں (دنیا میں) انبیاء کے سلسلہ کو ختم کرنے والا ہوں' اور میں یہ بات ازراہِ فخر نہیں کہتا' شفاعت کرنے والا سب سے پہلا شخص میں ہوں گا اور (سب سے پہلے) میری ہی شفاعت قبول ہو گی اور میں یہ بات ازراہِ فخر نہیں کہتا''۔ (دارمی)

تشریح: ''خاتم المرسلین'' کی بجائے ''خاتم النبیین'' فرمایا جو اس لئے کہ ''نبی'' اعم ہے ''رسول'' سے اس لئے اس خاتمیت کی نسبت اتم ہے۔

قیامت کے دن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت و برتری

۵۷۶۵ : وَعَنْ اَنَسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَنَا اَوَّلُ النَّاسِ خُرُوْجًا اِذَا بُعِثُوا وَاَنَا قَائِدُهُمْ اِذَا وَفَدُوا وَاَنَا خَطِيْبُهُمْ اِذَا اَنْصَتُوْا وَاَنَا مُسْتَشْفِعُهُمْ اِذَا حُبِسُوْا وَاَنَا مُبَشِّرُهُمْ اِذَا اَيِسُوا الْكَرَامَةُ وَالْمَفَاتِيحُ يَوْمَئِذٍ بِيَدِىْ وَلِوَاءُ الْحَمْدِ يَوْمَئِذٍ بِيَدِىْ وَاَنَا اَكْرَمُ وُلْدِ اٰدَمَ عَلٰى رَبِّىْ يَطُوْفُ عَلَىَّ اَلْفُ خَادِمٍ كَاَنَّهُمْ بَيْضٌ مَكْنُوْنٌ اَوْ لُؤْلُؤٌ مَنْثُوْرٌ ۔(رواہ الترمذی والدارمی وقال الترمذی هذا حدیث غریب)

اخرجه الترمذی فی السنن ۵/۵٤٦ حدیث ۳٦١٠ والدارمی ۱/۳۹ حدیث رقم ٤٨

ترجمہ: ''حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے' فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''(قیامت کے دن) جب لوگ (قبروں سے) اُٹھائے جائیں گے تو سب سے پہلے قبر میں سے میں نکلوں گا جب لوگ بارگاہِ خداوندی میں حاضر ہوں گے تو ان کا پیش رو میں ہوں گا' جب تمام لوگ خاموش ہوں گے تو میں ہی ان کا ترجمان ہوں گا اور جب لوگ (موقف میں) روک دیئے جائیں گے تو ان کی (خلاصی کے لئے) شفاعت کروں گا' جب لوگوں پر (غلبہ خوف کے باعث اللہ تعالیٰ کی رحمت سے) ناامیدی اور مایوسی چھائی ہو گی تو (اہل ایمان کو مغفرت و رحمت کی) بشارت دینے والا میں ہوں گا' اس (قیامت کے) دن شرف و کرامت اور جنت کی کنجیاں میرے ہاتھ میں ہوں گی' حمد کا پرچم اس دن میرے ہاتھ میں ہوگا' پروردگار کے نزدیک بنی آدم میں سے سب سے بزرگ و اشرف میری ہی ذات ہو گی' میرے آگے پیچھے ہزار خادم پھرتے ہوں گے جیسے وہ چھپے ہوئے انڈے یا بکھرے ہوئے موتی ہوں''۔ اس روایت کو ترمذی و دارمی نے نقل کیا ہے۔

اسنادی حیثیت: امام ترمذی نے کہا ہے کہ یہ حدیث غریب ہے''۔

تشریح: ''الوفد'' اس جماعت کو کہا جاتا ہے جو اپنی کسی حاجت کے لئے بادشاہ کے ہاں حاضر ہوتی ہے۔ وانا خطیبھم۔ ''خطیب'' سے مراد متکلم اور ترجمان ہے۔

اذا انصتوا: یعنی جب میدانِ حشر میں عام دہشت و ہولنا کی چھائی ہو گی ہر شخص متحیر ہو گا' کوئی عذر و درخواست پیش نہیں کر سکے گا اس وقت میں سب کی طرف سے ان کے رب کے سامنے عذر و معذرت پیش کروں گا اس مقام پر ساری مخلوق میں سے مجھے ہی کلام کرنے کی قدرت حاصل ہو گی اور میں ایسی تعریف و ثنا بیان کروں گا جو اس کی شان کے لائق ہو گی اس وقت میرے

علاوہ کسی کو بولنے اور کچھ کہنے کی اجازت نہیں ہوگی۔

باری تعالیٰ کا ارشاد: ﴿هذا يوم لاينطقون ولا يوذن لهم فيعتذرون﴾ [المرسلات: ۳۵] (یہ وہ دن ہوگا جس میں وہ لوگ نہ بول سکیں گے اور نہ ان کو (عذر کی) اجازت ہوگی) سے آنحضرت ﷺ کی ذات مستثنیٰ ہے کہ آپ ﷺ کے علاوہ اور کسی کو بولنے کی اجازت نہیں ہوگی۔

یا یہ کہ اس آیت میں ابتدائی مرحلہ کا ذکر ہے کہ شروع میں کسی کو بھی بولنے کی اجازت نہیں ہوگی مگر بعد میں آنحضرت ﷺ کو اجازت عطا فرمائی جائے گی۔

یا اس آیت کا تعلق صرف کفار سے ہے۔

وانا مستشفعهم: فاء کے فتحہ کے ساتھ اسم مفعول ہے۔ عرب کے اس قول سے ماخوذ ہے: **استشفعت زيداً الى فلان۔ اى سألته أن يشفع اليه**: مستشفع ہے اور "فلان" **مستشفع عليه** ہے۔ یعنی میں نے زید سے فلاں لوگوں کی شفاعت کرائی۔ تمام لوگ خدا کے سامنے آپ سے شفاعت کرائیں گے

اور بعض نسخوں میں فاء کے کسرہ کے ساتھ ہے یعنی اسم فاعل کے صیغے کے ساتھ مذکور ہے اس صورت میں معنی ہوگا **اسال الله ان اكون شفيعالهم**۔ میں اللہ سے شافع ہونے کی درخواست کرتا ہوں کہ اللہ مجھے ان کا شافع بنائے۔

والكرامة تصحیح شدہ نسخوں میں رفع کے ساتھ ہے' مبتدا ہے اور "**المفاتيح**" کا اس پر عطف ہے خبر **بيدى** ہے **يومئذ** ظرف ہے۔ یا اذا سے بدل ہے۔

(**بيدى**) مفرد ہے اس صورت میں معنی ہوگا قیامت کے دن شرف و کرامت شفاعت اور جنت کی کنجیاں ساری میرے تصرف میں ہوں گی۔

ایک نسخے میں یاء کی تشدید کے ساتھ تثنیہ کا صیغہ ہے اور آخر میں یاء مبالغہ یا توزیع و تنوع کے لئے ہے اور یہ اس طرح کہ اللہ تبارک و تعالیٰ کے لطف و کرم اور فضل کی تمام انواع انبیاء علیہم السلام و غیر انبیاء کو آپ کی اس شفاعت عامہ سے حاصل ہوگی جو مقام محمود اور حوض کوثر پر آپ ﷺ کریں گے' مقام محمود میں ساری مخلوق انبیاء کے ساتھ ایک جھنڈے تلے جمع ہونگی اور حوض کوثر سے

اور ایک نسخے میں "الکرامۃ" مغصوب ہے اس صورت میں یہ ایسوا کا مفعول ہوگا اور بیدی صرف المفاتیح کی خبر ہوگی۔ **اى اذا قنطو من حصول الكرامة ووقعوا فى وصول الندامة** (یعنی کہ جس وقت ساری مخلوق ندامت کے اسباب کی وجہ سے کرامت کے حصول سے مایوس ہو چکی ہوگی اس وقت بھی مذکورہ تمام فضائل مجھے ہی نصیب ہوں گے۔)

بيدى: یاء کے سکون کے ساتھ ہے۔

قوله : كانهم بيض مكنون۔ مکنون کا معنی گرد و غبار سے محفوظ کیا گیا ہے۔ ان خدام کو صفاء و بیاض میں شتر مرغ کے انڈوں سے تشبیہ دی ہے۔ سفیدی اور کچھ زردی مائل ہونے کی وجہ سے ان کا رنگ بہت بھلا لگتا تھا۔ میں کہتا ہوں ایسا تو بعض عرب کے ہاں ہے۔ میں نے تو عرب کی کچھ اولاد کو اس پر پایا ہے عام اہل شام روم و عجم کے مزاج پر ہیں کہ وہ سفید مائل بسرخی رنگ کو زیادہ پسند کرتے ہیں جیسا کہ آنحضرت ﷺ کے شمائل میں آیا ہے اور قرآن کریم میں حور العین کو یاقوت اور مرجان سے

تشبیہ دی گئی۔ ﴿کانھن الیاقوت والمرجان﴾ [الرحمٰن: ۵۸] مفسرین نے ''مرجان'' کی تفسیر لولو سے کی ہے۔ اگلا جملہ ''اولؤلؤ منشور'' پر دلالت کر رہا ہے اور بتفسیر ''او'' کے متعلق تین احتمالات ہیں۔

① ''او'' تشبیہ میں تخییر کے لئے ہے۔ یعنی دونوں میں سے جس سے چاہو تشبیہ دے لو۔

② یا ''او'' تنویع کے لئے ہے۔ ایک شارح فرماتے ہیں: ''بیض مکنون'' سے مراد سیپ میں چھپا ہوا موتی ہے جس کو کسی ہاتھ نے نہ چھوا ہو۔

''بکھرے ہوئے'' کی قید اس لئے لگائی کہ بکھرے ہوئے موتی کسی لڑی میں پروئے گئے موتیوں کی بہ نسبت زیادہ بھلے لگتے ہیں۔ مزید یہ کہ نثر تفرق خدم کے زیادہ مناسب ہے۔

③ اولؤلؤ منثور: یہ راوی کا شک ہے (راوی کو شک ہے کہ آپ ﷺ نے بیض مکنون فرمایا یا لؤلؤ منثور فرمایا۔)

جامع الاصول میں ترمذی کی روایت کے الفاظ یوں ہیں: انا اول الناس خروجا اذا بعثو' وانا خطیبھم اذا وفدو وانا مبشرھم اذا ایسو لواء الحمد یومئذ بیدی وانا اکرم ولد آدم علی ربی ولا فخر۔

''قیامت کے دن جب لوگوں کو قبروں سے اٹھایا جائے گا سب سے پہلے میں اٹھوں گا' جب لوگ بارگاہ خداوندی میں پیش ہوں گے تو میں ان کا ترجمان ہوں گا جب لوگ ناامید ہوں گے تو میں ان کو خوشخبری سنانے والا ہوں گا' اس دن میرے ہاتھ میں حمد کا پرچم ہوگا میں ہی اس دن اپنے رب کے ہاں سب سے مکرم ہوں گا اور اس میں کوئی فخر کی بات نہیں۔''

حضور ﷺ عرشِ الٰہی کے دائیں جانب کھڑے ہوں گے

۵۷۶۶ : وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ عَنِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قَالَ فَاُكْسٰی حُلَّةً مِّنْ حُلَلِ الْجَنَّةِ ثُمَّ اَقُوْمُ عَنْ یَمِیْنِ الْعَرْشِ لَیْسَ اَحَدٌ مِّنَ الْخَلَائِقِ یَقُوْمُ ذٰلِكَ الْمَقَامَ غَیْرِیْ (رواہ الترمذی وفی روایة جامع الاصول عنه) اَنَا اَوَّلُ مَنْ تَنْشَقُّ عَنْهُ الْاَرْضُ فَاُكْسٰی۔

اخرجه الترمذی فی السنن ۵/۵٤٦ حدیث رقم ۳٦۱۱۔

ترجمہ: ''حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نبی کریم ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''(قیامت کے دن) مجھے جنتی جوڑا پہنایا جائے گا اور پھر میں عرش کے دائیں جانب کھڑا ہو جاؤں گا' اس مقام پر مخلوقات میں سے سوا میرے کوئی کھڑا نہیں ہوگا۔ اس حدیث کو امام ترمذی رحمہ اللہ نے روایت کیا ہے اور جامع الاصول کی روایت میں جو حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ ہی سے مروی ہے یوں ہے کہ (آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا) سب سے پہلے میں قبر سے باہر آؤں گا' پھر مجھے ایک جنتی جوڑا پہنایا جائے گا الخ''۔

تشریح: جامع الاصول وغیرہ میں اس حدیث کے شروع کے کلمات یوں ہیں وانا اول من تنشق عنه الارض۔ پس یہ اختصار صاحب مصابیح نے کیا ہے جو کہ روایةً ودرایةً ہر دو اعتبار سے مخل ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے مقام وسیلہ کی طلب

۵۷۶۷: وَعَنْهُ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ سَلُوْا اللّٰهَ لِيَ الْوَسِيْلَةَ قَالُوْا يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ وَمَا الْوَسِيْلَةُ قَالَ اَعْلٰى دَرَجَةٍ فِي الْجَنَّةِ لَا يَنَالُهَا اِلَّا رَجُلٌ وَاحِدٌ وَّاَرْجُوا اَنْ اَكُوْنَ اَنَا هُوَ. (رواه الترمذی)

اخرجه الترمذی فی السنن ٥٤٦/٥ حديث رقم ٣٦١٢ واحمد فی المسند ٢٦٥/٢

ترجمہ: ''حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''(مسلمانو!) میرے لئے اللہ تعالیٰ سے ''وسیلہ'' کا سوال کیا کرو۔ صحابہؓ نے (یہ سن کر) عرض کیا کہ یارسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) یہ ''وسیلہ'' کیا چیز ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''وسیلہ جنت کا سب سے اعلیٰ درجہ ہے جو صرف ایک شخص کو ملے گا اور میں امید رکھتا ہوں کہ وہ شخص میں ہوں''۔ (ترمذی)

تشریح: اذان کی دعا: ''آت محمدا الوسیلة'' میں یہی وسیلہ منقول ہے۔ یہ اطلاق وتقیید ہر دو کو محتمل ہے۔ النہایہ میں ہے ''وسیلہ'' اصل میں اس چیز کو کہا جاتا ہے جو شئی تک توصل وتقرب حاصل کرنے کا ذریعہ ہو۔ میں کہتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد اسی سے ہے: ﴿یا ایها الذین آمنوا اتقوا الله وابتغو الیه الوسیلة﴾ ''اے ایمان والو ڈرتے رہو اللہ سے اور ڈھونڈو اس تک وسیلہ''۔ اس آیت مبارکہ میں بھی وسیلہ سے یہی قرب واتصال کا معنی مراد ہے۔

① امام طیبیؒ فرماتے ہیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے امتیوں کو اپنی ذاتِ اقدس کے لئے وسیلہ مانگنے کا حکم دینا تو اللہ کے حضور صلی اللہ علیہ وسلم اپنی محتاجگی اور کسر نفسی کے اظہار کے لئے ہے۔

② یا یہ مقصد تھا کہ امت کے لوگوں کو فائدہ ہوگا اور ان کو ثواب ملے گا۔

③ یا یہ کہ اس حکم کے ذریعہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے امت کے لوگوں کی رہنمائی فرمائی ہے کہ ہر مسلمان کو چاہئے کہ وہ اپنے ساتھیوں سے دعا کی درخواست کرے۔

قالوا یارسول الله وما الوسیلة؟ یعنی یہ مقصود ومسؤل چیز کیا ہے؟ امام طیبیؒ فرماتے ہیں کہ: وما الوسیلة کا معطوف مقدر ہے تقدیری عبارت یوں ہے نفعل ذلك وماالوسیلة (ہم ضرور کریں گے لیکن وسیلہ ہے کیا چیز؟) اور زیادہ واضح یہ ہے کہ یوں کہا جائے: أمرتنا بسوال الوسیلة وما الوسیله۔ یارسول اللہ آپ نے ہمیں وسیلہ کی دعا مانگنے کا حکم فرمایا۔ تو یہ وسیلہ کیا چیز ہے بعض لوگ کہتے ہیں: ''وما الوسیله'' میں واؤ کلام میں ربط پیدا کرنے کے لئے ہے۔

قوله :قال :اعلی درجة فی الجنة لاینالها...... آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا اسم گرامی تواضعاً ظاہر نہیں فرمایا۔

ارجو اور ایک نسخہ میں واؤ کے ساتھ ''وارجو'' ہے۔

ان اکون انا هو: ضمیر مرفوع ھو کو ضمیر منصوب وایاہ کی جگہ لایا گیا ہے جامع الاصول میں اس روایت کے الفاظ یوں ہیں سلوا الله لی الوسیلة اعلی درجة فی الجنة لا ینالها الا رجل وارجوا ان اکون انا هو۔ (اللہ سے جنت کے

سب سے بڑے درجہ وسیلہ کی میرے لئے دعا مانگو ایک صاحب کے سوا اس کو کوئی نہیں پا سکے گا میں اللہ سے امید رکھتا ہوں کہ وہ صاحب میں ہی ہوں گا۔

امام ابن ابی شیبہ نے اور طبرانی نے حضرت ابن عباسؓ سے روایت کیا ہے:

سلوا الله لی الوسیلة فانها لا یسألها عبد فی الدنیا الا کنت له شهیدا او شفیعا یوم القیامة۔

''اللہ تعالیٰ سے میرے لئے وسیلہ کی دعا مانگو چونکہ دنیا میں جو شخص میرے لئے یہ دعا مانگے قیامت کے دن میں اس کی گواہی دوں گا یا اس کی شفاعت کروں گا۔

آنحضرت صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم تمام انبیاء علیہم السلام کے امام ہوں گے

۵۷۶۸ : وَعَنْ اُبَیِّ بْنِ کَعْبٍ عَنِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اِذَا کَانَ یَوْمُ الْقِیٰمَةِ کُنْتُ اِمَامَ النَّبِیِّیْنَ وَخَطِیْبَهُمْ وَصَاحِبَ شَفَاعَتِهِمْ غَیْرَ فَخْرٍ۔ (رواہ الترمذی)

اخرجه الترمذی فی السنن ۵/۵۴۷ حدیث رقم ۳۶۱۲ واحمد فی المسند ۵/۱۳۷۔

ترجمہ: ''حضرت اُبی بن کعب رضی اللہ عنہ نبی کریم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم سے روایت کرتے ہیں کہ آپ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے ارشاد فرمایا: ''جب قیامت کا دن ہوگا تو میں (مقام محمود میں) تمام انبیاء کا امام ہونگا' (جب ان میں کوئی بھی بولنے پر قادر نہیں ہوگا تو) میں ان کی ترجمانی کروں گا اور (مقام محمود میں) سب کی شفاعت کروں گا اور میں یہ بات بطور فخر نہیں کہتا''۔ (ترمذی)

تشریح: امام النبیین: لفظ امام مشکوۃ کے نسخے میں ہمزہ کے کسرہ کے ساتھ ہے تو ریشتیؒ فرماتے ہیں کسرہ ہی کے ساتھ صحیح ہے اور جو لوگ اس کو فتحہ اور نصب کے ساتھ پڑھتے ہیں ظرف مکان بناتے ہوئے یہ ٹھیک نہیں۔ (یعنی اس کو منصوب علی الظر فیہ پڑھنا درست نہیں) شارح لکھتے ہیں کہ ہمزہ کا فتحہ پڑھنا صحیح نہیں ہے ابن الملک فرماتے ہیں ہمزہ پر فتحہ پڑھنا غلط ہے۔ میں (ملا علی قاریؒ) کہتا ہوں روایت کے اعتبار سے بات کی جائے تو فتحہ پڑھنے کی کوئی صورت نہیں بنتی لیکن اگر بات از روئے درایت کی جائے تو اس کی صورت بالکل ممکن ہے کیونکہ اس صورت میں بمعنی مقدام ہوگا جیسا کہ پہلے روایت گزر چکی ہے وانا قائدهم اذا وفدوا۔ بلکہ اس موقع پر امامت کا مفہوم مقتداء کے سوا اور کچھ بنتا ہی نہیں۔

تخریج: امام احمد اور ابن ماجہ نے اور حاکم نے اپنی مستدرک میں نقل کیا ہے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام اور آنحضرت صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم

۵۷۶۹ : وَعَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ مَسْعُوْدٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ لِکُلِّ نَبِیٍّ وُلَاةً مِّنَ النَّبِیِّیْنَ وَاِنَّ وَلِیِّ اَبِیْ وَخَلِیْلُ رَبِّیْ ثُمَّ قَرَاَ اِنَّ اَوْلَی النَّاسِ بِاِبْرَاهِیْمَ لَلَّذِیْنَ اتَّبَعُوْهُ وَهٰذَا النَّبِیُّ وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَاللّٰهُ وَلِیُّ الْمُؤْمِنِیْنَ۔ (رواہ الترمذی)

اخرجه الترمذی فی السنن ۲۰۸/۵ حدیث رقم ۲۹۹۵ واحمد فی المسند ۴۰۱/۱ سورة آل عمران، الایة رقم ۶۸

ترجمہ: ''حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے' فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''ہر نبی کے لئے انبیاء میں سے ایک ولی ہوتا ہے' میرے ولی میرے باپ اور پروردگار کے خلیل حضرت ابراہیم علیہ السلام ہیں''۔ اس کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے (اپنے اس قول کی دلیل کے طور پر) یہ آیت پڑھی: ﴿اِنَّ اَوْلَی النَّاسِ بِاِبْرٰهِیْمَ لَلَّذِیْنَ اتَّبَعُوْهُ وَهٰذَا النَّبِیُّ وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَاللّٰهُ وَلِیُّ الْمُؤْمِنِیْنَ﴾ ''بلاشبہ سب آدمیوں میں زیادہ ابراہیم علیہ السلام کے ساتھ خصوصیت رکھنے والے البتہ وہ لوگ تھے جنہوں نے (ان کے زمانہ میں بھی اور ان کے بعد بھی) ان کی پیروی کی اور یہ نبی ہیں اور وہ لوگ ہیں جو ایمان لائے اور اللہ تعالیٰ حامی و کارساز ہے ایمان والوں کا''۔ (ترمذی)

تشریح: ولاۃ: واؤ کے ضمہ کے ساتھ ہے ولی کی جمع ہے۔ من النبیین تورپشتیؒ فرماتے ہیں انبیاء کی آپس میں رفاقت اور قرابت دوسروں کی رفاقت سے اولیٰ اور مقدم ہے۔

وخلیل ربی: یہ ''ان'' کی خبر ثانی ہے۔ ان اولی الناس بابراهیم للذین اتبعوه۔ ''الذین اتبعوه'' سے مراد حضرت ابراہیم کی اتباع کرنے والے لوگ ہیں چاہے آپ کے اپنے زمانے کے لوگ ہوں یا بعد کے ہوں کیونکہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بعد جتنے بھی انبیاء آئے ہیں وہ سب آپ علیہ السلام کی اولاد ہیں اور اصل توحید و توکل اور تفویض التفرید میں آپ علیہ السلام ہی کے پیروکار ہیں۔

وهذا النبی ...... یعنی آپ صلی اللہ علیہ وسلم خصوصاً اور عموماً بھی۔

تورپشتی رحمہ اللہ فرماتے ہیں مصابیح میں ''وان ولیی ربی'' ہے غلط ہے' شاید یہ تحریف باری تعالیٰ کے اس ارشاد کو دیکھ کر کی ہے: ﴿ان ولیی الله الذی نزل الکتاب﴾ [الاعراف: ۱۶۹] روایت ان الفاظ کے ساتھ ہے جو ہم نے ذکر کئے ہیں۔ ''میرا حمایتی تو اللہ ہے جس نے کتاب اتاری اور وہ حمایت کرتا ہے نیک بندوں کی''۔

شیخ مظہر فرماتے ہیں اگر یہ جملہ اس طرح ہو جس طرح تورپشتیؒ نے ذکر کیا ہے تو یہ جملہ بغیر واؤ کے ہونا چاہئے تھا کیونکہ واو موجب مغایرت ہوتا ہے اور لفظ خلیل کی اضافت ربی کی طرف ہوتی تا کہ لفظ ابی کے لئے عطف بیان ہوتا۔

میں کہتا ہوں اگر عبارت شیخ کے قول کے برعکس ہو تو اس صورت میں عبارت کا تقاضا یہ ہوگا لفظ خلیل کی اضافت (ربی) کی ضمیر کی طرف ہو۔

طیبیؒ فرماتے ہیں معتبر روایت اسی طرح ہے جس طرح شیخ نے ذکر کیا ہے اگر یہ مان لیا جائے کہ خلیل ربی واؤ کے بغیر عطف بیان ہے تو حضرت ابراہیم کا ''اب النبی'' اور ''ولیی النبی'' ہونا محض ہو جائے گا اس لئے اس کا عطف بیان لایا گیا اور اگر اسے معطوف علیہ بنایا جائے تو آپ کی شہرت اسی سے لازم آئے گی اور عطف کے مدح کے طور پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کیلئے کوئی اور صفت ثابت کرنے کے لئے ہوگا۔ چنانچہ روایت کے مطابق اس کے برخلاف دوبارہ مدح لازم آتی ہے میں کہتا ہوں یہ کہنا زیادہ واضح ہے کہ یہاں عطف تغایر وصفین کیلئے ہے جیسے اس آیت میں ہے: ﴿تلك آیات الکتاب وقرآن مبین﴾ [الحجر: ۱]

آنحضرت ﷺ کی بعثت کا مقصد

۵۷۷۰ : وَعَنْ جَابِرٍ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اِنَّ اللّٰهَ بَعَثَنِيْ لِتَمَامِ مَكَارِمِ الْاَخْلَاقِ وَكَمَالِ مَحَاسِنِ الْاَفْعَالِ۔ (رواه في شرح السنة)

اخرجه البغوی فی شرح السنة ۲۰۲/۱۳ حدیث رقم ۳۶۲۲

ترجمہ: ''حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''اللہ تعالیٰ نے مجھے مکارمِ اخلاق اور محاسن افعال کی تکمیل کے لئے بھیجا ہے''۔ (شرح السنۃ)

تشریح: مکارم، مکرمۃ کی جمع ہے وہ طبعی خصلت اور باطنی وصف کہ جس کی بدولت انسان کریم شمار کیا جائے۔ ''الاخلاق'' سے مراد احوال ہیں اسی وجہ سے اس کے مقابل ''و کمال محاسن الافعال'' ذکر فرمایا گیا ہے۔ اس سے مراد امور ظاہرہ عبادات و افعال ہیں۔

''المحاسن'' خلافِ قیاس حسن کی جمع ہے۔

حاصل یہ ہے کہ آپ ﷺ کی شریعت ظاہری افعال کے اعتبار سے بھی درجہ کمال تک پہنچی ہوئی ہے۔

ابن الملکؒ فرماتے ہیں: حدیث کا مطلب یہ ہے کہ اللہ نے مجھے پیغمبر بنا کر پورے عالم کی طرف اس مقصد سے بھیجا ہے کہ میرے ذریعہ اپنے بندوں کے مکارم اخلاق اور محاسن افعال کو مکمل کرے۔

طیبیؒ فرماتے ہیں اس روایت میں (مکارم کی اخلاق کی طرف اور محاسن کی افعال کی طرف) اضافۃ ہے یہ اضافت الصفۃ الی الموصوف کے قبیل سے ہے۔ امام راغب اصفہانیؒ فرماتے ہیں اپنے باب میں جو چیز بلند رتبہ ہوتی ہے اس کو کرم کی صفت کے ساتھ متصف کیا جاتا ہے (ملاحظہ فرمایئے مندرجہ ذیل آیات) باری تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿و انبتنا فيها من كل زوج كريم﴾ [لقمان: ۱۰] اور ایک جگہ فرمایا: ﴿ومقام كريم﴾ [الشعراء: ۵۸ ۔ الدخان: ۲۶] ﴿انه لقرآن كريم﴾ [الشعراء: ۵۸] جب اللہ تعالیٰ کو اس نام کے ساتھ موصوف کیا جائے تو اس سے اللہ تعالیٰ کے انعامات و احسانات متظاہرہ مراد ہوتے ہیں۔ اگر انسان کی صفت بنے تو اس سے مراد انسان سے ظاہر ہونے والے افعال و اخلاق حمیدہ مراد ہوتے ہیں چنانچہ ان افعال حمیدہ کے ظاہر ہونے سے قبل کسی کو کریم نہیں کہا جاتا۔ طیبیؒ کا قول ان العطف للتاكيد اس سے جو ہم نے بیان کیا زیادہ اولیٰ ہے۔

طیبیؒ فرماتے ہیں اس حدیث اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث مثلي و مثل الانبياء...... أنا سددت موضع اللبنة کا مفہوم ایک جیسا ہے کہ جس طرح اللہ نے انبیاء کی عمارت کا خلاء آنحضرت ﷺ کے ساتھ مکمل فرمایا ایسے ہی اخلاق حسنہ کے درجات کو بھی آنحضرت ﷺ ہی کے ذریعہ پایۂ تکمیل تک پہنچایا۔ امام بغوی نے شرح السنہ میں اپنی سند سے اس روایت کو ذکر کیا ہے۔

اس حدیث کو ابن سعد نے اور امام بخاریؒ نے الادب المفرد میں روایت کیا ہے حاکم اور امام بیہقی نے ابو ہریرہؓ سے نقل کیا

ہے: انما بعثت لأتمم صالح الاخلاق۔ مجھے اچھے اخلاق کو پورا کرنے کے لئے بھیجا گیا ہے۔ امام بیہقی اور حکیم نے حضرت عائشہؓ سے اسی طرح کی روایت نقل کی ہے۔

دس چیزیں مکارم اخلاق میں سے ہیں:

جس کی سعادت اللہ کو منظور ہو اس کو نصیب فرما دیتے ہیں۔ کبھی یہ اوصاف باپ میں ہوتے ہیں بیٹے میں نہیں ہوتے۔ کبھی بیٹے میں پائے جاتے ہیں باپ میں نہیں۔ غلام میں پائے جاتے ہیں آقا میں نہیں۔ یہ اللہ کی تقسیم ہے جس کو چاہے نصیب فرما دے وہ دس چیزیں یہ ہیں۔ سچائی' سچا استغنا' سخاوت' اچھائی کا بدلہ اچھائی سے دینا' امانت داری' صلہ رحمی' پڑوسی کے ساتھ اچھا سلوک کرنا' ساتھی کے ساتھ اچھا سلوک کرنا' مہمان نوازی' حیاء' مسلمان کی حرمت کا خیال رکھنا۔

بزارؒ نے ابن عمرؓ سے مرفوعاً روایت کیا ہے: اللهم اهدنى لصالح الاعمال والاخلاق لايهدى لصالحها ولا يصرف سيئها الا انت: ''اے اللہ مجھے نیک اعمال و اخلاق کی توفیق بخش تیرے سوا کوئی نیک اعمال و اخلاق کی توفیق نہیں دے سکتا اور نہ میرے اعمال سے بچا سکتا ہے۔''

تورات میں آنحضرت ﷺ اور امت محمدی کے اوصاف کا ذکر

۵۷۷۱ : وَعَنْ كَعْبٍ يَحْكِيْ عَنِ التَّوْرٰةِ قَالَ نَجِدُ مَكْتُوبًا مُحَمَّدٌ رَسُوْلُ اللّٰهِ عَبْدِيَ الْمُخْتَارُ لَا فَظٌّ وَلَا غَلِيْظٌ وَلَا سَخَّابٌ فِي الْاَسْوَاقِ وَلَا يَجْزِيْ بِالسَّيِّئَةِ السَّيِّئَةَ وَلٰكِنْ يَعْفُوْ وَيَغْفِرُ مُوْلِدُهُ بِمَكَّةَ وَهِجْرَتُهُ بِطِيْبَةَ وَمُلْكُهُ بِالشَّامِ وَاُمَّتُهُ الْحَمَّادُوْنَ يَحْمَدُوْنَ اللّٰهَ فِي السَّرَّآءِ وَالضَّرَّآءِ يَحْمَدُوْنَ اللّٰهَ فِيْ كُلِّ مَنْزِلَةٍ وَيُكَبِّرُوْنَهُ عَلٰى كُلِّ شَرَفٍ رُعَاةٌ لِلشَّمْسِ يُصَلُّوْنَ الصَّلٰوةَ اِذَا جَآءَ وَقْتُهَا يَتَأَزَّرُوْنَ عَلٰى اَنْصَافِهِمْ وَيَتَوَضَّئُوْنَ عَلٰى اَطْرَافِهِمْ مُنَادِيْهِمْ يُنَادِيْ فِيْ جَوِّ السَّمَآءِ صَفُّهُمْ فِي الْقِتَالِ وَصَفُّهُمْ فِي الصَّلٰوةِ سَوَآءٌ لَهُمْ بِاللَّيْلِ دَوِيٌّ كَدَوِيِّ النَّحْلِ هٰذَا لَفْظُ الْمَصَابِيْحِ وَرَوَى الدَّارِمِيُّ مَعَ تَغْيِيْرٍ يَسِيْرٍ۔

اخرجه الدارمى ۱۷/۱ حديث رقم ۸

ترجمہ: ''حضرت کعب احبارؒ تورات سے نقل کرتے ہیں کہ ہم یہ لکھا ہوا پاتے ہیں: ''محمد ﷺ اللہ کے رسول اور اس کے برگزیدہ بندے ہوں گے' وہ نہ درشت خو ہوں گے اور نہ سخت گو' نہ بازاروں میں چلانے والے ہوں گے اور نہ برائی کا بدلہ برائی سے لینے والے بلکہ درگزر کرنے والے اور بخش دینے والے ہوں گے' ان کی جائے پیدائش مکہ ہوگا' ان کی ہجرت کی جگہ طیبہ (مدینہ) ہوگا اور ان کی حکومت کی جگہ ملک شام ہوگا' ان کی اُمت اللہ عزوجل کی بہت زیادہ حمد و ثناء کرنے والی ہوگی جو ہر حالت میں کیا غمی' کیا خوشی اور کیا فراخی' کیا تنگی' خدا کی حمد و ثنا کرے گی' وہ لوگ جہاں بھی اتریں گے یا ٹھہریں گے' خدا کا شکر بجالائیں گے اور جہاں بھی چڑھیں گے خدا کی بڑائی بیان کریں گے (یعنی جب اونچی جگہ پر چڑھیں گے تو

اللہ اکبر کہیں گے) اور سورج کی نگہداشت کریں گے جب نماز کا وقت ہوگا نماز پڑھیں گے اپنی کمر پر (یعنی ناف کے اوپر ازار باندھیں گے (یعنی ستر پوشی کا بہت زیادہ خیال رکھیں گے) (یا یہ کہ ان کا ازار نصف پنڈلیوں تک ہوگا) جسم کے اعضاء پر وضو کریں گے (یعنی ہاتھ پاؤں اور منہ دھوئیں گے اور پورا وضو کریں گے) ان کا منادی بلند جگہ پر منادی کرے گا (یعنی مؤذن کسی بلند جگہ جیسے منارہ وغیرہ پر کھڑا ہو کر اذان دیا کرے گا) جنگ میں اور نماز میں ان کی صف یکساں ہوگی (یعنی وہ دشمنانِ اسلام کے خلاف میدانِ جنگ میں بھی صف بندی کے اصول وقواعد کی پابندی کریں گے اور باجماعت نماز ادا کرنے کے لئے بھی اپنی صفیں درست کریں گے) رات میں (اپنے نفس اور شیطان کی سرکوبی کے لئے عبادت کے وقت) ان کی آواز پست ہوگی (یعنی تسبیح وتہلیل اور ذکر وتلاوت ہلکی آواز سے کیا کریں گے) جیسے شہد کی مکھی کی آواز ہوتی ہے''۔ مصابیح نے اس روایت کو انہی الفاظ کے ساتھ اور دارمیؒ نے قدرے تغیر کے ساتھ نقل کیا ہے''۔

تشریح: قولہ: وملکه بالشام:

حضرت معاویہؓ اور ان کے بعد کی اموی خلافت کا مرکز شام ہی رہا مظہرؒ فرماتے ہیں یہاں حکومت سے مراد دین اور نبوت ہے چونکہ یہ شام میں غالب ہوگا اگرچہ ان کی حکومت پورے آفاق میں رہے گی چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: سیبلغ ملك امتی مازوی لی منها۔ بعض کا کہنا ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ غزوہ جہاد یہاں ہوگا چونکہ یہ بلاد بلاد کفار ہوں گے اور جہاد اہل اسلام کے لئے ہے۔ گویا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فضیلت جہاد حاصل کرنے کے لئے شام کی طرف سفر کا حکم دیا ہے۔ میں کہتا ہوں یہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں تھا اب اگرچہ جنگوں کا مرکز روم ہے وہ بھی شام ہی کی سمت میں واقع ہے۔

منزلة: منزلۃ سے مراد مرتبہ حالت ہے۔ ای مرتبة من مراتب الاحوال۔ بعض نے اس کا معنی ''فی کل منزل'' بیان کیا ہے اور شاید کہ اس کی تانیث بقعہ وناپہ کے معنی میں ہونے کی وجہ سے ہے۔ یعنی جہاں بھی پڑاؤ ڈالیں گے اللہ تعالیٰ کا شکر بجالائیں کہ اس ذات نے اطمینان اور ٹھکانہ نصیب فرمایا ویکبرونه علی کل شرف (شین اور راء کے فتحہ کے ساتھ)

رعاة: (راء کے ضمہ کے ساتھ راعِ کی جمع ہے) یعنی آپ کی امت سورج کے طلوع' استواء وغروب کا لحاظ کرے گی یعنی نماز روزے اور دیگر عبادات کے ایام واوقات کی پابندی ورعایت کریں گے۔ ایک روایت میں جس کو حاکم نے عبداللہ ابن ابی اوفیٰؓ سے مرفوعاً نقل کیا ہے فرمایا گیا ہے۔

ان خیار عباد الله الذین یرعون الشمس والقمر والنجوم والأظلة لذکر الله۔ ''بلاشبہ خدا کے بہترین بندے وہ ہیں جو اللہ تعالیٰ کی عبادت کے لئے (اوقات کی تعیین کی خاطر) سورج' چاند' ستاروں کا دھیان رکھتے ہیں۔ قوله: یصلون الصلوٰة اذا جاء وقتها۔ جملہ استینافیہ تعلیلیہ ہے' ماقبل کے لئے۔ یعنی یہ سورج دیکھنے کا اہتمام اس لئے کریں گے تاکہ اوقات نماز معلوم ہوتے رہیں' کوئی نماز اپنے وقت سے فوت نہ ہو اور اگلے جملے میں امت کے بقیہ احوال بیان فرمائے ہیں: ''یتازرون'' (زاء کی تشدید کے ساتھ باب تفعل سے ہے) یعنی ناف سے گھٹنے تک ازار باندھیں گے اس معنی کی تائید مصابیح کے بعض نسخوں سے بھی ہوتی ہے جس میں انصافهم کی جگہ علی اوساطهم کا لفظ ہے۔ یہاں مراد یہ ہے کہ ستر پوشی کا بہت زیادہ خیال رکھیں گے اور یہ بھی ممکن ہے کہ علیٰ کو بمعنی الیٰ بنائیں۔ ای ازرهم الی انصاف سوقهم۔ اس صورت میں معنی ہوگا

ان کا ازار تہبند نصف ساق تک ہوگا۔

طیبیؒ فرماتے ہیں اس میں ادماج ہے اس معنی تجلد و تشمر للقیام الی الصلاۃ کیونکہ جو شخص تہبند پنڈلی تک کس لیتا ہے تو اس سے کسی اہم کام کے لئے تیار ہونا سمجھا جاتا ہے' یا یہ کنایہ ہے تواضع سے۔ جیسے ازار کا لٹکانا تکبر سے کنایہ ہوتا ہے۔

صفھم فی القتال و صفھم فی الصلاۃ سواء ان کی صفیں سیسہ پلائی دیوار کی مانند ہونے میں برابر ہوں گی۔

طیبیؒ فرماتے ہیں امت محمدیہ کے لوگوں کی نمازوں کی صفوں کو نفس امارہ اور شیطان کے ساتھ زیادہ مجاہدہ کرنے کے سبب دشمنان اسلام کے خلاف میدان جنگ میں ہونے والے مجاہدے کی صفوں کے ساتھ تشبیہ دی ہے اور اس کو تشبیہ میں تشابہ کے مقام میں ذکر کیا یہ بتانے کے لئے بل کہ ان میں سے ہر ایک مشبہ اور مشبہ بہ بن سکتا ہے لیکن صف صلاۃ کا ذکر موخر کیا تاکہ زیادہ ابلغ ہونے کی وجہ سے مشبہ بہ بنے۔

دوی دال کے فتحہ اور یاء کی تشدید کے ساتھ۔ یعنی تسبیح' تہلیل اور ذکر و تلاوت ہلکی آواز سے کیا کریں گے۔

قولہ :وروی الدارمی مع تغییر یسیر : میں کہتا ہوں اولیٰ یہ تھا کہ دارمی کے الفاظ کو ذکر کرتے' کیونکہ دارمی جلیل القدر اصحاب تخریج میں سے ہیں اور محدثین کے نزدیک ان کی نقل اکمل ہوتی ہے۔

دارمی کے الفاظ زیادہ اکمل ہیں کیونکہ اصحاب التخریج محدثین کے ہاں زیادہ معتمد ہیں۔

۵۷۷۲ : وَعَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ سَلَامٍ قَالَ مَكْتُوْبٌ فِي التَّوْرٰةِ صِفَةُ مُحَمَّدٍ وَّعِيْسٰى بْنُ مَرْيَمَ يُدْ فَنُ مَعَهٗ قَالَ اَبُوْ مَوْدُوْدٍ وَقَدْ بَقِيَ فِي الْبَيْتِ مَوْ ضِعُ قَبْرٍ (رواه الترمذی)

اخرجه الترمذی فی السنن ۵/ ۵۴۹ حديث رقم ۳۶۱۷۔

ترجمہ:''حضرت عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ سے مروی ہے' فرماتے ہیں کہ تورات میں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے اوصاف کا ذکر ہے اور یہ بھی لکھا ہوا ہے کہ عیسیٰ بن مریم علیہ السلام آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ دفن ہوں گے۔ حضرت ابو مودودؒ کہتے ہیں کہ (حضرت عائشہؓ کے) حجرۂ مبارکہ میں (جہاں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم زیر زمین آرام فرما ہیں) ایک قبر کی جگہ باقی ہے''۔ (ترمذی)

تشریح: فی التوراۃ: یہ خبر ہے وعیسٰی اس کا عطف ہے مبتداء پر۔ ای و مکتوب فیھا ایضا ان عیسیٰ یدفن معه۔ یعنی اس میں یہ بھی لکھا ہوا ہے کہ عیسیٰ ابن مریم علیہ السلام آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے حجرہ مبارک میں مدفون ہوں گے طیبیؒ فرماتے ہیں عبارت یوں ہے ھذا ھو المکتوب فی التوراۃ۔ تقدیری عبارت یوں ہے: المکتوب صفة محمد کذا و عیسٰی ابن مریم یدفن معه۔ تورات میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اوصاف بیان ہوئے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ایسے ایسے ہوں گے' انہی اوصاف میں یہ بھی لکھا ہوا ہے کہ حضرت عیسیٰ ابن مریم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مدفون ہوں گے یا یہ فرمایا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے فلاں فلاں اوصاف لکھے ہوئے ہیں ساتھ یہ بھی لکھا ہوا ہے کہ عیسیٰ ابن مریم بھی آپ کے حجرے میں مدفون ہوں گے۔

قال ابو مودود یہ اس حدیث کے ایک مدنی راوی ہیں طیبیؒ نے ایسا ہی ذکر کیا ہے۔ مصنف کہتے ہیں یہ عبدالعزیز بن سلیمان مدنی ہیں انہوں نے حضرت ابو سعید خدریؓ کو دیکھا ہے عثمان بن ضحاک اور سائب بن یزید سے ان کا سماع ثابت ہے جبکہ ابن مہدی' کامل' عقبی اور ثقوی ان سے روایت کرتے ہیں خلیفہ مہدی کے زمانے میں وفات پائی۔

قولہ:وقد بقی فی البیت' موضع قبر (حجرہ عائشہ کے کس مقام میں ہے) آنحضرت ﷺ کی قبر مبارک اور صدیق و عمر رضی اللہ عنہم کی قبر کے بیچ میں ہے۔ادب کے لحاظ سے یہ اقرب ہے۔حضرت عمرؓ کی قبر مبارک کے پہلو میں مدفون ہوں گے جگہ یہیں پر خالی ہے اس لئے یہ قول زیادہ معتبر معلوم ہوتا ہے کیونکہ شیخ جزریؒ فرماتے ہیں کہ حجرۂ مبارک میں داخل ہونے والے ایک سے زائد لوگوں نے تینوں قبروں کی آنکھوں دیکھی ترتیب یوں بیان کی ہے کہ سب سے آگے سرکار دوعالم ﷺ کی قبر مبارک ہے اس کے بعد حضرت ابوبکرؓ کی قبر اس طرح ہے کہ جہاں آنحضرت ﷺ کا سینہ مبارک ہے وہاں حضرت ابوبکرؓ کا سر ہے حضرت ابوبکرؓ کی قبر کے بعد حضرت عمرؓ کی قبر اس طرح ہے کہ جہاں حضرت ابوبکرؓ کا سینہ مبارک ہے وہاں حضرت ﷺ عمر کا سر ہے اور حضرت عمرؓ کے پہلو میں ایک قبر کی جگہ خالی ہے بعض روایات میں ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اس دنیا میں اپنی عمر کے آخری حصے میں پہنچیں گے تو حج بیت اللہ کے لئے مکہ معظمہ تشریف لے جائیں گے وہاں سے واپس آرہے ہوں گے کہ مکہ اور مدینہ کے درمیان انتقال فرما جائیں گے۔چنانچہ ان کی نعش مبارک مدینہ منورہ لائی جائے گی اور روضہ اقدس میں حضرت عمرؓ کے پہلو میں دفن کئے جائیں گے اس طرح یہ دونوں صحابیوں حضرت ابوبکر اور عمر رضی اللہ عنہما کو ان دو انتہائی عظیم المرتب نبیوں کے درمیان تاقیامت رفاقت کا شرف حاصل رہے گا۔

الفصل الثالث:

انبیاء علیہم السلام اور آسمان والوں پر آنحضرت ﷺ کی فضیلت کی دلیل

۵۷۷۳: عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ اِنَّ اللّٰهَ تَعَالٰى فَضَّلَ مُحَمَّدًا صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَلَى الْاَنْبِيَآءِ وَعَلٰى اَهْلِ السَّمَآءِ فَقَالُوْا يَا اَبَا عَبَّاسٍ بِمَ فَضَّلَهُ اللّٰهُ عَلٰى اَهْلِ السَّمَآءِ قَالَ اِنَّ اللّٰهَ تَعَالٰى قَالَ لِاَهْلِ السَّمَآءِ وَمَنْ يَّقُلْ مِنْهُمْ اِنِّيْ اِلٰهٌ مِّنْ دُوْنِهٖ فَذٰلِكَ نَجْزِيْهِ جَهَنَّمَ كَذٰلِكَ نَجْزِي الظّٰلِمِيْنَ وَقَالَ اللّٰهُ تَعَالٰى لِمُحَمَّدٍ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحًا مُّبِيْنًا لِّيَغْفِرَ لَكَ اللّٰهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِكَ وَمَا تَاَخَّرَ قَالُوْا وَمَا فَضْلُهٗ عَلَى الْاَنْبِيَآءِ قَالَ قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰى وَمَا اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا بِلِسَانِ قَوْمِهٖ لِيُبَيِّنَ لَهُمْ فَيُضِلُّ اللّٰهُ مَنْ يَّشَآءُ الْاٰيَةَ وَقَالَ اللّٰهُ تَعَالٰى لِمُحَمَّدٍ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَمَا اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا كَآفَّةً لِّلنَّاسِ فَاَرْسَلَهٗ اِلَى الْجِنِّ وَالْاِنْسِ۔

اخرجه الدارمي ۳۸/۱ حديث رقم ٤٦۔

ترجمہ:"حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ انہوں نے فرمایا:"اللہ تعالیٰ نے حضرت محمد ﷺ کو تمام انبیاء علیہم السلام اور آسمان والوں پر فضیلت عطا فرمائی ہے۔حاضرین مجلس کہنے لگے کہ اے ابوعباس! اللہ تعالیٰ نے آنحضرت ﷺ کو آسمان والوں پر کس چیز سے فضیلت دی ہے؟ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا:"اللہ تعالیٰ نے آسمان والوں سے تو یوں خطاب فرمایا: ﴿وَمَنْ يَّقُلْ مِنْهُمْ اِنِّيْ اِلٰهٌ مِّنْ دُوْنِهٖ فَذٰلِكَ نَجْزِيْهِ جَهَنَّمَ كَذٰلِكَ نَجْزِي الظّٰلِمِيْنَ﴾

(ان میں سے جس نے کہا کہ میں اللہ تعالیٰ کے سوا معبود ہوں تو ہم اسے جہنم کی سزا دیں گے۔ہم اسی طرح ظالموں کو سزا دیتے ہیں)'' (گویا اس خطاب میں نہ صرف یہ کہ نہایت سخت انداز اور رعب و دبدبہ کا اظہار کیا بلکہ سخت عذاب کی دھمکی بھی دی گئی جبکہ آنحضرتؐ کو خطاب فرمایا گیا تو بڑی ملائمت' مہربانی اور کرم وعنایت کا انداز اختیار فرمایا گیا چنانچہ) محمدؐ سے اللہ تعالیٰ نے یوں ارشاد فرمایا:﴿اِنَّا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحًا مُّبِيْنًا لِيَغْفِرَ لَكَ اللّٰهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْۢبِكَ وَمَا تَاَخَّرَ﴾ ''(اے محمد ﷺ) ہم نے تمہارے لئے عظمتوں اور برکتوں کے دروازے پوری طرح کھول دیئے ہیں (جیسا کہ مکہ کا فتح ہونا) اور یہ اس لئے ہے کہ اللہ نے تمہارے اگلے پچھلے گناہ بخش دیئے ہیں''۔لوگوں نے عرض کیا کہ (اچھا یہ بتائیے) اللہ تعالیٰ نے دیگر انبیاء پر آنحضرت ﷺ کو کس چیز سے فضیلت دی ہے؟ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: ''اللہ تعالیٰ نے دوسرے انبیاء کی نسبت یوں فرمایا:﴿وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا بِلِسَانِ قَوْمِهٖ لِيُبَيِّنَ لَهُمْ فَيُضِلُّ اللّٰهُ مَنْ يَّشَآءُ﴾ ''ہم نے ہر نبی کو اس کی قوم کی زبان کے ساتھ بھیجا تاکہ وہ قوم کے سامنے خدا کے احکام وقوانین بیان کرے اور اللہ جس کو چاہتا ہے گمراہ کرتا ہے الخ''۔ جب کہ اللہ تعالیٰ نے محمد ﷺ کے بارے میں یہ ارشاد فرمایا:﴿وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا كَآفَّةً لِّلنَّاسِ﴾ ''یعنی اے محمد (ﷺ) ہم نے آپ ﷺ کو تمام انسانوں کے لئے رسول بنا کر مبعوث کیا ہے''۔

تشریح: صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا یہ سوال: **اھم فالاھم** کے اعتبار سے تھا یا اس آیت﴿**یوم تبیض وجوہ**﴾ [ال عمران : ۱۰۶] کے طرز وطریقہ کی بات ہے۔

طیبیؒ فرماتے ہیں آپ کی فضیلت کا اظہار باری تعالیٰ نے اہل آسمان سے رعب و دبدبہ کے ساتھ فرمایا ہے اور فرشتوں سے جس کام کا ہونا ناممکن ومحال ہے اس کو فی الواقع قرار دے کر باری تعالیٰ نے اپنے جلال وکبریائی کے اظہار کے لئے سخت وعید اور عذاب کی دھمکی دی ہے حالانکہ فرشتے شرک کی ان نسبتوں سے کوسوں دور ہیں جو ان کی طرف کی جاتی ہیں چنانچہ مشرکین مکہ کی حقارت وذلت بیان کرتے ہوئے ارشاد فرمایا:﴿**و جعلوا بینہ وبینی الجنة نسبا**﴾ [الصافات : ۱۵۸] جبکہ آنحضرت ﷺ سے نہایت ملائمت سے خطاب فرمایا اور یہ کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کے اگلے پچھلے گناہ معاف فرمادیئے ہیں یعنی آپ ﷺ مغفور ہیں اور فتح مکہ کو مومنین کے قلوب میں نزول سکینہ کا باعث بنایا۔نیز آپ ﷺ کی نصرت ومغفرت اور اتمام نعمت وہدایت کی علت بھی قرار دیا۔

طیبیؒ کے کلام کا خلاصہ یہ ہے کہ فرشتوں کے خطاب وعید میں سختی اختیار فرمائی گئی ہے جبکہ آنحضرت ﷺ کے ساتھ خطاب وعدہ میں نرمی اختیار فرمائی گئی ہے جو کہ آپ ﷺ کی آسمان والوں پر فضیلت کی دلیل ہے لیکن یہ دلیل محل نظر ہے کیونکہ باری تعالیٰ نے قرآن مجید کے کئی مقامات میں فرشتوں کی حد درجہ تعریف فرمائی ہے چنانچہ آیت ہے:﴿**ومن عندہ لا یستکبرون عن عبادته ولا یستحسرون یسبحون اللیل والنھار لا یفترون** ترجمہ (حق تعالیٰ کی وہ شان ہے) کہ جتنے کچھ آسمان اور زمین میں ہیں سب اسی کے ہیں ان میں سے جو اللہ کے نزدیک (بڑے مقبول ومقرب ہیں) وہ اس کی عبادت سے عار نہیں کرتے اور نہ تھکتے ہیں۔آگے فرمایا:﴿**وقالوا اتخذ الرحمن ولدا سبحنه بل عباد مکرمون لا یسبقونه بالقول وھم بامرہ یعملون یعلم ما بین ایدیھم وما خلفھم ولا یشفعون الا لمن ارتضی وھم من خشیته مشفقون**﴾ [الانبیاء ۲۶ تا ۲۸]

"اور یہ (مشرک) لوگ یوں کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے (فرشتوں کو) اولاد بنا رکھا ہے وہ (اللہ تعالیٰ اس سے) پاک ہے بلکہ (وہ فرشتے اس کے) بندے ہیں (ہاں) معزز۔ وہ اس سے آگے بڑھ کر بات نہیں کر سکتے اور وہ اسی کے حکم کے موافق عمل کرتے ہیں۔ (وہ جانتے ہیں کہ) اللہ تعالیٰ ان کے اگلے پچھلے احوال کو جانتا ہے اور وہ بجز اس کے جس کے لئے (شفاعت کرنے کی) خدا تعالیٰ کی مرضی ہو اور کسی کی سفارش نہیں کر سکتے اور وہ سب ڈرنے والے ہیں۔

آنحضرت ﷺ کو بر طریق فرض و تقدیر سختی سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا: ﴿لئن اشرکت لیحبطن عملك ولتکونن من الخاسرین﴾ (الزمر ٦٠): "اگر تو شرک کرے گا تو تیرا کیا کرایا (عمل تیرے) کام سب غارت ہو جائیں گے اور تو خسارہ میں پڑے گا (کبھی شرک مت کرنا)۔

جبکہ آیت: ﴿و من یقل منھم﴾ میں فرشتوں اور مخلوق دونوں سے خطاب کا احتمال ہے۔ قاضی عیاض نے اس آیت سے تین باتیں مقصودی طور پر نقل کی ہیں۔ ① فرشتوں میں نبوت کی نفی۔ ② فرشتوں سے اس دعویٰ کے الزام کی نفی۔ ③ فرشتوں کی ربوبیت کے دعویٰ پر مشرکین مکہ کو تحدید۔

تو آپ ﷺ کی فضیلت کے متعلق یوں کہنا اولیٰ ہے کہ یہ آیت مبارکہ اس بات پر دلالت کر رہی ہے کہ آپ ﷺ (صرف جن و انس کی طرف نہیں بلکہ) فرشتوں کی طرف بھی مبعوث فرمائے گئے ہیں جیسا کہ بعض علماء نے فرمایا ہے۔

قولہ: وما ارسلناك الا کافۃ للناس۔

طیبیؒ دوسرے انبیاء علیہم السلام پر آنحضرت ﷺ کی فضیلت کے متعلق بیان فرماتے ہیں کہ آیت مبارکہ اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ انبیاء سابقہ مخصوص قوم کی طرف مبعوث ہوتے تھے جبکہ آنحضرت ﷺ کی بعثت تمام نوع انسانی کی طرف ہوئی ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ تمام رسول بندوں کو بتوں کی عبادت سے نکال کر اللہ کی عبادت' اور لوگوں کو کفر کے اندھیروں سے دین کی روشنی کی طرف اور ان کو صراط مستقیم دکھلانے کے لئے مبعوث فرمائے گئے اب انبیاء میں سے جس کی تبلیغ کی تاثیر اس امر میں زیادہ رہی وہ زیادہ افضل رہا آنحضرت ﷺ سب کے سرخیل تھے اس میں سب سے آگے تھے کیونکہ آپ کسی ایک قوم یا وقت کے لئے نہیں بھیجے گئے تھے بلکہ آپ کا دین کرہ ارض کے طول و عرض میں پھیل گیا اور ہر جگہ پہنچ کر رہا اور تسلسل کے ساتھ ہر زمانے میں پھیلتا رہا اللہ تعالیٰ ہمیشہ ہمیشہ ان کی عزت و شرف میں اضافہ فرمائیں کیونکہ اگلی پچھلی کل فضیلتیں آپ ﷺ کی ذات میں جمع ہو گئیں ہیں۔

قولہ: فارسلہ الی الجن و الانس۔ یہ مفہوم آیات قرآنیہ سے بھی مستفاد ہے۔ چنانچہ باری تعالیٰ کا ارشاد: ﴿واذ صرفنا الیك نفرا من الجن یستمعون القرآن﴾ (الاحقاف: ۲۹) ترجمہ اور جبکہ ہم جنات کی ایک جماعت کو آپ کی طرف لے آئے جو قرآن سننے لگے تھے۔ اسی طرح سورہ رحمان کی یہ آیت: ﴿یامعشر الجن والانس﴾ [الرحمٰن: ۳۳] آیت: ﴿ما ارسلناك الا کافۃ للناس﴾ میں صرف انسان کے ذکر پر اکتفا تعظیماً یا تغلیباً ہے۔ یا اس لئے کہ یہ دونوں کو عام ہے۔ چنانچہ قاموس میں ہے: "الناس" کا اطلاق انس و جن دونوں کو ہوتا ہے۔ "الناس" انس کی جمع ہے اس کی اصل اناس ہے۔ یہ جمع

نادر ہے جس پر لام تعریف کا ہے۔

بعض لوگ کہتے ہیں کہ فاء تعقیب کے لئے ہے' لیکن ظاہری عبارت کا تقاضا یہ ہے کہ نتیجے کے لئے ہو اور اس کی توجیہ یہ ہے "الناس" کے شروع میں لام تعریف استغراق جنس کے لئے ہے اور "كافة" حال ہے مصدر محذوف کے لئے یا صفت ہے: ای تکف ان تخرج فرد من افراد هذا الجنس من الارسال۔ اور مطلب یہ بنتا ہے یہ روکتا ہے اس سے کہ اس جنس کا کوئی بھی فرد اس بعثت کی برکت سے خارج ہو جن انسان کے تابع ہیں چنانچہ التزاماً معلوم ہوا کہ آپ ﷺ کی بعثت جن وانس سب کی طرف ہوئی یعنی تمام نوع انسانی کی طرف ہوئی آپ ﷺ جن وانسان دونوں کے پیغمبر ہیں۔

آنحضرت ﷺ نے اپنی نبوت کو کیسے جانا

۵۷۷۴: وَعَنْ اَبِیْ ذَرٍّ الْغِفَارِيِّ قَالَ قُلْتُ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ كَيْفَ عَلِمْتَ اَنَّكَ نَبِيٌّ حَتّٰى اسْتَيْقَنْتَ فَقَالَ يَا اَبَا ذَرٍّ اَتَانِیْ مَلَكَانِ وَاَنَا بِبَعْضِ بَطْحَاءِ مَكَّةَ فَوَقَعَ اَحَدُهُمَا اِلَى الْاَرْضِ وَكَانَ الْاٰخَرُ بَيْنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ فَقَالَ اَحَدُهُمَا لِصَاحِبِهٖ اَهُوَ هُوَ قَالَ نَعَمْ قَالَ فَزِنْهُ بِرَجُلٍ فَوُزِنْتُ بِهٖ فَوَزَنْتُهٗ ثُمَّ قَالَ زِنْهُ بِعَشْرَةٍ فَوُزِنْتُ بِهِمْ فَرَجَحْتُهُمْ ثُمَّ قَالَ زِنْهُ بِمِائَةٍ فَوُزِنْتُ بِهِمْ فَرَجَحْتُهُمْ ثُمَّ قَالَ زِنْهُ بِاَلْفٍ فَوُزِنْتُ بِهِمْ فَرَجَحْتُهُمْ كَاَنِّیْ اَنْظُرُ اِلَيْهِمْ يَنْتَثِرُوْنَ عَلَیَّ مِنْ خِفَّةِ الْمِيْزَانِ قَالَ فَقَالَ اَحَدُهُمَا لِصَاحِبِهٖ لَوْ وَزَنْتَهٗ بِاُمَّتِهٖ لَرَجَحَهَا۔ (رواهما الدارمی)

اخرجه الدارمی فی السنن ۱/ ۲۰ حدیث رقم ۱۴۔

ترجمہ: "حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے' فرماتے ہیں کہ میں نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! آپ ﷺ نے کیسے جانا کہ آپ نبی ہیں یہاں تک کہ آپ کو اپنی نبوت کا یقین ہو گیا اور آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا: "ابوذر میں بطحائے مکہ میں تھا کہ میرے پاس دو فرشتے آئے' ان میں سے ایک فرشتہ تو زمین پر اتر آیا اور دوسرا زمین وآسمان کے درمیان ٹھہرا رہا' پھر ان میں سے ایک نے (میری طرف اشارہ کر کے) اپنے ساتھی فرشتہ سے پوچھا کہ کیا یہی وہ شخص ہیں (جن کے بارے میں خدا نے ہمیں بتایا ہے کہ میرے ایک پیغمبر ہیں ان کے پاس جاؤ) اس فرشتہ نے جواب دیا کہ ہاں وہ یہی ہیں۔ پھر پہلے فرشتے نے دوسرے فرشتے سے کہا کہ (ان پیغمبر کی امت میں سے) ایک آدمی کے ساتھ ان کا وزن کرو۔ میرا اس کے ساتھ وزن کیا گیا تو میں بھاری رہا۔ پھر اس نے کہا دس آدمیوں کے ساتھ ان کا وزن کرو چنانچہ میرا دس آدمیوں کے ساتھ وزن کیا گیا تو میں ان دس آدمیوں سے بھی بھاری رہا' پھر اس نے کہا اچھا سو آدمیوں کے ساتھ ان کو تولو' چنانچہ مجھے سو آدمیوں کے ساتھ وزن کیا گیا اور میں ان سو آدمیوں کے مقابلہ میں بھی بھاری رہا' پھر اس نے کہا اچھا اب ایک ہزار آدمیوں کے ساتھ ان کو تولو' چنانچہ مجھے ہزار آدمیوں کے ساتھ وزن کرو تو میں ان ہزار آدمیوں کے مقابلہ میں بھی بھاری رہا اور گویا (اب بھی) میں ان ہزار آدمیوں کو دیکھ رہا ہوں کہ وہ جس پلڑے میں تھے وہ (میرے پلڑے کے مقابلہ میں) اتنا ہلکا تھا (اور اتنا اوپر اٹھ گیا تھا) کہ مجھے لگا جیسے وہ سب کے سب میرے اوپر گر پڑیں گے۔ اس کے بعد ان دونوں

میں سے ایک نے اپنے ساتھی سے کہا کہ اگر تم ان کو ان کی ساری امت کے ساتھ بھی تولو تو یہ یقیناً ساری امت کے مقابلہ میں بھی بھاری رہیں گے"۔ ان دونوں روایتوں کو دارمیؒ نے نقل کیا ہے"۔

تشریح: حتی استیقنت طیبیؒ فرماتے ہیں "حتیٰ" علم کی غایت بیان کرنے کے لئے ہے۔

اھو ھو یہاں ایک ضمیر اسم اشارہ ھذا کی جگہ ہے۔

فوزنت به یہ فعل مجہول ہے فوزنته یہ معروف ہے۔

طیبیؒ فرماتے ہیں اس روایت سے یہ معلوم ہوا کہ جس طرح امت نبی صادق کی معرفت میں نبی کی جانب سے خارق عادت امور کے اظہار کی محتاج ہوتی ہے۔ اسی طرح نبی اپنی نبوت کی معرفت میں ان جیسے خوارق کے محتاج ہوتے ہیں۔

میں کہتا ہوں کہ یہ (یعنی امام طیبی کا یہ کلام) اس بات کی صلاحیت رکھتا ہے کہ اس آیت: ﴿ربی کیف تحیی الموتی﴾ میں مذکور حضرت ابراہیم علیہ السلام کے مشہور اشکال کا جواب بن سکے۔

حضور ﷺ پر ہر حالت میں قربانی فرض تھی

۵۷۷۵ : وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كُتِبَ عَلَيَّ النَّحْرُ وَلَمْ يُكْتَبْ عَلَيْكُمْ وَاُمِرْتُ بِصَلٰوةِ الضُّحٰى وَلَمْ تُؤْمَرُوْا بِهَا۔ (رواه الدارقطنی)

اخرجه الدارقطني في سننه ۲۸۲/۴ حديث رقم ٤٢ من باب الصيد۔ في المخطوطة "لفي"

ترجمہ: "حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: "مجھ پر قربانی فرض کی گئی ہے اور تم پر اس طرح فرض نہیں ہے (بلکہ اسی حالت میں فرض ہے جب تم مالی استطاعت رکھو) نیز مجھ کو چاشت کی نماز کا حکم (وجوب کے طور پر) دیا گیا ہے اور تمہیں اس کا حکم نہیں دیا گیا ہے"۔ (دارقطنی)

تشریح: کتب "اوجب" کے معنی میں ہے۔ اور امام طیبیؒ فرماتے ہیں: ای وجب۔ اور اس سے مراد اللہ جل شانہ کا یہ ارشادِ گرامی ہے: ﴿فَصَلِّ لِرَبِّكَ وَانْحَرْ﴾ [الکوثر: ۲]

بعض حضرات کہتے ہیں کہ مالی استطاعت نہ ہونے کے باوجود آنحضرت ﷺ پر قربانی واجب تھی کیونکہ آپ ﷺ کی حدیث ہے: ثلاث کتبت علی ولم تکتب علیکم۔ الضحی والاضحی والوتر۔ تین چیزیں مجھ پر واجب کی گئیں تم پر نہیں۔ چاشت کی نماز، قربانی اور وتر یا تہجد ابن الملکؒ نے شرح المشارق میں ایک حدیث نقل کی ہے آپ ﷺ نے فرمایا قربانی کے وجوب کے متعلق ابھی ابھی مجھ پر یہ سورت نازل ہوئی ہے پھر آپ ﷺ نے تسمیہ پڑھ کر سورۃ کوثر کی تلاوت فرمائی۔

ابن حجر عسقلانی شرح شمائل میں فرماتے ہیں دارقطنی کی روایت امرت...... ضعیف ہے اور جو یہ کہا جاتا ہے کہ یہ آپ ﷺ کے خصائص میں سے ہے تو اس کی حقیقت یہ ہے کہ نفس نماز آپ پر واجب تھی لیکن مواظبت واجب نہ تھی۔

میں (ملاعلی قاریؒ) کہتا ہوں احمد اور طبرانی نے الکبیر میں حضرت ابن عباسؓ سے بھی کتب علی الاضحی ولم یکتب علیکم وامرت بصلوٰۃ الضحی ولم تؤمروا بها نقل کی ہے۔

اس اعتبار سے دار قطنی کی اس روایت کا اقل درجہ حسن کا بنتا ہے اگر اس کا ثبوت نہ ہوتا تو اس کو آپ کے خصائص میں کیوں شمار کیا جاتا اور جب وجوب ثابت ہو جائے تو مواظبت کا وجوب خود بخود سمجھ میں آتا ہے جیسے دیگر واجبات میں ہوتا ہے' یوں کہنا زیادہ اولیٰ تھا کہ امرت سے وجوب کا ثبوت لازم نہیں آتا کیونکہ لفظ امرت میں استحباب کا بھی احتمال ہوتا ہے چنانچہ دار قطنی ہی کی حضرت انسؓ سے مرفوع روایت بھی اس پر دلالت کر رہی ہے: **امر بالوتر والاضحی ولم یعزم**۔ حضرت انسؓ فرماتے ہیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: **امرت بالوتر والاضحی ولم یعزم علی** (مجھے وتر اور چاشت کی نماز کا حکم دیا گیا لیکن اس کو مجھ پر لازم نہیں کیا گیا)۔

امام احمدؒ نے ابن عباسؓ سے نقل کیا ہے **امرت بالوتر ورکعتی الضحی ولم یکتب**
''مجھے وتر اور چاشت کی دو رکعتوں کا حکم دیا گیا ہے لیکن اس کو واجب نہیں کیا گیا۔''

ادلہ کو جمع کرتے ہوئے یوں کہا جائے اصل کے اعتبار سے تو واجب تھی البتہ استمرار و مواظبت مستحب تھی۔ واللہ تعالیٰ اعلم

بَابُ اَسْمَاءِ النَّبِيِّ ﷺ وَصِفَاتِهٖ

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اسماء مبارک اور صفات کا بیان

ترکیب کے لحاظ سے "وصفاته" اسماء النبی ﷺ کے لئے عطف تفسیر ہے آنحضرت ﷺ کا کوئی بھی اسم گرامی جامد نہیں ہے ہاں البتہ ایسا ضرور ہے کہ آپ ﷺ کے چند اسمائے گرامی ایسے ہیں جو وصفیت سے علمیت کی طرف منقول ہو کر آئے ہیں جیسے احمد، محمد وغیرہ ان اسماء کے علاوہ آنحضرت ﷺ کی کئی مخصوص صفات بھی ہیں جن میں امت کے لوگوں کے نام بھی ہوں گے اور دوسرے انبیاء بھی شریک ہیں یہاں اسماء سے ان دونوں سے اعم معنی مراد ہے۔

مشہور قواعد میں سے یہ قاعدہ بھی ہے کہ کثرت اسماء مسمّٰی کی عظمت پر دلالت کرتی ہے۔

شرح مسلم للنووی میں ہے کہ قاضی ابوبکر ابن عربی مالکی نے اپنی کتاب الاحوذی فی شرح الترمذی میں لکھا ہے بعض حضرات سے منقول ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ہزار نام ہیں اور اس کے حبیب کے بھی ہزار نام ہیں پھر ان میں سے ساٹھ سے زائد اسماء کو تفصیلاً نقل کیا ہے۔ ابن جوزیؒ نے ابوالحسن ابن الفارس اللغوی کے حوالے سے اپنی کتاب الوفاء میں بائیس نام ذکر کیے ہیں جن کو طیبیؒ نے مفصلاً نقل کیا ہے۔

امام سیوطیؒ نے بھی آپ ﷺ کے اسماء مبارک پر البهجة السوية في الاسماء النبويه کے نام سے مستقل کتاب لکھی ہے جو تقریباً پانچ سو صفاتی اسماء پر مشتمل ہے۔ اسماء حسنیٰ کے عدد کے بقدر کی میں نے تلخیص کی ہے میں یہاں ان کے ذکر پر اکتفا کروں گا جن کا ذکر آنے والی احادیث میں ہے اور جو مقصود کے اعتبار سے وافی کافی شافی ہیں۔

الفصل الاول :

اسماء نبویہ

۵۷۷۶ : عَنْ جُبَيْرِ بْنِ مُطْعِمٍ قَالَ سَمِعْتُ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ اِنَّ لِيْ اَسْمَاءً اَنَا مُحَمَّدٌ وَّاَنَا اَحْمَدُ وَّاَنَا الْمَاحِيْ الَّذِيْ يَمْحُوا اللّٰهُ بِيَ الْكُفْرَ وَاَنَا الْحَاشِرُ الَّذِيْ يُحْشَرُ النَّاسُ عَلٰى قَدَمَيَّ وَاَنَا الْعَاقِبُ وَالْعَاقِبُ الَّذِيْ لَيْسَ بَعْدَهٗ نَبِيٌّ۔ (متفق علیه)

اخرجه البخاری ٥٥٤/٦ حدیث رقم ٣٥٣٢ ومسلم ١٨٢٨/٤ حدیث رقم (١٢٤-٢٣٥٤) والترمذی فی السنن ١٢٤/٥ حدیث رقم ٢٨٤٠ واخرجه مالك ١٠٠٤/٢ حدیث رقم ١ من کتاب اسماء النبی ﷺ اخرجه الدارمی ٤٠٩/٢ حدیث رقم ٢٧٧٥ واحمد فی المسند ٤٠٧/٤۔

ترجمہ: ''حضرت جبیر بن مطعم سے مروی ہے' فرماتے ہیں کہ میں نے نبی کریم ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا: ''میرے کئی ایک (مشہور و عظیم الشان) نام ہیں میں محمد ہوں میں احمد ہوں میں ''ماحی'' ہوں اللہ تعالیٰ میرے ذریعہ کفر کو مٹاتا ہے' میں ''حاشر'' ہوں لوگ میرے قدموں پر اٹھائے جائیں گے اور میرا نام ''عاقب'' ہے اور عاقب وہ شخص ہے جس کے بعد کوئی نبی نہ ہو''۔ (بخاری و مسلم)

تشریح: بعض کا کہنا ہے کہ ''محمد'' باب تفعیل سے اسم مفعول کا صیغہ ہے۔ مبالغہ حمد کے لئے ہے۔ محمد کا مطلب ہے وہ ہستی جس کی بے انتہا تعریف کی گئی ہو۔ حمدت فلانا احمدہ اس وقت بولا جاتا ہے جب کسی کے صفات جلیلہ کی وجہ سے تعریف کی جاتی ہے اور ''احمدته'' اس وقت کہتے ہیں جب صاحب حمد محمود ہو یا یوں کہتے ہیں: هذا الرجل محمود۔ پس جس ہستی میں یہ صفات محمودہ انتہاء کو پہنچ جائیں اور تمام محاسن و مناقب کمال درجہ کو چھونے لگیں۔ اس کو محمد کہتے ہیں چنانچہ اعمش ایک بادشاہ کی تعریف میں کہتا ہے۔

الی الماجد القرع الجواد المحمد:

اعمش کی مراد وہ ذات ہے جس میں تمام صفات محمودہ اتم درجہ میں پائی جاتی ہوں اور یہ بناء ہمیشہ بلوغ نہایت پر دلالت کرتی ہے جیسے آپ حمد میں ''محمد'' کہتے ہیں اور ذم میں ''مذمم'' کہتے ہیں ایک قول یہ ہے کہ یہ بناء تکثیر کے لئے ہے جیسے فتحت الباب فهو مفتح۔ جب یہ عمل بار بار دہرایا گیا ہو ''محمد'' اسم منقول ہے از راہِ تفاؤل کہ عنقریب آپ ﷺ کی حمد بکثرت بیان ہوگی۔

میں کہتا ہوں باطن کو دیکھتے ہوئے ظاہر کا نام رکھا گیا ہے اور عنقریب اولین و آخرین سب آپ کے ثنا خواں ہوں گے قیامت کے دن مقام محمود میں آپ کے پرچم حمد کے نیچے ہوں گے۔

قوله: أنا احمد: احمد افعل التفضیل ہے اس کے متعلق کو بطور مبالغہ حذف کیا گیا ہے اصل عبارت یوں ہے: احمد من کل حامد یا بمعنی ''محمود'' اسم فاعل یا اسم مفعول (یعنی زیادہ تعریف کرنے والا ہے یا زیادہ تعریف کئے گئے ہوں۔) کے معنی میں ہے پہلا معنی زیادہ ظاہر ہے۔ تا کہ تکرار لازم نہ آئے۔

قیامت میں بھی اللہ تعالیٰ کی وہ تعریفیں القاہوں گی جو اولین و آخرین میں سے کسی کو القانہیں ہوئیں۔ آنحضرت ﷺ میں حامدیت اور محمودیت دونوں جمع ہیں جس طرح محبت اور محبوبیت' مراد اور مریدیت جمع تھیں میں نے اپنے رسالہ الصلوات العلویه علی الصلوات المحمدیه میں اس طرح کے بہت سے نکات صوفیہ کی طرف اشارہ کیا ہے۔ (فلیراجعها)

ابن جوزیؒ الوفاء میں ابن قتیبہ کے حوالے سے لکھتے ہیں آنحضرت ﷺ کی نبوت کی علامتوں میں سے یہ بھی ہے کہ آپ سے قبل کسی کا نام محمد نہیں رکھا گیا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کے اسم مبارک کی حفاظت فرمائی۔ جیسے حضرت یحییٰ کے ساتھ کیا گیا

کہ "یحییٰ" نام آپ سے پہلے کسی کا نہ تھا اہل کتاب نے بھی یہ نام اس لئے رکھا تھا کہ کتب سابقہ میں اس نام کے ساتھ آپ کا ذکر تھا اور انبیاء علیہم السلام نے بھی اسی نام کے ساتھ آپ کی بشارت دی تھی اگر آپ ﷺ کا اسم گرامی کوئی مشترک نام رکھا جاتا تو بہت سے دعویدار پیدا ہوتے چنانچہ خداوند کریم نے آپ کے نام مبارک کو شرکت سے محفوظ فرمایا۔ البتہ جب حضور ﷺ کی ولادت کا زمانہ قریب تھا تو اہل کتاب میں سے بہت سے لوگوں نے اس امید پر کہ شاید ہماری ہی اولاد ان بشارتوں کی مستحق بن جائے محمد نام رکھنا شروع کر دیا تھا۔

الکفر آپ کی بعثت اس وقت ہوئی جب دنیا کفر کے گھٹا ٹوپ اندھیروں میں ڈوبی ہوئی تھی آپ ﷺ اس نور ساطع ساتھ آئے کہ کفر کے سارے اندھیروں کو مٹا دیا۔ امام نوویؒ فرماتے ہیں اس سے آنحضرت ﷺ کا حجت اور غلبہ کے ساتھ ظہور ہونا بھی مراد لیا جا سکتا ہے جیسا کہ باری تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿لیظھرہ علی الدین کلہ﴾ [التوبۃ : ۳۳] ترجمہ تاکہ آپ کے ذریعہ اس دین کو تمام ادیان پر غالب کرے۔

قولہ :وأنا الماحی الذی یمحوا اللہ بہ۔

ایک اور حدیث میں اس کی تفسیر یہ آئی ہے کہ اللہ میرے ذریعہ میری امت اور متبعین کے سیئات کو مٹائیں گے چنانچہ باری تعالیٰ کا ارشاد ہے قل للذین کفرو ان ینتھو یغفرلھم ماقد سلف (الانفال:۳۸) ترجمہ آپ ان کافروں سے کہہ دیجئے کہ اگر یہ لوگ (اپنے کفر سے) باز آجائیں گے تو ان کے گناہ (جو اسلام سے) پہلے ہو چکے ہیں سب معاف کر دیئے جائیں گے۔

قولہ :وانا الحاشر الذی یحشر الناس علی قدمی ۔ "قدمی" میم کے فتحہ اور یاء کی تشدید کے ساتھ ہے اور ایک نسخہ میں میم کے کسرہ اور یاء کے سکون کے ساتھ ہے۔ ای علی أثری۔ امام نوویؒ فرماتے ہیں محدثین نے لفظ "قدمی" کو یاء کی تخفیف کے ساتھ بطور مفرد اور تشدید کے ساتھ بطور تثنیہ ضبط کیا ہے۔ طیبیؒ فرماتے ہیں اسم موصول کی رعایت کے پیش نظر بظاہر "قدمیہ" ہونا چاہئے الا یہ کہ لفظ "انا" کے مدلول کے معنی کی رعایت کی گئی ہے۔

اور شرح السنہ میں ہے: ای یحشر اول الناس۔ یعنی تمام لوگوں میں سب سے پہلے اٹھنے والا شخص میں ہوں گا۔ کیونکہ آپ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے انا اول من تنشق عنہ الارض۔

طیبیؒ فرماتے ہیں یہ کلام اسناد مجازی کے قبیل سے ہے اس لئے کہ آنحضرت ﷺ ہی دوسرے لوگوں کے اٹھنے کا سبب ہوں گے کیونکہ لوگوں کو اس وقت تک نہیں اٹھایا جائے گا جب تک آپ کو نہیں اٹھایا جائے گا۔ (عاقب کے معنی ہے سب سے پیچھے آنے والے) امام نوویؒ فرماتے ہیں: ای علی اثری و زمان نبوتی ولیس بعدی نبی۔ یعنی کوئی نبی میرے زمانہ نبوت میں نہیں آیا اور نہ میرے بعد کوئی نبی آئے گا سارے انبیاء کی نبوت کو مجھ میں جمع کر دیا گیا و العاقب: الذی..... نبی ظاہراً یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ صحابی کی تفسیر یہ ہے یا ان کے بعد والے کسی صاحب کی بیان کردہ۔ شرح مسلم ابن الاعرابی میں کہتے ہیں العاقب اس شخص کو کہتے ہیں جو خیر کے کاموں میں اپنے اگلوں کا خلیفہ بنے اسی سے عرب کی کہاوت ہے عقب الرجل لولدہ۔ شیخین کے علاوہ نسائی ترمذی اور مالکؒ نے بھی اس کو نقل کیا ہے۔

۵۷۷۷ : وَعَنْ اَبِیْ مُوْسٰی الْاَشْعَرِیِّ قَالَ کَانَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یُسَمِّیْ لَنَا نَفْسَہٗ

اَسْمَاءً فَقَالَ اَنَا مُحَمَّدٌ وَّاَحْمَدُ وَّالْمُقَفِّيْ وَالْحَاشِرُ وَ نَبِيُّ التَّوْبَةِ وَ نَبِيُّ الرَّحْمَةِ ۔ (رواه مسلم)

اخرجه مسلم ۱۸۲۸/٤ حديث رقم (۱۲٦-۲۳۵۵) واحمد في المسند ۳۹۵/٤۔

ترجمہ: ''حضرت ابوموسیٰ اشعری سے مروی ہے' فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ اپنے کئی ایک نام ہمیں بتلایا کرتے تھے چنانچہ (ایک دن) آپؐ نے ارشاد فرمایا: ''میں ''احمد'' ہوں ''محمد'' ہوں ''مقفّی'' (تمام نبیوں کے پیچھے آنے والا ہوں) میں حاشر (یعنی قیامت کے دن تمام لوگوں کو جمع کرنے والا) ہوں اور میں نبی توبہ اور نبی رحمت ہوں''۔ (مسلم)

تشریح: المقفی یہ لفظ تمام اصول مصححہ میں فاء مشددہ کے کسرہ کے ساتھ ہے۔ اس کا معنی ہے: المتبع: من قفا اثره اذا تبعه سے ماخوذ ہے۔ یعنی آپ ﷺ انبیاء کے آخر میں آئے' ان کے نقش قدم پر آئے۔ آپ کے بعد کوئی نبی نہ ہوگا بعض علماء نے اس کا معنی (پہلے انبیاء کا اتباع کرنے والا) سے کیا ہے (دوسرے معنی کا حاصل یہ ہے کہ آپ اصل توحید اور اصول دین میں جملہ انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کے موافق تھے) اس کا نمونہ قرآن کریم میں بھی پایا جاتا ہے چنانچہ باری تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿فبهداهم اقتده﴾ (الانعام: ۹۰) "سو آپ بھی ان ہی کے طریق پر چلیے"۔

بعض حضرات کہتے ہیں المقفی عاقب ہی کے معنی میں ہے شمائل کے بعض نسخوں میں فاء مشددہ کے فتحہ کے ساتھ ہے (بمعنی چلے ہوئے)۔

طیبیؒ لکھتے ہیں بعض کا کہنا ہے کہ المقفی اسم فاعل ہے جس کا معنی ہے: المولی الذاهب۔ کہا جاتا ہے قفی "عليه" ای ذهب به۔ تو گویا اس کا مطلب آخری نبی کا بنتا ہے جب آپ ﷺ آخری نبی ہوئے تو آپ کے بعد کوئی نبی نہیں آئے گا اس اعتبار سے عاقب اور مقفّی کا ایک ہی معنی بنتا ہے۔ کیونکہ آپ ﷺ ''تبع الانبیاء'' ہیں یا آپ ﷺ اس اعتبار سے مقفّی ہوئے کہ آپ انبیاء کے متبع ہیں جو بھی چیز دوسرے کے تابع ہو وہ اس کی قفا کہلاتی ہے جیسے عرب کہتے ہیں: هو يقفو أثر فلان یعنی فلاں شخص کا اتباع کر رہا ہے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿ثم قفينا على آثارهم برسلنا﴾ [الحديد: ۲۷] اس کے علاوہ ایک اور وجہ بھی ہے وہ یہ کہ مقفّی (قاف کے فتحہ کے ساتھ) یہ القفی والقفاوۃ سے ماخوذ ہو۔ القفی کا معنی نہایت مہربان اور مکرم مہمان کے ہیں جبکہ القفاوۃ کا معنی ہے نیکی' اچھائی اور بھلائی مہربانی' گویا کہ آپ ﷺ کا یہ نام آپ کے فضل' سخاء اور کرم کی وجہ سے رکھا گیا لیکن پہلی توجیہہ زیادہ بہتر اور واضح ہے۔

اقول (ملا علی قاریؒ فرماتے ہیں) اس دوسری توجیہہ کا کوئی تک ہی نہیں یہ تصحیف ہے چونکہ یہ مخالف ہے اصول مشکوٰۃ' شمائل اور شفاء کے۔

والحاشر و نبی التوبة : آنحضرت ﷺ چونکہ توبہ و استغفار بہت زیادہ کرتے کرتے تھے اور اللہ کی جانب بکثرت رجوع کیا کرتے تھے۔ چنانچہ آپ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے: انی استغفر الله في اليوم سبعين مرة او مائة مرة میں دن میں ستر یا سو مرتبہ اپنے رب سے استغفار کرتا ہوں'' نیز آپ ﷺ ہی کی ذات کا فیض تھا کہ آپ کی امت کے لوگ پختہ عہد و یقین کے ساتھ زبان سے توبہ کرلیں تو اللہ تعالیٰ ان کی زبانی توبہ کو محض استغناء کی بناء پر قبول فرمالیتا ہے۔ بخلاف پچھلی امت کے لوگوں کے۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا۔ ﴿ولو انهم اذظلموا انفسم جاؤوك فاستغفرواالله واستغفرلهم الرسول لوجدوا الله

توابا رحیما﴾ (النساء:٦٤)

ترجمہ اور یہ لوگ جس وقت اپنا نقصان کر بیٹھیں اس وقت آپ کی خدمت میں حاضر ہوتے پھر اللہ سے معافی چاہتے اور رسول بھی ان کے لئے اللہ تعالیٰ سے معافی چاہتے تو ضرور اللہ کو توبہ قبول کرنے والا اور رحمت کرنے والا پاتے۔

جب یہ خوبی آپ ہی کا خاصہ رہا تو آپ کا نام ہی "نبی التوبة" پڑ گیا۔ قولہ: نبی الرحمة۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿وما ارسلناك الا رحمة اللعالمین﴾ [الأنبیاء: ۷] ترجمہ ہم نے آپ کو تمام جہان والوں کے لئے رحمت ہی بنا کر بھیجا۔ آپ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے: ﴿انما انا رحمة مهداة﴾ حقیقت یہ ہے کہ میں اللہ تعالیٰ کی بھیجی ہوئی رحمت ہوں۔

رحمت نام ہے مہربانی' شفقت اور رافت کا۔ آنحضرت ﷺ مومنین کے لئے رؤف ورحیم ہیں' اسی وجہ سے آپ ﷺ کی امت کو امت مرحومہ کہا جاتا ہے۔ چونکہ نبی کریم ﷺ محض اللہ کی رحمت کے سبب ہی رحم فرمایا کرتے تھے۔

تخریج: احمدؒ نے بھی اسی طرح نقل کیا ہے۔ جیسا کہ امام سیوطیؒ نے (مسلم اور احمد) دونوں سے نقل کیا ہے البتہ نبی الرحمۃ کی جگہ "الرحمۃ" منقول ہے پھر آگے فرماتے ہیں کہ طبرانی نے الکبیر میں ونبی الملحمه کے الفاظ کا اضافہ کیا ہے۔

آنحضرت ﷺ اور کافروں کی گالیاں

۵۷۷۸ : وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اَلَا تَعْجَبُوْنَ كَیْفَ یَصْرِفُ اللّٰهُ عَنِّیْ شَتْمَ قُرَیْشٍ وَّلَعْنَهُمْ یَشْتِمُوْنَ مُذَمَّمًا وَیَلْعَنُوْنَ مُذَمَّمًا وَاَنَا مُحَمَّدٌ (رواه البخاری)

اخرجه البخاری ٥٥٤/٦ حدیث رقم ٣٥٣٣ والنسائی فی السنن ١٥٩/٦ حدیث رقم ٣٤٣٨ واحمد فی المسند ٢٤٤/٢۔

ترجمہ: "حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے' فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کیا تم تعجب نہیں کرتے کہ اللہ تعالیٰ قریش کے سب وشتم اور لعن وطعن کو مجھ سے کس طرح پھیر دیتا ہے' وہ مذمم کو سب وشتم کرتے اور مذمم کو لعن طعن کرتے ہیں جب کہ میں "محمد" ہوں"۔ (مذمم نہیں ہوں) ۔ (بخاری)

تشریح: لعنهم لعن بمعنی مذمت ہے اور استفہام تقریر کے لئے ہے پھر اس کو پھیرنے کی توجیہ (یشتمون) سے بیان فرمائی۔ یشتمون (تاء کے کسرہ کے ساتھ) یعنی وہ گالیاں دیتے ہیں۔

قولہ: یشتمون مذما و یلعنون مذمما وأنا محمد۔

یعنی وہ جو بیان کرتے ہیں وہ اوصاف تو "مذمم" کے ہیں اور میں تو بحمد اللہ "محمد" ہوں۔

بعض کا کہنا ہے کہ قریش مکہ محمد کہنے کے بجائے مذمم کہا کرتے تھے۔

تورپشتیؒ فرماتے ہیں آپ نے انا محمد کہہ کر قریش مکہ کی تعریض فرمائی۔ ابولہب کی بیوی عوراء بنت حرب کہا کرتی تھی۔

مذمما قلینا ودینه ابینا وامره عصینا۔

ہم نے آپ کو مذمم کہا ہم نے ان کے دین کا انکار کیا اور ان کے حکم کی نافرمانی کی۔

چہرۂ اقدس' بال مبارک اور مہر نبوت کا ذکر

۵۷۷۹ : وَعَنْ جَابِرِ بْنِ سَمُرَةَ قَالَ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَدْ شَمِطَ مُقَدَّمُ رَأْسِهٖ وَلِحْيَتِهٖ وَكَانَ اِذَا ادَّهَنَ لَمْ يَتَبَيَّنْ وَاِذَا شَعِثَ رَأْسُهٗ تَبَيَّنَ وَكَانَ كَثِيْرَ شَعْرِ اللِّحْيَةِ فَقَالَ رَجُلٌ وَّجْهُهٗ مِثْلُ السَّيْفِ قَالَ لَا بَلْ كَانَ مِثْلَ الشَّمْسِ وَالْقَمَرِ وَكَانَ مُسْتَدِيْرًا وَّرَاَيْتُ الْخَاتَمَ عِنْدَ كَتِفِهٖ مِثْلَ بَيْضَةِ الْحَمَامَةِ يُشْبِهُ جَسَدَهٗ ۔ (رواه مسلم)

اخرجه مسلم ۱۸۲۳/۴حديث رقم (۱۰۹۔۲۳۴۴) واخرجه الترمذى فى السنن۵۵۸/۵حديث رقم ۳۶۳۶ واحمد فى المسند ۹۰/۵۔

ترجمہ:''حضرت جابر بن سمرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے' فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کے سر اور داڑھی کے اگلے حصہ کے کچھ بال سفید ہو گئے تھے جب آپ ﷺ بالوں میں تیل لگا لیتے تو وہ ظاہر نہیں ہوتے تھے' اور جب آپ ﷺ بال بکھرے ہوئے ہوتے تو یہ سفیدی جھلکنے لگتی تھی اور آنحضرت ﷺ کی داڑھی میں بہت زیادہ بال تھے (جب حضرت جابر رضی اللہ عنہ نے آنحضرت ﷺ کا یہ حلیہ شریف بیان کیا) تو ایک آدمی نے کہا آپ ﷺ کا چہرۂ مبارک (چمک اور دمک میں) تلوار کی طرح تھا۔ حضرت جابر رضی اللہ عنہ نے کہا کہ نہیں بلکہ آفتاب و ماہتاب کی طرح تھا اور گولائی لئے ہوئے تھا۔ نیز میں نے آپ ﷺ کی مہر نبوت کو دیکھا جو شانہ کے قریب تھی اور کبوتری کے انڈے کی مانند (گول) تھی' اور وہ آپ کے جسم اطہر کے رنگ کے مشابہ تھی۔ (مسلم) میں نے آپ ﷺ کی مہر نبوت کو دیکھا جو شانہ کے قریب تھی''۔ ایک اور روایت میں مروی ہے کہ مہر نبوت دونوں شانوں کے درمیان تھی' ان دونوں روایتوں میں کوئی تضاد نہیں ہے دراصل وہ مہر نبوت بائیں شانہ کے قریب تھی' لہٰذا کسی نے تو یہ بیان کیا کہ شانہ کے قریب تھی اور کسی نے یہ کہا کہ دونوں شانوں کے درمیان تھی۔

تشریح: قوله : كان رسول الله ﷺ قد شمط مقدم رأسه و لحية:

قد شمط: میم کے کسرہ کے ساتھ بمعنی شاب۔ چنانچہ مغرب میں شمط کسر کے ساتھ اس وقت کہا جاتا ہے جب سر کے بال سفید جائیں۔ سیاہ بالوں کے ساتھ سفید بال بھی ہوں' اس کا وصف اشمط آتا ہے فارسی میں دوموی کہتے ہیں مطلب یہ ہے کہ آپ کے سر مبارک اور داڑھی میں کچھ سفیدی ظاہر تھی۔

(و کان) کان کی ضمیر کا مرجع یا تو آپ ﷺ کی ذات ہے یا لفظ شیب (یعنی آپ کا بڑھاپا) ہے۔

ادھن: دال کی تشدید کے ساتھ اور اس کا معنی ہے تیل استعمال کرنا۔ طیبیؒ لکھتے ہیں یہ دلالت کرتا ہے کہ آپ تیل لگانے کے وقت بال اکھٹے کر کے ملا لیتے تھے۔ اس لئے آپ کے سفید بال تعداد میں کم ہونے کی وجہ سے نظر نہیں آتے تھے اور جب آپ کے بال خشک ہوتے تھے تو وہ سفید بال ظاہر ہو جاتے تھے۔

میں (ملا علی قاریؒ) کہتا ہوں۔ ''شعث الرأس'' عدم ادھان سے کنایہ ہے۔ اس پر ترمذی کی وہ روایت بھی دلالت کرتی ہے جو حضرت جابر بن سمرہ رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ جب ان سے آپ ﷺ کے سفید بالوں کے متعلق پوچھا گیا انہوں نے فرمایا:

کان اذا ادھن رأسہ لم یریٰ عنہ شیب وان لم یدھن رؤی منہ کہ جب آپ ﷺ اپنے سر مبارک (بالوں) کو تیل لگاتے تو وہ سفید بال نظر نہیں آتے تھے اگر تیل نہ لگاتے تو نظر آ جاتے تھے۔

سفید بال کُل کتنے تھے؟

قال :انما کان یشیب رسول اللہ ﷺ نحوا من عشرین شعرہ بیضاء۔

ترمذی نے حضرت ابن عمرؓ سے روایت کیا ہے فرماتے ہیں آپ کے سر اور داڑھی مبارک میں بیس کے لگ بھگ بال سفید تھے۔

حضرت انسؓ سے مروی ہے کہ میں نے آپ کی داڑھی اور سر مبارک میں صرف چودہ سفید بال اشمار کئے۔

و کان کثیر شعر اللحیۃ یعنی آپ ﷺ کی داڑھی مبارک گھنی تھی آنحضرت ﷺ چھدری داڑھی والے نہیں تھے۔ یا مراد ہے کہ آپ ﷺ "کوسج" نہیں تھے۔

قولہ :فقال رجل وجھہ مثل السیف :یعنی چمک دمک کے اعتبار سے مثل تلوار کے تھا لیکن اس سے بعض مرتبہ طول مراد ہوتا ہے۔ اس لئے اس وہم کو دور کرنے کے لئے حضرت جابر ؓ نے وضاحت فرمائی۔

قولہ :قال لابل کان مثل الشمس والقمر بلکہ آپ کا چہرہ مبارک یعنی قوت ضیاء اور کثرت نور کی وجہ سے چاند و سورج کی مانند تھا۔

ممکن ہے یہ جملہ سوال مقدر کا جواب ہو تقدیر عبارت یوں ہوگی او جھہ مثل السیف کیا آپ ﷺ کا چہرہ انور تلوار کی مانند تھا؟ جواب میں فرمایا لا بل مثل الشمس والقمر۔ قولہ وکان وجھہ مستدیرا آپ ﷺ کا چہرہ مبارک کچھ گولائی لئے ہوئے تھا ایک حدیث میں وضاحت کے طور پر لم یکن مکلثم الوجہ کے الفاظ آئے ہیں جس کا مطلب ہے کہ آنحضرت ﷺ کا چہرہ مبارک نہ بالکل گول تھا نہ بالکل لمبا بلکہ گولائی لئے ہوئے تھا۔ یہ جملہ تتمیم معنیٰ اور تعمیم معنیٰ کے لئے شمائل میں ہے۔

طیبیؒ فرماتے ہیں جب ان صاحب نے (چمکدار) شفاف تلوار کے ساتھ آپ کے چہرہ انور کو تشبیہ دی تو راوی نے بلیغ انداز سے رد کیا اور چونکہ "وجہ" طرفین کو شامل نہ تھا اور تمام مراد یعنی استدارت' اشراق کامل و ملاحت سے قاصر تھا تو حضرت جابر ؓ نے بتایا کہ آپ ﷺ کا رخ زیبا انتہائی روشن و چمکدار ہونے کے اعتبار سے مثل آفتاب تھا اور حسن و ملاحت میں مانند ماہتاب تھا اور اس تعبیر سے عرفاً گولائی کے معنی مراد نہیں ہوتے۔ اس لئے مرادی معنی کو بیان کرنے کے لئے مزید وضاحت فرمائی۔

وکان مستدیرا: جواب دیا کہ آپ کا چہرہ انور میں نہ تو زیادہ لمبائی تھی (جس سے بدنمائی ظاہر ہوتی ہے) نہ ہی گولائی نورانیت و ملاحت میں کمی تھی بلکہ سورج سے زیادہ پرنور اور حسن و ملاحت میں مانند قمر تھے سورج سے تشبیہ دینے میں صرف گولائی کی تشبیہ مراد نہیں ہوتی بلکہ اس سے تمام اوصاف مقصود ہوتے ہیں اس مقصود کو مستدیرا سے بیان کیا۔

قوله :ورأيت الخاتم عند كتفه يشبه جسده۔ الخاتم۔ تاء کے فتحہ کے ساتھ ہے اور کسرہ کے ساتھ بھی پڑھا جاتا ہے۔ خاتم :سے مراد مہر نبوت ہے۔ الحمامة: بیضوی شکل میں تھی یشبہ اس سے مراد رنگ ہے اس کی رنگت آپ ﷺ کے جسم مبارک کے رنگ کی سی تھی برصی کی طرح بدنما رنگ نہ تھا۔

جامع الاصول کے الفاظ یوں ہیں مكان خاتم النبوة فى ظهره بضعة ناشزة۔ آپ ﷺ کی پشت مبارک میں کچھ گوشت ابھرا ہوا تھا اس کو ترمذی نے باب الشمائل میں ابو سعید خدریؓ سے نقل کیا ہے۔

اور ترمذی نے حضرت جابر ابن سمرہؓ سے نقل کیا ہے كان خاتمه غدة حمراء مثل بيضة الحمامة۔ میں نے (مہر نبوت کی) حدیث کے طرق کو شرح الشمائل میں جمع کر کے سب کی وضاحت کی ہے۔

مہر نبوت کہاں تھی؟

۵۷۸۰ : وَعَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ سَرْجَسٍ قَالَ رَاَيْتُ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَاَكَلْتُ مَعَهُ خُبْزًا وَّلَحْمًا اَوْ قَالَ ثَرِيْدًا ثُمَّ دُرْتُ خَلْفَهٗ فَنَظَرْتُ اِلٰى خَاتِمِ النُّبُوَّةِ بَيْنَ كَتِفَيْهِ عِنْدَنَا غِضِ كَتِفِهِ الْيُسْرٰى جُمْعًا عَلَيْهِ خِيْلَانٌ كَاَمْثَالِ الثَّآلِيْلِ۔ (رواه مسلم)

اخرجه مسلم فى صحيحه ۱۸۲۳/٤ حديث رقم (۱۱۲۔۲۳٤٦) واخرجه الترمذى فى السنن ٥٦٢/٥ حديث رقم ۳٦٤۳ واحمد فى المسند ۸۲/٥۔

ترجمہ: "حضرت عبداللہ بن سرجس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کی زیارت کی اور آپ کے ساتھ گوشت روٹی یا کہا ثرید کھانے کا شرف حاصل کیا پھر میں آپ ﷺ کی پشت کی طرف آیا اور مہر نبوت کو دیکھا جو آپ ﷺ کے دونوں شانوں کے درمیان بائیں شانہ کی نرم ہڈی کے پاس تھی اور (ہیئت کے اعتبار سے) مٹھی کی مانند تھی اور اس پر مسوں کی طرح تل تھے"۔ (مسلم)

تشریح: قوله :رأيت النبى ﷺ ...... أو قال :ثريدا:

راوی کو الفاظ میں شک ہے کہ لحما کہا تھا یا ثریدا کہا تھا۔ بہر حال معنی ایک ہے مراد میں اختلاف ہے۔ حاکم اور ابوداؤد کی روایت میں ابن عباسؓ سے منقول ہے كان احب الطعام اليه الثريد من الخبز و الثريد من الحيس۔

قوله :ثم داب خلفه ...... عند كتفه اليسرى:

لفظ ناغض غین معجمہ کے کسرہ کے ساتھ شانہ کا بالائی حصہ بعض کہتے ہیں بائیں شانہ کی نرم ہڈی کے قریب تھی النہایہ میں اسی طرح مذکور ہے اور ابن الملک نے ان کی اتباع کی ہے۔

شارح لکھتے ہیں :الناغض الغضروف۔ نرم ہڈی کو کہتے ہیں لیکن ان روایتوں اور مشہور روایت کے درمیان کوئی تضاد نہیں کیونکہ مہر نبوت بائیں یا دائیں شانے کے قریب تھی یا بالکل دونوں کے درمیان میں تھی۔ چونکہ احتمال ہے کہ انہوں نے وہیں پائی ہو۔

جمعا: جیم کے ضمہ اور میم کے سکون کے ساتھ' صاحب النہایہ فرماتے ہیں: **الجمع هو ان تجمع الاصابع و تضمها (کذا ذکره بعضهم)** اس سے وہ صورت بنتی ہے جو انگلیوں کو بند کرنے کی صورت میں مٹھی کی بنتی ہے (یعنی مٹھی) کہا جاتا ہے: **ضربه بجمع کفه** جیم کے ضمہ کے ساتھ۔ باقی میم کے ضمہ کے ساتھ راوی سے سہواً ہوا ہے۔

مصابیح میں **جمعا** کے بجائے **جميعا** بمعنی مجموعاً منقول ہے امام تورپشتیؒ فرماتے ہیں میں اس بات کو تسلیم نہیں کرتا کہ یہ سہو راوی سے ہوا بلکہ حقیقت یہ ہے کہ یہ کاتب کی غلطی ہے کتاب مسلم میں مثل الجمع جیم کے ضمہ کے ساتھ مذکور ہے جس سے بند مٹھی مراد ہوتی ہے اس کی تائید اس روایت سے بھی ہوتی جو مہر نبوۃ کی کیفیت کے متعلق ہے اس میں کالکف کے الفاظ مذکور ہیں کتاب مسلم ہی میں ایک اور طریق سے یہ لفظ جمعاً منقول ہے یعنی منصوب بنزع الخافض ہے۔

ابن الملکؒ فرماتے ہیں یہ جیم کے فتحہ کے ساتھ مروی ہے' پس حال ہونے کی وجہ سے منصوب ہے تقدیری عبارت یوں ہے **ظرت اليه مجموعا ای مجتمعا**۔

امام نوویؒ فرماتے ہیں عبداللہ ابن سرجس نے مہر نبوت کو لفظ جمعاً سے تشبیہ دی ہے اس میں دو احتمال ہیں: ① یہ تشبیہ ہیت کے اعتبار سے ہے۔ ② تشبیہ مقدار کے اعتبار سے ہو البتہ سیاق کلام سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہیئت میں تشبیہ مراد ہے اس سے یہ ں روایت کے موافق ہو جائے گی جس میں **مثل بيضة الحمام** کے الفاظ موجود ہیں۔

خیلان خاء کے کسرہ کے ساتھ "خال" کی جمع ہے۔ سیاہی مائل نقطہ' یعنی تل۔ صاحب النہایہ لکھتے ہیں: **وهو الشامة فی لجسد**۔

الثآلیل: ثائے مثلثہ کے فتحہ ہمزہ کے مدہ اور پہلے لام کے کسرہ کے ساتھ ثؤلول ثائے مضمومہ اور ہمزہ ساکنہ کے ساتھ' یہ کی مع ہے۔

النہایہ میں ہے اس کو فارسی میں زخ کہتے ہیں۔

بچوں پر شفقت

۵۷۸۱: وَعَنْ اُمِّ خَالِدٍ بِنْتِ خَالِدِ بْنِ سَعِيْدٍ قَالَتْ اُتِيَ النَّبِيُّ ﷺ بِثِيَابٍ فِيْهَا خَمِيْصَةٌ سَوْدَاءُ صَغِيْرَةٌ فَقَالَ ائْتُوْنِيْ بِاُمِّ خَالِدٍ فَاُتِيَ بِهَا تُحْمَلُ فَاَخَذَ الْخَمِيْصَةَ بِيَدِهٖ فَاَلْبَسَهَا قَالَ اَبْلِيْ وَاَخْلِقِيْ ثُمَّ اَبْلِيْ وَاَخْلِقِيْ وَكَانَ فِيْهَا عَلَمٌ اَخْضَرُ اَوْ اَصْفَرُ فَقَالَ يَا اُمَّ خَالِدٍ هٰذَا سَنَاهُ وَهِيَ بِالْحَبْشِيَّةِ حَسَنَةٌ قَالَتْ فَذَهَبْتُ اَلْعَبُ بِخَاتَمِ النُّبُوَّةِ فَزَبَرَنِيْ اَبِيْ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ دَعْهَا۔ (رواه البخاری)

اخرجه البخاری ۱۰۸۳/۶ حدیث رقم ۳۰۷۱ وابو داؤد فی ۳۱۱/٤ حدیث رقم ٤٠٢٤۔

ترجمہ: "خالد بن سعید کی بیٹی ام خالد سے مروی ہے' فرماتی ہیں کہ (ایک دن) نبی کریم ﷺ کے پاس کچھ کپڑے آئے

جن میں ایک سیاہ رنگ کی چھوٹی سی چادر بھی تھی۔ آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا: کہ اُم خالد کو میرے پاس لاؤ۔ وہ اٹھا کر آپ ﷺ کے پاس لائی گئی تو آپ ﷺ نے وہ چادر لی اور اپنے ہاتھ سے اُم خالد کو اوڑھادی اور پھر ام خالد کو یہ دعا دی اس کپڑے کو پرانا کرو اور پھر پرانا کرو یعنی اللہ تعالیٰ تمہاری عمر دراز کرے اور بار بار تمہیں کپڑا استعمال کرنا اور بہت پہننا نصیب ہو۔ اس چادر میں سبز یا زرد نشان بنے ہوئے تھے! آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''ام خالد! یہ کپڑا تو بہت خوبصورت ہے'' اور لفظ سناہ (جس کا ترجمہ ''بہت خوبصورت'' کیا گیا ہے) حبشی زبان کا لفظ ہے جس کے معنی خوبصورت اور بہترین کے ہیں۔ ام خالد کہتی ہیں کہ پھر میں (آنحضرت ﷺ کی پشت مبارک کی طرف چلی) گئی اور (بچپن کی ناسمجھی کی بناپر) مہر نبوت سے کھیلنے لگی' میرے والد نے (یہ دیکھا تو) مجھے ڈانٹا' تو رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''اسے چھوڑ دو (ڈانٹ ڈپٹ نہ کرو)''۔ (بخاری)

تشریح: خمیصة: یعنی من جملہ ان کپڑوں میں ایک دھاری دار سیاہ کملی بھی تھی۔

سوداء: یہ تاکید یا تجرید کے لئے ہے۔

تحمل: (بہاء کی ضمیر سے حال ہے) فاخذ...... فالبسها۔

قال یہ جملہ استینافیہ ہے ماقبل کا بیان ہے۔ ابلی' ابلاء سے مشتق ہے جس کا معنی ہے کپڑا پرانا کرنا۔

واخلقی یہ اخلاق سے ہے معنی دونوں لفظوں کا ایک ہے اس کو تاکید کے طور پر ذکر کیا ہے دونوں سے دعا مقصود ہے۔

قوله: ثم أبلي وأخلقي۔

آپ کے قول مبارک ابلي و اخلقي سے درازی عمر کی دعا ہے۔

جان لیجئے: لفظ اخلقی نسخہ صحیحہ میں قاف کے ساتھ ہے البتہ کچھ نسخوں میں فاء کے ساتھ منقول ہے اس صورت میں یہ کلمہ لفظاً جملہ تاسیسیہ ہوگا نہ کہ تاکیدیہ۔ اگرچہ معنی میں کوئی فرق نہیں آئے گا اور مطلب یہ بنے گا بار بار تمہیں کپڑا استعمال کرنا اور بہت کپڑے پہننا نصیب ہو کیونکہ اخلاف بعد الاخلاق ہوتا ہے (کہ پہلا کپڑا بوسیدہ ہوتا ہے تب دوسرے کپڑے کی ضرورت پڑتی ہے) اس کی تائید ابوداؤد کی اس روایت سے بھی ہوتی ہے آپ ابوداؤد لکھتے ہیں آنحضرت ﷺ جب بھی اپنے کسی صحابی کو نیا کپڑا پہنے ہوئے دیکھتے تو فرماتے تبلي و يخلف الله پرانا کرو اور پھر اللہ (نیا) عطا کرے الحصن میں صیغہ مفرد کے ساتھ تین بار مذکور ہیں یعنی ابل و اخلق ثم ابل واخلق ثم ابل و اخلق یہ الفاظ آنحضرت ﷺ نے تین بار ام خالد کے لئے فرمایا تھا تو یہ روایت بالمعنی ہے۔

قوله: وكان فيها علم اخضرا واصغر ...... هذا سناه۔ ہا کا مرجع خمیصة ہے هذا کا مشار الیہ علم یا ثوب ہے سناة یہ لفظ سین اور فتحہ نون' الف اور ہائے سکتہ کے ساتھ ہے (بمعنی حسن)

ایک نسخہ میں سین کے کسرہ کے ساتھ ہے علاوہ ازیں ایک روایت میں ''سنہ'' بغیر الف نون خفیفہ کے ہے ایک اور روایت میں نون مشددہ کے ساتھ ہے۔ اس کو سوائے فارسی کے سب نے سین کے فتحہ کے ساتھ ذکر کیا ہے وہ اس کسرہ دیتے ہیں۔

وھی اس سے کلمہ سناہ مراد ہے بالحبشة: یعنی یہ حبشی زبان کا لفظ ہے۔

بمعنی اس حسنۃ کو مبتداء کی وجہ سے مونث لایا گیا ہے مبتداء لفظ (ھی) ہے یہ کلام ام خالد کا تھا۔

قوله :فقال رول الله ﷺ دعها:

تا کہ مہر نبوت سے بھی اس طرح تبرک حاصل کرے جیسا خلعت شریفہ کی وجہ سے تبرک حاصل ہوا۔

یہ روایت آنحضرت ﷺ کی اپنے صحابہ کے ساتھ کمال شفقت حلم وکرم اور حسن صحبت کی دلیل ہے۔ شیخ شہاب الدین الصمدانی سہروردی قدس سرہٗ نے اپنے عوارف میں یہ نکتہ لکھا ہے کہ مشائخ صوفیاء کے ہاں لبس خرقة کی سند یہی حدیث ہے۔

میں (ملاعلی قاریؒ) کہتا ہوں شاید الباس سے خرقة التبرك مراد ہے نا کہ الباس خرقہ اجازت۔

تخریج: ابوداؤد نے بھی ایسے ہی ذکر کیا ہے۔

آنحضرت ﷺ کے قد وقامت کا ذکر

۵۷۸۲: وَعَنْ اَنَسٍ قَالَ کَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَيْسَ بِالطَّوِيْلِ الْبَائِنِ وَلَا بِالْقَصِيْرِ وَلَيْسَ بِالْاَبْيَضِ الْاَمْهَقِ وَلَا بِالْاٰدَمِ وَلَيْسَ بِالْجَعْدِ الْقَطَطِ وَلَا بِالسَّبْطِ بَعَثَهُ اللّٰهُ عَلٰى رَاْسِ اَرْبَعِيْنَ سَنَةً فَاَقَامَ بِمَكَّةَ عَشْرَ سِنِيْنَ وَبِالْمَدِيْنَةِ عَشْرَ سِنِيْنَ وَتَوَفَّاهُ اللّٰهُ عَلٰى رَاْسِ سِتِّيْنَ سَنَةً وَلَيْسَ فِيْ رَاْسِهٖ وَلِحْيَتِهٖ عِشْرُوْنَ شَعْرَةً بَيْضَاءَ وَفِيْ رِوَايَةٍ يَصِفُ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ كَانَ رَبْعَةً مِّنَ الْقَوْمِ لَيْسَ بِالطَّوِيْلِ وَلَا بِالْقَصِيْرِ اَزْهَرَ اللَّوْنِ وَقَالَ كَانَ شَعْرُ رَاْسِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِلٰى اَنْصَافِ اُذُنَيْهِ وَفِيْ رِوَايَةٍ بَيْنَ اُذُنَيْهِ وَعَاتِقِهٖ (متفق عليه وفی رواية للبخاری) قَالَ كَانَ ضَخْمَ الرَّاْسِ وَالْقَدَمَيْنِ لَمْ اَرَ بَعْدَهٗ وَلَا قَبْلَهٗ مِثْلَهٗ وَكَانَ سَبْطَ الْكَفَّيْنِ وَفِيْ اُخْرٰى لَهٗ قَالَ كَانَ شَثْنَ الْقَدَمَيْنِ وَالْكَفَّيْنِ۔

اخرجه البخاری فی صحیحه ٥٦٤/٦ حدیث رقم ٣٥٤٨-٣٥٤٧ ومسلم فی صحیحه ١٨٢٤/٤ حدیث رقم (١١٣-٢٣٤٧) والنسائی فی السنن ١٣٣/٨ حدیث رقم ٥٠٦١ واخرجه الترمذی ٥٥٨/٥ حدیث رقم ٣٦٣٧ واخرجه مالك فی الموطأ ٩١٩/٢ حدیث رقم ١ من كتاب صفة النبی واحمد فی المسند ٢٤٠/٣۔

ترجمہ: "حضرت انس ؓ سے مروی ہے' فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نہ بالکل سفید تھے اور نہ بالکل گندمی یعنی مائل بہ سیاہی' آپ ﷺ کے سر کے بال نہ زیادہ گھنگریالے تھے اور نہ بالکل سیدھے تھے اور اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو چالیس سال کی عمر میں مبعوث فرمایا (یعنی منصب رسالت پر فائز کیا) پھر آپ ﷺ نے دس سال مکہ میں قیام فرمایا اور دس سال مدینہ میں اور اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو ساٹھ سال کی عمر میں وفات دی' اس وقت آپ ﷺ کے سر مبارک اور داڑھی میں صرف بیس بال سفید تھے"۔ ایک اور روایت میں حضرت انس ؓ نے نبی کریم ﷺ کے اوصاف بیان کرتے ہوئے یہ کہا کہ آنحضرت ﷺ لوگوں میں میانہ قد کے تھے نہ لمبے تھے نہ پست قد۔ آپ ﷺ کا رنگ نہایت صاف اور چمکدار تھا۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ نے یہ بھی بیان کیا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے سر کے بال آدھے کانوں تک تھے اور ایک روایت میں یہ الفاظ ہیں کہ (آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے سر کے بال) کانوں اور شانوں کے درمیان تک لمبے تھے۔ (بخاری و مسلم) ایک اور روایت میں جس کو بخاری نے روایت کیا ہے اس طرح ہے کہ حضرت انس رضی اللہ عنہ نے بیان کیا: آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا سر مبارک (اعتدال کی حد تک) بڑا تھا اور پاؤں پُر گوشت تھے میں نے آپ جیسا (وجیہہ و شکیل انسان) نہ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے دیکھا تھا اور نہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہتھیلیاں فراخ تھیں"۔ بخاری ہی کی ایک روایت میں یہ ہے کہ حضرت انس رضی اللہ عنہ نے بیان کیا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے دونوں بازو اور ہتھیلیاں گداز اور پُر گوشت تھیں"۔

تشریح: قوله: كان رسول الله ﷺ ليس بالطول البائن ولا بالقصير:

البائن: بائن کا معنی اعتدال سے زیادہ۔

بالقصير: پست قد (جس کو ٹھگنا کہتے ہیں) جیسا کہ ایک روایت میں بھی ہے حاصل یہ ہے کہ آپ کا قد مبارک درمیانہ تھا لیکن طول کی طرف کو مائل تھا کیونکہ نفی وصف بائن کی ہو رہی ہے جس سے کچھ درازی خود بخود ثابت ہوتی ہے لیکن بہت زیادہ لمبے شخص کے مقابلے میں کم تھے البتہ ٹھگنے بالکل نہ تھے اس لئے قصیر کی نفی کو متردد کے ساتھ مقید کیا اس کی تائید اس روایت سے بھی ہوتی ہے جس میں "انه ربعة الى الطول" کے الفاظ آئے ہیں۔ یہ ساری تفصیل بطور حد ذاتہ ہے۔ وگرنہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ کوئی دراز قد چلتا تھا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس سے طویل نظر آتے تھے۔

قوله: وليس بالابيض الامهق: یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی رنگت برف، برص اور دودھ کی طرح بالکل سفید نہ تھی۔ مراد یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی رنگت سفید مگر کھلتی ہوئی تھی۔ چنانچہ ایک روایت میں ہے: **كان بياضه مشوبا بالحمرة**۔ یہ رنگ طباع موزونہ کے نزدیک سب سے زیادہ خوبصورت رنگ شمار ہوتا ہے حضرت انسؓ کے قول: **ولا بالآدم** کا معنی یہی بنتا ہے یعنی گہری گندمی نہ تھی۔

قوله: وليس بالجعد القطط ولا بالسبط:

القطط قاف اور طاء دونوں پر فتحہ ہے اور کبھی طاء کو کسرہ بھی دیا جاتا ہے، یعنی حبشیوں کے بالوں کی طرح بہت زیادہ پیچ دار (گھنگھریالے) نہ تھے۔

السبط باء پر فتحہ کسرہ اور سکون پڑھنا جائز ہے جو "السبوطة" سے مشتق ہے جو جعودت کی ضد ہے۔ سیدھے بال جیسے عام اعاجم کے بال ہوتے ہیں قاموس میں ہے "السبط" باء کے سکون اور حرکت کے ساتھ یہ بروزن (کتف) الجعودۃ کی ضد ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ دونوں کے بیچ تھے۔

قوله بعثه الله على رأس أربعين سنة:

مشہور یہ ہے کہ آپ کو پورے چالیس سال کی عمر میں نبوت ملی۔ پس الرأس سے سال کا آخری حصہ مراد ہے جیسا کہ رؤوس الآی سے قراء اور مفسرین کے ہاں آخری حصہ مراد ہوتا ہے۔

صاحب جامع الاصول لکھتے ہیں اہل علم کے ہاں صحیح ماثور قول تینتالیس سال کا ہے۔

فاقام بمكة عشر سنين۔ اور تین سال کی مزید مدت کے بارے میں اختلاف ہے' وگرنہ قول صحیح یہی ہے کہ آپ ﷺ کی عمر مبارک تریسٹھ سال بنتی ہے باقی جن لوگوں نے پینسٹھ سال کہا ہے اس کی حقیقت یہ ہے کہ ان لوگوں نے سن ولادت اور سن وفات کو بھی اس میں شمار کیا ہے۔

"عشرہ" شین کے سکون کے ساتھ ہے' باقی چند تصحیح شدہ نسخوں میں فتحہ کے ساتھ جو ضبط کیا گیا ہے وہ غیر معروف ہے۔

قوله :في رأسه ولحية عشرون شعرة بيضا:

یہ جملہ حالیہ ہے "شعرة" عین کے فتحہ اور سکون دونوں کے ساتھ درست ہے۔

يصف يصف ينعت کے معنی میں ہے۔

ربعة یہ لفظ باء کے سکون کے ساتھ ہے ہاں کبھی فتحہ کے ساتھ بھی پڑھا جاتا ہے۔ رجل ربعة و مربوع اس وقت کہا جاتا ہے جب انسان میانہ قد ہو حضرت انسؓ کا قول ليس بالطويل ولا بالقصير كان ربعة من القوم کے لئے تفسیر و بیان ہے۔

ازهر اللون: (یہ کان کی خبر ثانی ہے۔ اس کا معنی سفید مائل بسرخی ہے۔

طیبیؒ نے قاضی عیاضؒ کا قول نقل کیا ہے آنحضرت ﷺ کی رنگت میں چمک دمک اور خوبروئی تھی۔

قوله :وقال كان شعر ابى انصاف اذنيه۔

لفظ شعر پر عین کا فتحہ اور سکون دونوں پڑھنا صحیح ہے اور لفظ اذنیہ ذال کے ضمہ اور سکون کے ساتھ پڑھ سکتے ہیں وفي رواية بين اذنيه وعاتقه۔

قوله : كان ضخم الرأس : سر مبارک بڑا تھا سر کا بڑا ہونا عرب میں سرداری' عظمت اور عقلمندی کی نشانی سمجھا جاتا تھا اس سے آپ کی عظمت کی طرف اشارہ ہے' و القدمين پاؤں پر گوشت تھے اس سے آپ کی شجاعت' ثابت قدمی اور عبادت کے لحاظ سے قوی ہونے کی طرف اشارہ ہے کیونکہ پیروں کا پر گوشت ہونا شجاعت اور ثابت قدمی کی علامت ہے۔ قوله :لم اربعده ولا قبله :یعنی تمام مراتب خلق و خلق و کمال میں آپ کے مثل و مساوی کبھی کسی کو نہیں دیکھا۔

و كان سبط الكفين۔ ابوعبیدہؒ فرماتے ہیں غلظ و قصر کی طرف زیادہ مائل تھیں۔ ان کے علاوہ دوسرے حضرات کہتے ہیں اس کا مطلب یہ ہے کہ انگلیاں پر گوشت تھیں ممکن ہے یہ آپ کی جود و سخا ہو اس لئے کہ عرب بخیل کو "جعد الكف" اور سخی کو "سبط الكف" سے تعبیر کرتے ہیں۔ كان...... و الكفين۔

شثن ثاء کے سکون کے ساتھ شثن سے مشتق ہے۔

یہ صفت مردوں میں قوت شجاعت کی علامت ہونے کی وجہ سے عمدہ سمجھی جاتی ہے جبکہ عورتوں میں عیب شمار ہوتی ہے کیونکہ عورتوں میں نزاکت اچھی معلوم ہوتی ہے۔ یہاں غلظ سے مراد خلقت کے اعتبار سے اعضاء کی مضبوطی ہے نہ کہ جلد کا کھردراپن۔

چنانچہ حضرت انسؓ سے صحیح روایت ہے :ما مست ديباجة ولا حريرة الين من كف رسول الله ﷺ۔ میں نے رسول کریم ﷺ کی ہتھیلیوں سے زیادہ ملائم و نرم کوئی ریشم و دیباج نہیں چھوا۔

۵۷۸۳ : وَعَنِ الْبَرَاءِ قَالَ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَرْبُوْعًا بَعِيْدَ مَا بَيْنَ الْمُنْكِبَيْنِ

لَهُ شَعْرٌ بَلَغَ شَحْمَةَ أُذُنَيْهِ رَأَيْتُهُ فِي حُلَّةٍ حَمْرَآءَ لَمْ أَرَ شَيْئًا قَطُّ أَحْسَنَ مِنْهُ (متفق عليه وفي رواية لمسلم) قَالَ مَارَأَيْتُ مِن ذِي لِمَّةٍ أَحْسَنَ فِي حُلَّةٍ حَمْرَاءَ مِنْ رَّسُولِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ شَعْرُهُ يَضْرِبُ مَنْكِبَيْهِ بَعِيْدُ مَا بَيْنَ الْمَنْكِبَيْنِ لَيْسَ بِالطَّوِيْلِ وَلَا بِالْقَصِيْرِ.

اخرجه البخاري في صحيحه ٥٦٥/٦ حديث رقم ٣٥٥١ ومسلم في صحيحه ١٨١٨/٤ حديث رقم (٩١-٢٣٣٧) وابو داؤد ٣٣٧/٤ حديث رقم ٤٠٧٢ والترمذي في السنن ٥٥٨/٥ حديث رقم ٣٦٣٥ والنسائي في السنن ١٨٣/٨ حديث رقم ٥٢٣٢ وابن ماجه ١١٩٠/٢ حديث رقم ٣٥٩٩ والدارمي في السنن ٤٤/١ حديث رقم ٥٧ واحمد في المسند ٣٠٠/٤۔

ترجمہ: ''حضرت براء رضی اللہ عنہ سے مروی ہے' فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میانہ قد کے تھے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے دونوں شانوں کے درمیان فراخی تھی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے سر کے بال کانوں کی لو تک تھے اور میں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو سرخ حلہ میں (جو یمنی کپڑے کے تہبند اور چادر پر مشتمل تھا) دیکھا (اس میں کوئی مبالغہ نہیں کہ) میں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ حسین کوئی چیز نہیں دیکھی''۔ (بخاری و مسلم) اور مسلم کی ایک روایت (نیز ابوداؤد' ترمذی و نسائی) میں یہ الفاظ ہیں کہ حضرت براء رضی اللہ عنہ نے کہا: میں نے کوئی بالوں والا آدمی سرخ حلہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ خوبصورت نہیں دیکھا' آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے سر کے بال کندھوں تک تھے۔ آپ کے دونوں کندھوں کے درمیان فراخی تھی اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نہ بہت لمبے قد کے تھے اور نہ پستہ قد''۔

تشریح: قوله و کان رسول الله ﷺ مربوعا: یعنی تقریباً متوسط القامہ تھے۔ وگرنہ تو حقیقت یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا قد مبارک میانہ سے طویل تھا۔

بعید ما بین المنکبین: بعید مکبیر و مصغر دونوں طرح منقول ہے' اعراب کے اعتبار سے بھی دو طرح پڑھا گیا ہے۔

① یہ منصوب ہے کان کی خبر ہونے کی وجہ سے۔ ② مبتداء محذوف کی خبر ہونے کی وجہ سے مرفوع پڑھا گیا ہے۔

قوله له شعر بلغ شحمة اذنیه: پڑھا گیا۔ ترمذی اور ابن ماجہ کی حضرت عائشہؓ سے منقول روایت میں یوں ہے کان شعره دون الجمة وفوق الوفرة کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بال جمہ سے کم اور وفرہ سے لمبے تھے۔

(عربی میں انسان کے سر کے بالوں کے لئے عام طور پر تین لفظ مستعمل ہوتے ہیں) ① جمہ: سے مراد وہ بال ہوتے ہیں جو کان کی لو سے اتنے نیچے تک ہوں کہ کاندھوں تک پہنچ جائیں (اور کبھی اس لفظ سے مطلق بال مراد لئے جاتے ہیں خواہ وہ چھوٹے ہوں یا بڑے)۔ دوسرا لفظ لمہ ہے یہ لفظ بالوں کی اس زلف کے لئے استعمال ہوتا جو کانوں کی لو سے متجاوز ہو لیکن کاندھوں تک نہ پہنچی ہو اور تیسرا لفظ وفرہ ہے جو کانوں کی لو تک لٹکتے ہوئے بالوں کے معنی میں استعمال ہوتا ہے)۔ روایتوں کا اختلاف شاید حالات کے اختلاف کی وجہ سے ہو (کہ جس شخص نے جس حالت میں آپ کے بالوں کو دیکھا اس کے مطابق ان کی لمبائی کو ذکر کیا۔ (مزید اقوال آگے آرہے ہیں)

قوله: رأیته في حلة حمراء ابن الملک کہتے ہیں اس سے مراد سرخ دھاری دار لباس ہے۔ ابن الہمامؒ کہتے ہیں یہ

سرخ اور سبز دھاری والے دو یمنی کپڑوں پر مشتمل ہوتا ہے۔اس سے بالکل سرخ لباس مراد نہیں۔ابن حجر عسقلانی فرماتے ہیں یہ لباس دھاری دار ہوتا ہے۔میرکؒ فرماتے ہیں اس حدیث میں ان لوگوں کے لئے کوئی دلیل نہیں ہے جو سرخ لباس کو مردوں کے لئے جائز کہتے ہیں وہ بالکل غلط ہے کیونکہ یہ روایت اس کی دلیل نہیں بنتی۔

① یہ آپ کی خصوصیات میں تھی کہ صرف آپ کے لئے جائز کیا گیا تھا۔② یہ اس وقت کی بات ہے جب نہی وارد نہیں ہوئی تھی۔③ اگر نہی کے بعد آپ ﷺ نے زیب تن فرمایا تھا تو اس صورت میں اس سے جواز ثابت ہوتا ہے البتہ نہی والی روایات کو سامنے رکھتے ہوئے یوں کہا جاسکتا ہے کہ سرخ لباس مردوں کے لئے مکروہ ہے حرام نہیں۔

لم أرشيئا قط احسن منه اس حصہ میں بھی عرفاً مساوات کی نفی ہے رواہ ابوداؤد والترمذی والنسائی۔**وفی روایة لمسلم** کتب اور ثلاثہ میں بھی مسلم کی طرح یوں ہے۔**لمة** لفظ لمہ لام کی کسرہ اور میم کی تشدید کے ساتھ النہایہ میں ہے اللمہ سر کے بالوں کی لمبائی کی وہ مقدار ہے جو جمہ سے کم ہو اس کو کان سے کاندھوں کی طرف متجاوز ہونے کی وجہ سے ہی لمہ کہا جاتا ہے جب اس سے بھی بڑھ جائے تو یہ ''جمة'' کہلاتے ہیں۔

''بعید'' مرفوع ہے۔**قوله ليس بالطويل و لا القصير** نہ تو اتنے دراز تھے کہ معیوب نظر آئیں اور نہ اتنے پست قد تھے کہ معیوب نظر آئیں۔

۵۷۸۴ : وَعَنْ سِمَّاكِ بْنِ حَرْبٍ عَنْ جَابِرِ بْنِ سَمُرَةَ قَالَ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ضَلِيْعَ الْفَمِ اَشْكَلَ الْعَيْنِ مَنْهُوْشَ الْعَقِبَيْنِ قِيْلَ لِسِمَاكٍ مَا ضَلِيْعُ الْفَمِ قَالَ عَظِيْمُ الْفَمِ قِيْلَ مَا اَشْكَلَ الْعَيْنِ قَالَ طَوِيْلُ شَقِّ الْعَيْنِ قِيْلَ مَا مَنْهُوْشُ الْعَقِبَيْنِ قَالَ قَلِيْلُ لَحْمِ الْعَقِبِ (رواه مسلم)

اخرجه مسلم في صحيحه ١٨٢٠/٤ حديث رقم (٩٧-٢٣٣٩) والترمذي في السنن ٥٦٣/٥ حديث رقم ٣٦٤٧ واحمد في المسند ١٠٣/٥۔

ترجمہ: ''سماک بن حرب' حضرت جابر بن سمرہ رضی اللہ عنہ سے نقل کرتے ہیں کہ انہوں نے فرمایا رسول اللہ ﷺ کشادہ دہن تھے۔آپ ﷺ کی آنکھوں میں سرخ ڈورے تھے اور ایڑیاں کم گوشت تھیں (راوی کہتے ہیں کہ) سماکؒ سے پوچھا گیا کہ ''ضَلِيْعُ الْفَمِ '' سے کیا مراد ہے؟ تو انہوں نے کہا کہ کشادہ دہن! ان سے پوچھا گیا کہ ''اَشْكَلَ الْعَيْنِ '' کے کیا معنی ہیں؟ تو انہوں نے جواب دیا کہ دائرہ چشم کا بڑا ہونا! پھر ان سے پوچھا گیا کہ ''مَنْهُوْشُ الْعَقِبَيْنِ '' کے کیا معنی ہیں تو انہوں نے جواب دیا کہ وہ ایڑیاں جن پر گوشت کم ہو''۔(مسلم)

راوی حدیث:

سماک بن حرب (سین کے کسرہ کے ساتھ)۔یہ سماک بن حرب ''ذہلی'' ہیں۔ان کی کنیت ''ابومغیرہ'' ہے۔کوفہ کے مشہور تابعی ہیں۔فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کے اسی (۸۰) اصحاب کو پایا ہے۔جابر ابن سمرہ اور نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہم سے روایت کرتے ہیں۔ان سے شعبہ اور زائدہ روایت کرتے ہیں۔ان سے تقریباً دوسو (۲۰۰) حدیثیں مروی ہیں

۔یہ ثقہ تھے لیکن حافظہ کمزور ہو گیا تھا۔ان کو ابن مبارک وشعبہ وغیرہ نے ''ضعیف'' کہا ہے۔ان کا انتقال ۱۲۳ھ میں ہوا۔

تشریح: ضلیع الفم ۔ ''ضلیع'' کا معنی کشادہ دہن ہے۔نووی فرماتے ہیں اکثر محدثین نے اس کا معنی عظیم اور وسیع کیا ہے اور یہی زیادہ ظاہر ہے یہ چیز عرب میں مردوں کے لئے قابل تعریف سمجھی جاتی ہے جبکہ منہ کا چھوٹا ہونا عیب سمجھا جاتا ہے۔اشکل العین: قاموس میں ''الاشکل'' کا معنی وہ آنکھ جس میں سرخی اور سفیدی ملی ہوئی ہو یا سفیدی سرخی کی طرف مائل ہو۔منھوش العقبین قاموس میں لفظ ''منھوش'' سین شین دونوں کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے۔

قاموس میں لکھا ہے کہ ''ضلیع الفم'' کا معنی منہ کا بڑا ہونا یا کشادہ ہونا یا دانتوں کا میں سے اگلے دانتوں کچھ کشادہ ہونا جن میں کسی قدر ریخیں ہوں۔عرب کشادہ دھنی کو محمود اور پست دہنی کو معیوب سمجھتے تھے۔

قولہ ما اشکل العینین؟ قال العینین ۔ العیین: شق شین کے فتحہ کے ساتھ ہے۔

قاضی عیاضؒ فرماتے ہیں ''اشکل العینین'' کی جو تفسیر سماک نے کی ہے یعنی ''شق العینین'' ان کا سہو ہے اور واضح طور پر غلط ہے۔درست معنی وہ ہے جس پر علماء کا اتفاق ہے اور اس کو ابوعبیدہ نے نقل کیا ہے یعنی آنکھ کی سفیدی جو سرخی مائل ہو۔

۵۷۸۵:وَعَنْ اَبِی الطُّفَیْلِ قَالَ رَاَیْتُ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ کَانَ اَبْیَضَ مَلِیْحًا مُقَصَّدًا.

(رواہ مسلم)

اخرجہ مسلم فی صحیحہ ۱۸۲۰/۴حدیث رقم (۹۹۔۲۳۴۰) وابو داؤد فی السنن۱۸۶/۵حدیث رقم ۴۸۶۴ واحمد فی المسند ۴۵٤/۵۔

ترجمہ: ''حضرت ابوطفیل رضی اللہ عنہ سے مروی ہے' فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سفید ملیح رنگ کے اور میانہ قد کے تھے''۔(مسلم)

تشریح: ملیحا:(متوسط و معتدل) یہ احتراز ہے ''امھق'' (بغیر چمک کے بہت سفید رنگ) سے۔

مقصدا یہ لفظ صاد مشددہ کے فتحہ کے ساتھ ہے۔

النہایہ میں ہے:ھو الذی لیس بطویل ولا قصیر ولا جسیم۔

امام ترمذی نے شمائل میں اسی راوی سے نقل کیا ہے اور حضرت ابوہریرہؓ کی جانب منسوب ہے:کان ابیض کانما صیغ من فضۃ گویا کہ آپ کا بدن چاندی سے ڈھالا گیا ہے۔

امام بیہقی نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے:انہ صلی اللہ علیہ وسلم کان ابیض مشوبا بحمرۃ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا رنگ سرخ و سفید تھا حضرت ابوہریرہؓ فرماتے ہیں اذا وضع رداء ہ عن منکبیہ فکانہ سبیکۃ فضۃ ۔جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنے شانوں سے چادر اتارتے اور جسم مبارک پر نظر پڑتی تو یوں لگتا جیسے چاندی کا ٹکڑا ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خضاب استعمال نہیں کیا

۵۸۸۶ : وَعَنْ ثَابِتٍ قَالَ سُئِلَ اَنَسٌ عَنْ خِضَابِ رَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فَقَالَ اِنَّہٗ لَمْ

يَبْلُغْ مَا يَخْضِبُ لَوْ شِئْتُ اَنْ اَعُدَّ شَمَطَاتِهِ فِي لِحْيَتِهٖ وَفِي رِوَايَةٍ لَوْ شِئْتُ اَنْ اَعُدَّ شَمَطَاتٍ كُنَّ فِي رَاْسِهٖ فَعَلْتُ (متفق عليه وفي رواية لمسلم) قَالَ اِنَّمَا كَانَ الْبَيَاضُ فِي عَنْفَقَتِهٖ وَفِي الصُّدْغَيْنِ وَفِي الرَّأْسِ نُبَذٌ.

اخرجه البخاری فی صحیحه حدیث رقم ۵۸۹۵ومسلم فی صحیحه ۱۸۲۱/۴حدیث رقم (۱۰۴-۲۳۴۱) واحمد فی المسند ۲۲۷/۳۔

ترجمہ: ''حضرت ثابت رضی اللہ عنہ سے مروی ہے' فرماتے ہیں کہ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خضاب کے بارے میں دریافت کیا گیا تو انہوں نے فرمایا: آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی عمر اتنی نہیں ہوئی تھی کہ خضاب استعمال کرتے' اگر میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی داڑھی کے سفید بال کو گننا چاہتا تو یقیناً گن سکتا تھا۔ایک روایت میں یہ الفاظ ہیں کہ اگر میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے سر کے سفید بالوں کو گننا چاہتا تو گن سکتا تھا''۔(بخاری ومسلم) اور ایک روایت میں یہ بھی ہے کہ حضرت انس رضی اللہ عنہ نے کہا: ''بالوں کی سفیدی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی داڑھی کے نیچے کے حصہ میں اور کن پٹیوں میں تھی اور کچھ سر مبارک میں''۔

راویٔ حدیث

یزید بن ابی عبید۔ یہ یزید ابو عبید کے بیٹے ہیں۔سلمہ بن الاکوع رضی اللہ عنہ کے آزاد کردہ ہیں۔امام بخاری رحمہ اللہ کے شیخ کے شیخ ہیں' ان سے مکی ابن ابراہیم اور مکی بن ابراہیم سے بخاری روایت کرتے ہیں۔امام بخاری رحمہ اللہ کی ثلاثیات اسی طریق سے ہیں۔یزید نے سلمہؓ سے اور ان سے یحییٰ بن سعید وغیرہ نے روایت کی۔

تشریح: خضاب خاء کے کسرہ کے ساتھ ہے۔شارح لکھتا ہے:''یبلغ'' کی ضمیر فاعل ''شعر النبی'' کی طرف راجع ہے اور ''ما'' مصدر یہ ہے ''یخضب'' کا فاعل نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہیں: ای لم یبلغ الخضاب۔بعض کہتے ہیں ''ما موصولہ'' ہے اس کی ضمیر عائد محذوف ہے ای یخضبه ''اور یہ موصول صلہ ''یبلغ'' کا مفعول بہ ہے۔ای لم یبلغ شعرہ حدا یخضبه۔یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بال اتنے سفید نہیں ہوئے تھے کہ خضاب کی ضرورت پیش آتی تھوڑے بہت بال سفید تھے۔طیبیؒ فرماتے ہیں ان کی مقدار اتنی کم تھی کہ بادی النظر میں معلوم بھی نہیں ہوتے تھے خضاب سے ان کو چھپانے کی ضرورت ہی نہیں تھی۔

شمطاته تینوں حروف متحرک ہیں۔جواب ''لو'' محذوف ہے: ای لا عدها او لعدوتها او لفعلت یعنی آپ کے بال کو گننا چاہتا تو یقیناً گن سکتا تھا۔ولو شئت ...... فعلت یہ جملہ کنایہ ہے قلت بیاض سے کیونکہ معدود اوصاف قلت میں سے ہے چنانچہ باری تعالیٰ کا ارشاد ہے:﴿ایام معدودات﴾ [البقرة: ۱۸۴] گنتی کے چند دن اسی طرح کہا جاتا ہے دراہم معدودہ کچھ دراہم۔

وفی روایة لمسلم قال: انما کان البیاض بال مراد ہیں۔بیاض بڑھاپے سے کنایہ ہے۔

عنفقته عین مفتوح اور نون ساکن پھر فاء اور اس کے بعد قاف ہے اس سے مراد داڑھی کے نیچے کے حصے یعنی نچلے ہونٹ سے نیچے اور ٹھوڑی سے اوپر کے حصہ میں۔

و في الصد غين صاد پر ضمہ ہے۔ وفي الواس نبذ: نون مفتوح' باء ساکن اور ذال معجمہ کے ساتھ ہے۔ اي شئ يسير من شيب۔ ایک نسخہ میں نون مضموم اور باء مفتوحہ کے ساتھ ہے۔ اي شعرات متفرقة۔ اس صورت میں کچھ متفرق بالوں کی سفیدی مراد ہوگی۔

طیبیؒ فرماتے ہیں: نبذ مبتدا مؤخر ہے اس کی خبر في عنفقته مقدم ہے مبتدا خبر مل کر کان کی خبر ہے۔ میں کہتا ہوں کوئی بعید نہیں کہ اس جملہ کا عطف: انما كان پر ہو اور زیادہ واضح یہ ہے کہ جار مجرور کا عطف ماقبل والے جار مجرور پر ہو۔ "نبذ" یہ مبتدأ محذوف ہو کی خبر ہے جو "بیاض" کی طرف راجع ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ہتھیلیاں اور پسینہ

۵۷۸۷ : وَعَنْ اَنَسٍ قَالَ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَزْهَرَ اللَّوْنِ كَانَ عَرَقَهُ اللُّؤْلُؤُ اِذَا مَشٰى تَكَفَّأَ وَمَا مَسِسْتُ دِيْبَاجَةً وَلَا حَرِيْرًا اَلْيَنَ مِنْ كَفِّ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَلَا شَمِمْتُ مِسْكًا وَلَا عَنْبَرَةً اَطْيَبَ مِنْ رَائِحَةِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ۔ (متفق عليه)

اخرجه البخاري ٥٦٦/٦ حديث رقم ٣٥٦١ واخرجه مسلم ١٨١٥/٤ حديث رقم (٨٢-٢٣٣٠) واخرجه الدارمي في السنن ٤٥/١ حديث رقم ٦١ واخرجه احمد في المسند ٢٢٨/٣۔

ترجمہ: "حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے' فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سفید و روشن رنگ کے تھے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پسینے کے قطرات (ہیئت و چمک اور صفائی میں) موتی کی طرح ہوتے تھے' جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم چلتے تو آگے کی طرف جھکے ہوئے چلتے اور میں نے کسی دیباج و حریر کو بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہتھیلیوں سے زیادہ ملائم اور نرم نہیں پایا اور میں نے کوئی ایسا مشک و عنبر نہیں سونگھا جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بدن اطہر کی خوشبو سے زیادہ معطر ہو"۔ (بخاری و مسلم)

تشریح: تكفأ: فاء مشددہ کے بعد ہمزہ ہے اور ایک نسخہ میں فاء کے بعد الف ہے۔ نوویؒ فرماتے ہیں یہ ہمزہ کے ساتھ ہے' البتہ کبھی ہمزہ کو ترک بھی کر دیا جاتا ہے۔ بہت سے لوگوں کا یہ زعم ہے کہ یہ بغیر ہمزہ کے ہے لیکن ایسا نہیں ہے۔ جیسا کہ وہ فرماتے ہیں "تكفأ" میں روایۃ معتمدہ بغیر ہمزہ کے ہے لیکن ہرویؒ کہتے ہیں حقیقت یہ ہے کہ اصل کے اعتبار سے ہمزہ تھا پھر اس کو ترک کر دیا گیا ہے۔

تورپشتیؒ فرماتے ہیں بعض لوگ (اس کا مطلب بیان کرتے ہوئے) کہتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم آگے کی جانب اس طرح جھکے ہوئے چلتے تھے جس طرح کشتی پانی میں تیری رہی ہو (یعنی تیز رفتار تھے) تکفأ اہل لغت کے قول اكفأته و كفأته اترتے ہوئے سے ہے۔ اور چلنے کے لئے ایک معنی جھومتے اور مٹکتے ہوئے چلنے کا بھی لغت میں منقول ہے اور کہا جاتا ہے كفأت الاناء فكفأ و تكفأ برتن کا اوندھا اور الٹ جانا یہ چال ایسی ہوتی ہے جیسے کوئی شخص بلند زمین سے نشیب میں اتر رہا ہو اس جملہ کا یہ معنی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم جب چلتے تو اس اعتماد اور وقار کے ساتھ قدم اٹھاتے تھے جس طرح کوئی بہادر اور قوی و توانا شخص قدم اٹھاتا

قول منقول ہے کہ آپ کشتی کی طرح ہچکولے لیے ہوئے چلتے تھے اظہریؒ فرماتے ہیں یہ مطلب غلط ہے کیونکہ یہ منکرین کی چال ہے۔

البتہ قاضی عیاضؒ اس قول میں بھی ایک اچھی توجیہہ بیان فرماتے ہیں اس کا مطلب شمر سے بیان کیا ہے یہ اس وقت معیوب ہے جبکہ فطری چال نہ ہو بلکہ خودساختہ ہوالبتہ فطری چال ہونے کی صورت میں یہ مذموم میں شمار نہیں ہوتی۔

قوله :مامست ديباجة ولا حريرا الين من كف رسول الله ﷺ مست۔

سین اول کے کسرہ کے ساتھ کبھی فتحہ کے ساتھ بھی آتا ہے۔**ديباجة**: دال کے کسرہ کے ساتھ ہے اور کبھی دال کے فتحہ کے ساتھ بھی پڑھا جاتا ہے یہ ریشم کی ایک قسم ہے۔**ولا حريرا** سے مطلق ریشم مراد ہے۔

قوله ولا سممت مسكا...... **شممت** یہ لفظ باب ضرب اور نصر دونوں سے آتا ہے۔ابن حجر عسقلانیؒ ان دونوں کلموں کے متعلق فرماتے ہیں **مسست** افصح لغت میں سین اولیٰ کی کسرہ کے ساتھ ہے ایسا ہی **شممت** کا میم اول بھی فصیح لغت کے اعتبار سے مکسور ہے۔البتہ فتحہ کے ساتھ ایک لغت میں ہے یہ فصیح لغت کے خلاف ہے کیونکہ فصیح لغت میں ان کا مضارع **امسه** و **اشمه** فتحہ کے ساتھ منقول ہے البتہ اس لغت میں ضمہ کے ساتھ بھی ہے۔قاموس میں ہے:**الشم :حس الأنف (سونگھنا) شممته بالكسر أ شمه و شمته أشمه بالضم شما۔** سونگھنے کے معنی میں ضمہ اور کسرہ کے ساتھ ہے یعنی ضرب اور نصر دونوں سے ایک ہی معنی میں ہے۔

ترمذی کی شمائل میں اس روایت کے الفاظ یوں ہیں **كان رسول الله ﷺ من احسن الناس خلقا ولا مسست خزا ولا حريرا قط ولا شيئا كان الين من كف رسول الله ﷺ ولا شممت مسكا۔ قط ولا عطرا كان اطيب من عرق رسول الله۔** اور ایک نسخہ میں "**من عرف**" فاء کے ساتھ ہے۔

حضور ﷺ اقدس ﷺ اخلاق میں تمام دنیا سے بہتر تھے اسی طرح خلقت کے اعتبار سے بھی حتیٰ کہ میں نے کبھی کوئی ریشمی کپڑا یا خالص ریشم یا کوئی اور نرم چیز ایسی نہیں چھوئی جو حضور ﷺ اقدس ﷺ کی بابرکت ہتھیلی سے زیادہ نرم ہو اور میں نے کبھی کسی قسم کا مشک یا کوئی عطر حضور ﷺ کے پسینہ کی خوشبو سے زیادہ خوشبودار نہیں سونگھا۔

پسینہ مبارک

۵۷۸۸ : وَعَنْ اُمِّ سُلَيْمٍ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَانَ يَاْتِيْهَا فَيَقِيْلُ عِنْدَهَا فَتَبْسُطُ نِطَعًا فَيَقِيْلُ عَلَيْهِ وَكَانَ كَثِيْرَ الْعَرَقِ فَكَانَتْ تَجْمَعُ عَرَقَهٗ فَتَجْعَلُهٗ فِي الطِّيْبِ فَقَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَا اُمَّ سُلَيْمٍ مَا هٰذَا قَالَتْ عَرَقُكَ نَجْعَلُهٗ فِي طِيْبِنَا وَهُوَ مِنْ اَطْيَبِ الطِّيْبِ وَفِي رِوَايَةٍ قَالَتْ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ نَرْجُوْ بَرَكَتَهٗ لِصِبْيَانِنَا قَالَ اَصَبْتِ۔ (متفق علیه)

اخرجه البخاری ۱۱/ ۷۰ حدیث رقم ۶۲۸۱ ومسلم ۴/ ۱۸۱۵ حدیث رقم (۸۳۔۲۳۳۱) واحمد فی المسند

۔۱۳۶/۳

ترجمہ: ''حضرت اُم سلیم رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ ان کے یہاں تشریف لاتے اور وہاں آ کر قیلولہ فرمایا کرتے تھے (یعنی دوپہر کے وقت ان کے یہاں استراحت کے لئے تشریف لایا کرتے تھے) چنانچہ ام سلیم رضی اللہ عنہا آپ ﷺ کے لئے چمڑے کا بستر بچھا دیتیں اور آپ ﷺ اس پر آرام فرماتے۔ آپ ﷺ کو پسینہ بہت آتا تھا۔ اُم سلیم رضی اللہ عنہا آپ ﷺ کا پسینہ جمع کر لیتیں اور اسے ملا لیتی تھی) (ایک دن) آنحضرت ﷺ نے (ان کو پسینہ جمع کرتے دیکھا تو) پوچھا کہ ام سلیم! یہ کیا ہے؟ (یعنی یہ تم کیا کر رہی ہو؟) ام سلیم رضی اللہ عنہا نے کہا کہ یہ آپ ﷺ کا پسینہ ہے جس کو جمع کر کے ہم اپنے عطر میں ملا لیتے ہیں' بات یہ ہے کہ آپ ﷺ کا پسینہ مبارک تمام خوشبوؤں سے عمدہ خوشبو ہے اور ایک روایت میں یہ الفاظ ہیں کہ اُم سلیم رضی اللہ عنہا نے کہا: یا رسول اللہ! اس پسینہ کو ہم اپنے بچوں کے لئے باعث برکت تصور کرتی ہیں (یعنی آپ ﷺ کے مبارک پسینہ کو ہم اپنے بچوں کے بدن اور منہ پر ملتی ہیں اور یقین رکھتی ہیں کہ وہ بچے اس پسینہ کی برکت سے آفات اور مصائب سے محفوظ رہیں گے) آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: تم نے ٹھیک کیا''۔

(بخاری و مسلم)

تشریح: قوله :وعنه عن ام سليم: یہ نام کتب اصول معتمدہ میں تصغیر کے وزن پر منقول ہے اور بعض نسخوں میں ''وعنہ'' کے بغیر ہے۔

فيقيل :قیلولة سے ماخوذ ہے۔ عندها حضرت ام سلیم آپ ﷺ کے خادم حضرت انسؓ کی والدہ تھیں' حدیث میں کشف یا خلوت پر کوئی دلالت موجود نہیں ہے۔ امام نوویؒ فرماتے ہیں ام حرام اور ام سلیم کسی رضاعی یا نسبی رشتے سے آپ کی خالہ تھیں لہٰذا نبی مریم ﷺ کا ان کے ہاں خلوت میں تشریف لے جانا درست تھا۔ آنحضرت ﷺ دوپہر کے وقت ان کے ہاں جا کے قیلولہ فرما لیا کرتے تھے آنحضرت ﷺ صرف ان دو عورتوں کے ہاں جایا کرتے تھے ان کے علاوہ کسی عورت کے ہاں نہیں جایا کرتے تھے۔

بعض کا کہنا ہے کہ ان کے ہاں قیلولہ فرمایا کرتے تھے' یہ حجاب کا حکم نازل ہونے سے قبل ان دونوں بہنوں کے ہاں بھی نہیں جایا کرتے تھے نزول حجاب کے بعد ان کے ہاں جانا ثابت ہے جو اس بات کی دلیل ہے کہ رشتہ دار تھیں۔ آنحضرت ﷺ کی رضاعت مدینہ منورہ کی کسی خاتون سے ثابت نہیں کیونکہ متعین ہو جاتا ہے کہ ان دونوں بہنوں کے ساتھ حضرت عبداللہ کے واسطے سے کوئی رضاعی رشتہ تھا۔

امام تورپشتیؒ فرماتے ہیں میں نے بعض کتب احادیث میں لکھا ہوا دیکھا ہے کہ یہ آپ ﷺ کی محرمات میں سے تھیں کیونکہ آپ ﷺ اجنبی عورت کے ہاں استراحت نہیں فرمایا کرتے تھے لہٰذا اگر نسبی اعتبار سے ان کا کوئی رشتہ نہ بنتا تھا تو ضرور کوئی رضاعی رشتہ تھا۔

(باقی یہ رضاعی رشتہ کس جانب سے تھا؟ خود آنحضرت ﷺ کی جانب دیکھیں تو یہ ثابت نہیں ہوتا) کیونکہ آنحضرت ﷺ رضیع ہونے کی حیثیت سے مدینہ منورہ نہیں لے جائے گئے یہ بالکل متعین ہو گیا کہ یہ رشتہ آپ ﷺ کے والد ماجد حضرت عبداللہ

کی جانب سے تھا کیونکہ عبدالمطلب اپنے والد ہاشم سے علیحدہ ہو گئے تھے اور مدینہ منورہ میں قبیلہ بنونجار میں شادی کر لی تھی۔ حضرت عبداللہ کی ولادت مدینہ میں ہوئی۔ ام حرام اور ام سلیم یہ دونوں بنونجار سے تھیں۔ اب ان تمام باتوں کو سامنے رکھیں تو معلوم ہوتا ہے ان کے ساتھ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا رشتہ رضاعت کا تھا ام حرام اور ام سلیم سے ہم ایک جم غفیر کو روایت کرتے پاتے ہیں لیکن ان میں سے کسی نے رشتہ وغیرہ کی کوئی علت بیان نہیں کی اس کی دو وجہیں ہو سکتی ہیں۔ یا غفلت' یا اس بارے میں عدم علم۔ میں نے اس کو اس وجہ سے بیان کرنا پسند کیا تاکہ کوئی جاہل آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق بدگمانی کا شکار نہ ہو یا اس کو دیکھ کے جس چیز میں رخصت نہیں شریعت کی طرف سے (یعنی خلوۃ اجنبیہ) اس کا شکار نہ ہو جائے' میں یہ سمجھتا ہوں' واللہ اعلم۔ میں وہ پہلا شخص ہوں جس کو اس کی توفیق دی گئی ہے۔ یہ وہ موتی ہے جسے میں نے ہی نکالا ہے میں اس خاص انعام پر اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا بیان کرتا ہوں۔

نطعا: نون کے فتحہ و کسرہ اور طاء کے سکون کے ساتھ' قاموس میں نون کے فتحہ کسرہ کے ساتھ ساتھ (حرکت) اور ''عنب'' کی طرح ہونا منقول ہے۔ چمڑے کا بچھونا مراد ہے۔ وھو یہ ضمیر عرقک یا طیب مخلوط کی طرف راجع ہے۔

قوله :قالت یا رسول الله نرجو بر کته لصبیاننا۔

لصبیاننا...... اصبت: اس حدیث سے صالحین کے آثار سے تبرک و تقرب حاصل کرنے کا استحباب ثابت ہوتا ہے۔

بچوں کے ساتھ پیار

۵۷۸۹ : وَعَنْ جَابِرِ بْنِ سَمُرَةَ قَالَ صَلَّيْتُ مَعَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ صَلٰوةَ الْاُوْلٰى ثُمَّ خَرَجَ اِلٰى اَهْلِهٖ وَخَرَجْتُ مَعَهٗ فَاسْتَقْبَلَهٗ وِلْدَانٌ فَجَعَلَ يَمْسَحُ خَدَّىْ اَحَدِهِمْ وَاحِدًا وَاحِدًا وَاَمَّا اَنَا فَمَسَحَ خَدِّىْ فَوَجَدْتُ لِيَدِهٖ بَرْدًا اَوْ رِيْحًا كَاَنَّمَا اَخْرَجَهَا مِنْ جُؤْنَةِ عَطَّارٍ رَوَاهُ مُسْلِمٌ وَذُكِرَ حَدِيْثُ جَابِرٍ سَمُّوْا بِاسْمِىْ فِىْ بَابِ الْاَسَامِىْ وَحَدِيْثُ السَّائِبِ بْنِ يَزِيْدَ نَظَرْتُ اِلٰى خَاتَمِ النُّبُوَّةِ فِىْ بَابِ اَحْكَامِ الْمِيَاهِ۔

اخرجه مسلم فی صحیحه ۱۸۱٤ حدیث رقم (۸۰-۲۳۲۹)۔

ترجمہ: ''حضرت جابر بن سمرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے' فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ظہر کی نماز پڑھی (نماز سے فراغت کے بعد) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنے گھر جانے کے لئے مسجد سے باہر نکلے میں بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہی نکل آیا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے کچھ بچے آ گئے' آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان میں سے ایک ایک بچہ کے گالوں پر ہاتھ پھیرتے اور پھر میرے گال پر بھی ہاتھ مبارک پھیرا۔ اس وقت میں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے دست مبارک کی ٹھنڈک اور خوشبو ایسے محسوس کی جیسے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ابھی عطار کے ڈبہ سے اپنا ہاتھ نکالا ہے۔ (مسلم) اور حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی روایت میں ''سَمُّوْا بِاسْمِىْ......'' باب الاسامی میں اور حضرت سائب بن یزید کی روایت: ''نَظَرْتُ اِلٰى خَاتَمِ النُّبُوَّةِ'' باب احکام المیاہ میں نقل

کی جاچکی ہیں۔

تشریح: قوله :صليت مع رسول الله صلى الله عليه وسلم ۔

صلاة الاولى ۔ یہ موصوف کی اضافت صفت کی طرف کے قبیل سے ہے۔متبادر یہ ہے کہ امام نووی اور ان کی اتباع میں ابن الملک فرماتے ہیں یہ ظہر کی نماز تھی۔

ولدان: یہ ولید کی جمع ہے فجعل: شروع کرنے کے معنی میں ہے۔

واحدا واحدا : یہ حال ہے۔

قوله: واما انا فمسح خدی: یہاں تثنیہ کے صیغے کے ساتھ ہے اور ایک نسخہ میں صغیہ مفرد کے ساتھ ہے جس سے جنس مراد ہے۔

او ریحا: یہاں او بمعنی واؤ یا بمعنی بل ہے لفظ جونۃ جیم کے ضمہ اور ہمزہ کے سکون کے ساتھ ہے کبھی اس ہمزہ کو واؤ سے بدل دیتے ہیں النہایۃ میں ہے یہ لفظ جیم کے ضمہ کے ساتھ ہے اس سے مراد وہ (ظرف) ہے جس میں خوشبو تیار کی اور رکھی جاتی ہے۔

امام نووی لکھتے ہیں اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو خاص شرف سے نوازا تھا کہ آنحضرت ﷺ کا جسم مبارک خوشبودار تھا۔

(علماء) فرماتے ہیں لیکن اس کے باوجود آنحضرت ﷺ اکثر اوقات خوشبو استعمال فرمایا کرتے تھے تاکہ آپ ﷺ ملائکہ سے ملنے وحی حاصل کرنے اور مسلمانوں کے ساتھ ہم نشینی کے وقت خوب معطر ہوں۔

الفصل الثانی:

حضور ﷺ کا سراپا مبارک

۵۷۹۰ : عَنْ عَلِيِّ بْنِ اَبِي طَالِبٍ قَالَ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَيْسَ بِالطَّوِيْلِ وَلَا بِالْقَصِيْرِ ضَخْمَ الرَّاْسِ وَاللِّحْيَةِ شَثْنَ الْكَفَّيْنِ وَالْقَدَمَيْنِ مُشْرَبًا حُمْرَةً ضَخْمَ الْكَرَادِيْسِ طَوِيْلَ الْمَسْرُبَةِ اِذَا مَشٰى تَكَفَّأَ تَكَفُّؤًا كَاَنَّمَا يَنْحَطُّ مِنْ صَبَبٍ لَمْ اَرَ قَبْلَهٗ وَلَا بَعْدَهٗ مِثْلَهٗ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ

(رواه الترمذی وقال هذا حدیث حسن صحیح)

اخرجه الترمذی ٥٥٨/٥ حدیث رقم ٣٦٣٧ واخرجه احمدفی المسند ٩٦/١۔

ترجمہ: ''حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے' فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نہ تو دراز قد تھے نہ پستہ قد (بلکہ میانہ قد تھے) بڑے سر اور گھنی داڑھی والے تھے' ہاتھوں کی ہتھیلیاں اور پاؤں پُر گوشت تھے' آپ ﷺ کا رنگ سفید بہ سرخی مائل تھا' ہڈیوں کے جوڑ موٹے تھے اور سینہ سے ناف تک بالوں کی ایک لمبی لکیر تھی جب چلتے تو آگے کی جانب جھکے ہوئے چلتے گویا آپ ﷺ بلندی سے اتر رہے ہوں۔ میں نے آپ ﷺ جیسا کوئی شخص نہ تو آپ ﷺ سے پہلے دیکھا اور نہ آپ ﷺ کے بعد دیکھا آپ پر اللہ کی رحمت اور سلامتی ہو''۔ اس روایت کو ترمذی نے نقل کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ حدیث

حسن صحیح ہے''۔

تشریح: فخم الرأس: بڑا سر آپ کی عظمت اور سرداری پر دلالت کرتا ہے۔

طبرانی نے حضرت عداء ابن خالد سے روایت نقل کی ہے: کان حسن السبلة: خوبصورت داڑھی والے تھے۔

ششن الکفین و القدمین: النہایہ میں ہے یعنی دونوں غلظ وقصر کی طرف مائل تھے۔

مشربا حمرۃ: آپ کا رنگ سفید مائل بسرخی تھا ''مشربا'' تخفیف کے ساتھ اسم مفعول کا صیغہ ہے' تشدید کے ساتھ پڑھنا بھی جائز ہے۔ النہایہ میں ہے ''اشراب'' کا مطلب ہے ایک رنگ کو دوسرے رنگ سے اس طرح ملا ہونا گویا ایک رنگ نے دوسرے رنگ کو پی لیا ہے کہا جاتا ہے: بیاض مشرب بحمرۃ۔ تخفیف کے ساتھ اور اگر تشدید کے ساتھ پڑھا جائے تو اس صورت میں تشدید تکثیر ومبالغہ کے لئے ہوگی۔

ضخم الکرادیس: یہ کردوس کی جمع ہے۔ جیسے کندھے' گھٹنے وغیرہ۔ بعض نے اس کا معنی رؤوس العظام بیان کیا ہے۔ طویل المسربۃ المسربہ میم کے فتحہ' سین کے سکون اور راء کے ضمہ کے ساتھ) بالوں کی وہ باریک لکیر مراد ہے جو سینہ سے ناف تک تھی۔

تکفأ فاء مشدد ہے اس کے بعد ہمزہ یا الف ہے یہ تلفظ ''تکفیا'' کے زیادہ مناسب ہے تکفیا: فاء مشددہ کے کسرہ کے ساتھ ہے اس کے بعد یا ہے یہ اصل میں فاء کے ضمہ اور ہمزہ کے ساتھ تکفوا ہے جب اس کی ماضی میں ابدال کر کے مخفف کر دیا گیا تو اس کے مصدر کو معتل کے ساتھ ملحق کر دیا اور ایک نسخے میں یہ کلمہ اپنی اصل کے مطابق تکفوا منقول ہے۔

شارحؒ کہتے ہیں تکفأ اور تکفؤ ادونوں ہمزہ کے ساتھ ہیں جس کا معنی ہے چلتے ہوئے کبھی دائیں بائیں جھک کے چلنا بعض حضرات کہتے ہیں کفأت الانا (مثال) سے یہ لفظ تکفاء ہے جس کا معنی قوت اور اعتماد ووقار کے ساتھ پاؤں زمین سے اٹھانے کے ہیں اس معنی کی تائید اگلی عبارت سے بھی ہوتی ہے کانما ینحطط اء کی تشدید کے ساتھ۔

من صبب من تعلیلیہ یا ظرفیہ کے معنی میں ہے اسی وجہ سے اس کا معنی بلند زمین سے نشیب میں اترنے سے کیا جاتا ہے مطلب یہ بنتا ہے کہ آپ مضبوط قدم اور تیز رفتاری کے ساتھ چلتے تھے۔

شرح السنۃ میں ہے الصبب الحدور سے مراد یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ قوت کے ساتھ پاؤں اٹھاتے اور رکھتے تھے متکبرین کی طرح پاؤں گھسیٹتے ہوئے نہیں چلتے تھے۔

لم أر قبلہ یہاں قبلہ سے آپ ﷺ کی موت سے قبل کا وقت مراد ہے کیونکہ حضرت علیؓ آپ سے بہت چھوٹے تھے آپ سے قبل کا زمانہ نہیں پایا و لا بعدہ یعنی آپ ﷺ کی وفات کے بعد۔ کبھی اس طرح کا کلام کنایہ ہوتا ہے اس بات پہ کہ آپ کا مثل دنیا میں کوئی نہ تھا کسی زمانے میں بھی۔ آپ کی اتنی خصوصیات ہیں کہ جن کے بیان سے ہم عاجز ہیں۔

۵۷۹۱: وَعَنْهُ كَانَ اِذْ وَصَفَ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ لَمْ يَكُنْ بِالطَّوِيْلِ الْمُمَّغِطِ وَلَا بِالْقَصِيْرِ الْمُتَرَدِّدِ وَكَانَ رَبْعَةً مِّنَ الْقَوْمِ وَلَمْ يَكُنْ بِالْجَعْدِ الْقَطَطِ وَلَا بِالسَّبْطِ كَانَ جَعْدًا رِجَلًا وَلَمْ يَكُنْ بِالْمُطَهَّمِ وَلَا بِالْمُكَلْثَمِ وَكَانَ بِالْوَجْهِ تَدْوِيْرٌ اَبْيَضُ مُشْرَبٌ اَدْعَجُ الْعَيْنَيْنِ اَهْدَبُ

الْاَشْفَارِ جَلِيْلُ الْمُشَاشِ وَالْكَتِدِ اَجْرَدُ ذُوْمَسْرُبَةٍ شَثْنُ الْكَفَّيْنِ وَالْقَدَمَيْنِ اِذَا مَشٰى يَتَقَلَّعُ كَاَنَّمَا يَمْشِيْ فِيْ صَبَبٍ وَاِذَا الْتَفَتَ الْتَفَتَ مَعًا بَيْنَ كَتِفَيْهِ خَاتَمُ النُّبُوَّةِ وَهُوَ خَاتِمُ النَّبِيِّيْنَ اَجْوَدُ النَّاسِ صَدْرًا وَاَصْدَقُ النَّاسِ لَهْجَةً وَاَلْيَنُهُمْ عَرِيْكَةً وَاَكْرَمُهُمْ عَشِيْرَةً مَنْ رَاٰهُ بَدِيْهَةً هَابَهٗ وَمَنْ خَالَطَهٗ مَعْرِفَةً اَحَبَّهٗ يَقُوْلُ نَاعِتُهٗ لَمْ اَرَقَبْلَهٗ وَلَا بَعْدَهٗ مِثْلَهٗ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ. (رواہ الترمذی)

اخرجه الترمذی فی السنن ۵۵۹/۵ حدیث رقم ۳۶۳۸۔

ترجمہ: ''حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اوصاف بیان کرتے تو کہتے: آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نہ تو بہت لمبے قد کے تھے اور نہ پستہ قد' بلکہ میانہ قد لوگوں میں تھے' آپ کے بال نہ تو بہت زیادہ گھنگھریالے تھے نہ بالکل سیدھے تھے بلکہ معمولی سا بل کھائے ہوئے' نہ منہ بالکل گول اور بھاری تھا اور نہ گال پھولے ہوئے تھے (بلکہ پورا چہرہ ستواں' درخسار یکساں و برابر تھے اور پیشانی بلند تھی) روئے مبارک کسی قدر گولائی لئے ہوئے تھا' رنگ سرخ وسفید تھا' آنکھیں سیاہ تھیں' پلکیں بڑی بڑی تھیں۔ جوڑوں کی ہڈیاں ابھری ہوئی اور مونڈھوں کا درمیانی حصہ (جہاں دونوں شانوں کی ہڈیاں آ کر ملتی ہیں) مضبوط اور پُر گوشت تھا' جسم مبارک پر بال نہیں تھے صرف ایک لکیر بالوں کی تھی جو سینہ سے ناف تک چلی گئی تھی' ہاتھ اور پاؤں بھرے ہوئے یعنی پر گوشت تھے' جب راستہ چلتے تو قوت کے ساتھ پاؤں اٹھاتے' گویا بلندی سے نیچے اتر رہے ہوں' جب دائیں یا بائیں متوجہ ہوتے تو پورے جسم کے ساتھ متوجہ ہوتے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے دونوں شانوں کے درمیان مہر نبوت تھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم خاتم النّبیین تھے' آپ صلی اللہ علیہ وسلم لوگوں میں سب سے زیادہ دل کے سخی اور زبان کے سب سے سچے تھے' طبیعت کے بہت نرم اور قبیلہ کے لحاظ سے سب سے معزز و مکرم انسان تھے' جو شخص آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو پہلی مرتبہ دیکھتا' وہ ہیبت زدہ ہو جاتا اور جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے میل جول رکھتا ہو وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے والہانہ محبت کرتا''۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ان صفات وخصوصیات کو بیان کرنے والے (حضرت علیؓ) کہتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم جیسا کوئی شخص نہ تو میں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے دیکھا اور نہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد دیکھا' اللہ کی رحمت اور سلامتی ہو آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر''۔ (ترمذی)

تشریح: الممغط: میم اول مضموم ہے میم ثانی مشدد مفتوح اور غین معجمہ پر کسرہ ہے۔ المغط سے اس کا معنی ہے ''المد''۔ ابن اثیرؒ نے جامع الاصول میں اس کو باب انفعال سے شمار کیا ہے۔ محدثین کو سہوا ہوا ہے کہ انہوں نے باب تفعیل سے اسم فاعل بتایا ہے۔ جوہریؒ نے ان محدثین کی پیروی کی ہے' پھر شیخ جزری نے جوہری کی اتباع کی ہے پھر (میرک نے اسی طرح نقل کیا ہے)۔

النہایۃ میں ہے کہ یہ کلمہ میم ثانی کی تشدید کے ساتھ انتہائی لمبائی کے معنی میں ہے۔ یہ **امغط النهار اذا امتد و مغط الحبل وغیرہ اذا مددته** سے ماخوذ ہے۔ اس کا اصل **منمغط** تھا نون مطاوعت کے لئے ہے نون کو میم سے بدل کر میم کو میم میں مدغم کر دیا عین مہملہ کے ساتھ بھی اسی معنی میں آتا ہے۔

ولا بالقصیر المتردد یعنی اتنے زیادہ پست قد نہ تھے کہ جسم کا ایک عضو دوسرے میں ضم ہو کر ایک دوسرے میں پیوست ہو جائیں **وکان ربعة من القوم** یہ جملہ معنی ماقبل کی تاکید ہے۔

ولم یکن بالجعد القطط و لا بالسبط اس کی تفصیل پہلے گزر چکی ہے۔ رجلا لفظ رجلا جیم کی کسرہ کے ساتھ ہے کبھی فتحہ بھی پڑھا جاتا ہے آپ ﷺ کے بال نہ تو بہت زیادہ گھونگھریالے تھے نہ بالکل سیدھے بلکہ خفیف سا بل کھاتے ہوئے تھے ولم یکن بالمطھم ہاء مشددہ مفتوحہ کے ساتھ یہ کلمہ اضداد میں سے ہے منہ مبارک نہ بالکل بھاری تھا نہ بالکل کمزور اور نہ گال پھولے ہوئے تھے بلکہ پورا چہرا استواں' رخسار یکساں و برابر تھے۔

و لا بالمکلثم : ثاء کے فتحہ کے ساتھ۔ یعنی چہرہ مبارک بالکل گول نہ تھا البتہ کسی قدر گولائی لئے ہوئے تھا اسی وجہ سے فرمایا و کان فی الوجہ تدویر یعنی کچھ گولائی تھی۔

ابیض مشرب: مشرب کا معنی مخلوط بالحمرۃ ادعج العینین آنکھیں سیاہ اور کشادہ تھیں (ذکرہ شارح) النہایہ میں ہے: الدعج و الدعجۃ کا معنی آنکھوں وغیرہ کا بہت زیادہ سیاہ ہونا مراد یہ ہے کہ آپ ﷺ کی آنکھوں کی پتلی نہایت سیاہ تھیں۔

اھدب الاشفار : ہمزہ کے فتحہ کے ساتھ شفر شین کے ضمہ کے ساتھ کی جمع ہے یعنی پلکیں بڑی بڑی تھیں یعنی پلکیں لمبی تھیں کیونکہ لمبی پلکوں والے شخص کو الاہدب کہا جاتا ہے بعض حضرات کہتے ہیں اس سے پلکوں کے وہ اطراف و کنارے مراد ہیں جہاں بال اگتے ہیں۔

النہایہ میں ہے کہ اس کا معنی ہے دراز پلکوں والا جلیل المشاش : جوڑوں یعنی کہنیوں' گھٹنوں کی ہڈیاں بڑی اور مظبوط تھیں جوہریؒ فرماتے ان ہڈیوں کو کہا جاتا ہے جن کو چبایا جاتا ہے۔ شارح فرماتے ہیں یعنی ہڈیوں کے سرے مونڈھوں کی ہڈیاں بڑی تھیں۔

و الکتد تائے فوقیہ کے فتحہ کے ساتھ ہے' کبھی کسرے کے ساتھ بھی پڑھا جاتا ہے۔ یہ مجرور ہے' اس کا عطف ''المشاش'' پر ہے۔ ایک شارح فرماتے ہیں اس سے مونڈھوں اور کمر کا درمیانی حصہ مراد ہے۔ صاحب النہایہ فرماتے ہیں اس سے دونوں مونڈھوں کے جوڑ مراد ہیں جس کو کاہل کہتے ہیں۔

اجرد : اس شخص کو کہا جاتا ہے جس کے جسم پر بالکل بال نہ ہوں لیکن آپ ﷺ ایسے نہیں تھے' ان کی کلائی اور پنڈلیوں جیسی جگہوں کے بال تھے اور اشعر ضد ہے اجرد کا اس سے مراد وہ شخص ہوتا ہے جس کے تمام بدن پر بال ہوں اس لئے حضرت علیؓ نے اپنے قول ''ذو مسربۃ'' سے اس کی وضاحت فرما دی کہ آپ ﷺ علی الاطلاق بالکل اجرد نہ تھے بلکہ کہیں کہیں بال تھے جس کی تفصیل اوپر گزر چکی ہے۔ ہندوستان وغیرہ کے حکماء مرد کے جسم پر بال نہ ہونے کو نہایت معیوب سمجھتے ہیں خصوصاً سینہ پر نہ ہونے کو شثن الکفین و القدمین ہاتھ اور پاؤں پر گوشت تھے جو آپ ﷺ کی شجاعت و عبادت میں قوی ہونے کی علامت تھی۔

یتقلع لام مشددہ کے ساتھ جب راستے پر چلتے تو ہمت اور قوت کے ساتھ (قدم مبارک) بہادروں کی طرح کشادہ اور علیحدہ کر کے اٹھاتے تھے عورتوں اور متکبرین کی چھوٹے چھوٹے قدم نہیں رکھتے نہ پاؤں گھسیٹتے۔ التفت معا: یعنی پورے جسم کے ساتھ متوجہ ہوتے اور مطلب یہ ہے کہ اگر آپ ﷺ کو دائیں یا بائیں کسی کی طرف التفات مقصود ہوتا تو بے اعتنائی برتنے والوں کی طرح نظریں چرا کر نہ دیکھتے اور نہ گردن گھما کر دیکھتے بلکہ پورے التفات کے ساتھ اس کی طرف متوجہ ہوتے۔

امام تورپشتیؒ فرماتے ہیں مراد یہ ہے کہ دائیں بائیں متوجہ ہونے کے لئے کم ظرف لوگوں کی طرح گردن نہ گھماتے بلکہ اپنا منہ ادھر کرکے پورے جسم کے ساتھ گھوم کر اس کی طرف دیکھتے اور کامل توجہ کا اظہار فرماتے۔

بين كتفيه خاتم النبوة یہ جملہ مبتدأ خبر ہیں۔

اجود: جیم کے فتحہ کے ساتھ اگر اس کو وسعت قلبی جودة بمعنى السعة والانفساخ سے ماخوذ سمجھا جائے تو اس صورت میں مطلب یہ ہوگا کہ آپ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم دل کے فراخ تھے' آپ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم امت کی طرف سے بدوؤں کی تکلیف پہنچانے والی حرکتوں سے ملول اور تنگ دل نہ ہوتے تھے اور اگر اجود' لفظ جود سے ماخوذ مانا جائے جس کے معنی عطاو بخشش کے ہیں تو پھر مطلب یہ ہوگا کہ آپ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کوئی بھی چیز دینے اور عطا کرنے میں ذرا سا بھی بخل نہیں کرتے تھے دنیاوی ساز وسامان' علوم وحقائق ومعارف آپ کے سینے میں بے دریغ تھے لوٹاتے تھے۔

لہٰذا آپ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم دل کے اعتبار سے سب سے زیادہ سخی تھے۔

لهجة: ہاء کے سکون اور فتحہ دونوں کے ساتھ منقول ہے۔ قاموس میں ہے۔ لهجة ہاء کے سکون اور حرکت کے ساتھ زبان مراد ہوتی ہے کبھی اس کو حرکت بھی دیتے ہیں صحاح میں قاموس جیسا اعراب منقول ہے جبکہ دیوان میں ہے اللهجه لام اور ہاء کے فتحہ کے ساتھ بمعنی لسان ہے آگے لکھتے ہیں یہ لغت فصیح ہے' ہاء کے سکون کے ساتھ لغت ضعیف ہے الفائق میں ہے لفظ لهجة ہاء کے فتحہ اور سکون دونوں سے منقول ہے البتہ فتحہ افصح ہے۔ ابوحاتم اصمعیؒ سے نقل کرتے ہیں لفظ اللهجة ہاء ساکنہ کے ساتھ ہے حرکت کے ساتھ مجھے معلوم نہیں یعنی میرے نزدیک صحیح نہیں ہے یا میری معلومات سے خارج ہے' عريكة عریکہ کا معنی طبیعت کے ہے النہایہ میں ہے فلان لين العريكه اس شخص کے متعلق کہا جاتا ہے جو نرم مزاج' فرمانبردار' نرم خو ہو۔

واكرمهم عشيرة: عین کے فتحہ' شین کے کسرہ اور یائے تحتیہ کے ساتھ' قبیلة مراد ہے اور ایک صحیح نسخہ میں کسرہ وسکون کے ساتھ بمعنی معاشرت ومصاحبت ہے طیبیؒ فرماتے ترمذی اور جامع الاصول میں بغیر یاء کے عشرة ہے' بمعنی صحبت کے منقول ہے جبکہ مصابیح میں یاء کے ساتھ عشيرة (بمعنی الصاحب ہے۔ لیکن اس میں اشکال یہ ہے کہ دونوں نسخے شمائل وغیرہ میں موجود ہیں جیسا کہ ہم ماقابل میں بیان کر چکے ہیں' واللہ اعلم۔

هابه: هيبة هاب الشيء سے ہے' مطلب یہ ہے جو شخص پہلے پہل آپ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کے سامنے آتا آپ کے وقار وہیبت سے خوف محسوس کرنے لگتا جو شخص آپ سے واقفیت رکھتا یعنی آپ کے ذاتی اوصاف وخصائل اور اخلاق واطوار سے واقفیت رکھتا وہ آپ سے والہانہ محبت کرتا۔

قوله: يقول ناعته......: آنحضرت صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کا حلیہ اور خصوصیات بیان کرنے والا اپنا عجز ظاہر کرتے ہوئے یہ کہتا ہے لم ار قبله یعنی آپ کی موت سے قبل ولا بعده مثله ترمذی ترمذی اور شمائل دونوں میں نقل کیا ہے۔

حضور صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کے پسینہ مبارک کی خوشبو کا بیان

۵۷۹۲ : وَعَنْ جَابِرٍ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَمْ يَسْلُكْ طَرِيقًا فَيَتْبَعُهُ اَحَدٌ اِلَّا عَرَفَ اَنَّهُ قَدْ

سَلَكَهُ مِنْ طِيْبِ عَرَقِهِ اَوْ قَالَ مِنْ رِيْحِ عَرَقِهِ (رواه الدارمی)

اخرجه الدارمی فی السنن ۱/۴۵ حدیث رقم ۶۶۔

ترجمه: ''حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جب کسی راہ سے گزر جاتے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد اس راستہ سے گزرنے والا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی جسم مبارک کی خوشبو سے یا (حضرت جابر رضی اللہ عنہ نے) یہ کہا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پسینہ مبارک کی خوشبو سے معلوم کر لیتا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس راستہ سے تشریف لے گئے ہیں''۔ (دارمی)

تشریح: مطلب یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جس راستے سے گزرتے اس راستے کی ہوا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے جسم مبارک یا پسینہ مبارک کی خوشبو سے معطر ہو جاتی اور پورا راستہ مہک اٹھتا تھا چنانچہ جو شخص آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد اس راستہ سے گزرتا اس مخصوص خوشبو سے آپ کے گزرنے کو معلوم کر لیتا تھا۔ **قوله** :أو قال من ريح عرقه :**عرقه** عین اور راء کے فتحہ کے ساتھ خوشبو۔ راوی کو شک ہے لیکن حاصل ایک ہی ہے کیونکہ دونوں سے مقصود یہ ہے کہ یہ مہکار آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات کی ہوتی تھی نہ کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بدن یا کپڑوں کو لگی ہوئی کسی خارجی خوشبو کی جیسا پہلے گزر چکا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خصوصیات میں سے تھا کہ خداوند کریم نے یہ خاص صفت ودیعت فرمائی تھی کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پسینہ سے خوشبو آتی تھی۔

ابن الملکؒ فرماتے ہیں علاوہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کسی نبی کو یہ صفت عطا نہیں ہوئی یہ صرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا خاصہ ہے۔

عرض مرتب: مرقات کے نسخہ دوم میں ''رواہ الترمذی'' ہے۔ اس کے علاوہ میں ''رواہ الدارمی'' ہے۔ مشکوٰۃ میں بجائے ترمذی کے دارمی کا نام ہے۔

رخِ زیبا کی تابانی کا عالم

۵۷۹۳ : وَعَنْ اَبِىْ عُبَيْدَةَ بْنِ مُحَمَّدِ بْنِ عَمَّارِ بْنِ يَاسِرٍ قَالَ قُلْتُ لِلرُّبَيِّعِ بِنْتِ مُعَوِّذِ بْنِ عَفْرَاءَ صِفِىْ لَنَا رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَتْ يَا بُنَيَّ لَوْ رَاَيْتَهٗ رَاَيْتَ الشَّمْسَ طَالِعَةً (رواه الدارمی)

اخرجه الدارمی ۱/۴۴ حدیث رقم ۶۰۔

ترجمه: ''محمد بن عمار بن یاسر کے صاحبزادے ابو عبیدہؒ سے مروی ہے کہ میں نے معوذ بن عفراء رضی اللہ عنہ کی صاحبزادی حضرت ربیعؓ (جلیل القدر صحابیہ) سے کہا کہ آپ ہمارے سامنے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا وصف بیان کریں تو انہوں نے کہا: میرے بیٹے! اگر تم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھ لیتے تو تمہیں یوں معلوم ہوتا کہ سورج دیکھ لیا ہے''۔ (دارمی)

تشریح: صفی ''وصف'' سے امر مخاطب کا صیغہ ہے۔

یابنی یائے مشددہ مکسورہ یا مفتوحہ کے ساتھ تصغیر شفقت اور رحمت کیلئے ہے۔ **قوله** :رأيت الشمس طالعة اس کے دو معنی بیان کئے گئے ہیں۔ ① گویا کہ سورج آپ کے چہرے پر طلوع ہو رہا ہے۔ ② اگر تم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھ لیتے تو یہی سمجھتے کہ چمکتا ہوا سورج دیکھا ہے یہ معنی زیادہ ظاہر معلوم ہوتا ہے۔

چہرے مبارک کی وہ تابانی کہ ماہتاب بھی شرمائے

۵۷۹۴ : وَعَنْ جَابِرِ بْنِ سَمُرَةَ قَالَ رَاَيْتُ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِي لَيْلَةٍ اِضْحِيَانٍ فَجَعَلْتُ اَنْظُرُ اِلٰى رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَاِلَى الْقَمَرِ وَعَلَيْهِ حُلَّةٌ حَمْرَاءُ فَاِذَا هُوَ اَحْسَنُ عِنْدِيْ مِنَ الْقَمَرِ

(رواه الترمذی و الدارمی)

اخرجه الترمذی فی السنن ۱۰۹/۵ حدیث رقم ۲۸۱۱، والدارمی فی السنن ٤٤/۱ حدیث رقم ۵۷۔

ترجمہ: ''حضرت جابر بن سمرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے' فرماتے ہیں کہ میں نے چاندنی رات میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا تو میں کبھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے جمال عالم تاب کی طرف نظر کرتا اور کبھی چاند کو دیکھتا' (کہ دونوں میں سے کس کا روپ بڑھ کر ہے) آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے جسم مبارک پر دھاری دار حلہ تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ میرے نزدیک آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا حسن و جمال چاند سے کہیں زیادہ تھا''۔ (ترمذی' دارمی)

تشریح: لیلۃ: (اس کی تنوین برائے تعظیم ہے) عظیمہ ۔

(اضحیان) یہ کلمہ ہمزہ اور حاء کے کسرہ اور یاء کی تخفیف کے ساتھ ہے دوسری روایات میں بھی اسی طرح ہے یہ کلمہ منصرف ہے اگر چہ اس میں الف اور نون دونوں زائد ہیں لیکن اس کی مونث فعلانة کے وزن پر ہے۔ الف نون زائد کی تاثیر کے لئے شرط یہ ہے کہ اس کی مؤنث فعلانہ کے وزن پر نہ ہو'' اس کا اصل معنی ظہور ہے شارح کہتے ہیں اس سے مراد ایسی رات ہے جس میں ابر نہ ہو آسمان بالکل شفاف ہو۔ اس کا مادہ الضحو ہے' کیا جاتا ہے لیلة اضحیان' اضحیانة' ضحیاء' ضحیانه اور الفائق میں لکھا ہوا ہے کہ اس سے چاندنی رات مراد ہے۔ جو اول تا آخر روشن ہو۔ اہل عرب کے ہاں افعلان کا وزن قلیل مستعمل ہے علیه حلة حمراء یہ جملہ حالیہ معترضہ ہے۔ فاذا هو احسن عندی۔ حقیقت یہ ہے میری نگاہ میں عقیدت کے لحاظ سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم زیادہ حسین و جمیل اور منور تھے شمائل میں ترمذی کے الفاظ یوں ہیں: فلهو عندی احسن من القمر۔ میرے نزدیک آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا حسن و جمال چاند سے کہیں زیادہ تھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات ہمہ جہت ظاہری حسن و جمال کے علاوہ بے مثال معنوی حسن و کمال کا بھی پرتو تھی۔

جیسے بعض ارباب عشق مجازی اپنی محبوبہ کو مخاطب کرتے ہوئے کہتے ہیں۔ یشابهك القمر۔ چہ نسبت عالم خاک را بعالم پاک۔ آپ چاند جیسی ہیں لیکن ان کا حسن آپ کے جمال جہاں آرا کی مانند کہاں۔

حضرت شیخ الحدیث رحمہ اللہ نے اس روایت کے ذیل میں ایک شعر ذکر کیا ہے دیر و حرم میں روشنی شمس و قمر سے ہو تو کیا۔ مجھ کو تو تم پسند ہو اپنی نظر کو کیا کروں۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی رفتار

۵۷۹۵: وَعَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ قَالَ مَا رَاَيْتُ شَيْئًا اَحْسَنَ مِنْ رَّسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَاَنَّ الشَّمْسَ تَجْرِیْ مِنْ وَّجْهِهٖ وَمَا رَاَيْتُ اَحَدًا اَسْرَعَ فِیْ مَشْيِهٖ مِنْ رَّسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَاَنَّمَا الْاَرْضُ تُطْوٰى لَهٗ اِنَّا لَنَجْهَدُ اَنْفُسَنَا وَاِنَّهٗ لَغَيْرُ مُكْتَرِثٍ (رواه الترمذی)

اخرجه الترمذی فی السنن ۵/۵۶۳ حديث رقم ۳۶۴۸ واخرجه احمدفی المسند ۲/۳۵۰۔

ترجمہ: ''حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے' فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ حسین وجمیل کوئی چیز نہیں دیکھی' ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آفتاب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے چہرۂ مبارک میں جلوہ ریز ہے اور میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ تیز رو کسی کو نہیں دیکھا (جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم چلتے تو) ایسا لگتا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے کی زمین لپٹی جا رہی ہے' ہم سخت جدوجہد اور کوشش کرتے لیکن آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی بے نیاز چال چلتے تھے''۔(ترمذی)

تشریح: طیبیؒ فرماتے ہیں کہ حضرت ابوہریرہؓ نے آفتاب کے اپنے مدار میں چلنے کو تشبیہ دی ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے چہرۂ انور پر جلوہ فگن حسن سے اسی معنی میں شاعر کا یہ قول ہے۔

یزیدك وجهه حسنا ☆ اذا ما زدته نظرا

''آپ اس کو زیادہ دیکھیں گے اتنا زیادہ اس کا چہرہ آپ کو حسین معلوم ہوگا۔''

اس میں عکس تشبیہ ہے' جس سے مبالغہ مقصود ہے۔

قولہ: ما رأيت احد اسن فی اسرع فی مشيه۔ من رسول الله ﷺ۔ باری تعالیٰ کے ارشاد: ﴿واقصد فی مشيك﴾ [لقمان: ۱۹] اپنی چال میں میانہ روی اختیار کر۔ اس پر عمل کرتے ہوئے وقار سکونت اور میانہ روی کے ساتھ تیز تیز چلتے۔

كأنما الارض تطوى له۔ صیغہ مجہول کے ساتھ ہے گویا کہ آپ کے سامنے زمین لپٹی جا رہی ہے یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا معجزہ تھا جو آپ کی سہولت کے لئے عطا ہوا تھا۔

و انا یا استینا فیہ بیانیہ ہے۔

انفسنا نون کے ضمہ اور ہاء کے کسرہ کے ساتھ ہے اور ایک نسخہ میں نون اور ہاء دونوں کے فتحہ کے ساتھ ہے اس صورت میں الاجهاد یا الجهد سے ماخوذ ہوگا۔

ہم سخت جدوجہد کر کے اپنی رفتار بڑھاتے۔

امام تورپشتیؒ فرماتے ہیں نون پر فتحہ اور ضمہ دونوں پڑھنا جائز ہے عرب کہتے ہیں: جهد دابته و اجهدها طاقت سے زیادہ بوجھ ڈالا جائے۔ یہاں مطلب یہ ہے کہ جب ہم لوگ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے راستہ چلتے تو اپنی طاقت سے بڑھ کر رفتار کو بڑھاتے کہ آپ تک پہنچنے کی کوشش کرتے۔

وانه لغير مكترث: راء کے کسرہ کے ساتھ یہاں غیر مکترث غیر مبال کے معنی میں ہے مبال بہ کا معنی اپنے کو تھکا نا کہا جاتا ہے: **اكترث بالأمر اذا بالى به**۔ (كذا ذكره شارح) النہایۃ میں لکھا ہوا ہے کہ مبال کا لفظ منفی معنی میں ہی استعمال ہوتا ہے مثبت معنی میں اس کا استعمال شاذ ہے۔

حضور ﷺ کی پنڈلیوں اور سرمگیں آنکھوں کا بیان

۵۷۹۶ : وَعَنْ جَابِرِ بْنِ سَمُرَةَ قَالَ كَانَ فِي سَاقَيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ حُمُوْشَةٌ وَكَانَ لَا يَضْحَكُ اِلَّا تَبَسُّمًا وَكُنْتُ اِذَا نَظَرْتُ اِلَيْهِ قُلْتُ اَكْحَلُ الْعَيْنَيْنِ وَلَيْسَ بِاَكْحَلَ.

(رواه الترمذی)

اخرجه الترمذی فی السنن ٥/٦٠٢ حديث رقم ٣٦٤٥ واحمد فی المسند ٥/٩٧

ترجمہ: ''حضرت جابر بن سمرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کی پنڈلیاں سبک و نازک تھیں اور آپ ﷺ عام طور پر مسکرایا کرتے تھے (کھلکھلا کر نہ ہنستے تھے) اور میں جب آپ ﷺ کی طرف دیکھتا تو (دل میں) کہتا کہ آپ ﷺ نے سرمہ لگا رکھا ہے حالانکہ آپ ﷺ سرمہ لگائے نہ ہوتے تھے''۔ (بلکہ آپ ﷺ کی آنکھیں سرمہ لگائے ہوئے سرمگیں لگتی تھیں)۔ (ترمذی)

تشریح: **قوله : كان فی ساقي رسول الله ﷺ حموشة**۔

حموشة: حاء مہملہ اور میم کے ضمہ کے ساتھ یعنی دوسرے اعضاء کی نیابت سے پنڈلیوں میں بھی رقت و لطافت تھی۔ طرح نہایت خوبصورت تھیں۔ **قوله : وكان لا يضحك** عام طور پر ہنسا نہیں کرتے تبسم ضحک کا مقدمہ ہوتا ہے یہ استثنیٰ متصل اور منقطع دونوں بن سکتے ہیں۔ امام طیبیؒ لکھتے ہیں تبسم کو ضحک میں شمار کرنے کے بعد مستثنیٰ کیا ہے اس لئے کہ تبسم ضحک کے لئے ایسا ہے جیسے نیند کے لئے اونگھ اور اسی سے یہ آیت ہے: ﴿فتبسم ضاحكا من قولها﴾ [النمل: ١٩] **ای شارعا فی الضحك** (**وكنت**) صیغہ متکلم کے ساتھ اگر صیغہ خطاب کے ساتھ ہوتا تو **قوله : كان لا يضحك الا تبسما** کے الفاظ کے ہی ساتھ نقل کیا ہے۔ (امام احمد اور حاکم)

الفصل الثالث:

حضور ﷺ کے دندان مبارک کا ذکر

۵۷۹۷ : وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَفْلَجَ الثَّنِيَّتَيْنِ اِذَا تَكَلَّمَ رُئِيَ كَالنُّوْرِ يَخْرُجُ مِنْ بَيْنِ ثَنَايَاهُ. (رواه الدارمی)

اخرجه الدارمی فی السنن ١/٤٤ حديث رقم ٥٨ والبغوی فی شرح السنة ١٣/٢٢٣ حديث رقم ٣٦٤٤۔

ترجمہ: ''حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے' فرماتے ہیں کہ آپ ﷺ کے اگلے دو دانتوں میں کچھ کشادگی تھی' جب آپ ﷺ گفتگو فرماتے تو ان دونوں دانتوں کے درمیان سے نور سا نکلتا ہوا محسوس ہوتا۔ (دارمی)

تشریح: قوله : افلج الثنيتين ۔ اور شمائل کے ایک نسخہ میں افلج الثنایا کے الفاظ ہیں۔ النہایۃ میں لکھا ہوا ہے کہ الفلج حرکت کے ساتھ' اس سے وہ خلا مراد ہے جو ثنایا اور رباعیات کے بیچ میں ہو اور الفرق سے وہ خلاء مراد ہوتا ہے جو صرف سامنے کے اوپر اور نیچے دو دو دانتوں کے ہو۔ یہاں حدیث میں افلج الفرق کی جگہ استعمال ہوا ہے۔ طیبیؒ نے بھی ایسا ہی ذکر کیا ہے قاموس میں جو کچھ لکھا ہوا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ لفظ افلج اور الفرق میں کوئی فرق نہیں افلج تینوں متحرک ہوں تو اس سے پاؤں اور دانتوں میں پائے جانے والا خلاء مراد ہوتا ہے اس لئے اس کے ساتھ لفظ اسنان کا ذکر ضروری ہے تاکہ فرق واضح ہو جائے۔ تکلم: صیغہ مجہول کے ساتھ ہے۔

یخرج: یہ جملہ حال ہے۔ ای حال کو نه یظهر ۔ اس نور سے آپ ﷺ کا نورانی کلام یا اور کوئی زائد چیز مراد ہے جس کو ذوق وجدان ہی محسوس کر سکتا ہے دونوں کو جمع بھی کیا جا سکتا ہے چنانچہ امام احمد نے حضرت ابوالدرداءؓ سے نقل کیا ہے کان لا یحدث حدیثا الا تبسم کہ آنحضرت ﷺ مسکراتے ہوئے کلام فرمایا کرتے تھے اور عارف ابن الفارض نے شاید اسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا ہے۔

؎ علیك بها صرفا فان شئت مزجها ☆ فعدلك عن ظلم الحبیب هو الظلم

طیبیؒ لکھتے ہیں کہ یخرج کی ضمیر مستتر میں دو احتمال ہیں: ① کلام کے انداز کی طرف راجع ہے۔ ② یا النور کی طرف راجع ہے کاف زائد ہے۔ یہ تشبیہ ہے باعتبار بیان ظہور کے۔ جیسے ''حجت ظاہر'' کو نور کہا جاتا ہے۔ دوسرے احتمال کے مطابق یہ تشبیہ نہیں ہوگی بلکہ جیسا کہ آپ کے اس قول میں ہے: مثلك سجود۔ پہلی صورت میں آپ کی معجزاتی صفت بنے گی امام ترمذی نے بھی شمائل میں ان ہی الفاظ کے ساتھ نقل کیا ہے۔

حضور ﷺ کی خوش دِلی چہرے پر بھی نمایاں ہوتی تھی

۵۷۹۸ : وَعَنْ كَعْبِ بْنِ مَالِكٍ قَالَ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذَا سُرَّ اسْتَنَارَ وَجْهُهُ حَتّٰى كَانَ وَجْهُهُ قِطْعَةُ قَمَرٍ وَكُنَّا نَعْرِفُ ذٰلِكَ (متفق علیه)

اخرجه البخاری ۷/......حدیث رقم ۴۴۱۸ ومسلم فی صحیحه ۴/۲۱۲۰ حدیث رقم ۵۳/۲۷۶۹، واحمد فی المسند ۳/۴۵۹۔

ترجمہ: ''حضرت کعب بن مالک رضی اللہ عنہ سے مروی ہے' فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ جب خوش ہوتے تو آپ ﷺ کا چہرۂ مبارک کھل اٹھتا تھا اور یوں معلوم ہوتا کہ آپ ﷺ کا چہرۂ مبارک چاند کا ٹکڑا ہے اور اس چیز سے ہم (آپ ﷺ کی اندورنی کیفیت پہچان لیتے تھے''۔ (بخاری و مسلم)

تشریح: سر: سین کے ضمہ کے ساتھ۔

قطعة قمر: شاید یہ اضافت بیانیہ ہو یا بمعنی "من" ہے **وکنا نعرف ذالك** یعنی آنحضرت ﷺ کے چہرہ مبارک کی اس تروتازگی اور چمک اتنی نمایاں ہوتی تھی کہ تنہا میں نے نہیں بلکہ سب ہی لوگ آپ کی اندرونی مسرت کو پہچان لیتے تھے۔

طیبیؒ فرماتے ہیں کہ یہ جملہ حال موکدہ ہے۔ آپ ﷺ کی یہ مسرت اتنی واضح ہوتی تھی کہ ہر صاحب بصیرت و بصارت اس کو پہچان لیتا تھا۔

حضور ﷺ کی خصوصیات وصفات کا تورات میں ذکر

۵۷۹۹ : وَعَنْ اَنَسٍ اَنَّ غُلَامًا يَهُوْدِيًّا كَانَ يَخْدُمُ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَمَرِضَ فَاَتَاهُ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَعُوْدُهٗ فَوَجَدَ اَبَاهُ عِنْدَ رَاْسِهٖ يَقْرَءُ التَّوْرٰةَ فَقَالَ لَهٗ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَا يَهُوْدِيُّ اَنْشُدُكَ بِاللّٰهِ الَّذِيْ اَنْزَلَ التَّوْرَاةَ عَلٰى مُوْسٰى هَلْ تَجِدُ فِي التَّوْرَاةِ نَعْتِيْ وَصِفَتِيْ وَمَخْرَجِيْ قَالَ لَا قَالَ الْفَتٰى بَلٰى وَاللّٰهِ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اِنَّا نَجِدُ لَكَ فِي التَّوْرَاةِ نَعْتَكَ وَصِفَتَكَ وَمَخْرَجَكَ وَاِنِّيْ اَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَنَّكَ رَسُوْلُ اللّٰهِ فَقَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لِاَصْحَابِهٖ اَقِيْمُوْا هٰذَا مِنْ عِنْدِ رَاْسِهٖ وَلُوْا اَخَاكُمْ (رواه البيهقى فى دلائل النبوة)

البيهقى فى دلائل النبوة ٢٧٢/٦۔

"حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ایک یہودی لڑکا نبی کریم ﷺ کی خدمت کیا کرتا تھا' وہ بیمار ہوگیا تو نبی کریم ﷺ اس کی عیادت کے لئے اُس کے گھر تشریف لے گئے' آپ ﷺ نے دیکھا کہ اس کا باپ اس کے سرہانے بیٹھا ہوا تورات پڑھ رہا ہے (جیسے مسلمانوں میں نزع کے وقت سورۂ یٰسین پڑھی جاتی ہے) رسول اللہ ﷺ نے (یہ دیکھ کر) اس سے پوچھا کہ اے یہودی! میں تجھے اس خدا کی قسم دے کر پوچھتا ہوں جس نے موسیٰ علیہ السلام پر تورات نازل کی (سچ سچ بتانا) کیا تم اس تورات میں میری تعریف وتوصیف اور میرے (وطن سے) نکلنے کا ذکر پاتے ہو؟ اس یہودی نے جواب دیا کہ نہیں! لیکن وہ لڑکا بولا: ہاں یا رسول اللہ ﷺ! خدا کی قسم ہم تورات میں آپ ﷺ کی تعریف وتوصیف اور آپ کے نکلنے کا ذکر پاتے ہیں اور میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور بلاشبہ آپ اللہ کے رسول ہیں"۔ رسول اللہ ﷺ نے اپنے صحابہؓ سے فرمایا: اس کے باپ کو اس کے سرہانے سے اٹھا دو اور تم اپنے اس (دینی) بھائی کے والی بنو (یعنی اگر اس لڑکے کا انتقال ہو جائے تو پھر اس کے تجہیز وتکفین وغیرہ کے امور تم انجام دو)"۔ اس روایت کو بیہقی نے دلائل النبوۃ میں ذکر کیا ہے۔

يخدم: دال کو ضمہ اور کسرہ دونوں کے ساتھ پڑھا جا سکتا ہے۔ **فاتاه النبى يعوده** اس کی عیادت یا اسلام لانے کی امید سے اس کے گھر تشریف لے گئے۔

انشدك: شین کے ضمہ کے ساتھ۔ **نعتى:** یعنی میری ذاتی وخلقی اعتبار سے۔

صفتی باعتبار افعال واحوال کے۔

ومخرجی یعنی وطن مکہ میں ولادت یا بعثت کا یا ہجرت کے زمانے کے متعلق کچھ ذکر پاتے ہوئے۔

ووصفك: اور ایک صحیح نسخہ میں بجائے ووصفك کے وصفتك منقول ہے هذا۔ اس کا مشار الیہ لفظ اب ہے یعنی اس کے باپ کو اس کے سرانے سے ہٹادو۔ ولوا اخاکم: اس جملہ میں واؤ عاطفہ ہے' اس جملہ کا اقیموا پر عطف ہے "ولی الامر" سے امر مخاطب کا صیغہ ہے۔ اور ولو سے صحابہ کرام کو خطاب ہے کہ اگر اس لڑکے کا انتقال ہو جائے تو تم ہی لوگ اپنے اس بھائی کے ولی بن کر تجہیز و تکفین وغیرہ کے امور سرانجام دو۔

محدث سیّد جمال الدین فرماتے ہیں ہمارے زمانے کے کچھ محدثین نے کلمہ "لو" کو شرطیہ بتایا ہے لیکن یہ روایۃ ودرایۃ تصحیف وتحریف ہے۔

آنحضرت ﷺ رحمتِ خداوندی

۵۸۰۰ : وَعَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَنَّهٗ قَالَ اِنَّمَا اَنَا رَحْمَةٌ مُهْدَاةٌ۔

(رواه الدارمي والبيهقي في شعب الايمان)

اخرجه الدارمي في السنن ۲۱/۱ حديث رقم ۱۵ والبيهقي في شعب الايمان ۶۴/۲ حديث رقم ۱۴۴۶۔

ترجمہ: "حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نبی کریم ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: "کہ میں اللہ تعالیٰ کی بھیجی ہوئی رحمت ہوں"۔ اس روایت کو دارمی نے اور شعب الایمان میں بیہقی نے نقل کیا ہے"۔

تشریح: مهداة: میم کے ضمہ کے ساتھ یعنی عین رحمت اللعالمین ہوں۔ اللہ نے تمام لوگوں کی طرف مجھے بھیجا ہے۔ پس جو آپ ﷺ کے دین کو قبول کرے گا وہ کامیاب وکامران ہوگا اور جو اس کو قبول نہ کرے وہ ذلیل وخوار ہوگا جیسے باری تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿وما ارسلناك الا رحمة للعالمين﴾ [الأنبياء : ۱۰۷] حاکم اور ابن سعد نے بھی ابو صالح سے مرسلا اسی طرح نقل کیا ہے جبکہ امام حاکم نے اپنی کتاب مستدرک میں مرفوعا ابو ہریرہؓ سے نقل کیا ہے۔

بَابٌ فِیْ اَخْلَاقِهٖ وَشَمَائِلِهٖ صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق وعادات کا بیان

النہایہ میں ہے خلق (لام کے ضمہ اور سکون کے ساتھ) ہے جس کے معنی دین' طبع و باطنی وصف کے ہیں اس کی حقیقت یہ ہے کہ انسان میں جس طرح ظاہری خصوصیات ہوتی ہیں باطن کے اعتبار سے بھی مختلف اوصاف ہوتے ہیں اور ہر انسان میں ظاہر و باطن کے اعتبار سے اچھی اور بری ہر دو صفات موجود ہوتی ہیں اخروی اعتبار سے ثواب وعقاب کا تعلق باطنی اوصاف سے زیادہ ہوتا ہے۔ شمائل شمال کی جمع ہے جس کے معنی عادت اور خو کے ہیں۔ نہ کہ بمعنی ''یسار'' اسی سے یہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿يَتَفَيَّؤُا ظِلٰلُهٗ عَنِ الْيَمِيْنِ وَالشَّمَآئِلِ﴾ (النحل: ٤٨) یہ شین کے فتحہ اور ہمزہ کے ساتھ اس باب سے مناسبت نہیں رکھتا۔

الفصل الاوّل:

خادم کے ساتھ حسن خلق کا بیان

۵۸۰۱ : عَنْ اَنَسٍ قَالَ خَدَمْتُ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَشَرَ سِنِيْنَ فَمَا قَالَ لِيْ اُفٍّ وَلَا لِمَا صَنَعْتَ وَلَا اَلَّا صَنَعْتَ (متفق علیه)

اخرجه البخاری فی صحیحه ٤٥٦/١٠حدیث رقم ٦٠٣٨ومسلم فی صحیحه ١٨٠٤/٤حدیث رقم ٢٣٠٩/٥١ واخرجه ابو داؤد ١٣٣/٥حدیث رقم ٤٧٧٤ والترمذی ٣٢٢/٤حدیث رقم ٢٠١٥ والدارمی فی السنن ٤٥/١حدیث رقم ٨٢۔

ترجمہ: ''حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے' فرماتے ہیں کہ میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی دس سال خدمت کی (اس پورے عرصہ میں) آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی مجھے اف بھی نہیں کہا اور نہ کبھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فرمایا کہ تم نے یہ کام کیوں کیا اور یہ کام تم نے کیوں نہیں کیا''۔ (بخاری ومسلم)

تشریح: عشر سنین :اور مسلم کی روایت میں نو سال کا ذکر ہے۔اف ہمزہ کے پیش' فاء کی تشدید اور کسرہ کے ساتھ ہے اور ایک نسخہ میں فاء کے زبر کے ساتھ اور ایک نسخہ میں تنوین وکسرہ کے ساتھ ہے۔

تینوں قراءت متواترہ ہیں۔ امام نوویؒ شرح مسلم میں لکھتے ہیں کہ اس میں دس لغات ہیں۔ نمبر۱ تا ۳۔ فاء کے ضمہ فتحہ اور کسرہ کے ساتھ بغیر تنوین کے۔ (۴-۶) اور تینوں تنوین کے ساتھ۔ (۷) ہمزہ کے ضمہ اور فاء کے سکون کے ساتھ۔ (۸) ہمزہ کے کسرہ اور ف کے فتحہ کے ساتھ۔ (۹-۱۰) اُفی' اُفہ دونوں میں ہمزہ کے ضمہ کے ساتھ۔ شارحؒ فرماتے ہیں یہ کلمہ تنگی و ملال کے لئے ہوتا ہے کہا جاتا ہے **ماقال لی مافیہ تبرم و ملال** یعنی کبھی بھی ایسی بات نہیں کہی کہ جس سے مجھے تکلیف و ملال ہوتا و **لا الاصنعت**؟ تم نے یہ کام ہے میری مرضی کے بغیر کیوں کیا و **لا الا** لام کی تشدید کے ساتھ **ھلا** کے معنی میں (کیوں نہیں کیا کے معنی میں ہے) مطلب یہ ہے کہ کیسے ہوئے کام میں کبھی عیب نہ نکالتے اور نہ ایسا ہوتا کہ آنحضرت ﷺ نے مجھ سے کسی کام کے لئے کہا ہو اور میں وہ کام نہ کرسکا ہوں تو آپ نے جواب طلبی فرمائی ہو۔

طیبیؒ فرماتے ہیں لفظ اف اسم فعل ہے۔ بمعنی اتضجر واکر مستعمل ہے' اور حرف تخصیص ماضی کے ساتھ آئے تو ندامت کا فائدہ دیتا ہے جیسا کہ مضارع پر داخل ہو تو تحریض کا فائدہ دیتا ہے۔

واضح رہے حضرت انس رضی اللہ عنہ کے ساتھ آنحضرت ﷺ کا یہ ترک اعتراض کا معاملہ ان امور میں ہوتا تھا جن کا تعلق آنحضرت ﷺ کے کاموں کی خلاف ورزی سے تھا نہ کہ دینی معاملات وامور سے کیونکہ کسی دینی کام کے کرنے نہ کرنے کے اعتبار سے چشم پوشی کرنا روا نہیں ہے۔

اس حدیث سے خود حضرت انسؓ کی خوبی بھی ظاہر ہوتی ہے کہ انہوں نے بھی ایسا موقع کبھی آنے نہ دیا کہ آنحضرت ﷺ کو کوئی شکایت پیدا ہو۔ امام ترمذیؒ نے شمائل میں لفظ ''اف'' کے بعد یہ الفاظ روایت کیے ہیں: **قط وما قال لشئ صنعتہ لم صنعتہ ولا لشئ ترکتہ لم ترکتہ۔**

۵۸۰۲: وَعَنْهُ قَالَ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مِنْ اَحْسَنِ النَّاسِ خُلُقًا فَاَرْسَلَنِيْ يَوْمًا لِحَاجَةٍ فَقُلْتُ وَاللّٰهِ لَا اَذْهَبُ وَفِيْ نَفْسِيْ اَنْ اَذْهَبَ لِمَا اَمَرَنِيْ بِهٖ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَخَرَجْتُ حَتّٰى اَمُرَّ عَلٰى صِبْيَانٍ وَهُمْ يَلْعَبُوْنَ فِي السُّوْقِ فَاِذَا رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَدْ قَبَضَ بِقَفَايَ مِنْ وَّرَائِيْ قَالَ فَنَظَرْتُ اِلَيْهِ وَهُوَ يَضْحَكُ فَقَالَ يَا اُنَيْسُ ذَهَبْتَ حَيْثُ اَمَرْتُكَ قُلْتُ نَعَمْ اَنَا اَذْهَبُ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ. (رواہ مسلم)

اخرجه مسلم فى صحيحه ١٨٠٥/٤ حديث رقم (٥٤-٢٣١٠) وخرجه ابو داؤد فى ١٣٢/٥ حديث رقم ٤٧٧٣۔

ترجمہ: ''حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے' فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ بہترین اخلاق کے حامل تھے۔ ایک دن آپ ﷺ نے مجھے کسی کام سے کہیں بھیجا' میں نے کہا اللہ کی قسم میں نہیں جاؤں گا' لیکن میرے دل میں یہی تھا کہ رسول اللہ ﷺ نے جو حکم دیا ہے اس کی تعمیل کے لئے ضرور جاؤں گا' چنانچہ میں چل پڑا' بازار سے گزرا تو ایک جگہ بچے کھیل رہے تھے' میں وہاں ٹھہر گیا' اچانک رسول اللہ ﷺ وہاں آ گئے اور پیچھے سے میری گدی پکڑ لی۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں' میں نے مڑ کر آپ ﷺ کی طرف دیکھا تو آپ مسکرا رہے تھے۔ فرمانے لگے: ارے انیس تو وہاں جا رہا ہے' جہاں [illegible]

نے تجھے بھیجا تھا؟ میں نے عرض کیا ہاں یا رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم)! میں (اب) جا رہا ہوں"۔ (مسلم)

تشریح: خلقا خاء اور لام کے پیش کے ساتھ۔

حتی امر: منصوب ہے اور ایک نسخہ میں مرفوع ہے باری تعالیٰ کے اس فرمان: ﴿حتی یقول الرسول﴾ [البقرۃ: ۲۱۴] کی طرح طیبیؒ فرماتے ہیں یہ ماضی کے حال کی حکایت ہے ممکن ہے یہاں حتی ناصبہ ہو بمعنی کئی۔

میں (ملا علی قاریؒ) کہتا ہوں اگر ناصبہ بنائیں تو معنی میں غایت نہیں کیونکہ عبارت یوں بنے گی انی خرجت اذھب الی ان مررت فی طریقی میں نکلا اور میرا گزر میرے راستے سے ہوا۔ بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ حضرت انسؓ کھیلنے یا تماشہ دیکھنے کی غرض سے کھڑے ہوئے تھے۔

بقفا: قصر کے ساتھ ہے: من ورائی: یہ تاکید کے لئے ہے یا قبض کے متعلق ہے:

وقال یا انیس: انس کی تصغیر ہے اور یہ تصغیر برائے اظہار شفقت ورحمت سے ہے:

قلت نعم: نعم اس لئے فرمایا کہ آپ چلنے لگے ہوں گے حضرت انس کا انا اذھب کہنا اس کام کی تکمیل کی طرف اشارہ ہے۔ شارح فرماتے ہیں لفظ نعم اس لئے استعمال فرمایا کیونکہ جس کی امید ہوتی ہے گویا وہ موجود ہوتا ہے اس بناء پر کہ آپ نے اس جانے کا پختہ عزم کر رکھا تھا۔ یا یہ کہ سوال میں "ذھبت" بمعنی مضارع ہے۔ یا کہ حضرت انس رضی اللہ عنہ اب تک اس کام کے لئے گئے نہیں تھے آپ نے پوچھا کہ کیا انس اس کام پر جا رہے ہو؟ انسؓ نے یقیناً جانا تھا اس لئے جواب میں نعم فرمایا۔ طیبیؒ نے صرف معنی اول پر اکتفا کیا ہے پھر آگے لکھتے ہیں واللہ لا اذھب اور ان جیسے الفاظ اس زمانے کے ہیں جب وہ صبی غیر مکلف تھے۔ اسی وجہ سے امام جزریؒ فرماتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت انسؓ کو تادیب نہیں فرمائی بلکہ دل لگی کا معاملہ فرمایا اور ان کو گدی سے پکڑ لیا۔

دیہاتی کے ساتھ حسن سلوک

۵۸۰۳ : وَعَنْهُ قَالَ كُنْتُ اَمْشِيْ مَعَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بُرْدٌ نَجْرَانِيٌّ غَلِيْظُ الْحَاشِيَةِ فَاَدْرَكَهٗ اَعْرَابِيٌّ فَجَبَذَهٗ بِرِدَائِهٖ جَبْذَةً شَدِيْدَةً وَرَجَعَ نَبِيُّ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِي نَحْرِ الْاَعْرَابِيِّ حَتّٰى نَظَرْتُ اِلٰى صَفْحَةِ عَاتِقِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَدْ اَثَّرَتْ بِهَا حَاشِيَةُ الْبُرْدِ مِنْ شِدَّةِ جَبْذَتِهٖ ثُمَّ قَالَ يَا مُحَمَّدُ مُرْلِيْ مِنْ مَّالِ اللّٰهِ الَّذِيْ عِنْدَكَ فَالْتَفَتَ اِلَيْهِ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ثُمَّ ضَحِكَ ثُمَّ اَمَرَلَهٗ بِعَطَاءٍ۔ (متفق علیه)

اخرجه البخاری ۲۵۱/۶ حدیث رقم ۳۱۴۹ ومسلم فی صحیحه ۷۳۰/۲ حدیث رقم (۱۲۸-۱۰۵۷) واخرجه ابن ماجه فی السنن ۱۱۷۷/۲ حدیث رقم ۳۵۵۳ واحمد فی المسند ۲۲۳/۴۔

ترجمہ: (انسؓ) ... میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ چل رہا تھا' اس

وقت آپ ﷺ کے جسم پر (یمن کے شہر) نجران کی بنی ہوئی (دھاری دار) چادر تھی، جس کے کنارے دبیز اور موٹے تھے (اچانک راستہ میں) ایک بدو آنحضرت ﷺ کو مل گیا اور اس نے (اپنی طرف متوجہ کرنے کے لئے) آپ ﷺ کی چادر اتنے زور سے کھینچی کہ نبی کریمؐ اس دیہاتی کے سینہ کے قریب پہنچ گئے۔ میں نے نظر اٹھا کر دیکھا تو اس دیہاتی کے اس قدر سختی سے چادر کھینچنے سے رسول اللہ ﷺ کی گردن مبارک پر چادر کے کنارے کی رگڑ کا نشان پڑ گیا' پھر اس بدو نے کہا اے محمد (ﷺ) اللہ کا جو مال تمہارے پاس ہے اس میں سے کچھ مجھ کو دلواؤ۔ آنحضرت ﷺ نے پہلے تو (حیرت کے ساتھ) اس کی طرف دیکھا پھر (ازراہ تلطف) مسکرائے پھر اسے کچھ دینے کا حکم صادر فرمایا''۔ (بخاری ومسلم)

تشریح: برد: نہایہ میں اس کا معنی دھاری دار لکھا ہے۔

نجرانیی نون کے فتح اور جیم کے سکون کے ساتھ یمن کے شہر نجران کی طرف منسوب ہے شارح نے تو اسی طرح ذکر کیا ہے اور نہایہ میں لکھا ہوا ہے حجاز' شام اور یمن کے درمیان ایک مشہور جگہ کا نام ہے۔

غلیظ الحاشیة: مراد کنارے ہیں **الجبذ**: جذب ایک لغت ہے اور بعض کا کہنا ہے کہ یہ اس سے مقلوب ہے۔

قوله :ورجع نبی الله فی نحر الاعرابی:

امام طیبیؒ فرماتے یعنی آنحضرت ﷺ مکمل طور پر اعراب کے سامنے چلے گئے اور حدیث **اذا التفت التفت معاً** کا مطلب بھی یہی بنتا ہے کہ آنحضرت ﷺ پورے جسم اور توجہ کے ساتھ دیکھتے اور متوجہ ہوتے یہ حدیث لوگوں کی بے مروتی اور بداخلاقی سے آپ کے تحمل پر اثر نہ پڑنے کی دلیل ہے۔ **عاتق** گردن کا وہ حصہ جہاں چادر رکھی جاتی ہے۔ **قد اثرت بها حاشية......**

جبذته: اللہ تعالیٰ نے سچ فرمایا: ﴿**الاعراب اشد کفرا و نفاقا' واجدر ان لا یعلموا حدود ما انزل الله علی رسوله**﴾ (التوبہ:۹۷) ترجمہ ان منافقین میں جو دیہاتی لوگ (ہیں وہ) کفر اور نفاق میں بہت ہی سخت ہیں اور ان کو ایسا ہونا ہی چاہئے کہ ان کو احکام کا علم نہ ہو جو اللہ نے اپنے رسول پر نازل فرمائے ہیں۔

قوله :ثم قال: یا محمد بظاہر یہ شخص مؤلفۃ القلوب لوگوں سے تھا اس لئے اس نے اتنی بے باکی سے یہ کام کیا ہے۔ یعنی پھر جود و کرم کے اس سمندر کو اس کے نام سے پکارتے ہوئے کہنے لگا مرلی اس کے دو معنی بنتے ہیں یا تو اپنے وکلاء سے کہئے کہ وہ مجھے حصہ دیں یا یہ کہ آپ خود مجھے صدقہ کے لئے دینے کا حکم دیں **من مال الله الذی عندك**: اس اجڈ نے اس جملہ سے گویا کہ یہ کہا یہ مال تیری کمائی کا نہیں جو میں تجھ سے مانگ رہاں ہوں تیرا کیا احسان۔ چنانچہ ایک دوسری روایت میں اس کی تصریح آئی ہے کہ اس نے یوں کہا تھا **لا من مالك و لا مال ابيك** کہ نہ تیرے مال میں سے اور نہ تمہارے باپ کے مال سے۔

مال سے زکوۃ کا مال مراد تھا کیونکہ آپ ﷺ کچھ حصہ زکوۃ کا مولفۃ القلوب لوگوں کو بھی دیا کرتے تھے۔ اس حدیث سے ایک تو یہ بات معلوم ہوئی کہ حاکم اور بادشاہ کے لئے مستحب ہے کہ وہ اپنی رعایا اور نادان لوگوں کی ایذا پر صبر و تحمل سے کام لیں دوسری یہ بات بھی معلوم ہوئی کہ اپنی عزت و وقار کی حفاظت کے لئے کسی کو کچھ دینا جائز ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سخاوت وشجاعت

۵۸۰۴ : وَعَنْهُ قَالَ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَحْسَنَ النَّاسِ وَاَجْوَدَالنَّاسِ وَاَشْجَعَ النَّاسِ وَلَقَدْ فَزِعَ اَهْلُ الْمَدِيْنَةِ ذَاتَ لَيْلَةٍ فَانْطَلَقَ النَّاسَ قِبَلَ الصَّوتِ فَاسْتَقْبَلَهُمُ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَدْ سَبَقَ النَّاسَ اِلَى الصَّوْتِ وَهُوَ يَقُولُ لَمْ تُرَاعُوْلَمْ تُرَاعُوْا وَهُوَ عَلٰى فَرَسٍ لِاَ بِيْ طَلْحَةَ عُرْيٍ مَا عَلَيْهِ سَرْجٌ وَفِي عُنُقِهٖ سَيْفٌ فَقَالَ لَقَدْ وَجَدْتُّهٗ بَحْرًا (متفق عليه)

اخرجه البخاري في صحيحه ١٠/٤٥٥حديث رقم ٦٠٣٣ومسلم في صحيحه ٤/١٨٠٢حديث رقم (٤٨-٢٣٠٧) واخرجه الدارمي في السنن ٤٤/١ حديث رقم ٥٩۔

ترجمہ:"حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم (خلق وخلق صورت وسیرت حسب ونسب معاشرت ومصاحبت میں) تمام لوگوں سے بڑھ کر حسین تھے تمام لوگوں سے زیادہ سخی تھے (قوت وقلب کے اعتبار سے) اور تمام لوگوں سے زیادہ بہادر تھے۔ایک رات کا واقعہ ہے کہ مدینہ کے لوگ (کسی سمت سے چور وڈاکو یا کسی دشمن کی آواز سن کر) خوفزدہ ہوگئے (اور ایک دوسرے کو آوازیں دینے لگے) پھر (کچھ) لوگ (جمع ہوکر) اس آواز کی سمت گئے انہیں آگے سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم آتے ہوئے ملے جو لوگوں میں سب سے پہلے (گھر سے نکل کھڑے ہوئے تھے اور تن تنہا) اس آواز کی سمت روانہ ہوگئے تھے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کو اطمینان دلاتے ہوئے فرمایا کہ ڈرو نہیں کوئی خطرہ نہیں ہے۔آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس وقت ابوطلحہ رضی اللہ عنہ کے گھوڑے پر سوار تھے جو ننگی پیٹھ تھا اس پر زین نہیں تھی نیز آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی گردن میں حمائل (تلوار) تھی پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: میں نے تو اس گھوڑے کو دریا کی طرح تیز رو پایا"۔(بخاری ومسلم)

① اس حدیث پر امام بخاری نے ترجمۃ الباب باندھا ہے۔

② اللہ جل شانہ کا یہ فرمان بھی دلالت کر رہا ہے:﴿فقاتل في سبيل الله لا تكلف الا نفسك و حرض المؤمنين﴾ [النساء : ٨٤] پس آپ اللہ کی راہ میں قتال کیجئے آپ کو بجز اپنے ذاتی فعل کے کوئی حکم نہیں اور مسلمانوں کو ترغیب دے دیجئے۔

اسی وجہ سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم خچر پر سوار ہو جاتے جبکہ بزدل سے یہ کام ممکن نہیں ہوتا۔حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شجاعت و بہادری پر دلالت کرنے والی ایک حدیث وہ ہے جو جلد ہشتم میں گزر چکی ہے ترجمۃ الباب کی مناسبت سے وہ حدیث یہاں دوبارہ ذکر کی جاتی ہے۔

فزع: راء کے کسرہ کے ساتھ ہے۔

اهل المدينة مصابیح میں "فزع الناس" کے الفاظ ہیں شرح السنہ میں لکھا ہے کہ صحابہ کرام ایک دوسرے کو آوازیں دینے لگے یعنی یہ مدد طلب کرنے کے معنی میں ہے جب فزع کسرہ کے ساتھ خاف۔کے معنی میں آتا ہے و فزع اليه أى استغاث (یعنی اگر صلہ میں الی آجائے تو مدد طلب کرنے کے معنی میں ہوتا ہے) شارح نے بھی اسی طرح ذکر کیا ہے ذات ليلة

جب انہوں نے دشمن یا ڈاکوؤں کی وہ آواز سنی تو مضطرب ہو گئے۔ قبل: قاف کسرہ اور ب کے فتحہ سمت اور طرف کے معنی میں۔ لوگ جمع ہو کر اس آواز کی سمت گئے وہاں انہوں نے پہلے ہی سے آپ کو موجود پایا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم تن تنہا اس آواز کی سمت روانہ ہو گئے تھے یہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی دلیری کی علامت ہے۔

طیبیؒ نے بہت دور کا احتمال بیان کیا ہے کہ ''یستقبلهم'' کی ضمیر اس چیز کی طرف راجع ہے جس پر وہ آواز دلالت کر رہی ہے کہ جس سے اہل مدینہ مضطرب ہوئے تھے۔ میرکؒ فرماتے ہیں بظاہر ''یستقبلهم'' کی ضمیر ''الناس'' کی طرف راجع ہے اور مراد یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سب سے پہلے اس سمت نکلے تھے اور جب واپس تشریف لا رہے تھے اس وقت دوسرے لوگ اس آواز کی سمت جا رہے تھے۔ میں کہتا ہوں یہی معنی متعین ہے۔ ''لم تراعوا'' اس کا قرینہ ہے۔

وهو يقول: لم تراعوا: تراعو۔ الروع سے مجہول کا صیغہ ہے' بمعنی فزع وخوف۔ ای لم تخافظ ولم تفزعوا ۔مطلب یہ ہے ڈر اور خطرے کی کوئی بات نہیں اطمینان رکھو۔ چنانچہ نفی کی تاکید کے لئے صیغہ نفی جحد بلم ارشاد فرمایا گویا کہ کسی بھی قسم کا کوئی ڈر اور خوف کبھی بھی نہیں ہوا۔ لم تراعوا یہ جملہ یا تو تاکیداً فرمایا یا یمیناً وشمالاً جو لوگ موجود تھے سب کو اطمینان دلانے کی غرض سے دوبارہ ارشاد فرمایا شرح السنہ میں ہے یہ دوسرا جملہ لفظ لن کے ساتھ لن تراعوا بھی منقول ہے کیونکہ عرب لفظ لم اور لن کو لا کی جگہ بھی استعمال کرتے ہیں۔

طیبیؒ فرماتے ہیں اس اعتبار سے یہ جملہ خبر بمعنی نہی ہوگا۔ بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے خبر بمعنی نہی کی تاویل کے بغیر معنی اول میں بھی اسی طرح ہے۔ یہ بات مان لی جائے تو اس صورت میں نہی کا معنی مراد ہوگا۔ تورپشتیؒ لکھتے ہیں: کہ مستند ترین روایات میں ﴿لن تراعو﴾ مطلب یہ ہے کہ خوف وفزع کی کوئی بات نہیں اطمینان رکھیں ''ربع فلان'' اس وقت کہتے ہیں جب کوئی خوف زدہ ہو۔ عری: ضمہ اور پھر سکون کے ساتھ ہے یعنی اس پر زین نہیں تھی۔ ما عليه سرج: یہ بیان وتاکید کے لئے یا اس بات کو بتلانے کے لئے لایا ہے کہ زین تو کجا لگام وغیرہ تک بھی اس پر نہیں تھی۔ وفي عنقه: ضمیر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف راجع ہے (سیف) کہ آپ کی گردن میں تلوار حمائل تھی ایک نسخہ میں یہ لفظ سین کے کسرہ کے ساتھ ہے یعنی اس گھوڑے کے گلے میں کھجور کی کھال سے بنائی ہوئی رسی تھی شارح نے اسی کو اختیار کیا ہے اگر چہ مبنیٰ کے اعتبار سے یہ معنی قریب قریب ہے لیکن معنی کے اعتبار سے بہت دور ہے۔ بحرا: میں نے اس گھوڑے کو دریا کی طرح تیز رو پایا۔ یہ گھوڑا بہت سست رفتار' تنگ قدم اور سرکش تھا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی سواری کی برکت سے کایا ہی پلٹ گیا (یعنی ایسا تیز رفتار ہوا کہ کوئی بھی گھوڑا اس سے آگے نہیں نکل پاتا)۔

جب گھوڑا عمدہ وسبک رفتار ہوتا ہے۔ اس کو دریا وسمندر سے تشبیہ دی جاتی ہے۔ کیونکہ اس کے سوار کو اسی طرح راحت پہنچتی ہے جیسے کشتی پر بیٹھے شخص کو راحت ہوتی ہے جب ہوا بھی چل رہی ہو۔

امام نوویؒ فرماتے ہیں اس حدیث میں کئی خاص باتوں کا ذکر ہے۔ ① اللہ تعالیٰ نے آپ کو جن صفات جلیلہ سے نوازہ تھا ان کا ذکر ہے۔ ② ایک معجزہ کا ذکر ہے کہ اس گھوڑے کی حالت آپ کی ذرا سی دیر کی سواری سے بدل گئی۔ ③ اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اگر کسی طرف سے دشمن وغیرہ کی کوئی آہٹ محسوس ہو تو صورت حال کی تحقیق کے لئے جانا مستحب ہے۔ بشرطیکہ ہلاکت میں نہ پڑنے کا یقین ہو۔ ④ اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ مستعار سواری پر جہاد کرنا جائز ہے۔ ⑤ تلوار

گردن میں لٹکانا مستحب ہے۔⑥ خوف کے ختم ہونے کے بعد لوگوں کو خوشخبری سننا مستحب ہے۔

کبھی کسی سائل کو انکار نہیں کیا

۵۸۰۵ : وَعَنْ جَابِرٍ قَالَ مَا سُئِلَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ شَيْئًا قَطُّ فَقَالَ لَا (متفق عليه)

اخرجه البخاری ۱۰/۴۵۵ حديث رقم ۶۰۳۴ واخرجه مسلم ۴/۱۸۰۵ حديث رقم (۵۶۔۲۳۱۱) والدارمی ۱/۴۷ حديث رقم ۷۰۔

ترجمہ: ''حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے' فرماتے ہیں کہ ایسا کبھی نہیں ہوا کہ رسول اللہ ﷺ سے کوئی شے مانگی گئی ہو اور آپ ﷺ نے انکار کر دیا ہو''۔ (بخاری ومسلم)

تشریح: فقالا: لا: ایسا کبھی نہیں ہوا کہ آپ ﷺ نے کسی سائل کو انکار کر دیا ہو یا اس کو نہ دیا ہو۔ ہوتا تو عطا فرماتے نہ ہوتا تو عذر بیان کر دیتے اور دعا فرما دیتے یا اس آیت مبارک پر عمل کرتے ہوئے دوسرے وقت کا وعدہ فرما لیتے۔

﴿واما تعرضن عنهم ابتغاء رحمة من ربك ترجوها فقل لهم قولا ميسورا﴾ [الاسراء: ۲۸] ترجمہ اگر تم کو اس رزق کے انتظار میں جس کی اپنے پروردگار کی طرف سے توقع ہو ان سے پہلوتہی کرنا پڑے تو ان سے نرمی سے بات کہہ دینا۔ یعنی دل جوئی کے ساتھ ان سے وعدہ کر لینا کہ ان شاء اللہ کہیں سے آئے گا تو دیں گے دل آزار جواب مت دینا۔

امام بخاریؒ نے الادب المفرد میں حضرت انسؓ سے روایت کیا ہے کہ آپ ﷺ (اتنے) رحیم تھے کہ جب بھی کوئی آپ کے پاس آتا ہونے کی صورت میں وعدے کو پورا فرما لیتے (یعنی فوراً عطا کر دیتے) ورنہ دوسرے وقت میں دینے کا وعدہ فرما لیتے۔ اور بزازی موجوف نے حضرت بلال اور ابوہریرہؓ سے خود آپ ﷺ کا یہی ارشاد نقل کیا ہے انفق یا بلال (بعض لوگوں نے بلال کے بجائے بلالا کا لفظ نقل کیا ہے) ولا تخش من ذی العرش اقلالا (ترجمہ اے بلال خرچ کر اور عرش کے مالک سے کمی کا اندیشہ نہ کر) جبکہ طبرانی نے حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ سے نقل کیا ہے۔

فرزدق نے زین العابدین کی کیا ہی بلیغ مدحت بیان کی۔

حمال اثقال اقوام اذ مدحوا ☆ حلو الشمائل يحلو عنده نعم

ما قال لا قط الا في تشهده ☆ لولا التشهد كانت لاؤه نعم

یعنی لا (انکار کا لفظ) آپ ﷺ کی زبان پر کبھی نہیں آیا۔ یہ اور بات ہے کہ کوئی سوال پورا کرنا آپ کے بس میں نہ رہا ہو (متفق علیہ)

جامع الاصول میں ہے کان لا يسئل شيئا الا اعطاه او سكت جب بھی آنحضرت ﷺ سے کچھ مانگا جاتا تو اس کو عطا فرما دیتے۔ (اگر آپ کے پاس موجود ہوتا) یا سکوت اختیار فرما لیتے۔ حاکم نے اس کو حضرت انسؓ سے روایت کیا ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی عطاء و بخشش کا ایک واقعہ

۵۸۰۶ : وَعَنْ اَنَسٍ اَنَّ رَجُلاً سَأَلَ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ غَنَمًا بَيْنَ جَبَلَيْنِ فَاَعْطَاهُ اِيَّاهُ فَاَتٰى قَوْمَهٗ فَقَالَ اَىْ قَوْمِ اَسْلِمُوْا فَوَاللّٰهِ اِنَّ مُحَمَّدًا لَيُعْطِىْ عَطَاءً مَا يَخَافُ الْفَقْرَ (رواه مسلم)

اخرجه مسلم فی صحیحه ١٨٠٦/٤ حدیث رقم (٥٨-٢٣١٢) واحمد فی المسند ١٠٨/٣۔

ترجمہ: ''حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے' فرماتے ہیں کہ ایک شخص نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے اتنی بکریاں مانگیں جو دو پہاڑوں کے درمیانی فاصلہ کو بھر دیں' چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس (کی چاہت کے مطابق) کو اتنی ہی بکریاں دے دیں' اس کے بعد وہ شخص اپنی قوم میں آیا اور کہا: اے میری قوم کے لوگو! اسلام قبول کر لو' خدا کی قسم محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اتنا دیتے ہیں کہ فقر و افلاس سے بھی نہیں ڈرتے''۔ (مسلم)

تشریح: وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی اس بخشش و عطا سے نہایت متعجب ہوا۔ جو آپ کا جود و سخا' توکل و قناعت اور زہد و استغنا پر دلالت کرتا ہے: فقال: ای قوم یعنی اے میری قوم۔ اسلموا کہ حلقہ بگوش اسلام ہو جاؤ کیونکہ اسلام مکارم اخلاق کی تعلیم دیتا ہے۔ عطاء :ما یخاف الفقر۔ طیبیؒ لکھتے ہیں یہ جملہ یعطی کی ضمیر سے حال بنائیں یا لفظ عطا کے لئے صفت ثانی بنائیں۔ تقدیری عبارت یوں ہوگی: عطاء ما یخاف الفقر معه۔ اگر آپ یہ کہیں کہ عطا کا یہ وصف وجوب اسلام کا سبب کیسے بنا تو اس کا جواب یہ ہے کہ عطاء جزیل کے ساتھ ادعاء نبوت کا مقام دلالت کر رہا ہے کہ ان کا اس ذات پر کامل یقین ہے جس نے ان کو دعوتِ خلق کے لیے بھیجا ہے۔ کیونکہ فقر کا خوف انسان کو فطری و جبلی چیز ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ﴿الشیطان یعد کم الفقر﴾ [البقرة: ٦٨]

خلق نبوی صلی اللہ علیہ وسلم

۵۸۰۷ : وَعَنْ جُبَيْرِ بْنِ مُطْعِمٍ بَيْنَمَا هُوَ يَسِيْرُ مَعَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَقْفَلَهٗ مِنْ حُنَيْنٍ فَعَلِقَتِ الْاَعْرَابُ يَسْئَلُوْنَهٗ حَتّٰى اضْطَرُّوْهُ اِلٰى سَمُرَةٍ فَخَطِفَتْ رِدَائَهٗ فَوَقَفَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ اَعْطُوْنِىْ رِدَائِىْ لَوْ كَانَ لِىْ عَدَدُ هٰذِهِ الْعِضَاةِ نَعَمٌ لَقَسَمْتُهٗ بَيْنَكُمْ ثُمَّ لَا تَجِدُوْنِىْ بَخِيْلاً وَلَا كَذُوْبًا وَلَا جَبَانًا۔ (رواه البخاری)

اخرجه البخاری فی صحیحه ٣٥/٦ حدیث رقم ٢٨٢١ والنسائی فی السنن ٢٦٢/٦ حدیث رقم ٣٦٨٨ ومالك فی الموطأ ٤٥٧/٢ حدیث رقم ٢٢ من كتاب الجهاد واحمد فی المسند ٨٢/٤۔

ترجمہ: ''حضرت جبیر بن مطعم رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ غزوہ حنین سے واپسی کے موقع پر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ چل رہا تھا کہ (راستہ میں ایک مقام پر) کچھ (غریب) دیہاتی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو لپٹ گئے اور (غنیمت کا مال) مانگنے لگے اور

اس حد تک پیچھے پڑ گئے کہ آپ ﷺ کو (کھینچتے ہوئے) ایک کیکر کے درخت تک لے گئے۔ آپ ﷺ کی چادر کیکر کے کانٹوں میں الجھ کر رہ گئی آپ (بڑی بے چارگی کے ساتھ) ٹھہر گئے اور فرمایا: "لاؤ میری چادر تو دے دو اگر میرے پاس ان کانٹوں کے برابر بھی چوپائے (یعنی بکریاں اور اونٹ وغیرہ) ہوتے تو میں ان سب کو تمہارے درمیان تقسیم کر دیتا اور تم جان لیتے کہ میں نہ بخیل ہوں اور نہ جھوٹ بولنے والا اور بزدل ہوں"۔ (بخاری)

تشریح: مقفله: یہ مصدر میمی یا ظرف زمان ہے۔ بصر اور رجع کی طرح قفل مصدر قفولاً سے اسم زمان ہے۔

حنین لفظ حنین (تصغیر کے ساتھ) یہ مکہ اور طائف کے درمیان ایک جگہ کا نام ہے۔

فعلقت : لام کے کسرہ کے ساتھ (سمع یسمع سے) ہے۔

وھو یعطیھم یا ان سے وعدہ فرمایا۔ **الی سمرۃ** سین کے فتحہ اور میم کے ضمہ کے ساتھ۔ ایک کیکر کے درخت تک لے گئے **فخطفت** طاء کے کسرہ کے ساتھ **ردائۃ** وہاں آپ کی چادر کیکر کے کانٹوں میں الجھ کر رہ گئی شارح نے سلبت کے معنی میں کیا ہے کوئی بعید نہیں کہ ضمیر اعراب کی طرف راجع ہو (کہ ان لوگوں نے آپ کی چادر تک چھین لی) اس پر **اعطو ردائی** بھی دلالت کر رہا ہے۔

طیبیؒ نے عجیب سی بات لکھی ہے کہ آپ ﷺ نے اپنی چادر درخت پر لٹکا دی تھی جس کو خطف (چھیننے) سے تعبیر کیا گیا ہے۔ جبکہ انہوں نے چادر نہیں چھینی تھی۔

العضاۃ: عین مکسورہ پھر ضاد معجمہ اور آخر میں ہاء "ام غیلان" (نامی درخت) کو کہتے ہیں۔ اس کا واحد عضاہۃ ہے کبھی ہا کو حذف کر کے "عضۃ" بھی پڑھا جاتا ہے۔ اور لفظ عدد منصوب ہے مصدریت کی بنا پر اصل میں **بعد عددھا** ہے یا منصوب بنزع الخافض ہے اصل میں **بعدھا** یا **کعددھا** تھا اس سے مقصود کثرت بتلانا ہے۔ نعم نون اور عین دونوں کے فتحہ کے ساتھ۔ قاموس میں ہے لفظ نعم پر کبھی کسرہ بھی پڑھا جاتا ہے۔ اس سے اونٹ اور چھوٹے مال مویشی یعنی بھیڑ بکری مراد ہوتے ہیں یا خاص ہے۔ اونٹوں کے لئے اس صورت میں اس کی جمع انعام آئے گی۔ لیکن میں کہتا ہوں اس صورت میں باری تعالیٰ کا ارشاد: ﴿ومن الانعام ثمانیه ازواج﴾ (الزمر:٦) سے اعتراض وارد ہوتا ہے کیونکہ اس سے اونٹ، گائے اور بھیڑ بکری نر مادہ سب مراد ہیں صرف صنف ابل مراد نہیں۔ **لقسمته بینکم** سب کچھ تم میں تقسیم کر دینا کیونکہ مجھے اپنے منعم حقیقی کی رضا چاہئے جس کے لئے میں نے تمام راحتیں اور خواہشات ترک کر دی ہیں۔

ثم لا تجدونی...... یہاں "ثم" فاء کے معنی میں ہے یا تراخی زمان کے لئے ہے یعنی تمہیں عنایات، وعدہ وفائی اور توکل کے اعتبار سے۔ مظہرؒ فرماتے ہیں اس کا مطلب یہ ہے جب تم مجھے آزماؤ گے تو مجھے ان اوصاف رذیلہ سے (متصف نہ پاؤ گے۔ آنحضرت ﷺ کے اس ارشاد گرامی میں اس بات کی دلیل ہے کہ ایک شخص کو اعتماد دلانے کے لئے جو سب کو نہیں جانتا، اوصاف حمیدہ کے ذریعہ اپنی تعریف کرنا جائز ہے۔

طیبیؒ لکھتے ہیں کہ "ثم" یہاں تراخی فی الرتبہ کے لئے ہے، اور مطلب یہ ہے کہ میں ان اموال کا محتاج نہیں بے نیاز ہوں اگر کوئی آجاتا ہے تو دل کی خوشی اور رغبت کے ساتھ اس کو دیتا ہوں اور نہ یہ بات ہے کہ اپنا مال بچانے اور محض ٹالنے کے لئے

جھوٹا سچا وعدہ کر کے سائلین سے اپنا پیچھا چھڑا لیا کرتا ہوں اور نہ یہ کہ میں بزدل ہوں کسی سے ڈرتا ہوں۔ گویا یہ سابق کلام کا تتمہ ہے۔

مخلوقِ خدا پر شفقت و ہمدردی

۵۸۰۸ : وَعَنْ اَنَسٍ قَالَ كَانَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذَا صَلَّى الْغَدَاةَ جَاءَ خَدَمُ الْمَدِيْنَةِ بِاٰنِيَتِهِمْ فِيْهَا لْمَاءُ فَمَا يَاْتُوْنَ بِاِنَاءٍ اِلَّا غَمَسَ يَدَهُ فِيْهَا فَرُبَّمَا جَاؤُهُ بِالْغَدَاةِ الْبَارِدَةِ فَيَغْمِسُ يَدَهُ فِيْهَا۔

(رواه مسلم)

اخرجه مسلم في صحيحه ۱۸۱۲/٤ حديث رقم (٧٤-۲۳۲٤) واحمد في المسند ۱۳۷/۳۔

ترجمہ: ''حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے' فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جب صبح کی نماز پڑھ لیتے تو اہل مدینہ کے خدام (یعنی لونڈیاں اور غلام) اپنے اپنے برتنوں میں پانی لے کر پہنچ جاتے (تاکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے دست مبارک کی برکت سے عافیت اور بیماریوں سے شفا حاصل کریں) وہ جو بھی برتن لاتے آپ صلی اللہ علیہ وسلم (اس کی خوشی کی خاطر اور مقصد برآری کے لئے) اس برتن میں اپنا ہاتھ ڈال دیتے۔ سردی کے موسم میں صبح ہی صبح اپنے برتن لے کر آتے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم (بڑی خوشدلی کے ساتھ) ان برتنوں میں اپنا دست مبارک ڈال دیتے''۔ (مسلم)

تشریح: جامع الاصول میں ''جاءه'' ہے : اٰنیتھم۔ اناء کی جمع ہے۔

فما یأتون: جامع الاصول میں 'فما یؤتی'' کے الفاظ ہیں۔

طیبیؒ لکھتے ہیں اس حدیث سے تین باتوں کا علم ہوتا ہے۔

نمبر۱: یہ حدیث اس طرف رہنمائی کرتی ہے کہ لوگوں کے دِل خوش کرنے کے لئے مشقتیں برداشت کرنی چاہیں۔ خصوصاً خدام و ناتواں لوگوں کے ساتھ بہت زیادہ رحمت کا برتاؤ ہونا چاہئے۔

نمبر۲: ان برتنوں میں دست مبارک تبرک کے لئے داخل فرماتے تھے۔

نمبر۳: اس حدیث میں ضعفاء کے ساتھ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی شفقت و ہمدردی کا ذکر ہے۔

٭ مسند احمد میں اسی طرح کے الفاظ ہیں جبکہ صاحب جامع الاصول نے مسلم اور احمد کے حوالے سے یہ حدیث اس طرح نقل کی ہے کہ اس میں ''فربما......'' کے الفاظ نہیں ہیں۔ ابن عساکر نے حضرت انسؓ سے نقل کیا ہے: انه ﷺ كان ارحم الناس بالصبيان والعيال کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بچوں اور عورتوں کے ساتھ بہت زیادہ شفقت کا برتاؤ فرماتے تھے۔

جامع الاصول میں منقول ہے: كان مما يقول للخادم ألك حاجة۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم غلاموں سے پوچھتے رہتے تھے کہ تمہاری کوئی حاجت ہے؟

آنحضرت ﷺ کی کسر نفسی کا بیان

۵۸۰۹ : وَعَنْهُ قَالَ كَانَتْ اَمَةٌ مِنْ اِمَاءِ اَهْلِ الْمَدِيْنَةِ تَاخُذُ بِيَدِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَتَنْطَلِقُ بِهٖ حَيْثُ شَاءَتْ (رواه البخارى)

اخرجه البخارى فى صحيحه ٤٨٩/١٠ حديث رقم ٦٠٧٢۔

ترجمہ: ''حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے' فرماتے ہیں کہ (بالفرض) مدینہ والوں کی لونڈیوں میں سے کوئی لونڈی رسول اللہ ﷺ کا ہاتھ پکڑتی اور جہاں چاہتی لے جاتی''۔ (بخاری)

تشریح: تاخذبید رسول الله :کہا گیا ہے کہ ہاتھ پکڑنے سے مراد اس کا لازم ''رفق'' نرمی شفقت ہمدردی کی وجہ سے ان کے ساتھ ہو لیتے یہاں تک کہ فتنطلق به حیث شاء ت مدینہ منورہ سے باہر کیوں نہ جانا پڑتا یعنی دور کیوں نہ جانا پڑتا۔اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ آنحضرت ﷺ اپنی امت کے لوگوں کے ساتھ انتہائی تواضع کے ساتھ پیش آتے تھے۔

۵۸۱۰ : وَعَنْهُ اَنَّ امْرَاَةً كَانَتْ فِيْ عَقْلِهَا شَيْءٌ فَقَالَتْ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اِنَّ لِيْ اِلَيْكَ حَاجَةً فَقَالَ يَا اُمَّ فُلَانٍ اُنْظُرِيْ اَيَّ السِّكَكِ شِئْتِ حَتّٰى اَقْضِيَ لَكِ حَاجَتَكِ فَخَلَا مَعَهَا فِيْ بَعْضِ الطُّرُقِ حَتّٰى فَرَغَتْ مِنْ حَاجَتِهَا ۔ (رواه مسلم)

اخرجه مسلم فى صحيحه ١٨١٢/٤ حديث رقم (٧٦-٢٣٢٦) وابو داوٗد فى السنن ١٦١/٥ حديث رقم ٤٨١٨ واحمد فى المسند ١١٩/٣۔

ترجمہ: ''حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے' فرماتے ہیں کہ مدینہ میں ایک عورت تھی جس کی عقل میں کچھ فتور تھا' وہ ایک دن کہنے لگی یارسول اللہ (ﷺ) مجھے آپ ﷺ سے کچھ کام ہے (جو لوگوں سے پوشیدہ طور پر کہنے کا ہے) آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: تمہارا جو کام ہوگا میں ضرور کروں گا (یعنی تم جس تنہا مقام پر مجھ سے بات کرنا چاہو چلو میں وہاں چل کر تمہاری بات سن لوں گا)۔ چنانچہ آپ ﷺ اس کے ساتھ ایک گلی کوچہ میں تشریف لے گئے اور وہاں اس عورت کو جو کچھ کہنا سنانا تھا اس نے کہا سنا''۔

تشریح: السكك :سین پر کسرہ ہے پھر فتحہ ہے ''السكة'' کی جمع ہے۔ معها فى بعض الطرق۔ نیز اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ عورت کے ساتھ کوچہ میں خلوت' گھر میں اجنبی عورت کے ساتھ خلوت کی مانند نہیں ہے' علاوہ ازیں اس کوچہ میں آنحضرت ﷺ اس عورت کے ساتھ بالکل تنہا نہیں تھے بلکہ وہ لوگ جن کے مکانات وہاں موجود تھے برعایت حسن ادب اس جگہ سے کچھ فاصلے پر کھڑے تھے جہاں آپ ﷺ اس عورت کی بات سن رہے تھے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اوصافِ حمیدہ

۵۸۱۱ : وَعَنْهُ قَالَ لَمْ يَكُنْ رَّسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَا حِشًا وَلَا لَعَّانًا وَلَا سَبَّا بًا كَانَ يَقُولُ عِنْدَ الْمَعْتِبَةِ مَالَهُ تَرِبَ جَبِينُهُ (رواه البخاری)

اخرجه البخاری فی صحیحه ۱۰/۴۵۲ حدیث رقم ۶۰۳۱ واحمد فی المسند ۳/۱۵۸۔

ترجمہ: ''حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فحش گوئی اور لعنت کرنے والے نہ تھے اور نہ ہی سب وشتم کرتے تھے جب کسی پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو غصہ آتا تو بس یہ فرماتے ! کیا ہوا اس کو (جو اس نے یہ بات کہی یا یہ کام کیا) اس کی پیشانی خاک آلود ہو''۔ (بخاری)

تشریح: قوله :لم یکن رسول الله ﷺ: (یعنی گناہ کے کام کرنے والے نہیں تھے) ولا لعاناً ولا سباباً ان دونوں کلموں سے مقصود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے لعن وسب اور ہر طرح کی فحش گوئی کی نفی کرنا ہے۔ نہ کہ ان دو کلموں میں پائی جانے والی مبالغہ کی نفی۔ حضرت انسؓ نے خاص طور پر ان دو کی نفی مبالغہ کے ساتھ اس لئے ذکر کی کہ عادتاً ان (دونوں میں) مبالغہ کیا جاتا ہے۔ تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بابت صیغہ مبالغہ کے ساتھ ان دونوں کلموں کی نفی مبالغہ کے ساتھ فرمائی اور مقصود تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم میں یہ دونوں صفتیں بالکل نہ تھیں جیسا کہ حضرت انسؓ کے کلام کا آخری حصہ بھی دلالت کر رہا ہے۔

امام طیبیؒ لکھتے ہیں اگر آپ یہ کہیں کہ فعال کا صیغہ تکثیر یا مبالغہ کے لئے آتا ہے اس سے مطلق لعن اور سب کی نفی لازم نہیں آتی ؟ جواب یہ ہے کہ یہاں یہ مفہوم معتبر نہیں۔ اس لئے کہ یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مدح میں وارد ہوئے ہیں۔ میرے نزدیک آیت مبارکہ اور حدیث دونوں کے متعلق واضح بات یہ ہے کہ فعال کا صیغہ تمار (کھجور بیچنے والا اور لبان (دودھ بیچنے والا) کی طرح نسبت بیان کرنے کے لئے آیا ہے۔ معنی یہ ہے: لیس الله بذی ظلم مطلقا ولا رسوله بصاحب لعن ولا سب...... اور اسی طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان کفار و فجار کو بھی لعن وشتم نہیں کرتے تھے جو لعنت کے مستحق نہ تھے کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نبی الرحمۃ تھے اسی لئے راوی نے اگلا کلام بطور جملہ مستانفہ کے ذکر فرمایا کہ ''کان یقول عندالمعتبة ماله ترب جبینه'' غصہ آتا تو بس یہ فرماتے کیا ہوا اس کو؟ خاک آلود ہو جائے اس کی پیشانی۔

المعتبة: تاء کے فتحہ کے ساتھ ہے۔ بعض کا کہنا ہے کہ کسرہ کے ساتھ بھی ہے بمعنی جیسا کہ قاموس میں ہے۔ ابن الملک نے یہی معنی مراد لیا ہے جبکہ نہایۃ میں اس کا معنی ''غضب'' لکھا ہے شارحؒ نے اسی معنی کو اختیار کیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ حد درجہ یہ تھا آپ علیہ السلام یہ کلمہ غصہ اور مخاصمت کے وقت مدمقابل کو مخاطب کئے بغیر صرف اعراض کے طور پر کہتے تھے۔

قوله :ماله؟ ترب جبینه :اس جملہ کے دو معنی مراد لئے جاسکتے ہیں:

① بددعا ہو رغم انفك: کے معنی میں

② دعا پر محمول ہے عبادت وسجدہ ریزی سے کنایہ کہا جاسکتا ہے کیونکہ عبادت اور سجدہ کرنے والے کی پیشانی اور ناک کو خاک لگتی ہے۔

دشمنوں کے حق میں بددُعا

۵۸۱۲ : وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قِیْلَ یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اُدْعُ عَلَی الْمُشْرِكِیْنَ قَالَ اِنِّیْ لَمْ اُبْعَثْ لَعَّانًا وَاِنَّمَا بُعِثْتُ رَحْمَةً. (رواہ مسلم)

اخرجه مسلم فی صحیحه ۲۰۰۶/٤ حدیث رقم (۸۷۔۲۵۹۹)۔

ترجمہ:''حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے' فرماتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا گیا یارسول اللہ! آپ (اپنے دشمن) کافروں کے حق میں بددعا فرمایئے تا کہ وہ ہلاک ہوں اور ان کی جڑ اکھڑ جائے۔ تو ارشاد فرمایا: ''مجھے لعنت کرنے والا بنا کر نہیں بھیجا گیا بلکہ مجھے تو رحمت بنا کر بھیجا گیا ہے''۔ (مسلم)

تشریح: لم أبعث لعانًا: یعنی مجھ کو لعنت کرنے والا بنا کر نہیں بھیجا گیا اگرچہ وہ کافروں کی کوئی مخصوص جماعت کیوں نہ ہو کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿لیس لك من الأمر شیء او یتوب علیهم او یعذبهم﴾ (آل عمران:۱۲۸) ''آپ کو کوئی دخل نہیں یہاں تک کہ خدا تعالیٰ ان پر یا تو متوجہ ہو جائیں اور یا ان کو کوئی سزا دے دیں''۔

قوله : وانما بعثت رحمة: یعنی میں تو مسلمانوں کے لئے خصوصی اور عام لوگوں کے لئے عمومی طور پر رحمت بنا کر بھیجا گیا ہوں اور طبعًا مجھے رحمٰن ورحیم کی صفات سے نوازا گیا اور میرے رب نے بھی یہی فرمایا ہے۔ ﴿وما ارسلناك الا رحمة للعالمین﴾ (الانبیاء:۱۰۷) ابن الملک'' فرماتے ہیں۔ اہل ایمان کے حق میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا باعث رحمت ہونا تو ظاہر ہی ہے۔ اور کافروں کے حق میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا باعث رحمت ہونا تو وہ اس اعتبار سے ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بابرکت وجود کے باعث ان پر سے دنیا کا عذاب اٹھالیا گیا ہے۔

باری تعالیٰ نے خود ارشاد فرمایا: ﴿وما كان الله لیعذبهم وانت فیهم﴾ (الانفال:۳۳) ۔ میں کہتا ہوں حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی برکت سے اس وعدہ کو آپ کی حیات مبارکہ تک ہی محدود نہیں رکھا بلکہ ہمیشہ کے لئے طے فرما دیا کہ کلی استیصال کا عذاب قیامت تک نازل نہیں ہوگا۔ طیبیؒ لکھتے ہیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد گرامی کا مطلب یہ ہے کہ اس دنیا میں میں اس لئے نہیں آیا کہ کسی کو اللہ کی رحمت سے دور کروں ۔ بلکہ میری بعثت کا مقصد لوگوں کو اللہ اور اس کی رحمت کے قریب کرنا ہے۔ کسی پر لعنت بھیجنا اور بددعا کرنا میری شان سے بعید اور میرے حال کے غیر مناسب ہے۔ تو میں ان کافروں پر کس طرح لعنت بھیجوں۔ الادب المفرد میں امام بخاریؒ نے بھی انہیں الفاظ سے اس حدیث کو نقل کیا ہے۔ طبرانی نے حضرت کریز ابن شامہ سے انی لم ابعث لعانا کے الفاظ نقل کئے ہیں جبکہ امام بخاریؒ نے کتاب التاریخ میں حضرت ابو ہریرہؓ سے انما بعثت رحمة ولم ابعث عذابا کے الفاظ نقل کئے ہیں یعنی ''میں عذاب نہیں بلکہ رحمت بنا کر بھیجا گیا ہوں''۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شرم وحیاء اور غیرت کا بیان

۵۸۱۳ : وَعَنْ اَبِیْ سَعِیْدِ الْخُدْرِیِّ قَالَ كَانَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اَشَدَّ حَیَاءً مِّنَ الْعَذْرَاءِ

فِي خِدْرِهَا فَإِذَا رَأَى شَيْئًا يَكْرَهُهُ عَرَفْنَاهُ فِي وَجْهِهِ (متفق عليه)

اخرجه البخاري في صحيحه ٥٦٦/٦حديث رقم ٣٥٦٢ومسلم في صحيحه ١٨٠٩/٤حديث رقم (٦٧۔٢٣٢٠) وابن ماجه في السنن ١٣٩٩/٢حديث رقم ٤١٨٠ واحمد في المسند ٧٩/٣۔

ترجمہ: "حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے' فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ پردہ نشین کنواری لڑکی سے بھی زیادہ حیادار تھے' جب کوئی چیز ایسی دیکھتے جو (طبعی طور پر غیر پسندیدہ یا غیر شرعی ہونے کی وجہ سے) آپ ﷺ کو ناگوار گزرتی تو ہم اسے آپ ﷺ کے چہرۂ مبارک سے پہچان لیتے تھے"۔ (بخاری ومسلم)

تشریح: خدر: خاء کے کسرہ کے ساتھ (پردے میں رہنے والی) خدر: پردہ کو کہتے ہیں۔ طیبیؒ لکھتے ہیں کہ یہ تتمیم ہے (یعنی اس حدیث میں آپ کی غایت شرم کو بیان کیا گیا ہے کہ آنحضرت ﷺ اس پردہ نشین کنواری سے بھی زیادہ حیاوالے تھے جو گھر سے باہر قدم تک نہیں رکھتی۔ کیونکہ کنواری میں اتنی شرم نہیں ہوتی۔

قوله :فاذا رأى شيئا يكرهه عرفناه في وجهه : آپ ﷺ کے سامنے کوئی ایسی بات پیش آتی جو طبعی اور شرعی طور پر ناپسندیدہ ہونے کی وجہ سے آپ ﷺ کے مزاج کے خلاف ہوتی۔ تو اس کی ناگواری آپ کے چہرہ انور سے پہچان لیتے اور ناگواری کو محسوس کر کے اس کے دفعیہ کی کوشش کرتے کیونکہ اگر اس کا تعلق کسی امر طبعی یا کسی ایسے امر شرعی سے ہوتا جو حرام نہ ہوتو غصہ نہیں ہوتے تھے۔

امام نوویؒ نے یہ مطلب لکھا ہے کہ اگر خلاف مزاج بات پیش آتی غلبہ حیاء سے آپ ﷺ اس کے خلاف ناگواری کا اظہار زبان سے نہ کرتے تھے بلکہ اس کے اثرات آپ ﷺ کے چہرے پر ظاہر ہو جاتے تھے۔ چنانچہ ہم آپ ﷺ کے چہرے کے تغیر سے آپ کی ناگواری کو محسوس کر لیتے تھے۔ اس حدیث سے نہ صرف شرم وحیاء کی فضیلت ظاہر ہوتی ہے بلکہ یہ سبق ملتا ہے کہ اس وصف کو اپنے اندر زیادہ سے زیادہ پیدا کرنا چاہئے تاوقتیکہ اس کی وجہ سے کوئی ضعف پیدا نہ ہو۔

آنحضرت ﷺ کی مسکراہٹ

۵۸۱۴ : وَعَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ مَا رَأَيْتُ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مُسْتَجْمِعًا قَطُّ ضَاحِكًا حَتّٰى أَرٰى مِنْهُ لَهَوَاتِهِ وَإِنَّمَا كَانَ يَتَبَسَّمُ (رواه البخاري)

اخرجه مسلم في صحيحه ٦١٦/٢حديث رقم (١٥۔٨٩٩)والبخاري في صحيحه ١٠/حديث رقم ٦٠٩٢ واحمد في المسند ٦٦/٦۔

ترجمہ: "حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے' فرماتی ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو کبھی کھلکھلا کر ہنستے ہوئے نہیں دیکھا کہ مجھے آپ ﷺ کے حلق کا کوا نظر آیا ہو' آپ ﷺ کی ہنسی (زیادہ تر) مسکرانے تک محدود رہتی تھی"۔ (بخاری)

تشریح: مستجمعًا : دوسری میم کے کسرہ کے ساتھ۔ یہاں ضحک سے مراد کھل کر ہنسنا ہے۔ عرب کہتے ہیں : استجمع الفرس جریا۔ طیبیؒ لکھتے ہیں "ضحکا" کی جگہ "ضاحکا" اس لئے لایا گیا کہ یہ تمیز ہونے کی بنا پر منصوب ہے

مغرب میں لکھا ہے: استجمع السیل کا معنی ہے سیلاب کا ہر جگہ سے آ کر اکٹھا ہونا اور کہا جاتا ہے: استجمعت للمرء امورہ۔ یہ کلمہ لازم ہے۔ باقی فقہاء کا قول "مستجمعا شرائط الجمعة" ثابت نہیں۔ اس کے جملہ کا مطلب یہ ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کبھی اس طرح ہنستے نہیں دیکھا کہ آپ کا سارا منہ کھل گیا ہو۔

لھواۃ: لام اور ہاء کے فتحہ کے ساتھ "لھاۃ" کی جمع ہے مسلم اور ابوداؤد میں بھی اسی طرح ہے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا اندازِ تکلم

۵۸۱۵: وَعَنْهَا قَالَتْ اِنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَمْ يَكُنْ يَسْرُدُ الْحَدِيْثَ كَسَرْدِكُمْ كَانَ يُحَدِّثُ حَدِيْثًا لَوْ عَدَّهُ الْعَادُّ لَاَحْصَاهُ (متفق عليه)

اخرجه البخاری فی صحیحه ٥٦٧/٦حدیث رقم ٣٥٦٧ومسلم فی صحیحه ١٩٤٠/٤حدیث رقم (١٦٠-٣٤٩٣) وابو داؤد ٦٥/٤حدیث رقم ٣٦٥٥ والترمذی فی السنن٥/٦٠٠حدیث رقم ٣٦٣٩ واحمد فی المسند ١١٨/٦

ترجمہ: "حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تمہاری طرح تیز تیز اور مسلسل بات نہیں کرتے تھے آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس طرح ٹھہر ٹھہر کر گفتگو فرماتے کہ اگر کوئی (آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے الفاظ) گننا چاہتا تو گن سکتا تھا"۔ (بخاری)

تشریح: یسرد: راء کے ضمہ کے ساتھ۔ کسردکم: یعنی جس طرح تم لوگوں میں متعارف ہے کہ تم لوگ مسلسل بولے چلے جاتے ہو الفاظ الفاظ سے ملے ہوتے ہیں۔ بلکہ آپ کی گفتگو بالکل واضح ہوتی تھی الفاظ بالکل عام فہم اور جدا جدا ہوتے کیونکہ آپ کو فصیح گفتگو ہی کا حکم تھا حضرت عائشہؓ بھی اس کو بیان کرتی ہوئی فرماتی ہیں کان یحدث حدیثاً لو عده العاد کہ اگر کوئی گننا چاہتا تو گن سکتا۔ اور شمار کر سکتا اصل میں لو عده العاد عده ہونا چاہئے۔ لفظ الحصاه کا اس کی جگہ لانا مبالغہ کے لئے ہے۔ کیونکہ لاحصاء کا معنی کنکر وغیرہ کے ساتھ شمار کرنے کے ہے اور ظاہر ہے کہ کنکر کے گننے اور اٹھانے کے لئے مہلت چاہئے۔

طیبیؒ لکھتے ہیں کہا جاتا ہے: سرد الحدیث کا معنی تسلسل کے ساتھ جلدی جلدی کلام کرنا ہے اور سرد الصوم کا معنی لگا تار روزہ رکھنے کا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا کلام ایسا لگا تار نہیں ہوتا کہ ایک کا اثر دوسرے میں آ جانے کی وجہ سے مخاطب کو اشتباہ ہو جائے بلکہ آپ ٹھہر ٹھہر کے ایک ایک جملہ کو الگ الگ کر کے بڑے باوقار لہجہ میں گفتگو فرماتے تھے کہ اگر کوئی صاحب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے الفاظ اور جملوں کو گننا چاہتا یقیناً گن سکتا تھا۔

تخریج: امام ترمذی نے شمائل میں اس کو ذکر کیا ہے۔ جامع الاصول میں الفاظ کچھ یوں ہیں: کان یحدث حدیثا ولو عده العاد لاحصاه اور لکھا ہے کہ اس کو شیخین اور ابوداؤد نے روایت کیا ہے۔ جامع الاصول میں یہ الفاظ بھی منقول ہیں: کان یعید الکلمة ثلاثا لتعقل عنه رواه الترمذی والحاکم عن انس یعنی حاکم اور ترمذیؒ نے حضرت انسؓ سے نقل کیا ہے

کہ حضور اقدس ﷺ (بعض مرتبہ) کلام کو (حسب ضرورت) تین تین مرتبہ دھراتے تاکہ آپ کے سننے والے اچھی طرح سمجھ لیں۔

امور خانگی میں دستورِ نبوی ﷺ

۵۸۱۶ : وَعَنِ الْاَسْوَدِ قَالَ سَاَلْتُ عَائِشَةَ مَا كَانَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَصْنَعُ فِي بَيْتِهٖ قَالَتْ كَانَ يَكُوْنُ فِي مِهْنَةِ اَهْلِهٖ تَعْنِي خِدْمَةَ اَهْلِهٖ فَاِذَا حَضَرَتِ الصَّلٰوةُ خَرَجَ اِلَى الصَّلٰوةِ (رواہ البخاری)

اخرجه البخاری فی صحیحه ۱۶۲/۲ حدیث رقم ۶۷٦ والترمذی فی السنن ٥٦٤/٤ حدیث رقم ۲٤٨٩ واحمد فی المسند ٤٩/٦۔

ترجمہ: ''حضرت اسود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے' فرماتے ہیں کہ (ایک دن) میں نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے دریافت کیا کہ نبی کریم ﷺ گھر میں کیا کیا کرتے تھے تو انہوں نے فرمایا: آپ ﷺ (کی عادت مبارکہ یہ تھی کہ آپ ﷺ) گھر میں خانگی کام کرتے رہتے تھے اور جب نماز کا وقت آتا تو نماز کے لئے تشریف لے جاتے تھے (اس وقت سارا کام کاج چھوڑ دیتے تھے اور گھر والوں سے کوئی مطلب نہیں رکھتے تھے)۔'' (بخاری)

تشریح: **قوله :ما كان النبي يضع في بيته؟** یہ ''ما'' استفہامیہ ہے۔

مهنة میم کے فتحہ کے ساتھ ہے اور کبھی کسرہ بھی دیا جاتا ہے۔ جبکہ ہاء ساکن ہے یعنی خانگی کام۔ **المهنه** کے معنی خدمت کرنا اور کام کاج میں لگے رہنا اس جملہ سے مبالغہ مقصود ہے۔ صاحب نہایۃ نے لکھا ہے ''**مهنة**'' کا معنی خدمت کرنا ہے۔ روایت میم کے فتحہ کے ساتھ ہے البتہ کبھی کسرہ بھی پڑھا جاتا ہے۔ زمخشری لکھتے ہیں: **وهو عند الاثبات خطأ**۔

امام اصمعیؒ کہتے ہیں لفظ ''**مهنة**'' میم کے فتحہ کے ساتھ ہے کسرہ کے ساتھ نہیں پڑھا جاتا۔ اگرچہ قیاس کا تقاضا یہ تھا کہ لفظ جلسۃ اور خدمۃ کی طرح کسرہ دینا بھی جائز ہو۔ لیکن مذکور ہی ایک وزن یعنی فتحہ کے ساتھ ہے۔ قاموس میں لفظ مہنہ کے ساتھ اور بروزن کلمۃ ہے' اس کا معنی ہے: **الحذق بالخدمته والعمل** یہ ''**منعه**'' اور ''**نصره**'' کی طرح ہو تو مصدر **مهنا** و **مهنة** آتا ہے اور کسرہ کے ساتھ ہو تو بمعنی ''**خدمه**'' آتا ہے۔ میم کے فتحہ' کسرہ اور میم' ہاء اور نون تینوں کی حرکت (فتحہ) کے ساتھ خدمت کرنے کے معنی میں لکھا ہوا ہے۔

ابن حجر عسقلانیؒ لکھتے ہیں لفظ مہنہ میم کے فتحہ اور کسرہ کے ساتھ ہے۔ اگرچہ امام اصمعیؒ نے کسرہ کا انکار کیا ہے اور اس کا معنی اہل بیت کی خدمت کرنے سے بیان کیا ہے مزید لکھا ہے راوی کا تفسیری قول شعبہ نے نقل کیا ہے۔ کیونکہ ایک جماعت نے اس روایت کو بغیر تفسیری قول کے نقل کیا ہے۔ ابن سعدؒ نے دو روایتیں نقل کی ہیں ایک **خدمة اهله** کے الفاظ کے بغیر ہے جبکہ دوسری روایت کے آخر میں **تعني بالمهنة خدمة اهله** کے الفاظ بھی منقول ہیں۔

تخریج: اس حدیث کو ترمذی نے بھی نقل کیا ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کسی سے بھی انتقام نہیں لیتے تھے

۵۸۱۷ : وَعَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ مَا خُيِّرَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بَيْنَ اَمْرَيْنِ قَطُّ اِلَّا اَخَذَ اَيْسَرَهُمَا مَا لَمْ يَكُنْ اِثْمًا فَاِنْ كَانَ اِثْمًا كَانَ اَبْعَدَ النَّاسِ مِنْهُ وَمَا انْتَقَمَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لِنَفْسِهٖ فِىْ شَيْءٍ قَطُّ اِلَّا اَنْ يُّنْتَهَكَ حُرْمَةُ اللّٰهِ فَيَنْتَقِمُ لِلّٰهِ بِهَا (متفق عليه)

اخرجه البخاري في السنن ٥٦٦/٦ حديث رقم ٣٥٦٠ ومسلم في صحيحه ١٨١٣/٤ حديث رقم ٧٧۔٢٣٢٧) واخرجه ابو داؤد ١٤٢/٥ حديث ٤٧٨٥ ومالك في الموطأ ٩٠٢/٢ حديث رقم من باب حسن الخلق، واحمد في المسند ٣٢/٦۔

ترجمہ: ''حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دو کاموں میں سے ایک کا اختیار دیا جاتا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہمیشہ اسی کام کو اختیار فرماتے جو آسان ہوتا' بشرطیکہ وہ گناہ کا کام نہ ہوتا اگر وہ (ہلکا اور آسان) گناہ کا کام ہوتا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس سے سب سے دور رہنے والے شخص ہوتے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنی ذات کے متعلق کبھی کسی معاملے میں انتقام نہیں لیا۔ ہاں حدود اللہ کو توڑا جاتا تو پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ (کے حکم) کے پیش نظر اس کی سزا دیتے تھے''۔ (بخاری و مسلم)

تشریح: اثما ترمذی کی روایت میں اثمًا کے بجائے ''مالم یکن مأثما'' کے الفاظ ہیں مصدر میمی یا ظرف مکان کا صیغہ ہے۔ ترمذی کی روایت انہی الفاظ پر ختم ہو جاتی ہے۔

فان کان اثما کان ابعد الناس منہ۔ یعنی اگر وہ ہلکا اور آسان کام ہوتا مگر گناہ کا موجب ہوتا تو رشد و ہدایت والا کام جو اللہ تک پہنچانے والا ہوتا اختیار فرماتے اگرچہ نہایت مشکل اور سخت کیوں نہ ہوتا۔

عسقلانیؒ فرماتے ہیں خیر کا فاعل مبہم رکھا گیا تاکہ اختیار دینے کا تعلق اللہ تعالیٰ اور مخلوق ہر دو سے ہو سکے۔ لیکن اللہ کی طرف سے اختیار دیئے جانے کی صورت میں یہ بات بہت مشکل ہے کہ ان دو کاموں میں سے کوئی ایک کام گناہ کا اور دوسرا کام غیر گناہ کا ہو۔ ہاں دو جائز کاموں میں اختیار ملنے کی بات کا تعلق اللہ کی طرف سے ہو سکتا ہے۔ البتہ اگر گناہ کی بات سے مراد وہ چیزیں لیں جو بذات خود تو گناہ نہ ہوں لیکن وہ کسی بھی درجہ میں گناہ تک پہنچانے کا احتمال رکھتی ہوں مثلاً اللہ تعالیٰ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو زمین کے خزانوں کا اختیار دیا تھا کہ دنیا کے خزانے لینا چاہو تو لے لیں (اللہ سب آپ کو عطا فرما دیں گے) اور چاہو تو بقدر ضرورت و حاجت روزی پر قناعت کریں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے امر ثانی کو اختیار فرمایا اگرچہ امر اول دنیاوی مال و دولت کے خزانے بذات خود کوئی گناہ کی چیز نہیں لیکن اس بات کا احتمال ضرور ہوتا ہے کہ کوئی شخص اس کے معاملات میں اس طرح مصروف ہو جائے کہ عبادات کے لئے فارغ نہ ہو سکے اور امر ثانی اگرچہ بہت ہی سہل ہے۔ پس یہاں ''اثم'' امر نسبی ہے۔ خطبہ مراد نہیں چونکہ عظمت ثابت ہے۔

الا ان ینتهك : صیغہ مجہول کے ساتھ ارتکاب کے معنی میں ہے۔

فینقم مرفوع اور ایک نسخہ میں منصوب ہے یعاقب کے معنی میں ہے۔

ہاں اگر کوئی ایسی بات ہوتی جس کو اللہ تعالیٰ نے حرام قرار دیا ہے تو پھر اللہ کے حکم کے پیش نظر اس کی سزا دیتے تھے۔ یہاں "انتهاك الحرمة" کلمہ میں امور حرام بھی داخل ہیں کیونکہ عرب کہتے ہیں فلان انتهك محارم الله یعنی جو فعل اللہ تعالیٰ نے اس پر حرام کیا ہے۔

طیبیؒ لکھتے ہیں یہاں مستثنیٰ منقطع ہے: ای ماعاقب احد الخاصة نفسه لجنابة جنی علیه بل بخق الله ...... اور مطلب یہ ہے آنحضرت ﷺ پت کی گئی جنابت کا بدلہ آپ نے کبھی کسی سے نہیں لیا۔ البتہ آیت: ﴿ولا تأخذ کم بهما رأفة فی دین الله﴾ پر عمل کرنے کی خاطر' حقوق اللہ میں حرام کا ارتکاب کرنے والے سے اللہ کے حق کی بابت ضرور انتقام لیا ہے۔

اور ابن حجر عسقلانیؒ فرماتے ہیں مراد یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ کبھی کسی غلطی یا جرم کی سزا اپنی ذات کا انتقام لینے کے لئے نہیں دیتے تھے۔ باقی آپ ﷺ نے عقبہ ابن ابی معیط اور عبداللہ بن خطل وغیرہما موذی لوگوں کو قتل کرنے کا جو حکم فرمایا تھا۔ سو یہ اس بناء پر تھا کہ یہ لوگ آپ ﷺ کو ایذا پہنچانے کے ساتھ ساتھ اللہ کی حرام کردہ باتوں کے بھی مرتکب تھے۔

بعض کہتے ہیں آپ کو یہ اختیار ان امور میں تھا جو مفضی الی الکفر تھے اور بعض کا کہنا ہے کہ مال کے ساتھ مختص تھا۔ عزت و آبرو کے معاملہ میں آنحضرت ﷺ بدلہ لیا کرتے تھے۔

تخریج: اس حدیث کو امام ابوداؤد نے بھی اسی طرح نقل کیا ہے۔

آنحضرت ﷺ نے کبھی کسی کو نہیں مارا

۵۸۱۸ : وَعَنْهَا قَالَتْ مَا ضَرَبَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ شَيْئًا قَطُّ بِيَدِهٖ وَلَا امْرَاَةً وَلَا خَادِمًا اِلَّا اَنْ يُّجَاهِدَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَمَا نِيْلَ مِنْهُ شَيْءٌ قَطُّ فَيَنْتَقِمَ مِنْ صَاحِبِهٖ اِلَّا اَنْ يُّنْتَهَكَ شَيْءٌ مِنْ مَحَارِمِ اللّٰهِ فَيَنْتَقِمُ لِلّٰهِ (رواه مسلم)

اخرجه مسلم فی صحیحه ۱۸۱٤/٤ حدیث رقم (۷۹-۲۳۲۸) واخرجه ابو داؤد ۱٤۲/٥ حدیث رقم ٤۷۸٦ وابن ماجه فی السنن ٦۳۸/۱ حدیث رقم ۱۹۸٤۔

ترجمہ: "حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے' فرماتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے کفار سے مڈبھیڑ کے علاوہ کبھی کسی کو اپنے ہاتھ سے نہیں مارا' نہ عورت کو اور نہ خادم کو اور کبھی ایسا نہیں ہوا کہ (کسی شخص کی طرف سے) آپ ﷺ کو کوئی اذیت و تکلیف پہنچی ہو اور آپ ﷺ نے اذیت و تکلیف پہنچانے والے سے انتقام لیا ہو' ہاں اگر حدود اللہ کو پامال کیا جاتا تو آپ ﷺ اللہ (کے حکم کی تعمیل) کی خاطر اس کی سزا دیتے تھے"۔ (مسلم)

تشریح: قوله : ماضرب رسول الله ﷺ شیئا قط بیده : شیئا سے مراد انسان ہیں۔ کیونکہ سواری کے جانوروں کو بعض مواقع پر مارنا منقول ہے۔ یہاں خصوصیت کے ساتھ ان دونوں صنفوں یعنی خادم اور عورت کا ذکر اس لئے کیا ہے کہ ان دونوں کو عام طور پر مارا جاتا ہے۔ اگرچہ بعض حالات میں کچھ شرائط کے ساتھ تھوڑا بہت مارنا جائز ہے۔ لیکن ان حالات میں بھی اجتناب کرنا اولیٰ ہے۔ اس مسئلہ کو اولاد کو مارنے کے مسئلہ پر قیاس نہیں کرنا چاہئے کیونکہ ان کی تادیب و تربیت

سب سے مقدم ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ اولاد کو مارنا اس کی اصلاح کے لئے ہوتا ہے جبکہ ان دونوں کو مارنے کا تعلق زیادہ تر نفس کے تقاضے سے ہوتا ہے۔ تو صحیح تربیت اور تادیب کے پیش نظر اولاد کی غلطی پر اس کو مارنا اولیٰ ہے اور نفس کے تقاضے اور غصہ پر قابو رکھنے کے لئے ان دونوں (خادم اور عورت) کے ساتھ عفو درگزر کا معاملہ اولیٰ ہے۔

الا ان یجاهد فی سبیل الله: جہاد خدا کے دشمنوں سے ہوتا ہے اس لئے اس وقت آنحضرت ﷺ کسی کے ساتھ عفو درگزر کا معاملہ نہیں کرتے تھے۔ چنانچہ غزوہ احد میں ابی بن خلف کو آپ ﷺ نے اپنے ہاتھوں سے قتل کیا نیز یہاں (خدا کی راہ میں جہاد) سے مراد صرف خدا کے دشمنوں کو مارنا ہی نہیں بلکہ حدود و تعزیرات وغیرہ بھی اسی میں داخل ہیں۔

ما نیل قط: نون کے کسرہ کے ساتھ سمع سے "نال" کا مجہول کا صیغہ ہے مولف کہتے ہیں: نال منه نیلا اس وقت کہا جاتا ہے جب کوئی اذیت اور تکلیف پہنچے۔ ایک حدیث میں ہے: ان رجلا کان ینال من الصحابة ای یقع فیهم و یصیب منهم۔

ترمذیؒ نے پہلی فصل میں: ماضرب رسول الله بیده شیئا قط الا ان یجاهد فی سبیل الله ولا ضرب خادما ولا امرة کے الفاظ نقل کئے ہیں جبکہ فصل ثانی میں الفاظ اس طرح ہیں ما رأیت رسول الله ﷺ منتصرا من مظلمة ظلمها قط مالم ینتهك من محارم الله تعالٰی شیء کان من اشدهم فی ذلك غضبا۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں میں نے کبھی نہیں دیکھا کہ حضور اقدس ﷺ نے اپنی ذات کے لئے کبھی کسی کے ظلم کا بدلہ لیا ہو البتہ اللہ کی حرمتوں میں سے کسی حرمت کا ہتک ہوتا (یعنی کسی حرام فعل کا کوئی مرتکب ہوتا) تو حضور ﷺ سے زیادہ غصہ والا کوئی نہیں ہوتا تھا۔"

الفصل الثّانی:

خدام کے ساتھ آنحضرت ﷺ کا برتاؤ

۵۸۱۹ : وَعَنْ اَنَسٍ قَالَ خَدَمْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَاَنَا ابْنُ ثَمَانِ سِنِيْنَ خَدَمْتُهُ عَشْرَ سِنِيْنَ فَمَا لَا مَنِيْ عَلٰی شَیْءٍ قَطُّ اُتِیَ فِيْهِ عَلٰی يَدَیَّ فَاِنْ لَا مَنِیْ لَا ئِمٌ مِّنْ اَهْلِهٖ قَالَ دَعُوْهُ فَاِنَّهٗ لَوْ قُضِیَ شَیْءٌ كَانَ هٰذَا لَفْظُ الْمَصَابِيْحِ (رواه البیهقی فی شعب الا یمان مع تغیر یسیر)

اخرجه احمد فی المسند ۲۳۱/۳ والبیهقی فی شعب الایمان ۲۵۸/۶ حدیث رقم ۸۰۷۰۔

ترجمہ: "حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے' فرماتے ہیں کہ مجھے آٹھ سال کی عمر میں کو رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں پیش کیا گیا اور میں نے دس سال آپ ﷺ کی خدمت کی۔ (جو مدینہ میں آپ ﷺ کی کل مدت قیام ہے) اس پورے عرصہ میں ایسا کبھی نہیں ہوا کہ میرے ہاتھ سے کوئی نقصان ہوا اور آپ ﷺ نے مجھ کو ملامت کی ہو اور اگر آپ ﷺ کے اہل خانہ میں سے کوئی شخص (کسی چیز کے ضائع ہو جانے پر) مجھے ملامت کرتا تو آپ ﷺ فرماتے جانے دو' اس کو ملامت نہ کرو۔ روایت کے یہ الفاظ مصابیح کے ہیں اور بیہقی نے بھی اس روایت کو الفاظ کی کچھ تبدیلی کے ساتھ شعب الایمان میں نقل کیا ہے"۔

تشریح: ثمان کے آخر سے یاء کو اضافت کی وجہ سے حذف کیا گیا ہے۔ یہ جملہ حال ہے خدمت کے ابتدائی زمانے پر دلالت کر رہا ہے۔ اس وجہ سے مطلق ذکر کیا ہے پھر آگے قید کے ساتھ ذکر کرتے ہوئے خدمت عشر سنین فرمایا۔

اتی : مجہول صیغہ کے ساتھ ہے بمعنی أهلك و اتلف ۔ یعنی کوئی چیز ہلاک اور ضائع ہو جاتی۔ عرب کہتے ہیں: اتی علیهم الدهر جس کا مطلب ہوتا ہے زمانے نے انہیں ہلاک وفنا کر دیا اور "فيه" کی ضمیر "شئ" کی طرف راجع ہے اور جار مجرور نائب فاعل ہیں

علی یدی لفظ یدی ایک نسخہ میں تثنیہ کے صیغہ کے ساتھ ہے جبکہ بعض نسخوں میں مفرد صیغہ کے ساتھ ہے۔

طیبیؒ فرماتے ہیں کہ کلمہ اتی شیء کی صفت ہے۔ عیب وطعن کا معنی اس میں ضمناً پایا جاتا ہے جبکہ علی یدی حال ہے شیء سے۔ ضمیر منصوب ضمیر شان ہے۔ لو قضی شیء کان یعنی ہر چیز کا ٹوٹنا پھوٹنا اور تلف ہونا قضاوقدر الٰہی کے تحت ہوتا ہے۔

تخریج: اس حدیث کو ابن حبان نے بھی اپنی صحیح میں اسی طرح نقل کیا ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے کچھ اوصافِ حمیدہ

۵۸۲۰ : وَعَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ لَمْ يَكُنْ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَاحِشًا وَلَا مُتَفَحِّشًا وَلَا سَخَّابًا فِي الْأَسْوَاقِ وَلَا يَجْزِيْ بِالسَّيِّئَةِ السَّيِّئَةَ وَلٰكِنْ يَعْفُوْ وَيَصْفَحُ (رواه الترمذی)

اخرجه الترمذی فی السنن ٣٢٤/٤ حديث رقم ٢٠١٦ وابن ماجه فی السنن ١٣٩٨/٢ حديث رقم ٤١٧٨ واحمد فی المسند ١٧٤/٦۔

ترجمہ: "حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے' کہتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نہ تو طبعی اعتبار سے فحش گو تھے اور نہ تکلفاً فحش گوئی کرتے تھے۔ (گویا کسی بھی طرح اور کسی بھی حالت میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے فحش گوئی کا صدور نہیں ہوتا تھا) اور نہ ہی بازاروں میں شور وغل کرتے تھے (جیسا کہ عام لوگوں کی عادت ہوتی ہے) اور نہ برائی کا بدلہ برائی سے دیتے تھے بلکہ (برائی کا بدلہ اچھائی کے ساتھ دیتے تھے) معاف کر دیتے اور (ظاہر میں بھی) اس سے درگزر کا معاملہ کرتے تھے"۔ (ترمذی)

تشریح: "فاحشا" ذافحش کے معنی میں ہے۔ اور "متفحشا" کا مطلب یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نہ بتکلف فحش گو تھے اور نہ عمداً۔ (کذافی النہایۃ)

قاضی عیاضؒ لکھتے ہیں کہ اس جملہ میں قولاً وفعلاً ہر دو چیز میں طبعاً وتکلفاً آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے فحش کی نفی کی گئی۔ اھ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں منقول مؤخر لاکر صفت درحقیقت اس آیت قرآنی کے باعث تھا: ﴿فاعف عنهم واصفح ان الله يحب المحسنين﴾

[المائدة : ١٣]

حضور صلی اللہ علیہ وسلم سراپا تواضع

۵۸۲۱ : وَعَنْ اَنَسٍ يُحَدِّثُ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّهٗ كَانَ يَعُوْدُ الْمَرِيْضَ وَيَتْبَعُ الْجَنَازَةَ وَيُجِيْبُ دَعْوَةَ الْمَمْلُوْكِ وَيَرْكَبُ الْحِمَارَ وَلَقَدْ رَاَيْتُهٗ يَوْمَ خَيْبَرَ عَلٰى حِمَارٍ خِطَامُهٗ لِيْفٌ

(رواه ابن ماجة والبيهقي في شعب الايمان)

اخرجه ابن ماجه في السنن ۱۳۹۸/۲حديث رقم ۴۱۷۸وابيهقي في شعب الايمان ۲۸۹/۶حديث رقم ۸۱۹۰۔

ترجمه: "حضرت انس رضی اللہ عنہ نے (ایک موقع پر) نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق (بہترین اخلاق و عادات کا ذکر کرتے ہوئے) بیان کیا کہ "آپ صلی اللہ علیہ وسلم بیماروں کی عیادت کرتے' جنازوں میں شریک ہوتے' مملوک وغلام کی دعوت قبول فرما لیتے اور گدھے پر (بھی) سواری کرتے تھے سوار ہونے میں بھی کوئی تکلف نہیں فرماتے تھے' چنانچہ غزوۂ خیبر کے دن میں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک گدھے پر سوار دیکھا جس کی لگام کھجور کے پوست کی تھی"۔ اس روایت کو ابن ماجہ نے اور شعب الایمان میں بیہقی نے نقل کیا ہے"۔

تشریح: یتبع بائے موحدہ کے ساتھ ہے اور ایک نسخہ میں تائے مشددہ اور یائے مکسورہ کے ساتھ منقول ہے۔

الجنازہ جیم کے فتحہ اور کسرہ کے دونوں کے ساتھ منقول ہے۔ **ويجيب دعوة المملوك** یہاں مملوک سے ماذون' معتق (آزاد کردہ) ہے یا وہ غلام ہے جو اپنے مالک کی جانب سے آپ کو دعوت دیتا تھا۔

ويركب الحمار: اس حدیث میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے جن اوصاف حمیدہ کا ذکر کیا گیا ہے وہ سب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی کسر نفسی' تواضع' حسن خلق اور حسن معاشرت پر دلالت کرتے ہیں۔ **لقد رايته**...... **خطامه** خاء کے کسرہ کے ساتھ لیف یعنی جس کی باگ کھجور کے پوست کی تھی۔ ابن الملک فرماتے ہیں گدھے پر سواری کرنا تمام انبیاء کی سنت ہے۔ میں کہتا ہوں جو گدھے کی سواری سے عار محسوس کرے (جیسے متکبرین اور ہند کے جہال کی عادت ہے) وہ اس گدھے سے بھی بدتر ہیں۔ جامع الاصول میں ہے **كان يجلس على الارض وياكل على الارض ويعتقل الشاة ويجيب دعوة المملوك على خبز الشعير**۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم زمین پر بیٹھا کرتے زمین پر بیٹھ کر کھانا کھاتے اپنے ہاتھ سے بکری کا دودھ دھویا کرتے غلاموں کی دعوت کرتے اگرچہ وہ دعوت جو کی روٹی ہی کیوں نہ ہوتی۔ طبرانی نے جامع الکبیر میں حضرت ابن عباس سے اس کو روایت کیا ہے جبکہ حاکم نے اپنی کتاب مستدرک میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے یوں نقل کیا ہے **كان يردف خلفه ويضع طعامه على الارض ويجيب دعوة المملوك' ويركب الحمار** ۔ اور ایک روایت میں ہے: **عريا ليس عليه شيء** کے الفاظ ہیں۔ کہ آپ سواری پر اپنے پیچھے کسی اور کو بھی بٹھاتے' کھانا زمین پر رکھ کے تناول فرماتے' غلاموں کی دعوت قبول فرماتے' گدھے تک پر سواری فرماتے یا بغیر کسی زین وغیرہ کے ننگی پیٹھ پر سواری کرتے (یعنی کچھ بھی عار نہ سمجھتے)

ابن عساکر نے حضرت ابو ایوب سے نقل کیا ہے: **كان يركب الحمار' ويخصف النعل ويرقع القميص**'

ویلبس الصوف و یقول: من رغب عن سنتی فلیس منی ترجمہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم گدھے پر سواری فرمایا کرتے تھے اپنی جوتیاں خود گانٹھ لیتے تھے اپنے کپڑوں پر خود پیوند لگا کر مرمت کر لیتے حتیٰ کہ اون تک پہن لیتے تھے اور فرماتے جو میری سنت سے اعراض کرے وہ مجھ سے نہیں۔

اپنے ذاتی کاموں میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا معمول

۵۸۲۲ : وَعَنْ عَآئِشَةَ قَالَتْ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَخْصِفُ نَعْلَهٗ وَيَخِيْطُ ثَوْبَهٗ وَيَعْمَلُ فِيْ بَيْتِهٖ كَمَا يَعْمَلُ اَحَدُكُمْ فِيْ بَيْتِهٖ وَقَالَتْ كَانَ بَشَرًا مِّنَ الْبَشَرِ يَفْلِيْ ثَوْبَهٗ وَيَحْلُبُ شَاتَهٗ وَيَخْدُمُ نَفْسَهٗ ۔ (رواہ الترمذی)

اخرجه احمد في المسند ١٦٧٦۔

ترجمہ: "حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنا جوتا خود گانٹھ لیتے تھے اپنا (نیا یا پرانا) کپڑا خود سی لیتے تھے اور گھر میں یونہی کام کرتے تھے جس طرح تم میں سے کوئی شخص اپنے گھر میں کام کاج کرتا ہے" مزید فرمایا: آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بھی ایک ایک ایسے ہی انسان تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے کپڑے کی جوئیں خود دیکھتے تھے اپنی بکری کا دودھ خود دوہتے تھے اور اپنی خدمت آپ صلی اللہ علیہ وسلم کر لیتے تھے (یعنی اپنا ذاتی کام خود ہی کر لیا کرتے تھے کسی دوسرے سے کرنے کے لئے کم ہی کہا کرتے تھے)"۔ (ترمذی)

تشریح: یخصف: صاد کے کسرہ کے ساتھ گانٹھنا' پیوند لگانا اور شرح السنہ میں لکھا ہوا ہے یطبق طاقة علی طاقه: کہ ایک پیوند کو دوسرے پر یا کپڑے کے ایک ٹکڑے کو دوسرے پر جوڑنا۔ کیونکہ "الخصف" کا اصل معنی ملانا اور جمع کرنا ہے۔ باری تعالیٰ کا قول: ﴿ویحصفان علیهما من ورق الجنة﴾ (الاعراف: ٢٨) میں بھی یہی معنی مراد ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام اور حوا علیہا السلام ایک پتے کو دوسرے کے اوپر ڈالتے ہوئے اپنے بدن کو چھپانے لگے۔

اسی سے ہے: ای یطبقان ورقة ورقة علی بدنهما۔

ویخیط خا کے کسرہ کے ساتھ (باب تفعیل سے) ہے ثوبه...... فی بیته یہاں تعیم بعد التخصیص ہے جامع میں بروایت امام احمد ابن حضرت عائشہؓ سے منقول ہے: كان يخيط ثوبه' و يخصف نعله' ويعمل ما يعمل الرجال في بيوتهم کہ آپ خود اپنے کپڑے سی لیا کرتے تھے جوتے گانٹھ لیتے تھے اور جو کام مرد حضرات اپنے گھروں پر کرتے ہیں آپ بھی کیا کرتے تھے۔

یفلی ثوبه یفلی کلمہ لام کے کسرہ کے ساتھ ہے یعنی اپنے کپڑوں کو خود دیکھا کرتے کہ کہیں ان میں جوئیں تو نہیں پڑ گئی ہیں؟ یہ بات اس روایت کے منافی نہیں ہے جس میں آیا ہے کہ جوئیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو پریشان نہیں کرتی تھیں۔ ایک شارحؒ کہتے ہیں یعنی جوئیں نکالا کرتے تھے۔

یحلب: لام کے ضمہ کے ساتھ ہے۔

ویخدم نفسه نصر سے ہے کبھی ضرب سے بھی پڑھا جاتا ہے اس جملہ میں تعیم وتمیم ہے۔

طیبیؒ لکھتے ہیں کہ حضرت عائشہؓ نے یہ بات بطور تمہید فرمائی ہے جس کا مقصد آگے کہی جانے والی بات کے پس منظر کو ظاہر کرنا تھا۔ دراصل حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو کفار ومشرکین یہ کہتے ہیں کہ اگر محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اللہ کے نبی اور رسول ہوتے تو وہ اپنا رہن سہن اور طور وطریقہ عام لوگوں کی طرح نہ رکھتے بلکہ بادشاہوں کی طرح شان وشوکت کے ساتھ رہتے اپنی بڑائی اور دبدبے کو ظاہر کرتے عام لوگوں کے رہن سہن اور طور طریقوں سے اجتناب کرتے۔

ان کی اس بات کو قرآن نے بھی نقل کیا ہے: ﴿مال هذا الرسول یاکل الطعام ویمشی فی الاسواق﴾ (الفرقان:۷) ترجمہ اس رسول کو کیا ہوا کہ وہ عام لوگوں کی طرح کھانا کھاتا ہے اور بازاروں میں چلتا پھرتا ہے۔

پس حضرت عائشہؓ نے کفار کی تردید میں فرمایا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کی مخلوقات ہی میں سے ایک مخلوق (شخص) تھے اولاد آدم میں سے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنی رسالت ونبوت کے منصب عظمیٰ سے سرفراز فرمایا آپ شرف ومرتبت کے سب سے اعلیٰ مقام پر فائز ہونے کے باوجود مخلوق کے ساتھ اخلاق کے ساتھ زندگی گزارتے تھے' اللہ کے ساتھ دل کی سچائی کے ساتھ مخلوق ہی کی طرح کام کرتے اور اللہ کی جانب سے مخلوق تک اس کا پیغام پہنچانے کے لئے تواضع (اور تواضع کی جانب رہنمائی کرنے) اور ترفع سے بچنے کے لئے ان کے کاموں میں تعاون فرمایا کرتے تھے جس کا آپ کو حکم تھا قرآن کریم میں ہے: ﴿قل انما انا بشر مثلكم﴾ (الکہف:۱۱۰) ترجمہ آپ کہہ دیجئے کہ میں تمہارے جیسا ایک انسان ہوں میرے پاس بس یہ وحی آتی ہے۔

تخریج: ابن حبان نے بھی اسی طرح نقل کیا ہے اور یہ روایت صحیح ہے اور جامع الاصول میں ہے: كان يأتي ضعفاء المسلمين' ويزورهم' ويعود مرضاهم و يشهد جنائزهم کہ آپ فقراء مسکین کے پاس جایا کرتے تھے ان کی زیارت فرماتے تھے ان کے بیماروں کی عیادت کرتے اور ان کے جنازوں میں شریک ہوتے۔

اس روایت کو حضرت سہل بن حنیف سے حاکم نے اپنی مستدرک میں ابن حبان نے اپنی صحیح میں اور ابویعلی نے اپنی مسند میں نقل کیا ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنے ہم نشینوں کے ساتھ

۵۸۲۳ : وَعَنْ خَارِجَةَ بْنِ زَيْدِ بْنِ ثَابِتٍ قَالَ دَخَلَ نَفَرٌ عَلٰى زَيْدِ بْنِ ثَابِتٍ فَقَالُوْا لَهٗ حَدِّثْنَا اَحَادِيْثَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ كُنْتُ جَارَهٗ فَكَانَ اِذَا نَزَلَ عَلَيْهِ الْوَحْيُ بَعَثَ اِلَيَّ فَكَتَبْتُهٗ لَهٗ فَكَانَ اِذَاذَكَرْنَا الدُّنْيَا ذَكَرَهَا مَعَنَا وَاِذَا ذَكَرْنَا الْاٰخِرَةَ ذَكَرَهَا مَعَنَا وَاِذَاذَكَرْنَا الطَّعَامَ ذَكَرَهٗ مَعَنَا فَكُلُّ هٰذَا اُحَدِّثُكُمْ عَنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ (رواه الترمذی)

اخرجه البغوی فی شرح السنة ۲۴۵/۱۳ حديث رقم ۳۶۷۹۔

ترجمہ: ''حضرت خارجہ بن زید بن ثابت رضی اللہ عنہ سے مروی ہے' فرماتے ہیں کہ (ایک دن) کچھ لوگ (تابعین کی ایک جماعت) میرے والد محترم' حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کے پاس آئے اور ان سے کہا کہ ہمارے سامنے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی (وہ) احادیث بیان کیجئے (جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خوش خلقی اور عام لوگوں کے ساتھ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بہترین اور خوشگوار تعلقات کو ظاہر کریں) حضرت زید رضی اللہ عنہ نے کہا: میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پڑوس میں رہتا تھا' جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی نازل ہوتی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم مجھے بلا بھیجتے' پس میں وہ وحی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو لکھ دیتا۔ (آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی عادتِ مبارکہ یہ تھی کہ) جب ہم دنیا (کی خرابیوں یا دنیا کے مزرعۃ الآخرۃ ہونے کے اعتبار سے اس کی خوبیوں) کا ذکر کرتے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بھی ہمارے ساتھ اس کا ذکر فرماتے' جب ہم آخرت کا ذکر کرتے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم بھی ہمارے ساتھ آخرت کا ذکر کرتے اور جب ہم کھانے پینے کا ذکر کرتے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم بھی ہمارے ساتھ اس کا ذکر کرتے۔ یہ تمام باتیں میں تم لوگوں کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بتا رہا ہوں''۔ (ترمذی)

راویٔ حدیث:

خارجۃ زید۔ یہ ''خارجہ زید بن ثابت انصاری'' مدنی کے بیٹے ہیں۔ جلیل القدر تابعی ہیں۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے زمانہ کو انہوں نے پایا ہے اپنے والد اور دوسرے حضرات صحابہ سے ان کو سماع حدیث ثابت ہے۔ یہ مدینہ کے فقہائے سبعہ میں سے ہیں۔ پختہ کار اور ثقہ ہیں۔ ان سے زہری رحمہ اللہ نے روایت کی ہے۔ ان کی وفات ۹۹ھ میں ہوئی۔

تشریح: نفر: کا استعمال تین سے دس تک افراد کے لئے ہوتا ہے۔

قوله: احادیث: رسول اللہ ایک نسخہ میں احادیث رسول الله ﷺ کی جگہ عن رسول الله ﷺ کے الفاظ ہیں۔

قال: كنت جاره: اس جملہ سے حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ نے اس طرف اشارہ کیا کہ مجھے روحانی وجسمانی دونوں طور پر بہت زیادہ قرب حاصل تھا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو حالات کا علم دوسروں کی نسبت بہت زیادہ ہے۔

قوله: اذا ذكرنا الدنيا ذكرها معنا: کہ جب ہم دنیا کی خرابیوں یا دنیا کے مزرعۃ الآخرہ ہونے کے اعتبار سے اس کی خوبیوں کا ذکر کرتے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بھی ہمارے ساتھ اس دنیاوی ذکر میں اخروی نقطہ نظر کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے شریک ہو جاتے کیونکہ دنیا آخرت کی زادِراہ ہے: **واذا ذكرنا...... معنا** تو آپ بھی ہمارے ساتھ آخرت کا ذکر کرتے تا کہ یہ ذکر مزید تقویٰ اور خیر کا باعث بنے اور جب ہم کھانے کا ذکر کرتے تھے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کھانے کے آداب' فوائد اور اس کے حکم وغیرہ کے اعتبار سے گفتگو فرمایا کرتے۔ حاصل یہ ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنے صحابہ کے ساتھ گفتگو میں شرکت فرما کر ان کی دل داری فرماتے تھے۔ تا کہ وہ دلبرداشتہ نہ ہوں اور ان کو اکتاہٹ نہ ہو۔ موضوع کی مناسبت سے جن مواعظ احکام کی ضرورت ہوتی ان کو روشناس فرماتے رہتے یہ حدیث اس روایت کے منافی نہیں جس میں ہے: **انه ﷺ كان يخزن لسانه الا فيما يعنيه** آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنی زبان کو محفوظ (بند) رکھتے تھے علاوہ اس بات کے جو کام کی اور ضرورت کی ہو یقیناً آپ کی مجلس خالص علمی مجلس ہوتی تھی کیونکہ بسا اوقات دنیاوی کھانے کے ذکر سے بھی بہت سے علمی' معاشرتی' حکمی اور ادبی فوائد بھی حاصل ہوتے ہیں۔ (لہٰذا جس

مجلس میں کسی بھی ایسے دنیاوی امور سے متعلق گفتگو ہو جن سے مذکورہ فائدے حاصل ہوتے ہوں تو اس مجلس کو بھی علمی مجلس ہی شمار کیا جائے گا) اور بالفرض یہ مجلس ان فوائد سے خالی بھی ہوتی تو تب بھی اس حدیث میں اس بات کی طرف بھی اشارہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنے صحابہ سے اکثر مباح امور میں بھی بات کر لیا کرتے تھے تاکہ وہ اس کا جواز جان لیں اور بیان جواز کے لئے اس طرح کی بات چیت میں حصہ لینا آپ پر واجب بھی تھا۔ واللہ اعلم

فکل ھذا رفع نصب دونوں کے ساتھ جائز ہے ای جمیع ما ذکر ہے **احدثکم**: اس جملے کے اعراب کے متعلق بعض کہتے ہیں روایت رفع کے ساتھ ہے اور اس کی خبر سے حرف رابط محذوف ہے۔ اس کو حالت نصب کے ساتھ پڑھنا بھی جائز ہے۔ ای احدثکم ایاہ۔ اس جملہ (**فكل هذا أحدثكم عن رسول الله ﷺ**) سے حضرت زیدؓ کا مقصود حدیث کا صحت کی تاکید اور اس کے اہتمام کا اظہار ہے۔ واللہ اعلم۔

مصافحہ مواجہہ اور مجلس میں نشست کا طریقہ

۵۸۲۴ : وَعَنْ اَنَسٍ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَانَ اِذَا صَافَحَ الرَّجُلَ يَنْزِعُ يَدَهُ مِنْ يَدِهِ حَتّٰى يَكُوْنَ هُوَ الَّذِىْ يَنْزِعُ يَدَهُ وَلَا يَصْرِفُ وَجْهَهُ عَنْ وَجْهِهِ حَتّٰى يَكُوْنَ هُوَ الَّذِىْ يَصْرِفُ وَجْهَهُ عَنْ وَجْهِهِ وَلَمْ يُرَ مُقَدِّمًا رُكْبَتَيْهِ بَيْنَ يَدَىْ جَلِيْسٍ لَّهُ۔ (رواه الترمذی)

اخرجه الترمذی فی السنن ٥٦٤/٤ حديث رقم ٢٤٩٠ واخرجه ابن ماجه ١٢٢٤/٢ حديث رقم ٣٧١٦۔

ترجمہ: "حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے' فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب کسی آدمی سے مصافحہ کرتے تو اپنا ہاتھ اُس کے ہاتھ سے اس وقت تک علیحدہ نہ کرتے جب تک کہ وہی شخص اپنا ہاتھ علیحدہ نہ کر لیتا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنا چہرۂ انور اس کے چہرہ سے نہیں ہٹاتے تھے جب تک کہ وہی شخص اپنا چہرہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے چہرۂ انور کے سامنے سے نہ ہٹا لیتا' نیز آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی (مجلس میں) اپنے ہم نشین کے آگے گھٹنے نکال کر بیٹھے ہوئے نہیں دیکھا گیا"۔ (ترمذی)

تشریح: ینزع زاء کے کسرہ کے ساتھ (ضرب سے)۔

لم یر صیغہ مجہول کے ساتھ۔

مقدماً: دال مشددہ کے کسرہ کے ساتھ۔ **جلیس**: بمعنی مجالس ہے۔ **له** بعض حضرات کہتے ہیں اس سے مراد یہ ہے کہ کسی مجلس میں اس طرح نہیں بیٹھتے کہ آپ کے گھٹنے برابر میں بیٹھے ہوئے شخص سے آگے ہو جائیں جیسا کہ متکبرین تھے۔ لوگوں کی عادت ہوتی ہے۔ مراد یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم گھٹنے جھکا کر بیٹھتے تھے۔ لوگوں کے سامنے اپنے گھٹنے کھڑے کر کے نہیں بیٹھتے بعض حضرات نے یہ لکھا ہے کہ دو رکبتین سے مراد رجلین ہیں اور ان کے آگے بڑھانے سے مراد مجلس میں پاؤں لمبا اور پھیلا کر بیٹھنا ہے۔ جیسے کہا جاتا: قدم رجلا واخر اخری یعنی ایک پاؤں آگے کیا دوسرا پیچھے۔ مطلب یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم آداب مجلس کا لحاظ کرتے ہوئے کبھی کسی کے سامنے پاؤں پھیلا کر نہیں بیٹھتے تھے۔

طیبیؒ لکھتے ہیں حدیث کے اس جملہ: "کان لاینزع یدہ قبل نزع صاحبه" میں امت کے لئے یہ تعلیم ہے کہ اپنے

مسلمان بھائی کی تعظیم وتکریم کرے۔ چنانچہ مفارقت میں پہل نہ کرے اور نہ اس کی طرف پاؤں پھیلا کر اس کی اہانت کرے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا کمال توکل

۵۸۲۵ : وَعَنْهُ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَانَ لَا يَدَّ خِرُشَيْئًا لِغَدٍ (رواه الترمذی)

اخرجه الترمذی فی السنن ٤/١٠٥ حديث رقم ٢٣٦٢۔

ترجمہ: ''اور حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کبھی کل کے لئے کوئی چیز ذخیرہ نہیں کرتے تھے۔

تشریح: شیئاً لغد: کبھی کل کے لئے کوئی چیز ذخیرہ نہ کرنا۔ اللہ پر توکل اور اس کے خزانوں پر اعتماد کی وجہ سے لیکن یہ بات صرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات کی حد تک محدود تھی۔ البتہ اپنے اہل وعیال کے ضعف حال، عدم قوت برداشت اور قلت کمال کے باعث بسا اوقات ایک سال کی اصل ضروریات کے بقدر چیزیں جمع کر کے رکھ دیتے تھے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی کم گوئی کا ذکر

۵۸۲۶ : وَعَنْ جَابِرِ بْنِ سَمُرَةَ قَالَ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ طَوِيْلَ الصَّمْتِ

(رواه فی شرح السنة)

اخرجه احمد فی المسند ٥/٨٦۔

ترجمہ: ''حضرت جابر بن سمرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اکثر اوقات خاموش رہتے تھے''۔
اس راویت کو بغوی نے (اپنی سند کے ساتھ) شرح السنۃ میں نقل کیا ہے''۔

تشریح: الصمت: کثیر السکوت۔ یعنی (زیادہ خاموش رہنے والے) کے معنی میں ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ضرورت کے مطابق بات کرتے تھے۔ چنانچہ شیخینؒ نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے: من كان يؤمن بالله واليوم الآخر فليقل خيرا او ليسكت ''جو شخص اللہ تعالیٰ اور آخرت پر یقین رکھتا ہو اس کو چاہئے کہ اچھی بات کرے ورنہ خاموش رہے''۔
حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ فرماتے تھے: ليتني كنت أخرس الا عن ذكر الله۔ کاش! اللہ کے ذکر کے موقع کے علاوہ میں گونگا ہوتا۔

امام احمدؒ نے اپنی مسند میں بھی حضرت جابر بن سمرۃ سے نقل کیا ہے: كان طويل الصمت قليل الضحك۔ ''آپ کم ہنسنے والے تھے'' زیادہ خاموشی اختیار کرنے والے تھے۔

توضیح:

صاحب مشکوۃ کو چاہئے تھا کہ وہ اس روایت کی نسبت ان ہی کی طرف کرتے۔ کیونکہ مسند احمد کی حدیث معتمد علیہ احادیث

میں سے ہے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی گفتگو کا انداز

۵۸۲۷ : وَعَنْ جَابِرٍ قَالَ كَانَ فِيْ كَلَامِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ تَرْتِيْلٌ وَتَرْسِيْلٌ .

(رواہ ابوداود)

اخرجه ابوداود في السنن ۵/۱۷۱ حديث رقم ۴۸۳۸۔

ترجمہ:" حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے' فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے الفاظ کی ادائیگی میں ترتیل اور ترسیل کا لحاظ ہوتا تھا"۔ (ابوداؤد)

تشریح: قوله: و عن جابر: یہاں حضرت کا بر سے مراد جابر بن عبداللہؓ ہیں' اسی لئے تو "وعنہ" نہیں کہا۔ جب مطلق جابر آ جائے تو اس سے جابر بن عبداللہ مراد ہوتے ہیں۔

قال: كان في كلام رسول الله ﷺ ترتيل و توسيل : ترتیل جب قرآن پڑھتے تو ترتیل سے پڑھتے کیونکہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:...... ﴿ورتل القرآن ترتيلا﴾ (المزمل:٤) "جب گفتگو کرتے تو ٹھہر ٹھہر کر کرتے تھے یا تو پہلے والے حکم پر قیاس کرتے ہوئے یا باری تعالیٰ کے قول: ﴿وما على الرسول الاالبلاغ المبين﴾ (یس:۱۷) کی رعایت کرتے ہوئے۔

ابن الملکؒ کہتے ہیں ترتیل اور ترسیل دونوں کا معنی ایک ہی ہے یعنی حروف میں تبین وایضاح (یعنی ہر لفظ کا ظاہر ہونا اور واضح ہونا)۔ یعنی "ترتیل" کے بعد "ترسیل" کا لفظ تاکید کے لئے ہے اور اصل معنی میں اتحاد ہے۔ لیکن یہ امر مخفی نہیں کہ تاکید پر حمل کرنے کے بجائے تقیید پر اس کی بنیاد رکھنا زیادہ اولیٰ ہے۔ اگر چہ دونوں کا حاصل ایک ہے اور اصل معنی میں اتحاد ہے کیونکہ دونوں سے مراد یہ ہے کہ حروف کی ادائیگی میں جلد بازی نہ کرتے تھے بلکہ مخارج وصفات ہر دونوں کے لحاظ سے ٹھہراؤ اور صفائی کے ساتھ ساتھ حرکات وسکنات میں بھی امتیاز کرتے ہوئے کلام فرماتے تھے۔ خلاصہ کلام یہ ہے کہ عجلت کی نفی اور تودت (ٹھہراؤ کا) اثبات مقصود ہے۔

نہایہ میں لکھا ہے حروف وسکنات کو واضح وظاہر کر کے خوش اسلوبی کے ساتھ پڑھنا۔ "سورتل" کے ساتھ تشبیہ ہے۔ جس کو اقحوان کے نور کے ساتھ تشبیہ دی جاتی ہے۔ کہا جاتا ہے: رتل القراة وترتل فيها (قرآن کو ٹھہر ٹھہر کر عمدہ طریقہ سے پڑھا)۔ اور ترسیل کے معنی ترتیل کے ہیں عرب میں جب کوئی شخص اطمینان وسکون کے ساتھ بات کرے یا چلے تو کہتے ہیں: ترسل الرجل في كلامه و مشيه ترسیل اور ترتیل دونوں برابر ہیں (یعنی ایک چیز ہیں)۔

۵۸۲۸ : وَعَنْ عَآئِشَةَ قَالَتْ مَا كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَسْرُدُ سَرْدَكُمْ هٰذَا وَلٰكِنَّهٗ كَانَ يَتَكَلَّمُ بِكَلَامٍ بَيْنَهٗ فَصْلٌ يَحْفَظُهٗ مَنْ جَلَسَ اِلَيْهِ (رواه الترمذي)

اخرجه الترمذي في السنن ۵/۶۰۰ حديث رقم ۳۶۳۹ واحمد في المسند ۶/۲۵۷۔

ترجمہ:" حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے' فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی گفتگو تمہاری طرح مسلسل نہیں

ہوتی تھی بلکہ آپ ﷺ اس طرح ٹھہر ٹھہر کر کلام فرماتے کہ جو شخص آپ ﷺ کے پاس بیٹھا ہوا ہوتا (پوری گفتگو کو) اچھی طرح یاد کر لیتا"۔(ترمذی)

آپ ﷺ کے چہرۂ مبارک پہ اکثر مسکراہٹ رہتی

۵۸۲۹ : وَعَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ الْحَارِثِ بْنِ جَزْءٍ قَالَ مَا رَأَيْتُ اَحَدًا اَكْثَرَ تَبَسُّمًا مِنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ. (رواه الترمذی)

اخرجه الترمذی فی السنن ٥/٦١ حديث رقم ٣٦٤١ واحمد فی المسند ٤/١٩٠۔

ترجمہ:"حضرت عبداللہ بن حارث بن جزء رضی اللہ عنہ سے مروی ہے' فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے زیادہ کسی کو مسکراتے نہیں دیکھا"۔

وحی کا انتظار

۵۸۳۰ : وَعَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ سَلَامٍ قَالَ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذَا جَلَسَ يَتَحَدَّثُ يُكْثِرُ اَنْ يَّرْفَعَ طَرْفَهٗ اِلَى السَّمَآءِ. (رواه ابوداود)

اخرجه ابوداود فی السنن ٥/١٧١ حديث رقم ٤٨٣٧۔

ترجمہ:"حضرت عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ سے مروی ہے' فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ جب گفتگو کرنے بیٹھتے تو آپ ﷺ کی نگاہ اکثر آسمان کی طرف اٹھتی رہتی تھی"۔(ابوداؤد)

تشریح: يكثر : باب افعال سے ہے' اس کا معنی ہے: يتحقق منه كثيرا۔

طرفه: راء کے سکون کے ساتھ' بمعنی نظر۔

اس ارشادِ گرامی کا حاصل یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ دورانِ گفتگو اپنی نگاہ اکثر آسمان کی طرف اٹھاتے تھے اور یہ رفع بصر کئی وجوہ کے پیش نظر ہوتا تھا:

الفصل الثالث:

اہل وعیال پر شفقت نبوی ﷺ

۵۸۳۱ : عَنْ عَمْرِو بْنِ سَعِيْدٍ عَنْ اَنَسٍ قَالَ مَا رَأَيْتُ اَحَدًا كَانَ اَرْحَمَ بِالْعِيَالِ مِنْ رَّسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَانَ اِبْرَاهِيْمُ ابْنُهٗ مُسْتَرْضِعًا فِىْ عَوَالِى الْمَدِيْنَةِ فَكَانَ يَنْطَلِقُ وَنَحْنُ مَعَهٗ فَيَدْخُلُ الْبَيْتَ وَاِنَّهٗ لَيُدَّخَنُ وَكَانَ ظِئْرُهٗ قَيْنًا فَيَاْخُذُهٗ فَيُقَبِّلُهٗ ثُمَّ يَرْجِعُ قَالَ عَمْرٌو فَلَمَّا تُوُفِّىَ

اِبْرَاهِيمُ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ اِبْرَاهِيمَ ابْنِي وَاِنَّهُ مَاتَ فِي الثَّدْيِ وَاِنَّ لَهُ لَظِئْرَ يْنِ تُكَمِّلَانِ رَضَاعَهُ فِي الْجَنَّةِ. (رواہ مسلم)

اخرجه مسلم في صحيحه ١٨٠٨/٤ حديث رقم ٦٣/٢٣١٦ واحمد في المسند ١١٢/٣۔

ترجمہ: ''حضرت عمرو بن سعید حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے کہا: ''میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ کسی کو اپنے بچوں پر مہربان اور شفیق نہیں دیکھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے صاحبزادے ابراہیم رضی اللہ عنہ (جو ماریہ قبطیہؓ کے بطن سے تھے) بالائی مدینہ میں زیر رضاعت تھے' آپ صلی اللہ علیہ وسلم اکثر اس محلّہ میں جایا کرتے تھے ہم بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہوتے تھے' آپ صلی اللہ علیہ وسلم وہاں پہنچ کر (دایہ کے) گھر میں تشریف لے جاتے تھے جہاں دھواں گھٹا ہوتا تھا کیونکہ دایہ کا شوہر لوہار تھا اور ان کی بھٹی کا دھواں گھر میں چاروں طرف بھرا رہتا تھا پھر ابراہیم رضی اللہ عنہ کو گود میں لیتے' پیار کرتے اور اپنے گھر واپس آ جاتے۔ حضرت عمرو نے (حضرت انس رضی اللہ عنہ سے نقل کر کے) بیان کیا کہ جب ابراہیم رضی اللہ عنہ فوت ہوئے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''ابراہیم میرا بیٹا ہے زمانہ شیر خوارگی میں فوت ہوا ہے' (دنیا کی ایک دائی کے بدلے میں) اس کے لئے جنت میں دو دائیاں متعین کی گئی ہیں جو اس کی مدت رضاعت پوری کریں گی''۔ (مسلم)

قولہ: وعن عمرو بن سعيد عن انس: مشہور اصول اور معتمد نسخوں میں اسی طرح ہے' کاشف میں موجود روایت سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔ اور ایک نسخہ میں ''عن انس عن عمرو بن سعد'' منقول ہے کہ زلۂ کلام قلب کلام اور سہو قلم ہے۔ کیونکہ مؤلف کی کتاب اسماء الرجال میں لکھا ہے کہ یہ وہ عمرو بن سعید ہیں ثقیف بصری کے مولیٰ ہیں۔ حضرت انس اور ابوالعالیہ وغیرہما سے روایت کرتے ہیں اور ان سے ابن عون' جریر' ابن حازم اور کئی اور حضرات روایت کرتے ہیں۔

قولہ: مارأيت احدا كان ارحم بالعيال من رسول الله ﷺ: امام نوویؒ لکھتے ہیں مشہور یہی ہے اور بعض روایات میں ''بالعباد'' منقول ہے۔ میں کہتا ہوں یہاں ''العیال'' کے الفاظ ہی زیادہ مناسب ہیں۔ قرینہ یہ ہے کہ اس کے بعد جملہ مستانفہ بیانیہ ہے۔ **كان ابراهيم ابنه مسترضعاً۔ مسترضعا** ضاد کے فتحہ کے ساتھ ہے' بعض نے ضاد پر کسرہ کے ساتھ کہا ہے۔ **ليدخن** یاء کے ضمہ' دال کی تشدید اور خاء کے فتحہ کے ساتھ ہے۔ جبکہ ایک نسخہ میں یاء کے فتحہ دال کی تشدید اور خاء کے کسرہ کے ساتھ ہے ایک اور نسخہ میں دال کے سکون کے ساتھ ہے۔ پھر اس گھر میں زیادہ دھواں ہونے کی وجہ ذکر کرتے ہیں **و كان ظئره قينا** یہ لوہار ابو سیمین ہیں جن کا اصل نام براء بن اوس انصاری ہے۔ یہ صاحب اپنی کنیت سے مشہور ہیں۔

امام نوویؒ لکھتے ہیں لفظ ظئر ظاء کے کسرہ کے ساتھ مہموزہ ہے۔

''ظئر'' دوسرے کے بچہ کو دودھ پلانے والی دایہ کو کہتے ہیں ساتھ دایہ اور انا کے شوہر کو بھی ظئر کہتے ہیں۔ اور القین قاف کے فتحہ کے ساتھ لوہار کو کہتے ہیں پھر یہ دونوں جملے معترضہ اور حالیہ ہیں۔ جملہ معطوف علیہ یعنی **فيدخل** اور معطوف **فياخذه** کے درمیان یاخذہ کی ضمیر منصوب آپ کے صاحب زادے حضرت ابراہیم کی طرف راجع ہے۔

فيقبله...... عمرو قال عمرو سے آگے کا کلام حضرت انسؓ سے نقل کرتے ہوئے کہتے ہیں راوی سے بعض لوگوں کو اس کا شبہ ہوا ہے کہ جو راوی سے منقول ہے لیکن ایسا نہیں کیونکہ راوی تابعین میں سے ہیں البتہ یہ ممکن ہے کہ اگلا مقولہ ماقبل سے منقطع

ہونے کے باوجود اس جملہ پر موقوف ہے۔

فلما...... ابني: حضرت ابراہیم کی والدہ لونڈی تھیں یہ حضرت ماریہ قبطیہ ہیں شاہ مصر واسکندریہ مقوقس قبطی نے بطور ہدیہ آپ کی خدمت میں بھیجا تھا۔

ذی الحجہ ۸ھ میں حضرت ابراہیم ان کے بطن سے پیدا ہوئے۔

وانه مات في الثدي: یہ کنایہ ہے مدت رضاعت سے یا اس سے مراد دودھ ہے۔ اور جو خاتون حضرت ابراہیم کو دودھ پلا رہی تھی ان کا نام ام بردہ تھا۔ (**كذا ذكره المؤلف**) محل بول کر حال مراد ہے۔ اور طیبی فرماتے ہیں: **اى في سن رضاع الثدي او في حال تغذية بلبن الثدي**۔

طیبیؒ لکھتے ہیں: تکملان ۔ **تکملان** باب افعال سے ہے۔ اور ایک نسخہ میں باب تفعیل سے منقول ہے جس کا معنی ہے وہ دونوں اس مدت کو پوری کر رہی ہیں۔

اور لفظ رضاع راء کے فتحہ کے ساتھ ہے کبھی کسرہ بھی دیا جاتا ہے (مدت رضاع مراد ہے شیر خوارگی کی مدت دو سال) پورے ہونے تک دودھ پلائیں گی کیونکہ جس وقت حضرت ابراہیم فوت ہوئے تو ان کی عمر سولہ یا سترہ مہینے تھی بعض کہتے ہیں کہ ستر دن کے تھے۔ **في الجنة**۔ وہ دونوں مل کر دو سال کے پورا ہونے تک دودھ پلائیں گی۔ صاحب تحریر کہتا ہے کہ حضرت ابراہیم کو ان کے اعزاز اور آنحضرت کے اعزاز کی خاطر موت کے فوراً بعد جنت میں داخل کر کے ان کی مدت رضاعت کی ختم تک کے لئے شیر خوارگی کا انتظام کیا گیا۔ باقی حدیث **لو عاش ابراهيم لكان صديقا نبيا** (کہ اگر ابراہیم زندہ ہوتے تو سچے نبی ہوتے) تو اس کو ماوردی نے حضرت انسؓ سے نقل کیا ہے ابن عساکر نے حضرت جابر ابن عباس اور ابن ابی اوفی سے۔ جبکہ ابن سعد نے زہری سے مرسلاً دو روایتیں نقل کی ہیں۔

① حضرت مکحول سے نقل کیا ہے: **لو عاش ابراهيم مارق له خال** اگر ابراہیم زندہ ہوتے تو ان کے ننھیال کبھی غلام نہ رہتے۔
ابن سعد نے زہری سے مرسلاً نقل کیا ہے: **لو عاش ابراهيم لوضعت الجزية عن كل قبطي** ''اگر ابراہیم زندہ رہتے تو ہر قبطی سے جزیہ ساقط ہو جاتا۔''

امام جلال الدین سیوطیؒ نے جامع صغیر میں اسی طرح نقل کیا ہے۔

ابن ربیعؒ اپنی کتاب ''**تمييز الطيب من الخبيث**'' میں لکھتے ہیں: ابن ماجہ وغیرہ نے ابن عباسؓ سے ایک روایت نقل کی ہے کہ ابن عباسؓ فرماتے ہیں: **لما مات ابراهيم ابن النبي ﷺ وقال ان له مرضعا في الجنة' ولو عاش لكان صديقا نبيا' ولو عاش اعتقت اخواله من القبط' وما استرق قبطي**۔

''جب آپ ﷺ کے صاحبزادہ حضرت ابراہیم کی وفات ہوئی تو آنحضرت ﷺ نے فرمایا: ابراہیم کے لئے اللہ نے جنت میں دایہ مقرر فرما دی ہے اگر ابراہیم زندہ رہتے تو سچے نبی ہوتے اگر وہ زندہ رہتے تو بنو قبط میں سے ان کے ننھیال والے قبطی آزاد ہو جاتے اور کوئی قبطی غلام نہ رہتا''۔

اس روایت کی سند میں ابو شیبہ ابراہیم ~~ابن عثمان~~ واسطی ہیں جو کہ ضعیف ہے۔ واللہ اعلم۔

امام نوویؒ اپنی کتاب تہذیب میں لکھتے ہیں متقدمین سے جو ایک حدیث نقل کی جاتی ہے: ''لو عاش ابراھیم لکان نبیا'' یہ باطل ہے اور مغیبات میں کلام کرنے کی جسارت ہے اور محض اٹکل ہے بلکہ عظیم ذات پر بڑا حملہ ہے۔

ابن عبدالبر اپنی کتاب تمہید میں لکھتے ہیں ''لا ادری ما ھذا'' میں نہیں جانتا یہ کیسی بات ہے۔ دلیل نفی کے طور پر لکھتے ہیں حضرت نوح کو سارے غیر نبی اولاد پیدا ہوئے اگر ہر نبی کو نبی پیدا ہوتے ہیں تو نوح علیہ السلام کی تمام اولاد بھی نبی ہونے چاہیے تھے کیونکہ وہ بھی تو نوح ہی کی اولاد سے تھے۔

لیکن یہ بہت کمزور دلیل ہے کیونکہ (متقدمین کے) کلام میں سے کوئی کلام اس پر دلالت نہیں کر رہا ہے کہ ہر نبی کا بیٹا نبی ہی ہوا کرتا ہے۔ بفرضِ تقدیر کی قید کے ساتھ اگر کوئی خاص بات بیان کی جائے تو اس میں کوئی حرج کی بات نہیں ہوتی۔ لہٰذا یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خاتم النبیین ہونے کے منافی نہیں ہے بلکہ یہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس قول مبارک کے قریب قریب ہے جس کو امام حاکم' امام ترمذیؒ اور امام احمدؒ نے حضرت عقبہ بن عامرؓ سے مرفوعاً نقل کیا ہے: لو کان بعدی نبی لکان عمر بن الخطاب اگر میرے بعد کوئی نبی ہوتا تو وہ عمر بن خطاب ہوتے۔ باقی وہ کیسے تھے کیسے ہوتے کیسے نہ ہوتے اگر ہوتے تو کس حال میں ہوتے یہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ زیادہ جانتا ہے۔

ہمارے شیخ المشائخ عالم ربانی حافظ ابن حجر عسقلانیؒ ''الاصابہ'' میں لکھتے ہیں: امام نووی سے یہ عجیب بات صادر ہوئی ہے حالانکہ یہ روایت تین صحابہ کرام سے (آئی ہے) ثابت ہے اور کسی صحابی کے بارے میں یہ گمان نہیں ہوسکتا کہ وہ اس طرح کی بات اپنے اندازے سے کہے۔

میں (ملا علی قاریؒ) کہتا ہوں مزید یہ کہ ان حضرات نے یہ روایت موقوفاً نقل نہیں کی ہے۔ بلکہ مرفوعاً منقول ہے' چنانچہ امام جلال الدین سیوطیؒ نے ایک مستقل رسالہ میں کافی سندوں کے ساتھ اس کو ذکر کیا ہے۔ علاوہ ازیں قواعد معتبرہ کے لحاظ سے بھی یہ بات ثابت ہے کہ کسی صحابی کی موقوف روایت'' کہ جس کے متعلق یہ تصور نہ کیا جاسکتا ہو کہ اس نے وہ بات اپنی رائے سے کہی ہوگی'' تو وہ مرفوع کے حکم میں ہوتی ہے چنانچہ مذکورہ روایت مرفوع روایت کے حکم میں ہے۔ باقی امام نوویؒ کا ابن عبدالبرؒ کی طرح اس کا انکار کرنا شاید دو وجہوں سے ہے۔ اس کی تفصیل ان کی نظروں سے نہیں گزری یا اس کی کوئی اچھی تاویل ان پر ظاہر نہیں ہوئی واللہ اعلم۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک یہودی عالم کے ساتھ طرزِ عمل

۵۸۳۲ : وَعَنْ عَلِيٍّ اَنَّ يَهُوْدِيًّا كَانَ يُقَالُ لَهٗ فُلَانٌ حَبْرٌ كَانَ لَهٗ عَلٰى رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ دَنَانِيْرُ فَتَقَاضَى النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ لَهٗ يَا يَهُوْدِيُّ مَا عِنْدِيْ مَا اُعْطِيْكَ قَالَ فَاِنِّيْ لَا اُفَارِقُكَ يَا مُحَمَّدُ حَتّٰى تُعْطِيَنِيْ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذًا اَجْلِسُ مَعَكَ فَجَلَسَ مَعَهٗ فَصَلّٰى رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ الظُّهْرَ وَالْعَصْرَ وَالْمَغْرِبَ وَالْعِشَاءَ الْاٰخِرَةَ

وَالْغَدَاةَ وَكَانَ اَصْحَابُ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَتَهَدَّدُوْنَهُ وَيَتَوَعَّدُوْنَهُ فَفَطِنَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَا الَّذِىْ يَصْنَعُوْنَ بِهٖ فَقَالُوْا يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ يَهُوْدِيٌّ يَحْبِسُكَ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ مَنَعَنِىْ رَبِّىْ اَنْ اَظْلِمَ مُعَاهِدًا وَغَيْرَهٗ فَلَمَّا تَرَجَّلَ النَّهَارُ قَالَ الْيَهُوْدِيُّ اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَشْهَدُ اَنَّكَ رَسُوْلُ اللّٰهِ وَشَطْرُ مَالِىْ فِىْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمَا وَاللّٰهِ مَا فَعَلْتُ بِكَ الَّذِىْ فَعَلْتُ بِكَ اِلَّا لِاَنْظُرَ اِلٰى نَعْتِكَ فِى التَّوْرَاةِ مُحَمَّدُ بْنُ عَبْدِ اللّٰهِ مَوْلِدُهٗ بِمَكَّةَ وَمُهَاجَرُهٗ بِطِيْبَةَ مُلْكُهٗ بِالشَّامِ لَيْسَ بِفَظٍّ وَلَا غَلِيْظٍ وَلَا سَخَّابٍ فِى الْاَسْوَاقِ وَلَا مُتَزَيٍّ بِالْفُحْشِ وَلَا قَوْلِ الْخَنَا اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَنَّكَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَهٰذَا مَالِىْ فَاحْكُمْ فِيْهِ بِمَا اَرَاكَ اللّٰهُ وَكَانَ الْيَهُوْدِيُّ كَثِيْرَ الْمَالِ۔ (رواہ البیہقی فی دلائل النبوت)

رواه البيهقي في دلائل النبوة ٦/ ٢٨٠۔

ترجمہ: ''حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے مروی ہے کہ فلاں نام کا ایک یہودی عالم تھا رسول اللہ ﷺ کے ذمہ اس کے کچھ دینار قرض تھے (ایک دن) اس یہودی نے آ کر آپ ﷺ سے (اُن دیناروں کا) تقاضا کیا' آپ ﷺ نے اس سے فرمایا کہ اے یہودی! تمہیں دینے کے لئے اس وقت میرے پاس کچھ نہیں ہے (یعنی نہ تو میرے پاس دینار ہیں کہ تمہارا قرض چکا دوں اور نہ کوئی ایسی چیز ہے جو ان دیناروں کے بدلہ میں تمہیں دے کر تمہارا مطالبہ بے باق کر دوں)۔ یہودی نے کہا: ''محمد (ﷺ) میں اس وقت تک یہاں سے نہیں ٹلوں گا جب تک تم میرا قرض ادا نہیں کر دو گے'' تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: تو پھر میں تمہارے پاس بیٹھ جاتا ہوں۔ آپ ﷺ اس کے پاس بیٹھ گئے اور اسی جگہ (یہودی کے سامنے) رسول کریم ﷺ نے ظہر کی' عصر کی' مغرب کی' عشاء کی اور پھر (اگلی صبح) فجر کی نماز پڑھی۔ صحابہؓ اس یہودی کو ڈرا دھمکا رہے تھے (اور کہہ رہے تھے کہ اگر تو اپنی گستاخی سے باز نہ آیا اور آنحضرت ﷺ کو اس طرح پابند بنائے رکھا تو مجبوراً ہم تجھے یہاں سے اٹھا کر پھینک دیں گے یا قتل کر ڈالیں گے) آپ ﷺ سمجھ گئے کہ صحابہ ؓ اس یہودی کو ڈرا دھمکا رہے ہیں (تو آپ ﷺ نے ان کو سختی سے منع فرمایا یا غضبناک نگاہوں سے ان کی طرف دیکھ کر گویا واضح کر دیا کہ تمہارا یہ عمل مجھے ہرگز پسند نہیں ہے) صحابہؓ نے (آنحضرت ﷺ کی ناگواری دیکھ کر معذرت کے انداز میں) عرض کیا کہ یا رسول اللہ (ﷺ) ایک یہودی نے آپ ﷺ کو روک رکھا ہے اور یہاں بیٹھے رہنے پر مجبور کر رہا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''(کیا تمہیں نہیں معلوم کہ) اللہ تعالیٰ نے کسی ذمی وغیرہ پر ظلم کرنے سے مجھے منع فرمایا ہے۔ جب دن نکلا تو وہ یہودی بول اٹھا'' میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود برحق نہیں اور میں گواہی دیتا ہوں کہ یقیناً آپ ﷺ اللہ کے رسول ہیں۔ (پھر اس نے کہا کہ یا رسول اللہ!) میں (قبول اسلام کی توفیق ملنے کے شکرانہ اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے اور زیادہ اجر و انعام کی امید میں اپنے مال کا نصف حصہ اللہ کی راہ میں صدقہ کرتا ہوں۔ (آپ ﷺ اور یہاں موجود سارے صحابہ) جان لیں کہ خدا کی قسم میں نے اس وقت آپ ﷺ کے ساتھ سخت رویہ اختیار کیا کہ میں آپ ﷺ میں ان اوصاف کو آزمانا چاہتا تھا جس کا ذکر تورات میں موجود ہے (اور تورات میں وہ اوصاف اس طرح مذکور ہیں) کہ ان کا اسم گرامی محمد ﷺ ہوگا' عبداللہ کے

بیٹے ہوں گے' ان کی پیدائش مکہ میں ہوگی' وہ مدینہ طیبہ کی طرف ہجرت کریں گے' ان کی مملکت کی سرحدیں شام (اور اس کے گرد و نواح) تک پھیلی ہوں گی' وہ نہ بدزبان ہوں گے نہ سنگدل' نہ بازاروں میں شور و غل کرنے والے ہوں گے' نہ فحش کی وضع اختیار کرنے والے اور نہ ہی بے یاوہ گوئی کرنے والے ہوں گے۔ میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبودِ برحق نہیں اور یہ کہ یقیناً آپ صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے رسول ہیں۔ (یارسول اللہ!) یہ میرا مال حاضر ہے آپ صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے حکم کی روشنی میں اس (سارے مال یا نصف مال) کے متعلق جو مناسب سمجھیں فیصلہ فرمائیں۔ وہ یہودی بہت مالدار تھا اللہ نے اس مال کے ساتھ اس کا حال و منال اور اس کا بھی اچھا کر دیا۔ اس روایت کو بیہقی نے دلائل النبوۃ میں نقل کیا ہے''۔

تشریح: فلان: یہ اس کے نام سے کنایہ ہے۔

ما عندی ما اعطیك اس جملہ میں پہلا ''ما'' نافیہ ہے اور دوسرا ''ما'' موصوفہ ہے۔ **ای شیئا أعطیك ایاہ عوضا عن الدنانیر۔ حتی** ''کی'' یا ''الآن'' کے معنی میں ہے۔

اذا تنوین کے ساتھ ہے۔

اجلس : رفع کے ساتھ ہے اور ایک نسخہ میں نصب کے ساتھ ہے۔ **و الغداۃ**: یہاں غداۃ سے اگلی فجر کی نماز مراد ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم صبح تک کہاں بیٹھے رہے۔ اس میں دو احتمال ہیں۔ مسجد نبوی میں یا کسی حجرہ مبارک میں۔ پہلا احتمال زیادہ ظاہر معلوم ہوتا ہے۔ قرینہ اگلا جملہ ہے: **و کان اصحاب رسول اللہ یهددونه**۔

ففطن طاء کے کسرہ کے ساتھ: **ما الذی یصنعون به**: یہاں **ما** موصول ہونے کے ساتھ ساتھ موصوفہ بھی ہے۔

یارسول اللہ: یھودی یحبسك۔ طیبیؒ لکھتے ہیں یہاں ہمزہ انکاری مقدر ہے اور لفظ یہودی کی تنکیر تحقیر کے لئے ہے۔ اور ''معاہد'' کو مقدم ذکر کیا۔ **معاهدا**: ہاء کی کسرہ کے ساتھ' اس سے ذمی یا مستامن مراد ہے۔۔

وغیرہ: (وہ کوئی بھی ہو) یہاں تخصیص کے بعد تعمیم ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ موقع اسی اسلوب کا متقاضی تھا یا اس وجہ سے یہ اسلوب اختیار فرمایا کہ دنیا میں اس کا حق چکانا زیادہ آسان تھا بہ نسبت آخرت کے۔ اس لئے کہ نہ آخرت میں تو کسی مسلمان کی نیکیاں اس کو دے کر راضی کرنا ممکن ہوگا نہ اس کی گناہ مسلمانوں کے ذمہ ڈال کر جان چھڑانا ممکن ہوگا۔ جیسے چوپایوں کے ایک دوسرے پر کئے گئے مظالم میں ہوتا ہے۔

(اس موقع پر ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس وقت اس یہودی کا قرض ادا نہ کرنے سے اس درجہ معذور تھے کہ یہودی کی طرف سے عائد کردہ اتنی سخت پابندی تک برداشت کرنی پڑ رہی تھی۔ کیا صحابہؓ بھی اس قرض کی ادائیگی پر اس وقت قادر نہیں تھے؟ تو فرماتے ہیں یا تو یہ بات ہوگی کہ وہاں موجود صحابی بھی اس قرض کی ادائیگی پر اس وقت قادر نہیں تھے یا یہ کہ اس یہودی کا جو اصل مقصد تھا یعنی اخلاق و کردار اور ان اوصاف کو آزمانا جن کا ذکر تورات میں اس نے پایا تھا اس کے پیش نظر وہ یہودی صحابہ کرام کی طرف سے اس قرض کی ادائیگی پر راضی نہ ہوا ہوگا یا ممکن ہے خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ کرامؓ کی جانب سے اس ذاتی قرض کی ادائیگی پر راضی نہ ہوئے ہوں۔ یہ بات زیادہ ظاہر بھی معلوم ہوتی ہے۔ کیونکہ عام طور پر خاص حکمت کے تحت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ کرام کے علاوہ لوگوں سے قرض لیا کرتے تھے۔ شاید یہ اس لئے ہوتا کہ دنیاوی غرض کی طمع سے خلاصی ہو اور

نفع حاصل کرنے کی وجہ سے اخروی اجر کو نقصان نہ پہنچے۔باری تعالیٰ کا بھی ارشاد ہے: ﴿قل لا اسئلکم علیه اجرا﴾ (الشوریٰ:۲۳) ترجمہ آپ (ان سے) یوں کہیئے کہ میں تم سے کچھ مطلب نہیں رکھنا چاہتا۔

کفار کے الزام کے مقابلے میں تمام انبیاء کی یہی سنت رہی کہ ہر نبی نے اپنی قوم سے یہی فرمایا: ﴿ما اسئلکم علیه من اجر ان اجری الا علی رب العالمین﴾ کہ میں اس تبلیغ رسالت پر کوئی بدلہ نہیں چاہتا۔میرا اجر تو اللہ رب العالمین پر ہے۔

یہ اسلوب آنحضرت ﷺ نے شاید اس لئے بھی اختیار فرمایا ہوتا کہ اس یہودی پر حجت ہو جائے کہ ان کے کتب میں آپ اس صفت کے ساتھ متصف ہیں کہ آپ ﷺ فقر کو غنیٰ پر ترجیح دیں گے۔ساتھ یہود کو اس بات پر بھی سرزنش کرنا تھا کہ جب باری تعالیٰ کا ارشاد: ﴿من ذالذی یقرض الله قرضا حسنا﴾ (البقرہ:۲۴۵) نازل ہوا تو یہود نے نازیبا الفاظ کہے جس کا ذکر باری تعالیٰ نے حکایتاً قرآن کریم میں فرمایا ہے: ﴿لقد سمع الله قول الذین قالوا ان الله فقیرونحن اغنیاء﴾ (آل عمران:۱۸۰) ترجمہ بے شک اللہ تعالیٰ نے سن لیا ہے ان لوگوں کا قول جنہوں نے یوں کہا کہ اللہ تعالیٰ مفلس ہے اور ہم دولتمند ہیں۔تو اس خاص قضیہ کے پس منظر میں ایک خاص حکمت اور بھی تھی جس کا ذکر اگلے جملہ میں ہے۔

فلما ترجل النار: جب دن نکلا یہودی کی تو کیفیت یہ تھی کہ شک دور ہو چکا تھا دل کی ظلمت نور سے بدل گئی تھی اور شدت سرور سے بدل گئی تھی۔

مهاجره: جیم کے فتحہ کے ساتھ جائے ہجرت۔

بطیبة مدینہ منورہ کا نام ہے۔

الخنا: خاء کے فتحہ کے ساتھ اسم مقصور ہے۔

هذا مالی : یا تو اس مال کا نام لیا یا مکان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ یہ میرا مال حاضر ہے۔

معاشرے کے کمزور طبقوں سے حسن سلوک

۵۸۳۳ : وَعَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ اَبِیْ اَوْفٰی قَالَ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يُكْثِرُ الذِّكْرَ وَيُقِلُّ اللَّغْوَ وَيُطِيْلُ الصَّلٰوةَ وَيُقَصِّرُ الْخُطْبَةَ وَلَا يَانِفُ اَنْ يَّمْشِيَ مَعَ الْاَرْمَلَةِ وَالْمِسْكِيْنِ فَيَقْضِيَ لَهُ الْحَاجَةَ۔ (رواه النسائی والدارمی)

اخرجه النسائی فی السنن ۱۰۸/۳ حدیث رقم ۱۴۱۴ والدارمی فی السنن ۴۸/۱ حدیث رقم ۷۴۔

ترجمہ: ''حضرت عبداللہ بن ابی اوفی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے' فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ اکثر اوقات ذکر اللہ میں مشغول رہتے بے مقصد (یعنی فضول) باتیں بالکل نہیں کرتے تھے' نماز کو طویل اور خطبہ کو مختصر کرتے اور بیوہ و مسکین کے ساتھ چلنے میں کوئی عار محسوس نہ فرماتے اور ان کی ضروریات پوری کر دیتے تھے''۔

تشریح: قوله : کان رسول الله ﷺ یکثر الذکر ذکر سے مراد اللہ کا ذکر اور ہر وہ چیز ہے جو ذکر سے تعلق رکھتی ہے۔جیسا کہ مسند فردوس میں حضرت عائشہؓ سے منقول ہے: ''من احب شیئا اکثر من ذکرہ'' جو شخص کسی چیز سے محبت کرتا

ہے اکثر اسی کا ذکر کرتا ہے (یعنی اس کی یاد میں مشغول رہتا ہے)۔

قولہ: ویقل اللغو: لغو فضول باتوں سے مراد ہر وہ بات ہے جو ذکر اللہ کے علاوہ ہو اور دنیاوی امور سے تعلق رکھتی ہو اگر چہ دنیاوی امور کا ذکر بھی مصلحت وحکمت سے خالی نہیں ہوتی لیکن ذکر حقیقی کے اعتبار سے فضول باتوں ہی میں شامل ہے۔ اسی لئے امام غزالیؒ نے فرمایا تھا۔

ضیعت قطعة من العمر العزیز فی تالیف البسیط و الوسیط و الوجیز۔

میں نے اپنی عمر عزیز کا ایک حصہ اپنی کتابوں بسیط' وسیط اور وجیز کی تالیف میں ضائع کیا۔

ان کی ظاہری صورت اور مبنیٰ کے اعتبار سے ان کی حقیقت سے قطع نظر کر کے ان پر لغو کا اطلاق کیا۔ اسی قبیل سے عارفین کا یہ قول بھی ہے: حسنات الابرار سیئات المقربین۔ وگرنہ تو اللہ جل شانہ مؤمنین کاملین کا یہ وصف بیان کرتے ہیں: والذین هم عن اللغو معرضون (القصص:۵۵) اور دوسری جگہ فرمایا: ﴿واذا سمعوا اللغو أعرضوا عنه﴾ [القصص: ۵۵] اور یہ جو کہا گیا کہ یہاں قلیل (یعنی کم) کا لفظ (لا یلغو اصلاً) کے معنی میں استعمال ہوا ہے (جس کا مطلب یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ کبھی بھی کوئی لغو بات زبان سے نہیں نکالتے تھے اس کی دلیل میں وہ حضرات کہتے ہیں کہ) قلیل کا لفظ کبھی مطلق نفی میں بھی استعمال ہوتا ہے جیسے قرآن میں بھی فرمایا گیا ہے: ﴿قلیلا ما تؤمنون﴾ (الحاقه:۴۱) تو واضح رہے کہ حسن مقابلہ میں لفظ "یکثر" کی تعبیر اس کا انکار کر رہی ہے۔ مگر (حدیث کے سیاق میں) یہ قول زیادہ موزوں نہیں کیوں کہ تکثیر کا لفظ یقل کے لئے جس معنی کا تقاضا کرتا ہے وہ تعبیر اس معنی سے ادا نہیں ہوتا جو پہلے ذکر کیا گیا ہے باقی بعض لوگوں کا یہ قول ہے کہ لغو سے مراد ہنسی مذاق ہے یعنی آپ ہنسی مذاق بالکل نہیں کرتے تھے یہ قول بالکل مردود ہے۔ آنحضرت ﷺ کے مزاح کو لغو میں سے شمار کرنا خود لغو بات ہے۔ اس لئے کہ آنحضرت ﷺ کے مزاح کے متعلق امام ترمذیؒ نے حضرت ابو ہریرہؓ سے نقل کیا ہے کہ صحابہ نے عرض کیا: یارسول اللہ! انك تداعبنا قال: انی لا اقول الا حقا۔ اے اللہ کے رسول آپ ہم سے ہنسی مذاق کرتے ہیں۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا میں مزاح میں بھی سچ ہی کہتا ہوں۔ علماء نے صراحت کی ہے آنحضرت ﷺ کا مزاح فرمانا مستحبات میں سے ہے۔ لہٰذا لغویات میں شمار کیسے ہوگا؟ الّا یہ کہ یوں کہا جائے کہ جو ہم نے ذکر کیا ہے وہ امر نسبی ہے اور لغوی اضافی ہے۔

قولہ: ویطیل الصلوة: خاص طور سے جمعہ کی نماز مراد ہے کیونکہ جملہ "ویقصر الخطبة" سے یہی بات موزوں معلوم ہوتی ہے لفظ یقصر تقصیر (یعنی باب تفعیل سے) ہے اور ایک نسخہ میں (مجرد قصر سے ہے) اس کی وجہ بظاہر یہ معلوم ہوتی ہے کہ نماز چونکہ مومن کی معراج اور پروردگار کی مناجات کا موقع ہے۔ اس لئے اتنی طوالت جو بغیر اکتاہٹ کے ہو۔ اس کے مناسب ہے۔ جبکہ خطبہ کا تعلق لوگوں کی طرف متوجہ ہونے اور ان کو حق کی طرف بلانے سے ہے (جس میں زور بیان اور اثر اندازی کے لئے فصاحت و بلاغت پر توجہ دینی پڑتی ہے) اور یہ چیز ایسی ہوتی ہے جس پر ریاء وسمعہ کا گمان کیا جا سکتا ہے اس لئے خطبہ مختصر کرنا ہی بہتر ہوتا ہے۔ چنانچہ ایک حدیث میں بھی منقول ہے من فقه الرجل طول صلاته و قصر خطبته نماز کا طویل اور خطبہ کا مختصر ہونا انسان کی دانشمندی کی علامت ہے۔

ولا یأنف ان یمشی مع الارملة' الانفة سے نون کے فتحہ کے ساتھ ناک چڑھانا' عار محسوس کرنا۔ جامع الاصول میں ''ولا یستنکف'' کے الفاظ بھی ہیں یعنی نہ کبر کی وجہ سے بیوہ اور مساکین کے ساتھ چلنے میں عار محسوس کرتے۔ نہایہ میں ہے الأرامل جمع ہے ارمل اور ارملہ۔ کی مساکین مذکر و مؤنث کے لئے استعمال ہوتا ہے لیکن زیادہ استعمال خواتین کے لئے ہوتا ہے قاموس میں لکھا ہوا ہے ارملۃ اس عورت کو کہا جاتا ہے جو محتاج اور مسکین ہو چاہے کنواری ہو یا بیوہ۔ اور الارمل رنڈوے کو کہا جاتا ہے۔ مالدار بیوہ کو ارملہ نہیں کہا جاتا ہے یہاں بیوہ مراد ہے کیونکہ مسکین کا لفظ مستقل موجود ہے۔ آخری بات یہ کہی جا سکتی ہے ''والمسکین'' یہ عطف تفسیری ہے چنانچہ ''فیقضی له الحاجة'' سے بھی یہی معلوم ہوتا کیونکہ صیغہ افراد کے ساتھ اس کو ذکر کیا ہے۔

یا ''لکل منهما'' کی تاویل میں ہے۔ بیوی اور مساکین دونوں مراد ہیں یا ''لما ذکر'' کی تاویل میں ہونے کے باعث صرف مساکین۔ جامع الاصول میں ''والمسکین'' کے بعد لفظ والعبد کی زیادتی ہے۔ اس کے بعد لکھتے ہیں کہ اس حدیث کو ابن ابی اوفی سے حاکم اور نسائی دونوں نے جبکہ ابوسعید سے بھی حاکم نے روایت کیا ہے۔

قریش مکہ آنحضرت صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کی تکذیب کیوں کرتے تھے؟

۵۸۳۴ : وَعَنْ عَلِيٍّ اَنَّ اَبَا جَهْلٍ قَالَ لِلنَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّا لَا نُكَذِّبُكَ وَلٰكِنْ نُكَذِّبُ بِمَا جِئْتَ بِهٖ فَاَ نْزَلَ اللّٰهُ تَعَالٰى فِيْهِمْ فَاِنَّهُمْ لَا يُكَذِّبُوْنَكَ وَلٰكِنَّ الظّٰلِمِيْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ يَجْحَدُوْنَ (رواه الترمذی)

اخرجه الترمذی فی السنن ۲٤۳/٥ حدیث رقم ۳۰۲۳۔

ترجمہ: ''حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے مروی ہے کہ جب ابوجہل نے نبی کریم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم سے یہ کہا کہ: ہم (یعنی قریش مکہ) آپ کو نہیں جھٹلاتے (کیونکہ آپ میں صدق و امانت کے ساتھ مشہور ہو) ہم تو اس چیز کو جھٹلاتے ہیں جو آپ لے کر آئے ہیں تو اللہ تعالیٰ نے (قریش مکہ یعنی ابوجہل اور اس جیسے دوسرے لوگوں) کے حق میں یہ آیت نازل فرمائی: فَاِنَّهُمْ لَا يُكَذِّبُوْنَكَ وَلٰكِنَّ الظّٰلِمِيْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ يَجْحَدُوْنَ ''وہ آپ کی تکذیب نہیں کرتے بلکہ وہ ظالم تو اللہ کی آیتوں کو جھٹلاتے ہیں''۔ (ترمذی)

تشریح: لا نکذبك: ذال کی تشدید کے ساتھ ہے تخفیف کے ساتھ پڑھنا بھی جائز ہے۔ چنانچہ قرآن کریم کی آیت: ﴿وکذبه قومك وهو الحق﴾ [الأنعام : ٦٦] میں ہے: کذب بالامر تکذیبا کا معنی ہے کسی بات کا انکار کرنا' اور ''کذب فلانا'' کا معنی ہے جعله کاذبا۔

میں کہتا ہوں نکذب حدیث میں دونوں معنی میں استعمال ہوا ہے: فانهم لا یکذبونك اس آیت کا شروع حصہ یوں ہے: قد نعلم انه لیحزنك الذی یقولون فانهم لا یکذبونك [الأنعام : ۳۳] ترجمہ ہم خوب جانتے ہیں کہ آپ کو ان کے اقوال مغموم کرتے ہیں سو یہ لوگ آپ کو جھوٹا نہیں کہتے۔

جمہور قراء کے ہاں یکذبونک کلمہ تشدید کے ساتھ ہے البتہ ابن عامر نے تخفیف کے ساتھ پڑھا ہے۔

قوله : ولکن الظالمین بایات الله یجحدون (الانعام:۳۳) لیکن یہ ظالم تو اللہ کی آیتوں کا انکار کرتے ہیں یعنی اس کے فرمائے ہوئے دین کو جھٹلاتے ہیں۔ علم کے باوجود جب کوئی منکر ہو جائے تو کہا جاتا ہے جحد حقه و بحقه آپ کا انکار عصبیت کی وجہ تھا۔ کہا جاتا ہے: جحد حقه وبحقه' کمنعه انکره مع علمه۔ (کذا فی القاموس) امام طیبی فرماتے ہیں' روایت میں آتا ہے ایک دفعہ اخنس بن شریق نے ابوجہل سے پوچھا اے ابوالحکم محمد کو تو ہم ہیں آپ بتائیں محمد ﷺ سچے ہیں یا جھوٹے؟ ابوجہل کہنے لگے محمد ﷺ بالکل سچے ہیں جھوٹ تو انہوں نے کبھی بولا ہی نہیں لیکن لواء' سقاية' حجابة اور نبوت سارے اعزاز بنو قصی لے جائیں تو باقی قریش کے لئے کیا رہے گا؟ گویا ابوجہل کا قول ولکن نکذب بما جئت به ولکن نحسدك کی جگہ ہے یعنی مسبب کو سبب کی جگہ ذکر کیا ہے۔

آنحضرت ﷺ نے اپنے لئے دولت مندی کو پسند نہیں فرمایا

۵۸۳۵ : وَعَنْ عَآئِشَةَ قَالَتْ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَا عَائِشَةُ لَوْ شِئْتُ لَسَا رَتْ مَعِيَّ جِبَالُ الذَّهَبِ جَآءَ نِيْ مَلَكٌ وَاِنَّ حُجْزَتَهٗ لَتُسَاوِيْ الْكَعْبَةَ فَقَالَ اِنَّ رَبَّكَ يَقْرَأُ عَلَيْكَ السَّلَامُ وَيَقُوْلُ اِنْ شِئْتَ نَبِيًّا عَبْدًا وَاِنْ شِئْتَ نَبِيًّا مَلِكًا فَنَظَرْتُ اِلٰى جِبْرِيْلَ عَلَيْهِ السَّلَامُ فَاَشَارَ اِلَيَّ اَنْ ضَعْ نَفْسَكَ۔

اخرجه البغوی فی شرح السنة ۲۴۷/۱۳ حدیث رقم ۳۶۸۳۔

ترجمہ: ''حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے' فرماتی ہیں کہ (ایک دن) رسول اللہ ﷺ فرمانے لگے: ''عائشہ! اگر میں چاہوں (اور اپنے پروردگار سے اپنے لئے دنیا کا مال و منال طلب کروں) تو میرے ساتھ سونے کے پہاڑ چلا کریں۔ (تمہیں ایک دن کی بات بتاتا ہوں کہ) ایک فرشتہ میرے پاس آیا (جو اس قدر دراز تھا کہ) اس کی کمر (کی چوڑائی) کعبہ کے برابر تھی۔ اس نے مجھ سے کہا کہ آپ ﷺ کا پروردگار آپ ﷺ کو سلام کہتا ہے اور فرماتا ہے کہ اگر آپ ﷺ پسند کریں تو آپ ﷺ کو بندہ پیغمبر بنا دیتے ہیں (یعنی آپ ﷺ کو دونوں باتوں کا اختیار دیا جاتا ہے یعنی اگر آپ کی چاہت ہو تو آپ کو بادشاہ یا پیغمبر بنا دیتے ہیں) میں نے (یہ سن کر) جبرائیل کی طرف (سوالیہ انداز میں) دیکھا (اور گویا ان سے مشورہ طلب کیا کہ تم ہی بتاؤ میرے لئے کون سی صورت بہتر رہے گی' انہوں نے کہا: اپنے نفس کو پست کر دو۔ یعنی فقر و مشقت اور تنگی و محتاجگی کی زندگی کو اختیار کرو)''۔

تشریح: جاء نی: جملہ مستانفہ بیانیہ ہے متضمن معنی تعلیل ہے۔ حجزته: حاء کے ضمہ' جیم کے سکون پھر زاء کے ساتھ۔

شاید اس کا اس بڑائی و صورت کے ساتھ ظاہر ہونا اس امر کی عظمت اور ہیبت بیان کرنے کے لئے تھا۔

فقال ... علیه السلام گویا کہ جب وہ (قاصد) [illegible]

50

اس (مسلّم علیہ) کو سلام پہنچاتا ہے تو وہ اس کو ابھارتا ہے کہ وہ بھی سلام کہے اور اس کو جواب دے۔

قاموس میں ہے: قرأ علیه السلام کا معنی ہے پہنچانا اور "اقرأه" بھی اسی طرح ہے۔ مگر "اقرأه" اس وقت کہا جاتا ہے جب سلام مکتوب ہو۔

قوله: و یقول ان شئت ...... نبیا ملکا: ای نبیا کعبد'

جب قراع صلے میں علی آ جائے تو زبانی سلام کہنے کے معنی میں ہوتا ہے۔ وقول ...... عبدا چاہے تو بندہ پیغمبر بنو یعنی عبودیت اور نبوت دونوں وصف مشترکہ کے ساتھ جامعیت والا بننا چاہو تو فکن یا اختر یافلك هذا تینوں فعل محذوف نکال سکتے ہیں۔

حاصل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے دونوں امر کا آپ کو اختیار دیا گیا ہے اس میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ کمال عبودیت اور بادشاہت جمع نہیں ہو سکتے۔

امام طیبیؒ لکھتے ہیں نبیا عبدا: یہ "کان" فعل ناقص محذوف کی خبر ہے۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ دوسری روایت میں صراحت کے ساتھ یوں آیا ہے: ان الله یخیرك بین ان تکون عبدا نبیا اس روایت میں ان تکون عبدا نبیا شرط کی جزا محذوف ہے تقدیر عبارت یوں ہے ان شئت ان تکون نبیا عبدا فکن ایاه۔ فنظرت الی جبریل علیه السلام آپ ﷺ نے اس فرشتے کی طرف دیکھا گویا کہ مشورہ طلب کیا (کہ تم ہی بتاؤ میرے لئے کون سی صورت بہتر ہے) کیونکہ باری تعالیٰ کا فرمان ہے: ان ربك یبسط الرزق لمن یشاء ویقدر انه کان بعباده خبیرا بصیرا۔ (الاسراء: ۳۰)

"بلاشبہ تیرا ربّ جس کو چاہتا ہے زیادہ رزق دیتا ہے اور وہی تنگی کر دیتا ہے۔ بے شک وہ اپنے بندوں کو خوب جانتا ہے دیکھتا ہے۔" کیونکہ بعض انبیاء علیہم السلام کو اللہ تعالیٰ نے دونوں چیزیں یعنی نبوت اور بادشاہت عطا فرمائی تھیں اور بسا اوقات مال اور بادشاہت ہی کو مرتبہ کمال گمان کیا جاتا ہے۔ جیسا کہ وارد ہوا ہے:

نعم المال الصالح للرجل الصالح۔ اور اس لئے بھی کہ یہ فتوحات بلاد اور توسیع عباد وغیرہ کا وسیلہ بنتا ہے۔

فاشار الی ان ضع نفسك: یہاں ان مصدریہ ہے اور "ضع" وضع سے امر کا صیغہ ہے۔ تفسیر یہ ہے چونکہ "اشار" میں "قول" کا معنی ہے۔

حاصل یہ ہے کہ حضرت جبرائیل نے مجھے بادشاہت اور دولتمندی کے بجائے مقام عبدیت کو اختیار کرنے کا اشارہ فرمایا۔ کیونکہ مقام عبدیت مآل کے اعتبار سے اعلیٰ منازل میں اعلیٰ اور ذوق طالبین میں احلیٰ ہے۔ کیونکہ حقیقی بادشاہت تو واحد القہار ذات اللہ ہی کی ہے انسان و جن کو تو اپنی بندگی کے لئے پیدا فرمایا ہے جیسے باری تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿وما خلقت الجن والانس الا لیعبدون﴾ (الذاریات: ۵٦) یعنی تمہاری عبودیت میرے لئے ظاہر ہو جائے اور میری الوہیت و ربوبیت تمہارے لئے ظاہر ہو جائے جیسا کہ حدیث قدسی میں ہے کنت کنزا مخفیا فاحببت ان اعرف فخلقت الخلق لاعرف۔ شرطیہ اولیٰ یہ روایت اس بات کی صریح دلیل ہے کہ صابر فقیر شاکر غنی سے افضل ہے بخلاف ابن عطاء وغیرہ کے انہوں نے اس میں اختلاف کیا ہے اور جنید بغدادیؒ نے ان کے حق میں بددعا کی ہے۔

۵۸۳۶ : وَفِي رِوَايَةِ ابْنِ عَبَّاسٍ فَالْتَفَتَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِلٰى جِبْرَئِيْلَ كَالْمُسْتَشِيْرِ لَهٗ فَاَشَارَ جِبْرَئِيْلُ بِيَدِهٖ اَنْ تَوَاضَعْ فَقُلْتُ نَبِيًّا عَبْدًا قَالَتْ فَكَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بَعْدَ ذٰلِكَ لَا يَاْكُلُ مُتَّكِئًا يَقُوْلُ اٰكُلُ كَمَا يَاْكُلُ الْعَبْدُ وَاَجْلِسُ كَمَا يَجْلِسُ الْعَبْدُ.

(رواه في شرح السنة)

اخرجه البغوي في شرح السنة ۲۴۸/۱۳ حديث رقم ۳۶۸۴۔

ترجمہ: ''اور ابن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت میں یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ مشورہ طلب انداز میں جبرائیل علیہ السلام کی طرف متوجہ ہوئے' حضرت جبرائیل علیہ السلام نے اپنے ہاتھ سے (زمین کی طرف) اشارہ کر کے بتایا کہ تواضع اختیار کر لیجئے۔ پس (آنحضرت ﷺ نے فرمایا) میں نے کہا کہ یقیناً میں بندہ پیغمبر بنوں گا''۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے بیان کیا: ''اس کے بعد رسول اللہ ﷺ نے کبھی ٹیک لگا کر کھانا نہیں کھایا اور فرمایا کرتے تھے کہ میں اس طرح کھانا کھاتا ہوں جیسے غلام کھاتا ہے اور میں اس طرح بیٹھتا ہوں جیسے غلام بیٹھتا ہے۔ اس روایت کو بغویؒ نے شرح السنۃ میں (اپنی سند کے ساتھ) نقل کیا ہے''۔

تشریح: ان تواضع یعنی اس فقر اور عبودیت کو اختیار کریں جو اللہ کے ہاں بلند قدری اور تواضع کا باعث ہے۔ برخلاف اس بادشاہت و دولتمندی کی زندگی کے جو سرکشی اور خدا فراموشی کے باعث تکبر و ناشکری کی موجب ہوتی ہے جس کو اختیار کر کے انسان اپنے پروردگار کی نظروں سے گر جاتا ہے۔ یہ بات غالب احوال کے اعتبار سے ہے۔ اسی لئے اللہ تعالیٰ نے اکثر انبیاء' علماء' صلحاء اور اولیاء کو فقر کی زندگی نصیب فرمائی۔ اللہ ہمیں بھی ان میں سے بنائے اور انہیں کے ساتھ اٹھائے۔

قولہ: قالت فکان رسول اللہ ﷺ..... متکئا! اکثر حضرات نے الاتکاء کی تفسیر کسی ایک پہلو کی جانب جھک کے کھانا کھانے سے کی ہے کیونکہ اس طرح کھانا نقصان دہ ہے اس سے کھانے کی نالی بند ہونے کا خطرہ ہوتا ہے۔ قاضی عیاضؒ نے شفاء میں بعض محققین سے اس کی تفسیر چوپڑی مار کر زانوں کے نیچے تکیہ وغیرہ رکھے کھانے سے بیان کی ہے۔ کیونکہ اس ہیئت پر بیٹھ کر مقدار زیادہ کھانا کھایا جاتا ہے۔

یقول: یہ جملہ متانفہ ہے ماقبل کے لئے بیان ہے۔ **واجلس کما یجلس العبد** اس سے بیٹھنے کی تین صورتیں مراد لی جا سکتی ہیں۔ (پہلی صورت) دو زانو بیٹھنا جیسے نماز کی حالت میں بیٹھا جاتا ہے۔ اور بیٹھنے کی افضل ترین ہیئت بھی یہی ہے۔ (دوسری صورت) کھانا وغیرہ کے وقت بیٹھنے کی وہ ہیئت جس میں ایک زانو کھڑا کر کے گوٹ مار کر بیٹھتے ہیں۔ (تیسری صورت) احتباء کی شکل میں دونوں زانوں کھڑے کر بیٹھنا۔ نماز کے علاوہ آنحضرت ﷺ عام طور پر اسی ہیئت سے بیٹھا کرتے تھے۔

شمائل ترمذی میں ابوجحیفہ سے مرفوعاً روایت ہے **اما انا فلا آکل متکئا** آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا میں ٹیک لگا کر کھانا نہیں کھاتا۔ جامع صغیر میں ہے **انما انا عبد اکل کما یأکل العبد واشرب کما یشرب العبد**۔ ابن عدی نے الکامل میں یہی روایت حضرت انسؓ سے نقل کیا ہے۔ امام احمدؒ مسلم اور ابوداود رحمہم اللہ نے حضرت کعبؓ بن مالک سے نقل کیا ہے۔ انه

(صلی اللہ علیہ وسلم) كان ياكل بثلاث اصابع' ويلعق يده قبل ان يمسحها آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تین انگلیوں سے کھانا تناول فرمایا کرتے اوران کو پونچھنے سے قبل چاٹ لیا کرتے تھے۔

ابن سنی اور طبرانی نے حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ سے نقل کیا ہے: انه ﷺ كان اذا شرب تنفس في الاناء ثلاثا يسمى عند كل نفس ويشكر في آخرهن۔ جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم پانی پیتے تو تین سانس لے کے پیتے اور ہر سانس کے ساتھ بسم اللہ پڑھتے اور آخر میں شکر الحمد اللہ کہتے۔ ابونعیم کی حلیہ میں ابو جعفرؒ سے مرسلاً منقول ہے۔ جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم پانی نوش فرماتے تو آخر میں یہ دعا پڑھتے الحمدلله الذى سقانا عذبا فراتا برحمته ولم يجعله ملحا اجاجا بذنوبنا۔

طبرانی نے حضرت ابن عباسؓ کی روایت نقل کی ہے۔ انه (ﷺ) كان يجلس على الارض وياكل على الارض ويعتقل الشاة ويجيب دعوة المملوك الى خبز الشعير آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم زمین پر بیٹھا کرتے تھے' زمین پر بیٹھ کر کھانا تناول فرماتے' بکری کا دودھ تک خود دھوتے۔ غلاموں کی دعوت قبول فرماتے اگرچہ وہ دعوت جو کی روٹی ہی کی کیوں نہ ہوتی۔

بَابُ الْمَبْعَثِ وَبَدْءِ الْوَحْيِ

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت اور نزول وحی کا بیان

ترجمۃ الباب کا یہ عنوان بقول ارباب ہدایت النہایہ ہی الرجوع الی البدایہ کے قبیل سے ہے۔

باب اصل میں بوب تھا واؤ کو ماقبل متحرک مفتوح ہونے کے سبب الف سے بدل دیا گیا۔ اس کی جمع "ابواب" آتی ہے۔ علامہ عینیؒ لکھتے ہیں اس کی جمع "ابوبة" بھی آتی ہے۔ یہاں اس سے مراد کلام کی ایک ایسی نوع مراد ہے جس میں اس کتاب کی ایک جنس کے احکام جو اپنی نوع کے تمام افراد کو شامل ہیں۔ جیسا کہ میں نے بخاری کے باب کی پہلی تعلیق میں بیان کیا ہے۔

پھر لفظ "المبعث" مادہ بعث سے مصدر میمی ہے بمعنی بھیجنا ابن الملک نے ایسا ہی ذکر کیا ہے۔ پس مراد یہ ہوا کہ "مبعث" مصدر میمی ہے۔ اور زیادہ ظاہر یہ ہے کہ اس سے مقصود زمانہ اور مکان بعث کی معرفت اور جاننا ہے فصل اول کی پہلی حدیث سے بھی ہوتی ہے) یہی معلوم ہوتا ہے۔ پھر لفظ بدء (باء کے فتحہ دال کے سکون اور ہمزہ کے ساتھ جس کے معنی آغاز ابتداء اور شروع کے ہیں۔ بعض حضرات سے بدو بضم الاول والثانی بدو واو کے تشدید کے ساتھ نقل کیا ہے جس کے معنی اظہار اور ظہور کے آتے ہیں۔ اب ان دونوں معانی میں سے کون سا معنی بہتر ہے کہ پہلا معنی مراد لینے کی صورت میں دونوں معنی جمع ہو جاتے ہیں یا دوسرا معنی لیں تو وہ بھی اعم ہے۔ اس بارے میں دونوں طرح کی رائے ہیں یعنی بعض نے پہلے معنی کو بہتر سمجھا ہے بعض نے دوسرے معنی کو۔ لیکن میں کہتا ہوں ان باتوں کا اصل محل وہ امام بخاریؒ کا قول: کیف کان بدء الوحی؟ ہے کیونکہ وہ مقام دونوں معنی کا احتمال رکھتا ہے جس کی وضاحت ہم نے اپنے مقام پر کر دی ہے اور جس بحث میں ہم ہیں اس میں رسم الخط اس کا ساتھ نہیں دیتا۔ دوسرا یہ کہ یہاں یاء کے ساتھ ہے بخلاف اس کے جو صحیح میں ہے اس میں واؤ کے ساتھ لکھا جاتا ہے بس آپ بغیر تھوڑ ا سا غور کریں تو بات سمجھ میں آجائے گی۔

ہم نے جو کچھ لکھا ہے اس کی تائید ابن حجر عسقلانیؒ کے اس کلام سے ہوتی ہے جو انہوں نے قاضی عیاض کے حوالے سے فتح الباری میں نقل کیا ہے۔ قاضی عیاضؒ فرماتے ہیں کہ لفظ "بدؤ" ہمزہ اور دال کے سکون کے ساتھ مروی ہے اس کا معنی ہے ابتداء اور بغیر ہمزہ دال کے ضمہ اور واؤ مشددہ کے ساتھ ہو تو بمعنی ظہور کے ہوگا۔ میرے نزدیک یہ ہے کہ ہم کو جو روایات پہنچی ہیں اس میں ایسی کوئی بات نہیں دیکھی جس کے بل بوتے پر کچھ کہہ سکیں البتہ کچھ روایات میں ہمزہ کے ساتھ کیف کان ابتداء الوحی کے الفاظ ہیں جس میں ہمزہ واقع ہوا ہے جس سے معنی اول کو ترجیح بیان ہوتی ہے اور یہی کچھ ہم نے اپنے مشائخ کے منہ

سے بھی سنا ہے امام بخاریؒ نے بھی اس عبارت کو بہت استعمال کیا ہے جیسے **بدء الحیض بدء الاذان بدء الخلق** اور لفظ وحی کا اصل معنی تفہیم ہے۔اسی سے باری تعالیٰ کا یہ فرمان: ﴿واوحی ربك الی النحل﴾ [النحل: ٦٨] ترجمہ اور آپ کے رب نے شہد کی مکھی کے جی میں یہ بات ڈالی۔

اور شرعی تعریف یہ ہے: **ھو الاعلام بالشرع** یعنی شرعی احکام بتلانے کا نام وحی ہے کبھی مطلقاً وحی کہہ کر اسم مفعول موحی مراد ہوتا ہے یعنی انبیاء پر نازل ہونے والا اللہ کا کلام۔

شارح لکھتا ہے بعث مصدر میمی ہے بمعنی ارسال (بھیجنے) اور بدء سے ابتداء اور وحی سے رسالت مراد ہے شارح نے دوسروں کی طرح مصدر کے معنی میں ہونے کی بات شاید اس لئے اختیار کی ہے کہ مصدر فعل کی اصل کیفیت پر کرنے کے ساتھ ساتھ زمانہ اور مکان کو بھی شامل ہوتا ہے واللہ اعلم۔

الفصل الاول:

بعثت' نزولِ وحی' ہجرت اور وصال

۵۸۳۷: عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ بُعِثَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لِاَرْبَعِيْنَ سَنَةً فَمَكَثَ بِمَكَّةَ ثَلٰثَ عَشَرَةَ سَنَةً يُوْحٰى اِلَيْهِ ثُمَّ اُمِرَ بِالْهِجْرَةِ فَهَاجَرَ عَشْرَ سِنِيْنَ وَمَاتَ وَهُوَ ابْنُ ثَلٰثٍ وَسِتِّيْنَ سَنَةً.

(متفق عليه)

اخرجه البخارى فى صحيحه ١٦٢/٧ حديث رقم ٣٨٥١ ومسلم ١٨٢٦/٤ حديث رقم (١١٧-٢٣٥١)
واخرجه الترمذى فى السنن ٥٦٥/٥ حديث رقم ٣٦٥/٢ واحمد فى المسند ٣٧١/١۔

ترجمہ: ''حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے' فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کو چالیس سال کی عمر میں رسالت و نبوت سے سرفراز کیا گیا اس کے بعد آپ ﷺ تیرہ سال مکہ میں رہے اور آپ ﷺ پر وحی آتی رہی اور پھر آپ ﷺ کو (سوائے مدینہ) ہجرت کا حکم دیا گیا چنانچہ آپ ﷺ نے (مدینہ کی طرف) ہجرت فرمائی اور دس سال مدینہ میں رہے اور تریسٹھ سال کی عمر میں آپ ﷺ نے وفات پائی۔'' (بخاری و مسلم)

تشریح: **بعث**: صیغہ مجہول کے ساتھ ہے' **لاربعین سنة**: امام طیبیؒ لکھتے ہیں لاربعین کے شروع میں جو لام ہے وہ وقت کے معنی میں ہے جیسے اس آیت: ﴿قدمت لحیاتی﴾ [الفجر: ٢٤] میں ہے (فمکث) کاف کے ضمہ کے ساتھ ہے اور فتحہ کے ساتھ بھی آتا ہے **عشرة**: شین معجمہ کے سکون کے ساتھ ہے کبھی کسرہ بھی دی جاتی ہے۔ **یوحی الیه**: یہ جملہ حالیہ ہے یا استینافیہ ہے یعنی ان سالوں میں بھی آپ ﷺ پر وحی نازل ہوتی رہی۔ **واقام بھا عشر سنین**: یہاں عشر صرف سکون کے ساتھ ہے۔

قوله: **ومات وھو ابن ثلاث و ستین سنة** یہی روایت صحیح ہے۔

بعض کہتے ہیں آپ کی وفات اس وقت ہوئی تھی جبکہ آپ ۶۵ سال کے تھے جیسا کہ عنقریب حضرت ابن عباسؓ کی روایت

آ رہی ہے کہ اس مدت میں ولادت ووفات کے سال کو بھی شمار کیا گیا ہے۔ بعض کہتے ہیں اس وقت آپ کی عمر ۶۰ سال تھی جیسا کہ حضرت انسؓ سے روایت آ رہی ہے کسر کو ساقط کر کے۔

نزولِ وحی کی ابتداء

۵۸۳۸ : وَعَنْهُ قَالَ اَقَامَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِمَكَّةَ خَمْسَ عَشْرَةَ سَنَةً يَسْمَعُ الصَّوْتَ وَيَرَى الضَّوْءَ سَبْعَ سِنِيْنَ وَلَايَرٰى شَيْئًا وَثَمَانَ سِنِيْنَ يُوْحٰى اِلَيْهِ وَاَقَامَ بِالْمَدِيْنَةِ عَشْرًا وَتُوُفِّيَ وَهُوَ ابْنُ خَمْسٍ وَّسِتِّيْنَ سَنَةً (متفق عليه)

اخرجه مسلم في صحيحه ۱۸۲۷/٤ حديث رقم (۱۲۳-۲۳۵۳) واخرجه الترمذي في السنن ٥٦٤/٥ حديث رقم ۳٦٥۱ واحمد في المسند ۲٦٦/۱۔

ترجمہ: ''حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے' فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے (رسالت ملنے کے بعد) پندرہ سال مکہ میں قیام فرمایا اور (ان پندرہ سالوں میں سے) آپ سات سال تک (حضرت جبرائیل علیہ السلام کی) آواز (یا محمد ﷺ) سنتے اور (اندھیری راتوں میں ایک عجیب وغریب) روشنی دیکھتے تھے اس کے علاوہ کوئی چیز نظر نہیں آتی تھی۔ پھر (ان پندرہ سالوں میں سے آخر کے) آٹھ سال مکہ میں وحی نازل ہوتی رہی' اس کے بعد آپ ﷺ نے دس سال مدینہ میں قیام فرمایا اور جب وفات ہوئی تو آپ ﷺ کی عمر ۶۵ سال کی تھی''۔ (بخاری ومسلم)

تشریح: قوله اقام رسول الله ﷺ بمكة خمس عشرة سنة: سن ولادت اور ہجرت کو ملا کے پندرہ سال مراد ہیں۔

قوله: ويسمع الصوت ...... ایک عظیم روشنی دیکھتے۔ سبع سنين: طیبیؒ لکھتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ منصب نبوت پر فائز ہونے سے قبل سات سال تک علامات نبوت میں سے صرف ایک روشنی دیکھا کرتے تھے اس کے ساتھ کوئی فرشتہ دکھائی نہ دیتا تھا۔ اگلے جملہ ولا يرى شيئا یہی مطلب ہے کہ یعنی سوائے روشنی کے کچھ نہیں نظر آتا تھا۔ (علماء) فرماتے ہیں' بغیر فرشتہ کے روشنی دکھانے میں حکمت یہ تھی کہ آپ ﷺ اس طرح اولاً اس نفس ضوء سے مانوس ہو جائے اور خوف جاتا رہے۔ کیونکہ یکایک فرشتے کے ظہور پر دہشت کی وجہ ذہول اور عقل جانے کا خطرہ ہوتا ہے۔

ابن الملک نے اس کے متعلق خوب لکھا ہے فرماتے ہیں اس میں راز یہ تھا کہ فرشتہ ضوء ملکیت اور نور ربوبیت سے خالی نہیں ہوتا اگر آپ ﷺ ابتداءً اس کو دیکھتے تو قوت بشریت کے عاجز ہونے کی وجہ سے برداشت نہ کر پاتے اور ممکن تھا بے ہوشی طاری ہو جاتی۔ اس لئے اولاً روشنی کے ذریعہ آپ کو مانوس کیا گیا پھر فرشتہ اتارا گیا۔ یہاں ضوء سے مراد نزول وحی سے قبل شرح صدر مراد لینا بھی جائز ہے ممکن ہے اسی انشراح صدر کو ضوء سے تعبیر کیا گیا ہو اور انشراح صدر مکمل نہیں ہوتا مگر چالیس سال میں۔ اور انبیاء میں یہ استعداد پیدا کرنے کی ضرورت اس لئے ہوتی ہے تاکہ انبیاء اللہ اور اس کی مخلوق کے درمیان واسطہ بننے کے لئے تیار ہو جائیں۔

قوله : متفق عليه: میرکؒ فرماتے ہیں یہاں متفق علیہ کہنا بے محل ہے' کیونکہ امام بخاریؒ نے اس کو نقل نہیں کیا ہے یہ روایت صرف مسلم شریف میں ہے۔ اس غلطی کی حمیدی نے "الجمع بين الصحيحين" میں اور ابن حجر عسقلانیؒ نے شرح البخاری میں تصریح کی ہے۔ اصل میں صاحب مشکوۃ کو ابن اثیر کے جامع الاصول میں متفق علیہ کہنے کہ وجہ سے دھوکہ ہوا ہے انہوں نے بغیر ماخذ کو دیکھے ان کے ظاہری کلام پر اعتماد کیا ہے۔ اس لئے وہ ہوا جو ہوا' واللہ اعلم۔

وصال کے وقت آنحضرت ﷺ کی عمر مبارک

۵۸۳۹ : وَعَنْ اَنَسٍ قَالَ تَوَفَّاهُ اللّٰهُ عَلٰى رَأْسِ سِتِّيْنَ سَنَةً (متفق عليه)

اخرجه البخاري في صحيحه ٣٥٦/١٠ حديث رقم ٥٩٠٠ ومسلم في صحيحه ١٨٢٤/٤ حديث رقم (١١٣-٢٣٤٧) واخرجه مالك في الموطأ ٩١٩/٢ حديث رقم ١ من كتاب صفة النبي۔

ترجمہ: "حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے' فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے آنحضرت ﷺ کو ساٹھ سال کی عمر پوری ہونے پر اٹھالیا"۔ (بخاری و مسلم)

تشریح: على رأس ستين: امام طیبی فرماتے ہیں کہ اس تعبیر میں "مجاز" ہے۔ ای آخره۔ یعنی آخری عمر جیسے راس آیہ سے مجازاً آیت کا آخری حصہ مراد ہوتا ہے۔ عرب چیز کے آخر کو "رأس" سے تعبیر کرتے ہیں یہ اس لئے کہتے ہیں کہ یہ اگر آیت ہے تو یہ دوسری آیت کا آغاز بنتی ہے اور اگر عدد ہے تو دوسری دہائی کی ابتداء بنتا ہے۔ امام ترمذیؒ نے بھی شمائل میں اس روایت کو نقل کیا ہے۔

وصال کے وقت خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم کی عمریں

۵۸۴۰ : وَعَنْهُ قَالَ قُبِضَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَهُوَ ابْنُ ثَلٰثٍ وَسِتِّيْنَ وَاَبُوْبَكْرٍ وَّهُوَ ابْنُ ثَلٰثٍ وَسِتِّيْنَ وَعُمَرُ وَهُوَ ابْنُ ثَلٰثٍ وَسِتِّيْنَ (رواه مسلم قال محمد بن اسمعيل البخاري ثلث و ستين اكثر)

اخرجه مسلم في صحيحه ١٨٢٥/٤ حديث رقم (١١٤-٢٣٤٨) واخرجه الترمذي ٥٦٥/٥ حديث ٣٦٥٣۔

ترجمہ: "حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے' فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے تریسٹھ سال کی عمر میں وفات پائی اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی وفات بھی تریسٹھ سال کی عمر میں ہوئی اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے بھی تریسٹھ سال کی عمر میں وفات پائی۔ (مسلم) اور محمد بن اسماعیل بخاری نے کہا: آنحضرت ﷺ کی عمر کے متعلق زیادہ روایات تریسٹھ سال ہی کی ہیں"۔

تشریح: قبض : "توفی" وفات پانے کے معنی میں ہے۔

وهو ابن ثلاث۔ (یہ جملہ حالیہ ہے) ای والحال انه صاحب ثلاث و ستين۔ اس حال میں کہ ابھی آپ تریسٹھ سال ہی کے تھے۔ و ستین لفظ سنة محذوف ہے جیسے ایک نسخہ میں صراحتاً موجود ہے وابو بكر وهو ابن ثلاث و ستين بغیر

اختلاف کے۔ آپؓ کی خلافت دو سال چار مہینے رہی وعمر وھو ابن ثلاث وستین حضرت عمرؓ کے عمر میں اختلاف ہے بعض کہتے ہیں آپ نے انسٹھ سال کی عمر میں وفات پائی بعض کہتے ہیں اٹھاون سال کی عمر میں وفات پائی بعض کہتے ہیں چھپن سال کی عمر میں وفات پائی۔ بعض کہتے ہیں اکیاون سال کی عمر میں وفات پائی۔

مولفؒ فرماتے ہیں حضرت مغیرہ ابن شعبہ کے غلام ابو لوء لوء نے ۲۶ ذی الحجہ ۲۳ھ کو بدھ کے دن آپ کو خنجر مار کر زخمی کیا تھا اور دس محرم ۲۴ھ اتوار کو آپ مدفون ہوئے اس وقت آپ کی عمر تریسٹھ سال تھی یہی قول تمام اقوال منقولہ میں سے اصح ہے۔ آپ کی خلافت ساڑھے دس سال رہی اور حضرت عثمانؓ ہفتہ کی شب جنت البقیع میں دفن کئے گئے اس وقت ان کی عمر ۸۲ سال تھی بعض نے کہا ہے کہ ۸۸ سال تھی۔ ان کے علاوہ بعض اور روایات ہیں۔ حضرت عثمان کی خلافت بارہ سال رہی۔

حضرت علیؓ شہادت عثمانؓ کے دن خلیفہ منتخب کئے گئے یہ ۱۸ ذی الحجہ ۳۵ھ جمعہ کا دن تھا۔ پھر ۱۷ رمضان المبارک ۴۰ھ کو جمعہ کی صبح عبدالرحمان ابن ملجم نے کوفہ میں ان پر قاتلانہ حملہ کیا جس کے نتیجہ میں وہ شدید زخمی ہوئے اور اس حملے کے تین دن بعد وفات پائی بوقت سحر مدفون ہوئے۔ اس دن ان کی عمر ایک قول کے مطابق تریسٹھ سال کی تھی بعض کہتے ہیں پینسٹھ سال تھی بعض کہتے ہیں ساٹھ سال تھی بعض کہتے ہیں اڑسٹھ سال تھی۔ ان کی خلافت کی مدت کچھ دن اوپر چار سال نو مہینے رہی۔ ان کی عمر کے بارے میں صحیح بات یہ ہے کہ انہوں نے ۶۳ سال عمر پائی۔ اس کے باوجود حضرت انس رضی اللہ عنہ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کا ذکر شاید اس وجہ سے نہیں کیا کہ اس وقت تک حضرت علی رضی اللہ عنہ بقید حیات تھے۔ واللہ اعلم۔

امام ترمذیؒ نے حضرت جریرؓ کے حوالے سے معاویہؓ کے متعلق لکھا ہے کہ انہوں نے حضرت معاویہؓ سے خطبہ میں سنا آپ فرمارہے تھے **مات رسول اللہ وھو ابن ثلاث و ستین و ابو بکر و عمر کذالك و انا ابن ثلاث وستین** یعنی آنحضرت ﷺ نے تریسٹھ سال کی عمر میں وفات پائی ابو بکر وعمر رضی اللہ عنہما نے بھی اسی طرح تریسٹھ سال کی عمر میں ہی وفات پائی اور میں بھی تریسٹھ کا ہوں۔ میری موت بھی ان کی طرح تریسٹھ سال کی عمر میں متوقع ہے۔ جامع الاصول میں لکھا ہے کہ حضرت معاویہؓ جس وقت یہ روایت بیان کر رہے تھے تریسٹھ سال کے تھے لیکن انہوں نے اس عمر میں وفات نہیں پائی بلکہ اٹھہتر یا چھیاسی سال کی عمر میں وفات پائی۔

میرکؒ کہتے ہیں حضرت معاویہؓ نے تمنا تو کی تھی لیکن مطلوب نہ پا سکے بلکہ قریب قریب اسی سال کی عمر میں وفات پائی۔ میں کہتا ہوں حضرت معاویہؓ نے عمر زیادہ پانے کے باوجود توافق کا ثواب پالیا تھا۔ کیونکہ مومن کی نیت اس کے عمل سے زیادہ بہتر ہے۔

قولہ :قال محمد بن اسماعیل البخاری ثلاث و ستین اکثر :ثلاث (جر کے ساتھ) یا تو اعراب حکائی کی وجہ سے مجرور ہے یالفظ روایۃ اس سے پہلے مقدر ہے امام بخاری کے قول کا مطلب یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ کی عمر مبارک کے بارے میں جو مختلف روایتیں منقول ہیں ان میں سب سے زیادہ روایتیں تریسٹھ سال کے قول کی ہیں۔ امام احمد بن حنبلؒ نے بھی اسی روایت کو ترجیح دی ہے۔ امام نوویؒ شرح مسلم میں لکھتے ہیں آپ کی عمر مبارک کے متعلق تین طرح کی روایتیں نقل کی گئی ہیں۔

① آنحضرت ﷺ نے ساٹھ سال کی عمر میں وفات پائی۔

② اس وقت آپ ۶۵ سال کے تھے۔

③ تریسٹھ سال کی عمر میں وفات پائی یہی روایت اصح اور زیادہ مشہور ہے۔ امام مسلمؒ نے یہاں حضرت انسؓ حضرت عائشہؓ اور ابن عباسؓ اور معاویہؓ سے منقول روایات کو نقل کیا ہے۔ تفصیل یہ ہے کہ ساٹھ والی روایت کا دار و مدار اکائیوں کو چھوڑ کے صرف دہائیوں پر ہے جبکہ ۶۵ والی روایت اس کے منافی ہے حضرت عروہؓ بن زبیرؓ نے تو حضرت ابن عباسؓ کی پینسٹھ برس والی روایت کا انکار کیا ہے وہ فرماتے ہیں ابن عباسؓ نے نبوت کا ابتدائی زمانہ ہی نہیں پایا اور آنحضرت ﷺ کے ساتھ ان کی صحبت بھی اتنی نہیں رہی ہے جتنی دیگر حضرات کی رہی۔ مشہور تر روایت کے مطابق آپ ﷺ کی ولادت مبارکہ واقعہ فیل کے سال ہوئی قاضی عیاضؒ نے تو اس پر علماء اور تاریخ دانوں کا اجماع نقل کیا ہے۔ نیز یوم ولادت کے متعلق بھی اس بات کو سب نے متفقہ طور پر تسلیم کیا ہے کہ آپ ﷺ ربیع الاول کے مہینہ پیر کے دن پیدا ہوئے۔ البتہ تاریخ کے بارے میں اختلاف ہے۔ آپ کی وفات بھی ربیع الاول ہی کے مہینے میں ۱۲ تاریخ کو پیر کے دن چاشت کے وقت ہوئی صلوٰت اللہ وسلامہ علیہ۔

یہ بات مخفی نہ رہے کہ یہاں ایک اور قول بھی ہے کہ آپ کی عمر مبارک ساڑھے باسٹھ سال تھی اس کی دلیل آپ ﷺ سے منقول ایک حدیث سے پیش کی جاتی ہے۔ وہ اس طرح کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا ہر آنے والے نبی کی عمر اس سے پہلے نبی کی آدھی عمر کے برابر ہوتی ہے۔ آپ ﷺ سے پہلے حضرت عیسیٰ علیہ السلام گزرے ہیں جن کی عمر ایک سو پچیس سال تھی اس اعتبار سے آپ کی عمر ۶۲ سال چھ ماہ بنتی ہے کہا گیا ہے۔ کہ یہ روایت ضعف سے خالی نہیں اس لئے یہ کہا جا سکتا ہے حساب دانوں کے ہاں الغاء کسور عام طور سے ہوتا ہی ہے اس اعتبار سے تریسٹھ سے نصف سال کم ہو سکتا ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

آغازِ وحی

۵۸۴۱ : وَعَنْ عَآئِشَةَ قَالَتْ اَوَّلُ مَا بُدِئَ بِهٖ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مِنَ الْوَحْيِ الرُّؤْيَا الصَّادِقَةُ فِي النَّوْمِ فَكَانَ لَا يَرٰى رُؤْيًا اِلَّا جَآئَتْ مِثْلَ فَلَقِ الصُّبْحِ ثُمَّ حُبِّبَ اِلَيْهِ الْخَلَاءُ وَكَانَ يَخْلُوْ بِغَارِ حِرَاءٍ فَيَتَحَنَّثُ فِيْهِ وَهُوَ التَّعَبُّدُ اللَّيَالِي ذَوَاتِ الْعَدَدِ قَبْلَ اَنْ يَّنْزِعَ اِلٰى اَهْلِهٖ وَيَتَزَوَّدُ لِذٰلِكَ ثُمَّ يَرْجِعُ اِلٰى خَدِيْجَةَ فَيَتَزَوَّدُ لِمِثْلِهَا حَتّٰى جَاءَهُ الْحَقُّ وَهُوَ فِي غَارِ حِرَاءَ فَجَآئَهُ الْمَلَكُ فَقَالَ اِقْرَاْ فَقَالَ مَا اَنَا بِقَارِئٍ قَالَ فَاَخَذَنِيْ فَغَطَّنِيْ حَتّٰى بَلَغَ مِنِّيَ الْجُهْدُ ثُمَّ اَرْسَلَنِيْ فَقَالَ اقْرَاْ قُلْتُ مَا اَنَا بِقَارِئٍ فَاَخَذَنِيْ فَغَطَّنِي الثَّانِيَةَ حَتّٰى بَلَغَ مِنِّيَ الْجُهْدُ ثُمَّ اَرْسَلَنِيْ فَقَالَ اقْرَاْ قُلْتُ مَا اَنَا بِقَارِئٍ فَاَخَذَنِيْ فَغَطَّنِي الثَّالِثَةَ حَتّٰى بَلَغَ مِنِّيَ الْجُهْدُ ثُمَّ اَرْسَلَنِيْ فَقَالَ اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِيْ خَلَقَ خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ اِقْرَاْ وَرَبُّكَ الْاَكْرَمُ الَّذِيْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ يَعْلَمْ فَرَجَعَ بِهَا رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَرْجُفُ فُؤَادُهٗ فَدَخَلَ عَلٰى خَدِيْجَةَ فَقَالَ زَمِّلُوْنِيْ زَمِّلُوْنِيْ فَزَمَّلُوْهُ حَتّٰى

ذَهَبَ عَنْهُ الرَّوْعُ فَقَالَ لِخَدِيْجَةَ وَاَخْبَرَهَا الْخَبَرَ لَقَدْ خَشِيْتُ عَلٰى نَفْسِيْ فَقَالَتْ خَدِيْجَةُ كَلَّا وَاللّٰهِ لَا يُخْزِيْكَ اللّٰهُ اَبَدًا اِنَّكَ لَتَصِلُ الرَّحِمَ وَتَصْدُقُ الْحَدِيْثَ وَتَحْمِلُ الْكَلَّ وَتَكْسِبُ الْمَعْدُوْمَ وَتَقْرِي الضَّيْفَ وَتُعِيْنُ عَلٰى نَوَائِبِ الْحَقِّ ثُمَّ انْطَلَقَتْ بِهٖ خَدِيْجَةُ اِلٰى وَرَقَةَ بْنَ نَوْفِلِ ابْنِ عَمِّ خَدِيْجَةَ فَقَالَتْ لَهٗ يَا ابْنَ عَمِّ اسْمَعْ مِنِ ابْنِ اَخِيْكَ فَقَالَ لَهٗ وَرَقَةُ يَا ابْنَ اَخِيْ مَاذَا تَرٰى فَاَخْبَرَهٗ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ خَبَرَ مَا رَاٰى فَقَالَ وَرَقَةُ هٰذَا النَّامُوْسُ الَّذِيْ اَنْزَلَ اللّٰهُ عَلٰى مُوْسٰى يٰلَيْتَنِيْ كُنْتُ فِيْهَا جَذَعًا يٰلَيْتَنِيْ اَكُوْنُ حَيًّا اِذْ يُخْرِجُكَ قَوْمُكَ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَوَ مُخْرِجِيَّ هُمْ قَالَ نَعَمْ لَمْ يَاْتِ رَجُلٌ قَطُّ بِمِثْلِ مَا جِئْتَ بِهٖ اِلَّا عُوْدِيَ وَاِنْ يُدْرِكْنِيْ يَوْمُكَ اَنْصُرْكَ نَصْرًا مُؤَزَّرًا ثُمَّ لَمْ يَنْشَبْ وَرَقَةُ اَنْ تُوُفِّيَ وَفَتَرَ الْوَحْيُ. (متفق علیه)

اخرجه البخاري في صحيحه ۲۳/۱ حديث رقم ۳ ومسلم في صحيحه ۱۳۹/۱ حديث رقم (۲۵۲-۱۶۰) واخرجه الترمذي ۵۰۶/۵ حديث رقم ۳۶۳۲ واحمد في المسند ۲۳۲/۶

ترجمہ: ''حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے' فرماتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ پر نزولِ وحی کا آغاز رؤیائے صادقہ سے ہوا' آپ ﷺ جو خواب دیکھتے اس کی تعبیر (کسی ابہام و اشتباہ کی آمیزش کے بغیر) صبح کے اُجالے کی طرح روشن ہو کر سامنے آ جاتی' اس کے بعد (جب کہ ظہورِ نبوت کا وقت آنے کو ہوا) آپ ﷺ کو تنہائی کا شائق بنا دیا گیا اور آپ ﷺ غارِ حرا میں خلوت گزین رہنے لگے' اس غار میں آپ ﷺ عبادت کیا کرتے یعنی متعدد راتیں وہیں عبادت میں مشغول رہتے جب تک کہ گھر والوں (کے پاس جانے) کا اشتیاق پیدا نہ ہو جاتا' آپ ﷺ (ان عبادت کی راتوں کے لئے گھر سے) کھانے پینے کی چیزیں لے جاتے اور (جب وہ چیزیں ختم ہو جاتیں تو) پھر حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے پاس تشریف لاتے اور اگلی راتوں کے بقدر کچھ چیزیں لے کر واپس غار میں چلے جاتے (یہ سلسلہ یوں ہی جاری رہا) یہاں تک کہ حق (کے ظہور کا وقت) آ گیا' آپ ﷺ اس وقت غارِ حرا ہی میں تھے' آپ ﷺ کے پاس فرشتہ (یعنی جبرئیل اور ایک روایت کے مطابق اسرافیل علیہ السلام) آیا اور کہا کہ پڑھو! آپ ﷺ نے جواب دیا میں پڑھنا نہیں جانتا۔ آنحضرت ﷺ فرماتے ہیں: فرشتہ نے (میرا یہ جواب سن کر) مجھ کو پکڑ لیا اور خوب زور سے دبایا یہاں تک کہ میں پریشان ہو گیا' پھر اس (فرشتہ) نے مجھے چھوڑ دیا اور کہا: پڑھو! میں نے پھر کہا کہ میں پڑھنا نہیں جانتا۔ آنحضرت ﷺ ارشاد فرماتے ہیں: فرشتہ نے دوسری مرتبہ مجھ کو پکڑ لیا اور (خوب زور سے) دبایا' یہاں تک کہ میں پریشان ہو گیا' پھر اس نے مجھے چھوڑ دیا اور کہا پڑھو! میں نے اب بھی یہی کہا کہ میں پڑھنا نہیں جانتا۔ فرشتہ نے تیسری مرتبہ مجھ کو پکڑا اور (خوب زور سے) دبایا یہاں تک کہ میں پریشان ہو گیا' پھر اس نے مجھے چھوڑ دیا اور کہا: اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِيْ خَلَقَ خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ اِقْرَاْ وَرَبُّكَ الْاَكْرَمُ الَّذِيْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ يَعْلَمْ '' یعنی پڑھو اپنے پروردگار کے نام سے جس نے (تمہیں اور ہر چیز کو) پیدا کیا' انسان کو (رحمِ مادر میں) جمے ہوئے خون سے پیدا کیا' پڑھو اور تمہارا پروردگار سب سے بزرگ و برتر ہے' وہ پروردگار جس نے قلم کے ذریعہ بہت سا علم سکھایا اور انسان کو ہر وہ چیز سکھائی جس کو وہ نہ جانتا تھا۔' اس کے بعد

(فرشتہ تو غائب ہو گیا اور) آپ ﷺ ان آیتوں کے ساتھ (اپنے گھر) واپس آئے اس وقت یہ حال تھا کہ (وحی کی شدت رعب سے سخت دہشت زدہ تھے اور نہ صرف) آپ ﷺ کا دل کانپ رہا تھا (بلکہ بخار اور لرزہ کی کیفیت پورے جسم پر طاری تھی) آپ ﷺ نے حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے پاس پہنچ کر کہا کہ مجھے کمبل اڑھا دو' مجھے کمبل اڑھا دو' انہوں نے آپ ﷺ کو کپڑا اڑھا دیا یہاں تک کہ (کچھ دیر کے بعد اس رعب و ہیبت کی شدت ختم ہوئی تو) آپ ﷺ کا خوف و ہراس جاتا رہا (اور اصل جسمانی حالت بحال ہوئی) تب آپ ﷺ نے حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا سے سارا واقعہ کہہ سنایا اور ان سے یہ بھی فرمایا کہ مجھ کو اپنی جان کا خوف ہے۔ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا نے (تسلی دیتے ہوئے) کہا کہ آپ ﷺ قطعاً خوف نہ کریں۔ (آپ ﷺ جو سوچ رہے ہیں ایسا ہرگز نہیں ہوگا) خدا کی قسم (مجھے پورا یقین ہے کہ) اللہ تعالیٰ آپ ﷺ کو کبھی رسوا نہیں کرے گا کیونکہ آپ ﷺ قرابت داروں سے صلہ رحمی کرتے ہیں (اگرچہ وہ قرابت دار آپ ﷺ سے ترک تعلق اور بدسلوکی ہی کا معاملہ کیوں نہ کرتے ہوں) بعض روایتوں میں یہاں یہ الفاظ بھی ہیں کہ تودی الامانة۔ یعنی آپ ﷺ امانت کی ادائیگی میں کوتاہی نہیں کرتے۔ دوسروں کا بوجھ اٹھاتے ہیں' غریبوں اور مسکینوں پر خرچ کرنے کے لئے کماتے ہیں' مہمانوں کی خاطر مدارت کرتے ہیں (اور ان کی ہر طرح سے مدد کرتے ہیں) اور مصیبت زدہ افراد ان کی مدد کرتے ہیں۔ اس کے بعد حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا آپ ﷺ کو اپنے چچا زاد بھائی ورقہ بن نوفل کے پاس لے گئیں اور ان سے کہا کہ: اے ابن عم! اپنے بھتیجے کی روداد سن لیجئے! ورقہ آنحضرت ﷺ کی طرف متوجہ ہوئے اور کہا میرے بھتیجے! تم کیا دیکھتے اور محسوس کرتے ہو؟ رسول اللہ ﷺ نے وہ سارا واقعہ ان کے گوش گزار کر دیا جو آپ ﷺ کے ساتھ پیش آیا تھا' ورقہ نے (ساری باتیں سن کر) کہا کہ (تم دونوں کو مبارک ہو) یہ تو وہی ناموس (فرشتہ) ہے جسے اللہ تعالیٰ وحی دے کر حضرت موسیٰ علیہ السلام کے پاس بھیجتا تھا' کاش میں طاقتور جوان ہوتا' کاش میں اس وقت زندہ ہی رہتا (چاہے میرے اندر طاقت و توانائی نہ ہوتی) جب تمہاری قوم (یعنی قریش میں سے تمہارے قرابت دار تمہارے شہر سے) تمہیں نکال دیں گے۔ رسول اللہ ﷺ نے (یہ سن کر حیرت کے ساتھ) پوچھا! کیا واقعی میری قوم مجھے نکال دے گی؟ ورقہ نے کہا: ہاں (تمہاری قوم کے لوگ تمہیں شہر سے ضرور نکال دیں گے) کیونکہ (ہمیشہ یہی ہوا ہے کہ جب بھی کوئی شخص تمہاری طرح نبوت و شریعت لے کر آیا' اس کے ساتھ دشمنی کی گئی (ایک روایت میں یوں ہے: جب بھی کوئی پیغمبر اس دنیا میں آیا کافروں نے اس کے ساتھ دشمنی کی اور اس کو سخت ترین ایذائیں پہنچائیں' اگر میں ان ایام میں (جب تم لوگوں کو خدا کے دین کی طرف بلاؤ گے اور اس کے جواب میں تمہاری قوم کے لوگ تمہیں ایذا پہنچائیں گے اور تمہیں تمہارے شہر سے نکالیں گے) زندہ رہا تو پوری طاقت و قوت سے تمہاری مدد و حمایت کروں گا۔ لیکن اس کے بعد ورقہ زیادہ دن زندہ نہ رہے اور جلد ہی اس دنیا سے رحلت کر گئے اور آپ ﷺ پر وحی آنے کا سلسلہ بھی کچھ دن کے لئے منقطع ہو گیا''۔ اس روایت کو یہاں تک بخاری و مسلم دونوں نے نقل کیا ہے۔

تشریح: امام نوویؒ لکھتے ہیں یہ حدیث مراسیل صحابہ میں سے ہے کیونکہ حضرت عائشہؓ نے وحی کا ابتدائی زمانہ نہیں پایا ہے۔ یقیناً ام المومنینؓ نے یہ واقعہ آنحضرت ﷺ یا کسی صحابی سے سن کر روایت کیا ہوگا۔ مراسیل صحابہ سوائے استاذ ابواسحٰق اسفرائنی کے جمہور علماء کے ہاں حجت ہیں' طیبی لکھتے ہیں زیادہ ظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ ام المومنینؓ نے خود آنحضرت ﷺ سے ہی

سنا ہے کیونکہ ام المومنین سے آگے فاخذنی فغطنی کے الفاظ معول ہیں جو قرینہ ہے اس بات کا کہ آنحضرت ﷺ کے جو الفاظ منقول تھے اس کی روشنی میں ام المومنین نے اول ما بدیء به رسول الله کے الفاظ کے ساتھ اس حدیث کو حکایۃً نقل کیا ہے اس کی مثال قرآن کریم سے بھی ملتی ہے چنانچہ آیت قل للذین کفروا ستغلبون کلمہ تاء اور یاء ہر دونوں کے ساتھ منقول ہے اور اس تفسیر کے مطابق کہ آنحضرت ﷺ وحی الٰہی کو انہیں الفاظ یا ان کے ہم معنی الفاظ کے ساتھ ادا فرماتے آیت کا یہ جملہ بھی دونوں الفاظ کے ساتھ منقول ہونے کی وجہ سے پڑھا جاتا ہے اس تحقیق کے اعتبار سے یہ حدیث مراسیل صحابہ مین سے نہیں ہو گی۔

میں کہتا ہوں طیبیؒ سے یہ انوکھی بات صادر ہوئی ہے کیونکہ حضرت ام المومنینؓ نے حدیث کے آغاز میں یہ نہیں بتایا کہ میں نے آنحضرت ﷺ سے سنا لامحالہ یہ مراسیل ہی میں سے ہے۔ انہوں نے یا تو آنحضرت ﷺ سے سنا یا کسی صحابی سے سن کے نقل فرمایا ہے دونوں صورتوں میں قال کا لفظ غلط نہیں یا تو قال کہہ کر آپ کا کلام نقل کیا ہے یا صحابی کا کلام نقل کیا ہے صحابی کے کلام ہونے کی صورت میں تقدیر عبارت ہوگی قال نا قلاً عنه الصلوٰة و السلام یعنی حضور ﷺ کا قول نقل کرتے ہوئے انہوں نے یوں فرمایا۔ پھر زیادہ واضح بات یہ ہے کہ آپ ﷺ کا قول من الوحی میں من تبعیضیہ ہے بعض حضرات نے بیانیہ لکھا ہے لیکن بیانیہ صحیح نہیں ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اقسام وحی کا سلسلہ سب سے پہلے جس چیز سے شروع ہوا وہ سچے خواب کا نظر آنا تھا۔ فی النوم یا تو تاکید کے لیئے ہے یا تجرید ہے کیونکہ خود لفظ الرؤیا کا استعمال اسی پر ہوتا ہے جو نیند میں دیکھا جاتا۔

پھر جان لیجئے۔ سچے خواب کی حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ خوابیدہ شخص کے دل و دماغ یا اس کے حواس میں ان چیزوں کا عکس پیدا کرتا ہے (جو آئندہ وقوع پذیر ہونے والی ہوتی ہیں یا پہلے وقوع پذیر ہو چکی ہوتی ہیں لیکن پہلے سے اس شخص کے علم میں نہیں ہوتیں) اللہ سبحانہ وتعالیٰ کو ہر چیز پر قدرت حاصل ہے وہ جس طرح چاہتا ہے کر دیتا ہے اس کے کسی فعل یا حکم کی راہ میں نہ نیند رکاوٹ بن سکتی ہے نہ اور کوئی چیز۔ بسا اوقات انسان خواب میں جو کچھ دیکھتا ہے اس کی بعینہٖ عملی تعبیر وہ جاگنے کے بعد دیکھ یا جان لیتا ہے۔ اور بسا اوقات خواب میں دیکھی جانے والی چیز آئندہ پیش آنے والے حالات کی علامت اور نشانی ہوتی ہے یا ماضی میں ہونے والے واقعات کی خبر ہوتی ہے۔ جیسے بادلوں کو اللہ تعالیٰ نے بارش کی علامت بنایا ہے اسی طرح یہ چیزیں بھی حق تعالیٰ کے حکم اور قدرت کے تحت وقوع پذیر ہوتی ہیں۔ (علامہ کرمانیؒ کی تحقیق)

فکان لا یری رؤیا: ایک نسخہ میں "الرؤیة" ہے **مثل فلق الصبح**: لفظ فلق فاء اور لام کے فتحہ کے ساتھ (نصر ینصر سے) ہے۔

شرح السنۃ میں ہے کہ اس کا معنی یہ ہے کہ وہ خواب اس طرح پورے ہوتے جیسے صبح کی روشنی پھوٹتی ہے۔ ایک شارح کہتے ہیں لفظ فلق تینوں حروف کی حرکت کے ساتھ عین صبح کے معنی میں ہے۔ اس صورت میں صبح کی جانب اس کی اضافت بہت اچھی ہے اور اگرچہ یہ اضافت اختلاف لفظ کی وجہ سے ہے کیونکہ یہ الفاظ مشترکہ میں سے ہے کیونکہ فلق صبح کو بھی کہتے ہیں اور نشیبی زمین کو بھی۔ چنانچہ بیداری میں خواب کے موافق پیش آنے والے امور کو ان کے واضح، روشن اور صحیح ہونے میں صبح سے تشبیہ دی گئی ہے۔

قاضی عیاضؒ فرماتے ہیں آپ ﷺ کو حالت بیداری میں جو امور پیش آتے وہ خواب کے عین مطابق ہوتے تھے۔ تو ان کی

وضاحت کی وجہ سے انہیں صبح سے تشبیہ دی ہے فلق صبح ہی کو کہتے لیکن لفظ فلق جہاں اس معنی میں استعمال ہوتا ہے دیگر معانی میں بھی استعمال ہوتا ہے جیسے قل اعوذ بربك الفلق میں ہے اس لئے تخصیص اور بیان کے لئے اس کی اضافت صبح کی طرف کی گئی ہے گویا کہ عام کی اضافت خاص کی طرف ہے عرب کہتے ہیں عین المشیء ونفس الشیء۔

طیبیؒ لکھتے ہیں فلق (صبح) کی اپنی ایک عظیم شان ہے اسی وجہ سے آیت مبارکہ: ﴿فالق الاصباح﴾ [الانعام: ۹۶] میں یہ کلمہ باری تعالیٰ کے وصف کے طور پر آیا ہے اور صبح کے رب کی پناہ مانگنے کا حکم دیا گیا ہے اس لئے کہ وہ عالم شہادت سے اندھیرے کے چھٹنے اور سورج کے طلوع ہونے سے صبح کے آثار نمودار ہونے اور آفاق کی روشن ہونے کی خبر دیتا ہے کیونکہ رؤیا صالحہ مبشرات ہیں وہ بھی عالم غیب کے انوار اور الہامات کے طلوع ہونے کے اثر کا پتہ دیتے ہیں۔ ان خوابوں کو جو کہ نبوت کا ایک معمولی حصہ اور ثبوت نبوت کی تنبیہات میں سے ایک تنبیہ ہیں صبح سے تشبیہ دی گئی ہے۔ آپ ﷺ کو بھی نبی اس لئے کہا جاتا ہے کہ آپ غیب کی ایسی خبریں دیتے تھے کہ جس کے ادراک سے عقل عاجز تھی۔ شرح مسلم للنووی میں ہے وحی کا ابتدائی سلسلہ رؤیا صالحہ سے اس لئے شروع کیا گیا کہ اگر فرشتہ اچانک سامنے آتا اور صریح نبوت کے ساتھ اچانک نازل ہو جاتا تو اس کا تحمل نہ کر پاتے۔ اس لئے مانوس کرنے کے لئے عزت وشرف کے ابتدائی آثار رؤیائے صالحہ کے ذریعہ شروع کیے گئے۔ میں کہتا ہوں امور دینیہ ودنیاویہ میں مقتضیٰ ہی یہی ہے کہ تمام امور تدریجاً ہوں۔

قولہ :ثم حبب الیہ الخلاء مد کے ساتھ۔ خلوت' تخلیہ کے زیادہ مناسب ہے اور تخلیہ تخلیہ سے مقدم ہوتا ہے۔

امام نوویؒ فرماتے ہیں خلوت گزینی عارفین وصالحین کی مخصوص شان ہے۔ خطابیؒ فرماتے ہیں آپ کو خلوت اس لئے محبوب بنا دی گئی تھی کہ اس سے دل ودماغ کو فراغت حاصل ہوتی ہے۔ اللہ کی یاد میں معین ومددگار بنتی ہے۔ بشری خواہشات سے روکتی ہے (یعنی مروج چیزوں سے خلوت گزینی بچاتی ہے) عبادت میں خشوع خضوع اور خاطر جمعی پیدا کرتی ہے۔ کیونکہ جب خلوت گزینی کرنے والا اپنے مولیٰ کی خاطر اس کی پناہ میں آتا ہے تو وہ بھی اس کے مقصود کو اس پر کھول دیتا ہے چنانچہ جب نفس کی تاریکی ختم ہو جاتی ہے تو دل غیب کے نور سے روشن ہو جاتا ہے۔

سلامت دین' احوال نفس کے جائزہ اور اخلاص عمل کی خاطر خلوت مطلوب وپسندیدہ ہے۔ اھ۔ خلوت وجلوت اور عزلت واختلاط کی افضلیت میں اختلاف ہے صحیح یہ ہے کہ ان میں سے ہر ایک صورت اپنے موقع محل میں معتبر اس کا مدار پیش آمدہ حالات ومعاملات کے حسن وقبیح پر ہے اور ان دونوں میں سے ہر ایک صورت ان کے ساتھ افضل ہے اس مصلحت کے پیش نظر کہ جس پر حکمت الٰہیہ کا ترتب ہوتا ہے اور صفت ربوبیت کے اقتضاء کے پیش نظر۔

قولہ :وکان یخلو بغار حراء: حائے مہملہ کی کسرہ راء کی تخفیف اور مد کے ساتھ' صحیح قول کے مطابق مذکر اور منصرف ہے۔ بعض کا کہنا ہے کہ مؤنث ہے اور غیر منصرف ہے۔ امام نوویؒ نے بھی اس کو ذکر کیا ہے۔ قاضی زاہد' صاحب ثعلبی ' خطابی وغیرہما حضرات کہتے ہیں لفظ حراء میں عوام تین غلطیاں کرتے ہیں۔

① حاء کو فتحہ دیتے ہیں حالانکہ حاء مکسورہ ہے۔

② راپر کسرہ پڑھتے ہیں حالانکہ وہ مفتوح ہے۔

④ الف کو مقصور پڑھتے ہیں حالانکہ وہ ممدودہ ہے۔
حرا مشہور پہاڑ کا نام ہے جو مکہ مکرمہ کے نواح میں مکہ سے منیٰ جاتے ہوئے تین میل کے فاصلہ پر بائیں جانب واقع ہے۔
شارحؒ لکھتے ہیں حرا حاء کے کسرہ اور الف ممدودہ کے ساتھ ہے الف کو مقصورہ پڑھنا غلط ہے مذکر و مونث دونوں شمار کیا جاتا ہے اول کی حیثیت سے منصرف اور ثانی کی حیثیت سے غیر منصرف ہے۔ میں کہتا ہوں شاید مذکر کہنے کی وجہ باعتبار موضع اور تانیث کہنے کی وجہ باعتبار بقعۃ کے ہے۔
عسقلانیؒ لکھتے ہیں کلمہ حراء حاء کے کسرہ اور الف ممدودہ کے ساتھ ہے یہی اعراب روایۃً صحیح ہے اگر چہ اس کے علاوہ بھی وجوہ جواز نقل کی جاتی ہیں لیکن وہ روایۃً ثابت نہیں۔ اصیلیؒ کے نزدیک یہ کلمہ حاء کے فتحہ اور الف مقصورہ کے ساتھ ہے۔
فیتحنث فیه: یعنی اغیار سے جدا ہو کے وہاں عبادت میں مصروف رہتے۔ سیرت ابن ہشام میں لفظ تحنث کی جگہ فاء کے ساتھ **فیتحنف** کا لفظ آیا ہے یعنی دین حنیف ملت ابراہیمی کے مطابق عبادت کرتے تھے۔ امام سیوطیؒ لکھتے ہیں تاء کو اکثر عرب فاء سے تبدیل کرتے ہیں۔ وھو یعنی تحنث کا معنی التعبد ہے۔ "حنث" کا معنی ہے "اثم" یعنی گناہ۔ یہ معنی اس لئے اختیار فرمایا کیونکہ عبادت کرنے والا باطل سے حق کی جانب جاتا ہے اور عبادت کے ذریعہ گناہوں سے اجتناب کرنے کی کوشش کرتا ہے "**وھو التعبد**" کے ساتھ یہ جملہ تفسیر یہ یا تو حضرت عائشہؓ کا قول ہے یا امام زہری کا جس کو حدیث میں مندرج کیا گیا ہے۔
تحنث کا اصل معنی گناہ کے ہیں باب تفعیل میں سلب ماخذ کی خاصیت پائی جاتی ہے لہٰذا اس کے معنی ازالہ اثم کے ہوں گے اور یہ تعبد کو مستلزم ہیں بعض حضرات کہتے ہیں اپنے اوپر سے کسی چیز کے اتارنے کے معنی ہیں۔ تحنث تو ثم اور تحوب کے علاوہ کوئی مادہ باب تفعیل سے نہیں آتا ہے۔ شارح نے بھی ایسا ہی ذکر کیا ہے۔
امام سیوطیؒ فرماتے ہیں "**وھو التعبد**" یقینی طور پر مدرج ہے۔ عسقلانیؒ فرماتے ہیں اس میں احتمال ہے کہ یہ حضرت عروہ یا ان سے نیچے کے کسی کا قول ہے طیبیؒ نے جزم کے ساتھ امام زہری کی جانب سے ادراج نقل کیا ہے لیکن اس کی دلیل ذکر نہیں کی۔ تورپشتیؒ فرماتے ہیں۔ حضرت عائشہؓ نے "**تحنث**" کی تفسیر "**ھو التعبد**" سے بیان کیا ہے اگر چہ اس میں یہ بھی احتمال ہے کہ یہ امام زہریؒ کا قول ہو کہ انہوں نے اپنا قول حدیث میں داخل کر دیا ہے۔ امام نوویؒ فرماتے ہیں یہ زہری کی عام عادت ہے۔ اور **اللیالی ذوات العدد** کا تعلق تحنث کے ساتھ ہے نہ کہ التعبد کے ساتھ۔ کیونکہ اس کا مطلب ہے راتوں کو عبادت کرنا۔ اگر اس کو تعبد کے ساتھ متعلق کریں گے تو معنی غلط ہو جاتا ہے۔ کیونکہ تحنث کے معنی میں رات بھر عبادت کرنا شرط نہیں قلیل و کثیر دونوں مراد لیے جاسکتے ہیں یہ تسری قول ام المومنین کا کلام ہے کیونکہ **فیتحنث فیه اللیالی ذوات العدد** پھر فیتحنث کی تفسیر وھو التعبد سے بیان کی گئی ہے۔ بہر حال متعدد راتوں سے مراد کئی روز و شب ہیں اور خاص طور پر راتوں کا ذکر اس وجہ سے کیا گیا ہے کہ خلوت کے ساتھ رات کا جوڑ زیادہ موزوں اور مناسب تھا۔
متعدد کی قید اس سے قلت کی طرف اشارہ ہے جیسے اس آیت: ﴿دراهم معدودة﴾ (یوسف: ۲۰) میں ہے۔ پس "**ذات العدد**" سے قلت مراد ہے اور بعض حضرات کہتے ہیں اس سے کثرت بھی مراد ہو سکتی ہے کیونکہ کثیر عدد کا محتاج ہوتا ہے قلیل عدد کا محتاج نہیں ہوتا۔ بعض کا کہنا ہے کہ عدد کا ابہام اس مدت کے ایام مختلف ہونے کی وجہ سے ہے۔ جس کے دوران آنحضرت ﷺ

گھر واپس آتے تھے۔ ورنہ اصل خلوت کی مدت معلوم ہے۔ کیونکہ محققین نے لکھا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خلوت گزینی کی مدت ہر سال ایک مہینہ ہوتی تھی اور وہ مہینہ رمضان کا ہوتا تھا۔ میں کہتا ہوں کہ یہ مدت چالیس دن کی ہوتی ہوگی' حضرت موسیٰ علیہ السلام کے میعار قیاس کرتے ہوئے۔ علاوہ ازیں اس میں ''اربعینات'' کے ''اطوار'' کے ساتھ مطابقت بھی ہے۔ (مظاہر) حمل کے ۴۰ دن کی دورانہ مراد لئے ہیں کیونکہ اس مدت کے خواص وآثار ہیں' جس کے آثار وانورات صوفیا پر ظاہر ہونے کی عام عادت مشہور ہے۔ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا بھی ارشاد ہے **من اخلص لله اربعين صباحا ظهرت ينابيع الحكمة من قلبه على لسانه** جو شخص خلوص نیت سے چالیس دن تک خدا کی عبادت کرتا ہے تو حکمت کے چشمے اس کے دل سے نکل کر زبان پر پھوٹ پڑتے ہیں۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نبوت سے پہلے سابقہ شریعتوں میں سے کس شریعت کی اتباع کرتے تھے؟

حافظ عسقلانی لکھتے ہیں اس کے متعلق کوئی خاص تصریح والی روایت نہیں۔ لیکن ابو اسحاق کے ہاں عبید بن عمیر کی روایت میں یہ الفاظ ہیں: **فيطعم من يرد عليه من المشركين** کہ مشرکین میں سے جو بھی آپ کے پاس آتے آپ کھانا کھلاتے تھے یعنی صدقات فرماتے۔ امام سیوطیؒ نے حاشیہ مسلم میں بعض مشائخ کے حوالے سے نقل کیا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی عبادت کا تعلق فکر و استغراق سے ہوتا تھا۔ (ذكره السيوطي في حاشية مسلم)

امام ابن ہمام کی کتاب التحریر میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بعثت سے قبل بھی عبادت کیا کرتے تھے اب عبادت کس شریعت کے مطابق کرتے اس میں کئی قول ہیں بعض کہتے ہیں حضرت نوح کی شریعت کے مطابق کرتے تھے۔ بعض کہتے ہیں حضرت ابراہیم کی شریعت کے مطابق بعض کہتے ہیں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی شریعت کے مطابق بعض کہتے ہیں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی شریعت کے مطابق عبادت کیا کرتے تھے۔

مالکیہ اور آمدی نے اس کی نفی کی ہے۔ امام غزالیؒ نے توقف کیا ہے' یعنی اس بارے میں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی بعثت سے پہلے کس شریعت کے مطابق عبادت کیا کرتے تھے۔

تحریر کی شرح میں لکھا ہے کہ امام الحرمینؒ اور مازری وغیرہما فرماتے ہیں اس مسئلہ میں اصول اور فروع کے اعتبار سے کوئی ثمرہ ظاہر نہیں ہوتا بلکہ اس میں منقول ایک تاریخی بات مذکور ہے اس پر کوئی شرعی حکم مرتب نہیں ہوتا۔ التعبد سے بظاہر یہاں عبودیت کے لئے تجرد مراد ہے اور تجرد کا مطلب ہے مخلوق سے بالکل منقطع ہونا اور صفت ربوبیت کے تقاضے کے موافق رب کی عبادت کے لئے ہر شے سے یکسو ہونا نفس کی خواہشات اور شہوانی حاجات سے خالی ہونا۔

اس کا خلاصہ یہ ہے کہ ماسوا اللہ سے ''غیوبت'' اور حضوری مع اللہ ہو' جس کا ترجمہ **لااله الاالله** سے ہوتا ہے کیونکہ حدیث میں آتا ہے افضل الذکر **لااله الاالله** اور یہی مطلب ہے: ﴿فاعلم انه لااله الا الله﴾ [محمد: ١٩] کا جس کو صوفیہ فناء' بقاء انفصال' اتصال' بینونہ اور کینونہ سے تعبیر کرتے ہیں۔ یہی یہ (بندوں) عبادت گزاروں کے مراتب ومطالب کی انتہا ہوتی ہے۔

قبل ان ينزع الى اهله: کہا جاتا ہے نزع الى اهله ينزع اہل وعیال کی دید کا مشتاق ہونا (یعنی آپ صلی اللہ علیہ وسلم عبادت میں اس وقت تک مشغول رہتے جب تک گھر والوں کے پاس جانے کا اشتیاق پیدا نہ ہو جاتا) اسی وجہ سے بعض کہتے ہیں ينزع يرجع کا

ہم وزن و ہم معنی ہے۔ایک شارح لکھتا مطلب یہ ہے کہ آپ اہل کو بالکل چھوڑ کے خلوت گزین نہیں ہوتے جس پر آپ ﷺ کا قول یتزود بھی دلالت کر رہا ہے۔ ویتزود مرفوع ہے اس حدیث میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ توشہ لینے کا اہتمام کرنا توکل اور اعتماد کے منافی نہیں۔حاصل یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ حتی جاءه الحق: مصاف محذوف ہے یا تو لفظ امر الحق سے مراد وحی ہوگی یا امر الحق سے مراد رسل الحق ہے اس صورت میں رسول الحق سے حضرت جبرائیل علیہ السلام مراد ہوں گے یہ تو رپشتیؒ نے ذکر کیا ہے۔یا یہ معنی ہے کہ حق ظاہر ہو گیا اور جمال مطلق ظاہر ہو گیا و هو ...... الملك الف لام عہدی ہے۔کون سے فرشتے تھے؟ صحیح قول یہ ہے کہ حضرت جبرائیل علیہ السلام تھے ایک روایت کے مطابق حضرت اسرافیل تھے۔فقال اقرأ :اقرأ مطلقاً ہے جو امر کا تقاضا کرتا ہے۔

قوله : فقال: ما انا بقاری: مطلب تھا کہ میں اچھی طرح پڑھنے پر قادر نہیں ہوں میں نے پڑھنا اس طرح نہیں سیکھا جیسے پڑھنے والے سیکھتے ہیں۔

فغطنی: طاء کی تشدید کے ساتھ بمعنی عصرنی یعنی مجھے بھینچا۔بعض کا کہنا ہے کہ ''غط'' کا اصل معنی پانی میں ڈبکی دینا غوطہ لگانا ہے۔نہایہ وغیرہ میں اس طرح آیا ہے اور غوطہ کھانے کی وجہ سے انسان کا سانس گھٹتا ہے۔اس لئے اس کا استعمال گلہ گھوٹنے کے معنی میں بھی ہوتا ہے۔اس لئے بعض روایات میں ہے فخنقنی میں کہتا ہوں الغط کا زیادہ ظاہر یہ ہے کہ ''الغط'' کا معنی ''العصر'' ہے۔خواہ پیٹ کی طرف سے ہو خواہ پشت کی طرف سے ہو لیکن بسا اوقات زیادہ شدت کی وجہ سے سانس گھٹ جاتا ہے اس لئے کبھی گلا گھوٹنے کے مشابہ ہو جاتا ہے اس لئے خنق سے تعبیر کر دیا گیا ہے۔یہ مطلب اولیٰ اور اخلق ہے شرح مسلم میں ہے علماء فرماتے ہیں اس کی حکمت یہ تھی کہ حضرت جبرائیل علیہ السلام آپ کو جو کچھ پڑھانا چاہ رہے تھے اس کی طرف مکمل توجہ اور حضور رب قلبی ہو جائے اور تین بار بھینچنا اس تنبیہ میں مزید مبالغہ کے لئے تھیں۔

اس حدیث سے یہ بات ثابت ہوئی ہے کہ معلم کو چاہئے کہ متعلم کو تنبیہ کرتے وقت احتیاط کرے۔استاذ شاگرد کو حضور قلب کا حکم دے۔وقیل انما غط لیختبره بعض حضرات فرماتے ہیں حضرت جبرائیل نے آپ کو بطور امتحان بھینچا تھا کہ آپ اپنے طور پر بھی کچھ پڑھنا (یا کہہ) سکتے ہیں کہ نہیں۔حتی بلغ منی الجهد: جیم کے ضمہ کے ساتھ فتحہ بھی دیا جاتا ہے اور رفع، نصب دونوں کے ساتھ پڑھا گیا ہے رفع کی صورت میں بلغ کا فاعل ہوگا اس وقت معنی ہوں گے کہ میری مشقت انتہا کو پہنچ گئی اور نصب کی صورت میں معنی ہوگا میری وجہ سے وہ فرشتہ مشقت کی انتہا کو پہنچ گیا۔

امام نوویؒ لکھتے ہیں لفظ الجهد کے جیم پر فتحہ اور ضمہ دونوں جائز ہیں جس کا معنی انتہاء اور مشقت کے ہیں اور دال کے نصب اور رفع کے ساتھ پڑھنا بھی جائز ہے نصب کی صورت میں مطلب ہوگا کہ حضرت جبرائیل علیہ السلام مشقت کی انتہا کو پہنچ گئے اور رفع کی صورت میں معنی ہوں گے: بلغ الجهد منی مبلغه و غایته۔ میری مشقت انتہاء کو پہنچ گئی صاحب تحریر نے بھی جیم کے فتحہ اور دال کے نصب والی وجہ کو ذکر کیا ہے ایک شارح لکھتا ہے۔لفظ جهد جیم کے ضمہ اور دال کے رفع کے ساتھ پڑھا جائے تو معنی ہوگا قوت طاقت سے بھینچنے کے اور جیم کے فتحہ کے ساتھ پڑھنے کی صورت میں معنی ہوگا مشقت میں پڑھنا۔بعض حضرات کہتے ہیں یہ مبالغہ اور انتہا کے معنی میں ہے بعض کہتے ہیں دونوں لغتیں طاقت کے معنی میں ہیں۔باقی مشقت اور انتہا کا

معنی صرف جیم کے فتحہ کی صورت میں مراد لئے جاسکتے ہیں۔

امام توریشتی رحمہ اللہ فرماتے ہیں جن لوگوں نے دال کے نصب کے ساتھ روایت کیا ہے وہ وہم یا بطور احتمال جائز ہے۔ کیونکہ نصب پڑھنے کی صورت میں معنی بنتا ہے کہ حضرت جبرائیل علیہ السلام نے آپ کو اس قدر بھینچا کہ اپنی قوت کو ختم (خالی) کر دیا اور نہایت مشقت میں مبتلا ہوئے کہ مزید قوت باقی نہیں رہی۔ یہ قول مناسب نہیں کیونکہ بشری قوت ملکیہ کا متحمل نہیں ہو سکتی خصوصاً ابتدائی مرحلہ میں تو اور بھی مشکل ہوتا ہے۔ یہ واقعہ اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ اس سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو گھٹن ہوئی اور گھبرائے۔

طیبیؒ لکھتے ہیں اس وقت حضرت جبرائیل علیہ السلام اپنی اس حقیقی شکل میں نہیں تھے جس شکل میں شب معراج کے وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مقام سدرۃ المنتہیٰ میں کرسی پر بیٹھے ہوئے دیکھا تھا۔ اپنی طاقت صرف کرنے کا مطلب یہ ہے کہ اس وقت جس صورت میں ظاہر ہوئے تھے اس کے مطابق قوت سے بھینچا تھا۔ حضرت جبرائیل اس وقت آدمی کی شکل میں تھے جس وجہ سے ان میں انسانی طاقت باقی رہ گئی تھی۔ اب روایت جب صحیح ہوگی تو اشکال ختم ہوگیا۔ (ملا علی قاریؒ) اصل ہیئت ملکی تبدیل کر کے انسانی شکل اختیار کرنے سے حضرت جبرائیل سے قوت ملکیہ کا سلب ہونا لازم نہیں آتا کیونکہ امر معنوی ہیکل صوری کی تبدیلی سے نہیں بدلتا۔ پس شیخ کا کلام اپنے محل میں ہے اور روایت کی صحت کا دارومدار نقل پر ہوتا ہے نہ کہ نفس جواز ذکر اور حمل پر۔ (لہٰذا شیخ کا کلام اشکال سے خالی نہیں) یعنی یہ ان کی اپنی رائے ہے۔

ارسلنی: حضرت جبرائیل علیہ السلام نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو مقام جمع سے حالت میں ''تفرقہ'' اور مرتبہ ولایت سے مرتبہ نبوت پر منتقل کر کے درجہ ''**جمع الجمع**'' تک پہنچا۔ یعنی حضرت جبرائیل علیہ السلام نے مجھ کو مقام بعد میں چھوڑا **فقال ما أنا بقاری** تمام شارحین کا طریقہ یہ ہے وہ **ما انا بقاری** کا ہر مرتبہ ایک ہی معنی بیان کرتے ہیں یوں کہنا بھی صحیح ہے کہ پہلے جملہ **ما انا بقاری** میں ما نافیہ ہے ثانی میں استفہامیہ اور باء زائدہ ہے یا اہل مصر کے لغت کے مطابق علیٰ کے معنی میں ہے یعنی کیا چیز پڑھوں۔

قوله : فقلت : ما أنا بقاری: فاخذنی...... **بقاری** یہاں **ما** موصولہ مبتداء ہے اور خبر محذوف ہے۔ **ای الذی أنا بقاریٔ ما هو** اس جملہ اور ماقبل والے **ما انا بقاری** میں معنی مقصود کے اعتبار سے فرق یہ ہے کہ پہلا ما استفہام انکاری کے لئے ہے اور یہاں استفہام اعلام کے لئے ہے۔ **فاخذنی...... فقال اقرا باسم ربك:** امام نوویؒ لکھتے ہیں یہ روایت نزول وحی کے اعتبار سے سورہ علق کی ابتدائی آیات کی پہلی وحی ہونے کی صریح دلیل ہے۔ جمہور علماء سلف وخلف کے نزدیک یہی قول صحیح ہے۔ بعض حضرات کہتے ہیں پہلی نازل ہونے والی سورۃ یاایھاالمدثر ہے۔ یہ قول بہت کمزور ہونے کی وجہ سے قابل اعتنا نہیں ہے۔

(ملا علی قاریؒ دونوں قولوں کے درمیان لطیف تطبیق دیتے ہوئے فرماتے ہیں بظاہر سورہ اقراء اول حقیقی ہے اور ﴿یاایھاالمدثر﴾ اضافی ہے یعنی پہلی وحی سورہ اقراء نازل ہونے کے بعد نزول وحی کا جو سلسلہ کچھ عرصہ کے لئے منقطع ہوگیا تھا اور پھر دوبارہ یہ سلسلہ شروع ہوا تو اس وقت سب سے پہلے ﴿یاایھاالمدثر﴾ نازل ہوئی۔

جو حضرات بسم اللہ کے سورت کا جز نہ ہونے کے قائل ہیں انہوں نے اس حدیث سے استدلال کیا ہے (اور یہ استدلال بالکل ظاہر ہے کیونکہ) یہاں بسم اللہ کو ذکر نہیں کیا ہے۔ اور جو حضرات بسم اللہ کے جز ہونے کے قائل ہیں وہ یہ جواب دیتے ہیں کہ بسم اللہ اولاً نازل نہیں ہوئی بلکہ دوسری سورتوں کی طرح دوسرے وقت میں نازل ہوئی ہے۔ میں کہتا ہوں پھر تو بسم اللہ جمیع اوائل سور کا جزء تو نہ ہوئی' کیونکہ ''قائل بالفعل'' تو کوئی بھی نہیں ہے۔

چنانچہ اہل فضل کا دعویٰ خود بخود ثابت ہو جاتا ہے۔ امام نووی رحمہ اللہ نے شاید کہ جب جواب کے ضعف کو سمجھ لیا تو ان کے قول سے براءت کے لئے ''واللہ اعلم بالصواب'' فرمایا۔

طیبیؒ لکھتے ہیں لفظ ''اقرأ'' سے مطلقاً ایجاد قراءت کا حکم ہے اور یہ قراءت کسی ایک پڑھی جانے والی چیز کے ساتھ خاص نہیں ہے۔ اور جملہ (باسم ربك) حال ہے تقدیری عبارت ہے اقرا مفتتحا باسم ربك (اپنے رب کے نام سے آغاز کرتے ہوئے پڑھئے) ای قل بسم الله الرحمن الرحیم ثم اقرأ۔ یعنی پہلے بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کہئے پھر پڑھئے اور یہ اس پر دلالت کرتا ہے کہ ہر قراءت سے قبل بسم اللہ پڑھنا واجب ہے لامحالہ اس سورت سے قبل بھی بسم اللہ پڑھنا واجب ہوگا۔ میں کہتا ہوں طیبیؒ نے جو کچھ لکھا ہے عقلمندوں پر پوشیدہ نہیں۔

طیبیؒ نے امر بایجاد القراء ۃ کہا ہے اس میں بحث ہے اس لئے کہ ایجاد اور امداد باری تعالیٰ کے افعال میں سے ہیں جو اعتقاداً ثابت ہے تو امر مباشرت قراءت کی طرف متوجہ ہوگا نہ کہ ایجاد کی طرف۔

پھر آگے جو کہا ہے وھو لا یختص بمقرؤ دون مقرؤ (کہ کسی ایک پڑھی جانے والی چیز کے ساتھ خاص نہیں ہے) اس میں بھی یہ اشکال ہے۔ کہ یہاں لفظ اقرا بھی تو مقرو ہے۔ زیادہ بہتر یہ تھا کہ یوں کہتا کہ (باسم ربك) کے شروع میں لفظ باء استعانت یا الصاق یا ملابست کے لئے ہے جیسے سورہ فاتحہ کے شروع میں بسم اللہ پڑھنے کے متعلق کہا جاتا ہے کہ اقرا مستعینا باسم ربك یا ملصقا به أو حال كونك متلبسا به۔ بلکہ اس کا ظاہر خلاف مامون ہے مزید یہ کہ ان کے کلام سے تو یہ لازم آتا ہے پڑھی جانے والی چیز (اقراء باسم ربك) کے بعد ہے جبکہ معاملہ ایسا نہیں ہے۔ اس لئے کہ شوافع کا دعوی بسم اللہ کو'' اقراء باسم ربك'' سے پہلے ثابت کرنے کا ہے۔

پھر طیبیؒ کا قول وھذا یدل علی ان البسملة مامور بقراء تها فی ابتداء کل قراۃ۔ بھی ممنوع اور غیر مقبول بات ہے کیونکہ علماء کا اس بات پر اتفاق ہے کہ قبل القراءت تعوذ پڑھنا واجب یا مستحب ہے۔ اور سورہ براءت کے علاوہ ابتداء قراءت میں بسم اللہ پڑھنے کے بارے میں بھی (اتفاق) ہے جبکہ درمیان سورۃ سے پڑھنے کی صورت میں بسم اللہ کے پڑھنے نہ پڑھنے میں اگرچہ اختلاف ہے لیکن معتمد قول ممانعت کا ہے۔

الذی خلق: یعنی جس ذات نے تمام اشیاء کو پیدا کیا من جملہ ان میں سے قراءت پر قدرت اور طاعت کی قوت کو بھی پیدا کیا۔ قولہ: خلق الانسان من علق تعمیم کے بعد تخصیص لا کر اس بات کی طرف اشارہ فرمایا کہ انسان تمام مخلوق کا نچوڑ اور موجودات کا جوہر ہے۔ یہ کلام طیبیؒ کے کلام سے زیادہ بہتر ہے کہ ان کا کہنا ہے کہ اس میں ابہام اور تبیین ہے۔

خلق الانسان من نطفة [النحل : ٤] کے بجائے خلق الانسان من علق کی طرف عدول کرنے کی وجہ فواصل کی

رعایت ہے اور اطوار مختلفہ سے گزر کر مرتبہ نبوت تک پہنچ جانے کی طرف اشارہ ہے۔

اقرأ: یہ تاکید ہے تقریر کے لئے اور تکریر تکثیر کے لئے ہے۔ وربك الاکرم: کہ ہر کریم کا کرم اس کے کرم کے اثر سے ہوتا ہے اور جوہر اور خاک کے ذرہ کا وجود بھی اسی کی نعمتوں کے سورج کی کرنوں کے ظہور سے ہے۔ اس میں اشارہ ہے اس بات کی طرف کہ اللہ تعالیٰ کا وصف "الاکرم" امی کو مقام کے حصول تک پہنچانے کا تقاضا کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے آنحضرت ﷺ کو علم کے فیض کو افراد عالم تک پہنچانے کا واسطہ بنایا۔

قوله: الذی علم بالقلم: یعنی اس قلم کے ذریعہ سے بہت سے علوم متعارفہ کی بنی آدم کو تعلیم دی۔ علم الانسان: زبان کے ذریعہ وہ کچھ سکھایا مالم یعلم کہ انسان کی بس کی بات نہیں تھی کہ زمان و مکان میں ہر لحہ وجود پذیر ہونے والی نئی نئی چیزوں کے علم پر واقع ہو۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ یہاں انسان سے مراد انسان کامل یعنی آنحضرت ﷺ کی ذات ہو (اور الف لام عہد ذہنی ہو) اس صورت میں کہا جائے گا کہ اس سے اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کی طرف اشارہ ہے وعلمك مالم تكن تعلم وكان فضل الله عليك عظيما (النساء) ترجمہ اور ہر وہ چیز آپ کو سکھائی جو آپ نہیں جانتے تھے اور یہ آپ پر اللہ کا فضل ہے۔ فرجع بها تو آنحضرت ﷺ ان آیات مبارکہ کے ساتھ مکہ واپس آئے۔ یرجف: جیم کے ضمہ کے ساتھ مضطرب ہونے کے معنی میں ہے۔ فواده: رعب داخل ہونے کی وجہ سے نہایت دھڑک رہا تھا۔ فدخل علی خدیجة طیبیؒ لکھتے ہیں جبرائیل علیہ السلام کے بھینچنے کی وجہ سے آپ ﷺ کے دل پر گھبراہٹ طاری تھی لفظ رجع کا معنی تحییٰ کے معنی میں اور قصد کے معنی میں بھی آتا ہے۔ اور ہم نے جو کچھ پہلے لکھا ہے وہ بھی مخفی نہیں۔ زملونی: یہ لفظ میم کی تشدید اور کسرہ کے ساتھ) زملونی دوبارہ تکرار تاکید یا زیادہ تاکید کے لئے فرمایا ہے۔ الروع لفظ الروع (راء کے فتحہ کے ساتھ) جوف اور شدید رعب فقال...... الخبر: یہ جملہ قول اور مقولے کے درمیان بطور جملہ معترضہ کے آیا ہے۔ علی نفسی آنحضرت ﷺ ہلاکت یا جنون کا خطرہ محسوس کرنے لگے تھے۔ ایک شارح لکھتا ہے میں فرشتے کی ہیئت بدیہہ کی وجہ سے اس سے دہشت زدہ ہوگیا اور اپنی جان پر شیطان کے حملہ کا خوف محسوس ہونے لگا۔ (شرح مسلم للنووی) میں ہے کہ قاضی عیاضؒ فرماتے ہیں خوف سے یہ مراد نہیں کہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے ملنے والی چیز پر آپ کو شک ہونے کی وجہ سے کوئی خوف لاحق ہوا تھا بلکہ یہاں کبھی کسی امر پر قدرت نہ ہونے کی وجہ سے خوف لاحق ہو جاتا ہے اور یہاں ڈر یہ تھا کہ منصب نبوت کا بار برداشت سے باہر نہ ہو جائے اس وجہ سے دم گھٹ رہا تھا۔ یا نیند یا بیداری کی حالت میں پہلی خوشخبری تھی اور آپ نے لقاء ملک اور آپ کی جانب سے رسالت کے ثبوت سے قبل خاص قسم کی آواز سنی تھی تو آپ کو یہ خوف ہو رہا تھا کہ کہیں یہ شیطان کی آواز نہ ہو۔ باقی جب سے نبوت عطا ہوئی اور فرشتے کی آمد کا سلسلہ شروع ہوا اس کے بعد تو شک اور شیطان کے تصرف کی بات نہ رہی شیخ محی الدینؒ فرماتے ہیں یہ احتمال نہایت ضعیف ہے اس لئے کہ یہ خوف فرشتے کے وحی کے ساتھ آنے اور آپ ﷺ کو بھینچنے کے بعد پیدا ہو گیا تھا جس کی مکمل تصریح کی گئی ہے۔

امام سیوطیؒ لکھتے ہیں آپ کو یا تو جنوں کا خوف محسوس ہونے لگا تھا یا آپ کو اندیشہ تھا کہ یہ جو کچھ دیکھا ہے کہانت نہ ہو۔ اسماعیلی کہتے ہیں علم ضروری کے حصول سے قبل فرشتے کے آنے کی وجہ سے خوف محسوس ہوا۔ یعنی فطری خوف تھا اور یہ اللہ کی جانب سے تھا۔ بعض حضرات کہتے ہیں شدید رعب کی وجہ سے موت کا خوف محسوس کرنے لگے تھے بعض نے بیماری کا خوف مراد

لیا ہے بعض کہتے ہیں منصب نبوت کے بار برداشت نہ ہونے کا خوف محسوس فرمانے لگے تھے بعض کہتے ہیں قوم کی طرف سے جن ایذاؤں اور تکالیف کا سامنا کرنا پڑے گا اس میں عدم صبر کا خوف تھا بعض نے کہا یہ خوف تھا کہ قوم کہیں قتل نہ کر دیں بعض کہتے ہیں تکذیب اور استہزاء کا خطرہ محسوس فرما رہے تھے۔

کلا: یہ کلمہ ردع ہے۔ای لا تظن ذلك أو لا تخفف' یا حقًا کے معنی میں ہے۔

واللہ: تاکید اور تاکید کی تابید کے لئے ہے۔

لا یخزیك الله ابدا: امام نوویؒ فرماتے ہیں لفظ یخزیك یونس اور عقیل کی روایت میں یاء کے ضمہ اور خاء معجمہ کے ساتھ ہے۔اور معمر کی روایت میں حاء مہملہ اور نون کے ساتھ ہے۔اور یاء کے فتحہ اور ضمہ کے ساتھ بھی جائز ہے اور دونوں تلفظ صحیح ہیں۔ میرے نزدیک حاء پر فتحہ پڑھنا اس صورت میں صحیح ہوگا جب زاء کو مضموم پڑھا جائے بخلاف حاء پر ضمہ پڑھنے کی صورت میں کہ اس میں زاء کسرہ کے ساتھ پڑھی جائے گی۔ جیسے آیت: ﴿ولا یحزنك﴾ (یونس:٦٥) میں دونوں قراءتوں کے ساتھ متواتراً پڑھا جاتا ہے اور پہلی روایت (یعنی یونس اور عقیل والی) کے اعتبار سے یہ مصدر الاخزاء بمعنی افضاح (رسوا) اور اهانه (توہین) کے ہوگا یہی معنی آیات یوم لا یخزی الله النبی والذین آمنو معه میں بھی پایا جاتا ہے۔انك ان ہمزہ مکسورہ کے ساتھ جملہ مستانفہ ہے اس میں تعلیل کا شائبہ ہے۔تصدق الحدیث بوال کے ضمہ کے ساتھ (نصر سے) ہے وتحمل: میم کے کسرہ کے ساتھ (ضرب یضرب سے) ہے۔الکل کاف کے فتحہ اور لام کی تشدید کے ساتھ۔یعنی آپ ایسے لوگوں کا بوجھ برداشت کرتے ہیں جن کی مستقل کوئی آمدن نہیں ہوتی۔بعض مرتبہ اس کو نفس بوجھ سے بھی تعبیر کیا جاتا ہے جیسے آیت وھو کل علی مولاء میں ہے۔مطلب اس کا یہ ہے آپ محتاج لوگوں کے موؤنت (اعانت) کا بوجھ اٹھاتے ہیں اگرچہ قوم والے آپ کو چھوڑ دیں اور مدد نہ کریں محتاج کے بوجھ اٹھانے کے حکم میں ضعیف' یتیم' بیوہ اور عیال کے مرد و عورت سب کی مؤونت داخل ہے۔وتکسب المعدوم: صحیح اور مشہور روایت کے مطابق لفظ تکسب تاء کے فتحہ کے ساتھ ہے ایک روایت میں تاء کے ضمہ کے ساتھ ہے اس کو امام نوویؒ نے ذکر کیا ہے (عرض مترجم): یعنی (باب افعال اور مجرد دونوں سے آتا ہے اور مجرد کی صورت میں لازمی اور متعدی دونوں طرح سے استعمال ہوتا ہے)۔اس جملے کے مطلب میں بھی کئی وجوہ بیان کی گئی ہیں۔

نمبر ا: کہ آپ ﷺ مال خیر کے لئے کماتے ہیں۔نمبر ۲: یا آپ محتاجوں کو مال عطا فرماتے ہیں۔کیونکہ فقیر بھی فی نفسہ معدوم ہوتا ہے یا یہ کہ فقیر غنی کی نظر میں معدوم ہوا کرتا ہے یا معدوم کا لفظ اس لئے استعمال فرمایا کہ فقر فناء اور ٹھہراؤ کا تقاضا کرتا ہے جیسے غنٰی ظہور و تحریک اور طغیان کا موجب ہوتا ہے۔وتقری الضیف تاء کے فتحہ اور راء کی کسرہ کے ساتھ (ضرب یضرب سے) ہے۔وتعین علی نوائب الحق آپ ﷺ حقیقی حادثات و مصائب میں ان کی مدد کرتے ہیں۔بعض کی رائے یہ ہے کہ نوائب جمع ہے نائبۃ اور نائبہ حادثہ اور مصیبت کو کہتے ہیں۔نوائب کی اضافت حق طرف اس لئے فرمایا کہ حادثہ خیر اور شر دونوں میں ہوتا ہے جیسے لبید کا شعر ہے

نوائب من خیر و شر کلاهما
فلا الخیر ممدود ولا الشر لازب

امام ثعلب اور خطابی وغیرہما حضرات فرماتے ہیں' کہا جاتا ہے: کسبت الرجل مالا و اکتسبته' یہ دو لغات ہیں ''کسبته'' والی لغت زیادہ فصیح ہے۔ (یعنی تکسب مجرد اور مزید دونوں سے آتا ہے البتہ مجرد سے افصح ہے۔ معنی ہوگا کبھی آپ تبرعاً ان کو مال عطا فرماتے ہیں۔ اصل عبارت ہے تکسب غیرك المال المعدوم موصوف کو حذف کر کے موصوف یہ کو اس کا قائم مقام بنایا گیا ہے۔ بعض حضرات فرماتے ہیں اس کا معنی ہے کہ آپ لوگوں یا یہ کہ آپ لوگوں کو عمدہ فوائد اور مکارم اخلاق میں سے دیتے ہیں جو ان لوگوں کو آپ کے علاوہ کسی اور کے پاس میسر نہیں یا یہ کہ آپ کو اتنا مال کما لیتے ہیں کہ جس کے حصول سے دیگر لوگ عاجز ہیں۔ کیونکہ عموماً سارے عرب اور قریش خصوصاً نسب و مال پر فخر محسوس کرتے تھے آنحضرت ﷺ تجارت میں ان کے ہاں قابل رشک شخص تھے۔

امام نوویؒ فرماتے ہیں یہ قول بالکل ضعیف اور غلط ہے البتہ اس کے ساتھ مزید کچھ ملایا جائے تو یہ قول بھی قابل قبول بن سکتا ہے۔ مطلب اگر یوں بیان کیا جائے کہ آپ اتنا کثیر مال کماتے ہیں کہ جس سے غیر عاجز آتے پھر اس مال کو ابواب خیر اور مکارم میں صرف فرما دیتے ہیں جیسے تحمل الکل و تصل الرحم ذکر کیا ہے۔ بقول صاحب تحریر ''المعدوم'' کو ایسے شخص سے عبارت ہے جو کسب سے عاجز معدوم اور محتاج ہو۔ اور کہتے ہیں اس کو معدوم اس لئے کہا جاتا ہے کہ وہ میت کی طرف کمنان ہوتا ہے کیونکہ معیشت میں اس کا کوئی تصرف نہیں ہوتا بعض حضرات فرماتے ہیں تکسب المعدوم کا اصل معنی یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ غریب و مفلس لوگوں کو عطا کرتے ہیں اور ان کو حیثیت دیتے ہیں اس لئے کہ لفظ المعدوم افعال کے تحت داخل نہیں ہوتا۔

تورپشتیؒ کہتے ہیں اہل روایت کے ہاں لفظ ''المعدوم'' بالکل صحیح لفظ ہے اور بعض نے کہا کہ اس کا اطلاق بطور توسع کیا گیا ہے کہ عجز میں مبالغہ کے لئے عائل کو بمنزل معدوم شمار کیا گیا ہے۔ جیسے آپ بخیل اور بزدل کے متعلق کہتے ہیں لیس بشیء (وہ کچھ بھی نہیں ہے) اور فرماتے ہیں تکسب کسبت زیدا مالا یا کسبت مالا سے ماخوذ ہے اور تاء کے ضمہ کے ساتھ اکسبت زیدا مالا سے مزید (افعال) سے پڑھنا بھی جائز ہے۔ خطابیؒ کہتے ہیں کسبته یعنی یہ مجرد سے ہے۔ اب اگر اس کو ایک مفعول کی طرف متعدی کریں تو معنی ہوگا کہ آپ مال کماتے ہیں اور وہ مال موجود بھی ہوتا ہے لیکن اس کو اپنے نفس پر خرچ کرنے کے بجائے مہمان نوازی کرتے ہیں۔

یہ تمام اوصاف اس مخصوص واقعہ کے لئے سبب ہیں جن لوگوں میں یہ اوصاف پائے جاتے ہیں ایسے لوگوں کو اللہ کبھی رسوا نہیں فرمایا کرتے۔ یا تکسب المعدوم میں المعدوم سے مراد فقیر ہے اس کو مبالغۃ معدوم سے تعبیر فرمایا گیا ہے گویا کہ وہ انتہائی فقر کی وجہ سے گم اور ناموجود ہو جاتا ہے اور اس پر خرچ کرنے والا اس کے لئے کما کے جب خرچ کرتا ہے عدم سے اس کا وجود ظاہر ہو کر موجود بن جاتا ہے۔

نمبر۲: اور اگر اس کو متعدی بدو مفعول بنائیں تو اس میں یا تو مفعول اول محذوف ہوگا یا مفعول ثانی۔ اگر مفعول اول محذوف ہو تو تقدیر عبارت ہوگی تکسب غیرك المعدوم اس صورت میں معنی ہوگا کہ آپ کے پاس جو کچھ بھی مال ہوتا ہے وہ مفلس کو عطا فرماتے اور خود ہی ان تک پہنچاتے ہیں۔

اگر محذوف مفعول ثانی ہو تو عبارت ہوگی تکسب المعدوم ای الفقیر مالا یعنی آپ اپنا مال فقراء پر خرچ کرتے ہیں۔ خلاصہ یہ ہے کہ ام المومنین خدیجہؓ کا مقصد یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ ان لوگوں میں سے ہیں جن کو کوئی گزند نہیں پہنچ سکتی اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے آنحضرت ﷺ کی ذات میں تمام مکارم اخلاق اور محاسن کو جمع فرمایا ہے۔

اس حدیث سے یہ ثابت ہوا کہ اچھے اخلاق اور اچھی خصلتیں انسان کو کسی نقصان اور آفت میں پڑنے سے بچاتی ہیں۔

نمبر۲: کسی خاص مصلحت وحکمت کے تحت بعض حالات میں کسی شخص کی اچھائیوں اور خوبیوں کی تعریف اس کے منہ پر کرنا جائز ہے۔

نمبر۳: اگر کوئی شخص کسی معاملہ میں خوف زدہ ہو تو اس کو اطمینان وتسلی دینا اور اس کے سامنے امن وسلامتی کے اسباب کا ذکر کرنا چاہئے۔

نمبر۴: حضرت خدیجہؓ انتہائی فراست وبصیرت' معرفت وفقاہت اور دور اندیش اور سمجھداری کے بلند وبالا مقام پر فائز تھیں۔

نمبر۵: آنحضرت ﷺ کا فقر اختیاری اور پسندیدہ تھا نہ کہ اضطراری اور غیر پسندیدہ تھا۔ جس کا اصل منشا سخاوت وکرم کے درجہ کمال کا اظہار تھا۔

نمبر۶: آنحضرت ﷺ میں یہ اوصاف ومحاسن آپ ﷺ کی ذات بابرکت میں طبعی اور خلقی طور پر بعثت سے پہلے موجود تھے۔

ورقه: کلمہ ورقہ واؤ اور راء دونوں کے فتحہ کے ساتھ (ابن نوفل) ابن اسد القرشی ہیں۔ کیونکہ آحضرت خدیجہ رضی اللہ عنھا خلاد ابن اسد ابن عبد العزیٰ کی بیٹی تھیں اور ورقہ نوفل ابن اسد ابن عبد العزیٰ کے بیٹے تھے اس اعتبار سے ورقہ حقیقی چچازاد بھائی بنتے ہیں۔ صاحب قاموس نے حضرت ورقہ کے اسلام کے متعلق علماء کا اختلاف ذکر کیا ہے۔ ابن اخیك: ابن اخیك کا لفظ بطور مجاز ارشاد فرمایا ہے جیسے عرب کہتے ہیں یا اخا العرب ایک شارح لکھتا ہے حضرت ام المومنین نے ابن اخیک کا جملہ تعظیما کہا ہے نہ کہ حقیقتاً کہ آنحضرت ﷺ ان کے بھتیجے تھے۔ فقال له ورقه: کیونکہ انہوں نے زمانہ جاہلیت میں نصرانیت اختیار کرلیا تھا اور کتب سابقہ پڑھ رکھیں تھیں۔ اس وقت ضعیف العمر ہو کے نابینا ہو چکے تھے۔ مولف نے فصل صحابہ میں ان کا ذکر کیا ہے: ماذا تری: بعض علماء لکھتے ہیں لفظ ذا زائدہ ہے اور ما استفہامیہ ہے بعض لکھتے ہیں لفظ ذا موصولہ ہے یعنی ماالذی تراہ۔

ناموس آدمی کے اس راز دان کو کہتے ہیں جو اس کو اس کے باطن پر مطلع کرے۔

قوله :هذا هو الناموس الذی انزل الله علی موسٰی ۔

''ناموس'' کی تحقیق:

اہل کتاب حضرت جبرائیل علیہ السلام کو ناموس کہا کرتے تھے۔

بعض اہل لغت حضرات کہتے ہیں ناموس خیر (اچھی باتوں) کے رازدان کو کہتے ہیں اور ''جاسوس'' شر (بری باتوں) کے رازدان کو کہا جاتا ہے۔

بعض حضرات کہتے ہیں کہ جبرائیل علیہ السلام کو ناموس اس وجہ سے کہا جاتا تھا کہ انہیں اللہ تعالیٰ نے وحی نازل کرنے کے

لئے خاص فرمایا تھا۔ یالیتنی لیتنی کے بعد کلمہ "کنت" محذوف ہے۔ ایک نسخہ میں صراحتاً بھی آیا ہے۔ جذعا جیم اور ذال معجمہ کے فتحہ کے ساتھ یعنی طاقت ور جوان ہوتا میں پوری طاقت وقوت سے تمہاری مدد کرتا۔ یہ لفظ الجذع من الخیل سے ہے۔ گھوڑے یا گائے کا وہ بچہ ہوتا ہے جس کی عمر کا تیسرا سال شروع ہو گیا ہو۔ یہاں بطور استعارہ استعمال ہوا ہے اور منصوب یا تو اس لئے ہے کہ یہ کنت محذوف کی خبر ہے یا لیت تمنیت کے معنی میں ہے۔ لیکن اصح یہ ہے کہ یہ حال ہے اور تقدیر عبارت یوں ہے لیتنی حاصل فیھا جذعا جیسا کہ بصریوں کا اس جملہ یالیت ایام العبار واجعا کے بارے میں مذہب ہے۔ خطابی ٗ مازری وغیرہ حضرات لکھتے ہیں جذعاً کان محذوفہ کی خبر ہونے کی وجہ سے منصوب ہے تقدیر عبارت یہ ہے لیتنی اکون فیھا جذعااور یہی کوفیین کا مذہب ہے۔

قاضی عیاضؒ لکھتے ہیں میرے نزدیک ظاہر یہ ہے کہ جذعاً حال ہونے کی بنا پر منصوب ہے اور لیت کی خبر قول فیھا ہے اس کا عامل وہی ہے جو ظرف کا متعلق ہے۔ ایک قول میں ہے یالیتنی کا منادی یا محمد محذوف ہے ابن مالکؒ کہتے ہیں اکثر لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ یالیتنی پر جو یاء داخل ہے وہ حرف ندا ہے اور منادی محذوف ہے۔ لیکن میرے نزدیک یہ رائے ضعیف ہے اس لئے کہ کبھی یالیتنی کہنے دال اکیلا ہوتا اس کے ساتھ منادی نہیں ہوتا (اس لئے ندا نہیں ہوسکتی) جیسے حضرت مریم کے قول کو قرآن کریم نے ذکر کیا ہے یالیتنی مت قبل ھذا میں کہتا ہوں تقدیراً یارب ٗ یانفسی ٗ یاولدی ہو اور یا اس سے وہ خطاب عام تھا جو اوہام اذہان میں مقصود ہوتا ہے۔

پھر (ابن مالکؒ) آگے لکھتے ہیں اور اس لئے کہ کسی چیز کا حذف کرنا وہاں جائز ہوتا ہے جہاں خاص مقام اس کے حذف کا تقاضا کرے اور اس کے استعمال کا ثبوت بھی اس جگہ پایا جائے جیسے امر یا دعا سے قبل منادی کو حذف کیا جاتا ہے۔ ان موقعوں میں منادی کا حذف کرنا کثرت ثبوت کی وجہ ہے۔ امر سے قبل منادی کا ثبوت اس آیت مبارکہ: ﴿یایحیی خذالکتاب بقوۃ﴾ [مریم: ۱۲] سے ہے اور دعا سے قبل ثبوت کی مثال یا موسی ادع لنا ربك (الاعراف: ۱۳۴) ہے۔ امر سے قبل منادی کو حذف کرنے کی مثال کسائی کی قراءت کے مطابق الا یا اسجدوا ہے جو اصل میں الا یا ھؤلاء اسجدوا ہے اور دعا سے قبل حذف کرنے کی مثال شاعر کا یہ قول ہے الا یا اسلمی یا دارمی علی البلا جو اصل میں الا یادارمی اسلمی ہے۔ تو ان مقامات پر منادی کو حذف کرنے کو ثبوت پر اعتماد کی وجہ سے مستحسن شمار کیا گیا ہے۔ بخلاف لیت کے۔ اس لئے کہ عرب نے منادی محذوف کے ساتھ اس کو استعمال نہیں کیا ہے لہٰذا یہاں حذف کا دعویٰ کرنا باطل ہے۔ اب متعین ہو گیا کہ یہاں جو یا ٗ لایا گیا ہے یہ محض تنبیہ کے لئے ہے جیسے شعر کے اس مصرع میں ہے۔

الا لیت شعری ھل ابیتن لیلۃ۔

میں کہتا ہوں لفظ لیت کے ساتھ منادی کو حذف کرنے کی بات بھی شاید کثرتِ استعمال کی وجہ سے ہے اب یہ منادی کبھی مفرد مذکر یا مونث ہوتا ہے اور کبھی تثنیہ و جمع کبھی حقیقتاً ہوتا ہے اور کبھی موہوماً اور اس میں کوئی شک نہیں کثرت استعمال حذف اور تخفیف کا موجب ہوتا ہے بلکہ بعض مرتبہ حذف کو واجب شمار کیا جاتا ہے۔ کثرت استعمال کی وجہ سے حذف کا دعویٰ اور خیال حق ہے بلکہ واجب ہے نہ کہ باطل اور ضعیف۔ پھر میں نے قاموس میں دیکھا صاحب قاموس نے دونوں وجہوں کا جواز ذکر کیا ہے

اورصاحب قاموس بھی وہی کچھ لکھتے ہیں جوابھی ہم نے ذکر کیا۔ چنانچہ صاحب قاموس لکھتے ہیں اگر یا ایسے کلمہ کے ساتھ آ جائے کہ جو منادی نہیں ہوتا جیسے الایا اسجدوا میں فعل کے ساتھ آیا ہے اور حرف کے ساتھ جیسے یالیتنی کنت معھم میں ہے اس کی دوسری مثال: یا رب کاسیۃ فی الدنیا عاریۃ فی العقبیٰ جملہ اسمیہ کے ساتھ جیسے اس شعر میں ہے یالعنۃ اللہ والاقوام کلھم۔ والصالحین علی سمعان من جار۔ ان تمام جگہوں میں یا تو نداء کے لئے ہے اور منادی محذوف ہے یا محض تنبیہ کے لئے ہے تا کہ پورے جملے کو حذف کرنے کی وجہ سے اجحاف (ظلم اور بے جا طرفداری) لازم نہ آئے۔ صاحب مغنی نے ان کی اتباع کی ہے۔ اس میں کافی کلام ہے جو مخفی نہیں۔ واللہ تعالیٰ۔ ھو یعلم السرو اخفی۔ اذیخرجك: اس مقام میں اذا کی طرح اذ بھی مستقبل کے لئے ہے معنی ہوگا کہ جس وقت تجھے اپنے شہر سے نکالنے کے لئے اسباب پیدا کریں گے۔ اُومخرجی ھم او 'واؤ' کے فتحہ کے ساتھ اور لفظ مخرجی اصلا یاء کی تشدید اور فتحہ کے ساتھ ہے البتہ کسرہ دینا بھی جائز ہے جیسے لفظ مصرخی کو فتحہ اور کسرہ کے ساتھ پڑھنا جائز ہے اور یہ خبر ہے ھم ضمیر کی۔

مخرجی اصل میں مخرجون اضافت کی وجہ سے نون گر گیا پھر واؤ کو یا کر کے یا میں مدغم کیا گیا ہے اور یاء کی مناسبت سے جیم کو کسرہ دیا گیا ہے اس کا اعراب مسلمی کی طرح تقدیری ہے پھر اس جملہ کا عطف مقدر پر ہے اور شروع کا ہمزہ بطور تعجب استعلام کے لئے ہے اس طرح مقصود بالکل ظاہر ہو جاتا ہے مطلب یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرمانے لگے کہ جو آپ کہہ رہے ہیں واقعتاً وہ مجھے نکال دیں گے؟ الا عودی المعادۃ سے ماضی مجہول کا صیغہ ہے اور مستثنیٰ مستثنیٰ مفرغ ہے عام احوال کے اعتبار سے اعم میں ہے۔ وان یدرکنی یومك: یہ جملہ شرط ہے اور جزا انصرك نصرا موزرا موزر اراء مفتوحہ کی تشدید کے ساتھ قاضی عیاضؒ (فرماتے ہیں) کہتے ہیں یوم سے مراد یا تو وہ زمانہ ہے جس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم دعوت تبلیغ شروع کریں گے یا وہ وقت ہے جب قوم آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے دشمنی شروع کر کے ایذا پہنچانے اور جلاوطن کرنے کا ارادہ کریں گے۔ اور موزرًا الازر سے قوت میں انتہا یعنی بھرپور قوت کے ساتھ کسی کی مدد کرنے کے ہیں اس کی مثال قرآن کریم کی آیت: ﴿اشدد به ازری﴾ [طٰہٰ: ۳۱] ہے ثم لم ینشب نون کے سکون اور شین کے فتحہ کے ساتھ بمعنی لم یلبث ہے۔

ان توفی: تمیز ہونے کی بناء پر منصوب ہے۔ ای من جھۃ الوفاء' ای لم یلبث وفاته بأن جاء ت سریعا۔ طیبیؒ لکھتے ہیں یہ بدل اشتمال ہے "ورقه" سے۔ اور معنی ہے لم یلبث وفاته میں اس کا ذکر آرہا ہے۔ متفق علیہ

۵۸۴۲ : وَزَادَ الْبُخَارِیُّ، حَتّٰی حَزَنَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ فِیْمَا بَلَغَنَا حُزْنًا غَدَ مِنْهُ مِرَارًا کَیْ یَتَرَدّٰی مِنْ رُؤُسِ شَوَاهِقِ الْجَبَلِ فَکُلَّمَا اَوْفٰی بِذُرْوَةِ جَبَلٍ لِکَیْ یُلْقِیَ نَفْسَهٗ مِنْهُ تَبَدّٰی لَهٗ جِبْرَائِیْلَ فَقَالَ یَا مُحَمَّدُ اِنَّكَ رَسُوْلُ اللّٰهِ حَقًّا فَیَسْکُنُ لِذٰلِكَ جَاْشُهٗ وَتقِرُّ نَفْسَهٗ۔

اخرجه البخاری فی صحیحه ۲۳/۱ حدیث رقم ۳ واحمد فی المسند ۲۳۳/۶۔

ترجمہ: اور امام بخاری نے (مسلم کی روایت پر) یہ الفاظ بھی نقل کئے ہیں کہ: "(نزول وحی کا سلسلہ منقطع ہو گیا تو) ان حدیثوں کے مطابق جو ہمیں پہنچی ہیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس انقطاع وحی سے اس قدر کبیدہ خاطر ہوئے کئی مرتبہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم صبح کو اس ارادہ سے پہاڑوں پر گئے کہ اپنے آپ کو ان اونچے پہاڑوں کی چوٹی سے نیچے گرا دیں' جب بھی آپ کسی پہاڑ کی چوٹی پر

پہنچتے تا کہ اپنے آپ کو نیچے گرا دیں تو (اچانک) جبرائیل علیہ السلام آپ ﷺ کے سامنے ظاہر ہوتے اور کہتے: محمد (ﷺ) بلاشبہ آپ ﷺ اللہ کے برحق رسول ہیں چنانچہ (حضرت جبرئیل علیہ السلام کی یہ بشارت سن کر) آنحضرت ﷺ کا قلبی اضطراب جاتا رہتا اور آپ ﷺ مطمئن ہو جاتے''۔

تشریح: حزن : زاء کے کسرہ کے ساتھ حزن اور حزن سے سرور کی ضد ہے مجرد اور مزید دونوں سے مستعمل ہے کہا جاتا ہے: حزن الرجل آدمی غمگین ہو فھو حزن و حزین وہ غمگین ہے و اخزنہ دوسرے کو غمگین کیا اور مجرد سے متعدی ہونے کی صورت میں زاء کے فتحہ کے ساتھ ہوگا۔ فیما بلغنا : اور یہ جملہ معترضہ ہے فعل اور اس کے مفعول مطلق حزنا کے درمیان واقع ہے۔ حزنا : اصلا حاء کے ضمہ اور زاء کے سکون کے ساتھ ہے البتہ حاء اور زاء کے فتحہ کے ساتھ بھی جائز ہے۔ (اور تنوین برائے تعظیم ہے) اس کی صفت محذوف ہے تقدیری عبارت ہے حزنا عظیما کہ یہ غم اور حزن اتنا شدید تھا کہ کئی مرتبہ صبح کے وقت اس ارادہ سے پہاڑ پر گئے کہ ان پہاڑوں کی چوٹی سے اپنے آپ کو گرا دیں۔

لفظ غدا : ذہب کے معنی میں ہے۔

منه: یعنی اس حزن کی وجہ سے یا انقطاع وحی کی وجہ سے۔

بعض کا کہنا ہے غدا جاوز کے معنی میں ہے اس صورت میں عدا عین مہملہ کے ساتھ ہوگا۔ زین عرب نے اس توجیہ کو ذکر کیا ہے۔ ابن حجر عسقلانیؒ لکھتے ہیں یہ لفظ عین مہملہ کے ساتھ ہے جس کا معنی سرعت کے ساتھ جانا ہے اور بعض نے اس کو معجمہ کے ساتھ بتایا ہے' بمعنی صبح کے وقت جانا۔ شارحؒ نے صرف عین مہملہ والے تلفظ پر اکتفا کرتے لکھا ہے: ای مشی من العدو سے ہے۔ من رؤوس شواهق الجبل : شواھق کا معنی چوٹی کے ہے بعض کہتے ہیں یہ شاہق کی جمع اور یہ پہاڑوں کو کہا جاتا ہے۔ بذروة بذال کے کسرہ کے ساتھ ہے اور تثلیث بھی جائز ہے۔ یامحمد انك رسول الله حقا۔ کلمہ حقا مصدر ہے جملہ سابقہ کی تاکید کے لئے آیا ہے: انك لرسول الله الا یہ جیسا ہے اور حقا منصوب ہے فعل محذوف کی وجہ سے تقدیری عبارت ہے احق هذالكلام حقا۔

فيسكن لذالك جاشه : چنانچہ حضرت جبرائیل علیہ السلام کی یہ بشارت سن کر آنحضرت ﷺ کے دل کا اضطراب' دہشت' قلق' روع وفزع جاتا رہتا۔

وتقر : قاف کے کسرہ اور راء کی تشدید نیز سکون کے ساتھ (باب افعال سے) ہے۔

فترتِ وحی کا بیان

۵۸۴۳ : وَعَنْ جَابِرٍ اَنَّهٗ سَمِعَ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يُحَدِّثُ عَنْ فَتْرَةِ الْوَحْيِ قَالَ فَبَيْنَا اَنَا اَمْشِي سَمِعْتُ صَوْتًا مِنَ السَّمَآءِ فَرَفَعْتُ بَصَرِيْ فَاِذَا الْمَلَكُ الَّذِيْ جَآئَنِيْ بِحِرَاءٍ قَاعِدٌ عَلٰى كُرْسِيٍّ بَيْنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ فَجُئِثْتُ مِنْهُ رُعْبًا حَتّٰى هَوَيْتُ اِلَى الْاَرْضِ فَجِئْتُ اَهْلِيْ فَقُلْتُ

زَمِّلُوْنِی زَمِّلُوْنِی فَزَمَّلُوْنِی فَاَنْزَلَ اللّٰہُ تَعَالٰی یٰاَیُّھَا الْمُدَثِّرُ قُمْ فَاَنْذِرْ وَرَبَّکَ فَکَبِّرْ وَثِیَابَکَ فَطَھِّرْ وَالرُّجْزَ فَاھْجُرْ ثُمَّ حَمِیَ الْوَحْیُ وَتَتَابَعَ (متفق علیه)

اخرجه البخاری فی صحیحه ۲۷/۱ الحدیث رقم ٤، ومسلم فی صحیحه ۱٤۳/۱ حدیث رقم (۲۵۵/۱٦۱)
واخرجه الترمذی فی المسند ۳۹۹/۵ حدیث رقم ۳۳۲۵ واحمد فی المسند ۳۲۵/۳۔

ترجمہ: ''حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کچھ دن کے لئے) انقطاع وحی (اور پھر سلسلۂ وحی کے دوبارہ شروع ہونے) کا حال اس طرح سنا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''(ایک دن مکہ کے کسی راستہ پر یا حراء پہاڑ پر) میں چلا جا رہا تھا کہ اچانک میں نے آسمان سے ایک آواز سنی' میں نے نظر اٹھائی تو دیکھا کہ وہی فرشتہ جو غارِ حرا میں میرے پاس آیا تھا' زمین و آسمان کے درمیان ایک کرسی پر بیٹھا ہوا ہے (اس پر نظر پڑتے ہی) میرے دل میں اتنا سخت رعب اور خوف پیدا ہو گیا کہ میں زمین پر گر پڑا' پھر میں (اٹھ کر) اپنے گھر والوں کے پاس آیا اور کہا کہ مجھے کمبل اوڑھا دو' مجھے کمبل اڑھا دو۔ چنانچہ انہوں نے مجھے کمبل اڑھا دیا جب ہی اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: یٰاَیُّھَا الْمُدَثِّرُ قُمْ فَاَنْذِرْ وَرَبَّکَ فَکَبِّرْ وَثِیَابَکَ فَطَھِّرْ وَالرُّجْزَ فَاھْجُرْ۔ اے کمبل اوڑھنے والے اٹھو اور مخلوق کو ڈراؤ اور اپنے رب کی بڑائی بیان کرو اور اپنے کپڑوں کو پاک رکھو اور پلیدی سے دور رہو۔ اس کے بعد وحی مسلسل آنے لگی''۔ (بخاری و مسلم)

تشریح: فبینا: ایک نسخہ میں میم کے ساتھ ''فبینما'' ہے فجثت کلمہ فئثت: جیم کے ضمہ' ہمزہ کے کسرہ اور ثاء مثلثہ کے سکون کے ساتھ۔ رعبا: کے ضمہ اور عین کے سکون اور دونوں کے ضمہ کے ساتھ۔ حال ہے۔ ای ممتلئا رعبا اور مرعوبا کل الرعب یعنی مکمل دہشت زدہ ہو گیا کلمہ رغب خود متعدی ہے دوبارہ متعدی بنانے کی ضرورت نہیں یا مفعول مطلق ہے یا مفعول لہ ہے اس لئے کہ فزع (خوف) نام ہے ایسے انقباض اور نفور کا کہ جس کی وجہ انسان شئ مخیف سے بھاگنے پر مجبور ہو جائے۔ یہ معنی جزع کے قریب ہے جبکہ ''رعب'' نام ہے خوف کے باعث حق ہونے والے انقطاع کا (کذا حققه القدر پشتیٔ وغیرہ من أتباعه) میرے نزدیک زیادہ واضح یہ ہے کہ یہ تمیز موکد ہے اس کی نظیر یہ آیت مبارکہ ہے: ﴿ذرعها سبعون ذراعا﴾ ہے۔ ھویت واؤ کے فتحہ کے ساتھ ہے۔

فقلت: زملونی زملونی: مجھے چادر اوڑھا دو اور مجھ پر کوئی بھاری چیز رکھ دیں زمل الزاملة سے ماخوذ ہے ''زاملہ'' متاع (سامان) کے بوجھ کو کہتے ہیں اور تکرار تاکید وتکثیر کے لئے ہے۔ یاایھاالمدثر: دال اور ثاء دونوں کی تشدید کے ساتھ ہے بمعنی کپڑوں میں لپٹنے والا اور بوجھ اٹھانے والا۔

بعض علماء نے فرمایا المدثر کا معنی ہے ایھاالمتلبس باعباء النبوۃ اے نبوت کے ذمہ داری میں (مبتلا) پڑنے والے اور رسالت کا بوجھ اٹھانے والے (قم) ہمارے حکم سے کھڑے ہو جایئے یا یہ معنی ہے کہ ہمیشہ طاعت پر قائم رہئے یا رات کو عبادت کے لئے کھڑے ہو جایئے یہ معنی یاایھاالمزمل قم اللیل سے مستفاد ہے۔

اسی وجہ سے کہا گیا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا قیام نبوت کے مامور تھے۔ قیام رسالت کا حکم اسی کی طرف اشارہ فرمایا فانذر سے۔ فانذر کا معنی ہے عام لوگوں کو عذاب الٰہی سے ڈرائیں اور مومنین کو نیک اعمال پر انواع ثواب کی خوشخبری سنائیں۔

صرف انذار کے ذکر پر اکتفا اور اقتصار کرنے کی وجہ یہ کہ اس وقت مسلمانوں کی تعداد بہت کم تھی اور گنے چنے تھے سب منکرین اور کفار تھے جو کسی بشارت کے مستحق نہیں بلکہ ڈرانے ہی کے مستحق تھے۔

وربك فكبر: صرف اپنے رب کی بڑائی بیان کیجئے لفظ رب اس جگہ اس لئے اختیار کیا گیا ہے کہ یہ خود علت ہے اس حکم کی کہ جو سارے جہاں کا پالنے والا ہے وہی ہر بڑائی اور کبریائی کا مستحق ہے۔

قوله: وثيابك فطهر: یعنی ظاہری نجاسات سے اپنے آپ کو پاک کیجئے اس سے باطن کو باطل خیالات اور اخلاق رذیلہ سے پاک کرنے کا معنی بطریق اولیٰ مراد لیا جا سکتا ہے۔ بعض کا کہنا ہے کہ اس کا معنی ہے قصر ثيابك: یعنی ذکر مسبّب کا ہے اور مراد سبب ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ اس حدیث میں اللہ کی کبرائی اور بڑائی کے سامنے ایسی تواضع اور ملائمت کے اظہار کا بھی حکم ہے جو اس کی ربوبیت کے شایان شان ہو۔ والرجز: راء کے کسرہ اور ضمہ دونوں کے ساتھ پڑھنا جائز ہے اس سے مراد شرک وعصیان ہے۔

فاهجر: راوی حدیث نے اقتصار اور اختصار کے پیش نظر مذکورہ آیتوں کے آخری حصہ کو تو نقل نہیں کیا ہے جو یہ ہے: ولا تمنن تستكثر ولربك فاصبر...... [المزمل: ٧٦] ترجمہ اور کسی کو اس غرض سے مت دو کہ دوسرے (وقت) زیادہ چاہو اور اپنے رب کی خوشنودی کے لئے صبر کرو۔ ثم حمى الوحى لفظ حمی میم کے کسرہ کے ساتھ ہے۔

نزولِ وحی کی چند کیفیات کا بیان

۵۸۴۴: وَعَنْ عَائِشَةَ اَنَّ الْحَارِثَ بْنَ هِشَامٍ سَاَلَ رَسُوْلَ اللّٰهِ فَقَالَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ كَيْفَ يَاتِيْكَ الْوَحْيُ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ اَحْيَانًا يَاتِيْنِيْ مِثْلَ صَلْصَلَةِ الْجَرَسِ وَهُوَ اَشَدُّ عَلَيَّ فَيُفْصِمُ عَنِّيْ وَقَدْ وَعَيْتُ عَنْهُ مَا قَالَ وَاَحْيَانًا يَتَمَثَّلُ لِيَ الْمَلَكُ رَجُلًا فَيُكَلِّمُنِيْ فَاَعِيْ مَا يَقُوْلُ قَالَتْ عَائِشَةُ وَلَقَدْ رَاَيْتُهٗ يَنْزِلُ عَلَيْهِ الْوَحْيُ فِي الْيَوْمِ الشَّدِيْدِ الْبَرْدِ فَيَفْصِمُ عَنْهُ وَاِنَّ جَبِيْنَهٗ لَيَتَفَصَّدُ عَرَقًا۔ (متفق عليه)

اخرجه البخاری فی صحيحه حديث رقم ٢، ومسلم فی صحيحه ١٨١٦/٤ حديث رقم (٨٧۔٢٣٣٣) والترمذی فی السنن ٥٥٧/٥ حديث رقم ٣٦٣٤ والنسائی ١٤٦/٢ حديث رقم ٩٣٣ واحمد فی المسند ١٥٨/٦۔

ترجمہ: ''حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ حارث بن ہشام رضی اللہ عنہ نے (جو ابوجہل کے بھائی تھے اور فتح مکہ کے دن اسلام لائے تھے) رسول اللہ ﷺ سے پوچھا کہ یا رسول اللہ! آپ ﷺ پر وحی کیسے آتی ہے؟ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: میرے پاس وحی کبھی تو گھنٹی کی آواز کی طرح آتی ہے۔ (یعنی وحی کے الفاظ جو مجھ تک پہنچائے جاتے ہیں گھنٹی کی آواز کی طرح کا صوتی آہنگ رکھتے ہیں) اور یہ وحی مجھ پر سخت ترین وحی ہوتی ہے جب وہ مجھ سے موقوف ہوتی ہے تو اس کے الفاظ مجھے یاد ہو چکے ہوتے ہیں اور کبھی فرشتہ انسان کی شکل اختیار کر کے مجھ سے ہمکلام ہوتا ہے اور جو کچھ کلام کرتا ہے میں یاد کر لیتا ہوں۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا (یہ بیان کر کے) کہتی ہیں کہ میں نے دیکھا کہ جب سخت سردی کے دن آپ ﷺ پر وحی اترتی تھی اور جب وہ موقوف ہوتی تو آپ ﷺ کی پیشانی پسینہ سے شرابور نظر آتی تھی''۔ (بخاری، مسلم)

راویٔ حدیث:

حارث بن ہشام کے حالات: حارث بن ہشام مخزومی ہیں فتح مکہ کے دن مسلمان ہوئے۔ یہ فضلاء صحابہ میں سے تھے۔ شام کی فتوحات کے زمانے میں شہادت پائی (رضی اللہ عنہ)۔ بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ حدیث مسانید عائشہؓ میں سے ہے۔ اصحاب "اطراف" نے اسی پر اعتماد کیا ہے گویا کہ آپؓ اس موقع پر خود موجود تھیں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ حارثؓ بن ہشام نے بعد میں آپ کو سنایا ہو اس صورت میں یہ مرسل صحابی ہوگی اور صحابہ کا حکم بالاتفاق وصل کا ہے۔ اور اس کی تائید اس سے بھی ہوتی ہے کہ مسند احمد وغیرہ میں عامر بن صالح زہری کی سند سے یوں منقول ہے۔ **عن هشام عن ابيه عن عائشة عن الحارث بن هشام قال سألت**۔ اس سند میں عامر ابن صالح ضعیف راوی ہیں۔ لیکن ابن مندہ کے نزدیک اس کا متابع موجود ہے۔

فقال...... احيانا : اى فى بعض الاحيان و الأ زمان: بعض علماء فرماتے ہیں اس صورت کے ساتھ اس وقت وحی نازل ہوتی جب اس میں وعید پر مشتمل کوئی آیت نازل ہوتی۔

اس جملہ کا اعراب کیا ہے؟ امام طیبیؒ لکھتے ہیں مفعول مطلق بنانا جائز ہے لیکن بہتر یہ ہے کہ حال بنایا جائے۔ یعنی حال ہے اور معنی یہ ہے کہ مجھ پر جو وحی نازل ہوتی ہے اس کی آواز گھنٹی کی آواز کے مشابہ ہوتی ہے۔ صلصلہ لوہے کی اس آواز کو کہا جاتا ہے جو حرکت کے وقت پیدا ہوتی ہے۔ **و هو :** یعنی وحی کی اقسام میں سے یہ قسم **اشد على** یہ مجھ پر سخت ترین اور تھکا دینے والی وحی ہوتی ہے۔ ابن حجر عسقلانیؒ فرماتے اس کی وجہ یہ ہے کہ متکلم کے کلام کو مخاطب جس سہولت کے ساتھ سمجھ سکتا ہے اس کے مقابلے میں گھنٹی کی آواز کی مانند کلام سے سمجھنا بہت دشوار اور مشکل بات ہے اس لئے آنحضرت ﷺ پر یہ کیفیت بہت گراں گزرتی تھی۔ شاید اللہ تعالیٰ کے ارشاد: ﴿انا سنلقى عليك قولا ثقيلا﴾ [المزمل: ۵] سے اسی وحی کی کیفیت کی طرف اشارہ ہو۔ خطابیؒ کہتے ہیں اصل مراد تو اللہ جانتا ہے۔ ظاہراً مراد یہ ہے کہ وہ ایک غیر مفہوم آواز ہوتی تھی جس کو آپ سنتے تو تھے لیکن پہلی مرتبہ سن کر دل میں جما نہیں سکتے تھے بلکہ بعد میں اسے سمجھا کرتے تھے اس وجہ سے فرمایا **و هو اشده على۔ فيفصم عنى :** کلمہ فیفصم یاء کے فتحہ اور صاد کے کسرہ کے ساتھ (ضرب یضرب سے) ہے یعنی پھر وہ مجھ سے منقطع ہو جاتی۔ ایک دوسرے نسخہ میں یاء کے ضمہ اور صاد کے کسرہ کے ساتھ مثال **افصم الحمى و المطر** سے (بمعنی سلسلہ وحی کا بند ہو جانا اثر کا اترنا) ہے جیسے کہ قاموس میں ہے۔ ایک اور نسخہ میں صیغہ مجہول کے ساتھ ہے۔ اس صورت میں مطلب یہ ہوگا: **يقطع عنى كرب الوحى** یعنی پھر وحی کی تکلیف اتار دی جاتی یا بند کر دیا جاتا۔

ابن حجر عسقلانیؒ لکھتے ہیں **:قوله :فيصم اى الوحى أو الملك:** گویا کہ انہوں نے یہاں تقدیر مضاف کو جائز قرار دیا ہے۔ **اى كيف يأتيك صاحب الوحى وهو الملك۔** وحی یا فرشتے کا رک جانا ہے پھر لکھتے ہیں یہ لفظ یاء کے فتحہ فاء کے سکون اور صاد مہملہ کی کسرہ کے ساتھ ہے ابوالوقت کے نزدیک بھی اسی طرح ہے۔ مادہ ضرب یضرب ہے اور مراد شدت کا ختم ہو جانا ہے یعنی پھر وہ تکلیف اور سختی ختم ہو جاتی ہے نیز یاء کے ضمہ اور صاد کے کسرہ کے ساتھ **"افصم المطر"** سے ماخوذ ہوگا جس کا معنی ہے: **اقلع**۔ مفاتیح میں لکھا ہوا ہے کہ یہ لغت قلیل الاستعمال ہے۔ ایک اور روایت میں حرف اول کے ضمہ اور ثالث کے فتحہ

کے ساتھ بطور اسم مفعول مذکور ہے جبکہ فاء کو عاطفہ شمار کیا گیا ہے۔ فصم کا معنی کسی چیز کا اس طرح علیحدہ ہو جانا ہے کہ وہ بالکل جدا نہ ہو۔ گویا کہ آپ ﷺ یوں فرما رہے ہیں کہ پھر فرشتہ مجھ سے جدا ہو جاتا ہے تاکہ میری حالت اور کیفیت دوبارہ اپنی اصل حالت وکیفیت پر لوٹ آئے۔ وقد وعيت عنه ماقال: یہ جملہ حالیہ ہے اور لفظ وعیت عین کے فتحہ کے ساتھ ہے یعنی پھر میں اس کو یاد کر لیتا ہوں جو فرشتہ سناتا ہے۔ ماقال میں ما موصولہ ہے ضمیر عائد محذوف ہے پھر یہاں الوعی سے (یعنی یہ یاد کرنا) وحی کا سلسلہ ختم ہونے سے قبل اور کلام کے نازل ہونے کے بعد دونوں حالتوں میں کرنا مراد ہے اسی وجہ سے اولاً ماضی اور ثانیاً حال وارد ہوا ہے۔ چنانچہ فرمایا: فيكلمني (فاوعی مايقول)۔

امام ورپشتیؒ فرماتے ہیں اس حدیث سے بہت سے لوگوں کو مغالطہ ہوا ہے۔ اس سے عام لوگوں کو شک میں مبتلا کر کے گمراہ کرنے کا ذریعہ بنایا ہے حالانکہ یہ ایسا حق ہے جو نہایت روشن ہے اور ایسا نور ہے جس کو شجرہ مبارکہ سے روشن کیا گیا ہے۔ يكاد زيتها يضيء ولولم تمسسه نار ترجمہ اس کا تیل اس قدر صاف اور سلگنے والا ہے کہ اگر اس کو آگ بھی نہ چھوئے تاہم ایسا معلوم ہوتا ہے کہ خود بخود جل اٹھے۔ اس سے وہ شخص دھوکا کھا سکتا ہے جس کو آنکھ اور دل دونوں کے اعتبار سے اللہ نے اندھا کر دیا ہو۔ اس باب میں آخری بات ہم یہ کہہ سکتے ہیں آنحضرت ﷺ کو رسالت کے معاملہ میں دستگیری کتاب (قرآن) پر دسترس حاصل تھی جس کی وجہ سے علوم غیبیہ کے انکشاف میں آپ ﷺ کو پوری امت کے مقابلہ میں استعداد کے اعتبار سے وافر حصہ نصیب تھا اس لئے جب بھی آنحضرت ﷺ امت کے لوگوں کو کسی ایسے علوم کے متعلق خبر دینا چاہتے جس میں ان کو مہارت حاصل نہیں ہوتی تو ان کے لئے دلائل ظاہرہ کے ساتھ مثال پیش فرماتے تاکہ مرئی چیز کے ذریعہ غیر مرئی کو پہچان لیں۔ اس لئے جب وحی کے باب میں صحابیؓ نے آنحضرت ﷺ سے وحی کی کیفیت کے متعلق پوچھا جو کہ ان علوم غریبہ اور باریک مسائل میں سے ہے جن کے چہرے سے نقاب کشائی کسی طالب ومتطلب' عالم ومتعلم کے لئے ممکن نہیں اس لئے محسوسات میں سے صوت متدارک کے ساتھ تشبیہ دی جس کی آواز تو سنی جاتی ہے لیکن سمجھ کچھ نہیں آتا۔ یہ تشبیہ اس بات پر تنبیہ فرمانے کے لئے دی۔ کہ یہ دل پر ایک مخصوص انداز میں وارد ہوتی ہے۔ فيفصم عني وقد وعيت کا یہی مطلب ہے یفصم کا اصل معنی تو اکھیڑنے اور سلسلہ گفتگو کے ختم کرنے کے ہیں یعنی جب وحی کا کرب مجھ سے ختم ہو جاتا ہے تو میں اس کو محفوظ کر لیتا ہوں۔ وحی کو تشبیہ دی ہے بخار کے ساتھ کہ جیسے محموم (بخار زدہ) سے بخار اترتا ہے تو طبیعت بحال ہو جاتی ایسے ہی مجھ سے وحی کا کرب جب ختم ہوتا ہے تو میں بھی طبیعت بحال ہو جاتی ہے۔ کہا جاتا ہے افصم المطر یعنی بارش کا سلسلہ ختم ہو گیا اور بارش رک گئی وحی کی یہ کیفیت اس وحی کی نظیر ہے جو ملائکہ کی طرف کی جاتی چنانچہ ابو ہریرہؓ آنحضرت ﷺ سے نقل کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ جب اللہ تعالیٰ آسمان میں کوئی حکم نازل فرماتے ہیں تو فرشتے ڈر کے مارے پرندے کی طرح اپنے پنکھ بجا دیتے ہیں اور لرزنے لگتے ہیں (گویا کہ چٹان پر زنجیریں ہیں) ان کو یہ ڈر ہوتا ہے کہ معلوم نہیں کیا ارشاد صادر ہوتا ہے۔ پھر یہ تلاوت فرمائی حتى اذا فزع عن قلوبهم قالوا ماذا قال ربكم قالوا الحق وهوالعلي الكبير۔ ''یہاں تک کہ جب ان کے دلوں سے گھبراہٹ دور ہو جاتی ہے تو ایک دوسرے سے پوچھتے ہیں کہ تمہارے پروردگار نے کیا حکم نازل فرمایا وہ فلانی حق بات کا حکم فرمایا اور وہ ذات عالی شان سب سے بڑی ہے''۔

حضرت عائشہؓ کی اس حدیث سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ وحی دو کیفیتوں کے ساتھ نازل ہوتی تھی۔ پہلی کیفیت دوسری سے سخت ہوتی تھی وہ اس طرح کہ کبھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو طبائع بشریہ سے جدا کر کے ملکوتی حالات روحانیت آپ پر غالب کر دی جاتی جس سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو فرشتوں کے ساتھ مناسبت حاصل ہو جاتی پھر آپ کو بھی اسی طرح وحی کی جاتی جیسے فرشتوں کو ہوا کرتی تھی جس کا ذکر حدیث ابو ہریرہؓ میں ابھی گزرا۔ اور یہ حدیث حسن صحیح ہے۔ دوسری کیفیت یہ ہوتی کہ کبھی ایسا ہوتا تھا کہ حضرت جبرائیل انسان کی شکل میں آتے تھے اور کلام الٰہی سناتے یہ صورت نزول وحی کی آسان ترین ہوتی تھی۔

طیبیؒ لکھتے ہیں کوئی بعید نہیں کہ وہاں حقیقتاً وحی کی آواز ہو جو معانی کو متضمن ہو اور عدم مناسبت کی وجہ سے نفس کو دہشت میں ڈالنے والی ہو۔ لیکن دل مناسبت کی وجہ سے اس کے معنی کو جذب کر کے پی جاتا پھر آواز جب چلی جاتی تو نفس کو بھی افاقہ ہو جاتا۔ افاقہ ہونے کے بعد ۔ل میں القاء ہونے والے کلام کو نفس حاصل کر کے محفوظ کر لیتا اس کیفیت سے ہے علم کا حصول یہ اسرار باطنی میں سے جس کا ادراک عقل نہیں کر سکتی۔

شرح مسلم میں قاضی عیاضؒ نے لکھا ہے کہ اس کیفیت کے ساتھ جو وحی نازل ہوتی تھی وہ اپنے ظاہر پر محمول ہے اور اس کی کیفیت اور صحیح صورت اللہ سبحانہ وتعالیٰ ہی جانتا ہے اور وہ جانتا ہے جس کو اس کے متعلق باری تعالیٰ نے خبر دی ہے۔ مثلاً ملائکہ اور رسل۔ باقی اس کے ظاہر کو چھوڑ کر تاویلیں اور حیلے ضعف النظر اور ضعف الایمان کی وجہ سے ہے کیونکہ جو چیز شریعت و دلائل عقلیہ سے ثابت ہو اس میں کسی حیلے کی گنجائش نہیں ہوتی۔

قولہ: **قالت عائشة**: علامہ کرمانیؒ کہتے ہیں احتمال ہے کہ یہ حصہ بھی اسی سند مذکور میں داخل ہو۔ حرف عطف محذوف کے واسطہ سے عطف جائز قرار دیں۔ اور یہ بھی ممکن ہے یہ جملہ اسناد مذکور کے تحت داخل نہ ہو بلکہ دوسری کسی سند سے ثابت ہو اور یہاں بطور تعلیق اس امر کی شدت اور تاکید کے لئے ذکر کیا گیا ہے۔ ابن حجر عسقلانی لکھتے ہیں یہ ماقبل والی سند سے ہے اگرچہ بغیر عطف کے کیوں نہ ہو۔ **وان جبينه يتفصد عرقا** کلمہ ان ہمزہ کی کسرہ کے ساتھ ہے اور واؤ حالیہ ہے یعنی وحی جس وقت ختم ہوتی تو آپ کی حالت یہ ہوتی کہ آپ کی پیشانی پسینہ سے شرابور نظر آتی۔

عرقًا: تمیز از فاعل ای **فيفصل الوحي عنه والحال ان** پر محمول ہے۔ امام ترمذیؒ نے بھی اس کو ذکر کیا ہے۔

نزولِ وحی کے وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی جسمانی کیفیت

۵۸۴۵: وَعَنْ عُبَادَةَ بْنِ الصَّامِتِ قَالَ كَانَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذَا اُنْزِلَ عَلَيْهِ الْوَحْيُ كُرِبَ لِذٰلِكَ وَتَرَبَّدَ وَجْهُهُ وَفِيْ رِوَايَةٍ نَكَسَ رَاْسَهُ وَنَكَسَ اَصْحَابُهُ رُءُوْسَهُمْ فَلَمَّا اُتْلِيَ عَنْهُ رَفَعَ رَاْسَهُ۔ (رواہ مسلم)

اخرجه مسلم في صحيحه ١٨١٧/٤ حديث رقم (٨٨-٢٣٣٤)

ترجمہ: ''حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ سے مروی ہے' فرماتے ہیں کہ جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی نازل ہوتی تو اس (کی شدت وصعوبت) کے سبب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کرب وحزن محسوس کرتے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے چہرۂ مبارک کا رنگ متغیر ہو جاتا

تھا"۔ اور ایک روایت میں یوں ہے کہ آپ ﷺ اپنا سر جھکا لیتے تھے اور (اس وقت جو صحابہ (موجود ہوتے وہ) بھی اپنا سر جھکا لیتے تھے' جب وحی موقوف ہو جاتی تو آپ ﷺ (اور صحابہ بھی) اپنا سر اٹھا لیتے"۔ (مسلم)

تشریح: انزل: انزل باب افعال سے مجہول کا صیغہ ہے۔

کرب: صیغہ مجہول کے ساتھ ہے۔

ایک شارح نے لکھا ہے: "الکرب" اور "الکربۃ" اس جان لیوا غم کو کہا جاتا ہے۔ کربه الغم: اس وقت کہا جاتا ہے جب بہت زیادہ رنج و ملال ہو "کرب" کی ضمیر "النبی" کی طرف راجع ہو تو مطلب یہ ہوگا کہ نبی کریم ﷺ وحی کے شدت اہتمام کے باعث اس شخص کی مانند ہو جاتے تھے جس کو غم نے آ پکڑا ہو۔ یعنی اس کے مبنی کے سبب سے' یا معنی کے سبب سے۔ اسی وجہ سے آنحضرت ﷺ سے فرمایا گیا: ﴿لاتحرك به لسانك لتعجل به ان علینا جمعه وقرآنه﴾ (القیامہ:۱۶) ترجمہ اے پیغمبر! آپ قبل اختتام وحی قرآن پر اپنی زبان نہ لہرایا کیجئے تاکہ آپ اس کو جلدی لیں ہمارے ذمہ ہے (آپ کے قلب میں) اس کا جمع کر دینا اور پڑھوا دینا۔ یا یہ غم و فکر آپ ﷺ کو اس سبب سے ہوتا تھا کہ نازل ہونے والی وحی میں غیظ و غضب اور سزا و عذاب کا اظہار کرنے والی آیات بھی ہوتی تھیں۔ یا اس وجہ سے کہ خود وحی بہت گراں گزرتی تھی کیونکہ کرب میں شدت کا معنی اصلاً موجود ہوتا ہے۔ میں کہتا ہوں یہ تشریح اگر مان لی جائے تو لذالك کہنا مناسب نہیں۔ امام تورپشتیؒ لکھتے ہیں کذلك میں یہ احتمال بھی ممکن ہے کہ وحی کے سبب آپ کو غم اس وجہ سے لاحق ہوتا کہ آنحضرت ﷺ ایک تو وحی کا بہت زیادہ اہتمام فرماتے اور جن امور میں حقوق عبودیت اور شکر منعم کا مطالبہ ہوتا اس کی فکر لاحق ہو جاتی اور امت کے نافرمانوں کے متعلق آپ کو خوف ہوتا اور سخت فکر مند ہو جاتے تھے کہ کہیں امت کے لوگ اللہ کے غیظ و غضب اور عذاب کے مستوجب نہ ہو جائیں اور جب تک نازل ہونے والی وحی کا پورا علم نہ ہوتا غم لاحق رہا۔ اور اس سے یہ بھی مراد ہو سکتا ہے کہ بذات خود وحی کی شدت و کرب کی وجہ سے غم زدہ ہو جاتے کیونکہ کرب میں شدت تو ہوتی ہی ہے۔ باقی صحابی نے کرب اس وجہ سے کہا ہے کہ نزول وحی کے وقت آپ کی حالت مکروب کی حالت کی مانند ہو جاتی تھی۔ اور تربد وجهه کا معنی ہے آنحضرت ﷺ کا چہرہ مبارک متغیر ہو کر سرخ ہو جاتا تھا جس طرح غصہ کے وقت چہرہ سرخ ہوتا ہے۔ تربد الرجل: کا معنی ہے: تغیر۔

اتلی عنه: اتلی: ہمزہ کے ضمہ' تائے فوقیہ کے سکون' لام کے کسرہ اور (یائے تحتیہ) کے فتحہ کے ساتھ بمعنی سری عنه و کشف۔ گویا کہ "اتلی" متضمن ہے الاتلاء کے معنی کو اور اتلاء نام ہے احالہ اور کشف کا۔ قرینہ یہ ہے کہ صلہ میں "عن" آیا ہے اور کتب اصول میں یہی مشہور ہے اور مشکوۃ کے نسخوں میں اس تلفظ کے علاوہ کوئی ضبط نہیں پایا جاتا۔ اور پہلی روایت کے مطابق معنی یہ ہوگا: فلما ارتفع الوحی۔ جب وحی مرتفع ہو جاتی اور دوسری روایت کے مطابق معنی ہوگا کہ جب کرب ختم ہو جاتا۔

امام نوویؒ لکھتے ہیں "اتلی" ہمزہ پھر تاء مثناۃ فوقیہ کے سکون پھر لازم کے کسرہ اور لام کے بعد یاء ہے ہمارے علاقہ کے معتبر نسخوں میں اسی طرح ہے اس کا معنی ہے پھر آپ پر وحی کا سلسلہ ختم ہو جاتا۔ صاحب تحریر وغیرہ نے بھی اسی طرح بیان کیا ہے بعض نسخوں میں اتلی کے بجائے اجلی یعنی جیم کے ساتھ مذکور ہے ابن ماہان کی ایک روایت میں انجلی ہمزہ نون اور جیم کے ساتھ منقول ہے جس کا معنی ہے کی شدت کا زائل ہونا اور ختم ہو جانا ہے۔ طیبیؒ لکھتے ہیں اتلی اقلع کے معنی میں لازم ہے پھر عن کے

ذریعہ اس کو متعدی کیا گیا ہے شرح السنہ کی روایت بھی اس کی موید ہے جس میں فلما اقلع عنه کے الفاظ صراحتاً موجود ہیں۔
تورپشتی فرماتے ہیں جملہ فلما اتلی علیه کی تفصیل مصابیح میں اسی طرح ہے لیکن میرے نزدیک صحیح بات یہ ہے یہ تلاوت سے ماخوذ ہے۔ یعنی "اتلی علیه" ہے اور اگر "اتلی علیه" کے الفاظ تحقیق سے ثابت ہوں تو یہ بمعنی "احیل" ہوگا۔ کہا جاتا ہے: اتلیته أحیلته۔ ای أحیل علیه البلاغ۔

کوہِ صفا سے امت کو پہلا خطاب

۵۸۴۶ : وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ لَمَّا نَزَلَتْ وَاَنْذِرْ عَشِيْرَتَكَ الْاَقْرَبِيْنَ خَرَجَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ حَتّٰى صَعِدَ الصَّفَا فَجَعَلَ يُنَادِيْ يَا بَنِيْ فِهْرٍ يَا بَنِيْ عَدِيٍّ لِبُطُوْنِ قُرَيْشٍ حَتّٰى اجْتَمَعُوْا فَجَعَلَ الرَّجُلُ اِذَا لَمْ يَسْتَطِعْ اَنْ يَّخْرُجَ اَرْسَلَ رَسُوْلاً لِيَنْظُرَ مَا هُوَ فَجَاءَ اَبُوْ لَهَبٍ وَقُرَيْشٌ فَقَالَ اَرَءَ يْتُمْ اِنْ اَخْبَرْتُكُمْ اِنَّ خَيْلًا تَخْرُجُ مِنْ صَفْحِ هٰذَا الْجَبَلِ وَفِي رِوَايَةٍ اَنَّ خَيْلًا تَخْرُجُ بِالْوَادِيْ تُرِيْدُ اَنْ تُغِيْرَ عَلَيْكُمْ اَكُنْتُمْ مُصَدِّقِيَّ قَالُوْا نَعَمْ مَا جَرَّبْنَا عَلَيْكَ اِلاَّ صِدْقًا قَالَ فَاِنِّيْ نَذِيْرٌ لَّكُمْ بَيْنَ يَدَيْ عَذَابٍ شَدِيْدٍ قَالَ اَبُوْ لَهَبٍ تَبًّا لَّكَ اَلِهٰذَا جَمَعْتَنَا فَنَزَلَتْ تَبَّتْ يَدَا اَبِيْ لَهَبٍ وَّتَبَّ.

(متفق علیه)

اخرجه البخاری ۱/۸ ۵۰حدیث رقم ۴۷۷۰ ومسلم فی صحیحه ۱۹۳/۱حدیث رقم (۳۵۵-۲۰۸) والترمذی فی السنن ۴۲۰/۵حدیث رقم ۳۳۶۳ والد ار می فی السنن ۳۹۵/۲حدیث رقم ۲۷۳۲ واحمد فی المسند ۳۰۷/۱۔

ترجمہ: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ جب یہ آیت وَاَنْذِرْ عَشِيْرَتَكَ الْاَقْرَبِيْنَ نازل ہوئی تو نبی کریم ﷺ (اس حکم کی تعمیل کے لئے فوراً) نکل پڑے اور کوہِ صفا پر چڑھ کر (قبائل قریش کو) پکارنے لگے: اے فہر کی اولاد! اے عدی کی اولاد! اس طرح آپ ﷺ نے قریش کی تمام شاخوں کو نام بنام پکارا۔ چنانچہ (آپ ﷺ کی اس آواز پر) وہ سب (آپ ﷺ کے گرد) جمع ہو گئے یہاں تک کہ جو شخص (کسی عذر اور مجبوری کے سبب) خود اس جگہ نہ پہنچ سکا تو اس نے کسی کو اپنا نمائندہ بنا کر بھیج دیا تا کہ وہ پتہ لگائے کہ معاملہ کیا ہے (محمد ﷺ نے کیوں سب کو بلایا ہے)۔ غرضیکہ (آنحضرت ﷺ کا چچا) ابولہب اور قریش سب آ گئے تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ: اگر میں تمہیں یہ خبر دوں کہ (جنگجو) سواروں کا ایک لشکر آنے والا ہے اور ایک روایت کے الفاظ یہ ہیں کہ سواروں کا ایک دستہ (مکہ کے) جنگل سے نمودار ہوا ہے اور اس کا مقصد قتل و غارت گری کے لئے (دن یا رات کے کسی حصہ میں) تم لوگوں پر دفعۃً ٹوٹ پڑنا ہے تو بتاؤ کہ کیا تم لوگ میری اس بات کو سچ مانو گے"۔ سب نے (ایک زبان ہوکر) کہا کہ ہاں (ضرور سچ مانیں گے) کیونکہ ہم نے آپ کو ہمیشہ سچا پایا ہے۔ تب آپ ﷺ نے فرمایا: (تو سنو) میں تمہیں اس سخت عذاب سے ڈراتا ہوں جو (دنیا یا آخرت میں) تمہیں پیش (آنے والا) ہے"۔ (یہ سننا تھا کہ) ابولہب (بھک اٹھا اور) کہنے لگا تم ہلاک ہو جاؤ" کیا تم نے ہمیں اس لئے جمع کیا تھا؟ اس پر یہ

آیت نازل ہوئی۔تَبَّتْ يَدَآ اَبِيْ لَهَبٍ وَّتَبَّ (ہلاک ہو جائے ابولہب اور وہ ہلاک ہو گیا)‘‘۔(بخاری ومسلم)

تشریح: خرج النبی ﷺ۔ جبکہ ایک نسخہ میں رسول اللہ ﷺ کے الفاظ ہیں۔ **حتی صعد الصفاء:** عین کے کسرہ کے ساتھ۔ یعنی آپ ﷺ کوہ صفا پر چڑھے۔ **فجعل ینادی** بلند آواز سے فرمانے لگے یا نبی **فهر** فاء کے کسرہ اور ہاء کے سکون کے ساتھ یا نبی **عدی** اسی طرح دوسرے قبائل قریش۔ **من صفح هذا الجبل** صُفح سے مراد پہاڑ کی اوٹ یا دامن کوہ ہے۔ قاموس میں **الصفح** سے مراد طرف و جانب ہے اور **الصفح من الخیل** کا معنی گھوڑے کا لیٹ جانا ہے۔ اور سین کے ساتھ السفح سے پہاڑ کا نچلا سخت حصہ جس سے پانی بہہ کر آئے مراد ہوتا ہے۔ چکنی اور نرم چٹانوں کو بھی کہا جاتا ہے۔ **وفی روایة بالوادی:** الوادی میں لام عہد ذہنی ہے اور وادی سے مراد شاید وادی فاطمہ ہے جو مکہ مکرمہ سے مدینہ جاتے ہوئے راستے میں پڑتی ہے۔ ترید کا فاعل خلیل ہے مراد اس سے مالک اور سوار ہیں۔ **ماجربنا علیك الا صدقا۔**

طیبیؒ لکھتے ہیں اتلی بمعنی اقلع (ہٹ جانے اور زائل ہونے کے معنی میں ہے) ہے اس کی تائید شرح السنہ کی روایت سے بھی ہوتی ہے کیونکہ شرح السنۃ صراحتاً میں **اقلع عنه** کے الفاظ موجود ہیں اور مطلب یہ ہے کہ ہم نے جب بھی کسی خبر اور معاملہ کے اعتبار سے آپ کا تجربہ کیا آپ کو سچا ہی پایا۔ **الهذا جمعتنا:** کلمہ لھب ھاء کے فتحہ کے ساتھ کبھی سکون کے ساتھ بھی پڑھا جاتا ہے۔ یعنی وہ اور اس کے پلید ہاتھ ہالک و برباد ہو جائے یا ہاتھ سے مراد اس کا پورا وجود ہے کیونکہ تمام اعضاء انسانی میں ہاتھ ہی ایسا عضو ہے جس سے انسان اپنے تمام خارجی کام کاج کرتا ہے اور ان کا انحصار بھی ہاتھوں پر ہوتا ہے۔ اس اعتبار سے ہاتھ بول کر پورا وجود مراد لیا جاتا ہے۔ جیسا کہ ایک اور جگہ میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد: ﴿ذلك بما قدمت يداك﴾ اور باری تعالیٰ کا ارشاد **وتب:** کلمہ تب اول کی تاکید ہے اول سے مراد دنیا اور ثانی سے آخرت میں عذاب مراد ہے گویا کہ خسر الدنیا والآخرہ اول (تبت یدا) بددعا ہے ثانی (وتب) سے عذاب کی خبر دی گئی ہے۔

آنحضرت ﷺ کے ساتھ عمائدین قریش کی بدسلوکی اور ان کا عبرتناک انجام

۵۸۴۷ : وَعَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ مَسْعُوْدٍ قَالَ بَيْنَمَا رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يُصَلِّيْ عِنْدَ الْكَعْبَةِ وَجَمْعُ قُرَيْشٍ فِيْ مَجَالِسِهِمْ اِذَا قَالَ قَائِلٌ اَيُّكُمْ يَقُوْمُ اِلٰى جَزُوْرِ اٰلِ فُلَانٍ فَيَعْمِدُ اِلٰى فِرْثِهَا وَدَمِهَا وَسَلَاهَا ثُمَّ يُمْهِلُهٗ حَتّٰى اِذَا سَجَدَ وَضَعَهٗ بَيْنَ كَتِفَيْهِ فَانْبَعَثَ اَشْقَاهُمْ فَلَمَّا سَجَدَ وَضَعَهٗ بَيْنَ كَتِفَيْهِ وَثَبَتَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ سَاجِدًا فَضَحِكُوْا حَتّٰى مَالَ بَعْضُهُمْ عَلٰى بَعْضٍ مِنَ الضِّحْكِ فَانْطَلَقَ مُنْطَلِقٌ اِلٰى فَاطِمَةَ فَاَقْبَلَتْ تَسْعٰى وَثَبَتَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ سَاجِدًا حَتّٰى اَلْقَتْهُ عَنْهُ وَاَقْبَلَتْ عَلَيْهِمْ تَسُبُّهُمْ فَلَمَّا قَضٰى رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ الصَّلٰوةَ قَالَ اَللّٰهُمَّ عَلَيْكَ بِقُرَيْشٍ ثَلٰثًا وَكَانَ اِذَا دَعَا دَعَا ثَلٰثًا وَاِذَا سَاَلَ سَاَلَ ثَلٰثًا اَللّٰهُمَّ عَلَيْكَ بِعَمْرِو بْنِ هِشَامٍ وَعُتْبَةَ بْنِ رَبِيْعَةَ وَشَيْبَةَ بْنِ رَبِيْعَةَ وَوَلِيْدِ بْنِ عُتْبَةَ وَاُمَيَّةَ ابْنِ خَلَفٍ وَعُقْبَةَ ابْنِ اَبِيْ مُعَيْطٍ

وَعُمَارَةَ بْنَ الْوَلِيْدِ قَالَ عَبْدُ اللّٰهِ فَوَاللّٰهِ لَقَدْ رَأَيْتُهُمْ صَرْعٰى يَوْمَ بَدْرٍ ثُمَّ سُحِبُوْا إِلَى الْقَلِيْبِ قَلِيْبِ بَدْرٍ ثُمَّ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ وَأُتْبِعَ أَصْحَابُ الْقَلِيْبِ لَعْنَةً (متفق عليه)

اخرجه البخاري في صحيحه ۳۴۹/۱ حديث رقم ۲۴۰ ومسلم في صحيحه ۱۴۱۸/۳ حديث رقم (۱۰۷-۱۷۹۴)۔

ترجمہ: ''حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے فرماتے ہیں کہ (ایک دن) جب کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بیت اللہ کے پاس نماز پڑھ رہے تھے اور وہاں (بیت اللہ کے پاس) قریش (کے عمائدین) کا ایک گروہ مجلس جمائے بیٹھا تھا اچانک ان میں سے کسی نے کہا کہ تم میں سے کون ہے جو فلاں محلّہ اور قبیلہ میں جائے اور ان کے ذبح شدہ اونٹ کی غلاظت سے بھری ہوئی اوجھڑی اس کا خون اور اس کا پوست اٹھا لائے پھر ٹھہرا رہے اور جب محمد صلی اللہ علیہ وسلم سجدہ میں جائیں تو وہ ان سب چیزوں کو ان کے دونوں مونڈھوں کے درمیان ڈال دے۔ (یہ سن کر) ایک انتہائی بد بخت شخص (عقبہ بن ابی معیط یا ابوجہل) اٹھا (اور یہ سب چیزیں لے کر آ گیا) چنانچہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سجدہ میں گئے تو اس نے وہ چیزیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے مونڈھوں کے درمیان رکھ دیں اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم (ان گندی چیزوں کا بوجھ اٹھا نہ سکے اور) سجدے میں پڑے رہ گئے' وہ بدبخت یہ دیکھ کر ہنسنے اور ٹھٹھا مارنے لگے اس ہنسی میں اس قدر بدحال ہوئے اور ہنستے ہنستے ایک دوسرے پر گر گئے' اسی دوران کسی شخص نے جا کر حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا سے کہہ دیا' حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا دوڑتی ہوئی تشریف لائیں اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اس وقت تک (ان غلاظتوں میں دبے ہوئے) سجدہ میں پڑے تھے' حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا نے ان تمام چیزوں کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی پشت پر سے اٹھا کر پھینکا اور ان بدبختوں کی طرف متوجہ ہو کر ان کو برا بھلا کہنے لگیں' جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نماز سے فارغ ہوئے تو دعا کی: اے اللہ! تو قریش کو پکڑ لے' (یعنی مشرکین قریش کو ہلاک و برباد فرما) تین بار آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ دعا فرمائی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا معمول تھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ سے کچھ مانگتے تو تین بار مانگا کرتے۔ پھر عمومی طور پر قریش کے حق میں بددعا فرمانے کے بعد خاص طور سے ان ازلی بدبختوں کا نام لے کر یوں بددعا فرمائی: اے اللہ! تو عمرو بن ہشام (ابوجہل) کو عتبہ بن ربیعہ اور شیبہ بن ربیعہ (دونوں بھائیوں) کو ولید بن عتبہ کو' امیہ ابن خلف کو' عقبہ بن معیط اور عمارہ بن ولید کو پکڑ لے''۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ (راوی) نے (یہ روایت بیان کر کے) کہا کہ اللہ کی قسم میں نے جنگ بدر کے دن ان سب مشرکین کو ہلاک شدہ زمین پر پڑے دیکھا پھر انہیں گھسیٹ کر ایک کنوئیں میں' جو مقام بدر کا کنواں تھا پھینک دیا گیا اور (اس وقت) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا: ان لوگوں کو جو کنوئیں میں پھینکے گئے ہیں' ملعون قرار دے دیا گیا ہے''۔ (بخاری و مسلم)

تشریح: **وجمع قريش في مجالسهم** :یہ جملہ حال ہے صحاح میں جو کچھ ذکر کیا گیا ہے اس کے مطابق اوجھ میں بھرا ہوا گوبر اور لید کو کہتے ہیں اور ضمیر جزور کی طرف راجع ہے اگرچہ لفظ جزور مذکر و مونث دونوں میں استعمال ہوتا ہے لیکن لفظاً مونث ہے اگرچہ آپ اس سے مذکر کیوں نہ مراد لیں نہایہ میں بھی اسی طرح ہے۔ **سلاها** لفظ سلاہ اس پوست کو کہا جاتا ہے جو چوپاؤں کے بچوں کی پیدائش کے وقت بچے کے ساتھ ماں کے پیٹ سے باہر آتا ہے۔ بعض حضرات کہتے ہیں چوپاؤں کے اس

پوست کو السلاء کہا جاتا ہے اور انسانوں کے پوست کے لئے مشیمۃ استعمال ہوتا ہے لیکن پہلا معنی مراد لینا زیادہ بہتر ہے کیونکہ مشمیہ ولادت کے بعد خارج ہوتا ہے ولادت کے وقت بچہ اس میں ملفوف نہیں ہوتا۔ نہایۃ میں بھی اسی طرح مذکور ہے۔ فانبعث اشقاهم: یہ سن کر ایک انتہائی بد بخت شخص اٹھا اور ان چیزوں کو لانے کے لئے چلا گیا۔

یہ بد بخت کون تھا؟

ایک شارح نے لکھا ہے کفار قریش میں سے یہ بد بخت ابو جہل تھا بعض کہتے ہیں عقبہ بن ابی معیط تھا۔ امام نوویؒ لکھتے ہیں یہ عقبہ بن ابی معیط تھا۔ کیونکہ دوسری روایت میں ان کا نام صراحتاً موجود ہے۔ وضعه بين كتفيه: یہ کس نے رکھا تھا؟ فاعل کو شاید اس لئے مجہول رکھا ہے تاکہ باسقہ دونوں قولوں کو جمع کیا جائے۔ وثت النبي ﷺ ساجدا: ساجداً۔ حال ہے۔ لیکن اپنے پروردگار کے قرب حاصل ہونے کی وجہ سے اس کے حضور میں ثابت قدم رہے اس کے قضا پر راضی رہے اس کے امر اور آزمائش کو تسلیم فرماتے ہوئے غایت سرور میں رہے۔ جبکہ کفار قریش کے عمائدین حق مطلق سے دور اور مخلوق سے جی لگانے کی وجہ سے اپنے رب کریم سے غافل ہو کر ادھر اپنے لئے ہلاکت کا سامان پیدا کر گئے۔ فاقلبت تسعى: حضرت فاطمہؓ اس واقعہ کے وقت بہت چھوٹی تھیں۔ کیونکہ ان کی ولادت کے وقت آنحضرت ﷺ کی عمر مواہب کی رویات کے مطابق اکتالیس برس تھی۔ وثبت النبي ﷺ ساجدا: یہ جملہ ماقبل کے لئے تاکید اور مابعد کے لئے تمہید ہے۔ مابعد سے مراد جملہ حتى القته ہے۔ واقبلت تسبهم: اور ان کے منہ پر برا بھلا کہا اور لعن طعن فرمایا اور وہ حضرت فاطمہ کے صغرسنی کی وجہ سے خاموش رہے۔ حضرت فاطمہؓ کے علاوہ شاید ہی کوئی یہ کام کر سکتا کیونکہ ان کے علاوہ خاندان کا کوئی اور فرد ہوتا تو باہم طویل جنگ چھڑ جاتی۔ اللهم عليك بقريش: کلمہ قریش پر باء زائدہ ہے اور عليك اسم فعل ہے بمعنی خذهم اخذاً شديداً اخذ عزيز مقتدر یعنی اے اللہ تو ان لوگوں کو ایسے سخت پکڑ کہ جیسے عذاب کے وقت تیری پکڑ ہوتی ہے یعنی ان کو ہلاک و برباد فرمایا۔ وكان اذا دعا......
سأل ثلاثا: آپ ﷺ کی عادت تھی کہ جب بھی دعا کرتے اور اللہ کو پکارتے تو تین بار دعا کرتے۔ اسی طرح جب آپ ﷺ اللہ تعالیٰ سے کچھ مانگتے تو بھی تین بار التجا کرتے۔ بعض حضرات کہتے ہیں دعا کی اہمیت ظاہر کرنے کی خاطر اس طرح فرماتے لیکن اصل یہ ہے کہ یہ آنحضرت ﷺ کی مخصوص عادت تھی۔

شرح مسلم میں امام نوویؒ لکھتے ہیں اس حدیث کے بارے میں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب آنحضرت ﷺ کی پشت مبارک پر ناپاک اور گندی چیزیں ڈال دی گئی تھیں تو یقیناً آپ ﷺ کا بدن مبارک اور کپڑے ناپاک ہو گئے ہوں گے۔ تو اس کے باوجود آپ ﷺ نماز میں بدستور کیسے مشغول رہے؟ قاضی عیاضؒ نے اس کا جواب یہ دیا کہ وہ اوجھ ناپاک نہ تھی کیونکہ اوجھ اور اس کے جسم کی رطوبت پاک ہیں ناپاک چیز تو صرف دم مسفوح ہوتا ہے۔ اور یہی امام مالکؒ کا مذہب ہے اور جن لوگوں نے ان کی موافقت کی ہے وہ کہتے ہیں حلال جانوروں کا گوبر پاک ہے۔ جبکہ ہمارا اور امام ابو حنیفہؒ کا مذہب یہ ہے کہ حلال جانوروں کا فضلہ نجس ہے۔ قاضی عیاضؒ نے یہ جو بات کی ہے یہ ضعیف ہے اس لئے کہ اس طرح کی اوجھ خون سے خالی نہیں ہوتیں اور ساتھ یہ بت پرستوں کا ذبیحہ تھا جس کا نجس ہونا یقینی ہے۔ ملا علی قاریؒ فرماتے ہیں۔ میں جو کہہ رہا ہوں یہ صرف ذبیحہ کی

حیثیت سے کہہ رہا ہوں وگرنہ او جھ بالا تفاق نجس ہے امام نوویؒ حدیث میں دم کی تصریح کرنا بھول گئے ہیں صرف اتنا فرمایا کہ او جھا اکثر خون سے خالی نہیں ہوتا۔ پھر لکھتے ہیں مناسب جواب یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ کو پشت مبارک پر رکھی جانے والی چیز کے نجس ہونے کے متعلق علم نہ تھا اس لئے بدستور نماز میں مشغول رہے کہ کوئی پاک چیز ہوگی۔ ملا علی قاریؒ فرماتے ہیں اس پر یہ اشکال ہوتا ہے کہ اگر معاملہ اس طرح ہوتا تو حضرت جبرائیل علیہ السلام آپ کو ضرور خبر دیتے کیونکہ نجاست کے ساتھ نماز ہوتی ہی نہیں۔ اس طرح کے سوال کا جواب بھی ضرور ہونا چاہئے اور اس کا صحیح جواب یہ ہے کہ یہ واقعہ اس وقت کا ہے جب خوف وغیرہ اور مشرکین کے ذبیحہ کی حرمت نازل نہیں ہوئی تھی اس وجہ سے آپ کی نماز پر بھی کوئی اثر نہیں پڑا جیسا کہ شراب کی حرمت نازل ہونے سے پہلے جب کپڑے کو شراب لگ جاتی تھی تو اس کپڑے میں نماز پڑھ لیتے تھے اور نماز ہو جاتی تھی۔ طیبیؒ لکھتے ہیں آپ ﷺ کا اس طرح ثابت رہنا شاید بہت زیادہ شکوہ اور اللہ اور اس کے رسول کے دشمنوں کی بدسلوکی کے اظہار کے لئے تھا۔ کہ اللہ تعالیٰ ان کو ہلاک و برباد کرے۔ اسی وجہ سے آنحضرت ﷺ نے دعا بھی تین مرتبہ فرمائی۔

اللّٰھم ...... ھشام: خصوصی طور پر اس بدبخت کا نام لیا یہ مغیرہ مخزومی جاہلی کا مشہور بیٹا ہے زمانہ جاہلیت میں ابوالحکم کی کنیت سے مشہور تھا۔ پھر آنحضرت ﷺ نے ان کی کنیت ابوجہل رکھی تو یہ کنیت ان کے اصل نام اور قدیم کنیت پر غالب رہی اور وہ ابوجہل ہی کے نام سے مشہور ہوا۔ غزوہ بدر میں حضرت عفراء کے صاحبزادوں (معاذ اور معوذ) نے انہیں زخمی کر کے گرا دیا تھا پھر عبداللہ ابن مسعودؓ نے اس کا سر قلم کیا۔ **وعتبہ بن ربیعہ:** جاھلی ان کو حضرت حمزہؓ بن عبدالمطلب نے بدر کے دن حالت شرک میں قتل فرما دیا تھا۔ **وشیبہ بن ربیعہ:** ان کا پورا نسب یوں ہے ابن عبد شمس بن عبد مناف جاہلی ان کو بدر کے دن حضرت علیؓ نے واصل جہنم کیا تھا۔ **الولید بن عتبہ:** یہ ولید ابن عتبہ ابن ربیعہ ہیں یہ بھی غزوہ بدر کے موقع پر مارا گیا۔ **وامیۃ:** ہمزہ کے ضمہ میم کے فتحہ اور یاء مشددہ کے ساتھ **ابن خلف:** فاء اور لام کے فتحہ کے ساتھ یہ بھی غزوہ بدر کے موقع پر مارا گیا تھا ان کے بھائی ابی بن خلف کو غزوہ احد کے موقع پر آنحضرت ﷺ نے خود اپنے ہاتھوں سے مارا تھا۔ مولف نے ان کے نام کو مقتولین احد میں ذکر کیا ہے۔ **عقبہ:** عین کے ضمہ اور قاف کے سکون کے ساتھ۔ **ابن ابی معیط:** لفظ معیط تصغیر کے وزن پر ہے۔ **وعمارہ:** عین کے ضمہ اور میم مخففہ کے ساتھ۔ **ابن الولید...... رایتھم:** ان سب کو میں نے دیکھا کہ صرعی یہ حال ہے رایتھم کی ضمیر منصوب سے یعنی مفعول بہ سے **سحبوا:** صیغہ مجہول ہے کھینچے اور گھسیٹنے کے معنی میں ہے۔ **الی القلیب:** قلیب کچے کنویں کو کہا جاتا ہے قلیب بدر یہ مجرور ہے بدل ہے القلیب اول سے نیز رفع نصب کے ساتھ بھی جائز ہے: بدر ایک مشہور مقام کا نام ہے اس کی وجہ تسمیہ کیا ہے؟ بعض حضرات کہتے ہیں ایک شخص کا نام تھا جو اس علاقے کا مالک تھا اس کے نام سے یہ مقام بدر کہلاتا ہے۔

ابن حجر عسقلانیؒ لکھتے ہیں یہاں عمارہ۔ کے نام کو مقتولین مذکور میں ذکر کرنے سے یہ اشکال پیدا ہوتا ہے کہ عمارہ تو بدر میں نہیں مارا گیا تھا حضرت عبداللہ نے ان کا نام ان میں کیوں ذکر فرمایا کیونکہ اصحاب مغازی نے لکھا ہے یہ حبشہ میں فوت ہوئے تھے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ کا کلام اکثریت پر محمول ہے کہ ان میں سے زیادہ تر مشرکین کا یہی حال ہوا۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ ابن ابی معیط بھی بدر سے بچ کر آ گیا تھا بعد میں بری طرح مارا گیا اور امیہ بن خلف جنگ بدر میں ہی مارا گیا تھا اس کو ویسے ہی کنویں میں نہیں ڈالا گیا بلکہ کاٹ کاٹ کر ڈالا گیا۔

ثم قال ...... واتبع :صیغہ مجہول کے ساتھ مخففاً اصحاب القلیب لعنة: مطلب یہ ہے کہ اخروی عذاب بھی اس دنیاوی سزا کے ساتھ شروع ہو چکا ہے یعنی دنیا میں تو ان کو اپنے کئے کی سزا مل گئی۔ اخروی عذاب اس کے علاوہ ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿واتبعوا فی هذالدنیا لعنة ویوم القیامة﴾ (ھود: ٦٠) ترجمہ اور (ان افعال کا نتیجہ یہ ہوا کہ) اس دنیا میں بھی لعنت ان کے ساتھ ہی رہی اور قیامت کے دن بھی۔ ایک نسخہ میں لفظ اتبع ہمزہ کے فتحہ باء کی کسرہ اور لفظ اصحاب کے نصب کے ساتھ۔ ان کے خلاف بددعا ہے کہ ہمیشہ ان پر اللہ کی لعنت اور پھٹکار ہو۔

عسقلانیؒ لکھتے ہیں جملہ واتبع.....میں کئی احتمال ہیں۔

① یہ جملہ ماضی کے دعا کی تتمہ ہو اس اعتبار سے یہ معجزات نبوت میں سے عظیم معجزہ شمار ہوگا کہ آپ نے جس طرح بددعا فرمائی تھی بعینہ اسی طرح پوری ہوگئی۔

② اور یہ بھی احتمال ہے کہ آپ نے یہ جملہ ان مشرکین کو کنویں میں ڈالنے کے بعد ارشاد فرمایا ہو۔ (متفق علیہ)

طائف میں آنحضرت ﷺ سے طائف کے سرداروں کا سلوک اور آپ کا کمال تحمل

۵۸۴۸ : وَعَنْ عَآئِشَةَ اَنَّهَا قَالَتْ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ هَلْ اَتٰى عَلَيْكَ يَوْمٌ كَانَ اَشَدَّ مِنْ يَوْمِ اُحُدٍ فَقَالَ لَقَدْ لَقِيْتُ مِنْ قَوْمِكِ وَكَانَ اَشَدَّ مَا لَقِيْتُ مِنْهُمْ يَوْمَ الْعَقَبَةِ اِذَا عَرَضْتُ نَفْسِيْ عَلٰى ابْنِ عَبْدِ يَا لَيْلَ بْنِ كُلَالٍ فَلَمْ يُجِبْنِيْ اِلٰى مَا اَرَدْتُّ فَانْطَلَقْتُ وَاَنَا مَهْمُوْمٌ عَلٰى وَجْهِيْ فَلَمْ اَسْتَفِقْ اِلَّا بِقَرْنِ الثَّعَالِبِ فَرَفَعْتُ رَأْسِيْ فَاِذَا اَنَا بِسَحَابَةٍ قَدْ اَظَلَّتْنِيْ فَنَظَرْتُ فَاِذَا فِيْهَا جِبْرِيْلُ فَنَادَانِيْ فَقَالَ اِنَّ اللّٰهَ قَدْ سَمِعَ قَوْلَ قَوْمِكَ وَمَا رَدُّوْا عَلَيْكَ وَقَدْ بَعَثَ اِلَيْكَ مَلَكَ الْجِبَالِ لِتَاْمُرَهُ بِمَا شِئْتَ بِهِمْ قَالَ فَنَادَانِيْ مَلَكُ الْجِبَالِ فَسَلَّمَ عَلَيَّ ثُمَّ قَالَ يَا مُحَمَّدُ اِنَّ اللّٰهَ قَدْ سَمِعَ قَوْلَ قَوْمِكَ اَنَا مَلَكُ الْجِبَالِ وَقَدْ بَعَثَنِيْ رَبُّكَ اِلَيْكَ لِتَاْمُرَنِيْ بِاَمْرِكَ اِنْ شِئْتَ اَنْ اُطْبِقَ عَلَيْهِمُ الْاَخْشَبَيْنِ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بَلْ اَرْجُوْا اَنْ يُّخْرِجَ اللّٰهُ مِنْ اَصْلَابِهِمْ مَنْ يَّعْبُدُ اللّٰهَ وَحْدَهُ وَلَا يُشْرِكُ بِهٖ شَيْئًا (متفق علیه)

اخرجه البخاری فی صحیحه ٦/٣١٢حدیث رقم ٣٢٣١ومسلم فی صحیحه٣/١٤٢٠حدیث رقم (١١١-١٧٩٥)

ترجمہ: ''حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ انہوں نے (ایک دن) عرض کیا: یارسول اللہ ﷺ! کیا احد کے دن سے بھی زیادہ سخت کوئی دن آپ ﷺ پر گزرا ہے؟ (احد کی جنگ میں آنحضرت ﷺ کو بہت زیادہ مصیبتوں اور اذیتوں کا سامنا کرنا پڑا تھا جس کا ذکر اگلی حدیث میں آرہا ہے) آپ ﷺ نے فرمایا: مجھے تیری قوم سے بہت تکلیفیں پہنچی ہیں' اور سب سے زیادہ تکلیف مجھے عقبہ کے روز پہنچی جب میں ابن عبد یالیل ابن کلال کے پاس پہنچا (اور اس کو اسلام قبول کرنے

کی تلقین کی) لیکن اس نے میری (تلقین پر کوئی توجہ نہیں دی اور میں رنجیدہ و غمگین جدھر کو منہ آیا' چل پڑا (اور چلتا ہی رہا) یہاں تک کہ قرن ثعالب پہنچ کر میرے حواس قابو میں آئے' میں نے سراو پر اٹھایا تو کیا دیکھتا ہوں کہ ایک (بڑا) بادل کا ٹکڑا ہے جو مجھ پر سایہ کئے ہوئے ہے اس بادل کے ٹکڑے میں مجھے جبرئیل علیہ السلام دکھائی دیئے۔ جبرئیل علیہ السلام نے مجھے پکارا اور کہا کہ آپ ﷺ کے پروردگار نے آپ ﷺ کی قوم کی بات سن لی اور اس کا جواب بھی سن لیا جو اس نے آپ ﷺ کو دیا ہے (یعنی آپ ﷺ کی قوم کا آپ ﷺ کو برا بھلا کہنا' آپ ﷺ کو جھٹلانا اور آپ ﷺ کو ایذا پہنچانا سب معلوم ہے) اور اب اس (پروردگار) نے آپ ﷺ کے پاس پہاڑوں کے فرشتہ کو (جس کے سپرد تمام روئے زمین کے کوہ وجبل کی عملداری ہے) اس لئے بھیجا ہے کہ آپ ﷺ اپنی قوم (کی ہلاکت وتباہی اور ان تمام ظالموں کو پہاڑوں میں دبا دینے) کے بارے میں جو چاہیں حکم صادر فرمائیں۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا: ''اس کے بعد پہاڑوں کے فرشتوں نے مجھ کو (یا نبی! یا محمد! کہہ کر) مخاطب کیا اور سلام کر کے کہا کہ اے محمد ﷺ! اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کی قوم کی بات سن لی ہے' میں پہاڑوں کا فرشتہ ہوں' مجھے آپ ﷺ کے پروردگار نے آپ ﷺ کے پاس بھیجا ہے کہ آپ ﷺ مجھے جو چاہیں حکم فرمائیں۔ اگر آپ ﷺ فرمائیں تو میں آپ ﷺ کی قوم کے لوگوں پر ان دونوں پہاڑوں اَخْشَبَیْن کو الٹ دوں (جن کے نیچے دب کر سب کے سب نیست و نابود ہو جائیں) رسول اللہ ﷺ نے (یہ سن کر) فرمایا: (میں ان کی ہلاکت کا خواہاں نہیں ہوں) بلکہ مجھے تو اُمید ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کی نسل میں سے ایسے لوگ پیدا فرما دے گا جو صرف اسی ایک خدا کی عبادت کریں اور کسی بھی چیز کو اس کا شریک قرار نہ دیں (یعنی نہ شرک جلی میں مبتلا ہوں اور نہ شرک خفی میں)''۔ (بخاری ومسلم)

تشریح: **کان اشد ...... من قومك** :مشقت احد کے وقت پہنچنے والی مشقت سے بھی زیادہ ہو۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا تمہاری قوم کی طرف سے جو صورت حال پیش آتی تھی وہ احد کے دن سے کہیں زیادہ مجھ پر سخت تھی یا تمہاری قوم کی طرف سے جو کچھ مجھ کو تکلیف پہنچی تھی اس کا اندازہ نہیں لگایا جا سکتا ہے۔ مفعول مبہم کو اس لئے حذف کیا گیا ہے تا کہ **و کان ...... منهم** ۔کلمہ **اشد** کے نصب کے ساتھ ایک نسخہ میں اس کے رفعہ کے ساتھ ہے۔ آنحضرت ﷺ کا قول **یوم العقبه** یہ نصب کے ہی ساتھ ہے عقبہ اصل میں تو اس راستہ کو کہتے ہیں جو دو پہاڑوں کے درمیان گزرتا ہے۔ لیکن یہاں عقبہ سے مراد وہ جگہ ہے جو منیٰ میں واقع ہے جس کی طرف جمرہ کی نسبت کر کے جمرۃ العقبہ کہتے ہیں۔ ایک شارح کہتا ہے۔ اشد نصب کے ساتھ ہے کیونکہ یہ کان کی خبر ہے اور جملہ **مالقیت منهم** محلًا مرفوع ہے **کان** کے اسم ہونے کی وجہ سے اور **یوم العقبه لقیت** کا مفعول فیہ ہے تقدیر عبارت یوں ہے: **و کان ما لقیته منهم یوم العقبة اشد مما لقیته منهم فی سائر الایام** کہ یوم عقبہ میں جو تکلیف مجھے پہنچی تھی اس جیسی تکلیف کبھی نہ پہنچی ہوگی یعنی عقبہ کے موقع پر بہت زیادہ ایذا پہنچائی گئی تھی۔ یہ ترکیب بھی جائز ہے کہ یوم العقبہ کو کان کا اسم بنایا جائے کہ اس کی خبر اشد ہوگی ما موصولہ یا موصوفہ جس سے ایام مراد ہیں اشد کے لئے مضاف الیہ ہوگی اس صورت میں تقدیر عبارت یوں ہوگی **و کان یوم العقبة اشدالایام التی لقیت منهم** یعنی کفار قریش کی جانب سے پہنچنے والی ایذاؤں میں عقبہ کا دن تمام ایام میں سب سے زیادہ سخت تھا۔ یا یوں ہے **اشد ایام لقیت منهم**۔ اس کے عکس بھی جائز ہیں یعنی اشد کو کان کا اسم اور یوم العقبہ کو خبر بنانا بھی صحیح ہے بعض حضرات کہتے ہیں **مالقیت منهم یوم العقبه** کان کا اسم ہے اور اشد خبر

ہے اور اس سے قبل مضاف یا مین مقدر ہے۔

طیبیؒ لکھتے ہیں: اشد ما لقیت پورا جملہ کان کی خبر ہے اور کان کا اسم ضمیر مع جو مقدر کی طرف راجع ہے پھر یہ پورا جملہ جملہ لقد لقیت کے لئے مفعول بہ ہے اور یوم العقبہ ظرف (مفعول فیہ) ہے۔ اور معنی یہ ہے یوم عقبہ میں تمہاری قوم سے جو ایذا مجھے پہنچی تھی وہ ان کے دیگر ایذاؤں سے بہت زیادہ سخت تھی اور عقبہ سے وہ مقام مراد ہے جو منیٰ میں ہے۔ کیونکہ آنحضرت ﷺ کا یہ معمول تھا کہ آپ ﷺ حج کے زمانہ میں لوگوں کو اسلام کی دعوت دیتے تھے اور ان کے سامنے خدا کا پیغام رکھتے تھے۔ چنانچہ اس دن بھی جب آپ ﷺ نے عقبہ کے مقام پر جمع لوگوں کے سامنے اسلام پیش کیا تو انہوں نے انکار کیا جو آنحضرت ﷺ پر بہت شاق گزرا یہی مطلب ہے آپ کے قول مبارک اذا عرضت نفسی کا ایک نسخہ میں اذا کے بجائے لفظ اذ ہے اور یہی زیادہ واضح تلفظ ہے۔ علامہ طیبی لکھتے ہیں اذا جو مستقبل کے لئے آتا ہے اس کو اذ کی جگہ رکھا گیا جو ماضی کے لئے موضوع ہے اس فصیح حالت کے استحضار کی غرض سے جو آپ کے ساتھ پیش آئی تھی۔ مطلب یہ ہے کہ جس وقت امان اور اجازت کی غرض سے میں نے اپنے آپ کو عرب کے دستور کے مطابق بنی عبد یالیل کے سامنے پیش کیا۔ علی ابن عبد یالیل ابن کلال: عبد یالیل دال اور لام اول کے کسرہ کے ساتھ۔ ابن کلال کاف کے ضمہ کے ساتھ یہ ان کی کنیت ہے مغازی کی روایت میں تو یہ منقول ہے کہ آنحضرت ﷺ سے عبد یالیل نے خود بات کی تھی۔ اہل انساب کے نزدیک کلال عبد یالیل کا بھائی ہے نہ کہ والد کیونکہ ان کا نسب عبد یالیل بن عمرو بن عمرو ہے اور عبد یالیل کا اصل نام سعود ہے۔ ابن عبد یالیل اہل طائف میں بنو ثقیف کے سرداروں میں سے تھے۔

بعض حضرات کہتے ہیں سن دس ہجری میں پورے وفد کے ساتھ آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر مشرف بالاسلام ہوئے۔ ابن عبد البرؒ نے ان کا نام صحابہ میں ذکر کیا ہے لیکن واقدی نے ان کے متعلق جو کچھ لکھا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ اسلام نہیں لائے۔ واللہ اعلم۔ فلم یجبینی الی ما اردت: یعنی جس وقت میں نے ان سے عہد اور امان لینے کا ارادہ کیا۔ فانطلقت وانا مهموم: یہ جملہ حالیہ ہے اور فعل اور اس کے متعلق کے درمیان بطور جملہ معترضہ واقع ہے اس کا متعلق قول مبارک علی وجهی ہے۔

طیبیؒ لکھتے ہیں اس کا مطلب یہ ہے کہ میں اس صعوبت اور شدت غم کے عالم میں اس طرح حیران پریشان چلا جا رہا تھا کہ تھا یہ بھی معلوم نہیں ہو رہا تھا کہ میں کہاں جا رہا ہوں۔ فلم ...... الثعالب: افاق اور استفاقہ کا معنی بیماری اور نشہ میں افاقہ ہونے کے ہیں۔ القرن: سے مراد پہاڑ ہے یہ مکہ اور طائف کے درمیان ایک پہاڑ کا نام ہے فرفعت راسی میں نے اپنا سر آسمان کی طرف اٹھایا کیونکہ یہی جہت قبلہ دعا اور جہت رجاء تھی۔ فناداني...... قول قومك' وما ردوا عليك اس میں یہ احتمال بھی ہو سکتا ہے کہ جملہ ثانی اول کے لئے تاکید اور بیان ہو کیونکہ یہاں مصدر کی اضافت اپنے ہی فاعل کی طرف ہے۔ فسلم علی: تعظیماً و تکریماً مجھے سلام کیا ان شئت ان اطبق: ہمزہ کے ضمہ اور باء کے کسرہ کے ساتھ (باب افعال) اطبق سے ہے جس کا معنی ہے ایک چیز کو دوسری چیز کے اوپر اس طرح رکھنا کہ جمیع جوانب کو محیط ہو جائے کہ جس طرح رکھی ہوئی تھال زمین پر محیط ہوتی ہے۔ اور مطلب یہ ہے کہ اگر چاہیں تو ان پہاڑوں کو ان پر الٹ دوں۔ علیهم الاخشبین: ایک شارح نے ذکر کیا ہے یہ دو

پہاڑ ہیں جن کی اضافت کبھی مکہ کی طرف کی جاتی ہے اور کبھی منیٰ کی طرف۔ اور دونوں سے ایک ہی مراد ہے فائق میں ہے یہ دونوں پہاڑ مکہ کے قریب ہیں ایک جبل ابوقبیس اور دوسرا جبل احمد ہیں جو کہ بہت اونچا پہاڑ ہے جس کا منہ قعیقان کی جانب ہے (یہ وہ جگہ ہے جہاں جدہ کی میقات ہے جس کو قرن منازل بھی کہتے ہیں) قاموس میں ہے قعیقان زعفران کی طرح ہے۔ یہ مکہ مکرمہ کے قریب ایک پہاڑ کا نام ہے جس کا منہ جبل ابوقبیس کی جانب ہے۔

غزوۂ اُحد میں آنحضرت صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم کا زخمی ہونا

۵۸۴۹ : وَعَنْ اَنَسٍ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كُسِرَتْ رُبَاعِيَتُهٗ يَوْمَ اُحُدٍ وَشُجَّ فِيْ رَاْسِهٖ فَجَعَلَ يَسْلُتُ الدَّمَ عَنْهُ وَيَقُوْلُ كَيْفَ يُفْلِحُ قَوْمٌ شَجُّوْا رَاْسَ نَبِيِّهِمْ وَكَسَرُوْا رَبَاعِيَتَهٗ۔

(رواه مسلم)

اخرجه البخاري في صحيحه ١٧٣/١٠ حديث رقم ٥٧٢٢ ومسلم في صحيحه ١٤١٧/٣ حديث رقم (١٠٤-١٧٩١)، واخرجه الترمذي في ٢١١/٥ حديث رقم ٣٠٠٣ وابن ماجه في السنن ١١٤٧/٢ حديث رقم ٣٤٦٤ واحمد في المسند ٢٨٨/٣۔

ترجمہ: "حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ غزوۂ احد کے دن رسول اللہ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم کا دانت مبارک ٹوٹ گیا اور آپ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم کا سر بھی زخمی ہو گیا تو آپ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم خون پونچھتے جاتے تھے اور فرماتے جاتے تھے کہ وہ قوم کیونکر فلاح پا سکتی ہے جس نے اپنے نبی کا سر زخمی کیا اور اس کے دانت توڑ دیئے"۔ (مسلم)

تشریح: **رباعتیه**: کلمہ رباعیہ راء کے فتحہ اور یاء کی تخفیف کے ساتھ ثمانیۃ کے وزن پر اوپر کے دو دانتوں کو کہا جاتا ہے جو ثنایا اور انیاب کے درمیان ہوتے ہیں۔ اگر راء کے کسرہ کے ساتھ پڑھا جائے تو نیچے کے یہی دو دانت مراد ہوتے ہیں۔ واضح رہے کہ دانتوں کے ٹوٹنے کے یہ معنی نہیں ہیں کہ وہ دانت جڑ سے اکھڑ گیا تھا بلکہ اس کا دائیں جانب کا ایک حصہ ٹوٹ کر علیحدہ ہو گیا تھا۔ **وشج**: لفظ شج شین کے ضمہ اور جیم کی تشدید کے ساتھ۔ معنی ہے آپ کا سر مبارک کو بھی زخمی کر دیا تھا یا تو تاکید اُفرمایا یا شج میں تجرید کی گئی ہے کیونکہ شج میں خود سر کے زخمی ہونے کا معنی پایا جاتا ہے۔

طیبی رحمہ اللہ لکھتے ہیں اس کا تعلق **يجرح في عراقيبها نصلي** کے قبیل سے ہے یعنی اتنا گہرا زخم پہنچا کہ پورا سر اس زخم کے لئے بمنزل ظرف کے ہو گیا تھا ضمناً یہ کہنا چاہ رہا ہے کہ یہ زخم آپ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم کے سر مبارک پر لگا تھا کیونکہ بعض روایات میں پیشانی مبارک کے زخمی ہونے کا ذکر ہے۔ **فجعل يسلت**: لام کلمہ کے ضمہ کے ساتھ (نصر ینصر سے)۔ امام سیوطیؒ نے بخاری شریف کے حاشیہ میں ابن شہاب زہریؒ کے حوالہ سے نقل کیا ہے یوم احد کے موقع پر آنحضرت صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم کے چہرہ انور پر ستر سے زیادہ بار تلوار سے حملہ کیا گیا لیکن ہر بار اللہ تعالیٰ نے ان کے شر سے آپ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم کو محفوظ رکھا شاید آپ کو یہ تکلیف اس لحاظ سے پہنچی کہ احد کے ستر شہداء کے ساتھ آپ کی مشارکت حاصل ہو جائے لیکن اللہ تعالیٰ نے اپنا وعدہ: ﴿**والله يعصمك من الناس**﴾ (المائدہ:٦٧) کے تحت حفاظت فرمائی البتہ کچھ زخم آپ کو ضرور پہنچے جس سے آنحضرت صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم کے دانت مبارک کا کچھ حصہ بھی ٹوٹ کر گرا۔ تاکہ

اجر وثواب حاصل ہو جائے اور بشری اوصاف عجز' ضعف کے مقتضیٰ کے اظہار اور مقام عبودیت کے مناسب اثر سے متاثر ہونے کا امر ظاہر ہو جائے۔ کیونکہ کبریائی کلی عظمت' استغناء' قوت اور قدرت ملائمہ یہ ربوبیت کا خاصہ ہے۔

مسلم کے علاوہ امام ترمذی' ابن ماجہ اور نسائی میں بھی یہ روایت موجود ہے۔

۵۸۵۰ : وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اشْتَدَّ غَضَبُ اللّٰهِ عَلٰى قَوْمٍ فَعَلُوْا بِنَبِيِّهٖ يُشِيْرُ اِلٰى رُبَاعِيَّتِهٖ اِشْتَدَّ غَضَبُ اللّٰهِ عَلٰى رَجُلٍ يَقْتُلُهٗ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِیْ سَبِيْلٍ۔ (متفق علیه)

اخرجه البخاری فی صحیحه ۳۷۲/۷حدیث رقم ۴۰۷۳ومسلم فی صحیحه ۱۴۱۷/۳حدیث رقم (۱۰۶۔۱۷۹۳) واحمد فی المسند ۳۱۷/۲۔

ترجمہ: ''حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے' فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: اس قوم پر اللہ تعالیٰ کا سخت غضب ہوگا جس نے اپنے نبی کے ساتھ ایسا سلوک کیا''۔ (ایسے سلوک سے) آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا اشارہ اپنے دانتوں کی طرف تھا (جن میں ایک دانت کو کفار نے جنگ احد میں شہید کر دیا تھا) اور اس شخص پر بھی اللہ تعالیٰ کا سخت ترین غضب پر ہے جس کو (اللہ کا رسول) اللہ کے راستہ (جہاد) میں قتل کر دے''۔ (بخاری ومسلم)

الفصل الثانی:

وهذا الباب خال عن الفصل الثانی:

اور اس باب میں دوسری فصل نہیں ہے

الفصل الثالث:

۵۸۵۱ :عَنْ يَحْيَى بْنِ اَبِیْ كَثِيْرٍ قَالَ سَاَلْتُ اَبَا سَلَمَةَ بْنِ عَبْدِ الرَّحْمٰنِ عَنْ اَوَّلِ مَا نَزَلَ مِنَ الْقُرْاٰنِ قَالَ يٰۤاَيُّهَا الْمُدَّثِّرُ قُلْتُ يَقُوْلُوْنَ اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ قَالَ اَبُوْ سَلَمَةَ سَاَلْتُ جَابِرًا عَنْ ذٰلِكَ وَقُلْتُ لَهٗ مِثْلَ الَّذِیْ قُلْتَ لِیْ فَقَالَ لِیْ جَابِرٌ لَا اُحَدِّثُكَ اِلَّا بِمَا حَدَّثَنَا رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ جَاوَرْتُ بِحِرَآءَ شَهْرًا فَلَمَّا قَضَيْتُ جِوَارِیْ هَبَطْتُ فَنُوْدِيْتُ عَنْ يَمِيْنِیْ فَلَمْ اَرَ شَيْئًا وَنَظَرْتُ عَنْ شِمَالِیْ فَلَمْ اَرَ شَيْئًا وَنَظَرْتُ عَنْ خَلْفِیْ فَلَمْ اَرَ شَيْئًا فَرَفَعْتُ رَاْسِیْ فَرَاَيْتُ شَيْئًا فَاَتَيْتُ خَدِيْجَةَ فَقُلْتُ دَثِّرُوْنِیْ فَدَثَّرُوْنِیْ وَصَبُّوْا عَلَیَّ مَاءً بَارِدًا فَنَزَلَتْ يٰۤاَيُّهَا الْمُدَّثِّرُ قُمْ فَاَنْذِرْ وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ وَثِيَابَكَ فَطَهِّرْ وَالرُّجْزَ فَاهْجُرْ وَذٰلِكَ قَبْلَ اَنْ تُفْرَضَ الصَّلٰوةُ۔ (متفق علیه)

اخرجه البخاری فی صحیحه ۶۷۶/۸ حدیث رقم ۴۹۲۲ ومسلم فی صحیحه ۱۴۴/۱ حدیث رقم (۲۵۷۔۱۶۱)

واحمد فی المسند ۳/۳۰۶۔

ترجمہ: ''حضرت یحییٰ بن کثیر کہتے ہیں کہ میں نے حضرت ابوسلمہ بن عبدالرحمٰن بن عوف سے (جو اونچے درجہ کے تابعین' مشاہیر علماء اور فقہاء سبعہ میں سے ہیں) پوچھا کہ قرآن کریم کا کون سا حصہ سب سے پہلے نازل ہوا؟ انہوں نے کہا یٰٓاَیُّهَا الْمُدَّثِّرُ میں نے کہا کہ لوگ (یعنی اکثر علماء) تو یہ کہتے ہیں کہ سب سے پہلے اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ نازل ہوئی ہے! حضرت ابوسلمہ نے فرمایا: میں نے حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے اس کے متعلق دریافت کیا تھا (کہ قرآن کا کون سا حصہ سب سے پہلے نازل ہوا ہے؟ تو انہوں نے بھی یہی جواب دیا جو میں نے تمہیں دیا ہے) پھر میں نے بھی ان سے یہی کہا جو تم نے مجھ سے کہا ہے (کہ لوگ تو یہ کہتے ہیں کہ سب سے پہلے (اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ...... اتری ہے) تو انہوں نے مجھ سے فرمایا کہ میں تمہیں وہی کچھ بتا رہا ہوں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں بتائی تھی' آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فرمایا کہ میں ایک مہینہ تک غار حرا میں خلوت گزیں رہا' جب میری خلوت گزینی اور اعتکاف کی مدت پوری ہوئی اور میں پہاڑ سے اترا تو (اچانک میرے کانوں میں آواز آئی کہ) کوئی مجھے مخاطب کر رہا ہے' میں نے دائیں طرف (مڑ کر) دیکھا لیکن مجھے کوئی چیز نظر نہیں آئی بائیں طرف دیکھا تو اِدھر بھی کوئی چیز نظر نہیں آئی' پیچھے کی طرف نظر کی تو اُدھر بھی کوئی دکھائی نہیں دیا' پھر جب میں نے اوپر نظر اٹھائی تو مجھے کچھ نظر آیا یعنی ایک فرشتہ دکھائی دیا' میں اس کو دیکھ سہم گیا اور مارے خوف کے کانپتا ہوا) خدیجہ رضی اللہ عنہا کے پاس آیا اور کہا کہ مجھے کپڑا اڑھا دو مجھے کپڑا اڑھا دو۔ خدیجہ رضی اللہ عنہا نے (فوراً) مجھ کو ایک کپڑا اڑھا دیا اور (میرے حواس بحال کرنے کے لئے) مجھ پر ٹھنڈا پانی ڈالا اس کے بعد یہ آیت نازل ہوئی: یٰٓاَیُّهَا الْمُدَّثِّرُ قُمْ فَاَنْذِرْ وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ وَثِیَابَكَ فَطَهِّرْ وَالرُّجْزَ فَاهْجُرْ (یعنی اے کپڑے اوڑھنے والے اٹھ کھڑے ہو اور اپنے رب کی بڑائی بیان کرو اور اپنے کپڑے کو پاک رکھو اور ناپاکی سے اجتناب کرو) یہ نماز فرض ہونے سے پہلے کا واقعہ ہے''۔ (بخاری و مسلم)

راویٔ حدیث:

یحییٰ بن ابی کثیر: یہ یحییٰ ہیں ابوکثیر کے بیٹے ہیں۔ ان کی کنیت ابونصری یمامی ہے۔ ''بنو طے'' کے آزاد کردہ ہیں۔ دراصل بصرہ کے ہیں۔ پھر یمامہ منتقل ہو گئے۔ انہوں نے حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ کی زیارت کی ہے اور عبداللہ بن ابی قتادہ رضی اللہ عنہ وغیرہ سے حدیث کی سماعت کی۔ ان سے عکرمہ اور اوزاعی وغیرہ نے روایت کی۔

تشریح: جملہ یشیر الی رباعیته۔ کلمہ رسول اللہ سے حال ہے اس کا عامل لفظ قال اور کلمہ فعلوا کے مفعول کے لئے بطور تفسیر کے واقع ہوا ہے۔ (اشتد...... فی سبیل اللّٰہ) جملہ اشتد اور یقتلہ کے درمیان حرف عطف کو ذکر نہ کرنے کی وجہ شاید یہ ہے کہ اس بات کی طرف اشارہ کر رہے ہیں کہ یہ دو مستقل حدیثیں ہیں جن کو راوی نے جمع کر کے ایک بنایا ہے اس کی دلیل یہ ہے کہ جملہ اشتد غضب اللّٰہ مکرر آیا ہے یا یہ بتلانے کے لئے مکرر لایا ہے کہ دونوں کاموں کی وجہ سے خدا کا غضب یقیناً نازل ہوتا ہے اور لفظ او اس لئے ذکر نہیں کیا تاکہ راوی کی جانب سے شک کے اظہار کا وہم نہ ہو جائے۔

طیبی رحمہ اللہ لکھتے ہیں لفظ رسول اللہ سے یا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خود اپنی ذات مراد لی یا پھر ہر پیغمبر مراد ہے۔ اسم ضمیر کی جگہ اسم ظاہر ذکر فرما کر اس بات کی طرف اشارہ فرمایا کہ رحمۃ اللعالمین کے ہاتھوں جو شخص قتل ہو جائے وہ سب سے بڑا بدبخت ہے

۔ کیونکہ یہ اس بات کا سب سے بڑا ثبوت ہوتا ہے کہ وہ شخص کسی بھی صورت میں معافی کا قابل اور کسی بھی طرح کی رعایت کے لائق نہیں یہ بد بخت جس کو اللہ کے رسول نے خود قتل فرمایا ابی بن خلف ہے۔

امام النوویؒ فرماتے ہیں **فی سبیل اللہ** یعنی جہاد کی قید احتراز ہے حدود قصاص میں مارے جانے والے شخص سے کیونکہ ایسا شخص اس وعید میں داخل نہیں۔ البتہ جو شخص حالت جہاد میں آپ کے ہاتھوں مارا گیا تھا وہ اس وعید میں اس لئے شامل ہے کہ اس کا ارادہ آنحضرت کو مارنے کا تھا۔

سب سے پہلے کون سی سورت نازل ہوئی۔ (**عن اول ما نزل...... یاایھاالمدثر**) بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ روایت حدیث کے وقت نسیان کے سبب راوی کے ذہن میں مسئلہ کی اصل نوعیت پوری طرح محفوظ نہیں رہی تھی جس کی وجہ سے انہوں نے یہ حدیث اس طرح بیان کی کہ گویا یہ حدیث اس بات کی دلیل ہے کہ سب سے پہلے وحی یاایھاالمدثر...... ہے حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ یاایھاالمدثر کی اولیت اضافی ہے نہ کی حقیقی اور وحی کے بعد اس کا نزول ہوا جس کی تفصیل ام المومنین عائشہ رضی اللہ عنہا کی حدیث میں پہلے گزر چکی ہے یا یاایھاالمدثر کی اولیت مخصوص ہے انداز کے ساتھ یا یہ کہ باعتبار رسالت کے یہ پہلی وحی ہے اور اقراء کے ساتھ نازل ہونے والی وحی ثبوت نبوت کے اعتبار سے پہلے وحی تھی واللہ اعلم۔

جو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمارے سامنے ارشاد فرمائی تھی اس میں میں نے ذرا بھی تبدیلی نہیں کر رہا ہوں کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں اس طرح بیان فرمایا (**قال جاورت بحراء شھرا**) کہ میں ایک مہینہ تک غار حرا میں خلوت گزین اور معتکف تھا اس حدیث سے یہ معلوم ہوا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ایام فترہ کی مدت ایک ماہ تھی۔ (**فلما قضیت جواری**) جیم کی کسرہ کے ساتھ خولت گزینی اور اعتکاف مراد ہے (**ھبطت**) نزلت (نازل ہوئی) کے معنی میں ہے اس جملہ میں یہ اشارہ موجود ہے کہ نزول وحی کے اعتبار سے یہ دوسرا دور تھا اس لئے کہ نزول قراءت کا سلسلہ غار حرا میں سورہ علق کے ذریعہ سے شروع ہو چکا تھا جس کی تفصیل گزر چکی ہے۔ (**فنودیت...... شیئا**) اس کے متعلق حضرت جابرؓ کی روایت بھی تفصیلا گزر چکی ہے اس میں انہوں نے یہ بیان کیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے انقطاع وحی کے بارے میں بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ میں چلا جا رہا تھا کہ اچانک میں نے آسمان سے آئی ہوئی ایک آواز سنی اوپر نظر اٹھائی تو کیا دیکھتا ہوں وہی فرشتہ ہے جو میرے پاس کوہ حراء میں آیا تھا۔

اس حدیث سے بھی صراحتاً یہی بات ثابت ہوتی ہے کہ یہاں اس حدیث میں حضرت جابرؓ نے اضافی اولویت مراد لی ہے (**فاتیت خدیجةؓ...... باردا**) ٹھنڈا پانی شاید اس لئے بہا گیا تا کہ حواس بحال ہو جائیں اور غشی طاری نہ ہو یہ روایت اس ماقبل والی روایت کے خلاف نہیں جس میں یہ تذکرہ تھا کہ آپ کو خوف کی وجہ سے (سردی لگی) کانپنے لگے کیونکہ خوف کی وجہ سے جو کپکپی طاری ہوتی ہے اور سردی لگتی ہے اس میں ٹھنڈک پہنچانا مضر نہیں ہوتا۔

طیبی رحمہ اللہ لکھتے ہیں حضرت جابرؓ کا قول **لا احدثك**...... شاید سائل کا سوال کامل سورت کے نازل ہونے کی نسبت تھا اس لئے حضرت جابرؓ نے خبر دیتے ہوئے فرمایا کہ یاایھاالمدثر پہلی نازل ہونے والی سورۃ ہے لیکن یہ بات مطلوب پر دلالت نہیں کر رہی ہے کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے آخری کلمات مبارک **فقلت دثرونی فنزلت یاایھاالمدثر** اس بات کا صریح قرینہ ہے کہ

یاایہاالمدثر فترۃ وحی کے بعد نازل ہونے والی پہلی آیات ہیں نہ کہ مطلقاً پہلی نازل ہونے والی وحی کیونکہ ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی تفصلاً روایت گزرچکی ہے کہ پہلی نازل ہونے والی وحی اقرا باسم ربک الذی خلق ہے اسی وجہ سے بعض محققین کہتے ہیں جن لوگوں نے یہ کہا ہے کہ پہلی نازل ہونیوالی وحی یاایہاالمدثر ہے یہ قول ضعیف ہے صحیح یہ ہے کہ عمومی اعتبار سے پہلی نازل ہونے والی وحی اقرا باسم ربک الذی خلق ہے چنانچہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی حدیث میں اس کی صراحتاً وضاحت موجود ہے ہاں یاایہاالمدثر کا نزول فترۃ وحی کے بعد سب سے پہلے ہوا ہے اس کی وضاحت زہریؒ کی اس روایت میں موجود ہے جوانہوں نے حضرت جابرؓ سے کی ہے اس کی دلیل یہ ہے کہ راوی کہتا ہے وھو یحدث عن فترة الوحی......اور آخر میں کہتا فانزل اللہ یاایھاالمدثر تو ایہاالمدثر کے متعلق جو بات ہورہی ہے وہ فترۃ وحی کے بعد نازل ہونے کے اعتبار سے نہ کہ مطلق وحی کے اعتبار سے۔

امام نوویؒ کہتے ہیں بعض مفسرین نے لکھا ہے کہ سب سے پہلے سورۃ فاتحہ نازل ہوئی لیکن یہ بات غلط ہے۔ ملا علی قاریؒ لکھتے ہیں امام نوویؒ کا مطلقاً یوں کہنا صحیح نہیں کیونکہ اس میں تین طرح سے تاویل ممکن ہے۔ یا تو مکمل سورت نازل ہونے کے اعتبار سورۃ فاتحہ پہلی صورت کہا گیا ہے۔ یا مدینہ منورہ تشریف لانے کے بعد سب سے پہلی نازل ہونے والی سورۃ کے اعتبار سے پہلی کہا گیا ہے۔ یا اقرا اور سورہ مدثر کے بعد اترنے والی پہلی سورت کے اعتبار سے فاتحہ کو اول کہا گیا ہے۔ تو مفسرین نے ممکن ہے سورۃ فاتحہ کو پہلی نازل ہونے والی سورۃ ان تین وجوں کی وجہ سے کہا ہو۔ اور اس میں بھی اولویت اضافی مراد لینا درست ہے۔ اس لئے مفسرینؒ کے قول پر بطلان کا حکم لگانا غیر مناسب ہے اس کی تائید آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا قول مبارک (و ذلك) (یعنی سورہ مدثر کا اترنا) قبل ان تفرض الصلوٰۃ سے بھی ہوتا ہے کیونکہ نماز کی صحت واتمام کا دارومدار سورہ فاتحہ پر تھی جو کہ اب تک نازل نہیں ہوئی تھی۔ واللہ اعلم۔

بَابُ عَلَامَاتِ النُّبُوَّةِ

نبوت کی علامتوں کا بیان

علامات علامت کی جمع ہے علامت اصل میں مطلق نشانی اور خاص طور پر اس نشان کو کہتے ہیں جو...... کہ سڑکوں پر قائم کیا جاتا ہے جس کا مقصد مسافروں اور راہ گیروں کو ان کے راستے اور منزل کا پتہ بتانا ہوتا ہے۔ اسی قبیل کے دو اور لفظ معلم اور علم کے بھی یہی معنی ہیں۔ یہاں علامات سے مراد وہ نشانیاں ہیں جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی پیغمبری کو ظاہر و ثابت کرتی ہیں اور آپ کی ذاتی و اخلاقی صفات و خصوصیات آپ کے فضائل و شمائل اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے افعال و احوال پر اس طرح دلالت کرتی ہیں کہ عقلمند اور سمجھدار شخص ان کے ذریعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت و رسالت کا یقین حاصل کر سکتا ہے۔ اسی طرح سابقہ آسمانی کتابوں میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی جن صفات و خصوصیات اور احوال کا ذکر ہے وہ بھی اسی قبیل سے ہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو جتنے معجزات عطا ہوئے وہ سب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت و رسالت کی علامتوں میں سے ہیں۔

بچپن میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے شق صدر کا واقعہ

۵۸۵۲ : وَعَنْ اَنَسٍ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَتَاهُ جِبْرِئِيْلُ وَهُوَ يَلْعَبُ مَعَهُ الْغِلْمَانُ فَاَخَذَهُ فَصَرَعَهُ فَشَقَّ عَنْ قَلْبِهٖ فَاسْتَخْرَجَ مِنْهُ عَلَقَةً فَقَالَ هٰذَا حَظُّ الشَّيْطَانِ مِنْكَ ثُمَّ غَسَلَهُ فِي طَسْتٍ مِّنْ مَكَانِهٖ وَجَاءَ ذَهَبٍ بِمَاءِ زَمْزَمَ ثُمَّ لَاَمَهُ وَاَعَادَهُ فِيْ وَجَآءَ الْغِلْمَانُ يَسْعَوْنَ اِلٰى اُمِّهٖ يَعْنِيْ ظِئْرِهٖ فَقَالُوْا اَنَّ مُحَمَّدٌ قَدْ قُتِلَ فَاسْتَقْبَلُوْهُ وَهُوَ مُنْتَقِعُ اللَّوْنِ قَالَ اَنَسٌ فَكُنْتُ اَرٰى اَثَرَا لْمَخِيْطِ فِيْ صَدْرِهٖ۔ (رواہ مسلم)

اخرجه مسلم في صحيحه ١٤٧/١ حديث رقم (٢١١-١٦٢) واخرجه الترمذي في السنن ٥٥٣/٥ حديث رقم ٣٦٢٤۔

ترجمہ: ''حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم (اپنے بچپن میں جب دایہ حلیمہ کے پاس تھے تو اس وقت کا واقعہ ہے کہ ایک دن آپ صلی اللہ علیہ وسلم بچوں کے ساتھ کھیل رہے تھے کہ اچانک جبرئیل علیہ السلام آئے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو پکڑ کر لٹایا' اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا دِل چاک کر کے اس میں سے بستہ خون کا ایک سیاہ ٹکڑا نکال لیا اور کہا کہ یہ شیطان کا حصہ ہے (اگر یہ

ٹکڑا تمہارے جسم میں یوں ہی رہنے دیا جاتا تو شیطان کو اس کے ذریعہ تم پر قابو پانے کا موقع ملتا رہتا) اس کے بعد انہوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے دل کو ایک سونے کے طشت میں زمزم کے پانی سے دھویا اور پھر دل کو اس کی جگہ رکھ کر سینۂ مبارک کو اوپر سے برابر کر دیا۔ (وہ) بچے (جو اس وقت آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ساتھ یہ پورا منظر دیکھ کر گھبرا گئے اور) بھاگے ہوئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی والدہ یعنی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی دایہ (حلیمہؓ) کے پاس آئے اور کہا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم قتل کر دیئے گئے (دایہ حلیمہ کے گھر اور پڑوس کے) لوگ (یہ سنتے ہی) آپ کے پاس پہنچے دیکھا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا رنگ متغیر ہو رہا تھا۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ (یہ روایت بیان کر کے) کہتے تھے کہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سینۂ مبارک پر سلائی کا نشان دیکھا کرتا تھا"۔ (مسلم)

تشریح: (فاستخرجه منه علقة) جامع الاصول میں عن قلبه کے بعد واستخرجه کا لفظ بھی منقول ہے پوری عبارت یوں ہے: فشق عن قلبه واستخرجه فاستخرج منه علقة یعنی پھر انہوں نے آپ کے (سینہ کو) دل کے قریب سے چاک کیا دل کو نکالا اور پھر دل میں سے بستہ خون کا ایک سیاہ ٹکڑا نکال لیا جو برائیوں اور گناہوں کی جڑ ہوتا ہے)۔ (ثم غسله) اس میں تین احتمال ممکن ہیں۔ یا تو آپ کے دل کو دھویا تھا یا جوف کو دھویا تھا یا مقام شق کو دھویا تھا۔ (في طست) طاء کے فتحہ و کسرہ اور سین مہملہ کے ساتھ نیز سین کے بعد آخر میں تاء مفتوحہ کے ساتھ بھی پڑھا جاتا ہے۔ شرح مشارق میں ابن الملکؒ لکھتے ہیں کلمہ طست طاء کے فتحہ کے ساتھ ہے اگرچہ اس میں کئی لغات ہیں طست یعنی طاء کے فتحہ کے ساتھ۔ طست یعنی طاء کی کسرہ کے ساتھ۔ طس طاء کے فتحہ بغیر تاء کے طس۔ طاء کی کسرہ کے ساتھ طسۃ طاء کے فتحہ اور آخر میں تاء مفتوحہ (مدورہ) طسہ طاء مکسورہ اور آخر میں تاء مفتوحہ کے ساتھ۔ (من ذهب) سونے کی لگن آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت و کرامت کے اظہار کے لئے تھا۔ جہاں تک سونے کے استعمال کی ممانعت کا سوال ہے اس کا جواب یہ ہے یہ تمام واقعہ جو اس وقت پیش آیا وہ اس دنیا سے تعلق نہیں رکھتا بلکہ عالم غیب اور دوسرے جہاں کے احوال سے تعلق رکھتا ہے۔ نیز سونے کی لگن کا استعمال آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے نہیں ہوا تھا بلکہ فرشتے نے کیا تھا جو احکام و مسائل میں ہماری طرح مکلف نہیں تھا۔ ایک بات یہ بھی کہی جا سکتی ہے کہ سونے کی لگن کے استعمال کا یہ واقعہ اس وقت کا ہے جب احکام و مسائل کا نفاذ ہی نہیں ہوا تھا اور شرعی طور پر کسی چیز کی حلت و حرمت نازل اور معلوم نہیں ہوئی تھی۔ (بماء زمزم) سب سے افضل پانی کون سا ہے؟ اس کے متعلق کئی اقوال ہیں بعض حضرات کہتے ہیں آب زم زم سب پانیوں سے افضل و برتر ہے یہاں تک کہ جنت کے پانی کوثر پر بھی فضیلت و برتری رکھتا ہے کیونکہ اگر کوئی پانی زم زم کے پانی سے افضل ہوتا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے قلب مبارک کو بجائے آب زم زم کے اسی پانی سے دھویا جاتا۔ تاہم اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ پانی جو بطور معجزہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی انگلیوں سے ابل کر نکلا تھا تمام پانیوں پر یہاں تک کہ زمزم پر بھی فضیلت و برتری رکھتا ہے۔ کیونکہ وہ پانی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دست مبارک کے اثر سے نکلا تھا جبکہ زم زم حضرت اسمٰعیل کے پیروں کے اثر سے برآمد ہوا ہے۔ بہرکیف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھوں کے اثر سے پہنچنے والا اعجاز زیادہ ابلغ ہے۔ بعض حضرات فرماتے ہیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے فم (منہ) مبارک سے نکلنے والا پانی سب سے کامل ہے اگرچہ غیر پانی سے کیوں نہ ملا گیا ہو۔ عارف بن مارض نے اپنے شعر میں شاید اسی کی طرف اشارہ فرمایا ہے شعر

علیك بها صرفا وان شئت مزجها

فعدلك عن ظلم الحبيب هو الظلم

ثم لأمه: پہلے لام ہے اس کے بعد ہمزہ (واعادہ) ضمیر قلب کی طرف راجع ہے کیونکہ جامع الاصول کی سابقہ روایت اسی پر دلالت کر رہی ہے۔

(**في مكانه**) واعادہ میں واؤ مطلق جمع کے لئے ہے یہ اس بات کے منافی نہیں کہ پہلے دل کو اپنی جگہ رکھنے کے بعد پھر زخم کو بھر دیا گیا ہو تورپشتیؒ فرماتے ہیں (**لأمت الجرح والصدع**) اس وقت کہا جاتا ہے جب زخم کی جگہ کو باندھ کر برابر کر دیا جائے اور مراد یہ ہے کہ برابر کر کے ٹھیک اسی طرح بھر دیا گیا جیسے پہلے تھا۔ (**وجاء الغلمان يسعون الى امة يعني ظئره**) آنحضرت ﷺ کی رضائی ماں حضرت حلیمہ سعدیہ کے پاس آئے۔ (**فقالوا: ان محمدا قد قتل**) شق بطن کے بعد حیات کا تصور خارق عادت اور علامات نبوت میں سے ہے۔ (**فاستقلبوه**) یہ سن کے پورے گھر والے آپ کی طرف دوڑے۔ کیا دیکھتے ہیں کہ آپ تشریف لا رہے ہیں (**وهو منتقع اللون**) اور آپ کے چہرہ کا رنگ بدلا ہوا تھا قاموس میں ہے **انتقع لونه** صیغہ مجہول کے ساتھ اس وقت استعمال ہوتا ہے جب چہرہ کا رنگ متغیر ہو جائے۔

تورپشتیؒ فرماتے ہیں **انتقع لونه** اس وقت کہا جاتا ہے جب خوف اور غم کی وجہ سے چہرہ کا رنگ بدل جائے اس کے لئے میم کے ساتھ امتقع بھی استعمال ہوتا ہے یہ حدیث اور اسی طرح دوسری حدیثیں اس قبیل سے تعلق رکھتی ہیں جن کو جوں کا توں تسلیم کرنا واجب ہے اور بطریق مجاز تاویل وتوجیہہ کے ذریعہ ان کے ظاہری معانی ومفہوم سے اعراض کرنا نہ تو جائز ہے اور نہ اس کی کچھ ضرورت ہے۔ کیونکہ ان حدیثوں میں جو کچھ بیان کیا گیا ہے وہ انسانی عقل وفہم سے کتنا ہی ماوراء کیوں نہ ہو اس کے حق اور سچ ہونے کے لئے یہی بات کافی ہے کہ اس کا تعلق قادر مطلق کی قدرت کے ظہور سے ہے اور یہ وہ باتیں ہیں جن کی خبر صادق ومصدوق ﷺ نے دی ہے۔

شق صدر کی حکمت کے متعلق جو کچھ کہا گیا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ کے سینہ مبارک کو چاک کر کے قلب مبارک کو صاف کرنے میں قدرت کی یہ حکمت کارفرما تھی کہ آپ ﷺ کا باطن اس طرح مجلی و پاکیزہ اور آپ کا قلب مبارک اس قدر لطیف وروشن ہو جائے کہ وحی الٰہی کا نور جذب کرنے میں کوئی چیز رکاوٹ نہ بنے۔ اور منصب رسالت کا بار اٹھانے کے لئے قلب ودماغ پہلے سے تیار رہے۔ نفسانی وسوسوں کا آپ ﷺ میں کہیں سے گزر نہ ہو اور شیطان آپ ﷺ پر غلبہ حاصل کرنے میں بالکل مایوس اور نامراد ہو جائے۔ جیسے حضرت جبرائیل علیہ السلام کے الفاظ **هذا حظ الشيطان منك** اس طرف اشارہ کرتے ہیں۔ (**قال انس...... المخيط**) میم کے کسرہ کے ساتھ۔ (**في صدره**) حضرت انسؓ اس بات کی طرف اشارہ فرما رہے ہیں۔ کہ شق صدر کا یہ واقعہ حسی تھا نہ کہ معنوی اس بات میں علماء کا اختلاف ہے کہ شق صدر کا یہ معاملہ صرف آنحضرت ﷺ کی خصوصیت ہے یا کہ بقیہ انبیاء علیہم السلام کے ساتھ بھی آتا رہا۔ آنحضرت ﷺ کے ساتھ شق صدر کا واقعہ کئی مرتبہ پیش آیا ایک مرتبہ تو بچپن میں جب آپ ﷺ دایہ حضرت حلیمہ کے پاس تھے جس کا ذکر اس حدیث میں ہے دوسری مرتبہ دس سال کی عمر میں تیسری مرتبہ ظہور نبوت کے وقت چوتھی مرتبہ شب معراج کے موقعہ پر کہ جس وقت حضرت جبرائیل آپ کو لینے کے لئے آئے تھے۔ نسائی میں بھی اسی طرح ہے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو مکہ کے پتھر بھی پہچانتے تھے

۵۸۵۳ : وَعَنْ جَابِرِ بْنِ سَمُرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنِّي لَاَعْرِفُ حَجَرًا بِمَكَّةَ كَانَ يُسَلِّمُ عَلَيَّ قَبْلَ اَنْ اُبْعَثَ اِنِّي لَاَعْرِفُهُ الْاٰنَ (رواه مسلم)

اخرجه مسلم في صحيحه ١٧٨٢/٤ حديث رقم (٢-٢٢٧٧) واخرجه الترمذي في السنن ٥٥٣/٥ حديث رقم ٣٦٢٤ واخرجه الدارمي ٢٤/١ حديث رقم ٢٠۔

ترجمہ: ''حضرت جابر بن سمرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے' فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''میں اس پتھر کو پہچانتا ہوں جو مکہ میں قبل از بعث مجھے سلام کیا کرتا تھا' میں اب بھی اس کو پہچانتا ہوں''۔ (مسلم)

تشریح: (وعن جابر...... علي) یعنی اس پتھر سے یوں آواز آتی تھی ۔السلام عليك يا نبي الله اے اللہ کے نبی السلام علیکم ۔ جیسے کہ ایک روایت میں بھی وارد ہوا ہے (قبل ان ابعث) بعض محدثین نے کہا ہے کہ اس پتھر سے مراد حجر اسود ہے الشفاء کے کچھ حاشیوں میں بھی اس طرح ہے اور بعض حضرات نے کہا ہے کہ اس سے مراد وہ پتھر ہے جو زقاق الحجر کے نام سے مشہور ہے اور وہ اب تک مکہ میں موجود ہے مسجد حرام اور حضرت خدیجہؓ کے گھر کے درمیان واقع ہے۔

ایک روایت حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے بھی منقول ہے ام المومنین بیان کرتی ہے کہ رسول کریمؐ نے مجھ سے فرمایا جب حضرت جبرائیل میرے پاس رسالت لے کر آئے اور مجھے نبوت و رسالت کے منصب پر فائز کر دیا گیا تو اس کے بعد جب بھی میں کسی پتھر یا درست کے پاس سے گزرتا وہ کہتا: السلام عليك يارسو ل الله اس میں اشارہ ہے اس بات کی طرف کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم تمام مخلوق کی طرف مبعوث ہوئے ہیں حضرت ملا علی قاری لکھتے ہیں میں نے اپنے شیخ جمال الدین مکبری کے قول خليفتك على كافة خليقتك کی شرح تحت اس کی پوری تفصیل بیان کی ہے۔ رواہ مسلم امام احمدؒ اور ترمذیؒ نے بھی اپنی کتابوں میں اسی طرح نقل کیا ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا شق قمر کا معجزہ

۵۸۵۴ : وَعَنْ اَنَسٍ قَالَ اِنَّ اَهْلَ مَكَّةَ سَاَلُوْا رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَنْ يُّرِيَهُمْ اٰيَةً فَاَرَاهُمُ الْقَمَرَ شِقَّتَيْنِ حَتّٰى رَاَوْحِرَآءً بَيْنَهُمَا۔ (متفق عليه)

اخرجه البخاري في صحيحه ٦٣١/٦ حديث رقم ٣٦٣٧ ومسلم في صحيحه ٢١٥٩/٤ حديث رقم (٤٦-٢٨٠٢) واخرجه الترمذي في السنن ٥٥٣/٥ حديث رقم ٣٦٢٤ واحمد في المسند ٢٠٧/٣۔

ترجمہ: ''حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے' فرماتے ہیں کہ اہل مکہ نے (جمع ہو کر) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مطالبہ کیا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے دست مبارک کے اشارہ سے چاند کے دو ٹکڑے کر کے دکھا دیئے' یہاں تک کہ انہوں نے حراء ... (بخاری و مسلم)

تشریح: (فأراهم القمر شقتين) لفظ شقتین شین کی کسرہ اور قاف کی تشدید کے ساتھ۔

۵۸۵۵ : وَعَنِ ابْنِ مَسْعُوْدٍ قَالَ انْشَقَّ الْقَمَرُ عَلٰى عَهْدِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِرْقَتَيْنِ فِرْقَةٌ فَوْقَ الْجَبَلِ وَفِرْقَةٌ دُوْنَهٗ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِشْهَدُوْا۔ (متفق عليه)

اخرجه البخاري في صحيحه٦٣١/٦حديث رقم ٣٦٣٦ومسلم في صحيحه٢١٥٨/٤حديث رقم (٤٤-٢٨٠٠) واحمد في المسند ٣٧٧/١۔

ترجمہ: ''حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے' فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں چاند اس طرح دو ٹکڑے ہو گیا کہ ایک ٹکڑا پہاڑ کے اوپر کی جانب تھا اور دوسرا نیچے کی طرف۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے (کافروں کی طلب پر یہ معجزہ دکھا کر ان سے) فرمایا کہ میری نبوت یا میرے معجزہ کی گواہی دو''۔ (بخاری ومسلم)

تشریح: (فرقتین) جدا جدا دو ٹکڑوں کے معنی میں ہے (فقال رسول الله ﷺ اشهدوا) یعنی میری نبوت یا معجزہ کی شہادت دو۔ بعض حضرات نے ایک معنی یہ بھی لکھا ہے کہ آ ؤ اور اس معجزہ کو دیکھو۔ اس معنی کے اعتبار سے اشھدو اکوشہادت سے مشتق مانا جائے گا اور پہلے معنی کے اعتبار سے اشھدو اکوشہود سے مشتق مانا جائے گا۔ علامہ زجاج فرماتے ہیں بعض لوگوں نے ﴿اقتربت الساعة وانشق القمر﴾ سے مراد تمام جمہور مفسرین کے قول سے عدول کرتے ہوئے یہ کہا ہے کہ یہاں انشقاق قمر سے مراد وہ انشقاق ہے جو قیامت کے دن واقع ہوگا۔ لیکن ان کی یہ بات صحیح نہیں ہے بلکہ آیت مبارکہ میں وہ شق قمر مراد ہے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے معجزہ کے طور پر واقع ہوا کیونکہ اس کی واضح دلیل خود آیت مبارکہ کے الفاظ : ﴿ان یروا ایة یعرضوا ویقولوا سحر﴾ مستمر ہیں۔

اس سے قیامت کا انشقاق کیسے مراد ہو سکتا ہے؟ کیونکہ اللہ تعالیٰ کا قول سحر مستمر اس بات کا قرینہ ہے کہ کفار قریش نے اس سے قبل بھی آپ کے لئے معجزات اور نشانیاں دیکھ رکھی تھیں اب یہ جو معجزہ دیکھا بہت ہی خارق عادت تھا اس لئے سحر مستمر کے الفاظ کے ساتھ جھٹلایا۔

امام فخر الدین رازیؒ لکھتے ہیں:

بعض منکرین صداقت ایک اعتراض کرتے ہیں کہ چاند میں اتنا زبردست تغیر ہو جانا کہ وہ ٹکڑوں میں بٹ گیا کوئی معمولی نہیں تھی اگر حقیقت میں ایسا ہوا تھا تو اس کا مشاہدہ صرف اہل مکہ تک محدود نہ رہتا بلکہ اس کرشمہ کو تمام اہل زمین دیکھتے اور بلا تفریق مذہب وملت تمام مؤرخین تواتر کے ساتھ اس کا تذکرہ کرتے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ جہاں تک تاریخ میں اس واقعہ کے ذکر کا تعلق ہے تو اسلامی تاریخ وسیر کی کتابوں میں اس واقعہ کا ذکر تواتر کے ساتھ موجود ہے۔ گو اسلام مخالف اور دین بیزار لوگ اس سے انکار کریں۔ یا اس کا جواب یہ ہے اول تو اس معجزہ کا وقوع کچھ خاص لوگوں کے مطالبہ پر ہوا تھا اور ان ہی کو یہ کرشمہ دکھانا اور لا جواب کرنا مقصود تھا علاوہ ازیں کو یہ کرشمہ دکھانا اور لا جواب کرنا مقصود تھا علاوہ ازیں...... کے وقت کا واقعہ ہے جو ایک لمحہ کے لئے تھا۔ دوسرے یہ کہ اختلاف مطالع کی بناء پر ممکن ہی نہیں ہو سکتا کہ چاند ایک ہی وقت میں ایک مطلع پر دنیا کے تمام خطوں میں نظر آئے اس لئے اس معجز ے وقوع ~~کے وقت کا~~ چاند دنیا کے تمام خطوں میں سے کچھ کو نظر آیا اور کچھ کو نہیں جیسا کہ چاند گرہن

ہوتا ہے کہ کچھ خطوں میں نظر آتا ہے کچھ میں نظر نہیں آتا۔ ہماری سب سے بڑی دلیل قرآن کریم ہے جو سب سے اولیٰ اور اقویٰ شاہد ہے اور اس کے واقع ہونے میں عقلاً بھی کوئی شک نہیں ہے اس کی خبر صادق مصدوق ﷺ نے بھی دی ہے۔ جس کے حقیقت پر ایمان لانا واجب ہے باقی امتناع الخرق والالتیام کی باتیں مطعون لوگوں کی باتیں ہیں شرح مسلم میں امام نوویؒ نے بعض حضرات کے حوالے سے یہ جو لکھا ہے کہ شق قمر کا واقعہ رات کو پیش آیا کہ اس وقت اکثر لوگ نیند کی وجہ سے غافل تھے گھروں کے دروازے بند تھے اور لوگ میں چھپے ہوئے سو رہے تھے ان کو کیا نظر آتا اس وقت کون آسمان میں ہونے والے واقعات کا سوچتا اور دیکھتا۔

شرح السنہ میں ہے حضرت انسؓ کی حکایت کے مطابق اس معجزہ کا وقوع کچھ خاص لوگوں (یعنی اہل مکہ) کے مطالبہ پر ہوا تھا اور یہ معجزہ رات کے وقت ان کو دکھلایا گیا۔ حال یہ تھا کہ اکثر لوگ اس وقت اپنے شہری اور صحرائی گھروں میں یا تو محو خواب تھے یا داخلی امور میں مشغول تھے۔ ساتھ یہ بات بھی ملحوظ رہے کہ یہ معجزہ ایک لمحہ کے لئے تھا ظاہر ہے کہ ایسے میں جب کہ اکثر لوگ محو خواب ہوں اس لمحاتی کرشمہ کا عام مشاہدہ کیسے ممکن تھا دوسرے یہ کہ اختلاف مطالع کی بنا پر یہ ممکن ہی نہیں ہوسکتا کہ چاند ایک ہی وقت میں ایک مطلع پر دنیا کے تمام خطوں میں نظر آئے اس لئے اس معجزہ کے وقوع کے وقت کا چاند کچھ خطوں کو نظر آیا۔ کچھ کو نہیں آیا جیسے خسوف کے وقت چاند گرہن کچھ حصوں میں نظر آتا ہے کچھ میں نہیں آتا۔ علاوہ ازیں اس معجزہ کو کچھ لمحوں کے لئے ایک مخصوص قوم کو دکھانے میں بھی خاص حکمت تھی کہ لوگ انکار کی صورت میں ہلاک نہ ہو جائیں۔ کیونکہ اللہ کی سنت ہے جب کسی قوم کے ہر خاص و عام لوگ ایسا کوئی معجزہ مانگتے جس کا تعلق حس سے ہوتا معجزہ دیکھنے کے بعد منکر ہو جائیں تو اللہ تعالیٰ پوری قوم کو ہلاک کر دیتے ہیں۔ چنانچہ ماقبل کی قوموں میں اس کی بے شمار مثالیں پائی جاتی ہیں جیسے قوم ثمود وقوم وغیرہ۔

قوم عیسیٰ علیہ السلام نے جب فائدہ مانگا تو اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: ﴿انی منزلها علیکم فمن یکفر بعد منکم فانی اعذبه عذابا لا اعذبه احدا من العالمین﴾ (المائدہ ۱۱۵) ترجمہ (حق تعالیٰ نے ارشاد فرمایا) میں وہ کھانہ تم لوگوں پر نازل کرنے والا ہوں پھر جو شخص تم میں سے اس کے بعد ناحق شناسی کرے گا تو میں اس کو ایسی سزا دوں گا کہ وہ سزا جہاں والوں میں سے کسی کو نہ دوں گا۔

(ان لوگوں نے کھانا کھانے کے بعد جب ذخیرہ اندوزی اور نافرمانی کی تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی بدعاء سے خنزیر بن گئے) خلاصہ کلام یہ ہے کہ اللہ نے اس خاص حکمت کے تحت معجزہ شق القمر عام لوگوں کو نہیں دکھایا واللہ اعلم۔

ملا علی قاریؒ لکھتے ہیں اس نفس قصہ میں ایک بلیغ اشارہ موجود ہے۔ وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ نے خاص حکمت کے تحت اہل حجاز میں سے صرف ان لوگوں کو یہ معجزہ دکھایا جو حرا کے سامنے کی جانب تھے حتیٰ کہ پہاڑ کے دوسری جانب کے جو لوگ تھے ان کو یہ معجزہ نہیں دکھایا۔ اس لئے کہ معجزہ کے لئے یہ شرط نہیں کہ جب بھی وہ دکھایا جائے تو تمام لوگوں کو دکھائی دے باوجود اختلاف مطالع کے۔ بلکہ معجزات میں عام اصول یہ ہے کہ حسب موقع اور نبی کی ضرورت کے مطابق ظہور پذیر ہوتا ہے۔ حضرت صالح علیہ السلام کو مخصوص ناقہ کا معجزہ عطا ہوا تھا جو کہ ایک مخصوص قوم کے مطالبہ پر حق ثابت کرنے کے لئے اللہ تعالیٰ نے آپ کو عطا فرمایا اس سے یہ مستلزم نہیں آتا ہے کہ اس کا ظہور عام ہو ورنہ وہ معجزہ معجزہ نہیں کہلائے گا۔

ابوجہل کے سامنے خندق آجانے کا واقعہ

۵۸۵۶ : وَعَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ اَبُوْ جَهْلٍ هَلْ يُعَفِّرُ مُحَمَّدٌ وَجْهَهٗ بَيْنَ اَظْهُرِكُمْ فَقِيْلَ نَعَمْ فَقَالَ وَاللَّاتِ وَالْعُزّٰى لَئِنْ رَاَيْتُهٗ يَفْعَلُ ذٰلِكَ لَاَ طَاَنَّ عَلٰى رَقَبَتِهٖ فَاَتٰى رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَهُوَ يُصَلِّیْ زَعَمَ لِيَطَاَعَلٰى رَقَبَتِهٖ فَمَا فَجِئَهُمْ مِنْهُ اِلَّا وَهُوَ يَنْكُصُ عَلٰى عَقِبَيْهِ وَيَتَّقِیْ بِيَدَيْهِ فَقِيْلَ لَهٗ مَالَكَ فَقَالَ اِنَّ بَيْنِیْ وَبَيْنَهٗ لَخَنْدَقًا مِنْ نَارٍ وَهَوْلًا وَاَجْنِحَةً فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَوْ دَنَا مِنِّیْ لَاخْتَطَفَتْهُ الْمَلٰٓئِكَةُ عُضْوًا عُضْوًا (رواہ مسلم)

اخرجہ مسلم فی صحیحہ ۲۱۵٤/٤ حدیث رقم (۳۸۔۲۷۹۷)۔

ترجمہ: ''حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے' فرماتے ہیں کہ (ایک مرتبہ) ابوجہل نے (لوگوں کے سامنے بڑی تحقیر کے ساتھ) کہا کہ کیا محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) تمہارے سامنے اپنے چہرہ کو خاک آلود کرتا ہے (یعنی نماز پڑھتا ہے اور سجدہ کرتا ہے) جواب ملا کہ ہاں! ابوجہل بولا' لات وعزیٰ کی قسم اگر میں نے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو ایسا کرتے (یعنی نماز پڑھتے اور سجدہ کرتے) دیکھ لیا تو (اپنے پیروں سے) اس کی گردن روند ڈالوں گا۔ چنانچہ (ایک دن) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے اور نماز شروع کر دی (جب سجدہ میں تھے) ابوجہل آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی گردنِ مبارک کو اپنے پاؤں سے روندے لیکن پھر وہ (آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف بڑھتے بڑھتے اچانک رک گیا اور فوراً) پچھلے پاؤں لوٹنے لگا اور وہ اپنے دونوں ہاتھوں سے کسی چیز سے بچ رہا تھا (یعنی جب وہ لوٹ کر اپنے لوگوں تک پہنچا تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کوئی سخت آفت اس پر ٹوٹ پڑی ہے اور وہ اپنے دونوں ہاتھوں سے اس کو روک رہا ہے) لوگوں نے (یہ دیکھ کر) اس سے پوچھا کہ تجھے کیا ہوا (کہ تو اپنا ارادہ پورا کئے بغیر الٹے پاؤں لوٹ آیا اور اپنے ہاتھوں سے کوئی چیز روکنے کی کوشش کر رہا ہے؟) ابوجہل نے (نہایت بوکھلائے لہجہ) میں کہا (میں یہ دیکھ رہا ہوں کہ) میرے اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے درمیان آگ کی خندق' ہیبت ناک منظر اور (محافظ فرشتوں کے) پروبازو ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''اگر ابوجہل میرے قریب آجاتا تو فرشتے اس کے جسم کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے لے جاتے (یعنی ہر فرشتہ اس کے بدن کا ایک ایک عضو نوچ کر لے جاتا)۔''

تشریح: (وجهه) لفظ یعفر فاء کی تشدید اور کسرہ کے ساتھ (باب تفعیل سے معروف کا صیغہ ہے التعفیر سے جس کے معنی مٹی میں اپنے چہرے کو خاک آلود کرنا۔ مطلب یہ ہے کہ کیا نماز پڑھتا ہے اور سجدہ کرتا ہے۔ (بین اظهر کم) اس وقت کہا جاتا ہے جبکہ کسی کی حمایت اور پشت پناہی کی وجہ سے کوئی کام ہو رہا ہو یا مخالفین میں دشمن کے روکنے کی طاقت نہ ہو گویا کہ مار دلاتے ہوئے ابوجہل نے یہ بات کہی۔ طیبی رحمہ اللہ لکھتے ہیں کلمہ یعفر محمد سے ابوجہل کی مراد آپ کا مٹی پہ سجدہ کرنا تھا۔ سجدہ کی جگہ تعفیر کا لفظ اس نے بطور تحقیر وتذلیل اور عناد وتعنت استعمال کیا۔

(وهو یصلی) یہ جملہ مفعول بہ سے حال ہے اور جملہ (زعم) فاعل سے حال واقع ہو رہا ہے (زعم) عین کے فتحہ کے ساتھ (لیطأ) یضع (رکھنے) کے معنی میں ہے۔ (رجله علی رقبته) ابن ملک کہتے ہیں ایک نسخہ میں لفظ لیطاء لام کے فتحہ کے

ساتھ منقول ہے یعنی لام تاکید ہے اس صورت میں فعل مرفوع ہوگی اور ایک نسخہ میں لفظ زعم عین کی کسرہ کے منقول ہے۔ قاموس میں ہے لفظ زعم فرح طمع کی طرح ہے۔ طیبی رحمۃ اللہ لکھتے ہیں لفظ زعم فاعل سے حال واقع ہو رہا ہے۔ مفعول کے حال کے بعد یعنی جملہ وھو یصلی مفعول سے حال ہے جس کے بعد جملہ زعم فاعل سے حال واقع ہو رہا ہے اور زعم طمع (چاہا) وارده (قصد) کے معنی میں ہے۔ اساس البلاغہ میں لکھا ہے مجاز کی مثالوں میں سے زغم فلان کو غیر مزعم میں اور طمع کو غیر مطمع میں استعمال کرنا بھی ہے۔ اس لئے کہ طمع کرنے والا کو جب تک یقین کا معنی حاصل نہ ہو جائے زاعم ہی ہوتا ہے۔ (فما فجئهم منه) لفظ فجأ کو جیم کی کسرہ اور فتحہ دونوں کے ساتھ پڑھنا جائز ہے۔ قاموس میں ہے فجئه سمع و منع کی طرح ہے۔ معنی ہے وہ اچانک آپ طرف آتے ہوئے رک گیا اور فوراً الٹے پاؤں اپنے لوگوں کی طرف لوٹنے لگا۔ (الا وھو) جملہ حالیہ ہے (ینکص) کاف کی کسرہ کے ساتھ نیز ضمہ کے ساتھ بڑھنا بھی صحیح ہے یہ جمع کے معنی میں ہے۔

طیبی رحمۃ اللہ لکھتے ہیں یہاں مستثنیٰ فجئی کا فاعل ہے یعنی ابوجہل کے ساتھ پیش آنے والے واقعہ کی خبر اس کے ساتھیوں کو تب ہوئی جب ابوجہل الٹے پاؤں بھاگتا ہوا ان کے پاس پہنچا۔ یہاں حال کو فاعل کا قائم مقام بنایا گیا ہے یہاں کلام کو ہے حالت پر چھوڑ دیا گیا ہے لفظ کی رعایت نہیں کی گئی۔ بعض علماء لکھتے ہیں ضربی زیدا قائما میں حال قائم ہے خبر کی۔ اسی طرح یہاں بھی حال کو فاعل کا قائم مقام بنایا گیا ہے اور کلام میں بجائے لفظ کے معنی کی رعایت کی گئی۔ یہاں یوں کہنا بھی صحیح ہے کہ فجئی کی ضمیر ابوجہل کی طرف راجح ہے اور منہ کی ضمیر امر کی طرف اور تقدیر عبارت یوں ہوگی فما فجئی ابو جهل اصحابه کائنا من الامر علی حال من الاحوال الاهذه الحال یعنی ابوجہل کے رفقاء نے ابوجہل کو اس سے قبل کسی حالت میں اتنا گھبرایا ہوا نہیں پایا تھا سوائے اس موقع کے۔ قاموس میں ہے نکص علی عقبیه کے معنی رجوع کے ہیں اور اس کا استعمال خاص کر خیر کے لئے ہوتا ہے البتہ جوہریؒ نے بغیر قید کے مطلق بولنے کی صورت میں تردد ذکر کیا ہے لیکن لکھتے ہیں ستر میں اس کا استعمال نادر ہے ملا علی قاریؒ فرماتے ہیں حدیث ہذا تو شریہ کے معنی میں مستعمل ہونے پر دلالت کر رہی ہیا سی طرح آیت مبارکہ فلما ترائت الفئتان نکص علی عقبیه میں بھی ستر کے معنی میں استعمال ہوا ہے اگر چہ صاحب قاموس کے کلام سے یہ ظاہر ہو رہا ہے کہ نکص مضموم المضارع (مضر منصر سے) ہے لیکن تمام قراء مکسور العین (ضرب سے) ہونے کے قائل ہیں کیونکہ زجاج کے علاوہ حضرات کہتے ہیں نصر ینصر سے شواذ (زرائت) میں بھی یہ نہیں پایا جاتا ہے ہاں زجاجؒ کہتے ہیں ضمہ کے ساتھ پڑھنا بھی جائز ہے علامہ کرمانیؒ نے آیت مبارکہ: ﴿علی اعقابکم تنکصون﴾ (المومنون ٦٦) کے تحت زجاجؒ کے اس قول کو نقل کیا ہے (فقیل له) ضمیر ابوجہل کی طرف راجح ہے (ما لک) یعنی کس چیز نے تجھے اپنے ارادہ سے روکا اور کیا چیز تو اور روک رہا ہے؟ لفظ ھو لا ھاء کے فتحہ اور واؤ کے سکون کے ساتھ خوف اور شدید پیش آنے والا منظر کے معنی میں ہے (واجنحة) جناح کی جمع ہے بمعنی پر یعنی محفظ فرشتوں کے پر و بازو ہیں۔ راوی کے اس قول کی تائید خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قول لو دنا منی لا خطفته الملائکه سے بھی ہوتی ہے زنا کے معنی ہے اگر میرے قریب ہو جاتا۔ لا خطفته کا معنی ہے سرعت کے ساتھ نوچ لینا۔

امن وامان کے بارے میں آپ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کی ایک پیشینگوئی

۵۸۵۷ : وَعَنْ عَدِیِّ ابْنِ حَاتِمٍ قَالَ بَیْنَا اَنَا عِنْدَ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اِذَا اَتَاہُ رَجُلٌ فَشَکَا اِلَیْہِ الْفَاقَۃَ ثُمَّ اَتَاہُ الْاٰخَرُ فَشَکٰی اِلَیْہِ قَطْعَ السَّبِیْلِ فَقَالَ یَا عَدِیُّ ہَلْ رَاَیْتَ الْحِیْرَۃَ فَاِنْ طَالَتْ بِکَ حَیٰوۃٌ فَلَتَرَیَنَّ الظَّعِیْنَۃَ تَرْ تَحِلُ مِنَ الْحِیْرَۃِ حَتّٰی تَطُوْفَ بِالْکَعْبَۃِ لَا تَخَافُ اَحَدًا اِلَّا اللّٰہَ وَلَئِنْ طَالَتْ بِکَ حَیٰوۃٌ لَتُفْتَحَنَّ کُنُوْزُ کِسْرٰی وَلَئِنْ طَالَتْ بِکَ حَیٰوۃٌ لَتَرَیَنَّ الرَّجُلَ یُخْرِجُ مِلْاَ کَفِّہٖ مِنْ ذَہَبٍ اَوْ فِضَّۃٍ یَطْلُبُ مَنْ یَّقْبَلُہٗ فَلَا یَجِدُ اَحَدًا یَّقْبَلُہٗ مِنْہُ وَلَیَلْقَیَنَّ اللّٰہَ اَحَدُکُمْ یَوْمَ یَلْقَاہُ وَلَیْسَ بَیْنَہٗ وَبَیْنَہٗ تَرْجُمَانٌ یُتَرْجِمُ لَہٗ فَلَیَقُوْلَنَّ اَلَمْ اَبْعَثْ اِلَیْکَ رَسُوْلًا فَیُبَلِّغَکَ فَیَقُوْلُ بَلٰی فَیَقُوْلُ اَلَمْ اُعْطِکَ مَالًا وَاُفْضِلْ عَلَیْکَ فَیَقُوْلُ بَلٰی فَیَنْظُرُ عَنْ یَمِیْنِہٖ فَلَا یَرٰی اِلَّا جَہَنَّمَ وَیَنْظُرُ عَنْ یَسَارِہٖ فَلَا یَرٰی اِلَّا جَہَنَّمَ اتَّقُوا النَّارَ وَلَوْ بِشِقِّ تَمْرَۃٍ فَمَنْ لَّمْ یَجِدْ فَبِکَلِمَۃٍ طَیِّبَۃٍ قَالَ عَدِیٌّ فَرَاَیْتُ الظَّعِیْنَۃَ تَرْ تَحِلُّ مِنَ الْحِیْرَۃِ حَتّٰی تَطُوْفَ بِالْکَعْبَۃِ لَا تَخَافُ اِلَّا اللّٰہَ وَکُنْتُ فِیْمَنِ افْتَتَحَ کُنُوْزَ کِسْرٰی بْنِ ہُرْمُزَ وَلَئِنْ طَالَتْ بِکُمْ حَیٰوۃٌ لَتَرَوُنَّ مَا قَالَ النَّبِیُّ اَبُوالْقَاسِمِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یُخْرِجُ مِلْاَ کَفِّہٖ۔ (رواہ البخاری)

اخرجہ البخاری فی صحیحہ ٦١٠/٦ حدیث رقم ٣٥٩٥ واحمد فی المسند ٢٥٧/٤۔

ترجمہ: ”حضرت عدی بن حاتم رضی اللہ عنہ سے مروی ہے فرماتے ہیں کہ (ایک دن) میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس میں بیٹھا تھا کہ اسی اثناء میں ایک آدمی آیا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے اپنے فقر و فاقہ اور افلاس کی شکایت کی' پھر ایک اور شخص آیا' اس نے راہزنی کی شکایت کی (کہ راستہ میں کچھ ڈاکوؤں اور قزاقوں نے مجھے لوٹ لیا ہے) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے (ان دونوں کی باتیں سننے کے بعد مجھ سے) فرمایا: عدی! کیا تم نے حیرہ دیکھا ہے؟ اگر تمہاری عمر لمبی ہوئی تو تم دیکھو گے کہ ایک عورت تنہا اونٹنی پر سوار ہو کر حیرہ سے چلے گی اور (مکہ پہنچ کر) کعبہ کا طواف کرے گی اور اسے سوائے اللہ تعالیٰ کے کسی (چور یا راہزن) کا خوف نہیں ہوگا' اگر تمہاری عمر لمبی ہوئی تو (دیکھو گے کہ) کسریٰ (فارس کے بادشاہ) کے خزانے (مسلمانوں کے لئے) کھول دیئے جائیں گے (جو غنیمت کے طور پر ہاتھ لگیں گے اور تمام مسلمانوں میں تقسیم ہوں گے) اور اگر تمہاری عمر دراز ہوئی تو تم دیکھو گے کہ آدمی مٹھی بھر کر سونا یا چاندی لے کر (خیرات کرنے کو) نکلے گا اور قبول کرنے والے (یعنی کسی محتاج و مفلس کو) تلاش کرتا پھرے گا مگر اسے کوئی ایسا آدمی نہیں ملے گا جو اس سے خیرات کا مال لے لے اور (یاد رکھو) قیامت کے دن تم میں سے ایک شخص اللہ کے حضور اس طرح پیش ہوگا کہ اس کے اور اللہ کے درمیان کوئی ترجمان نہیں ہوگا جو اس کی ترجمانی کرے' پھر اللہ تعالیٰ فرمائیں گے کہ کیا میں نے رسول نہیں بھیجا تھا؟ جو تجھ تک میرے احکام پہنچائے' وہ شخص کہے گا کہ بے شک آپ نے رسول بھیجا تھا۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ کہیں گے کہ میں نے تجھ کو مال و زر عطا نہیں کیا تھا اور کیا نے تجھ

پر فضل واحسان نہیں کیا تھا؟ وہ کہے گا بے شک آپ نے مجھ کو مال بھی عطا کیا تھا اور مجھ پر فضل واحسان بھی فرمایا تھا۔ اس کے بعد وہ شخص اپنے دائیں طرف دیکھے گا تو اسے جہنم کے سوا کچھ نظر نہیں آئے گا (جس کو اس نے ترک طاعت وعبادات کے سبب اپنے لئے واجب کررکھا ہوگا) پھر وہ اپنے بائیں طرف دیکھے گا تو اسے جہنم کے سوا کچھ نظر نہیں آئے گا (جس کو اس نے ارتکاب معصیت کے سبب اپنے اوپر واجب کررکھا ہوگا)۔ (پس رسول اللہ ﷺ نے تمام لوگوں کو مخاطب کر کے فرمایا کہ لوگو) دوزخ کی آگ سے (خیرات کے ذریعہ) اپنے آپ کو بچاؤ۔ اگرچہ کھجور کا ایک ٹکڑا ہی خیرات کرنے کی استطاعت رکھتے ہو اور اگر کوئی شخص (اللہ کے نام پر خرچ کرنے کے لئے) کھجور کا ایک ٹکڑا بھی نہ پائے تو نرمی اور خوش خلقی کے ساتھ بات کر کے (خود کو دوزخ کی آگ سے بچائے)۔ حضرت عدی بن حاتم رضی اللہ عنہ نے (یہ روایت بیان کرنے کے بعد) کہا: (آنحضرت ﷺ کی اس پیشگوئی کے مطابق) میں نے دیکھا کہ ایک عورت حیرہ سے تن تنہا اونٹنی پر سوار ہو کر آتی ہے اور آ کر بیت اللہ کا طواف کرتی ہے اور اسے اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کا ڈر نہیں تھا' اور میں خود ان لوگوں میں شامل تھا۔ جنھوں نے کسریٰ بن ہرمز بن نوشیرواں (فارس کے بادشاہ) کے خزانوں کو فتح کیا' اور اگر تمہاری عمر دراز ہوئی تو ابوالقاسم (محمد ﷺ) کی اس پیش گوئی کو بھی حرف بحرف پورا ہوتے دیکھ لوگے کہ ایک شخص مٹھی بھر کر (سونا چاندی خیرات کرنے کو نکلے گا) اور کوئی شخص اس کو لینے والا نہیں ملے گا''۔ (بخاری)

تشریح: (اذا ...... فشکا) لفظ شکا الف کے ساتھ ہے ایک نسخہ میں یاء کے ساتھ ہے جو اصل میں واؤ کے ساتھ ہے۔ قاموس میں یاء ہی کے ساتھ ہے۔ (الیہ الفاقۃ) یعنی فقر وفاقہ اور افلاس کا مشکوہ کیا۔ (ثم اتاہ الآخر) ایک نسخہ میں بغیر الف لام کے آخر منقول ہے اور یہی ضبط زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے۔

(فقال: یاعدی...... الحیرۃ) حاء کی کسرہ کے ساتھ نہایہ میں ہے حیرہ کوفہ کے پاس ایک پرانا شہر ہے اور اسی میں مشہور بستی نیشاپور ہے۔ بعض حضرات حیرہ سے مراد نیشاپور لیتے ہیں لیکن راجح بات یہ ہے کہ حیرہ سے مراد کوفہ کے پاس جو قدیم شہر ہے وہی مراد ہے۔ کیونکہ عرب کے ہاں یہی قدیم شہر مشہور تھا اسی وجہ سے شارح نے بھی اسی پر اکتفاء کیا۔ کیونکہ قول ثانی تکلف سے خالی نہیں بعض علماء نے لکھا ہے حضرت عدی نے جواب دیا یارسول اللہ دیکھا تو نہیں ہے لیکن اس کے متعلق معلومات ضرور رکھتا ہوں۔

ملا علی قاریؒ لکھتے ہیں یہ بھی ممکن ہے کہ رأیت بمعنی علمت ہو اس اعتبار سے یہ کلمہ جواب پر موقوف نہیں ہوگا کیونکہ آگے آپ ﷺ فرمارہے ہیں (فان طالت بك حیاۃ فلترین) لفظ ترین حرکات موالیات کے ساتھ معنی ہے تم یقیناً دیکھو گے۔

(الظعینۃ) کی تحقیق: ظعینہ مسافر عورت کو کہا جاتا ہے۔ ظعینہ کہنے کی وجہ کیا ہے؟ فرماتے ہیں ظعینہ کے معنی چلنے پھرنے کے ہیں اس کو ظعینہ اس لئے کہا جاتا ہے کہ یہ اپنے شوہر کے ساتھ جہاں چاہے چلی جاتی ہے۔ بعض محققین کہتے ہیں اس کو ظعینہ اس لئے کہتے ہیں کہ سفر کی حالت میں اس کو ہودج میں اٹھایا جاتا ہے۔ بعض حضرات کہتے ہیں ظعینہ اصل میں اس عورت کو کہا جاتا تھا جو ہودج میں بیٹھی ہوئی ہو پھر ہودج کو ظعینہ کہا جانے لگا اور مسافر عورت کا بھی نام بغیر ہودج کے ظعینہ پڑ گیا النہایہ کی تحقیق بھی یہی ہے۔

ایک شارح لکھتا ہے عورت جب تک پالکی (ہودج) میں ہو ظعینہ کہلاتی ہے پالکی میں نہ ہو تو ظعینہ نہیں کہلاتی اور یہاں حدیث میں مطلقاً مسافر عورت مراد ہے چاہے ہودج میں ہو یا نہ ہو۔

ملا علی قاریؒ لکھتے ہیں ہودج میں ہونے کا معنی مراد لینا زیادہ بہتر ہے کیونکہ آنحضرت ﷺ کا قول (ترتحل عن الحیوۃ) اسی پر دلالت کرتا ہے کہ اکیلی اونٹ پر سوار ہو کر حیرہ کے مقام سے چلے گی (حتی ...... الا اللہ) روایت میں آتا ہے حضرت عدی فرماتے ہیں میں نے اپنے دل میں کہا کہ اس زمانہ میں قبیلہ طئی کے چرواہے کہاں ہوں گے؟ (ولئن طالت ...... لتفتحن) لتفتحن صیغہ مجہول کیس اتھ مصدر الفتح سے ہے اور ایک نسخہ باب افتعال سے ہے اور امتحت اور استفتحت کے معنی فتح طلب کرنے کے ہیں یہاں حدیث میں حاصل کرنے کے معنی میں ہے (کنوز کسری) یعنی عنقریب کسری کے خزانے بطور مال غنیمت حاصل کرو گے حضرت عدیؓ فرماتے ہیں کسری سے کسرہ ابن ہرمز مراد ہے کیونکہ آپ ﷺ نے کسرہ ابن ہرمز ہی فرمایا۔ قاموس میں ہے لفظ کسریٰ کاف کے کسرہ اور فتحہ دونوں کے ساتھ پڑھا جا سکتا ہے فارس کے بادشاہ کا نام ہے ان کا لقب خسرو ہے یعنی بڑی سلطنت والا (من ذھب او نضہ) لفظ او سے نقدی کی دونوں نوع کی طرف اشارہ فرمایا احتمال ہے کہ یہاں لفظ او بمعنی واؤ ہے یا او شک کے لئے ہو (یطلب من یقلہ) اس سے مراد یا تو یہ ہے کہ سونا چاندی قبول کرنے والا کوئی نہ ہوگا کہ یہ دونوں چیزیں کسی کام کے نہ ہوں گے یا یہ کہ معاشی خوش حالی کی وجہ سے کوئی بھی زکوۃ لینے والا نہیں رہے گا یا استغناء اتنا ہوگا کہ ہر شخص کفایت شعار ہوگا (فلا یجد احدا یقبلہ منہ) (اب یہ کس زمانے میں ہوگا؟)۔

بعض علماء کہتے ہیں یہ پیش گوئی حضرت عمر بن عبدالعزیز کے زمانہ خلافت میں پوری ہو چکی ہے ان کے عہد میں عام لوگوں کی اقتصادی حالت اتنی زیادہ بہتر تھی کہ صدقہ خیرات کا مال لینے والا کوئی نہیں ملتا تھا اسی وجہ سے بیہقی نے اس قول کو جزم کے ساتھ اختیار کیا ہے۔ بعض حضرات کہتے ہیں قول ثانی کو اگر ترجیح دی جاتی کیونکہ حدیث میں حضرت محمد ﷺ فرما رہے ہیں (ولئن طالت بك حیاۃ) یعنی اگر تمہاری زندگی وفا کرے تو کچھ عرصے میں تم دیکھ لو گے اور حضرت عمر بن عبدالعزیز کا زمانہ قریب ترین زمانہ ہے۔

ملا علی قاریؒ فرماتے ہیں قول اول کے راجح ہونے میں بھی کوئی شک نہیں کیونکہ حضرت عدیؓ کا آنے والا قول (ولئن طالت بکم حیاۃ لقرون) سے اس کی تائید ہوتی ہے (ولیلقین) اس کا عطف حدیث کے ابتدائی حصہ پر ہے اس کا فاعل (احدکم) ہے لفظ جلالہ مفعول مقدم ہے یہاں مفعول کو عظمت اہتمام اور مقام کے تعظیم کی وجہ سے مفعول کو مقدم کیا گیا ہے (یوم یلقاہ) یہ مفعول فیہ ہے (لیلقین) کے لئے اگرچہ اس میں دوہری ترکیب بھی ممکن ہے بمعنی مترجمکے ہے۔

دو نسخوں میں تاء کے فتحہ اور جیم کے ضمہ کے ساتھ تاء اور جیم دونوں کے ضمہ کے ساتھ۔ تاء اور جیم دونوں کے فتحہ کے ساتھ۔ یعنی بغیر واسطے کے اللہ تعالیٰ سے گفتگو ہوگی۔ صاحب مشارق لکھتے ہیں لفظ ترجمان تاء کے فتحہ اور جیم کے ضمہ کے ساتھ ہے اصیلی نے دونوں کے ضمہ کے ساتھ ظطیفی کیا ہے۔ النہایہ میں ہے لفظ ترجمان ضمہ اور فتحہ کے ساتھ اس شخص کو کہا جاتا ہے جو ایک لغت سے دوسری میں کلام منتقل کرتا ہے اور آخر میں الف اور نون دونوں زائد ہیں قاموس میں ہے لفظ ترجمان عنفوان، زعفران اور ایھقان کے وزن پر کلام کی زبانی تفسیر بیان کرنے کے معنی میں ہے۔ بذات خود بھی متعدی ہوتا ہے اور صلہ کے ذریعہ بھی متعدی کہا جاتا

ہے اس کے شروع میں تاء اصلی ہے کیونکہ اس کی فعل تاء کے اصل ہونے پر دلالت کرتی ہے مفاتیح میں ہے لفظ ترجمان زعفران کے وزن پر ہے اس پر تاء کے فتحہ اور جیم کے ضمہ اور دونوں کے ضمہ کے ساتھ اعراب پڑھنا بھی جائز ہے۔ لام مفتوحہ کی تشدید اور تخفیف دونوں کے ساتھ (فیقول ...... وافضل) لافضال سے مجزوم ہے کیا میں نے تیرے ساتھ احسان اور انعام والا معاملہ نہیں کیا؟ یہ استفہام اقراری ہے یعنی میں نے تجھ کو مال و دولت سے سرفراز کیا تجھ پر اپنا فضل وانعام کیا اس مال و دولت کو خرچ کرنے اس سے فائدہ اٹھانے اور مستحق وضرورت مند لوگوں پر اس کو صرف کرنے کی قدرت عطا کی۔

(فیقول ...... جھنم) دراصل یہ دونوں جملے اس بات سے کنایہ ہے کہ اس دن بندہ اپنے کو چاروں طرف سے دوزخ کے درمیان گھرا ہوا دیکھے گا اور اس ہولناک جگہ سے گلوخلاصی کا راستہ اس کے علاوہ کچھ نہیں ہوگا کہ اس کو دوزخ کے اوپر (پل صراط) سے گزرنا پڑے گا۔

(اگر دنیا میں ایمان وتقویٰ کی زندگی اختیار کی ہوگی اور اللہ کا فضل شامل حال رہا تو اس کے اوپر سے گزر کر جنت میں پہنچ جائے گا ورنہ دوزخ میں گر پڑے گا) ارشاد ربانی ہے: ﴿وان منکم الا واردھا کان علی ربك حتما مقضیا ثم ننجی الذین اتقوا﴾ ''اور تم میں ایسا کوئی شخص نہیں جس کو اس دوزخ کے اوپر سے گزرنا نہ پڑے گا یہ تمہارے رب کا حتمی فیصلہ ہے پھر ہم پرہیزگاروں کو نجات دیں گے''۔

اسی لئے آنحضرت ﷺ نے فرمایا: (اتقوا النار ولو بشق تمرۃ) یہاں تک کہ تم کھجور کے ایک ٹکڑے کے برابر معمولی چیز دینے کے علاوہ اور کچھ نہیں دے سکتے تو وہی معمولی چیز دے کر اس کا سوال پورا کرو (فمن لو یجد فبکلمۃ طیبۃ) یعنی دیگر باقیات الصالحات جیسے اذکار دعائیں وغیرہ یا یہ کہ اپنے کھرے اور بھدے جواب جواب کے ذریعہ اس کی دل شکنی کرنے کے بجائے نہایت نرمی اور ملائمت کے ساتھ اس کے سامنے اپنا عذر بیان کرو اسی کو اللہ پاک نے کہی تو قولا معروفا اور کہی قولا میسورا سے تعبیر فرمایا ہے۔

طیبی رحمہ اللہ لکھتے ہیں اگر آپ یہ پوچھیں کہ اس حدیث مبارک کا شان ورد کیا ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ نے جو پہلی پیشینگوئی فرمائی وہ دراصل اس شخص کے جواب میں تھی جس نے فاقہ اور خوف کی شکایت کی تھی جو معنوی عسر کے قبیل سے تھی آنحضرت ﷺ کے صحابہ کرام کی حالت بھی فتوحات سے قبل عسر کی تھی تو آنحضرت ﷺ نے دونوں شکایت کندہ کی ضمن میں حضرت عدی اور دیگر صحابہ کرام کو بھی یسر اور امن کی خوشخبری بھی سنائی تا کہ سب کو تسلی ہو جائے البتہ روئے سخن حضرت عدی ابن حاتم کی طرف رکھا جو اس وقت مجلس شریف میں حاضر تھے اللہ تعالیٰ کی طرف سے بھی اس کی خوشخبری (ان مع العسر یسرا) کے الفاظ کے ساتھ موجود ہے۔

اس کے ساتھ ساتھ آپ ﷺ نے یہ بھی واضح کرنا ضروری سمجھا کہ مال و دولت کی فراوانی چونکہ عام طور پر انسان کو دنیا کے عیش وعشرت میں ڈال کر آخرت سے غافل کر دیتی ہے اس لئے اہل ایمان کو چاہئے اس فراخی وتوانگری کے زمانہ میں یہ بات فراموش نہ کریں کہ دنیا میں مال و دولت کی آسائش وراحت دراصل آخرت میں تنگی اور ندامت کا باعث ہے الا یہ کہ اللہ تعالیٰ جس کو مصارف خیر میں خرچ کر کے توشہ آخرت بنانے کی توفیق دے ایسے لوگوں کے لئے دنیا وآخرت دونوں جگہ آسائش ہی

آسائش ہوگی اس کی نظیر حضرت علیؓ کی وہ روایت ہے جو باب تغیر الناس میں گزری جس کے الفاظ تھے: کیف بکم اذا غدا احدکم فی حله و راح فی حلة ووضعت بین یدیه صحفة اور آخر میں تھا لانتم الیوم خیر منکم یومئذ ۔
لفظ ہرمز ہاء اور میم کے ضمہ کے ساتھ۔ مصابیح میں لفظ کنور کے ساتھ الابیض کی صفت بھی ہے ایک شارح کہتا ہے کنوز الابیض سے مراد قصر ابیض مراد ہے جو کہ مدائن میں تھی فارسی میں اس کو یغد کوشک کہتے ہیں۔

۵۸۵۸ : وَعَنْ خَبَّابِ بْنِ الْاَرَتِّ قَالَ شَكَوْنَا اِلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَهُوَ مُتَوَسِّدٌ بُرْدَةً فِي ظِلِّ الْكَعْبَةِ وَلَقَدْ لَقِيْنَا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ شِدَّةً فَقُلْنَا اَلَا تَدْعُوْا اللّٰهَ فَقَعَدَ وَهُوَ مُحْمَرٌّ وَجْهُهُ وَقَالَ كَانَ الرَّجُلُ فِيْمَنْ كَانَ قَبْلَكُمْ يُحْفَرُلَهٗ فِي الْاَرْضِ فَيُجْعَلُ فِيْهِ فَيُجَآءُ بِمِنْشَارٍ فَيُوْضَعُ فَوْقَ رَاْسِهٖ فَيُشَقُّ بِاثْنَيْنِ فَمَا يَصُدُّهٗ ذٰلِكَ عَنْ دِيْنِهٖ وَيُمْشَطُ بِاَ مْشَاطِ الْحَدِيْدِ مَا دُوْنَ لَحْمِهٖ مِنْ عَظْمٍ وَعَصَبٍ وَّمَا يَصُدُّهٗ ذٰلِكَ عَنْ دِيْنِهٖ وَاللّٰهِ لَيَتِمَّنَّ هٰذَا الْاَمْرُ حَتّٰى يَسِيْرُ الرَّاكِبُ مِنْ صَنْعَاءَ اِلٰى حَضَرَمَوْتَ لَا يَخَافُ اِلَّا اللّٰهَ اَوِالذِّئْبَ عَلٰى غَنَمِهٖ وَلٰكِنَّكُمْ تَسْتَعْجِلُوْنَ ۔ (رواه البخاری)

اخرجه البخاری فی صحیحه ۶۱۹/۶ حدیث رقم ۳۶۱۲ واحمد فی المسند ۳۹۵/۶۔

ترجمہ: "حضرت خباب بن ارت رضی اللہ عنہ سے مروی ہے فرماتے ہیں کہ ایک دن ہم نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے (کفار کی سخت ترین مخالفت اور دشمنی کی) شکایت کی۔ اس وقت آپ صلی اللہ علیہ وسلم کعبۃ اللہ کے سایہ میں دھاری دار چادر سر کے نیچے رکھے ہوئے لیٹے تھے۔ ہمیں کفار سے بہت اذیت و تکلیف پہنچ چکی تھی' اس لئے ہم نے عرض کیا کہ (جب وہ لوگ ایذا رسانی سے باز نہیں آتے تو) آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان کے حق میں بددعا کیوں نہیں فرماتے (ہماری یہ بات سنتے ہی) آپ صلی اللہ علیہ وسلم اٹھ بیٹھے اور چہرۂ مبارک سرخ ہوگیا' فرمایا: تم سے پہلے جو لوگ گزرے ہیں کہ ان میں سے کسی کے لئے زمین میں ایک گڑھا کھودا جاتا تھا پھر اس شخص کو اس گڑھے میں بٹھایا یا کھڑا کیا جاتا تھا اور پھر آرہ لا کر اس کے سر پر رکھا جاتا تھا اور اس آرہ سے اس کو چیر کر اس کے دو ٹکڑے کر دیئے جاتے تھے لیکن یہ سخت عذاب بھی اس کو دین سے پھرنے نہیں دیتا تھا اور لوہے کے (تیز) کنگھے ان کے جسم پر پھیرے جاتے جو گوشت کے نیچے ہڈیوں اور پٹھوں تک چیرتے چلے جاتے تھے' لیکن یہ سخت ترین عذاب بھی انہیں دین سے پھرنے نہیں دیتا تھا' خدا کی قسم یہ دین یقیناً درجۂ کمال کو پہنچے گا اور تم مصیبتوں اور پریشانیوں کے ختم ہو جانے والے اس دور کے بعد آسانیوں اور اطمینان کا وہ زمانہ بھی دیکھو گے کہ ایک شخص صنعاء سے حضر موت تک تنہا سفر کرے گا اور اسے خدا کے علاوہ کسی کا خوف نہ ہوگا یا یہ کہ کسی شخص کو اپنی بکریوں کے بارے میں بھیڑیوں سے بھی کوئی خوف وخطرہ نہیں ہوگا' لیکن تم جلدی کرتے ہو"۔ (بخاری)

تشریح: راوی فرماتے ہیں لفظ محمر احمر سے اسم مفعول کا صیغہ ہے راء کی تشدید کے ساتھ یعنی غصہ کی حرارت کی وجہ سے چہرہ انور سرخ ہوگیا (وقال: کان الرجل) الرجل پر لام عہد ذہنی ہے الف لام عہد ذہنی نکرہ کے حکم میں ہوتا ہے یحفر له صیغہ یحفر مجہول کا صیغہ ہے (فی الارض) یہ قید اتفاقی ہے کیونکہ حفر زمین ہی میں ہوا کرتا ہے اس کے بعد پھر فی الارض کہنا تاکید ہے (فیجعل فیه' فیجاء منشار) لفظ منشار کی تین صورتیں منقول ہیں نون کے ساتھ جیسے اس روایت میں ہے۔ ہمزہ کے

ساتھ یعنی منشار۔ ہمزہ کو یاء کے بدل کر یشار پڑھنا بھی جائز ہے۔ آراء جس سے لکڑیاں چیری اور کاٹی جاتی ہیں۔ (ویمشط) صیغہ مجہول کے ساتھ (بامشاط الحدید) امشاط ہمزہ کے فتحہ کے ساتھ وہ آلہ جس سے بال سنوارے جاتے ہیں (مادون لحمہ) ضمیر کا مرجع کیا ہے؟ اس میں دو احتمال ہیں یا وہی الرجل ہے یا اور کوئی دوسرے شخص کی مثال ہے ظاہراً یہ کسی دوسرے شخص کا ذکر معلوم ہوتا ہے جو آرے سے چیرے جانے والے کے علاوہ تھا (من عظم و عصب) لفظ عصب عین اور صاد دونوں کے فتحہ کے ساتھ۔

طیبی رحمہ اللہ لکھتے ہیں یہاں من بیانیہ ہے مادو لحمہ کا بیان ہے بطور مبالغہ کے ذکر فرمایا گیا ہے کہ کنگھی اس تیزی اور سختی کے ساتھ چلائی جاتی تھی کہ جو گوشت کے نیچے ہڈیوں پٹھوں تک چیرتی چلی جاتی تھی لیکن (وما یصدہ ذلک عن دینہ) یہ جملہ حالیہ ہے (واللہ لیتمن) لیتمن یاء کے فتحہ تاء کی کسرہ میم کی تشدید کے ساتھ صیغہ معروف ہے۔ ایک نسخہ میں صیغہ مجہول کے ساتھ ہے ایک اور نسخہ میں حرف مضارع (یاء) کے ضمہ اور تاء کی کسرہ کے ساتھ منقول ہے یعنی لفظ جلالہ (اللہ) فاعل اور ولۃ ذلام مفعول بہ ہے۔ اس سے آیت: ﴿لیظهرہ علی الدین کلہ﴾ کی پیشینگوئی کی طرف اشارہ ہے (حتی یسیر الراکب) الراکب میں الف لام جنسی ہے یعنی مرد و عورت دونوں مراد لئے جا سکتے ہیں (من ضعاء) یہ یمن کا مشہور ترین شہر ہے (الی حضرت موت) میم کے فتحہ کے ساتھ مرکب منع صرف ہے علیت اور ترکیب کی وجہ سے غیر منصرف ہے یہ بھی پہلے یمن کا ایک حصہ تھا اور ایک جگہ نام تھا لیکن اب عدن کے مشرق سمت کے ایک بڑے علاقہ پر مشتمل بہت سے شہروں اور آبادیوں کے مجموعہ کا نام ہے بعض حضرات کہتے ہیں یہ ایک قبیلہ کا نام تھا۔

حضر موت کی وجہ تسمیہ اور اعراب:

اس میں دو قول ہیں۔ مشہور ہے کہ حضرت صالح علیہ السلام کا انتقال یہیں ہوا تھا اور وفات کے وقت انہوں نے یہ جملہ فرمایا تھا حضر الموت (موت حاضر ہوگئی) اس وقت سے اس جگہ کا نام ہی حضر موت پڑھ گیا۔ بعض حضرات نے لکھا ہے ایک پیغمبر حضرت جرجیس علیہ السلام کی موت اس جگہ آئی تھی اس وقت سے اس (موضع) کو حضر موت کہا جانے لگا۔ ابن الملک نے اس قول کو اختیار کیا ہے۔

قاموس میں ہے حضرت موت میم کے ضمہ کے ساتھ ہے اور یہ کسی شہر یا قبیلہ کا نام ہے یہ اضافت اور بغیر اضافت کے استعمال ہوتا ہے جیسے ہٰذا حضرموت اور حضرموت یعنی راء کے ضمہ کے ساتھ آپ چاہیں تو اسم ثانی (موت) کو بغیر تنوین کے پڑھیں (لایخاف الا اللہ...... غنمہ) ایک نسخہ میں او الذئب کے بجائے والذئب ہے اس صورت میں ممکن ہے واؤ بمعنی اُو ہو۔ اگر اصل او ہی ہو تو اس میں بھی دو احتمال ممکن ہیں او بمعنی واؤ ہو جو جمع کے لئے آتا ہے یا او کو راوی نے الفاظ میں شک کی وجہ سے ذکر کیا ہے۔ بہرکیف جو بھی ہو مقصد ایک ہے اور وہ یہ کیا امن امان کا ایسا دور دھرائے گا کہ مخلوق کا کوئی خوف باقی نہیں رہے گا۔ کسی شخص کو اپنی بکریوں کے بارے میں بھیڑیوں سے بھی خطرہ نہیں رہے گا اس جملے کا اپنا اصل معنی مراد نہیں یعنی یہ مطلب نہیں کہ واقعۃً بھیڑئے بکریوں پر حملہ کرنا اور اپنی درندگی کا نشانہ بنانا چھوڑ دیں گے کیونکہ عادۃً یہ ممکن نہیں اگرچہ آخر زمانے

میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا جب نزول ہوگا تو اس وقت اتنا بابرکت امن قائم ہوگا کہ بھیڑیئے بھی بکریوں پر حملہ نہیں کریں گے۔ بلکہ اس جملے کا اصل مقصد انسانوں کے باہمی اعتبار سے اعتماد اور امن وامان کو شدت کیساتھ ظاہر کرنا ہے کہ ایسا وقت آئے گا کہ اس وقت لوگ ایک دوسرے کے ظلم وستم سے بالکل محفوظ و مامون ہوں گے اور پورا معاشرہ اس طرح امن وعافیت سے بھرپور ہو گا جس کا تصور بھی زمانہ جاہلیت میں نہیں کیا جا سکتا تھا۔

(ولکنکم تستعجلون) یہ جملہ آنحضرت ﷺ نے صحابہ کرام کو تسلی دیتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ تمہیں گھبراہٹ کا شکار نہیں ہونا چاہیے صبر واستقامت کا دامن تھامے رکھو گے تو یہ تمام مصائب چھٹ جائیں گے۔ اللہ کے دین کا بول بالا ہو جائے گا۔ تمہیں چاہیے کہ گذشتہ امتوں کے اہل ایمان واہل حق کی طرح اپنے اندر استقامت پیدا کرو۔ نسائی اور ابوداؤد نے بھی بعینہ اسی طرح نقل کیا ہے۔

قسطنطنیہ کی پیشینگوئی

۵۸۵۹ : وَعَنْ اَنَسٍ قَالَ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَدْخُلُ عَلٰى اُمِّ حَرَامٍ بِنْتِ مِلْحَانَ وَكَانَتْ تَحْتَ عُبَادَةَ ابْنِ الصَّامِتِ فَدَخَلَ عَلَيْهَا يَوْمًا فَاَطْعَمَتْهُ ثُمَّ جَلَسَتْ تَفْلِي رَاْسَهٗ فَنَامَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ثُمَّ اسْتَيْقَظَ وَهُوَ يَضْحَكُ قَالَتْ فَقُلْتُ مَا يُضْحِكُكَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ قَالَ اُنَاسٌ مِنْ اُمَّتِيْ عُرِضُوْا عَلَيَّ غُزَاةً فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ يَرْكَبُوْنَ ثَبَجَ هٰذَا الْبَحْرِ مُلُوْكًا عَلَى الْاَسِرَّةِ اَوْ مِثْلَ الْمُلُوْكِ عَلَى الْاَسِرَّةِ فَقُلْتُ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اُدْعُ اللّٰهَ اَنْ يَّجْعَلَنِيْ مِنْهُمْ فَدَعَا لَهَا ثُمَّ وَضَعَ رَاْسَهٗ فَنَامَ ثُمَّ اسْتَيْقَظَ وَهُوَ يَضْحَكُ فَقُلْتُ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ مَا يُضْحِكُكَ قَالَ اُنَاسٌ مِّنْ اُمَّتِيْ عُرِضُوْا عَلَيَّ غُزَاةً فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ كَمَا قَالَ فِي الْاُوْلٰى فَقُلْتُ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اُدْعُ اللّٰهَ اَنْ يَّجْعَلَنِيْ مِنْهُمْ قَالَ اَنْتِ مِنَ الْاَوَّلِيْنَ فَرَكِبَتْ اُمُّ حَرَامٍ الْبَحْرَ فِيْ زَمَنِ مُعَاوِيَةَ فَصُرِعَتْ عَنْ دَابَّتِهَا حِيْنَ خَرَجَتْ مِنَ الْبَحْرِ فَهَلَكَتْ۔ (متفق علیہ)

اخرجه البخاري في صحيحه ١٠/٦ حديث رقم ٢٧٨٨ ومسلم في صحيح

ترجمہ: "حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ حضرت ام حرام بنت ملحان رضی اللہ عنہا جو حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ کی بیوی تھیں کے ہاں تشریف لے جاتے تھے ایک دن (حسب معمول) آپ ﷺ اُم حرام رضی اللہ عنہا کے ہاں تشریف لائے تو اُم حرام رضی اللہ عنہا نے آپ ﷺ کو کھانا کھلایا اور پھر آپ ﷺ کے سر مبارک میں جوئیں دیکھنے بیٹھ گئیں اس دوران آپ ﷺ سو گئے پھر (کچھ ہی دیر بعد) آپ ﷺ ہنستے ہوئے بیدار ہو گئے! اُم حرام کہتی ہیں کہ میں نے (آپ ﷺ کو اس حالت میں ہنستے دیکھا تو) پوچھا یا رسول اللہ ﷺ آپ ﷺ کو کس چیز نے ہنسایا؟ فرمایا (خواب میں) میری امت میں سے کچھ لوگ ~~محمد ﷺ کے~~ راستے میں جہاد کرتے ہوئے دکھائے گئے اور وہ سمندر میں اس طرح محو

سفر تھے جیسے بادشاہ اپنے تخت پر ہوتے ہیں۔یا یہ فرمایا کہ بادشاہوں کی طرح جو تخت پر جلوہ گر ہوں''۔میں نے (یہ سن کر) عرض کیا یا کہ یارسول اللہ ﷺ اللہ سے دعا کیجئے کہ وہ ان مجاہدوں میں (جو سمندر کے سینے کو چیرتے ہوئے خدا کی راہ میں جہاد کو نکلیں) مجھے بھی کر دے۔آپ ﷺ نے اُم حرام رضی اللہ عنہا کے حق میں دعا فرمائی۔پھر آپ ﷺ نے (تکیہ پر) سر رکھا اور پھر سو گئے (کچھ دیر بعد) پھر آپ ہنستے ہوئے بیدار ہوئے'میں نے آپ ﷺ سے ہنسنے کی وجہ دریافت کی تو آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا:اب پھر (خواب میں) میری امت میں سے کچھ لوگ میرے سامنے اس حال میں پیش کئے گئے کہ وہ خدا کی راہ میں جہاد کر رہے تھے جیسا کہ آپ ﷺ نے پہلی مرتبہ فرمایا تھا(اس مرتبہ بھی وہی الفاظ ارشاد فرمائے کہ وہ لوگ سمندر میں اس طرح محوسفر تھے جیسے بادشاہ اپنے تخت پر ہوتے ہیں) میں نے (یہ سن کر اس مرتبہ) پھر عرض کیا کہ یارسول اللہ ﷺ !اللہ تعالیٰ سے دعا فرمائیں کہ وہ ان مجاہدوں میں مجھ کو بھی شامل کر دے۔آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا:تم پہلی جماعت میں ہو''۔چنانچہ حضرت اُم حرام رضی اللہ عنہا نے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں (جہاد کی غرض سے) بحری سفر کیا اور جب سمندر سے اتر کر جانور پر سوار ہوئیں تو (اچانک) جانور کی پشت سے زمین پر گر پڑیں اور (راہ خدا میں شہادت کا مرتبہ پا کر اس دُنیا سے کوچ کر گئیں''۔(بخاری ومسلم)

تشریح:(وعن انس ...... ملحان) ملحان میم کے کسرہ کے ساتھ یہ ملحان ابن خالد ہیں اورام حرامؓ حضرت انسؓ کی سگی خالہ ہیں۔ام حرام اورام سلیم آنحضرت ﷺ کے والدمحترم کی رضاعی یا نسبی خالہ تھیں امام نوویؒ فرماتے ہیں یہ آپ کی محرم عورتوں میں سے تھیں۔اور فرماتے ہیں کیفیت محرمیت میں علماء کا اختلاف ہے۔ابن عبدالبرؒ کہتے ہیں آپ کی رضاعی خالات میں سے تھیں بعض دیگر حضرات کا کہنا ہے کہ یہ دونوں خواتین آپ کے والد ماجد یا جدامجد عبدالمطلب کی جانب سے خالہ لگتی تھیں۔کیونکہ حضرت عبداللہ اور حضرت عبدالمطلب کی والدہ بنی نجار سے تھیں۔پوری تفصیل حضرت ام سلیم کے پاس آنے جانے والی روایت میں گزر چکی ہے۔(وكانت تحت عبادة بن الصامت)تحت کا معنی ہے یہ حضرت عبادہ ابن الصامتؓ کے نکاح میں تھی یعنی بیوی ہیں۔

حضرت مؤلف فرماتے ہیں مشرف باسلام ہوئی۔آپ ﷺ کے ہاتھ پر بیعت کی۔روم (شام) کی کاروائی میں اپنے شوہر کے ساتھ شریک تھی وہی وفات پائی اور قبرص میں مدفون ہوئیں۔ان سے زیادہ تر بھائی حضرت انس اور شوہر حضرت عبادہ بن الصامتؓ روایت کرتے ہیں۔ابن عبدالبرؒ فرماتے ہیں میں ان کی کنیت کے علاوہ صحیح نام سے واقف نہیں ہوں (یعنی یہ اپنی کنیت سے مشہور ہیں)۔حضرت عثمانؓ کی خلافت کے زمانہ میں ان کی وفات ہوئی۔(تفلي راسه)لفظ تفلي لام کے کسرہ اور تخفیف کے ساتھ۔یعنی آپ کے سر مبارک کے بالوں میں جوئیں دیکھنے لگیں۔(فنام...... استيقظ)کافی دیر بعد بیدار ہوئے۔ (وهو يضحك...... ما يضحكك) یاء کے ضمہ اور حاء کے کسرہ کے ساتھ (باب افعال سے) (یارسول اللہ) کیونکہ آپ بغیر سبب کے کبھی بھی نہیں ہنستے۔(من امتي عرضوا على غزاة)(يركبون ثبج هذا بحر)لفظ ثبج ثاء باء اور جیم کے فتحہ کے ساتھ۔وسط اور روش کے معنی میں ہے۔(ملو كا على...... اُو على الاسرة) بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ لفظ اُو شک کے لئے ہے ۔یعنی راوی نے الفاظ میں شک ہونے کی وجہ سے لفظ او ذکر کیا ہے اور ملو کا مصدر محذوف سے حال یا صفت واقع ہو رہا ہے

تقدیری عبارت یر کبون ملو کا علی لاسرۃ یا رکوبا مثل رکوب الملوك علی لاسرۃ ہے۔یعنی جیسے بادشاہ اپنے تخت پر ہوتے ہیں یا یہ فرمایا کہ بادشاہوں کی طرح جوتخت پر جلوہ گر ہوں۔طیبی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں اس جملہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے سمندر کے سینہ کو گویا زمین کی پشت سے اور کشتی کو تخت سے مشابہت دی اور کشتی میں سوار ہونے کو تخت سلطنت پر بادشاہ کے بیٹھنے کے مشابہ قرار دیا۔اور اس طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ اشارہ فرمایا کہ وہ لوگ اگرچہ اپنی جان ہتھیلی پر رکھ کر اتنی خطرناک مہم پر روانہ ہوں گے لیکن مقصد کے حصول کے لئے اخلاص و یقین اور رضائے الٰہی کے حصول کا جذبہ صادق رکھنے کی وجہ سے ان کے دلوں میں نہ کوئی خوف ہوگا نہ گھبراہٹ اور وہ اس قدر ذہنی اطمینان وسکون اور قلبی طمانیت ونشاط کے ساتھ کھلے سمندر میں سفر کریں گے اور کشتیوں میں بیٹھے ہوئے ہوں گے جیسے کوئی بادشاہ اپنے محفوظ و مامون محل میں تخت سلطنت پر اطمینان سے بیٹھا ہو۔

شرح مسلم میں ہے بعض لوگ کہتے ہیں یہ ان مجاہدین کی اخروی حالت بتائی گئی ہے کہ جب وہ جنت میں داخل ہوں گے تو تخت پر براجمان ہوں گے۔لیکن صحیح یہ ہے کہ یہ دنیاوی اعتبار سے ان کی کیفیت بتلائی گئی ہے کہ خوش حالی کی وجہ سے بادشاہوں کی طرح شاہی سواریوں پر سوار ہوں گے اور اپنے کاموں کو نہایت استقامت کے ساتھ پورے کیا کریں گے اور مسلمانوں کی کثرت کی وجہ سے کسی دشمن کا خوف سوار نہیں ہوگا۔حدیث کے اس جملہ سے اس بات کی طرف اشارہ ہو رہا ہے کہ دونوں معنی کے اعتبار سے یہاں حال مقدر بخلاف طیبی رحمۃ اللہ علیہ کے کلام کے۔

(فقلت ...... فدعالها) جملہ فدعالہامیں کئی احتمال ہیں۔التفات ہے یا تجرید ہے یا نقل بالمعنی ہے یا یہ حضرت انس رضی اللہ عنہ کا کلام ہے (یارسول اللہ...... من الاولین) من الاولین سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اولین کا درجہ آخرین سے اونچا ہے اور فی الاولی یہ راوی کا کلام ہے جو خلاصہ کے طور پر۔(فرکبت ام حرام البحر فی زمن معاویہ) روایت کے ان الفاظ سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ام حرام کی سفر جہاد میں روانگی اور پھر سواری سے گر کر وفات پانے کا واقعہ حضرت امیر معاویہ کے زمانہ حکومت کے دور کا ہے جبکہ اسماء الرجال اور سیر کی کتابوں میں ان کی وفات حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی خلافت کے زمانے میں بیان کی گئی ہے۔اس سلسلے میں اصل بات یہ ہے کہ یہاں حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے زمانے سے مراد ان کی گورنری کا زمانہ ہے یعنی حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی خلافت کے زمانے میں جب حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ عامل و گورنر تھے اس وقت یہ واقعہ پیش آیا تھا۔لہٰذا دونوں روایتوں کے درمیان کوئی تزاد نہیں۔فصرعت عن دابتها: صرعت مجہول صیغہ کے ساتھ یعنی سواری کی پشت سے گر پڑی (فهلكت) ای ماتت (مرگئی) اس کی نظیر قرآن کی آیت حتی اذا هلك ہے یعنی جب یوسف علیہ السلام فوت ہوئے شیخین کے علاوہ نسائی ترمذی اور ابوداؤد نے بھی نقل کیا ہے۔

حضرت ضماد رضی اللہ عنہ ازدی کا قبول اسلام

۵۸۶۰ : وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ اِنَّ ضِمَادًا قَدِمَ مَكَّةَ وَكَانَ مِنْ اَزْدِ شَنُوْءَةَ وَكَانَ يَرْقِىْ مِنْ هٰذَا الرِّيْحِ فَسَمِعَ سُفَهَآءَ اَهْلِ مَكَّةَ اِنَّ يَقُوْلُوْنَ مُحَمَّدًا مَجْنُوْنٌ فَقَالَ لَوْ اِنِّىْ رَاَيْتُ هٰذَا الرَّجُلَ لَعَلَّ اللّٰهُ يَشْفِيْهُ عَلٰى يَدِىْ قَالَ فَلَقِيَهُ فَقَالَ يَا مُحَمَّدُ اِنِّىْ اَرْقِىْ مِنْ هٰذَا الرِّيْحِ فَهَلْ لَكَ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ

صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ الْحَمْدُ لِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَنَسْتَعِيْنُهٗ مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ مَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَا هَادِىَ لَهٗ وَاَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ وَاَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ اَمَّا بَعْدُ فَقَالَ اَعِدْ عَلَيَّ كَلِمَاتِكَ هٰؤُلَاءِ فَاَعَادَهُنَّ عَلَيْهِ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ثَلٰثَ مَرَّاتٍ فَقَالَ لَقَدْ سَمِعْتُ قَوْلَ الْكَهَنَةِ وَقَوْلَ السَّحَرَةِ وَقَوْلَ الشُّعَرَآءِ فَمَا سَمِعْتُ مِثْلَ كَلِمَاتِكَ هٰؤُلَاءِ وَقَدْ بَلَغْنَ قَامُوْسَ الْبَحْرِ هَاتِ يَدَكَ اُبَايِعْكَ عَلَى الْاِسْلَامِ قَالَ فَبَايَعَهٗ (رواه مسلم وفي بعض نسخ المصابيح بلغنا نا عوس البحر وذكر حديث ابي هريرة وجابر بن سمرة) يَهْلِكُ كِسْرٰى وَالْاٰخَرُ لَتَفْتَحَنَّ عَصَابَةٌ فِي بَابِ الْمَلَاحِمِ۔

اخرجه مسلم في صحيحه ٥٩٣/٢ حديث رقم(٤٦-٨٦٨) واحمد في المسند ٣٠٢/١۔

ترجمہ:''حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے' فرماتے ہیں کہ ایک شخص جس کا نام ضماد تھا' اور قبیلہ ازشنوءہ سے تعلق رکھتا تھا (اسلام کے ابتدائی زمانہ میں) مکہ آیا وہ ہوا (یعنی آسیب وجن) اتارنے کے لئے جھاڑ پھونک کیا کرتا تھا جب اس نے مکہ کے نادانوں سے یہ سنا کہ محمد ﷺ کو جنون ہوگیا ہے تو اس نے کہا کہ اگر میں اس شخص (محمد ﷺ) کو دیکھوں (تو علاج کردوں) شاید اللہ تعالیٰ اس کو میرے علاج سے شفا دے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ اس کے بعد ضماد آپ ﷺ کی خدمت میں آیا اور کہا کہ اے محمد (ﷺ) میں جھاڑ پھونک کے ذریعہ آسیب وجن دفع کرتا ہوں' اگر آپ چاہیں تو میں اپنی جھاڑ پھونک کے ذریعہ آپ کا علاج کروں؟ رسول اللہ ﷺ نے اس کے جواب میں ارشاد فرمایا:''تمام تعریفیں اللہ ہی کے لئے ہیں' ہم اسی کی حمد وثنا کرتے ہیں (اس کی نعمتوں کا شکر ادا کرتے ہیں) اور اسی سے (ذکر وطاعت اور عبادت کی توفیق اور) مدد چاہتے ہیں' وہ جسے ہدایت دیدے (اور راہ یاب کرے) اس کو کوئی گمراہ نہیں کرسکتا اور جس کو وہ راستہ سے بھٹکا دے اس کو کوئی ہدایت نہیں کرسکتا اور منزل مقصود تک نہیں پہنچا سکتا۔ میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں' وہ یکتا ہے کوئی اس کا شریک نہیں اور میں گواہی دیتا ہوں کہ محمد اللہ کے بندے اور اللہ کے رسول ہیں۔ امابعد! ضماد (یہاں تک سننے کے بعد) بے ساختہ بولا کہ ان کلمات کو ایک مرتبہ پھر میرے سامنے دہرا دیجئے' آپ ﷺ نے یہ کلمات اس کو تین مرتبہ سنائے۔ ضماد نے کہا''میں نے کاہنوں' ساحروں اور شاعروں کا کلام سنا ہے لیکن (خدا کی قسم) آج تک میں نے اس کلام جیسا کوئی کلام نہیں سنا' حقیقت تو یہ ہے کہ آپ ﷺ کے یہ کلمات (فصاحت وبلاغت اور تاثیر کے اعتبار سے) دریائے علم وکلام کی انتہائی گہرائیوں تک پہنچے ہوئے ہیں' لائیے اپنا ہاتھ بڑھائیے' میں (آپ ﷺ) کے دست مبارک پر) اسلام کی بیعت کرتا ہوں۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ ضماد نے (اسی وقت) آپ ﷺ کے ہاتھ پر بیعت کی (اور مسلمان ہوگیا)۔''۔(مسلم)

تشریح:(قال: ان صماد) یہ لفظ ضماد اصل میں ضاد کی کسرہ یا ضمہ' میم مخففہ اور آخر میں دال کیس اتھ ہے لیکن بعض حضرات نے اس نام کو آخر میں میم کے ساتھ یعنی ضمام نقل کیا ہے (قدم علة) قدم قاف کی کسرہ کے ساتھ (سمع سے ہے) دوران سفر مکہ میں اترا (یعنی آیا) (وكان من ارد شنوء ة) لفظ شَنُوْءَة حرف اول اور ثانی کے ضمہ پھر واؤ اس کے بعد ہمزہ اور

آخر میں ہاء کے ساتھ یمن کے ایک بہت بڑے قبیلہ کا نام ہے اور ازد اسی قبیلہ کی ایک شاخ کو کہتے ہیں ابن الملکؒ فرماتے ہیں لفظ ضماد ضاد معجمہ کے ضمہ اور کسرہ دونوں کیس اتھ صحیح ہے ایک شخص کا نام ہے یہ آنحضرت کے پرانے دوست تھے اور (و کان یرقی) قاف کے کسرہ کے ساتھ (ضرب سے ہے) یعنی جھاڑ پھونک ان کا خاص فن اور پیشہ تھا (من هذا الريح) طیبی رحمہ اللہ لکھتے ہیں اسم اشارہ ہٰذا سے بیماری کی سب کے طرف اشارہ ہے جس کا جھاڑ پھونک کے ذریعہ علاج کی اجاتا تھا یعنی اہل مکہ آپ کے کام کو جنون سے تعبیر کرتے تھے۔ تورپشتیؒ لکھتے ہیں ہٰذا الریح سے مراد ان کی یہ تھی کہ نعوذ باللہ ان پر آسیب کا اثر ہے یا ان پر دیوانگی کا مرض غالب آ گیا ہے اور اس کو الریح سے تعبیر کرتے تھے اب وموسیٰؒ کہتے ہیں الریح سے یہاں آسیب کا اثر ہے اور ریح اس لئے کہتے تھے کہ جنات بھی ہوکی طرح نظر نہیں آتے ہیں (ہٰذا الرجل) اگر واقعہ اس میں مذکور اوصاف پالوں تو میں ان کا علاج کروں گا یہاں کلمہ لو کا جواب مقدر ہے اور لو تمنی کے لئے ہے کیونکہ جملہ (لعل الله...... فهل لك) اس کا قرینہ ہے۔ یعنی شاید اللہ کرے گا میرے سبب سے ان کا علاج ہو جائے۔

قال: اس قال کا فاعل ابن عباسؓ ہے (فلقيه) ضمیر مفعول کا مرجع لفظ محمد ﷺ ہے (فقال: فهل لك؟) یعنی اگر تم کو رغبت ہے تو میں جھاڑ پھونک سے آپ کا علاج کروں اور جنات سے آپ کی جان چھڑاؤں؟ (فقال ﷺ ان الحمد لله) کوئی تعریف کرے یا نہ کرے تمام تعریفوں کا لائق وہی ہے (نحمده) کیونکہ اس کی تعریف کرنا ہم پر واجب بھی ہے اور اس کا نفع بھی ہمیں نصیب ہوتا ہے (و نستعينه) ہم تمام امور میں اس سے مدد طلب کرتے ہیں (من يهده الله) یعنی جس کو اپنے فضل سے توحید کا راستہ دکھاتا ہے اور اپنے واحدانیت کی فکر سمجھاتا ہے (فلا مضل له' و من يضلل) اور جس شخص کو خود ہدایت کے راستہ چھوڑنے کی وجہ سے سیدھے راستے سے بھٹکا دیتا (فلا هادی له...... وحده) وہی یکتا ہے یہ جملہ ماقبل کی تاکید ہے (لاشريك له) یہ جملہ بھی اسی مضمون کی تاکید ہے جملہ اول سے توحید ذات اور ثانی سے توحید صفات کا اثبات ہے (واشهد ان محمدا عبده) ایسا بندہ ہے کہ جس کو شرف سے نوازا ہے (و رسوله) اور رسول کی حیثیت سے بھی سب سے بڑی عظمت شرف اور کرم سے نوازا گیا ہے (اما بعد) آنحضرت ﷺ نے چاہا تھا کہ ان کے سامنے ایک ایسا خطبہ عظیمہ اور موعظ جسیمہ ارشاد فرمادے کہ جس جس تمام بلغاء عاجز اور فصحاء متحیر ہو جائیں تا کہ حقیقی طور پر عقلمند لوگ جان لیں کہ ان کو مجنون کہنے والے خود مجنون اور بیوقوف ہیں ابھی حمد و ثناء کے کلمات اور تمہیدی جملے ہی ارشاد فرماتے تھے کہ زبان رسالت کے اعجاز نے ضماد کو آگے کچھ اور سننے کی ضرورت باقی رہنے دی اور حضرت ضماد کو خطبہ کے ان تمہیدی جملوں کو سن کر اپنے دل و دماغ کی دنیا بدلتی محسوس ہونے لگی تو درخواست کی (فقال: اعد علی کلمائت هؤلاء) آپ ان کلمات مبارکہ کو پھر دھرا دیں (فأعادهن...... مرات)۔

ثلاث مرات: یا تو اپنی عادت مبارکہ کے مطابق تین مرتبہ دھرایا مقام افادہ میں تمام استفادہ کے لئے مبالغۃ تین مرتبہ دھرایا (لقد سمعت قو الكهنة) الکھنہ کاف اور ہاء دونوں کے فتحہ کے ساتھ کاہن (نجومی) کی جمع ہے عبارات مسجعہ اور اشارات مبتدعہ کے ذریعہ لوگوں کو غیب کی جھوٹی خبریں دینے والوں کو کہتے ہیں (وقول السحرة) یہ جمع ہے ساحر (جادوگر) کی جو اپنے فعل یا قول (منتر) کے ذریعہ لوگوں کی آنکھیں اور ذہن کی بندش کرتے ہیں (وقول السحرة) یہ جمع ہے ساحر (جادوگر) کی جو اپنے فعل یا قول (منتر) کے ذریعہ لوگوں کی آنکھیں اور ذہن کی بندش کرتے ہیں (قول الشعراء) یہ شاعر کی

جمع ہے جو اپنی چرب زبانی سے اچھے کو برا اور برے کو اچھا بتائے رہتے ہیں۔

حضرت ضمادؓ کا مقصد یہ تھا کہ تم کفار کبھی آپ ﷺ کی نسبت کہانت کی طرف کرتے ہیں **(فما سمعت)** میں نے ان لوگوں جتنے کے کلامات کو ہیں وہ آپ کے مبارک کلمات جیسے نہیں اگر آپ ﷺ کا ہم' ساحر اور شاعر ہوتے تو آپ کا کلام کا ضرور بضرور ان کے کلام سے مشابہت ہوتی جبکہ آپ کا کلام ان کے کلام سے بہت زیادہ بلیغ ہے آپ کو کوئی بیوقوف ہی مجنون کہہ سکتا ہے عاقل شخص سے یہ بہت زیادہ دور کی بات ہے کفار قریش اپنے زعم میں کاہن' ساحر اور شعراء کو لوگوں میں سب سے زیادہ صاحب بلاغت اور متصرفین سمجھتے تھے چاہئے ان کا اسلوب بیان جیسا تیسا کیوں نہ ہو یہ جملہ کہہ کر حضرت ضمادؓ نے اس بات کی طرف اشارہ فرمایا کہ آپ کے کلام کا اعجاز اتنا اونچا ہے کہ بلاغت کے تمام درجات سے متجاوز کر چکا ہے۔

حاصل یہ ہے کہ حضرت ضماد نے فوراً آپ کے کلام کو قبول فرمالیا تا کہ آپ کے دشمن کو اپنے جہل اور آپ ﷺ کے کمال عقل کا علم ہو جائے۔

طیبی رحمہ اللہ لکھتے ہیں آپ ﷺ کا قول مبارک **ان الحمد لله** یہ حضرت ضماد کے قول کا جواب ہے کہ جب انہوں نے کفار قریش سے سنا نعوذ باللہ محمد ﷺ مجنون ہو گئے ہیں تو وہ ان کی جھوٹی بات پہ اعتقاد کرتے ہوئے اور آپ ﷺ پر شفقت کرتے ہوئے آپ کی خدمت میں آیا اور کہنے لگا **هل لك رغبة في ان ارقيك و اخلصك من الجنون؟** تو آپ ﷺ نے ان کی بات کی طرف التفات کئے بغیر ان کو خالص حق اور سفید سچ کی طرف رہنمائی کرتے ہوئے فرمایا کہ نہ میں مجنون ہوں اور نہ مجنوں کی طرح کی بہکی باتیں کرتا ہوں میرا تو کلام الحمد للہ اور اس کی مانند اعجاز والا کلام ہوا کرتا ہے تم لوگ غور سے دیکھو اور بتاؤ کیا مجنون لوگ اس طرح کے کلمات کہہ سکتے ہیں آپ ﷺ کے اس قول مبارک کا مفہوم باری تعالیٰ کے قول مبارک **(ويقولون: انه لمجنون وما هو الا ذكر للعالمين)** (القلم) میں بھی ہے کہ جو لوگ آپ کو مجنون کہتے ہیں حقیقت میں ان لوگوں پر قرآن کریم کی تاثیر کو دیکھ کر جنون طاری ہے۔

قرآن تو خدا کا ذکر ہے اور جہاں والوں کے لئے نصیحت ہے جس ہستی کے پاس اس جیسا کلام آتا ہو وہ کیسے مجنون ہو سکتا ہے؟ ملا علی قاریؒ لکھتے ہیں مجنون تو وہ ہوتا ہے جو مخلوق کے کلام میں مشغول ہو کر ذکر حق سے غافل ہو جائے ذکر حق میں مجنون کی سی کیفیت دھارنا تو اصل زندگی ہے چنانچہ آنحضرت ﷺ کا ارشاد ہے **(اذكر الله حتى يقولوا مجنون)** اللہ کا ذکر اس طرح کرو کہ لوگ تمہیں مجنون کہیں۔

پھر طیبی رحمہ اللہ لکھتے ہیں **فما سمعت مثل كلمات هولاء** سے کلمات کی طرف اشارہ ہے عرب بسا اوقات غیر عاقل کے لئے بھی استعمال کرتے ہیں اس کی مثال قرآن کریم میں بھی موجود ہے چنانچہ باری تعالیٰ کا ارشاد: ﴿ان السمع والبصر والفواد كل اولئك كان عنه مسؤلا﴾ (الاسراء:۳۶) اولٰئك سے غیر عاقل کی طرف اشارہ ہے اور شاعر کا قول ہے

اور شاعر کا قول ہے:

ذم المنازل بعد منزلة اللوى
والعيش بعد اولئك الايام

یہاں بھی اولئک سے غیر عاقل کی طرف اشارہ ہے

(وقد بلغن): یعنی آپ کے کلمات مبارکہ فصاحت وبلاغت کے اعتبار سے ایسے جامع حروف پر مشتمل ہیں کہ جن کے موتیوں کو نکالنے اور ظاہر کرنے سے غوطہ خور عاجز ہیں کیونکہ اس میں ایسے دلائل اور علم کے سمندر ہیں کہ جو اعجاز کے اعتبار سے انتہائی گہرائی تک پہنچے ہوئے ہیں۔

(قاموس البحر): صاحب قاموس لکھتے ہیں القمس کے معنی غوطہ لگانے کا ہے اور القمس و القوس کا معنی بڑے دریا کے ہیں جیسے قاموس کو قاموس البحر بھی کہتے ہیں یا ایسے مقام کو کہتے ہیں جس میں نہای گہرائی ہو۔(هات): تا کی کسرہ کے ساتھ یعنی ہاتھ دیجئے۔(يدك ابا يعلك): جواب امر ہونے کی وجہ سے مجزوم ہے۔

(وفي بعض نسخ المصابيح: بلغنا): بلغنا جمع متکلم کے صیغہ کے ساتھ۔(ناعوس البحر): لفظ ناعوس نون اور عین کے ساتھ تصحیف اور تحریف ہے کیونکہ لغت کی مشہور کتاب میں لفظ ناعوس نہیں ملتا۔امام تورپشتیؒ فرماتے ہیں مصابیح میں بلغن کی جگہ بلغنا کا لفظ ہے، یہ خطاء ہے کیونکہ روایۃً اور معنی کے لحاظ سے اس کی تقویم کی کوئی صورت نہیں بنتی اس لئے کہ اس لفظ کے ساتھ کوئی روایت وارد نہیں ہوئی ہے۔اسی طرح ناعوس البحر کے الفاظ بھی غلط ہیں، اگرچہ صحیح مسلم کی روایت میں ناعوس کا لفظ ہے لیکن صحیح مسلم کے علاوہ دوسری کتابوں کی مشہور روایتوں میں لفظ قاموس لکھا ہے۔اس لئے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ کسی راوی کا وہم ہے، شاید یوں ہوا ہے کہ کسی راوی نے سننے میں خطاء کی ہے اور پھر اسی طرح غلطی کے ساتھ روایت کر دی ہے جو آگے نقل ہوگئی ہے۔کیونکہ لغت عرب میں یہ کبھی سنا نہیں گیا ہے، لہٰذا اصل لفظ قاموس البحر ہے موقع مناسبت کے مطابق بھی یہی لفظ سب سے زیادہ مناسب ہے [کیونکہ قاموس، قمس سے ہے جس کی تفصیل چند سطر قبل تحریر کر دی گئی ہے' القاموس کے حوالے سے]

طیبی رحمہ اللہ کہتے ہیں: لفظ بلغن کی جگہ بلغنا اگر بطور روایت نقل کیا گیا ہے تو یہ خطاء ہے اور اس کی خطائی کا ہم انکار نہیں کر سکتے، کیونکہ کتب اصول میں یہ لفظ روایۃً موجود نہیں۔اور اگر معنیٰ کے اعتبار سے نقل کیا گیا ہے تو صحیح ہے کیونکہ معنی سے ہم ہیرے اور موتیوں کے گرداب اور پہنائی تک پہنچ گئے ہیں اب اس کے ہیرے جواہرات کو سمیٹنے اور لوٹنے کا وقت ہے۔کہ غوطہ لگا کے حاصل کرنا ہے۔

ملا علی قاریؒ فرماتے ہیں: شیخ تورپشتیؒ نے معنی لغوی حقیقی کی نفی کی ہے نہ کہ معنی مجازی کی، جو اشارہ صوفیہ کے مشابہ ہے اس لئے آپ خوب تدبر اور متنبہ رہیں باقی یہ جو کہا ہے کہ ناعوس البحر بھی خطاء ہے یہ بات ٹھیک نہیں کیونکہ امام محی الدین نوویؒ شرح مسلم میں لکھتے ہیں ہم نے اس لفظ کو دونوں طرح یعنی ناعوس بھی نقل کیا ہے۔ہمارے یہاں صحیح مسلم کے جو نسخے پائے جاتے ہیں اس میں ناعوس ہی کا لفظ ہے

قاموس البحر یعنی قاف اور میم کے ساتھ۔صحیح مسلم کے علاوہ دوسری کتابوں میں مشہور روایتوں میں یہی لفظ لکھا ہوا ہے اور یہ قول شیخ تورپشتیؒ کے قول کے منافی ہے کیونکہ روایۃً اس کے نقل کے محدثین منکر نہیں ہے البتہ لغۃً اور درایۃً اس پر جرح کرتے ہیں۔امام نوویؒ مزید لکھتے ہیں: قاضی عیاضؒ نے لکھا ہے کہ بعض حضرات نے نون اور عین کے ساتھ اس کو نقل کیا ہے ہمارے شیخ

ابوالحسین نے کہا ہے ناعوس کا وہی معنی ہے جو قاموس کا ہے۔ ملا علی قاریؒ فرماتے ہیں شیخ ابوالحسینؒ کے کلام سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ مشہور لفظ قاموس ہی ہے کیونکہ وہ فرمار ہے ہیں ''ناعوس کا معنی قاموس جیسا ہی ہے''۔ لفظ ناعوس ایک روایت میں ہے جس کو معنی کی بنیاد بنا صحیح تھا اس لئے کہا، یہ قاموس کے معنی میں ہے اگر چہ کلام عرب میں مسموع نہ بھی ہو۔ امام نوویؒ فرماتے ہیں النہایہ میں ابوموسیٰؒ کا قول نقل کیا ہے وہ فرماتے ہیں صحیح مسلم میں یہ لفظ ناعوس البحر ہی کے ساتھ ہے، مسلم کے علاوہ دوسری کتابوں کی مشہور روایات میں قاموس البحر ہے جس کا معنی دریاء کا وسط اور گرداب و پہنائی ہوتی ہے، اس کے معنی سے واقفیت نہ ہونے کی وجہ سے کسی نے تصحیف کر دی ہے کیونکہ مسند اسحاق بن راہویہ میں یہ لفظ بالکل موجود نہیں جہاں سے مسلمؒ نے یہ حدیث روایت کیا ہے، یوں لگتا ہے کہ ابوموسیٰ نے اس کو ملایا ہے شاید اسی وجہ سے اس نے یہ بات کہی ہے اور ہوتا ہے بھی اس طرح کہ جب انسان کوئی لفظ لے آتا ہے پھر کتب میں تلاش کے بعد نہیں ملتا تو متحیر ہو جاتا ہے جب اس نے ہماری کتاب کو دیکھا تو اس کا اصل اور معنی پہچان لیا ہوگا۔ ملا علی قاریؒ فرماتے ہیں ان تمام باتوں سے شیخ تورپشتیؒ کے بات کی تائید ہوتی ہے کہ انہوں نے اس لفظ کے روایۃً عدم صحت کی جو بات کی تھی وہی اصل بات ہے۔

طیبی رحمہ اللہ کہتے ہیں: اس لفظ کے درایت کے متعلق قاضی ناصر الدین فرماتے ہیں ناعوس البحر پانی کے اس کثیر حصہ والی جگہ کو کہا جاتا ہے کہ جس کے نچلے حصہ سے موتیاں نکالنے کے لئے غوطہ خوری کی جاتی ہے۔ اور یہ لفظ نعس سے نوم کے معنی میں ہے کیونکہ جہاں پانی گہرا ہوتا ہے تو اس کی حکت ظاہر نہیں ہوتی اور یوں محسوس ہوتا ہے کہ سویا ہوا ہے میں کہتا ہوں پہلے عرش بنتا ہے پھر فرش بچھتا ہے لہٰذا روایت کی تحقیق مقدم ہے درایت کی باریکیوں سے، باوجود اس کے کہ یہ اس کا لغوی معنی نہیں بلکہ معنی مجازی کو صحیح بنانے کے لئے ایک طرح کی تکلف اور تعسف ہے۔ میں تو شیخ کے قول کو ترجیح دیتا ہوں کیونکہ لفظ ناعوس ان الفاظ میں سے ہے جو لغت عرب میں نہیں سنا گیا ہے۔ ملا علی قاریؒ فرماتے ہیں: طیبی رحمہ اللہ نے ایک انوکھی بات لکھی ہے کہ ممکن ہے ناعوس البحر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات سے (استعارہ) ہو کیونکہ جہاں ممکنات ہوتی ہیں ان میں سے یہ بھی ممکن ہے کہ لفظ ناعوس' قاموس میں حقیقت ہو اور لفظ ناعوس لغت خفی ہو جس کی وجہ سے مشہور نہ ہوا ہو۔ لیکن طیبی رحمہ اللہ کی یہ بات اس لئے صحیح نہیں کہ اگر ہم امکان کا دروازہ کھول دیں تو تحقیق نام کی کوئی چیز ہی باقی نہیں رہے گی۔

واللہ المستعان...... (وذكر...... ابی سمرة): دونوں حدیث کی اضافت دونوں روایتوں لف نشر مرتب کی ترتیب پر ہے، پہلی روایت کے الفاظ **يهلك كسرى** ہے اور دوسری روایت کے الفاظ میں **"لتفتحن عصابة"** کے ساتھ منقول جنہیں جن کو باب الماحم میں ذکر کیا گیا ہے۔ **فی باب الملاحم:** یہ فعل محذوف ذکر کے ساتھ متعلق ہے اس کی توجیہ بار بار کر دی گئی ہے اسی طرح **وهذا الباب خالٍ عن الفصل الثانی** کی بھی وجہ کئی مرتبہ ذکر کر دی گئی ہے۔

الفصل الثانی:

وَهٰذَا الْبَابُ خَالٍ عَنِ الْفَصْلِ الثَّانِيْ

اور اس باب میں دوسری فصل نہیں ہے

الفصل الثالث:

۵۸۶۱: عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ حَدَّثَنِي اَبُو سُفْيَانَ بْنُ حَرْبٍ مِنْ فِيْهِ اِلٰى فِيَّ قَالَ انْطَلَقْتُ فِي الْمُدَةِ الَّتِي كَانَتْ بَيْنِي وَبَيْنَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ فَبَيْنَا اَنَا بِالشَّامِ اِذْ جِيءَ بِكِتَابٍ مِّنَ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِلٰى هِرَقْلَ قَالَ وَكَانَ دِحْيَةُ الْكَلْبِيُّ جَاءَ بِهٖ فَدَفَعَهٗ اِلٰى عَظِيْمِ بُصْرٰى فَدَفَعَهٗ عَظِيْمُ بُصْرٰى اِلٰى هِرَقْلَ فَقَالَ هِرَقْلُ هَلْ هٰهُنَا اَحَدٌ مِّنْ قَوْمِ هٰذَا الرَّجُلِ الَّذِيْ يَزْعَمُ اَنَّهٗ نَبِيٌّ قَالُوْا نَعَمْ فَدُعِيْتُ فِي نَفَرٍ مِّنْ قُرَيْشٍ فَدَخَلْنَا عَلٰى هِرَقْلَ فَاُجْلِسْنَا بَيْنَ يَدَيْهِ فَقَالَ اَيُّكُمْ اَقْرَبُ نَسَبًا مِّنْ هٰذَا الرَّجُلِ الَّذِيْ يَزْعَمُ اَنَّهٗ نَبِيٌّ قَالَ اَبُوْسُفْيَانُ فَقُلْتُ اَنَافَا جَلَسُوْنِي بَيْنَ يَدَيْهِ وَاَجْلَسُوْا اَصْحَابِي خَلْفِي ثُمَّ دَعَا بِتَرْجُمَانِهٖ فَقَالَ قُلْ لَهُمْ اِنِّي سَائِلٌ هٰذَا عَنْ هٰذَا الرَّجُلِ الَّذِيْ يَزْعَمُ اَنَّهٗ نَبِيٌّ فَاِنْ كَذَبَنِي فَكَذِّبُوْهُ قَالَ اَبُو سُفْيَانَ وَاَيْمُ اللّٰهِ لَوْ لَا مَخَافَةُ اَنْ يُؤْثَرَ عَلَيَّ الْكَذِبُ لَكَذَبْتُهٗ ثُمَّ قَالَ لِتَرْجُمَانِهٖ سَلْهُ كَيْفَ حَسَبُهٗ فِيْكُمْ قَالَ قُلْتُ هُوَ فِيْنَا ذُوْ حَسَبٍ قَالَ فَهَلْ كَانَ مِنْ اٰبَائِهٖ مِنْ مَلِكٍ قُلْتُ لَا قَالَ فَهَلْ كُنْتُمْ تَتَّهِمُوْنَهٗ بِالْكَذِبِ قَبْلَ اَنْ يَّقُوْلَ مَا قَالَ قُلْتُ لَا قَالَ وَمَنْ يَّتْبَعُهٗ اَشْرَافُ النَّاسِ اَمْ ضُعَفَاءُ هُمْ قَالَ قُلْتُ بَلْ ضُعَفَائُهُمْ قَالَ اَيَزِيْدُوْنَ اَمْ يَنْقُصُوْنَ قَالَ قُلْتُ لَا بَلْ يَزِيْدُوْنَ قَالَ هَلْ يَرْتَدُّ اَحَدٌ مِّنْهُمْ عَنْ دِيْنِهٖ بَعْدَ اَنْ يَّدْخُلَ فِيْهِ سَخْطَةً لَهٗ قَالَ قُلْتُ لَا قَالَ فَهَلْ قَاتَلْتُمُوْهُ قُلْتُ نَعَمْ قَالَ فَكَيْفَ كَانَ قِتَالُكُمْ اِيَّاهُ قَالَ قُلْتُ يَكُوْنُ الْحَرْبُ بَيْنَنَا وَبَيْنَهٗ سِجَالًا يُّصِيْبُ مِنَّا وَنُصِيْبُ مِنْهُ قَالَ فَهَلْ يَغْدِرُ قُلْتُ لَا وَنَحْنُ مِنْهُ فِي هٰذِهِ الْمُدَّةِ لَا نَدْرِيْ مَا هُوَ صَانِعٌ فِيْهَا قَالَ وَاللّٰهِ مَا اَمْكَنَنِي مِنْ كَلِمَةٍ اُدْخِلُ فِيْهَا شَيْئًا غَيْرَ هٰذِهٖ قَالَ فَهَلْ قَالَ هٰذَا الْقَوْلَ اَحَدٌ قَبْلَهٗ قُلْتُ لَا ثُمَّ قَالَ لِتَرْجُمَانِهٖ قُلْ لَهٗ اِنِّي سَاَلْتُكَ عَنْ حَسَبِهٖ فِيْكُمْ فَزَعَمْتَ اَنَّهٗ فِيْكُمْ ذُوْ حَسَبٍ وَكَذٰلِكَ الرُّسُلُ تُبْعَثُ فِي اَحْسَابِ قَوْمِهَا وَسَاَلْتُكَ هَلْ كَانَ فِي اٰبَائِهٖ مَلِكٌ فَزَعَمْتَ اَنْ لَّا فَقُلْتُ لَوْ كَانَ مِنْ اٰبَائِهٖ مَلِكٌ قُلْتُ رَجُلٌ يَطْلُبُ مُلْكَ اٰبَائِهٖ وَسَاَلْتُكَ عَنْ اَتْبَاعِهٖ اَضُعَفَاءُ هُمْ اَمْ اَشْرَافُهُمْ فَقُلْتَ بَلْ ضُعَفَائُهُمْ وَهُمْ اَتْبَاعُ الرُّسُلِ وَسَاَلْتُكَ هَلْ كُنْتُمْ تَتَّهِمُوْنَهٗ بِالْكَذِبِ قَبْلَ اَنْ يَّقُوْلَ مَا قَالَ فَزَعَمْتَ اَنْ لَّا فَعَرَفْتُ اَنَّهٗ لَمْ يَكُنْ لِيَدَعَ الْكَذِبَ عَلَى النَّاسِ ثُمَّ يَذْهَبُ فَيَكْذِبُ عَلَى اللّٰهِ وَسَاَلْتُكَ هَلْ يَرْتَدُّ اَحَدٌ مِّنْهُمْ عَنْ دِيْنِهٖ بَعْدَ اَنْ يَّدْخُلَ فِيْهِ سَخْطَةً لَهٗ فَزَعَمْتَ اَنْ لَّا

وَكَذٰلِكَ الْإِيمَانُ إِذَا خَالَطَ بَشَاشَتُهُ الْقُلُوْبَ وَسَأَلْتُكَ هَلْ يَزِيْدُوْنَ اَمْ يَنْقُصُوْنَ فَزَعَمْتَ اَنَّهُمْ يَزِيْدُوْنَ وَكَذٰلِكَ الْإِيْمَانُ حَتّٰى يَتِمَّ وَسَأَلْتُكَ هَلْ قَاتَلْتُمُوْهُ فَزَعَمْتَ اَنَّكُمْ قَاتَلْتُمُوْهُ فَتَكُوْنُ الْحَرْبُ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُ سِجَالاً يَنَالُ مِنْكُمْ وَتَنَالُوْنَ مِنْهُ وَكَذٰلِكَ الرُّسُلُ تُبْتَلٰى ثُمَّ تَكُوْنُ لَهَا الْعَاقِبَةُ وَسَأَلْتُكَ هَلْ يَغْدِرُ فَزَعَمْتَ اَنَّهُ لَا يَغْدِرُ وَكَذٰلِكَ الرُّسُلُ لَا تَغْدِرُ وَسَأَلْتُكَ هَلْ قَالَ هٰذَا الْقَوْلَ اَحَدٌ قَبْلَهُ فَزَعَمْتَ اَنْ لَّا فَقُلْتُ لَوْ كَانَ قَالَ هٰذَا الْقَوْلَ اَحَدٌ قَبْلَهُ قُلْتُ رَجُلٌ اِئْتَمَّ بِقَوْلٍ قِيْلَ قَبْلَهُ قَالَ ثُمَّ قَالَ بِمَا يَاْمُرُكُمْ قُلْنَا يَاْمُرُنَا بِالصَّلٰوةِ وَالزَّكٰوةِ وَالصِّلَةِ وَالْعَفَافِ قَالَ اِنْ يَّكُ مَا تَقُوْلُ حَقًّا فَاِنَّهُ نَبِيٌّ وَقَدْ كُنْتُ اَعْلَمُ اَنَّهُ خَارِجٌ وَلَمْ اَكُ اَظُنُّهُ مِنْكُمْ وَلَوْ اَنِّيْ اَعْلَمُ اَنِّيْ اَخْلُصُ اِلَيْهِ لَاَحْبَبْتُ لِقَاءَهُ وَلَوْ كُنْتُ عِنْدَهُ لَغَسَلْتُ عَنْ قَدَمَيْهِ وَلَيَبْلُغَنَّ مُلْكُهُ مَا تَحْتَ قَدَمَيَّ ثُمَّ دَعَا بِكِتَابِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَرَاَهُ ۔ (متفق علیه وقد سبق تمام الحدیث فی باب الکتاب الی الکفار)

اخرجه البخاری فی صحیحه ۱/ ۳۰حدیث رقم ٦ ومسلم فی صحیحه۳/ ۱۳۹۳ حدیث رقم (۱۷۷۳۷٤)

ترجمہ: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے' فرماتے ہیں کہ ابوسفیان بن حرب نے میرے روبرو بیان کیا کہ اس صلح (حدیبیہ) کی مدت کے دوران جو میرے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے درمیان تھی (اور نہ صرف یہ کہ میں مسلمان نہیں ہوا تھا بلکہ دشمنانِ اسلام کا سردار تھا) میں نے سفر کیا اور اتفاق سے میں اس وقت شام میں ہی تھا جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا نامہ مبارک ہرقل (قیصر روم) کو موصول ہوا' ابوسفیان نے کہا کہ نامہ مبارک دحیہ کلبی رضی اللہ عنہ لے کر آئے تھے وہ انہوں نے حاکم بصریٰ کو دیا حاکم بصریٰ نے اس نامۂ مبارک کو ہرقل کی خدمت میں پیش کیا' ہرقل نے پوچھا کہ کیا اس شخص کی قوم کا کوئی آدمی یہاں ہے جو اپنے تئیں نبی ہونے کا مدعی ہے (تا کہ میں اس مدعی نبوت کے بارے میں معلوم حاصل کر کے یہ جان سکوں کہ وہ سچا ہے یا جھوٹا؟) اس کے درباریوں نے بتایا کہ ہاں (اس شخص کی قوم سے تعلق رکھنے والا ایک شخص ہے جو ہمارے یہاں تجارت کی غرض سے آیا ہوا ہے) چنانچہ مجھے قریش کی ایک جماعت کے ساتھ (جو بیس آدمیوں پر مشتمل تھی) ہرقل کے دربار میں طلب کیا گیا۔ جب ہم ہرقل کے پاس پہنچے تو ہمیں اس کے سامنے بٹھایا گیا (تا کہ آسانی کے ساتھ ہم اس کی اور وہ ہماری بات سن سکے) ہرقل نے پوچھا کہ تم میں سے کون آدمی اس شخص کا قریبی رشتہ دار ہے جو نبی ہونے کا مدعی ہے؟ ابو سفیان کا بیان ہے کہ (یہ سن کر) میں نے کہا کہ اس شخص کا سب سے قریبی رشتہ دار میں ہوں۔ اس کے بعد مجھے ہرقل کے سامنے (تخت شاہی کے قریب) بٹھا دیا گیا اور میرے ساتھ والوں کو میرے پیچھے بٹھا دیا گیا۔ پھر ہرقل نے اپنے ترجمان کو طلب کیا (جو عربی اور رومی دونوں زبانیں جانتا تھا) اور اس سے کہا کہ اس شخص (ابوسفیان) کے ساتھیوں سے کہہ دے میں اس (ابوسفیان) سے اس شخص کے حالات معلوم کروں گا جو نبوت کا دعویٰ کرتا ہے' اگر یہ ابوسفیان مجھ سے کوئی جھوٹ بولے مجھ کو کوئی غلط بتائے تو تم لوگ (بلا جھجک) اس کی تردید کرنا اور مجھے صحیح بات بتا دینا۔ ابوسفیان کہتے ہیں کہ خدا کی قسم اگر یہ ڈر نہ ہوتا کہ مجھے دروغ گو مشہور کر دیا جائے گا تو یقیناً میں ہرقل کے سامنے جھوٹ بولتا (اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں اس کو

صحیح بات نہ بتاتا) اس کے بعد ہرقل نے اپنے ترجمان سے کہا کہ ابوسفیان سے پوچھو! تمہارے درمیان اس شخص (آنحضرت ﷺ) کا حسب کیسا ہے؟ ابوسفیان کہتے ہیں کہ میں نے کہا کہ وہ شخص ہم میں حسب والا ہے یعنی اعلیٰ حسب رکھتا ہے۔ پھر ہرقل نے پوچھا کہ کیا اس شخص کے آباء واجداد میں کوئی بادشاہ گزرا ہے؟ میں نے کہا نہیں! پھر ہرقل نے پوچھا' ان کے اس دعوائے نبوت سے پہلے کسی نے انہیں جھوٹ سے متہم کیا ہے؟ (یعنی نبوت کا دعویٰ کرنے سے پہلے کے زمانہ میں کیا وہ جھوٹ بولا کرتا تھا یا کسی شخص نے کبھی اس پر جھوٹ کا الزام لگایا تھا؟) میں نے کہا نہیں! پھر ہرقل نے پوچھا اس کی پیروی کرنے والے (اور اس پر ایمان لانے والے) اشراف لوگ ہیں یا کمزور؟ ابوسفیان نے کہا: اس کے متبعین کرنے والے کمزور وضعیف لوگ ہیں۔ ہرقل نے پوچھا: اس شخص کے متبعین کی تعداد دن بدن بڑھ رہی ہے یا کم ہو رہی ہے؟ ابوسفیان نے کہا کہ کم نہیں ہو رہی ہے بلکہ زیادہ ہو رہی ہے۔ پھر ہرقل نے پوچھا: اس کے دین میں داخل ہونے کے بعد کوئی شخص اس سے ناخوش ہو کر (یا اس دین کی راہ میں پیش آنے والی سختیوں سے بیزار ہو کر) مرتد بھی ہوا ہے؟ ابوسفیان نے کہا: نہیں کوئی مرتد نہیں ہوا۔ ہرقل نے کہا کیا تم نے اس سے لڑائی کی ہے؟ میں نے جواب دیا: ہاں! پھر ہرقل نے پوچھا: اس سے تمہاری لڑائی کا انجام کیا ہوتا ہے؟ ابوسفیان نے کہا کہ میں نے جواب دیا: ہمارے اور اس کے درمیان ہونے والی جنگ ان دو ڈولوں کی طرح ہے جن کو بیک وقت پانی سے بھرنے کی کوشش کی جائے کہ کبھی ایک بھر جاتا ہے اور دوسرا خالی رہ جاتا ہے اور کبھی دوسرا بھر جاتا ہے تو پہلی خالی ہو جاتا ہے ایسے ہی کبھی ہم کامیاب ہو جاتے ہیں اور کبھی وہ (اسی طرح کبھی ہم اس کی وجہ سے مصیبتوں اور پریشانیوں میں مبتلا ہو جاتے ہیں اور کبھی وہ ہماری وجہ سے مصائب و تکلیف اٹھاتا ہے) پھر ہرقل نے پوچھا: کیا اس نے کبھی عہد شکنی بھی کی ہے؟ (یعنی کسی سے صلح کرنے کے بعد اپنے عہد و پیمان کو توڑ دیتا ہے؟) میں نے کہا: نہیں (پہلے تو کبھی ایسا نہیں ہوا کہ اس نے کسی سے صلح کی ہو اور اس کو از خود ختم کر دیا ہو' البتہ آج کل ہمارے اور اس کے درمیان جو صلح (یعنی صلح حدیبیہ) ہے اس کے بارے میں ہم نہیں کہہ سکتے کہ اس کی روش کیا رہے گی (آیا وہ اس صلح کو اس کی مدت ختم ہونے سے پہلے توڑ دے گا یا باقی رکھے گا) ابوسفیان کہتے ہیں کہ خدا کی قسم (ہرقل سے پورے سوال و جواب کے درمیان) صرف یہی ایک بات ایسی تھی جو میں نے اپنے جذبات کے تحت کہی تھی اس کے علاوہ اور کوئی بات میں نے اپنی طرف سے نہیں کہی (یعنی میں ہرقل کے کسی بھی سوال کے جواب میں کوئی ایسی بات کہنے پر قادر نہیں ہو سکا جو میرے نزدیک خلاف حقیقت تھی یا جس سے آنحضرت ﷺ کی توہین و تنقیص ہوتی' ہاں اس ایک بات کا اظہار اپنی طرف سے میں نے بے شک کیا کہ آج کل ہمارے اور ان کے درمیان جو صلح چل رہی ہے اس کے بارے میں ہمیں یہ خوف ہے کہ کہیں وہ عہد شکنی نہ کریں میری اس بات سے ذات رسالت کی طرف عہد شکنی کی نسبت کا احتمال ظاہر ہوتا تھا) پھر ہرقل نے پوچھا کیا اس نے پہلے بھی کسی نے یہ دعویٰ کیا ہے؟ (یعنی مشہور پیغمبروں جیسے ابراہیم علیہ السلام' اسماعیل' اسحٰق' یعقوب' اسباط' موسیٰ اور عیسیٰ علیہم السلام کے علاوہ تمہاری قوم سے کسی اور شخص نے بھی اس سے پہلے نبوت کا دعویٰ کیا ہے؟) میں نے جواب دیا: نہیں۔ (ان تمام سوال و جواب کے بعد) ہرقل نے (ضروری سمجھا کہ اپنے ان سوالوں کو جو نبوت و رسالت کے باب میں بنیادی اہمیت رکھتے ہیں عقل و نقل اور تجربہ و معلومات کی روشنی میں واضح کرے۔ چنانچہ اس نے) اپنے ترجمان سے کہا کہ تم اس (سفیان) سے کہو کہ میں نے اس شخص کے حسب کے بارے میں تم سے پوچھا اور تم نے بتایا کہ وہ ہم میں

حسب والا ہے تو حقیقت یہی ہے کہ رسول اور نبی اپنی قوم کے اشراف ہی میں سے ہوتے رہے ہیں۔ پھر میں نے پوچھا تھا کہ اس کے آباء واجداد میں کوئی بادشاہ تھا اور تم نے بتایا کہ کوئی نہیں' تو میں نے (اپنے دل میں) کہا کہ اگر اس کے آباء و اجداد میں کوئی بادشاہ ہوتا تو میں سمجھتا کہ وہ ایک ایسا شخص ہے جو اپنے باپ دادا کی حکومت کا طالب ہے (اور حکمرانی و سرداری کی اپنی اس طلب وخواہش کو نبوت کے دعوے کے ذریعہ ظاہر کررہا ہے) پھر میں نے تم سے پوچھا تھا کہ اس کی اتباع کرنے والے لوگ اپنی قوم کے شرفاء (یعنی دولت وثروت اور دنیاوی جاہ وحشم رکھنے والے ہیں یا کمزور وضعیف (یعنی مفلس ومسکین اور گوشہ نشین لوگ) ہیں اور تم نے بتایا کہ کمزور وضعیف لوگ اس کے تابعدار ہیں تو حقیقت یہ ہے کہ پیغمبروں کے تابعدار (عام طور پر) کمزور وضعیف لوگ ہی ہوتے ہیں۔ میں نے تم سے پوچھا تھا کہ اس وقت وہ جو کچھ کہتا ہے (یعنی دعویٰ نبوت) اس سے پہلے کیا تمہیں کبھی اس کے جھوٹ کا تجربہ ہوا ہے اور تم نے بتایا کہ نہیں تو مجھے یقین ہو گیا کہ جو شخص لوگوں سے جھوٹ نہیں بولتا وہ اللہ پر بھی جھوٹ نہیں بول سکتا۔ بولنے سے اجتناب کرے اور اللہ کی نسبت جھوٹ بولے۔ میں نے پوچھا تھا کہ اس کے دین میں داخل ہونے کے بعد کوئی شخص اس سے ناخوش ہو کر مرتد بھی ہوا ہے؟ اور تم نے بتایا تھا کہ نہیں' تو درحقیقت ایمان کا یہی حال ہے کہ وہ جب دلوں میں جگہ پکڑ لے اور روح اس کی لذت وحلاوت سے آشنا ہو جائے' تو پھر ہرگز جدا نہیں ہوتا (اور اگر شاذ ونادر کوئی شخص دین چھوڑ بھی بیٹھے تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اس کے دل میں ایمان سرے سے داخل وراسخ ہی نہیں ہوا تھا) میں نے تم سے پوچھا تھا کہ اس شخص کے تابعداروں کی تعداد روز بروز بڑھ رہی ہے یا گھٹ رہی ہے؟ اور تم نے بتایا تھا کہ بڑھ رہی ہے تو درحقیقت ایمان کا یہی حال ہے (کہ روز بروز اس کا دائرۂ اثر وسیع تر ہوتا جاتا ہے اور اہل ایمان کی تعداد بڑھتی رہتی ہے) اور آخر کار وہ پایۂ تکمیل واتمام کو پہنچ جاتا ہے۔ میں نے تم سے پوچھا تھا کہ کیا تم نے اس سے کوئی لڑائی لڑی ہے؟ اور تم نے جواب دیا تھا کہ ہاں لڑی ہے اور لڑائی کا انجام دو ڈولوں کی طرح ہوتا ہے کبھی وہ تم سے مصیبت اٹھاتا ہے اور کبھی تم اس سے مصیبت اٹھاتے ہو' تو حقیقت یہ ہے کہ رسولوں کا امتحان اسی طرح لیا جاتا ہے (کہ کبھی ان کو دشمنانِ دین پر غلبہ عطا کیا جاتا ہے اور کبھی دشمنوں کو ان پر غالب کردیا جاتا ہے) لیکن انجام کار رسولوں اور ان کے متبعین ہی کو کامل فتح ونصرت حاصل ہوتی ہے اور ان کا دین چھا جاتا ہے۔ میں نے تم سے پوچھا تھا کہ کیا آپ نے کبھی عہد شکنی کی ہے اور تم نے جواب دیا تھا کہ وہ عہد شکنی نہیں کرتے۔ حقیقت یہ ہے کہ رسول عہد شکنی نہیں کرتے اور میں نے تم سے سوال کیا تھا کہ...... تمہاری قوم میں اس سے پہلے بھی کسی نے یعنی نبوت کا دعویٰ کیا ہے؟ اور تم نے جواب دیا تھا کہ نہیں تو میں نے (اپنے دل میں) کہا کہ اگر اس سے پہلے کسی نے اس طرح نبوت کا دعویٰ کیا ہوتا تو کہا جاسکتا تھا کہ یہ بھی پہلے شخص کی پیروی میں اس طرح کا دعویٰ کررہا ہے۔ ابوسفیان کا بیان ہے کہ اس کے بعد ہرقل نے مجھ سے پوچھا کہ (اچھا یہ بتاؤ) وہ شخص تمہیں کس بات کا حکم دیتا ہے؟ میں نے کہا: وہ ہم سے کہتا ہے کہ نماز پڑھو' زکوۃ دو' ناتے داروں سے محبت اور اچھا سلوک کرو اور حرام چیزوں سے بچو۔ ہرقل نے (یہ سن کر) کہا: اگر تمہارا بیان درست ہے تو یقیناً وہ شخص پیغمبر ہے اور مجھے پہلے ہی معلوم تھا (کہ آخر زمانہ میں) ایک نبی ہونے والا ہے لیکن میرا یہ خیال نہیں تھا کہ وہ تمہاری قوم میں پیدا ہوگا' اگر میں جانتا کہ ان تک پہنچ سکوں گا تو ان سے ملاقات کرنا میرے لئے سب سے زیادہ پسندیدہ بات ہوتی اور اگر میں ان کے پاس حاضر ہوتا تو ان کے دونوں پاؤں (اپنے ہاتھ سے) دھوتا اور (میں تم کو بتاتا ہوں) اس کا

حکومت و اقتدار کا دائرہ اس زمین (ملک روم و شام تک) پہنچ جائے گا جو میرے قدموں کے نیچے ہے' پھر ہرقل نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے نامہ مبارک منگوا کر پڑھا۔ (بخاری و مسلم) اور یہ حدیث پیچھے باب الکتاب الی الکفار میں پوری نقل ہو چکی ہے''۔

تشریح: (من فیه الی في): من ابتدائیہ ہے جو واقعہ میں بیان کر رہا ہوں یہ ابوسفیان کی منہ سے میرے منہ میں منتقل ہوا درمیان میں کوئی واسطہ نہ تھا۔ یعنی براہ راست مجھ سے بیان کیا۔ طیبی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ حضرت ابن عباسؓ نے گویا یہ وضاحت کی ہے کہ ابوسفیان نے اپنا یہ واقعہ مجھ سے براہ راست خود بیان کیا ہے یہ نہیں کہ کسی واسطہ و ذریعہ سے مجھ تک نقل ہوا ہے۔ لیکن یہ کہنا زیادہ صحیح معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابن عباسؓ نے ان الفاظ کے ذریعہ یہ واضح کیا کہ جب ابوسفیان نے یہ واقعہ مجھ سے بیان کیا تو اس وقت میرے علاوہ کوئی اور موجود نہیں تھا، چنانچہ حدثنی اور في کا لفظ بھی اسی مطلب پر دلالت کرتے ہیں۔ کیونکہ اگر حضرت ابن عباسؓ کے علاوہ بھی کوئی موجود ہوتا تو فیه الی في کی حصر بیان کرنے کی ضرورت نہ تھی۔

(انطلقت في المدة التي کانت بیني وبین رسول الله ﷺ): یہ سن ۶ ھ میں ہوئی تھی اور صلح نامہ کی رو سے اس کی مدت دس سال قرار پائی تھی لیکن خود کفار مکہ نے اس صلح کو درمیان ہی میں اس طرح ختم کر دیا تھا کہ انہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حلیف قبیلہ خزاعہ کے بعض (کسی آدمی) کو ناحق قتل کر دیا تھا جس کی بناء پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو کفار مکہ سے جنگ کرنا پڑی۔ اور اس کے نتیجہ میں سن ۸ ھ کو فتح مکہ کا واقعہ ہوا۔

(اذ...... هرقل): لفظ ھرقل کا تلفظ شرح مسلم میں مشہور تلفظ ھاء کے کسرہ، راء کے فتحہ اور قاف کے جزم کے ساتھ منقول ہے۔ ایک نسخہ میں ھاء اور قاف کے کسرہ اور راء کے سکون کے ساتھ ہے۔ اس صورت میں عجمہ اور علمیت کی وجہ سے غیر منصرف ہوگا۔ یہ روم کے بادشاہ کا نام ہے ان کا لقب قیصر ہے، دیناروں پر ٹھپہ لگا کر اس کا باقاعدہ شکل دینے والا پہلا بادشاہ یہی ہرقل ہے۔ قاموس میں ہے عیسائی دنیا میں یہ امتیاز بھی اسی کو حاصل ہے کہ گرجا گھر سب سے پہلے اسی نے تعمیر کرائے۔ اور لفظ بصری ،یاء کے ضمہ اور الف مقصورہ کے ساتھ، ایک بستی کا نام ہے جو مدینہ منورہ اور دمشق شام کے راستے میں واقع ہے۔

(احد...... انه نبي): بعض حضرات کہتے ہیں ان میں حضرت مغیرہ بن شعبہؓ بھی تھے لیکن اس میں یہ اشکال ہے کہ حضرت مغیرہؓ صلح حدیبیہ سے قبل غزوہ خندق کے سال مسلمان ہو چکے تھے اور یہ ممکن ہی نہیں کہ وہ ان میں موجود ہو اور خاموش رہے۔ ملا علی قاریؒ فرماتے ہیں حضرت مغیرہؓ کے موجودگی پر اشکال کی کوئی ضرورت نہیں۔ کیونکہ کہا جاتا ہے کہ ابوسفیانؓ نے کوئی منافی بات کہی نہیں تھی جس پر ان کے خاموشی کے منافی ہو۔

(فدخلنا...... فاجلسنا): صیغہ فاجلسنا مجہول ہے، ایک نسخہ میں صیغہ معروف کے ساتھ ہے۔ (فقال...... نبي): علماء فرماتے ہیں قرابت دار سے اس لئے پوچھا جا رہا تھا کہ وہ اس کے احوال سے زیادہ واقف بھی ہوتا ہے، نیز جھوٹ بولنے کا خدشہ بھی کم ہوتا ہے کیونکہ نسبی غیرت بہرکیف کسی نہ کسی صورت میں موجود ہوتی ہے۔ (واجلسوا اصحابی خلفی): ان ساتھیوں کو ان کے پیچھے اس لئے بٹھایا گیا تاکہ جب یہ کوئی جھوٹ کہے تو وہ اس کے خلاف ہرقل کی مدد کریں اور ان سے پیٹھ کے پیچھے ہونے کی وجہ سے نہ شرمائیں۔ یا یہ مقصد تھا کہ جب یہ جھوٹ کہے گا تو ساتھی ہاتھ یا سر کے ذریعہ کوئی اشارہ کریں گے۔

جس سے اس کا جھوٹ واضح ہو جائے۔ یہ بھی بعید نہیں کہ ابوسفیانؓ کو آپ ﷺ کے قریبی قرابت دار ہونے کی وجہ سے تعظیماً سب سے آگے بٹھایا گیا ہو، کیونکہ آدب کا یہی تقاضہ تھا۔

(ثم دعا بترجمانه): لفظ ترجمان، تاء کے فتحہ اور جیم کے ضمہ کے ساتھ نیز تاء اور جیم دونوں کے ضمہ کے ساتھ بھی پڑھنا جائز ہے۔ لیکن تاء کے فتحہ کے ساتھ زیادہ فصیح ہے۔ پہلے یہ بھی نقل کیا گیا تھا کہ تاء اور جیم کے فتحہ کے ساتھ بھی جائز ہے۔ ترجمان اس شخص کو کہا جاتا ہے جو ایک زبان کو دوسری زبان میں بیان کرے۔

یہاں یا تو باء زائدہ ہے یا یہ مطلب ہے کہ ھرقل نے کسی کو حکم دیا کہ ترجمان کو بلایا جائے، چنانچہ۔(انی سائل هذا): ایک نسخہ میں اضافت کے ساتھ معنی ہوگا میں ابوسفیان سے کچھ پوچھنا چا رہا ہوں (یا پوچھنے لگا ہوں)۔ (فان كذبني): ذال کے تخفیف (بغیر تشدید) کے ساتھ، یعنی اگر مجھ سے جھوٹ بولنے لگے تو (فكذبوه) یہاں ذال مشددہ کے ساتھ ہے تو فوراً اس کی نسبت جھوٹ کی طرف کر دینا، باطل کہنے پر بالکل خاموش نہ رہنا بلکہ مجھے سچ پر مطلع کرتے رہیں۔ (وايم الله): اس کی مکمل تحقیق پہلے گزر چکی ہے۔ (لو لا مخافة ان يؤثر): صیغہ مجہول کے ساتھ۔ (على الكذب): کاف کے فتحہ اور ذال کے کسرہ کے ساتھ، ایک نسخہ میں کاف کے کسرہ اور ذال کے سکون کے ساتھ منقول ہے معنی ہے۔ اگر مجھے اپنی قوم میں دروغ گو مشہور ہونے کا خوف نہ ہوتا۔ (لكذبته): بغض کی وجہ سے ضرور جھوٹ بولتا۔ طیبی ؒ لکھتے ہیں: کلمہ كذب پر على اس لئے داخل کیا کہ یہ ضرر مستلزم ہے یعنی اگر جھوٹ بولتا، تو اس کا نقصان ہی ہوتا کوئی فائدہ میرے لئے اس میں نظر نہیں آ رہا تھا۔ ابوسفیانؓ کے اس جملہ سے یہ معلوم ہوا کہ جھوٹ جس طرح اسلام میں قبیح ہے زمانہ جاہلیت میں بھی قبیح شمار ہوتا تھا۔ ملا علی قاریؒ فرماتے ہیں صحیح معنی یہ معلوم ہوتا ہے کہ اگر مجھے اپنے ان ساتھیوں کی طرف سے جھوٹ پکڑنے کا خوف نہ ہوتا، تو میں ضرور ان سے جھوٹ بولتا، اپنے مقصد کی خاطر۔ (ثم قال ـــ فيكم؟): جوہریؒ کہتے ہیں: حسب وہ چیز ہے جس کو لوگ اپنے اباؤ اجداد پر فخر کرنے کیلئے استعمال کرتے ہیں۔ حسب نسب سے اہم چیز ہے اس لئے نسب کے بجائے حسب کے متعلق پوچھا۔ بخاریؒ میں حسب کے بجائے كيف نسبه؟ کے الفاظ ہیں، جامع الاصول میں ہے كيف حسبه (قال: قلت هو فينا ذو حسب): ؟ یعنی عظیم حسب کے مالک لوگوں میں سے ہیں اس لیے کہ ان کا نسب محمد بن عبداللہ بن عبدالمطلب بن ھاشم بن عبد مناف ہے اور میرا نسب ابوسفیان بن حرب بن امیہ بن عبد شمس بن عبد مناف ہے۔ اس وقت اس جماعت میں بنی عبد مناف میں سے میرے علاوہ اور کوئی نہ تھا۔ (قال...... من آبائه): یہاں آباء سے مراد اسلاف ہیں۔ ایک نسخہ میں من آبائه کی جگہ في ابائه ہے۔ (من ملك): ایک نسخہ میں من موصولہ ہے اور ملك ماضی کے صیغہ کے ساتھ ہے۔ یعنی ان کے اسلاف میں کون بادشاہ گزرا ہے بعض محققین لکھتے ہیں من حرف جر کے ساتھ ہے اور لفظ ملك صفت مشبہ کا صیغہ ہے۔ یہ روایت اصیلی، ابوالوقت نیز ابن عساکر کے ایک نسخہ میں ہے اور ابوذر نے کشمیھنی سے جو روایت ہے اس میں من ملك ہے من موصولہ ہے۔ اور لفظ ملك فعل ماضی ہے اور ابوذر سے جو روایت فتح میں ہے اس میں من آبائه ملك بغير من کے منقول ہے۔ لیکن پہلی روایت زیادہ مشہور ہے۔ (قال...... تتهمونه): دوسری تاء کی تشدید کے ساتھ (باب تفعیل سے) ہے۔ (قلت لا! قال ومن): من سے پہلے واؤ ہے۔ (الناس): یعنی اشراف ہیں۔ (ام ضعفاؤهم؟): الطیبی ؒ کہتے ہیں مسند حمیدی اور جامع الاصول میں ومن

یتبعه کی جگہ فهل یتبعه ہے۔اور ام یہاں متصلہ ہے جوقرینہ ہے هل کا،لیکن اشکال یہ ہے کہ هل جملہ کے حصول کے متعلق سوال کا تقاضہ کرتا ہے،اور ام متصلہ حصول جملہ کا تقاضہ کرتا ہے اس لئے کہ ام متصلہ سے مسند اور مسند الیہ میں سے کسی ایک کے معنی کے تعیین کے متعلق سوال ہوتا ہے۔

صحیح وہی ہے جو مسلم شریف اور اس کے شرح اور مشکاۃ میں ہے یعنی فمن تبعه اور قول اشراف الناس سے پہلے ہمزہ استفہام مقدر ہوگا، گویا اولاً اس نے اجمالاً پوچھا پھر تفصیلاً۔(قال: قلت بل ضعفاء هم): اشراف سے مراد اہل ثروت اور متکبرین ہیں۔نہ کہ ہر شریف' وگرنہ تو ہرقل کے سوال سے قبل حضرت ابوبکر اور عمرؓ جیسے لوگ مسلمان ہو چکے تھے جو اشراف ہی میں سے تھے۔بعض حضرات نے یہی توجیہ بیان کی ہے۔عینیؒ نے ان کے قول کے بعد لکھا ہے حضرت ابوبکرؓ وعمرؓ اور حمزہؓ اہل ثروت میں سے تھے،لیکن ابوسفیان کی بات یہاں اکثریت اور اغلبیت کے اعتبار سے تھی اس لئے کسی مزید توجیہ کی ضرورت نہیں۔

(قال ایزیدون): یعنی کیا ان ہی جیسے لوگ اور بھی بڑھ رہے ہیں۔یا(ام ینقصون): یعنی ان میں سے کوئی ان کو چھوڑ کے علیحدہ بھی ہوا ہے۔یا یہ کہ کسی کی موت واقع ہونے کی وجہ سے ان کی تعداد میں کمی واقع ہورہی ہے،مزید ایمان والے نہ ملنے کی وجہ سے کمی ہورہی ہے۔(سخطة): سین کے فتحہ اور ضمہ ساتھ خاء معجمہ کے سکون (جزم) کے ساتھ۔نفرت اور ناپسندیدگی کی وجہ سے۔(له): ضمیر دین کی طرف راجع ہے اور یہ مفعول له ہے،اس سے وہ لوگ نکل گئے جو جبر یا اپنی طبیعت کی خباثت کی وجہ سے مرتد ہوئے تھے۔(قال: قلت: لا...... تکون): کلمہ تکون،تاء اور یاء دونوں کے ساتھ پڑھنا صحیح ہے۔(الحرب): سے محاربہ مراد ہے۔(بیننا وبینه سجال): سجال،سین کے کسرہ کے ساتھ ممساجله (باہم مقابلہ کیلئے رسہ کشی رہتی ہے) یا سجل سے ہے سجل ڈول کو کہتے ہیں۔

(یصیب منا ونصیب منه): یہ سجالاً کی تفسیر ہے یعنی کبھی وہ غالب آتے ہیں کبھی ہم غالب آجاتے ہیں۔جیسے باری تعالیٰ کا ارشاد ہے:﴿وتلك الأيام نداولها بين الناس﴾.

ایک شاعر کہتا ہے:

فیومًا علینا ویومًا لنا ☆ ویومًا نسر ویومًا نساء

طیبی رحمہ اللہ لکھتے ہیں سجالاً کی اصل سجل ہے۔سجل ڈھول کو کہتے ہیں اور ڈھول سے تشبیہ دینے کی وجہ یہ ہے کہ جنگ میں اترنے والوں میں سے ہر فریق کی مثال ڈھول کے مانند ہے یا یہ ہے کہ لڑائیوں کا حال ان دو ڈولوں کی طرح ہے جن کو بیک وقت پانی سے بھرنے کی کوشش کی جائے تو کبھی ایک بھر جاتا ہے دوسرا خالی رہ جاتا ہے اور کبھی دوسرا بھر جاتا ہے پہلا خالی رہ جاتا ہے۔ایسے ہی کبھی ہم اس مدعی نبوت اور اس کے ساتھیوں پر غالب آجاتے ہیں اور کبھی وہ ہم پر غالب آجاتے ہیں۔اسی طرح کبھی ہم اس کی وجہ سے مصیبتوں اور پریشانیوں میں مبتلا ہو جاتے ہیں اور کبھی وہ ہماری وجہ سے مصائب وتکالیف اٹھاتا ہے۔

چونکہ اس واقعہ سے قبل آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے درمیان تین لڑائیاں بدر،احد اور خندق واقع ہو چکی تھیں جن میں سے بدر میں مسلمانوں کا غلبہ رہا،اُحد میں اس کا عکس ہوا اور خندق میں جانبین سے تھوڑا تھوڑا نقصان ہوا تھا۔لہٰذا ابوسفیانؓ نے اس وقت جو تشبیہ بلیغ دی تھی اس میں وہ بالکل سچے تھے۔الحرب اسم جنس ہے اس کی خبر جمع کے ساتھ لانا جائز ہے۔طیبی رحمہ اللہ کے علاوہ

بعض لوگوں نے کلمہ سجالاً کے ساتھ دلواً کبیراً کی قید لگائی ہے یعنی سجل بڑے ڈول کو کہتے ہیں جبکہ طیبی رحمۃ اللہ علیہ نے مطلقاً ڈول کہا ہے۔

(قال فهل يغدر): یغدر، دال کی کسرہ کے ساتھ (ضرب سے) غدر سے ہے۔ یہ ضد ہے الوعد کی (بمعنی نقض عہد وعدہ خلافی کرنا)۔ (لا ندري ما هو): ما هو سے یا تو نبی کریم یا اللہ تعالیٰ کی ذات مراد ہے۔ (و الله ما امكنني من كلمة): امکن، قدرت کے معنی میں ہے اور کلمہ سے مراد جملہ مفیدہ ہے۔ (قال: فهل قال هذا القول): القول، سے مراد نبوت اور دعویٰ رسالت ہے۔ یعنی مشہور پیغمبر حضرت ابراہیم، اسماعیل، اسحٰق، یعقوب، اسباط، موسیٰ اور عیسیٰ وغیرہ کے علاوہ تمہاری قوم کے کسی اور شخص نے بھی اس سے قبل نبوت کا دعویٰ کیا ہے؟

(انه فيكم...... احباب قومها): حقیقت یہی ہے کہ رسول اور نبی اپنی قوم کے اشراف ہی میں سے ہوتے ہیں۔ بعثت کو کلمہ فی کے ساتھ متعدی کرنا خود اس بات کا قرینہ ہے کہ انبیاء کا وقوع اشراف ہی میں سے ہوتا ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ کلمہ فی من کے معنی میں ہو۔ صاحب قاموس اور صاحب مغنی نے اس کو جائز لکھا ہے۔ یہی بہتر قول ہے بنسبت طیبی رحمۃ اللہ علیہ کے قول کے انہوں نے اس موقع پر زیادہ تکلف سے کام لیا ہے۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں: تبعث وهو ذو حسب، یہ تجرید میں سے ہے یعنی صاحب حسب ہی کو نبی بنایا جاتا، یہ اس طرح ہے جیسے آپ کہتے ہیں في البيضة عشرون رطلاً من الحديد.

بعض حضرات کہتے ہیں یہ سوال اس لئے کیا تھا کہ انبیاء لوگ باطل سے دور رہتے ہیں اور لوگ ان کی اطاعت کو جلد قبول کرتے ہیں۔ اور یہ بات نقل سے مستفاد ہوتی اس لئے عقل بھی اس کو تسلیم کرتی ہے۔

(و سألتك هل كان في آبائه ملك؟): اگر کلمہ ملك، میم کے ضمہ کے ساتھ ہوتا، تو کوئی اور شان ہوتی۔ (يطلب ملك آبائه): کہ وہ اپنی اس بادشاہی کو دوبارہ حاصل کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ یہ عقلی دلیل ہے۔ (فقلت من ضعفاؤهم اتباع الرسل): اپنے کہا فقراء تو حقیقت یہ ہے کہ ابتداء میں انبیاء کے متبعین ایسے ہی لوگ ہوتے ہیں، آج کل بھی عام مشاہدہ یہی ہے علماء صلحاء کے متبعین بھی اسی طرح کے لوگ ہوتے ہیں۔

امام نوویؒ لکھتے ہیں: ہرقل نے یہ جو کہا کہ ان الضعفاؤ هم اتباع الرسل، یہ اس وجہ سے کہا کیونکہ دنیا والے لوگ اس کو ابتداءً عار اور اپنی توہین سمجھتے ہیں، اس لئے عام طور پر کتراتے ہیں، جبکہ فقراء مساکین اور گوشہ نشین لوگ میں یہ بات نہیں ہوتی اس لئے جلد مطیع ہو کر حق کو قبول کر لیتے ہیں۔

(و سألتك...... ليدع): لام جحد ہے ل تیرك [جھوٹ چھوڑنے یعنی جھوٹ باندھنے کے معنی میں ہے]۔
یعنی یہ تو ہر ایک جانتا ہے کہ جو شخص لوگوں سے جھوٹ بولنے کو قبیح جانتا ہو، وہ اللہ تعالیٰ پر کیسے دروغ گوئی کر سکتا ہے۔
کیونکہ اللہ پر جھوٹ باندھنا بہت زیادہ قبیح ہے۔ اس لئے کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿ومن اظلم ممن افترى على الله كذبا﴾ اس شخص سے بڑھ کر کوئی ظالم نہیں ہو سکتا جو اللہ پر جھوٹ بولے۔ (و سألتك...... و كذالك الايمان): واؤ کے ساتھ۔ صحیح یہ ہے کہ فكذالك ہونا چاہئے، کہ حقیقت میں ایمان کا یہی حال ہوتا ہے۔ (اذا خالط بشاشه): بشاشته، باء کے فتحہ کے ساتھ اُنس اور خوشی کو کہتے ہیں۔ (القلوب): ایمان جب دلوں میں جگہ پکڑ لے اور روح اس کی لذت وحلاوت سے

آشنا ہو جائے، تو پھر ہر گز جدا نہیں ہوتا۔ اگر شاذ و نادر کوئی شخص دین کو چھوڑ بیٹھے، تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اس کے دل میں ایمان سرے سے داخل و راسخ ہی نہیں ہوا تھا، اس بشاشت ایمانی کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کہیں طعم کہیں حلاوہ سے تعبیر فرمایا ہے۔ کہ جو شخص اس کی لذت ایک بار چک لیتا ہے وہ اس کی محبوب ترین چیز بن جاتی ہے۔ اگر کوئی ایمان کی حالت چکھے نہ اس کو کیا علم ہوگا کہ ایمان کیا چیز ہے۔ کیونکہ اس نے عارفین کے مشرب سے گھونٹ تک نہیں بھرا ہے۔ ہمارے بعض مشائخ نے فرمایا جو شخص رفیق کے پاس جانے والی جماعت کے ساتھ ہولے وہ رفیق تک ضرور پہنچتا ہے، کیونکہ رفیق کی جماعت بھی مانند رفیق ہوتی ہے اور وہ ان کے ہمراہ امن کے ساتھ پسندیدہ مقام تک پہنچ ہی جاتا ہے۔ لیکن جو راستے ہی سے واپس ہو جائے اس کو کیا ملے گا۔

ملا علی قاریؒ فرماتے ہیں ہمارے مشائخ میں سے ابوالحسن بکری قدس اللہ سرہ فرماتے ہیں: جب ایمان قلب میں داخل ہو جائے تو انسان سلب کے خوف سے مأمون ہو جاتا ہے، یقیناً یہاں بھی اس معنی کے طرف اشارہ ہے اس معنیٰ پر اللہ تعالیٰ کا ارشاد بھی دلالت کرتا ہے؛ چنانچہ ارشاد ہے ﴿**فمن یکفر بالطاغوت ویؤمن باللہ فقد استمسك بالعروۃ الوثقیٰ لا نفصام لها**﴾. (سو جو شخص شیطان سے بداعتقاد ہو اور اللہ تعالیٰ کے ساتھ خوش اعتقاد ہو یعنی [اسلام قبول کرے] تو اس نے بڑا مضبوط حلقہ تھام لیا جس کو کسی طرح شکستگی نہیں ہو سکتی)۔ آیت مبارکہ میں طاغوت سے مراد ماسویٰ اللہ ہے، اور **یؤمن باللہ** سے کماحقہ ایمان لانا مراد ہے۔ نفصام سے مراد حق سے انقطاع انفصال کی نفی ہے اور باطل کے ساتھ اتحاد و اتصال کی نفی ہے۔

(**وسألتك هل یزیدون ام ینقصون**): ملا علی قاریؒ فرماتے ہیں ہرقل نے مساوات کے واسطہ کو شاید اس بات کی طرف اشارہ کرنے کی غرض سے ترک کر دیا ہے کہ کسی قوم میں اضافہ نہ ہو جانا اس کا نقصان ہی شمار ہوتا ہے اور شرح ترقی کا رُک جانا افرادی ترقی کے منافی شمار ہوتا ہے۔ (**فزعمت...... الایمان**): درحقیقت ایمان کا یہی حال ہے کہ روز بروز اس کا دائرہ اثر وسیع تر ہوتا جاتا ہے اور اہل ایمان کی تعداد بڑھتی رہتی ہے۔ (**حتی یتم**): اور اس کے امور معتبرہ نماز، زکوٰۃ، روزہ وغیرہ پایۂ تکمیل اور اتمام تک پہنچ جاتے ہیں، اسی وجہ سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے آخری عمر میں یہ آیت نازل ہوئی: ﴿**الیوم اکملت لکم دینکم واتممت علیکم نعمتی**﴾ (آج کے دن میں نے تمہارا دین مکمل کر دیا اور تم پر اپنی نعمتیں تمام کیں)۔

یہ اس وعدہ کا اتمام تھا جو اللہ رب العزت نے اپنے نبی کے ساتھ ابتدائی زمانے میں فرمایا تھا کہ ﴿**یریدون أن یطفوا نور اللہ بافواهم ویأبی اللہ الا ان یتم نورہ**﴾.

الحمد للہ ہزار سال گزرنے کے باوجود ہماری تعداد دن بدن بڑھتی چلی جا رہی ہے اور ایمان کی یہ کرنیں اللہ کے وعدہ کے مطابق روشن ہیں اور روشن رہیں گی۔

(**وسألتك...... وتنالون منه**): یعنی کبھی تم کو تکلیف پہنچتی ہے اور کبھی تمہارے ہاتھوں ان کو تکلیف پہنچتی ہے۔

(**و کذلك الرسل تبتلی**): اس میں اشارہ ہے اس بات کی طرف کہ دنیا بہر کیف دارالامتحان ہے، اسی وجہ سے بعض عارفین کا قول ہے کہ جب تک انسان اس دنیا میں ہو وہ ضرور رنج و ملال میں مبتلا ہو کے رہتا ہے۔ خود باری تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿**وفی ذلکم بلاء من ربکم عظیم**﴾. **بلا** کی تفسیر مفسرین نے مشقت اور آزمائش اور انعام سے کیا ہے۔ لفظ **بلا** اضداد میں سے ہے۔ جو خاص بندوں کے ساتھ پیش آتی ہے (یعنی اہل اللہ کے ساتھ) اسی کی طرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اشارہ فرمایا ہے

اشد الناس بلاء الانبیاء ثم الاولیاء، سب سے زیادہ آزمائش انبیاء اور اولیاء کو پیش آتی ہیں۔لیکن (العاقبة) اس کی صفت محذوف ہے یعنی المحمودة (اچھا انجام) ان ہی لوگوں کا ہوگا۔باری تعالیٰ کا ارشاد ہے:﴿العاقبة للتقویٰ و الآخرة خير وابقیٰ﴾۔

امام نوویؒ فرماتے ہیں اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو اس لئے زیادہ آزماتے ہیں کہ جو توانائی اطاعت میں صرف کرتے ہیں اور مصیبت میں صبر کرتے ہیں اس کا عظیم بدلہ ملے۔

(وسألتك هل يغدر؟ فزعمت انه): ضمیر منصوب یا تو نبی کی طرف راجع ہے یا ضمیر شان ہے۔(لا يغدر): قاعدہ یہ ہے کہ جو چیز جس فطرت پر مبنی ہے اسی پر باقی رہتی ہے۔کیونکہ استصحاب کے مسئلہ میں یہ قاعدہ مسلمہ ہے جملہ مدخولہ معلولہ لانے سے اعراض کیا۔(وكذلك...... رجلٌ نتم بقول قيل قبله): یعنی بعد والے کے متعلق یہ اندیشہ ہوتا ہے کہ یہ اسی ماقبل والے شخص کا اقتداء کر رہا ہے۔(ثم قال بما يأمركم): یہاں جمع کا صیغہ تغلیباً یا بطور التفات استعمال کیا ہے، اس وجہ سے ابوسفیانؓ نے بجائے قلت کے قلنا يامرنا بالصلوٰة والزكاة فرمایا کہ ہمیں مالی اور بدنی دونوں عبادتوں کا حکم دیتے ہیں۔(والصلة): صلہ رحمی کے متعلق اللہ تعالیٰ نے جو کچھ آپ کو حکم دیا ہے ہمیں بھی اس کا حکم دیتے ہیں۔(والعفاف): عین کے فتحہ کے ساتھ ہے اور مکارم اخلاق کے خلاف جتنے بھی اوصاف رذیلہ ہیں ان سے بچنے کا حکم دیتے ہیں۔(قال ان يلك ما تقول حقا فانه نبی): شرح مسلم میں ہے علماء کرام کہتے ہیں: ہرقل نے یہ جو بات کہی کتب سابقہ سے اخذ کیا تھا کیونکہ آنحضرت ﷺ کے علامات کے متعلق توراۃ، انجیل میں اسطرح کے بہت سی (آیات) نشانیاں مذکور تھیں، جن سے ہرقل بخوبی واقف تھا۔اس نے جب ساری علامتیں معلوم کر لیں تو کہنے لگا فانه نبیٌ. اس کے علاوہ آپ ﷺ کے نبوت کی قطعی دلیل وہ معجزات تھے جو خارق عادت دنیا میں ظاہر ہوئے، یہ تو مازریؒ کا قول تھا۔شیخ اکمل الدینؒ فرماتے ہیں ہرقل کی بدنصیبی رہی کہ وہ اپنے علم و ذہانت۔آنحضرت ﷺ کی نبوت و رسالت کی حقیقت جاننے کے باوجود ایمان کی دولت سے محروم رہا۔اور اپنے علم و آگہی سے فائدہ حاصل نہ کر سکا۔اور اس نے نہ صرف یہ کہ آنحضرت ﷺ کی دعوت پر لبیک کہہ کر اسلام قبول نہیں کیا بلکہ آنحضرت ﷺ اور آپ ﷺ کے صحابہؓ کے خلاف نبرد آزما بھی ہوا، اس نے مجاہدین اسلام کے خلاف متعدد بار اس زمانہ کی رومی سلطنت کی انتہائی ترقی یافتہ فوجیں روانہ کیں اور مختلف علاقوں اور شہروں میں اسلامی شیروں کو اس کے جابر لشکروں کا مقابلہ کرنا پڑا۔اللہ تعالیٰ کی مدد اپنے نام لیواؤں کے ساتھ ہوتی ہے۔اس لئے ہر میدان جنگ میں ہرقل کی رومی فوج کو زبردست پسپائی و ہلاکت کا سامنا کرنا پڑا اور اس کے لشکر کے بہت ہی کم لوگوں کو میدانِ جنگ سے صحیح و سالم واپس ہونے کا موقع نصیب ہوتا تھا۔ہرقل اپنی عظیم سلطنت اور فوج کی طاقت کے بل بوتے پر مسلمانوں کے خلاف زندگی بھر مصروف رہا، لیکن اللہ تعالیٰ نے ہمیشہ اہل اسلام کے مقابلے پر ان کو مغلوب کیا۔ہرقل مسلمانوں کو شکست دینے کی تمنا لئے ہوئے مر گیا۔ہرقل کے بعد اس کا بیٹا تخت نشین ہوا لیکن اسلام کے مقابلہ پر زوال پذیر رومی سلطنت کو وہ بھی سہارا نہ دے سکا۔اس کے مرنے کے بعد تو اس سلطنت کا وجود ہی ختم ہو گیا۔ملا علی قاریؒ فرماتے ہیں زمانہ جاہلیت والی سلطنت ختم ہو گئی۔لیکن پھر ایک وہ زمانہ بھی آیا جب ان ہی رومیوں میں سے ایک قوم (ترک) کو اللہ تعالیٰ نے ایمان و اسلام کی سعادت عطاء فرمائی۔اس قوم نے بے پناہ شجاعت و بہادری اور ایمانی طاقت سے نہ

صرف یہ کہ اپنے زمانے میں دنیا بھر کے عیسائیوں کی مشترکہ طاقت کو پسپا کیا، اور کافروں کے مقابلے پر اسلام کی حفاظت کی۔ بلکہ خود کو مسلمان کہنے والے اس فرقہ رافضہ کا قلع قمع کیا جو مکر و سازش کے ذریعہ اسلام اور مسلمانوں کی جڑیں کاٹنے میں مصروف تھے۔ یہ ترک ہی تھے جن کو اللہ تعالیٰ نے حرمین شریفین کی تعمیر و ترقی، خدمت و محافظت کی سعادت عطاء کی۔ انہوں نے مسجد حرام، مکہ مکرمہ اور حرم نبوی ﷺ کی خدمت محفاظت، اہل مکہ اہل مدینہ کی دیکھ بھال اور مالی امداد و اعانت اور علماء و مشائخ کی تعظیم و تکریم جس اخلاص و عقیدت اور لگن سے کی اس کی کوئی مثال نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیشہ قیامت کو ان کو دشمنوں پر غلبہ نصیب فرمائیں۔ فجزاهم الله احسن الجزاء. اس سے معلوم ہوا کہ جس کو اللہ تعالیٰ ہدایت نصیب فرما دے اس کو کوئی گمراہ نہیں کر سکتا اور جس کو اللہ تعالیٰ گمراہی میں پڑا رہنے دے اس کو کوئی ہدایت نہیں کر سکتا۔ لا حول ولا قوة الا بالله۔ ایک طرف تو وہ ہرقل تھا، جس کو آنحضرت ﷺ کی پوری حقیقت معلوم تھی لیکن اس کی سچی معلومات اس کے کوئی کام نہیں آسکیں، کیونکہ اس کا اصل مطمع نظر وہ ریاست و سلطنت تھی جس کو وہ کسی حال میں چھوڑنا نہیں چاہتا تھا۔ اور مال و دولت کی وہ محبت تھی جس نے اس کے دل و دماغ پر حقیقت پسندی سے زیادہ جاہ پسندی کی چھاپ ڈال رکھی تھی۔ لہٰذا وہ توفیق الٰہی اور ازلی سعادت سے محروم رہا اور ابدی بدبختی کا مستوجب بنا۔ اسی وجہ سے وہ کہنے لگا (وقد كنت اعلم) یعنی مجھے یقین تھا کہ (انه خارج) نبی آخر الزمان مبعوث ہونے والا ہے۔ (ولم أك اظنة' منكم): میرا یہ خیال نہ تھا کہ وہ اسماعیلؑ کے نسل میں سے ہوگا۔ جو کہ ابو العرب ہیں۔ بلکہ میرا خیال یہ تھا کہ وہ ہم میں سے ہوگا یعنی بنی اسحٰق میں سے مبعوث ہوگا۔ کیونکہ اکثر و بیشتر انبیاء حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بعد بنی اسحٰق میں ہوئے ہیں۔ یہ ان کی باطل دلیل تھی اور بے وقوفی کی علامت ہے۔ کیونکہ فان الظن لا يغني من الحق شياۂ. وما يتبع اكثرهم الا ظناً. والحق احق ان يتبع. کیونکہ محض خیال حق کا کوئی فائدہ نہیں دیتا۔ کفار کی اکثریت اپنے خیالات فاسدہ کی اتباع کرتی ہے۔ حالانکہ حق اس لائق ہے کہ اسی کی پیروی کی جائے۔

(ولو انی اعلم انی اخلص اليه): اخلص، لام کے ضمہ کے ساتھ' میں ان کی خدمت میں پہنچ سکتا ان کی زیارت کر سکتا۔ (لا حببت لقاء ہ): میرے لئے سب سے پسندیدہ بات ہوتی اگر میں ان کی خدمت میں حاضر ہوتا۔ اپنے چہرے کو ان کے قدموں سے گرنے والے پانی سے دھوتا، کیونکہ وہ حق پر ثابت قدم ہے۔ یا یہ مطلب ہے کہ ان کے ہاتھ چومنے کے بعد ان کے قدم مبارک سے گرد و غبار صاف کرتا۔

(وليبلغن ملكه ما تحت قدمي): کلمہ قدمي، یاء مشددہ کے ساتھ تثنیہ کے لئے بطور خبر تاکید اور مبالغہ کیلئے ہے۔ امام نوویؒ فرماتے ہیں: ہرقل کے ایمان نہ لانے پر کوئی عذر نہیں تھا، کیونکہ وہ آنحضرت ﷺ کی سچائی سے بخوبی واقف تھا۔ لیکن سلطنت اور حکومت کے شوق اور لالچ نے اس کو اس سعادت سے محروم کر دیا وہ جاہ و حشمت کو اسلام پر ترجیح دیتا رہا۔ بخاری شریف میں یہ روایت صراحتاً منقول ہے کہ ہرقل نے آنحضرت ﷺ کا مذکورہ نامہ مبارک پڑھ کر اپنے ملک کے اعیانِ سلطنت اور عمائدین مملکت کو اپنے محل میں جمع کیا اور پھر بند کمرہ میں ان کی مجلس منعقد کی اور سب کو مخاطب کر کے کہا کہ لوگو! اگر تم اپنی مراد کو پہنچنا چاہتے ہو اور فلاح یاب ہونے کے خواہش مند ہو تو اس نبی آخر الزمان (ﷺ) کی دعوت قبول کر لو اور ان پر ایمان لے آؤ۔ یہ سنتے ہی ان تمام لوگوں نے سخت برہمی اور نفرت کا اظہار کیا اور اس قدر مشتعل ہوئے کہ ہرقل بھی ان کے ردعمل سے گھبرا

گیا۔اس نے کہا کہ تم لوگوں کو وحشت زدہ ہونے کی ضرورت نہیں اپنے دین پر قائم رہو، میں نے تو صرف یہ آزمانے کیلئے کیا تھا کہ تم لوگ اپنے دین اور عقیدے میں کس قدر مستحکم اور مضبوط ہو۔ یہ سن کر سب مطمئن ہو گئے اس کے سامنے سجدہ ریز ہو گئے۔ اگر اللہ تعالیٰ ان کو ہدایت نصیب کرنا چاہتے تو توفیق عطاء فرما دیتا۔ جیسے نجاشی کو ایمان نصیب فرمایا تھا ایمان لانے کی وجہ سے ان کی ریاست وحکومت ختم نہیں ہوئی، بلکہ اللہ تعالیٰ نے مزید ان کو عزت بخشی۔ ہمارے شیخ المشائخ حافظ جلال الدین سیوطیؒ کہتے ہیں: ہرقل کے ایمان کے متعلق حضرات میں اختلاف ہے لیکن راجح قول یہی ہے کہ وہ کفر وشرک پر عامل رہا تھا اور کفر وشرک کی حالت ہی میں مرا۔ ایمان واسلام کی دولت نصیب نہیں ہوئی۔ مسند احمد میں ایک روایت منقول ہے کہ اس نے مقام تبوک سے آنحضرت ﷺ کو لکھا تھا کہ میں مسلمان ہوں لیکن آنحضرت ﷺ نے فرمایا: ہرقل بالکل جھوٹ کہتا ہے وہ نصرانیت پر قائم ہے۔ ملاعلی قاریؒ فرماتے ہیں ان کے حالت کفر میں مرنے پر کوئی نص نہیں۔ لیکن بنیادی بات سامنے رکھتے ہوئے کفر والی بات کو ترجیح دی گئی ہے

(ثم دعا بكتاب رسول الله فقرأه): اس نے آنحضرت ﷺ کے نامہ مبارک کو نہ صرف اشتیاق اور التفات کے ساتھ پڑھا بلکہ اس کی بڑی تعظیم وتکریم کی، اور اس نامہ مبارک کو محفوظ رکھنے کا زبردست اہتمام کیا اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ خود بھی زندگی بھر تخت وسلطنت کا مالک رہا اور اس کی اولاد بھی ایک طویل مدت تک برسر اقتدار رہی، اس کے برخلاف فارس کے بادشاہ کسریٰ بدبخت نے نامہ مبارک کی بے حرمتی کی، نامہ مبارک کو چاک کر کے پارہ پارہ کر دیا جس کے پاداش میں اللہ تعالیٰ نے اس کی سلطنت کو بھی ٹکڑے ٹکڑے کر دیا، اس کی اولاد ذلت ورسوائی کے ساتھ دربدر ماری ماری پھرتی رہی اور اس کی نسل میں سے کسی کو بھی تخت وتاج کی صورت دیکھنا نصیب نہ ہوا۔

شیخ اکمل الدینؒ نے سیف الدین کے حوالے سے ایک واقعہ نقل کیا ہے سیف الدین کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ ایک عرب حکمران نے مجھے کسی معاملہ میں فرنگی بادشاہ کے پاس سفارش کے لئے بھیجا، میرے پاس اس کا خط تھا اس نے ہمارے بادشاہ کی سفارش قبول کی اور اس کو پورا کرنے کا وعدہ کیا تو میں نے انکار کیا، اسیر فرنگی بادشاہ کہنے لگا میں آپ کو ایک قیمتی چیز دیکھاتا ہوں، پھر انہوں نے اپنا صندوق کھولا اور اس میں سے سونے کا قلمدان نکالا، اس سے ایک خط نکالا جس کے اکثر حروف مٹ چکے تھے۔ کہنے لگا یہ تمہارے نبی ﷺ کا نامہ مبارک ہے، جو آپ ﷺ نے میرے دادا قیصر کو لکھا تھا یہ نسل در نسل بطور وراثت ہم لوگوں کے پاس ہے کیونکہ ہمارے دادا نے وصیت کی تھی کہ اس خط کی حفاظت کریں جب تک یہ نامہ مبارک تم لوگوں میں رہے گا تمہاری سلطنت باقی رہے گی اس لئے اپنی بادشاہت کے بقاء کیلئے ہم اس نامہ مبارک کی زبردست حفاظت کرتے ہیں۔ (متفق علیہ)

وقد سبق تمام الحديث (في باب الكتاب الى الكفار): کیونکہ یہ خط بھی ان لوگوں کیلئے لکھا گیا تھا جو کافر تھے۔

بَابُ فِي الْمِعْرَاجِ

معراج کا بیان

الفصل الاول:

معراج کا لفظ عروج سے ہے جس کے معنی ہیں چڑھنا اوپر جانا۔ قرآن کریم میں ہے ﴿تعرج الملائکة والروح﴾۔ اور معراج، میم کے کسرہ کے ساتھ، اس چیز کو کہتے ہیں جو اوپر چڑھنے کا ذریعہ بنے یعنی سیڑھی معراج کو سیڑھی سے تشبیہ دی گئی کیونکہ یہ عروج سے اسم آلہ کا صیغہ ہے بمعنی چڑھنا، اللہ تعالیٰ نے نبی کریم ﷺ کو جو آسمانوں کی سیر کرائی اور وہاں خاص خاص نشانیاں آپ ﷺ کو دکھلائی اس کو بھی معراج اسی وجہ سے کہا جاتا ہے، گویا آنحضرت ﷺ کیلئے سیڑھی رکھی گئی، جس پر چڑھ کر آپ ﷺ آسمان پر تشریف لے گئے۔ بعض حضرات کہتے ہیں یہ حقیقت میں سیڑھی ہی تھی کیونکہ ایک روایت میں معراج یعنی سیڑھی کا تذکرہ بھی آیا ہے کہ جب آنحضرت ﷺ کا عالم بالا کا سفر شروع ہوا تو آپ ﷺ کیلئے ایک سیڑھی رکھی گئی جس کے ذریعہ آسمان کے اوپر تشریف لے گئے، اور یہی وہ سیڑھی ہے جس کے ذریعہ فرشتے آسمان سے آمد و رفت رکھتے ہیں اور جس پر سے بنی آدم کی ارواح آسمان تک چڑھتی ہیں۔

معراج اور اسراء میں فرق:

ملا علی قاریؒ فرماتے ہیں اسراء اور معراج میں کیا فرق ہے اس کی تفصیل کو میں نے اپنے رسالے ''مدارج المعراج'' میں ذکر کیا ہے۔

جس کا حاصل یہ ہے کہ اسراء اس سفر کو کہتے ہیں جو آنحضرت ﷺ نے اس شب میں مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ تک کیا، اور مسجد اقصیٰ سے آسمان تک کے سفر کو معراج کہا جاتا ہے، اسراء نص قرآن سے ثابت ہے۔ اور اس کا انکار کرنا دائرہ اسلام سے خارج ہونا ہے اور معراج مشہور و متواتر آحادیث مبارکہ سے ثابت ہے، جس کا انکار کرنے والا گمراہ اور بدعتی کہلاتا ہے۔

یہ واقعہ خواب میں پیش آیا یا عالم بیداری میں؟

شرح السنہ میں قاضی عیاضؒ فرماتے ہیں کہ اس بارے میں علماء کا اختلاف ہے کہ آنحضرت ﷺ کو جو معراج ہوئی، وہ خواب کا واقعہ ہے یا عالم بیداری کا؟ ایک بار پیش آیا یا متعدد بار؟ یا یہ کہ ایک بار عالم بیداری میں پیش آیا اور خواب میں متعدد بار پیش آیا؟ وغیرذالک؟

کچھ حضرات کہتے ہیں کہ معراج کے ارے واقعات خواب ہی میں پیش آئے لیکن حقیقی اور زیادہ صحیح قول یہ ہے کہ معراج کا یہ واقعہ ایک بار پیش آیا اور عالم بیداری میں جسم اور روح کے ساتھ پہلے آپ ﷺ کو مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ تک، پھر آسمانوں تک، پھر آسمانوں سے ان خاص مات تک جہاں تک اللہ نے چاہا' آپ ﷺ کو لے جایا گیا۔ جمہور فقہاء وعلماء محدثین و متکلمین صوفیاء اور اکثر سلف کا یہی مسلک ہے اس لئے بغیر دلیل کے اس کے ظاہر سے عدول نہیں کیا جاسکتا اور نہ کسی اور چیز پر اس کو محمول کرنا ممکن ہے۔

معراج کا زمانہ:

بعض حضرات کہتے ہیں وحی کے نزول سے قبل کا واقعہ ہے لیکن یہ قول غلط ہے اس سے کسی نے اتفاق نہیں کیا ہے، کیونکہ اسراء کے متعلق کم سے کم جو بات کہی گئی ہے وہ یہ ہے کہ بعثت کے پندرہ ماہ بعد معراج کا واقعہ پیش آیا۔ حربیؒ کہتے ہیں معراج نبوت کے بارھویں سال یعنی ہجرت سے ایک سال پہلے ستائیسویں شب ربیع الثانی کے مہینہ میں ہوئی۔ زہریؒ کہتے ہیں آنحضرت ﷺ کے بعثت کے پانچویں سال میں معراج ہوئی۔ ابن اسحاقؒ کہتے ہیں: آپ کو اس وقت معراج پر لے جایا گیا جب اسلام مکہ میں پھیل چکا تھا۔ تمام اقوال میں زہریؒ اور ابن اسحاق کے اقوال زیادہ قوی معلوم ہوتے ہیں، کیونکہ اس میں سب کا اتفاق ہے کہ نماز لیلۃ الاسراء ہی کے موقع پر فرض ہوئی، تو معراج وحی سے قبل کیسے ہوسکتی ہے؟

باقی جن لوگوں نے خواب میں معراج کے واقعہ پیش آنے کا قول نقل کیا ہے انہوں نے حضرت شریکؒ کی روایت وھو نائمؒ اور ایک اور روایت کے الفاظ بینا انا عند البیت بین النائم و الیقظان) سے استدلال کیا ہے، لیکن ان روایتوں میں اس پر دلیل نہیں ہے، کیونکہ ان روایات میں جو کچھ بیان ہوا ہے وہ اس حقیقی واقعہ کا ابتدائیہ اور تمہید تھی، جو عالم بیداری میں پیش آیا، اور اس کا مقصد یہ تھا کہ جسمانی طور پر آسمانوں کی سیر کرنے سے پہلے آپ ﷺ میں روحانی اور نفسیاتی طور پر اس عالم بالا سے ایک گونہ مناسبت اور تعلق پیدا ہو جائے۔ جیسا کہ ابتدائے نبوت میں رویائے صادقہ ہی کو وحی اور عالم بالا سے آپ ﷺ کی مناسبت اور تعلق کا ذریعہ بنایا گیا تھا۔ اس کے علاوہ اس حدیث میں ایسی کوئی چیز نہیں جو اس بات پر دلالت کرے کہ معراج کا یہ سارا واقعہ خواب ہی میں پیش آیا۔

معالم میں شیخ محی السنہ کہتے ہیں اکثر لوگ اسی پر ہیں۔ ملاعلی قاریؒ لکھتے ہیں: تھوڑے سے لوگ اس بات کی طرف بھی گئے ہیں، واقعہ معراج نوم اور یقظہ دونوں حالتوں میں پیش آیا اور یہ ایسا قول ہے کہ مختلف ادلہ جمع ہو جاتے ہیں۔۔

طیبی رحمہ اللہ لکھتے ہیں: آیت مبارکہ ﴿وما جعلنا الرؤیا التی اریناك الا فتنة للناس﴾ [اسراء] کے تشریح میں ہم نے بخاریؒ اور ترمذیؒ کی ابن عباسؓ سے مروی روایت ذکر کی، وہ فرماتے ہیں یہاں رؤیا سے خوب کا قصہ نہیں بلکہ ایک واقعہ عجیبہ یعنی بیت المقدس کی طرف سفر حالت بیداری میں دکھلانا ہے۔ مسند امام احمد ابن حنبلؒ میں حضرت ابن عباسؓ سے منقول ہے: آپؓ فرماتے جو چیز آنحضرت ﷺ کو بیداری میں دکھلائی گئی تھیں، خواب میں بھی پہلے سے آنحضرت ﷺ نے دیکھ رکھا تھا۔

[آیت مبارکہ میں لفظ فتنه آیا ہے فتنہ عربی زبان میں بہت سے معانی کیلئے استعمال ہوتا ہے ایک معنی گمراہ آتا ہے نیز آزمائش بھی آتا ہے ایک معنی ہنگامہ وفساد کے برپا ہونے کے بھی آتے ہیں، لیکن اکثر مفسرین نے اس جگہ فتنہ سے مراد یہی آخری معنی لئے ہیں اور فرمایا یہ فتنہ ارتداد کا تھا کہ جب رسول کریم ﷺ نے شب معراج میں بیت المقدس اور وہاں سے آسمانوں پر جانے اور صبح سے پہلے واپس آنے کا ذکر کیا تو بہت سے نومسلم قریش جن میں ایمان راسخ نہ ہوا تھا اس کلام کی تکذیب کر کے مرتد ہوگئے تھے، اگر یہاں خواب ہی مراد ہوتا تو لوگوں کے مرتد ہوجانے کی کوئی وجہ نہیں تھی کیونکہ خواب تو ہر شخص دیکھ سکتا ہے۔

لہٰذا حق بات یہ ہے کہ آپ ﷺ کو دونوں اعتبار سے معراج سے نوازا گیا، پہلے رؤیا صادقہ میں پھر حالت بیداری میں بھی آپ کو معراج کا شرف بخشا گیا۔ محی السنہ کہتے ہیں یہاں رویاء سے مراد وہ خواب ہیں جو وحی سے قبل آپ کو دکھلائے جاتے تھے پھر نزول وحی کے بعد ہجرت سے ایک سال قبل ان خوابوں کی حقیقت دکھلانے کیلئے حالت بیداری میں بھی آپ کو آسمانوں پر لے جایا گیا اور یہ معاملہ دوسرے مات میں بھی رہا جیسے ۶ھ میں آپ ﷺ نے فتح مکہ خواب دیکھا تھا، دوسال کے بعد ۸ھ میں آپ کا یہ خواب بعینہ اسی طرح پورا ہوا۔

بعض محققین سے منقول ہے: انسانی ارواح باری تعالیٰ کے کمال وجلال کے انوار سے ماخوذ ہیں۔ روح کا تعلق جسم سے اس طرح کا ہے جیسے سورج کی ٹکیہ کا اس کائنات سے، سورج کی روشنی کی کرنیں جب ہر جسم تک پہنچتی ہیں تو ان کی تاریکیاں روشنی سے تبدیل ہوجاتی ہیں اس طرح انسانی جسم کے جس حصہ کو روح کا نور پہنچ جاتا ہے، اس کی حالت موت سے حیات کی طرف تبدیل ہوجاتی ہے۔

ارواح کی تقسیم:

ارواح کی چار قسمیں ہیں: (۱) ایسی ارواح جو صفات بشریہ سے گدلی ہوتی ہیں ان پر حیوانی قویٰ کے غلبہ کی وجہ سے یہ عروج کو قبول نہیں کرتیں، یہ ارواح عام عوام الناس کی ہوتی ہیں۔ (۲) وہ ارواح ہوتی ہیں جن کو علوم حاصل کرنے کی وجہ سے قوت نظری حاصل ہوتی ہے یہ علماء کی ارواح ہیں۔ (۳) وہ ارواح ہیں جن کے بدن کو اخلاق حمیدہ کی کثرت کی وجہ سے کمال قوت مدبرہ حاصل ہوتی ہے یہ اہل ریاضت کی ارواح ہوتی ہیں کہ جب ریاضت اور مجاہدوں کی وجہ سے انکا بدن قوی ہوتا ہے اور معرفت کے ایک خاص مقام تک پہنچنے کے بعد اس صلاحیت کے حامل ہوجاتے ہیں کہ ان پر اشیاء کی کچھ حقیقت روشن اور واضح ہوجاتی ہے۔ (۴) وہ ارواح جن کو دو قوتوں کا کمال حاصل ہوتا ہے یہ روح ارواح بشریہ میں ایسے بلند اور اعلیٰ مقام پر ہوتی ہیں جہاں دوسری ارواح کی رسائی نہیں ہوتی یہ ارواح انبیاء وصدیقین کی ہیں جب ان کی ارواح کی قوت میں اضافہ ہوتا ہے تو زمین

سے ان کے اجسام ارتفاع کی قوت بھی بڑھ جاتی ہے، اسی وجہ سے جب انبیاء علیہم السلام کے جسم میں اس روح کی قوت بڑھ جاتی ہے تو ان کے جسم کو لے کر آسمان کی جانب اوپر چڑھ جاتی ہیں اور انبیاء علیہم السلام میں سے یہ قوت سب سے زیادہ ہمارے پیارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم میں پائی جاتی تھی، اس لئے ان کو قاب قوسین سے بھی زیادہ قریب تک لے گئی۔

واقعہ معراج' حضرت مالک بن صعصعہ کی روایت

۵۸۶۲: عَنْ قَتَادَةَ عَنْ اَنَسِ بْنِ مَالِكٍ عَنْ مَالِكِ بْنِ صَعْصَعَةَ اَنَّ نَبِيَّ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ حَدَّثَهُمْ عَنْ لَيْلَةِ اُسْرِيَ بِهٖ قَالَ بَيْنَمَا اَنَا فِي الْحَطِيْمِ وَرُبَّمَا قَالَ فِي الْحِجْرِ مُضْطَجِعًا اِذْ اَتَانِي اٰتٍ فَشَقَّ مَا بَيْنَ هٰذِهٖ اِلٰى هٰذِهٖ يَعْنِي مِنْ ثُغْرَةِ نَحْرِهٖ اِلٰى شِعْرَتِهٖ فَاسْتَخْرَجَ قَلْبِي ثُمَّ اُتِيْتُ بِطَسْتٍ مِّنْ ذَهَبٍ مَمْلُوٍّ اِيْمَانًا فَغَسَلَ قَلْبِي ثُمَّ حُشِيَ ثُمَّ اُعِيْدَ وَفِي رِوَايَةٍ ثُمَّ غُسِلَ الْبَطْنُ بِمَاءِ زَمْزَمَ ثُمَّ مُلِئَ اِيْمَانًا وَحِكْمَةً ثُمَّ اُتِيْتُ بِدَابَّةٍ دُوْنَ الْبَغْلِ وَفَوْقَ الْحِمَارِ اَبْيَضَ يُقَالُ لَهُ الْبُرَاقُ يَضَعُ خَطْوَهٗ عِنْدَ اَقْصٰى طَرْفِهٖ فَحُمِلْتُ عَلَيْهِ فَانْطَلَقَ بِي جِبْرَئِيْلُ حَتّٰى اَتَى السَّمَآءَ الدُّنْيَا فَاسْتَفْتَحَ قِيْلَ مَنْ هٰذَا قَالَ جِبْرَئِيْلُ قِيْلَ وَمَنْ مَعَكَ قَالَ مُحَمَّدٌ قِيْلَ وَقَدْ اُرْسِلَ اِلَيْهِ قَالَ نَعَمْ قِيْلَ مَرْحَبًا بِهٖ فَنِعْمَ الْمَجِيْءُ جَاءَ فَفُتِحَ فَلَمَّا خَلَصْتُ فَاِذَا فِيْهَا اٰدَمُ فَقَالَ هٰذَا اَبُوْكَ اٰدَمُ فَسَلِّمْ عَلَيْهِ فَسَلَّمْتُ عَلَيْهِ فَرَدَّ السَّلَامَ ثُمَّ قَالَ مَرْحَبًا بِالْاِبْنِ الصَّالِحِ وَالنَّبِيِّ الصَّالِحِ ثُمَّ صَعِدَ بِي حَتّٰى اَتَى السَّمَآءَ الثَّانِيَةَ فَاسْتَفْتَحَ قِيْلَ مَنْ هٰذَا قَالَ جِبْرَئِيْلُ قِيْلَ وَمَنْ مَعَكَ قَالَ مُحَمَّدٌ قِيْلَ وَقَدْ اُرْسِلَ اِلَيْهِ قَالَ نَعَمْ قِيْلَ مَرْحَبًا بِهٖ فَنِعْمَ الْمَجِيْءُ جَآءَ فَفُتِحَ فَلَمَّا خَلَصْتُ اِذَا يَحْيٰى وَعِيْسٰى وَهُمَا ابْنَا خَالَةٍ قَالَ هٰذَا يَحْيٰى وَهٰذَا عِيْسٰى فَسَلِّمْ عَلَيْهِمَا فَسَلَّمْتُ فَرَدَّا ثُمَّ قَالَا مَرْحَبًا بِالْاَخِ الصَّالِحِ وَالنَّبِيِّ الصَّالِحِ ثُمَّ صَعِدَ بِي اِلَى السَّمَآءِ الثَّالِثَةِ فَاسْتَفْتَحَ قِيْلَ مَنْ هٰذَا قَالَ جِبْرَئِيْلُ قِيْلَ وَمَنْ مَعَكَ قَالَ مُحَمَّدٌ قِيْلَ وَقَدْ اُرْسِلَ اِلَيْهِ قَالَ نَعَمْ قِيْلَ مَرْحَبًا بِهٖ فَنِعْمَ الْمَجِيْءُ جَآءَ فَفُتِحَ فَلَمَّا خَلَصْتُ اِذَا يُوْسُفُ قَالَ هٰذَا يُوْسُفُ فَسَلِّمْ عَلَيْهِ فَسَلَّمْتُ عَلَيْهِ فَرَدَّ ثُمَّ قَالَ مَرْحَبًا بِالْاَخِ الصَّالِحِ وَالنَّبِيِّ الصَّالِحِ ثُمَّ صَعِدَ بِي حَتّٰى اَتَى السَّمَآءَ الرَّابِعَةَ فَاسْتَفْتَحَ قِيْلَ مَنْ هٰذَا قَالَ جِبْرَئِيْلُ قِيْلَ وَمَنْ مَعَكَ قَالَ مُحَمَّدٌ قِيْلَ وَقَدْ اُرْسِلَ اِلَيْهِ قَالَ نَعَمْ قِيْلَ مَرْحَبًا بِهٖ فَنِعْمَ الْمَجِيْءُ جَآءَ فَفُتِحَ فَلَمَّا خَلَصْتُ فَاِذَا اِدْرِيْسُ فَقَالَ هٰذَا اِدْرِيْسُ فَسَلِّمْ عَلَيْهِ فَسَلَّمْتُ عَلَيْهِ فَرَدَّ ثُمَّ قَالَ مَرْحَبًا بِالْاَخِ الصَّالِحِ وَالنَّبِيِّ الصَّالِحِ ثُمَّ صَعِدَ بِي حَتّٰى اَتَى السَّمَآءَ الْخَامِسَةَ فَاسْتَفْتَحَ قِيْلَ مَنْ هٰذَا قَالَ جِبْرِئِيْلُ قِيْلَ وَمَنْ مَعَكَ قَالَ

مُحَمَّدٌ قِيلَ وَقَدْ أُرْسِلَ إِلَيْهِ قَالَ نَعَمْ قِيلَ مَرْحَبًا بِهِ فَنِعْمَ الْمَجِيءُ فَفُتِحَ فَلَمَّا خَلَصْتُ فَإِذَا هَارُوْنُ قَالَ هٰذَا هَارُوْنُ فَسَلِّمْ عَلَيْهِ فَسَلَّمْتُ عَلَيْهِ فَرَدَّ ثُمَّ قَالَ مَرْحَبًا بِالْأَخِ الصَّالِحِ وَالنَّبِيِّ الصَّالِحِ ثُمَّ صَعِدَ بِيْ حَتّٰى أَتَى السَّمَآءَ السَّادِسَةَ فَاسْتَفْتَحَ قِيلَ مَنْ هٰذَا قَالَ جِبْرَئِيْلُ قِيلَ وَمَنْ مَعَكَ قَالَ مُحَمَّدٌ قِيلَ وَقَدْ أُرْسِلَ إِلَيْهِ قَالَ نَعَمْ قِيلَ مَرْحَبًا بِهِ فَنِعْمَ الْمَجِيءُ جَاءَ فَفُتِحَ فَلَمَّا خَلَصْتُ فَإِذَا مُوْسٰى قَالَ هٰذَا مُوْسٰى فَسَلِّمْ عَلَيْهِ فَسَلَّمْتُ عَلَيْهِ فَرَدَّ ثُمَّ قَالَ مَرْحَبًا بِالْأَخِ الصَّالِحِ وَالنَّبِيِّ الصَّالِحِ فَلَمَّا جَاوَزْتُ بَكٰى قِيلَ لَهُ مَا يُبْكِيْكَ قَالَ أَبْكِي لِأَنَّ غُلَامًا بُعِثَ بَعْدِيْ يَدْخُلُ الْجَنَّةَ مِنْ أُمَّتِهٖ أَكْثَرُ مِمَّنْ يَدْخُلُهَا مِنْ أُمَّتِيْ ثُمَّ صَعِدَ بِيْ إِلَى السَّمَآءِ السَّابِعَةِ فَاسْتَفْتَحَ قِيلَ مَنْ هٰذَا قَالَ جِبْرَئِيْلُ قِيلَ وَمَنْ مَعَكَ قَالَ مُحَمَّدٌ قِيلَ وَقَدْ بُعِثَ إِلَيْهِ قَالَ نَعَمْ قِيلَ مَرْحَبًا بِهِ فَنِعْمَ الْمَجِيءُ جَاءَ فَلَمَّا خَلَصْتُ فَإِذَا إِبْرَاهِيْمُ قَالَ هٰذَا أَبُوْكَ إِبْرَاهِيْمُ فَسَلِّمْ عَلَيْهِ فَسَلَّمْتُ عَلَيْهِ فَرَدَّ السَّلَامَ ثُمَّ قَالَ مَرْحَبًا بِالْاِبْنِ الصَّالِحِ وَالنَّبِيِّ الصَّالِحِ ثُمَّ رُفِعْتُ إِلٰى سِدْرَةِ الْمُنْتَهٰى فَإِذَا نَبِقُهَا مِثْلُ قِلَالِ هَجَرٍ وَإِذَا وَرَقُهَا مِثْلُ آذَانِ الْفِيَلَةِ قَالَ هٰذَا سِدْرَةُ الْمُنْتَهٰى فَإِذَا أَرْبَعَةُ أَنْهَارٍ نَهْرَانِ بَاطِنَانِ وَنَهْرَانِ ظَاهِرَانِ قُلْتُ مَا هٰذَانِ يَا جِبْرَئِيْلُ قَالَ أَمَّا الْبَاطِنَانِ فَنَهْرَانِ فِي الْجَنَّةِ وَأَمَّا الظَّاهِرَانِ فَالنِّيْلُ وَالْفُرَاتُ ثُمَّ رُفِعَ لِيَ الْبَيْتُ الْمَعْمُوْرُ ثُمَّ أُتِيْتُ بِإِنَاءٍ مِّنْ خَمْرٍ وَّإِنَاءٍ مِّنْ لَّبَنٍ وَإِنَاءٍ مِّنْ عَسَلٍ فَأَخَذْتُ اللَّبَنَ فَقَالَ هِيَ الْفِطْرَةُ أَنْتَ عَلَيْهَا وَأُمَّتُكَ ثُمَّ فُرِضَتْ عَلَيَّ الصَّلٰوةُ خَمْسِيْنَ صَلٰوةً كُلَّ يَوْمٍ فَرَجَعْتُ فَمَرَرْتُ عَلٰى مُوْسٰى فَقَالَ بِمَ أُمِرْتَ قُلْتُ أُمِرْتُ بِخَمْسِيْنَ صَلٰوةً كُلَّ يَوْمٍ قَالَ إِنَّ أُمَّتَكَ لَا تَسْتَطِيْعُ خَمْسِيْنَ صَلٰوةً كُلَّ يَوْمٍ وَإِنِّيْ وَاللّٰهِ قَدْ جَرَّبْتُ النَّاسَ قَبْلَكَ وَعَالَجْتُ بَنِيْ إِسْرَائِيْلَ أَشَدَّ الْمُعَالَجَةِ فَارْجِعْ إِلٰى رَبِّكَ فَسَلْهُ التَّخْفِيْفَ لِأُمَّتِكَ فَرَجَعْتُ فَوَضَعَ عَنِّيْ عَشْرًا فَرَجَعْتُ إِلٰى مُوْسٰى فَقَالَ مِثْلَهُ فَرَجَعْتُ فَوَضَعَ عَنِّيْ عَشْرًا فَرَجَعْتُ إِلٰى مُوْسٰى فَقَالَ مِثْلَهُ فَرَجَعْتُ فَوَضَعَ عَنِّيْ عَشْرًا فَرَجَعْتُ إِلٰى مُوْسٰى فَقَالَ مِثْلَهُ فَرَجَعْتُ فَوَضَعَ عَنِّيْ عَشْرًا فَأُمِرْتُ بِعَشْرِ صَلَوَاتٍ كُلَّ يَوْمٍ فَرَجَعْتُ إِلٰى مُوْسٰى فَقَالَ مِثْلَهُ فَرَجَعْتُ فَأُمِرْتُ بِخَمْسِ صَلَوَاتٍ كُلَّ يَوْمٍ فَرَجَعْتُ إِلٰى مُوْسٰى فَقَالَ بِمَا أُمِرْتَ قُلْتُ أُمِرْتُ بِخَمْسِ صَلَوَاتٍ كُلَّ يَوْمٍ قَالَ إِنَّ أُمَّتَكَ لَا تَسْتَطِيْعُ خَمْسَ صَلَوَاتٍ كُلَّ يَوْمٍ وَإِنِّيْ قَدْ جَرَّبْتُ النَّاسَ قَبْلَكَ وَعَالَجْتُ بَنِيْ إِسْرَائِيْلَ أَشَدَّ الْمُعَالَجَةِ فَارْجِعْ إِلٰى رَبِّكَ فَسَلْهُ التَّخْفِيْفَ لِأُمَّتِكَ قَالَ سَأَلْتُ رَبِّيْ حَتّٰى اسْتَحْيَيْتُ وَلٰكِنِّيْ

اَرْضٰی وَاُسَلِّمُ قَالَ فَلَمَّا جَاوَزْتُ نَادٰی مُنَادٍ اَمْضَیْتُ فَرِیْضَتِیْ وَخَفَّفْتُ عَنْ عِبَادِیْ۔ (متفق علیه)

اخرجه البخاری فی صحیحه ۲۰۱/۷حدیث رقم ۳۸۸۷ومسلم فی صحیحه ۱۵۱/۱حدیث رقم (۲۶۵-۱٦٤) واخرجه النسائی فی السنن ۲۱۷/۱ حدیث رقم ٤٤۸ واحمد فی المسند ۲۰۷/٤۔

ترجمہ: حضرت قتادہ (تابعیؒ) حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے اور وہ حضرت مالک بن صعصعہؓ سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسراء اور معراج کی رات کے متعلق بیان کرتے ہوئے فرمایا: ''اس رات میں حطیم میں لیٹا ہوا تھا اور بعض موقعوں پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ''حجر'' میں لیٹنے کا ذکر فرمایا کہ اچانک ایک آنے والا (فرشتہ) میرے پاس آیا اور اس نے (میرے جسم کے) یہاں سے یہاں تک کے حصہ کو چاک کیا۔ راوی کہتے ہیں کہ (یہاں سے یہاں تک سے) آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی مراد گردن گڑھے سے زیر ناف بالوں تک کا پورا حصہ تھا۔ پھر نکالا' اس کے بعد میرے سامنے سونے کا ایک طشت لایا گیا جو ایمان سے بھرا ہوا تھا اور اس میں میرے دل کو دھویا گیا' پھر دل میں (اللہ کی عظمت ومحبت یا علم وایمان کی دولت) بھری گئی اور پھر دل کو سینہ میں اس کی جگہ رکھ دیا گیا اور ایک روایت میں یہ الفاظ ہیں کہ پھر میرے پیٹ (کے اندر کی تمام چیزیں یا دل کی جگہ) کو زمزم کے پانی سے دھویا گیا اور پھر اس میں ایمان وحکمت بھرا گیا' اس کے بعد سفید رنگ کا ایک جانور لایا گیا جو خچر سے چھوٹا اور گدھے سے بڑا تھا' اس کا نام براق تھا (اس کی تیز رفتاری کا یہ عالم تھا کہ) جہاں تک اس کی نظر جاتی تھی وہاں اس کا ایک قدم پڑتا تھا' مجھے اس پر سوار کیا گیا اور جبرئیل مجھے لے کر چلے یہاں تک کہ میں آسمان دنیا (یعنی پہلے آسمان) پر پہنچا' جبرئیل علیہ السلام نے دروازہ کھولنے کے لئے کہا تو (دربان فرشتوں کی طرف سے) پوچھا گیا کہ کون ہے؟ انہوں نے کہا: میں جبرئیل ہوں پھر پوچھا گیا اور تمہارے ساتھ کون ہے؟ جبرئیل علیہ السلام نے جواب دیا: محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ اس کے بعد سوال کیا گیا: ان (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) کو بلانے کے لئے کسی کو بھیجا گیا تھا (یا از خود آئے ہیں) جبرئیل علیہ السلام نے جواب دیا بلائے ہوئے آئے ہیں۔ تب ان فرشتوں نے کہا: ہم محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو خوش آمدید کہتے ہیں' آنے والے کو آنا مبارک ہو۔ اس کے بعد آسمان کا دروازہ کھولا گیا اور جب میں آسمان میں داخل ہوا تو میں نے دیکھا کہ حضرت آدم علیہ السلام میرے سامنے موجود ہیں' جبرئیل علیہ السلام نے کہا: یہ تمہارے باپ (یعنی جد اعلیٰ) آدم ہیں ان کو سلام کرو۔ میں نے حضرت آدم علیہ السلام کو سلام کیا' انہوں نے سلام کا جواب دیا اور فرمایا: صالح بیٹے اور صالح پیغمبر کو خوش آمدید۔ پھر جبرئیل علیہ السلام مجھے لے کر اوپر دوسرے آسمان پر آئے' انہوں نے دروازہ کھولنے کے لئے کہا تو پوچھا گیا کون ہے؟ انہوں نے کہا: میں جبرئیل ہوں۔ پوچھا گیا: تمہارے ساتھ کون ہے؟ انہوں نے کہا محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ پھر پوچھا گیا ان کو بلانے کے لئے کسی کو بھیجا گیا تھا؟ جبرئیل علیہ السلام نے کہا: ہاں! تب دربان فرشتوں نے کہا: ہم محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو خوش آمدید کہتے ہیں۔ آنے والے کو آنا مبارک ہو۔ اس کے بعد آسمان کا دروازہ کھولا گیا اور جب میں آسمان میں داخل ہوا تو میں نے وہاں حضرت یحییٰ اور عیسیٰ علیہما السلام کو پایا جو ایک دوسرے کے خالہ زاد بھائی تھے۔ جبرئیل علیہ السلام نے کہا: یہ یحییٰ وعیسیٰ علیہما السلام ہیں' ان کو سلام کرو۔ میں نے دونوں کو سلام کیا اور دونوں نے میرے سلام کا جواب دے کر کہا: صالح بھائی اور صالح پیغمبر' خوش آمدید۔ اس کے بعد جبرئیل علیہ السلام مجھ کو لے کر اوپر چلے اور تیسرے آسمان پر آئے انہوں نے دروازہ کھولنے کے لئے کہا تو پوچھا گیا کون ہے؟ جبرئیل نے کہا: میں جبرئیل ہوں۔ پوچھا گیا کہ تمہارے ساتھ کون ہے؟

انہوں نے کہا محمد ﷺ ہیں۔ پھر پوچھا گیا ان کو بلانے کے لئے کسی کو بھیجا گیا تھا؟ جبرئیل علیہ السلام نے کہا: ہاں۔ تب ان فرشتوں نے کہا: ہم محمد ﷺ کو خوش آمدید کہتے ہیں' آنے والے کو آنا مبارک ہو۔ اس کے بعد آسمان کا دروازہ کھولا گیا اور جب میں تیسرے آسمان میں داخل ہوا تو میں نے وہاں حضرت یوسف علیہ السلام کو پایا' جبریل علیہ السلام نے کہا: یہ یوسف ہیں' ان کو سلام کرو۔ میں نے ان کو سلام کیا اور انہوں نے سلام کا جواب دے کر کہا: صالح بھائی اور صالح پیغمبر کو خوش آمدید۔ اس کے بعد جبرئیل مجھ کو لے کر اور اوپر چلے اور چوتھے آسمان پر آئے انہوں نے دروازہ کھولنے کے لئے کہا تو پوچھا گیا: کون ہے؟ انہوں نے کہا میں جبرئیل ہوں' پوچھا گیا کہ تمہارے ساتھ کون ہے؟ انہوں نے کہا محمد ﷺ ہیں۔ پھر پوچھا گیا: ان کو بلانے کے لئے کسی کو بھیجا گیا تھا؟ جبرئیل علیہ السلام نے کہا ہاں۔ تب ان فرشتوں نے کہا: محمد ﷺ کو خوش آمدید کہتے ہیں۔ آنے والے کو آنا مبارک ہو۔ اس کے بعد آسمان کا دروازہ کھولا گیا اور جب میں چوتھے آسمان میں داخل ہوا تو کیا دیکھتا ہوں کہ حضرت ادریس علیہ السلام سامنے کھڑے ہیں' جبرئیل علیہ السلام نے کہا: یہ ادریس علیہ السلام ہیں ان کو سلام کرو۔ میں نے ان کو سلام کیا اور انہوں نے میرے سلام کا جواب دے کر کہا: میں نیک بخت بھائی اور پیغمبر صالح کو خوش آمدید کہتا ہوں۔ اس کے بعد جبرئیل علیہ السلام مجھ کو لے کر اور اوپر چلے اور پانچویں آسمان پر آئے' انہوں نے دروازہ کھولنے کے لئے کہا تو پوچھا گیا کون ہے؟ انہوں نے کہا: میں جبرئیل علیہ السلام ہوں' پھر پوچھا گیا اور تمہارے ساتھ کون ہے؟ انہوں نے کہا: محمد ﷺ ہیں۔ پھر پوچھا گیا: ان کو بلانے کے لئے کسی کو بھیجا گیا تھا؟ جبرئیل علیہ السلام نے کہا: ہاں! تب ان فرشتوں نے کہا: محمد ﷺ کو خوش آمدید کہتے ہیں' آنے والے کو آنا مبارک ہو۔ اس کے بعد آسمان کا دروازہ کھولا گیا اور جب میں پانچویں آسمان میں داخل ہوا تو وہاں میں نے حضرت ہارون علیہ السلام ہیں' جبرئیل علیہ السلام نے کہا یہ ہارون ہیں ان کو سلام کرو۔ میں نے ان کو سلام کیا اور انہوں نے میرے سلام کا جواب دے کر کہا: صالح بھائی اور پیغمبر صالح کو خوش آمدید کہتا ہوں۔ اس کے بعد جبرئیل علیہ السلام مجھ کو لے کر اور اوپر چلے اور چھٹے آسمان پر آئے انہوں نے دروازہ کھولنے کے لئے کہا تو پوچھا گیا کہ کون ہے؟ جبرئیل علیہ السلام نے کہا: میں جبرئیل علیہ السلام ہوں' پھر پوچھا گیا: تمہارے ساتھ کون ہے؟ انہوں نے کہا محمد ﷺ ہیں۔ پھر سوال کیا گیا: ان کو بلانے کے لئے کسی کو بھیجا گیا تھا؟ جبرئیل علیہ السلام نے کہا ہاں! تب ان فرشتوں نے کہا: ہم محمد ﷺ کو خوش آمدید کہتے ہیں۔ آنے والے کو آنا مبارک ہو۔ اس کے بعد آسمان کا دروازہ کھولا گیا اور جب میں چھٹے آسمان میں داخل ہوا تو کیا دیکھتا ہوں کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام میرے سامنے کھڑے ہیں' جبرئیل علیہ السلام نے کہا: یہ موسیٰ علیہ السلام ہیں ان کو سلام کرو۔ میں نے ان کو سلام کیا اور انہوں نے میرے سوال کا جواب دے کر کہا: میں نیک بخت بھائی اور پیغمبر صالح کو خوش آمدید کہتا ہوں۔ اس کے بعد جب میں آگے بڑھا تو حضرت موسیٰ علیہ السلام رونے لگے' پوچھا گیا: آپ کیوں روتے ہیں؟ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کہا: ایک نوجوان جس کو میرے بعد رسول بنا کر دنیا میں بھیجا گیا اس کی امت کے لوگ میری امت کے لوگوں سے کہیں زیادہ جنت میں داخل ہوں گے۔ بہرحال (اس چھٹے آسمان سے گزر کر) جبرئیل علیہ السلام مجھ کو لے کر اور اوپر چلے اور ساتویں آسمان پر آئے' انہوں نے آسمان کا دروازہ کھولنے کے لئے کہا تو پوچھا گیا کہ کون ہے؟ جبرئیل علیہ السلام نے کہا: میں جبرئیل علیہ السلام ہوں۔ پھر پوچھا گیا: اور تمہارے ساتھ کون ہے؟ انہوں نے کہا: محمد ﷺ ہیں۔ پھر سوال کیا گیا ان کو

بلانے کے لئے کسی کو بھیجا گیا تھا؟ جبرئیل علیہ السلام نے کہا ہاں! تب ان فرشتوں نے کہا: ہم محمد ﷺ کو خوش آمدید کہتے ہیں' آنے والے کو آنا مبارک ہو۔ اس کے بعد آسمان کا دروازہ کھولا گیا اور جب میں ساتویں آسمان میں داخل ہوا تو میں نے وہاں حضرت ابراہیم علیہ السلام کو پایا۔ جبرئیل علیہ السلام نے کہا: یہ تمہارے باپ (مورث اعلیٰ) ابراہیم علیہ السلام ہیں ان کو سلام کرو۔ میں نے ان کو سلام کیا اور انہوں نے سلام کا جواب دے کر کہا: صالح بیٹے اور صالح پیغمبر کو خوش آمدید۔ اس کے بعد مجھ کو سدرۃ المنتہیٰ تک پہنچایا گیا' میں نے دیکھا کہ اس کے پھل مقام ہجر کے (بڑے بڑے) مٹکوں کی طرح تھے اور پتے ہاتھی کے کانوں کی طرح تھے' جبرائیل علیہ السلام نے (وہاں پہنچ کر) کہا: یہ سدرۃ المنتہیٰ ہے! میں نے وہاں چار نہریں دیکھیں' دو نہریں تو باطنی تھیں اور دو نہریں ظاہری تھیں' میں نے پوچھا: جبرئیل یہ دو طرح کی نہریں کیسی ہیں؟ جبرئیل علیہ السلام نے بتایا: یہ باطن کی دو نہریں جنت کی ہیں اور یہ ظاہر کی دو نہریں نیل اور فرات ہیں' پھر مجھے بیت المعمور دکھایا گیا اور اس کے بعد ایک پیالہ شراب کا' ایک پیالہ دودھ کا اور ایک پیالہ شہد کا میرے سامنے لایا گیا تو میں نے دودھ والا برتن اٹھا لیا (یہ دیکھ کر کہ میں نے دودھ کے پیالہ کو اختیار کیا) کہا: یہ وہ فطرت ہے جس پر آپ اور آپ کی امت کے لوگ اسی فطرت پر (قائم و عامل) رہیں گے (اور جہاں تک شراب کا معاملہ ہے تو وہ اُم الخبائث اور شر و فساد کی جڑ ہے) اس کے بعد مجھ پر (ایک دن اور ایک رات کی) پچاس نمازیں فرض کی گئیں۔ پھر (جب ملاء اعلیٰ کا میرا سفر تمام ہوا اور درگاہ رب العزت سے) میں واپس ہوا تو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے پاس سے گزرا' تو انہوں نے پوچھا: تمہیں کس عبادت کا حکم دیا گیا ہے؟ میں نے ان کو بتایا کہ (ہر شب و روز میں) پچاس نمازوں کا حکم دیا گیا ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے (یہ سن کر) کہا تمہاری امت (نسبتاً کمزور قویٰ رکھنے کے سبب یا کسل و سستی کے سبب) رات دن میں پچاس نمازیں ادا نہیں کر سکے گی' خدا کی قسم میں تم سے پہلے لوگوں کو آزما چکا ہوں (کہ عبادت خداوندی کے راستہ میں مشقت و تعب برداشت کرنا ان کی طبیعتوں پر کس قدر مشکل تھا) اور بنی اسرائیل کی اصلاح و درستی کی سخت ترین کوشش کر چکا ہوں (لیکن وہ اصلاح پذیر نہ ہوئے باوجودیکہ ان کے قویٰ تمہاری امت کے لوگوں سے زیادہ مضبوط تھے' تو پھر تمہاری امت کے لوگ اتنی زیادہ نمازوں کی مشقت کیسے برداشت کر سکیں گے) لہٰذا آپ اپنے پروردگار کے پاس واپس جائیں اور اپنی امت کے حق میں تخفیف اور آسانی کی درخواست کرو۔ چنانچہ میں (اپنے پروردگار کی بارگاہ میں) دوبارہ حاضر ہوا اور میرے پروردگار نے میرے عرض کرنے پر) دس نمازیں کم کر دیں' میں پھر حضرت موسیٰ علیہ السلام کے پاس آیا (اور ان کو بتایا کہ دس نمازیں کم کر کے چالیس نمازیں کر دی گئی ہیں) لیکن انہوں نے پھر وہی کہا جو پہلے کہا تھا (کہ میں پہلے لوگوں کو آزما چکا ہوں' تمہاری امت کے لوگ چالیس نمازیں بھی ادا نہیں کر سکیں گے' اب پھر بارگاہ رب العزت میں جا کر مزید تخفیف کی درخواست کرو) چنانچہ میں پھر بارگاہ خداوندی میں حاضر ہوا اور (چالیس میں سے) دس نمازیں کم کر دی گئیں' میں پھر حضرت موسیٰ علیہ السلام کے پاس آیا انہوں نے پھر وہی کہا جو پہلے کہا تھا' چنانچہ میں بارگاہ خداوندی میں حاضر ہوا اور (تیس میں سے) دس نمازیں کم کر دی گئیں' میں پھر حضرت موسیٰ علیہ السلام کے پاس آیا تو انہوں نے پھر وہی کہا جو پہلے کہا تھا' چنانچہ میں بارگاہِ خداوندی میں حاضر ہوا اور مجھے ہر روز دس نمازوں کا حکم دیا گیا' میں پھر حضرت موسیٰ علیہ السلام کے پاس آیا تو انہوں نے پھر وہی کہا جو پہلے کہا تھا۔

چنانچہ میں پھر بارگاہ خداوندی میں حاضر ہوا اور میں نے پانچ نمازوں کی تخفیف کی درخواست کی مجھے ہر روز پانچ نمازیں پڑھنے کا حکم

دیا گیا' میں پھر حضرت موسیٰ علیہ السلام کے پاس آیا تو انہوں نے کہا کہ اب تمہیں کیا حکم ملا ہے؟ میں نے ان کو بتایا کہ اب مجھے رات دن میں پانچ نمازیں پڑھنے کا حکم دیا گیا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کہا: حقیقت یہ ہے کہ تمہاری امت کے اکثر لوگ (پوری پابندی اور تسلسل کے ساتھ) رات دن میں پانچ نمازیں بھی نہیں پڑھ پائیں گے' حقیقت یہ ہے کہ میں تم سے پہلے لوگوں کو آزما چکا ہوں اور بنی اسرائیل کی اصلاح ودرستی کی سخت کوشش کر کے دیکھ چکا ہوں (وہ تو اس سے بھی کہیں کم عبادت خداوندی پر عامل نہیں رہ سکے تھے) لہٰذا آپ پھر پروردگار کے پاس جائیں اور اپنی امت کے لئے (پانچ نمازوں میں بھی) تخفیف کی درخواست کریں۔ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: (کہ اس موقع پر میں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہا) کہ میں بار بار اپنے پروردگار سے تخفیف کی درخواست کر چکا ہوں لہٰذا اب مجھے حیاء آتی ہے (اگرچہ امت کی طرف سے پانچ نمازوں کی پابندی نہ ہو سکنے کا گمان ہے مگر مزید تخفیف کی درخواست کرنا اب میرے لئے ممکن نہیں ہے) میں اپنے پروردگار کے اس حکم کو (برضا ورغبت) قبول کرتا ہوں (اور اپنے اور اپنی امت کا معاملہ اس کے سپرد کر دیتا ہوں کہ وہ اپنی توفیق ومدد سے امت کے لوگوں کو ان پانچ نمازوں کی ادائیگی کا پابند بنائے)۔ فرمایا حضرت موسیٰ علیہ السلام سے اس گفتگو کے بعد جب میں وہاں سے رخصت ہوا تو (اللہ تعالیٰ کی طرف سے) یہ ندائے غیبی آئی: میں نے (پہلے تو) اپنے فرض کو جاری کیا اور پھر (اپنے پیارے رسول کے طفیل میں) اپنے بندوں پر تخفیف کر دی (مطلب یہ کہ اب میرے بندوں کو نمازیں تو پانچ ہی پڑھنی پڑیں گی لیکن ان کو ثواب پچاس نمازوں کا ملے گا۔'' (بخاری ومسلم)

تشریح: **ان نبی الله ﷺ حدثهم**: آنحضرت ﷺ نے اسراء ومعراج کی رات کے احوال وواردات کی تفصیل صحابہ کرام سے بیان فرمائی جن میں حضرت مالک بن صعصعہؓ بھی موجود تھے۔ (**عن ليلة اسري به**): لیلۃ، اضافت کے ساتھ ہے، ایک نسخہ میں تنوین کے ساتھ ہے بعد والا جملہ لیلۃ کی صفت ہے۔ شرح مصابیح میں زین العرب کہتے ہیں کلمہ لیلۃ مضاف ہے جملہ ماضی کے طرف ایک نسخہ میں دو روایتیں ہیں مجرور اور تنوین کے ساتھ۔ طیبی رحمہ اللہ کہتے ہیں لیلۃ معرومنی دونوں اعتبار سے پڑھنا جائز ہے۔ اور اسري مجہول کے صیغہ کے ساتھ ہے اس جملہ سے آیت مبارکہ **سبحان الذی اسری بعده ليلاً** کی طرف اشارہ ہے اور **الا سراء اسری** ضرب یضرب سے رات کے وقت چلنے کے معنی میں ہے۔ بعض حضرات کہتے ہیں **سری** اور **اسری** کا ایک ہی معنی ہے۔ بعض حضرات کہتے ہیں اسري رات کے اول حصے میں سفر کرنے کیلئے آتا ہے اور سری مجرد سے رات کے آخری حصے میں سفر کرنے کے معنی میں آتا ہے۔

کچھ حضرات نے اس قول کو اقرب قرار دیا ہے اسري به میں لفظ **به** تعدیہ کیلئے ہے اور دوبارہ کلمہ **ليل** تاکیداً یا تجریداً فرمایا۔ آیت مبارکہ میں لیل نکرہ ہے جس سے تقلیل وتعظیم بتلانا مقصود ہے۔

(**بينما انا فی الحطيم**): قاضی عیاضؒ کہتے ہیں حطیم سے مراد حجر ہی ہے، اس کو حجر اس لئے کہا جاتا ہے ہلالی شکل کی دیوار ہے حطیم اس لئے کہتے ہیں خانہ کعبہ کے برابر کی دیوار ہے۔ آنحضرت کے قول مبارک سے یہی مقام مراد ہے۔ (**وربما قال في الحجر**): اس جملہ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ واقعہ معراج آنحضرت ﷺ نے کئی مرتبہ بیان فرمایا، کبھی اس کو حطیم سے تعبیر فرمایا کبھی حجر سے، بعض حضرات کہتے ہیں حطیم حجر کے علاوہ کوئی اور جگہ ہے یہ مقام ابراہیم اور باب رحمت کے درمیان کا حصہ ہے۔

بعض حضرات کہتے ہیں اس سے رکن یمانی مقام ابراہیم اور زمزم کے درمیانی حصہ مراد ہے کہ آپ یہاں کہیں استراحت فرما رہے تھے حطیم کے بعد حجر'یہ راوی کا شک ہے۔ کہ انہوں نے حطیم یا حجر کا کلمہ سنا

ابن حبیبؒ کہتے ہیں: حطیم رکن یمانی یعنی جہاں حجر اسود لگا ہوا ہے، وہاں سے ہوتے ہوئے باب رحمت اور مقام ابراہیم تک کا حصہ ہے کیونکہ اس حصہ پر لوگوں کی بھیڑ ہوتی ہے اور ٹوٹ پڑھتے ہیں۔ شارح اول نے یہی تفصیل ذکر کی ہے۔ واللہ اعلم

مضطجعا یہ قید دونوں روایتوں کے اعتبار سے ہے اور یہ حالت نیند و بیداری دونوں حالتوں کا احتمال رکھتی ہے۔

(ما بين هذه الى هذه يعنى): بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے **يعنى ثغرة نحره الى شعرته** تک یہ حضرت مالکؒ کے تفسیری کلمات ہیں جو انہوں نے آنحضرت کا قول مبارک **هذه** کی مراد بیان فرمایا ہے۔

کلمہ ثغرہ کا تلفظ:

ثاء کے ضمہ عین کے سکون کے ساتھ، پسلی کی ڈیوں کے درمیان کے حصے کو کہتے ہیں جو گھڑا سا ہوتا ہے۔ **الى شعرته**، شین کی کسرہ کے ساتھ، زیر ناف بالوں تک کا پورا حصہ، بعض حضرات کہتے ہیں نچلا وہ حصہ جہاں بال اگتے ہیں۔ النہایہ میں اسی طرح ہے۔

فاستخرج قلبى: ایک شارح کہتے ہیں: شق صدر کا یہ واقعہ اس واقعہ کے علاوہ ہے جو بچپن میں پیش آیا تھا، اس وقت آپ ﷺ کے سینہ مبارک کے چاک کئے جانے کا مقصد آپ ﷺ کے اندر سے وہ مادہ نکالنا تھا جس کے ذریعہ انسان کو گمراہ کرنے کا موقعہ شیطان کو ملتا ہے یا جس کے سبب خود انسان کا نفس گمراہی اور برائی میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ معراج کی رات میں شق صدر کا مقصد آپ ﷺ کے قلب مبارک میں علم و معرفت کا کمال بھرنا تھا۔ ملا علی قاریؒ فرماتے ہیں حدیث کے اس جملہ میں تخلیہ، تحلیہ، مقام فناء اور بقاء نیز اثبات مولی اور غیر کی نفی کے طرف اشارہ ہے جس طرح کلمہ توحید سے ان تمام باتوں کی طرف اشارہ ہے۔

پھر یہ سمجھ لیں کہ یہ آپ ﷺ کے معجزات میں سے ایک معزہ ہے وگرنہ تو عام عادت کے مطابق یہ محال سمجھا جاتا ہے کہ ایک شخص کے سینہ کو چاک کر کے دل بھی نکالا گیا ہو پھر بھی وہ زندہ رہے۔ اسی وجہ سے بعض لوگوں نے اس جملہ کو معنی مجازی پر محمول کیا ہے۔ تورپشتیؒ ایسے لوگوں پر رد کرتے ہوئے فرماتے ہیں: حدیث مبارک میں شق صدر اور اس طرح کے دوسرے جو واقعات آنحضرت ﷺ کے متعلق منقول ہیں اس میں درست یہ ہے کہ بغیر کسی چوں چراں کے اس کو تسلیم کیا جائے۔ اور قیل وقال کرنے والوں کے جواب میں تاویلات پیش کرنے کی ضرورت نہیں، کیونکہ وہ صحیح بات سے بھاگنے کیلئے اسی طرح کے واقعات میں محال کا حکم لگاتے ہیں۔

ہم بحمد للہ سچی خبر میں حقیقت سے مجاز کی طرف جانے کی کوئی ضرورت محسوس نہیں کرتے کیونکہ قادر مطلق ذات کے سامنے کوئی چیز بھی محال نہیں۔

(ثم اتيت بطست): کلمہ **طست**، طاء کے فتحہ اور کسرہ کے ساتھ نیز عربی میں سین کے ساتھ جبکہ عجمی زبان میں شین

(طشت) کے ساتھ۔ (من ذهب): یہ سونے کی حرمت سے قبل کا واقعہ ہے۔ یا آپ ﷺ کی خصوصیت ہے، عام امت کیلئے سونے کے برتن استعمال کرنا جائز نہیں۔ (مملوء ة): مفعول کے وزن پر ہمزہ کے ساتھ نیز واؤ کے شد کے ساتھ بھی پڑھا جاتا ہے۔ (ایمانًا): یہ تمیز ہے۔ یہ کنایہ اور تمثیل ہے کیونکہ اشاء غیر مرئیہ کیلئے صورت مثالی ثابت ہے۔ جیسے انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کے ارواح اسی جسم کے ساتھ موجود ہوتی، جس کے ساتھ پہلے تھیں کیونکہ صحیح قول کے مطابق ارواح اجسام لطیفہ میں سے ہیں الا یہ کہا جاتا ہے انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کے ارواح کی تمثیل ان کے اجساد ہانیہ کے ساتھ ہے یا نہیں؟ تو اس میں حقیقت یہ ہے کہ انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کے اجساد مبارک کو ہمیشہ کیلئے اللہ تعالیٰ نے زمین پر حرام کیا ہے وہ ان کے جسم کو نہیں نگل سکتی اگر یہ کہا جائے کہ انبیاء کے وہ اجسام کہ جن کے ساتھ روح کا تعلق ہوتا ہے وہ عالم ملک میں ہوتے ہیں اوران اجسام کی صورت مثالیہ عالم ملکوت میں ہوتی ہے تو یہ توجیہہ نہایت شاندار ہے۔ بلکہ یہی توجیہہ ظاہر ہے اور ایسا ہونا اللہ تعالیٰ کے قبضہ قدرت سے باہر بھی نہیں۔

شرح مسلم میں ہے ایمان کو ایک طشت میں لانے سے مراد کوئی ایسی چیز ہے جس سے ایمان میں اضافہ ہوتا ہے، اس چیز کو مجازاً ایمان سے تعبیر کیا گیا ہے۔ شارح اول کہتے ہیں: ممکن ہے ایمان کو ظاہری جسم دے کر واقعۃً اس طشت میں بھرا گیا ہو جیسے قیامت کے دن اعمال کو مجسم کیا جائے گا تا کہ ان کو میزان میں تولا جا سکے۔ اور موت کے مینڈھے کو ذبح کیا جائے گا

(فغسل قلبي، ثم حشي): الحشو سے ماضی مجہول کا صیغہ ہے یعنی دل کو میرے پروردگار کی محبت سے بھر دیا گیا۔

(ثم اعيد): پھر دل کو اپنی جگہ مکمل طور پر رکھ دیا گیا۔ (وفي رواية: ثم غسل البطن): پورے پیٹ کو یا صرف دل کو دھویا گیا کیونکہ دل باری تعالیٰ کے محبت کا گھر ہے۔

(بماء زمزم ثم ملئ ايمانًا وحكمة): بطور ایقان، احسان علم وحکمت سے بھر دیا گیا یہ ایمان وحکمت کی تکمیل وتمیم تھی۔

(ثم اتيت بدابة): لفظ دابة مذکر ومؤنث دونوں کیلئے بولا جاتا ہے نیز عاقل غیر عاقل بھی استعمال ہوتا ہے چنانچہ باری تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿وما من دابة في الارض الا على الله رزقها﴾ میں جملہ مخلوقات مراد ہیں۔ آخر میں تائے مدودہ وحدت کیلئے ہے یہاں درمیانی جسم کا سواری مراد ہے۔ (ابيض): حال یا صفت ہونے کی وجہ سے منصوب ہے۔ (البراق): البراق باء کے ضمہ کے ساتھ

اس جانور کا نام براق اس مناسبت سے رکھا گیا کہ وہ برق (بجلی) کی طرح تیز رفتار اور روشنی کی طرح چمکدار تھا اس کا قدم حد نظر پر پڑتا تھا، اس سے بعض حضرات نے یہ استدلال کیا ہے کہ وہ براق ایک ہی قدم میں آسمان پر پہنچ گیا ہوگا کیونکہ زمین سے اس کی حد نظر آسمان ہی تھا اس تیز رفتاری کی تائید آپ کے قول مبارک (ويضع خطوه عند اقصیٰ طرفه) سے بھی ہوتی ہے۔

کلمہ طرفه طاء کے فتحہ اور راء کے سکون کے ساتھ یا دونوں کے فتحہ کے ساتھ۔ بعض حضرات کہتے ہیں تمام انبیاء کیلئے اللہ تعالیٰ نے یہ سواری متعین فرمائی تھی۔ بعض حضرات فرماتے ہیں ہر نبی کیلئے اس کی حیثیت ومرتبہ کے مطابق الگ الگ براق تھے، جیسا کہ آخرت میں ہر نبی کیلئے اس کے مرتبہ ومقام کے مطابق الگ الگ حوض بنے ہوئے ہیں۔ شرح مسلم میں ہے حضرات

فرماتے ہیں براق اس مخصوص سواری کا نام ہے جس پر معراج کی شب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے سواری فرمائی۔ زبیریؒ اور صاحب تحریر لکھتے ہیں: براق وہ جانور ہے جس پر انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام سواری فرمایا کرتے تھے۔ صاحب تحریر اور زبیرؒ نے جو کہا ہے یہ نقل صحیح کا محتاج ہے۔

طیبی رحمہ اللہ کہتے ہیں: شاید صاحب تحریر اور زبیرؒ نے دوسری روایت **فربطسه بالحلقه التی تربط بها الانبیاء** سے استدلال کیا ہے، لیکن اس روایت میں بھی کوئی ایسی بات دلیل کی نہیں کہ ان کی کہی ہوئی بات تسلیم کی جاسکے، کیونکہ روایت ثانی میں بھی براق سے جنس براق ہے۔ طیبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں اس بارے میں زیادہ ظاہر روایت فصل ثانی کی حضرت انسؓ والی روایت ہے جس میں حضرت جبریل براق کو مخاطب کرتے ہوئے فرماتے ہیں **فما رکبك احد اکرم علی الله منه**، کہ آنحضرت کے علاوہ کسی کو اللہ تعالیٰ نے تم پر سواری کا شرف نہیں بخشا ہے۔

کیونکہ اس میں یہ احتمال موجود ہے حضرت جبرائیل اور دیگر ملائکہ میں سے کسی نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے قبل اس پر سواری کی ہوگی کم از کم یہ احتمال تو ممکن ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے طرف آتے ہوئے کسی فرشتے نے سواری کی ہو۔

یا حضرت جبرائیلؑ کے قول کا یہ مطلب ہوگا آپ جیسے یا آپ کی جنس کے لوگوں میں سے (یعنی انبیاء میں سے) کسی بھی ایسے شخص نے سواری نہیں کی جو مرتبے میں آپ کے برابر ہو سکے لہٰذا اس سے بے رغبتی کا کوئی سبب موجود نہیں ہے۔

(فحملت علیه): مجھے اس پر سوار کیا گیا، اس جملہ میں اس طرف اشارہ ہے کہ اس براق پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا سوار ہونا محض اللہ کی مدد اور قدرت سے ممکن ہوا اور یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ حضرت جبرائیلؑ نے اپنی قوت ملکیت کے ذریعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اس براق پر سوار کرایا تھا اس کی تفصیل آگے آرہی ہے۔

(فانطلق...... الدنیا): اس سے بظاہر یہ مفہوم ہوتا ہے کہ آنحضرت براق کی سواری ہی کے ذریعے آسمان میں داخل ہوئے۔ بعض حضرات نے اسی حدیث سے استدلال کرتے ہوئے کہا ہے کہ معراج کا واقعہ اس شب سے الگ ایک دوسری شب میں پیش آیا تھا جس میں صرف اسراء یعنی بیت المقدس تک کا سفر پیش آیا تھا جس کو لیلۃ الاسراء کہا جاتا ہے کیونکہ اس روایت میں بیت المقدس تک کے سفر کا کوئی ذکر نہیں ہے بلکہ مسجد حرام سے براق پر سوار ہو کر روانہ ہونے کا ذکر ہے اس لئے معلوم ہوتا ہے کہ اس شب میں صرف معراج پیش آئی تھی۔ معراج کے وقت جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم آسمان پر تشریف لے گئے تو براق پر سوار تھے یا سیڑھی کے ذریعہ عروج وصعود فرمایا؟

اس روایت سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ براق پر سوار ہو کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم آسمان پر تشریف لے گئے جب کہ دوسری روایت سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ آسمان تک کا عروج سیڑھی کے ذریعہ ہوا۔

تو حقیقت یہ ہے کہ یہاں اس روایت میں راوی نے اختصار سے کام لیا ہے اور واقعہ کی تفصیل ذکر کرنے کے بجائے اجمال پر اکتفاء کیا ہے اس سے پہلے یہ بیان کیا جاچکا ہے کہ آنحضرت براق پر سوار ہو کر بیت المقدس پہنچے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے براق کو اس حلقہ سے باندھ دیا جس سے انبیاء کرام اپنے براقوں کو باندھتے تھے اور یہ عین ممکن ہے کہ بیت المقدس تک کا سفر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے براق پر کیا پھر بیت المقدس کے مشاغل سے فارغ ہو کر معراج (سیڑھی) کے ذریعہ آسمانوں پر تشریف لے

گئے۔ واللہ اعلم

راوی نے روایت کو مختصر بیان کیا ہے دیا ہے جس کی وجہ سے مفہوم سمجھنے میں خلل واقع ہوا ہے۔

آپؐ کو پہلے بیت المقدس لے جانے کی حکمت کے متعلق بعض حضرات لکھتے ہیں کہ اس میں حکمت یہ تھی تا کہ دشمنوں کے سامنے حق کو ظاہر کر دیا جائے اگر آپ ﷺ کو مکہ مکرمہ سے براہ راست آسمانوں پر لے جایا جاتا تو معاندین کے سامنے حق کی وضاحت کے لئے کوئی راستہ باقی نہیں رہتا چنانچہ جب روایات میں آتا ہے کہ آپ ﷺ سے جب کفار مکہ نے بیت المقدس کی نشانیاں اور حالات پوچھا نیز اپنے شام جانے والے قافلوں کے متعلق جب پوچھا تو آپ ﷺ نے ٹھیک ٹھیک تمام نشانیاں ان کے سامنے اس طرح بیان فرمائی جیسے سامنے دیکھ کے کوئی بتاتا ہے جس وجہ سے کفار مکہ کا منہ بند ہوا۔

اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ آپ ﷺ کو اس مقدس سرزمین کی طرف اس لئے لے جایا گیا کہ یہ اکثر انبیاء کا وطن ہجرت رہا ہے۔

امام سیوطیؒ نے بھی ایک حکمت ذکر فرمائی ہے وہ یہ کہ روایت میں آتا ہے' آسمان کا دروازہ جس کو مصعد الملائکہ کہا جاتا ہے عین بیت المقدس کے اوپر ہے۔ اس لئے اولاً آپ ﷺ کو بیت المقدس لے جایا گیا تا کہ وہاں سے سیدھا آسمانوں کی طرف چڑھیں بغیر کسی پیچدگی کے۔

(قال جبریلُ): جبریل سے پہلے لفظ ھو یا انا محذوف ہے۔ قاضی عیاضؒ فرماتے ہیں اس جملہ سے معلوم ہوا کہ آسمان میں حقیقۃً دروازے ہیں اور ان دروازوں پر دربان مقرر ہیں۔ اس جملہ سے یہ بھی ثابت ہوا کہ اگر کسی کے گھر جا کر آواز یا دستک دی جائے اور گھر کے اندر سے پوچھا جائے کہ کون ہے؟ تو اس کے جواب میں صرف یہ نہ کہا جائے کہ میں ہوں [جیسا کہ عام طور پر لوگوں کی عادت ہے] بلکہ اپنا نام لے کر جواب دیا جائے مثلاً یوں کہا جائے "میں زید ہوں" کیونکہ صرف میں ہوں کہنے کی ممانعت وارد ہوئی ہے۔

(قیل ومن معك؟): یعنی آپ کو تو ہم جانتے ہیں آپ کے ساتھ کون ہے۔ کہ آپ دروازہ کھلوا رہے ہیں۔ (قال: محمد. قیل: وقد ارسل الیه؟): واؤ عاطفہ ہے اور حرف استفہام مقدر تقدیر عبارت ہے أطلب وارسل الیه بالعروج او بالوحی. کیا ان کو بلایا گیا ہے اور ان کو معراج پر بلانے کے لئے آپ کو بھیجا گیا تھا یا وحی لے کے گئے تھے پہلا مطلب زیادہ مشہور اور واضح ہے۔ اور اکثر حضرات نے اس جملہ کا یہی مطلب لیا ہے۔ امام نوویؒ فرماتے ہیں ایک روایت میں ہے وقد بعث الیه، یعنی کیا آپ کو آنحضرت ﷺ کے پاس اسرا اور صعود الی السماء کی غرض سے بھیجا گیا تھا۔ اس روایت کے الفاظ سے اصل بعثت اور رسالت کے متعلق سوال نہیں کیونکہ آپ کی بعثت اور رسالت اتنی مدت تک ملائکہ سے مخفی نہیں رہ سکتی، اور یہی بات صحیح بھی ہے۔ بیضاویؒ فرماتے ہیں: اس کا معنی ہے کیا ان کو معراج پر لانے کیلئے بھیجا گیا تھا۔ بعض حضرات کہتے ہیں اس کا معنی ہے کیا ان کے طرف وحی ہوئی ہے اور ان کو نبی بنایا گیا ہے۔ پہلا معنی زیادہ ظاہر معلوم ہوتا ہے کیونکہ آنحضرت ﷺ کی نبوت عالم ملکوت میں پہلے سے مشہور تھی آسمان کے محافظین سے یہ امر کبھی بھی مخفی نہیں رہ سکتا کہ وہ آپ کی نبوت اور رسالت کے متعلق پوچھیں۔ استفتاح اور استیذ ان کے حق میں بھی یہی صورت زیادہ موافق بنتی ہے۔ اسی وجہ سے یہ کلمات بار بار فرمائے گئے ان اور ان کے نظائر دوسرے کلمات کے نیچے ایسے اسرار پنہا ہیں کہ اہل بصیرت لوگوں کے بصیرت مزید کھل جاتی ہے اور ان کا فطری ملکہ

مزید روشن ہو جاتا ہے۔

یقیناً تمام ابواب سماء پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا وقوف ارباب عقل کی عادات معروفہ میں سے ہے، ارباب عقل جب کسی کے در پے جاتے ہیں اپنا پورا تعارف اور مقصد سے میزبان کو آگاہ کرتے ہیں اسی طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم بھی ہر دروازے پر ٹھہرتے رہے اور حضرت جبرائیل مہمان کا تعارف کرتے رہے پھر پردے کے پیچھے سے سوال کے بعد مرحباً مرحباً کے ساتھ آپ کا استقبال کرنا یہ رحمانی مہمان نوازی، صمدانی استقبال، اور اقبال فروانی تھی جو حدیث قدسی کے اس مفہوم کی طرف اشارہ جس میں باری تعالیٰ خود ارشاد فرماتے "من أتاني يمشي اتيته هرولة ومن تقرب الى ذراعاً تقربت اليه باعاً". (جو میرے طرف چلتے ہوئے آتا ہے میں دوڑ کے آتا ہوں اور جو میرے طرف ایک ذراع قریب ہو جاتا ہے میں اس کی طرف ایک [باع] دو ہاتھ قریب ہوتا ہوں) اس سے اشارہ ہے اللہ تعالیٰ کے ارشاد ﴿وهو معكم اينما كنتم﴾ [الحدید]. اور وہ تمہارے ساتھ رہتا ہے خواہ تم لوگ کہیں بھی ہو یہ مقام مزید مزید کے ساتھ خاص معیت کی تصریح ہے چنانچہ فرمایا ﴿ونحن اقرب اليه من حب الوريد﴾ [ق]. (اور ہم انسان کے اس قدر قریب ہیں کہ اس کی رگ گردن سے بھی زیادہ) پھر اپنے زبان پر وارد ہونے والے کلما کو دوسروں کیلئے بھی وضیفہ بنایا ان اللہ معنا پھر اپنے اس علو مقام کو، اور حصول مرام کو اپنے اباء کرام اور اخوان عظام کے سامنے پیش کیا وہ کیا مبارک گھڑی تھی کہ اس گھڑی سے بڑھ کر کوئی گھڑی نہیں ہو سکتی۔ [صوفیا کا کلام ختم ہوا]

بعض حضرات کہتے ہیں: فرشتوں کا یہ سوال آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر ہونے والا اس انعام کی وجہ سے بطور تعجب یا معراج پر تشریف لانے پر بطور خوش خبری تھا۔ کیونکہ فرشتوں کے ہاں یہ کھلی بات تھی کوئی بھی بشر بغیر اللہ کی اجازت و حکم کے آسمان کی طرف نہیں چڑھ سکتا۔ اللہ تعالیٰ جب کسی بشر کو لانے کا ارادہ فرماے ہیں تو اپنے فرشتوں کو اس کے صعود کا حکم دیتے ہیں۔ اور جبرئیل بھی بغیر بھیجے کے کسی کو آسمان پر نہیں لاتے۔ اور نہ کسی کے لئے آسمان کے دروازے کھولے جاتے ہیں۔

(قال): یعنی حضرت جبریل فرمانے لگے۔ (نعم): جی ہاں! تقرب اور انعام بخشنے کے لئے مجھے ان کے لانے کا حکم ہوا ہے۔ (قيل مرحباً به): ہم اللہ کی طرف سے اپنے نبی کو بلانے پر مرحبا کہتے ہیں کہ ان کو مقام وواسع نصیب ہو بہ میں باء تعدیہ کیلئے ہے اور مرحباً مفعول بہ ہے اور معنی ہے جاء اهلاً وسهلاً. (فنعم المجيئ): ان کا آنا مبارک ہو۔ [فنعم المجيئ جاء کا اعراب]

جاء فعل ماضی جملہ مستأنفہ بیانیہ ہے بطور ظرف زمان یا حال واقع ہو رہا ہے اور المجيئ نعم کا فاعل مخصوص بالمدح محذوف ہے۔ مظہرؒ فرماتے ہیں اس میں تقدیم و تاخیر ہے نیز مخصوص بالمدح محذوف ہے عبارت یوں ہے جاء فنعم المجيئ مجيئه بعض کہتے ہین تقدیر عبارت یوں ہے نعم المجيئ الذى جاء ه [آنے والے کا آنا کیا خوب ہے] موصول کو حذف کر کے صرف صلہ پر اکتفا کیا گیا ہے یا تقدی عبارت تھی نعم المجيئ مجيئ جاء. موصوف کو حذف کر کے صرف صفت پر اکتفاء کیا گیا ہے۔ (ففتح): چنانچہ آسمان کا دروازہ کھولایا۔ (فلما خلصت): لام کے فتحہ کے ساتھ جب وہاں پہنچ گیا اور اس آسمان پر داخل ہو گیا۔ (فاذا فيها آدم فقال): قال کا فاعل جبرئیل علیہ السلام ہیں۔ (هذا ابوك): یہ آپ کے جد اعلیٰ آدمؑ ہیں۔ (فسلم عليه): تورپشتیؒ کہتے ہیں: حضرت جبرئیل نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کو پہلے سلام کرنے کا جو

حکم فرمایا اس کی وجہ یہ تھی کہ اس وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم انبیاء کے پاس سے گزر رہے تھے اس اعتبار سے آنحضرت اس شخص کے حکم میں تھے جو کھڑا ہو اور انبیاء اپنی اپنی جگہ پر موجود برقرار تھے اس اعتبار سے وہ اس شخص کے حکم میں تھے جو بیٹھا ہو، اور اصول یہ ہے کہ اگر ایک شخص کھڑا اور ایک شخص بیٹھا ہوا ہو تو کھڑا ہوا شخص پہلے سلام کرے اگرچہ وہ بیٹھے ہوئے شخص سے افضل ہو، لہٰذا ان انبیاء کرام کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پہلے سلام سے یہ اشکال نہیں ہوتا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم چونکہ تمام انبیاء سے افضل ہیں، اس لئے سلام میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو سبقت کا حکم کیوں دیا گیا نیز یہ حدیث اس پر بھی دلالت کرتی ہے کہ آنحضرت مرتبہ میں سب سے اعلیٰ، حالت کے اعتبار سے اقویٰ، اور عروج کے اعتبار سے اتم درجہ پر فائز ہیں۔ **فسلمت علیه (فرد السلام)**: مفعول مطلق مع اپنی صفت کے محذوف ہے عبارت ہے **فرد السلام رداً جمیلاً**، حضرت آدمؑ نے بہت خوش اسلوبی سے سلام کا جواب دیا، حدیث کے اس جملہ میں یہ دلیل موجود ہے کہ انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام حقیقتاً زندہ ہیں۔ **(ثم قال: مرحباً بالابن الصالح والنبی الصالح)**: حضرت آدم بلکہ حدیث میں مذکور تمام انبیاء نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا استقبال کرتے ہوئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی مدح وتعریف میں لفظ صلاح یعنی نیک بختی کا ذکر کیا اس سے معلوم ہوا کہ نیک بختی وہ عظیم مرتبہ اور بلند ترین مقام ہے جو تمام انسانی واخلاقی خوبیوں اور بھلائیوں کا مجموعہ ہے اس لئے کہا گیا ہے صالح وہ شخص ہے جو اللہ اور اللہ کے بندوں کے تمام لازمی حقوق کی ادائیگی پر عامل وقائم ہو۔ اللہ تعالیٰ نے بھی قرآن مجید میں بھی انبیاء کا اصل وصف صالح ہی بیان کیا ہے ﴿**وکل من الصالحین**﴾ انبیاء علیہم السلام کے دعاء میں بھی یہ کلمہ وارد ہوا ہے، چنانچہ انبیاء نے فرمایا: **توفنی مسلماً والحقنی بالصالحین**. اور یہ بھی ممکن ہے الصالح سے مراد یہاں مقام عالی اور صعود متغالی ہو۔

(ثم معد بی): عین کی کسرہ کے ساتھ۔ پھر جبرئیل مجھے لے کے چلے لفظ "بی" میں یا تعدیہ یا مصاحبت کیلئے ہے۔ **(حتی اتی السماء الثانیة)**: ایک روایت میں ہے کہ دونوں آسمانوں کے درمیان پانچ سو سالوں کی مسافت ہے۔ **(فاستفتح...... فنعم المجیئ جاء)**: تمام آسمانوں کے دروازوں پر سوال وجواب میں یہ اشارہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کے لئے زمانے کو وسیع کر دیا تھا اور مکان کو لپیٹ دیا تھا۔ آپ کی زبان مبارک کو وسعت اور عظمت کو اسی آن میں تمام عالم ملکوت میں پھیلا دیا تھا۔ **(ففتح...... وھما ابنا خالة)**: **وھما ابنا خالة**، یہ جملہ معترضہ ہے اس میں دو احتمالات ہیں، یا تو یہ جملہ اصل حدیث کا حصہ ہے یا راوی نے اندراج کیا ہے۔

ابن الملک شرح مشارق میں لکھتے ہیں انبیاء کی صورتیں جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دیکھیں یہ انبیاء کی ارواح تھیں جن کو ان انبیاء کی صورت میں دکھایا گیا۔ سوائے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے، ان کی اصلی صورت میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے ملاقات ہوئی۔

تورپشتیؒ کا کلام پہلے گزرا کہ آسمانوں پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا انبیاء کو دیکھنا اور بیت المقدس میں ان کو امامت کرانے کو ان کے ایسی رؤیت روحانیہ پر محمول کیا گیا ہے جو ان کی اس اصلی صورت کے مشابہ تھیں جو صورت انکی حالت حیات میں تھی، ہاں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی رؤیت میں حقیقت یہ ہے کہ ان کی رویت شخصی تھی۔

ملا علی قاریؒ فرماتے ہیں: ہم نے پہلے یہ بیان کیا کہ انبیاء علیہم السلام اس طرح نہیں مرتے جس طرح دوسرے لوگ مرتے ہیں۔ بلکہ انبیاء دار بقاء سے دار فناء کی طرف منتقل ہو جاتے ہیں کئی احادیث ایسی موجود ہیں کہ انبیاء اپنی قبروں میں زندہ ہیں کیونکہ انبیاء

شہداء سے افضل ہیں وہ اپنے ربّ کے ہاں زندہ ہیں ان کورزق عطاء ہوتا ہے۔
(هذا يحيٰى): حضرت یحییٰ علیہ السلام کا نام پہلے اس لئے لیا کہ وہ وجود میں حضرت عیسیٰ سے مقدم تھے [یعنی پہلے پیدا ہوئے]۔ (وهذا عيسىٰ): اس آسمان کے سفر کی انتہاء حضرت عیسیٰ کی ملاقات پر ہوا کیونکہ وہ آپ کی گواہی کے سب سے بڑے شاہد اور ارباب جود وفضل کے سردار ہیں۔
(فسلم عليهما): دونوں کو ایک ساتھ یا علیحدہ علیحدہ سلام کرلیں۔(فسلمت فردا): کما حقہ میرے سلام کا جواب دیا۔
(ثم قالا: مرحباً بالاخ الصالح): کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے ﴿انما المؤمنون اخوة﴾ (تمام مؤمنین بھائی ہیں)۔ پہلے حدیث میں بھی گزر چکا ہے کہ تمام انبیاء علیہ الصلوٰۃ والسلام علاتی بھائی ہیں سب کی مائیں مختلف اور دین سب کا ایک ہے۔
(والنبی الصالح...... جاء ففتح): اس حدیث میں اس طرف بھی اشارہ ہے کہ تمام انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کو حکم الٰہی کے بعد استعلاء حاصل ہوا اوران میں سے ہرایک کی مثال فرشتوں کی سی ہے کہ ہرایک کا مقام متعین ہے اور حال معلوم ہے۔ جس کو درجے میں مؤخر کیا ہے اس کے لئے تقدیم نہیں اور جس کو مقدم رکھا ہے وہ مؤخر نہیں ہوسکتا۔ واللہ اعلم
(فلما خلصت...... فنعم المجيئ جاء): یہ تکرار و بیان بطور تکثیر ہے، یہ اس شعر کے قبیل سے ہے:

اعد ذكر نعمان لنا ان ذكره ☆ هو المسك ما كررته يتضوع

(ففتح...... النبی الصالح): قاضی عیاضؒ فرماتے ہیں یہ اہل تاریخ کے اس قول کے خلاف ہے کیونکہ حضرت ادریس علیہ السلام آنحضرت ﷺ کے آباء میں آتے ہیں البتہ یہ احتمال ہے کہ حضرت ادریس کا مرحباً بالاخ الصالح کہنا شفقت اور ادب کرنے کے لحاظ سے ہو، اس اعتبار سے بھائی بھی ہیں کہ تمام انبیاء بھائی بھائی ہیں اگرچہ باپ بھی ہوں۔ شرح مسلم میں بھی اسی طرح مذکور ہے۔ (ثم صعد...... ففتح): اس میں اس طرف بھی اشارہ ہے، کہ آسمان کے دروازے اسی کیلئے کھولے جاتے ہیں جو پہلے سے صفت علاء وولاء سے متصف ہو۔ دشمنوں کیلئے آسمان کے دروازے کبھی بھی نہیں کھولے جاتے۔ حتى يلج الجمل فى سم الخياط، کہ اونٹ سوئی کے ناکے میں کیوں نہ داخل ہوجائے۔ (فلما خلصت...... ففتح): اس میں اپنے نبی کو یہ تنبیہ فرمایا جس کے لئے آسمانوں کے دروازوں کو کھولے گئے اس کے لئے دیگر ابواب خیر بھی کبھی بند نہیں ہوسکتے اور ایسے شخص سے حجاب بھی نہیں ہوگا، بلکہ اس کے لئے دنیا میں رحمت کے دروازے کھولائے جائیں گے پھر آخرت میں جنت کے دروازے بھی۔ کسی صاحب حال نے کیا خوب کہا ہے:

على بابك الا على مددت يدالرجا
ومن جا هذا الباب لا يختشى الردىٰ

(فلما خلصت...... فلما جاوزت): یعنی جب حضرت موسیٰ کی ملاقات کے بعد آگے چلا، یا اپنے مقام سے آگے چلا۔ (بکی): حضرت موسیٰ کا رونا دراصل اپنی قوم کی قابل رحم حالت پر حسرت وافسوس اور شفقت ومحبت کا بے ساختہ اظہار تھا۔ جب انہوں نے دیکھا کہ ایک طرف تو میری امت کے لوگ ہیں جن کو اللہ نے بڑی بڑی عمریں دیں مضبوط قویٰ سے نوازا، طویل عرصے تک مصروف عمل رہنے کا موقعہ دیا، لیکن انہوں نے میری اتباع سے وہ فائدہ نہ اٹھایا جو محمد ﷺ کی امت کے لوگ چھوٹی

چھوٹی عمریں اور کمزور قویٰ رکھنے کے باوجود اپنے پیغمبر کے اتباع کی صورت میں اٹھائیں گے۔ اس تقریر سے آنے والے سوال جواب کی وجہ واضح ہو جاتی ہے۔ (قیل: ما یبکیک...... من امتی): واضح رہے اس موقع پر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جو یہ کہا کہ ایک نوجوان جس کو میرے بعد رسول بنا کر دنیا میں بھیجا گیا اس سے آنحضرت کی حقارت یا توھین مقصود نہیں تھی۔ اس لئے کہ کبھی جوان کہہ کر قوی اور بہادر مراد لیا جاتا ہے یہ تورپشتیؒ کے کلام کا خلاصہ ہے۔

بعض حضرات نے اس جملہ کو غبطہ پر محمول کیا لیکن اس قول سے اہل فطن حکو شہد ملتی ہے اس لئے یہی کہا جائے کہ یہ حضرت موسیٰ کی تمنا تھی، اصل حالت اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔

بعض علماء نے لکھا ہے کہ حضرت موسیٰ کا اس موقع پر رونا معاذ اللہ بطور حسد نہیں تھا کیونکہ حسد اور جلن تو وہ برا جذبہ ہے جس سے عام مؤمنین کو بھی بچنے کی تلقین کی گئی ہے اور آخرت میں معمولی درجہ کے اہل ایمان کے دلوں میں سے بھی یہ برا جذبہ نکال باہر کیا جائے گا پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ حضرت موسیٰ جیسی عظیم ہستی اس بُرے جذبے میں مبتلا ہو؟ نیز حضرت موسیٰ اس وقت عالم ملکوت کے پاکیزہ ماحول میں بھی تھے۔ اس موقع پر حضرت موسیٰ کا رونا اس حسرت وافسوس کے سبب تھا کہ ان کی امت کے لوگوں نے اللہ تعالیٰ کے احکام وتعلیمات کی مخالفت کر کے اپنے پیغمبر کے اجر وثواب کو نقصان پہنچایا، کیونکہ ہر پیغمبر کو اس شخص کا ثواب بھی ملتا ہے جو اس کی متابعت کرتا ہے، جن لوگوں کو خود ثواب نہ ملتا ہو وہ اپنے پیغمبر کے اجر وثواب میں اضافہ وترقی کا باعث کیسے بن سکتے ہیں۔ باقی حضرت موسیٰ نے لفظ غلام جو کہا ہے یہ بطور تنقیص نہیں تھی بلکہ یہ جملہ اللہ تعالیٰ کے کمال قدرت اور کمال کرم پر اظہار تعجب کے تھا یعنی پروردگار کی قدرت کی بڑائی کے کیا کہنے کہ اس نے اس نوجوان کو اس چھوٹی سی عمر میں وہ مرتبہ وفضل عطاء فرمایا جو پہلے نبیوں اور رسولوں کو بڑی بڑی عمروں میں نصیب نہیں ہوا۔ ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: میری سمجھ میں یہ آرہا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر اللہ کی طرف سے ہونے والے انعامات کی طرف اشارہ فرمایا ہے کہ آپ کی عمر مبارک بڑھاپے کی دہلیز تک پہنچنے والی ہے، لیکن اس کے باوجود اب تک نہ قوت میں کمی آئی ہے اور نہ آپ کے جسم میں بڑھاپا داخل ہوا ہے۔ ملا علی قاریؒ فرماتے ہیں: یہ بھی ممکن ہے کہ حضرت موسیٰ نے لفظ غلام (نوجوان) کا لفظ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی عمر کے اعتبار سے ہی استعمال کیا ہو کیونکہ اس وقت انبیاء کرام کی ان عمروں کی بہ نسبت کہ جو وہ دنیا میں گزار کر آئے تھے اور پھر جتنا طویل عرصہ ان کو عالم برزخ میں گزارتے ہو گیا تھا اس کے مقابلے میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی عمر یقیناً بہت چھوٹی تھی اور ان کے سامنے آپ صلی اللہ علیہ وسلم بالکل نوعمر تھے اور اس نوعمری کے زمانے میں ہی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ مرتبہ عالیہ نصیب ہوا کیونکہ نبوت کے اعتبار سے بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم ابھی نوعمر ہی تھے کہ مدت بعثت کے تھوڑے دنوں بعد معراج نصیب ہوا جس کی تفصیل پہلے بیان ہو چکی ہے کہ ہجرت کے ایک سال قبل کا واقعہ پیش آیا، للهذا نوجوان کہنا عمر کے لحاظ سے بھی صادق تا ہے اس لئے کہ آپ کی عمر اب تک دیگر انبیاء کی طرح پایہ تکمیل کو نہیں پہنچی تھ۔ واللہ اعلم

(ثم صعد بی الی السماء السابعه...... فنعم المجیئ جاء): انبیاء کرام کا آپ کی مدح میں ایک طرح کا کلام اور ایک طرح کی مدح کے جملے اس بات کی علامت ہے کہ السنه الخلق اقلام الحق مخلوق کی زبان حق کا قلم ہے، اس جگہ کتب اصول میں لفظ ففتح موجود نہیں، راوی سے رہ گیا پہلے کے تمام جملوں میں گزرنے کی وجہ سے اس پر اکتفاء کیا ہے اس پر آگے

کا کلام دلالت کر رہا ہے۔ (**فلما خلصت فاذا ابراھیم،...... فرد السلام**): گویا کہ ہمارے نبی ﷺ استغراق تام اور مشاہدہ مرام میں مشغول ہونے کی وجہ سے مخلوق سے بالکل غافل تھے اسی کی طرف اللہ نے اشارہ فرمایا: ﴿**ما زاغ البصر وما طغیٰ**﴾ (نگاہ نہ تو ہٹی اور نہ بڑھی اس لئے ہر مقام پر حضرت جبرائیل کو سلام کرنے کی تعلیم بار بار دینی پڑی۔

(**ثم قال مرحباً بالابن الصالح والنبی الصالح**): حافظ سیوطیؒ فرماتے ہیں اس حدیث میں سوال پیدا ہوتا ہے کہ آسمانوں میں جن انبیاء کرام سے آنحضرت ﷺ کی ملاقات کرائی گئی وہ جسم وروح کے ساتھ وہاں موجود تھے یا ان کی موجودگی محض روحانی تھی؟ اگر وہ جسم وروح کے ساتھ وہاں موجود تھے تو پھر یہ اشکال لازم آتا ہے کہ ان کے اجسام تو قبور میں ہیں آسمانوں میں ان کی موجودگی کیسی تھی؟ اس کا جواب یہ دیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کی ارواح کو اجسام مثالیہ کے ساتھ متمثل کر کے آپ کی ملاقات کے لئے جمع کیا کہ اللہ تعالیٰ نے آنحضرت ﷺ کے اعزاز واکرام کے لئے ان انبیاء کرام کو مع اجسام عنصریہ کے مسجد اقصیٰ اور آسمانوں میں جمع کیا تھا، یا یہ ایک سوال اور پیدا ہوتا ہے کہ آسمانوں میں چند حضرات انبیاء کو آنحضرت ﷺ کی ملاقات کے لئے کیوں مخصوص کیا گیا نیز ہر نبی کو ایک آسمان کے ساتھ کس وجہ سے مخصوص کیا گیا اس میں کیا حکمت تھی؟

علماء کہتے ہیں: مشہور بات یہ ہے کہ چند انبیاء کرام سے آنحضرت ﷺ کی ملاقات کرانے اور ان میں سے ہر نبی کو تفاوت درجات کی ترتیب ایک ایک آسمان کے ساتھ مخصوص کرنے میں ان خاص حالات کی طرف اشارہ مقصود تھا جو حضور کو وقتاً فوقتاً پیش آئے۔

ابن ابی جمرہؒ اس حکمت کے متعلق کہتے ہیں: پہلے آسمان پر حضرت آدمؑ سے ملاقات کی خصوصیت یہ تھی کہ آدمؑ ہی سب سے پہلے نبی ہیں اور ہر انسان کے پہلے باپ ہیں اس لئے سب سے پہلے ان ہی سے ملاقات کرائی گئی دوسری آسمان پر حضرت عیسیٰؑ سے ملاقات کی خصوصیت یہ تھی کہ تمام انبیاء میں انہیں سے آنحضرت ﷺ کو سب سے زیادہ زمانی قرب حاصل ہے، تیسرے آسمان پر حضرت یوسفؑ سے ملاقات کی خصوصیت یہ تھی کہ حضرت عیسیٰ کے بعد آنحضرت کو حضرت یوسف علیہ السلام کے ساتھ اس بناء پر سب سے زیادہ مخصوص قرب حاصل ہے کہ جب آنحضرت ﷺ کی امت جنت میں داخل ہوگی تو حضرت یوسفؑ کی شکل وصورت کے حسن وجمال کی حامل ہوگی، چوتھے آسمان پر حضرت ادریس علیہ السلام سے ملاقات کی یہ خصوصیت تھی کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت ادریسؑ کے بارے میں فرمایا ﴿**ورفعنٰه مکاناً علیاً**﴾ چونکہ ساتوں آسمانوں میں درمیانی اور معتدل چوتھا آسمان ہی ہے اس لئے ان کو چوتھے آسمان پر رکھا گیا اور پانچویں آسمان پر حضرت ہارونؑ سے ملاقات کی خصوصیت یہ تھی کہ وہ حضرت موسیٰ کے بھائی ہونے کی حیثیت سے ان سے بہت قریب بھی تھے اور دعوت حق کے راستے میں ان کے معتمد ومددگار بھی، اس اعتبار سے ان کو حضرت موسیٰ کے آسمان سے قریب پانچویں آسمان پر رکھا گیا اور ان کے اوپر چھٹے آسمان پر حضرت موسیٰ کو رکھا گیا کیونکہ وہ کلیم اللہ کی فضیلت رکھنے کے سبب دوسرے نبیوں سے اوپر چھٹے آسمان ہی سے موزونیت رکھتے تھے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو حضرت موسیٰؑ سے بھی اوپر رکھا گیا کیونکہ حضرت ابراہیم علیہ السلام ہمارے نبی ﷺ کے بعد سب سے افضل ہیں اس لئے وہ ساتویں آسمان سے موزونیت رکھتے تھے۔ ملا علی قاریؒ رقم طراز ہیں فرماتے ہیں کہ ان مشاہیر انبیاء کرام کے علاوہ دیگر انبیاء کے متعلق بھی یہ کہا جا سکتا ہے، شاید وہ بھی آسمانوں پر اپنے اپنے مناسب مقام میں موجود ہوں گے، آپ ﷺ نے صرف

ان آسمانوں کا ذکر فرمایا جس میں مشاہر انبیاء تھے اور ان کے ذکر پر اکتفاء کیا۔ انتھیٰ

(ثم رفعت الی سدرة المنتھٰی): سیدؒ کے نسخہ میں اس طرح ہے اور کچھ اور نسخوں میں لفظ "الی" کی جگہ رفعت لي سدة المنتھٰی کے الفاظ ہیں، اس کی تائید آنے والے قول یعنی ثم رفع لی البیت المعمور سے بھی ہوتی ہے، یعنی پہلے مجھے سدرۃ المنتہٰی پر لے جایا گیا پھر وہاں سے بیت المعمور پر۔ ایک اور نسخے میں لي :اور الی کے بجائے "اِلي" یاء کی تشدید کے ساتھ منقول ہے۔

ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ لکھتے ہیں: لفظ "رفعت" اکثر نے راء کے ضمہ، فاء کی کسرہ عین کے سکون اور آخر میں تاء ضمیر متکلم اس کے بعد حرف جر الی کے ساتھ نقل کیا ہے۔ کشمیہنی کہتے ہیں: رفعت، عین کے فتحہ اور تاء کے سکون کے ساتھ یعنی رفعت السدره لي یعنی سدرۃ المنتہٰی کو میرے لئے اٹھایا گیا۔

دونوں روایتوں کو اس طرح جمع کیا جا سکتا ہے کہ دونوں کی مراد ایک ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو سدرۃ المنتہٰی پر لے جایا گیا اور مقامِ سدرۃ المنتہٰی کو ظاہر کر دیا گیا۔ کسی چیز کے طرف رفع کا مطلب اس کے قریب کرنے کے بھی ہوتے ہیں۔ تورپشتیؒ رفع کے متعلق کہتے ہیں کہ رفع کا معنی یہ ہے کہ آپ کسی چیز کے بالکل قریب ہو جائیں۔

اللہ تعالیٰ کے ارشاد ﴿وفرشٍ مرفوعه﴾ کے متعلق بھی یہی کہا گیا ہے کہ جنت میں بچھونے ان کے بالکل قریب ہوں گے گویا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم یہ فرما رہے ہیں کہ سدرۃ المنتہٰی کو آپکے سامنے ایسا واضح کر کے کھولا یا گیا تھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو اس طرح پھر پورے طریقہ سے دیکھا جس طرح کسی چیز کے بالکل نزدیک ہو کے دیکھنے سے اس کے تمام اوصاف منکشف ہو جاتے ہیں اور دیکھنے میں کوئی کسر باقی نہیں رہتی۔ رفع لی بیت المعمور، رفع لي بیت المقدس کا بھی یہی مفہوم ہے یعنی ان مقامات کو کما حقہٗ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دیکھا اور ان کا مشاہدہ کیا۔

سدرۃ المنتہٰی کی وجہ تسمیہ:

سدرہ: کے معنی بیری کے درخت کے ہیں اور منتھیٰ: کے معنی ہیں وہ جگہ جہاں ہر چیز پہنچ کر رک جاتی ہے اور پھر اوپر اٹھائی جاتی ہے اس طرح ملاءِ اعلیٰ سے جو چیز اترتی ہے وہ سدرۃ المنتہٰی پر آ کے ٹھہر جاتی ہے۔ پھر نیچے لائی جاتی ہے۔ امام نوویؒ کہتے ہیں اس کو سدرۃ المنتہٰی اس لئے کہا جاتا ہے کہ فرشتوں کا علم اس مقام پر ختم ہو جاتا ہے، اس سے اوپر کے احوال کی انہیں خبر نہیں ہوتی اور نہ آگے جا سکتے ہیں ہمارے پیارے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے علاوہ کوئی بھی اس سے آگے نہیں جا سکا ہے۔ حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ سے نقل کیا گیا ہے اس مقام کو سدرۃ المنتہٰی اس لئے کہتے ہیں کہ ملاءِ اعلیٰ سے جو چیز اترتی ہے وہ یہاں آ کر ٹھہر جاتی ہے، اور جو چیز نیچے سے آتی ہے وہ بھی یہاں آ کے ٹھہر جاتی ہے۔ امام سیوطیؒ فرماتے ہیں لفظ سدرہ کی اضافت المنتہٰی کی طرف ہے اس لئے کہ یہ ایک ایسا مقام ہے کہ مخلوق کے اعمال اور علوم یہاں آ کے ٹھہر جاتے ہیں اس مقام سے آگے ہمارے پیارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے علاوہ کوئی نبی و فرشتہ نہیں گیا یہ شرف صرف صرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہی کو نصیب ہوا یہ ساتویں آسمان پر ایک بیری کا درخت ہے جس کی جڑ چھٹے آسمان میں ہے۔

(فاذا نبقها): نبق، باء کی کسرہ کے ساتھ نیز سکون کے ساتھ بھی، یعنی پھل کی جسامت درخت کی جسامت پر دلیل ہے۔
(مثل قلال هجر): قلال یہ جمع ہے قلة [قاف کے ضمہ کے ساتھ] یہ عرب والوں کا ایک برتن تھا جیسے ہمارے ہاں بڑا مٹکا ہوتا ہے یعنی بڑے مٹکے کے مانند اور لفظ هجر شہر کا نام ہے اعراب کے اعتبار سے منصرف ہے اور منصرف ہی ہوتا ہے غیر منصرف نہیں بن سکتا۔ مثال اور ممثل لہ میں مناسبت یہ ہے کہ پھل اپنے چھلکوں میں اس طرح مستور ہوتے ہیں جیسے کھانے کی اشیاء برتن میں اس لئے بیری کے پھل کو جسامت کے اعتبار سے اس مشہور و معروف برتن سے تشبیہ دی جو عرب میں متعارف تھا۔

قاموس میں کلمہ هجر کا اعراب تمام حروف کے حرکت کے ساتھ بتایا گیا ہے۔ کہتے ہیں کہ یہ یمن کے ایک شہر کا نام ہے مذکر اور منصرف ہے کبھی مؤنث بھی پڑھا جاتا ہے، ہاں مؤنث ہونے کی صورت میں غیر منصرف ہوگا، علم اور تانیث کی وجہ سے یہ بستی یا اس نام کی ایک بستی مدینہ منورہ کے قریب تھی اس لئے کبھی قلال کی نسبت اس کی طرف ہوتی ہے کبھی مدینہ کی طرف۔

(واذا ورقها): یعنی جسامت میں اس کے پتے۔ (مثل آذان الفيلة): اس جملہ میں الفيلة، فيل (ہاتھی کی جمع ہے اور دیکہ کے وزن پر ہے جو ديك [مرغ] کی جمع ہے اور آذن، مد کے ساتھ اذن [کان] کی جمع ہے۔

فائدہ : [سدرۃ المنتہیٰ کے پھلوں کو بڑے بڑے مٹکوں کے برابر اور اس کے پتوں کو ہاتھی کے کانوں کے برابر کہنا عوام کو سمجھانے کے لئے ہے، حقیقت یہ ہے کہ لفظی طور پر نہ تو خود اس درخت کی لمبائی موٹائی حدِ حصر میں آسکتی ہے اور نہ اس کے پھل اور پتوں کے بڑے پن کا کوئی اندازہ کیا جاسکتا ہے]۔

(هذه): مشار الیہ میں دونوں احتمال ہیں یعنی مقام یا درخت۔ (سدرة المنتهٰى فاذا اربعة انهارٍ): انهارٍ کی صفت محذوف ہے یعنی طاهرةٍ۔ ایک شارح کہتا ہے اس جملہ میں اذا مفاجاتیہ ہے کہ اسی سدرۃ المنتہیٰ کے مقام میں اچانک میں نے چار نہریں دیکھیں۔ (نهران باطنان ونهران ظاهران قلت ما هذان): چار نہروں میں دو قسم کی نہریں دیکھیں اس کی ترکیب اللہ تعالیٰ کے ارشاد ﴿هذان خصمان اختصموا فى ربهم﴾ کی طرح ہے۔ (يا جبريل...... فى الجنة): ابن ملکؒ کہتے ہیں باطن کی ان دو نہروں میں سے ایک نہر، نہر رحمت اور دوسری کوثر تھی، ان کو نهران باطنان اس اعتبار سے کہا گیا ہے کہ عقل ان کے اوصاف و خصوصیت کی حقیقت و کہنہ کا ادراک نہیں کر سکتی یا اس اعتبار سے کہا گیا ہے کہ وہ دونوں نہریں جنت میں بہتی ہیں وہاں سے باہر نہیں نکلتی ہیں، جس وجہ سے ناظرین کی آنکھوں سے اوجھل اور پوشیدہ ہیں جب تک جنت میں داخل نہیں ہوں گے نظر نہیں آئیں گی۔

(واما الظاهران فالنيل والفرات): قاضی عیاضؒ فرماتے ہیں حدیث کا یہ جملہ اس پر دلالت کر رہی ہے کہ سدرۃ المنتہیٰ کی جڑ زمین میں ہے اور اسی جڑ سے نیل اور فرات کی نہریں نکل رہی ہیں۔ ابن ملکؒ فرماتے ہیں ان دونوں نہروں کو نیل اور فرات سے تعبیر کرنا یا تو تشبیہ اور استعارہ کے طور پر ہے کہ دریائے نیل اور فرات کا پانی شرینی و لطافت اور فوائد و منافع کے اعتبار سے جنت کے پانی کے مشابہ ہے یا یہ محض اسمی اشتراک ہے کہ جیسے زمین کے دو دریاؤں کے نام نیل و فرات ہیں ایسے ہی جنت کی دو نہروں کے نام بھی نیل و فرات ہیں۔

شرح مسلم میں حضرت مقاتلؒ سے منقول ہے: باطنی دو نہروں سے مراد سلسبیل اور کوثر ہیں اور ظاہر کی دو نہروں سے بظاہر

یہ معلوم ہوتا ہے ان دونوں نہروں سے مراد مصر کا دریائے نیل اور عراق کا دریائے فرات ہے۔ یہ دونوں نہریں سدرۃ المنتہیٰ کی جڑ سے نکل کر اللہ کی مشیت کے مطابق کہیں سے بہتی ہوئی زمین پر آئی ہیں پھر زمین سے نکل کر روئے زمین کے علاقوں میں بہتی ہیں اور یہ ایسی کوئی محال بات نہیں جس کو شریعت اور عقل تسلیم نہ کرے اور حدیث کا ظاہری مفہوم بھی یہی ہے، اس لئے اسی کو تسلیم کرنا ضروری ہے۔

(ثم رفع لي): پھر میرے لئے قریب کر کے بالکل ظاہر کر دیا گیا۔ (البيت المعمور): بیت المعمور، خانہ کعبہ کی محاذات میں ساتویں آسمان پر ایک گھر کا نام ہے، جو خانہ کعبہ کی طرح محترم اور فرشتوں کا کعبہ ہے۔ (ثم اتيت باناء...... فاخذت اللبن): ابن ملکؒ فرماتے ہیں: فطرت سے مراد اسلام ہے، جس کو حق تعالیٰ نے ہر انسان کی پیدائش وخلقت کی بنیاد بنایا ہے دودھ اور فطرت یعنی دین اسلام میں مماثلت ومناسبت یہ ہے کہ جس طرح دین اسلام وانسان کی روحانی اور اعتقادی تخلیق کی خشیت اول ہے اس طرح دودھ انسان کی جسمانی پرورش اور اٹھان کا بنیادی عنصر ہے، یہ دودھ ہی ہوتا ہے جس سے آدمی کی پیدائش ہوتے ہی پرورش شروع ہو جاتی ہے اور پھر دودھ میں جو فطری خوبیاں، لطافت وپاکیزگی، شرینی ومنفعت حاصل ہے اس سے دین فطرت یعنی اسلام کو بہت مناسبت حاصل ہے اس لئے عالم بالا میں دین اور علم کی مثال دودھ کو قرار دیا گیا جو سعادت قوت روحانیہ اور وصول الی اللہ کا ذریعہ ہے فقال هي الفطرة ضمیر راجع کو مؤنث لایا حالانکہ لفظ لبن مذکر ہے یہاں خبر کی رعایت کی گئی ہے۔ (انت عليها وامتك): آپ اور آپ کی امت کے لوگ علم دین کے اسی فطرت پر رہیں گے۔ (ثم): یعنی جب مقام تجلی پر پہنچے۔ ﴿دنا فتدلى فكان قاب قوسين او ادنى فاوحى الى عبده ما اوحى﴾ [النجم] (پھر نزدیک ہوا پھر اور نزدیک آیا سو دو کمانوں کی برابر فاصلہ رہ گیا بلکہ اور بھی کم، پھر اللہ تعالیٰ نے اپنے بندہ پر وحی نازل فرمائی جو کچھ نازل فرمائی تھی)۔

(فرضت علي الصلاة): آنے والی حدیث میں فرضت، علي کی جگہ فرضت على امتي کے الفاظ ہیں لیکن اس میں کوئی منافات نہیں کیونکہ آپ اور امت پر دونوں پر نماز کو فرض کیا گیا ہے۔ (خمسين صلاة): یہ جملہ منصوب ہے مفعول ہونے کی وجہ سے کہ اس سے پہلے اعني محذوف ہے۔ اور کلمہ كل يوم کے بعد وليلة بھی محذوف ہے جو اعني کا مفعول فیہ ہے۔

(فرجعت فمررت على موسىٰ): واپسی پر حضرت ابراہیمؑ کے بعد حضرت موسیٰؑ سے ملاقات ہوئی۔ ترمذی نے روایت کیا ہے آپ ﷺ نے فرمایا: "لقيت ابراهيم ليلة اسري بى فقال: يا محمد! اقرأ امتك مني السلام واخبرهم ان الجنة طيبة التربة عذبة الماء وانها قيعان وان غراسها سبحان الله والحمد لله ولا اله الا الله والله اكبر" [اسراء] کی رات جب میری ملاقات حضرت ابراہیمؑ سے ہوئی تو وہ فرمانے لگے اے محمد! اپنی امت کو میرا اسلام کہیے اور ان کو بتائیے جنت بہت عمدہ مٹی والی اور میٹھے پانی والی جگہ ہے لیکن چٹیل ہے اس کی روئیدگی سبحان اللہ الحمد للہ، لا الہ الا اللہ واللہ اکبر ہے]۔

(قلت أمرت بخمسين صلاة): کل پچاس۔ ان کی کم مقدار دو رکعتیں ایک سلام کے ساتھ۔ ابن ملکؒ کہتے ہیں:

بعض علماء فرماتے ہیں پہلے ہر نماز دو دو رکعت کے ساتھ تھی اس کی دلیل یہ ہے کہ اگر کوئی نذر مانے اور کہے اس کام کے ہونے پر مجھ پر نماز، تو بالاتفاق دو رکعتیں واجب ہوں گی۔ (کل یوم): اس کلمہ سے نمازوں کا دن کے ساتھ خاص ہونا معلوم ہوتا ہے لیکن زیادہ ظاہر یہ ہے کہ دن اور رات دونوں مراد ہیں، کیونکہ آگے آ رہا ہے خمس صلوٰت فی کل یوم ولیلة. اس روایت میں صرف دن کے ذکر پر اکتفاء کیا گیا ہے کیونکہ رات دن کے تابع ہوتی ہے اور اس کے مفہوم میں شامل ہوتی ہے۔

(قال: ان امتك لا تسطيع): حضرت موسیٰ نے امت کی قید لگائی کیونکہ انبیاء کی قوت وعصمت مخالفت سے مانع اور موافقت فی الطاعات میں مددگار ہوتی ہے اگرچہ مشقت طاقت سے بھی باہر کیوں نہ ہو، مطلب یہ ہے کہ عادۃ یا ضعف اور غفلت کی وجہ سے ان کے ادا کرنے پر قادر نہیں ہوں گے۔ (خمسين صلاة كل يوم): (فارجع الى ربك فاسأله): فاسأله، سئل (مہموز العین) سے امر کا صیغہ ہے یا مبدل یا منقول ہے یہ دو مقبول نسخے ہیں اور دو صحیح قراءتیں ہیں، معنی ہے مانگیئے۔ (التخفيف لامتك فرجعت): چنانچہ میں اپنے ربّ کے پاس گیا۔ (فوضع عني عشراً): یہ اصل کا خمس ہے، آگے آ رہا ہے کہ آپ ﷺ سے پانچ نمازوں کو کم کیا گیا، گویا کہ خمس کا عدد پہلا تھا پھر دس ہو گئیں یا پانچ کو دس سے تعبیر کیا گیا۔ اقتصاراً واختصاراً۔

فرجعت: پھر دوبارہ گیا۔ (فوضع عنیٔ عشرا، فرجعت...... فرجعت): تیسری مرتبہ پھر بارگاہ خداوند میں آیا۔ فوضع عني عشرًا...... فرجعت: چوتھی مرتبہ پھر آیا۔ فامرت...... فرجعت: یعنی پانچویں بار۔ (فامرت بخمس صلوٰة كل يوم): یوم (دن) کا ذکر تغلیباً ہے، کیونکہ اکثر نمازیں دن میں ہیں، یا اس لئے صرف یوم کو ذکر کیا کہ رات اپنے سے قبل والے دن کی تابع ہوتی ہے جیسے عرفہ کی رات۔ ایام نحر کی راتیں۔ (فرجعت الى موسیٰ فقال بما أمرت؟...... ان امتك): امت سے مراد امت کی اکثریت ہے۔ (لا تستطيع خمس صلوٰة): یہاں استطاعت سے مواظبت ومداومت اور اس کی حفاظت مراد ہے۔ (كل يوم واني...... المعالجة): لیکن وہ اس سے بھی کم تعداد والی نمازوں کو بھی ادا نہ کر سکے۔ (فرجع الى ربك...... لامتك): طیبی رحمہ اللہ نے اس موقع میں خطابیؒ کا کلام ذکر کیا ہے، خطابیؒ نے کہا ہے: حضرت موسیٰؑ کا آنحضرت ﷺ کو بار بار اللہ کے پاس بھیجنا اور ان کے مشورہ پر آنحضرت ﷺ کا اللہ تعالیٰ سے نمازوں کی تعداد میں تخفیف کی درخواست کرنا، اس بات کی علامت ہے کہ حضرت موسیٰ کو پہلے ہی معلوم ہو چکا تھا کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے نمازوں کی فرضیت کا جو ابتدائی حکم صادر ہوا ہے وہ وجوب کے لئے اور قطعی طور پر نہیں اس میں تبدیلی کی گنجائش ہے، اگر حقیقت موسیٰ کو یہ بات معلوم نہ ہوتی تو وہ بار بار تخفیف کی درخواست کا مشورہ نہ دیتے نیز آنحضرت ﷺ کی طرف سے بار بار درخواست پیش کرنا اور ہر مرتبہ اس درخواست کا منظور ہونا بھی اس امر کی دلیل ہے کہ اللہ تعالیٰ کا پہلا حکم قطعاً وجوب کے طور پر نہیں تھا۔ کیونکہ جو حکم وجوب قطعی کے طور جاری ہوتا ہے اس میں تخفیف کی گنجائش نہیں ہوتی۔ ابن الملکؒ نے بھی خطابی کا اتباع کیا ہے۔ ملا علی قاریؒ کے نزدیک خطابی کی بات وزن دار نہیں، ان کا کہنا یہ ہے کہ تخفیف کی درخواست کرنا اصل میں علامت ہی اس بات کی ہے کہ اللہ تعالیٰ کا حکم وجوب کے طور پر تھا کیونکہ جو چیز واجب نہ ہو، اس میں تخفیف کی درخواست کی ضرورت نہیں آتی اس سلسلہ میں صحیح بات وہی ہے جو بعض حضرات نے نقل کی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے پہلے پچاس نمازیں ہی فرض کی تھیں، پھر اپنے بندوں کے حال پر رحم کرتے ہوئے

تخفیف کی درخواست قبول فرمائی اور پچاس نمازوں کے حکم کو منسوخ کر کے پانچ نمازوں کا حکم جاری و نافذ فرمایا، جیسا کہ بعض احکام میں بھی تبدیلی و منسوخی کا عمل ہوا ہے مثلاً بعض کے نزدیک آیت رضاع، ایک قول کے مطابق متوفی عنہا زوجہا کی عدت ان احکام میں تبدیلی و منسوخی کا عمل ہوا ہے۔ اس حدیث میں یہ دلیل بھی موجود ہے کہ کسی چیز کا نسخ اس کے وقوع سے پہلے بھی ممکن اور جائز ہے، یہی اکثر کا قول ہے اور یہ صحیح ہے البتہ معتزلہ اور بعض دیگر علماء اس کے جواز اور امکان کے قائل نہیں، معتزلہ اور دیگر علماء والا قول امام نوویؒ نے ذکر کیا ہے: قال: یعنی نبی ﷺ فرما رہے ہیں۔ (سألت ربی): تخفیف کی مزید درخواست کرتا رہا۔ (حتی استحییت): بار بار جانے کی وجہ سے مجھے حیا آتی ہے۔ ایک نسخہ میں ایک یاء کے ساتھ استحیت ہے، یہ دو لغت ہیں یا دوسری روایت جس میں نقل اور حذف کے ساتھ پہلے روایت کی تخفیف کی گئی ہے اور معنی ہے اگر چہ میرا ابھی خیال یہی ہے کہ امت اس پر دوام اور محافظت کی قدرت نہیں رکھے گی لیکن اب میں مزید تخفیف کی درخواست نہیں کروں گا۔ (ولکنی ارضیٰ): میں اپنے رب کے حکم اور تقسیم پر راضی ہوں۔ (واسلم): امت اور اپنا معاملہ اللہ کے سپرد کرتا ہوں [کہ وہ اپنی توفیق و وعدہ سے امت کے لوگوں کو ان پانچ نمازوں کی ادائیگی کا پابند بنائے]۔

طیبی رحمہ اللہ کہتے ہیں: لکنی ارضی واسلم، پر اگر آپ یہ کہیں کہ مطلب ٹھیک ہے لیکن لفظ "لکن" ایسے دو کلاموں کے درمیان میں واقع ہو رہا ہے جو معنی کے اعتبار سے متغائر ہیں اس کی یہاں کیا وجہ ہے؟ جواب یہ ہے کہ یہاں کلام کی تقدیر یوں ہے حتی استحییت فلا ارجع، اب مجھے حیا آتی ہے میں واپس نہیں جاؤں گا اگر میں واپس جاؤں تو راضی اور تسلیم کرنے والا شمار نہیں ہوں گا۔ لہٰذا میں اس پر راضی اور شاکر ہوں۔ [جواب ختم ہو گیا]

ملا علی قاریؒ رقمطراز ہیں یہ بات مخفی نہیں کہ مراجعت رضاء و تسلیم کے منافی نہیں تھی وگرنہ حضرت موسیٰ اور ہمارے پیارے نبی اس پر کیسے راضی ہوتے، اس کی وضاحت یہ ہے کہ اللہ سے عافیت مانگنا مصیبتوں سے چھٹکارے کی دعاء، دشمنوں کے خلاف مدد کی دعائیں ان کے علاوہ بھی ان جیسی بے شمار دعاؤں کا صدور اللہ تعالیٰ کے انبیاء و اولیاء سے ہوا ہے جو کبھی بھی رضا بالقضاء کے منافی نہیں رہی ہیں اور نہ تسلیم حکم کے منافی ہیں۔

(قال): یعنی نبی ﷺ نے فرمایا۔ (فلما جاوزت): جب حضرت موسیٰ کے پاس سے اب کی بار بغیر مراجعت کے رخصت ہوا۔ (نادی مناد): اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ ندائے غیبی آئی۔ (امضیت فریضتی): پہلے اپنے حکم کو جاری اور نافذ کیا تھا۔ (وخففت عن عبادی): پھر اپنے بندوں کے لئے تخفیف کر دی، اس جملہ کا بہت اہم تتمہ آگے آ رہا ہے جہاں اس کا مطلب واضح ہو جائے گا ان شاء اللہ۔

تخریج: نسائی نے بھی اس روایت کو نقل کیا ہے۔

واقعہ معراج حضرت انس رضی اللہ عنہ کی روایت

۵۸۶۳: وَعَنْ ثَابِتٍ الْبُنَانِيِّ عَنْ اَنَسٍ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اُتِيْتُ بِالْبُرَاقِ وَهُوَ دَابَّةٌ اَبْيَضُ طَوِيْلٌ فَوْقَ الْحِمَارِ وَدُوْنَ الْبَغْلِ يَقَعُ حَافِرُهُ عِنْدَ مُنْتَهٰى طَرْفِهِ فَرَكِبْتُهُ حَتّٰى اَتَيْتُ بَيْتَ

الْمُقَدَّسِ فَرَبَطْتُهُ بِالْحَلْقَةِ الَّتِيْ تَرْبِطُ بِهَا الْاَنْبِيَآءُ قَالَ ثُمَّ دَخَلْتُ الْمَسْجِدَ فَصَلَّيْتُ فِيْهِ رَكْعَتَيْنِ ثُمَّ خَرَجْتُ فَجَآءَنِيْ جِبْرِيْلُ بِاِنَاءٍ مِّنْ خَمْرٍ وَاِنَاءٍ مِّنْ لَبَنٍ فَاخْتَرْتُ اللَّبَنَ فَقَالَ جِبْرِيْلُ اِخْتَرْتَ الْفِطْرَةَ ثُمَّ عُرِجَ بِنَا اِلَى السَّمَآءِ وَسَاقَ مِثْلَ مَعْنَاهُ قَالَ فَاِذَا اَنَا بِاٰدَمَ فَرَحَّبَ بِيْ وَدَعَا لِيْ بِخَيْرٍ وَّقَالَ فِي السَّمَآءِ الثَّالِثَةِ فَاِذَا اَنَا بِيُوْسُفَ اِذَا هُوَ قَدْ اُعْطِيَ شَطْرَ الْحُسْنِ فَرَحَّبَ بِيْ وَدَعَا لِيْ بِخَيْرٍ وَلَمْ يَذْكُرْ بُكَآءَ مُوْسٰى وَقَالَ فِي السَّمَآءِ السَّابِعَةِ فَاِذَا اَنَا بِاِبْرَاهِيْمَ مُسْنِدًا ظَهْرَهُ اِلَى الْبَيْتِ الْمَعْمُوْرِ وَاِذَا هُوَ يَدْخُلُهُ كُلَّ يَوْمٍ سَبْعُوْنَ اَلْفَ مَلَكٍ لَا يَعُوْدُوْنَ اِلَيْهِ ثُمَّ ذَهَبَ بِيْ اِلَى السِّدْرَةِ الْمُنْتَهٰى فَاِذَا وَرَقُهَا كَاٰذَانِ الْفِيَلَةِ وَاِذَا ثَمَرُهَا كَالْقِلَالِ فَلَمَّا غَشِيَهَا مِنْ اَمْرِ اللّٰهِ مَا غَشِيَ تَغَيَّرَتْ فَمَا اَحَدٌ مِّنْ خَلْقِ اللّٰهِ يَسْتَطِيْعُ اَنْ يَّنْعَتَهَا مِنْ حُسْنِهَا وَاَوْحٰى اِلَيَّ مَا اَوْحٰى فَفَرَضَ عَلَيَّ خَمْسِيْنَ صَلٰوةً فِيْ كُلِّ يَوْمٍ وَلَيْلَةٍ فَنَزَلْتُ اِلٰى مُوْسٰى فَقَالَ مَافَرَضَ رَبُّكَ عَلٰى اُمَّتِكَ قُلْتُ خَمْسِيْنَ صَلٰوةً فِيْ كُلِّ يَوْمٍ وَّلَيْلَةٍ قَالَ اِرْجِعْ اِلٰى رَبِّكَ فَسَلْهُ التَّخْفِيْفَ فَاِنَّ اُمَّتَكَ لَا تُطِيْقُ ذٰلِكَ فَاِنِّيْ بَلَوْتُ بَنِيْ اِسْرَائِيْلَ وَخَبَرْتُهُمْ قَالَ فَرَجَعْتُ اِلٰى رَبِّيْ فَقُلْتُ يَا رَبِّ خَفِّفْ عَلٰى اُمَّتِيْ فَحَطَّ عَنِّيْ خَمْسًا فَرَجَعْتُ اِلٰى مُوْسٰى فَقُلْتُ حَطَّ عَنِّيْ خَمْسًا قَالَ اِنَّ اُمَّتَكَ لَا تُطِيْقُ ذٰلِكَ فَارْجِعْ اِلٰى رَبِّكَ فَسَلْهُ التَّخْفِيْفَ قَالَ فَلَمْ اَزَلْ اَرْجِعُ بَيْنَ رَبِّيْ وَبَيْنَ مُوْسٰى حَتّٰى قَالَ يَا مُحَمَّدُ اِنَّهُنَّ خَمْسُ صَلَوَاتٍ كُلَّ يَوْمٍ وَّلَيْلَةٍ لِكُلِّ صَلٰوةٍ عَشْرٌ فَذٰلِكَ خَمْسُوْنَ صَلٰوةً مَّنْ هَمَّ بِحَسَنَةٍ فَلَمْ يَعْمَلْهَا كُتِبَتْ لَهٗ حَسَنَةً فَاِنْ عَمِلَهَا كُتِبَتْ لَهٗ عَشْرًا وَمَنْ هَمَّ بِسَيِّئَةٍ فَلَمْ يَعْمَلْهَا لَمْ تُكْتَبْ لَهٗ شَيْئًا فَاِنْ عَمِلَهَا كُتِبَتْ لَهٗ سَيِّئَةً وَاحِدَةً قَالَ فَنَزَلْتُ حَتّٰى انْتَهَيْتُ اِلٰى مُوْسٰى فَاَخْبَرْتُهٗ فَقَالَ ارْجِعْ اِلٰى رَبِّكَ فَسَلْهُ التَّخْفِيْفَ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقُلْتُ قَدْرَجَعْتُ اِلٰى رَبِّيْ حَتّٰى اسْتَحْيَيْتُ مِنْهُ۔ (رواه مسلم)

اخرجه مسلم فی صحيحه ١٤٥/١ حديث رقم (٢٥٩۔١٦٢) واحمد فی المسند ٣٩٢/٥۔

ترجمہ: ''حضرت ثابت بنانی (تابعی) حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میرے سامنے براق لایا گیا جو ایک سفید رنگ کا' دراز قد جانور تھا' گدھے سے بڑا اور خچر سے چھوٹا تھا' جہاں تک اس کی نگاہ جاتی وہاں اس کا ایک قدم پڑتا تھا' میں اس پر سوار ہو کر بیت المقدس پہنچا اور میں نے اس براق کو (مسجد کے دروازہ پر) اس حلقہ سے باندھ دیا جس کے ساتھ انبیاء (اپنے براقوں کو یا اس براق کو) باندھتے تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: پھر میں مسجد اقصیٰ میں داخل ہوا اور دو رکعت نماز پڑھی' پھر میں مسجد سے باہر آیا اور جبرئیل علیہ السلام میرے سامنے ایک پیالہ شراب کا اور ایک پیالہ دودھ کا لائے' میں نے دودھ کا پیالہ لے لیا تو حضرت جبرئیل علیہ السلام نے کہا: آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے

فطرت (یعنی دین اسلام) کو اختیار کر لیا اور پھر ہمیں آسمان کی طرف لے جایا گیا''۔ اس کے بعد حضرت انس رضی اللہ عنہ نے سابقہ حدیث کے ہم معنی حدیث بیان کی' کہا جو سابق حدیث میں گزرا کہا کہ (آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:) میں نے (پہلے آسمان پر) حضرت آدم علیہ السلام سے ملاقات کی' انہوں نے (ان الفاظ میں) مرحبا کہا (میں نیک بخت بیٹے اور پیغمبر صالح کو خوش آمدید کہتا ہوں) اور میرے لئے خیر و برکت کی دعا کی۔ پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تیسرے آسمان کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا کہ وہاں میری حضرت یوسف علیہ السلام سے ملاقات ہوئی جن کو آدھا حسن عطا کیا گیا تھا' انہوں نے بھی مجھ کو مرحبا کہا اور میرے لئے خیر و برکت کی دعا کی۔ راوی یعنی ثابت بنانی نے (حضرت انس رضی اللہ عنہ سے اس روایت میں) حضرت موسیٰ علیہ السلام کے رونے کا ذکر نہیں کیا (جیسا کہ حدیث سابق میں تھا) اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ساتویں آسمانوں کا ذکر کرتے ہوئے (سابق حدیث کی بہ نسبت مزید) یہ بھی ارشاد فرمایا کہ وہاں میری ملاقات حضرت ابراہیم علیہ السلام سے ہوئی' جو بیت المعمور سے پشت لگائے بیٹھے تھے' اور بیت المعمور میں ہر روز ستر ہزار فرشتے (طواف کے لئے) داخل ہوتے ہیں پھر دوبارہ ان کی باری نہیں آتی' (یعنی ہر دن نئے ستر ہزار فرشتے طواف کے لئے آتے ہیں کیونکہ فرشتوں کی کثرت کی بنا پر کسی فرشتے کو ایک مرتبہ کے بعد پھر دوبارہ بیت المعمور میں داخل ہونے کا کبھی موقع نہیں ملتا) اس کے بعد مجھ کو سدرۃ المنتہیٰ کی طرف لے جایا گیا (جو ساتویں آسمان پر بیری کا درخت ہے) میں نے دیکھا کہ اس (سدرہ) کے پتے ہاتھی کے کانوں کے برابر اور اس کے پھل (یعنی بیر) مٹکوں کے برابر تھے' پھر جب سدرۃ المنتہیٰ کو اللہ کے حکم سے کسی ڈھانپنے والی چیز نے ڈھانپ لیا' تو اس کی حالت بدل گئی (یعنی اس میں پہلے سے زیادہ اعلیٰ تبدیلی آ گئی اور حقیقت یہ ہے کہ اللہ کی مخلوق میں سے کوئی بھی اس کی خوبی اور وصف (کے کمال) کو بیان نہیں کر سکتا' پھر اللہ تعالیٰ نے جو وحی چاہی میری طرف بھیجی (یعنی مجھ سے بلاواسطہ کلام فرمایا) پھر مجھ پر دن رات میں پچاس نمازیں فرض کی گئیں' پھر میں اس بلند مقام سے نیچے اترا اور (ساتویں آسمان پر حضرت ابراہیم علیہ السلام سے رخصت ہوتا ہوا) حضرت موسیٰ علیہ السلام کے پاس ''چھٹے آسمان پر'' آیا تو انہوں نے پوچھا: آپ کے ربّ نے آپ کی امت پر کیا فرض کیا ہے؟ میں نے کہا رات دن میں پچاس نمازیں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کہا اپنے ربّ کے پاس واپس جائیں اور (نمازوں کی تعداد میں) تخفیف کی درخواست کریں کیونکہ آپ کی امت اتنی طاقت نہیں رکھتی' میں بنی اسرائیل کو آزما کر اور ان کا امتحان لے کر پہلے دیکھ چکا ہوں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: (حضرت موسیٰ علیہ السلام کے مشورہ پر) میں بارگاہ خداوندی میں پھر حاضر ہوا اور کہا: میرے پروردگار! میری امت کے حق میں آسانی فرما دیجئے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے پانچ نمازیں کم کر دیں۔ پھر میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے پاس آیا اور ان کو بتایا کہ مجھ سے پانچ نمازیں کم کر دی گئی ہیں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کہا: آپ کی امت اتنی (نمازیں ادا کرنے کی بھی) طاقت نہیں رکھتی' آپ اپنے پروردگار کے پاس جائیں اور مزید تخفیف کی درخواست کریں! آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: میں اسی طرح اپنے پروردگار اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے درمیان آتا جاتا رہا (اور تخفیف کا سلسلہ اسی طرح جاری رہا کہ میری درخواست پر ہر مرتبہ پانچ نمازیں کم کر دی جاتیں) یہاں تک کہ (جب آخری مرتبہ بھی تخفیف ہوگئی اور رات دن یہ پانچ نمازیں رہ گئیں تو) پروردگار نے فرمایا: محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) رات دن میں یہ پانچ نمازیں فرض ہیں اور ہر نماز کا ثواب دس گنا ہے' اس طرح یہ پانچ نمازیں ثواب میں پچاس نمازوں کے برابر ہیں

اور ہمارا اصول یہ ہے کہ جو شخص نیکی کا قصد کرے اور اس کو (کسی شرعی عذر یا کسی دوسری رکاوٹ کے سبب) پورا نہ کر سکے تو اس کے حساب میں (صرف اس قصد ہی کی وجہ سے) ایک نیکی لکھ دی جاتی ہے اور اگر اس قصد کے بعد اس نے اس نیکی کو کر لیا تو اس کے حساب میں وہ نیکی دس گنا لکھی جاتی ہے اور جو شخص برے کام کا قصد و ارادہ کرے اور پھر اس برے کام کو نہ کر سکے تو اس کے حساب میں وہ برائی نہیں لکھی جائے گی اور اگر اس نے اپنے قصد کے مطابق اس برے کام کا ارادہ کیا اور پھر اس برے کام کو نہ کر سکا تو اس کے حساب میں وہ برائی نہیں لکھی جائے گی اور اگر اس نے اپنے قصد کے مطابق اس برے کام کو کر لیا تو اس کے حساب میں وہی ایک برائی لکھی جائے گی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: پھر بارگاہِ خداوندی سے نیچے (چھٹے آسمان پر) واپس آیا اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کو صورتِ حال بتائی' انہوں نے پھر وہی مشورہ دیا کہ اپنے پروردگار کے پاس واپس جائیں اور (پانچ نمازوں میں بھی) تخفیف کی درخواست کریں! آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہا کہ میں بار بار اپنے پروردگار کے پاس جا چکا ہوں اب مجھے اس کے پاس جاتے شرم آتی ہے"۔ (مسلم)

تشریح: (اتیت بیت المقدس): المقدس، میم کے فتحہ، قاف کے سکون اور دال کے کسرہ کے ساتھ۔ نیز میم کے ضمہ، قاف کے فتحہ اور دال مشددہ مفتوحہ کے ساتھ بھی روایت کیا جاتا ہے۔ (فربطته بالحلقه) الحلقه، لام کے سکون کے ساتھ کبھی فتحہ بھی دیا جاتا ہے۔ امام نوویؒ فرماتے ہیں۔ فصیح اور مشہور لغت سکون لام والی ہے البتہ اس کے فتحہ کے بھی حکایت ہے۔ (التی بربط): لفظ یربط مذکر کے صیغہ کے ساتھ ہے تانیث کے ساتھ بھی پڑھنا جائز ہے، اس کو باء کے کسرہ اور ضمہ دونوں کے ساتھ پڑھا جاتا ہے۔ قاموس میں ربط، ضرب یضرب اور نصر دونوں سے ہے یعنی اس کو باندھا اور صحاح میں ہے اخفش سے ربطت الشی اربطه و اربطه بھی منقول ہے۔ انتھیٰ معلوم یہ ہو رہا ہے ضمہ والی لغت ضعیف ہے اسی وجہ سے آیت (ولیربط علی قلوبکم) میں تمام قراء کسرہ والی قراءت پر متفق ہیں، پھر لفظ "بھا" مشکوٰۃ کے تمام نسخوں میں ضمیر مؤنث کے ساتھ ہے۔

اور یہی ظاہر ہے شرح مسلم میں ہے الحلقة التی یربط به یعنی ضمیر مذکر کے ساتھ کتب اصول میں بھی ضمیر مذکر کے ساتھ ہے جو کہ حلقہ کے معنی کے طرف راجع کیا ہے کیونکہ اس سے وہ چیز مراد ہے جس کے ساتھ سواری باندھ دی جاتی ہے۔ (الانبیاء): جس سے انبیاء نے اپنے اپنے براق باندھا تھا یا یہی براق مراد ہے علی اختلاف ما تقدم اگر روایت یربط الانبیاء بھا ہو تو براق پر تمام انبیاء کی سواری والی بات متفقہ ہو جائے گی۔ (ثم دخلت المسجد): مسجد سے مسجد اقصیٰ مراد ہے۔

مسجد اقصیٰ تک کے سفر پر سب علماء کا اتفاق ہے اور کسی نے اس واقعیت سے اختلاف نہیں کیا ہے البتہ مسجد اقصیٰ سے آسمان تک سفر یعنی واقعہ معراج میں، معتزلہ نے اختلاف کیا ہے اور ان کا یہ اختلاف بھی علماء کے قدیم اس نظریہ کو ماننے کی وجہ سے ہے کہ آسمان میں خرق و التیام متفقہ محال ہے۔ (فصلیت فیه رکعتین): یہ تحیۃ المسجد کی دو رکعتیں تھی جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مسجد اقصیٰ میں داخل ہونے کے بعد پڑھیں اور زیادہ صحیح بات یہ ہے کہ یہ اس نماز کا ذکر ہے جس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے امامت فرمائی

اور انبیاء نے آپ ﷺ کی اقتداء کی تھی [راوی نے اس موقع پر آنحضرت کی امامت کا ذکر اختصار کے پیش نظر نہیں کیا]۔ چنانچہ آپ ﷺ یہیں پر امام الانبیاء بنے۔

(ثم خرجت): یعنی مسجد سے۔ (فجاء ني جبريل ...... الفطره): آپ نے اس فطرت کو اختیار کیا جس پر لوگوں کو پیدا کیا گیا ہے۔ یہاں لفظ عسل رہ گیا ہے جو شاید راوی کا اقتصار ہے یعنی اختصار سے کام لیتے ہوئے صرف دو پیالوں کا ذکر کیا اور تیسرے پیالے یعنی شہد کے پیالے کے ذکر کی ضرورت نہ سمجھی حضرت جبرئیل نے جو یہ کہا اخترت الفطرہ یہ اس وجہ سے کہ یہی سیدھا راستہ یعنی دین انسانی فطرت ہے۔ (وهو الدين القيم): اور اسی کے طرف آنحضرت نے بھی اشارہ فرمایا کل مولود يولد على الفطرة. (ثم عرج): راء اور عین کے فتحہ کے ساتھ۔ امام نوویؒ نے یہ اعراب ذکر کیا ہے۔ امام سیوطیؒ نے امام نوویؒ کی اتباع کی ہے۔ عرج کا فاعل جبرئیل یا ربّ جلیل ہے۔ چونکہ آنحضرت نے آگے "بنا" کا لفظ ارشاد فرمایا ہے اس لئے عروج کا فاعل اللہ تعالیٰ ہوا، مطلب یہ کہ پھر اللہ تعالیٰ نے مجھے اور جبرئیل کو اوپر آسمان تک پہنچایا، اور یہ بھی ممکن ہے کہ بنا کا لفظ محض اظہار تعظیم کے لئے ہو۔ اس صورت میں عروج کا فاعل حضرت جبرائیلؑ ہی ٹھہریں گے۔ ایک نسخہ میں عروج کا لفظ بصیغہ مجہول نقل ہوا ہے، اس صورت میں ترجمہ ہوگا پھر ہمیں اوپر آسمان تک لے جایا گیا۔ (الى السماء وساق مثل معناه): پھر حضرت ثابت نے حضرت انسؓ سے اس حدیث کو اسی طرح ذکر کیا جس طرح حضرت انسؓ نے حدیث کا مفہوم بیان کیا جو سابق حدیث میں گزرا "قال فاذا انا بادم فرحب بى". (قال): قائل، یا تو آنحضرت ﷺ ہیں یا ثابتؒ یا انسؓ ہے، اگر حضرت انسؓ ہو تو پھر مرفوعاً ہوگا۔ فرحب بى، یعنی میرے سلام کا جواب دینے کے بعد مجھے خوش آمدید کہتے ہوئے فرمایا مرحباً بالأبن الصالح والنبى الصالح. (ودعا لي بخير): ممکن ہے یہ فنعم المجيئ جاء، کا بیان یا اس کے علاوہ کوئی اور دعا ہو۔ (وقال فى السماء الثالثه: فاذا انا بيوسف اذ هو): دوسرا اذا: پہلے والے سے بدل اشتمال ہے۔ (قد اعطىٰ شطر الحسن): مظہرؒ کہتے ہیں: شطر الحسن کا معنی نصف حسن کے ہیں۔ ملا علی قاریؒ فرمارہے ہیں میرے نزدیک کل جنس حسن کا نصف مراد ہے۔ یا اپنے زمانے کے تمام لوگوں سے زیادہ حسین تھے گویا کہ آنحضرت نے یہ ظاہر فرمایا کہ حضرت یوسف کے زمانے میں جتنا حسن و جمال تمام لوگوں میں تھا، اس کا آدھا حصہ تنہا حضرت یوسفؑ کو ملا تھا۔ بعض حضرات کہتے ہیں نصف کے بجائے بعض حصہ مراد ہے کیونکہ جس طرح شطر سے نصف مراد لیا جاتا ہے، اسی طرح کبھی بعض حصہ بھی مراد لیا جاتا ہے۔ ملا علی قاریؒ فرماتے ہیں اگرچہ بعض شارحین نے اسی پر اقتصار کیا ہے، لیکن یہ مقام مدح کے (خلاف ہے) مناسب نہیں، پھر یا تو یہ مطلق ہے اس صورت میں ملاحت معنوی کے بغیر صرف حسن صوری کی زیادتی پر محمول کیا جائے گا تاکہ ہمارے نبی ﷺ کے صورت کے مثل ہونے کا معنی لازم نہ آئے۔ یا یہ مقید ہے اپنے زمانے کے تمام لوگوں کے حسن کے آدھا حصے سے اور یہ زیادہ ظاہر بھی معلوم ہوتا ہے۔ طیبی رحمۃ اللہ علیہ نے یہی معنی مراد لیا ہے لیکن طریقہ استدلال بڑا انوکھا اختیار کیا ہے کیونکہ وہ اس معنی کو وقد يراد به الجهة سے تعبیر کررہے ہیں اور دلیل کے طور پر آیت مبارکہ۔ (فول وجهك شطر المسجد الحرام): کو پیش کررہے ہیں کہ ان میں حسن کی ایک جہت مسبحه (اثرتها) جیسے کہا جاتا ہے على وجهه مسحة ملك ومستحه جمال، یعنی اس کے ماتھے پر بادشاہت اور جمال کا اثر ہے۔ اور یہ جملے بطور مدح کے بولے جاتے ہیں۔ طیبی رحمۃ اللہ علیہ کے کلام کی غرابت عقلمندوں سے مخفی نہیں۔

ہمارے مشائخ میں سے متعدد متأخرین محققین نے لکھا ہے کہ آنحضرت ﷺ، حضرت یوسف علیہ السلام سے زیادہ حسن و جمال کے مالک تھے۔ اس کی دلیل یہ بیان کی ہے کہ حضرت یوسفؑ کے بارے میں یہ کہیں نہیں آیا ہے کہ ان کی صورت کے جمال کا عکس مثل آئینہ کے دیوار پر پڑتا ہو، اور سامنے کی چیزیں اس میں نظر آتی ہوں جب کہ آنحضرت ﷺ کے بارے میں یہ منقول ہے کہ آپ ﷺ کے روئے انور کا جمال اسی درجہ کا تھا یہ اور بات ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کے اس روشن جمال کے بہت کچھ حصہ کو آپ ﷺ کے صحابہ پر پوشیدہ رکھا تھا، اگر ایسا نہ ہوتا اور آپ ﷺ کے رُخ روشن کا جمال اپنی پوری تابانی کے ساتھ جلوہ ریز رہتا تو نہ کسی کو تاب و نظارہ ہوتی، اور نہ کسی کو روئے انور کے دیدار کی سعادت حاصل ہو سکتی تھی، جبکہ حضرت یوسفؑ کا جو کچھ حسن و جمال تھا سب کی نظروں کے سامنے تھا اس میں سے کوئی حصہ پوشیدہ نہیں رکھا گیا تھا، اھ۔ محققین کا یہ کلام ہم نے ماقبل میں جو کچھ کہا ہے اس کا مؤید ہے۔ جس طرح ہمارے پیارے نبی ﷺ میں حسن معنوی کی زیادتی پائی جاتی تھی اس طرح حضرت یوسفؑ میں حسن صوری کی ایک گونہ زیادتی پائی جاتی تھی۔ بہرکیف اصل حسن کے اندر دونوں کا اشتراک ہے۔

بعض حضرات نے اس جملہ سے آنحضرت ﷺ کی یہ مراد بیان کی ہے، کہ حضرت یوسفؑ کو میرے حسن کا آدھا حصہ عطا کیا گیا تھا۔ یعنی جو حسن و جمال آنحضرت کو عطا کیا گیا تھا اس کا آدھا حصہ حضرت یوسفؑ کو ملا تھا۔

(فرحب بی...... ولم یذکر): حضرت ثابت نے حضرت انسؓ کی اس حدیث میں حضرت موسیٰ کے رونے کا ذکر نہیں کیا، جیسا کہ حدیث سابق میں تھا۔ **(قال فی السماء السابعه)**: سابق حدیث کے بہ نسبت اس میں۔ **(فاذا انا با ابراهیم)**: کے الفاظ مزید ارشاد فرمائے۔ **(مسنداً)**: نون کے کسرہ کے ساتھ۔ یہ حال ہونے کی وجہ سے منصوب ہے، مشکوۃ کے تمام نسخوں میں اس کا یہی اعراب لکھا گیا ہے، اور یہ صحیح مسلم وشرح صحیح ومسلم اور شرح السنہ کے مطابق ہے جبکہ مصابیح میں مرفوع مبتداء محذوف کی خبر ہونے کی وجہ اور حکم "ظهره" ان دونسخوں کے اعتبار سے ظرفیت کی وجہ سے منصوب ہے۔ اور "الی البیت المعمور" یہ مسنداً کے ساتھ متعلق ہے۔

طیبی رحمہ اللہ لکھتے ہیں الیه کی ضمیر مجرور بیت المعمور کی طرف راجع ہے، یعنی اتنی کثیر تعداد میں فرشتے ہیں کہ جب ایک فرشتہ اس میں طواف کیلئے داخل ہوتا ہے تو پھر کبھی بھی اس کی باری دوبارہ نہیں آتی۔ **(ثم ذهب لبی)**: صیغہ معروف کے ساتھ، ایک نسخہ میں صیغہ مجہول کے ساتھ ہے، اس صورت میں ترجمہ ہوگا مجھے لے گیا گیا۔ **(الی السدرة المنتهیٰ)**: جامع الاصول میں لفظ سدرة الف لام کے ساتھ منقول ہے، اور کچھ روایات میں بعد هذا سدرة المنتهیٰ کے الفاظ ہیں۔ شرح مسلم میں بھی اسی طرح ہیں۔ **(فاذا راقها...... فلما غشیها)**: ضمیر سدرہ کے طرف راجع ہے غشی، شین کے کسرہ اور یاء کے فتحہ کے ساتھ۔ (سمع یسمع سے ہے) یعنی جب آپ وہاں پہنچے اور مقام سدرة المنتهیٰ پر اترے تو اس کا منظر یہ تھا۔ **(من امر الله)**: یہ جملہ بیانیہ یا تعلیلیہ معترضہ ہے۔ **(ما غشی)**: اس سے آیت ﴿فغشاها ما غشی﴾ کی طرف اشارہ ہے۔ کس چیز نے سدرة المنتهیٰ کو ڈھک دیا تھا؟ اس بار میں مختلف اقوال ہیں بعض حضرات کہتے ہیں بے شمار فرشتے سدرة المنتهیٰ کو گھیرے ہوئے تھے، ان کے پروں کی روشنی اور چمک نے گویا پورے درخت پر نور کی چادر ڈال دی تھیں۔ بعض حضرات نے کہا ہے سونے کے پتنگوں پروانوں اور دوسری رنگ برنگ کی عجیب وغریب چیزوں نے [جن کی حقیقت و کیفیت کوئی نہیں جانتا] سدرة المنتهیٰ کو ڈھک دیا تھا۔

قاضی عیاضؒ فرماتے ہیں: شاید اللہ کے جلال اور عظمت کا نور سونے کے پروانوں کی طرح اس پر گر رہا تھا جس کے نیچے پورا درخت چھپ گیا تھا اور اس کو بہت زیادہ روشن اور صاف ہونے کی وجہ سے سونے کے پتنگوں سے تعبیر کیا جاتا ہے، یا کوئی اور رنگ تھا جس کی حقیقت کا علم نہیں اور یہی بات زیادہ ظاہر معلوم ہوتی ہے۔

(تغیرت): سدرۃ المنتہیٰ میں پہلے سے زیادہ اعلیٰ تبدیلی آ گئی۔ یہ جملہ لما کا جواب ہے۔ (فما احد من خلق الله): یہاں خلق سے آسمانی اور زمینی ساری مخلوق مراد ہیں۔ (یستطع ان ینعتها): عین کے فتحہ کے ساتھ (سمع سے) کہ وہ اس کی خوبی و وصف بیان کر سکے۔ (من حسنها): من تعلیلہ ہے یعنی اس کے جمال کے کمال اور اس کے جلال کی عظمت کی وجہ سے کوئی اندازہ نہیں کر سکتا۔ (و اوحی الی ما اوحی): لفظ "ما" کو موصولہ یا موصوفہ میں مبہم رکھنے میں وحی کے تعظیم کے طرف اشارہ ہے اور یہ ان چیزوں کی قبیل سے جن کی روایت اور حکایت نہیں کی جا سکتی۔ (ففرض علی خمسین صلاۃ...... الی موسیٰ): ایک صحیح نسخہ میں یوم کے ساتھ ولیلۃ کا لفظ بھی ہے۔

(قال:...... فانی بلوت): یعنی بڑا تجربہ کیا۔ (بنی اسرائیل و خبرتهم): اور ان کا امتحان و آزمائش کر چکا ہوں۔

(قال: فرجعت ...... علی امتی): یعنی ان کے حق میں آسانی فرما دیجئے۔ علی کے طرف عدول کیا کہ وہ سہولت کے معنی کو شامل ہے۔ (فحط عنی): چنانچہ میری وجہ سے اور میری سفارش سے امت کے حق میں۔ (خمساً): پانچ نمازیں کم کر دیں۔ اس حدیث سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ پچاس نمازوں میں جو تخفیف ہوئی وہ ہر مرتبہ پانچ پانچ نمازیں کم ہونے کی صورت میں ہوئی جبکہ سابق حدیث میں ہر مرتبہ دس دس اور آخر میں پانچ نمازیں کم ہونے کی صورت ذکر کی گئی ہے، لہٰذا ہو سکتا ہے کہ یہاں اس طرح ہو خمساً فخمساً یعنی میری امت کے حق میں پانچ اور پھر پانچ نمازیں کم کر دیں، گویا ہر دفعہ پانچ پانچ کر کے دس نمازیں کم کی گئی ہوں گی، اس طرح اس حدیث کی سابقہ حدیث سے مطابقت ہو جائے گی۔ لیکن زیادہ صحیح یہ ہے کہ ہر مرتبہ پانچ پانچ نمازوں کی تخفیف ہوتی رہی، البتہ سابق حدیث میں طوالت سے بچنے کے لئے ہر مرتبہ پانچ پانچ کا ذکر کرنے کے بجائے دس دس کا ذکر کر کے کلام کو مختصر کر دیا گیا۔ اس کی تائید اسی حدیث کے ان الفاظ یعنی "فرجعت الی موسیٰ فقلت حط عنی خمسًا، قال: ان امتك لا تطيق ذالك" سے بھی ہوتی ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا: پھر میں حضرت موسیٰؑ کے پاس آیا اور ان کو بتایا کہ میری درخواست پر پانچ نمازیں کم کر دی گئی ہیں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا بقیہ تعداد پر بھی آپ کی امت عمل نہ کر سکے گی۔

(فارجع ...... بین موسیٰ): امام نوویؒ کہتے ہیں اس سے وہ مقام مراد ہے جہاں پر پہلی بار ہم کلامی ہوئی تھی دوبارہ بھی وہی جگہ مقام مناجات بنی، اور حضرت موسیٰ سے جس جگہ ملاقات ہوئی تھی اولاً، پھر وہیں پر ثانیاً بھی ملاقات ہوتی رہی۔ (حتی قال): قائل اللہ سبحانہ وتعالیٰ ہیں۔ (یا محمد! انهن خمس صلوٰة): یعنی فرض تو پانچ نمازیں ہیں۔ (کل یوم ولیلة): طیبی رحمہ اللہ لکھتے ہیں انهن: ضمیر مبہم ہے جس کی تفسیر ان: کی خبر کر رہی ہے۔ جیسے شاعر کے اس قول میں ہے:

هی النفس ماحملتها تتحمل

کہ اس میں حملتها کی ضمیر مبہم ہے تتحمل اس کی تفسیر ہے۔

(لکل صلاۃ): اس میں ہر نماز کا ثواب۔ (عشراً): دس نمازوں کے برابر ہے۔ (فذلك): اس طرح مجموعی اعتبار سے۔ (خمسون صلاۃ): پچاس کے برابر ہیں۔ پھر دوبارہ ایک اور قضیہ اور عطیہ کو ایک قاعدہ کلیہ کے طور پر ذکر فرما رہے ہیں جس میں بہت سی اس طرح کی جزئیات مندرج ہیں، چنانچہ فرمایا "من هم بحسنة" یعنی ہمارا اصول یہ ہے کہ جس شخص نے نیکی کا قصد کیا۔ (فلم یعملها): پھر کسی شرعی عذر یا رکاوٹ کی سبب پورا نہ کر سکا تو (کتبت له حسنة): صرف اس ارادہ کی وجہ سے اس ارادہ کرنے والے کو ایک نیکی کا ثواب دیتے ہیں۔

کتبت، مجہول کا صیغہ ہے حسنہ کے طرف اضافت کی وجہ سے مؤنث کا صیغہ لایا، مضاف کو حذف کر کے مضاف الیہ کو اس کا قائم مقام بنایا گیا ہے۔ تقدیر عبارت یوں ہے "ثواب حسنة واحدةٍ"۔ طیبی رحمہ اللہ لکھتے ہیں: لفظ کتبت، مجہول کا صیغہ ہے، نائب فاعل ضمیر مستتر ہے جو بحسنةٍ کے طرف راجع ہے۔ اور یہ حسنة قائم مقام مصدر ہے، اصل میں یوں ہے کتبت الحسنة کتابة واحدةً، اور یہی اعراب عشرًا اور شیئاً کا بھی ہے، یعنی یہ دونوں بھی مصدریت کی وجہ سے منصوب ہیں۔ مسلم، جامع الاصول اور شرح السنہ میں منصوب ہی منقول ہیں، البتہ مصابیح کے کچھ نسخوں میں حسنه اور عشره دونوں مرفوع منقول ہیں لیکن یہ لکھنے والے کی غلطی ہے ہیں۔ ملاعلی قاریؒ کو طیبی رحمہ اللہ کا یہ قول وزن دار معلوم نہیں ہو رہا ہے، وہ فرماتے ہیں: شاید طیبی رحمہ اللہ نے باعتبار روایت کے یہ بات کہی ہے وگرنہ درایۃً خود اس جملے میں وجہ موجود ہے وہ اس طرح کہ آنحضرت ﷺ کا قول "کتبت له" یہ جملہ مستقلہ مجملہ ہے اور حسنة مبتداء محذوف هی کی خبر ہے، یہ جملہ مبینہ مفصلہ ہے۔

(فان عملها): اگر اس قصد کے بعد اس نے وہ نیکی کر بھی لی۔ (کتبت): اس مہتم بالشان نیکی کا دس گنا زیادہ ثواب ملتا ہے۔ یعنی نیکی تو وہ ایک ہی کرے گا مگر اس کے دل کے ارادے کا عمل کے ساتھ انضمام ہونے کی وجہ سے اس کے نامۂ اعمال میں ثواب دس نیکیوں کا لکھا جائے گا۔ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے اس کی بشارت یوں دی ہے: ﴿من جاء بالحسنه فله عشر امثالها﴾ (جو کوئی ایک نیکی لے آئے گا اس کو ایسی دس نیکیاں ملیں گی)۔ غیر حرم میں تضاعف کا یہ سب سے ادنی درجہ ہے (یعنی حرم شریف کے علاوہ دوسری جگہوں پر کئے جانے والے کسی ایک نیک عمل پر جو کئی گنا زیادہ ثواب کا وعدہ فرمایا گیا ہے اس میں دس گنا سب سے ادنی درجہ ہے کیونکہ دوسری احادیث سے ثابت ہے کہ بعض صورتوں میں ایک عمل پر دس گنا سے بھی زائد، یہاں تک کہ سات سو تک بلکہ بقدر اخلاص سات سو گنا سے بھی زیادہ ثواب مل سکتا ہے)۔

(ومن هم بسیئة): ارادہ تو کیا ہے لیکن اس کا عزم نہ کیا تھا۔ (فلم یعملها): بغیر کسی باعث اور سبب مباح کے اس کو نہ کر سکا تو اس کے حساب میں وہ برائی نہیں لکھی جائے گی (یعنی اگر کسی شخص نے کوئی بُرا کام کرنے کا ارادہ کیا اور پھر کسی وجہ کے بغیر یا کسی ایسے سبب سے کہ جو مباح میں سے ہو، اس نے وہ بُرا کام نہیں کیا تو اس کے نامہ اعمال میں کوئی برائی نہیں لکھی جائے گی، بشرطیکہ وہ ارادہ محض سطحی طور پر پیدا ہوا ہو دل میں مضبوطی کے ساتھ نہ رہا ہو۔ اور اگر اس نے برے کام کا ایسا ارادہ کیا ہو جو دل میں پختگی کے ساتھ تھا۔ پھر اس نے وہ برا کام نہیں کیا تو دیکھا جائے گا کہ اس نے عزم کے باوجود برا کام کس سبب سے نہیں کیا؟ اگر سبب یہ ہو کہ عزم کے بعد محض اللہ کے خوف اور اس کی رضاء کی خاطر اس برے کام سے اجتناب ہے تو اس صورت میں اس کے نامہ اعمال میں ایک نیکی لکھ دی جائے گی)۔

(لم تكتب له شيئاً): اور اگر کسی غرض فاسد کی وجہ سے اس نے برا کام نہیں کیا تھا تو پھر بھی ایک برائی لکھ دی جاتی ہے۔ حجۃ الاسلام غزالیؒ نے بھی احیاء علوم الدین میں یہی کچھ لکھا ہے۔ اور اکثر علماء نے بھی یہی تصریح کی ہے۔ (فان عملها كتبت): ایک صحیح نسخہ میں لفظ کتبت کے بعد "له" کا لفظ بھی ہے۔

(سيئة واحدة): تو اس کے حساب میں صرف وہی ایک برائی لکھی جائے گی۔ کا مطلب یہ ہے کہ جیسے ایک نیکی کرنے پر نامہ اعمال میں وہ نیکی دس گنا لکھی جاتی ہے لیکن ایک برائی کرنے پر نامہ اعمال میں وہ برائی دس گنا نہیں لکھی جاتی، بلکہ ایک ہی برائی لکھی جاتی۔ کیونکہ کمیت کے اعتبار سے برائی مضاعف نہیں ہوتی، خود باری تعالیٰ کا بھی ارشاد ہے: ﴿ومن جاء بالسيئة فلا يجزیٰ الا مثلها وهم لا يظلمون﴾ [الانعام]. (اور جو کوئی ایک برائی لے کر آئے گا اُسے ویسی ہی سزا ملے گی اور ان پر ظلم نہیں کیا جائے گا)۔ "اور ان پر ظلم نہیں کیا جائے گا" سے واضح ہوا کہ برائی کا مضاعف نہ ہونا عدل خداوندی کا اظہار ہے جبکہ نیکی کا مضاعف ہونا فضل خداوندی ہے۔ (قال...... قد رجعت الى ربی): میں اپنی امت کے حق میں بار بار جاتا رہا۔ (حتی استحييت): یہاں تک کہ مجھے حیاء آ گئی۔ (رواه مسلم).

واقعہ معراج...... حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کی روایت

۵۸۶۴: وَعَنِ ابْنِ شِهَابٍ عَنْ اَنَسٍ قَالَ كَانَ اَبُوذَرٍ يُّحَدِّثُ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ فُرِجَ عَنِّي سَقْفُ بَيْتِي وَاَنَا بِمَكَّةَ فَنَزَلَ جِبْرَئِيْلُ فَفَرَجَ صَدْرِيْ ثُمَّ غَسَلَهٗ بِمَآءِ زَمْزَمَ ثُمَّ جَآءَ بِطَسْتٍ مِنْ ذَهَبٍ مُمْتَلِيءٍ حِكْمَةً وَاِيْمَانًا فَاَفْرَغَهٗ فِيْ صَدْرِيْ ثُمَّ اَطْبَقَهٗ ثُمَّ اَخَذَ بِيَدِيْ فَعُرِجَ بِيْ اِلَى السَّمَآءِ فَلَمَّا جِئْتُ اِلَى السَّمَآءِ الدُّنْيَا قَالَ جِبْرَئِيْلُ لِخَازِنِ السَّمَآءِ افْتَحْ قَالَ مَنْ هٰذَا قَالَ هٰذَا جِبْرَئِيْلُ قَالَ هَلْ مَعَكَ اَحَدٌ قَالَ نَعَمْ مَعِيَ مُحَمَّدٌ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ اُرْسِلَ اِلَيْهِ قَالَ نَعَمْ فَلَمَّا فَتَحَ عَلَوْنَا السَّمَآءَ الدُّنْيَا اِذَا رَجُلٌ قَاعِدٌ عَلٰى يَمِيْنِهٖ اَسْوِدَةٌ وَعَلٰى يَسَارِهٖ اَسْوِدَةٌ اِذَا نَظَرَ قِبَلَ يَمِيْنِهٖ ضَحِكَ وَاِذَا نَظَرَ قِبَلَ شِمَالِهٖ بَكٰى فَقَالَ مَرْحَبًا بِالنَّبِيِّ الصَّالِحِ وَالْاِبْنِ الصَّالِحِ قُلْتُ لِجِبْرَئِيْلَ مَنْ هٰذَا قَالَ هٰذَا اٰدَمُ وَهٰذِهِ الْاَسْوِدَةُ عَنْ يَمِيْنِهٖ وَعَنْ شِمَالِهٖ نَسَمُ بَنِيْهِ فَاَهْلُ الْيَمِيْنِ مِنْهُمْ اَهْلُ الْجَنَّةِ وَالْاَسْوِدَةُ الَّتِيْ عَنْ شِمَالِهٖ اَهْلُ النَّارِ فَاِذَا نَظَرَ عَنْ يَمِيْنِهٖ ضَحِكَ وَاِذَا نَظَرَ قِبَلَ شِمَالِهٖ بَكٰى حَتّٰى عُرِجَ بِيْ اِلَى السَّمَآءِ الثَّانِيَةِ فَقَالَ لِخَازِنِهَا افْتَحْ فَقَالَ لَهٗ خَازِنُهَا مِثْلَ مَا قَالَ الْاَوَّلُ قَالَ اَنَسٌ فَذَكَرَ اَنَّهٗ وَجَدَ فِي السَّمٰوٰتِ اٰدَمَ وَاِدْرِيْسَ وَمُوْسٰى وَعِيْسٰى وَاِبْرَاهِيْمَ فِي السَّمَآءِ السَّادِسَةِ قَالَ ابْنُ شِهَابٍ فَاَخْبَرَنِي ابْنُ حَزْمٍ اَنَّ ابْنَ عَبَّاسٍ وَاَبَا حَبَّةَ الْاَنْصَارِيَّ كَانَا يَقُوْلَانِ قَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ثُمَّ عُرِجَ بِيْ حَتّٰى ظَهَرْتُ لِمُسْتَوًى اَسْمَعُ فِيْهِ صَرِيْفَ

الَّا قُلَامٍ وَقَالَ ابْنُ حَزْمٍ وَاَنَسٌ قَالَ النَّبِیُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَفَرَضَ اللّٰهُ عَلٰى اُمَّتِیْ خَمْسِيْنَ صَلٰوةً فَرَجَعْتُ بِذٰلِكَ حَتّٰى مَرَرْتُ عَلٰى مُوْسٰى فَقَالَ مَا فَرَضَ اللّٰهُ لَكَ عَلٰى اُمَّتِكَ قُلْتُ فَرَضَ خَمْسِيْنَ صَلٰوةً قَالَ فَارْجِعْ اِلٰى رَبِّكَ فَاِنَّ اُمَّتَكَ لَا تُطِيْقُ فَرَاجَعْتُ فَوَضَعَ شَطْرَهَا فَرَجَعْتُ اِلٰى مُوْسٰى فَقُلْتُ وَضَعَ شَطْرَهَا فَقَالَ رَاجِعْ رَبَّكَ فَاِنَّ اُمَّتَكَ لَا تُطِيْقُ ذٰلِكَ فَرَجَعْتُ فَرَاجَعْتُ فَوَضَعَ شَطْرَهَا فَرَجَعْتُ اِلَيْهِ فَقَالَ ارْجِعْ اِلٰى رَبِّكَ فَاِنَّ اُمَّتَكَ لَا تُطِيْقُ ذٰلِكَ فَرَاجَعْتُهٗ فَقَالَ هِیَ خَمْسٌ وَّهِیَ خَمْسُوْنَ لَا يُبَدَّلُ الْقَوْلُ لَدَیَّ فَرَجَعْتُ اِلٰى مُوْسٰى فَقَالَ رَاجِعْ رَبَّكَ فَقُلْتُ اسْتَحْيَيْتُ مِنْ رَّبِّیْ ثُمَّ انْطَلَقَ بِیْ حَتّٰى انْتَهٰى بِیْ اِلٰى سِدْرَةِ الْمُنْتَهٰى وَغَشِيَهَا اَلْوَانٌ لَا اَدْرِیْ مَا هِیَ ثُمَّ اُدْخِلْتُ الْجَنَّةَ فَاِذَا فِيْهَا جَنَابِذُ اللُّؤْلُؤِ وَاِذَا تُرَابُهَا الْمِسْكُ۔ (متفق علیه)

اخرجه البخاری ۴۵۸/۱ حدیث رقم ۳۴۹ ومسلم فی صحیحه ۱۴۸/۱ حدیث رقم (۲۶۳-۱۶۳) واحمد فی المسند ۱۲۲/۵

ترجمہ: ''حضرت ابن شہاب زہریؒ (تابعی) حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے کہا: حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ بیان کرتے تھے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میں مکہ میں اپنے گھر میں (سویا ہوا) تھا کہ (اچانک) میرے گھر کی چھت کھلی اور حضرت جبرئیل علیہ السلام نازل ہوئے' انہوں نے میرا سینہ چاک کر کے آب زمزم سے دھویا پھر وہ جو ایمان وحکمت سے بھرا ہوا تھا' اس کو میرے سینہ پر ڈال دیا اور پھر میرے سینہ کو ملا کر برابر کر دیا۔ اس کے بعد جبرئیل علیہ السلام نے میرا ہاتھ پکڑا اور مجھے آسمان کی طرف لے گئے' جب میں آسمان دنیا پر پہنچا تو جبرئیل علیہ السلام نے آسمان کے محافظ سے کہا کہ (دروازہ) کھولو' محافظ نے پوچھا: کیا تمہارے ساتھ اور کوئی بھی ہے؟ جبرئیل علیہ السلام نے کہا: ہاں' میرے ساتھ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) ہیں۔ محافظ نے پوچھا: کیا ان کو بلوایا گیا ہے؟ جبرئیل علیہ السلام نے کہا: ہاں چنانچہ دروازہ کھولا گیا اور جب ہم آسمان دنیا کے اوپر پہنچے تو کیا دیکھتے ہیں کہ ایک صاحب تشریف فرما ہیں اور (ان کی اولاد وذریات میں سے) کچھ لوگ ان کے دائیں جانب اور کچھ ان کی بائیں جانب بیٹھے ہوئے ہیں (پھر میں نے یہ بھی دیکھا کہ) وہ اپنی دائیں جانب دیکھتے ہیں تو ہنسنے لگتے ہیں (کیونکہ اس طرف جنتی لوگ تھے اور ان کو دیکھنا یقیناً خوشی وفرحت کا باعث تھا) اور جب بائیں جانب دیکھتے ہیں تو رونے لگتے ہیں (کیونکہ اس طرف دوزخی لوگ تھے جن کو دیکھنا رنج وغم کا باعث تھا) انہوں نے (سلام وجواب کے بعد میری طرف مخاطب ہو کر) کہا: پیغمبر صالح اور نیک بخت بیٹے کو خوش آمدید کہتا ہوں۔ میں نے جبرئیل سے پوچھا کہ یہ کون ہیں؟ جبرئیل علیہ السلام نے کہا: یہ آدم علیہ السلام ہیں اور یہ لوگ جو ان کے دائیں بائیں بیٹھے ہیں ان کی اولاد کی روحیں ہیں' ان میں سے جو لوگ ان کے دائیں بیٹھے ہیں وہ جنتی ہیں اور جو لوگ ان کے بائیں بیٹھے ہیں وہ دوزخی ہیں' اسی لئے جب یہ (آدم علیہ السلام) اپنی دائیں جانب دیکھتے ہیں تو ہنستے ہیں اور جب بائیں جانب دیکھتے ہیں تو روتے ہیں۔ اس کے بعد جبرئیل علیہ السلام مجھ کو لے کر دوسرے آسمان پر چڑھے اور انہوں نے آسمان کا دروازہ کھولنے کے لئے کہا تو اس کے محافظ نے بھی وہی سوال کیا جو پہلے آسمان کے محافظ نے کیا تھا۔ راوی کہتے ہیں! غرضیکہ اسی طرح

آپ ﷺ نے تمام آسمانوں پر پہنچنے اور وہاں حضرت آدم علیہ السلام' حضرت ادریس' حضرت عیسیٰ اور حضرت ابراہیم علیہم السلام سے ملاقات کا ذکر فرمایا' لیکن ان کے منازل ومقامات واحوال کو بیان نہیں کیا' صرف یہ بیان کیا کہ حضرت آدم علیہ السلام سے پہلے آسمان پر اور حضرت ابراہیم علیہ السلام سے چھٹے آسمان پر ملاقات ہوئی۔ ابن شہاب کہتے ہیں کہ مجھ کو ابن حزم نے بتایا کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور حضرت ابوحبہ انصاری رضی اللہ عنہ نے بیان کیا کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''پھر مجھ کو اور اوپر لے جایا گیا' یہاں تک میں ایک ہموار اور بلند مقام پر پہنچا جہاں قلموں سے لکھنے کی آوازیں آ رہی تھیں''۔ ابن حزم اور حضرت انس رضی اللہ عنہ نے بیان کیا کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: پھر اللہ تعالیٰ کی طرف سے میری امت پر پچاس نمازیں فرض کی گئیں' چنانچہ (پاس فرض نمازوں کا یہ حکم اور اس پر عمل آوری کا ارادہ لے کر) میں واپس ہوا' لیکن جب حضرت موسیٰ علیہ السلام کے پاس سے گزرا تو انہوں نے پوچھا کہ ''پروردگار نے تمہارے ذریعہ تمہاری امت پر کیا چیز فرض کی ہے؟ میں نے ان کو بتایا کہ پچاس نمازیں فرض کی ہیں۔ انہوں نے کہا: اپنے پروردگار کے پاس واپس جاؤ (اور ان سے نمازوں میں تخفیف کی درخواست کرو) کیونکہ تمہاری امت اتنی نمازیں ادا نہیں کر سکے گی۔ اس طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام نے مجھ کو بارگاہ رب العزت میں واپس کیا (یعنی ان کے کہنے میں نے پروردگار کی بارگاہ میں واپس جا کر درخواست پیش کی) اور ان میں سے کچھ نمازیں (یعنی دس نمازیں) کم کر دی گئیں۔ میں پھر حضرت موسیٰ علیہ السلام کے پاس آیا اور انہیں بتایا کہ اللہ تعالیٰ نے (پچاس نمازوں کا) کچھ حصہ معاف کر دیا ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کہا: اپنے پروردگار کے پاس پھر جاؤ (اور عرض معروض کر کے مزید تخفیف کی درخواست کرو) کیونکہ آپ کی امت اتنی نمازیں ادا کرنے کی بھی طاقت نہیں رکھے گی۔ میں پھر واپس گیا (اور مزید تخفیف کے لئے عرض معروض کی) چنانچہ ان میں سے کچھ اور نمازیں کم کر دی گئیں' اس کے بعد پھر حضرت موسیٰ علیہ السلام کے پاس آیا تو انہوں نے کہا کہ پھر اپنے پروردگار کے پاس جاؤ (اور مزید تخفیف کی درخواست کرو) کیونکہ تمہاری امت اتنی نمازیں ادا کرنے کی بھی طاقت نہیں رکھے گی' چنانچہ میں پھر گیا (اور پروردگار سے خوب عرض معروض کی) پس (پروردگار نے مزید تخفیف کر دی' یہاں تک کہ جب دس نمازیں رہ گئیں اور آخری مرتبہ بارگاہ رب العزت میں لوٹ کر گیا اور میری درخواست پر ان میں بھی تخفیف کر کے پانچ نمازوں کا حکم دے دیا تو) پروردگار نے فرمایا: فرض تو یہ پانچ نمازیں ہیں لیکن (اجر وثواب کے اعتبار سے) پچاس نمازوں کے برابر ہیں' میرے ہاں بات تبدیل نہیں ہوتی۔ میں پھر حضرت موسیٰ علیہ السلام کے پاس آیا اور ان کو بتایا کہ اب پانچ نمازیں فرض رہ گئی ہیں تو انہوں نے پھر مجھے بارگاہ رب العزت میں واپس جانے (اور ان پانچ نمازوں میں بھی تخفیف کی درخواست کرنے) کا مشورہ دیا' لیکن میں نے کہا کہ اب مجھ کو اپنے پروردگار سے شرم آتی ہے۔ اس کے بعد (آپ ﷺ نے فرمایا کہ) مجھ کو سدرۃ المنتہیٰ تک لے جایا گیا جسے (جلال کبریائی کے انوار یا ملائکہ کے پروں کی چمک یا کسی اور چیز کے) کئی قسم کے رنگوں نے ڈھانپ رکھا تھا' جن کے بارے میں کچھ نہیں جانتا کہ وہ کیا چیز تھی (یعنی یا تو اس وقت جو کچھ میں نے دیکھا اور محسوس کیا اس کو اب بیان کرنے پر قادر نہیں ہوں یا یہ کہ اس وقت میں ذات حق کی طرف اس طرح متوجہ اور مستغرق تھا کہ میری نظر کو سدرۃ المنتہیٰ پر چھائے ہوئے رنگوں کی حقیقت تک پہنچنے اور جاننے کا موقع ہی نہیں ملا) اس کے بعد مجھے جنت میں لے جایا گیا وہاں میں نے موتیوں کے گنبد دیکھے اور یہ بھی دیکھا کہ جنت کی مٹی مشک تھی''۔ (بخاری ومسلم)

تشریح: (یحدث ان رسول الله ﷺ قال: فرج): فاء کے ضمہ راء کی تخفیف کے ساتھ نیز شد بھی دیا جاتا ہے، یہ فرج اور التفریج مجرد اور مزید دونوں سے پھٹنے اور ظاہر ہونے کے معنی میں ہے اور یہاں ہٹانے کے معنی میں ہے۔ (عنی سقف بیتی): طیبی رحمہ اللہ کہتے ہیں: اگر کوئی یہ سوال کرے کہ حضرت انسؓ کی مالک ابن صعصعہ والی روایت سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ آپ حطیم یا حجر میں تھے جہاں سے آپ کو بیت المقدس، پھر آسمان پر لے جایا گیا، جبکہ اس روایت میں ہے فرج عنی مسقف بیتی، کہ میں مکہ میں اپنے گھر میں تھا کہ اچانک مکان کی چھت کھلی اور حضرت جبرائیلؑ نازل ہوئے، بظاہر دونوں حدیثوں میں تضاد معلوم ہوتا ہے؟

ہم کہتے ہیں: آنحضرت ﷺ کو دوبار معراج نصیب ہوا۔ ① حالت بیداری میں جس کا ذکر حضرت مالک ابن صعصعہ والی روایت میں ہے۔ ② حالت نوم میں جس کا ذکر اس میں ہے اور شاید یہاں بیتی سے مراد حضرت ام ھانیؓ کا گھر ہے، اس لئے کہ بعض روایتوں میں یہ ذکر ہے کہ جب حضرت جبرائیلؑ آپ ﷺ کو لینے آئے تو اس وقت آپ ﷺ حضرت ام ھانیؓ کے مکان میں آرام فرمارہے تھے، اور یہ روایت مشہور بھی ہے۔ اسی گھر کی نسبت آنحضرت کبھی اپنے طرف کرتے ہیں کہ اس وقت آپ ﷺ یہیں پر مقیم تھے، اور کبھی حضرت ام ھانیؓ کی طرف نسبت فرماتے ہیں یہ اس اعتبار سے صحیح ہے کہ وہ اس کی مالک تھی۔ بعض محققین نے ان تمام مختلف اور متضاد روایتوں کی تطبیق اس طرح دی ہے کہ جس شب اسراء اور معراج کا واقعہ پیش آیا، نبی کریم ﷺ حضرت ام ہانیؓ کے مکان میں سوئے ہوئے تھے جو شعب ابی طالب میں واقع تھا، چنانچہ حضرت جبرائیلؑ مکان کی چھت پھاڑ کر آنحضرت ﷺ کے پاس تشریف لائے اور آپ ﷺ کو جگا کر مسجد حرام میں خانہ کعبہ کے پاس لائے، جہاں حطیم اور حجر ہے، آپ حطیم میں لیٹ گئے اور چونکہ نیند کا اثر باقی تھا اس لئے آپ ﷺ وہاں پھر سو گئے، حضرت جبرئیل نے پھر آپ ﷺ کو جگایا، اور شق صدر وغیرہ کے مراحل سے گزارنے کے بعد آپ ﷺ کو مسجد حرام کے دروازے پر لائے جہاں آپ ﷺ کو براق پر سوار کر کے مسجد اقصیٰ لے جایا گیا۔

(انا بمكة): یہ جملہ حالیہ ہے اس بات کی طرف اشارہ کرنے کے لئے لایا کہ واقعہ معراج مکی واقعہ ہے نہ کہ مدنی۔

(اذا رجل قاعد علی یمینه اسودة): اسودة: سواد کی جمع ہے جیسے ازمنة، زمان کی جمع ہے۔ یہ انسان اور شخص کے معنی میں ہے جب آپ ﷺ نے دیکھا تو دور سے کالے نظر آرہے تھے مطلب یہ ہے کہ ان کے اولاد میں سے کچھ لوگ دائیں طرف بیٹھے ہیں۔ (وعلی یساره اسودة "اذ"): ایک نسخہ میں اذ: کی جگہ "اذا" ہے۔ (نظر قبل یمینه): لفظ قبل: قاف کے کسرہ اور باء کے فتحہ کے ساتھ۔ (واذ نظر قبل شماله بكیٰ): کیونکہ اس طرح دوزخی لوگ تھے جن کو دیکھنا رنج وغم کا باعث تھا کہ وہ دیکھ رہے تھے کہ یہ شریر اور منحوس لوگوں میں سے ہیں۔ (فقال): سلام وجواب کے بعد، حضرت آدمؑ فرمانے لگے۔

(مرحبًا بالنبی الصالح والابن الصالح...... قيل): بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے، حضرت آدم نے جب خوش آمدید کہا تو پھر آنحضرت ﷺ نے پوچھا یہ کون ہیں؟ حضرت مالک بن صعصعہ کی روایت اس کے برعکس ہے اور یہی روایت معتمد علیہ ہے، لہٰذا اس روایت کو حضرت مالک والی روایت پر محمول کیا جائے گا، کیونکہ حضرت ابوذر والی اس روایت میں حرف تمثیل موجود نہیں۔

ملا علی قاریؒ ارشاد فرمارہے ہیں: اسم اشارہ ھذا جو سوال میں ہے کا مشارٌ الیہ یہی الاسودة ہے لیکن حضرت جبرئیل نے

جواب میں حضرت آدمؑ کا نام لیا تا کہ اصل خطاب والے کی طرف مائل ہو جائے، اب راوی کا کلام بالکل درست ہو جائے گا۔

(ھذا آدم...... وشمالہ): اور ایک صحیح نسخہ میں وعن شمالہ کے الفاظ ہیں۔ (نسم بینہ): نون اور سین دونوں کے فتحہ کے ساتھ، نسمۃ، کی جمع ہے۔ مراد روح ہے یا نفس مراد ہے اس صورت میں نسمٌ سے ہوگا نسم، نفس ہی کو کہا جاتا ہے، یعنی سانس۔ اس سے نسیم الصباح (صبح کی ہوا) ہے۔ اس سے کیا مراد ہے؟ یا تو صرف اولاد سابقین کی ارواح مراد ہیں یا سابقین کے ساتھ ساتھ آنے والی اولاد کی ارواح مراد ہیں، باقی لفظ "بینہ" میں بنین: کا ذکر تغلیباً ہے۔ جیسے آیت ﴿یا بنی آدم﴾ میں ہے۔ (اھل الجنۃ...... قبل شمالہ): ایک صحیح نسخہ میں وانا نظر عن شمالہ کے الفاظ ہیں۔ (بکیٰ): قاضی عیاضؒ فرماتے ہیں: منقول ہے کہ مؤمنین کی روحیں تو علیین میں راحت سے بسر کرتی ہیں اور کافروں کی روحیں "سجین" میں محبوس ہیں، لہٰذا یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ وہ سب روحیں ایک مقام میں وہ بھی آسمانوں پر حضرت آدمؑ کے دائیں بائیں کیسے جمع ہوئیں۔ اس کا جواب یہ دیا گیا ہے کہ شاید ایک وقت معین میں یہ روحیں حضرت آدمؑ کے سامنے پیش ہوتی ہوں گی اور آنحضرت ﷺ جب آسمان دنیا پر پہنچے اور حضرت آدمؑ سے ملاقات کی تو وہ وہی وقت تھا جب تمام روحیں حضرت آدمؑ کے سامنے پیش تھیں۔ اور یہ احتمال بھی ہے کہ آنحضرت ﷺ نے شب معراج میں حضرت آدمؑ کے دائیں بائیں جو روحیں دیکھی تھیں وہ ان لوگوں کی تھیں جو اس وقت تک دنیا میں پیدا نہیں ہوئے تھے اور وہ روحیں اپنے اپنے اجسام میں نہیں گئی تھیں جو اس وقت تک دنیا میں پیدا نہیں ہوئے تھے اور ہوسکتا ہے کہ ان دونوں کے رہنے کی جگہ حضرت آدمؑ کے دائیں بائیں ہو، نیز حضرت آدمؑ ان روحوں کا انجام جانتے تھے کہ جو روحیں دائیں طرف ہیں وہ دنیا میں اچھے عقائد و اعمال اختیار کر کے جنت میں جائیں گے اور جو روحیں بائیں طرف ہیں وہ دنیا میں برے عقائد و اعمال اختیار کر کے دوزخ میں جائیں گے۔ لہٰذا جملہ نسم بنیہ عام مخصوص البعض ہے۔ واللہ اعلم

(حتی عرج بی): ضبط تو معروف صیغہ کے ساتھ ہے البتہ کچھ حضرات کہتے ہیں مجہول کا صیغہ ہے پہلی صورت میں معنی ہوگا جبرائیل مجھے دوسرے آسمان کی طرف چڑھا کر لے گئے الی السماء الثانیۃ. جامع الاصول میں اس طرح ہے ثم عرج بی جبریل الی السماء الثانیۃ.

(فقال لخازنھا:...... الاول) (قال انس: فذکر): ذکر کا فاعل یا تو النبی ﷺ ہیں یا ابو ذرؓ۔ اگر ابو ذرؓ ہوں تو پھر یہ مرفوعاً روایت ہوگی اور یہی بات بظاہر زیادہ صحیح معلوم ہوتی ہے۔ (انہ): یعنی نبی ﷺ۔ (وجد فی السماوات آدم، وادریس، وموسیٰ، وعیسیٰ وابراھیم) اور ان کے علاوہ حضرت ہارون، یحییٰ، یوسف علیہم السلام سے بھی ملاقات رہی، اس روایت میں ان کے اسماء کو ساقط کر دیا گیا ہے۔ (ولم یثبت): باء کی کسرہ کے ساتھ (یعنی باب افعال) الاثبات سے ہے۔ یعنی ابو ذرؓ یا نبی کریم ﷺ نے یہ بیان نہیں کیا کہ (کیف منازلھم...... الدنیا): حضرت آدمؑ کے ساتھ پہلے آسمان پر ملاقات میں تمام روایات متفق ہیں۔ (ابراھیم فی السماء السادسۃ): حضرت شہاب کی یہ روایت جس سے یہ مفہوم ہوتا ہے کہ شب معراج میں حضرت ابراہیمؑ سے آنحضرت ﷺ کی ملاقات چھٹے آسمان پر ہوئی تھی، گویا یہ اس روایت کے مطابق ہے جو حضرت انسؓ سے ایک دوسرے راوی حضرت شریک نے نقل کی ہے، ان روایتوں کے علاوہ باقی تمام روایتوں سے یہ ثابت ہے۔ حضرت

ابراہیمؑ سے ملاقات ساتویں آسمان پر ہوئی تھی۔ اگر یہ کہا جائے کہ معراج کا واقعہ ایک سے زائد مرتبہ پیش آیا تھا تو اس صورت میں ان متضاد روایتوں سے کوئی اشکال پیدا نہیں ہوگا۔ ہاں اشکال اس وقت پیدا ہوگا جب یہ کہا جائے کہ جسمانی معراج کا واقعہ ایک ہی مرتبہ پیش آیا تھا، جیسا کہ معتمد و مشہور قول ہے، اس صورت میں اس اشکال کا جواب یہ ہوگا کہ معراج کے سلسلہ میں سب سے زیادہ قوی اور سب سے زدیادہ صحیح روایت وہ ہے جس میں بیان کیا گیا کہ آنحضرت ﷺ نے شب معراج میں حضرت ابراہیمؑ کو دیکھا کہ وہ بیت المعمور سے پشت لگائے بیٹھے تھے، اور یہ بات کسی اختلاف کے بغیر ثابت ہے کہ بیت معمور ساتویں آسمان پر ہے، علاوہ ازیں یہاں راوی نے یہ کہا ہے کہ آنحضرت ﷺ تمام آسمانوں پر پہنچے اور پھر وہاں حضرت آدم اور دیگر انبیاء سے ملاقات ہوئی۔ لیکن ان کے منازل ومقامات کو بیان نہیں فرمایا، اس سے خود ثابت ہو جاتا ہے کہ راجح اور قابل اعتماد روایت وہی قرار پائے گی جس میں ہر نبی اور رسول کے بارے میں وضاحت کے ساتھ ذکر ہے کہ کس نبی سے کس آسمان پر ملاقات ہوئی۔

(لمستوی): واؤ کے فتحہ کے ساتھ، تنوین کے ساتھ ہے۔ اس سے مراد وہ بلند مقام ہے جہاں صریف الاقلام کا ذکر ہے استوی شئ کا معنی استعلاء ہوتا ہے۔ واؤ کے بعد یاء کا ثبوت دلالت کرتا ہے کہ یہ اسم مفعول کا صیغہ ہے اور شروع میں جو "لا" ہے یہ لام تعلیلیہ ہے اور مطلب ہے استعلا کی غرض سے میں اوپر کو چلا یہاں تک کہ بلند مقام تک پہنچا۔ یا اس کی رویت یا اس کے مطالعہ کی غرض سے ہموار اور بلند مقام پر پہنچا۔ یہ بھی احتمال ہے کہ یہ مصدر کے ساتھ متعلق ہو۔ اس صورت میں معنیٰ

اور یہ بھی ممکن ہے کہ یہاں لام "الی" کے معنی میں ہو جیسے اللہ تعالیٰ کے اس قول میں ہے: لھا الیھا (یعنی اس کے طرف) لام بمعنی الی ہے۔ بعض کہتے ہیں لام بمعنی علیٰ ہے۔ صریف آواز ہے جو لکھتے وقت قلم سے پیدا ہوتی ہے۔ بعض حضرات کہتے ہیں اس کا مطلب یہ ہے کہ جب آنحضرت ﷺ کو اوزعروج ہوا، تو آپ ﷺ اس بلند مقام پر پہنچے جہاں قضاء وقدر کے قلم مشغول کتابت تھے۔

بعض شراح نے ہمارے علماء محققین کا یہ قول نقل کیا ہے کہ ان محققین نے حدیث کے اس جملہ کی وضاحت میں لکھا ہے!

آنحضرت ﷺ کے اس ارشاد کا حاصل یہ ہے کہ اس عروج کے دوران اس مقام تک لے جایا گیا جہاں رفعت مرتبہ کے سبب اس جگہ تک پہنچنا بھی نصیب ہوا جو کائنات کے نظام قدرت، احکام خداوندی کے صدور اور مخلوق کے تمام خدائی نظم ونسق کا بلاتشبیہ وتمثیل مرکز اور صدر مقام ہے۔ اس طرح اس جگہ پہنچ کر گویا مجھ پر کائنات سے متعلق نظام قدرت رموز کا انکشاف ہوا، اس سے معلوم ہوا کہ یہ وہ مقام ہے جہاں آپ ﷺ سے پہلے کسی اور کو پہنچنا نصیب نہیں ہوا۔

امام نوویؒ فرماتے ہیں: المستوی، واؤ کے فتحہ کے ساتھ۔ خطابیؒ کہتے ہیں: اس سے مراد مقام صعود ہے۔ بعض حضرات کہتے ہیں مکان مستوی مراد ہے اور لفظ صریف الاقلام صاد مھملہ کے ساتھ، اس سے مراد ان فرشتوں کے قلموں کی آواز ہے جو اللہ کے احکام وحی، کو لوح محفوظ سے نقل کرنے میں مصروف تھے یا اللہ تعالیٰ نے جن امور پر ان کو مقرر کیا ہے اور جن کے لکھنے کا حکم ہے وہ لکھ رہے تھے اور جن چیزوں کے ختم کرنے کا ارادہ فرماتے ہیں فرشتے ان کو مٹاتے ہیں۔ قاضی عیاضؒ فرماتے ہیں: یہ حدیث اہل السنت والجماعت کی دلیل ہے، اس بات میں کہ: کہ اقلام کے ذریعہ لوح محفوظ سے اللہ کی کتابوں میں لکھی گئی تقادیر کی صحت پر ایمان لانا واجب ہے۔

باقی اس کی کیفیت کیا ہے یہ اللہ تعالیٰ جانتا ہے۔ نیز قلم کی صورت اور کیفیت کیا ہے؟ اور کس طرح لکھتا ہے؟ یہ بھی اللہ تعالیٰ جانتا ہے۔ جو لوگ اس کی تاویل کرتے ہیں اور اس کے ظاہر سے اعراض کرتے ہیں یہ ان کے ضعف نظر اور ضعف ایمان کی علامت ہے۔ کیونکہ شریعت مطہرہ نے اس کی نفی نہیں کی ہے اور عقلی دلائل بھی اس کو محال نہیں سمجھتے ہیں۔

(قال ابن حزم وانس): اس جملہ کا عطف فاخبرنی پر ہے۔ اور یہ ابن شہاب زہری کا قول ہے۔ (قال النبی ﷺ: ففرض اللّٰہ علی امتی): یہ قول ففرض علی خمسین صلاۃ کے منافی نہیں۔ (خمسین صلاۃ فرجعت بذلک): میں اس کو قبول کرتے ہوئے عمل کی نیت سے چلدیا۔ (حتی مررت علی موسیٰ فقال: ما فرض اللّٰہ): ما، استفہامیہ ہے، اور "لک" لام تعلیلیہ ہے۔ (فراجعنی): راجع بمعنی رجعنی ہے، یعنی موسیٰ نے مجھے واپس لوٹا دیا اور میرے واپس بارگاہ ایزدی میں بھیجنے کا باعث بنے۔ فرجعت: چنانچہ میں دوبارہ اسی جگہ پہنچا جہاں پہلے حاضر ہوا تھا۔ (فوضع): یہ کم کرنے کے معنی میں ہے یعنی اللہ تعالیٰ نے شطرھا، ان پچاس نمازوں میں سے کچھ حصہ کم کر دیا، یہ وہی پانچ نمازوں کے حسب سے، جس کو کہیں دس سے یا دس دس کے حساب سے کم ہوئیں تھیں جن کو خمس سے تعبیر کیا گیا ہے، جس کی تفصیل ماقبل میں گزر چکی ہے۔

(فرجعت...... راجع ربک): پھر دوبارہ جائیے۔ (فان امتك لا تطیق ذالك)، ایک نسخہ میں ذالك کا لفظ موجود ہے کچھ میں یہ لفظ موجود نہیں۔ (فرجعت): یعنی پھر ہمارے درمیاں وہی بحث ہوئی اور اسی مقام پر پھر جا کے اپنا مطالبہ پیش کر دیا۔ یہاں مفاعلہ کا صیغہ استعمال ہوا ہے، اور مفاعلہ کا صیغہ مبالغہ کیلئے استعمال نہ بھی کیا ہو پھر بھی اس میں مبالغہ کا معنی ضرور ہوتا ہے۔ (موضع شطرھا، فرجعت الیہ) الیہ، کی ضمیر حضرت موسیٰ کی جانب راجع ہے۔ (فراجعتہ): ایک نسخہ میں فراجعت ربی کا لفظ ہے۔ (فقال): حضرت موسیٰ نے آخر میں فرمایا، پھر جاؤ۔ مصابیح میں فی لاخرۃ کا بھی موجود ہے، معنی یہ ہے کہ حضرت موسیٰ آنحضرت ﷺ کو بار بار بارگاہ خداوندی میں جانے کو جو کہہ رہے تھے اب کی بار یہ آخری بار یہ پر بھیجے گئے۔ (ھی): ایک نسخہ میں "ھی" کی جگہ ھن کی ضمیر ہے یہ ادائیگی کے اعتبار سے پانچ ہوں گی۔ (وھی خمسون): اور ثواب وجزاء کے اعتبار سے پچاس ہوں گی۔ (لا یبدل القول لدی): ان الفاظ کے دو معنی ہو سکتے ہیں، ایک تو یہ کہ میں نے اجر و ثواب کے اعتبار سے پانچ نمازوں کو پچاس نمازوں کے برابر کر دیا ہے اور اس میں کوئی تبدیلی نہیں ہوگی۔ اور دوسرا یہ کہ تمہارے بار بار کہنے پر میں نے پچاس نمازوں کی جگہ پانچ نمازیں کر دی ہیں اور اب اس میں کوئی تبدیلی نہیں ہوگی۔ طیبی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں معنی ثانی کے اعتبار سے پھر استحییت من ربی والا معنی صحیح نہیں ہوتا۔

ملا علی قاری رحمہ اللہ کو طیبی کی یہ بات وزن دار نہیں معلوم ہو رہی ہے اس لئے فرما رہے ہیں معنیٰ ثانی کے لحاظ سے بھی جملہ استحییت ربی بالکل مناسب ہے، کیونکہ یہ بات عدم تبدیلی کے علم سے قبل پر محمول کی جا سکتی ہے۔

(فرجعت الی موسیٰ...... من ربی): یعنی اب جبکہ مجھے معلوم ہو چکا ہے کہ باری تعالیٰ کا قول تبدیل نہیں ہوتا تو پھر اس کی بارگاہ میں حاضر ہونا اور مزید تخفیف کی درخواست کرنا حیاء کے خلاف ہے۔ (ثم انطلق بی حتی انتھی بی): دونوں صیغہ مجہول ہیں اور معنی یہ ہیں پھر مجھے لے جایا گیا اور پہنچا دیا گیا۔ (الی سدرۃ المنتھی وغشیھا): لفظ غشی، بغیر تخفیف کے ہے یعنی جب ہم پہنچے تو حال یہ تھا کہ سدرۃ المنتہیٰ کو "الملون" نور کے انوارات یا فرشتوں نے یا کسی اور چیزوں نے ڈھانپ رکھا

تھا۔(لا ادری): لا ادری سے آپ ﷺ جس وقت یہ بیان کر رہے تھے وہ وقت مراد ہے، اور شب معراج کے وقت سکون کے ذات پر نظر ہونے کی وجہ سے مکان کے احوال کو نہ پہچان سکا۔(ما ھی): کہ اس جگہ یا اس وقت کیا ہو رہا تھا اس کی حقیقت کا مجھے علم نہ ہو سکا۔(ثم ادخلت الجنة فاذا): اذا مفاجاتا کے لئے ہے۔

(فیها جنابذ اللؤلؤ): جنابذ، جیم کے فتحہ، باء کی کسرہ اور ذال معجمہ کے ساتھ یہ جمع ہے جنبذة (یعنی جیم مضموم اور باء) کی اس سے مراد قبہ ہے، یا ایسی چیز جس کو اونچا کر کے گنبد کی شکل میں بنایا گیا ہو۔ عام لوگ کہتے ہیں الجنبذة، باء کے فتحہ کے ساتھ نبذة کی طرح معرب ہے۔(واذا ترابها المسك): یعنی جنت کی مٹی سے ایسی خوشبو پھوٹ رہی تھی جیسے مشک مہک رہی ہو یا یہ کہ جنت کی جو مٹی ہے وہ دراصل مشک ہے ایک حدیث میں فرمایا گیا ہے جنت کی خوشبو کی لپٹ پانچ سو سال کی مسافت کی دوری تک پہنچتی ہے۔

واقعہ معراج...... حضرت عبداللہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی روایت

۵۸۶۵: وَعَنْ عَبْدِ اللّٰهِ قَالَ لَمَّا اُسْرِیَ بِرَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنْتُهِیَ بِهٖ اِلٰی سِدْرَةِ الْمُنْتَهٰی وَهِیَ فِی السَّمَآءِ السَّادِسَةِ اِلَيْهَا يَنْتَهِی مَا يُعْرَجُ بِهٖ مِنَ الْاَرْضِ فَيُقْبَضُ مِنْهَا وَاِلَيْهَا يَنْتَهِی مَا يُهْبَطُ بِهٖ مِنْ فَوْقِهَا فَيُقْبَضُ مِنْهَا قَالَ اِذْ يَغْشَى السِّدْرَةَ مَا يَغْشٰی قَالَ فَرَاشٌ مِّنْ ذَهَبٍ قَالَ فَاُعْطِیَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ثَلٰثًا اُعْطِیَ الصَّلَوَاتِ الْخَمْسَ وَاُعْطِیَ خَوَاتِيْمَ سُوْرَةِ الْبَقَرَةِ وَغُفِرَ لِمَنْ لَا يُشْرِكُ بِاللّٰهِ مِنْ اُمَّتِهٖ شَيْئًا نِ الْمُقْحِمَاتُ۔ (رواہ مسلم)

اخرجه البخاری فی صحیحه ۳۷٤/٦ حدیث رقم ۳۳٤۲ ومسلم فی صحیحه ۱/۵۷ حدیث رقم (۲۷۹۔۱۷۳) واحمد فی المسند ۳۸۷/۱

ترجمہ: "حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے فرماتے ہیں کہ جب رسول اللہ ﷺ کو رات میں (بیت المقدس اور آسمانوں کی) سیر کرائی گئی تو آپ ﷺ کو سدرۃ المنتہیٰ لے جایا گیا اور سدرۃ المنتہیٰ چھٹے آسمان پر ہے زمین سے جو بھی چیز اوپر لے جائی جاتی ہے وہ سدرۃ المنتہیٰ پر جا کر ٹھہر جاتی ہے اور وہاں سے جو بھی چیز اوپر اٹھائی جاتی ہے اسی طرح جو چیز ملاء اعلیٰ سے زمین پر اتاری جاتی ہے وہ بھی اسی سدرۃ المنتہیٰ پر آ کر ٹھہر جاتی ہے اور وہاں سے لے جاتی ہے"۔ اس کے بعد حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے یہ آیت پڑھی: اِذْ يَغْشَى السِّدْرَةَ مَا يَغْشٰی: (یعنی اس وقت کہ ڈھانک لیا سدرہ کو جس چیز نے ڈھانک لیا) اور کہا کہ "وہ چیز (جس نے سدرہ کو ڈھانکا ہے سونے کے پتنگے ہیں"۔ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے یہ بھی کہا کہ شب معراج میں رسول اللہ ﷺ کو تین چیزیں عطا ہوئیں: ❶ پانچ نمازیں عطا ہوئیں ❷ سورۂ بقرہ کی آخری آیتیں عنایت ہوئیں ❸ اور آپ کی اُمت میں سے اس شخص کے گناہ کبیرہ کی معافی کا پروانہ عطا ہوا جو کسی کو اللہ کا شریک نہ ٹھہرائے"۔ (مسلم)

تشریح: (قال: لما اسري برسول الله ﷺ ...... السادسة): ایک شارح لکھتے ہیں کہ یہ کسی راوی کا وہم ہے یعنی

اصل حدیث میں حضرت ابن مسعودؓ نے تو سدرۃ المنتہیٰ کے ساتویں آسمان پر ہونے کا ذکر کیا تھا لیکن ان کے بعد کسی راوی نے غلط فہمی سے بھول کر چھٹے آسمان کا ذکر کر دیا ہے۔ کیونکہ جمہور محدثین و محققین کے نزدیک سدرۃ المنتہیٰ ساتویں آسمان پر ہونا ثابت ہے۔ اور جمہور راویوں نے بھی یہی نقل کیا ہے، اس لئے اکثر علماء و محققین کا قول بھی یہی ہے۔ اس لئے سہو کی نسبت ایک راوی کے طرف کرنا اولیٰ ہے، چنانچہ روایت میں آتا ہے، کہ تمام مخلوق کے علم کی انتہیٰ ایہیں پر ہوتی ہے اور یہ بات سب کے ہاں اتفاقی ہے، کہ اعمال کا مستقر ساتویں آسمان پر سدرۃ المنتہیٰ کا مقام ہے۔

امام نوویؒ فرماتے ہیں تمام اصول میں سدرۃ المنتہیٰ کا ساتویں آسمان پر ہونا ثابت ہے۔ قاضی عیاضؒ فرماتے ہیں یہی بات زیادہ صحیح ہے کہ سدرۃ المنتہیٰ ساتویں آسمان پر ہے، اور یہی جمہور کا قول ہے اور معنی بھی اسی کا تقاضہ کرتا ہے کیونکہ منتہیٰ بھی اسی وجہ سے اس کا نام رکھا گیا ہے۔ امام نوویؒ فرماتے ہیں اگر یہ تسلیم کیا جائے کہ اس حدیث میں چھٹے آسمان کا ذکر کسی راوی کا وہم نہیں بلکہ روایت کے اصل الفاظ ہیں، تو اس صورت میں اس روایت اور ان روایتوں کے درمیان کہ جن میں سدرۃ المنتہیٰ کے ساتویں آسمان پر ہونا ذکر ہے یوں تطبیق ہو سکتی ہے کہ سدرۃ المنتہیٰ کی جڑ چونکہ چھٹے آسمان میں ہے اس لئے اس کا چھٹے آسمان پر ہونا ذکر کیا گیا ہے اور اس کا اصل ظہور اور شاخیں چونکہ ساتویں آسمان پر ہیں اس لئے زیادہ تر روایتوں میں یہ ذکر کیا گیا کہ وہ ساتویں آسمان پر ہے۔

محقق خلیلؒ نے کہا: سدرۃ المنتہیٰ ساتویں آسمان پر ہے جو تمام آسمانوں اور جنت پر چھایا ہوا ہے۔ قاضی عیاضؒ تو فرماتے ہیں کہ فرات اور نیل کے سدرۃ المنتہیٰ کے جڑ سے نکلنے کے ذکر کا تقاضہ تو یہ ہے کہ اس کی جڑ زمین پر ہو اگر اس کو تسلیم کیا جائے تو پھر اس روایت کو بھی اسی پر محمول کیا جائے گا۔

(ينتهي ...... من الارض): ما سے نیچے سے آنے والے اعمال، مخلوق کی ارواح وغیرہ مراد ہیں۔ **(فيقبض منها)**: فیقبض اور آنے والا جملہ ینتھی دونوں مجہول کے صیغے ہیں اس میں یہ احتمال بھی ممکن ہے کہ ان اعمال وغیرہ پر مختلف فرشتے مامور ہیں یا یہ کہ علوی اور سفلی امور یہاں پر جمع ہو جاتے ہیں۔ **(واليها ينتهي ما يهبط من فوقها)**: ما یھبط سے وحی اور احکام الٰہی مراد ہیں، جو اوپر سے نازل ہوتے ہیں۔ **(فيقبض ...... قال)**: پھر حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ نے بطور دلیل یہ آیت پڑھی یا یہ کہ اسی کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: ﴿اذ يغشى السدرة ما يغشى﴾ [النجم] اور حضرت ابن مسعودؓ نے ما یغشٰی کی تفسیر میں فرمایا، اس سے مراد سونے کے پتنگے ہیں۔ **(فراش من ذهب)**: من ذھب مرفوع ہے یا مرفوع کے حکم میں ہے۔ طیبی رحمہ اللہ کہتے ہیں: اگر آپ یہ سوال کریں کہ حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ کا قول فراش من ذھب اور پہلی والی روایت کے الفاظ فغشيها الوان لا ادري ما هي کی تطبیق کیسی ہوگی؟

جواب یہ ہے: آنحضرت ﷺ کا قول مبارک غشيها لوان لا ادري ما هي بھی آیت: اذ يغشى السدرة ما يغشى کا ترجمہ ہے، جو حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ نے سدرۃ المنتہیٰ کے مناسبت سے پڑھی، گویا حق تعالیٰ نے بھی اس چیز کو مبہم ہی رکھا، جس نے سدرۃ المنتہیٰ کو ڈھانک رکھا ہے اور اس طرح مبہم انداز سے بیان کرنے کا مقصد اس چیز کی عظمت اور ہیبت کو بیان کرنا ہے جہاں یہ مقصد نہیں، اس کو ظاہر فرما دیا گیا ہے۔ جیسے فرعون کے حق میں فرمایا: فغشيهم من اليم ما غشيهم

[طھ] حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ کا قول فراش من ذھب اسی کا بیان ہے۔ ملا علی قاریؒ فرماتے ہیں: اصل حقیقت تو اللہ ہی بہتر جانتے ہیں، لیکن بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت بہت سی چیزوں نے سدرۃ المنتہیٰ کو ڈھانپ رکھا تھا جن کو شمار نہیں کیا جا سکتا، اور نہ کوئی یہ بتا سکتا ہے کہ وہ چیز مقدار اور تعداد میں کتنی تھی، کیونکہ نفس سدرۃ ہی منتہیٰ مقام ہے۔ کہ سب کا علم اس سے نیچے ہی ختم ہو جاتا ہے تو جو چیز اس کے اوپر ہو اس کی حقیقت اللہ کے سوا کون جان سکتا ہے۔ اور سدرۃ المنتہیٰ پر دیکھی جانے والی چیز کا نہ جاننا اس کے منافی نہیں کہ دیگر چیزیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دیکھیں یا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو دکھائی گئیں ان کی حقیقت کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کیسے پہچانا، کیونکہ یہ بات علم وادراک کی منافی نہیں۔ اس طرح تمام روایات جمع ہو جائیں گی۔

سدرۃ المنتہیٰ پر دکھائی گئی چیزوں کے متعلق اقوال:

بعض کا کہنا ہے کہ یہ فرشتوں کا جم غفیر تھا جس نے اس کو ڈھانک رکھا تھا، کیونکہ ایک روایت میں اسی سدرۃ المنتہیٰ کے متعلق یہ بھی آیا ہے کہ اس کے ہر پتے پر فرشتہ کھڑا ہے جو اللہ تعالیٰ کی تسبیح میں مشغول ہے۔ اور ایک روایت میں ہے کہ اس کے شاخوں اور پتوں پر سبز رنگ کے پرندوں کا جھنڈ ہے۔

بعض حضرات نے کہا ہے کہ وہ سبز رنگ کے پرندے دراصل انبیاء اور اولیاء کی روحیں ہیں۔ بعض لوگوں نے مزید اور بھی اقوال نقل کیے ہیں۔ آنحضرت کے قول "لا ادری" سے اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ اعیان مشہودہ متحضرہ میں ایسی کوئی چیز نہیں کہ جس کے ساتھ اس کی تشبیہ بیان کی جا سکے۔

الفراش سے کیا مراد ہے؟

ملا علی قاریؒ فرمارہے ہیں: فراش، فاء پر فتحہ کے ساتھ اس خاص پرندے کا نام ہے جو آگ کے گرد منڈلاتے رہتے ہیں۔ اور اس میں گر جاتے ہیں (یعنی پتنگے) انہی کی مثال اللہ تعالیٰ نے آیت مبارک ﴿یوم یکون الناس کالفراش المبثوث﴾ [القارعۃ: ٤] میں ذکر فرمائی ہے۔ (جس دن آدمی پریشان پروانوں کی طرح ہو جائیں گے)۔

بعض حضرات کہتے ہیں ممکن ہے یہاں الفراش سے انبیاء کی ارواح مراد ہوں، اور یہ قول روایت اولیٰ کے الفاظ فغشیھا الوان لا ادری کے منافی نہیں، کیوں کہ جن چیزوں نے سدرۃ المنتہیٰ کو ڈھانک رکھا تھا ان میں یہ بھی ہوں گے نیز حضرت ابن مسعودؓ کا اس چیز کو سونے کے پروانوں سے تعبیر کرنا بھی اس کی حقیقت وماہیت بیان کرنے کے لئے نہیں کہ وہ چیز واقعۃً سونے کے پتنگے تھیں، بلکہ یہ تو انہوں نے محض تشبیہ کے طور پر ذکر کیا ہے۔ آیت اذ یغشی السدرۃ ما یغشی، اور اللہ تعالیٰ کے ارشاد فغشیھم من الیم ما غشیھم میں فرق بالکل واضح ہے، آیت اول میں ابہام تعظیم کے مقصد سے رکھا گیا ہے، جبکہ فرعون کے واقعہ میں حقارت کی وجہ سے، ما کے مفہوم کو واضح کر دیا گیا ہے۔

(قال): ابن مسعودؓ نے فرمایا۔ (فاعطی رسول اللہ): اس رات یا اسی سدرۃ المنتہیٰ کے مقام پر۔ (ثلاثا): تین چیزیں عطا کی گئیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اس سب میں علم وعمل معرفت وحقائق اسرار وفیوض، انوار وبرکات کے وہ عظیم خزانے عطاء ہوئے جو لا

خاص اہمیت ہونے کی وجہ سے ان کا ذکر کیا جانا بھی ضروری تھا۔(اعطي الصلوٰت الخمس): اعطی فرض کیا گیا کے معنی میں ہے۔(واعطي خواتيم سورة البقرة): شب معراج میں ان آیتوں کے عطاء ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان دعاؤں کی قبولیت کا پروانہ عطا فرمایا جوان آیتوں میں مذکور ہیں۔ یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ روایت بظاہر اس روایت کے منافی معلوم ہوتی ہے جو صحیح مسلم وغیرہ میں حضرت عبداللہ ابن عباسؓ سے مروی ہے جس کے الفاظ یوں ہیں:

"بينا جبريل قاعد عند النبی ﷺ سمع نقيضًا من فوقه اى صوتاً فوفع رأسه فقال: هذا ملك نزل الى الارض لم ينزل قط الى اليوم، فلسم وقال: ابشر بنورين او تيتهما لم يؤتهما نبی قبلك: فاتحه الكتاب وخواتيم سورة البقرة، لن تقرأ بحرف منها الا اعطيته".

''کہ ایک دن حضرت جبرائیل علیہ السلام آنحضرت ﷺ کے پاس بیٹھے ہوئے تھے کہ انہوں نے اچانک ایک آواز سنی حضرت جبرائیل علیہ السلام نے سر اٹھا کر اوپر دیکھا اور پھر کہا یہ ایک فرشتہ ہے، جو زمین پر آج ہی آیا ہے، آج سے قبل کبھی یہ زمین پر نہیں آیا تھا۔ اس کے بعد اس نو وارد فرشتے نے آنحضرت ﷺ کو سلام کیا اور کہا: آپ ﷺ کو مبارک ہو کہ آپ ﷺ کو دو نور عطا کئے گئے ہیں، جو آپ ﷺ سے پہلے کسی نبی کو عطا نہیں ہوئے۔ ایک تو (فاتحۃ الکتاب) سورۃ فاتحہ اور دوسرا سورۃ البقرہ کی آخری آیتیں، آپ ﷺ ان دونوں میں سے جو حرف بھی پڑھیں گے اس کے عوض (اجر وثواب یا اس میں مذکورہ دعا کی قبولیت) سے نوازے جائیں گے۔''

(قلت): میں کہتا ہوں، یعنی اس کا جواب یہ ہے کہ ان دونوں روایتوں میں کوئی منافات نہیں ہے۔ کیونکہ اس روایت میں یہ بیان کیا گیا ہے، کہ شب معراج میں ان آیتوں کا دیا جانا اللہ کے ان انعامات کا ایک حصہ تھا جن سے اس اہم موقع پر اور اس رفیع الشان مقام میں آپ ﷺ کو سرفراز فرمایا گیا، جس کی ایک یادگار نماز پنجگانہ ہے، اور مسلم وغیرہ کی اس روایت میں جو کچھ بیان کیا گیا ہے، اس کا حاصل یہ ہے کہ فرشتے کا آسمان سے اترنے کا مقصد آپ ﷺ کو شب معراج میں عطاء شدہ ان آیتوں کی اہمیت وفضیلت کو ظاہر کرنا، اور یہ بشارت دینا تھا کہ آپ ﷺ کو یہ اتنی بڑی چیز عطاء ہوئی ہے جو آپ ﷺ سے پہلے کسی بھی نبی کو عطا نہیں ہوئی، لہٰذا ان دونوں روایتوں میں کسی طرح کا تضاد نہیں ہے، البتہ یہاں یہ اشکال ضرور پیدا ہوتا ہے، کہ سورۃ بقرہ (وہ سورۃ بقرہ جبکہ معراج کا واقعہ مکی زمانہ کا ہے۔ اس کا مطلب ہوا کہ یہ آیتیں مدنی نہیں بلکہ مکی ہیں؟

اس کا جواب یہ دیا گیا ہے کہ سورہ بقرہ کو مدنی اس اعتبار سے نہیں کہا گیا ہے کہ اول سے آخر تک اس کی تمام آیتیں مدینہ میں نازل ہوئیں، بلکہ اس اعتبار سے کہا گیا ہے کہ ان دونوں آخری آیتوں کے علاوہ بقیہ تمام آیتیں مدینہ میں نازل ہوئی ہیں۔

ابن ملکؒ نے حضرت حسن بصری، ابن سیرین اور مجاہد سے یہ قول نقل کیا ہے، کہ اللہ تعالیٰ نے سورہ بقرہ کی وحی حضرت جبرئیل کے واسطے کے بغیر شب معراج میں براہ راست خود عطا فرمائی تھی، گویا ان حضرات کے ہاں پوری سورۃ بقرہ مکی ہے لیکن جمہور مفسرین اور محدثین کے نزدیک پوری سورۃ مدنی ہے۔

تورپشتیؒ فرماتے ہیں: قول اعطی کا یہ مطلب نہیں کہ یہ آیتیں شب معراج میں آپ ﷺ پر نازل ہوئی، بلکہ مطلب یہ ہے کہ ان آیات کے الفاظ غفرانك سے (آخر تک) میں جو دعا تلقین کی گئی ہے اس کے قبولیت کا پروانہ شب معراج میں عطا ہوا،

کہ جو بھی ان آیتوں کو پڑھے گا اس کی دعاء قبول ہوگی۔

طیبی رحمہ اللہ کہتے ہیں: اس جملہ میں اس طرف اشارہ ہے کہ ان آیتوں کا دوبارہ عطا ہونا ان کے نزول کے بعد ہو، کیونکہ **اعطی** کا مطلب ان آیتوں میں مذکور دعا کے الفاظ کا قبول ہونا ہے، اور یہ قبولیت طلب سے قبل ہی نصیب ہوئی جو اللہ کا بڑا احسان اور فضل عظیم ہے۔ ہاں سورہ بقرہ مدنی سورۃ ہے اور واقعہ معراج مکی واقعہ ہے۔ نیز یہ کہنا بھی صحیح ہوسکتا ہے کہ یہ آیت: ﴿فاوحی الی عبده ما اوحی﴾ کے قبیل سے ہو، یعنی اجمالاً صرف ان آیتوں کا نازل ہونا مراد ہو اور مدینہ منورہ میں نازل ہونے کا مطلب ﴿وما ینطق عن الهوی ان هو الا وحي یوحي علمه شدید القوی﴾ سے ہو یعنی تفصیلاً اس کا نزول مدینہ منورہ میں ہو۔

خلاصہ یہ ہے کہ یہ آیتیں دو مرتبہ نازل ہوئیں، شب معراج میں بلا واسطہ، پھر مدینہ منورہ میں حضرت جبرائیل کے واسطے سے نازل ہوئیں ان آیات کی تعظیم اور اہمیت ظاہر کرنے کے لئے دوبارہ ان کا نزول ہوا، دوسرا مقصد یہ تھا کہ قرآن کریم چونکہ حضرت جبرائیل علیہ السلام کے واسطے سے نازل ہوا تھا، اور شب معراج میں جب یہ آیتیں بلا واسطہ نازل ہوئی تو دوبارہ حضرت جبرائیل کے واسطے سے اس کو اس لئے نازل کیا گیا تا کہ پورا قرآن حضرت جبرائیل کے ذریعہ مکمل ہو جائے، اس کے متعلق باری تعالیٰ نے خود بھی اشارہ فرمایا: ﴿نزل به الروح الامین علی قلبك لتكون من المنذرین﴾۔

اس لئے شیخ تورپشتیؒ کے کلام کو اس پر بھی محمول کیا جا سکتا ہے کہ یہاں **اعطی** سے مراد ان دعاؤں کی قبولیت بھی ہے جو آئندہ نازل ہونے والی آیتوں میں نازل ہوں گی۔ اس اعتبار سے یہ شب معراج میں نازل ہونے کے بعد دوبارہ ان کے نزول کے منافی نہیں۔

طیبی رحمہ اللہ کہتے ہیں: **خواتم سورہ بقرہ** کو اعطاء عطیہ سے اس لئے تعبیر فرمایا گیا ہے کہ یہ آیتیں اللہ کے اس خزانے سے ودیعت فرمائی گئیں ہیں جو عرش کے نیچے ہیں، چنانچہ حضرت احمد ابن حنبلؒ سے ہمیں ایک روایت پہنچی ہے جس کے الفاظ یوں ہیں: "**اعطیت خواتیم سورة البقرة من كنزٍ تحت العرش لم يعطهن نبي قبلي**"، کہ مجھے سورہ بقرہ کی آخری آیتیں اس خزانے سے عطا کی گئی، جو عرش کے نیچے ہے اور یہ آیتیں مجھ سے پہلے کسی نبی کو عطا نہیں ہوئیں۔

اللہ تعالیٰ نے ہمارے نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کو ایسے مقامات اور مراتب نصیب فرمائے ہیں جن پر اولین وآخرین رشک کرتے رہے ہیں۔ ان میں سے ایک مرتبہ دنیا میں نصیب فرمایا جو کہ شب معراج میں نصیب ہوا اور وہ مرتبہ یہی ہے، دوسرا آخرت میں نصیب فرمائیں گے یعنی مقام محمود اور ان دونوں ہی مقامات میں یہ سارا اہتمام اس امت مرحومہ ہی کے خاطر ہوا۔

(**وغفر**): صیغہ مجہول کے ساتھ۔ (**لمن لا یشرك با الله من امته شیئا المقحمات**): **المقحمات**، پیش کے ساتھ قائم مقام ہوگا فاعل کا حاء کے زیر کے ساتھ، اس سے وہ کبیرہ گناہ مراد ہیں جو اس گناہ کرنے والے کو جہنم میں لے جانے کا باعث بنیں گے، الا یہ کہ غفار ذات معاف فرمادے۔

مطلب یہ ہے کہ اس رات آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے امت کی مغفرت کا وعدہ بھی کیا گیا، کہ اللہ جس کو چاہے گا بغیر عذاب کے

وعدہ آیت ﴿ان اللہ لا یغفر ان یشرك به ویغفر ما دون ذالك لمن یشاء﴾ کے نزول سے قبل ہی فرما دیا تھا۔ کیونکہ یہ سورہ نساء کی آیت ہے جو مدنی سور ہے، حدیث کے اس جملہ سے یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ گناہ کبیرہ کے مرتکب کو کھلی معافی دے دی گئی، اور کسی بھی ایسے مؤمن وموحد کو عتاب وعذاب کا سامنا نہ کرنا پڑے گا جو گناہ کبیرہ کا مرتکب ہو جائے کیونکہ مؤمنین کا بھی گناہ کبیرہ کے مرتکب ہو جانے کی وجہ سے عذاب میں مبتلا ہونا نصوص شرعیہ اور اجماع امت سے ثابت ہے۔ رہا یہ سوال کہ اگر گناہ کبیرہ کے مرتکب کی مغفرت کا تعلق مشیت الٰہی سے ہے تو پھر اس حدیث میں اس کا ذکر کیوں نہیں کیا گیا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ مغفرت کا انحصار مشیت الٰہی پر ہونا چونکہ ایک کھلی بات تھی جس کا علم سب کو ہے اس لے مشیت الٰہی کی قید لگانے کی ضرورت ہی محسوس نہیں کی گئی۔

ابن حجرؒ نے لکھا ہے کہ گناہ کبیرہ کی معافی سے مراد یہ ہے کہ مؤمنین وموحدین میں سے کوئی بھی شخص دوزخ میں ہمیشہ نہیں رکھا جائے گا، خواہ اس نے کتنے ہی گناہ کبیرہ کیے ہوں جب کہ مشرکین ہمیشہ دوزخ میں رہیں گے، یہ مطلب نہیں کہ آنحضرت ﷺ کی امت کو بالکل سزا نہیں ملے گی کیونکہ نصوص شرعیہ اور اجماع امت س یہ ثابت ہے کہ موحدین میں سے بھی جو گناہ کبیرہ کے مرتکب ہوں گے ان کو سزا ملے گی۔ انتھیٰ

ملا علی قاریؒ ابن حجرؒ پر نقد فرماتے ہوئے ارشاد فرما رہے ہیں: اس صورت میں نہ تو اس امت کی کوئی خصوصیت باقی رہتی ہے اور نہ اس کے مرتبہ کی بلندی ظاہر ہوتی ہے۔ لہٰذا یہ کہنا زیادہ موزوں معلوم ہوتا ہے کہ ''معافی اور مغفرت سے مراد امت محمدیہ کے اکثر افراد کو معافی ومغفرت کا پروانہ عطا ہونا ہے (یعنی دوسری امتوں کے مقابلہ میں یہ خصوصیت آنحضرت ﷺ کی امت کو حاصل ہوگی کہ اس کے اکثر لوگ باری تعالیٰ کی خصوصی رحمت کے تحت بخش دیئے جائیں گے)۔ اسی اعتبار سے اس امت کو امت مرحومہ کیا گیا ہے۔ واللہ اعلم

کفار قریش کے اعتراضات اور آپ ﷺ کا معجزہ

۵۸۶۶: وَعَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَقَدْ رَاَيْتُنِیْ فِی الْحِجْرِ وَقُرَيْشٌ تَسْاَلُنِیْ عَنْ مَسْرَایَ فَسَاَلَتْنِیْ عَنْ اَشْيَاءَ مِنْ بَيْتِ الْمَقْدِسِ لَمْ اُثْبِتْهَا فَكُرِبْتُ كَرْبًا مَا كُرِبْتُ مِثْلَهٗ فَرَفَعَهُ اللّٰهُ لِیْ اَنْظُرُ اِلَيْهِ يَسْاَلُوْنِیْ عَنْ شَیْءٍ اِلَّا اَنْبَاْتُهُمْ وَقَدْ رَاَيْتُنِیْ فِیْ جَمَاعَةٍ مِّنَ الْاَنْبِيَاءِ فَاِذَا مُوْسٰى قَائِمٌ يُّصَلِّیْ فَاِذَا رَجُلٌ ضَرْبٌ جَعْدٌ كَاَنَّهٗ مِنْ رِّجَالِ شَنُوْءَةَ وَاِذَا عِيْسٰى قَائِمٌ يُّصَلِّیْ اَقْرَبُ النَّاسِ بِهٖ شَبَهًا عُرْوَةُ بْنُ مَسْعُوْدٍ الثَّقَفِیُّ وَاِذَا اِبْرَاهِيْمُ قَائِمٌ يُّصَلِّیْ اَشْبَهُ النَّاسِ بِهٖ صَاحِبُكُمْ يَعْنِیْ نَفْسَهٗ فَحَانَتِ الصَّلٰوةُ فَاَمَمْتُهُمْ فَلَمَّا فَرَغْتُ مِنَ الصَّلٰوةِ قَالَ لِیْ قَائِلٌ يَامُحَمَّدُ هٰذَا مَالِكٌ خَازِنُ النَّارِ فَسَلِّمْ عَلَيْهِ فَالْتَفَتُّ اِلَيْهِ فَبَدَاَنِیْ بِالسَّلَامِ ۔(رواہ مسلم وھذا الباب خال عن الفصل الثانی)

اخرجه البخاري في صحيحه ۲۳۰/٦ حديث رقم ۳۳۹٤ ومسلم في صحيحه ۱۵٦/۱ حديث رقم

(۲۷۸-۱۷۲) والترمذی فی السنن ۵/۲۸۰ حدیث رقم ۳۱۳۰۔

ترجمہ: ''حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے' فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: میں نے اپنے آپ کو حجر (حطیم) میں دیکھا (اس حال میں کہ میں کھڑا تھا) اور قریش مکہ مجھ سے سفر معراج کے متعلق میں سوالات کر رہے تھے اور بیت المقدس کی وہ چیزیں اور نشانیاں دریافت کر رہے تھے جو مجھ کو اس وقت یاد نہیں رہی تھیں۔ اس بات سے (کہ قریش کی پوچھی ہوئی باتوں کا جواب نہ دے پایا تو یہ سب لوگ میرے بیت المقدس کے سفر اور معراج کے واقعہ کو ایک جھوٹا دعویٰ سمجھیں گے) مجھے اس قدر بے چینی اور کرب لاحق ہوا کہ پہلے کبھی نہ ہوا تھا۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے میری مدد فرمائی اور بیت المقدس کو بلند کر دیا' میں اسے دیکھ رہا تھا۔ (یعنی قادر مطلق نے میرے اور بیت المقدس کے درمیان سارے فاصلے سمیٹ دیئے اور سارے حجابات اٹھا دیئے' جس سے بیت المقدس کی پوری عمارت اپنے گرد و پیش کے ساتھ میری نظروں کے سامنے آ گئی اور میں اس قابل ہو گیا کہ قریش مکہ بیت المقدس کی جس چیز اور علامت کے بارے میں پوچھیں' میں اس کو دیکھ دیکھ کر بتاتا رہوں) چنانچہ وہ مجھ سے (بیت المقدس کے بارے میں) جو کچھ پوچھتے میں ان کو (سامنے دیکھ کر) بتا دیتا اور میں نے (اسراء و معراج کی رات میں) اپنے آپ کو انبیاء کے درمیان دیکھا' میں نے (اس وقت) حضرت موسیٰ علیہ السلام کو دیکھا جو کھڑے ہوئے نماز پڑھ رہے تھے' حضرت موسیٰ علیہ السلام متوسط قامت کے اور گھنگھریالے بالوں والے تھے' وہ (قبیلہ) شنوءہ کے آدمی ہیں۔ میں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو بھی دیکھا جو کھڑے ہوئے نماز پڑھ رہے تھے' ان سے سب سے زیادہ مشابہت رکھنے والے شخص عروہ بن مسعود ثقفی ہیں' پھر میں نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو بھی دیکھا جو کھڑے ہوئے نماز پڑھ رہے تھے' ان سے سب سے زیادہ مشابہت جو شخص رکھتا ہے وہ تمہارا دوست ہے۔ (تمہارے دوست سے) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مراد خود اپنی ذات تھی۔ پھر (آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ) جب نماز کا وقت ہوا تو میں ان سب (انبیاء) کا امام بنا اور جب نماز سے فارغ ہوا تو (آسمان پر جانے سے پہلے یا آسمان پر پہنچنے اور بارگاہ رب العزت میں حاضری کے بعد) ایک کہنے والے نے مجھے کہا: محمد صلی اللہ علیہ وسلم! یہ دوزخ کا داروغہ مالک ہے (اپنے پروردگار کی قہاریت کی تعظیم کے لئے یا جیسا کہ ابرار و صالحین کے آداب میں سے ہے از راہ تواضع و انکسار) اسے سلام کریں۔ چنانچہ میں (سلام کرنے کے لئے) اس (داروغہ دوزخ) کی طرف متوجہ ہوا' لیکن سلام میں پہل اسی نے کی''۔ (مسلم)

تشریح: (عن اشیاء من بیت المقدس لم اثبتها): الاثبات سے یعنی وہ بیت المقدس کی نشانیاں دریافت کر رہے تھے، اور مجھ کو دیگر اہم امور میں مشغول ہونے کی وجہ سے اس وقت یاد نہیں تھیں۔ (کربا): مشکاۃ کے تمام نسخوں میں یہ لفظ اسی طرح منقول ہے یہ مفعول مطلق ہے۔ معنی ہے سخت غمگین ہونا۔ اور آگے اسی مناسبت سے۔ (ما کربت مثلہ): فرمایا گیا کہ اس سے پہلے کبھی اتنا پریشان نہیں ہوا تھا۔ قاموس میں کرب کا معنی ''غم'' لکھا ہے جو دل میں پیدا ہوتا ہے جیسے الکربۃ اور کربہ الغم فھو مکروب کا معنی ''غم'' آتا ہے اور اسم مفعول مکروبٌ آئے گا۔

طیبی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے: مصابیح میں اسی طرح ہے۔ شرح مسلم میں کربا کی جگہ کربۃ یعنی آخر میں تاء مفتوحہ کے ساتھ منقول ہے۔ امام نووی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں لفظ مثلہ میں ضمیر الکربۃ کے معنی کی طرف راجع ہے جو کہ ''ہم'' یا ''غم'' یا شئی ہے۔

جوہریؒ فرماتے ہیں کربہ، کاف کے ضمہ کے ساتھ ہو تو اس سے وہ غم مراد ہوتا ہے جو سختی کے وقت دل میں پیدا ہوتا ہے۔

(انظر اليه): یہ جملہ حال ہے فرفعه کی ضمیر مفعول سے۔ مطلب یہ ہے کہ قادر مطلق نے میرے اور بیت المقدس کے درمیان سارے حجاب اٹھا دیے جس سے میں اس قابل ہو گیا کہ قریش بیت المقدس کی جس چیز کے بارے میں پوچھیں، میں دیکھ دیکھ کر بتا تا رہوں۔ اس معنی کے اعتبار سے یہ جملہ مستأنفہ مبینہ بن جائے گا۔ (ما يسألونی لی): نون پر تشدید اور بغیر تشدید دونوں صحیح ہیں۔ (عن شئ الا انباتهم): اور میں وہیں بیٹھے بیٹھے اس کو دیکھ دیکھ کے جواب دیتا رہا۔ گویا حالت مستحضرہ مراد ہے، تب ہی تو ماضی سالونی استعمال نہیں فرمایا۔ (وقد...... من الانبياء):

میں نے اپنے آپ کو انبیاء علیہم السلام کے درمیان دیکھا کا مطلب:

یہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اُس وقت کا ذکر کیا جب شب معراج میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم آسمانوں پر جانے سے پہلے مکہ سے بیت المقدس روانہ ہوئے اور بیت المقدس تشریف لائے کیونکہ حدیث کا سیاق وسباق اسی پر دلالت کرتا ہے علماء کا بھی متفقہ قول یہی ہے، کہ یہ دیکھنا اس دیکھنے کے علاوہ ہے جو آسمانوں میں تھا۔ بعض حضرات نے کہا ہے کہ ان انبیاء کو آسمانوں میں دیکھنا ان کی ارواح کے دیکھنے پر محمول ہے، البتہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ذات اس سے مستثنیٰ ہے، کیونکہ ان کے بارے میں یہ ثابت ہے کہ وہ اپنے جسم کے ساتھ آسمان پر اٹھائے گئے ہیں اور وہاں موجود ہیں۔

اسی طرح بعض نے حضرت ادریسؑ کے بارے میں بھی یہی کہا ہے۔

مسجد اقصیٰ میں جن انبیاء علیہم السلام کے ساتھ نماز پڑھنے کا ذکر ہے وہ کس پر محمول ہے؟

اس میں دو احتمال ہیں: (1) یہ احتمال ہے کہ یہ محض ان کی روحوں نے نماز پڑھی تھی۔ (2) اور یہ بھی احتمال ہے کہ ان کے جسموں نے روحوں سمیت نماز پڑھی۔ یہ دوسرا احتمال زیادہ قرین قیاس ہے۔ اور یہ نماز پڑھنا بھی آسمانوں میں جانے سے قبل ہے۔ جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے کہ انبیاء کرام اپنے پروردگار کے ہاں زندہ ہیں اور اللہ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے انبیاء کے جسموں کو کھانا زمین پر حرام کیا ہے یعنی اللہ تعالیٰ کے حکم سے زمین انبیاء کے جسم کو نہیں کھاتی اور وہ قبروں میں جوں کے توں موجود ہیں، نیز انبیاء کے جسم عام جسموں کی طرح کثیف نہیں بلکہ روحوں کی طرح لطیف ہیں، لہٰذا عالم ملک وملکوت میں کہیں بھی ان کے حاضر وجمع ہونے میں کوئی چیز مانع نہیں۔ خود حدیث کے الفاظ "فاذا موسى قائم يصلي" بھی اسی بات کی تائید کرتے ہیں کہ انبیاء کرام نماز پڑھتے وقت بیت المقدس میں اپنے جسم وروح دونوں کے ساتھ موجود تھے، کیونکہ نماز پڑھنے کا مطلب ہی یہ ہے کہ وہ مختلف افعال جو اعضا وجوارح کے ذریعہ صادر ہوتے ہیں وہ جسم ہی سے صادر ہوں نہ کہ محض روح کے ساتھ، اس لئے اس کا حکم بعینہ ایسا ہے کہ یوں کہا کہ انبیاء روح مع اجسام کے حاضر تھے، نیز "فاذا رجل ضرب" بھی اس کا قرینہ ہے۔ "رجل ضرب" کا معنی ہے کہ وہ میانہ قد مرد یا ہلکے جسم والے کے ہیں۔

(جعد): جیم کے زبر اور عین کے سکون ~~کے ساتھ~~ اس کے دو معنی آتے ہیں: (1) گٹھا ہوا مضبوط جسم، اس صورت میں مطلب یہ ہوگا کہ حضرت موسیٰؑ مضبوط بدن والے آدمی تھے۔ (2) گھونگر [illegible]

حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ حضرت موسیٰ سیدھے بالوں والے تھے۔ صاحب تحریر نے بھی یہی معنی ذکر کیا ہے۔
امام نوویؒ فرماتے ہیں دوسرا معنی لینا بھی جائز ہے کیونکہ جس شخص کے بال گھونگریالے بال ہوں لیکن گھونگریالے پن کم ہو اس کو بھی جعد کہا جاتا ہے۔

(كانه من رجال شنوءه): شنوءہ، مشہور قبیلہ کا نام ہے۔ (واذ عيسى قائم يصلي): اس حدیث میں یہ اشارہ بھی موجود ہے کہ نماز مؤمن کی معراج ہے کیونکہ مؤمن نماز کی حالت میں اپنے محبوب حقیقی کے سب سے زیادہ قریب ہوتا ہے اسی وجہ سے اللہ کے ذات وصفات کے عاشق لوگوں کے لیے سب سے زیادہ لذت والی چیز نماز ہی ہے۔ (اقرب الناس.... الثقفي): الثقفی یہ حضرت عروہ کی اپنے قبیلے کی طرف نسبت ہے، ابن مسعود کے لفظ سے کوئی یہ نہ سمجھے کہ یہ عبداللہ بن مسعودؓ کے بھائی ہیں، یہ ان کے بھائی نہیں' کیونکہ حضرت عبداللہ بن مسعود کا تعلق قبیلہ ھذیل سے ہے۔ مصابیح کے کچھ حواشی میں ان کو ابن مسعود کا بھائی لکھا گیا ہے جو صحیح نہیں۔ (واذا ابراهيم...... الناس به): آخری ذکر حضرت ابراہیمؑ کا فرمایا۔ طیبی رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ اشبه الناس به کا مطلب ہے تمام لوگوں میں حضرت ابراہیم کے ساتھ سب سے زیادہ مشابہ۔ (صاحبكم .... يعني نفسه): وہ یہی تمہارے ساتھی ہیں۔ (يعني نفسه): یہ کلام حضرت ابو ہریرہؓ یا ان کے بعد کے کسی راوی کا ہے، جو صاحبکم کی تفسیر ہے یعنی صاحب سے آنحضرت ﷺ نے اپنے ذات گرامی کو مراد لیا ہے اس سے آیت ﴿وما صاحبكم لمجنون﴾ کی طرف اشارہ ہے کہ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے صاحب کا لفظ آپ ہی کے لئے بولا ہے۔

حدیث کے الفاظ سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت نے انبیاء کو یہ نماز آسمان پر جانے سے پہلے بیت المقدس میں پڑھائی۔ آنحضرت ﷺ کا انبیاء کو نماز پڑھتے ہوئے دیکھنے میں یہ احتمال ہے کہ آپ بیت المقدس کی طرف جب سفر فرما رہے تھے اس دوران دیکھا ہو اور یہ بھی ممکن ہے کہ مسجد اقصیٰ ہی میں ان کو نماز پڑھتے ہوئے دیکھا، پھر کیونکہ مسجد اقصیٰ ہی انبیاء بنی اسرائیل کا سب سے بڑا مرکز رہا ہے اس لیے یہی بات زیادہ قرین قیاس معلوم ہوتی ہے کیونکہ جملہ "فحانت الصلواة" سے بھی اسی کی تائید ہوتی ہے، جس کے شروع میں فاء تعقیب کیلئے ہے۔ یعنی اتنے میں نماز کا وقت ہو گیا۔

آنحضرت ﷺ نے کس نماز کی امامت کرائی؟

یہ نماز جس کی امامت آنحضرت ﷺ نے کرائی یا تو تحیۃ المسجد تھی یا معراج کی مناسبت سے کوئی مخصوص نماز تھی، جو صرف اسی موقع پر پڑھی گئی تھی۔ (فامتهم): چنانچہ میں ان کا امام بنا کیونکہ حقیقت میں ابھی میں ہی ان کا امام تھا۔ شرح مسلم میں قاضی عیاضؒ کا قول نقل کیا گیا ہے کہ اگر کوئی یہ سوال کرے کہ جب آنحضرت ﷺ نے انبیاء کرام کو مسجد اقصیٰ میں نماز پڑھتے دیکھا بلکہ ان کو نماز پڑھائی تھی۔ پھر ان کو آسمانوں میں کیسے دیکھا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ پہلے ان انبیاء نے مسجد اقصیٰ میں آنحضرت ﷺ کے پیچھے نماز پڑھی اور پھر ان کو آنحضرت ﷺ کے استقبال کے لئے آسمانوں پر پہنچا دیا گیا ہو، نیز یہ بھی ممکن ہے کہ آنحضرت ﷺ جب سدرۃ المنتہیٰ سے واپس نیچے تشریف لائے تو تمام انبیاء آپ کے ساتھ بیت المقدس تک آئے اور آپ ﷺ نے یہاں الوداعی نماز پڑھائی۔ ان دونوں باتوں کے پائے جانے میں کوئی عقلی اور نقلی مانع بھی موجود نہیں اگرچہ یہ خارق العادہ

امور اپنی کیفیت کے اعتبار سے عقل سے خارج ہیں، لیکن اللہ تعالیٰ قادر مطلق ہے، اس کی قدرت سے کوئی چیز باہر نہیں ہے وہ جس طرح چاہتا ہے اپنی قدرت کا کرشمہ ظاہر کرتا ہے اس کی نظیر موجود ہیں چنانچہ اولیاء اللہ کو متعدد صورتوں کے ساتھ لوگوں نے دیکھا ہے، صوفیاء نے اس طرح کے بہت سے حالات بزرگوں کے نقل کئے ہیں، تو انبیاء علیہم السلام کے ساتھ ایسی صورت پیش آنے میں کیا استبعاد ہے۔

روایت میں آتا ہے حضرت عبدالقادر جیلانیؒ سے کسی نے کہا: قضیب البان نماز نہیں پڑھتے۔ آپؒ نے فرمایا آپ لوگ اس طرح نہ کہیں ان کا سر تو ہمیشہ باب کعبہ پر سجدہ ریز رہتا ہے، یہ حال ہے اہل اللہ کا، تو انبیاء کے بارے میں تو کوئی خفا والی بات ہے ہی نہیں، انبیاء تو پہلے سے زندہ تھے، اپنی اپنی قبروں میں نماز میں مشغول تھے۔

انہیں سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کے معراج سماوی کا جب علم ہوا تو وہ بھی اللہ کے حکم سے تشریف لائے اور سارے بیت المقدس میں اکٹھے ہوگئے (جو تمام اصفیاء کا مرکز تھا) پھر سب نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اقتداء کی جو اس وقت سب سے افضل ہونے کی وجہ سے امام الکل کا درجہ رکھتے تھے۔ پھر آپ کے احترام میں سب نے آسمانوں تک مشایعت فرمائی۔ آسمانوں پر پہنچ کر ہر ایک اللہ تعالیٰ کے طرف سے عطا کردہ اپنے اپنے مقام پر سکونت پذیر ہوئے پھر جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ان کے پاس سے گزر ہوا، ہر ایک کو خاص طور پر سلام کیا اور تمام مقربین نے اپنے اپنے طور پر آپ کو خوش آمدید کہا اور چلتے چلتے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سدرۃ المنتہیٰ سے بھی تجاوز کر کے اس مقام پر جا پہنچے جس کو قرآن کریم بیان کرتا ہے، فرمایا: ﴿قاب قوسین او ادنی فاوحی الی عبده ما اوحیٰ ما كذب الفؤاد ما رای﴾ [النجم ۹ تا ۱۱] (نزدیک آیا پھر اور نزدیک آیا سو دو کمانوں کی برابر فاصلہ رہ گیا، بلکہ اور بھی کم، پھر اللہ تعالیٰ نے اپنے بندے پر وحی نازل فرمائی جو کچھ نازل فرمائی تھی)۔ یہ قرب و محبت وہ انتہائی اعلیٰ مقام تھا جہاں مزید فنا کو جب بقاء حاصل ہوگی اور ملاقات کے بعد جدائی ہوئی، رفع کے بعد نزول ہونے لگا تو اللہ تعالیٰ کی جانب سے نماز اور دیگر تحفے عطاء ہوئے، جن کو لے کر دوبارہ اسی راستے منزل کی جانب روانہ ہوئے، راستے میں انبیاء علیہم السلام دوبارہ جمع ہوئے اور آپ کے ساتھ یا آگے پیچھے چلتے ہوئے پھر بیت المقدس آپہنچے، چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے ساتھ الوداعی نماز پڑھی اور رخصت ہوئے۔

پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا قول: ''فلما فرغت من الصلوة'' میں بھی دونوں احتمال ہیں کہ یہ نماز اوپر جانے سے پہلے پڑھی ہو یا واپسی کے بعد۔

(فسلم عليه): آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے فرمایا ان سے اللہ کی جلال کبریائی کی تعظیم کی خاطر سلام کیجئے، یا تواضعاً آپ سے درخواست فرمائی جو کہ نیک لوگوں کا شیوہ ہے۔ (فالتفت اليه): جب میں نے سلام کے ارادے سے ان کی طرف التفات کیا۔ (فبدانى بالسلام): بجائے میرے انہوں نے پہل کر دی کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا مقام عظیم اور آپ کے ادب سے واقف ہے اس لئے فوراً سلام کر دیا۔

طیبی رحمہ اللہ کہتے ہیں جہنم کے داروغہ نے سلام میں پہل اس لئے کی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان کو دیکھ کر خوفزدہ ہوئے تھے اور فرشتہ اس کو زائل کرنا چاہ رہا تھا۔ بخلاف انبیاء کرام کو آپ کا سلام کرنا جس میں اس طرح کی کوئی بات نہ تھی مزید تفسیر پہلے گزر چکی ہے۔ انتہی۔

ملا علی قاریؒ فرماتے ہیں کما سبق کی تفصیل یہ گزری ہے کہ آنحضرت ﷺ نے انبیاء علیہم السلام کو پہلے سلام فرمایا تھا جو کہ ان کی تعظیم اور اکرام کے لئے تھا، نیز اس میں تواضع کا پہلو بھی ملحوظ تھا یا آپ بمنزلہ کھڑے شخص کے تھے اور انبیاء بمنزلہ قاعد کے تھے، جس کی تفصیل آدمؑ سے ملاقات کے ذیل میں کی جا چکی ہے، یا آپ ﷺ بمنزلہ راہ گزر کے تھے اور وہ بمنزل جالسین کے تھے یا آپ ﷺ نے اس لئے سلام کیا کہ آپ زندہ تھے اور وہ بمنزلہ اموات کے تھے۔ واللہ اعلم بحقیقه الحالات۔

الفصل الثانی:

وھذا الباب خال عن الفصل الثانی

اس باب میں دوسری فصل نہیں ہے

الفصل الثالث:

۵۸۶۷ :وَعَنْ جَابِرٍ اَنَّهٗ سَمِعَ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ لَمَّا كَذَّبَنِىْ قُرَيْشٌ قُمْتُ فِى الْحِجْرِ فَجَلَّى اللّٰهُ لِىْ بَيْتَ الْمُقَدَّسِ فَطَفِقْتُ اُخْبِرُهُمْ عَنْ اٰيَاتِهٖ وَاَنَا اَنْظُرُ اِلَيْهِ۔ (متفق علیه)

اخرجه البخاری فی صحیحه ۱۹۶/۷ حدیث رقم ۳۸۸۶ ومسلم فی صحیحه ۱۵۶/۱ حدیث رقم (۲۷۶-۱۷۰) والترمذی فی السنن ۲۸۱/۵ حدیث رقم ۳۱۳۳ واحمد فی المسند ۳۷۸/۳۔

ترجمہ: ''حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ انہوں نے رسول اللہ ﷺ کو ارشاد فرماتے ہوئے سنا: ''جب قریش نے (شب معراج میں میرے بیت المقدس جانے کے بارے میں) میری تکذیب (اور مجھ سے بیت المقدس کی عمارتی علامات اور نشانیاں پوچھنے لگے) تو میں حجر یعنی حطیم میں کھڑا ہو گیا اور اللہ تعالیٰ نے بیت المقدس کو میرے لئے ظاہر کر دیا' چنانچہ میں بیت المقدس کی طرف دیکھ دیکھ کر اس کی نشانیاں اور علامات ان لوگوں کو بتا تا رہتا''۔ (بخاری ومسلم)

تشریح: (عن جابر...... لما کذبنی) (فجلی اللہ): باب تفعیل سے لام مشدد کے ساتھ۔ (فطفقت): یہ سارا واقعہ آپ کی نبوت کی علامت ہیں۔ (وانا انظر الیه): جملہ حال ہے۔